پشتو عوامی کہانی

زرسانگہ

فہمیدہ اختر

لنڈی خانہ کے درخت شینوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گہرے سبز رنگ کے گول گول سے پتوں میں مونگیا رنگ کے شینوں کے خوشے لنڈی خانے میں گہرا حسن پھیلا رہے تھے۔ زرسانگہ کے قدم رقص کی سی کیفیت لئے شاطرینہ سے آگے بڑھ گئے۔ اس نے ہنستی ہوئی نظروں سے شینوں کے شاداب درختوں کو دیکھا اور دو پٹہ سامنے والے درخت کی اوپر والی شاخ پر پھینک کر اسے نیچے جھکا لیا۔ اور شینوں کے خوشے توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالنے لگی۔ جب جھولی بھر گئی تو دونوں ہاتھوں سے اُسے رگڑ سی دی۔ خوشوں میں سے شینوں کے دانے جھولی میں بکھر گئے، اس نے دانے ٹوکری میں ڈال دئے اور دانوں سے خالی خوشے پھینک دئے۔ اس نے دوسری شاخ جھکائی اور دونوں ہاتھوں میں اسے پکڑ کر جھولا سا جھولنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں ایک رسیلی سی آواز آئی "بہت خوش ہو، بھائی کی منگنی ہونے والی ہے، آخر کیوں نہ اتنی خوشی ہو۔ آٹھ بہنوں کا ایک بھائی ہے"۔ زرسانگہ نے ایک دم سے رک کر سامنے دیکھا۔ اس کی نظر درختوں میں چھپی ہوئی گل مندا پر پڑی۔ ایک لطیف قہقہہ اس کے پاکیزہ لبوں پر پھیل گیا۔ جھکی ہوئی شاخ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ وہ بولی "منگنی تو جیسے کو ہوئی ہے مگر خوشی منانی ابھی باقی ہے۔ ہمارے آدمی جلال آباد گئے ہوئے ہیں، قوال لانے کے لئے"۔ گل مندا مسکرائی اور زرسانگہ کے قریب آتے ہوئے بولی "اچھا، مجھے تو علم نہ تھا، تمہیں مبارک ہو"۔

زرسانگہ کی نشیلی آنکھوں میں شینوں کے درختوں کی ساری ٹھنڈک بھر گئی۔ اس نے دعا دی "خدا کرے تمہارے بھائی کی منگنی بھی جلد ہو جائے"۔ گل مندا نے پوچھا "وہ لوگ کب لوٹیں گے جلال آباد سے؟" زرسانگہ نے آزاد سرزمین کی آزاد ہواؤں میں ایک سرد سانس لیتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے آج ہی آ جائیں، پھر آج رات کو ہی محفل جمے گی، تم بھی آنا ہمارے ہاں، چھت پر سے تماشا دیکھیں گے"۔ اور زرسانگہ کے خوبصورت ہاتھ اوپر اٹھ گئے اور اس کی لانبی لانبی سفید سفید انگلیاں گریبان میں اٹکے ہوئے کابلی روپوں پر ٹپ ٹپ کرنے لگیں گویا وہ بھائی کی منگنی کی خوشی میں کوئی سریلا سا ساز بجانے لگ گئی ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے پیچھے سے آ کر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ گل مندا کی نظریں کانپ گئیں اور زرسانگہ کا دایاں ہاتھ کابلی روپوں پر ساز بجاتا ہوا ایکدم رک گیا۔

اس نے حیران ہو کر بائیں جانب دیکھا۔ اس کی نظر شاہ خمیر پر پڑی۔ وہ فوراً سب کو سمجھ گئی اور اُسے حقیقت بتانے کے انداز میں چلائی "میں بازار کے یار محمد کے خاندان سے نہیں ہوں، میں کرمنہ کے بادشاہ گل کے خاندان سے ہوں، میرا لباس تو دیکھ، یہ کرمنہ کا لباس ہے"۔ مگر شاہ خمیر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اپنے پیچھے کھینچنے لگا۔ گل مندا گرجی "یہ سچ کہہ رہی ہے، اسے چھوڑ دو"۔ شاطرینہ نے دو درختوں کے درمیان سے دیکھا اور اس کے چہرے کے ارد گرد دہکتے ہوئے انگاروں نے حلقہ کر لیا، اُس نے ایک بھاری پتھر اٹھایا تاکہ شاہ خمیر کا سر [illegible] اچانک اس کی نظر شاہ خمیر کے دو ساتھیوں پر پڑ گئی۔ اُسے اپنی جان بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ وہ غصے میں لرزتی ہوئی درختوں کی آڑ میں ہو گئی۔ زرسانگہ کے کانوں میں قبائلی علاقے کی تیز و تند آندھیوں کا سارا شور بس چکا تھا۔ وہ طوفان کی طرح چیخی "میں زخاخیلوں کے بہادر اور غیرت مند قبیلے سے ہوں بدبخت، ہمارے ساتھ کیوں دشمنی مول لیتے ہو؟" جب اس نے محسوس کیا کہ شاہ خمیر اکیلا نہیں، اس کے ہمراہ دو نوجوان اور بھی ہیں تو اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا "ارے بہادرو، پہلے دشمن پہچانا کرو، پھر دشمنی کیا کرو"۔ شاہ خمیر کے قدم مدھم پڑ گئے، اس نے مڑ کر [illegible] کی طرف دیکھا۔ شکر خان غرایا "ایسے ہی کہہ رہی ہے، مت چھوڑنا"۔ اس کے ساتھ ہی شاہ خمیر کی رفتار تیز ہو گئی۔

جوان اول بی بی کیمپ کے باہر بیٹھی اپنا سرخ رنگ کا کرتا سی رہی تھی، جب اس کی نظر شاہ خمیر اور زرسانگہ پر پڑی تو اس کی سفید پیشانی پر کئی شکنیں نمودار ہو گئیں اور ان شکنوں میں سوچ کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی، کرتا کندھے پر ڈالا اور ان کے قریب آ کر اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ زرسانگہ کے تر و تازہ چہرے پر شفق کی ساری سرخیاں جمع تھیں، اس کا سانس تیزی سے آ جا رہا تھا اور اس کی نشیلی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ اول بی بی نے قہر آلود نظر شوہر پر ڈالی اور بولی "نئی دشمنی مول لے لی؟ یہ لڑکی یار محمد کے خاندان سے نہیں، یہ کرمنہ کی ہوتی ہے"۔ شاہ خمیر کی نظروں میں غصہ بھر گیا، وہ شکر خان کی طرف دیکھنے لگا۔ زرسانگہ نے بھی ایک لمحے کے لئے شکر خان کی طرف دیکھا۔ شکر خان کو یوں

جیسے وہ کہہ رہی ہو "تم ایک ٹھیک دشمن نہیں ہو۔" لشکر خاں کے سینے میں پشیمانیوں کے مدوجزر اٹھنے لگے۔ وہ شانے کے ساتھ لٹکے ہوئے پستول سے کھیلنے لگا۔ اور خفت آمیز لہجہ میں بولا "تو کیا ہوا، یہ واپس جا سکتی ہے۔"

اوّل بی بی نے زرسانگہ کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو بہن کچھ کھا پی لو۔ تھک بھی گئی ہو گی، ذرا آرام کر لو، دوپہر کے بعد چلی جانا۔"

زرسانگہ نے بے قراری سے کہا "نہیں میں ابھی وقت واپس جاؤں گی۔"

اوّل بی بی اسے سمجھانے لگی، "اتنا صبر کرو بہن کہ گل اکبر اور خان بادشاہ آجائیں، اُن کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گی، تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

زرسانگہ کیمپ کے اندر جا کر چارپائی پر ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اوّل بی بی نے اس کے سامنے ایک چنگیر لا کر رکھ دی اس میں لسی سے بھرا ہوا کٹورہ، مکھن، پیاز اور جوار کی دو روٹیاں تھیں۔

زرسانگہ منہ پھیر کر بولی "میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

اوّل بی بی نے نرمی سے کہا۔ "تم ہماری مہمان ہو بہن، تمہارے خاندان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں" اور لسی کا پیالہ زرسانگہ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

جب قبائلی علاقے کی ہواؤں میں دوپہر کی تمازت بھر گئی تو زرسانگہ، گل اکبر اور خان بادشاہ کے ساتھ چل پڑی۔ "اُچ لرگی" کا پہاڑ عبور کر کے وہ اُسے "لنڈی خانے" تک چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ شینوں کے ٹھنڈے سایوں والے درختوں کے جھنڈ تک پہنچ کر اسے اپنی نند شاطرینہ کا خیال آیا۔ اُس نے کرمنے کے سارے علاقے میں آگ لگا دی ہو گی! ایسا نہ ہو کہ آدم خیل آچکا ہو اور قوالوں کو واپس کر دیا ہو۔ وہ شینوں کے خوبصورت درختوں میں بھاگنے لگی۔ آن کی آن میں تاغیانو کے پہاڑ پر چڑھ گئی اور پھر تیزی سے دوسری طرف اُتر گئی۔ جب اس نے کرمنے کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کا جی چاہا کسی سے پوچھے "میرے بھائی نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟" اچانک اس کی نظر بارانے پر پڑی جو کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈیوں پر سے گذر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر بے تابی سے بولی "میرا بھائی جلال آباد سے آگیا ہے؟ اُس نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟" بارانے نے اُسے حیران نظروں سے دیکھا اور کہا "وہ ابھی نہیں آیا۔" زرسانگہ کی زندگی کے گویا تمام اندیشے علاقہ آزاد کی فضاؤں میں کھو کر رہ گئے۔ وہ گنگنائی "خدایا ہم آٹھ بہنوں کے بھائی کو سات بیٹوں کا باپ کرنا"! بارانے نے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ پگڈنڈیوں پر سے دوڑتی چلی گئی۔

شاطرینہ صحن میں مرجھائی ہوئی بیٹھی تھی، محلے کی چند عورتیں اُسے گھیرے ہوئے تھیں۔ جب اُن کی نگاہ زرسانگہ پر پڑی تو وہ چونک سی گئیں اور اس طرح اُسے دیکھنے لگیں جیسے ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے کسی شناسا کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند لمحے لگاتار دیکھنے کے بعد شاطرینہ کا سویا ہوا چہرہ جاگ اٹھا۔ وہ بھاگ کر آئی اور اپنی حسین بھاوج کے گلے سے لپٹ گئی۔

کرمنہ میں شور مچ گیا کہ زرسانگہ واپس آگئی، وہ غلطی سے لے جائی گئی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا گھر عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ سب اُسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے تھے جیسے انہوں نے اُسے پہلی بار دیکھا ہو اور وہ کسی اجنبی شہر سے آئی ہو۔

جب دن کے اُجالے شام کے دھندلکوں میں ڈھلنے لگے تو ننھا رخسے بھاگتا ہوا آیا اور بولا "وہ آگئے ہیں۔" زرسانگہ کا جی چاہا کہ وہ رخسے کو گود میں اٹھا کر اس کا پھول سا چہرہ چوم لے مگر وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر گئی اور دیوار کی آڑ میں ہو کر نیچے دیکھنے لگی۔ اس کی نظر کئی چہروں پر پڑنے کے بعد آدم خیل پر پڑی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناچتی ناچتی اس تک پہنچ جائے اور اُسے سینے سے لگا لے اور کہے "میرے اچھے بھائی، اللہ تجھے سات بیٹوں کا باپ بنائے۔"

یارست کرمنہ کی چہ میگوئیوں سے بے خبر حجرے کو درست کرنے لگ گیا۔ اس کے چہرے پر جلال آباد کے سفر کی تکان کے کوئی آثار نہ تھے۔ حجرے کے چاروں طرف چارپائیاں ڈال دی گئیں اور درمیان میں چٹائی بچھا دی گئی دیکھتے ہی دیکھتے کرمنہ کے جوان اور بوڑھے بندوقیں تھامے اُن کی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ بچے قوالوں کے ارد گرد زمین پر جمع ہو گئے، محلے کی کئی عورتیں آئیں اور زرسانگہ کے پاس چھت پر چلی گئیں، قوالوں نے قوالی شروع کر دی اور کرمنہ کے در و دیوار موسیقی کی تانوں میں کھو گئے۔

یارست محسوس کرنے لگا کہ محفل میں بیٹھے ہوئے لوگ جب اس کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کی نظریں کوئی عجیب سی کہانی سنانے لگتی ہیں۔ اس نے غزل سے پوچھا "یہ کیا بات ہے"؟ غزل نے اُسے اشارہ کیا اور وہ دونوں موسیقی کی محفل سے باہر نکل گئے۔

غزل صبح کا واقعہ سناتا گیا اور یارست کا خون کھولتا گیا۔ جب غزل خاموش ہو گیا تو یارست نے ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ میں تھامی ہوئی بندوق کو کندھے کے ساتھ لگا لیا اور بھاری بھاری قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ غزل اس کے پیچھے بھاگا "دیکھو دوست، بھابی بے قصور ہے، اُسے کچھ نہ کہنا۔"

یارست غرایا "اسے بازار کے علاقے میں جا کر شینے اکٹھے کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ لوگ میری طرف دیکھیں اور کہیں کہ اس کی بیوی

جگر مراد آبادی ممتاز مفتی قیوم نظر ابوسعید نورالدین

ڈاکٹر آصفجاہ کاروانی اختر ہوشیارپوری انجم اعظمی یونس احمر

جمیل نقوی مشتاق مبارک رفعت روبینہ سحاب قزلباش

مقبرہ شرف النسا

یہ دو منزلہ مقبرہ میکینکل انجینئرنگ کالج لاہور کے عقب میں واقع ہے اور اپنی سیدھی سادی وضع سے دل پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

مگر شاعر نے بہشت میں جو قصر شرف النسا دیکھا ، اس کی خوبصورتی اور شان و شوکت ناقابل بیان ہے

مقبرہ کے چوکور برج کی دوسری منزل

(ملاحظہ ہو نظم علامہ اقبال
صفحہ ۱۷۰

ماہِ نو

جلد ۱۰ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۵۷ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ——— آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

سرورق: شاہ عنایت اللہ شہید کا روضہ (جھوک ضلع ٹھٹھہ) — رنگین عکس: آفتاب احمد

آپس کی باتیں

عہدِ حاضر خامۂ اقبال گشت — ملک الشعراء بہار نے یہ بڑی پتے کی بات کہی تھی۔ یہ دور واقعی اقبال ہی کا دور ہے جو ہر اعتبار سے اس کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے یونہی نہیں کہہ دیا تھا کہ، من نوائے شاعرِ فرداستم

اقبال پہلے بھی شاعرِ فردا تھے، اب بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، کیونکہ جس دور میں وہ پیدا ہوئے اس کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ مشرق و مغرب کو ایک بار پھر آمیز کیا جائے اور ایک نئی زندگی، نئے نظام، نئے سلسلۂ تہذیب و تمدن کا آغاز ہو۔ اس میں ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کا پیدا ہونا لازم تھا جو موجودہ تمدنوں کے اختلاط سے ایک جامع نظام کی بنیاد رکھے اور یہ کہہ سکے کہ: من شاید نخستیں آدم از عالمے دیگر

اقبال ایک ایسی ہی عہد آفریں شخصیت تھے، اپنے ہی "انسان کامل" کی ایک عمدہ مثال۔ انہوں نے ایک نئے تصور کو جنم دیا جو زندگی کو نت نئے سانچوں میں ڈھالنے میں مدد دیتا ہے۔ اسلئے یہ تصور کبھی فرسودہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں عبرانیت اور یونانیت، عرب و عجم، مشرق و مغرب کا ایسا امتزاج پیش کیا گیا ہے جس سے فرد اور جماعت دونوں کی مسلسل نشو و نما لازمی ہے۔

اقبال کی یہ آفاقیت، یہ ابدیت روز بروز نمایاں ہو رہی ہے۔ وہ دن گئے جب وہ انجمن میں تنہا تھے۔ اب عجم بھی اسی طرح ان کے افکار سے باخبر ہے جس طرح عرب، اور مغرب بھی اتنا ہی مستفیض ہو رہا ہے جتنا مشرق۔ چنانچہ ایران، مصر، فرانس، اٹلی، انگلستان، امریکہ ہر کہیں ان کی تصانیف کے تراجم ہو رہے ہیں اور ان کے ہمنواؤں کا حلقہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ مشرق تو الگ رہا مغرب میں بھی اقبال پر جس ذوق و شوق سے کام ہو رہا ہے، حیرت آفریں ہے۔ بعض اہلِ مغرب تو اس طرح اقبال کے افکار کی شرح و تفسیر کر رہے ہیں جیسے وہ آیاتِ الٰہی ہوں اور ان کی تصانیف مذہبی صحائف۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ملک کی ایک مایۂ ناز شخصیت نے اپنے تخیلات سے نئی جوت جگائی ہے اور نوعِ انسان کی رہنمائی کی ہے۔

ایسی عظیم شخصیت کے افکار کی توضیح اور نشر و اشاعت ہمارا فرض ہے، یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اقبال اکاڈمی کے قیام سے اس اہم کام کا وسیع پیمانہ پر اہتمام کیا گیا ہے۔ حال ہی میں اس ادارہ نے کراچی میں اقبال سے متعلق نوادر کی نمائش منعقد کی جس سے تحقیق کے لئے نیا سامان میسر آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہم اس شمارہ میں اس تقریب کی چند تصاویر پیش کر رہے ہیں ان کے ساتھ ہی تبرکاً اقبال کے مقبرہ، ان کی اپنی تعمیر کردہ کوٹھی اور ان کے ملازم علی بخش کی تصویریں بھی پیش کر رہے ہیں۔ ان سب سے زیادہ ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم سب سے پہلے شرف النساء کے مقبرہ کی چند تصاویر پیش کر رہے ہیں جس کا ذکر اقبال نے جاوید نامہ میں کیا ہے۔ یہ خاتون لاہور کے مغل گورنر عبدالصمد کی دختر نیک اختر تھیں جو تلوار باندھ کر قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتی تھیں کیونکہ یہ دونوں ملت کی بقا اور تحفظ کے ضامن ہیں۔ اور ان کی وصیت کے مطابق دونوں کو ان کے مرقد پر رکھ دیا گیا تھا۔ ہم نے قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر ایک جگہ "جاوید نامہ" کے وہ اشعار بھی درج کر دئے ہیں جو شرف النساء سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس شمارہ کے ساتھ "ماہِ نو" کی عمر کا دسواں سال شروع ہوتا ہے۔ نئے سال کے نئے عزائم کی ایک ابتدائی جھلک اس اشاعت میں نظر آئے گی۔ منجملہ دیگر خصوصیات کے اس شمارہ میں تصاویر کا اہتمام ایک خاصے کی چیز ہے چنانچہ اس شمارہ میں لاہور کے شکستہ مغلیہ باغ "چوبرجی" کی چند تصاویر بھی پہلی بار پیش کی جا رہی ہیں۔ یہی کیفیت ایبٹ آباد کی ہے۔ ان سب وجوہ کی بنا پر یہ شمارہ تصویری اعتبار سے نوادر اور اولیات کا شمارہ ہے۔

آج کل مغرب میں اقبال کا جو چرچا ہے اس کی تھوڑی سی جھلک آپ کو جناب قیوم نظر کے مضمون "خمستانِ فرنگ" میں دکھائی دے گی جس میں انہوں نے موجودہ دور کے اہلِ قلم سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے اور اس کے آخر میں کلامِ اقبال کے ولندیزی مترجم ہولسٹ سے گفتگو پیش کی ہے۔

"ماہِ نو" کا اگلا شمارہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی یادگار ہوگا۔ "قصہ گویاں قصۂ ناگفتہ اند"۔ غیر مسلم مورخین نے اس کے خدوخال مسخ کر دئے ہیں اب وقت ہے کہ ہم حقیقت کے رخ سے نقاب ہٹا کر اس کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کریں۔ یہ ہمارے اہلِ قلم اور اربابِ تحقیق کو صلائے عام ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اس قومی پیشکش، اس شمارۂ خاص میں ایسی آب و تاب پیدا کریں گے کہ یہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہے۔

اقبال کا تصوّرِ خودی

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی

اگرچہ علامہ اقبال کی جملہ نگارشات کا مرکزی خیال خودی ہے تاہم انہوں نے اپنے نظریات دیگر فلاسفہ کی طرح بالتفصیل اور بالترتیب کہیں بیان نہیں کئے منظومات میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، گلشن رازِ جدید اور بالِ جبریل کے ساقی نامے میں اُن کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے دیباچوں اور ڈاکٹر نکلسن کو اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے کے سلسلے میں انہوں نے جو خط لکھا تھا اس میں نظریۂ خودی کی بعض جزئیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اُن میں تفصیلاتِ نظریہ کم ہیں، خودی کی اہمیت اور استحکام پر زیادہ زور ہے۔ اپنی تمام تصانیف میں سے صرف انگریزی خطبات موسوم بہ "ری کنسٹرکشن آف ریلی جیئس تھاٹ اِن اسلام" میں اقبال نے نظریاتی حیثیت سے خودی کی تفصیلات سے بحث کی ہے لیکن چونکہ ان خطبات کا براہ راست تعلق فلسفہ سے نہیں ہے بلکہ مذہبی فکر کی از سر نو ترتیب سے ہے۔ لہٰذا ان میں بھی نظریۂ خودی کی تفصیلات پر بالترتیب روشنی نہیں ڈالی گئی۔ علاوہ اس کے ان خطبات میں اقبال نے اپنے نظریات کے مغربی مآخذ کو نظر انداز کر دیا تھا جس کی وجہ سے اُن کا جامع تصوّر قائم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۸ء میں اقبال نے غلام بھیک نیرنگ کو اُن کے خطبات کے ترجمے کے بارے میں لکھا تھا "باقی رہا لکچروں کے ترجمے کا کام سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور از بس مشکل ضرور ہے۔ ان لکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو اُن کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں میں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو محفوظ خاطر رکھا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو خواں دنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے کیونکہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو پہلے سے حاصل ہے، اس کے بغیر چارہ نہ تھا"

اس مقالے میں علامہ اقبال کی نگارشات اور اُن کے تخیل کے مشرقی و مغربی مآخذ کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے فلسفۂ خودی کے نظریاتی پہلو پر روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے:

اقبال کے نزدیک جملہ موجودات کی اصل ایک باشعور قوت تخلیق ہے جسے وہ انتہائی خودی (ULTIMATE EGO) کہتے ہیں:-

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ اُو
غیرِ اُو پیداست از اثباتِ اُو
می شود از بہرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل
خیزد انگیزد پرد تابد دمد
سوزد افروزد کشد میرد دمد

اپنے انگریزی لکچروں میں وہ کہتے ہیں: "شعوری تجربے کے عمیق پہلوؤں کا تزکیہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تجربہ کا انتہائی منبع ایک باشعور قوت تخلیقی ہے جس کو میں نے انتہائی خودی کا نام دے دیا ہے۔"

اگر چشمی کشائی بر دلِ خویش
درونِ سینہ بینی منزلِ خویش (گلشن رازِ جدید)

اُن کا خیال ہے کہ اس انتہائی خودی کو قرآن پاک میں ایک مکمل شخصیت تصور کیا گیا ہے اور اس کی انفرادیت کو واضح کرنے کی غرض سے اس کو اللہ کا مخصوص نام دیکر اس کی یہ تعریف کی گئی ہے:-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ

اس تعریف کی تائید میں دلائل پیش کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: انتہائی خودی زمانِ مجرد میں رہتی ہے۔ زمانِ مجرد میں رہنا انتہائی خودی کا اثبات ہے اور خودی کے اثبات کے معنی انا ہیں۔ انا یا خودی چونکہ شخصیت کا دوسرا نام ہے لہٰذا یہ واضح ہو گیا کہ خدا ایک شخصیت ہے چونکہ انتہائی خودی کا دائرہ عمل زمان مجرد ہے جو ایک حرکی عضویہ (DYNAMIC ORGANISM) ہے اور

ایک مسلسل "ہنوز" کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے لہٰذا نہ تو انتہائی خودی کی کوئی ضد ہو سکتی ہے اور نہ وہ جامد و ساکت ہو سکتی ہے بلکہ اسے ایک بے مثال قوتِ تخلیق ہی کی شکل میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انتہائی خودی کی کوئی ضد نہیں، اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں، اس لئے اس کا تخلیقی عمل خارجی نہیں داخلی ہوگا اور وہ بازیابی (RECREATION) کے متضاد رجحان سے پاک ہوگی۔ انتہائی خودی چونکہ بازیابی کے متضاد رجحان سے مبرّا ہے۔ لہٰذا اس کی ذات ہر نقص سے پاک ہوگی اور اس کی شخصیت کامل ہوگی۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ انتہائی خودی ایک شخصیت ہے کامل، خود مرکوز، بے نظیر اور بازیابی کے وصف سے پاک۔ اُن کا خیال ہے کہ یورپ کے جدید سائنٹفک اور فلسفیانہ تجربوں اور دریافتوں سے بھی خدا کے اس تصور کی تصدیق ہوتی ہے ۔

لیکن شخصیت کا تصور کردار کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ انتہائی خودی اگر شخصیت ہے تو اس کا بھی کچھ کردار ہونا چاہئے۔ اقبال کے خیال میں فطرت انتہائی خودی کا کردار ہے جس کی تصدیق وہ اس حدیث سے کرتے ہیں "دہر کو برا مت کہو، دہر خدا ہے"۔ وہ کہتے ہیں "انتہائی خودی کے لئے فطرت کی وہی حیثیت ہے جو انسانی خودی کے لئے کردار کی ہے۔ فطرت کا مطالعہ خدا کے کردار کا مطالعہ ہے"۔ فطرت کا مطالعہ کرنے سے انتہائی خودی کا تصور بھی قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کا قرب بھی حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

خدا کو شخصیت تصور کر لینے سے ایک دقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اُسے لامحدود کیسے سمجھا جائے ؟ اقبال اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں "خدا کو لامکانی محدودیت کے لحاظ لامحدود تصور نہیں کیا جا سکتا۔ روحانی معاملات میں محض مکانی بڑائی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ مادی اور مکانی لامحدودیت کو مطلق بھی نہیں کہا جا سکتا۔ جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فطرت کوئی ساکت و جامد شے نہیں جو لامحدود خلا میں واقع ہو بلکہ وہ تو باہم متعلق واقعات کا نظام ہے جس کے باہمی تعلقات سے زمان و مکاں کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ گویا یہ اس حقیقت کو پیش کرنے کا دوسرا طریقہ ہے کہ زمان و مکاں وہ معانی ہیں جو فکر نے انتہائی خودی کے تخلیقی عمل کو دیدئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر زمان و مکاں انتہائی خودی کے امکانات ہیں جن کا کچھ حصہ ہمارے زمان و مکاں کی شکل میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ انتہائی خودی کے باہر اور اس کے تخلیقی عمل کے علاوہ نہ زماں ہے نہ مکاں۔ لہٰذا انتہائی خودی نہ تو مکانی لامحدودیت کے لحاظ سے لامحدود ہے اور نہ پابندِ مکاں انسانی خودی کی طرح محدود۔ اس کی لامحدودیت کا دارومدار اس کے تخلیقی عمل کے لامحدود امکانات پر ہے جن کا نامکمل مظاہرہ ہماری یہ کائنات ہے۔ مختصر یہ کہ خدا کی لامحدودیت داخلی ہے خارجی نہیں" (انگریزی لکچر ص ۶۵)

شخصیت کے سلسلہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ خودی انتہائی ہو یا محدود، غیر خودی کے بغیر اس کا تصور کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ نیز اگر انتہائی خودی کے باہر کوئی شے نہیں ہے تو پھر اسے خودی کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس اعتراض کے جواب میں اقبال کہتے ہیں "حقیقت کی اس نوعیت کے بارے میں جس کا انکشاف شعوری تجربے سے ہوتا ہے منطقی استدلال سے رائے قائم کرنے میں کوئی مدد نہ ملے گی۔ شعوری تجربے کا تزکیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقت ابدی ایک باشعور زندگی ہے جسے زندگی کے تجربے کی روشنی میں ایک عضوِ کل ہی تصور کیا جا سکتا ہے جو خود مرکوز بھی ہے اور مرکزی نقطے کا حامل بھی۔ چونکہ زندگی کا یہی خاصہ ہے لہٰذا حیاتِ ابدی کو بھی خودی ہی تصور کیا جا سکتا ہے۔" (انگریزی لکچر ص ۷۸-۷۹)

اقبال انتہائی خودی کے چار اوصاف بتاتے ہیں یعنی خالقیت، علمیت، ابدیت اور قدرتِ مطلقہ۔ (۱) خالقیت۔ عام طور پر لوگوں میں یہ خیال رائج ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا عمل ایک مخصوص گزشتہ واقعہ ہے۔ خدا نے 'کُن' کہا اور یہ کائنات ہو گئی۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر کائنات کو ایک مکمل اور موجود بالذات شے تصور کر لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی حیثیت خدا کی زندگی میں ایک اتفاق سے زیادہ نہیں۔ اگر یہ اتفاق واقع نہ ہوتا تو یہ کائنات وجود ہی میں نہ آتی اس نظریہ سے خدا کی تخلیق بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں "قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ خدا ہر روز اپنے آپ کو کسی نئے کام میں مصروف رکھتا ہے"۔ اور اس آیت سے یہ معنی اخذ کرتے ہیں کہ خدا کا تخلیقی عمل اب بھی جاری ہے۔ وہ اس تفسیر کی تائید میں جدید سائنس کا نظریۂ اضافیت پیش کرتے ہیں جس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "یہ کائنات کوئی ٹھوس شے نہیں ہے۔ بلکہ باہم متعلق واقعات کا ایک نظام ہے جس میں اضافہ ہو رہا ہے"۔ وہ کہتے ہیں "ہمارے شعوری تجربے کا تزکیہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ زمان و مکاں اور مادہ موجود بالذات انتہائی خودی کی مدِ مقابل حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ وہ تو خدا کی تخلیقی زندگی کو سمجھنے کے عقلی طریقے ہیں"۔ اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ اس کائنات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کا تخلیقی عمل مسلسل جاری ہے ۔

اقبال کا خیال ہے کہ "انسان جس میں خودی نسبتاً مکمل ہو چکی ہے، الہٰیت کی قوتِ تخلیق میں ایک ٹھوس مقام رکھتا ہے۔ خدا کی جملہ تخلیقات میں صرف وہی اس قابل ہے کہ اپنے خالق کی تخلیقی زندگی میں باشعور شرکت کر سکے"۔ اور

بیاد اقبال رح

کراچی میں شاعر مشرق سے متعلق
یادگاروں کی پہلی نمائش
(بہ اہتمام اقبال اکادمی)

یادگار خطوط و مسودات

جناب ممتاز حسن ، نائب صدر اقبال اکادمی کی افتتاحی تقریر، زیر صدارت بیگم ''جنجیرہ''

نمائش کے افتتاح سے پہلے
شرکائے جلسہ

علی بخش
(اقبال رح کا [illegible] خدمت گذار)

''جاوید منزل''
(لاہور میں شاعر مشرق کی رہائش گاہ)

آخری آرامگاہ
(زیارت‌گاہ خاص و عام)

وہ بہتر دنیا کا تصور قائم کرنے اور موجود کو مطلوب کی شکل دینے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے اور اپنی خودی کے لئے بے مثال اور مجموعی انفرادیت حاصل کرنے کی غرض سے اِس بات کا متمنی رہتا ہے کہ تہہ کے ماحول کو استعمال کرے اور اپنا تخلیقی عمل جاری رکھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا آزاد تخلیقی عمل کی مالک انسانی خودیوں کے صدور اور عمل سے خدا کی تخلیقی آزادی محدود تو نہیں ہو جاتی۔ اقبال اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ بدیہی اور ناقابلِ تعین عمل کی صلاحیت رکھنے والی خودیوں کا ظہور ہمہ گیر خودی کی آزادی پر ایک طرح کی پابندی ہے لیکن یہ پابندی خارجی طور پر عائد نہیں کی گئی بلکہ وہ تو اس کی اپنی تخلیقی آزادی سے پیدا ہوئی ہے جسکے ذریعہ اس نے محدود خودیوں کو اپنی زندگی، قوت اور آزادی میں شریک کرنے کے لئے منتخب کیا ہے"۔ (انگریزی لکچر ص۸)

۲۔ ابدیت: اقبال کا خیال ہے کہ انتہائی خودی کی ابدیت کا مسئلہ سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے وقت کی نوعیت معلوم کرلی جائے۔ وقت کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لئے اپنے شعوری تجربے کا نفسیاتی تزکیہ ضروری ہے۔ اس تزکیہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہماری خودی کے دو رُخ ہیں کارگذار ——— (EFFICIENT) اور قدر افزا (APPRECIATIVE)۔ کارگذار صورت میں وہ اپنی فوری ضروریات کے پیش نظر وقت کو "آج" اور "کل" میں تقسیم کرلیتی ہے۔ یہ شماری وقت ہے جو حقیقی وقت نہیں ہے لیکن قدر افزا صورت میں اسے ماضی، حال اور مستقبل ایک مسلسل "ہنوز" معلوم ہوتا ہے۔ یہ زمان مجرد ہے جو حقیقی وقت ہے۔ یہ ایک عضوی کلیہ ہے جس کو ہم ابدیت کہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے شعوری تجربے کی رہنمائی قبول کرلیں اور ہمہ گیر خودی کو زندگی کے مشابہ تصور کرلیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ابدی خودی ایک طرف شماری وقت میں رہتی ہے اور دوسری طرف زمانِ مجرد میں ؛

۳۔ علمیت: محدود خودی کی حالت میں علم کے معنیٰ استدلالی معلومات ہیں جن کا تعلق کسی موجود بالذات شے سے ہوتا ہے۔ لیکن اقبال کے خیال میں انتہائی خودی کی علمیت کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کیونکہ اس کا مدمقابل کوئی نہیں ہے۔ ہمہ گیر خودی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں فکر و عمل، عملِ علم اور عملِ تخلیق یکساں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسی خودی جو دانا بھی ہے اور موضوعِ معلوم کی اصل بھی، اس کے علمیت کی نوعیت کسی طرح بھی استدلالی نہیں ہوسکتی۔ انتہائی خودی چونکہ زمانِ مجرد میں رہتی ہے جہاں ماضی حال اور مستقبل مل کر ایک ابدی "ہنوز" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا اسے کائنات کے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام واقعات کا علم ہونا چاہئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ خیال ایک حد تک درست ہے لیکن اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایک کامل نظام ہے جس کا مستقبل پہلے سے متعین ہے، جس کے واقعات کے تسلسل کو بدلا نہیں جاسکتا گویا ایک جابر تقدیر ہے جس نے خود خدا کے تخلیقی عمل کو محبوس کر دیا ہے۔ اس نظریئے سے خدا کی تخلیقی آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "علم الٰہی کو ایک ایسا زندہ تخلیقی عمل سمجھنا چاہیئے جس سے موجودات کا عضوی تعلق ہے۔ خدا کے تخلیقی حیات کے عضوی کل میں مستقبل یقیناً پہلے سے موجود ہے۔ لیکن وہ واقعات کی متعینہ اشکال اور مقررہ تنظیم کی صورت میں نہیں ہے بلکہ صرف کھلے امکانات کی شکل میں ہے"۔ (انگریزی لکچر ص۷۹) اس طرح اقبال یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جہاں تک کھلے امکانات کا تعلق ہے انتہائی خودی ان سے پہلے سے واقف رہتی ہے۔ لیکن واقعات کے اوقات اور اُن کی جزئیات اس کے علم میں نہیں ہوتے ؛

۴۔ قدرتِ مطلقہ: مندرجہ بالا بحث سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انتہائی خودی تخلیق اور علمیت کے لحاظ سے متناہی ہے تو پھر اسے 'قادرِ مطلق' کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ ہمیں لفظِ 'محدود' سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ خدا کا ہر عمل خواہ وہ تخلیقی ہو یا کسی اور نوعیت کا ایک قسم کی محدودیت ہے جس کے بغیر خدا کو ایک ٹھوس عملی خودی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ذہنی طور پر تصور کی ہوئی قدرتِ مطلقہ ایک اندھی اور ناقابلِ اعتبار قوت ہوگی۔ خدا کی لامحدود قدرت کا راز اس کی آمرانہ آزادی میں نہیں بلکہ اُس کی باضابطہ دانشمندی میں ہے ؛ (لکچرز ص۷۹)

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ اقبال کے نزدیک خدا کی لامحدودیت خارجی نہیں داخلی ہے، اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خدا کی ہر جگہ موجودگی کے نظریہ کے قایل نہیں ہیں۔ اپنے انگریزی لکچروں میں وہ نظریۂ خدا کے تحت لکھتے ہیں: "میرے خیال میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی الہامی کتب میں خدا کو جو نور کہا گیا ہے اور اس سے جو مفہوم اب تک لیا جاتا رہا ہے اُسے اب بدلنا ہوگا جدید طبعیات نے یہ طے کر دیا ہے کہ روشنی کی رفتار گھٹائی بڑھائی نہیں جاسکتی۔ اور ہر ناظر کے لئے اس کا نظامِ حرکت کچھ بھی ہو یہ رفتار ایک سی رہتی ہے۔ لہٰذا اس تغیر و تبدل کی دنیا میں روشنی ہی ایک ایسی چیز ہے جو مطلق کے قریب تر آجاتی ہے۔ چنانچہ نور کا جو استعارہ خدا کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی جدید معلومات کی روشنی میں "خدا کی ہمہ جائی" نہیں بلکہ اس کی مطلقیت لینا چاہئیں۔" گلشن راز جدید میں وہ کہتے ہیں:

مجو مطلق دریں دیر مکافات

کہ مطلق نیست جز نور السموٰات

"انتہائی خودی کو ایک ایسی شخصیت جو مکمل، بے مثال، یکتا، بازیابی کے متضاد رجحان سے مبرا اور اپنا مدمقابل نہ رکھتی ہو تصور کر لینے سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کا تخلیقی عمل کیسے ہوتا ہے؟ اقبال کے خیال میں انتہائی خودی سے صرف خودیاں وجود میں آسکتی ہیں ؎

نہ ریزد جز خودی از پرتوِ او
نہ خیزد جز گہر اندر رنو او
خودشکن گردید و اجزا آفرید
اندکی آشفت و صحرا آفرید

"انتہائی خودی جس میں فکر و عمل ہم آہنگ ہیں اس کی قوتِ تخلیق خودی وحدتوں کی شکل میں عمل پیرا رہتی ہے۔" یہ خودی وحدتیں انتہائی خودی کے باہر نہیں بلکہ اندر رہتی ہیں۔ ان خودیوں کی مجموعی حیثیت کو وہ ایک خودی وحدت تصور کرتے ہیں جسے عام اصطلاح میں فطرت یا کائنات کہا جاتا ہے ؎

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

وہ کہتے ہیں "یہ کائنات مادی ذرے کی میکانی حرکت سے لیکر انسانی خودی کی آزاد فکری حرکت تک اپنے ہر عمل میں 'انا الاکبر' کا خود انکشاف ہے۔ موجودات کا ہر ذرہ ایک خودی وحدت ہے" (انگریزی لکچر ص۲۰) لہذا یہ کائنات کوئی خارجی شے نہیں ہے بلکہ انتہائی خودی کا داخلی تخلیقی عمل ہے اور اس کا ادھورا انکشاف ؎

زمین و آسماں اور امقامی
میانِ کارواں تنہا خرامی
ز احوالش جہانِ ظلمت و نور
صدائے صور و مرگ و جنت و حور
درونِ شیشۂ او رنگ است
ولے بر ما بتدریج آشکار است

ہماری محدود عقل نے انتہائی خودی کے اس انکشاف کو ٹھوس شکل دے لی ہے ؎

کہن دیری کہ بینی مشتِ خاک است
دمے از سرگذشت ذاتِ پاک است

خرد در لامکاں طرحِ مکاں بست
چو زناری زماں را بر میاں بست

فطرت یا کائنات زمانِ مجرد میں حرکت کرتی رہتی ہے جہاں فکر، زندگی اور مقصد ہم آہنگ ہو کر ایک عضوی وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں یہ "وحدت نظر کا دھوکہ نہیں بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے جس کا تصور صرف خودی وحدت کی صورت میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک ٹھوس خودی وحدت جو ہر چیز پر طاری و ساری ہو اور ہر انفرادی حیات و فکر کا سرچشمہ ہے۔" نیز یہ کائنات ایک آزاد تخلیقی حرکت ہے زندگی ہے۔ حرکت اور تغیر اس کی اساسی خصوصیات ہیں، وہ ایک ایسا ترقی پذیر اور خود بازیاب نظام ہے جس کے اضافے اور ارتقا کی حدود مقرر نہیں ہیں ؎

من ایں گویم جہاں در انقلاب است
درونش زندہ و در پیچ و تاب است
درونش خالی از بالا و زیر است
ولے بیرون او وسعت پذیر است

فطرت کے انتخابی اور شعوری اختیارات متعین ہیں اور وہ خودی وحدتوں کی شکل میں عمل پیرا رہتی ہے۔ یہ خودی وحدتیں اسفل خودیوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ یہ اسفل خودیاں فطرت کے تسلسل میں ایسے واقعات کی صورت میں ہوتی ہیں جن کو فکر مکانیت کا جامہ پہنا دیتا ہے اور عملی اغراض کے پیشِ نظر ان کو الگ الگ اشیا تصور کر لیتا ہے ؎

جہاں را فربہی از دیدنِ ما
نہالش رستہ از بالیدنِ ما

یہ کائنات زماں میں حرکت کرتی رہتی ہے یہ تخلیقی حرکت کسی خارجی دباؤ یا اثر کے تحت نہیں ہوتی۔ بقول اقبال "اس کائناتی بہاؤ یعنی زماں میں مکانی حرکت کی کوئی طے شدہ منزل نہیں ہے اگر ایسی بات ہوتی تو اس کی اور تخلیقی اور تخلیقی نوعیت ہی ختم ہو جاتی۔ کائنات کی تخلیق کسی مذاق کا بھی نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کی زمانی حرکت سے بتدریج نباتی اصولوں پر تجربات پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ان تجربات کے تین درجے ہیں۔ مادی۔ حیاتی اور شعوری۔

مادے کی نوعیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "بہرنوع یہ ایک تجربے میں آنے والی حقیقت ہے کہ جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو روح اور جسم متحد ہو جاتے ہیں اور دونوں مل کر اس کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ روح اور جسم کے تعاون کی حدود قائم نہیں کی جا سکتیں اور یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کام کا کتنا حصہ جسم نے کیا اور کتنا حصہ روح نے۔ اس سے یہ محسوس

ہوتا ہے کہ دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔" یعنی روح مادے سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ مادہ روح کا ایک رُخ ہے۔ اپنے اس خیال کی تصدیق وہ جدید سائنس کے نظریۂ اضافیت سے کرتے ہیں۔ "میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جسم یا مادہ خلائے مطلق میں واقع کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ واقعات یا اعمال کا ایک نظام ہے۔" تجربات کا وہ نظام جسے روح یا خودی کہا جاتا ہے وہ بھی واقعات کا ایک نظام ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ روح اور جسم کی اصل ایک ہی ہے اور باوجود اس کے کہ دونوں کا فرق قائم رہتا ہے وہ ایک دوسرے کے لئے تار و پود کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خود عملی چونکہ خودی کی خصوصیت ہے، لہٰذا اُن اعمال کی تکرار جاری رہتی ہے جن سے جسم بنتا ہے ؎

تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا دیدن حرام است
بجاں پوشیدہ رمزِ کائنات است
بدن حالی ز احوالِ حیات است
عروسِ معنی از صورت حنا بست
نمودِ خویش را پیرایہ ہا بست
حقیقت روئے خود را پردہ باف است
کہ او را لذتی در انکشاف است (گلشن راز جدید)

چنانچہ اقبال کے نزدیک جسم روح یا خودی کا جمع شدہ کردار یا عمل ہے اور اُسے روح یا خودی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو شعور کا ایک مستقل عنصر ہے اور اسی مستقل عنصر کے باعث وہ باہر سے پائیدار معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں "مادہ اسفل درجہ کی خودی وحدتوں کا نظام ہے۔ جب ان خودی وحدتوں کے اجتماع اور بین العملی میں ایک خاص قسم کا تعاون پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے اعلیٰ درجہ کی خودی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر عالمِ رنگ و بو میں اپنی رہنمائی خود کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔" (انگریزی لکچر ص ۱۰۵-۱۰۶)

زماں میں مکان کی حرکت سے پیدا ہونے والے دوسرے تجربے کا نام زندگی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ چونکہ ذی حیات عضویوں کا عمل اسبابی نہیں مقصدی ہوتا ہے، اس لئے زندگی کے ظہور کا مسئلہ نظریۂ علت و معلول کی روشنی میں حل نہیں ہو سکتا۔ نظریۂ علت و معلول کا تعلق صرف خارجی اعمال سے ہوتا ہے لیکن زندگی ایک داخلی عمل ہے۔ یہ مسئلہ تو ایسے نظریئے سے حل ہو سکتا ہے جس کا تعلق داخلی اعمال سے ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ذی حیات عضویوں کے اعمال کے بعض پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جو فطرت کی غیر ذی حیات اشیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اساسی طور پر عضویہ کا کردار میراثی ہوتا ہے۔ جس کی تسلی بخش تشریح نظریۂ طبیعیائی جواہر سے نہیں کی جا سکتی۔ ذی حیات عضویہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ خود کفیل اور خود باز یاب (SELF-REPRODUCING) ہوتا ہے۔ طبیعیائی اور کیمیائی میکانیت اس خصوصیت کی تشریح پیش کرنے سے قاصر ہے حقیقت یہ ہے کہ حیات ایک بے مثال غیر معمولی ظہور ہے، اس کا تجزیہ نباتی اصولوں کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے" (لکچرز ص ۴۴-۴۵)

حیات پر نفس بحر روانی	شعور و آگہی اُو را کرانی
چہ دریائے کہ ژرف و موجدار ست	ہزاراں کوہ و صحرا بر کنار ست
مپرس از موج ہائے بے قرارش	کہ ہر موجش بروں جست از کنارش
گذشت از بحر و صحرا را نمی داد	نگہ را لذتِ کیف و کمی داد
ہراں چیزے کہ آید در حضورش	منور گردد از فیضِ شعورش
بخلوت مست و صحبت ناپذیر ست	دلے ہر شئے ز نورش مستنیر ست
نخستیں می نماید مستنیرش	کند آخر بہ آئینی اسیرش
خرد بندِ نقاب از رخ کشودش	ولیکن نطق عُریاں تر نمودش

نگنجد اندریں دیر مکافات
جہاں او را مقامی از مقامات

ارتقائے حیات کے سلسلہ میں وہ مولانا رومی کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں "کہ اس شاعر نے ارتقا کے جدید تصور کی کسقدر کامیابی سے پیشگوئی کی ہے"۔

آمدہ اوّل بہ اقلیم جماد	وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد	وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز جمادی چوں بہ حیواں اوفتاد	نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلی کہ دارد سوئے آں	خاصہ در وقت بہار و ضیمراں
باز از حیواں سوئے انسانیش	می کشد آں خالقی کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت	تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقل ہائے اولینش یاد نیست	ہم ازیں عقلش تحول کردنیست
تا رہد ایں عقل پر حرص و طلب	صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب

ارتقا کا مقصدی عمل جاننے اور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ حیات طبیعی اور کیمیائی اعمال کا نتیجہ نہیں ہو سکتی بلکہ وہ زمان میں مکانی حرکت کا ایک تجربہ ہے اور اس کی اصل روحانی ہے بیا اور بات ہے کہ اپنے ارتقا کے طویل عرصے میں اس نے کیمیائی اور طبیعی اعمال کا مقررہ انداز اختیار کر لیا ہے۔

"زندگی کے ارتقا کے راستے میں سب سے بڑی مزاحمت مادہ یعنی فطرت ہے لیکن فطرت چونکہ زندگی کے داخلی قویٰ کو پھلنے پھولنے کے ذرائع بہم پہنچاتی ہے اس لئے اس کو بری چیز تصور نہ کرنا چاہیئے۔ زندگی مختاری حاصل کرنے کی کوشش کا نام ہے جو اپنے راستے سے تمام مزاحمتوں کو دور کرکے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔"

زماں میں مکاں کی حرکت سے پیدا ہونے والے تیسرے تجربے کا نام شعور ہے۔ شعور کو زندگی کا ایک انحراف تصور کرنا چاہیئے۔ اس کا کام زندگی کے بڑھتے ہوئے کارواں کے لئے روشنی بہم پہنچانا ہے۔ شعور کشاکش کی ایک حالت ہے، خود یکسوئی SELF-CONCENTRATION کی ایک شکل ہے جس کے ذریعہ زندگی ان جملہ تعلقوں اور یادداشتوں کو الگ کردیتی ہے جن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی حدود مقرر نہیں ہیں، ضرورت کے لحاظ سے اس کا دائرۂ عمل کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ اسے مادے کے اعمال کا ایک ضمنی مظاہرہ تصور کرنا اس کی آزاد عملی حیثیت سے انکار کرنے کے مترادف ہوگا۔ اور اس کے آزاد عمل سے انکار کرنے کے یہ معنی ہونگے کہ علم کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم شعور ہی کے منظم اظہار کا دوسرا نام ہے۔ بقول اقبال "شعور نہ زندگی کے ایک خالص روحانی اصول کی ایک قسم ہے، وہ کوئی شے نہیں بلکہ ایک منظم اصول اور کردار کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔"

زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیق انسان ہے۔ جو ذی حیات اشیا میں افضل ترین درجہ رکھتا ہے جسمانی خواہ روحانی اعتبار سے وہ ایک خود مرکز و منفرد ہے۔ انسانی منزل پر پہنچ کر زندگی کا مرکز خودی یا شخصیت ہو جاتا ہے۔ شخصیت کشاکش کی حالت کا نام ہے۔ اور اس کی بقا کا دارومدار اس حالت کو برقرار رکھنے پر ہے۔

اقبال کے خیال میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین نفیٔ خودی نہیں بلکہ اثبات خودی ہے۔ اس خیال کے ثبوت میں وہ اس طرح دلائل پیش کرتے ہیں کہ یہ جہان رنگ و بو، یہ زمین اور آسماں، یہ وادیاں اور پہاڑ، یہ روز و شب کا تسلسل اور موسموں کا تغیر و تبدل، یہ چاند اور سورج، یہ ستارے اور سیارے سب واہمہ سہی۔ نظر کا دھوکا سہی۔ یہ بھی مانا کہ انسان اور اس کا علم محدود ہے، زمان و مکاں کا پابند ہے

توان گفتن جہانِ رنگ و بو نیست — زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
توان گفتن ہمہ نیرنگ ہوش است — فریب پردہ ہائے چشم و گوش است

لیکن ایک چیز تو یقینی واقعی ہے جس میں شک قطعی ناممکن ہے اور وہ خود میرا سوچنا اور شک کرنا ہے۔ یہ تو ایک متضادات ہوگی کہ جو چیز سوچ رہی ہے وہ سوچنے کی حالت میں موجود ہی نہ ہو۔ شک کرنے کے معنی سوچنے اور سوچنے کے معنی ہونے کے ہیں۔ میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو میری خودی، میری 'انا'، میری ذات کا وجود تو قطعاً ہے۔

اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان ست
نمودش چون نمود این و آن ست
بگو با من کہ دارائے گماں کیست
یکی در خود نگر آں بے نشاں کیست
خودی را حق بداں باطل مپندار
خودی را کشت بے حاصل مپندار

اقبال کے خیال میں انسانی خودی وحدت کی پہلی اہم خصوصیت اس کی لازمی خلوت پسندی ہے۔ جو ہر خودی کی بے مثالیت کو نمایاں کرتی ہے۔ مثلاً جب میرے دل میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ تو اس خواہش کا تعلق صرف میری ذات سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مجھے کوئی تکلیف ہوتی ہے تو باوجود ہر ممکن کوشش کے میری تکلیف کوئی مجھ سے نہیں لے سکتا ہے۔ میری خوشیاں، میری تکالیف، میری خواہشات صرف میری ہیں، میری ذاتی خودی کا مخصوص حصہ ہیں۔ میرے جذبات، میری محبت، میری نفرت، میرے فیصلے، میرے عزائم بلاشرکتِ غیر کلیتاً میرے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں "خود خدا بھی مجھے کسی بات کے محسوس کرنے، کوئی فیصلہ کرنے یا کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا۔" اپنی داخلی کیفیات کے اسی بے مثال تعلق کو ہم لفظ "میں" یا "انا" سے تعبیر کرتے ہیں۔

خودی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دیگر خودیوں کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کرلینے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود وہ خود مرکوز ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت کا ایک ذاتی دائرہ ہوتا ہے جس کے اندر کوئی اور خودی داخل نہیں ہوسکتی۔ گلشن راز جدید میں اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

خودی اندر خودی گنجد محال است
خودی را عین خود بودن کمال است

درحقیقت خودی کی قطعیت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے

وجود کو الگ تھلگ برقرار رکھے۔ ان کا بیان ہے "انسان کی خودی جس قدر کامل تر ہوگی۔ اسی قدر وہ قوتِ الٰہی کے وجود میں ٹھوس حیثیت کی مالک ہوگی۔ اور اپنے گرد و پیش کی چیزوں کے مقابلے میں اعلیٰ درجہ کی حیثیت رکھے گی"۔

خودی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو بحیثیت خودی برقرار رکھنے کی متمنی ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ بازیابی کا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ چونکہ وہ ایک زمانی عمل ہے اور موت کی تلوار اس کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے۔ اور ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ اس کا سلسلۂ حیات کسی وقت بھی منقطع ہو جائے وہ انفرادی بقا کے بجائے اجتماعی بقا حاصل کرنے کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اقبال کے نزدیک "شجرِ ابدیت کا ممنوعہ پھل کھانے کے معنی جنسی شعور بیدار کرنے کے ہیں اور یہی جنسی شعور بازیابی کے ذریعہ موت کا مقابلہ کرتا ہے"۔ اسی خیال کو وہ "بالِ جبریل" کے ساقی نامہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

گویا زندگی موت سے کہتی ہے: اگر تم زندوں کی ایک پود ختم کر دو گی تو میں دوسری پیدا کر لوں گی۔

خودی کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پابند مکان نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسی وحدت میں ظاہر کرتی ہے جس کو ہم ذہنی حالتیں کہتے ہیں۔ ذہنی حالتیں الگ الگ نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ ایک دوسرے میں گھلی ملی رہتی ہیں۔ وہ ایک کثیر الاجزائی کل یعنی ذہنی کیفیات میں پائی جاتی ہیں۔ ان باہم متعلق حالتوں یا واقعوں کی وحدت ایک مخصوص نوعیت کی اور مطلقاً بے مثال وحدت ہوتی ہے جو مادی وحدت سے اساسی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا ایک عقیدہ دوسرے عقیدے کے کس طرف ہے۔ نہ کسی چیز کے دلکش ہوتے یا غیر دلکش ہونے کا اندازہ اس کے قرب و بعد سے لگاتے ہیں۔

ہم جو تصور مکاں کے بارے میں قائم کرتے ہیں، وہ مکانی لحاظ سے مکاں سے منسوب نہیں ہوتا۔ بلکہ خودی کا یہ وصف ہے کہ وہ کئی مکانی نظاموں کا تصور پیدا کر سکتی ہے۔ بیداری کی حالت اور خواب کی حالت کی مکانیت میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ حالتیں ایک دوسری میں مخل بھی نہیں ہوتیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خودی اس لحاظ سے پابند مکاں نہیں ہے جس لحاظ سے جسم ہے۔ باوجود اس کے کہ ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کے واقعات وقت میں نمودار ہوتے ہیں۔ خودی کے وقت کا پیمانہ جسمانی وقت کے پیمانے سے اساسی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ جسمانی واقعے کا امتداد واقعۂ حاضر کے طور پر پابند مکاں ہوتا ہے لیکن خودی کا امتداد داخلی ہوتا ہے جس میں ماضی حال اور مستقبل تینوں ملے رہتے ہیں۔

خودی زاندازہ ہائے ما فزون ست
خودی زاں کل کہ تو بینی فزون ست
ضمیر زندگانی جاودانی ست
بہ چشم ظاہرش بینی زمانی ست
خرد بہرہ ابد ظرفی ندارد
نفس چوں سوزنِ ساعت شمارد
چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد
سکون و سیر و کیف و کم دگر شد

اقبال کے خیال میں خودی کے دو رخ ہیں۔ کارگذار اور قدر افزا۔ کارگذار خودی کا تعلق ہمارے روزمرہ کے معاملات سے ہے۔ اس خارجی نظام کی اشیاء سے ہے جو ہماری ان شعوری کیفیات کو متعین کرتا ہے۔ اور ان پر مکانی علیحدگی کی مہر لگا دیتا ہے۔ یہاں خودی کا دائرۂ عمل خارجی ہوتا ہے۔ اور ایک کلیت کی حیثیت سے اپنی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنے آپ کو مخصوص اور متعدد حالتوں میں نمایاں کرتی ہے۔ اس حیثیت میں خودی کا دائرۂ عمل اس زماں میں ہوتا ہے جسے کم و بیش کہا جاتا ہے اس قسم کے زماں کو جو حقیقی زماں نہیں ہے۔ مکاں سے ممیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ خودی وحدت فطرت کو الگ الگ حصوں میں بانٹ کر روزمرہ کی کارگذاری کا پروگرام مرتب کرتی ہے۔ اور اس طرح فطرت پر قابو پاکر اپنے وجود کو مستحکم کرتی ہے۔

شعوری تجربہ کا غائر جائزہ لینے سے خودی کا دوسرا رخ نظر آئیگا جسے اقبال قدر افزا کہتے ہیں۔ خودی کا یہ رخ روزمرہ کی مصروفیات کا

وجہ سے دبا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی گہری سوچ، بے ہوشی یا نیند کی حالت میں جب کارگذار خودی معطل ہوتی ہے اور ہم اپنے داخلی وجود میں جھانکتے ہیں تو ہمیں تجربہ کا یہ داخلی مرکز نظر آتا ہے جس کا عمل خارجی نہیں داخلی ہے۔ قدر افزا خودی کے وجود میں شعور کی مختلف حالتیں ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں۔ خودی کی کلیت میں کیفیات کا کارگذاری امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اور کارگذار خودی کے برعکس اس کے اجزاء کی کثرت خالص کیفی ہو جاتی ہے۔ جس میں حرکت بھی ہوتی ہے اور تغیر بھی لیکن یہ تغیر و تحریک منقسم ہوتے ہیں۔ اور نوعیت کے لحاظ سے بالکل غیر شماری ہو جاتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدر افزا خودی کا وقت ایک مسلسل ہنگام ہے۔

اقبال کے خیال میں انسانی خودی کے وجود میں امرِ الٰہی کا عنصر موجود ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال میں مختار نہیں ہے لیکن اقبال کے نزدیک امرِ الٰہی کے معنی زمانِ مجرد کے ہیں جس میں آئندہ واقعات کے کھلے امکانات پہلے سے موجود ہوتے ہیں لیکن ان کے اوقاتِ وقوع اور تفصیلات مقرر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا جہاں تک خودی کی استقبالی کارکردگی کے امکانات کا تعلق ہے وہ تعین نہیں کرتی لیکن ان امکانات میں سے کسی ایک امکان کو اپنی کارکردگی کے لئے منتخب کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا یہ خودی کے اختیار میں ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں کلیتاً آزاد اور خود مختار ہے۔

اقبال کے نزدیک لافانیت خودی کا موروثی حق نہیں ہے البتہ اپنے عمل سے وہ لافانیت حاصل کر سکتی ہے لیکچروں میں وہ کہتے ہیں۔

"ذاتی لافانیت ہمارا موروثی حق نہیں ہے۔ انسان فقط امیدوار کہا جا سکتا ہے اور اس کو لافانیت اپنے عمل سے حاصل کرنی ہوگی۔ اگر خودی نے اپنے آپ کو اپنے عمل سے مستحکم اور آئندہ زندگی کے لئے منضبط کر لیا ہے۔ تو جسم کی تخریب کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ اور موت کا طوفان اس کی کشتی کو غرقاب نہیں کر سکتا۔"

اقبال کا عقیدہ ہے کہ موت انقطاعِ سلسلۂ حیات کا نام نہیں۔ بلکہ وہ تو استحکامِ خودی کا امتحان ہے۔ لیکچروں میں وہ کہتے ہیں: "زندگی خودی کو عمل کا موقع بہم پہونچاتی ہے۔ اور موت خودی کی امتزاجی عملیت کا امتحان لیتی ہے۔" اگر موت کا جھٹکا خودی کا خاتمہ نہیں کر دیتا تو وہ خاکی جسم چھوڑنے کے بعد عالمِ برزخ میں پہونچکر حقیقت کے نئے پہلوؤں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اور اپنے آپ کو ان نئے حالات کے مطابق بنانے کی تیاری کرتی ہے۔ خودی کو اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھنی ہوگی جب تک وہ اپنی رستخیز حاصل نہیں کر لیتی۔ رستخیز کوئی خارجی عمل نہیں اور تو خودی کا زندگی کے اعمال کا جائزہ ہے۔ رستخیز انفرادی ہو یا اجتماعی اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوگی کہ خودی اپنے سابقہ حاصلات اور آئندہ امکانات کا جائزہ لے۔" آزادی خودی کا ہر عمل ایک نئی صورتِ حال پیدا کر کے تخلیقی انکشاف کے نئے امکانات پیدا کرتا رہے گا۔

جسدِ خاکی چھوڑنے کے بعد خودی کی جسمانی ساخت کیا ہوگی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں: "اس کائنات کی فطرت ایسی ہے کہ انسانی جسم کی تباہی کے بعد خودی کے لئے کوئی جامہ مہیا کر دے جس کی وساطت سے وہ اپنی کارکردگی کا سلسلہ جاری رکھ سکے البتہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس جامہ کی نوعیت اور ہیئت کیا ہوگی۔ بہرنوع انسان کی گذشتہ تاریخ اور ارتقاء حیات کی مختلف منزلوں کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ جسم کی تباہی کے بعد خودی کا تخلیقی عمل بھی ختم ہو جائے"۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ خودی دوبارہ اس دنیا میں نہیں آئے گی۔

کیا محدود خودی اور انتہائی خودی ایک دوسرے سے قطعاً الگ تھلگ رہ سکتی ہیں، کیا محدود خودی انتہائی خودی کے روبرو اپنی شخصیت کو برقرار رکھ سکتی ہے؟ اقبال کے خیال میں یہ سوالات لامحدود کے غلط تصور سے پیدا ہوتے ہیں۔ لامحدودیت کے معنی لامحدود وسعت نہیں، ایسی لامحدودیت کا تصور تمام محدود حدبندیوں کو سامنے رکھے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ انتہائی خودی کی لامحدودیت خارجی نہیں داخلی ہے۔ اس کا دارومدار مکانی وسعت پر نہیں، تخلیقی امکانات پر ہے۔ نیز محدود خودی خارجی چیز نہیں بلکہ داخلی قوت کا نام ہے۔ جب ہم اس لحاظ سے سوچتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ محدود خودی اگرچہ جداگانہ نہیں ہے پھر بھی حیثیت رکھتی ہے۔ خارجی وسعت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ زمانی مکانی نظام میں جذب نظر آئے گی۔ داخلی وسعت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اس شے کی مدمقابل محسوس ہوگی جس پر اس کی حیات کا دارومدار ہے۔ گویا وہ اس سے الگ بھی ہے اور گہرا تعلق بھی رکھتی ہے۔ اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے کے سلسلے میں اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو جو خط لکھا تھا اس میں کہتے ہیں "جو خدا سے قریب ترین نقطہ پر پہونچ جائے وہی مکمل ترین شخص ہے۔ وہ بالآخر خدا کی ذات میں جذب نہیں ہو جاتا بلکہ تسخیرِ کائنات کے ذریعے خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے۔" گلشن راز جدید میں کہتے ہیں ؎

بحرش گم شدن انجام ما نیست
اگر او را تو در گیری فنا نیست

اقبال کے خیال میں انسانی خودی لامحدودیت کے لحاظ سے بحیثیت حیاتی وحدت ابھی نامکمل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خود مرکوز، موثر، متناسب اور یکتا وحدت بننے کی متمنی ہے۔ اسے کامل وحدت بننے کے لئے ابھی بہت سے ماحولوں سے گزرنا ہوگا۔ اپنی زندگی کی موجودہ منزل پر یہ اس کے لئے مشکل ہے کہ وہ کشاکش کی حالت کو مستقل طور پر اور بغیر سستائے برقرار رکھ سکے۔ موجودہ شکل میں تو خفیف سے خفیف اشتغال بھی اس کی وحدت کو توڑ کر اس کی قوت انتظامیہ کو زائل کر سکتا ہے۔

اقبال کے خیال میں انسانی خودی کو اس وجہ سے حقیر نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی تخلیق اسفل درجے کی خودی سے ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں "کسی چیز کی اہمیت کا اندازہ اس کی اصل سے نہیں لگانا چاہئیے اس کا دارومدار درحقیقت چیز کی ذاتی صلاحیت، اہمیت اور رسائی پر ہوتا ہے۔"

انسان جو ذی حیات اشیاء میں افضل ترین درجہ رکھتا ہے اپنے آپ کو مخالف ماحول میں پاتا ہے جہاں مزاحم قوتیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ جب گردوپیش کے حالات سازگار ہوتے ہیں تو وہ ان کو اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ اس پر حملہ آور ہوتی ہیں تو وہ اپنے اندر سمٹ کر خوشی اور امید کے داخلی ذرائع پیدا کر لیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ کمزور ہے اور اس کا کام مشکل، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کائنات کی کوئی چیز اس سے زیادہ دلکش، طاقت ور اور حوصلہ افزا نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کی کارکردگی کی ابتداء ہے لیکن "اس کائنات کے وجود میں ایک مستقل عنصر بننا اس کا حصہ ہے۔ وہ اپنی اصلیت کے لحاظ سے ایک تخلیقی عمل ہے، ایک ترقی پذیر جذبہ جو اپنے سفر میں یکے بعد دیگرے منزلیں طے کرتا رہتا ہے" (انگریزی لکچر ص۱۲) یہ انسان ہی کا حصہ ہے کہ وہ گردوپیش کی کائنات کی خواہشات میں شریک ہو کبھی اپنے آپ کو قوائے فطرت کے مطابق بدلتے ہوئے اور کبھی فطری قوتوں کو اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے اپنی اور اس کائنات کی تقدیر بنائے۔ اس ترقی پذیر تعمیری عمل میں خود خدا انسان کا شریک کار ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ پہل کرے۔ اگر وہ پہل نہیں کرتا، اگر وہ اپنی داخلی دولت کو بڑھانے کی صورت حال پیدا نہیں کرتا، ——————

—————— اگر وہ زندگی کے رواں دواں دھارے کی رفتار محسوس نہیں کرتا تو اس کی خودی مضمحل ہونی شروع ہو جاتی ہے اور وہ بے حس مادہ بن کر رہ جاتا ہے۔

زندگی کے رواں دواں دھارے کی رفتار محسوس کرنے، ہر گھڑی بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے، اور ان سے پیدا ہونے والی مزاحمت پر قابو پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے گردوپیش کی حقیقت سے تعلقات پیدا کرے۔ اقبال کے خیال میں یہ تعلقات علم کے ذریعے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ علم تین ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے۔ مشاہدہ، فکر اور وجدان۔

مشاہدے کی تلقین کرتے ہوئے گلشن راز جدید میں کہتے ہیں ؎

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما
ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
دل ما را با و پوشیدہ راہی ست
کہ ہر موجود ممنونِ نگاہی ست
گر او را کس نہ بیند زار گردد
اگر بیندیم دکہسار گردد
حدیث ناظر و منظور رازی ست
دل ہر ذرہ در عرض نیازی ست
تو ہم از صحبتش یاری طلب کن
نگہ را از خم پیچش ادب کن
بیاری ہائے او زخود خبر گیر
تو جبریل امینی بال و پر گیر
بہ لبیاری کش چشم نحو را
کہ دریابی تماشائے آحد را

مشاہدہ پر زور دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "ایشیا بلکہ تمام قدیم دنیا کی تہذیب محض اس لئے زوال پذیر ہوئی کہ اس نے خارجی دنیا کو نظر انداز کیا اور حقیقت کو محض داخلی طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ اس طریقے سے نظریئے تو پیدا ہو گئے لیکن اقتدار حاصل نہ ہو سکا اور محض نظریات کی بنیادوں پر پائیدار معاشرے نہیں وجود میں آ سکتے۔"

فکر کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "یہ کہنا درست نہیں کہ چونکہ

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

اقبالؒ کا نظریۂ انسانِ کامل

ابوسعید نورالدین

انسانِ کامل ایک صوفیانہ نظریہ ہے، جس کی بنیاد "وحدت الوجود" ہے صوفیا کا عقیدہ ہے کہ انسان کی روح ربانی ہے۔ انسان اسی دنیائے آب و گل میں رہ کر بہیم مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے ذاتِ خداوندی سے اتحاد و اتصال پیدا کر سکتا ہے۔ یا صوفیانہ اصطلاح میں "مجاہدہ" سے "مکاشفہ" تک پہنچ سکتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ "انسانِ کامل" کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے، وہ دنیا میں خدا کا نائب اور دنیا کا محافظ ہوتا ہے۔ اس کے وجہ سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے، اس لئے اس کو دنیا کا قطب بھی کہا جاتا ہے ؛

اس نظریہ کی بنیاد یوں تو تیسری صدی ہجری میں بایزید بسطامیؒ اور منصور حلاجؒ کے ذریعہ ہی سے پڑ گئی تھی اور "سُبحَانِیْ مَا اَعظَمُ شَانِیْ" اور "اَنَاالْحَقُّ" کہہ کر انہوں نے اس امر کا ثبوت پیش کر دیا تھا کہ انسان بھی روحانی طور سے خدا سے اتحاد و اتصال پیدا کر کے انجام کار اس اعلیٰ مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے، جہاں اس کی رضا خداوند تعالیٰ کی رضا بن جاتی ہے، لیکن تاریخِ تصوّفِ اسلام میں انسانِ کامل کی اصطلاح کو سب سے پہلے ساتویں صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ نے اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں استعمال کیا ہے۔————— اور بعد میں نویں صدی ہجری میں عبدالکریم الجیلیؒ نے اس پر مستقل طور پر بحث کی، اور "انسانِ کامل" کے نام سے ایک بسوط کتاب تصنیف کی ؛

حدیثِ قدسی میں آیا ہے، لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ۔ دوسری ایک حدیث شریف میں آیا ہے : اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ۔ ان احادیث کی رو سے ابنِ عربیؒ کے نزدیک تخلیقِ کائنات کی علت حقیقتِ محمدیہ ہے۔ جس طرح جملہ کائنات میں انسان اشرف اور اکمل مخلوق ہے، اسی طرح آپ جملہ افرادِ انسانی میں اشرف اور اکمل ہیں۔ آپ ہی دراصل انسانِ کامل ہیں۔ دوسروں کو یہ شرف آپ ہی کے فیض اور برکت سے حاصل ہوتا ہے؛

انسانِ کامل حقیقت کا مظہر ہے۔ وہ کائنات کا ایک ایسا خلاصہ ہے، جس کی ذات میں خدا کی صفاتِ کاملہ منعکس ہوتی ہیں، اور جس طرح حقیقتِ محمدیہ کائنات کی تخلیقی حقیقت ہے، اسی طرح انسان کامل بھی تخلیقِ کائنات کی علت ہے۔ چنانچہ ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے : کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا، فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ، فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ ابن عربیؒ کہتے ہیں : "چوں کہ صرف انسانِ کامل ہی حقیقی معنوں میں خدا کو پہچانتا اور محبوب رکھتا ہے، اس لئے انسانِ کامل ہی دراصل تخلیقِ کائنات کی علت ہے" ؛

صوفیائے کبار کی طرح اقبالؒ نے بھی دنیا کے سامنے "انسانِ کامل" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ لیکن چونکہ انہوں نے "وحدتُ الوجود" کی مخالفت کی ہے، اور اس کے برعکس نظریہ "خودی" کو پیش کیا ہے، اس لئے "انسانِ کامل" کے نظریہ میں بھی انہوں نے اس قدیم نظریہ سے اختلاف کیا ہے یعنی ان کے نظریہ "انسانِ کامل" کی بنیاد دیگر صوفیائے کبار کی طرح "وحدت الوجود" نہیں بلکہ "خودی" اور محض "خودی" پر ہے ؛

دیگر صوفیا نے جہاں "وحدت الوجود" کی رو سے انسان کا ذاتِ خداوندی سے اتحاد اور اتصال پیدا کر کے "انسانِ کامل" کا نظریہ پیش کیا، وہاں اقبالؒ نے انسان کی ہستی کو خدا کی ہستی سے الگ قائم کیا۔ اس کو عشق و محبت سے مستحکم کر کے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" کی رو سے صفاتِ الٰہیہ سے متصف کرنے کی تلقین کی، اور انسانی "خودی" کو ایک خاص لائحۂ عمل کے ماتحت تربیت دے کر "انسانِ کامل" کا نظریہ پیش کیا۔ اس سلسلہ میں اگرچہ دونوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔ صوفیا اپنی ذات کو ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا کر کے اس منزل تک پہنچتے ہیں، اور علامہ اقبال اپنی ذات کو ذاتِ باری تعالیٰ سے الگ قائم کر کے اس منزل تک پہنچتے ہیں ؛

چونکہ اقبال کے نظریۂ "انسانِ کامل" کی تمامتر بنیاد "خودی" پر ہے، اس لئے یہ بتانا لازم ہے کہ انسانِ کامل تک اُن کی روحانی ارتقا کا طریقہ کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کو "اسرارِ خودی" میں منظم طریقے سے پیش کیا ہے۔ انکے نزدیک خودی کی تربیت کے مندرجۂ ذیل تین مراحل ہیں :—

۱۔ اطاعت : اطاعت سے مقصود اللہ، اس کے رسولؐ اور

احکامِ الٰہی کی اطاعت ہے۔ تربیتِ خودی میں اطاعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اطاعت نہ ہو، تو انسان کسی حالت میں بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اقبال نے اطاعت کو تربیتِ خودی کا اوّلیں مرحلہ قرار دیا ہے۔ اطاعت کا صحیح نمونہ دیکھنے کے لئے وہ اونٹ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ جانور اپنی طبع میں مطیع، فرمانبردار اور محنت شعار ہوتا ہے۔ شتربان اُسے جدھر چلاتا ہے، بے چون وچرا، صبر و استقلال کے ساتھ اطاعت کرتا ہے۔ انسان کو بھی چاہئے کہ اسی طرح خدا، اس کے رسولؐ اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے۔ اسلئے کہ اطاعت اور فرماں پذیری ہی سے وہ کمال کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں:

توہم از بارِ فرائض سر متاب — برخوری از عِندَہٗ حُسنُ المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرماں پذیری کس شود — آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

اور اس لئے آئینِ محمدیؐ کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں:

شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو — از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو

ضبطِ نفس: اس مرحلہ میں وہ اسلام کے ارکانِ خمسہ کی پابندی کو لازمی قرار دے کران کے مقاصد اور فوائد بیان کرتے ہیں۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ یہ ہیں: (۱) کلمۂ توحید (۲) نماز (۳) روزہ (۴) حج (۵) زکوٰۃ۔

ضبطِ نفس کا پہلا رکن کلمۂ توحید ہے۔ جب تک انسان اس پر ایمان نہ لائے، اس کا نفس ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتا ہے، لیکن جو شخص کلمۂ توحید پہ ایمان لے آئے، اس کا نفس ہر قسم کے وسوسوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اس وقت وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا خالق و مالک سمجھتا ہے اور دل میں اسی کا خوف رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
خوف را در سینۂ اُو راہ نیست — خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

انسان کو فطری طور پر اپنے اعزّہ سے محبت ہوتی ہے، اور ان کی محبت بعض اوقات ایسی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ فرائضِ دینی کی انجام دہی سے بھی غافل ہو جاتا ہے، لیکن کلمۂ توحید پر جو شخص ایمان رکھتا ہے، وہ "بندِ زن و فرزند سے فارغ" ہو جاتا ہے۔

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد — فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ما سوا قطعِ نظر — می نہد ساطور بر حلقِ پسر

ضبطِ نفس کا دوسرا رکن نماز ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ط اس آیت کی رو سے نماز ضبطِ نفس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ نفس ہمیشہ بُرے کاموں کا حکم دیا کرتا ہے، اور نماز اس سے باز رکھتی ہے۔ نماز کی اسی فضیلت کی بنا پر اس کو حجِ اصغر کہا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:-

لا الٰہ باشد صدف، گوہر نماز — قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است — قاتلِ فحشا و بغی و منکر است

ضبطِ نفس کا تیسرا رکن روزہ ہے۔ روزہ سے نفس کو فطری طور پر ضعف پہنچتا ہے، اور منہیات اور ناجائز خواہشات سے بچنے کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:-

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند — خیبرِ تن پروری را بشکند

ضبطِ نفس کا چوتھا رکن حج ہے۔ وطن پرستی نفس کی خاص خواہشات میں سے ہے۔ اس کے ترک کا واحد ذریعہ حج ہے۔ یہ مسلمانوں کو ہجرت سکھاتا ہے، اور یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کی بدولت سال میں ایک خاص مرکز پر مسلمانوں کو یکجا جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:-

مومناں را فطرت افروز است حج — ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایۂ جمعیتے — ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے

ضبطِ نفس کا پانچواں رکن زکوٰۃ ہے۔ حُبِّ مال و حُبِّ دولت نفسانی خواہشات کا تقاضا ہے۔ اس سلسلہ میں ضبطِ نفس کا واحد طریقہ زکوٰۃ ہے۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ سے اُخوّت و مساوات کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے اور مال میں برکت بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ — ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حَتّٰی تُنْفِقُوْا محکم کند — زر فزاید، الفتِ زر کم کند

الغرض یہ ہیں اسلام کے ارکانِ خمسہ، جن پر انسان کاربند ہو کر ضبطِ نفس، یعنی حصولِ کمال کا دوسرا مرحلہ طے کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تست — پختہ، محکم اگر اسلامِ تست

نیابتِ الٰہی:- اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد انسان خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ ہونے کا مستحق ہو جاتا ہے، اور اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کی صداقت کا صحیح معنی میں احساس کر سکتا ہے۔ جو شخص نیابتِ الٰہی اور خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ ہونے کا مستحق ٹھہرتا ہے، وہی انسانِ کامل ہے۔ انسانِ کامل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ انسان کے روحانی ارتقا کا خلاصہ ہے۔ "حیات" یا "خودی" مدتوں تک مسلسل رو تی رہتی ہے۔ تو کہیں جا کر

ایک انسان کامل ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات   تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اس "دانائے راز" کا ظہور حقیقتِ محمدیہ کی صورت میں ہو چکا ہے۔ آپ ہی "دانائے راز" اور "انسانِ کامل" ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت   تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

لیکن آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اس لئے اقبال بھی صوفیا کی طرح ایک دوسرے انسانِ کامل کے قائل ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ پروفیسر نکلسن کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "انسانِ کامل کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ لیگیں، پنچایتیں اس مقصد کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ آئے دن اس قسم کی لیگیں اور پنچایتیں برابر ناکام ثابت ہو رہی ہیں"۔

انسانِ کامل کی پیدائش سے قبل انسانیت کے لئے جسمانی و روحانی حیثیتوں سے مدارجِ ارتقا کا طے کرنا شرط ہے۔ وہ ابھی ہمارے لئے ایک نصب العین ہے۔ اس زمانہ میں خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں۔ البتہ انسانیت کے تدریجی ارتقاء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں ایک ایسی قوم پیدا ہوگی، جس کے افراد کم و بیش ایسے یکتا ہوں گے کہ وہ انسانِ کامل ان ہی میں پیدا ہوگا۔ چنانچہ وہ اس کے ظہور کے شدت سے متمنی ہوتے ہیں:۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا   اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو   در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

شورشِ اقوام را خاموش کن   نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

باز در عالم بیار ایامِ صلح   جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

قرآن مجید میں آیا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اس کی رو سے انسان آنحضرت صلعم کی ذاتِ بابرکت کو نمونہ قرار دے کر انسانِ کامل بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اقبال کے عقیدے کے مطابق انسان کے اندر نائبِ الٰہی بننے کی صلاحیت بدستور موجود ہے۔ اس کی بیّن دلیل خدا کا قول:۔ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ہے۔

انسانِ کامل دنیا میں خدا کا حقیقی حکمران ہوگا۔ وہ اپنی فطرت کے خزانہ سے دوسروں کو "دولتِ حیات" بخشے گا۔ انسان ارتقا کے مدارج جس قدر طے کرتا جائے گا، اسی قدر وہ اس سے قریب تر ہوتا جائے گا، اور جس قدر اس کی طرف بڑھتا جائے گا، اسی قدر وہ کمال کے درجہ تک پہنچتا جائے گا۔

'انسانِ کامل' کامل ترین خودی ہے۔ انسانیت کے ارتقائی مدارج میں جس قدر مشکلیں اور صعوبتیں پیش آئیں، وہ صرف اسی نصب العین کے حصول کی خاطر گوارا ہو سکتی ہیں۔ انسانِ کامل دراصل موجودہ انسان کی جسمانی اور روحانی معراجِ کمال ہوگا۔ اس میں زندگی کی متضاد قوتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی اور اس کے اندر قوت اور علم اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا۔ وہ انسانِ کامل تمام کائنات پر حاوی ہوگا۔ اقبال کے الفاظ میں ؏

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مولانا رومیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی میں آنحضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ کا ایک واقعہ نہایت دلپذیر پیرایہ میں بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسانِ کامل کائنات میں گم نہیں ہو سکتا، بلکہ خود کائنات اس کے اندر گم ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلعم کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہؓ ایک دن آپ کے ایامِ طفولیت میں آپ کو لیکر بیابان کی طرف گئی ہوئی تھیں، یکایک آپ گم ہو گئے۔ وہ آپ کو نہ پاکر بہت پریشان ہوئیں اور آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑیں، لیکن غیب سے یہ تسلی بخش ندا آئی:۔

غم مخور، یاوہ نگردد او ز تو

بلکہ عالم یاوہ گردد اندرو

اقبال کہتے ہیں کہ میں انسانِ کامل کے متعلق اس سے بڑھ کر کہتا ہوں:۔

در رضایش مرضیِ حق گم شود   ایں سخن کے باور مردم شود

انسانِ کامل کے اندر وہ قوت موجود ہے جس کی رو سے وہ نہ صرف کائنات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، بلکہ خود خدا کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں:۔

مسلم استی، دل با قلیمے مبند   گم مشو اندر جہانِ چون و چند

می نہ گنجد مسلم اندر مرز و بوم   در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

دل بدست آور کہ در پہنائے دل   می شود گم ایں سرائے آب و گل

انسانِ کامل کی ہمہ گیر فطرت کے متعلق انہوں نے "مردِ مسلمان" کے عنوان سے "ضربِ کلیم" میں ایک پُرزور نظم لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن   گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت   یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

وغیرہ وغیرہ

اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال اپنے کلام میں عموماً انسانِ کامل کے لئے مختلف اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ جیسے مردِ مومن، مردِ مسلمان، عبدِ خدا، مردِ حق، مردِ آزاد، مومن، مومنِ جانباز، مردِ کامل، قلندر، فقیر وغیرہ۔ ان سب کا مفہوم ان کے نزدیک ایک ہی ہے، یعنی انسانِ کامل۔

خمستانِ فرنگ

قیوم نظر

ہالینڈ کے مترجم ادیبوں سے ملاقات کے ذکر کے سلسلے میں مجھے سب سے پہلے برٹ وونن اور جیمز ہومز کا خیال آتا ہے۔ یہ دونوں شاعر ہیں اور اپنی اپنی زبان میں اچھے شعر کہتے ہیں۔ مگر اب یہ دونوں خود شعر لکھنے کی بجائے دوسرے شعرا کے اشعار کو مختلف زبانوں کا جامہ پہناتے ہیں اور اس طرح زبان کے بُعد کو مٹاتے اور ایک زبان کے خیال کو دوسری زبان بولنے والوں تک پہنچاتے ہیں۔ برٹ وونن ڈچ شاعر ہے مگر انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں پر بھی اتنی قدرت رکھتا ہے کہ ان کی نظموں کو نہایت سلیقے سے ڈچ زبان میں ڈھال لیتا ہے۔ جیمز ہومز امریکن ہے اور انگریزی کا شاعر ہے، وہ آج سے پانچ برس پہلے ہالینڈ کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایمسٹرڈم پہنچا تھا اور ابھی تک ایمسٹرڈم ہی میں مقیم ہے۔ اسی اثنا میں اس نے ڈچ زبان میں اتنی مہارت پیدا کرلی ہے کہ وہ اب ڈچ شعرا کی نظموں کو بلاتکلف انگریزی کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

ایمسٹرڈم میں پروفیسر ڈاکٹر وان ہوورن سے میری ملاقات ایسٹل ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں ہالینڈ کی پی ای این کلب نے میرے اعزاز میں اپنے ملک کے ادیبوں شاعروں صحافیوں ڈراما نگاروں وغیرہ وغیرہ کو مدعو کیا تھا۔ اس محفل میں اتنے لوگ جمع تھے کہ میرے لئے ہر ایک کو جاننا مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں اپنے لیکچر وغیرہ سے فارغ ہو کر حاضرین سے رخصت ہو رہا تھا کہ پروفیسر وان ہوورن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھ سے ایک تفصیلی ملاقات کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اپنے ملک میں بیلے (BALLET) اور پیرا کا ذکر جس انداز سے میں نے اپنی گفتگو میں کیا تھا اس سے ان کی دلچسپی ان دونوں چیزوں اور مجھ میں بہت بڑھ گئی تھی۔ آخر میں نے اسے اپنی فراغت کا دن بتایا تھا اور اس کے ساتھ ایک خصوصی اور تفصیلی ملاقات کا پروگرام بنایا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق میں آج اس کے قبضے میں تھا۔

دراصل میں آج دوپہری کو ہیگ سے ایمسٹرڈم آگیا تھا۔ اور پروفیسر ہورن کے ساتھ کھانا کھانے اور اس سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد جب میں رولنڈ ہولسٹ سے جو ایمسٹرڈم سے کافی دور ایک گاؤں میں رہتا ہے ملنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ڈاکٹر وان ہوورن مجھے جیمز ہومز کے مکان پر لے گیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہولسٹ کے ملنے سے پہلے اگر میں جیمز ہومز کو مل لوں تو بہت مفید رہے گا۔ ڈاکٹر کی کار پر بیٹھ کر جب میں ہومز کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ سارا مکان ایک ہی کمرے میں ہوتا ہے۔ کمرے پر نگاہ دوڑائی تو آمنے سامنے کی دو دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی الماریوں میں ڈچ شعرا کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں، ایک دیوار میں روشنی کے لئے کھڑکیاں اور دوسری دیوار میں ہاتھ منہ دھونے کا برتن اور نل وغیرہ لگا ہوا تھا۔ ایک پلنگ تھا جس پر گرم بستر بچھا تھا۔ پلنگ کے سامنے ایک چھوٹی میز اور دو کرسیاں دھری تھیں۔ پرے کونے میں چھوٹی سی تپائی پر ایک گملا رکھا تھا۔ جس میں نہ جانے کونسی بیل لگی تھی۔ یہ سبھی کچھ ایک ہی کمرے میں موجود ہونے کے باعث گمان گذر سکتا ہے کہ ہر چیز بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ہوگی۔ مگر ایسا نہ تھا اور یہ یقیناً اس کمرے میں رہنے والے کی خوش سلیقگی پر دلالت کرتا تھا۔ جیمز ہومز نے اپنے کمرے کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معذرت چاہی اور ہمیں بستر پر ہی بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ دراصل پروفیسر وان ہوورن نے مجھے یہاں لاتے ہوئے راستے میں بتایا تھا کہ جیمز ہومز نے تفصیل سے جدید ڈچ شعرا کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے متعلق جس قدر بحثوں میں حصہ لیا ہے اس کے پیش نظر میرا اس سے ملنا غیر مفید نہ ہو سکتا تھا۔

جیمز ہومز نے جدید ڈچ شعرا میں میری دلچسپی کے پیش نظر مجھے ان کی ایسی نظموں کا ایک مجموعہ دیا جنہیں اس نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ ان شعرا نے کونسی ایسی نئی بات پیدا کی تھی جس کے پیش نظر ان کو اس قابل گردانا گیا کہ ان کی نظموں کو خاص طور پر مجموعے کی صورت میں شائع کیا جائے۔ ہومز کا خیال تھا کہ جدید ڈچ شاعری بالعموم اعلیٰ پایہ کی نہیں ہے۔ مگر یہ ایک ایسا دور ہے جس میں تمام دنیا کی شاعری پر زوال آیا ہوا ہے۔ اس لئے اس خیال کے پیش نظر کہ چونکہ ڈچ شاعری بہت اچھی نہیں اس لئے اسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیش ہی نہ کیا جانے بجا نہیں۔ ویسے جدید ڈچ شعرا نے بھی

دوسری زبانوں کے شعرا کی طرح ہیئت میں ایسی تبدیلیاں اور موضوع میں ایسا نیا پن لانے کی کوشش کی ہے جو بار آور ہونے پر اچھے نتائج پیدا کر سکے گی۔ دراصل یہ دور تجرباتی ہے بعض جدید شعرا اس دور میں یقیناً نہیں ابھر سکتے کیونکہ ان کے تجربات اتنے ذاتی اور محدود ہیں کہ ان کے زندہ رہنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ تاہم جدید ڈچ شعرا میں ایک دو شاعر ایسے بھی مل سکتے ہیں جن سے مستقبل میں کچھ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ جدید ڈچ شعرا نے ہیئت میں کیا ضروری تبدیلیاں کی ہیں، جیمز ہومز نے بتایا کہ کلاسیکل ڈچ شاعری میں قافیے کے بغیر شعر کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وزن کا کینڈا بھی یونانی شاعری کے ڈھب پر تھا۔ جدید ڈچ شعرا یہ باتیں محض نئے پن کے لئے روا رکھتے ہیں، اسی لئے ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ مگر جدید ڈچ شاعری میں بسا اوقات کوئی بات ایسے ڈھب سے بھی آن پڑتی ہے کہ کلاسیکی شاعری کے تمام بندھنوں کو توڑنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقام بہت نازک ہے۔ کم ظرف دھوکا کھاتا اور بہک جاتا ہے۔ اسی لئے بہت سی آزاد نظمیں ناکام رہتی ہیں۔ مگر جب کہیں یہ چیز فکر کی پختگی اور کاریگری کی صناعی کے طفیل ابھرتی اور نکھرتی ہے تو لاجواب ہوتی ہے۔ ایسی نظموں کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جدید ڈچ شعرا میں اختر برج نے اپنی ابتدائی نظموں میں اسی بغاوت کا اظہار کیا تھا۔ شاید اس کو رستے کی دشوار گذاری کا احساس جلد ہی ہو گیا تھا چنانچہ اپنی بعد کی نظموں میں وہ کلاسیکی ہیئت کی طرف پھر لوٹ آیا اور اس کی بعض اچھی نظمیں اسی کلاسیکی سانچے میں ہیں۔ مگر اختر برج کا معاملہ کچھ الگ سا ہے۔ وہ جدید شعرا کی صنف میں شمار تو ہوتا ہے۔ مگر اس کا موضوع سراسر رومانی ہے۔ وہ بیشتر حسن و عشق ہی کی بات کرتا ہے اور پھر اپنی بات کو گھما کر ایک ہی مرکز پہ لے جاتا ہے۔ اس نے اپنی محبوبہ کو مار ڈالا تھا اور پھر شاید احساس گناہ نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔ اپنی دیوانگی کے طفیل وہ کچھ عرصہ پاگل خانے میں بھی رہا تھا۔ بالآخر اس کو ایک نرس کی نگرانی میں دیا گیا تھا یہی نرس آجکل اس کی بیوی ہے مگر یہ تو ایک مختلف کہانی ہے۔

ہومز نے گفتگو کے دوران میں میں نے دو ایک بار ہولسٹ کا ذکر کیا تو اس نے کچھ اس بے اعتنائی سے اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی شاعری میں زیادہ جان نہ دیکھتا تھا اور اسے شاید جدید شاعروں میں شامل کرنا بھی زیادتی شمار کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں اب مجھے ڈاکٹر وان ہوون کی اس بات کا مطلب بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ کیوں یہ چاہتا تھا کہ میں ہولسٹ سے ملنے سے پہلے ہومز سے ضرور ملاقات کر لوں۔ میرا اندازہ ہے کہ ہومز شاید ہولسٹ کے اس فلسفۂ زندگی کو سراہ ہی نہ سکتا تھا جو اسے مادیت سے دور کسی اور سرزمین میں لے گیا تھا اور جس کے کارن ہولسٹ نے نہ صرف تجرد کی زندگی کو اختیار کیا تھا بلکہ آکسفورڈ کا فارغ التحصیل ہونے اور ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوصف وہ درویشی کے دامن کو تھامے ہوئے بے نیازی کی وادیوں میں نکل گیا تھا۔ دراصل جیمز ہومز اور وان ہوون شعرا کے ایک ایسے گروہ کے مداحوں میں سے تھے جن میں اختر برج کو اہم مقام حاصل تھا۔ اگرچہ اب تک مجھ پر یہ بات بھی روشن ہو چکی تھی کہ ہالینڈ میں اس وقت دو شاعر ایسے تھے جو اپنے ہم عصر ساتھیوں کو لئے ہوئے الگ الگ کھڑے تھے لیکن تعجب اس بات پر تھا کہ ان کے مداحوں میں ایک حد تک وہی جذبہ کام کر رہا تھا جو ایک زمانے میں لکھنؤ میں انیسیوں میں اور دبیریوں میں تھا۔ گو ہومز اور ہوون ہولسٹ کے خلاف بظاہر کچھ بھی نہ کہتا تھا بلکہ رسماً اس کی تعریف بھی کی تھی لیکن دونوں جس انداز سے اختر برج کا تذکرہ کرتے، اس کی شاعری کو سراہتے اور ہولسٹ کے ذکر سے پہلوتہی کرتے ہوئے گذر جاتے تھے اس سے ان کے دل کی کیفیت زبان تک آئے بغیر واضح ہو جاتی تھی۔

جیمز ہومز کے نزدیک اختر برج ایک ایسا شاعر تھا جو دنیا کے لئے کوئی پیغام نہ رکھتا ہو یا جو دنیا کے نظام ہی کو بدلنا چاہتا ہو یا پھر حیات انسانی کی الجھنوں ہی کا کوئی حل پیش کرتا ہو۔ آج کے شاعر کے لئے ایسا کرنا ضروری بھی نہ تھا کیونکہ آج کا ڈچ شاعر تو اپنی ہی دنیا میں گم رہنا چاہتا تھا اس کی تو اپنی ہی زندگی ایسے ایسے تجربات کا مرقع تھی جن کو وہ ابھی تک خود بھی پوری طرح نہ سمجھ پایا تھا۔ دراصل یہ نا سمجھی ہی جدید ڈچ شاعری کا جوہر تھی بعض لوگوں کے نزدیک یہی بات اس کی خرابی کا باعث بھی ٹھہرتی تھی۔ پھر وان ہوون بھی دبی زبان میں کبھی کہنے لگتا تھا "ہولسٹ اس کا دوست ہے اور وہ اس کے کوائف سے پوری طرح آگاہ بھی ہے۔ اس کی بیشتر اچھی شاعری اسی زمانے کی یادگار ہے جب اس کی عمر چالیس پینتالیس برس سے زیادہ نہ تھی اور اب تو وہ بہت ہی کم لکھتا ہے"۔ چنانچہ ہوون کو یقین تھا کہ گذشتہ پندرہ بیس برس میں ہولسٹ نے دس نظمیں بھی تو ایسی نہ لکھی تھیں جنہیں ادب میں کوئی مقام حاصل ہو سکتا تھا۔ اور پھر اسے زیادہ نظمیں لکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کے پاس زمین تھی، جائیداد تھی جس کے سہارے وہ آسائش کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وقت اور زمانہ اس کے لئے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اس کو جنگ متاثر کرتی تھی نہ امن

وہ اب ہر بات سے بے نیاز تھا۔ شاعری سے بھی۔

اب میں نے ہولسٹ کی شاعری پر بات چیت کرنے کی بجائے مناسب خیال کیا کہ ہومر سے ترجمے کی مشکلات کا تذکرہ کیا جائے لیکن اس نے ترجمے کی دقتوں سے پہلے اپنی مشکلات کا ذکر شروع کر دیا جو زیادہ تر زبان سے متعلق تھیں۔ اگرچہ اس نے گذشتہ پانچ برس میں شبانہ روز کی محنت سے ڈچ زبان پر کسی قدر قدرت حاصل کر لی تھی مگر اس کا خیال تھا کہ زبان کی بھی بہت سی باریکیاں تھیں جن کو وہ کماحقہٗ نہ سراہ سکتا تھا اور بسا اوقات اس کو اس ضمن میں اپنے خاص دوستوں سے مدد بھی لینا پڑتی تھی پھر بعض ڈچ شعرا موضوع کی پیچیدگیوں کے باعث خود اپنی زبان میں بھی زیادہ نہ کھلتے تھے، اسی لئے ان کی نظموں کو ترجمہ کرتے ہوئے الجھنیں اور بھی بڑھ جاتی تھیں۔ یا پھر ایسی نظموں کو ایک تشریحی سے انداز میں ترجمہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی جس کو وہ مناسب خیال نہ کرتا تھا۔ اور آخر میں اس کے کہنے کے مطابق ہر قابلِ ذکر زبان کی طرح ڈچ زبان کا بھی اپنا ایک مزاج تھا جو انگریزی سے یقیناً مختلف تھا۔ مزاج کو پانے اور اسے سمجھنے کے لئے اس کے خیال میں زیادہ مدت درکار تھی۔ زبان دانی کی ان تمام دقتوں اور موشگافیوں کے باوجود دان ہودن کا خیال تھا کہ برٹ ووٹن ایسا ہمدرد مترجم جدید شعرا کو ملنا مشکل تھا چونکہ ہودن بھی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا تھا اسی لئے اس کی رائے میں ہومر کے تراجم اصل کی اکثر و بیشتر خوبیاں اور رعنائیاں لئے ہوئے تھے۔ اور جدید شعرا اس ضمن میں خوش قسمت تھے کہ ان کو ایک نہایت اچھا مترجم مل گیا تھا۔

برٹ ووٹن کے ہاں میں ہورنک کی ہمراہی میں رات کے دس بجے کے لگ بھگ پہنچا تھا۔ ہومر سے فارغ ہو کر دان ہودن مجھے جمباتن لے گیا تھا۔ یہ ایک ایسا اشاعتی ادارہ ہے جو ایشیائی زبانوں کی کتابوں کے ڈچ زبان میں تراجم کو شائع کرتا ہے۔ دان ہودن اس کے ڈائرکٹروں میں سے ایک ہے۔ شام کا کھانا مجھے اسی ادارے کے شعبۂ تاریخ کے مہتمم کے ہاں کھانا تھا۔ اس لئے دان ہودن چلا گیا اور میں ڈاکٹر کے ہمراہ اس کے گھر کھانے پر پہنچ گیا۔ وہاں پروگرام کے مطابق ہورنک پہنچ گیا جو بالآخر مجھے برٹ ووٹن سے ملانے کے لئے اس کے گھر لے گیا۔ ہورنک خاصا جسیم اور تنومند تھا، انگریزی ذرا کم ہی جانتا تھا اور اگرچہ وہ اکیس کتابوں کا مصنف تھا جن میں سولہ اس کی نظموں کے مجموعوں پر مشتمل تھیں لیکن وہ مجھ سے کسی بحث میں نہ الجھنا چاہتا تھا اور مجھے فوری طور پر برٹ ووٹن کے مکان پر لے جانا چاہتا تھا۔ ہورنک بقول شخصے

قد آور شاعر تھا مگر اپنے آپ کو جدید ڈچ شعرا کی صف میں شمار نہ کرتا تھا کیونکہ اس نے ہر قسم کے مضامین کو اپنی نظموں میں باندھا تو تھا مگر اس نے کبھی قافیہ اور وزن کے مستند اصولوں سے انحراف نہ کیا تھا۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ جدید ڈچ شعرا کو اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کا پورا موقع ملنا چاہیئے۔ گو اُسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ شاعری کسی طرح پروان نہیں چڑھ سکتی۔

برٹ ووٹن کا مکان کم از کم تین کمروں پر ضرور مشتمل تھا۔ کیونکہ ایک کمرے میں اُس کے دو بچے سوئے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اس کی بیوی بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ اور ایک کمرے میں وہ خود کرسی پر بیٹھا ہیملٹ کا ترجمہ ٹائپ کر رہا تھا۔ اُس کا قد درمیانہ، ٹھوڑی نکیلی اور عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اب تک فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی نظموں کے دس مجموعے ڈچ زبان میں ترجمہ کئے تھے مگر میں اس کو ان مجموعوں کے باعث ملنے کی بجائے اس لئے ملنا زیادہ اہم شمار کر رہا تھا کہ اوّل تو اُس نے اقبال کی نظموں کو ڈچ زبان میں ڈھالا تھا اور میں جاننا چاہتا تھا کہ اُس نے اقبال کے ترجمے اگر براہِ راست کئے ہیں تو اُس کو اُردو اور فارسی سے کس قدر آشنائی حاصل تھی۔ دوسرے جب پروفیسر وان ہمن نے مجھے یہ کہا تھا کہ برٹ ووٹن نے شاید جدید پاکستانی شعراء کی نظموں کے تراجم بھی کئے ہیں تو اس ملاقات میں میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ ہالینڈ کی تمام یونیورسٹیوں میں مجھے ایک شخص بھی تو ایسا نہ ملا تھا جو اُردو جانتا ہو۔ اسوا میوزیم کے اس ایک اسسٹنٹ کے جو لائیڈن میں رہ کر لنگوا فون ریکارڈوں سے اُردو سیکھتا تھا۔ اور میں جب اس سے ملا تھا تو اس نے مجھ سے اپنا تعارف اُردو ہی میں کرایا تھا جس پر میں نہایت خوش ہو کر اس کو اسکی ہمت کی داد دے رہا تھا۔

عام ڈچ گھروں کی طرح برٹ ووٹن کا گھر بھی صاف ستھرا اور خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ جس کمرے میں وہ بیٹھا کام کر رہا تھا مجھے اس پر کسی لائبریری کا کمرہ ہونے کا گماں ہوتا تھا۔ کیونکہ چاروں طرف الماریوں میں نثر و شاعری کی کتابیں اور مختلف زبانوں کے شعرا کے مجموعے نہایت قرینے سے رکھے تھے اور جب برٹ ووٹن نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی تمام کائنات ایک بیوی، دو بچے اور یہ چند کتابیں ہیں تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تھا کہ وہ عام زندگی میں کیا کرتا، کیا کماتا، کیا کھاتا اور کیا بچاتا تھا۔ اس کے جواب میں اس نے مجھے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ اب تو وہ پیشہ ور مترجم ہو کر رہ گیا تھا۔ آج ڈچ زبان میں ترجمہ کرنا اتنے پیسے ضرور دے جاتا تھا کہ ایک معمولی ضروریات رکھنے والا آدمی اُن سے اپنے اخراجات کو پورا کر سکے۔ البتہ پس انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ نچی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا کے مصداق دنیا کی کسی زبان کا عام ادیب قلم کو شاید ہی

معاش تو بنا سکتا ہے مگر اس میں آسائش اور پس اندازی کو شامل نہیں کر سکتا۔
میرے ایک اور سوال کے جواب میں برٹ دوٹن نے بتایا تھا کہ عام طور پر اُسے ترجمہ کرتے ہوئے بہت سا وقت لگتا تھا۔ مثلاً ہیملٹ جس کا وہ اب ترجمہ کر رہا تھا ایک برس سے پہلے نہ ختم ہو سکتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر ــــ کے ہاں جب میں نے جدید شعرأ کا ذکر کرتے ہوئے رونلڈ ہولسٹ کو ہالینڈ کے بہترین شعرا کی صف میں شمار کیا تھا تو ہورنک نے پہلے تو دبی زبان میں اس کی بڑائی سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ ہولسٹ ایک اعتبار سے صوفی شاعر ہے، وہ آئر لینڈ والوں سے اور کیلٹک سے زیادہ متاثر تھا اور شاعری میں بھی وہ "ڈبلیو بی ایٹس" کی پیروی کرتا ہے مگر یہی نہیں جب وہ ڈچ زبان میں آئرستانی روایات کو لاتا ہے تو اُن سے بے تحاشا اجنبیت کی بو آتی ہے اور جیمز ہومز کی اس رائے سے پروفیسر وان ہوون نے بھی اتفاق کیا تھا مگر برٹ دوٹن سے جب میں نے ہولسٹ کا ذکر چھیڑا تو اس کو اس کی تعریف میں رطب اللساں پایا۔ دوٹن کا خیال تھا کہ ہولسٹ ڈچ شعراء میں نہ صرف نہایت اہم مقام کا مالک ہے بلکہ بعض زاویوں سے تو کوئی جدید شاعر اس کے نزدیک تک نہیں پہنچتا، پھر دوٹن نے بتایا تھا کہ ہولسٹ بہت شرمیلا شاعر ہے۔ وہ تنہائی پسند اور کم آمیز ہے، اس لئے وہ لوگ جو پراپگنڈے سے متاثر ہوتے ہیں، ہولسٹ کی شاعری کی تعریف نہیں کر سکتے۔ ہولسٹ کی کم آمیز طبیعت اور الگ تھلگ رہنے کی عادت کا ایک تجربہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔

میں ہالینڈ میں پہنچتے ہی یورس ڈیلز سے ملا تھا۔ ڈیلز عجب باغ و بہار اور ہر فن مولا قسم کا آدمی تھا۔ اگرچہ ان دنوں وہ ہیگ کی اسٹیج پر بطور اداکار کام کر رہا تھا، مگر گذشتہ تیس برس میں اس نے اسکول میں معلمی سے زندگی شروع کر کے اسٹیج پر ایکٹر اور ڈائریکٹر کے راستے سے ہوتے ہوئے دو فلمیں تیار کرنے کے ساتھ نہ صرف میکبتھ، مڈسمر نائٹ ڈریم اور انٹونی اینڈ کلوپیٹرا کا ڈچ زبان میں ترجمہ کر ڈالا تھا بلکہ گذشتہ جنگ کے دوران میں اس نے اسٹیج کے لئے دو طربیہ کھیل بھی لکھے تھے جو ان دنوں بہت کامیاب ہوئے تھے۔ ترجموں کے سلسلہ میں اُس نے بہت سے فرانسیسی شاعروں کی نظموں کو ڈچ زبان کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ چنانچہ جب تفصیل سی گفتگو کے بعد اُسے میری دلچسپیوں کا بھی علم ہوا تو اس نے از خود بر ختی میں، جو ہیگ سے شاید دو سو میل دور ہے، رونلڈ ہولسٹ کو فون کیا اور میرا اس سے فوراً ملاقات کرنا ضروری خیال کیا۔ ہولسٹ کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ تھی۔ اس لئے ڈیلز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس ہنگامہ خیز دنیا سے الگ تھلگ رہ کر ہی اپنی شاعری کی دنیا میں مگن رہتا تھا اور پھر یہ بھی نہیں کہ وہ بہت زیادہ لکھتا تھا۔ سال میں چند ایک نظمیں ہی اس کے قلم سے نکلتی تھیں۔ وہ نقادوں کی بات پر بھی زیادہ دھیان نہ دیتا تھا اور اپنے موافق اور خلاف ہر قسم کی تنقید پہ خاموشی اختیار کئے رکھتا تھا۔ اس لئے نقادوں کا ایک گروہ بھی اس سے بدظن تھا۔

ہولسٹ سے ٹیلی فون پر گفتگو کرنے کے بعد ڈیلز نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوگا۔ چنانچہ ملاقات کا وقت معین کرنے کے بارے میں وہ کل مجھ سے براہ راست میرے ہوٹل پر ٹیلی فون کرے۔ اور پھر جب اس نے مقررہ وقت پر مجھے ٹیلی فون کیا تھا تو اپنے بڑھاپے کا واسطہ، راستے کی دشوار گذاری (کیونکہ اس گاؤں تک ریل وغیرہ نہ جاتی تھی) مکان کی مرمت اور بعض دیگر الجھنوں کا ذکر کر کے معذرت چاہی تھی۔ اس سے دو دن بعد مجھے اس کا ایک تفصیلی معذرت نامہ اور ایک تصویر جو میں نے مانگی تھی، مل گئی تھی۔ جب میں نے ایمسٹرڈم میں جو اس کے گاؤں سے شاید اسّی میل دور تھا اُسے پی۔ای۔ این کلب کی ایک مجلس میں ملنے کے لئے لکھا تھا تو اُس نے پھر معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ میں نے بھی شاید اس سے ملنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک دن اسکو اطلاع دیئے بغیر جب میں اس کے گاؤں میں جا ہی پہنچا تھا تو وہ اتفاق سے گھر پر موجود نہ تھا اور جانے کھیتوں میں کہاں چھپا ہوا تھا کہ تلاش کے باوجود اس کا سراغ نہ ملتا تھا۔

برٹ دوٹن بھی اس کے مداحوں اور شاید قریبی دوستوں میں تھا۔ اس لئے جب میں نے اُسے ہولسٹ سے نہ مل سکنے کی سرگذشت سنائی تو اُس نے بتایا کہ وہ اس کے تمام معروف وغیر معروف ٹھکانے جانتا تھا۔ اِس لئے چند دنوں تک وہ یقیناً اس قابل ہو سکے گا کہ مجھے اس سے بہر عنوان ملا سکے۔ لیکن مجھے تو اس سے اگلے ہی دن ہالینڈ کی سرحد کو عبور کرنا اور جرمنی چلے جانا تھا۔ اس لئے دوٹن کی مدد اور ہمت کے باوجود میں اب اس سے نہ مل سکتا تھا اور اس کا مجھے افسوس تھا۔

ہولسٹ کی متصوفانہ شاعری سے گذر کر جب جدید شعراء کا ذکر چلا تو دوٹن کا خیال تھا کہ یہ گروہ ماضی سے یکلخت الگ ہو جانا چاہتا تھا۔ اُن کا ایک پاؤں تو شاید حال پر رہتا تھا مگر دوسرا پاؤں ہوا میں معلق ہونے کے باعث اُن کو لنگڑانا پڑتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ گروہ شاید ہر منطقی استدلال کو شاعری کے منافی خیال کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کی نظمیں متوازن، ہموار اور رواں نہ ہوتی تھیں۔ اس گروہ کی نظمیں پڑھنے سے ذہن کو اسی طرح جھٹکے لگتے تھے۔

جس طرح ایک ٹوٹی پھوٹی، جگہ جگہ گڑھوں اور ملبے سے اٹی ہوئی سڑک پر ایک گاڑی میں بیٹھ کر گذرنے سے درگت بنتی تھی۔ اور جس طرح اس سڑک پر جسم کے توازن کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا ویسے ہی جدید شعراء کی نظموں کو پڑھتے وقت ذہنی توازن کو برقرار رکھنا عام سوجھ بوجھ والے قاری کے لبس کی بات نہ تھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں وو ڈن سے ایک ایک بات پر تفصیل سے گفتگو کروں مگر رات بھیگ چکی تھی اور مجھے ابھی ہیگ واپس جانا تھا۔ اس لئے میں نے اس تمام سلسلے کو بھی گول کیا اور موضوع گفتگو کو اقبال کی نظموں کے تراجم پر لے آیا۔

میرا خیال تھا کہ وو ڈن اردو اور فارسی میں سے ایک زبان ضرور جانتا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر اقبال کی نظموں کے ترجمے کا کٹھن کام سرانجام نہیں پا سکتا۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ تو علم ہو گیا تھا کہ وو ڈن کو اردو سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ وہ فارسی کی ضرور کچھ شد بد رکھتا ہوگا۔ اس لئے جب میں نے اس سے یہ دریافت کیا کہ اس کا فارسی کا علم کس قدر تھا تو مجھے اقبال کی بزرگی کے باوجود اس پر رحم آنے لگا۔ وو ڈن فارسی سے بھی بیگانۂ محض تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آج دنیا کی ہر زبان میں ایسا ہو رہا ہے اور مترجم اصل کو دیکھے اور جانے بغیر ترجمے سے ترجمے کئے جا رہے ہیں۔ بلکہ آج سے پچیس اٹھائیس سال پہلے جب تاجور مرحوم نے "ادبی دنیا" کو پہلے پہل جہازی سائز پر شائع کیا تھا اور اس کے ادارے میں سید عابد علی عابد بھی شامل تھے تو رسالے کا ایک حصہ مختلف زبانوں کی نظموں کے تراجم کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اس میں تراجم کے نیچے "چینی سے، ملائی سے، یونانی سے، عبرانی سے" وغیرہ وغیرہ کے الفاظ دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس ادارے میں کون ایسا فاضل ہو سکتا تھا جو دنیا کی ہر زبان کی نظموں کو براہ راست اردو کے قالب میں ڈھال سکتا تھا۔ یہ میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چنانچہ ایک دن کالج میں عابد علی عابد صاحب سے جب حقیقتِ حال معلوم ہوئی تو اُن شعرا کے ساتھ جن کی نظموں کے تراجم ہوتے تھے ہمدردی پیدا ہونے کی بجائے مجھے اس نظریئے کو جان کر خوشی ہوئی جس کے تحت ادبی دنیا کا ادارہ یہ کام کر رہا تھا۔ مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اقبال کے ساتھ ویسی ہی ہمدردی پیدا ہونے لگی تھی جو بسا اوقات کسی مظلوم اور بے بس کے لئے از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اقبال کی نظموں کے مطالب کو دونوں زبانوں کو جانے بغیر سمجھنا مشکل تھا۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ اُردو اور فارسی میں سے کسی ایک کو جانے بغیر تیسری زبان اور دوسرے ذہن کے سہارے چوتھی زبان میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس سارے سلسلہ میں کیا کیا دقتیں پیش نہ آئی ہونگی اور کیا کیا لطیفے نہ ہوتے ہونگے۔ میں نہ جانے اُن کو کیوں احاطہ کرنے لگ گیا تھا۔

اقبال کی نظموں کے ساتھ میرا یہ جذباتی سا ردعمل بہت مختصر سے لمحے کے لئے تھا، کیونکہ اب مجھے اس سلسلہ کی افادیت کے بہت سے پہلو نظر آنے لگے تھے۔ اقبال پاکستان کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس نے پاکستان کے خیال کو جذبات کی بھٹی سے نکال کر نظموں کے سانچے میں چھاپے خانے کی سیاہی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ پھر عقل و دانش، علم و حکمت، اور ذوق و یقین کے اس نے ایسے رموز کھولے تھے کہ مشرق کی بات مغرب کو بھی وزن دار معلوم ہوتی تھی۔ سرمایہ پرستی کے اس دور میں جب کہیں بھولے سے مغرب پر کوئی ایسا لمحہ بھی طاری ہوتا تھا جب وہ اس کے عواقب و عوامل سے گھبرا اٹھتا تھا تو اس کی نگاہ اب مشرق کی روحانیت کی طرف ہی اٹھتی تھی۔ مشرق کی اس روحانیت کو فکر و عمل کے نئے سانچے میں ڈھالنے میں اقبال کی شاعری کو بھی ایک بلند مقام حاصل تھا۔ اقبال نے پاکستانی مسلمانوں کے روپ میں دنیا کے مسلمانوں کو جس طرح پکارا اور ابھارا تھا اس کا غلغلہ اور دبدبہ مغرب کے ایوانوں تک اس کی نظموں کے تراجم ہی سے تو پہنچ سکتا تھا۔ میں اب ہربرٹ وو ڈن کی کوششوں کو سراہ رہا تھا۔ اس کی ہمت کی داد دے رہا تھا اس کے کام کی افادیت کا تذکرہ کر رہا تھا اور ترجموں کی کتاب کی جو اس اثنا میں اس نے مجھے دی تھی ورق گردانی کر رہا تھا۔ فرطِ حیرت سے اُنہیں سونگھ رہا تھا اور اس خوشبو سے حظ اٹھا رہا تھا جو ایسے موقعوں پر نہ جانے کاغذ میں کس طرح سرایت کر جاتی ہے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ اس نے ترجمہ کرتے وقت اقبال کے کن کن انگریزی تراجم کو پیش نظر رکھا تھا، وو ڈن نے مجھے بتایا کہ اُس نے نکلسن کے ترجمے سے بھی استفادہ کیا تھا۔ لیکن وہ اپنے ڈچ ترجموں کو بیشتر ڈاکٹر کیرنن کے انگریزی ترجموں کے سانچے پر ڈھال رہا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں کیرنن نے نکلسن سے زیادہ سلاست اور روانی اور شاعرانہ معانی آفرینی سے کام لیا تھا اور جب میں نے اشارۃً کیرنن کے ترجموں کی کمزوریوں اور اُن پر کیرنن کی اپنی ہی نظرثانی کی جانب توجہ دلائی تو اس نے مجھے بتایا کہ اسے اس چیز کا بہت بعد میں علم ہوا لیکن اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ اسکے اپنے ترجموں کی اساس کمزور تراجم پر ہو۔ اس لئے اس کو بھی کیرنن کی تبدیلیوں کے پیش نظر اپنے بعض ترجموں کی صورت بدلنا پڑی تھی۔ ترجمہ کرنے کے دوران میں وو ڈن کے ایک ڈچ دوست نے بھی اسکی مدد کی تھی جو خود شاعر تھا نہ مترجم مگر فارسی

(باقی [illegible] پر)

نذرِ اقبالؒ

سحاب قزلباش

دلوں میں یوں خودی کا ذوق پیدا کر دیا تو نے
کہ ہر قطرے کو طوفاں سے شناسا کر دیا تو نے

سکھایا ہم کو دنیا میں طریقہ جینے والوں کا
ہجومِ یاس کو یکسر تمنا کر دیا تو نے

تری لَے بول اُٹھی، دیر و حرم تک گنگنا اُٹھے
کہ پتھریلے دلوں میں درد پیدا کر دیا تو نے

ترے اشعار میں گذرے ہوئے موسم کی انگڑائی
نظر میں عظمتِ کہنہ کو زندہ کر دیا تو نے

بھٹکتا ہے جہاں مایوس انساں اپنے مسلک سے
وہاں امید کا ہر سو اُجالا کر دیا تو نے

قصرِ شرف النسا

علامہ اقبالؒ

گفتم ایں کاشانۂ از لعلِ ناب — آنکہ می گیرد خراج از آفتاب!
ایں مقام ایں منزل ایں کاخِ بلند — حوریاں بر درگہش احرام بند!
اے تو دادی سالکاں را جستجوئے — صاحبِ او کیست؟ با من باز گوئے
گفت "ایں کاشانۂ شرف النساست — مرغِ بامش با ملائک ہم نواست!
قلزمِ ما ایں چنیں گوہر نزاد — ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد!
خاکِ لاہور از مزارش آسماں — کس نداند راز او را در جہاں!
آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ — حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
آں فروغِ دودۂ عبدالصمد — فقرِ او نقشے کہ ماند تا ابد!
تا ز قرآں پاک می سوزد وجود — از تلاوت یک نفس فارغ نبود
در کمر تیغِ دو رو قرآں بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز
بر لبِ او چوں دمِ آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید!
گفت اگر از راز من داری خبر — سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند — کائناتِ زندگی را محور اند!
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس — دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن — تیغ و قرآں را جدا از من مکن
دل بآں حرفے کہ می گویم بنہ — قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است!

عمرہا در زیرِ ایں زریں قباب — بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہانِ بے ثبات — اہلِ حق را داد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد با خود آنچہ کرد — گردشِ دوراں بساطش در نورد
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت — خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد"

بنگالی نظم

میں گیت اُسی کے گاتی ہوں

(دعا و اقبالؒ)

بیگم صوفیہ کمال

مترجم:۔ یونس احمر

گیت اُسی کے گاتی ہوں

جس نے حیات کا کھوج لگایا جس نے جیون پتھ دکھلایا
جہل کی تیرہ شب میں جس نے نور وضیا کا دیپ جلایا
دیپ جلائے جس نے من کے، دن کا سُندر نور اُڑا کر
زیست پہ جس نے جیت دلائی خوف کی باتیں دل سے ہٹا کر
گیت اُسی کے گاتی ہوں

میں گیت اُسی کے گاتی ہوں
شکھ ساگر میں لہراتی ہوں
ہر دم جس کے ہونٹوں نے ہیں انساں ہی کے نغمے گائے
جن کو سن کر خوں گرمایا، جن سے طوفاں شرما جائے
جس نے مجبوروں مظلوموں کی آہوں سے ہو کر مضطر
"شکوہ" کے انداز میں اپنے رب سے باتیں کیں جی بھر کر
گیت اُسی کے گاتی ہوں

جس دن تیرے ہونٹوں سے تھا گیت فضا میں لہرایا
دل میں آشا جاگ اُٹھی تھی، آنکھوں نے اک سپنا دیکھا
اور تو نے للکارا تھا:

جیون بڑا کٹھن ہے بھائی، شان سے آگے بڑھتے جاؤ
رستے کیسے ہی اوگھٹ ہوں تم گھاٹی پر چڑھتے جاؤ
دل سے شبہے دور کرو، زنجیریں خود کٹ جائیں گی
نیا نشیمن اپنا بناؤ، صبحیں نجات کی آئیں گی
یہ گیت جو میرے ہونٹوں پر دن رات مچلتے رہتے ہیں
دراصل ترے ہی نغمے ہیں جو دل میں اُبلتے رہتے ہیں
وہ دیکھ کہ ان نغموں نے ہیں زنداں کی گرا دیں دیواریں
دریا میں بھی طوفاں آہی گیا، کام آگئیں موجوں کی یلغاریں
وہ لَے تھی تری ہی لَے جس میں شعلوں کی زبانیں پلتی تھیں
ہاں تیرے ہی دم سے مشکل راہیں پل بھر میں آسان ہوئیں
راتیں تو نے رو رو کاٹیں، پلکوں سے طوفان بہے
اپنی قوم کی دکھیاری آنکھوں سے سب آنسو پونچھے
گیت میں تیرے گاتی ہوں

تو قوم کی آنکھ کا تارا ہے، میں گیت ترے ہی گاتی ہوں
تیری ہی چھایا ہے جس کو میں اپنے من میں پاتی ہوں
کیا قوم کی خاطر دکھ جھیلے اور پہروں اشک بہائے ہیں
زنجیرِ غلامی توڑنے کو طوفانی نغمے گائے ہیں
محکومی کی زنجیروں میں جو قوم تھی سب کچھ بھول چکی
تو اس کا دلیلِ راہ بنا اور بخشی اس کو آزادی
تعظیم سے میرا سر ہے نگوں ہاں تیری خدمت میں اقبال
اس دور کا تو قومی شاعر، تو سچ مچ ہے اک نیا ہلال
میں گیت ترے ہی گاتی ہوں

غزل

جگر مرادآبادی

اک یہی حسنِ یقیں، تسکینِ جان و دل سہی
مجھ سے تو غافل نہیں ہے تجھ سے میں غافل سہی

پھر بھی آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اک سراپا ناز کو
زندگی میں ہر تجلّی حُسن کی شامل سہی

جو بھی مل جائے محبّت میں وہی انعامِ دوست
کیفِ محرومی سہی، لطفِ شکستِ دل سہی

پھر بھی کتنی دل نشیں ہے پھر بھی کتنی جانفزا
حسن کی ایک ایک ادا ظالم سہی قاتل سہی

عشق ہی کی فطرتِ سرکش کا لیکن کیا علاج
ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی منزل سہی

کس کو ملتی ہے جگر یہ دولتِ بیدار بھی
لاکھ جامِ جم کے بدلے اک شکستہ دل سہی

ورتاژ

معلق شاہراہ

(۲)

مہاندری

ممتاز مفتی

اویۂ نظر

جیپ رک گئی

"یہ کوائی ہے" کمبل میں لپٹے ہوئے گاڈدی نے فخریہ انداز میں کہا میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پہاڑ سامنے سے کھلے ہوئے ے اور مشرقی کونے کی طرف جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی آپس میں مل گئے تھے۔ اس کھوہ نما کونے میں چیل کا ایک گھنا جنگل تھا۔ "بڑی خوبصورت جگہ ہے" ڈدی نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "خوبصورت!" میں نے ایک بار پھر اس کھوہ کی طرف دیکھا "شیروں کی آماجگاہ معلوم ہوتی ہے۔" مسعود نے ہنسکر کہا۔ بے وقوف" عمر نے ناک سکوڑی۔ "تم پہاڑوں کو کیا جانو۔ تختے کی طرح فلیٹ میدانوں کے رہنے والے کیا جانیں، انہیں تو اُلٹا چھوٹی سی پہاڑی بھی اچھی تی ہے۔" مسعود نے کہا "ہنہ" اور عمر نے پھر ناک سکوڑی۔

کھوہ کے کونے پر دھوئیں کے سیاہ رنگ میں چھپی ہوئی جھونپڑی سے غلیظ کپڑوں کے پلندے میں سے سفید رنگ کے دانت چمکے "یہ تو اپنی اپنی نجر ہے۔ بابوجی۔ ۔ اے ہو گئے" وہ بولا "اور بابوجی جب انگریج یہاں آیا کرتے تھے تو کوائی کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جایا کرتے تھے کہتے تھے کہ کوائی کا جواب نہیں —— اپنی اپنی نجر ہے بابوجی"

مسعود نے طنزاً کپڑوں کے اس غلیظ پلندے کی طرف دیکھا اور جیپ میں بیٹھ گیا اور جیپ ہونکتی ہوئی چڑھائی چڑھنے لگی اور اوپر موڑ کے قریب جاکر پھر رک گئی جہاں دوسری جانب سے آنے والی ایک اور جیپ کھڑی تھی۔ اس جیپ سے ایک صاحب اور میم غور سے نیچے کوائی کی کھوہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "بیوٹی فل" میم نے خوشی کے جذبے سے چھلکتے ہوئے کہا۔ "بیوٹی فل" میں نے مڑ کر کوائی کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ درختوں کا ایک وسیع جھنڈ جو نیچے سے شیروں کی آماجگاہ دکھائی دے رہا تھا یہاں بلندی سے ایک عظیم الشان شالامار معلوم ہو رہا تھا۔ ہموار میدان کے طے زینے کی سیڑھیوں کی طرح اوپر نیچے پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی عظیم مغل کے ہاتھ نے نہایت سلیقے سے ان روشوں کو سنوارا اور سجایا ہو۔

کیا یہ وہی کوائی تھی جسے ہم نے نیچے سے دیکھا تھا؟ میں نے جانچنے کی کوشش کی۔ "سبحان اللہ!" سردے کی پھانک سے چھینٹے اڑے۔

"سب نظر کا کھیل ہے" گاڈدی مسکرایا اور اس نے بامعنی انداز سے اسحاق کی طرف دیکھا جو کوائی کے تختوں کی بجائے میم کے سرخ ہونٹوں اور چھلکی ہوئی آنکھوں میں کھویا ہوا تھا۔

"ہاں" ضیا نے طنزاً دہرایا "سب زاویے کا فرق ہے۔" "بیوٹی فل انڈیڈ" عمر نے قہقہہ لگایا "فلیٹ زمین پر رہنے والے چراغ تلے اندھیرے کے مصداق دور سے پہاڑوں کا حسن دیکھ سکتے ہیں"۔

"دور سے"۔ اسحاق چونک کر بولا اور اس نے حسرت سے صاحب کی طرف دیکھا جو اپنے زاویے میں محو تھا اور گویا کوائی کے زینہ نما تختوں ۔۔۔م رہا تھا۔

میری نظر میں وہ ایستادہ پہاڑ گھومنے لگے جیسے وہ پردۂ سیمیں کا ایک منظر ہو۔ دور کے مٹیالے پہاڑوں نے گویا سبز پیرہن پہن لئے۔ دبی ہوئی چھپی ہوئی گھاٹیاں ابھر کر حسین وادیاں بن گئیں۔ چیل کے گڈمڈ درخت قطاروں میں ایستادہ ہو گئے۔ نیچے نشیب میں سڑک کے کنارے

کنارے پاکستانی جوان سڑک کو سہارا دیے کھڑے تھے ان کے متبسم چہرے امید بھری مسکراہٹ سے روشن تھے۔ ان کی نگاہیں وطن کی عظمت کے زاویے سے منطبق، ان کے قدم مارچ کی لے پر ناچ رہے تھے اور نیچے کنہار بڑے چلو کی دھن گنگنا رہا تھا۔

جیپ ہونکتی ہوئی اس تنگ سڑک پر لڑھک رہی تھی جیسے کوئی کھلونہ منڈیر پر قلابازیاں لگا رہا ہو۔ دائیں ہاتھ پہاڑ کی دیوار سے چوٹیاں جھک جھک کر اس عجیب سے کھلونے کی طرف جھانک رہی تھیں، بائیں ہاتھ دور کہیں نیچے دریا ہونک رہا تھا اور اس کے پار کوہستان کا ہیبت ناک پہاڑ اپنا کلاہ اٹھائے کھڑا تھا۔ سڑک پر کوئی مکان یا دکان دکھائی نہیں دے رہی تھی کبھی کبھار کوئی راہ گیر ہاتھ میں سونٹا پکڑے ہوئے سڑک پر نظر آتا تھا اور جیپ کو دیکھ کر سہم کر ایک طرف ہو جاتا۔ اس کی ڈری ڈری نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس علاقے میں اجنبی ہے۔ "سمجھ میں نہیں آتا" مسعود نے کہا "یہ اپنے علاقے میں اجنبیوں کی طرح کیوں چل پھر رہے ہیں"

"اونہوں" عمر چلایا "یہ اس علاقے کے نہیں ہیں"

"اور کیا برمنگھم سے آئے ہیں؟" مسعود طنزاً ہنسا۔

"یہاں گاؤں بھی تو دیکھنے میں نہیں آیا کہیں" ضیا نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "گاؤں بسانے کی جگہ بھی ہو کہیں"۔ سرور کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں "یہاں تو دیواریں ہی دیواریں ہیں۔ میدان تو سرے سے مفقود ہے"۔

"بیوقوف" عمر نے قہقہہ لگایا "انسان جب بسنے پر آتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ نشیب ہے یا دیواریں ہیں"۔

"یہ بھی ٹھیک ہے" ضیا ہنسا۔ "الٹے پانی تیرنے والا جانور ہے نا۔ کیوں اسحاق"؟ اس نے اسحاق کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"ہوں کیا ہے؟" اسحاق چونکا

"تمہارا زاویۂ نظر کیا کہتا ہے؟"

مسعود نے قہقہہ لگایا۔ "ان کا زاویۂ نظر تو اب تک نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ اس میں سیاہ فام لوگ نہیں سماتے"۔

سرخ مرچ بیلی پڑ گئی "میں کہتا ہوں" وہ بولا "وہ ضرور آئرش تھی۔ آئرلینڈ والیوں میں کتنی جان ہوتی ہے"۔

"دیکھا۔ بیچارہ اسی چکر میں پھنسا ہے"۔ ضیا بولا "اماں یہ وادی کاغان ہے۔ اتنے پیسے خرچ کر کے تمہیں یہاں لائے ہیں اور تم آئرلینڈ میں گھوم رہے ہو"

قافلے

دفعتاً سامنے سے شور سنائی دیا اور سب کی توجہ ادھر منعطف ہو گئی حتیٰ کہ اسحاق بھی آئرلینڈ سے لوٹ کر وادی کاغان کی اس سڑک پر آپہنچا۔ سامنے سڑک پر دوڑتی ہوئی پست قد پہاڑی گایوں اور بھینسوں کا ایک ریوڑ سڑک پر گڈمڈ ہو رہا تھا اور ایک مختصر پہاڑی کنبہ ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑے انہیں سڑک سے ہٹا کر پہاڑی کی جانب ہانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بوڑھا بھینس کے پیچھے بھاگ رہا تھا جوان لڑکی کو گائے سینگوں سے دھکیل رہی تھی اور ایک چھوٹا سا لڑکا کھوہ کے کنارے ایک شریر بکری کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں، عالم بے بسی میں کھڑا جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی بھیانک آواز سے تمام مویشی ڈر کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ نوجوان لڑکی کو گائے کے سینگوں کے آگے بے بسی کی کیفیت میں دیکھ کر ضیا نے کمبل میں لپٹے ہوئے گاڑی کا بازو پکڑ لیا "یا خدا کا خوف کرو، رک جاؤ ذرا" گاڑی بان ہنسنے لگا "یہ گوجروں کے قافلے تو قدم قدم پر ملیں گے۔ ان کے لئے رکنا شروع کر دیا تو بس سمجھو رات یہیں بسر کرنی پڑے گی"۔

"بیچارے کس مصیبت میں ہیں" اسحاق نے کہا

"میں کہتا ہوں" مسعود چلایا۔ "یہ مویشیوں کو دھکیل رہے ہیں یا مویشی انہیں، پہلے اس بات کا فیصلہ کر لو"۔

"گوجروں کی ساری زندگی مویشیوں کو دھکیلنے اور دھکیلے جانے میں صرف ہوتی ہے۔ اب سردیاں آنے والی ہیں نا اس لئے یہ اپنے ٹھنڈے نچلے علاقوں میں آ رہے ہیں"۔

"کیوں؟" اسحاق نے پوچھا۔

"بھئی دسمبر میں تو یہاں برف ہی برف ہوگی۔ نہ کھیت نہ چارہ، ان دنوں یہاں وہی رہے گا جس کے گھر میں کھانے کے لئے اناج ہوگا اور گرم رہنے کیلئے

بندھن" عمر نے کہا۔

مولیشیوں اور گوجروں کی اس کھینچا تانی کے بعد تمام قافلے والے اور گائے بھینیں سب پہاڑی کے دامن میں ایک طرف گڈ مڈ ہو رہے تھے بڑھا ہونک سا تھامے لکی ڈری سہمی ہوئی ایک تھپر سے مپٹی ہوئی تھی۔ عورت بچے کو سر سے چمٹائے چٹان کے کونے پر اپنا سر تھامے بیٹھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی اور نو سال کا بچہ گہری ادی کے کنارے ایک درخت سے مپٹا ہوا تھا۔

"ارے یہ تو بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں بیچارے" ضیا چلانے لگا" اگر ہر جیپ کی آمد پر انہیں اسی قدر تگ و دو کرنی پڑتی ہے تو سمجھ لو کہ یہ تیس میل لمبی سڑک ن کے لئے پل صراط سے کم نہیں"

"زندگی کتنی کٹھن ہے" عمر بولا "سارا دن چلتے ہیں، مولیشیوں کے سینگوں کے دھکے کھاتے ہیں اور رات کسی کھلے میدان میں تھک ہار کر پڑ رہتے ہیں۔ گرمیوں میں اوپر پہاڑیوں کی چوٹیوں کی طرف چل پڑتے ہیں، سردیوں میں نیچے میدانوں کی طرف"

"وہ دیکھو وہ کیسے گھور رہی ہے ہمیں، جیسے سارا قصور ہمارا ہو" ضیا نے جوان لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے" مسعود چلایا۔ "یہ خان ڈرائیور انہیں راہ کی رکاوٹ سمجھتا ہے اور وہ اس گھمر گھمر کرنے والے انجن کو اپنی جملہ مشکلات کا باعث سمجھتے ہیں"

"ہاں بھئی" میں نے کہا" اس سڑک پر تو دو ہی زاویے ممکن ہیں، پیدل اور سوار"

گوجروں کے قافلے کے بعد اونٹوں کا قافلہ شروع ہو گیا۔ اونٹوں اور خچروں کی لمبی لمبی قطاریں چلی آ رہی تھیں، ان پر کھالیں لدی ہوئی تھیں۔ خچر جیپ کو دیکھ کر دولتیاں چلاتے تھے ، اونٹ ڈر کر بھاگتے تھے اور اپنے رکھوالوں کو مصیبت میں ڈال دیتے تھے۔

"ارے یہ کیا مصیبت ہے" ضیا اس افراتفری کو دیکھ کر چلایا۔ "یہ اونٹ ہیں یا کیا۔ وہاں پنڈی میں جب کبھی فوج کے اونٹ سڑک پر چلتے ہیں تو لاکھ ہارن بجاؤ، گھنٹیاں دو، موٹر کے گیئر بدلو، وہ اپنے مزے سے چلتے رہتے ہیں، جیسے سنا ہی نہ ہو، جیسے سڑک باوا جان نے خرید رکھی ہو"

"ہم تو مانتے ہی نہیں کہ یہ اونٹ ہیں" مسعود نے ہنسکر کہا۔

"وہ کیسے" عمر چڑ گیا "اندھے ہو گیا؟"

"پڑھے لکھے لوگ ہیں ہم۔ تمہاری طرح اَن پڑھ نہیں" مسعود بولا۔

"یہ کون سا علم ہے بھائی؟" ضیا شرارت سے مسکرایا۔ جب سے مکتب جانا شروع کیا ہے پڑھتے چلے آئے ہیں کہ اونٹ صحرا کی کشتی ہے، ریگستان میں پیدا ہوتا ہے، ریت پر چلتا ہے اور ریگستان ہی میں مر کر دفنایا جاتا ہے اور زندگی وہاں گزارتا ہے جہاں پانی نہیں ملتا اور یہاں دیکھو تو نیچے دریا بہہ رہا ہے۔ اوپر سے چشمے گر رہے ہیں، ریت کا نام و نشان تک نہیں۔ پھر ہم کیسے مان لیں کہ یہ اونٹ ہیں" مسعود نے فاتحانہ انداز سے بات ختم کی۔

عین اسوقت ایک اونٹ نے باواز بلند منہ سے بگل سا بجایا اور اس کے منہ سے جھاگ کا ایک تودہ مسعود کے منہ پر آ گرا۔ عمر تالیاں بجا کر ہنسنے لگا" لو کر لو بات" ضیا کی ہی ہی سے پہاڑیاں گونجنے لگیں۔ سر دے کے چھینٹے اڑنے لگے اور مرچ کا رنگ اور بھی سرخ ہو گیا۔ کمبل کی گٹھری میں بھی حرکت ہوئی۔

"اے خان" مسعود نے گٹھری کو جھنجھوڑا "خدا کے لئے تم نہ ہنسو۔ تمہارے بازوؤں ہی چھجانوں کا دار و مدار ہے"

"باہوں سے تو نہیں ہنستا وہ" عمر چلایا "کیوں خان؟"

"جو مرنا ہے بھائی" کمبل پوش گاڑی بولا "تو ہنستے ہوئے کیوں نہ مریں؟"

"لیکن" مسعود نے کہا "آخر مریں کیوں، خالی ہنستے ہی کیوں نہ رہیں؟"

دفعتاً گاڑی رک گئی۔

لینڈ سلائیڈ

"لو بھائی صاحب" خان بولا۔ "اب چاہے دل کھول کر ہنس لو، گاڑی آگے نہیں جا سکتی"

"آگے نہیں جا سکتی" عمر غصے میں بولا "کیوں؟"

سڑک پہ پہاڑ گرا ہوا ہے" اس نے کہا۔

"ارے!" ضیا چلایا۔ "سڑک پر پہاڑ گر پڑے اب، اب تک تو پہاڑ پر سڑک سر پٹختی آئی ہے۔"

ہمارے سامنے موڑ پر سڑک یوں ڈھیری سی بنی ہوئی تھی جیسے کسی کے اوپر سے ایک بہت بڑا ٹرک گزر گیا ہو۔ بڑے بڑے پتھر یہاں سے وہاں تک بکھرے پڑے تھے جن کے تلے پانی رس رہا تھا۔ دس پندرہ پہاڑی ہاتھوں میں کدالیں اور ٹوکرے اُٹھائے کام میں مصروف تھے، لیکن اِن پتھروں کے ڈھیر کے سامنے دس پندرہ آدمی یُوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ڈبل روٹی پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

"میں بتاؤں" عمر چلایا "یہ لینڈ سلائیڈ ہے۔"

"سوال یہ ہے" ضیا بولا "اب ہوگا کیا؟"

"جو ہونا ہے ہو جائے گا۔" مسعود ہنسا "اسی لئے تو گھر چھوڑ کر آئے ہیں اتنی دور۔"

"اس کی نفسیات تو کنواری لڑکیوں کی سی ہے۔" میں نے کہا "جو ہونا ہے ـــ"

"کیا بات ہے؟" ضیا ہنسنے لگا۔

"مسعود کی بات چھوڑو۔" عمر چلایا "جو منہ میں آیا بک دیا۔"

مسعود کا منہ غصے سے کُپّا ہو گیا۔ "عجب احمق ہو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ خصوصیت تو تہذیب حاضرہ کی جان ہے، لوگ روزمرہ کی زندگی سے بور ہو جاتے ہیں، وہ اطمینان اور سکون کو موت کے مترادف سمجھتے ہیں تاکہ زندگی میں مدوجزر پیدا ہو یعنی کچھ ہو جائے۔ اگر عمر کتاب میں یہ حقیقت پڑھ لے تو واہ واہ کر کے دوستوں کو سُناتا پھرے گا۔ اور مسعود کے مُنہ سے نکلے یہی بات تو کہے گا بکواس ہے۔"

کمبل پوش گائڈ جی نے ہماری بحث کو کاٹ دیا۔ قریب آ کر کہنے لگا۔ "بھائی صاحب یہ معاملہ ٹھیک نہ ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" عمر چیخنے لگا۔

"میرا مطلب ہے" گائڈ جی کہنے لگا۔ "سڑک صاف نہیں ہوگی، اس میں وقت لگے گا۔"

"لو اس میں کیا ہے، اگر ایک بلڈوزر لگا دو تو ابھی ایک دم ٹھیک نہ ہو جائے تو کہنا" عمر نے کہا۔

"لگا دو بھئی بلڈوزر" ضیا نے حاکمانہ انداز سے ہمیں یوں اشارہ کیا جیسے ہم سٹیج پر کھڑے ڈرامہ کھیل رہے تھے۔

"جو حکم ظلِ الٰہی" پہلی مرتبہ مرچ کے ہونٹوں پر تبسم جھلکا۔

"کتنا خوش قسمت ہے یہ شخص جسے عمر کہتے ہیں" مسعود نے کہا۔ "جو 'اگر' کی دنیا میں رہتا ہے اگر میں لکھ پتی ہوتا تو ہوائی جہاز میں سفر کرتا۔ لہٰذا ریل کا ٹکٹ خریدنے کی کیا ضرورت" وہ ہنسنے لگا "لیکن اگر بلڈوزر ہوتا کیوں، اگر ہوائی جہاز ہوتا تو ہم کب سے پہنچ چکے ہوتے منزلِ مقصود پہ۔"

"اب ہوائی جہاز سے اتر کر زمین پہ آؤ بھائی صاحب۔" ضیا کندھے پہ بستر اُٹھائے ہمارے قریب آ کر بولا۔ "ذرا اپنا بستر اٹھا لو، خان ڈرائیور کہتا ہے کہ جیپ کراس کرنے کے لئے خالی کرنا پڑے گا۔"

"ارے" عمر چیخنے لگا۔ "تو کیا ہم بستر اٹھا کر چلیں گے؟"

"نہیں نہیں۔" مسعود غرّایا۔ "تم یہاں بیٹھ کر بلڈوزر کا انتظار کرو۔"

سب نے اپنے اپنے بستر کندھے پر اٹھا لئے اور سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا کر پتھروں کے اس ڈھیر کو پار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ابتدا میں تو یہ ایک نیا تجربہ تھا لیکن دو قدم چلنے کے بعد اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ ان ناہموار اور گیلے پتھروں پر سامان اٹھا کر چلنا بہت کٹھن کام تھا۔ اس کے باوجود عمر اپنا سامان لئے یوں بھاگا جا رہا تھا جیسے کوٹ اٹھا کر مال روڈ پر ٹہل رہا ہو۔ عبداللہ المطمئن سے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ مسعود، اسحاق، ضیا اور میں یوں گرتے پڑتے بڑھ رہے تھے جیسے مال گاڑی میں گڑ کی بوریاں دھکیلی ہیں۔

"ارے!" ضیا چلایا۔ "یہاں تو خالی ہاتھ چلنا بھی مشکل ہے۔ پھر یہ بستر اور ٹرنک ـــ"

"بستر اور ٹرنک کی بات چھوڑو" مسعود بولا۔ "ان پتھروں پر چلنے کی بات کرو جو پھسلتے جا رہے ہیں۔"

"ابھی ہم جیپ میں بیٹھے ہوئے قافلوں پر ہنس رہے تھے" ضیا نے قہقہہ لگایا "اور اب خود قافلہ بنے ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔" مسعود نے شور مچایا۔ "اب بدلا زاویۂ نظر۔"

"اگر اب کوئی جیپ ملے تو دیکھیں گے کہ سوار لوگ کیسے دکھائی دیتے ہیں۔ ارے۔" ضیا نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن وہ دھڑام سے گر پڑا اور سامان اور بستر اس کے اوپر آ گرا۔ بمشکل ضیا اٹھا اس نے بستر اٹھایا اور پھر خاموشی سے چلنے لگا۔

"کیوں بھئی۔" مسعود نے اسے چھیڑا۔ "ایک بار گرنے سے کیا ہوا؟"

"ارے نہیں بھائی۔ لیکن ان حالات میں صرف ایک کام ہو سکتا ہے 'یا چلو اور یا بات کرو۔'"

"جب جیپ میں بیٹھے تھے تم اس وقت تو بہت اتراتے تھے۔" عمر چیخنے لگا۔

"جب برکھا رت تھی اب موسم خشک ہے۔" ضیا نے جواب دیا۔

"شکر ہے۔" مسعود نے کہا۔ "کہ وہ تمام قافلے جنہیں ہم راستے میں ملے تھے ادھر سے اُدھر جا رہے تھے ورنہ اگر کوئی اُدھر سے اِدھر آ رہا ہوتا تو اب وہ ہماری حالت دیکھ کر ہم پر ہنستے۔"

"ہنس لینے دو میاں، اپنا کیا جاتا ہے" عمر چلایا۔ "ان قافلے والوں کا کیا ہے۔ ان کی زندگی مسلسل جدوجہد میں گزر جاتی ہے، موسم گرما میں وہ پاکستان سے نمک لے کر جاتے ہیں، سرما کی آمد سے پہلے وہ چلاس اور گلگت سے کھالیں، زیرہ، ٹٹو اور سلاجیت لاد کر لاتے ہیں۔ وہاں چلاس اور گلگت میں نمک نہیں ملتا۔" وہ بولا۔

"تو کیا نمک خواری کا محاورہ چلاس اور گلگت میں ترتیب دیا گیا تھا۔" مسعود نے پوچھا۔

"ہاں بھائی۔" ضیا ہنسنے لگا "کسی ایسی ہی جگہ ترتیب دیا گیا ہوگا جہاں نمک نہیں ملتا۔ اور لوگوں کو اس بات کا احساس ہے کہ نمک اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ ہے۔"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" عمر بولا "کہ یہ محاورہ کہاں ترتیب دیا گیا تھا۔ لیکن نمک خواری کا حق ادا کرنے میں گلگت کے لوگوں کا جواب نہیں۔ انہیں پاکستان سے عشق ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا "اگر کوئی اُن سے کہے کہ پاکستان تو جہنم ہے جہنم تو وہ جواب دینگے ہمیں جنت میں جانے کی خواہش نہیں۔ ہم تو جہنم ہی میں خوش رہینگے۔"

"بھئی واہ۔" مسعود بولا "کیا جواب ہے۔"

"جواب کہاں یہ تو لاجواب ہے۔" ضیا ہنسنے لگا۔

"اس ملک کا جواب نہیں۔" پھر میری طرف اشارہ کر کے عمر کہنے لگا "اور اس قلندر کی جتنی تصویریاں ہیں وہاں جا کر سب چوپٹ ہو جاتی ہیں۔ یہ کہا کرتا ہے نا کہ وادیوں میں رہنے والی عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ نگاہیں اٹھا کر پوچھتی ہیں 'ہیں جی' اور چوٹیوں پر رہنے والیاں آنکھیں جھکا کر 'جی ہاں' گلگت جا کر دیکھو تو سمجھ میں آئے کہ وہاں جنسی بے ہودگی سرے سے مفقود ہے۔"

"اس کی بات چھوڑو۔" مسعود بولا "اپنی بات ثابت کرنے کیلئے کہدے گا کہ گلگت دراصل ایک ایسی چوٹی ہے جو وادی میں واقع ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"عجیب ملک ہے۔" عمر رومانی انداز میں بولا۔ "جہاں لوگ گھروں کو تالے نہیں لگاتے۔"

"ارے" ضیا چلایا "تو کہو نا وہاں چندر گپت لودیا کا راج ہے۔"

"عجیب چغد ہو۔" عمر چیخنے لگا۔

"بھائی تاریخ میں تو یہی لکھا ہے۔" ضیا بولا۔

"وہاں جرم نہیں ہوتے" وہ بولا "وہاں کا راجہ ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔"

"ارے۔" مسعود بولا "راجہ اور انسان۔ بھئی یہ بات تو ہم نے بھی نہیں سنی کبھی۔"

"بڑا غیر تاریخی ملک ہے" ضیا ہنسنے لگا "جو ساری تواریخ کو جھٹلا رہا ہے۔"

"صرف انسان ہی نہیں۔" عمر ہنسنے لگا "پرجا میں بیٹھ کر حقہ پیتا ہے حقہ۔ لوگوں کے ساتھ قہقہے لگاتا ہے۔ بھلا سُنا ہے کبھی کسی مہاراجہ کو ہنستے۔ اور پھر بدست مہمانوں کی تواضع کرتا ہے۔ بدستِ خود۔"

"ارے" ضیا نے آتی ہوئی جیپ کو دیکھ کر کہا۔ "یہ کون سے راستے سے آگئی؟"

جیپ میں سے کمبل کی گٹھری سے گاؤدی کے دانت چمکے "آؤ بیٹھ جاؤ بھائی صاحب" وہ بولا۔ "گاڑی تو میں نے نکال لی ہے ان پتھروں کے ڈھیر سے، لیکن اتنی دیر ہو چکی ہے کہ ہمیں مہاندری سے نکلنے نہیں دینگے۔"

"نکلنے نہیں دینگے؟" مسعود بستر سر سے پھینکتے ہوئے بولا۔ "وہ کیوں؟"

"بھئی ون وے ٹریفک ہے نا اس سڑک پر۔ بالاکوٹ سے ناران جانے والی گاڑیوں کا وقفہ ختم ہو گیا اب ناران کی گاڑیاں بالاکوٹ کی طرف چل رہی ہوگی۔"

"جی۔" گاؤدی نے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا "مہاندری کا سنتری ہمیں آگے نہ جانے دیگا۔"

"اجی سنتری کا کیا ہے" ضیا جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ایک سنترا تھماؤ تو سنتری کا منہ بند ہو جاتا ہے۔"

"ہاں بھئی کچھ کرنا چاہیئے" عمر بولا "ورنہ رات مہاندری میں گذارنی پڑے گی لیکن صاحب کیا جگہ ہے مہاندری سبحان اللہ!"

اب کنہار کی وہ V شکل کی وادی کھلتی جا رہی تھی۔ بالاکوٹ سے پارس تک گویا ہم ایک عظیم دیوار کے کنارے پر چیونٹی کی طرح رینگتے رہے تھے۔ کبھی جیپ اوپر سے نیچے لڑھکتی اور پھر نیچے سے اوپر ہونکتی ہوئی چڑھتی۔ بائیں ہاتھ کالے پہاڑ چل رہے تھے۔ اس بلندی سے جہاں جیپ چل رہی تھی نہ تو دریا دکھائی دیتا تھا اور نہ کہیں دیواروں کے اس تسلسل میں فرق آیا تھا کہ نگاہ دور تک جا سکے اور اس پھیلاؤ کو منظر کہا جا سکے۔ پارس تک ہماری کیفیت لکڑی کے بندر کی سی تھی جو رسی کھینچنے سے سوٹی پر چڑھتا ہے اور پھر گر پڑتا ہے لیکن پارس کے بعد وہ V شکل کی وادی U شکل میں کھلنے لگی۔ اور ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم ویران علاقے کی سڑک پر رینگتے ہوئے نہیں بلکہ ایک آباد علاقے میں گذر رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار سڑک پر کوئی شخص یوں ٹہلتا ہوا دکھائی دیتا جیسے اسے کہیں پہنچنا نہ ہو۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا کہ وہ کسی قافلہ کا فرد نہیں اور وہ ہماری جیپ کی طرف یوں گھورتا جیسے باغ کا مالی اس راہگیر کی طرف دیکھتا ہے جو اس کی ملکیت پر قدم رکھ رہا ہو یا کبھی کبھار اوپر کسی چوٹی پر سے کوئی بچہ سر نکالتا اور شوق سے ہماری جانب دیکھتا۔ یا کوئی بکری نچلے ڈھلان پر میں میں کرتی۔ ان کے علاوہ وہاں آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔

پارس کے بعد سڑک مسلسل طور پر اتر رہی تھی۔ اور اس اترائی کی نوعیت ایسی تھی کہ ہم بھولے جا رہے تھے کہ وہ جیپ ہے اور تیل سے چلتی ہے اور چلتے ہوئے بڑبڑاتی اور ہونکتی ہے۔ وہ یوں پھسل رہی تھی جیسے موٹر نہیں کھلونہ ہو۔

دفعتاً ایک موڑ کے بعد وہ رک گئی اور ہمارے سامنے دریا چل رہا تھا۔

مہاندری

"ارے" ضیا چلایا۔ "یہ۔ یہ کیا ہے۔ یہ تو دریا ہے۔"

اس دریا کو دیکھ کر ہم سب حیران ہوئے جیسے اس کا یوں منظر عام پر آجانا ایک عجیب سی بات ہو۔ کوائی کے اس پار تک ان دو متوازی دیواروں کے درمیان چلتے ہوئے عین ان جانے میں یہ گمان ہو چکا تھا کہ وہ وادی کاغان نہیں تھی بلکہ طلسم ہوشربا کا ایک پراسرار منظر تھا یا کوئی جنات کا زندان تھا جس کی تہ کے منظر عام پر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور ہم بالو سر یا اس کی طرف جانے کی بجائے کسی کوہ ندا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور وہ کمبل پوش گاؤدی کوئی رحم دل پری زاد تھا جس نے ہماری بے بسی پر رحم کھا کر ہمیں منزل مقصود پہ پہنچانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ انکھ کھولیں وہ دیواریں مل جائیں گی اور وہ کمبل پوش اس اڑن کھٹولے سے باہر نکل کر کہے گا "اے آدم زاد، یہاں میری حد ختم ہو گئی۔ اب میں تمہیں آگے نہیں لے جا سکتا البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ اس دیوار پر چڑھنے کے بعد ایک خون کا دریا آئیگا اور پھر ــــــ"

اس جیتے جاگتے دریا کو دیکھ کر ہم نے آنکھیں ملیں، ہمارے روبرو دو کی بجائے تین دیواریں کھڑی تھیں جو نیچے سے اوپر تک چلتی گئی تھیں اور ان کے اوپر بالشت بھر آسمان ٹنگا ہوا تھا۔ سیاہ خوفناک دیواریں جن پر اندھیرے نے ابھی سے تسلط جما لیا تھا اور نیچے وہ مختصر سا دریا چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، بین کر رہا تھا۔ کتنا خوفناک لیکن کتنا جاذب منظر تھا۔

"یہ ہے مہاندری" گاؤدی کے دانت چمکے۔

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

افسانہ:-

نئی شام

رفعت روبینہ

بھلا قہقہہ لگانا بھی کوئی آرٹ ہے مگر شکیل بھیانے ہمیشہ ہر جاننے والے کا قہقہہ ہی تو سننے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو قہقہے سے مجھے بھی بڑی دلچسپی ہے مگر جنون نہیں۔

میرے خیال میں قہقہہ تو آنسوؤں اور مسکراہٹ کے امتزاج کا سنگم ہے، قہقہے کو کم کرتے چلے جائیں تو وہ چہرے پر گلابی مسکراہٹ بن کر چھا جائے گا، بڑھاتے ہی چلے جائیں تو گالوں کی لالی پر آنسو بھی ڈھلکا دے گا اور پھر قہقہے ہیں بھی کتنی قسم کے، مثلاً بڑے ہی لنبے اور جاندار قہقہے جو تیرہ برس سے بیس برس کے سن کے لڑکے لڑکیوں یا بے فکرے امیر نوجوانوں نے ہی خدا سے الاٹ کروا لئے ہیں، بڑے طویل اور ہچکیاں کھاتے ہوئے قہقہے جو کافی ہاؤسوں، باروں، ریسٹورانوں کی چھتوں تلے اُبھرتے ہیں یا رات کے وقت لمبی لمبی کاروں کی پچھلی سیٹوں سے ڈوبتے ابھرتے قہقہے، مہذب سوسائٹی کے احترام کا نشان، ایک دم سے گونجتے مگر کھوکھلے قہقہے جیسے متوسط طبقہ کی سفید پوش زندگی، ہچکی سی بن کر پھر دھیمی ہنسی میں بدل جانے والا قہقہہ کسی راز کا حامل ہے، بے ترتیب قہقہہ مختصر سے سکون اور گھڑی بھر کی بے فکری کا عکس۔ ایسے ہی بے ترتیب قہقہے آج کل کی مجلسوں میں زیادہ گونجتے ہیں اور ایسے ہی نقرئی قہقہوں کی محفل کے اختتام پر ایک دن شکیل بھیانے میرے ہی کمرے میں عافیہ آپی کو بڑی رازداری سے پوچھا تھا "کبھی تم نے قہقہہ لگانے کی کوشش بھی کی ہے عافی؟" تو کیا بھیا آپ مجھے انسان نہیں سمجھتے، قہقہے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ غیر ارادی طور پر ہونٹوں سے اُبل پڑتا ہے، عافیہ آپی نے فیروزی دوپٹے میں چُنٹیں ڈالتے ہوئے کہا۔

مگر عافی تمہاری تحریروں میں اس قدر درد ہوتا ہے جس سے محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ تم ہنسی کا مفہوم بھی جانتی ہو یا نہیں۔ اور پھر تحریر کے علاوہ خود تمہاری باتوں میں بھی اکثر اوقات تلخئ احساس کا پرتو ملتا ہے، تو کیا پھر تلخیاں اور قہقہے ایک جلو میں زندہ رہ سکتے ہیں؟ شکیل بھیا دریچے سے لگے برساتی ہوائیں جھومتے ہوئے باہر دیکھنے لگے۔

ہوں، شکیل بھائی، تلخیاں اور قہقہے تو ہمیشہ ہی اکھٹے رہتے ہیں۔ اگر آپ کے کان نہ سن سکیں تو علیحدہ بات ہے، قلقل مینا مشہور ہے حالانکہ مینا کے اندر تلخ شراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا، مگر جو نہی تلخی کو انڈیلا، مینا کے ہونٹوں سے قہقہہ اُبل پڑا، خواہ کرواہٹ کی شدت سے یا زمانہ کی خود فریبی پہ۔ مگر جاندار اور مسلسل قہقہہ جیسے۔۔۔

خوب عافیہ محترمہ، تو آج سمجھا آپ واقعی ادیبہ ہیں، شکیل بھائی نے میری بک شیلف سے "گردشِ جام" تلاش کرتے ہوئے عافیہ آپی کی مدلل گفتگو کو اپنے طنزیہ فقرے تلے دبا ڈالا اور پھر صوفے میں دھنس کر عدم کی شاعری اپنی بھاری آواز میں انڈیلنے لگے، اور عافیہ آپی قالین پر بیٹھی خاموشی سے دوپٹے میں چُنٹیں ڈالتی رہیں، اور بظاہر تو میں اپنی فائلوں میں گم، مگر دل میں سوچنے لگی۔

"آپی کتنی پیاری ہے! کاش یہ میری حقیقی بڑی بہن ہوتی اور جب لڑکیاں مجھے کہتیں، تمہاری باجی کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں جیسے ہزار سالہ نرگس کی آنکھ جس میں شبنم کی نمی بھی ہے، بھونرے کی سیاہی بھی، جھیل کے شفاف پانی کی نیلاہٹ بھی، اور پھولوں سی معصومیت بھی، اور پلکیں کتنی گھنی جیسے گل ہزارہ کی پتیاں، جسم کتنا متناسب جیسے بچپن سے تیراکی کر کے تراشا خوبصورت بنایا ہے، تمہاری باجی تو کسی شوکیس میں رکھنے کے قابل ہے"۔

تو میں اور بھی مارے فخر کے اکڑ اکڑ کر چلتی۔ اور اپنی آپی کو گہرے فیروزی فاختئی اور سی گرین رنگ کے کپڑے پہننے کو کہا کرتی۔ مگر عافیہ آپی کو تو جیسے اپنی خوبصورتی کا احساس تک نہ تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن میں نے زبردستی اُن کے بالوں کے رنگلٹ بنائے تھے، اور جب میں نے خود ہی اپنی کوشش پر مسرور ہو کر اُن سے لپٹ کر بڑے پیار سے کہا "آپ کتنی خوبصورت ہیں عافی آپی" تو انھوں نے کہا

"ہاں۔ ہوا نجمہ گر حسین تو خزاں بھی بہار ہے"

اور میں خاموشی سے چلی آئی۔

تو اس دفعہ تو امی کے ہزار اصرار پر چچی نے عافیہ آپی کو چھٹیاں گزارنے بھیج دیا۔ ورنہ تو بیچے گا کہ آپی کبھی فالتو ہمارے یہاں آئی ہوں۔ رشتہ دار دور کی سہی مگر اتنی دور کی بھی نہ تھی اور پھر آج کل تو رشتہ داری کتنی دور کی بھی ہو خوبصورت لڑکیوں اور قابل لڑکوں کے والدین یوں بھی اپنی قرابت

نکال لیتے ہیں، اور پھر عانی آپی تو ابو جان کے کسی رشتہ میں ہمارے سگے چچا کی لڑکی لگتی ہے۔ اب امی بھی شکیل بھیا کے لئے نسبتیں دیکھ رہی تھیں، عانی پر نظر پڑ گئی ؛

اور ادھر شکیل بھائی تو نہ جانے اپنے کو کیا سمجھتے تھے، آج تک شاذ ہی کوئی لڑکی اُن کی تنقید سے بچ نکلی ہو۔ میری ہی سہیلیوں کے نام بڑے عجیب رکھے ہیں، بیچاری ایک بڑی ہی خاموش لڑکی ہے برجیس جو اکثر کمزور رہتی ہے، اُسے اب یہ زہریلے آنسو کہتے ہیں کیونکہ اُس کے چہرے کے خاموش اور غمگین تاثرات انھیں قاضی نذر الاسلام کے زہریلے آنسو یاد دلاتے ہیں۔ روفیہ ہی کو لو، ایک دن پک نک کے دوران باہر سے آتے ہوتے لڑکے نے اُس پر کوئی فقرہ کس دیا، روفیہ طیش میں آکر خوب تیزی سے اُسے باتیں سنانے لگیں، بس اُسے اُسی دن سے تھری ناٹ تھری کہنے لگے، اسے اب بھی کہتے ہیں۔ "روفیہ تم تو تھری ناٹ تھری کی گولی سے بھی تیز ہو۔" عابدہ بیچاری تندرست، سرخ و سفید، موٹی تازی ہونے کے باعث ملٹی وٹامن کے خطاب سے نوازی گئی۔ مگر جس دن سے آپی آئیں میں خود حیران کہ وہ اب تک کسی آنریری خطاب سے کیوں محفوظ ہیں۔ تو آج یہ قہقہے کا بہانہ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے، اور پھر پڑھتے پڑھتے خود ہی بولے یہ گیت کیسا ہے "جیون"؟

"مجھے تو بہت پسند ہے مگر گیتوں سے زیادہ مجھے قطعات پسند ہیں، بالکل ہلکے پھلکے مگر جذبات سے بھرپور" عافیہ آپی نے رائے دی ؛

اچھا تو تمہیں شعر و شاعری سے بھی اُنس ہے۔ کوئی ایسی چیز بتاؤ جو تمہیں پسند ہو۔ آج شکیل بھائی تو انتہائی بات کرنے کے موڈ میں تھے ؛

جی، مجھے تو ایسے شعر جو پڑھتے ہی دل میں اتر جائیں پسند ہیں، ویسے تو چیزوں کی پسند میں تم میری ہم خیال ہو۔ اکثر میرا دل چاہتا ہے کہ رات کی خاموشی میں کوئی میرے دریچے کے دھندلکوں میں چھپا بڑی پیاری آواز میں کوئی پُر درد نظم سنا دے۔ اور کئی بار تو میں نے اپنے اوپر کیفیت طاری کرنے کے لئے رات کو کھڑکیاں کھلی چھوڑ دی ہیں۔ اور میری روح چیخ چیخ کر ایک نسوانی آواز کی تمنا کرتی ہے۔ سرد ہوا کے ہوتے ہوتے بھی میرا جسم و جان جلنے لگتے ہیں ؛

مگر آپ کو ایسی نظمیں آخر اتنی کیوں پسند ہیں۔ ان میں تو طوفان حوادث۔

"ہاں ہاں ابھی تک طوفان سے محفوظ ہوں، مگر طوفان ضرور حوادث کے ہی نہیں ہوتے اور بھی تو ہوتے ہیں" بھائی نے آپی کی بات ٹوک کر جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے ؛

مگر اسی شام جب ہم ہیڈی پوائنٹ کا چکر لگا کر واپس آتے تو عافیہ آپی کی چمپئی رنگت دیکھنے سی لگی تھی اور میرے دل میں ایک جانا پہچانا سا خیال بھٹک کر آ گیا: اگر یہ میری بھابی بن جائے تو؟

تین دن کی ایسی ہی باتوں کے بعد ایک دن جب ہم سیر سے واپس آ رہے تھے تو برساتی ہوا بہت تیز چلنے لگی اور سردی ہو گئی۔ عافیہ آپی نے سویٹ کریپ کی قمیض پہنی ہوئی تھی، سردی سے کپکپانے لگی، بھائی ہمیں ہوٹل میں بٹھا کر ساتھ والی دکان سے کشمیری کام کی فاختئی کوٹی خرید لاتے۔ آپی جھینپ سی گئیں مگر بھیا کی نظروں میں نہ جانے کیا نظر آ گیا کہ جھٹ پہن لی، دوسرے دن بارش اور دھند کے باعث ہم باہر نہ جا سکے، گھر میں بیٹھے تاش اور کیرم، شعر و شاعری کی بازیاں لگاتے رہے۔ اور میں دیکھتی رہی کہ آپی بھیا کے نزدیک ہوتی جا رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں آپی اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کوٹی کی نئے سرے سے فٹنگ دیکھ کر کچھ گنگناتے جا رہی تھی ؛

میں برآمدے میں کھڑی گہری دھند کو دیکھ رہی تھی، عانی آپی کی گنگناہٹ نے مجھے چونکا سا دیا، میرا دل چاہا کہ میں عافیہ آپی سے جا کر کہوں "آپی آپ ایک گرم کوٹی لے کر اور چند باتوں کی لطافت اور دلچسپی میں بہہ کر اپنی دھڑکنوں کو محبت کا راگ سمجھنے لگی ہو۔ مگر میرے شکیل بھائی تو اب تک نہ جانے کتنے تحفے دے چکے ہیں، وہ ہر لڑکی کو تحفہ دیتے ہیں تاکہ ان کے گرد لڑکیوں کا حلقہ وسیع ہو جائے، مگر محبت۔ اوں ہوں! محبت تو اُن کے نزدیک ایک وقتی جذبہ ہے، بیئر کا پیگ اور بس۔ پھر ایک پیگ چڑھا کر جیسے کبھی نشہ نہیں ہوا، ہاں تین چار پیگ سے گہری نیند آ جاتی ہے۔ بھیا بھی اپنے نزدیک ایک وقت میں دو تین 'شعلے' دیکھ کر اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اور عافیہ آپ تو بڑی ہی حساس ہیں، ایک دم مشرقی جو محبت کے زینے سے پہلا قدم پھسل جانے کے بعد تا عمر اس کی چوٹ کو ذلت سمجھ کر اپاہج بن جاتی ہے۔ اگر آپ واقعی محبت کرنا چاہتی ہیں۔ تو آپ بھی ریحانہ بن جائیں، قدسیہ کی عادات اپنائیں، قمر اور بلقیس سے سبق لیجئے گا، نسیم اور افتخار کو دیکھئے گا۔ ان سب نے کئی بار محبت کی ہے جو برساتی دھند کی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ قمر، نسیم اور بلقیس، انھوں نے شکیل بھائی کے ساتھ پک نک منائی، سیر کیں، تلاش اور کیرم کی بازیاں لگائیں، فلم دیکھے، رومان اور ادب پر گفتگو کی، اور آج کل بھیا تمہاری باتوں میں محو ہیں تو اُن کو کوئی اور پسند آ گیا۔۔۔ اس طرح دونوں کی زندگیوں میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ؛

اگر آپ کو ایوننگ اِن مری مار کر محبت کرنی ہے تو شوق سے۔ اگر آپ اس بازی میں جیت گئیں تو ہمیں خوشی ہوگی، کیونکہ اماں ابھی تک پارٹیوں پر نہ جانے کتنے روپے برباد کر چکی ہیں۔ مگر ان کا بیٹا ابھی تک کوئی لڑکی پسند ہی نہیں کر

"دادی ہوں! یہ لڑکی ہے یا پان کی بیگم، تو ری چلتی کیسی ہے بطخ کی طرح، شاہدہ کی کمر ضرورت سے زیادہ پتلی ہے۔ رابعہ کی آواز ایک دم مصنوعی، نادرہ تو حلکم کا گولا ہے شاہینہ کی ناک بہت اونچی تو نشاط کی آنکھیں سانپ کی طرح گول"۔

غرض وہ آج تک کوئی لڑکی پسند ہی نہیں کر سکے، یا جان بوجھ کر پسند کرتے ہی نہیں، اسی لئے تو امی اب انہیں کی طرف پلٹی ہیں کہ شاید کوئی پسند کی بھول جائے اسی لئے عافیہ آپ کی ضرورت سے زیادہ خاطریں ہوتی ہیں، آپ کو فلم دکھائے جاتے ہیں۔ پک نک منائی جاتی ہے، مگر دیکھئے اب بھی بھائی شادی کے لئے سنجیدہ؟ ہوتے ہیں یا نہیں، وہ ہر لڑکی کو دیکھنے کے لئے بہت جلد باز قسم کے ہیں، پچھلے ہی اتوار کی تو بات ہے بڑی آپا کی نند گوہر کو پارٹی پر محض اس لئے بلایا تھا کہ دیکھوں اب وہ کتنی بدل گئی ہے۔ سنا ہے کالج جاتے ہی بڑی ہی سمارٹ بن گئی ہے۔ اور پارٹی کے ختم ہوتے ہی بھیا نے رائے دی: "بڑی بور قسم کی لڑکی ہے"۔

اور بشریٰ بیچاری بڑی بھلی سی لڑکی ہے، بی۔ اے پاس مگر بھیا کہتے ہیں اس کی لپ اسٹک ہمیشہ ایک طرف کے دانتوں پر لگی رہتی ہے۔ جس لڑکی کو لپ اسٹک لگانا نہیں آتا وہ بھی کوئی لڑکی ہے۔ اور اب اگر بھیا کو آپ میں کچھ نظر آگیا ہے تو ہم بھی خوش قسمت ہیں اور آپ بھی"۔

اور پھر ایک دم سے بھیا اور آپی کے قہقہوں نے میرے خیالات کی لہریں سمیٹ ڈالیں۔

دو تین دن سے بھیا بڑے پریشان سے نظر آنے لگے۔ اباجی کے ساتھ کاروبار کے کاغذات بھی ٹھیک نہ کئے تھے۔ بظاہر پریشانی کی کوئی وجہ نہ تھی، وہ اسی طرح نو بجے صبح بیڈ ٹی کا آرڈر دیتے اور ساڑھے دس بجے تک شیو، غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر باہر نکل جاتے، دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل یا دوست کے یہاں کھاتے، تین بجے واپس آکر سو جاتے اور شام چھ بجے ایوننگ سوٹ میں سیر کے لئے چل دیتے، ساڑھے گیارہ بجے شب واپس آتے، اس لئے ہم میں سے کسی نے کبھی انہیں نہیں پوچھا۔ بارش کی زیادتی کے باعث رین کوٹ بھی ناکافی تھا، اس لئے بھیا نے دوپہر تو سوتے میں گزار دی اور شام بھی گھر ہی میں بسر کی۔ ہفتہ کی رات جو اُن کے لئے نئی رنگینیاں لے کر آتی۔ اسی لئے وہ ضرورت سے زیادہ خاموش اور سنجیدہ بن گئے۔ میں نے آپی کے ساتھ جلدی سے کھانا کھایا۔ اور بھیا کے کمرے کا رُخ کیا۔ انھوں نے کمرے ہی میں کھانا منگوایا تھا۔ بھیا غسل خانے میں تھے، اُن کے پلنگ کے قریب والی میز پر بیئر کی بوتل اور پیگ پڑے تھے۔

"بیئر"۔ آپی دیکھتے ہی چونک پڑی۔

"بیٹھئے آپی" میں نے کرسی پیش کی، مگر وہ ابھی تک حیران کھڑی تھیں۔

"بیئر" وہ زیر لب پھر بولیں۔

"آخر آپ کو اتنی حیرت کیوں ہے آپی؟" میں پوچھ ہی بیٹھی۔

"مگر گھر میں بھی؟" آپی جیسے ہوش میں لئے بولیں۔

"تو اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے آپی کہ اپنے گھر کمرے میں بند ہو کر پی جاتے؟" عین اس وقت بھیا ڈریسنگ گون کی ڈوری باندھتے ہوئے قریب آکر بولے۔

"بیٹھو بھئی، کیوں کھڑی ہو دونوں؟"

اور آپی مجسمے کی طرح آرام کرسی میں ڈھیری ہو گئیں۔ کمرے میں ہم تینوں کی گہری گہری سانسیں ابھرنے لگیں۔ بند دریچوں پر بارش کے قطرے فوجی نوجوانوں کی طرح چاندماری کر رہے تھے۔ نیچے کھڈ سے اَن گنت بوندیوں سے لبریز ہوا کے تند جھونکے بڑی تندہی سے اوپر آکر شور مچا رہے تھے۔ میں نے شال اچھی طرح لپیٹ کر اپنے آپ کو کرسی میں لٹا سا لیا، کمرے میں کافی خنکی تھی اور آپی نے بھی خنکی محسوس کرتے ہوتے آرام کرسی میں دبک کر پاؤں سکیڑ کر پائنچوں میں چھپا لئے، پشمینہ کی نرم کشمیری شال اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لی۔ بھیا پلنگ کی پائنتی بیٹھے خاموشی سے لائٹر صاف کرنے لگے۔

میں اس خنک سکوت سے اکتا کر خود ہی بولی "کوئی بات کی جائے بھئی۔ خاموش بیٹھنا تو تھا پھر میں اپنے بستر میں بہتر تھے"۔ اور بھیا نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے رائے دی "آؤ تاش کھیلیں"۔ میں نے تاش کے پتے بانٹنے شروع کر دئے۔

"تم نے کافی کے لئے کسی کو کہہ دیا ہوتا" بھیا بولے۔ اور عین اس وقت ہلکی سی دستک دے کر کریم کافی لے آیا۔ بھیا خلاف معمول بنانے بھی لگے۔

کافی اور تاش، تاش اور کافی، کتنا ہی وقت نکل گیا مگر بھیا کے چہرے پر ابھی تک تھکن کے آثار تھے جنہیں وہ ایک ہفتہ سے چھپا رہے تھے۔ آپی کی آواز میں میٹھی سی لہر تھی۔ مگر وہ بھیا کی بیئر سے آج بہت ڈر گئی تھیں حالانکہ جانتی تھیں کہ وہ ہر قسم کی پینے کے عادی ہیں مگر عادی اتنا نہ سمجھتی ہوں گی کہ حضرت گھر پہ بھی شوق فرماتے ہیں۔ بھیا دھیرے دھیرے یہ شعر گنگنانے لگے۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

"ذرا اونچے بھیا" آپی نے فرمائش کی۔

اور بھیا واقعی اونچے سُروں میں بہہ نکلے، ایک کے بعد دوسرا، تیسرا اور چوتھا اور پھر میں نے نمبر جمع کرنے کے لئے انہیں خاموش کرا دیا، اس دفعہ پھر میں جیت گئی تھی۔

اور بھیا نے سگرٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"تم شکست سے خائف ہو عافی؟"

"جی نہیں بھیا، شکست کے بغیر جیتنے کا بھی لطف نہیں آتا۔ جیت ایک لافانی عطیہ ہے تو شکست ایک ایسا تحفہ ہے جس کی کسک ابد تک قائم رہتی ہے"

"ہوں، تو تمہیں شکستیں عزیز ہیں؟ گویا کہ" بھیا نے کش لگانے کے لئے بات روکی۔ "آپی بولیں"۔ "ابھی تک تو کوئی شکست نہیں اپنائی، جسے عزیز رکھوں ویسے"۔

"اچھا تو شکستوں پر رونے کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟" بھیا نے مزید تفصیل چاہی۔

"رونا تو بچوں کا کام ہے شکو بھیا، ویسے جو آنسو میں گہرائی ہے وہ قہقہے میں نہیں"۔

"ہوں تو عافی تم قہقہے سے بھی دلچسپی رکھتی ہو، میں حیران ہوں تمہارے خیالات مجھ سے اتنے کیوں ملتے ہیں۔ قہقہہ تو مجھے ہمیشہ پسند رہا، مگر آنسو، کسی ہمدرد کی آنکھ کا آنسو، محبوبہ کا آنسو، خوشی کا آنسو، غم کا آنسو واقعی ان میں کتنی گہرائی ہے۔ جن میں ڈوب کر انسان زندگی کے عمق میں پہونچ جاتا ہے۔ جدا ہوتے ہوئے محبوبہ کی آنکھ کا آنسو وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جو اس کے لرزتے ہوتے ہونٹ کبھی نہیں کہہ سکتے، کسی زخم پر ایک ہمدرد آنسو کا قطرہ وہ اثر کرتا ہے جو مرہم نہیں کر سکتا"۔

"آخر آپ سارا فلسفہ آج ہی کیوں بگھارنے پر تلے ہیں؟" میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تمہیں نیند آرہی ہے؟" دلچسپ باتوں میں محو آپی چونک پڑیں۔ اور بھیا کہنے لگے "میں کہتا تھا گھر میں رہ کر ہفتہ کی رات بور گذرے گی مگر شکر ہے کہ کچھ بہتر رہی" اور پھر "عہد وفا" کی آخری رات کے شعر گنگنانے لگے۔ اور آپی ایک بار پھر شاعر کے تخیل اور دانہ کے تاثر میں ڈوب گئیں۔ مگر بھیا یہ دوگانہ ہو جاتا تو میں نے یونہی کہہ دیا۔ اور آپی اپنی جگہ خود ہی سمٹ شرما کر رہ گئیں۔ آپی، عافی، ثانی بھلا شرمانے کی کیا بات ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہہ کر پھر ٹاس نکال لی اور پھر میں جو نہی اٹھی، آپی بھی چپلیاں گھسیٹتی میرے پیچھے لپک آئیں، رات کا ایک بجا تھا بارش پہلے سے ہلکی تھی پہاڑوں سے ٹکراتے ہوئے نالے بے طرح بلند آواز میں بہے جا رہے تھے۔ دریچے بند ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ رک رہے تھے اور پڑنے بل رہے تھے، روشنی بجھا کر میں بستر میں دراز ہوگئی۔

صبح سات بجے آنکھ کھلی تو پہاڑوں پر ہلکی ہلکی دھوپ کے آثار نظر آتے

اور مجھے یاد آیا، آج ننھے خلیل کی چھٹی سالگرہ ہے۔ وہ شام بھی کتنی دلچسپ تھی، تمام دن کی تیاری کے باعث ربانہ، مارینہ اور میں تھک سے گئے تھے، خلیل اور سہیل بچوں کو اکٹھا کرتے رہے، مارینہ نے آپی کو ہلکا سا میک اپ کیا۔ سج تے دا مہانوں کی نگاہوں میں نچ کر رہ گئیں۔ نرگس نے کھانے کی فرمائش کی پہلے تو بچوں کے لئے لوریوں کے کورس ہوتے پھر خلیل اور بھیا کا بڑا پیارا دوگانہ، اس کے بعد لبے بی تابندہ، عشرت اور مور یہ کے ننھے ننھے دلچسپ ڈانس، خلیل اپنے تحفے دیکھنے دکھانے بڑی میز کی طرف لپکا اور بچے اودھم مچاتے باہر نکل گئے اب پارٹی کا رخ پلٹا۔ میں نے غور سے دیکھا اب تصنع کے شاہکاروں کی مسکراہٹ بچوں کے کھیلوں سے ہٹ کر اپنے لئے تھی، شکیل بھیا بچوں کے ڈانس دیکھنے آتے تھے اور اب بالوں اور جوڑوں کے نئے سٹائلوں، پنسل سے بناتے ہوئے ابروؤں، مشین سے مڑی ہوئی پلکوں، میکس فیکٹر سے رنگے ہوتے چہرے سے لطف اٹھانے لگے تھے، بچوں کی سالگرہ کا تو ایک بہانہ ہوتا ہے ورنہ بچوں سے زیادہ ایسی محفل میں بڑے شامل ہوتے ہیں۔ یہاں رنگی ہوئی جمائیاں انگڑائیاں لیتی ہیں اور رومان انگڑائی کا میٹھا نشہ بن جاتا ہے۔

روزی ڈارلنگ ایک گانا سنا دو، ربانہ نے فرمائش کی، اور روزی نے ہمیشہ کی طرح اپنی ایک پسندیدہ غزل کملا جھریا کی آواز میں پیش کی۔ پھر ثمینہ کی باری آئی۔ اس نے گانا سنایا۔

آواز اتنی اچھی نہ تھی۔ اور اسی طرح پانچواں نمبر عافی کا انھوں نے بڑے اصرار کے بعد ایک اور غزل چھیڑ دی اس کے بعد پارٹی ختم ہوگئی۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب بھیا اچانک ہی تار لئے گھر میں داخل ہوتے۔ عافی کے لئے بری خبر تھی، ان کے ابا سخت بیمار تھے۔ بادلِ ناخواستہ انھوں نے جانے کی اجازت دی۔ انھوں نے اپنے کپڑے سمیٹے اور پانچ بجے کے قریب بھیا نے ایجنسی سے آکر کار نکالی، بھیا اور میں چھوڑنے جا رہے تھے پنڈی تک، خیال تھا گاڑی پر چڑھا کر ہم بھیا کے دوست وسیم کے یہاں رات گذاریں گے۔ امی کو ٹوا تر یا تھا۔ ابا جی دو دن پہلے ہی کراچی جا چکے تھے آپی اداس تھیں اور فکر مند بھی۔ امی کی آنکھوں میں آنسو تھے، مارینہ اور ربانہ رو رہی تھیں۔

بھیا اپنی عادت کے مطابق راستے میں بولنے لگے "یہ جلیبی موڑ ہے مگر ہاتھ کی لکیریں اس سے زیادہ پیچ دار ہیں۔ یہ چیڑ کے درخت ہیں سرو کے درخت کو قامت یار سے تشبیہ دی جاتی ہے مگر ان کے متعلق آج تک کسی نے نہیں سوچا حالانکہ جلتے یار سے پٹے ہوئے پھیپھڑوں کے چھالے

اسی کی ہوا سے شفا پاتے ہیں اب ہیں یہ موڑ نشیب میں لے جاتے گا تا وہ پھر
بھیا نے جب دیکھا کہ ان کی شاعرانہ باتوں نے بھی اداس دل پر کوئی اثر نہیں
کیا اور وہ کیفنا میں گانے بھی لگے تو میں نے جلدی سے کہا "شکو بھیا شراب کا
ذکر مت کیجئے، آپی تو برسوں کی بیئر ہی سے بُری طرح خائف ہیں۔ آپ کے
کمرے میں دیکھ کر" تو بھیا ایک ننھا سا قہقہہ اچھال کر بولے۔

"بیئر!! ارے بیئر سے کیوں ڈرگئیں؟ بیئر شراب نہیں، یہ تو گرمیوں میں
اچھی ٹانک ہے۔ شراب سے ڈرنا کیا۔ عافیہ تم ادب نواز ہو تو پھر تمہیں شراب
کا مرتبہ جاننا چاہیئے۔ اس شراب سے ڈرنا چاہیئے جو پینے والوں کو پاگل بنا دے
جو سرور اور کیف بخشے اسے بڑھ کر اٹھا لینا چاہیئے، لڑکیاں یوں بھی شراب
سے خائف رہتی ہیں شاید اپنا رقیب سمجھتی ہیں۔ اس لئے تمہارا ڈر بھی حیران کن
نہیں۔ اچھا تو ان شعروں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

وہ آفتاب جو شب کو طلوع ہوتا ہے
تلاش کر کے کہیں سے وہ آفتاب تو لا

صدائے قلقلِ مینا بھی ایک نغمہ ہے
مرے حسین مغنی ذرا رباب تو لا

میں بھول جاؤں نہ مفہومِ زندگی اے دوست
ذرا چھلکتا ہوا ساغرِ شراب تو لا"

نیچے گھاٹی میں برساتی پانی نغمہ ریز تھا اور کار میں شکو بھائی اور میں ان
دونوں سے محظوظ ہوتے پنڈی تک آ گئے۔ دل بری طرح ستا رہا تھا۔ آپی کو بھی
چکر آنے لگے، اس لئے پہلے تو کافی پی گئی اور پھر وقت گذارنے کے لئے صدر اور
مال پر پیدل ہی چل پڑے۔ بھیا کی زبان اسی طرح چل رہی تھی، آپی خاموش
تھی، شہر کے آئس کریم سینڈوچ کھاتے ہوتے میں نے دونوں کے چہروں پر نظر
کی بھیا کے چہرے سے سب پریشانی اور تھکن دھل چکی تھی۔ مگر آپی خاموش تھی بھیا
سے چپ زبان شخص کی موجودگی میں بھی اداس تھی!

رات کو گاڑی پر چڑھا کر جب ہم واپس آنے لگے تو بھیا نے کھڑکی سے لگ کر
کہا "مانی مجھے افسوس ہے کہ تم سب گرمیاں ہمارے یہاں نہ گذار سکیں۔ اگر چچا جان
بیمار نہ ہوتے تو بڑے آرام سے گرمیاں کٹ جاتیں" اور آپی نے مخصوص مسکراہٹ
سے جواب دیا "جی قسمت کی لکیروں پر آبلے پھوٹ پڑیں تو برف کے گالوں کی تمنا
بے سود ہے شکو بھائی، ویسے میں نے اچھا وقت گذارا ہے جس کی یاد میرے دل میں
ہمیشہ باقی رہے گی، خصوصاً آپ کے ساتھ جاتی ہوئی پک نک، بارش کے دن،
سہانی اجلی شامیں" بات کرتے میں آپی کی آنکھوں میں آنسو ٹمٹمائے اور بھیا کے
چہرے پر تھکن کی ایک لہر سی آ گئی۔

"آنسو میں واقعی کتنی گہرائی ہے" میں نے آپ سے کہا۔

دوسری شام جب ہم مری جا رہے تھے، پنڈی سے چند میل آگے جا کر
بھیا نے اپنی جیب سے تار کا فارم نکال کر پرزے پرزے کر کے نیچے گھاٹی کی طرف
اڑاتے ہوتے کہا:

"جاؤ میرے جھوٹ کے حامل کاغذی پرندو اڑ جاؤ کہ سب بیت گیا" اور پھر
خود ہی قہقہے لگانے لگے۔

"بھیا" میں نے چیخ کر سٹیرنگ پر رکھے ہوتے بھیا کے ہاتھ کو بُری طرح
کچل دیا۔ اور وہ بولے

"ڈرو نہیں میں پاگل نہیں مگر اتنی بات ہے کہ میں حقیقت کا سامنا کرنا
نہیں چاہتا، کر سکتا ہی نہیں اور تقریباً دس بارہ روز سے مجھے مانی کی آنکھوں
سے خلوص اور پاکیزہ محبت جھلکنے لگی تھی، تم جانتی ہو اس معاملے میں کتنا بزدل
ہوں، میں تو محبت کا مفہوم چند تحفوں کے تبادلے سمجھتا تھا اور پاکیزہ محبت کی
دیوی ماکیہ میری نظروں میں بہت بلند ہے، وہ خالص مشرقی لڑکی ہے اور
میری محبت پاکیزہ کی خوشبو، میرے وقتی جذبے برسات کے بادل ہیں اس کی
آنکھوں میں زندگی کے سوز و ساز کی گہرائی۔ اور میں ان حقیقتوں کا سامنا کبھی نہیں
کر سکتا۔ میں نے کمرے میں بلا کر اس کے سامنے شراب پی، اس کے پاس بیٹھ کر دوسری
لڑکیوں سے مذاق کیے اور پھر ایک فارم ڈیم کو پنڈی بھیج دیا۔ تم نے جلدی سے
پنڈی اور لاہور کی غلطی نہ جانی۔ تار میں نے جیب میں رکھ لیا۔ چونکہ تم اداس ہو،
مجھے پتہ ہے وہ تمہیں بہت عزیز تھی مگر میں تو نرگس کے لئے زمرد آپا کو کہہ چکا ہوں۔
وہ اس ہفتہ نکاح کرنے کو تیار ہیں۔ آج مجھے دیکھو کتنی خوشی ہے، آج شام کتنی حسین
ہے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ پہلی بار میں مری میں داخل ہو رہا ہوں" اور بھیا
نہ جانے کیا کیا بولتے رہے۔

سر کو سیٹ کی پشت سے ٹکا کر میں نے نئی شام کی اجلی شفق پر ایک نظر ڈال
کر نمناک آنکھیں بند کر لیں۔

پشتو عوامی کہانی

زرسانگہ

فہمیدہ اختر

لنڈی خانہ کے درخت شینوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گہرے سبز رنگ کے گول گول سے پتوں میں مونگیا رنگ کے شینوں کے خوشے لنڈی خانے میں گہرا حسن پھیلا رہے تھے۔ زرسانگہ کے قدم رقص کی سی کیفیت لئے شاطرینہ سے آگے بڑھ گئے۔ اس نے ہنستی ہوئی نظروں سے شینوں کے شاداب درختوں کو دیکھا اور دوپٹہ سامنے والے درخت کی اوپر والی شاخ پر پھینک کر اسے نیچے جھکا لیا۔ اور شینوں کے خوشے توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالنے لگی۔ جب جھولی بھر گئی تو دونوں ہاتھوں سے اُسے رگڑ سی دی۔ خوشوں میں سے شینوں کے دانے جھولی میں بکھر گئے۔ اس نے دانے ٹوکری میں ڈال دئے اور دانوں سے خالی خوشے پھینک دئے۔ اس نے دوسری شاخ جھکائی اور دونوں ہاتھوں میں اسے پکڑ کر جھولا سا جھولنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں ایک رسیلی سی آواز آئی "بہت خوش ہو نا بھائی کی منگنی ہونے والی ہے، آخر کیوں نہ اتنی خوشی ہو۔ آٹھ بہنوں کا ایک بھائی ہے"۔ زرسانگہ نے ایک دم سے رک کر سامنے دیکھا۔ اس کی نظر درختوں میں چھپی ہوئی گل مندا پر پڑی۔ ایک لطیف قہقہہ اس کے پاکیزہ لبوں پر پھیل گیا۔ جھکی ہوئی شاخ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ وہ بولی "منگنی تو جیسے کو ہوتی ہے مگر خوشی منانی ابھی باقی ہے۔ ہمارے آدمی جلال آباد گئے ہوئے ہیں، قوال لانے کے لئے"۔ گل مندا مسکرائی اور زرسانگہ کے قریب آتے ہوئے بولی "اچھا، مجھے تو علم نہ تھا، تمہیں مبارک ہو"۔

زرسانگہ کی نشیلی آنکھوں میں شینوں کے درختوں کی ساری ٹھنڈک بھر گئی۔ اس نے دعا دی "خدا کرے تمہارے بھائی کی منگنی بھی جلد ہو جائے"۔ گل مندا نے پوچھا "وہ لوگ کب لوٹیں گے جلال آباد سے؟" زرسانگہ نے آزاد سرزمین کی آزاد ہواؤں میں ایک سرد سانس لیتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے آج ہی آ جائیں، پھر آج رات کو ہی محفل جمے گی، تم بھی آنا ہمارے ہاں، چھت پر سے تماشا دیکھیں گے"۔ اور زرسانگہ کے خوبصورت ہاتھ اوپر اٹھ گئے اور اس کی لانبی لانبی سفید سفید انگلیاں گریبان میں اٹکے ہوئے کابلی روپوں پر ٹنک ٹنک کرنے لگیں گویا وہ بھائی کی منگنی کی خوشی میں کوئی سریلا سا ساز بجانے لگ گئی ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے پیچھے سے آ کر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ گل مندا کی نظریں کانپ گئیں اور زرسانگہ کا چلتا ہاتھ کابلی روپوں پر ساز بجاتا ہوا ایک دم رک گیا۔

اس نے حیران ہو کر بائیں جانب دیکھا۔ اس کی نظر شاہ خمیر پر پڑی۔ وہ فوراً معاملے کو سمجھ گئی اور اُسے حقیقت بتانے کے انداز میں چلائی "میں بازارگے یار محمد کے خاندان سے نہیں ہوں، میں کرمنہ کے بادشاہ گل کے خاندان سے ہوں، میرا لباس تو دیکھو یہ کرمنہ کا لباس ہے"۔ مگر شاہ خمیر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اپنے پیچھے کھینچنے لگا۔ گل مندا گرجی "یہ سچ کہہ رہی ہے اسے چھوڑ دو"۔ شاطرینہ نے دُور درختوں کے درمیان سے دیکھا اور اس کے چہرے کے اردگرد دہکتے ہوئے انگاروں نے حلقہ کر لیا، اُس نے ایک بھاری پتھر اٹھایا تاکہ شاہ خمیر کا سر پھوڑ دے۔ اچانک اس کی نظر شاہ خمیر کے دو ساتھیوں پر پڑ گئی۔ اُسے اپنی جان بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ وہ غصے میں لرزتی ہوئی درختوں کی آڑ میں ہو گئی۔ زرسانگہ کے کانوں میں قبائلی علاقے کی تیز و تند آندھیوں کا سارا شور بس چکا تھا۔ وہ طوفان کی طرح چیخی "میں زخاخیلوں کے بہادر اور غیرت مند قبیلے سے ہوں بدبخت، ہمارے ساتھ کیوں دشمنی مول لیتے ہو؟" جب اس نے محسوس کیا کہ شاہ خمیر اکیلا نہیں اس کے ہمراہ دو نوجوان اور بھی ہیں تو اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا "ارے بہادرو! پہلے دشمن کو پہچانا کرو، پھر دشمنی کیا کرو"۔ شاہ خمیر کے قدم مدھم پڑ گئے، اس نے مڑ کر زرسانگہ کی طرف دیکھا۔ شکر خان غرایا "ایسے ہی کہہ رہی ہے، مت چھوڑنا"۔ اس کے ساتھ ہی شاہ خمیر کی رفتار تیز ہو گئی۔

جوان آدل بی بی کیمپ کے باہر بیٹھی اپنا سرخ رنگ کا کرتا سی رہی تھی۔ جب اس کی نظر شاہ خمیر اور زرسانگہ پر پڑی تو اس کی سفید پیشانی پر کئی شکنیں نمودار ہو گئیں اور ان شکنوں میں سوچ کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی، کرتا کندھے پر ڈالا اور زرسانگہ کے قریب آ کر اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ زرسانگہ کے تر و تازہ چہرے پر شفق کی ساری سرخیاں جمع تھیں، اس کا سانس تیزی سے آ جا رہا تھا اور اس کی نشیلی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ آدل بی بی نے قہر آلود نظر شوہر پر ڈالی اور بولی "نئی دشمنی مول لے لی؟ یہ لڑکی یار محمد کے خاندان سے نہیں، یہ کرمنہ کی ہوتی ہے"۔ شاہ خمیر کی نظروں میں غصہ بھر گیا، وہ شکر خان کی طرف دیکھنے لگا۔ زرسانگہ نے بھی ایک لمحے کے لئے شکر خان کی طرف دیکھا۔ شکر خان کو یوں

جیسے وہ کہہ رہی ہو "تم ایک ٹھیک دشمن نہیں ہو۔" لشکر خاں کے سینے میں پشتانیوں کے مدوجزر اٹھنے لگے۔ وہ شانے کے ساتھ لٹکے ہوئے پستول سے کھیلنے لگا۔ اور خفت آمیز لہجہ میں بولا "تو کیا ہوا، یہ واپس جاسکتی ہے۔"

اوّل بی بی نے زرسانگہ کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو بہن کچھ کھا پی لو، تھک بھی گئی ہوگی، ذرا آرام کرلو، دوپہر کے بعد چلی جانا۔"

زرسانگہ نے بے قراری سے کہا "نہیں میں اسی وقت واپس جاؤں گی۔"

اوّل بی بی اسے سمجھانے لگی "اتنا صبر کرو بہن کہ گل اکبر اور خان بادشاہ آجائیں، ان کو تمہارے ساتھ بھیجدوں گی، تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

زرسانگہ کیمپ کے اندر جاکر چارپائی پر ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اوّل بی بی نے اس کے سامنے ایک چنگیر لاکر رکھدی اس میں لسی سے بھرا ہوا کٹورہ، مکھن پیاز اور جوار کی دو روٹیاں تھیں۔

زرسانگہ منہ پھیر کر بولی "میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

اوّل بی بی نے نرمی سے کہا "تم ہماری مہمان ہو بہن، تمہارے خاندان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں" اور لسی کا پیالہ زرسانگہ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

جب قبائلی علاقے کی ہواؤں میں دوپہر کی تمازت بھر گئی تو زرسانگہ، گل اکبر اور خان بادشاہ کے ساتھ چل پڑی۔ "آپ لرگی" کا پہاڑ عبور کرکے وہ اُسے "لنڈی خانے" تک چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ شیشوں کے ٹھنڈے سایوں والے درختوں کے جھنڈ تک پہنچ کر اسے اپنی نند شاطر بینہ کا خیال آیا۔ اُس نے کرمنہ کے سارے علاقے میں آگ لگادی ہوگی! ایسا نہ ہو کہ آدم خیل آچکا ہو اور قوالوں کو واپس کردیا ہو۔ وہ شیشوں کے خوبصورت درختوں میں بھاگنے لگی۔ آن کی آن میں تاغیاتو کے پہاڑ پر چڑھ گئی اور پھر تیزی سے دوسری طرف اُتر گئی۔ جب اس نے کرمنہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کا جی چاہا کسی سے پوچھے "میرے بھائی نے قوال تو واپس نہیں کردیئے؟" اچانک اس کی نظر بارانے پر پڑی جو کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈیوں پر سے گذر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جاکر بے تابی سے بولی "میرا بھائی جلال آباد سے آگیا ہے؟ اُس نے قوال تو واپس نہیں کردیئے؟" بارانے نے اُسے حیران نظروں سے دیکھا اور کہا "وہ ابھی نہیں آیا۔" زرسانگہ کی زندگی کے گویا تمام اندیشے علاقہ آزاد کی فضاؤں میں کھو کر رہ گئے۔ وہ گنگنائی "خدایا ہم آٹھ بہنوں کے بھائی کو سات بیٹوں کا باپ کرنا"! بارانے نے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ پگڈنڈیوں پر سے دوڑتی چلی گئی۔

شاطر بینہ صحن میں مرجھائی ہوئی بیٹھی تھی، محلہ کی چند عورتیں اُسے گھیرے ہوئے تھیں۔ جب اُن کی نگاہ زرسانگہ پر پڑی تو وہ چونک سی گئیں اور اس طرح اُسے دیکھنے لگیں جیسے ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے کسی شناسا کو پہچاننے کی کوشش کررہی ہوں۔ چند لمحے لگاتار دیکھنے کے بعد شاطر بینہ کا سویا ہوا چہرہ جاگ اٹھا۔ وہ بھاگ کر آئی اور اپنی حسین بھاوج کے گلے سے لپٹ گئی۔

کرمنہ میں شور مچ گیا کہ زرسانگہ واپس آگئی، وہ غلطی سے لے جائی گئی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا گھر عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ سب اُسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے تھے جیسے انہوں نے اُسے پہلی بار دیکھا ہو اور وہ کسی اجنبی شہر سے آئی ہو۔

جب دن کے اُجالے شام کے دھندلکوں میں ڈھلنے لگے تو ننھا رخسے بھاگتا ہوا آیا اور بولا "وہ آگئے ہیں۔" زرسانگہ کا جی چاہا کہ وہ رخسے کو گود میں اٹھاکر اس کا پھول سا چہرہ چوم لے مگر وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر گئی اور دیوار کی آڑ میں ہوکر نیچے دیکھنے لگی۔ اس کی نظر کئی چہروں پر پڑنے کے بعد آدم خیل پر پڑی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناچتی ناچتی اس تک پہنچ جائے اور اُسے سینے سے لگالے اور کہے "میرے اچھے بھائی، اللہ تجھے سات بیٹوں کا باپ بنائے۔"

یارست کرمنہ کی چہ میگوئیوں سے بے خبر حجرے کو درست کرنے لگ گیا۔ اس کے چہرے پر جلال آباد کے سفر کی تکان کے کوئی آثار نہ تھے۔ حجرے کے چاروں طرف چارپائیاں ڈال دی گئیں اور درمیان میں چٹائی بچھادی گئی دیکھتے ہی دیکھتے کرمنہ کے جوان اور بوڑھے بندوقیں تھامے اُن کی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ بچے قوالوں کے اردگرد زمین پر جمع ہوگئے، محلہ کی کئی عورتیں آئیں اور زرسانگہ کے پاس چھت پر چلی گئیں، قوالوں نے قوالی شروع کردی اور کرمنہ کے درودیوار موسیقی کی تانوں میں کھو گئے۔

یارست محسوس کرنے لگا کہ محفل میں بیٹھے ہوئے لوگ جب اس کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کی نظریں کوئی عجیب سی کہانی سنانے لگتی ہیں۔ اس نے غزل سے پوچھا "یہ کیا بات ہے"؟ غزل نے اُسے اشارہ کیا اور وہ دونوں موسیقی کی محفل سے باہر نکل گئے۔

غزل صبح کا واقعہ سناتا گیا اور یارست کا خون کھولتا گیا۔ جب غزل خاموش ہوگیا تو یارست نے ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ میں تھامی ہوئی بندوق کو کندھے کے ساتھ لگالیا اور بھاری بھاری قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ غزل اس کے پیچھے بھاگا "دیکھو دوست، بھابھی بے قصور ہے، اُسے کچھ نہ کہنا۔"

یارست غرایا "اسے بازار کے علاقے میں جاکر شیشے اکٹھے کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ لوگ میری طرف دیکھیں اور کہیں کہ اس کی بیوی

کو فلاں لوگ پکڑ کر لے گئے تھے؟ تم چاہتے ہو کہ میں بے غیرت بن جاؤں اور خاموش رہوں؟" اور وہ تیز تیز قدموں سے جانے لگا۔ غزل دیر تک وہاں حیران اور پریشان کھڑا رہا۔

صحن میں قدم رکھتے ہی یار مست نے بیوی کو پکارا۔ آواز میں پہاڑوں کی سی سختی اور طوفانوں کا سا جوش تھا۔ بھائی کی منگنی کی خوشیوں میں مگن اور ساری کائنات سے بے خبر زر سانگہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور لرزتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے لگی۔ باقی عورتیں خوفزدہ ہو کر چھت کے اس کنارے پر آگئیں۔ یار مست گرجا "میرے گھر سے اسی وقت نکل جاؤ، میں بے غیرت نہیں ہوں کہ اس عورت کو گھر میں رکھوں جس کے ہاتھوں میری بے عزتی ہو۔" زر سانگہ کے حلق میں علاقہ آزاد کے سارے کانٹے چبھ گئے۔ چھت پر بیٹھی ہوئی عورتیں لرز کر رہ گئیں۔ شاطرینہ کو چکر سا آگیا، وہ بھاگ کر آئی اور بھائی کے قدموں میں گر پڑی۔ "میرے بھائی، اس بیچاری کا کیا قصور ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" یار مست نے پاؤں کھینچ لئے۔ "میں نہیں چاہتا کہ میرے وطن کے دشمن اسے میرے لئے ایک مستقل طعنہ بنا دیں۔ میں وطن کے لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں غیرت مند ہوں۔" پھر وہ بندوق زور سے زمین پر مار کر بولا۔ "تم ابھی تک کھڑی ہو، میں کہتا ہوں جاؤ، بھائی کے گھر کا رُخ کرو۔"

زر سانگہ بوجھل قدموں سے دروازے سے نکل گئی۔ اس کی زندگی کی راہوں پر جلتے ہوئے سارے دیئے بجھ گئے۔ چاروں طرف تاریکیاں پھیل گئیں۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ کیا یہ خواب ہے؟ اس نے بے جان سے دل کے ساتھ سوچا۔ وہ زور زور سے آنکھیں جھپکانے لگی۔ تو کیا یہ حقیقت ہے؟ اس کے سہمے ہوئے سے دماغ میں یہ خیال اُبھرا۔ اس کے سامنے ہی موسیقی کی تانیں بستی کے لوگوں کے تمسخر آمیز قہقہوں میں بدل گئیں۔ وہ آگ اُگلتے ہوئے تنور میں جا گری، اس کے لبوں کو تیزی سے جنبش ہوئی۔ "یہ شاطرینہ کا بھائی سمجھتا ہے کہ وہ غیرت مند ہے اور میں غیرت مندوں کی بیٹی نہیں ہوں۔" اس کے پاؤں تیزی سے حرکت میں آگئے۔ وہ بھائی کے حجرے کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

آدم خیل سامنے والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ روز کی نسبت زیادہ خوبصورت اور جوان معلوم ہو رہا تھا۔ اچانک زر سانگہ کو یوں لگا جیسے وہ وزیروں کے ایک طاقتور قبیلے کو اس کا دشمن بننے کے لئے پکارنے آئی ہے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں سات تاروں کا جھرمٹ بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ اس نے اس کی چھاؤں میں گہری ٹھنڈک محسوس کی۔ اس کے قدموں نے اس طرف لپکنا چاہا مگر اسی لمحے اس نے پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کائنات پکارنے لگی تھی "بے غیرت!" شعلے لپکے اور اس کی روح سے بغلگیر ہو گئے۔ اُن کی گرمی میں نیلگوں آسمان پر چمکنے والے سات تارے اپنی ساری ٹھنڈک کھو بیٹھے۔ وہ اس زور سے کھانسی کہ محفل میں سے بہتوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ دوران شاہ جلدی سے اس کے پاس آیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟" وہ بے چینی سے بولی "آدم خیل کو بھیج دو۔"

آدم خیل نے قریب آتے ہی خوشی کے لہجے میں کہنا چاہا۔ "قوال اچھے ہیں؟ میں تو نہیں لانا چاہتا، پھر سوچا چلو ہماری بہن خوش ہو جائے، اصرار کر رہی ہے، مگر جب اس نے تاروں کی مدھم روشنی میں اُسے غور سے دیکھا تو پریشان ہو کر کہا "کیا بات ہے؟ کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

زر سانگہ اُسے صبح کی واردات سنانے لگی، اس کی آواز میں تُند ہواؤں کا سا زور تھا۔ جب وہ خاموش ہو گئی تو آدم خیل اُداسی سے بولا "تو یار مست نے تمہیں گھر سے نکال دیا ہے؟"

"ہاں! وہ کہتا ہے میں بے غیرت نہیں ہوں کہ تمہیں گھر میں رکھوں۔ تمہارے ہاتھوں میری بے عزتی ہوئی ہے" پھر اس کا وجود تیزی سے جلنے لگا، وہ چیخ پڑی "اُس نے اس طرح مجھے گھر سے نکال کر تمہاری غیرت کو پکارا ہے۔"

آدم خیل کے صحت مند وجود میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولا "میری غیرت اس پکار کو سُنے گی، میرے پیچھے آؤ۔"

یار مست صحن میں بیٹھا بندوق گود میں لئے کلائیاں گھٹنوں پر رکھے اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے کچھ سوچ رہا تھا۔ جب ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا تو وہ چونک اٹھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ آدم خیل کی آنکھوں میں کسی پختہ مگر خطرناک عزم کی سرخی ہے اور اس کے پیچھے زر سانگہ کھڑی ہے۔ آدم خیل گرجا "میں دشمنوں کو غیرت کے معنی سمجھانے جا رہا ہوں، اب تمہیں میری بہن کو گھر سے نکالنے کی ضرورت نہیں۔" اور جب وہ دروازے کی طرف مڑا تو زر سانگہ بولی "شاہ خمیر تو مجھے راستے سے ہی واپس کر دیتا لیکن شکر خان نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔"

آدم خیل سوچ میں پڑ گیا "میں نے شکر خان کو کبھی نہیں دیکھا۔"

زر سانگہ جلدی سے بولی "اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔"

یہ سنتے ہی آدم خیل تیزی سے دروازے سے نکل گیا۔ اس وقت اس کے قدموں کی چاپ سے زمین کا سینہ کانپ رہا تھا۔ حجرے میں پہنچتے ہی وہ چیخا "بند کر دو یہ موسیقی!"

آثار صنادید : چوبرجی
(لاہور کا ایک شکستہ باغ)
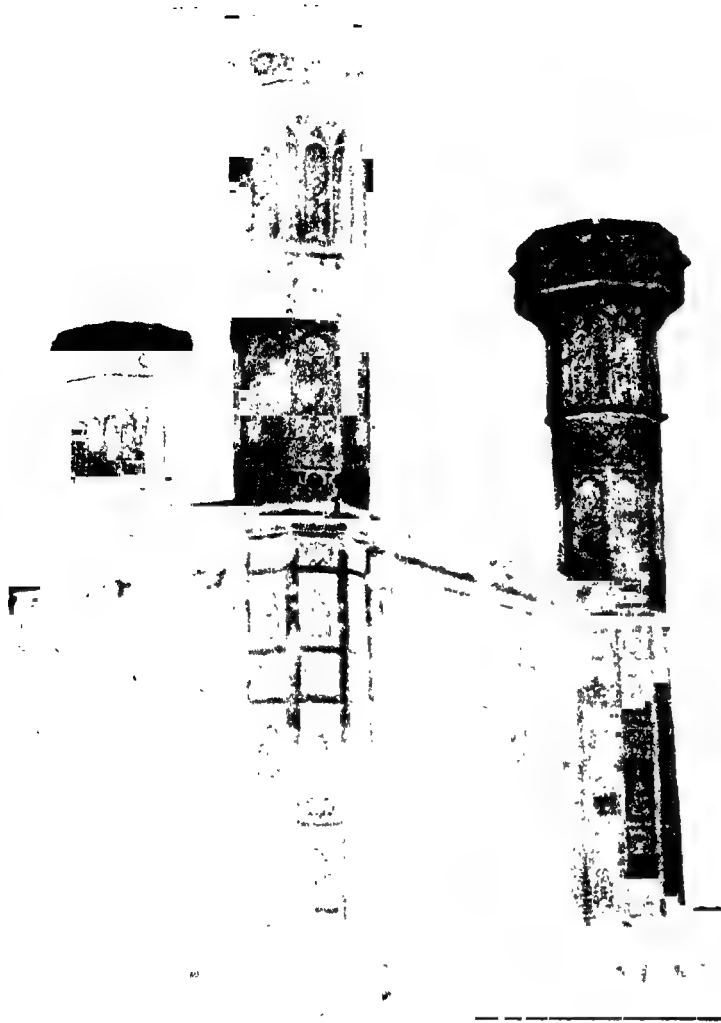
صدر دروازہ

میناروں پر نقش و نگار
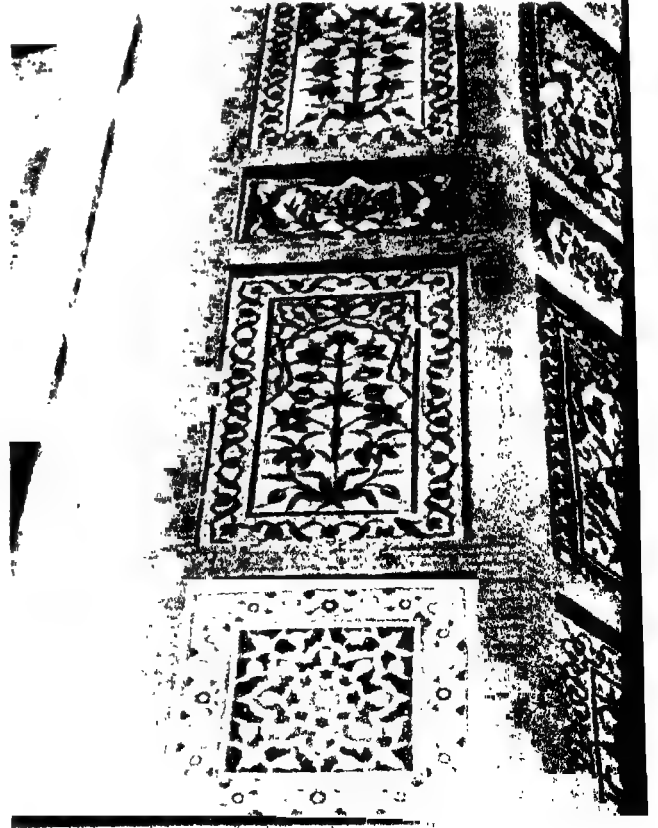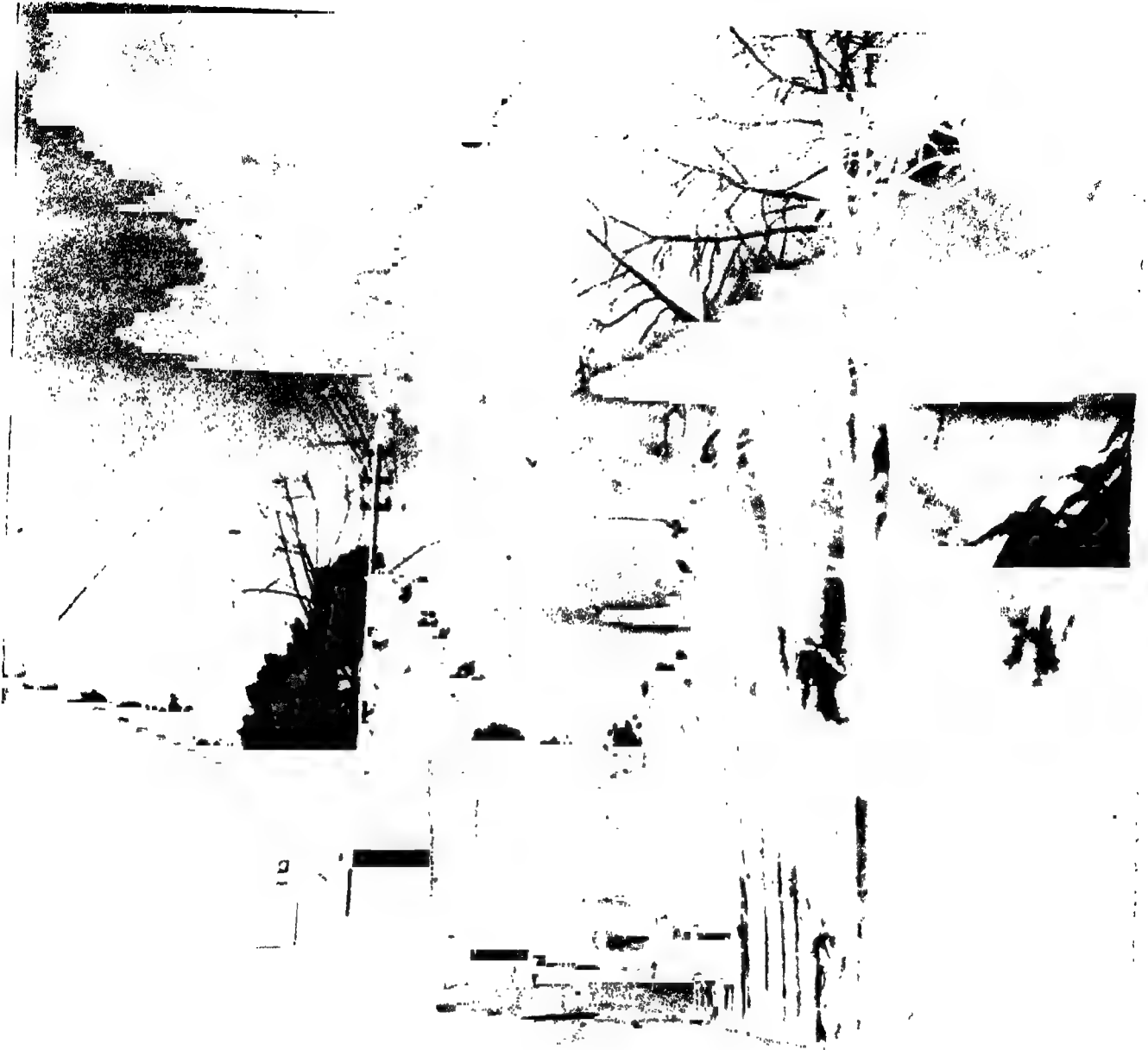
ایبٹ آباد
(مغربی پاکستان کی خوش منظر پہاڑی بستی)

موسیقی ایک دم بند ہوگئی۔ آدم خیل کے سُرخ چہرے کی طرف لوگ اس طرح دیکھنے لگے جیسے اُنہیں تمام معاملے کا علم ہو۔ مت غلی اُسے مشورہ دینے لگا "اس وقت اس محفل کو درہم برہم نہ کرو۔"

آدم خیل بندوق پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "جب تک میں دشمنوں سے انتقام نہیں لے لیتا صرف اس بندوق سے پیار کروں گا۔"

مت غلی کہنے لگا "انتقام کا وقت معین نہیں ہوتا، انتقام چالیس سالوں میں بھی لیا جاسکتا ہے۔"

"میں باعزت بادشاہ گل کا بیٹا ہوں، میری نظروں میں بے عزتی کے انتقام کا وقت معین ہے، میں چالیس گھنٹوں کے اندر اندر انتقام لونگا۔"

مت غلی کے چہرے پر فکر کے آثار پیدا ہوگئے۔ "بے وقوف نہ بنو آدم خیل، بہتر موقع کی تلاش میں رہو۔ شاہ خمیر کیمپ میں رہتا ہے اور کیمپ میں گورا فوج ہے۔"

آدم خیل گرجا "تم بھولتے ہو مت غلی، غیرت کی آگ پہاڑوں میں شگاف پیدا کردیتی ہے اور سمندروں کے پانیوں کو خشک کرڈالتی ہے۔"

پوری محفل نے یہ سب کچھ سنا۔ روغن شاہ نے بنات گل سے کہا "غیرت مندوں کی اولاد غیرت مند ہوتی ہے، طاقتوروں کے مقابلہ پر جارہا ہے، وہ چھ بھائی ہیں اور یہ تنہا ہے۔"

ملنگ نے خان میر سے کہا "عزت دنیا کی بہت بڑی دولت ہے۔"

اسی رات علاقۂ غیر کے آسمان پر چمکنے والے چاند نے ایک خوبصورت نوجوان کو دیکھا جس نے بندوق تھامے تیز تیز قدموں سے بوڑے پہاڑ کو عبور کیا اور خیبر سے ہوکر لواڑگی کی طرف چلا۔ اس کے پیچھے لالٹین تھامے اس کے دو ساتھی تھے۔

صبح چار سیر گوشت خریدا گیا اور سیڑھی کہیں سے حاصل کی گئی اور رات کی تاریکی میں جب کیمپ کا رخ کیا گیا تو کتے بھونکنے لگے۔ ان کے آگے چار سیر گوشت پھینک دیا گیا، وہ گوشت کھانے لگے۔ رات خاموش ہوگئی، کیمپ کی دیوار کے ساتھ سیڑھی کھڑی کردی گئی۔ آدم خیل بڑے اطمینان سے اوپر چڑھا، دیوار کے اندر کی جانب دایاں پاؤں اور باہر کی جانب بایاں پاؤں لٹکا کر سیڑھی اوپر کھینچنے لگا۔ نیچے سے گل نواز اور مست خان سیڑھی اوپر کی طرف اٹھا رہے تھے۔ جب وہ اوپر اٹھ گئی تو آدم خیل اسے کیمپ کے اندر کی جانب جھکانے لگا، یہاں تک کہ وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ آدم خیل نیچے اترا اُسے چاند کی مدھم روشنی میں کئی چارپائیاں نظر آئیں۔ وہ ایک چارپائی کے پاس گیا، وہاں ایک عورت کو سویا ہوا پایا، دوسری چارپائی کے پاس گیا تو نظر چیچک کے داغوں سے آلودہ چہرے پر پڑی۔ اس کے نتھنوں کی رفتار تیز ہوگئی اس نے حقارت سے چیچک زدہ چہرے کو دیکھا اور بندوق اس کے سینے پر رکھ کر چلادی کیمپ میں سوئے ہوئے لوگ ایکدم جاگ پڑے انہیں یوں محسوس ہوا جیسے خواب میں کچھ دیکھا ہو۔ کیمپ کے اندر کسی کا قتل! کوئی اتنی جرأت کرسکتا ہے؟ ہر ایک کا ذہن یہی سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کسی وہم کے پیدا ہوتے ہی شاہ خمیر نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سید اکبر نے بھی عین اسی وقت سر اٹھایا اور پوچھا "گولی چلنے کی آواز تھی؟" اب تو شاہ خمیر گھبرایا اور جلدی سے بولا "ہاں"۔ پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سرہانے رکھی ہوئی بندوق فوراً ہاتھ میں تھام لی۔ سید اکبر بھی اٹھ بیٹھا اور پورے کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس وقت تک آدم خیل دیوار پھاند کر کیمپ سے دور جاچکا تھا۔ ایکدم کیمپ سے روشنیاں بلند ہوئیں، آدم خیل اور اس کے ساتھی سیڑھی کے ساتھ زمین پر منہ کے بل لیٹ گئے۔ جب اندھیرا چھا گیا تو بجلی کی سی تیزی سے اٹھے اور بھاگنے لگے۔ پھر روشنیاں بلند ہوئیں اور وہ پھر زمین کے سینے سے چمٹ گئے۔ جانے کتنی بار روشنیاں بلند ہوئیں اور کتنی بار اُن کے تندرست وجودوں نے زمین کی چھاتی کو چھوا۔

دوسرے روز صبح تک کرمنہ، یہ خبر پہنچ گئی کہ آدم خیل کامیاب رہا۔ اسی روز مغرب کے وقت وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چپکے سے لواڑگی کے ایک مکان سے نکلا اور کرمنہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ بوڑے پہاڑ کو عبور کرنے تک وہ بڑے چوکنے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاروں طرف نظریں دوڑالیتے۔ بوڑے پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد آدم خیل کے فتحمندانہ قدم بہن کے گھر کی طرف اُٹھ گئے۔ بستی کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جم غفیر اُسے تحسین کی نظروں سے دیکھتا ہوا ساتھ ہولیا۔ زرسانگہ دوڑ کر آئی اور اس کی مضبوط چھاتی سے چمٹ گئی۔ وہ غیور لہجے میں بولا "میں نے تمہیں دشمنوں میں بہت اونچا کردیا ہے۔" ان گنت نظریں زرسانگہ کی طرف اُٹھ گئیں۔ زرسانگہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس بستی کی ایک ایسی باوقار ملکہ ہے جس کی مسرتوں کے چمکتے ہوئے چاند کو بجھانے کے لئے دور دیس کا ایک قبیلہ کمر باندھ رہا ہے۔ ایکا ایکی سات دیئے نیلگوں آسمان میں بکھر کر خلاؤں میں کھو گئے۔ وہ بے اختیار رونے لگی، اس نے آدم خیل کی چوڑی چھاتی کے گرد اپنی بانہوں کا حلقہ اور تنگ کر لیا اور اس کی جانب اٹھی ہوئی ان گنت نظروں میں عزت و توقیر کے ساتھ ساتھ رشک بھر گیا۔

پچھتاوا

جمیل نقوی

کبھی چلے تھے ہم اک عزمِ زندگی لے کر
تری نگاہ سے ٹکرا کے پاش پاش ہوا
وہ ایک راز جو تحت الشعور میں تھا نہاں
ترے وصال کی منزل پہ آ کے فاش ہوا

ترا وجود مری زندگی کا سرمایہ
ترا خیال مرے دل کا جزوِ لاینفک
مشامِ جاں کو عطا کر رہے ہیں شادابی
تری جبیں کا پسینہ ترے بدن کی مہک

مگر یہ کیا، نہ تمنّا، نہ آرزو، نہ خلش
یہ زندگی ہے تو اس زندگی میں رنگ کہاں
ہزار گرمیٔ احساس، ایک سوزِ دروں،
نشاطِ بزم کہاں، خوفِ عار و ننگ کہاں

بہت حسین ہیں رنگینیوں کے افسانے
کہ مستعار ہیں رنگ آفریں بہاروں سے
جلو میں جلوۂ صد لالہ زار ہو تو کیا
جنوں کی پیاس تو بجھتی ہے خارزاروں سے

جنوں بکھیر رہا ہے فضا میں لالہ و گل
مگر یہ کیا کہ خرد رولتی ہے انگارے
فروغِ جلوۂ صد کہکشاں کو کیا کیجے
مری نظر میں سلگتے ہیں ڈوبتے تارے

بفیضِ حُسن شگفتہ ہوا گلِ احساس
بنامِ عشق جنوں کامگار رہ نہ سکا
وبالِ جان ہوئی فطرتِ دلِ خودگیر
قرار پا نہ سکا بے قرار رہ نہ سکا

تم کون ہو؟

قاضی نذر الاسلام
مترجمہ: ابتسام الدین

تم کون ہو اے دوست جو یوں کرتے ہو نظروں سے اشارے

پھر بند بھی سب مجھ پہ ہیں دروازے شبستاں کے تمہارے

لا لا کے ہوا چیت کی دیتی ہے پُر اسرار سندیسے

باغوں میں چہکتی ہیں جہاں کوئلیں شاخوں کے سہارے

بیساکھ میں پھر فاختہ آتی ہے تری بن کے پیامی

کیا کیا مجھے للکارتے ہیں ندی کے بپھرے ہوئے دھارے

پت جھڑ میں چھلکتے ہیں سرِ شاخ تری پلکوں کے آنسو

اد نگھا کبھی جاڑے میں تو اٹھلا کے ٹھوکے مجھے مارے

اور پوس میں تنہا تو بھٹکتا ہے مری یاد میں اکثر

ہم کرتے ہیں اک بحر جدائی کے کناروں سے اشارے

اے شاعرِ وارفتہ ہم آغوشِ نسیم و نفسِ گل ہو بصد شوق

کرنے ہوں اگر دوست کے کاشانۂ رنگیں کے نظارے

ہدیہ ہائے نیاز

عالی رضوی

یہ شب کی مانگ ستاروں سے کون بھرتا ہے
ہوائیں مشک چرا کے کہاں سے لاتی ہیں
ستارے ڈوب کے کن منزلوں کو جاتے ہیں
بہاریں لوٹ کے کن بستیوں سے آتی ہیں

یہ غنچگی کا تبسم فسانہ خواں کیا ہے
شگفتِ گل کی صدا میں حکایتیں کیا ہیں
پریدہ رنگ خزاں کی اداس شاموں میں
سلگتی شاخوں کے لب پر شکایتیں کیا ہیں

یہ صبح و شام کے پیہم گریز پا لمحے
مرے شعور سے سرگوشیاں سی کرتے ہیں
خیال و خواب کے ہر نا تمام پیکر میں
کبھی اداس کبھی شوخ رنگ بھرتے ہیں

نگاہ و دل مجھے جب آئینہ دکھاتے ہیں
شعورِ ذات غمِ کائنات بنتا ہے
یہ رنگ و بو کے مظاہر مجھے بتاتے ہیں
کلی کا زخم کلی کے لہو سے بھرتا ہے

ہر اک وجود زمان و مکاں کا زندانی
ہر اک مقام پہ اک لذتِ شگفت و شہود
یہ اہتمامِ بہاراں، یہ موج نغمہ و نور
فقط و فورِ نمو ہے فقط گداز و کشود

میں ارتقا کے تسلسل کا آفریدہ ہوں
ہوائیں میری رفاقت کے گیت گاتی ہیں
یہ چاند، پھول، ستارے بتا رہے ہیں مجھے
تو کائنات کا دولہا ہے ہم براتی ہیں

مرے وجود سے قائم ہے لذتِ تخلیق
مری طلب کا کرشمہ ہے حسن کا اعجاز
مرے لئے ہے یہ آرائشِ خمِ کاکل
مرے لئے ہیں یہ اندیشہ ہائے دور و دراز

یہ ماہ و سال کی گردش مری تمنائی
تغیراتِ زمان و مکاں مرے دمساز
عروسِ ہستیٔ عشوہ طراز کے جلوے
مرے حضور ہیں فطرت کے ہدیہ ہائے نیاز

آبگینے

ضمیر اظہر

نیند

پپوٹے جھک رہے ہیں خواب کے رنگیں تخیل سے
کہ چشمِ نیم وا میں گھل رہی ہیں مستیاں پیہم
اُلجھ کر رہ گئی ہیں ذہن میں مبہم سی تدبیریں
فضائے جان و دل پر چھا رہا ہے سحر کا عالم

شادی

اچانک کان میں گونجی صدا محزوں ترانے کی
سرِ شاخِ شبنمی سے بھر گئے آنکھوں کے پیمانے
دلِ نازک پہ دستک دی خیالاتِ گذشتہ نے
ادھورے رہ گئے تخئیل میں بچپن کے افسانے

لبِ جو

زرفشاں سائے، کنارِ آبجو، عکسِ نجوم
پرتوِ مہتاب سے معمور ہیں سیمیں حباب
فرشِ مرمر پہ فروزاں ہیں سنہری مشعلیں
یا شگفتہ ہیں سرِ سیماب رخشندہ گلاب

خوابِ حسیں

آئینۂ مہتاب ترا روئے مبیں ہے
پیکر میں ترے جذب کوئی سحر نہیں ہے
ہوتا ہے گماں مجھ کو تری ذات پہ اکثر
معصوم فرشتوں کا تو اک خوابِ حسیں ہے

قدیم وادیٔ سندھ کی معاشرت

(۲)

ادریس صدیقی

وادیٔ سندھ کے قدیم باشندے بال باندھنے کے لئے موباف استعمال کرتے تھے۔ یہ موباف عام طور پر نصف انچ چوڑی سونے، چاندی اور دوسری دھاتوں کی بنی ہوئی پتلی پتلی پٹیاں ہیں۔ جو وضع میں سیدھی، مخروطی یا محراب دار ہوتی تھیں۔ بعض بعض موباف ۱۶ انچ تک لمبے ہوتے تھے۔ ان کے کناروں پر سوراخ ہوتے تھے، جن میں ڈوری ڈال کر ان کو سروں کے گرد باندھا جاتا تھا۔ بعض موبافوں پر کسی نوکیلی چیز سے نقطے ڈال کر نقاشی کی گئی ہے۔ سمیریا میں بھی ایسے موباف کثرت سے مستعمل تھے۔ پیشانی پر نوکیلے قسم کا جھومر استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسا جھومر مارواڑی عورتیں آج کل بھی پہنتی ہیں۔

کانوں میں بالیاں پہننے کے رواج کا اندازہ مجسموں پر بنی ہوئی نقاشی سے کیا گیا ہے، لیکن بالیاں شاذ و نادر ہی دریافت ہوتی ہیں۔ سونے کی بنی ہوئی دندانے دار چند ایسی ٹکیاں ملی ہیں جن کے پیچھے کیل سی جڑی ہوئی ہے۔ اور یہ ناک کی کیل کی بہ نسبت کانوں کے ٹاپس سے زیادہ مشابہ ہیں۔

ہاتھوں میں کنگن اور دست بند کے علاوہ چوڑیاں پہننے کا عام رواج تھا۔ یہ چوڑیاں سونے، چاندی، تانبے، کانسے، ہاتھی دانت اور مٹی کی بنی ہوتی تھیں۔ سونے اور چاندی کی چند پولی اور کھوکھلی چوڑیاں بھی دریافت ہوتی ہیں۔ غریب عورتیں مٹی کی چوڑیاں پہنتی تھیں، جو نہایت نفاست سے بنائی جاتی تھیں۔ اور بعض چوڑیوں پر تصویری نقاشی بھی کی گئی ہے۔ رقاصہ کے مجسمہ کے بائیں ہاتھ میں کلائی سے بغل تک چوڑیاں نظر آتی ہیں۔ گجرات (ہندوستان) میں اب بھی پورے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنی جاتی ہیں، البتہ سندھ میں اب یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔ خیال ہے کہ رقاصہ کے ہاتھ کی چوڑیاں ہاتھی دانت کی بنی ہوں گی یا سنکھ کی کیونکہ اگر یہ کسی دھات یا مٹی کی بنی ہوتیں تو ان کے بوجھ کی وجہ سے ہاتھ اٹھانا بھی مشکل ہو جاتا۔ شیشے کی چوڑیاں موئن جو دڑو میں دریافت نہیں ہوتی ہیں اور نہ شیشے کی کوئی دوسری چیز ہی ملی ہے۔

انگلیوں میں انگوٹھیاں اور چھلے پہنے جاتے تھے۔ بعض انگوٹھیاں بالکل سادہ گول یا چپٹے تار کے چھلے جیسی ہیں۔ بعض ایک ہی تار کو کئی بار چھلوں کی شکل میں موڑ کر بنائی گئی ہیں۔ اس طرز پر بنے ہوئے چھلوں میں سات سات پھیر ہیں۔ عام طور پر انگوٹھیاں تانبے یا کانسے کی بنائی جاتی تھیں۔ چاندی کی صرف ایک انگوٹھی ملی ہے جس میں ایک چپٹے تار کے اوپر نگ رکھنے کی جگہ چپٹے چوکور ماتھے پر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوتے خطوط کھینچے گئے ہیں۔

پیروں میں کڑے پہننے کا رواج تھا۔ مٹی کے چند مجسموں کے پیروں میں کڑے پائے گئے ہیں۔ کانسے کے ایک مجسمے کے پیروں میں بالکل اسی قسم کا کڑا پڑا ہے جیسا کہ آج بھی شملہ (ہندوستان) کی پہاڑی عورتیں پہنتی ہیں۔ اسی قسم کے کڑے کریٹ میں بھی پہنے جاتے تھے۔

بالوں میں کنگھا لگایا جاتا تھا۔ ایک دوہرے دندانے والا ہاتھی دانت کا بنا ہوا کنگھا جس کے دونوں طرف گول دائروں کی نقاشی کی گئی ہے، ایک نوجوان خاتون کے کاسہ سر کے قریب ملا تھا۔ ایک اور V شکل کا کنگھا بھی دریافت ہوا ہے۔ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک خوبصورت کنگھی بھی دریافت ہوئی ہے جس میں موجودہ کنگھیوں کی طرح دونوں طرف دندانے ہیں۔

تانبے، کانسے اور چینی کے گول بٹن بھی دریافت ہوتے ہیں۔ یہ شکل میں عام طور پر مالٹا، پرتگال اور جنوبی فرانس کے بٹنوں سے مشابہ ہیں۔ یہ سادہ ہیں اور ان کی پشت کی جانب تاگا پرونے کے لئے دو سوراخ بنائے گئے ہیں۔ کانسے کے بٹن گنڈی نما ہیں اور ان کے اوپری جانب دو سوراخ ہیں۔

سنگھار

عورت کے ساتھ ساتھ شاید سنگھار کی بھی تخلیق کی گئی۔ چنانچہ وادیٔ سندھ کی عورتیں بھی سنگھار کی دلدادہ و مشتاق تھیں۔ وہ آرائش حسن کے لئے سرمہ اور غازہ استعمال کرتی تھیں۔ سرمہ دانیاں اور سلائیاں کثیر تعداد میں پائی گئی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں سرمہ لگاتے تھے۔ آج کل بھی سندھ میں عام طور پر سرمہ استعمال کیا جاتا ہے۔ گھونگھے اور سیپ کی ڈبیوں میں سرخ رنگ کا پاؤڈر دریافت ہوا ہے۔ ایسی ہی ڈبیوں میں اس قسم کا غازہ کیش اور اُر کے مقبروں سے بھی دریافت ہوا ہے۔

ہڑپہ اور موئن جو دڑو میں سیسے کا کاربونیٹ بھی ملا ہے جو شاید چہرے کو سفید کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہوگا جیسا کہ یونان اور چین میں

ی عہد میں دستور تھا۔ تزئین کے لئے شنگرف بھی مستعمل تھا۔ ایک قسم کا ایسا سبز
دہ بھی دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں مسٹر میکے کا خیال ہے کہ وہ شاید
جل کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ مصر میں سلی کیٹ [1] مستعمل تھا۔ تانبے
ے گول آئینے بھی ملے ہیں جن کے کنارے جلد محفوظ رکھنے کے لئے ابھرے رکھے
جاتے تھے پیروں کو صاف کرنے کے لئے مٹی کے جھانوے استعمال کئے جاتے تھے۔

الغرض آپ اپنے ذہن میں اس عہد کی خاتون کا ایک نقشہ قائم کریں اور
س پر تھوڑی دیر غور فرمائیں تو ایسا محسوس کریں گے جیسے بھرے بھرے ہونٹوں
ور دوشیزہ صفت سینوں والی ایک جیتی جاگتی عورت آپ کے سامنے
ھڑی ہے۔ کلائیوں میں چوڑیاں، بازو پر بازو بند یا جوشن، گلے میں کئی لڑیوں
کا ہار ہے بالوں کو یوں آراستہ کر رکھا ہے کہ سامنے کی طرف ایک بل کھاتی ہوئی
دبکی لہر بن گئی ہے۔ باقی بالوں کو چوڑی چوٹی بنا کر کندھے پر چھوڑ دیا ہے ساتھ
پر موباف ہے، کمر کے گرد ایک چوڑی کردھنی، پاؤں میں کڑے، کانوں میں
بالیں، ناک میں کیل، چہرہ پر غازہ، گالوں پر سُرخی، آنکھوں میں سرمہ، بھلا
کس چیز کی کمی ہے؟

کھلونے

وادی سندھ کے قدیم بچے موجودہ بچوں کی طرح کھلونوں کے معاملے میں بہت خوش قسمت تھے۔ یہاں لاتعداد کھلونے
ملے ہیں جن سے یہ بھی اندازہ لگتا ہے کہ اس عہد کے والدین اپنے بچوں کی دلچسپی
اور ان کے کھیل کود پر کتنی توجہ دیتے تھے۔ یہاں مٹی، سیپ، پتھر اور ہاتھی دانت
کے کھلونے پائے گئے ہیں جو اس صنعت کی ترقی کے مظہر ہیں۔ خیال ہے کہ لکڑی
کے کھلونے بھی بنائے جاتے ہوں گے جو تلف ہو گئے ہیں اور اب ان کے آثار
ناپید ہیں۔ مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بکثرت ملی ہیں جو وضع قطع میں
ان بیل گاڑیوں سے قطعی مشابہ ہیں جو آج کل بھی موئن جو دڑو کے علاقہ میں
سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ان سے یہ اندازہ بھی لگتا ہے کہ موئن جو دڑو
کے لوگ مسافرت اور باربرداری کے لئے بیل گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔
مدہ گاڑیوں کے ساتھ ساتھ مٹی کے بنے ہوئے بیل بھی ملے ہیں۔ بیل گاڑی کا ایک
دلچسپ سٹ ملا ہے جس میں کوچوان اپنی جگہ پر پیر موڑے بیٹھے دکھایا گیا ہے۔
دو مسافر اس کے پیچھے بیٹھے ہیں گاڑی کے آگے آگے ایک کتا دوڑتا ہوا
دکھایا گیا ہے جو پیچھے مڑکر کوچوان کو دیکھ رہا ہے۔ ان تینوں آدمیوں کی بیٹھنے
کی جگہ چھوٹے چھوٹے کھانچے سے ہیں جن میں یہ سوار فٹ ہو جاتے ہیں اور اگر
ان کو کسی دوسری جگہ بٹھانے کی کوشش کی جائے تو لڑھک جاتے ہیں۔ یہاں
ایسے رتھ دریافت نہیں ہوئے ہیں جو عام طریقہ پر میدان جنگ میں کام آتے تھے۔

ایسے جھنجھنے بھی دریافت ہوئے ہیں جو گیند کی طرح گول اور اندر سے
کھوکھلے ہیں۔ ان کے اندر چھوٹی چھوٹی کنکریاں پڑی ہوئی ہیں اور ان کے ہلنے
سے آواز پیدا ہوتی ہے جو بچوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوتی ہوگی۔ ایسی
چڑیاں بھی ملی ہیں جو کھوکھلی ہیں اور جن کی دُم کے پاس ایک سوراخ ہے۔ یہ بچوں
کی سیٹیاں تھیں۔ ان کی دم کے سوراخ سے ہوا پھونکنے پر آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس
کے علاوہ کتنی دوسری طرزوں بیٹھی ہوئی چڑیاں بھی ملی ہیں۔ ایک چڑیا چونچ کھولے
ہوئے دکھائی گئی ہے گویا چوں چوں کر رہی ہے۔ ہڑپا اور موئن جو دڑو میں چڑیا
کے پنجرے بھی ملے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگتا ہے کہ چڑیاں پالی بھی جاتی تھیں۔ ایک
پنجرے کی کھڑکی سے ایک چڑیا غالباً بلبل (؟) باہر نکلتی ہوئی دکھائی گئی ہے [2]۔ بانس
پر چڑھتے ہوئے بندر یا کسی دوسرے جانور کے بہت سے نمونے ملے ہیں اور
ان کے علاوہ چھوٹے سینگوں والے بیل، گینڈے، بھینس، شیر، سور، بندر اور
کتے کے نمونے بھی۔ آبی جانوروں میں مگرمچھ اور کچھوا، پرندوں میں مرغی اور
فاختہ کے بھی چھوٹے چھوٹے مجسمے ملے ہیں۔ ترازو کے چند چھوٹے چھوٹے پلڑے
بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں ڈوریاں ڈالنے کے سوراخ بھی ہیں یہ پلڑے
بہت بھدے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں نے بنائے ہیں۔ اسی طرح گھروں
میں برے جانے والے برتنوں کی وضع کے چھوٹے چھوٹے مٹی کے کھلونے بھی پائے گئے
ہیں۔ جن میں سے بعض پر تو بچوں کی ننھی ننھی انگلیوں کے نشان بھی ہیں۔ عہد طفولیت کی
معصوم مشغولیت کے یہ نشان کتنے دلچسپ ہیں!

اعلےٰ قسم کے بنے ہوئے کھلونوں میں ایسی قسم کے بیل ہیں جن کے سر دھڑ
سے الگ بنائے گئے ہیں۔ یہ سر کھوکھلی گردن میں ایک ایک کے ذریعہ پھنسائے جاتے
تھے اور کوہان میں ایک سوراخ کر کے اس کے اندر سے ایک ڈور گذار کر ان سروں
میں باندھ دی جاتی تھی۔ اس طرح ڈور کھینچنے پر یہ سر ہلتے تھے۔ اسی طرح بندر کا
ہمشکل ایک جانور ملا ہے جس کے ہاتھ ہلتے ہیں۔ ایسے کھلونے بھی ملے ہیں جن میں

[1] ایک سبز رنگ کی معدنی شے جو تانبے کے "کمس" سے مرکب ہے
[2] اکثر ماہرین آثار نے ان کو چڑیوں کے پنجرے کہا ہے لیکن یہ قیاس زیادہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کی جسامت اتنی چھوٹی ہے کہ ان میں چڑیا سما نہیں سکتی۔ چند محققین کا خیال ہے کہ مٹی کی گول قندیلیں ہیں جن سے روشنی چھن چھن کر باہر آتی ہوگی۔ اور بلبل والی شبیہ غالباً پتنگا ہے جو روشنی کی کشش سے قندیل کے پاس آیا ہے۔

اس حکمت سے سوراخ کئے گئے ہیں کہ ان میں تاگا ڈال کر حسب دلخواہ رفتار سے اوپر نیچے دوڑایا جاسکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ لڑکیوں کا محبوب ترین کھلونا یعنی گڑیا کہیں نہیں ملی۔ یہ کپڑے یا لکڑی کی بناتی جاتی ہوں گی اور تلعت، ہو گئی ہیں ؛

کھیل تفریح برصغیر ہند و پاکستان کی ابتدائی تاریخ میں پانسہ کا بڑا دخل رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کس طرح یدھشٹر راج پاٹ، دھن دولت، حتیٰ کہ اپنی رانی تک کو ہار گیا۔ اسی طرح راجہ نل کا قصہ بھی زبان زد خاص و عام ہے اور آج بھی پانسہ اور کوڑیاں کھیلنے والے راجہ نل کی دہائی دیتے ہیں۔ رگ وید میں بھی اس کھیل کا کئی مقامات پر ذکر ہے لیکن یہ کھیل اس عہد سے بھی بہت قدیم ہے اور وادیٔ سندھ کے لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وادیٔ سندھ کے پانسے مٹی اور پتھر کے بنے ہیں۔ ان کی چھ سمتوں میں مختلف تعداد میں گول نشان بنے ہیں۔ یہ نشان ایک سے چھ تک ہیں اور اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک کے بالمقابل دو ہے تین کے بالمقابل چار اور پانچ کے مقابل چھ۔ اس قسم کا مٹی کا بنا ہوا ایک پانسہ موتل کے قریب ٹیپ گوآرا کی تہ نمبر ۲ میں ملا ہے جو تقریباً ۲۲۰۰ سال قبل مسیح کا بنا ہوا ہے۔ آج کل کے پانسوں میں عام طریقہ پر نشانوں کو اس طرح بنایا جاتا ہے کہ مختلف سمتوں کے نشانات کا جوڑ ہر حالت میں سات ہوتا ہے بعض پانسوں کے کونے گھسے ہوئے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کو کسی نرم چیز پر پھینکا جاتا ہوگا۔ بعض چوکور پانسوں میں جو عام طور پر ہاتھی دانت کے بنائے گئے ہیں تین سمتوں میں تو ایک دو اور تین نشانات ہیں اور چوتھی سمت میں طول البلدی خطوط کھینچے گئے ہیں۔ کچھ پانسوں پر ہر طرف ایک مختلف تصویری تحریر ہے جو ابھی تک پڑھی نہیں جاسکی۔ ایسے کندہ پانسے بھی دریافت ہوتے ہیں جنھیں نجومی قسمت کا حال بتلانے میں استعمال کرتے ہیں۔ ان پانسوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے قدیم فرزند اپنی قسمت کے سربستہ راز معلوم کرنے کے اتنے ہی مشتاق تھے جتنے کراچی میں بندر روڈ پر بیٹھے ہوئے نجومیوں کے پاس جانے والے موجودہ لوگ!

موجودہ شطرنج کے پیادوں کی طرح مٹی، پتھر اور ریشب کے لاتعداد مہرے ملے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت ہی خوبصورت ہیں۔ یہ جسامت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعی شطرنج کے مہرے ہی رہے ہوں گے ؛

موئن جو دڑو میں ایک ایسی اینٹ ملی ہے جس پر چار چوکور خانوں کی تین قطاریں کھدی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک خانہ متوازی الاضلاع ہے جس کے وتر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بنائے گئے ہیں۔ یوں ⊠ خیال کیا گیا ہے کہ یہ چوسر کی بساط کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس اینٹ کے ساتھ ہی اس قسم کی اور اینٹیں ہوں گی جس سے تین خانوں کی دس قطاریں ہوں گی اور ان پر مصر یا کی طرح دتسی کھیلی جاتی تھی اور اگر اس میں چھبیس خانے تھے جو اس طرح بنائے گئے تھے کہ ایک طرف تین قطاروں میں بارہ خانے تھے اور ان دونوں کے بیچ میں دو خانے بنائے گئے ہوں گے تو یہ سر وولی کی آر میں دریافت شدہ سمیری بساط سے مماثلت رکھتی تھی۔ یہ اینٹ ایک فرش سے دستیاب ہوتی ہے اور یہ کھیل فرش پر بیٹھ کر ہی کھیلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی اینٹیں ملی ہیں اور یہ قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ چوسر اور سر بگھی کے قسم کے کھیل کھیلے جاتے ہوں گے۔ البتہ ان کا نام کچھ اور رہا ہوگا۔ اور کھیلنے کے طریقے بھی مختلف ہوں گے۔ یہاں مٹی اور پتھر کی بہت سی گولیاں بھی ملی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ گولیاں کھیلنے کا دستور بھی ہو بعض گولیاں اتنی خوبصورت، گول اور چکنی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا ان کے بنانے میں اتنا انہماک کیوں برتا گیا ہے ؛

ایک مہر پر دو پرندے ایک دوسرے پر جھپٹتے دکھائے گئے ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پرندوں سے دل لگی بھی یہاں کا محبوب مشغلہ رہا ہوگا اور جس طرح آج کل بلبل، مرغ، تیتر اور بٹیریں لڑائی جاتی ہیں اسی طرح وادیٔ کے لوگ بھی پالیاں بدتے ہوں گے۔ بیلوں کی لڑائی کا بھی رواج تھا۔ یہ تفریح جزیرہ کریٹ (قریطش) کی پرانی تہذیب میں بھی رائج تھی اور ہسپانیہ میں آج بھی اس کے مناظر دیکھے جاسکتے ہیں ؛

شکار وادیٔ سندھ کے لوگ گوشت خور تھے۔ وہ پالتو جانوروں کے علاوہ جنگلی جانوروں کو شکار کر کے بھی گوشت فراہم کرتے تھے۔ ایک مہر پر دو آدمیوں کو تیر کے ذریعہ ہرن کا شکار کرتے دکھایا گیا ہے۔ دوسری مہر پر جنگلی بکری کو ہدف بنایا گیا ہے۔ موئن جو دڑو میں بے شمار تیر دریافت ہوتے ہیں اور ان کو شکار میں استعمال کیا جاتا ہوگا۔ یہاں کی تصویری تحریر میں بھی تیر کمان کے نشان ملتے ہیں۔ مٹی کی پختہ گولیاں یا غلے بھی ملے ہیں جن سے گلا کی شکل کی غلیل کے ذریعہ چڑیوں کا شکار کیا جاتا تھا۔ چوہوں کو پکڑنے کے لئے مٹی کے پھندے یا چوہے دان استعمال کئے جاتے تھے۔ اس قسم کے چوہے دان موئن جو دڑو میں دریافت ہوتے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کے سیکڑوں کانٹے اور جال ڈبونے کے لئے استعمال کی جانے والی گولیوں کی دریافت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مچھلی کے شکار کا بھی عام رواج تھا۔ مٹی کے بنے ہوئے چند ایسے کتے بھی

ہیں جو شباہت میں شکاری کتوں جیسے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ کتے جانوروں کے شکار میں استعمال کئے جاتے ہوں۔ سندھ میں آج کل بھی شکاری کتوں کی مدد سے کافی شکار کھیلا جاتا ہے۔

پالتو جانور

وادیٔ سندھ کے باشندے جانوروں کو شکار کر کے کھانے کے ہی شائق نہ تھے بلکہ جانوروں کو پالتے بھی تھے۔ پالتو جانوروں کی اقسام کم نہ تھیں۔ چنانچہ کھدائی میں کوہان والا بیل یا سانڈ، بھینسا، بھیڑ، ہاتھی، اونٹ، سؤر اور مرغ کے ڈھانچے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ سؤر اور مرغ کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پالتو تھے یا جنگلی۔ پالتو جانوروں کے بارے میں بچوں کے کھلونے اور مہروں پر نقش کی ہوئی تصویریں بھی ہماری بڑی رہنمائی کرتی ہیں۔ ان سے اندازہ لگتا ہے کہ یہ لوگ جیسے، بندر، کتا، بلی، طوطا، مور اور مرغ سے اچھی طرح واقف تھے۔ گدھے کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا اور محققین میں اس بارے میں کافی اختلاف ہے کہ وادیٔ سندھ کے لوگ گھوڑے سے واقف تھے یا نہیں۔

وادیٔ سندھ میں سانڈوں کے ڈھانچے بڑی کثرت سے ملے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیلوں کی نسل لینے کا کتنا اچھا انتظام تھا۔ یہ بیل سندھ، شمالی گجرات اور راجپوتانہ کے موجودہ شاندار بیلوں سے کلی طور پر مشابہ تو نہیں ہیں البتہ اُن چھوٹے کوہان والے بیلوں سے بالکل مختلف ہیں جو آج کل وسط ہند اور دکن میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ سندھ اور بلوچستان میں بغیر کوہان اور چھوٹی سینگوں والے بیل بھی ہوتے تھے۔

اس سلسلے کی سب سے دلچسپ دریافت ایک ایسی پختہ اینٹ ہے جس پر ایک کتے اور بلی کے پیروں کے نشان بنے ہیں۔ یہ نشان اس وقت پڑے ہوں گے جب گیلی مٹی سے اینٹیں بنائی گئی ہوں گی اور اس کتے نے بلی کا پیچھا کیا ہوگا۔ وہ بلی ان اینٹوں کے اوپر سے بھاگی ہوگی۔ اور کتے نے بڑی تیزی سے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ یہ نشان کافی گہرے ہیں اور اس طرح سے بنے ہیں کہ اس طریقہ کے علاوہ کسی اور طرح نہیں پڑ سکتے۔ یہ تیز بھاگنے والی بلی اور اس کا پیچھا کرنے والا کتا تو نہ جانے کب کے ختم ہو چکے لیکن اینٹوں پر پڑے ہوئے یہ نشان جہدِ بقا کی مسلسل اور مستقل داستان کی غمازی کرتے ہیں۔

جنگلی جانور

اُن جانوروں سے قطع نظر جن کا ذکر شکاری یا پالتو جانوروں کے ضمن میں کیا گیا ہے، یہاں ایسے وحشی اور نیم وحشی جانور بھی تھے جو گھروں میں آیا جایا کرتے تھے جیسے نیولا اور سیاہ چوہا۔ ان کے علاوہ خرگوش بھی موجود تھا۔ شیر، ریچھ، ہاتھی اور گینڈے جیسے وحشی جانور عام تھے۔ ہرن چار قسم کے ہوتے تھے۔ کشمیری بارہ سنگھا، سانبھر، چیتل، اور پاڑا ہرن۔ ان ہرنوں کے صرف سینگ ہی پائے گئے ہیں ممکن ہے یہ سینگ دواؤں میں استعمال کئے جانے کے لئے دور دور سے منگائے گئے ہوں۔ کشمیری بارہ سنگھا آج کل صرف کشمیر اور ہمالیہ کے نواح میں ملتا ہے۔ چیتل آج کل نہ سندھ ہی میں پایا جاتا ہے، اور نہ پنجاب میں۔ اسی طرح سانبھر بھی سندھ، راجپوتانہ اور پنجاب میں نہیں ملتا، البتہ پاڑہ ہرن اب بھی سندھ میں ملتا ہے۔

رقص و سرود

موہن جوڈرو میں رقص کا عام رواج تھا جس کے ثبوت میں کانسے کا بنا ہوا رقاصہ کا مجسمہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہڑپہ سے دریافت شدہ پتھر کا ایک اور مجسمہ بھی عالمِ رقص میں دکھایا گیا ہے۔ رقص قدیم ہندوستان کی مذہبی رسوم میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اور پرستش کا ایک خاص جزو ہوتا تھا۔ معلوم نہیں موہن جوڈرو میں اس کو مذہبی حیثیت حاصل تھی یا یہ محض تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ تھا۔ ناچ کے ساتھ گانا بجانا بھی ہوتا تھا۔ دو مہروں پر ڈھولک کی تصویر بنی ملی ہے۔ ایک مہر پر ایک مردانی شبیہ کی گردن میں ڈھولک یا مردنگ لٹکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ناچنے والے کو تھاپ دینے کے لئے کھڑتال بھی مستعمل تھی جس کے چند نشانات پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وادیٔ سندھ کی تصویری تحریر میں ایسے بہت سے نقوش ملے ہیں جن کو بربط اور چنگ تصور کیا جا سکتا ہے، اس قسم کے ساز تحریر میں بھی مستعمل تھے۔

حکمت

ایسے شواہد بہت کم ملے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وادیٔ سندھ کے لوگ طب، نجوم اور علم الحساب سے بھی واقف تھے۔ البتہ یہاں سمندر جھاگ اور بارہ سنگھے کے سینگ کے ٹکڑے دریافت ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ضرور یہاں کے ویدوں کے نسخوں کا جز ہوں گی۔ ایک ایسا سیاہ مادہ بھی دریافت ہوا ہے جس کو سلاجیت تجویز کیا گیا ہے۔ سلاجیت ضعف معدہ، ذیابیطس، جگر کے امراض اور گٹھیا وغیرہ کے لئے اکسیر ہے۔ اسی طرح مٹی کی ہانڈیوں میں وہ شاخہ یا استخوان ماہی رکھی ہوتی ملی ہے۔ یہ بھوک بڑھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور بیرونی طور پر کان، آنکھ، گلے اور جلدی امراض میں استعمال کی جاتی ہے۔ مونگے اور نیم کے درخت کی پتیاں بھی احتیاط سے رکھی ہوئی پائی گئی تھیں اور یہ بھی ادویات کے کام آتی ہوں گی۔ ان تمام چیزوں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس تہذیب میں "اور ویدک" طریقِ علاج ابتدائی دور میں تھا۔

بالکل صحیح سمتوں میں بنے ہوئے مکانات اور سڑکوں سے اندازہ لگایا

(باقی صفحہ پر)

غزلیات

اختؔر ہوشیارپوری

اے پریشان گیسوؤں والو
آؤ کچھ دیر کو تو سستا لو

کیا کرو گے چلا نہ دَور اگر
اے حسین انکھڑیوں کے متوالو

ہم بڑے کام کے ہیں دیوانے
ان سے کہہ دو کہ ہم کو اپنا لو

میری قسمت تو بن ہی جائے گی
پہلے اپنی لٹیں تو سلجھا لو

فصلِ گل آئی کھو چلے وحشی
تم کہاں ہو جنوں کے رکھوالو؟

وقت پھر لوٹ کر نہ آئے گا
آؤ اور اپنی بات منوا لو

دل کا ہر داغ ایک اختؔر ہے
روشنی مانگو تیرگی والو

انجم اعظمی

بزمِ خوباں سے پرے کوچۂ جاناں سے ہیں دور
وصل کیا خاک ہو جب یہ ہے جنوں کا دستور

ان سے اب کرتے نہیں کوئی ملاقات مگر
ہم ہوئے جاتے ہیں اس طرزِ وفا پر مغرور

ہر قدم ایک فسوں تازہ بہ تازہ گویا
ایک ہم ہیں کہ ہمیں یہ بھی نہیں ہے منظور

شیخ جی آئے ہو پھر جام و صراحی لیکر
بات تو جب ہے کہ پہلو میں بٹھا دو اک حور

ان دنوں حرفِ تمنا پہ مٹے جاتے ہیں
ہم سے مت پوچھ کہ یوں بھی ہمیں ملتا ہے سرور

حسرتِ دید کے قائل ہی نہیں ہیں ہم لوگ
جلوۂ یار کا سودا ہے تو دیکھیں گے ضرور

دل لگی جس کو سمجھتے تھے وہ شے کیا نکلی
پڑ گئے آج مرے زخمِ جگر میں ناسور

دن میں کیا ڈھونڈتے ہو انجمِ مستانہ کو
رات آتی ہے تو میخانے میں ہوتا ہے ظہور

شائستہ بیزار

اپنے غبارِ راہ سے منزل نئی بنائیں
کیوں ہوں اداس بے رُخیٔ رہبراں سے ہم

آئی تھی آج اپنی تہی دامنی پہ شرم
یوں لوٹ لوٹ آئے ترے آستاں سے ہم

تنہائیاں دلوں کی بھلا کس طرح مٹیں
کچھ اجنبی سے آپ ہیں کچھ بدگماں سے ہم

معلوم اب ہوا کہ وہی منزلیں بھی تھیں
سو بار اضطراب میں گزرے جہاں سے ہم

ایسا نہ ہو کہ شیشہ و پیمانہ توڑ دیں
گھبرا کے بے نیازیٔ پیرِ مغاں سے ہم

ملتا کسی نظر کا سہارا اگر ہمیں
یوں تھک نہ جاتے زیست کے بارگراں سے ہم

ہو جائے گر طلوعِ سحر کا یقیں تو پھر
گھبرائیں گے نہ تیرگیٔ بے کراں سے ہم

آج ان کے التفات کا انجام سوچ کر
بیزار سے ہیں ہر نگہِ مہرباں سے ہم

شیدا گجراتی

ابھر رہے ہیں دلوں کے نقوش دیرینہ
لٹا رہی ہے طبیعت سخن کا گنجینہ

دکھا رہا تھا خرد کو جنوں کا آئینہ
دھڑک دھڑک سا گیا کائنات کا سینہ

کہیں تو کس سے کہیں اور سنے تو کون سنے
نئے جہاں میں وفا کی حدیث پارینہ

مری نوا میں مری شخصیت کو ڈھونڈ اے دوست
مری غزل ہے مری زندگی کا آئینہ

گذر رہے ہیں یہ کن منزلوں سے فرزانے
زباں پہ پیار کی باتیں دلوں میں ہے کینہ

اس انجمن میں ملا بھی تو کیا ملا دل کو
یہی کہ ٹوٹ گیا حسرتوں کا آئینہ

جنوں ہی اصل میں میراثِ ابنِ آدم ہے
جنوں ہی عظمتِ انساں کا آخری زینہ

کبھی تو ہوگا عبارت سے آشنا شیدا
وہ میری عمرِ محبت کا خوابِ دوشینہ

مشتاق مبارک

مستی بھری نگاہ تو نکھرا ہوا شباب
گویا سمٹ کے آگیا ساغر میں آفتاب
اٹھی یہ کس کے عارضِ پرنور سے نقاب
عالم مری نظر میں ہے اک نقشِ اضطراب
میں تابِ حسن لا نہ سکوں اس سے کیا غرض
اپنی تجلیوں کو تو ہونے دے بے نقاب
خود ملتفت نگاہ سے دیکھا کئے مجھے
میری نظر ملی تو انہیں آگیا حجاب
صرفِ سجود اور رہو پھر عشق کے حضور
یا رب مزاجِ حسن میں کیسا یہ انقلاب
کیفیتوں سے کتنی عبارت ہے ایک دل
ہے یہ امینِ سوز و الم درد و اضطراب
میرے جنونِ شوق کی یہ وسعتیں تو دیکھ
ذروں سے کر رہا ہوں میں تخلیقِ آفتاب

اقبال صفی پوری

رگ رگ میں اس مست نظر کا کیفِ مجسم آج بھی ہے
کتنے عالم بدلے لیکن اپنا وہ عالم آج بھی ہے
جس کی آڑ میں تم ہو پنہاں وہ غمِ محکم آج بھی ہے
درد تو کم ہوتا رہتا ہے، درد تو کم کم آج بھی ہے
اُن کے غم کو کیوں اپنایا، درد کو اپنا سمجھا کیوں
اتنی بات پہ گردشِ دوراں مجھ سے برہم آج بھی ہے
کس پروار کیا دُنیا نے اس کو کوئی کیا سمجھے
چہرے تو ہنستے ہیں لیکن روح میں ماتم آج بھی ہے
اُن سے جب ٹکرائی تھیں نظریں اس کو زمانہ بیت گیا
دل کی تہ میں ایک خلش سی مبہم مبہم آج بھی ہے
سیکڑوں سورج اُبھرے ڈوبے پھر بھی وہی ہے ربطِ جمال
پہلے بھی تھی پھول پہ شبنم، پھول پہ شبنم آج بھی ہے
سب کو یہ دولت نہیں ملتی، غم ہے بقدرِ ظرف اقبال
جس میں ہے کچھ ظرف کی وسعت اس کے لئے غم آج بھی ہے

فکاہیہ:

احوالِ واقعی

محمد مسعود

کامریڈ قسم کے حضرات مجھے سرمایہ دار سمجھتے ہیں اور سرمایہ دار گھٹیا قسم کا کامریڈ تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے پانچ سال کے طویل عرصہ میں ایک دفعہ بھی کار تبدیل نہیں کی اور نہ میرے پاس لمبی مونچھوں اور چمک دار بٹنوں والا کوئی ڈرائیور رہی ہے۔ میرا پرانا مستری بوڑھے گدھ کی طرح نیم وا آنکھوں سے منتظر رہتا ہے کہ کب میری کار میں کوئی نقص ہو اور وہ میری حجامت بنائے۔ جب میں با دلِ ناخواستہ اُس کی دکان کا رُخ کرتا ہوں تو پہلے بصد منت بنک کے منیجر سے ضروری رقم کا بندوبست کر جاتا ہوں۔ اور جب پہلی تاریخ کو بنک والے وہ رقم کاٹ لیتے ہیں تو اہلیہ محترمہ جو میرے چند بال باقی ہیں اُن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ سگریٹوں کا راشن آدھا رہ جاتا ہے اور تمام مہینہ جلی کٹی سنتا رہتا ہوں۔ غرضیکہ کار کی وجہ سے میری جان عذاب میں ہے اور ایک لمبی سانس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں ؎ کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے داستاں میری۔ اس کے باوجود مجھے کامل یقین ہے کہ اِن چند حروف کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ اور کیا عجب کہ بچارے کار والوں کے متعلق کئی ایک غلط فہمیاں رفع ہو جائیں ؛

کار کی موجودگی کو زر و دولت کا نشان یا ثبوت سمجھا جاتا ہے، لیکن اصلی حالت یہ ہے کہ دس تاریخ کے بعد دوکانداروں کے تپاک سے گرم جوشی محو ہو جاتی ہے، پندرہ تاریخ تک دوست معانقہ کرنے سے کتراتے ہیں، بیس کے لگ بھگ سے چھپنا شروع کر دیتے ہیں، پچیس تاریخ کو والدِ محترم ہوا سے مخاطب عام دنیا سے بجٹ متوازن رکھنے کی تلقین کرتے سنے جاتے ہیں، انتیس تاریخ کو بیگم صاحبہ کا درجۂ حرارت تھرما میٹر سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور ڈاکٹروں کی کوشش کے باوجود پہلی تاریخ تک راہِ راست پر نہیں آتا۔ اگر پہلی اتوار کو ہو تو پھر سوموار تک بخار کے اترنے کی توقع کی جاتی ہے ؛

ٹانگے والے، گڈے والے، ریڑھے والے، بھینسوں والے، بکری والے، ٹرک والے، سائیکل والے، اور پیدل چلنے والے مجھ دنیا کے لئے خطرناک وبا سمجھتے ہیں۔ اور ہر ایک کی یہی خواہش ہے کہ دنیا اس سرمایہ دار کے وجود سے کب پاک ہو جو غرور و نخوت کا پتلا ہے، جس کے پاس بے شمار دولت ہے، جو جان بوجھ کر کیچڑ کی چھینٹیں اور غبار کے بادل اُڑاتا ہے اور جس کا ہارن کانوں کے پردے پھاڑتا ہے۔ ان نیک خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ہر وقت کمربستہ نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی اس کارِ خیر میں کامیابی بھی حاصل کر لیتے ہیں ؛

میں کار والا بچارا نہایت رنجاں رنج قسم کا، طعنوں سے ڈرنے والا اور بہتوں کا بھلا کرنے والا انسان ہوں۔ کار خرید کر اپنا دیوالہ نکالنے کے بعد ہر تیسرے ماہ چالیس پچاس کے لگ بھگ ٹیکس ادا کرتا ہوں، ٹیکس ادا کرنے اور ضروری کاغذات وصول کرنے کے لئے "بچارے کلرک" کے پاس کئی چکر لگانا پڑتے ہیں۔ وہ پان چبانے اور سگرٹ پینے میں سخت مشغول ہوتے ہیں، کئی رجسٹروں کے خالی صفحوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کبھی کبھار نظریں اوپر اٹھاتے ہیں تو بغیر سلام دعا اُن کے منہ سے یہی نکلتا ہے کہ "پرسوں آئیے"۔ کاش میرے پاس ایک روپیہ ہوتا اور میں اس کام کے لئے ایک ملازم کو روانہ کر دیتا اور "روپیہ اندر اور کاغذ باہر" کا مقولہ آزما لیتا۔ جب پٹرول خریدتا ہوں تو فی گیلن تقریباً ڈیڑھ روپیہ سرکارِ عالیہ کی خدمت میں بطور ٹیکس ادا کرتا ہوں، اس پر نئے ٹائر، ٹیوب، بیٹری اور حضرتِ مستری کے بل مستزاد ہیں۔ دوکاندار کار دیکھتے ہی پگڑی سیدھی کر لیتے ہیں، کھجوروں سے مکھیاں اُڑا دیتے ہیں اور ڈیڑھ روپے سیر والے سیب دو روپے سیر کے حساب سے میرے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان مصیبتوں کے باوجود سنتری صاحب کی سیٹی صرف میرے لئے مخصوص ہے۔ ٹانگے والا جہاں چاہے گھوڑا دوڑا دے، سائیکل والے صاحب انارکلی میں "سنیک اور لیڈر" کھیلتے چلے جائیں، اُن سے کوئی باز پرس نہیں۔ جہاں مجھ سے ذرا سی چوک ہوئی سنتری صاحب کی سیٹی بجی اور میری کمبختی آئی ؛

کار پر کمر توڑ کسٹم ڈیوٹی اور پٹرول پر گردن توڑ ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ اور تمام اسی روپے کے صرف سے سڑکوں کے عین درمیان وہ بڑے بڑے گڑھے تجویز کئے جاتے ہیں جو کار کی کمانی اور میری اپنی ریڑھ کی ہڈی توڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور میں "سرِ دستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی" کا ورد کرتا رہتا ہوں۔ میں چیختا چلاتا رہتا ہوں، "ٹانگے والا" "آوارہ ہوں" کے فلمی گیت کی تانیں اُڑاتا ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ میں نے بصد عجز عرض کیا "اے کوچوان صاحب، اگر آپ اپنے ٹانگے کو ایک طرف کر لیں تو میری مشکل حل ہو جائے۔" فرمایا "باؤ جی۔

گھوڑانواں ہیں۔" اور میں شاہ عالمی سے لوہاری تک ان کے پیچھے پیچھے گھسٹتا چلا گیا۔
بھینسوں کو مجھ سے خاص دشمنی ہے۔ جب مجھے کہیں جلد جانا ہو تو بھینسیں بھی اسی وقت ہوا خوری کا پروگرام بنا لیتی ہیں۔ مجھ خاکسار اور اس کی کار کو بصد استغنا نظرانداز کرتے ہوئے سڑک کے عین درمیان اور دائیں بائیں نہایت اطمینان سے چہل قدمی میں مصروف رہتی ہیں اور گوبر کے انباروں سے میرا سواگت کرتی جاتی ہیں۔ بھینس والا کبھی کبھار نظر آ جائے تو بڑی مدد کرتا ہے۔ ڈنڈے سے اشارے کرتا ہے تو وہ بھینس جو سڑک چھوڑ دینے پر آمادہ نظر آتی تھی، وہیں سڑک پر آ جاتی ہے۔
گدھے تو خیر گدھے ٹھہرے، وہ مغرب کی سمت جا رہے ہیں۔ میں بھی اسی سمت جانا چاہتا ہوں۔ جہاں میں نے ہارن دیا گدھا صاحب فوراً "اباؤٹ ٹرن" ہو گئے۔ دُم کی بجائے اپنا منہ کار کی طرف کر دیا۔ میں بھی رکتے رکتے اُن کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بھی بڑھے اور سڑک کے عین وسط میں میرے بمپر سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ میں نہایت لجاجت سے عرض کرتا ہوں کہ صاحب رستہ دیجئے، مجھے جلد جانا ہے، بمپر سے پھر کانفرنس کر لینا۔ مگر وہ اپنی تحقیق میں محو ہیں، بمپر سے ہٹانے پر آمادہ نہیں ہوتے، تاآنکہ اُن کا "ڈرائیور" دو چار سلواتیں اور ثقیل قسم کی گالیاں نہ سنا دے۔ حضرت اونٹ جن کی کوئی کل سیدھی نہیں، اُن سے میری ملاقات عموماً نہر کے کنارے پر ہوتی ہے۔ میں نے ہارن دیا اور انہوں نے نہر کی سڑک پر بھاگنا شروع کر دیا۔ نہ دائیں طرف نہر میں چھلانگ لگاتے ہیں، نہ بائیں طرف سڑک سے اترتے ہیں۔ میرے آگے آگے پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنی "میراتھون" شروع کر دیتے ہیں۔ یہ شغل صرف آٹھ میل تک جاری رہتا ہے۔ اور میں اپنی منزلِ مقصود پر ایک گھنٹہ دیر سے پہنچتا ہوں۔ لاہوری بھیڑا دیکھ کر تو میں دم بخود کار ایک طرف ٹھہرا لیتا ہوں، کیونکہ سُنا گیا ہے کہ کئی مائیں بچوں کو ریہڑوں پر ہی تجم دیگر گھوڑے کی رسیاں بچے کے ہاتھ میں دے دیتی ہیں۔

کار کیا ہے؟ اپنے ملکی بھائیوں سے دشمنی کا پروانہ ہے۔ سرمایہ داری کا داغ تو الگ رہا۔ جہاں کہیں خدانخواستہ کسی قسم کا حادثہ ہوا، بیچارے کار والے کی شامت آئی۔ بچہ کسی فوری جذبے کے تحت اچانک سڑک پر آ جائے تو قصور کار والے کا ہے۔ وہ گڈا جس پر ہزاروں من بھوسا لدا ہے اور جس کے "ڈرائیور" کو دائیں بائیں کی تمیز نہیں، کار سے ٹکرا جائے، اس کا انجر پنجر ڈھیلا کر دے تو بھی قصور کار والے کا ہے۔ راہ گیر دائیں بائیں کی تمیز نہ کرتے ہوئے کار کی زد میں آ جائیں تو بھی قصور کار والے کا ہے۔ غرضیکہ ساری دنیا کے جانداروں کو اجازت ہے کہ وہ بغیر آنکھیں کھولے جہاں چاہیں کریں اور جہاں چاہیں چلیں۔ اُن پر کسی قسم کی پابندی نہیں اور نہ انہیں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کی مہم جاری کی جاتی ہے۔ لیکن حادثوں سے بچنے کی ذمہ داری تمام تر کار والے پر عائد ہوتی ہے۔ اور ہر حال میں قصور اسی کا ہے۔

میں معمولی رفتار سے سڑک پر جا رہا ہوں۔ کہ ایک شاعر نما حضرت اچانک فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پر آ جاتے ہیں۔ میرا ہارن چلاتا ہے، بریکیں چیختی ہیں، لیکن وہ مڑ کر نہیں دیکھتے۔ اُن کو بصد مشکل بچاتے بچاتے میں صفر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے، اُن سے ذرا ہٹ کر گذر جاتا ہوں تو مجھے تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "انسانیت! انسانیت!" میں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بھی کوئی مصرعہ ہے اُن کو مکرر مکرر کہتے گذر جاتا ہوں۔

لوگ انارکلی میں تفریحاً جاتے ہیں۔ میرے لئے یہ تفریح بھی ناممکن ہے۔ اوّل تو سنتری جی مجھے چوک نیلا گنبد میں آدھا گھنٹہ ٹھہرا لیتے ہیں اور میرے گرد تانگوں، سائیکلوں، بسوں اور دیگر کاروں کا ایک گروہ جمع ہو جاتا ہے۔ جبتک ازراہ نوازش مجھے چلنے کا اشارہ ملے میرے حواس باختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ کار کو ٹانگے سے بچاؤں تو میرا مڈ گارڈ بس سے جا چپکتا ہے، بس سے بچاؤں تو کسی منسٹر کی نئی کار کا سامنا ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ "جل تو جلال تو" کا ورد کرتا انارکلی میں داخل ہوتا ہوں۔ وہاں عموماً حسین جلوہ ریز ہوں۔ ادائیں فتنہ خیز ہوں۔ ہوائیں عطر بیز ہوں، تو شوق کیوں نہ تیز ہوں" کا عالم ہوتا ہے لیکن اس گنہگار کی نظریں ٹانگوں کے پائیدانوں، کاروں کے بمپروں اور سائیکلوں کے پیڈلوں پر ہوتی ہیں کہ کب میری کار کا بخیہ ادھیڑتے ہیں۔ پٹر دل جلاتا، ہارن بجاتا جگہ ڈھونڈتا ہوں کہ کہیں کار کھڑی کر سکوں، لیکن کاروں اور ٹانگوں کی مسلسل قطار لوہاری دروازہ تک نظر آتی ہے۔ میں بھی رینگتا رینگتا انارکلی کے اخیر تک پہنچ جاتا ہوں اور دل میں شکر بجا لاتا ہوں کہ انارکلی میں کار کے لئے جگہ نہیں ملی تو نہ سہی۔ جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ اتنے میں ایک سائیکل سوار حضرت بجلی کی تیزی سے دائیں بائیں لپکتے، پیچھے سے نمودار ہوتے ہیں اور اپنے دائیں پیڈل کی وساطت سے میرے بائیں مڈ گارڈ پر مختلف قسم کے نقش و نگار چھوڑ جاتے ہیں اور مڈ گارڈ کا کچھ حصہ ساتھ لے جاتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار!

ملہ رنجان، بابو صاحب گھوڑا انا ہے۔

ہماری ڈاک

محبی۔ آداب و نیاز۔ "ماہ نو" کا استقلال نمبر ملا اور سرورق دیکھتے ہی
ب و یاقوت کے جگمگاتے ہوئے ہار، کھیراج اور پی دوت کے دست بند
رنیلم و زبرجد کی بیش بہا انگشتریاں یاد آگئیں۔ سرورق اس قدر حسین اور دیدہ
وز تھا کہ اسے ہی دیکھتا رہا۔ جی کسی طرح تیار نہ ہوتا تھا کہ آگے بھی کچھ ورق الٹ کر
یھوں منظومات اور مضامین کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ اور
ی بات ہوگی۔ آپ کا انتخاب قابل قدر اور ہر لحاظ سے لائق صد تحسین ہے۔
یری داد تحسین ناشناس سہی لیکن داد دئے بغیر چپ بھی نہیں رہا جا سکتا۔

جناب ادریس صدیقی صاحب کا مضمون بے حد دلچسپ اور معلومات
وا ہے۔ آپ ایسے مضامین شائع فرما کر ادب کے علاوہ ہمارے ملک کی
ذیب و ثقافت کی ایک بے مثال خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔
ا "ماہ نو" کو سلامت رکھے کہ اس کی بدولت اپنے آبا کے مدائن کی سیر تو
جاتی ہے۔

جناب ابوالفضل صدیقی صاحب کا "بکھیڑے" بیحد پسند آیا۔ میں بہت
ہنستا ہوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بعض مقامات پر بے اختیار ہنس پڑا۔
کی ہندی دانی کی تعریف فضول ہے۔ ان کی ساری عمر مہاجنوں، بنیوں،
رتوں اور دودانوں میں گذری ہے۔ وہ ہندی نہیں لکھیں گے تو اور کون
ے گا؟

مخدومی و مکرمی ڈاکٹر باقر صاحب قبلہ کا غصہ بجا ہے لیکن انہوں نے
جھے درباراداروں کی فہرست میں گنوایا ہے، یہ مجھ پر ظلم ہے۔ وہ جو کچھ فرماتے
بجا ہے۔ لیکن انہیں شعرا کی افتاد طبع کا احترام تو کرنا چاہئیے تھا۔ بہرحال
ستاد ہیں اور سعادت مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ استاد کی گھڑکیاں بھلی
ں اور سامنے "ٹھوکنا" اچھا نہیں۔

آپ کا ۱۸۵۷ء مئی نمبر کا اعلان پڑھ کر کلیجے پر چھریاں چل گئیں۔ جیسے
چہار درویش" کا پہلا درویش بعینہ یہی واقعات دہراتا ہے اور ۱۸۵۷ء
بعد اسیران وطن کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے تخلیق پاکستان تک آکر حضرت
عظم کی ایک تقریر سنا کر اپنا بیان ختم کر دیتا ہے۔ افسوس! یہ نظم پہلے
ہمایوں" میں چھپ چکی ہے۔ —————— جعفر طاہر

مکرمی۔ سلام نیاز
میں مستقل طور پر تو نہیں، البتہ اکثر "ماہ نو" کا مطالعہ کرتا ہوں۔
میرے نزدیک "ماہ نو" اردو ادب اور پاکستانی ثقافت کی بڑی ٹھوس خدمات
انجام دے رہا ہے۔ "جمہوریہ نمبر" دیکھ کر تو آپ کو بے اختیار آپکو مبارکباد
پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس سے قبل کئی دفعہ یہ چیز میرے ذہن میں کھٹکی کہ "ماہ نو" باوجود
ہر قسم کے وسائل مہیا ہونے کے ٹائپ میں کیوں طبع نہیں ہوتا، جب کہ "ماہ نو"
اردو زبان و ادب کی ترقی کا بہت بڑا علمبردار ہے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ
نہیں کہ لیتھو کی چھپائی اردو کی خاطر خواہ ترقی میں بڑی رکاوٹ ہے۔ پھر یہ
سوچ کر کہ نہ جانے "ماہ نو" کن مصلحتوں کی بنا پر لیتھو میں چھپ رہا ہے،
خاموش ہو جاتا رہا ہوں۔ اب جمہوریہ نمبر کے چند صفحے ٹائپ میں چھپے ہوئے دیکھ کر
بیحد مسرت ہوئی اور بے اختیار یہ سطور لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ آپ خود دونوں
چھپائیوں کا موازنہ کریں اور قارئین سے بھی دریافت فرمائیں۔ نتیجہ یقیناً میری
رائے سے اتفاق کی صورت میں نکلے گا۔

اگر اس اقدام میں کوئی مانع نہ ہو تو جلد یا بدیر "ماہ نو" کو ٹائپ میں
طبع کرانے کا انتظام فرمائیں۔ فی الحال چند صفحات ٹائپ کے شامل کیے
جا سکتے ہیں۔ اگر تجربہ مفید صورت میں نکلے تو سارے کا سارا "ماہ نو"
ٹائپ میں طبع ہونا چاہئیے۔ پھر جب آپ دوسری زبانوں کے رسائل ٹائپ
میں طبع کراتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم اردو پڑھنے والوں کو اس سے محروم
رکھا جائے؟ امید ہے آپ یہ انتظام فرما کر اردو خواں طبقے پر بہت بڑا احسان فرمائیں گے۔

مخلص محمد احمد

محترم مدیر۔ تسلیم — بچپن سے لیکر مجھے اردو زبان کے ساتھ دلچسپی رہی ہے۔
اب تک کسی رسالہ کا خریدار نہیں بنا۔ "ماہ نو" کے اوراق، کتابت اور طباعت کی خوبی کو بہت
پسند کیا۔ اب اصل معاملہ یہ ہے کہ میں مندرجہ ذیل شرائط کی بنا پر خریدار بننے کیلئے تیار ہوں۔

۱۔ میری نظمیں اور مقالات معیاری ہونے کی صورت میں آپکو "ماہ نو" میں شائع
کرنے ہونگے۔ معمولی سی اصلاح و ترمیم کا آپکو حق حاصل ہوگا۔ "ماہ نو" میں شائع
شدہ منظومات یا غزلیں اس کے حوالے سے کسی رسالہ یا اخبار میں شائع کرا سکوں گا۔

۲۔ منظومات، مضامین اور مقالات کی اشاعت کے عوض آپکو کوئی معاوضہ ادا نہ کرنا ہوگا۔

۳۔ نظم یا غزل یا مضمون کے ابتدا میں نام پورا لکھنا ہوگا یعنی م۔ش۔ق ہوشیار
پوری ..... لائلپور۔ صرف "ق ہوشیاری" پر اکتفا نہ کیا جائے گا۔ ٹائیٹل پر آپ
صرف ق ہوشیار پوری لکھ سکتے ہیں۔

خمستانِ فرنگ

بقیہ: ص ۲۳

جانتا تھا اور بعض جگہ جہاں ٹکلسن یا آربری الجھ یا بھٹک جاتے تھے اور وِڈن خود بھی ایک طرح سے بے بس ہو جاتا تھا تو اس کا وہ دوست فارسی کی اصل نظم کو دیکھ کر اس کی دستگیری کرتا تھا اور یوں یہ نہایت مشکل کام اپنی تمام دقتوں کے باوجود سرانجام پا گیا۔

ترجمے کی دشواریوں سے گذر کر اب وِڈن اقبال کی شاعری کی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ کہہ رہا تھا کہ اگرچہ اس نے دوسری زبانوں کے شاعروں کے کلام کو بھی اکثر ڈچ زبان کے سانچے میں ڈھالا تھا اور ان ترجموں کے بہت سے مجموعے بھی شائع کئے تھے لیکن معانی کی جتنی مشکلیں اس کو کلامِ اقبال کا ترجمہ کرتے وقت پیش آئی تھیں، اس کا اندازہ وہی کچھ کر سکتا تھا یا اسکے وہ دوست جو اس کو اقبال کے شعروں پر سر دھنتے ہوئے دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ اس کے نزدیک اقبال واقعی بہت بڑا شاعر تھا اور اس کی عظمت سے انکار کرنا کم از کم اس کے لئے ناممکن تھا۔ دراصل اس کی عظمت ہی کا یہ سحر تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اس بے حد دشوار کام کو سرانجام دینے کے لئے رضامند کر لیا تھا۔ اقبال کو اپنے مطلب کے اظہار پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ان تمام شعرا میں جن کا کلام اس نے ترجمہ کرنے کی غرض سے مطالعہ کیا تھا، اقبال کو نہایت بلند اور ارفع مقام پر پایا تھا۔

میں اب وِڈن سے ایک ایک کر کے اقبال کی اُن نظموں کے عنوان جاننا چاہتا تھا جن کا اس نے ترجمہ کیا تھا اور پھر اپنے ذہن میں اُن نظموں کے اصل متن کو لا کر اُن کے ترجمہ شدہ مفہوم سے آشنا ہونا چاہتا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ ڈچ ترجمے میں اصل خیال کے کہاں تک نقش و نگار باقی رہ گئے تھے کہ ہورنک کو، میں نے ہماری اس تمام گفتگو میں کم ہی دلچسپی لی تھی اور جو کرسی پر بیٹھا اب اونگھنے بھی لگا تھا، یکایک جیسے دورہ سا پڑا۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا اور مجھے بتایا کہ ہیگ کے لئے آخری گاڑی چھوٹنے میں صرف چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اور اگر مجھے کل صبح تک یہیں نہیں رہنا تھا تو مجھے فوراً اسٹیشن پر پہنچنا چاہیئے تھا۔ صبح تک ایمسٹرڈم میں رہنے کے تصوّر نے جیسے مجھے خواب سے چونکا دیا۔ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا۔ نہایت عجلت میں مسز وِڈن سے، جو ہمیں اس تمام عرصے میں بار بار کافی پلاتی رہی تھی، رخصت طلب ہوا۔ وِڈن میرے ساتھ اسٹیشن تک جانے کا تہیّہ کر چکا تھا۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ راستے میں بھی اقبال کے بارے میں اس سے گفتگو کروں گا۔ مگر اسٹیشن اتنا قریب تھا اور ہورنک نے کار کو اس قدر تیزی سے چلایا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں گاڑی پر سوار نہ ہو سکتا تھا۔

قدیم وادیٔ سندھ کی معاشرت

بقیہ: ص ۴۷

گیا ہے کہ یہ لوگ سماوی اثرات کے قائل تھے اور علم نجوم سے کچھ نہ کچھ شغف رکھتے تھے۔ بعض محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہاں کے لوگوں کا سال شمسی حساب سے تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا گیا ہے کہ دریائے سندھ میں برسات کے خاص مہینوں میں طغیانی اور اسی طرح مقررہ مہینوں میں جاڑے اور گرمی کے موسم آتے ہوں گے اور موسموں کی یہ تبدیلی سورج کے عمل کے تابع ہے۔ چنانچہ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ لوگ چاند کی بہ نسبت سورج سے زیادہ عقیدت رکھتے ہوں گے۔ اس کے مزید ثبوت سواستکا کے بہت سے نشانات کا پایا جانا بھی ہے جو سورج کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

جو باقیات اب تک دریافت ہوئے ان سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں کے اہلِ علم و حکمت، وید، جوتشی اور ساحر پر مشتمل تھے جنگجو طبقہ کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ برچھیاں، تیر اور دوسرے اوزار اتنے اچھے نہیں ہیں کہ ان سے لڑ کر کوئی جنگ جیتی جا سکے۔ حکام میں حکومت کے عمال اور بندیہ کے ملازمین تھے۔ یہاں ایک تجارت پیشہ قوم آباد تھی۔ بقیہ لوگ صنعت کار اور اہلِ حرفہ تھے۔ مثلاً کاشتکار، مچھیرے، ملاح، بھیڑوں اور گایوں کے چرواہے، گاڑی بان، گھریلو نوکر، زرگر، عقیق اور ہاتھی دانت کے کاریگر، کمہار، کھلونے بنانے والے، کسیرے، راج، معمار، مکان بنانے والے مزدور، لکڑہارے، سنگ تراش اور مہر تراش، ان تمام پیشہ وروں کی موجودگی کے کچھ نہ کچھ شواہد ضرور ملتے ہیں۔

"معلق شاہراہ" ———— بقیہ: صفحہ ۳۲

"چاندنی ہے ارے ـــ" ضیا چلایا "یہ تو کوئی زنداں معلوم ہوتا ہے۔" ضیا کا قہقہہ اس زنداں میں یوں دب کر رہ گیا جیسے پریس کے نیچے روئی دب جاتی ہے۔

"بھائی وہ سنتری" عمر بآوازِ بلند چلایا۔ "میں نے کہا مسعود"

وہ چیخ کر بولا "اماں میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"عمر کے ہونٹ ہل رہے تھے غصے میں، وہ یوں ہاتھ چلا رہا تھا جیسے سینما میں آواز خراب ہو جانے پر تصویریں خالی ہونٹ ہلاتی ہیں۔

"یہ عمر کیا کہہ رہا ہے؟" ضیا بولا۔

"بھئی واہ" مسعود قہقہہ مار کر ہنسا۔ "یہ تو لاجواب جگہ ہے۔ یہاں تو خالی ہونٹ ہلتے ہیں، آواز نہیں نکلتی۔ بیاہے ہوئے لوگوں کو اپنی بیویوں کو یہاں لے آنا چاہیئے تاکہ نہ اُن کا جھگڑا سنائی دے نہ گھر کا سکون تباہ ہو۔"

"اچھا سکون ہے۔" ضیا بولا "یہاں تو ویسے ہی رونگٹے کھڑے رہیں گے۔"

"ذرا قریب ہو کر بات کرو تو کچھ پتہ بھی چلے۔" مسعود بولا۔

ہر کوئی کھڑا اپنے ہونٹ ہلا رہا تھا ہر کوئی چلا رہا تھا۔

"بھئی واہ" مسعود تالیاں بجاتے ہوئے چیخنے لگا۔ "اسمبلی ہاؤس تو یہاں بننا چاہیئے، ہر کوئی چلائے اور کسی کی کوئی نہ سنے کے منظر کی یہاں تکمیل ہو جائے گی۔"

عمر بھاگا بھاگا آیا، اس نے سب کو گردن سے پکڑا، ایک مقام پر اکٹھا کیا اور پھر چلا کر کہنے لگا "بھئی آگے جانا ہے کہ نہیں؟ وہ سنتری مہملا ہے، کہتا ہے اب ادھر سے کوئی گاڑی ناران کی طرف نہیں جا سکتی۔ ٹائم ختم ہو گیا ہے، اس نے پھاٹک بند کر رکھا ہے۔"

"بے کار ہے" مسعود چلایا۔ "وہ ہماری بات سنے گا ہی نہیں۔ چاندنی میں کوئی شخص دوسرے کی بات نہیں سن سکتا۔ میں اپنی ماں اور بیوی کو یہاں بھیج دوں گا، بڑی محبت سے رہیں گی یہاں وہ۔" وہ تالیاں بجاتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"بے وقوف" عمر چلایا۔ "وقت گزرتا جا رہا ہے۔ سنتری کو منا لو تو مزے میں رہیں گے ورنہ رات یہاں گزارنی پڑے گی۔"

"میں کہتا ہوں سنتری کو ایک روپیہ تھما دو۔" ضیا چلایا۔

"تو تم دے دو نا، سے روپیہ" عمر چلایا۔

"نہ بھئی۔" ضیا نے کہا "یہ مشکل بات ہے۔ اپنے کو اس کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔"

روپیہ دینے سے باری باری سب نے انکار کر دیا۔ عمر کہنے لگا میں تو دھونس دکھا سکتا ہوں، روپیہ نہیں دے سکتا۔ عبداللہ بات سن کر ہنس دیا۔ اس کی خاموشی مفہوم سے لبریز تھی۔ اسحاق بولا "بھائی لینے کا معاملہ تو ٹھیک ہے، رشوت دینے کا تجربہ نہیں۔" ابھی میری باری نہیں آئی تھی کہ مسعود چلانے لگا۔ "روپیہ دینے کا کیا ہے؟" وہ بولا "روپیہ میں دے دوں گا، کہو تو پانچ دے دوں لیکن بات نہیں کرنا ہو گی۔"

سنتری سے بات کرتے ہوئے۔ عمر جوش میں آ گیا اور روپیہ دینے کی تفصیل کو بھول کر دھونس دکھانے لگا۔ "آخر کیوں نہیں کھولتے تم پھاٹک؟" وہ چلایا۔ "ہم اپنی غلطی کی وجہ سے لیٹ نہیں ہوئے۔" ادھر عمر چلا رہا تھا، ادھر سنتری یوں خاموشی سے پہاڑوں کی طرف گھورنے میں لگا ہوا تھا جیسے وہ سپاہی نہیں بلکہ عاشق ہو اور اس کی محبوبہ پہاڑ کی اس چوٹی پر رہتی ہو۔ دفعتاً مسعود ڈرامائی انداز سے آگے بڑھا اور بات کئے بغیر سنتری کے ہاتھ پر روپیہ رکھ کر بولا۔ "دیکھنا تو بھائی یہ روپیہ کھرا ہے۔" سنتری چونکا۔ اسے بجانے لگا۔ یہ دیکھ کر مسعود آگے چل پڑا۔ جب سنتری نے کہا "ہاں ٹھیک ہے۔" تو وہ دور جا چکا تھا "کھرا ہے بابو۔" سنتری نے چلا کر کہا لیکن مسعود چلتا گیا۔ سنتری نے حیرانی سے ہماری طرف دیکھا اور پھر روپیہ جیب میں ڈال از سر نو بت بن کر بیٹھ گیا اور سامنے پہاڑ کی چوٹی کو گھورنے لگا۔

"ہمیں جواب دو نا ـــ" عمر نے چلا کر کہا لیکن سنتری چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"کہنوں۔" ضیا چلایا "بے کار ہے۔" یہ کہہ کر وہ دریا کی طرف چل پڑا۔ اسے آتے دیکھ کر ہم سب وہاں سے سرک آئے۔ صرف عمر وہاں کھڑا رہ گیا۔ وہ چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، اس کے منہ سے کف جاری تھے لیکن وہ ابوالہول سنتری یوں چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے پان فروش چپ چاپ ریڈیو کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔

غزلیں

نہیں کہ ہم نے کبھی حالِ سوزِ جاں نہ کہا
مگر بہ حیلۂ آرائشِ بیاں نہ کہا

دوہے

دوہے کبت کہہ کہہ کے عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھے نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

گیت

خود لکھوں یا کوئی اور لکھے
سب گیت مرے

جمیل الدین عالی

جمیل الدین عالی کی آواز مدت سے جانی پہچانی ہے۔ اب ان کا مجموعۂ کلام شائع ہو رہا ہے:

"غزلیں، دوہے، گیت"

ناشر: مکتبۂ نیا دور، کراچی

قیمت عہ/

"اقبال اور تصورِ خودی" ——— بقیہ: صفحہ ۱۵

فکر کی رسائی محدود ہے اس لئے وہ لامحدود کو نہیں سمجھ سکتا۔ فکر اپنی عمیق حالت میں اس لامتناہی محیط کل تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کی خود کش حرکت میں مختلف متنہاہی تصورات محض لمحات کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا فکر اپنی اصلی نوعیت کے لحاظ سے جامد نہیں حرکی ہے اور بتدریج اپنی داخلی لامحدودیت کو زماں میں ظاہر کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک حرکی خود اظہار کل ہے جو ہم کو متعین شکلوں کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔ فکر کائنات کی زندگی میں "تدریجی شرکت سے اپنی محدودیت کی حدود کو توڑ کر داخلی لامحدودیت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے بے معنی تصور کرنا درست نہیں کیونکہ وہ اپنے طور پر متناہی کو لامتناہی کی خبر دیتا ہے۔" (الکچرز صفحہ ۶)

وجد کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہمارا قلب ایک قسم کی داخلی بینائی ہے یہ ہم کو حقیقت کے ایسے پہلوؤں کا مشاہدہ کراتی ہے جو مشاہدہ اور فکر سے نظر نہیں آ سکتے۔ یہ بینائی کوئی پُراسرار حس نہیں ہے بلکہ حقیقت کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے جس میں ظاہری حواس کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ گو اس تجربے کا منطقی لحاظ سے تزکیہ ممکن نہیں تاہم علم کے ایک ذریعے کے لحاظ سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فکر اور وجد متضاد اور مخالف تجربات نہیں ہیں۔ زبور عجم میں کہتے ہیں ؎

عقل ہم عشق است و از ذوق نگہ بیگانہ نیست

ان کے خیال میں ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں۔ ایک حقیقت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کا جائزہ لیتا ہے، دوسرا اس کا کلیتہً نظارہ کرتا ہے۔ ایک کی نظر حقیقت کے خارجی پہلو پر ہوتی ہے دوسرے کی داخلی پہلو پر۔ دونوں کو باہمی احیا کے لئے ایک دوسرے کی ضرورت ہے ؛

انسانی خودی اسی علم کے ذریعہ حقیقت کو سمجھنے اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق بنانے کی سعی کرتی ہے اور اسی ہتھیار سے حقیقت کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر فتح حاصل کرتی ہے ؛

اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کی اس تشریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی کا واحد مقصد خودی کا استحکام و ارتقا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خودی کے استحکام کے لوازمات کیا ہیں اور وہ کونسی باتیں ہیں جو خودی کو کمزور کر کے اس کے انہدام کا باعث ہوتی ہیں۔ اقبالؔ نے اقدار کا معیار بھی پیش کر دیا ہے، جس سے اعمال و افعال کی اچھائی برائی پہچانی جا سکے۔ ہر وہ عمل جو خودی کو چمکائے، ابھارے مستحکم کرے احسن ہے، صواب ہے عبادت ہے۔ ہر وہ عمل جو خودی کو مضمحل کرے، کمزور کرے، مٹائے برا ہے گناہ ہے ؛

سیدھی پیٹھ
اور
مضبوط اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچے کو یہ خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK

اس کا عملی نتیجہ : بچوں میں پڑھائی کا بڑھتا ہوا شوق

سرحد(مغربی پاکستان) میں تعلیمی ترقی

سال نئی ہود کو تعلیم کا راستہ دکھا رہی ہے

بچیوں کا تعلیمی شوق

لان قوم کی تعلیم کے لئے جگہ جگہ نئے نئے اسکول کھل رہے ہیں

ماہِ نو
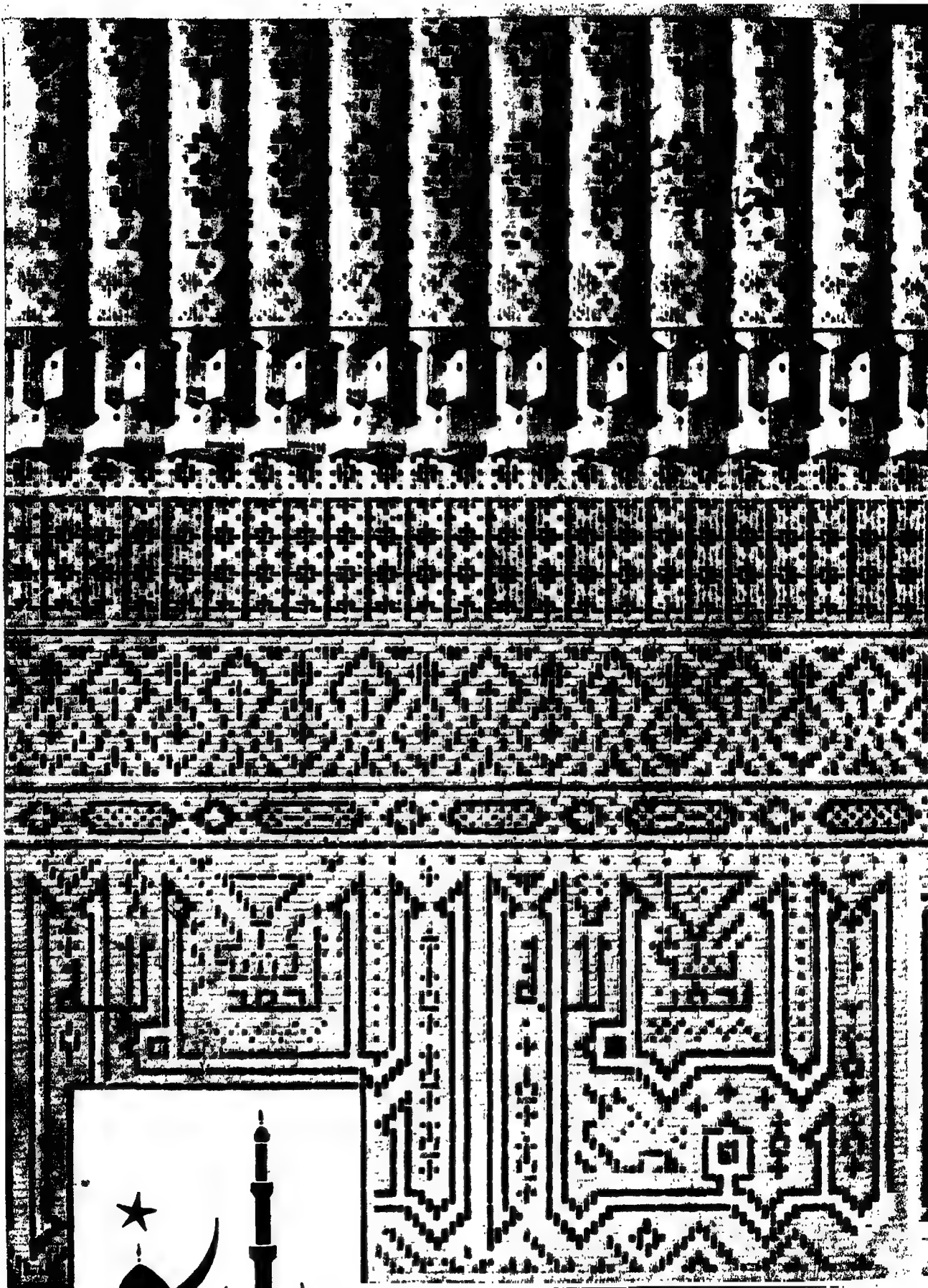
یادگار تحریک آزادی ۱۸۵۷ء

جنگ آزادی کا ایک مورچہ
کوہ مری

(ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۵۶ پر)

مال روڈ کا وہ حصہ جہاں انگریزی فوج نے
مجاہدوں پر گولیاں برسائیں

مری کا ایک عام منظر

یہیں زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو پہلے پہل ایک
انگریز نووارد نے ساٹھ روپے کو خریدا تھا!

ماہِ نو

جلد ۱۰ شمارہ ۲

مئی ۱۹۵۷ء

خاص نمبر

بیادگار تحریک آزادی ۱۸۵۷ء

مدیر ـــ رفیق خاور

نائب مدیر ـــ ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

قیمت خاص نمبر: ایک روپیہ چار آنہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

سرورق: امیر تیمور صاحبقران، بانی سلسلۂ تیموریہ کی آخری آرامگاہ (سمرقند)
دیواروں کی نقاشی

آپس کی باتیں

وہ طلسم جو غلبۂ فرنگ سے ہم پر مدتوں طاری رہا اور جس کی وجہ سے ہم ہر بات کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، اب ٹوٹ چکا ہے۔ اب ہمارا نقدِ خودداری بہائے دیدۂ اغیار نہیں رہا۔ آزادی نے ہماری خودی کو پھر سے زندہ کر دیا ہے اور وہ تمام پردے اٹھا دئے ہیں جو مدت سے ہمارے دیدہ و دل پر چھائے ہوئے تھے۔ اب ہم حالات کو صحیح رنگ میں دیکھ سکتے ہیں اور ان کے متعلق صحیح رائے بھی قایم کر سکتے ہیں :

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اس تبدیلیٔ نظر کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ایک وقت تھا جب اس واقعہ کو "غدر" اور "رستخیزِ بے جا" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور ہم اس کو جنگِ آزادی قرار دینے سے گریز کرتے تھے۔ وجہ ظاہر ہے، جب تک انگریزوں کا غلبہ رہا اس کے معنی تھے بغاوت کا اقرار۔ یعنی مسلمانوں پر حکومت کے خلاف ہونے کا جو الزام عائد کیا جاتا تھا اس کو وہ خود تسلیم کریں اور اپنے آپ کو تعزیر و سیاست کا تختۂ مشق بنائیں اور یہی مصلحت یہی تھا کہ ہم اس بغاوت سے انکار کریں، خود کو حکومت کا وفادار قرار دیں اور یہ کہیں کہ ہمیں ان باغیوں سے کیا سروکار؟ ہم تو شروع ہی سے سرکارِ دولت مدار کے خیرخواہ ہیں اور آئندہ بھی اسی کے حلیف رہیں گے ؎

حلقۂ پیرِ مغانم ز ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

آج یہ بات نہیں رہی، آج ہم بے باکی سے حقیقت کا اعلان کر سکتے ہیں، آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ باغی نہ تھے، مجاہد تھے۔ یہ ملک و قوم کی ناموس کے نگہبان تھے، وہ بر حق تھے، انہوں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ جس چیز کو "غدر" کہا جاتا ہے وہ آزادی کی جنگ تھی، رستخیزِ بجا تھی۔ اسی لئے ہم آج ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار منا رہے ہیں۔ یہ ایک قومی یادگار ہے۔ اس پر ہم اپنا سر فخر سے بلند کر سکتے ہیں اور سرخروئی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے جراُت مندانہ اقدام سے ملت کی لاج رکھ لی۔ آئیے ہم ان غیر فانی شخصیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔ سلام ان جواں مردوں کو جنہوں نے ملک و قوم کی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھائے اور میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہوئے۔ اسلام ان سعید روحوں کو جنہوں نے جہاد کی تحریک جاری کی! سلام ان شہیدوں کو جنہوں نے اس مقدس مقصد کے لئے اپنی جانیں قربان کیں! یہ وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہوں نے مل جل کر ہماری دوسری جنگِ آزادی کی بنیاد رکھی اور "ایک آنے والی اسلامی حکومت" کے لئے راستہ ہموار کیا۔ آج یہ تمام جلیل القدر ہستیاں زندہ ہو کر ہمارے سامنے آتی ہیں اور ہم ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ شمارہ اس حقیر مگر پر خلوص پیشکش کے سوا اور کچھ نہیں۔ اے کاش ہم اس کو زیادہ وقیع اور ان زندۂ جاوید ہستیوں کے شایانِ شان بنا سکتے ۔

یہ شمارہ اس یادگار ملی واقعہ اور ان نامور شخصیتوں سے منسوب ہونے کی بنا پر ایک ملی شمارہ ہے۔ اس میں ایک خاص روح، ایک خاص لگن کام کر رہی ہے، اور لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے دلی شوق سے لکھا ہے۔ جب اس شمارے کی تیاری شروع ہوئی تو اس موضوع سے متعلق ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا اور نہ کوئی غیر معمولی مواد فوری طور پر دستیاب ہونے کی امید تھی۔ اس کے باوجود جیسے یک بیک کوئی ہر دلعزیز تحریک جاری ہو گئی ہو، نئی نئی انمول چیزیں ہاتھ آتی گئیں اور وہ بھی اس کثرت سے کہ ان کو سمیٹنا مشکل ہو گیا۔ ان میں سے جو چیزیں منتخب تھیں اور بر وقت موصول ہو گئیں، وہ آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثلاً جمیل الدین عالی کا "فرشتوں کا لکھا"۔ یہ بڑی انوکھی چیز ہے۔ مضمون نگار نے حقائق کو ترتیب دے کر اس طرح ایک افسانہ لکھا ہے کہ اس پر افسانہ ہونے کا یقین نہیں ہوتا۔

ایک ایسی ہی چیز کو ہسادری کا ہنگامہ ہے جو رپورتاژ کا رپورتاژ اور حقیقت کی حقیقت ہے ؛

دکن اور سندھ کے واقعات عام طور پر نظروں سے اوجھل رہے ہیں لیکن ذوق تخلیق نے یہاں کی تحریکات آزادی کا بھی سراغ لگا کر چھوڑا۔ سندھ میں جو محاربات ہوئے ان کے متعلق ہمیں سندھی ادبی بورڈ کے توسط سے بہت کار آمد مواد حاصل ہوا جس کو ہمارے مضمون نگار نے بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے، اس طرح کہ اس سے یہاں کی تحریک کا ملی پہلو نمایاں ہو ؛

ایک اور مضمون "شہزادہ فیروز شاہ" سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ تحریک آزادی کا آغاز ۱۰ مئی ۵۷ء کو نہیں ہوا بلکہ اس کے مظاہرے اس سے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے۔ اور اس بنا پر ہمیں اس کی تاریخ آغاز کو بدلنا ہوگا۔ یہ ایک بڑا اہم انکشاف ہے ؛

نظم کی مہم نثر سے زیادہ کٹھن تھی کیونکہ شاعری تمام تر دل کی بات ہے۔ ممکن ہے شاعر کے دل میں وہ چبھک نہ پیدا ہو جو ایک پُر تاثیر قومی نظم یا گیت کو جنم دے۔ یہاں بھی اس پُر اسرار جذبے نے کام کیا جو خبر نہیں کیسے طلسمی طور پر شعراء کے دل میں یکایک پیدا ہو گیا۔ اس میں کچھ ہماری اپنی لگن کو بھی دخل تھا جس نے اہل قلم کو اس ملی خدمت میں شریک ہونے کی ترغیب دلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ چنانچہ ہمارے جواں فکر شاعر صہبا اختر کو غنائیہ کی شکل میں ایک سیر حاصل مدوجزر اسلام لکھنے پر اکسایا اور انہوں نے تنگیٔ وقت کے باوجود اس کٹھن کام کو عملی جامہ پہنایا۔ اسی طرح عبدالرؤف عروج نے آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر کی زبان سے ان کا دلدوز مرثیہ لکھا جو افسانہ بھی ہے اور حقیقت بھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بڑی خندہ پیشانی اور گرمجوشی سے اس ملی شمارے کی تکمیل کو اپنا فرض گردان کر اس کی تیاری میں ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ "ماہ نو" کے نگراں جناب شان الحق حقی نے بھی مواد اور تصاویر کی تلاش میں بڑی کاوش کی۔ ان کو ظفر کے کلام کے ساتھ خاص لگاؤ ہے اور انہوں نے اس پر بہت کچھ کام بھی کیا ہے۔ ظفر کے کلام کا انتخاب اور تعارف کچھ ان ہی کے قلم سے موزوں تھا ؛

فرائض منصبی سے قطع نظر مجھے مسرت ہے ـــــ اور اس کے لئے واحد متکلم ہی میں بات موزوں معلوم ہوتی ہے ـــــ کہ میرے ہاتھوں یہ کام سر انجام پایا۔ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی ملی شمارے پیش کئے گئے ہیں اور کافی مقبول ہوئے ہیں لیکن میری ذاتی دلچسپی اور ذوق و شوق زیادہ تر اسی شمارے میں بروئے کار آیا ہے۔ گویا یہ میری اپنی ہی تخلیق ہو اور محبوب ترین تخلیق! یہ شمارہ میری ہی نہیں، ہم سب کی ذاتی پیشکش ہے، یہ ہمارے دل کی آواز ہے، اس میں ہماری پوری ملی روح بول رہی ہے کیونکہ اس کا موضوع ہم سب کا اپنا چہیتا موضوع ہے اور اس کے متعلق خود بخود کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ بہر کیف آج ہم سب نے مل کر ایوانِ ملی میں ایک شمع روشن کی ہے۔ اور امید کرتے ہیں کہ اس کی لو سب کے دلوں میں جگہ پیدا کرے گی ؛

ہم ان تمام اصحاب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس خصوصی شمارۂ ملی کی ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ امید ہے وہ آئندہ بھی اسی ذوق و شوق کے ساتھ ادب و فن اور حیات ملیہ کو نمو دینے میں ہمارا ساتھ دیں گے ؛

آخر میں اس دور کے متعلق چند الفاظ بے جا نہ ہوں گے جس میں کشمکش آزادی کے ابتدائی ہنگامے برپا ہوئے اور جو قدیم و جدید دوروں کے مابین برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اورنگزیب کی وفات سے لے کر ۵۷ء تک کے زمانہ کو عموماً زمانۂ تنزل خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر کہیں بہت ہی تاریک اور گھناؤنی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ بالکل ویسی ہی جو حالی کے "مسدس مدوجزر اسلام" میں پیش کی گئی ہے۔ واقعات اس تصور کی تردید کرتے ہیں۔ کیونکہ قوم میں ہر قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ تباہی کا باعث طاقت کے دعویداروں کی باہمی کشمکش تھی نہ کہ طاقت کا فقدان۔ اس میں فاتحین کے زیادہ منظم اور طاقتور یا ایک تہذیب کے دوسری تہذیب سے بہتر ہونے کا سوال بھی نہ تھا۔ جس دور میں اس قدر زبردست تحریکیں جاری ہوں، اتنی بڑی بڑی ہستیاں، بڑے بڑے مجاہد معرکہ آرا ہوں، اس کو دور تنزل کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس شمارہ کے مضامین سے یہی احساس پیدا ہوتا ہے اور ہمیں اپنے منفی تصور کو تبدیل کرنے پر مجبور کرتا ہے ؛

آخری مغل تاجدار — ابوظفر بہادر شاہ ثانی

بندۂ بادشاہِ مطلق ہوں　　گرچہ رکھتا ہوں تاجِ زر ہوں کون؟
کوئی پہچانتا بھی ہے مجھ کو　　شاہ ہوں یا گدا ظفر ہوں کون؟

مجدد الف ثانی سے سید احمد شہید تک

محمد علی عثمانی

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سید شیخ احمد سرہندیؒ ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ "سرہند" کے لفظی معنی ہیں "شیروں کی کچھار"۔ اس قصبہ کو فیروز شاہ تغلق نے بسایا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک بار فیروز تغلق پنجاب کا خزانہ لے کر دہلی جا رہا تھا، راستہ میں سرہند کے مقام پر مقیم ہوا جو اس وقت ایک ویرانۂ محض اور شیروں کی آماجگاہ تھا۔ ایک مرد بزرگ، جو "صاحب کشف" کے نام سے مشہور تھے، شاہی قافلہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے فیضان روحانی سے یہ پیش گوئی کی کہ جس مقام پر شاہی دستہ مقیم ہے وہاں ایک بہت بڑا مصلح پیدا ہوگا جو اسلام کو سربلند و سرخرو کرے گا۔ اس پیشین گوئی کی خبر جب فیروز شاہ کو پہنچی تو اس نے مصلح اسلام کی پیدائش اور اس پیشین گوئی کی یادگار قائم کرنے کے لئے اس مقام پر ایک شہر بسائے جانے کا حکم دیا۔ شہر کی بنیاد حضرت امام ربانی کے جد بزرگ حضرت امام رفیع الدینؒ اور حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ نے مل کر ڈالی۔ حضرت قلندرؒ نے فرمایا کہ جس ہستی کی پیدائش کے انتظار میں اس شہر کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے، وہ شاہ رفیع الدین کی نسل سے ہوگا*۔

۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو "صاحب کشف" کی پیشین گوئی نے یوں حقیقت کا جامہ پہنا کہ حضرت شیخ عبد الاحد کے گھر ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام احمد رکھا گیا۔ مخدوم شیخ عبد الاحد حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ کے مرید تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر، بیرم اور ماہم کے اثر سے آزاد ہو کر مطلقانہ سلطنت کی ابتدا کر چکا تھا۔ اور اس مذہبی پالیسی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی جس کے رد کے لئے قدرت نے شیخ احمدؒ کو جنم دیا تھا۔ اس انتظام میں قدرت کا ہاتھ کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ شیخ مذکور نے اوائل عمر ہی سے غیر معمولی ذہانت اور دانش کا ثبوت دیا۔ انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں فقہ، حدیث، صرف و نحو اور دوسرے تمام مروجہ علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ چھوٹی سی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا، جو اس عمر کے بچے کے لئے بڑی غیر معمولی بات سمجھی گئی۔ انہوں نے اول اول اپنے پدر بزرگوار شیخ عبد الاحد سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیالکوٹ گئے، یہاں مولانا کمال کشمیری سے کسب فیض کیا۔ مولانا موصوف بڑے مشہور استاد، عالم دین اور فقیہہ تھے۔ لیکن شیخ احمد نے تعلیم حدیث کی تکمیل مولانا یعقوب کشمیری سے کی جو اپنے وقت کے بہت بڑے عالم حدیث تھے اور جن کا قول حدیث کے بارے میں سند سمجھا جاتا تھا۔ سیالکوٹ سے نوجوان شیخ آگرہ تشریف لے گئے تاکہ علم کی دوسری شاخوں میں تکمیل حاصل کریں۔ وہاں ان کی ملاقات ابو الفضل اور فیضی سے ہوئی، جو اکبر کے دربار کے نہایت ممتاز فضلا تھے۔ یہ دونوں بھائی، جن کا نقطۂ نظر خلافِ اسلام سمجھا جاتا تھا، اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود حضرت شیخؒ کو متاثر کرنے سے قاصر رہے۔ شیخ نے جلد ہی یہ اندازہ کر لیا کہ یہ دونوں اسلام کے راستے سے دور جا پڑے ہیں۔ ان کی تعلیم اور ان کی سرگرمیاں صوفیت کے پردہ میں ہندو ویدانتی اور سراسر خلافِ اسلام تھیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ شیخ موصوف نے خود طریقۂ سلوک میں تربیت پائی تھی۔ نیز یہ بات یاد رکھنی بھی بہت ضروری ہے کہ برصغیر کے مسلمان اٹھارویں صدی کے آخیر تک صوفیت سے بہت متاثر تھے۔ مسلمانوں کی مذہبی عبادات، ان کی روایات، ادب، رسم و رواج سب کے سب صوفیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، لیکن وہ صوفیت جس سے سولہویں، سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے مسلمان متاثر تھے روبہ تنزل ہوتے ہوتے قطعاً غیر اسلامی رنگ اختیار کر چکی تھی اور حضرت مجددؒ وہ پہلی شخصیت تھے جس نے اس حقیقت کو محسوس کیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تصوف و تورع کے خلاف تھے بلکہ انہوں نے اس رجحان کو روکنے کی کوشش کی جس نے تصوف کو یقینی طور پر اسلام سے منقطع کر دیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام اور ہندو دھرم کا ایک دوسرے پر ردعمل صنفۂ صوفیت اور ویدانت مسلمانوں کو اس سیدھے راستے سے بھٹکا رہے تھے جو رسولؐ نے انہیں دکھایا تھا۔ گویا حضرت امام ربانی صوفیت کے خاتمہ کے لئے کوشاں نہیں تھے، بلکہ آپ کا جہاد اس نام نہاد غیر اسلامی تصوف کے خلاف تھا جو اسلام اور ہندو مت کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے سے پیدا ہوا اور جس کی اکبر نے حمایت و سرپرستی کی۔ آپ نے اپنے والد محترم کے طریقہ کی مطابقت میں پہلے سلسلۂ چشتیہ سے بیعت کی، لیکن بعد ازاں سلسلۂ قادریہ سے

* یہ امر قابل تحقیق ہے۔ (مدیر)

منسلک ہوگئے اور اپنے وقت پر شیخ سکندر کیتھلیؒ کی وراثت کے طور پر خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ کچھ زمانہ کے بعد آپ کی ملاقات حضرت باقی باللہؒ بانیٔ سلسلۂ نقشبندیہ سے ہوئی اور آپ تینوں روحانی سلسلوں، چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ سے بیک وقت منسلک ہوگئے۔

مختلف سلسلوں سے ایک ہی وقت میں تعلق ہو جانے کا طریقہ "طریقۂ محمدیہ" کہلانے لگا۔ اب یہ سمجھا جانے لگا کہ جو شخص سلسلۂ محمدیہ سے منسلک ہے وہ یک وقت تمام مسلمہ سلسلہ ہائے صوفیت کو تسلیم کرتا ہے۔

حضرت امام ربانیؒ اور آپ کی تحریک دونوں برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ احیاء اسلام کی اس تحریک کا اثر نہ صرف ان کے دور یعنی سولھویں صدی پر پڑا بلکہ اس کا بڑا گہرا اثر سترھویں، اٹھارہویں، انیسویں، حتیٰ کہ بیسویں صدی تک پڑا، بلکہ وہ صاحب نظر و فکر لوگ جنہیں اس مسئلہ پر کچھ کہنے کا حق پہنچتا ہے، کہتے ہیں کہ وہ تحریک اکیسویں صدی پر بھی اثر انداز ہوگی۔ اور غالباً اس کے بعد بھی اس کا اثر محسوس ہوتا رہے گا۔ ایسی ایسی ہستیاں جیسے خواجہ محمد باقی باللہ، حضرت امام کے مرشد روحانی، امام الہند شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالحئیؒ (حضرت شاہ عبدالعزیز کے داماد) حضرت سید احمد بریلوی جو سلسلۂ اہلِ حدیث کے بانی تھے، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، سر سید احمد خاں، محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، اساتذۂ دیوبند یونیورسٹی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، اقبال اور بے شمار دوسری ہستیاں حضرت امام ربانی کی تحریک سے بے حد متاثر تھیں۔ آپ ہی کی تحریک فی الاصل وہ سرچشمہ ہے جس سے بعد میں مسلمانوں کی تمام مذہبی، معاشی اور سیاسی تحریکوں نے جنم لیا۔

اس بیان کے بعد مسلمانوں پر حضرت امام ربانی کی تحریک کی صحیح اہمیت بخوبی واضح ہو جائے گی حضرت شیخ احمد سرہندی کو "مجدد الف ثانی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، جس کے لفظی معنے ہیں "اسلام کی زندگی کے دوسرے ہزار سال کی ابتدا میں اسلام کی تجدید کرنے والا"۔ شیخ بزرگ اپنے آپ کو "مجدد" سمجھتے تھے۔ مسلمانوں میں یہ یقین عام ہے کہ گیارھویں صدی میں اسلام کے جس مجدد کی آمد کے بارہ میں دو حدیثیں روایت کی جاتی ہیں، وہ آپ کی ہی ذات ہے۔

اکبر نے اپنی اسلام دشمن پالیسی سے اسلام کو ارادۃً کمزور اور درخستہ کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ نہ صرف وہ علاقوں پر حکومت کرے بلکہ لوگوں کی روحوں پر بھی اسکی حکمرانی ہو۔ اس مقصد کی خاطر اس نے ایک مذہب "دینِ الٰہی" کے نام سے ایجاد کیا، جو اپنے جملہ اعتقادات میں اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف تھا۔ اکبر اسلام کے احکام کو خلافِ عقل اور بے معنی سمجھتا تھا۔ کتنے ہی علماء سوء نے اکبر کا نچایا ہوا ناچ ناچنا شروع کر دیا۔

ان بدنام کنندگانِ علمِ دین نے اکبر کو معصوم قرار دیا اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے دین کی بے حرمتی کی۔ بادشاہ نہ قرآن کو مانتا تھا، نہ موت کے بعد زندگی کو اور نہ روزِ قیامت کو۔ اکبر کا کلمہ تھا "لا الٰہ الا اللہ۔ اکبر خلیفۃ اللہ"۔ اکبر نے تعظیم کا وہ طریقہ رائج کیا جس کی رو سے ہر شخص کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا پڑتا تھا۔ اس نے یہاں تک بھی جرأت کی کہ شراب اور سؤر کے گوشت کو جائز قرار دے دیا اور اس کے برخلاف گائے کے گوشت کو ناجائز قرار دیا۔ مسلمانوں کے نزدیک سخت ناپسندیدہ جانور سؤر اور کتے خاص طور سے پالے جاتے تھے اور اکثر نام نہاد علماء ان مشاغل میں اکبر کی پیروی کرتے۔ اکبر نے ایک طرف تو جزیہ بند کر دیا، دوسری طرف عربی زبان، فقہ، تفسیر، اور حدیث کی تعلیم سے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی۔ ان علوم کا مذاق اُڑایا جاتا تھا، اذان اور نماز باجماعت منع کر دی گئی، ایسے نام جن میں احمد، محمد اور مصطفےٰ آتے ہوں بادشاہ کو ناپسند تھے اور ان کے رکھنے سے لوگوں کو باز رکھا جاتا تھا۔ اکبر کی اس پالیسی سے ہندوؤں کی مذہبی عبادات اور رسوم برسرِ عام سرانجام دی جاتی تھیں، لیکن اگر مسلمان یہی جرأت کرتے تھے تو انہیں مورد سزا سمجھا جاتا تھا کئی مسلمانوں کو اس بناء پر پھانسی کی سزا دی گئی کہ انہوں نے گائے کا ذبیحہ کیا۔ یہ حالات تھے جب شیخ موصوف نے آنکھ کھولی اور آپ کو یہ محسوس کرکے دلی قلق ہوا کہ اسلام کو ارادۃً ذلیل و خستہ کیا جا رہا ہے اور اس کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ اگر اس رجحان کو فوری طور پر روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو اسلام ہندوستان سے مٹ جائیگا۔ آپ کو اکبر کی پالیسی کے گہرے اثرات کا علم تھا، اسی لئے آپ نے اصلاحِ اسلام کی تحریک شروع کی اور دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ آپ کی ذات ہی ان دونوں حدیثوں کا مرجع ہے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اس پہلو سے حضرت مجدد کی تحریک کا تجزیہ سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ شیخ محمد اکرام اپنی قابل قدر تصنیف "رود کوثر" میں مولانا آزاد کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اکبری عہد میں نہ اسلام خراب و خستہ ہوا تھا نہ اتنا ذلیل کیا گیا تھا جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ان کی یہ بھی رائے ہے کہ اکبر دینِ الٰہی کے باوجود سچا مسلمان مرا۔ اگر ہم اکرام صاحب کی رائے سے اتفاق کریں تو یہی سوچنا پڑے گا کہ اکبر اپنی موت سے

پہلے دوبارہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوا ہوگا۔ تاریخ کے حوالے سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اکبر نے اسلام کو انتہائی ضعف پہنچایا اور اگر یہ بات سچ ہو کہ اکبر بستر مرگ پر دوبارہ مسلمان بن گیا تو بھی یہ حقیقت نہیں بدلی جا سکتی جس کی نقش کشی مولانا آزاد نے کی ہے۔ اتنا البتہ ممکن ہے کہ مولانا آزاد اور اُن دوسرے تمام مؤرخین نے جو اُن سے متفق ہیں اکبر کی غیر اسلامی حرکات کے بیان میں کسی قدر مُبالغہ سے کام لیا ہو۔

حضرت مجدد کی شادی شیخ سلطان رئیس تھانیسر کی دختر سے ہوئی جو بڑا قیمتی جہیز لائیں۔ شیخ احمد نے اس تمام دولت کو اپنی اس تحریک کی اشاعت میں صرف کیا جسے انہوں نے اسلام کو اکبر اور اس کے حواریوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے شروع کیا تھا۔ حضرت شیخ احمد نے چالیس سال کی عمر میں مجددیت کا منصب سنبھالا۔ انہیں القا ہوا کہ ان کی ذات کو مصلح الف ثانی کے مقام کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ حضرت نے اسلام کو نئی زندگی بخشنے اور برصغیر میں اسے اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے مندرجۂ ذیل طریقے اختیار کئے جن میں سے چند ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اپنی کتاب "مجدّد کا نظریۂ توحید" (THE MUJADDID'S CONCEPTION OF TAUHID) میں بیان کئے ہیں:۔

۱۔ آپ نے اپنے مریدوں کی ایک جماعت تیار کی، انہیں تربیت دی اور اکناف ملک میں اسلام کی صحیح صورت تبلیغ کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ کام نہ صرف اس ملک بلکہ پڑوسی مسلم ممالک میں بھی نہایت کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا گیا۔

۲۔ آپ نے برصغیر اور دوسرے اسلامی ممالک کی ممتاز شخصیتوں سے خط و کتابت کا ایک وسیع سلسلہ شروع کیا۔ آپ کے یہ خطوط "مکتوبات" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان مکتوبات میں آپ نے اسلامی عقائد و حقائق کی تشریح کی اور نظریت سے زیادہ عملیت پر زور دیا۔

۳۔ آپ نے دربار کے امرا کو اپنے معتقدین کے زمرہ میں داخل کیا اور اُن کے ذریعے سے شاہی دربار کے اس طبقہ کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی اور بادشاہ کی تبدیلیٔ قلب کی کوشش کی۔

۴۔ جب اکبر کا انتقال ہوگیا اور جہانگیر کو جانشینی ملی تو آپ نے ایک مہم شروع کی جس میں لوگوں کو دعوت دی کہ وہ تمام غیر شرعی احکام کی پابندی نہ کرنے کا عہد کریں۔ اس مہم سے شاہی فوجوں کے افراد بھی متأثر ہوئے۔

جہانگیر نے اپنی بیگم نور جہاں اور اپنے برادرِ نسبتی آصف الدولہ کے مشورہ سے حضرت مجدد کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ نور جہاں اور آصف الدولہ نے قید کرنے کا یہ مشورہ اس لئے دیا کہ حضرت مجدد ہندوؤں کے سخت مخالف اور بڑے متشدد حنفی تھے۔ شریعتِ حنفی کی پابندی اس سختی اور تشدد سے کرتے تھے جو اس سے پہلے دیکھی نہ گئی تھی۔ حضرت کی قید سے ملک کے طول و عرض میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور آپ کے مرید جہانگیر کے خلاف بغاوت پر تُل گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مملکت کے وہ بڑے بڑے امیر جو حضرت کے معتقد تھے دور دراز علاقوں میں تبدیل کر دئے گئے۔ خانِ خاناں، صدرِ جہاں، خانِ جہاں، خانِ اعظم اور مہابت خاں کو علی الترتیب دکن، بنگال، مالوہ، گجرات اور کابل بھیجا گیا۔

ایک ہی سال گزرا تھا کہ جہانگیر کو اپنے فعل پر سخت ندامت و پشیمانی ہوئی اور اس نے حضرت کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ اس کے بعد شیخ اور جہانگیر کے درمیان بڑے گہرے تعلقات قائم ہوگئے۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے "میں آخرت میں بخشش کا امیدوار اس سبب سے ہوں کہ شیخ فرماتے ہیں وہ اس وقت تک داخل بہشت نہ ہوں گے جب تک میں ان کے ہمراہ نہ ہوں"۔ جہانگیر نے شیخ کی عائد کردہ تمام شرائط کو قبول کر لیا۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ان شرائط کو یوں بیان کیا ہے:۔

۱۔ شہنشاہ سجدۂ تعظیم کو منسوخ کر دے گا۔

۲۔ وہ مساجد جو شہید کر دی گئی ہیں، دوبارہ تعمیر کی جائیں گی۔

۳۔ ذبیحہ گاؤ پر سے تمام پابندیاں منسوخ کر دی جائیں گی۔

۴۔ اسلامی احکام کی تعمیل اور پابندی کرانے کے لئے قاضی، مفتی، اور محتسب مقرر کئے جائیں گے۔

۵۔ جزیہ دوبارہ جاری کیا جائے گا۔

۶۔ تمام بدعات۔ وہ اعمال جن کی سند شریعت سے نہیں ملتی، ترک کر دئے جائیں گے۔

۷۔ قانون شریعت رائج کیا جائے گا۔
۸۔ وہ سب لوگ جنہیں حکومت کی مذہبی پالیسی کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں قید کیا گیا ہے رہا کر دئیے جائیں گے۔
بادشاہ نے نہ صرف ان تمام شرائط کو منظور کیا بلکہ شیخؒ کی خدمت میں خلعت ونذر پیش کی۔ اس کے بعد جہانگیر نے ہمیشہ شیخؒ کی بے حد تکریم کی اور آئندہ چھ سال تک تمام معاملات، بالخصوص مذہبی امور میں شیخؒ کے مشوروں پر عمل کرتا رہا۔
امام ربانی کی تعلیمات کو مختصراً ایک پُرمغز جملہ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:۔
"کتاب وسنت کی طرف لوٹ جاؤ، اپنے آپ کو رسولؐ کا تابعدار بناؤ، یہی ایک سچا راستہ ہے۔"
بعد کے زمانہ میں سید احمدؒ بریلوی نے اس عظیم مصلح کی پیروی کی۔ سید احمد مجددی دبستان سے تعلق رکھتے تھے اور صوفیائے اسلام میں بڑے اونچے مرتبہ کے مالک تھے۔ سید موصوف کا اعتقاد تھا کہ ان کا براہِ راست تعلق رسولؐ سے ہے اور یہ کہ انہیں رسول مقبولؐ سے راہ نمائی حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے ایک نیا طریقہ "طریقِ نبوت" رائج کیا۔ باقی تمام طریقے ان کے نزدیک "طریقِ ولایت" قرار پائے۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ صوفی پہلے سختی کے ساتھ سنت پر عمل کرے اور پھر "فکر" کی راہ اختیار کرے۔ آپ نے عقیدۂ "ہمہ اوست" اور "وحدت الوجود" کی سختی سے مخالفت کی اور الوہیت کی تعلیم دی۔ انہوں نے سماع و وجد کے مقابلہ پر جہاد کی افضلیت بیان کی۔ خود نہایت سختی سے کتاب وسنت پر عمل کیا اور تمام بدعات کی بیخ کنی کی۔ اسی کے باعث انہوں نے مسلمانوں کی تنظیم کی اور سکھوں کی طاغوتی طاقت کے خلاف، جو پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کو غلام بنائے ہوئے تھے، جہاد کیا۔ آپ کا یہ جہاد دلیری اور جرأت ایمانی کی ایک جلا داستان ہے۔ اس کوشش میں آپ خود شہید ہوئے اور آپ کے ساتھ آپ کے شریک ومرید حضرت شاہ اسمٰعیلؒ بھی۔
مجدد کی تحریک کا ایک اثر یہ پڑا کہ علما، حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے پہلے لوگ محض فقہ پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔ لوگوں نے حدیث کو سیکھنا شروع کیا اور شاہ ولی اللہ نے ہندوستان میں حدیث کی پہلی درسگاہ قائم کی۔ بعدازاں اس مکتبۂ فکر کو اصل حدیث کا نام دیا گیا، لیکن اس میں تصوف کی گنجائش تھی۔ کچھ عرصے کے بعد تقلید کی مخالفت پر زور دیا جانے لگا اور غیر مقلدین کا فرقہ ظہور پذیر ہوا جو مختلف قسم کے اہلِ حدیث ہیں۔
اس سلسلہ میں اس اصلاح وتنقید کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو سرسید نے شروع کی۔ سرسید نے حدیث کی تنقید پر زور دیا، قرآن کی طرف توجہ دلائی اور کتاب کو اسلام کا صحیح منبع قرار دیا۔ اس سے اپنے وقت پر اہلِ قرآن کا فرقہ پیدا ہوا۔
سرسید کی تربیت طریقۂ مجددیہ پر ہوئی تھی، ان کا نظریہ توحید بھی "وحدتِ وجود" اور "ہمہ اوست" کے بجائے "الوہیت" تھا۔ تصوف کے بارے میں وہ اور ایک قدم آگے گئے اور کہہ دیا کہ یہ محض روحانی اور اخلاقی پاکیزگی کا ایک طریقہ ہے اور کچھ نہیں۔ یہ چیز گو حضرت مجددؒ کی تعلیم میں موجود تھی لیکن اب تک اس صفائی کے ساتھ بیان نہیں کی گئی تھی۔ توحید کے مسئلہ پر حضرتِ مجددؒ نے سب سے زیادہ زور دیا اور اسی کی ضرورت بھی تھی۔ اس سلسلہ میں آپ کا کام بہت اہم بھی ہے اور منفرد بھی۔ آپ نے اس نام نہاد صوفیت کے ڈھانچہ کی بنیاد پر ضرب کاری لگائی جس کا وجود "ہمہ اوست" پر قائم تھا۔
اس مختصر سی بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت مجددؒ کی اصلاحی تحریک کے اثرات بہت گہرے تھے جو صدیوں کی پیشانی پر نقش بن کر چمکے۔ مسلمان مفکروں اور مصلحوں کی ایک بڑی جماعت آپ کی تعلیمات اور جوشِ اصلاح سے متاثر ہوئی۔

شاہ ولی اللہؒ

امام الہند شاہ ولی اللہ پر اس تحریک نے بالخصوص بہت گہرا نقش چھوڑا۔ وہ لوگ جو مجدد اعظم کی تحریک کی پیداوار ہیں، ان میں شاہ صاحب کی حیثیت نمونہ کی ہے۔ شاہ صاحب کی اصل اہمیت یہ ہے کہ آپ کی ذات سے ایک اور ایسی ہی عظیم تحریک شروع ہوئی جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس تحریک نے انہیں شعور کی وہ دولت عطا کی جس سے وہ اس سے پہلے محروم تھے۔ اس تحریک نے بڑا جوش پیدا کیا۔ آپ کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت کھڑی ہوگئی جو آپ سے بیحد متاثر ہوئی اور آپ کے پیغام کو اس عقیدت، خلوص اور محبت سے لے کر اٹھی جو بہت نایاب ہے۔
امام الہندؒ ۱۷۰۳ء میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات سے تین سال پہلے پیدا ہوئے۔ یہ بات نامناسب نہ ہوگی اگر یہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے

ابتدائی دس سال میں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی حالت بیان کر دی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب ایک حد درجہ دین دار بادشاہ تھا۔ اس نے برصغیر میں اسلام کو حیات نو بخشنے کے لئے انتہائی جدوجہد کی لیکن مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی حالت اس قدر دگرگوں ہو چکی تھی کہ انجام کار اورنگ زیب مسلمانوں کو اس سطح پر لانے میں ناکام رہا جو اس کا مقصود تھی۔ اخلاقی قدروں کے اعتبار سے مسلمان پستی کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ ایسے مسلمانوں کی تعداد جو معمولی رشوت پر اپنی قوم کا مفاد ہر موقع پر فروخت کرنے کو تیار تھے حیرت ناک حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بلا جد و جہد حکومتِ وقت سے ہر قسم کی بخشش و انعام کے امیدوار تھے۔ عیاشی نے ان کے اخلاق کو ناقابلِ قیاس حد تک خراب کر دیا تھا۔ ادھر مرہٹے، سکھ اور ہندو ملک کے مختلف حصوں میں سر اٹھا رہے تھے۔ مغل سلطنت کا وہ ڈھانچہ جو بظاہر نہایت پرشکوہ معلوم ہوتا تھا، اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب نے انہی حالات کے پیشِ نظر اپنے ہم مذہبوں کو، جن کی اخلاقی پستی اور بدحالی سے وہ بخوبی واقف تھا، بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اورنگ زیب خود حضرت مجدد کی تحریک کی پیداوار تھا اور اس تحریک کے محرکین نے اسلام کو حیاتِ نو بخشنے کے لئے جو کوشش کی تھی اس سے بہت متاثر تھا۔ لیکن جہاں اورنگ زیب جیسا عظیم المرتبت بادشاہ اپنی پرشکوہ مملکت کے تمام ذرائع استعمال کرنے کے باوجود مسلمانوں کی اخلاقی حالت اصلاح سے قاصر رہا، وہاں حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک نے انہیں قعرِ مذلت میں گرنے سے بچا لیا۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ صاحب مجددی تحریک سے بہت متاثر تھے لیکن اس وقت تک وہ تحریک اپنی حیات طبعی پوری کر کے نیم مردہ ہو چکی تھی۔ ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ مجددِ اعظم نے اسلام کو نئی زندگی بخشنے، بلکہ اسلام کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ان کی تحریک ایسی بنیادی اور قوت بخش اصلاحات نافذ کرنے سے قاصر رہی جو مسلمانوں کو انجام کار تباہی سے بچا سکتی۔ تحریکِ سرہند، اسلام اور مسلمانوں کی برتری کی قائل تھی اور ہندوؤں اور ہندو مت کو حقیر سمجھتی تھی۔ انہی دو بنیادوں پر وہ تحریک پھلی پھولی۔ یہاں اس بات کو یاد رکھنا بہت اہم ہے کہ حضرت مجدد کی تحریک کا مقصد ان نقصانات کی تلافی نہیں تھا جو ملت کو برصغیر میں ایک قومی کلچر اور مذہب سے مقابلہ کرنے پر اٹھانے پڑے تھے۔ یہ شاہ صاحب کی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ نہ صرف ہندو مت میں جذب ہو جانے کا مقابلہ کامیابی سے کریں بلکہ انہیں یہ لیاقت بخشی کہ وہ اپنی تہذیب کو اس صد رنگ مذہب کے مقابلہ پر قائم رکھیں جس سے وہ بنیادی طور پر مختلف تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجددی تحریک اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دس سال تک اپنا زور و شور صرف کر چکی تھی، اس کو نئی اور شدید قوتِ متحرکہ اور نئے خون کی ضرورت تھی۔ یہ قوتِ متحرکہ اور نیا خون حضرت شاہ صاحب کی تحریک نے مہیا کیا ورنہ تحریک سرہند اٹھارہویں صدی کے پہلے نصف کے بعد زندہ نہ رہتی۔ مجددِ اعظم کی تحریک کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں میں تصوف کے غیر معمولی اقتدار اور اہمیت کو ختم کرنا تھا اور اس مقصد کے لئے وہ تحریک کافی قوت اور کشش رکھتی تھی۔ وہ مذہبی پابندیاں جو اسلام عائد کرتا ہے مسلمانوں میں اس نام نہاد صوفیت کے رجحان کو دبانے میں کامیاب رہی تھیں اور یہی مجددی تحریک کا فائدہ تھا لیکن یہ مسلمانوں کو اس اخلاقی سطح پر لانے میں ناکام رہی تھی جس پر ہندو پہنچے ہوئے تھے، بالخصوص مرہٹے پندرھارپور کی تحریکِ احیاء کے زیرِ اثر ایک زندہ طاقت بن چکے تھے۔ تحریک مجددی میں اس سے نصف بھی قوت نہ تھی جتنی مثال کے طور پر پندرھارپور تحریک میں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک نے وہ معجزہ تو نہ دکھایا جو تحریکِ احیاء کے زیرِ اثر وقوع پذیر ہوتا ہے تاہم اس نے برصغیر میں اسلام، مسلمانوں اور مسلم کلچر کو زندہ رکھا۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک کو ان کے خاندان کے افراد نے ایک بے مثال جوش و خلوص سے زندہ رکھا۔ ان میں سے دو ایک نے مسلمانوں کو اخلاقی پستی سے نکالنے میں معرکے کا کام کیا۔ یہاں شاہ صاحب کے جانشینوں کا شجرہ درج کیا جاتا ہے:-

- شاہ ولی اللہؒ
  - شاہ عبدالعزیزؒ
    - مولانا عبدالحیؒ (داماد)
      - مولانا محمد اسحٰقؒ
      - مولانا محمد یعقوبؒ
  - شاہ رفیع الدینؒ
    - مولوی مخصوص اللہؒ
  - شاہ عبدالقادرؒ
  - شاہ عبدالغنیؒ
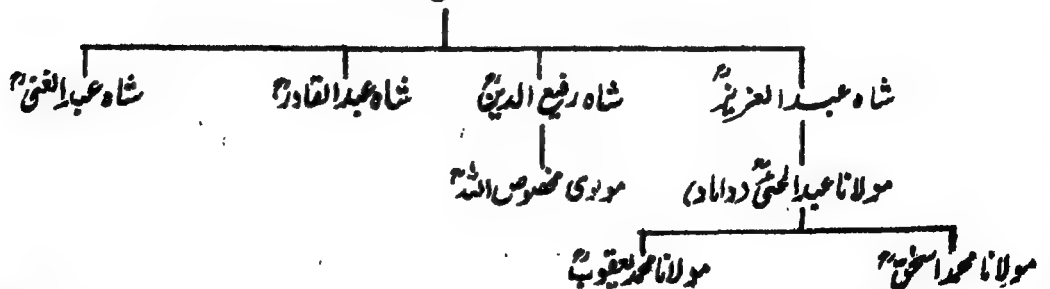
خود شاہ ولی اللہ ایک مشہور عالم شاہ عبدالرحیمؒ کے صاحبزادے تھے جو اپنے تبحر علمی کے سبب اپنے وقت میں بہت ممتاز تھے۔ شاہ عبدالرحیم ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی اپنی عمر ساٹھ سال کی تھی کہ آپ کو قدرت نے شاہ ولی اللہ جیسے فرزند سے نوازا۔ شاہ صاحب خود اپنے وقت میں تین غیر معمولی لیاقت کے

فرزندوں کے باپ بنے، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، اور شاہ عبدالقادر۔ ان میں سے ہر ایک عالم متبحر تھا اور انہوں نے شاہ عبدالرحیم کے گھر کی روایات کو سربلندی کے ساتھ قائم رکھا۔ برصغیر کے ہر گوشہ سے لاکھوں آدمی اس عظیم خاندان کے قدموں سے فیضِ علمی اور انوار روحانی حاصل کرنے کے لئے دہلی آئے تھے۔ شاہ صاحب کے چاروں بیٹوں میں سے صرف شاہ عبدالغنی کوئی قابلِ ذکر کام کرنے سے قاصر رہے لیکن ان کے مایۂ ناز فرزند شاہ اسمٰعیل شہید نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جس نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے فرزند عبدالعزیز کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ آپ کی تین بیٹیاں تھیں ان میں سے ایک مولانا عبدالحئی سے بیاہی گئی جو بڑے عالم اور بہت بڑے استاد تھے۔ ان کے دونوں فرزندوں، مولانا محمد یعقوب اور مولوی محمد اسحٰق نے خاندان شاہ ولی اللہ کی شرکت میں اساتذہ کی حیثیت سے قوم کے لئے بڑے پائے کی خدمات سرانجام دیں۔

حضرت سید احمدؒ و شاہ اسمٰعیلؒ

حضرت مجددؒ کی تحریک نے شاہ ولی اللہ کو متاثر کیا اور شاہ ولی اللہ کی جدوجہد نے اس تحریک کو نئی قوت محرکہ عطا کی۔ ان دونوں تحریکوں کا مشترکہ نتیجہ وہ روشن قربانیاں تھیں جو سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نبیرۂ شاہ ولی اللہ اور ان دونوں کے پیروؤں نے اسلام کی راہ میں دیں۔ سید احمد بریلوی نے جب یہ سنا کہ برصغیر کے شمال مغرب میں سکھ اسلام اور مسلمانوں کو کچل رہے ہیں تو آپ نے ایک مہم شروع کی۔ آپ دہلی تشریف لائے اور شہر اور گردونواح کے مسلمانوں میں تحریک و تبلیغ کرنا شروع کی۔ سید احمدؒ کے خلوص اور شوقِ جہاد نے سید اسمٰعیل شہید کو ایسا متاثر کیا کہ آپ نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ سکھوں کے خلاف، جو مسلمانوں کو پنجاب اور سرحد میں نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے، جہاد کی کٹھن مہم میں شاہ صاحب کے شریک رہیں گے۔ ۱۸۲۵ء میں سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ اس فیصلہ کن جہاد کی راہ پر چل پڑے۔ ان کی معیت میں سات ہزار سرفروش مسلمان تھے جو آپ کی پیروی میں بے قاعدہ سپاہیوں کی حیثیت سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں کوئی ایسی تربیت نہ ملی تھی جسے فوجی ٹریننگ کہا جا سکتا نہ ان کے پاس کوئی ایسا سامان حرب تھا جس پر حالتِ جنگ میں بھروسہ کیا جا سکتا۔ وہ بھی ایسے سخت اور قوی دشمن کے مقابلہ پر جیسے سکھ تھے لیکن بلاشبہ ان کا جوش و حوصلہ بہت بلند تھا۔

جان نثار مریدوں کی اس جماعت کے ساتھ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید ٹونک کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں سے بہاولپور، حیدرآباد سندھ اور شکارپور ہوتے ہوئے درہ بولان کے راستہ کابل جا داخل ہوئے۔ کابل سے درۂ خیبر کے ذریعہ پشاور آئے اور وہاں سے نوشہرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لڑائی شروع کرنے سے پہلے انہوں نے لاہور میں سکھ دربار کو تحریری اطلاع بھیجی کہ اگر ان کے مطالبات منظور نہ کئے گئے تو وہ سکھ حکومت کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیں گے۔ دربار لاہور نے جواب دینے کے بجائے جنرل بودھ سنگھ کے زیر کمان ایک بڑی فوج بھیجی۔ اس مہم کی پہلی لڑائی ۲۱ ردسمبر ۱۸۲۶ء کو ایک چھوٹے سے گاؤں اکوڑہ میں لڑی گئی جو نوشہرہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ بودھ سنگھ کو شکست ہوئی اور مجاہدین نے اسے پنجاب میں دھکیل دیا۔ دوسری لڑائی ہزارہ کے مقام پر ہوئی جس میں مجاہدین کو پھر کامرانی ہوئی۔ اس فتح سے انہیں کثیر تعداد میں سامانِ حرب و خوراک حاصل ہوا۔ ان دو فتوحات کے بعد بہت سے علما اور رؤسا نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، انہیں امیر المومنین چنا گیا اور اسی حیثیت سے ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ سردار یار محمد خاں اور سردار پیر محمد خاں پشاوری نے بذریعہ مکتوب بیعت کی۔ اسی دوران میں مجاہدین اور مولوی محبوب علی کے مابین غلط فہمی کا آغاز ہوا۔

مولوی صاحب مذکور برصغیر سے کمک لیکر آئے تھے لیکن ایک درانی افغان نے ان سے بدسلوکی کی۔ انہیں اس بدسلوکی سے اتنا رنج ہوا کہ وہ مجاہدینؒ کو کمک دیئے بغیر واپس چلے گئے۔ سرحد میں سید صاحب کی مہم کی آخری لڑائی بالاکوٹ کے مقام پر جو مانسہرہ کے نزدیک ہے، لڑی گئی۔ مقامی مسلمانوں نے مجاہدین سے غداری کی اور سکھوں کے ساتھ مل گئے۔ اس مقام پر سکھ جرنیل راجہ شیر سنگھ نے مجاہدین کو چاروں طرف سے گھیر کر المناک شکست دی۔ سید احمد صاحب اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ دونوں میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے ؎

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہ مختصر سا خاکہ ہے حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک اور اس کے اثرات کا لیکن یہ داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ شاہ صاحب اور سید احمدؒ کی تحریکیں گل و بار لائیں اور ما بعد کی نسلوں میں جو دینی و سیاسی تحریکیں اٹھیں اور جنہوں نے ان کو مذہبی بیداری اور سیاسی آزادی سے ہمکنار کیا، وہ ان ہی تحریکوں کا نتیجہ تھیں۔

جنگ ۱۸۵۷ء میں دیسی فوج کے دو مورچے
(انگریز مصوروں کے قلم سے)
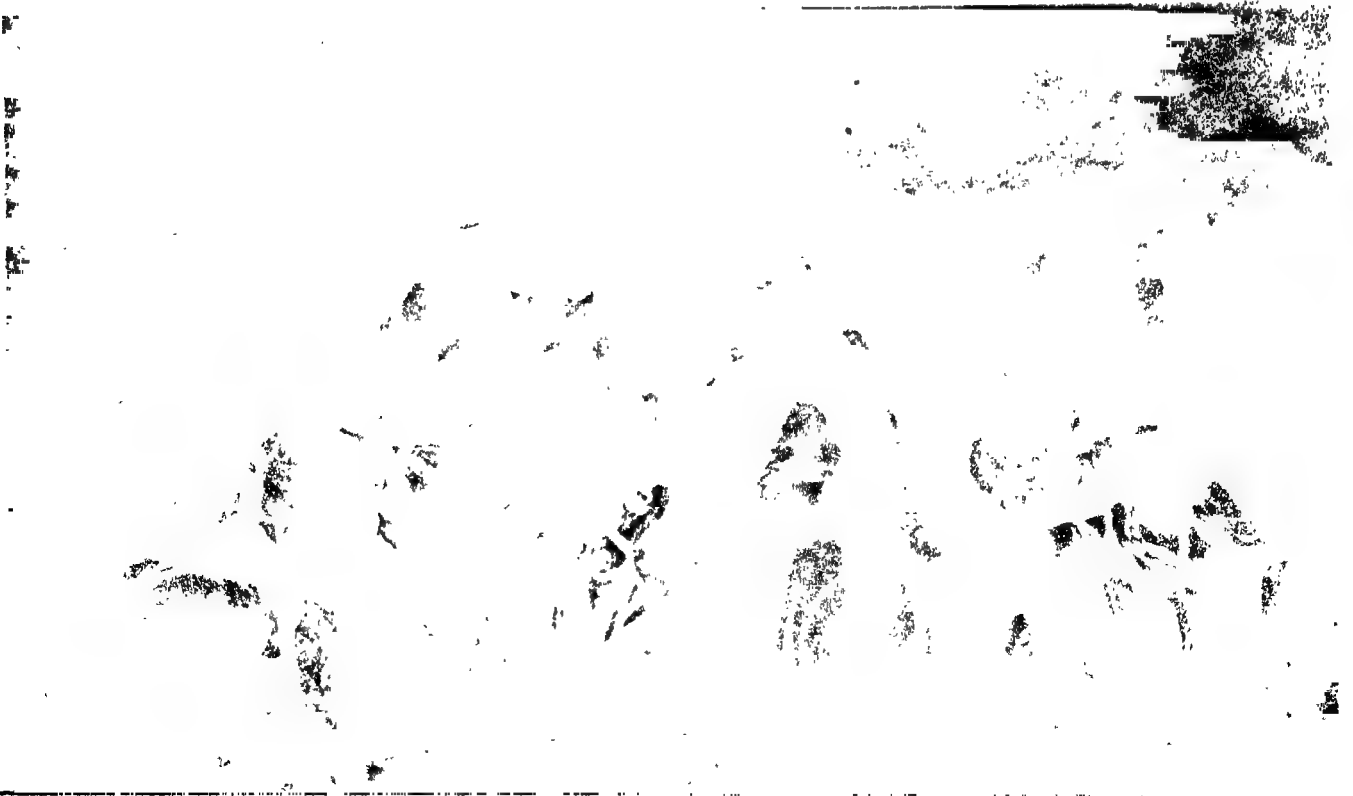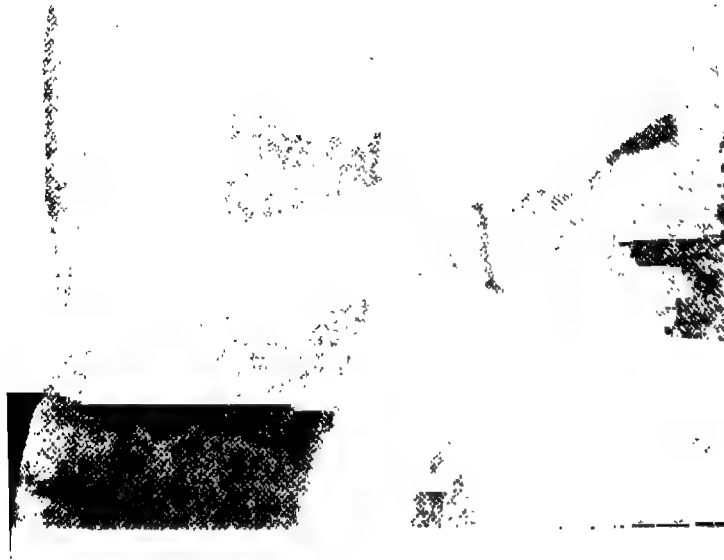
نواب سراج الدوله

سلطان ٹیپو شہید

جہاد آزاد
کے
اولین سرفرا

مقبره سراج ال
علاقه ''خوش
مرشد آباد

ماہ نو کراچی۔ مئی ۵۷ء ۱۹

سلطان ٹیپو شہیدؒ

سید ہاشمی فرید آبادی

میسور کی تیسری جنگ واقع ۱۷۹۲ء کے کچھ روز بعد ایک انگریز کپتان ٹیل نے اس مملکت کی سیاحت کی۔ ان دنوں انگریزوں کو ٹیپو سلطان اور اس کے باپ حیدر علی مرحوم سے انتہائی دشمنی تھی اور جیسا کہ ٹیل نے لکھا ہے۔ انگریزی زبان میں جس قدر سب وشتم کے الفاظ مل سکتے تھے، ٹیپو کی نسبت وہ استعمال کرتے، بلکہ نئی نئی گالیاں وضع کرتے رہتے تھے۔ مگر ٹیل کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ملک نہایت آباد و خوش حال تھا اور عام لوگ ٹیپو سلطان کی محبت اور وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ قابلِ زراعت زمین کا مشکل سے کوئی قطعہ ایسا ہوگا، جو سرسبز اور زیر کاشت نہ ہو۔ اکثر علاقوں سے زمین دار اور جاگیر دار کا دخل اُٹھا دیا گیا تھا، مالیہ بہت کم تھا اور کاشت کار براہِ راست حکومت کو ادا کرتے اور زمین داری کے حقوق رکھتے تھے۔

زراعت کی عام ترقی اور مزارعین کی خوش حالی کی گواہی ایک اور سیاح بکانن کے سفرنامے سے ملتی ہے۔ وہ سلطان کی شہادت سے دو تین سال بعد میسور آیا اور وہاں کے مختلف اضلاع میں گشت کرتا رہا تھا۔ سلطان کو ملاحت اور زرعی پیداوار بڑھانے کی طرف جیسی کچھ توجہ تھی اس کا ایک ثبوت آبپاشی کے بند ہیں، جو اس نے کاویری اور دوسری ندیوں پر باندھے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مقالہ نویس نے اسے "ٹیپو بند ساز" کے نام سے یاد کیا ہے۔ شوقِ باغبانی کی یادگار اُس کے کئی باغ اور ان میں پھول کے درختوں کی کئی قسمیں ہیں، جو بیرونی ممالک سے منگائیں اور پہلی دفعہ سرزمین میسور میں ان کی کاشت اور پرورش کرائی تھی۔

سلطان کے عہد میں ظروف سازی، پارچہ بافی اور مختلف دیسی صنعتوں نے ایسا فروغ پایا جو شاید پہلے کبھی اس علاقہ کو نصیب نہ ہوا تھا، مگر ان میں سب سے زیادہ لائقِ تحسین و حیرت جدید اسلحہ اور جنگی جہازوں کی صنعت ہے، جنھیں دیسی اور فرنگی ماہروں کی مدد سے ٹیپو مرتے دم تک ترقی دیتا رہا۔ اس نے ۱۷۸۲ء سے ۱۷۹۹ء تک صرف سترہ سال حکومت کی اور زیادہ حصہ جنگ و جدال کی نذر ہوا۔ دوسرے، انگریزوں کے آئندہ تسلط نے بہت جلد ان صنعتوں خصوصاً جہاز سازی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن جب ہم انگریزی تاریخوں میں پڑھتے ہیں کہ سلطان کی شہادت کے بعد صرف سری رنگ پٹن کے قلعے سے ایک ہزار توپیں انگریزوں کے ہاتھ آئیں، جن میں سے دو تہائی ملکی ساخت کی تھیں اور جس طرح ساخت کی خوبی، پائیداری، ضرب کی قوت میں بھی بہترین فرنگی توپوں کا مقابلہ کرتی تھیں، اسی طرح گولہ بارود کی بڑی مقدار مقامی کارخانوں میں تیار کی گئی تھی تو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ فرماں روا کیسا بیدار مغز اور اس کا ملک کتنا ترقی پذیر تھا۔ صنعت و حرفت کے ساتھ ملکی تجارت کو فروغ دینے کے سلسلے میں یہ دلچسپ بات ہمیں مسٹر شاما راؤ کی کتاب 'موڈرن میسور' سے معلوم ہوئی اور تاریخِ سلطنت خداداد میں جناب محمود خاں بنگلوری نے نقل کی ہے کہ ٹیپو نے اپنے کئی شہروں میں تجارت کی بڑی بڑی کوٹھیاں یا سرکاری منڈیاں بنائی تھیں، جو مقامی اشیا فراہم کرتی اور باہر کے ملکوں میں مال روانہ کرتی تھیں۔ عجب نہیں کہ یہ تدبیر ذہین سلطان کو انگریز تاجروں کی دشمنی نے سجھائی ہو اور خود انگریزوں کے لئے یہ ایک اور وجہ اشتعال و عداوت بن گئی ہو۔

جب سری رنگ پٹن فتح ہوا تو انگریز کے ساتھیوں نے اس دولت مند شہر کو خوب لوٹا اور انتظام ہوتے ہوتے سلطانی محلات میں چوری اور غارت گری کرتے رہے۔ باایں ہمہ زر و جواہرات اور قیمتی ظروف و پارچہ کے بے حساب صندوق فتح مند فوج کے قبضے میں آئے۔ مالِ غنیمت کا حصہ سپاہ میں تقسیم ہوا۔ اس میں جنرل ہارس کو ڈیڑھ لاکھ اشرفیاں ملیں۔ باقی جواہر و نوادر کلکتے اور ولایت انگلستان کو بھیج دیئے گئے۔ انہی میں سلطانی کتب خانہ کی بہت سی کتابیں تھیں، جن کی بعض جلدوں پر سونے کا کام اور زمرد و الماس کے نگینے جڑے تھے۔ قرآن مجید، الٰہیات، اخلاق و فلسفے کے علاوہ بہت سی کتابیں اُردو زبان اور ادب سے تعلق رکھتی تھیں اور لنڈن کے انڈیا آفس یا سابق وزارتِ ہند کے کتب خانے میں محفوظ کی گئی تھیں۔ ان میں دکنی شعرا، ملا نصرتی، ابن نشاطی اور قطب شاہ وغیرہ کے مجموعوں کے ساتھ انعام اللہ خاں یقین اور مرزا رفیع سودا کے دیوان بھی شامل تھے، جو ٹیپو سلطان کے ہم عصر اُردو کے مشہور استاد گزرے ہیں۔ سلطان اُردو اور فارسی سے خوب واقف تھا اور ان زبانوں میں خود بھی شعر کہتا تھا۔ کتاب تحفہ یا فتح المجاہدین کے بعض جنگی اشعار کی تصنیف اس سے منسوب کرتے ہیں۔ بہر حال یہ کتابیں

اور اشعار اس بات کا قطعی اور صریحی ثبوت ہیں کہ اُردو زبان اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے ممالک میں شمال سے جنوب تک بولی جا رہی تھی۔ میسور کی رائج الوقت اُردو کا نمونہ فتح المجاہدین کے یہ اشعار ہیں، جو میسوری فوجیں مختلف مقررہ اوقات میں مل کر گایا کرتی تھیں:۔

۱۔ طلوعِ صبح کے وقت ترہی پر:۔

صبح دم ہے اے مجاہد خواب سوں بیدار ہو　　　طاعتِ حق واسطے جلدی سوں تم ہوشیار ہو

۲۔ وقتِ اجتماع بہ نغمہ اصغر:۔

عجب نئیں حکم سے سلطان کے ہوئے جمع گر یک جا　　　فلک پہ جوں ثریا آفتاب و ماہ اختر ہا

۳۔ بیت وقتِ آہستہ قدم:۔

تا تمل ستی نیک ہووے ہنر　　　تاقی سے ہوتا ہے پانی گہر

سلطان کی اپنی قلم کی لکھی ہوئی تحریریں اور بہت سے احکام ابھی محفوظ ہیں، جو اُردو فارسی یا کنڑی میں لکھے تھے، مگر سرکاری مراسلات اور دوسرے ملکوں سے سفارت کی زبان فارسی ہی تھی۔ اس میں لکھنے بولنے کی سلطان مہارت رکھتا تھا۔ اس کے ندیم اور درباری عہدہ داروں میں بھی ایرانی اہلِ قلم کو خاص امتیاز حاصل رہا۔ ان میں ایک ایسی کتاب "فتح المجاہدین" کا مصنف زین العابدین شوستری ہے جسے اوّل اوّل فوج کا سپہ سالار یعنی جرنیل بنایا گیا تھا، مگر ایک معرکہ میں اس نے بزدلی دکھائی تو پھر انشائی خدمت پر متعین کیا گیا۔ یہ شخص حیدر آباد کے وزیر میر عالم کا بھائی بتایا گیا ہے اور ممکن ہے کہ میر عالم کی طرح خود بھی انگریزوں سے مخفی رابطہ رکھتا ہو۔

ایک اور ایرانی فاضل میر غلام علی سلطان کی طرف سے سفیر بنا کر ترکی بھیجا گیا تھا۔ یہ آخر میں جا کر انگریزوں سے مل گیا تھا اور اسی حُسنِ خدمت کا وظیفہ حاصل کیا۔ ایک اور شخص میر قاسم علی سلطان کا پُرانا ملازم اور سری رنگ پٹن کا قلعہ دار رہ چکا تھا۔ آخری جنگ میسور میں انگریزوں کے ساتھ ہو گیا اور قلعہ کشائی میں ان کی رہنمائی کی، مگر ان بے وفائی کرنے والوں میں سب سے زیادہ بدنام میر صادق گزرا ہے، جو ایک زمانے تک سلطان کا معتمد علیہ، میر منشی اور وزیر رہا اور پھر دشمنوں سے مل کر اس کی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوا۔ اس کی قبر پر آج بھی لوگ تھوکتے ہیں اور حضرت اقبال علیہ الرحمۃ نے جاوید نامہ میں اسی کو بنگال کے میر جعفر کے ساتھ ملتِ اسلامی کے بدترین غداروں میں شمار کیا ہے۔

لیکن ایرانی نژاد عہدہ داروں کے علاوہ خود مقامی حکام اور ہندو جاگیرداروں میں متعدد ایسے تھے جو مخالفت کی سازشوں میں شریک ہوئے۔ میسور کے قدیم راجہ کی رانیاں برابر نواب نظام، مرہٹوں اور انگریزوں کے پاس فریاد کی عرضیاں دوڑاتی رہتی تھیں۔ کئی دفعہ ان کے ہرکارے پکڑے گئے، مگر تنبیہ اور تہدید کے سوا حیدر علی یا ٹیپو سلطان ان عورتوں کو اور کوئی سزا دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ تاریخ میں انہی سازشوں اور بے وفائیوں کا حال پڑھ کر سلطنت خداداد کی بنیادی کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے کہ کثیر ہندو آبادی کو فوجی قوت سے مغلوب کرنا تو ممکن تھا، مگر وہاں مستقل حکومت جمانے میں بڑی دشواری پیش آئی، خصوصاً جب کہ ہمسائے میں کئی کئی حریف موجود تھے۔ ارکاٹ یعنی مدراس کے ساحلی قطعات میں انگریزوں کا عمل دخل ہو گیا تھا، مغرب میں مرہٹوں کا زور تھا، شمال میں حیدر آباد کی طاقت ور مملکت قائم تھی اور اصل میں موجودہ ملک پہلے انہی کے ششش صوبۂ دکن کا ایک مغلیہ صوبہ اور قصبہ سرا اس کا دار الحکومت تھا۔ حیدر علی نے مرہٹوں اور انگریزوں سے عہدنامے کئے، مگر وہ محض وقتی مجبوریوں سے کئے جاتے تھے اور فریقین میں جسے موقع ملتا اپنے قول و قرار سے منحرف ہو جاتا تھا۔ دربارِ نظام نے خاندانی تعصب کے باعث "حیدر نائک" سے رشتۂ دوستی قائم کرنا پسند نہیں کیا۔ اس طرح حیدر علی اور اس کا جانشین برابر دشمنوں میں گھرے ہوئے چومکھی لڑائی لڑتے رہے۔ انجام وہی ہوا جو ہونا تھا، لیکن ہمت اور دلاوری میں ان باپ بیٹوں کے نام جریدۂ روزگار پر ثبت ہو گئے اور آج بھی ہم اس بہادر باپ کے بہادر فرزند کی یاد تازہ اور اس پر تحسین و عقیدت کے پھول نثار کر رہے ہیں۔

سلطان شہید کا نام فتح علی تھا، لیکن باپ نے ایک درویش سے اولاد نرینہ کی دعا کرائی۔ وہ "ٹیپو مستان" کہلاتے تھے۔ خدا نے بیٹا دیا تو اُسے بھی انہی کے نام پر ٹیپو پکارنا شروع کیا۔ ولادت کا سال ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء اور مقام بنگلور کے قریب قریہ دیون ہلی تھا۔ خود حیدر علی کی حیثیت ان دنوں ایک معمولی فوجی سردار یا نائک سے زیادہ نہ تھی۔ سرنگاپٹن ایک چھوٹی ریاست رہ گیا تھا اور وہاں کے موروثی راجہ کو اس کے دیوان (نندراج) نے بالکل بے بس کر رکھا تھا۔

ماہ نو، کراچی۔ مئی ۱۹۵۷ء

ملک میں چاروں طرف بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کے انتہائی عروج کے وقت پانی پت کی تیسری جنگ نے ان کے غرور کا سر توڑا۔ نظام علی خاں نے دکن کے کئی ضلعے واپس چھین لئے۔ دوسری طرف انگریز اور فرانسیس آپس کی جنگ میں الجھ گئے۔ اسی فرصت میں حیدر علی نے بہت سا حصّہ ملک فتح کر لیا۔ نندراج دیوان کو قید میں ڈالا اور اپنی خود مختار حکومت قائم کی، جس کی حدود ٹراونکور سے کرشنا ندی تک اور ساحل ملیبار سے سرحد ارکاٹ تک پھیلی تھیں۔ محمود خان صاحب بنگلوری کے خیال میں اسے شاہی سے بڑھ کر شہنشاہی کا رتبہ حاصل ہو گیا تھا، لیکن آزاد اور قومی فرماں روا ہونے اور شاہانہ جاہ و جلال دکھانے کے باوجود حیدر علی نے علانیہ کبھی بادشاہی کا دعوٰے نہیں کیا۔ البتہ اس کا انتقال ہوا تو غالباً رسمِ تاجپوشی کے وقت ٹیپو نے سلطان کا خطاب اختیار کیا اور جنوبی ہند میں وہی نہ صرف پہلا بلکہ آخری سلطان گزرا ہے۔ تخت نشینی کا جشن محرم ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں سرنگا پٹن میں دھوم دھام سے منایا گیا۔ اسی کے ساتھ پہلے انگریزوں سے پھر حیدرآباد اور مرہٹوں سے جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور ابتدائی ۴، ۵ سال تک میسوری افواج کو اکثر معرکوں میں فتوحات حاصل ہوئیں۔ اسی زمانے میں کورگ کا محاصرہ اور تسخیر عمل میں آئی اور وہاں کے اکثر قیدیوں نے دین اسلام قبول کر لیا۔ انہی نو مسلم سپاہیوں سے ٹیپو نے ایک نئی فوج تیار کی اور "جماعت احمدی" اس کا نام تجویز کیا۔

بعض انگریزی تاریخوں میں ٹیپو کو سخت متعصب بلکہ مذہبی دیوانہ بتایا گیا ہے اور غیر مسلموں پر اس کے مظالم کی عجیب عجیب داستانیں گھڑ لی گئی ہیں۔ یہ زیادہ تر جھوٹی، بے سروپا اور بعض نہایت مبالغہ آمیز ہیں۔ ان مفتریات کو خود ہندو اور انگریز اہلِ قلم نے حالیہ کتابوں میں غلط قرار دیا ہے۔ ہندو رعایا کے ساتھ سلطان عموماً رواداری اور فیاضی کا برتاؤ کرتا تھا۔ مندروں کو معافیوں کی اسناد اور بعض مہنتوں کو اس کے عنایت آمیز خطوط اب روشنی میں آ چکے ہیں۔ بایں ہمہ یہ درست ہے وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور جس حد تک اپنے دین کو سمجھتا تھا اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مسکرات کی ممانعت اور بدعات محرم وغیرہ کا حکماً انسداد اس کی مذہبی اصلاحات مانی گئی ہیں۔ البتہ فرنگی ملازمین کو شراب کشی کی اجازت دے دی تھی۔

سلطان کے فرنگی رفیقوں میں اکثر فرانسیسی تھے اور ۱۷۹۰ء میں جب انگریزوں نے عہدنامہ دوستی کے باوجود ٹیپو کے خلاف نظام اور مرہٹوں کا جتھا بنایا اور یکایک حملہ کر کے اس کا شمالی علاقہ چھین کر اتحادیوں میں بانٹ لیا تو سلطان کو انگریزوں سے اور زیادہ دشمنی اور اہلِ فرانس کی طرف بہت میلان ہو گیا۔ یہی جنگ تھی جس میں اس نے منادی کرائی تھی کہ جو شخص کسی انگریز سپاہی کے ناک کان کاٹ کر لائے گا اُسے ایک ہُن طلائی انعام دیا جائے گا۔

اس جنگ میں شکست و نقصان کے بعد سلطان کو مرتے دم تک آزادی بچانے اور انگریزوں سے انتقام لینے کی دھن لگی رہی۔ اس شکست کے غم میں کہتے ہیں کہ اس نے پلنگ پر سونا، اچھا کھانا، اچھا پہننا، بلکہ ہنسی دل لگی تک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے کی نسبت دوگنی تگنی فوج اور بہترین جدید اسلحہ فراہم کئے۔ کابل، ایران اور ترکی سفیر بھیجے کہ اُسے انگریزوں سے لڑنے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مدد دیں۔ سلطنت فرانس کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی کئی بار کوشش کی، نپولین سے اس کی خط و کتابت چھاپی گئی تھی وہ صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ البتہ سلطان ترکی نے جواب میں اُسے آگاہ کیا تھا کہ حکومت فرانس انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں کی دشمن ہے۔ ٹیپو نے برصغیر میں راجپوت ریاستوں کو بھی تاکیدی خط لکھے اور خبردار کیا کہ انگریزوں کا اگر مل کر مقابلہ نہ کرو گے تو وہ ایک ایک کر کے سب کو مغلوب کر لیں گے اور سارے برصغیر پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ سلطان میسور کی یہ کوشش و نمائش جو عملاً کارگر نہیں ہوئی لیکن آئندہ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ وہ کیسا دور اندیش اور آزادی کی حفاظت کا کتنا آرزومند تھا۔ حتٰی کہ اسی آزادی کی خاطر اس نے اپنی جان قربان کر دی۔

ٹیپو کی مخالفانہ سرگرمیوں سے انگریز غافل و بے خبر نہ تھے۔ خود غلام علی نے جو سفیر بن کر ترکی آیا سلطان میسور کے خط استنبول کے برطانوی سفیر کو دکھا دیئے تھے۔ جواب میں فوجی تیاریوں کے ساتھ سلطان کے خلاف سازش کا وسیع جال تیار کیا جا رہا تھا، جس میں میسور کے بڑے بڑے حکام اور درباری تک اپنے ملک و مالک کے پھانسنے کا پھندا بن گئے۔ سلطان کی بیرونی ممالک تو کیا مدد کرتے، خود اپنے ہمسائے فوجیں لے کر چڑھ آئے اور کئی بڑے امیروں، وزیروں نے اس کی تباہی میں حصّہ لیا۔ آخر وقت میں بھی جب کہ دشمن قلعے میں گھس آئے اور وہ تین طرف سے گھرا ہوا لڑ رہا تھا، کسی نے مشورہ دیا کہ اب لڑنا بے کار ہے۔ ہتھیار رکھ دیئے جائیں۔ یہ سُن کر وہ شیر کی مانند بھڑک اُٹھا اور اپنا وہی پُرانا قول دہرایا کہ دو برس گیدڑ بن کر جینے سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی صرف ایک دن شیر کی طرح زندہ رہ کر جان سے گزر جائے۔ پھر دوپہر سے شام تک بھوکا پیاسا لڑتا رہا، یہاں تک کہ سینے پر گولی لگی اور اس زندۂ جاوید روح نے قفسِ عنصری کو چھوڑ دیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

یہ سانحہ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو گزرا جب کہ سلطان شہید کی عمر پوری اڑتالیس برس کی بھی نہ ہوئی تھی۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

ماہِ نو، کراچی۔ مئی ۱۹۵۷ء

شہدائے بالاکوٹ

محمد عارف

"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق"۔ دنیا میں دیوانے تو بہت ہوتے ہیں لیکن ایسے دیوانے کم ہوتے ہیں جن پر فرزانوں کو بھی نچھاور کیا جا سکے۔ بالاکوٹ کے شہیدوں کا شمار ایسے ہی دیوانوں میں ہوتا ہے۔ آزادی کے تحفظ، حق و صداقت کی سربلندی اور مذہب کی بقاء پر قربان ہونے کے لئے عقل کی نہیں، عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ دہکتی ہوئی آگ میں کودنا از روئے عقل صحیح نہیں لیکن ابراہیمؑ کا آتشِ نمرود میں کودنا عشق کی معراج ہے۔

بالاکوٹ میں شہید ہونے والے دیوانوں کی بھولی بسری کہانی کے اوراق ابھی زیادہ بوسیدہ نہیں ہوئے، اُن کے خون کی لکیریں اسی طرح روشن ہیں۔ اُن کی عظیم قربانی نے بالاکوٹ کو شہرتِ دوام بخشدی ہے۔ آج اس نام میں زندگی کی حرارت اور محسوسات کی شدت ہے۔ یہ نام زبان پر آتے ہی ہمارا ذہن فوراً اُن مردانِ حق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جنہیں اپنی قوم کی بے بسی کا احساس تھا اور جو وطن کی آزادی کے جذبے سے سرشار تھے۔ انہوں نے عزم و ہمت، جوش اور ولولے کے ساتھ صحراؤں، پہاڑوں اور وادیوں کو عبور کیا، اُن کی تلواریں حق کی حمایت میں بے نیام ہوئیں اور کچھ اس طرح کہ دشمن سراسیمہ و حیران ہو کر رہ گیا۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے	جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا	سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن	نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اورنگ زیب کو اقبال نے ہمارے ترکش کا آخری تیر کہا ہے۔ اس کے بہت سے وجوہ ہیں۔ حق و باطل کی جو جنگ اکبر کے زمانے میں شروع ہوئی تھی، اس کا پرتو ایک مرتبہ پھر دارا کی شخصیت میں جھلکتا ہوا نظر آیا، لیکن جو چراغ حضرتِ مجدد الف ثانیؒ نے روشن کیا تھا، باطل کی تند ہوائیں اُسے نہ بجھا سکیں۔ اورنگ زیب نے احیائے دین کے لئے بہت کچھ کیا لیکن اس کی وفات کے بعد ہی خانہ جنگی، لامرکزیت اور انحطاط کا ایک ایسا دور شروع ہوا کہ عیش و نشاط اور رنگ رلیوں میں سرمست ہو کر مسلمانوں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات کو نذرِ تغافل کر دیا۔ برصغیر میں احمد مختارؐ کی اُمت جو اپنی ترقی، سربلندی اور عروج کے اعتبار سے بے مثال تھی، آہستہ آہستہ تباہ و برباد ہو گئی۔ طاؤس و رباب مقصدِ حیات بنا اور اقتدار سے محرومی کو مشیتِ ایزدی پر محمول کیا گیا۔ مایوسی اور اضمحلال کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُمید کے دو دیئے روشن ہوئے، سراج الدولہ نے بنگال اور سلطان ٹیپو نے جنوبی برصغیر میں دینِ متین کا علم سنبھالا، لیکن بادِ صرصر کے تند و تیز جھونکوں نے جلد ہی ان ٹمٹماتی ہوئی شمعوں کو بھی گل کر دیا۔

احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ نے ملک پر حملہ کیا تاکہ اسے غیروں کے پنجے سے چھڑا کر یہاں پھر اسلامی سلطنت قائم کی جائے مگر اپنے ملک کی سرحدات پر بغاوت کے باعث اُسے واپس جانا پڑا۔ اس نے رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ زمان کی وفات پر رنجیت سنگھ پنجاب، ملتان، کشمیر اور صوبہ سرحد کا خود مختار حکمران بن گیا۔ سکھوں کی یہ حکومت مسلمانوں کے لئے ایک عظیم تباہی کا پیغام لائی۔ قیصر و کسریٰ کے تاج اُلٹنے والے آج سکھوں کے زیرِ نگیں تھے اور شاہانِ روم کی قبائیں نوچنے والے مذہبی آزادی کی بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ عمل و اقتدار کی عناں اب مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ تھی بلکہ غلامی کا جُوا اُن کے کاندھوں پر تھا۔ اور ایک پنجاب کیا قریہ قریہ ہی دوسروں کے زیرِ نگیں تھا۔

یہ تو تھی سیاسی زوال کی داستان۔ سماجی اور مذہبی زبوں حالی کی کہانی اس سے بھی زیادہ دردانگیز ہے۔ سیاسی آزادی سے محروم ہونے کے بعد ہم نے اپنے جملہ اوصافِ حمیدہ بھی کھو دیئے تھے۔ قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور بے شمار دوسرے سلسلوں کے بزرگوں نے اسلام کی عظیم الشان خدمات سرانجام دی تھیں۔ لیکن آج انہیں کی جانشینی کا دعویٰ کرنے والے اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں مصروف تھے۔ خاندانی برتری کا احساس ملی مفاد پر غالب آ چکا تھا۔ عوام بھی شمشیر و سناں کی جھنکار کو فراموش کر کے طاؤس و رباب کو اپنائے ہوئے تھے۔ سلطنت کے چلے جانے کا احساس صرف چند ایک دردمندوں کو تھا۔ صحیح مذہبی تعلیم کے فقدان نے اُن کے اعتقادات کو انتہائی گھناؤنا بنا دیا تھا۔ غیر مسلموں نے قبولِ اسلام کے بعد بھی اکثر پرانی عادات کو جو سراسر خلافِ اسلام تھیں، ترک نہ کیا۔ اور اُن کا

اثر ابھی تک موجود تھا۔ ایک دفعہ جب جہانگیر کشمیر جا رہا تھا تو دریائے جہلم کے کنارے قیام کے دوران میں اُسے معلوم ہوا کہ یہاں کے مسلمان اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے بلکہ چتا پہ جلاتے اور اپنی لڑکیوں کی شادی ہندوؤں کے ساتھ بھی کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ جہالت اور مذہب سے ناواقفیت بیسویں صدی کی ابتدا میں بھی عروج پر تھی، چنانچہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملکانہ راجپوتوں میں جو بظاہر مسلمان ہیں، ابھی تک ہندوؤں کی بہت سی رسمیں موجود ہیں۔ یہ لوگ ہندوؤں کے سے نام رکھتے ہیں، مندروں میں جاتے ہیں، دیوتاؤں سے مدد مانگتے ہیں اور سلام کی جگہ رام رام کرتے ہیں۔ غرضکہ عام مسلمان کا مذہب توہمات اور جھوٹے عقائد کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔

سیاسی تنزل اور سماجی انحطاط کا یہ دور تھا جب شاہ ولی اللہؒ کے مایۂ ناز فرزند شاہ عبدالعزیزؒ اور اُن کے داماد شاہ عبدالحیؒ نے ان الفاظ میں ملک کو دارالحرب قرار دیا:

"جب کفار ایک اسلامی ملک پر قابض ہو جائیں اور ملک کے مسلمانوں اور پڑوسی اضلاع کے باشندوں کے لئے یہ ناممکن ہو جائے کہ وہ کفار کا اخراج عمل میں لاسکیں۔ اور جب کفار کی طاقت اتنی بڑھ جائے کہ وہ اپنی خوشی کے مطابق اسلامی احکام کو منسوخ یا برقرار رکھ سکیں اور جب کفار کی اجازت لئے بغیر کوئی شخص ملک کے باشندوں سے محاصل وصول نہ کر سکے اور جب مسلمان پہلے کی طرح محفوظ زندگی بسر کرنے سے قاصر ہوں تو ایسا ملک سیاسی طور پر دشمن کا ملک یعنی دارالحرب ہے۔"

شاہ عبدالعزیزؒ کے اس فتوے کو سب سے پہلے جن عظیم ہستیوں نے قبول کیا وہ شاہ محمد اسمٰعیلؒ اور سید احمد شہیدؒ تھے۔ اِن لوگوں نے سرزمینِ بالاکوٹ پر جامِ شہادت نوش کیا اور قوم کو حیاتِ جاوید کا سبق دے کر ابدی نیند سو گئے۔ شاہ اسمٰعیلؒ، شاہ ولی اللہؒ کے پوتے اور شاہ عبدالغنیؒ کے فرزند تھے۔ اُن کے چچا شاہ عبدالقادرؒ نے اُن کی تعلیم و تربیت کی اور اُن کی وفات پر شاہ اسمٰعیلؒ اُن کے جانشین بنے۔ اسی دوران میں سید احمد بریلویؒ جو شاہ عبدالقادرؒ کے شاگرد رہ چکے تھے اور اُن کی وفات سے ناواقف تھے، دہلی میں آئے۔ اُن کے زہد و تقویٰ کا ہر طرف چرچا تھا۔ مولوی اسمٰعیلؒ اور شاہ عبدالحیؒ انہیں آزمانے کے لئے آئے۔ شاہ اسمٰعیلؒ نے فرمایا نماز تو پڑھتا ہوں لیکن حضورِ قلب سے محروم ہوں۔ سید احمدؒ کے کہنے پر دونوں حضرات نے عشا کی نماز اُن کے حجرے میں ادا کی۔ نماز میں ساری رات گذر گئی اور صبح کو دونوں حضرات نے سید احمدؒ بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ یہی بیعت آگے چل کر ایک عظیم واقعے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ملک بھر میں حج کا وعظ کیا اور سینکڑوں لوگوں کی معیت میں ۱۸۲۳ء میں اس فرض سے سبکدوش ہو کر واپس پہونچے۔ اس سفر میں تقریباً تین سال صرف ہوئے۔

حج سے واپس آنے کے بعد قوم کے اِن محسنوں نے اس کی زبوں حالی کا پورا جائزہ لیا۔ اس وقت ملک میں مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ ایک فرنگی نے اِن الفاظ میں کھینچا ہے: "تعلیمیافتہ مسلمان دیکھ رہا ہے کہ اُسے اختیارات کے حصے اور مراعات سے محروم رکھا گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے تمام فوائد ہندوؤں کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمانوں کا انحطاط ہماری سیاسی بے خبری اور تغافل کا نتیجہ ہے۔"

ادھر "ترغیب الجہاد" کے مطابق "سکھوں کے مظالم تمام حدود کو پھاند چکے ہیں، وہ ہزارہا مسلمانوں کو انتہائی بے انصافی سے موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں اور ہزارہا مسلمانوں کی توہین کر چکے ہیں۔ اذان دینے اور گائے ذبح کرنے کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔"

اِن حالات کا مکمل مشاہدہ کرنے کے بعد ان بزرگوں نے جہاد کو تمام مشکلات کا واحد حل قرار دیا۔ قریے قریے اور کوچے کوچے میں جہاد کا پیغام پہونچایا گیا۔ گوشے گوشے میں اس پیغام کی اشاعت کی گئی۔ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے سکھوں کو شکست دے کر اسلامی حکومت کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ یہ وہی جہاد تھا جس کی شاہ اسمٰعیلؒ بچپن سے کرتے آئے تھے۔ فنِ حرب، پیراکی اور کشتی رانی میں مہارت حاصل کرنے، فاقہ کشی کی عادت ڈالنے، اپنی عادات پر قدرت حاصل کرنے اور تپتی ہوئی زمین پر گھنٹوں ننگے پاؤں چلنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ زمانۂ جہاد کی ہر مشکل کو بآسانی برداشت کر سکیں۔ اب وعظ و تبلیغ کا دور ختم ہو چکا تھا، بحث و تمحیص کا زمانہ گذر گیا تھا، کفر کے فتووں کا جواب دینے کا وقت نہیں تھا بلکہ عملی دنیا میں قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔ آزادی اپنے متوالوں کا خون مانگتی تھی اور وطن کی آزادی کیلئے سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کا مقدس خون درکار تھا۔ دبی ہوئی چنگاریاں شعلۂ فروزاں بن گئیں، بظاہر بجھی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ اور خدمتِ ملّی کے جذبے سے سرشار صاحبِ دل مسلمان اُن کی حمایت کے لئے تیار ہو گئے۔

عزمِ جہاد

۱۲۴۱ھ بمطابق ۱۸۲۶ء میں جب سرفروشوں کی یہ جماعت دہلی سے سندھ کے راستے یاغستان کو چلنے لگی تو عالم یہ تھا کہ لوگ کشاں کشاں اس میں شریک ہو رہے تھے۔ سید احمد بریلویؒ لشکر کی قیادت کر رہے تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیلؒ اور شاہ عبدالحیؒ ان کے ہمراہ تھے۔

لشکر میں دس بارہ ہزار افراد شامل تھے۔ چونکہ راستے میں دشواریاں زیادہ تھیں اور آسانیاں کم، دشمن بے شمار تھے اور دوست خال خال؛ اس لئے مجاہدین نے بھیس بدلا اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں آگے بڑھے۔ نواب ٹونک سید صاحبؒ کے مرید تھے۔ انہوں نے لشکر کی مالی امداد کی۔

سید صاحبؒ نے سکھوں کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے سرحد کی سنگلاخ سرزمین کو اس لئے ترجیح دی تھی کہ یہ علاقہ مجاہدین کے لئے نسبتاً محفوظ تھا۔ دوسرے یہاں کے باشندوں کی شجاعت اور حمیتِ ملی مسلم تھی۔ اگرچہ یہ بعد میں محض ایک سراب ثابت ہوئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریزی حکومت سکھوں سے معاہدہ کر چکی تھی۔ جس کے باعث انگریزی سرحد سے سکھ سلطنت پر حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سید صاحبؒ کا سفر مشکلات و مصائب کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ انہیں بے آب و گیاہ ریگستانوں اور پتھریلی چٹانوں سے گذرنا پڑا لیکن شوقِ شہادت اِن تمام آزمائشوں میں پورا اُترا۔ اور یہ چند ہزار مردانِ کار اسلام کی سربلندی پر قربان ہونے کے لئے ۱۸۲۶ء میں پشاور پہونچ گئے۔ ہشت نگر میں قیام کیا۔ یوسف زئی قبیلے کے پہاڑی علاقوں میں اُن کی حکومت بآسانی قائم ہوگئی۔ کیونکہ اُن کا ایک با اثر فرد عمر خاں پنج تر غازیوں کا ساتھ دینے پر تیار ہوگیا۔ البتہ کابل کا حکمران یار محمد مجاہدوں کے خلاف تھا۔ افسوس! کابل کا حکمران طبقہ سکھوں کے مظالم دیکھ کر بھی مجاہدین کی مدد پر آمادہ نہ ہوا۔ ان لوگوں نے اس وقت بھی بند باندھنے کی تدبیر نہ کی جب سیلاب سامنے نظر آرہا تھا۔

معرکۂ حق و باطل

رنجیت سنگھ کو ان واقعات کی خبر ملی تو اس نے اپنے ایک رشتہ دار جرنیل سردار بدھ سنگھ کو دس ہزار سپاہ دے کر بھیجا۔ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر اکوڑہ میں سکھوں کے ساتھ پہلا مقابلہ ہوا۔ پوری فضا تلواروں کی جھنکاروں سے معمور تھی۔ سید صاحبؒ اور اُن کے ساتھیوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اجنادین اور یرموک کے فاتحین کے جانشینوں کی تلواریں ابھی زنگ آلود نہیں ہوئیں۔ دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور حق کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس سے اُن کے حوصلے بڑھ گئے، اُن کا عزم جوان ہوگیا۔ اُن کے قدم اپنے مقصد کی طرف زیادہ تیزی سے اُٹھنے لگے۔ انہوں نے بارگاہِ رب العزت میں تشکر و امتنان کے آنسوؤں کے ساتھ ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔ اب یار محمد بھی مجبور ہوگیا کہ وہ یوسف زئی علاقے کی سرحدوں کے احترام کا وعدہ کرے۔

شہادت

اس کے بعد سکھوں کے ساتھ اور چھوٹے چھوٹے معرکے ہوئے۔ آخر ۸ار جنوری ۱۸۳۱ء کو مجاہدین کا یہ لشکر راج دواری پہنچ گیا۔ سچوں، بھوگڑ منگ اور مظفر گڑھ پر قبضہ کرنے کے بعد بالاکوٹ کو اپنی رزم گاہ بنایا۔ یہ قصبہ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقوں میں وادئ کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے۔ دریائے کنہار کے مغربی کنارے کے ساتھ شمال کو جانے والی سڑک پر مانسہرہ کشمیر روڈ سے ۱۲میل کے فاصلے پر یہ قصبہ آج اُن جاں نثارانِ قوم کی آخری آرام گاہ بنا ہوا ہے جنہوں نے استحکامِ ملی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

بالاکوٹ اور مظفر آباد پر اسلامی پرچم کے لہرانے کی خبر سنتے ہی راجہ شیر سنگھ، جو اس زمانے میں پشاور میں مقیم تھا، واپس آیا اور مجاہدین سے ٹکرانے کے لئے پر تولنے لگا۔ سید صاحبؒ نے بالاکوٹ کو سردار حبیب اللہ کے سپرد کیا اور خود بقیہ شہروں کی حفاظت پر کمربستہ ہوئے۔ راجہ شیر سنگھ کو جب بالاکوٹ کے ترکش میں تیروں کی تعداد کم نظر آئی تو اس نے پہلے انہی سے نبٹنے کی کوشش کی۔ سردار حبیب اللہ نے سید صاحبؒ کو تمام حالات سے آگاہ کیا، چنانچہ وہ اور اُن کے ساتھی بالاکوٹ کی حفاظت کے لئے عقاب وار آموجود ہوئے ؎

مجاہدانِ صف شکن بڑھے جو عزمِ جاں لئے ... تو موت پا ادب بڑھی حیاتِ جاوداں لئے
یہ سیدِ شہید یہ مجاہدان ہم سفر ... کہ جیسے ماہتاب ہو جلو میں کہکشاں لئے
یہ وہ ہیں جن کے عمر بھر قدم نہ ڈگمگا سکے ... مصیبتوں نے بارہا ہزار امتحاں لئے
فدائیانِ باصفا کی پیشوائی کے لئے ... ملائکہ اُتر رہے ہیں مژدۂ جناں لئے

شیر سنگھ کی فوج ایک قدیم راستے سے حملہ آور ہوئی۔ راستے کا پتہ اسے کسی مخبر نے بتایا تھا۔ مجاہدین شوقِ شہادت میں سرشار تھے۔ سید صاحبؒ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ جاں نثار ساتھیوں نے اُن کی تقلید کی اور دشمن کی صفوں کو درہم برہم کرنے لگے۔ زمین و آسماں حیرت سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے کہ ...۱۲ فدائیانِ مصطفےٰؐ ...۱۵ دشمنانِ اسلام کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔ سرحد کی پتھریلی چٹانوں پر حق و باطل کا معرکہ ہو رہا تھا، محکوموں کا لہو گرم تھا اور وہ آزادی کی مقدس قربان گاہ پر نذرِ جاں پیش کر رہے تھے۔ آج پہاڑی نالوں میں ایک نئے نالے کا اضافہ ہوگیا تھا، اس نئے نالے میں سرد اور شیریں پانی نہیں،

بلکہ انسانوں نہیں آزادی کے متوالوں کا اُبلتا ہوا خون بہہ رہا تھا۔

آخر اکثریت اقلیت پر غالب آئی۔ بیشتر مجاہدین سرزمین بالاکوٹ پر جام شہادت نوش کر کے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اس شمع کو بھی گُل کر دیا جو سید صاحبؒ کے جسدِ مبارک میں فروزاں تھی۔ شاہ اسمٰعیلؒ بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے عالمِ بقا کو سدھارے۔ یہ واقعہ بروز جمعہ ۶ مئی ۱۸۳۱ء (۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ھ) کو پیش آیا۔

لیکن آزادی کی یہ تحریک صرف یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ نے سینوں میں جو لَو لگائی تھی وہ تا دیر باقی رہی۔ مشکلات و مصائب کے باوجود اُن کا پیغام زندہ رہا اور ہر دور میں ایسے مردانِ دلاور پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اِن کے پیغام کو سینے سے لگائے رکھا۔ "ایک مرتبہ ایک مجاہد سفیر کے طور پر سرحد سے آکر پٹنہ جا رہا تھا۔ جب انبالہ پہنچا تو اُسے محسوس ہوا کہ پولیس اُس کی جستجو میں ہے، لہٰذا اس نے چاقو سے اپنی ایک آنکھ نکال کر گاڑی سے باہر پھینک دی اور خون پونچھ کر بیٹھ گیا۔ انبالہ پہنچ کر پولیس نشاندہی کے مطابق گاڑی میں آئی مگر وہ شخص جس کی تلاش میں تھی، اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس کی بجائے وہاں تو ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جس کی ایک ہی آنکھ تھی۔"

یہ تھی اُن لوگوں کی ہمت و مردانگی جو شاہ شہیدؒ کا علم بلند کئے ہوئے تھے۔ یہ مواد آہستہ آہستہ پکتا رہا اور آخر کار ۱۸۵۷ء میں ظاہر ہوا۔ ہر طرف آزادی کا چرچا ہونے لگا۔ اہلِ ملک نے ایک مرتبہ پھر آزادی کے لئے خون پیش کیا۔ اس جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد بھی یہ تحریک مختلف صورتوں میں جاری رہی۔ ڈیڑھ سو سال کی مسلسل کوشش کے بعد آخر ۱۹۴۷ء میں سید شہیدؒ کی آرزوؤں اور شاہ شہیدؒ کی تمناؤں نے حقیقت کا جامہ پہنا اور برصغیر کی فضا توحید کے نعروں سے گونج اٹھی۔

یہ اُن جاں فروشوں کی داستاں ہے جنہوں نے اپنا سب کچھ قوم پر قربان کر دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دوربیں نگاہوں نے آنے والے خطرات کا پہلے ہی مشاہدہ کر لیا تھا۔ اور اُن کی مدافعت کے لئے کمربستہ ہو گئے تھے۔ جب برصغیر میں اسلام کے نام لیوا محوِ خواب تھے تو یہ جانبازان نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہے تھے ؎

ہندیانِ خفتہ را بیدار کرد　　　بندگانِ نفس را احرار کرد

آج برصغیر کے مسلمانوں میں جو بیداری موجود ہے اس کی تخلیق میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، شاہ عبدالحئیؒ اور اُن کے رفقائے کار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ اسی مذہبی اور ملی احساس کا نتیجہ ہے جس کے زیرِ اثر انہوں نے بالاکوٹ میں اپنے سروں کو کٹانا منظور کیا۔ ان شہیدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔ انہوں نے جو چراغ جلایا تھا وہ آج تک روشن ہے، اس کی کرنیں آج بھی مسلمانوں کے دلوں کو منور اور تاریکیوں میں اُن کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ درحقیقت اُن کی شہادت نے قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے عمل کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اُن کی جاری کی ہوئی تحریک اس طوفاں خیزی میں بھی نہیں مٹ سکی، بلکہ اس کے اثرات مابعد اتنے قوی تھے کہ آج برصغیر کے کم از کم ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر تو متصرف ہونے میں ہمیں کامیابی ہوئی جہاں آٹھ کروڑ مسلمان امن و چین سے زندگی بسر کر سکیں اور اپنی ثقافت، مذہب اور تہذیب کی حفاظت کر سکیں۔ مستقبل کا مورخ جب اس برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ قلم بند کرے گا تو وہ شہدائے بالاکوٹ کو فراموش نہیں کر سکیگا۔ اُن کا نام ہمیشہ تابندہ رہیگا۔ ان کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر سنہرے حروف میں لکھے جائینگے۔ اُن کی ہمت، اُن کی دلیری، اُن کی جانبازی اور اُن کی حق آگاہی ملتِ پاکستان کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہوگی۔

کلام ظفر

اردو غزل کے مالا مال خزانے میں یوں تو بڑی آب و تاب کے دیوان ہیں، لیکن ظفر کے سرمایۂ سخن پر اُن کی شخصیت اور مخصوص فصاحت دونوں کے ٹھپے بہت نمایاں ہیں۔ بقول مولانا حالی "ذوق کے ہاں زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اوّل سے آخر تک یکساں ہے۔" (مقدمہ شعر و شاعری)

جتنے لائق انتخاب اشعار ظفر کی کلیات میں موجود ہیں اور بہت کم دیوانوں میں ملتے ہیں۔ ان میں اُنکی پوری نفسیات اور حالاتِ زندگی کا مرقع بھی نظر آجاتا ہے ؎

بلا سے جاہ و حشم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو
نہیں ہے ہم کو بھی غم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو

بلکہ ذرا غور کیجئے تو آنے والے انقلاب کے اشارے بھی مل جاتے ہیں ؎

کشتۂ قامت جتنے ہیں اُس کے آپس میں سب مل جُل کر
کریں اگر اک حشر بپا، کیا اچھا ہو کیا اچھا ہو!

پنشن خواری اور ڈپلومیٹک روابط اُن کو اس سے زیادہ کھل کر کچھ کہنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ مگر یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ ؎

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوجِ ہندستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا!

پیش نظر غزل دیوان دوم کی ہے جو ۱۸۲۳ء کے بعد مگر تخت نشینی ہندستان سے بہت پہلے لکھی گئی ہوگی۔ (ش۔ حقی)

انقلاب سے پہلے

بسا آنکھوں میں وہ پیارا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے
تصور سا بندھا اس کا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

وہ ہے پیشِ نظر اور پھر نظر آتا نہیں ہرگز
پڑا غفلت کا اِک پردا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

غمِ فرقت میں تیرے ہم کو کب فرصت ہے ہنسنے کی
فقط یاں شغل گریے کا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

بلا سے گر نہیں ہے سایۂ بالِ ہما سر پر
تری دیوار کا سایا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

ہمیں کیا کام جو ناحق سہارا غیر کا ڈھونڈیں
سہارا یاں خدا ہی کا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

سرِ ہر گام خارِ دشت کو ہے آنکھ دکھلاتا
ہمارے پاؤں کا چھالا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

خیال اس خالِ لب کا دل سے جاتا ہی نہیں اپنے
غرض یہ دلنشیں نکتہ کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

مزا جو کچھ کہ اس دردِ محبت میں ہے بے دردو
وہ ہم سے پوچھتے ہو کیا۔ کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

ظفر دنیائے فانی خواب کا سا ایک عالم ہے
مگر اس خواب میں دیکھا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

انقلاب کے بعد

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہار حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

مرے پاس آتے تھے دمبدم وہ جدا نہ ہوتے تھے ایکدم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم وہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے

جو ملاتے تھے مرے منہ سے منہ کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
جو غرور تھا وہ انہی پہ تھا وہ تو سب غروروں کو ڈھا گئے

بندھے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ یہ حسرت اُن کی گلے پڑی
وہ جو کاکلیں تھیں بڑی بڑی وہ انہی کے پیچ میں آ گئے

ظفر کے زمانۂ نظر بندی کا کلام بہت نامعتبر صورت میں ملتا ہے۔ بعض درد مندوں نے اُن کی زمینوں میں شعر لکھ کر گویا اُن کی ہمنوائی بھی کی یا انہیں نام لے کر مخاطب کیا۔ اس طرح بھی یہ کلام خلط ملط ہو گیا جیسے یہ غزل ؎
گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
جو دراصل ایک غیر معروف شاعر حسامی کی غزل ہے۔

پیش نظر غزل کثرت شہرت کے علاوہ اپنے انداز و قرائن کی داخلی شہادت کے بموجب ظفر ہی کی معلوم ہوتی ہے جو ایک مدت تک دلی کا ایک نابینا فقیر گا گا سنائی دیتا تھا۔

تغزل نے قطع نظر کر کے دیکھئے (اور رنگون یا دلی کے زنداں میں ایک خانہ خراب بڈھا تغزل کی کیا صلاحیت رکھتا ہوگا) تو شعر خود گواہی دیں گے کہ اس وقت ظفر کے پیش نظر کوئی خیالی شاہد نہیں بلکہ اُن کی آنکھیں قلعے ہی کے اصنام شکستہ پر جمی ہوئی ہیں۔ بن سنور کر آنے اور بہار حسن دکھانے والے جو "دل کو داغ لگا کر" رخصت ہوئے اور جن کی "حسرت گلے پڑی"، اس کے اپنے چشم و چراغ اور اس کی اپنی گمشدہ جنت کے حور و غلماں تھے جن کی یاد میں آخر لئے یہ اشک حسرت بہائے ہیں!!
چنانچہ یہ غزل بہا پُر تاثیر مرثیہ بن گئی ہے۔

یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو — ظفر

(ش۔ح)

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۷ء

انیسویں صدی کا افسانۂ تباہی

محمد امین زبیری

۱۸ویں صدی کے آغاز میں ہی اورنگ زیب عالم گیر کے وارثان سلطنت میں جو جنگ و جدل برپا ہوئی اور نئی نئی قوتیں ظہور پذیر ہوئیں، ان قوتوں میں انگریزوں کی تجارتی کمپنی جس نے ان تمام لڑائیوں میں زبردست حصہ لیا، آخر الامر سب سے بڑی طاقت بن گئی۔ حتّٰے کہ نصف صدی کے اندر ہی مغل سلطنت کی جانشین ہوگئی اور آخری مغل بادشاہ اس کا وظیفہ خوار ہوگیا جس کا دائرۂ حکومت صرف قلعہ معلّٰے کی چار دیواری تھا۔ اس زمانہ تغیر و تبدل میں سلطنت کے انحلال و بربادی سے مسلمان ہی سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر تباہ نہ تھے بلکہ مذہبی طور پر بھی نام کے مسلمان رہ گئے تھے۔ پنجاب میں سکھوں نے ان کی حالت غلاموں سے بدتر کردی تھی۔ اس حالت کی تبدیلی یا اصلاح کے لئے (حضرت شاہ) ولی اللہی تحریک پیدا ہوئی جس میں بعد کو جذبۂ جہاد بھی شامل ہوگیا۔ کئی سال تک بڑے بڑے معرکے ہوئے مگر خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے یہ تحریک انجام کار سرد پڑگئی۔ انگریز تاجر برابر ترقی اور حکومت کرتے رہے۔ اور کمپنی جب حکومت کی شکل میں آگئی تو اس کا تعلق برطانوی حکومت سے ہوگیا۔ برصغیر میں اس کا گورنر جنرل اعلیٰ اختیار کا حاکم تھا۔ غرض اب مسلم حکومت کی جانشین عیسائی حکومت بنی۔ عیسائیوں میں ہنوز مسلمانوں کے ساتھ مذہبی تعصب شدید ترین طور پر موجود تھا۔ اسی صدی کے آغاز میں ترکی سلطنت کے خلاف جب یونان کے عیسائیوں نے، جو ترکی کی رعایا میں تھے، علم بغاوت بلند کیا تو انگلستان کے ایک ممتاز و مشہور شاعر لارڈ بائرن نے اپنی نظموں سے بغاوت کی آگ پر تیل چھڑکا۔

برصغیر میں بھی یہ مسیحی تعصب مختلف صورتوں میں مسلمانوں پر حملہ آور تھا اور وہ ایک منصوبہ کے تحت اقتصادی طور پر تباہ کئے گئے بطور مثال ۱۸۱۸ء میں صوبۂ بنگال میں ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے تمام لاخراج زمینیں، جو مغل سلاطین نے عطا کی تھیں، ضبط کرلی گئیں۔ اس وقت بنگال میں ۹۵ فی صدی مسلمان ان زمینوں کے مالک تھے۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد ان کی تعداد پانچ فی صدی رہ گئی۔ پھر ۱۸ سال بعد ایک اور قانون نافذ ہوا جس نے مسلمانوں کی حیات قومی پر سخت ضرب لگائی یعنی فارسی اور اردو کو دفتر و دربار سے خارج کیا گیا۔ اس وقت تک تمام معمولی حکام دیوان، مفتی، قاضی، صدر اعلےٰ، صدر امین اور کوتوال علاوہ محرروں اور نقل نویسوں کے سب مسلمان ہوتے تھے۔ اس قانون سے دفعتہً یہ سب عہدے اُن کے ہاتھوں سے نکل گئے۔

اس تعصب کا اندازہ اس طرح کرنا چاہیئے کہ ۱۸۴۲ء میں معرکۂ غزنین کے بعد لارڈ ایلن برا نے ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا تھا کہ وہ خاص لوگ جن کی گذر ہمارے ٹکڑوں پر ہے دل سے ہمارے بدخواہ تھے۔ بخلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار مسرت کر رہے ہیں جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کامل ہے جن کی تعداد دہ ہے، تو پھر ہم کیوں نہ اس قوم کا ساتھ دیں جس کی تعداد ۹ ہے اور جو ہماری وفادار ہے؟

پھر دوسری مرتبہ لکھا کہ میں اس یقین کے خلاف کیسے آنکھیں بند کرلوں کہ مسلمانوں کی یہ نسل دیوانہ وار ہماری دشمن ہے اور اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مہربانی کی جائے۔

اسی تعصب کی وجہ سے فوج میں بھی مسلمانوں کی بھرتی میں بہت کمی کی گئی۔ اور جو ہوئی تو ان فوجی دستوں کی شمولیت میں جن میں ہندوؤں کی تعداد غالب تھی تعلیم بھی عیسائیت کے رنگ میں جاری کی گئی۔ وہ تبلیغ مسیحیت کی بنیاد پر تھی اور سرکاری طور پر سب سے زیادہ مسلمان نشانۂ ملامت بنے مثلاً ایک رپورٹ میں لکھا گیا کہ تاریکی کا اصلی علاج ان میں روشنی پھیلانا ہے اور ان کی برائیوں کا علاج جو سب سے بہتر ہے، ان تک ہمارے علوم اور ان کی روشنی کا پہونچانا ہے کیونکہ راسخ العقیدہ عیسائی دنیا کی نجات عیسائیت میں سمجھتا ہے۔ تبلیغی مشن اور مدارس ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے، اعلےٰ حکام ان مدرسوں میں جاتے امتحان لیتے اور کم عمر طلباء سے پوچھا جاتا کہ تمہارا خدا کون ہے اور نجات دہندہ کون ہے؟ اگر وہ عیسائی عقیدہ کے مطابق جواب دیتے تو انھیں انعام دیا جاتا۔ ہر گورنر اور انسپکٹر گاؤں گاؤں اس تعلیمی منادی و ترغیب کے لئے دورے کرتے۔ یہ افسر گاؤں میں کالا پادری کے نام سے مشہور ہوتا تھا۔
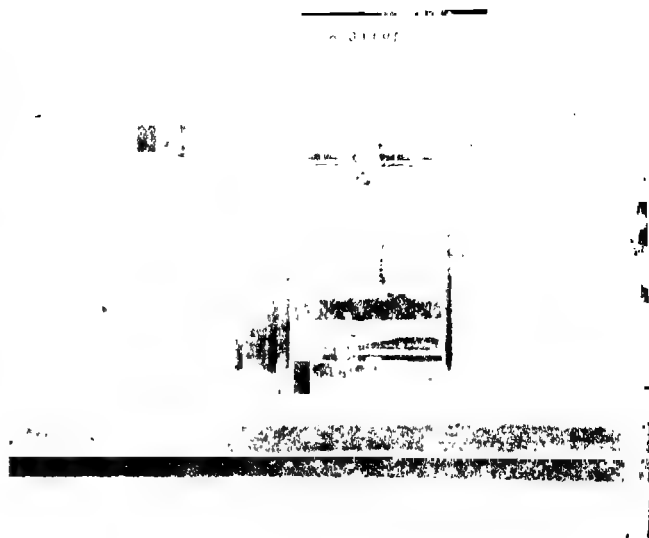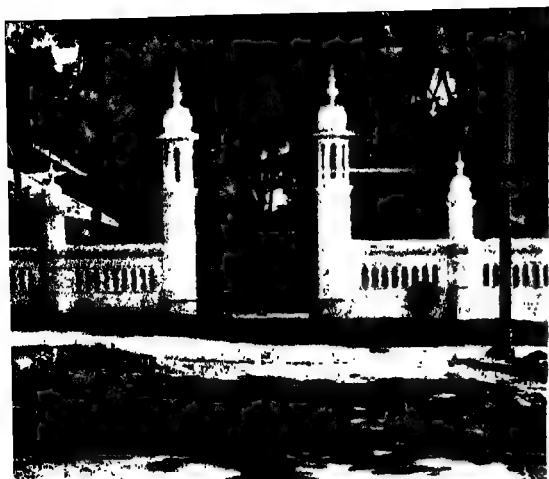
رنگون میں جلا وطن
بادشاہ بہادرشاہ ثانی
کا مزار
(چند اندرونی و بیرونی مناظر

۱۸۵۷ء کے بعد دور کشاکش
میں سفینۂ ملی کے پہلے نگہبان
سر سید احمد خاں

نشاۃالثانیہ کی تحریک
میں سر سید کے بعض رفقا

غرض اس تعلیم اور سلسلے سے مسلمان دور دور رہے۔ یہ نظام تعلیم ہی ایک عذاب تو تھا بلکہ بڑا عذاب یہ تھا کہ ان کے اوقات تعلیم بھی ضبط کئے گئے۔ ہگلی میں ایک بڑا وقف تھا
جس کی آمدنی اسّی ہزار سالانہ تھی لیکن اُن پر صرف ڈھائی ہزار خرچ تھا جو ایک عربی مدرسہ کو دیا جاتا ہے

کمپنی کے اس متعصبانہ رویہ کے علاوہ اس کا عام نظام حکومت بھی اہل ملک کے رسم و رواج اور روایات و حالات کے خلاف تھا بعض ایسے قوانین جاری ہوئے جن سے عامتہ بیزاری پیدا ہوئی۔ فوجی نظم و نسق میں بھی یہی عوامل اور یہی اسباب تھے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل متعدد مرتبہ فوجی سرکشی کی نوبت آئی تھی۔ اعلیٰ
اور ذمہ دار حکام میں عیش پسندی اور غرور تھا اور اصلی حالات اور اہل ملک کے خیالات و مصائب سے خبر نہ ہوتی اور نہ وہ اس کی ضرورت جانتے تھے

آخر یہ مادہ جو عرصہ سے پک رہا تھا پھوٹ پڑا اور ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ خواہ کسی نام سے تعبیر یا یاد کیا جائے، برپا ہوا مگر اس کا رقبہ وسیع نہ تھا۔ دہلی دوآب اور وسط ملک تک ہی محدود رہا اور ان مقامات میں بھی وفادار اور غیر وفادار دونوں قسم کے آدمی تھے جن میں عام و خاص ہندو مسلمان، فوجی غیر فوجی سب ہی شامل تھے۔ جب یہ شعلے سرد ہوئے تو انتقام کا سب سے بڑا شعلہ بھڑکا جس کی لپیٹ میں ہندو مسلمان دونوں تھے، لیکن ہندو بچ گئے اور مسلمان جلتے رہے
قلعہ دہلی میں مغل سلطنت کا جو آخری وارث تھا اب ایک مجرم کی حیثیت سے فوجی عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ اس موقع پر وکیل سرکار نے جو تقریر کی

اس میں مسلمان خاص طور پر ہدف الزام تھے۔ اس نے کہا:۔

"ایشیائی طرز معاشرت سے جو کوئی بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہوگا فوراً اس بات کو تسلیم کرلے گا اور خصوصاً ہندوؤں کی نسبت کہ ان کے بہت تھوڑے سے لوگ برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ چپاتیوں کی تقسیم اور آٹے میں ہڈیوں کے ملانے کی افواہ بلاشبہ ایک جڑ سے نکلی ہیں۔ اور دونوں کو اسلامی سازشوں کی گڑھی ہوئی فطرت کی طرف منسوب کرنا صاف بیانی یا استدلال قطعی کی حد سے باہر نہیں۔ ہندو سپاہی اپنی پہلی لغزش جذبات پر نادم ہوتے ہیں اور مسلمان ساتھیوں پر ملامت کرتے ہیں کہ انھوں نے ہم کو گمراہ کیا ہم نے اپنی تحقیقات میں اسلامی سازشوں کا سراغ لگایا ہے، اس میں ہم کو کوئی ایسا کاغذ دستیاب نہیں ہوا کہ ہندوؤں نے بھی جماعت بن کر ہمارے خلاف سازش کی یا اُن کے برہمنوں اور پنڈتوں نے عیسائیوں سے جہاد کی تبلیغ کی ہو۔ ان کے پاس کوئی بادشاہ تخت نشیں کرانے کو نہ تھا، کوئی مذہب تلوار سے پھیلانے کو نہ تھا۔ اسلامی تعصب پہلے سے حملہ آور تھا اور یہ خاص مذہب کینہ ور متعصب حکومت کے لئے جد و جہد کر رہا تھا۔ صرف مسلمان ہی خلش دار جڑے ہوئے پیکان ہیں ہندو اپنے پیش قدم ہمسایہ کے حکم بردار رہے ہیں"

غرض (بقول سرسید) کوئی آفت جو اس زمانہ میں ہوئی ہو، گو وہ رام دین اور ماتا دین نے ہی کی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جس نے پہونچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ ان دنوں میری نظر سے جو انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں، وہ بھی میں نے دیکھیں اور ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بد ذات کوئی نہیں مگر مسلمان، مسلمان، مسلمان کوئی کانٹوں دار درخت اس زمانہ میں نہیں ہوگا جو یہ نہ کہا گیا کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا کہ مسلمانوں نے اُٹھایا تھا"

غرض یہی تعصب تھا جس کے جذبے سے مسلمانوں سے بہیمانہ انتقام لیا گیا، وحشیانہ سزائیں دی گئیں۔ ایک شخص کو محض اس بنا پر پھانسی دی گئی کہ اس نے انگریزوں کو نصاریٰ لکھا تھا۔ بہر حال یہ آتشیں زمانہ سرد ہوا اور اب تاج کی حکومت شروع ہوئی۔ اس میں بھی ہم کو اسی تعصب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں

مسلمانان سرحد و پنجاب پر سکھوں نے اپنے زمانۂ عروج میں جو مظالم کئے تھے ان سے متاثر ہو کر مولانا سید احمد بریلوی اور اُن کے خلیفہ مولوی محمد اسمٰعیل رحمہم اللہ نے ۱۸۲۶ء میں جو سلسلۂ جہاد شروع کیا تھا، وہ ۱۸۴۷ء تک جاری تھا تا آنکہ انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا۔ اُس وقت کے سردار مجاہدین مولوی عنایت علی و مولوی ولایت علی مع رفقاء کے اپنے وطن کو واپس بھیجے گئے اور اُن سے سرحد کو نہ جانے کے میعادی مچلکے لئے گئے لیکن میعاد گذرنے پر یہ دونوں سرحد پہونچے اور ایک لڑائی میں شہید ہو گئے۔ ان علمائے کرام کے باعث بعض سرحدی مقامات علمی مرکز بھی بن گئے جہاں اکثر طالبان علم حصول علم کے لئے جاتے نیز ہجرت کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا۔ بہار و بنگال وغیرہ سے ان طلباء و مہاجرین کی امداد میں بڑی بڑی رقوم بھیجی جاتیں۔ ۵۷ء کے بعد تعداد مہاجرین

---

[1] اس داستان کا یہ عبرت ناک باب ہے کہ خود ان مجاہدین اور سرحدیوں کے فروعی تعصبات و اختلافات اور بعض مواقع پر غداری اور حرص و آز، زیادہ تر سیاسی ذہنیت و قابلیت کے فقدان نے اُن نتائج سے محروم رکھا جو اس عزم و جوش اور مالی و جانی قربانی سے حاصل ہو سکتے تھے

میں اضافہ ہوگیا اور جس طرح اکثر مفسد آدمی اور مفرور سپاہی نیپال کی ترائی اور راجپوتانہ کے بیابانوں میں سزا سے بچنے کے لئے منتشر ہو گئے اسی طرح ان سرحدی مقامات پر بھی پہونچے مگر حکومت نے چونکہ ۱۸۶۲ء سے سرحدی محاربات کا آغاز کردیا تھا لہٰذا ان کا استیصال بھی ضروری تصوّر کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۴ء کے درمیان جن لوگوں پر اس خالص مذہبی خیرات دینے اور جمع کرنے کا شبہ ہوا ان کو سیاسی مقدمات میں ماخوذ کیا گیا اور ۱۸۶۸ء میں متعدد اشخاص ایکٹ III ۱۸۱۸ء کے ماتحت نظربند کئے گئے۔

یہ لوگ اہلِ حدیث تھے، ان کو وہابی کہا گیا اور وہابیت بالخصوص بنگال میں بغاوت کے مرادف قرار دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "بنگال میں وہابی تحریک کے بعد انگریزوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس سے مسلمان جاگیرداروں اور امین داروں کی تمام املاک، جو وسعت میں تمام بنگال کی ایک چوتھائی تھیں، گورنمنٹ انگلشیہ نے ضبط کرلیں۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ملّت کے سینکڑوں شریف آدمی اور خوشحال خاندان نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور ہماری قوم کے ہزاروں افراد عالمِ بیکسی و مفلسی میں دربدر پھرنے لگے، سینکڑوں گھرانوں نے شہروں کو خیرباد کہہ کر دیہات میں سکونت اختیار کرلی اور کاشتکاری پر قناعت کی۔" (سر عبدالرحیم)

یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے نہایت پُرآشوب تھا اور ان کے خلاف ایسا سخت پروپیگنڈا تھا جو کبھی ان کو ابھرنے نہ دیتا۔ اخبارات میں مسئلہ جہاد ایک خاص بحث کا موضوع تھا مسلمانوں پر الزام لگایا گیا کہ سرحد والوں کو انھوں نے ہی انگریزوں کی مخالفت پر ابھارا تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد کی لڑائیاں اسی کا نتیجہ تھیں۔ تقریباً چودہ اسلامی کتابوں کے غلط ترجمے کئے گئے اور تاریخی واقعات کو رنگ دے کر شائع کیا گیا۔ اتفاق سے اسی دوران میں ایک سرحدی پٹھان نے ۱۸۷۱ء میں لارڈ میو کو انڈمان اور دوسرے نے مسٹر نارمن چیف جسٹس کو کلکتہ میں قتل کردیا۔ یہ ان کا مجنونانہ جوش تھا۔ ان واقعات پر بھی مذہبی تعصب کا رنگ چڑھایا گیا۔ یہی وقت تھا جس میں ایک ممتاز انگریز نے ایک کتاب شائع کی جس میں اسلامی تعلیمات کو ایسی تدلیس اور تاویل کے ساتھ پیش کیا کہ ہر مسلمان عیسائیوں کا دشمن نظر آتا تھا۔ اس کتاب سے نہ صرف ہندوستان کے انگریز بلکہ انگلستان میں بھی بہت برا اثر پڑا۔ اس کتاب کا عنوان تھا "کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر ازروئے ایمان ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟" ایک موقع پر لکھا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لئے موجبِ خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے باعثِ خطر چلے آتے ہیں۔"

اگرچہ اس کتاب کا زہر بہت کچھ رفع کیا گیا، پھر بھی آئندہ صدی یعنی ۱۹۰۰ء کے بعد بھی تعصب کے آثار موجود رہے۔

تواریخِ آزادی

جامؔ نوائی بدایونی

تاریخِ آزادیٔ جانفزا

۱۳۷۶ھ

کامراں تحریک اٹھارہ سو ستاون کی ہوئی
مُہرِ خاموشی لبِ باطل پہ تبخالہ ہے آج
جامؔ میں نے شکرِ داور کہہ کے برجستہ کہا
"جدوجہدِ حریت کا جشنِ صد سالہ ہے آج"

۱۳۷۶ھ = ۱۹۵۷ء

لے کے جو تحریک اٹھارہ سو ستاون کی اٹھے
اُن سراپا نازِ بربادی شہیدوں کو سلام
جامؔ ہے اس یادِ صد سالہ کا سالِ عیسوی
"مستفیضِ جہدِ آزادی شہیدوں کو سلام"

۱۹۵۷ء

سانحات ۱۸۵۷ء کا ایک مرثیہ خواں:

ظہیر دہلوی

ڈاکٹر سید عبداللہ

۱۸۵۷ء کی جنبشِ آزادی نے سماج اور ادب کو کیا کچھ دیا اس کی داستان طویل ہے۔ اور اس پر کئی مضامین اور چند کتابیں متعدد اہلِ علم کے قلم سے نکل بھی چکی ہیں۔ اس لئے میں اس مختصر سے مضمون میں سنہ ستاون کے صرف ایک ادیب ظہیر دہلوی کا ذکر کرتا ہوں جس نے اس واقعۂ ہوش ربا سے متاثر ہو کر ایک کتاب نثر میں اور ایک شہر آشوب اور ایک غزل نظم میں لکھی۔ اور اگرچہ غدر دہلی کے متعلق غالب اور بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اپنے تاثرات نظم میں پیش کئے ہیں مگر میں نے ظہیر دہلوی کا اس لئے انتخاب کیا ہے کہ سب معاصرین کے مقابلے میں ان کے تاثرات ۱۸۵۷ء کے واقعہ کا معقول تبصرہ معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے اس کے معقول نقطۂ نظر میں عقلی تجزیہ کی ایک خاص جھلک نظر آئی جس کی وجہ سے میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ اس مصنف کے شہر آشوب اور اس کی نثری کتاب "داستان غدر" پر کچھ روشنی ڈالوں۔

ظہیر ذوق کے شاگرد تھے اور رسماً بادشاہ ظفر سے بھی انہیں شرف تلمذ حاصل تھا۔ مگر میری نظر میں ان کی نثر ان کی شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔ ظہیر نے انقلاب دہلی کے متعلق جو کتاب نثر میں لکھی ہے، اس کی اہمیت تاریخی لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں مگر سوانح عمری کی حیثیت سے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ بظاہر اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض داستان غدر نہیں، یہ اس مصنف کی خود نوشت سوانح عمری ہے جس میں اس ہنگامہ کے واقعات کی تفصیل قدرے زیادہ ہے۔ ظہیر نے اس کی مندرجہ ذیل الفاظ میں خود بھی تصریح کی ہے۔

"چند اجزائے پُر ملال بسانِ نامۂ اعمال... اور تمامی سرگذشت بطور سوانح عمری دورِ ولادت سے تا بزمانۂ شیخوخت راست راست بلا کم و کاست... قلم برداشتہ تحریر میں لائے" (داستانِ غدر مطبع کریمی ص۱)

اردو میں آپ بیتیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ میر تقی میر کی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر" فارسی میں ہے۔ اس لئے اس کو اردو کی سوانح عمریوں میں کسی صورت میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی میں بھی آپ بیتیوں کی اس درجہ کمی ہے کہ اس صنف کا وجود و عدم برابر ہی نظر آتا ہے۔ بعض مصنفوں نے سفر ناموں کی صورت میں آپ بیتی کے فرائض کو ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ یا سفر نامے کے اشعار میں خود کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ محمد شاہ کے زمانے میں حاکم لاہوری نے ایک تذکرہ "مردم دیدہ" کے نام سے لکھا اور اس میں اپنے حالات دوسروں کے حالات کے اندر "ملفوف" کر کے پیش کئے ہیں۔ یہ ان شعرا و ادبا کا تذکرہ ہے جن سے حاکم کو ملنے کا اتفاق ہوا۔ اپنی جگہ یہ کتاب خوب ہے مگر اس کو آپ بیتی کہنا ٹھیک نہیں۔ اردو میں غالب کے خطوط ہر چند کہ ان میں آپ بیتی کا مواد موجود ہے مگر پھر بھی وہ خطوط ہی ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان خطوط میں آپ بیتی کا مواد ضرور موجود ہے۔ غالب کو مکتوب نگاری کی عادت ہی نہ تھی، مکتوب نگاری سے عشق تھا۔ اور پھر غالب کو اس میں بھی مزا آتا تھا کہ خطوں میں مکتوب الیہ سے زیادہ خود سے کلام کرے اور اپنی ذات کو مکتوب الیہ کے سامنے جلوہ گر کرے۔ ان سب میلانات کے سبب غالب کے خطوط آپ بیتی نہ سہی آپ بیتی کا مواد اور اس کے قائم مقام ضرور بن گئے ہیں۔

پھر بھی، جیسا کہ بیان ہوا، مکاتیب و خطوطِ غالب آپ بیتی نہیں ہیں۔ جہاں تک معلوم کر سکا اردو کی اولیں باقاعدہ اور بے قاعدہ آپ بیتیاں آشوب دہلی (یا ۱۸۵۷ء کی جنبشِ آزادی) کے ماحول میں فروغ پذیر ہوئیں، غالب بھی اس ماحول کے آدمی تھے۔ اور وہ بھی ایک کامیاب آپ بیتی نگار یا خود نوشت نگار ہوتے مگر جلوہ نمائی کی عادت ان پر اس درجہ مسلط تھی اور وہ اس سے اس درجہ مجبور تھے کہ آپ بیتی کے ضبط و اخفا کی تاب لانا ان کے لئے بے حد دشوار تھا۔ کامیاب آپ بیتی سات پردوں اور ہزار غلافوں کے اندر پرورش پاتی ہے۔ آپ بیتی اکثر "خود کو چھپانے" کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اہلِ عالم کی نگاہ گرم خود نوشت نگار کو "تعلیم ضبط" دے کر اس کی ذات کو پردوں میں اس طرح چھپا دیتی ہے جس طرح شعلہ خس میں اور خوں رگ میں نہاں ہو جاتا ہے۔

ع شعلہ خس میں، جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

یہ تو ظاہر ہے کہ آپ بیتی پر قلم اٹھانا "دمِ تیغ" پر چلنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ زندگی جن جلوتوں اور خلوتوں سے عبارت ہے، اس کی لطافتیں جن

---

[1] سید ظہیر الدین حسین عرف لالہ مرزا دہلوی خلف میر جلال الدین خوشنویس استاد محمد بہادر شاہ، شاگرد شیخ ابراہیم ذوق۔

کثافتوں سے آلودہ ہیں اور اس کے چمنستانِ بہار جن زنگارہ آلودہ ہواؤں کے رہینِ منت ہیں ان میں مصفا اور مجلّٰی زندگی — ہر لحاظ سے پاک و صفا زندگی کی امید کرنا ہی ایک شغل عبث ہے مگر اس کے باوجود انسان کی نگاہ غلط کوش خطاپوش ہونے کی بجائے اپنے علاوہ دوسرے سب انسانوں کو فرشتہ دیکھنے اور اس کو انسانی صفات سے مبرّا دیکھنے کی عادی ہے۔ ہر آپ بیتی لکھنے والا قلم اٹھانے سے پہلے اپنے بنی نوع کی اس فرشتہ سیرتی سے خائف ہو کر رکتے رکتے قلم اٹھاتا ہے۔ اس لئے یا تو وہ سات پردوں میں چھپ کر آپ بیتی لکھتا ہے یا اپنی انسانی صفات کو فرشتوں کی تعزیر کے خوف سے چھپا جاتا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اس "مردم گزیدگی" کے احساس سے آپ بیتی کھلی آپ بیتی بننے سے اکثر خائف و گریزاں ہی رہتی ہے۔ یا پھر دوسرے سہارے تلاش کرتی ہے۔ روزنامچے ڈائریاں، سفرنامے اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں ؛

سوانح عمری خصوصاً خود نوشت کے بارے میں بے خوفی یا "بے حجابی" جدید تر دور کی خصوصیت ہے اگرچہ اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اعمال نامہ کا مصنف گلستاں کے باب پنجم پر پہنچ کر کچھ وحشت زدہ سا ہو جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کہہ سکتا جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ اور خون بہا وغیرہ میں تو اتنی تاب و تواں بھی نہیں نظر آتی جتنی اعمال نامے کے مصنف نے دکھائی ہے۔ بہر حال آپ بیتی میں خوف اور اخفا کی فضا ضرور موجود رہتی ہے خواہ کوئی چھپ کر لکھے یا برملا لکھے۔ اور روزنامچے اور ڈائریاں تو اس سے بھی زیادہ اخفا اور سرّیت کی متقاضی ہوتی ہیں۔

۵۷ء کے واقعات کی خفیہ روداد یں کئی اور بھی ہیں۔ یہ سب خوف کی فضا میں لکھی گئیں، ان میں سے کچھ خواجہ حسن نظامی نے شائع کی ہیں ؛

اس گیر و دار کے عالم میں احتساب کا خوف یقینی اور بدیہی بات ہے۔ اس خوف کی وجہ سے ایک خاص قسم کی "سرّیت" کی فضا پیدا ہو گئی تھی اور اس قیامت صغریٰ کے تجربات و حوادث تھے بھی ایسے جن کو سینے کی چار دیواری میں مقید رکھنا آسان بات بھی نہ تھی غم جب زیادہ ہو جاتا ہے تو ضبط نہیں ہو سکتا انسان کسی نہ کسی صورت میں اس کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے اس زمانے میں کئی اہل قلم چھپ چھپا کر ڈائریاں اور روزنامچے لکھتے رہے — یا انہوں نے ان حوادث کو اپنے دوسرے تجربات میں جذب کر لیا۔ اور پھر موقع ملنے پر دوسری صورتوں میں ظاہر کیا ؛

نذیر احمد کا ناول ابن الوقت بھی اسی قسم کی پردہ داری کی ایک مثال ہے۔ غالبؔ کی شاعری کے بعض اجزا، حالیؔ کے مسدس کا اندرونی جذبہ، سب اسی حادثہ کے مظاہر خارجی ہیں۔ انہی حالات میں ظہیرؔ کی کتاب "داستان (وقائع) غدر" بھی لکھی گئی ؛

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ظہیرؔ دہلوی کی "داستانِ غدر" سنہ ستاون کے واقعات کی مکمل روداد نہیں۔ ظہیرؔ نے ان حوادث کے چند نمایاں رُخ پیش کئے ہیں۔ اور ان کو آپ بیتی کی شکل دی ہے اور اس طرح اپنی زندگی کے کچھ اور اجزا بھی اس کے ساتھ پیوست کر دئے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک داستان بھی ہے اور آپ بیتی بھی جسے اردو کی اولیں آپ بیتی نہ بھی کہا جائے تب بھی اس کو "چند" اول ترین آپ بیتیوں میں سے ضرور شامل کیا جا سکتا ہے ؛

"داستانِ وقائع غدر" میں آپ بیتی کا حصہ حقیقت نگاری کے لحاظ سے جیسا کچھ بھی ہو اس میں مجلسی روابط اور سماجی احوال کی بڑی دل کش اور سبق آموز داستان ملتی ہے۔ خصوصاً دہلی اور قلعہ معلّٰی کی معاشرت کے دل چسپ نقشے نظر سے گذرتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم و تربیت کے طریقوں کی تفصیل عہد اسلامی کی تعلیمی تاریخ کے ہر طالب العلم کے لئے عمدہ جزئیات سے لبریز ہے اور پھر تربیت میں تہذیبی اور دینی رسوم پر اصرار کی یہ حیثیت ملاحظہ ہو کہ ظہیرؔ کے ماں باپ اس سے ۴ سال کی عمر میں ہی روزہ رکھواتے ہیں۔ پھر اس پہلے روزے کی افطاری کی رسم منائی جاتی ہے، یہ افطار کی رسم خاصی دل چسپ ہے۔ اس طرح بسم اللہ یعنی مکتب میں بیٹھنے کی رسم، پھر قرآن مجید پڑھنا، پھر معمولی نوشت خواند کے بعد پند نامہ سعدی، پھر گلستاں بوستاں اور دوسری کتابوں کی تعلیم تا آنکہ ۱۲ سال کی عمر میں ہی رسمی تعلیم سے فراغت ہو جاتی ہے۔ شعر گوئی کی ابتدا بھی عجب طرح ہوئی، والد صاحب شعر گوئی سے منع کرتے، مگر شہر میں شاعروں کی کثرت، شاہ نصیرؔ کے مکان پر خصوصی مشاعرے، دلّی کے اکابر شعراء مثلاً غالبؔ، آزردہؔ، عیشؔ، وحشتؔ، شیفتہؔ اور بعد میں داغؔ وغیرہ کے ادبی جلسے اور شام کی محفلیں، ان میں شعر کی شراب سے بچا نہ سکے۔ ظہیرؔ کی داستان غدر میں دہلی کی سیر گل فروشاں کے علاوہ اس زمانے کی شہری زندگی کے متعلق خاصا مواد مل جاتا ہے۔ گویا ظہیرؔ نے آپ بیتی کے نام سے تہذیب دہلی کی معاصرانہ سرگذشت بھی لکھ ڈالی ہے ؛

ظہیرؔ نے اپنے بچپن اور لڑکپن کی تفریحات اور کھیلوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ پتنگ بازی، کبوتر بازی، گنجفہ، چوسر، گھوڑے کی سواری وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس آپ بیتی میں سب سے زیادہ دل چسپ اور پُر از معلومات حصہ مشاعروں اور ادبی تقریبوں کا تذکرہ ہے اور اس سے اس زمانے کے ذوق و میلان پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ریاست الور کے مشاعرے، رام پور، بھوپال اور ٹونک کے مشاعرے۔ نواب احمد علی خاں کی مشاعروں سے دل چسپی، حیدرآباد میں مشاعروں کے انوکھے اور دل چسپ طریقے۔ ان سب سے زمانے کے ادبی رجحانات کا مفصل حال معلوم ہوتا ہے۔ پھر داد و تحسین کے عجب طریقے سامنے آتے ہیں جن میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ مگر بعض اس تہذیب کے ساتھ ہی مٹ گئے، غرض مشاعروں کی عجیب و غریب رسمیں ان مشاعروں میں ہی پیدا ہوئیں اور باقاعدہ روایات بنتی گئیں۔ مثلاً ٹونک کے بعض مشاعروں کے ضمن میں لکھا ہے کہ بعض شعراء دوسرے شاعروں کی غزل سن کر داد و تحسین کے طور پر اپنی غزلیں چاک کر ڈالتے تھے۔ قلم توڑنے کا ذکر بھی ہے مگر شاید یہ محض استعارۃً ہے۔ اسی طرح اپنے پورے دیوان ایک ایک شعر کے بدلے نذر کر دینے کی رسم بھی مذکور ہوئی ہے (اگرچہ شاید آج تک اس طرح کا نذرانہ کسی نے قبول کیا نہیں)

ظہیرؔ نے یوں تو [illegible] ضمنی مباحث۔ داستان غدر میں ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز واقعہ کے اصلی حوادث کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ الم انگیز واقعہ دہلی کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے جس طرح اہم اور انقلاب انگیز تھا اسی طرح ظہیرؔ کی اپنی زندگی میں بھی بڑے بڑے انقلابات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کے باعث جو ظہیرؔ سے دلی چھٹی تو پھر گردش روزگار نے ساتھ نہ چھوڑا۔ جگہ بہ جگہ در بہ در کوچہ بہ کوچہ ہر ملک اور خطے کی خاک چھاننی پڑی۔ چنانچہ یہ شعر اپنے متعلق پیش کیا ہے۔

چہ پرسی از سر و سامانم عمر لیست چوں کاکل
سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بر دوشم

ظہیرؔ اس سوانح عمری میں جا بجا دلی کے ایام بہار اور اپنے دور بے فکری کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ ایام طفلی کی فراغت، دلی میں شام کی محفلیں، قص و سرود کی محافل، سیر گل فروشاں، قلعہ معلی کی شان (اور ملک کی بدحالی)، متوسلین قلعہ کا اطمینان و سکون، غرض اس گئے گذرے اور معدوم ہوتے ہوئے قلعہ کی زندگی کے ہر روپ اور ہر رخ کا تذکرہ کر کر کے روتے ہیں اور اشک بہاتے ہیں اور اس شعر کے ذریعہ بربادیوں کی تصویر ذہن نشین کراتے اور رلاتے ہیں۔

جہاں کھودو وہیں بنیاد کے پتھر نکلتے ہیں
بہت معمورۂ ہستی میں اجڑے گھر نکلتے ہیں

جیسا کہ قدرتی تھا انہوں نے شرفاء دہلی کی تباہ حالی کا حال زیادہ دل کھول کر لکھا ہے پہلے کالوں، پھر گوروں کے ہاتھ سے مظلوم شرفاء دہلی پر جو ظلم و ستم ہوئے ان کی پر درد ناک کہانی اس لئے بھی زیادہ دردناک ہو گئی ہے کہ لکھنے والے کی اپنی سرگزشتِ غم بھی اس میں شامل ہے کیونکہ مصنف خود بھی بڑے مصائب و آلام کا شکار ہوا ہے۔

ظہیرؔ کو سب سے زیادہ رنج دو باتوں سے ہوا۔ اول مجبور بادشاہ بہادر شاہ کی مجبوری و بے بسی کا۔ دوم دہلی کے اہلِ کمال کے قتل کا۔ ظہیرؔ کے خسر کی شہادت کا واقعہ بھی کچھ کم دردانگیز نہیں مگر صہبائی وغیرہ کی موت اور سانڈرس کے زہر گداز مظالم کا رنج انہیں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا۔ ظہیرؔ کی یہ آپ بیتی کوئی مکمل و مفصل آپ بیتی تو نہیں مگر آپ بیتی لکھنے کے لئے جس قلم اور جیسے دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرت کی طرف سے ظہیرؔ کو حاصل تھے۔ ظہیرؔ کو بیانیہ نگاری پر اچھی خاصی قدرت ہے۔ وہ جزئیات کے حسنِ ترتیب سے بڑے عمدہ مرقعے بنا لیتے ہیں اور ایک اچھے فنکار کی طرح انہیں یہ فن بھی آتا ہے کہ آپ بیتی کو دل کش اور خیال انگیز کہانی کس طرح بنایا جا سکتا ہے اور کہیں کہیں تو انہوں نے ایک ایک فقرے سے اشخاص متعلقہ کی ذہنی حالتوں کی تصویریں اس عمدگی سے کھینچ دی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے مثلاً خون آشام سانڈرس، انسان تو انسان بے زبان حیوانوں سے بھی ناخوش تھا۔ اسے ہر جگہ بغاوت ہی بغاوت کی بو آتی تھی۔ وہ اتنا شکی مزاج ہو گیا تھا کہ دیسی ہاتھیوں تک سے بدک جاتا تھا۔ چنانچہ "مولا بخش ہاتھی" کو دیکھ کر بولا "یہ ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کر دو"۔ ہاتھی بچارا تو کیا باغی ہو گا دراصل سانڈرس کے اپنے دماغ پر پوربی چھائے ہوئے تھے۔ اس خیال سے دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ تلنگوں نے بے دانشی اور سیاہ کاری کے عالم میں شرفاء دہلی کو تنگ کرنے کے لئے "میموں" کے روپوش ہونے کا بہانہ بنایا ہوا تھا اور جس گھر کو لوٹنا چاہتے تھے اس کی طرف اشارہ کر دیتے تھے کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے۔ اس کو یوں لکھا ہے — "شہر کی یہ کیفیت تھی کہ شہر کے بدمعاش پوربیوں کو ہمراہ لئے ہوئے بھلے مانسوں کے گھر لٹواتے پھرتے تھے اور جس کو

حال دار دیکھا اس کے گھر پور بیوں کو لے جا کر کھڑا کر دیا کہ یہاں "میم چھپی ہوئی ہے":

یہ "میم چھپی ہوئی ہے" کا ایک فقرہ ایک خاص ذہن کی تشریح کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک اور مثال دیکھئے۔ پوربی اس قدر غالب آگئے تھے اور اس قدر گستاخ بھی ہو گئے تھے کہ قلعہ میں داخل ہو کر بہادر شاہ کو دھمکیاں دیتے تھے کہ اگر ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم تمہارا بھی برا حال کریں گے۔ اس رویّہ کے اظہار کے لئے ظہیرؔ نے ان کی زبان سے یہ فقرہ نقل کیا ہے جو ان کے طرزِ عمل اور روش کی کامیاب عکاسی کرتا ہے: "سنو بڑھؤ (بڈھے) ہم نے تمہیں باسا (بادشاہ) کیا"

ظہیرؔ شرفاءِ دہلی کے ہمراہ جس قافلے میں دہلی سے نکل کر آوارۂ دشتِ غربت ہوئے۔ اس کی بادیہ گردی کا حال خاصا تفصیلی ہے مگر کہانی کی تمہید یوں لکھی ہے:۔ "قافلہ چلا مگر اب آغاز و انجام اس سفر کا کچھ معلوم نہیں"۔ اور کسے معلوم تھا کہ جس سفر کا آغاز ہو رہا تھا اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر اس طرزِ بیان سے ظہیرؔ نے سوانح عمری کو ناول سا بنا دیا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔ ظہیرؔ کی اس داستانِ غدر کو داستانِ الم افزا کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور حق یہ ہے کہ اس کے سوا یہ اور ہوتی بھی کیا؟ قتل و غارت، جنون و آتش، بربادی و تباہی۔

دلّی میں گاتی بدمعاش کی عملداری تھی جو مجبروں کا سرغنہ تھا اور دلّی سے باہر گوجروں، جاٹوں اور میواتیوں کی لوٹ مار اور شب خون، اس کے ہوتے ہوئے وہ اس میں مسرت اور اطمینان کا رنگ بھرتے بھی تو کیسے؟ دراصل خونِ غم کے چھینٹوں سے ان کی یہ سرگذشت رنگین ہے۔

یہ تو ہوئی ظہیرؔ دہلوی کی آپ بیتی، اب ان کے ادبی کام کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔ وہ اچھے شاعر شیخ ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد اور قلعہ معلّٰی کے اہلِ شعر و سخن میں سے تھے۔ اس مضمون میں ان کی عام شاعری سے بحث مقصود نہیں۔ حادثہ سن ستاون کے مرثیہ نگار شاعر کی حیثیت سے میں صرف ان کے مسدس شہر آشوب کا اجمالی تذکرہ کرتا ہوں جو "فغانِ دہلی" اور "انقلابِ دہلی" (= فریادِ دہلی) میں شائع ہو چکا ہے۔

ظہیرؔ کا مسدس شہر آشوب خاصا طویل ہے اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی داستانِ غدر بھی اسی مسدس کی منثور شکل ہے۔ چنانچہ ظہیرؔ نے اس میں اپنے اس شہر آشوب کا خود بھی تذکرہ کیا ہے۔

انقلابِ دہلی کے سلسلے میں ظہیرؔ کے مسدس کے علاوہ کچھ اور شہر آشوب بھی ہیں جو دوسرے شعرائے دہلی کے قلم سے نکلے ہیں۔ ان کی تفصیل میں نے اپنے ایک مضمون (مشمولہ بحث و نظر) بعنوان "شہر آشوب کی تاریخ" میں پیش کی ہے۔ ان سب شہر آشوبوں میں ظہیرؔ کا یہ مسدس ایک خاص نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ نقطۂ نظر متوسلینِ قلعہ معلّٰی کا ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں سن ستاون کا واقعہ ایک خارجی سازش کا نتیجہ تھا اور قلعہ والوں کا خصوصاً بہادر شاہ کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے نزدیک وہ مجبورِ محض تھے، وہ کالوں اور گوروں میں سے کسی ایک کی نظر میں نیک نام نہ ہو سکے۔ انگریزوں کی نظر میں اس لئے بدنام ہوئے کہ تمام باغی افواج انہیں کو تحریک کا مرکز قرار دے کر انہیں کو ملک کا بادشاہ بنانا چاہتی تھیں۔ بادشاہ ان کی اس پیشکش کو قبول نہ کر سکے۔ بادشاہ کی مجبوری کا یہ حال تھا کہ وہ باغی افواج سے کھل کر یہ بھی نہ کہہ سکتے تھے کہ مجھے آپ کے نظریہ سے اتفاق نہیں۔ اس سے انگریزوں کی نظر میں معتوب ہوئے مگر ظہیرؔ نے یہی ثابت کیا ہے کہ بہادر شاہ کا فوجی بغاوت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

ملہ ان کے یہ اشعار تذکرہ نگاروں نے بہت پسند کئے ہیں۔ ؎

مانا کہ تم سے دل نہیں ملتا نہیں ملے — کیا مجھ سے خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

یاں یہ نیاز ہے کہ سراپا نیاز ہیں — واں ناز وہ کہ ناز اٹھایا نہ جائے گا

ہے میری خستگی مری صورت سے آشکار — کچھ داغِ دل نہیں کہ دکھایا نہ جائے گا

جاتے کو خیر جایئے اس بزم میں ظہیرؔ — حضرت سلامت آپ سے آیا نہ جائے گا

کوئے دشمن سے گزرنا کیسا تھا

اے دل وہ رفت و قیامت ہی سہی

ظہیر کے شہر آشوب یہ کلام کی خاص اہمیت اس کا نسبتاً معتدل نقطہ نظر ہے جو بعض دوسرے شہر آشوبوں کے مقابلے میں (مثلاً مبین، سوزاں، محسن، افسردہ، داغ، اور تشنہ کی نظموں کے مقابلے میں) تجزیہ و تفکر کا مناسب نمونہ ہے۔ جہاں مبین نے اپنے شہر آشوب میں واقعات کے اقتصادی اسباب کو بطورِ خاص ابھارا ہے، جہاں سوزاں نے ضرورت سے زیادہ انگریز دوستی کا ثبوت دیا ہے، جہاں تشنہ کو اس آشوبِ بلا میں صرف شعر و سخن کی محفلوں کی بربادی کا غم ہوا ہے، جہاں قربان علی بیگ سالک نے شرفائے دہلی کی بے گناہی پر آنسو بہائے ہیں، جہاں داغ نے دبی زبان سے اس سارے ہنگامے کو فسادِ خلق سے تعبیر کیا ہے، وہاں محسن اور ظہیر ہی دو ایسے شخص ہیں جن کا قلم سوچ کے راستوں پر چلا ہے اور قدرے توازن کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس ہولناک قیامت کے اندرونی اسباب پر بھی نظر ڈالی ہے اور ان ظاہری مصائب کے پس پردہ اخلاقی اور روحانی خرابیوں کا سراغ بھی لگایا۔ اور ظہیر کے شہر آشوب میں تو عقلی تجزیے کے خاص آثار ملتے ہیں۔

حادثۂ دہلی سے متعلق شہر آشوبوں میں محسن کا شہر آشوب خاصی کامیاب چیز ہے۔ مگر ظہیر کی نظم بھی سیاسی نقطہ نظر اور عام مصوری کے لحاظ سے کچھ کم کامیاب نہیں۔ ظہیر نے سب سے پہلے دہلی کی سابقہ عظمت اور شان و شوکت دکھائی ہے، پھر اس کا تقابل دکھاتے ہوئے اس تباہی و بربادی کا نقشہ کھینچا ہے جس نے دلی کی خاک تک ہوا میں اڑا دی۔ مندرجہ ذیل بند میں حالتِ بربادی کی کتنی مؤثر تصویر ہے ؎

گلی گلی سے ہے آتی صدائے واویلا — زمیں زمیں سے ہے اٹھتی نوائے وادردا
دکاں دکاں سے ہے گھر گھر سے حشر ہے پیدا — مکاں مکاں سے اٹھا غلغلہ ہے شیون کا

چہار سمت رواجِ ستم پرستی ہے
فلک سے تازہ بلا پر بلا برستی ہے

زمیں زمین کے درپے ہے خاک اڑانے کو — مکاں مکان کے دوڑے ہے کاٹ کھانے کو
رہی نہ جائے زمانے کو سر اٹھانے کو — ٹھکانے ڈھونڈتے فتنے ہیں بیٹھ جانے کو

گھروں کو دیکھ کے پڑنے لگے ہیں گھر عبرت
بنے ہیں روزنِ دیوار دیدۂ حسرت

ذیل کے بند میں وہ سماں دکھایا ہے، جب دہلی کے لوگ پریشان و بدحواس ہو کر شہر سے بھاگنے لگتے ہیں۔ اور بے سر و سامانی، خوف اور سراسیمگی کے عالم میں کسی کو کچھ نہیں سوجھتا ؎

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے — ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کرو ڈ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے — قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے

کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمینِ شہر نے ایک اک کے پاؤں پکڑے ہیں

وہ دھوپ اور وہ ریگِ تپاں وہ گرم ہوا — وہ فوج فوج ہر اک سو سے نرغۂ اعدا
وہ کینہ و رزیٔ غارت گرانِ بے پروا — اور اس پہ ظلم گنواروں کا وہ کہ واویلا

جو ہم سے سنتے ہیں اس انقلاب کی باتیں
وہ لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

غرض جہادِ آزادی کا معرکۂ اول جس کے لئے شکست و ناکامی نے "غدر" کا منحوس لفظ تجویز کیا، خون و آتش اور قتل و بربادی کے بھیانک مظاہر میں ختم ہوا اور خوف زدہ دلوں اور دماغوں نے مجبور ہو کر اپنے لئے آئندہ احتیاط اور گزشتہ را صلوات کا اصول وضع کر لیا۔ جو ظہیر کی زبان سے یوں ادا ہوتا ہے ؎

ظہیر بیہدہ تا چند خامہ فرسائی — خیال ہرزہ درائی و بادہ پیمائی

ہمیں پسند نہیں تیری نغمہ آرائی — عبث عبث یہ تگاپوئے آبلہ پائی

زباں کو بند کر اور منہ سے کچھ نکال نہ بات

شغل سخن بھی ہے تو نے گزشتہ را صلوات

یہ "منہ سے کچھ نکال نہ بات" اس وضع احتیاط کا پتہ دیتی ہے جس سے شاعر کا دم رُکا جا رہا ہے۔ یہ مختصر سا جملہ ان حوادث و مصائب کے ہجوم اور اس خوف و ہراس کے عالم کی ایک جھلک اتنی اچھی طرح دکھا گیا ہے کہ سوچنے والے اور خیال کو کام میں لانے والے قاری کے سامنے اس فضا کی گویا پوری تصویر کھنچ گئی ہے ـــــ اور "پھر گذشتہ را صلوات" کہہ کر آئندہ کی اس حکمتِ عملی کی بلیغ تشریح بھی کر دی ہے جس پر بالآخر سر سید مرحوم کی دور اندیشی قوم کو لے آئی۔ ظہیر کی شہر آشوبیہ غزل میں تقریباً یہی روح کار فرما ہے۔ مگر عام طور سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہیں دہلی، قلعۂ معلّٰی اور زبانِ دہلی کا غم سب سے زیادہ ہے۔ چنانچہ ان اشعار سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے ؎

رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی

اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت و شنید

ایک عالم سے نرالا ہے جہانِ دہلی

رات دن گریہ ہے اور سنگ ہے اور سینہ ہے

اور ظہیرِ جگر افگار و بیانِ دہلی

اس شعر پر ظہیر جگر افگار کی یہ غزل ختم ہوتی ہے اور اسی شعر پر ظہیر پر یہ مضمون بھی ختم ہو رہا ہے۔ مگر مجھے ایک بار پھر یہ کہنا ہے کہ میں نے انقلاب دہلی ۱۸۵۷ء کے بے شمار مرثیہ خوانوں میں سے صرف ظہیر کو اس لئے انتخاب کیا ہے کہ ان کا غم یا مرثیہ صرف شاعری تک ہی محدود نہ رہا اور دیگر شاعروں کے لئے ایک عام سی بات ہے جسے "بیکاری کا مشغلہ" بھی کہا جا سکتا ہے) بلکہ ان کا غم اتنا گہرا تھا جس کے لئے انہوں نے "یادگار داستاں" بھی لکھ ڈالا اور یہی نہیں، انہوں نے اسی مرکزی واقعہ کے ارد گرد اپنی پوری سوانح عمری کو بھی ڈھالنے کی کوشش کی ؛

بسکہ فعالِ ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کئے شکوہ — سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالبؔ

کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

زینت محل بیگم، دختر احمد قلی خان
نبیرهٔ احمد شاه ابدالی
والده شهزاده جوان بخت

نواب حضرت بیگم دختر محمد شاه شهنشاه دهلی
ملکهٔ احمد شاه ابدالی
والده شاه شجاع و تمر شاه

سلسلۂ حادثات

ڈاکٹر محمد باقر

پونے تین سو سال کے ماضی کے وہ اوراق اُلٹ کر دیکھئے جو اس وقت کے روزمرہ کے واقعات تھے اور اب تاریخ بن چکے ہیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر مغلوں کا امیر ترین بادشاہ، اپنے باپ شاہجہاں کی وسیع سلطنت پر قابض ہے۔ اُسے اس حکومت پر قابض ہوتے ربع صدی سے زیادہ حصہ گذر چکا ہے۔ وہ پانچ لڑکوں کا باپ اور کتنے پوتوں کا دادا بن چکا ہے۔ ان پوتوں میں سے بھی کچھ اس عمر کو پہونچ چکے ہیں کہ اب وہ سلطنت کے انصرام میں دادا کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ انہی پوتوں میں سے ایک پوتا عظیم الشان، جو شاہ عالم کا بیٹا ہے، دادا کے حکم سے بنگال کا وائسرائے مقرر ہوتا ہے۔ اس سے چند سال پہلے لندن سے چند طالع آزما برصغیر میں تجارت کی غرض سے وارد ہو کر اس علاقے میں پہونچتے ہیں جہاں عالمگیر کا سکہ چلتا ہے اور اس کا پوتا عظیم الشان اس کے نائب کی حیثیت سے یہاں کا فرمانروا ہے۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک جزو ہے جو ۱۶۸۶ میلادی میں ایک چھوٹے سے غیر معروف گاؤں ست ندی (کبھی اسے سُتانَدی اور چھوٹانَدی بھی لکھا گیا ہے) میں پہونچ کر ڈیرے ڈال دیتا ہے۔

حوادث عالم میں پونے تین سو سال کی مدت کوئی طولانی عرصہ نہیں، لیکن واقعات کی تفصیل تلاش کرنا ہو تو گزشتہ سال کے حوادث کی کرید کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے آج یہ کون بتا سکتا ہے کہ ۱۶۸۶ء میں ست ندی میں مقیم ہونے کے بعد انگریز کن وسائل سے کام لے کر عظیم الشان کے دربار میں باریاب ہوئے اور عظیم الشان کے سامنے کیا مصالح تھے جن کی بنا پر اس نے چار سال بعد یہی چھوٹا سا غیر معروف گاؤں یعنی ست ندی کا زمیندارہ انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آج کوئی یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ عالمگیر کو اس واقعہ کی اطلاع بھی دی گئی یا نہیں اور اس کے لئے کتنا روپیہ وصول کیا گیا۔ ایک انگریز (جیمز گرانٹ) دو سو سال بعد (۱۷۸۹ء میں) دھندلائے ہوئے واقعات سے پردہ اُٹھاتے ہوئے لکھتا ہے کہ عظیم الشان کو روپے کی اس لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے باپ اورنگ زیب کو تخت سے ہٹانے کے لئے سازش کرنا چاہتا تھا، لیکن اس گپ کا اعتبار کون کرے۔ جس محقق کو یہ بھی معلوم نہیں کہ عظیم الشان اورنگ زیب کا بیٹا نہیں بلکہ پوتا تھا اور ابھی اس کا باپ شاہ عالم بہادر شاہ (جو آگے چل کر بادشاہ بھی بنتا ہے) بھی زندہ تھا، اس کی تاریخ دانی معلوم! بہرصورت یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ۱۶۹۰ء میں انگریزوں نے عظیم الشان سے یہ گاؤں خرید لیا اور پھر اس سے ملحق گاؤں گوبند پور اور کلکتہ کے زمیندارے خرید لئے۔ اس سے اگلے سال یعنی ۱۶۹۱ میلادی میں مسٹر جوب چارنک کلکتہ اور برصغیر میں انگریزوں کی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔ یہ وہی چارنک ہے جس کے نام پر ایک عرصہ تک کلکتہ کے قریب بیرکپور کا پہلا شہر چارنک کہلاتا رہا۔ کلکتہ کے عیسائیوں کے قبرستان میں اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک اس کا سنگ مزار انگریزوں کی زیارت گاہ بنا رہا کیونکہ مدراس اور بمبئی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا مضبوط قدم محلات کے شہر کلکتہ میں مضبوطی سے قائم کرنے والا یہی چارنک تھا۔

زمانے نے نصف صدی کا ورق اُلٹا، چارنک کی لگائی ہوئی اینٹ کو آج سے دو سو سال قبل یعنی ۱۷۵۶ میلادی میں بنگال کے جواں سال حاکم نواب سراج الدولہ نے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ مشہور سیاست مدار میکالے انگریزوں سے نواب سراج الدولہ کی بچپن سے نفرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔ "اس کے دل میں یہ واہمہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کے واہموں کے کبھی کوئی آڑے نہیں آتا تھا۔" لیکن میکالے کا یہ بیان ہمیں اس وقت درست نظر نہیں آتا، جب ہم دیکھتے ہیں کہ نواب سراج الدولہ اپنی کم عمری کے باوجود یہ صحیح طور پر بھانپ رہا تھا کہ چارنک کے جانشین ست ندی سے آگے بڑھ کر رفتہ رفتہ سارے ملک پر قبضہ کر لیں گے اور سچ پوچھئے تو برصغیر میں فرنگی استعمار کے خلاف یہ پہلا احتجاجی قدم تھا جو اس مرد مومن نے اُٹھایا۔ بعد میں آنے والی تحریکیں، انقلابات، سیاسیات اور آزادی خواہی کی مساعی کتنی ہی شاندار اور پُرشکوہ کیوں نہ ہوں، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ۱۷۵۶ء وہ پہلا سال ہے جس میں پہلی مرتبہ اس شہید اعظم نے

ا۔ بنگال کا دارالحکومت اس وقت پٹنہ تھا اور اسی مغل شاہزادے عظیم الشان نے اس کا نام عظیم آباد رکھا تھا۔

جان کی قربانی دے کر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی کوشش کی اور اس وقت تک تمام انگریز اس کے معترف ہیں کہ نواب سراج الدولہ کے منظر سے ہٹنے کے بعد ہی بنگال میں انگریزوں کا اقتدار بڑھا ۔

ہوا یوں کہ نواب سراج الدولہ کا ایک ماتحت افسر ڈھاکہ سے شاہی خزانہ کی چوری کر کے فرار ہوا اور کلکتہ میں جا کر انگریزوں کے بنائے ہوئے "قلعہ فورٹ ولیم" میں پناہ گزیں ہو گیا۔ نواب کو اس پر بہت طیش آیا۔ اس نے انگریزوں کو قلعہ گرا دینے کا حکم دیا۔ چند دنوں تک گفت و شنید جاری رہی، لیکن جب انگریزوں نے ایک نہ مانی تو نواب نے ۱۵ر جون ۱۸۵۶ میلادی کو کلکتہ پر حملہ کر دیا اور انگریزوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شکست کے الزام سے بچنے اور نواب کی انگریزوں پر مظالم کی داستان کو مقبول بنانے کے لئے اسی وقت بلیک ہول کا افسانہ گھڑا گیا۔ جس کی تردید اب مستند طور پر ہو چکی ہے۔ اس وقت ہوبہ ارکاٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کا افسر کرنل کلائو تھا، جو بعد میں لارڈ کلائو بنا۔ اس نے ۹۰۰ فرنگیوں اور ۱۵۰۰ دیسی سپاہیوں کے ساتھ کلکتہ پر حملہ کیا، لیکن جب نواب کی فوجوں کے سامنے پیش نہ گئی، تو سراج الدولہ سے صلح کا معاہدہ کر کے بات بظاہر ختم کر دی۔ "بظاہر" میں نے اس لئے کہا ہے کہ کلائو نے ۲ر جنوری ۱۷۵۷ میلادی کو نواب سراج الدولہ سے صلح کرنے کے باوجود اپنی زیرِ زمین سازشوں کو جاری رکھا اور اس فکر میں رہا کہ حریف کو شکست کیسے دی جائے۔ کلائو کی قسمت نے یاوری کی تو ایک مہینے کے بعد ہی اُسے ایک غدارِ ملت مل گیا۔ یہ میر جعفر تھا، جو نواب سراج الدولہ کے آبا کا پروردہ اور نمک خوار افسر تھا۔ کلائو نے اس کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا جس کی ایک شق یہ تھی کہ سراج الدولہ کی شکست کے بعد میر جعفر کو بنگال کا حاکم مقرر کیا جائے گا۔ چنانچہ آئندہ جون میں کلائو نے نواب سراج الدولہ پر حملہ کیا اور میر جعفر اور اسکی فوجوں کی نمک حرامی کی وجہ سے اُسے شکست دی۔ نواب سراج الدولہ کو بھاگ کر جان بچانی پڑی لیکن ۱۵ر شوال ۱۱۷۰ قمری (۹ جولائی ۱۷۵۷ میلادی) کو اُسے پکڑ کر میر جعفر کے لڑکے میرن نے نہایت بیدردی سے قتل کر دیا۔ نواب سراج الدولہ شہید کی عمر اس وقت ابھی پورے بیس برس کی بھی نہ تھی ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

وطن کی محبت میں فداکاری کے اس واقعہ کو لوگ آہستہ آہستہ بھول گئے، لیکن حریت پسندی کا جو بیج نواب شہید نے بویا وہ انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبے کی شکل میں بڑھتا اور پھلتا پھولتا رہا۔ تاریخی واقعات کو فراموش کرنے کے باوجود لوگ فرنگی استبداد و استعمار کی بیخ کنی کے منصوبے بناتے رہے۔ کلائو کرنل سے لارڈ بن کر فوت ہوا، اس کی ہڈیاں گل گئیں۔ لیکن اس کا مجسمہ انڈیا آفس کے سامنے نصب نہ کر لوگوں کو یہ یاد دلاتا رہا کہ اس نے بنگال کے جعفر کی مدد سے برصغیر پر انگریزوں کی حکومت کو مسلط کیا تھا۔ زمانے نے ایک اور صدی کی کروٹ لی۔ اب برصغیر میں انگریز کی ہر طرف حکومت تھی۔ چارنک کا بسایا ہوا شہر کلکتہ اب مملکت کا دارالسلطنت بن گیا تھا، لیکن چارنک نامی شہر یعنی کلکتہ کے شمال میں ۱۵ میل کے فاصلے پر چوبیس پرگنوں کا جو ضلع بیرک پور کے نام سے مشہور تھا اور دیہاتی مسکن تھا، آج ۲۹ر مارچ ۱۸۵۷ میلادی کو اُس آگ کو اُگلنے والا تھا جو ایک سو سال پہلے نواب شہید نواب سراج الدولہ اپنا خون بہا کر لوگوں کے دلوں میں سلگا گیا تھا ۔

کلکتہ میں سرما کا اختتام ہو چکا ہے، کیونکہ مارچ کے اواخر میں بنگال میں گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ بیرک پور کا موسم کلکتہ سے ذرا مختلف ہے، لیکن گرمی بہر صورت یہاں بھی بہت ہوتی ہے۔ اتوار کا دن ہے۔ انگریز حاکم صبح گرجے سے فارغ ہو کر ملاقاتیں کرنے کے بعد لنچ کھا کر دوپہر کو ستا رہے ہیں۔ دیسی "پنکھا قلی" آرام کرنے والے حاکموں کے دروازوں پر بیٹھے ہوئے پنکھے کی رسی کھینچ رہے ہیں۔ مشقت اور موسم کی حدت سے کبھی کبھی یہ اونگھ بھی جاتے ہیں، لیکن آقا کا خوف پھر انہیں چوکس بنا دیتا ہے۔ بیرک پور چھاؤنی میں پریڈ کا میدان تمازتِ آفتاب سے تپ رہا ہے لیکن ملکی غلاموں کی قسمت میں چین نہیں۔ ۳۴ ویں دیسی پیادہ فوج یعنی 34th NATIVE INFANTRY کے پہرہ دار اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے لئے وردی پہنے ہوئے پریڈ کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ سب کے سب اونچی گوت کے لمبے تڑنگے برہمن ہیں۔ انگریز مسلمان شہنشاہوں کی سلطنت کامل طور پر غصب کرنے کی فکر میں ہے، اس لئے مسلمانوں کو ایسے بااعتماد انتصابات سے دُور رکھتا ہے۔ محافظوں کی قطار کے پیچھے سپاہیوں کا ایک ہجوم جمع ہے۔ ان میں سے چند ایک باوردی ہیں۔ کچھ سادہ لباس میں ہیں، بعض کے پاس اسلحہ ہے اور بعض خالی ہاتھ ہیں۔ لیکن یہ سارا ہجوم کچھ اس طور پر مشتعل ہے جیسے یہ ابھی ابھی کہیں دھاوا بول دے گا۔ محافظوں کی قطار سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر اور اُن کے سامنے ایک دیسی سپاہی ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق لئے جلدی جلدی اور بپھرے ہوئے انداز میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چکر کاٹ رہا ہے۔ یہ وہی آگ ہے جو مرحوم سراج الدولہ نے سلگائی تھی اور آج شعلہ بن کر بھڑک اُٹھی ہے۔ پورے ایک سو سال کے بعد !

کچھ لوگ کہتے ہیں، فرنگی نے جو نئے کارتوس بنائے ہیں، ان کو موسم کے اثرات سے محفوظ رکھنے اور آسانی سے استعمال کرنے کے لئے ان پر گائے اور سؤر کی چربی لگا دی ہے۔ فرنگی کہتا ہے کہ میں نے ایسے کارتوس نہیں بنائے، لیکن اس کے بھائیوں نے خود ہی چند سال بعد یہ راز فاش کیا کہ ان دیسی ٹھیکیداروں کی رسیدیں موجود ہیں جو ۱۸۵۳ میلادی سے چار آنے فی سیر کے حساب سے کارتوس کی فیکٹری میں یہ چربیاں مہیا کرتے رہے۔ کئے (KAYE) بھی لکھتا ہے:۔"اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ چکناہٹ کے لئے گائے کی چربی استعمال کی جاتی تھی" لارڈ رابرٹس نے بھی لکھا ہے: "مسٹر فارسٹ نے حکومتِ ہند کے دفاتر کی جو حالیہ تحقیق کی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کارتوس تیار کرنے کے لئے گائے اور سؤر کی چربی استعمال کی جاتی تھی اور اس طرح سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابلِ یقین طور پر مجروح کیا جاتا تھا" اور مصیبت یہ ہے کہ ان کارتوسوں کو اسلحے میں بھرنے سے پہلے ان کے غلاف کو دانتوں سے اُتارنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام سپاہیوں کے ذمہ ہے۔ پھر بھی چلد سال تک دیسی، سپاہی یہ کام کرتے رہے ہیں، لیکن آج ایک سپاہی محافظوں کے سامنے بڑے جوشیلے انداز میں گھوم رہا ہے۔ یہ آزادی خواہی کے جذبے نے مذہبی نفرت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے بندوق کو ہوا میں اُچھال رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے تلوار ہلا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ اپنے سامنے کھڑے ہوئے ہمکاروں سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے:۔

"بھائیو آؤ، میرے ساتھ آؤ، سب میرے ساتھ آجاؤ۔ یہاں کھڑے ہوئے کیا کر رہے ہو؟ میں تمہیں خدا اور پرماتما کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میرے ساتھ آؤ اور اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے دشمنوں کا گلا کاٹ ڈالو۔ کارتوسوں کو دانتوں سے کھول کھول کر تم اپنا مذہب کیوں خراب کر رہے ہو؟ آج موقع ہے، آگے بڑھو"

دیسی محافظ دم بخود کھڑے ہیں۔ جوشیلے سپاہی کا ہر ایک لفظ اور ہر ایک نعرہ ہر سننے والے کے دل و دماغ میں آگ لگاتا جاتا ہے۔ ہر طرف سے اور سپاہی دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور آناً فاناً پریڈ کے میدان میں ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے۔ ہر ایک سپاہی کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے برسنے لگتے ہیں۔ انسانی بارود پھٹ پڑنے کے لئے بیقرار ہے +

ایک مخبر ایجوٹنٹ لفٹیننٹ باغ (BAUGH) کے دروازے پر کھڑا ہو کر چلاتا ہے "صاحب! جلدی اٹھو ظلم ہو گیا" ایجوٹنٹ بیرکپور کی گرمی سے بے تاب ہو کر اونگھتا ہوا اُٹھتا ہے۔ خبر سنتا ہے اور پیٹی میں گولی سے بھرے ہوئے پستول ٹھونستا ہوا تلوار لگا لیتا ہے۔ باہر اصطبل میں ایسے موقعوں کے لئے ہر وقت زین کسا ہوا گھوڑا کھڑا رہتا ہے لفٹیننٹ باغ چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو جاتا ہے اور پریڈ کے میدان کی طرف اسے سرپٹ دوڑاتا ہے۔ اس کا خون کھول رہا ہے' ایک دیسی سپاہی کیسے جرأت کر سکتا ہے کہ اپنے ہمکاروں کو آقاؤں کے خلاف بغاوت کی دعوت دے۔ گھوڑے کے سموں کی ٹاپ سُن کر پریڈ کے میدان کا ہجوم چونکتا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ سڑک ایک ایسے گرد و غبار کا نام ہے جو گھوڑے کے گزرنے کے بعد بادل کی شکل میں اس کے تعاقب میں دوڑ رہا ہے۔ اس بادل کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ ہجوم کا جوش بڑھتا جاتا ہے۔ جوشیلا سپاہی ٹھنڈا ہو کر سڑک کی طرف سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب اس نے بندوق شانے پر لگا لی ہے اور نشانہ لے رہا ہے۔ اس کا وہ سارا ہیجان ختم ہو چکا ہے جس کے اثر سے چند لمحے پیشتر اس کا سارا جسم تھر تھرا رہا تھا۔ اس کے مُنھ پر بھی اب کامل طمانیت کے آثار ہویدا ہیں اور وہ بندوق تانے ہوئے ایک بُت کی طرح ساکت کھڑا ہے۔ دفعتہً بندوق شرر اگلتی ہے اور پھر گولی چلنے کی آواز سے فضا گونج جاتی ہے۔ سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا لڑکھڑاتا ہے، پھر زمین پر قلابازی کھا کر گرتا ہے اور گرد و غبار کے بادل میں گم ہو جاتا ہے۔ سپاہی کی گولی نے اُسے ہلاک کر دیا ہے +

جب غبار کا بادل مدھم ہوتا ہے تو ایجوٹنٹ دھول جھاڑتا ہوا اس میں سے باہر نکلتا نظر آتا ہے اور پستول ہاتھ میں لے کر فوراً سپاہی کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ سپاہی سے دس قدم کا فاصلہ رہ جانے کے بعد وہ پستول کو ہوا میں بلند کرتا ہے۔ باریک سی نال سے ایک شعلہ لپکتا ہے، پھر تھوڑا سا دھواں خارج ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہوا میں ایک تلوار بجلی کی طرح کوندتی ہے۔ گھوڑے سے گرنے والے باغ کا وار خالی جاتا ہے اور سپاہی کی تلوار کام کر جاتی ہے۔ لفٹننٹ باغ زمین پر گر کر تڑپنے لگتا ہے۔ اس کے خون سے زمین رنگین ہو رہی ہے۔ شہید سراج الدولہ کا خون آج رنگ لے آیا ہے +

ہجوم ایک قسم کا اطمینان محسوس کر رہا ہے اور پھر گرد و غبار سے اٹی ہوئی اس سڑک پر کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ سارجنٹ میجر ہیوسن (HUENSON) جو اپنے افسر کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے پریڈ کے میدان تک پہنچا ہے' اُس کی آنکھیں فوراً صورتِ حال کا جائزہ لیتی ہیں۔ ایجوٹنٹ کا مرا ہوا گھوڑا سڑک کے درمیان پڑا ہوا ہے۔ گھائل ایجوٹنٹ خون کے تالاب میں تیر رہا ہے۔ وہ چلا کر دیسی محافظوں کو حکم دیتا ہے:

"پکڑ لو اس بدمعاش کو"

لیکن دیسی محافظ بتوں کی طرح خاموش کھڑے ہوئے ہیں، وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ سارجنٹ میجر ایک لمحہ تامل کے بعد کود کر سپاہی پر حملہ کرتا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے میں اس کا جسم ہوا میں بلند ہونے کے بعد زمین پر گرتا ہے۔ سپاہی نے ایک اور گولی چلا کر سارجنٹ میجر ہیوسن کو بھی زخمی کر دیا ہے۔

ہجوم کالے کالے ہونٹوں میں سے سفید سفید دانت نکال کر ہنستا ہے۔ اُن کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے۔ سپاہی نے ان کی لاج رکھ لی ہے۔ ۳۴ ویں پیادہ فوج کے محافظوں کے دیسی افسر کے دل میں تذبذب کی ایک لہر اُٹھتی ہے۔ اس کے دو "صاحبوں" (صاحبوں) کے زخمی دھڑ زمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ اُسے کچھ تو کرنا چاہیئے۔ وہ محافظوں کے دستے کو ڈبل مارچ کا حکم دیتا ہے۔ فوج کی تربیت پائے ہوئے جوان جب دیسی جمعدار کی گرجدار آواز سنتے ہیں تو ان کے پاؤں بے اختیار ہو کر پریڈ کے میدان پر دوڑ پڑتے ہیں، لیکن صرف چند قدم۔ دوڑنے کو تو وہ دوڑ پڑتے ہیں لیکن "صاحبوں" کو تلوار اور بندوق کا نشانہ بنانے والے سپاہی کو گرفتار نہیں کرتے۔ بلکہ افراتفری کے انداز میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر لفٹنٹ اور سارجنٹ میجر کے زخمی جسموں کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے جو زخمیوں کے قریب ہیں وہ اپنی بندوقوں کے کندوں سے زخمیوں کو کچلنے لگتے ہیں۔ سراج الدولہ کو ایک کمرے میں بند کر دا کر انگریزوں نے میرن سے تلوار کے کچوکے لگوا کر اُسے شہید کر دایا تھا۔ آج تاریخ ٹھیک ایک سو سال کے بعد مخالف سمت میں اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

گولیوں کی آواز چند اور انگریز افسروں کو پریڈ کے میدان میں لے آتی ہے، لیکن کوئی نہیں جو سپاہی کی طرف انگلی بھی اُٹھائے۔ عیار حاکم سہمے ہوئے کھڑے ہیں:

عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

۳۴ ویں پیادہ فوج کا کرنل ہڑبڑا کر اُٹھتا ہے، جلدی جلدی وردی پہنتا ہے اور پریڈ کے میدان کی طرف بڑھتا ہے۔ کرنل وہیلر کا خمیر اس شجاعت سے نہیں اُٹھایا گیا جو ان عہدوں اور مواقع کے لئے درکار ہوتی ہے۔ وہ چھ فٹ لمبے سپاہی کو میدان میں تنہا ڈٹا ہوا دیکھتا ہے۔ ایک طرف چند انگریز افسر کھڑے ہیں، دوسری طرف ایک ہزار دیسی سپاہیوں کا خشمناک ہجوم ہے۔ وہ سہم جاتا ہے، لیکن ایک دفعہ دل کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر دیسی محافظوں کی طرف دیکھ کر للکارتا ہے:

"گرفتار کر لو اسے"

اس کی نیم بزدلانہ آواز فضا میں گونج کر خاموش ہو جاتی ہے۔ سامعین پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور کرنل میدان سے منہ موڑ کر واپس چلا آتا ہے۔ دیسی ہجوم قہقہے لگا کر ہنسنے لگتا ہے۔ بعد میں عدالت میں بیان دیتے ہوئے اس خردل کرنل نے کہا:

"میں نے محسوس کیا کہ اس معاملے میں مزید کارروائی بیکار ہے۔ کسی انگریز افسر کو سپاہی کو گرفتار کرنے کا حکم دینے سے خواہ مخواہ ایک جان کی قربانی کرنا پڑتی...... میں محافظوں کو وہیں چھوڑ کر واپس چلا آیا اور بریگیڈیر کو سارے واقعہ کی اطلاع دے دی" بیچارہ کرنیل! اس کے ذمے اس فوج کی کمان تھی اور بغاوت فرو کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا، لیکن بغاوت کے منظر کے خوف سے ہی وہ اس قدر ہراساں ہوا کہ اپنا گھوڑا دوڑا کر اپنے افسر بریگیڈیر جنرل ہیرسے کے پاس پہنچ گیا۔

ہیرسے نے اپنے کرنیل کی بات سنی تو اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور پریڈ کے میدان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے دائیں بائیں اس کے ذاتی محافظ بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ جرنیل نے میدان میں پہنچ کر سیدھا سپاہی کا رخ کیا۔ کسی نے چلا کر کہا: "جرنیل صاحب! ہوشیار! سپاہی نے اپنی بندوق پھر بھر لی ہے۔" جرنیل اسی مٹی کا بنا ہوا تھا جو فوج میں ایسے موقعوں پر کام آتی ہے۔ اس نے جواب میں کہا "جہنم میں جائے اس کی بندوق" سپاہی نے ایک دفعہ پھر بندوق شانے پر رکھ لی اب وہ جرنیل کا نشانہ لے رہا تھا۔ جرنیل نے مڑ کر اپنے پیچھے آنے والے بیٹے سے کہا: "جان! اگر میں مارا جاؤں تو تم کسی نہ کسی طرح فوراً حملہ کر کے اسے ہلاک کر دینا۔"

اور پھر جرنیل کو ایک فوجی ترکیب بھی سوجھ گئی۔ اس نے دیسی محافظوں کے دیسی جمعدار کے پاس جا کر اپنا گھوڑا فوراً روک لیا اور اپنا پستول نکال کر اور جمعدار کے سر کے ساتھ لگا کر محافظوں سے للکار کر بولا: "آگے بڑھو اور باغی کو گرفتار کر لو" لوہے کی چھ انچ کی چھوٹی سی نالی نے عجب کام کیا۔ دیسی جمعدار نے اپنے سر سے پستول لگا ہوا دیکھ کر فوراً جرنیل کا حکم دہرایا۔ ڈھیلے کھڑے ہوئے دیسی محافظ دفعتہً تن گئے اور جرنیل کے حکم کی اطاعت میں آگے بڑھنے لگے۔ سپاہی کو اپنا انجام واضح طور پر نظر آنے لگا۔ اس نے بندوق شانے سے اُتار کر زمین پر ٹیک دی، خود نالی کے اوپر سینہ رکھ کر جھکا اور پیشتر اس کے کہ محافظ دستہ اس تک پہنچے اس نے ننگے پاؤں کے انگوٹھے سے بندوق کا گھوڑا دبایا۔ فضا میں ایک گونج پیدا ہوئی، گولی سپاہی کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن مر نہ سکا۔ یہ واقعہ ۲۹ مارچ ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ (باقی ص۵۵ پر)

محاربات سندھ

ضمیر اظہر

آج سے ٹھیک سو سال پہلے وہ قومی جنگ برپا ہوئی تھی جس کو ہم نہایت فخر سے اپنی آزادی کی پہلی جنگ قرار دے سکتے ہیں۔ تب سے اب تک اس موضوع پر بے شمار کتابیں اور تحقیقی مضامین لکھے جا چکے ہیں جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ابتدا میں یہی خیال کیا جاتا تھا کہ یہ محض سپاہیوں کی ہنگامہ آرائی تھی اور بس۔ لیکن اصل حقیقت اس سے کہیں مختلف تھی، چنانچہ سر سیّد نے اپنی معرکۃ آلارا تصنیف "اسباب بغاوت ہند" میں کتنے ہی دوسرے اہم اسباب سے پردہ اُٹھایا اور تصویر کے کتنے ہی اور رُخ بے نقاب کئے۔ اس سے تحقیق کا سلسلہ آگے بڑھا اور اب اس بات کے واضح تاریخی ثبوت مل چکے ہیں کہ جو کچھ ہوا محض سپاہیوں کی بغاوت نہ تھی بلکہ اس میں اور بھی بہت سی باتوں کو دخل تھا جو اس واقعہ کو کہیں زیادہ وسیع بنا دیتی ہیں۔ اس برصغیر اور انگلستان میں کئی لوگوں کا ابتدا ہی سے یہی خیال تھا، ورنہ لندن کے اخبارات اس موضوع پر کبھی اس طرح خامہ فرسائی نہ کرتے کہ

"اگر بے اطمینانی صرف سپاہیوں تک ہی محدود ہے اور عام لوگ ہمارے ساتھ ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند کیوں بار بار انگریزی فوجیں طلب کرتی ہے اور تار پر تار کیوں کھڑکاتی ہے؟ اگر لوگ حکومت کے ساتھ ہیں، جیسا کہ وزیر — اور کمپنی کے ڈائرکٹر بیان کرتے ہیں تو انھیں وہیں سے اتنے آدمی مل سکتے ہیں کہ وہ ان سے دس فوجیں کھڑی کرلیں۔"

آج جب ہم تمام معلومات کو پیشِ نظر رکھ کر اس واقعہ پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ ملک کا ایک حصہ ہی نہیں، تمام حصے اس ہنگامہ سے متاثر ہوئے اور ان میں شورش پیدا ہوئی۔ سندھ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ اگرچہ اس میں انگریزی راج کو قائم ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی اور بظاہر اس کی فضا بہت پُرسکون اور طمانیت بخش تھی، لیکن یہاں کے حریت پرست ایسی جنگ میں شامل ہونے سے کیسے باز رہ سکتے تھے جو درحقیقت اسلام اور اس کی ناموس، قوم اور اس کے وقار کی جنگ تھی، جس کا مدعا مسلمانوں کو پنجۂ اغیار سے نجات دلانا تھا جن کو وہ کافر اور ایک اجنبی تہذیب کے علمبردار خیال کرتے تھے، جس کی نوعیت بڑی حد تک جہاد کی تھی اور جو اہلِ ملک کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھی؟ اس صوبہ کو فخر حاصل ہے کہ اس کے حریت نوازوں کے دل میں بھی آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی، انھوں نے بھی جنگ آزادی میں شرکت کی اور اس کی سرزمین بھی خون شہیداں سے لال ہو کر گل بداماں ہوئی۔

اس جنگ کے بارے میں معاصر اخبار "بمبئی ٹائمز" نے جو کچھ کہا تھا وہ سچائی سے خالی نہ تھا۔ ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو اس میں سپاہیوں اور ان کے افسروں کے جھگڑے کے متعلق جو خبر شائع ہوئی تھی وہ بے بنیاد تھی۔ جو لوگ حقیقت سے باخبر تھے انھوں نے ایوان عام میں تسلیم کیا تھا کہ اس وقت ڈم ڈم میں جو انسن فیلڈ رائفلیں بنائی جا رہی تھیں ان میں واقعی کوئی چربی استعمال کی جاتی تھی اور ایک خلاصی نے بڑی ذات والے پر جو فقرہ چست کیا تھا کہ "ذرا ہوش کے ناخن لو! یہ اونچی نیچی جات کا ڈھونگ تو بس چار دن کی بات ہے۔ اب تو گائے اور سؤر کی چربی سے چکنے کئے ہوئے کارتوس دانتوں سے کاٹنے پڑیں گے۔" وہ بالکل صحیح تھا۔ دیسی سپاہیوں نے پہلے ہی کم تنخواہ اور اتنی بڑی سلطنت کی حفاظت کی گراں بار ذمہ داریوں پر بڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی تنخواہ اور بغیر بھتہ سمندر پار نوکری کے متعلق انھیں پہلے ہی سے شکایت تھی۔ اب مذہب پر حملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مسلمانوں نے سؤر کی چربی کی بات سنی تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہندوؤں، مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا شور تو پہلے ہی مچا ہوا تھا، عیسائی مشن اس کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے اور حکومت ان کی برابر پشت پناہی کرتی رہی تھی بلکہ اس کی اپنی پالیسی یہ تھی کہ جیسے بھی ہو یہاں کے لوگوں کو اپنے جیسا اور اپنا پورا پورا حلیف بنا لیا جائے۔ ان کے عیسائی مذہب اور یورپین طور طریق اختیار کر لینے سے یہ دونوں مقصد حاصل ہو جاتے تھے۔ سپاہیوں نے یہ سمجھا کہ اب جب انگریزوں کی یہ مجنونانہ کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوئی تو انھوں نے ان کا مذہب بگاڑنے اور ان کو عیسائی بنانے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ اکھڑ اور ان پڑھ فوجی بھلا اس کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ مگر وہ بغاوت میں کیسے کامیاب ہو سکتے تھے تاوقتیکہ اس مقصد کے لئے ان میں بڑے رازدارانہ طور پر اشارے کنائے اور ساز باز نہ ہو۔ حکام کو دیسی سپاہیوں کی بے اطمینانی کا علم تو ہو چکا تھا لیکن وہ یہ نہیں جان سکے تھے کہ بات کہاں تک پہنچ چکی ہے۔

ورنہ فتح گڑھ کے ضلع میں جو کچھ ہوا اس پر وہاں کے حکام اتنے پریشان نہ ہوتے۔ آیئے ہم اس واقعہ کا حال "فرنڈ آف انڈیا" کی زبانی سُنیں:۔

"پچھلے مہینے، فروری کے آخر میں صبح کو فتح گڑھ کے حکام میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگ ایک تھانہ سے دوسرے تھانہ کو دو دو پانچ تلکی چھوٹی چھوٹی چپاتیاں پہنچا رہے ہیں۔ ہوا یہ کہ کچھ دن پہلے کانپور کے ایک چوکیدار نے فتح گڑھ کے چوکیدار کو ایک چپاتی دکھلا کر حکم دیا کہ وہ ایسی ہی بارہ چپاتیاں تیار کرے، وہ اپنے پاس رکھے اور دو دو چپاتیاں پانچ اور چوکیداروں کو جو اس کے قریب ہوں پہنچا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور چپاتیاں زور شور سے بننے اور تقسیم ہونے لگیں۔ دوسرے پانچ چوکیداروں نے بھی اس حکم پر عمل کیا اور اپنے پیغامات پچیس چوکیداروں کو پہنچا دیئے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا اور چپاتیاں اس تیزی سے تقسیم ہو رہی تھیں کہ نئی نئی چلی ہوئی ڈاک بھی اس تیزی سے نہیں چل سکتی۔ یہ طوفانی رو ابھی تک نہیں تھمی!"

حالات کے تیور پہچاننے والے جانتے تھے کہ کہیں نہ کہیں ضرور کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے اور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ چنانچہ "فرنڈ آف انڈیا" چپاتیوں کا واقعہ بیان کر کے سوال کرتا ہے "کیا یہ غیظ و غضب کا کوئی دھماکا ہونے والا ہے یا محض ستم ظریفانہ بات؟ کیا یہ چپاتیاں آتشیں صلیب والی چپاتیاں ہیں یا بدہضمی کا پیدا شدہ مراق؟ بغاوت کا نقیب یا محض تو بیخ کا ورد؟" مگر قبل اس کے کہ ان سوالات پر توجہ دی جائے، اُن کا جواب خود ہی موصول ہو گیا۔ آزادی کی جنگ شروع ہو گئی ورنہ اس شورش کو شروع ہونے سے پہلے ہی کچل دیا جاتا۔

سندھ کو انگریزی سلطنت میں شامل ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کو غصب ہوئے کُل چودہ سال ہی تو گزرے تھے۔ جب دھاندلی سے سندھ پر قبضہ کیا گیا تھا اس سے یہی توقع ہوتی تھی کہ لوگوں کے لئے حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونے کا وقت آ پہنچا اور وہ یک لخت غلامی کا جوا اُتار پھینکیں گے۔ اس کے باوجود سندھ اس طرح مطمئن و آسودہ نظر آتا تھا کہ بظاہر حکومت کو اس میں کسی شورش کی توقع تھی نہ یہاں کے باشندوں کو۔ حکومت نے احتیاطاً پریس پر کڑی پابندی عائد کر دی کیونکہ بغاوت کے متعلق ہر صوبہ میں طرح طرح کی افواہیں موصول ہو رہی تھیں جس کا لوگوں پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ سندھ میں بھی یہاں کے مختلف مقامات پر چھوٹی چھوٹی بغاوتوں کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ اور ان میں سے بعض اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ مثلاً انگریزی اخبار "قاصد" (کراچی) میں دو بار حیدرآباد اور شکارپور میں بغاوت کی خبریں شائع ہوئیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی:۔

"سننے میں آیا ہے مگر خبر نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے کہ ۱۳ نیٹو انفنٹری کے کئی سپاہیوں نے فوج سے بھاگ جانے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے اور اب زیرِ حراست ہیں۔ وہ اُس سزا کے منتظر ہیں جس کو انھوں نے خود دعوت دی ہے۔ چھ اشخاص جن پر شبہ کیا جاتا ہے کہ وہ بنگال سے بھیجے گئے ہیں، گرفتار ہو گئے ہیں اور ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ توپچیوں کا ایک دستہ جو ملتان جا رہا تھا حیدرآباد روک لیا گیا ہے تاکہ وہ کسی نازک موقع پر کام آ سکے۔ شکارپور میں بڑی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔"

حکومت کی تمام احتیاطوں کے باوجود اہلِ سندھ کو انگریزوں کے قتل کی خبریں مختلف صوبوں کے اخبارات کے ذریعہ پہنچتی ہی رہیں۔ خصوصاً ڈاک کے نئے انتظامات کی وجہ سے۔ ان خبروں نے یہاں کے انگریزوں کو بہت سراسیمہ کر دیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا مقامی یورپین باشندے سندھ میں مقیم دیسی سپاہیوں کی وفاداری کی طرف سے بدگمان ہوتے گئے۔ حکومت نے ان کو لاکھ مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے اندیشے دور نہ ہوئے اور سچ پوچھئے تو ان کے اندیشے بے جا بھی نہ تھے۔ شکارپور، حیدرآباد اور کراچی میں بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی اور بھڑک بھی پڑی، چنانچہ آزادی کے پروانے ستمبر ۵۷ء میں بغاوت کی آگ میں کود پڑے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا دیا، اگرچہ افسوس ہے کہ ان کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ حیدرآباد کا قلعہ چھین کر اس کو دہلی کے لال قلعے کی طرح باغیوں کا مرکز بنا لیں اور پھر کراچی، شکارپور، جیکب آباد، ملتان وغیرہ میں ایک ساتھ بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیں۔

بغاوت کی پہلی کوشش حیدرآباد میں قرار پائی تھی اور اس کے لئے ۱۲ ستمبر کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ حکام کو اس کی بروقت اطلاع مل گئی۔ ایک غدار نے یہ راز فاش کر دیا کہ توپ خانہ کے سپاہیوں میں کچھ ساز باز ہو رہی ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ فوج کے جانبازآزادی کے حق میں تلوار اٹھائیں، سارے رسالہ کے ہتھیار چھین لئے گئے اور آزادی دغابازی کے بھینٹ چڑھ گئی اور اس کے ساتھ آزادی کے پروانے بھی۔ ایک حوالدار، ایک لانس نائک اور تین جوان۔ ان کا انجام بہت افسوسناک رہا، لیکن آزادی کی راہ میں انجام جتنا خونیں ہو اتنا ہی قابلِ فخر ہے، کیونکہ یہ شہادت کا پروانہ ہے۔ ان شیدایانِ آزادی کا کورٹ مارشل ہوا، سب مجرم قرار پائے۔ حوالدار کو جو تحریک کا سرغنہ تھا، توپ سے اُڑا دینے کی سزا سنائی گئی اور باقیوں کو عمر قید بہ عبور دریائے شور کی! اگلے دن حیدرآباد کی

تمام سپاہ پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہوئی تاکہ جرمِ آزادی کے گناہگار کو چھ پاؤنڈ گولے والی توپ سے اُڑا دیا جائے! سننے والوں نے سنا کہ ایک فدائے قوم کے "اُڑنے کے پُرزے"۔ یہ "تماشہ" ہوا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حوالدار کو پشتے سے باندھ دیا گیا۔ "ریڈی، فائر" کا حکم ہواؤں میں گونجا اور پھر توپ کی دندناتی ہوئی آواز اس طاغوتی اور قہرمانی طاقت کے سامنے انسانی گوشت پوست کی حقیقت کیا ہے۔ اس کا بدن اور مشتِ استخواں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں پھیل گئی اور آنے والی نسلوں کو آزادی کے لئے جاں نثار کرنے کا حیات افروز پیغام دے گئی۔ کچھ دن بعد آزادی کے چھ اور گناہگار بھی گرفتار ہوئے اور انھیں بھی آزادی کے لئے جان قربان کر دینے کا شرف حاصل ہوا۔

اب کراچی کا حال سنئے۔ مدت سے ایک یونہی مبہم سا شبہ تھا کہ ۲۱ رجمنٹ این۔ آئی[1] میں بھی بغاوت کے کچھ کچھ جراثیم ہیں — بعض بنگالیوں کی وجہ سے جو یہاں رہتے تھے۔ یہ شبہ صحیح نکلا۔ یہاں بھی بھائیوں نے بھائیوں کو دغا دے کر ان کے گلے کٹوائے۔ ایک دیسی افسر نے یہ راز فاش کر دیا کہ اس کی رجمنٹ بغاوت پر تلی بیٹھی ہے اور تین گھنٹوں کے اندر اندر اُٹھ کھڑی ہوگی۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، ایک مخبر نے یہ بھی بتا دیا کہ باغیوں نے باقاعدہ منصوبہ بنا رکھا ہے۔ یہ کہ ساری باغی فوجیں خزانہ چھین کر حیدرآباد روانہ ہوں گی۔ اس طرح حریف کو تیاری کا پورا پورا موقع مل گیا اور حریت پرستوں کا کیا دھرا سب بے کار گیا۔ ان کے ہتھیار چھین لئے گئے۔ باغیوں نے ۱۴ توپوں میں گولے بھر رکھے تھے۔ اور کارروائی کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ ادھر ۱۴ این۔ آئی سے بھی ہتھیار چھین لئے گئے۔ اس طرح بغاوت پہلے ہی کچل دی گئی۔ البتہ ۲۱۔ این۔ آئی کے ۲۵ آدمی پریڈ میں موجود نہ تھے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ سب یا تو گرفتار ہو گئے یا ان کی کیفیت کا پتہ چل گیا۔ بغاوت کا سرغنہ بھی گرفتار ہوا۔ مجرموں کا کورٹ مارشل ہوا۔ پوسٹ آفس کے سامنے جو میدان ہے اس میں سولیاں گاڑی گئیں۔ ۱۷ ستمبر کو ساری سپاہ اور پولیس جمع ہو گئی۔ توپ خانہ سولیوں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ مجرموں کو بہ آوازِ بلند ان کی سزا سنائی گئی، سات کو پھانسی اور تین کو توپ سے اڑا دیئے جانے کی سزا! پہلے ساتوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے اور ان کو سیڑھیوں پر چڑھا کر اس جگہ چڑھا دیا گیا جہاں سے انھیں جھٹکے کے ساتھ گرانا تھا۔ ان کے گلوں میں رسیاں کس کر باندھی گئیں، چنڈال نیچے اُتر آئے۔ ایک اشارے پر سہارا اُٹھا لیا گیا اور ایک جھٹکے سے ان شیدایانِ آزادی کا کام تمام ہو گیا۔ اسی طرح باقی تین مجرم بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ انتقام نے اپنی طرف سے ان کی انتہائی تذلیل کی۔ لیکن آج ہماری جبینیں اُن کے احترام میں خم ہیں، قدرت نے ان کو حیاتِ عارضی سے محروم کر کے حیاتِ دوام عطا کر دی!

سکھر میں باغیوں کو جواں مردی دکھانے کا زیادہ موقع ملا۔ توپچی آدھی رات کو توپوں پر آ ڈٹے اور خود کو مربع شکل میں ترتیب دے کر چاروں طرف اندھا دھند گراپ برسانے لگے۔ پولیس موقعِ واردات پر پہونچ گئی، لیکن باغیوں نے کچھ ایسی عجیب پوزیشن اختیار کر لی تھی کہ وہ دیر تک کچھ نہ کر سکی۔ آخر گھوڑا سوار فوج نے ان پر ہلہ بول دیا۔ اس سے پولیس کو توپیں چھین لینے کا موقع مل گیا، کئی باغی لڑتے لڑتے مارے گئے اور کئی گرفتار ہوئے۔ جمعدار سخت زخمی ہوا۔ اُس سے معلوم ہوا کہ اس دن آدھی رات کو توپ خانہ وہاں پہونچا تھا تاکہ وہ مل کر اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں، لیکن — اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! ۲۵ باغی جیکب آباد گئے تھے تاکہ وہاں کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کریں۔

شکارپور کی شورش یہیں ختم نہیں ہوئی۔ یہاں کے کچھ معزز سپاہی سکھر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک کو پولیس نے پکڑ لیا۔ باقی دریا کو پار کر کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ سکھر سے رائل فیوزیلیرز کا ایک دستہ شکارپور بھیجا گیا۔ گولہ اندازی کے چار جوان اور ۱۶ این۔ آئی کے صوبہ دار اور حوالدار کو سزائے موت دی گئی۔ پہلے چاروں کو توپ کے گولے سے اُڑا دیا گیا۔ اور دوسروں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ یہ تھے سندھ میں آزادی کے آخری پروانے جنھوں نے ملک و ملت پر قربان ہو کر جذبۂ آزادی کو برقرار رکھا۔

جلے اجل کر تجھے بھی چشمِ صورت بیں میں پروانے
فروزاں کر گئے وہ نام لیکن شمعِ سوزاں کا

---

[1] نیٹو انفنٹری

بنگال کی سیاست و معاشرت

(دورِ اسلامی سے ۱۸۵۷ء تک)

عبدالرحمٰن بیخود

اٹھارہویں صدی کے بہت پہلے ہی سے یورپ کی متعدد قومیں تاجرانہ اغراض سے برصغیر میں آگئی تھیں۔ ان قوموں میں پرتگالی، ولندیزی، انگریز اور فرانسیسیوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈنمارک اور جرمنی کے باشندے بھی ان کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی تجارت پر اجارہ داری کی نیت سے یورپ کی ان اقوام نے باہمی رقابت کا بھی اچھی طرح مظاہرہ کیا۔ اس ملک کے حاکمانہ انتظامات کی کمزوری اور یہاں کے بے دست و پا عوام کی قومی اور وطنی طاقت کی کمی سے فائدہ اٹھا کر اور ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کی آڑ لے کر ہوشیار اور چالاک انگریزوں نے اس ملک پر سیاسی اقتدار اور دور رس اختیارات حاصل کر لئے۔ پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کی شکست نے صرف ایک حکومت کی بیخ کنی اور دوسری سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط ہی نہیں کیا، بلکہ اس برصغیر کے ہزار سالہ تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ کلائیو جیسے بیدار مغز مدبروں نے لڑائی میں فتح یاب ہوتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑی مضبوط اساس پر قائم کرنے کے لئے تمام تر راستوں کو ہموار کیا اور اس طرح یہاں کے بسنے والوں کی روزمرہ معاشرت میں ایک ہمہ گیر تغیر واقع ہو گیا۔

۱۷۵۷ء میں کلائیو نے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر میر جعفر کو نام کے لئے نواب بنایا اور وصولئ محاصل کی ذمہ داری خود اپنے ہاتھوں میں رکھی، تاہم محبِ وطن اور آزادی پسند انسانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنجۂ اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوششوں میں کمی نہ کی۔ اس مقصد کے لئے میر قاسم نے انگریزوں سے متعدد لڑائیاں لڑیں۔ محدود طاقت کے باوجود یہ بات ہمیں برابر نظر آتی ہے کہ میر قاسم نے بنگال کی آزادی کے لئے ہر طرح کی جد و جہد کی۔ میر قاسم پر ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی نظامت خود اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

بنگال کو اس وقت "ملکِ زریں" کہا جاتا تھا۔ غیر منقسم بنگال جیسے وسیع خطے پر اقتدار حاصل کر کے دولت کے بندوں یعنی کارکنان و مالکانِ کمپنی کا دستِ حرص و آز اور پنجۂ ہوس حدودِ عدل و انصاف سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ساتھ ہی عوام الناس کے دکھ درد کی مصیبت بھی بے قیاس حد تک زیادہ ہو گئی۔ ۱۷۷۶ء کا مشہور قحط بھی اسی کا نتیجہ تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس ملک کا اقتدارِ اعلیٰ اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد ہی یہاں کی زمینداری اور کاشت کاری کی اصلاح کی جانب قدم بڑھایا۔ ۱۷۸۸ء سے ۱۷۹۳ء تک اصلاحِ زمین کے سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں، ان کے غیر معمولی اثرات ۱۷۹۳ء کے بندوبست استمراری میں نمایاں نظر آتے ہیں، اس پر بھی زمین کا بندوبست کرنے والے مطمئن نہیں ہوئے۔ بنگال کی ساری زرعی زمین کے مقابلے میں اس وقت لاخراج زمین کی حیثیت بھی بہت معمولی نہ تھی، اس کی آمدنی بھی بہت تھی۔ ۱۷۹۷ء میں لارڈ کارنوالس نے تفصیلی طور پر یہ اعلان کیا کہ موجودہ حکومت کی منظور کردہ لاخراج زمینوں پر کمپنی کی حکومت کو سب سے زیادہ حق حاصل ہے، لیکن اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اپنے اعلان کے بل پر لاخراج زمینوں کو اپنے قابو میں نہ لا سکی۔ تقریباً ایک چوتھائی صدی اسی حالت میں غیر مطمئن طور پر گذر جانے کے بعد ۱۸۲۸ء میں منتظمین اور حکمرانوں نے بہ اتفاق کام کر کے مختلف ناجائز اور غلط مقدمات دائر کئے اور اس پر آٹھ لاکھ پونڈ خرچ کرنے کے بعد حکومت کو سالانہ تین لاکھ پونڈ کی مستقل آمدنی کا مالک بنایا۔ اس تمام لاخراج زمین کی آمدنی بنگال کے مسلمانوں ہی کے گھروں سے وصول کی گئی تھی، کیونکہ ایسی زمینوں کے مالک صرف وہی تھے۔

اس زمانے تک اس علاقے کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ لارڈ بینٹنگ کے دورِ حکومت میں لارڈ میکالے کی سفارش پر فارسی کے بجائے سرکاری زبان انگریزی ہو گئی۔ ملک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اس کے اثرات دور رس ہوئے۔ زبان اور ادب کے لحاظ سے یہ کتنا بڑا انقلابی حادثہ تھا، اس کا

تاریخ ادب کی تحقیق سے پورا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے اس ملک کی حکومت چھین لی۔ یہی سبب تھا کہ ایک صدی سے زائد عرصے تک مسلمانوں نے بھی انگریزی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ انگریزوں نے بھی اسی طرح مسلمانوں کو شک اور شبہے کی نظر سے دیکھا۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو محکوم ملک کے عوام کی تائید کے بغیر بہت دنوں تک استحکام پذیر نہیں ہو سکتی۔ جس وقت انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ یہ معاندانہ رویہ تھا، انہوں نے یہاں کے ہندوؤں کو خوش کر کے انہیں اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوششیں برابر جاری رکھیں۔

ایک جانب تو مسلمانوں نے اپنی حاکمانہ طاقت کھو دی، دوسری طرف یہاں کا اقتدار حاصل کرتے ہی اپنی بنیاد زیادہ مستحکم کرنے اور انگلستان میں انگریزوں کی مالی حالت درست اور ترقی پذیر کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں نے جو متعدد انقلابی اصلاحات جاری کیں، وہ سب کی سب مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچانے والی تھیں۔ بندوبست استمراری کے اجراء اور لاخراج زمینوں سے بے دخلی کی بنا پر مسلمان تباہ اور تنگدست ہو گئے۔ رعیت اور مسلمانوں کے درمیان تحصیل دار، نائب، محرر اور گماشتے وغیرہ، جو سب کے سب ہندو ملازمین تھے، انگریزوں کے زیر سایہ تھوڑے ہی وقت میں زمینوں کے مالک بن بیٹھے مزید برآں سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی ہونے کی وجہ سے ملازمت پر زندہ رہنے والے بے بس مسلمانوں کے لئے روزی کے دروازے بند ہو گئے۔ بنگال کی مالی زندگی کی اصل بنیاد زمین ہے اور اس کی معاون ملازمت، یکے بعد دیگرے ان دونوں سے محروم ہو کر مسلمانوں کی مالی تباہی کی کوئی حد نہ رہی۔

فارسی کے بجائے ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو سرکاری زبان کی حیثیت ملنے کے بہت پہلے ہی سے بنگال کے ہندو حالات سے فائدہ اٹھا کر تیزی سے انگریزی سیکھنے لگے۔ حالات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اور انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں بنگال کے ہندوؤں کو راجا رام موہن نے دعوت عام دی۔ اور معاشرتی و مذہبی اصلاح میں سیاسی مہارت رکھتے ہوئے بڑی دور رس سوجھی۔

۱۸۰۱ء میں انگریز سویلین افسران کو اس ملک کے حالات اور رسم و رواج سے باخبر کرنے اور اس ملک کی زبان یعنی بنگالی کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ اور ۱۸۱۶ء میں ہندو کالج قائم ہوا۔ یہی کالج آج پریسیڈنسی کالج کے نام سے موسوم ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں معلمی کی خاطر اور بنگالی نثر کی ترویج کے پیش نظر یہاں کے کچھ ہندو بھی انگریزوں کے ہم صحبت ہو گئے۔ اس کے بعد ہی سے ہندو کالج میں بنگالی ہندوؤں کو بھی حصول تعلیم میں منہمک دیکھا گیا۔ ان پیوستہ واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اسی دور میں اصلاح زمین کے نتیجے میں انگریزوں کو غیر معمولی منافع بھی حاصل ہوئے۔ اسی وقت ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ بنگال کی خام دولت اور خام سامان کی بدولت انگلستان میں ڈنڈی، برمنگھم، مانچسٹر وغیرہ تجارتی اہم شہروں کو غیر معمولی وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ بنگال کے ہندوؤں کی قسمت بھی اس کی بدولت کچھ کم تبدیل نہ ہوئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خوش نصیب ہندو زمینداروں کو نصف صدی ہی میں دیہاتوں سے نکل کر کلکتہ میں آباد ہوتے دیکھا گیا۔

پلاسی کی جنگ سے پہلے تک بنگال کی راجدھانی مرشد آباد تھی اور یہی پورے بنگال کے تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مرشد آباد کی مرکزی تہذیبی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور نو تعمیر دار الحکومت یعنی کلکتہ میں نئے سرے سے اس کی نشو و نما ہونے لگی۔ اتنے دنوں تک مرشد آباد کو مرکز بنا کر مسلمانوں کی جس تہذیب نے ترقی حاصل کی تھی، اس کا کلکتے کی مرکزی تہذیب میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ مالی اور معاشرتی تبدیل شدہ حالت میں جس وقت ہندوؤں نے انگریزوں سے تعاون کے لئے اقدام کیا، بالکل اسی وقت جنگ پلاسی کے بعد سے ہی، تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصے تک، انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید ذہنی کشاکش اور غیر مصالحانہ عدم تعاون جاری رہا۔ جنگ پلاسی کے بعد اٹھارہویں صدی کے آخر میں اس عدم تعاون نے غیر منقسم بنگال میں میر قاسم کے ساتھ اور میسور میں شیر دکن حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ساتھ خونریز جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ان مجاہدین اعظم کی جنگ، شکست اور شہادت کے بعد بنگال ہی نہیں، پورے برصغیر کے مسلمان کچھ دنوں کے لئے دل شکستہ اور مفلوج ہو کر رہ گئے۔ اس ذہنیت ہی سے مذہب کی طرف کشش ان میں زور دار ہو گئی۔ مذہب کو پورے طور پر اختیار نہ کرنا اور مذہب سے دور ہونا ہی اس برصغیر میں ان کی بدحالی کا خاص سبب تھا۔ یہ خیال اس زمانے کے ہندی مسلمانوں کے ذہن میں راسخ ہو گیا تھا۔

برصغیر کی گذشتہ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کی فتح کے زمانے سے شک، ہون اور یونانی وغیرہ جو قومیں ہندوستان میں آئی تھیں، انہیں برصغیر

کی تہذیب اور مذہب نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ صرف اسلام ہی باہر سے آکر اس اصول سے مستثنیٰ رہا مسلمانوں نے اپنا نام و نشان کھو کر یہاں کی ہندو تہذیب اور مذہب میں اپنے آپ کو مدغم نہ کیا۔ مذہبی حیثیت سے اس کے عدم انجذاب کا سبب یہ تھا کہ اسلام میں انقلابی تحریک کی رو سے استحکام تھا اور سماجی حیثیت سے اس نے انسانوں کی روزمرہ زندگی کے مشاہدات، مقتضیات اور تجربات کو تسلیم کیا تھا، نیز اخوت، مساوات اور آسان انسانی حوائج کی بنیاد پر اس مذہب کا قیام تھا۔ برصغیر میں اگرچہ اسلام نے اپنا نام و نشان نہ مٹایا تاہم مفتوح قوم کی روایات اور تہذیب نے مسلمانوں پر نمایاں اثر ڈال کر کچھ نہ کچھ انتقام ضرور لیا۔ شمالی، وسطی اور مغربی بھارت میں اس تاثر کے تاریخی اسباب میں سے مغل حکمرانوں کی غیر مدبرانہ وسیع النظری بھی شامل تھی اور بنگال میں اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں کے اکثر باشندوں نے نامکمل حیثیت سے اسلام قبول کیا تھا۔

منجملہ دیگر ہندوانہ اثرات کے ایک یہ تھا کہ بنگال کے سندربن کے علاقے میں مسلمانوں کے زندہ غازی اور کالو غازی نامی دو پیر مانے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کی نیچ ذاتوں میں مسلمانوں کے مذکورہ کالو غازی شیر کے دیوتا کی حیثیت سے نام کالورائے موسوم ہیں۔ ہیضہ اور چیچک کی تباہ کاری کو دور کرنے کے لئے نیچ ذات کے ہندوؤں میں "اولا دیوی" اور "سیتلا دیوی" کی پوجا مروج تھی۔ ان کی نحوست اور سوء نظر سے بچنے کے لئے ہندوؤں میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ گاؤں سے باہر اور گاؤں کے سامنے برگد اور پیپل کے درختوں کی جڑوں میں کچے ناریل کارس، کدو اور اسی قبیل کے وہ کھانے جن سے معدہ ٹھنڈا رہے، بطور نذرانے کے رکھے جاتے تھے۔ دیوتاؤں کو خوف زدہ کرنے کے لئے ایک اونچے بانس پر بکری کی کھال میں دھان کا پیال اور گھاس پھوس بھر کر باندھ دیتے۔ مسلمان بھی ان چیزوں کا اعتقاد رکھتے اور اپنے پڑوسی ہندوؤں کی تقلید میں مصیبت کے زمانے میں ان بُری رسموں پر عمل درآمد کرتے۔ گھر کے پالتو جانور گم ہو جانے پر انہیں دوبارہ حاصل کرنے کے لئے وہ منت مانتے۔ بنگال کے کرتا بھجا (جماعت) اور آؤل باؤل (جماعت) وغیرہ نیز لاتعداد شیرا شیرا ز سرمنڈے فقیروں کی جماعت ابھی اس اثر اندازی میں معین رہے ہیں۔ دور وسطیٰ کے بنگالی شاعروں اور ادیبوں کی بہت سی تحریرات میں ان تمام چیزوں سے خوش اعتقادی ظاہر ہوتی ہے۔ "کرتا بھجا" اور باؤل جماعت کے گاؤں میں اس ذہنیت کے نشانات بہت نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ سید سلطان کی کتاب "نبی بنگشو" میں برہمی اور وشنو وغیرہ ہندو دیوتاؤں اور ذیلی دیوتاؤں کو بھی نبی کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ بنگال کے سری کرشن بجے کی تقلید میں "نبی بنگشو" کی تصنیف بھی صراحت کے ساتھ ہندو اثرات ہی کی آئینہ دار ہے۔ مسلمانوں کی شادیوں میں "پن" دینے کا رواج اور روپیہ پیسے کا لین دین ہندوؤں ہی کی تقلید میں جاری ہوا ہے۔

بنگال بلکہ تمام برصغیر، بالخصوص مسلمان قوم میں اس قسم کے ہندو اثرات مسلمانوں کے دورِ حکومت ہی سے داخل ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حاکمانہ اقتدار نکل جانے کے بعد تعلیم اور تبلیغ کی بدنظمی کے سبب سے ان میں یہ کورانہ ذہنیت اور برے رسم و رواج تیزی کے ساتھ ترقی پاتے رہے۔ ان کا بری تہذیب سے لگاؤ کس حد تک پہنچ گیا تھا اس کا صریح اندازہ علامہ اقبالؒ کے اس قول سے ہو سکتا ہے:۔

"یقیناً ہم ہندوانہ رسم و رواج اور اعتقادات میں ہندوؤں سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ ہم دو طرح ذات گوت کے امتیازات کا شکار ہیں۔ فرقہ پرستی اور ذات پات کا امتیاز، جن کو ہم نے ہندوؤں ہی سے سیکھا ہے۔ یہ اس خاموش عمل کی مثال ہے جس سے مفتوح قومیں فاتحین سے انتقام لیتی ہیں۔"[1]

اس لئے سماج اور ذات پات کے متعلق ذلیل اور غیر اسلامی یا ہندوانہ اثرات کو ہی مسلمان اپنی تمام تر بدنصیبیوں کا سبب سمجھنے لگے۔ اپنی خوش نصیبی کے آفتاب کو دوبارہ اُن طلوع دینے کے لئے وہ یہ ضروری سمجھنے لگے کہ حضرت محمدؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے سے مابعد کی تمام بدعات اور مشرکانہ رسوم سے نجات حاصل کر کے قدیم اور خالص اسلام کو پھر سے حیات نو بخشیں۔ اسی اعتقاد کی بناء پر اس زمانے کے مسلمانوں نے اپنی مذہبی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں بنگال کی فرائضی تحریک اور پورے ہندوستان کی وہابی تحریک کا حال بھی قابل بیان ہے۔

سترہویں صدی کے آخر میں ایک بہادر فرزند عرب عبدالوہاب نے ملک عرب میں حضرت محمدؐ کے خالص اسلام کے احیاء اور قیام کے لئے جو جدوجہد شروع کی تھی، وہ تاریخ اسلام میں "وہابی تحریک" کے نام سے مشہور ہے۔ عبدالوہاب کے بعد ان کے فرزند محمد نے اس تحریک کو زندہ اور جاری رکھا۔ وہابی تحریک

---

[1] منقول از "ہندوستان ریویو"؛ رپورٹ درباره مردم شماری ہند (۱۹۱۱ء) ص ۱۴۲، پنجاب، حصہ اول، صفحہ ۱۶۵

کے عرب سردار سیاسی طاقت کے حصول میں بھی کامیاب ہوئے۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے مکہ شریف پر قبضہ کیا۔ ترکوں نے جنگ کر کے وہابیوں کو وہاں سے پھر بے دخل کیا اور دوبارہ مکہ معظمہ پر قبضہ حاصل کیا، لیکن اس سے وہابی تحریک کا خاتمہ نہ ہوا۔

شمالی ہند میں رائے بریلی کے رہنے والے مذہبی مقتدا حضرت سید احمد بریلویؒ اور مشرقی بنگال کے فرائضی رہنما حاجی شریعت اللہ نیز مغربی بنگال کے فرائضی لیڈر نثار علی عرف تیتو میر حج کے سلسلے میں مکہ معظمہ گئے اور وہاں انہوں نے وہابی تحریک سے واقفیت حاصل کی۔ وطن واپس آنے کے بعد وہ برصغیر میں تجدید اور اصلاح مسلمین میں زور شور سے مشغول ہو گئے۔

مشرقی بنگال میں فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے۔ وہ ضلع فرید پور میں موضع بندر کھولا کے باشندے تھے، بچپن ہی میں مکہ معظمہ چلے گئے اور ۱۸۲۸ء کے لگ بھگ باشعور ہونے کے بعد وطن واپس آئے۔ وہ عیسائی انگریزوں کے پنجۂ اقتدار میں محصور برصغیر کو دار الحرب مانتے تھے اور چونکہ دار الحرب میں مسلمانوں کے لئے عیدین اور جمعہ کی نماز ممکن نہیں ہے، اس لئے حاجی شریعت اللہ نے اپنے اس مسلک کی تبلیغ کی۔ محرم کے جلسے جلوس کو بھی انہوں نے ہندوؤں کے درگا پوجا کے مماثل سمجھ کر اس کی شدید مخالفت کی اور اسے ایک قبیح' خلاف اسلام عمل قرار دیا۔ پیر پرستی کی مخالفت کر کے انہوں نے استاد اور شاگرد کے تعلق کا تصور استوار کیا۔ اور اسی حیثیت سے پیر اور مرید کو تعلق رکھنے پر زور دیا۔ حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد ان کے وارث کی حیثیت سے اس تحریک کی سربراہی ان کے فرزند محمد محسن عرف دودو میاں پر آپڑی۔ ان کے زمانے میں یہ تحریک صرف ایک مذہبی اور اصلاحی تحریک نہ رہی، بلکہ حالات کی تبدیلی سے اس نے مقامی ہندو زمینداروں کی اعانت سے ایک بڑی اقتصادی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ سابق فرید پور اور باری سال کو مختلف علاقائی حصوں میں تقسیم کر کے دودو میاں نے وہاں اپنے خلفاء مقرر کئے اور ان علاقوں پر ان کا اقتدار انیسویں صدی کے وسط تک قائم رہا۔

قدیم فرائضی تحریک کے سربراہوں کی اصلاحی جدوجہد کے دور میں مغربی بنگال میں بھی یہ فرائضی تحریک بڑے زور شور سے جاری تھی۔ مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ اور ضلع ندیا کو مرکز بنا کر نثار علی عرف تیتو میر اس جدوجہد کو تیز رفتاری سے چلا رہے تھے۔ وہ باراسات ضلع کے محکمہ بشیر ہاٹ کے رہنے والے تھے۔ تقریباً ۱۸۲۴ء میں حج سے فارغ ہو کر وطن واپس آئے۔ اور بنگالی مسلمانوں کی شرک و بدعت کی رسموں کے خلاف ایک گونہ جہاد شروع کیا۔ حاجی شریعت اللہ کی طرح وہ بھی پیر پرستی کے مخالف تھے۔ ہندوؤں سے مسلمانوں کے خصوصی امتیاز کو نمایاں کرنے کے لئے انہوں نے ڈاڑھی رکھنے اور اسلامی لباس کے استعمال کو بہت ضروری خیال کیا۔ مُردوں کے نام پر فاتحہ اور غریبوں کو فاتحہ کا کھانا کھلانا نیز پختہ مزار کی تعمیر کو وہ شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔

ان اصلاحی تحریکات میں شریک ہونے کی وجہ سے تیتو میر کو ہندو زمینداروں سے جنگ میں مبتلا ہونا پڑا۔ یہ جنگ رفتہ رفتہ زیادہ خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ جو مسلمان تیتو میر کے ہم نوا ہوئے ان سے بھی ان کے متبعین کی کشاکش شروع ہو گئی۔ اس تحریک کو چلانے میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ اس دور کی مقامی حکومت کے اقتدار کو نہ مان کر انہوں نے نارکل باڑی مقام پر ایک آزاد حکومت قائم کی۔ اس وقت کی انگریزی حکومت اس سے بہت گھبرا گئی۔ باراسات کے جوائنٹ مجسٹریٹ الیگزنڈر انقلابی تیتو میر کی سرکوبی کے لئے جا کر اور خود ہی ان کے ہاتھوں شکست کھا کر مصائب کا شکار ہوئے۔ باراسات اور کرشن نگر کے حکام ضلع تیتو کی سرکوبی میں ناکام ثابت ہوئے اور ان کی اعانت کے لئے کلکتے سے میجر اسکوٹ کی کمان میں ایک پیادہ فوج کی بٹالین آئی۔ تیتو میر نے بانسوں سے ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اور مسلح انگریزی فوج کے ساتھ باقاعدہ بہادری کے ساتھ جنگ کر کے سنہ ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ ان کے پچاس متبعین بھی ان کے ساتھ ہی شہید ہوئے۔

تبدیلی حالات کی وجہ سے مغربی اور مشرقی بنگال کے فرائضی جماعت والے اگرچہ حکمرانوں سے نبرد آزما ہوئے تھے لیکن ان کی یہ لڑائی کسی ہمہ گیر سیاسی تحریک میں تبدیل نہ ہو سکی۔ ان کی اصلی تحریک مذہبی اصلاح کے متعلق ہی تھی تاہم فرائضی تحریک کی وجہ سے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں جدوجہد کی بدولت اس وقت جو جوش پیدا ہو گیا تھا، اس نے اس وقت اور مابعد کے دور میں ایک عظیم اور ملک گیر وہابی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

اصولی حیثیت سے فرائضی تحریک کے متبعین اگرچہ وہابی تحریک میں کلی طور پر شریک نہ تھے تاہم وہ ان کی جماعت سے منسلک ضرور تھے۔ فرائضی اور وہابی جماعتوں کے مقاصد ایک ہی تھے۔ مذہبی اصلاح اور قدیم خالص اسلام کا احیائے ثانیہ۔ ان میں جو فرق نظر آتا ہے وہ صرف طریقۂ عمل کا ہے۔ وہابی حصولِ مقاصد کے لئے جان و دل سے جنگ کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جہاد جس طرح ایک جانب اصلاحِ نفس کرتا ہے، اسی طرح تمام غیر حق سے جنگ

کے لئے نفس کو دائمی بیداری بھی بخشتا ہے۔ جہاد یا مذہبی جنگ کے معاملے میں وہابی ہر وقت جان دینے اور قربانیاں برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے وہ اس معاملے میں اٹل تھے۔ تمام عمر جہاد میں مشغول رہنے اور اس کے واسطے بوقت ضرورت ہجرت کے لئے بھی آمادہ رہا کرتے تھے۔ جہاد کے معاملے میں وہابیوں کو ایک گونہ ترقی پسند فرائضی جماعت کا مثیل کہا جاسکتا ہے، ورنہ برصغیر کے اسلام کی اصلاح اور شرک و بدعات سے اسے پاک کرنے کے مقاصد میں فرائضی اور وہابی دونوں ہی ہم رائے تھے۔

برصغیر میں مذہبی اصلاح کی جدوجہد کی بنیاد مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے ڈالی۔ امام غزالی کی طرح فلسفیانہ بنیادوں پر انہوں نے اسلام کی تشریح کی۔ پھر شاہ ولی اللہ کے اصول کی تبلیغ ان کے بھتیجے شاہ عبدالعزیز نے کی۔ ایک آزاد ملک میں آزاد اسلام کے قیام کے لئے دل میں اتھاہ سوزش حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندانی مرید حضرت سید احمد بریلوی نے محسوس کی۔ وہ ۲۴ راکتوبر ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اصول پروری میں گہرائی کے مالک تھے اور روحانی زندگی کی دنیاوی زندگی پر اثراندازی کا سید احمد کو بہت بڑا اعتقاد تھا۔ ان معاملات میں وہ اپنے مقامی اور عربی اساتذہ سے بھی آگے بڑھ گئے۔ اصول کو واقعی شکل میں لانے کے رام کرشن پرم ہنس کے لئے جو حیثیت ببکانند کی تھی وہی حیثیت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے نزدیک سید احمد صاحب کی تھی۔ سید احمد کی اصول پروری کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت پرورانہ تیز ذہانت، بیدار اور حساس دل، غیر معمولی قوت عمل، ناقابل شکست جذبہ اور بے نہایت حوصلہ بھی ان کے ہم رکاب تھا۔

پنجاب اس زمانے میں سکھوں کے زیر حکومت تھا۔ سکھوں کے راجا رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کو نماز، اذان اور قربانی وغیرہ مذہبی حقوق سے جبراً روک دیا تھا۔ ان اسباب کی بنا پر سید احمد نے ۱۸۲۶ء سے ۱۸۲۷ء تک سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دو قریبی عزیز مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحئیؒ نے سید احمد کے آخری ایام حیات تک ان کے اصول کی تبلیغ کے لئے ملک کا سفر کیا۔ برصغیر اور افغانستان کے مسلمانوں نے اس وقت استحکام دین اور قیام صداقت کے پیش نظر سید احمد کو اپنا امام تسلیم کر لیا۔ صوبۂ سرحد میں انہوں نے ایک آزاد حکومت کی بنیاد رکھی اور پنجاب کے راجا رنجیت سنگھ کے ساتھ بہت سی لڑائیاں کیں۔ آخر مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کی جنگ میں خود انہوں نے اور ان کے عقیدت مند شاگرد مولانا اسمٰعیل اور دوسرے بہت سے رفقاء نے شہادت پائی۔

سید احمد کی زندگی میں وہابی تحریک نے انگریزوں کے خلاف صف آرائی نہیں کی۔ آزاد ملک میں آزاد اسلام اگرچہ سید احمد شہید کا خواب تھا، لیکن بیک وقت سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ جنگ کے لئے وہ تیار نہ ہوئے۔ اس سے ان کی حقیقت پسندی اور دور بینی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد سید احمد کے پیرو اور متبع مسلمانوں نے انگریزوں کے ساتھ بھی معاندانہ کارروائیاں شروع کیں اور ان کی اس تحریک میں انگریزوں سے مخالفت کا مظاہرہ، ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ جنگ آزادی کے بعد بھی دس سال تک باقی رہا۔

وہابی تحریک درحقیقت کسی قدر منظم اور دیرپا تحریک تھی۔ اس کی تاریخ بہت حیرت انگیز ہے۔ اس انقلاب میں میدان جنگ صوبہ سرحد او ستانہ تبلیغ اور عمل کا مرکز صوبہ بہار میں پٹنہ اور سامان، سرمایہ اور مجاہدین کی تیاری کا مرکز بنگال تھا۔ ڈھاکا، میمن سنگھ، باقر گنج، فرید پور، نواکھالی، ندیا، چوبیس پرگنہ، پبنا، بوگرا اور راجشاہی وغیرہ بنگال کے اضلاع نے ایک طویل زمانے تک نامحدود دولت اور ہزاروں رضاکار امدادی طور پر بھیج کر انگریزوں کی مخالفت میں ایک مثال قائم کی تھی۔

بنگال تجدید پسند ملک ہے، اور بنگالی اس قدر جذباتی قوم کے افراد ہیں کہ ایک مرتبہ ان پر جو نشہ چڑھ جاتا ہے اُسی نشے میں وہ پروانہ وار اپنے شمع تخیل پر نثار ہوتے رہتے ہیں۔ ورنہ پچاس سال سے بھی زیادہ مدت تک بنگال کے غریب اور کم علم کسان اور مقہور و مغلوب تحتانی طبقے کے دیہاتی کو اس تحریک میں جوق در جوق والہانہ طور پر شریک ہوتے ہوئے نہ دیکھا جاتا۔ بنگالی مسلمانوں کا مذہبی جوش کس قدر تیز اور تموج خیز ہے اس کا مریحی ثبوت وہابی تحریک کی تاریخ سے ملتا ہے۔ ولیم ہنٹر صاحب کی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے صفحہ ۱۰۱ پر ایک تعجب خیز تشریح ملتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "مشرقی بنگال کے تقریباً ہر ہر ضلع سے وہابیت کے مبلغین نے بیس سال سے کم عمر کے بھولے بھالے نوجوانوں کو اکثر ان کے والدین کی لاعلمی میں یقینی موت کے راستے کی طرف دھکیل دیا۔ لاکھوں غریب کسان خاندان میں اس تحریک نے دائمی غربت اور مستقل غم پیدا کر دیا۔ مستقبل کی

تمناؤں کے مرکز یعنی نوجوانوں کے متعلق ان کے اہل خاندان کے دلوں میں ایک مستقل فکر پیدا ہوگئی جیسی وہابی باپ کا لڑکا ذرا ہوشمند یا پرجوش اور مذہبی ہوتا، اس کے متعلق اس کے والدین قطعی قائل تھے کہ وہ کب اس گاؤں سے لاپتہ ہو جائے گا۔ اس طرح جن نوجوانوں کو ان کے گھروں سے لاپتہ کیا گیا تھا، ان میں سے اکثر بیچارے بھوک اور تلوار کے زخموں سے برباد ہوئے"۔

اگرچہ برصغیر میں اسلام سے شرک و بدعت کو دور کر کے خالص اسلام کا قیام ہی اس تحریک کا ابتدائی مقصد تھا لیکن وقت اور حالات کی تبدیلی سے اس انقلابی تحریک نے کچھ ایسی مذہبی، سماجی اور سیاسی صورت اختیار کر لی کہ اس وہابی تحریک کے متبعین ہی نے انگریزوں کے ساتھ موت و حیات کی جنگ شروع کر دی۔ انہوں نے ہی انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کا علم بلند کیا۔ لوگوں کو بیرونی اثرات سے بچانے کے لئے انگریزی تعلیم سے باز رکھا اور انگریز نیل کے کارخانہ داروں کے خلاف نیل کی کاشت کرنے والوں کو دادنی کی رقم تک نہ لینے دی۔ وہابی کسانوں نے نیل کے زمینداروں کا کام بند کر کے خودکشانہ مفلسی کی مصیبت اختیار کر لی اور موت کو بازیچۂ اطفال سمجھا۔ اس انقلاب کی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی، لیکن یہ بات صحیح ہے کہ بیسویں صدی کی مغربی روشنی حاصل کرنے والے لوگوں کے ذریعہ سے جو تحریک عدم تعاون ملک میں چلائی گئی اور تخویف کی پالیسی پر عمل کرنے والوں نے حکمرانوں سے ہار منوالی، وہ اگرچہ علمی دور کی تحریک تھی مگر اس سابق وہابی تحریک کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہابیوں کی اخلاقی جرأت اور مذہبی جنگ کے نام پر اپنی زندگی قربان کرنیکا عزم صمیم، سچائی، سردی و گرمی اور خورد و نوش کے تقاضوں پر فتحیابی اور بنگال سے صوبہ مغربی شمالی سرحد تک کی طویل ہزاروں میل کی مسافت کو پیادہ پا رہ کر بھی مدت دراز تک طے کرتے رہنے کے لئے جس جانبازی، قربانی اور ہمت کی ضرورت ہے، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اپنی قوم، سماج اور تہذیب، نیز مذہب کو بچانے کی خاطر اور ایک دار الحرب میں دار الاسلام قائم کرنے کے لئے ان کی یہ قربانی واقعی بے نظیر ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ذریعہ سے انگریزوں کے خلاف پہلی تحریک آزادی شروع ہوئی اور پروان چڑھی۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمراں عمال کی چند غلطیوں نے اس تحریک کو ہوا دی تھی۔ یہ انقلابی جدوجہد جس طرح وقتی تھی اسی طرح تھوڑے ہی دنوں میں اس کا خاتمہ بھی وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس کی پشت پر کوئی طویل مدت کا منصوبہ اور بہت دنوں کی جدوجہد کارفرما نہ تھی۔ اس تحریک آزادی اور وہابی تحریک میں اگرچہ بلاواسطہ کوئی تعلق نہ تھا، لیکن اس میں حضرت سید احمد شہید کے ہاتھوں سے تیار کئے ہوئے بہت سے مجاہدین شامل ہو گئے تھے اور اس تحریک کے خاتمے کے بعد بھی انگریز حکمرانوں کو آزادی کے شیدائیوں سے تقریباً دس سال تک مقابلہ کرنا پڑا۔ اس تحریک سے ہوشیار اور تجربہ کار ہو کر انگریزی حکومت نے مسلمانوں پر اچھی طرح تیغ ستم کی آزمائش شروع کی۔

تحریک آزادی اور وہابی تحریک کے فوراً ہی بعد شمالی برصغیر میں سرسید احمد نے انگریزوں کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کیا اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل کیا۔ سرسید کی یہ تحریک "علی گڑھ تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ میں اینگلو محمڈن کالج قائم ہوا۔ یہی کالج ترقی پا کر آج علی گڑھ یونیورسٹی کی صورت میں موجود ہے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں سرسید کی تحریک علی گڑھ کالج کی خدمات شمالی و مغربی برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ ترقی میں جس طرح تعجب خیز ہے اسی طرح قابل ذکر بھی ہے۔

انگریزی میں سید امیر علی اور صلاح الدین خدا بخش نے تہذیب اسلامی کی تشریحات کیں اور نواب عبد اللطیف نے اپنی معاونت اور مساعی سے بنگلا زبان کے ذریعہ بنگالی مسلمانوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا۔ پھر بھی بنگال کے مسلمانوں میں چونکہ سرسید احمد جیسے دوراندیش اور فہیم لیڈر پیدا نہ ہوئے، اس لئے انگریزوں اور مسلمانوں کے باہمی ناموافق اور مشکوک تعلقات کی بنا پر حکمراں انگریز اور محکوم مسلمانوں کے تعلقات میں یوماً فیوماً ابتری ہی پیدا ہوتی گئی۔ اس موقع پر انگریزوں نے اپنی تمام تر توجہات اور عنایات کا مرکز یہاں کے ہندوؤں کو بنایا۔ انیسویں صدی کے شروع ہی میں ہندو سماج کی خوش نصیبی سے اسے رام موہن رائے جیسا زیرک، تیز نگاہ اور دور اندیش رہنما مل گیا تھا جس نے اپنی عقل، اپنی ذہانت اور قوت فیصلہ کی مدد سے ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان استوار اور دوستانہ رویہ پیدا کرنے میں بہت مدد دی۔ ان مصالحانہ اور [illegible] تعلقات کی بنا پر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑنے کے باوجود انیسویں صدی کے آخر تک ان دونوں قوموں کے درمیان تعاون اور مصالحت کا اصول ہی کارفرما رہا۔ بیسویں صدی کی ابتداء یعنی ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کو رد کرنے کے لئے ہندوؤں نے جو تحریک چلائی اسی میں ان کی انگریزوں سے علانیہ مخالفت کی بنیاد پڑی۔ ۱۹۱۱ء

میں تقسیم بنگال کے خلاف تردیدی اعلان اگرچہ شائع ہو گیا تھا، لیکن آزادی ملک کے لئے اس وقت سے ہندوؤں نے جس تحریک کی ابتدا کی وہ گاندھی جی
کی تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ یہی تحریک بنگال کے نوجوانوں کی تحریک تخویف اور کانگریس کی ۹ اگست والی تحریک
کی صورت میں مختلف روپ اختیار کئے ہوئے ۱۹۴۷ء میں دو آزاد حکومتوں کے قیام کی صورت تک میں گوناگوں مشکلیں دکھاتی گئی۔

ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ جو تعاون شروع کیا تھا وہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے تھا مسلمانوں نے وہ تعاون تقریباً ایک صدی کی طویل
مدت کے بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں قیام مسلم لیگ کے بعد شروع کیا، بے بس مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں نے جو غیر منصفانہ رویہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۳۱ء تک
جاری رکھا تھا، اس کی زد سے بچنے کے لئے جب مسلمانوں نے اپنی تنظیم شروع کی اور بار بار نئے قوانین کے اجراء اور خصوصی اصلاحات کے ذریعہ سے
کسی قدر اپنی دلجمعی کی کوشش کی تو ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ پھر مسلمان قوم میں بھی تھوڑی بہت انگریزی تعلیم پھیلنے
کی وجہ سے جب حصول ملازمت میں ہندوؤں کو کسی قدر دشواریاں پیش آنے لگیں تو بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے طریقۂ فکر اور جنگ آزادی کے لئے
انداز جدوجہد نے مختلف راستے اختیار کئے۔ آخر کار مسلم لیگ اور قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ہندوؤں کے آزاد بھارت کے بالمقابل مسلمانوں
نے بھی آزاد پاکستان حاصل کیا۔

انگریزوں نے ملک کو فتح کر کے وہاں کا نظام حکومت جس طرح آہستہ آہستہ مستحکم کیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے اقتدار کو پائدار بنانے کے لئے
اس ملک میں مختلف عنوانوں سے یہاں کے تہذیب اور تمدن پر فتح حاصل کرنے یا ثقافتی غلبہ کے لئے بھی مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اولاً یہاں کے
باشندوں کو انگریزی زبان سکھائی۔ ثانیاً انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے عیسائی مشنریوں کی مدد سے یہاں کے لوگوں کو عیسائیوں کی طرف مائل کرنا شروع کیا۔
عیسائیت کا مقابلہ کرنے کی غرض سے انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں راجہ رام موہن رائے کی کوششوں سے برہمو دھرم کی بنیاد پڑی۔ مذکورہ صدی کے وسط میں
کیشب چندر کا نیوبی دھان اور رام کرشن پرم ہنس کے ذریعہ مذہب کی نئی تشریحات نیز بی بیکانند کے ذریعہ ہندومت کی تبلیغ کا اجراء ہوا۔ عیسائیت
کی کشش نے جس قدر ہندوؤں کو انیسویں صدی میں محو حیرت بنا دیا تھا اور جس طرح انہوں نے اس مذہب کو لبیک کہا تھا، اسی طرح کا جواب اس کو مسلمانوں
کی طرف سے نہیں ملا۔ اس کے اسباب ہمیں بنگال فرائضی اور وہابی تحریکات کی تاریخ ہی میں ملیں گے۔ لیکن اس تحریک کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں
بالخصوص مغربی بنگال کے مسلمانوں میں عیسائی ہونے کی طرف ایک خاص میلان پایا گیا۔ اس مصیبت سے اس زمانے میں بنگال کے مسلمانوں کو
منشی مہر اللہ نے بچایا تھا۔ انیسویں صدی کے چند آخری عشرے اور بیسویں صدی کی ابتداء میں وہ مسلمان بنگالیوں کے لئے رام موہن ہی جیسے مذہبی
رہنما ثابت ہوئے۔ اس کم تعلیم یافتہ مگر بزرگ انسان نے اس زمانے میں بنگال کے ایک ایک دیہات میں مسلمانوں کو باخبر اور ہوشیار کرنے کے لئے جس مذہبی
وعظ اور جن قومی جذبات کا طوفان کھڑا کیا تھا اس کی قدر و قیمت آج بھی متعین نہ ہو سکی۔ انہی کی صحبت میں آ کر اس زمانے کے پادری ضمیر الدین نے مذہب
اسلام قبول کیا اور ان کا نام منشی ضمیر الدین رکھا گیا۔ منشی ضمیر الدین نے انہی کے شاگرد کی حیثیت سے تبلیغ اسلام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس
ایثار پسند جوان اور زبردست مقرر منشی مہر اللہ نے قومی احساس پیدا کرنے اور اسلام کا اپنا نقش بٹھانے نیز اسلامی پیغام کے حامل ادب کی خدمت کیلئے
مسلمانوں کو ابھارا تھا۔ میر مشرف حسین اگرچہ مہر اللہ سے کسی قدر سابق العہد تھے لیکن انہیں ہم عصر کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بھی ادب اور آرٹ
کے نظریات کی رو سے مسلمانوں کی روایات اور مذہبی موضوعات پر اپنے ادب کی بنیاد رکھی۔ یہ سچ ہے کہ میر مشرف حسین نے منشی مہر اللہ کے ذہنی
اصلاح کرنے والے ادب کے معیار پر ادبی خدمت نہ کی۔ اس کے لئے کیقباد، شیخ عبدالرحیم، ریاض الدین احمد اور مزمل حق وغیرہ ادیبوں کی ضرورت
لاحق ہوئی تھی۔ انہوں نے اسلامی ادب کا جو نہ بجھنے والا چراغ روشن کیا تھا وہی بنگالی مسلمانوں کے لئے پاکستان کے دور کا خالص نئی ادب
بن کر آج بھی ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔

تہذیبی تصادم اور اسلامی نشاۃ الثانیہ

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

انیسویں صدی کے ساتھ اس برصغیر میں ایک نیا دور طلوع ہوا جب کہ اقوام مغرب کی آمد سے نئے حالات رونما ہوئے اور ان کی تہذیب و تمدن کے زیر اثر گوناگوں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ یوں تو مغربی قوموں سے میل جول اور ان کے اثرات کا سلسلہ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط ہی سے شروع ہو چکا تھا، لیکن بھرپور اثر دو سو سال بعد طاری ہوا جب کہ انگریزوں نے تمام حریفوں کو شکست دے کر سارے ملک پر اقتدار قائم کر لیا۔

ان دو تہذیبوں کے تصادم سے، جو ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھیں اور جن کے تصورات اور اقدار ایک دوسرے کی ضد تھیں، ایک نئی تشکیل کی ضرورت پیدا ہوئی جو زندگی کے کم و بیش ہر پہلو کو محیط ہو، چنانچہ نئے حالات کے تحت جو انقلاب عظیم رونما ہوا اور مذہبی و معاشرتی اصلاح، صنعتی انقلاب، ملت پرستی، سیاسی تغیر و تبدل، مقامی زبان و ادب کی نشو و نما وغیرہ کو اپنے جلو میں لئے ہوئے تھا، بجا طور پر نشاۃ الثانیہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تحریک اس قدر وسیع ہے اور اس قدر گہری اہمیت رکھتی ہے کہ جس مغربی تحریک کے مقابلے میں یہ رونما ہوئی، اس سے کہیں زیادہ وقیع اور مہتم بالشان ہے۔ ہماری کتنی ہی نامور ہستیاں، مفکر، اہل قلم، سیاسی قائد اور معاشرتی و مذہبی رہنما مثلاً سرسید، حالی، اکبر، اقبال وغیرہ اسی تصادم اور اختلاط کی پیداوار ہیں۔

اس دوگونہ عمل کی کیا کیفیت ہے؟ اس کا جواب آسان نہیں۔ اس سلسلہ میں ان عوامل کا جائزہ لازم ہے جن سے یہ اثرات طاری ہوئے۔ ان میں سب سے پہلے عیسائی مشن قابل ذکر ہیں کیونکہ انھوں نے برصغیر کی تمام قوموں کے بہت ہی نازک پہلو یعنی مذہبی احساسات کو چھیڑا جس سے ان میں غیر معمولی اضطراب اور ہلچل پیدا ہونا لازم تھی۔ اس کے نتائج دوررس ہوتے ہوئے سیاسی اثرات کو بھی جلو میں لئے ہوئے تھے۔ ایسی تبلیغی سرگرمیاں بالعموم بڑے بڑے انقلابات کا پیش خیمہ ہوتی ہیں، چنانچہ برصغیر میں بھی ان سے کچھ کم نتائج رونما نہیں ہوئے۔ پہلا عیسائی مشن سرامپور میں ولیم کیرے اور اس کے رفقائے کار وارڈ اور مارشمین کی سربراہی میں قائم ہوا۔ ان کے کے بعد ایک تنقل پرست ڈیوڈ ہیر نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور ایک ادارہ قائم کیا جو بعد میں پریذیڈنسی کالج کہلایا۔ اس کا مدعا روشن خیالی پھیلانا تھا۔ اس سال لارڈ ولزلی نے انگریز سول افسروں کی تربیت کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ انگریزی حکومت پہلے تو کوئی نظام تعلیم جاری کرنے کے خلاف تھی، کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ جوں جوں لوگوں میں ذہنی بیداری پیدا ہوگی، انہیں اپنی طاقت اور حقوق کا احساس ہوگا۔ بعض اس رائے سے اختلاف رکھتے تھے، چنانچہ چارلس گرانٹ نے اس پالیسی میں تبدیلی کے لئے ۱۷۹۲ء میں ایک تحریک جاری کی۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا واحد مدعا یہ تھا کہ ہندوؤں میں تعلیم پھیلا کر ان کو عیسائیت کی طرف راغب کیا جائے۔ گرانٹ کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۸۱۳ء میں تبلیغی جماعتوں کو برصغیر میں جانے کی عام اجازت مل گئی۔ چنانچہ عیسائیوں کی بے شمار تبلیغی جماعتیں جوق در جوق آنے لگیں اور سارے ملک میں ان کے مراکز قائم ہوگئے، جن میں الہ آباد، مرزا پور، بریلی، لکھنؤ، آگرہ، دہلی اور لدھیانہ کے مراکز خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ بے شمار اسکول، بورڈنگ ہاؤس، دار الیتامیٰ، پناہ گاہیں، رہائش گاہیں اور شفاخانے بھی قائم ہوئے۔ پریس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ سینکڑوں کتابیں اور رسالے شائع کئے گئے اور بعض اوقات مفت تقسیم کئے گئے۔ عوام کے ساتھ میل جول بڑھانے کی حوصلہ افزائی کی گئی اور نسوانی مبلغوں کے ذریعہ مستورات میں تبلیغ کا بندوبست کیا گیا۔ اس طرح سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو مسیحی مبلغوں کی سرگرمیوں سے متاثر نہ ہوا ہو۔ صرف چرچ آف انگلینڈ ہی نے ۲۰ مدرسے کھولے اور ۱۸۲۰ء میں کلکتہ میں بشپس کالج قائم کیا گیا جس کا چندہ انگلستان میں فراہم کیا گیا۔ ۱۸۲۷ء میں مشہور دہلی کالج قائم ہوا جو مسلمانوں پر براہ راست اثر انداز ہونے والا پہلا تعلیمی ادارہ تھا۔

اب تک تعلیم مشرقی السنہ ہی کے ذریعہ ہوتی تھی اور انگریزی کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۸۲۹ء میں الگزنڈر ڈف نے ایک انگلش سکول کھولا، کیونکہ اس کی رائے میں ہندوؤں پر مغربی تہذیب کا اثر ڈالنے کے لئے اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہ تھا۔ اتنے میں انگریزی سلطنت بھی وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی اور جنگ و جدل کا سلسلہ بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے زیادہ توجہ سیاسی معاملات، نظم و نسق اور قیام امن پر صرف ہونے لگی۔ لارڈ بنٹنک اپنے اصلاحی ذوق و شوق

کے لئے مشہور ہیں۔ انھوں نے سب سے زیادہ تعلیم پر توجہ دی، جو اب سب سے اہم اور مقدم سیاسی مسئلہ بن چکی تھی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں تعلیم کا فروغ اور پریس کی سرگرمیاں عوام میں بیداری نہ پیدا کردیں اور اس طرح انگریزوں کا احترام کم ہو جانے۔ چنانچہ انھوں نے لارڈ منٹلے کے زیر صدارت تعلیمات عامہ کی کمیٹی قائم کی تاکہ وہ اس معاملے پر غور و خوض کرے۔ اس وقت میدان مستشرقین یعنی مشرقی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دینے والوں اور "انگلیسائی" دبستان کے مابین تھا۔ آخر الذکر دبستان کے حامی لوگوں کو تعلیم سے "انگریز نما" بنانے کے قائل تھے اور اس طرح تعلیم و تدریس کے ذریعہ عوام میں نفوذ پیدا کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اس طرح یہاں کے لوگ خود بخود مقامی زبانوں میں تعلیم پانے کے بجائے مغربی علوم و فنون کو ترجیح دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی زبان اور جدید علوم کا مطالعہ ملکیوں کو اول درجہ کے انگریز بنا دے گا اور ایک ایسا طبقہ پیدا کرے گا جو رنگ و خون میں ملکی مگر مذاق، ذہنیت، اخلاق، طور و طریق وغیرہ میں انگریز ہوگا۔ مدعا یہ تھا کہ ملک کو انگلستانی بنالیا جائے، جس طرح رومانے گال (فرانس) اور آئبیریا (یونان و روم) کو لاطینی بنالیا تھا۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ یہ طرز عمل حکومت کی نفوذ و غلبہ کی پالیسی کا سب سے مفید ذریعہ ہوگا۔

لارڈ بنٹنک نے اس رائے کی تائید کی، چنانچہ حکومت کا مسلک یہ قرار پایا کہ سارا ملک ایک بڑی قلمرو کا جزو ہو جس پر سورج کبھی غروب نہ ہو۔ اس طرح باشندوں کو مغربی بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جان و دل سے وفاقیۂ برطانیہ (PAX BRITANNICA) میں شریک ہو جائیں گے۔ جب وہ ایک دفعہ مغربی تصورات اور نصب العین کو سمجھ جائیں گے تو برطانوی حکومت کے بے اندازہ فوائد کو خود بخود محسوس کرلیں گے۔

لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۲۴ء میں اعلان کیا کہ انگریزی جاننے والے امیدواروں کو سرکاری ملازمتوں میں ترجیح دی جائے گی۔ اس اقتصادی ترغیب نے انگریزی پڑھنے کو ایک عملی صورت بنا دیا۔

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ حکومت کی تعلیمی پالیسی نفسیات کی اصلاح میں ذوجہت (AMBIVALENT) تھی۔ ایک طرف اس کا مقصد رعیت کے دل و دماغ کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا، خاص طور و طریق کا مطیع کرنا تھا اور دوسری طرف روایات اور رسم و رواج کے ٹھکرا دینے والے اثرات سے بچانا تھا تاکہ وہ ایسے نمایاں اوصاف پیدا کریں جن سے ان کی شخصیت نمو پذیر ہو۔

تصادم اور نشاۃ الثانیہ کے دوگونہ عمل میں پریس نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ اس کی بدولت جس طرح برصغیر میں بیداری پیدا ہوئی، اس کی بناء پر اس کو یہاں کی تاریخ میں ایک سنگ میل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے مغربی تہذیب کی نشر و اشاعت کو زبردست تقویت پہونچی۔ ۱۸۲۴ء میں اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ اس کے ساتھ ہی اندرون ملک بھی صحافت کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلا خالص اردو اخبار مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا جو ۵۷ء تک برابر شائع ہوتا رہا اور اس نے ملکی معاملات میں نمایاں حصہ لیا۔ اس شہر سے ۱۸۳۷ء میں سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد نے "سید الاخبار" جاری کیا۔ رفتہ رفتہ شمالی برصغیر میں اور بھی کئی اخبارات جاری ہوگئے۔ ملکی خبروں اور واقعات کو منظر عام پر لانے کے علاوہ ان اخبارات میں ملکی مسائل اور سیاسیات پر بھی نقد و نظر سے کام لیا جاتا تھا جس سے رائے عامہ کی تشکیل اور فکری پختگی ہوتی تھی اور ان کی بناء پر تحریکیں جاری ہوتی اور پروان چڑھتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ پریس اپنا کام کر رہا تھا اور جمہور کے دل و دماغ میں پیرِ تسمہ پا سے آزاد ہونے کا جذبہ پرورش پا رہا تھا۔

جب دو تہذیبیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں اس طرح آپس میں ملتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے پر گہرا اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکیں تو ایک طرف ثقافتی تصادم اور دوسری طرف امتزاج لازم ہو جاتا ہے جس سے رفتہ رفتہ ایک نئی مخلوط صورت رونما ہوتی ہے۔ یہ ترکیب و آمیزش تمام تر اس امر پر موقوف ہوتی ہے کہ جو تہذیب دوسری تہذیب کا تختۂ مشق بن رہی ہو وہ [illegible] سیاسی غلبہ سے آزاد ہے یا نہیں اور اپنے تمدنی ارتقاء پر کس قدر اختیار رکھتی ہے۔ یہاں بھی ایک مضبوط حکومت یا عمدہ قیادت کی موجودگی یا فقدان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں تک ملی شعور کا تعلق ہے بیرونی تہذیب و تمدن کی مخالفت بالکل قدرتی ہے۔ مگر جب وہ تہذیب جو دوسری تہذیب کا تختۂ مشق ہو اس کے مقابلہ کی صلاحیت نہ رکھتی ہو اور اس کے طوفانی حملے کی تاب لانے سے معذور ہو یا پھر یہ محسوس کرتی ہو کہ وہ اس سے ادنیٰ ہے یا فرسودہ ہو چکی ہے اور نئے زیادہ پیچیدہ حالات کا سامنا نہیں کرسکتی تو وہ بے بس ہو کر نئی تہذیب کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے یا شعوری طور پر آزادی کے ساتھ اپنے سماجی اور سیاسی اداروں کو نئے [illegible] نئے طور و طریق اور نئی قدروں سے بدل دیتی ہے تاکہ وہ سیاسی زیر دستی اور محکومیت کے شدید تر خطرے سے بچ جائے۔ نئی تہذیب کے قبول و رد کے سلسلہ میں یہ دیکھنا بھی لازم ہے کہ زبردست تہذیب لچک دار ہے یا جامد اور اس لئے بآسانی تغیر و تبدل کو قبول کرسکتی ہے یا نہیں۔

ان حالات میں تہذیبی قبول اثر دو نمایاں اقسام پر مشتمل ہوتا ہے۔ "مرکزی ضبط" جس کی مثال جاپان اور ترکی ہے کیونکہ یہاں نئی تہذیب کو ایک طاقتور حکمران جماعت نے بڑی تیزی کیساتھ مسلط کر دیا ہے۔ منتشر قسم کا اخذ و نفوذ جس کی مثال چین ہے۔ اس صورت میں نئی ثقافتی شیرازہ بندی یا تو دیر تک اثر پذیر رہ کر غیر شعوری ردوبدل کی شکل اختیار کر لیتی ہے یا کسی ملی قاید کے زیر ہدایت دانستہ اصلاح اور تجدید کا روپ دھارتی ہے اور یہ اصلاح اور تجدید معاشرہ کو سنجیدگی سے ترغیب دلانے اور تعلیم و تربیت سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ یہ عمل بلاشبہ سست اور تدریجی ہوتا ہے، بعض اوقات کافی رائیگاں بھی جاتا ہے۔ اور اس میں نظم و ضبط نہیں ہوتا تاہم پھر بھی اس میں اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ بالکل قوم کی اپنی رضا و منشا سے ہوتے ہوئے ترقی کے مراحل طے کرتا ہے۔ اور اس سے کوئی ہولناک نتائج رونما نہیں ہوتے۔

اس برصغیر کا معاملہ کچھ اور ہی قسم کا تھا۔ یہ سب سے پہلے مغربی اثرات سے دوچار ہوا۔ یہ نہ صرف سیاسی حیثیت سے حملہ آور تمدن کے زیر نگیں تھا بلکہ اس میں کتنی ہی قسم کی تہذیبیں اور نظام گڈمڈ ہو گئے تھے، جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تہذیبیں اور تمدن سب سے نمایاں تھے۔ مسلمان جو اٹھارویں صدی عیسوی میں سیاسی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے انحطاط پذیر تھے، نئی تہذیب کے اثر انداز ہوتے ہی دفعتاً ۱۹ویں صدی کے اوائل میں خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور انہیں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ کس قدر خطرناک صورت حالات سے دوچار ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حملہ آور تہذیب کی شدید مزاحمت کی۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے وہ تو پہلے ہی ایک ہزار سال سے محکوم چلے آتے تھے۔ اس لئے اس وقت ان کے سامنے صرف اقتصادی اغراض ہی تھیں اور بس۔ انہیں اتنا ہی فیصلہ کرنا تھا کہ وہ دو اجنبی تہذیبوں میں کس کو ترجیح دیں۔ اس لئے انہوں نے فوراً بڑی خوشی سے نئی تہذیب کو لبیک کہی اور اس کو بصد شوق قبول کر لیا۔ اگرچہ قدیم روایات ان کے بھی آڑے آئیں اور انہیں نئی تہذیب کو قبول کرنے میں برابر سد راہ رہیں۔ غرض اس برصغیر میں قبول اثر "مرکزی ضبط" اور منتشر نفوذ اور ریشہ دوانی کا تھا۔

بیرونی تسلط نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے ثقافتی قبول و رد پر ایک اور طرح بھی اثر ڈالا۔ اجنبی حکومت نے اپنے اقتدار اعلیٰ کو برقرار رکھنے کے لئے "حکمتِ تدبیرِ نفاق" کے مقولے پر عمل کیا۔ اور سیاسی مقاصد کے پیش نظر مسلمانوں کو ہر طرح گرائے اور ہندوؤں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کو پوری طرح حل کرنے کے لئے مسلمانوں پر تمام دفاتر کے دروازے بند کر دیئے گئے یہاں تک ڈاکٹر ہنٹر کے الفاظ میں "ایک قوم جس کے پیچھے کتنی ہی عظیم روایات تھیں بیروزگار ہو گئی اور اس کے افراد چپراسی دفتری سے بہتر کسی نوکری کی امید نہ کر سکتے تھے"۔ اس طرح ان کے لئے نئی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کوئی اقتصادی ترغیب باقی نہ رہی۔ علاوہ بریں ان کے تعلیمی اداروں کو اوقاف سے محروم کر کے ان اوقاف کو ہندوؤں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا گیا۔ ادھر کیری، گرانٹ اور ڈف جیسے غیر سرکاری افراد کی سرگرمیاں بھی ہندوؤں کی تعلیمی ترقی ہی کے لئے وقف تھیں۔

حکومت کی پالیسی اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ مسلمانوں کو علوم شرقیہ کے رسائل اور کتب خانوں سے بھی محروم کر دیا گیا۔ کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے حکم دیا کہ سامی تمدن سے متعلق تحقیقات پر کچھ صرف نہ کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر روئیر جو ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۲ء تک ایشیاٹک سوسائٹی کے مہتمم رہے اور ان کے بعد تھیوڈور گولڈ سٹیکر اوفرٹ ہال وغیرہ اس پالیسی پر سختی سے کاربند رہے جس کی وجہ سے عربی بالکل نظر انداز ہو گئی۔ ان لوگوں کی سرگرمیاں تمام تر سنسکرت پر مرکوز رہیں اور مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ان کا تمدن خطرے میں ہے، لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ انہوں نے نئے تمدن کی جو مخالفت کی وہ تعصب یا تنگ نظری پر مبنی تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی مزاحمت کچھ گورنمنٹ کی پالیسی اور کچھ اس مذہبی اصلاح اور قومی بیداری کا نتیجہ تھی جو شاہ عبدالعزیزؒ اور دیگر ارباب گرامی کی ان تھک کوششوں اور مساعی جمیلہ نے پیدا کی تھی۔

اس جگہ سیاسی زوال کی دلخراش داستان کو دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ "شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر" کی حقیقت سے ہم پہلے ہی واقف ہیں۔ اس کی انتہا یہ تھی کہ آخر کار انگریز حقیقتاً برصغیر کے مالک بن گئے اگرچہ انہوں نے خود کو عرفاً یا علانیہ مالک قرار دینا قرینِ مصلحت نہ سمجھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے اس سلسلہ میں جلد بازی کی اور حاکم اعلیٰ ہونے کا اعلان کر دیا تو مسلمان فوراً علم بغاوت بلند کر دیں گے کیونکہ یہ ان کا دینی فرض ہے کہ وہ کفار کے خلاف جہاد کریں۔ بنابریں انگریزوں نے غیر محسوس طور پر اسلامی ملک کو ملک غیر بنانے کی پالیسی پر عمل کیا۔

بعض ارباب بصیرت نے یہ حقیقت بھانپ لی تھی۔ ان میں سب سے اہم مشہور محدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا خاندان تھا۔ شاہ ولی اللہؒ ایک وسیع المشرب اور روشن خیال مفکر تھے۔ انہوں نے مذہبی جذبات کے جمود اور اسلامی طاقت کے زوال کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی مشہور تصنیف "حجۃ البالغہ" مصنفہ ۱۷۳۵ء کے ذریعہ مسلمانوں کے احیاء اور اصلاح کی زبردست تحریک جاری کی۔ ان کے فرزند شاہ عبدالعزیزؒ متوفی ۱۸۲۴ء، شاہ رفیع الدینؒ ۱۷۴۹ء سے ۱۸۱۰ء اور شاہ عبدالقادرؒ ۱۷۵۳ء سے ۱۸۱۵ء بھی ان کے نقش قدم پر چلے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے "عزت الخفا" لکھی اور ان کے دوسرے دو بھائیوں نے قرآن مجید کے

علیحدہ علیحدہ ترجمے کئے۔ ان کے پُر عقیدت مرید سید عبداللہ نے شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ ۱۸۲۹ء میں ہگلی سے شائع کیا اور اس طرح برصغیر کے مسلمانوں کو قرآن مجید اپنی زبان میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ اسلام میں پھر بیداری کی لہر دوڑنے لگی۔ یہ تحریک جو ترغیب محمدیہ کے نام سے موسوم ہے، انیسویں صدی کے اوائل تک شاہ عبدالعزیزؒ کے زیر قیادت ایک حیات افروز عنصر بن گئی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اُن کے نصب العین کی کامیابی ایک پُرجوش اور آتشیں نہاد قائد پر موقوف ہے، جو مسلمانوں میں از سر نو برقی حرارت پیدا کر دے، انہوں نے ایک پنڈارہ سردار سید احمد بریلویؒ کو اپنا مرید بنا لیا اور تین سال کے رشد و ہدایت کے بعد مبلغ کی حیثیت سے روانہ کیا۔ اُن کے داماد شاہ اسمٰعیلؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے شاہ عبدالحئیؒ دونوں بڑے نامور اور متبحر عالم تھے۔ انہوں نے علی الاعلان سید احمد کو اپنا روحانی مرشد تسلیم کر لیا جو "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے مصداق مسلمانوں کے احیائے ثانیہ پر مامور ہوا ہے۔ اس سے تمام لوگوں کی توجہ سید احمدؒ کی طرف مبذول ہو گئی اور انہوں نے سارے ملک میں تبلیغی مرکز قائم کئے جن کا صدر مقام پٹنہ تھا۔ ساتھ ہی زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام بھی ہوا۔ ۱۸۲۰ء تک یہ تحریک ایسے مضبوط اور منظم طور پر جاری ہو گئی جیسے وہ کوئی باقاعدہ حکومت ہو +

اس مرشد روحانی کی تعلیم بہت سیدھی سادی تھی۔ وہ مسائل میں نہ الجھے اور اپنے آپ کو روزمرہ کے عملی مسائل کے لئے وقف کر دیا، اپنے پیروؤں کو بہتر زندگی بسر کرنے کی تلقین کی اور توحید و رسالت کا درس دے کر توہمات و مزخرفات سے منع کیا جو ہندوؤں کی بدولت اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کی کوشش یہ تھی کہ اسلام میں پھر سے قرون اولیٰ کی سی سادگی پیدا کر دیں +

۱۸۲۲ء میں سید صاحب مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں وہابی تحریک سے روشناس ہوئے جو اسی قسم کی ایک اصلاحی تحریک تھی اور جسے عبدالوہاب نجدیؒ نے اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں عرب میں جاری کیا تھا تاکہ وہ اسلام کو از سر نو ایک زندہ قوت بنا دے۔ جب سید صاحب اپنے وطن واپس آئے تو ان میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک اور ہی انسان تھے۔ وہ محض تبلیغ سے مطمئن نہ تھے۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے سابقہ جاہ و جلال اور عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کسی بڑے جرأت آمیز اقدام کی ضرورت ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی جدوجہد کو دو راستوں پر لگا دیا، ایک اسلام کی اندرونی اصلاح اور دوسری انگریزوں کے استحصال اور مغربی اثرات کے ازالہ سے مسلمانوں کی سیاسی طاقت کی بحالی۔ چنانچہ انہوں نے مذہبی زندگی میں جوش و خروش اور توانائی پیدا کرنے سے بسم اللہ کی اور اپنی کوششوں سے جن میں ان کے پیرو بھی شریک تھے، مسلمانوں کو بیدار کر کے قومی و سیاسی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالی +

بالآخر شاہ عبدالعزیزؒ اور عبدالحئی نے فتوے دیدئے کہ یہ برصغیر دارالاسلام نہیں بلکہ دارالحرب ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ کفار کو ملک سے باہر نکالے۔ اس سلسلے میں کتنا ہی ادب پیدا ہوا جس نے قومی بیداری کو شدت سے مہمیز دیا۔ ملی جذبات کو ہوا دینے کے لئے مقبول عام نظمیں تحریر کی گئیں تاکہ سامعین میں یہ احساس پیدا ہو کہ ان کا اولین فرض اپنے نصب العین کے لئے جان دے دینا ہے۔ پروگرام کی ایک شق یہ بھی تھی کہ پنجاب کو سکھوں سے نجات دلائی جائے، چنانچہ اس مہم کا آغاز پشاور اور اس کے گرد و پیش کے علاقہ کی تسخیر ہی سے ہوا۔ تیتو میاں نے بنگال میں انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں علم بغاوت بلند کیا +

اس تحریک کا زبردست اثر ہوا۔ اس نے مسلمانوں کو اُس خواب غفلت سے بیدار کر دیا جس میں وہ کھو گئے تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر کے الفاظ میں اس نے برصغیر میں احیائے مذہب کی عظیم ترین تحریکات میں سے ایک کو جنم دیا۔ یہ وہ تحریک ہے جس نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبے کو پچاس سال تک برقرار رکھا اور آج بھی مختلف صورتوں میں بدستور جاری ہے +

اس کے بعد جو تحریک جہاد شروع ہوئی وہ ۱۸۵۷ء کی زبردست جنگ آزادی پر منتج ہوئی، ہانز کوہن کے الفاظ میں درحقیقت حصول آزادی کے لئے قومی جنگ کے سوا اور کچھ دہ تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی مغرب کے تمدنی غلبہ سے بچنے کی آخری سر توڑ کوشش بھی تھی۔

یہ تحریک درحقیقت نشاۃ اولیٰ تھی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے مذہبی، معاشرتی، ذہنی بیداری جس نے اپنی ہی روایات پر پرورش پائی تھی اور اسی کے حیات افروز خون سے پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس تحریک نے بعد کے اصلیت پسند اور زمانہ شناس مصلحان قوم سر سید احمد، حالی، نذیر احمد وغیرہ پر گہرا اور دور رس اثر ڈالا۔ ان لوگوں میں سے اکثر نے اس وقت آنکھ کھولی جب کہ دونوں تہذیبیں زور شور سے متصادم ہو رہی تھیں اور وہابی تحریک ذہین افراد کو

شدت سے متاثر کر رہی تھی۔ یہ ثقافتی تصادم اپنے پورے زور پر تھا جب مولانا حالی میدان میں آئے۔ انہوں نے وہابیت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کی پہلی کتاب اسی کی حمایت میں تحریر کی گئی تھی۔ سرسید خود کو کھلم کھلا وہابی کہتے تھے۔
اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں نے نئے تمدنوں کی جو اس طرح پُر زور مخالفت کی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ تنگ نظر تھے اور نئے علوم اور نئی دانش و حکمت سے روشنی حاصل کرنے کے خلاف تھے۔ کیونکہ شاہ عبدالعزیز نے "جو اس تحریک کا دل و دماغ اور روح رواں تھے" خود فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی پڑھنا اور علوم جدیدہ کی تحصیل اسلامی روح و روایات کے عین مطابق ہے۔ (ترجمہ و تلخیص)

●

برصغیر پاک و ہند کو برطانیہ کا تہذیبی جزو بنانے کی جس حکمتِ عملی پر اس مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہے وہ جنگِ آزادی کا ایک قوی محرک ہونے کی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ملک کے اندیشے بے جا نہ تھے اور انہیں انگریزی زبان اور علوم کو سیکھنے اور مغربی تہذیب کو اپنانے میں جو تامل تھا وہ بڑی معقول وجوہ پر مبنی تھا۔ خود حکمراں طاقت کا مدعا یہ تھا کہ رعایا اپنی انفرادیت کو چھوڑ کر اس کی ہم رنگ اور اسی کی ہیئتِ اجتماعیہ کا جزو بن جائے۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنی ذات کو کسی اور کی ذات میں مدغم کر دے۔ یہ بڑی گہری چال تھی اور ممکن ہے کامیاب ثابت ہوتی اگر ہم کو اس درجہ اپنی خودی اور روایات کا احساس نہ ہوتا، بالخصوص مسلمانوں کو جو اپنے مذہب کے پرستار تھے اور اس کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ یہ ان کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اور انہیں اپنے مذہب، اپنے ماضی، اپنی روایات سے چھڑانے کی کوشش، ایک کھلا چیلنج تھا اور اس کا لازمی نتیجہ ایک شدید ردِ عمل، ایک بغاوت، تہذیبِ مغرب اور اس کے لوازمات۔ زبان، علوم اور خود انگریزوں سے اپنا دامن چھڑانے کی علانیہ شعوری کوشش۔ یہ ایک نہایت اہم نفسیاتی حقیقت تھی جس سے مفر کی کوئی صورت نہ تھی اور اس کا حالات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا ناگزیر تھا۔ بالفاظِ دیگر ان دونوں میں شروع ہی سے ان بن تھی، ان میں شروع ہی سے اک صورت خرابی کی موجود تھی جو آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے ایک آشوبِ عظیم بن گئی۔ سرنگ پہلے ہی بچھی ہوئی تھی اور فلیتہ برابر سلگ رہا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ آگ کب بارود تک پہنچتی ہے اور ایک زبردست دھماکا ہوتا ہے جو تمام ملک کی بنیادیں ہلا دے۔ ۵۷ء تک جو جھڑپیں اور حادثے ہوئے تھے وہ سب اس حادثۂ عظیم کی تمہید تھے۔ یہ حادثہ دراصل دونوں تہذیبوں کا آخری معرکہ آرا تصادم تھا جس سے ایک کی کم از کم ظاہری حیثیت سے کچھ عرصہ تک، بالادستی کا فیصلہ ہوگیا۔ تعجب یہ نہیں کہ ۵۷ء کی جنگِ آزادی بروئے کار آئی، تعجب اس وقت ہوتا اگر یہ جنگ برپا نہ ہوتی۔ ۵۷ء تک ملک و قوم دونوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی ہمہ جہت اور گوناگوں تدابیر انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ استعمار، نصرانیت کا پرچار، جس نے ملک بھر میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، مادیت، علوم جدیدہ وغیرہ وغیرہ اس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اگر ان کو روکا نہ گیا تو یہ واقعی سارے برصغیر پر چھا جائیں گے۔ ۵۷ء کا ہنگامہ اس بے تحاشا اقدام کے خلاف اتنا ہی شدید ردِ عمل تھا۔ ایک تہذیبی ردِ عمل جس نے سیاسی شکل اختیار کی۔ بعد میں یہی ردِ عمل ذہنی و ادبی شکل میں ظاہر ہوا جس کے مظہر اکبر اور اقبال ہیں، اگرچہ یہ ردِ عمل امتزاج کا اچھا خاصہ عنصر بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ (مدیر)

شہزادہ فیروز شاہ

(انقلاب ۱۸۵۷ء کا ایک جانباز مجاہد)

انتظام اللہ شہابی

شہزادہ کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کے بڑے حصہ پر صاحب اقتدار تھی۔ یہاں کی دولت کھنچ کر انگلستان پہنچ چکی تھی، ملک افلاس اور نکبت کے جال میں پھنس چکا تھا۔ جنگِ پلاسی ۱۷۵۷ء سے انگریز مغلیہ حکومت کا جانشین بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ آخرش ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم خود کمپنی کے وظیفہ خوار بن گئے۔ ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی نے وظیفہ سنبھالا۔ حکمرانی ان کی قلعہ تک محدود تھی، ریاستیں ملحق ہوتی جا رہی تھیں۔ پونا، ستارہ کی ضبطی کے بعد جھانسی اور راودھ پر نظر تھی۔ عوام سے روپیہ وصول کرنے کی تدبیریں شروع کر دی گئیں۔ ۱۸۱۴ء میں دفعہ ۱۶ ریگولیشن ایکٹ کی رو سے گورنمنٹ نے ہاؤس ٹیکس کا قاعدہ جاری کیا۔ بریلی روہیلوں کی بستی تھی، اس ظلم سے ہنگامہ بپا ہوگیا۔ مولانا مفتی محمد عیوض پہلے فرد تھے جو عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے انگریز کے مقابل صف آرا ہوئے۔ مجاہدین جوق جوق ان کے ساتھ ہو گئے۔ ۱۸۰۶ء میں انگریزی فوج نے مقابلہ کیا جس میں مسٹر لیسٹر بج کا لڑکا مارا گیا، مگر کپتان کننگھم کی فوج مراد آباد سے تازہ دم آگئی۔ مجاہدین ناکام ہو کر منتشر ہو گئے۔ مفتی صاحب ٹونک سدھار گئے۔ پہلی جنگِ آزادی کی تحریک کا یہ پہلا واقعہ ہے۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں محکمہ شرعیہ ختم ہوا، صدر نظامت قائم کیا گیا۔ یہ علمائے کرام کے لئے تازیانہ تھا۔ اسی کے لگ بھگ فریزر کو قتل کر دیا گیا۔ کریم خاں گل شاہ کو پھانسی کر سولی دے دی گئی۔ نماز جنازہ شاہ محمد اسحاق سبط شاہ عبد العزیز دہلوی نے پڑھائی۔ آٹھ ہزار کا مجمع اس کے جنازہ کے ہمراہ تھا۔ دفن کے بعد مزار پر چادریں چڑھنے لگیں۔ اس سلسلہ میں نواب شمس الدین رئیس لوہارو کو بھی پھانسی لگی۔ مسلمان اس واقعہ سے بہت اثر پذیر ہوئے۔ علماء نے اقتدار نصاریٰ کی بنا پر ملک کو دار الحرب قرار دے دیا۔ شاہ اسحاق ۱۲۵۰ھ میں حجاز چلے گئے۔ مولانا یعقوب نے بھی ہجرت کی۔ اکثر علماء حجاز پہنچ گئے۔ مرزا جہانگیر، اکبر شاہ کا چہیتا بیٹا تھا، مگر اس میں صلاحیت نہ تھی کہ وہ انگریز سے دو دو ہاتھ کرتا۔ وہ ان کو موقع بے موقع ذلیل کرتا رہتا تھا، مگر انگریزوں نے اس کو الہ آباد بھجوا دیا، جہاں اس کا انتقال ہوگیا۔

۱۸۳۰ء میں بنگال میں تیتو میاں نے انگریز سے دو دو ہاتھ کئے لیکن وہ شہید ہوگئے۔ بالاکوٹ میں سید احمد بریلی ۱۲۴۶ھ میں شہید ہوئے ورنہ پشاور پر قبضہ کے بعد انگریز سے جنگ کرنے کو تھے۔ انہوں نے بالاکوٹ سے ہندو راؤ کو دلی خط بھیجا تھا کہ میرے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ اکبر شاہ ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۷ء میں انتقال کر گئے۔ ابو ظفر بہادر شاہ جانشیں ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد عمال کمپنی نے ان کے آداب شاہی ختم کر دیے حتیٰ کہ ان کا دربار بھی بند کر دیا گیا۔ اب انگریز یہ چاہ رہا تھا کہ بہادر شاہ کا نشان راہ سے ہٹا دیا جائے۔ دارا بخت ولیعہد تھے۔ ان کے مرنے پر مرزا فخر الدین فتح الملک ولیعہد مقرر ہوئے۔ یہ بھی ہیضہ سے فوت ہوگئے۔ بادشاہ اور نواب زینت محل نے مرزا جواں بخت کو ولیعہد بنانے کے لئے انگریزوں کو درخواست دی۔ انہوں نے مرزا قویش ابن بہادر شاہ کے پندرہ ہزار روپیہ ماہوار اور قلعہ چھوڑنے پر سودا کر لیا۔ بادشاہ کو اس واقعہ کا بڑا صدمہ ہوا اور دل میں انگریز سے نفرت کرنے لگا۔ پیری مریدی شروع کر دی۔ فوجیوں کو مرید کرنے لگا۔ انگریز مزاحم ہوا، بادشاہ گاہے گاہے مشاعرہ کر کے دربار کی یاد تازہ کر لیا کرتے۔ اس زمانہ میں مولوی احمد اللہ شاہ، جو نواب چینا پٹن کے صاحبزادے تھے، ترکِ امارت کر کے گوالیار آئے۔ محراب شاہ قلندر کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور ملک سے نصرانیوں کو بے دخل کرنے کی ٹھانی، دہلی پہنچے، بادشاہ سے نہ مل سکے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ کا خط لے کر ۱۸۴۶ء میں آگرہ آئے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر سابق مفتی محکمہ شرعیہ دہلی کے یہاں مقیم ہوئے جو سرکاری وکیل تھے۔ صدر نظامت سے منسلک یوپی کے بڑے بڑے علماء تھے۔ مفتی صاحب کا گھرانہ بزرگوں کا مرکز تھا۔ یہیں مجلس علماء کی تشکیل کی گئی۔ مولانا غلام امام شہید، مولانا غلام جیلانی، مولوی طفیل احمد خیرآبادی، مولانا محمد قاسم دانا پوری،

مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ اس کے ارکان بنے۔ شاہ صاحب نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور آگرہ کے قرب و جوار میں تبلیغی دورہ کیا۔ ہزار ہا مسلمان مرید ہوگئے، ہندو بھی معتقد تھے۔ بہادر شاہ کو بھی انگریز سے گلو خلاصی کی فکر پڑ گئی۔ چنانچہ مرزا حیدر حسین کے ذریعہ شاہ ایران سے تعلقات کرنے چاہے اور قنبر حبشی کے ہاتھوں سلطان روم کو خط بھیجا۔ یہ کام قلعہ میں اس قدر خفیہ ہو رہا تھا کہ احسن اللہ خاں لاعلم رہے۔ آخری پیشوا باجی راؤ کے متبنّٰی نانا راؤ کی پنشن ضبط کر لی گئی۔ اس کی بحالی کے لئے نانا نے اپنے کامدار مولوی عظیم اللہ خاں کو انگلستان بھیجا جو انگریزی کے بڑے عالم تھے۔ پانچ لاکھ روپیہ صرف کرکے وہ کانپور لوٹ آئے۔ فرانس اور روس کے لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ انگریز کو ملک سے نکال باہر کرو، ہم امداد دیں گے۔ چنانچہ بٹھور میں نانا راؤ مرہٹہ سردار تانتیا توپے، مینا بائی، عظیم اللہ خاں اور مولوی عبد اللہ صدر الصدور کانپور، مسٹر گریسی روسی معروف بہ "عبد اللہ" مشورہ میں شریک کئے گئے اور انگریز کے نکالنے کی تدبیر سوچی گئی۔ ۱۸۵۶ء میں عمال کمپنی نے ناکردہ گناہ واجد علیشاہ کو معزول کرکے کلکتہ بھیجا اور اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑا۔ پادری یورپ سے آکر اسلام کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ آگرہ میں پادری فنڈر اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی سے مناظرہ ہوا، پادری بھاگ گیا۔ حکومت کو ذلت کا سامنا ہوا۔ انگریز علماء کا دشمن بن گیا۔ یہ بھی میدانِ عمل میں کود پڑے۔ انفرادی طور سے تمام ملک میں انگریز کے خلاف تیاریاں شروع ہوگئیں۔ گورکھپور میں مولوی سرفراز علی پیر جنرل بخت خاں روہیلہ، الہ آباد میں مولوی لیاقت علی۔ پٹنہ میں مولانا پیر علی، ملتان میں سردار احمد خاں، حیدر آباد سندھ میں مولوی ہوش محمد، فتح پور ہسوہ میں حکمت اللہ خاں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں نصرانیوں سے جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے۔ لکھنؤ کی تمام فوج نکال دی گئی تھی، وہ بھی مخالف ہوگئے۔ ان میں کی دو پلٹنیں بارکپور پہونچیں۔ ان میں محمد شفیع دفعدار تھے۔ انہوں نے چاروں طرف فوجوں کے صوبہ داروں اور دفعداروں کے نام خط لکھے۔ فقرا کی ٹولیاں علیحدہ علیحدہ گشت کرتی انگریز کے خلاف فوج کو ابھارنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بارکپور اور رانی گنج میں ۳۴ رجمنٹ کے سپاہیوں نے بنگلے جلا دیئے۔ ۲۶ فروری ۵۷ء کو ۱۹ رجمنٹ کے فوجیوں نے برہم پور میں بلوہ کیا، بمشکل فرو ہوا۔ چربی کے کارتوس کا اشتعال ایسا حریت نوازوں کے ہاتھ لگا کہ جس نے فوجوں میں آگ سی لگا دی۔ بارکپور میں منگل پانڈے نے کارتوس کے قضیہ میں انگریز افسر کو گولی ماردی اور خود بھی مارا گیا۔ چپاتیوں کی تقسیم راز ہی میں رہی کہ کہاں سے سلسلہ نکلا۔ مولوی احمد اللہ آگرہ سے کانپور آئے۔ عظیم اللہ سے مل کر لکھنؤ پہونچے۔ مولانا فضل حق سے مل کر فیض آباد گئے، وہاں نظر بند ہوگئے۔

محمد صادق نے ایران سے آکر ایک اشتہار دلّی کی جامع مسجد پر لگایا کہ ایرانی فوج ملک کو انگریز سے آزاد کرنے آنے والی ہے۔ یہ مارچ ۵۷ء کے "صادق الاخبار" میں شائع ہوا۔ تمام ملک میں خبر گرم تھی کہ انگریز کو ختم کرنے کی تمام تدبیریں پوری ہو چکی تھیں۔ قلعہ میں بھی ان خبروں میں دلچسپی لی جاتی تھی۔ آخرش میرٹھ میں، ۱۰ مئی ۵۷ء کو فوج نے انگریز کے خلاف بغاوت کر دی اور ملک کے آزاد کرنے کے لئے فوجی اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں کی فوج رسالدار حسن علی بریلوی کی سرکردگی میں دلّی پہونچی۔ بریلی میں نواب خان بہادر خاں نے نوابی سنبھالی۔ نجیب آباد میں جنرل محمود خاں حاکم بنے۔ الہ آباد میں لیاقت علی گورنر ہوئے۔ جنرل بخت خاں بریلی سے دہلی پہنچ گئے اور فوج کی کمان ہاتھ میں لی۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان ابن بہادر شاہ، ابوبکر پوتے سب فوج کے افسر بنائے گئے۔ بادشاہ نے بھی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ غرضکہ سب کے طول و عرض میں میرٹھ کے واقعہ کا بڑا اثر لیا گیا۔ لکھنؤ میں برجیس قدر تخت نشین ہوئے۔ حضرت محل نگراں ہوئیں۔ فیض آباد کی فوج مولوی احمد اللہ شاہ کو لے کر لکھنؤ آگئی۔ نصف حصہ پر قبضہ کیا۔ ان کے حکم احکام جاری ہوگئے۔

کانپور میں نانا راؤ تخت نشین ہوئے۔ فرخ آباد میں نواب حسین خاں نے حکومت سنبھالی۔ نواب ولی داد خاں نے بلند شہر پر قبضہ کیا۔ اس طرح شہزادہ فیروز شاہ جنگ آزادی میں کود پڑے۔

شاہزادہ فیروز شاہ صاحب عالم مرزا ناظم بخت کے خلف ارشد، شاہ ہند شاہ عالم ثانی کے پوتے اور شہنشاہ فرخ سیر کے نواسے تھے۔ مرزا ناظم بخت نے اپنے لخت جگر فیروز شاہ کو علوم مروجہ سے آراستہ کیا اور فنون حرب میں صاحبانِ فن سے طاق کرایا۔ شہزادہ کی طبیعت کا رجحان دینی تعلیم کی طرف زیادہ تھا، اوراد و وظائف میں نوجوانی کاٹی۔ قلعہ میں تمام شاہزادے عیش و عشرت کی بانسری بجا رہے تھے، اُن کا علمی شوق شعر و شاعری تک محدود تھا۔ بہادر شاہ خود شاہِ اقلیم سخن تھے، ہر شہزادہ ذوق و غالب کی شاگردی کا دم بھرتا۔ شاہزادے شاہی مشاعرے کی زینت بنا کرتے تھے، مگر فیروز شاہ اُن سے الگ تھلگ رہے۔ ۱۸۵۶ء میں فریضۂ حج ادا کرنے گئے۔ ۱۸۵۷ء میں اس وقت بمبئی وارد ہوئے جب حریت نوازوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف جنگ آزادی شروع کر دی تھی۔ بمبئی سے اندور آئے، عمال کمپنی کو اُن کی آمد کا

پتہ لگ گیا۔ انہوں نے ان کو گرفتار کرنا چاہا۔ یہ بچ کر گوالیار آگئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرکے فوجیوں کو ہمنوا کیا۔ دھول پور کی ایک تحصیل پر دھاوا بول دیا، ایک لاکھ روپیہ ہاتھ لگا۔ افغانی ملازم رکھے، باضابطہ فوج کی تشکیل کی گئی۔ گوالیار اور دھول پور کے بہت سے مسلمان بہ نیت جہاد اُن کے شریک کار ہوگئے۔ کچھ گوالیار کی فوج بھی آملی تو آگرہ روانہ ہوئے۔ آگرہ میں ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی واقعہ کی اطلاع پہنچ چکی تھی، ۳۰ر مئی کو دو پلٹنیں، جو رجمنٹ نمبر ۴۴۔ ۴۴ سے تعلق رکھتی تھیں، خزانہ کی محافظت کے واسطے متھرا روانہ کی گئی تھیں وہ سیدھی دلّی چل دیں۔ ۱۵ر جون کو گوالیار کنٹنجنٹ انگریز افسروں سے منحرف ہوگئے اور مار دھاڑ شروع کردی۔ ۳ر جولائی کو عوام میں سخت بے دلی پھیلی ہوئی تھی، فوجیوں کے ساتھ ہوگئے، ڈر کر تمام انگریز قلعۂ اکبری میں پناہ گزین ہوگئے۔ نیمچ اور نصیر آباد سے جو فوج آگرہ کے حدود میں پہنچی اُس سے لال خاں میواتی فتح پور سیکری سے مع مجاہدین آکر مل گیا۔ شہزادہ فیروز شاہ بھی اس فوج میں شامل ہوگئے اور فوج کی کمان ہاتھ میں لیکر جنگ کی تیاری کی۔ انگریز فوج اُن کے مقابلہ پر آئی، موضع سوچیتہ نزد کالی ندی پر شاہزادے نے مقابلہ کیا، انگریزی فوج بھاگی اور قلعہ میں جاکر دم لیا۔ لال خاں نے شہر میں داخل ہوکر بنگلے جلا دیئے۔ آگرہ کے کوتوال سعادت علی خاں کی سرکردگی میں اس کے ساتھ ہوگئے، سید اکبر زماں بھی، جن کو کالا پانی ہوا، اس کے شریک تھے۔ غرضکہ لال خاں کے مشورہ سے میوات جانے کی ٹھہری۔ نیمچ کی فوج دلّی روانہ ہوگئی۔ شہزادہ میوات پہنچا، شیخ فضل علی رسالدار اور جنرل عبدالصمد خاں شہزادے کے ہمنوا ہوگئے۔ فرخ آباد کا رخ کیا، نواب تفضل حسین خاں سے ملے۔ انہوں نے خوب خاطر مدارات کی۔ یہاں سے شاہجہاں پور گئے اور ساتھیوں کو ٹھہرا کر لکھنؤ آئے، اپنی عزیزہ سلطان بہو کے یہاں قیام کیا۔ حضرت محل نے تواضع و مدارات میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ کچھ دن بعد ہمراہیوں سے آملے اور بریلی گئے۔ نواب خان بہادر خان نے بے رخی کا برتاؤ اُن سے روا رکھا۔ شہزادہ مرادآباد روانہ ہوگئے۔ مرادآباد میں ۱۴ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے قضیۂ کارتوس کی خبر پہنچی تھی۔ اِن دنوں مسٹر سانڈرس مجسٹریٹ، جے کرفٹ کیمبل جوائنٹ مجسٹریٹ اور جے کرافٹ ولسن جج تھا، ۱۶ر اپریل سے یہاں مقرر تھا۔ اِن سب نے مل کر شہر کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ ۱۹ر مئی کو دس نفوس مجاہدین رام پور سے آگئے۔ مولوی منّو سب کے پیشوا بنے۔ انگریزی فوج نے مجاہدین کو گھیر لیا۔ مولوی منّو نے جام شہادت نوش کیا۔ ۳ر جون کو پلٹن ۲۹، انگریزوں کے مظالم سے تنگ آکر افسروں سے منحرف ہوگئی اور پہلے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کردیا۔ رام پور سے مجاہدین شوق شہادت میں جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ نواب مجدالدین عرف مجّو خاں، جو کہ نواب عظمت اللہ خان فاروقی حاکم مرادآباد کی اولاد سے تھے، نواب عباس علی خاں نبیرۂ نواب دوندے خاں اور مولوی کفایت علی کافی نے باہمی مشورہ سے محبانِ وطن کی سربراہی اپنے ہاتھ میں لی۔ انگریز حکام رنگ دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور نینی تال اور میرٹھ چلتے بنے۔ میدان خالی پاکر نواب مجّو خاں سب کے مشورہ سے حاکم مرادآباد بن گئے۔ عباس علی خاں کے والد اسد علی خاں دوندے خانی توپخانے کے افسر بنائے گئے، مولوی کفایت علی کافی صدر الشریعہ مقرر ہوئے۔ شہر کے انتظام کے بعد ضلع کی طرف توجہ کی۔ نواب یوسف علی خاں نے یہ حالات سُن کر انگریز کی وفاداری میں اپنے چچا عبدالعلی خاں کو رام پور سے مرادآباد بھیجا۔ انہوں نے رام پور کے مجاہدین کو ورغلا کر یہاں سے واپس کیا۔ موسیٰ رضا کو کوتوال کیا گیا، غلام شبیر کے سپرد جیل خانہ تھا۔ اس کے بعد رام پور سے یوسف علی خاں خود مرادآباد آئے۔ نواب مجّو خاں کو ناظم برقرار رکھا، حکیم سعادت علی خاں جج مقرر ہوئے، نیاز علی خاں ڈپٹی کلکٹر بنائے گئے۔ مولوی کفایت علی نے ان تمام حالات سے نواب خان بہادر خان کو بریلی مطلع کیا۔ جنرل بخت خاں روہیلہ جو اس وقت تک صوبہ دار توپخانہ تھے، انگریز سے بیزار ہوکر بریلی چلے آئے تھے، پلٹن نمبر ۱۸ اُن کے ساتھ تھی۔ ۹ر جون ۱۸۵۷ء کو جنرل صاحب مرادآباد آئے۔ گنیش گھاٹ پر قیام کیا اور نواب یوسف علی خاں کو رام پور اطلاع دی کہ تم آکر ہمارے ساتھ شریک ہوجاؤ۔ نواب نے ولی عہد کو بھیج دیا اور سامان وغیرہ رسد کا بھیجا۔ نواب کا انتظام مرادآباد سے ہٹ گیا۔ مجاہدین کی سرگرمیاں پھر بڑھ گئیں۔ یہاں کی حالت دیکھ کر جنرل صاحب عازم دہلی ہوئے۔ اُن کے جاتے ہی نواب کے کارندوں نے نواب مجّو خاں اور نواب عباس علی خاں میں پھوٹ ڈلوادی۔ ۲۴ر جون کو نواب رام پور نے دوبارہ مرادآباد پر قبضہ کرلیا۔ عبدالعلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں مع فوج کے مرادآباد آگئے۔ نواب مجّو خاں سنبھل کے ناظم بنائے گئے۔ ۱۳ر اگست کو اہل مرادآباد نے رام پوری فوج پر حملہ کردیا۔ رام پوری کثرت سے کام آئے۔ ۷ر رمضان ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو فیروز شاہ سنبھل

ہوکر مرادآباد آگئے اور عیدگاہ کے قریب قیام کیا۔ مجاہدین کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ غلام ناصر خاں، موسیٰ رضا اور مولوی شاہ علی شاہزادہ سے ملے، انہوں نے منہ نہ لگایا۔ دوسرے دن شاہزادہ اور نواب کی فوج بھڑ گئی اور شکست کھاگئی۔ رام پور سے اور فوج آئی، شہزادہ نے رام گنگا پر مقابلہ کیا۔ شہزادہ کے پاس پانچ ہزار قواعد دان فوج تھی، ۱۶ ہزار شہری ہمراہ تھے۔ تین مورچے قائم کئے، ایک شاہ بلاقی کے مزار کے پاس، ایک قلعہ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان میں۔ رام پوری فوج ہر ایک مورچے پر مقابل آگئی۔ ناظم علی مزار کے پاس، حکیم سعادت علی خاں قلعہ پر، درمیان میں عبدالعلی خاں فوج کی کمان لئے ہوئے تھے۔ ۲۴ر اپریل ۱۸۵۸ء کو ناظم علی خاں نے پہل کی۔ فیروز شاہ کی فوج نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہنگامۂ جدال و قتال گرم ہوا، حکیم سعادت علی خاں، حسین بخش، یعقوب خاں نے شہزادہ کی فوج پر دوسری طرف سے حملہ کیا، مگر رام پوری

پٹ گئے۔ رام پوری سنبھل کر دوبارہ ۱۲ بجے حملہ آور ہوئے اور شہرت یہ دے دی کہ جنرل جانسن تازہ دم فوج گوروں کی لیکر عقب سے آرہا ہے۔ مجاہدین اس خبر سے منتشر ہونے لگے۔ شاہزادے نے یہ رنگ دیکھ کر اپنی فوج کو بچا کر بریلی کی طرف رُخ کر دیا، ۲۵ کو جانسن مراد آباد پر قابض ہوا اور قتل عام کر ڈالا۔

شاہزادہ بریلی پہونچا، نواب خان بہادر خاں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور خود استقبال کے لئے آئے۔ شہزادہ کو ہاتھی پر سوار کرا کر جلوس نکالا۔ انگریزی فوج بریلی پر حملہ آور ہوئی۔ نواب تفضل علی خاں، نانا راؤ پیشوا ہمراہ تھے۔ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ خان بہادر خاں مع اہل وعیال کے پیلی بھیت چلے گئے۔ شاہزادہ بھی تاب مقابلہ نہ لا سکا۔ شاہجہاں پور پہنچے۔ یہاں مولوی احمد اللہ شاہ لکھنؤ سے آگئے تھے۔ انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا، حکیم محمد حسن خاں نبیرۂ نواب محبت خاں اس معرکہ میں شہید ہوگئے۔ مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ نے شاہجہاں پور کے قریب محمدی پور پر قبضہ کیا، گڑھی کو توپوں سے آراستہ کیا۔ یہیں جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی، نانا راؤ پیشوا، عظیم اللہ خاں کانپوری، مولوی سرفراز علی امیر المجاہدین، نواب تفضل حسین خاں فرخ آبادی، مولوی لیاقت علی الہ آبادی جمع ہوگئے۔ شاہ صاحب نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ ذیل کا سکہ جاری کیا گیا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ

حامئ دین محمد احمد اللہ بادشاہ

شاہزادہ خود بادشاہی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سندیلہ روانہ ہوگئے اور اس پر جا کر قبضہ کر لیا، مگر قبضہ نہ رہ سکا۔ خیر آباد آئے۔ مولانا حسین بخش نے ہمنوائی کی۔ مگر ناظم خیر آباد ہر پرشاد، مولوی محمد ناظم لسوا باڑی پور، راجہ گلاب سنگھ رئیس پروا سے مجبور رہی تو محمد آباد آئے۔ ظریف خاں رسالدار اور ڈاکٹر وزیر خاں رفیق کار رہے۔ جنرل اسمٰعیل خاں، قاضی عنایت علی خاں بریگیڈیر رفاقت ترک کر کے انگریز سے مل گئے۔ شہزادہ ہمراہیوں کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر باڑی چلے گئے اور گنگا پر پہنچ کر کشتی سے پار اتر کر فرخ آباد آئے اور کن پور ہو کر اٹاوہ اور وہاں سے شیر پور کے گھاٹ سے اتر کر جے پور کی راہ لی اور بیکانیر کا رُخ کیا۔ پھر حیدر آباد سندھ پہنچے اور کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ ایران ہو کر حجاز چلے گئے۔ مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی۔ یہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی۔ شاہ عبد الغنی دہلوی، مولانا یعقوب دہلوی، مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی، مولانا محمد مظہر مجددی جیسے حضرات ہدایت واصلاح کی ایک جماعت بنائے بیٹھے تھے۔ نواب فیض احمد خاں رئیس دتاؤلی، مولوی واعظ الحق بہاری، حکیم نوازش حسین بہاری، شہزادہ فیروز شاہ، ڈاکٹر وزیر خاں بھی اس جماعت کے رکن ہوگئے۔

شہزادہ فیروز شاہ کی ایک بہن شہزادی کلثوم زمانی بیگم تھیں جو ۱۸۵۷ء میں قلعہ سے نکل کر فقیرانہ لباس اختیار کر کے میرٹھ چلی آئی تھیں۔ نواب ممتاز علی خاں نبیرۂ نواب صولت اندیش خاں کے یہاں عزت ووقار سے تمام عمر بتادی۔ شادی نہیں کی۔ بھائی کے لئے دعائیں کرتی کرتی دنیا سے چل بسیں۔ مکہ معظمہ میں شاہزادہ فیروز شاہ کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا۔ یہ تھی اس مجاہد ملت کی ولولہ انگیز داستان۔

سلسلۂ حادثات —— بقیہ صفحہ ۳۶

زخمی سپاہی کو ہسپتال بھجوا دیا گیا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا، جس کے فیصلے کے مطابق ۸ را پریل کی صبح کو اُسے پھانسی دے دی گئی۔

سن ستاون کے واقعات کے بہت سے اسباب گنائے جاتے رہے ہیں اور آئندہ بھی گنائے جائیں گے۔ چربی لگے ہوئے کارتوسوں سے لے کر کھانے پانی کی تادیلیں پیش کی جائیں گی اور ان سب قیاسات کے باوجود ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکیں گے، کیونکہ جب تک اس نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور نہ ہوگا کہ سن چھپن میں سراج الدولہ شہید کا کلکتہ پر حملہ ہوا یا سن ستاون میں بیرکپور سے لے کر لاہور تک جو آگ بھڑک اُٹھی تھی اور جس کے شعلے پھر ۱۹۲۰ ——۱۹۲۲ء میں بھڑک اُٹھے تھے، اُس کا اصل مقصد خارجی حکمران کے خلاف اظہار نفرت تھا، ہم صحیح اسباب تک رسائی حاصل نہ کر سکیں گے۔ اس مسئلہ پر ایک اور طرح سے بھی غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خارجی حکومت کا جوا اتار پھینکنے میں مسلمانوں نے صدیوں تک تنہا اور برادران ملک کے ساتھ مل کر مساعی کیں، لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی اور برادران وطن نے متحدہ برصغیر میں ان مساعی کے لئے صرف خود اعزاز حاصل کرنا چاہا تو ملت اسلامیہ کو ایسے رہنما بھی میسر آئے، جنھوں نے ملت کی سربلندی اور سرفرازی کے لئے ایک الگ جد وجہد مناسب سمجھا۔ ان میں سب سے بلند نام حضرت علامہ اقبالؒ اور مرحوم قائد اعظمؒ کے ہیں، جن کی مساعی بفضلہ بار آور ہوئیں اور برادران کے بقول استقلال پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۷ء

کوہسار مری کا ہنگامہ

عزیز ملک

یکم جنوری ۱۹۵۷ء ۔۔ کوہ مری میں نئے سال کے پہلے ہی دن کا مطلع برف آلود تھا۔ برف باری گذشتہ رات سے جاری تھی لیکن سحر کے جاگتے ہی تیز ہوا کا طوفان بھی طاری ہو گیا۔ ہوا کے تھپیڑے برف کے گالوں کو اُتھل پتھل اُڑائے لئے پھرتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے ؎

نگہ میں دامنِ سیمیں بار اُڑتا ہے

کہ موتیوں کا مجلا غبار اُڑتا ہے

مغرب کے بعد ہوٹل سے کھانا کھا کر جب میں اپنے حجرے کے قریب پہنچا تو گہرا اندھیرا چھا چکا تھا۔ دن بھر کی اُداسی اور سنسانی کی بے کیفی کو زائل کرنے کے لئے میں نے شاہ داد کے کمرے میں جھانکا۔ وہاں تین چار احباب اور بھی بیٹھے تھے۔ میں بھی محفل میں شریک ہو گیا۔ آتش دان کے اندر لکڑیاں جل رہی تھیں جن سے کمرہ کا ماحول خاصہ گرم تھا۔

شاہ داد اسی پہاڑ کا باشندہ اور ایک مقامی دفتر میں کلرک ہے۔ کوہ مری کے ایک نشیبی گاؤں میں اس کا کنبہ اپنے آبائی شکستہ مکان میں آباد ہے۔ جہاں پر سر ہفتہ وہ بھی ہو آتا ہے۔ وہ فطرتاً کم آمیز اور کم گو نوجوان ہے۔ لیکن اس کے رفقائے دفتر اُس کی بے پناہ ذہانت کے معترف ہیں۔ اس سے میرا تعارف دو تین ماہ پہلے ہوا تھا لیکن ہمسائیگی میں رہنے کے باوصف ہمارے مراسم اس سے بیش نہیں کہ وہ کبھی کبھار میرے کمرے کی طرف آنکلتا ہے یا میں اس طرف جاتے ہوئے خیر خیریت دریافت کر لیتا ہوں۔ آج بھی میرا ارادہ زیادہ دیر تک وہاں ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ لیکن کچھ تو آگ کی کشش اور کچھ موسمی حالات نے مجھے پکڑ کر وہاں بٹھا لیا۔

باہر ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ برف لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہم بہت دیر تک شعلوں کے سُرخ سُرخ پردوں پر خیالی تصویریں دیکھتے اور اپنے تصورات میں گُم بیٹھے رہے۔ پھر آصف نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "لیجئے موسال نے ایک اور ورق اُلٹا اور آج ۱۹۵۷ء کا آغاز بھی ہو گیا!"

یہ سنتے ہی شاہ داد نے اپنی گردن گھما کر سامنے دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ پھر آتش دان میں دو تین موٹی موٹی لکڑیاں جھونک کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ کمرے سے باہر برف اور طوفانی ہوا کا زور شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور کمرے کے اندر آتش دان میں ناچتے ہوئے شعلوں کی زبانیں بھی کچھ اور نوکیلی ہو گئی تھیں۔ شاہ داد نے ایک سگریٹ سلگا کر لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ ۔ میں آپ سے عرض کروں بس شاد کو اس کوہسار مری سے ایک گونہ نسبت ہے کہ یہاں بھی ایک صدی پہلے انگریزوں کے خلاف انقلاب کا نعرہ لگایا گیا تھا۔ یہ کہتے کہتے وہ دفعتہً رک گیا اور اس کی نگاہیں آتش دان میں لوٹتے ہوئے شعلوں پر گڑ گئیں۔ شاید اس کا ذہن داستانِ ماضی کے ورق اُلٹ رہا تھا..... !

اس خواب سے چونک کر اس نے سلسلۂ کلام کو پھر سے شروع کرتے ہوئے کہا کہ گذری ہوئی صدی سے بھی نصف صدی اُدھر کی بات ہے جب کوئی فرنگی یہاں پہلے پہل آیا تھا اور اس نے اس پہاڑ کی آب و ہوا کو اپنے سفید فام ہم وطنوں کے مزاج کے سازگار پایا۔ کہتے ہیں اس کے ہمراہ اس کی میم بھی تھی۔ یہ جوڑا میا ڑی کے رئیس سے ملا اور دو بنگلوں کے لئے زمین خرید کرنے کی بات چیت ہوئی۔ اس زمین کا رقبہ موجودہ مارکیٹ سے لیکر گورکھا لائین تک پھیلا ہوا تھا۔ بھاؤ تاؤ کے بعد یہ سودا مبلغ ساٹھ روپے پر طے ہو گیا۔ اس رقم میں سے اس بھولے بھالے رئیس نے دس روپے اپنی طرف سے صاحب کی میم کو بیٹی کہہ کے پیش کر دیئے کہ بے چاری سر سے ننگی تھی اور اس کی پنڈلیاں بھی برہنہ تھیں۔

لیکن یہ پیش کش تہذیبِ نو کے سر کو ڈھک نہ سکی۔ کیونکہ اُن دنوں یہ طفل ابھی گھٹنوں چلنا سیکھ رہا تھا۔ آگے چل کر اس کی زلفیں روز بروز کھلتی گئیں اور پنڈلیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ زمانہ جوں جوں آگے کو سرکتا گیا۔ پیراہن سمٹ سمٹ کر اور بھی اُوپر سرکتے چلے گئے۔

یہ خشتِ اوّل تھی اس نئی بنیاد کی جس کی گہرائیوں میں اس پہاڑ کے مکینوں کی قسمت آج بھی سو رہی ہے کیونکہ وہ ایک نرالی بیم تھی جب کہ اس پہاڑ کے اصلی وارث مبلغ ساٹھ روپے چہرہ شاہی کے عوض ہمیشہ کے لئے فروخت ہو گئے۔ اور اب اُن کی اولاد گھاٹیوں میں ہر طرف بکھری پڑی ہے۔ آپ دیکھتے ہوں گے کہ اوپر تلے ہر طرف دیہاتی آبادیوں کے سلسلے چلے گئے ہیں۔ ڈھلوانوں پر ڈھاتوں کے چھوٹے چھوٹے کھیت زینہ بہ زینہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ابن آدم ان دشوار مقامات میں بھی رہتا بستا ہے محنت

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۷ء

مشقت سے گذر اوقات کے اسباب اور وسیلے فراہم کرتا اور پاؤں پسار کر سو رہتا ہے۔ کچے گھروندوں کے ان سادہ مکینوں کو شہر والوں کی پُر پیچ سیاست سے دور کا علاقہ بھی نہیں۔ یہ اور اُن کے آباؤ اجداد صدیوں سے انہی چٹانوں کا تکیہ لگائے اپنی معصوم اُمنگوں کے سہارے زیست کئے جاتے ہیں۔ محنت اُن کی عادت اور مشقت اُن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ انہیں سرد و گرم زمانہ سے فکر نہیں ہے۔ برسات، پالے، بہار اور پت جھڑ کے موسم اپنے اپنے وقت پر آتے اور گذر جاتے ہیں۔ صبح اپنے وقت پر طلوع ہوتی ہے اور سحر کے انگڑائی لیتے ہی مناظرِ فطرت کی رنگا رنگی دامانِ نظر کو مقناطیسی جذب کے ساتھ کھینچتی ہے۔ جب دریچۂ مشرق سے شاہدِ خاور کی کرنیں سر اُٹھاتی ہیں تو جلوۂ سحر سے کوہسار کا گوشہ گوشہ پتہ پتہ جگمگا اُٹھتا ہے۔ اور ہر طرف ردائے نور بچھ جاتی ہے جس میں سے رنگِ حُسن نکھرتا نظر آتا ہے اور ہر سُو بکھرتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ ؎

حُسن خود کرتا ہے نظارہ قریب و دور کا

بارش کے دن بھی کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ پہاڑیوں اور درختوں کی آغوش سے بادلوں کے مرغولے دُھواں دُھواں رقص کرتے اُبھرتے اور آہستہ آہستہ فضا پہ چھا جاتے ہیں۔ پھر پگھلی ہوئی چاندی کے یہ صاف اور شفاف ٹکڑے سُرمئی گھٹاؤں کا لبادہ اوڑھ کر شامیانوں کی طرح تن جاتے ہیں اور پورے کوہسار کو اپنے سائے میں لپیٹ کر گرجتے اور اس زور سے برستے ہیں کہ چٹانوں کا مُنہ دُھل جاتا ہے۔

وہ اپنی رَو میں بہتا چلا جا رہا تھا کہ اُسے پھر یکبارگی فرنگی کا خیال آ گیا اور اس نے کہا کہ آثار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہی دنوں یونیک کلب کے متصل انگریزوں کا ایک قبرستان بھی کھل گیا تھا جس میں سب سے پُرانی بلکہ مرنے میں سبقت کرنے والے گورے کی قبر پہ فارسی لوح نصب ہے جس پر ۱۸۴۸ء سنِ وفات درج ہے۔ اُن دنوں یہاں پر سکھوں کی چیرہ دستیوں کے افسانے کوہ مری میں آج بھی مشہور ہیں۔ اُن سے پہلے ڈوگرے ڈاکو یہاں لُوٹ مار کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ مقامی لوگ اُنہیں ایراجی کے نام سے پکارتے تھے۔ اُن کے ظلم و ستم کا مقابلہ پہاڑ کے عباسی قبیلے نے کیا اور ایک دن اُن تمام حملہ آوروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

عباسی قبیلے کے لوگ دراصل رہتک، کرنال اور مراد آباد وغیرہ مقامات سے بسبیلِ ہجرت یہاں وارد ہوئے تھے۔ مراد آباد انہی کے کسی بڑے بوڑھے مراد خاں نے بسایا تھا۔ مغلوں کے اخیر عہد میں کسی سیاسی کشمکش کی بنا پر اس قبیلے کے بہت سے افراد پنجاب میں آن بسے اور انہی میں سے ایک گروہ نے کوہ مری میں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس قافلے کے سردار کا نام ڈھونڈ خان تھا اور اسی نسبت سے عباسیوں کو ڈھونڈ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ اپنی ملی غیرت کے لئے مشہور رہا ہے۔ ان سے پہلے دھنیال، ستی اور کھیٹوال قبیلے یہاں آباد تھے۔ لیکن عباسیوں نے اپنی شرافت اور شجاعت سے اُن سب پر بالادستی حاصل کر لی۔

جب انگریز نے ۱۸۴۹ء کے بعد پنجاب کو سلطنتِ برطانیہ میں شامل کیا اور پنڈی کو علاقائی حیثیت سے فوجی چھاؤنی کا مقام مل گیا تو کوہ مری کو ناردرن کمانڈ کا گرمائی مستقر قرار دیا گیا۔ آنے والے چند ہی سالوں میں مقامی دیہاتیوں کے کچے گھروندے اور بوسیدہ کھپریلوں کو آئینہ دکھانے کے لئے جدید فنِ تعمیر کے قالب میں ڈھلے ہوئے پختہ مکان اُبھرتے گئے۔ یوں اس کوہسار کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے دیودار دل، چیلوں اور شاہ بلوط کے جنگلوں میں آدم زاد نے پھر نئے سرے آبادی کی جوت جگائی اور نشیب و فراز یمین و یسار، ڈھلوانوں اور پہاڑوں کی اوٹ میں اوپر تلے شاندار مکانات بننے لگے۔ بازار لگ گئے اور چہل پہل ہونے لگی۔ سول اور فوجی دفاتر کے علاوہ گرد و نواح میں تریٹ، گھڑیال، باڑیاں، اپر ٹوپا اور بھوربن میں فوجی کیمپ کھل گئے۔ بہت دنوں تک مقامیوں نے حالات کی اس افتاد کو اکراہ کے ساتھ دیکھا تا آنکہ مئی ۱۸۵۷ء میں جب دہلی اور میرٹھ میں غدر کی آگ بھڑکی تو اس وقت انہوں نے بھی ھل من مبارز کا نعرہ لگایا۔ اس نعرے میں پہاڑ کے تمام قبیلے شریک تھے۔ چند روز ایک مضبوط اور منظم حملے کی تیاری جاری رہی اور خفیہ اجتماعات منعقد ہوتے رہے۔ اور حملے کا ایک دن معین ہو گیا۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کمنی حاق گاؤں کی ایک بڑھیا نے انگریز کمشنر سے جا کر مخبری لگا دی کہ اے بھائی انگریز از خوابِ گراں خیز!

یہ خبر ملتے ہی انگریزوں نے اپنی تمام فوجی طاقت دفترِ خزانہ کے آس پاس جمع کر لی۔ کیونکہ غازیوں نے مقررہ پروگرام کے مطابق کمشنر بہادر کے بنگلے کو نذرِ آتش کرنے کے بعد خزانے پر دھاوا بولنا تھا۔

حملے کے دن دھنیالی مجاہد ابھی پیچھے ہی تھے کہ عباسیوں کا لشکر تکبیر کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ اور آتے ہی کمشنر کے بنگلے کو پھونک کر رکھ دیا۔ یہاں سے آگے بڑھے ہی تھے کہ انگریزی فوج نے فائر کھول دیئے اور بہت سے غازی ڈھیر ہو گئے۔ کچھ بھاگ گئے اور گرفتار ہوئے۔

ابھی یہ معرکہ جاری تھا کہ لوئر ٹوپا کی سمت سے دھنیالی لشکر بھی موقع واردات کے قریب پہنچ گیا لیکن صورتِ حال کی نزاکت کا علم ہونے پر اُن کے سردار بادا بڈھے خان نے اپنے لشکر سے نکل کر انگریزی کمانڈر سے ملاقات کی کہ ہم آپ کی امداد کو آئے ہیں۔ انگریز نے شاباش کہہ کر اُنہیں واپس چلے جانے کی اجازت دے دی۔

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۷ء

اب علاقے بھر میں عباسیوں کی ڈھنڈیا پڑی۔ اور گاؤں پر گاؤں جلائے جانے لگے۔ پکڑ دھکڑ کا بازار گرم ہو گیا۔ عباسی لشکر کا سردار رحمت خان تحصیل بالغ سے گرفتار کر کے لایا گیا۔ بغاوت کے مقدمے کی مختصر سی سماعت کے بعد چوبیس ۲۴ سرکردہ غازیوں کو فٹ بال گراؤنڈ میں توپ دم کر دیا گیا۔ اور انسانی جسموں کے لاتعداد ٹکڑے فضا کی نیلاہٹ میں لرزاں و وجد کناں حالت میں دور دور جا کر گرے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس جذبۂ حریت کی عبرتناک شکست کے بعد داستان کا ایک باب ختم ہو گیا۔ پھر تہذیب افرنگ کے روپ میں پاداش عمل بیدار ہوئی اور یہ سبز پوش بستی اہلِ تعیش کا گوشۂ عشرت بن کر رہ گئی۔

اُن دنوں سیر و سفر کی موجودہ آسانیاں میسر نہ تھیں۔ لوگ بہ ہزار دقت پہاڑ کے پیچ در پیچ راستے پر سفر کرتے تھے۔ بیل گاڑیوں کا زمانہ تھا یا گھوڑے تانگے تھے۔ جناب جان بل اپنے گل و کمبل سمیت بیل گاڑیوں پر ہی سفر کرتے تھے۔ البتہ انگریزی فوج کے سپاہی پیدل آتے تھے اور اُن کا سفر رات کے وقت تاروں کی چھاؤں میں ہوا کرتا تھا۔ یکے اور تانگے صرف سنی بینک تک آتے جاتے تھے۔ پھر دھنجی بھائی کی فٹن سروس شروع ہوئی۔ اس کا اڈہ موجودہ موٹر ایجنسی ہی میں کھولا گیا۔ جہاں آجکل کنگ ہوٹل واقع ہے اس جگہ دھنجی بھائی کا اصطبل تھا اور یونیک کلب کی پرانی عمارت میں کوچوانوں کی سرائے تھی۔

سرِ شام جب فٹنیں کارواں در کارواں پہنچتیں تو میلہ سا لگ جاتا۔ خوانچے والوں کی چیخ پکار اور قلیوں کی مار مار سے بازار گرم ہو جاتا۔ ایک فٹن سرکاری ڈاک لیکر ڈاکخانے تک بھی آتی جاتی تھی۔

فٹن سروس علی الصباح روانہ ہو کر مغرب کے وقت راولپنڈی پہنچتی۔ راستہ میں کئی جگہ گھوڑے بدلائے جاتے اور مسافروں کے ستانے کو پڑاؤ پڑتے تھے۔ چونکہ اُن دنوں راستہ پرخطر تھا اس لئے چور ڈاکوؤں کے ڈر سے پانچ سات فٹنوں کا قافلہ روانہ ہوتا۔ فٹن پر کوچوان کے ہاتھ میں چابک کے علاوہ ایک بگل بھی پکڑا ہوتا جس سے پیدل راہ چلنے والوں کو خبردار کیا جاتا تھا۔ شاید قیوم نظر نے بگل باجے کا مصرعہ اسی منظر سے مستعار لیا ہو گا۔

مری سے چل کر گھوڑا گلی۔ ڈھارا امیر سنگھ۔ ساملی۔ چھترا پانی۔ تریٹ۔ بائیس میل۔ سترہ میل۔ بارہ کہو۔ دھمریال وغیرہ مشہور پڑاؤ تھے جہاں دن بھر مسافروں کا تانتا بندھا رہتا۔ ان سب میں سے ڈھارا امیر سنگھ جو گھوڑا گلی اور ساملی کے عین وسط میں واقع تھا ایک عظیم الشان پڑاؤ تھا جہاں ضرورت کی سب اشیاء مل جاتی تھیں۔ خدا کی شان ہے کہ آج اس پڑاؤ کا نام و نشان تک مٹ چکا۔

یہی پڑاؤ تھے جہاں پر مقامیوں نے اپنے محدود وسائل کے بل پر معمولی دھندے کھول رکھے تھے۔ لیکن جب زمانہ کچھ آگے بڑھا تو سفر کی سہولتوں نے یہ پڑاؤ اُجاڑ کر رکھ دیئے۔ گھوڑوں کی جگہ ہارس پاور موٹروں اور بسوں نے لے لی۔ اب اہل مری کے لئے ذلیل ترین ملازمتوں کے سوا کوئی مقصد حیات نہ رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ خوانچے لگا لئے اور پہاڑی املوک اور گرنڈے وغیرہ غریب پرور میووں کی تجارت شروع کر دی۔ بہتیرے اُن میں سے ایسے بھی ہیں جو آس پاس کے دیہاتوں سے سانجھ سویرے نکل پڑتے ہیں اور ڈاکخانہ کی سیڑھیوں پر آ بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بیٹھنے کی ممانعت کا نوٹس لگا ہوا ہے۔ مگر لوگ بے غل و غش بیٹھتے ہیں۔ دن بھر بیٹھے ہیں۔ نسوار چڑھا کر بیٹھتے ہیں۔ جم جا اور دندنا کر بیٹھتے اور سیٹیاں مارتے ہیں۔ انہیں بیکاری کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں۔ اور مری میں کاروبار ہے بھی کہاں؟ یہ لوگ عمداً تعلیم سے محروم رکھے گئے۔ انگریز کی منشا اور سن ستاون کے اقدامِ حریت کا انتقام! علاوہ ازیں عباسیوں پر بالخصوص فوجی اور بالعموم سول ملازمتوں کے دروازے حکماً بند کر دیئے گئے تھے۔ یہ حالت ۱۹۱۴ء تک برقرار رہی۔ اس کے بعد انگریز کی جنگی ضرورتوں نے ان کو بھی خوانِ یغما پر بلایا اور کچھ نوجوان فوج میں بھرتی ہونے لگے لیکن بایں ہمہ عباسیوں کے لئے نوکری کاروبار کے علاوہ تمام راستے مسدود ہی رہے۔ جہالت بدستور رہی اور افلاس بھی مسلط رہا۔ اس کے برعکس لارنس کالج گھوڑا گلی میں تعلیمی گرانٹ کے علاوہ انگریز بچوں کو بندوق کی مشق اور نشانہ بازی کے لئے تقریباً چار لاکھ روپے سالانہ حکومت کی طرف سے ملتے رہے۔

آپ نے مفلوک الحال مقامیوں کو دیکھا ہوگا جن کے چہروں پر پریشانی کے افسانے بول رہے ہیں۔ ان کے اہل و عیال درختوں کے پتے اُبال اُبال کر کھاتے اور جیتے ہیں۔ کبھی آپ نے محسوس کیا جب سرِ راہ ملیں گے سلام علیک ضرور کہیں گے۔ ناداری کے باوصف اُن کے کردار کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو اپنا مسلمان بھائی سمجھ کر سلام کہتے ہیں۔ لیکن سلام کرتے ہی آپ سے فوراً وقت بھی پوچھ لیں گے۔ انہیں شاید کسی شبھ گھڑی کا انتظار ہے۔ یا غالباً اس استفسار کا مطلب یہ ہو کہ ابھی افرنگی اور

اس کی تہذیب پہاڑ سے نیچے اتری یا نہیں ؟

اِن بیچاروں کی تشکن در تشکن پیشانیاں اپنی صد سالہ محرومیوں پر ماتم کناں سہی لیکن اُنہوں نے غربت و افلاس میں بھی اپنی غیرت نہیں بیچی۔ اُنہوں نے بھوکا اور ننگا رہ کر بھی اپنی عصمتوں کو منڈی کی جنس نہیں سمجھا، بلکہ اس نگری میں حُسن کے بازار کا راس المال اور اس کے خریدار دونوں ہی باہر سے آتے ہیں ؛

بہت عرصہ ہوا لوہربان کے قریب کسی برٹش یونٹ کا مستقل کیمپ تھا۔ ایک مرتبہ کسی ٹامی نے گاؤں کی ایک لڑکی کو گھورا اور فحش اشارے کئے۔ گاؤں والوں نے یورش کر کے اس ٹامی کو اذیتیں دے دے کر مار ڈالا۔ انگریز فوجیوں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ مورچے لگ گئے اور مشین گنیں نصب ہو گئیں۔ لیکن کمانڈر کی بر وقت مداخلت سے حالات نازک تر نہ ہونے پائے اور محاصرہ رفع ہو گیا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد یہ کیمپ بھی وہاں سے ہمیشہ کے لئے اٹھا لیا گیا۔ کیمپ کے کھنڈر ابھی تک وہاں پائے جاتے ہیں ؛

اِس نوعیت کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ غیرت والوں نے اہلِ ہوس کو عبرتناک سزائیں دیں۔ یقین جانیئے مر کر بھی اگر کسی جماعت میں پاسِ ناموس باقی ہے تو وہ یقیناً کسی دن زندہ ہو کر رہے گی ؛

یہ باتیں سنتے سناتے رات نصف سے اوپر بیت گئی۔ آتش دان قریباً بجھ چکا تھا۔ ہم سب شاہ داد کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔ باہر اب مکمل سکون تھا۔ ہوا خاموش اور ابر بھی چھٹ گیا تھا۔ اگرچہ برف کی دو اڑھائی فٹ تہہ جم گئی تھی ؛

مجھے بقیہ رات کوشش کے باوجود نیند نہ آسکی۔ چنانچہ صبح سویرے ہی برف کی سیر دیکھنے کے ارادے سے چل پڑا۔ ایجنسی کے موڑ والے پُل پر شرفو مجذوب کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور بیڑی سلگا کر دُھواں اُڑانے لگا۔ میں اُسے سلام کہتا ہوا آگے بڑھ گیا ؛

نئی نویلی برف پر میرے پاؤں کہیں پھسلتے اور کہیں جم کر پڑتے تھے۔ بہرکیف میں اپنا راستہ خود ہی تراشتا ہوا جا رہا تھا۔ غالباً مجھ سے پہلے اس شاہراہ پر سے کوئی گذرا نہ تھا کیونکہ برف کے اُجلے راستے پر جب کوئی فرد گذرنے میں پہل کرتا ہے تو پیچھے آنے والے لوگ اُس پیش رو کے نقوشِ قدم پر قدم دھرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ مال روڈ پر پہنچتے پہنچتے خاصہ اُجالا ہو چکا تھا۔ ہر شے نرم برف کے غلاف میں لپٹی پڑی تھی اور کہیں کوئی ذی جان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ مال روڈ کی فرسلی صبح تھی۔ دفعتاً مجھے یہاں کی بھڑکیلی شامیں یاد آگئیں جو حسن و رعنائی۔ دلبری و زیبائی میں اودھ کی شاموں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوا کرتیں ؛

یہ مال روڈ ایک صدی کے تمدنِ رفتہ کی گذرگاہ ہے۔ یہاں سے کبھی وہ قافلے بھی گذرے تھے جنہوں نے رنگِ نو کی طرح ڈالی تھی۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ گذری ہوئی ایک صدی کا رنگ جمال پوری طرح نکھر کر اپنے عہدِ شباب کو پہنچ رہا ہے۔ اسی گذرگاہ پر موٹی بھاری پتلی دُبلی۔ کالی۔ گوری ہر نمونے اور تراش کی عورت دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ یہاں غرارے آتشیں شرارے بن کر لہراتے ہیں اور سینوں میں دل تھرتھراتے ہیں۔ یہاں پتلون پوش بیگمات بھی موجود ہیں اور برہنہ پنڈلیوں کا دیدار بھی عام ہے۔ یہاں نظروں سے نظریں ملتی اور اکثر سُنہرے جال بُن لیتی ہیں۔ یہاں پر ایسے ایسے سُرخ ہونٹ پائے جاتے ہیں جیسے لعل و یاقوت کے دل میں غوطہ لگا کر اُبھرے ہوں۔ یہاں نسوانی قہقہوں میں چوڑیوں کی جھنکار کا نغمہ آمیز ہو کر ہواؤں میں پھیل جاتا ہے۔ یہیں لڑکیاں لانبے لانبے آدم قد قمیض پہننا سیکھ جاتی ہیں۔ یہاں ہر سمت چمکیلے مکھڑے۔ قاتل زلفیں۔ تمتمائے گال اور اُودے نیلے پیلے لال گلال ریشمی اور کمخوابی لباسوں کی نمائش کھل جاتی ہے۔ وہ ابریشمی لباس کہ دانشِ افرنگ جن کے تار تار کو مشینوں پر بُن کر تن جامہ زیب پر چُن دیتی ہے۔ یہاں ایسے بیوپاری بھی آتے ہیں جن کی صورت اس شکستہ دیوار کی طرح ہوتی ہے جس پر سفیدی کرانے کے بعد سُرخ روشنائی سے لکھا ہوتا ہے "کہ میں بکاؤ مال ہوں جی"؛

آج یہ مال روڈ پیر مغرب کے مزار سے کم نہیں جس پر ہر سال موسمِ گرما میں عُرس لگتا ہے۔ معتقد جوق در جوق آتے۔ شیرینی چڑھاتے اور مرادیں پاتے ہیں۔ یہاں سالکانِ راہِ حق کو تعلیم دی جاتی ہے کہ دیکھتا جا اور منہ سے نہ بول۔ کیونکہ مشاہدۂ جمال مطلق کے لئے نرگس کی سی آنکھ درکار ہوتی ہے جس پر جنبشِ مژگاں بار ہوتی ہے۔ مزار کے بعض حصوں پر کچھ طغرے بھی آویزاں ہیں مثلاً "خدا کی زمین پر چلتے پھرتے نظر آیئے" اور "اپنے نفس کے کتوں کو زنجیر سے قابو میں رکھئے" وغیرہ وغیرہ ؛

میں اس مزار شریف پر کچھ دیر انا للّٰہ پڑھ کر پنڈی پوائنٹ کی طرف سے ہو کر آ رہا تھا کہ دفعتہً میری نظر فٹ بال گراؤنڈ پر پڑی جس کی پہنائی میں برف کی چاندنی پڑی تھی۔ نہیں بلکہ سن ستاون کے اُن غازیوں اور شہیدوں کی رُوحیں چادرِ نور تانے آرام فرما رہی تھیں جن کو آزادی کے جرم میں ایک صدی پہلے یہاں بارود سے اُڑا دیا گیا تھا ۔۔۔ اُس وقت نسیم سحری رُبابِ ازل پر یہ نغمہ سنا رہی تھی ؏

اُٹھو سونے والو سحر ہو گئی ہے

ماہ نو کراچی، مئی ۱۹۵۷ء

حاجی صاحب ترنگ زئی

عبدالغفور خاں

آزادی، شجاعت، محبت، ناساعد حالات کے خلاف بے باکانہ جدوجہد۔ یہ ساری باتیں جن میں زندگی کا حقیقی سوز پایا جاتا ہے، مغربی پاکستان کے اس سرحدی علاقے کی روح و رواں ہیں۔ جہاں ہمارے ملک کے جری اور پُرجوش قبائل آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سخت سے سخت حالات میں بھی کسی سے نہیں دبے۔ چنانچہ اس دور سے زیادہ کٹھن دور کیا ہوگا جب انگریزی فتوحات کا سیلاب قریب قریب تمام برصغیر کو محیط ہو چکا تھا اور برابر آگے بڑھتے ہوئے سرحد کی آزاد چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کران پر چھا جانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس زمانہ میں بھی مردانِ کہستان نے نہ غیر مردی نہ چھوڑی، اپنی جانبازی کی روایات کو ترک نہ کیا، حریفانِ جنگ آزما کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے اور بڑی بے باکی سے اس قوم کے مقابلے پر ڈٹے رہے، جس کی قلمرو پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ

حملے حسرت پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

ایسی فضا میں وہی لوگ رہنمائی کا حق ادا کرسکتے تھے جو شجاعت کی روح سے بدرجۂ اتم سرشار ہوں۔ ظاہر ہے کہ جہاں بچہ بچہ تیغ و تفنگ سے لیس ہو، وہاں خاص الخاص مردانِ حُر ہی مقبولِ عام ہو سکتے تھے۔ انہی میں سے ایک حاجی صاحب ترنگ زئی تھے، جن کی سرگرمیاں اُسی جذبۂ آزادی کی آئینہ دار اور برصغیر کی مجاہدانہ کارروائیوں کا مقامی مظہر تھیں، جو شہدائے بالاکوٹ کی جہاد آرائی کا باعث ہوئی تھیں اور گوناں گوں مجاہدانہ معرکوں کی آخری مہتم بالشان صورت اختیار کرکے نہ صرف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آشکارا ہوئی تھیں بلکہ بعد میں بھی مختلف صورتوں میں جاری رہیں اور آج بھی اپنا اثر دکھا رہی ہیں۔

حاجی صاحب فضل واحد پیران ہشت نگر کے مشہور خاندان کا چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ پیر بہاءُ الدین تھے جو غالباً ۸۰۰ھ میں ہجرت کرکے آنے والے پٹھان قبائل کے ساتھ آئے تھے۔ محمد زئی قبیلہ نے ان کو اپنے پیر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اور وہ ہشت نگر میں ترنگ زئی کے گاؤں میں آباد ہوگئے۔ انھوں نے روحانی تعلیم و تربیت کی خاطر اپنے آبائی وطن قندہار کو چھوڑا تھا اور ترنگ زئی میں وفات پائی۔ ان کا مزار اتمان زئی کی شول گرہ یعنی چاول بونے کے علاقے میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ اس کو تیموڑئے بابا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اب بھی پٹھان مرد، عورتیں دور دور سے اس کی زیارت کرنے کو یہاں آتی ہیں اور منتیں مانگتی ہیں۔ میٹھی چوری یعنی مالیدہ بانٹا جاتا ہے، دنبے ذبح کئے جاتے ہیں اور مزار شریف کو غلاف پہنائے جاتے ہیں۔ چونکہ بہاءُ الدین قندھار سے تشریف لائے تھے، اس لئے ان کو بابا ولی قندہاری کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حاجی صاحب نے ان کا فضل اور بزرگی ورثے میں پائی تھی اور انہی کی طرح نہ صرف روحانی فیض کو جاری رکھا بلکہ قبائل میں اصلاح و تہذیب سے ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش بھی کی۔

اپنی خاندانی روایات کے مطابق حاجی صاحب نے مذہبی تعلیم حاصل کی اور پھر تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب کشش تھی۔ جو کوئی ایک بار اُن کی مجلس میں شامل ہو جاتا، وہ عمر بھر کے لئے ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ہجرت کی مشہور تحریک کے بعد جو ۱۹۱۹ء میں جاری ہوئی تھی، حاجی صاحب ایک ایسے علاقے میں تشریف لے گئے جو غیر آباد اور ویران تھا۔ انھوں نے وہاں اپنا روحانی فیض جاری کیا۔ ہر روز اس سنگلاخ علاقے میں لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ جس علاقے میں وہ سکونت پذیر ہوئے، اس قدر بدامنی اور لاقانونیت کا شکار تھا کہ بندوقوں اور اسلحہ کے بغیر اس میں سے گزرنا محال تھا۔ مگر حاجی صاحب کی برکت سے وہاں لوگوں کا گزر امن و اماں سے ہونے لگا اور کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جاتی تھی۔ حالانکہ یہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں کوئی سیاسی طاقت بھی امن قائم نہیں کر سکی تھی۔ مقامی ملک اور خان قزاقوں کی لوٹ مار اور قتل و خون سے تنگ آ چکے تھے۔ مگر جس وقت یہاں حاجی صاحب کا فیض جاری ہوا، ہر طرح سے امن و سکون قائم ہو گیا۔ جیسا کہ اقبالؔ نے کہا ہے ؎

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

حاجی صاحب نے بہت سی اصلاحات جاری کیں، لوگوں کو شریعت کے راستے پر ڈالا، بُرے رسم و رواج سے منع کیا اور ان کی برکت سے قبائل کے

رہن سہن میں بہت تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہنے لگے، برادیاں قائم ہوئیں، پرانی دشمنیوں کا قلع قمع ہوا اور پری جیسے جھینی دھڑے بندیاں وغیرہ ختم ہو گئیں۔ اس دوران میں حاجی صاحب کے انگریزوں کے ساتھ بھی بڑے بڑے معرکے ہوئے، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ یادگار ہے۔ چنانچہ ہمندنامہ یعنی قبیلۂ مہمند کے علاقہ کا ذرہ ذرہ ان معرکوں کی گواہی دیتا ہے۔ حاجی صاحب کو مال و زر کا کوئی لالچ نہ تھا۔ جس مقصد کے لئے انھوں نے اپنے وطن سے ہجرت کی تھی، وہ آخری وقت تک اس پر کمربستہ رہے۔ جب کبھی سرحد کے کسی علاقے میں غازیانہ معرکے شروع ہوتے تھے، وہ اپنی ضعیف العمری کے باوجود سب سے پہلے وہاں جا پہونچتے تھے۔ چٹیل میدان ہو یا پہاڑ، وہ شیر کی طرح ڈٹے رہتے تھے۔ انھوں نے آخری وقت تک جہاد سے مُنہ نہ موڑا۔

انگریزوں کے ساتھ حاجی صاحب کا آخری معرکہ ۱۹۳۵ء میں ایک پہاڑ کی چوٹی ناقمی پر ہوا جب کہ وہ ضعف کی وجہ سے پالکی میں اُٹھا کر لے جائے گئے کیونکہ پاؤں میں تکلیف ہونے کی وجہ سے وہ گھوڑے کی رکاب میں پاؤں ڈالنے سے معذور تھے۔ یہ ایک بہت نازک موقع تھا کیونکہ انگریزوں کی فوجیں ایسے مقام پر پہنچ گئی تھیں کہ ان کے لئے چوٹی سے نیچے اُتر کر ہلّہ بول دینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس وجہ سے حاجی صاحب خود مورچے پر تشریف لے گئے۔ ان کے پہنچنے کی خبر سنتے ہی بہت دور دراز عقبی علاقے سے ایسے ایسے قبائل بھی چلے آئے جو فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب لڑائی میں شریک ہونے سے قاصر تھے۔ جس طرح انگریز اپنی آخری طاقت اس آخری مورچے پر ڈال چکے تھے، اس طرح حاجی صاحب کی موجودگی کی برکت سے عقبی قبائل بہت دور سے اتنی تیزی کے ساتھ پہنچے جس کا کوئی امکان نہ تھا۔ حاجی صاحب نے انگریزوں کو حملے کا موقع نہ دیا اور خود پہل کر کے ناقمی کی چوٹی پر پہنچ کر ایسی دست بدست لڑائی کر کہ گائیڈز کا سارا رسالہ ختم ہو گیا اور اس میں سے صرف چند مخبر ہی زندہ رہ سکیں۔ اس زبردست فتح سے انگریزوں کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور فاتحین کو بے اندازہ مال اور اسلحہ، مالِ غنیمت کے طور پر ہاتھ آیا۔

حاجی صاحب کی توجہ صرف مقامی حالات ہی پر مرکوز نہ تھی اور وہ محض سیدھی سادی اصلاحوں ہی سے مطمئن نہ تھے۔ ان کی نظر بہت وسیع تھی، اس لئے وہ ہر قسم کے مفید اثرات کو قبول کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ انھیں برصغیر کے حالات اور تحریکات کا پورا پورا علم تھا۔ سید اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کے معرکے تو خود سرحد ہی میں ہوئے تھے اور ان کی صدائے بازگشت ذرہ ذرہ سے سنائی دیتی تھی۔ یہ معرکے حاجی صاحب کے لئے ایک مقدس ورثہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے ان اولوالعزم مردانِ جانباز کی شاندار روایات گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ حج نے ان کو تمام دنیائے اسلام کی انقلابی سرگرمیوں سے روشناس کیا۔ کیونکہ حریم کعبہ تمام زعمائے ملت کا مرکز و محور تھی۔ ان دنوں جمال الدین افغانیؒ کی تحریک کا چرچا عام تھا اور تمام اقوام عالم اس سے متاثر تھیں۔ یہ تحریک اقوام غالب سے آزادی، جد و جہد اور نشاۃ الثانیہ ہی کی تحریک تھی اور حاجی صاحب نے اس کا پورا پورا اثر قبول کیا۔ وطن کو واپس آتے وقت وہ برصغیر سے گزرے اور یہاں کے حالات سے واقف ہوئے۔ ان دنوں یہاں حصول تعلیم اور آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ حاجی صاحب نے اس سے بہت گہرا اثر قبول کیا اور اپنے علاقہ میں ایسی ہی تحریکات جاری کرنے کا تہیّہ کیا۔ برصغیر کے حالات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے تعلیم کی ضرورت بھی محسوس کی اور اس کا فیض عام کرنے کے لئے انھوں نے ایک پرزور تحریک جاری کی۔ وہ تعلیم کے بہت سرگرم مبلغ تھے۔ انگریزوں نے محسوس کیا کہ اگر یہ تحریک پروان چڑھی اور حاجی صاحب اپنے بلند مقاصد میں کامیاب ثابت ہوئے تو برصغیر کی طرح سرحد میں بھی بیداری پیدا ہو جائے گی جو اُن کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوگی۔ اس لئے انھوں نے حاجی صاحب کے مریدوں اور پیروؤں کو بے دریغ گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ اس سے حاجی صاحب کو شدید اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر وہ انگریزوں کے مقبوضہ علاقے میں فروکش رہے تو وہ بھی گرفتار ہو جائیں گے۔ اس لئے انھوں نے مہمندوں کے علاقے میں ہجرت کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی اور اس کو اپنی سرگرمیوں کی جولاں گاہ بنا لیا۔ قبائلی علاقے میں پہونچ کر ان کی سرگرمیاں بدل گئیں۔ چنانچہ جہاں وہ پہلے پٹھانوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت پر توجہ دیتے تھے، وہاں اب انگریزوں کے خلاف جہاد پر زور دینے لگے۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ فرزندانِ اسلام دوسری قوموں کے غلام ہو کر با عزت زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس لئے انھوں نے اس کی مخالفت کا عزم بالجزم کر لیا۔ انگریزی سیاست کا ایک زبردست وار یہ تھا کہ اس نے سرحد اور پنجاب کے متحدہ علاقہ کو دو ٹکڑے کر دیا۔ چنانچہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا ایوان تقدیر ہی یہ ذومعنی اور حقارت آمیز فقرہ جو اس منحوس فیصلہ کے وقت انھوں نے اوپر گیلری میں بیٹھے ہوئے چست کیا تھا، کسے یاد نہ ہوگا کہ

I LOOK DOWN UPON YOU

یعنی ایک تو میں واقعی تمہاری کارستانیاں اُوپر سے دیکھ رہا ہوں اور دوسرے میں تمہاری اس حرکت کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اس اقدام کو یہاں کے باشندوں نے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ جو ریل گاڑیاں سرحد کو جاتی تھیں ان کو سخت خطرہ درپیش ہوتا تھا اور حفاظت کے لئے

جو کمپارٹمنٹ پر سپاہی متعین ہوتے تھے۔ حاجی صاحب کی آزاد منشی اور حریت پرستی غلبۂ اغیار کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ چنانچہ فرنگیوں کے بارے میں ان کے جذبات و احساسات وہی تھے جو سرحد کے تمام فرزندان غیور کے تھے اور وہ ان کی مخالفت کو دینی فرض خیال کرتے تھے ۔

جہاں حاجی صاحب پٹھانوں کی ترقی کے لئے انگریزوں سے رزم و پیکار کی پالیسی کے قائل تھے وہاں صاحب زادہ عبدالقیوم مصالحانہ تعاون سے اسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب صاحب موصوف علی گڑھ تشریف لے گئے تو پٹھان طلباء نے جو وہاں تعلیم پا رہے تھے ان کو دعوت دی اور اپنے علاقے میں کالج قائم کرنے پر زور دیا۔ حاجی صاحب جان و دل سے اس کار خیر کے حامی تھے اور اس لحاظ سے صاحب زادہ عبدالقیوم سے طبعاً ہم آہنگ تھے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا اور اس طرح تیبر کے مُنہ پر چراغ جلایا۔ اس سے چپکے ہی چپکے گویا زیر زمین، ایک سیاسی ہلچل اور بیداری پیدا ہو گئی جس نے آگے چل کر معرکے کا کام کیا ۔

انگریزوں نے آزاد علاقے کو اپنی فوجوں کی تربیت گاہ بنا رکھا تھا اور آئے دن اس پر یلغاریں کرتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قبائلی جنگ و جدل ہی میں مصروف رہیں اور ان میں ایکا نہ پیدا ہو۔ اگر وہ ذہنی طور پر بیدار ہو گئے تو ان میں لازمی طور پر یگانگت پیدا ہو جائے گی اور انگریزوں کے سرحد میں قدم جمنا تو درکنار ان کے لئے خود کو دوسری جگہوں میں سنبھالنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ یہاں کے باشندوں کو ڈرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی استقامت کے لئے ملاؤں اور پیروں کا حربہ بھی استعمال کئے بغیر نہ چھوڑا۔ چنانچہ ان میں سے بعض ان کا آلۂ کار بنے رہے اور اپنی ریشہ دوانیوں سے حاجی صاحب کی سرگرمیوں میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے رہے۔ انہی کا مکمل طور پر سد باب کرنے اور اپنی جد و جہد کو کامیاب کرنے کے لئے وہ وادیٔ پشاور میں مقیم ہوئے اور اسی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ انھوں نے اتمان زئی آزاد اسکول کے نام سے جو ادارہ قائم کیا تھا وہ برابر برقرار رہا اور آخر کار اس کا الحاق جامعہ ملیہ دہلی سے ہوا۔ جب حاجی صاحب ہجرت کر کے چلے گئے تو یہی اسکول انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کا مرکز رہا اور جیسے جیسے برصغیر میں سیاسی روشیں جاری ہوتی رہیں، یہاں کی تحریک بھی کروٹیں بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ آخری دو مطالبۂ پاکستان کے ساتھ ہمکنار ہوئی اور اس طرح وہ آزادی جس کی حاجی صاحب کو ہمیشہ تمنا رہی اور جو اُن کا محبوب ترین نصب العین تھی، آخر کار مسلمانان برصغیر کو میسر ہوئی۔ اس طرح جس فیضان کے لئے ہم قائد اعظمؒ اور دیگر مجاہدین ملت کے ممنون ہیں اس میں سرحد کے اس مرد مجاہد کا بھی کافی حصہ ہے اور اس کی یاد ہم سب کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ تازہ رہے گی۔

حاجی صاحب ۱۹۳۷ء میں جاں بحق تسلیم ہوئے اور آخری وقت تک فرنگیوں کے خلاف جہاد میں سرگرم کار رہے۔ چنانچہ ان کا آخری معرکہ جو ناکامی کی شکل پر منتج ہوا ۱۹۳۵ء ہی میں لڑا گیا اور اس نے جہاں انگریزوں کے قدم پیچھے لوٹا دیئے وہاں فرزندان سرحد کی فتح و کامرانی کا علم ہمیشہ کے لئے نصب کر دیا اور وہ حریت کے میدان میں برابر آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ پاکستان کا سبز و سفید پرچم مکمل آزادی کی علامت بن کر فضاؤں میں لہرا گیا ۔

•

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر میں ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا غدر، دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سر لُٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضہ کا، اس میں بہت سے پیٹ بھر مرے، پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑا لڑکا، ایک داروغہ، خدا ان دونوں کو جلد صحت دے!

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلال عہد وصال بتاں نہ پوچھ

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوتا ہے (غالبؔ)

عوامی تحریک
(دکن میں)

مسلم ضیائی

غلامی اور محکومیت ایسی لعنتیں ہیں، جنہیں کوئی باشعور فرد یا قوم کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں اس برصغیر پر برطانوی عملداری کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی مخالفت میں بھی اضافہ ہوتا رہا، لیکن یہ مخالفت نہ تو پوری طرح منظم ہی تھی اور نہ ملک گیر منظم قومی جذبہ نہ ہونے کے باعث رفتہ رفتہ انگریز شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پورے ملک پر قابض ہو گئے۔ اجنبی حکمرانوں کو نہ تو اہلِ ملک کے جذبات و احساسات کا لحاظ تھا اور نہ اُن کی بھلائی کا خیال۔ اُن کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا جسے عرفِ عام میں استحصال کہتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کبھی تو ملکی مصنوعات پر بھاری محصول عائد کئے اور کبھی اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش کی۔ اس کے باعث ایک شدید مگر خاموش کشمکش شروع ہو گئی۔ جسے انگریزوں نے اپنی پوری قوت سے کچلا۔ یہ داستان بہت طویل ہے اور اس میں قدم قدم پر جہاں سازشیں اور غداریاں نظر آتی ہیں وہیں آزادی کے لئے دیوانہ وار بہادرانہ کوششیں بھی۔ اگر ایک طرف میر جعفر اور میر صادق ہیں تو دوسری طرف ٹیپو سلطان اور اسمٰعیل شہید۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کے لئے ان ابتدائی کوششوں کو انگریزوں نے بڑی بے دردی سے کچلا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چنگاریاں راکھ میں دب گئیں، لیکن سلگتی رہیں اور آخر کار ۱۸۵۷ء میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں جس نے برصغیر کے بیشتر علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

انیسویں صدی کے آغاز تک بدیسی حکومت کے خلاف مقامی باشندوں کی کشمکش دیسی حکمرانوں اور کمپنی بہادر کے درمیان رہی، لیکن اس کے بعد اس کشمکش نے عوامی شکل اختیار کر لی۔ معاشی لوٹ کھسوٹ، مسیحیت کی سرپرستی اور عام بے روزگاری نے عوام کے دلوں میں بدیسی حکمرانوں کے خلاف، جو کمپنی بہادر کے نمائندے تھے، عام نفرت کا احساس پیدا کر دیا۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ، اُن کے اہلِ خاندان اور متبعین نے باقاعدہ مخالفت شروع کی اور اس طرح بدیسی حکومت کے خلاف وہ تحریک پروان چڑھی جسے وہابی تحریک کہتے ہیں اور جس کے ممتاز ترین رہنما سید احمد بریلوی اور اسمٰعیل شہید تھے۔ یہ تحریک نہایت منظم تھی، اس کے مبلغوں نے چپاتیوں کے اندر چھپا کر اپنے پیغامات ملک کے قصبے قصبے اور قریے قریے تک پہنچا دیئے۔ انگریزوں نے اس تحریک کو بڑی بے دردی سے کچلا اور اس بُری طرح بدنام کیا کہ آج بھی خود بہت سے مسلمان لفظ "وہابی" سے بدکتے اور اس کو بُرا کہتے ہیں۔

اگرچہ انگریز ان بہادروں کو کچلنے میں کامیاب ہو گئے، ان کے رہنماؤں کو پھانسیاں دی گئیں اور توپوں سے باندھ کر اڑا دیا، پھر بھی اس نفرت کو ختم نہ کر سکے جو مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کے لئے بدیسی حکمرانوں کے خلاف پیدا ہو گئی تھی۔

دکن بھی اس تحریک سے متاثر ہو چکا تھا۔ کرناٹک اور میسور کی حکومتیں ختم ہو چکی تھیں اور حیدرآباد میں انگریز رزیڈینٹ ظلِ اللہ بنا ہوا تھا۔ سازشوں کا بازار گرم تھا اور ہر باشعور شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار چراغِ سحری بن کر دم توڑنے کے قریب ہے۔ وزراء اور اُمراء سازشوں میں مصروف تھے، لیکن عوام بدیسی حکمرانوں کی لیٹروں سے بیزار تھے اور آزاد ہو کر بہ جبر غاصبوں کو اپنے وطن سے نکال دینا چاہتے تھے۔ اس لئے جوں ہی میرٹھ اور دہلی سے انگریزوں کے خلاف شورش کی اطلاعات وصول ہوئیں، حیدرآباد میں بھی برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں اور جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔

عین اسی زمانے میں نظام حیدرآباد نواب ناصر الدولہ کا انتقال ہو گیا اور ایک کم سن لڑکے افضل الدولہ کو جانشین بنایا گیا۔ اس وقت حیدرآباد کے مدار المہام نواب سالار جنگ اوّل میر تراب علی خان تھے۔ اُن کا شمار برطانوی حکومت کے وفادار ترین دوستوں میں ہوتا ہے۔ ناصر الدولہ نے مرتے مرتے اپنے بیٹے افضل الدولہ کو وصیت کی تھی کہ انگریز کا ہمیشہ وفادار رہنا، اس لئے جس وقت شمال میں آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو حکومتِ حیدرآباد کا رویہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔

افضل الدولہ کو مسندِ نظامت پر بیٹھا کر برطانوی رزیڈینٹ کرنل ڈیوڈسن ریذیڈنسی پہنچا ہی تھا کہ اُسے گورنر جنرل کا تار ملا جس میں لکھا تھا کہ "دہلی کو باغیوں نے فتح کر لیا ہے۔ وہاں کے انگریز حاکم اور بہت سے یورپین مارے گئے ہیں اور باقی پریشانیوں میں گرفتار ہیں۔" اس اطلاع کے وصول ہوتے ہی ریذیڈینٹ نے حیدرآباد کے میر جعفر یعنی سالار جنگ اوّل میر تراب علی خاں مدار المہام حکومتِ آصفیہ کو طلب کیا اور تمام حالات سنا کر مشورہ کیا۔ اس وقت سالار جنگ نے بتایا کہ شہر میں تین روز سے یہ

انوا ہیں پھیل رہی ہیں، اور عوام دہلی میں انگریزوں کی شکست کو برصغیر سے انگریزی حکومت کے خاتمہ کی نشانی تصور کرتے ہیں۔

مشوروں کے بعد سالار جنگ نے وعدہ کیا کہ حکومت حیدرآباد اس آڑے وقت میں انگریزوں کا ساتھ دے گی، اور ہر قسم کی شورش کو پوری قوت سے کچلنے کی کوشش کریگی۔ چنانچہ اس کے بعد ہی شمع آزادی کے پروانوں کو ختم کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ریاست حیدرآباد میں اورنگ آباد شمالی حصۂ ملک سے زیادہ قریب ہے نظام کے دارالحکومت یعنی شہر حیدرآباد سے فاصلے پر بھی ہے چونکہ وہاں دہلی کی خبریں سب سے پہلے پہنچتی تھیں، اس لئے آزادی کا علم بھی سب سے پہلے وہیں بلند ہوا اور چند بہادر خفیہ طور پر حیدرآباد روانہ ہوئے تاکہ دارالحکومت میں انگریزوں کے خلاف آزادی کا جھنڈا بلند کیا جائے۔

یہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ حکومت حیدرآباد اور رزیڈینٹ کے درمیان پہلے ہی سے آزادی کی کوششوں کو کچلنے کے لئے ساز باز ہو چکی ہے، اس لئے انہوں نے خفیہ طور پر اپنا کام شروع کر دیا اور عوام کو بغاوت کے لئے تیار کرنے لگے۔ برطانوی حکومت اور سالار جنگ کو ان لوگوں کی آمد کا علم ہو گیا اور یہ لوگ گرفتار کرکے وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے رزیڈینٹ کے پاس روانہ کر دیئے گئے۔ یہ خبر عوام میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ان لوگوں کی رہائی کے لئے کوششیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپس میں مشوروں کے بعد طے پایا کہ افضل الدولہ سے مل کر ان لوگوں کو رہا کرایا جائے اور اگر نظام اور سالار جنگ راضی نہ ہوں تو ان دونوں کو ختم کر دیا جائے۔

چونکہ آزادی پسندوں کے ارادوں اور مشوروں کی جملہ خبریں برطانوی رزیڈینٹ اور سالار جنگ کو جاسوسوں کے ذریعہ ملتی رہتی تھیں، اس لئے یہ لوگ پہلے ہی تیار تھے۔ چنانچہ شہر کے تمام دروازوں پر عربوں کے پہرے بٹھا دیئے گئے اور حکم دیا گیا کہ جو شخص بھی انگریزی حکومت کے خلاف نظر آئے یا لوگوں کو بغاوت کی ترغیب دیتا ہوا دیکھا جائے اُسے گولی مار دی جائے۔ اس کے بعد سارے شہر میں ڈھنڈورہ پٹوا کر عوام کو تنبیہ کی گئی، لیکن آزادی کے شیدائی تلواروں اور بندوقوں سے نہیں ڈرتے بلکہ آزادی کی خاطر اپنے سروں کو ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف یہ بہادر، شمع آزادی کے پروانے جہاد پہ وعظ کرتے اور لوگوں کو انگریزوں کی غلامی کا جُوا اتار پھینکنے کی تلقین کرتے تھے اور دوسری طرف نظام کے سپاہی اور نظام کے کارندے اُنہیں گرفتار کرکے پھانسی پر چڑھا دیتے یا گولیوں کا نشانہ بناتے۔

حکومت کی سختیوں کے ساتھ ساتھ عوام کا جوش بھی بڑھتا رہا اور بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو کئی ہزار بہادر باغیوں نے رزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ ان بہادروں کے سردار مولوی علاؤ الدین اور طرہ باز خاں تھے۔

برطانوی رزیڈنسی پرانے حیدرآباد کے شمالی جانب ایک وسیع سنگ بستہ قلعہ نما عمارت ہے، جس کی دیواروں میں گولیاں چلانے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سوراخ بنے ہوئے ہیں۔ باغی افسر نظام کی فوجوں کو دھکیلتے ہوئے رزیڈنسی کی دیواروں کے قریب پہنچ گئے اور قریب کے مکانات پر قبضہ کرکے اندر ہی اندر دیواریں توڑتے ہوئے قریب تھا کہ رزیڈنسی پر ایک زبردست حملہ کریں۔ اتنے میں ایک غدار میر اعظم علی نے رزیڈینٹ کو خبر پہنچا دی، جس نے فوراً ہی اس جانب سپاہی بھیج کر حفاظت کا انتظام کر لیا۔ پتھر سے بنی ہوئی رزیڈنسی کی عمارت حیدرآباد میں برطانوی اقتدار کا مظہر تھی۔ باغیوں کا ارادہ تھا کہ اسے فتح کرکے رزیڈینٹ کو گرفتار کرلیں تو انگریزی اقتدار کی شمع گل ہو جائے گی، لیکن چونکہ سالار جنگ اور دوسرے غداروں نے پہلے ہی سے ریذیڈینٹ کو حالات سے مطلع کر دیا تھا۔ اس لئے رزیڈینٹ کی فوج کیل کانٹے سے مسلح اور مقابلے کے لئے تیار تھی۔ رزیڈنسی کے اندر ہر قسم کے ہتھیار کثیر تعداد میں موجود تھے اور توپ خانہ حملے کے لئے تیار تھا، اس لئے جونہی باغی رزیڈنسی کے پاس اور مکانوں کے قریب پہنچے، رزیڈنسی کی بندوقوں اور توپوں نے آگ برسانا شروع کر دی۔ باغیوں کے پاس توپ خانہ نہیں تھا۔ دوسرے پست کی جانب سے نظام کی فوجوں سے حملہ کا اندیشہ تھا۔ اس لئے باغیوں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور کئی سو بہادر شہید ہو گئے۔ مجبوراً اُنہیں واپس ہونا پڑا۔ عین اس وقت سکندرآباد کی فوجی چھاؤنی سے بھی انگریزی فوج رزیڈنٹ کی مدد کو پہنچ گئی۔ اس وقت رزیڈنٹ اور سالار جنگ کے درمیان مشورہ ہوا۔ بعض انگریز فوجی افسروں کی رائے تھی کہ انگریزی فوجوں کو باغیوں کے غضب سے بچانے کے لئے دوسرے مقامات پر بھیج دیا جائے لیکن سالار جنگ نے اُن کی اس رائے سے اختلاف کیا اور انگریزی فوج رزیڈنٹ کو مدد دینے کے لئے حیدرآباد میں رہ گئی۔

اگر سالار جنگ کی انگریز پرستی آڑے نہ آتی تو حیدرآباد میں انگریزی قوت کمزور ہو جاتی۔ باغی بآسانی رزیڈنٹ کو شکست دے کر حیدرآباد میں برطانوی

اقتدار کا خاتمہ کر دیتے اور حیدرآباد کو اِن مصیبتوں اور ذلتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو اس کے بعد "یار وفادار" کہلائے جانے کے باوجود ۱۹۴۷ء تک نظام پر مسلط رہیں۔

بہرحال ان مشوروں اور تفصیلوں کے بعد نظام اور انگریزوں کی فوجوں نے باغیوں پر حملے شروع کر دیئے، چاروں طرف افواہیں پھیلائی گئیں اور غداری کے لئے انعام مقرر ہوئے۔ نیز سالار جنگ نے اعلان کیا کہ جو کوئی مولوی علاؤالدین اور طرہ باز خاں کے سر لائے گا اُسے پانچ ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔

فوج اور باغیوں کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں، جن میں طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں بہادر سردار یعنی علاؤالدین اور طرہ باز خاں ایک سازش کے تحت گرفتار کر لئے گئے۔ علاؤالدین خان انڈمان بھیج دیئے گئے جہاں کئی سال بعد انہوں نے وطن سے دور وفات پائی۔ طرہ باز خاں کی ران میں گولی لگی تھی، لیکن چند روز بعد ایک دن موقع پاکر، جب کہ ابھی اُن کے زخم مندمل بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ قید سے بھاگ نکلے اور بعد میں ۱۲۷۵ء میں ایک اور غدار میر قربان علی بیگ کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جنگل میں ایک باؤلی میں پانی پینے کے لئے اترے تھے، غدار مذکور انہیں دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ موقع پاکر اس نے گولی چلادی اور ذرا ہی دیر میں آزادی کا یہ نڈر سپاہی خاک و خون میں غلطاں نظر آیا۔

باغیوں کی ناکامی کے کئی اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ اُن کے سپاہی تربیت یافتہ نہ تھے۔ دوسرے اُن کے پاس اعلیٰ ہتھیار اور توپ خانہ نہیں تھا تیسرے وہ دو دشمنوں یعنی نظام اور انگریزی فوجوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ چوتھے اُن کے خلاف جاسوسوں کا ایک زبردست جال بچھا ہوا تھا اور بڑی زبردست سازشیں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اس زمانے میں انگریزوں اور سالار جنگ کی جانب سے سینکڑوں خط لکھوا کر حیدرآباد سے باہر مختلف مقامات پر بھیجے گئے۔ اِن خطوط میں لکھا گیا تھا کہ یہاں انگریزوں سے کئی زبردست لڑائیاں ہوئیں، لیکن ہر ایک میں انگریزوں کو فتح ہوئی اور باغیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ حیدرآباد میں بھی دوسرے مقامات سے اسی قسم کے خطوط موصول ہوئے۔ اِن خطوں کے باعث عوام میں دہشت پھیل گئی اور جو لوگ باغیوں کی مدد کرنا چاہتے تھے، گھبرا کر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

سقوط دہلی پر دکن میں بھی بغاوت کے شعلے خاموش ہو گئے۔ برطانوی حاکموں کی درندگی اور بربریت چنگیز اور ہلاکو سے بھی بڑھ گئی۔ ہزاروں لاکھوں انسان قتل کئے گئے یا انہیں عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ نہ مقدمہ تھا اور نہ گواہ، بیان تھا نہ شنوائی۔ جرم صرف اس قدر تھا کہ تم حکومت کے خلاف آزادی کا علم کیوں بلند کیا۔

اس کے باوجود چند بہادر اپنی جانوں پر کھیل رہے تھے، مگر اب یہ جنگ اجتماعی نہیں تھی، انفرادی رہ گئی تھی۔ چنانچہ فروری ۱۸۵۹ء میں شمالی ہند کے ایک باشندے جہانگیر خاں نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن پر گولی چلائی جو سالار جنگ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نظام کے دربار سے واپس آرہا تھا۔ اتفاق سے گولی نہ لگی اور سالار جنگ کے سپاہیوں نے حملہ کر کے جہانگیر خاں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس پر بھی جہانگیر خاں زندہ رہے۔ اس سے قبل بھی انہوں نے ایک انگریز افسر کرنل میکنزی پر حملہ کیا تھا۔ رزیڈنٹ اور سالار جنگ کے حکم سے اس مغنفہ گوشت کو قید میں رکھا گیا اور ہر قسم کی تکلیفیں دے کر اُن سے ساتھیوں کے نام پوچھے گئے۔ اس بہادر نے ایک ماہ تک ہر قسم کے مظالم برداشت کئے، لیکن زبان سے کسی کا نام نہ لے کر اسی حال میں انتقال کیا اور اس طرح حیدرآباد میں آزادی کی آخری شمع بجھ گئی۔

ماہِ نو کراچی۔ مئی ۱۹۵۷ء

انقلاب کے بعد کا ادب

سید عابد علی عابد

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جسے انگریز مورخ غدر کہہ کر پکارتے ہیں، کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے جس دن سے انگریزوں نے اس ملک پر پاؤں جمانے تھے اسی دن سے تحریک آزادی کی چنگاریاں بھی سلگنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کے دل سے طبعاً اغیار کی حکومت کے برخلاف جذبے کا رنگ چوکھا تھا کیونکہ انگریزوں نے انہی کی عظمت کے کھنڈروں پر اپنی بنا تے ملکت استوار کی تھی۔ بہرحال ۱۸۵۷ء ملک پر گہرے اور دیرپا اثرات پیدا کر کے رفع ہوگیا جن دنوں تحریک آزادی عروج پر تھی۔ انہی دنوں انگریز مدبروں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کے رہے سہے اقتدار کو ملیامیٹ نہیں کر دیا جائے گا انگریزی حکومت کی بنیادیں استوار نہیں ہوں گی ⁖

تحریک آزادی کے فرو ہونے کے بعد انگریزوں کی نئی حکمت عملی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ مسلمان امیروں اور جاگیرداروں کی ریاستیں ختم کر دی گئیں مسلمانوں کو چن چن کر تہ تیغ کیا گیا۔ ملک میں مسلمانوں کی حکومت کی آخری علامت یعنی بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیج دیا گیا۔ اور صحیح معنی میں برعظیم ہند و پاکستان میں فرنگی عملداری قائم ہوگئی۔ مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک مقام تھا ایک تو یہ کہ وہ سیاسی طور پر کچلے جا رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ اقتصادی طور پر بھی ان کو بے حال بنانے کی کوششیں جاری تھیں۔ اس وقت سر سید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ایسے اسلوب سے رہنمائی کی کہ باید و شاید۔ سر سید نے بجا طور پر محسوس کر لیا تھا کہ اغیار اس موقع پر ہر اس تحریک کو سختی سے کچل دیں گے جس میں کسی سیاسی عنصر کی آمیزش ہو یا جو مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس لئے سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے بچے کھچے ذوق عمل کا رخ موڑ کر ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کے حیرت انگیز اثرات رونما ہونے والے تھے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اغیار ہی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حملہ کیا جائے اور اس حملے کی رفتار ایسی ہو کہ جب تک کاری اور مہلک ضرب لگانے کا مقام نہ آئے اس وقت تک اغیار خطرے کی نوعیت سے بالکل باخبر نہ ہونے پائیں ⁖

سر سید احمد خاں نے اس حملے کے مقدمات یہ قرار دیئے ⁖

(۱) مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور انگریزی علوم و فنون سے باخبر کیا جائے تاکہ وہ مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو کامیابی سے روک سکیں ⁖

(۲) مسلمانوں کے دل میں اپنی تمدنی اور ثقافتی عظمت کا احساس پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی جرأت کو دوبارہ حاصل کرنے میں کوشاں ہوں ⁖

(۳) تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو آہستہ آہستہ ایسی ارتقا یافتہ شکل دی جائے کہ وہ اغیار کی حکومت کا جوا آہستہ آہستہ اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں ⁖

سر سید احمد خاں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے طبعاً ادب کا وسیلہ ڈھونڈا اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنے اردگرد ایسے لوگوں کو جمع کر لیا جو ہر طرح ان کے محرم راز تھے۔ انھیں لوگوں نے تخلیقات ادب کے ذریعے آہستہ آہستہ وہ چنگاریاں سلگائیں جن کو شعلے بن کر برعظیم ہند و پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لینا تھا۔ سر سید احمد خاں کا منصوبہ کتنا منظم تھا، اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے اب تک جتنے چشمے پھوٹے ہیں۔ ان کا ماخذ و منبع انہی لوگوں کی تحریریں تھیں جو سر سید کے رفقائے کار تھے۔ ذرا غور کیجئے گا۔ مذہب کے معاملے میں تنگ نظری رفع کرنے کے لئے خود سر سید نے قرآن مجید کی ایک نئی تفسیر لکھی اس سلسلے میں انھوں نے مخالفتیں بھی برداشت کیں ان کے خلاف کفر کے فتوی بھی صادر ہوئے لیکن وہ برابر اپنے کام میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ اکبر الہ آبادی کو بھی جو ان کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے کہنا پڑا۔

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

''اے خاصہ' خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے''

'' اٹھے ہیں جفاپیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہرکرا!''

چند ادبی پیشوا

، نے اپنے سحر سخن سے اہل قوم
کے دلوں کو جوانی بخشی !
الی ۔ حسرت ۔ ظفرعلی خاں

ندا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
وں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا''

مجاهدین ملت کی

آخری آرام گاهیں

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کا مزار (بیت المقدس)

شاہ اسماعیل شہید رحہ کا مزار
بالاکوٹ (مغربی پاکستان)
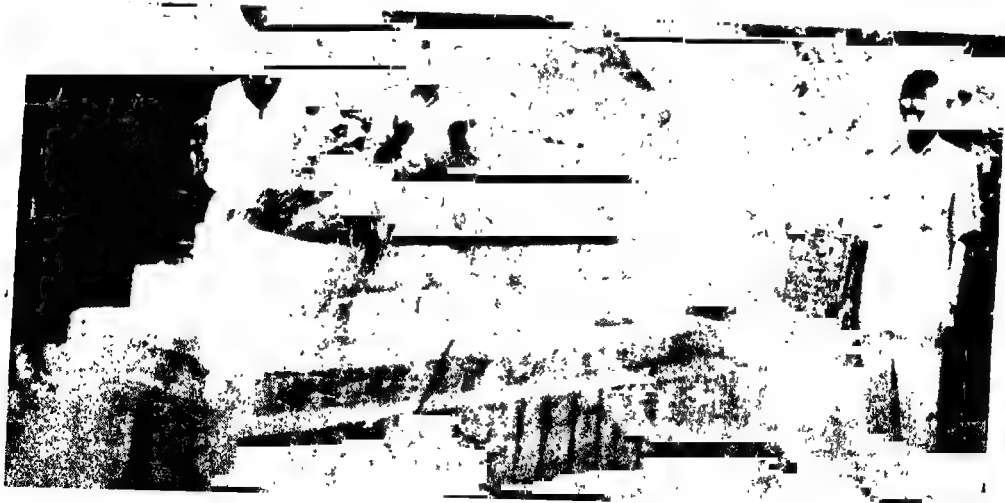
سید احمد بر
کا مزار (بالا
مغربی پاک

سرسید کے رفقا سے جس شخص نے سب سے زیادہ بے لوثی سے مسلمانوں کی خدمت کی اور سرسید کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اعانت کی اسے تاریخ حالی کہہ کر یاد کرتی ہے۔ حالی کی نثری اور شعری تخلیقات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ قوم کو ایک نئے حملے کے لئے تیار کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس حملے سے مراد یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی چنگاریوں کو پھر سلگایا جائے تاکہ آخر کار مسلمان اغیار کی حکومت سے نجات حاصل کر کے اپنی تمدنی اور سیاسی میراث کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ مسدس میں اس مقصد کے حاصل کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب، انداز بیان، زاویۂ نظر، مطالب و معانی، ترتیب سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اگرچہ حالی انگریزی حکومت کی برکتوں کے گن بھی گاتے تھے۔ اور یہی مصلحت تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہ تلقین بھی کرتے تھے کہ ان برکتوں سے صحیح طریقہ پر بہرہ یاب بھی ہوں۔ جمہوریت کے اصولوں کے مطابق سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی غالباً اردو میں یہ پہلی منظم کوشش تھی اور اس میں حالی کا طریقہ پیچدار تھا۔ رفتہ رفتہ حالی نے اقبال کی ہنگامہ آرائی کے لئے فضا ہموار کی۔ حالی کی بعض سیاسی نظمیں اور جدید غزلوں کے بعض اشعار نہایت معنی خیز ہیں مثلاً:۔

صلح ہے یا مہلت سامانِ جنگ — کرتے ہیں بھرنے کو خالی یاں تفنگ

کبک و قمری میں یہ جھگڑا ہے چمن کس کا ہے — کل خزاں آ کے بتا دے گی وطن کس کا ہے

ڈاکٹری معائنے کے سلسلے میں کالے اور گورے کے فرق پر جو انھوں نے مختصر سی نظم لکھی ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اقبال نے مغرب کی تہذیب کو مغربی افکار سے مسلح ہو کر جس طرح غارت کرنے کی کوشش کی ہے، حقیقت میں وہ حالی ہی کا فیضان ہے۔ حالی کے شریک کار ادیبوں میں شمس العلما مولانا حافظ نذیر احمد بھی تھے۔ جو ڈپٹی نذیر احمد کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ جنگ آزادی کی ناکام تحریک کے بعد جب سرسید احمد نے مسلمانوں کے تعلیمی اور تمدنی احیا کا بیڑا اٹھایا تو نذیر احمد نے غالباً سب سے زیادہ ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی قوم صحیح معنی میں اس وقت تک تمدنی اور سیاسی سوجھ بوجھ کی حامل نہیں ہو سکتی جب تک اس قوم کی عورتیں تعلیم یافتہ اور مہذب نہ ہوں۔ نذیر احمد نے اپنے فسانوں، ناولوں اور تحریروں کے ذریعے عورتوں کو یہ ترغیب دلائی کہ وہ تعلیم و تربیت سے بہرہ یاب ہوں۔ اور ان نونہالوں کو اپنی آغوش شفقت میں پروان چڑھائیں، جنھیں ایک نئی جنگ آزادی میں حصہ لینا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو عورتوں کی تربیت کا کتنا خیال تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ توبۃ النصوح میں انھوں نے عورتوں کی کردار کشی میں نہ صرف احتیاط اور چابک دستی سے کام لیا ہے بلکہ ان کو اصلاح اور مردوں کی اصلاح پر مقرر کیا۔ غالباً ان کی کتاب اُمہات الامہ میں بھی عورتوں میں اپنے صحیح مقام کا شعور پیدا کرنے کی جو کوششیں انھوں نے کی تھیں اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے استیصال کی جو منظم کوشش کی گئی تھی اس کو ناکام بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو اپنی گزشتہ عظمت یاد دلائی جائے تاکہ انھیں احساس ہو کہ وہ کن کن انقلابات سے گذر کر کن کن مقامات تک پہنچے۔ اس بات کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے دل میں یہ یقین پیدا کیا جائے کہ ان کے علمی اور فنی ادارے اپنے زمانے کے اعتبار سے مغرب کے اداروں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی معلومات حاصل ہونے سے ہمارے دل میں بجا طور پر یہ خیال آتا ہے کہ ہم تہذیب مغرب کے محتاج نہیں ہیں اور ہم نے بھی مملکت داری اور جہانبانی کے اصولوں کو سمجھا اور برتا ہے۔ سرسید کی نگرانی میں یہ کام شبلی نعمانی نے انجام دیا۔ اُن کی تصانیف المامون، الفاروق اور ان کے مختلف مضامین جو رسائل شبلی کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں سب کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تمدنی میراث کی ہمہ گیری سے آگاہ کیا جائے۔ سچ پوچھیے تو ان کی کتاب سیرت النبی جنگ آزادی ہی کی تحریک کا رد عمل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی عملداری قائم ہو جانے سے جو دوررس نتائج پیدا ہوئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لوگ مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور اس بیگانگی کے پیدا کرنے میں ان مستشرقین اور پادریوں کی تحریروں کا بہت حصہ تھا جو رسول اقدس کی زندگی کے واقعات کو مسخ کر کے پیش کرتے تھے۔ سیرت النبی ان تمام اعتراضات کا مدلل جواب دینے کی کوشش ہے جو غیروں نے اسلام کے پیمبر یا اسلامی تعلیمات پر کئے تھے۔

سرسید کے دور ہی میں اکبر نے اپنا جہاد اکبر شروع کر دیا تھا۔ اس کا کلام گویا حالی اور اقبال کے کلام کے درمیان نہایت اہم درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر کو سرسید سے اختلاف تھا۔ یہ اختلاف حصول مقصد سے نہ تھا طریق کار میں تھا اور کچھ یہ بھی تھا کہ اکبر نے سرسید کی تحریک کی غایت سمجھنے

میں مجتہدانہ غلطی کی۔ بہرحال مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی شعور کے احیا میں اکبر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کی بغاوت مغربی تہذیب، تمدن، تعلیم اور یہاں تک کہ سائنس کے خلاف بھی تھی۔ یوں ان کے کلام میں افراط کی ناہمواری پائی جاتی ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے مغرب کے قائم کردہ تہذیبی، تربیتی اور عملی اداروں کے نقائص کو کھول کھول کے بیان کیا اور یوں ہمارے دل میں احساس پیدا کیا کہ جس چیز پر ہم دیوانہ وار مرمٹے ہیں وہ اتنی والہانہ شیفتگی کی سزاوار نہیں۔ ان کی نظم، دہلی دربار، نہایت معنی خیز سیاسی اشاروں پر مشتمل ہے یہ بند سنئے گا:

اوج بخت ملاقی ان کا — چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا — آنکھیں میری باقی ان کا

'برق کلیسا' میں انھوں نے جس لطافت اور خوبی سے اس قیمت کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کو حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے میں ادا کرنی پڑی اس کی نظیر اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔ برق کلیسا، تہذیب فرنگ ہے کہ مسلمان سے ذوق عمل، سیاسی شعور، جہاد کی تمنا، ایمان کا احساس چھین لینا چاہتی ہے اور اس کے بدلے کچھ دولت دنیوی اور کچھ اعزاز منصبی عطا کرتی ہے۔ برق کلیسا کہتی ہے:

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

بے چارہ مسلمان کہتا ہے۔

جوہر تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار — نور ایماں کا ترے آئینۂ رخ پہ نثار
میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو — ہنس کے بولی تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

حالی اور اکبر کے بعد اقبال نے مسلمانوں کو ایک نئی جنگ آزادی کے لئے تیار کرنے کے لئے اپنی تمام شاعرانہ استعداد اور اپنی غیر معمولی ذہانت کو اس طرح صرف کیا کہ اس کا کلام اس ذہنی بیداری ملی کی علامت بن کر رہ گیا جس کے پیدا کرنے میں حالی اور سرسید نے اتنا نمایاں حصہ لیا تھا۔ صحیح یہ ہے کہ اقبال بھی اس شعری تحریک کی پیداوار ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوئی تھی لیکن اس کا اسلوب اپنے پیشروؤں سے مختلف ہے۔ اقبال کے پیشرو ہمارے ذہنوں کو آزاد کرنا چاہتے ہیں اور تہذیب مغرب کے مقابلے میں مشرقی تمدن کو پیش کرتے ہیں۔ اقبال ایسا بھی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کرتا ہے کہ مغرب کے تمام علوم و فنون سے مسلح ہو کر مغرب کے فلسفے اور منطق کی تمام موشگافیوں سے کام لے کر مغربی تہذیب کے تمام نکات سے باخبر ہو کر تہذیب مغرب پر ایسی کاری ضرب لگاتا ہے کہ یہ بت سنگیں پاش پاش ہو کر گر پڑتا ہے۔ "ضرب کلیم" کا ذیلی عنوان ہے: "اعلان جنگ عصر حاضر کے خلاف" اور ظاہر ہے کہ عصر حاضر تہذیب فرنگ کا عصر ہے، فرنگی سامراج کا دور ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کرتا بلکہ تحریر اور تقریر کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے ایک خطے کا مطالبہ کرتا ہے جہاں وہ اپنے ملی اور قومی خصائص کو برقرار رکھ سکیں اور اقتصادی طور پر پروان چڑھ سکیں۔ اقبال ہی نے آخری دور میں ہمارے ذہن کے تمام جالوں کو صاف کر دیا۔ مشرق میں جو زندگی کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں ان کو ہوا دی۔ ہمیں اپنی تمدنی میراث کی عظمت سے بخوبی باخبر کیا اور آہستہ آہستہ ہمیں ایسے مقام پر لے آیا جہاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک مطالبۂ پاکستان کی شکل اختیار کر گئی۔ ضرب کلیم میں وہ کہتا ہے:

محنت باریک ہیں امراض امم کے اسباب — کھول کر کہئے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دین خیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ — دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی

اقبال کی مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی رفتار میں خود اپنے گمراہ امام اور شیوخ حائل ہیں۔ قیادت کا وہ بھی قائل ہے، امامت کی حقیقت کا وہ بھی معترف ہے، لیکن وہ مسلمانوں کی باگ ڈور اس تاریک دور میں اس شخص کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے جو امتوں کے امراض سے باخبر ہو اور ان کے علاج پر قادر ہو۔ یہ کام اس ملا کا نہیں جو بحث و جدل کو منصب حیات تصور کرتا ہے، اس شیخ کا نہیں جو خانقاہوں میں قوالی کی محفلوں کو حاصل زیست سمجھتا ہے۔ اس مدرس کا نہیں جو شاہین بچوں کو خاک بازی کا درس دیتا ہے بلکہ اس مرد قلندر کا ہے جو سلطان جابر کے حضور میں نعرۂ حق بلند کرتا ہے کہ اس سے بڑا جہاد تصور میں نہیں آسکتا۔ اقبال نے اپنی مختصر نظم کرامات میں ان تمام تحریکوں کو مہلک قرار دیا ہے جو سلاطین وقت کی پرستاری سکھاتی ہیں اور امام وقت اس کو

(باقی صفحہ نمبر ۱۲۴ پر)

ماہ نو کراچی۔ مئی ۔ ۱۹۵۷ء

عظیم اللہ خاں

شکیل احمد

۱۸۵۷ء میں جب آزادی کے لئے وہ عوامی کشمکش شروع ہوئی جس میں برصغیر کے عمائدین نواب ہی نہیں بلکہ ہر طبقے کے عوام الناس بھی فرنگیوں کو وطن سے نکال باہر کرنے اور وطن کو دوبارہ آزاد کرانے کے لئے اٹھے، تو جو ہستیاں خاص طور سے نظروں کے سامنے رہیں اور جنھوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے، ان میں سے ایک نہایت ممتاز ہستی عظیم اللہ خاں کی تھی۔

عظیم اللہ ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن دماغی صلاحیتیں کسی خاص رنگ ونسل، ملک وقوم یا طبقے کے لئے مخصوص نہیں ہوتیں اس لئے عظیم اللہ بھی ایک غریب گمنام گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کے ذریعہ اس مقام پر پہونچے جہاں اچھے لوگ محسود ہو جاتے ہیں اور جہاں دشمنوں کے قلم اور ان کی زبانیں ان کی مخالفت کرنے اور انھیں برا بھلا کہنے کے لئے تیزی سے حرکت کرنے لگتی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے متعلق انگریز مورخوں کی لکھی ہوئی جملہ کتابوں میں دوسرے آزادی پسند بہادروں اور انقلاب دوستوں کے مانند عظیم اللہ خاں کے لئے برے سے برے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور انھیں حقیر کرنے کے لئے لکھا ہے کہ وہ ایک اینگلو انڈین گھرانے میں باورچی یا خانساماں تھے۔

"پیشہ میں عیب" نہیں ہوتا عظیم اللہ خاں غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اپنا اور اپنے ماں باپ کا پیٹ پالنے کے لئے انھوں نے کمسنی ہی میں نوکری کرلی لیکن دنیا کے دوسرے عظیم انسانوں کے مانند وہ بھی عظمت اور بلندی کے خواب ہی نہیں دیکھتے تھے بلکہ عظمت حاصل کرنے کی عملی تیاریاں بھی کر رہے تھے چنانچہ انھوں نے اسی زمانہ میں انگریزی ہی نہیں فرانسیسی زبان میں بھی مہارت حاصل کرلی اور مہارت بھی ایسی کہ نہایت بے تکلفی سے دونوں زبانیں بولتے اور اپنا مافی الضمیر سننے والے کو پوری طرح سمجھا سکتے تھے۔

علم کے شوق نے بہت جلد اس نوجوان کو جس کی پیشانی پر بچپن ہی سے "ستارۂ بلندی" چمک رہا تھا، ملازمت کو خدا حافظ کہہ کر مدرسے میں داخل ہونے پر مجبور کیا چنانچہ وہ بہت جلد اپنے وطن کانپور ہی کے ایک مدرسے میں داخل ہو گئے اور ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اسی مدرسہ میں تعلیم بھی دینے لگے۔

پھول کھلتا ہے تو خوشبو بھی پھیلتی ہے۔ اس زمانہ میں باجی راؤ پیشوا کے متبنیٰ نانا صاحب کانپور سے قریب ہی بٹھور میں رہتے تھے۔ انگریزوں نے باجی راؤ کی پنشن سے نانا صاحب کو محروم کر دیا۔ انھیں ایک جوہر قابل کی تلاش تھی، عظیم اللہ خاں کی اعلیٰ قابلیت، معاملہ فہمی اور دماغی صلاحیتوں کی خبریں نانا صاحب تک پہنچیں تو انھوں نے "نوجوان و مثل پیراں پختہ کار" عظیم اللہ کو اپنے پاس طلب کیا۔ باتیں کیں تو جتنا سنا تھا اس سے بہتر پایا جس کے بعد یہ جوہر قابل نانا صاحب کا ایسا مشیر بن گیا جس کی صلاح و مشورے کے بغیر بعد کی زندگی میں نانا صاحب نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

کچھ روز بعد عظیم اللہ خاں کے مشورے سے نانا صاحب نے طے کیا کہ کمپنی کے خلاف حکومت انگلستان سے اپیل کی جائے اور مطالبہ کیا جائے کہ باجی راؤ کو جو آٹھ لاکھ روپیہ بطور پنشن دئے جاتے تھے وہ ان کے متبنیٰ بیٹے نانا صاحب کو دیا جائے کیونکہ وہی متوفی کے جائز وارث اور اس پنشن کے مستحق ہیں۔

چونکہ اس مسئلہ پر کسی انگریز پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس وقت عظیم اللہ خاں سے زیادہ معتمد، معاملہ فہم اور بہتر شخص نانا صاحب کی نظر میں نہ تھا اس لئے نانا صاحب نے انھیں اپنا معتمد وکیل بنا کر انگلستان روانہ کیا اور وہ ۱۸۵۴ء میں لندن پہونچ گئے۔

انگریز مورخ ہوں یا دیسی، دوست ہوں یا دشمن اس امر میں سب متفق ہیں کہ عظیم اللہ خاں نہایت وجیہ، خوش کلام اور خوش مزاج تھے۔ انگریزی رسم و رواج آداب واخلاق نیز انگلستان اور یورپ کے سیاسی معاملات اور حالات سے خوب واقف تھے اس لئے بہت جلد لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں مقبول ہو گئے۔ خرچ کرنے اور دعوتیں دینے کے لئے، روپیہ بھی کافی موجود تھا اس لئے ہر شخص انھیں "شاہزادہ" کہنے لگا بعض انگریز عورتیں ان سے محبت کرنے لگیں اور شادی کی خواہش مند ہوئیں۔ حالت یہ تھی کہ لندن کے جس پارک میں بھی عظیم اللہ خاں چلے جاتے چاروں طرف سے "ہندوستانی شہزادہ" کو گھیر لیا جاتا تھا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ عظیم اللہ خاں لندن میں پہونچ کر عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئے۔ اعلیٰ سوسائٹی میں جگہ پیدا کرنے سے ان کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ کسی طرح انگلستان کے صاحبِ اثر لوگوں سے دوستی پیدا کر کے اپنے مقدمہ میں کامیابی حاصل کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کمپنی کے ڈائرکٹر میٹھی میٹھی باتیں کر کے ٹالتے رہے اور جب بہت زیادہ زور ڈالا گیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ

"ہندوستان میں جو فیصلہ کیا گیا ہے، اس سے ہمیں اتفاق ہے"

یعنی باجی راؤ کے متبنّٰی نانا صاحب کو متوفی کی پنشن پر کوئی حق نہیں۔

عظیم اللہ خاں کو اس فیصلہ سے بڑا صدمہ ہوا۔ ان کی محنتوں پر پانی پھر گیا تھا لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ ان کے دل میں ایک نئی روشنی پیدا ہوئی اور ایک نئی آگ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے طے کر لیا کہ جو چیز درخواستوں اور عرضداشتوں سے حاصل نہیں ہوتی اسے بزورِ شمشیر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں ستارہ کی مرہٹہ حکومت کا نمائندہ رنگو باپوجی لندن میں مقیم تھا۔ اسے بھی اپنے مقدمہ میں ٹکا سا جواب ملا تھا جس کے باعث وہ غصّہ اور نفرت کی آگ سے جل رہا تھا۔ عظیم اللہ خاں اور رنگو باپوجی کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے اپنے اپنے مسائل ایک دوسرے کے سامنے رکھے اور مشورے کے بعد ایک ہی نتیجے پر پہونچے۔ آزادی کے لئے جنگ اور فرنگیوں کی حکومت کا خاتمہ۔

انھوں نے یہ بھی طے کیا کہ انگریزی حکومت پر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ باہر سے بھی ضربیں لگائی جائیں چنانچہ سرجان کے کا بیان ہے کہ نانا صاحب کی شکست پر بٹھور کے محل میں جو خطوط انگریزوں کو حاصل ہوئے ان میں سے اکثر خط انگلستان کے اعلیٰ طبقہ کی خواتین اور لندن والی محبوبہ کے تھے۔ دو خط ایک فرانسیسی لاافان کے تھے۔ چند عظیم اللہ خاں کے قلم سے لکھے ہوئے تھے جنھیں روانہ نہیں کیا گیا تھا۔ ان خطوں میں چندر نگر کے فرانسیسیوں اور کلکتہ کے غیر مطمئن لوگوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھا کر ان کا قلع قمع کر دیں۔ ایک خط قسطنطنیہ کے عمر پاشا کے نام تھا جس میں مقامی سپاہیوں کی بے چینی اور ملک کے عام حالات درج تھے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ نانا صاحب، شہنشاہ دہلی، نواب اودھ اور دوسرے امراء سے مراسلت کر رہے ہیں۔

بہرحال ان مشوروں کے بعد رنگو باپوجی ستارہ گئے اور وہاں جا کر دکن میں انگریزی حکومت کے خلاف علمِ آزادی بلند کرنے کی تیاریاں کرنے لگے لیکن عظیم اللہ خاں نے اس امر پر غور کرنا شروع کیا کہ یورپ کے کن کن ملکوں سے انگریزوں کے خلاف مدد مل سکتی ہے، اخلاقی بھی اور فوجی بھی۔ چنانچہ وہ پیرس ہوتے ہوئے قسطنطنیہ پہونچے جہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ زار کی فوجوں نے ساستوپل میں انگریزوں کو شکست فاش دی ہے۔ انگریز مورخوں کی رائے ہے کہ عظیم اللہ خاں یہ معلوم کرنے گئے تھے کہ روسی فوجیں انگریزوں کے خلاف ایشیا میں بھی لڑیں گی یا نہیں۔ تاکہ اگر ممکن ہو تو ان کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد کرنے کا معاہدہ کر لیا جائے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں جب برصغیر میں علمِ آزادی بلند ہوا تو ہر شخص کی زبان پر تھا کہ نانا صاحب اور روسیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا ہے اور روسی فوج فرنگیوں سے لڑنے کو تیار ہے۔

روس میں عظیم اللہ خاں کی ملاقات لندن ٹائمز کے نامہ نگار مسٹر رسل سے ہوئی تھی۔ جونہی عظیم اللہ خاں کو انگریزوں کی شکست کا حال معلوم ہوا، وہ انگریزوں کے کیمپ میں رسل کے خیمہ پر پہونچے اور اس سے ملتے ہی مسکراتے ہوئے کہا کہ "میں اس شہر اور اس کے رستموں یعنی روسیوں کو دیکھنے آیا ہوں جنھوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو شکست دی ہے"۔

رسل طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں خیمہ کے اندر لے گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا رسل کی ڈائری کہتی ہے کہ "اس روز شام ہونے تک عظیم اللہ خاں نہایت دلچسپی سے روسیوں کی گولہ اندازی کا معائنہ کرتے رہے۔ توپ کا ایک گولہ ان کے پیروں کے قریب ہی آ کر گرا جس قدر آدمی تھے دور دور بھاگ گئے لیکن عظیم اللہ ٹس سے مس نہ ہوئے، اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے اور شام کو بڑی سنجیدگی سے کہا" میرا خیال ہے کہ آپ لوگ شاید ہی اس مستحکم مقام پر قبضہ کر سکیں۔

لندن سے عظیم اللہ خاں کہاں کہاں گئے، نہیں کہا جا سکتا لیکن اس امر کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ مصر سے بھی سیاسی گفتگوئیں کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں ایران کے متعلق بھی برصغیر کے اخباروں میں خبریں چھپتی رہتی تھیں اور دہلی میں ایران اور اس ملک کے درمیان انگریزوں کے خلاف تعاون کی خبریں عام تھیں بہرحال عظیم اللہ خاں ۱۸۵۶ء میں بٹھور واپس پہونچے اور سارے حالات نانا صاحب کے سامنے پیش کر کے مشورہ دیا کہ "عجز و نیاز" سے راہ پر لانے کا

خیال خام ہے اور کامیابی دامن کو "حریفانہ" کھینچنے ہی سے حاصل ہوتی ہے اس لئے فرنگیوں کو نکال باہر کرنے کا سامان کیجئے کیونکہ یہی ایک راستہ ہے۔ آزادی کا حقیقی راستہ۔

اسی وقت سے آزادی اور انقلاب کے لئے اسکیمیں بنائی جانے لگیں۔ ان اسکیموں میں نانا صاحب، اس کے دو بھائی بابا جی، بالاجی، ایک بھتیجا راؤ صاحب، عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپے شریک تھے اور اس کے بعد ہی جملہ والیان ریاست اور صاحب اثر زمینداروں کے نام چٹھیات بھیجے گئے جن میں فرنگی حکومت کی عیاریوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے تنبیہ کی گئی تھی کہ ڈلہوزی کی الحاقی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوگا کہ دوسروں کے مانند آپ بھی غلام بن جائیں گے اور اپنے اقتدار اور علاقہ سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ انقلاب اور آزادی کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔

یہ خطوط الحاق اودھ سے دو تین ماہ قبل بھیجنے شروع کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک خط انگریزوں نے میسور میں پکڑا تھا۔ الحاق اودھ کے بعد بھور میں راجاؤں، نوابوں اور زمینداروں کے پاس سے جوابوں کی بارش ہونے لگی۔ مولوی، پنڈت، سنیاسی، فقیر اور سادھو تمام ملک میں پھیل گئے اور انہوں نے سپاہیوں اور عوام میں بغاوت کی آگ بھڑکانی شروع کر دی۔ طریولیان لکھتا ہے کہ بہشتیوں نے انگریزوں کے لئے پانی بھرنا چھوڑ دیا۔ آیائیں اجازت لئے بغیر نوکری سے رخصت ہو گئیں، باورچی اور ہرکارے گستاخی اور بدتمیزی سے "آقاؤں" کے ساتھ پیش آنے لگے۔

۱۸۵۷ء شروع ہوا تو انقلابی جماعت نیز نانا صاحب اور ان کے ساتھیوں نے زیادہ تیزی اور مستعدی سے کام شروع کر دیا۔ چنانچہ نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں اوائل مارچ میں "یاترا" کے لئے کانپور سے روانہ ہوئے اور سب سے پہلے دہلی پہونچے۔ وہاں کیا ہوا اور کیا باتیں ہوئیں انھیں دیوان خاص کے در و دیوار ہی بتا سکتے ہیں۔ دہلی سے آزادی کے "زائر" انبالہ چھاؤنی پہونچے اور وہاں سے ۱۸ اپریل کو لکھنؤ وارد ہوئے۔ عین اسی روز لکھنؤ کے عوام نے سر ہنری لارنس کمشنر لکھنؤ کی بگھی پر سنگ باری کی۔

لکھنؤ سے یہ جماعت کالپی ہوتی ہوئی بٹھور واپس پہونچی۔ رسل کہتا ہے کہ ان لوگوں نے گرینڈ ٹرنک روڈ کی جملہ چھاؤنیوں کی "یاترا" کی لیکن اس طرح کہ فرنگی حکومت کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

یہ دورہ اواخر اپریل میں ختم ہو چکا تھا اور اب موقع کا انتظار تھا کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں آزادی کا علم بلند کر دیا گیا جس کی اطلاع کانپور میں ۱۵ مئی کو پہونچی۔ چونکہ تار کاٹ دئے گئے تھے اس لئے انگریزوں کو تین روز بعد یعنی ۱۸ مئی کو علم ہوا۔

کانپور انگریزوں کا اہم فوجی مرکز تھا اور یہاں کی فوج کا سپہ سالار سر ہیو وھیلر۔ اس نے توپ خانہ کو گورہ بارک میں منتقل کر کے بارک کے گرد خندقیں کھدوائیں اور آذوقہ بھی جمع کرایا لیکن ویسی ٹھیکہ دار نے جسے آزادی کے علم برداروں سے ہمدردی تھی مقررہ مقدار میں غلہ نہیں پہنچایا۔ وھیلر نے لکھنؤ سے مدد طلب کی۔ ساتھ ہی نانا صاحب کو جن کے ساتھ اتنی شدید ناانصافی کی گئی تھی، مدد کے لئے لکھا۔ شہر میں چونکہ بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور حملہ کی افواہیں گرم تھیں اس لئے وھیلر کو اندیشہ ہوا کہ مسلمان عید کے روز یعنی ۲۴ مئی کو حملہ کریں گے۔ لیکن کوئی حملہ نہیں کیا گیا اور حالات ایسے پُرامن معلوم ہوئے کہ وھیلر نے لارڈ کیننگ کو اطلاع دے دی کہ اب یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن اس کے چوتھے روز یعنی ۴ جون ۱۸۵۷ء کو "دین دین" کے نعرے بلند کرتے ہوئے انگریزی مورچہ پر حملہ کر دیا گیا، ساری فوج باغی ہو گئی اور طے پایا کہ دہلی کی طرف کوچ کیا جائے۔

اس وقت عظیم اللہ خاں نے نانا صاحب کو مشورہ دیا کہ ہماری فوجوں کا اور ہمارا دہلی کی طرف جانا مناسب نہیں۔ یہاں رہ کر ہی دشمن کو تہ و بالا کیا جا سکتا ہے۔ پلاسی کو سو سال گذر چکے ہیں اس کا انتقام لینا چاہئے۔ کانپور ایک مرکزی مقام ہے جہاں سے دہلی اور کلکتہ کو راستے جاتے ہیں۔ دہلی میں اور بھی بعض امراء ہوں گے وہاں آپ کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہوگی۔ اس لئے اسی علاقہ میں رہ کر بیرونی اقتدار کا قلع قمع کرنا چاہئے۔

نانا صاحب کو یہ مشورہ پسند آیا چنانچہ دہلی کی طرف جانے والی فوج کو کلیان پور سے واپس بلا کر وھیلر کو الٹی میٹم دیا گیا کہ "ہم آپ پر حملہ کرنے والے ہیں اس لئے اطلاع دی جاتی ہے۔ ہتھیار ڈال دیجئے یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیے"۔

اس الٹی میٹم کے بعد ۷ جون کو حملہ کیا گیا۔ ساتھ ہی عظیم اللہ خاں کے مشورے سے شہر کا انتظام کرنے کے لئے ایک مجلس بنائی گئی اور مجرموں کو اور لوٹ مار کرنے والوں کو سزا دینے کے لئے عدالت قائم کی گئی جس کے ایک جج عظیم اللہ خاں بھی تھے، اس طرح شہر میں امن و امان قائم رکھا گیا۔

معارف عظیم کا مولف کہنیا لال لکھتا ہے کہ گولہ باری سے فرنگیوں کے آذوقہ کا ذخیرہ تباہ ہوگیا اور انھوں نے مجبور ہوکر ۲۵ر جون کو مایوس ہوکر صلح کا جھنڈا بلند کیا۔ نانا صاحب نے عظیم اللہ خاں کے ہاتھ خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ملکہ وکٹوریہ کی رعایا میں سے جن لوگوں کو ڈلہوزی کی پالیسی سے اتفاق نہ ہو اور ہتھیار ڈالنے کو تیار ہوں انھیں اور انگریز عورتوں اور بچوں کو الہ آباد پہونچایا جا سکتا ہے۔ اگر تمہارے سپاہی لڑنا چاہیں تو ان لوگوں کو واپس پہونچانے کے بعد واپس آکر لڑ سکتے ہیں"۔

انگریزوں نے ہتھیار ڈال دئے اور خزانہ نانا صاحب کے حوالہ کر دیا۔ عوام کا جوش و خروش اور مخالفت دیکھتے ہوئے نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں کی رائے تھی کہ انگریز رات کے وقت کانپور سے نکل جائیں لیکن وھیلر نے یہ سوچ کر کہ یہ لوگ ہمیں دھوکہ دیں گے دوسرے روز صبح کو جانے پر ضد کی جس پر رضامندی ظاہر کی گئی چنانچہ صبح کو چالیس کشتیوں میں انگریزوں کو مع عورتوں اور بچوں کے سوار کر دیا گیا ساتھ ہی آذوقہ بھی رکھ دیا گیا اور کشتیاں روانہ ہوگئیں۔

دریا کے دونوں جانب خلقت کا اژدہام تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کے عزیز مختلف مقامات پر فرنگیوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے تھے اور جن کے ماں باپ، بچوں اور بیویوں کو انگریزوں نے پھانسی پر چڑھایا اور آگ میں جلوایا تھا۔ یہ لوگ انتقام کی آگ سے جل رہے تھے اس لئے کشتیاں روانہ ہوتے ہی عوام نے حملہ کر دیا اور بہت سے انگریز مارے گئے۔

نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں کو اطلاع ملی تو فوراً ہی قتل عام بند کرایا گیا اور جو انگریز عورتیں اور بچے بچ گئے تھے انھیں حفاظت سے بی بی گڈھ میں رکھا گیا اور بہادر شاہ کو لکھا گیا کہ ان کے بارے میں کیا کارروائی کی جائے۔ اس کا جواب یہ آیا کہ "انھیں قتل نہ کرو بلکہ قید رکھو"۔

لیکن چند روز بعد الہ آباد سے ایک سوار نے آکر اطلاع دی کہ ان قیدیوں میں سے ایک عورت نے ایک چٹھی خفیہ طور پر الہ آباد بھیجی تھی جس کے باعث وہاں سے فوج آرہی ہے۔

اسی زمانہ میں جنرل نیل اور اس کے ساتھیوں نے بنارس، الہ آباد اور ان کے دیہات میں ایسے ایسے مظالم کئے تھے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہزاروں دیہات زمین کے برابر کر دئے گئے اور ان گنت انسانوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ فوج کے راستے میں کوئی درخت ایسا نہ تھا جس پر دس دس بیس بیس لاشیں نہ لٹکی ہوں۔ چارلس بال کا بیان ہے کہ نیل نے بنارس اور الہ آباد میں ہندوستانی عورتوں بچوں اور بوڑھوں تک کو آگ میں جلا دیا۔ یہ خبریں کانپور تک پہونچ چکی تھیں۔ عوام اور خصوصاً سپاہی انتقام کی آگ میں پھنک رہے تھے۔ الہ آباد میں نیل کے کئے ہوئے مظالم کی داستان جس روز کانپور پہونچی اس کے دوسرے روز یعنی ۱۸ر جولائی کو کانپور میں قیدی انگریز عورتوں اور بچوں کی قسمت پر بھی مہر لگ گئی۔

بعض مورخوں کا بیان ہے کہ اس قتل عام سے ناراض ہو کر عظیم اللہ خاں نے نانا صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن یہ درست نہیں۔ وہ مختلف مقامات پر نانا صاحب کے ساتھ رہے اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں مصروف رہے۔ جب خود وطن کے بعض غداروں کے باعث شکستوں پر شکستیں ہوئیں تو نانا صاحب کے ساتھ نیپال کی ترائی میں پناہ لی۔

۱۸۵۸ء میں جب آزادی کی جنگ ختم ہوگئی اور برطانوی تسلط مکمل ہوگیا تو انگریزی حکام نے برطانوی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کو گرفتار کرنے کے لئے انعامات کا اعلان کیا۔ نانا صاحب کی گرفتاری کے لئے دس ہزار پونڈ (تقریباً ایک لاکھ روپیہ) مقرر کیا گیا لیکن عظیم اللہ خاں کا نام مجرموں کی فہرست میں نہ تھا۔

انگریزوں کو توقع تھی کہ عظیم اللہ خاں نانا صاحب سے غداری کر کے اسے گرفتار کرا دیں گے لیکن وطن کے سپوت اور بہادر سپاہی جنھیں آزادی کی لگن ہوتی ہے، غدار نہیں ہوتے اور قوم اور وطن کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دیتے ہیں، دولت نام اور جان بھی۔

●

سیاست دانوں کا خیال ہے کہ یہ تمام ہنگامہ اودھ کی بربادی کے باعث، جو ان لوگوں کا وطن تھا، ہوا۔ اس کے علاوہ جب گوروں کی فوج دکن کی تسخیر کے واسطے بھیجی گئی تو ان تلنگوں کو خبر نہیں کی گئی۔ یہ بھی ایک بڑی وجہ ان کی بددلی اور شورش کی ہو سکتی ہے۔ نیز یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس میں لکھنؤ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ کا بھی ہاتھ تھا کیونکہ یہ سب لوگ اودھ کے رہنے والے انہیں کی رعایا تھے لیکن بظاہر کارتوس کاٹنے کا قصہ مشہور کیا گیا، ورنہ یہ کارتوس کا جھگڑا کوئی ایسا اہم قصہ نہ تھا کہ حکام اس کی وجہ سے ایسی سختی برتتے اور ایسی عمدہ فوج کو جو کروڑوں روپیہ صرف کر کے تیار کی گئی تھی اس طرح ایک معمولی سی بات پر ضائع کر دیتے۔

("غدر کا نتیجہ" : غلام حسین خاں)

بہادر شاہ ظفر کے فرامین

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اور ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی تاریخی جنگ، جس میں انگریزوں کو شمالی ہندوستان میں پہلی فتح نصیب ہوئی دراصل اسی دن قسمت نے سلطنت کا فیصلہ کر دیا اور اگلے تقریباً دو سو سال تک ہزاروں میل دور بیٹھے ایک قوم کے چند افراد لاکھوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے رہے۔ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۵۷ء تک صرف پچاس سال کی مختصر مدت میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مستحکم سلطنت جس طرح پارہ پارہ ہوئی اس کی داستان دلخراش بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ حکومت اور امارت نے خون سفید کر دیئے تھے۔ مذہب، ایمان، اخلاق سب کی بندشیں ٹوٹ گئی تھیں۔ طوائف الملوکی تھی۔ افراتفری تھی۔ ذہنی اور سماجی انتشار تھا۔ غرض آفات اور حوادث کی ایسی آندھیاں چل رہی تھیں کہ اُمید کی شمعیں جلائی جاتیں اور بجھ جاتیں۔ سلطان شہید ٹیپوؒ اور سراج الدولہ سے بہادر شاہ ظفر تک انھیں آندھیوں میں اُمید کے چراغ روشن کرنے والے بھی موجود تھے۔ ان کے ذرائع اور وسائل محدود تھے۔ انھیں بیگانوں ہی سے شکایت نہ تھی، اپنوں کا بھی شکوہ تھا اور آج جب ہم پچھلے دو سو سال کی تاریخ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو ان کی اُمیدیں اور تمنائیں، ان کے ولولے اور اُن کا جوش عمل اور ان کی ناکامیاں اور محرومیاں ایک مرقع بن کر سامنے آجاتی ہیں۔

بہادر شاہ ظفر پر سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن کیا ظفر چاہتے تو وہ اس انقلاب کو روک سکتے تھے؟ کیا ان میں اس قدر طاقت اور قوت تھی جو وہ اس تناور درخت کو جس کی بنیادیں پوری ایک صدی سے کھوکھلی چلی آرہی تھیں، گرنے سے روک لیتے؟ اور کیا وہ تنہا اس جنگ آزادی میں جسے برطانوی عہد کے مؤرخین "غدر" کے مکروہ نام سے یاد کرتے ہیں ایک سامراجی قوت کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے تھے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا جواب بہادر شاہ ظفر کا مؤرخ ہی دے سکتا ہے۔ ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ اس جنگ آزادی کی کہانی ان کے فرامین میں کہاں کہاں اور کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔

بہادر شاہ کے مطبوعہ فرامین میں ان کے وہ احکام شامل ہیں جو جنگ آزادی کے ایام میں انھوں نے بعض درخواستوں اور مراسلوں پر تحریر کیئے تھے اور جن کو بہادر شاہ پر مقدمہ چلاتے وقت بطور شہادت ان کے خلاف پیش کیا گیا تھا۔ یہ کاغذات (TRIAL OF BAHADUR SHAH) میں شامل تھے۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے "غدر کے فرمان" کے نام سے ان کا ترجمہ کر دیا۔ یہ خط بیشتر اُردو میں تھے TRIAL OF BAHADUR SHAH میں ان کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے اور پھر انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئے۔ اس طرح ان فرامین کی عبارت بہادر شاہ کی اصلی عبارت نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں تصرف کیا گیا ہو۔ بہر حال ان فرامین کے مطالعہ سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ بہادر شاہ جنگ آزادی کی تحریک کا مرکز اور محور تھے۔ لیکن یہ ایک عوامی تحریک تھی اور اختلاف مذہب یا اختلاف زبان ان لوگوں کے اتحاد میں مانع نہ تھا جو اس جنگ میں شریک تھے۔ دوسری طرف ان فرامین سے اس جنگ کی ناکامی کے اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ خزانہ خالی تھا، بہادر شاہ کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی جو سپاہیوں کو باقاعدہ اور بر وقت تنخواہ مل جاتی۔ یہی حال سامان حرب اور آلات جنگ کا تھا۔ رسد کا یہ حال تھا کہ جو فوج دہلی میں موجود تھی اس کے ایک حصہ کو دو دن کا فاقہ گزر چکا تھا، جب سو من بھنے ہوئے چنے طلب کیئے گئے۔ پھر اس کے ساتھ آپس کی چشمک، حسد، رقابت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی جاری تھی۔ یعنی خود اپنی صفوں میں اتحاد نہ تھا۔ ایک طبقہ ایسا تھا جو ذاتی مفاد کے لئے انگریزوں کا ساتھ دے رہا تھا اور انھیں میں وہ جاسوس شامل تھے جو ہر کارروائی کی اطلاع دشمن کو پہنچاتے رہتے تھے۔ ایسے ایک بزرگ محمد درویش تھے جنھوں نے لفٹننٹ گورنر کو ایک خط میں لکھا تھا کہ بادشاہ دہلی حسن عسکری کی معرفت شاہ ایران سے ساز باز کر رہے ہیں اور بادشاہ کے کمرۂ خاص میں شب و روز ایرانیوں کی فوری آمد کا ذکر رہتا ہے۔ بغرض خیر خواہی مندرجہ بالا حالات سے مطلع کیا گیا ہے، اب گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ مناسب بندوبست کرے۔ اس خیر خواہ کی یہ خیر خواہی ۲۴ر مارچ ۱۸۵۷ء کو لفٹننٹ گورنر کو ملتی ہے۔ جنگ آزادی مئی میں شروع ہوئی۔ گویا مہینوں پہلے جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان کی تفصیل سے انگریز پوری طرح آگاہ تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہادر شاہ کمرۂ خاص میں جن مشاہیر یا اکابر سے گفتگو کرتے تھے اور جو خفیہ احکام صادر فرماتے تھے ان کی اطلاع بھی لفٹننٹ گورنر کو ہو جاتی تھی۔ ۱۰ر اگست ۱۸۵۷ء کو لکھا ہوا

ایک خط ملتا ہے جو مکندلال نے لکھا ہے۔ مکندلال کے خط میں ۲۷ خطوط و ہدایات کی تفصیل ہے اور لکھنے والا مکندلال بہادر شاہ کا سیکرٹری ہے۔ مکندلال ہندو تھا۔ اگر اس جنگ کی نوعیت صرف یہ ہوتی کہ مسلمان اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے تو ظاہر ہے غیر مسلموں پر بھروسہ نہ کیا جاتا اور کم از کم انھیں بادشاہ کے سیکرٹری کا اہم عہدہ نہ دیا جاتا۔ بادشاہ کا دل صاف تھا، جن لوگوں پر اعتماد کیا گیا وہ اس اعتماد کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ بہادر شاہ کی بیکسی اور بے بسی کا اندازہ ان کے اس فرمان سے کیجئے:-

"بنام فرزند ما بدولت شہرۂ آفاق دلاور میرزا ظہور الدین عرف مرزا مغل بہادر۔ جانو کہ جب پیدل، سوار میرے پاس آئے تھے تو میں نے خود اپنی زبان سے ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے پاس خزانہ یا مال نہیں ہے جس سے میں ان کی مدد کروں۔ انھوں نے میرا یہ بیان سن کر سر تسلیم خم کیا اور میرے لئے اپنی جانوں کو قربان کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور ماتحتی اور فرماں برداری کو منظور کیا۔ اس پر انھیں اول ہدایت کی گئی تھی کہ میگزین اور خزانے کی اشیا مہیا کریں تاکہ اس سے انھیں اور مجھے فائدہ پہنچے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ اس معاملہ میں ان سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا تاہم روپیہ قرض لیا گیا۔ تاکہ ہر پیدل و سوار کو روزانہ الاؤنس دیا جاوے۔ مکرر فرمان جاری کئے گئے کہ شہر میں لوٹ مار اور دار و گیر نہ کی جائے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ فوجی اور سپاہی ایسی زیادتیاں کرتے ہیں کہ ان تمام [illegible] جو بیرونی فوجی دخل کے تصرف میں لائے گئے ہوں ایسی غارت گری نہ ہوئی ہوں۔ چنگیز خاں اور نادر شاہ بادشاہوں نے بھی ایسے شہروں کو پناہ دی ہے جو بڑے بڑے جھگڑے قبضے میں آ گئے ہوں۔"

اس کے بعد بہادر شاہ سپاہیوں کی بدتمیزی کی شکایت کرتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے اعلیٰ افسر بھی قلعہ دیکھنے آتے تو دیوان عام کے دروازے پر گھوڑوں سے اتر پڑتے اور وہاں سے پیدل آتے۔ لیکن یہ لوگ دیوان خاص کے کمرے تک گھوڑوں پر بیٹھے چلے آتے ہیں۔ ابتری اور افراتفری کی طویل اور دلخراش داستان بہادر شاہ ان الفاظ میں ختم کرتے ہیں:

"اس حکومت کی بربادی صاف عیاں ہے۔ مجبوراً تھک کر ہم نے آخر کار اپنی بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کرنے کی ٹھان لی ہے اور خطاب شہنشاہی کو جو تفکرات اور مشکلات سے لبریز ہے، موجودہ خطرات و بیقراریوں سے تنگ آ کر تہیہ کر لیا ہے کہ ترک کر دیں۔ اور کفن پہن کر پہلے خواجہ صاحب کی درگاہ میں جا کر مقیم ہوں اور پھر ضروری انتظام کر کے وہاں سے مکہ مکرمہ روانہ ہو جائیں۔"

اس ہنگامے میں یہ ضروری تھا کہ شہری زندگی میں کوئی بڑا خلل واقع نہ ہو اور فوج شہری نظم و نسق سنبھالنے کی جگہ مورچوں کا رخ کرے۔ اس ضرورت کے احساس سے ۲۳ جولائی کو بہادر شاہ نے یہ فرمان جاری کیا:

"اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی کسی پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ ظلم نہ کرے اور یہ کہ اصل زمینداروں کی رعایا بن کر رہے کہ وہ سلطنت کے خیر خواہ سمجھے جاتے ہیں نظم و نسق کے لئے بہت جلد فوجی قوت روانہ کی جائے گی۔ اعلیٰ حضرت بادشاہ سلامت کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبودی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔ چنانچہ وہ تمام لوگ جو بدامنی پھیلاتے یا احکام با اختیار سے سرکشی کرنے کے مجرم ہوں گے مستوجب سزائے شدید ہوں گے۔ یہ اعلان عوام کی آگاہی کیلئے کیا جاتا ہے۔"

کسی جنگ میں سب سے اہم کام فوجی نقل و حرکت اور محاذ جنگ کی ترتیب ہے۔ یہ کام سوائے فوجی ماہروں کے کسی اور کے بس کا نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یا تو فوج میں قحط الرجال تھا کہ اس کام کے قابل کوئی آدمی نہ تھا یا آپس کے حسد و رقابت کی وجہ سے بادشاہ کو خود ان امور کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً کمانڈر انچیف مرزا مغل تھے جو بادشاہ کے فرزند تھے۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضی پیش کرتے ہیں:

"چونکہ اعلیٰ حضرت نے فوج کو میرٹھ جانے کا حکم صادر فرمایا ہے لہٰذا رسد وغیرہ کے انتظامات کے لئے بیس سوار، پچاس پیدل جانے ضروری ہیں۔ امید ہے کہ خادم کو ان کے روانہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی۔"

اس پر بہادر شاہ نے پنسل سے یہ فرمان لکھا ہے:

"میر حیدر حسین خان ۲۰ سواروں کو اور شاہ رخ بیگ پچاس پیدلوں کو روانہ کر دیں۔"

بادشاہ اس موقع پر صرف نقل و حرکت ہی کی نگرانی نہیں کرتے تھے بلکہ رسد اور سامان حرب کے نقل و حمل کی ذمہ داری بھی ان پر تھی۔ چنانچہ ۲۰ جون کو کما مرزا مغل کے نام ایک فرمان میں لکھا گیا:

"معلوم ہو کہ شورہ لانے کے لئے چھ گاڑیاں تیار کی گئی ہیں۔ جو باہر جمع ہیں اور بارود کے لئے جس کی ضرورت ہے۔ پس 'باقاعدہ پیدل' کے پچیس آدمیوں

کی حفاظت کے لئے مقرر کر دو کہ بہ حفاظت میگزین پہنچ جائے۔ نیز فوجی پہرہ متعینہ لاہوری دروازے کے نام احکام جاری کردو کہ اس آمد و رفت میں رخنہ اندازی نہ کریں۔"

اگر بہادر شاہ کا کام صرف فوجوں اور فوجی سامان کے نقل و حمل تک محدود ہوتا تو ایک بات تھی، فوجوں کی بھرتی اور ملازمت کی ذمہ داری بھی بالآخر براہ راست ان پر ڈال دی گئی تھی اور ہر ملازم ہونے والے کی درخواست ان کے سامنے پیش ہوتی تھی۔ مرزا مغل کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:

"معلوم ہو کہ بے شمار آدمیوں کی درخواستیں تمہاری درخواست کے ساتھ موصول ہوئیں جن میں نوکری کی خواہش کی گئی ہے۔ فرزند! تم کو معلوم ہے کہ خزانہ شاہی میں روپے کی قلت ہے ۔۔۔۔۔۔ قسمتوں سے آمدنی وصول نہ ہونے اور فوج کے باہر جا کر بندوبست نہ کرنے اور حکومت میں ڈاکہ زنی و لوٹ مار کرنے کے سبب سے اور پھر ہر حصۂ ملک سے کثیر افواج کے ایک جگہ جمع ہو جانے کے سبب اخراجات روزمرہ بھی پورے نہیں ہوتے۔ پھر ان لوگوں کو کیونکر ملازم رکھا جائے؟ اور ان کی تنخواہیں اور اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں؟ ایسی حالت میں ان لوگوں کو جن کے وطن دور دراز فاصلے پر ہیں موہوم امیدیں دلانی بالکل بیجا بات ہے۔"

برہمن، حجام، دھوبی، درزی تک کے تقرر کا مسئلہ بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا جاتا ۔۔۔۔۔۔ بہادر شاہ کی ذمہ داریوں کا تو یہ حال تھا اور ان کی کس مپرسی کا یہ عالم کہ نہ ان کے پاس روپیہ تھا، نہ فوج اور نہ سپاہ ان کے احکام کی تعمیل کرتی تھی۔ وہ تنہا اس جنگ کو کیسے جیت سکتے تھے؟ سب سے بڑی پریشانی روپے کی کمی سے پیدا ہوئی۔ ایک فرمان سے اس کا اندازہ کیجئے:

"فرزند شہرۂ آفاق دلاور، مرزا ظہور الدین عرف مرزا مغل کمانڈر انچیف بہادر۔ معلوم ہو کہ فوج کی روزانہ یا ماہانہ تنخواہ دینے اور میگزین کے ضروری مصارف اور اخراجات توپ خانہ و بارود کے لئے خزانے میں روپیہ بالکل نہیں ہے اور بارود نہ ہو تو دشمن سے لڑنا دشوار ہو جائے گا۔ لہذا ضرورت ہے کہ فی الفور کہیں نہ کہیں سے بغیر سود کے قرضہ لیا جائے اور پنجابی سوداگروں اور انگریزوں کے مالدار نوکروں سے بھی روپیہ لے کر خزانہ میں داخل کیا جائے۔ نیز یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ہنڈیاں بنا کر ہمارے پاس بھیجو کہ ہماری مہر خاص اس پر ثبت کی جائے اور روپیہ وصول کرنے کے لئے انہیں تقسیم کیا جائے۔ جس میں معاہدہ ہو گا کہ مالگزاری کی آمدنی وصول ہونے پر سب کا روپیہ ادا کر دیا جائے۔ قرض مذکور میں سے کچھ بھی باقی نہ رکھا جائے گا اور اس پر تمام لوگوں کو یقین دلا دو۔ ما سوا اس کے اگر وہ لوگ چندے کا بندوبست کریں گے تو علاوہ ان کا قرضہ ادا کرنے کے اپنے اپنے مرتبے اور لیاقت کے موافق ملازمت اور انعام بھی دیا جائے گا۔"

ان حالات میں بہادر شاہ کے نیک ارادے، ان کی ذاتی مستعدی اور سرگرمی کیا کام آ سکتی تھی۔ ان فرامین کے مطالعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ بہادر شاہ کے بس میں جو کچھ تھا انھوں نے اس سے گریز نہ کیا۔ لیکن یہ جنگ شروع ایسے وقت ہوئی جب ملک اس کے لئے پوری طرح تیار نہ تھا اور اس فیصلے کی ذمہ داری بھی بہادر شاہ ظفر پر نہیں۔ وہ اس جنگ میں شریک ہوئے اور شرکت کی پوری ذمہ داریاں قبول کیں۔

آخر میں بہادر شاہ ظفر کی ایک نظم کے چند اشعار سنئے جو مجموعہ "فغان دہلی" میں شامل ہیں۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ایسا نہ تھا جس کا اثر صرف بہادر شاہ ظفر کی ذات یا اس کے متوسلین تک محدود رہا۔ دلی جو اس سے پہلے بھی کئی بار لٹ چکی تھی اس مرتبہ ایسی اجڑی کہ پھر اس کی خرابی شرمندۂ تعمیر نہ ہو سکی۔ دلی کے مٹنے سے مراد عمارت و عمارات نہیں جو آج کھنڈر بن چکی ہیں۔ دہلی ایک تہذیب، ایک معاشرت، ایک روایت کی علمبردار تھی۔ یہ تہذیب، یہ معاشرت اور یہ روایت اب محض ایک افسانہ رہ گئی ہے۔ لیکن اس چمن کے بعض عنادل اس وقت بھی نالہ سرا ہوئے تھے اور آج بھی نوحہ خواں ہیں۔ مجموعہ "فغان دہلی" میں انھیں نالوں کو جمع کیا گیا ہے اور سب سے پہلا نالہ بہادر شاہ ظفر کا ہے:

کیا پوچھتے ہو کج روئ چرخ چنبری
ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستمگری
کرتا ہے خوار تو انھیں جن کو ہے برتری
اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری
کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

(باقی صفحہ ۱۴۳ پر)

غنائیہ:-

"رہِ وادئ خیال"

صہبا اختر

راہی:

آج آکاش نیلیں بھی نہیں
آج کی رات انجمیں بھی نہیں
صرف تاریک رات کا جادو
بڑھ رہا ہے لئے کُھلے گیسو
حبس ہے، گرم ہے فضا ساری
موت کا سا طلسم ہے طاری
ایسے عالم میں قلبِ سودائی
یادِ ماضی کہاں سے در آئی؟

آ مرے قلبِ پریشان دحزیں
تو کبھی اس رات کی صورت ہے غمیں
لال قلعے کی طرف جاتے ہیں
اپنے ماضی کی خبر لاتے ہیں

اے مرے قلبِ پریشان وحزیں
ہم تو اس شہر سے واقف بھی نہیں
لال قلعے تو پہنچ جائیں گے
پر وہاں جاکے بھی کیا پائیں گے
اجنبی نقشِ دگر کیا سمجھیں
رمزِ دُنیائے دِگر کیا سمجھیں

یک بیک کون یہ لہرایا ہے
کس کا فردوسِ نظر سایہ ہے؟
کاش اس راز کو پا سکتے ہیں ہم
دلِ بیتاب ذرا تیز قدم

کون جانے کہ کوئی رہبر ہو
جلد چلئے کہ سفر بہتر ہو
اے ذوی الاحتشام کون ہیں آپ؟
ہے خدا ساز آپ کا یہ ملاپ

زروانؔ:

اک جہاں گردِ کہن سال ہوں میں
روحِ باساز پروبال ہوں میں
اک ہیولائے جہاں پیما ہوں
شش جہت مثلِ جہاں پھرتا ہوں
اپنی تنہائی سے کھیلا ہوں میں
آپ کی طرح اکیلا ہوں میں
میں گئے وقت کا سناٹا ہوں
اک صدی بعد یہاں آیا ہوں
سانس لینا بھی یہاں بھاری ہے
یہ فضا پھر بھی مجھے پیاری ہے
دامنِ شوق بھریں گے کیا آپ
قلعے کی سیر کریں گے کیا آپ؟

راہی:

اے خوشا گر یہ عنایت ہو جائے
لال قلعے کی زیارت ہو جائے
آپ کچھ غم نہ کریں
آئیے ساتھ چلیں

زروان:-

یہ ہے وہ قلعہ کہ ہے عظمتِ ماضی کا نشاں
منجمد اس میں ہیں ہمتر صد زلزلوں کے طوفاں
"یہ در و بام یہ محراب یہ مینار یہ طاق
جیسے تاریخ مرتب کرے اپنے اوراق
دلِ ہر نقش میں خوابیدہ جوانی کا خروش
جیسے لب تشنۂ تقریر ہے ہر سنگِ خموش
مرتعش مے کی طرح نقش سرِ لوحِ جبیں
بول اٹھنے کو صنم خانۂ فردوس زمیں
صفحۂ برگ پہ تحریر صدا فسانۂ گل
سبزۂ خاک پہ آباد صنم خانۂ گل
لبِ ساحل پہ پرافشاں ہے کہانی اس کی
آبِ جمنا میں نہاتی ہے جوانی اس کی
اس کے پرتو سے صبا مست شرابی ہو جائے
دھوپ دیوار کو چھولے تو گلابی ہو جائے
مہ جبینوں کے خدوخال نظر آتے ہیں
کہیں یاقوت کہیں لال نظر آتے ہیں
چشمِ ماضی کا حسیں خواب اُڑا لایا ہے
کون ارژنگ کی تصویر چُرا لایا ہے

اور یہ حوض ہیں وہ چشمۂ انوار یہاں
رقص کرتے تھے کبھی آ کے مہ و مہر جہاں
ہاتھ پھیلائے شفق رنگ لیا کرتی تھی
چاندنی رات جہاں غسل کیا کرتی تھی
کشتیاں ان میں گلابوں کی تری رہتی تھیں
پریاں کھیلنے کے لئے جن کو کھڑی رہتی تھیں
اور یہ سنبل و ریحان و سمن کے تختے
سات رنگوں کی دھنک جیسے زمیں پہ لچکے

ؔ زروان: روحِ زمان و مکان (جاوید نامہ)

"چوں عشق حرم باشد سہل است بیاباں ہا"
حصول آزادی کی آخری گفتگو کے لئے رہنمایان قوم کا، دسمبر ۱۹۴۶ء میں، لندن کا سفر

سردار امیر اعظم خاں ، وزیر اطلاعات و نشریات و امور پارلیمانی کی پاکستان کے پہلے جشن جمہوریہ کے ایک جلسہ میں تقریر

کراچی کی تقریبات

نامور ایرانی ادیبہ ڈاکٹر کوچکینہ کاظمی جو علامہ اقبال رح
خاص ارادت رکھتی ھیں ، ایک ثقافتی دورے پر

نامور پاکستانی مصورہ زبیدہ آغا کی نقاشی کی نمائش

حوض کے اُجلے کناروں سے ہم آغوش چمن
جیسے سمٹی ہوئی بیٹھی ہو حسینوں میں دلہن
بادۂ رنگ سے لبریز ہیں پھولوں کے ایاغ
شعلۂ حسن سے تابندہ بہاروں کے چراغ
ذرہ ذرہ ہے اسی خاک کا انجم ایجاد
گوشہ گوشہ ہے اسی باغ کا فردوس نژاد

اور یہ بارہ دری ہے کہ جہاں راتوں کو
لالہ و گل سے صبا آتی ملاقاتوں کو
رات دن بزمِ افق میں جو گلے مل جاتے
اس کے دامن میں ستاروں کے کنول کھل جاتے
ایک اک طاق میں جل اٹھتے حنا رنگ چراغ
جھوٹ سے جن کی چمک اٹھتا ہر اک تختۂ باغ

غیرت و عصمت و ناموس کا افسانہ ہے
یہ شبستانِ حیا یعنی حرم خانہ ہے
اس میں روشن تھے محبت کے وہ پاکیزہ چراغ
جن سے تابندہ و پائندہ تھے ناموس کے باغ
زہرہ وش، مہر لقا، شعلہ بدن، ماہ جبیں
اس کی آغوش میں آباد تھے وہ پردہ نشیں
جن کے آنچل پہ کبھی چاند کی کرنیں نہ پڑیں
جن کے چہرے پہ ستاروں کی کبھی نظریں نہ پڑیں
ہر قدم پردۂ احکام ادب حائل تھا
بے اجازت تو صبا کا بھی گزر مشکل تھا
جن کے گیسو بھی گھٹا کی طرح گہرے تھے
اُن کنیزوں کے ہر اک گام یہاں پہرے تھے

یہ ہے وہ خوابگہِ بادشہِ عرش مقام
نیند آتی تھی نشے لے کے جہاں جام بہ جام
در دولت سے پلٹ جاتی تھی آ آ کے صبا
باریابی کا شرف جز ملکہ کس کو تھا

ریشم و اطلس و کمخواب بچھے رہتے تھے
نیلے پردے ستاروں کے گرے رہتے تھے
تا سحر طالعِ بیدار فروزاں رہتا
عنبر و عود کی شمعوں سے چراغاں رہتا

یہ وہ دیوانِ صداقت ہے مرے دوستِ جہاں
عدل و انصاف کا اک چشمۂ نوریں تھا رواں
راستہ روکنے بڑھتی تھی نہ کوئی زنجیر
داد فریاد کی پاتا تھا، غنی ہو کہ فقیر
عدل و انصاف کے روشن تھے شب و روز دئے
عام تھا سلسلۂ لطف و کرم سب کے لئے
اک ترازو میں عمل سب کے تلا کرتے تھے
آبِ حیواں سے یہاں قلب دُھلا کرتے تھے
سیل ظلمات کا ہر چند فضا میں بہتا
آئینہ خانۂ انصاف منور رہتا
اس کی ہر ایک کرن دیدہ و دل کی محبوب
یہ وہ سورج ہے جو شب کو بھی نہ ہوتا تھا غروب

یہ وہ دیوان ہے "تھا خاص" جہاں کا عالم
جس کے ہر بام پہ تھا کاہکشاں کا عالم
شاہ کے گرد تھا یوں رمز شناسوں کا ہجوم
چاند جس طرح کرے دائرہ بندی نجوم
زائچہ کش تو کوئی بادشہِ علمِ نجوم
کوئی دنیائے سیاست کوئی دنیائے علوم
تھا کوئی سنگتراش اور مصوّر کوئی
ماہرِ فلسفہ کوئی تو مفکر کوئی
کوئی منطق کو سمجھتا ہے اجارہ اپنا
کوئی تاریخ میں ثانی نہیں رکھتا اپنا
کوئی سنجیدہ نظر واقفِ آدابِ شہی
کوئی سر تا بہ قدم پیکرِ بذلہ سنجی

صاحبِ سیف کوئی صاحبِ تحریر کوئی
یہاں رکھتی نہیں رخ دوسرا تصویر کوئی
حدِ ساحل پہ سمندر نہیں چڑھتا کوئی
اپنے منصب سے قدم بھر نہیں بڑھتا کوئی
نشے آراز دیا کرتے تھے برساتوں کو
گرم رہتی تھی یہاں بزمِ سخن راتوں کو
مرمریں سقف کے زرکار کنول چومتی ہے
غالب و ذوق کی آواز یہاں گونجتی ہے
صاحبِ عشق و رفیقانِ جنوں تھے یہ لوگ
بامِ ایوانِ حکومت کے ستوں تھے یہ لوگ

راہی :-
نکہت و رنگ سے آباد چمن یاد آئے
جلوہ کارانِ شبستانِ وطن یاد آئے
کھل گئے ذہن میں ماضی کے دریچے کتنے
اٹھ گئے عالمِ افکار سے پردے کتنے
عظمت و دبدبہ و شوکت و صد جاہ و جلال
ہائے تاریخ کے دھندلائے ہوئے یہ خد و خال
آپ چاہیں تو چمک سکتے ہیں یہ نقشِ جمال
آپ کے سامنے آئینہ کمال اور زوال
پھونکئے ایسا پر اسرار نگاہوں سے فسوں
خلد عنائی ماضی کا تقاضا کروں
وطنِ پاک کی روداد سنائیں گے آپ
خواب سے کیا مرے ماضی کو جگائیں گے آپ

نروان :-
آہ یہ رودادِ ماضی داستانِ رنگ رنگ
گاہ اک آوازِ طوفاں گاہ اک آوازِ چنگ
صاعقہ بردوش طوفانوں کا ہے جس میں خروش
گاہ جو بادِ بہاری کی طرح نغمہ فروش
گاہ جس کا گوشہ گوشہ تیرگی آباد ہے
گاہ جس کا ذرہ ذرہ آئینہ ایجاد ہے

جھانکتے ہیں جس کے غرفے سے سنہرے آفتاب
گاہ جس کی ظلمت رخ ہے حجاب اندر حجاب
ہر ورق سے جس کے رہ رہ کر ٹپکتا ہے لہو
گاہ غنچہ بار ہے جس پر سحابِ مشکبو
چہرۂ تاریخ سے اٹھی وہ ماضی کی نقاب
وہ پٹے گوشہ بہ گوشہ ظلمتِ شب کے حجاب
وہ بڑھے طوفاں بہ طوفاں ترک شیرازی بڑھے
سایۂ بابر میں وہ تاتار کے غازی بڑھے
سرخ آنکھوں میں جلائے عزم و جرأت کے دیے
بر سرِ کہسار و دریا بابری پرچم لئے
ایڑیوں سے تیز گھوڑوں کی زمیں کو روندتے
بجلیوں کی طرح دشمن کے سروں پر کوندتے
اونچے اونچے کہساروں کو خوشی سے راندتے
خوں کے دریا کہیں جوشِ طرب میں پھاندتے
موت کے تاریک صحراؤں میں دَر آتے ہوئے
کف اگلتے، خوں نگلتے آگ برساتے ہوئے
آگ جس سے ڈھنگ موسم کے بدل کر رہ گئے
آگ جس سے برف کے طوفاں پگھل کر رہ گئے
ہفت گردوں جن کے عز و شان سے شرما گئے
بابری پرچم کے سائے دور تک لہرا گئے
خاندانِ مغلیہ کا یہ چراغِ اولیں
کر گیا خورشید عالم تاب کو زیرِ نگیں

اور اس کے بعد بابر کے جیالے جانشیں
ہاتھ میں لے کر بڑھے صد پرچمِ عزم و یقیں
نور کے دریا زمیں سے آسماں تک بہہ گئے
فاصلے صدیوں کے لمحوں میں سمٹ کر رہ گئے
وہ ہمایوں، اکبرِ اعظم، جہانگیرِ متیں
آنکھ جن کے سامنے تاریخ کی اٹھتی نہیں
نور ہیں تاریخ کے جو چہرۂ شفاف کا
آج تک شہرہ ہے جن کے عدل اور انصاف کا

اور وہ شاہ جہاں دلدادۂ حسنِ بتاں
پتھروں میں بھر دیا جس نے جمالِ دلبراں
مرمریں تصویر سے مہتاب تک کجلا گیا
تاج جیسا معجزہ بھی دہر کو دکھلا گیا
یہ نفس تھے صاحبانِ حشمت و جاہ و جلال
سطوت و شانِ جہانداری میں آپ اپنی مثال
درۂ خیبر سے لے کر جنتِ بنگال تک
سرنگوں تھا بابری پرچم کے آگے خود فلک
ہر چمن ہر گل میں تھا بس ایک ہی چہرے کا روپ
شرق سے تا غرب پھیلی بس اک ہی سورج کی دھوپ
اکبرِ اعظم سے لے کر عہدِ عالمگیر تک
غیر ممکن تھا کہ کج رفتار ہو سکتا فلک

ساہی:-
کتنی دلچسپ ہے روداد مرے ماضی کی
جیسے جنت بھی ہو ایجاد مرے ماضی کی
آہ پھر تیز ہوا سلسلۂ جوشِ جنوں
کاش اس جنتِ گم گشتہ کو میں دیکھ سکوں

زروان:-
صاحبِ عشق کی ہر ایک ادا جانتی ہے
ہم نفس میری نظر درد کو پہچانتی ہے
لذتِ دید کا ساماں بھی کئے دیتا ہوں
میں ترے درد کا درماں بھی کئے دیتا ہوں

ہاں سمٹ گردشِ ایام کے گہرے سائے
تاکہ اک حسرتِ بیتاب سہارا پائے
جنتِ ماضیٔ شاداب مرے سامنے آ
اے فلک پردۂ تاریکیٔ آلام اٹھا
رنگ در رنگ ابھر اے شفقِ شامِ وطن
اک سہاگن کی طرح سج مرے ماضی کی دلہن
بہہ چلیں سطوتِ دیرینہ کے خورشید نگوں
تاکہ کھوئی ہوئی جنت کا نظارہ کر لوں

ناگہاں چار طرف قوسِ قزح لہرائی
لال قلعے کے در و بام سے آواز آئی!

باادب باملاحظہ ہشیار!
تھم گیا رقصِ ثابت و سیار
تھم گئی تیز وقت کی رفتار
ہر نظر ہو ادب کی آئینہ دار
باادب باملاحظہ ہشیار!
آسماں سرنگوں زمیں بہ سجود
اے خوشا شاہِ دو جہاں کا ورود
ہر قدم بوس دو جہاں کے وقار
باادب باملاحظہ ہشیار!
رشکِ صد مہر و ماہ آتے ہیں!
شاہِ عالم پناہ آتے ہیں
ایک عالم ہے آپ پر نثار
باادب باملاحظہ ہشیار!

سر پہ ہے ہالۂ دائرۂ مہر گداز
مسند آرا ہوئے شاہنشہِ اورنگ طراز
خانِ دربار جو کچھ جوشِ طرب پر آئی
ناگہاں ایک مغنی کی صدا لہرائی

آسمانوں پہ ترے حسن کی تابندہ و درخشندہ شعاعوں سے جو
شہرۂ ایوانِ شکوہ
اے خوشا شاہِ بلند اختر و مہ پیکر و خورشید گرد
جلوۂ مہتابِ شبستانِ شکوہ
رشکِ صد قیصر و اسکندر و دارا و سلاطینِ زمانہ
دو جہاں بانیٔ خاقانِ شکوہ
تیری عظمت کے تصدق میں ہر اک گوشۂ آفاق
بڑے ناز سے وابستۂ دامانِ شکوہ
پھر فضاؤں کو ملا فردۂ نغمہ رنگ، جبرۂ پر غنچہ ہوا رقص
ہواؤں کا شروع

پھر سجیں شوق قدمبوس لئے انجمن گل میں بہاریں، وہ
ہوا پھر سرد سامانِ شکوہ
ہاں رہے تا بہ ابد نور فشاں مہر جہاں پرچم خورشید نشاں
صاحب اورنگ جہاں
ہاں رہے تا بہ ابد مست وگل اندام و جواں سال بہاروں
کا نشیمن یہ گلستانِ شکوہ

راہی:-
سیانِ جنتِ ماضی جلوہ زار تھا میں
ابھی ابھی تو بہاروں سے ہمکنار تھا میں
یہ کیا ہوا یہ در و بام کیوں لرزنے لگے
یہ برق و باد کے طوفان کیوں مچلنے لگے
خزاں شکار ہوئے قافلے بہاروں کے
شکست ہونے لگے آئینے ستاروں کے

زروان:-
آہ اب ختم ہوا سلسلۂ دورِ نشاط
موج طوفاں نے الٹ ڈالی ہے شاہانہ بساط
بجھ گیا عظمتِ بابر کا درخشندہ چراغ
پڑ گیا چہرۂ خورشید پہ ظلمات کا داغ
بال بکھرائے گذرتی ہے صبائے گلشن
خون میں ڈوب گئی آہ قبائے گلشن

راہی:-
کون جانے کہ یہ طوفان کہاں ٹھہرے گا
افقِ تار سے کیا صرف لہو برسے گا

زروان:-
لہو ہاں لہو ابر بدر ابر آفاق کی وسعتوں سے ہر خاک
برسا
لہو جو کہیں دشت و صحرا پہ ٹوٹا، لہو جو کہیں لالہ و گل
سے چھلکا
لہو جس نے مہتاب زادوں کی دنیا میں تاریکیوں کا تلاطم
اچھالا
لہو جس نے نہ ہو شہزادوں کے تخلیق کردہ مہ و مہر کو
داغ ڈالا

لہو جس سے سنبل کی زلفیں بھی سلگیں لہو جس سے نرگس
نے آنکھیں بھی کھوئیں
لہو جس سے غنچہ بہ غنچہ بہاریں خزاں در خزاں موت کی
نیند سوئیں
لہو پیاس دھرتی کی جس نے بجھائی، لہو آگ جس نے
دلوں میں لگائی
لہو جس کے آگے سراسیمہ و بیقرار و پریشان تھی
کج کلاہی
اگرچہ لہو کی گھٹا ٹوپ برکھا افق سے افق تک
شب و روز برسی
مگر دوستانِ وطن نے لہو کے اسی سیل سے اپنی
تاریخ لکھی!
ہوا مغلیہ عظمتوں کو لئے گل چراغِ تجلائے
اورنگ زیبی
تو اربابِ حرص و ہوس کے دلوں پر مچلنے لگا سانپ
خود فریبی
وہ ریشہ دوانی میں مصروف شہزادے اپنے
شبستان راحت سے نکلے
کہ جیسے کئی برق رفتار ناوک بشدت کمانِ
شقاوت سے نکلے
ادھر سر میں اعظم کے سودا سمایا کہ تاج حکومت
مرے سر پہ رکھو
ادھر وہ عظیم آگ بن کے اٹھا وہ معظم پکارا
مجھے سلطنت دو
ادھر خانہ جنگی سے شیرازہ و انتظام و قیام
حکومت پریشاں
ادھر کام بخش آسمانِ دکن کے ستاروں پہ اپنے
تسلط کا خواہاں
ادھر وہ معظم نے اعظم کے خوں سے گلستان ہستی کو
رنگیں بنایا
ادھر رشک و بغض و نفاق و حسد کے شیاطین نے
سینوں میں ڈیرا جمایا

وہ سیاہ برادر جنہیں ناز تھا آج تک آپ اپنی
نمک خواریوں کا
مزا چکھ رہے تھے وہ خوانِ ہوس پر شب و روز تازہ
ہوس کاریوں کا
ادھر مرہٹوں نے وہ آنکھیں دکھائیں ادھر راجپوتوں
نے طوفاں اٹھایا
ادھر وہ بغاوت کے زائیدہ سکھوں نے پنجاب کو
اپنا مسکن بنایا
جہاں دار و فرخ سیر اور رفیع و محمد سے خود کام
شہزادے آئے
مگر سینہ چاکانِ ملک و وطن کے سروں سے نہ پلٹے
مصیبت کے سائے
ادھر یہ فضا تھی ادھر مرگ سامان نادر نے دہلی پہ
شبخون مارا
ہر اک قلب میں ایک تلوار توڑی، ہر اک آنکھ میں
ایک نیزہ اتارا
نہ چھوڑا کوئی پھول بھی جس نے شاداب و رنگین
کاشانۂ زندگی میں
ثریدہ سروں کے مینارے کھڑے کر دئے جس نے
فتح و ظفر کی خوشی میں
زر و مال و دولت سے لبریز جتنے خزانے تھے ان کو
شب و روز لوٹا
ادھر سنگ دل خاک دہلی سے لوٹا ادھر شاہ سے
تختِ طاؤس چھوٹا
یہ عالم تھا جب پھیلتے جا رہے تھے پریشان راتوں
کے تاریک سائے
اسی سائے میں چھپ کے مغرب کے کچھ سامراجی
لٹیروں نے ڈیرے جمائے
وہ اک ایلچی جس نے ٹکڑا زمیں کا جہانگیر سے بھیک
خیرات پایا
اسی کے عزیزوں نے آخر جہانگیر کے دیس کو اک
جہنم بنایا

وطن کی قمر رنگ و شفاف و روشن مقدس جبیں پر
نئے داغ آئے
پریشان و مجبور و بیکس وطن دوستوں کے دلوں نے
نئے زخم کھائے
تجارت کے "پردلے" ہاتھوں میں لے کر سیاست کے
کچھ شاطران گرامی
کبھی کلائیو سے کوئی آفات بنکر کبھی ڈلزلی سے اجل
کے پیامی
وہ "تقسیم کرکے حکومت کرو" کے اصول سیہ پر عمل
کرنے والے
ہر اک صبح کے سینۂ نور افشاں میں زہراب آلام
شب بھرنے والے
کہیں سینہ زوری کہیں صاف چوری کہیں چالبازی
کہیں پست دھوکے
نہ ملنے کہیں مال و دولت کے بھوکے نہ ٹھہرے کہیں
جاں نثاروں کے روکے
بڑھے شہر در شہر قریہ بہ قریہ اٹھاتے ہوئے ظلمتوں کے
پھریرے
کچلتے ہوئے مست و شاداب گلشن نگلتے ہوئے ماہتابی
سویرے
بہ تیغ زر و سیم فاقہ کشوں کو کھلاتے ہوئے زخم
ناداریوں کے
دکھاتے ہوئے ڈھنگ عیاریوں کے بچھاتے ہوئے
جال مکاریوں کے
وہ عفریت زادے کہ جن کے تنفس کے آگے جہنم کے
شعلے بھی ہیں
ہوس ملک گیری کی لے کر بڑھیں تو زمیں کیا ہے کہسار
و افلاک کانپیں
وہ انسان نما ننگ انسانیت بھیڑیے جو لہو سے
فضاؤں کو پاٹیں
وہ جوع البقر میں گرفتار اژدر زمیں در زمیں جو
فقط خاک چاٹیں

کہیں ہڈیوں کو مزے سے چباتے کہیں خوں کے دریاؤں
میں رقص کرتے
بڑھے زہر آلود سانسوں سے اپنی گل و یاسمن میں
شراروں کو بھرتے
وہ "بکسر" سے طوفان اٹھے مگر پھر نہ اٹھے کبھی موت کی
نیند سو کر
"پلاسی" کے شعلہ در آغوش میدان جلے اور بکھر گئے
خاک ہو کر
وہ قاسم، سراج اور چندا کے خوں سے ستارے افق
تا افق جھلملائے
وہ حیدر علی موت کی نیند سویا لہو سے وہ ٹیپو کے
طوفان چھائے
وہ "میسور" جلنے لگا وہ "سرنگاپٹم" سے شراروں کے
طوفان چھوٹے
وہ بنگال نگلا، دکن کو ڈسا، وہ اودھ کی شفق رنگ
شاموں پہ ٹوٹے
خزاں در خزاں دشت در دشت اٹھے بگولے
فنا کیش ویرانیوں کے
قفس در قفس اور زنداں بہ زنداں پڑے طوق گردن
میں زندانیوں کے
غلامی کی یہ تیرہ و تار راتوں کی برکھا کچھ اتنی شدید
اور گھنی تھی
کہ دلی عروس البلاد وطن بھی اسی کے اندھیروں
کی زد میں کھڑی تھی
وہ تیمور زادہ کہ جس کے آب و جد کے آگے زمین و
فلک سرنگوں تھے
اسی کے محل کے در و بام اغیار کے سائے میں بیقرار
سکوں تھے
دلوں میں تلاطم تھے بے چینیوں کے نگاہوں میں شعلے
تھے ویرانیوں کے
غرض ٹکڑے ٹکڑے وطن کی جبیں پر نشاں ہو گئے تھے
ریشہ دوانیوں کے

کہاں تک اسیر شب یاس رہتی شرر ریز سینوں
کی شعلہ بجانی
کئی جاں نثاران ملک و وطن نے وطن کے لئے
جاں نثاری کی ٹھانی
اٹھے بند در بند محبوس طوفاں سیہ رات کی بیکراں
تیرگی سے
وطن کی جبیں کا حسیں چاند ابھرا بغاوت کی بیتاب
شعلہ گری سے
وہ اک برق ساماں تجلی بداماں سحر خواب در خواب
راتوں پہ چھائی
وہ گونجی فضا، وہ وطن کے کچھاروں سے شیران قومی
کی آواز آئی

(پس منظر میں رزمیہ نغموں کی آواز)

کہاں سو رہے ہو رفیقان جرأت
اٹھو شہریاران ملک شجاعت
سنو یہ وطن کا تقاضائے غیرت
بغاوت، بغاوت، بغاوت، بغاوت

بغاوت کڑے بندھنوں سے بغاوت
خدائی کے ان رہزنوں سے بغاوت
کثافت بھرے دامنوں سے بغاوت
بغاوت وطن دشمنوں سے بغاوت

رگوں میں لہو جم گیا ہے بتاؤ
قفس کے مکینو حمیت دکھاؤ
اڑاؤ بغاوت کے شعلے اڑاؤ
جگاؤ جگاؤ جہنم جگاؤ

یہ دیکھو یہ گیہوں کی سادہ چپاتی
دھڑکتی ہے جس سے غریبوں کی چھاتی
بنی ہے جو اغیار کی ملک ذاتی
[illegible]

قسم ہے اُمڈتی ہوئی جنتوں کی
قسم تم کو پھیلی ہوئی ظلمتوں کی
قسم تم کو روتی ہوئی قسمتوں کی
قسم تم کو لٹتی ہوئی عصمتوں کی

لہو سے بھرے دامنوں کو نچوڑو
مڑوڑو کلائی ستم کی مڑوڑو
اسیرانِ غم، خوابِ غفلت کو چھوڑو
قفس کی یہ سنگین دیوار توڑ دو

کوئی مدعی ہے دل کی ناشادیوں کی
غلامی کی بے درد بربادیوں کی
وہ دیکھو فضا موت کی وادیوں کی
وہیں صبح پنہاں ہے آزادیوں کی

چلو اس فضا میں قیامت مچائیں
بپیں دشمنوں کا لہو اور پلائیں
بغاوت کے شعلے فضا میں اٹھائیں
اندھیروں سے ہم صبح کو چھین لائیں

یہ گیت آگ کی طرح پھیلا فضاؤں میں
گونجا نگر نگر تو چھڑا گاؤں گاؤں میں
لب ہائے بیقرار پہ نغمے اسی کے ہیں
ہر دل میں ہر نگاہ میں شعلے اسی کے ہیں
تقسیم ہاتھوں ہاتھ ہوئیں وہ چپاتیاں
جن میں چھپا ہوا تھا طلسمِ شررفشاں
کعبہ ہو دیر ہو کہ حرم ہو کہ بت کدہ
بس ایک نغمہ ایک صدا ایک زمزمہ
کیسا نشہ تھا گیت کا سب چور ہو گئے
کیا طلسم تھا سبھی مسحور ہو گئے
محلوں سے شاہ نکلے گھروں سے فقیر بھی
شاہ و گدا تھے یا کہ امیر و فقیر تھے
زلفِ عروسِ عزم کے سب ہی اسیر تھے
برقِ ہمالہ راس کمار ی پہ کوندتی
آندھی اٹھی بسیط فضاؤں کو روندتی
کہسار و دشت ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے
اک شعلۂ چراغ سے سب دیپ جل گئے
کھیتوں سے آ گئیں وہ کسانوں کی ٹولیاں
کھیلیں گے اپنے خون سے یہ لوگ ہولیاں
بندوق ہے نہ پاس سناں ہے نہ برچھیاں
لیکن انہیں نہ روک سکیں تنگ دستیاں
کچھ گند سے کدال شکستہ سے ہل لئے
یہ بھی چلے ہیں بادۂ حبِ وطن پیئے
میرٹھ ہو لکھنؤ کہ ہوں دہلی و کانپور
خارا شگاف موت سے ٹکرائیں گے ضرور
پھوٹی افق سے خونِ شہیداں کی روشنی
وہ گردنوں سے دور ہوئے طوقِ آہنی
حبِ وطن جو دیدہ و دل سے ہوئی قریب
ذلت سے نوکری کی رہا ہو گئے غریب
زندانیوں نے چھین لیں زنداں کی کنجیاں
وہ قیدیوں نے کاٹ دیں پیروں کی بیڑیاں
آزادیوں نے نذر طلب کی جو خون کی
"حاضر ہیں ہم" صدا یہ فضاؤں میں گونج اٹھی
ہر سازِ زیرِ و بم زنگ نے راگ اپنے دے دیئے
معصوم دلہنوں نے سہاگ اپنے دے دیئے
بہنوں نے اپنی آنکھ کے تارے عطا کئے
ماؤں نے اپنے راج دلارے عطا کئے
خوں سے دراز دامنِ ایثار بھر دیئے
شہزادیوں نے اپنے محل ترک کر دیئے
حیدر علی کے عزم کی تسخیر تو نہیں
ٹیپو کے خواب کی یہی تعبیر تو نہیں
(ایک لمحے کا وقفہ)

زدوان:۔
پہلے پہل چھڑی تھی جہاں داستانِ خوں
آؤ میں اب تمہیں اسی مقتل میں لے چلوں
یہ دیکھو سامنے رہی میرٹھ کی چھاؤنی
یہ ہیں کہ جن کے خون سے تاروں میں روشنی
یہ وہ جری سپاہی شجاعت سرشت ہیں
میدان جن کو جنگ کے رشکِ بہشت ہیں

راہی:۔
لیکن حضور چہرے پہ ہیں کیسی زردیاں
شیروں نے آج کیسے پہن لیں یہ بیڑیاں

زدوان:۔
ان کے لہو کا پیاسا ہے لشکر یہ موت کا
چپ چاپ دیکھتے رہو منظر یہ موت کا

ایک آواز:۔
مجرمو تم نے شیاطیں کی رفاقت کی ہے
باغیو تم نے حکومت سے بغاوت کی ہے
مان جاؤ کہ ابھی بحرِ کرم جاری ہے
باز آ جاؤ اگر جان تمہیں پیاری ہے
جانتے ہو جو فضا آہنی سولی کی ہے
جانتے ہو جو سزا حکم عدولی کی ہے

باغی:۔
نذرِ زنداں تھے ہمیشہ سے مگر آج نہیں
پا بجولاں تھے ہمیشہ سے مگر آج نہیں
یہ محل بیچ دئے تھے یہ زمیں بیچی تھی
....
جاگ اٹھے تھے شب و روز کی بربادی سے
آج آزاد ہیں ہم، روح کی آزادی سے

آواز:۔
تم پسِ مرگ جہنم میں گرفتار رہو
باغیو اپنی سزا کے لئے تیار رہو

باغی:
جان نثاروں کے لئے جلوہ گہہ نور ہے موت

آوازیں:-

ان کی ناپاک نگاہوں میں شرارے بھر دو
وردیاں نوچ لو جسموں کو برہنہ کردو
بلبلی داب دو بندوقوں کی
ختم ہو آگ بجھیں جسموں کی
(ایک ساتھ گولیوں کی آواز اور پھر موت کا سکوت)
(وقفہ)

زدوان:-

تیرگی خونِ شہیداں سے چمک اٹھی ہے
آگ کب ختم ہوئی آگ بھڑک اٹھی ہے
زاغِ وحشی رات کے ہاتھ سے جہنم چھوٹا
بجلیوں کا وہ شرربار سمندر ٹوٹا
موج بر موج بڑھا سیل شرر باروں کا
لو وہ سیماب پگھلنے لگا سیاروں کا
ہر طرف مرگ اثر آتش وحشت پھیلی
آگ جنگل میں لگی آگ کی صورت پھیلی
راکھ کا ڈھیر ہوئی جل کے بہشت شداد
موت کے پنجۂ مضبوط میں چپ ہے صیاد
اب کہاں ظلم و تشدد کے گھنے سائے ہیں
اب نشاں جبر کے کس قصر پہ لہرائے ہیں
پے بہ پے آگ نے طوفان وہ برسائے ہیں
سب کے سب سرخ لبادے میں سمٹ آئے ہیں
وہ چلا سیل شرربار چلا
ظلم کو خاک سیہ کرتا ہوا
لو وہ قلعے کی فصیلوں پہ قدم بوس ہوا
اور تحسین کے نعروں سے فلک گونج اٹھا

آوازیں:-

جلوۂ چہرۂ تجلائے سحر زندہ باد۔
بارشِ روشنیِ برق و شرر زندہ باد!
صبحِ آزادیِ خورشید نظر زندہ باد!
قیصرِ ملک، شہنشاہ ظفر زندہ باد!

دوسری سمت سے آوازیں:-

چراغِ بابر و اکبر نژاد زندہ باد!
نشانِ قافلۂ اتحاد زندہ باد!
ترا یقین، ترا اعتماد زندہ باد!
پناہِ شعلگیِ برق و باد زندہ باد!
(ایک لمحے کا وقفہ)
وہ شہنشاہ ظفر آئے دریچے کے قریب
سرنگوں ہو گئے تا حدِ نظر شاہ و غریب
سر ہوئیں توپیں سلامی میں شہِ والا کی
وہ گرج تھی کہ فضا کانپ اٹھی دنیا کی
(وقفہ)
منعقد شان سے دربار ہوا
شاہ نے قوم سے ارشاد کیا
خوش آمدید ضیغم و شیرانِ زندگی
خوش آمدید شعلہ طرازانِ زندگی
غیرت نشان، زلزلہ سامانِ زندگی
خوش آمدید قیصر و خاقانِ زندگی
ماضی کی شانِ رفتہ کے خود نوحہ گر ہیں ہم
مانگو جو مانگنا ہے چراغِ سحر ہیں ہم

باغی:-

گیتی پناہ، عرش نشیں، آسماں جاہ
طالب ہے دستگیریِ عالی کی یہ سپاہ
سرکار ناخدا ہیں ہمارے خدا گواہ
انصاف چاہتے ہیں سزاوارِ بے گناہ
ارضِ وطن کی خون میں ڈوبی فضاؤں کی
سرکار دستگیری کریں بے نواؤں کی

بہادر شاہ:

گلشن سے پھول بن کوئی مالی نہیں گیا
محرومِ لطفِ درگہِ عالی نہیں گیا
مایوس ایک دن بھی سوالی نہیں گیا
اس در سے آج تک کوئی خالی نہیں گیا

تیمور کی قسم غمِ ہستی سے کیا حسند
سر چاہیے ہمارا تو صدقے ہے قوم پہ

باغی:-

اس مملکت پہ بابری پرچم اڑائیں گے
سوگندِ شہجہاں کی قیامت مچائیں گے
غوطے لہو کی تیز ندی میں لگائیں گے
ماضی کے آفتاب کو ہم ڈھونڈ لائیں گے
تاریکیوں کو حسنِ شبِ ماہ مل گیا
ارضِ وطن کو آج شہنشاہ مل گیا
(پس منظر میں مسرت کے شادیانے)
(طویل وقفہ)
(پس منظر میں گولیوں اور توپوں کی گھن گرج)

زدوان:-

دھم دھا دھم چوٹ نقاروں پہ وہ پڑنے لگی
موت بن کر ایک سیلِ بیکراں بڑھنے لگی
خاک میں آنکھوں کے موتی رل گئے
لو وہ توپوں کے دہانے کھل گئے
گھن گرج سے گونج اٹھے کیا زمیں کیا آسماں
تیز شعلوں میں گھرے ہیں کیا چمن کیا گلستاں
برق نشاں برق ساماں ہے ہوا
حشر در آغوش ہے ساری فضا
ضبط کرتے کرتے آخر پھٹ پڑا آتش فشاں
لو وہ برسانے لگا لاوا زمیں پر آسماں
وہ چلا وہ آبشارِ آتشیں
وہ جلی پگھلی تڑپ اٹھی زمیں
آبشارِ آتشیں میں غوطہ زن ہیں جاں نثار
اور اوپر سے مسلسل گولیاں ہیں شعلہ بار
نشۂ حبِ وطن سر پر سوار
زندگی یا موت کی ہر سو پکار
تیز طوفاں، زلزلے شعلے، کڑکتی بجلیاں
گولیاں بندوقیں توپیں برچھیاں تیغ و سناں

موت کے سائے ادھر بڑھنے لگے
خون کے دریا ادھر چڑھنے لگے
لگ گیا شدّاد کی جنّت میں لاشوں کا ہجوم
آسمانِ ظلم سے گرنے لگے ماہ و نجوم
وہ ہوئے ہیں نعرہ زن انجم شکار
بھاگ اٹھے ظلم کے پروردگار

(ایک طویل وقفہ)

(پس منظر میں حزنیہ نغموں کی آواز)

سامراجی رہزنوں نے پھر بچھائے اپنے جال
دو مہینے میں دگرگوں ہو گئی تصویرِ حال
موجۂ خوں سے فضاؤں کو معطّر کر چکے
باوفا خاکِ وطن پر جاں نچھاور کر چکے
بادۂ حُبِّ وطن سے مست شاداں جاں نثار
رفتہ رفتہ ہو گئے پیوندِ شامِ انتظار
روشنی ظلمت پہ لمحے بھر کو چھا کر رہ گئی
صبحِ آزادی جھلک اپنی دکھا کر رہ گئی
حریّت کی آہ شمعِ آخری خاموش ہے
بخت خاں جیسا بہادر اور جری خاموش ہے!
بجلیوں کی طرح گرتی جھلملاتی کوندتی
وہ شہیدانِ وطن کی پاک لاشیں روندتی
لیجئے وہ شہر میں داخل ہوئی فوجِ ستم
تک رہا ہے پھر زمیں کو آسماں باچشمِ نم
شہر کے دیوار و در پر مردنی طاری ہوئی
لال قلعے کی فضا سے اک صدائے غم اٹھی

سلام اے مرے قلعے، مری حیات کے راز
سلام اے مری راتوں کے ہمدم و دمساز
سلام اے مرے ماضی کے آفتابِ حسیں
سلام اے مرے انجم نژاد و زہرہ جبیں
سلام اے مرے اجداد کے ہنر کی نظیر
سلام مسکنِ شاہ جہان و عالمگیر
خموشیوں سے ملیں گے مجھے پیام ترے
سلام تجھ کو در و بام کو سلام ترے

سلام تخت گہہ حکمرانِ عرش مقام
سلام تجھ کو تری جاوداں فضا کو سلام
سلام تجھ کو تری خوش نگاہیوں کو سلام
سلام تجھ کو تری کج کلاہیوں کو سلام
محل کو چھوڑ کے اک مقبرہ لبساتے ہیں
کبھی مکیں بھی مکانوں کو چھوڑ جاتے ہیں

(ایک وقفہ)

ذروان:-

ہمایوں کا وہ حسیں مقبرہ اداس ہے آج
کہاں وہ رونقِ شاہی کہاں وہ تخت و تاج
کہ آج تخت کا وارث درود پڑھتے نہیں
پناہ ڈھونڈنے آیا ہے لے کے قلبِ حزیں
وہ جن کا دیدۂ دل پر تھا دو جہاں کے راج
وہ شاہزادے وہ شہزادیاں غریب ہیں آج!
اجل نے گھیر لیا ہو تو راہ کیسے ملے
شکستہ حال کو آخر پناہ کیسے ملے
وہ مقبرے کے در و بام غم سے کونج اٹھے
وہ دیو سار ستمگر یہاں بھی آ پہونچے
کوئی نہیں جو انہیں ان کے ظلم پر ٹوکے
کوئی نہیں جو انہیں بڑھ کے راہ میں روکے
وہ تھک کے غم سے ڈھلے آنکھ کے کٹورے بھرے
وہ شاہزادیاں چیخیں وہ شاہزادے گرے
ہزار اشک گرے صد ہزار اشک پئے
غریب باپ نے بیٹوں کے سر بھی دیکھ لئے! (وقفہ)
وہ لال قلعہ جہاں کھلا ہی تھی رقصاں
اسی مقام پہ قیدی ہے فخرِ شاہجہاں
نگاہِ غور سے دیکھو یہی وہ قیدی ہے
کہ جس کو عظمتِ اسکندری ترستی ہے
نہ احترام نہ کچھ پاسِ شان رکھ کبھی
پکارتا ہے کوئی راہزن کوئی قیدی
غریب شاہ کا اب کون احترام کرے
وہ سرنگوں ہے جسے آسماں سلام کرے

جو آج صیدِ ستم ہے کریم تھا کل تک
حقیر آج ہوا ہے عظیم تھا کل تک

ایک آواز:-

تم نے ہر پھول ہمارے ہی گلستاں کا چُنا
تم نے وہ ظلم کئے ہیں جنہیں دیکھا نہ سُنا
تم نے غدار عناصر کی رفاقت کی ہے
تم نے سرکارِ گرامی سے بغاوت کی ہے
قابلِ لعنت و نفرین لبِ پستی ہو
تم کہ قاتل بھی ہو مجرم بھی ہو بے دل بھی ہو
تم سے بڑھ کے کوئی دنیا میں گنہگار نہیں
تم بجز مرگ کسی شے کے سزاوار نہیں

(ایک وقفہ)

پھر وہی آواز:-

گو انتقام کا جذبہ تو کسمساتا ہے
مگر تمہاری ضعیفی پہ رحم آتا ہے
یہی بہت ہے تمہیں بستۂ رسن کر دیں
وطن کی روح وطن سے جلاوطن کر دیں

(پس منظر میں غم انگیز موسیقی کی ڈوبتی لہریں)

ذروان:-

ادھر یہ حکم ہوا اور ادھر یہ حالِ تباہ
وطن سے دور چلا صاحبِ شبابِ وطن
تمام عمر رہا بستہ و اسیرِ رسن!
دیارِ غیر میں اک خانماں خرابِ وطن
غروب ہو گیا رنگون کے اندھیروں میں
مصیبتوں کے گہن لے گئے آفتابِ وطن
یہ اور بات کہ اس وقت کی فضاؤں میں
بدل سکا نہ کوئی رنگِ انقلابِ وطن
ہر ایک آنکھ کی زینت، ہر ایک دل میں رہا
کبھی جو شاہ نے دیکھا تھا ایک خوابِ وطن
وہ نوّے سال کی تاریک رات ختم ہوئی
لہو میں ڈوب کے ابھرا ہے آفتابِ وطن

بہادر شاہ ظفر کے فرامین — بقیہ ص۳۵

بالعکس ہیں زمانے میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانے نے اختیار

ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجب روش باغِ روزگار

جو نخل پُر ثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

بادِ صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دم بدم کفِ افسوس برگ تاک

غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہووے گا سر پہ چرخ بھی جاویں گے ہم کہاں

کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں!
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

اور اس جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں بہادر شاہ ظفر رنگون میں جلاوطنی کی زندگی گزار کر قید حیات اور قید فرنگ دونوں سے چھوٹے
(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

غزل

بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ — موت بھی جرم، زندگی بھی گناہ

میں چلا جا رہا تھا اپنی راہ — سامنے آپ آ گئے ناگاہ

کس کا شکوہ کہاں کا حالِ تباہ — اُف، وہ نازک سی زیرِ لب اک آہ

رہ گئی جزوِ زندگی بن کر — ایک معصوم اجنبی سی نگاہ

آپ پھولوں سے جھولیاں بھر لیں — ہم نے کانٹوں سے کر لیا ہے نباہ

میں بہ ہر حال ہوں فراق نصیب — تو بہر رنگ ہے مرے ہمراہ

میکدے میں جنابِ شیخ کہاں

آ ہی نکلے، تو خیر بسم اللہ

غزل

سید ذوالفقار علی بخاری

زندگی کا افسانہ ہر دور میں لکھا جاتا ہے۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ لیکن وہ تاثر جسے غزل کی زبان نصیب ہو جائے عہد بعہد تازہ نظر آتا ہے۔ سید ذوالفقار علی بخاری کی پیش نظر غزل بھی ایک ایسی ہی یادگار ہے۔

آتا ہے نظر انجام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے
باقی ہے خدا کا نام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

لا بھر کے بخطِ جام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے
دے مستی کا پیغام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

کیا ہوش و خرد سے کام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے
لا اور پلا اِک جام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

اک جام کے بدلے ہوش و خرد یہ سودا مہنگا پڑتا ہے
پر کون جھکائے دام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

خورشید کو جام سے شرمائیں گے شام کو تیرا وعدہ تھا
ایفائے عہدِ شام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

ہم کتنی پینے والے ہیں تم کتنی پلانے والے ہو
یہ راز ہے طشت از بام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

اب ظرف کہاں تک پرکھو گے چھوڑو یہ پرانی باتیں ہیں
رندوں پہ فیضِ عام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

اے رند ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کیا ساقی کا منہ تکتے ہو
محفل میں مچے کہرام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

یہ راہ پر آ ہی جائے گا تو زاہد سے مایوس نہ ہو
اُٹھ لے کے خدا کا نام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

سب تیرے دست نگر تھے لیکن میں تھا تیرا چشم نگر
کر ایک نظر انعام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

یہ برہم ہونے والی محفل یوں بھی برہم ہو جاتی
ہم کہہ کے ہوئے بدنام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

اب کوئی نہیں سنتا ہے، تاروں کی آنکھیں جھپکی ہیں
چل ساتھ مرے دو گام کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

اک شمع رہ گئی تھی ـــ!

عبدالرؤف عروج

تیرگی حدِ نظر تک چھا گئی رات آ گئی
آرزوئے عشرتِ فردا گئی رات آ گئی
داستاں گو کی حدیثِ دلگداز و جاں گسل
نیند سے آخر شکستیں کھا گئی رات آ گئی
دور ـــ اس زنگوں میں پُر ہول خوابوں کی گھٹا
اک نئے انداز سے لہرا گئی رات آ گئی
کچھ عزیزانِ وطن مظلوم قیدی ہو گئے
قید خانے کی فضا سنولا گئی رات آ گئی

آج کی رات بڑی دیر سے بیدار ہوں میں
آج کی رات فغاں رد بہ اثر ہو کہ نہ ہو
آج کی رات خدا جانے سحر ہو کہ نہ ہو
کتنی بیتی ہوئی باتیں مجھے یاد آتی ہیں
کتنی گذری ہوئی راتیں مجھے یاد آتی ہیں
یاد آتے ہیں نگارانِ خود آرا مجھ کو
کتنے کھوئے ہوئے مجروں نے پکارا مجھ کو
خورشید و مہ و کاہکشاں تیرے لئے ہو
تسلیم کہ ہر اوج جہاں تیرے لئے ہے
یہ عظمتِ احساس! یہ گنجینۂ معنی!
منجملۂ الفاظ و بیاں تیرے لئے ہے
یہ عزم یہ ایثار یہ ہمت یہ بلندی
یہ خاصۂ صاحب نظراں تیرے لئے ہے
دیوانوں پہ اس سمت بھی اک چشمِ عنایت
نذرانۂ جنبشِ دل و جاں تیرے لئے ہے

جانے کیا بات ہے، ہر بات پہ رو دیتا ہوں
اور دل بیٹھے بٹھائے یونہی بھر آتا ہے
کیا ابھی اور نگاہوں کو جھلسنا ہوگا
کیا مرے خوابِ مسرت کی یہ تعبیریں ہیں؟
جن کی تقدیر تھے پھولوں کے مہکتے گجرے
آج ان ہاتھوں میں فولاد کی زنجیریں ہیں

میں ہوں اور قید کی ڈستی ہوئی تنہائی ہے
میری قسمت مجھے زنگوں میں لے آئی ہے
سطوتِ جاہ گئی، بخت گیا، راج گیا
چھٹ گئے اہلِ وطن، تخت گیا، تاج گیا

مدتوں سے ہیں مری یاد میں محفوظ اب تک
اُفقِ دار پہ لہرائے ہوئے سینکڑوں جسم
کمپنی کی ہوسِ جاہ کے ناپاک طلسم
ہر طرف فوجِ ستم پیشہ بہ اندازِ سموم
چاندنی چوک میں دم توڑتی لاشوں کے ہجوم
روئے تہذیب پہ خنجر کی خراشیں دیکھیں
میں نے ان آنکھوں سے روندی ہوئی لاشیں دیکھیں
موت کا رقص، بصد جبر مکرر دیکھا
زندگی سر بہ گریباں تھی کہ کیونکر دیکھا

اے مری بے کسیٔ زیست سنا ہے تو نے
لال قلعہ میں اُڈتی ہوئی فوجیں گونجیں
اپنی زینت کو لٹیروں کے حوالے کر دوں،
میرے بچوں ہی کے سر کاٹ کے بھیجے مجھکو
اور پھر حکم کہ دو روز کا فاقہ ٹالوں

کونسا جرم کیا، کیسی بغاوت کی تھی
میں نے انسان کی عظمت سے محبت کی تھی
ایک خونخوار سیاست کی نمائش کے لئے
مجھکو حاکم سرِ بازار لئے پھرتے تھے

شاہراہوں پہ تھا مخلوق کا اک جمِ غفیر
کھا کے غش مرد و زن و پیر و جواں گرتے تھے
کیا رہے گی نہ وہ فریاد و فغاں یاد مجھے؟

اک شہنشاہ کو زنجیر بپا کرتے ہیں — کونسے لوگ ہیں یہ اور یہ کیا کرتے ہیں
فرشِ گل بھی تھا گراں جس کی نزاکت پہ اگر — ظلم ہے ظلم گرفتارِ بلا کرتے ہیں
ایک اک شہر فسانہ ہے ستم گاری کا — ملک یوں بھی کہیں تاراج ہوا کرتے ہیں
چاندنی چوک پہ پہرہ ہے نگہبانوں کا — شاہراہوں سے بھی طوفان اٹھا کرتے ہیں

آخری شمع جلی تھی سرِ ایوانِ وطن
اور کم بخت اسے نذرِ فنا کرتے ہیں
کتنی ویران نگاہوں نے کہا کیا ہوگا
میں بھی کچھ سوچ کے خاموش رہا کیا ہوگا
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتا ہوں
خوش رہو اہلِ وطن اب تو سفر کرتا ہوں
غالب و ذوق کی وہ چشمکِ باہم بھی گئی
میں جنہیں بھول گیا کتنے حقائق ہوں گے
وائے ناکامیٔ احساس نہ تھی مجھکو خبر
کہ مرے شعر مرے حال پہ صادق ہوں گے:

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھکو — عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ — ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

کون چھوتا ہے مری روح کے الجھے ہوئے تار
اور پہلے سے زیادہ ہے مرے دل کی جلن
افقِ ذہن پہ ہے دیر سے منڈلائی ہوئی
عشرتِ عمرِ گذشتہ کی دلآویز تھکن
میرے ارمانوں کے ایوانوں کی زنگیں پریاں
میرا سرمایۂ جاں لوٹ رہی ہیں جیسے!

جیسے ہر بات پہ دل ڈوب کے رہ جاتا ہے
جسم کی ساری رگیں ٹوٹ رہی ہیں جیسے
میرے اجداد کی معصوم مقدس روحو!
تم جہاں ہو اسی دنیا میں بلا لو مجھکو
دل میں پیوست ہیں اس طرح کے نشتر لاکھوں
یہ حزیں گیت نہ رو رو کے سناؤ مجھکو

یاروں کی انجمن میں پرائے ہوئے ہو تم — صورت بتا رہی ہے ستائے ہوئے ہو تم
یہ بیڑیاں، یہ طوق و سلاسل یہ قید و بند — کن کن مصیبتوں کے رلائے ہوئے ہو تم
آزادیٔ حیات کا پرجوش ولولہ — شاید دلِ جہاں میں جگائے ہوئے ہو تم
کوشش کے باوجود کسی سے نہ بجھ سکے
طوفاں میں وہ چراغ جلائے ہوئے ہو تم

میرے اجداد کی معصوم مقدس روحو!
اب تو ماضی کے تصور سے بھی گھبراتا ہوں
انتظار اور ذرا ابھی اور کہ میں آتا ہوں
وادیٔ مرگِ وفا، قیدِ بلا خوب ملی
مجھکو ناکردہ گناہوں کی سزا خوب ملی
میرے سینے میں ہے اس جذبۂ گلکار کی ضو
جو سیہ پوش فضاؤں میں بکھر جائے گی!
یہی تاریخِ بغاوت، یہی تحریکِ عظیم
انہیں کچلے ہوئے ڈھانچوں سے ابھر جائے گی
جن کو سینچا ہے مرے خونِ تمنا نے وہ پھول
خلدِ مستقبلِ زریں میں مہک اٹھیں گے
اور پھر غیرتِ قومی کے جواں ہونٹوں پر
گیت آزادیٔ انساں کے دہک اٹھیں گے
آفتابوں کا ستاروں کا وطن جاگے گا
بے کراں گنگ و جمنی بہاروں کا وطن جاگے گا
وطن جاگے گا — وطن جاگے گا۔

(اوم تورڈ تیاہی)

*
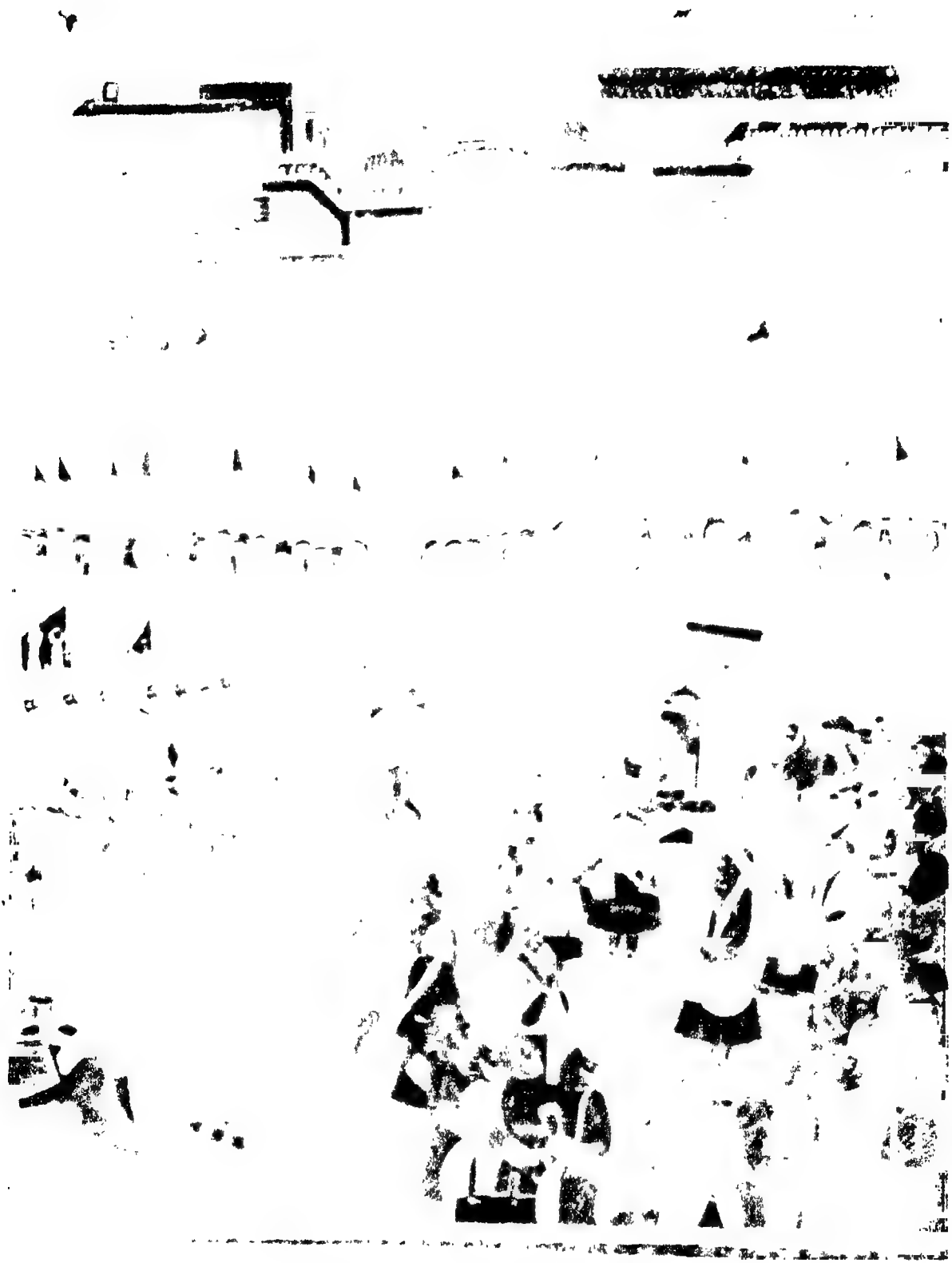
شہنشاہ اورنگزیب کا محاصرۂ گولکنڈہ
(از عجائب خانہ ، لاہور)

غزل

فضل احمد کریم فضلی

بند ہیں راہیں کہیں، حکمِ زباں بندی کہیں
بندہ پرور یوں بھی ہوتی ہے خداوندی کہیں

آشیاں اجڑا کرے گا باغباں کوئی بھی ہو
آج تک بدلا ہے دستورِ چمن بندی کہیں

ظلم ڈھاتے تو ہیں اپنے آرزو مندوں پہ آپ
اور جو ہم چھوڑ بیٹھے آرزو مندی کہیں

لو قفس میں اور بھی شورِ غنا دل بڑھ گیا
فطرتِ آزاد پہ چلتی ہے پابندی کہیں

یاد اُن میں سے نہ آئیں ایک بھی ہنگامِ شوق
جتنی باتیں مجھ سے تو نے اے خردمندی کہیں

منہ سے کہتے تو نہیں ہو آئنہ بھی دیکھنا
بولتی ہیں یوں بھی آنکھیں بے رضامندی کہیں

برق گرتی ہے گرے اور آگ لگتی ہے لگے
اسطرح رکتا ہے کارِ آشیاں بندی کہیں

اب مصائب سے بھی گھبراتے ہوئے ڈرتا ہے دل
وہ بڑھاتے ہوں نہ میری حوصلہ مندی کہیں

گر نہیں کچھ اور تو اپنا ہی خوش ہوتا ہے دل
دوستو بے کار جاتی ہے ہنر مندی کہیں

خوب غزلیں آپ کی ہیں حضرت فضلی مگر
ہو نہ جائے آپ کو نازِ ہنر مندی کہیں

شعلۂ مستعجل —!

(حیدر علی)

عبداللہ خاور

ظلمتِ شب چھا گئی، سو گئی بزمِ وجود
دیدۂ انجم میں ہے، اشکِ سحر کی نمود
شعلۂ رم آشنا، مجھ کو تری جستجو
تجھ کو اُڑا لے گئی، میری ہوائے سجود
جلوۂ حسن تمام، مجھ کو فریب اور دے
کار تمنا نہیں، راز کی بست و کشود
رو نیاز ازل سے رہی حالِ رنگِ دوام
پھر بھی ہے کیوں ناتمام شورشِ بود و نبود
کاوشِ پیہم کہ ہے لمحہ و بیجا جاوداں
جب فروِ دوست پہ ہو غمِ دل کی نمود
جلوہ گہِ دلبری، تیری سحر کی ہو خیر
آتشِ دل سے چلی، اُڑتی ہوئی موجِ دود
شعلۂ بے جنبش کے جا، عارضِ گلرنگ میں
حسن کی انگڑائی بن، عشقِ تمنا بسر و د
حسرتِ ناکام آہ، کون سی منزل میں ہے
توڑ گئی آرزو، تیری طلب کے حدود
خونِ شہیداں سے تھا چرخ کبھی لالہ فام
ابرِ رواں گم ہوا، رہ گیا رنگِ کبود!
گرمیِ احساس سے جاگ اُٹھا ہے شعور
ٹوٹ گیا دامِ یخ، اُڑ گیا رنگِ جمود

گردشِ افلاک ہست، ہم قدم ساقیم
جرعۂ گلگوں کش از میکدۂ باقیم

خواب سحر ہی نہیں تیرگیٔ شب کا حل
خواب کی منزل میں ہیں فردِ شوخِ عمل

سلسلۂ آرزو، آزرِ اصنامِ خواب
خالقِ تعبیرِ خواب، زخمۂ سازِ عمل
آہنِ کردار سے، فردِ ملل کا حریف
یورشِ رفتار سے، سرد خروشِ دُہل
جراتِ کردار سے، قیصر و کسریٰ نگوں
گرمیٔ گفتار سے، گرمۂ ہیبتِ اجل
جست کی زد میں ترے کون و مکاں شش جہات
اپنی حدوں کا اسیر، اپنی حدوں سے نکل
روکیں گے کیا راہزن، عزم کے رہوار کو
شوق کو مہمیز ہے، دامِ فریب و دغل

مدعیانِ وطن حیلہ گرانِ فرنگ
صید زمیدہ شوند، باز کشش یکدرنگ

وہ سفرِ بے قیام، وہ حضرِ بے مقام
دل میں غنا ایک دُھن، لب پہ تقاضا کہ تم
مٹتے گئے فاصلے، میری تگ و تاز سے
اٹک گیا ناتواں، اشہبِ سیماب گام
بل گئے دشت و جبل، یورشِ رفتار سے
توڑ گئی سب حصار، صرصرِ طوفاں خرام
بحرِ عرب کا خروش، میری نوا کا امیں
دامنِ ملبار پر، نقش مرے صبح و شام
تندیٔ باراں سے بھی رک نہ سکا سیلِ عزم
چیر گیا بحر کو صاعقۂ بے زمام
ایک قدم دشت میں، ایک قدم بام پر
جیتے ہی اٹھ جاتے تھے اہلِ جنوں کے خیام

اُڑتے ہوئے راہوار، اہلِ وفا کی سحر
نیزوں کی انگوں شفق، راہ نوردوں کا نام
سیکڑوں کوہِ گراں، میرے لئے گردِ راہ
مجمعِ طفلاں مجھے، راجہ، فرنگی و نظام
ہو نہ سکی پھر بھی آہ، صبحِ وطن آشکار
دیدۂ بیدار کو، خواب سکوں تھا حرام
فتنوں کی یورش میں تھی عدلِ عمر کی لگن
ذہن میں تھا جاگزیں، ملکِ خدا کا قیام

دستِ اجل ناگہاں، کرد پریشاں بگلم
پُف زدۂ و گم گشت شعلۂ مستعجلم

لیلیٔ صبحِ دکن آہ کون سے محمل میں ہے
تیری جبیں کی شفق، کس افقِ دل میں ہے!
کھو گئے کس موڑ پہ، آہ مرے شہسوار
اٹھتی ہوئی گردِ راہ، کیوں مرے کاجل میں ہے
دود کرشناہ، تری فطرتِ بے تاب کا
سیلِ ہزاراں خروش، کون سی منزل میں ہے
میرے سرِ تیغ پر، تیرے ستاروں کا عکس
رقص کناں آج بھی آئینۂ دل میں ہے
سو گیا کس طرح تو، اے مرے بدرِ جوگ
شورشِ حشر آفریں اب بھی تری گل میں ہے
خالقِ ارضِ جناں مجھ کو وہیں بھیج دے
تاب و تبِ بے خروش جگ کے ساحل میں ہے

کس نہ بود دریں دشت محرمِ تنہائیم
چاک شدہ دامنِ صبر و شکیبائیم

فرشتوں کا لکھا

جمیل الدین عالی

"اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جامہ دار میرے پاس بھی آیا۔"

(اردوئے معلیٰ)

نقل رپورٹ نمبر ۲۱۲ الف بابت اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ساکن بلی ماراں

جناب عالی

تفتیش حسب ضابطہ عمل میں لائی گئی۔ اسد اللہ خاں کہ مرزا نوشہ کے نام سے معروف ہے اور غالبؔ تخلص کرتا ہے۔ مدت دراز سے برادر بزرگ حکیم پٹیالے والے کے کرایہ دار ہے۔ اس محلے میں سب وابستگان خیر خواہان صاحبان عالیشان کے رہتے ہیں مگر شخص مذکور۔ انحصار اس کے قیام کا عالی جناب کرنل براؤن صاحب بہادر کے حکم زبانی پر ہے جس کی کوئی شہادت مہیا نہیں ہو سکی۔ یہ شخص ایک مدت قلعے سے متوسل رہا ہے کہ استاد بادشاہ بہادر شاہ کا تھا اور تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے پر مامور تھا۔ یہ تاریخ فدوی کی نظر سے نہیں گذری ویسے بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں حالات خاندان تیموریہ کے اس طور پر درج ہیں کہ رعایا کے دلوں میں حکومت کمپنی بہادر سے جذبات منافرت کے پیدا ہوتے تھے۔ ایک تصنیف حال اس کی اور ہے جس کا نام دستنبو رکھا ہے جو بزبان فارسی تحریر کی گئی ہے اس کے بارے میں بھی یہی مشہور ہے کہ تمام تر خرافات حالات بغاوت سے ہے اور اس میں افواج حکومت انگلشیہ کے خلاف نظم و نثر میں ہرزہ سرائی کی گئی ہے۔ یہ شخص اطوار سے چالاک اور مکار معلوم ہوتا ہے کہ بے اسباب ظاہر کے حوالے حکام بالا کے دیتا ہے اور انداز تملق کا رکھتا ہے نہ یہ صاحب جائداد ہے نہ صاحب وظائف۔ اقربا اس کے لوہارو والے ہیں جو زیر حراست و معتوب روبکاری ہیں۔ آشنا اس کے باغیان ہیں کہ منجملہ ان کے نواب مصطفےٰ خاں اہل میرٹھ بھی ہیں جنھیں بمیعاد سات برس قید و حکم ضبطی املاک ہوا ہے۔ پنشن اس کی ریاست فیروز پور سے متعلق تھی جو ۱۸۳۷ میں ضبط ہو چکی ہے اور بعد ازاں ایک امدادی رقم بصورت خیرات نہ کہ بہ ذیل حقوق اس کو دی جاتی تھی۔ علاوہ اس نے چند قصیدہ جات کے دئیے ہیں جو بمدح چند صاحبان عالیشان کا دکھے گئے تھے مگر بصورت مطلب برآری نہ کہ بہ نیت وفاداری۔ چنانچہ وفاداری اس کے ذیل کے واقعے سے متحقق ہوگی جو بہ سلسلہ تفتیش ہذا فدوی کے گوش گذار ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شخص مذکور کے پڑوس میں ایک بے ننگ و نام سا شخص رہتا تھا جو خود کو اہل سادات میں شمار کرتا تھا اور اہل محلہ میں تلقین مذہب کے نام پر روٹی کھاتا تھا اس کی دو بیٹیاں نوعمر تھیں جو نہ خوش شکل تھیں نہ خوش آواز۔ جب فیض کردگار سے قبضہ دوبارہ اس شہر پر افواج قاہرہ حکومت انگلشیہ کا ہوا اور مختلف محلوں پر بوجہ رفع فساد پہرے بٹھا دئے گئے تو چند صاحبان عالیشان کہ در جہ افواج قاہرہ میں سپاہی کا رکھتے تھے بہ سلسلہ انجام دہی فرائض ادھر سے بھی گذرے اور بہ سبب تھکن کے اس بدبخت کے گھر کے نزدیک فروکش ہوئے چونکہ ان کی چھاگلوں میں پانی ختم ہو گیا تھا اس لئے آدمی بھیجا کہ چند صراحیاں و کٹورے مہیا کئے جائیں۔ سو اس مفسد نے ہر کارے سے برتاؤ توہین آمیز کیا اور اپنی شکایت صاحبان عالیشان سے کی کہ ہر کارے نے اس کی بیٹیوں کو ادائے خانہ سے روک کر الفاظ ناشائستہ استعمال کئے ہیں اس پر صاحبان مذکور نے بغرض ذاتی تحقیق کے اس کے گھر کا رخ کیا اور یہ ثابت ہونے پر شکایت اس کی کہ مجموعہ افترا تھی اس کو مناسب سرزنش کی جس پر اس شخص نے سخت واویلا کیا اور اپنی لڑکیوں کو اسد اللہ خاں مذکور کے گھر میں چھت پر سے اتارنا چاہا ہو نکہ اس اقدام میں پہلو توہین حکومت کا مخفی تھا اس لئے صاحبان مذکور نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا اور جملہ اہالیان خانہ کو زیر حراست لے لیا اور پھر کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی گئی۔ اس دوران میں اسد اللہ خاں مذکور اپنے گھر میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا اور کوئی امداد زبانی یا عملی صاحبان مذکور کی نہیں کی اور محلے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلنے کے باوجود کوئی اخبار

تھانہ متعلقہ میں نہیں گذارا جس سے انتہا پردازوں کے خلاف کارروائی کی جاتی حالانکہ دیگر محلہ جات میں بھی چند ایسے واقعے پیش آئے تھے۔ جہاں خیرخواہ وقت پر کام آئے ہیں۔

لہذا گذارش ہے کہ یہ شخص شہر میں رہا تو مزید باعث فساد کا ہوگا چنانچہ حکم خاص اس شخص کے اخراج کا فوراً کیا جاوے اور حکم مزید بابت مستقل ضبطی پنشن کا بھی کیا جاوے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ آگے جو حکم ہو۔

فدوی

(مہر مع دستخط) تھانہ دار حوض قاضی دہلی

(۲)

نقل رپورٹ بابت اسکیم ہائے آبادی شہر از عالی جناب میجر ایف جانسن بہادر

(خفیفہ)

ہرگاہ کہ میں نے بعد فتح اس شہر کے جملہ بستیوں اور محلہ جات کا بذات خود معائنہ کیا ہے اور دریافت کیا ہے کہ تقریباً تمام علاقے جن پر قابض و مختار مسلمان تھے بے حد پیچیدہ گلیوں اور عالی شان عمارتوں پر مشتمل ہیں جن میں مخالف حکومت گروہوں کے اجتماع رہتے تھے۔ اور اسلحہ جمع کیا جاتا تھا اور جو باقی رہے تو پھر السلطان قدیم کو موقع بازیافتگی کا مل جائے گا لہذا تجویز ہے کہ مندرجہ ذیل علاقے فوری طور پر مسمار کر دئے جائیں اور حسب نقشہ منسلکہ سڑکیں اور میدان نکالے جائیں۔

خانم کا بازار۔ کٹرہ سعادت خاں۔ کوچہ بلاقی بیگم۔ دھوبی واڑہ۔ پنجابی کٹرہ۔ مزید نقشہ دوم کے مطابق کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک ہر دو طرف تیس تیس گز مکانات مسمار کر دئے جائیں کہ وسط میں ریل کی پٹریاں بچھائی جائیں گی۔

ظاہر ہے کہ اب اس شہر کا دارالخلافہ رہنا ممکن نہ ہوگا چنانچہ یہاں جدید آبادی کی گنجائش رکھنی نہ ضروری ہے نہ مناسب۔ لہذہ مجوزہ اسکیم کے مطابق کوئی دو لاکھ آبادی کی بچت عمل میں آئے گی۔ نئی آبادکاری میں حکومت اس بات کا لحاظ رکھے کہ مسلمان کم سے کم تعداد میں آسکیں کیونکہ یہی لوگ اہل حکومت و اہل جائداد تھے اور بغیر التیاز ان کو بسانا بے حد نئے مسائل اور الجھنیں پیدا کر دے گا۔

مناسب ہے کہ راقم الحروف اس موقع پر حکومت کو یاد دہانی کرے کہ راقم الحروف ایک فوجی افسر ہے۔ اور گو کہ اسے کسی قسم کے فرائض کی انجام دہی میں عذر نہیں تاہم یہ مشورہ دینا مناسب سمجھتا ہے کہ اس اسکیم پر ماہرین تعمیرات کی رائے کے مطابق عمل ہونا چاہیئے۔

دستخط ایف۔ جانسن۔ میجر

(۳)

اجرٹن صاحب حاکم شہر کا روزنامچہ

ہفتہ

آج پھر چند مسلمان عمائدین شہر میرے پاس آئے۔ یہ لوگ خیرخواہان سرکار ہیں پھر بھی ڈرے ڈرے آتے ہیں تلواریں گلوں میں بندھی ہوئی جوتے برآمدے کے باہر اتار دیتے ہیں اور گردن جھکائے آنکھیں نیچی کئے کھڑے رہتے ہیں۔ معاملہ جامع مسجد کا تھا۔ میں نے سمجھایا کہ ابھی تو ضبطی املاک بھی کمل نہیں ہوئی واگذاشت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر بہت لمبی تقریریں کرتے رہے اور معاملے کو صرف مذہبی گفتگو میں الجھائے رکھا۔ میں نے کہا یہ جگہ پھر آپ کی قوم کو اجتماع کا موقع دے گی اور پھر حکومت کے خلاف سازشیں ہونے کا احتمال ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت پہرہ مقرر کر دے ہم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں فرائض ادا کر لیا کریں گے اور بغیر درس و تقریر کے چلے جایا کریں گے۔ میں نے تاوان کا سوال اٹھایا تو سب گھبرا گئے کیونکہ ابھی کسی کے پاس اتنی جائداد نہیں بچی ہے کہ مل جل کر بھی تاوان پورا کیا جاسکے مگر پھر تیار ہو گئے کہ اچھا آپ حکومت سے ایک مناسب رقم مقرر کرا دیجئے۔ عجیب قسم کے لوگ ہیں یہ۔ ان کے اپنے معاملات بے حد خراب ہیں اور کسی کو اپنے بارے میں اطمینان نہیں ہے ہزاروں مارے گئے اور لاکھوں بے گھر ہو گئے پھر بھی یہ مسجد کا قضیہ ختم نہیں ہونے دیتے۔

میں نے کہا آپ لوگ اودھ یا دکن کی طرف کیوں نہیں چلے جاتے؟ یہاں نہ آپ کی عزت ہے نہ دولت۔ ہم نے جنھیں رکھا وہ بہت کم ہوں گے اور ان کے لئے بھی ہم نہیں جانتے کہ کیا حکم ہوگا۔ یہ سن کر سب چپ ہوگئے، آنکھیں نیچی کئے سوچتے رہے، پھر بولے ہم چلے بھی جائیں تو اودھ دکن والے کیا کریں گے۔ خیر آج کوئی بات طے نہیں ہوئی لیکن میں سوچتا ہوں کہ ہم نے ان کے لئے جینا حرام کر دیا ہے، ان کی بستیاں منہدم کر دی ہیں، ان کے ذرائع آمدنی مسدود کر دئے ہیں، ان کی عبادت گاہیں برباد کر دی ہیں، پھر بھی یہ کون لوگ ہیں کہ انھیں اسی شہر میں رہنے پر اصرار ہے۔

اتوار

کلکتے سے دو مراسلے آچکے ہیں کہ بادشاہ دہلی پر مقدمے کے سلسلے میں شہادتیں مہیا کی جائیں۔ میں نے بہت کچھ کام کر لیا ہے لیکن عینی گواہوں کا دستیاب ہونا محال معلوم ہوتا ہے۔ ویسے بہت سے آوارہ بدقماش لوگ ہیں جو ہر بات کے لئے تیار ہیں لیکن شرفا اور معقول لوگ زیادہ تو مارے گئے یا بھاگ گئے، جو باقی ہیں وہ دروغ حلفی پر آمادہ ہیں۔ نہ جانے ہماری حکمت عملی کیا ہے۔ ہم نے ایک ملک فتح کر لیا اور بس۔ ایک بادشاہ ہمارے قبضے میں ہے، ہم اسے قتل کر دیں یا جلا وطن، یہ ہمارا اختیار ہے۔ اب مقدمے کا کیا سوال ہے۔ مقدمہ تو حکومت رعایا پر چلا سکتی ہے نہ کہ دوسری حکومت پر۔ وہ جیسا بھی تھا قانوناً بادشاہ تھا، ہم اس کے حلیف تھے یا مددگار تھے، اس کے آقا تو نہیں تھے۔ اچھا اس نے ہمیں دھوکہ دیا۔ تو ہم نے بھی جنگ کی اور ہم جیت گئے۔ ہم اپنی فوجوں سے جو سلوک کریں اس کو باغی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ نہ جانے پارلیمنٹ میں اس معاملے پر کیا بحث ہو۔ آخر اس مقدمہ بازی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب شہادتوں کا حال یہ ہے کہ ان کے مطابق تو بادشاہ باغیوں کے ہاتھوں مجبور نہیں تھا، میرٹھ سے اس کے پاس فوج پہونچی اور اس نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ ادھر حکومت بادشاہ سے یہ بیان چاہتی ہے کہ اس کو مجبور کر دیا گیا تھا۔ بہرحال میں نے گواہیوں کے مسودات مرتب کئے ہیں، جیسا حکم آئے گا پھر انتظام کروں گا۔ یہاں کی آبادی اتنی سراسیمہ اور پریشان ہے کہ کسی بات پر بھی آمادہ کر لینا مشکل نہیں مگر مذہب میں اب تک یہ لوگ شدت برت رہے ہیں۔

اتوار

ایک اور تجویز ہے کہ خاندان شاہی میں سے جن لوگوں نے ہم سے خیرخواہی کی ان کے وظائف مقرر کئے جائیں۔ مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن میں نے کہا ہے کہ ان وظائف کو سردار خاندان کی ذات سے منسوب نہ کیا جائے بلکہ ہر وظیفہ جائداد کی طرح قابل تقسیم ہو۔ یہ بات ان سب کو پسند بھی آئے گی اور بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جوں جوں حکومت کے قدم جمتے جائیں گے اس خاندان کی مالی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جائے گی یہاں تک کہ تیس چالیس برس میں اوسط پانچ چھ سو فی کس سے گھٹتے گھٹتے دس بارہ روپے فی کس ماہانہ رہ جائے گی۔ میرا خیال ہے میری تجویز مان لی جائے گی۔

(۴)

بیان حاجی نبن میاں پٹیکار حضوری کا جو بعد میں انگریزوں کے جاسوس ہو گئے تھے

اب وجہ اصلی تو سید احمد خاں نے بہت لکھی ہے، تحقیق حال بھی ہوئی ہے اور قیاس آرائیاں بھی، مگر بھائی سچ پوچھو تو جھگڑا ہونا ہی تھا۔ ہم بادشاہ کے پٹیکار تھے۔ پچیس روپے ماہوار، گھوڑا، خلعت اور انعام و اکرام ملتا تھا، شہر میں بڑی آبرو تھی مگر جب کاغذات ریذیڈنٹ کے ہاں لے کر جاتے تو عرق عرق ہو جاتے تھے، وہ تو کہاں نظر آتا اس کے معمولی معمولی اہلکار بلکہ خدمت گار گورے ہم سے ایسا سلوک کرتے جیسے ہم بھکاری ہوں۔ شہر میں اول تو گورے آتے نہیں تھے، اپنی چھاؤنی ہی میں رہتے اور شرابیں پی پی کر تیز گھوڑے دوڑاتے ہوئے کبھی کبھی ترکمان دروازے کے باہر تک پہونچ جاتے تھے مگر جب کبھی کبھار وہ شہر سے گذر جاتے تو کہرام مچ جاتا تھا۔ ایک تو وہ اندھا دھند سواری کرتے پھر کسی دکان سے کچھ اٹھا لیا تو دکاندار کی کیا مجال کہ خود دام مانگ لے۔ بس دے دئے تو دے دئے ورنہ ٹکٹ کاٹ کر پھینکا اور یہ جا وہ جا۔ اب وہ مہینوں چھاؤنی میں عرضیاں گذار رہا ہے، دھکے کھا رہا ہے۔ کبھی مل گئے کبھی معلوم ہوا یہ گورا تو تبادلے پر چلا گیا۔ پھر یہ کہ جو افسر تھے وہ ظاہرا تو بہت شان و شوکت رکھتے تھے۔ فٹن پر آنا جانا، اردلی ہمراہ، کیا مجال جو کھڑکی سے باہر بھی جھانک لیں مگر تھے سب بد معاش۔ کرنل فریزر تو اسی چکر میں شمس الدین خاں فیروز پور جھرکے والے کے اشارے سے قتل بھی ہوا تھا۔ اس کا قصہ وہ نہیں ہے کہ بھائیوں سے جائداد کے معاملے پر کرنل اس کے خلاف ہو گیا تھا بلکہ اصل میں یہ ہے کہ جھرکے کی ایک دھوبن تھی سردن۔ سردن کہتے ہیں کہ پدمنی تھی پدمنی۔ پان کھاتی تو حلق سے پیک نظر آتی تھی، نواب کی اس پہ

نظر تھی مگر وہ رعایا کا بڑا پاس رکھتا تھا۔ فریزر صاحب جو دورے پر گئے تو سَرون کی تعریف سُنی اور نواب سے کہلوایا کہ سَرون کو دکھا دو۔ نواب انھیں چاہتا تھا مگر آخر یہ دلّی کا ریذیڈنٹ تھا اس نے بہت ٹالا مگر یہ نہ مانے خیر اس نے دور سے دکھا دیا۔ یہ عاشق ہو گئے اور وہ حال ہوا کہ لوگوں نے گیت لکھ ڈالے۔ کیا تھا کچھ ایسا گیت تھا۔

لہنگا چھوڑ دے ری مری سرون سایا دوں گا پنھائے

پھر بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے سرون پر ہاتھ ڈالا بلکہ شاید دلّی لے بھی آئے۔ خیر یہ تو مارے گئے اور بچارا نواب بھی پھانسی پر چڑھا مگر اس سے انگریزوں نے کچھ سبق نہ لیا۔ فریزر صاحب کھُل کر گانا سنتے تھے بلکہ ڈیرے دار طوائف کا محاورہ بھی یوں چلا ہے کہ بہت پہلے جب انگریز دورے کرتے تو اچھی طوائفوں کو ناچ گانے کے لئے بلاتے۔ ساتھ تو رکھ نہ سکتے تھے، وہ الگ الگ کیمپوں میں کوس کوس بھر کے فاصلے سے چلتی تھیں۔ سب سے اچھی طوائفیں ڈیرے دار کہلانے لگیں۔ خیر تو یہ پرانی بات تھی ہمارے زمانے میں تو ان کو حکومت کا نشہ ہو گیا تھا۔ کھلے بندوں پان چباتے، انگرکھے پہنتے اور مجرے کراتے اور داد و دہش کرتے نہیں تھکتے، بس حکومت کی دھونس تھی، اس سے شہر میں برہمی اور بھی پھیلتی ؛

ادھر ایک قصہ اور بھی مشہور ہوا جس سے شہر میں آگ سی لگ گئی تھی۔ ہوا یہ کہ کلکتے یا جانے کہاں کے کسی ہندو نے چھاؤنی کے مجسٹریٹ کے ہاں عرضی گذاری کہ خاص باغ اس کا ہے جسے بادشاہ دبائے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے بادشاہ کے نام سمن جاری کر دیا اور غضب یہ کیا کہ پیادے کے ہاتھ بھجوا دیا۔ یہ بات سب کو معلوم ہو گئی اور جاں نثار تلواریں کھینچ کر دوڑ پڑے۔ پھر اسی طرح روز ایک نہ ایک بے عزتی کی بات ہوتی تھی۔ کبھی بادشاہ کا وظیفہ کم کر دیا گیا کبھی اخراجات کا محاسبہ ہو رہا ہے کبھی ولیعہدی کا معاملہ بیچ میں ڈال دیا گیا ہے۔ بادشاہ نام کا بادشاہ تھا مگر پھر بادشاہ تھا، مراسلوں کے جواب نرم گرم لکھوانا تھا مگر ہم کو معلوم ہے کہ ایک ایک لفظ پر چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور بار بار اٹھ کر ٹہلتا تھا جیسے باز کے پر کاٹ کر اسے شکار دکھاؤ تو وہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ ایک بار نیا ریذیڈنٹ آیا تو اس نے لکھا کہ مجھے فرزند دلبند مت لکھا کیجئے، میں کمپنی بہادر کا نمائندہ اور برطانوی قوم کا ایک باعزت افسر ہوں، آپ کی اولاد کی طرح نہیں ہوں۔ بادشاہ یہ مراسلہ دیکھ کر دو پہر ساکت و جامد بیٹھے رہے کہ اب ہمارے سر سے ٹوپی بھی اتاری جا رہی ہے۔ یہ خبر بھی دلّی والوں تک پہونچی اور اس پر خوب خوب باتیں بنیں۔ بات یہ ہے کہ ویسے تو دلّی میں نہ فوج تھی نہ اسلحہ مگر کچھ خاندان پرانے ملازم خانوں کے پڑے ہوئے تھے جن میں روز دو ایک بار تلوار چل جانا کوئی بات نہیں تھی، یہ لوگ بڑے بکٹ اور جیالے تھے اور ہر وقت انگریزوں کے خلاف منصوبے باندھتے رہتے تھے۔ پھر ایک قصہ مدتوں سے جہاد کا بھی چل رہا تھا، جہاد میں تو ہمارے نانا جان بھی گئے تھے اور بالاکوٹ سے واپس نہ ہوئے، یوں ہمارے زمانے میں مجاہدوں کا معاملہ کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا تھا پھر بھی قیل و قال ہوتی ہی رہتی تھی۔ پھر لکھنؤ کی خبریں بھی آئی تھیں کہ بادشاہ کو ایسے لے گئے اور یہ ہوا تو جب جھگڑا شروع ہوا اور تلنگے قلعے میں گھس کر بادشاہ کی آرام گاہ میں پہونچ گئے تو انھوں نے صرف یہ کہا کہ بس قسمیں لیں اور پھر اللہ کا نام لے کر کھڑے ہو گئے، یہ جو مشہور ہے کہ ان کے سینے پر تمنچہ رکھ کر آزادی کا اعلان کرایا گیا یہ بات ہمیں تو جھوٹ ہی معلوم ہوتی ہے، وہ جب چاہتے جنگ کے بیچ میں انگریزوں کے پاس پہونچ جاتے مگر ایسا نہیں تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ ہار جائیں گے۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا اور ان کے خاندان کا کیا حشر ہوگا مگر بس ایک قسمت آزمائی تھی سو وہ اس سے بھاگے نہیں، لڑے اور ہار گئے۔ ہائے اس زمانے میں ٹیپو سلطان ہوتا تو مزا آ جاتا ؛

ہم اس زمانے میں قلعے نہیں جاتے تھے مگر قلعے کے متوسلین سے برابر ملتے رہے۔ یہ بات تو غلط ہے کہ بادشاہ سازشوں کا شکار ہو گئے کیونکہ سازش نہ بھی ہوتی تو انگریزوں میں قوت تھی، وہ مار ہی لیتا مگر ان سازشوں نے شکست کو بہت جلد ظاہر کر دیا۔ سازشیں بادشاہ کے قریبی لوگوں نے ہی کیں۔ باہر والے پھر وفادار رہے، بات یہ ہے ناکہ باہر والوں سے انگریز کا تعلق بھی کم تھا اور وہ تو سر ہتھیلی پر رکھ کر آئے ہی تھے، وہ کیا بے وفائی کرتے۔ ہاں دلّی والوں نے جتنی وفا کی اتنی ہی بے وفائی بھی کی، حکیم احسن اللہ خاں برابر وزیر اعظم رہے اور برابر پوری تفصیلات انگریزوں کے کیمپ میں پہنچاتے رہے۔ اور بھائی میں کس گنتی میں تھا، میری بچت تو اسی میں تھی کہ جب بادشاہ ہار گئے اور ہمایوں کے مقبرے چلے گئے اس وقت سے میں انگریزوں کا مخبر ہو گیا، میں نے کسی کو قتل نہیں کرایا نہ کسی کی چغلی کھائی جیسی کہ مرزا جی کے خاندان نے کیا جس کا بدلہ وہ یہ جائدادیں لئے بیٹھے ہیں۔ میں نے تو بس یہ کیا کہ جھوٹی سچی خبریں بادشاہ کی خانگی زندگی کے بارے میں پہونچائیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس سے ان کو کوئی اور نقصان تو پہونچے گا نہیں، یہ تو قتل کئے ہی جائیں گے ہاں میں بچ جاؤں گا۔ سو یہی ہوا، میں نام کو مخبر مشہور ہو گیا اور جان بھی بچ گئی مگر نہ انعام ملا نہ خطاب۔ پھر بھی اب کفارہ ادا کیا ہے اور دعا کرتا ہوں کہ ان کی روح مجھے معاف کرے اور میں بخشا جاؤں مگر میاں وہ وقت ہی ایسا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

عوامی گیت

(سہارن پوری گوجر عورتوں کا گیت)

(میرٹھ ۱۸۵۷ء)

یہ لوک گیت جو "غدر" کے زمانے میں گایا جاتا تھا، حفیظ ہوشیارپوری صاحب کو برٹش میوزیم میں دستیاب ہوا اور انہوں نے اس کی نقل سید ذوالفقار علی بخاری صاحب کو بھیجی۔ ہم بخاری صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ لوک گیت 'ماہِ نو' میں اشاعت کے لئے عنایت کیا۔

لوگوں نے لوٹے شال دوشالے میرے پیارے نے لوٹے رومال

میرٹھ کا صدر بازار ہے

میرے سیّاں لوٹ نہ جانے

لوگوں نے لوٹے تھال کٹورے میرے پیارے نے لوٹے گلاس

میرٹھ کا صدر بازار ہے

میرے سیّاں لوٹ نہ جانے

لوگوں نے لوٹے گولے چھوہارے میرے پیارے نے ایک بادام

میرٹھ کا صدر بازار ہے

میرے سیّاں لوٹ نہ جانے

لوگوں نے لوٹے مہر اشرفی میرے پیارے نے لُوٹے چھدام

میرٹھ کا صدر بازار ہے

میرے سیاں لوٹ نہ جانے

یہ بھی اس دور کا ایک مقبول گیت ہے جو ہمیں جمیل الدین عالی صاحب نے عنایت کیا ہے۔

اے جی نیلی سی گھوڑی پاتلی

اور پاتلیا ہے سوار

اور سانوریا ہے سوار

پیاسے کو پانی پلا دے مری گوری

کہ جائے مسافر راہ

اے جی بھر ہیو چھیلا بھر پیو

اے جی بھر پیو ڈول پچاس

اے جی کاہے کی توری انڈوی

اور کاہے کی رسّی ڈول

اے جی رتن جڑاؤ انڈوی

اور سونے کا میرا ڈول

اے جی بارہ برس کی بالی میں

سو لاکھ جوبن کا مول

اے جی بھر پیو ڈول پچاس

اے جی کیا تمہیں آئی نیند ہے

یا چڑھا ہے تم کو خمار

اے جی نا ہمیں آئی نیندیا

نا چڑھا ہے ہم کو خمار

یوں ہی بلما کا ہے پچار

اے جی بھر پیو ڈول پچاس

ماہ نو کراچی۔ مئی۔ ۱۹۵۷ء

رپورتاژ:۔

معلّق شاہراہ

(۳)

ممتاز مفتی

ضیا چلانے لگا "لو خواہ مخواہ روپیہ بھی کھویا اور مسعود نے دیا بھی اس انداز سے جیسے اس کا قرض واپس کرنا تھا۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ سردے سے مسلسل چھینٹے اُڑ رہے تھے، سرخ مرچ پیلی پڑی ہوئی تھی۔

مسعود واپس آکر کہنے لگا "مجھے تو صرف دینا ہی تھا نا روپیہ، جو مجھے کہا گیا وہ میں نے کر دیا۔ اگر مجھ سے کہا جاتا کہ رشوت کے طور پر دینا ہے تو میں کہہ دیتا لو سنتری یہ لو، یہ خالص رشوت ہے، میرا وہ کیا بگاڑ لیتا؟"

"پھر کہتے ہیں۔" ضیا چلایا "کہ دنیا میں رشوت چلتی ہے۔ دیکھ لو ہم چھ میاں اچھے خاصے پڑھے لکھے ہیں لیکن رشوت کے طور پر ایک روپیہ نہیں دے سکے۔"

"لیکن لے تو سکتے ہیں۔" اسحاق نے کہا۔

"یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی جناب کی۔" مسعود بولا "اگر کسی وقت لینے کا موقع پڑے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک اٹھنی رشوت کی ملی تھی۔ ایمان سے پورے چھ دن پسینہ پونچھتا رہا، چار تولیے میلے کر دیئے، بس ان کی دھلائی میں خرچ ہو گئی وہ اٹھنی۔"

"رشوت دینا لالہ پر ختم تھا، دائیں ہاتھ سے دیتا تھا تو بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی۔" اسحاق نے کہا۔ "اگر لینے والا اس کا کام نہ بھی کرتا تو بھی لالہ اسے کبھی نہ جتاتا کہ اس نے رشوت لے کر کام نہیں کیا۔"

"پھر یہ رشوت نہ ہوئی دان ہوا۔" مسعود چلایا۔ "اور یہاں لالہ کی کیا پوچھتے ہو، اسے دینا بھی آتا تھا اور لینا بھی۔"

"عجیب انسان ہو تم سب۔" عمر چیختا ہوا داخل ہوا۔ "مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے آئے۔ میں نے بھی اس کی وہ بے عزتی کی کہ یاد کرے گا۔"

"اگر اس نے سنی ہو گی تو ضرور یاد کرے گا۔" مسعود نے کہا۔

"وہ سُنے نہ سنے، عمر نے تو اپنا دل ٹھنڈا کر لیا۔" ضیا مسکرایا۔

"چلو بھئی اب چائے کا انتظام کریں۔ جی چاہتا ہے چائے پینے کو۔" عمر بولا۔

"کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔" مسعود نے کہا۔

"دیکھو۔" عمر نے یوں کہنا شروع کیا جیسے لکچر دے رہا ہو۔ "تم سب میرے کہنے پر عمل کرو تو کوئی تکلیف نہیں ہو گی تمہیں۔"

"میاں نے تو پہلے ہی کر دکھایا ہے تمہارے کہنے پر عمل۔" مسعود نے کہا "تم نے کہا تھا سنتری کو روپیہ دیدو، سو میں نے دے دیا۔"

"وہ میں لے آیا ہوں۔" عمر نے فاتحانہ انداز سے روپیہ جیب سے نکالا۔ "چھوڑ کیسے آتا! بدمعاش سڑک کھولتا نہیں لیکن روپیہ جیب میں رکھ لیا۔ بھئی واہ اچھی شرافت ہے۔"

"شرافت تو میری ملاحظہ ہو۔" ضیا ہنسنے لگا۔ "اگرچہ روپیہ تمہارا تھا لیکن اس کے ضائع ہو جانے سے اتنا دکھ محسوس کر رہا تھا کہ جی چاہتا تھا دنیا چھوڑ کر بیراگی ہو جاؤں۔"

"وہ تو ہو ہی گئے ہم۔" مسعود نے قہقہہ مارا۔ "جب سے یہاں آئے ہیں۔ اب کوئی اور بات کرو۔"

"اچھا بھائی سنو۔" عمر نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور یوں آڈر آڈر چلانے لگا جیسے سینما کی کچہری میں بڑا جج کیا کرتا ہے۔

"دیکھو پہلے ہم چائے پئیں گے، پھر ڈاک بنگلے کے چوکیدار کو رام کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ ہمیں بنگلے میں رات بسر کرنے دے۔"

"اگر چوکیدار کو روپیہ دینا پڑے تو بھی اب تم میں سے کوئی اور یہ فرض ادا کرے، میں نے تو اپنی باری بھگتا دی ہے۔" مسعود بولا۔

"آرڈر۔" عمر ہنستے ہوئے بولا "پھر ہم سامان بنگلے میں رکھ کر دریا کے کنارے جا بیٹھیں گے' آج چاندنی کی چودھویں تاریخ ہے، چودھویں نہیں تو بارھویں تیرھویں ضرور ہو گی۔"

عمر میں یہ عادت بری ہے کہ جب بھی دو چار آدمی اکٹھے مل جائیں تو وہ تقریر کرنی شروع کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے مسعود ہمیشہ لوگوں کو خبردار کرتا رہتا ہے کہ وہ اکٹھے نہ ہونے پائیں اور جب لوگ کہیں جانے لگیں تو وہ منتیں کرتا ہے "بھائیو مجھے عمر کے ساتھ اکیلے چھوڑ کر نہ جانا، یہ تقریر شروع کر دے گا۔"

"دیکھا نا" مسعود چلایا "شروع کر دی اس نے تقریر۔" ہم سب وہاں سے سرکنے لگے۔ اور چند منٹوں کے بعد وہ وہاں اکیلا کھڑا چیخ رہا تھا۔

چاندنی ایک مختصر سا میدان تھا، اس میدان کے ایک طرف چیل کے تیس چالیس درخت اُگے ہوئے تھے، دوسری طرف ایک خوبصورت ڈاک بنگلہ یوں بنا ہوا تھا کہ بنگلے کے برآمدے کے سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ چیل کے درختوں کے پاس بنگلے سے ہٹ کر پتھر کی دو چار کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جن کے سامنے دریا کی ایک نالی سی بہہ رہی تھی۔ اس نالی کے نیچے دریا تھا اور اس کے کنارے پر بڑے بڑے پتھر تھے۔ چیل کے جھنڈ کے ساتھ سڑک تھی جس پر سنتری کی کٹیا بنی ہوئی اور کٹیا کے ساتھ لکڑی کا ایک پھاٹک تھا جو سڑک کے کنارے آر پار ایستادہ تھا۔ پھاٹک سے سڑک پھر اوپر چڑھتی تھی اور کچھ دور پرے چاندنی کا گاؤں تھا۔

چیل کے جھنڈ میں پہلے ہی ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ قافلے میں چھ ایک عورتیں اور بچے تھے اور چند ایک مرد تھے۔ اس کے علاوہ دو اونٹ اور ایک خچر تھا۔ چیل کے درختوں تلے قافلے والوں کا وہ کنبہ کس قدر سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔ سڑک پر دن بھر اونٹوں اور خچروں سے طاقت آزمائی کرنے کی وجہ سے مرد تھک کر چور ہو رہے تھے اور عورتیں گویا بیدار ہو چکی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے دبی دبی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ کام میں مصروف تھیں، بچیاں جلانے کے لئے ایندھن چن رہی تھیں، مرد درختوں تلے یوں بے جان پڑے تھے جیسے زندگی سے بیزار ہوں۔ عورتیں کام کرتے کرتے ان کی طرف دیکھتی تھیں جیسے انہیں اس بیزاری سے نکالنے کے لئے تگ و دو کر رہی ہوں۔ ان کے لئے زندگی مسلسل تگ و دو تھی۔ دن کے وقت سڑک پر وہ جانوروں کو قابو میں رکھنے کے لئے سعی کرتیں۔ شام کو بچوں کی دیکھ بھال کرتیں، کھانا پکاتیں اور پھر مردوں کی بیزاری دور کرنے کے لئے آنکھوں سے شرارے چھوڑتیں، ان کے لئے زندگی مشقت نہیں تھی بلکہ مشقت زندگی تھی، اور ان کی نگاہوں کی چمک کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ زندگی کے بھید سے واقف ہوں۔ اس کے برعکس مردوں کے لئے زندگی خالی مشقت تھی اور وہ اس مسلسل مشقت سے گویا ہار چکے تھے، صرف زاویہ نظر کا فرق تھا، کتنا عظیم فرق تھا۔

بنگلے کا چوکیدار ٹرے میں چائے لایا تو سب چلانے لگے۔ اس کے پیچھے پیچھے عمر تھا، عمر کی شکل یوں بنی ہوئی تھی جیسے اس کے شانوں پر منہ کی جگہ باکسنگ کا گلوب لگا ہوا ہو۔ جب چوکیدار ٹرے رکھ کر چلا گیا تو مسعود چلانے لگا۔ "زندہ باد عمر! کیا موقع پہ چائے منگوائی ہے دوست نے اور دیکھو تو" وہ چلایا۔ "کس قدر خوش نظر آتا ہے یہ عمر وا ہا اس وقت ——"

مسعود کی پرانی عادت ہے جلتے کو جلانا اس کا من بھاتا مشغلہ ہے اور جلتی پر تیل ڈالنے میں ضیا کا جواب نہیں۔ ضیا ہنسنے لگا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا "بھائی رات گزارنے کے لئے چوکیدار سے بات کیسے کی جائے؟"

"یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔" مسعود بولا "یہ مشکل تو عمر نے چلنے سے پہلے ہی حل کر دی تھی ——"

"وہ کیسے؟" ضیا نے پوچھا۔

"عمر ان چوکیداروں کو خوب سمجھتا ہے۔ روپیہ ان کی ہتھیلی پر رکھو اور آنکھ مار دو۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ بنگلے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔"

"لیکن اس سنتری کے پھاٹک کا دروازہ تو نہیں کھلا تھا۔" ضیا چلایا۔

"سنتری کا چوکیدار سے کیا مقابلہ۔ سنتری تو بدتہذیب ہوتے ہیں۔" مسعود بولا۔

جوں جوں شام پڑتی گئی ڈاک بنگلے کے چوکیدار کا مسئلہ اہم ہوتا گیا۔ عمر اب بھی اپنے نظریہ کا حامی تھا۔ ہتھیلی پر روپیہ رکھ دو اور آنکھ مار دو لیکن سوال یہ تھا کہ ہتھیلی پر روپیہ کون رکھے اور آنکھ کون مارے۔ مسعود چلا رہا تھا "یار جلدی کرو، اندھیرا ہو گیا تو آنکھ ماری بھی گئی تو فائدہ؟ اسے دکھائی ہی نہیں دے گی۔ کہو تو روپیہ ہتھیلی پر رکھنے کا فریضہ میں ادا کر دوں لیکن آنکھ مارنا اپنے بس کا روگ نہیں۔"

ضیا کہنے لگا "بھئی آنکھ تو عمر کی ہے نا جیسے کنوارا ہو۔ اگر عمر مارے آنکھ تو معلوم بھی ہو گا۔"

"یہ غلط ہے۔" عمر غصے میں چلانے لگا "یہ کوئی بات ہے کہ روپیہ کوئی رکھے ہتھیلی پر اور آنکھ کوئی اور مارے۔"

"تو پھر روپیہ بھی تمہیں رکھ دینا عمر۔" مسعود چیخنے لگا۔

"لیکن تمہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے کیا؟" عمر نے بگڑ کر کہا۔

"بھائی بات یہ ہے۔" مسعود نے کہا "کہ آنکھ مارنے کی رسم آجکل پرانی ہو چکی ہے۔ پرانے زمانے میں یہ نسخہ استعمال کیا جاتا تھا۔ آج کل تو آنکھ مارنے کی تکلیف کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور چونکہ یہ پرانے زمانے کی چیز ہے لہٰذا ہم میں سے سب سے زیادہ عمر رسیدہ آدمی یہ کام کر سکے گا۔"

اس پر سب کی نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ مجھے گھبرائے ہوئے دیکھ کر مسعود نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا "تم کیا تماشبین بن کر آئے ہو؟ یہاں تمہیں بھی تو کچھ کرنا چاہیئے۔"

"کیا کرنا ہو گا مجھے؟" میں نے یوں چونک کر پوچھا جیسے بحث کے موضوع سے واقف ہی نہ تھا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ کچھ سوچنے کے لئے وقت مل جائے۔

"کرنا کیا ہے۔" ضیا بولا "بنگلے کے چوکیدار کی ہتھیلی پر روپیہ رکھ کر آنکھ مار دینا اور بس۔"

عین اس وقت عمر کے عقب سے بنگلے کے چوکیدار کی آواز سنائی دی "بابو جی ایک روپیہ نہیں ساڑھے پانچ روپے۔"

سب کی نگاہیں چوکیدار کی طرف اٹھ گئیں جو عمر کے پیچھے کھڑا ہماری باتیں سن چکا تھا۔ چوکیدار کو دیکھ کر مسعود نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ضیا بھی ہنسنے لگا۔ مرغ مرغ کے دانت یوں نکلے جیسے وہ پھوٹ گئی ہو اور زردیج باہر گر رہے ہوں، سردے سے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اور چوکیدار چپ چاپ چا۔ ٹے کے برتن اکٹھے کر رہا تھا۔

اس کے بعد چوکیدار سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لہٰذا عمر کے اس نظریہ کو آزمانے کا پہلا موقعہ ہاتھ سے نکل گیا اور وہیں رات اس کوٹھری میں بسر کرنی پڑی جس کے قریب ہم بیٹھے ہوئے تھے۔

جہاندری میں سورج غروب نہیں ہوتا بلکہ ڈوبتا ہے جیسے کنوئیں میں پتھر ڈوبتا ہے، دیر تک وہ ان مغربی دیواروں پر ٹنگا رہتا ہے جن کے کناروں پر گھمانا ہوا وہ گاڈوی کمبل پوش ہمیں لایا تھا۔ پھر وہ یک لخت ڈوب جاتا ہے اس کے ڈوبنے پر آسمان کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر جو جہاندری کے کنوئیں کے عین اوپر واقع ہے، شام پڑ جاتی ہے لیکن جہاندری رات کے اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔

آسمان کے اس ٹکڑے پر سرخی چھا رہی تھی جیسے وہ تانبے کا بنا ہوا ہو، نیچے کنوئیں کی گہرے اندھیرے میں قافلے والوں کے الاؤ روشن تھے اور الاؤ کی روشنیوں میں نسوانی آنکھیں روشن تر ہوتی جا رہی تھیں جیسے وہاں کوئی سورج طلوع ہوتا جا رہا ہو۔

وہ عظیم درخت ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ناچ رہے تھے اور کنہار کی وہ بھیانک آواز بھیانک تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس مسلسل آواز نے گویا اپنے پنجے ہمارے دلوں میں گاڑ رکھے تھے۔ وہ آواز ہمارے دلوں میں گونجتی تھی اور ہم جسم کے بال سر اٹھا اٹھا کر اسے سنتے تھے اور روح میں عجیب سی دھونکنی بجتی اور یہ احساس ہونے لگتا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا ہم سب پر بوجھل خاموشی چھائے جا رہی تھی مسعود کے قہقہے مفقود ہوتے جا رہے تھے۔ ضیا کی مسکراہٹ معدوم ہوتی جا رہی تھی حتیٰ کہ سردے کے چھینٹے ختم ہو چکے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے وقت ختم ہو چکا ہو اور اسرافیل کے صور کی آواز دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہو اور ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی اس آواز کی شدت سے وہ پہاڑی دیواریں روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گی۔ اور تمام عالم کی دھجیاں اڑ جائیں گی اور پھر ایک مسلط اور مہیب خاموشی۔

دریا کے کنارے پتھروں پر ہم سب خاموش بیٹھے ہوئے تھے، قریب ہی درختوں تلے قافلے والوں کے الاؤ تھے۔ ڈاک بنگلے کے برآمدے میں گیس جل رہا تھا جس کے قریب ایک بنی سنوری عورت منتظر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بھاری بھرکم مرد میز پر کہنیاں ٹیکے ہاتھ میں گلاس پکڑے شاید اس چھائے ہوئے خوف سے سہا بیٹھا جو ہر لحظہ جہاندری پر مسلط ہوا جا رہا تھا۔

"کس قدر خوفناک منظر ہے۔" ضیا نے آہ بھری۔

"ہاں ۔۔۔" مسعود بولا "خوف کی دھنکی سے روح کی پھپھوندی کس طرح اُڑتی ہے اور وہ گویا صاف ہو جاتی ہے۔"

"تو ہم گویا دل کی پھپھوندی صاف کرنے آئے ہیں یہاں" ضیا چیخنے لگا۔ "کہو بھائی!"

اس نے مجھے کہنی ماری۔

"اسے نہ چھیڑو۔" عمر ہنسنے لگا۔ "ورنہ یہ ابھی ایک سوال کرے گا جس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ کہیگا اگر یہاں دل کی پھپھوندی اُڑتی ہے تو قافلہ والیوں کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں کیوں چل رہی ہیں اور ڈاک بنگلے کی محترمہ کیوں منتظر بیٹھی ہے، کس کی منتظر ہے؟" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ لیکن اس صورِ اسرافیل کے شور میں اس کا قہقہہ کراہ کی طرح سنائی دے رہا تھا۔

"کیوں بھائی۔ ٹھیک کہتا ہے کیا عمر؟" ضیا نے مجھ سے پوچھا۔

"تم میرے خیالات کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہو؟" میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"سُن لیا۔" مسعود چلایا "یہ شخص کبھی نہیں کہیگا کہ تم میرے خیالات کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ یوں کہے گا کہ تم میرے خیالات کو اہمیت کیوں دیتے ہو۔ ذاتی پروپیگنڈے کا یہ انداز کتنا موثر ہے۔"

"سب بے کار ہے" میں نے چیخ کر کہا "اِس ماحول میں بات کرنے کی گنجائش نہیں۔ یہ صورِ اسرافیل سُن رہے ہو۔ ابھی یہ پہاڑ پرزوں کی طرح اُڑ جائیں گے، میں یہ محسوس کر رہا ہوں جیسے کچھ ہونے والا ہے۔"

"ہاں بھئی" ضیا بولا "احساسات تو میرے بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔"

"ہاں۔" عمر نے آہ بھری "کانگڑہ میں ہمارے دھرم سالہ کے قریب ایک جگہ نگوئی تھی، تم نے تو دیکھا ہے نگوئی کو" وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا "نگوئی ایک ایسا مقام تھا جہاں تین طرف اونچے ٹیلے تھے۔ وہ ٹیلے پہاڑوں کی طرح نہیں تھے بلکہ ایسے تھے جیسے تبت کا ملک ہے۔ یعنی اوپر سے وہ چپٹے تھے اور پھر دفعتاً اُن کے آگے ایک گہری کھڈ شروع ہو جاتی تھی، اُن کی اونچائی اتنی نہ تھی جیسے ان مہیب دیواروں کی ہے۔ سمجھ لو وہ چار پانچ منزلوں کے برابر اونچے تھے اور اُن پر دریا بہتے تھے جو کھڈ پر پہنچ کر تین آبشار بناتے تھے۔ نیچے کھڈ کافی وسیع تھی لیکن آبشاروں کے قریب وہ کافی تنگ تھی۔ اِس کھڈ کے مرکز میں بیٹھ کر انسان پاگل ہو جاتا تھا، تینوں طرف گویا پانی کی دبیز چادریں گرتی تھیں اور پھر اُن کا شور۔ گرتے ہوئے پانی کو دیکھ کر آنکھوں کی پتلیاں گویا اپنی جگہ سے ہل جاتی تھیں اور کائنات اُلٹ جاتی تھی اور اِس خوفناک شور سے دل میں لہو جم جاتا تھا اور دل ڈھونکنی کی طرح بجتا تھا۔ اُف کتنی خوفناک جگہ تھی وہ۔ اور وہاں سے چند فرلانگ دور جو سلیٹ کو یری تھی اس کے صاحب نے اس کھڈ کے عین مرکز میں اپنا کوارٹر بنوا رکھا تھا جہاں وہ اپنی بوڑھی میم کے ساتھ رہتا تھا اور وہاں اس کوارٹر میں کوئی کسی کی بات نہیں سُن سکتا تھا۔"

"تعجب ہے۔" ضیا بولا۔

"صاف بات ہے۔" مسعود چلایا "اس کی میم جھگڑالو قسم کی ہوگی اس لئے اس نے وہاں بنوائی ہوگی اپنی کوٹھی۔"

"یہ تو بجتا ہے۔" عمر چلایا۔ "میں خود اس صاحب سے ملا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔"

"تو کیا کہا تھا وہ؟" اسحاق نے پوچھا۔

"کہتا تھا۔" عمر بولا "یہاں ہر سانس عبادت ہے ہر سانس"

"تو کیا جبھی کہتے ہیں ہر وقت اللہ سے ڈرو؟" ضیا بولا

"یعنی اللہ کا کام یہاں یہ اونچی دیواریں اور یہ خداؤ ناشور اور اندھیرا ادا کر رہا ہے۔" مسعود نے کہا "یہی عبادت کا کیا ہے۔ میرے ایک دوست کو کسی وجہ سے چار راتیں حوالات میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹتے ہی وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا، مسعود خدا کے لئے قید ہو جاؤ۔ کچھ کرو۔ چوری کرو۔ ڈاکہ ڈالو یا قتل کرو، قید ہو جاؤ۔ خدا کی قسم ولی اللہ بن کر نکلو گے جیل سے۔ عبادت اور مجاہدہ کے لئے اس سے بہتر جگہ روئے زمین پر نہیں ہے۔"

"اچھا" ضیا ہنسنے لگا۔

"اور پھر تم نے کیا کہا؟" اسحاق نے پوچھا۔

مسعود ہنسا، بولا "میں نے کہا ہو جاؤں گا، ہو جاؤں گا۔ جب وقت آئے گا ہو جاؤں گا۔ ابھی ذرا جوانی کے دن گذار لوں، ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔ لیکن اب تمہاری کو دیکھنے کے بعد قید خانے جانا بے کار ہے، اب جب بھی وقت آئے گا یہاں آرہوں گا، جہاں پہ ہر ساعت دل پہ ایک ضرب لگتی ہے"! وہ خاموش ہو گیا اور ہم سب محسوس کرنے لگے جیسے ہر لحظہ وہ ضرب شدید تر ہوتی جا رہی ہو۔

ان بے باک دیواروں سے گھری ہوئی اس پرشور کھنڈ میں خدا کس قدر نزدیک تھا۔ اُس کا ہاتھ گویا ہماری شہ رگ پر تھا۔ اس عظیم موجودگی کا احساس ہمارے جسم کے بند بند پر بوجھ بن کر چھایا ہوا تھا اور ہمارے دلوں کی دھڑکن یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ پس منظر سے نکل کر پیش منظر میں آگئی ہو، جیسے کوئی دھنکی بج رہی ہو اور اس دھنکی سے اللہ ہو کی آواز آ رہی تھی اور ہماری روح کی پھپھوندی اُڑ رہی تھی۔

دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" عمر نے مجھے مخاطب کر کے کہا "تم بہت خاموش ہو آج"۔

سوچنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جسے محسوسات کے ذریعہ مشاہدے کی لذت حاصل ہو وہ بھلا کیوں سوچے گا۔ سوچنے کا فعل تشنگی کی علامت ہے۔ تشنگی یا محرومی میں ہم سوچتے ہیں لیکن محسوسات کی دولت اگر ہمارے دل کی جھولی میں پڑی ہو تو سوچنا ایسے بے معنی ہو جاتا ہے جیسے غنی کے لئے ہاتھ پھیلانا۔ اس وقت میں محسوس کر رہا تھا جیسے میں عورت ہوں جو محسوسات سے یوں بھری ہوتی ہے جیسے مالٹا رس سے، اور جس میں بیکار سوچ بچار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ زندگی دل کی دھڑکنوں کے سوا کیا ہے۔ ایک وہ دھڑکن جس سے دل اُچھلتا ہے دوسری وہ جس کے سخت دل پہ چوٹ لگتی ہے۔ ہم تفریح گاہوں میں جاتے ہیں، ہوٹلوں میں بھٹکتے ہیں، مراجعوں اور گلاسوں کے چکر میں پھنستے ہیں، حسن و جمال کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں تاکہ ہمارا دل اُچھلے اور ہمیں اس اچھلن کی لذت محسوس ہو، یا پھر ہم عشق کرتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں، جوئے میں روپیہ ہارتے ہیں تاکہ دل پہ ٹھیس لگے اور ہمیں ٹیس کی لذت حاصل ہو۔ وہ لذت جو ہمیں اس وقت اس زنداں میں صرف دریا کے کنارے بیٹھ کر حاصل ہو رہی تھی جب دل اُچھلتا ہے تو ہم کائنات پر حاوی ہو جاتے ہیں اور خدا ہماری نگاہوں میں معدوم ہو کر رہ جاتا ہے اور جب ٹھیس لگتی ہے اور خدا ہمارے قریب آجاتا ہے، اور قریب، حتیٰ کہ وہ مستفاد و محیط ہو جاتا ہے۔ اس وقت تہاندری میں خدا ہمارے قریب تھا۔ بہت قریب! ❊

غزل

نان الحق حقی

بے خبر ہے دلوں سے دورِ زماں
ساز ٹوٹے ہیں رقص ہے کہ رواں!
حسن ہے دشت و در میں جلوہ کناں
عشق کن خلوتوں میں ہے پنہاں
یہ شبِ مہ یہ بزمِ ماہ وشاں
اے مرے شاہدِ خیال کہاں؟
اک کرشمے کی ہو گئیں آنکھیں
اک تجلی پہ لٹ گیا ایماں
خرمنِ دل پہ میرے ٹوٹ پڑے
بجلیوں کے بنے ہوئے انساں
ہو رہے ہیں سنبھل سنبھل کے کلام
اور ہم بھی سمجھ رہے ہیں کہ ہاں!
منزلیں مجھ سے گردشیں میری
تھے جہاں کل وہیں ہیں کون و مکاں
کرتی جاتی ہے صیقلیں حیرت
کھلتی جاتی ہے جوہروں کی زباں
دیکھ کھلتے ہیں یوں چمن سے چمن
دیکھ بنتے ہیں یوں جہاں سے جہاں
چھا رہا ہے خمارِ خوابِ بہار
ان دنوں چشمِ گل کو ہوش کہاں
ڈالے جاتے ہیں بجلیوں پہ حجاب
روکی جاتی ہے آندھیوں کی عناں
دیدۂ آرزو کی محرومی!
کیفِ نظارہ ہے نہ خوابِ گراں
آہ! مست چیرِ سینۂ شبِ مہ
ڈھونڈ دل ہی میں داغِ دل کا نشاں
یہ فسانے ہیں میری روح کے راز
یہ ترنم ہے میرے دل کی زباں

علی اختر

وہ نغمہ سنا اب مطربِ دل، اسرار سے پردا اٹھ جائے
جلووں میں کچھ ایسی ہلچل ہو ہر قیدِ تماشا اٹھ جائے

کیا لطف جو بے مانگے نہ ملے اک ساغرِ مے میخانے میں
ہم غیرتِ رندی! جب جانیں یہ رسمِ تقاضا اٹھ جائے

پھر عشق، حریمِ ہستی میں، دنیا کی پہیلی بوجھے گا
اس انجمنِ اسرار سے اب اندیشۂ رسوا اٹھ جائے

ہم تشنہ لبوں پر ساقی کی اس وقت نگاہیں پڑتی ہیں
کھل جائیں فلک پر جب بادل جب بزم سے مینا اٹھ جائے

یہ موجِ بہار و خندۂ گل، عقل ان کی لطافت کیا جانے
دنیا سے اگر دل اٹھ جائے ہر عشرتِ دنیا اٹھ جائے

میخانے میں پہلے رندی کے آداب سکھائے ساقی نے
پھر حکم دیا اس محفل سے ہر تشنۂ صہبا اٹھ جائے

انجامِ تمنا کچھ نہ سہی، پھر بھی یہ ضروری ہے اختر
دنیا نہ رہے دنیا سے اگر آئینِ تمنا اٹھ جائے

ماہِ نو کراچی مئی ۱۹۵۷ء

افسانہ

بے ربط کہانی

ابو سعید قریشی

گاؤں کی کچی فصیلوں سے اُبھرتے ہوئے ٹیلے مورچوں اور بُرجوں کو دیکھ کر یوں احساس ہوتا تھا جیسے زمین اپنی باہیں بلند کئے، ہاتھ اُٹھائے دعا مانگ رہی تھی۔ دعا جس کے الفاظ سرگوشیوں کی اس پُراسرار بازگشت میں ناقابلِ فہم ہو گئے تھے جو پہاڑیوں پر معلق تھی۔ سرگوشیاں، جو بہرے کانوں پر بار بار پلٹتے ہوئے، پتھروں سے اپنا سر پیٹ رہی تھیں۔ الفاظ، جن کے زخموں سے رستا ہوا لہو سنگدل چٹانوں کی کالی رگوں میں جم کر رہ گیا تھا۔ دفعتاً، کہیں دور درّے کی گود میں کوئی شنواری بس ہچکیاں لیتی سسکیاں بھرتی دکھائی دی اور میرے خیالات کا تار ٹوٹ گیا۔

زندگی کی اس علامت سے میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ارد گرد کے پہاڑوں پر نگاہ دوڑائی، سبزے کا چھینٹا تک نہیں تھا اور میری آنکھیں، جو مری اور کشمیر کے زمرد دیکھ چکی تھیں، ان برہنہ چٹانوں کے تند تیور دیکھ کر سہم گئیں۔

"گھاؤ!" کھنڈروں کو دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جو کبھی نہیں ملتے،" میرے میزبان نے کہا "صدیاں گذر جاتی ہیں۔ نسلیں!"

"کھرنڈ" میں نے ٹیلے پتھروں میں کالی چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔

"بچوں کے ناخن انہیں کھرچ ڈالتے ہیں، تا آنکہ ایک گھاؤ دوسرے کے برابر گہرا ہو جائے۔ ایک زخم سے دوسرے کے برابر خون نہ بہہ جائے! یہی ان پہاڑوں کی زندگی ہے، انفرادیت ہے یا جو کچھ بھی اسے کہہ لیجئے۔ اور اسی پر ان کو ناز ہے۔"

ملک شفا ورخاں کے ہونٹوں پر تلخ، طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ شاعر تھا اُس سے میری ملاقات پشاور میں ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور ہم باتیں کرتے کرتے دور نکل آئے تھے۔

"اس سے آگے۔ اس پتھر کے اُس طرف اُن کی زمین ہے۔ ان کی قلمرو، میری مملکت یہاں ختم ہو گئی۔" وہ ہنسا دیوانہ وار ہنسا، کھِل کھِلا کر ہنسا، جیسے چٹانوں کے تیکھے کون ٹوٹ کر ڈھلوانوں سے لڑھک پڑے تھے۔

"ہم بھی عجیب لوگ ہیں سعید صاحب! آپ تو افسانہ نگار ہیں۔ آپ یہاں سے جھولیاں بھر بھر کے کہانیاں لے جا سکتے ہیں، ہر پتھر ایک افسانہ ہے، ہر چٹان ناول، ہر چوٹی اور ہر وادی شعر ہے، نظم ہے، غزل ہے، اور۔ اور وہ کیا کہتے ہیں اُسے۔ بیک وقت قصیدہ اور ہجو، ساقی نامہ اور پند! لیکن ہمارے یہاں کے تکوں یا پھر اس انٹری کے علاوہ جسے لوگ درۂ خیبر کہتے ہیں، ہمارے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ یہ چٹانیں! ان کا ایک ایک پتھر، ایک ایک آئینہ ہے، جس میں ہماری زندگی کا عکس پڑ رہا ہے۔ ہم خود ان سے اتنے قریب ہیں کہ اپنی مکمل صورت، پورا چہرہ، مجموعی ناک نقشہ نہیں دیکھ سکتے۔ ہمیں صرف اپنی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اور لوگوں کو؟ اوروں کو جو یہاں کبھی کبھی آتے ہیں، رومان! تاریخ کا رومان!! فاتحین کے گھوڑوں کی ٹاپوں اور ان کے نعروں کے شور میں سیاح ان آوازوں کو نہیں سُن سکتے جو ان چٹانوں کی جان ہیں اور جن سے ان سلوں کا سینہ آباد ہے۔ سکندر و محمود کی سواریوں کے سلسلے میں وہ کردار آنکھ اوجھل ہو جاتے ہیں جو اس اسٹیج کی اصل رونق ہیں۔ کھیل جو بادشاہوں کی آرزومندی اور کشور کشائی، اُن کے عروج و زوال کے قصوں کے ساتھ ساتھ کھیلے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایک نہ ایک کھیل کا کردار ہے یا تماشائی۔ اور یہ ایسے کھیل ہیں جن میں تماشائی اور کردار سب ہی حصّہ لیتے ہیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ ہمارے قصّوں میں جو مقامات آپ کو ملیں گے، جتنے آپ دیکھیں گے، وہ آپ جیسے کہنہ مشق ادیبوں کے ذہن میں کبھی نہیں آ سکتے۔ آپ سوچتے رہ جائیں گے کہ ہائیں، یہ بھی ہو سکتا ہے؟ یوں بھی ہوتا ہے؟

"یہ پتھر جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ بھی سٹیج کا ایک حصّہ ہے، یا کردار ہے۔ آج سے بیس برس پہلے جب میری عمر اس مدّت سے نصف ہو گی، جو اس واقعہ

کو بیت چکی ہیں۔ آپ اِن پتھروں اس مقام پر نہیں آسکتے تھے، جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ دن کے وقت بھی نہیں آسکتے تھے۔ اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میرے خاندان کے لوگ متواتر پانچ سال تک دن کے اُجالے میں اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے تھے"۔

"تو زندگی کے کام کاج کیسے ہوتے تھے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"شب کور کیسے جیتا ہے؟" میرے میزبان نے کہا "سب کام رات کو، سفر، تجارت۔ البتہ شادی غمی میں یہ کرفیو اُٹھ جاتا تھا"۔

"اور کھیتی باڑی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو ہمارے یہاں یوں بھی برائے نام ہی ہوتی ہے۔ ان چٹانوں پر اپنا پسینہ ٹپکا کر آدمی ان سے کیا حاصل کرے گا؟ مٹھی بھر مکی، جھولی بھر جَو، کشکول بھر آٹا! کیا مل جائے گا ان سے؟ ہماری گذر بسر تجارت پر ہوتی ہے، سو میرے لئے وہ بھی نہیں۔ شعر کی منڈی ہمیشہ کی طرح سرد ہے۔ جب قصیدہ گو کی نہ بن آئی تو غزل گو کو کون پوچھتا ہے۔ ہم ایسے تو بس مصرع ہوتے ہیں۔ کچھ دن لوگوں نے بے سوچے سمجھے گنگنایا اور پھر بھول گئے۔ اور ہم ابھی یہ بھی نہیں سوچ پاتے کہ یہ گنگنا کیوں رہے تھے کہ ہمارا اپنا قافیہ گم ہو جاتا ہے۔ ردیف غائب! جانے ان چٹانوں کی رگیں، کسی بھولے ہوئے رسم الخط میں کس فردوسی کی تاریخ وفات کہہ رہی ہیں، کتنے لغے اِن پہاڑیوں سے سر پھوڑ چکے ہیں اور ان وادیوں میں کتنی رباعیاں دفن ہیں؟ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان پتھروں پر اپنا پسینہ ٹپکانے سے حاصل؟ لیکن ہم لوگ، سعید صاحب، ان پر اپنا لہو ٹپکاتے ہیں، بڑے رومان پرور واقعہ ہوئے ہیں ہم۔ اور زندگی کے وہ پانچ سال، جب ہم دن کے اُجالے میں گھر سے نہیں نکلے تھے، اسی لہو کے چراغوں نے ہماری راتوں میں اُجالا کیا"۔

"یہ کھائی دیکھ رہے ہیں آپ۔ یہ خندق! وہ یہاں تک آپہونچے تھے۔ میرے تربور۔ یہ بھی ہمارے یہاں ایک ادارہ ہے۔ باپ بھائیوں کے بیٹے۔ ایک ہی دادا کی اولاد۔ آپ کے یہاں جانی دوست، راز دار۔ ہمارے یہاں جانی دشمن! وہ دھواں اُنھیں کے گھر سے اُٹھ رہا ہے۔ نہیں آپ نہیں دیکھ سکتے۔ تربور کے گھر کا دھواں تربور ہی کو نظر آتا ہے۔ خیر وہ ہے اُن کا حجرہ۔ اُس مورچے کے پیچھے، اُس کالی چٹان کی سیدھ میں۔ وہ برج۔ جی؟"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہزار گز کے فاصلے پر، اُس برج کے سوراخوں سے بندوقوں کی نالوں کے پیچھے نیلی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ پہاڑوں نے اپنا سانس روک لیا تھا اور وہ سرگوشیاں چپ ہو گئی تھیں جن کا مجھے ابھی تھوڑی دیر ہوئی احساس ہوا تھا۔ اور اس خاموشی میں شنا ور خاں کا ایک ایک لفظ ان چٹانوں کے کناروں کی طرح واضح اور وزنی معلوم ہو رہا تھا جن سے ہمارے ارد گرد کے پہاڑ عبارت تھے۔

"شہباز خاں، میرا تربور، آنکھ بند کر کے آواز پر گولی مارتا تھا ظالم! لیکن اس روز گولی ٹھس ہو گئی۔ پرانی تھی شاید۔ میرا بھائی شمروز بھی اعلےٰ درجہ کا نشانچی تھا۔ پرانی چھوٹی دونّی تو یاد ہوگی آپ کو؟"

"چاندی کی۔ گول؟"

"جی ہاں۔ تو شمروز اسے ہوا میں اُچھال کر پستول سے اڑاتا تھا۔ تو اُدھر شہباز تھا اور اِدھر شمروز۔ اُس دن تک لوگ یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ دونوں میں کون بہتر ہے، برابر کا جوڑ تھا۔ اور اُس روز اگر شہباز کی گولی اُسے دھوکہ نہ دیتی تو میرا بھائی گیا تھا۔ بغیر کسی اوٹ کے فصیل پر کھڑا تھا۔ خوف تو اس کے پاس نہیں پھٹکا تھا۔ جہالت کی حد تک دلیر تھا میرا بھائی، لیکن ابھی اُسے کچھ دن اور جینا تھا اور شہباز کی آئی تھی۔ اُس بیچ میں کہ وہ گولی بدلتا میرے بھائی کی دو گولیاں اُس کے دل میں اُتر چکی تھیں۔ میرے ماموں کا ایک لڑکا بھی اس وقت تک کام آچکا تھا، چنانچہ معاملہ برابر تھا۔ لیکن خانہ جنگی جاری رہی"۔

"مورچے لگ گئے، سینہ مٹی سے ہار مان گیا۔ فصیلوں کے کنگروں میں دندانے پڑ گئے، اِدھر بھی اور اُدھر بھی۔ آج وہ چھاپہ مارتے تو موقع پا کر کل حملہ کر دیتے، لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر انھوں نے ہمارے حجرے کو سرنگ سے اُڑانے کی ٹھانی، لیکن میرے ماموں کے بیٹے علی کا گولی سے فلیتہ لگانے والا ہاتھ کلائی سے علیحدہ ہو گیا۔ یہ بہادر تھا شہباز کا چھوٹا بھائی۔ نشانہ اُس کا بھی کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ زندہ ہے ابھی، کالے کپڑے پہنے پھرتا ہے۔ آیا کرتا ہے سرائے میں۔ ابھی آج صبح ہی نظر آیا تھا۔ اب بھی بندوق اُٹھائے پھرتا ہے"۔

"عادت!" میں نے کہا۔

"یا شوق؟"

"عجب الٹا شوق ہے۔ اتنا وزن بلا وجہ اٹھائے پھرنا۔ جب چلا نہیں سکتے تو۔"

"نہیں، چلاتا ہے" شنا ور خاں نے میری بات کاٹی۔

"وہ کیسے؟"

"ٹنڈ پر رکھ کے۔ اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ نشانہ اب کبھی خطا نہیں جاتا۔"

"خوب اشوق ہو تو ایسا۔ مگر آپ کو اسلحہ سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی" اس کی مضطرب نگاہیں پتھروں میں کچھ ڈھونڈتی ہوئی نظر آئیں۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کہانی کے ٹکڑے، جو آپ کو سنا رہا تھا۔ اب اتنی مدت گذر چکی ہے اس بات کو کہ ان ٹکڑوں کو اکٹھا کرنا بھی مشکل اور تکلیف دہ معلوم ہو رہا ہے۔ اُف قبائلی پندار کی کرچیاں۔ کتنی تیز ہیں، ہاتھ لگائے خون نکلتا ہے یہیں بہا تھا اس آئین کے محافظوں کا خون" اس نے ایک لمبا سانس لیا۔

میں سمجھا جذباتی ہوگیا، لیکن اس کے لہجے میں ایکا ایکی اس شخص کا انداز آگیا جو کسی سیاح کو تاریخی مقامات دکھا رہا ہو۔

"یہ خندق ہمارا آخری مورچہ تھی، یہ خوڑ۔ یہ برساتی نالہ! قدرت نے ہم لوگوں کی ضروریات کا خاص خیال رکھا ہے۔ قدم قدم پر کمین گاہ ہے، موڑ موڑ پہ مورچہ، چپے چپے پر ڈھال ہیں تو صرف بندوق ہی اٹھانا پڑتی ہے۔ خیر جب ہمارے حجرے کو سرنگ سے اڑانے کی کوشش بھی ناکام ہوئی، تو ہمارے تربوروں نے ایک اچھا بڑا لشکر اکٹھا کیا۔"

لشکر؟ میرے ذہن میں لشکر کا وہی تصور تھا جس کا ذکر میں نے تاریخ کی درسی کتابوں میں پڑھا تھا یعنی دو حکمرانوں کی آپس میں باقاعدہ جنگ۔ لیکن کسی جنگ کا حال پڑھاتے وقت ہمیں اس کے اسباب اور وجوہ بھی بتائی جاتی تھیں۔

"مگر ضروری نہیں کہ وجہ معقول بھی ہو" شنا ور خاں نے کہا۔ "جنگ تبھی ہوتی ہے جب عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ اور ہمارے پندار کی پہاڑیاں کچھ ایسی بجری سے بنی ہیں کہ ایک کنکر گرا تو پورا پہاڑ لڑھک پڑا۔ جیسے اس خوڑ کے پتھر، پانی کے ریلے پر جانے کہاں سے کہاں نکل آئے ہیں۔"

"میں اسی پہلے پتھر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اس کنکر کے متعلق جس کے ہلنے سے یہ پہاڑی بہہ نکلی۔"

"صبر کیجیے، قصہ گو کو ٹوکتے نہیں۔ داستان پہلے ہی خاصی بے ربط ہو رہی ہے۔ ربع صدی کے ہاتھوں نے ساری تفصیل غلط ملط کر دی ہے۔ آپ تو افسانہ نگار ہیں۔ میری مجبوری کا اندازہ لگائیے اور سنتے جائیے۔ واقعات کے اس ملبے، پتھروں کے اس ڈھیر سے مجھے سارا پہاڑ پھر کھڑا کرنا ہے۔ اُلٹی تقلیب!

"تو ہم اس خندق تک پہونچ چکے ہیں۔ ان برساتی نالوں کو، جب یہ خشک ہو جاتے ہیں ہم خندقوں اور پگڈنڈیوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ دیکھتے رہیئے کہ یہ راستہ ہمیں کہاں لے جاتا ہے۔ حیرت ختم ہوئی تو کہانی بھی ختم۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ حیرت نہ ہو تو آدمی کیا بنے۔ اگر اُسے پہلے ہی معلوم ہو جائے کہ اب کیا ہونے والا ہے تو جینے کا جادو ٹوٹ جائے۔ شاید حیرت کی ساعت ہی کھنچ کر زندگی بن گئی ہے۔ مگر کہانی رہی جا رہی ہے۔

"ہاں تو یہ خندق ہمارا آخری مورچہ تھی۔ حملے کی خبر ہمیں ذرا دیر سے ملی۔ تیاری کا وقت نہیں تھا" دیدہ خواہد شد، میرے بھائی نے کہا۔ اب کی برسات اس خوڑ کا رنگ کچھ اور ہوگا۔

"یہی وقت ہوگا۔ سورج اسی طرح اس چوٹی کے اوپر چمک رہا تھا جب ہم نے ڈھول کی آواز سنی اور مورچے سنبھال لیے۔ آج ملک مراد خاں کی اولاد کا آپس میں مقابلہ ہے! میرے بھائی نے للکار کر کہا: اور جب تک شمر قند کے تھیلے میں ایک گولی بھی موجود ہے، اس پتھر سے ادھر کوئی نہیں آئے گا، اس نے ہوا میں ایک پتھر اچھالا۔ لیکن اسے زمین پر نہ گرنے دیا۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ ہمارے عزیزوں کی صف سے بھی اسی طرح ایک پتھر اڑا۔ بہادر سے کے ٹنڈ پر رکھی بندوق نے بھی اُسے ہوا میں جا لیا۔"

ٹنڈ پر رکھی ہوئی بندوق کے تصور سے میرے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔

"مجھے یوں نظر آیا" شنا ور خاں نے کہا "جیسے وہ گولی بہادرے کی بندوق سے نہیں بلکہ اس کی کٹی ہوئی کلائی سے نکلی تھی۔ کالی آستین میں لپٹی ہوئی بانہہ بالکل مشین گن کے دہانے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ آج صبح جب میں نے اسے سرائے میں دیکھا تو وہی منظر پھر میری آنکھوں کے سامنے آگیا اور میرے جی میں آئی کہ بھاگ

جاؤں۔ وہ سیاہ پوش زخمی کلائی گولیوں سے بھرا ہوا میگزین معلوم ہوتی تھی۔ ظالم کی آنکھیں بھی سیسے کی طرح نیلی ہیں، لیکن تشبیہ کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی۔ جنگ شروع ہوئی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ آج کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ گولی سے بچ گیا تو دہشت دبوچ لے گی، دہشت نے بخش دیا تو غم کھا جائے گا۔

"گولیاں شہد کی مکھیوں کی طرح اُڑ رہی تھیں۔ کبھی ایک کو ڈس گئیں کبھی دُوسرے کو۔ لیکن اتنے میں جرگے کا جھنڈا دکھائی دیا اور پتھر رکھ دیا گیا، یعنی عارضی صلح ہو گئی۔ سیز فائر۔ جیسے کشمیر میں۔" وہ ہنسا "اور پھر حساب لگایا گیا کہ ہمارے زیڑوں کے کتنے دشمن ہلاک ہوئے تھے اور ان کے دشمنوں کے کتنے۔ جمع تفریق کے بعد ان کا ایک آدمی ہمارے ذمے نکلتا تھا۔ اور تاوان یا خون بہا کے بغیر جنگ بند نہیں ہو سکتی تھی، لیکن جرگے نے فیصلہ کیا کہ ہمارے تربوروں میں دو بڈھے بھی مارے گئے تھے، جو اپنی زندگی کی بہار مدت ہوئی ختم کر چکے تھے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے یہاں سبھی نوجوان کام آئے تھے۔ بڈھے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ایک بڈھا برابر دو جوانوں کے قرار پایا۔ اور ہر چند کہ جوانوں کے لئے یہ کوئی قابل فخر سند نہیں تھی، لیکن جرگے کا فیصلہ بھی آسانی سے نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ اُنھوں نے اپنا سیدھا سادہ قبائلی حساب لگایا تھا کہ کسی طرح اور خون خرابہ نہ ہو۔ جیسے یہاں اب بھی 'پکا' دُنبا، چلتا ہے اور سیر، سوا سیر کا ہوتا ہے! تو صاحب یوں پتھر رکھ دیا گیا کہ بہت ہو چکی! اب ہوش میں آؤ۔ اور اس دن سے جنگ بند ہے، پتھر رکھا ہے"۔

"لیکن اس پہلے پتھر کی خبر نہ ملی" میں نے کہا

"کنکر کہئے، بلکہ ذرہ۔ لیکن ایسا کہ پہاڑ پھوڑ دے۔ تربوروں کے ہاں عقیقہ تھا کسی کا۔ جڑا ہوا، لیتی ناچے، ڈھول پیٹے، سرناسنکی، دف دھڑکی، سارندہ چیخا اور رباب گونجا۔ اور یہی آخری ساز اس نغمے کا الاپ تھا۔ خون خرابے کا باعث! شاید شیطان کی تانت لگی تھی یا آدمی کی کھال منڈھی تھی، جانے کیا تھا۔ ہوا یہ کہ میراثیوں نے شہباز خاں سے شکایت کی کہ آپ کے حجرے سے ہمارا رباب غائب ہو گیا۔ کہا نا کہ شیطان کی آنت لگی تھی، چھلاوا بن گیا۔ اور یہ کام سوائے ہمارے اور کس کا ہو سکتا تھا؟

"شہباز خاں کے حجرے سے رباب کیا غائب ہوا، عقل کا سر غائب ہو گیا۔ ہم سے مطالبہ کیا گیا کہ رباب فوراً واپس کیا جائے، جانے رباب کون لے گیا تھا مگر ستم یہ ہوا کہ تربوروں کی طرح ہماری رگوں میں بھی ملک مراد خاں کا خون تھا۔ چنانچہ عقل کا سر اِدھر بھی غائب تھا۔ اُدھر تو نہیں ہوئی اور اِدھر ہتک کہیں چور ٹھہرائے ہوئے ایسے میں آہنگ کی کیفیت معلوم! تانت تن گئے، سُر الجھ پڑے۔ مضرابیں انتقام انتقام پکارنے لگیں۔ اور اگر ان دو بڈھوں نے، خدا انھیں جنت نصیب کرے، جان دے کر حساب برابر نہ کیا ہوتا تو شاید آج میں یہ کہانی سنانے کے لئے موجود نہ ہوتا"۔

"وہ بڈھے بخشے گئے" میں نے کہا۔

"خدا سبھی بڈھوں کو ایسی ہی توفیق دے" شنادر خاں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ اُس کی داڑھی میں نصف سے زیادہ سفید بال تھے۔ غالباً اُس نے اس واقعے اور اپنی عمر کا حساب لگاتے وقت بھی کوئی قبائلی پیمانہ استعمال کیا تھا۔

اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا "اب اِس جنگ کو، جس کی بے ربط کہانی میں نے آپ کو سنائی ہے، اتنی مدت گذر چکی ہے کہ اس کی تفصیل شاید کسی کو یاد نہیں۔ ہاں بہادر سے کو"۔

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ اس کے حلق سے ایک آہ نکلی اور اُس کے ساتھ ہی رائفل کے فائر کی آواز کسی بھٹکی ہوئی بے چین رُوح کی طرح چٹانوں میں پھڑپھڑاتی ہوئی سنائی دی۔ اور سامنے، شنادر خاں کے تربوروں کی فصیل پر ایک سیاہ سایہ تیرتا ہوا غائب ہو گیا۔

گولی شنادر خاں کے سینے میں لگی تھی۔

"آخر بہادر سے نے اپنے بھائی کا انتقام لے لیا" اُس نے کہا "آج حساب پوری طرح بیباق ہو گیا۔ اب ہمارے ذمے اُن کا ایک بڈھا بھی باقی نہیں"۔

وہ ہنسا۔ اُس کے منہ سے خون کے بلبلے اُبھرے اور داڑھی تر ہو گئی۔ اس نے چادر کے پلو سے اپنے ہونٹ پونچھے اور خندق کی اوٹ میں لیٹ گیا۔

"ایک اور کھرنڈ اتر گیا۔ اب دونوں گھاؤ برابر ہیں۔ ابھی ابھی۔ میں نے۔ بڈھوں کے لئے دعا مانگی تھی۔ اس وقت۔ شاید آسمانوں کے دروازے کھلے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے۔ نہ بیوی ہے۔ نہ بچہ۔ نہ کوئی اور عزیز زندہ ہے۔ جو اِس نئے بننے والے کھرنڈ کو۔ کھرچ سکے گا۔ چلئے ایک شاعر۔ دنیا میں کم ہو جائے گا۔ تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ لیکن۔ سنا ہے۔ شاعر وہاں بھی۔ دوزخ میں جلیں گے"۔

وہ ہنسا اور پھر نڈھال ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ معاً مجھے اپنی تھرمس کا خیال آیا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ اُس کے حلق میں ٹپکایا۔

اور اب بھی گدر رہا ہے۔ ٹھوڑی اور اوپر کے ہونٹ پر ٹھنڈی مٹی والے مردوں کی سی ڈاڑھی مونچھیں لیکن بننے سنورنے کا اتنا شوق ہے کہ سفید اور بے ٹنکے کپڑے کبھی پہنے نہیں۔ جب سے سر سفید ہوا اجال ہے کہ مہندی کو دو سرے سے تیسرا دن تو ہو جائے۔ گرمی ہو یا جاڑا سر سے لے کر بھوؤں، ہونٹ اور ٹھوڑی تک مہندی تھوپی۔ دانت تھے یا نہ تھے کیا مقدور کہ روز مسّی نہ لگے۔ اور لاکھا نہ جمایا جائے۔ کاجل آنکھوں ہی میں نہیں لگتا تھا بلکہ بھویں رخسار اور ماتھے کے تل بھی بنائے جاتے تھے۔ کچھ دن سے چوڑیوں کی ایسی نرالی لت لگی تھی کہ ہر رنگ کا ایک ایک جوڑا ہاتھوں میں ضرور رہتا تھا کہتی تھیں کہ بی یہ شگون کی چوڑیاں ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ساتویں دولہا کا بیسواں تھا اور آپا نہائی دھوئی سر سے پاؤں تک رنگین کپڑے پہنے گہنے میں لدی ہوئی بیٹھی تھیں کہ سندر مشاطہ نے جھک کر سلام کیا۔

آپا:۔ مردار! مردار! بڑی طوطا چشم ہے۔ اس دن سے جو گئی تو آج صورت دکھائی۔

سندر:۔ بیگم کیا بتاؤں ایک ایسا ہی کام ہو گیا تھا جو آنا نہیں ہوا۔

آپا:۔ ہاں بوا میرا نمک ہی ایسا ہے۔ بیسیوں جوڑے پہنا دئے۔ کڑوں کی جوڑیاں ہاتھوں میں ڈال دیں۔ اصل یہ ہے کہ تم لوگ ہوتے ہی بے مروّت ہو۔

سندر:۔ بیگم۔ کیوں نہیں۔ آپ کا نمک بوٹی بوٹی میں رچا ہوا ہے۔ اور سرکار کیا اب اور کڑوں کی جوڑی نہ پہنوں گی۔

آپا:۔ بس باتیں بنانی آتی ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ تمہیں میرا خیال ہی نہیں۔

سندر:۔ واہ حضور واہ۔ واری جاؤں یہ کیا آپ نے کہا۔ نئی نو دن تو پرانی سو دن۔ اپنی پرانی سرکار کا خیال نہ ہو گا تو کس راہ چلتے کا ہو گا۔

آپا:۔ میں نے کہا آج بیسواں تو ہو ہی گیا ہے۔ جلدی فکر ہونی چاہئے۔ تم جانو بغیر گھر والے کے گھر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ ہزاروں قسم کی بدنامیاں۔ وہی مثل ہے کہ مارنے کے ہاتھ پکڑے جاسکتے ہیں کہنے کی زبان نہیں روکی جاتی۔ اور بوا میرے اس سہاگ کا دیکھنے والا بھی تو کوئی ہو۔ پھر میرا ابھی بگڑا ہی کیا ہے۔ پان جتنے چاہو کھلا دو۔ باتیں جتنی چاہو بنوا لو کہو تو صبح سے شام تک بیٹھی بناؤ سنگار کئے جاؤں۔

سندر:۔ (بلائیں لے کر) حضور میں کیا اندھی ہوں۔ بیوی دنیا میں زندہ دلی ہی کا تو سارا مول ہے۔

آپا:۔ لیکن ابھی سندر اب کے تو دیکھیو دولہا دولہا ہی ہو۔

سندر:۔ سرکار۔ اللہ مالک ہے۔ جو جگہ میں نے تاک رکھی ہے .... آپ تو مجھے بے مروت کہتی ہی ہیں مگر خیر۔ حضور گنگا جمنی کپڑے پہنوں گی۔

آپا:۔ (چھاتی ٹھونک کر) گنگا جمنی سندر گنگا جمنی۔ اور جوڑا میری طرف سے۔

سندر:۔ خدا میری سرکار کو سلامت رکھے۔ اچھا حضور جاتی ہوں پرسوں آؤں گی۔

آپا:۔ اری نگوڑی یہ بھی تو کہہ کہ خوشخبری لاؤں گی۔

سندر:۔ لیجئے سرکار بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ خالی آ کر کیا مجھے اپنا سر منڈوانا ہے۔

آپا:۔ ہاں۔ بس سمجھ گئی نا۔

آپا نے بٹوے میں سے ایک روپیہ نکال سندر کو دیا اور دعائیں دیتی یہ جا وہ جا۔

تیسرے دن دوپہر کے بعد ظہر کی نماز پڑھ کر آپا پن کٹی میں پان کوٹ رہی تھیں۔ کھانا پکانے اور اوپر کے کام والی دونوں مامائیں پاس بیٹھی تھیں کہ سندر مشاطہ ہنستی ہوئی آئی اور لال کاغذ پر لکھا ہوا رقعہ ریشمی سرخ رومال میں لپٹا ہوا آپا کے سامنے رکھ دیا۔ "حضور منہ میٹھا کرائیے۔ بات بھی وہ لائی ہوں کہ بس آگے اللہ کا نام ہے۔ اور بات کیا آٹھویں دن نکاح ہو جائے گا۔" آپا نے آئینہ اٹھا کر پہلے منہ دیکھا۔ مانگ پٹی درست کی۔ پان کی پیک جو باچھوں تک بہ آئی تھی رومال سے پونچھی اور مسکرا کر بولیں "میں کوئی پڑھی لکھی ہوں جو رقعہ پڑھوں۔ کچھ زبان سے کہے تو سمجھوں۔"

سندر:۔ سرکار زبان سے کیا کہوں۔ اب گھنٹہ بھر میں دولہا والیاں آ جائیں گی۔ سب باتیں طے ہو جائیں گی۔ میں تو صاف معاملہ رکھتی ہوں۔ چھ سو روپیہ مہر

آپا :۔ کیا تماشے کی عورت ہے۔ چڑیل نے مجھ سے پوچھا نہ گچھا۔ اری دلہن بھی کہیں زمانے میں بات کرتی ہے۔ لو شامت۔ میری ہی شادی اور میں ہی بات کرلوں سات شادیاں ہوئیں ایک دفعہ بھی مجھے کوئی دیکھنے نہیں آیا۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔

سندر :۔ ان کا اکلوتا لڑکا ماشاءاللہ سے جوان۔ چاند کا ٹکڑا۔ گھر کے آسودہ۔ ان کے ہر طرح کے ارمان ہیں۔ اور سرکار میری آپ کو شرم کیوں آئے۔ اللہ نے صورت شکل قد قامت کیا کچھ نہیں دیا ہے۔ اور اس پر بچپن ایسی کہ لاکھوں میں ایک۔

پکانے والی :۔ بیگم! دیکھنے آتی ہیں تو جم جم آئیں۔ بلائیں لے کر جائیں گی۔ عورت کی تو کاٹھی دیکھی جاتی ہے۔ ہزاروں لڑکیوں سے آپ اچھی ہیں۔

اوپر کے کام والی :۔ اے بُوا نہ دلّی کا پانی کچھ ایسا بگڑا ہے کہ میرے آگے کے بچے ہیں اور لپو لپے۔ سر سفید بگلا۔ دور کیوں جاؤ میری نواسی کو دیکھ لو، ابھی تیورس کے سال شادی ہوئی ہے۔ دو بچے ہوئے ہیں کہ بڑھیا پھونس معلوم ہوتی ہے تو کیا دور بار وہ بڑھیا ہے۔ ہماری سرکار تو بیسیوں سے اچھی ہیں۔

آپا :۔ ہاں بُوا نزلے کی پوٹ تو میں بچپن سے ہوں۔ اسی نگوڑ مارے نے میرا کھوج کھو دیا ہے۔ بھلا ابھی میرے دانت ٹوٹنے اور بال سفید ہونے کے دن تھے۔ اور میرا کیا بگڑا ہے۔ دل میں جوانی کے سارے چاؤ موجود ہیں۔ پھر تجربہ کار کیسی، ابھی بچہ ہو جائے تو دیکھو کیسا پالتی ہوں۔

سندر :۔ اچھا بیگم صاحب۔ لو اب دولہا والیاں آنے والی ہیں، آپ تیاری کریں۔

یہ سن کر آپا تو کوٹھڑی میں گئیں اور باہر سے آواز آئی کہ سواریاں اتروالو۔ سندر دوڑی ہوئی گئی۔ مکان تو صاف ستھرا تھا ہی سواریاں اتریں۔ ماماؤں نے ادب سے سلام کیا۔ صدر دالان میں قالین پر جا بٹھایا۔ اتنے میں آپا بارہ ابرن سولہ سنگار کئے گھونگٹ نکالے جھکی جھکی آئیں اور گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ گفتگو شروع ہوئی۔

سندر :۔ سرکار اب ساری باتیں طے ہونی چاہئیں۔

دولہا والی :۔ ہاں ہاں۔ مگر دلہن کی طرف سے کون گفتگو کرے گا۔

سندر :۔ اے حضور خود بدولت۔ اللہ رکھے اپنی مالک مختار ہیں۔ (آپا سے مخاطب ہوکر) حضرت۔ گھر کی بڑی بوڑھی کہئے یا لڑکی جو کچھ ہیں آپ ہی ہیں، بات کیجئے، مہر، بَٹاری، چڑھاوا بری وغیرہ کے متعلق طے کر لیجئے۔ یہ سن کر آپا نے شرما کر اور بھی گردن نیچی کر لی۔

ایک آنے والی :۔ صاحبزادی ایسی کیا شرم ہے۔ ذرا سر اٹھا کر بیٹھو۔ بات کرو۔

پکانے والی :۔ ہاں بوا اگلے زمانے کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی تھیں۔

آپا کو یہ سننے کی تاب کہاں تھی۔ منہ سے ہوں ہوں کر کے دوپٹہ میں سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا۔ سندر منہ سے نہیں پھوٹتی اگلے زمانے کا کون ہے۔

سندر :۔ سرکار میرا تو کالا منہ نہ کرائیے۔ اگلے زمانے کی کیوں ہونے لگیں، دلہن تو ماشاءاللہ شہر بربادی کے کچھ ہی دن پہلے کی پیدائش ہیں۔ بس سرکار اب دیکھا بھالی ہو چکی۔ زیادہ ضد نہ کیجئے۔ چار دن بعد پیٹ بھر کر دیکھ لیجئے گا۔

اتنے میں آپا نے اوپر کے کام والی ماما کو پاس بلا کر کہا کہ نگوڑ ماری کہہ دے کہ پچیس ہزار کا مہر ہوگا۔ پچاس روپے مہینہ بَٹاری کے خرچ کا اور نو من کی بری۔ ماما نے پکار کر سمدھنوں سے یہ شرطیں بیان کیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مہر اور بَٹاری کا خرچ جیسا تم نے کہا منظور ہے۔ لڑکا کچھ ایسا شوہرا ہے کہ دونوں شرطوں پر حامی بھر لے گا۔ بری البتہ زیادہ ہے۔ لیکن خیر نو من نہ سہی پانچ سات من سہی۔ ہاں دولہا میاں نے اپنی ایک شرط پر بڑا زور دیا ہے۔

سندر :۔ بیوی وہ بھی کہہ ڈالئے۔ دولہا ہی کا تو سارا ظہور ہے۔ نباہ تو انہی سے ہونا ہے۔

سمدھن :۔ دولہا میاں کہتے ہیں کہ دلہن کو دونوں وقت بلا ناغہ میموں کی طرح کھٹ پٹ کرتے سر کھولے میرے ساتھ ہوا خوری کو جانا پڑے گا۔

سندر :۔ اے سرکار یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

ماما :۔ مگر حضور بے پردہ پھرنا کیسے ہو سکتا ہے، نا پالکی نہ ڈولی۔ ہماری بیگم تو دالان سے انگنائی تک کی جگہ ٹھوکریں کھاتی ہیں۔

سندر :۔ سرکار فرمائیے؟

آپا ان چہ میگوئیوں سے پریشان تھیں گھبرا کر آخر بول اٹھیں۔ سندر تو گونگی ہی بنی جاتی ہے، کہہ کیوں نہیں دیتی ہے کہ وہ ہوا خوری تو کیا ولایت بھی لے جائیں گے تو

بے مغز جاؤں گی۔ دو قدم ان سے آگے نہ رہوں تو کہنا ؛

سندر:۔ سن لیا؟

سمدھن:۔ ہاں سن لیا ؛

سندر:۔ سرکاروں کو مبارک ہو۔

ماما:۔ بیگم صاحبہ دریافت کرتی ہیں کہ پھر کیا ٹھہرا۔ یونہی مبارکیں دینے لگی ؛

سندر:۔ اے ادہر کی شرطیں اُدہر، اُدہر کی شرطیں ادہر منظور کر لیں۔ بس بات پکی ہو گئی۔

ماما:۔ تو پھر برات کس دن آئے گی؟

سندر:۔ حضور امیر گھرانوں کی شادی ہے گڑیوں کا کھیل تو نہیں۔ ان کا لاڈلا بچہ ہے۔ پہلے مائیوں بٹھائیں گے۔ مہندی ساچق نکاح وداع چوتھی چالے ساری باتیں ہوں گی۔ کنوارا بر یونہی تھوڑی مل جاتا ہے۔

ماما:۔ بیوی کہتی ہیں یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن چاہتی ہوں پہلے وداع ہو جائے پھر نکاح۔ ساچق چالے وغیرہ جو جو وہ کہیں گے ہوتے رہیں گے۔ آخر میرے ہاں بھی تو کوئی انتظام کرنے والا ہو۔ تم سمجھو کا اتنی رسموں میں پورا خرچ ہو گا۔ یہاں کون بیٹھا ہے جس پہ مجھے بھروسہ ہو۔ اتنی بڑی شادی میں بوا مرد کا ہونا بہت ضروری ہے تو ان کے سوا میرا ہمدرد کون ہو سکتا ہے۔

یہ سن کر ہنسی کے مارے ساری عورتوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ سندر نے بڑی مشکل سے قہقہوں کے طوفان کو روکا۔ شام ہو رہی تھی۔ مہمانوں کی سواریاں ڈیوڑھی پر لگی ہوئی تھیں۔ آپا نے بے چین ہو کر سندر سے کہا، خام پارہ لہنگا پھڑکاتی پھرتی ہے۔ مجھ سے کہہ کون سی تاریخ ٹھہری۔

سندر:۔ سرکار۔ اب یہ جا کر اپنے مردوں سے ذکر کریں گی۔ وہاں کنبے رشتے کے سارے لوگ جمع ہوں گے۔ ابھی بری تاریخیں دیکھی جائیں گی۔ اور پھر نکاح کے دن کا تقرر ہو جائے گا۔ آپ خاطر جمع رکھئے۔ ایک اٹھواڑے کے اندر اندر خدا کو منظور ہے تو دلہن بنا دوں گی۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

پہلے ہندوستان میں اور خصوصاً دلی میں بننے بنانے کا بڑا چرچا تھا۔ لوگوں میں زندگی تھی زندہ دلی تھی۔ جھینپنے ہنسانے کے لئے بہلانے ڈھونڈتے جاتے تھے۔ کسی بڈھے کو گھوڑی چڑھایا جا رہا ہے۔ کسی بڑھیا کی زچہ گیریاں گائی جا رہی ہیں۔ جہاں کسی کو اپنی حیثیت اپنی حالت اور اپنی عمر کے خلاف کچھ کرتے دیکھا۔ چار نے مل کر اسے بنا لیا۔ پانچ سات دن خوب دل لگی رہی۔ اس میں یہ پروا نہ تھی کہ بننے والے کا حشر کیا ہو گا۔ کوئی اپنے آپے میں آ گیا کسی کے دماغ کی چول اور زیادہ بگڑ گئی۔ چنانچہ آپا کا شوقِ نکاح بازی بھی کافی تفریح کا باعث ہو گیا تھا۔ قاسم جان کی گلی کی ایک نواب زادی نے جوان کی پڑوس کے افسانے سنے تو انہیں بھی آپا سے مذاق کی سوجھی۔ اپنے ہاں کی کوٹن سندر کو مشاطہ بنا کر بھیجا۔ ڈیوڑھی کے نوکر کلو کے بیٹے مٹھو کو دولہا مقرر کیا۔ بات ٹھہرائی۔ نکاح کا دن آیا۔ کچھ پڑوس کی کوٹنیں کچھ گھر کی لونڈیاں سمدھنیں بن کر چلیں ؛

بی آپا کے گھر بھی اسی قسم کی پڑوسنوں کا مجمع تھا۔ آپا دلہن بنی گھونگٹ نکالے کوٹھڑی میں بیٹھی تھیں کہ سواریاں اترنی شروع ہوئیں۔ اترنے والی پہلے کوٹھڑی میں جا کر جھانکتی تھی اور پھر ہنستی ہوئی دالان میں جا بیٹھتی تھی۔ رنگ برنگ کپڑے۔ کوئی لہنگا پہنے ہوئے ہے تو کوئی سوسی کا پاجامہ عجب عجب وضع کی سمدھنیں ہیں۔ ایک غل ایک شور۔ ایک کہتی ہے "اری شبراتن مٹھو کی بہو کو بھی دیکھا" دوسری بولی "سندر کہوے تھی کہ یہ تو برس میں دو خصم کرے ہے۔ گود میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے اور شادی پر شادی کئے جائے ہے" تیسری بولی "ارے دولہا کی بہن کہاں مر گئی۔ آے نا"۔ ادھر والیوں نے جو سنا تو بکھر گئیں ماما جل کر کہنے لگی "نوج یہ سمدھنیں ہیں بیگم کے نصیب پھوٹ گئے۔ مجھے تو کوٹنیں معلوم ہوتی ہیں" دولہا کی بہن جو بنی ہوئی تھی وہ تنک کر بولی "اری لا اس کی باتیں تو سن کیسی اترائے ہے۔ یہ بڑی شریف جادی ہے نا۔ ایسی بکے ہے جیسے اس کے لال لٹک رہے ہیں"

سندر نے جو یہ رنگ دیکھا تو جلدی سے دولہا کی بہن کا ہاتھ پکڑے دلہن کی کوٹھڑی میں لے آئی "سرکار، یہ خدا رکھے دولہا میاں کی بہن ہیں، ان سے بات کرو۔

آپا :۔ (شرمائی ہوئی) بڑی ہیں یا چھوٹی ؟

سندر :۔ اے بڑی ہیں نہ چھوٹی منجھولی ہیں ؛

آپا :۔ رشتہ کی بہن ہوں گی ؛

سندر :۔ حضور رشتہ کی کیسی۔ دولہا میاں کے والد کی سالی کے چچا کی جو سمدھن تھیں ان کے بیٹے کی سلج کے ماموں کی گیلڑ بیٹی ہیں۔ یہ ایسا کہاں کا دور کا رشتہ ہے جو سگی نہ کہی جائے ؛

اتنے میں باہر سے شہدوں کی آوازیں آئیں۔ "الٰہی سازگاری ہو۔ آمین۔ دولہا سلامت رہتا ہو۔ آمین" اور ساتھ ہی ڈیوڑھی پر غل ہوا کہ پردہ کر لو، دولہا اندر آتا ہے۔ آپا تو نکاح کرتے کرتے منجھ گئی تھیں یہ نئی بات جو دیکھی کہ ان سے کوئی پوچھنے بھی نہیں آیا اور نکاح ہو گیا۔ گھونگھٹ میں سسکیاں لینے لگیں گردن ہلانے کی تمنا رہ گئی۔ کلیجہ پھاڑ کر بولیں۔ " اے سندر کہاں غارت ہو گئی۔ مجھ سے کوئی جل تو نہیں کھیلا جا رہا۔ مجھ سے بغیر پوچھے قاضی نے کیسے نکاح پڑھ دیا ؟

سندر آئی تو آپا بے اوسان تھیں لگیں برا بھلا کہنے۔ مگر سندر نے کہا۔ "واری! آپ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی آپ راضی تھیں جب ہی تو برات آئی۔ اور بیگم کہیں دلہنیں بھی بولتی ہیں۔ لڑکے والیاں کیا کہیں گی۔

آپا نے دل میں کہا کہ ہاں نگوڑی سچ تو کہتی ہے۔ میری رضامندی ہی سے تو یہ سب کچھ ہوا ہے۔ پھر اس وقت مجھ سے نہ پوچھا تو کونسا ظلم ہو گیا ——— اچھا ہوا میں راضی میرا خدا راضی۔ غرضکہ جھوٹ موٹ پردہ ہوا۔ دولہا میاں ایک میلا سا پاجامہ پہنے جس کے گھیر پر دوہرا چھوٹا سفید گوٹا ٹنکا ہوا سفید ململ کا افشاں کیا ہوا دوپٹہ کمر سے لپیٹے جھوٹے لٹھے کا ڈھیلا کلی دار پاجامہ جس کا ایک پائنچہ سفید دوسرا نیلا بے گوٹ کا۔ گھسیلا جوتا جھکی کے کام کا جس میں پیتل کے گھنگرو دونوں طرف نوک سے ایڑی تک لگے مگر ایک پاؤں میں دوسرے میں لال نری کی پرانی جوتی۔ گیندے کے پھولوں کا سہرا لٹکائے۔ منہ پر مہندی سے رنگا ہوا رومال تشریف لائے۔ دولہا کی یہ ہیئت دیکھ کر آپا کو پھر تاب نہ رہی " ارے میں نے تو جوڑے کے سو روپے بھیجے تھے۔ وہ لکاتہ کٹنی کہاں ہے۔ پوچھو تو سہی کہ شریفوں کے دولہا ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ماما :۔ بیگم صاحب۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کے ہاں کی یہی رسم ہو گی ؛

آپا پھر سنبھلیں کہ واقعی ہر ملکے وہر رسمے۔ نوابوں میں دولہا ایسے کپڑے پہنتا ہو گا اور میں نے آج تک کسی کنوارے سے نکاح کیا بھی تو نہیں جو معلوم ہوتا کہ دولہا کی پوشاک کیسی ہوتی ہے ؛

الغرض آنچلوں کے سائے میں دولہا میاں دالان میں مسند پر بٹھلائے گئے۔ دو چار عورتوں نے دلہن کو سنبھالا اور وہ جھکی جھکی آ کر دولہا کے سامنے بیٹھ گئیں۔ ڈومنیوں نے گانا شروع کیا۔ رسمیں ہونے لگیں۔ پہلے دلہن کے دونوں ہاتھ نکال کر ان میں شکر اور کالے تل رکھ دولہا کو ڈھکایا گیا پھر دولہا کے ہاتھ سے دلہن کو کھانڈ چٹائی۔ دلہن نے جوں ہی کھانڈ چاٹنے کو منہ آگے بڑھایا ڈومنی نے دولہا کا ہاتھ جھٹک دیا تو بی آپا کا چہرہ "تلنگنی کالی مرچ دال" بن گیا۔ کچھ کھانڈ آنکھوں میں پڑی، گلوں پر پسینہ تھا تل چمٹ گئے۔ رومال سے منہ صاف کرنا چاہا۔ پیک نکل پڑی۔ اس وقت آپا کی کوئی صورت دیکھتا۔ صدقے کی گڑیا میں اور ان میں کچھ فرق نہ تھا کئی رسموں کے بعد سہاگ پڑا اور سل بٹہ آیا۔ دولہا نے مسالہ پیسا پہلے دلہن کی مانگ بھروائی۔ دلہن کو رعشا اور دولہا شریر بجائے سر پر جانے کے ہاتھ منہ پر لگا اور اس زور سے لگا کہ بی آپا کا اوپر کا اکلوتا دانت جھوٹا کھا گیا۔ آنکھوں میں بجلی کوند گئی مگر شادی کے شوق میں بیچاری نے اُف نہ کی۔ پھر سات سہاگنیں آئیں اور انہوں نے سروج لگایا۔ اب آرسی مصحف کا وقت آیا۔ چھپر کھٹ تو تھا نہیں۔ زمین پر ہی دونوں کو آمنے سامنے بٹھا آئینہ اور قرآن بیچ میں رکھ دیا۔ اوپر سے ایک تارکشی کا دوپٹہ ڈال ڈومنیوں نے کہا۔ "میاں سہرا اٹھا ڈالو اور بی بوڑھی سہاگن تم بھی گھونگھٹ کے پٹ کھول دو۔ ادھر تو دولہا نے بی آپا کو دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور ادھر بی آپا نے جو آئینہ پر نظر ڈالی تو ایک کالا بھجنگ شیدی بچہ زرد زرد ٹیٹیاں سی آنکھیں۔ ہونٹ جیسے گردے۔ پھیپا پھری ہوئی ناک۔ منہ میں سے سڑاند کے بھبکے آ رہے ہیں۔ ایک چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑیں۔

کئی گھنٹے کے بعد آپا کو جو ہوش آیا تو نہ دولہا تھا نہ سمدھنیں بس اسی وقت سے دل کا ورق الٹ گیا۔ بھرے گھر کو یونہی چھوڑ نکل کھڑی ہوئیں۔ سارے دن پھرا کرتیں بچوں سے چھیڑ چھاڑ رہتی کوئی دیوانہ سمجھتا کوئی مجذوب کہتا لیکن دلہن بنے رہنے کا شوق مرتے مرتے رہا اور سنا ہے کہ لال کپڑوں ہی میں انہیں دفنایا بھی گیا؛

بھاگ[1] بھری کی وادی

شیر افضل جعفری

ہاتھوں میں کیسلے کے پنکھے — البیلی، سرشار ہوائیں
شاخوں کی چنچل باہوں میں — حوروں کی معصوم ادائیں
کرٹیوں[2] کے سرخیلے بندے — دوشیزاؤں کو ترسائیں
پاک فضا کے مست فرشتے — مٹی سے کشمیر اگائیں
ندی کنارے شہتوتوں کی — چھاؤں میں پریاں سستائیں
شیشم کی نازک لغروں[3] کے — ہونٹوں پر خاموش دعائیں
متوالے نوخیز بروٹے[4] — کھیتوں کے غلماں کہلائیں
پتوں پر جھلمل شبنم کی — بوندوں سے تارے شرمائیں
آموں کے نخریلے ساقی — پیلی رس بھریاں چھلکائیں
کوئل کی میٹھی کُوکُو میں — سورٹھ کی تانیں مسکائیں
بادل کی زلفوں کے پیچھے — دھرتی پر موتی برسائیں
اڑ اڑ کر رنگیلے آنچل — قوس قزح تک پھول کھلائیں
چھیل چھبیلے چرواہوں کے — گیتوں میں نیندیں لہرائیں

بھاگ بھری کی اس وادی میں
ساون بھادوں رک رک جائیں

---

[1] وادی پنجاب: "بھاگ بھری" وارث شاہ کی محبوبہ کا نام ہے (مدیر) [2] کریوں [3] شاخوں [4] پودے

غزل

سید عبدالحمید عدمؔ

سبو کو دور میں لاؤ، بہار کے دن ہیں
ذرا سا رنگ پلاؤ، بہار کے دن ہیں

یہ احتیاط و تکلف بھی نادرست نہیں
مگر یہ بھول نہ جاؤ، بہار کے دن ہیں

یہ کام عین عبادت ہے موسمِ گل میں
ہمیں گلے سے لگاؤ، بہار کے دن ہیں

تمام صحنِ چمن کو ہے پیاس نغمے کی
مغنّیوں کو بلاؤ، بہار کے دن ہیں

جنوں کا حکم سنو اور عمل کرو اُس پر
خرد کو آگ لگاؤ، بہار کے دن ہیں

ہے عمرِ رفتہ سے پرخاش کیا بھلا ہم کو
قریب ہے تو بلاؤ، بہار کے دن ہیں

خدا کو حسنِ عقیدت کی نذر پیش کرو
صنم کی زلف سجاؤ، بہار کے دن ہیں

ضرور آؤ مگر اس ادا سے مت آؤ
ستم ظریف گھٹاؤ، بہار کے دن ہیں

گلوں کی سیج بچھے تو بہار رقص کرے
گلوں کی سیج بچھاؤ، بہار کے دن ہیں

نوائے ساز بھی منزل ہے اک محبت کی
رباب و چنگ بجاؤ، بہار کے دن ہیں

ستارے رقص نہ سیکھے تو بد دعا دیں گے
انہیں بھی رقص سکھاؤ، بہار کے دن ہیں

یہی تو وقت ہے شرابوں پہ جاں چھڑکنے کی
پلاؤ خوب پلاؤ، بہار کے دن ہیں

بغیر اُس کے نہ چمکے گا رنگ محفل کا
عدمؔ کو ڈھونڈ کے لاؤ، بہار کے دن ہیں

حبیب جالبؔ

کوچۂ صبح میں جا پہنچے ہم
صورتِ موجِ صبا پہنچے ہم

نزہتِ گل کا پیام آیا تھا
لاکھ تھے آبلہ پا پہنچے ہم

مل گئی خاک میں ہر تلخیٔ غم
اس چمن زار میں کیا پہنچے ہم

بہرِ تعظیم اُٹھے دشمن بھی
یوں سرِ بزمِ وفا پہنچے ہم

ہم ہوئے تیز قدم تیز قدم
سرحدِ نور تک آ پہنچے ہم

منزلِ دار و رسن تک جالبؔ
خندہ لب نغمہ سرا پہنچے ہم

ماہِ نو کراچی۔ مئی ۱۹۵۷ء

کینٹو

سرگزشت پہلے درویش کی

سید جعفر طاہر

مگر ایک نا قدر قدرت نے آہستہ آہستہ ہم پر تسلط جمایا
تجارت کے پردے میں سادہ فضاؤں پہ چھایا سیہ دل سیاست کا سایا
نہ پوچھو جو یورپ کے چالاک سوداگروں نے ہمیں داستانیں سنائیں
نہ پوچھو تعلق بڑھانے کی خاطر جو ساحل بساحل دکانیں سجائیں

نہ جانے وہ کیا ساعتِ نحس تھی جب ہمارے وطن میں یہ مہمان آئے
بظاہر بڑے بھولے بھالے، بڑے سیدھے سادے حیا سے نگاہیں جھکائے
کبھی مسجدوں کے قصیدے کبھی معبدوں مندروں کے لبوں پر ترانے
کبھی جا کے رشیوں کے استھان دیکھیں کبھی اپنے ابدال کے آستانے

کبھی اس دیارِ کہن کی محبت کے چرچے، رواداریوں کی ثنائیں
کبھی آلِ تیمور کے تذکرے اور کبھی ان کے درباریوں کو دعائیں
کبھی کوئلے اور لوہے کے معدن جو دیکھیں تو بے ساختہ جھوم جائیں
مگر اپنے بھولے امادوں کے تیور جو بھیں تو پھر زیرِ لب مسکرائیں

یہ اصحاب شاہی سفیروں کے جامے پہن کر وطن میں کئی بار آئے
سیاحت کی خاطر کبھی اور کبھی آزمندانِ بحر آزما ساتھ لائے
نظر چلنے کے سبز باغات، لوبان و بادام کی مخملیں باڑیوں پر
یہی فکر جیسے کبھی ہو یونین جیک لہرائیں اس دیس کی کھاڑیوں پر

کبھی کوئی گاما کبھی کوئی لالی کبھی کوئی ٹامس کبھی کوئی ہیری
غرض اک چمن اور ہزاروں بلائیں غرض اک وطن اور لاکھوں ہی بیری
کبھی جشنِ عشرت میں شرکت کی خاطر جو آئے تو لائے مئے پرتگالی
ستم ہے کہ جو کام خان و خدیو نہ کر پائے وہ کر گئی اک پیالی

کبھی باریابی کی خاطر جو حاضر ہوئے تو لبادوں میں خنجر چھپائے
کسی دخترِ شہ کی تیمارداری میں انعام پایا تو قلعے بنائے
کبھی ایک ظلِ الٰہی کے دربار کی مدحتیں اس ادا سے بیاں کیں
کہ بھولے شہنشہ نے بھٹکے ہوئے رہزنوں کو نئی منزلیں بھی بتا دیں

ہمیں کیا خبر تھی دکانوں کے پردے میں تعمیر ہوں گی یہاں قتل گاہیں
یہ کیا علم تھا جن کو مہماں سمجھتے ہیں ظالم نہ دیں گے ہمیں کو پناہیں
مراعات و بخشش کی جن پر نظر ہے وہ ایسے ستمگر تو ہرگز نہ ہوں گے
اٹھائیں گے وہ ہاتھ ہم میزبانوں پہ ایسے کبھی خودسر تو ہرگز نہ ہوں گے

نہ پوچھو کہ فیاض شاہوں کے جود و کرم نے ہمیں کس قدر آزمایا
نہ پوچھو کہ مہماں نوازی مسافر پرستی نے کیسا کرشمہ دکھایا
ستم ہے کہ نیرنگ بازانِ افرنگ کی یہ سیاست نہ سمجھی کسی نے
لُٹے دیکھتے دیکھتے آن کر لنگر ساحلوں پر ہزاروں سفینے

کوئی میر جعفر سا غدار دیکھا تو بخشا خطابِ یمینِ حکومت
کوئی میر صادق جو ہمراز پایا تو ٹیپو کی بخشندہ اس کو دولت
فدایانِ قوم و وطن کے مٹانے کو حیلے، حوالے، ہزاروں بہانے
کبھی روزنِ تار کی تہمتیں اور کبھی سخت گیری کے جھوٹے فسانے

سرنگا پٹم کے جواں عمر سلطاں نے ہر چند ہر شاہ سے التجا کی
ستم ہے مگر پاسبانِ ملت نے مردِ مجاہد سے مل کر دغا کی
مگر چند جانباز تھے جو کہ ٹیپو کے ہمراہ میدان میں کام آئے
دردِ دل پہ پڑھتے رہیں گے ہمیشہ سرنگا پٹم کی فصیلوں کے سائے

رفیقو یہ کیا پوچھتے ہو کہ یہ قوم تھی کس قدر اپنے خوں کی پیاسی
سرنگاپٹم سے یہ ظالم جو پلٹے تو گنجِ شہیداں بنا پھر پلاسی
عیاں کب ہوئی ظلم کی فتح آخر یہاں کب ہوس کو ہوئی کامیابی
سلام ان شہیدوں پہ جن کے مقدس لہو سے فضا پھر بنی انقلابی

مقدس وطن کی حفاظت کا معصوم جذبہ دلِ پاکِ میرٹھ میں جاگا
اِدھر خواب سے چونک اٹھا جو شیخِ حرم تو برہمن بھی ہر مٹھ میں جاگا
مرے ما جواب سنو کاستہ بخت بند دل نے کی ملک بھر میں بغاوت
جری دل سپاہی بڑھے اور دینے لگے رزم گاہوں میں دادِ شجاعت

یہ شعلہ جو بھڑکا تو بنگال کی سرزمینِ پشیماں نے بھی آنکھ جھپکی
نیامِ تجارت سے لیکن فرنگی سیاست کی بے رحم تلوار لپکی
اِدھر دہلی اور لکھنؤ کے جوانانِ جنگ آزما کی زباں پر رجز تھا
معاذ اجل معترف ہو گیا زورِ بازوئے مردانِ گلگوں قبا کا

بگولوں کی مانند اٹھے، کڑکتی ہوئی بجلیاں بن کے اعدا پہ ٹوٹے
لہو کے ابلتے ہوئے سرخ چشمے سیہ ریگزاروں کے سینے سے پھوٹے
گدایانِ شب کوک کے تند نعروں کی دستک پہ دیوار و در تھرتھرائے
اٹھے اپنے دہقاں تو اونچے حصاروں کی سنگیں فصیلوں میں کہرام آئے

وہ چھٹنے لگیں خوف کی ظلمتیں پھڑپھڑانے لگے ذلتوں کے پھریرے
گماں تھا کہ راتوں کے سیلِ مسلسل پہ غالب رہیں گے سنہری سویرے
فرنگی حکومت نے لیکن خطابات و انعام و جاگیر کے دام ڈالے
اسیروں کی چشم و لب و دست و دل پر لگائے گئے آمریت کے تالے

بھڑکنے لگے دیکھتے دیکھتے قصر، ایواں، محل، آشیانے، بسیرے
شبستاں تبستاں اندھیرے اندھیرے مکاں در مکاں آفتوں کو گھیرے
دلہن کی بہاریں دبے پاؤں شرما کے رخصت ہوئیں بام و در کانپ اٹھے
وہ توپوں کے پہیوں میں لاشیں چٹخنے لگیں نوکِ نیزہ پہ سر کانپ اٹھے

ہزاروں کلیجے نچوڑے گئے اور بنایا گیا قصرِ شاہی کا گارا
جیالے جوانوں کے جلتے جنازوں کے گلرنگ ساحل پہ لشکر اتارا
حریمِ طہارت کی بے دست و پا نازنینوں کے سینوں میں خنجر چبھوئے
سنہری لبوں کے صدف چیر کر تاجِ شاہی کے حلقے میں گوہر پروئے

کنول رنگ سینوں کا مرمر مٹا کر کئی شیش محلوں کے زینے تراشے
گلابی پپوٹے کھرچ کر کئی خشمگیں پتلیوں کے نگینے تراشے
ہنرمندوں کے ہاتھ کاٹے گئے تا فنونِ لطیفہ کی رو رک نہ جائے
سرانداز چھینے حسینوں کے تا آفتابِ تمدن کی ضو رک نہ جائے

وہ ابریشمی نقرئی نرم بانہوں کے ٹوٹے ہوئے ہر طرف گاہوارے
وہ نایافتہ پاک سینوں سے بہتے ہوئے خاک پر خون کے سرخ دھارے
نہ وہ جگمگاتی جبینوں پہ تابانیاں تھیں نہ وہ عارضوں کی ضیائیں
نہ وہ اب گھنیرے گھنے مست گاتے ہوئے گیسوؤں کی گمکتی گھٹائیں

وہ بلور سی گردنیں کاٹ کر ظالموں نے تراشے تو کیسے پیالے
سلگتی سنانوں سے کتنے سنہرے سلونے بدن بے خطر چیر ڈالے
نہ پوچھو کہ تپتے ہوئے خنجروں کی زباں نے ڈسے کس قدر دوش و بازو
نہ پوچھو کہ تیروں کی بارش میں گم ہو گئے کتنی معصوم آنکھوں کے آنسو

فنا وہ درختوں کی مانند ہر سو شہیدوں کے ننگے جنازے پڑے تھے
جو مسند نشیں تھے وہ تیغوں کے پہرے میں پا سولیوں کے سرہانے کھڑے تھے
حسیں بیگمیں جنسِ بازار بن کر بکیں ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا
کئی مہوشانِ جواں ٹامیوں کو ملیں ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا

بھڑکتی چتاؤں کے شعلوں میں جلتے ہوئے آئینہ زارِ حسن و جوانی
کہیں سرخ لہریں بناتی ہوئی بانوانِ ستارہ نظر کی کہانی
بنوں جنگلوں میں اکیلی بھٹکتی ہوئی کوئی تیمور و بابر کی بیٹی
کڑکتی کمانوں کی محرابِ تاباں میں حیراں وہ کوئی مقدر کی ہیٹی

وہ طاسِ طلاکار میں نوجواں شاہزادوں کے فرقِ گرامی اٹھائے
خورد و نوش کے وقت بوڑھے شہنشاہ کے سامنے مسکرا کر بڑھائے
کہیں بیگمات حرم کے دمکتے لبوں کی تراشی ہوئی سرخ قاشیں
اسیروں کو کھانے میں بخشی گئیں بھون کر ہائے معصوم بچوں کی لاشیں

شہنشاہِ گم گشتۂ دار و دربار نے کس طرح زندگانی بسر کی
نہ پوچھو کہ رنگون کے ایک گوشے میں مدفون ہے لاش کس تاجور کی
نہ پوچھو جوانان بنگال و یورپ کے دم سے وطن کی بہاروں پہ گزری
نہ پوچھو سرِ آسیاب ستم جو مری سلطنت کے ستاروں پہ گزری

اور اب اک صدی بعد مرغانِ بے بال و پر نے کیا پھر رہائی کا چرچا
قفس در قفس طائران تہی صوت نے پھر کیا اک نیا حشر برپا
وہ بند و قیں ٹکرائیں سنگیں ہوائیں لہرائے شعلہ فشاں تازیانے
مگر سب نے دیکھا اجل کے دھماکوں پہ غالب رہے زندگی کے ترانے

شہیدوں کا خوں رنگ لا کر رہا ہے، شہیدوں کا خوں رنگ لاتا رہے گا
ستاروں کو ہر صاحبِ ہوش تاریخ کا ایک بابِ درخشاں کہے گا
یہ آزادیاں جن پہ ہم آج نازاں ہیں اپنے شہیدوں کا اعجاز ہے یہ
دلوں میں ہیں بیداریاں جس سے پیدا انہیں پاک روحوں کی آواز ہے یہ

(انتخاب)

ماہِ نو، کراچی، مئی ۱۹۸۰ء

سندھ کے آخری شہزادے

میر عبدالحسین سانگھی

غزل

(سندھی سے ترجمہ)

میر عبدالحسین سانگھی، سندھ کی تالپور حکومت کے وارث اور آخری تالپور حکمراں میر نصیر خاں کے صاحبزادے ۱۸۵۱ء میں بمقام کلکتہ اُن کے زمانۂ نظر بندی میں انگریز بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۳ء میں رہا ہو کر وطن کو لوٹے۔ سندھی، فارسی اور اُردو میں شاعری کرتے رہے اور ایک منفرد مقام پیدا کر لیا۔ خاص طور پر غزل کے استاد ہیں۔ دو مطبوعہ دیوانوں کے علاوہ اُن کا ایک غیر مطبوعہ فارسی دیوان بھی محفوظ ہے۔ طرزِ عاشقانہ میں یگانہ اور حسنِ ترکیب کے ماہر ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں وفات پائی اور حسبِ وصیت روضۂ شاہ لطیفؒ کے جوار میں دفن ہوئے۔ یہاں اُن کی ایک سندھی غزل کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

جس دن سے پڑا ہے مرا اس گُل سے سروکار
بلبل ہی سمجھتی ہے فقط میری یہ گفتار

میدانِ مصفّا میں ہُوا سبزہ نمودار
جی میں ہے چلے جایئے تا دامنِ کہسار

دل کھول کے برسا ہے یہاں ابرِ بہاری
سرسبز نظر آتا ہے ہر گوشۂ گلزار

ہر چیز دگر چیز سے پاتی ہے نمائش
خورشید کے انوار سے ذرات نمودار

ہے جام و مے و مطرب و مینا و دف و نے
مطلوب فقط مجھ کو ہے اک صاحبِ دیدار

ہر روز نئے رنگ نئے ڈھنگ عیاں ہیں
یہ عالمِ اسباب بھی ہے قابلِ دیدار

اس دور میں سردار وہی شخص ہے بنتا
مٹکے سے بڑی سر پہ بندھی جس کے ہو دستار

دشمن نہ مرا کوئی، کسی سے نہ عداوت
اغیار بھی ہیں میرے لئے یارِ وفادار

اب تک نہ مری ذات سے واقف ہوا کوئی
اک بزم میں دیوانہ ہوں اک بزم میں ہشیار

(ترجمہ: رشید احمد لاشاری)

خیابانِ پاک

"بے ربط کہانی" ——— بقیہ صفحہ ۱۰۵

اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور معذرت آمیز انداز میں کہا:

"مجھے افسوس ہے کہ میں۔ کہ میری وجہ سے۔ آپ کو اتنی زحمت ہوئی۔ آپ تو سیر کے لئے آئے تھے۔ چلئے۔ ایسا تماشہ آپ کو اور کہاں نظر آئے گا۔ اب میری کہانی میں بھی شاید کچھ۔ ربط پیدا ہو گیا۔ آپ تو افسانہ نگار ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے۔ کہ میں۔ آپ کی تواضع نہ کر سکا۔ آپ بھی کہتے ہوں گے کہ یہ قبائلی کیسے لوگ ہیں۔ اچھا۔ خدا کے سپرد۔ امان"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں کھینچ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہ ہاتھ اب مدت ہوئی سرد ہو چکا ہے لیکن اس کا گرم پُرخلوص لمس میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔

"فرشتوں کا لکھا" ——— بقیہ صفحہ ۹۴

پوچھو تم نے شہر فتح کر لیا ملک فتح کر لیا۔ اب امن چین کرو حکومت کرو اور ہمیں بھی سکھ چین سے رہنے دو۔ مگر انگریز کو تو ایسا غصہ تھا جیسے وہ خود اپنے ملک کو دشمنوں سے چھڑا کر واپس آیا ہو۔ جیسے ہم نے اس کا کوئی مال ہضم کر لیا تھا۔ اسے بھی قتل و خون تو جنگ کا نام ہی ہے۔ پہلے وہ مارے گئے۔ اب انھوں نے مارا مگر مار و قتل کرو پھانسیاں دو اور ختم کرو قصے کو۔ مگر صاحب وہ جو بپتا پڑی وہ تو سنانے کے قابل نہیں ہے ظلم پر ظلم تھا۔ جو لڑے وہ اور ان کے خاندان تو خیر کیا کہئے۔ ظلم تو یہ تھا کہ تم نے کیا ہماری خیر خواہی کی۔ کیا خبر پہونچائی کیا کام کیا؟ بس یہ ثابت کرو ورنہ مارے جاؤ۔ چنانچہ جن میں ہمت نہ تھی وہ جھوٹ بولتے تھے۔ الٹے سیدھے ثبوت لاتے تھے۔ پھر بھی کوئی بچا کوئی مارا گیا۔ اب تم دلی میں ہی تباہ کئے خاندان پرانے رہ گئے ہیں اور جو معافی کے بعد میں آ گئے ہیں ان میں کتنوں کو روٹی کپڑا میسر ہے۔ اور یہ جو شہزادے شہزادیاں ہیں انہیں ہی دیکھ لو۔ یہ بھی قسمت ہے کہ یہ لوگ منشیوں متصدیوں کے گھر پڑے ہیں اور دو دو ڈھائی ڈھائی روپے وظیفہ ملتا ہے ورنہ ہم نے انہی کے دادا نانا دیکھے ہیں۔ امیر کبیر نہ تھے مگر قلعے والے کہلاتے تھے۔ پالکی میلنے میں باہر نکلتے تھے۔ ہاں ان میں زیادہ تر کم ذات ضرور ہیں کوئی ڈومنی کا کوئی رنڈی کا انگریزوں نو بادہ نسل ہو کی ذات ہی کیا اور کس شاہی خاندان کی نسل صاف رہی ہے۔ غرض تو یہ ہے کہ یہ لوگ شاہزادے تھے اور شاہزادے مانے جاتے تھے سو آج کیا ہیں۔ الہیاں کلے صاحب کے جانشین نے ان لوگوں سے کہا بھی کہ آپ لوگ دلی سے چلے جائیے یہاں بھرم رہ جائے گا۔ یہ لوگ نہ گئے اور آج ہاشما کہلاتے ہیں مگر انہی کا کیا ذکر اس واقعے کے بعد سے دلی میں ذات پات کا تو پھیر ہی نہیں رہا۔ مخبر انعام داروں میں کوئی سید کوئی مرزا کوئی خان بن بیٹھا۔ اور اب تو قبر و اکرام کے معیار ہی دوسرے قائم ہو گئے۔ شرفاء بعضے جلاہے بن گئے۔ بنا ہی تھا زمین ذرق جائداد ضبط تعلیم کا سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ لئے بیٹھے ہیں اپنی خاندانیت کو جو دو کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا کوئی جھوٹے منہ بھی بیٹی مانگے تو انکار نہیں کرتے۔

اور میاں دلی کی بات کچھ جدا نہیں۔ یہ تو ہمیشہ ہوا ہے۔ جب اتنا بڑا انقلاب آتا ہے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ انقلاب کے فائدے الگ ہیں۔ جب عقلمند کہتے ہیں تو ضرور ہوں گے مگر یہ بھی تو ہے کہ ان بڑے فائدوں کے چکر میں چھوٹی چھوٹی جمی جمائی تہذیبیں شرافتیں اور خوبصورتیاں کیسے ایک دم تباہی اور گمنامی کے غاروں میں دھکیل دی جاتی ہیں۔

(یہ افسانہ ۱۸۵۷ء کے مستند واقعات پر مبنی ہے)

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
وہ بھی فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی (مصحفی)

ہماری ڈاک

مکرمی! السلام علیکم

دیدۂ گوہر فشاں سے گرد رخسار جبذا ... بس ہمیں یک آمد و باصد من حق دو ہم

آپ نے استاد محترم علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی بناء پر میرے نام کے ساتھ سید لکھا ہے، اپنی نسل میں پہلا سید میں بنا، میرے آبا و اجداد کوئی سید نہیں ہوا ہے، اس رتبۂ بلند کا حق دار نہیں ہوں، براہِ مہربانی اسکی اصلاح فرمالیجیے ورنہ کہیں مجھے سید نہ چھاپ دیجیے گا۔ بزرگان خاندان اپنا نسب نامہ حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچاتے ہیں لیکن میرے پاس اس ادعا کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے، اتنا شرف کافی ہے کہ ان بزرگوں کے غلاموں میں شمار کیا جا سکوں جن کی طرف خاندانی نسب نامہ منسوب کرتا ہے۔

میرے نزدیک ۳۰۰۰ ق م سے بہت پہلے کچھ لوگ دیارِ عرب سے سندھ میں آئے۔ ۵۰۰۰ ق م کے قریب یہیں کے لوگوں نے عراق پہنچکر اکادی حکومت قائم کی اور بحرِ احمر اور خلیج فارس کے درمیان کو فتح کیا۔ ۲۶۷۵ ق م کے ایک عرب الزانش نے ہند پر حملہ کیا، اس کی خبر عراق میں گئی نارام سن نے اسے زندہ گرفتار کر لیا۔ ۲۲۰۰ ق م کے قریب عراق سے گوتیوم کو نکالا گیا۔ یہ لوگ عراق سے نکل کر سندھ میں آ بسے، اور یہی لوگ ہمارے جاٹ ہیں، کچھ عرصہ بعد پھر سندھی لوگ عراق پہنچے اور ان کے پہنچنے کے دنوں میں خاندانِ حمورابی کی حکومت قائم ہوئی۔ حمورابی کی تصویر موہن جو دڑو میں مل چکی ہے جس کا ذکر سر جان مارشل نے کیا ہے۔ ۱۶۰۰ ق م کے قریب ایک قوم آئی اور بڑی بیدردی سے یہاں کے لوگوں کو قتل کیا پھر جلا وطن کیا۔ پانی نام کی قوم جنوبی عرب میں عدن کے پاس جا بسی۔ ویدک زمانے کے ان آریا ہیرو "اہی" کا بھی ایک مہر پر ذکر ہے، ایسے قرائن ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ ویدک آریوں نے اس تمدن کو برباد کیا لیکن قدیم کھنڈر پر کوئی جدید عمارت بنا نہ سکے۔

والسلام (ابوالجلال ندوی)

عزیزِ گرامی قدر زاد لطفہ سلام مسنون

آپ نے ماضی کے ہنگاموں کی یاد تازہ فرما کر گزشتہ واقعات کا ناقابلِ فراموش منظر پیش کر دیا۔ اللہ اکبر! وقت گزرتے پتہ نہیں چلتا۔ میرا ایک شعر ہے۔ شاید یہ کچھ وقت رواں کا تجزیہ کر سکے ؎

اب کوئی دم میں یہ آنکھوں سے نہاں ہو جائے گی
کشتیٔ عمرِ رواں کی چال کتنی تیز ہے

آہ اختر شیرانی تیز گام نکلا۔ وقت سے پہلے ہی دنیا سے کنارہ کش ہو گیا۔ اور اس کے بعد نازش کے نار بیز اور زن میں سے تاثیر و حسرت بھی چل دیے ؎

تاب و توان و ہوش و خرد و داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

والسلام دعاگو ابوظفر نازش رضوی

نازش رضوی۔ شاعر رومان اختر شیرانی کے خوش الحان راوی ۔ مشاعروں میں "اے عشق کہیں لے چل" اور دوسری نظمیں پڑھتے تھے تو ایک سماں چھا جاتا تھا۔ ایک طرف اختر کی رومانوی شاعری، دوسری طرف نازش کا گونجتا ہوا آہنگ، دونوں نے مل کر لاہور کے ادبی حلقوں میں آناً فاناً اختر کا غلغلہ بلند کیا۔ ہم نے اپنے خط میں انہی واقعات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مدیر۔

مدیرِ محترم! سلام مسنون۔ جی چاہتا تھا کہ "ماہِ نو" کے لئے کچھ لکھوں۔ آج "ماہ نو" کے ایک پرانے فائل میں محترمہ کی تصویر نظر پڑی اور بیساختہ چند اشعار ہو گئے۔ یہ خالص "الہامی تحفہ" "ماہ نو" کے لئے حاضر ہے۔

رسید کا منتظر۔ خاکسار۔ ض۔ ن

دیدہ ام

پامالِ حسنِ بتاں! در قدمِ برہمناں!

دیدہ ام!

زدو برہم پری رخاں! خزاں زدہ گلبدناں!

دیدہ ام!

تو دانی اثر گملے! محبت زدہ براں براں!

دیدہ ام!

شب ہائے وصال ہوا! پر ہائے ہجر خنداں!

دیدہ ام!

آتشِ خزاں، نالہ کردن! عادلِ بہارِ چمناں!

دیدہ ام!

گل رخسار باہم! وفا جویاں جویاں!

دیدہ ام!

کلام شکستہ بر قلوبِ زاہداں رنداں

دیدہ ام!

نئی مطبوعات

اندھا کنواں

ناشر: مرکزِ ادب ۔ پوسٹ بکس ۴۲۲۹، کراچی
قیمت: ساتھ روپے آٹھ آنے

گذشتہ تین سال سے مکتبہ فرینکلن امریکی ادب کے انتخاب کے تراجم اُردو میں شائع کرا رہا ہے۔ اس مکتبہ نے مشرقِ وسطیٰ کی مختلف زبانوں میں امریکی ادب کے اچھے تراجم شائع کئے ہیں اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان میں تراجم شائع کرنے کا انتظام بھی کر رہا ہے۔ اس کام میں مکتبہ والوں نے اُردو کے اچھے لکھنے والوں کی مدد حاصل کی ہے۔ حال ہی میں مکتبہ نے مرکزِ ادب کراچی کے اشتراک سے ایڈگر ایلن پو کی کہانیوں کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ کہانیوں کا ترجمہ اُردو کے نوجوان شاعر ابنِ انشا نے کیا ہے اور یہ مجموعہ "اندھا کنواں اور دیگر پراسرار کہانیاں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ابنِ انشا اپنی نظموں کی وجہ سے اہلِ ذوق میں مشہور ہیں۔ اُن کی زبان میں ایسی روانی، لچک اور بے ساختہ پن ہے جو پڑھنے والے کی توجہ کو تھام لیتا ہے۔ ابنِ انشا نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو ترجمے کے فرائض سے عہدہ برآ کیا ہے۔ ترجمہ، خصوصاً ایسا ترجمہ جو کسی مکتبہ کے اصرار پر کیا گیا ہو، عموماً نقلی ہوتا ہے جس میں جگہ جگہ بے دلی اور بددلی کی مثالیں ملتی ہیں مگر انشا نے بڑی محنت سے ایڈگر ایلن پو کی دلچسپ کہانیوں کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمے کی خوبی اصل سے ہم آہنگی ہے اور یہ خوبی انشا کے ترجمے میں موجود ہے۔ جس احتیاط و صحت سے ابنِ انشا نے ان کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے، وہ ایڈگر ایلن پو کو ہمارے دلوں کے قریب لانے میں یقیناً مدد دیں گی۔

(الطاف گوہر)
(بشکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

حرف وحکایت

انتخاب سندباد جہازی
شائع کردہ: مکتبۂ کارواں۔ ایبک روڈ لاہور
قیمت دس روپے ۔ صفحات ۱۶۷

چراغ حسن حسرت ہماری دنیائے صحافت کے بہت بڑے داستان گو ہیں، یہاں تک کہ اب اُن کا نام خود ایک داستان بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ پہلے کوچہ گرد تھے، اس کے بعد سندباد جہازی بن گئے۔ "حرف وحکایت" کے کالم اپنے مختصر سے دامن میں ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کالموں میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، جیسے مضامین صرف لطیفے، طنزیئے، خاکے بن کر رہ گئے ہیں۔ ایک ایک بات چُبھتی ہوئی اور ایک ایک لفظ تیر بہدف ۔ "حرف وحکایت" کی رنگ در رنگ داستانیں حسرت جیسے داستان گو کے بعد ختم ہو گئیں۔ کسی کو یہ اندازِ قلم نصیب نہ ہو سکا اور شاید نہ آئندہ ہو سکے۔ حرف وحکایت کا یہ انتخاب ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۵۵ء تک کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ پھول اور کانٹے ہیں جن کو حسرت کے قلم نے پاکستان کی نوبہاروں اور خزاؤں سے چُنا ہے۔ جمہوریت سے لیکر ناک پریس ملوں تک، رعنائی سے لیکر دولتانہ تک روزمرہ کے واقعات اس طرح لکھے گئے ہیں جیسے ابھی ابھی وقوع پذیر ہوئے ہوں یا ہو رہے ہوں، ماضی قریب کی یہ رنگارنگ داستان پڑھنے کی چیز ہے۔

(م ۔ ا)

لہو ترنگ

شائع کردہ: مکتبۂ کارواں۔ ایبک روڈ۔ لاہور۔
قیمت: دو روپے۔ صفحات ۱۲۵۔

سید ضمیر جعفری صاحب سیف و قلم ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک شاعر بھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک سپاہی بھی۔ "لہو ترنگ" اُن کی رزمیہ نظموں کا مجموعہ ہے جس میں ستار کے نغموں کی جھنکار کے ساتھ ساتھ تلوار کی جھنکار بھی شامل ہے اور ان دونوں کی آمیزش سے نغمگی کا ایک انوکھا اور نرالا چشمہ پھوٹا ہے۔ قدیم عرب میں رزمیہ نظموں کا خاص رواج تھا جنہیں عام طور پر اس وقت پڑھا جاتا تھا جب دو فوجیں مقابلے کے لئے تیار ہوتی تھیں۔ آج بھی مغربی اقوام میں اُن کے قومی ترانوں کے علاوہ فوجوں کے علیحدہ علیحدہ اپنے رزمیہ نغمے بھی ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہماری فوج آج تک ایسے نغموں سے محروم رہی ہے۔ ضمیر جعفری صاحب نے "لہو ترنگ" کو ترتیب دے کر یقیناً اس خلا کو بہت حد تک پورا کر دیا ہے۔ یوں تو اس مجموعے کی ایک ایک نظم حب وطن سے بھرپور ہے لیکن "پاکستانی ہوا بازوں کو سلام"، "ایک قبائلی لشکر" اور "ایک رات" کے تاثر اور قوت کے اعتبار سے اس مجموعے کی بہترین نظمیں ہیں۔ جنگ کے تاریک ترین محاذ اور جنگ کے بعد فتح کے روشن ترین آفاق دونوں اس مجموعۂ کلام سے جھانکتے ہیں۔

(م ۔ ا)

صُورِ اسرافیل

ناشر: ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی
صفحات ۱۱۹ علاوہ مقدمہ، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
خوبصورت رنگین جلد، طباعت (نسخ) نہایت عمدہ

"آمادہ یہ چاروں کوبی ہے ۔ ہمارا گانے اور جگانے والا شاعر۔ مشرقی پاکستان کے نامور شاعر قاضی نذرالاسلام کی قلمی تصویر کے لئے کچھ ایسے ہی الفاظ موزوں ہیں جو بیک وقت رنگین نوا بھی ہیں اور آتش نوا بھی، بزم کے رسیا بھی اور رزم کے دھنی بھی، رومان پرست بھی اور انقلاب پسند بھی۔ اُن کے ہاں شانت رس بھی ہے اور طمن گر بھی۔ امن سکون بھی اور بغاوت بھی۔ اس قدر متضاد اور بوقلموں عناصر کا ایک ہی ذات میں جمع ہو جانا

زاویات میں سے ہے۔ وہ ایک ہی تار کے مغنی نہیں بلکہ اُن کا سازِ سخن کتنے ہی روپہلے سنہرے تاروں پر مشتمل ہے جن سے کومل گیت، رسیلے غنائیے، جیالے ترانے، پرجوش نعرے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے اور غضب وکیف، رجز و تہور کا ایک بھرپور، دیرپا اثر پیدا کرتے ہیں۔ یہ سب ایک جیتے انسان کی جیتی شاعری ہیں۔ "صورِ اسرافیل" جو اپنے آہنگِ جلیل سے خفتہ احساسات جگاتا اور افسردہ دلوں کو گرماتا ہے، خواہ اس کا موضوع بزم ہو یا رزم، اہلِ ذوق ابھی تک اس نوائے حشر آفریں سے بالواسطہ ناواقف تھے۔ اب وہ متعدد ماہرینِ فن کی کوشش سے اس "بھرپور رنگیت" یا "مسلسل غنائیہ" کا آہنگ اردو میں بھی سن سکتے ہیں۔ اور اس کی صدائے بازگشت سے اصل کی شان و شوکت اور دبدبہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان میں آثر لکھنوی، یونس احمر، شن حقی اور خلیل لسمر کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، جنہوں نے بڑی چابکدستی اور خوش اسلوبی سے بنگلا شہ پاروں کے رُوپ سروپ، جوت جلال اور کیف و رنگ کو اپنے متبادل پاروں میں برقرار رکھا ہے۔ یہ صرف اعلیٰ درجہ کی تخلیقی و ترجمانی صلاحیتوں ہی سے ممکن تھا۔ ان "چوکوں" کے جلانے میں بنگلہ کے جادوگری کے علاوہ دوسرے کویوں کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ جو ان کے لئے بہ حیثیت امانی نہیں بلکہ بہ حیثیتِ ذاتی باعثِ فخر ہے۔

مقدمہ بہ عنوان "نذرالاسلام" جس میں شاعر اور اس کے کلام کا نہایت بلیغ تعارف کرایا گیا ہے، بجائے خود ان حسین جواہر پاروں کا حریف ہے جو اس مجموعہ میں پیش کئے گئے ہیں ــــ ایک بھرپور رنگیت، ایک مسلسل غنائیہ۔ اس کا حق شن حقی جیسا شعر و سخن کا اداشناس ہی ادا کر سکتا تھا گو

پرعا پھوڑتا ہے وہ اس سنے کہ اُٹھائے نہ بنے!

زردِاغِ دل

از: عبدالعزیز خالد

ناشر: مکتبۂ شعور، پریڈی اسٹریٹ، صدر، کراچی

آرائش: آذر زوبی

صفحات ۴۴۴، قیمت دس روپے

تیر کی ترکیب نے اُردو میں منظوم ڈراموں کے اوّلین مجموعے کا روپ دھالا ہے، اور اس پرکاری کے ساتھ کہ سارا مجموعہ "صنم خانۂ آذر" معلوم ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت اپنی صنف کا نقشِ اولیں ہونے ہی سے ظاہر ہے۔ اس میں شعر اور ڈراما دونوں کا بھرپور کیف ہے اور یہ لازم تھا کیونکہ اس کا سرچشمہ انگریزی کے مسلمہ شاہکار ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے ان کو کس طرح اپنایا ہے۔ اسے متعلق بھی دو رائیں ممکن نہیں کیونکہ ان میں ترجمہ و اخذ کی کوئی علامت نہیں۔ ہر کہیں شاعر کی اپنی ہی چھاپ ہے جس کو تخلیق یا طبع زاد کے بمنزلہ قرار دینا ہی مناسب ہے۔ تمام تمثیلیں اصل ڈراموں کی حریف بلکہ حریفِ غالب ہیں جس میں ایک منفرد اسلوب کی کارفرمائیوں کو بہت کچھ دخل ہے۔ بعض لغزشیں (اختتامیہ اور چند ادق الفاظ) سے قطع نظر بیان میں یکساں شکوہ اور ایسی بلندیاں ہیں جن کے بعد بہت کم بلندیاں رہ جاتی ہیں۔ یہاں تسکین اوسط کی پیچیدہ بحث میں الجھنا مشکل ہے۔ تاہم ظاہر ہے کہ شاعر کو مروّجہ عروض میں گداز پیدا کرنے کا پورا پورا احساس ہے اور جو حل اس نے پیش کیا ہے وہ جزوی ہونے کے باوجود کافی مفید ہے۔

سُرور

از: ابوالفضل صدیقی

ناشر: مکتبۂ افکار، رابسن روڈ، کراچی

صفحات ۳۲۰، قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

بعض اوقات اچھے واقعیت نگار بھی رومان کی وادیوں میں آنکلتے ہیں۔ اور ابوالفضل صدیقی سے بڑھکر واقعیت کا رسیا اور کون ہوگا جس کا ہر افسانہ دھرتی میں پوری طرح رچا ہوا ہے اور اُن کی سلونی، چٹخارے دار، با محاورہ مقامی زبان اصلیت کو اُبھارنے میں اُن کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے ــــ یوں تو اُن کا ہر افسانہ بڑی حد تک طویل مختصر ہوتا ہے ــــ ایک ناولٹ لیکن اب کے لئے ناول کی حد تک جا پہنچی ہے اور اس سے ایک بڑی دلچسپ کیفیت پیدا ہوگئی ہے کیونکہ یہاں اصلیت اور رومان ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں، جو اُردو میں ایک نئی چیز ہے۔ نہ رومان بے سروپا رہا ہے جس میں من گھڑت باتوں کے سوا اور کچھ نہ ہو اور نہ اصلیت وہ روکھی پھیکی اصلیت رہی ہے جو تخیل کے رنگین تصورات کو رلا نہ دے۔ ناول نگار کی اُپج نے پلاٹ کی بنیاد آن ہونے واقعات پر نہیں رکھی۔ ہیرو اور ہیروئن رومانوی کٹھ پتلیاں نہیں بلکہ گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان ہیں اور اُن کے سچے اور آسان ملاپ کے راستے میں حقیقی واقعات ہی سے رکاوٹ پیدا کی گئی ہے اور اس طرح کہانی کو ایک پُرلطف انجام تک پہنچایا گیا ہے جس سے اصلیت کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں اور رومان کی خواہش بھی تشنہ نہیں رہتی۔

ناول کے دوران میں مصنف کے انشاپردازی کے منفرد جوہروں کو بھی ابھرنے کا خوب موقع ملا ہے اور اُس کے مخصوص چٹپٹے پن اور ایچ پیچ کھاتے جملوں نے جابجا ایک سماں پیدا کر دیا ہے۔ اس کے افسانوں کی طرح ہم ناول میں بھی قصہ گو کے بجائے انشاپرداز ہی سے دوچار رہتے ہیں ــــ وہی پرانا زندہ دل یار شاطر، ساحر ابوالفضل ــــ اور بقدرِ ذوق حظ اُٹھاتے ہیں۔

(ر ــ خ)

"انقلاب کے بعد کا ادب" — بقیہ: ص ۱۸

تسلیم کیا ہے جو آبرو کی موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے وہ کہتا ہے:-

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے — حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست — زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے — فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

سب جانتے ہیں کہ امت مسلمہ کو برعظیم ہند و پاکستان میں ایسا ایمان اور ایسا قائد، قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم و مغفور کی صورت میں نصیب ہوا جس کی ذات گرامی مسلمانوں کی ہر جنگ آزادی کی ایک دل نشیں علامت بن کر رہ گئی تھی، ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک ادب اور ادبی تخلیقات جس مرد قلندر کے ظہور کی نوید دے رہی تھیں، آخر اس کا کوکب اقبال طلوع ہوا اور حریفوں کے تمام ستارے ماند پڑ گئے۔ اقبال کو مرنے سے پہلے بہ تحقیق معلوم ہو چکا تھا کہ مسلمان جس نازک دور سے گزر رہے ہیں اس میں ان کی راہنمائی خدا نے ایسی ذاتِ گرامی کے ذمے کر دی ہے جو نہ طوفان سے گھبراتا ہے اور نہ خدا کے سوا کسی طاقت کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ ارمغان حجاز کی بعض نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اس آنے والے انقلاب کو دیکھ لیا تھا جس کی طرف مسلمان تیزی سے بڑھے جا رہے تھے۔ وہ باخبر تھا کہ مغرب میں جو کچھ ہو رہا ہے مشرق پر اس کے نتائج ضرور بر آمد ہوں گے اور برعظیم ہند و پاکستان بھی اس انقلاب سے ضرور متاثر ہوگا جو ایک دوسری جنگ عظیم کے بعد برپا ہوگا۔ یہاں تک کہ ہمالہ کے چشمے بھی ابلنے لگیں گے اقبال کہتا ہے:-

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے — بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویمِ فردا ہے باطل — گرے آسماں سے پرانے ستارے
ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے — کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے — نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک — خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

"ماہ نو" اپریل ۱۹۵۷ء میں جو تصاویر مقبرہ شرف النساء اور چوبرجی کی شائع ہوئی ہیں اُن کے فوٹو غلام جیلانی صاحب نے کھینچے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی کوٹھی، علی بخش اور مزارِ اقبالؒ کی تصاویر خورشید انور صاحب کی کھینچی ہوئی ہیں۔ (ادارہ)

تصحیح: "ماہ نو" مارچ ۵۷ء کے صفحہ ۳۴ پر "شہزادی" افسانہ کے تیسرے حصہ میں پہلے کالم کی پہلی سطر دوسرے کالم کی پہلی سطر کے بعد پڑھئے۔ (ادارہ)

ہم نے پچھلے شمارے (اپریل
۔۔۔) میں شرف‌النساء کے مقبرہ کی
تصـ۔ـر پیش کی تھیں - خواجہ محمود،
ا۔۔روف به حضرت الیشاں بخاری رح
ک۔ مزار اس مقبرہ کے پاس ہی شالیمار
روڈ کے کنارے واقع ہے -

حضرت الیشاں سولہویں صدی عیسوی
کے نامور عالم و بزرگ تھے جن سے
ا۔۔بر، جہانگیر اور شاہجہاں کو
۔۔ہری عقیدت تھی - وہ حضرت
میاں میر کے معاصر تھے جن کے ساتھ
مذہبی مباحث پر اکثر گفتگو رہتی -

یہ مزار حضرت الیشاں کے حین حیات
میں تعمیر ہوا اور مدتوں مرجع
خاص و عام رہا - لیکن بعد کے
پر آشوب زمانہ میں :
آں قدح بشکست و آں ساقی نماند !

مزار حضرت الیشاں رح (لاہور) کے چند مناظر

آپ کی خانگی زندگی میں ایسی بہت سی مبارک تقریبات آئیں گی جن کی بدولت زندگی خوشگوار اور پُربہار ہوجاتی ہے۔

اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے ایک خوشگوار مستقبل اور زندگی سے پوری پوری لطف اندوزی کا سامان کرنے کے لئے برابر روپیہ پس انداز کرتے رہیئے، اور اپنی بچت سے سیونگ سرٹیفکیٹ خریدیئے۔ یہ آپ کے اور آپ کے بال بچوں کے لئے بھی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور آپ کے ملک کی خوشحالی کا باعث بھی
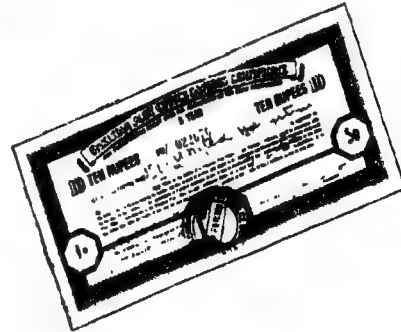
پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگایئے

۴½ فی صد منافع ۔ تمام ڈاک خانوں سے مل سکتے ہیں
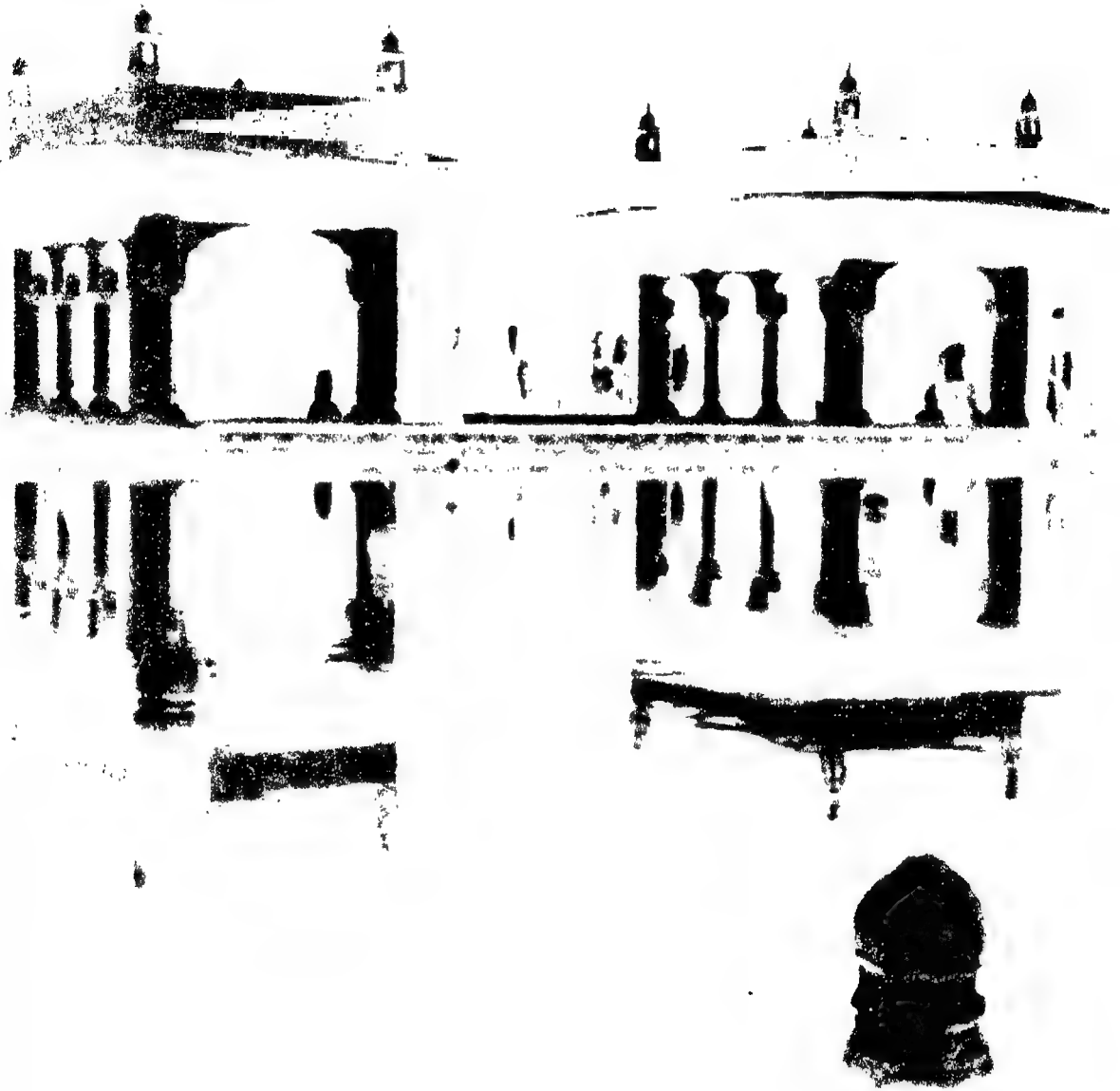
AFP 49/56 UNITED

اُردو مرکز

جامعہ ملیہ، نئی دہلی

جون ۱۹۵۷ء

ابوالاثر حفیظ　　فراق گورکھپوری　　فضل احمد کریم فضلی

ممتاز مفتی　　حجاب امتیاز علی　　ڈاکٹر سید عبداللہ

سید ضمیر جعفری　　سید یوسف بخاری　　یونس احمد

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی یادگاری تقاریب
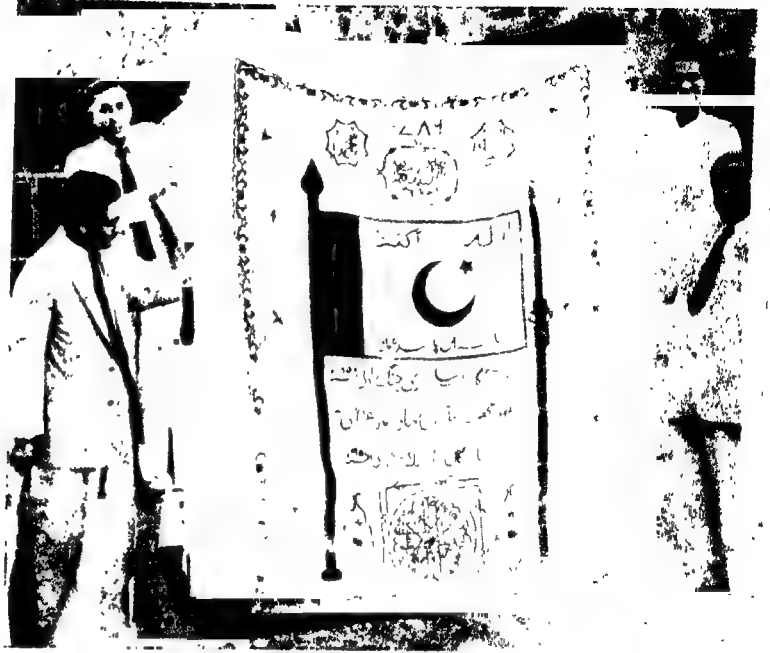
اہالیان کراچی کی طرف سے مزار بہادر شاہ ظفر (رنگون) کے لئے ایک زرکار چادر

کراچی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی یادگار میں ایک مینار تعمیر کیا جائے گا۔ نیاز محمد خاں صاحب چیف کمشنر نے سنگ بنیاد رکھا

یوم ظفر پر کراچی میں ڈاکٹر محمود حسین کے زیر صدارت ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا

ماہِ نو

جلد ۱۰ شمارہ ۳

جون ۱۹۵۷ء

مدیر رفیق خاور
نائب مدیر ظفر قریشی

سرورق: شالامار باغ لاہور رنگین عکس: خورشید

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صد سالہ یادگار سے بڑھ کر ہنگامہ اور کیا ہوگا جو بیک وقت سانحۂ غم بھی تھا اور ہنگامۂ شادی بھی۔ یہ ہمارے قومی احساس کا امتحان تھا اور مقامِ مسرت ہے کہ ہم اس میں کامیاب رہے۔ جس جوش و خروش سے یہ یادگار منائی گئی اور اس سلسلہ میں جو سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں، ان کا غلغلہ اس تاریخی واقعہ سے کم نہ تھا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو کسی قوم کو دل زندہ اور جان زندہ رکھتے اور اس میں وقتاً فوقتاً نئی روح پھونکتے رہتے ہیں۔

اس ہلچل سے شعر و ادب کی زود اثر دنیا میں بھی ہلچل پیدا ہوتی ہے، اور عوام کے سینوں سے جو لہریں اٹھتی ہیں ویسی ہی لہریں ادب و فن میں بھی اٹھتے ہیں اور اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں، چنانچہ پہلے کی طرح اب بھی دونوں میں ایک نئی جان پڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تخلیق اور تحقیق کے کتنے ہی نادر نمونے سامنے آگئے جو ہمارے علمی، ادبی اور تاریخی سرمایہ میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ ان سے اس قسم کی مزید سرگرمیوں کے لئے راستہ کھل گیا ہے جن کا سلسلہ دیر تک جاری رہے گا اور امید ہے دور رس نتائج پیدا کرے گا۔

غور سے دیکھا جائے تو کسی قوم کی زندگی ہنگاموں ہی سے عبارت ہوتی ہے، بعض چھوٹے بعض بڑے، کوئی سرسری کوئی دیرپا۔ اور اپنی نوعیت کے مطابق چھوٹا یا بڑا، سطحی یا بھرپور اثر بھی پیدا کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ادب ہمیشہ ہنگامی واقعات سے وابستہ ہو کیونکہ ادب میں تفریح و تفنن کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اور اس سے بڑھ کر آفاقی و ابدی مسائل کو۔ تاہم زندہ تحریکوں سے جو کسماہٹیں، رواں دواں حیات سے جو احساسات ابھرتے ہیں اور ذہن و شعور میں جو اقدار و انگیخت پیدا ہوتی ہے، وہ محض خیالی پلاؤ پکانے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ تمام نوعِ انسان کا سوال۔ طلسمی محلوں اور ہاتھی دانت کے برجوں کا ماحول بھی شاید ذہنی بقا کے لئے ضروری ہے۔ وہاں بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی حد تک جان حقیقی تجربے ہی سے پیدا ہوتی ہے اور واقعیت سے ربط رکھنا پڑتا ہے۔ جو ادب زندہ سرگرمیوں اور آج کے حالات و واقعات سے ابھرتا ہے، وہ چلتے پھرتے زندہ انسانوں کے لئے زیادہ تاثیر رکھتا ہے اور تفنن کا سامان بشرطیکہ وہ تجربہ کسی پختہ فنی ذہن میں پرورش پاکر نمودار ہوا ہو۔

یہ بات جتلانے کے لائق ہے کہ فراریت کے الزامات کے باوجود اردو شاعری میں زندگی کے مادی کوائف کا جتنا گہرا احساس ہر عہد میں موجود رہا ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ قومی شاعری کے جو دفتر ہمارے ہاں موجود ہیں، دوسری زبانوں میں کہاں لکھے گئے اور کون سا شاعر ہے جس نے سیاسیات پر قلم نہ اٹھایا ہو۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمیں اپنے ادبی تقاضوں پر بھی نئے سرے سے نظر ڈالنا لازم ہوا۔ تاہم حالی اور ان کے معاصرین کی نہج پر قدیم و جدید کا محتاط محاکمہ اور جامعیت سے اصلاح و تجدید، یہی ادبی ترقی کا راز اور صحیح ادبی مسلک ہے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر، نئی روشنی (عالمگیر ذہنی و ثقافتی فضا) میں بیش از بیش جدیدیت اور توسیع و ترقی، رسمیت اقل اور تجدید اتم، موجودہ انتشار کو دور کرکے اور مناسب جائزہ و تنقیح کے بعد مختلف نظریات، تصورات اور روایات کو سمو کر ایک جامع مسلک کی تشکیل ہمارا ادبی نصب العین ہونا چاہئے۔ ہم یہ بات حتمیت کے دعوے کے ساتھ نہیں بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کے لئے لکھ رہے ہیں۔

پاکستانی یا قومی ادب کا سوال بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے، کیونکہ صحیح معنوں میں قومی ادب وہ ہے جو مخصوص خد و خال کے باوجود مقامی نہیں آفاقی ہو۔ ضرورت صرف ایک نمایاں وضع کی ہے اور ایسی خصوصیات کی جو ہمارے مزاج اور روح، ہماری روایات اور ملی خصائص کی عکاسی کریں۔ کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر باقر نے ایک مضمون "اردو ادب اور ملی زندگی" (جمہوریت نمبر) میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کہ ہمارے ذہین افراد کو اس مسئلہ کا احساس ہے۔

عہدِ حاضر بین الاقوامی روابط کا زمانہ ہے جس میں ثقافتی و تمدنی اشتراک لازم ہے۔ ہم اس شمارہ سے "افق تا افق" کے زیرِ عنوان دوسری زبانوں سے ہم آہنگ اقتباسات کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ شہری زندگی کا معیار بلند تر کرنے کے لئے ایک مستقل مصور فیچر اضافہ کیا گیا ہے جو تجربۃً نسخ میں طبع ہوگا۔ اس طرح امید ہے کہ "ماہِ نو" مفادِ عامہ میں بھی قوم کی خدمت کر سکے گا۔

ماہِ نو، کراچی - جون ۱۹۵۷ء

اقبال کا ایک ممدوح ــــ نظیری

ڈاکٹر سید عبداللہ

اقبال نے اپنے کلام میں جن شاعروں کی ستائش کی ہے اور ان کے اشعار یا مصرعوں کی تضمین کی ہے، ان میں سے ایک عہد اکبری کا مشہور شاعر نظیری بھی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ بھی تحسین کی ایک صورت ہے۔ وہ کلام جو تضمین میں آجاتا ہے پسند کی نظر سے دیکھے جانے کے بعد انتخاب اور تضمین کا شرف پاتا ہے۔ نظیری کے اس قسم کے اشعار اور مصرعے اقبال کے کلام میں اگرچہ بہت زیادہ نہیں مگر جس قدر ہیں وہ اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اقبال کو نظیری کے کلام سے دلچسپی تھی۔ اس کا دیوان ان کے مطالعات میں شامل تھا اور وہ اس کی شاعری کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔

نظیری کے متعلق اقبال کی تحسین، جو تضمین کے پردے میں ہے، وہ بالواسطہ سہی مگر انہوں نے نظیری کی کھلی تحسین بھی ایک غزل میں کی ہے۔ یہ غزل نظیری کی زمین میں ہی لکھی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے :-

بملکِ جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
"کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

اقبال کے مصرعے کا پیرایۂ بیان صاف صاف بتا رہا ہے کہ انہیں نظیری کے اس مصرعے نے بے حد متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے داد بھی ایسی دی ہے جو (اُن کی زبان سے) رومی کے سوا شاید کسی اور شاعر کو نہ ملی ہوگی۔ بلاشبہ عرفی بھی ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کے لئے اقبال کے دل میں بڑی عقیدت کا جذبہ موجود ہے، چنانچہ انہوں نے عرفی پر ایک نظم لکھ کر بڑی محبت کا اظہار کیا ہے۔ کئی اور موقعوں پر بھی انہوں نے عرفی سے بڑی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ مگر نظیری کی تحسین کا یہ انوکھا انداز، جو نظیری کے حصے میں آیا ہے، شاید عرفی کے لئے بھی استعمال نہیں ہوا۔ بظاہر داد و تحسین کا یہ طریق محض شاعرانہ اور رسمی بھی سمجھا جا سکتا ہے مگر رسمی تعریف اقبال کی عادت میں داخل نہیں تھی ــــ اقبال ہی ہمارے وہ شاعر ہیں جو رسمی تعریف سے عموماً محترز رہے ہیں۔ لہٰذا اقبال کی طرف سے پیش کی ہوئی اس داد کو رسمی نہیں سمجھا جا سکتا اور ظاہر ہے کہ اس سچی داد و تحسین کے محرکات بھی اونچی قسم کے ہوں گے جن کے زیر اثر ان کا جذبہ بے اختیار یہ "راز" افشا کرنے پر مجبور ہوا۔ قدرتاً ان کا تعلق ان ذہنی اور جذباتی روابط سے ہوگا جو اقبال کو نظیری سے وابستہ کئے ہوئے تھے۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ رومی و حافظ کے بعد اقبال نے اسالیب کے معاملے میں سب سے زیادہ استفادہ اگر کیا ہے تو عہد مغلیہ کے شعرائے ایران سے کیا ہے۔ ان میں بھی خاص طور سے وہ نظیری، عرفی، فیضی، اور غالب کے خوشہ چیں یا گل چیں ہیں جس کا سراغ ان کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اقبال مولہ بالا شاعروں کے حسنِ بیان یا بلندی افکار سے متاثر تھے۔ جن کی گرمی یا شیرینی کو وہ اپنی شاعری میں جذب کر لینا چاہتے تھے۔ اب ان شاعروں کے وہ انداز خاص جن میں اقبال کو دلچسپی ہو سکتی ہے کئی اور بھی ہوں گے مگر ان کے لئے شاید سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ثابت ہوتی ہے۔ زندگی کی وہ تیز لے اور تند لہر جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اور گو کہ ان میں سے بیشتر شاعر انسان کو تقدیر کا نخچیر یا صید زبوں ہی مانتے ہیں مگر ان کی شاعری میں طلب اور تڑپ کے کچھ ایسے انداز بھی نظر آتے ہیں جو انسان کی محکمی اور قوت کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ ایرانی کی عام شاعری میں قطعِ آرزو کا جو دل کش اور حیات سوز فلسفہ جاری و ساری رہتا ہے، اس کی تلافی کی صورتیں اگر کہیں نظر آتی ہیں تو مغلوں کے اس ابتدائی زمانے کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ دور بھی کوئی عظیم اثباتی فلسفہ پیش نہ کر سکا کیونکہ اس زمانے کو ایک خاص فکری آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ آزمائش تھی اکبر کی عقلیت جو اتنی علمی یا منطقی کی پیداوار نہ تھی بلکہ پیچ در پیچ ذہنی تضادوں کی مخلوق تھی جن کے زیر اثر ضد کا جواب

ضد سے دیا جا رہا تھا۔ عہدِ اکبری کی اصل بُرائی اس کی دینی تحریک میں نہ تھی، اس کی بُرائی تو اس پُرجوش رومانی تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی جس کی قیادت ابوالفتح گیلانی وغیرہ نے کی اور جس کی پرورش میں خان خاناں کی فیاضیوں نے خاص حصہ لیا۔ غرض اکبری زمانے کی شاعری میں زندگی کا خون دوڑتا نظر آتا ہے۔ اور یہی خون کی سرخی ہے جو اقبال کی نگہ میں کھُب کھُب جاتی ہے۔ یوں تو عام عشقیہ اور صوفیانہ شاعری میں طلب اور عشق کی اہمیت جتائی گئی ہے۔ مگر زیرِ بحث دور کا لب و لہجہ بھی زندگی کی نو سے معمور ہے۔

نظیری کا ایک عام مضمون ہے کہ زندگی کے لئے عشق اور عشق کے لئے طلب اور جد و جہد ضروری ہے۔ اور یہی وہ وسائل ہیں جن سے زیشتِ خاک اکسیر بن سکتی ہے۔ پھر زندگی ایک نبرد ہے، ایک معرکہ ہے، جس کو صرف جفا طلبی اور سخت کوشی سے ہی جیتا جا سکتا ہے۔ پس کامیابیوں اور فتح مندیوں سے ہم کنار ہونے کی آرزو صرف اس شخص کو رکھنی چاہئے جو نازکی اور آرام طلبی کا دلدادہ نہ ہو۔

عہدِ مغلیہ کی ساری جان دار شاعری میں زندگی کی تکمیل کی آرزو پائی جاتی ہے۔ نظیری، فیضی، عرفی اور غالب، ان چاروں کے کلام میں حیات کی کہنگی و فرسودگی کے خلاف احتجاج، ایک شکایت، ایک شکوہ موجود ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے یہاں حیات کو بدلنے اور اس کو نئی بنیادوں پر کھڑا کرنے کی بے تاب خواہش نظر آتی ہے اور یہ سب رجحانات وہ ہیں جو اقبال کے افکار کا جزوِ خاص ہیں۔

مذکورہ بالا چاروں شاعروں کے لفظیات اور استعارات و کنایات بھی ان کی شاعری کی معنوی لہر سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ زندگی، طلب اور تڑپ کے تأثر کو واضح اور مؤثر بنانے کے لئے حرکت، روانی، جوش، مقابلہ و جنگ کے استعارات استعمال کئے گئے ہیں۔ ان شاعروں نے مبالغے سے بڑا کام لیا ہے۔ مبالغے کی تاثیر سے ان کو اُنف کا نقش دلوں اور دماغوں پر زیادہ گہرا، زیادہ تیز اور شدید ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کے انداز، لہجے اور آوازیں اپنی اپنی شخصیتوں کے مطابق جُدا جُدا ہیں، ایک ہی میدان میں لڑنے والے کئی سپاہیوں کی طرح جو ایک ہی معرکے میں جرأت آزما ہوں مگر ان میں سے ہر ایک کا کس بل جدا جدا اور اندازِ پیکار مختلف ہو، یا جیسے ایک ہی دُھن میں ایک ہی قسم کے راگ الاپنے والے کئی گائیکوں کی آوازیں ہر ایک کے لئے وجہِ امتیاز بن رہی ہوں، اس لحاظ سے نظیری، عرفی، فیضی اور غالب کی آوازیں جدا جدا ہیں، خواہ ان کے بعض رجحانات مشترک ہی کیوں نہ ہوں۔ اقبال ان میں سے ہر ایک کی طرف نسبت بہ نسبت ملتفت ہوئے ہیں مگر اقبال کی شاعری اور ان کی شاعری کی مجموعی سپرٹ میں بیّن فرق پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں ان کے متعلق جو بڑی کشش ہے اس کا بہت بڑا سبب ان کا وہ جوش انگیز لہجہ بھی ہے جو اقبال کے پیغامِ خاص سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔

سب سے پہلے نظیری کی اس غزل کو لیجئے جس کے ایک شعر کی تضمین کر کے اقبال نے نظیری کو بہت بڑا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ غوغا نیست، دانا نیست ـــــ یہ نظیری کی پوری غزل ہے، اس کا مطلع بالکل اقبال کے مذاق کے مطابق ہے۔ اس میں ایک معرکے کا تصور ہے جو جاں بازی اور سر بازی کا متقاضی ہے۔ ستیز، جفا طلبی اور خطر طلبی اقبال کے محبوب افکار ہیں۔ خواہ وہ غزل کے لباس میں ہوں یا کسی اور پیرائے میں "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست" میں جوش اور سر فروشی کا جو رنگ ہے وہ اقبال کے فکر سے مطابقت رکھنے والی چیز ہے۔ نظیری کی غزل کے تیسرے شعر میں بھی "صف بستہ" اور "معرکہ" کے الفاظ نے حسن و عشق کا عجب معرکہ گرم کر رکھا ہے۔ غزل کے باقی اشعار میں بھی اندازِ بیان برجستہ اور مضمون زندگی کا ترجمان ہے۔ غرض یہ ساری غزل حیات بخش ہے اور پہلا شعر تو جہادِ زندگی کا ایسا درس دیتا ہے جو فیضی اور عرفی کے سوا کسی اور شاعر کے یہاں خال خال ہی ملے گا۔ اکبری، جہانگیری دور کی شاعری کا یہی لہجہ اس کو باقی ادوار کی شاعری سے ممتاز کرتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ یاد رہے کہ نظیری زندگی کی اس لہر کے باوجود خوش آواز غزل گو ہے۔ اس کی نو فیضی اور عرفی کے مقابلے میں لطیف اور مدہم ہے اور بعض خاص صورتوں میں تو اس کی آواز بہت کمزور اور نرم و نحیف معلوم ہوتی ہے۔ وہ عرفی سے خاصا دور اور غالب کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کلام میں اقبال کی نو بھی ہے مگر جب اس کی غزل اس کے شخصی غم کی ترجمان بن جاتی ہے یا اس کے افسردہ اور گھٹتے ہوئے مزاج کی آئینہ داری کرنے لگتی ہے۔ یا جب وہ معاملہ بندی کی روح میں ڈوب کر لکھتا ہے، تو وہ اقبال سے خاصا دور اور اقبال سے بالکل الگ شخص معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کی جو غزل نظیری کی مندرجہ بالا غزل کے جواب میں ہے وہ یہ ہے:

زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست   تجلیٔ دگرے در خورِ تقاضا نیست
بملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را   کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست
اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت   تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناس نۂ و زمقامِ بے خبری   چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست
نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست   جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست
بیا کہ غلغلہ در شہرِ دلبراں فگنیم   جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گردِ صحرا نیست
زقید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور   مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
مریدِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت   بجادۂ کہ در و کوہ و دشت و دریا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش   حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست
برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است   حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اقبال کی اس غزل میں ان کے پیغام کے مختلف اجزا ایک جا جمع ہیں۔ ان کی خود شناسی، تحفظ خودی، خطر طلبی، معرکہ آزمائی، ہنگامۂ پیکارِ حیات، غلغلہ و غوغا، تسخیر و جہاں گیری، حسن و عشق کے نئے زاویے، جدت، درتازگی غرض وہ سب باتیں پائی جاتی ہیں جو اقبال کی شاعری سے مخصوص سمجھی جاتی ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعہ سے دونوں شاعروں کا جو فرق واضح ہوتا ہے۔ وہ اولاً یہ ہے کہ نظیری کے اشعار کا مرجع فرد اور اس کا قلب ہے۔ اقبال کے اشعار کا مرجع ملت اور اس کا اجتماعی وجدان ہے۔ اس کے علاوہ جہاں نظیری کے یہاں "رخصتِ تماشا نیست" کی مجبوری ہے وہاں اقبال کی غزل میں "فرصتِ تماشا نیست" کی خود کفی بے نیازی ہے۔ اس لحاظ سے اقبال اور نظیری کے مشترک میدان بہت محدود معلوم ہوتے ہیں مگر دونوں شاعروں کے پیغام میں مرجع اور مدعا کے عدم اشتراک کے باوجود لہجہ و گفتگو کے کئی مشترک انداز بھی نمایاں ہیں۔ دونوں کی غزل کے پیرائے اور تیور باہم خاصے مانوس بھی ہیں۔

اقبال کی شاعری کا ایک بنیادی خیال یہ ہے کہ زندگی جفا طلبی ہے اور اس میں خطرات و مصائب نہ صرف برداشت کرنا چاہئیں بلکہ ان کو لازمۂ حیات سمجھ کر ان کا استقبال کرنا چاہیے ؎

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است   (پیامِ مشرق)

نظیری کے کلام میں بھی "خطر طلبی" اور سخت کوشی کے حق میں بہت کچھ مل جاتا ہے۔ نظیری پر حافظ کا اثر ایک مانی ہوئی بات ہے مگر حافظ کی طرح کا شیوۂ تسلیم و رضا نظیری کے تصورات میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتا۔ حافظ تو دہر کی قہرمانی قوتوں کے سامنے بے محابا ہتھیار ڈال دینے کے قائل ہیں اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے حیلے یا مصالحت کے معتقد ہیں۔ زمانے سے کھلی لڑائی کی ہمت نہیں رکھتے، چنانچہ لکھا ہے ؎

اگر ستیزہ کنی روزگار بستیزد

مگر اکبری دور کے رجحانات حافظ کے دور سے خاصے مختلف تھے، اس لئے بیشتر امور میں نظیری نے حافظ سے الگ طرح سوچا ہے۔ نظیری میں اقبال کی سی مردانگی نہ سہی تاہم یہ ہمت تو ہے کہ زمانے کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

دہر چوں در دشمنی سست است افگندم سپر
دشمنِ نامرد را من مردِ میداں نیستم

نظیری کے استعارات و لفظیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک سخت جانی اور جفاکشی کی بڑی اہمیت ہے، وہ تو نرمی و نازکی کو (حسن کے معاملے میں بھی) کوئی خوبی کی بات نہیں سمجھتا۔ کیونکہ نرمی و نازکی جہادِ زندگی میں حقیقت و صداقت کے جوئندہ سپاہی کے کسی کام نہیں آسکتی ؎

نشانِ ذوقِ حقیقت بہ نازکاں ندہند
چہ شد کہ فاختہ خوش گوی است مرد ناوک نیست

اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں کہ نظیری کے اشعار میں گلشن کے بجائے دشت سے محبت کا خاصا ذکر ہے۔ وہ اپنے آپ کو فضائے دشت کا طائر کہتا ہے، اسے گلشن کی نرم اور خواب آور فضا میں راحت نہیں ملتی ؎

تا از فضائے دشت بگلشن فتادہ ام
از چشم طائرانِ نوازن فتادہ ام

دلم از زمزمۂ طرفِ چمن نکشاید
گوش بر قہقہۂ دامنِ کہسار کنم
نالۂ نغمہ سرایانِ چمن بے اثر است
روشِ دام زمرغانِ گرفتار کنم

در چمن معذور داریدم اگر گرم ملول
نغمہ سنج کوہ و دشتم از گلستاں نیستم

نظیری کو کوہ و دشت سے جو لگاؤ ہے یہ بے سبب نہیں ہو سکتا۔ وہ ذہناً سخت اور قوی صفاتِ حیات سے رغبت رکھنے والا شاعر ہے۔ زندگی کے تجربات نے اسے جس بصیرت سے بہرہ ور کیا، اس کی روشنی میں اس کو یہ محسوس ہوا کہ زندگی سراسر ایک معرکۂ خیر و شر یا معرکۂ جذبات ہے۔ اس میں تلخی و نامرادی ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اس سے نباہ کرنے کے لئے طبعِ بلاکش کی ضرورت ہے۔ سختی، درشتی، اور ناگواریوں کو خوش آیند بنا لینے کی عادت تقاضائے حیات ہے۔
نظیری ایک نئی دنیا کی تخلیق کے لئے بھی تڑپ رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے کہنہ و فرسودہ نظام کا شاکی ہے اور اس کو ڈھا کر اس کے کھنڈروں پر ایک بالکل نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتا ہے ؎

ایں جہاں زشت است طرحِ تازۂ بر صفحہ کش
ویں بنا سست است قصرِ تازۂ بنیاد کن

بلکہ اسے تو قائم شدہ نظامِ عالم کی ابتری پر ہنسی آتی ہے ؎

تختۂ تعلیم گردوں بین و نقشِ درہمش
خندہ چوں شاگردِ زیرک طبع بر استاد کن

جہاں تک میں سمجھ سکا نظیری کے ذہن کو نظامِ کائنات کی تعمیرِ نو سے اتنی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی جتنی اس بات سے کہ حیات کا نظامِ کہن برباد ہو جائے، خواہ اس کی جگہ کوئی نیا عالم ظہور میں آئے یا نہ آئے۔ یہ کیوں ہے؟ اس کے لئے اس کی ذاتی زندگی کے حوادث اور الم انگیز تجربات ذمے دار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کے لہجے میں سختی سے زیادہ تلخی پائی جاتی ہے اس کے لہجے میں وہ احتجاج اور وہ شکوہ ہے جس میں کچھ کر گزرنے کا ارادہ پنہاں ہے۔ اس کے استعارات کچھ اور ہی زاویوں کا پتہ دیتے ہیں۔ نظیری اسی وجہ سے نور کی بجائے برق کی پرستش کرتا ہے۔ مثلاً ؎

ما برق جائے نور بکاشانہ بردہ ایم
آتش بپاسبانئ یک دانہ بردہ ایم

امثلاً ع، سینہ بر برق کشیم و جگر تازہ کنیم

ع: راہِ عاشق بر میانِ ہفت دریا آتش است

تن اگر خاک است اما دل سراپا آتش است

اس کی ذہنی دنیا میں سیلاب اور طوفان دونوں فنا کے کارندے ہونے کے باوجود یوں معلوم ہوتے ہیں گویا وہ حیات اور تعمیر کے نمائندے ہیں جن سے حیات کو ثبات و دوام ہوتا ہے۔ زندگی کی ہمواریاں بھی چونکہ سکون و قرار کی علامت ہیں، اس لئے شاعر کو ان ہمواریوں سے بھی گویا ضد سی ہے ــ شور، آشوب، غوغا، نظیری کے نظام حیات میں دلآویز نغموں سے زیادہ دلکشی رکھتے ہیں ـ (کہ با خود ہر نفس آشوب و غوغائے دگر دارم)۔ "نغمۂ سنجیدہ" (شاعری اور محض موزونیت) اسے مطلوب نہیں۔ وہ توفغانِ درد کا طلب گار ہے ؎

نغمۂ سنجیدہ می گویند ایں را نالہ نیست

نے نشانِ درد دارد نے خراشِ سینۂ

غرض ان سب تاثرات کا ثبوت ان کی لفظیات میں موجود ہے، چنانچہ آتش، سیل، طوفان اور برق کا بکثرت استعمال ان کی خاص ذہنی افتاد کا پتہ دیتا ہے۔ پھر تاخت و تاراج کے استعارے (جو نظیری سے زیادہ فیضی کے یہاں پائے جاتے ہیں) نظیری کے اس رجحان کی اور بھی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ آشوب سے نظیری کو جو خصوصی لگاؤ ہے، تلخیوں سے اس کو جو خاص محبت ہے، ناگواریوں سے جو خاص دلچسپی ہے، اس سے ان کے اس ذہنی رجحان کا اظہار ہوتا ہے کہ زندگی ایک معرکہ ہے، ایک پیکار ہے۔ اسی کے زیر اثر وہ زندگی سے نوشِ بے نیش کی نہ توقع رکھتا ہے نہ ایسی حلاوت کا آرزو مند ہے[1]۔ اسی کے سبب کو زہر میں شکر خند کی سی حلاوت ملتی ہے اور گریۂ تلخ میں شہد و شکر کی سی مٹھاس۔ یہ سب باتیں دراصل اس تجربے کی پیداوار ہیں جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا۔

نظیری کے ذہنی میلانات میں پیش قدمی، ہر چہ بادا باد اور تہور کے رجحانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ع : بیشتر راندیم رخش از کارواں سود ازدیم

ع : آتش افگندم بمجلس، بال بر مجمر زدم

ع : آتشے آوردم و در عرصۂ محشر زدم

ع : سوئے ہر چشمہ شدم چشمۂ حیواں کردم

ع : از بغل مینا بہ آوردیم و بر خارا زدیم

اقبال نے مندرجہ ذیل شعر کی تضمین کی ہے۔ اس میں بھی وہی انداز تہور پایا جاتا ہے ؎

ہر کجا راہ دہد اسپ بر آں تاز کہ ما

بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدیم

اور یہ سب باتیں نظیری کی آشوب پسندی اور ہنگامہ دوستی کی شاہد ہیں۔ نظیری کا یہ رجحان خالص محبت کے مضامین میں بھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ مثلاً حسن کے ہزاروں انداز ہوتے ہیں، اس میں رنگا رنگ دل فریبیاں پائی جاتی ہیں اور نظیری کی نظر بھی ان دلفریب جلووں اور نظر فریب رنگوں پر پڑی ہے، وہ یقیناً حسینوں کے ناز و غمزہ اور کرشمہ و ادا سے مسحور ہوتا ہے۔ مگر اسے اصلی راحت ایسے دوست کے قرب میں حاصل ہوتی ہے جو شوخ، ہنگامہ آفریں اور دل آشوب ہو اور خوئے عتاب رکھتا ہو۔ شاید محبوبوں کے اسی "قبیلے" کی تعریف میں نظیری نے وہ مشہور غزل لکھی ہوگی جس کا مطلع یہ ہے ؎

بہوش سیر چمن کن کہ شاہداں مستند

قرابہ بر سر ابر بہار بشکستند

---

[1] بہ کس نشیں نظیری کہ بہ نیش نوش بخشد | چہ تمتع از حلاوت ز حدیث بے گزنداں
طلبم حنظل ما بعادت ماست کرم و مذاق | ہمہ کہ شکر از تلخی از دہاں اندا ختیم

[illegible] معاملات میں محبوبوں کی باہم لڑائی بھڑائی اور اس میں قرابہ و صراحی کی شکست و ریخت، اس سے مستیوں کی طرح عربدہ جو کا پتہ چلتا ہے۔ [illegible] ایسی انداز خاص نظیری کو مرغوب ہے +

صاحب ذہنی میلانات کا نتیجہ یہ ہے کہ نظیری کی نوا میں ایک خاص قسم کا جوش پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی داخلی لہر اور ظاہری آواز ولولہ انگیز ہے۔ اس کے [illegible] لئے بیان میں وہ شور قیامت تو نہیں جو عرفی کے یہاں ہے (یا بعض اوقات غالب کے یہاں ہوتا ہے) مگر آشوب و ہمہمہ یقیناً ہے۔ اسی وجہ سے اس کی عام غزلوں کی لَے بھی جوشِ زندگی سے لبریز ہے۔ مثلاً ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔ اس کے الفاظ کتنے رعب دار اور اس کا لہجہ کس قدر تند ہے ؎

وقت آں آمد کہ خنجر گہ بگل سوری زنی
لعبتِ چینی گرینی جام فغفوری زنی
چہرہ از لعلِ قبایانِ بدخشانی کنی
بادہ با فیروزہ خطانِ نشاپوری زنی

باقی اشعار میں بھی یہی صوتی طنطنہ ہے +

نظیری کے ذہن کے یہ سب رنگ اقبال کے دل میں گھر کرنے والے ہیں۔ ان میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن کو رسمی کہا جا سکتا ہو۔ یہ اکبری دور کی خاص ذہنیت کی پیداوار اور اس دور کی شاعری کے مخصوص نتائج ہیں۔ نظیری کے یہاں بعض ایسے مضامین بھی ہیں جن کو روایتی کہنا چاہئے۔ مثلاً عقل کے مقابلے میں عشق کی فوقیت اور انسان کا اشرف المخلوقات ہونا وغیرہ۔ یہ صوفیوں کے عام نظریے ہیں جو ہر صوفی شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک خاص قسم کا انائی احساس، یا دل کی فضیلت وغیرہ وغیرہ، مگر اس نوع کے مضامین نظیری سے خاص نہیں۔ یہ عام صوفیوں کے عقائد ہیں۔ اس لئے اقبال کو اس معاملے میں نظیری سے بطور خاص استفادہ کی حاجت نہ تھی، نہ ان خیالات میں اقبال و نظیری کی ہم خیالی پر زور دینے کی کوئی ضرورت ہے +

یہاں تک تو بحث یہ تھی کہ نظیری کس حد تک ذہنی اور جذباتی طور پر اقبال کے ہم قبیلہ شاعر تھے، مگر نظیری کی شاعری ان تصورات سے الگ بعض دوسرے گوشوں تک بھی پھیلی ہوئی ہے، جن کی رنگین فضاؤں سے ان کا اپنا دور اور بعد میں آنے والے اردو اور فارسی کے بہت سے شاعر خاصے متاثر ہوئے، چنانچہ تذکروں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اردو کے کئی شاعروں نے نظیری کے تتبع کا دعویٰ کیا۔ اور مصحفی کے متعلق تو یہ کہا گیا ہے کہ اس نے ایک مکمل دیوان نظیری کے تتبع میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اکثر فارسی اردو کے شاعروں نے نظیری سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ یہ تو غائر مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکے گا کہ ان میں سے کتنوں نے سچ مچ نظیری کے رنگ میں لکھا مگر اس کی شاعری کے ترکیبی عناصر میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جس میں نظیری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور اس فیض کا غالب نے اعتراف اور اعلان بھی کیا ہے ؎

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

غالب پر نظیری کا رنگ اگر کہیں نظر آتا ہے تو معاملہ بندی میں یا ادا نگاری میں۔ وہ غزل خاص طور سے پیشِ نظر رہے جس کا قافیہ ردیف ہے "رنگ کش نگر، [illegible]کش نگر" وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی استفادہ کی کچھ صورتیں نظر آتی ہیں مگر اقبال نے نظیری کی معاملہ بندی کو گویا ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ نظیری اور اقبال یہاں پہنچ کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اب اقبال و نظیری کی بحث ختم۔ نظیری کی شاعری کے بعض منفرد پہلوؤں کا اجمالی تذکرہ کرنا مقصود ہے +

عہد مغلیہ کے فارسی شاعروں میں سے (غالب کو چھوڑ کر) کسی شاعر کی شاعری اس کی شخصی زندگی کی اتنی صاف صاف ترجمانی نہیں کرتی جتنی نظیری کی شاعری۔ نظیری کے کلام سے (غزل سے بھی) نظیری کی پوری شخصیت کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ اس کی زندگی کے تقریباً سبھی نشیب و فراز [illegible] اس کی شاعری سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ کاشان و ہندوستان کا تفاوت، احمد آباد کی زندگی کے آولین [illegible]

[illegible] کی دعوت ہے جلال، محبت کے [illegible] کے مطلب [illegible] سے [illegible]
اور عشق [illegible] مگر محبت کے بدلتے ہوئے کئی رنگوں کا عکس اس کی غزل میں واضح صورت میں نظر آتا ہے۔ اور قصیدوں اور مرثیوں میں تو
اس کے جذبات کی رنگ برنگ تصویریں اور بھی نمایاں شکل میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ تو واضح ہے کہ کسی شاعر کی شاعری اس کی سوانح عمری کی قائم مقام
نہیں بن سکتی، مگر سوانح عمری کے داخلی انعکاسات کی نشاندہی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ بھی نہیں۔ یہ البتہ اس شاعر کے بارے میں درست
ہو سکتا ہے جس کا ہر ہر شعر اس کے تجربات و حادثات زندگی کے براہ راست ردِ عمل کا نتیجہ ہو، اور وہ شعر کو خلوص اور راست بازی کا آئینہ سمجھتا ہو۔
اس قسم کی سچائی اور راست بازی نظیری کے یہاں موجود ہے۔ اس نے اپنے تجربے کے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کیا، نہ اس کے معاملے میں ریاکاری [illegible]
نظیری کے یہاں زندگی کے ہر دور کے احساسات کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ شباب، ادھیڑ عمر اور پیری، تینوں ادوار کی الگ الگ نفسی
کیفیتیں اس کی شاعری کے آئینہ میں نظر آ جاتی ہیں۔ نظیری کے یہاں مقامی اشارات بھی کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کاشان، نیمد، [illegible]
ہند کی جھلک بلکہ واقعاتِ تاریخی تک بھی اس کی غزل میں جذب ہو جاتے ہیں۔ مخصوص اور معین تجربہ اور مقامیت کا احساس اس کے بیان
عرفی سے کہیں زیادہ ہے۔ نظیری کی بڑی امتیازی خصوصیت جس میں عرفی و فیضی اس کے مقابلے میں کبھی ٹھہر نہیں سکے، وہ ان کی معاملہ بندی ہے
یا پھر ہلکی ہلکی لذتِ الم جس کی تاثیر دل و جگر میں پیوست ہو جاتی ہے۔ عرفی کی غزل میں گرمی اور جوشِ بیان ہے مگر خلشِ الم نہیں۔ نظیری کی
دو باتیں عرفی کو حاصل نہیں ہوئیں، ایک تو وہ خراشِ غم جس کا ذکر ہوا۔ اور دوسری وہ لطافتِ بیان جس کی ادائے خاص پر غالب جیسا خود نگر
عاشق تھا۔ عرفی کا جوش اور اس کے استعاروں کی شعلہ انگیز گرمی اپنی جگہ بڑی توانا چیز ہے۔ مگر آگ کو کبھی کبھی گلزارِ خلیل بننے کی بھی ضرورت ہوتی
ہے۔ عرفی تو خود کہتا ہے کہ زندگی آگ بھی ہے اور سلسبیل بھی ہے

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است (عرفی)

مگر عرفی کی شاعری میں آگ ہی آگ ہے سلسبیل نہیں۔ یہ سلسبیل اگر ہے تو نظیری کے ہاں۔ پھر نظیری کا غم بھی عجب طرح کا غم ہے۔ کچھ
میٹھا غم کہ اگر کھو جائے تو اس کے کھو جانے کا رنج ہو۔ کچھ ایسا غم کہ اس کی جستجو میں بھی لطف آئے۔ پھر یہ غم کسی ترش رو قنوطی یا جھلائے ہوئے محروم
آرزو شخص کا غم بھی نہیں کہ طبیعت پر گراں گزرے۔ یہ تو ایک عالی ظرف آدمی کا غم ہے جس نے نیش و نوش دونوں کو اپنی فطرت میں جذب کرنے کی قوت
پالی ہو۔

نظیری کی معاملہ بندی بھی صرف خارجی اور نمائشی نہیں اس میں قلبیات شناسی کا عنصر بھی موجود ہے۔ عاشق و معشوق دونوں کی نفسیات کا علم اور
انسانی فطرت سے باخبری اور اس سے بڑھ کر انسانوں کے دل و دماغ کے تاثرات سے خاصا واقف۔ جذبات قلبی کا جو اثر عاشق اور معشوق کی [illegible]
اداؤں اور عادتوں پر ہوتا ہے، اس سے بھی اس کو بڑی واقفیت ہے۔ جذبۂ انسانی کے متعلق نظیری کی یہ بصیرت اس کو خاصا اونچا شاعر بنا دیتی ہے
وہ جب محبت اور نفسیات محبت کا بیان اپنی مخصوص شوق انگیز لے میں کرتا ہے تو اس کے اثر اور تاثیر کی حدیں بیکراں ہو جاتی ہیں۔ پُر جوش بیان [illegible]
[illegible] کے [illegible] اسرار سے واقفیت عشق کی اداؤں کی مصوری، زندگی کی کچھ تحسین، کچھ تعجب، کچھ زہر خند، کچھ شکر خند، کچھ [illegible]
[illegible] کچھ [illegible] کچھ گل [illegible] ہیں [illegible] خدو خال نظیری کی شاعری کے!

[illegible] کے بیان کے مطابق نظیری آخر عمر میں خاصہ صوفی بن گیا تھا [illegible] عقائد کا ذکر بھی بیان اس کے اشعار میں [illegible]
[illegible] صوفیانہ لب و لہجہ پیدا ہو گیا ہے مگر صوفیانہ جذب و سرور کی کیفیت کچھ زیادہ پیدا نہیں ہو سکی۔ [illegible]
[illegible] کی شاعری کا [illegible] سے [illegible]
[illegible] اور [illegible] محسوس ہوتی۔

[illegible] محبت کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہے وہ انہیں ہوائی کا خطاب دے [illegible] لیکن اگر ہم ان کی عمر وہ زندگی [illegible]

طبیعت کا بغور مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ اپنے گیتوں بھرے دل کی طرح ایسا ہی ایک دل چاہتے تھے جو ان کی محبت کی حدت کو [illegible]

بھڑکا دے۔ مگر ایسا کوئی دل انہیں نہیں ملا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب ان کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ان کی موسیقی پر ہر عورت [illegible]

جان چھڑکتے تھے اُن ہی دنوں نہ جانے کتنی لڑکیاں اُن کی شمع شاعری پر پروانہ وار گریں۔ وہ ان کی زندگی کا بڑا ہی رومانی دور گزرا ہے۔" پران توش [illegible]

نے جو قاضی صاحب کے قریبی ساتھی رہ چکے ہیں اپنی کتاب "قاضی نذرل" میں لکھا ہے:

" قاضی نذرل بنگالی شاعری کے اُفق پر شعلوں کی طرح آئے اور دیکھتے ہی چھا گئے۔ ان ہی شعلوں میں ان گنت مرد و عورت یا تو پتنگے کی طرح بھسم ہو گئے یا کندن بن کر چمک اُٹھے۔ لیکن وہ تو صحرا نوردی کرنے کے لئے اس دنیا میں آئے تھے ــــ! تلاش اور جستجو ہی ان کا مدعا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی شکتی نہ رہ سکے۔ ایک خیال کے بعد دوسرا خیال آتا ــــ ایک اُفق سے دوسرے اُفق کی طرف روانہ ہو جاتے۔ انہیں منزل نہ مل سکی۔"

انہیں منزل نہ مل سکی، اس لئے وہ سپنوں میں حقیقت کی جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک گیت "سنگھار" میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ان کا یہ سپنا کبھی حقیقت نہ بن سکا۔ حقیقت بن جاتا تو ان کے گیتوں کے فوارے رُک جاتے اور دل کے اندر بھڑکنے والی آگ سرد ہو جاتی۔ بعض بنگالی نقادوں کا خیال ہے کہ پرمیلا دیوی یعنی ان کی دوسری بیوی ہی ان کے سپنوں کی ملکہ تھی اور جب وہ انہیں مل گئی تو ان کی تلاش و جستجو بھی ختم ہو گئی۔ اس کی حمایت میں وہ قاضی صاحب کی مشہور نظم "پجارن" کو پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے پرمیلا دیوی کو خطاب کر کے دل کی باتیں کہی ہیں لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں بات کچھ اور ہی ہے۔ بلاشبہ پرمیلا دیوی سے انہیں بے پناہ محبت تھی اور وہ ان کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے مگر ان کے دل میں جو چنگاری ابتدائے جوانی سے بھڑکی تھی وہ کسی طرح سرد نہ ہو سکی۔ پرمیلا دیوی کو حاصل کرنے کے بعد بھی وہ کچھ کمی محسوس کرتے تھے۔ ایک نامعلوم کسک تھی جو بار بار ان کے ذہن کو کُرید جاتی۔ انہیں خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کون بنت مریم ہے جو ان کی دبی ہوئی راکھ میں چنگاری پیدا کر جاتی۔ انکی دل گداز نگی سب سجل گیتوں کے چشمے بہاتی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وہ گیتوں کی دنیا میں کھوئے رہتے ــــ کیونکہ وہ سراپا شعر تھے۔ [illegible] کی بات ہے۔ وہ بنگالی روزنامہ "نوایگ" کے ایڈیٹر تھے۔ مجھے ان کی نظمیں اور گیت پڑھنے کے بعد ان سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ لوئر سرکلر روڈ (کلکتہ) میں دفتر تھا۔ میں اُن سے ملنے گیا ــــ پہلی بار۔ انہیں کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ میں نے چپراسی کے ذریعے اپنا نام لکھ کر بھیجا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مجھے بلایا۔ اس وقت اُن کے سر پر ٹوپی تھی اور ڈھیلے ڈھالے کرتے کے اوپر ایک چادر پڑی تھی۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے گیتوں کے ہزاروں چراغ جل رہے تھے۔ مجھ پر اُن کا رعب ایسا غالب ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑی مشکل سے زبان سے اتنا نکلا ــــ "آپ سے ملنے کی دیرینہ تمنا تھی۔" یہ سُن کر وہ مسکرا پڑے۔ اس وقت شاید وہ کوئی [illegible] سوچ رہے تھے کیونکہ سامنے کاغذ رکھا ہوا تھا اور اس پر چند شعر لکھے نظر آئے۔ میں نے پوچھا "آپ پہلے شاعر ہیں یا موسیقار؟" یہ سوال سن کر [illegible] نے مجھے بغور دیکھا۔ پھر کہا: "میری شاعری محض اتفاقی ہے اور موسیقی کی دیوی کو تو میں نے خون جگر دے کر حاصل کیا ہے۔ یہ دن رات کی [illegible] نتیجہ ہے کہ میں کچھ پاسکا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ گنگنانے لگے۔ ان کی گنگناہٹ میں بھی موسیقی کا جادو شامل تھا۔ مجھے [illegible] [illegible] ان کے دل و نظر میں عشق کے جو شعلے تڑپ رہے ہیں وہ گیتوں کے بول میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ ان کی اس موسیقی میں بھی ان کے [illegible] ہے کہ اگر ان کا دل جذبہ عشق اور سوز محبت سے خالی ہوتا تو موسیقی پھیکی پڑ جاتی۔

[illegible] عشق [illegible] ہے اور نرم و گداز بھی۔ کبھی آتش کے خاکستر میں کوئی چنگاری اُٹھتی ہے تو ان کے جذبات میں [illegible] [illegible] ہے۔ اور اس وقت وہ اپنی اس کیفیت کو قلمبند کر دیتے [illegible]

[illegible]

غزل

ابوالاثر حفیظ

دل بے مدعا ہے اور میں ہوں
مگر لب پر دعا ہے اور میں ہوں

نہ ساقی ہے نہ اب وہ شے ہے باقی
مرا دور آ گیا ہے اور میں ہوں

کوئی پرساں نہیں پیرِ مغاں کا
مرا پاسِ وفا ہے اور میں ہوں

ادھر دنیا ہے اور دنیا کے بندے
ادھر میرا خدا ہے اور میں ہوں

یہ طولِ عمرِ نامعقول و بے کیف
بزرگوں کی دعا ہے اور میں ہوں

نہ پوچھو حال میرا کچھ نہ پوچھو
کہ تسلیم و رضا ہے اور میں ہوں

لہو کے گھونٹ پینا اور جینا
مسلسل اک مزا ہے اور میں ہوں

حفیظ ایسی فلاکت کے دنوں میں
[illegible]

غزل

(ظفر کی کہانی فضلی کی زبانی)

فضل احمد کریم فضلی

جانِ وطن تھے ہم تو ہم بھی وطن سے نکلے
نکلے تو روح جیسے کھینچ کر بدن سے نکلے

تھا برق و باغباں کا دھڑکا چمن میں لیکن
کیا کیا نہ دل پہ گزری جب ہم چمن سے نکلے

بے اختیار نکلیں آنکھوں سے جیسے آنسو
کچھ اس طرح سے ہم بھی اس انجمن سے نکلے

وہ شانِ بے گناہی وہ آنِ کج کلاہی
ہم راہِ امتحاں میں کس بانکپن سے نکلے

سمجھے تھے قد و گیسو آرامِ جاں بنیں گے
لیکن وہ قد و گیسو دار و رسن سے نکلے

دنیا کو بھی ہنسایا دنیا پہ بھی ہنسے ہم
کیا کیا نہ کام اپنے دیوانے پن سے نکلے

نکلے تھے سیرِ گل کو تسکینِ دل کی خاطر
لیکن یہ لالہ و گل خونیں کفن سے نکلے

دل ٹوٹنے کی تجھ کو ہو بھی خبر تو کیونکر
شیشہ نہیں جو ظالم آواز چھن سے نکلے

وہ بولتی نگاہیں وہ بولتی ادائیں
گوشے ہزار اُن کی طرزِ سخن سے نکلے

اُن کی ادا غزل میں کچھ یوں جھلک رہی ہے
چھن چھن کے حسن جیسے اس پیرہن سے نکلے

یادِ ظفر میں فضلی شعروں میں ڈھل گئے ہیں
آنسو جو آج چشمِ عہدِ کہن سے نکلے

غزل

فراق گورکھپوری

مردِ حق پیشہ کو پھر دار و رسن پر کھینچا
اک ستون اور گرا ایک چراغ اور بجھا

دام نادار لگائیں گے نئی دُنیا کا
اہلِ دولت سے تو اے چرخ یہ سودا نہ پٹا

جس کو کچھ سود و زیاں سے نہیں اے دلِ ہرکار
عشق کا اس کو حساب آتا ہے سیدھا سیدھا

لے لیا صبحِ ازل کو اُسے میرے دل نے
بارِ غم کو وہ گراں سے کبھی اٹھائے نہ اُٹھا

آ پڑے وقت تو دُنیا ہے قسم کھانے کو
ہاں قسم ہے تجھے اے عشق قسم اس کی نہ کھا

جس سکوں کی ہے طلب، روئے زمیں پر وہ نہیں
ہم نے اس انجمنِ ناز کو بھی جا دیکھا

سب سے موزوں ہے زیارت کے لئے شہرِ نگار
یہ زمیں وہ ہے جہاں عشق نے دم توڑ دیا

ہو نہ ہو کوئی کمی تو ہے زمانے میں ضرور
نظر آتا ہے یہ عالم مجھے سُونا سُونا

دھڑکنیں دل کی دئے جاتی ہیں بس ایک پیام
زندگی کیا ہے بس اک سلسلۂ بیم و رجا

عشق والوں میں وہ پہلی سی نہ گرمی نہ تڑپ
حسن والوں میں وہ اگلی سی وفا ہے نہ جفا

اک کشش ہوتی ہے اسلاف کی جگ بیتی میں
قصہ گو عہدِ گزشتہ کے کچھ افسانے سُنا

کم سے کم موت سے ایسی مجھے امید نہیں
زندگی تو نے تو دھوکے پہ دیا ہے دھوکا

خواب تھا خواب وہ نظارۂ حالِ انساں
آنکھ جس وقت کھلی مجھ سے تو دیکھا نہ گیا

نام سے دل کے سرِ میکدہ جس کی ہے تلاش
میرے پہلو میں وہ اک جام تھا چھلکا چھلکا

وہ پھریں اپنے در و بام پہ اہلے گہلے
عشقِ آوارہ پھرے دشت میں مارا مارا

آپ کا شائقِ ارشاد ہوں میں آپ سے دور
علم کی دین ہے سمجھیں مجھے آیا آیا

ہے جو اللہ کی قدرت کا تماشا منظور
اک ذرا آئینے کے سامنے گھونگھٹ کو اٹھا

محفل اُن کی ہے، گھر اُن کا ہے، مراعات اُن کی
دخل کیوں دیتے ہو تم حضرتِ دل تم سے کہا

چل گئی حضرتِ واعظ میں اور اک رند میں آج
معرکہ خوب ہے جیسے کو ملا ہے تیسا

اُف یہ تنہائی کا احساس بھری دُنیا میں
زندگی مجھ سے اب اس طرح تو آنکھیں نہ چرا

دور بدلا تو کہاں جائیں گے اے حاکمِ وقت
ہم غریبوں کی الگ بات ہے عالیجاہا

مجھ سے تو پوچھ رہا ہے شبِ غم کا مصرف
دل میں سوئی ہوئی اک جوت ہے آج اس کو جگا

رند بے چین ہیں بزمِ مہ و انجم روشن
ساقیا جام اُٹھا، جام اُٹھا، جام اُٹھا

منتظر دل کی کٹی جاتی ہے تاروں بھری رات
نیند آتی ہے تری یاد کو آنا ہے تو آ

اس کی دیوار کے سائے میں کٹی عمرِ فراق
میں تو کم بخت یہیں تھا کہیں آیا نہ گیا

غزل

سراج الدین ظفر

ہم مہ وشوں کا رازِ دروں کھولتے رہے
میزانِ دلبری پہ انہیں تولتے رہے

عکسِ جمالِ یار بھی کیا تھا کہ دیر تک
آئینے طوطیوں کی طرح بولتے رہے

کل شب ہمارے ہاتھ میں جب تک سبو رہا
اسرارِ کتم راز میں پَر تولتے رہے

کیا کیا تھا حلِ مسئلۂ زندگی میں لطف
جیسے کسی کا بندِ قبا کھولتے رہے

دنیا شبِ سیاہ تھی لیکن سبو بدست
ہم اُس میں نورِ صبحِ ازل گھولتے رہے

پوچھو نہ کچھ کہ ہم سے غزالانِ بزمِ شب
کس شہرِ دلبری کی زباں بولتے رہے

ہم متقیٔ شہرِ خرابات رات بھر
تسبیحِ زلفِ سیم تناں رولتے رہے

کل رات ملتفت تھے اِدھر کچھ نئے غزال
ہم بھی نظر نظر میں اُنہیں تولتے رہے

تا صبح جبرئیل کو ازبر تھا حرف حرف
راتوں کو جو سرور میں ہم بولتے رہے

اتنی کہانیاں تھیں کسی زلف میں کہ ہم
ہر رات ایک دفترِ نو کھولتے رہے

کل رات میکشوں نے توازن جو کھو دیا
خطِ سبو پہ کون و مکاں ڈولتے رہے

وہ رندِ خوش عمل ہیں کہ دنیا کا ہر اصول
جام و سبو کے تول پہ ہم تولتے رہے

روکا ہزار بزم نے ہنگامِ مے کشی
ہم تھے کہ رازِ ارض و سما کھولتے رہے

اپنا بھی وزن کر نہ سکے لوگ اور ہم
بے جسم ایک ذات کو بھی تولتے رہے

سرمایۂ ادب تھی ہماری غزل ظفرؔ
اشعارِ نغز تھے کہ گہر رولتے رہے

رپورتاژ:

معلق شاہراہ

(وادیٔ کاغان)

ممتاز مفتی

خوفناک گونج: وہ سب دریا کے کنارے بیٹھے اُن ہیبت دیواروں کی طرف دیکھ رہے تھے جو تینوں طرف سے اُن کو محیط تھیں۔ پھر دفعتاً سورج یوں ڈوب گیا جیسے درخت سے ٹوٹ کر آم گرتا ہے۔ اور اندھیرا چھا گیا۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا، دریائے کنہار کا شور خوفناک ہوتا جا رہا تھا، حالانکہ پہاڑوں کی وہ خوفناک دیواریں نگاہ سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ وہ پُرہیبت چوٹیاں اور تنگ و تاریک گھاٹیاں نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد گویا کنہار کے شور میں منعکس ہو رہی تھیں۔ دریا کے شور میں دل دہلا دینے والی گونج اُبھر رہی تھی۔ ایسی خوفناک گونج جسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ہمارا خون بلو رہا ہو۔

"چلو یار اندر کوٹھڑی میں چلیں" عمر بولا۔ "یہاں باہر بیٹھے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"تم؟" مسعود بولا۔ "تم تو خود سراپا وحشت ہو۔ تمہیں کیا وحشت ہو گی۔"

"ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میرا دل پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔" عمر نے جھرجھری لی۔

"ہاں بھئی۔" ضیا بولا "بڑا سناٹا ہے۔ نسیں تاروں کی طرح بج رہی ہیں۔"

"ہا" مسعود ہنسا۔ "ذرا اور بج لینے دو۔"

"واقعی دھنک دھنک سی ہو رہی ہے۔" اسحاق نے کہا۔

"اس دھنک دھنک سے روح کی غلاظت صاف ہو جاتی ہے۔" مسعود بولا۔

"چھوڑو یار" عمر غصے میں چلایا۔ "ہم یہاں تفریح کے لئے آئے ہیں، روح کی ڈرائی کلیننگ کے لئے نہیں آئے۔ رکھو اپنے پاس ہی اپنی لانڈری۔"

عمر اُٹھ کر اندر جانے لگا تو مسعود نے لپک کر اسے پکڑ لیا: "اور وہ جو سستے جاسوسی ناول پڑھا کرتا ہے اور سنسنی خیز فلم دیکھا کرتا ہے، اسی لئے تاکہ روح کے تار لرزیں، یہاں بغیر دام خرچے روح کے تار لرز رہے ہیں، تو میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے۔"

"گرار رڑا ——— ڈوم ———" ایک عجیب آواز سنائی دی۔ سب سہم گئے۔

"یہ کیسی آواز تھی بھئی؟" ضیا گھبراتے ہوئے بولا۔ "جیسے زمین کا سینہ شق ہو گیا ہو۔"

"چلو خدا کے لئے اندر چلو" عمر نے ہاتھ جوڑے، مسعود کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ عمر بھاگا اور سب اس کے پیچھے پیچھے کوٹھڑی کی طرف چل پڑے۔

ڈاک بنگلے کے برآمدے میں ایک گیس اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں سسکیاں بھر رہا تھا۔ گیس کے قریب صاحب دونوں ہاتھوں میں سر تھامے کہنیاں میز پر رکھے، یوں اس چھائے ہوئے خوفناک اندھیرے کو گھور رہا تھا جیسے چھپکلی سے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بیگم اس کا بازو پکڑے اسکے پہلو سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ ڈر کر کائنات میں کھویا ہوا تھا، وہ ڈر کر میاں میں کھوئی ہوئی تھی!

کوٹھڑی کے پاس بنگلے کا چوکیدار لالٹین جلائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری لکیریں یوں متحرک تھیں جیسے پہاڑ پر پگڈنڈیاں دوڑ رہی ہوں۔ اس کی گہری آنکھوں میں گویا کنہار کی وہ خوفناک گونج بسی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ دیکھو وہ" ضیا نے ہنس کر چوکیدار کی طرف اشارہ کیا۔

"تو یہ ہے" عمر بولا "جیسے شانوں پر کنہار کی وادی اُٹھائے بیٹھا ہو۔"

"دریا کا سارا شور اس کی روح میں سلب ہو چکا ہوگا" مسعود نے کہا۔

"ہاں" اسحاق بولا۔ اور پھر سب خاموش ہو گئے۔

گڑا اڑ ڑا ——— گڑ دو دم!

ایک بار پھر وہی آواز بلند ہوگئی جیسے پہاڑ کی چوٹیاں وادیوں کو بلا رہی ہوں یا زمین دوز چوٹیاں اُبھر کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"بابا یہ کیسی آواز تھی؟" عمر نے چوکیدار سے پوچھا۔

"ہاں" وہ چونکا۔ "آواز؟ —" وہ رک گیا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ وہ مسکراہٹ ایسی تھی جیسے اس مسکراہٹ کے پلو سے کائنات کا راز بندھا ہوا ہو۔ چوکیدار کی خاموشی میں چاندنی کی عظمت تھی، خوفناک عظمت جس پر حسرت و یاس کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اس کے روبرو لالٹین کا شعلہ لرز رہا تھا۔

ایک مرکز:

کوٹھڑی میں پہنچ کر جب ہم زمین پر اپنے اپنے بستر بچھا رہے تھے تو ضیا کہنے لگا۔

"یار یہاں سانپ وانپ کا اندیشہ تو نہیں؟"

"سانپ" مسعود پھنکارا۔ "بے وقوف جہاں کائناتی خوف مسلط ہو وہاں چھوٹے موٹے ڈر کی گنجائش نہیں رہتی۔"

"اس کائناتی خوف سے ڈر کر اپنے بل میں گھسا ہوا ہوگا" عمر نے کہا۔

"اور اگر وہ سالا کائناتی خوف سے بے نیاز ہو تو؟" ضیا ہنسنے لگا۔

"کیا فرق پڑتا ہے" میں نے کہا اور ہم سب لیٹ کر اس کائناتی خوف میں کھو گئے۔

اس چھوٹی اور بے ڈھب سی کوٹھڑی میں جلتی ہوئی لالٹین کا شعلہ اس کائناتی خوف سے لرز رہا تھا۔ باہر وہ خوفناک گونج ہر لمحہ مہیب تر ہوتی جا رہی تھی۔

"ارے یار" ضیا بولا۔ "یہاں کے لوگ اس مسلسل شور کی وجہ سے کیسے سوتے ہوں گے؟"

"لڑکے" مسعود اُٹھ بیٹھا۔ "تم نے وہ نیاگرا فالز کا قصہ نہیں سنا؟"

"نہیں تو" ضیا نے جواب دیا۔

"تو سنو" مسعود بولا۔ "امریکہ میں نیاگرا فالز کے قریب ایک گاؤں آباد ہے۔ ایک روز رات کے دو بجے کے قریب گاؤں کے سب لوگ یوں بیدار ہو گئے جیسے کسی نے انہیں جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ وہ سب محسوس کرنے لگے جیسے کچھ ہو گیا ہے، جیسے کچھ کھو گیا ہے، جیسے کوئی خلافِ معمول بات وقوع میں آئی ہو لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر دفعتاً ایک شخص چیخ کر بولا "ارے آبشار!" اور معاً سب نے محسوس کیا کہ آبشار کی آواز بند تھی۔ اور گاؤں پر ایک خوفناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یعنی وہ گاؤں جہاں مسلسل آبشار کا شور رہتا تھا اس وقت پُراسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ "آبشار کیا ہوا؟ آبشار کیا ہوا؟" ان کے دلوں میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈر کر وہ اُٹھ بیٹھے۔ سارے گاؤں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ پھر وہ لالٹین جلا کر آبشار کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر وہ حیران رہ گئے۔ دریا میں پانی نہ تھا۔ آبشار کی جگہ تہہ کی چٹانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔" مسعود نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"کمال ہے" ضیا بولا۔ "مسلسل شور ہو تو ڈر، اور یکدم خاموشی چھا جائے تو بھی ڈر! کیا زندگی ہے ہماری!"

"اب سونے بھی دو گے یا نہیں" عمر بولا "یہ طوطا مینا کا قصہ سنا دیا ہے یار نے، تو یہ ڈر آنے لگا ہے کہ کہیں یہ شور ختم نہ ہو جائے۔"

"جبھی تو کہتے ہیں" میں نے کہا کہ "ڈر کے جذبے کو ایک جگہ مرکوز کر لو اور چھوٹے موٹے ڈروں سے بے نیاز ہو جاؤ۔"

گڑا اڑ ڑا۔ ڑ دو دو دم —— پھر وہی مہیب آواز گونجی، جیسے کائنات نے لبیک کہا ہو "ایک مرکز۔ ایک مرکز" کنہار کے پانی نے اسے دہرانا شروع کر دیا۔ شا آ آ آں۔ ہوا کا ایک تند جھونکا آیا۔ لالٹین کی بتی لرزی اور گل ہو گئی اور وہ کوٹھڑی، وہ بنگلہ، وہ دریا، وہ کوہسار، وہ مہیب شور اور وہ چھایا ہوا اندھیرا سب ایک ہو گئے، ایک۔ صبح جب وہ بیدار ہوئے تو آنکھیں ملتے ہوئے ضیا بولا "ارے!" سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر وہ آپ ہی آپ کہنے لگا "شکر ہے کنہار کا شور قائم ہے۔ ساری رات اس ڈر کے مارے میں نے آنکھ نہیں کھولی کہ کہیں شور بند نہ ہو جائے۔"

"ہونہہ" مرچ جھنجھلائی۔ "ساری رات خراٹے لیتا رہا ہے اور اب ــــــــــــ"

"لو سن لو" ضیا ہنسا۔ "میاں کنہار کے ہوتے ہوئے کوئی خراٹے لے سکتا ہے کیا؟ اور اگر لے بھی تو کیا وہ سنائی دیں گے؟ یہاں اس کا نناتی شور میں بھلا خراٹوں کی کیا حیثیت، کیوں بھائی؟" اس نے تفریحاً چوکیدار سے پوچھا جو چائے اٹھائے کوٹھڑی میں داخل ہو رہا تھا۔

چوکیدار کے چہرے کے کہساروں اور وادیوں میں عجیب سی حرکت ہوئی۔

"تم خراٹے لیا کرتے ہو سوتے میں؟" ضیا نے اس سے پوچھا۔

"خراٹے" وہ بولا "ہاں صاحب، خراٹے تو لیتے ہی ہیں لوگ"

"اور یہ شور" ضیا نے ہاتھ چلا کر کہا۔

"شور" بڈھے نے تعجب سے دیکھا "کونسا شور صاحب؟"

"دریا کا شور" وہ بولا۔

"ہاں" بڈھے کے چہرے کی وادیوں میں گویا کرنیں دوڑ گئیں۔ "وہ تو ہے صاحب"

جب بوڑھا چائے رکھ کر باہر نکل گیا تو ضیا ہنسنے لگا۔ "ارے یار حد ہے" وہ بولا۔ "انہیں یاد دلانے پر دریا کا شور یاد آتا ہے۔ اس مسلسل شور کی نسبت انہیں خراٹوں کے شور کا زیادہ احساس ہے"

"اپنی اپنی توجہ ہے" مسعود نے کہا "رات کو درختوں تلے الاؤ کے پاس وہ خانہ بدوش بیٹھا تھا نا" اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ دریا کے شور سے بے نیاز ہو، جیسے اس کی روح میں اس دریا سے زیادہ مہیب دریا بہہ رہا ہو۔ "کیوں بھئی نفسیاتی بابکے، کیا کہتا ہے تمہارا علم؟" اس نے میری طرف دیکھ کر دانت نکالے۔

"میں بتاؤں کیا کہے گا یہ؟" عمر چلانے لگا۔

"کیا؟" ضیا نے پوچھا۔

"کہے گا" عمر بولا "جب رات کے وقت اس بڈھے چوکیدار کی بیوی جاگتی ہے اور یہ سوتے میں خراٹے لیتا ہے تو اس کی بیوی کے لئے ان خراٹوں کی آواز کنہار کے شور کی نسبت زیادہ مہیب ہوتی ہے۔ ہی ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگا۔

اڑھائی ہزار کا کیمرہ

"کیوں ٹھیک کہتا ہے یہ؟" ضیا مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اب بول" عمر چلایا "اب کیوں خاموش ہے۔؟"

"کوئی کیمرا ہوتا تو تصویر لیتے اس کی" مسعود بولا۔

"ارے میرا کیمرہ" ضیا چلایا۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور اپنے بستر کو ٹٹولنے لگا۔ "اگر کھو گیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا"

"کیمرا ہی ہے نا، کوہ نور کا ہیرا تو نہیں" مسعود چلایا۔

"خدا کی قسم! کوہ نور کے ہیرے سے کم نہیں" وہ بولا۔ "اور مانگے کا ہے"

"شکر ہے مل گیا" اس نے کیمرا ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہے کیا قیمت ہے اس کی؟ اڑھائی ہزار!"

"اڑھائی ہزار! دکھانا تو" عمر چلایا۔

مسعود نے لپک کر کیمرا ضیا کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور وہ کیمرے کو دیکھنے لگے۔

"جرمن ساخت کا ہے" ضیا بولا "اور اسی سال کا موڈل ہے۔ ہر چیز موجود ہے اس میں۔ روشنی اور ایکس پوژر کا آلہ بھی ساتھ لگا ہے۔ آٹومیٹک ایکس پوژر کا انتظام بھی ہے۔ فوکس فکس کرنے کا آلہ لگا ہے۔ اور یہ آلہ جو ہے اسے چلا دو، جو اس بٹن کے دبانے سے کام کرتا ہے، تو جب تک فوکس ٹھیک نہ ہو جائے ویوئر (VIEWER) میں تصویر نہیں آتی۔ یعنی کٹی رہتی ہے۔ لیٹسٹ ماڈل ہے لیٹسٹ"

"جبھی تو اڑھائی ہزار قیمت ہے" اسحاق نے حیرت سے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی واہ، پھر تو مزے ہوگئے" مسعود ناچنے لگا۔ "پھر دیر کس بات کی ہے، ابھی ہوجائے ایک تصویر۔"

"آؤ بھئی آؤ" وہ چلانے لگا۔ "سب باہر نکل آؤ، تصویر ہوگی۔ آجاؤ لڑکو" وہ چیخ کر بولا۔

"لیکن۔ لیکن" ضیا چلایا۔

"لیکن کیا؟" مسعود غرانے لگا۔

"لیکن تصویر کون کھینچے گا؟"

"تصویر کون کھینچے گا؟ تم اور کون؟" مسعود نے کہا۔

"لیکن مجھے تو اس کیمرے کو چلانا نہیں آتا" ضیا نے مجرمانہ انداز سے کہا۔ "مجھ سے تو یہ کھلتا بھی نہیں۔ لینس کا شٹر نہیں کھلتا۔"

"تو اس میں کیا ہے" عمر بولا۔ "مجھے دو۔"

"لیکن یار" ضیا بولا "توڑ نہ دینا اسے۔"

عمر دیر تک کیمرے کو لے کر اُلٹتا پلٹتا رہا۔ پھر مسعود نے اُس سے کیمرہ چھین لیا اور اس کے پیچ وپیچ مروڑتا رہا۔ اس دوران میں سب اس کے اردگرد کھڑے ہو کر دیکھتے رہے اور ضیا چلاتا رہا "ارے یار کہیں توڑ نہ دینا، توڑ نہ دینا کہیں"۔ مایوس ہو کر مسعود غصے میں آگیا۔ "یہ کیا کیمرا ہے اونہوں۔ یہ تو کوئی جنتر منتر معلوم ہوتا ہے۔ جیسے گورکھ دھندا۔"

"اتنا قیمتی کیمرا ہے اور تم کہتے ہو منتر جنتر ہے۔"

"ہا ہا" مسعود ہنسا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی جو ایک بار آئی سپیشلسٹ نے کی تھی۔ سنو یار سنو۔" اس نے عمر اور اسحاق کو گھورا، جو کیمرے سے کشتی لڑنے میں مشغول تھے۔ "میری بات سنو" وہ غرایا۔ "ایک بار والد صاحب کی دائیں آنکھ خراب ہوگئی تو میں انہیں ایک آئی سپیشلسٹ کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے آلات سے اُن کی آنکھ کا بغور معائنہ کیا، کہنے لگا ہوں! 'آنکھ کی پتلی بالکل ٹھیک ہے، بالکل او کے، فسٹ کلاس۔ ہوں، آنکھ بالکل صاف ہے۔ اُنہوں، موتیا بند، بالکل نہیں، شیشے کی طرح صاف۔ کالا بالکل ٹھیک۔ سفیدی او کے۔ آنکھ کے سل خوب خوب، بہت اچھے، بہت اچھے۔ اِٹ اِز اے فسٹ کلاس آئی۔ او کے پرفیکٹ'۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا "صرف نقص یہ ہے کہ اس میں بینائی دکھائی نہیں دیتی۔" اس پر میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور وہ مسالا چڑ گیا۔ "بے وقوف کہتا تھا اِٹ اِز اے فسٹ کلاس آئی۔ پرفیکٹ، صرف نقص یہ ہے کہ قوت بینائی نہیں۔ ایڈیٹ ــــ اور ضیا کا یہ اڑھائی ہزار کا کیمرا موسٹ ماڈرن ماڈل ہے۔ ہر قسم کی کل لگی ہے اس میں۔ ٹائم ایکسپوژر، سلف فوکس، لائٹ ایڈجسٹمینٹ، صرف نقص یہ ہے کہ تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ہا ہا" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔

مسعود کی عادت ہے کہ جب وہ غصے میں سوڈا بن جائے تو وہ طنزاً ہنستا ہے۔ 'ہا ہا' یا خالی ایک 'ہا'۔ اس 'ہا' میں بلا کی بناوٹ ہوتی ہے، بلا کا غصہ ہوتا ہے، اور اُس کی وہ خشک اور گرم "ہا" گونجتی ہے اور سننے والے محسوس کرتے ہیں جیسے وہ "ہا" اُن کے کان کے پردے پھاڑنے کے لئے ہو۔ اور وہ محسوس کرتے ہیں جیسے اُن کا مذاق اُڑایا جارہا ہو اور جوں جوں اُن کے چہروں پر غم وغصہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی "ہا" میں بے رحم خوشی کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔

"ہا۔ ہا۔ ہا" مسعود بھیانک آواز میں بھونک رہا تھا۔ عمر کا منہ سُرخ ہوتا جارہا تھا، مرچ جل رہی تھی، ضیا کی مسکراہٹ بوکھلائے جارہی تھی۔ باہر دروازے پر موٹر ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ "بابو چلو گے یا نہیں، وَن وے ٹریفک ہے، وقت گذر گیا تو کیا کریں گے؟" بنگلے کا چوکیدار گھبرایا ہوا کھڑا تھا کہ کن دیوانوں سے پالا پڑا ہے۔ فکر کی وجہ سے اس کے چہرے کی لکیریں گویا سمٹ کر معدوم ہونے کی کوشش میں رخساروں سے کانوں کی طرف دوڑی جارہی تھیں۔ میدان میں ٹھہرے ہوئے خانہ بدوشوں کی دو عورتیں منہ میں اُنگلیاں ڈالے حیرت سے ہماری طرف تک رہی تھیں اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے دریائے کہار کا شور رُک گیا ہو، پانی ٹھہر گیا ہو، چڑیاں اپنے کلاہ اُتار کر نیچے ہماری طرف جھانک رہی ہوں۔ "ہا۔ ہا۔ ہا" مسعود کی آواز اور بلند تر ہوئی جارہی تھی۔ اور بلند اور بلند!

"بھوں بھوں" ــــ موٹر کا ہارن زور سے بجا اور دفعتاً گویا مجھے ہوش آگیا۔ ہماری جیپ نیچے کی طرف پھسلتی جارہی تھی، سب خاموش بیٹھے تھے۔ عبداللہ ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسحاق یوں سہما ہوا بیٹھا تھا جیسے ربی بل کھائے ہوئے ہو۔ گویا سامنے عمر پہاڑ کی چوٹیوں کو ناپنے میں مصروف تھا۔ گاڑی کمبل سے باہر نکل کر سٹیرنگ وہیل سے چمٹا ہوا تھا۔ اور مسعود گھونسے کی شکل بنائے اپنے بوٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"دفعتاً ضیا چلایا" ارے یار میرا کیمرا!"
کیمرے کا نام سنتے ہی سب چونک پڑے۔
"کیمرا" عمر نے چونک کر دوہرایا۔
"وہیں تو نہیں پھینک آئے کیا؟" ضیا نے چیخ کر پوچھا۔
"مجھے تو نہیں معلوم" عمر بولا۔
"معلوم نہیں کس نے رکھا ہے؟" اسحاق نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"میں تو ساری زندگی میں اڑھائی ہزار کی رقم ادا نہ کر سکوں گا۔" ضیا سر پیٹنے لگا۔
"گھبراؤ نہیں، میرے پاس ہے۔" سر دے سے شمس بھرے چھینٹے اُڑے، پریشان چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔
دفعتاً مسعود نے سر اٹھایا۔ "ڈرائیور!" وہ چلایا۔ "ذرا روکو، ٹھہرو۔"
"کیوں بابو جی؟" گاڑی والے نے حیرانی سے دوہرایا۔
"ہاں" مسعود نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس موٹر میں نہیں جاؤں گا۔"
"نہیں جاؤ گے؟" عمر نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کیوں؟"
"بس نہیں جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "ہم گھر سے پک نک کرنے آئے ہیں، قدم قدم پر اڑھائی ہزار کے کیمرے کے گم ہو جانے کا غم کھانے نہیں آئے۔"
"ہا ہا ہا" عمر نے قہقہہ لگایا۔
"ہنسنے کی کیا بات ہے؟" مسعود نے سنجیدگی سے کہا۔ "یا تو تم سیر و تفریح کر سکتے ہو یا اڑھائی ہزار کے کیمرے کی چوکیداری۔ دونوں کام بیک وقت نہیں ہو سکتے۔"
"ٹھیک کہتا ہے، ٹھیک کہتا ہے۔" اسحاق بولا۔
"سچ جا گو تو اللہ کا نام لینے کے بجائے کیمرے کا غم کھاؤ۔ بھئی وہ دیکھنا میرا اڑھائی ہزار کا کیمرا موجود ہے نا۔ چائے پیو تو گھونٹ گھونٹ پر کیمرے کا غم کھاتے رہو۔ دوڑ رہے ہو گے تو یہ فکر کندھوں پر اٹھائے پھرو کہ کیمرا کھو تو نہیں گیا اور رات کو سوؤ۔۔۔ لیکن سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سرہانے تلے اڑھائی ہزار کی رقم رکھی ہو تو نیند کیسے آئے گی؟"
"بات تو معقول ہے۔" عمر ہنسا۔
"بکو نہیں۔" مسعود نے سینگ نکالے۔ "میں مذاق نہیں کر رہا، اگر اڑھائی ہزار کا غم کھانے کی اہلیت ہوتی تو خدا کی قسم اب تک میں اڑھائی کیا پانچ ہزار روپے جمع کر چکا ہوتا۔ ہم نے تو آج تک اپنے سرمائے کا غم کھانا بھی گوارا نہیں کیا اور یہ لڑکا چاہتا ہے کہ بیگانے کے اڑھائی ہزار کا غم کھائیں۔ نہ بھئی مجھ سے یہ نہ ہوگا۔"
"بھئی بات تو واقعی سوچ آنے والی ہے۔" ضیا کی شرارت بھری مسکراہٹ چمکی۔
"اور پھر کیمرا بھی وہ" مسعود چلایا۔ "جو تصویر تک نہیں کھینچ سکتا۔ روک دو بھئی۔ میں کہتا ہوں روک دو گاڑی۔"
"جیپ رک گئی۔" مسعود نے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔
"ارے" ضیا چیخنے لگا۔ "وہ تو واقعی اُتر گیا ہے۔"
"بے وقوف!" عمر نے اس کے پیچھے پیچھے پھلانگتے ہوئے کہا۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔
"لاحول ولا قوۃ۔" عبداللہ ہنسا اور گاڑی سے اُتر گیا۔
سب مسعود کے پیچھے پیچھے جیپ سے اُتر گئے۔
"ارے!" سڑک پر ضیا چیخنے لگا۔ "یہ تو بستی ہے اور میں سمجھا ویرانے میں رکے ہیں۔"

جیپ سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی۔ سامنے سڑک پر دو رویہ، پتھر کی بند راہیں بھدی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جن میں کپڑا، اناج اور چائے

وادیٔ کاغان: وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ان دکانوں کے سامنے ٹوٹے ہوئے بنچ تھے، جن پر کچھ لوگ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے انہیں کوئی کام کاج نہ ہو۔ دکاندار آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور دکان میں پڑے ہوئے سامان اور آتے جاتے لوگوں سے اس قدر بیگانہ تھے جیسے انہیں خرید و فروخت سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، اُن کے چہروں پر کوئی جذبہ نہ تھا، کوئی اظہار نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے کھو گئے ہوں، اپنے آپ سے کھو گئے ہوں۔ یا جیسے ان گھروندوں میں بیٹھے بیٹھے انہیں نروان حاصل ہو چکا ہو، اُن کی کسی حرکت میں شوق، جستجو یا جد و جہد کی جھلک نہ تھی۔ اُن کے چہروں پر حسرت آلود سیری کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

ان غلیظ گھروندوں کے اِرد گرد، گھنا اور گہرا سبزہ لہلہا رہا تھا۔ درخت، کھیت، پھول دار پودے، گھاس اور کائی۔ چاروں طرف سے سبزے نے گویا اُن پر یورش کر رکھی تھی اور انہیں اس حد تک مغلوب کر دیا تھا کہ انہیں سُدھ بُدھ نہ رہی تھی۔ بائیں ہاتھ کی طرف دور کھیتوں کے پرے کہنار گویا ایک فاتح کی طرح بینڈ بجاتا ہوا مارچ کر رہا تھا۔

"میں نے کہا، یہ کونسی جگہ ہے؟" ضیا نے گاڑی سے پوچھا۔

"کاغان" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"کاغان۔ یہ؟" وہ چلایا۔ "تو کیا ہم یہ دیکھنے کے لئے اتنی دور سے آئے ہیں؟" اس نے عبداللہ سے کہا۔

عبداللہ کی آنکھوں سے مسرت کی بوندیں اُڑیں جیسے وہ کاغان آنے پر بے حد مسرور ہو۔

"لاحول ولا قوۃ" اسحاق بولا۔ "کوئی جگہ ہے یہ؟"

وہ دیکھو وہ دیکھو" عمر چلایا۔ "وہ" اس نے ٹوکروں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کونسی سبزی ہے بھئی؟" ضیا نے پوچھا۔

"سبزی، بے وقوف!" عمر بھنا گیا۔ "اندھے ہو؟ یہ سیب ہیں سیب۔ کاغان کے سیب"۔

"اچھا" وہ مسکرایا۔ "میں سمجھا انڈے ہیں۔ پر یار یہ اس قدر سبز کیوں ہیں؟ اور سبز بھی ایسے جیسے بد رنگ سے ہوں۔ جیسے موٹے بیر ہوتے ہیں"۔

"یہاں کے سیب ایسے ہی ہوتے ہیں بے وقوف" عمر بولا۔ "تمہیں کچھ پتہ بھی ہو" پھر وہ مسعود کی طرف بھاگا جو سڑک کی پتلی اُلگز پر یوں کڑی نگاہ سے بازار کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے پاکستانی فلم کا ولین اپنی سازش کے ناکام ہونے کے بعد اپنے کمزور ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ "سیب کھاؤ گے؟ مسعود کاغان کے سیب کھاؤ گے؟" اس نے مسعود سے یوں پوچھا جیسے اڑھائی ہزار کے کیمرے کی بات ہی نہ ہوئی ہو کبھی۔

"ہاں" مسعود نے ریچھ کی طرح سر ہلایا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاں کہہ کر اس نے عمر پر احسان کیا ہو۔

سیب کھانے کے موقع کو بھانپ کر سب مسعود کے گرد جمع ہو گئے۔

"یہاں کے لوگوں کے چہروں پر اتنی بے حسی اور اکتاہٹ کیوں ہے مسعود؟" ضیا نے گویا اڑھائی ہزار کا کیمرہ ساتھ لانے کی معذرت پیش کی۔

"ہوں!" مسعود نے اپنی لمبی تھوتھنی موڑی۔

اس لمبی تھوتھنی کو دیکھ کر ایک ساعت کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔

نفسیات کا چکر: "واہ واہ" دبی زبان سے اسحاق بولا۔

"ارے" ضیا نے زیرِ لب کہا۔ اور اسحاق کی طرف اشارہ کیا جو اپنی ہی دُھن میں کھویا ہوا تھا۔ "اس بھلے مانس کا زاویۂ نظر بھی دیکھ لو بھائی"۔ ضیا نے مسعود کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

سب کی نگاہیں اس طرف اُٹھ گئیں جس طرف اسحاق کی نظریں گڑی ہوئی تھیں۔ "ارے" ضیا نے شور مچا دیا۔ "میں نے بھی کہا۔" واہ واہ کرنے کا یہاں کیا مقام ہے؟"

"کیا مقام ہے واہ ولا کرنے کا؟" ہاتھوں میں سیب اٹھائے عمر نے آکر پوچھا۔

"واہ واہ کرنے کا وہ مقام ہوتا ہے جدھر اسحاق کی توجہ مرکوز ہو!" ضیا زیرِ لب ہنسنے لگا۔

بائیں طرف دو دکانوں کے درمیان میں سے ایک چھوٹی سی تنگ سی گلی نکل گئی تھی۔ سامنے ایک مکان کا دروازہ کھلا تھا اور اندر صحن میں چار ایک عورتیں ڈھولک لئے بیٹھی تھیں۔ اُن کے جسم پامال تھے۔ چہرے خشک اور کھردرے تھے۔ اُن کے انداز میں شوخی نہ تھی اور نہ نمائش ہی تھی، لیکن اُن کی آنکھوں میں ایک نگاہ تھی۔ ایک عجیب سی نگاہ، بھوکی ننگی نگاہ، اُن کا گیت ایک بین تھا، حسرت و یاس کی ایک مدھم زیرِ لب پکار۔

"ارے" ضیا چلایا۔ اور اسحاق کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ارے بھائی اب تو کافی ہو چکا، اب بس کر دنا" لیکن اسحاق ویسے ہی کھویا ہوا تھا۔ اور اُن جانے میں کھچا سا جا رہا تھا۔

"میں نے کہا مسعود!" ضیا بولا "بھئی اسے سمجھاؤ نا، ابھی تو ہمیں مسافت طے کرنی ہے۔"

"بھئی عجیب بات ہے" عمر چلایا۔ "یہاں کے مرد یوں ہیں جیسے اکتائے ہوئے ہوں اور ان گانے والیوں میں بھوک اور گرسنگی ہے۔ کیوں مسعود ہے نا؟" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر وہ پوچھنے لگا "کیوں مہاراج، تمہارا علم کیا کہتا ہے اس مسئلے کے بیچ؟"

"ہا" مسعود کا وہی قہقہہ گونجا۔ "ہا" اور اس کی تھوتھنی سمٹ کر اپنی جگہ پر آگئی۔

ضیا خوش ہوا کہ اس کے اڑھائی ہزار کے کیمرے کی بات پس پشت پڑ گئی۔ وہ تالیاں پیٹنے لگا۔ عمر نے مسعود کا رنگ بدلتے دیکھا تو جھٹ ایک ایک سیب سب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "ہا" مسعود نے سیب کھاتے ہوئے کہا "چکر میں ڈالنا منفی پر ختم ہے، اس سے پوچھو گے تو تمہیں چکر میں ڈال دے گا۔ اس سے پوچھو کہ یہاں کے مرد اکتائے ہوئے کیوں ہیں؟ تو کہے گا اس لئے کہ عورتوں کی نگاہوں میں تشنگی ہے۔ اور اگر پوچھو کہ عورتوں کی نگاہ میں تشنگی کیوں ہے؟ تو کہے گا اس لئے کہ مرد اکتائے ہوئے ہیں۔ ہا" اس کا وہ بھیانک قہقہہ گونجا۔

"ہا ـــــ ہا"

"ہی ہی ہی ہی" ضیا نے گویا ہنسی کی پچکاری چلائی۔ "لیکن یار بیچارہ خود چکر میں پڑا ہے۔ کسی کو کیا ڈالے گا"

"اونھوں" عمر بولا "یہ خود نہیں پڑا بلکہ نفسیات کا علم بذاتِ خود ایک چکر ہے۔"

"ہا" مسعود چلایا۔ "واہ!"

سر دے میں سے چھینٹے اڑنے لگے، مرچ گویا کڑاھائی میں سوں سوں کر رہی تھی۔

"ارے" دفعتاً ضیا چلایا "یہ کیا تھا؟"

"کیا، کیا تھا؟" عمر نے پوچھا۔

"یہ جو میں نے ابھی کھایا ہے" ضیا بولا "یہ کیا سیب تھا؟"

"اور کیا بھنے ہوئے چنے تھے؟" اسحاق نے چمک کر بات کی۔

"منہ میں تو ایسا ذائقہ ہے جیسے حلوہ کدو کھایا ہو۔ ایمان سے ہمارے گاؤں کے شلغم ہی اِن سیبوں سے زیادہ شیریں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں ہمارے گاؤں میں ایک گورا پلٹن آنکلی۔ کنجڑا شلغموں کا ٹوکرا رکھے بیٹھا تھا۔ ٹامیوں نے پوچھا 'واٹ دِس؟' کنجڑا بولا 'سیب۔ سیب۔ فروٹ'۔ وِل وِل فروٹ کہہ کر وہ پل پڑے، کنجڑے نے ایک ایک آنے میں سارے شلغم بیچ دیئے، ایمان سے! اور یہ سیب۔ ہونہہ!"

"عجب آدمی ہے" عمر چلایا "بھئی یہ جگہ تو سیبوں کے لئے مشہور ہے۔ اور تم کہہ رہے ہو یہ سیب سیب ہی نہیں۔"

"بھائی" اسحاق نے کہا "کبھی اٹک کے پل پر گئے ہو۔ وہاں تلی ہوئی مچھلی بکتی ہے، وہاں کی مچھلی مشہور ہے۔ لوگ کراچی سے چل کر آتے ہیں اسے کھانے کے لئے، اور معلوم ہے وہ مچھلی آتی کہاں سے ہے؟ دریا سے نہیں، کراچی سے! ہاں، کریٹ کے کریٹ بھرے آتے ہیں۔ روز ریل گاڑی سے۔"

"ٹھیک تو ہے" مسعود بولا "دریا کے کنارے بیٹھ کر مچھلی کھانے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ سمندر سے پکڑی ہوئی مچھلی کھا رہا ہے۔"

"ہاں بھئی" اسحاق نے کہا "یہ سوچنے کی بات ہے"
"چھوڑو اس چکر کو" مسعود بولا "آخر دنیا کی اقتصادی مشکلات کا غم ہم کیوں کھائیں؟"
"ہاں بھئی تم ملوکدہ سیب کھاؤ" ضیا چلایا۔
"تمہیں سیبوں کا کیا پتہ ہے؟" عمر غصے میں آگیا۔
"عمر سے کسی پہاڑی چیز کی عیب جوئی نہ کیا کرو" عبداللہ نے پہلی مرتبہ بات کی "اُسے غصہ آجاتا ہے"
"کیوں؟" ضیا نے پوچھا "اس کا سسرال ہے کیا؟"
"نہیں ننھیال ہے" عبداللہ نے جواب دیا۔
"جبھی تو اُسے پہاڑوں پر چڑھنے کا خبط ہے" مسعود بولا "جس طرح بلی چوہے کو دیکھ کر اُسے مارنے پر مجبور ہوتی ہے، یہ پہاڑ دیکھتا ہے تو اس پر چڑھنے کا خبط دیوانگی بن کر اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے"
"نہ بھائی" ضیا بولا "یہ اس کا ننھیال ہے، یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی"
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"جو یہ اس کا ننھیال ہے تو پھر اس کے چہرے پر اکتاہٹ کیوں نہیں؟ اُلٹا اس کی نظر میں تو ننگی بھوک ہے" ضیا نے ہنسی کی پچکاری چھوڑی۔
"تو کیا ــــ؟ ہاہا - ہاہا" مسعود ناچنے لگا"
"بدبخت، کمینے" عمر نے سیب تھوک کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔
"اب چلوگے بھی بابوجی؟" گاڈی ڈرائیور نے قریب آکر کہا۔
"ہاں بھئی" عبداللہ بولا "ون وے ٹریفک ہے۔ ورنہ رات یہیں بسر کرنی پڑے گی"
"چلتے ہیں، چلتے ہیں" ضیا بولا "پر خان صاحب" اس نے گاڈی سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ یہاں کے دکانداروں کو کیا ہے؟"
"کیا ہے؟" وہ بولا۔
"یہ اس قدر اُکتائے ہوئے کیوں ہیں، جیسے گاہک کی پرواہی نہ ہو، بکری کا خیال ہی نہ ہو"
"جیسے سیر بھر پلاؤ کھا کر سیر ہوئے بیٹھے ہوں" مسعود نے بات کی وضاحت کی۔
"بابوجی" گاڈی بولا۔ "انہیں گاہک کی کیا پروا؟ گاہک تو ان کی رعایا ہیں"
"ارے رعایا؟" ضیا چلایا
"بابوجی یہ دکاندار نہیں، یہ تو کاغان کے سید ہیں، ساری زمینوں کے مالک ہیں"
"فیوڈل لارڈ ہیں" عبداللہ نے وضاحت کی۔
"تو بھئی یہ کمبی نیشن بھی عجیب ہے" عمر ہنسا۔ "فیوڈل لارڈ دکانداری کر رہے ہیں"
"یعنی" مسعود چلایا۔ "اپنی رعایا کو سودا دے کر احسان کرتے ہیں۔ کپڑا بیچتے ہیں، اُن کا تن ڈھانکتے ہیں۔ یہ بات ہے نا؟"
"مطلب ہے" ضیا بولا۔ "یعنی جو پیسے قیمت کے طور پر وصول کرتے ہیں وہ ایک ضمنی بات ہے"
"پھر تو ٹھیک ہے بھائی یہ اکتاہٹ" مسعود بولا۔
"اور وہ ننگی بھوک" ضیا چلایا۔
"وہ تو ہوگی، مالدار ہونے کا دوسرا رُخ ہے نا" مسعود نے کہا۔
"پھر تو نفسیات کا وہ چکر ٹھیک ہوا نا" عمر بولا۔

کراچی میں پاکستانی مصور "صادقین" کی تصاویر کی نمائش — افتتاح: وزیر اعظم پاکستان

وزیر اعظم پاکستان کا دورہ جاپان

بگولہ وسیم ایدین

دعا محسن حسین

بہار حبیب ابراہیم رحمت اللہ

یہ تصویریں

صفحہ مقابل پر جو تصویریں پیش کی جا رہی ہیں وہ پاکستان کے تین ممتاز عکاسوں کے فن کے نادر نمونے ہیں جن کو فوٹوگرافی کے بین الاقوامی ادارے "الیف اے آئی پی" نے حال ہی میں فوٹوگرافی کے اعلیٰ ترین خطابات "آنریری ایکسیلینسی" اور "ایکسیلینسی" عطا کئے۔ اس سے پہلے کسی پاکستانی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا ہے۔

یہ خطاب ان فنکاروں کو دئے جاتے ہیں جو نہ صرف فوٹوگرافی کی مشہور عالمی نمائشوں میں فن کے معیاری نمونے پیش کرنے کے اہل ہوں بلکہ اس کی مدتوں بے لاگ خدمت بھی کرتے رہے ہوں۔ ادارہ دنیا کے تمام فن کاروں کے کام کو برسوں جانچتا رہتا ہے اور جب کوئی فن کار ہر لحاظ سے معیار پر پورا اترتا ہے تو اس کی کاوش اور خدمات کے اعتراف میں یہ خطابات دئے جاتے ہیں جن کو وہ عمر بھر اپنے نام کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی ایک ڈپلوما اور طلائی بیج بھی اعزاز کے طور پر دیا جاتا ہے، جو عکاس کے ماہر فن ہونے کی علامت ہے۔

مذکورہ بالا تینوں عکاس پاکستان کے اولین اور ممتاز ترین ادارۂ عکاسی "فوٹوگرافک سوسائٹی آف پاکستان" کے سرگرم و سرکردہ اراکین ہیں اور انہوں نے پاکستان میں اس فن کو ترقی دینے اور اس کا ذوق عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کی کھینچی ہوئی تصاویر دنیا کی متعدد مشہور نمائشوں میں دکھائی گئی ہیں۔ GONE WITH THE WIND — لندن کی ایک نمائش میں دکھائی جا چکی ہے اور تین نہایت مشہور رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ مسٹر ابراہیم رحمت اللہ (آنریری ایکسیلینسی) ایک عرصہ فوٹوگرافک سوسائٹی کے صدر رہے ہیں اور مسٹر وسیم الدین (آنریری ایکسیلینسی) اس کے سکریٹری ہیں۔ مسٹر محسن صبیح (ایکسیلینسی) اس سوسائٹی کے رسالہ "فوٹو ٹرینڈ" کے مدیر اعزازی ہیں جو پاکستان میں فوٹوگرافی کا واحد رسالہ ہے۔ ان کی تصویر ILL MANNERED دنیا کی بہترین تصویروں میں چنی گئی تھی اور الیف آئی اے پی ایئر بک میں پورے صفحہ پر شائع ہوئی +

سانیٹ:

شاید صدف، شاید گہر!

(کیماڑی سے منوڑا جاتے ہوئے)

ش، ضحیٰ

نیلے نیلے پیچ و خم کا ایک لہراتا چمن
ہلکے ہلکے زیر و بم میں کچھ سکوں، کچھ اضطراب
یہ سفینہ ہے کہ نغمہ، وہ جزیرہ یا حباب
جھاگ کے فانوس میں شمعوں کی رنگیں انجمن
میں کہ حیراں، تو کہ حیرانی پہ میری خندہ زن
اِک حقیقت کتنی واضح، کتنا مبہم ایک خواب
اِک طرف فطرت کے جلوے، اِک طرف تیرا شباب
اور میرے دل کے آئینے میں دونوں ضو فگن

دل کا آئینہ کہ ہے خود ایک بحرِ بے قرار
جس کے مدّ و جزر ہیں یہ منظرِ شام و سحر
جس کی موجیں کہکشانی رفعتوں سے ہمکنار
جن پہ رقصاں دو سفینے، ایک سورج اِک قمر
تو اسی دل کے تموّج کا ہے کوئی شاہکار
اور میں؟ اس موج کا شاید صدف، شاید گہر!

روزنامچہ:

ماہ مارچ کے لیل و نہار

حجاب امتیاز علی

یکم مارچ سہ شنبہ: آج صبح ایک بھونرا دروازے سے اندر آیا اور دریچے سے باہر نکل گیا!

بہاریں آنے ہی والی ہیں ——— !

۴ر مارچ شنبہ: رات شب گذشتہ محفل موسیقی سے ڈیڑھ بجے گھر واپس پہنچے۔ رات بے حد سرد اور دل بے حد غیر مطمئن تھا۔ رات کے دو بجے کے قریب کھانے کی میز پر بیٹھی کافی پی رہی تھی کہ کسی نے صحن باغ کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اتنی رات گئے سوائے چور کے اور کون ہو سکتا ہے! یہ سوچ کر پریشان سی ہو گئی۔ دوبارہ سہ بارہ کھٹ کھٹانے پر آہستہ سے دروازہ کھولا اور جالی کے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا تو صندل ——— صندل کو دیکھ کر اچانک سردی کا احساس کافور اور اطمینان قلب شدید ہو گیا۔ یہ بلا آج چار دن سے پر اسرار طریق پر گم ہو گیا تھا اور میں سخت پریشان تھی۔ خیر صبح کا گیا شام کو لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ حالانکہ رات تین بجے سوئی تھی، مگر آج آنکھ سویرے کھل گئی۔ ناشتے پر پھل اور شہد کھایا۔ عرشہ چمن پر بیٹھ کر اخبار ختم کیا۔ آج اخبار میں ایک دلچسپ خبر پڑھی۔ لکھا ہے ایک بیل نے خودکشی کر لی! اور اس خودکشی کی تہہ میں عشق کارفرما تھا! اس عجیب خودکشی کی تفصیل یہ ہے کہ جودھپور سے خبر آئی ہے کہ ایک انعام یافتہ بیل نے ڈیڑھ سو فٹ بلند عمارت پر چڑھ کر چار دفعہ خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ مگر چاروں دفعہ عین وقت پر اُسے بچا لیا گیا۔ اس خوفناک ارادے سے ہفتہ بھر پہلے اس پیارے جانور "بندے" نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور روپوش ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ایک چوکیدار نے اُسے عمارت پر چڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور بمشکل خودکشی سے باز رکھ کر نیچے اُتار لایا۔ مگر ۳ر مارچ کی منحوس صبح ——— لوگوں نے دیکھا۔ اسی عمارت کے نیچے بندے کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں اسے محبت کی ناکامی نے خودکشی پر آمادہ کیا تھا ——— ! یہ خبر پڑھ کر میں سوچتی رہی کہ اب عشق کی دست درازی جانوروں تک بھی جا پہنچی! میری تشخیص یہ ہے کہ اگر مرحوم بیل نے واقعی خودکشی کی ہے تو وہ "نروس بریک ڈاؤن" کا مریض تھا۔ اسے تجزیۂ نفس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ناکامیٔ عشق سے جو شخص بھی خودکشی کرتا ہے ظاہر ہے اس کی وجہ محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کا اپنا دبا ہوا شدید غصہ ہوتا ہے۔ یہ کام ایک اعصابی ہی کر سکتا ہے۔ ویسے تو اسٹیکل نے بھی اسّی سال کی عمر میں خودکشی کی تھی مگر اس کی وجہ اُس کا فساد اعصاب نہیں تھا۔ خودکشی ہمیشہ غیر متوازن ذہنیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محبت انسان کو حیاتِ جاودانی بخشتی ہے، موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکتی۔

چھ بجے آرٹس کونسل کا کھیل "مرا قاتل" دیکھنے گئی۔ وہاں سے پونے دس بجے فارغ ہوئی۔ اور ہم تینوں "ایڈیٹر" ہال ہوں ——— "میاں بشیر احمد کے ہاں ڈنر پر چلے گئے۔ چونکہ وقت مقررہ سے دیر میں پہنچے تھے۔ اس لئے برآمدے میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ ابھی مہمانوں نے کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ پلیٹیں ہاتھ میں لئے کھڑے تھے میرے اندر جاتے ہی بیگم گیتی بشیر احمد نے کہا کئی مہمان نہیں آئے ہیں۔ نہ جانے لوگوں میں کیا مرض ہے کہ عین وقت پر ٹیلی فون کر کے معذرت چاہ لیتے ہیں۔ اس کے باوجود کمرۂ طعام مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میاں بشیر احمد اور بیوی بشیر احمد (بقول شوکت تھانوی) کی خوش طبعی اور خوشدل مہمانوں کے قہقہوں نے غیر موجود مہمانوں کا خیال نہ آنے دیا۔

رات نہایت خنک ہے، بادل ہیں، گھٹائیں ہیں اور نہایت تند ہوائیں۔

۵ر مارچ سہ شنبہ: رات کے کھانے سے بڑی دیر میں گھر لوٹی۔ آج ریڈیو والوں کو ایک افسانہ مکمل کر کے دینا تھا۔ چنانچہ عرشہ چمن پر بیٹھ کر تمام صبح لکھتی رہی۔ بارہ بجے کے قریب بلیوں کو لے کر سبزے پر چہل قدمی کرتی رہی۔ ایک بجے ہم تینوں مسٹر "کنڈاوالا" کے ہاں لنچ پر چلے گئے۔ دوپہر حسین اور روشن تھی۔ اور کھانے کی میز موسمی پھولوں سے آراستہ۔ وہاں مسٹر اور مسز چیمپین سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب ہالی وڈ سے "پاکستان" نامی فلم بنانے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ کھانے پر شانغ تانگ سی ایک جاپانی لڑکی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اسے دیکھ کر بار بار باغ کی تیتری کا خیال آتا رہا۔ اس دعوت میں صرف امریکن اور جاپانی تھے۔

پھر افسانہ ختم کر کے روانہ کر دیا ؛
پونے تین بجے گھر واپس آئی پانچ منٹ باغ کے زینے پر کھڑی گہرے نیلے آسمانوں کو دیکھتی رہی۔ یاسمین نے پہلی ہی بار پارٹ ایسے رکھ رکھاؤ
چھ بجے آرٹ کونسل کے کھیل "مرا قاتل" دیکھنے پھر چلی گئی۔ اس کھیل میں یاسمین بھی پارٹ ادا کر رہی ہیں۔ وہاں سے سوا نو بجے فارغ
اور نفاست سے کیا ہے کہ ایک ایک ملنے والے نے بے حد تعریف کی۔ آج تماشائی بہت زیادہ تھے۔ کئی تو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے واپس چلے گئے۔ منظور قادر صاحب علیل
ہو کر ہم تینوں وہیں سے سیدھے لیڈی عبدالقادر کے ہاں ڈنر پر چلے گئے۔ یہ کھانا انہوں نے اپنے بیٹے میجر جنرل الطاف کے اعزاز میں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد بیگم منظور قادر
ہیں۔ مگر اس کے باوجود مہمانوں کے درمیان ایک دیوان پر نیم دراز رہے اور باوجود بخار ہونے کے شگفتہ نظر آنے کی کوشش کرتے رہے۔ اتنی دیر باتیں کرتے
اُنہیں معالج کی ہدایت پر آرام کرنے کے لئے اندر لے گئیں۔ امتیاز، لیڈی عبدالقادر اور بیگم میجر جنرل اعظم خاں معاشرتی و ثقافتی موضوع پہ
رہے کہ نصف شب گذر گئی۔ تینوں کمرے مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے ؛
رات ایک بجے واپس آ کر روزنامچہ لکھ رہی ہوں۔ سردی کی وجہ سے تمام بلیاں لحافوں میں محوِ خواب ہیں۔ اور آسمان کے مشرقی حصے پر ایک ستارہ بڑی تیزی سے

چمک رہا ہے ؛
۶ مارچ ۵۷ء : آج صبح "بس سٹاپ" فلم دیکھا۔ یہ میرا اس سال کا اٹھارواں فلم ہے۔ پونے چار بجے کینرڈ کالج گئی جہاں امتیاز کو چھوٹی
لڑکیوں کا ڈرامہ دیکھ کر رائے زنی کرنی تھی۔ لڑکیوں نے اپنی بساط بھر اچھا کھیل کیا۔ پونے چار بجے "چین پاکستان دوستی" کی استقبالی چاء میں گئی جو آرٹ
کونسل کے خوبصورت سبزہ زار پر تھی۔ ساڑھے پانچ بجے "نپولین نینا سی" فلم دیکھنے چلی گئی۔ کئی ریویو اس کی تعریف میں پڑھ چکی تھی۔ پیش کش اچھی معلوم
ہوئی۔ مگر جو کچھ دکھایا اس کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہی۔ رات کو کھانے کے بعد دوسری منزل کی چھت پر بیٹھی تارے گنتی اور کانپتی رہی۔ کیونکہ رات بعید
خنک تھی۔ اندھیرے درختوں پر پرند بدخوابی کی وجہ سے کبھی کبھی کراہنے لگتے تھے ؛
۷ مارچ ۵۷ء : بہاروں کو کیا ہو گیا ہے؟ کسی طرح آنے ہی نہیں پاتیں۔ میں تقریباً ہر صبح اس امید میں اٹھتی اور صحن گلستاں میں جاتی ہوں
کہ شاید بہار کی گرم ہواؤں کا کوئی جھونکا موتیا اور یاسمین کی کلیوں کو آج شگفتہ کر دے گا۔ مگر سرما کی سرد بے لطف ہوائیں کلیوں کو کھل کر پھول نہیں بننے دیتیں۔
آج ساتویں مارچ ہے مگر نہ کہیں کوئل کی کوک سنائی دیتی ہے نہ کسی ابابیل کی کوئی سیٹی! ۔ ہاں پرسوں شام کی بات ہے کہ پائیں باغ میں نارنجی گلاب کے عقب میں
ایک بلبل سرنگوں نظر آئی تھی وہ بھی میری طرح بادِ مخالف کی شاکی معلوم ہوتی تھی ؛
حسبِ معمول صبح کا سارا وقت عرشۂ چمن پر تحریری کام میں گذر گیا۔ ان دنوں میں مسودے ٹھیک کر رہی ہوں ؛
آج آسمان کی رنگت گہرے کاسنی رنگ کی رہی جو عموماً آخری خزاں میں رہتی ہے۔ البتہ شام کے قریب اس کا رنگ ارغوانی ہو گیا تھا۔ جو اکثر ابتدائی بہاروں

میں ہوا کرتا ہے ؛
آج میں نے کھانے پر سرو بالائی بھی کھائی۔ اس کے بعد باغ کے زینے پر بیٹھ کر دیوانِ غالب پڑھتی اور یوڈی کولون سونگھتی رہی۔ پھر چار بج کر چند منٹ
صحن گلستاں میں بلبل کی نغمہ سرائی سنتی رہی۔ چار بجکر دس منٹ پر "فار بیڈن" فلم دیکھا۔ سوا چھ بجے آرٹ کونسل کے مشاعرے میں چلی گئی۔ جب فیض احمد فیض
صاحب نے اپنی نظم پڑھی اور اس کے بہترین مصرع پر پہنچے تو میرے پیچھے سے چند خواتین نے "ویری گڈ۔ ویری گڈ" کہہ کر انہیں داد دی۔ اس جدید طرز
کی داد کو سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ آئندہ ہمارے مشاعروں میں شاعروں کے آگے شمع کی بجائے ٹیوب لائٹ پیش کی جائے گی! زہرہ نگاہ نے بال ترشوا دیئے
ہیں۔ مجھے پسند آئے۔ مگر راجہ غضنفر علی خاں صاحب نے جھک کر مجھ سے سرگوشی کی۔ "شاعرہ نے بال کیوں ترشوا دیئے؟" میں نے کہا عورتیں معمہ ہوتی ہیں۔
اُن کی باتیں وہی جانیں! ؛
رات کا کھانا گھر پہ کھایا۔ پھر عرشۂ چمن کے تاریک گوشے میں دیر تک بیٹھی تاروں میں کھوئی سردی سے کانپتی رہی ؛
۸ مارچ ۵۷ء : آج کا دن یوں ہی گذر گیا ——
پونے ۳ بجے کے قریب باغ کی راہ سے دو گلابی پروالی تیتریاں اکٹھی رقص کرتی ہوئی اندر آئیں اور لمحہ بھر میرے سامنے ناچ کر باہر نکل گئیں ——
اب نہ جانے یہ بچھڑی ہوئی کب ملیں! کیونکہ زندگی کی رقص گاہ نہایت پیچیدہ اور طویل ہے ۔ !

۹ر مارچ ۵۷ء : آج صبح "بیٹوین هیون اینڈ هیل" فلم کا سنسر شو دیکھا۔ واپس آکر مسودے ٹھیک کرتی رہی۔ ایک کہانی مکمل کر کے الماری میں بند کر دی۔ پھر باغ کی سیڑھی پر بیٹھ کر "پیکاسو" کی تصاویر والی کتاب دیکھتی اور پڑھتی رہی۔ گذشتہ مہینے میں تجریدی فن کی تصاویر کی ایک نمائش ہوئی تھی جو مجھے بہت پسند آئی۔ جدید آرٹ اور اس کے بیباک شوخ رنگ بڑے دل آویز ہوتے ہیں۔ جدید فن کو دیکھتے ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ مصوّر کے مدفون اور خفیہ جذبات کا اشارتی اظہار ہے۔ اس طرح تجریدی آرٹ دیکھنے والے کے لئے زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ فرائڈی نفسیات ہمیں اپنی ذہنی تندرستی کی سلامتی کے لئے اپنے دبے ہوئے جذبات و احساسات کے اظہار کا بڑی شدت سے مشورہ دیتی ہے اور خفیہ جذبوں کی اظہاریت کے لئے فن سے زیادہ اور کیا چیز موزوں ہو سکتی ہے! انسان کے دبے ہوئے نامعلوم خوفناک ارادوں اور جذبوں کا ایک حسین اظہار اس کا فن ہوتا ہے۔ دوسری بات جو اس جدید آرٹ کو دیکھ کر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مصوری محض فطرت کی نقالی نہیں بلکہ فن کار کی انفرادیت کا اعلان ہے۔ زندگی جھوٹ بول کر بھی گذاری جا سکتی ہے مگر فن میں جھوٹ نہیں چل سکتا۔ اس میں خالص صداقت کی ضرورت ہے اور فن میں صداقت اسی وقت آتی ہے جب اس میں فن کار کی شخصیت، اس کے فلسفے، اور اس کی انفرادیت کی شدید اظہاریت ہو۔

آج دیر تک میں دیوانِ غالب بھی پڑھتی رہی اور سر دھنتی رہی ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے!

سوال یہ ہے کہ آج اس قسم کی بیخودی کس کو نہیں چاہیئے!

شام کو "سیمی ریمیس" فلم دیکھا۔ توقع تھی کہ مصرِ قدیم کا یہ افسانہ لذیذ ہو گا مگر مایوسی ہوئی۔

۱۰ر مارچ ۵۷ء : آج سنسر شو میں امتیاز کا جانا لازمی تھا۔ اس لئے صبح کے وقت "آئی ڈائیڈ اے تھاؤزنڈ ٹائمس" دیکھا۔ واپس آکر مسودات درست کرتی رہی۔

آج شام ہم نے اُن تمام اداکاروں کو چائے اور موسیقی پر مدعو کر رکھا تھا جنہوں نے آرٹ کونسل میں امتیاز کے کھیل "مرا قاتل" اور "باکس اینڈ کاکس" میں کردار ادا کئے تھے۔ یہ سب اداکار گورنمنٹ کالج اور دو ایک اور کالجوں کے طالبعلم ہیں۔ ان کے علاوہ مسٹر جسٹس ایس۔ اے رحمان (صدر آرٹ کونسل) اور مسٹر خلیل (سکریٹری) بھی شریکِ محفل رہے۔ بیس پچیس لوگ تھے۔ "مرا قاتل" کے پروڈیوسر مسٹر صفدر میر (پروفیسر گورنمنٹ کالج) بھی شریک رہے۔ اُنکی شرکت سے ظاہر ہوا کہ طوفان گذر چکا۔ لہٰذا ہم سب کو خوشی ہوئی۔ مہمانوں میں سے کئی نے گا کر سنایا۔ یاسمین نے کلاسیکی موسیقی آج دل لگا کر یوں گائی کہ مجھے کلاسیکی موسیقی پر جو اعتراضات تھے وہ چند منٹوں کے لئے بالکل دور ہو گئے۔ بہار کی جنوں انگیز شاموں میں بہترین موسیقی کو سُن کر عام طور پر مجھے مالیخولیا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

شام ہوشربا تھی۔ اداکار مہمان خوشدلی سے ہنس بول رہے تھے۔ بعض مہمان تو بڑی دیر تک ٹھہرے رہے۔ اِن سب کے جانے کے بعد ساڑھے نو بجے میں ایک لمبی ڈرائیو کو چلی گئی۔ واپس آکر بلیوں کو طاقت کی گولیاں نگلوائیں۔ اب ڈیڑھ بجے کے قریب یہ روزنامچہ لکھ رہی ہوں ـــ ابھی تو مجھے کچھ دیر تاروں کی دنیا میں بھی جانا ہے۔

۱۱ر مارچ ۵۷ء : صبح اُٹھتے ہی خواب گاہ کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے صحن گلستاں کو دیکھا۔ پائیں باغ میں گلابی، زرد، نارنجی اور تربوزی رنگ کے بیسیوں گلاب قہقہے لگاتے نظر آئے۔ لیمو کی کیلوں میں لپی ہوئی چینی کی چائے پی۔ اور بلیوں کو لیکر تختۂ گلاب کے قریب چہل قدمی کرتی رہی۔ پھر سرِ شام چمن پر بیٹھ کر تحریری کام میں مصروف ہو گئی۔ آج اعصاب تہہ و بالا سے ہیں۔ اِس لئے کام میں دل نہ لگا۔ لہٰذا بالاخانے پر چلی گئی اور خواب گاہ کے دریچے میں جھک کر "شاہکار تصاویر" دیکھتی رہی۔ بڑی خوبصورت کتاب ہے۔ اس میں ایک تصویر پر مری نظر جم کر رہ گئی۔ تصویر کے نیچے امتیاز نے یہ تشریح لکھی ہے :-

"قدیم مصر کی دیواری تصاویر میں کسی بلّی کی تصویر زندگی سے ایسی بھرپور نہیں جیسی "کرسی تلے بلّی" ہے۔ بلّی ایک نقشین کرسی کے پائے سے بندھی ہے۔ کھانے کی طشتری اس کی پہنچ سے باہر ہے چنانچہ جھنجھلاہٹ اور جھلاہٹ کے مارے بدن کا ایک ایک رُواں کانٹے کی طرح کھڑا ہے۔ مصور کو ٹھیک علم نہ تھا کہ بلّی کی دُم کہاں ہوتی ہے؟ اس نے دو بار دُم لگانے کی کوشش کی لیکن دونوں ہی بار ناکام رہا۔"

یہ پڑھ کر میں نے غور سے تصویر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بلی کی دُم مصوّر نے پہلے تو بلی کے نیچے لگانے کی کوشش کی تھی پھر جب اسے اپنی صریح غلطی کا احساس ہوا تو سوچ سوچ کر اور اپنی طرف سے صحیح جگہ منتخب کر کے کمر کے عین اوپر لگا دی! ۔۔۔ "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا" !! بھدا نی کے اس گمنام معری مصور کی اس انجانیت پر پیار آنے لگا۔ جو بھی اس تصویر کو دیکھے گا اسے مصور کے بھولپن پر پیار آئے گا۔ اور دُم کی بے جا جگہ دیکھ کر ہنسی بھی آئے گی اور تعجب بھی ہوگا۔

اس کتاب میں ایک سیاہ رُو سیاہی بلی کی تصویر دیکھی جس کی آنکھیں بہار کے آسمانوں جیسی گہرے فیروزے رنگ کی ہیں۔ ایسی ہی آنکھیں میرے بلّے عنبر کی ہیں ÷

چھ بجے "بلیک ماسک" فلم دیکھی۔ رات بزمِ اقبال کے ڈنر میں چلی گئی جو ایران کی ڈاکٹر کاظمی کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ میزبان خلیفہ اور بیگم عبدالحکیم تھے بہت سے علماء موجود تھے۔ چونکہ ڈاکٹر کاظمی طبیب ہیں۔ اس لئے بعض ڈاکٹر صاحبان بھی مدعو تھے۔ ڈاکٹر کاظمی حسین اور دلآویز خاتون ہیں۔ اور پاکستان کی شیدا ہیں۔ دیر تک میں اُن سے ایران کے افسانہ نگاروں کے متعلق پوچھتی رہی۔ کھانے کے بعد تقریریں ہوئیں۔ اخیر میں خاتون موصوفہ نے بھی انگریزی اور فارسی میں مختصر مگر معقول تقریر کی ÷

واپسی میں رات نہایت خیال انگیز ہوگئی تھی۔ خنک ہوائیں تھیں اور کالی گھٹائیں۔ کہیں کہیں بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ واپس آ کر ہم نے کافی پی۔ بلیوں کو دودھ دیا۔ اور جعفر طوطے کو ایک امرود ÷

۱۲ مارچ ۶۵ء: صبح سے آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے چاروں طرف پھول کھلے ہوئے ہیں ۔۔۔! آج تمام دن مالیخولیا کی سی کیفیت چھائی رہی۔ یہ سب بہاروں کا اثر ہے! میرے دونوں کبوتر "سُنبل و ریحان" کل شام سے لاپتہ ہیں ÷

صبح کے وقت حسبِ معمول عرشۂ چمن پر تحریری کام کرتی رہی مگر طبیعت بے چین سی ہوگئی تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نیچے کی منزل میں چلی گئی۔ گُلدانوں کے پانی کی مقدار ٹھیک کی اور اُن میں ایک ایک جن البسپرین کی ٹکیہ ڈالی۔ پھر تازہ پھول کاٹ کر دیگچوں میں لگائے۔ مگر طبیعت کا رحجان قنوطیت کی طرف مائل رہا اور غیا آتا جنوں انگیز! لہٰذا سکونِ اعصاب کے لئے یوڈی کلون سونگھتی رہی اور سبز آسمانوں کے نیچے چپ بیٹھی کتاب پڑھتی رہی ÷

آج لنچ پر چند دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ لہٰذا ایک بجے کے قریب تیار ہو کر نیچے اُتر آئی۔ بہاریں تھیں اس لئے میں نے کھانے کی میز پر آڑو کے شگوفوں کے لاتعداد گچھے جگہ جگہ رکھ دیئے اور سرخ گلاب کی پتیوں کی تو میں نے بارش کر دی۔ پھولوں کی اس افراط کے باوجود میرے دو مہمانوں کی طبیعتیں خواہ مخواہ اخلاقی تنزلیہ پر مائل رہیں۔ اور عین کھانے پر ایک خاص موضوع پر کج بحثی شروع ہوگئی۔ دونوں حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے کے چراغِ محفل سمجھے جاتے ہیں۔ مگر کج بحثی کا علمیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ اس کی وجہ آدمی کی جہالت ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ آدمی کا اندرونی جذباتی انتشار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اکثر پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اُلٹی باتیں کرتے اور کج بحثی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ ہماری معاشرت میں بے شمار ہیں۔ ان کے جذبات کی تحت الثریٰ میں جھانک کر دیکھیے تو کیا نظر آئے گا ۔۔۔؟ ایک تلاطم بے ترتیب! ۔۔۔ اس نامعلوم بے ترتیبی سے جو بے چینی اُن کی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اس کو ترتیب دینے کی کوشش میں اکثر اُن لوگوں کی علمیت کی کشتی ڈگمگاتی نظر آتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے اس اندرونی انتشار سے آگاہ اور محتاط رہنا چاہیئے۔ اِس موضوع پر کبھی بحث نہیں کرنی چاہیئے جس کے متعلق کوئی معلومات نہ ہوں۔ ایک عالم اور ماہرِ فن کا طورِ طریق طالب علمانہ ہوتا ہے، استادانہ نہیں۔ آج کے دونوں حضرات اندر سے سخت کھوکھلے تھے اور اس پر ستم انداز استادانہ رکھتے تھے ÷

آج کی دوپہر کا رنگ گلابی تھا۔ شام کے قریب نیلا ہوگیا ۔۔۔ شام کو فلم "موبی ڈک" دیکھا۔ جس کتاب سے یہ فلم بنا ہے وہ میں نے نہیں پڑھی۔ یہ کتاب امریکی کلاسیکس میں شمار ہوتی ہے۔ فلم اکتا دینے والا ہے۔ گریگری پیک کے ڈاڑھی لگی ہوئی تھی جس سے اور وحشت ہوئی۔ رات کا کھانا گھر ہی پر کھایا اور صحنِ گلستاں میں بلیوں کو لے کر ٹہلتی رہی۔ آج طبیعت پر عجیب وارفتگی چھائی رہی ÷

۱۳ مارچ ۶۵ء: شکر ہے کل طوفان آنے کے آثار تھے۔ آج اس کے گذر جانے کی علامات ہیں! آج 'سنبل و ریحان' واپس آگئے۔ شام کو فلم "شارٹ گراس" دیکھا۔ آج آسمان بنفشی رنگ کا تھا۔ شام کے وقت گہرے سبز رنگ کا ہوگیا۔ جس پر کاسنی رنگ کے ٹکڑہائے ابر منتشر رہے ÷

۱۴ مارچ ۶۵ء: حسبِ معمول تمام صبح عرشۂ چمن پر بیٹھ کر تحریری کام کرتی رہی۔ تقریباً تمام مسودے درست کر لئے۔ کام کی رفتار یہی تیز رہی تو جلد فارغ ہو جاؤں گی۔ اور دوسرا افسانہ لکھنا شروع کر دوں گی ÷

آج کا دن بھی سرد تھا جس کی وجہ سے کئی کلیاں مکمل کر پھول نہ بن سکیں۔ آفتابی کرنوں کے چومنے کے بعد ہی تو موتیا کی کلیاں کھلتی ہیں۔ موسم کی اس بے جا

بے وقت کی خنکی نے بیزار کر رکھا ہے۔ مجھے خنکی نہ انسان میں اچھی لگتی ہے نہ موسم میں!

کھانے کے بعد خواب گاہ کے دریچے میں بیٹھ گئی۔ دو ہزار سال پہلے کے ایک گھوڑے کو تکتی اور سر دھنتی رہی۔ اگر حسن اور فن ایک ہی چیز ہے تو پھر کہنا پڑتا ہے کہ حسن کو ابدیت حاصل ہے۔ عظیم فن پارہ یعنی حسن کبھی فنا نہیں ہوتا۔ "شاہ کار تصاویر" میں ایک گھوڑے کے سنگین مجسمے کی تصویر درج ہے جسے ایک سنگ تراش نے دو ہزار سال پہلے تراشا تھا۔ تصویر کے نیچے کی عبارت تصویر کی طرح حسین ہے۔ لکھا ہے:-

> "شاعروں نے بے شمار کتابیں حسن کی تعریف میں لکھی ہیں کہ کس طرح وقت نہ حسن کو گہنا سکتا ہے نہ مٹا سکتا ہے۔ اس کا پیارا پن بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ دو ہزار تین سو سال گذرے ایک گمنام یونانی سنگ تراش نے گھوڑے کا یہ مجسمہ بنایا تھا۔ کیسے کمال کا جسم ہے! اس پہ یہ چنچل پن! ہوا کی بے فکری سے قدم اٹھاتا ہوا جیسے زمانے میں بڑھا آ رہا ہے!"

تصویر دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کائنات کی اس مہیب تاریکی میں عقیدت و محبت کی شمع لے کر اس پیارے یونانی کو ڈھونڈوں جس کے جسم کو ہر چند اجل نے عرصہ ہوا نابود کر دیا ہے۔ مگر یہ تراشیدہ فن پارہ آج دو ہزار سال بعد بھی اس کی زندۂ جاوید انفرادیت اور لافانی شخصیت کو ہمیشگی بخش رہا ہے۔ اس فانی دنیا میں ہمارا جسم نہیں —— بلکہ ہماری شخصیت اور شخصیت کا فلسفہ ہمیں زندہ رکھتا ہے۔ آج سقراط زندہ ہے۔ افلاطون زندہ ہے۔ ارسطو زندہ ہے۔ فرائڈ اور جیمز زندہ ہیں۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں اُن کے فلسفے کی داخلیت، اُن کی حیاتِ ابدی کی شاہد ہے۔

آج راجہ غضنفر علی خاں کے ہاں ڈپٹی ہائی کمشنر انڈیا مسٹر اور مسز راؤ کے لئے الوداعی ڈنر تھا۔ ابتدائی بہاروں کی حسین رات اپنے اندر ایک داستانیت سی لئے ہوئے تھی۔ راجہ صاحب کی نئی کوٹھی کے تقریباً تمام کمرے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ مہمان ایوانِ ملاقات کے علاوہ باغ کی شہ نشینوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ یاسمین نے میزبان کی خواہش پر دو دُھنیں گا کر سنائیں۔ مہمانوں میں ڈاکٹر خان صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہیں نیند آ رہی تھی۔ اور ان کے متعلق میرا خیال تھا کہ انہیں سوائے سیاسیات کے اور کسی شے سے دلچسپی نہ ہوگی۔ مگر عجیب بات ہے کہ وہ یاسمین کی کلاسیکی دھن سے متاثر ہو گئے۔ نصف شب کے گذرنے پر باغ کے اندھیرے پر زرد رنگ کا چاند نمودار ہوا۔ مہمانوں کے ہجوم سے ہٹ کر کسی نہ کسی طرح میں نے اسے دیکھ ہی لیا۔ دو ایک مہمانوں کو دکھلانے کی کوشش بھی کی۔ مگر مرد موجودہ سیاسیات پر نالاں اور رائے زنی کر رہے تھے اور خواتین ساڑھیوں کی قیمتوں پر! دونوں قابلِ رحم تھے۔ بہتر تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے مکروہاتِ دنیوی سے کنارہ کش ہو کر چاند کی پرستش میں محو ہوتے جسے دیکھ کر آج ڈانٹا کا خیال بے اختیار آ جاتا تھا کیونکہ آج وہ اس قدر درخشاں تھا جیسے نور کا دیوتا —— ! چاند دیکھ کر جب میں دوبارہ ایوانِ ملاقات میں واپس آئی تو راجہ صاحب فیض احمد فیض صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ اس پر فیض صاحب نے حسبِ معمول اپنی بے حد دھیمی آواز میں فرمایا، میں اپنی چیزیں لوگوں کو سناتا ہوں یا دوستوں کو۔ مگر جو خواتین و حضرات موجود ہیں انہیں نہ "لوگ" کہا جا سکتا ہے نہ سب "مرے دوست" ہیں لہٰذا مجھے معذور سمجھئے"! یہ سن کر میں پھر چاند دیکھنے میں محو ہو گئی۔

رات کے ڈیڑھ بجے واپس آ کر اب یہ چند سطور لکھ رہی ہوں۔ ابھی کافی ہے —— بلیاں ہیں —— تارے ہیں —— ان تین چیزوں سے فارغ ہو کر سو سکوں گی۔

۲۳ر مارچ ۵۷ء:- آج یوم جمہوریہ ہے! —— میں تمام دن بادلوں کو دیکھتی رہی۔ رنگین اور درخشاں ٹکڑے ابر سفید جیسے گہرے نیلے آسمانوں پر جانوروں، چلتے ہوئے جہازوں اور اپنے کئی جاننے والے دوستوں اور رشتہ داروں کی شکل اختیار کرتے رہے اور ہواؤں میں تیرتے رہے۔ میں چمن کے بالاخانے کی پرنیم دراز ہو کر تمام وقت بادلوں کا نظارہ کرتی رہی۔ یادداشت کے لئے لکھتی ہوں۔ گیارہ بجے کے قریب ایک بادل کا ٹکڑا بالکل شوکت تھانوی کی شکل اختیار کر گیا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے منہ میں پان نہیں تھا۔ میں بے اختیار ہنس پڑی۔ پھر وہ گلفام (مرا ابلا) بن گیا۔ پھر سوسن (بلی) بن کر رہ گیا۔

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

نقوشِ بہار

ضمیر اظہر

بہار کا مشک بیز پیکر
وہ مسکی نغمہ نواز، ساحر فسانہ گو، جھولتی جوانی
کہ جیسے فردوس کی کہانی،
سمن سفید و گداز اُس کے
وہ سرخ تازہ گلاب اُس کے
کچھ اس طرح شیشۂ تخیل میں نقش اپنا جما گئے ہیں
بہار اب تک نظر کی ساکت فضاؤں میں لہلہا رہی ہے

•

ربابِ دوراں کا راگ بدلا
عروسِ لیل و نہار کی مسکراہٹیں کھو گئیں اچانک فسانہ بن کر کسی خلا میں
سکوت کے غار میں بھٹک کر فنا ہوئیں حال کی صدائیں
چلیں کچھ ایسی شریر، گستاخ، تیز، تلوار سی ہوائیں
بکھر گئے شاخ شاخ سے ٹوٹ کر گلوں کے حسین ڈیرے!
جھلس گئے کیسے کیسے چہرے!!

•

خزاں کا سکّہ ہوا ہے جاری
چمن چمن ہے جمود طاری
شجر شجر برف سرنگوں ڈالیوں پہ چپ چاپ سو رہی ہے
ہوا کہیں جھاڑیوں میں منہ کو چھپائے نوحے سُنا رہی ہے
غموں کا جادو جگا رہی ہے
میں پھر بھی ہوں مطمئن کہ دل میں
کوئی حسیں شے لبادۂ ہفت رنگ میں مسکرا رہی ہے
بہار اب تک نظر کی ساکت فضاؤں میں لہلہا رہی ہے

رہ و رسمِ وفا

شاہد عشقی

نہ تو ہے آج نم آلود کوئی گوشۂ چشم
نہ کسی دستِ نگاریں کا سہارا حاصل
اس بھرے شہر میں تنہائی کا شکوہ ہے مجھے
آج اک لفظِ محبت کو ترستا ہے یہ دل

نقش جو چھوڑ گئے تھے آشفتہ مزاجی نے مری
اجنبی قدموں سے دھندلائے ہوئے ہیں یکسر
کل جہاں میرے لئے سارے دریچے وا تھے
وا نہیں آج وہاں میرے لئے ایک بھی در

یوں بھی تنہائی ہر انساں پہ گراں ہوتی ہے
اور پھر طرفہ ستم یہ ہے کہ شاعر ہوں میں
چند یادیں ہیں جو سینہ سے لگا رکھی ہیں
ورنہ خود اپنے وطن میں بھی مسافر ہوں میں

ان ہی یادوں سے فروزاں ہے شبستانِ خیا
قلبِ انساں میں حرارت ہے ان ہی یادوں
پھر بھی یادوں کے سہارے تو نہیں کٹ سکت
زیست ہر چند عبارت ہے انہی یادوں سے

زندہ انسانوں کی بستی کا ہی اک فرد ہوں میں
پھر بھی ان لاشوں کو کاندھوں پہ لئے پھرتا ہوں
کہیں مسموم نہ ہو جائے ہوں سے بستی کی فضا
اس لئے اپنے لبوں کو بھی سئے پھرتا ہوں

تمہارے دل میں بھی اک چاہ کا ارمان ک
تنگ ہے اہلِ محبت پہ بہت عرصۂ زیس
آج شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نف
گھٹ کے رہ جاتا ہے سینہ میں ہر اک نغمۂ زیب

آج اخلاص و وفا جنسِ گراں مایہ ہیں
چشمِ نم تک مری آسکتا ہے دامن کس کا
کون ہوتا ہے شریکِ غمِ تنہائیٔ دل
اٹھ گئی جبکہ زمانے سے رہ و رسمِ وفا

بنگلا افسانہ:

رقیہ

سید شمس الحق

مترجمہ: ابو سعید نورالدین

الگنی میں ٹنگی ہوئی ایک بڑی اور تین چھوٹی چھوٹی آرسیاں رہنے کے باوجود رقیہ آج کل آرسی کے بغیر ہی کنگھی کرتی اور چوٹی گوندھتی ہے۔

چار سال کی بچی آلو جب دوسری منزل پر چھبی آپا کے پاس گئی ہوئی تھی اور آلو کا باپ بھی اس وقت تک دفتر میں تھا، اور کالونی کے آسمان پر سورج اتنا پہنچ چکا تھا کہ تقریباً چار بجے کا عمل ہو۔ اس وقت رقیہ اکیلی خالی گھر میں فرش پر بیٹھ کر کنگھی کر کے چوٹی گوندھ رہی تھی۔ یہ وقت گویا اس نے چوٹی گوندھنے ہی کے لئے الگ کر رکھا تھا۔ اس کے بعد اپنے شوہر کے آنے سے پہلے ہی، وہ اٹھ کر رسوئی میں چلی گئی، بہت دیر تک ناشتہ تیار کرتی رہی، شام ہونے سے بہت پہلے ہی رات کے لئے ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔ شوہر کے آنے کے بعد اس نے آلو کو بلایا، پھر اس کے ہاتھ کھانا بھیج کر پکانے میں مصروف ہو گئی۔ رات کو سونے کے لئے جب کمرے میں آئی تو آلو گہری نیند سو رہی تھی، اور حمید کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جونہی اس نے پاؤں کی آہٹ پر آنکھیں اٹھا کر دیکھا رقیہ ساڑھی کے آنچل سے منہ پونچھنے کا بہانہ کرنے لگی اور کہا:

"تم اور کچھ دیر پڑھو گے کیا؟"

"ہاں، کچھ ایسا ہی خیال ہے"

رقیہ نے جواب کا انتظار نہ کیا، پاس سے گذر کر بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولی:

"لیکن رات بہت ہو گئی ہے"۔

"معلوم ہے"۔ حمید کے جواب میں کچھ غصے کی آمیزش تھی۔ پھر خاموشی۔

"روشنی چبھ رہی ہے آنکھوں میں"۔ اس قدر آہستہ اور مدھم آواز میں اس نے یہ بات کہی کہ اچھی طرح سمجھ ہی میں نہیں آئی، لیکن حمید کا مزاج بگڑ گیا۔ بولا "ہاں ضرور لگتی ہوگی۔ اتنا بڑا شیڈ لگا رکھا ہے بتی پر پھر بھی روشنی آنکھوں میں چبھتی ہے، بڑے تعجب کی بات ہے"۔

اس نے کتاب بند کر کے منہ پھرا کر دیکھا تو رقیہ ادھر منہ کر کے تکیہ میں سر چھپا کر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سارا جسم بل کھا کر ذرا سا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بستر سے چمٹ گئی ہے۔ حمید کو بتی بجھا دینے کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

اسی طرح ہر روز کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہی رہی۔ پچھلے آٹھ مہینے سے روز بروز کشیدگی پیدا ہوتی رہی بڑھتی رہی۔ رقیہ کو کبھی کبھی یہ خوف ہونے لگا کہ کسی دن اس کا بیڑا غرق نہ ہو جائے، اندیشہ ہونے لگا کہ اس کی زندگی میں کہیں خلل نہ پیدا ہو جائے۔ یہی اندیشہ مہیب شکل اختیار کر کے اس کو دباتا اور پیستا رہا۔ رقیہ کو ایک دن کی بات اب بھی یاد پڑتی تھی۔ کوئی پانچ مہینہ پہلے کی بات ہے، شام کے تھوڑی دیر بعد حمید کا چھوٹا بہنوئی افسر آیا ہوا تھا، جب حمید خود اپنے ہاتھ میں کھانے کی طشتری اور چائے کی پیالی لے کر گھر میں داخل ہوا تو اس کو تعجب ہوا اس نے پوچھا بھابی کہاں ہیں؟

"کیوں؟ اندر ہے"۔

"پھر بیمار پڑ گئیں کیا؟"

"ہاں، کچھ بخار چڑھ گیا ہے"۔

حمید اس روز جھوٹ بولنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ رقیہ کی ضد نہ توڑ سکا۔ رقیہ اندر جانا نہیں چاہتی تھی۔ دروازے کے پاس کان لگا کر وہ کھڑی تھی۔ حمید کا جواب سن کر اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتے ہوئے بھی اس نے اس روز اطمینان کا سانس لیا تھا لیکن مصیبت اتنی جلدی ٹلنے والی نہ تھی۔ پھر سوال ہوا:

"کچھ بخار چڑھ گیا ہے؟ تو اس کمزوری میں یہ اور خطرہ کی بات ہے۔"

اس کے جواب میں حمید شاید ہنسا تھا۔

"نہیں، نہیں ہنسنے کی بات نہیں۔ چلئے نا اندر دیکھ آئیں۔"

اس کے بعد جو گزرا تھا، اس سے رقیہ کا مرنا ہزار درجہ بہتر تھا۔ افسر کے اندر جانے کے لئے دروازہ کا پردہ اٹھاتے ہی ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اس کو یہاں سے بھاگ جانے کے لئے ایک لحہ بھی مہلت نہ ملی۔ صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر افسر کی طرف دیکھتی رہی۔ افسر بھی جلدی میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ گویا رقیہ اندر آ گئی، رقیہ کے اسی وقت گھر میں آنے کی بات ہو رہی تھی۔ یہ سوچ کر وہ دائیں جانب کچھ ہٹ کر کھڑا ہو گیا، راستہ دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کمرہ کی روشنی، جو اب تک پردہ کی وجہ سے رکی ہوئی تھی، جا کر رقیہ کے چہرہ پر پڑی۔ گویا ایک لحہ میں ایک سیاہ پردہ اٹھ گیا۔

کچھ اچھی طرح یاد نہیں پڑتا تھا اس کو۔ جب بھاگ کر سونے کے لئے وہ گھر میں آن چھپی تو وہ رو رہی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد حمید گھر میں آ کر داخل ہوا۔ بہت دیر تک کوئی بات نہ کی۔ اس خاموشی نے اس کو گویا اور مجبور کر دیا۔ اس کو ڈر ہوا، حمید بھی شاید اس کو دور ہٹا رہا ہے۔ ایسی ایک گونگی تاریکی کی گہرائی کی طرف دھکیل دینا چاہتا ہے، جہاں صرف ایک خطرناک تنہائی ہے۔ اگر وہ اس وقت اس کو نام لے کر بلاتا، تو وہ اس کے پاؤں پڑتی، اور رو رو کر دریا بہا دیتی۔ واقعی حمید نے اس وقت اس کو بلایا تھا: "رقیہ"

لیکن اس کی آواز میں غصہ کی آمیزش تھی، اسی لئے رقیہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کا سارا جسم کانپ اٹھا تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے، بتاؤ تو؟"

وہ کیا بتا سکتی تھی۔ حمید نے پھر کہا:

"اس طرح لوگوں کو ہنساؤ گی تم کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ چھی، چھی، چھی!"

اس کے بعد کرسی کھینچنے کی آواز سنائی دی۔ شاید حمید بیٹھ گیا تھا۔

یہ صرف تم ہی پر نہیں گذرتی، کتنے ہی لوگوں پر گذرتی ہے!"

ہاں، اس سے رقیہ کا مر جانا ہی اچھا تھا۔

بڑی آرسی دیوار کے ٹھیک بیچ میں ٹنگی ہوئی ہے۔ دروازہ پر آ کر کھڑے ہونے سے پوری تصویر منعکس ہوتی ہے اور اس کا فریم اس قدر خوبصورت بنا ہوا ہے کہ اس سے منعکس شدہ چہرہ پر فریم کئے ہوئے چہرہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ آرسی حمید نے اس کو شادی کے بعد دی تھی اور دوسرے دن کہا تھا: "تمہیں اس وقت اس کے علاوہ اور کچھ دینا تو نازیبا ہوتا، کم سے کم پہلے تحفہ کے لحاظ سے۔ بازار کی سب سے اچھی آرسی میں تمہارے لئے لایا ہوں، ادھر آؤ۔"

اس کے بعد زبردستی اس کو کھینچ کر آرسی کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ رقیہ کو بڑی شرم لگ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ جائے، لیکن حمید نے اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ "واہ! آرسی کی طرف دیکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے؟ آنکھیں اٹھا کر دیکھو تو ذرا۔" پھر آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ہی وہ ہنس پڑی تھی۔

کچھ دن ہوئے رقیہ نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا۔ ہمیشہ پردہ پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھی حمید اس کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کر لیا کرتا ہے۔ رقیہ کبھی اس میں منہ نہیں دیکھتی۔ آرسی کے نیچے ذرا دور دروازہ کی طرف منہ کر کے فرش پر بیٹھ کر رقیہ کنگھی کر رہی تھی۔ دونوں آنکھیں نیچی کی ہوئی تھیں۔ ایک ننھی سی بلی اس کے پاؤں پر اپنے نرم جسم کو ٹیک لگا کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت دوسری منزل سے چھوٹی کی بڑی بہن، ہاتھی ہاتھ میں کنگھی لئے دروازہ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ یہ لڑکی گویا طوفانی آسمان کی چمکتی ہوئی بجلی ہے۔ بڑی خوبصورت اور موزوں قد و قامت، گوری، دونوں آنکھیں بڑی بڑی اور گہری گہری۔ عمر بھی کوئی اٹھارہ یا انیس سال کی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس کا بچپنا ابھی تک نہیں چھٹا۔ چنچل پروانے کی طرح دن رات ادھر ادھر بھاگتی پھرتی! شرم و حیا نام کی بھی نہیں اس میں۔ شوہر کا ہاتھ پکڑ کر برآمدہ میں کھینچا تانی کرتی رہتی ہے۔ پھر بھی ساری باتوں کے باوجود رقیہ کو وہ بڑی اچھی لگتی ہے۔ یہی ہاسی دروازہ کے پاس کھڑی تھی۔ رقیہ نے آنکھیں اٹھا کر کہا: "آؤ"

"نہیں، بیٹھوں گی نہیں۔"

لیکن ہاسی بیٹھی، رقیہ کے پاس اور کہا "میری چوٹی گوندھ دیں گی؟

"ہائے ماں، میں پھر کب سے چوٹی گوندھنے والی ہو گئی" رقیہ تعجب سے بہانہ کرنے لگی۔

"یہ میں نہیں جانتی۔ جلدی کر دیجئے"

رقیہ نے اس کو اپنے قریب کھینچا اور بالوں میں کنگھی کرتے کرتے یوں ہی پوچھا "کیوں، اتنی جلدی کیا ہے؟"

ہاسی ہنس دی بہت دیر تک کچھ نہ بولی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں کہا "آج شام باہر جاؤں گی نا اس لئے"

"کہاں، سینما دیکھنے؟"

ہاسی منہ پھیر کر بیٹھی۔ آنکھیں مٹکتے ہوئے پوچھا "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ معلوم کرنا بھی کچھ مشکل ہے؟— نہیں، میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا"

چوٹی گوندھی جا چکی تو ہاسی جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے گوندھے ہوئے بالوں کو آہستہ آہستہ دبایا، پھر دیوار میں ٹنگی ہوئی آرسی کے سامنے جا کر پردہ سرکا کر بہت دیر تک منہ دیکھتی رہی۔ ہونٹ پر شاید کچھ میل لگا ہوا تھا، انگلی سے اسے صاف کر دیا۔ کان کی لو کے نیچے کچھ بال ہوا میں رقص کناں تھے، ان کو پیچھے ہٹا دیا۔ جب تک ہاسی آرسی کے سامنے منہ دیکھتی رہی، رقیہ الٹی طرف منہ کر کے کھڑی رہی۔ ہاسی چلی جا رہی تھی، رقیہ نے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور کہا "ابھی جلدی؟ اور بیٹھو نا!"

اس نے عذر کیا، لیکن رقیہ کے اصرار پر وہ بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ رقیہ اس کی نرم گردن پر ہاتھ رکھ کر ذرا سرک کر بیٹھی۔

"جانے کے لئے دل بے تاب ہو رہا ہے، نا؟"

یہ بات کہہ کر خود رقیہ کو کچھ شرم سی محسوس ہوئی۔ ہاسی کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

"جائیے جی، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں!"

"وہ بہت پیار کرتا ہے، نا؟"

رقیہ کو جانے کیا ہو گیا۔ وہ جانتی تھی، اچھی طرح جانتی تھی، ایسی باتیں پوچھنا اس کو زیب نہیں دیتا، پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔

ہاسی نے ہنستے ہنستے جواب دیا "خاک پیار کرتا ہے!"

"کیسا پیار؟"

"جانے دیجئے، میں نہیں جانتی۔ اب چلتی ہوں"

یہ کہہ کر ایک لمحہ میں وہ ہرنی کی طرح بھاگ گئی۔ گویا موجیں، ٹکرا کر، پانی چھڑکا کر چلی گئی۔ رقیہ نے اس کو اور روکنے کی کوشش نہیں کی۔

رقیہ کے بھی کبھی ایسے ہی دن تھے۔ دام دھنو پرندے کے پر کی طرح بڑے سندر اور جنوبی ہوا سے اڑتی ہوئی سیمل کی روئی کی طرح صاف و شفاف۔ کاش ان دنوں کبھی شام نہ ہوتی! رقیہ نے جانے کتنے دن آنکھیں بند کر کے سوچا، اور وہ بات سوچ کر کتنی دفعہ اس کی آنکھوں میں خواب کا سایہ گھنا ہو کر اتر آیا تھا۔ لیکن ایک دن اس کی زندگی کے صاف و شفاف آسمان پر بادل چھا گیا۔ غیر متوقع طور پر اجلی دوپہر کی تصویر پر سیاہی بکھر گئی۔ رقیہ نے کبھی اپنے عجیب سے عجیب خواب میں بھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ اس کی زندگی میں کچھ ایسا بھی پیش آئے گا۔ اندھیرے میں اکیلے پن اور لمبی، خواب آلود راتوں میں بھی اس کے دل میں ایسا اندیشہ پیدا نہیں ہوا تھا، اسی لئے شاید آج وہ اس قدر پریشان ہو گئی تھی۔ کس وجہ سے ایسا ہوا، اس کی اہمیت دوسروں کے ہاں جو بھی ہو، رقیہ کو اسے بہت بڑی قیمت ادا کر کے قبول کرنا پڑا۔ اس کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔

بالکونی کی اس طرف کس کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی؟ دروازہ کی آڑ سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ زینل باہر سے واپس آیا۔ رقیہ نے دروازہ کے پٹ ذرا اور ملا دیئے۔ زینل کے چلے جانے پر پھر باہر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ سیڑھی کے نیچے کوئی کھڑا ہے۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ہاسی وہاں کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ جھلملانے لگا۔ اس کے بعد وہ دونوں آہستہ آہستہ اوپر چڑھ گئے۔ ایک دن ٹھیک اسی طرح حمید بھی

اٹھ آیا تھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا تھا "سنو"

"کیا؟"

"ایک پیالی چائے"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد ہم دونوں باہر جائیں گے"

اسٹوو کی نیلی لو کی روشنی میں رقیہ کا چہرہ گویا کانپ رہا تھا۔ پیشانی، ناک اور ٹھوڑی پر پسینے کے قطرے جم گئے تھے۔ ایک دو لٹیں اڑ کر کان کے پاس گال پر آ گری اور اس نے بائیں ہاتھ سے آگ پر سلور کا فرائی پان پکڑ رکھا تھا۔ اسٹوو کی لگاتار شوں شوں کی آواز کو اگر شمار نہ کیا جائے، تو کمرہ میں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ حمید ذرا دور ایک کرسی پر آرام سے بیٹھا ہوا رقیہ کو دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹکی باندھ کر اس کے چہرہ پر نظر جمائے دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ رقیہ کی آنکھیں فرائی پان پر تھیں لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر کہا تھا:

"کیا بات ہے، اس طرح دیکھ کیوں رہے ہو؟ مجھے کبھی تم نے دیکھا نہیں کیا؟"

اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی تھی۔ ذرا سی میٹھی ہنسی، اور حمید بھی ساتھ ہی ساتھ خاموشی سے ہنسا تھا۔ اس کے بعد سامنے کی طرف ذرا جھک کر بولا تھا:

"ایک انڈا بنانے میں اتنی دیر لگتی ہے؟"

"ابھی ہوا جاتا ہے۔ اتنی جلدی کیا ہے؟ ذرا سی دیر ہو جائے تو حرج کیا ہے؟"

دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر دیر تک چائے پیتے رہے۔ اس کے بعد دروازہ پر تالا ڈال کر سیڑھی سے گن گن کر قدم ڈالتے ہوئے نیچے اتر آئے تھے۔ اس وقت شام گہری ہو چلی تھی۔ وہ دونوں پیدل راستہ پار کر کے چوراہے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔ حمید نے پوچھا تھا "رکشا لے لوں، کیا خیال ہے تمہارا؟ یا پیدل ہی چلوگی؟"

"نہیں پیدل چلنا اچھا نہیں لگتا"

سینما جانے کے لئے رکشا لی گئی تھی لیکن تھوڑی دور جا کر حمید نے اس سے کہا تھا "کیوں؟

"سینما شروع ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ چلو نا ذرا گھوم پھر لیں"

"چلو"

عظیم پورہ سے گذر کر رکشا رمنا جا پہنچی تھی۔ وہاں راستہ کے دونوں طرف مختلف قسم کے درختوں کی قطار لگی ہوئی تھی جن میں سے بعض کے نام تو معلوم ہیں اور بعض کے نہیں۔ درختوں نے چاروں طرف شاخیں پھیلا کر اوپر کا حصہ گویا ڈھانپ لیا تھا اور دیکھنے میں ایک طرح سبز رنگ کا شامیانہ معلوم ہوتا تھا۔ کہیں کہیں سے ایک آدھ ٹکڑا آسمان کا بھی نظر آتا تھا۔ اس وقت حمید نے اس کے گوندھے ہوئے بالوں سے ایک بیلہ کا پھول اٹھا کر کہا تھا "میں نے چوری کی"

"ہائے شریر کہیں کے! راستہ میں لوگ کیا کہیں گے؟"

رقیہ نے کچھ غصہ کے انداز میں اس کو دھمکایا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر وہ منہ چھپا کر ہنسی تھی اور حمید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ "واہ، تو پھر ہنسی کیوں؟"

"یونہی!"

"یونہی کیا کوئی ہنستا ہے؟"

"ہنستا ہے نا، تم بالکل بچے ہو!"

"لیکن شوہر کو کبھی بچہ نہیں کہنا چاہیئے"

"سچ؟"

اس کے بعد ہنستے ہنستے رقیہ کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔

سورج اور زیادہ ڈھل گیا تھا، رقیہ کا آنچل پھسل گیا تھا، اس کو ٹھیک کرتے کرتے اس نے کہا تھا "بہت گھومے ہم"۔

"اور بھی ذرا گھومیں کیا؟"

"نہیں، رہنے دو" پھر تھوڑی دیر بعد کہا تھا، "آج سینما نہ جائیں تو کیا رہے گا۔ چلو گھر واپس چلیں"۔

"کیوں؟"

"ایک دن کے لئے سینما رہنے دو نا۔ چلو پیدل گھر چلیں"۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو کر پیدل چلتے ہوئے گھر واپس ہوئے تھے، اور سیڑھی سے اوپر چڑھتے چڑھتے حمید نے آہستہ سے کہا تھا، "کیوں، اور کتنے دن باقی ہیں؟"

"کیا؟"

حمید اس کے جواب میں ہنسا تھا۔ ایک عجیب ڈھنگ سے ہنس پڑا تھا وہ۔ رقیہ کے نزدیک اس ہنسی کے معنے نامعلوم نہیں تھے۔ پہلے اس کو بڑی شرم محسوس ہوئی تھی، لیکن اس کے بعد اس کا سارا جسم گویا ایک لمحہ میں کسی کے لمس کے لئے بے چین ہو گیا تھا۔ "پتا نہیں، مجھے کیا معلوم"۔

یہ کہہ کر وہ اور ذرا اوپر چڑھ گئی تھی اور حمید نے لپک کر دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ چڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور بائیں ہاتھ کو کولھے پر رکھ کر گننے لگا تھا، ایک، دو، تین، ـــ

"چپ شریر کہیں کے!" رقیہ نے اس کو روکا۔

"شاید بہت جلدی، نا، کیوں؟"

"ہوں"

پھر دروازہ کا تالا کھولتے کھولتے حمید نے کہا تھا "اگر لڑکی ہو تو اس کا نام رکھیں گے آلو"۔

"کیسے معلوم ہوا تم کو کہ لڑکی ہو گی؟"

"ایسے ہی"

"اگر لڑکی ہو گی تو تم بہت خوش ہو گے، نا؟"

"ہوں۔ اور خوب ـــ تمہاری طرح خوبصورت اور گورے رنگ کی"۔

واقعی، ان کے گھر میں آلو ہی آئی۔ اس کی شکل و صورت بالکل رقیہ جیسی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی ٹھوڑی بھی بالکل اسی جیسی تھی۔ صرف اس کا منہ اور زیادہ ننھا، زیادہ نرم اور زیادہ سفید تھا۔

اب رقیہ کو آلو کے لئے خطرہ ہے۔ اس کی زندگی سے جو لعنت وابستہ ہو گئی ہے (ہاں رقیہ اس کو لعنت ہی کہے گی) وہ گویا اس کی بچی آلو کو بھی چھو جائے گی۔ آٹھ مہینے پہلے جو بلائے ناگہانی آئی تھی، اس کا اعادہ اگر آلو کی زندگی میں بھی ہو، تو وہ اس کو کیسے روکے گی؟ ایسی بھی کیا ہمت ہے رقیہ کی؟ نہیں کچھ بھی نہیں۔ رقیہ کا شعور ڈوبتا رہا ہے۔

آٹھ مہینے پہلے بغل کے چھوٹے گھر کے دروازے اور کھڑکیوں میں لال پردے لگے ہوئے تھے۔ کئی دن بعد جب وہ سب کھول لئے گئے تھے، اس وقت بیرونی فضا کی کھلی ہوئی روشنی آکر اس کی دونوں آنکھوں میں تیر کی طرح چبھ رہی تھی۔ اس روز اس کو غیر یقینی طور پر جانی پہچانی فضا بھی بالکل نئی لگ رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو یہاں رہنے کا اور کوئی حق نہیں پہنچتا۔ وہ گویا سب کے بیچ میں رہ کر بھی بالکل تنہا ہے ہنس کے پر سے جس طرح پانی الگ ہو جاتا ہے، گویا اسی طرح اس کے ہاتھ سے اس کا آخری سہارا بھی جاتا رہا! سب سے بڑھ کر اس کے سامنے اس دن عدم اعتمادی کا سایہ اور اسی کے دوسرے رُخ پر لایعنی مذاق آکر نمودار ہوا تھا!! جو رقیہ ایک دن حمید کے ہاتھ اپنے آپ کو مکمل کر سپرد کر کے

خوش ہوتی تھی، وہی آج اپنے آپ کو اس سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہے، آڑ تلاش کرتی ہے! ایک دن حمید نے اس سے کہا تھا:

"آلو کو صبح و شام ذرا پڑھا تو سکتی ہو۔ اس کے اسکول جانے کی عمر تو ہو آئی ہے۔"

"پڑھاتی تو ہوں" پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا تھا:

"دوسری منزل والی ہاسی اس روز کہہ رہی تھی کہ بجلی کی روشنی سے بچوں کی آنکھیں جلد خراب ہو جاتی ہیں۔"

"کیوں، کیا ہوا؟"

حمید کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ رقیہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ رقیہ بھی کچھ ٹھیک سمجھ نہیں سکی تھی کہ کیا جواب دے۔ حمید ابھی سوالیہ انداز میں اس کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں آنکھیں نیچی کر کے دروازہ کی طرف بڑھتے بڑھتے آہستہ سے کہا تھا یہی کہہ رہی تھی کہ میز کی بتی پر ایک بڑا شیڈ ہوتا، تو اچھا ہوتا۔"

اسی دن حمید دفتر سے واپس آتے ہوئے کاغذ کا ایک بڑا شیڈ خرید لایا تھا، اور رقیہ اس کو خود اپنے ہاتھ سے بہت دیر تک لمپ پر چڑھاتی رہی۔ چڑھاتے وقت جانے کس طرح وہ ہاتھ سے چھٹ کر ایک دفعہ فرش پر گر گیا تھا۔

شام کے وقت جب بتی جلائی گئی تھی تو کیسی مدھم روشنی سے کمرہ بھر گیا تھا۔ شیڈ کے نیچے صرف اجلی روشنی کا ایک دائرہ بن گیا تھا اور اس کے بعد روشنی کم ہوتے ہوتے کمرہ کے چار کونے میں جا کر اس قدر کم ہو گئی تھی کہ وہاں صرف اندھیرا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اچھی طرح نگاہ نہ ڈالنے سے ٹھیک کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ باہر سے واپس آنے پر شروع میں کمرہ اندھیرا ہی معلوم ہوتا تھا، کچھ دیر بعد آنکھیں ذرا موافق ہو جانے سے چار طرف صرف پھیکی روشنی کی افسردگی دکھائی دیتی تھی۔ پہلے دن ہی حمید نے اس کی شکایت کی تھی۔

"کیا فائدہ ہوا، بتاؤ تو اتنا بڑا شیڈ خرید کر؟ آنکھوں سے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا!" رقیہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس نے پھر کہا تھا "تمہارے اس قسم کے خیالات کے کوئی معنی نہیں ہوتے، بے کار! تم ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہو!" رقیہ نے گویا اس دن اس طرح چپ رہ کر یہ سمجھا دیا تھا کہ نہیں، وہ ٹھیک ہی ہے۔ اس کو کہیں ادھر ادھر نہیں کیا جائے گا۔ حقیقت میں ایسا ہوا بھی نہیں تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچتی رہی، حمید اگر چاہتا تو آسانی سے لمپ پر سے شیڈ الگ کر سکتا تھا۔ اس کو پھاڑ بھی سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی، تو وہ کر ہی کیا سکتی تھی؟

وہ کب راستہ کی طرف کی کھڑکی کے پاس سرک آئی، اس کو کچھ معلوم نہ ہوا۔ ایک دفعہ احساس ہوا کہ وہ نیچے کی طرف دیکھ رہی ہے، راستہ کی طرف۔ کالونی کے راستہ سے ہاسی اور زنیل اب پیدل کہیں جا رہے ہیں۔ بڑی سڑک پر اٹھ کر شاید وہ دونوں رکشہ کر لیں گے۔ رقیہ آنکھیں کھول کر بڑی توجہ سے ادھر دیکھتی رہی۔ یہ کیا، وہ لوگ رک کے کیوں؟ کس کے ساتھ بات کر رہا ہے زنیل؟ کون ہے وہ؟ عجیب بات ہے! حمید کو رقیہ نہیں پہچان سکتی؟

زنیل نے جانے کیا کہا اور اسی کے جواب میں حمید ہنسا۔ کیسی پھیکی ہنسی! اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ حمید پیدل آ رہا ہے۔ ہاتھ میں کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ ہے۔ آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ کھینچ کھینچ کر قدم اٹھا رہا ہے۔ گویا نیچے سے کسی چیز نے کھینچ کر پکڑ رکھا ہے۔ دوسری منزل کی بالکونی پر سے اس کو دیکھنا کیسا عجیب لگتا ہے!

حمید کے سیڑھی پر چڑھنے سے پہلے ہی رقیہ جا کر رسوئی میں گھس گئی۔ اس طرح جانے کی کیا ضرورت تھی؟ تھوڑی دیر بعد بھی جاتی تو کیا نقصان تھا! لیکن پھر بھی جائے بغیر نہ رہ سکی اسٹوو جلانے کے لئے بے چین ہو گئی۔ طاق پر رکھی ہوئی ماچس تلاش کرنے لگی۔ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو وہ رسوئی سے بولی۔ "آ گئے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

تھوڑی دیر بعد حمید نے آواز دی "ذرا سنو تو ادھر۔"

"کیا؟"
رقیہ ماچس جلاتے جلاتے رُک گئی۔
"ذرا سنو تو!"
رقیہ اسٹوو میں آگ سلگاتے سلگاتے بولی۔ "تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ تم ہاتھ منہ دھو لو۔ میں تمہارا کھانا لے کر آتی ہوں"۔
حمید کی اور کوئی آواز نہ آئی۔ رقیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی وہ جائے، لیکن جانے وہ کیوں نہ جا سکی۔ ایسا محسوس ہوا کسی نے اس کو پکڑ رکھا ہے۔
کھانا تیار ہو گیا، تو طشتریاں نکال کر ان میں چننے لگی۔ اس کے بعد ذرا منہ بڑھا کر آواز دی "آلو، آلو!"
کیسی نرم اور مہین آواز ہے! آلو کا کچھ پتا نہ لگا۔ شاید وہ چھبّی آپا کے ساتھ بیٹھ کر کھیل رہی ہے۔ وہ دونوں کیا کھیل رہی ہیں۔ ان کی گڑیوں کی شادی ہو گی! ناچار خود رقیہ ہی کھانے کی طشتری اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر آئی۔ ہاسی اس وقت دیوار کی آرسی میں منہ دیکھ کر چلی گئی تھی لیکن اس پر پردہ کھینچ کر نہیں گئی۔ دروازے کے پاس آ کر وہ رک گئی۔ آرسی میں حمید کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر تولیہ سے دن بھر کی تھکن کو پونچھ کر کرسی کے ہاتھ پاؤں پھیلائے نیم دراز ہو کر بیٹھا تھا۔ سہاگ بھری نظروں سے وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس کے سامنے آ کر میز پر کھانا رکھ کر ذرا پرے جا کر کھڑی ہوئی۔ حمید نے بستر پر سے پیکٹ اٹھا کر کہا "آلو کے لئے کپڑے لایا ہوں"۔
رقیہ نے کپڑے ہاتھ میں لئے، اُلٹ پلٹ کر دیکھا "اگلے منگل کو اس کی سالگرہ ہے۔ جو بنانا ہے ذرا جلدی بنا لینا"۔
"اچھا۔"
"اور یہ لو، تمہارے لئے یہ ساڑھی لایا ہوں۔ ایک دو دوستوں کو آنے کے لئے کہا ہے۔ اس دن تم کو یہ پہننی ہو گی"۔
کیوں؟ صندوق میں تو کافی ساڑھیاں پڑی ہیں؟
"حمید ایک گھونٹ چائے پی کر بولا "تو کیا اس لئے نئی ساڑھی نہیں خریدنی چاہیئے؟"
رقیہ نے اور کوئی بات نہ کی ساڑھی اور کپڑے الگنی پر رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد رسوئی میں چلی گئی سیڑھی پر نرم پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ آلو اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ "امّی!"
"کیا؟"
"میرے کپڑے کب بناؤ گی؟"
"کل"
"نہیں آج"
"اچھا آج"
آلو خوش ہو کر چلی گئی۔ سونے کے کمرے میں جا کر فرش پر بیٹھ گئی اور دیکھنے لگی نئے لائے ہوئے کپڑوں میں کتنے پھول ہیں وہ گننے لگی۔ کسی حد تک گن کر الجھ گئی، آگے گن نہ سکی۔ حمید بولا۔ "آلو؟"
"کیا؟"
"کپڑے تم کو پسند آئے؟"
"خوب۔"
"بہت اچھا۔"
رقیہ رسوئی میں بیٹھ کر رات کا کھانا پکانے لگی۔ اب تقریباً شام ہونے والی تھی۔ رقیہ سوچنے لگی۔ سارے دن کی باتیں وہ سوچنے لگی۔ ہاسی کی بات، نرگل کی بات، آلو کی بات۔ ہاسی کے لئے اس کے دل میں کیسی محبت پیدا ہو گئی ہے۔ ابھی تک وہ بچی ہے، بڑی بھولی بھالی ہے۔ رقیہ دل و جان سے

دعا کرتی ہے۔ اس کی طرح کبھی اس کو ایسی بدقسمتی پیش نہ آئے۔ صرف اس کو کیوں کسی کو بھی نہ آئے۔ لیکن کیا یہ واقعی اس کی بدقسمتی ہے! غیر شعوری طور پر رقیہ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا۔ اس اجڑی ہوئی دنیا میں وہ کس کو لے کر زندہ رہے گی [illegible] کے بعد ہی پھر وہ سوچنے لگی، اس کا تو سب کچھ ہے، اس کے تو سب ہی موجود ہیں، تو کس لئے وہ اپنے آپ کو اس قدر پریشان کر رہی ہے! [illegible] کی یہ اجڑی دنیا کیا اس کی من گھڑت نہیں ہے؟"

ایک ایک کر کے اسی طرح ہزاروں سوالات. موافق و مخالف دلائل کے ساتھ آکر اس کے [illegible] میں بھیڑ لگاتے رہے۔ ان سوالات اور دلائل کے گویا اپنے بنیادی حقوق ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق خود بخود بن اور بگڑ رہے ہیں۔ رقیہ کا گویا ان پر کوئی قابو نہیں۔ خیالات کے سمندر میں طوفان اٹھا ہے، موجیں گویا آج کے دن ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ رقیہ گویا پورے یقین اور تمام دلائل کے ساتھ اس [illegible] ان کے سامنے تھر تھر کانپ رہی ہے۔

حمید کیا اب بھی اس سے محبت کرتا ہے؟ ممکن ہے رقیہ کی یہ غلط فہمی ہو جو حمید کو اس نے دیکھا ہے، وہ شاید اسی کا بنایا ہوا ہے۔ کیا ضرورت تھی حمید پر شبہ کرنے کی؟ (شاید وہ آج بھی اس سے اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح پہلے کرتا تھا) آٹھ مہینے کے بعد آج پہلی دفعہ اس نے ساڑھی خرید کر دی ہے۔ سامنے آلو کی سالگرہ ہے، اس لئے حمید کی دنیا میں رقیہ کو بھی تک کافی دخل ہے، اسی لئے تو اس کے لئے ہرے رنگ کی، اس کی سب سے مرغوب ساڑھی دیکھ کر لایا ہے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، کچھ دینا چاہئے، اسی لئے دی۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں یہ بات وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی!

آج، اسی وقت رقیہ کو خیال آیا حمید اتنے چھوٹے دل کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ آج شام پھر اس کو صرف یہی خیال رہا، اس کا بھی ایسا کوئی ہے جس کے ہاتھ وہ اپنے آپ کو سپرد کر سکتی ہے اور جس کے ذمہ سارا کام چھوڑ کر وہ اطمینان کا سانس لے سکتی ہے۔ بالکونی پر سے راستہ میں حمید کو دیکھ کر اس کو ایک دفعہ خیال آیا تھا، ہاں، اس کا بھی ایک سہارا ہے، اسی لئے کھانا لے کر جب وہ گھر کے اندر آئی۔ اور آرسی میں اس کی تصویر دیکھی، تو اس طرح رک گئی۔

لیکن آٹھ مہینے سے جس کو اس نے اس طرح دیکھا ہے، اپنے آپ کو علیحدہ کر کے سوچا ہے، آج وہ سب باتیں ایک دم فراموش کر کے ایک ہی دن میں اس کے قریب آ جانا کیا ممکن ہے؟ اس لئے اس کے دل میں جتنی منت و سماجت پیدا ہوئی، اتنی ہی جھجک بھی اس کے ساتھ دکھائی دی۔ اس تذبذب میں پڑ کر رقیہ پتھر کی طرح جم گئی۔ سینہ کیسا خالی خالی محسوس ہونے لگا۔ کھانے پینے کے بعد حمید ایک نئی لائی ہوئی افسانہ کی کتاب پڑھنے بیٹھا۔ رات کے اس وقت تو یا دس بجے ہوں گے، لیکن زیادہ دیر تک نہیں پڑھ سکا، رکنا پڑا۔ سونے کے کمرہ کی بغل میں اور ایک کمرہ ہے، وہ اکثر خالی ہی رہتا ہے، اسے آلو کے کھیلنے کا کمرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ عزیز و اقارب میں سے کوئی آئے، تو اس میں سونے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کمرہ سے ایک عجیب مہین اور دل سوز آواز آنے لگی۔

کیا کوئی رو رہا ہے! کون؟ حمید چوکنا ہو کر سننے لگا، صاف رونے کی آواز ہے۔ اس نے کتاب اٹھا کر پھینک دی۔ بھاگ کر جا کے دیکھا، رقیہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ اس کو آتے نہ دیکھ کر اس نے خیال کیا تھا، شاید دوسری فلیٹ پر گئی ہوئی ہے، لیکن وہ یہیں کھڑی ہے، اس کے خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔

"رقیہ رو کیوں رہی ہے؟" پاؤں کی آہٹ سن کر اس نے منہ پھیرا۔ آنکھ کے پانی سے دونوں گال بھیگ گئے تھے۔ کان کے قریب سے کچھ بال پانی میں تر ہو کر گال سے چمٹ گئے تھے۔ حمید کو دیکھ کر رقیہ بالکل بچوں کی طرح رو پڑی۔ سینہ کی گہرائی سے زور زور سے سانس لینے لگی۔ حمید نے قریب جا کر اس کا منہ پونچھتے ہوئے پوچھا:

"کیوں، کیا ہوا؟"

اس کا پیارا نام لے کر اس نے آواز دی۔ رقیہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ صرف اس کے سینہ پر سر رکھ کر روتی رہی۔ حمید نے اس کو نہیں روکا، رونے دو۔ ایک دفعہ رونا آہستہ آہستہ کم ہو کر رک گیا۔

کالونی کی کھڑکیوں سے روشنی آ کر نیچے گری، راستہ پر۔ سبز گھاس کے فرش پر ٹوٹی ہوئی روشنیاں بڑی خوبصورت دکھائی دینے لگیں۔ کئی آدمی ادھر سے پیدل جا رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ایک رکشا جا رہی تھی۔ راہ چلتے لوگ اوپر سے دیکھنے میں کیسے چھوٹے چھوٹے لگتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے ساتھ چپک کر چپٹے ہو گئے ہیں۔ اس وقت دور کی ایک دو فلیٹوں سے دھندلی آواز کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ رات زیادہ ہونے لگی۔ حمید اپنا منہ رقیہ کے قریب لے آیا۔ آٹھ مہینے پہلے رقیہ کو چیچک ہوئی تھی۔ سارے چہرہ پر گہری نشانیاں تھیں، کالے کالے گڑھوں کی طرح، ناہموار۔ حمید گویا ان کو شناسائی کی کوشش کرنے لگا۔

وصلی: حافظ امیرالدین شاگرد میرپنجہ کش دہلوی

وصلی: میر عماد (عہد شاہجہانی)

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ ۝
وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝ وَمِن شَرِّ
النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا
سُورَةُ النَّاسِ ۝ مدنية ست آيات
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ
قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلَٰهِ
النَّاسِ ۝ مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝
الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ
وَالنَّاسِ ۝
کتبہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا ایک صفحہ

خطاط : احمد بن محمد الجمی (قیاساً ۱۱۰۰ھ)

اس تحریر کے دنیا میں صرف تین نسخے موجود ہیں۔

وصلی: داراشکوہ

حجری کندہ کاری (نستعلیق)

لاہور کی ایک قدیم مسجد کا روکار

ثقافت:۔

خطّاطی

(۱)

سید یوسف بخاری

یہ بتانا مشکل ہے کہ خط کیسے اور کب ایجاد ہوا۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں چند مخصوص نقوش اور تصاویر سے کام لیا گیا ہوگا۔ یعنی ہر واقعہ یا مجرد خیال کو تصویر کی صورت میں پیش کرنے لگے۔ یہ نقوش یا تصاویر چونکہ بہت بڑے تھے اس لئے زیادہ جگہ گھیرنے کے علاوہ ان کے بار بار بنانے سے بڑی دقت پیش آتی تھی۔ لہٰذا یہ آہستہ آہستہ خود بخود مختصر ہوتے گئے اور ایسی شکل اختیار کی جس میں صوریت کم اور معنویت زیادہ ہو گئی۔ یہ طریقِ عمل بھی تکلیف دہ تھا کیونکہ ہر بڑے واقعہ کی وضاحت کے لئے کئی کئی تصاویر سے کام لینا پڑتا تھا۔ لہٰذا مصوری کو ترک کر کے مختلف اجسام اور اشکال میں چند علامتیں مقرر کی گئیں جن کو ابجد کہتے ہیں۔ اس طرح (۲) ہی تمام تہجّائی حروف مرتب ہو گئے۔ اس دَور کو صوری حروف سے تعبیر کیا گیا اور یہی السنۂ عالم کی کتابت کا سنگِ بنیاد ٹھہرے۔ کچھ عجب نہیں کہ تمام زبانوں کی ابجد اور خطوط کا ارتقا ایک ہی ماخذ سے ہوا ہو۔ جب اس حد تک دسترس حاصل ہو گئی تو حروف کی ترتیب سے لفظ اور الفاظ سے جملے وضع ہوئے۔ یہ کتابت کا حرفی دَور کہلایا۔

رہا یہ سوال کہ ابجد کا آغاز کس زمانے میں ہوا۔ اس کا فیصلہ بھی مشکل ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ کوئی ۴ ہزار سال قبل ہوا ہوگا۔ غالباً ۴ ہزار برس ق۔م سے بابل میں حکومتوں کا قیام اور ان کے حدود میں کتابت جاری ہو چکی تھی۔ اس زمانہ کا خط سومری یا سومیری کہلاتا تھا۔ سومری دراصل عرب اور سام حضرت نوح کے فرزند تھے

اسلامی عقیدے کے مطابق حضرت آدم پر جو اولین صحائف نازل ہوئے ان کی زبان سریانی تھی۔ یہ پہلے خام اینٹوں پر لکھے گئے جن کو بعد میں تحفظ کے خیال سے پختہ کیا گیا۔ یہ خشتی کتابت بظاہر طوفانِ نوح میں غرق ہو گئی۔ حضرت ادریس نے اس ابجد کو ترقی دی جو تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نشو ونما پاتی رہی۔ اس اسلامی روایت کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ بابل کے آثارِ قدیمہ سے عہدِ اشوریہ بنی پال (۶۶۸ ق۔م) وغیرہ کے سنگی کتبات برآمد ہو چکے ہیں، جن پر پوری کتابیں تحریر ہیں۔ کتابت کی اصطلاح میں انبیائے کرام کے خطِ وحی کو "توفیقیہ" اور اصلاح یافتہ قلم کو خطِ اصلاحیہ کہا جاتا ہے۔

ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں جس قدر نمونے خطوط کے موجود ہیں ان کی تاریخ مصر سے شروع ہوتی ہے اور مصری ہی ابجد یعنی خط کے موجد قرار پاتے ہیں۔ اگر ان تمام خطوط کے باہمی تعلق اور ان کی ارتقائی کیفیتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ایک شجرہ مرتب ہو جاتا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ خطوط حسبِ ذیل ہیں:۔

خط سریانی : اس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

خط سمر نجیلی، المخفف، السرطا : ان خطوط کی ایجاد مصری خطوط کے زوال اور فنیقیہ کے بعد ہوئی۔ ان میں سطرنجیلی آگے چل کر ایک کامیاب خط کی صورت میں اُبھرا اور خطِ کوفی قدیم کے لئے ایک بنیادی خط ثابت ہوا۔ دونوں خطوط گو سریانی کی مشہور شاخیں ہیں لیکن وقتی طور پر پیدا ہوئے اور فنا ہو گئے۔ بنیادی خطوط ہونے کی وجہ سے ان کو علیحدہ شجرہ کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

خط سومری : یہ خط قدیم اہلِ بابل کی یادگار ہے جو طوفانِ نوح سے ۴ ہزار برس قبل مسیح رائج تھا۔ اس کے موجد سامی عرب تھے۔

مسماری، پیکانی یا میخی : حمورابی خاندان نے جو سنہ ۲۲۰۰ ق۔م میں بابل پر حکمران تھا، اس خط کو مسماری (پیکانی یا میخی) خط میں تبدیل کر دیا جو ابتدا میں مصور تھا اور اس کی شکل آہنی میخوں یا تیروں سے مشابہ تھی۔

مقدس ہیروغلیفی : یہ مصریوں کا سب سے پہلا مذہبی خط تھا۔ اس کا ہر حرف مصور تھا۔ اس کے کاتب مندروں کے پجاری تھے۔ اہلِ مصر

مکمل ابجد انہی تصاویر میں بنائی گئی۔

چونکہ ابتدا میں وحوش کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اس لئے اظہارِ خیال کا ذریعہ حیوانات کی تصاویر قرار دیا گیا۔

آسانی کے خیال سے انہوں نے اس کی دو قسمیں کردیں:۔

ہیراطیقی (ہیراٹک) : یہ پہلی قسم تھی جس کا تعلق براہِ راست مذہبی احکامات سے تھا۔ یہ خط شاہی دفاتر میں بھی جاری تھا۔ اگرچہ یہ کافی رواں تھا لیکن حروف میں کچھ کجی تھی اس لئے ہیراٹک کہلایا۔ اس خط میں پوری تصویر کا صرف ایک جزو باقی رہ گیا اور کاغذ پر لکھا جانا لگا۔ حضرت ابراہیم سے (۵۰۰) برس قبل کی کتابیں اس خط میں موجود ہیں۔

دیموطیقی (دِیماٹک) : یہ دوسری قسم تھی۔ اس میں پہلے خط سے زیادہ روانی تھی۔ مصر میں جب سولہواں خاندان حکمران تھا اس وقت یہ خط اپنے پورے شباب پر تھا۔ اس تقسیم سے مصریوں کو ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ مصوری کی زحمت سے قدرے نجات مل گئی۔

فنیقیہ : (اہلِ فنیشیا) مصریوں کے شاگرد ہوئے اور انہوں نے ہیروغلیفی سے اپنا جداگانہ خط پیدا کیا جو مصری خطوط سے زیادہ واضح اور شاندار تھا۔ اس طرح عہدِ قدیم کے یہ چار خط اصل قرار پائے اور ان کی شاخیں تمام دنیا میں پھیلیں۔

مربع عبرانی : عبرانیوں میں ان کا ایک قدیم خط رائج تھا۔ موجودہ مربع عبرانی دراصل فنیقیہ قوم کا عطیہ ہے جس کی بنیاد ۵۶۰ ق م میں بابل میں پڑی۔ یہ خط فنیقیہ سے زیادہ مہذب اور واضح تھا۔

قدیم یونانی : جب مصر پر یونانیوں کا تسلط ہوا تو تینوں مصری خط بالکل زوال میں آگئے۔ یونانیوں نے فنیقی خط کو سامنے رکھ کر قبطی خط میں یونانی حروف شامل کئے اور اپنا جداگانہ رسم الخط ایجاد کیا۔ قبطی خط بھی یونانی حروف سے مرکب تھا جو آغازِ اسلام تک جاری رہا لیکن خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے گورنر عبداللہ نے ۸۷ھ میں اس خط کو عربی خط میں تبدیل کردیا۔

ارامی یا سامی : سلطنت اشوریہ (بابل) جب رُو بہ زوال ہوئی تو اس کی ابجد، جس کا تعلق فنیقیہ سے تھا، متمدن دنیا میں پھیلی۔ اس سے چند قلم پیدا ہوئے۔ ان میں ایک خط ارامی تھا۔ ارام حضرت سام کے بیٹے اور حضرت نوح کے پوتے تھے۔ یہ قبائل ساحل بحرین پر دیگر عربوں کے ساتھ آباد تھے۔ ان کی زبان قریب قریب بالکل عربی تھی جس میں ارامی زبان کے مادے بھی بکثرت شامل تھے۔ ابتدا میں فنیقیہ اور ارامی خطوط میں بھی زیادہ فرق نہ تھا کیونکہ ارامی خط فی الاصل مصری خطوط کو سامنے رکھ کر معمولی فرق کے ساتھ جاری کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ فرق نمایاں ہوگیا۔

جب سامی اقوام کا متمدن دنیا سے ربط ضبط بڑھا تو انہوں نے اپنی قدیم زبان سومری کے علاوہ ارامی زبان اور خط دونوں کو اختیار کرلیا۔ اسی لئے ارامی خط کا دوسرا نام سامی ہے۔ اس کی دو شاخیں مشہور ہیں۔

تدمری : یہ ارامی خط کی پہلی شاخ ہے۔ دراصل یہ قلم تدمر (پال مائرا) کے شہریوں کا تھا۔

نبطی : یہ دوسری مشہور شاخ ہے۔ اصل میں یہ قلم پترایا بطرا والوں کا خط تھا جو مدین، ارض سینا، فلسطین اور حوران (ممالکِ شام) میں رائج تھا۔ نبطی دراصل حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہیں۔ حضرت اسمٰعیل کے ایک صاحبزادے کا نام "نابت" تھا۔ دو تین صدی قبل مسیح نبطیوں کی حکومت نجد سے ساحل بحر احمر، عقبہ اور بادیۂ شام تک دراز تھی۔ ان کا مرکز شہر بطرا تھا اور زبان عربی تھی۔ ابتدا میں ان کا خط سامی تھا مگر انہوں نے سریانیوں سے حاصل کیا تھا۔ سامیوں کی طرح جب نبطیوں کے بھی متمدن دنیا سے تعلقات پیدا ہوئے تو وہ سیاسی و تجارتی اغراض کے ماتحت اپنا سامی خط چھوڑ کر ارامی خط میں کتابت کرنے لگے۔

مسند یا مسند سبائی : شمالی عرب میں خط ارامی کی تیسری شاخ مسند سبائی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ موجودہ دور میں یمن کی جو تاریخ کتبات آثارِ قدیمہ سے مرتب کی گئی ہے اس میں یمن کے تین دور دکھائے گئے ہیں۔ اول ملوک معین، دوم ملوک سبا اور سوم ملوک حمیر۔ یہ تمام بادشاہ نسل کے اعتبار سے ایک تھے لیکن ان کی حکومتوں کا زمانہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اہلِ معین کی زبان سبائیوں سے مشابہ تھی۔ پہلے چھ ...

ف یہ قوم ابتدا میں ساحل بحرین اور خلیج فارس پر آباد تھی۔ جب اس پر یورش ہوئی تو نواحِ یمن میں آباد ہوئی۔ پھر دوسرے انقلاب میں ارض کنعان (شام) پہونچی۔ ساحلِ روم کے شہر صور (ٹائر) اور صیدا (سیڈان) انہی کی یادگار ہیں۔ اسی قوم نے کلدانیوں، یونانیوں اور عبرانیوں کو کتابت اور تجارت کی تعلیم دی۔ از تحقیقات ماہرین ۱۲۔

کہ ان کی ابجد مسند حمیری کے نام سے مشہور ہوئی جس کا بیان آگے آئے گا۔ مسند سبائی سے تین قلم نکلے جو عرب قبائل کے نام سے موسوم ہوئے یعنی صفوی۔ ثمودی اور لحیانی۔

قبل اس کے کہ ہم مسند حمیری اور حیری یا قدیم کوفی کا ذکر چھیڑیں، قدیم خطوط کے ضمن میں حیثی، چینی اور جاپانی خطوط کا تذکرہ کریں گے تاکہ یہ سلسلہ اپنی جگہ مکمل ہو جائے۔

حیثی : ولادت حضرت مسیح سے قبل حیثی ایک قوم تھی جو فراعنۂ مصر کی ہم عصر تھی۔ یہ شام سے ایشیائے کوچک تک آباد تھی۔ اس کا خط بھی ہیرو غلیفی کی طرح مصور مگر بھدا تھا۔ شہر حماۃ (شام) میں اس خط میں کتبات برآمد ہوئے ہیں۔

چینی : ایشیائی خطوط میں چینی ایک عجیب اور دلچسپ خط تھا۔ کیونکہ اس کی کتابت اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی تھی۔ چینیوں کا اعتقاد تھا کہ فیضانِ الٰہی کا نزول آسمان سے زمین کی طرف ہوتا ہے۔

جاپانی : یہ خط درختوں کی شاخوں کی طرح پیچدار تھا، اس لئے اہلِ عرب اپنی اصطلاح میں اسے "شجر" کہتے تھے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: "کٹلنا" اور "ہیراگانا"۔ جاپانی اور قدیم مغلئی چینی خط ہی کی شاخیں ہیں۔

سریانی، عبرانی اور عربی خطوط دائیں سے بائیں جانب لکھے جاتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان سے حرکت طبعی کا آغاز ہمیشہ دائیں ہاتھ اور دائیں قدم سے ہوتا ہے۔ جیسے آسمان دائیں سے بائیں یعنی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہندی، قبطی، رومی اور قدیم فارسی خطوط کی کتابت بائیں سے دائیں جانب ہوتی تھی۔ کیونکہ حکمائے یونان کی تحقیق کے مطابق دورانِ خون قلب سے شروع ہوتا ہے اور قلب بائیں جانب ہے۔ نیز قلب عقل کا مرکز ہے۔

مسند حمیری : ہیرو غلیفی سے ارامی یا سامی خط تک (مربع عبرانی اور یونانی قدیم کو نظر انداز کرتے ہوئے کیونکہ وہ خارج از بحث ہیں) خطوط کی پانچ منزلیں پوری ہوتی ہیں۔ چھٹی منزل سطرنجیلی (شاخ فنیقیہ) خط تھا جو ظاہر ہے کہ مسلسل پانچ دور گزرنے کے بعد نہایت واضح اور روشن بن چکا تھا۔ لیکن جب اسے نبطیوں نے اختیار کیا تو اس میں پھر گنجلک پیدا ہو گئی جس کا عظیم ردِعمل یمن میں جا کر ہوا۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سطرنجیلی اور نبطی کے لطیف امتزاج سے خطِ مسند حمیری وجود میں آیا۔

حیری یا قدیم کوفی : مسند حمیری کو اہلِ حیرہ نے مناسب اصلاح کے بعد اور بھی آراستہ و مہذب کیا اور یہ حیری یا قدیم کوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ واضح رہے کہ یہ اصلاحی خط کوفی نہ تھا جس کو عام طور پر خطِ کوفی جدید سمجھا جاتا ہے بلکہ محض وہ خط تھا جس کو اہلِ یمن اور اہلِ مکہ نے حیرہ والوں سے حاصل کیا تھا۔ اس عہد اور اس خط تک نقاط، اعراب، علامات اور اوقاف کا دستور بھی وضع نہیں ہوا تھا اور الف بھی سیدھا نہیں بنتا تھا بلکہ نیچے کا حصہ مڑا ہوا تھا۔ اور اس کی شکل یہ تھی "ا" چنانچہ فرامینِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی کرم اللہ وجہ اور ان کے صاحبزادگان حضرت حسنؓ اور حسینؓ تک کی تمام تحریریں اسی خطِ حیری یا قدیم کوفی خط میں ہیں لہٰذا حیری کو جدید کوفی سمجھنا اور دوسروں کو باور کرانا کہ رسولِ مقبولؐ، چاروں صحابہ کرام اور حضرت حسن و حسین کے فرامین یا نسخہ ہائے قرآن مجید، جو ان کے زمانے میں لکھے گئے جدید خطِ کوفی میں تھے، سراسر غلط اور ایک فاش غلطی ہو گی۔

قدیم خطوط کی تاریخ اس جگہ تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور عربی ابجد یا خطوط کا آغاز ہوتا ہے۔ مشہور مؤرخ ہشام بن محمد کی روایت کے بموجب عربی خط کا بانی قبیلہ نصر بن کنانہ میں سے تھا۔ دوسری روایت حمیر بن سبا کو اس کا موجد ٹھہراتی ہے۔ بہرحال یہ سب قبیلۂ قریش ہی کے افراد تھے۔

عربوں میں رسم الخط کی ترقی کے اسباب میں سب سے بڑا وحی الٰہی ہے جس کے ذریعہ قرآن نازل ہوا۔ حضرتؐ کو کتابت وحی کے لئے کاتبوں کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے رسم الخط کی طرف توجہ فرمائی۔ غزوۂ بدر میں ستر قیدی ایسے ہاتھ آئے جو نوشت و خواند سے واقف تھے۔ آپ نے اپنی حکمت سے ہر قیدی کا فدیۂ آزادی یہ مقرر کیا کہ وہ دس آدمیوں کو کتابت کی تعلیم دے۔ اس طرح ایک قلیل مدت میں بیک وقت ۷۰۰ نفوس کتابت سے واقف ہو گئے اور پہلا دارالکتابت مدینہ ہوا۔ اس وقت مدینہ کے مقابلہ میں مکہ میں صرف ۱۷ آدمی ایسے تھے جو لکھنا جانتے تھے۔

بعد ازاں جب خلافت راشدہ کا آغاز اور اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تدریس و تدوین میں ترقی ہوئی تو ایک ربع صدی ہی میں سینکڑوں کاتب اور منشی پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی حفاظت اور تبلیغ کے لئے چند نسخے لکھے گئے جن میں حضرت عثمان اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ پیش پیش تھے۔ اس وقت تک قرآن مجید کی کتابت میں نقاط اور اعراب کا رواج نہیں تھا۔ نقاط کی ایجاد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے عہدِ خلافت میں حاکم بصرہ کے ایما پر ہوئی۔ ان نقاط کے موجد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے ندیم خاص ابو الاسود تھے۔ ان نقاط نے پوری ایک صدی تک اعراب کا کام دیا۔ ابو الاسود کا دوسرا کارنامہ عربی نحو کے ابتدائی قواعد کی ترتیب اور تدوین تھا۔ ان کی وفات سنہ ۶۹ھ میں ہوئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا رسم الخط میں بھی مسلسل ترمیم و اصلاح ہوتی رہی۔ پہلے حیرہ علم خط کا مرکز تھا مگر خلافت بنی امیہ اور عباسیہ میں مدینہ اور مکہ کے علاوہ بصرہ اور کوفہ بھی خط کا مرکز بن گئے۔ کوفہ کو ایسی تاریخی شہرت حاصل ہوئی کہ یہ شہر نہ صرف فن کتابت کا معلم ہوا بلکہ اکثر علوم عربی کا مبدا بن گیا۔ چنانچہ لغت کی پہلی کتاب جو خلیل بصری کی تصنیف تھی اس کی کتابت بھی کوفہ ہی میں ہوئی۔ جدید خط کوفی ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

خط کوفی جدید: اس کا آغاز خلیل بن احمد نحوی موجد علم عروض کے زمانے سے ہوا۔ یہ عہد عباسی کا ایک نامور فاضل تھا۔ اس نے قدیم خط کی اصلاح کی اور موجودہ اعراب جاری کئے۔ سنہ ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ اسی سال خلیفہ ہارون الرشید عباسی تخت نشین ہوا۔ خلیل کے بعد علی بن حمزہ کسائی نحوی نے خلیل کے مہذب خط پر ایک اور غائر نظر ڈالی۔ اس میں خوشنویسی سے زیادہ مصورانہ شان اور نقاط میں بانکپن پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اس خط کو قبول عام کی سند مل گئی اور اس خط کا نام "خط کوفی" ہوا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ اب مصاحف کی کتابت اور دفتر انشاء کی مراسلت بھی اسی خط میں ہونے لگی۔ کسائی نے سنہ ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ اسی عہد کو اس خط کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔

عہد ہارون الرشید سے عہد معتصم باللہ عباسی تک متعدد نامور خطاط ہوئے۔ ان خطاطوں کے تذکروں سے بلا اختلاف یہ ثابت ہے کہ خط نسخ کے جس قدر بہترین نمونے دورِ حاضر میں ملتے ہیں، ان سب کی اصل یہی خط کوفی ہے۔ خط کوفی سے عہد ہارون الرشید تک بارہ قلم (جدول ۱) ایجاد ہو چکے تھے۔ جن کی کتابت ہر قلم کی معنوی نسبت کے مطابق اسی خط میں ہوتی تھی۔ "تحقیقات ماہرین" میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ یہ بارہ قلم تیسری صدی ہجری تک رائج رہے۔ ان بارہ قلموں پر عہد ہارون الرشید کے بعد آٹھ قلم (جدول ۲) کا اور اضافہ ہوا۔ اس طرح خط کوفی سے بیس قلم نکلے۔ ان بیس قلموں کے ساتھ ساتھ چھ قلم (جدول ۳) اور جاری تھے جو خوشنویسی اور کتابت کلام مجید کے لئے مخصوص تھے۔ خلیفہ کے عہد میں گو ان تمام خطوط کے کاتب موجود تھے لیکن ان کے موجد اور معلم کون تھے، اس باب میں تاریخ تقریباً خاموش ہے۔ جب ابن مقلہ نے اپنے چھ خط (جدول ۴) ایجاد کئے تو یہ تمام خط یکسر متروک اور فنا ہو گئے۔

خطِ نسخ: فی الاصل خط کوفی کا مصلح اعظم و اول ابو علی محمد بن علی بن حسن بن عبد اللہ ملقب بہ ابن مقلہ تھا۔ سنہ ۲۷۲ھ میں پیدا ہوا۔ خلیفہ القاہر باللہ عباسی کا وزیر تھا۔ لیکن بعض امور سیاسی میں اختلاف کے باعث ابن مقلہ نے خلیفہ کے خلاف سازش کی، اس وقت تو وہ کسی نہ کسی طرح اس سازش کی پاداش سے بچ گیا، کیونکہ سازش کے ماتحت خلیفہ معزول ہو گیا تھا۔ لیکن جب اس کا بیٹا ابو العباس راضی باللہ خلیفہ ہوا اور سازش عیاں ہو گئی تو قید ہوا۔ اس کا دایاں ہاتھ اور زبان کاٹ دی گئی اور اسی حالت میں بعمر ۵۶ سال سنہ ۳۲۸ھ میں وفات پائی۔ ابن مقلہ کا انتہائی کمال یہ تھا کہ جب دایاں ہاتھ کٹ گیا تو کہنی میں پنسل باندھ کر لکھتا اور لاجواب لکھتا۔ اس نے ایک خاص روشنائی ایجاد کی تھی جس نے اس کے خط کو اور روشن کر دیا تھا۔ اس عدیم النظیر خطاط نے خطِ کوفی اور معقلی کے لطیف امتزاج سے اول خط نسخ کے علاوہ پانچ اور قلم (جدول ۴) جاری کئے۔ ان پانچ خطوں کے بعد چھ قلم (جدول ۵) اور نکلے مگر ان کو نئے قلم کہنا درست نہیں۔ دراصل یہ سب نسخ کی شاخیں ہیں جو ابن مقلہ اور دوسرے خطاطوں کی اصلاح کردہ ہیں۔ دوسرے اصلاح کرنے والوں میں سے ایک مشہور و معروف خطاط ابو الحسن علی ابن ہلال بوّاب (دربان) تھا۔ ابن بوّاب، ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً ۸۴ سال بعد پیدا ہوا اور آسمانِ شہرت پر بدر کامل ہو کر چمکا کیونکہ خط نسخ کی تہذیب اور حسن و جمال کا سہرا آخر میں ابن بوّاب کے سر رہا۔ یہ ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء یا سنہ ۴۲۳ھ میں بمقام بغداد فوت ہوا۔ ابن بوّاب کے بعد نسخ کے باکمالوں میں تین یاقوت مشہور ہوئے۔

یاقوت اول: امین الدولہ ابوالدر یاقوت بن عبداللہ موصلی۔ یہ شاہ سلجوقی کا غلام تھا، اس لئے یاقوت الملکی مشہور ہوا $\frac{۶۱۸}{۱۲۲۱}$ھ میں بمقام موصل وفات پائی۔

یاقوت دوم: یاقوت بن عبداللہ الرومی الحموی ہوا اس نے سنہ ۶۲۶ھ میں وفات پائی۔

یاقوت سوم: یاقوت بن یاقوت بن عبداللہ رومی المستعصمی۔ یہ باکمال ابوالمجد خواجہ عماد الدین رومی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ خطِ نسخ کا آخری امام یہی ہوا ہے جس پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا $\frac{۶۹۸}{۱۲۹۹}$ھ میں وفات پائی۔ اس یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید اب تک نواب زادہ سعید الظفر خان بہادر بھوپال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ نواب موصوف نے اسے پیرزادگان ملہر شریف کے کتب خانے سے حاصل کیا تھا۔

ایران کی تاریخِ کتابت کیومرث سے شروع ہوتی ہے جسے ایرانی یا زردشتی اپنے ملک کا بابا آدم سمجھتے ہیں اس کے چھ دور مقرر ہوئے ہیں:

۱۔ **آشوری دور:** جرمن محقق اسپیگل کی تحقیق کے مطابق مسیح سے ایک ہزار برس قبل ایران میں زبانِ قدیم فارسی اور پیکانی خط رائج تھا جو مصری اور چینی خط سے مشابہ ہونے کے ساتھ ساتھ معقود بھی تھا۔

۲۔ **میڈوی دور:** (مسیح سے ۸۰۰ برس قبل) اس میں وہی قدیم زبانِ فارسی تھی، جو اب مفقود ہو چکی ہے اور خط پیکانی تھا۔

۳۔ **قدیم ایرانی دور:** (۵۵۹ سے ۳۳۰ ق۔م تک) اس عہد کا آخری بادشاہ دارائے اعظم تھا۔ جس کو سکندر اعظم یونانی نے شکست دی اور ایران کو تاخت و تاراج کیا۔ چنانچہ کوہِ بےستون اور نقشِ رستم کے کتبات میں ان کے کارنامے درج ہیں جو قریب قریب پیکانی خط میں ہیں۔ زبان قدیم فارسی یا اوستائی تھی۔

۴۔ **طوائف الملوکی دور:** (۳۳۰ ق م سے ۲۲۶ ق م تک) اس عہد کی بدنظمی کی کیفیت شاہنامہ فردوسی میں "اشکانیاں" کے عنوان کے تحت زبانِ فارسی میں درج ہے۔ قدیم کتابت بدستور قائم رہی۔

۵۔ **ساسانی دور:** (۲۲۶ تا ۶۵۲ ق م) ساسانی حکومت کا بانی اردشیر تھا۔ جس نے زردشتی مذہب کو دوبارہ حیات بخشی۔ بہرام، نوشیرواں خسرو پرویز وغیرہ نامور بادشاہ ہوئے۔ آخری بادشاہ یزدگرد $\frac{۳۱}{۶۵۲}$ھ میں قتل ہوا۔ زبان متوسط فارسی ہوگئی جو اُس وقت عرفِ عام میں پہلوی کہلاتی تھی۔ خط بھی پہلوی ہوگیا لیکن اس کا ماخذ شکستہ شکل میں مسماری ہی تھا۔

۶۔ **اسلامی دور:** (آغاز از عہد خلافت فاروقی) حلقہ بگوشِ اسلام ہوجانے کے بعد چونکہ مذہبی احکام کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم کا لکھنا پڑھنا اور سمجھنا لازم ہوگیا تھا، اس لئے ایرانی نوشت و خواند میں عربی کا عمل دخل بڑی تیزی سے شروع ہوا اس کے باوجود آئندہ ایک صدی تک پہلوی خط دوش بدوش جاری رہا۔ اس کا ثبوت رودکی کے اشعار سے ملتا ہے:

فکاھیہ:

پرائی موٹر کا چسکا

سیّد ضمیر جعفری

دوست بدظن ہیں کہ ان سے بدگماں رہتا ہوں میں　　"ماہ و مہر و مشتری کا ہمعناں" رہتا ہوں میں
کیا بتاؤں دوستوں کو اب کہاں رہتا ہوں میں　　اپنے ہمسائے کی موٹر میں رواں رہتا ہوں میں

رفتہ رفتہ ترک سب سے دوستانہ ہو گیا
ہوتے ہوتے میں "ضمیرِ غائبانہ" ہو گیا

یہ نہیں کہ آجکل میں "خطۂ ڈالر" میں ہوں　　میں اسی جوتی، اسی ٹوپی اسی کالر میں ہوں
میرا کیا مقدور، میں کنگال گیلن بھر میں ہوں　　یہ تو اس داتا کی بخشش ہے کہ اس موٹر میں ہوں

کیا کروں عادات کو اوقات پر قابو نہیں
اندریں حالات اپنی ذات پر قابو نہیں

میں یہ کہتا ہوں کہ بارش ہے پری خانے کو چل　　وہ یہ کہتا ہے سفارش ہے ذرا تھانے کو چل
میں یہ کہتا ہوں کسی شاداب کاشانے کو چل　　وہ یہ کہتا ہے کہ بس خالی ہوا کھانے کو چل

میں یہ کہتا ہوں وہاں کچھ شعر تر ہو جائیں گے
وہ یہ کہتا ہے کہ شاعر "دردِ سر" ہو جائیں گے

میں یہ کہتا ہوں کہ اسپتال تک لے چل مجھے　　وہ لئے جاتا ہے سوئے مشہد و موصل مجھے
میں یہ کہتا ہوں ذرا حسن کے دو اک پل مجھے　　وہ یہ کہتا ہے ذرا لٹھا مجھے، ململ مجھے

اختیار اس کی روانی پر اگر ہوتا مجھے
"دیکھتا سینا مجھے، موسٹے مجھے، جلوا مجھے"

جب سے ارزاں ہو گئی یہ کار بے دام و درم　　کوچہ و بازار میں چلنے سے گھٹ جاتا ہے دم
الحذر! یہ ہر طرف چھلکی ہوئی "خیر الامم"!　　ران پر ریڑھے کا پہیا، کان پر تانگے کا بم

اے مرے پیارے، گلی کوچے کے یارو! الوداع!
سائیکلسٹو، پیدلو، تانگہ سوارو، الوداع!

دو قدم چلنا ہوا دشوار یارو کیا کروں　　حوصلہ کم، فاصلہ بسیار، یارو کیا کروں
بن گئی رفتار ہی دیوار یارو کیا کروں　　کر دیا اس کار نے بیکار یارو کیا کروں

گھر سے تو اکثر بہ قصدِ دوستاں آتا ہوں میں
پھر جدھر موٹر چلی جائے چلا جاتا ہوں میں

"ماہ مارچ کے لیل و نہار —— بقیہ : ص ۳۵

آج رہی پبلک ڈے کی وجہ سے لاہور میں بڑے ہنگامے ہیں، زمین پر بھی آسمان پر بھی —— میں زیادہ تر عادتاً آسمان ہی پر رہی۔ وہاں اتنا حسن اور اس قدر رعنائی بہت تھی۔ بمشکل ڈیڑھ بجے لنچ کے لئے نیچے اتری۔ تمام بلیوں کو گولیاں منگوائیں۔ کھانا کھلایا، سنبل و ریحان کو دانہ دیا، جعفر کو امرود اور ہری مرچ دی، پھر خود کھانا کھانے بیٹھی۔ آج میں نے معنوی حرارت سے پختہ پھل بھی کھائے۔ امتیاز نواب سر مہر شاہ کے ہاں لنچ پر گئے ہوئے اور یاسمین اپنی سہیلیوں کے ساتھ "کنگ اینڈ آئی" فلم دیکھنے گئی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں بیک بینی و دو گوش واپس آگئیں۔ دلچسپ اور خوبصورت تصویر ہے۔ میری دیکھی ہوئی ہے۔

آج کی رات دن کی طرح روشن تھی۔ تمام شہر چراغاں تھا۔ بقعۂ نور راستوں پر لوگوں کے اژدحام میں خلاں خراماں کاریں ہم گویا چہل قدمی کرتے رہے۔ روشنی دیکھنے کے دوران میں امتیاز پر عجیب قسم کی سرور آگیں کیفیت طاری تھی جس کی لاشعوری وجہ پر غور کرنے کا مجھے اب تک وقت نہیں ملا۔ جو فقرہ بھی اُن کی زبان سے ادا ہوتا وہ ناچتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کار یاسمین چلا رہی تھی اُس سے کہا: "دیکھنا لوگن میں کریانہ پھنس جائے" مطلب تھا دیکھنا لوگوں میں کار نہ پھنس جائے۔ یہ سن کر یاسمین کہنے لگی "یہ تو کسی ٹھمری کے بول معلوم ہوتے ہیں!" میرے بار بار ٹوکنے پر بھی وہ باز نہ آئے۔ جنرل پوسٹ آفس آئی تو اُسے "پتا فیش" کے نام سے یاد کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی پرانے یونانی فلسفی کا نام ہو۔ جب میں نے اِس طرزِ تکلم پر اعتراض کیا تو ایک معنوعی وقار سے فرمایا "جب کوئی عالم چھٹی منانے کے لئے نکلتا ہے تو اس کی طبیعت اس طرح RELAX کرتی ہے"! اِن حرکات کی نفسیاتی وجہ ڈھونڈنے کا وقت نہ تھا کیونکہ ڈنر کے بعد محکمۂ ریڈیو کے بلاوے پر اُن کے جشنِ موسیقی میں جانا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے سبزہ زار پر شامیانوں کے زیرِ سایہ ایک ہزار (اندازاً) موسیقی کے شیدا بیٹھے تھے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان۔ کل کے منسٹر صاحبان (کیونکہ آج پنجاب کی منسٹری ٹوٹ چکی ہے) اور یاں کی عمارتِ تہذیب و ثقافت کے کئی مضبوط ستون رونق افروزِ بزم تھے۔ دیر میں پہنچنے کے باوجود خوش قسمتی اور اتفاق سے صفِ اول میں جگہ مل گئی۔ اس لئے میں بآسانی ماہرینِ موسیقی کی دلخراش تانوں کے ساتھ اُن کے چہروں کے جذباتی اتار چڑھاؤ کو بھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد نشستیں نہ تھیں۔ بعد میں آنے والی کئی خواتین کھڑی تھیں۔ آخر امتیاز اور شفیع نے ہمت سے کام لیا اور اپنی نشستیں اُن خواتین کے لئے چھوڑ دیں اور خود قالین پر ہمارے گھٹنوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد کئی حضرات نے اُن لوگوں کی تقلید کی۔

موسیقی کے پرستاروں کا وجد، ستار، طبلے اور سارنگی کے دلنواز اور کیف آور نغمے۔ موسیقاروں کا انہماک اور کمال۔ گل سوسن و برگ ریحان کی مہکیں۔ غرض حسین رات پر ایک داستانی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات کہ اتنے میں موسیقاروں نے ایک قوالی شروع کر دی جس کے بول تھے۔

"حالات بدلتے رہتے ہیں
دن رات بدلتے رہتے ہیں"

اس پر راجہ غضنفر علی خاں صاحب نے قہقہہ لگا کر ایک دن پہلے کے فوڈ منسٹر پیرزادہ عبدالستار صاحب کی طرف دیکھا۔ اس پر پیرزادہ صاحب فرمانے لگے "سیاسیات جیسی گندی چیز کو فن جیسی خوبصورت چیز سے نہ ٹکرائیے راجہ صاحب"!

اس جشن سے ڈیڑھ بجے لوٹے۔ رات گیلی اور تاریک ہے۔ گھٹائیں ہیں اور ہوشربا برساتی ہوائیں —— ! اور ابھی ——

آخر میں نزاکت علی، سلامت علی مشہور موسیقاروں نے ایک گھنٹہ کلاسیکی موسیقی سنائی۔ پروگرام دیکھ کر اندیشہ ہو رہا تھا کہ فنی مہارت کی یہ موسیقی گھنٹہ بھر کیونکر سنی جائے گی۔ مگر دونوں بھائی گانے والوں نے محفل کو مسحور کر لیا۔ ریڈیو سیٹ پر شاید اتنی دیر اس قسم کی موسیقی نہ سنی جا سکتی۔ سامنے بیٹھ کر محفل میں سننا بہت پر لطف تھا۔

اس جشن سے ڈیڑھ بجے گھر لوٹے۔ رات گیلی اور سخت خنک ہے۔ گھٹائیں ہیں اور ہوشربا برساتی ہوائیں! ابھی دو ہی بجے ہیں۔ ایشیائی بہاروں کی راتیں نیند میں ضائع کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ انہیں تخیلات میں بسر کرنا چاہیئے —— یہ بھی ممکن ہے کہ میں رات کی اس پُراسراریت میں شمع ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر بھٹکتی پھروں اور اُن چیزوں کو ڈھونڈوں جو مجھے کبھی دستیاب نہ ہو سکیں!

اُفق تا اُفق

(چیدہ اقتباسات)

مسئلۂ کشمیر: صلاح الدین خورشید

۔ اس مضمون کے اہم مطالب یہ ہیں، ماضی اور حال میں اہلِ کشمیر پر ظلم و ستم، سکھوں، اور ہندوؤں کی لوٹ کھسوٹ اور بہیمانہ مظالم

۲۔ تاریخی پس منظر: اہلِ کشمیر کا قبولِ اسلام، عہدِ مغلیہ میں ان کی خوشحالی، سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد سکھوں کے حملے، پھر ہندوؤں کے حملے، موجودہ حکمراں خاندان کی انگریزوں کے ساتھ سازش، معاہدۂ امرتسر (۱۸۴۶ء)

۳۔ اہلِ کشمیر کی بغاوت۔ ۱۵۰ سال سے تحریکِ آزادی کا قیام۔ وادی کشمیر میں آزادی کے لئے جو جدوجہد کی جارہی ہے وہ نوزائیدہ نہیں بلکہ ۱۵۰ سال سے کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی ہے۔

۴۔ تقسیم برصغیر، قیام پاکستان، انضمام ریاستہائے مختلفہ:

۵۔ مہاراجہ کشمیر کی بھارتی حکومت کے ساتھ سازش اور کشمیر کا بھارت سے الحاق:

۶۔ فسادات و خونریزی۔ بھارتی حکومت کا اعلان کہ یہ انضمام عارضی ہے، آخری فیصلہ اہلِ کشمیر کریں گے۔ (اکتوبر ۱۹۴۷ء)

۷۔ بھارت کی جانب سے متعدد بار عہد شکنی۔ اقوام متحدہ کے فیصلوں اور قراردادوں سے انحراف۔ پنڈت نہرو کی استصواب رائے سے متعلق اولاً ٹال مٹول اور پھر انکار صریح۔ پنڈت نہرو کی بے طور روش اور عناد پر زور، معاہدہ بغداد اور سیٹو سے متعلق غیر منطقی حجت۔

۸۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری اور قید، اقوام متحدہ کے نام، شیخ عبداللہ کا مراسلہ جس میں مقبوضہ کشمیر میں مظالم و استبداد، وحشی قوانین کا نفاذ، کشمیری لیڈروں کی گرفتاری اور زباں بندی اور استصواب رائے کے مطالبہ کا ذکر ہے:

۹۔ بھارتی حکومت سے مطالبہ کہ وہ اقوام متحدہ کی قرارداد کا احترام کرے اور عالمی نگرانی میں استصواب رو بہ عمل لائے:

اسلام سے پیشتر عربی شعر میں فلسفۂ زندگی: عباس محمود العقاد

اخلاقی اقدار کو سمجھنے کے لئے عرب کسی فلسفی یا معلم اخلاق کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ شاعروں کے کلام میں اخلاقی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں، اس حقیقت کو مشہور شاعر ابو تمام نے اپنے ایک شعر میں یوں سمویا ہے:

اگر شعر حمیدہ اخلاق و صفات کی نشاندہی نہ کرتا تو بڑی شخصیتیں بلندی اور عظمت کی ان منزلوں پر نہ پہنچ پاتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اخلاق حمیدہ اور صفات عالیہ سے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جس کا ذکر شعر عربی نے نہ کیا ہو، اہم بات یہ ہے کہ شعر میں ایسی زندگی بخش اور متحرک تصویریں پیش کی جاتی ہیں کہ عام طور پر عرب اپنے جذبات و فطرت اور اخلاقی فعالیت کے درمیان ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں، ان کے نزدیک مبہم سے اخلاقی نظریات، فلسفیانہ موشگافی اور منطقی ریشہ دوانیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، ان کے نزدیک اچھے اخلاق کی کسوٹی ایسی عظیم شخصیتیں ہیں جو کارنامے اخلاق حمیدہ کی عملی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کے اعمال میں ہر مرد و زن اور پیر و جواں کو اپنی افتاد کے مطابق عملی مثالیں مل جاتی ہیں۔

تاریخ اسلام کے چند صفحات : ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (سابق ریکٹر اسیوط یونیورسٹی)

تاریخ عبرت انگریز حوادث سے بھری پڑی ہے۔ انسان اپنی زندگی کے مسائل حل کرنے میں ان حوادث سے مدد لے سکتا ہے تاریخ اسلام بھی ایسے حوادث و واقعات سے پُر ہے آپ کو ایسے کئی خلفاء، امراء، قواد، علماء اور مصلحین کا ذکر ملے گا جنہوں نے فضلیت کا پرچم لہرانے اجتماعی عدل قائم کرنے اور تہذیب و تمدن کو آگے بڑھانے میں گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔

فاضل مؤلف نے رسولِ کریمؐ خلفاء راشدین اور بعض اموی خلفاء کی سوانح حیات کے چند شذرات پیش کئے ہیں، ان کے سادہ طرز زندگی اور عظیم کارناموں پر خاص طور پر زور دیا ہے اور گاہ بگاہ موجودہ اجتماعی مصائب پر نکتہ چینی کرتے ہوئے صدرِ اسلام کی اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔ مضمون نگار نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ رومن اور دیگر اقوام کے ساتھ اختلاط سے عرب کس حد تک متاثر ہوئے، امیر معاویہ نے نظام حکومت انہی سے مقتبس کیا تھا، خلفاء بنی امیہ سے پیشتر مملکت اسلامیہ میں شاہانہ شان و شوکت اور دبدبۂ سلطانی معدوم تھا، اموی خلفاء نے پہلی بار ان مظاہر کو اختیار کیا، اعیان و ارباب بست و کشاد نے حکمران طبقہ کی تقلید میں آہستہ آہستہ حسب مراتب ان مظاہر کو اختیار کرنا شروع کر دیا، اونچے اونچے محل تعمیر کئے گئے، بڑے بڑے باغ لگائے گئے دمشق رشک جناں ہو گیا۔

آخر میں کھیلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک پہلا خلیفہ ہے جس نے گھوڑدوڑ کی ابتدا کی، اس زمانے میں دیگر کھیلوں کے علاوہ چوگان بازی کا کھیل نہایت مقبول تھا۔

معراج : جواد المرابط (الوزیر المفوض سفارت خانۂ شام در پاکستان)

اس مضمون میں معراج پر روشنی ڈالی گئی ہے عقل انسانی کائنات کی کنہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ خدائے تعالیٰ انبیاء کے وسیلہ سے بنی نوع انسان کو راہ راست دکھاتا ہے، ماورائے کائنات کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا، معراج دراصل اس عالم الغیب کی ایک جھلک ہے، اللہ نے رسولِ کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عنایت خاص سے نوازا۔ مگر آہ جس مقام سے واقعہ عظیم رونما ہوا وہ آج دنیا بھر کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے قبضہ میں ہے..... اے فلسطین، ہماری آنکھیں تیرے غم میں اشکبار ہیں لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فلسطین پر یہودیوں کے قبضہ کا حادثۂ فاجعہ طوفان بلاخیز ثابت ہوگا۔ یہ سفینہ ایک چٹان سے ٹکرائے گا اور فاسد عناصر نذرِ امواج ہو کر فنا ہو جائیں گے"

فاضل مؤلف نے نماز کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے پابندی احکام دین کی دعوت دی ہے۔ اور اقبال کے مندرجہ ذیل دو شعروں کا عربی ترجمہ نقل کیا ہے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں ——— اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ——— ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

پاکستان کی یاد میں : نزیہ فنصتہ "مالک اخبار الانباء" (دمشق)

یورپ امریکہ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک کا میں نے دورہ کیا ہے لیکن میری لوح قلب پر دورۂ پاکستان نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ کبھی محو نہ ہوں گے حد درجہ تعجب خیز یہ بات ہے کہ اس نوزائیدہ ملک نے اتنی مختصر سی مدت میں تعمیر و ترقی کے ایسے بے نظیر کارنامے انجام دئے ہیں کہ کوئی ملک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

سیدھی
پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچّے کو یہ
خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
آسٹرملک ایک خالص قوت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جو کہ اُن بچّوں کے لئے بیحد ضروری ہے جنکو کہ مائیں چھاتی کا دودھ کامیابی سے نہیں پلا سکتی ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا اس لئے ملایا جاتا ہے کہ بچّے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ بچّوں کو سیدھی پیٹھ اور مضبوط بازؤں کیلئے اچھی و قوت بخش غذا کی سخت ضرورت ہے۔ اسی لئے آج ہی آپ آسٹرملک خریدیئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ آپ کا بچہ بہترین دودھ پا رہا ہے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچّوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
سنگترہ کا رس پہلے مہینہ کے بعد سے ہر بچّہ کو دینا چاہیے۔ اسمیں وٹامن "سی" ہوتا ہے جو کہ صحت کے لئے ضروری اور ہاضمہ کے لئے مفید ہے۔ ایک چھوٹے چمچ کے برابر رس اُسی قدر پانی کے ساتھ ابتداءً میں دینا شروع کیجئے۔ ضرورت ہو تو تھوڑی شکر یا گلیکسو کا تھوڑا گلوکوز ڈی بھی ملا دیا کیجئے۔
آسٹرملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی
لاہور
چٹاگانگ
ڈھاکہ

ش۔ح

نقد و نظر

گویا دبستاں کھل گیا

مصنف: چودھری محمد علی ردولوی
ناشر: اکادمی پنجاب۔ مال روڈ۔ لاہور
صفحات ۲۸۴ ۔ قیمت ڈھائی روپے۔

یہ چودھری محمد علی ردولوی کے نجی خطوط کا مجموعہ ہے جو اُن کی صاحبزادی ہما بیگم نے مرتب کر کے مولوی صلاح الدین احمد کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اہلِ ذوق کے لئے اس مجموعے کا دراصل اتنا ہی تعارف کافی ہے۔ "کشکول محمد علی شاہ فقیر" کی اشاعت کے بعد اس حال میں کہ چودھری صاحب فراش اور تحریر و تصنیف سے معذور ہیں، سرِ دست کسے گمان تھا کہ اُن کی تحریر کا ایک ایسا بھرپور مجموعہ اور ہاتھ آجائے گا۔ خانم موصوفہ نے کیا خوب کیا کہ اس کتاب کو مرتب کر دیا جس میں نہ صرف مصنف کی تحریر کے بیش بہا نادر نمونے محفوظ ہو گئے بلکہ اُردو خطوط کے سرمائے میں بھی ایک اچھوتی اور بڑی وقیع تالیف کا اضافہ ہوا۔ آپ بیتی کا سا انداز بلکہ سچ پوچھ کی واردات تو چودھری صاحب کی سبھی تحریروں میں موجود ہے لیکن ان نجی خطوط کو ان کے سوانح کا بھی بڑا دلچسپ باب کہا جائے گا۔ چودھری صاحب جیسی مقبول ادبی شخصیت کے نجی کوائف اُردو کی ادبی دنیا کے لئے جو قدر و قیمت رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

اِن ۲۸۴ صفحات میں سو سے اوپر خطوط ہیں جن میں سے اکثر اُن کے عزیزوں کے نام ہیں اور کمتر بعض ادیبوں یا دوسرے دوستوں اور ملاقاتیوں کے نام۔ مدتِ تحریر ۱۹۳۲ء سے لے کر ایامِ حال تک ہے۔ اس کے باوجود طبیعت کی شگفتگی اور تحریر کی گرماگرمی میں کہیں بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ گویا پوری کتاب ایک مسلسل تصنیف ہے جو ایک ہی کیفیت میں ابھی کے ابھی لکھ کر تمام کی گئی ہے۔ موضوع کسی کی یادآوری ہو، شکوہ و شکایت ہو، یا دکھ بیماری، ادب یا آرٹ کا مذکور ہو یا بستی کا کوئی سکینڈل۔ زر زمین کا جھگڑا ہو یا کوئی رومانی واردات، چودھری صاحب کا قلم اُسی البیلے انداز سے پھول بکھیرتا اور رنگ اُڑاتا چلا جاتا ہے۔

اس یادگار مجموعے کے ایک مستقل ادبی تالیف ہونے میں کلام نہیں لیکن کسی قدر تشنہ ضرور ہے ۔۔۔ اُمید ہے کہ آئندہ اس کے زیادہ جامع ایڈیشن بھی شائع ہوں گے۔ کتاب مجلّد اور ظاہری محاسن سے بھی آراستہ ہے۔

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری

از: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
ناشر: اُردو مرکز۔ لاہور
مجلّد، صفحات ۸۸۸، قیمت ۱۳/۸ روپے

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اُردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب ہونے کے علاوہ ایک مجموعۂ اقدار کا نام ہے جو بعض مستقل ادبی رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ رجحانات تمام تر مستحسن نہیں، بلکہ ناقدینِ ادب نے ان کو بہت کچھ نشانۂ ملامت بنایا ہے۔ لیکن ان کا مطالعہ اپنی جگہ نہایت دلچسپ ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں جذبات و گفتار کی وہ سادگی اور عشق کی گرمی نہ سہی جو دہلی کی خصوصیات شمار کی جاتی ہیں، لیکن اپنی جگہ یہ کلام نہایت پر لطف ہے اور تفننِ طبع کے ایسے ایسے سامان رکھتا ہے کہ ان کا جواب دنیا بھر میں نہیں ملتا۔ زبان کی صفائی کا جو عمل دہلی میں قدرتاً جاری ہو چکا تھا اُسے بھی لکھنؤ والوں نے آگے بڑھایا۔ ان میں سے بعض تبدیلیاں، خصوصاً متروکات دہلی میں بھی قبول کئے گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ دونوں جگہ کی زبان میں محاورے کا اندک اختلاف ضرور پیدا ہوا اور لکھنؤ میں ہندی کی جگہ فارسی و عربی لغات پر زیادہ زور رہا۔ اگرچہ وہ سلیس زبان جو دلی میں مقبول تھی پھر بھی معیارِ فصاحت رہی، لیکن زبان کی ترویج اور علمی ترقی کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں وہ رجحان بڑھتا گیا جس کا آغاز لکھنؤ نے قائم کیا تھا۔

زیرِ نظر کتاب جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں لکھنوی ادب کا غائر جائزہ لیا گیا ہے اور تاریخی و تہذیبی پس منظر میں اُردو کی دوسو سال کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے بہت سے ایسے مآخذ تک بھی دسترس بہم پہنچائی جو اب تک نادریافت تھے۔ یہ ایک ادبی جائزہ ہے، چنانچہ اس میں سوانح سے کم بحث کی گئی ہے اور تصانیف سے زیادہ۔ لیکن اپنی معینہ حدود میں یہ کتاب بڑی جامع اور ادب کے طالبعلموں کے لئے نہایت مفید تالیف ہے۔ معذرت خانہ اعتدال پسندی کے لحاظ سے مؤلف کے تنقیدی نکات کہیں بھی گنجائشِ کلام نہیں رکھتے۔ یہ تالیف اُردو ادب کی تاریخ میں بلاشبہ بڑا وقیع اور پائیدار اضافہ ہے۔ آخر میں فہرست آخذ، اشاریہ اور دوسرے ضمیمہ جات کے اضافے سے اس کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کے جو مرقعے مولانا شرر نے پیش کئے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن اس تہذیب کی خاص پیداوار یعنی شاعری کا یہ پہلا مفصل جائزہ ہے جو لیث صاحب نے تاریخی التزام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابھی ان شعراء کی تفصیل اور ان کے ادبی کارناموں پر دفتر لکھے جا سکتے ہیں لیکن ایک منضبط مطالعے اور یکجائی تبصرے کے طور پر یہ کتاب ہمیشہ مفید رہے گی۔ کتاب ظاہری محاسن کے لحاظ سے بھی امتیاز رکھتی ہے اور قدر کے قابل ہے۔

معلق شاہراہ : —— بقیہ صفحہ ۲۸

"بابوجی اب چکر میں نہ پڑو!" خان نے کہا "دیر ہو جائے گی!" اور سب جیپ میں سوار ہو گئے۔

جیپ نیچے کی طرف لُڑھکنے لگی۔ مسعود لبستر پر بیٹھا چٹکی بجا رہا تھا۔ عمر سیب کھاتے ہوئے سامنے کوہستان کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اسحاق کی نگاہیں چھوٹی چھوٹی گلیاں تلاش کر رہی تھیں، ضیا اپنا کیمرہ ٹٹول رہا تھا۔ اور عبداللہ اطمینان سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔

دکانوں میں فیوڈل لارڈ بے پروائی اور بے حسی سے جیپ کی طرف دیکھ رہے تھے، بچے تالیاں بجاتے ہوئے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ دُور عورتیں حسرت و حرماں بھرے سُروں میں رو رہی تھیں اور ڈھولک ناچنے کی بجائے اپنے سر پہ دوہتڑ مار رہی تھیں۔ نیچے کنہار ناچ رہا تھا، جیسے وہ ایک تماش بین ہو اور اس تماشے سے محظوظ ہو رہا ہو۔ سڑک گر رہی تھی اگرے جا رہی تھی اور جیپ پھسل رہی تھی، پھسلے جا رہی تھی!

افق تا افق : —— بقیہ صفحہ ۵۳

اس ملک کی ہر چیز حسین و جمیل و جذاب، اس کے زعماء میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور وہ ایسے جوش و خروش سے سرگرم عمل ہیں کہ زمانہ انگشت بدنداں ہے۔ اس کے صدر جنرل اسکندر مرزا بے حد مقبول و محبوب ہیں۔ انہوں نے آیاتِ قرآنی کی ضیا پاش فضاء میں اس جمہوریت کا افتتاح ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو کیا۔

جمال فطرت کی تعریف سے قوت بیان عاجز ہے۔ لاہور تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں سے جس جنت کا وعدہ کیا ہے۔ لاہور اس کا نمونہ ہے ÷

اہل پاکستان کو ہر عربی چیز سے والہانہ عشق ہے، ان کی بے پناہ محبت صرف پرجوش استقبال پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ عملی طور پر عربوں کے ہر مسئلہ میں دلچسپی لیتے ہیں اور پرخلوص حمایت و تائید کرتے ہیں ÷

ہر عرب اور اسلامی ملک کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کے تمام مسائل میں اس کی مدد کریں، خاص طور پر مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی ہر ممکن امداد [illegible]

(مترجم عربی مجلہ "الوطنی" کراچی سے)

آپ بہتر زندگی کا سہرا کریں

دور ہوئی مکھی

یہ جون کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں ہمارے گھر، گلیاں، بازار، اسکول، دفتر سبھی مکھیوں کے بے پناہ حملوں کا شکار ہوتے ہیں ۔ جب مکھیاں ہمارے منہ پر آ کر بیٹھتی یا بازوؤں پر رینگتی ہیں تو ایک سنسنی سی پیدا ہوتی ہے اور بڑا ناگوار گزرتا ہے ۔ تعجب یہ ہے کہ ہم پھربھی مکھیوں کے روادار ہوتے ہیں ۔ وہ لوگ بھی، جو بقول کسے، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں، نہ معلوم اسے ہی کن کن ناپاک چیزوں پر بیٹھنے دیتے ہیں ۔ لیکن یہ بے پروائی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ مکھی مہلک بیماریاں پھیلاتی ہے جو اپاہج کردیتی ہیں یا جان ہی لے کر ٹلتی ہیں ۔

سمجھدار لوگ جانتے ہیں کہ عام گھریلو مکھی بڑی بڑی خطرناک بیماریوں کے جراثیم پھیلا سکتی ہے ۔ مثلاً غذائی زہرباد ، اسہال ، پیچش ، تپ محرقہ، ہیضہ ، انتڑیوں میں کرم ، ککرے

یہ ہیں
مکھیوں کی
خاص
پرورش
گاہیں

ٹی بی یا سوکھا اور کئی دیگر بیماریاں بھی -

امید ہے اس مضمون کو پڑھنے والے ان باتوں کو دوسروں تک بھی پہنچائیں گے خصوصاً جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے - یہ ایک قومی اور سماجی خدمت ہے - جسے لازم سمجھنا چاہئے -

آپ کے لئے جو کچھ بھی دام ہوں مکھیوں کے لئے سارا بازار مفت ہے-
ایسی چیزیں پوٹاشیم پرمنگنیٹ سے دھولینی چاہئیں

مکھیاں انڈے کہاں دیتی ہیں ؟

مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے گرمی اور نمی کی ضرورت ہوتی ہے - یہ دونوں چیزیں صحنوں، چوبچوں، پاخانوں ، پیشاب خانوں ، نالیوں اور غلیظ باورچی خانوں میں کوڑے کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر پر ملتی ہیں- یہاں مکھی کو غذا بھی ملتی ہے اور وہ پرورش بھی پاتی ہے - کیونکہ مکھی کا من بھاتا کھاجا انسانوں اور جانوروں کا فضلہ ہے یا گلی سڑی ترکاریاں ، پھل اور خوراک - مکھی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں انڈے دیتی ہے جن میں سے ''لاروا'' یعنی چھوٹے چھوٹے بے پر کے کیڑے جلد ہی نکل آتے ہیں یہ گلتے سڑتے پھل ترکاریوں پر پل کر بڑے ہوجاتے ہیں پھر ان کے پر نکل آتے ہں - یہ مٹیالے رنگ کی انڈے سے ملتی جلتی ننھی سی جانیں ہوتی ہیں - اس حالت سے نکل کر یہ پوری مکھی بن جاتے ہیں جو خوراک کی تلاش میں گندگی کے قریب ترین ڈھیر یا گلتی سڑتی مردار چیزوں اور سبزیوں کی طرف لپک کر جاتی ہیں -

مکھیاں خوراک میں جراثیم کیونکر داخل کرتی ہیں ؟

مکھی ٹھوس چیزیں نہیں کھاسکتی - جب یہ کسی ٹھوس چیز پر آکر بیٹھتی ہے تو اپنے

جملے میں جو کچھ ہو باہر اگل دیتی ہے اور پھر اس اگلے ہوئے لعاب یا اپنی بیٹ کو ٹانگوں سے مل مل کر خوراک میں گھول دیتی ہے اور اپنی نلی جیسی لمبی سونڈ سے اس کو پی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تصویر بڑی گھناؤنی ہے۔

مکھیوں کو خاص طور پر مٹھائیاں اور دودھ پسند ہیں، جن کو ہمارے بچے بھی پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے ملک میں، جہاں ہر کہیں مکھیوں کی بھرمار ہے، بچوں کی تعداد اموات بہت زیادہ ہے۔
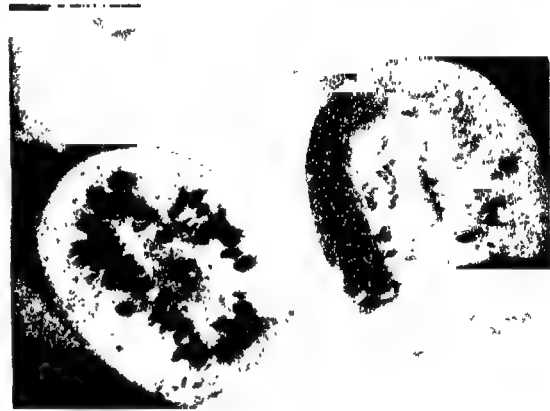
پہلے تربوز تھا اب بیماریوں کی پوٹ ہے!

مکھی کی عمر دو تین ہفتوں سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن اس مختصر عرصے میں بھی یہ کتنی خوفناک تباہی نازل کر سکتی ہے۔ مکھی کی ٹانگوں اور بدن پر بڑے چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں جن کو صرف خوردبین ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر انکے ساتھ گندگی کے بےشمار ٹکڑے اور بیماری پھیلانے والے جراثیم چمٹے ہوتے ہیں۔ مکھیاں بڑی تیزی سے پھلتی پھولتی ہیں، چنانچہ ایک جوڑا، اگر چھ مہینے زندہ رہے، تو اپنی جیسی پچپن (۵۵) کروڑ اور مکھیاں پیدا کرسکتا ہے!!

مکھیوں پر قابو کیسے پایاجائے؟

چونکہ مکھیاں گندگی پر نشو و نما پاتی ہیں اسی لئے گندگی کو دور کر کے ہم ان کی پرورش گاہوں کا خاتمہ کرسکتے ہیں۔ صفائی کے علاوہ گھر کے اندر باہر مکھیوں کی روک تھام کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

اسی مقصد کے لئے ہر گھر میں ایسے منہ بند

شہری رضاکار صفائی کی مہم پر

صفائی کی مہم میں محکمہ صحت کا ھاتھ بٹائیے

ڈبے یا کنستر ہونے چاہئیں جن میں کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالی جاسکے۔ پاخانوں کو بالکل صاف رکھنا چاہئے۔ جہاں کہیں پانی بھرنے کے لئے ہاٹ برتے جاتے ہوں وہاں پاخانے کا دروازہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں مکھیاں داخل نہ ہوسکیں اور کبھی کبھار اس کے چوکھٹے پر مٹی کا تیل بھی مل دیناچاہیئے۔

اگر آپ کھیتوں یا فارموں کے پاس رہتے ہیں تو آپ کو جانوروں کا گوبر اور کھاد گڑھے میں

ڈال دینا چاہئے ۔

یہاں شیشہ بند مٹھائی مکھیوں کی دستبرد سے محفوظ ہے

کھانے پینے کی تمام چیزیں ڈھانپ کر رکھیں ۔ مثلاً ہوادار نعمت خانوں میں کھانے پینے اور پکانے کے برتن خوب صاف ستھرے رہیں ۔ یہ دھیان رکھیں کہ کہیں بچی کھچی کھانے کی چیزیں یا روٹی کے ٹکڑے فرش کے سوراخوں میں جمع نہ ہوجائیں ۔

جہاں مکھیاں زیادہ ہوں وہاں ''ڈی۔ڈی۔ٹی،، ''گیمیکزین،، یا ''فلٹ،، کا ایسا چھڑکاؤ کریں جو دیواروں، دروازوں اور دریچوں پر لگا رہ جائے ۔ یہ بہت کارگر ثابت ہوگا اور اس کا اثر ڈیڑھ سے تین مہینے تک باقی رہیگا۔ مکھی کو معمولی چیز خیال کر کے بے پروائی نہ کریں ۔ یہ آپکی صحت کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ہم سب کو مکھیوں کے ملیامیٹ کرنے کا تہیہ کرلینا چاہئے ۔ خاص طور پر موجودہ دنوں اور برسات کے موسم میں جب کہ مکھیوں کی خاص طورپر افراط ہوتی ہے *

کراچی :سرکاری اہتمام میں مچھلیوں کا ایک اسٹال
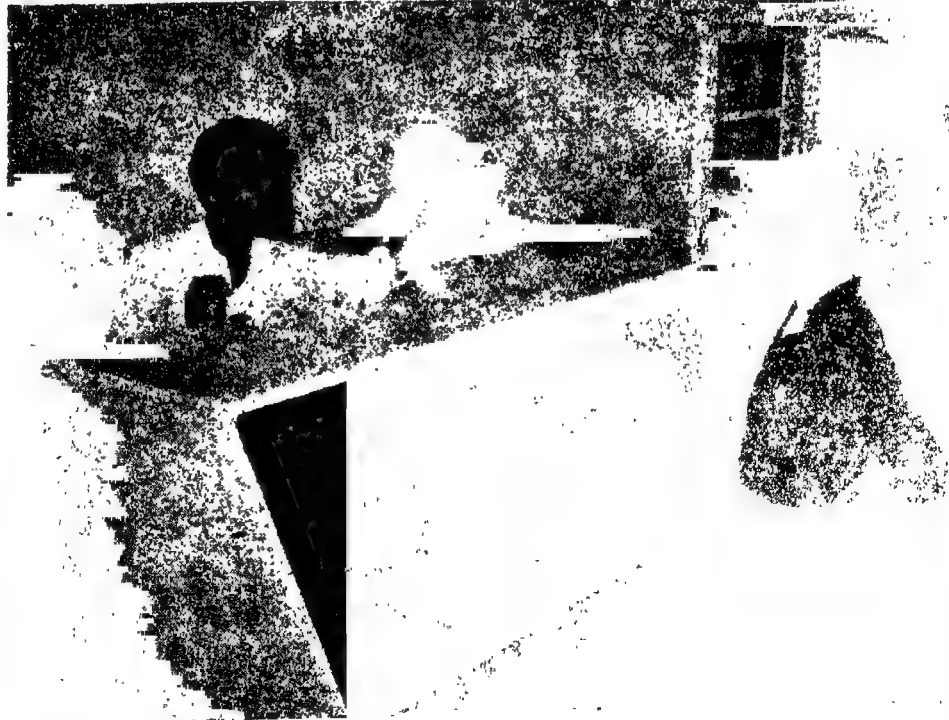
مشرقی پاکستان
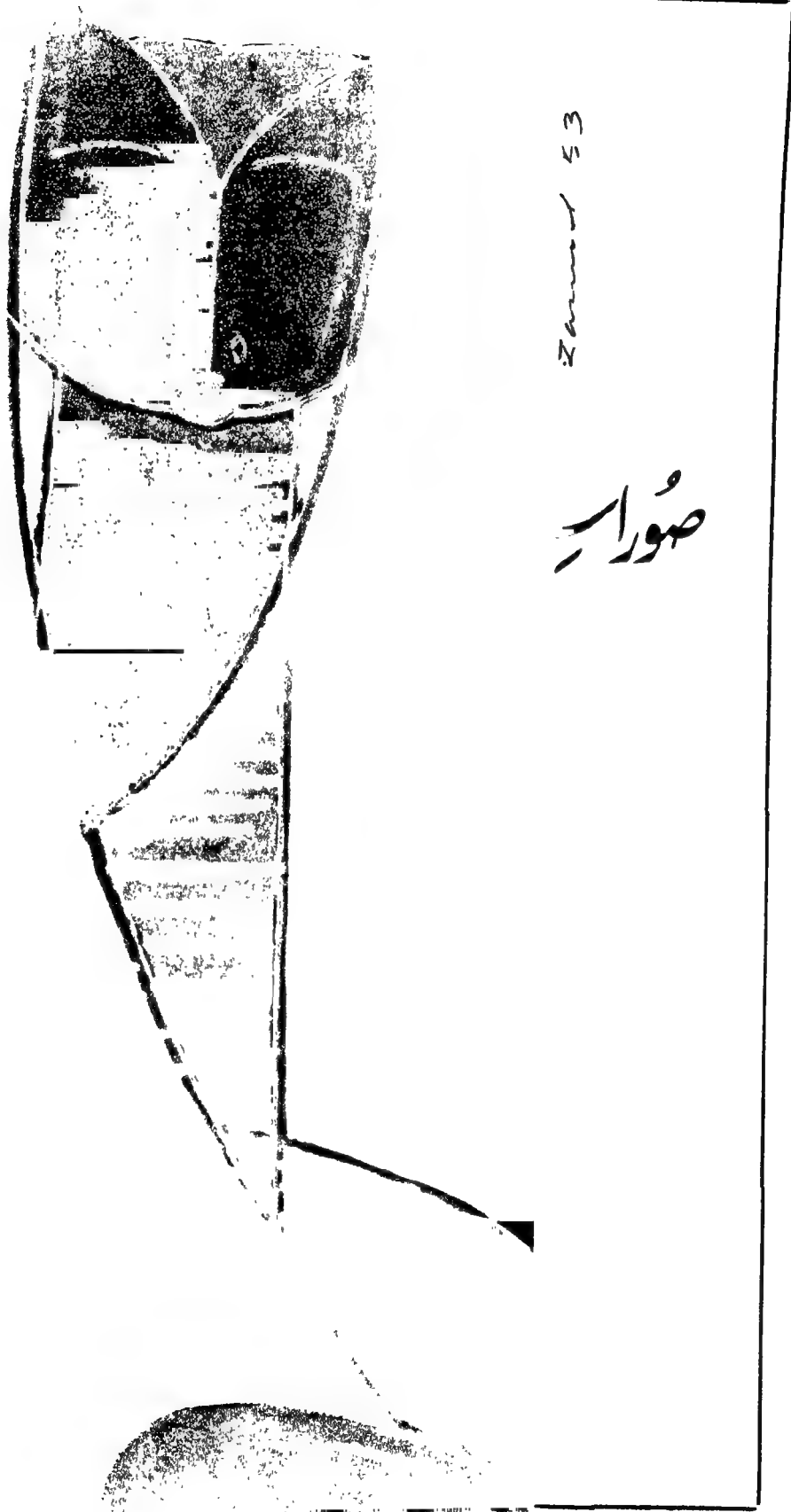
(دو دلکش نظارے)
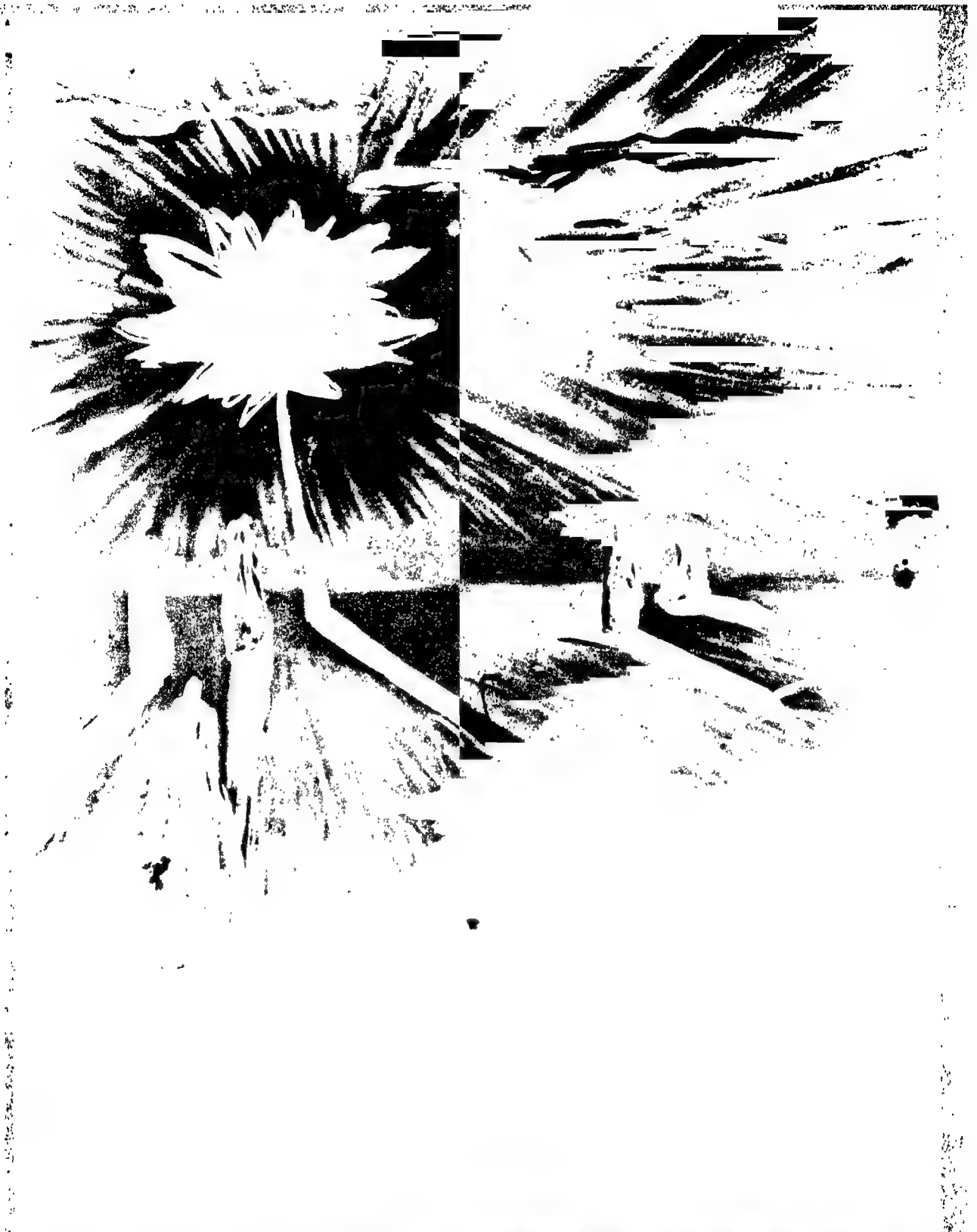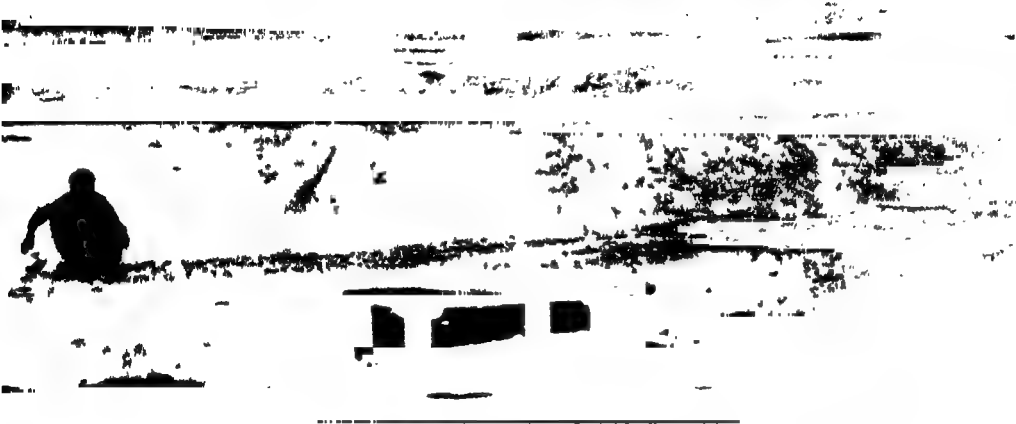
جولائی
۱۹۵۷ء

سوات

مغربی پاکستان کی دل آویز قدرتی وادی

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۴

جولائی ۱۹۵۷ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی — آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی

✿ ✿ ✿

"آپس کی باتیں"

ہم سوچ رہے تھے کہ ایک ہی خط جو کسی قوم یا خطے میں رائج ہو کس طرح دور دور تک پہنچ کر ایسے ایسے روپ بدلتا ہے کہ وہ سب بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں گویا اُن کا اصل خط ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ چینی اور جاپانی خطوط کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آئیں۔ اب ایک ایسی ہی چونکا دینے والی بات نے اس سوچ بچار کو اور بھی تازیانہ لگایا ہے یعنی مغرب کے کئی مشہور ادبی شاہکاروں کا سرچشمہ مشرق ہی کی افسانہ خیز اور داستان پرور سرزمین ہے۔ یہ تو خیر سب جانتے ہیں کہ دنیا میں تہذیبی لین دین کا سلسلہ شروع ہی سے جاری رہا ہے اور چراغ سے چراغ برابر جلتے چلے آئے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری قوم نے دوسری تہذیبوں کے آثار کو اپنایا اور سمویا ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ بالخصوص اس وقت جب کسی قوم یا تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر ہو اور دوسری قومیں اور تہذیبیں اس کے سامنے گہنا جائیں۔ چونکہ تاریخ کا تازہ ترین دور مغربی تہذیب و تمدن کے عروج ہی سے مرتب ہوا تھا، اس لئے اس کے متعلق بھی مدتوں حسنِ ظن رہا کہ اس کے مظاہر تمام تر اسی کی طبعی صلاحیتوں کے مرہونِ منت ہیں، لیکن آج اس میں مشرقی قوموں کے فیضان کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اناجیل، الف لیلہ، واقعۂ معراج وغیرہ کی حد تک تو یہ فیضان اظہر من الشمس ہے اور عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن کتنے ہی امور ایسے ہیں جن میں یہ فیضان دبیز پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ بعض محققین نے مغرب کے کتنے ہی اساطیر اور داستانوں کا سراغ ایرانِ قدیم کے قصص و حکایات سے لگایا ہے۔

زیرِ نظر شمارہ میں ایسا ہی انکشاف مغرب کی چند معرکۃ آلارا تصانیف کے بارہ میں کیا گیا ہے جن کو ہم تمام تر طبع زاد خیال کرتے ہوئے یہ سمجھتے رہے ہیں کہ جدت طرازی اہلِ مغرب ہی کا حصہ ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ مشرق میں ایسے گنج ہائے گراں مایہ اور بھی ہوں جن سے دانایانِ فرنگ نے استفادہ کیا۔ ایسے نوادر پر توجہ لازم ہے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ فکرِ مشرق نے کس حد تک مغربی تہذیب و تمدن کی آبیاری کی ہے۔

پچھلی بار "افق تا افق" کے زیرِ عنوان، عربی سے جو چیدہ اقتباسات پیش کئے گئے تھے وہ ادارہ کے ایک فاضل رکن جناب عطا حسین نے "ماہِ نو" کے لئے ترجمہ کئے تھے۔ موصوف نے ہمیں اُم الالسنہ کے علمی و ادبی نوادر سے روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور متفرق تراشوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً اہم شاہکاروں سے بھی نوازتے رہیں گے۔ اب کے انہوں نے ہمارے لئے نامور افسانہ نویس "محمود تیمور" کے ایک تازہ شاہکار کا ترجمہ کیا ہے جو ہم اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں۔

اس شمارہ میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے یادگاری سلسلہ کی چند اور کڑیاں پیش کی جا رہی ہیں، جو اُمید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ ان میں سے ایک ظفر کی شاعری پر خاصا دلچسپ مضمون ہے۔ بہادر شاہ ظفر صرف خاندانِ مغلیہ کا آخری تاجدار ہی نہ تھا بلکہ اردو کے باکمال شعراء کے سلسلہ میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا کلام مختلف حیثیتوں سے توجہ کا مستحق ہے، گو اب تک بہت کم ناقدین نے اس پر نظر ڈالی ہے۔

اقلیتیں پاکستان کی ایک مقدس امانت ہیں۔ ان میں سے ایک "کبیر پنتھی" ہیں جو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے زیرِ سایہ پوری آزادی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ اب کی اس اقلیتی فرقہ کے ایک نمائندہ سوامی کلجگانند ہماری ادبی محفل میں شریک ہو رہے ہیں۔

سرورق پر جو نقش پیش کیا جا رہا ہے، ایک پاکستانی مصورہ صغریٰ ربابی کے فن کا نمونہ ہے۔ اس میں شوخیٔ تصور کے ساتھ شوخیٔ اظہار کی رعنائیوں کو بھی کچھ کم دخل نہیں۔ اس میں تجرید اور واقعیت، سادگی و پرکاری، اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ دیکھتے ہی مکمل وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ اور "طلوع" کا تصور یک دم جھلک جاتا ہے۔

ڈاکٹر باقر نے "ملی ضروریات اور ملی زبان" کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بعض بنیادی اصلیتوں کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کاغذی تجویزیں پیش کرنے اور خیالی گھوڑے دوڑانے کی بہ نسبت کوئی عملی قدم اٹھانا یقیناً زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔

مصوّر فیچر کے لئے تصاویر اور چارٹ ہمیں ٹریفک پولیس (کراچی) نے عنایت کئے ہیں جس کے لئے ہم اس کے ممنون ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کی شاعری

محمد طاہر فاروقی

بہادر شاہ ظفر روشن دل، دانشمند، بیدار مغز اور بلند حوصلہ انسان تھے، لیکن ان کی ساری زندگی مجبوری اور بے بسی میں گزری۔ مشہور ہے کہ "بادشاہیٔ شاہ عالم از دہلی تا پالم" لیکن یہ حکومت ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں تو قلعۂ معلّٰی کے اندر ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بلکہ قلعہ کے اندر بھی انگریزوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ بہادر شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد یہ حالات اور بگڑتے گئے۔ ڈھلتے سورج کو روکنا کسی کے بس کا نہیں ہوتا، مگر بہادر شاہ ایک حساس، غیور اور صاحب دل شخص تھے۔ اس لئے اپنی بیچارگی و بے بسی پر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ حالات و واقعات کی تلخی و ناخوشگواری نے طبیعت پر گہرا اثر ڈالا، تو انہیں تصوف و شاعری کے دامن میں پناہ نظر آئی۔ درویشی اور شاعری سے ان کو فطرتاً بھی مناسبت تھی۔ پھر مرشد و استاد ملے حضرت شاہ نصیر الدین عرف کالے صاحبؒ (خلیفہ حضرت مولانا فخر الدینؒ) اور شاہ نصیر جیسے کاملین فن، چنانچہ بہادر شاہ ایک سچے صوفی اور کامل شاعر کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔

شاعری میں ظفر کو چار استادانِ فن سے تلمذ حاصل ہوا۔ شاہ نصیر، کاظم حسین بیقرار، ذوق اور غالب۔ بیقرار سے مشورے کا زمانہ تھوڑا ہے اور مرزا غالب کو غزلیں بالکل آخر زمانے میں دکھائی گئی تھیں، جبکہ ظفر، عمر اور شاعری کی پختگی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہیں کہ ان کے شاعرانہ رنگ کو نمایاں کرنے میں ان کی اپنی طبیعت کے بعد جو اثر ہو سکتا ہے وہ شاہ نصیر اور استاد ذوق کا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا اصلی رنگ ان دونوں سے لگا نہیں کھاتا۔

آزاد نے ظفر کے چاروں دیوان اُن سے چھین لئے ہیں۔ وہ آدھے دیوان کو شاہ نصیر کی محنت اور باقی ساڑھے تین دیوان کو ذوق کا فیض بتلاتے ہیں۔ مگر یہ الزام لگا کر انہوں نے ظفر ہی نہیں، شاہ نصیر اور ذوق پر بھی ظلم کیا ہے۔ ظفر کے کلام میں ان کے استادوں کا اثر ضرور تلاش کیا جا سکتا ہے، مگر سارا کلام ان استادوں کی طرف منسوب کر دینا ذوق سلیم کی ہنسی اُڑانے کے مرادف ہے۔ اس کے برعکس یوں کہنا چاہیئے کہ جس طرح غالب کی آخری شاعری کو سہلِ ممتنع بنانے میں دوسرے اسباب کے ساتھ قلعہ سے وابستگی کو دخل تھا اسی طرح ذوق کو قلعۂ معلّٰی کے تعلق ہی نے روزمرّہ اور محاورے کا بادشاہ بنایا تھا۔ ویسے بھی ذوق کے کلام میں جیسی پرواز خیال، تازگی مضامین، چھوٹی فارسی ترکیبیں اور جوش و خروش پایا جاتا ہے (غزلوں سے زیادہ قصائد میں) ظفر کے ہاں ان کی تلاش بیکار ہے، بلکہ بقول مولانا حالی "ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرّہ کی خوبی میں اوّل سے آخر تک یکساں ہے۔ لیکن اس میں تازگیٔ خیالات کم پائی جاتی ہے۔" اس کے سوا ان کے ہاں جو معاملہ بندی، محاکات، درد و الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے، اس سے شاہ نصیر اور استاد ذوق کا کلام یکسر عاری ہے۔

ذوق نے شکایت کی ہے کہ:

> ذوقؔ مرتب کیونکہ ہو دیوان، شکوۂ فرصت کس سے کریں
> باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفرؔ کے جھگڑے ہیں

جاننے والے جانتے ہیں کہ ان جھگڑوں کے معنی دربارداری اور حضوری کے ہیں نہ کہ دیوان تصنیف کرنے کے۔

دبستان دہلی کا یہ دور اردو شاعری کا عہد زرّیں ہے۔ ذوق، مومن اور غالب نے میر، سودا اور درد کے ورثے کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ہم ظفر کی شاعری کو ان استادوں کی صف میں تو جگہ نہیں دے سکتے، لیکن ان کے بعد شیفتہ، ممنون، اور تسکین کے ساتھ ان کا نام ضرور لیا جائے گا۔ بلکہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے یہ دَور ظفر کی شاعری کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ظفر

صنعت گر بھی تھے اور فطری شاعر بھی۔ ان کی شاعرانہ صناعی یا صناعانہ شاعری شیخ ناسخ اور شاہ نصیر کا رنگ دکھاتی ہے تو ان کی فطری شاعری میر اور جرأت کی روش پر چل کر تغزل کے روپ کو نکھارتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ تصور کیجئے کہ بہادر شاہ کیسی مصیبت اور بے بسی کا شکار تھے۔ دشمنوں کی مکاریاں اور سازشیں تو الگ رہیں، اپنوں کی بے وفائی و غداری ہر لحظہ ان کے حساس دل پر ٹھیس لگاتی ہوگی۔ اور دنیا کی بے ثباتی، حالات کی بے اعتباری اور زمانے کی نیرنگی نے ان کی طبیعت پر گہرے نقش ثبت کئے ہوں گے۔ اسی لئے انہوں نے جرأت کے رنگ سے ہٹ کر میر کی قلمرو میں بھی قدم رکھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اپنے اس رنگ کی شاعری میں وہ اپنے استادوں کو کہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ پھر یہ کہ تغزل اور معاملہ بندی کے ساتھ حزن و یاس اور سوز و گداز کا یہ امتزاج دوسرے باکمالوں میں آسانی سے دستیاب نہ ہوگا۔

بات یہاں تک آگئی ہے تو ظفر کی شاعری پر نظر ڈالنے سے پہلے ان کی ایک غزل سن لیجئے۔ جو اُن کے اس پختہ رنگ کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں:

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہیگا جہاں میں سدا نہ رہا
اسے چاہا یہیں نے کہ روک رکھوں، مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کئے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا
لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
دلے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا
ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

ظفر کا ۱۸۵۷ء سے پہلے کا کام چار جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ کہتے ہیں پانچواں دیوان ۱۸۵۷ء کی نذر ہوگیا، مگر اس کے بعد کے پانچ سال کا کلام بالکل مرتب نہ ہوسکا جس وقت سے کہ انہیں ہمایوں کے مقبرے سے حراست میں لیا گیا تھا، آخر تک وہ قید و بند ہی میں رہے۔ ۱۸۵۸ء کے آخر میں رنگون بھیجے گئے تھے۔ راستہ گوروں کی سنگینوں اور پستولوں کی چھاؤں میں کٹا تھا، وہاں بھی آخری دم تک آتش و آہن کی یہ حفاظت اُن پر سایہ ڈالے رہی۔ اس زمانے میں ظفر نے جو کچھ کہا ہوگا، اس میں اپنے دل جگر کے ٹکڑے نکال کے کاغذ پہ بکھیر دئے ہوں گے۔ یاس و حسرت، درد و اثر اور سوز و گداز کے ایسے مرقعے، ایسی آپ بیتی اور کہاں مل سکتی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظفر کا کچھ کلام رنگون سے دہلی آ رہا تھا۔ کیا عجب کہ اب بھی نامعلوم مقامات پر محفوظ ہو۔ مگر افسوس کہ اب تک اس کو مہیا نہ کیا جاسکا، ورنہ ادب میں منفرد حیثیت کی چیز ہوتا۔

ہمارے شعرا کے دیوانوں میں ہموار و ناہموار، پست و بلند اور اچھے برے سبھی طرح کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ میر کے چھ دیوان اور مصحفی کے سات دیوان ان کی استادی کی دلیل ضرور ہیں، مگر ان کی شاعری ان دیوانوں کے پست اشعار دیکھ کر محجوب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی شعرا کی غزلوں میں یہ کمزوری موجود ہے، تو اس زمانے میں تو پُرگوئی بھی ایک ہنر سمجھی جاتی تھی، مگر کسی شاعر کے متعلق رائے قائم کرتے وقت ہم اس کے بھرتی کے اشعار سے نظر چرا جاتے ہیں۔ تو پھر کیا سبب کہ ظفر کے معاملے میں بھی ہم اسی اصول کو

ملحوظ نہ رکھیں۔

شاہ نصیر کی طرح ظفر نے بھی مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں مشق کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نہ تازگیٔ مضامین ہوگی نہ آمد، مضامین کی تکرار اور آورد کی بھدی مثالیں ملیں گی۔ مگر ظفر کے ذوقِ سلیم کی داد دیجئے کہ ایسی زمینوں میں بھی وہ اچھے شعر نکال لیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اس اعتبار سے وہ شاہ نصیر کے مقابلے میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں اسی کا نام شاعری اور استادی تھا۔ ایسے کچھ شعر سنئے اور لطف لیجئے۔ ایک زمین ہے "خواب کہے تو کہدوں۔ آب کہے تو کہدوں"۔ فرماتے ہیں:

لیجئے نام اس کا بہت آہیں بھرا کرتا ہے کیوں ابھی اے دلِ بیتاب کہے تو کہدوں!
یوں تو افسانہ مرا وہ نہیں سنتا اے دل اس سے یہ قصۂ دمِ خواب کہے تو کہدوں!

عجیب زمین ہے۔ "ہوس پر لگی ہوئی۔ قفس پر لگی ہوئی" یہ مضمون سنئے:

یوں ہے طبیعت اپنی ہوس پر لگی ہوئی مکڑی کی جیسے تاک مگس پر لگی ہوئی
آزاد کب کرے ہمیں صیاد دیکھئے رہتی ہے آنکھ بابِ قفس پر لگی ہوئی

"باتیں" ردیف ہے۔ دیکھئے کیا باتیں سناتے ہیں:

کبھی تو آؤ ہمارے گھر میں، سنو ہماری بھی چار باتیں عجب ہے شکوہ رقیب کا یاں، ہزار منہ ہیں ہزار باتیں
گئے ظفر کل جو اس کے گھر ہم، کھلا یہ شکوے کا آگے دفتر گزر گئی شب تمام تس پر نہ ہو چکیں زینہار باتیں

کیسی ٹیڑھی اور مشکل ردیف ہے "کیونکر کہو تو کیا کروں" پھر بھی چند شعر کام کے نکال لئے ہیں، بلکہ زبان نے عجب لطف پیدا کیا ہے۔ سنئے:

یار دل مانگے، نہ دوں کیونکر۔ کہو تو کیا کروں! اور جب دیدوں۔ تو لوں کیونکر۔ کہو تو کیا کروں!
جب کہ پوچھے یار مجھ سے شیفتہ ہے کس پہ تو منہ سے میں اپنے کہوں کیونکر۔ کہو تو کیا کروں!
اپنا احوالِ محبت سامنے اس کے ظفر آپ میں لکھ کر پڑھوں کیونکر۔ کہو تو کیا کروں!

"کبھی ایسی تو نہ تھی" ردیف ہے۔ مشہور غزل ہے۔ ایسی زمین میں ایسی کامیاب غزل، استادی کا کمال نہیں تو کیا ہے:

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
اُس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی
چشمِ قاتل مری دشمن تھی ہمیشہ لیکن جیسی اب ہوگئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
خو تری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

ایسی مشکل زمینوں میں اپنے رنگ کے اشعار نکال لینا کمال شاعری ہے۔ آپ نے دیکھا جرأت کی معاملہ بندی بھی ہے، اور سلاست روانی کے ساتھ روزمرہ کی سادگی اور حلاوت بھی۔ عام اور سچے جذبات بھی ہیں اور سوز و گداز بھی۔ بس یہی ظفر کا اصلی رنگ ہے، مگر یہی باتیں جب انہوں نے شگفتہ زمینوں میں کہی ہیں تو زمینِ سخن کو آسمان بنا دیا ہے:

"زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی" تو ان کے کلام میں ہر جگہ نظر آئے گی، لیکن میں ان کی ایک اور خصوصیت کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہوں۔ جذبات کی مصوری اور محاکات کی صداقت جیسی ظفر کے کلام میں ملتی ہے، وہ ان کے تغزل کی پختگی، تاثرات کی صحت اور احساسات کی صداقت کا ثبوت ہے۔ اول چند متفرق اشعار سنئے۔ پھر مسلسل اشعار پیش کروں گا۔

سر تنک دستِ ستم جو نہی ترا قاتل بڑھا خونِ جسمِ ناتواں تل تل گھٹا تل تل بڑھا

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفرؔ آج دل کی آگ
آگے تو شعلہ سا کبھی بار اٹھ کے رہ گیا

میں اس کو دیکھ کے یہ محو ہوں، کہ حیراں ہوں
جو کچھ وہ پوچھے گا مجھ سے جواب کیا دوں گا

نہ پہنچا تو نہ پہنچا طالبِ دیدار تک اپنے
تری تکتے ہی تکتے راہ، وقتِ واپسیں پہنچا

ایک مسلسل غزل میں رقاصہ کے ناچ گانے کا منظر پیش کرتے ہیں۔ چند شعر سنیئے :۔

تو جو مہتابی پہ کل رات کھڑا اکڑاتا تھا
دائرہ مہ بھی لئے ساتھ دئے جاتا تھا

بندھ گئی تھی وہ ہوا گانے کی تیرے کو مرا
ساتھ ہر تان کے جی تھا کہ اڑا جاتا تھا

کیا کہوں رقص کا عالم عجب انداز کے ساتھ
ساتھ ٹھوکر کے تری ٹھوکریں دل کھاتا تھا

ہاتھ کو ہاتھ پہ تو رکھ کے لگا جب چلنے
ہاتھ ہم ملتے تھے، دل تھا کہ ہلا جاتا تھا

آنکھ چاہت کی ظفرؔ کوئی بھلا چھپتی ہے
اس سے شرماتے تھے ہم، ہم سے وہ شرماتا تھا

ایک اور مسلسل غزل ہے۔ ظفرؔ سے پہلے اس زمین میں طپش، جرأت وغیرہ لکھ چکے تھے۔ ان کی تقلید میں ظفرؔ نے بھی مطربہ کا سراپا لکھا ہے۔ اور موازنہ کیجیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظفرؔ نے اپنے لئے ان سے بچ کر راہ نکال لی ہے۔ چند متفرق شعر ملاحظہ ہوں :۔

شمشیر برہنہ مانگ غضب، بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہرِ خدا، زلفوں کی لٹک پھر ویسی ہے

ہر بات میں اس کی گرمی ہے، ہر ناز میں اس کے شوخی ہے
قامت ہے قیامت چال پری، چلنے میں پھڑک پھر ویسی ہے

وہ گائے تو آفت لائے ہے، ہر تال میں لیوے جان نکال
ناچ اس کا اٹھائے سو فتنے، گھنگرو کی جھنک پھر ویسی ہے

ہر بات میں ہم سے وہ جو ظفرؔ کرتا ہے رکاوٹ مدت سے
اور اس کی چاہت رکھتے ہیں ہم آج تلک پھر ویسی ہے

محاکات کی ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفیات، احساسات، واردات اور تاثرات کی تصویر کشی ظفرؔ کو کیسا کمال حاصل ہے سادہ الفاظ، سلیس انداز اور نازک طرز ادا نے ان اشعار میں کیسی کچھ تاثیر بھر دی ہے۔ یہیں سے ظفرؔ کی ایک اور خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسلسل غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ کئی مثالیں پہلے گزر چکیں۔ ایک اور مشکل زمین میں ان کی یہ مسلسل غزل مشہور ہے، جو اردو ادب میں انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور جسے خاصے کی چیز سمجھنا چاہئے۔ طرز بیان کی یہ جدت و ندرت ظفرؔ پر ختم ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

تا درِ جاناں ہمیں اوّل تو جانا منع ہے
اور گئے تو حلقۂ در کا ہلانا منع ہے

حلقۂ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے
اب بتائیں کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے

نام بتلایا جو میں نے تو وہ سن کر چپ رہے
پھر پکاریں کس طرح سے غل مچانا منع ہے

غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجھلا کے کہا
جاؤ کیوں آئے تمہیں گھر میں بلانا منع ہے

اور بلایا بھی تو پھر جائیں وہاں ہم کس طرح
وہ جہاں ہیں، ہم کو واں تک بار پانا منع ہے

بار پا کر کچھ اگرچہ ہم گئے بھی واں تلک
آنکھ اٹھا کر کیونکہ دیکھیں آنکھ اٹھانا منع ہے

سامنے بھی وہ کسی صورت سے گر آئے تو پھر
بولنا ہنسنا تو کیا واں مسکرانا منع ہے

مسکرائے بھی تو کچھ چپکے ہی چپکے غنچہ وار
دل میں کیا کیا مدعا اور لب ہلانا منع ہے

لب ہلائے بھی تو کی کچھ بات منہ سے اور ہی
پڑھنا ہر مطلب پہ شعر عاشقانا منع ہے

عاشقانہ شعر بھی کوئی پڑھا تو پڑھ کے پھر
آہ بھرنا منع ہے، آنسو بہانا منع ہے

آہ بھر کر کچھ اگر آنسو بہائے بھی تو پھر
وہ جو دل کی بات ہے اس کا جتانا منع ہے

بات گر دل کی جتائی بھی تو پھر ہوتا ہے کیا
اے ظفر ایسی جگہ دل ہی لگانا منع ہے

ظفر کے کلام میں تشبیہات و تمثیلات بھی پائی جاتی ہیں۔ اور بڑی خوبصورتی سے نظم ہوئی ہیں۔ سادگی، موزونیت اور قریب الفہم ہونا ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ پہلے ایسی کچھ مثالیں گزر چکی ہیں۔ چند شعر اور دیکھئے۔ پہلے شعر میں تو مثال کی تاریخی صداقت نے سادگی میں پرکاری کا رنگ بھر دیا ہے:۔

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر — فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا!

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفر آج دل کی آگ — آگے تو شعلہ سا کوئی بار اٹھ کے رہ گیا

ٹکڑے نہیں ہیں آنسوؤں میں دل کے چار پانچ — سرخاب بیٹھے پانی میں ہیں ل کے چار پانچ

جوں بوئے گل رفیقِ نسیم چمن ہیں ہم — اے ہد ہوا وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

اس چمن میں کیا کرو گے میکشو ہنس بول کے — غنچہ ساں خاموش خون دل کو پی کے ہو رہو

جگر پر داغ، لب پر دودِ دل، اور اشک دامن میں — تری محفل سے ہم مانند شمع صبحدم نکلے

لالۂ کہسار نے جوشش چراغاں کی طرح — خوب تربت پر تری اے کوہکن کی روشنی

غنچے کی مٹھی میں مذ ہے اور نہیں دست کرم — تنگیٔ دل اور ہے، اور تنگ دستی اور ہے
ہستی یک دم پہ اپنی تو جو ہنستا ہے شرر — تیری اس غفلت پہ ہنستی تیری ہستی اور ہے

غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقش بر آب — موج کی مانند کیوں پھرتے ہو بل کھاتے ہوئے

تصوف کا رنگ ظفر پر اچھی طرح چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک بڑے مرشد کا ہاتھ پکڑا تھا، جن سے ان کو کمال درجے کی عقیدت تھی اور ان کے فیض سے انہوں نے سلوک کی منزلیں طے کی تھیں۔ بہت سے مقامات ان کے لئے حال کا درجہ رکھتے تھے۔ اس لئے یہاں صرف قال ہی نہیں ہے۔ مگر یہ ان کا پسندیدہ رنگ نہیں۔ اس لئے ایسے مضامین ان کے ہاں کم ملتے ہیں۔

سب رنگ میں اس گل کی مرے، شان ہے موجود — غافل تو ذرا دیکھ وہ ہر آن ہے موجود

نہیں موقوف شیخ و برہمن پر۔ دیر و کعبہ پر — ہر اک سو جلوہ گر ہے حق جدھر چاہو ادھر دیکھو

اے ظفر اس پردے میں کچھ کہہ رہا ہے نے نواز — نے یونہی کرتی نہیں شور و فغاں بے فائدہ

[illegible] اے ساقی نہیں پینے کا میں جامِ شراب — مجھ کو اپنے بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے

[illegible] کیا ظہور کے مظہر نئے نئے — جلوے ہیں اس کے پردے کے اندر نئے نئے

شراب عشق سے کیفیت بقا ئے ابد | وہ دیکھیے آپ کو جو یاں فنا سمجھ کے پئے
خوابِ عدم سے چونکے ہیں مشتاق ہم ترے | دیکھا نہ تجھ کو اور اسی حسرت میں سو گئے

اخلاقیات کے مضامین ظفر کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سب ان پر گزرے تھے۔ ابنائے زمانہ کی غداری اور بیوفائی سے ان کو سابقہ پڑ چکا تھا۔ بیگانوں کے جور و ستم کے ساتھ بے مہری اور بے مروتی ان کا شب و روز بن چکی تھی، جس نے یقیناً دنیا سے ان کا دل کھٹا کر دیا ہوگا۔ چنانچہ دنیا کی بے ثباتی، ابنائے زمانہ کی بیوفائی، اور دوسرے اخلاقی مضامین پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں ان کے دل سے نکلی ہیں۔

نہ کوئی یار پایا اور نہ کوئی آشنا پایا | جسے یاں دوست جانا اس کو دشمن جان کا پایا
پایا نہ بجز داغِ سیہ کاری یک عمر | نقشِ قدم قافلۂ عمر رواں ہیچ
اپنی دانست میں چوکے نہیں تدبیر سے ہم | کیا کریں بس نہیں لاچار ہیں تقدیر سے ہم
اس چمن میں کیا کرو گے میکشو ہنس بول کے | غنچہ ساں خاموش خونِ دل کو پی کے ہو رہو

جذبات نگاری ظفر کی ایک اور خصوصیت ہے۔ وجدانی کیفیات، سچے جذبات، داخلی کیفیات اور قلبی تاثرات کو بیان کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے، جس کو ان کا طرز ادا سادگی و پرکاری کی تصویر بنا دیتا ہے۔ یہ ان کا خاص رنگ ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا | کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر | وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا
ضبطِ فریاد کر دں گریہ کو روکوں لیکن | دل بیتاب کو تھاموں، یہ نہیں ہو سکتا
نہ پوچھ مجھ سے ظفر تو مری حقیقتِ حال | اگر کہوں گا ابھی تجھکو میں رلا دوں گا
یہ کراہا ترا بیمار الم درد کے ساتھ | کسی ہمسائے کو بیمار نے سونے نہ دیا
کیا کہوں کیونکہ ترے کوچے میں ہو کر آیا | تجھ کو پایا جو نہیں خوب میں رو کر آیا
قسم خدا کی تجھے قاصدا کہ یہ پیغام | کہا ہے یار نے یا تو نے اپنے جی سے کہا
ظفر وہ دشمنِ جاں ہے اُسے نہ جانو دوست | ترے جانے کو ہم نے یہ دوستی سے کہا
کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے | دل سے میں مجھ سے مرا دل بے خبر ہونے لگا
کوچۂ جاناں میں جانا ہی پڑے گا ہو سو ہو | کیا کروں بیتاب دل پھر اے ظفر ہونے لگا

ایک غزل ٹھیٹھ بولی میں ہے۔ یہ رنگون کے زمانے کی یادگار بتائی جاتی ہے۔ اس کی بابت بعض حضرات کو شبہ ہے کہ یہ ظفر کی نہیں، مگر یہ اعتراض درست نہیں۔

کون نگر میں آئے ہم، کون نگر کے بسے ہیں | جائیں گے اب کون نگر کو من میں اپنے ہرا سے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا | کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون اداسے ہیں
کیا کیا پھلو دیکھے ہیں ہم نے اس پھلواری میں | اب جو پھولے اس میں پھول اور ہی ان میں باسے ہیں

دنیا ہے یہ رین بسیرا، بیت گئی، رہی تھوڑی سی
ان سے کہہ دو سو جاویں نیند میں جو نہ ملے ہیں

آپ نے دیکھا، جرأت اور میر دونوں کا رنگ کس فطری اور موثر انداز میں ظفر کے ہاں موجود ہے۔ صحیح تغزل کے لحاظ سے ہم ان کو طپش، جرأت اور مومن کی صف میں جگہ دیں گے۔ اور درد و اثر، سوز و گداز کے اعتبار سے ان کا نام میر کے بعد لینا چاہیئے۔

ملّی ضروریات اور ملّی زبان

ڈاکٹر محمد باقر

جب ہم اُردو کو ایک ممتاز درجہ عطا کرنے کا تقاضا کرتے ہیں تو یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ قوم کے سامنے وہ مسائل بھی پیش کریں جن کی مدد سے جلد از جلد اُردو کو تمام ملّی ضروریات کی کفالت کے قابل بنایا جا سکے۔ عملی طور پر ہم نے اُن مشکلات کا جائزہ بے تعصبی سے کبھی نہیں لیا جو اس زبان کو ملّی زبان بنانے کے راستے میں حائل ہیں۔ اور اب جبکہ ہم نے ملک کی کثیر آبادی کے لئے اِسے ملّی زبان قرار دینے کا سرکاری فیصلہ کر لیا ہے، میں اُردو کے بہی خواہوں کے لئے چند عملی تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں جو کسی طرح کا خرچ کئے بغیر اُردو کو ملّی مقام دلا سکتی ہیں بشرطیکہ ہماری آرزو اور دلی خواہش ایمانداری سے یہی ہو کہ ہمیں اُردو کو آگے بڑھانا ہے اور علاقائی زبانوں کے راستے میں کھڑا ہونا نہیں۔ کیونکہ تعمیری طرزِ فکر بہرصورت یہی ہو سکتا ہے کہ علاقائی زبانوں پر پتھر پھینکنے کی بجائے اُردو کے عاشق اردو کی اپنی رفعت کے لئے فداکاری کے جذبے سے مساعی کریں۔

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں ایسے ملازمین موجود ہیں جو اُردو کے دل و جان سے شیدا ہیں اور اُن کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ دفتری کام کے لئے اُردو استعمال ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ سب لوگ اس دور کی پیداوار ہیں جب ملک وملّت میں انگریزی کا اقتدار تھا۔ یہ لوگ انگریزی زبان میں ہی آج کل کی طرح تعلیم اور ڈگریاں حاصل کئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی زبان اور قلم انگریزی زبان میں ہی آسانی سے حرکت کرتا ہے۔ لہٰذا انہیں دفتر کا کاروبار انگریزی میں چلانے سے بڑی سہولت ہوتی ہے اور جب کبھی اِس کاروبار کو اُردو میں منتقل کرنے کی خواہش اِن کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے اُس وقت یہ ایماندار آدمی محض اس بنا پر اس خیال کو دل سے نکال دیتے ہیں کہ ہمیں تو صحیح اُردو لکھنا اور بولنا نہیں آتی۔ یہ اپنی انتہائی آرزو کے باوجود دفتر کا کام اُردو میں منتقل کرنے پر آمادہ نہیں ہو پاتے۔ مثال کے طور پر جب کلرک سے فائل مانگنے کے لئے اردو میں کوئی متفقہ اصطلاح موجود نہیں اور PUT UP THE FILE کا کوئی مسلّمہ ترجمہ نہیں تو افسر اُردو میں دفتر کو کیا ہدایت دے جو گذشتہ تیس برس سے انگریزی کے یہ چار کلمات کاغذوں پر لکھتا چلا آیا ہے، انگریزی میں دفتری کاروبار چلانے کے لئے ایسے بے شمار اصطلاحات اور مختصر جملے رائج ہو چکے ہیں جن کا صحیح ترجمہ آپ ڈھونڈتے رہیں اور پھر ان افسروں اور کلرکوں تک پہنچاتے رہیں تو اس میں بہت دیر لگیگی۔ مثلاً (P U C) اختصار ہے PAPER UNDER CONSIDERATION کا۔ انگریزی کا یہ جملہ محض دفتری ضرورت کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس فکر میں رہیں کہ جب تک صحیح اُردو میں تمام دفتری اصطلاحات کا ترجمہ نہ کر لیں اُس وقت تک دفتری نظام نہیں بدلنا چاہیئے تو اس میں ہمیں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔ اس کی وجہ بڑی واضح ہے۔ ہم ایک غریب ملک کے رہنے والے ہیں اور انگریز کے دیئے ہوئے دفتری نظام کی تمام لسانی ضروریات کو اُردو میں منتقل کرنے کے لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے یا ایک مسلسل طویل مدت درکار ہے جن میں سے ایک بھی میسر نہیں۔ آپ پوچھینگے پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ میرا جواب بالکل عملی ہے۔ آپ ہر شخص کو اجازت دے دیں کہ وہ جیسی بھی اُردو لکھ یا بول سکتا ہے اس کو برتنا شروع کر دے۔ اِس طرح آپ بغیر کسی دقت کے اور کوئی سرمایہ یا وقت خرچ کئے بغیر فی الفور دفتری نظام کو اُردو میں منتقل کر دیئے۔ اگر آپ اس تجویز کو قبول کر کے عمل کرنا شروع کر دیں تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ دفتری نظام میں استعمال ہونے والے مذکورہ بالا دو جملوں کے لئے اردو میں کچھ اس قسم کے کلمات لکھے جائینگے:۔

(۱) فائل پیش ہو۔ (۲) فائل میز پر رکھو۔ (۳) فائل دکھاؤ۔ (۴) فائل لاؤ۔ (۵) متعلقہ کاغذ لاؤ۔ (۶) فل = ف، ل (فائل لاؤ کا مخفف)۔

(۱) کاغذ زیرِ غور ہے۔ (۲) زیرِ غور کاغذ۔ (۳) فیصلے کے لئے کاغذ۔ (۴) کاغذ فیصلے کے لئے۔ (۵) زغک = ز۔ غ۔ ک (زیرِ غور کاغذ)

لیکن یہ سب کلمات اُردو میں ہونگے اور ہر اُردو جاننے والا انہیں سمجھ سکے گا۔ انہیں کلمات اور جملوں میں سے آگے چل کر ایک ایک جملہ مستند

اور قابلِ قبول شکل اختیار کر جائیگا۔ اور بالکل اسی طرح جیسے کہ انگریزی زبان میں صرف دفتری کاروبار کے لئے مخصوص اصطلاحات اور جملے وضع کئے گئے تھے، اُردو میں بھی رفتہ رفتہ یہ اصطلاحات اور جملے مرتب ہو جائیں گے ؛

یہ صرف دو مثالیں تھیں ۔ دفتری نظام کی ابتدا کاغذ اور فائل سے ہوتی ہے ۔ اگر کاغذ اور فائل کو چلانے کے لئے شروع شروع میں ہر قسم کی قابلِ فہم اُردو استعمال کرنے کی اجازت اُسی طرح دے دی جائے جیسے انگریز کے زمانے میں معروف ناخواندہ نہال چند (المعروف بہ نہالا) گارڈ کو ہر قسم کی انگریزی میں تار دینے کی اجازت تھی تو آپ دیکھینگے کہ دفتری کام کے لئے ہر قسم کی موزوں اصطلاحات چند دنوں کے عرصہ میں ظہور پذیر ہو جائینگی۔ اگر آپ اس انتظار میں رہے کہ پہلے تمام دفتری اصطلاحات کا ترجمہ اُردو میں کیا جائے پھر انہیں شائع کیا جائے اور پھر انگریزی داں افسروں اور اہلکاروں کو مطبوعہ اصطلاحات حفظ کرائی جائیں تو یہ کام ہو چکا۔ اُردو سے محبت رکھنے والوں کو ناخواندہ اور کم خواندہ افسروں اور کلرکوں کی زبان کے سلسلے میں فراخدلی سے کام لینا ہوگا، تب یہ بیل منڈھے چڑھیگی۔ ورنہ اگر آپ ہر انگریزی لفظ اور جملے کے لئے معیاری اُردو وضع کرنے کے انتظار میں رہے تو دفتری نظام کبھی اُردو میں منتقل نہ ہو سکیگا۔ اگر دفتری نظام اردو میں منتقل نہ ہوا اور دفتری کارکن اُردو میں لکھنے اور بولنے میں حجاب محسوس کرتے رہے تو اُردو اس ملک میں کبھی ملّی مقام اور مرتبہ حاصل نہ کر سکیگی۔ غالبًا یہ عام طور پر معلوم ہے کہ حکومت نے زرِ کثیر صرف کر کے ایسے ادارے بھی قائم کئے تھے جن کا کام صرف دفتری اصطلاحات کے اُردو بدل مہیا کرنا تھا۔ ان اداروں نے بڑی نیک نیتی اور سرگرمی سے کام بھی کیا ہے۔ اور میری اطلاع کے مطابق ہزاروں الفاظ کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں لیکن یہ فہرستیں چھپ جانے کے بعد کس طاقِ نسیاں کی زینت بنی ہیں یہ کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں جن کی خدمت میں یہ فہرستیں بھیجی گئی ہیں۔ لیکن ایک نتیجہ ظاہر ہے۔ سرکاری مشینری کا ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم اور کارکن ابھی تک ([illegible]) کے استعمال سے باز نہیں آیا۔ کیونکہ اگر اُس نے اِن چھپی ہوئی فہرستوں کو پڑھا بھی ہے تو اِن اصطلاحات کو ضرورت کے وقت استعمال کرنے کی ہمت اس لئے نہیں کرتا کہ اس کا ماتحت اور افسر دونوں اِس سے نابلد ہیں ؛

ظاہر ہے کہ ان حالات میں صرف ایک ہی عملی راستہ ہے کہ ہم دفتری اصطلاحات کے ترجمے کے ادارے قائم کرنے کی بجائے دفتروں کے کارکنوں کو اجازت دے دیں کہ وہ اُردو میں اپنے مافی الضمیر کو فائلوں پر منتقل کریں اور رفتہ رفتہ ہم اس بلند سطح پر پہنچ جائینگے جہاں انگریزی اب پہنچی ہوئی ہے ؛

اُردو کو ملّی زبان بنانے کے لئے دفتری نظام کے تعاون کی نہ صرف شدید ضرورت ہے بلکہ یہ اولین مرحلہ ہے جسے جلد از جلد طے ہو جانا چاہیئے کیونکہ جب تک کوئی غیر ملکی زبان دفتری نظام پر قابض رہے گی اُس وقت تک اُردو کو ملّی مقام دلانا ناممکن ہوگا ؛

دفتری نظام کے بعد دوسرا اہم مرحلہ ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ اُردو کے بہی خواہوں کے شدید اصرار کے باوجود ابھی اُردو ذریعۂ تعلیم مقرر نہیں ہو سکی اور اعلیٰ تعلیم میں تو یہ نہ ہونے کے برابر حصہ دار ہے۔ ابھی تک اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں میں اُردو، عربی، فارسی اور اسلامیات کے پرچے اور امتحان انگریزی میں ہو رہے ہیں لیکن بعض یونیورسٹیوں نے اِن مضامین کی تدریس اور امتحان اُردو میں منتقل کر دیئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلباء اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہی نہیں ہو رہے۔ اب یہ ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ کم از کم اِن مضامین کے امتحانات ملازمتوں کے لئے اُردو میں ہونے چاہئیں ؛

یہ ضمنی بحث تھی، کہنا یہ مقصود ہے کہ جس طرح دفتری نظام کو کسی لاگت کے بغیر اُردو میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، اس طرح ذریعۂ تعلیم کو بھی اُردو میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ایک اُس بڑی رکاوٹ کو دور کیا جا سکتا ہے جو اُردو کو ملّی زبان بنانے کے راستے میں حائل ہے۔ اُردو زبان کی عمر چونکہ بہت کم ہے اور دنیا کے متمدن ممالک نے اس قدر ادب اور علمی سرمایہ پیدا کر لیا ہے کہ اگر سالوں کے اعتبار سے محاسبہ کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اُردو زبان کا علمی سرمایہ انگریزی سے کئی صدی پیچھے ہے۔ یہ کوئی ایسی عیب کی بات نہیں کیونکہ اُردو سے بہت قدیم زبانیں مثلاً عربی اور فارسی بھی گذشتہ سات سو سال سے اس علمی سرمایہ سے اِس لئے محروم رہی کہ اِن کے ہاں اس عرصہ میں کوئی سائنسی تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم صرف انگریزی کے علمی سرمایہ کو اُردو میں منتقل کرنے لگیں تو گذشتہ سات سو سال کے تمام علمی کام کو اُردو میں ڈھالنے میں جو وقت صرف ہوگا اس میں علمی دنیا اور آگے نکل جائیگا۔ پھر اس کے لئے کثیر سرمایہ اور کثیر التعداد علمی کارکنوں کی ضرورت ہوگی، جو ہمیں میسّر نہیں۔ اس لئے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ علوم کو اُردو میں منتقل کرنے کا منصوبہ بظاہر قابلِ عمل نہیں۔ اس لئے اِسے ترک کر دینا چاہیئے اور دفتری نظام کو اُردو میں منتقل کرنے کی جو تجویز اوپر پیش کی گئی ہے

یہاں بھی وہی اختیار کرنی چاہیئے۔ یعنی ایک عام اجازت ہونی چاہیئے کہ تمام مضامین اور تمام درجوں کے اساتذہ اُس اُردو میں تدریس شروع کر دیں جو وہ بول اور لکھ سکتے ہیں۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے تدریس کے لئے معیاری زبان بولی اور لکھی نہیں جائے گی۔ مقامی صورتِ حالات کے پیشِ نظر اس تدریس کے دوران میں لوگ سندھی، بلوچی، پنجابی اور پشتو کے الفاظ بھی اُردو میں استعمال کرینگے۔ لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تدریس ملکی زبان میں ہوگی، اس میں انگریزی کی اصطلاحات بھی ملی ہوئی ہونگی، لیکن چند سال کے تجربے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ تمام علوم اور ادبیات کی تدریس نہایت مستند اور منجھی ہوئی پاکستانی اُردو میں ہونے لگیگی۔ علوم کی اصطلاحات اب بین الاقوامی مرتبہ اختیار کر چکی ہیں۔ وہ ہر زبان میں ایک ہی انداز میں لکھی جا رہی ہیں۔ اُن کی علامات بھی سارے یورپ، امریکہ اور انگلستان میں ایک ہی ہیں۔ مثلاً آکسیجن کو ساری دنیا میں آکسیجن ہی لکھا جا رہا ہے۔ اور اس کے لئے O (او) کی علامت استعمال کی جا رہی ہے۔ ان اصطلاحات اور علامات کو اُردو میں ترجمہ کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ اس لئے اِن کو اپنی اصلی شکل میں بحال رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن علمی نظریات اور مفاہیم کو اُردو میں آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ تجربہ شروع کر دیا جائے تو چند سالوں میں ایسے شاگرد پیدا کئے جا سکتے ہیں جو استاد بن کر معیاری پاکستانی اُردو میں تالیف و تصنیف کر سکیں گے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہی لوگ اور ان کے شاگرد تحقیق کے کام کی طرف بھی متوجہ ہو سکتے ہیں لیکن اگر ہم اس انتظار میں رہے کہ پہلے تمام علوم کو معیاری اُردو میں منتقل کیا جائے اور پھر ایسے استاد بنائے جائیں جو اس معیاری اُردو میں علوم کی تدریس کر سکیں تو ہم اُردو کو ملی زبان بنانے کے راستے میں وہ دیوار کھڑی کر دینگے جس کو کوئی آدمی عبور نہ کر سکیگا اور ہم ہر وقت اس چکّر میں رہیں گے کہ پہلے علم کو اُردو میں منتقل کیا جائے، پھر اُردو میں اس علم کے اُستاد پیدا کئے جائیں۔ اور پھر اس علم کی اُردو میں تدریس کی جائے۔ یہ ایسی ذمہ داریاں ہیں جن سے ایک غریب ملک اور غریب ملت عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمیں کسی زبان کو ملّی درجہ دینا ہے تو ہمیں آج سے اُس میں تدریس شروع کر دینا چاہیئے، اس میں طلباء کو نوٹ لکھوانے چاہئیں۔ اِسی میں لکچر دینا چاہیئے اور اسی میں امتحان لینا چاہیئے۔ اگر آج نہیں تو دس سال کے بعد یہ سارے کام معیاری اُردو میں ہونے لگیں گے۔ ضرورت اپنی حاجت روائی کے لئے خود کلمات ایجاد اور وضع کر لے گی۔ اور یہ کلمات بالآخر رواج اور استناد کے درجے بھی حاصل کر لیں گے ؛

میں سمجھتا ہوں کہ لسانی اعتبار سے ملّی ضروریات میں سب سے اہم یہی دو ضروریات ہیں۔ اگر ان کو پورا کر لیا گیا تو ملّی زبان نعروں کے بغیر عالم وجود میں آ جائے گی اگر دفتری اور تدریسی نظام کو کسی لاگت اور کوفت کے بغیر اردو میں منتقل کر دیا گیا تو ملّی زبان از خود پیدا ہو جائے گی۔ آیئے کوشش کریں کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دفتری کاروبار اور تدریس کو اُس اُردو زبان میں کرنے لگیں جس کو پشاور سے لے کر کراچی تک سب لوگ بولتے، سمجھتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اگر ہم معیاری زبان اور معیاری اصطلاحات پر مُصر رہے اور اِن کے معرضِ وجود میں آنے کے منتظر رہے، تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونگے۔ اگر ہمیں اُردو سے محبت ہے تو لاگت کے بغیر بھی اُردو کو آگے بڑھانا چاہیئے ؛

قطعۂ شہر آشوب

(اودھ کی ضبطی اور لکھنؤ کی بربادی پر وحید الدین وحید الہ آبادی، استاد حضرت اکبر الہ آبادی، کا نوحۂ پرسوز)

لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہو گیا — جلوۂ شمعِ شبستانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوئی وہ نرگسِ شہلا کی چشمِ سرمہ سا — دیدۂ شوخِ غزالانِ چمن کیا ہو گیا

سنبلِ سیراب کا کیا ہو گیا وہ پیچ و تاب — گیسوئے مرغولہ مویانِ چمن کیا ہو گیا

اے صبا نشو و نمائے غنچہ و گل کیا ہوئی — آب و رنگ خوبرویانِ چمن کیا ہو گیا

تختہ ہائے ارغوان و لالہ و گل کیا ہوئے — کشورِ آبادِ سلطانِ چمن کیا ہو گیا

بلبلوں کے غنچۂ دل میں نہیں بوئے نیاز — عشوۂ رنگیں ادایانِ چمن کیا ہو گیا

اپنے موقع پر نظر آتا نہیں کوئی نہال — انتظامِ نخلبندانِ چمن کیا ہو گیا

وہ روانی موجۂ انہارِ گلشن میں نہیں — جوہرِ شمشیرِ عریانِ چمن کیا ہو گیا

جس کو دیکھو بے اجازت اب وہ رکھتا ہی قدم — انتظامِ اہل کارانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوئی وہ باغباں کی عقل جو سابق میں تھی — اب وہ افلاطونِ یونانِ چمن کیا ہو گیا

کس لئے وہ روشنی چشمِ عنادل میں نہیں — سرمۂ گردِ صفاہانِ چمن کیا ہو گیا

جامۂ شادی گلوں کے کون اڑا کر لے گیا — وہ لباسِ نو عروسانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوا دامانِ گل میں قطرۂ شبنم جو تھا — وہ دُرِ نایابِ نیسانِ چمن کیا ہو گیا

پھیر دی کس سمت گلگوں عزیمت کی عناں — وہ ہجومِ نے سوارانِ چمن کیا ہو گیا

کون سے ناواقفوں نے کاٹ ڈالا سرو کو — مصرعۂ موزونِ دیوانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوئی باغِ جہاں سے خرّمی کی وہ صدا — نغمۂ مرغِ خوش الحانِ چمن کیا ہو گیا

آب و تاب چہرۂ گلہائے خنداں کیا ہوئی — جلوۂ روئے حسینانِ چمن کیا ہو گیا

غنچہ و گل، یار و ساقی، شیشہ و جامِ شراب
اے وحید اپنا وہ سامانِ چمن کیا ہو گیا

رباعی

کیونکر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوندِ کریم
اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

مرزا انیس

غزل

پنڈت ہری چند اختر

محبت میں تپاکِ ظاہری سے کچھ نہیں ہوتا
جہاں دل کو لگی ہو دل لگی سے کچھ نہیں ہوتا

یہ ہے جبرِ مشیت یا مری تقدیر ہے یا رب
سہارا جس کا لیتا ہوں اسی سے کچھ نہیں ہوتا

کوئی میری خطا ہے یا تری صنعت کی خامی ہے
فرشتے کہہ رہے ہیں آدمی سے کچھ نہیں ہوتا

ترے احکام کی دنیا مرے اعمال کا محشر
یہاں میری وہاں تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

رضا تیری، لکھا تقدیر کا، میری زیاں کوشی
کسی کی دوستی یا دشمنی سے کچھ نہیں ہوتا

بہرِ عالم ترا جبرِ خدائی کارفرما ہے
ہمارے اختیارِ بندگی سے کچھ نہیں ہوتا

مرے دستِ طلب کو جرأتِ گستاخ دے یارب
یہاں دستِ دعا کی عاجزی سے کچھ نہیں ہوتا

اگر تیری خوشی ہے تیرے بندوں کی مسرت میں
تو اے میرے خدا تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

کمالِ آگہی حاصل ہوا تو یہ کھلا اخترؔ
کہ دنیا میں کمالِ آگہی سے کچھ نہیں ہوتا

روشؔ صدیقی

وہ اجنبی نگاہ بڑا کام کر گئی
شائستگی سے عمرِ تمنا گذر گئی

آشفتگانِ عشق کی راہیں کچھ اور ہیں
کچھ دور ساتھ چل کے قیامت ٹھہر گئی

اک دردِ مشترک سے عبارت ہے زندگی
سب پر گذر رہی ہے جو ہم پہ گذر گئی

وہ سادگی کہ لغزشِ آدم کہیں جسے
تصویرِ خیر و شر میں عجب رنگ بھر گئی

اب تک نہیں ہے ہوش عروسِ بہار کو
وہ بوئے پیرہن اِدھر آئی اُدھر گئی

ہم خلوتِ خیال سے نکلے تو کیا ہوا
تھا عالمِ خیال جہاں تک نظر گئی

اتنا بھی ہوش کس کو تری جستجو میں تھا
کب سر جھکا کے گردشِ دوراں گذر گئی

دنیا نہ اب سُنے گی صدائے شکستِ دل
جب خامشی ہی شرطِ محبت ٹھہر گئی

کیا حسنِ اہتمامِ مشیت ہے اے روشؔ
ترتیبِ حادثات سے دنیا سنور گئی

حمّال

محمود تیمور
مترجمہ عطا حسین
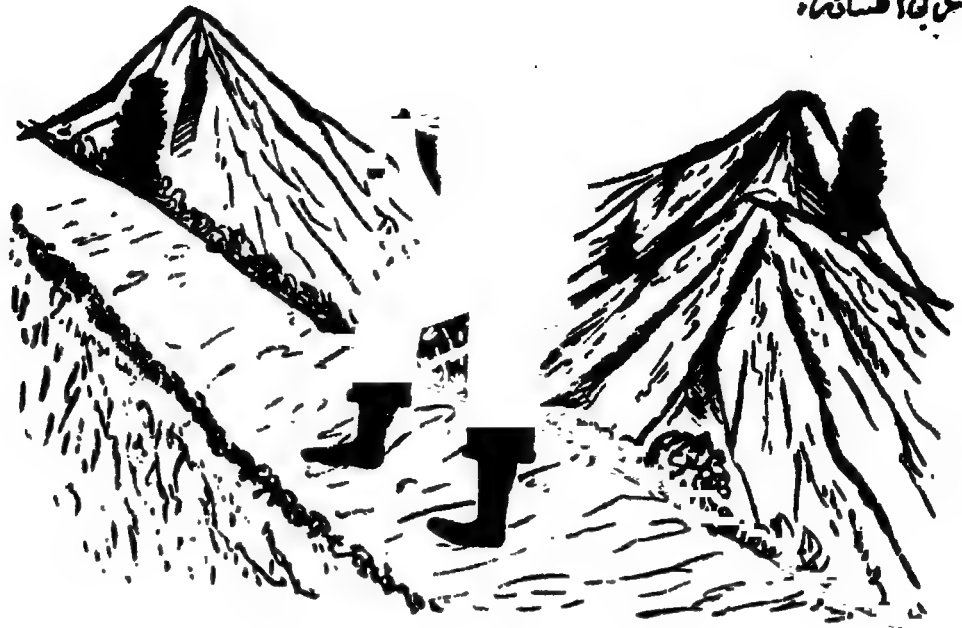
موسمِ گرما کا دم واپسیں تھا۔ خوش باش لوگ پہاڑوں کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ اکتوبر کی سرد ہوائیں کوہسار لبنان کے لئے جامۂ سیمیں تیار کر رہی تھیں۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، ایک بلند پہاڑ کے دامن میں واقع گاؤں شلفون حیات آفریں سکون میں غرق تھا، جسمانی اور روحانی آسودگی کے لئے میں چند دن اس گاؤں میں ٹھہر گیا۔

میرا معمول تھا کہ میں شام کو غروبِ آفتاب کے وقت سیر کے لئے اپنی قیام گاہ سے باہر نکل پڑتا، پہاڑی راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتا ہوا ساحل سمندر تک اُتر آتا، تھوڑی دیر ستانے کے بعد پھر اپنی منزل کا رُخ کرتا۔

ایک دن سمندر کے کنارے اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں افق کی پہنائیوں کو رنگا رنگ کر رہی تھیں، آلودگیوں سے پاک پُرسکون فضا کائنات کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھی، رات کی تیرگی جب شفق کی لالی کی طرف لپکنے لگی تو میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا، چند قدم چلنے کے بعد مجھے وحشت محسوس ہونے لگی۔ چاروں طرف دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ میری تنہائی مجھے ڈستی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کائنات میں میرے علاوہ کسی کا وجود نہیں، ایک عجیب ناقابلِ بیان خوف مجھ پر مسلط ہونے لگا، ہوا کی سرسراہٹ میرے دل میں وسوسے پیدا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرسراہٹ نہیں بلکہ عاشقانِ نامراد کی آہیں چرخِ نیلگوں میں سرگرداں ہیں اور یکلخت میرا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ مجھے اپنی وحشت انگیزی اور خوفزدگی پر حیرت ہونے لگی اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

انبارِ اوہام سے نجات پانے کے لئے میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا تو ماہ نو شرمیلی دلہن کی طرح جلوہ نمائی کر رہا تھا، اس کی ہلکی ہلکی ضو فشانی نے فضا کو حد درجہ رومان انگیز بنا دیا تھا۔ اس سے مختصر سے فاصلہ پر شام کا ستارہ گویا اس حسینہ کا تعاقب کر رہا تھا۔ ایسی روح پرور فضا اور یہ وحشت زدگی۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے شرم سی محسوس ہونے لگی۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم پہاڑی راستے کی طرف اُٹھنے لگے۔ ہوا کی خنکی اور نرم نرم چاندنی سے طبیعت میں شگفتگی اور سکون سا محسوس کرنے لگا۔ ستارۂ زہرہ عروسِ نو کا والہانہ تعاقب کر رہا تھا۔ اُس کے تعاقب نے میرے جذبات میں شوق اور تمناؤں کا ایک ہنگامہ سا بپا کر دیا۔ میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ دور کہیں ایک آدمی چڑھتا ہوا نظر آیا۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ یہ شخص ہموار سڑک کو چھوڑ کر دشوار گذار چڑھائی پر لمبے لمبے ڈگ کیوں بھر رہا ہے۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو یہ آدمی ضرور پہاڑی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ ایک

جنبی شخص ہموار راستے سے گریز کر کے ایسی خطرناک پگڈنڈی اختیار نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی جھاڑیوں اور درختوں میں روپوش ہو جاتا۔ مجھے ایسا گمان ہوتا کہ وہ آدمی نہیں بلکہ کوئی روح بھٹک رہی ہے اور میرے جسم میں خوف کی لہر سرایت کر جاتی۔ کبھی خیال آتا یہ شخص ڈاکو ہے جو لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر کسی مہم پر جا رہا ہے، کبھی یہ بھی سوچتا کہ شاید یہ شخص اسپورٹس کا دلدادہ یا کوہ پیمائی سے شغف رکھتا ہے۔ پھر سوچا کہ مجھے کیا پڑی ہے، ہوا کرے، لیکن میرے ذوقِ تجسس نے مجھے چین نہ لینے دیا۔ غیر شعوری طور پر میری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں، حتیٰ کہ ایک موڑ پر ہمارا تصادم ہو گیا۔ سفید ڈھلی ہوئی چاندنی میں اس پر نظر ڈالی اور اس کے حلیہ کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ خد و خال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ پہاڑی ہے، اس نے شلوار زیبِ تن کی ہوئی تھی، سر ایک خفیف عمامے سے مزین تھا، کمر جھکی ہوئی تھی، پیٹھ پر ایک تھیلا تھا جو عام طور پر حمال رکھتے ہیں، اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ تھیلے میں کوئی وزن دار چیز اٹھائے لئے جا رہا ہے۔ میرے ذہن میں عجیب عجیب وسوسے اور خیالات سر اٹھانے لگے۔ اتنا بھاری بوجھ لادے ہوئے اس اندھیرے میں یہ شخص ہموار راستے سے کترا کر خطرناک گھاٹیوں کو کیوں اختیار کرتا ہے؟ اس خیال نے میرے ذوقِ تجسس کو ایک تازیانہ لگایا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تاکہ اس سے جا ملوں، لیکن وہ اتنی پھرتی سے چھلانگیں مار رہا تھا کہ میں اسے نہ پکڑ سکا۔ آخر ایک چوراہے پر جا کر وہ ٹھہر گیا۔ میں بھی اس کی طرف لپکا اور بالکل اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی جبیں سے پسینہ صاف کر رہا تھا۔ اپنے خد و خال سے نہایت باوقار اور نرم دل معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً سلام کیا اور اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کیا۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے سگریٹ قبول کر لیا اور فوراً ماچس کی تیلی جلا کر میرا سگریٹ بھی سلگا دیا۔ اس کے خوش کن سلوک نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں نے کہا:

"کیا بات ہے تم ہموار راہ کو چھوڑ کر خطرناک اور تنگ راستے پر چلتے ہو؟"

"میں ان رستوں سے خوب واقف ہوں، اختصار کی غرض سے اس راستے پر چلتا ہوں۔" ایک لمبا کش لیتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ اور پوچھا:

"کیا تم ان خوش باش لوگوں میں سے ہو جو ہر سال یہاں گرمیاں گزارنے کی غرض سے آتے ہیں؟"

"ہاں" میں نے جواب میں کہا۔

"مگر موسم تو ختم ہو گیا۔"

"میں ذرا تنہائی پسند ہوں، مجھے ایسے ہی میں لطف آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، کبھی کبھی انسان کو خدا کی مخلوق سے فرار تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کاندھوں سے تھیلا اتارنے لگا۔ میں نے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہا، مگر اس نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا:

"بھائی سالہا سال سے میں یہ کام کر رہا ہوں، اب تکلیف کا احساس نہیں رہا....."

اس نے اپنا تھیلا پیٹھ سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور اس کی گرہ کھول کر تھیلے میں جو کچھ تھا اس میں سے ایک ایک کر کے لاپروائی سے پھینکنے لگا۔ جو چیز اس طرح پھینکی جا رہی تھی میں اسے دیکھ کر بہت دشتشدر رہ گیا۔ پتھر کے ٹکڑے، روڑے بیکار!

میں نے کہا:

"کیا یہی بیکار چیزیں اٹھا لائے تھے؟"

"میں کبھی کبھی اپنی پیٹھ پر پتھر لاد لیتا ہوں جن کی کوئی قیمت نہیں اور کبھی کبھی ایسا سامان بھی اٹھا لاتا ہوں جس کی قیمت ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا لیکن اس کے کھڑے ہونے کے انداز ایسے تھے گویا وہ کوئی بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ میری نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں، وہ میری حیرت کو تاڑ گیا، چنانچہ میرے بغیر پوچھے اس نے کہا:

"جناب من آپ جانتے ہیں کہ میں ایک حمال ہوں، ابتدائے جوانی سے بوجھ ڈھونے کا کام کرتا ہوں، روزانہ صبح اپنے گھر سے نکلتا ہوں اور شام کو لوٹ آتا ہوں، پہاڑ پر مقیم گاؤں والوں کو ضروری چیزیں مہیا کرتا ہوں۔"

آس پاس پڑے ہوئے پتھر کے ٹکڑوں کو دیکھ کر میں نے کہا۔

"کیا گاؤں والوں نے تم سے آج یہ پتھر منگوائے تھے؟ اُن کو ایسی کیا ضرورت تھی کہ تم اُن کو ساحلِ سمندر پر واقع گاؤں سے اٹھا کر لاتے؟"

"آج میں بیکار رہا، مجھے کوئی کام نہیں ملا!"

"تو یہ پتھر کس لئے؟"

"جب مجھے ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جو لوگوں کے کام آئے تو میں یہ بیگار اُٹھا لاتا ہوں جس سے کوئی فائدہ نہیں۔"

یہ سن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے ذرا چیخ کر کہا:

"بخدا! تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا!"

"میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ آج مجھے چھٹی ہے، یعنی زبردستی کی چھٹی، کوئی کام نہیں۔ کسی نے مجھ سے کوئی چیز نہیں منگوائی، تو پھر میں کیا کرتا۔ یہی پتھر اُٹھا لایا، بیکار بوجھا!"

ہم نے فوراً کہا:

"تو کیا ہوا، اگر کوئی چیز نہیں لانا تھا تو تم آرام کرتے۔ آخر یہ بیگار کیوں؟"

ایک لمبی آہ بھر کر اُس نے کہا:

"افسوس ہے ... مگر کیا کروں۔ جب مجھے اس پہاڑ پر چڑھنا ہوتا ہے کچھ نہ کچھ میری پیٹھ پر لادنا ہی چاہیئے، پتھر بھاری ہوتے ہیں، تھوڑی سی تعداد میں میرا کام ہو جاتا ہے۔"

کیا معنی؟ ... اور میرا کام ہو جاتا ہے ....؟"

میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

وہ میرے قریب ہو گیا اور دھیمے دھیمے لہجہ میں کہنے لگا:

"بھائی بوجھ ڈھوتے ڈھوتے میری جوانی گذر گئی، بڑھاپا آگیا اور میں حمالی کرتا رہا، حتیٰ کہ پیٹھ ٹیڑھی ہو گئی۔ میں اور لوگوں کی طرح سینہ تان کر سر اُٹھا کر نہیں چل سکتا۔ کوئی نہ کوئی بوجھ مجھے اٹھانا ہی چاہیئے۔ ورنہ توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے بغیر میرے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، ٹھیک سے چل نہیں سکتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وادی میں گرا چاہتا ہوں ...... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

میں نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا:

"مجھے معلوم نہیں .... اپنے معاملات کو تم خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہو .... ہو سکتا ہے جو تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہو۔"

میری بے بسی پر رحم کھاتے ہوئے اُس نے کہا:

"بوجھ ڈھونا میری زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا ہے، اس کے بغیر زندگی کا احساس نہیں ہوتا۔ بوجھ ہی کے ذریعہ میں اپنی زندگی میں توازن اور ہمواری قائم رکھ سکتا ہوں، اس کے بغیر چارہ نہیں، زندگی بے مصرف ہو جائے گی!"

"کیا تم اس سے خوش ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"خوش کیوں نہیں؟ زندگی بھر یہی کرتا رہا ہوں، مجھے اس سے فائدہ پہنچا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس سے فائدہ پہنچا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کام سے محبت ہو گئی ہے۔ اور کیا، انسان جس چیز کا ضرورت مند ہوتا ہے، وہ اس سے نفرت کرتا ہے؟"

اس کے لہجے میں حد درجہ متانت اور سنجیدگی تھی، اس کی نگاہوں میں بصیرت افروز چمک تھی۔ اس کی حرکات میں خود اعتمادی نمایاں تھی، میں ایک گہری سوچ میں پڑ گیا ..... ایک اتنا سادہ انسان ..... ایک حمال، کیا بساط ہے اس کی۔ مگر ایسی فلسفیانہ موشگافی اور حکمت پرور باتیں صرف فلسفی یا حکیم ہی کر سکتا ہے۔ اس معمولی سے انسان نے زندگی کو برتا ہے، زندگی نے اس کو برتا ہے، زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے اُس نے گریز نہیں کیا، اپنے فطری شعور کو مصافِ زندگی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس نے اپنی فطری صلاحیتوں کو زندگی سے گریز کرنے میں صرف نہیں کیا۔

پاکستان کے عوامی رقص

مشرقی پاکستان

مغربی پاکستان
جھومر
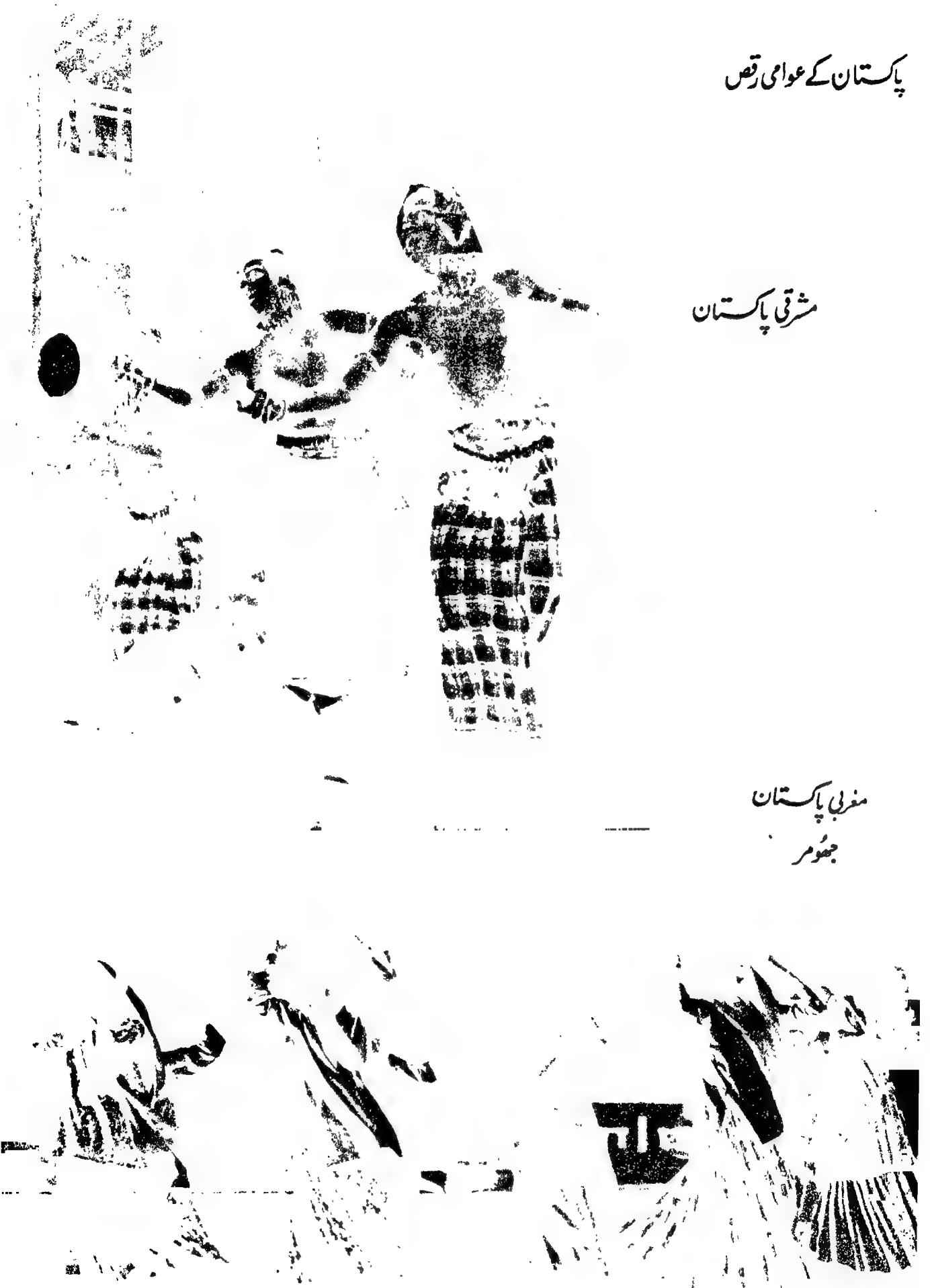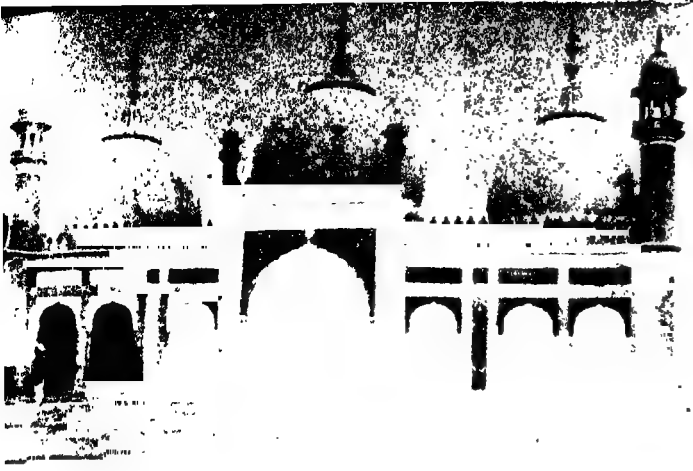
مُلتان

سغربی پاکستان کا قدیم علمی روحانی اور ثقافتی مرکز

مساجد اس شہر کے آثار میں امتیاز رکھتی ہیں۔

ایک مقبول صنعت   قالین بافی

روغنی ظروف پر نقش و نگار

شہر کا نظارہ

ملتان

شیر افضل جعفری

ہر طرح دار یہاں سروِ رواں ہوتا ہے
حُسن والوں پہ چناروں کا گماں ہوتا ہے

کھچّہ[1] خاک کی چوٹی پہ یہ باغاتِ بریں
ان کے ہر پھول پہ جنّت کا نشاں ہوتا ہے

پاک روضوں پہ یقیں مست دعاؤں کا جلوس
دھوم سے جانبِ افلاک رواں ہوتا ہے

مکتبِ نشترِ[2] جاں بخش کی پھلواری میں
عشق مرہونِ مسیحا نفساں ہوتا ہے

جگمگاتا ہے جبینوں سے حسین آگاہی[3]
شب کو بازاریں پریوں کا گماں ہوتا ہے

مصرِ بتوں کی زلیخاؤں کی زلفوں کی طرح
روپ نگری کے چراغوں کا دھواں ہوتا ہے

شہر کی سانولی گلیوں سے بہلنے کے لئے
کتنا بے تاب دلِ کاہکشاں ہوتا ہے

موٹریں چھم سے ٹہلتی ہیں کھلی سڑکوں پر
اُن کی رفتار پہ قربان جہاں ہوتا ہے

جب غزالانِ کنول رنگ پہ آتا ہے نکھار
رد کشِ بابِ حرم کوئے بتاں ہوتا ہے

آسمانوں سے نگاروں کی زیارت کے لئے
قافلہ چاند ستاروں کا رواں ہوتا ہے

گنگنائے جو حیا جھوم کے سندھڑے میں غزل
میر و غالب کا اثر نذرِ لباں ہوتا ہے

اور جب تیرِ نگہ کوئی چلاتا ہے
آسماں شوق سے جھکتا ہے کماں ہوتا ہے

بزمِ یاراں پری چہرہ میں آ جائے تو
شاعرِ جھنگ کا ایمان جواں ہوتا ہے

گیسوئے ناز کو خوشبو میں رچانے کے لئے
لکۂ ابرِ کرم عطر فشاں ہوتا ہے

دلکش و دلبر و دلدار و دل افروز و حسیں
لعبتِ ناز کا اندازِ بیاں ہوتا ہے

آم کی نازلی شاخوں کے بسنتی رخسار
چوم لیتا ہے تو بوڑھا بھی جواں ہوتا ہے

جب گھٹا ہی مست فضاؤں میں گھما لہرائے
ہر طرف طنطنۂ پیرِ مغاں ہوتا ہے

گرد و گرما کی ترائی پہ برستا بادل!
ذرّے ذرّے کیلئے رطلِ گراں ہوتا ہے

مور سے ناچنے لگتے ہیں دلوں میں اکثر
جب کبھی زمزمہ خواں ابر رواں ہوتا ہے

کشتیٔ دعائی[4] و پرواز کا ملتاں افضل
حُسن و رومان کے فردوس کی جاں ہوتا ہے

---

[1] مٹی کی چھوٹی سی پہاڑی [2] نشتر میڈیکل کالج [3] مشہور بازار [4] ملتان کے تین خوش گو شاعر۔

ڈرامہ:

زخمِ دل

رحمان مذنب

پہلا منظر

تاریک کمرہ۔ ونگ میں سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی ہے،
باہر مینہ پڑ رہا۔ بجلی کڑک رہی ہے۔ نفیس بیگم ہاتھ میں ہاتھ،
الماریاں کھکھیڑ رہی ہے۔ ان سے ہٹ کر میز کی دراز میں
دیکھنے لگتی ہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو — دیر تک تلاش
جاری رہتی ہے۔
کمرے کو مدھم نیلی بتیوں سے نیم روشن کیا جا سکتا ہے۔
بشرطیکہ تماشائیوں کو بتیاں نظر نہ آئیں۔ اس صورت میں
ونگ کی روشنی درکار نہ ہو گی۔

طاہرہ :- آج تو حد ہی ہو گئی ہے۔ توبہ، اتنی دیر، اتنی دیر! گیارہ
بج رہے ہیں۔

نفیس بیگم :- جبھی تو کہتی ہوں جا کر سو جا۔ آخر صبح کب اٹھے گی۔

طاہرہ :- نیند بھی تو آئے۔

نفیس بیگم :- لیٹے گی تو نیند آ ہی جائے گی۔

طاہرہ :- لیٹوں کیسے؟ دیکھو، رات کیسی ڈراؤنی ہے! ذرا بھی
تو روشنی نہیں اور ادھر بجلی بھی گل ہے

نفیس بیگم :- زیادہ باتیں نہ بنا، جا کر لیٹ رہ!

طاہرہ :- موم بتیاں ہی تو مل جائیں۔

نفیس بیگم :- وہی تو میں ڈھونڈ رہی ہوں۔ جانے کہاں پڑی ہیں کم بخت؟
(الماری کھولتے ہوئے) اس میں ڈھیروں سے پڑی رہتی تھیں
اور اس وقت نام کو بھی نہیں۔ جانے کہاں غائب ہو گئی ہیں؟

طاہرہ :- واہ، امی! تمہیں تو جیسے کچھ پتہ ہی نہیں۔ روز ابا جان دو دو
چار چار کر کے یہاں سے لے جایا کرتے تھے، ختم ہو گئی ہوں گی۔

نفیس بیگم :- (خفگی میں) لڑکی! ہوش کی دوا کر! تو اپنا کام چھوڑ کر دوسروں
کے کاموں میں کیوں دلچسپی لیتی ہے؟ تجھے اپنے کام سے کام
ہونا چاہیئے۔ تجھے اس سے کیا کہ دوسرا کوئی کیا کرتا ہے؟

طاہرہ :- تم تو بس یہی چاہتی ہو کہ ابا جان کے قریب بھی نہ پھٹکوں۔ ان سے
دور دور ہی رہوں۔ آخر کیا بات ہے ابا جان میں؟

نفیس بیگم :- بس چپ رہ، یونہی اوائی توائی نہ بکا کر؟

طاہرہ :- اس میں اوائی توائی کی کیا بات ہے؟ لڑکیاں اپنے ماں باپ
کے کاموں میں دلچسپی لیا ہی کرتی ہیں۔

نفیس بیگم :- (ایک دراز میں سے موم بتیاں نکال کر) لے پکڑ، مل گئیں
موم بتیاں! انہیں جلا!

طاہرہ :- لاؤ!

(طاہرہ کھونٹی سے لٹکے ہوئے کوٹ میں سے دیا سلائی نکالتی،
موم بتیاں جلاتی اور انہیں میز اور مچان پر جماتی ہے)

نفیس بیگم :- کچھ تو سہارا ہوا ورنہ اندھیرے نے تو ناک میں دم کر رکھا تھا۔
توبہ! اندھیری رات بھی کتنی خوفناک چیز ہے اور ایسے میں کوئی
مرد بھی نہیں یہاں۔

طاہرہ :- اور پھر ابا جان نے مکان بھی کس اجاڑ میں بنوایا ہے۔ نزدیک میں
کچھ آبادی بھی نہیں۔ پکی سڑک تک تو ہے نہیں۔

نفیس بیگم :- بیکار باتیں نہ کیا کر!

طاہرہ :- واہ، تم انہیں بیکار ہی کہا کرو اور چور آ جائیں پھر؟

نفیس بیگم :- کوتوال کیا ہوتا ہے؟ تیرے ابا جان..... آخر کچھ اپنا اثر
ہوتا ہے۔ چور اناڑی تو نہیں ہوتے۔ گھر گھر کی خبر رکھتے ہیں
اور دیکھ دیکھ کر چوری کرتے ہیں (دراز میں سے پستول
نکالتے ہوئے) جہاں پستول ہو وہاں چوروں کا کیا کام؟

طاہرہ :- آخر ابا جان کیا کرتے ہیں؟

نفیس بیگم :- پگلی! انہیں کاروبار کا کوئی گھاٹا ہے۔ مال درآمد برآمد کرتے ہیں،
ٹھیکیداری کرتے ہیں۔ آڑھت کرتے ہیں۔ جا، سو رہ جا کر!

طاہرہ :- وہ تو ٹھیک ہے سب کچھ لیکن ابا جان رات گئے کیوں
آتے ہیں؟ رات کو کیا کاروبار کرتے ہیں؟ ابھی تک نہیں

آ سے گئے۔

نفیس بیگم :۔ بیٹھ گئے ہوں گے کہیں یاروں دوستوں میں۔ کر رہے ہوں گے بیت بازی یا چھانٹ رہے ہوں گے سیاست۔ محفل باز تو وہ اول درجے کے ٹھیرے۔

طاہرہ :۔ میرا تو آج دل دھڑک رہا ہے، نا جانے کیوں؟

نفیس بیگم :۔ تو میری بات نہیں سنتی نا۔ جا، کمرے میں جا کر سو جا!

طاہرہ :۔ تم ابا جان سے کیوں نہیں کہتیں کہ رات کو باہر نہ رہا کریں؟

نفیس بیگم :۔ کاروباری آدمی کا کوئی ٹیک نہیں۔ اس کے لئے رات دن ایک برابر ہے۔

طاہرہ :۔ واجد تو کچھ اور ہی کہتا ہے۔

نفیس بیگم :۔ (چونک کر) کیا کہتا ہے واجد؟

طاہرہ :۔ (گھبرا کر) وہ، وہ..... اس نے..... اس نے کوئی اچھی بات تو نہیں کی۔

نفیس بیگم :۔ (تند ہو کر) کچھ پتہ بھی لگے۔

طاہرہ :۔ اس نے..... اس نے کہا تھا کہ ابا جان سمگلنگ کرتے ہیں۔

نفیس بیگم :۔ بکتا ہے۔ اس کا باپ سمگلنگ کرتا ہوگا۔

طاہرہ :۔ میں نے اس سے سخت لڑائی کی۔

نفیس بیگم :۔ اسے تجھ سے ایسی بات کہتے شرم نہ آئی؟

طاہرہ :۔ اس نے کوئی اپنی طرف سے تھوڑی کہی تھی۔ وہ کیوں ایسی بات کہتا۔ وہ تو اس نے چچا جان سے سنی تھی۔

نفیس بیگم :۔ تو تو واجد کی طرفداری ضرور کرے گی۔ یہ سب آوے کا آوا بگڑا ہے۔ اس کے چچا جان کہاں کے پارسا ہیں؟ جوئے اور شکار کے سوا انہیں کیا آتا ہے؟

طاہرہ :۔ میں جانتی ہوں، ناحق واجد کی طرفداری نہیں کرتی۔ میں نے تو وہ خبر لی کہ معافی مانگتا ہو گیا ہے۔

نفیس بیگم :۔ جا، اب جا کر سو، صبح اٹھنا ہوگا۔

طاہرہ :۔ تم بھی تو سو جاؤ!

نفیس بیگم :۔ تو بڑی ضدی ہے۔ مجال ہے جو بات مانے۔

طاہرہ :۔ تم سوؤ گی تو میں سوؤں گی۔ آج تو یونہی ہوگا۔

نفیس بیگم :۔ تجھے پتہ تو ہے مجھے نیند نہیں آتی۔ سوؤں کیسے؟

طاہرہ :۔ آخر تمہیں کیوں نیند نہیں آتی؟ ماشاء اللہ اتنی عمدہ صحت ہے، سرخ انگارے کی طرح چہرہ دمکتا ہے۔ اپنی عمر سے کتنی کم کی لگتی ہو۔ عورتیں، تمہیں دیکھ کر میری بہن بتاتی ہیں، اس پر بھی نیند نہ آئے تو تعجب کی بات ہے۔ جانے کیا بھید ہے۔

نفیس بیگم :۔ تو بڑی باتونی ہے۔ آج تجھے کیا ہوا ہے؟ سونے کا نام نہیں لیتی اور مغز چاٹے جاتی ہے۔ نہیں سوتی تو نہ سو، اپنے کمرے میں جا۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ ان کا سارا حساب جوڑنا ہے۔

طاہرہ :۔ توبہ امی! تمہیں تو روپیہ گننے اور حساب جوڑنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ ابا جان تو جیسے بس روپیہ لانے کا کام کرتے ہیں باقی کام تم کرتی ہو۔

نفیس بیگم :۔ تیرا بھلا ہو، اپنا کام کر! ہمارے معاملے میں دخل نہ دے! جا کر اپنے کمرے میں سو جا!

طاہرہ :۔ (جماہیاں لیتے لیتے اور اٹھتے اٹھتے) جانا ہی پڑے گا (موم بتی اٹھاتے اٹھاتے بجلی کڑکتی ہے) اوئی اللہ، موسم کتنا خراب ہے۔ جانے ایسے میں ابا جان کیوں باہر رہتے ہیں؟

نفیس بیگم :۔ لڑکی زبان بند کر! تجھے کیا خبر کہ دنیا کا دھندا ہر حال میں چلتا ہے۔

طاہرہ :۔ ایسے گندے موسم میں اور پھر وقت ہوا آدھی رات کا، جانے ایسے میں کونسا دھندا چلتا ہوگا؟

نفیس بیگم :۔ جا بابا! تو جیتی میں ہاری، اپنے کمرے میں جا!

طاہرہ :۔ لو تنگ آ گئی ہو تو جا رہی ہوں۔

نفیس بیگم :۔ بڑی تیری مہربانی ہے۔

(طاہرہ چلی جاتی ہے۔ نفیس بیگم کھٹ سے دروازہ بند کرتی ہے)

۔ وہی ہوا جس کا ہر وقت دھڑکا رہتا تھا۔ لاکھ چھپایا۔ آخر بھانڈہ پھوٹ کر ہی رہا۔ طاہرہ کیا کہے گی کہ سمگلر کی بیٹی ہے؟

پُراسرار موسیقی ———— زور کا قہقہا، ونگ میں سے نفیس بیگم کی ہمزاد آتی ہے۔

ہمزاد :۔ ہوں، تجھے طاہرہ کا خیال آ گیا، اپنا خیال نہ آیا۔ تو سمگلر کی بیوی نہیں؟

نفیس بیگم :۔ (مغموم ہو کر) میرا کیا ہے؟ میں تو اپنی لٹیا ڈبو بیٹھی۔ طاہرہ کا

خیال آتا ہے۔ وہ تو ابھی کنواری ہے۔ ابھی اس نے دیکھا ہی کیا ہے؟ مجھ سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اسے طعنے ملنے لگ گئے ہیں، وہ یہ طعنے کیسے سن سکے گی؟

ہمزاد :- (ہنس کر) ہونہہ، طعنوں سے کیا ہوتا ہے۔ سمگ لڑکی لڑکی ہے، اسے ذرا حرافہ بنا! اس میں تندی تیزی بھرا سب سے نمٹ لے گی۔

نفیس بیگم :- (سہم کر) نہیں نہیں، میں اسے ایسا نہ بناؤں گی۔ اس طرح تو وہ پریشانیوں میں پڑ جائے گی۔ بدنام ہو جائے گی۔

ہمزاد :- پریشانی اور بدنامی! تو نے دیکھ لیا، کبھی کبھی پیسہ بھی بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ بدنامی اور پریشانی دور نہیں کر سکتا۔ دیکھ تو اس وقت کتنی عاجز ہے! تیری سونے چاندی سے بھری ہوئی یہ تجوری پریشانی اور بدنامی دور نہیں کر سکتی۔

نفیس بیگم :- دیکھ لیا، سب کچھ دیکھ لیا۔

ہمزاد :- یاد ہے، تجھے کبھی فرحت علی سے پیار تھا؟

نفیس بیگم :- غلط، بالکل غلط۔ مجھے کبھی فرحت علی سے پیار نہ تھا۔

ہمزاد :- تو نے ٹھیک کہا۔ میں ہی بھول گئی تھی۔ واقعی تجھے فرحت علی سے محبت نہ تھی لیکن بات یہ ہے۔ تو بڑی شوخ، چنچل تھی اور رقاملہ بھی۔ تو نے کبھی غلط انداز سے اسے دیکھا اور وہ گھائل ہو گیا۔ مشرق میں تو یوں عام ہوتا ہے۔ یہاں لوگوں کے دل ذرا کمزور ہوتے ہیں۔ پھر تو نے اسے اپنا قدردان جانا اور... تو نے چاہا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قدردان رہے، تجھ پر مرتا رہے۔ تو نے کبھی کبھی اسے طرح بھی دی اور وہ بے چارہ غلط فہمی کی تلوار سے ذبح ہوتا رہا۔ وہ سمجھتا رہا کہ تجھے بھی اس سے پیار تھا اور... جب اس نے پچاس ہزار حق مہر کے مانے، تیرے نام کوٹھی لکھنے کو تیار رہا تو تیرے والد تجھے اس سے بیاہنے کو تیار ہو گئے۔

نفیس بیگم :- ہاں تیار ہو گئے۔ ماں باپ ہمیشہ اپنی اولاد کا سکھ چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ سب میری ہی بھلائی کے لئے کیا۔

ہمزاد :- بے شک لیکن تو نے انہیں بھلائی کرنے ہی نہیں دی۔ تو نے انہیں مایوس کیا۔ خیر، اس وقت نہ سہی بعد ہی میں سہی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ تو نے... یاد ہے تو نے کیا کہا تھا؟

نفیس بیگم :- کہا ہو گا کچھ؟

ہمزاد :- تو نے کہا تھا، دولت ہی سب کچھ نہیں، اور پھر تو آوارہ اکرم کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی جو آج تک سدھر نہ سکا، آج تک جس کے وہی لچھن ہیں۔ تیرے باپ نے مخالفت کی لیکن تو نے اس کی نہ چلنے دی۔ تو نے ماں کو اپنے حق میں ہموار کر لیا۔ اکرم اس کا بھتیجا تھا۔ تو جذبات میں بہہ گئی اور آج تک تیرے جذبات کا حشر تیرے سامنے ہے۔

نفیس بیگم :- ہاں، میرے سامنے ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ میں بالکل نہیں گھبراتی۔ انسان اپنے کئے کی سزا بھگت لیتا ہے۔

ہمزاد :- لیکن یہ تجھے خبر نہیں کہ شادی بیاہ کی غلطی پر عمر بھر سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ ہاں۔ شادی بیاہ کی غلطی دنیا کی سب سے بڑی غلطیوں میں سے ہے۔ دیکھ لے تو کس بری طرح اپنی زندگی سے کھیل رہی ہے۔ ہر وقت اپنے خاوند کے لئے دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ رات رات بھر اس کا انتظار کرتی ہے۔ ہر وقت ڈرتی رہتی ہے کہیں وہ پکڑا نہ جائے، کہیں کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے۔

نفیس بیگم :- میں نے دل کی بات مانی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ دل یوں خراب کیا کرتا تھا۔

ہمزاد :- دل... یہ دھڑکتا ہوا ایک چھوٹا سا ٹکڑا زندگی تو کیا دنیا کا نظام بدل دیتا ہے۔ تو بیچاری کہاں کی افلاطون ہے۔ یہ تو بڑے بڑے انسانوں کو چکر میں ڈال دیتا ہے اور پھر چکی کے پاٹ کی طرح انہیں پیس کر رکھ دیتا ہے۔ یہ دل..... نادان! اس کی دھڑکنوں میں تو زمین اور آسمان کے انقلاب پوشیدہ ہیں۔ یہ دھڑکتا ہے تو زندگی کانپتی ہے۔ دیکھ لے! دل نے تیرا کیا حال کیا اور فرحت علی کا کیا حال کیا۔ آج تک اسے تیرا انتظار ہے۔

نفیس بیگم :- چپ رہ! میں اپنے شریک حیات کی ہوں۔ فرحت علی کو مجھ پر اور مجھے اس پر کوئی حق نہیں۔

ہمزاد :- شریکِ حیات؟ آہاہاہاہا۔ نا سمجھ! تو اسے شریکِ موت کہہ! اسے کب زندگی پر بھروسہ ہے؟ بھروسہ ہے تو بس موت پر۔

نفیس بیگم :۔ (تھپڑ مار کر) تجھے ذرا خوف نہیں جو یہ منحوس خبریں سناتی ہے۔

ہمزاد :۔ بس نکال لی ہوس؟ تو مظلوم ہے۔ تو کچھ کر بھی تو نہیں سکتی۔ خیر تیرا قصور نہیں۔ مشرق کی مٹی ہی ایسی ہے جہاں عورتیں خاوند کو خدا مانتی ہیں، غلط خدا کا انتخاب کرتی ہیں اور پھر پچھتاتی بھی نہیں۔

نفیس بیگم :۔ دفع ہو! تیری باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔

ہمزاد :۔ فرحت علی تیرا انتظار کر رہا ہے اور۔۔۔ ہاں۔ تجھے اب عقل آ گئی ہے۔ تجھے اب اپنی طاہرہ کا خیال ہے۔ نیک خیال ہے۔ اگرچہ طاہرہ بھی وہی کر رہی ہے جو تو نے کیا لیکن حالات مختلف ہیں۔ طاہرہ کے حالات تجھ سے بہتر ہیں۔ اسے اپنے دل کی بات پوری کر لینے دے، مضائقہ نہیں اور۔۔۔ اور ہاں، اکرم سے کہو، فرحت علی کو طاہرہ سے کوئی دلچسپی نہیں، کوئی دلچسپی نہیں ذہن کس، اسے تو تجھ سے دلچسپی ہے۔ (دروازے پر دستک) لے وہ آ گیا، میں چلی۔

نفیس بیگم :۔ شکر ہے، چڑیل ٹلی۔

(چٹخنی گراتی ہے۔ اکرم خاں کی آمد)

ارے یہ خون؟ (چیخ مار کر) اوئی میرے اللہ۔

اکرم خاں :۔ ہاں، ہاں چپ رہو (ہانپ کر) چپ رہو (کراہ کر) ہائے بیگم! دروازے اچھی طرح بند کر دو!

(چارپائی پر گر پڑتا ہے۔ نڈھال ہو رہا ہے۔)

نفیس بیگم :۔ کیا ہوا؟

اکرم خاں :۔ دواؤں کا ڈبہ فوراً لاؤ!

نفیس بیگم :۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤں؟

اکرم خاں :۔ صرف وہ کرو جو میں کہوں۔ ڈاکٹر کو بلا کر کوئی نئی آفت کھڑی کرو گی۔ سارا بھانڈہ ہی پھوٹ جائے گا۔ پولیس سے اس نے کہہ دیا تو بس پھر کام ہی تمام ہے۔

(اکرم خاں کپڑے اتارتا ہے۔ سارا بدن لہولہان ہو رہا ہے۔ نفیس بیگم دواؤں کا ڈبہ لا دھرتی ہے۔)

نفیس بیگم :۔ یہ لو ڈبہ! کیا کروں؟

اکرم خاں :۔ گرم گرم دودھ لاؤ! اس میں گلوکوز ا دو اور اچھی طرح ملا دو!

نفیس بیگم :۔ ایک منٹ میں لاتی ہوں۔

(بجلی کے چولہے پر کام کرنے لگتی ہے۔ اکرم خاں گاؤ تکیے کا سہارا لے کر لیٹے لیٹے روئی سے زخم پونچھتا ہے۔ لہو سے لتھڑی ہوئی روئی کے ڈھیر لگتے چلے جاتے ہیں۔ زخموں پر دوا لگاتا ہے۔ دودھ گرم کر کے دیکھتی اور چیخ مارتی ہے) تم ۔۔۔۔ تم تو لہولہان ہو رہے ہو۔

اکرم خاں :۔ بیگم! ہوش کی دوا کرو! آخر ایسا کیا غضب ہو گیا جو تم چیخ اٹھیں۔ جھٹ پٹ دودھ پلاؤ!

نفیس بیگم :۔ توبہ، اتنے زخم کاہے کے ہیں؟ کیا ہوا تھا؟ ڈاکٹر کو بلا لوں؟

اکرم خاں :۔ (کراہتے ہوئے) کیسے لاؤ گی؟ کسی اجنبی سے علاج نہیں کروا سکتا۔ میرا اپنا ڈاکٹر جو راز میں شریک ہے وہ یہاں نہیں۔ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ آ جائے تو اسی سے علاج کرا لوں گا۔ ورنہ آپ ہی کچھ تدبیر کر لوں گا۔ تم پٹیاں تیار کر دو!

نفیس بیگم :۔ (دودھ پکڑاتے ہوئے) کوئی زخم سے زخم ہیں! میرے اللہ، کیا ہو گا؟

(بڑا زخم چھپا لیتا ہے جو دل کے قریب آیا ہے)

اکرم خاں :۔ گھبرانے سے کچھ نہ ہو گا۔ حوصلے سے کام لو! زخم تو خیر کافی آئے ہیں لیکن یہ جو دل کے قریب ہے یہ ذرا خطرناک ہے۔ خیر یہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ آدمی میں ہمت ہو، ذرا وہ جی کڑا کرے تو ہر آفت ٹل جاتی ہے۔

نفیس بیگم :۔ تمہیں یقین ہے کہ یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا؟

اکرم خاں :۔ یقین ہے، بالکل یقین ہے۔ یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے بڑے بڑے زخم ٹھیک ہو گئے۔ یہ کیا چیز ہے؟

نفیس بیگم :۔ خون بھی تو بند ہو۔

اکرم خاں :۔ بند ہو جائے گا۔ آخر زخم ہے۔ تھوڑا تھوڑا خون تو رستا ہی ہے۔ تم حوصلے سے کام لو!

(پٹیاں باندھتا ہے۔ دل کے زخم پر چھپا کر پٹی باندھتا ہے)

نفیس بیگم :۔ مجھ سے بڑھ کر کس کا حوصلہ ہو گا؟ حوصلے سے کام لیتے لیتے پتھر کا دل بنا لیا۔ آنکھیں بھی پتھر کی ہیں، دل بھی پتھر کا ہے۔

اکرم خاں :۔ مجھے ایسے ہی دل کی ضرورت ہے۔ ڈرامت کرو! تم

کسی بزدل کی بیوی تو نہیں۔

نفیس بیگم:۔ ایسے زخمی تو کبھی نہ ہوئے تھے۔ آج کیا ہوا؟

اکرم خاں:۔ لڑائی۔ اُف! کوئی لڑائی تھی۔ ایسی گھمسان کی لڑائی کبھی نہ ہوئی تھی۔

نفیس بیگم:۔ مال نہیں لائے؟

اکرم خاں:۔ ارے، وہ تو باہر ہی بھول آیا۔ سیڑھی پر رکھا ہے۔ دروازہ کھول کر اُٹھا لاؤ!

چٹخنی اتار کر ایک اٹیچی کیس لاتی ہے۔ چٹخنی پھر چڑھا لیتی ہے۔

نفیس بیگم:۔ بڑا وزنی ہے یہ اٹیچی کیس! تم اسے کیسے لائے!

اکرم خاں:۔ لے ہی آیا کسی طرح۔ میں ہاکو تیلی کے یہاں بیٹھا تھا۔ میرے آدمی مال لے کر آئے۔ طے کیا کہ رات بھر کام چلے گا۔ آدمی بارڈر پار جائیں گے اور مال لائیں گے۔ کم از تین چار پھیرے اور ہو جائیں گے۔ میرے آدمی دوسرے پھیرے جانے ہی کو تھے کہ بارڈر پولیس آگئی۔ جانے اسے کس نے خبر کی۔ ہم سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ سیدھے ہو گئے۔

دینا گوجر ہے نا میرا آدمی؟

نفیس بیگم:۔ ہاں، وہ لمبا تڑنگا جن بھوت کی شکل والا۔

اکرم خاں:۔ ہاں ہاں وہی۔ اسے مال تھما کر بھگا دیا۔ وہ تو کسی نہ کسی طرح نکل گیا۔ ہم پھنس گئے۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ بے چارہ ہاکو تیلی مارا گیا۔ مجھے سنگین لگی۔ نتھو، خیرا، رلدو، سب کے سب بری طرح زخمی ہوئے۔ لیکن ہم بچ کر نکل کر آئے۔ پاس ہی گنوں کا بڑا ڈبل کھیت تھا۔ اس نے ہمیں بچا لیا۔

نفیس بیگم:۔ شکر ہے کوئی پکڑا نہیں گیا۔

اکرم خاں:۔ نہیں، کوئی پکڑا نہیں گیا۔ آج تو تقدیر ہی الٹ گئی ورنہ کتنا شاندار موسم تھا! ایسا موسم تو بڑی دعائیں مانگ مانگ کر نصیب ہوتا ہے۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ موسلا دھار مینہ پڑ رہا تھا۔ ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ایسے میں تو لاکھوں کا مال ادھر سے ادھر ہو جاتا اور پتہ نہ چلتا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈیڑھ دو لاکھ کا مال رات ہی رات کھینچ لوں گا۔

نفیس بیگم:۔ اب تو یہ دھندا روز بروز مشکل ہو رہا ہے۔ اخبار پڑھو تو آئے دن کسی نہ کسی کے پکڑے جانے کی خبر چھپتی ہے۔

اکرم خاں:۔ کام کرنے کا تو مزا ہی اب ہے۔ اناڑی پکڑے جائیں گے۔ کاریگر کاریگر رہ جائیں گے۔

نفیس بیگم:۔ بڑا خطرناک کام ہے یہ!

اکرم خاں:۔ جتنا خطرناک یہ کام ہے۔ اس سے زیادہ میں خطرناک ہوں اور پھر جو لوگ میرے گروہ میں شامل ہیں اور ادھر سے ادھر مال کرتے ہیں وہ بڑے زبردست ہیں۔ دینے گوجر نے پانچ خون کئے ہیں۔ ہاکو بے چارہ مر گیا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس کا گھر ہمارا قلعہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اس گھر کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ علاقے میں ایسا ڈاکو نہ ہوگا۔ نتھو اور خیرا بڑے دلیر ہیں۔ اول درجے کے بدمعاش ہیں اور نشانچی بھی پہلے درجے کے ہیں۔ میں کہتا ہوں، ایک ایک آدمی ہیرا ہے اور اپنے ہنر میں یکتا۔ قسمت بری نکلی، ورنہ کام میں کوئی نقص نہیں۔

نفیس بیگم:۔ مجھے تو اب بڑا ڈر لگتا ہے۔ یہ دھندا برا ہے۔ بہت برا ہے۔

اکرم خاں:۔ نفیس! یہ تم کہہ رہی ہو؟ یاد نہیں کہ تمہارے والد تم سے میری شادی نہ ہونے دیتے تھے۔ مجھے آوارہ کہتے تھے۔ میری مفلسی کا مذاق اُڑاتے تھے۔ نفیس! آوارگی کیسی بے کار اور فضول شے ہے۔ جیسے عمر ضائع کرنی ہو، وقت برباد کرتا ہو وہ آوارگی کرے لیکن دیکھ لو نفیس! دیکھ لو میں نے آوارگی کو کتنا قیمتی اور کارآمد بنا دیا۔ میری آوارگی سونا چاندی پیدا کرتی ہے۔ میں نے سب کی زندگی سنوار دی۔ اس آوارگی کو انمول کہو! لاکھوں روپے لی پیشہ ہے۔ اس وقت تمہارے پاس کچھ نہیں تو پچاس ہزار کے زیور ہوں گے۔ یہ مکان چالیس ہزار کا ہے۔ طاہرہ کی شادی کے لئے بیس ہزار کی رقم محفوظ ہے۔ پندرہ ہزار کے زیور اس کے لئے بنوائے ہیں۔ تمہیں کس بات کی کمی ہے؟ نفیس! شکر کرو کہ آوارہ ہوں۔ آج بھی آوارگی کام آئی۔ آوارہ نہ ہوتا تو شاید بھوکوں مرتا اور کوڑی کوڑی کو ترستا۔

نفیس! میں دعوے سے کہتا ہوں جتنا فائدہ میں نے آوارگی سے اٹھایا ہے، کسی نے نہیں اٹھایا ہے۔ میری جان! یہ تو ایک نعمت ہے، نعمت۔

نفیس بیگم :- کچھ بھی ہو، اب یہ دھندا بند کر دینا چاہیئے! ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔

اکرم خاں :- خیر، یہ پھر سوچنے کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ زخم تو ٹھیک ہوں۔ آج تک کچھ نہ ہوا تھا۔ سارا خطرے کا کام میرے آدمی کرتے تھے۔ میں تو صرف ہاکوتیلی کے گھر ہی جاتا تھا۔ آدمی مال لے آتے تھے۔ میں ٹھکانے لگاتا تھا۔ خیر، آ گیا ایسا بھی موقعہ۔ وقت کی بات ہے۔ تقدیر پر کس کا زور چلتا تھا۔ نفیس! موت سے ڈرنا بزدلی ہے (اس دوران میں نفیس بیگم خون والی روئی اور چندیاں وغیرہ اٹھا کر ایک طرف گٹھڑی میں باندھتی اور اسے چھپا کر رکھ دیتی اور پھر فرش گیلے کپڑے سے پونچھ دیتی ہے) موت سے کون بچا ہے؟ جان کا خطرہ کسے نہیں؟ سڑک پر چلتے چلتے آدمی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ موت ہر وقت اور ہر کہیں منڈلاتی پھرتی ہے۔ اس کا کوٹہ مقرر ہے۔ جائز ناجائز ہر طریقے سے وہ اپنا کوٹہ پورا کرتی ہے۔ کہیں گاڑیوں کی ٹکر ہوتی ہے، کہیں لاریاں الٹ جاتی ہیں، کہیں ہوائی جہاز تباہ ہو جاتے ہیں، کہیں سیلاب آ جاتے ہیں، کہیں وبا پھیل جاتی ہے، کہیں قحط پڑ جاتا ہے۔ نفیس! ہر طرف موت کا راج ہے۔ موت سے کون بچتا ہے۔ جان کے خطرے کی بات نہ کیا کرو!

نفیس بیگم :- تم بڑے ضدی ہو۔

(اسٹیج کے قریب سخت مایوس اور نڈھال ہو کر الماری کے سہارے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہمزاد آتا ہے)

ہمزاد ... جسے تو شریک حیات کہتی ہے وہ شریک موت ہے۔ نادان! یہ شاندار محل ریت کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔ اس پر کوئی بھروسہ نہیں، اور اگر یہ محل گر پڑا اور اگر اکرم مر گیا (نفیس بیگم چیختی ہے)

اکرم خاں :- نفیس! کیا ہوا؟ کیوں چیختی ہو؟

نفیس بیگم :- کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ یونہی خیال آ گیا تھا۔

اکرم خاں :- نفیس! تم کمزور دل تو نہیں جو یوں چیخنے چلانے لگ گئیں۔

نفیس بیگم :- نہیں نہیں، میں کمزور دل نہیں۔ شیطان مجھے وسوسے ڈالتا ہے۔

اکرم خاں :- اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی خود شیطان بن جائے۔

نفیس بیگم :- ہاں ہاں، یہی علاج ہے۔

اکرم خاں :- آنسو پونچھ لو!

(نفیس آنسو پونچھنے لگتی ہے)

ہمزاد :- یہ مشرق بھی کیا دیس ہے! یہاں خاوند عورت کا خدا ہوتا ہے۔ خاوند نہ رہے تو عورت کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ وہ دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مٹی میں مل جاتی ہے۔ شریف عورت کچھ بھی تو نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے بغیر کوئی ہستی نہیں رکھتی۔ نفیس بیگم! گھبرا نہیں۔ تیرا ایک سہارا اور بھی ہے جسے آج تک تو نے سہارا نہیں سمجھا۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔ طاہرہ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے تجھ سے دلچسپی ہے۔

نفیس بیگم :- (تھپڑ مار کر) خاموش، بدتمیز!

اکرم خاں :- نفیس! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم نے کسے تھپڑ مارا؟ کسے بدتمیز کہا؟ اس کمرے میں تو کوئی بھی نہیں۔

نفیس بیگم :- میں نے شیطان کو تھپڑ مارا۔

اکرم خاں :- چھوڑو اس شیطان کا پیچھا! کیا رکھا ہے اس میں؟

دروازے پر دستک

دیکھو! کون ہے؟

نفیس بیگم :- دیکھتی ہوں (دروازے کے پاس جا کر) کون؟

آواز :- (زیرِ لب، رازدارانہ لہجے میں) بڑی حویلی والوں کے آدمی ہیں ہم۔

نفیس بیگم :- (اکرم خاں) بڑی حویلی والوں کے آدمی ہیں۔

اکرم خاں :- آنے دو!

نفیس بیگم کھٹکا اتارتی ہے۔ دو آدمی داخل ہوتے ہیں۔

کہو، دام لائے؟

پہلا آدمی :- کبھی دام کے بغیر بھی آتے ہیں؟ مال کتنے کا ہے؟

اکرم خاں :- (ضبط کر کے) چالیس کا

دوسرا آدمی :- پچیس ابھی لو! (تھیلی کھول کر اس میں سے ہزار ہزار کی پچیس گڈیاں نکالتے ہوئے) پندرہ کل، دس سے پہلے پہلے

پہنچا دیں گے۔

اکرم خاں :۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ وہ دھرا ہے مال الماری کے پیچھے، لے جاؤ نا!

دونوں آدمی جا کر اٹیچی کیس نکال لیتے ہیں۔

پہلا آدمی :۔ پھر اس دھندا! ایک کے سو بن گئے۔

اکرم خاں :۔ بیٹا! کر دو تب جانیں، گولیوں کی بوچھاڑ میں سے گزرو تو پتہ چلے کہ کیا دھندا ہے۔

دوسرا آدمی :۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ کام تو سارا آپ کے آدمی کرتے ہیں۔ آپ تو الگ بیٹھے رہتے ہیں۔

اکرم خاں :۔ کبھی چل کے دیکھو میرے ساتھ، سب کچھ معلوم ہو جائے گا کہ میرے آدمی کیا کرتے ہیں اور میں کیا کرتا ہوں۔

پہلا آدمی :۔ چلیں گے اور ضرور چلیں گے۔

اکرم خاں :۔ چلنا!

دوسرا آدمی :۔ اچھا۔

دونوں چلے جاتے ہیں نفیس بیگم چٹخنی چڑھاتی ہے!

اکرم خاں :۔ شکر ہے، مصیبت ٹلی۔ جب تک مال ٹھکانے نہ لگے خطرہ ہی رہتا ہے۔

نفیس بیگم :۔ (اطمینان کا سانس لے کر) اب لعنت بھیجو اس دھندے پر! ذرا گھر کی خبر لو! جوان لڑکی بیٹھی ہے۔ اس کے بیاہ کی فکر کرو! زمانہ برا ہے۔ خدانخواستہ کسی نے بہکا دیا تو عمر بھر کی رسوائی ہو جائے گی۔

اکرم خاں :۔ ٹھیک ہو جاؤں تو اس کا بیاہ کر دوں گا۔ میں تو برباد ہوں، طاہرہ کی زندگی کیوں برباد کر دوں؟

نفیس بیگم :۔ اس وقت رشتہ بھی اچھا مل رہا ہے۔

اکرم خاں :۔ ہاں حکیم فرحت علی خوب آدمی ہے۔ دس پندرہ لاکھ نقد ہیں اس کے پاس۔ چار پکی حویلیاں ہیں۔ ایک پورا بازار اس کا ہے۔ موٹر اور نوکر چاکر والا ہے۔

نفیس بیگم :۔ اسے چھوڑو۔ اپنا واجد ٹھیک ہے۔ عزیزوں میں اس سے قابل اور شریف کوئی لڑکا نہیں۔

اکرم خاں :۔ ارے نفیس! تم نے بھی کس بدھو کی بات کی؟

نفیس بیگم :۔ واہ بدھو کیسے ہوا؟

اکرم خاں :۔ اس نے اتنی تعلیم پائی، اتنی کتابیں پڑھیں، وہ کمائی کل تین سو روپے ماہوار۔

نفیس بیگم :۔ اپنا عزیز تو ہے، بھلا مانس تو ہے؟

اکرم خاں :۔ عزیز اور بھلے مانس کو لے کر کوئی چاٹے؟

نفیس بیگم :۔ اٹھارہ سال کی لڑکی اور چالیس سال کا میاں، ہونہہ۔

اکرم خاں :۔ تم نہیں سمجھتیں۔ دولت نوجوانوں کے پاس نہیں ہوتی۔ نوجوانوں کے پاس فقط جوانی ہوتی ہے۔ میں نے طاہرہ کو شہزادیوں کی طرح پالا ہے۔ خاوند کے یہاں آرام نہ ملا تو وہ پریشان ہوگی۔ نفیس! طاہرہ بڑی نازک مزاج ہے۔

نفیس بیگم :۔ کچھ بھی ہو، فرحت علی سے رشتہ نہ کرو!

اکرم خاں :۔ (کراہ کر، تعجب سے) وجہ؟ فرحت علی بدچلن ہے، بدکار ہے، کیا ہے؟

نفیس بیگم :۔ وہ اسے سکھ نہ دے گا۔

(ہمزاد اگر کہتی ہے "اسے کسی کا انتظار ہے"۔ اور چلی جاتی ہے۔ وہ، اور ڈھب کا آدمی ہے)

اکرم خاں :۔ خیر مجھ پر بات چھوڑ دو! ہائے، یہ زخم!

نفیس بیگم :۔ ہلو نہیں، یونہی رہو!

اکرم خاں :۔ تم یں اٹھ رہی ہیں۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ!

نفیس بیگم :۔ لو

سین بدلتا ہے

دوسرا سین

وہی کمرہ لیکن حلیہ نیا ہے۔ میز پر دوا کی چھوٹی بڑی چھوٹی شیشیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ روئی اور پٹیوں کے بنڈل رکھے ہیں۔ چھری، سلی اور کھرل بھی موجود ہیں۔

نفیس بیگم سہارا دے کر اکرم خاں کو اٹھاتی اور آرام کرسی پر بٹھاتی ہے۔ اکرم خاں چائے پیتا ہے۔

نفیس بیگم :۔ شکر ہے، کچھ گھاؤ ٹھیک تو ہوئے۔

اکرم خاں :۔ ہاں، بس وہی ذرا ٹھیک نہیں جو دل کے پاس ہے۔ آج پھر اس سے خون رستا ہے۔

نفیس بیگم :۔ دل تو چیز ہی ایسی ہے۔ اس کے گھاؤ سے خدا بچائے!

اکرم خاں :۔ واجد کو بلا لو! دیکھیں کیا کہتا ہے۔ تم نے اسے میرا پیغام

پہنچا یا اور وہ آیا۔

نفیس بیگم :۔ تمہارا فیصلہ اسے منظور نہیں۔

اکرم خاں :۔ یہ بھی خوب ہے۔ فیصلہ میرا اور اس کی منظوری دے

واجد! خیر، اسے بلاؤ ذرا!

نفیس بیگم ونگ کے قریب جا کر آواز دیتی ہے۔ واجد "حاضر ہوا" کہہ کر داخل ہوتا ہے۔ کیا بات ہے بھائی؟

واجد :۔ پھوپھی جان نے جو خبر سنائی ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ میں کیا نقص ہے؟

اکرم خاں :۔ واجد! سوال نقص کا نہیں خوبی کا ہے۔ میں وہ آدمی ہوں جس کی نظر میں نقص کوئی شے نہیں، صرف خوبی ایسی شے ہے جس کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ بیٹھ جاؤ اور تحمل سے سنو!

واجد :۔ جی، بس میں یونہی ٹھیک ہوں۔

اکرم خاں :۔ اچھا تو کھڑے رہو اور سنو! جانتے ہو طاہرہ عمر بھر کس طرح رہی؟ اس کے اخراجات کا کچھ اندازہ ہے۔

واجد :۔ ہوں یہ بات ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا تین سو روپے میں اچھی طرح گذارہ نہیں ہو سکتا؟

اکرم خاں :۔ تین سو زیادہ ہوتے ہیں کہ تین ہزار؟

واجد :۔ خوب، بات گنتی کی ہے، شرافت کی نہیں۔

اکرم خاں :۔ کون اولاد کی بہتری نہیں چاہتا؟

واجد :۔ لیکن صرف پیسہ ہی تو بہتری کی چیز نہیں۔ انسانیت بھی کچھ ہوتی ہے۔

اکرم خاں :۔ اگر انسانیت عالیشان مکان بن سکتی ہے، موٹر گاڑی بن سکتی ہے، اوڑھنا بچھونا بن سکتی ہے تو بڑی اچھی چیز ہے ورنہ پھر اس ڈھول کے پول کی مجھے ضرورت نہیں۔

واجد :۔ آپ کے لئے انسانیت کوئی چیز نہیں۔ دنیا میں آگ لگی ہے اور انسانیت اس میں جل رہی ہے۔ آپ جیسے لاکھوں انسان پیسے کی چمک دمک پہ فریفتہ ہیں، خیر اسے چھوڑیے! اپنے وعدے یاد کیجئے! (نرم لہجے میں) میں طاہرہ سے بیاہ کروں گا۔

اکرم خاں :۔ کس کتاب میں لکھا ہے؟

واجد :۔ دل کی کتاب میں۔

اکرم خاں :۔ دل؟ دل بڑی بری چیز ہے اور اس کا گھاؤ؟ اف، بڑی مشکل سے اچھا ہوتا ہے۔ دل نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ آدمی زیادہ سکھی ہوتا، زیادہ صحیح اور سالم رہتا۔ (بہ مشکل ہنستے ہوئے) خیر، وہ کچھ اور بات تھی جو میں نے کہی۔ یہ تو تمہارے دل کی بات ہے برخوردار! اس بیسویں صدی میں دل کو لئے پھرتے ہو؟ دل کے دن لد گئے۔ یہ دل، یہ تمہارا دل دھوکے کا آلہ ہے۔ تم بچے ہو۔ طاہرہ بھی بچی ہے۔ اس نے بھی دل کا نام لیا تھا

واجد :۔ خاندان بھر میں کسے خبر نہیں کہ ہم میں پیار ہے۔

اکرم خاں :۔ (تیزی سے) یہ سب دھوکے کا کھیل ہے۔ پیار کا ہلوں اور بیکاروں کے کام کی شے ہے۔ اندھا دھند بے سوچے سمجھے اناڑیوں کی طرح پیار کرنا حماقت ہے۔ اگر پیار کو حکیم کا نسخہ سمجھتے ہو تو اپنے حالات کے مطابق کسی لڑکی سے پیار کر لو!

واجد :۔ حالات تو بالکل ٹھیک ہیں۔ ہمارا پیار حالات کے عین مطابق تو ہے۔ ہم دونوں ایک گھر میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیلے۔ ہم نے ایک دوسرے کو جانا پہچانا اور پھر.... بڑے ہو کر بھی مدت تک ایک ساتھ رہے۔ آپ ہی نے طاہرہ کو میرے ساتھ کالج میں داخل کروایا اور مجھے اس کا خیال رکھنے کو کہا اور پھر... پھر ہم پچھلے چار سال تک انہی کمروں، انہی چار دیواریوں میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے رہے۔ آپ کو یاد نہیں، میں نے کس محنت سے طاہرہ کو تیاری کروائی۔ وہ یونہی تو اوّل درجے میں پاس نہیں ہوئی۔ آپ ہی نے باپ بن کر کہا تھا، جس طرح ہم بچپن سے ایک چلے آ رہے ہیں آئندہ بھی ایک رہیں گے۔ جو پودا یوں سینچ سینچ کر درخت بنا ہو اور جس میں دو ہستیوں کی روح کھپی ہو آپ اسے اکھاڑ پھینکیں گے؟

اکرم خاں :۔ تمہارا احسان بجا۔ کہو تو کاغذ پر لکھ دوں۔ چاہو تو معاوضہ لے لو۔

واجد :۔ پیسہ پیسہ پیسہ۔ آپ کو ہر چیز پیسے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ آپ کے نزدیک یہ دنیا اور اس کا سب کچھ پیسے کی طرح گول ہے، ہر چیز کو پیسے کے پیمانے سے ناپتے ہیں آپ۔ میں پھر کہتا ہوں، پیسہ ہی سب کچھ نہیں۔ ذریعہ ہے، زینہ ہے لیکن مدعا نہیں، مقصد نہیں، منزل نہیں۔ آپ نہیں مانتے تو مت مانیے لیکن میں اس انمول چیز کو نہیں بیچ سکتا جس سے میری یادوں

کے خزانے بھر لو، نہیں! جس سے میرے خیالات اور تصورات آباد ہیں۔

اکرم خاں:۔ تم پیسے کے دشمن ہو جن کے پلّے پیسہ نہیں وہ یونہی اسے کوستے ہیں لیکن پیسہ ہی ایسی چیز ہے جو دن کی طرح روشن ہے جس کا پیمانہ اندھے تک دیکھتے ہیں۔ یہ دنیا اچھی ہو یا بری، پیسے کے بغیر بے کار ہے۔ اور وہ ..... وہ جسے تم پیار کہتے، خلوص کہتے ہو اور جسے دل کی بات کہتے ہو جس کا تم ورد کرتے ہو وہ، وہ تمہارے سوا کسی کو نظر نہیں آتی۔ وہ چیز کس کام کی جو صرف تمہارے مطلب کی ہو جس کا مطلب تمہارے سوا کوئی نہ سمجھے؟

نفیس بیگم:۔ واجد بیٹے! تمہارے پھوپھا ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان کی باتوں کا برا نہ ماننا!

واجد:۔ (تلخ ہو کر) میری باتوں کی کوئی قیمت ہی نہیں، ایسی ہی بیکار ہیں یہ باتیں؟ طاہرہ سے تو پوچھیے!

اکرم خاں:۔ طاہرہ سے پوچھیں؟ گویا ہم اپنی اولاد کو تباہی کے گڑھے میں پھینک رہے ہیں۔ ہمیں اپنی اولاد اچھی نہیں لگتی؟ ہم اپنی اولاد کا بھلا نہیں چاہتے؟ واجد! کیا ہم قصائی ہیں؟

واجد:۔ آپ جانئے! آپ کا یہ فلسفہ آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ پیسہ انسان کو سنوار نہیں سکتا۔ دنیا کو سنوارنے والوں نے اسے پیسے سے نہیں سنوارا۔ سنوارنے والی چیز دل ہے، خلوص ہے، پیار ہے۔

اکرم خاں:۔ یہ دل، یہ خلوص اور یہ پیار ماں باپ کے پاس ہوتا ہے پیدائش سے ہوتا ہے اور اسی سے وہ اپنی اولاد کی زندگی سنوارتے ہیں۔ دل، خلوص اور پیار کو ہم سمجھتے ہیں، ہم ماں باپ۔ تم کیا سمجھو گے جو اسے کھیل جانتے۔ برخوردار! ابھی پیار کے معنی سمجھو! یہ کھیل نہیں۔ بڑی کٹھن چیز ہے پیار۔ اس کی منزل اور اس کا انجام تم نہیں جانتے! جاؤ کام کرو! نادان لڑکے! اپنی عقل کو ابھی اور پختہ کرو!

واجد:۔ بہت اچھا

(زور سے دروازہ بھیڑ کر نکل جاتا ہے)

نفیس بیگم:۔ بڑے غصے میں گیا ہے لڑکا۔

اکرم خاں:۔ کیا کرے گا؟

نفیس بیگم:۔ یہ عمر، جوانی کا زمانہ، اس میں انسان سبھی کچھ کر سکتا ہے۔ تم نے اس کے آخری الفاظ سنے؟ اس کا لب و لہجہ کتنا خطرناک تھا۔ تم نے اس کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھا، بالکل آگ تھا جیسے وہ برسنا چاہے۔ مجھے، مجھے تو خوف لگتا ہے۔

اکرم خاں:۔ یہ کل کا چھوکرا کیا کرے گا؟ یہ کس کھیت کی مولی ہے؟ (کراہ کر) ہائے، یہ زخم!

نفیس بیگم:۔ ناحق لڑکے سے الجھے۔ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس بری طرح زخمی ہوئے ہو، تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ ذرا سنبھلنے لگے تھے کہ پھر طبیعت پر بوجھ ڈال لیا۔ خدا کے لئے خاموشی سے آرام کرو! اب میں تمہیں کسی سے ملنے نہ دوں گی، اس کل کے چھوکرے سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ تم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔

اکرم خاں:۔ ہاں، مجھے کسی سے نہ الجھنا چاہیے۔ آرام کرنا چاہیئے۔ میری حالت کا یہی تقاضا ہے۔ یہ زخم! ڈرتا ہوں کہیں بڑھ نہ جائیں اور پھر یہ جو دل کے پاس ہے، یہ تو خاصا خطرناک ہے۔

نفیس بیگم:۔ خدایا کیسے ٹھیک ہوگا یہ تمہارا زخم؟

اکرم خاں:۔ ہوں، کیسے ٹھیک ہوگا؟ ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری قوتِ ارادی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر میں نہ مرنا چاہوں تو نہیں مر سکتا۔ نفیس! دیکھ لینا میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔

نفیس بیگم:۔ خدا کرے تم ٹھیک ہو جاؤ اور بڑی جلدی ٹھیک ہو جاؤ! میں نیاز دوں گی، کم سے کم دس دیگ کی نیاز دوں گی بندہ نواز کی مہربانی سے تم ٹھیک ہو جاؤ لیکن میں کہتی ہوں ——

اکرم خاں:۔ کیا کہتی ہو؟

نفیس بیگم:۔ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے اور ..... تم میں پوری طرح جان نہیں آ جاتی کوئی نئی الجھن نہ پیدا کرو! واجد سے مت بگاڑو!

اکرم خاں:۔ نفیس سنو! کان کھول کر سنو! میں ٹھیک ہو جاؤں یا نہ ہو جاؤں یہ بات اپنی جگہ رہی لیکن میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہ زخم مجھے کچھ نہیں کرنے دیتا لیکن موقعہ آن پڑا تو میں

اس کی بھی پروا نہ کروں گا۔ میں نے کبھی جان کی پروا نہیں کی۔
جان کی پروا بزدل کرتے ہیں۔ اکرم خاں بزدل نہیں۔

نفیس بیگم:۔ مجھے واجد کے تیور ٹھیک نہیں لگتے۔

اکرم خاں:۔ بچہ ہے نہ بیوا وہ کیا کرے گا؟

نفیس بیگم:۔ ماموں جان بتا گئے تھے کہ جب سے اس نے تمہارے انکار کی خبر سنی ہے دیوانہ ہو رہا ہے۔ آنکھوں میں خون اترا اترا رہتا ہے۔ تمہارے سامنے اس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ ورنہ کہتے ہیں کہ اس کے حواس بجا نہیں رہے۔ خود ہی سوچو جس نے اتنے سال طاہرہ سے محبت کی بچپن سے لے کر اب تک اس کے ساتھ رہا وہ اسے کیسے بھولے؟ جو محبت کرتا ہے وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔

اکرم خاں:۔ یہی تو میں پوچھتا ہوں وہ کیا کر بیٹھے گا۔

نفیس بیگم:۔ اتنے سال کی محبت! توبہ، تم جذبے کی گہرائی کو نہیں سمجھتے! یہ بھی زخم کی طرح ہوتا ہے۔ جتنا گہرا ہوتا ہے اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے، جان لیوا ہوتا ہے۔ کوئی لڑکا سترہ اٹھارہ سال کے تعلقات کے بعد لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ البتہ جان پر کھیل سکتا ہے۔

اکرم خاں:۔ اسے جان سے کھیلنے دو! ایسے احمق کا کوئی علاج نہیں۔ افیم کھالے، دریا میں کود پڑے، گاڑی تلے سر رکھ دے، پستول مار لے!

نفیس بیگم:۔ پستول؟ کہیں وہ فرحت علی کو پستول نہ مار دے۔ مجھے نہ مار دے۔ تمہیں نہ مار دے۔

اکرم خاں:۔ اگر وہ ایسے فضول ارادے کا مالک ہے تو اسے کہو مجھے مارے اور پھانسی لگ جائے۔ جاؤ، اس چھوکرے سے جا کر کہو! میری اور اپنی جان سے کھیل جائے۔ میں موت سے ڈرنے والا نہیں۔ میں آج تک موت سے نہیں ڈرا۔ میرا کاروبار ہی ایسا ہے سمگلر کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو بلکہ موت کے پنجوں میں پنجے ڈال کر اس سے لڑتا ہے۔ جب ہم گھر سے نکلتے ہیں موت ساتھ ساتھ چلتی ہے اور پھر موت سے بچنے کے لئے ہم دوسروں کو موت کا شکار بناتے ہیں۔ کون جانے اپنی جان بچانے کے لئے ہم نے کتنے خون کئے۔ اگر میری موت بزدل کے ہاتھوں لکھی ہے تو یونہی سہی کبھی کبھی بہادروں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

نفیس بیگم:۔ تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟

اکرم خاں:۔ نفیس! سمگلر مجھے اپنا سردار مانتے ہیں۔ میں مجرم ہوں لیکن باپ تو ہوں۔ شاید مجرم باپ اپنی اولاد کے بارے میں اسی طرح سوچتا ہو۔

نفیس بیگم:۔ یوں مت سوچو بلکہ یوں سوچو کہ طاہرہ بھی مان جائے وہ واجد کو چھوڑ کر حکیم فرحت علی سے بیاہ نہ کرے گی۔ یہ اور بات ہے کہ تم سے خوف زدہ ہو کر چپ ہو رہی ہے۔ آخر تم سے ڈرتی ہے لیکن اس کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیئے!

اکرم خاں:۔ نفیس! جو عمر بھر کانٹوں پہ چلتا رہے وہ کسی اور انداز سے سوچتا ہے۔ میں اناڑیوں اور ڈرپوکوں کی طرح نہیں سوچ سکتا۔ میری زندگی اور میری سوچ کا ایک ہی انداز ہے۔ ایسی ہی میری باتیں ہیں۔ جس طرح میں اپنی زندگی کو نہیں بدل سکتا اسی طرح اپنی سوچ اور اپنی باتوں کو نہیں بدل سکتا۔ طاہرہ کو ایک دولت مند شوہر کی ضرورت ہے تاکہ وہ بڑی عورت بن جائے، سوسائٹی میں نام پیدا کرے۔ قومی انجمنوں کی باگ ڈور سنبھالے کہیں صدر بنے کہیں سکرٹری۔ سیاست میں حصہ لے۔ اوپر جائے۔ پرواز کرے۔ تم چاہتی ہو وہ تین سو روپلی کے واجد سے بیاہ کرے اور پھر... اور پھر سکڑ کر رہ جائے، کنوئیں کا مینڈک بن جائے۔ پر کٹی لڑکی کیا کر سکتی ہے؟ نفیس! مجھے یہ منظور نہیں، ہرگز منظور نہیں۔ میری تو یہ آرزو ہے کہ وہ نام پائے۔ نفیس! وہ.... وہ میری بیٹی ہے۔ اسے میرا نام روشن کرنا ہے۔ ان داغوں کو... ان داغوں کو مٹانا ہے جو... میں نے... خاندان کی پیشانی پر لگائے ہیں۔ طاہرہ کو بڑے کام کرنے ہیں۔ تین سو روپلی میں یہ کام نہیں ہو سکتے

نفیس بیگم:۔ واجد ساری عمر تین سو روپلی پر تو نہیں پڑا رہے گا۔

اکرم خاں:۔ نفیس! کبھی کبھی تو تم بالکل بچہ ہی بن جاتی ہو۔ واجد آخر کونسا تیر مار لے گا۔ ریٹائر ہو کر بھی واجد کی اتنی آمدنی نہ ہوگی جتنی فرحت علی کی ہے اور پھر، اگر کل کلاں کو واجد مر گیا تو؟ طاہرہ کے ہاتھ کیا لگے گا؟ فرحت مرا تو لاکھوں چھوڑ مرے گا۔ یہ باتیں سوچنے والی ہیں نفیس! سوچنے والی۔

دروازے پہ دستک

دیکھو! چور دروازے پر کس نے دستک دی۔ کون آیا۔

نفیس بیگم :۔ (زیرلب، رازدارانہ لہجے میں) کون؟

آواز :۔ بڑی حویلی والوں کے آدمی ہیں۔ فوراً دروازہ کھولئے! غضب ہوگیا

(نفیس بیگم گھبرا کر چٹخنی اتارتی ہے۔ دو آدمی داخل ہوتے ہیں)

پہلا آدمی :۔ خان صاحب! غضب ہوگیا۔ کسی کمین نے مخبری کردی اور پولیس نے حویلی پر چھاپہ مار دیا۔ مال برآمد ہوگیا ہے۔ للو جان پکڑے گئے ہیں۔ آپ اپنا بندوبست کرلیں اور فوراً گھر چھوڑ دیں۔

نفیس بیگم :۔ اوئی اللہ، یہ کیا ہوا! یہ تو زخموں سے چور ہیں، کہیں جا ہی نہیں سکتے۔

اکرم خاں :۔ (ہنس کر) نفیس! تمہیں گھبرانے کی عادت نہ بھولی۔ حوصلے سے کام لو، حوصلے سے! ایک ہزار روپے نکال دو! میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گا۔ مجھے کوئی ڈر خطرہ نہیں۔

دوسرا آدمی :۔ آپ فوراً چلے جائیں! دیر مت کیجئے! پولیس اب آپ ہی کا پیچھا کرے گی۔

اکرم خاں :۔ مجھے کوئی غم نہیں۔ پولیس میری ہوا کو بھی نہ چھو سکے گی۔

(اکرم خاں مسکرا کر اٹھتا ہے نفیس بیگم ایک ہزار کے نوٹ لا کر دیتی ہے)

نفیس! ہمت نہ ہارنا! بیٹی طاہرہ، میری شہزادی کو اداس نہ ہونے دوں گا۔ میں آؤں گا، بہت جلد آؤں گا اور زندہ سے ہوکر آؤں گا۔ چوکس ہوکر رہنا! اچھا! تم تو میری راج دلاری ہو، میری اچھی بیوی ہو، غم نہ کرنا، ہوں، حوصلہ رکھنا، حوصلہ!

نفیس بیگم :۔ خدایا، یہ کیا ہو رہا ہے؟

اکرم خاں :۔ نفیس! جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا۔ خدا حافظ!

(اکرم خاں چلا جاتا ہے۔ نفیس بیگم کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ضبط کرتی ہے۔ منہ چھپا کر شدتِ غم کے مارے تیزی سے اندر چلی جاتی ہے)

تیسرا منظر

طاہرہ کا کمرہ ــــ سامنے آرائشی میز رکھی ہے جس پر میک اپ کا سامان بے ترتیب پڑا ہے۔ دونوں طرف بڑی بڑی کپڑوں والی الماریاں ہیں۔ طاہرہ ایک الماری کھولے کھڑی ہے اور ایک دوپٹے کی خاطر تمام کپڑے اتھل پتھل کر رہی ہے ــــ کپڑے اٹھاتی اور فرش یا صوفے پر پھینکتی جاتی ہے۔ نیچے سے دوپٹہ نکالتی ہے۔

واجد، چست لباس پہنے، ایک جانب کھڑا ہے۔ خوب سمارٹ نظر آرہا ہے)۔

واجد :۔ کیا یہ سب کچھ خواب تھا؟ سب کچھ جھوٹ تھا؟ ہماری ملاقاتیں وقت ضائع کرنے کے لئے تھیں؟ ہم یونہی ساری ساری رات جاگتے رہے؟ کیا صرف امتحان کی خاطر کتابیں مل کر چاٹتے تھے؟

طاہرہ :۔ تم تو خواہ مخواہ جوش میں آرہے ہو۔ میں نے جو کہا، مجھے کچھ پتہ نہیں۔

واجد :۔ یہ بھی کوئی ماننے والی بات ہے؟ گھر میں تمہارے خلاف سازش ہو رہی ہو اور تمہیں خبر نہ ہو۔

طاہرہ :۔ اللہ! مجھے کچھ پتہ نہیں، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے! ابا اور امی مجھے اپنی باتوں کی کبھی خبر نہیں دیتے۔ وہ تو مجھے بالکل دودھ پیتی بچی سمجھتے ہیں۔ پوچھ بیٹھوں تب بھی کچھ نہیں بتاتے۔ تمہیں معلوم تو ہے وہ اپنی باتیں اپنے تک ہی رکھتے ہیں۔

واجد :۔ طاہرہ! میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ تمہارے ماں باپ بدل گئے ہیں۔ جانے کس کے سونے چاندی نے انہیں بہکا دیا ہے۔

طاہرہ :۔ مجھے کچھ پتہ ہو تو کہوں۔

واجد :۔ میں دیوانگی میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ طاہرہ! میرا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ میں بہت بری بری باتیں سوچا کرتا ہوں۔ جب میں اپنے مستقبل کا تصور کرتا ہوں اور اس میں تمہیں نہیں پاتا تو اندھا ہو جاتا ہوں۔ مجھے موت کے سوا دوسرا راستہ نہیں سوجھتا۔ میرے ہاتھوں ۔۔۔ میں، میں کہتا ہوں، میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔

طاہرہ :۔ تم وہی کے وہی رہے۔ ذرا نہ بدلے۔ تمہارا دماغ واقعی خراب ہے۔ تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ اگر اسی طرح فضول باتوں میں دھیان لگاتے رہے تو ایک دن آپے سے باہر ہو جاؤ گے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندگی برباد کر بیٹھو گے۔

واجد :- زندگی اب بھی برباد ہے۔

طاہرہ :- کیسے؟

واجد :- میں کہتا ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہارا بیاہ کسی اور سے کر رہے ہیں؟

طاہرہ :- تم سے کس نے کہا ہے؟

واجد :- تمہارے ابا جان نے کہا ہے۔ وہی جو تم سے کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے مجھ سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ صاف انکار کر دیا ہے۔

طاہرہ :- کہا ہوگا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ابا جان کو مجھ سے زیادہ میرا خیال ہے۔ اگر انہوں نے کوئی فیصلہ کیا ہے تو اسے اٹل جانو! وہ بڑے سخت ہیں۔ ایک ہی گھر کی میں جان قبض کر لیتے ہیں۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ان سے سب ڈرتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا۔ اف! وہ اتنے زبردست ہیں، اتنے زبردست کہ ان جیسا کوئی زبردست نہیں۔ ان کی آنکھیں کیسی ڈراؤنی ہیں۔ ہا ہا! ہم تو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔

واجد :- میں کچھ نہیں جانتا۔ جب میں دیوانہ ہو جاتا ہوں تو مجھے بھی کچھ نہیں سوجھتا۔ طاہرہ! میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے پھر کیا ہو جاتا ہے۔ طاہرہ! میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، نہیں چھوڑ سکتا۔

طاہرہ :- تم تو بلا وجہ رائی کا پہاڑ بنانے کے عادی ہو۔ اپنے ہی آپ دل میں کوئی خیال جما لیتے ہو اور الٹا سیدھا نتیجہ نکال لیتے ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے ہو۔ صبر کی تو عادت ہی نہیں۔ نہ آگے کا سوچتے ہو نہ پیچھے کا۔ بس جان پر کھیلنے پر تیار ہو جاتے ہو۔

واجد :- ٹھیک ہی کہتی ہو۔ سائیکولوجی پڑھی ہے نا تم نے مجھ سے جو چوک ہوئی اس کی سزا بھگتوں گا۔ آج تو تمہیں بھی نئی نئی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ کیا خبر تھی کہ تم بھی شریک سازش ہو۔

طاہرہ :- پھر لگے پر کی اڑانے۔ یونہی ذرا سی بات کی اور اس پر اڑ گئے۔ تحمل سے کام لو! ابا تو کراچی گئے ہیں، ان سے کون بات کر سکتا ہے۔ البتہ امی سے بات کر دوں گی۔

واجد :- بس ایک بات یاد رکھنا! دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے میں تمہیں نہ چھوڑوں گا۔ تم میرے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ ہو۔ میں کہتا ہوں، اس مسئلے کو سلجھاؤ ورنہ ——

طاہرہ :- (سہم کر) ورنہ کیا؟ تم کیسے ہو کہ سمجھتے ہی نہیں۔ اپنی جان کے دشمن بنے بیٹھے ہو۔ جانے کون تمہیں الٹے پلٹے مشورے دیتا ہے! جاؤ، مجھے معاملہ سلجھانے دو! تاؤ میں آکر بات بگڑتی ہے، بنتی نہیں۔

واجد :- جاتا ہوں۔ طاہرہ! خدا کے لئے میں ہاتھ جوڑتا ہوں معاملے کو سنوار دو!

طاہرہ :- تم جاؤ تو سہی۔ مجھے کچھ سوچنے کی فرصت ملے۔

واجد :- لو جاتا ہوں۔

(واجد چلا جاتا ہے۔)

(طاہرہ ویسے ہی کپڑے چھوڑ چھاڑ کے آئینہ دیکھنے لگتی ہے۔ بناؤ سنوار کے بعد باہر چلی جاتی ہے)

چوتھا منظر

(وہی تیسرے منظر والا کمرہ نفیس بیگم اور جنت داخل ہوتی ہیں۔ نفیس بیگم آرائشی میز کو جا کر دیکھتی اور اس کا بے ترتیب سامان ٹھیک کرتی ہے۔)

نفیس بیگم :- یہ پاؤڈر کا ڈبہ کھلا پڑا ہے۔ لپ سٹک نیچے گری پڑی ہے سرخی کی ڈبیہ اور نیل پالش، یہ بھی کھلی پڑی ہیں۔ یہ لڑکی اتنی بڑی ہو گئی ہے لیکن ذرا ہوش نہیں اسے میک اپ کیا اور سامان اٹھا کر ٹھیک کر دیا۔ کبھی چیزیں قرینے سے نہیں رکھتی۔ ادھر کپڑے اسی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ یہ لڑکی کیا کرے گی؟

جنت :- ہے تو آخر تمہاری لڑکی۔

نفیس بیگم :- یہ ناتجربہ کار اور بے پروا لڑکیاں کس کام کی؟

جنت :- بیاہ کر دو گی تو آپ ہی تجربہ آ جائے گا۔

نفیس بیگم :- جو مجھے تجربہ ہے وہ اسے کہاں حاصل؟

جنت :- اب اپنا مقابلہ تو نہ کرو!

نفیس بیگم :- اور پھر..... یہ کیسے..... میں کہتی ہوں بس یہ واجد ہی کے لائق ہے۔ وہ بھی ناتجربہ کار یہ بھی ناتجربہ کار۔

جنت :- تو کیا کسی اور سے بیاہنے کا خیال نہیں؟

نفیس بیگم :- (قطعیت کے ساتھ) نہیں، ہرگز نہیں جنت! میں سچ کہتی ہوں۔ طاہرہ کسی اور کے ساتھ گذارہ کر ہی نہیں سکتی۔ بیاہنے کو تو کسی اور کے ساتھ بیاہ دوں لیکن ڈرتی ہوں کہیں بیاہ ناکام نہ رہے۔

جنت :۔ اڑتی اڑتی سی خبر سنی تھی کہ حکیم فرحت علی سے سازباز ہو رہی ہے۔

نفیس بیگم :۔ یہ سب بکواس ہے حکیم فرحت کے مزاج اور طاہرہ کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور پھر۔۔۔

جنت :۔ اور پھر کیا؟

نفیس بیگم :۔ فرحت علی کو کسی کا انتظار ہے؟

جنت :۔ کس کا انتظار ہے؟

نفیس بیگم :۔ جسے اس کا انتظار نہیں۔

جنت :۔ تو کیا وہ اس سے ملے گی نہیں؟

نفیس بیگم :۔ نہیں۔

جنت :۔ کیوں؟

نفیس بیگم :۔ چھوڑو ان باتوں کو! آؤ ذرا میری مدد کرو! اکرم خاں کی تصویر اتار کر صاف کروں گی۔

جنت :۔ صاف تو ہے۔

نفیس بیگم :۔ اور صاف کروں گی۔ شادی کے دن کی ہے۔ اسی لئے دولہا کا لباس پہن رکھا ہے۔

(میز پر اسٹول رکھ کر نفیس بیگم پڑھتی ہے جنت اسٹول پکڑ لیتی ہے) اور سے ادے اس کے پیچھے تو گرد ہی گرد ہے۔ کبھی بھی صاف نہیں ہوئی۔

(تھوڑی گرد اڑتی ہے)

جنت :۔ چلو! اب صاف ہو جائے گی۔

نفیس بیگم :۔ اب تو صاف ہو گئی ہے۔۔۔۔ لو ذرا ایک ہاتھ سے پکڑنا اسے!

جنت :۔ لاؤ پکڑاؤ!

نفیس بیگم :۔ لو پکڑو!

جنت :۔ لو پکڑ لی! اترآؤ احتیاط سے

نفیس بیگم :۔ (نیچے اتر کر) لاؤ، پکڑاؤ تصویر!

جنت :۔ لو!

نفیس بیگم :۔ میں اسے صاف کرتی ہوں۔ تم ذرا سنگار میز کی نچلی دراز میں سے ہار نکال لاؤ۔ تصویر کو ہار پہنائیں!

جنت :۔ اونہوں۔ میاں کی تصویر کے کیا کیا نخرے کرتی ہو۔

نفیس بیگم :۔ تم ایک کہا تو مانو! آؤ!

جنت :۔ لاتی ہوں۔

(برابر کے کمرے میں جاتی ہے۔ دراز کھٹ سے کھولنے اور بند کرنے کی آواز)

جنت :۔ (دور سے) کونسا ہار لاؤں؟ یہاں تو تین ہار پڑے ہیں؟

نفیس بیگم :۔ وہ جس میں سنہری اور روپہلی پتیاں ہیں اور بیچ میں گلابی پتیاں ہیں۔ وہ سب سے بڑے والا۔

جنت :۔ ہاں، ہاں ہے۔ یہ رہا۔

نفیس بیگم :۔ ہاں، بس لے آؤ اسی کو!

(آجاتی ہے)

جنت :۔ ہار قیمتی لگتا ہے

نفیس بیگم :۔ اصلی سونے اور چاندی کی پتیاں ہیں اس میں۔

جنت :۔ بڑا خیال رکھتی ہو تصویر کا!

نفیس بیگم :۔ اس سے گھر کی رونق قائم ہے۔

جنت :۔ اور تم سے کچھ نہیں؟ اللہ، تم تو گھر کی جان ہو۔ بس گلاب کا پھول ہو کتنی خوبصورت لگتی ہو! انہیں کون بیا ہتا کہے؟

نفیس بیگم :۔ میرے بیاہ کا کیا کہتی ہو؟ خدا ہی جانتا ہے، کس طرح دن گزرتے ہیں۔

جنت :۔ سمگلنگ کا دھندا تو بہت ہی برا ہے۔

نفیس بیگم :۔ کیا کہوں تم سے؟ ہفتوں ہفتوں غائب رہتے ہیں اور پھر ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔ کئی دفعہ پولیس سے جھڑپ ہوئی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی مارے گئے۔ لیکن جنت! کیا خبر، کب شامت آجائے؟ ایک بار بھی پکڑے گئے تو اگلی پچھلی کسر نکل جائے گی۔ ان کی ٹولی بڑی خطرناک ہے۔ بڑے بڑے ڈاکو اور خونی شامل ہیں۔ کئی سزا یافتہ مجرم اور جیل کے بھگوڑے بھی ہیں۔

جنت :۔ سچ تو یہ ہے، پیسے کے زور پر بات بنی ہوئی ہے۔ پیسہ نہ ہو تو لوگ اکرم خاں کی ذرا عزت نہ کریں۔

نفیس بیگم :۔ پیسہ ہے، کوٹھی ہے، سب کچھ ہے لیکن قرار نہیں ہر وقت دھڑکا رہتا ہے، کہیں نیکی بدی نہ ہو جائے۔

جنت :۔ میں نے تو سنا ہے، اکرم کی ٹولی اور پولیس میں زبردست لڑائی ہوتی ہے۔ پانچ سات بھن گئے ہیں۔

نفیس بیگم :۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

جنت :۔ واجد نے۔

نفیس بیگم :۔ (قہقہہ مار کر) بڑا معتبر مخبر ملا تمہیں بھی! وہ تو بے پر کی ہانکتا ہے۔

جنت :۔ اس نے کہا تھا اکرم خاں کو بڑے سخت گھاؤ آئے ہیں۔

نفیس بیگم :۔ جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ وہ تو خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں۔

جنت :۔ ٹھیک ہوں بہن! خاوند سے ہی ساری بہار ہے۔

نفیس بیگم :۔ ہاں جنت! خاوند سے ہی بہار ہے۔ اپنی اپنی قسمت جتنی مجھے خاوند کی قدر ہے شاید ہی کسی کو ہو۔

(گھنٹی بجتی ہے)

جنت :۔ جنت دیکھنا کون ہے؟

جنت :۔ (دنگ کے قریب جا کر دیکھتے اور پلٹتے ہوئے) ماما نے اسے اندر بھیج دیا۔ کوئی عورت ہے۔

نفیس بیگم :۔ آئیے۔

(ایک بڑھیا داخل ہوتی ہے)

بڑھیا :۔ اے بی بی! حکیم جی کے یہاں سے آئی ہوں۔ پچھوایا ہے آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟

نفیس بیگم :۔ کہہ دو بالکل ٹھیک ہے۔

بڑھیا :۔ پوچھتے تھے نبض دکھانے اب آپ کب آئیں گی اور ..... یہ بھی پوچھتے تھے کہ آپ نبض دکھانے آئیں گی یا ہم نبض دیکھنے آئیں اور ..... اور پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ وہ ... وہ انتظار ... جانے کس کے انتظار کا کہہ رہے تھے، خیر، کچھ انتظار کی بات تھی۔

نفیس بیگم :۔ بس بس، جا کر کہہ دو میں بالکل آرام ہے۔ نبض دیکھنے دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں بس جاؤ۔

بڑھیا :۔ پوچھتے تھے جو دوا آپ لائی تھیں وہ ٹھیک سے پی تو رہی ہیں۔

نفیس بیگم :۔ ہاں، پی رہی ہوں ٹھیک سے۔

بڑھیا :۔ بس بس، اچھا کہہ رہی ہیں آپ۔ دوسری بات پوچھ کے آؤں تو کہوں۔

نفیس بیگم :۔ بس بس کوئی ضرورت پوچھنے کی نہیں۔ اب مت آنا۔ بس چلتی بنو بوا!

بڑھیا :۔ اے لو بی بی چل دی بس۔ اب تو خوش ہو؟

(چلی جاتی ہے ـــ طاہرہ بدحواسی کے عالم میں آتی ہے۔)

طاہرہ :۔ امی، امی! میں واجد کے سوا اور کسی سے شادی نہ کروں گی؟

نفیس بیگم :۔ ہوا کیا ہے۔

طاہرہ :۔ میں اب ابا جان کی بات بھی نہیں مانوں گی۔

نفیس بیگم :۔ پتہ لگے، کیا ہوا ہے؟

طاہرہ :۔ میں نے خواب دیکھا ہے، عجیب وغریب خواب!

نفیس بیگم :۔ کیا خواب دیکھا ہے؟

طاہرہ :۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کالی کالی بدلیاں سب طرف سے گھر آئی ہیں بجلی زور زور سے کڑک رہی ہے اور لوگ کسی کا جنازہ لئے آرہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے جنازہ اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔

نفیس بیگم :۔ غائب ہو جاتا ہے اندھیرے میں؟

طاہرہ :۔ جنازہ، اندھیرا، بجلی کی کڑک ... الٰہی یہ سب کیا ہے، یہ سب کیا ہے؟

جنت :۔ خوابوں کی بھی بھلی کہی۔

نفیس بیگم :۔ جنت! خوابوں سے بہت ڈرتی ہوں۔ ایک دفعہ میں نے خواب میں جنازہ دیکھا تھا اور تب میرے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ یہ خواب، یہ جنازوں کے خواب بہت برے ہوتے ہیں۔

جنت :۔ یہ خواب وہم کے سوا کچھ نہیں۔

طاہرہ :۔ لیکن امی! آخر میں سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

نفیس بیگم :۔ ٹھیک ہو گیا؟

طاہرہ :۔ ہاں، ہاں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے اندھیرا غائب ہو گیا۔ بادل چھٹ گئے۔ چاندنی سی چاندنی پھیل گئی اور پھر، اور پھر امی! مجھے پر لگ گئے ـــ پری بن گئی اور اڑنے لگی۔ اور، امی! اڑتے اڑتے چاند ستاروں میں جا پہنچی پھر، اور پھر امی! پھولوں کی بارش ہونے لگی اور مزے کی بات یہ ہے کہ پھولوں کا ڈھیر لگ گیا، بڑا اونچا ڈھیر اور امی اس ڈھیر میں سے واجد نکل آیا۔

نفیس بیگم :۔ اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا۔

نفیس بیگم :- لیکن میری طبیعت گھبرا رہی ہے میرے دل کو کیا ہو رہا ہے
یہ خواب، وہ جنازہ! مجھے کیا ہو گیا۔ میرا دماغ ٹھیک نہیں۔
طاہرہ! نہیں نہیں جنت! جنت! مجھے وہ جنازہ نظر آ رہا ہے
جنت! اسے بلا لاؤ! جنت! حکیم فرحت علی کو بلا لاؤ! میرا
دل بیٹھا جا رہا ہے بیٹھا جا رہا ہے۔

(گر پڑتی ہے)

جنت :- غش آ گیا۔ طاہرہ! تو سنبھال ذرا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے
ڈال میں حکیم فرحت علی کو بلا لاؤں!

طاہرہ :- خالہ جنت! ذرا جلدی آنا۔ بہت جلدی۔ میں نے کیوں
اپنا خواب انہیں سنایا۔

جنت :- حوصلے سے کام لے لڑکی! کوئی بات نہیں۔ دل کو صدمہ
پہنچا ہے۔ میں حکیم کو لاتی ہوں۔ ابھی لاتی ہوں۔

(چلی جاتی ہے)

آخری سین

(اکرم خاں اپنی حویلی کے سامنے — ہتھکڑی لگی ہے۔
پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی اسے لے کر آئے ہیں)

اکرم خاں :- سنئے!

انسپکٹر :- کہئے!

اکرم خاں :- میرا یہ زخم جو دل کے قریب ہے بڑا سخت ہے۔ بس نہ جانے
کس طرح یہاں تک آیا ہوں۔ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔
مجھے آگے مت لے جائیے!

انسپکٹر :- دیکھئے! آپ کے زخم کو ڈاکٹر نے دیکھا تھا پہلے یہ واقعی
بڑا سخت تھا لیکن مرہم پٹی سے قریب قریب اچھا ہو چکا ہے۔
ڈاکٹر کے مشورے پر ہم آپ کو لائے ہیں اور آپ جانتے ہیں
کہ آپ پیدل تو نہیں آئے۔

اکرم خاں :- آپ نہیں مانتے۔ ڈاکٹر کی بات کو چھوڑئیے! میری حالت
بہت خراب ہو رہی ہے۔

انسپکٹر :- راستے میں خراب نہ ہوئی، خراب ہوئی تو مکان کے پاس آ کر۔

اکرم خاں :- جی ہاں۔ میرے پاؤں سن ہو گئے ہیں! ایک قدم بھی نہیں
چل سکتا۔ اور پھر سیڑھیاں چڑھنے کا تو سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔

انسپکٹر :- اس کا بندوبست ہو سکتا ہے ہم اسٹریچر منگوا لیں گے۔
اس پر بٹھا کر آپ کو لے جائیں گے۔

اکرم خاں :- میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ مجھے مکان کے اندر لے جائیں۔

انسپکٹر :- مجھے مکان کی تلاشی لینی ہے، آپ کی موجودگی میں۔

اکرم خاں :- مکان میں کچھ نہیں، بخدا کچھ نہیں۔

انسپکٹر :- نہ سہی۔ ذرا چل کر اتنا تو دیکھ لو کہ جہاں سے یہ روشنی
آ رہی ہے وہاں کہیں آپ کے جرم کی سیاہی تو نہیں چھپی بیٹھی۔
کسی گوشے میں، الماری کے کسی خانے میں، کسی تجوری میں
کہیں نہ کہیں آپ کے جرم کا سراغ ضرور ملے گا۔

اکرم خاں :- اللہ، مجھ پر رحم کھائیے! میں اس روشنی میں نہیں جا سکتا۔ روشنی
مجھے راس نہیں۔ میں کسی کو اپنا منہ نہیں دکھا سکتا۔

انسپکٹر :- ہم آپ کو دکھائیں گے کہ یہ عالیشان عمارت، یہ روشنیوں، اُف
محل آپ کے گناہوں کی کہانی ہے۔ آپ کو اس پر ناز ہے۔
ہم آپ کو ہی نہیں، تمام دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ محل آپ نے
کس طرح تعمیر کیا۔ یہ محل جرموں اور گناہوں کی بنیادوں پر
کھڑے ہیں۔ یہ بے نظیر محل آپ ایسے شرفا کا اشتہار ہے! ہم
اس کی تصویریں لیں گے۔ ہم آپ کی بھی تصویریں لیں گے اور دنیا کو
پیش کریں گے۔ شاید آپ کے بھائی بندوں کو عبرت حاصل
ہو۔ آج آپ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ دولت وہی
اچھی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کی جائے اور سکہ اسی
حالت میں نصیب ہوتا ہے جبکہ نیکی کی راہ اختیار کی جائے۔
ہم آپ کو سبق دیں گے۔ چلئے اپنے عالیشان محل کا دروازہ
کھٹکھٹائیں تاکہ گھر والے آپ کے استقبال کے لئے آئیں۔

اکرم خاں :- یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ میرے قدم اس گھر میں نہ جائیں گے۔
یہاں میری بیوی رہتی ہے۔ میری بیٹی رہتی ہے۔ میں اس
حالت میں کبھی بھی ان کے سامنے نہیں جا سکتا۔ وہ مجھے دیکھ کر
پاگل ہو جائیں گے۔ ان کی نبضیں بند ہو جائیں گی۔ وہ کبھی
تصور ہی نہیں کر سکتیں کہ مجھے ہتھکڑی لگ سکتی ہے۔

انسپکٹر :- تو کیا ایک ستمگر، ایک مجرم کے گلے میں پھولوں کے
ہار ڈالے جائیں۔ اسے وطن کا خادم اور قوم کا رہنما
خیال کیا جائے۔ اس کی پوجا کی جائے۔ ایک ستمگر کو

(باقی صفحہ پر)

قول و قرار

سائیں فضل
مترجمہ پرویز پروازی

تری الفت میں تو مر کے بھی جی لوں گا میں
درد سہہ لوں گا سبھی، ہونٹ بھی سی لوں گا میں
الفتِ یار میں جو زہر ہے پی لوں گا میں
میرے محبوب تجھے چھوڑ نہیں سکتا میں
جلوۂ حسن سے منہ موڑ نہیں سکتا میں

میرے اشعار کو خوں رنگ بنایا تو نے
غم و ادبار میں وعدوں کو نبھایا تو نے
مجھے ہر حال میں جینا بھی سکھایا تو نے
میں تجھے چھوڑ کے اے جان کہاں جاؤں گا
یہ تجلائے جہاں تاب کہاں پاؤں گا

میرے محبوب مجھے جان سے پیارا تو ہے
دکھ بھرے دہر میں جیون کا سہارا تو ہے
شبِ تاریک میں امید کا تارا تو ہے
میں تجھے چھوڑ نہیں سکتا، نہیں چھوڑوں گا
تا دمِ زیست کبھی تجھ سے نہ منہ موڑوں گا

([illegible])

"راوی"

محمد عظیم بھٹی

گیت کے مختلف بندوں میں خیالات کے تسلسل کے اعتبار سے کوئی ربط نہیں، البتہ ہر بند کے آغاز میں ایک ہی مصرع دوہرانے سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے
(ہمارے خیال میں ان بندوں کو ٹپوں کا اردو روپ سمجھنا چاہیئے۔ مدیر)

راوی کے نیلے پانی میں
پھولوں کے پودے بہتے ہیں
دنیا کے ستم خاموشی سے
ہم تیری خاطر سہتے ہیں

راوی کے نیلے پانی میں
وہ بگلا تیر رہا ہے کیا؟
پردیس میں جا کر ساجن رے
تو ہم کو بھول گیا ہے کیا؟

راوی کے نیلے پانی میں
یہ کیسا سیلاب آیا ہے؟
ہم بے گھر ہو کے پھرتے ہیں
کس پاپ کا بدلہ پایا ہے؟

راوی کے نیلے پانی میں
ہاتھوں سے گھڑا اک چھوٹ گیا
جب ساجن تیری یاد آئی
پلکوں سے آنسو ٹوٹ گیا

اندھیرا

عاصم حسین

اندھیرے کو چوما
بہت پیار سے روشنی نے
کہا مجھ کو دنیا کی نظروں میں
بنا دیتی ہیں آپ روشن
وہ میری تجلی میں اپنی ضیا دیکھتی ہیں
وگرنہ نگاہوں میں میری فسوں کیا ؟
نگاہیں۔ شعاعیں لرزتی لرزتی !
پیا اُن سے پروانوں کی انجمن میں
یہ پروانے۔ جانیں ہمکتی ہمکتی
یہ ہنگامہ ہائے جنوں کیا ؟
مگر تجھ میں اپنا ہی جوبن ہے۔ اپنی پھبن ہے
سیاہی میں پنہاں وہ لیلائیاں ہیں
کہ ہر آنکھ دل سے یہی چاہتی ہے
کہ وہ تجھ کو سرمہ بنا کر
بہ صد شوق تحلیل کر لے
نظر کی سلائی سے آنکھوں میں بھر لے
کہ جب زندگی بجھ بجھا کر
زمانے پہ چھاتی ہے بادل دھواں دھار بن کر
تو پھر تیرے دامن میں ہی چین پاتی ہے دنیا
تجھے اپنے دل سے لگاتی ہے دنیا !

پَو

عبدالعزیز فطرت

مجھ سے اُمڈی ہوئی مدہوش گھٹا کہتی ہے
ضبط عنوان ہے امید کے افسانوں کا
پھیلی پھیلی ہوئی راہوں سے بہار آئے گی
سرخوشی بن کے خیالوں کا نکھار آئے گی
گریہ بیکار ہے سہمے ہوئے انسانوں کا

چھپتی چھپتی ہوئی تاروں کی ضیا کہتی ہے
نظمِ ہستی میں محبت کی ادا ہے موجود
ظلمتیں اپنی خرابی سے ہیں خود ہی مایوس
کیا فضاؤں میں تغیّر نہیں ہوتا محسوس
ذرّوں میں صورتِ خورشید ضیا ہے موجود

نااُمیدی سے یہ کیوں پوچھیئے کیا کہتی ہے
ظلمتیں پردۂ اخفا میں چلی جائیں گی
سینۂ سنگ سے خود ہوں گے گلِ تر پیدا
موجِ خوابیدہ کے دامن سے سمندر پیدا
کرنیں پھر تازہ تب و تاب سے لہرائیں گی

* * *

ثقافت،

خطاطی

(۲)

سید یوسف بخاری

آشوری دور سے دورِ ساسانیاں تک ایران کا خط مسماری تھا، اس کے بعد پہلوی ہوا۔ محققین عرب کے بقول ایران میں قبل اسلام سات قلم (جدول ۱) جاری تھے اور ان خطوط کا ضمیمہ "زوارشن" تھا یعنی بوقت ضرورت ان خطوط میں مخصوص ہجوں سے کام لیا جاتا تھا۔ خراسان مامون الرشید کے زمانہ ہی میں علم و فن کا مرکز بن چکا تھا۔ مامون کی وفات کے بعد خاندان طاہریہ۔ دیالمہ۔ سلاجقہ۔ سامانیہ اور غزنویہ میں اور بھی قابل رشک ترقی ہوئی، یہاں تک ایرانیوں کو تصنیف و تالیف میں عربوں پر سبقت حاصل ہوگئی۔ علاوہ ازیں بغداد کے اصلاح یافتہ عربی خطوط (جدول ۲)، جن کو ابن بواب اور یاقوت مستعصمی نے مہذب اور مکلف کیا تھا، وہ سب کے سب ایران میں جاری ہوگئے۔ اس کے بعد حسن بن حسین بن علی فارسی نے ۳۰۰ھ (عہد شاہان دیالمہ) میں نسخ، رقاع، ثلث اور توقیع کے اختلاط سے ایک جدید ایرانی قلم "تعلیق" جاری کیا، نیز محقق سے ایک اور قلم نکلا جو "مطلق" کہلایا۔

دشتی۔ دیوانی۔ فارسی۔ ایران کے پہلو بہ پہلو دولتِ عثمانیہ (ترکی) نے بھی ان ایرانی قلموں کو خوش آمدید کہی۔ چنانچہ ان کے رواج پانے کے بعد اہل ترکی نے ان خطوط کی روشنی میں دشتی، دیوانی اور فارسی تین قلم ایجاد کئے، نیز ثلث اور رقاع کو بھی جاری رکھا۔

قلم تعلیق کے اساتذہ میں نجم الدین ابوبکر راوندی، خواجہ تاج سلیمانی اور میر عبدالحیٔ ہوئے۔ آخر الذکر ابوسعید مرزا گورگانی کے دفتر انشاء میں افسر تھے۔ اور متاخرین میں اشرف خاں خوش نویس دربارِ اکبری تھا۔

نستعلیق:۔ قدرت نے اہل عجم کی سرشت میں حسن و اجتہاد کا مادہ بڑی فیاضی کے ساتھ ودیعت کیا ہے چنانچہ ایرانی خطوط سے بھی اُن کی حسن پرستی اور جدت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ خطِ نسخ کے دائرے بالکل یکساں اور حروف ناہموار ہیں یعنی دائرے گول ہونے کے بجائے ان کا نچلا سرا کچھ اس طرح چپٹا ہو جاتا ہے کہ زاویے نمودار ہونے لگتے ہیں، لہٰذا انہوں نے نسخی حروف میں بھی اپنی فطری صلاحیت سے کام لیکر نقاشی اور مصوری کی شان پیدا کی یعنی دائرے گول بنائے، حروف کی نوکیں، گردنیں اور زیریں حصہ باریک کر دیا۔ اس کا نام انہوں نے "نستعلیق" رکھا۔ ذرا اس ندرتِ حسن و خیال کو بھی دیکھئے کہ قلم کی پرکاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے لفظی ترکیب میں بھی کس قدر نفاست سے کام لیا ہے کہ نسخ اور تعلیق کے درمیان جو (خ) کی خلیج حائل تھی اسے دور کر کے باقیات میں ایک جامع اور دلربا نستعلیق باقی رکھا جس میں بلاشبہ تمام قلموں کی شان اور باریکیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

شکستہ:۔ نستعلیق اگرچہ سب سے حسین اور جامع خط تھا لیکن اس کی کتابت دیطلب اور صبر آزما تھی، اس لئے تقریباً ۱۰۰۰ھ میں مرتضیٰ قلی شاملو حاکم ہرات نے عام دفتری مراسلت کے لئے خطِ شکستہ جاری کیا۔

شفیعہ:۔ آقا کی تقلید اور پیروی میں مرتضیٰ قلی کے میر منشی "شفیعا" نے اپنے آقا کے خطِ شکستہ میں ایک حسنِ خاص پیدا کر کے اس کا نام شفیعہ رکھا جو اب تک حسب سابق مشہور ہے۔

در اصل نستعلیق کتابی خط ہے جو ایران اور ہند و پاکستان وغیرہ میں جاری ہے اور مراسلت کا قلم شفیعہ ہے۔ نستعلیق کے حسنِ قبول اور ٹکسالی خط ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ لفظ نستعلیق سے کئی محاورات ایجاد ہوئے جو ہمارے ادب میں رائج اور زبان زدِ عوام ہیں مثلاً فلاں شخص بڑا ہی نستعلیق ہے یعنی باعتبار اخلاق و عادات نہایت مہذب انسان ہے۔ الغرض دنیائے اسلام کا مشترکہ مقدس خط عربی نسخ ہے۔ اس کے بعد نستعلیق کا درجہ ہے۔ ممالکِ اسلامیہ کے علاوہ دولتِ عثمانیہ (ترکی) مملکتِ مصر، عراق، حجاز، نجد، یمن، شام، الجزائر، مراکش،

قیروان، تونس، طرابلس، سوڈان، زنجبار، حبش، حوسیہ، مڈغاسکر، ملایشیہ، اندلس (مرحوم)، روس، فرانس، لندن، جرمنی، ہالینڈ، امریکہ، جزیرہ جاوا، ملایا، کردستان اور افغانستان، وغیرہ میں بھی نسخ اور نستعلیق دونوں کا رواج ہے۔ سیاسی و تجارتی مصلحتوں اور ضرورتوں کے پیش نظر مذکورہ ممالک میں نہ صرف عربی زبان میں گفتگو کرنے والے موجود ہیں بلکہ ان خطوط میں تعلیم اور نادر و نایاب عربی، فارسی، اردو کی کتابت اور طباعت بھی جاری ہے۔

کتابت کی تاریخ بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ اوّل نستعلیق کے مشہور اساتذۂ ایران کا تذکرہ کیا جائے، بعد ازاں عہدِ دولتِ مغلیہ پر ایک نظر ڈالی جائے جہاں یہ خط آخری بار پروان چڑھا اور اپنی پوری عمر کو پہونچا یعنی لاہور، اکبرآباد (آگرہ) دہلی اور لکھنؤ میں فنِ خطاطی کے چار مدرسے قائم ہوئے جہاں سے متعدد ماہرینِ فنِ خطاطی اور نامور شیریں قلم اور جواہر رقم پیدا ہوئے۔ انہی کی بدولت یہ فنِ لطیف آج تک زندہ اور تابندہ ہے۔

ایران میں نستعلیق کے حسب ذیل پانچ امام ہوئے :۔

خواجہ میر علی علوی تبریزی : ان کو خطِ نستعلیق کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہ عہدِ تیموریہ یعنی (۷۷۱ھ/۸۰۱ھ) کے نامور خطاط اور خوش فکر و خوش گو شاعر تھے۔ ابوالفضل اپنے دیباچہ "مرقع بادشاہی" (البم قطعات خوش نویسان ہند و ایران مرتبہ بادشاہ جہانگیر) میں لکھتا ہے کہ اس نے امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیق وصلیاں دیکھی تھیں۔ یہ شہادت یقیناً معتبر ہے اس لحاظ سے نستعلیق کا موجد کوئی اور تھا۔ وہ کون تھا؟ یہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ تاہم میر علی نستعلیق کے معلمِ اوّل ضرور تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں مولینا غلام محمد دہلوی کے "تذکرۂ خوش نویسان" سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے کہ گو میر علی نستعلیق کے موجد نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس قلم کے قواعد مقرر کئے اور اس کے مطابق نستعلیق کی نوک پلک میں حسن اور نزاکت پیدا کی۔ میر علی کے مقلدین میں ایرانی، ہندی اور ترکی تینوں شامل ہیں۔ ان کی وصلیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ایران اور انڈیا آفس لندن کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ میر علی ہروی، ملّا علی شیرازی اور میر علی خراسانی ان کے ہم نام و ہم عصر خطاطوں کے علاوہ سلطان علی مشہدی ان کے نامور شاگرد تھے۔

سلطان علی مشہدی :۔ یہ نستعلیق کے امام دوم تھے۔ سلطان حسین تیموری کے عہد میں ہوئے۔ سلطان نے ان کو "قبلۃ الکتاب" کا خطاب دیا تھا۔ متعدد کتابیں، وصلیاں اور فنِ خطاطی پر ایک جامع رسالہ یادگار چھوڑا۔ "تاریخِ تیموری" انہی کی تحریر کردہ ہے جس کی تصاویر مشہور مصور بہزاد نے تخلیق کی تھیں۔ بابر نے بھی اپنی تزک میں ان کے کمالات بیان کئے ہیں۔

سلطان علی کے شاگرد یہ ہیں :۔ سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور، علاء الدین محمد ہروی، مولینا عبداللہ ہروی، زین الدین محمود، عبدی نیشاپوری، محمد قاسم شادی شاہ، اور میر علی الکاتب ہروی، ان میں آخری زیادہ ممتاز ہیں +

میر علی الکاتب ہروی : یہ نستعلیق کے امام سوم کہلاتے ہیں۔ خطاطی کے ساتھ شاعری میں بھی کمال حاصل تھا۔ مجنوں تخلص تھا۔ فنِ خطاطی پر دو رسالے نظم کئے جو بہت مشہور ہیں۔ ۹۰۹ھ میں ایک اور رسالہ رسم الخط پر لکھ کر سلطان مظفر کے نام معنون کیا۔ یہ رسالہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ جب سلطان عبدالعزیز بخارا کے درباری ہوئے تو سلطان کی فرمائش پر دو کتابیں "گلستانِ سعدی" اور "مطلع الانوار" امیر خسرو رقم کیں۔ "گلستان" پیرس کی لائبریری اور "مطلع الانوار" خدابخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ابوالفضل نے بھی ان کو نستعلیق کا استاد تسلیم کیا ہے۔ "مرقع بادشاہی" (جہانگیر) میں بھی ان کی چند وصلیاں شامل ہیں۔ زیادہ معتبر روایت کے بموجب ۹۵۱ھ میں وفات پائی +

میر علی کے بعد نستعلیق کے مشہور خطاطوں میں ملّا محمد حسین تبریزی، میر سید احمد مشہدی، ملّا حسن علی مشہدی، ملّا شاہ محمد نیشاپوری اور مرزا ابراہیم اصفہانی ہوئے جن کا مرتبہ جدا جدا ہے +

میر عماد الحسینی قزوینی :۔ یہ نستعلیق کے امام چہارم ہیں۔ ان کو باباشاہ اصفہانی سے تلمذ حاصل تھا اور ملّا محمد حسین تبریزی اور سلطان علی مشہدی کے مقلد تھے۔ شاہ عباس صفوی کے دربار سے متعلق تھے۔ ان کے متعلق ایک روایت اس طرح مشہور ہے کہ جب ان کو شاہ عباس نے "شاہ نامہ فردوسی" نقل کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے اپنے لئے ایک آراستہ باغ مخصوص کرایا جس کے حوض میں شاہی خرچ سے عرقِ گلاب اور کیوڑہ بھرا گیا۔ یہ وقتاً فوقتاً تبدیل بھی ہوتا تھا، اس اہتمام اور تکلف کے ساتھ میر عماد نے تین سال کی مدت میں صرف چند جزو مکمل کئے۔ حاسد و نادار و اُمراء حماد کی تاک میں تھے، انہوں نے موقع پاکر شاہ کو بھڑکایا اور کہا کہ تین سال میں چھ لاکھ روپے کی رقم خطیر خرچ ہو چکی ہے اور ابھی صرف چند جزو

لکھے گئے ہیں۔ حواشی پر ابھی طلائی کام بھی نامکمل ہے۔ بادشاہ ان خوشامدیوں کی باتوں میں آکر غضب ناک ہوا اور میر عماد کو حکم دیا کہ نصف یوم میں چھ لاکھ روپیہ واپس خزانۂ شاہی میں داخل کیا جائے۔ میر عماد اس اچانک عتابِ شاہی سے متاسف تو ضرور ہوئے لیکن اسی وقت چند نقیبوں کے ہمراہ ایک سواری میں بیٹھ کر شہر گئے۔ نقیبوں نے صدا بلند کی "امروز تحریرِ عماد ارزاں است" چند ہی گھنٹوں میں وہ چھ جز و مقراض زدہ ہو کر ایک ایک دو دو سطروں کی شکل میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ مقررہ وقت سے قبل چھ لاکھ روپیہ خزانۂ شاہی میں جمع ہو گیا۔ بادشاہ یہ اطلاع پا کر اور بھی برافروختہ ہوا۔ بعد میں اپنی رسوائی اور بدنامی کے خوف سے اس نے میر عماد کو ایک حمام میں قتل کرا دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ سال وفات $\frac{\text{۱۰۲۴ھ}}{\text{۱۶۱۵ء}}$ ہے جو عہدِ جہانگیر تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے جب یہ دردناک واقعہ سنا تو رو پڑا اور کہا کہ اگر شاہ عباس اس کو قتل کرنے کی بجائے میرے پاس بھیج دیتا تو میں شاہ کو عماد کے ہم وزن موتی بھیج دیتا۔

آقا عبدالرشید دیلمی، میر عماد کے حقیقی بھانجے، داماد اور شاگرد تھے۔ آقا رشید کے نام سے مشہور ہوئے، اپنے فن میں اتنے کامل تھے کہ استاد و شاگرد کی وصلیوں میں امتیاز دشوار تھا۔ میر عماد کے واقعۂ شہادت اور اپنے قتل کے اندیشہ سے ایران سے راہ فرار اختیار کی، ہندوستان تک پورا سفر گھوڑے پر کیا، بحالتِ تباہ شاہجہاں کے حضور میں اکبر آباد آئے۔ بعض مورخوں کا قول ہے کہ اول لاہور پہونچے اور کچھ مدت وہیں قیام کیا۔ اس اثنا میں وہاں اُن کے متعدد شاگرد ہوئے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو نستعلیق کا پہلا مرکز لاہور کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آگرہ پہونچتے پہونچتے لباس و جامہ زبوں اور تار تار ہو چکا تھا اور یہ زبوں حالی باریابی میں مانع ہو رہی تھی۔ نذرِ شاہی کے لئے بھی کچھ درکار تھا۔ آقا رشید نے قدرے غور و تامل کے بعد قلم دوات طلب کی اور ایک قطعۂ کاغذ پر یہ اشعار لکھے ؎

ایا خجستہ خصالے کہ ساکنانِ فلک	بر آستانِ تو دارند میلِ دربانی
چہ حاجت است کہ گویم حالِ خستۂ خود	کہ حالِ خستہ دلاں را تو خوب میدانی

یہ پرزۂ کاغذ آقا رشید کے حق میں سچ مچ کاغذی پیرہن ثابت ہوا، جب یہ پیکرِ تصویرِ غم بادشاہ کے روبرو حاضر ہوا تو شوخیٔ تحریر خود منہ سے بول اٹھی، نقش خود فریادی بن گیا۔ شاہ جہاں نے آقا رشید کو دربار میں داخل کیا، دارا شکوہ کی اتالیقی بخشی اور پندرہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر کیا۔ بعد میں خدمتِ بیوتات سپرد ہوئی۔ گردش دور ہوئی، امیرانہ شان و شوکت کے ساتھ رہنے لگے۔ آگرہ میں کئی شاندار عمارتیں اور مسافر خانے تعمیر کرائے، آخر دم تک شغلِ کتابت جاری رہا، شاگردوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ہند و پاکستان کے چاروں دارالسلطنتوں، لاہور، آگرہ، دہلی، اور لکھنؤ میں اس فنِ لطیف کے چار مدرسے قائم ہوئے۔ اُن کی وصلیاں جواہر کے مول فروخت ہوتی تھیں۔ سنہ ۱۰۸۱ھ میں بمقام آگرہ بعہدِ اورنگ زیب وفات پائی۔

یہ تھی ایران میں خطاطی کی نشو و نما کی مختصر روداد۔ اس کے بعد امیر تیمور کا ستارہ چمکا اور نہ صرف ایران بلکہ برصغیر پاک و ہند کی قسمت بھی اسی خاندان کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ یہ خاندان خود ہی صاحبِ ذوق نہیں بلکہ اہلِ کمال کا بھی بے حد قدرداں تھا۔ اس لئے اس کے زیرِ سایہ علوم و فنون کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں خاندانِ مغلیہ نے ہنر پروری اور مردم نوازی کی ایسی روایات قائم کیں جن کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دربارِ مغلیہ ہر قسم کے اہلِ کمال کا مرجع و مآب بن گیا جن میں خطاطی کے ماہرین بھی شامل تھے۔ ان ماہرینِ خطاطی کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کا آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر خود اس فن میں طاق تھا۔ ان ماہرینِ فن کے کمالات کی داستان خاصی طویل ہے۔ اس لئے ہم اس کو کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں۔ شجرۂ خطوط اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ماہر القادری

میں کیا کروں مرے دل کی عجیب حالت ہے
تری نوازشِ پیہم سے بھی شکایت ہے

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو ترے آستاں سے نسبت ہے

کبھی گلہ تری بیگانگی سے تھا مجھ کو
جو اب ہوئی ہے توجہ تو اک قیامت ہے

غروبِ شام کے منظر کو دیکھنے والو!
اسی طرح سے مسافر کی شامِ غربت ہے

ترے جمال کی آئینہ داد کیا دے گا
کہ آئینہ کو تو خود اعترافِ حیرت ہے

یہ خواب ہے وہ تماشا یہ وہم ہے وہ طلسم
مجاز اپنی جگہ پھر بھی اک حقیقت ہے

میں اس کے ناز اٹھاؤں کہ دوں صلائے نیاز
وہ حسن جو مری تقدیر سے محبت ہے

نگاہِ ناز! ترے حسنِ التفات کے بعد
مری طرف سے تغافل کی بھی اجازت ہے

رہِ طلب میں قدم رکھ دیا تو ہے ماہر
اب اس کے بعد مری کوششوں کی قسمت ہے

شاد عارفی

تجربے جن کو جنوں کے نہ گریبانوں کے
طنز کرتے ہیں وہ حالات پہ دیوانوں کے

کہہ رہے ہیں کہ پڑو پاؤں نگہبانوں کے
آپ ہمدرد ہیں!!! ہم سوختہ سامانوں کے

کھل گئے بھید جو رندوں پہ جہاں بانوں کے
ڈھیر لگ جائیں گے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جگھٹے بیچ کے گذرتے ہوئے انسانوں کے
قہقہے اور بڑھا دیتے ہیں دیوانوں کے

موسمِ گل سے خزاں نے وہ سیاست کھیلی
گلستانوں کے ہوئے ہم نہ بیابانوں کے

میں نے سمجھا تھا شگوفوں کو دلِ صد پارہ
جب کیا غور تو ٹکڑے تھے گریبانوں کے

وہی اخلاق کو ایماں کو بناتے ہیں سپر
وہ جو اخلاق کے قائل ہیں نہ ایمانوں کے

شرطِ اول ہے مسلمان کا انساں ہونا
وہ مسلمان کے دشمن ہیں کہ انسانوں کے

جن کو آہوں کی طرح ضبط کیا جاتا ہے
ترجماں اشک ہی بنتے ہیں اُن ارمانوں کے

جس توقع پہ خوشامد میں لگے رہتے ہو
اختیارات سے باہر ہے نگہبانوں کے

کہہ رہے ہو جسے تم ابرِ بہاری اے شاد
میں سمجھتا ہوں کہ آثار ہیں طوفانوں کے

قمر جمیل

زنجیر بپا حباب جیسے
ہم پھر بھی ہیں آفتاب جیسے

اے دامنِ گل گواہ رہنا
کچھ داغ بھی ہیں گلاب جیسے

یہ دشت میں گھومتا بگولہ
مجھ آبلہ پا کا خواب جیسے

یوں دل میں ترا خیال آیا
صحرا میں کھلے گلاب جیسے

ہر رات کسی کی یاد آئی
وہ یاد بھی کیسی خواب جیسے

ہر موجِ سکوں کو ایسے دیکھا
سمجھا ہی نہیں سراب جیسے

ہر قطرۂ خوں میں جل رہی ہے
اک کیفیتِ شباب جیسے

کانٹوں سے جمیلؔ ہم بھی نکلے
پر اتنے جدا، گلاب جیسے

●

عبداللہ خاور

ملکوں ملکوں خوار و زبوں ہیں عشق کے راج دلارے
کس منزل پر حُسنِ گریزاں کوئی تجھ کو پکارے ؟

شمعِ جنوں اب کر لوں فروزاں، رات اندھیری آئی
بجھ بجھ جاتے ہیں رستے میں، ہوش کے جھوٹے تارے

اجنبی بن کر اب جو گذرا، میرے قدم تھرّائے
روح کبھی مانوس تھی جن سے آہ وہی گلیارے

جوشِ بہاراں تیری پھبن ہے، یا ہے قہر نمو کا
چشم نظارہ جل اُٹھی ہے، پھول ہیں یا انگارے

پیدا کوئی بھی آہٹ ہو، قلب دھڑک اُٹھتا ہے
ڈوبتی جاتی ہے وہ صدا پھر، لے کر ارماں سارے

میں یہ سمجھتا تھا، ہیں یہ شعلے میرے ہی دل میں پنہاں
چاند کی نگری بھی ہے فروزاں پا کر تیرے اشارے

قوسِ قزح کے رنگ کی صورت کیوں ہے مجھ سے گریزاں
فکر کا صورت گر نہ بنا لے تجھ سے سوا نظارے

تیرا تغافل دائم تو مت چھیڑ وفا کے نغمے
جیتے ہیں اور جیتے رہیں گے یونہی ترے دکھیارے

ڈوب گیا ہوں اُن آنکھوں میں حیرت کیا ہے خاورؔ
اُڑتے پنچھی رُک جاتے ہیں، اکثر جھیل کنارے

آرٹ کونسل پاکستان کے زیر اہتمام کراچی میں پاکستانی مصوّر
"شاکر علی" کی تصاویر کی نمائش

"مشرقی پاکستان ایسوسی ایشن" نے کراچی میں
ایک رنگارنگ تفریحی پروگرام پیش کیا۔
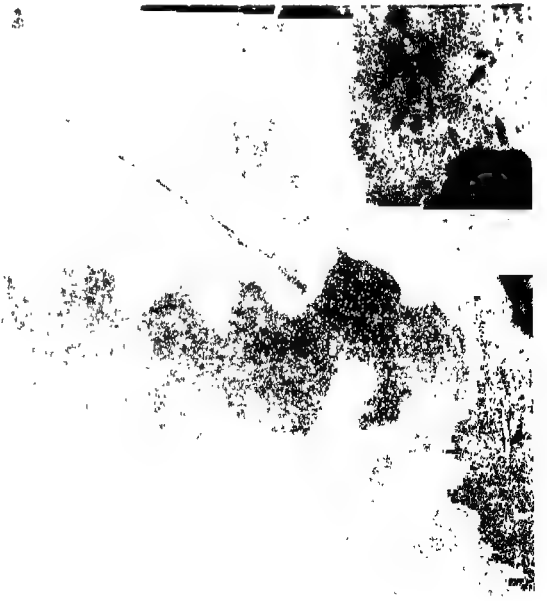
معاہدۂ بغداد کے ممالک کی اقتصادی
کمیٹی کا اجلاس کراچی میں۔

وزیراعظم پاکستان کا
کمیٹی سے افتتاحی خطاب

معاہدۂ بغداد کی اقتصادی کمی
میں معاہدات پر دستخ

اُردو مرکز
جامعۂ ملیہ، نئی دہلی
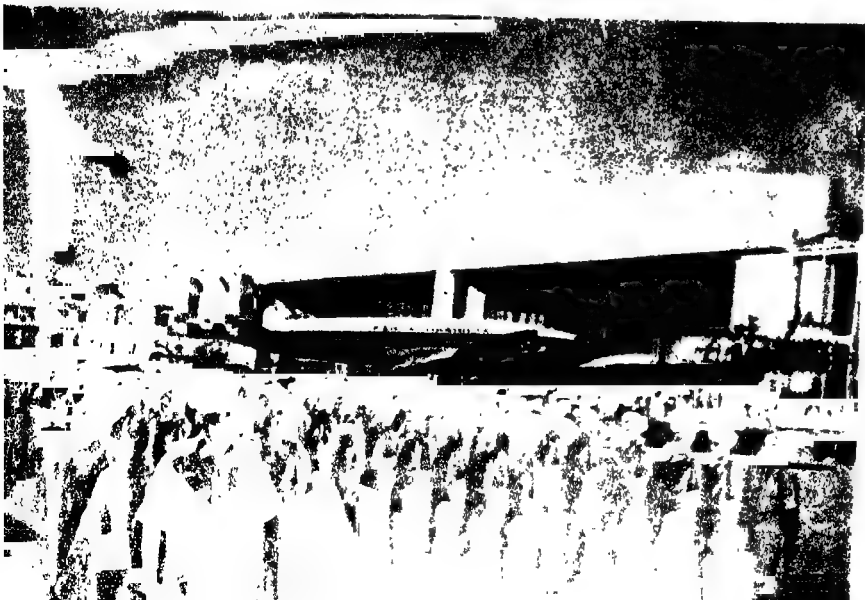
وزیراعظم جاپان کا
حالیہ دورۂ پاکستان

زخمِ دل ـــــ بقیہ صفحہ ۳

اور ایک مجرم سے اس کے سوا اور کیا سلوک کیا جائے۔
دوست گھبرایئے نہیں! یہ ہتھکڑی نہیں آپ کا زیور ہے۔
دروازہ کھٹکھٹایئے!

اکرم خاں :۔ آپ مجھے اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتے!

انسپکٹر :۔ اگر میری شرافت اور نرمی کا اثر قبول نہیں کرنا چاہتے تو میں سختی بھی کر سکتا ہوں۔ آخر آپ ایک سمگلر ہی تو ہیں۔ میں آپ کو جبراً اندر لے جاؤں گا۔ کانسٹبل! انہیں اندر لے چلو!

اکرم خاں :۔ (چلا کر) مجھ میں تاب نہیں کہ میں اپنی بیوی اور بچی کے سامنے ہوں جاؤں۔ (گھبرا کر، ہانپ کر) میں نہ جاؤں گا۔ میں اتنی بڑی ذلت گوارا نہیں کر سکتا۔ ہائے میرا دل، میرا یہ زخم! میں اپنے قابو میں نہیں۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ یہ محل یہ میرا نہیں۔ اسے ڈھا دو، گرا دو! یہ ریت کا تودہ ہے۔ مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں۔

انسپکٹر :۔ کیا ہوا ہے تمہارے دل کو؟ بہانے بناتے ہو! سمجھتے ہو کہ میں تمہاری چال میں آ جاؤں گا۔

اکرم خاں :۔ (دل پکڑ کر) دل بیٹھا جا رہا ہے۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا (بیٹھ جاتا ہے) میرے زخم سے خون رسنے لگا میرے دل کو کیا ہوا! یہ روشنی کیوں بجھ گئی؟ یہ کون چیخا؟ یہ کس کی چیخ ہے؟ یہ لوگ کیوں رونے لگے؟

انسپکٹر :۔ کانسٹیبل! انہیں اٹھا کر اندر لے چلو!

اکرم خاں :۔ بڑے شوق سے۔ زندہ نہ سہی مردہ ہی سہی۔ اس لاش کو جہاں چاہو لے جاؤ!

(گر پڑتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے)

انسپکٹر :۔ ہیں، اسے کیا ہوا؟ غش کھا گیا ہے!

سپاہی :۔ (نبض پکڑ کر) یہ تو ختم ہے۔

انسپکٹر :۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(ڈراپ سین)

سیدھی
پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچے کو یہ
خالص دودھ
دیجئے
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

ماہ نو کراچی۔ جولائی ۱۹۵۷ء

مولانا غلام رسول مہر کے افادہ بخش قلم سے

سرزمینِ پاک وہند میں تحریکِ آزادی اور احیائے دین کی

مکمل سرگزشت

سنہ ۱۸۵۷ء
پاک وہند کی پہلی جنگِ آزادی

ملک پر تسلط کے لئے انگریزوں کی فریب کاریاں، جنگِ آزادی کے اسباب، جہاد کی پہلی چنگاری، دہلی، لکھنؤ، کان پور اور بیسیوں دوسرے مقامات میں جنگ کے مفصل حالات، مجاہدین کی بے مثال استقامت، انگریزوں کے ظلم وجور کی دل ہلا دینے والی داستانیں، شہزادوں کا خونِ ناحق، بہادر شاہ کی اسیری، رنگون کی غربت، پھانسیاں، کالے پانی۔ اردو زبان میں ۱۸۵۷ء کے حالات پہلی مرتبہ صحیح اصول پر مرتب کئے گئے ہیں۔ نادر تصویریں اور نادر نقشے۔ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ صفحات ۳۶۴۔ عمدہ طباعت۔ قیمت ۷ روپے ۸ آنے

۱۸۵۷ء کے مجاہد
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں

جن بہادر اور اولوالعزم مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور وطن کو آزاد کرانے میں جان کی بازی لگائی اُن کے مستند اور مفصل سوانح حیات ہیں۔ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی اور یگانہ کتاب۔

اس میں حضرت محل ● رانی جھانسی ● شہزادہ فیروز شاہ ● مولانا احمد اللہ شاہ ● نانا صاحب ● تانتیا ٹوپے ● مولانا رحمت اللہ کیرانوی ● عظیم اللہ خاں ● راجا کنور سنگھ ● بزرگان دیوبند ● جنرل بخت خاں ● ڈاکٹر وزیر خاں ● مولانا لیاقت علی اور بیسیوں دوسرے مجاہدین کے ولولہ خیز حالات درج ہیں۔ ایسی کتاب آج تک کسی بھی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ صفحات ۲۱۲۔ عمدہ طباعت۔ قیمت ۴ روپے ۸ آنے

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ

فاضل مصنف کی بیس سالہ تحقیق وجستجو اور محنتِ شاقہ کا شاہکار۔ مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد شہید بریلوی کے سوانح حیات جن کا مطالعہ ہمارے لئے نہ صرف غور وفکر کی راہیں کھولتا ہے، بلکہ اس میں مسلمانوں کی اس جد وجہد کے خطوط بھی ملتے ہیں جن کی صداقت کے چہرے پر "غلط فہمیوں" کا غبار ہے۔ دین وسیاست کے معرکہ کی یادگار۔ اس برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے کے لئے اہم دستاویز۔ اُردو میں آج تک ایسی اہم تاریخی کتاب غالباً کوئی نہیں۔ نقشوں سے مزین۔ مجلد۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$۔ ضخامت ۵۰۰ صفحے۔ قیمت بارہ روپے۔

جماعتِ مجاہدین

سید احمد شہید اور اُن کے رفقاء ہماری تاریخ کے وہ نادر الوجود مشاہیر ہیں جن کے حالات وسوانح پر صد سالہ فراموش کاریاں کی گرد جمی ہوئی پڑی تھی۔ یہ وہ بزرگ تھے جنھوں نے شدید مخالف ہواؤں میں احیائے دین اور آزادیٔ وطن کے چراغ جلائے۔ ہم قوموں اور ہم وطنوں کے لئے عزت مندانہ قومی زندگی کے کبھی نہ مٹنے والے نشان قائم کئے۔ "جماعتِ مجاہدین" میں پہلی مرتبہ ہماری قومی تاریخ کے یہ شاندار ابواب پیش کئے جارہے ہیں۔ ان اوراق کا مطالعہ ہمیشہ دلوں کو ایمان کی حرارت سے لبریز رکھے گا اور اسلامیت وآزادی کے لئے ایثار وقربانی کے جذبات میں کبھی افسردگی نہ آنے دیگا۔ "جماعتِ مجاہدین" میں سید احمد شہید کی جماعت کے اصولِ تنظیم پر ترتیب کے ساتھ تفصیلاً بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان مجاہدین کے سبق آموز سوانح درج ہیں جو سید احمد شہید کی اسلامی تربیت کے بہترین نمونے تھے۔ جن حضرات نے "سید احمد شہید" کا مطالعہ فرمایا ہے ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ ضخامت ۴۲۵ صفحات۔ قیمت سات روپے

سرگزشتِ مجاہدین

اس میں اُن صد سالہ بکھرے ہوئے حالات کو ترتیب دیا گیا ہے جو مجموعی حیثیت سے ہمارے قومی مجاہدین کی مکمل تاریخ کا شاندار باب ہیں اور جن کے مطالعہ سے نہ صرف ہمارے دورِ زوال کا پس منظر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے بلکہ مستقبل کی عظیم عمارتِ آزادی کی بنیادوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ سرفروشانِ اسلام کے ولولہ خیز حالات، اسلام اور آزادی کے لئے بے دریغ قربانیاں، میدان جنگ میں عزم واستقلال کی ... ایسے مقدموں کی تفصیل، قیدیوں پر خوفناک سختیاں، محبانِ وطن کی بے وطنی، مال واملاک کی ضبطی، غرض سب کچھ مستند اور تاریخی نقطۂ نظر کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ یہ داستان آج تک کسی بھی زبان میں مرتب نہیں ہوئی اور پہلی مرتبہ پیش ہو رہی ہے۔ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ صفحات ۵۰۰۔ قیمت بارہ روپے

ملنے کا پتہ:- شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز وپبلشرز کتاب منزل کشمیری بازار لاہور بندر روڈ کراچی

MEDIUM
W.D.&H.O. WILLS
BRISTOL & LONDON
کیپسٹن خریدیئے
ان کا تمباکو بہتر ہوتا ہے
۱۰ میں ۰/۸/-
جہاں کہیں مقامی ٹیکس عائد ہو وہاں
اس قیمت میں کچھ فرق ہو سکتا ہے
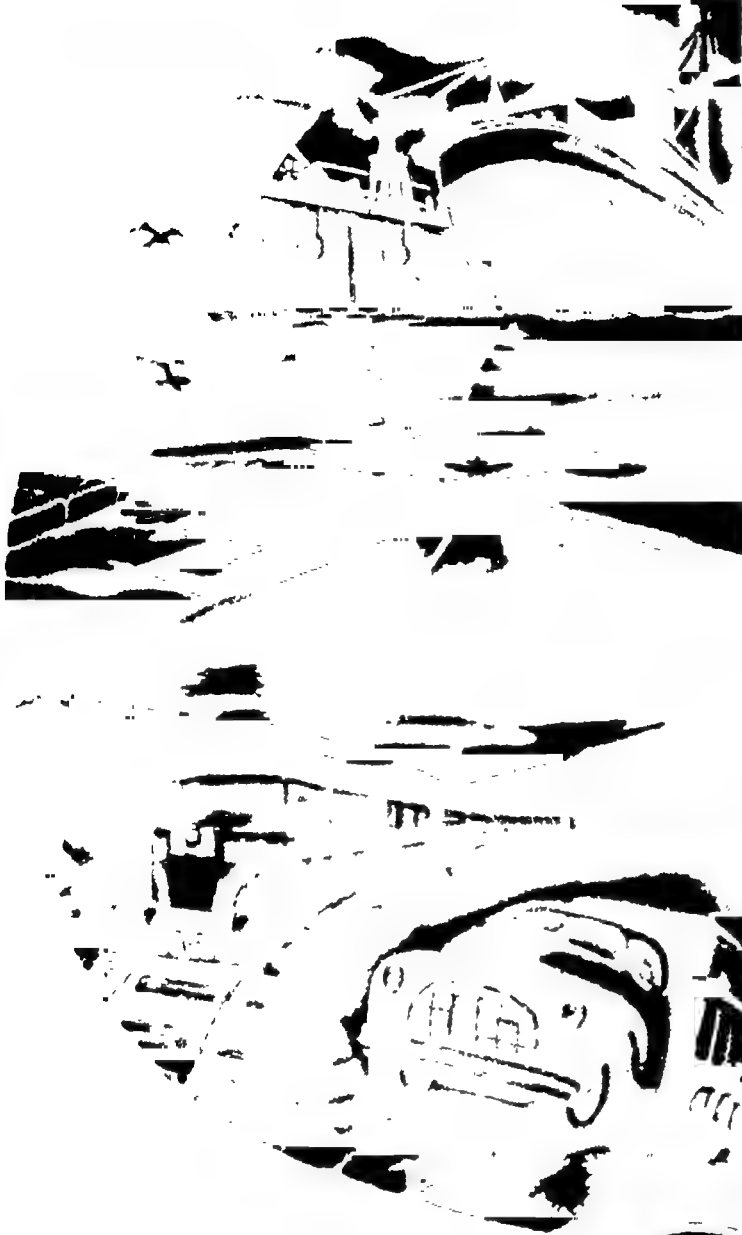
بھگت کبیر

سوامی کلجگانند

برگزیدہ اور بلند پایہ ہستیاں دنیا میں ہر وقت پیدا ہوتی رہی ہیں۔ بھگت کبیر داس جو آدی باسیوں یعنی اس سرزمین کے اصلی باشندوں میں سے تھے ایسی ہی ایک برگزیدہ ہستی تھے۔ چنانچہ اس دیس کے تمام لوگ مسلمان، ہندو اور دوسری جاتیوں کے پیرو ان کی نیکی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ کبیر پنتھیوں کے خیال اور عقیدے کے مطابق بھگت کبیر کی نہ ماں تھی نہ باپ۔ کہتے ہیں کہ ایک جولاہے، نورا اور اس کی بیوی نیما نے انہیں کاشی یعنی بنارس کے ایک تالاب میں ایک کنول پر تیرتے ہوئے پایا۔ نیما نے اس بچہ کو اٹھا لیا اور خدا کی قدرت دیکھئے کہ بچے نے اسی وقت بولنا شروع کر دیا۔ یہ دونوں میاں بیوی بچے کو خوشی خوشی گھر اٹھا کر لے گئے اور اس کو پال پوس کر پروان چڑھایا۔

جب بھگت کبیر بڑے ہو گئے تو انہوں نے اپنی نیکی کی وجہ سے بہت نام پیدا کیا۔ چنانچہ لاکھوں مسلمان، ہندو، امیر غریب ان کے پیرو بن گئے۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے فلسفے کی بڑی بڑی پیچیدہ گتھیاں بڑی صفائی سے حل کیں اور وہ اس قدر سیدھے سادے، عام فہم پیرائے میں تعلیم دیتے تھے کہ تمام لوگ اُن کی بات بڑی آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ اُن کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے چھوت چھات کے خلاف پرچار شروع کیا اور ذات اور رنگ و نسل کے امتیاز کی مخالفت کی۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ تمام انسان برابر ہیں اور ہر انسان کو اس پر پورا پورا عمل کرنا چاہیئے۔ جب وہ اس طرح انسانوں کے بھائی بھائی ہونے کی تعلیم دیتے تھے تو انہیں ایک بہت بڑا غیر معمولی عالم فاضل انسان ہونے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا اور لوگوں پر خواہ مخواہ کوئی دباؤ نہیں ڈالتے تھے بلکہ صرف تلقین اور نصیحت سے کام لیا کرتے تھے۔

بھگت کبیر کی زندگی بڑی پاکیزہ اور سیدھی سادی تھی۔ وہ تو بس ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی ذاتی سعی و کوشش اور جدوجہد ہی سے اس قدر نام پیدا کیا کہ آج تک دنیا میں اُن کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔

پہلے پہل جتنی ستی براہمنوں اور بڑے بڑے گن وان پنڈتوں نے اُن کی مخالفت کی۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اچھوت اور شودر بلکہ ہزاروں براہمن، پنڈت، سیٹھ، راجہ، مہاراجہ بھی اُن کی عزت کرنے لگے۔ مسلمان انہیں مسلمان اور ہندو، ہندو تصور کرتے تھے۔ لیکن سچ پوچھیئے تو اُن کا مذہب ایک ہی تھا۔ خدائی وحدت کا اقرار، اور انسانوں کی مساوات کا پرچار۔ جیسا کہ انہوں نے کتنے ہی گیتوں اور شعروں میں کہا ہے۔

بھگت کبیر نے لوگوں کے دلوں سے توہمات کو دور کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ بھوتوں وغیرہ کا عقیدہ اپنے دل سے نکال دیں۔ اس سلسلہ میں انہیں بڑی کامیابی ہوئی۔ اُن کی تعلیم کا اثر بہت وسیع، دور رس اور نتیجہ خیز رہا۔ ملک میں کتنے ہی ایسے گروہ پیدا ہو گئے جن کا مطمح نظر اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ بنی نوع انسان کی محبت اور خدمت کا دم بھریں اور اپنے مرشد کبیر داس کی تعلیم کو پورا کریں۔ ان میں بعض گروہوں کے نام نانک پنتھی، سدا ست نامی، شری نرائن، شونیا بادی، دادو پنتھی، اور آدمی وغیرہ وغیرہ۔ ان مختلف متوں کی کتابیں بھگت کبیر کی تعلیمات سے بھری پڑی ہیں۔ کبیر پنتھی اپنی رہنمائی کے لئے صرف ایک ہی کتاب کو تعلیم کرتے ہیں۔ اس کا نام خاص گرنتھ ہے جو اکیس[21] ابواب پر مشتمل ہے۔ چنانچہ گو کبیر پنتھی دوسرے تمام متوں کی مذہبی رسموں میں شریک ہوتے ہیں، مگر وہ پڑھتے صرف اسی کتاب ہیں۔

بھگت کبیر جس طرح بڑے پر اسرار طور پر دنیا میں نمودار ہوئے تھے اسی طرح غیر معمولی طور پر رخصت بھی ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ سرگباش ہو گئے تو ہندو مسلمان اُن کی میت پر جمع ہوئے۔ ہندو چاہتے تھے کہ وہ انہیں اپنے دھرم اور طریق کے مطابق اُن کی لاش کو جلائیں اور مسلم انہیں اپنے دستور کے مطابق سپرد خاک کرنا چاہتے تھے۔ اس سے جھگڑا پیدا ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب یہ جھگڑا ہو رہا تھا تو بھگت کبیر دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ دیر توحید اور اتحاد پر تقریر کرتے رہے۔ اس میں بھگت کبیر نے اس امر پر زور دیا کہ لوگ اُن کی تعلیم کو اس قدر جلد

بھول گئے۔ یہ کہہ کر وہ یک لخت غائب ہو گئے!

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ آسمان کی طرف چلے گئے۔ بہرکیف اُن کی تعلیم کا نتیجہ ہوا کہ ہندو مسلمانوں نے اُن کی میت پر جھگڑنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے اُن کی ارتھی پر پھول برسائے۔ ہندوؤں نے اُن کی یاد میں "کبیر چورا" کے نام سے بنارس میں ایک مندر تعمیر کیا۔ کاشی کے مہاراجہ بیر سنگھ نے اس جگہ ایک بہت خوبصورت عمارت تعمیر کی۔ اب بھی اس جگہ ہر سال ایک میلا منایا جاتا ہے۔

بھگت کبیر کی میت سے مسلمانوں کو جو پھول ہاتھ لگے اُن کو نواب بجلی خاں اپنے ساتھ لے گئے اور اُنہیں یوپی کے ضلع گورکھپور کے ایک گاؤں میں دفن کیا گیا۔ جس کا نام مگہر گاؤں ہے۔ اس جگہ ایک بہت عالیشان مقبرہ بھی تعمیر کیا گیا۔ یہاں بھی ہر سال بھگت کبیر کی یاد میں ایک میلا ہوتا ہے۔ کبیر پنتھی ان دونوں جگہوں کو بڑا متبرک خیال کرتے ہیں اور کبھی یہاں کبھی وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، بھگت کبیر کا طریق تعلیم بہت ہی نرالا تھا۔ ہندوؤں کو وہ یہ کہتے ہیں کہ بتوں کی پوجا اور مالا جپنا کوئی کام نہیں دیتا تاوقتیکہ آدمی کا من پوِتر نہ ہو۔

گنگا پھرا ہردوار کا گدڑی لیا من جپا رکا ۔ بھٹکا پھرا تو کیا ہوا جن عشق میں سر نا دیا

مسلمانوں کو بھی وہ اسی انداز سے تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ حج کرنا اور تسبیح کے دانے گننا بھی کوئی فائدہ نہیں دیتے جب تک کہ انسان کا دل پاک صاف نہ ہو اور انسان کی عبادت میں خلوص کو کوئی دخل نہ ہو۔

سنت دادو کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ پتھروں کی پرستش، دریاؤں میں اشنان وغیرہ سب بیکار ہیں۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ گنگا یا جمنا میں ایک یا دو بار اشنان کرنے سے مرنے کے بعد سورگ میں پہنچ جائیں گے، وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ مچھوے اور مچھلیاں تو عمر بھر انہیں دریاؤں میں رہتے ہیں۔ اس حساب سے تو انہیں کسی بہت ہی بڑے مہا سورگ میں پہنچ جانا چاہئے! غرض ان کی ساری تعلیم ایسے سیدھے سادے اور بہت موثر، دل میں گھر کرنے والے پیرائے میں تھی۔

بھگت کبیر کی تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں کتنے ہی مذہبی مت پیدا ہو گئے جن کا مدعا یہ تھا کہ وہ توحید اور اتحاد کے لئے بنی نوع انسان کی کوششوں کو جاری رکھیں۔ صرف مردوں ہی نے بھگت کبیر کی پیروی نہیں کی بلکہ عورتوں نے بھی اُن کے بلند مقاصد اور افکار کا پرچار شروع کیا۔ ان برگزیدہ پیشواؤں میں صرف براہمن ہی نہ تھے بلکہ دوسرے فرقوں اور طبقوں کے لوگ بھی جنہوں نے چھوت چھات، فرقہ پرستی، رنگ و نسب اور مقامیت کے خلاف جدوجہد کو جاری رکھا۔ اُن کا منتہائے مقصود صرف ایک تھا۔ محبت اور حقیقی مساوات، یعنی یہ کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

آدی باسیوں یعنی اچھوتوں کا دھرم ایک ہی ہے یعنی اتحاد (سنت دھرم) اس کی سرگرمیاں اور افعال ایک جمہوری یا پنچائتی نظام کے تحت ہیں۔ گرو کا تقرر انتخاب سے عمل میں آتا ہے۔ گرو کا آشرم نہ صرف عبادت گاہ ہوتا ہے، بلکہ امیروں، غریبوں سب کے لئے سرائے یا مہمان خانہ بھی ہوتا ہے۔ جہاں ہر روز ہزاروں لوگ کھانا کھاتے ہیں اور وہ بھی مفت۔

بھگت کبیر اُن سادھوؤں، سنتوں اور فقیروں کی بہت خدمت کرتے تھے جو خدا کی عبادت بجالاتے تھے اور مذہبی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ وہ اُن کی آرام و آسائش کا خاص دھیان رکھتے تھے۔ براہمنوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ کیونکہ بھگت کبیر ان موٹے تازے براہمنوں کو کبھی کھانے پینے کی دعوتوں پر بلانے کی زحمت نہ دیتے تھے۔ براہمنوں کے متعلق اُن کا قول یہ تھا کہ جتنا دھن انہیں ملے وہ آتا ہی اور مانگتے ہیں۔ اس سے براہمن بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے اُن کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ جب وہ اپنے مقصد میں ناکام ثابت ہوئے تو انہوں نے اُن کو رسوا کرنے کے لئے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے کچھ دے دلا کر ایک عورت کو یہ اعلان کرنے پر آمادہ کیا کہ بھگت کبیر اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ بھگت کبیر نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اس کے برعکس وہ اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھلے بازار میں چلنے لگے اور اس کو لیکر سیدھے راجہ کے دربار میں گئے۔ راجہ بھگت کبیر کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب اس نے یہ ماجرا دیکھا تو اُسے بھگت کبیر پر شبہ گذرا اور اس نے ان کو پرنام بھی نہ کیا۔ بھگت کبیر کچھ دور بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کلسے سے زمین پر کچھ پانی چھڑکا۔ راجہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ باندھ کر اس کا سبب پوچھنے لگا۔ کبیر داس نے اسے بتایا کہ اس کا مقصد نقصان پہنچانا نہیں، بلکہ صرف فائدہ پہنچانا ہے کیونکہ اس وقت کسی مندر کو آگ لگی ہوئی تھی۔ اس بات کی فوراً ہی تصدیق ہو گئی کیونکہ مندر جلنے سے بچ گیا اور اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے بعد راجہ بھگت کبیر کی اور بھی زیادہ عزت کرنے لگا۔

جمال ——— بقیہ صفحہ ۲۰

میرے ذہن میں یہ خیالات اُبھر رہے تھے اور میں اس کے ساتھ ساتھ باقی راستہ طے کر رہا تھا۔ چاند غائب ہو چکا تھا، تیرگی ساری کائنات کو اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔ شام کا تارہ ماتم گسار تھا۔ کبھی کبھی تیز ہوا کی سرسراہٹ مجھے چونکا دیتی اور یکلخت میرے ذہن میں اُس جمال کے یہ الفاظ اُبھر آتے:

"بوجھ ڈھونا میری زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا ہے، اس کے بغیر زندگی کا احساس نہیں ہوتا، بوجھ ہی کے ذریعہ میں اپنی زندگی میں توازن اور ہموار قائم رکھ سکتا ہوں، اس کے بغیر چارہ نہیں۔ زندگی بے مصرف ہو جائے گی۔"

اس کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے کہا:

"میرے دوست، یہ نہ سمجھنا کہ اس دنیا میں تو ہی ایک ایسا آدمی ہے جو یہ بوجھ اُٹھاتا ہے، ہر شخص کو کچھ کرنا پڑتا ہے، زندگی بذاتِ خود ایک بوجھ ایک بارِ ثقیل ہے، کسی متنفس کو اس سے مفر نہیں مگر اہم حقیقت یہ ہے کہ اس بارِ گراں کو اُٹھانے میں اُستواری اور توازن قائم رکھنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر زندگی کا کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا اور نہ مسرت و اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔"

بوڑھا جمال میری باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا، اس کے چہرے پر مسرت و اطمینان کے آثار ظاہر تھے، میں نے کہا:

"تو بھائی، تم صرف اکیلے نہیں ہو جو زندگی میں توازن قائم رکھنے کے لئے پتھر اُٹھا لیتے ہو، ہر شخص کو کوئی نہ کوئی بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے!"

اب وہ میرے مکان کے دروازے تک پہنچ چکا تھا، میں نے اس سے معانقہ کرتے ہوئے کہا:

"اے میرے دوست، اے انسان، تو نے آج مجھے انسانیت کا ایک انوکھا تصور دیا ہے، تو پیکرِ انسانیت ہے۔ تو اپنے اعمال سے اس کی تشریح کرتا ہے، میں تجھے سلام کرتا ہوں۔" اس کے چہرے پر نہایت عمیق سکون اور اطمینان کے آثار تھے۔

[illegible] وعلیکم السلام [illegible] کہہ کر وہ چلا گیا۔ ([illegible])

افق تا افق

ابنِ طفیل: (کامل گیلانی)

نگارشات ابن طفیل سے فن افسانہ نگاری پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا احاطہ بہت دشوار ہے، بایں ہمہ بعد میں آنے والے ادیبوں نے ابن طفیل کے طرز سے جو استفادہ کیا ہے اس کا کسی حد تک جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ یہ استفادہ صرف مشرقی ادیبوں تک ہی محدود نہیں بلکہ بعض مغربی اہلِ قلم بھی اس سے فیضیاب ہوئے ہیں مثلاً "تارزن" کے مولف نے اپنے ہیرو کی تربیت کا تصور ابن طفیل کی کہانی "حی بن یقظان" سے لیا ہے۔ اسی طرح مشہور انگریز ادیب ڈینیل ڈیفو نے "روبنسن کروسو" کی تخلیق میں ابن طفیل کی تقلید کی ہے۔ لیون گوئٹے (LEON GOETHE) "حی بن یقظان" کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "روبنسن کروسو" میں "فرائی ڈے" کا کردار ابن طفیل کے اُسال کا چربہ ہے اسی طرح "روبنسن کروسو" میں جو فلسفیانہ نکتہ سنجی اور حکیمانہ موشگافیاں پائی جاتی ہیں وہ "حی بن یقظان" ہی سے ماخوذ ہیں۔ اگرچہ اس کا اسلوب عصرِ جدید کے تقاضوں کے مطابق ہے، پھر بھی جہاں تک ماخذ کا تعلق ہے اس کی بنیادیں "حی بن یقظان" پر قائم ہیں۔

اسی طرح بون یونیورسٹی کے پروفیسر روڈلف نیس نے اپنے قصہ "خاندان سوئٹزرلینڈ" یا "سوئٹزرلینڈ کا روبنسن" کے لئے "حی بن یقظان" کا تتبع کیا ہے۔ سوفٹ اپنی کہانی "گلیورز ٹریولز" کی تالیف میں ابن طفیل ہی کا مرہونِ منت ہے۔

"حی بن یقظان" کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ پوکوک نے سب سے پہلے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا جس سے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا۔ بعد ازاں اس کے جرمن اور ہسپانوی ترجمے ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں بھی شائع ہوا۔ اشوکیل نے اپنے انگریزی ترجمہ کے مقدمہ میں ابن طفیل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ابوبکر ابن طفیل مشہور مسلمان فلسفی ہے۔ اس نے اپنے قصہ میں ارتقاء عقل انسانی کے مدارج واضح کئے ہیں اور نہایت چابک دستی سے رازہائے کائنات کا انکشاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی دقتِ مشاہدہ حوادثِ کون و مکاں کی تفسیر میں ظاہر و بین ہے۔

شعر کا اثر: (قاضی محمد زاہد حسین)

اگرچہ اسلام نے شاعری میں بے راہ روی اور کج خیالی کو منع کیا ہے لیکن جہاں تک اس کے افادی پہلو کا تعلق ہے شعر کو صرف جائز ہی نہیں قرار دیا بلکہ شاعروں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسان بن ثابت اور عبداللہ بن رواحہ کو اپنے عین اعتبار خاص میں رکھتے تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم عہدِ جاہلی کے اچھے شعروں کی سماعت فرماتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ خلفاء یا امراء کو ان کی حاجت روا کئے بغیر چارہ نہ ہوتا اور ایسی تعجب خیز تاثیر شعر ہی میں پائی جاتی ہے۔

("الوعی" سے)

UNITED

قدم دیکھ بھال کر رکھئے

کسی صاحب کو اپنی کار کے لئے شوفر کی ضرورت تھی - انہوں نے اشتہار دیا - تین امیدوار آئے - ان صاحب نے تینوں سے پوچھا :

''فرض کیجئے - آپ کسی پہاڑی راستے پر کار چلا رہے ہیں - ایک طرف دو قدم پر گہرا کھڈ ہے - آپ وہاں کار کو کتنا تیز چلا سکتے ہیں اور کھڈ کے کنارے کے کتنے قریب سے گاڑی کو سلامتی سے گذار سکتے ہیں ؟ ''

پہلے امیدوار نے جواب دیا : ''جناب آپ کی دعا سے تیس میل کی رفتار سے چلا لوں گا اور کنارے سے فٹ بھر سے زیادہ جگہ نہیں مانگوں گا '' -

دوسرے امیدوار صاحب ان کے گرو نکلے ، کہنے لگے : ''حضور ، پچاس میل کی رفتار سے چلاؤنگا اور کھڈ سے بس چھ انچ زمین چھوڑونگا - نہ چلاؤں تو نام بدل دیجئے ''

موٹر ڈرائیور یا سائیکل سوار، جس کا بھی قصور ہو، نتیجہ دونوں کے حق میں برا ہوا

تیسرا امیدوار آہستگی سے بولا :

''جناب کہہ نہیں سکتا - کبھی کوشش نہیں کی '' -

بتائیے - وہ نوکری کسے ملی ہوگی ؟

بے تحاشا تیزی کا نتیجہ
"اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن"

یہ موٹروں ، گاڑیوں کی ریل پیل کا زمانہ ہے اور یہ ایجادیں ہم پر نازل بھی کچھ اچانک ہوئی ہیں ۔ بڈھے ٹھڈے لوگ جو تانگوں، شکرموں کے عادی ہیں انہیں دیکھتے ہی بوکھلا جاتے ہیں ان کا بھی ذکر چھوڑئیے ، اچھے سمجھدار جوان لوگوں کا یہی حال ہے کہ پیدل یا سوار سڑک پر آتے ہیں تو ہوش گھر بھول آتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخبار میں آدھا صفحہ ٹریفک کے حادثوں کی خبروں سے پر ہوتا ہے ۔ گھر سے نکلے تو پھر خدا ہی ہے جو سلامت لائے ۔

اگر ہم ٹریفک کے قاعدے سمجھ لیں ۔ اور ان پر عمل کریں تو اس میں ہمارا اپنا فائدہ ہے

یہ بھی عام سمجھ کی بات ہے کہ ہمیں اپنی گاڑی کو ہر نقص سے مبرا رکھنا چاہئے ۔ کسی بھی اچھی گیریج میں گاڑی لے جائیے ۔ وہ دیکھ لیں گے کہ کوئی کل پرزہ ڈھیلا تو نہیں ۔ پر بریک خصوصاً ہمیشہ نہایت اچھی حالت میں ہونے چاہئیں اسی طرح ڈرائیور کو چاہئے کہ اپنا معائنہ کراتا رہے۔ آیا گاڑی چلاتے وقت اس کے اوسان بجا رہتے ہیں ، ہاتھ پاؤں کی اضطرابی حرکات موقع محل کے مطابق ہوتی ہیں ، نظر بالکل ٹھیک کام کرتی ہے ، رات کو ٹھیک دکھائی دیتا ہے اور صحت میں کوئی اور خرابی تو نہیں ۔ اگر کوئی شخص اس امتحان میں پورا نہیں اترتا تو سلامتی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام ان پر چھوڑ دے جو چاق و چوبند ہیں اور اس کام کے زیادہ اہل ہیں ۔

اگر آپ پیدل چل رہے ہیں تو سڑک پار کرنے سے پہلے دائیں طرف نظر ڈالئے ۔ پھر بائیں طرف اور پھر ایک بار دائیں طرف، تب قدم اٹھائیے ۔ بعض اوقات کوئی کار دور معلوم ہوتی ہے لیکن اسکی رفتار کا آپ کو اندازہ نہیں ہوتا ، ہوسکتا ہے وہ اتنی تیز آرہی ہو کہ پلک جھپکنے میں آپ کو آلے ۔ لہذا سڑک کے بیچوں بیچ سیاست کی گتھیاں سلجھائیے نہ بینگن اور بھنڈی کے بھاؤ پر بحث کیجئے !

اگر آپ گاڑی چلا رہے ہیں تو ایک بات یاد رکھئیے ۔ صرف آدھی سڑک آپ کی ہے اور اس میں بھی دوسروں کو حصہ دینا ہے ۔ اونٹ گاڑیوں کو ، گدھا گاڑیوں کو ، گھوڑا گاڑیوں کو ، آدھی سڑک سامنے سے آنیوالی گاڑیوں کے لئے ہے اور اس میں بھی گاڑیوں کے ساتھ ساتھ گدھے ، گھوڑے شریک ہیں ۔ ایکہ

ایک اور عبرت ناک سانحہ

صرف شہر کراچی میں ۱۹۵۶ء کے حادثات کے اعداد و شمار

بڑا اصول یہ یاد رکھیئے کہ کسی گاڑی سے آگے گزرنے کی کوشش خطرناک، بلکہ جان لیوا ہے اور پہاڑی پر یا موٹر پر تو ہرگز ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے ۔ پھر یہ ہے کہ سامنے سے گاڑیاں آرہی ہوں تو روشنی تیز مت چھوڑئیے ورنہ چکاچوند سے ان گاڑیوں کے ڈرائیوروں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور نتیجہ ان کے لئے بھی اور آپ کے لئے بھی خطرناک ہوگا ۔ دوسروں کی سلامتی سے آپ کی سلامتی بھی وابستہ ہے۔

لیکن سڑک پر چلنے کا سلیقہ کوئی کالا علم نہیں ۔ روزمرہ کی سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں ۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ایک وقت میں ایک جگہ میں بس ایک چیز سما سکتی ہے، دو نہیں ۔ پھر بھی بعضے خوش فکرے اس آزمودہ کو آزمانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ بھی دیو پیکر، قوی ہیکل گاڑیوں کے ساتھ جن کے نیچے ہڈیاں سرمہ ہوجائیں ۔ آپ دن میں کسی بھی وقت کسی بھی چوراہے پر کھڑے ہوکر دیکھیں ۔ ہر شخص اس کوشش میں نظر آئیگا کہ دوسروں سے پہلے سڑک پار کرے اور ایک آپا دھاپی مچی ہوگی ۔ علامہ اقبال کے مصرع کی کیفیت ہوتی ہے : ”بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق“ ۔ لیکن یہ ”آتش نمرود نہیں سڑک ہے

اور سڑک پر جان عزیز سے کھیلنا عشق نہیں بےوقوفی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نکلتے ہیں کہیں کے ارادے سے اور پہنچتے ہوں ہسپتال یا، (سب کی جان سے دور) ، مردہ خانے میں !

اگر آپ گاڑی میں جا رہے ہیں تو عقل کا تقاضا ہے کہ چوراہے کے پاس پہنچ کر رفتار دھیمی کرلیں ۔ اور پھر دیکھیں کہ کسے پہلے راستہ ملنا چاہئے ۔ اگر مصلحت اور ہوش کا تقاضا ہو تو اپنی باری اور حق چھوڑ کر پیچھے رہنے میں بھی ہرج نہیں ۔ بھلا دوسروں

ایک اور قلابازی

حادثات کی
رفتار
۵۳ء سے ۵۶ء تک
(صرف کراچی میں)

کو پیچھے دھکیل دینا اچھا ہے کہ جان کی سلامتی؟ اگر خدانخواستہ آپ کی جان جاتی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ راستی پر تھے— جان تو واپس آنے سے رہی۔ اگر خدانخواستہ ٹکر ہونی ہی ہے تو آہستہ ہونے میں یہ تو ہوگا کہ نقصان کم ہوگا، چوٹ کم آئے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب سینکڑوں گھوڑوں کی قوت کی گاڑی آپ کے ہاتھ میں ہو اور بس ایک پیڈل دبانے سے الہ دین کے جن کی طرح دوڑنے کو تیار ہو تو اپنے اوپر ضبط رکھنا دشوار ہوتا ہے لیکن انسانی ذمہ داری بھی ایک چیز ہے۔ آپ کے ہم جنسوں کے جسم و جان آپ کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، ذرا سی سوئی چبھنے سے اتنا درد ہوتا ہے اگر آپ کی گاڑی کسی غریب کے گوشت، ہڈیوں اور خون کو ایک کردے تو کیا ہوگا؟ اس ہولناک کیفیت کا تصور کرنے ہی سے جھرجھری آتی ہے۔ اور بے احتیاطی سے یہ حادثہ دوسرے کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی تو پیش آسکتا ہے۔ لہذا اس ہلاکت آفریں دیو یعنی اپنی گاڑی کو قابو میں رکھئیے۔ گاڑی کو اندھادھند بھگائیے نہیں کیونکہ اکثر حادثے اسی وجہ سے ہوتے ہیں۔ آپ کے مقامی حکام نے رفتار کی جو حدیں مقرر کر رکھی ہیں ان کے اندر رہئیے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اپنی جان بچائیے، اور دوسروں کو بھی اس کا بھید بتائیے۔

ہم میں سے جو کوئی ان اصولوں کو، جن کی بنیاد عام سمجھ بوجھ پر ہے، سمجھ لے گا تو جانو کہ اسے سڑک پر چلنے کا سلیقہ آگیا۔ ان اصولوں کی پابندی میں آپ پہل کیجئے۔ دوسروں کا منہ مت دیکھئیے۔ ہوسکتا ہے دوسرا آدمی یہی انتظار کر رہا ہو کہ آپ پہل کریں تو وہ بھی کرے۔

لہذا **کل** سے نہیں آج سے اور **آج** کیا، **ابھی** سے عمل شروع کیجئے *

مشرقی پاکستان

معدنی دولت کی تلاش (تیل)
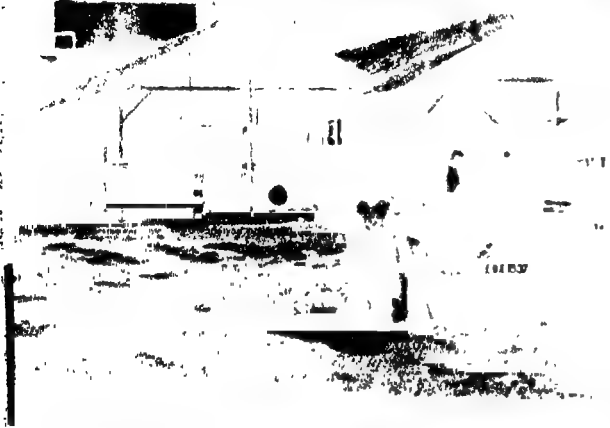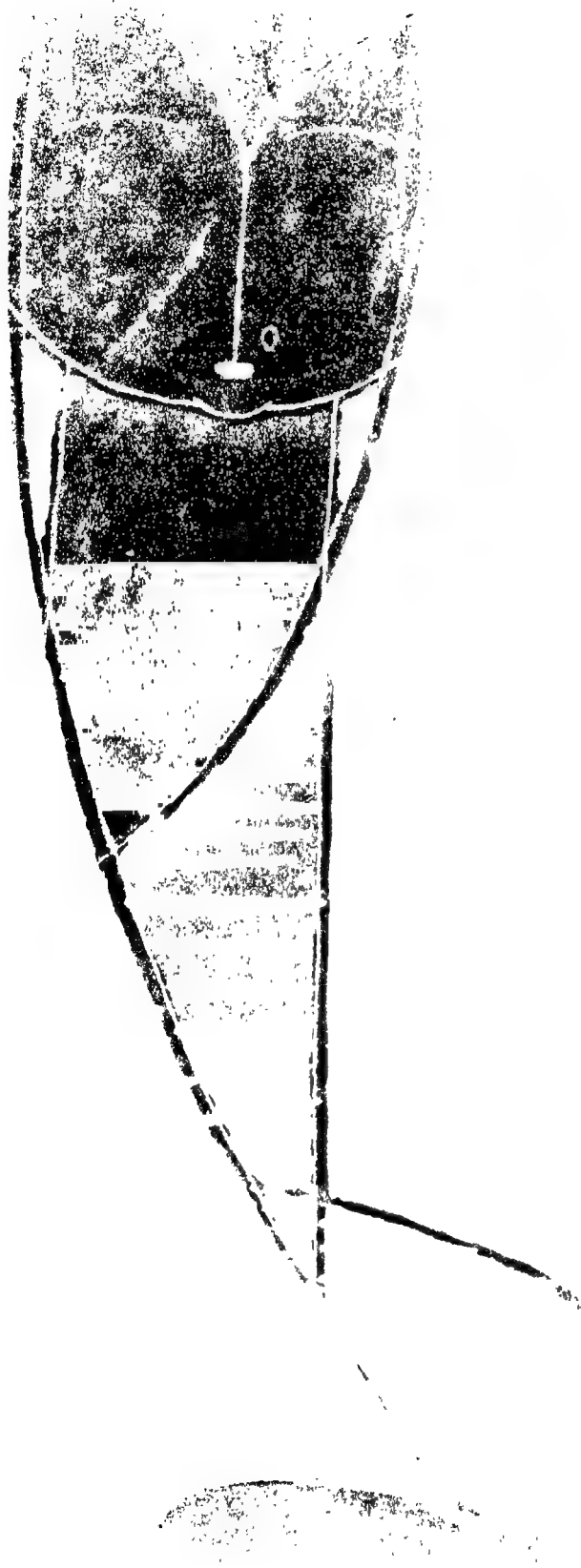
کوہ و دریا

صُوراسرافیل
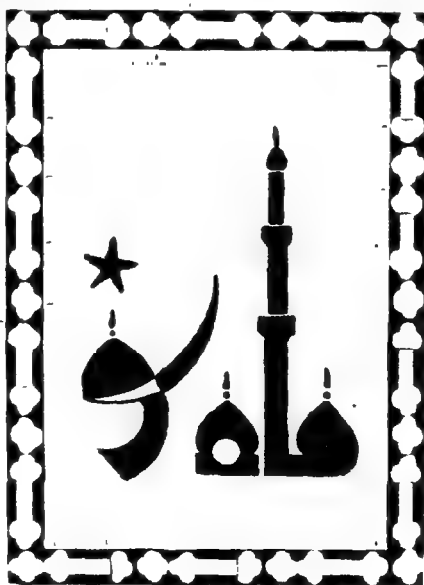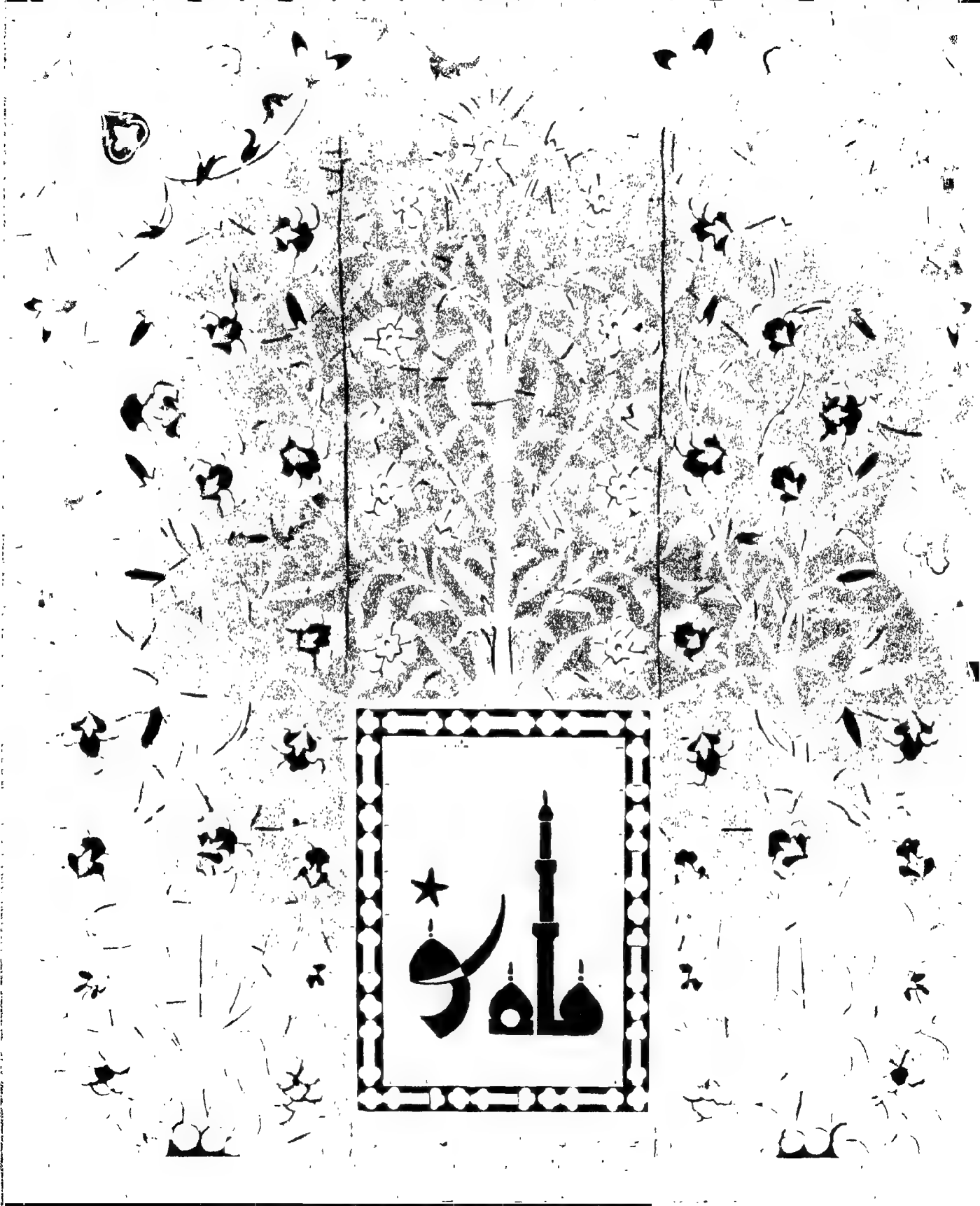
مقبرہ نورجہاں

لاہور کے چند مناظر (نئے زاویوں سے)

مقبرہ جہانگیر کے بڑے دروازے کا ایک کونا (عکس : خورشید)

ایک گلی میں صبح کا منظر (عکس : خور

ماہِ نو

جلد ۱۰ ——— شمارہ ۵

اگست ۱۹۵۷ء

ادارۂ تحریر:

رفیق خاور

ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ——— آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

اہلِ وطن کو آزادی کی دوسری دہائی کا طلوع مبارک ہو! اب اِس تاریخی سحر کا طلوع اپنے خیر مقدم کے لئے کسی جشن، دھوم دھام، طنطنوں یا غلغلوں کا محتاج نہیں، کیونکہ ہم اس ابتدائی مرحلے سے گذر چکے ہیں جب والہانہ مسرت وشادمانی کا احساس ایک خارجی ہنگامہ آرائی اور پرجوش مظاہروں کا متقاضی ہوتا ہے۔ اب ہماری قومی زندگی کی جوئے رواں ایک بحرِ بے کراں بن چکی ہے جس کی لہروں پر جھاگ یا شور وغل کا ہنگامہ نہیں بلکہ ایک خاموش وقار ہے۔ اِس لئے ہم یومِ استقلال کو اس خاموشی اور سنجیدگی سے منا رہے ہیں جو اس کے شایانِ شان ہے۔

اس مقام سے جہاں سے ہماری دس سالہ ترقی کے بے شمار سلسلے نظر آتے ہیں، آئینی، صنعتی، اقتصادی، رفاہی، معاشرتی، ثقافتی، بین الاقوامی وغیرہ، وہاں دور دور تک ہلکی دھند کے پردے میں کتنی ہی نادیدہ بلندیوں کی جھلکیاں بھی ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ہمارا جذبۂ قومی، ہماری قوتِ ارادی، ہماری ہمتِ بلند سرگرمِ کار رہی تو ہمارے لئے ہر نیا سال نئے عروج وترقی کا پیغام لے کر آئے گا اور ہمارے ملی وقار میں نت نئے اضافے ہوتے رہینگے

ع باز بر رفتہ و آئندہ نظر باید کرد

اِس شمارے میں پچھلے دس سال کی ترقیوں کا ایک سرسری جائزہ شامل ہے۔ افسوس ہے کہ طوالت کے خیال سے اسے مختصر کرنا پڑا ورنہ قومی زندگی کے متفرق شعبہ جات ہیں، ہمارے احساسِ تشنگی کے باوجود، جتنا کچھ میدان سر کیا گیا وہ ایک طولانی داستان ہے ع نقش ہیں ناتمام خونِ جگر کے بغیر۔ ابھی ہمیں اِس نقش کو ہر اعتبار سے سنوارنا اور مکمل کرنا ہے اور اس کے لئے مستقبل پہلے سے بھی زیادہ خونِ جگر کا منتظر ہے۔ ہم شمعِ وطن کے پروانے یقیناً اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانیوں سے دریغ نہ کرینگے۔

O

منجملہ دیگر مسائل کے جو دست گرہ کشا کے منتظر ہیں ایک مسئلہ کشمیر بھی ہے۔ ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ! اس سلسلے میں ہمارا مسلک آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ حق وانصاف کا مسلک، اور ہم پوری استقامت کے ساتھ اس پر ہمیشہ قائم رہینگے۔ تاوقتیکہ اس کا خاطر خواہ حل نہ ہوجائے۔ مخالف، خود غرض سنگدل عناصر کی چیرہ دستیاں جسقدر شدید ہوتی جائیں گی اسی قدر ہمارا عزم اور جدوجہد بھی شدید ترہوتا جائے گا۔ دسویں یومِ استقلال کے تاریخی موقع پر ہمارے قومی احساس کے اس پہلو کی نمائندگی غنائیہ تمثیل سے ہو رہی ہے جو اس شمارے میں شامل ہے۔

O

عوامی گیتوں، عوامی ادب، عوامی فنون میں دلچسپی اور اُن کا احیاء ہماری ملّی زندگی کا ایک اور اہم پہلو ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد آپ ہی آپ اُبھر پڑا اور اس تیزی سے پروان چڑھنے لگا جیسے یہ یہاں کی قدرتی پیداوار ہو۔ "ماہِ نو" اپنے ہر ہر علاقے کے اِس دلچسپ اور بہت ہی زندہ ادب وفن کو بروئے کار لانے میں پیش پیش رہا ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اس کی کوششوں نے ایک خاصی پر زور، ہمہ گیر اور جاندار تحریک کو جنم دیا ہے جس کے اثرات بہت دور رس اور نتیجہ خیز ثابت ہوں گے۔ اس بار الطاف گوہر کے قلم سے آرٹ کا ایک تعارف پیش کیا جا رہا ہے جو مشرقی پاکستان کے عوامی آرٹ سے متعلق ہے۔

O

یہ شمارہ زیرِ ترتیب تھا کہ اُردو کے محبوب صحافی اور اردو مزاح نگاری کے گنے چنے نام لیواؤں میں سے ایک یگانہ شخصیت مجید لاہوری کے انتقال کی حسرت ناک خبر ملی۔ "ماہِ نو" اپنے اس جوانمرگ اہلِ قلم کا ماتم گسار ہے۔ مجید لاہوری نے اپنے خداداد جوہر کو قوم کی خدمت میں صرف کیا اور وہ مقبولیت حاصل کی جو اُن کا حق تھی۔ انہوں نے مزاح سے تعمیری تنقید کا کام لیا۔ اُن کے گہرے جذبۂ قومی کی بنا پر اُن کے تیرونشتر ادبی پیرا فراد بے پناہ ہوگئے تھے۔ یہ تیر ونشتر اُن سے بھی اپنے لہو کی بھینٹ لیتے رہے اور آخر اس نشتر زنی نے خود ہی اُن کو اپنا شکار کرلیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس شمارے میں اُن کی ایک غیر مطبوعہ نظم خود اُن کے قلم سے لکھی ہوئی شامل کی جا رہی ہے۔

غزل

غم میں بھی جس کو اک سرور نہیں
زندگی کا اسے شعور نہیں

دل ہی وہ کیا جو ناصبور نہیں
تو نہ شرما، ترا قصور نہیں

عشق ہی کیا، کہ جو نہ ہو بیباک
حسن ہی کیا جسے غرور نہیں

(قطعہ)

مجھ کو شکوہ ہے چشمِ ساقی سے
پی رہا ہوں، مگر سرور نہیں

لالہ و گل بھی اجڑے اجڑے سے
شبِ مہتاب میں بھی نور نہیں

اپنی جنت کی فکر کر واعظ!
میری جنت تو مجھ سے دور نہیں

نشۂ آرزو، معاذ اللہ
کون اس میکدے میں چور نہیں

زندگی ہے ترے فراق کا نام
اور تو زندگی سے دور نہیں

کل دکھائے گا کیا بہار کو منہ
دل جو زخموں سے آج چور نہیں

یہ ہے قربت اگر، تو کیا کہیے
ہمیں جیسے ترے حضور نہیں

دل عبارت ہے سوزِ پیہم سے
اس کی معراج، برق و طور نہیں

میں ہوں اور دشتِ غم کا سناٹا
کوئی آواز، دور، دور نہیں

جگر

دیارِ سحر

عبدالرؤف عروج

مری نگاہ نے دیکھا ہے سرد و گرمِ جہاں
مری نگاہ سے گذرے ہیں روز و شب، مہ و سال
مری نگاہ سے ابھرے ہیں وقت کے خدوخال
مری نگاہ میں طوفاں سے کم مہیب نہ تھی
وہ ایک موج جو ساحل تلاش کرتی ہے
مری نگاہ نے دیکھے ہیں کارواں وہ بھی
جنہیں خود آپ ہی منزل تلاش کرتی ہے
مجھے خبر ہے کرشمے تھے کن ہواؤں کے
بدل کے رہ گئے انداز ناخداؤں کے
عرب کا سوزِ دروں جاگ اٹھا رگ و پے میں
عجم کے ساز کی آواز ہے بطنِ نے میں
لب و خیال کے بخیہ گروں کو کیا معلوم
کہ قید و بند سے لایا ہوا سکوتِ حزیں
پیامِ مرگِ بتاں بن کے جاگ اٹھتا ہے
شکستِ عہدِ گماں بن کے جاگ اٹھتا ہے
کبھی کبھی تو فغاں بن کے جاگ اٹھتا ہے

(۲)

جمود ٹوٹ گیا محوِ خواب دنیا کا
مری نگاہ نے دیکھا شباب دنیا کا
طلوعِ صبحِ سعادت کے زمزمے جاگے
جنوں پسند جوانوں کے ہمہمے جاگے
فروغِ جلوۂ آدم کی دل کشی لے کر
نئے تصوّرِ عالم کی دل کشی لے کر
حیات بخش ارادوں کی نرم تنویریں
شبِ تخیل و احساس میں ابھرتی رہیں
نہفتہ رنگ جواں حسرتیں نکھرتی رہیں
عروسِ فکر کی انگڑائیاں بکھرتی رہیں

(۳)

بھلا دیا ہے حقیقت نے ہر فسانے کو
حیات ڈھونڈھ رہی تھی نئے زمانے کو
عجیب چیز ہے دنیا میں لذتِ ایجاد
فرازِ عرش تلک اپنی پستیاں ابھریں
بنامِ مملکتِ پاک بستیاں ابھریں
وہ مملکت ـــ وہ تقاضائے نو بہ نو کی نمود
وہ مملکت وہ تفکر کی انتہائے طلب
وہ مملکت وہ تدبر کی اختراعِ جمیل
وہ مملکت وہ جلالت کی ایک شانِ وجود
وہ مملکت وہ تمنا کی منزلِ مقصود
قلندروں کے خیالوں کی آفریدہ تھی
تمدنوں کے اجالوں کی آفریدہ تھی
اسی کو ڈھونڈھ رہا تھا شعارِ اہلِ جنوں
یقیں نے توڑ دیا لذتِ گماں کا فسوں
عجیب چیز ہے بیداریٔ شعورِ زبوں
افق افق کی جبیں سے اندھیرے چھوٹ گئے
غلامیوں کے ہیولے پگھل کے ٹوٹ گئے

(۴)

سکوتِ جبر کا پردہ رخِ بیاں سے اٹھا
یہ کون راہ نما اپنے درمیاں سے اٹھا
خلوصِ اہلِ صداقت کی آبرو رکھ لی
اسی نے قوم کی ملت کی آبرو رکھ لی
اسی کے سوز سے برہم مزاجِ اہلِ فرنگ
اسی کے سوز سے روشن خود آگہی کے دیے
اسی کے سوز سے بیدار ملتوں کا دماغ
اسی کے سوز سے زندہ ضمیرِ اہلِ خبر
اسی کے سوز سے ارزاں متاعِ شام و سحر
اسی کا شعلۂ گفتار ـــ مرگِ ظلمتِ شب
اسی کی مستیٔ کردار ـــ نورِ صبحِ طرب

اُسی کی کیفیتِ ذکر — تابِ جاں افروز
اُسی کی کیفیتِ فکر — سوز و سازِ الم
شگفتِ لالہ و گل حسرتِ خزاں کے لئے
پیامِ صبر و سکوں — درد بیکراں کے لئے
شرارِ عزم و یقیں ہر خس گماں کے لئے
وہی ہے مایۂ جاں اپنے کارواں کے لئے
اُسی کی برقِ نظر حوصلہ بڑھاتی ہے
اُسی کی صوت میں تاریخ گنگناتی ہے

(۵)

بجھے بجھے سے چراغوں میں روشنی جاگی
دیارِ شب کو دیارِ سحر کیا اس نے
علو میں تابشِ قندیلِ علم وقف کر لئے
پیامِ جہدِ مسلسل کو تازگی بخشی
سکوتِ مرگ کی وادی میں زندگی بخشی
بتانِ کہنۂ صد رنگ و نسل ٹوٹ گئے
طویل راہ گذر کے شکستہ دامن سے
تعصبات کا سنگِ گراں ہٹایا ہے
یقیں کی مشعلِ شب تاب ساتھ لایا ہے

(۶)

نویدِ زیست ہے پیغامِ جاوداں اس کا
فروغِ شرق ہے احساس کارواں اس کا
اسی کی دعوتِ اخلاص — زندگی بن کر
دل و دماغ کے پردوں پہ تھرتھراتی ہے
یہی فضائیں جہنم، یہی فضائیں بہشت
یہ راز وہ ہے جو دانش وروں میں عام نہیں
جسے نصیب ہو تنظیم و اتحاد و عمل
وہ قوم گردشِ حالات کی غلام نہیں
مسائلِ فطری مستعار ہیں کہ جو تھے
حقیقت ابدی ہے وہ حوصلہ کہ جو تھا
اسی ادا سے سفر راہِ ارتقائے حیات
رواں دواں ہے تمنا کا قافلہ کہ جو تھا

ساقی نامہ

انجم رومانی

پلا ساقیا بادۂ مشکبو — کہ پھر آگیا موسمِ ہاؤ ہو
طیور اور اک نغمۂ دل فروز — چمن اور اک برقِ نظارہ سوز
بہار اور ہنگامۂ رنگ و بو — صبا ہے کہ اک موجۂ جستجو
جدھر دیکھتے ہیں عجب رنگ ہے — نگہ اپنے دامن سے دل تنگ ہے
پلا ساقیا بادۂ دلکشا — کہ ہو جس کا اک جرعہ مشکل کشا
فسردہ ہوں، دے جام بھر کر مجھے — شگفتہ مثالِ سحر کر مجھے
نہ کر آج خست کہ ہے عید پاک — جہاں کی جبیں پھر سے ہے تابناک
نیا آسماں ہے، نئے مہر و ماہ — نئی زندگی ہے، نئی رسم و راہ
نئے ولولے ہیں نئے حوصلے — نیا عزم لے کر چلے قافلے
نگاہوں میں ہیں منزلیں نو بہ نو — جمیں گی یہاں محفلیں نو بہ نو
ذرا تو بھی محفل جما ساقیا — کہ ہے یہ تقاضائے آب و ہوا
سنا مطربا کوئی ایسی غزل — کہ روشن ہوں جس سے دلوں کے کنول

اندھیرا گیا پھر اجالا ہوا
جہاں میں ترا بول بالا ہوا
ہوا پرچمِ دینِ حق پھر بلند
ہوا کفر کا پھر ازالہ ہوا
وہ کل سرخرو ہوگا تو نے جسے
ہے آج آزمائش میں ڈالا ہوا
اسے آندھیاں جیسے گل کو صبا
ہے آغوشِ طوفاں کا پالا ہوا
ہوا رفتہ رفتہ بہشت آفریں
یہ آدم وہاں سے نکالا ہوا

ماہِ نو، کراچی، اگست ۱۹۵۷ء

یہ حسن و دوشیزگی کے جلوے نظر میں لیتے ہوئے بسیرے
یہ زلف کی کافرانہ شامیں یہ رخ کے کشمیر گوں سویرے
تمام رعنائیوں کا حاصل یہی اجالے یہی اندھیرے
یہی اجالے یہی اندھیرے نہ روک لیں میرا راستہ پھر
گداز بانہوں کے نرم حلقے نہ روک لیں میرا راستہ پھر
یہ زندگی کے حسین لمحے نہ روک لیں میرا راستہ پھر
بچا کے دامن گزر رہا ہوں
جنوں کی تہذیب کر رہا ہوں
نگاہ والے اب آ کے دیکھیں کہ موجِ طوفانِ زندگی ہیں
برنگِ ساحل ابھر رہا ہوں
بچا کے دامن گزر رہا ہوں
کوئی مجھے پھر بلا رہا ہے دیارِ حسنِ بتاں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

یہ جوئے کہسار کے کنارے شراب و مہتاب کے جزیرے
سکوت کے بحرِ بیکراں میں سرود و مضراب کے جزیرے
یہ مست آنکھڑیوں میں گم سم جواں جواں خواب کے جزیرے
شبِ بہشت آگئی ہے گویا سوادِ گیسوئے مشکبو تک
پہنچ گیا حرفِ تشنہ کامی حکایتِ بادہ و سبو تک
میں کب پہنچتا ہوں دیکھنا ہے نظر ہے شہرِ آرزو تک
ابھی تو رستے میں کارواں ہو
یقیں ابھی تو فقط گماں ہو
حجابِ جادہ اٹھے تو دیکھوں یہ گردِ منزل بنے تو دیکھوں
نمودِ منزل ابھی کہاں ہے
ابھی تو رستے میں کارواں ہے
نکل پڑا ہوں طلب کی رو میں صفِ کارواں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

چمن کی نکھری ہوئی روش پر ہوائیں پہلو بدل رہی ہیں
سیاہیاں بھی کرن میں ڈھل کر سحر کے سانچے میں ڈھل رہی ہیں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہو کہ جیسے نظریں پھسل رہی ہیں
نفس نفس عمرِ رائیگاں کا اسیرِ لمحاتِ دلنشیں ہے
جو رگ سے کانٹوں کی رس رہا ہے وہ زہر بھی رشکِ انگبیں ہے
ہزار کچھ ہو حیاتِ نو کی یہ چھاؤں پھر بھی گھنی نہیں ہے
کلی پہ ہیں دھوپ کی نگاہیں
یہ ابر و گل کی سلگتی راہیں

صبا ہے مصرف کے مرحلے میں ہیں ہنوز گلزار کے گلے میں
ابھی حمائل خزاں کی باہیں
کلی پہ ہیں دھوپ کی نگاہیں
کوئی مجھے راستہ دکھا دے غمِ بہار و خزاں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

نفس کم آگاہی ادیبوں کے فیضِ عرفاں میں ڈھل کے نکلے
وہ رات کی بزم میں ستارے لباس اپنا بدل کے نکلے
حقیر ذرے بھی اپنے رخ پر شعاعِ خورشید مل کے نکلے
بجا کہ اکثر اداس راتیں سحر کی میزان میں تلی ہیں
بجا کہ اکثر جواں امنگیں شرابِ احساس سے ڈھلی ہیں
ابھی کمالِ نظر کی راہیں نظر وروں پہ کہاں کھلی ہیں!
ہیں راستے پیچ و خم سے مملو
شکستہ ہے رہبری کا جادو
چراغ ہیں روشنی سے عاری یہ صبحِ دانش کی تیرہ کاری
بکھر گئے ہیں جنوں کے گیسو
ہیں راستے پیچ و خم سے مملو
ہوا ہوں میں پھر بھی گام فرسا یقین و گماں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

ابھی ہیں پیوست روحِ انساں غمِ زمانہ کے تیر شاید
فغان و شیون کے زیر سے ہے نوا گروں کا خمیر شاید
ہیں زندگی میں یہ زندگی کی قیامتیں ناگزیر شاید
لہو گلوں کا ٹپک رہا ہے ہنوز کانٹوں کی آستیں سے
ہوائیں بڑھ بڑھ کے پونچھتی ہیں پسینہ خود شمع کی جبیں سے
نہ جانے اٹھیں گے کتنے فتنے ابھی خداؤں کی سرزمیں سے
مگر مجھے اس سے واسطہ کیا
کہ راستہ ہی الگ ہے اپنا
یہ مانا ہستی گریز پا ہے حیات خوابوں کا سلسلہ ہے
ہر اک نشہ ہے خمار آسا
مگر مجھے اس سے واسطہ کیا
مجھے بلاتی ہے ایک جنت خرابۂ دو جہاں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

انشائیہ:

ولر کے کنارے

رفیق خاور

نگاہیں پرافشاں کہستاں کہستاں   نئی جنتیں ہیں خیاباں خیاباں
سپہرِ بریں کی فضائیں زمیں پر   ستاروں کے جو مرافق کی جبیں پہ
پرستاں پرستاں نئی وادیاں ہیں   زمینوں پہ اتری فلک زادیاں ہیں
نئے خمکدہ زار دامن بہ دامن   طلسماتی تالار دامن بہ دامن
پیاپے نئے زاویے کھل رہے ہیں   سمے بن رہے ہیں سمے گھل رہے ہیں
یہ بننے کا عالم یہ گھلنے کا عالم   یہ گدلانے یہ دھوپ ڈھلنے کا عالم

یکایک نظر کے مقابل وہ کیا ہے؟
یہ کیسا طلسمی دریچہ کھلا ہے؟

نگاہوں پہ کیا شعبدہ وار چمکا   کوئی پیکرِ سیمیا وار جھمکا
نیا عالمِ خلد وش رونما ہے   جمالِ ازل زیب دوشِ فضا ہے
یہ روشن جبیں جبرئیلِ امیں ہے؟   سراپا تجلی سروشِ گزیں ہے؟

یہ مدوحِ فروزاں کنارِ ولر
یہ بُراق پیکر خضر ہے خضر

وہ جھرنوں کی صورت چھلکتی ہوئی   لٹیں اُجلی اُجلی دمکتی ہوئی
لٹیں جیسے بل کھاتی موجِ ہوا   صبا اوس سے یا گہر بر قبا

منزہ ہواؤں سے پاکیزہ تر
یہ پیکِ منور خضر ہے خضر

یہ ریشم کے لچھوں کی صورت لٹیں   فدا جس پہ آئینہ پیکر بطیں
یہ طولانی امواجِ سیال ہیں   یہ لہریں روپہلی تہا جال ہیں

کہ طاؤس رقصاں حنو ماہی چنور
یہ موجِ مصور خضر ہے خضر

وہ برفانی گالوں کی سیمیں پھوار   ہمالہ کی چوٹی پہ لیل و نہار
یہ نورانی چہرہ یہ سینائے نور   سراسر حریفِ تجلائے طور

کہ فانوس روشن، سحر ہی سحر
خضر ہے خضر ہے خضر ہے خضر

"اک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ"

یہ ممکن کہ انسان "گلشن کی بہار" کا ہر پہلو دیکھے، ایک ناظر کو اکساتی ہے کہ وہ ہمالہ کی برف پوش بلندیوں سے رواں ہوا دریائے سندھ کی طرح، جو ذوق جہاں پیما کی جیتی جاگتی علامت ہے، تمام نظاروں اور شاہدوں کو آغوشِ نظر میں سمیٹتا ہوا، آگے ہی بڑھتا چلا جائے، قدرتی طور پر اس کی نظر سب سے پہلے کشمیر ہی پر پڑتی ہے اور وہ اسی کے مناظر اور مسائل کا جائزہ لیتا ہے۔ آگے چل کر وہ قدرت کے علاوہ تاریخ و تہذیب کے اُن تمام آثار کو بھی دل و نظر میں سمو لیتا ہے جن سے وہ اس پہنائے عظیم میں یا اس سے ماورا دوچار ہوتا ہے۔

یہ تمثیل گوہر ستارہ نما — یہ تمثالِ مرمر سراپا جلا
غذائے ازل کا تراشا ہوا — طلسماتی سانچے میں ڈھالا ہوا

ازل تا ابد اعتبارِ ہنر
جہاں تاب پیکر خضر ہے خضر

خضر جو ہے دن رات سیماب پا — خضر دور تک اس کا دستِ رسا
شب و روز گردندۂ خشک و تر — خضر دور تک اس کا پائے سفر

یہ صورت امر ہے امر ہے امر
یہ پیکر خضر ہے خضر ہے خضر
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے
رواں ہیں خیالوں کے دھارے پہ دھارے

بہت دور جاتی ہیں نظریں خضر کی — کمندیں فلک گیر فکر و بصر کی
یہ موجیں ہیں فلماتی[1] آئینے گویا — بدلتے ہوئے رخ پہ رخ چشم آسا

خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے
رواں ہیں خیالوں کے دھارے پہ دھارے:

یہ رنگوں کی بستی یہ روپوں کا دیس — یہ سایوں کا یہ ہلکی دھوپوں کا دیس
سیاہی سفیدی کا سنگم یہاں — کہیں برف ہے اور کہیں گھاٹیاں
ہے خنکی فضاؤں میں تیری ہوئی — عجب تازگی سب میں پھیری ہوئی
گل و گل بہاریں ہمہ رنگ و بو — شجر اور حجر صف بہ صف، سو بہ سو
وہ آوازۂ مست کبکِ دری — حسیں گلدموں کی وہ جادوگری
وہ بلبل، حواصل، وہ دراخ و سار — طیورِ نوازن ہزاروں ہزار
کہیں نعرہ زن آبشاروں کا راگ — کہیں گونجتا چشمہ ساروں کا راگ
وہ جھرنوں کا شور، اُن کے جھرنے کی شان — وہ غدار سینہ اُبھرنے کی شان
ہو تیراک جیسے کوئی غوطہ زن — فضاؤں میں پھیلائے اپنا بدن
وہ جھرنے شب و روز رستے ہوئے — کڑاکے کی سردی سے جمتے ہوئے
اور اُن سے بہے آب پرنالہ دار — عجب نالیاں مرمریں[2] بے شمار
زبانیں[3] زبانیں جمے آب کی — ہوں وہ جھالریں جیسے کمخواب کی
چکاچوند وہ برف کی سبز گوں — مسلسل نظارے سے آنکھیں ہوں خوں[4]
وہ قدرت کا گمبھیر، گہرا سکوت — خدائی کی محویتوں کا ثبوت
فضا در فضا گنگناتی ہوئی — عجب راگنی سرسراتی ہوئی
چناروں کی آپس میں سرگوشیاں — ہری پتیوں کی نواکوشیاں
چمن در چمن قمریاں قمریاں — وہ اڑتی ہوئی شمریاں شمریاں

---

[1] محاکات فلم اسٹوڈیو سے ماخوذ ہے جس میں جابجا اعلیٰ درجے کے کیمرے نصب ہوتے ہیں بعض کا رخ جلدی جلدی بدل کر منظر کے ہر پہلو کو گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ ان کیمروں کے محجوب آئینے اس قدر لچیلے ہوتے ہیں کہ وہ آنکھوں کی طرح جلدی جلدی ادھر ادھر رخ پہ رخ بدل سکتے ہیں۔

[2] سنا ہے کہ موسم سرما میں جھرنوں کا بیرونی حصہ جم کر ایک مرمریں خول بن جاتا ہے اور ان قدرتی پرنالوں میں سے پانی بہتا ہے۔

[3] بعض اوقات جھرتا ہوا پانی ایسے نظر آتا ہے جیسے ہر طرف برف کی زبانیں ہی زبانیں یا جھالریں لٹکتی ہوں۔

[4] کوہ پیماؤں کا بیان ہے کہ کبھی کبھی برف کی سبز گوں چکاچوند سے آنکھیں سوج جاتی ہیں۔

مہکتی ہوئی وادیاں وادیاں — رچی جا بجا شادیاں شادیاں
اوراں سب نظاروں کی روحِ رواں — کمالِ فسوں کاریٔ شادماں
تبسم کناں ساحرانِ جمیل — خجالت دہ کوثر و سلسبیل
وہ اعضائے سیماب وش کا گداز — کہ تصویرِ حیرت ہو آئینہ ساز

مگر مجھ سے کہتی ہے آوازِ دل
عبث ہے یہ ہنگامۂ آب و گل

فریبِ تماشا ہے یہ سب چمن — کہ شعلوں سے کہسار ہے بن کا بن
خیاباں خیاباں سراسر اجاڑ — ہیں پتھریلے تودے فقط یہ پہاڑ
پس و پیش ہے ایک ہو کا سماں — گری ہیں زبس جا بجا بجلیاں[2]
پہاڑ اے دریغا دھواں ہی دھواں! — جہاں سوز ناریٔ سناں در سناں
وہ شعلوں پہ شعلے زباں در زباں — پرندوں کے جلتے ہوئے آشیاں
مکینوں کی جاں کاہ آہ و فغاں — حسینوں کی چیخوں کی دلدوزیاں
مئے بیخودی ذرا پلا ساقیا — کہ احوالِ دوراں سے ہے جی خفا
وہ سرمست جرعے کہ ہوں غم زدا — مسلسل پیا پے دما دم پلا
نہ پہلو میں احساسِ ہستی رہے — فقط مستی و مے پرستی رہے
مگر اس نشے سے ہے حاصل ہی کیا — جو دھڑکے نہ سینے میں وہ دل ہی کیا

غزل طرزِ اظہار میں نو فزوں
پھر اس میں نہ گفتار کیسے کروں

عظمتِ تیغ و تبر کب ہوگی — یہ مہم شوق کی سر کب ہوگی
مر مٹے آگ میں جلنے والے — شمعِ سوزاں کو خبر کب ہوگی
چارۂ زخمِ جگر کب ہوگا — پرسشِ دیدۂ تر کب ہوگی
سنگ سے رقصِ شرر کب ہوگا — زندگی برق اثر کب ہوگی
نعمتِ آب بھی تقسیم ہوئی — رحمتِ عام خضر کب ہوگی
زلزلے آتے ہیں کہسار میں روز — قاہری زیر و زبر کب ہوگی
آگہی کا ہے تسلطِ شب و روز — عاشقی سینہ سپر کب ہوگی
بے اثر خونِ شہیداں کب تک — عام نفرینِ شمر کب ہوگی
راحتِ خواب بھی مفقود ہے آج — ہائے یہ رات بسر کب ہوگی
ہم بھی مشتاقِ کرم ہیں تیرے — نظرِ شوق ادھر کب ہوگی
اب تو ہے غلبۂ افواجِ ستم — مہر و الفت کی ظفر کب ہوگی
ہے نجات اپنی مسلّم اے دل! — دیکھیں یہ بات مگر کب ہوگی

خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے
رواں ہیں خیالوں کے دھاروں پہ دھارے

[1] پہاڑی جنگلوں میں آگ بڑی مشکل سے بجھتی اور مدتوں جاری رہتی ہے۔

[2] عام طور پر بجلیاں گر گر کر چٹانوں کو چکنا چور اور درختوں کو چیر ڈالتی ہیں۔ شعلوں اور بجلیوں کے اشارات کافی واضح ہیں۔

قصۂ چہار خواب

قمر جمیل

پسرِ نوح بابداں بنشست ..... تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ یہ قصہ بھی اسی پسرِ نوح، کنعاں سے متعلق ہے۔ عُر، اُنا، عرب، مضہر اور کلاخ مشہور شہر تھے، اور یہ اُن دنوں کی بات ہے جب انسانی تہذیب نے دجلہ اور فرات کی وادی میں آنکھیں کھولی تھیں۔ کنعاں اور اس کے سارے متعلقات، امرِ واقعہ کے بیان کا صرف پیرایۂ اظہار ہیں یعنی "اشارئیے"......

چار خواب، چار منظر۔۔ جو باوجود الگ الگ ہونے کے، ایک کہانی کے چار اجزا۔۔ ہر خواب MANIFEST ہو کر اپنی افتاد دستا تا ہے، پہلا خواب جنس LIBIDO کا مظہر ہے ... درمیانی دو خواب زندگی کی لطیف اقدار FINER VALUES کے مظہر۔۔ آخری خواب اِن کا اختتامیہ ہے۔

پہلا: حلقۂ یاراں میں کنعاں رات کے پچھلے پہر
بستیوں سے دور نہروں کے کنارے خیمہ زن
وہ کھجوروں کے درختوں میں ستارے خیمہ زن
بستیوں سے دور صحرا کے نظارے خیمہ زن
ابر کے ٹکڑوں میں جیسے ماہ پارے خیمہ زن
حلقۂ یاراں میں کتنے نازنیں نازک کمر

دوسرا: رقص کے ہنگام کتنے بازوؤں کا پیچ و خم
دیکھنے والوں کی نظروں میں اتر آنے کو ہے
یہ بدن کا لوچ جیسے روح بل کھانے کو ہے
یہ نظر کے سامنے کتنے ہی عالم خواب سے
جاگ اُٹھتے ہیں بہ ہر یک ارتعاشِ تارِ چنگ
رقص کے ہنگام اُبھر آتے ہیں کتنے شوخ رنگ
اور کتنے تیز ہو جاتے ہیں نظروں کے خدنگ
یہ خیالوں کے گلستاں یہ نگاہوں کے قفس
رقص کے یہ دائرے شعلہ بداماں ہر نفس
جیسے زیر و بم میں کھوئی جا رہی ہو کائنات
جیسے نغمہ بن کے سوئی جا رہی ہو کائنات

تیسرا: رسم ادا ہونے نہ پائی تھی کہ خیموں کے قریب
شہ نشیں کی سمت دوڑے اسطرح وحشی غلام
اس طرح چلا اُٹھے مشعل بکف حبشی نقیب
جیسے دنیا ایک بھیانک خواب میں گم ہو گئی
کتنے ارماں کتنے غم اشکوں میں ڈھل کر رہ گئے
کتنے لب حسرت گزیدہ، کتنی آنکھیں اشک ریز
عین جشنِ رسم کے ہنگام کنعاں کا گریز
جیسے چشم و لب کے وہ منظر پگھل کر رہ گئے
جیسے ساغر آئے ہاتھوں میں مگر ٹوٹے ہوئے
کتنے نغمے خامشی میں یوں مچل کر رہ گئے
چھیڑ یوں مت زندگی کے بال و پر ٹوٹے ہوئے
تار ہیں اس ساز کے اے نغمہ گر ٹوٹے ہوئے

چوتھا: پھر سوئے شہر آ نا ان کجکلاہوں کا ورود
پھر نیا پہلو بدلتا ہے وہی چرخ کبود
جمع ہیں بہرِ کشودِ عقدہ ہائے جانگسل
یہ قبیلوں کے شیوخ پختہ عمرِ جاں فروش
وادیِ دجلہ کے شہری، کُرد کے خانہ بدوش
لڑ رہے ہیں اپنی اپنی کج کلاہی کے لئے
کون دارو بن کے آئے کم نگاہی کے لئے
آدمی کے رُوپ میں یہ آدمی کے اہرمن،
میرِ عُر، سردارِ عنبر، اور آقائے کلاخ،
گرمیِ گفتار سے ممکن نہیں دل کا رفو،
گفتگو سے اور بڑھ جاتا ہے جوشِ گفتگو

سعیٔ مشاطہ رہینِ زلفِ پرخم ہو گئی
یعنی محفل صلح کی کوشش میں برہم ہو گئی

الفاظ اور طرزِ معاشرت

محمد اقبال سلمان

ادب یعنی علم زبان کے کئی شعبے ہیں، مثلاً: صرف، نحو، لغات، عروض، انشا، معانی اور بیان وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سب سے بڑا درجہ لغات کا ہے۔ لغات یعنی الفاظ کی ایک اہمیت تو یہ ہے کہ وہ ہمارے خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہیں اور دوسری اہمیت یہ کہ وہ ہمیں اپنے اور دوسروں کے ماضی کو پہچاننے میں بڑی قیمتی مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے پیرائے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ کے ذریعے ہم کسی قوم کی تہذیب و معاشرت اور عقائد و رسوم کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس دعوے کا مقصد یہ نہیں کہ تاریخ کوئی غیر ضروری مضمون ہے۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ خاص طور پر اس حد تک کہ اس سے ہمیں تہذیبی یا سیاسی حوادث کی ترتیب زمانی کا علم حاصل ہوتا ہے، جو مطلق الفاظ کے مطالعے سے ممکن نہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ وقت کی تعیین کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، تو صرف الفاظ کے مطالعے سے ہم تاریخی واقعات تک پہنچ سکتے ہیں۔ پھر الفاظ کی زبانی جو واقعات ہمارے علم میں آئیں گے، ان کی صحت، تاریخی صحت سے قابل ترجیح ہوگی، کیونکہ تاریخ جانب داری، انتقام، ظن و تخمین اور سہو و خطا سے مبرا نہیں۔ الفاظ کا دامن ان عیوب سے بالکل پاک ہے۔ وہ واقعات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ واقعات کو غلط یا جانب دارانہ رنگ میں پیش کرنا ان کا کام نہیں۔

اس موقع پر یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کسی ٹھوس دلیل سے یہ واضح کیا جائے کہ الفاظ کا مطالعہ، تاریخ کے مطالعے کا قائم مقام ثابت ہو سکتا ہے۔ عربی سال کے مہینوں کے ناموں پر غور کیجئے۔ اس میں جمادیات کے دو مہینے ہیں، جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ۔ جمادی کا ماخذ جمد ہے، جس کے معنے ہیں پانی کا سردی سے جم کر یخ ہو جانا۔ جدید عربی میں جمد کا لفظ قدرتی اور مصنوعی دونوں قسم کی برف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں موسم سرما کے مہینے ہوئے۔ اب ربیع الاول اور ربیع الآخر کو لیجئے۔ "رمضان" کا مادہ رمض ہے یعنی گرمی، اور شوال شول سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "اونٹنی کا دودھ کم ہو جانا یا سوکھ جانا۔" اس مہینے میں چونکہ پانی کے چشمے سوکھ جاتے تھے، اس لئے یہ نام رکھا گیا۔

اب ان چھ مہینوں کے ناموں پر غور کرنے سے یہ نتائج ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ کسی زمانے میں عرب ایک سرد علاقہ تھا، جیسا کہ جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ کے معنوں سے ثابت ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا موسم گرم ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج وہ دنیا کے سخت گرم خطوں میں شمار ہوتا ہے۔

۲۔ عربی سال کسی زمانے میں شمسی سال تھا، کیونکہ اس کے بعض مہینوں کے ناموں سے موسمی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔ موجودہ قمری سال کے مہینے مختلف موسموں میں چکر لگاتے رہتے ہیں، انہیں کسی خاص موسم سے منسوب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ اہل عرب جنگی ضروریات کے لئے، مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے سال میں موسموں کا تو ذکر ہے لیکن موسمی ترتیب مفقود ہے۔

یہ تمہید جو صرف لفظوں کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے۔ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ الفاظ کس خوبی سے نہ صرف تاریخ کو بلکہ قدرتی حالات اور موسموں کی کیفیت تک کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ ان کی اس ہمہ گیر صلاحیت کے پیش نظر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ کسی واقعے کو نظر انداز کر سکتی ہے، لیکن الفاظ کی نظر سے وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔

اب ہمیں موضوع کے مطابق یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ الفاظ رسم و رواج اور تہذیب و معاشرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے کوئی حرج نہ ہوگا، اگر ہم باقی ماندہ عربی مہینوں پر بھی غور کرلیں۔ عربی سال کا ایک مہینہ "محرم" ہے۔ یہ لفظ "حرم" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں: ممنوع ہونا۔ اس مہینے میں جنگ و قتال چونکہ حرام ہے، لہٰذا اس کا نام محرم رکھا گیا۔ دوسرا مہینہ صفر ہے اور صفر کے معنی ہیں، خالی ہونا۔ اہلِ عرب اس مہینے میں جنگ کے لئے بستیوں کو خالی کر دیتے تھے۔ رجب کے معنی عزت و احترام کے ہیں۔ اس مہینے میں بھی جنگ ممنوع تھی۔ شعبان، شعب سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں منتشر ہونا۔ اس مہینے میں اہلِ عرب معاش یا پانی کی تلاش میں منتشر ہو جاتے تھے۔ ذوالقعد عربی سال کا گیارھواں مہینہ ہے، قعد کے معنی ہیں، بیٹھنا، اہلِ عرب اس مہینے میں جنگ سے ہاتھ اٹھا کر گھروں میں بیٹھ جاتے تھے، اس لئے یہ نام رکھا گیا۔ ذوالحجہ بارھواں قمری مہینہ ہے، جس میں وہ بیت اللہ کی زیارت کرتے تھے ۔

آپ نے دیکھا کہ ان چھ مہینوں کے ناموں سے جن کا تعلق موسم سے نہیں، عربوں کی معاشرتی زندگی کا تصور کرنے میں کتنی مدد ملتی ہے یعنی، ان کے ہاں جنگ و جدال کو ایک قومی اہمیت حاصل ہے۔ اگر دو قبیلوں کے درمیان ایک دفعہ لڑائی چھڑ جاتی، تو انتقام در انتقام کے طور پر کئی کئی پشتوں تک ختم ہونے کا نام نہ لیتی۔ اس صورتِ حال نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ باہمی رضامندی سے، سال کے چند مہینے پر امن رہنے کے لئے مقرر کرلیں۔ اس پر بھی ان کی جنگ جوئی کے جذبے کو تسکین نہیں ہوتی تھی اور وہ امن اور جنگ کے مہینوں کو اپنے مقصد کے مطابق آگے پیچھے کر دیتے، جسے اصطلاح میں نسیئی کہا جاتا تھا۔ اسلام آیا، تو اس نے اس قباحت کا خاتمہ کیا ۔

اب ہم عرب سے نکل کر برصغیر پاک و ہند کی طرف آتے ہیں، لیکن یہاں کی طرزِ معاشرت کا اندازہ لگانے کے لئے مہینوں اور دنوں کے نام ہمیں کوئی مدد نہیں دے سکتے، کیوں کہ ان کا تعلق اجرامِ فلکی سے ہے، تاہم ان پر غور کر کے ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچ سکتے ہیں کہ یہاں کے باشندے اپنی تقدیر کو ستاروں کے اثرات کے تابع سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں علم نجوم یا جوتش کو بڑی اہمیت دی گئی، جس نے یہاں کے عوام میں تقدیر پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے رجحانات کو فروغ دیا۔ سعی و تدبیر پر ان کا اعتماد کمزور ہوگیا اور وہ سستی اور کاہلی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ یہ ضعیف الاعتقادی ادب میں بھی در آئی، یہاں آپ جس بھی شاعر کا کلام سنیں گے، وہ ستاروں کی آماجگاہ یعنی فلک کی شکایت کرتا ہوا نظر آئے گا، اسے ظالم، ستمگر، بے مہر اور ناہنجار قرار دے گا۔ اسی فلک سے فلاکت، فلاکت زدہ اور مفلوک الحال جیسے لفظ بنائے گئے اور اسے تمام مصیبتوں، ہلاکتوں اور آفتوں کا منبع قرار دیا گیا۔ سماجی طبقات کے مذکور میں شودر، اچھوت، ملیچھ، بھنگی، چمار اور چوہڑا ایسے تحقیر آمیز الفاظ کے برعکس ہماری معاشرت میں مہتر یا حلال خور کا نام دیا گیا، نائی کو خلیفہ کا اور ڈوم کو میراثی کا۔ یہ ہماری قوم کی اخوت پسندی کی دلیل ہے۔

"برات" کا لفظ بھی ایک رسم ہی کا مظہر ہے۔ اصل میں یہ "بردلت" تھا۔ "بر" کے معنی "دولھا" اور "دات" کے معنی "آتا ہے"۔ لفظ نے رسم کی خود تشریح کردی ہے ۔

برات کے بعد نکاح کا مرحلہ آتا ہے اور "نکاح" کے لغوی معنے ہیں "کسی عورت سے شادی کرنا" ۔

"آرسی مصحف" کی رسم، زندہ رسموں میں شمار ہوتی ہے۔ "آرسی" آئینے کو کہتے ہیں اور "مصحف" قرآن مجید کو۔ نکاح کے بعد دولھا اور دلھن کو ایک دوسرے کے سر جوڑ کر آمنے سامنے بٹھا دیا جاتا ہے۔ ان کے اوپر ایک سرخ دوپٹہ ڈال دیتے ہیں اور دونوں کے درمیان آئینہ اور قرآن مجید میں سے سورۂ اخلاص نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ آئینہ رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور سورۂ اخلاص کا یہ کہ میاں بیوی میں خلوص و محبت کا رشتہ قائم رہے ۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں جہیز کا بھی ذکر آئے گا۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادہ جھز ہے جھز کے معنی ہیں "مال و سامان مہیا کرنا۔ اسی سے "جہاز" بنا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں جب بحری جہازوں کا رواج ہوا، تو وہ صرف تجارتی مال کی

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

جائزہ:

ترقی کی راہوں پر

(پاکستان کی دس سالہ سرگرمیوں پر ایک نظر)

مسعود اختر صدیقی

آج سے دس سال قبل یعنی ۱۹۴۷ء میں جبکہ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اس کے ہر گوشے اور ہر علاقے اور ترقی کے ہر میدان میں خلا ہی خلا پایا جاتا تھا، مثلاً ساری دنیا کی پٹ سن کی پیداوار میں پاکستان ستر فی صدی کا مالک تھا لیکن اس کے پاس پٹ سن کو استعمال کرنے کے کارخانے نہ تھے کہ ملک کی دولت میں اضافہ کا باعث بنتے۔ وہ بہت کافی مقدار میں کپاس پیدا کرتا تھا لیکن کپڑے اور سوت کے کارخانے بہت ہی کم تعداد میں چل رہے تھے۔ اسی طرح زراعت کے طریقے صدیوں سے جوں کے توں چلے آ رہے تھے اور مشینی طریقۂ کاشت سے وہ ذرا بھی آشنا نہ تھا۔ عمدہ زراعت کے لئے ذرائع آبپاشی میں ترقی کرنا ایک لابدی ضرورت تھی اس لئے کہ پاکستان کے تمام دریاؤں کے چشمے بھارت کی حدود میں واقع تھے۔ اسی طرح قدرتی ذرائع آمدنی بھی بالکل تاریکی میں پڑے تھے۔ برقابی طاقت اگرچہ بڑی وافر موجود تھی لیکن اسے کسی کام میں نہیں لگایا گیا تھا۔ ذرائع آمد و رفت بالکل ہی نامکمل اور ناکافی تھے۔ کراچی اور چاٹگام کی بندرگاہوں میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ سارے پاکستان کی درآمد کو سنبھال سکیں۔ بہرکیف ہر شعبۂ زندگی میں کچھ نہ کچھ کمی تھی جس کو دور کرنا پاکستان کا فرضِ اولیں تھا۔

زراعت

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومتِ پاکستان کے لئے لازمی تھا کہ وہ زراعت کو ترقی دے اور مصنوعات پاکستان کو زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد بڑھائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر اس نے حصول آزادی کے فوراً بعد ایک مجلس ترقیات قائم کر دی جس کے ذمہ تمام ترقیاتی منصوبوں کا جائزہ لے کر ان کی منظوری دینا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں حکومت نے اسی مجلس کی جگہ ایک منصوبہ بندی بورڈ اور ایک اقتصادی مجلس شوریٰ قائم کی۔ پاکستان کے شش سالہ منصوبے کو منصوبۂ کولمبو کا جزو قرار دیا۔ اس کی میعاد جولائی ۱۹۵۱ء سے جون ۱۹۵۷ء تک رکھی گئی اور اس کو پورا کرنے کے دو ارب ساٹھ کروڑ روپے کے خرچ کا تخمینہ لگایا گیا۔

ترقیاتی منصوبے

کوریا کی جنگ کی وجہ سے اس منصوبہ کی تکمیل میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی رہیں اس وجہ سے حکومت پاکستان نے ۱۹۵۱ء میں صرف دو سالہ پروگرام بنایا جس پر عملدرآمد کرنے میں پوری توجہ دی گئی۔ ۱۹۵۳ء میں ایک دوسرا منصوبہ بندی بورڈ بنا جس نے جو کچھ ترقی اب تک ہوئی تھی اس کا اور پاکستان کے وسائل کا پورے طور پر جائزہ لیا اور اپنی سفارشات میں ہر اس ممکن بات پر جو ملک اور حکومت کی ترقی کا باعث ہو سکے، زور دیا۔

اس کے بعد مئی ۱۹۵۶ء میں ایک پنج سالہ منصوبہ پھر بروئے کار لایا گیا جس کے خرچ کا تخمینہ گیارہ ارب ساٹھ کروڑ روپیہ لگایا گیا۔ اس کے ذریعہ ملک کی آمدنی میں ۲۰ فی صدی اضافہ کی اور پاکستان کے ہر شخص کی آمدنی میں ۱۲ فی صدی اضافہ کی امید ظاہر کی گئی۔ اس مجوزہ منصوبہ پر عوام، عمال حکومت، مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں سے رائے مانگی گئی۔ اپریل ۱۹۵۷ء میں ملک کی اقتصادی کمیٹی نے ثانیہ پنج سالہ منصوبہ کو مکمل طور پر جانچا اور اس کے سماجی، اقتصادی اور مادی اندازوں اور طریق عمل کی منظوری دے دی۔ گیارہ ارب ساٹھ کروڑ کے بجائے دس ارب اسّی کروڑ روپیہ کا تخمینہ برقرار رکھا۔ اس کے ذریعہ ملک کی آمدنی میں بجائے ۲۰ کے صرف ۱۵ فی صدی اضافہ کی اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے بجائے ۱۲ فی صد کے صرف ، فی صد کی فی کس آمدنی میں اضافہ کی امید ظاہر کی گئی۔ اس پنج سالہ منصوبہ میں زراعت، صنعت و حرفت، برقی اور آبی طاقتوں کی ترقی پر خاص طور سے زور دیا گیا۔

غیر ملکی امداد

اس کے ماسوا پاکستان کو جو امداد بیرونی ممالک سے ملی ہے اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور وہ ملک کے حالات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ دسمبر ۱۹۵۶ء تک پاکستان کو تین ارب بیالیس کروڑ روپیہ اقتصادی امداد اور قرضہ کی صورت میں باہر سے مل چکا ہے۔ اقتصادی امداد کے ضمن میں صرف مالی امداد ہی نہیں بلکہ فنی امداد بھی شامل ہے۔ فنی امداد میں بیرونی ممالک کے فنی ماہرین اور پاکستانی طلباء کو بیرونی ممالک میں تربیت اور تعلیم کے لئے بھیجنا بھی شامل ہے۔ اس طرح پاکستان کی صنعتی پسماندگی کو دور کرنے پر پوری پوری توجہ دی جا رہی ہے۔ جون ۱۹۵۶ء تک تقریباً ۸۰۰ فنی ماہرین نے پاکستان میں فنی امداد کے کام کیا ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ طلبائے پاکستان بیرون پاکستان میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ ان تمام طلباء کو تمام تر ترقیاتی منصوبوں سے متعلق تعلیم دی گئی ہے۔ پاکستان کو یہ بیرونی امداد خاص طور سے امریکہ، آسٹریلیا، کناڈا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، عالمی بینک، اقوام متحدہ کے متعلق شعبہ جات، فورڈ فونڈیشن، سویڈن، مغربی جرمنی اور دیگر ممبران کولمبو پلان سے حاصل ہوئی ہے۔

پاکستان کا شمار کم ترقی یافتہ ملکوں میں تھا۔ چنانچہ اسکو بھی اقتصادی حالات سے دوچار ہونا پڑا جو ملک کو تباہی کی طرف لئے جا رہے تھے۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد بین الاقوامی اقتصادی حالات کچھ اس طرح اثر پذیر ہوئے کہ ایک ملک دوسرے ملک سے قریب ہو گیا اور آپس میں سمجھوتے کی صورتیں رونما ہونے لگیں۔ ادارۂ اقوام متحدہ کی کوششوں کی بنا پر دنیا کے مختلف خطوں میں ایسی انجمنیں بن گئیں مثلاً معاہدۂ بغداد کی اقتصادی کمیٹی، سیٹو کے ماہرین اقتصادیات کی کمیٹی وغیرہم، ان کے ذریعہ مختلف اقوام میں اقتصادی ربط و اتحاد قائم ہو گیا۔ ایسی تمام انجمنوں کے مقاصد صرف ممالک مختلفہ میں اقتصادی اشتراک کے راستے ہموار کرنے تھے۔ پاکستان ایسے تمام اداروں میں شرکت کرتا رہا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں تجارت ترقی کرنے لگی۔ ترقی یافتہ ممالک سے ہر طرح کی فنی اور اقتصادی مدد پہنچنے لگی، اور اس کے ہمدرد ملکوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ پاکستان اس کا بہت کوشاں ہے کہ اس کے تعلقات دوسرے ممالک سے دوستانہ رہیں چنانچہ اس نے تمام ہی بین الاقوامی معاملات میں بہت دلچسپی سے حصہ لینا شروع کیا۔ آج ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان عالمی معاملات اور سیاست حاضرہ میں ایک وقیع درجہ پر فائز ہے۔

ترقی دیہات

اپنے تمام ترقیاتی منصوبوں میں اس وقت پاکستان کی توجہ خاص طور سے عوام پاکستان کی فلاح و بہبود پر مبذول ہے۔ بدیں وجہ دیہات کی زرعی اور صنعتی ترقی پر خاص طور سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ ہماری مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں نے ایک مکمل پروگرام کے تحت دیہات کے رہنے والوں کے حالات درست کرنے کی تیزی سے مہم شروع کر دی ہے۔ اس پروگرام کے ذریعہ دیہی آبادی کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ ان کے خود ذرائع، وسائل اور صلاحیتیں اس قدر کافی ہیں کہ وہ حکومت کی مدد کے بغیر بھی اپنی حالت آپ درست کر سکتے ہیں۔ وہ پرانے اور دقیانوسی طریقے جو دیہی آبادی میں جمود کی کیفیت پیدا کئے ہوئے تھے اب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی اور یقین کی لہر دوڑائی جا رہی ہے جو آگے چل کر ان کی زندگی کو روشن اور کامیاب تر بنا دے گی۔

دیہی امداد کے پروگرام کے مخصوص اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں:۔

(۱) لوگوں میں جذبۂ ایثار، ایجاد و ترقی، رہنمائی اور تعاون کو اجاگر کرنا تاکہ وہ اپنی اقتصادی، سیاسی، شہری اور سماجی ساکھ کو برقرار رکھ سکیں۔

(۲) سماجی جد و جہد کے ذریعہ ان کا معیار زندگی بلند کرنا۔

(۳) دور حاضرہ کے فنی اور مشینی طریقوں سے زرعی پیداوار اور دیہاتی صنعت و حرفت میں اضافہ کی صورتیں پیدا کرنا۔

(۴) دیہاتوں میں درسگاہیں، ہسپتال اور دیگر ذرائع آرام و آسائش خود انہی کی کوششوں اور وسائل سے قائم کرنا۔

(۵) حکومت کے ایسے محکمہ جات سے دیہات کے لوگوں کا رابطہ قائم کرنا جو ان کی فلاح اور بہبود کا ذریعہ بنیں۔

(۶) دیہات کے لوگوں کو اس قابل بنا دینا کہ وہ حکومت اور ملک کے لئے کارآمد ثابت ہوں۔

ان مقاصد کے پیش نظر اولین ضرورت یہ تھی کہ تربیت پائے ہوئے لوگ موجود ہوں جو امداد دیہی کے پروگرام کو اچھی طرح سمجھتے اور یقین رکھتے ہوں تاکہ وہ دیہات میں اس طرح بھائی چارہ سے کام کریں کہ وہاں کے لوگ انہیں اپنا رہنما اور دوست تصور کریں نہ کہ بطور اجنبی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی فراہمی جب ہی ممکن تھی جب کہ تربیت پانے والوں کے واسطے متعدد ادارے قائم ہوں۔ پاکستان میں ایسے ادارے کم و بیش نو جگہ قائم کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

مغربی پاکستان میں:۔ (۱) لالہ موسیٰ (۲) لائل پور (۳) پشاور (۴) ٹنڈو جام (۵) کوئٹہ (۶) رحیم یار خاں۔

مشرقی پاکستان میں:۔ (۱) تیج گاؤں (۲) گائے بندھا (۳) دولت پور

ان اداروں میں ۸۰۰ مرد اور ۲۰ خواتین زیر تربیت ہیں۔ ان کو وہاں زراعت، مویشیوں کی دیکھ بھال، جنگلات، ماہی گیری، صفائی، تندرستی، تعلیم، دیہی صنعت و حرفت، امداد باہمی، رسل و رسائل ذرائع آمد و رفت، گھریلو اقتصادیات اور جملہ فلاح و بہبود کے طریقے اور اصول سکھائے جاتے ہیں تاکہ وہ یہی اصول دیہاتی علاقوں میں پھیلا دیں اور پاکستان کے عوام کا معیار زندگی بلند ہو جائے۔

توسیع تعلیم

اس معیار زندگی کو بلند کرنے کے واسطے حکومت کی توجہ نہ صرف دیہاتوں کی طرف مبذول ہے بلکہ وہ تمام پاکستانی شہریوں کو شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتے دیکھنا چاہتی ہے اور اسی وجہ سے اس کی خاص توجہ تعلیم پر ہے۔ ۱۹۵۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں صرف ۱،۳۰،۵۸،۳۹۰ یعنی ایک کروڑ چالیس لاکھ کے لگ بھگ آبادی پڑھے لکھے لوگوں کی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کل آبادی میں تقریباً ۱۹ فی صد ایسے لوگوں کی تھی لیکن حکومت کا منشا عوام پاکستان کے درمیان سے جہالت اور تاریکی کو دور کرنا تھا اس لئے اس نے بڑی شد و مد سے اس کام میں دلچسپی لینی شروع کی اور زیادہ سے زیادہ اسکول اور کالج قائم ہونے لگے ہیں

لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کی تمام آسانیاں اور سہولتیں مہیا کی گئیں۔ اس جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ پاکستان میں اس وقت ۴۴۰۸۱ ابتدائی اسکول، ۵۴۹۵۷ ثانوی اسکول اور فنی اسکول ۴۰۰ کالج ہیں جن میں مختلف مضامین پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ چھ یونیورسٹیاں بھی مختلف مقامات پر ہیں یعنی ڈھاکہ، کراچی، پشاور، لاہور، حیدرآباد، (سابق سندھ) اور راج شاہی۔ صرف متذکرہ بالا جامعوں میں کم و بیش پچاسی ہزار طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان اداروں کا معیار بلند کرنے کے لئے مرکزی حکومت ان کو پچھلے سات برس سے مخصوص عطیات دے رہی ہے جو صوبجاتی حکومت کے عطیات سے بالکل علیحدہ ہیں۔ دوسری بات جو حکومت نے اس ضمن میں کی ہے وہ حکومت امریکہ سے ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے پاکستان کے مدرس، پروفیسر، ماہرین تعلیم، مشیر، طلباء اور تعلیمی ساز و سامان کا امریکہ کے ایسے ہی لوگوں سے تبادلہ کرنا ہے۔ یہ منصوبہ پاکستان اور امریکہ دونوں مل کر اپنے خرچ سے چلا رہے ہیں۔ ۱۲۲ ادارے اس منصوبہ میں آج کل شریک ہیں اور اس میں روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی ہے۔

مدرسہ لتعلیم امور خانہ داری

حکومت پاکستان نے ایک کالج خانگی تعلیمات کا کراچی میں قائم کیا ہے۔ جس کے واسطے ۱۹۵۵ء میں چھ لاکھ کا عطیہ اس کی عمارت کے لئے، اسی ہزار روپیہ دیگر ضروریات کے لئے اور چھ لاکھ پچیس ہزار روپیہ ۱۹۵۶-۵۷ء کے لئے اور فروری ۱۹۵۷ء میں ۱۲۵۰۷ روپیہ برائے ادائیگی کسٹم ڈیوٹی اس ساز و سامان کی جو اس کالج کو فورڈ فونڈیشن سے حاصل ہوئے۔ اس کالج میں وہ مدرس ہیں جو غیر ممالک سے خصوصی تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں۔

نئے تعلیمی ادارے

اسی طرح حکومت نے محسوس کیا کہ کراچی میں مردوں کے واسطے کالجوں کی تعداد بہت ہی کم اور تعلیم حاصل کرنے کی خواہش روز افزوں ترقی پر ہے۔ بدیں وجہ اس نے جس طرح خواتین کے واسطے مرکزی کالج قائم کئے اسی طرح مردوں کے واسطے بھی ایک کالج قائم کر دیا جو ستمبر ۵۶ء سے شروع ہو گیا ہے۔ یہ کالج ۱۹۵۵ء ہی میں قائم ہو جاتا لیکن چونکہ اچھے مدرس نہیں مل سکتے تھے کالج جاری نہیں کیا جا سکا۔ اب اس کے لئے پرنسپل اور دیگر مدرسین کا تقرر عمل میں آ چکا ہے۔ اور کالج جاری ہو گیا ہے جس میں ۲۰۰ طلباء فنون اور ۴۰ طلباء سائنس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

کراچی یونیورسٹی

کراچی یونیورسٹی کو بھی حکومت نے کافی امداد پہنچائی۔ ۵۱-۱۹۵۲ء میں ۴ لاکھ ۵۲-۱۹۵۳ء میں بھی ۴ لاکھ ۵۴-۱۹۵۳ء میں ۸۰ لاکھ ۵۵-۱۹۵۴ء میں ایک کروڑ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ایک کروڑ دس لاکھ اور ۵۷-۱۹۵۶ء میں دو کروڑ روپیہ دے چکی ہے۔ ۱۹۵۷ء میں کراچی یونیورسٹی کے واسطے بیس لاکھ روپیہ اس کے ساز و سامان کے واسطے اور بیس لاکھ روپیہ اس کی عمارت کے لئے بجٹ میں تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے لئے حکومت نے بارہ ہزار ایکڑ زمین بھی کراچی کے قریب ہی دے دی ہے۔ اس یونیورسٹی کے واسطے دو ہوسٹل جن کا افتتاح صدر پاکستان نے کیا ہے، بن رہے ہیں۔

ثانوی مدارس

حکومت پاکستان نے اپنے تعلیمی منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے غیر سرکاری ثانوی اسکولوں کو تین لاکھ روپیہ ان کی عمارتوں پر خرچ کرنے کے لئے عطا کیا ہے۔ خاص کراچی میں ایک دارالفنون (پالی ٹیکنیک) بھی قائم کیا ہے جس کے لئے ۱۰۲ ایکڑ اراضی بھی دے دی ہے۔ اس ادارے کی عمارت کا تخمینہ ۸۵ لاکھ روپیہ ہے جس میں سے تیس لاکھ روپیہ اس کے کارخانوں، دارالتجربوں، بجلی گھروں، اور درسگاہوں وغیرہ کی تعمیر پر خرچ ہو چکا ہے۔

سماجی بہبود

ہمارے اغراض و مقاصد میں پہلا کام عوام کی بہبود اور ان کی روزانہ کی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے صرف حکومت کی توجہ ہی کافی نہیں تاوقتیکہ عوام خود اپنی بہبود کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہوں۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے مثل اور تمام ترقی پسند ملکوں کے یہ ضروری سمجھا کہ عوام کو اپنے حالات درست کرنے کی تربیت دینا از خود بہت ضروری ہے تاکہ وہ اپنی بساط اور وسائل کے مطابق اپنی ہی کوششوں سے زندگی کے معاملات حل کر سکیں۔ یہی احساس بہبود معاشرہ کے اولین اور ضروری اصول ہیں جو دور حاضرہ میں بہت زیادہ ترقی پا چکے ہیں۔

انہی تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ کے شعبۂ عملی بہبود کو پاکستان میں دعوت عمل دی اور اس طرح سماجی بہبود کا منصوبہ مرتب ہوا جو اقوام متحدہ کے ایک مشیر کے تحت عملی جامہ پہننے لگا۔ ادارۂ اقوام متحدہ کے ماہرین بہبود سماج کے تحت اس کے تعلیمی پروگرام کراچی اور ڈھاکہ میں شروع کئے گئے۔ لاہور یونیورسٹی میں ۱۹۵۴ء سے اس کے درس دئے جانے لگے اور ۱۹۵۶ء میں ۲۳ طلباء نے وہاں سے اعلیٰ قابلیت کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اسی طرح ڈھاکہ میں بھی ایسے ہی تعلیمی پروگرام شروع ہونے والے ہیں۔ ان تمام جدوجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کے ۱۲۰۰ اشخاص بہبود سماج کی تعلیم مکمل کر چکے ہیں۔ کئی پاکستانیوں نے پاکستان سے باہر بھی اس کی تربیت حاصل کی ہے۔ اسی ادارہ کے تحت سماج میں کام کرنے کے لئے دو ملی وفود قائم کئے گئے ہیں جو کراچی اور ڈھاکہ میں سرگرم عمل ہیں۔

طبی امداد و علاج: جب پاکستان بنا تو اس کو عوام کی صحت کی دیکھ بھال کرنے میں بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے پاس حکیم اور ڈاکٹر تھے اور شفاخانے تھے اور دوائیں جو عوام کے استعمال میں آسکتیں۔ تمام مرکزی ادارے جو حفظان صحت سے متعلق تھے تقسیم ہند کے وقت بھارت کے قبضے میں رہ گئے

آئینۂ پاکستان

(چند اہم واقعات
جستہ جستہ تصویروں میں)

قائداعظم کے ہاتھوں
بنگال آئل ملز کا افتتاح

شہید ملت نے پہلی اسلامی اقتصادی کانفرنس کا افتتاح کیا

پاکستان انٹر نیشنل ائیر لائنز کا افتتاح

فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور کا سنگ

پنج سالہ منصوبہ پر پریس کانفرنس

قومی اسمبلی میں وحدت مغربی پاکستان کا بل ←

کراچی تک سوئی گیس کی آ

قومی اسمبلی میں طریق انتخاب کا بل
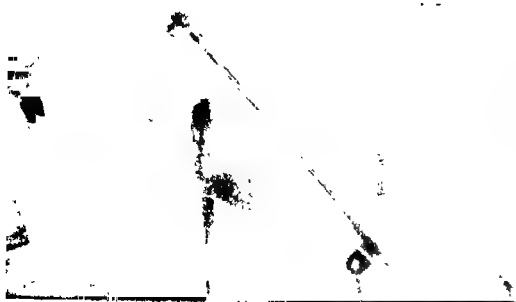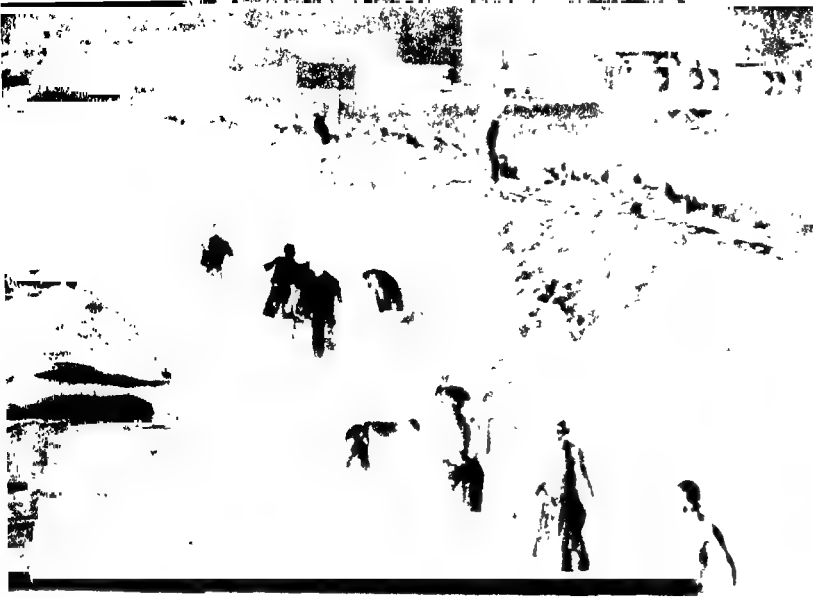
کراچی میں نئے مچھلی بندر کی تعمیر

قائداعظم جاپان ، داؤد کاٹن ملز کراچی میں

ملک کی بڑھتی ہوئی تجارت کے پیش نظر کراچی کی نئی بندرگاہ میں توسیع کی جا رہی ہے

ایچ ایم سلک ملز کراچی میں امریکی صحافی آلات کا معائینہ کر رہے ہیں
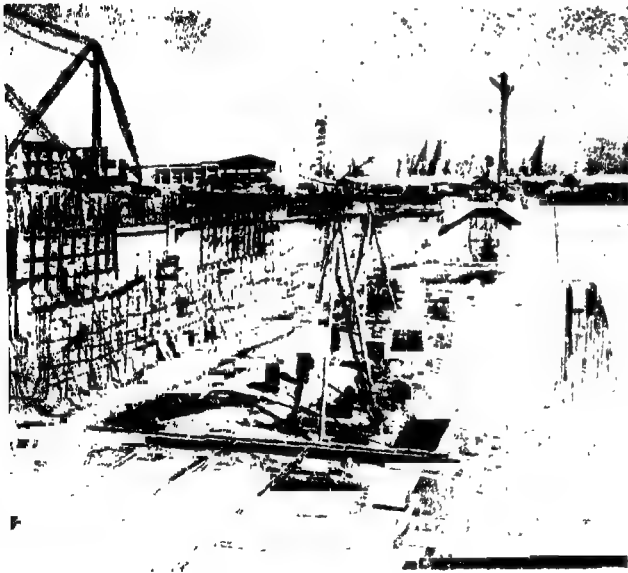
ایک اور نئی سیمنٹ فیکٹری (داؤد خیل)

جناب ممتاز حسن ، سکریٹری فنانس و صدر ریونیو بورڈ نے کراچی میں ایک نئے کسٹم ہاؤس کا سنگ بنیاد رکھا

ترقی کی راہوں پر
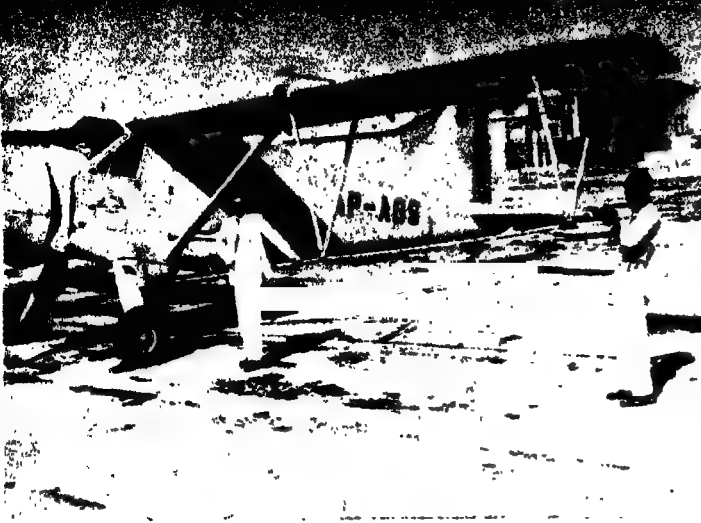
ی اصلاح کے لئے ہوائی جہازوں کے ذریعے کیڑے مارنے کی مہم

مشرقی پاکستان میں سیلابوں کی روک تھام کے لئے دلدل
صاف کرنے والے جہازوں کا استعمال
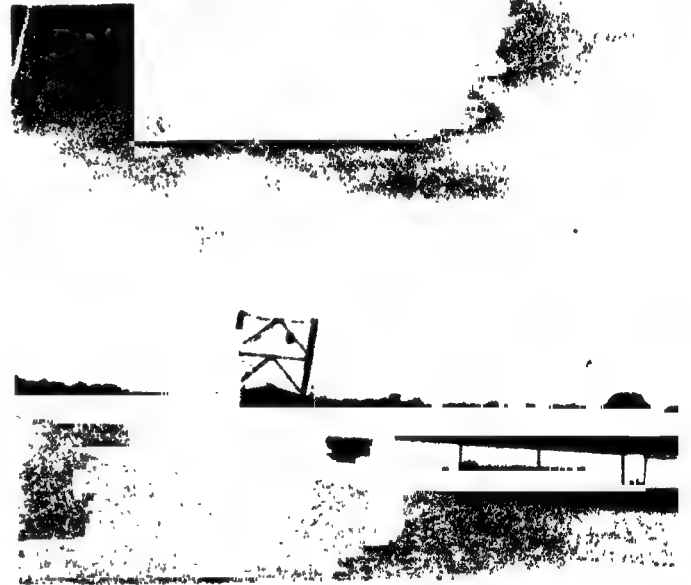
دیہی ترقی ۔ ایک کسان کا گھر اور جدید فارم

نارائین گنج (ڈھاکہ) کے ایک جوٹ مل کا اندرونی منظ

موٹا کاغذ بنانے کا کارخانہ (نوشہرہ)
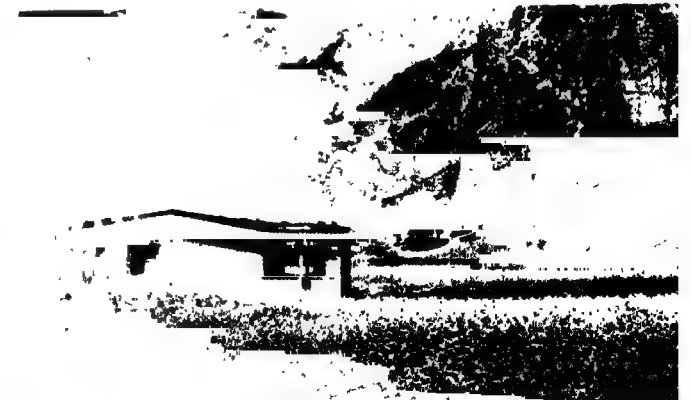
عوامی آرٹ

(مشرقی پاکستان)

گھاس کا بنا ہوا پنکھا

مٹی کا طشت :
رنگین نقش اور گلکاری
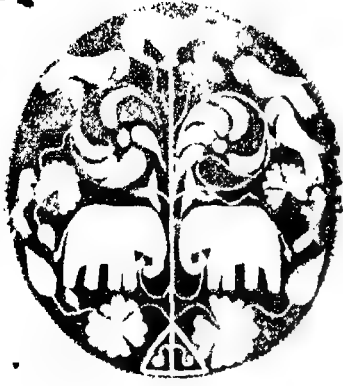
مٹی کا ہاتھی

”ہزار جامہ“ پر ”کنتھے“ کی کڑھائی

فرش پر آرائشی نقوش (چاول کی بدی سے بنائے ہوئے)

”سازندے“
(مٹی کے
نفیس
کھلونے)

میں جو ڈاکٹر متعین تھے وہ سب کے سب غیر مسلم تھے اور وہ پاکستان سے جا چکے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ پنجاب کے ۱۰۰ ہسپتالوں میں سے پاکستان بننے کے وقت ۷۰ ایسے بھی ہسپتال تھے جو بغیر کسی میڈیکل آفیسر کے چل رہے تھے۔

صحت عامہ

چنانچہ پاکستان میں نومبر ۱۹۴۷ء میں پہلی کل پاکستان کی کانفرنس لاہور میں، دوسری جنوری ۱۹۵۱ء میں بمقام ڈھاکہ اور تیسری اگست ۱۹۵۶ء میں کراچی میں منعقد ہوئی۔ ان تمام اجتماعات کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ عوام کی غذائی حالت، طبی تعلیم، اور دیہات میں طبی امداد وغیرہ کا جائزہ لیں۔ ۱۹۵۶ء کی کانفرنس جو کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس کا افتتاح وزیراعظم پاکستان نے کیا اور وزیر صحت نے بھی اس میں تقریر کی۔ اس کانفرنس میں منصوبہ بورڈ کے پنج سالہ پروگرام کی توثیق کی گئی۔ سارے پاکستان میں مچھروں کے خلاف شدید مہم کو منظور کیا گیا جس کے خرچ کا تخمینہ پانچ کروڑ تیس لاکھ روپیہ لگایا گیا اور بی۔ سی۔ جی (B. C. G.) کے ٹیکے لگانے کے پروگرام پر ۴۳ لاکھ روپیہ کے خرچ کی تجویز منظور کی گئی۔

غذا

اسی ضمن میں پاکستان کی غذائی حالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا بھی از حد ضروری ہے کیونکہ پاکستان ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی آبادی کم و بیش آٹھ کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے۔ روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی نے پاکستان کے وسائل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور آئے دن حالات بدلتے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی قدرتی حادثات نے جو غذائی حالات پر بہت جلد اثر پذیر ہوتے ہیں پاکستان کو بڑی الجھنوں میں گھیر رکھا ہے۔ آزادی ملنے کے دن سے آج تک پاکستان نے تقریباً ۲۴ لاکھ ٹن غلہ درآمد اور اندازاً ساڑھے سات لاکھ ٹن غلہ برآمد کیا ہے۔ امسال پاکستان کو سات لاکھ ٹن گیہوں باہر سے درآمد کرنا پڑے گا جس میں سے ایک لاکھ ٹن تو مشرقی پاکستان کے لئے اور تین لاکھ پچیس ہزار ٹن مغربی پاکستان کے واسطے، دو لاکھ ٹن کراچی کے لئے، پچاس ہزار ٹن دفاع کے لئے اور پچیس ہزار ٹن وزارت امور کشمیر کے لئے ہے۔

گیہوں

اس کمی کو دور کرنے کے واسطے ... ۵۳۰ ٹن گیہوں آسٹریلیا سے خریدا گیا ہے اور کچھ کمی مرکزی حکومت کو جو پچھلے وعدوں کی رو سے گیہوں ملے گا اس سے دور ہوگی۔ بقیہ کمی کو باہر کے ملکوں سے گیہوں درآمد کر کے دور کیا جائے گا۔

چاول

اسی طرح چاول کا بھی معاملہ ہے۔ اگست ۱۹۵۵ء میں تقریباً سارا مشرقی پاکستان سیلابوں کا نشانہ بنا ہوا تھا اور یہ سیلاب ۱۹۵۴ء کے سیلاب سے کہیں زیادہ سخت تھا چنانچہ اس کی وجہ سے چاول کی قیمت بہت چڑھ گئی۔ حکومت مشرقی پاکستان نے اپنے پاس سے اس وقت تین لاکھ پانچ ہزار من چاول دیا اور اس کی قیمت فروخت صرف چودہ روپیہ فی من رکھی۔ اس وجہ سے چاول کی بڑھتی ہوئی قیمتوں میں کمی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ مزید برآں صوبہ کی حکومت نے ۸۰ ہزار ٹن چاول بہ قیمت دس روپیہ فی من اور چھ روپیہ فی من کے دھان اجراء کئے لیکن قیمتیں برابر بڑھتی ہی رہیں یہاں تک کہ نومبر ۱۹۵۵ء میں حالت بہت تشویشناک ہو گئی اور ڈھاکہ کے بازاروں سے چاول بالکل غائب ہو گیا۔ اس وجہ سے قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔ حکومت نے یہ دیکھ کر ڈھاکہ، نرائن گنج اور دیگر بڑے مقامات پر راشننگ جاری کر دی۔ اس سے لوگوں میں اطمینان پیدا ہو گیا۔

۱۹۵۶ء میں حکومتِ مشرقی پاکستان نے اعلان کیا کہ اعداد و شمار کے مطابق ان کے صوبہ میں تین لاکھ ٹن غلہ کی کمی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حکومت مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان اور امریکہ سے چاول اور گیہوں درآمد کرنے کا ارادہ کیا۔ وزیراعظم پاکستان نے یہ حکم دیا کہ اس کمی کو بہر حال ۱۹۵۶ء میں ضرور بالضرور دور کر دیا جائے۔ چنانچہ اگست ۱۹۵۶ء میں یہ طے کیا گیا کہ مرکزی حکومت ایک لاکھ ٹن غلہ ماہ ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۱۹۵۶ء تک مشرقی پاکستان کو دے دے۔

۱۹۵۵ء میں غلہ کی درآمد پر جو زر مبادلہ صرف ہوا وہ اٹھارہ کروڑ چوراسی لاکھ روپیہ تھا اور جو غلہ بطور امداد کے ملا اس کی قیمت بیالیس کروڑ ستاسی لاکھ روپیہ ہے۔ حکومت پاکستان نے ایک معاہدہ حکومت برما سے بھی کیا ہے جس کی رو سے پاکستان ہر سال ایک لاکھ ٹن چاول تین سال تک خریدے گا۔ حکومت برما اس پر رضامند ہو گئی ہے کہ وہ پچاس ہزار ٹن ۱۹۵۶ء کے اندر اندر ضرور دے گا اور اس کی بھی کوشش کرے گا کہ اگر حالات درست ہو گئے تو پورا ایک لاکھ ٹن بھیج دے گا۔

شکر

اسی طرح ۱۹۵۶ء میں پاکستان نے ۷۸۴۰۵ ٹن شکر بیرونی ممالک سے درآمد کی جس میں ۴۱۳۱۴ ٹن بطور امداد امریکہ سے حاصل ہوئی تھی بقیہ ۳۶۸۹۱ ٹن خریدی گئی۔

ریلیں

پاکستان ریلویز دو مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو نارتھ ویسٹرن ریلوے جو مغربی پاکستان میں ہے اور دوسری ایسٹ بنگال ریلوے جو مشرقی پاکستان میں ہے نارتھ ویسٹرن ریلوے کی پٹریاں ۵۳۳۵۰۹۹ میل ہیں اور ایسٹ بنگال ریلوے کی پٹریاں ۱۷۱۹۰۰۴ میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس کے علاوہ ریلوے کے کارخانے بھی بنائے گئے ہیں جن میں گاڑیوں اور انجنوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ امید یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء تک پاکستان ان کارخانوں میں ۵۵ مال لے جانے والے ڈبے خود تیار کرے گا۔ ایسے ڈبے بنانے والوں کی تربیت کا بہت بڑے پیمانہ پر انتظام کیا جا رہا ہے۔

محکمہ ڈاک و تار

ذرائع آمدورفت کے ساتھ ساتھ ذرائع رسل و رسائل کا ذکر بھی ضروری ہے۔ پاکستان میں محکمہ ڈاک و تار نے یوم آزادی سے جو کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں وہ قابل صد ستائش ہیں۔ ڈاک و تار کی اچھی سروس ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محکمہ بہت ہی قابلیت اور دیانت سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ ڈاک اور تار اور ٹیلیفون کی سروس کے علاوہ اس محکمہ کے ذریعہ فوجیوں کی پنشنیں بھیجی جاتی ہیں اور رسیدوں کے ٹکٹ کی بھی فروخت ہوتی ہے۔ اسی محکمہ میں گورنمنٹ کے ملازمین کی زندگی کا بیمہ بھی کرانے کا انتظام ہے۔ یہ گورنمنٹ کی کفالتوں اور سیونگ سرٹیفکٹ کی بھی دیکھ بھال کرتا ہے اور ریڈیو پاکستان کے لائسنس کا اجراء بھی کرتا ہے۔

غیر ملکی تعلقات

پاکستان کے غیر ملکی تعلقات قریب قریب دنیا کے ہر ملک سے قائم ہیں۔ اس میں پڑوس کے ممالک اور دنیا کی بڑی بڑی قوتیں بھی جو براعظم یورپ، ایشیا اور امریکہ سے متعلق ہیں شامل ہیں۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان اقوام متحدہ میں شامل ہوا اور اس وقت سے اب تک وہ اس بات کا کوشاں رہا ہے کہ دنیا میں امن قائم رہے۔ ان تمام باتوں کو اپنا نصب العین بناتے ہوئے پاکستان سیٹو اور معاہدہ بغداد کا ایک سرگرم ممبر ہے۔ معاہدہ سیٹو جو منیلا میں ۸ ستمبر ۱۹۵۴ء کو آٹھ ممالک نے منظور کیا تھا اس کی رُو سے تمام ممبر ممالک کے وسائل کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے میں سارے شرکاء انفرادی اور اجتماعی طریقہ سے کوشاں رہیں گے۔ اگر ان میں سے کسی پر کوئی جارحانہ حملہ ہوا تو وہ سب مل کر اس کی مدافعت کریں گے۔

پاکستان اس بات کی برابر کوشش کر رہا ہے کہ وہ اپنے تعلقات تمام اسلامی ممالک سے استوار رکھے۔ اس کا یقین کامل ہے کہ بوجہ رشتۂ ملی، تمدنی اور روایاتی، مسلم ممالک کے درمیان ایک ایسی سیاسی برادری اُبھرے گی جو اسلامی ممالک کی ایک قومی جمہوریہ کی حامی اور طرفدار ہوگی۔

صنعتی ترقی

پاکستان کی صنعتی ترقی اس کے ترقیاتی منصوبوں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ کسی ملک کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی اس کے اقتصادی وسائل ہی ہوتے ہیں۔ صنعتی حالات ہی پر ملک کے اقتصادیات کا دارومدار ہے چنانچہ پاکستان کے بنتے ہی پہلی پاکستان صنعتی کانفرنس دسمبر ۱۹۴۷ء میں منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد خاص طور سے یہ تھے کہ عوام پاکستان کا معیار زندگی بلند کرنے کی تدابیر اور ذرائع معلوم کرے۔

اس بارے میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان اور نیشنل بنک آف پاکستان کا قیام ہے۔ غیر سرکاری بنکوں نے بھی اس زمرے میں بڑی مدد دی۔ اس کے ماسوا حکومت نے اور بھی بہت سی رعائتیں صنعتی کارخانوں کی تعمیر میں دیں۔ ۱۹۵۲ء میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ کے قیام نے صنعتی ترقی میں چار چاند لگا دئے۔ اس صنعتی ترقی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت پاکستان کے پاس آٹھ ملیں (Mills) لوہے کی سریاں اور سلاخیں وغیرہ تیار کرنے کی ہیں جن میں سالانہ ۰۰۰،۲۰ ٹن لوہا پگھلا کر سلاخوں کی صورت میں لایا جاتا ہے۔ ۱۲۸ فیکٹریاں ایسی ہیں جہاں پھل اور ترکاریوں کو ترکیبی طور سے بند کیا جاتا ہے۔ قریب قریب دس ارب سگریٹیں تیار ہوتی ہیں اور سارا تمباکو ہمارے ملک ہی کی پیداوار ہوتا ہے۔ چمڑے کے کارخانوں کی تعداد ۱۰۸ تک پہونچ گئی ہے جن میں سے ۵ مغربی پاکستان میں ہیں اور ۱۰۳ مشرقی پاکستان میں ہیں۔

روئی اور کپڑے کے کارخانے ملک کی دولت میں بہت بڑے اضافہ کا باعث بنے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پاس صرف ۱۷ کارخانے تھے اور اس وقت اس کے پاس ۱۰۴ کارخانے ہیں۔ اور مزید کارخانوں کی تعمیر زیر غور ہے۔ مصنوعی ریشمی کپڑے کے کارخانوں کی تعداد ۱۹۵۶ء تک ۱۰۱ تک پہونچ چکی ہے۔ رنگائی اور چھپائی کے کارخانوں کی تعداد بھی بہت کافی ہے۔ پورے پاکستان میں ۱۴۳ کارخانے ایسے ہیں جو مشین کے ذریعہ چھپائی اور رنگائی کرتے ہیں اور ۱۱۱ ایسے ہیں جو مزدوروں کے ذریعہ ہاتھ سے رنگتے اور چھاپتے ہیں۔ موزے اور بنیان کے کارخانوں کی تعداد ۱۹۱ تک پہونچ چکی ہے۔ اسی طرح ڈوری اور لیس وغیرہ کے کارخانوں کی تعداد ۲۰ ہے۔ مشینوں کے پرزے اور دیگر حصے بنانے کے کارخانوں کی تعداد ۸ ہے۔ بٹالا انجینیرنگ کمپنی لاہور کو اس کی اجازت مل گئی ہے کہ وہ خود بخود چلنے والے کرگھے اپنے کارخانے میں بنائے اور اس سے امید بندھ گئی ہے کہ پاکستان کے زرمبادلہ کی بڑی بچت ہوگی۔

پاکستان میں صنعت کو فروغ دینے کے لئے ۱۹۵۲ء میں پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن صرف ایک کروڑ کے سرمایہ سے شروع کیا گیا تھا اور یہ سب حکومت پاکستان کا روپیہ تھا۔ یہ صرف اس کے ہیڈ آفس کے اخراجات کے لئے دیا گیا تھا لیکن اس کے منصوبوں میں جو سرمایہ لگایا گیا وہ اس کے حصوں کی فروخت سے آیا لوگوں نے اس منصوبہ کی تشکیل کے وقت ہی اپنا سرمایہ لگا دیا۔ اس طرح اس کارپوریشن کے کام کی ابتدا ہوئی۔ اس کے مقاصد میں خاص طور سے ۱۱ چیزوں کی صنعت کو ترقی دینا تھا۔ اور وہ یہ تھے: (۱) جوٹ (۲) کاغذ کی دفتی سازی (۳) لوہے کی بڑی مشینیں (۴) جہاز سازی (۵) کیمیاوی تراکیب (۶) کھاد (۷) شکر (۸) سیمنٹ (۹) کپڑا (۱۰) ادویہ سازی (۱۱) قدرتی گیسوں کو کارآمد کرنا۔

ان ساڑھے پانچ برسوں میں اس کارپوریشن نے ۴۳ منصوبے تیار کئے جن پر امداداً چھپن کروڑ روپیہ لگا ہے اور اس کے علاوہ سترہ اور منصوبے ہیں جن میں تقریباً اکسٹھ کروڑ روپیہ لگنے کا امکان ہے۔ جو منصوبے مکمل ہو چکے ہیں ان میں ۱۲ پٹ سن کی ملیں۔ ۳ کاغذ سازی کی ملیں۔ ۲ شکر سازی کی ملیں۔ ایک سوت کی مل اور پانچ سوت سے کاتنے کے کارخانے۔ ایک ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ D.D.T. کا کارخانہ۔ ۱۳ اونی کپڑوں کے کارخانے۔ ایک کارخانہ سلفورک ایسڈ کا، ایک سیمنٹ کی فیکٹری اور سوئی گیس پائپ لائن شامل ہیں۔ جو منصوبہ زیر تعمیر ہیں وہ کراچی اور کھلنا میں جہاز سازی کے کارخانے اور نرائن گنج کی گودی میں دو کھاد بنانے کی فیکٹریاں، سوئی ملتان گیس پائپ لائن، ایک بڑا گرم آبی اسٹیشن ملتان کے قریب جو سوئی گیس پر مبنی ہوگا۔ دو گیس تقسیم کرنے کی کمپنیاں، ایک رنگ اور کیمیاوی ترکیبوں کا کارخانہ، تین شکر کی ملیں۔ ایک اخباری کاغذ بنانے کی فیکٹری جو کھلنا میں ہوگی اور دو کوئلے کی کان کھودنے کی کمپنیاں ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی بھی ترقی ہوئی ہے۔ جس میں پلاسٹک کا کام، رنگ سازی، ربر کا سامان، سوتی سامان، ریشمی کپڑا، چاندی کی تارکشی، وغیرہ شامل ہے۔ اس میں قریب قریب ۲۵ لاکھ روپیہ کچا سامان منگانے میں لگا ہے جو مختلف دیسی کارخانوں میں تقسیم کیا گیا ہے ÷

فلم: فلم سازی کا کام بھی بہت تیزی کے ساتھ پاکستان میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اس وقت پاکستان میں ۱۰ اسٹوڈیو۔ ۲ لیباریٹریاں اور ۳۲۰ سینما گھر موجود ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں صرف ۱۶ فلم پاکستان میں بنے تھے لیکن ۱۹۵۶ء میں ۳۵ فلم تیار ہوئے۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ پاکستان کتنی تیزی کے ساتھ اس صنعت میں آگے بڑھ رہا ہے۔ جرمنی کی ایک کمپنی Agfa company کو اس کی اجازت مل گئی ہے وہ ایک 35 MM رنگین فلم کے لئے تجربہ گاہ لیبارٹری پاکستان میں کھول لے۔ یہ بھی طے ہوا ہے پاکستان کے ہر صوبہ میں فلم کی صنعت کو ترقی دینے کا ایک کارپوریشن کھولا جائے جس کی مجلس شوریٰ کراچی میں رہے ÷

تجارت: پاکستان کی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تجارت اور کاروبار کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ پاکستان کے قیام کے وقت اس کے پاس کچھ ایسا کچا مال تھا جسے برآمد کیا جاتا تھا اور وہ پٹ سن، روئی، چاء، اون اور کچی کھالیں تھیں۔ برخلاف اس کے درآمد کی اشیاء کی تعداد سیکڑوں تھی۔ لوگوں کے استعمال کا سامان قریب قریب سب ہی درآمد کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے پاکستان کا بہت کافی زرمبادلہ خرچ ہوتا تھا۔ پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے یہ ضروری تھا وہ مشینری وغیرہ جس کے ذریعہ دولت پیدا ہو سکے درآمد کرے اور اپنا زرمبادلہ صرف اسی میں خرچ کرے ÷

اس مقصد کے پیش نظر اس نے پہلے طے کر لیا کہ کم سے کم درآمد اور زیادہ سے زیادہ برآمد کرنا ملک کے اقتصادیات کے لئے از حد ضروری ہے۔ اور اس کے لئے پاکستان نے یہ کیا کہ درآمد کے اخراجات کسی صورت سے بھی برآمد کی آمدنی سے نہ بڑھنے پائیں چاہے وہ سرکاری لین دین ہو یا غیر سرکاری۔ اور ساتھ ساتھ صنعتی ترقی کی ضروریات مثلاً مشینری وغیرہ بھی برابر پاکستان میں برآمد ہوتی رہیں تاکہ پاکستان کا اصل مقصد فوت نہ ہو۔ لہٰذا اس نے یہ کیا کہ جو چیزیں پاکستان میں خود بنتی ہیں اور ان کی مقدار یہاں کی ضروریات کے برابر ہو تو وہ چیزیں باہر سے ذرا بھی نہ درآمد کی جائیں۔ اس وقت پاکستان میں جو چیزیں باہر جا سکتی ہیں ان کی تعداد ۳۶۳ ہے۔ پاکستانی مال کی نکاسی کرنے والوں کے لئے ایک اسکیم ۱۹۵۲ء میں بنائی گئی۔ اس کی رو سے ۸۰ چھوٹی قسم کی اشیاء کی برآمد بھی شروع ہو گئی جو اب تک نہیں ہوئی تھیں۔ اور یہ نکاسی کرنے والوں کے لئے بڑی محرک ثابت ہوئیں۔ یہ اسکیم ستمبر ۱۹۵۶ء میں ختم ہو گئی اور اکتوبر ۱۹۵۶ء سے دوسری نکاسی بڑھانے کی اسکیم جاری کر دی گئی۔ برآمد کرنے کی فہرست اشیاء میں اور اضافہ کر دیا گیا۔ اس اسکیم کی رو سے ۹۰ اشیاء خام یا ابتدائی حالت میں۔ اور ۸۵ اشیاء تیار شدہ برآمد ہونے لگیں۔ نکاسی کرنے والوں کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے برآمد کرنے کی حد تک جو رقم غیر ملکوں سے وصول ہو وہاں کا سامان درآمد کر سکتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کے زرمبادلہ کی بہت کافی بچت کے امکانات ہیں ÷

سطور بالا میں ہم نے ملک کی صنعتی، اقتصادی اور عمومی ترقی کا ایک جائزہ پیش کیا ہے جو جستہ جستہ اعداد و حقائق پر مبنی ہے۔ تفصیل کے ساتھ ان پر نظر ڈالنا اس چھوٹے سے مضمون میں ممکن نہ تھا مگر اس سے بھی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک شروع دن سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کا مستقبل بفضلہ بہت تابناک اور امید افزا ہے ÷

مبارک مشغلہ

ابوالاثر حفیظ

تفرقہ بازی ہے بے ایمانی و ذلت کا کھیل
آؤ کھیلیں نوجوانو وحدتِ ملت کا کھیل

بس یہی اک کھیل ہے لَا رَیبَ فِیہِ بالیقیں
جیت شرطیہ ہے جس میں۔ ہار ممکن ہی نہیں

کھیلنا توحید کے اثبات و قوت کے لئے
کھیلنا نظم و مساوات و اخوت کے لئے

کھیلنا انسانیت کی پاسبانی کے لئے
کھیلتے جانا حیاتِ جاودانی کے لئے

ذوق و شوقِ خدمتِ خلقِ خدا میں کھیلنا
رحمۃ للعالمینی کی فضا میں کھیلنا

باندھ کر سر سے کفن۔ میداں میں آکر کھیلنا
جان کو ایماں کی بازی پر لگا کر کھیلنا

مرد ہو تو آؤ کھیلیں اب سے یہ مردانہ کھیل
کھیلتے ہیں شیر ہی اس رنگ کا شیرانہ کھیل

عوامی آرٹ
(مشرقی پاکستان)

الطاف گوہر

کوئی پرانا تصور کچھ دیر کے لئے ہماری نظروں سے روپوش ہو جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے متروک یا ناکارہ ہو گیا اور وہ کسی حیثیت سے اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ دی جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر کہیں قابلِ لحاظ رہتا ہے۔ اور جہاں اس اصول کا اطلاق ادب پر ہوتا ہے وہاں زندگی کی دوسری سرگرمیوں پر بھی اس کا اطلاق کچھ کم نہیں ہوتا۔ ("مطالعۂ تاریخ" ٹائن بی)

کچھ عرصہ سے عوامی ادب کے عمیق مطالعہ اور عوامی روایات اور آرٹ کو از سرِ نو دریافت اور زندہ کرنے کی جو کوششیں عمل میں آرہی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جذبہ کس قدر شدید ہے جس نے ہمیں ہزار ہا سال کے حدود کو پھلانگ کر اُن عجیب و غریب پیرایوں کو سمجھنے پر مجبور کیا ہے جن میں پرانے زمانے کے لوگوں نے اپنے دل و دماغ کی کیفیتوں کی ترجمانی کی تھی۔

روایات اور فن کی اس از سرِ نو دریافت اور احیاء سے نہ صرف فن کے ایسے انمول نمونے ہاتھ آئے ہیں جو دور دراز گمنام جگہوں میں اس طرح چھپے پڑے تھے کہ کسی کو ان کا علم یا وہم و گمان بھی نہ تھا، بلکہ ہم دورِ حاضر کے انسانوں کو یہ جاننے کا موقع بھی ملا ہے کہ عوامی نظم و آہنگ میں کیا سوز پنہاں ہے جو اس میں جان سی ڈال دیتا ہے اور ہماری روایاتی عوامی طرحوں کے ایک ایک نقش میں کس بلا کی توانائی کی لہر موجزن ہے۔ خود کو ترقی یافتہ سمجھنے کے زعم اور ترقی کے اندھا دھند خبط میں مہذب شعور نے کچھ یہی رجحان پیدا کر لیا تھا کہ جو نقش کہن دکھائی دے اس کو بھدا اور پارینہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ اس کے نزدیک عہدِ کہن، جس کے تصور سے اس کی روح کپکپاسی جاتی تھی، کی بلیغ ترین تعریف یہی ہے کہ اسے "دورِ تاریک" قرار دیا جائے۔ ماضی کی اس تحقیر و رد کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ جدید شعور آہستہ آہستہ اس تمام بیش بہا سرمائے سے محروم رہ جائے جو صرف حقائق کو صحیح نظر سے دیکھنے اور روایت کے سلسلہ کو درست طور پر سمجھنے اور جانچنے ہی سے ہاتھ آسکتا تھا۔ ماضی کو اس طرح بے سوچے سمجھے دھتکار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قدر خالی اور بے پتہ ہیں۔ یہ بیچارگی مادیت کے زعم کا لازمی نتیجہ ہے اور اس کے ساتھ ایک تکلیف دہ بوجھ کا احساس جو موجودہ انسانوں کے دل پر سوار ہے۔ ثقافت ہو یا ادب و فن دونوں میں حال ایک طرف ماضی کی جھلکیاں پیش کرتا ہے اور دوسری طرف مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ وہ اَن لکھی ثقافت جو سینہ بہ سینہ چلتی آتی ہے اور سوامی آرٹ جن کو ہم پارینہ قرار دیتے رہیں، تمدن کی جوئے رواں کا جزو لاینفک ہیں۔ آج دنیا بھر میں ان روایاتی عوامی طرحوں کو (جو ہماری بے توجہی کے باعث تیزی سے نابود ہوتی جارہی ہیں،) دوبارہ بروئے کار لانے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں ان کی اہمیت اس احساس میں مضمر ہے کہ وہ ہمارے ثقافتی ورثے کا ایک لازمی جزو ہیں اور ان کے ضائع ہو جانے سے اس اہم جزو کا ضائع ہونا بھی لازم ہے۔

کچھ عرصہ ہوا پاکستان آرٹ کونسل (ڈھاکہ) نے، جو مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا ثقافتی ادارہ ہے، یہ کوشش کی تھی کہ صوبہ کے تمام حصوں سے عوامی آرٹ کے نمونے فراہم کئے جائیں۔ چنانچہ صوبہ کے دور دراز حصوں سے ایسے ۰۰۰ سے زائد نوادر بہم پہونچائے گئے اور ان کو عوامی آرٹ کی ایک نمائش میں پیش کیا گیا۔

کونسل کے صدر نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں کہا تھا کہ ادارہ "صوبہ کے ہر حصہ کے ثقافتی ورثہ کی مختلف صورتوں کی دریافت اور احیاء کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا ہے" تاکہ ہم اپنی ملی ثقافت کو مناسب تاریخی پس منظر کی روشنی میں نشو و نما دیں۔ مزید یہ کہ "اس سلسلہ میں حقیقی عوامی آرٹ کا جعلی و نقلی آرٹ سے امتیاز لازم ہے"۔ اکثر لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ عوامی آرٹ ہے کیا اور ہم عوامی آرٹ کے نمونوں کو دستکاریوں کے نمونوں سے کس طرح شناخت کر سکتے ہیں۔ عوامی ادب کے ایک ماہر پرس بار یو نے کیا خوب کہا ہے کہ "جب کبھی بچے کو سلانے کے لئے لوری گائی جاتی ہے، جب کبھی ہم عادتاً یا فطری دھن میں گانے یا ناچنے لگتے ہیں، جب کبھی ماں اپنی بیٹی کو سینا پرونا، بننا، کاڑھنا، کاتنا، جھالر لگانا، غلاف بنانا یا سادھی ٹانکنا سکھاتی ہے، تو ہمیں آرٹ اپنی ابدی قلمرو میں حسبِ معمول سرگرمِ کار نظر آتا ہے۔ برابر زندہ و تازہ، رواں دواں اور ہمیشہ نئے نئے عناصر کو حاصل کرنے اور اپنانے پر مائل۔" معروف آرٹ کے برعکس، جس کے تصور میں بناوٹ کو دخل ہے، کیونکہ اس کے تخلیقی عمل میں شعور بیدار رہتا ہے اور اس پر کسی خاص فرد کی چھاپ نظر نہیں آتی اور نہ کسی کی اپنی تصنیف ہونے کا شائبہ ہوتا ہے، عوامی آرٹ عوامی حافظے، عوامی عادات اور

عوامی تجربے کا آئینہ دار ہوتا ہے جو کیفیت کے اعتبار سے کہیں زیادہ سیدھا سادا، براہِ راست اور اصلیت سے پر ہوتا ہے۔ اظہار کے عوامی پیرایوں کا ذکر کرتے ہوئے ٹامسن ہی لکھتا ہے "پرانے معاشرے میں تجربہ کا نچوڑ حاصل کرنے اور اس کو نسل بہ نسل منتقل کرنے کا یہ قدیم طریقہ آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔" "تجربہ کا نچوڑ" یہ الفاظ عوامی تجربہ کی انتہائی پاکیزگی اور سادگی اور ایسے ہی اندازِ بیان پر زور دیتے ہیں یہی خصوصیت اس آرٹ کو اس آرٹ سے ممیز کرتی ہے جس میں زیادہ پیچیدہ اظہار کی روایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

عام دستکاریوں، دیہاتی دستکاریوں اور گھریلو صنعتوں میں بھی عوامی تصورات اور طرحیں برتی جاتی ہیں، لیکن ان کا مقصد تمام تر کاروباری ہوتا ہے۔ دستکاریاں اپنے مطلب کے لئے عوامی فنون کی اشکال اور طرحوں سے ہی فیضان حاصل کرتی ہیں ان کا مقصد اولین یہ ہوتا ہے کہ وہ عوامی طرحوں اور تصورات کو بڑی دلکشی اور کفایت کے ساتھ کام میں لائیں۔ مثال کے طور پر کسی دیہاتی عورت نے سالہا سال کی محنت کے بعد جو گدا یا لحاف بنایا ہوگا اس میں کتنی ہی طرحیں اور ڈیزائن ہوں گے جن سے کسی کو بھی کپڑے یا ساڑھی کے بورڈر یا اندرونی زیبائش کے لئے برتا جا سکتا ہے ہماری دستکاریوں میں یہی تو کیا جاتا ہے کہ عوامی تصورات کے مطابق بنے ہوئے ڈیزائنوں کو میکانکی طریقوں سے چھاپ چھاپ کر تجارتی اغراض کے لئے استعمال کیا جائے۔

جن لوگوں نے ڈھاکہ کی مذکورہ بالا نمائش دیکھی ہے، وہ عوامی فنون کے نمونوں کی اس غیر متوقع کثرت پر بہت حیران ہوئے۔ ہر نمونہ اپنی ہی ایک کہانی سناتا تھا، جس کی سیدھی سادی جذباتی کیفیت کو رنگ اور خوش آئند وضع کے سانچے میں ڈھال دیا گیا تھا۔ ایک ننھی سی کشتی، کھلے بادبان، پٹ سن سے لدی ہوئی۔ یہ طوفانی پدما کے سوا اور کس کی کہانی ہو سکتی تھی! ایسے کہ غور کیا جائے تو شاید کشتی کھینے والے مانجھیوں کے گیت کی آواز بھی ہرے بھرے نامعلوم سے کناروں پر ٹکراتی گرتی گونجتی سنائی دے سکے مٹی کے بنے ہوئے سازندے اپنے ساتھ عوامی رزمیہ داستانوں کا ماحول لے آئے اور مٹی کا ٹھوس ہاتھی ہو بہو چاٹ گام کے پہاڑی علاقوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ لحاف کے کاڑھے ہوئے نقوش سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی برہ کی ماری عورت تھکی پی کی واپسی کی امید میں دروازے کی دہلیز پر بیٹھی اپنے سیدھے سادے مشاہدات کو بڑے ہی دلکش اور خوش آیند سانچے میں ڈھال رہی ہو۔ تنوع کے نقطۂ نظر سے مشرقی پاکستان کا عوامی آرٹ کچھ کم جاذبِ نظر نہیں۔ اس میں کنتھے یعنی گدا لحاف اور رضائیاں، گڑیاں، کھلونے، کشتیاں، پھول پنکھے، بید کی بنی ہوئی چیزیں اور آرائشی کام سبھی کچھ شامل ہیں مشرقی بنگال کے عوامی آرٹ کی نمایاں مثال "کنتھا" ہیں۔ یہ بہت ہی خوبصورت لحاف اور چادریں ہوتی ہیں "نقشی" کنتھے خاص موقعوں کے لئے بنائے جاتے ہیں اور معاشی کنتھے عام استعمال کے لئے۔ بچوں کے لئے دیہاتی عورتیں خاص قسم کے کنتھے بناتی ہیں، یہ کنتھے بالعموم پھٹے پرانے کپڑوں یا ساڑیوں، معمولی سوتی دھاگے اور رنگین تارکشی سے بنائے جاتے ہیں۔ غلافوں کے کنتھے چادروں کے کنتھوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ ایک غلاف جس کا نمونہ متعلقہ تصویری صفحہ پر پیش کیا جا رہا ہے چھوٹے چھوٹے خانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے پھول کاڑھے گئے ہیں اس سے نہ صرف ایک سیدھی کڑھائی کی نفاست بلکہ وہ نظم و آہنگ بھی ظاہر ہوتا ہے جو ایک ان پڑھ دیہاتی عورت اپنے کام میں پیدا کر سکتی ہے کنتھا بنانے کے لئے پہلے پرانے کپڑوں کو بڑے بڑے بخیوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح لحاف کی زمین تیار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد حاشیوں پر اقلیدسی نقش و نگار کے ساتھ ساتھ بیل بوٹے یا جانوروں کی شکلیں کاڑھی جاتی ہیں۔ بڑے کنتھے کے چار حصے ہوتے ہیں جن میں سارے ڈیزائن کو تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ہر حصے کا ڈیزائن الگ الگ ہوتا ہے جو ضروری نہیں کہ دوسروں سے ملتا جلتا ہو۔ کنول کے پھول، بیلیں، درخت، ہاتھی، گھوڑے، مچھلیاں، رتھ، پرندے، دیہاتی زندگی کے مختلف مناظر مثلاً شادی برات۔ یہ سب چیزیں مختلف حصوں میں سمو لی جاتی ہیں۔ رنگوں میں بڑے بڑے رنگ مثلاً کالا، سرخ، زرد اور نیلا برتے جاتے ہیں کشیدہ کاری کو مضبوط بنانے کے لئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفید دھاگے سے چھوٹے چھوٹے ٹانکے لگائے جاتے ہیں تکیوں پر شاذ و نادر انسانوں یا حیوانوں کی شکلیں کاڑھی جاتی ہیں، بلکہ درخت، بیلیں اور پھول ہی کاڑھے جاتے ہیں۔

کنتھوں کے ڈیزائن اس قدر سیدھے، سادے اور براہِ راست قسم کے ہوتے ہیں کہ ان سے ایک خوشگوار تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈیزائن کبھی زیادہ پیچیدہ یا خیالی نہیں ہوتا۔ ان میں کچھ ایسا توازن اور سکون ہوتا ہے جو صرف خطوط میں بے حد کفایت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

بعض کنتھا ڈیزائنوں سے پرانے الپانا ڈیزائنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جو دینی احساس کا عوامی اظہار ہیں۔ یہ نقش و نگار فرش اور سیڑھیوں پر چاولوں کی لُبدی سے بنائے جاتے ہیں مین وسط میں ایک گول سا نقش ہوتا ہے جس کے اردگرد بیل بوٹے کاڑھے جاتے ہیں۔ ایک کنتھا نقش جس سے اصلی الپانا نقش پھر سے ذہن میں ابھر آتا ہے، تصویری صفحہ پر پیش کیا گیا ہے۔ کنتھا اور الپانا نقوش بعض اوقات رزمیہ داستانوں کی توضیح کے لئے بھی برتے جاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کا ایک اہم ضلع جیسور اپنے کنتھاؤں کے لئے مشہور ہے۔ چنانچہ جیسور قاضی باڑی کے نقشی کنتھے آج بھی اپنی خوش وضعی، نفاست اور مضبوطی کے لئے یاد کئے جاتے ہیں۔ کنتھا دھجیوں چیتھڑوں سے بنائے جاتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار کی ذہانت کس طرح ساز و سامان کی کمی پر غالب آجاتی ہے۔ آیئے چشم تصور سے نمائش دیکھیں ۔۔۔ نمائش میں کتنے ہی کھلونے اور گڑیاں بھی تھیں جو مختلف اضلاع سے لائی گئی تھیں۔ ان میں سب سے چونکا دینے والی چیز ایک ہاتھی تھا جس کی سونڈ کے ہر ہر خط سے غضب کی حرکت ظاہر ہوتی ہے۔ پھر وہ سازندوں کی منڈلی کتنی جیتی جاگتی ہے جس سے یوں لگتا ہے جیسے ہم سچ مچ ان کے سازوں کی آواز سن رہے ہوں۔ جس جس حالت میں بھی وہ ہیں بالکل جیتے جاگتے ہیں اور ساری فضا زندگی سے دھڑکتی نظر آتی ہے۔ یہ دیکھئے قانون کی پشت و پناہ حوالدار اور سپاہی، گردنیں اکڑائے، کس آن بان سے ایک کم سن پالے خاں کو لئے جا رہے ہیں جس نے ابھی ابھی اپنے حریف کو مار کر چت گرا دیا ہے۔ مٹی کے پتلوں میں گاؤں کے باسیوں کی ظرافت کا ایک دلچسپ نمونہ! ایسے پتلے جن سے پورا منظر پیش کیا جاتا ہے، ڈھاکہ کے ضلع کی خاص چیزیں ہیں۔ میمن سنگھ کی یہ تین گڑیاں دیکھئے۔ ان کو نمائش تو کیا، جہاں کہیں رکھا جائے، وہاں رونق ہی رونق پھوٹ پڑے گی۔ یہ سب کاٹھ کی بنی ہوئی ہیں۔ درمیان کی سب سے اونچی لمبی پتلی کی ٹوپی کا رنگ ڈھنگ کتنا دلکش ہے۔ پیازی۔ لال۔ سفید رنگ کیا بہار دیتے ہیں۔ چہرہ ملتانی مٹی کی طرح زرد، اس پر پستی رنگ کی ساڑھی، سیاہ حاشیہ، جس میں ہرے ہرے لال لال چھینٹے سے ہیں، کیسی پیاری لگتی ہے۔ ساڑھی کے پھول سفید اور دھاریاں لال ہیں۔ بائیں طرف اس کی ہجولی کی ٹوپی بھی ایسی ہی طرحدار ہے، لیکن ساڑھی پر ہرے ہرے لال نشان ہیں۔ دائیں طرف سفید سی پتلی، سرخ دھاریوں اور سفید پھولوں والی نیلی ساڑھی میں ملبوس ہے، تینوں نے بڑی نفیس بالیاں پہن رکھی ہیں۔ غرض یہ تینوں صناعی کے بہت دلفریب نمونے ہیں۔

اب اور چیزوں کی طرف آیئے۔ سلہٹ کو بید کی بنی ہوئی چیزیں پیش کرنے پر ناز ہے۔ ان میں سے ایک بید کی ٹوکری تھی جس کی سڈول وضع کا آہنگ بہت ہی موزوں تھا۔ ایک بید کی کرسی کی پشت سے ان طریقوں کا پتہ چلتا تھا جن سے بید کی چیزوں میں کام لیا جا سکتا ہے۔

سلہٹ اور نواکھالی کی چٹائیاں، جن کو "سیتل پاٹی" کہتے ہیں، بڑی ہی دلکش چیزیں ہیں۔ ایک چٹائی دیکھئے۔ اس میں ایک بڑے درخت کے نیچے، جس میں شگوفے آ رہے ہیں، دو چھوٹے چھوٹے پیڑ ہیں۔

دلآویز حاشیے والی ٹنگیل ساڑھیوں میں عوامی تصورات کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا گیا ہے۔ دستی پنکھے ایک اور نفیس چیز ہیں۔ سلہٹ کا ایک تند آکرا گھاس کا بنا ہوا پنکھا جس میں پیازی، سفید اور گہرے سبز رنگوں سے نقش کاڑھے گئے ہیں، کتنا پیارا لگتا ہے۔ ایسا ہی ایک اور پنکھا ہے جس میں دو پھولے پھولے ہاتھی اور ان کے ساتھ، درمیان میں، ایک درخت ہے جس کی چوٹی پر دو پرندے بیٹھے ہیں۔ ایک اور پنکھے کے حاشیہ پر کچھ پرندے شاخوں پر چڑھتے دکھائے گئے ہیں جس سے ساری تصویر میں جان اور ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے۔

عوامی آرٹ کے ان شہ پاروں کو جمع کرنا اور عوامی فنون اور طرحوں کو پھر سے زندہ کرنا بہت بڑی خدمت ہے۔ کہتے ہیں عوامی آرٹ ایک زیر زمیں آبجو ہے جو دو مختلف تمدنوں کو آپس میں ملا دیتی ہے۔ یہ وہ آبجو ہے جس کو کوئی مادی یا شعوری روک ٹوک بند نہیں کر سکتی لہٰذا ایسی کوششیں جو مختلف تمدنوں کے مابین ذریعۂ تفاہم کو برقرار رکھ سکے وہ بڑی مستحسن ہیں۔ (ترجمہ: ضمیر اظہر)

آئیے بہتر زندگی اختیار کریں

ایک اور دشمن!

"جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے"

''اماں جان سرپھٹا جارہا ہے ۔ متلی سی ہورھی ہے۔ آج اسکول نہیں جاؤں گا ۔ دیکھو میرا پنڈا بھی کچھ گرم ہے'' ۔

''ہاں ہے تو پر دیکھو ، اسلم ، تم کو کتنا سمجھاتی ہوں کہ مچھردانی لگاکر سویا کرو ۔ شام کو نہایا مت کرو ۔ پسینے میں شرابور ہو اور نل کے نیچے بیٹھ جاتے ہو تم سے کتنی مرتبہ کہا کہ جیسے ھی مغرب کی اذان ہو آستینیں، جو تم چڑھائے ہوئے رکھتے ہو، نیچی کرلیا کرو اور جسم پر ذراسا تیل چپڑ کر سویا کرو ۔ مچھردانی بھی لگاؤ ۔ پھر نہ مچھر کاٹیں گے ، اور نہ موسمی بخار چڑھیگا ۔ اب ہائی! اوئی! کرنے سے کیا ہوتا ہے''
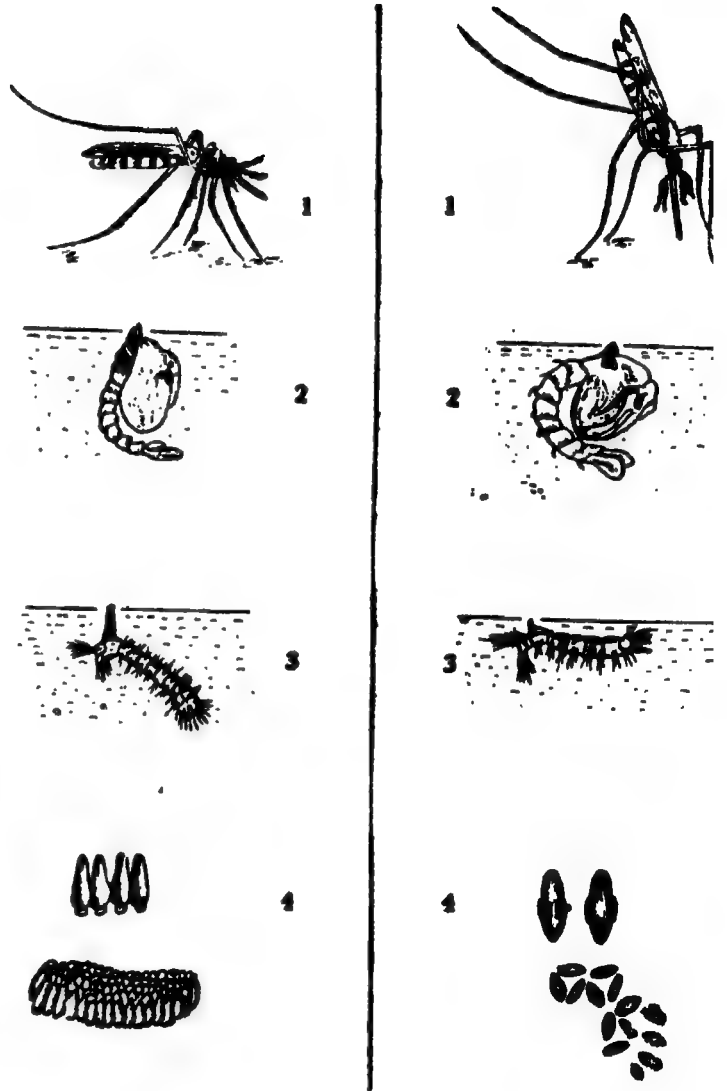
مچھر کی زندگی کی کہانی:

انیفلیز مچھر — کیولکس مچھر

۱۔ جوان مچھر ۲۔ وسطی حالت ۳۔ ابتدائی حالت ۴۔ انڈے

گلی کوچوں کے انبار غلاظت پر مچھر مار دوا کا چھڑکاؤ

''تو امی پھر کروں کیا؟ ''

''کرو کیا ''، ڈاکٹر کے پاس جاؤ - کونین کا مکسچر پیو - دیکھو غرارہ کرتے رہنا گلا صاف رکھو - قبض تو نہیں ہے ؟ '' -

''جی نہیں''

معاشری بہبود سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بستی میں صفائی کا انتظام خود کر رہے ہیں

''تو پھر جلدی افاقہ ہوگا - ارے تمہیں تو کپکپی لگ رہی ہے ''

''جی—جی—جی ھاں''

''اچھا—لو یہ کونین کی ٹکیاں تو کھاؤ''-

'' جی - اچھا ''

''روٹی ووٹی بالکل بند - صرف چائے پینا '' -

* * *

''آپ نے تو روز کا یہی وطیرہ بنا لیا ہے - روز روز چھٹی - کل اور پرسوں غیر حاضر رہے - آخر وجہ ؟ ''

''جناب والا - کیا عرض کروں ابھی تک '' فلو '' کی پریشانی میں مبتلا رہا - بدن کمزور تھا ھی اب یہ برسات کا موسم شروع ھوگیا ، ملیریا ھو گیا ہے'' -

''دیکھئیے صاحب - یہ دفتر ہے - روز روز کی غیر حاضری آپ کے لئے نقصان دہ ہوگی - اچھی طرح سمجھ لیجئے - آپ لوگ احتیاط کیوں نہیں کرتے'' -

''تقصیر معاف ، کیا احتیاط ؟ ''

''یہی کہ مچھر مارئیے''

''مچھر مارئیے ! ''

''جی ھاں - میرا مطلب ہے آپ لوگوں کی ذراسی توجہ سے ملیریا کا وجود ختم ھوسکتا ہے - آس پاس مچھروں کی پیدائش کا کیا حال ہے ؟ ''

''صاحب کچھ نہ پوچھئے - خود میرے گھر میں فوجیں کی فوجیں ھیں - باھر سے الگ یورش کرتے رہتے ھیں'' -

'' تو پھر ملیریا کی شکایت کیا ہے - آپ لوگ اگر ان کے پیدائش کے مقامات پر مٹی کا تیل ھی چھڑک دیں - تھوڑے تھوڑے وقفے سے چونا گڑھوں وغیرہ میں ڈال دیا کریں تو مچھروں کا نیست و نابود ھوجانا طے ہے - اگر ڈی ڈی ٹی وغیرہ دوائیں آپ لوگ خود میسر نہیں کرسکتے تو میونسپلٹی کے ملیریا سٹاف کو مطلع کیجئے وہ آکر سارے گھروں اور آس پاس کی جگھوں پر مچھر مار سفوف چھڑک جائینگے '' -

'' بہت مناسب ہے ''

* * *

'' ھیلو - ناصرہ، آج آرھی ھو پارٹی میں ؟''

(نحیف آواز میں) '' ارے کمبخت بخار نے سارا مزا کرکرا کردیا - کس چاؤ سے پارٹی کی تیاریاں کی تھیں مگر چار روز سے وہ جاڑے بخار نے پریشان کیا ہے کہ سر اٹھانے نہیں دیتا ''

'' اوھو ! بھئی کونین کھاتی رہا کرو اس موسم میں - ھر ھفتہ چند گریں کونین، اور معدہ کی صفائی بھی رکھو تو کبھی ملیریا نہیں ھو گا

مفلوج کردیتا ہے اور اس سے مجلسی ، شہری ، اقتصادی تعلیمی ، نقصانات کہاں تک پہونچتے ہیں - اس کے علاوہ کارخانوں کی پیداوار اور تجارت پر ہر سال جو اثر پڑتا ہے اس کا تو اندازہ ہی محال ہے -

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملیریا ایک موسمی بیماری ہے لیکن اگر اس کے اعداد و شمار پر آپ نظر ڈالیں تو اس کی ہلاکت خیزی اور مضرت رسانی کو دیکھکر روح لرز جاتی ہے -

ملیریا کا ایک مریض - زیر تربیت طلبہ کے سامنے ڈاکٹر کا تشریحی لیکچر

مشرقی پاکستان چونکہ بالخصوص پانی اور کثیر بارشوں کا علاقہ ہے اس لئے وہاں ملیریا کی تباہ کاری بہت زیادہ قومی اور شخصی نقصان پہنچاتی ہے - اس کی روک تھام کے لئے حکومت کا ملیریا انسٹی ٹیوٹ دونوں صوبوں میں برابر کام کر رہا ہے اور انسدادی تدابیر کامیاب ثابت ہو رہی ہیں - یہ انسٹی ٹیوٹ کراچی میں ۱۹۴۷ء میں قائم کردیا گیا تھا اور پھر اسے ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ منتقل کردیا گیا - اس کی شاخ اب بھی کراچی میں یہاں کے انسدادی کاموں کی دیکھ بھال کر رہی ہے -

یہ انسٹی ٹیوٹ ملیریائی روگ کی تحقیق کا کام کرتی رہتی ہے اور صوبہ جات کو انسدادی امور کے لئے ہدایات و مشورہ دیتی ہے - ملیریا روک تدابیر کے لئے مثلاً ڈی ڈی ٹی کا استعمال ازبس ضروری ہے - چنانچہ اس غرض سے نوشہرہ میں ''یونی سیف'' اور ''ادارہ عالمی صحت'' کے تعاون سے ڈی ڈی ٹی بنانے کا ایک بڑا کارخانہ قائم کردیا گیا ہے - حکومت نے اس پر ۱۶ لاکھ روپیہ خرچ کیا ہے -

اور آیا تو بہت ہی خفیف - اچھا بھئی خدا حافظ! اب تم آرام کرو - معاف کرنا تکلیف دی ''

* * *

''آج کے چھپے ہوئے پروگرام کے مطابق اس وقت صبا بیگم کے گیتوں سے آپ کی سامعہ نوازی کی جاتی مگر افسوس ہے کہ انھیں ملیریا ہوگیا ہے - ان کے گانے کی بجائے ریکارڈ سنئے !''

* * *

''ہمیں افسوس ہے کہ آج کی صدارت کے لئے الحاج خواجہ امان الرحمان صاحب، صدر انجمن تشریف نہ لا سکینگے کیونکہ انکو بھی ملیریا کی تکلیف نے پریشان کر رکھا ہے - ہمیں معلوم ہے کہ آپ حضرات ان ہی کی تقریر سننے کے لئے زیادہ تر جمع ہوئے ہیں - مگر-'' (چند آوزیں) ''جلسہ ملتوی کردیجئے'' -

* * *

یہ چند مثالی نمونے ہیں کہ ملیریا ہماری شہری زندگی کی مختلف سرگرمیوں کو کس طرح

مچھر کی ماہیت: اب ذرا مچھر کی بھی داستان سنئے کیوں کہ بس کی گانٹھ یہی پردار حیوان ہے جو آپ کو ہر برسات میں ناک چنے چبواتا ہے۔

پہلے یہ تصور کیا جاتاتھا کہ ملیریا خراب ہوا کے اثر سے پیداہوتا ہے۔ چنانچہ ملیریا کا لفظ ہی دو انگریزی لفظوں کا مرکب ہے یعنی (MAL) (خراب) اور (ARIA) - ایریا - (ہوا) - مگر بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ " مچھروں کے کاسہ لیس " (PARASITES) کے کاٹنے سے ملیریا پیدا ہوتاہے۔ یہ بھی مچھرھی ہوتے ہیں۔ ان کی دوبڑی قسمیں ہیں انوفلیز (ANOPHELES) اور کیولیکس (CULEX) انوفلیز ہی دراصل وہ مادہ مچھر ہے جس کے کاٹنے سے بخار چڑھتا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ جب وہ کہیں بیٹھتا ہے تو اس کے پچھلے پیر اوپر کی طرف اٹھے رہتے ہیں اور اس کا جسم ترچھا رہتاہے۔ یہ اندھیرے اور سیاہ رنگ کو پسند کرتا ہے۔ صاف رکے ہوئے پانی میں خاص طور پر انڈے دیتا ہے۔ ان کے انڈوں پر موم کی سی تہ جمی ہوتی ہے۔ اس کے سر پر لمبی سی سونڈ ہوتی ہے۔ یہ ایک بھالہ ہے جس سے وہ جسم انسانی کی سطح کو چیر کر خون چوستا ہے اور اس کا اپنا لعاب دھن اس زخم میں لگ جاتا ہے!

ملیریا سے بچنے کی تدبیریں یہ ہیں:

(۱) ایک ہفتہ میں کم از کم پندرہ گرین کونین ضرور کھائی جائے۔

(۲) مچھر دانی کا استعمال کیا جائے۔

(۳) گڑھوں - تالابوں - وغیرہ کو یا تو پاٹ دیا جائے یا ان پر مٹی کا تیل چھڑک دیا جائے۔

(۴) کمرہ بند کرکے گندھک جلائی جائے اور تین گھنٹے تک یہ کمرہ اسی طرح بند رہے۔

(۵) سر شام جسم کے زیادہ سے زیادہ حصے کو ڈھانپ کر رکھا جائے خاص کر بازو۔

(۶) سوتے وقت جسم کے کھلے ہوئے حصوں کو

ملریا کی روک تھام کا ٹیکہ (مشرقی پاکستان)

کسی تیل سے چپڑ لینا چاہئے۔

(۷) گھر کے قریب اور گھر کے اندر پانی کو کہیں ٹھیرنے اور سڑنے کا موقع نہ دیا جائے ایسی چیزیں ہٹادی جائیں جہاں پانی جمع رہ سکتا ہے اور مچھروں کی پرورش ہوسکتی ہے مثلاً مٹی کے برتن اور دوسرے برتن، ٹوٹے پھوٹے ٹین، وغیرہ۔

خلاصہ:

مچھروں کے فضائی حملے کا جواب یہ ہے کہ گھر کے باہر صفائی رکھئے، گھر کے ہر طرف صفائی ہوگی تو مچھروں کا صفایا ہو جائے گا۔

اس موسم کی تین بڑی احتیاطیں یاد رکھیں۔

(۱) مچھر دانی کا التزاماً استعمال۔

(۲) مچھروں کا قلع قمع کرنے والی ادویات کا چھڑکاؤ۔

(۳) کونین کی ہفتہ واری مقدار۔

مچھروں کو ایٹم بم کی طرح خوفناک سمجھکر ان کے خلاف گھروں اور بستیوں میں اب ہم سب کو کمربستہ ہو جانا چاہئے کیونکہ یہ ہمارا بڑا دشمن ہے اور دشمن کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے *

افسانہ

پرانی کہانی

ابوسعید قریشی

بڈھے راوی کے کنارے، جب وہ جوان تھا، آتشبازوں کے محلے میں دو بھائی رہا کرتے تھے، آفتاب اور مہتاب جن کے نام اپنے خاندان کے شجرے میں مہر و ماہ کی طرح چمک رہے تھے۔ اپنے فن میں اس گھرانے نے ایسے ایسے باکمال پیدا کئے تھے کہ سات سمندر پار سے ان کے قدردانوں کی فرمائشیں آتی تھیں۔ فتح و نصرت کا جشن ہو یا خانہ آبادی کی رونق، کوئی تقریب ان کی آتشبازی کے مظاہرے کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی ؛

دونوں بھائی، دو بہنوں سے بیاہے ہوئے تھے، جو ان کے ماموں کی لڑکیاں تھیں۔ ان کے ہاں ایک ہی دن اللہ کی دین ہوئی۔ آفتاب کے گھر لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شہاب رکھا گیا۔ مہتاب کے گھر لڑکی تولد ہوئی، لیکن اس وقت خاندانی قافیے کے سبھی نام صرف میں آچکے تھے۔ بڑی بڑی کتابیں دیکھی گئیں لیکن ایسا کوئی نام نہ ملا جو لڑکی کے لئے موزوں ہوتا۔ ایسے میں کسی نے ہنستے ہوئے کہا ؛

"نام تو تمہارے سامنے موجود ہے — کتاب!"

حاضرین ہنس پڑے۔ لیکن لڑکی کے باپ نے سنجیدگی سے کہا :

"ٹھیک تو ہے — کتاب! — اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ اگر عزالہ اور شاہین، ضیغم اور راشد، نرگس اور یاسمین۔ الماس یاقوت نیلم اور زمرد یعنی چرند و پرند، جمادات و نباتات کے ناموں پر انسانوں کے نام ہو سکتے ہیں تو کتاب میں کیا قباحت ہے؟ کتاب جو عرش و فرش کے علوم و فنون کی امین ہے ......"

اور اس نے کتاب، کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں ایسی تقریر کی کہ خاندان کے لوگ دنگ رہ گئے، اور سنبل و سوسن کی طرح کتاب بھی ان کے لب و گوش کو آشنا اور مانوس محسوس ہونے لگا ؛

یوں مہتاب کی بیٹی کا نام کتاب قرار پایا۔ اور وہیں، اسی محفل میں، زمانے کے دستور کے مطابق، بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی بیٹی کو اپنے بیٹے کے لئے مانگ لیا۔ اس رشتے سے محبت کا رشتہ اور مستحکم ہو گیا ؛

بچے جب کھیلنے کے قابل ہوئے تو رات کی چند گھڑیاں چھوڑ کر ہر وقت ساتھ رہنے لگے، جیسے ان کا رشتہ زمین پر نہیں، عرش پر ہوا تھا۔ دن چڑھتے ہی ہاتھ منہ دھو کر، دونوں برسوں کے بچھڑے ہوؤں کی طرح ایک دوسرے کی طرف لپکتے اور شام گئے تک ساتھ رہتے ......

وہ ایک ہی رکابی سے کھانا کھاتے اور جو کچھ بھی کھاتے کوشش یہی ہوتی کہ زیادہ حصہ دوسرے کو ملے اور اگر ایک کو بھوک نہ ہوتی تو دوسرا بھی روزہ رکھتا ؛

اور عادتوں کی طرح، ان کے کھیل بھی نرالے تھے۔ شہاب لڑکی کے کندھوں پر تتلیاں بٹھا دیتا اور کتاب اس کے بازوؤں سے کبوتروں کے پر ٹانک دیتی اور کہتی "میں پری ہوں، تم شہزادے میں اڑتی ہوں، تم مجھے پکڑو"۔ اور آنکھیں بند کرکے دو پنجوں پر کھڑے ہو جاتے۔ اور بازوؤں کو ہلاتے جیسے سچ مچ اڑ رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد دونوں چونک سے آنکھیں کھول دیتے اور کھلکھلا کر ہنس پڑتے جیسے دنیا مار چھوٹے ہوں ...... ایسے اور کئی کھیل ان کی ایجاد تھے۔ اور کچھ نہیں تو بیٹھے ایک دوسرے کو تک ہی رہے ہیں اور شہاب کا تو یہ عالم تھا کہ نگاہیں کتاب کے چہرے پر گڑی ہیں۔ ابا کے کتب خانے میں بڑی بڑی کتابوں میں حروف کی نوک پلک اور الفاظ کے نقش و نگار کی طرح کتاب کے چہرے کی عبارت میں نہ جانے اسے کیا نظر آتا کہ بس کھو ہی جاتا۔

ان کا پیار دیکھ کر محلے کے ان گھروں سے بھی ہم آہنگ آوازیں سنائی دینے لگی تھیں، جن میں ہر وقت دنگے فساد کا شور رہتا تھا۔ بستی کے بگڑے بچے بھی امن و آشتی سے رہنے لگے۔ بڑے بوڑھے ان کو دیکھ کر کہتے کہ یہ تو آتشبازوں کے ہاں فرشتے پیدا ہوئے ہیں ؛

محلے کے بچے تو بس ان کی پرستش کرتے تھے۔ اپنے حصے کی چیزیں وہ اکثر غریب بچوں میں بانٹ دیا کرتے۔ پھلجھڑیاں، ہتابیاں، پٹاخے۔ سب سے زیادہ فرمائش پھلجھڑیوں کی رہتی جن کا نسخہ آفتاب و مہتاب کے خاندان میں سینہ بسینہ چلا آ رہا تھا اور جو عام طور پر صرف امیروں ہی کے بچوں کو میسر آتی تھیں، لیکن شہاب اور کتاب کے نزدیک ان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ ان کی خوشی میں ان کے والدین کی خوشی تھی۔ اس نقصان کی انہیں قطعاً پروا نہیں تھی جو قیمتی آتشبازی کی بے دریغ تقسیم سے انہیں اٹھانا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ وہ آتشبازی جس کے لیے بوڑھوں تک کی آنکھیں ترستی تھیں، ان کی روشنی سے اب سنسان اور اندھیری گلیاں بھی جگمگانے لگی تھیں ؛

پھلجھڑیوں کی شاخوں سے ٹوٹتے تاروں اور برستے پھولوں کی چھاؤں میں بچوں کے چمکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر یہ خیال آتا تھا جیسے جوہریوں کا آتشبازوں سے عقد ہو گیا تھا۔ اور آتشبازی کی روشنی میں دلہن کا جہیز کھلا پڑا تھا۔ یا ستاروں کی شعل لے کر آرسی مصحف کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ شہاب اور کتاب اس منظر کو دیکھ کر تالیاں بجاتے اور ناچتے اور ان کے ماں باپ چپکے چپکے خوشی کے آنسو بہاتے، حتیٰ کہ سونے کا وقت ہو جاتا اور بچوں کی مائیں آوازیں دیتیں کہ آؤ بچو، اب نیندی کر لو۔ اور کتاب اور شہاب صبح کی امید میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور اپنی خوابگاہوں کا رخ کرتے ؛

ایک رات مہتاب کوئی نیا مسالحہ لایا۔ "آج وہ چیز لایا ہوں" اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ "پھلجھڑیاں مرجھا جائیں گی اس کے سامنے ہتابیاں ماند پڑ جائیں گی۔ اب کے جو چیز بنے گی کتاب کی امی، جگنوؤں کی طرح بغیر آگ کے چمکے گی"۔

کتاب اس وقت آنکھیں بند کیے سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ باپ کی بات سن کر اس نے اپنی گھنیری پلکوں کی اوٹ سے دیکھا تو تپائی پر شیشے کا ایک مرتبان دکھائی دیا جس میں وہ مسالحہ پڑا تھا۔ شمع گل کر دی گئی تھی، لیکن مرتبان سے کچھ عجیب پراسرار قسم کی روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی، جیسے پو پھٹنے سے پہلے زمین کا دامن بھڑک سا اٹھتا ہے۔ کالے دوپٹے پر کناری کی طرح بالوں میں مقیش کی مانند۔ اور کتاب سوچنے لگی کہ صبح شہاب کو بتاؤں گی کہ ابا کیا لائے ہیں۔

اتنے میں اس کے ابا اور امی کی آوازیں بند ہو گئیں لیکن کتاب کو نیند نہ آئی۔ وہ حیرت سے بلور کے مرتبان کو دیکھ رہی تھی جس میں وہ عجوبہ چمک رہا تھا۔ اس کی چمک کتاب کو شہاب کے تبسم کی طرح دکھائی دی جیسے کہہ رہا ہو کتاب ادھر آؤ، میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ تم حیران رہ جاؤ گی کہ آج میں نے کیا دیکھا۔ کتاب پریشان سی ہو گئی کہ ایسی ہی بات تو میں اس کو بتانا چاہتی تھی۔ اسے کیونکر معلوم ہو گیا کہ میرے دل میں کیا ہے، لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ شہاب کوئی اور ہی بات بتانا چاہتا ہو۔ چنانچہ وہ چپکے سے، سانس روکے اپنے پلنگ سے اٹھی او جس کو گھر کے لوگ کتاب کی رعایت سے رحل کہا کرتے تھے اور جس پر شہاب کی امی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مخملی رضائی تھی، جسے دیکھتے ہی نیند آ جاتی تھی، لیکن شہاب کا مسکراتا ہوا چہرہ اسے بلا رہا تھا ؛

وہ لحاف سے نکلی اور دبے پاؤں شیشے کے مرتبان کے پاس کھڑی ہو گئی، لیکن شہاب کہاں تھا۔ صرف اس کا تبسم موجود تھا۔ کتاب حیران ہو گئی کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس نے کہانیوں میں سنا تھا کہ شہزادیوں کو جب یہ دیکھنا ہوتا کہ ہم خواب تو نہیں دیکھ رہیں تو وہ اپنے بازو پر چٹکی بھرتیں۔ کتاب نے بھی یہی کیا۔ درد کے احساس سے اسے یقین ہو گیا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں شہاب کا تبسم بھی غائب ہو گیا۔ اور تپائی پر، بلور کے مرتبان میں صرف وہ چمکتا ہوا مسالحہ باقی رہ گیا جس کے بارے میں ابا نے کہا تھا کہ ہتابیاں ماند پڑ [illegible] اس تصور سے جو پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، اس کی حیرت اور بڑھ گئی ؛

اس نے اپنا سانس روک لیا۔ پنجوں کے بل کھڑی ہو گئی، مرتبان کا ڈھکنا اٹھایا اور اندر جھانکنے لگی۔ مرتبان کی گہرائیوں [illegible] شہاب کا تبسم پھر نمودار ہوا۔ ہاں ہاں وہی تو تھا۔ اس کا چہرہ روشنی سے نہایا ہوا تھا۔ گرمیوں کی چاندنی میں سنہری کے پردے کے

چھپن چھپائی ....

"شہاب، شہاب! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ نزدیک کان میں ۔ ابا ۔ آج ۔"

"کتاب، کتاب! میں بھی تو تمہیں یہی بتانے والا تھا ۔ چچا آج ابا کو دکھانے کے لئے ایک چیز لائے تھے ۔ اور ۔ کہتے تھے مہتابیاں ماند پڑ جائیں گی ۔"

"ماند کیا ہوتا ہے شہاب؟"

"ماند" شہاب نے بزرگوں کی سی صورت بنا کر کہا "بس ہوتا ہے جی کچھ۔ تمہیں اس سے کیا، ماند؟"

اور پھر جیسے یکایک روشنی کے تالاب میں بھنور پیدا ہوا، فوارہ سا اچھلا، لہر سی ابھری اور شہاب کا چہرہ غائب ہو گیا۔

"آنکھ مچولی کھیل رہا ہے ۔" کتاب نے سوچا "نا بھئی ۔ اب آ جاؤ شہاب ۔ ہم ہار مان گئے ۔ آ بھی جاؤ! ـــ نہیں آتے! ۔ پر تم ہو کہاں؟"

"یہاں" ۔

"کدھر؟"

"مرتبان کے پیچھے ـــ ڈھونڈ لو ـــ"

مرتبان دھماکے سے گرا۔ کتاب کی امی اور ابا جاگ اٹھے ـــ بچی تپائی کے پاس بیہوش پڑی تھی اور قریب ہی ٹوٹے ہوئے مرتبان کے نزدیک وہ مسالحہ سلگ رہا تھا جس کے بارے میں مہتاب نے کہا تھا کہ مہتابیاں ماند پڑ جائیں گی اس کے سامنے ۔ اور کمرے میں دم گھٹنے والی تیز بو پھیلی ہوئی تھی ÷

مہتاب بچی کو جلدی سے کھلے میں لایا ۔ لیکن مسالحہ کا زہر اپنا کام کر چکا تھا۔

"یہ تو گئی" مہتاب کی بیوی نے کہا "اب اس کی فکر کرو ۔ صبح جب وہ اپنی کتاب کو نہیں پائے گا تو اس پر کیا گذرے گی ۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گا ۔"

مہتاب اور اس کی بیوی کو اپنی بیٹی کا غم بھول گیا اور بھتیجے اور بھانجے کی فکر ہوئی ۔ مہتاب نے ہولے سے بھائی کے دروازے پر دستک دی ۔ آفتاب ابھی سویا نہیں تھا ۔ بھائی کی آواز سن کر باہر آیا تو دیکھا کہ مہتاب کی آنکھوں سے دیوانگی جھانک رہی ہے ۔ چاندنی میں اس کا چہرہ جلتی ہوئی گندھک کی طرح زرد اور نیلے رنگ بدل رہا تھا۔

"تمہاری کتاب تو کھو گئی بھائی ۔ اب شہاب کی فکر کرو! ....."

آفتاب کو جب حادثے کی تفصیل معلوم ہوئی تو اس نے اپنے بال نوچ لئے ۔ لیکن دیور کی آواز سن کر اتنے آفتاب کی بیوی بھی چلی آئی تھی اور اپنے شوہر کے پیچھے کھڑی تھی ۔

"صبر کرو" اس نے کہا "تم تو مرد ہو ۔ اب یہ سوچو کہ اس کو کیسے بہلاؤ گے ۔"

یہ سن کر دونوں بھائی سنبھل گئے ۔ اور صحن میں ٹہلنے لگے ۔ اور آخرکار انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کتاب کو جزدان میں لپیٹ کر چپکے سے صحن کے طاق میں رکھ دیا جائے ۔ اور شہاب جب صبح اس کے بارے میں پوچھے تو اس سے کہا جائے کہ وہ تمہارے لئے آسمان سے کوئی چیز لینے گئی ہے ÷

"تمہاری سالگرہ آ رہی ہے نا کہتی تھی کہ ایسا تحفہ لاؤں گی کہ شہاب دیکھ کر دنگ رہ جائے ÷

"لیکن آسمان پر کون جا سکتا ہے؟" شہاب نے کہا۔

جواب ملا: "واہ! یہ چڑیاں، کبوتر، طوطے، نہیں اڑتے آخر؟"

"وہ ان کے تو پر ہوتے ہیں" بچے نے کہا۔

"تو کیا ہے۔ تم بھی لگا لینا پر" مہتاب نے کہا "یہ کونسی مشکل بات ہے"

شہاب ہنسا لیکن اس کی آواز میں نہ جانے کیسی کھنک تھی جانے اس کو باپ اور چچا کی باتوں کا اعتبار آیا تھا کہ نہیں۔

"کدھر ہے کتاب؟" اس نے زمین پر ایڑی مارتے ہوئے تحکمانہ انداز میں پوچھا

"کہہ تو دیا بیٹا کہ تمہاری سالگرہ کے لئے تحفہ لانے گئی ہے"

"کب ہے میری سالگرہ؟"

"جب وہ آجائے گی۔ اسی روز"

یہ سن کر شہاب چپ ہو گیا۔ اور ہر گھڑی کتاب کا انتظار کرنے لگا۔

رات کو سرورے کی قوسوں سے، نیلے آسمان کی دوریوں میں، آنکھیں جھپکتے ہوئے تاروں کے پیچھے شہاب کو اکثر اس کا چہرہ نظر آتا لیکن پل بھر کے لئے۔ وہ جھلک دکھاتی اور غائب ہو جاتی۔ "آنکھ مچولی کھیل رہی ہے" وہ سوچتا۔ مسہری کی جالی کے پیچھے، یاسمین کی شاخوں کے سائے ہیں...... اور سویرے جب امی نماز کے لئے آتیں تو ان کے آنچل کی اوٹ میں بھی اسی کا سا چہرہ نظر آتا۔ وہ جاگ جاتا —— افق کے کنارے کنارے بھی اسی کے تبسم کی لہر نظر آتی۔ اور اپنی باہیں پھیلائے وہ اسے اپنی جانب بلا رہی ہوتی۔ اور شام کو وہ غروب آفتاب کے محلوں میں سرخ سفید اور زعفرانی پھولوں سے جھولی بھرے، کرنوں کی سیڑھی پر ناچتی دکھائی دیتی۔ سوتے میں وہ اس کے پلنگ کے پاس کھڑی ہوتی، اس کے کان میں کچھ کہنے کے لئے جھکتی۔ شہاب کو اس کا سانس اپنے بالوں میں محسوس ہوتا، لیکن جب وہ آنکھ کھولتا تو سرو کی شاخوں میں ہوا سرگوشیاں کر رہی ہوتی۔

شہاب نے اب دوسرے بچوں سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ اور وہ گلیاں جہاں کتاب کی موجودگی میں سر شام ہی ستارے اتر آتے تھے اب اندھیری اور ویران نظر آنے لگیں جیسے چاند ستارے گہنا گئے ہوں۔ اور شہاب چپ رہنے لگا۔ اسے مکتب بھیجا گیا، لیکن بچوں کا شور و غوغا بھی اسے پہلے کی طرح ہنسنے کھیلنے پر نہ اکسا سکا۔ بس وہ ہوتا اور اس کا سبق ہوتا۔ اس کی آنکھیں ہوتیں اور کتاب ہوتی۔ اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ ورق الٹنے یا استاد کی آواز کے سوا دوسری تمام آوازوں کے لئے اس کے کان بند تھے اور کچھ ہی مدت میں وہ ہر لفظ سے آشنا معلوم ہونے لگا۔ وہ بتا سکتا تھا کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر ساتویں سطر کا آٹھواں لفظ کس حرف سے شروع ہوتا ہے فلاں حکایت سے کیا سبق نکلتا ہے اور فلاں قصے میں شہزادہ پری کو کس طرح حاصل کرتا ہے۔

ریاضی جس کو رٹتے رٹتے طلبہ رو دیتے تھے، اسے کھیل نظر آتی تھی۔ لاکھوں، کروڑوں کی ضرب تقسیم کے سوال وہ زبانی حل کر دیتا۔ طب میں جالینوس اور بوعلی سینا کی بیاضیں اسے یوں یاد ہو گئیں جیسے ننھے منوں کو چڑیا کوے کی کہانی یا چندا ماموں کی لوری۔ نجوم میں اس کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ وہ بلاتکلف بتا سکتا تھا کہ اس وقت فلاں ستارہ فلاں برج میں ہوگا۔ ستاروں کی گزرگاہوں سے وہ اس طرح آشنا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہی محلے کی دیکھی بھالی کلیاں تھیں، باغ کی روشیں تھیں جن پر وہ اور کتاب کبھی جگنوؤں کی جستجو میں گھوما کرتے تھے۔

چند ہی سال میں علماء اور اس کے استادوں نے آفتاب اور مہتاب سے یہ کہہ کر معافی چاہی کہ آپ کے فرزند سے ہم ہار مانتے ہیں، ہمارا علم ختم ہوا۔ جو علوم و فنون لوگ ایک عمر میں حاصل نہیں کر سکتے وہ اس کے سینے میں محفوظ ہیں۔ اس کے لئے تو آپ آسمان سے ہی کوئی کتاب لائیں گے۔ ہمارے شہر کے کتب خانے، جن میں اس وقت دنیا کی ہر کتاب کی نقل موجود ہے، اس کے ذہن میں ہیں اس کے علم سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے اس سے یہ کیا کام لے گا۔

شہاب ایسی باتیں سن کر خلاؤں میں دیکھنے لگتا، اس کے چہرے کا رنگ قدرے اور گہرا ہو جاتا۔ اور اس کے لب ہلتے جیسے

ہزرائل ہائی‌نیس سلطان سر محمد شاہ آغا خاں (مرحوم)

پیدائش کراچی ۱۸۷۷ء

وفات جنیوا ۱۹۵۷ء

بچھڑے ہوئے ادیب

نا چراغ حسن حسرت (مرحوم)

خط بنام جناب محمد ایوب اولیاء صاحب

مجید لاہوری (مرحوم)

(ایک غیر مطبوعہ نظم 'بقلم خود')

محسوس ہوتے ہیں ۔ وہ کھلتے اور بند کتاب کے اوراق کی طرح آپس میں مل جاتے۔ اس کے والدین اور چچا و چچی اس کے بارے میں سخت فکر مند ہو گئے۔ سینے تمام علم کے باوجود وہ ان کے نزدیک ابھی بچہ ہی تھا۔ بچہ جس کے ساتھ کھیلنے والی اسے میدان میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس کا دل بہلانے کے لئے انہوں نے اسے اپنے آبائی فن کے راز بتانا شروع کئے، لیکن چند ہی روز میں انہیں پتہ چلا کہ وہ ان سے بہت کچھ زیادہ جانتا ہے۔ اس کے استادوں کی طرح وہ بھی ڈر گئے۔ وہ ابھی بچہ ہی تو تھا، تمیں بھی تو نہیں بھیگی تھیں۔ جن تجویزوں کو وہ تجربوں سے آزمانا چاہتے وہ انہیں کاغذ پر حساب کر کے بتا دیتا کہ یہ بات بنے گی اور وہ نہیں بنے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ طوطا ہی نہیں تھا جس نے سب کچھ بلا سوچے سمجھے رٹ لیا تھا۔ پہلے وہ اس سے خوف کھاتے تھے، اب احترام کرنے لگے اور اس نے اپنے بزرگوں کے پیشے میں کچھ ایسی دلچسپی لینا شروع کی کہ اس کے بارے میں ان کے اندیشے بھی دور ہو گئے۔ اور وہ سوچنے لگے کہ اس کا غم آہستہ آہستہ دور ہو رہا ہے ۔

وہ چپکے سے ان کے کمرے میں آتا اور کوئی نیا نسخہ بتا کر چلا جاتا۔ ان کی نت نئی اختراعات سے لاہور کے آتشبازوں کا نام اور بھی چمک اٹھا۔ اور لوگ، یہ کہتے سنائی دیئے کہ آگ سے سونا بناتے ہیں ۔

ایک دن دونوں بھائیوں کو خیال آیا کہ آتش بازی کا مقابلہ کیا جائے۔ علم کی آخر کوئی حد نہیں۔ کون جانے کہ کنویں کے مینڈک کی طرح ہم انہیں چند قطروں کو دریا سمجھے بیٹھے ہوں جو ہمارے لئے آتے ہیں۔ باکمال لوگوں کی دنیا میں ایسی بھی کیا کمی ہوگی۔ شاید ہم سے زیادہ صاحبِ فن بھی کوئی نکل آئے جس کے علم سے ہم فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ سوچ کر انہوں نے دنیا بھر کے ملکوں میں دعوت نامے بھیجے اور نگر نگر ڈھنڈی پٹوا دی کہ اب کے بہار میں آفتاب و مہتاب کے شہر میں جشنِ چراغاں منایا جائے گا جس میں دنیا کا ہر آتشباز اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ مقابلہ جیتنے والے کو پانچ دریاؤں کے دہانے کی مٹی گندم کے طلائی خوشوں والا پرچم ہشتلِ لاہور، سات توڑے اشرفیوں کے اور طشت موتیوں کا ملے گا ۔

آخر وہ دن آگیا جس کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور راوی کے کنارے، میدان میں آتشبازوں کے خیمے گڑ گئے۔ اور مقابلہ میں حصہ لینے والوں کو دیکھنے کے لئے زندہ دلوں کی ٹولیاں آنے لگیں۔ اور وہ کہتے سنائی دیتے کہ بڑا بڑا نامی آتشباز آیا ہے بھئی۔

قاف کے کاریگر آئے جو برفوں پر شعلے نچاتے تھے!

اولمپیا کی بلندیوں سے کبھی نہ بجھنے والی آگ کا بھید جاننے والے آتشباز آئے۔

جٹا دھاری جوگیوں کے مسکن ہمالہ کے آتشباز آئے جو آگ کو راکھ میں سمو کر اس کا سونا بنا دیتے تھے۔

غرض دنیا کے گوشے گوشے سے باکمال آئے۔ اور آخر وہ ساعت بھی آگئی جب مقابلے شروع ہونا تھے۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور قاضی القضاۃ نے مقابلے میں حصہ لینے والوں کو بلا کر حلف اٹھوایا کہ سحر، جادو، دھوکہ، فریب، نظر بندی سے کام نہیں لیا جائے گا۔

مقابلوں کے لئے سات راتیں وقف کر دی گئیں۔ چھٹی رات ہمالہ کا آتشباز میدان میں اترا۔ اس کے ماتھے پر دریا کی جوت جگمگا رہی تھی اور آنکھیں ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ اسے دیکھتے ہی لوگ مرعوب ہو گئے اور چہ مہ گوئیاں ہونے لگیں۔ اتنے اس نے اپنے ناخنوں کو رگڑ کر، جن پر چقماق کا سفوف چپکا ہوا تھا، آگ جھاڑی اور زمین سے ایک چکر آہستہ آہستہ بلند ہونا شروع ہوا جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ اسے اوپر اٹھا رہے تھے۔ چکر ہجوم کے سر کے اوپر کوئی پچاس گز کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ اس کی رفتار تیز ہوتی گئی، لوگ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ یکایک آگ کا وہ چکر تلوار کی تیز دھار کی طرح چلنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی نیچے اترے گا اور ہزاروں گردنیں تن سے الگ ہو جائیں گی۔ لوگ سہم کر زمین پر لیٹ گئے، لیکن اتنے میں اس کے اندر ایک دھماکہ سا ہوا۔ اور وہ تیرتا ہوا ہجوم سے دور راوی کے پانیوں میں گر کر بھسم ہو گیا ۔

میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ تماشائیوں نے کہا واقعی یہی انعام کا حقدار ہے۔ اتنے قاضی کی آواز سنائی دی:

"حاضرین ہمالہ کے آتشباز نے واقعی کمال کر دکھایا ہے، لیکن ابھی ایک مقابلہ اور باقی ہے۔"

قاضی کی آواز سن کر لوگ خاموش ہو گئے اور ساتویں رات کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے روز جب سورج غروب ہوا تو راوی کے کنارے لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے کہ دیکھیں آفتاب و مہتاب کیا کمال دکھاتے ہیں، لیکن اندھیرا بڑھتا گیا اور ان کے آثار نظر نہ آئے۔ اور لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ شاید ہالہ کے کاریگر کے مقابلے میں وہ کوئی چیز نہیں بنا سکے اور مارے شرم کے چھپ گئے ہیں۔ لوگوں کا اضطراب بڑھ چلا تھا کہ اتنے میں سات آدمی اپنے کندھوں پر قدِ آدم مرتبان سے اٹھائے، آفتاب و مہتاب کے خیموں سے برآمد ہوئے۔ مجمع پر سکوت چھا گیا۔ مزدوروں نے مرتبان میدان میں رکھے اور چلے گئے۔ سب نگاہیں خیمے پر لگی ہوئی تھیں۔ یکایک خیمے کا پردہ ہلا۔ اور دونوں بھائی، سنہری اور روپہلی دستاریں اور اسی رنگ کے انگرکھے پہنے نمودار ہوئے۔ انہوں نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا اور کہا سب بزرگی اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنے علم کے دریا سے ایک قطرہ عطا کیا ہے۔ ہمارا فن اسی کا مرہونِ منت ہے۔ ہمارا اس میں کوئی کمال نہیں۔ ہماری ہنرمندی اس کی تخلیقات کے عکس کا عکس ہے!

یہ کہہ کر دونوں صاحبوں نے ان سات مرتبانوں کے منہ پر چنگاریوں کا چھڑکاؤ کیا۔ اور تماشائی کیا دیکھتے ہیں کہ آنِ واحد میں زمین سے آسمان تک قوسِ قزح کی پینگ بڑھ گئی۔ اور جس طرح بھادوں کے مہینے میں دھوپ بھی دمکتی ہے اور مینہ بھی برستا ہے، اسی طرح قوسِ قزح کے رنگوں کی پھوار پڑنے لگی۔ لوگ عش عش کر اٹھے، اور یہ کہتے سنائی دئے کہ کل کے خوفناک کھیل کا کیسا حسین جواب ہے۔ معمر عورتیں جھولا گنگنانے لگیں، بچے ناچنے اور لڑکیاں اپنی چنریاں پھیلائے رنگ اکٹھے کرنے کو لپکیں:

"یہ سب روشنی کا کھیل ہے بچو" آفتاب نے کہا

"آپ روشنی کو نہیں پکڑ سکتے" مہتاب نے بڑے بھائی کی وضاحت کی۔

میدان تالیوں سے گونج اٹھا جن کی بازگشت سے راوی کے کنارے پر بندھی کشتیاں ڈولنے لگیں۔ آفتاب و مہتاب نے مقابلہ جیت لیا۔ قاضی فیصلے کا اعلان کرنے کے لئے منبر پر کھڑا ہوا لیکن اتنے نقارے پر بھرپور چوٹ پڑی۔ اور دونوں بھائیوں کے خیمے کے برابر ایک اور خیمے کا پردہ اٹھا۔ اور شہاب ظاہر ہوا۔ زعفرانی فرغل، قرمزی پٹکے اور سنہری دستار میں ملبوس۔ اس نے اپنی کمر پر کسی بہت بڑے تنکے سے ملتی جلتی کوئی چیز اٹھا رکھی تھی، اپنے قد سے دگنی۔

"حاضرین!" آفتاب نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میرا بیٹا شہاب ہے۔ آپ کی اجازت سے یہ بھی کوئی کھیل دکھانا چاہتا ہے"

ہجوم ایک آواز ہو کر پکارا "ضرور! ضرور!"

"ابھی ابھی آپ نے آسمان میں جو نظارہ دیکھا، وہ بھی اسی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ تھا" مہتاب نے کہا "ننھے اس کے تھے ہاتھ ہمارے"

حاضرین محوِ حیرت سے اس لڑکے کو دیکھ رہے تھے جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، اس کا قد تیر کی طرح سیدھا تھا۔

اس کے فرغل کے کنارے تیر کے پروں کی طرح کٹے ہوئے تھے۔

اور اس کی آنکھوں میں گویا مشعلیں جل رہی تھیں۔

شہاب کے پیچھے پیچھے سات حبشی آئے۔ ان کے کندھوں پر توپ کی شکل سے ملتا جلتا ایک فولادی ڈھانچہ تھا جس کے اندر لوہے کی پھریاں چمک رہی تھیں۔

شہاب نے تنکا ڈھانچے کے اندر رکھ دیا، باپ اور چچا کے قدم لئے اور کھیل دکھانے کی اجازت چاہی:

"مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہو تو معاف کیجئے گا" اس نے کہا "میں جا رہا ہوں"

"کہاں بیٹا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"کتاب کے پاس!"

مہتاب نے کہا "اب تک بچپن کے خواب دیکھ رہا ہے"

افسانہ

پھول کی پتی

حمید کاشمیری

"وہ اپنے لباس، حسن وضع قطع، رنگ ڈھنگ، اور طور طریقے سے کسی رومان پرور جزیرے کی شہزادی معلوم ہوتی جو آنکھیں بند کئے اور ملا کے پٹ کھولے تصوری تصور میں اپنے شہزادے کی تلاش میں نکلنے کی بجائے شام کے دھندلکوں سے پہلے پہلے شاہانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ شارٹ ہینڈ پڑھنے کے لئے انسٹی ٹیوٹ کی طرف چل دیتی ہو اور جس کے دماغ کی ایک چولیں پر ٹائپ رائٹر کی ٹپ ٹپ کی ہلکی ہلکی خراشیں پڑی ہوئی ہوں اور شارٹ ہینڈ کے آڑے ترچھے حروف کے تانے بانے نے محاصرہ کر لیا ہو۔"

میں کتنی ہی دیر تک کتابوں کے اس ڈھیر پر آنکھیں بند کئے جھکا رہا۔ میرے ماتھے پر ایک دم پسینے کے بہت سارے قطرے پھوٹ آئے۔ مجھے دوکاندار سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھ میں اٹھ کر بھاگنے کی سکت بھی باقی نہیں تھی جیسے میں سر بازار چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں اور لوگوں نے میرے آس پاس مجمع لگا رکھا ہو اور منتظر ہوں کہ میں اٹھ کے بھاگوں اور وہ سب دوکاندار سمیت ہنگامہ مچاتے ہوئے میرے پیچھے دوڑ پڑیں۔ نجانے اس وقت مجھے اپنے حال پر کیوں رحم آگیا اور میں نے اپنے اوپر ترس کھاتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ دزدیدہ نظروں سے دائیں بائیں فٹ پاتھ پر دیکھا اور مجھے قدرے تسلی ہوئی۔ فٹ پاتھ پر اکا دکا آدمی گذر رہے تھے اور ان میں سے کسی کی نگاہیں بھی مجھے اپنی طرف نہیں معلوم ہو رہی تھیں، لیکن دوکاندار کی طرف دیکھنے کا حوصلہ مجھے اب بھی نہیں تھا۔ میں بجلی کے کھمبے کا سہارا لیکر ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ لمحہ بھر کے لئے میں نے کھمبے کی تیز روشنی والے بلب کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پھر میں نے چندھیائی ہوئی نظروں سے دوکاندار کی طرف دیکھنے کا حوصلہ کیا۔ وہ اب بھی میری طرف دیکھ کر شہزادی کے سے انداز میں مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے نفرت سے نظریں اس کی طرف سے پھیر لیں۔ اور میرے قدم اپنے آپ سرکنے لگے۔ یہ شہر بھر میں آخری دوکان تھی جہاں سے ڈرائنگ سلف ٹاٹ ملنے کے امکانات ختم ہو گئے تھے۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں مگن، چپ چاپ، گم سم، کتنی ہی دیر تک سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا اور اگرچہ میرے اس طرح بے مقصد گھومنے کی واحد وجہ شہزادی تھی تاہم میں نے اس آوارہ گردی کے دوران میں شہزادی کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں سوچا بس میرا جی چاہ رہا تھا کہ تمام رات سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے گزار دوں ....!!!

رات گئے جب میں واپس آیا تو میرے کمرے کے در و دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی کمرے کی تنہائی میں گزار دیا ہے مگر مجھے اپنی تنہائی کا اتنی شدت سے احساس نہیں ہوا جتنا کہ اس رات کو ہو رہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور جب نیند میری آنکھوں سے دور ہو جاتی ہے تو اسے قریب لانے میں مجھے ایک رات سے زیادہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے تذبذب کے عالم میں ہوا کے لئے باہر والی کھڑکی جو کھولی تو میرے کمرے کی روشنی کے باہر جاتے ہی سامنے والے فلیٹ کے کمرے کی بتی جلی اور وہی روز والی لڑکی سامنے کھڑکی میں آئی، لمحہ بھر کے لئے اس نے نیچے اندھیرے میں سڑک پر دیکھا اور ایک طائرانہ سی نگاہ میرے کمرے پر ڈال کر پیچھے سرک گئی، پھر سامنے آئی اور کھڑکی پر پورا وزن ڈال کر کھڑی ہو گئی اور میں نے کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی ...... یہ لڑکی جس میں نسوانیت نام کو نہیں ہے اور جو صرف اپنے لمبے لمبے بالوں کی وجہ سے لڑکی معلوم ہوتی ہے، انہیں معلوم کیا چاہتی ہے۔ شاید اسے اپنی غیر نسوانی شکل و صورت کے ساتھ ساتھ میری تنہائی پر بھی رحم آتا ہے۔ اور رات کی تاریکیوں میں جب نیند کی گہری چادر تمام محلے کو ڈھانپ لیتی ہے تو یہ اٹھ کر کھڑکی میں آجاتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اس کے ساتھ مجھوتہ کرنے کے متعلق نہیں سوچا۔ ہم دونوں رات کو بہت کم سوتے ہیں وہ شاید میری وجہ سے اور میں ...... میں نجانے کیوں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں شہزادی کے بارے میں اس کا میرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] حاصل کر لیا ہو اور نہ کبھی اُن کے بارے میں جن کا قرب حاصل نہیں کر سکا۔ میں اپنے آپ کو راہب اندر تو نہیں کہتا جس کی تمام زندگی حسن سے [illegible] گلیوں میں گذر گئی ہو۔ تاہم میری زندگی میں بھی چند ایک قبول صورت لڑکیاں ضرور داخل ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ہر نوجوان آدمی کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں بشرطیکہ اس میں تھوڑی بہت جاذبیت اور رومانوی مذاق ہو۔ لیکن یہ سب کچھ اپنے آپ ہوتا رہا جیسے موسم بہار میں رات کی بند کلی صبح کو نا گہاں کھل کر پھول بن جاتی ہو۔ میں اپنے آپ کو اس تیز رفتار گاڑی کی طرح سمجھتا رہا جو دندناتی ہوئی سنگلاخ پہاڑوں، نخلستانوں، صحراؤں اور دریاؤں کو عبور کرتی جا رہی ہو اور جس کے راستے میں کبھی کوئی اسٹیشن نہ آیا ہو یا وہ کسی اسٹیشن پر نہ رکی ہو بلکہ اُن کو روندتی ہوئی چلی گئی ہو۔ لیکن اب مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ تند آندھی کی طرح چلنے والی گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ کسی مقام پر اچانک رُک گئی ہو، اس کے کل پرزے الگ الگ ہو گئے ہوں اور اب جیسے اُس کا آگے چلنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہو۔

رات کافی سے زیادہ گذر چکنے کے باوجود میں سونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا اس لئے کہ نیند اکھڑ چکی تھی۔ اور جب میری نیند اکھڑ جاتی ہے تو پھر سونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور پھر میں بستر پر پڑا کروٹیں لینے کی بجائے لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں اور سچ پوچھئے تو میں نے اس اکھڑی ہوئی نیند سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اُس وقت پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، رات گذارنی مقصود تھی۔ میں کاغذ قلم لے کر کچھ لکھنے کے ارادے سے بیٹھ گیا۔ میں کتنی ہی دیر کونے میں پڑی ہوئی میز پر جھکا رہا۔ کتنے ہی سگریٹ پھونک ڈالے، کتنی دفعہ ذہن پر زور دیا۔ مگر کاغذ کورے کا کورا ہی رہا۔ میں ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا۔ پھر مجھے نہیں معلوم میں نے بے دھیانی میں کیا لکھنا شروع کر دیا۔ میں کسی دھن میں کھویا رہا اور میرا قلم خود بخود چلتا رہا۔ ارد گرد کے ماحول سے قطعی بے خبر۔ جیسے "لسٹ فار لائف" میں ولندیزی آرٹسٹ وینسنٹ وینگو تیز آندھی میں ایک تصویر بنا رہا تھا۔ اور ایسا محو ہو گیا تھا کہ اُس کا ساتھی گوگن اکتا کر اُسے تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بات بعینہٖ ایسی تو نہیں تھی کہ وین گو جانتا تھا کہ وہ کیا بنا رہا ہے لیکن مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ بس بڑے انہماک کے ساتھ لکھے جا رہا تھا اور جب میں نے چونک کر کاغذ کی طرف دیکھا تو اس پر کچھ مہمل عبارت کے علاوہ جابجا "ڈرائنگ سلف ٹاٹ" لکھا تھا۔ میں نے جھٹ سے کاغذ پھاڑ دیا اور لیٹر پیڈ لے کر دوکان کی طرف سے امریکہ میں کتاب کے پبلشرز کے نام ایک خط لکھا جس میں "ڈرائنگ سلف ٹاٹ" بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ پھر میں نے جلدی جلدی اس خط کی کتنی ہی بہت سی نقلیں بنا کر لفافوں میں بند کر دیں اور جتنے بھی ملکی یا غیر ملکی کتب فروشوں کے پتے یاد تھے لکھ دیئے اور میری رات کچھ انہیں خطوط میں مصروف رہ کر تذبذب کے عالم میں گذر گئی۔

اگلے دن میں اسٹال پر بیٹھا حسب معمول شہزادی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ شہزادی کے آنے میں چند ایک منٹ باقی رہ گئے تھے اور یہ چند منٹ میرے لئے اتنی ہی بے تابی کے تھے جیسے ایک معصوم بچہ عید کا چاند دیکھنے سے پہلے بے قرار ہو جاتا ہے ..... میں نے اسٹال کی نکڑ پر کھڑے ہو کر ایک نظر فٹ پاتھ پر دور تک دوڑائی۔ شہزادی حد نگاہ تک کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر گھوم کر آگے انسٹی ٹیوٹ کی طرف دیکھا تو انسٹی ٹیوٹ کا ٹیچر بالکونی پر بے قراری کے سے عالم میں کھڑا میری طرح دور دور تک فٹ پاتھ پر دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس پر غصہ سا آ گیا۔ یہ ٹیچر جو اس انسٹیٹیوٹ کا مالک بھی ہے بالکونی پر صرف اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب شہزادی کی آمد کا وقت ہوتا ہے، یا اُس وقت جب وہ جا رہی ہوتی، اور جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتی پیچھے سے دیکھتا رہتا۔ حالانکہ اس کے پاس بیسیوں لڑکیاں مختلف اوقات میں ٹائپ۔ شارٹ ہینڈ، اکاؤنٹنسی، کمرشل لیٹرز اور نہ جانے کیا کیا کچھ پڑھنے آتی ہیں۔ لیکن کسی پر اتنی امتیازی نظر نہیں رکھتا جتنی شہزادی پر۔ لمحہ بھر کے لئے میرا جی چاہا کہ نیچے سے ایک پتھر اُٹھا کے اتنے زور سے پاجی کے سر پہ دے ماروں کہ دن میں تارے نظر آ جائیں۔ لیکن پھر سوچا کہ ہنگامہ ہو جائے گا اور وہ بھی شہزادی کے نام پر۔ اور شہزادی کے نام پر ہنگامہ کرنا تو کیا میرا بس چلے تو اس کے نام پر دنیا بھر کی بڑی طاقتوں سے جنگ نہ کرنے کی اپیل کر دوں تاکہ امن عالم قائم رہے اور ماؤں کے جگر گوشے ان سے الگ نہ ہوں۔ بیویوں کا سہاگ نہ لٹے، بھائیوں کے دست و بازو سلامت رہیں۔ اور شہزادیاں اپنے حسن کی ہلکی ہلکی تیکھی تیکھی اور دلوں کی تہوں میں اُتر جانے والی مسکراہٹ سے بنی نوع انسان کے دل و دماغ کو تراوت بخشتی رہیں ..... مجھے شہزادی کا خیال آتے ہی ٹیچر کے سر پر پتھر مارنے کا خیال جاتا رہا۔ میں نے توجہ ادھر سے ہٹائی اور پھر بڑی بے تابی کے ساتھ چور نظروں سے مغربی جانب سے آنے والے لوگوں میں شہزادی کو تلاش کرنے لگا۔

[illegible] اچانک میرے پیچھے نغمہ سی آواز اُبھری جیسے کسی نے نرائج سے کاغذی بادام توڑا ہو۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو [illegible] [illegible] کی گردن [illegible] کھڑی تھی۔ اس نے سُرخ سبز [illegible] ساڑھی پہن رکھی تھی اور ویسا ہی شوخ بلاؤز۔ شاید [illegible]

[illegible] اس طرح اس کی ہنسی تھی۔ آدمی کو ہنسی کا انتظار ہوتے دیر نہیں لگتی۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اُس دن پہلی دفعہ مس انجم کے [illegible] میرے دل میں کچھ ایسی ہی [illegible] پیدا ہوئی۔ میں نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے دل کی کیفیت کو بھانپ گئی۔ لیکن اس کے چہرے پر خفگی کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے۔ بلکہ اس نے شعوری طور پر ساڑھی کے پلو سے اپنا جسم ڈھانپ لیا اور دوسرے ہی لمحے کندھے کو ایک جھٹکا دے کر پھر اسی طرح کر دیا۔

"ارے کچھ کہو بھی۔" وہ پھر بولی، جیسے ایک بادام اور ٹوٹا ہو۔

"کچھ نہیں آیا۔" میں نے بوکھلا کر جواب دیا اور نظریں اس کی طرف سے ہٹا دیں۔ چند لمحوں کے لئے شہزادی کا خیال جو ذہن سے اوجھل ہو گیا تھا جیسے ایک دم لوٹ آیا اور میری طبیعت پانی کی طرح صاف ہو گئی۔

"جینز ڈین کا کوئی نیا میگزین نہیں آیا ہے میڈم۔" میں نے پھر مس انجم کی طرف دیکھ کر کہا۔ لیکن ابھی اس کے جسم کے بارے میں [illegible] کوئی رائے قائم نہیں کی۔ شہزادی کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود اس کا مجھ پہ بہت بڑا احسان ہے، اس نے میرے جسم اور روح کو پاکیزہ بنا دیا ہے۔ میں اگر کبھی کوئی آوارگی کی بات سوچتا ہوں تو دوسرے ہی لمحے میرا ضمیر مجھے جھنجھوڑ دیتا ہے اور میں اپنے اندر ایک نئی روح تازگی اور ایک خوشگوار سی تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہوں۔

مس انجم چھم چھم کرتی کار میں جا بیٹھی۔ میں پھر شہزادی کی راہ تکنے لگا اور میں نے دیکھا وہ آ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے فضا میں ایکدم ایک دلکش مہک، ایک سرور، تر و تازگی اور رنگینی رچ بس گئی ہو، کائنات نے ایک دلچسپ نغمہ الاپنا شروع کر دیا ہو۔ اور میں اس نغمہ کی لے میں مدغم ہو کر کہیں کائنات میں گم ہو گیا ہوں۔ یہ کیفیت اُس وقت تک طاری رہی جب تک کہ شہزادی روئی کے گالے کی طرح لہراتی ہوئی پر وقار انداز سے سامنے سے گذر رہی۔ اُس کے جاتے ہی فضا یکدم تبدیل ہو گئی۔ سڑک پر ٹریفک کا بے ہنگم شور اور فٹ پاتھ پر راہگیروں کی بھنبھناہٹ پھر طاری ہو گئی اور میں اسٹال کی نکڑ کے ساتھ یوں کھڑا تھا جیسے کسی نے ایک حسین خواب سے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ مجھے شہزادی کا ہلکا ہلکا تصور ساذہن میں آ رہا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو کبھی غور سے نہیں دیکھا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی ہے۔ میری آنکھوں میں صرف اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی لافانی مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔ آج میں نے پہلی بار اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی ہلکی تہیں دیکھی تھیں۔ میں نے عورت کے ہونٹوں پر سرخی کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ اگر حسن ہے تو [illegible] میں ہے۔ وہ کسی سرخی اور غازے کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن اس دن پہلی دفعہ شہزادی کے ہونٹوں پر سرخی دیکھ کر نجانے کیوں مونالزا کا تصور میرے ذہن میں اُبھرنے لگا اور میں سوچنے لگا کہ اگر مونالزا دوبارہ جنم لے سکتی ہے تو یقیناً اس نے شہزادی کا روپ دھارا ہو گا.....!

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب شہزادی کلاس ختم کر کے واپس گذرنے والی تھی تو اس وقت مجھے اپنی کم مائیگی اور محرومی کا پھر احساس ہونے لگا اور میں سوچنے لگا کہ کاش [illegible] سلف ٹائٹ کی صرف ایک کاپی میرے پاس موجود ہوتی تو میں کہیں نہ رکنے والی شہزادی کو صرف چند لمحوں کے لئے اپنے اسٹال پر روک لیتا۔ اور کتاب کو دیکھ [illegible] اس کے ہونٹوں کی غیر فانی مسکراہٹ اور نکھر جاتی اور بھینی بھینی خوشبو کے سبب اسٹال کے چاروں طرف پھیل جاتے۔ میں سوچتے سوچتے [illegible] بنا ہو گیا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میرے سامنے کون کھڑا ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر نظر اٹھا کے دیکھا تو جیسے ایک دفعہ میری آنکھوں پر چکا چوند کر دینے والی روشنی پڑی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا جیسے میں دھم سے گر جاؤں گا۔ مگر میں فوراً سنبھل گیا۔ خلافِ اُمید شہزادی کھڑی تھی ہونٹوں پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی اور حسن کا دبدبہ چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کچھ اور قریب آئی۔ میں بڑی عقیدت سے کھڑا رہا۔ گلاب کی پنکھڑیوں کے ہاتھ میں [illegible] پکڑی ہوئی تین چار کتابیں اس نے میری طرف بڑھا دیں اور قدرے جھجکتے ہوئے بولی "یہ میری کتابیں رکھ دیجئے، کتابیں کل لے جاؤں گی۔" [illegible] جیسے پہاڑ پر کوئی کوئل دو میٹھے بول بول کر چپ ہو گئی ہو۔ "یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے۔" میں نے دل میں سوچا "کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔" مجھے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہزادی ہے۔ میں نے اطمینان کرنے کے لئے آنکھوں کو دو چار مرتبہ بند کر کے پھر کھولا اور جب مجھے یقین ہو چلا کہ میرے سامنے شہزادی ہی کھڑی ہے۔ [illegible] کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر اس سے کتابیں لے لیں اور اس کی پانچوں انگلیوں نے میرے پورے ہاتھ کو چھو لیا جن کا لمس میرے ہاتھ پر [illegible] کو تھرتھرا سا [illegible] دیا۔

[illegible] کچھ بات کرنے کا [illegible] پیدا کیا۔

میں شہزادی کا انتظار کرتے کرتے مجبوراً انتظار سا ہو گیا تھا۔

اس دن شام کے وقت میں اپنے ایک فلساز دوست کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ گھومتے گھومتے ہم وہاں پہنچ گئے جہاں اس آرٹسٹ کا اسٹوڈیو تھا جس کا نام میں نے شہزادی کی کتاب پر لکھا ہوا دیکھا تھا۔ میرے دوست نے (جس کے آرٹسٹ کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے) اندر اسٹوڈیو میں چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میرے دل میں پہلے ہی سے یہ اسٹوڈیو دیکھنے کی خواہش پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور ہم دونوں اندر چلے گئے۔ اور دروازے سے داخل ہوتے ہی پہلے کمرے میں بیٹھ گئے۔ صوفوں پر دو مرد اور ایک امریکن عورت پہلے ہی بیٹھے تھے۔ آرٹسٹ صاحب اندر دوسرے کمرے میں مصروف تھے۔ امریکن عورت کوئی رسالہ پڑھنے میں مصروف تھی اور دو آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ پتہ نہیں وہ ہمارے آنے سے پہلے کس کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔ میرے دوست نے بھی ایک رسالہ اٹھایا اور پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ میں کچھ بور سا ہو گیا۔ ایک تو کمرہ پہلے ہی سے تنگ تھا اور کچھ گھٹن سی چھائی ہوئی تھی اور دوسرے وہ دو آدمی مستقل گھور رہے تھے۔ پھر اکتا دینے والی خاموشی اور اجنبی سا ماحول مجھے گھٹن سی ہونے لگی۔ میں وقت گزارنے کے لئے یوں ہی ادھر اُدھر دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ مجھے کوئی بھی تصویر ایسی معلوم نہیں ہو رہی تھی جسے شاہکار کہا جا سکتا۔ میں اُس کے باوجود بڑے غور سے تصویروں کو ایک ایک زاویے سے دیکھ رہا تھا اور ایک ایک تصویر کو دیکھتے دیکھتے جب میں نے اچانک بائیں جانب اپنے قریب رکھی ہوئی تصویروں پر نظر ڈالی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری پیشانی پر بڑے زور سے ایک نوکدار پتھر مار دیا ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک دھندلاہٹ سی چھا گئی اور زمین گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور جیسے کمرے نے گھومنا شروع کر دیا اور کمرے میں رکھے ہوئے صوفے اور صوفوں پر بیٹھے ہوئے آدمی سب گردش کرنے لگے ہوں اور جیسے کسی نے مجھے اُڑتے ہوئے جہاز سے دھکا دے کر نیچے پھینک دیا ہو اور میں خلا میں بل کھاتا نیچے ہی نیچے لڑھک رہا ہوں اور پیشتر اس کے میں ایک زوردار چیخ مارتا میں نے جھٹ آنکھیں بند کر دیں اور جب تھوڑی دیر بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں تو ہر چیز معمول پر تھی۔ میرا دوست، دو مرد اور ایک امریکن بدستور صوفوں پر بیٹھے تھے۔ میں نے پھر غور کے ساتھ بائیں جانب اپنے قریب والی تصویر کو دیکھا اگر شاید میری نظریں ہی دھوکا کھا رہی ہوں لیکن میری نظروں نے کبھی دھوکا نہ کھایا۔ وہ شہزادی کی ہی تصویر تھی۔ اگرچہ آرٹسٹ کی کاریگری اس تصویر یا کہیں بھی اجاگر نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم اس نے اپنی طرف سے اس تصویر پر بہت محنت کی تھی اور اس تصویر میں آرٹسٹ کے بُرے ارادے کئی جگہ جھلک رہے تھے۔ اس نے اس کے بلوز کے گلے کو غیر ضروری طور پر عریانی کی حد تک ننگا کر دیا تھا اور بالوں میں سرخ رنگ کے پھول لگا دیئے تھے اور خواہ مخواہ پس منظر میں مجھے آرٹسٹ ان پھولوں پر جھپٹ جانے کے لئے بیتاب معلوم ہو رہا تھا۔ میں تصویر کو دیکھتے دیکھتے بے قابو سا ہو گیا۔ مجھے اپنے ہی چہرے کا رنگ اُڑتا ہوا معلوم ہوا۔ بوکھلا کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا جہاں دو پراسرار آدمی بیٹھے تھے۔ میں نے وہاں سے بے اختیاری طور پر تصویر کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھنا شروع کیا۔ اسی طرح تصویر کو دیکھتے ہوئے میں وہاں سے بھی اُٹھا اور امریکن عورت کے پاس جا بیٹھا اور پھر وہاں سے اُٹھ کر واپس اپنے دوست کے قریب آ گیا۔ لیکن میری نظریں لگاتار تصویر ہی کی طرف تھیں۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میرے فلساز دوست نے مجھے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ میں نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر امریکن عورت اور دو آدمیوں کی طرف۔ سب لوگ میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میں نے کوئی جواب دیئے بغیر ایک سرد آہ بھری اور صوفے سے ٹیک لگا کے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو گیا۔ میں نے دل و دماغ پر شدت کا بوجھ اور سر میں درد محسوس کیا۔ میرے دوست نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور کہنے لگا: "تم رو رہے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا معلوم نہیں میں رو رہا تھا کہ نہیں لیکن اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ خوب روؤں تاکہ بے انتہا آنسو نکلیں اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ لیکن میں نے بہت ضبط سے کام لیا اور جیسے آنسوؤں کے اُمڈتے ہوئے طوفان کو بند لگا کے روک لیا ہو اور وہ آنسو جو میرے دوست نے میری پلکوں پہ دیکھے شاید میرے قابو سے باہر ہو کر چھلک گئے تھے۔ میں نے گھبرائے ہوئے انداز سے چاروں طرف دیکھا۔ اب میرے دوست اور دو پراسرار آدمیوں کے علاوہ امریکن عورت بھی حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "جلد کمرے کی اور گھٹن کی وجہ سے طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔" لیکن میری نظریں غیر ارادی طور پر بار بار شہزادی کی

"... یہ لڑکی کیا اسے جانتے ہو؟" میرے دوست نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا ... [illegible]

"شہزادی!" میں نے تصویر میں ڈوبے ہوئے جواب دیا۔

"کون شہزادی؟"

"یہ" میں نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکرا دیا۔

"ارے بھئی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔ میں چپ رہا۔ مجھے کیا معلوم کہاں رہتی ہے۔ میں نے کبھی اس کا تعاقب کر کے اس کا پتہ معلوم نہیں کیا۔ نہ مجھے معلوم ہے کہ کس کی لڑکی ہے۔ میں نے کبھی اس کا شجرۂ نسب معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مجھے اس کے اتے پتے سے کوئی سروکار ہے نہ اس کے باپ دادا سے دلچسپی۔ میں صرف اس کو جانتا ہوں۔ جو کچھ وہ ہے۔ وہ کس اعتماد کے ساتھ چلتی ہے۔ کس پُر وقار انداز سے رکتی ہے۔ میں اُس کے ہونٹوں پہ بکھرے ہوئے تبسم سے آشنا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی نور کی کرن سے میں واقف ہوں۔ میں صرف اس کو اسی حد تک جانتا ہوں۔ وہ میرے لئے جوہری کی دکان کے شوکیس میں رکھا ہوا ہیرا ہے۔ جس کو خرید کر انگوٹھی میں جڑنا تو درکنار میں اُس کے دام بھی نہیں پوچھ سکتا ہوں۔ ..... میں نے دوست کے استفسار کا کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ اندر ہی اندر سوچتا رہا۔

"کیا یہ وہ شہزادی تو نہیں جس پر تم نے کہانی لکھی تھی؟" میرے دوست نے جیسے میری دکھتی رگ پکڑ لی ہو۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اقرار کر لیا۔ اِس پر میرے دوست نے ٹھاٹھیں مار کے قہقہہ لگایا۔ ... "پاگل ....." اس نے قہقہہ جاری رکھتے ہوئے کہا "دیوانہ ...."

وہ کہتا ہی رہا اور اگر اچانک پچھلے کمرے سے آرٹسٹ نہ آجاتا تو میرا دوست میرے جذبات کی پرواکئے بغیر نہ جانے کیا کچھ کہہ جاتا۔

"یہ لڑکی کون ہے بھئی" میرے دوست نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے چھوٹتے ہی آرٹسٹ سے سوال کیا۔

"کیا کرو گے پوچھ کر" آرٹسٹ میرے دوست کے کندھے پہ ہاتھ مار کر بولا۔

"پھر بھی؟" میرے دوست نے اصرار کیا۔

"بس سمجھ لو میری شاگرد ہے۔ بولو اسے اپنی فلم میں لوگے؟" اس نے نہایت بے غیرتی سے تصویر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اسے؟" ایجے میرے فلمساز دوست نے بھی تصویر کو بڑے غور سے دیکھنا شروع کیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں کمینگی کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور میرے جذبات بری طرح مجروح ہونے لگے۔ مجھے چکر سے آنے لگے اور میرا ایک پل بھی وہاں گذرنا مشکل ہو گیا۔ میں ایک دم گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا۔ میرے دوست نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ لیکن میں نہیں رکا۔

"آپ کاروبار کیجئے میں جا رہا ہوں" میں نے پیچھے مڑ کر رقت بھری آواز میں کہا اور تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا دروازہ سے باہر نکل گیا اور پھر رات گئے تک تاریک گلیوں اور بازاروں میں بے مقصد گھومتا رہا اور اس آوارگردی کے دوران میں میں نے شہزادی کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں سوچا۔

کئی دن کئی مہینے گذر گئے لیکن شہزادی ایک دفعہ بھی سامنے سے نہیں گذری اور اس کی راہ دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ مجھے اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ بھی معلوم نہیں تھا جہاں کبھی چوری کی طرح گھوم آتا۔ لے دے کر ایک آرٹسٹ کا اسٹوڈیو تھا مگر وہاں بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اور اب تو اس کی تصویر بھی وہاں نہیں تھی۔ پھر میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا اور کسی کے دل کا حال کس کو معلوم ہے۔ مجھے اندر اندر ہی جیسے ایک روگ سا لگ گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میری صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ مگر میں نے اس بگڑتی ہوئی صحت پر بالکل توجہ نہ دی۔

اس دن میں اسٹال کے پیچھے گلی میں چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک کہیں سے میرا فلمساز دوست آن ٹپکا۔ اور آتے ہی میری ... [illegible] اونچی آواز میں بولا۔

"ہیلو شہزادے"

"ہیلو" میں نے بجھی ہوئی آواز میں بے رُخی سے جواب دیا۔ مجھے اُس کی اُس دن کی کمینگی ابھی تک یاد تھی۔

"کبھی اپنی شہزادی کی بھی خبر ہے کہ نہیں" وہ کچھ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آؤ تمہیں بتاؤں" اس نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے ... [illegible]

[illegible] دل [illegible] ایک بار میرے ہونٹ بند ہوئے اور پھر چپک کر رہ گئے۔ میں گوشت پوست کا مجسمہ بنا پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم سچ ہو" میں نے دل میں سوچا۔ "وہ بہت سخت بیمار ہے۔ اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ کی جگہ خزاں کے زرد پتے کی سی مایوسی چھا گئی ہے اس کی آنکھوں کے گہرے اور ساکت پانیوں میں کسی نے برساتی نالے کا رُخ پھیر دیا ہے۔ اُس کے چہرے کی چمک دمک اور رنگ روپ پر ہیبتناک سائے منڈلانے لگے ہیں۔ اب وہ میرے خوابوں کی شہزادی نہیں بلکہ تمہاری نظم کی........" میں پتہ نہیں دیوانہ وار ابھی اور کیا کچھ سوچتا کہ میرے دوست نے مجھے جھنجھوڑ کر چونکا دیا اور حیرت زدہ لہجے میں کہنے لگا۔

"ارے تم تو رو رہے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ پہلے میری بات تو سُن لو۔ پاگل کہیں کے...... دیوانے......"

"پرانی کہانی" —— بقیہ صفحہ ۳۴

"نہیں چچا! وہ مجھے بلا رہی ہے۔ ہر روز بلاتی ہے"

"کیسی باتیں کر رہے ہو شہاب" دونوں بھائیوں نے بیک وقت کہا

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ــ وہ دیکھئے! آسمان کے ظرفوں، چاند کے غاروں، کہکشاں کی منزلوں میں وہی تو ہے! مشتری کی جلوہ گاہوں، زہرہ کی محفلوں اور ثریا کے ایوانوں میں اسی کا چہرہ تو نظر آ رہا ہے۔ عرش کی محرابوں میں، راتوں کے پلکوں کے پیچھے، فلک کے ستونوں کی اوٹ میں!!! آنکھ مچولی کھیل رہی ہے وہ مجھ سے۔ ہاں، ہاں......"

شہاب نے یہ پہلی دفعہ اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ آفتاب و مہتاب چپ تھے، حیران تھے ــ حیران تھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے! کیا کر رہا ہے؟ کیا یہ وہی ہے جسے ہر وقت چپ لگی رہتی تھی؟

"دیر نہ کیجئے چچا۔ یہ فلیتہ سلگا دیجئے"

یہ کہہ کر وہ بنگلے کے اوپر یوں سوار ہو گیا جیسے کوئی گھوڑے کی زین میں بیٹھتا ہے۔

"فلیتہ سلگائیے چچا ــ دیر نہ کیجئے۔ خدا حافظ ــ امی اور چچی سے کہئے گا میں یہیں کہیں ہوں گا ــ بادلوں کے اوپر سیاروں کی گذرگاہوں میں، کائنات کے کنگروں کے آس پاس قطبین کے ادھر اُدھر، شفق کے گلزاروں، طلوع و غروب کی وادیوں میں ــ بہت دور نہیں جاؤں گا۔ یہیں تو ہے عرش بریں!

یوں سنائی دے رہا تھا جیسے وہ عمر بھر چپ رہنے کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔ آفتاب و مہتاب سکتے میں تھے۔ تماشائی مبہوت!

"جلدی کیجئے چچا!"

مہتاب نے جیسے کسی سحر کے زیر اثر فلیتے کو شعلہ دکھائی بنگلے سے، جس پر شہاب سوار تھا، زمین کی طرف آگ کا ایک فوارہ سا چھوٹا پھر دھماکہ ہوا۔ اور وہ ڈھانچے سے یوں نکل گیا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ شہاب کے فرغل کے کنارے پروں کی طرح پھیلے نظر آئے اور وہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور دیکھتے دیکھتے آسمان کی پہنائیوں میں کھو گیا!

کہتے ہیں کہ کبھی کبھی، سو پچاس سال کے بعد جو شہاب ثاقب سا کرۂ خط خاک کو نظر آتا ہے، وہی شہاب ہے، آفتاب کا بیٹا جو اس وقت، جب بڑھاپا آیا جوان تھا، اپنے چچا کی بیٹی کی تلاش میں نکلا تھا۔

وادیٔ سرما

عارف حجازی

میرا اجنبی ملاقاتی بھکشو میاں میری صورت دیکھ کر بولا "آپ کا پستہ قد سانولی صورت اور گول مٹول سر دیکھ کر میں یہ سمجھا تھا کہ آپ میرے ہی دیس کے رہنے والے ہیں"۔

میں نے ذرا حیرانی سے پوچھا ـــ "تمہارا مطلب؟"

اس نے مسکرا کے جواب دیا ـــ "میرا مطلب سلہٹ سے تھا"

"خوب! یونہی سمجھ لو، مگر یہ کیا کم ہے کہ ہم دونوں ایک ہی خدا اور نبیؐ کو مانتے ہیں۔ زبان کا فرق ہمارے اس رشتہ کو کسی طرح توڑ نہیں سکتا۔ ان معمولی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ ایسے خیالات دشمنوں کے پھیلائے ہوئے ہیں"۔

میرا جواب سنکر بھکشو میاں کھسیانی ہنسی ہنس کر خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت چھاگئی، جیسے اسے میرے جواب سے اپنی غلطی کا بڑا احساس ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے موضوع گفتگو بدل کر پھر باتیں چھیڑ دیں۔ اور میں اطمینان سے کشتی پر بیٹھا ہوا اس کی دلچسپ باتیں پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ بھکشو میاں بولا:

"اس وادی کے لوگ بڑے بھولے اور سیدھے ہوتے ہیں۔ قلم چلانے کی بجائے کھیتی باڑی کرتے ہیں، دستکاری اور ہنرمندی کا ان میں بڑا شعور ہے۔ مگر جو لوگ جو یہاں کے ماحول سے واقف نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ دھرتی کے ان پھیلے ہوئے پانیوں کی سرزمین کا ان کی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہاں تقریباً سال بھر میں چھ مہینے بارش کا موسم ہوتا ہے۔ جون سے لے کر اکتوبر تک کا زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ہر وقت بادل چھائے رہتے ہیں۔ آج بھی کالی گھٹا چھا رہی ہے۔ وادیٔ سرما کی کنواریاں شرمیلی گھٹا دیکھ کر اپنے من میں ایک عجیب مسرت محسوس کرتی ہیں۔ ان کے گھنے کے رس جیسے میٹھے گیت بڑے پُرکشش ہوتے ہیں، ان کی پرسوز آواز بانسری کی سریلی تانوں سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ سرما کی بیٹیاں اپنے غم کے بوجھ کو ان گیتوں سے ہلکا کرلیتی ہیں، اور اس کے بیٹے بڑے وطن پرست، بڑے محنتی ہوتے ہیں"۔

بھکشو نے کشتی کا چپو چلا کر ایک مسرت آمیز نگاہ سے دیکھا اور خاموش ہوگیا۔ اس وقت دریا کے مٹیالے پانی میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ عجیب سہانا سماں تھا سطح آب پر غل مچاتی ہوئی چڑیاں محو پرواز تھیں اور میرا پورا دھیان ان آزاد پنچھیوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ کشتی میں منجدھار میں تھی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اپنی سیاحت کا زمانہ یاد آگیا میں نے ہند و پاک کا کونا کونا چھان مارا تھا کہیں میں نے زندگی کے رسیلے گیت سنے تھے تو کہیں جوشیلے نغمے، ریگستانی قافلوں کو دیکھا تھا سرحد کے سنگلاخ بے برگ و بار پہاڑوں پر ٹنگ ٹکور پشتو گیت بھی سنے تھے۔ بنارس کی صبح اور اودھ کی شام کا لطف اٹھایا تھا اور پوربی دیس کی کسان لڑکیوں کی زبانی ساون کے گیت جھولے پر گاتے ہوئے سنے تھے۔

"ایک جھولا ڈالا میں نے امبوا کی ڈال پر ـــ امبوا کی ڈال پر
امبوا کی ڈال پر،
ننھی ننھی بوندیاں رے، ساون کا میرا جھولنا"

اس وقت بھی میرے کانوں میں ایسی ہی آواز آرہی تھی۔ سرما کی فضائیں بھینی بھینی خوشبو سے بسی ہوئی تھیں اور ہلکی ہلکی پھوار سے [illegible] ہو رہا تھا۔ کئی دلفریب مناظر فطرت ایسے بھی تھے جنہیں میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک وادیٔ سرما بھی [illegible]

[illegible] چاروں طرف دیکھ کر دل میں کہا +

کھلی آزاد ہواؤں سے کھیلتے کھیلتے سُرما کی بیٹیوں اور بیٹوں کا بچپن گزرتا ہے تو جوانی ان خوشبو سے بسی ہوئی ہواؤں تک ہی [illegible] ہوتی ہے۔ چاروں طرف لہکتا ہوا سبزہ، پانی ہی پانی اور مست خرام ہوائیں۔ کالے ناگ کی طرح سر اٹھائے ہوئے پہاڑیاں کھڑی تھیں اور دریائے سُرما بڑے وقار کے ساتھ اس حسین گوشے میں بہہ رہا تھا۔ اسے وادی کے اس خطے کے سارے گیت یاد تھے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے گیت ہی نہیں بلکہ تاریخی اور تہذیبی گیت بھی۔

ہماری چھوٹی سی کشتی ایک ہی رفتار سے بہاؤ کی جانب چلتی رہی۔ اب میں نے دیکھا تو بھکشو میاں بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی کالی صورت، سفید موتی جیسے دانت اور ذرا سی کھچڑی داڑھی، سیاہ روشن آنکھوں میں بلا کی جاذبیت اور حسن تھا۔ بنیان پہنے اور تہمد کسے وہ کشتی کھینے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے مجھے اپنے ساتھیوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اس نے بھی میری طرح بہت سے شہر دیکھے تھے، شمالی ہند اور یوپی میں بھی رہ چکا تھا چنانچہ جب وہ کوئی بات چھیڑ دیتا تو میں اس کے انداز تکلم اور اشاروں سے بڑا محظوظ ہوتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بنگالی کی طرح سلہٹی زبان میں بھی بڑی ندرت، اور شیرینی ہوتی ہے۔ بنگالی، منی پوری اور آسامی زبان کے ملے جلے الفاظ کی آمیزش نے اس زبان میں ان کی ساری مٹھاس یکجا کر دی ہے۔ خیالات کی سادگی اور رومانی مزاج کی شوخیاں بھی خوب پائی جاتی ہیں +

تھوڑی دیر کے بعد بھکشو میاں نے بڑی گہری رفاقت کی نظر سے دیکھا تو میں نے پوچھا "ابھی صدر گھاٹ تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی؟"

یہ سُن کر وہ ہنس دیا اور بڑے خوش آیند آواز میں بولا "معلوم ہوتا ہے آپ پانی دیکھتے دیکھتے اکتا گئے ہیں، مگر یہاں کے لوگوں کی زندگی پانی ہی میں گزرتی ہے۔ سُرما کو ہماری معاشرتی، تمدنی تاریخ ہی نہیں بلکہ اس سرزمین کے سارے اسرار معلوم ہیں۔ اس کی ہر موج ایک نغمہ ہے، اور اس نغمہ کی ہر لے کسی "بھٹیالی"[*] کے بول سے کم نہیں ہوتے۔ آپ زندگی کے سارے گیت اس ساز پر بخوبی سن سکتے ہیں۔ دیکھئے کیا سندر سماں ہے۔ اس موسم میں تو سرما کی مچھلیاں بھی خوشی سے ناچتی ہیں۔"

ابھی اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ ایک بڑی سی مچھلی پانی کی سطح چیر کر تڑپی اور پھر ڈبکی لگا کر غائب ہو گئی۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا:

"یہاں مچھلیاں بھی کثرت سے ہوتی ہیں؟"

"جی ہاں، ایسی مچھلیاں آپ نے دیکھی بھی نہ ہوں گی"

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے اور کشتی مستانہ چال چلتی رہی۔ میں نے سُرما کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر دل میں کہا "تو اس وادی کی شہ رگ ہے۔ تیری موجیں زندگی کا بہتا ہوا ساز ہیں۔ جو ہمیشہ بجتا رہے گا، تیری ہیرے جیسی مچھلیاں جب اس ساز کے پُر کیف نغموں کو سنتی ہیں تو ناچنے لگتی ہیں اور ماہی گیروں کے خوبصورت جال تیرے پانیوں پر بکھر جاتے ہیں۔ جب وہ ان کو پانی سے نکالتے ہیں تو وہ ان مچھلیوں کو پا کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے"

ابھی میں سُرما سے محو تکلم تھا کہ سیاہ بدلیوں کا سینہ چیرتی ہوئی سورج کی منور کرنیں چاروں طرف پھیل گئیں۔ دور بلند سرسبز چراگاہوں پر قوس قزح کی رنگینیاں رقصاں تھیں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی دھان اور پٹ سن کے کھیت جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کی پرجوش لہروں کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہمارے جذبات سے بے نیاز دھیمی اور مدھم آواز میں کہہ رہی تھی "میں سلہٹ کی تاریخ سے خوب واقف ہوں۔ میں نے تلواروں اور نیزوں کی گھمسان جنگ دیکھی ہے"۔

---

[*] ایک ساز جس میں تاروں کی بجائے گھوڑے کا بال لگا ہوتا ہے۔

میں نے جواب دیا تاریخ کی دنیا تو بہت بڑی ہے۔ اس میں ہزاروں لاکھوں افراد کے افسانے ملتے ہیں [illegible]
[illegible] فرعون کا نپولین، دہشت پسند ہٹلر، روس کا اسٹالن، غرضیکہ اسی طرح لاکھوں افراد ہیں جو دنیا کے اسٹیج پر ایک نئی تہذیب
[illegible] آن بان کے ساتھ ابھا گر ہوئے مگر ان میں سے کسی ایک کی زندگی ایسی نہ تھی جو قابل تقلید نمونہ بن سکتی، بلکہ روحانی سکون ملنے کی بجائے
ان کی زندگی کے محلوں سے بربادی اور تباہی کی آگ نکل کر ہر جگہ پھیل گئی۔ اب ان روایاتی تاریخوں میں کیا رکھا ہے؟

پھر مجھے خیال آیا اب تو ہماری عملی تاریخ کا دور پھر شروع ہو گیا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب خدا کا قانون بلا تفریق امیر و غریب گورے کالے سب ہی پر یکساں جاری ہو جائے گا۔ وہ قانون جو بادشاہوں کی طرح جسموں پر نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔

سُرما[1] شاید میری باتیں سن کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس کے پانی کو دیکھ کر سوچا شاید اس نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ اس سے پہلے میں اسے متی پور کے شمال میں برٹیل کے مقام پر مل چکا تھا۔ جہاں وہ ایک نوعمر بچی کی طرح اچھلتی، کودتی اور آنکھ مچولی کھیلتی ہوتی ہے۔ لیکن سلہٹ پہنچ کر تو وہ صدیوں کی بڑی بوڑھی معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں اسے تاریخ کے لہولہان قصے یاد تھے وہاں اس سرزمین کے محبت، دکھ سکھ اور فصلوں کے گیت بھی یاد تھے۔ وہ سلہٹ کے بارونق شہر کے درمیان سے اس قدر مانوس معلوم ہو رہی تھی کہ اس کے دونوں کنارے شہر کی آبادی سے جا ملے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک عرصہ کے بعد ماں اپنے جوان سال بیٹے کو دیکھ کر گلے لگانے کے لئے خوشی سے اپنی دونوں باہیں بڑھا رہی ہے۔

میں نے بیٹھے بیٹھے بھکشو میاں سے دریافت کیا "تمہیں سلہٹ کی تاریخ بھی معلوم ہے؟"

وہ مسکرا دیا۔ پھر لمحہ بھر سوچ کر بولا۔ "آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"یہی سلہٹ پہلے کیسا تھا۔ یہاں پر کون راج کرتا تھا؟"

"میں پڑھا لکھا تو نہیں ہوں لیکن بڑے بوڑھوں کی زبانی سنتا چلا آیا ہوں کہ آج سے صدیوں پہلے اس وادی کے چپے چپے پر دیوی دیوتاؤں کا راج تھا۔ اندھی تہذیب اور گونگے قانون رائج تھے اور چاروں سو جہالت کا دور دورہ تھا۔ سلہٹ کی تاریخ کا یہ زمانہ نہایت بھیانک تھا۔ میں یہاں کی تاریخ کی ایک دلچسپ کہانی سناتا ہوں جو یہاں کے لوگوں کو اب تک یاد ہے"، بھکشو میاں لمحہ بھر سانس لے کر بولا:

"شاید آپ نے کتابوں میں پڑھا ہو کہ پہلے سلہٹ کا نام گوبند پور تھا۔ اس شہر کو راجہ گوبند نے بسایا اور یہ اسی کے نام سے مشہور ہوا۔ کہتے ہیں وہ بہت بڑا جادوگر تھا اور اس کی جادوگری کے کمالات کا راز اس کے محل کے ایک کنوئیں میں چھپا ہوا تھا۔"

"کنوئیں میں؟"

"جی ہاں، کنوئیں میں۔ کہتے ہیں اس کنوئیں کے پانی کی صفت یہ تھی کہ جب راجہ کسی مردہ جانور یا آدمی پر اس کو چھڑک دیتا تو وہ زندہ ہو جاتا۔"

یہ سن کر میں نے دل میں کہا۔ شاید بھکشو میاں کی یہ کہانی طلسم ہوشربا اور چہار درویش کا قصہ ہے۔ چنانچہ میں چپ ہو گیا اور دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک مسلمان تاجر جس کے یہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، خدا سے منت مانگی کہ اگر اس کے یہاں بچہ ہو گا تو وہ اپنی عزیز گائے اس کے نام پر قربان کر دے گا۔ چنانچہ خدا کا کرنا ایسا ہی ہوا۔ تاجر کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے خوشی کے ذریعہ سے گائے اپنے گھر میں ذبح کی۔ اس کا سارا گوشت خفیہ طریقہ پر اپنے محلے کے چند مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ہڈیاں گھر کے صحن میں دفن کر دیں سوء اتفاق سے ایک آدھ ہڈی صحن میں پڑی رہ گئی جسے ایک چیل اٹھا لے گئی۔"

---

[1] دریائے سرما کا منبع۔

"پھر کیا ہوا؟"

"کہتے ہیں، وہ چیل جب اڑتی ہوئی راجہ کے پائیں باغ کے اوپر پہنچی تو ہڈی اس کی چونچ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی جہاں راجہ گوبند چہل قدمی کر رہا تھا۔ راجہ نے ہڈی کو دیکھ کر قیافے سے پہچان لیا کہ وہ گائے کی ہڈی ہے۔ پھر کیا تھا، اس کے غصے کی کوئی حد نہ رہی، چاروں طرف جاسوس اس شخص کی تلاش میں لگ گئے جس نے گائے ذبح کی تھی۔ بالآخر بڑی تگ و دو کے بعد وہ لوگ تاجر کو گرفتار کر کے راجہ کے سامنے لے آئے۔ راجہ کے دریافت کرنے پر تاجر نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے سارا قصہ گوش گزار کر دیا۔"

"تو راجہ نے تاجر کو معاف کر دیا"

"جی نہیں، اس نے تاجر کے اس جرم کی سخت سزا دی اور اس کے پھول جیسے بچے کو سرِ دربار منگوا کے اپنی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ بیچارہ تاجر روتا پیٹتا اپنے گھر لوٹ آیا اور پھر اسی رات اپنی بیوی کو لے کر دہلی فرار ہو گیا۔ اس کے بھاگ جانے پر راجہ گوبند مسلمانوں کا بڑا دشمن بن گیا۔ اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دیتا رہا۔

کہتے ہیں اس زمانے میں شہنشاہ اکبر کی حکومت تھی۔ تاجر نے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کر کے راجہ کے ظلم کی داستان سنائی۔ اس نے راجہ گوبند کی سرکوبی کے لئے ایک بہت بڑی فوج روانہ کی۔ اسی سُرما کے دوسرے کنارے پر مسلمان فوج نے خیمے لگائے۔ پھر راجہ کے سپاہیوں اور مسلمان فوج میں بڑے بڑے معرکے ہوئے، لیکن جب مسلمان سپاہی دریا پار اترتے تو فوراً لاپتہ ہو جاتے۔ فوج کا سپہ سالار بڑا حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب مسلمان فوجی دستے دریا کے دوسرے کنارے پہنچتے تو راجہ اپنے جادو کے کنویں کا پانی چھڑک کر انہیں پتھر بنا دیتا۔ آخر مسلمان فوج گوبند پور کا محاصرہ کرنے میں ناکام رہی۔ اور دریا میں کشتیوں اور سپاہیوں کی آمد و رفت بند کر دی گئی۔

اسی اثناء میں حضرت شاہ جلالؒ سیاحت کرتے ہوئے اپنے مریدوں کے ہمراہ نکل آئے۔ وہ سُرما کو پار کر کے آگے جانے کے ارادے سے ٹھہرے ہوئے تھے کہ مسلمان سپہ سالار نے فوج کشی، سپاہیوں کے لاپتہ ہونے اور راجہ کی جادوگری اور ظلم و ستم کی داستان بیان کی۔ اتنا معلوم ہونا تھا کہ شاہ صاحب کو جلال آ گیا اور انہوں نے اپنے عصا کو گھما کر دریا کی سطح پر زور سے پھینکا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ آناً فاناً پل سا بن گیا۔ آگے آگے شاہ صاحب اور ان کے مرید اور پیچھے پیچھے مسلمان فوج نے نہایت اطمینان سے دریا پار کیا۔ تھوڑی دیر میں چاروں طرف سے ہوا کے طوفان چلنے لگے اور وہ مسلمان سپاہی جو لاپتہ ہو چکے تھے زندہ ہو کر چاروں طرف سے امڈ آئے۔ راجہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ مسلمان فوج فتح و نصرت کا پرچم لہراتی آگے بڑھتی چلی گئی۔"

بھکشو میاں چیچ چلاتے چلاتے رک گیا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"جب راجہ کو اپنی فوج کی شکست کی خبر ملی تو اس نے شہر پناہ کے تمام دروازے بند کروا دئے اور خود اپنے محل میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ شاہ صاحب اور مسلمان فوج جب شہر کے صدر دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ اسے پتھر کی ایک بہت بڑی سل سے بند کر دیا گیا ہے جسے سینکڑوں ہاتھی بھی گھسیٹتے تو ہل نہیں سکتی تھی۔ لیکن شاہ صاحب کے ایک معمولی فقرے "سل ہٹ" کہنے پر وہ اس طرح راستہ سے ہٹ گئی جیسے ہوا سے تنکا اڑ کے دور جا گرتا ہے۔ پھر کیا تھا مسلمان فوج شاہ صاحب کی رہبری میں شہر میں داخل ہو گئی اور اسی روز سے "گوبند پور" کا نام "سلہٹ" مشہور ہو گیا۔"

"خوب! پھر تو راجہ گرفتار ہو گیا ہو گا۔"

"جی نہیں، وہ بڑا دلیر جادوگر تھا۔۔۔ اس نے اپنے تمام حربے اور بڑے سے بڑے جادو چلانے میں کسر نہ چھوڑی۔ جس وقت شاہ صاحب محل سرا میں داخل ہوئے تو انہیں سخت پیاس محسوس ہوئی اور پانی طلب کیا، لیکن آس پاس کہیں پانی نہ مل سکا۔ چنانچہ وہ اس جادو کے کنویں پر پہنچے۔ راجہ بڑا سیانا تھا، اس نے کنوئیں میں کئی من زہر پہلے ہی ڈلوا دیا تھا تاکہ جب کوئی اس کا پانی پئے تو فوراً ہلاک ہو جائے۔ اس کام کے لئے اس نے سولہ لڑکوں کو کنوئیں پر دیکھ بھال کے لئے بٹھا رکھا تھا۔ جب شاہ صاحب نے پانی مانگا تو راجہ کے بتلائے ہوئے لڑکوں نے بڑے اہتمام سے ایک

خوبصورت برتن میں پانی بھر کے پیش کیا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ شاہ صاحب پورا پانی پی گئے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس ان کے پانی پیتے ہی راجہ کا لڑکا جو پانی لے کر آیا تھا فوراً کھڑے کھڑے تڑپ کر مر گیا۔ راجہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے جان لیا کہ اب جان بچانے کی کوئی صورت نہیں اور ادھر شاہ صاحب کی زبانی زہر کا راز سب کو معلوم ہو گیا تھا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ راجہ کو فوراً تہہ تیغ کر دیں لیکن شاہ صاحب نے ان کو روک دیا۔ شاہ صاحب کی وجہ سے راجہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

بھکشو میاں کی کہانی سے میں کچھ اکتا سا گیا تھا۔ مگر میں نے مداخلت نہ کی۔ اس نے دھیرے سے کہا "پھر جانتے ہیں آپ کیا ہوا؟ شہر پر مسلمانوں کا قبضہ تو ہو چکا تھا مگر راجہ اپنے محل کے تہہ خانے میں چھپا رہا۔ اس نے فرار ہونے کی کئی ترکیبیں سوچیں اور اپنی جادوگری کا آخری کمال بھی دکھایا۔"

"وہ کیا؟"

"کہتے ہیں اس نے سانپ کی صورت اختیار کر لی اور ایک صندوق میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ پھر اپنی ماں سے کہا کہ وہ فقیری کے بھیس میں اس صندوق کو اٹھا شہر سے بھاگ جائے۔ چنانچہ اس کی ماں جب صندوق اٹھائے شہر سے گزر رہی تھی تو شاہ صاحب اپنے مریدوں کے ساتھ آتے دکھائی دئیے۔ راجہ کی ماں گھبرا گئی۔ جب شاہ صاحب قریب آ گئے تو ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شاہ صاحب صندوق کو دیکھ کر مسکرائے اور ارشاد فرمایا "گوبند! باہر نکل آ، تو چھپ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا ہے۔" اتنا کہنا تھا کہ صندوق کا ڈھکنا خود بخود کھل گیا اور راجہ گوبند انسانی صورت میں بکس سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں مسلمان سپاہی بھی آ گئے اور راجہ کو گرفتار کر کے لے گئے۔ یہ ہے سلہٹ کی تاریخی کہانی، اس کے علاوہ شاہ صاحب کے متعلق اور بھی بہت سے واقعات ہیں جنہیں میں پھر کبھی سناؤں گا۔"

"خوب! کہانی تو بڑی دلچسپ ہے۔" میں نے لمبا سانس لے کر کہا۔

میں نے نگاہ اٹھا کے جنوب کی طرف دیکھا۔ پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ کالی بھینس کی مانند سرسبز جنگلات کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک چلا گیا تھا۔ اسی کوہسار کے دامن میں میلوں میں چائے کے باغات تا حد نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ ان سے تھوڑی دور پر چائے کے کارخانے نظر آ رہے تھے۔ اس وقت ہماری کشتی دریا کے بل کھاتے ہوئے موڑ پر تھی۔ اور یہاں اس کے دونوں کنارے اور بھی وسیع ہو گئے تھے۔ اور شہر کی آبادی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے سُرما کے پانی کو چھو کر دیکھا تو وہ بڑا ٹھنڈا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جی بھر کے پی لوں، مگر بھکشو نے کہا: "اپنی جگہ بیٹھے رہئے، یہاں پر بھنور پڑتے ہیں۔" میں سنبھل کر اپنی جگہ جم کے بیٹھ گیا اور سُرما کے تیز رفتار دھاروں میں شادابی حُسن کے رنگوں کو دیکھتا رہا۔ ہر رنگ میں محبت اور تاریخ کے رومان جھلکتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سلہٹی دوشیزاؤں کا حسن ایک امرت ہی تھا۔ ان کے گندمی اور سانولے رنگ میں بڑی نمکینی اور جاذبیت ہوتی ہے۔ پھر چہرے کے خدوخال اتنے پُرکشش ہوتے ہیں کہ نگاہ جم کے رہ جاتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سُرما چپکے چپکے کہہ رہی ہے: "رات کے سناٹے میں جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو مائیں اپنے بچوں کو حقیقت افروز لوریاں سناتی ہیں۔ ان کے محبت سے بھرپور جذبات میں انوکھی سچائی اور آواز میں بڑا درد ہوتا ہے جسے سن کر ستارے بھی مسکرانے لگتے ہیں اور بچوں کو نیند آ جاتی ہے۔ جب میں ان لوریوں کو سنتی ہوں تو میں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی ندیوں کو تھپکا تھپکا کے گانے لگتی ہوں۔

"چندا ماما آؤ آؤ

بھات دوں گی۔ مچھلی دوں گی

کٹیا کے نیچے۔ بٹھلاؤں گی

آ منے کے سر پر بیٹھ"۔ (آسامی لوری جو ضلع سلہٹ میں بھی رائج ہے)

میں نے کہا "سُرما یہ لوری تو دادی کی جیتی جاگتی زندگی کی تصویر ہے۔"

بھکشو میاں دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا اور کشتی لہروں سے کھیلتی ہوئی چل رہی تھی۔ اب ہم اپنی منزل سے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔

(باقی صفحہ ۳۰۳ پر)

سید عبدالحمید عدمؔ

ستاروں میں کھویا گیا ہے ستارا، نگاروں میں کھوئی گئی ہے جوانی
چمکتی چمکتی دمکتی بہاروں میں کھوئی گئی ہے جوانی

جوانی کچھ ایسی تو پاگل نہیں تھی مگر اس کی جو آرزو تھی حسیں تھی
بڑے خوبصورت سرابوں کے بے رحم دھاروں میں کھوئی گئی ہے جوانی

محبت کا شعلہ، جوانی کا سینہ، بہاروں کا موسم نگاروں کی مجلس
شراروں میں گم ہوگیا ہے مسافر، چناروں میں کھوئی گئی ہے جوانی

جوانی کے کھونے کا یہ بانکپن بھی ہمیں تا قیامت نہ بھولے گا ساقی
تری انکھڑیوں کے شگفتہ اشاروں میں کھوئی گئی ہے جوانی

کسی وقت کی کوئی مانوس آہٹ سماعت کے زانو پہ سوئی ہوئی تھی
جگاتے جگاتے اسے دفعتاً آبشاروں میں کھوئی گئی ہے جوانی

امنگوں کے رنگین مرقد تو تھے اے عدمؔ زندگی کی خوشی کا اثاثہ
گئی تھی چڑھانے وہاں پھول، لیکن مزاروں میں کھوئی گئی ہے جوانی

غزل

ہم اُن کے تغافل کو ادا جان رہے ہیں — اس بات پہ کچھ لوگ برا مان رہے ہیں

اے حضرتِ ناصح ہمیں الزام نہ دیجے — اس عمر میں کچھ آپ بھی نادان رہے ہیں

احسان بہاروں کا اٹھایا نہ خزاں کا — دیوانے سدا چاک گریبان رہے ہیں

دیکھا تھا کبھی کوچۂ جاناں میں بھی تجھ کو — ہم اے غمِ دوراں تجھے پہچان رہے ہیں

رہزن کئی ملتے ہیں رہِ دیر و حرم میں — اس خوف سے ہم بے سر و سامان رہے ہیں

یارب یہ جہاں کہتا ہے کیوں ان کو بھی کافر — جو تیری خدائی کے نگہبان رہے ہیں

نادیدہ بہاروں سے ہمیں بھی تو لگن تھی — ہم بھی تو کبھی صاحبِ ایمان رہے ہیں

لازم ہے جہاں کے لئے اس دل کی عبادت — جس دل میں تری دید کے ارمان رہے ہیں

اڑتے ہوئے دیکھے نہیں کیا آپ نے لمحے؟ — اک رات مرے آپ بھی مہمان رہے ہیں

بے جہد و طلب پائے ہیں اوروں نے خزینے — ہم خاک ترے در کی مگر چھان رہے ہیں

ہر ایک بگولا ہے قتیل اپنا ہی مظہر
پوشیدہ مری خاک میں طوفان رہے ہیں

غزل

جمیل واسطی

بدل گئے ترے تیور چلی تھی بات میں بات
وگرنہ جانے حقیقت فقط خدا کی ذات

تڑپتے لوٹتے ڈستے ہیں سانپ سے دل میں
وہ بزمِ شب کے تبسّم کہ بن گئے شبہات

جو آبروئے محبت لٹی زمیں سہمی
کہا ستاروں نے ہیہات چاند نے ہیہات

حریمِ ناز ہے برباد بے سجود ہے دَیر
ہوس نے کردئے عریاں نکاتِ حسن و حیات

ورائے حُسن حسیں ہو مگر میں سوچتا ہوں
کہ کیوں وفا میں مری آگئیں جنوں کی صفات

ہے عشق حُسن فریب اور حُسن عشق فریب
مٹا جو حسن و محبت میں تھا وفا سے ثبات

حیاتِ واسطی بے کیف تھی غنیمت ہے
کہ پھر ہوا ہے حرم جلوہ گاہِ لات و منات

جعفر طاہر

ہم قافلۂ شیخ و برہمن نہ ہوئے ہم
شاعر تھے کسی طرح بھی پُرفن نہ ہوئے ہم

اوروں کے سئے پیرہن و پاکِ گریباں
ممنونِ قبا صورتِ سوزن نہ ہوئے ہم

دل بن کے چراغِ حرمِ ناز جلا ہے
یعنی سرِ محفل کبھی روشن نہ ہوئے ہم

ہم راہروؤں کو تو نہ دو خضر سے نسبت
رہبر نہ بنے ہم کبھی رہزن نہ ہوئے ہم

آغوشِ صبا میں تو کبھی سیلِ بلا میں
اے گلشنیاں! شمعِ نشیمن نہ ہوئے ہم

یہ عمر سبک تاز، یہ دیوانگیٔ شوق
وابستۂ یک جلوہ و روزن نہ ہوئے ہم

ہم شعلۂ گل بن کے رہے، تو چمن آرا
صد شکر کہ خار و خسِ گلخن نہ ہوئے ہم

ہیں دشمنِ اربابِ وفا خاور و دانش[1][2]
طاہر کبھی دشمن کے بھی دشمن نہ ہوئے ہم

---

[1] جو راولپنڈی تشریف لائے لیکن مجھ سے نہیں ملے۔
[2] جو خط کا جواب دینا باعثِ عار سمجھتے ہیں۔

غزل

سراج الدین ظفر

دشوار جو مقام تھا جبریل کے لئے
صرف ایک جست تھی مری تخئیل کے لئے

پھر ہے کسی کی زُلف کو کھُلنے کی آرزو
اجمال بے قرار ہے تفصیل کے لئے

خلوت کسی سے ہو تو دو عالم سے ہاتھ اٹھاؤ
اِس عالمِ حوالہ و تحویل کے لئے

اے رازِ جوئے بندِ قبا حوصلہ ہے شرط
اِس علمِ سربمُہر کی تحصیل کے لئے

اے بزمِ گُل، شراب کی سینے میں بھر کے تو
لایا ہوں میں شررِ تری قندیل کے لئے

آدم سے تکملہ نہ ہوا جس کا اے خدا
کوشاں ہوں اُس گناہ کی تکمیل کے لئے

پھر شرح دیکھنا مرے اجمالِ شوق کی
ملجائے کوئی رات جو تفصیل کے لئے

اے عصرِ نو سنبھل کہ پھر اُٹھے ہیں میگسار
اِک عالمِ جدید کی تشکیل کے لئے

مجھ تک براہِ راست بھی پہنچے ہیں کچھ پیام
ہر شے نہ تھی سماعتِ جبریل کے لئے

مانندِ نور ہے مری آغوشِ شوق آج
اک ماہِ نیم ماہ کی تحویل کے لئے

اسمائے گُل رُخاں میں بھی اے واعظانِ شہر
گنجائشیں ہزار ہیں ترتیل ہی کے لئے

ہر رات ڈھونڈتا ہوں کہ شاید کوئی چراغ
ملجائے میرے گوشۂ تخئیل کے لئے

خوش آگیا مزاجِ صبا مجھ کو ورنہ میں
مُصر تھا مہر و ماہ کی قندیل کے لئے

اے بابِ دلبری ترے گیسو کی سطر میں
سو علم تھے احاطہ و تحصیل کے لئے

کل شب کہ میگسار تھے مسند نشینِ گُل
قدموں میں جا تھی افسر و اکلیل کے لئے

کوئی غزل ظفر کہ بڑا نیک ہے یہ وقت
ہر آیتِ جدید کی تنزیل کے لئے

ش۔م

نقد و نظر

حیاتِ سرورِ کائنات (حصہ اول)

ملا واحدی دہلوی
ادارۂ نظام المشائخ

جیکب لائنز کراچی۔ مجلد۔ ۴۳۰ صفحات۔ قیمت سوا چار روپے

● حیاتِ نبی صلعم تاریخِ انسانی کا وہ عظیم اور مستقل موضوع ہے جس پر بہت سے اہلِ علم اور اہلِ تحقیق کی حیاتِ مستعار صرف ہوئی اور ہوتی رہے گی۔ جہاں تک وقائعِ حیاتِ مبارکہ کا تعلق ہے، مزید تلاش کے دروازے بظاہر بند ہو چکے۔ لیکن نگاہ و بصیرت کے لئے اب بھی اس میں بہت کچھ اکتساب کی گنجائش موجود ہے۔ ہر عہد کا شعور اور نظر الگ ہوتی ہے، بلکہ انفرادی فہم اور مذاقِ تحریر سے اس میدان میں اور بھی گوناگونی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جس کی زبان سے سنئے یہ حکایت جدید تر اور عجیب تر نظر آتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی ملا واحدی صاحب نے سیرت کے بیان میں نئی ترتیب اختیار کی ہے۔ یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے جس میں ولادت، خاندان، قوم عرب کی تاریخ سے لے کر بعثت، غزوات اور اشاعتِ اسلام آنحضرتؐ کے حینِ حیات میں، نیز حلیۂ مبارک اور سیرت کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ منصوبے کے مطابق دوسرا حصہ سیرت و اسوۂ حسنہ، نیز عمرانیاتِ اسلامی کے بعض پہلوؤں کی تعریف و تشریح پر مشتمل ہوگا۔ یہ حصہ بالاقساط رسالۂ "نظام المشائخ" میں شائع ہو رہا ہے۔ ملا واحدی صاحب کا سلیس و بے تکلف اندازِ بیان جس میں سراسر خلوص جھلکتا ہے، اس تالیف کے لئے بہت موزوں تھا۔ واحدی صاحب آرائشِ بیان سے پرہیز کرتے ہیں جس سے تحریر کی ثقاہت اور مؤرخانہ شان قائم رہتی ہے۔

خیال "سن ستاون نمبر" (شمارہ ۱-۲)

سندھ ساگر اکادمی۔
لاہور۔ ضخامت ۳۵۰
صفحات، قیمت چار روپے

● ناصر کاظمی اور انتظار حسین نے زیرِ نظر شمارے سے اپنے پرانے جریدے "خیال" کا احیاء کیا ہے۔ قومی تاریخ کے اس اہم واقعے کی صد سالہ یادگار کو پاکستان کے جرائد نے جس طرح منایا وہ ہماری صحافت کے لئے قابلِ مبارکباد ہے۔ ان جرائد میں "خیال" کو بلاشبہ بڑا ممتاز مقام حاصل ہے۔ "خیال" کا زیرِ نظر شمارہ سچ مچ بڑے خیال سے مرتب کیا گیا ہے، اور ایک یادگار صحیفہ بن گیا ہے جملہ مضامین، جو دس عنوانات کے تحت منقسم ہیں، نہ صرف جنگِ آزادی، بلکہ سو سال پہلے کے تاریخی دور کے اکثر اہم پہلوؤں پر حاوی ہیں: "سن ستاون اور ہم"، "پس منظر"، "آنکھوں دیکھا حال"، "شہر شہر"، "سود و زیاں" (یعنی تاریخی نتائج کا خلاصہ)، "جنگِ آزادی اور ادب"، "نظم و نثر"، "شخصیتیں"، "بیاض" (منظوم انتخابات) اور "خیال" کے نام پیغامات۔ ان میں سے ہر باب کے تحت متعدد دلچسپ اور بصیرت افروز تحریریں یکجا کی گئی ہیں جن میں سے اکثر نہایت قابلِ قدر ہیں۔ رسالہ تصاویر سے بھی مزین ہے اور ۱۸۵۷ء پر ایک مستقل تالیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

فنِ تدریس

از گلبرٹ ہائٹ
مترجمہ مشرف انصاری

اردو مرکز، لاہور۔ مجلد۔ ۳۷۵ صفحات۔ قیمت بلا درج

یہ تعلیم جیسے اہم موضوع پر ایک جدید اور مستند انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جسے اردو کی حالیہ مطبوعات میں بڑی وقیع تالیف اور تعلیمات پر اردو کے کم مایہ ذخیرے میں بڑا مفید اضافہ کہنا چاہیئے۔ پروفیسر گلبرٹ ہائٹ امریکا کی کولمبیا یونیورسٹی میں کلاسکی ادب کے استاد ہیں، جو نفسیاتِ تعلیم پر بڑی گہری نظر اور تعلیم کے عملی مسائل کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کی کتاب کی بہت سی جیتی جاگتی مثالوں سے بھی ظاہر ہے۔ ایک باب "جگت استاد اور ان کے شاگرد" تاریخ کی اہم شخصیتوں فلسفیوں، لیڈروں اور پیغمبروں کی بصیرت افروز حکایاتِ زندگی اور قیادت کی صلاحیتوں کے بیان پر مبنی ہے، جس کی افادیت اور دلچسپی ظاہر ہے۔ یہ کتاب بیک وقت فنِ تعلیم پر ایک درسی کتاب بھی ہے اور زندگی کے بہت سے دلچسپ اور پرمعنی حقائق کا مجموعہ بھی جنہیں مصنف نے بڑی طباعی سے ترتیب دیا ہے اور جن سے ہر شخص بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ ترجمہ بھی سلیس و رواں ہے اور دلبستگی سے کیا گیا ہے۔

وادیٔ سرما —— بقیہ صفحہ ۱۲

مجھے بیٹھے بیٹھے چائے کے باغ میں کام کرنے والی سلہٹی لڑکیوں کا گیت یاد آ گیا۔ جب وہ تین تین چار چار کی ٹولیاں بنا کر چائے کی پتیاں توڑنے میں معروف ہوتی ہیں تو بڑے مزے لے لے کر گاتی ہیں:

آؤ سہیلی
چائے کی بگیا
دیر نہ کر
دھوپ ہوئی تو رنگ ترا
آنچ سے میلا پڑ جائے گا
صبح سمے ہے کیسا سہانا
چلی بھی آ
خوشبوؤں میں بسی ہوئی
اس کی مہک ہر سو پھیلی ہے
دور پہاڑیوں کی جانب سے
آتی ہے جو پر کیف ہوا
کتنی ٹھنڈی روح فزا ہے
اس سے مرا من جھوم رہا ہے

مست ہوائیں مدھ متوالی
لوچ بھرے شریر کو میرے
آن کے جس دم چھو جاتی ہیں
رین نشیلی یاد آتی ہے
آؤ سہیلی
چائے کی یہ ہری ہری
نازک نازک کونپلیں توڑیں
ان کو بٹور کے ہاٹ چلیں
بیچ کے خوش خوش گھر آ جائیں
یونہی گزرے آج کا دن
کل کا اپنے خدا مالک ہے
آؤ سہیلی
چائے کی بگیا

—— اور چائے کے باغوں کی رانی یونہی روزانہ زندگی کے دن کاٹنے کے منصوبے بناتی ہے۔ شب کے خاموش رومان پرور لمحات دن بھر کی محنت و مشقت کو بھلا دیتے ہیں۔ ان گیتوں میں افلاطونی محبت کا افسوں نہیں ہوتا، بلکہ یہ گیت زندگی سے بڑی گہری مناسبت رکھتے ہیں اور انسانوں کی طرح چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ دل کی بات کے اظہار میں تصنع نام کو نہیں ہوتا۔ جو بات دل میں ہوتی ہے۔ وہی زبان پر۔ عشقیہ گیت ہوں یا فصلوں کے گیت، ان میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ نہ تو غم عشق کی کپش ہوتی ہے نہ ہجر کا رونا، حسنِ فطرت کے شاہکاروں کی جگہ جگہ عکاسی پائی جاتی ہے:

پھولن کی صورت مسکائی
اے میری البیلی گوری
میں نے تجھ کو دیکھ لیا
جیسے دھان کی جھومتی بالیں
جنگلی پھول ترو تازہ

تو ہے کتنی سہانی پیاری
گاؤں کے آوارہ پرندے
وہ بھی تجھ کو دیکھ کے گوری
خوشی سے پھولے نہیں سماتے

ایسے کئی گیت سننے میں آئے۔ ہاٹ، بازار اور دیہات کے گیت، فصلوں کے کاٹنے اور بننے کے گیت، ماہی گیروں اور شادی بیاہ کے گیت جو موسیقیت کی شیرینی سے معمور تھے ان میں زندگی ہی زندگی رقص کناں تھی۔ اکثر مغنی اور گشتی گویّوں کو اپنے انوکھے ساز "کنتری"[1] "چینا" اور "موہن بانسری"[2] بجاتے ہوئے سنا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی کے غموں کا بند بند ٹوٹ گیا ہو۔ وادیٔ سرما انہیں گیتوں کی پیداوار ہے۔ با جن میں ایسا جادو ہوتا ہے کہ انسان گزری ہوئی قحط سالی، سیلاب کی تباہی اور دوسرے دکھ سب بھول جاتا ہے[3]۔

---

[1] ستار کی طرز کا ساز جس کے سرے پر کدو کا خول چڑھا ہوتا ہے [2] موہن بانسری کے سُر سے جادو بھرے ہوتے ہیں۔
[3] گیتوں کو ادارہ کی فرمائش پر محترمہ [illegible] حسین نے نظم کیا ہے۔

الفاظ اور طرزِ معاشرت —— بقیہ صفحہ

نقل و حمل کے لئے استعمال ہوتے ہوں گے۔ اسی مادے یعنی جہز سے "تجہیز" کا لفظ نکلا، یعنی مُردے کا اسباب تیار کرنا۔

پرانے زمانے میں جب وقت بتانے والی گھڑیاں ایجاد نہ ہوئی تھیں، وقت کا حساب پہروں سے لگایا جاتا تھا۔ دن رات کے آٹھ پہر ہوتے تھے اور پہر برابر تھا، موجودہ تین گھنٹوں کے۔ پہر پہر کے بعد سنتری یا چوکیدار بدلے جاتے تھے، اس لئے یہیں سے "پہرا" اور "پہرے دار" کے لفظ پیدا ہوئے۔ پہروں کی جگہ گھنٹوں نے لے لی ہے، لیکن "پہرا" اور "پہرے دار" اب بھی موجود ہیں۔

"خوں بہا" ہمیں اس دور کی یاد دلاتا ہے، جب قاتل کو یہ اجازت تھی کہ اگر وہ جان کے بدلے میں جان دینے کے لئے تیار نہیں، تو مقتول کے وارثوں کی رضامندی سے، انہیں خون کی قیمت دے کر چھٹکارا پا سکتا ہے۔

پرانے زمانے میں قیدیوں کو چمڑے کی مضبوط ڈوری یا تسمے سے باندھا کرتے تھے اور انہیں "اسیر" کہتے تھے۔ اس لفظ کا ماخذ "اسر" یعنی چمڑے کا تسمہ ہے اب قیدیوں کے لئے لوہے کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں استعمال ہوتی ہیں، لیکن کہلاتے وہ اب بھی "اسیر" ہی ہیں۔

"مہمان" فارسی زبان کا ایک مرکب لفظ ہے۔ "مہ" کے معنی ہیں، بزرگ یا سردار۔ "مان" حرف تشبیہ ہے۔ اس کا ترجمہ "بزرگوار" کر لیجئے۔ ایران سے یہ لفظ ہندوستان میں پہنچا۔ اکیلا نہیں آیا، بلکہ اپنے ہمراہ مہمان نوازی کی روایت بھی لایا۔

قصہ مختصر، الفاظ کے نحوی مطالعے سے جسے اصطلاح میں فیلالوجی یا علم اللسان کہتے ہیں، حیرت انگیز معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس قسم کا مطالعہ ثقافتی اور معاشرتی تحقیقات ہی کے لئے ضروری نہیں، بلکہ علمی قابلیت میں اضافہ کرنے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ اگر ہم مطالعہ کرتے وقت الفاظ کی گرہیں بھی ساتھ ساتھ کھولتے جائیں، تو خشک سے خشک اور بے کیف سے بے کیف تحریر بھی ایک داستان گو کے قصے کی طرح دلچسپ ثابت ہوگی۔

سلہٹ

بار برداری کی کشتیاں

چائے کا باغ

ایک شاہراہ

بانسوں کی ناؤ بنائی جارہی ہے

عزاداریٔ حسین رض

حضرت امام حسین رض کے مرقد مبارک
پر بیگم اسکندر مرزا فاتحہ
پڑھ رہی ھیں

محفل شاہ خراسان (کراچی) میں
کربلائے معلیٰ کی ایک شبیہ

بندر روڈ کراچی پر تعزیوں کا ایک جلوس

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۶

ستمبر ۱۹۵۷ء

ادارۂ تحریر:

رفیق خاور

ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی — آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

"حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؓ" یہ قول حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب ہے۔ اور ایک اہم بنیادی سچائی کا اظہار کرتا ہے۔ خیر و شر کے تمام معرکہ ہائے عالم میں اس ذبح عظیم کی اٹل حجت اپنی تمثال آپ ہے۔ اسلام ارباب من دون اللہ کے بتوں ہی کو توڑنے کے لئے ظہور میں آیا تھا اور حسین (رض) نے اپنے جہد و جہاد سے "لا الٰہ" کی بنیاد مستحکم کرنے کے لئے ہی اپنے پاک خون کی قربانی پیش کی تھی۔

اس شمارہ میں شاعرِ انقلاب، جناب جوش ملیح آبادی نے اپنے مخصوص آہنگ میں بارگاہِ امام (رض) میں سلام عقیدت پیش کیا ہے اور جناب زیبا ردولوی صاحب نے مناقبِ حسینؓ کی سلکِ گوہریں پروئی ہے۔

ایک اور بڑا سانحہ جس سے اسلامیانِ برصغیر کو براہ راست واسطہ پڑا، طلوعِ آزادی کے جلو میں آیا۔ اس آشوب میں جبکہ یہ ملت دکھ، پریشانی، افراتفری، ہجرت اور حوادث کے آلام و محن سے دوچار تھی مؤسسِ پاکستان کی جلیل القدر ہستی اس نوزائیدہ مملکت کی بنیادوں کے استحکام کے لئے کوشاں اور اس کا شیرازہ سنبھالے رہی۔ درحقیقت پاکستان کا نہ صرف قیام بلکہ استحکام بھی اسی کے دستِ ہدایت کا مرہون ہے۔ اسی مہینہ وہ ہم سے جدا ہوئے تھے اس لئے اس مہینے ہمارے ذہنوں میں ان کی یاد کا آنا ناگزیر ہے۔ "ماہ نو" کا دسمبر کا شمارہ قائداعظمؒ کی یادگار کے لئے مخصوص ہے لیکن اس ماہ بھی ہم ان کی ایک نئی تصویر اور ان کی یاد میں جناب اسد ملتانی کا نذرانۂ خلوص پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

جناب ڈاکٹر محمد باقر نے اس دفعہ ایک اور اہم ادبی ضرورت کی طرف ملک کے ادبا و شعرا کی توجہ مبذول کرائی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ہمیں اپنے ادب میں مقامی رنگ اور پاکستانی فضا میں رچا ہوا شعور و آگاہی لانے کی ازحد ضرورت ہے اور یہ کہ ہمارے اہل قلم اس اہم بنیادی بات کی طرف سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔

تجویز کی اہمیت کے پیش نظر ہم قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا بھی اس موقع پر ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے اہل قلم اتنے سُست رقم نہیں رہے ہیں۔ بالخصوص "ماہ نو" کے معاونین ہم نے گذشتہ دس سال میں اس تحریک کی ابتدا کر کے جو کچھ بھی اپنے صفحات میں پیش کیا ہے یکسر پاکستانی ثقافت کی مٹی میں سے نکلا ہوا پودا ہے اور چونکہ یہ مٹی پہلے ہی سے زرخیز تھی اس لئے مخلوص و سعی کی سچائی سے ذرا نم ہوتے ہی ہماری کوشش برگ و بار لانے لگیں۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے گہر ریزے چن چن کر نکالنے اور اہلِ بصیرت تک انہیں پہنچانے میں "ماہ نو" نے جو کچھ بھی بقدرِ بساط کام کیا ہے اسے نظرانداز کرنا انصاف نہ ہوگا۔

پھر ہماری تنظیم کے دوسرے شعبے ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان نے بھی جو بسیط انتخابات، تالیفات اور کتابچے پاکستانی ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر آب تک شائع کئے ہیں انہیں بھی ملک میں وقعت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

● ہم سے شکایت کی گئی ہے کہ "ماہ نو" میں ایک ایسا افسانہ شائع ہوا جو اگرچہ بظاہر بے ضرر معلوم ہوتا تھا، لیکن اس کے ایک حصے میں افسانہ کا روئے سخن ایک مشہور فنی شخصیت کی طرف ہے۔ اگر اس بیان میں صداقت ہے تو ہم کو اس افسانے کی اشاعت کا بہت افسوس ہے۔ ظاہر ہے کہ مدیر کے لئے ہر افسانہ کا پس منظر جاننا محال ہے۔ "ماہ نو" کا مقصد صرف ادب کی خدمت کرنا ہے کسی طبقے یا فرد کی دل آزاری ہمیں کسی صورت میں بھی منظور نہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے قلمی معاون، خصوصاً افسانہ نگار، ایسی تحریریں ہم کو اشاعت کے لئے نہ بھیجیں گے جن کی وجہ سے کسی قسم کی شکایت کا امکان پیدا ہو۔

بہ یادِ امامؑ

فیضانِ حسینؑ

جوشؔ ملیح آبادی

قمیصِ یوسفؑ و خونِ حسینؑ آئینہ ہے جس کا
ہماری خاک میں ہے وہ مذاقِ رنگ و بُو اب بھی

کہاں ہے سوزن و مقراضِ خیاطانِ ذی ہمت
تمدن ہے رہینِ کاوشِ چاک و رفو اب بھی

چھڑی تھی درمیانِ حق و باطل جو سرِ مقتل
وقارِ لہجۂ تاریخ ہے وہ گفتگو اب بھی

بہا تھا جو زمینِ کربلا کے تشنہ ذرّوں پر
سحابِ گلستانِ زندگی ہے وہ لہو اب بھی

ہوئی اک عمر ساقی کو حجابِ قدس میں پہنچے
بساطِ رنگ پر ہے دَور میں لیکن سبو اب بھی

یزیدی میکدے میں دیر سے اک ہُو کا عالم ہے
حسینی خم کدے میں ہے خروشِ ہاؤ ہو اب بھی

کیا تھا اس کو باطل یہ کس مردِ رجائی نے
کہ ہے گونجا ہوا آوازۂ لاتقنطوا اب بھی

یہ اپنے خون سے کس نے لباسِ فقر دھویا تھا
کہ ہے اربابِ ہمت میں رواجِ شست و شو اب بھی

زمیں پر مشعلِ ناموس یہ کس نے جلائی تھی
کہ انساں کی جبیں پر ہے فروغِ آبرو اب بھی

خدا جانے یہ کس کوئے شبستاں کا تصور ہے
کہ اک رنگیں چراغاں ہے نظر کے روبرو اب بھی

یہ ہے کس مورثِ خونیں کفن کی روح کا پرتو
کہ انسانی شرف ہے لالہ فام و سرخرو اب بھی

مزارِ نازِ ہمت پر یہ کس نے زلف کھولی تھی
کہ ہے عشاق کو دار و رسن کی آرزو اب بھی

•

خزاں کے دور میں مہکا ہوا ہے یہ چمن کس کا
کہ اک جانب سے آتی ہے نسیمِ مشکبو اب بھی

خداوندا یہ راہِ کربلا سے کون گزرا تھا
کہ ہے اس کی ہواؤں میں صدائے الجدو اب بھی

یہ کس کی تشنگی نے چوٹ کی تھی ہفت قلزم پر
کہ گوشِ زندگی میں ہے فغانِ آبِ جو اب بھی

تسبیح گہر

زیبا ردولوی

اپنے ماحول کا آئینہ بشر ہوتا ہے   شجر پاک میں پاکیزہ ثمر ہوتا ہے
صدفِ نور کا خوش آب گہر ہوتا ہے   جیسے اجداد ہوں ویسا ہی پسر ہوتا ہے
کشمکش بھی ہے مقدر حق و باطل کیلئے
پرورش شرط ہے ہر جوہر قابل کے لئے

خود پرداخت رہے خام تو بڑھ بے تباہ   پسر نوح کو دیکھو کہ ہوا غرقِ گناہ
دہر میں ہیں وہ عوامل کہ نہیں جنکی پناہ   آئینے ان کے اثر سے نظر آتے ہیں سیاہ
جلوۂ دوست کے قابل نہیں رہنے پاتے
سینکڑوں قلب میں جو دل نہیں بننے پاتے

اسکے برعکس اگر ہو کوئی طینت کا عفیف   رد کئے جائے ہر اک طرح کے اظلام کثیف
اس پہ کچھ نیرِ اعظم کا بھی ہو لطفِ لطیف   جوہرِ ذات کو ملتے رہیں انوار شریف
پھر وہ اک دن ہمہ تن نور ہی بن جاتا ہے
جگمگاتا ہوا الماس نکل آتا ہے

بات جوہر کی جو تھی خوب ہے بھی خوب سہی   پرورش کا جو بیان ہے تو یہ اسلوب سہی
کن کا مقصود جو ہے اب وہی مطلوب سہی   مختصر یہ ہے کہ اللہ کا محبوب سہی
جو محمدؐ تھا محامد کی طرف بڑھتا تھا
کلمہ جس کا نصیری کا خدا پڑھتا تھا

ناسوت ہی سے دل نے کہا صل علیٰ   عرش پہ کہنے لگا ربِ علا صل علیٰ
[illegible] سے نکلی یہ صدا صل علیٰ   گونج اٹھے ارض و سما صل علیٰ صل علیٰ
[illegible] ہوائیں آئیں
[illegible] فرشتوں کی صدائیں آئیں

قدسی الاصل تھا در اصل وہ آنے والا   ہم گنہگاروں میں قرآن کو لانے والا
رشتۂ عبد و احد یاد دلانے والا   یعنی انسان کو انسان بنانے والا
نہ ملائک نہ نبی جان کو معراج ملی
اس کا صدقہ تھا کہ انسان کو معراج ملی

عرش کیا چیز ہے بس اک درِ سفتہ اس کا   گلشن قدس ہے اک پھول شگفتہ اس کا
خلقت نور ہے اک رازِ نہفتہ اس کا   علم خالق میں ہے یہ حرف نگفتہ اس کا
کہہ سکے کون وہ کس طرح بنا کب سے ہے
وہ تو ہے نورِ خدا کہیئے خدا کب سے ہے

اس نے تکمیل کے پیمانے میں صدیاں کاٹیں   لامکاں سکنے کا شانے میں صدیاں کاٹیں
درکِ مدرک کے نہاں خانے میں صدیاں کاٹیں   قلم و لوح کے افسانے میں صدیاں کاٹیں
گیسوئے لیلیٔ تخلیق کا شانہ بن کر
کس زمانہ میں رہا غیر زمانہ بن کر

خالق لم سے ترے تن عبادت سیکھی   مالک وحی سے تہذیب روایت سیکھی
اپنے معبود سے تکلیف عبادت سیکھی   مبدءِ علم سے تعلیم رسالت سیکھی
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کا مقصود بنا
سر فرشتوں کے جھکے کعبۂ مسجود بنا

کتنے انسابِ منور میں رہا نور اس کا   کتنے اصلابِ معطر میں رہا نور اس کا
کتنے ارحامِ مطہر میں رہا نور اس کا   کتنے ادوار مقرر میں رہا نور اس کا
مرکزِ حسن رہا منزلتِ دل پائی
آدم و نوح و براہیم کی منزل پائی

شجرِ طیب خلقت میں برومند بڑھا   دیکھ کر جذبۂ قربانیٔ فرزند بڑھا
کعبۃ اللہ کی تعمیر سے خورسند بڑھا   صلب عدنان میں قید اکلاد لبند بڑھا
گل عدن کا تھا تو دنیائے عنادل دیکھے
پھر اسی طرح سے انیس مراحل دیکھے

فخرِ اجداد تھا ہاشم پسرِ عبدِ مناف　　آفتابِ ارضِ عرب کا قمرِ عبدِ مناف
پاک دپاکیزہ و نورس ثمرِ عبدِ مناف　　حق شناسی کی صفت تھی اثرِ عبدِ مناف
عارف اللہ کا تھا حق سے قریب تھا ہاشم
نورِ اعلیٰ محمد کا امیں تھا ہاشم

ابنِ ہاشم کا وہ زمزم کو دوبارہ لانا　　میں یوں جیسے تھا قدرت کا اشارہ لانا
اہلِ کعبہ کے لئے آبِ گوارہ　لانا　　عرش سے فرش پہ تھا توڑکے تارہ لانا
ان کا احسان یہ کعبہ پہ بڑا بھاری ہے
فیض جاری یہ انہی کا ہے جو اب جاری ہے

پائی تھی ورثۂ اجداد میں دانائی بھی　　حسنِ کردار بھی رعنائی و زیبائی بھی
آستانِ احدیت پہ جبیں سائی بھی　　ان کے حصہ کی رفادت بھی تھی سقائی بھی
میہمانوں کا ہجوم ان کو مزا دیتا تھا
پیٹ بھر دیتا تھا اور پیاس بجھا دیتا تھا

پیاس کا ذکر ہی دل والوں کے دل پر ہے چھری　　کربلا میں بنِ ہاشم کے جگر بند کئی
نوجوان جن میں سن جن میں تھے اور بچے بھی　　کتنے پیاسے مگر پیاس کسی کی نہ بجھی
سامنے نہر تھی کچھ قحط بھی پانی کا نہ تھا
کوئی موقع ہی وہاں تشنہ دہانی کا نہ تھا

قابضِ نہر بھی کفار نہ تھے مسلم تھے　　لوگ کہتے ہیں کہ اغیار نہ تھے مسلم تھے
گل نہیں تھے نہ سہی خار نہ تھے مسلم تھے　　طوقِ نفریں کے سزاوار نہ تھے مسلم تھے
ظلم بچوں پہ کیا تھے وہ مسلماں کیسے
ان پہ نفریں نہ کرے صاحبِ ایماں کیسے

جس کو ظالم سے کراہت ہو مسلماں وہ ہے　　جس کو مظلوم سے الفت ہو مسلماں وہ ہے
جس سے کمزور کو قوت ہو مسلماں وہ ہے　　عدل کی جس سے اشاعت ہو مسلماں وہ ہے
یہ نہیں ہے کہ فقط اپنے خدا کو مانے
شرطِ ایماں ہے سزا اور جزا کو مانے

جس سے محفوظ مسلماں ہو مسلماں ہے وہی　　امن دنیا کو جو دے صاحبِ ایماں ہے وہی
جو نہ ہو بندۂ زر بندۂ یزداں ہے وہی　　جو بھی قرآں پہ چلے قائلِ قرآں ہے وہی
کس سے پائی ہے یہ ایمان کی دولت سمجھے
الفتِ آلِ نبی اجرِ رسالت سمجھے

اس پہ احمد نے جو احسان کیا ہے دیکھے　　کس طرح سے اسے انسان کیا ہے دیکھے
کیسی محنت سے مسلمان کیا ہے دیکھے　　اپنے فرزندوں کو قربان کیا ہے دیکھے
اپنی جو چیز تھی امت پہ نچھاور کر دی
گھر بھی لٹوا دیا اسلام کی جھولی بھر دی

اس کا گھر لوٹ کے لوگوں نے بھرا گھر اپنا　　اس کی مسند کو کہا یہ تو ہے بستر اپنا
اس کی مسجد میں گئے کر لیا ممبر اپنا　　اس کی امت کو یہ سمجھے کہ ہے لشکر اپنا
لے کے لشکر گئے ایماں کا خزینہ لوٹا
پہلے شبیر کا گھر بعد مدینہ لوٹا

گلِ زیتونِ مقدس پہ چلی بادِ سموم　　اور اسلام کی شہ رگ میں چبھا خارِ زقوم
کربلا ظلم رسیدہ تھی مدینہ مظلوم　　بیت کعبہ پہ جو گذری وہ ہے سب کو معلوم
حرمِ پاک میں پردوں سے بھی اٹھے شعلے
آہ آثارِ براہیم تک آئے شعلے

کیا عجب حشر بپا ہو بنِ ہاشم ہیں کہاں　　شور زمزم میں اٹھا ہو بنِ ہاشم ہیں کہاں
رکن کو جوشِ بکا ہو بنِ ہاشم ہیں کہاں　　کعبہ نے یاد کیا ہو بنِ ہاشم ہیں کہاں
یادِ غمخوار سے جو غم ہو وہ گھٹ جاتا ہے
غم گھٹے یا نہ گھٹے دھیان تو بٹ جاتا ہے

اور غمخوار بھی ایسا کہ نہیں جس کی مثال　　عمر بھر خانۂ خالق کا رہا جس کو خیال
عزت و حرمتِ کعبہ کا اٹھا جب بھی سوال　　جب موقع کبھی تلوار بنا ہے کبھی ڈھال
تھی نظرِ رحمت و فیضِ صمد پر جس کی
لشکرِ طیرِ ابابیل مدد پر جس کی

جو تھا قربانیٔ فرزند میں ثانیٔ خلیل   ایسا فیاض کیا چشمۂ زمزم کو سبیل
جس کے دلبندوں میں تقسیم ہوا نورِ جلیل   جس کے رتبہ پہ محمدؐ بھی علیؑ بھی ہیں دلیل
ایک اگر منصبِ تحریک سے مسرور رہا
دوسرا عہدۂ تائید پہ مامور رہا

ان کے فرزند علی صاحبِ انوارِ کثیر   ان کے پالے ہوئے احمدؐ جو ہوئے کل کے امیر
دونوں مولائے دو عالم ہیں باسنادِ غدیر   دونوں میں نورِ الٰہی کی ہے یکساں تنویر
اس میں کیا شک ہے کہ اک نفس نے دو قالب میں
پرورش پائی ہے دامانِ ابوطالب میں

ایک وہ نور کہ تھی زندہ عطوفت جس میں   ایک وہ نور کہ پائندہ جلالت جس میں
ایک وہ نورِ درخشندہ رسالت جس میں   ایک وہ نور کہ تابندہ امامت جس میں
ایک عبداللہِ ذی قدر کی پیشانی میں
دوسرا صلبِ ابوطالبِ عمرانی میں

پرورش ایک ہے نسل ایک ہے حالات بھی ایک   خصلتیں دونوں کی یکساں ہیں خیالات بھی ایک
ممکنات ایک ہیں دونوں کے محالات بھی ایک   دونوں کامل ہیں تو ہے نورِ کمالات بھی ایک
یوں تو ظاہر میں وہ ہیں شمع یہ پروانہ ہے
نور ہی ایک ہے اِن شکل جداگانہ ہے

کون عبداللہِ ذی قدر ابنِ عالی   پدرِ صاحبِ لولاک سخی ابنِ سخی
بہ "انا ابن الذبیحین" ذبیحِ ثانی   آخری پردۂ نورِ ازلی و ابدی
مقصدِ زیست فقط یہ تھا امانت دے جائیں
نورِ اعظم کے لئے جسمِ رسالت دے جائیں

نور سے نور کا رشتہ ہو خدا کو تھا پسند   اپنی زہرا کو کیا اپنے علی سے پیوند
اس عروسی پہ ہے رحمٰن کا سورہ خورسند   عقد کے جشن پہ اترا ہوا تارہ اسپند
خلق کا آب و نمک مہر بھی ٹھہرا ایسا
نہ دلہن ایسی ہوئی اور نہ دولہا ایسا

وہ ابوطالبِ عالی جو محمدؐ کے ولی   مدت العمر رہے پشت و پناہِ نبوی
سر بسر خلق و مدارات سراپا نیکی   ظرف کو دیکھ کے اللہ نے بھی نعمت دی
ذی حشم سب سے جو اس عہد میں پایا ان کو
سرپرست اپنے محمدؐ کا بنایا ان کو

ہوئے فرزند تو دامانِ رسالت میں پلے   دونوں دلبند محمدؐ کے جگر کے ٹکڑے
رشد و ارشاد و ہدایت کے درخشاں تارے   جیسے نانا تھے نواسے بھی تھے بالکل ویسے
آج تک ارض و سما ہیں اسی حیرانی میں
دو محمدؐ تھے یہ ایثار میں قربانی میں

کہیں مل سکتی ہے ایثار کی ایسی بھی مثال   کبھی آنے نہ دیا طبعِ مبارک پہ ملال
جاگتے سوتے محمدؐ کی حفاظت کا خیال   ان کے بستر پہ سلا دیتے تھے اپنے اطفال
شبِ ہجرت جو علی سوئے نئی بات نہ تھی
ایسی راتیں بہت آئی تھیں وہی رات نہ تھی

اپنے ماحول کا آئینہ بشر ہوں کہ نہ ہوں   شجرِ پاک میں پاکیزہ ثمر ہوں کہ نہ ہوں
صدفِ نور کے خوش آب گہر ہوں کہ نہ ہوں   جیسے اجداد تھے ویسے ہی پسر ہوں کہ نہ ہوں
کیوں تعجب ہے جو تسبیح گہر ہاتھ آئی
مبتدا جیسا تھا ویسی ہی خبر ہاتھ آئی

"رہنمائے پاک زاد"

آسد ملتانی

جب بھی آتا ہے ستمبر کے مہینے کا خیال
تازہ ہوتی ہے وفاتِ قائدِ اعظمؒ کی یاد

تھا یہی ماہ ستمگر جس میں ٹوٹا یہ ستم
ہو گیا ہم سے جدا وہ رہنمائے پاک زاد

فکر جس کی تازیانہ، قول تیغِ بے نیام
موت جس کی غازیانہ، زندگی جس کی جہاد

شبہ سے برتر رہا اس مردِ مومن کا خلوص
وہ ہمیشہ سامنے رکھتا تھا ملت کا مفاد

کر دیا اس نے سیاست کو بھی کتنا پاک و صاف
جب ہوئی حسنِ تدبر پر دیانت مستزاد

ساتھ کوشش کے توکل جو کرے اللہ پر
کام اس مردِ خدا کے کیوں نہ ہوں حسبِ مراد

زندگی اس کی شکستِ دام کی اک داستاں
سرگذشت اس کی قفس کے ٹوٹنے کی رُوداد

سیرت اس کی حق پرستی، مسلک اس کا صلحِ کُل
اس کا پیغام انضباط و اتحاد و اعتقاد

زندہ ہے اس کا تخیل، زندہ ہیں اس کے اصول
کیوں نہ بعدِ مرگ بھی اس کو کہیں ہم "زندہ باد"

قائدِ اعظمؒ کی رحلت تھی اشارت اے اسدؔ
ناخدا پر ہو بھروسہ یا خدا پر اعتماد؟

ادب اور ثقافت

ڈاکٹر محمد باقر

ادب اور ثقافت کا رابطہ معین کرنے اور اس موضوع پر تبصرہ کرنے سے پیشتر ان دو کلمات کی کچھ نہ کچھ حدود معین کرنی پڑیں گی۔ ادب کی تعریف مختلف زمانوں اور زبانوں میں مختلف طور پر کی جاتی رہی ہے۔ میرے نزدیک اردو میں ادب کا لفظ آپ اپنی تعریف ہے یعنی ہر وہ نظم اور نثر ادب ہے جو باشعور انسان کی کسی نہ کسی طرح تادیب کرتی ہے۔ انسانی حسیات اور فکر و عمل کے ان گنت رخ ہیں۔ ادب ان میں سے کسی نہ کسی کو جلا بخشتا ہے۔ ثقافت کی ایک عام تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ عوام کی طرز بود و ماند یعنی رہن سہن کے طریقہ کا نام ہے۔ یہ تعریف بہت حد تک جامع ہے۔ لیکن اگر ہم اس تعریف سے مطمئن ہو جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ مختلف قسم کی ثقافتوں میں امتیاز مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً مشرقی اور مغربی ثقافت کا تضاد ہمیشہ بحث کا موضوع بنا رہا ہے لیکن اگر ہم اہل مشرق اور اہل مغرب کے رہن سہن کے طریقوں کا مقابلہ کریں تو موسم کے اختلافات کی وجہ سے عاید ہونے والی پابندیوں کو چھوڑ کر اہل مشرق اور اہلِ مغرب کے طرز بود و ماند میں بظاہر کوئی تفاوت نظر نہ آئے گا۔ مثلاً اگر اہل مغرب شدید سردی کے موسم میں ٹائی، کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو اہلِ مشرق بھی اسی قسم کے درجۂ حرارت کے خطوں اور زمانوں میں یہی لباس پہنتے ہیں۔ کھانے پینے کے طور طریق میں مشرق میں چھری، کانٹے اور چمچے کا کچھ اس طرح رواج ہوا ہے کہ کسی بڑے مشرقی شہر کے ریستوراں اور مغربی ریسٹوران کے اندرونی منظر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ خوراک کے مختلف نمونے بھی یکساں یا مشابہ ہیں۔ ہذا اگر ظاہری رہن سہن کو ہی ثقافت کا نمونہ قرار دیا جائے تو اس وقت تو ساری دنیا میں ایک ہی ثقافت نظر آئے گی یا اگر آپ اور زیادہ معین طور پر ثقافت پر لیبل لگانا چاہیں تو یہ کہ سکتے ہیں کہ یورپی ثقافت عالمگیر ہے۔

میرے نزدیک ثقافت کا تعلق صرف ظواہر سے نہیں بلکہ اس کا تعلق فکر و عمل اور احساسات سے بھی ہے۔ پاکستان میں تو ابھی آپ کو مختلف قسم کے لباس نظر آتے ہیں لیکن مشرقِ وسطیٰ میں آپ کو عوام بالعموم یورپی لباس میں نظر آئیں گے اور اس لباس کے وہ اس قدر عادی ہیں کہ اب اس لباس کو قومی لباس سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مشرق کے لوگ فکر و عمل اور احساسات میں مغرب سے بالکل مختلف ہیں۔ اور یہ ان کا ثقافت کا اثر ہے۔ اور یہی فکر و عمل اور احساس جب ادب میں منعکس ہوتا ہے تو اسے ایک امتیازی رنگ بخشتا ہے جسے دیکھتے ہی ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ فلاں ملک یا ملت کا ادب ہے۔

ادب اور ثقافت کا سب سے اہم رشتہ یہی ہے کہ جاندار ادب ملی ثقافت کی نمایندگی کرتا ہے۔ ثقافت روح کی طرح ادب کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے اور نہ صرف اسے قوی، محکم اور پایدار بناتی ہے بلکہ اسے مخصوص قسم کی تابندگی بخشتی ہے جو ادب کے مقامی اور ملی خد و خال کے باوجود اس میں عالمگیر دلکشی بھر دیتی ہے۔ وضاحت کے لئے عرض کروں گا کہ ایک جاپانی مزدور کی پر مشقت اور المناک زندگی پر مشتمل افسانہ جاپانی حال کے احساسات اور اس کی طرز و بود و ماند کی تصویر کشی اور اس کے اپنے ماحول کے ساتھ اس طرح کرے گا کہ پڑھنے والے کے ذہن پر جاپانی فضا پھیلا پھیل جائے گی اور جاپانی ثقافت کے کچھ رخ ابھر آئیں گے۔ لیکن اگر افسانہ معیاری اور ادبی ہے تو پاکستانی اور انگریز قاری اس افسانہ میں بیان کی ہوئی فکر و عمل کی صداقتوں سے اسی طرح متاثر ہوگا جیسے جاپانی قاری۔ اور بالآخر سب لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ ایک کامیاب پارۂ ادب ہے۔ اسی طرح اگر ایک انگریز شاعر ایک امیر بیوہ کی زبان سے اس کے بچے کے لئے لوری لکھتا ہے تو اس میں برطانوی شوکت و امارت کی فضا کا انعکاس تو ضرور

ہو گا کیونکہ ثقافت کی نمائندگی اس سے بھی ہو گی لیکن بیوہ ماں کے جذبات میں کچھ اس قسم کا عالمگیر غم نمایاں ہو گا جسے عرب اور چینی بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ الغرض معیاری ادب جہاں مقامی ثقافتی اقدار کا حامل ہوتا ہے وہاں عالمگیر تاثیر کا بھی مالک ہوتا ہے۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ کسی قسم کی ثقافت ادب میں دخیل ہو کر اس کی خوبیوں کو محدود نہیں کرتی بلکہ اس کی تاثیر کو دوبالا کرتی ہے۔

اب اگر ہم ذرا گھر کی خبر لیں تو معلوم ہو گا کہ مغربی پاکستان کی ملی زبان یعنی پاکستانی اردو (میں ہندی اردو اور پاکستانی اردو میں تمیز کرتا ہوں کیونکہ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ دونوں اردوؤں کی رفتار و اسالیب نے جداگانہ راہیں اختیار کر لی ہیں) میں بالخصوص پاکستانی ثقافت کی بہت کم نمائندگی ہو رہی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہمارے ادیب اور ہمارے شاعر نے گھر اور نزدیک کے مسائل پر غور کرنا ہی شروع نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں اس کی کچھ مجبوریاں بھی ہیں مثلاً بے ایمانی، چور بازاری، معاشرتی منافقت، مذہبی مناقشت، اہل اثر کی سرد مہری اور اس قسم کے ثقافت کے ہزاروں رخ ہیں کہ اگر شاعر ان کی طرف متوجہ ہوا اور ادیب ان پر قلم اٹھائے تو اسے اپنی جان کی خیر منانا پڑے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو شاعر اور ادیب کے اس طرزِ عمل سے اس جبن کی بو آتی ہے جس سے کم از کم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن کا برائے فن پرستار نہیں۔ بلکہ صرف شعر کہنے یا قلم گھسنے کے لئے خامہ فرسائی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ فن کے اس معراج کو حاصل نہیں کر سکا جس میں ثقافت کی صحیح نمائندگی ہو رہی ہو۔ متذکرۃ الصدر عنوانات کچھ نازک سے تھے۔ لیکن مجھے تو یہ بھی شکایت ہے کہ معاشرہ کے نازک اور گھناؤنے رخوں کے علاوہ کچھ ایسے بے ضرر لیکن نہایت اہم رخ بھی ہیں جن کی طرف ہمارے ادیب یا شاعر نے کبھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ہمارا تاریخی ماضی، ہمارے مقامی رومان، بدلتے ہوئے حالات کے ہماری زندگی پر تاثرات، قدامت پسندوں کا جمود، تجدد پسندوں کا غیر ذمہ دارانہ رویہ، شعر و ادب میں جرأت انگیز اور جاندار تنقید؛ الغرض ہزاروں ایسے موضوعات ہیں۔ جن کے متعلق کسی کو مورد ہدف بنائے بغیر بھی شعر و ادب کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ابھی تک بیشتر ادیب اور شاعر صدیوں کے گھسے پٹے راستوں پر گھوم رہے ہیں اور لکیر کے فقیر بنے چلے آتے ہیں۔ ثقافت کی اگر وہ تعریف مان لی جائے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کی ہے یعنی یہ طرزِ بود و ماند کے علاوہ انسانی احساسات اور فکر و عمل کی بھی نمائندگی کرتی ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسانی احساسات اور فکر و عمل کے تغیر کے ساتھ ثقافت میں بھی تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ادب اور شعر ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے تو وہ بھی ان تبدیلیوں سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن ہمارے ادب کا جمود اب ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے اور چند مستثنیات کے علاوہ ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ باقی کے ادبا اور شعرا کے شعری اور ادبی تخلیقات میں کوئی تازگی نہیں۔ میرے خیال میں اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادب نے ثقافت سے کوئی ناطہ استوار نہیں کیا۔ اور جب تک یہ شرط پوری نہ ہو گی توی اور محکم ادب کی تخلیق ناممکن ہو گی۔ شاعر اور ادیب کو اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہو گا اور ادب کو جاندار اور پائیدار بنانے کے لئے ایک کام یہ کرنا پڑے گا کہ وہ ادب کا ثقافت سے مستقل رشتہ قائم کرے ؛

افسانہ:

باپ

ابوالفضل صدیقی

ہمارے خاص علمی معاون جناب ابوالفضل صدیقی کی دیرینہ ادبی خدمات اور شاعروں کی بین الاقوامی تنظیم پی، آئی، این (PEN) (شاخ پاکستان) نے اپنے حالیہ مقابلۂ افسانہ نویسی میں ایک ہزار روپے کا انعام دیا ہے۔ ان کے افسانے "چھتا سورج" کی خوبیوں اور کمال کا اعتراف، اور اس کی قدر دانی، جو صدیقی صاحب کو ملی ہر لحاظ سے خوشگوار واقعہ ہے جس پر ہم صدیقی صاحب کو دلی تبریک پیش کرتے ہیں۔ ان کا ایک تازہ تصنیف افسانہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

عمر ساٹھ سے متجاوز تھی پھر بھی وہ جاننے والا تھا، کھیتی باڑی میں بیٹے کا دستِ راست بنا ہوا تھا، ایک چیت کے گرم دن میں اچھا خاصا دو بیگھہ کھیت کاٹ کر لیٹا گھر پہنچ کر سیدھا ہاتھ سن سا محسوس ہوا، گھر میں کسی سے ذکر بھی نہ کیا اور دوسرے روز پھر کام پر پہنچ گیا، چند دن میں اس کیفیت کا عادی ہو گیا، کام میں کوئی حاجت تو تھی ہی نہیں، اور ابھی فصل کھلیان ہی میں تھی کہ دوسرا ہاتھ بھی جیسے سو گیا، کام زیادہ تھا، پھا آدمی بیٹے سے بیان کرنا اپنی کسرِ شان سمجھا جب اناج اُٹھ کر گھر میں آ گیا تو گھر والوں سے بیان کیا، ارنڈ کے پتے تیل چپڑ کر باندھے، ہلکا سینک کیا مگر کوئی فرق نہ پڑا، اور پھر ہلکی جھنجھناہٹ محسوس ہوئی جو کچھ عرصہ بعد سوزش میں تبدیل ہو گئی اور ہاتھ پاؤں اور بدن پر جگہ جگہ جھائیاں سی ابھر آئیں جو چتے دار کھال میں نمایاں ہوتی گئیں، مگر حرکت میں کوئی دقت نہ ہوتی البتہ لاس غائب ہو گئی، اور یہاں تک پہلے ناخنوں کا رنگ خراب ہوا اور پھر جھڑنے لگے، پاؤں اور ہاتھوں پر کھال پھٹنے لگی اور سب سمجھ گئے کہ بڈھے کا خون تاؤ کھا گیا، اور بدن پھوٹ رہا ہے:

دیہات میں ہیضہ اور طاعون کی عالمگیر وبا سے اتنا نہیں ڈرا کرتے جتنا کوڑھ سے خائف ہو کر چھوت کرتے اور گھناتے تھے۔ پہلے مادھو کے گھر میں پینگ پیلی اور خاموشی کے ساتھ بڈھے کو چوپال کی ایک بغلی کوٹھری میں منتقل کر دیا، ساتھ ہی پڑوسیوں میں بات پہنچی اور تمام بستی میں چرچا ہو گیا۔

"کوڑھ اُڑ کر لگتی ہے!"

"کوڑھ لاعلاج ہے!"

"کوڑھ سات سات گھر چاروں طرف پھیلتی ہے!"

جتنے منہ اتنی باتیں، پانچ سو نفوس کی مردم شماری کے چھوٹے سے گاؤں میں ہراس سی پھیل گئی، اور بڈھا تو سامنے پڑتا ہی نہ تھا۔ لوگ مادھو سے کچھ اجنبیت سی محسوس کرنے لگے پھر جیسے کچھ خائف سے معلوم ہوئے، مادھو نے پہلے تو گاؤں کی چہ میگوئیوں کو اس کان سن اس کان اڑا دیا، اور گاؤں والے اس سے کچھ کھلم کھلا ہیلتھ آفیسر کی طرح مطالبہ تو کر ہی نہ سکتے تھے، بعض بوڑھے ہمدردی کے الفاظ میں مربیانہ انداز کے ساتھ خود اس کو اور اس کے بیوی بچوں کو چھوت لگ جانے کے خدشے آگاہ کرتے، ساتھ ہی ساتھ بڈھے کی حالت زار پر افسوس کر کے مٹی عزیز ہونے وغیرہ کی دعا دیتے اور دبے لفظوں میں وہ ایک احتیاطی تجویز بھی جو ان کے تجربے علم سینہ کے ذریعہ پہنچی تھیں بیان کر ہی دیتے بعض کھرے جوان کھلم کھلا وہ ایک دفعہ صاف

کر دیتے اور کچھ زیادہ مہربان اور گہرے دوست اور کچھ نہیں تو چلتے چلتے سلام دعا کے ساتھ بیٹے سے باپ کی طبیعت پوچھنے ہی کے رسمی فرض میں اپنے کچھ خلوص کا میٹھا سا تیر پھینک دیتے۔ اور جتنا ان چیزوں سے مادھو کترا تا ویسا اتنی ہی سب کی ہمدردیاں بھی خواہیاں اور نصیحتیں بڑھتی گئیں ——

اور سب کسان تھے اور مادھو بھی کسان تھا، اور ہر ایک کے دل پر باپ، راجہ اور ایشور کے براہ راست شجرہ کا نقشہ پتھر کی لکیر کی طرح کھنچا ہوا تھا اور ہر ایک کی گھٹی میں پڑا تھا اور مادھو کی بھی کہ وہ باپ کی ملکیت ہے، اور باپ کی وراثت میں اسے زمین پہنچی ہے، اور زمین راجہ کی ہے، اور راجہ کو ایشور نے دی ہے۔ اور اس رشتہ سے باپ ایشور کا اوتار ہے —— اور کوڑھ ایشور نے بھیجی ہے :

مگر بات اپنی بستی سے چل کر ارد گرد دیہات میں جا پہنچی، اور بری بات تو آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ گھر میں بہتیرا دبائی مگر گانوؤں میں پھیل ہی گئی اور اب جیسے چوپال کی اندھیری کوٹھری میں سے کوئی بھوت پریت سے اُڑتا، اور مادھو اپنا گانؤں چھوڑ آس پاس کے گانوؤں تک میں اپنے باپ کے ایک ایک زخم اور ناسور کا نقشہ بڑے پیمانہ میں ہر کس و ناکس کی زبانی سنتا :

"اس چیت میں بڈھے کی سیدھے ہاتھ کی تین انگلیاں جھڑ گئیں!"

"بھادوں میں سنا ہے الٹے پانوؤں میں کیڑے پڑ گئے تھے!"

"اب تو سنتے ہیں ہونٹوں پر ٹپک رہی ہے!"

"کہنیوں پر کھاج بھی شروع ہو گئی"

"پانوؤں کی تو سنتے ہیں، دسوں ٹپک پڑیں!"

"الٹی آنکھ بیٹھ رہی ہے!۔ سیدھا ہاتھ ڈُنڈ ہو گیا" —— "ناک پچک گئی"

اور کوئی کوئی بہت ہی زیادہ ہمدرد کہتے سنائی دیتا "جنم کرم بگڑ گئے بیچارہ کے! چہ، چہ، چہ!"

اور بعض للہی بغض صاف صاف بول اٹھتا "اجی پچھلے جنم کی بھوگ رہا ہے بڑھاپے میں"

برابر کے گانوؤں میں اٹھوارے کے اٹھوارے چوبیس گانوؤں کی بھاری پینٹھ لگا کرتی۔ ایسی پینٹھوں سے دیہاتوں کی کاشتکارانہ تجارت کا گہرا تعلق ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ گانوؤں کی چھوٹی چھوٹی پنچائتیں بنتی ہیں، دیہاتی "فارن پالیسی" اور بارڈر کے بعض مسائل بھی کبھی کبھی طے ہو جاتے ہیں۔ اجناس کے مقامی بھاؤ کھلتے ہیں، ذاتی کاموں کی قرار دادیں ہوتی ہیں اور صفاتی چیزوں کا تبادلہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اکثر بیوپاریوں کے خلاف ننداؤں کی اوائیگیاں سر بازار ہوتی ہیں اور بیٹھے ساہوکاروں کے قرضے ایک گوشہ میں چپکے چپکے سے چک جاتے ہیں، اور بیاکہ، جیٹھ سال پیچھے ایک دو مرتبہ جب نئے گیہوں کی گرمی پیٹ سے اٹھ کر مغز کو چڑھ جاتی ہے تو حسب ضرورت گھنٹہ آدھ گھنٹہ لٹھ بازی بھی ہو لیتی ہے اور گئے ہاتھوں فاسد خون بھی نکال دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑا بہت فاضل اناج اور ہفتہ کے ہفتہ پابندی کے ساتھ اپنی بھینسوں کا گھی اور اپنی اکھیو کا گڑ لے کر مادھو پینٹھ جایا کرتا۔ پینٹھ کی معصوم تجارت میں نہ تو کمپیٹیشن ہوا کرتا ہے، نہ عامرانہ چمک اور نہ اقتصادی جوڑ توڑ۔ خاص ضرورت کی اسپرٹ یہاں دیہاتیوں کو جمع کرتی ہے اور زیادہ تر لین دین تبادلہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور گانوؤں گانوؤں اور گھر گھر کی ایک آدھ چیز کی گڈول اور شہرت سینہ بسینہ چلی آتی ہے اور باپ دادا کے زمانہ سے مادھو گھی اور گڑ کی کوالٹی کے معاملہ میں تمام دیہات میں ممتاز چلا آ رہا تھا۔ ایک دو پینٹھ چپکے ہی چپکے گزر گئی اور مادھو کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ اس کی ساکھ کو دھکا پہنچ گیا۔ شروع شروع میں مستقل گاہکوں اور بیوپاریوں کے قدرے سرد رویہ سے اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس کے بعد دوسری تیسری پینٹھ اسے اندازہ ہو گیا کہ گاہک اس سے کترانے لگے ہیں، اور معلوم ہو گیا کہ اس کے باپ کی کوڑھ کی خبر پینٹھ کے حلقہ کے چوبیس گانوؤں میں وبا کی طرح پھیل چکی ہے، اور اس نے غور کیا کہ عورتیں ڈری ڈری نظروں سے اس کے گھی کی مٹکیاں اور گڑ کی بھیلیاں دیکھتی نکل چلی جاتی ہیں اور اس کے محاذ سے چند قدم نکل کر سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں، پرانے مستقل گاہک اس کی چبوتری سے کترا کر نکل جاتے ہیں اور دوسری جگہ سے خریدتے ہیں اور اگر مادھو سے کسی سے نگاہیں چار بھی ہو جاتیں تو آنکھ چرا کر مونہہ پھیر لیتے ہیں —— اور شہر کے بیوپاری جو سب سے پہلے جھپٹ کر اور بھاؤ بڑھا کر اس کے گھی کی بوند بوند تلوا کر اپنے کنستر بھر لیا کرتے اور ہاتھوں ہاتھ گڑ کی ڈلی ڈلی اٹھا کر بوری بندی کر لیا کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈھٹائی کے ساتھ سامنے سے نکلے چلے جاتے اور اگر زیادہ متوجہ کرنے کے لئے مادھو نے پہل کر کے "رام رام" یا "سلام" کہہ کر ذرا ہاتھ اٹھا دیا تو دور ہی سے کچھ گھبرا کر جواب دیتے اور پوچھنے کے بجائے انداز میں گھر کی خیریت

دریافت کرتے اور مادھو کے "بھگوان کی کرپا ہے" کے رسمی جواب کے جواب میں لالہ نہایت پر رقت لہجہ میں ہمدردی کے ساتھ باپ کی طبیعت پوچھتے
اور پھر اس عیادت کے پردہ میں ہی دعا سلام خیریت پرسش ہمدردی سب کا میزان بازار اور ساکھ پر آ لگتا، ساتھ ساتھ لالہ مادھو کے مال پر نگاہ ڈال کر بات
کرنے کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں تول لیتے کہ کتنی پینٹھ سے مال صاف نہیں ہوا ہے، اور دل ہی دل میں مادھو کو خفیہ فروشی کی نوبت آ جانے کی امید لگاتے
پھر مادھو کی بوری بھینسوں کا چاندی سا گھی کڑوے تیل کے بھاؤ اور سونا سا گڑ کالے شیرے کے نرخ خریدیں گے اور بازار اور پینٹھ کے دن کے علاوہ کسی اور
دن علیحدہ اندھیرے اجالے کہیں جنگل یا کھیتوں میں چپکے سے سودا چکانے کی سوچتے۔ بھولے بھالے دیہاتی گاہکوں کے تیوروں میں معذرت ہوتی، چری چری آنکھیں
کہتی کہ جاتیں "مادھو بھیا تمہارا گھی امرت سا، تمہارا گڑ کندن سا۔۔ اور ہم تو برسوں سے تمہارا ہی گھی گڑ کھاتے چلے آئے ہیں، پھر اب کیا کریں۔۔ تم تو ایک کوڑھی
کو گھر میں پالے پڑے ہو۔۔۔۔۔۔" اور مادھو کے کھوپڑے میں جیسے نیلے سے زہر بجاتے۔۔۔ وہ اپنے گھی پر نگاہ ڈالتا پینٹھ بھر میں سب سے زیادہ مہکتا دانے دار گھی
اس کا ہوتا۔۔ وہ اپنے گڑ کی بھیلیوں کو دیکھتا یوں تو چوبیسوں گاؤں گھر گھر گڑ بنتا تھا اور ساری پینٹھ گڑ سے پٹی رہتی تھی، پھر ایسا سفید بھوری سا گڑ اپنی پینٹھ تو
در کنار بارہ بارہ کوس آس پاس کی پینٹھوں میں بھی کہیں نظر نہ آتا۔ اور وہ بازار میں بیٹھا مکھیاں مارا کرتا، مکھیاں جو اسے اپنے گڑ کی کوڑھ اور گھی کے ناسوروں
پر بھنبھناتی معلوم ہوتی تھیں۔۔ اور چوتھی پانچویں ہی پینٹھ مادھو کو بھی اور شہر کے سب بیوپاریوں بنیوں کو اور پینٹھ کے چوبیسوں گاؤں کے ایک ایک آدمی کو بھی
مادھو کے گھر کی گھی گڑ جیسی نعمتوں میں جذام کے کیڑے بجباتے دکھائی دینے لگے۔ اور کیڑوں پڑے مال پر گاہک نہیں ٹوٹا کرتا۔۔۔ اور مادھو تو ایک ٹکے کا نچیا
کسان تھا، تجارتی بائیکاٹ کا دھکا تو بڑی بڑی سلطنتوں اور قوموں کو سرنگوں کر دیتا ہے۔ بیٹے نے کوڑھی کو گھر میں رکھنے کا خطرہ برداشت کیا، پڑوسیوں کی شکایتیں اور
گاؤں والوں کے طعنے تشنے شکایتیں سہیں، ورنہ سماج نے تو کوڑھی کو خارج کر دینے کا فتویٰ روز ازل سے لگا دیا ہے، کیونکہ سماج میں نہ کوڑھی باپ ہو کر ملتا ہے نہ بیٹا۔
نہ بھائی برادر نہ پڑوسی اور نہ ہم وطن صرف کوڑھی ہی کوڑھی ہے اور اب تک تو مادھو کو باپ پہلے نظر آتا تھا اور دھندلا دھندلا سا یہ سا کوڑھی بعد کو لیکن اب اس کو بھی صرف
کوڑھی ہی کوڑھی دکھائی دینے لگا۔۔ اور بڈھا بھی کوڑھی کو خوب پہچانتا تھا، خود ہی سوچ سمجھ کر تجویز پیش کر دی اور جگہ بھی بتا دی۔ بستی سے آدھے کوس پر جنگل میں ایک
ٹیلا تھا جس پر گھاس اگتی تھی، اور جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے اور ایک نیم کے درخت کی چھاؤں میں باپ کی جھونپڑی بنا دی اور چوپال کی کوٹھری سے منتقل کر دیا سب کو
مادھو کا یہ اقدام بڑا اچھا معلوم ہوا، اور سب سے اچھا خود مادھو کے حق میں ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد دوسری تیسری پینٹھ گاہکوں کی نگاہوں میں گڑ کی مٹھاس اور پھر
باتوں میں گھی کی چکناہٹ پیدا ہو گئی اور چوتھی پانچویں پینٹھ تک دیہاتی بے تار برقی کے ذریعہ تمام علاقہ میں بات پہنچ گئی اور ساکھ بحال ہو گئی۔۔ گاؤں کا کوئی آدمی
حتیٰ کہ بھولے سے ٹیلے پر مویشی چرانے والے چرواہے اور آس پاس کے گاؤں کے بھولے بھٹکے راہگیر تک اب اس ٹیلے کی جانب نہ جاتے البتہ بستی کا واحد انسان
مادھو صبح شام آتا۔۔۔ تو مند تندرست بیٹا نحیف و نزار خستہ باپ کے لئے روٹی لے کر: سیدھے کندھے پر لاٹھی جس کی نوک پر کیلے کے پتے میں لپٹی ہوئی گڑ کے
چنے کی گھی چپڑی لپکتی روٹی بندھی ہوئی، الٹے کاندھے پر تازہ پانی کی چھاگل اور بغل میں کیلے کی چھال کا پرنالا لئے روزانہ دونوں وقت کوڑھی کے ٹیلے کی
جانب لپکتا نظر آتا۔ جھونپڑی کے دروازہ پر پہنچ کر آہستہ سے سنکارتا، اور سنکار پر بڈھا بستر سے رینگ کر دروازہ کے قریب آ بیٹھتا اور نیم کی لکڑی کا کٹھرا
بڑھا دیتا۔ بیٹا احتیاط کے ساتھ پیچھے کو ہٹتے ہوئے بانس بھر کی دوری سے احتیاط کے ساتھ لاٹھی سیدھی کر دیتا، کیلے کی ڈس سے ڈھیلی ڈھیلی بندھی ہوئی روٹی
کی پوٹلی لاٹھی کے سرے سے سرک کر بڈھے کے کٹھرے میں جا گرتی۔ لاٹھی پیچھے کھینچ کر مادھو پرنالا تھامتا اور بڈھا کٹھرے کے ہونہہ پر جاتا اس سرے سے مادھو
چھاگل پرنالے میں انڈیل دیتا، اور رزاق مطلق کی کچھ اسی شان کا منظر ہوتا جس میں وہ کیڑے کو پتھر کے اندر غذا پہنچا کر دکھاتے ہیں اور بیٹا گھر سے ٹیلے تک
چل کر دن میں دو مرتبہ باپ کی خدمت کی سعادت کی اخیر منزل پر پہنچا کرتا۔

شروع شروع میں مادھو کو اس کام میں عجیب مثبت منفی جذبات سے دو چار ہونا پڑا۔ بیٹا! باپ! رقت، رحم، افسوس اور کسی کسی دن جب
جی ماندہ ہو رہی ہو تو نفرت، کراہت۔۔ مگر پھر تو یہ معمولات زندگی میں شامل ہو گیا، لیکن بھینسوں اور بیلوں کو چارہ ڈالنے اور زمین جوتنے، نلائی،
گوڈائی کرنے جیسے معمولات میں نہیں، کچھ اور مزدوری پر کماو دینے اور سینچائی کرنے جیسا بیکار عمل، سماجی بیگار۔۔۔ گما ڈیوٹ پر چل چڑھانے والی بات بھی
نہیں، مگر کبھی کبھی آتے جاتے یک دم اپنے سینے میں سے لرزتی بپھرتی آواز سنائی پڑ جاتی "باپو!" اور یہ ہر بات کا جواب ہوتی۔۔۔ اور وہ نہ باپ
رہا نہ شوہر، بس وہ بیٹا ہی بیٹا۔۔۔ اور پھر اس شعور سے وہ خوشگوار احساس بھی معدوم ہو گیا جو شروع شروع میں بیٹے کو چوپال

کی کوٹھری سے ٹیلے کی جھونپڑی تک پہنچانے کے بطور پڑوسیوں بستی والوں اور نانا داداؤں کے نئے روپے سے بیدار ہوا تھا، کیونکہ پڑوسی بھول گئے تھے کہ وہ کوڑھی کو گھیر میں رکھے ہوئے ہے، گاؤں والوں کو یاد نہ رہا تھا کوڑھ اڑ کر لگتی ہے۔ اس کے مال میں سے کوڑھ کے کیڑے چپکے ہی چپکے رینگ گئے تھے، خوشبودار گھی کا دانہ دانہ دمک گیا تھا، کندن سے گڑ کی بھیلیاں گاہکوں کو خیرہ کرنے لگی تھیں . . . . .

(۲)

اور جیسے مادھو اچھل سا پڑا۔ اسے کسی نے پانچ سال بھولے رہنے کے بعد گویا بڑے زور سے دلکارا ہو 'کوڑھی کی اولاد!'۔ کوڑھی کے گھناؤنے بچے! اس نے ایک سے تین تک دادا اعانیہ پوتا دیکھا کہ سب کے سب کوڑھی کے گھناؤنے بچے تو جیسے اسے تین ترلوک دکھائی دے گئے، اور جب تین ترلوک دکھائی دیتے ہیں تو نگاہوں کے آگے تیلیاں ناچتی ہیں، سر لٹو کی طرح گھومتا ہے، اور پھر آنکھیں پتھرا جاتی ہیں، بت بن کر رہ جاتا ہے۔ حلقے کے سیٹھ نے اسے خبر سنائی کہ جب وہ اس کی بیٹی کی بات لے کر اور بیٹے کی بات لانے برادری میں گیا تو ہر جگہ لڑکے لڑکی والوں نے جواب دیا کہ نہ ہم کوڑھی کے گھر کی بات رکھیں گے نہ کوڑھی کے گھر بات بھیجیں گے اور یہ بات سن کر تو باپ کی کوڑھ کا ایک ایک ناسور جیسے مادھو کے رونگٹے رونگٹے پر پھوٹ گیا۔

اور گاؤں کے سیٹھ نے مادھو کی نگاہیں اپنی بسنتی اور اپنے رچنا کی جانب اٹھوائیں۔ میٹھا میٹھا نشہ جیسا اٹھان اٹھتی ہوئی بیٹی، بسنت کی پہلی شرمائی شرمائی نیم وا کلی کی طرح آہستہ آہستہ مسکراتی سی'۔۔۔ اور بھادوں میں چھوئی مٹی کو چیرتا پھاڑتا بانس کا اٹھتا ہوا کلّا سا بیٹا۔۔۔ جیسے بھگوان نے بیٹا اور بیٹی بناتے وقت بنانے کا حق ادا کر کے دیا ہے، ہاتھ پاؤں کے ایسے کہ گیارہ اور تیرہ ہی کی عمر میں پہاڑ جیسا اٹھان اور چٹان جیسی سختی۔۔۔ گھر کے اندر بیٹی ذرا سی عمر میں ماں کا سیدھا ہاتھ اور کھیت میں ابھی سے باپ سے زیادہ بیٹے کے مارے مٹی دھکے، بسنتی پڑوسیوں اور گاؤں والیوں تک کے چار کام سنبھال دیتی اور گھر گھر موہنی بکھیرتی پھرتی، رچنا "دھر بھتیوں" اور "منڈھیتوں" تک کے کھیتوں میں پہنچ کر ہاتھ بٹا دیتا اور پسینہ ٹپکا دیتا۔ گھروں میں پرکھوں کی رون رون کے ساتھ بچی کی دعائیں گونجتیں، چوپالوں پر رات کے اکٹھ میں الاؤ کے کنارے رچنا کی کارگزاریوں کے تذکرے سنائی پڑتے۔ بلدیو سیٹھ کی بات ابھی گاؤں میں عام نہ ہوئی تھی صرف مادھو کے کان میں پڑ کر اس کی بیوی کے کان تک سنکی تھی، اور سنتے ہی دونوں سُن ہو گئے تھے اور انہیں اپنی کھی کی نو دا سی بیٹی اور گٹھے بھیلے سے بیٹے میں کوڑھ کے کیڑوں کے انڈے نظر آ رہے تھے۔ اور بلدیو سیٹھ کی بے پناہ دس داروتوں پر امید لگی ہوئی تھی۔ یوں بھی شادی بیاہ کے معاملہ میں دیہات کے اندر سیٹھ کی پوزیشن قاضی الحاجات قسم کی ہوا کرتی ہے اور خیر محل میں تو ٹاٹ کا پیوند لگتے سنتے ہی چلے آئے ہیں مگر بلدیو سیٹھ کا علم تو تمام حلقہ میں سمندر کی چھاتی مانا جاتا تھا اور بلدیو سیٹھ کے جھانوں تک کو اس پر ناز تھا کہ پرانے زمانہ کے مہابلی راجاؤں کے راج دھانی میں تو شیر اور بکری ایک گھاٹ صرف پانی ہی پیا کرتے تھے مگر بلدیو سیٹھ کے پرتپ جوانی کے حلقہ میں کئی مثالیں شیرنی اور بکرے کے جوڑے مل جانے کی پائی جاتی تھیں۔ سیٹھ کی باتیں یوں بھی آسمانی کتابوں کی طرح کچھ مبہم ہوا کرتی ہیں اور پھر بیٹے بیٹی والے اس کام کو عقیدت اور مجبوری کے تحت کلیتاً سیٹھ پر چھوڑ بھی دیتے ہیں، مادھو بلدیو سیٹھ کی ٹوک کی بات پر اچھل ضرور پڑا مگر جب کی جڑ مٹی اترتی گفتگو سے امید و بیم میں پڑ گیا اور اتنا سمجھ گیا کہ اس کام میں بجائے ایشور کے یہی مختار کل ہیں اور بغیر ان کے کار برآری محال ہے۔

اور شادی بیاہ منگنی سگائی موہنہ کا نوالہ نہیں ہوا کرتیں، معمولی سے معمولی اور غریب سے غریب گھر میں دونوں جانب سال چھ مہینے تو لگ ہی جاتے ہیں اور پہلا سال تو بالعموم سیٹھ کے جھگڑوں ہی میں بیت جاتا ہے، ویسے سیٹھ چاہے تو گھڑی کے چھٹے انش میں چٹکی بجاتے گھر بسوا دے مگر پھر سال میں بارہوں مہینے کے تیسوں دن بلانے دعوتیں کیسے ہوں، خدا لے کیسے آئیں، جوڑے کہاں سے بنیں، اور کیسے لین دین دادا ادھر آسامی پھنس جاتے اس کے کہنے ڈھنگ کے مطابق سیٹھ جب اتنی تان لیتا ہے کہ ٹوٹنے پر نوبت آ جائے، تو پھر شادی طے کرا کر طرفین سے طے شدہ نذرانہ وصول کر لیتا ہے اور اگر سیٹھ کی خوش نصیبی سے شادی کے بعد کچھ الجھنیں ازدواجی زندگی میں پیدا ہو جائیں تو رفع کرنے میں اپنے علم سفینہ کی نشانی سے لے کر علم سینہ والے گنڈے تعویذ منتر تک ہر چیز کے زور سے، ٹوٹے کو جوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اس جوڑ توڑ میں دو طرفہ نذرانہ آتا ہے۔ مشہور بات تھی کہ مدت العمر میں بلدیو سیٹھ نے اپنے پلے کی کبھی نہ کھائی تھی اور ان کے جیسے بھی بیچے بیچا ہے کبھی کبھی تو دوسروں کے گھر سے چل کر پہنچا کرتی تھی اور سب سیٹھوں کی طرح بلدیو سیٹھ کے بھی کچھ لا پیل تو چلتے ہی نہ تھے، خوش نصیب جو تھے، اور بیٹے بیٹیاں پیدا کرتے اور بلدیو سیٹھ بلاتے ہوئے گھر بیٹھے کھاتے۔ بلدیو سیٹھ نے مادھو کو سیٹھی کا پہلا جھٹکا دیا تھا۔ اور انہیں شاید جھٹکا دیتے وقت خود

چیکے کی شدت کا اندازہ نہ ہوا اور نہ وہ یہی اندازہ کر سکے کہ یہ جھٹکا جوان کے بائیں ہاتھ کا ادنیٰ کرتب ہے ان کے اپنے فن کی بنیادیں ہلانے والا ثابت ہوگا۔ دیکھتے
پہلا تو پڑتے ہی مادھو تو خیر پھیلا اٹھا اور دن رات بلدیو سیٹھ کی "بزرگ داشت" الگ۔ یہ خوش حال کاشتکار گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، کھلانا پلانا
پہنانا، لینا، دینا بڑھ چڑھ کر ہونے لگا۔ اس سال ہولی دیوالی پہ پانچوں کپڑوں والا جوڑا، بلدیو سیٹھ نے مادھو کے یہاں کا بیٹا فصل فصل پر کھیت کھیت کی
گٹھڑیں چپکے ہی چپکے مادھو کے یہاں سے پہنچتی رہیں۔ بیوی میاں سے چرا چرا کر کے اور میاں بیوی سے چھپا چھپا کر علیحدہ نوازتے رہے اور کھلم کھلا الگ لیتے دیتے
رہے۔ بلدیو سیٹھ جنگل میں کھلیان کے قریب کہیں نظر پڑ جائیں اور مادھو کچھ نہیں تو تل کی گٹھڑی اور گنّے کا بھیلا چلتے چلتے لاد دے۔ مادھو کھیت پہ ہو یا پینٹھ بازار
کہیں باہر رستہ چلتے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں آتے جاتے بلدیو سیٹھ چوپال پہ ذرا کے ذرا سستانے کے لئے ٹھہر جائیں اور پیلی مٹھارسن کر مادھو کی بیوی باہر
آجائے، اور پانی مانگتے ہی دودھ کا لوٹا پیش کر دے، اور یہ منع ہی کرتے رہیں اور چلتے چلتے بیسن یا میدہ کی پوٹ، چاول کی گٹھڑی ٹاٹ کے تھیلوں میں ٹھنسی اک
گھی کا ملسا ہاتھوں میں دے دے، بستی کے آس پاس کہیں آتے جاتے راستہ پر مادھو کو گشت پر نکلے ہوئے بلدیو سیٹھ کا سایہ بھی نظر آجاتے اور مادھو بلدیو سیٹھ کھڑے
کھیتی کسانی کا کام تج تجا کر گھر لے آیا۔ کڑھائی چڑھوا دی، پوری پکوان ہونے لگا۔ بھوجن پر دودھ کی ہانڈی، دہی کی چھونی اور گھی کی مٹکی گھر کے اندر سے چوپال پر
یوں ہی اٹھی چلی آتی۔ دیہاتی تواضع کی جبلت اس پر اپنی غرض سونے پر سہاگہ ہو جاتی، ایک دن دو دن تین چار دن جتنی بھی کھینچ تان کر بلدیو سیٹھ کے وقت
میں گنجائش نکل سکتی اصرار کر کے روکتا اور چلتے وقت بڑے سے اور پوٹلیاں ساتھ باندھ دیتا۔ بھادوں کی جھڑی والے لمبے لمبے جینٹی کے دنوں میں چوپال کی
چوکی پر بیٹھ کر اور پوس کی لمبی لمبی راتوں میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کے کنارے جم کر مادھو اور بلدیو سیٹھ میں تمام تمام دن اور ساری ساری رات باتیں ہوتیں
تھیلی تھیلی تمباکو چلم چلم ہو کر پھونک گئی۔ بلدیو سیٹھ نے لمبی چوڑی باتوں میں خوب خوب بھاؤ بڑھائے اور مادھو کے کام میں جو جو مشکلات پیش آ رہی تھیں
ان کی من گھڑت تفاصیل سنا سنا کر اور اچھے اچھے گھروں کے سبز باغ دکھا دکھا کر پوری طرح اپنا نذرانہ تاڑ کے طے کیا۔ مادھو نے بیٹی کو بھاری جہیز جتنا
بھی بلدیو سیٹھ طے کرائیں اتنا دینے کا وعدہ کیا، اور بہو لیں بھی ایک جوڑے میں خالی چھاج چھلنی کے ساتھ سر آنکھوں پہ رکھ کر بیاہ لانے کا اقرار کیا اور لڑکی
لڑکے کے سیاہ و سپید کا کل اختیار بلدیو سیٹھ کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ ادھر بلدیو سیٹھ نے دیکھا کہ اب کو مرتبہ مادھو کی فصل بڑی اچھی اٹھ رہی ہے اور جھٹکے
ہی جھٹکے میں دوسرا سال لگ گیا، خوب کھا پی لے، اور یہ کام تو آج نہیں تو کل انہیں انجام ہی دینا ہے، سمت بھی اچھا ہے دونوں طرف سے ایک کی جگہ سوا ہو سکتا
ہے اور ان کا روپیہ کھرا بیس آنہ میں بھن سکتا ہے، بس استاد کا نام لے کر بچی کا ہاتھ کھڑے ہوئے، اور جس جال کے ایک سرے میں مادھو پھنسا ہوا تھا اس کا
دوسرا سرا اکھٹے لے فریب شکار کی تلاش میں نکل پڑے مگر سفید بھیوں کے نیچے سوکھے حلقوں میں بے وقت ٹھکرے کی طرح متحرک آنکھیں پتھرا سی گئیں پہلے ہی گشت میں
اندازہ ہو گیا کہ جس چیز کو گڑ کی ڈلی مونہہ میں سمجھ کر چلے تھے وہ اتنی آسان نہیں ہے اور دوسرے تیسرے گشت ہی تو لوہے کے چنے ہو گئی اور انہیں معلوم ہوا کہ
کوڑھ کے سلگتے ہوئے ناسوروں کی چراند تو پہلے ہی سے دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک مہینہ دو مہینے چار مہینے بلدیو سیٹھ کو اپنی پیر پتی جمانی کے سو سو اسو
گاؤں گھومتے، کھدرے، کنوار سے چیت آ لگے، آج پورب میں کل پچھم میں، بڑی گنگا کی ترائی سے چھوٹی گنگا کی کڑی تک اتر سے دکھن اور دکھن سے اتر، چالیس کوس
لمبے چوڑے جنگل کے اندر نہ معلوم کتنی زور آزمائیاں کیں، جنگل جنگل خاک چھانی، گھر گھر سنجھا پھینکا، بیچارے کی ٹانگیں پھیل گئیں اور ٹٹیا کے پاؤں سپر گئے اور
دلالی کی ساری تونتیں تھک گئیں اور انہیں پتہ چلا کہ اپنے سودے کا بھاؤ بڑھانے کے لئے جو جھوٹ بسیٹھی کے چٹکلے کے طور پر وہ مادھو کے سامنے ڈیڑھ سال سے بول
رہے تھے وہ پہلے ہی سے عین سچ تھا اور جھٹکا واقعہ تھا۔

اور چھ بیت کر چھ مہینے اور بیتے، اور بلدیو سیٹھ نہ مادھو کی بیٹی کی بات کہیں ٹھہرا سکے اور نہ مادھو کے بیٹے کی منگنی کہیں سے لا سکے، ان کو پچاس سالہ
تجربہ میں ایسا بے ڈھب معاملہ نہ پھنسا تھا، انہوں نے تین تین مرتبہ کی بھاگی ہوئی اور دو دو پیٹ گرائے، کھائی کھیلی رنڈیاں کنواری کنیا اور ستی ساوتری بنا کر پار لگا دی
تھیں۔ بڑے بڑے بے راہی بگڑے ہوئے ٹھاکر راجپوتوں کے تماشبین لونڈے جو دن رات ٹھیٹھوں پتریوں میں بدمست پڑے رہتے تھے جنگلی بجاتے بال بچوں کا
بنا کر چاند سی کنواری لڑکیوں سے بھاری بھاری جہیزوں کے ساتھ ایسے صاف بیاہ کرائے تھے کہ سمدھی سمدھن اور دولہا دولہن دونوں طرف بلدیو سیٹھ کو دیوتا
مان کر عمر بھر پوجتے رہے تھے، اور معمولی سیدھے سادے گھر بسانے کی تو شمار ہی نہ تھی ہزاروں دادے سے لے کر پوتے تک تین تین پشتیں بیاہ دیں اور کچھ
یہی نہیں کہ وقت وقت پر، مالدار خوشحال گھرانوں میں پہلے پوتے کا بسایا اور اس کے بعد ضرورت پڑنے پر اس سے چار سال کم والد کے ساتھ دادا کا [illegible]
[illegible] کی منگنی طے ہو جانے کے بعد اگر حادثاتی طور پر ماں گھر سے غائب ہو گئی اور جملہ معترضہ باپ کا درمیان میں آ ٹپکا تو بیٹے سے پہلے باپ کا [illegible]

پڑے باپ بیٹے کا ساتھ ساتھ ایک منڈھے کرا دیا۔ بیویوں کے تبادلے اور لڑکیوں کے خوش خرید سودے تو نہ معلوم کتنے بغیر ہی نخاس میں لگاتے پلک مارتے گائے بکری کے بھاؤ پر کرا دیئے غرض چھ سے لے کر چھیاسٹھ تک ہر عمر میں شادی کرانے کی اس دار قوت بلدیو سیٹھ کے اندر قدرت نے یکساں چپک کے ساتھ ودیعت کی تھی مگر مادھو کے بیٹی بیٹے کے پیوند کرانے کی تگ ودو میں بلدیو سیٹھ کی ٹیا اور ٹانگوں کے ساتھ زبان بھی تھک گئی، اور انہوں نے اپنے نصف صدی کے تجربہ میں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ان کا فن یہاں پر جواب دے گیا! بیچارے حال کی داد و دہش اور مستقبل کے انعام سے مایوس ہو گئے، اور کورا جواب دینا تو سیٹھ قسم کے لوگوں کی شان کے منافی ہوا کرتا ہے مگر مادھو کو جو کچھ جواب دیا اس سے وہ یہ سمجھ گیا کہ فی الحال برادری سے گرے گھر میں رشتہ کرنے کو کوئی طیار نہیں ہے۔ بلدیو سیٹھ سے جواب سا پا کر مادھو نے گھبرا کر اپنی بسنتی پر نظریں ڈالیں، وہ تیرہ کی ہو چکی تھی، اور ماکی کو تو ککڑی کی بیل سے نایا جاتا ہے اور یہ تو ککڑی کی بیل سے بڑھ کر کریل کی جھاڑی بن گئی تھی —— اور بیٹا پندرھویں برس ساگون کے کندے سے برگد کا پیڑ ہو گیا —— اگوٹی کی چھاتی ابھر گئی اور بیٹے کے مونہہ پر مونچھیں آ گئیں تو پھر کون بیا ہنے آئے گا —— اس کی بیوی ہر وقت اسی فکر میں کڑھتی، اور جل جل کر مادھو کے سامنے اپنے باپ ماں کی کریا میں کیڑے ڈالتی جو اسے ایسے گھر جھونک گئے تھے جیسے کوڑھ لگنے لگتی، —— جس کے باپ کی کوڑھ نے اس کے جیتان سے بیٹے کے شریر میں بغیر ہی کوڑھ کے کیڑے ڈال دئیے تھے۔ اس کی پدمنی سی گوری بیٹی کی چاند سی پیشانی پر کلنک لگا دیا تھا —— اس نے گھی کی لوندا سی بیٹی اور گڑ کا بھیلا سا بیٹا جن کر بھی کوڑھی پر وات چڑھائے تھے۔ تندرست، شیشہ سا دمکتے، گلاب سا کھلتے کوڑھی! —— اور اسے صبر نہ آتا، کبھی کبھی ناگن کی طرح بل کھاتی، منہ پر نوجوان بیٹے کی بھیگتی مسوں کا رونگٹا، یا کوڑھ کے دہکتے ہوئے کیڑے!؟ —— نوخیز دوشیزہ کا ابھرتا شباب یا سماجی کوڑھ کے دو پھوڑے!؟ —— دونوں وقت بڈھے کو روٹی پکاتے وقت دانت کٹکٹاتی، اور مادھو تپہ میں لپیٹے وقت مجوب ذرا دم سا سر جھکائے رہتا۔ یہ پھنکارتی، بڑبڑاتی اور جیسے باپ کے قصور میں بیٹا خود کو مجرم سا محسوس کرتا، گویا وہ سانپ کو دودھ پلانے جا رہا ہے، کسی ڈاکو کو کھلانے جا رہا ہے جس نے خود اسی پر چھاپہ مارا ہے اس رہزن کو —— مگر پھیکی روٹی کی دہیز تہ میں بیٹے کا دل دھڑکتا تھا اور وہ جیسے روٹی چھین کر لے بھاگتا۔ باپ کے لئے روٹی ۔ ۔ ۔ ۔ !

اور دولبسنت اور بیتے، اور بسنتی کی سکھیاں ایک جوڑ دو دو بچوں کی ماں بن گئیں، رمچنا کے ساتھ کے چلتے گوتے لونڈے بیٹے کے باپ ہو گئے۔ اور ہر بسنت بسنتی نیا روپ پا کر کھلتی گئی، بیساکھ کے بیساکھ رمچنا میں دن دونا رات چوگنا خون انیڈ انیڈ کر اچھلتا رہا، اور مادھو کے گھر نہ بیٹے کی منگنی آئی نہ بیٹی کی سگائی گئی۔ اور اب تو یہ بھی دونوں سیانے تھے زبان نہ کھلے تو کیا آنکھیں تو جواب سا طلب کریں، اور باپ کی نگاہ چار نہ ہوتی، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتے، تم کوڑھی کے گھر کیوں جنمے!؟ جو ہم تمہارے گھر جنم لے کر دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا ہو گئے۔ اور اس کا جواب تو اب بلدیو سیٹھ کے پاس بھی نہ رہا تھا۔ تھکے ہوئے بلدیو سیٹھ، گھبرائے ہوئے مادھو اور مادھو کی بیوی اور وہ ایک بھد دہڑ سی سب ملکر جتنا اس معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے اتنا ہی جالے میں پھنسی مکھی کی طرح الجھتا گیا —— اور کہتے ہیں کہ کوڑھی کی تو یوں بھی عمر بڑھ جاتی ہے —— کوڑھ کے سات سال!! بڈھے کی تو جیسے موت کو موت آ گئی تھی۔ اور پھر شاید دور گنگا پار نیا میدان ہموار کر کے "تل اوٹ پہاڑ اوٹ" بلدیو سیٹھ کسی غریب برادر کو آمادہ کر کے ڈکھا کر ٹپا سکتے تھے مگر جب تک یہ باپ کی پوٹ سامنے دھری تھی دکھو دکھاتے جیتی مکھی نگلوانا ان کی قوت سے باہر تھا . . . .

(۳)

"ڈھلتی رات کے مہیب اور تاریک سناٹے میں جھونپڑی کے قریب پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ ہوئی، اور بڈھا تو برسوں سے ڈھلتی ڈوبتی نیند سویا کرتا تھا پہلے کھٹکے پر چونک پڑا، اور بیلوں کی چاپ اور تانگے کی گھڑ گھڑاہٹ پر بستر سے کھسک کے دروازہ کے قریب آ کر متحیر سا بیٹھ گیا؟" مادھو کیوں آیا اس وقت تانگا لے کر!؟" —— مادھو نے بیلوں کو ٹھہرے رہنے کا ہونکارا دیا اور تانگے سے اتر کر جھونپڑی کے قریب آیا اور بڈھا تو خود ہی آواز دینے والا تھا کہ مادھو نے دروازہ کے قریب پہنچ کر بڑے شیریں لہجے میں پکارا "باپو" اور ایسی میٹھی لوچدار آواز تو بڈھے کے کانوں میں مدت سے نہ پڑی تھی —— "باپا" —— جیسے بچپن میں ایک ننھا منا مادھو صبح ہی صبح خربوزہ کے کھیت پر جا کر پکارا کرتا تھا جب خربوزوں کی مست خوشبو سے دور دور تک فضا بھری ہوتی تھی اور مادھو کا پیٹ خالی ہوتا تھا —— اور اب تو نہ معلوم کتنی مدت سے بجز ایک کرخت بیزاری سی "ٹھار" کے بیٹے کی کوئی آواز ہی کان میں نہ پڑی تھی —— روٹی کے وقت کی مخصوص "ٹھار"، جیسے تلخ گھونٹ پی کر حلق صاف کرنے کو "ٹھارنا" —— جیسے سن کر بھی بغیر دیکھے اندر ہی بیٹھے بیٹھے باپ کی نگاہ کے سامنے بیٹے کا سنگین چہرہ اور دھاڑ دار تیوری گھوم جاتے جیسے کوئی نادہند مقروض اپنے بیاج خور سے ..... سود کی رقم ادا کرنے آ گیا ہو اور یہ آواز سن کر بڈھے نے برجستہ جواب دیا۔

"کیوں بیٹا مادھو؟ خیر تو ہے؟!"

"ہوں" مادھو کے حلق سے بے معنی سا ہونکارا نکلا اور بڈھے نے دوسرا سوال کیا "کیا کہیں جا رہے ہو بیٹے؟"

"آں، نا، ہاں، نہیں، ایں، تمہیں لے جاؤں گا بابو۔ اوں" جیسے مادھو نے کسی اور کے موہنہ سے بولا۔

"کہاں بیٹے؟" بڈھے نے حیرت سے استفسار کیا۔

"اے، اے، ۔ علاج کرانے" اور مادھو نے کھنکھار کر حلق صاف کیا۔

"علاج! علاج! کہاں بیٹے؟!"

"گنگا پار، قصبہ میں" مادھو نے تھرتھراتی آواز میں مختصر سا جواب دیا اور بڈھا جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہتے بن نہ پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ "کوڑھ لاعلاج مرض ہے" کچھ سمجھ میں نہ آیا، اس کو ایک مرتبہ بیٹے کی زبانی مجملاً یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بلدیو لسیٹھ نے صاف جواب دیدیا کہ بلدی والا کوئی رشتہ کے لئے طیار نہیں ہوتا اور اس کی لڑکی اور لڑکا بیاہ منگنی سے تھک گئے خیال کیا کہ شاید اسی امید میں علاج کرانا چاہتا ہے کہ شفا کی کوئی صورت یا کچھ نہیں تو علاج کا بہانہ ہی پیدا ہو جائے تو شاید یہ رکاوٹ دور ہو جائے، یہ خیال آتے ہی بڈھا باوجود معذوری کے تن کر کھڑا ہو گیا، گوڈر میں لپٹے ہوئے ہاتھ میں لکڑی تھامے ٹھٹیوں پر پٹیاں چڑھے پاؤں سے لنگڑاتا ہوا چل کر تانگے میں آبیٹھا اور مادھو نے بیل ہانک دیئے۔

رات اندھیری تھی اور کنوار کی رات تو بڑی نم اور بوجھل ہوتی ہے سیلن اور تاریکی میں نامانوس راستہ پر بیل ذرا بھاری پاؤں ڈالتے چل رہے تھے مگر مادھو نہایت تسلسل کے ساتھ ٹٹخارتا اور ہنٹر کے ڈنڈے سے پیٹتا چلا جا رہا تھا، جنگل میں پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ بیلوں کے کھروں کی بدبداہٹ تانگے کی چرخ چوں اور مادھو کی ٹٹخاریوں کے باوجود بھی سناٹا تھا، موت جیسا سناٹا! ۔ بڈھا اندھیرے میں آگے پیچھے دائیں بائیں نظریں پھینکنے کی کوشش کر کے ماحول کو پرتالنا چاہتا تھا مگر وہ تو سمت کا تعین بھی نہ کر سکا۔ تقریباً گھنٹہ بھر چلنے کے بعد تاروں کی چھاؤں میں صبح کاذب کے سپیدے کی پہلی لکیر ابھرنا شروع ہوئی اور بڈھے کو کچھ کچھ ماحول کا اندازہ ہوا۔ اتنی دیر ساتھ چلنے کے باوجود بیٹے اور باپ میں بات چیت کی نوبت نہ آئی دو ایک سوال بڈھے نے کئے بھی مگر مادھو نے مہمل قسم کے ہونکارے میں اڑا دیا اور بیلوں کی رفتار تیز تر کر دی۔

مشرق سے سپیدہ بڑھا ایک خطِ نور بیچوں بیچ آسمان سے گذرتا مغرب تک چلا گیا، اور قریب کی چیزیں دھندلکے میں مٹی مٹی سی نظر آنے لگیں اور بڈھے کو ماحول کا پورا اندازہ ہو گیا، اس نے بار بار چونک کر بیٹے کی جانب دیکھا مگر اس کی تو ادھر کو پشت تھی اور بڑی دھن کے ساتھ بیلوں کو ہانک رہا تھا ....

اور ادھر کچھ دھندلکا چھٹا آدھر ماحول کے متعلق بڈھے نے تیقن کیا اور مشتبہ مشتبہ مستفسرانہ سی نظریں بیٹے کی پشت پر گاڑ دیں اور بار بار دور بہت دور نگاہیں پھینکیں اور سمجھ گیا کہ بیٹا اسے گنگا پار قصبہ کے راستہ پر نہیں لئے جا رہا ہے بلکہ اس کا تانگا اس بند کے راستہ پر چل رہا ہے جس کے عین نیچے عمودی انداز میں کرارے کی جڑ سے لگی ہوئی گنگا بہتی ہے اور بند کی روک کے سبب یہاں پر دریا اتھاہ بھی ہے اور انتہائی برہم بھی، اور مٹی اٹھنے کی وجہ سے بند کے نیچے بہت گہرا کنڈا ابلتا ہے جس سے لگا ہوا مضبوط کرارا کھڑا ہے۔

اور باپ کا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنک گیا تھا پچھلے پہر کے گہرے دھندلکے میں سمت اور راستہ کا تعین کر کے سمجھ لیا کہ اس کے بیٹے کی منزل مقصود کہاں ہے، اور اس نے بند کی جانب ایک لمبی نگاہ پھینکی، اور بند کی چوٹی سے اتر کر آہستہ آہستہ راستہ کے بیچ دم پرانے پاتوں الٹی مضبوط بیٹے کی آہنی ہاتھوں پر آکر ٹھہر گئی جو بیلوں کو بڑے زور سے ہانک رہے تھے اور مشینی حرکت میں تھے اور پھر بیٹے کے ہاتھوں سے پھسل کر مہیب بند کے بلند ترین خط تک پہنچی اور ہاتھوں سے بند کی چوٹی تک اور چوٹی سے ہاتھوں تک چڑھنے اترنے لگی اور ایک مرتبہ جب بیٹے کے بیل ہنکاتے ہوئے آہنی پنجوں اور سنگین کلائیوں کی حرکت میں آکر ابھی تو ڈر کے مارے بڈھے کو پسینہ آگیا۔ ایک جھرجھری سی لے کر گوڈری کے اندر ہاتھ پاؤں پرو لیا۔

"ہوں میرے بیٹے، ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے" اور شاید لفظ "میرے بیٹے" ادا کرتے وقت باپ کے کڑوے کسیلے موہنہ میں شکر سی

گھل گئی اور مادھو پر ایسی نظریں پڑیں جیسے کنجوس سرمایہ دار کی اپنے سونے کے ڈھیر پر۔ اور اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا، اس کی آواز سے طویل علالت والی مخصوص رقت کم ہو گئی "تم جو کچھ کرنے جا رہے ہو وہ میرے لئے بڑا اچھا ہے" اور بڈھے کے حلق نے ایک جھٹکا لیا۔ اور آواز کی علالت پر قابو پاکر جیسے جھٹکے کے ردعمل والی آواز میں کہا" اور پھر ابھر بیٹا مدھو ئے! پھر، ت، تم۔ ..... " اور باپ کی زبان بیٹے کے مستقبل کے خوف سے لڑکھڑا گئی، دل دھک سے ہو گیا، حرکت کا تسلسل تھا، اس کے بیٹے کے مضبوط ہاتھ بیلوں کو ہنکانے میں سرگرم عمل تھے۔ ہاتھ کے اشارہ پر بیلوں کے پاؤں مستعدی سے بڑھ رہے تھے اور تانگے کے پہیے مسلسل بندکی جانب گردش کر رہے تھے۔ اور پھر بند پر پہنچکر۔ .... اور وہ کپکپا اٹھا! شاید باپ کی فکر رسا بیٹے کی اس غیر فطری حرکت کے ردعمل کے خیالی نتیجہ کے خوف میں اس منزل تک پہنچ گئی جہاں روم کا آئین مرتب کرنے کے بعد بابائے قانون سولن اعظم کے فلسفۂ تعزیر کی پروا نہ ہو سکی تھی ؛

صبح کے دھندلکے کا دامن چیرتے بیل اب گرم ہو چکے تھے۔ راستہ کے مانوس پن کا احساس جبلت سے دور ہو چکا تھا۔ پاؤں پوری مضبوطی اور تیزی سے اٹھ رہے تھے باپ کی بات سن کر بیٹا بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ اور پہل رسمی ہونکارا نکالا ہانکنے کی ٹخ ٹخ سے جا ملا، اور بیل دو تین کھنٹی فاصلہ اور لپیٹ گئے اور باپ پھر گڑگڑایا" بیٹا مدھو ئے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے اپنی جھلسی ہوئی جان پیاری ہے۔ اور میں اپنے لئے ڈر رہا ہوں۔ میرے لئے تو اس سے بڑی بھلائی اس سنسار میں نہیں ہے"۔ اور یہاں پر بڈھے کی آواز گویا ڈر کے مارے گھگھیا سی پڑی۔ اور مادھو کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا، البتہ اتنا سمجھ گیا کہ بڈھا بہت خائف ہے۔ اور مادھو "بیٹے" اور "باپ" چکی کے دو پاٹوں بیچ آ گیا" رچنا" !چکی کا متحرک پاٹ! ۔"بابو" چکی کا جما ہوا پاٹ! ۔ کچر کچر کچر! جیسے اس کی کھوپڑی کھچڑی کی ہانڈی کی طرح پک نکلی۔ اس نے گردن کو ایک جھٹکا سا دیا بیلوں کو ٹنکار کر زور سے ڈنڈا مارا اور بیلوں نے چند ہی قدم اٹھا کر ڈالے تھے کہ رفتار مدھم ہو گئی جیسے اس کے بدن میں سے خون کی بوند بوند الٹ کر قلب میں جمع ہو گئی۔ اس کا دل خون کے دباؤ سے پھٹا جا رہا ہے۔ از خود بیلوں کی رسیاں تن گئیں اور چند قدم سست سست سے ڈالے، اور جیسے اسے معلوم ہوا کہ تانگے کے پہیے پیچھے کو گھوم رہے ہیں اور اس خود فریبی میں اسے یک گونہ طفلانہ طمانیت سی محسوس ہوئی، اس نے جھنجلا کر گردن جھٹکی اور پھر باپ کی آواز کان میں آئی جیسے آکاش سے سوتے سوتے جاگ کر بہما بولے" دیکھو بیٹا ہم تو کلاپ سے چھوٹ جائیں گے، اور تمہیں دعائیں دیتے جائیں گے۔ پھر جاتے وقت بھی اطمینان سے نہ جائیں گے، میرے چندا ۔" بیٹے نے سنبھل کر باپ کی بات کے منہ تک پہنچنا چاہا۔ اور باپ نے ایک گھونٹ لے کر کہا" مجھے سب معلوم ہے جو تم نے بتایا وہ بھی اور جو نہیں بتایا وہ بھی۔ تمہیں ذات برادری سے نکال دیا، تمہارا کام گر گیا، بلدیو بسیٹھ تمہیں ٹھگ کر کھا گیا، تمہاری بیٹی بیٹا منگنی بیاہ سے تھک گئے، ہم بھائی برادری سے گر گئے تمہارے مال کا مندا ہو گیا۔ اور تم تو کبھی دو چار باتیں چلتی ہوئی روٹی سے کے آتے جاتے بتا جاتے ہو اور میں بہت کچھ سمجھتا ہوں اور سات برس سے میری آتما بے چین ہے اور اب جب میں اس بھوگنی سے نروان پا رہا ہوں تو بھی آتما بے چین ہی جا رہی ہے" اور باپ کی تقریر نے جیسے بیٹے کا خون بلو دیا، سن سنا نا سا ئیں۔ پاؤں کی چھنگلی سے لے کر سر کے بال تک طوفان سا چڑھنے اترنے لگا، کنپٹیوں کی رگیں پھڑک اٹھیں، گردن کی سلاخیں ابھر گئیں، چہرا لال پھر نیلا اور پھر پیلا ہو گیا، ایک جھرجھری سی آئی اور جیسے بتاشہ پر پانی کی بوند ٹپک پڑی، وہ پورے تن سے بجھ گیا اور بمشکل عاجز بیٹے نے کوڑھی باپ سے مخاطب ہو کر روہانسی آواز میں ڈر کر ادا کیئے" تو پھر میں کیا کروں بابو! ۔ میرے تو جنم کرم میں کیڑے پڑ گئے"! اور یکا یک اسے اپنے رونگٹے رونگٹے میں چیونٹیاں سی کاٹتی محسوس ہوئیں۔

" ہوں بیٹا، اور مجھے ڈر لگتا ہے ؛ میرے مدھو آ کے ہاتھوں ہتھیا نہ ہو جائے۔ میری آتما کانپ جاتی ہے، کبھی کبھی اسی جنم بھی بھوگنی پڑ جاتی ہے ..... " اور یہ باپ بولا، اور یہاں خوف، غم، اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا سنگم بن گیا، ماضی کا تاسف، حال کی پریشانی سب کی سب مستقبل کے خوف میں تبدیل ہو گئیں۔ اور بوڑھے کوڑھی موت کے کنارے کھڑے ہوئے باپ کی آواز مرنے کے بعد اپنے بیٹے کے مستقبل کے خوف میں لرز رہی تھی اور ڈر کے مارے نحیف خستہ جسم پسینہ پسینہ تھا۔

اور "ہتھیا" "سراپ" اور بھوگنی "پڑ جانے کے خوف سے نہیں، باپ کی طرز فکر کے ملکوتی تیوروں نے جیسے اس کی گدی پکڑ لی اور دھکی

رگ رگ میں بٹیا جھن جھنا پڑا، بیلوں کی رسیاں اپنے آپ سختی کے ساتھ کلائیوں پر لپٹ گئیں، اس نے پورے زور سے بیلوں کو کھینچ دیا۔ تانگہ ٹھہر گیا جیسے سینہ کے اندر دل کی تمام رگیں اور ریشے کسی نے مونجھ کی رسی کی طرح مروڑ کر رکھ دئے اور اس کے منہ سے بیلوں کو پیچھے موڑنے والی مخصوص ٹٹکاری ہوائی کی طرح چھوٹ گئی، جو گردن پیچھے مڑنے سے تا مر تھی، اسپرنگ جیسے جھٹکے کے ساتھ خود بخود مڑ گئی، باپ بیٹے کی آنکھیں چار ہوئیں اور نہایت تڑاخے کے ساتھ زبان بول پڑی "باپو میں لوٹے چلتا ہوں!"

اور باپ بیٹے کی کتاب میں باپ نے ایک نادر باب کا اضافہ کیا۔ بڈھے کی آواز سے طویل بیماری اور سات سالہ شدید معذوری کی مخصوص رقت یک دم غائب ہو گئی، بے نور سی کبھی کبھی آنکھوں میں مادھو سے زیادہ چمک ابھر آئی، تانگے میں بیٹھے ہی بیٹھے پھیل کر تن سا گیا، جیسے زخمی سوختہ داغ دار بدن کا ایک ایک ناسور ڈر کے مارے کہیں جا چھپا اور اب کی مرتبہ باپ کے منہ آگے بڑھانے والی ٹٹکاری نکلی تھی، بیل مڑتے مڑتے پھر سیدھے ہو گئے اور چل پڑے، اور بڈھا تحکمانہ انداز میں مختتم سے دو لفظ بولا، جیسے اپنے زمانہ میں کاشتکاری کی کوئی اہم گتھی سلجھاتے ہوئے موسم کے مزاج اور وقت کو پہچان کر نا تجربہ کار بیٹے کو قطعی رائے دیا کرتا تھا "ہاں، ہاں بڑھے چلو" بیٹیوں میں لپٹے ہوئے ہاتھ کے ٹھونٹ کو مضبوطی کے ساتھ اٹھا کر بند کی جانب اشارہ کیا اور بیل پوری رفتار چلنے لگے۔ صبح صادق کے آثار پھوٹ پڑے، کنواری کنواری شفق، رات کے دھندلکے اور تاروں کی مدھم مدھم سی روشنی سے دست و گریباں ہو گئی، ذرا دیر جذ و جہد اور آویزش کا سماں رہا، پھر رفتہ رفتہ رات کا نظام کچھ منتشر سا ہونے لگا۔

مضبوط بیل بند کے اس رخ میں پھیلا ہوا چپ چپا پانی طے کرتے دلدل کاٹ کر ڈھلوان چلنے لگے، نوجوان بیٹے کا ڈھیلا ڈھیلا پگھلتا موم کا بت جیسا بدن اپنی پشت پر لدا رہا۔ مفلوج سا ہنٹر لٹکتا رہا، بے جان سے ہاتھ ٹھہر گئے اور جیسے وہ بیلوں کے ساتھ جتا ہوا تیسرا بیل تھا، نہیں مشین کا ایک پرزہ رہ گیا جو بڈھے کے اشارہ پر بیل ہانکنے کی جگہ لگا ہوا تھا۔ اور جیسے بیل اس کے بغیر ہی ہانکے تیزی سے بڑھتے رہے۔ بیٹے کی جوانی اور تندرستی کے سارے دم خم باپ کے بوڑھے علیل خستہ ڈھانچے میں آ کر چھپ گئے تھے اور ایک مقام پر پہنچ کر بڈھے نے نہایت تحکمانہ انداز میں کہا "روکو" اور تانگہ ٹھہر گیا، یہاں سے عین نیچے بند کی جڑ سے لگا کنڈا ابل رہا تھا اور اس جگہ سے ذرا اور اوپر کو بڑھ کر بند کی چوٹی کے خط کا ایک مخصوص مقام تھا جہاں سے بند کی دیوار کنڈے کے کنارے ساتھ عمودی انداز میں ایستادہ تھی، شفق کائنات پر قابو پا چکی تھی، تا حد نظر گلال افشاں سی چھڑکی ہوئی تھی کنڈے کے خشم ناک پانی میں خون کا جوار بھاٹا سا اٹھ رہا تھا، بڈھے نے بالکل اس انداز میں جیسے ایک پرانا کمانڈر اپنے ادنیٰ سپاہی کو حکم دیتا ہے آواز نکالی:

"بیلوں کے آگے کھڑے ہو جاؤ، بڑھ نہ جائیں" اور مادھو جیسے سوچ سے عاجز، خالی الذہن مسمریزم کا معمول، بڈھے کی آواز کی تال پر چپ چاپ اتر کر بیلوں کے آگے جا کھڑا ہوا، اپنے بکھرے بکھرے سے وجود کو ٹٹولتا ہوا مخمور، مار گزیدہ سا۔ نیچی نیچی آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا۔ گردن اور شانے جھکائے ہمہ تن تعجب! سوالیہ نشان کی صورت ایستادہ۔۔۔۔۔

تانگے کے تختے پر بڈھا اٹھ کھڑا ہوا۔ بغیر لکڑی کی ٹیک کے۔ حتیٰ کہ تانگے کے جنگلے کا سہارا بھی نہ لیا اور تن کر سیدھا ہو گیا، چاق چوبند ذرا بانکپن کے ساتھ دائیں سے بائیں گردن گھمائی، بڑے اطمینان اور استقامت سے لمبی سانس لی اور آہستہ سے جھرجھری لے کر ذرا جھکا سا اور پھر ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ڈھیلا سا ہو کر اک ثانیہ جیسے کچھ ٹھٹکا۔ اور یکدم بھرپور توانائی کے ساتھ سنبھل کر ایک جست میں تانگے سے نیچے آ گیا، اور جیسے ٹکرانے والے زور کے ساتھ یلغار سی کر تا کنڈے کی جانب جھپٹا۔۔۔۔ اور بیٹے کے پاؤں میں جیسے بچھو نے ڈنک چبھو دیا، بجلی کی طرح تڑپ کر باپ کی جانب جست لگائی "نہ، نہیں، نہیں باپو نہیں! چلو!" اور بند کی چوٹی کے بلند ترین خط پر پہنچتے پہنچتے مادھو کے پہلو میں سے بیٹے کے دو ہاتھوں نے کہربائی انداز میں برآمد ہو کر باپ کو دبوچ لیا۔ پدریت نے پسریت کو بڑے زور سے دھکا دیا، بڈھا مچھلی کی طرح مادھو کی گرفت سے نکل گیا۔۔۔۔۔۔۔ "ہم جا رہے ہیں!" بیٹے کا حلق موت کی چیخ ڈہارا، اور بند کی مہیب بلندی سے کنڈے کی اتھاہ گہرائی میں جاتی ہوئی باپ کی گٹھری کا لوسے کی لاش سے کھڑے بیٹے کی نگاہ نے تعاقب کیا، شفق گوں ابلتے پانی کی گھمر گھمر کرتی چکیوں کے بلوریں پاٹوں پر چھپاکا بلند ہوا، قرمزی پانی کا ایک چھینٹا اڑا، اور باپ کی تصویر کے خاکے میں شوخ ترین رنگ بھر گیا۔۔۔۔ اور مادھو کے ہاتھ میں بڈھے کے بوسیدہ لباس میں سے بچا ہوا ایک چیتھڑا باپ بیٹے کی کشمکش کی یادگار ہوا میں لہراتا رہ گیا!

افسانہ:

سوکھے پتّے

حجاب امتیاز علی

جب وہ اپنی منزل پر پہونچے تو سورج ابھی ڈوبا نہ تھا!

وہ دونوں گاڑی سے اترے تو پالکول کا اسٹیشن انہیں بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ اسٹیشن کی وہ پُرانی لالٹین۔ اس کے سائے میں سونے والا وہ مریل سا ڈبلا کُتا۔ کھڑکی کے اندر بیٹھا ہوا وہ مسخرا ٹکٹ بابو۔ کچھ بھی نہ تھا۔ زمانے کی آندھی نجانے ان سب کو اڑا کر کہاں لے گئی تھی! ـــــ پالکول کا اسٹیشن پہلے ایسا تو نہ تھا!

پھر یک وقت دونوں کی نظریں گاؤں کی مسجد کے میناروں کی طرف اٹھ گئیں جس کے عقب میں سورج نے افق کو ارغوان زار بنا رکھا تھا۔ یہی ایک پرانی چیز وہاں موجود تھی ـــــ افق کے شفق زار میں دکھتا ہوا پرانا سورج! جو زندگی کی بہاروں میں بھی بالکل اسی طرح اسی مسجد کے عقب میں ڈوبا کرتا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چاند ہو یا سورج اپنے وقت پر ڈوبتا اور ابھرتا ہے۔ خواہ وہ انسانی آبادیوں پر ڈوبے یا ویرانیوں پر اُبھرے۔ اسے انسان کے ماضی و مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر بوڑھے میاں بیوی ذرا دیر کھڑے ادھر ادھر تکتے رہے۔ ایک حسرتناک حیرانی نے انہیں ساکت کر دیا تھا۔ یہ وہی مقام ہے؟ پُرانی یادوں کی کہر میں سے اس مقام کی جو تفریحیاں اور رنگینیاں جھلکا کرتی تھیں۔ ان کا کہیں سراغ نہ تھا۔

ایک دبی ہوئی آہ بھر کر وہ آہستہ آہستہ سامنے کی چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہونچتے پہونچتے دونوں کا سانس پھول چکا تھا۔ جادۂ حیات کے یہ تھکے ماندے مسافر زندگی کے اس کٹھن نشیب و فراز کو طے کرنے کے اب ناقابل معلوم ہوتے تھے۔

بڑھیا ٹھیر گئی بولی "۔ اب مجھ سے چلا نہیں جاتا"

بوڑھے نے کہا: " ذرا سی ہمت اور۔ میرا خیال ہے اب چند ہی قدم پر منزل آجائے گی"

" ان راہوں پہ چلتے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ اب یہ شاہراہیں بن چکی ہیں" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی " نئے رستوں پر پرانے مسافروں کا کیا کام! واپس چلو احمد۔"

مگر بوڑھا احمد حال کے ماحول میں پچاس سال پُرانے ماضی کو دیکھ رہا تھا یک لخت بول اٹھا "ارے وہ مسجد! دیکھنا زیتون۔ یہ مسجد یہاں نہ ہوتی تو میں اس جگہ کو پہچان بھی نہ سکتا!

"اور وہ۔ وہ رہا وہ تاڑ کا پُرانا درخت ـــــ" زیتون کے لہجے پر یک لخت ایسی گرمجوشی آگئی جیسے مدتوں کے بچھڑے رفیق کو دیکھ کر آجاتی ہے" احمد! احمد! وہ اس ڈھلوان پہ اب تک جوں کا توں کھڑا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گذرے وقتوں پہ ماتم کر رہا ہو!"

" ہر چیز پرانی ہو چکی ہے" احمد نے اک گہرا سانس لیکر کہا " اس قبرستان میں صرف ایک چیز زندہ ہے!"

" وہ کیا؟"

زندگی سے بھرپور آواز میں احمد نے آہستہ سے کہا " محبت!"

بڑھیا زیتون مسکرا دی۔ جیسے خزاں کی شام میں آفتاب کی کوئی بھولی بھٹکی کرن بادلوں کو چیرتی ہوئی باہر نکل آتی ہے۔ پھر بولی " تمہاری باتیں کتنی لذیذ ہوتی ہیں!"

احمد نے اپنے بازو پھیلا دئیے بولا۔ "آؤ زیتون۔ ارمانوں کے ان پرانے کھنڈروں میں اپنی روح کے جوان جذبوں کو ڈھونڈیں جن کی شدت ابھی تک زمیں پر کبھی پیدا ہوئے تھے۔ مرا سہارا لو اور ذرا آگے کو بڑھو"۔

اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دئیے ایک دوسرے کے سہارے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھے۔ ان کے نحیف پیکروں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تند آندھی میں دو سوکھے پتے اپنی منزل سے اڑ کر نجانے کسی دشتِ نامعلوم کی طرف رواں ہیں!

چلتے چلتے احمد نے اچانک رک کر کہا۔ "ارے سننا! یہ اس پرانی پن چکی کی آواز تو نہیں جو تم کو بے حد مرغوب تھی ـــــ؟ ادھر نہیں تھی وہ؟"

زیتون بولی۔ "دور تو نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے اسٹیشن سے اتر کر جونہی ہم اس چڑھائی پر چڑھتے تھے تو وہ سامنے نظر آجاتی تھی۔ کوکوکو ـــ اس کی آواز اب تک مرے کانوں میں ہے۔ کیسے کیسے وقتوں میں اس کی کوکو سُنی ہے۔ بہار کی چمکیلی دوپہروں میں۔ خزاں کی ویران شاموں میں۔ اور گرمیوں کی لمبی راتوں میں! یہ تو کسی پرند کی آواز ہے پن چکی اب کہاں ـــ اُف!! ناقابل برداشت ـــ میری پشت میں ٹیس سی اٹھنے لگی۔ نجانے مجھے یہ کیا پراسرار مرض ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی یہاں برچھی کی چبھن سی محسوس ہوتی ہے"۔

اور بوڑھے کی دنیا تاریک ہو گئی۔ وہ گھبرا کر بڑھیا کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیا درد بہت زیادہ ہے؟ کچھ دیر سستا لو زیتون"۔

احمد کی پریشانی پر زیتون کا دل پسیج گیا۔ اس نے درد کو ضبط کر کے موضوع بدل کر کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ ہمارا پرانا ٹھکانا "گلزنگ" کتنی دور رہ ہے؟"

احمد بے تاب سا ہو گیا بولا۔ "ہائے ہائے گلزنگ! یاد ہے اس میں کیسی کیسی شامیں ہم نے گذاری تھیں؟ اس زمانے میں جو اکا دکا مسافر بھی اس دیار میں آنکلتا تھا اس کا واحد ٹھکانا گلزنگ ہی ہوتا تھا۔ دیکھا وہ سفید دیواریں اسی کی تو نہیں؟ مگر یہ تو بہت اونچی عمارت ہے"۔

زیتون بولی۔ "کیا معلوم یہ عمارت گلزنگ کی قبر پر ہی کھڑی ہو؟"

احمد ذرا بے چین ہو گیا جیسے اس دردناک حقیقت سے انکاری ہے بولا۔ "نہیں نہیں ـــــ"

سامنے سے ایک نوجوان شکاری لباس میں ایک سریلا عشقیہ گیت الاپتا ہوا گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا۔

احمد نے آگے بڑھ کر اس نے پوچھا۔ "یہاں گلزنگ نامی ایک چھوٹی سی سرائے تھی، کدھر کو ہے؟"

نوجوان نے گاتے گاتے پلٹ کر ان دو کمزور مسافروں کو بے پروائی سے دیکھا۔ "نام تو بڑا بانکا ہے۔ مگر یہاں اس نام کی سرائے کوئی نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ غزل کا دوسرا مصرعہ الاپتا ہوا آگے کو بڑھ گیا۔

احمد دو قدم آگے کو بھاگا۔ "ذرا رکنا صاحبزادے۔ مگر گلزنگ تو مشہور سرائے ہے۔ آپ یہاں اجنبی تو نہیں؟ پہاڑ کی ڈھلوان کے ختم ہوتے ہی یہاں سامنے نظر آجاتی تھی"۔

نوجوان مشکوک نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "بڑے میاں، خواب تو نہیں دیکھ رہے؟"

احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ "نہیں صاحب۔ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں"۔

"کب کی باتیں کر رہے ہو؟"

"ابھی چند سالوں کی"۔

زیتون نے آگے کو بڑھ کر کہا۔ "شادی کے بعد ہم چند روز اسی سرائے میں رہے تھے"۔

یہ سن کر نوجوان ہنس دیا۔ "ایک صدی پرانی چیز کو آج ڈھونڈنے نکلے ہو ـــــ؟"

اور وہ اپنے گھوڑے پر سوار یوں نکل گیا جیسے وقت گذر جاتا ہے۔

انہیں آج تک اس بات کا کبھی خیال نہ آیا تھا کہ گلزنگ کے رنگین لمحات کو گذرے اتنی مدت ہو چکی ہے جس میں ویرانیاں آبادیاں اور آبادیاں ویرانیاں بن جاتی ہیں۔ انسان کا حافظہ دردناک واقعات کو بہت جلد بھلا دیتا ہے مگر خوشگوار یادوں کے لئے ہمارے حافظے کی سرزمین اتنی زرخیز

ہوتی ہے کہ اس کے لہلہاتے ہوئے باغ کبھی نہیں مرجھاتے۔ اور دراصل انہیں بہاروں کی وجہ سے تو ہماری زندگی خزاؤں میں سے سلامتی سے گذرجاتی ہے!
اچانک ایک ابابیل آہیں بھرتی ہوئی ان کے سروں پر سے اڑکر شفق زاروں پر جاکر غائب ہوگئی ـــــ اور ایک خشک پتا درخت سے ٹوٹ کر ان دونوں کے سامنے آگرا۔ راستہ اور بھی ویران معلوم ہونے لگا ـــــ

نوجوان کے جانے کے بعد دونوں تھوڑی دیر چپ کھڑے رہے۔ خیالات میں گم اور جذباتی تلاطم میں گرفتار۔ جس زمانے کو وہ حال کی بات سمجھتے تھے اسے گئے نصف صدی گذر چکی تھی! وقت کے پر نہیں ہوتے پھر بھی وہ کس تیزی سے پرواز کرجاتا ہے ـــــ!!
پھر نحیف آواز میں زیتون بولی: "ممکن ہے اس نوجوان کو گلرنگ کے متعلق معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہے ویسے یہ بڑا بدتہذیب اور سرکش بھی معلوم ہوتا تھا"
بڑھیا کے بڑھتے ہوئے غم واندوہ کو محسوس کرتے ہوئے بوڑھے نے اسے بہلانا شروع کردیا: "یاد نہیں کسی زمانے میں میں کتنا سرکش ہوتا تھا، تم بے حد خائف رہتی تھیں"

زیتون کے خشک ہونٹوں میں اک لرزش سی پیدا ہوئی: "وہ اور بات تھی۔ تمہاری سرکشی اور بیباکی میں بھی نیازمندی اور لگاؤ کا ایک پہلو جھلکتا تھا!"
احمد کو غمگین بڑھیا کے خیال بٹانے کا ایک راستہ مل گیا، بولا: "تم بھی تو کچھ کم نہ تھیں۔ یاد ہے ہماری پہلی ملاقات؟ تم اور تمہاری سہیلی عائشہ کوہ مشو سے آرہی تھیں۔ اتفاق سے میں بھی اسی ٹرین میں سوار تھا۔ اور تمہیں یاد ہے ٹرین کس تیزی سے اڑی جارہی تھی؟"
"ہاں ـــ شاید وقت کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ـــــ"
" اور سفر کے ختم ہوتے ہی گاڑی سے اترنے کے چند منٹوں بعد یوں کہو زبردستی میں نے اپنا تعارف آپ کرا لیا تھا۔ تمہاری شوخ ادائیں اور معصوم حرکات مجھے مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھیں۔ زندگی کے اس یادگار سفر کا وہ دلچسپ واقعہ مجھے اب تک یوں یاد ہے جیسے کل کی بات ہو"
زیتون بے چین ہو کر بولی: "کل ہی کی تو بات ہے! وہ برسات کی گیلی شام تھی اور اب تک گیلی مٹی کی مندار خوشبو مری ناک میں بسی ہوئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے یہ پچھلی برساتوں کی بات ہے۔ میں اور عائشہ مدرسے سے تین مہینوں کی چھٹی ملنے پر واپس آرہی تھیں۔ راستہ میں پالگول کا اسٹیشن آتا تھا۔ یہاں عائشہ کی ایک خالہ زاد بہن رہتی تھی جس نے خاندان کی مرضی کے خلاف عشقیہ شادی کی تھی۔ اور ہم دونوں دو دن کے لئے اس سے ملنے آئی تھیں اور سب ہمیں منع کر رہے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں عشقیہ شادیاں معیوب سمجھی جاتی تھیں"
"عشقیہ شادیاں ہر زمانے میں معیوب سمجھی جاتی رہی ہیں۔ دراصل لوگ عاشق و معشوق سے جلتے ہیں۔ یاد نہیں ہمارے بزرگ ہم سے کیسے خفا ہوگئے تھے؟"
احمد نے ماضی کو گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
زیتون بولی: "جوانی میں آدمی عشقیہ شادی کا مخالف نہیں ہوتا۔ اسی لئے تو عائشہ کی خالہ زاد بہن ہمیں اچھی لگتی تھی اور ہم سب کی رائے کے خلاف اس سے ملنے آئے تھے۔ دل میں خود اعتمادی کا ایک ولولہ تھا اور ذہن میں بغاوت کی ایک چنگاری سلگ رہی تھی۔ ہائے۔ کیا طوفان خیز زمانہ تھا! زندگی ایک اُبلنے والے چشمے کی طرح تھی جس میں سے صرف فرحت وانبساط ہی کے فوارے چھوٹ سکتے تھے! ـــــ" یہ کہہ کر زیتون کچھ اداس ہوگئی۔ شاید بیتے دنوں کی یاد نے اس کے دل میں برچھی چبھو دی یا شاید اندرونی مرض کی خطرناک ٹیس نے اسے بے چین کردیا۔
احمد کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ افسردہ ہو کر زیتون کے تغیر کو دیکھنے لگا۔ جس نامراد مرض میں اس کی رفیقۂ حیات مبتلا تھی اس کے خیال ہی سے اس کی روح لرز جاتی تھی۔ اس خوفناک حقیقت سے فرار کی ایک ہی راہ کھلی ہوئی تھی ـــ ماضی کی خوشگوار یاد ـــــ چنانچہ احمد نے دلداری کے لہجے میں کہنا شروع کیا: "اور وہ شام بھی عجیب شام تھی زیتون۔ ٹرین پہاڑ کے دامنوں میں سے بل کھاتی ہوئی بھاگی جارہی تھی۔ زمین۔ آسمان۔ درخت۔ پہاڑ غرض پوری کائنات پر ایک آسمانی نور برس رہا تھا۔ تمہیں یاد ہے؟"
زیتون سر ہلا کر درد انگیز آواز میں بولی: "اچھی طرح! چشم زدن میں یہاں کا اسٹیشن آگیا تھا۔ یہی پالگول کا اسٹیشن جسے آج ہم پہچان بھی نہ سکے تھے۔ اس کا تو اب حلیہ ہی بدل گیا ہے احمد!"
" اور ذرا دیکھو تو میری بدحواسی" احمد بولا: "آج گاڑی سے اترتے ہی میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا تھا کیسے ہوا یا س؟ ـــــ تو مجھے اس نے

ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی کسی اندھے کو رحم کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ پالکول کے اسٹیشن پر سوائے الیاس کے اور کوئی اسٹیشن ماسٹر ہو ہی نہیں سکتا۔ یاد نہیں وہ تھلے سے جسم کا موٹا اسٹیشن ماسٹر؟ جو بعد میں ہماری محبت کے سلسلے میں ہم سے متنفر اور بدگمان سا ہونے لگا تھا؟"

"ہاں ہاں —— وہی تھا؟"

"نہیں —— جانے وہ اب کہاں ہوگا"

زیتون یک لخت مسکرانے لگی، "مگر تھا بڑے مزے کا آدمی۔ اس زمانے میں میں اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ کیونکہ پہلے ہی دن سے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ جس شام ہماری ٹرین یہاں پہونچی ہے میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ میں اور عائشہ گاڑی سے اتر کر پریشان کھڑی تھیں کیونکہ ہمیں کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ اور آتا بھی کون! عائشہ کی خالہ زاد بہن کو علم نہ تھا کہ ہم اس سے ملنے آ رہی ہیں۔ عائشہ کا وہ پریشان لہجہ مجھے آج تک یاد ہے کہنے لگی "ا ب کیا ہوگا! گھر کیونکر پہونچیں گے۔ یہاں تو کوئی کرائے کی گاڑی واڑی بھی نہیں"!

بڑی دیر سے دُور پرے ایک گوشے میں الیاس کھڑا ہمیں اشتیاق سے دیکھ رہا تھا عائشہ کا فقرہ سنتا تھا کہ اپنی توند لئے خراماں خراماں مسکراتا ہوا ہماری طرف آن نکلا اور مسکرا کر بولا، "حسین لڑکیوں کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہیئے"!

یہ سُن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں نے جھٹ سے کہہ دیا "جناب! آپ ہمیں ہمارے حالوں پر چھوڑ دیجئے اور اپنی توند لیکر واپس تشریف لیجائیے"

بوڑھا زور سے ہنس پڑا، "میں نے کیا کہا تھا؟ تم تھیں بڑی تیز۔ پھر کیا ہوا؟"

زیتون بولی "وہ قہر آلود نظروں سے ہمیں دیکھتا ہوا چلا گیا مگر عائشہ فکر مند ہو گئی کہ نجانے اب کیا فساد کھڑا ہو چنانچہ اسے تسلی دینے کے لئے میں نے کہا وہ دیکھو ایک بیل گاڑی کھڑی ہے اس پر اناج کی بوریاں لد رہی ہیں۔ اسی پر نہ بیٹھ جائیں ہم؟"

اس پر عائشہ نے سر اٹھا کر دیہاتی وضع کی گاڑی کو دیکھا اور پریشان لہجہ میں بولی تھی، "اس پر چڑھنے کے لئے تو سیڑھی چاہیئے۔ تم نے خواہ مخواہ اسٹیشن ماسٹر کو بھی ناراض کر دیا"

میں بقول تمہارے تیز تھی ہی —— جل کر بولی، "تو کیا تمہارا ارادہ اس کے کندھے کو سیڑھی بنا کر اوپر چڑھنے کا تھا؟"

احمد انتہائی دلچسپی سے پوچھنے لگا "پھر؟ تم دونوں نے کیا کیا؟"

میں نے فوراً ایک تجویز پیش کر دی کہ پہیئے پر پاؤں رکھ کر پہلے میں اوپر چڑھوں گی پھر عائشہ کو کھینچ لوں گی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں چھلانگیں لگا لگا کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ وہ اسٹیشن ماسٹر الیاس میری جھڑکی کھانے کے بعد کھسیانی بلی کی طرح دور کھڑا ہماری حرکات کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بے صبری سے ہماری طرف آ نکلا، اور رعب دار آواز میں پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں کب دبنے والی تھی؟ بے پروائی سے بولی، "دیکھ نہیں رہے؟"

وہ غصے سے بولا "میں پوچھتا ہوں ارادہ کیا ہے؟"

"ارادہ؟ —— اس پر چڑھ کر گھر پہونچنے کا ارادہ ہے۔ اور کیا ارادہ ہوتا؟" میں چھلانگ لگاتے لگاتے بولی؟

احمد بے اختیار مسکرانے لگا بولا، "مجھے معلوم ہے تم کافر ادا تھیں۔ اس وقت تک میں تم لوگوں کے درمیان پہونچا نہ تھا۔ اچھا تو پھر میاں الیاس کیا بولے؟"

زیتون کہنے لگی، "بولتے کیا۔ پیچ و تاب کھاتے رہے۔ پھر فرمایا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اناج کا ناس ہو جائے گا"

"ہمارے بیٹھنے سے؟" عائشہ نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

اور میں نے چیخ کر کہا تھا "ہمیں جگہ ہی کتنی چاہیئے؟" وہ انتقام پر آمادہ تھا ہی۔ چڑ کر بولا، "دو بوریوں کی جگہ تم دونوں لے لو گی ——"

بوڑھا احمد ایک تو اس قصۂ پارینہ میں خود دلچسپی لے رہا تھا دوسرے وہ چاہتا تھا کہ بڑھیا کچھ دیر اور اپنی بیٹھ کے درد اور منزل کی دُوری کو

بھول کر اُن ہی باتوں میں کھوئی رہے۔ اس نے سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے کہا: "تم حاضر دماغ تو ہمیشہ کی ہو۔ پھر کیا ہوا؟"

بڑھیا بولی: "میں نے اسے ڈانٹ کر کہا: کم بخت" اتنے میں اچانک کسی نے پیچھے سے ایک لمبی سیٹی بجائی۔ میں اور عائشہ گھبرا کر دیکھنے لگیں تو ــــ

احمد زور سے ہنس پڑا: "اور وہ میں تھا! ــــ ہیں نا؟"

"اور کون ہو سکتا تھا! تم بڑے بانکے سجیلے تھے۔ میں تمہیں دیکھ کر حیران ــــ"

بوڑھے نے لطف اندوزی کے لہجے میں کہا: "کیوں نہیں کہتیں کہ پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئی تھیں ــــ"

"خیر ــ یوں تو نہیں ہوا تھا۔ یہ بعد کی بات ہے ــــ" بی زیتون نے ناز سے کہا۔

"مگر مجھے اپنی شکست کے اعتراف میں کوئی عذر نہیں ــــ میں تو تمہیں دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا تھا۔ اس زمانے میں میں شاعری پر ایک بسیط مضمون لکھ رہا تھا۔ اس لئے مری زبان پر ان دنوں غزل کا بڑا اثر تھا۔ تمہیں دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا تھا" وہ جانِ بہار آ ہی گیا"

بی زیتون مسکرا کر بولیں: "مجھے یاد ہے اس کے بعد تم نے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے نہایت بیباکی سے ایا اس سے سوال کیا تھا یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ــــ تمہیں دیکھ کر وہ موٹا گستاخ کسی قدر پیچھے کو ہٹ گیا تھا اور ہم دونوں کسی قدر آگے کو بڑھ گئی تھیں۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا "یہاں کھانے کی کوئی چیز مل جائے گی؟"

احمد نے مسکرا کر کہا: "اور میں نے جواب دیا تھا ــــ کیوں نہیں۔ جہاں انسان ہو گا وہاں کھانے کی چیز بھی ہو گی"

"اور پھر تم ہم دونوں کو ایک کرائے کی گاڑی پر سوار کرا کے گھر تک لے گئے تھے۔ ہائے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے احمد"

بڑھیا گویا تو ں میں لگنے کی کوشش کرتے کرتے بوڑھا واقعی عمر میں آ گیا تھا: "اور تمہیں یاد ہے زیتون۔ جب گاڑی میں عائشہ اتفاق سے مرے پہلو میں بیٹھ گئی تھی تو تم نے اس کے بازو میں چپکے سے ایک چٹکی بھری تھی ــــ! تم میں رقابت کا جذبہ شدید تھا۔ تم عائشہ کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی تھیں۔ تمہیں شبہ تھا کہ میری توجہ اس کی طرف ہے"

بی زیتون نے نظر اٹھا کر اپنے پچاس سال پہلے کے عاشق کی طرف دیکھا: "سچ بتاؤ۔ تمہیں اس سے دلچسپی نہیں تھی؟"

احمد ہنس پڑا: "محض اس غلط فہمی کے باعث تمہیں عائشہ سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو گئی اور وہ تمہیں بری لگتی رہی"

زیتون آہ بھر کے بولی: "اور اب وہ بچاری بیوہ ہسپتال میں پڑی اپنی عمر کے آخری ایام پورے کر رہی ہے! مرا دل اس کی طرف سے صاف ہے"

احمد بولا: "مگر جب تک وہ تندرست رہی تم کبھی صاف دلی سے اس سے نہ مل سکیں"

زیتون ذرا ناگواری کے لہجے میں بولی: "محض اس لئے کہ میرے بار بار پوچھنے پر بھی تم نے اس بات کا اقرار کبھی نہ کیا کہ تمہارے دل میں عائشہ کے لئے محبت نہیں ہے" اور اس کے چہرے کی ویران جھریوں میں غم و غصے کا ارتعاش بجلی کی طرح کوند گیا۔

دونوں آگے بڑھ گئے۔ مگر دونوں ہی کے دل کی دھڑکن میں قصۂ پارینہ نئے سرے سے دھڑکنے لگا تھا ــــ وہ سرخ چہرے اور سیاہ زلفوں والی لڑکی عائشہ ــــ اس سے زیتون کو جتنی محبت تھی اس سے کہیں زیادہ نفرت تھی۔ کبھی کبھی زیتون کا جی چاہتا تھا عائشہ کسی وبا میں مبتلا ہو کر اس جہان سے گذر جائے۔ کیونکہ عائشہ اس کی دنیائے محبت میں ایک چھوٹی سی چٹان کی مثال تھی جس سے اس کی کشتی کو ہر وقت ٹکرا کر پاش پاش ہونے کا خطرہ لگا رہتا تھا!

کچھ دیر دونوں چپ چاپ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ ہواؤں میں سوسن کی کلیوں کی مہک پریشاں تھی اور شام گہری ہوتی جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد زیتون نے پژمردہ سے لہجے میں کہا: "نجانے عائشہ اب کیسی ہے؟"

احمد گفتگو کا سلسلہ دوبارہ چھڑنے پر ذرا مطمئن ہو کر بولا: "پچھلے دنوں اطلاع ملی تھی کہ اسے ہسپتال سے واپس لایا گیا ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بیٹے کی بدسلوکیوں سے تنگ آ گئی ہے اور کسی دارالاماں میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ کیا کرے بچاری ــــ"

"نجانے قصور کس کا ہے۔ ماں کا یا بیٹے کا؟"

"ایسے معاملات میں کسی کا قصور نہیں ہوتا۔ یہ وقت کا قصور ہے کہ وہ کیوں آدمی کو ناکارہ کر کے اتنی جلدی گذر جاتا ہے ——" اور باوجود انتہائی ضبط کی کوشش کے احمد آہ بھرے بغیر نہ رہ سکا۔

زیتون بولی "بیٹے کے ہوتے ہوئے ماں کا کسی دارالاماں میں داخل ہونا ستم ہے"

نجانے کیوں —— یہ سن کر احمد کو ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ اس نے ذرا تامل کر کے کہا۔ "اس میں ہرج کیا ہے زیتون؟" اور وہ اداس ہو گیا۔ زیتون حیران ہو کر بولی، "یہ کیسی باتیں کرتے ہو احمد۔ بھلا کون ماں بیٹے کو رکھتے ہوئے کسی خیراتی دارالاماں میں رہنا پسند کرے گی؟ خدا کا شکر ہے۔ ہمارا کوئی سوتیلا بیٹا نہیں، اور ہمارا فرخ کتنا محبت شعار لڑکا ہے!؟

"بہت ——" اور احمد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی چال میں اب تکان کا اظہار ہونے لگا۔ وہ تمام زندگی حقیقت پسند رہا۔ مگر عمر کی اس آخری منزل پر پہونچ کر حقیقت اس کے لئے ایک خوفناک درندے کی شکل اختیار کر گئی تھی اور وہ اکثر اسے چھوڑ کر اور اس سے منہ موڑ کر ماضی کی خواب ناک آغوش میں جا گرتا تھا۔ لہٰذا جب اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو کنوئیں کی بیری اسے ماضی میں گھسیٹ لے گئی اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا "امجد!"

زیتون بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سامنے کنوئیں کے پاس بیری کی جھاڑیوں تلے ایک دس بارہ سال کا لڑکا جھک جھک کر بیر چن رہا تھا۔ "پاگل ہو گئے ہو؟ کس امجد کو پکار رہے ہو؟"

احمد چونک سا پڑا اور اشرمندہ ہو کر بولا۔ "میں سچ مچ سودائی ہوں —— اس لڑکے کی سرخ دھاری دار واسکٹ کو دیکھ کر یکلخت مجھے امجد کا دھوکا ہو گیا تھا۔ نجانے کیسے! اس کی وہ سرخ واسکٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ ہم دونوں مدرسے سے چھٹی پاتے ہی کنوئیں کی بیری تلے پہونچ جاتے۔ اور گرمیوں کی تمام دوپہر اسی شغل میں لگے رہتے۔ بالکل اسی طرح —— جیسے یہ لڑکا جھک جھک کر چن رہا ہے۔ ہماری مائیں گھر پر ہمارا انتظار کیا کرتی تھیں اور سخت ناراض ہوتی تھیں۔ مگر کیا وقت تھا اور کیا ولولے —— ہم پر کسی کی ناراضی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ امجد کو آج اس دنیا سے رخصت ہوئے پندرہ سال گذر گئے ہیں۔ وہ اپنی ملازمت کی مدت ختم کر کے اور پنشن لے کر آرہا تھا ریل کے حادثے میں —— مگر نصف صدی گذرنے کے بعد بھی آج میرے تصور میں امجد وہی دس بارہ سال کا بے فکر لڑکا رہ گیا ہے۔ اس کمسن لڑکے کو بیری تلے دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے وہی زمانہ ہے، اور وہی ہماری عمریں —— اور گھروں میں ہماری مائیں ہماری راہ تک رہی ہیں —— میاں لڑکے! ادھر تو آنا ——"

بیری تلے کے لڑکے نے سر اٹھا کر بوڑھے کو حیرانی سے دیکھا۔

احمد نے دلچسپی سے پوچھا "کیا کر رہے ہو بیٹے؟ کہاں سے آرہے ہو؟"

"اپنے دوست کے گھر سے" لڑکے نے جواب دیا "ارے دیکھا تم نے زیتون؟ ——" احمد نے بشاشت سے کہا؛ "سچ ہے۔ اس رستے پر سے ایک امجد گذر جاتا ہے تو دوسرا نمودار ہو جاتا ہے۔ زندگی کی پگڈنڈیاں کبھی خالی نہیں ہوتیں۔" "اچھا۔ تو دوست کے گھر سے آرہے ہو! —— ٹھیک بیٹے۔ گھر پر تمہاری اماں تمہاری راہ تک رہی ہوں گی؟"

"وہ تو ہمیشہ ہی راہ تکتی رہیں گی؟" لڑکے نے کہا۔

احمد کے چہرے پر یکلخت ایک بادل سا آگیا۔ "نہیں بیٹے۔ یہاں تم غلطی پر ہو۔ وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہہ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ تمہارا انتظار نہیں کریں گی؟"

لڑکا حیران ہو کر احمد کو دیکھنے لگا۔ پھر اپنے کام میں محو ہو گیا۔ اسے زندگی کے فلسفے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شاید وہ بوڑھے کو سودائی سمجھ رہا تھا۔ اب سورج دھان کے کھیتوں پر دم توڑنے لگا تھا۔ درختوں پر ایک المناک سی اداسی مسلط ہوتی جاتی تھی اور راستے شام کے دھندلکے میں مدھم اور افسردہ نظر آنے لگے تھے۔ اب وہ دونوں بھی تھک گئے تھے۔ فرخ کی تلاش بے سود تھی۔ اس کی عادت بھی مدھم پڑتے پڑتے ماضی کے

سایوں میں جا چھپی تھی۔ لہٰذا دونوں نے ایک ایسی جگہ رات بسر کرنے کی ٹھانی جو ان لوگوں کے لئے اجنبی تو تھی مگر اتنی سستی کہ اس کا خرچ وہ برداشت کر سکتے تھے۔

رات کا کھانا دونوں نے اس چھوٹی سی سرائے کے ویران صحن میں چُپ چاپ کھایا۔

بہار کی رات تھی، مگر سخت تاریک! شاید آخری تاریخوں کا چاند نکلنے والا تھا۔ مگر چاند کا انتظار کون کرتا۔ ان کے سامنے تو رات کا اندھیرا تھا۔ کھانے کے بعد دونوں دیر تک بیٹھے، رات کی غمناک سیاہی کو تکتے رہے۔ بوڑھا احمد برابر کوشش کرتا رہا کہ زیتون باتوں میں لگی رہے۔ لیکن اپنی کوشش میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ رات کی تاریکی ایک بوجھ بن کر اس کی روح پر بیٹھتی جا رہی تھی۔ بار بار سکوت طاری ہو جاتا تھا۔ بہار کے عطر بیز جھونکے ان کے چاندی کے سے سفید بالوں کو لہراتے ہوئے نکل جاتے تھے اور زندگی کے ساحل پر کسی قسم کا کوئی طوفان نہ تھا۔

نصف شب گذرنے پر زیتون نے کہا: "اب چل کر سو رہیں۔ ڈاکٹر نے آرام کی تاکید کی تھی۔ ڈرتی ہوں درد کا دورہ نہ پڑے؟"

"ہاں چلو — تم سو رہو۔ مجھے ابھی ایک خط بھی لکھنا ہے۔"

"اتنی رات گئے؟"

"ہاں۔ شاید پھر موقع نہ ملے۔ فرخ کے خط کا جواب لکھ دینا چاہتا ہوں۔"

کمرے میں پہنچ کر زیتون نے کہا: "فرخ کو لکھ دینا کہ جونہی کچھ افاقے کی صورت نظر آئے گی میں اس کے پاس چلی آؤں گی۔ وہ فکر نہ کرے۔"

"بہت اچھا —"

زیتون بستر پر لیٹ گئی۔ اور جلدی ہی غافل ہو گئی۔

اس کے سونے کے بعد احمد لکھنے کی میز پر جا بیٹھا۔ آنکھوں پر چشمہ لگایا۔ اور کاغذ سامنے رکھ کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ دو دفعہ اس نے لکھنے کی ناکام کوشش کی۔

آخر تیسری دفعہ لکھنے لگا:

"میرے پیارے بیٹے فرخ —

میں اور تمہاری والدہ پینتالیس سال بعد آج ایک ایسے مقام پر لوٹ آئے ہیں جہاں ہم نے اپنی زندگی کا بہترین اور رنگین زمانہ گزارا تھا۔ اس وقت اس دنیا میں تمہارا تو وجود بھی نہ تھا۔ لیکن تمہاری تمنا ہمارے دلوں میں اس وقت بھی دھڑک رہی تھی!

یہاں کی تو اب دنیا ہی بدل چکی ہے نہ وہ لوگ رہے نہ وہ پرانی صورتیں۔ گلیاں، سڑکیں اور گھر عمارت بن چکے ہیں۔ جہاں کھیت تھے وہاں کارخانے ہیں اور جہاں درخت تھے وہاں دکانیں — تمہاری والدہ کی اور میری نظریں آج کے نئے ماحول میں پچاس سال پرانے ماضی کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ آج شام جب ہم یہاں پہنچے تو سورج ابھی ڈوبا نہ تھا۔ وہ عہدِ گزشتہ کی طرح ایک مسجد کے میناروں پر غروب ہو رہا تھا جس نے ہماری جوانی کے ایام دیکھے تھے۔ مگر میرا دل پوچھ رہا تھا — کیا یہ وہی سورج ہے، وہی پرانا سورج! — سالہا سال بعد آج وہ تھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس پر سے بھی جوانی کی بہاریں بیت چکی ہوں۔

نجانے میں اپنے جنون میں کیا کچھ لکھ گیا ہوں۔ مجھے لکھنا تو صرف اتنا تھا کہ اپنے پچھلے خط میں تم نے اپنی جن الجھنوں کا ذکر کیا ہے اب ان کی فکر نہ کرو۔ تم نے ٹھیک لکھا کہ تمہارا گھر مختصر ہے اور اس میں کوئی فالتو کمرہ موجود نہیں۔ آجکل کے گھر واقعی بہت مختصر ہو گئے ہیں — کوئی مہمان دو دن کے لئے بھی آ جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سر پر پہاڑ آن ٹوٹا۔ پھر ہم لوگ تو کبھی دو دن کے لئے نہ رہے تھے۔ پانچ سات مہینوں کے لئے بیٹھ رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ آجکل کے مختصر گھر اور مصروف زندگی میں کسی کے لئے جگہ مہیا کرنا آسان بات نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ شائستہ کے ہاں بچہ بھی ہونے والا ہو۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو جائے۔ تمہاری والدہ کی خواہش ہے کہ پیدائش کے بعد تم اپنی اور اپنے دونوں بچوں اور دلہن کی ایک تصویر ہمارے دیکھنے کے لئے ضرور بھیجو۔ کیونکہ پھر نجانے کب ملنا ہو۔ تمہارا خط میں اب تک تمہاری والدہ کو نہ دکھا سکا۔

۱۰ لو، کراچی، ستمبر ۱۹۵۷ء

جس دن خط پہونچا وہ درد سے بیتاب تھیں۔ پھر جب ذرا طبیعت سنبھلی تو انہیں بہلانے کے لئے یہاں لے آیا۔ ویسے وہ ہر روز تمہارے خط کا انتظار کرتی ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ قلم پکڑنے کے ناقابل ہو گیا ہے ورنہ اب تک وہ تمہیں لکھ چکی ہوتیں۔ ارادہ ہے آج رات کسی وقت تمہارا خط پڑھ کر انہیں سنا دوں۔

تمہارا خط پڑھ کر اب مجھے خیال آتا ہے کہ اگر ہم تمہارے ہاں رہنے کو آتے تو تمہارے اخراجات بھی بہت بڑھ جاتے۔ آجکل تمہیں کفایت شعاری سے بسر کرنے کی ضرورت ہے۔ آنے والے معصوم کے لئے تمہیں کئی چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ آج کی مہنگائی کو دیکھتے ہوئے ویسے تو میں اور تمہاری والدہ تمہارے ہاں یوں بھی نہ رہتے۔ اپنے مقدور کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور کسی صورت میں پیش کر دیتے۔ مگر اچھا ہی ہوا کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ورنہ تمہاری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا اور تمہیں دکھ پہونچتا۔

بیٹے! ایک بات میں تمہیں لکھ دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا گذشتہ چار مہینے سے تمہاری والدہ کی پشت میں درد رہتا تھا جو صبح کے وقت تیز ہو جایا کرتا تھا۔ دو ہفتے ہوئے میں انہیں ایک ڈاکٹر کے لے گیا تھا۔ اس نے ایک بہت ناخوشگوار خبر سنائی اور اس ناخوشگواری کے انکشاف کے انعام میں تینتیس ۳۲ روپے فیس کے بھی لئے۔ اس کا خیال ہے کہ تمہاری والدہ کو سرطان کا مرض ہو گیا ہے اور وہ چند مہینوں سے زیادہ نہ جی سکیں گی۔ مجھے اطمینان اس بات کا ہے کہ میں تھرمبوسیس کا مریض ہوں، شاید یہ صدمہ دیکھنے سے بچ جاؤں۔ دراصل اسی لئے میں چاہتا تھا کہ کچھ عرصہ ہم تمہارے ساتھ رہ لیں۔ مگر ہمیں اس بات کا بالکل ہی خیال نہ رہا تھا کہ نئے گھروں میں میاں بیوی کے علاوہ اور کسی کے رہنے کی گنجائش نکالنا ناممکن ہے۔

تم جانتے ہو میں دل کا مریض ہوں۔ جب سے تمہاری والدہ کے لاعلاج مرض کا علم ہوا ہے اس کی دھڑکنوں میں فتور محسوس کر رہا ہوں۔ اسی لئے ہم دونوں یہ آخری بہاریں اس مقام پر بسر کرنے آ گئے ہیں جہاں ہماری زندگی کی ابتدائی بہاریں گذری تھیں ——! اس بات کا علم ہم میں سے کسی کو نہیں کہ پہلے تمہاری والدہ کو جانا پڑے گا یا مجھے! مگر میں نے اس کا بھی ایک مناسب حل سوچ لیا ہے۔ اگر پہلے مجھے بلاوا آ گیا تو تمہاری والدہ یہاں کے نرسنگ ہوم میں داخل ہو جائیں گی جو اس قسم کے مریضوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور اگر وہ مجھے تنہا چھوڑ گئیں تو میں دارالاماں میں، جو شکستہ دل ضعیفوں کے لئے مخصوص ہے، بخوشی داخل ہو جاؤں گا۔ وہاں پہلے سے میرے کئی دوست موجود ہیں۔ کیونکہ ان کے گھروں میں بھی رہنے کے لئے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

تم اطمینان رکھو۔ تمہارے خط سے نہ تمہاری والدہ کو کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے نہ مجھے۔ والدین کا کام سمجھنا ہوتا ہے نہ کہ شکایت کرنا۔ نئی کلیاں نکل آتی ہیں تو سوکھے پتے شاخ سے گر پڑتے ہیں۔ جب ہم گھر سے چلے تھے تو موسم خوشگوار تھا تاہم میں نے احتیاطاً تمہاری والدہ کا پرانا کوٹ مرمت کرا لیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ان کا فاختائی رنگ کا کوٹ۔ اس کی آستینوں کو کیڑے نے چاٹ لیا تھا۔ لیکن مرمت کے بعد اب وہ یوں لگتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو دو ڈھائی سال اور کام دے جائے گا۔ ڈھائی روپے اس کی مرمت میں لگے۔ میرا ارادہ تو ایک نئی شال اُن کے لئے خریدنے کا تھا مگر اپنی صحت کی ناپائداری کو دیکھ کر انہوں نے منع کر دیا اور یہ چند روپے بچا کر تمہارے پردینی کی سالگرہ کے لئے ایک ٹرائسکل تحفے کے طور پر خریدنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ مگر چونکہ اب ہمارا آنا رہ گیا ہے اس لئے وہ اس مبارک موقع پر روپے بھیج رہی ہیں۔ ننھے پردینی کی سالگرہ میں ابھی پانچ چھ مہینے اور باقی ہیں۔ مگر ہمارا اسپ حیات کچھ اس قدر تیز رفتار ہو گیا ہے کہ شاید سالگرہ کے دن سے پہلے ہی اُفقِ حیات کو پھلانگ جائے!

خط طویل ہوتا چلا گیا —— مگر شاید پھر مجھے موقع نہ ملے اس لئے اس کی طوالت کا مجھے یا تمہیں خیال نہ کرنا چاہئے۔ تمہارے خط میں دو ایک باتیں اور رہ گئی ہیں جن کا جواب لکھے دیتا ہوں۔

تم نے ٹھیک لکھا کہ کسبِ معاش کی اُلجھنیں اس قدر شدید ہو گئی ہیں کہ کسی دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کا خیال بھی فرصت کا طلب گار ہوتا ہے۔ واقعی زمانے کے طور طریق بدل چکے ہیں اور زندگی ایک باقاعدہ مشقت بن کر رہ گئی ہے۔ مگر بیٹے اس سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ زندگی کے بکھیڑے اور الجھنیں انسان کے ساتھ ہمیشہ سے یوں ہی رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ آج کے انسان میں ان کو سہنے کی طاقت گھٹتی جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے یہ سب آجکل کی کلوں اور مشینوں کی مہربانی ہے پہلے کا انسان جسمانی محنت کی وجہ سے تھکا ضرور رہتا تھا کیونکہ اسے مشینوں کی بجائے اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کرنا پڑتا تھا مگر اس پر ذہنی اضمحلال کے دورے نہیں پڑتے تھے۔ اس کا ذہن تر و تازہ رہتا تھا اور زندگی کی آندھیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا تھا۔ خط

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

ماہ نو، کراچی ستمبر ۱۹۵۷ء

افسانہ:

"فاختہ"

واجدہ تبسم

مینا ابھی ابھی بستر پر سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جھلس رہا تھا۔ سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی اس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا۔ اور پورا بستر بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

شبیر میاں جوتے اتار کر بستر پر بیٹھنے لگے تو اکدم انہیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اسے بڑا نرم نرم گرم گرم سا پایا۔ جیسے فاختہ کے پر۔

"سوں" کر کے انہوں نے زور سے سانس لی۔ اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک اتر گئی۔ اکدم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گذری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور پھٹے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اٹھ گئے۔ منی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا:

"اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

منی بھاگتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹاتی ہوئی بولی:

"ہمیں بلایا ابا میاں"؟؟

"بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں۔"؟ انہوں نے حد درجہ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا"۔ اور انہوں نے ارشد کو پکارا۔ "واہ جی۔ ہم تو ایک ساں منی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ہم نے تھوڑے ہی دھرے ہیں گندے پیر آپ کے بستر پر۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں۔"؟

بشیر میاں سُن ہو گئے۔ بستر پر مچلتی ہوئی خوشبو نے انہیں آپ ہی بتا دیا تھا "میں مینا کے پاس سے آئی ہوں"۔!

انہیں یاد آیا ممانی بی سدا مینا کے لئے چکی میں خوشبودار مصالحے پسوایا کرتی تھیں۔ اور مینا ہمیشہ سے صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلنے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بڑی باریک سی۔ ملائم سی میٹھی آواز آئی:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے"۔

آج شبیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی۔ لہجہ بالکل نیا لگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے الجھتے رہے۔ "اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔" ممانی بی مینا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بیٹا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگایا کرتے ہیں۔" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا مینا کی زبان ہکلا گئی۔

شبیر میاں ممانی بی کے سگوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دوہرا رشتہ ہو گیا۔ بھانجے لگتے تھے اور ممانی بی ممانی بی کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کام ہو کوئی کاج ہر کام میں بشیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے۔ بشیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی سی چیز پکی۔ رکابیوں میں لگا، سرپوش ڈھک، جھٹ سے نصیبن بوا کے حوالے کشتی کی کہ "جا جلدی سے شبیر میاں کے ہاں پہونچا آ۔"

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہوگی۔ اور جب سے تو ان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا، یہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہیں آ بسے تھے۔ ممانی بی کے ہی پڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا۔ وہیں رہتے۔ شادی شدہ تھے۔ شریف خاندانی بیوی تھی۔ دو بچے۔ مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پاتیں تو رفیعہ بیگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی بی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملتے کیا دیر لگتی ہے۔ ؟ یہ تیئیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولھویں سترھویں میں ہی تھی۔ پھر بھی دونوں ایسے گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے میٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا تو انہی کی کوششوں سے بیچ "نہ" ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی کہتی ہیں:

"نا بی۔ اچھا کماؤ لڑکا ہے۔ گن کا ڈھنگ کا۔ اب اور کیا دیکھیں گے۔"؟ مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں۔ ممانی بی نے کہا بھی۔

"اے تم ایسی جنم جنم کی دشمن کاہے سے ہوگئی ہو لڑکی کی۔ کہ منہ توڑا انکار کئے جاتی ہو۔" ہنس کے بولیں۔ "اے ممانی بی ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں مجبور کریں ہمیں۔"

اصل میں مینا کی مرضی نہ تھی۔ کیوں نہیں تھی؟ بس نہیں تھی۔ اڑتے اڑتے اتنا ضرور سنا تھا کہ صاحبزادے ذرا رنگین مزاج ہیں۔ ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے صاف "نہیں" سن سکتیں۔ اس لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنا دی۔ ممانی بی بھی کھٹک گئیں سوچا "اپنی طرف سے تو یہ زور زبردستی سے کہہ نہیں سکتی۔ ہوگی دونوں کی ملی بھگت۔" خاموش رہ گئیں۔

ویسے سچ بات تو یہ بھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں۔ انہوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرا دی تھیں۔ "عصمت" تو خیر بہت زمانے سے آتا تھا۔ اب تو رسالوں کی دور بندھ گئی تھی۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سنا اور مینا نے چندہ بھیجا۔ اتنا یقین تو انہیں ٹھیک ضرور تھا کہ اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر مینا نے نہیں پڑھیں مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی کہ ایک مضمون لکھ ڈالا۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی کیا کرے۔ وہ چھپ بھی گیا۔ سارے خاندان میں وہ لے دے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی نہ بن پڑ سکا۔ پانی ایک ہی بار زور توڑ کے راہ بنائے تو پھر تو سبھی جگہ سے بہنا چلا جاتا ہے۔ پہلی بات تھی۔ سبھوں میں دھوم سی ہوگئی۔ مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہوگیا کہ مینا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھ ڈالی۔ بہشتی زیور اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے تھے۔ الٹے سیدھے ناول کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی "دولت پر قربانیاں" تھی۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی۔

مگر اب الٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ سرے سے ناک ہی کاٹ ڈالی ماں باپ کی۔ مگر ہاں اپنا مستقل فرد بنا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی باتوں کا تو زیادہ بھی اسی نے توڑا۔ چار کلی کے کھڑے پائینچوں کے پاجاموں، اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی۔ کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنیں ہی نہیں۔ جگ مگ جگ مگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی۔ جھکا جھول چندن ہار اور چوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا کوئی نکلس ڈال لیتی۔ اور یہ بھی روز روز نہیں۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پہ پہن لیا۔ نہیں تو وہی اپنے بھونڈے ہاتھ۔ بھونڈا گلا۔ آنے جانے والیاں ٹوکتیں بھی۔

"اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھونٹھے ہاتھوں کی کیا چال اٹھائی ہے بی۔" یہ مسکرا کر رہ جاتی۔ خاندان والے تو علی الاعلان کہتے کہ۔ "اے بی بڑی بیگم نے تو لونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔"

گھپ اندھیرے میں ذرا ذرا اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو چکاچوند کرنے لگتی ہیں پھر اسی چکاچک اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ ممانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے الگ ہے۔

ممانی بی کے میکے میں، اور اب یہاں سسرال میں بھی اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا

مغربی پاکستان کا ثقافتی میلہ

(مری)

صدر جمہوریہ پاکستان، جناب اسکندر مرزا مع بیگم ناہید اسکندر
نمائش مصوری و عکاسی میں

ثقافتی میلے کا افتتاح صدر جمہوریہ پاکستان،
جناب اسکندر مرزا نے فرمایا
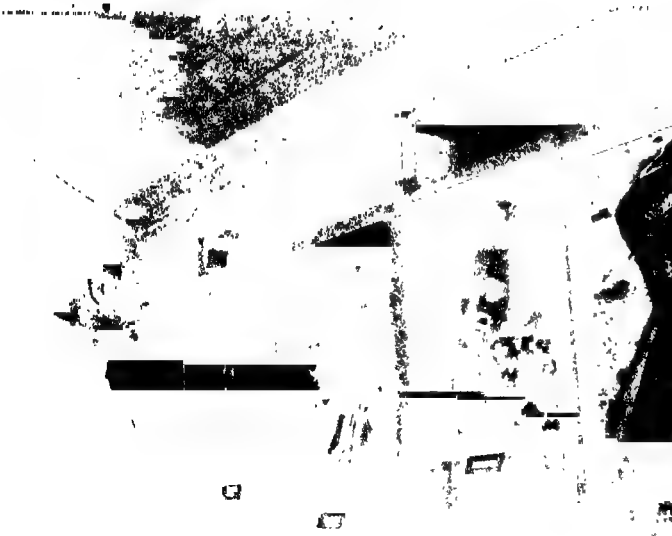
نمائش کا ایک گوشہ : جنرل محمد ایوب خاں،
کمانڈرانچیف افواج پاکستان، تصاویر
ملاحظہ فرما رہے ہیں

وزیراعظم نے اپنے حالیہ دورہ اسپین میں
پاکستان اور اسپین کے مابین
معاہدہ دوستی پر دستخط فرمائے

آغا خان چہارم ، ہزہائنیس شہزاد
کی کراچی میں آمد پر ہوائی اڈہ
استقبالیوں کا ہجوم

وزیراعظم پاکستان کے یورپ، امر
اور اسلامی ممالک کے دورے
واپسی پر اہل کراچی نے ان
کا پرجوش استقبال دیا

مینا کو بھی حسبِ قاعدہ سب سے پردہ کرایا جاتا مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اچھالے تو سبھی جڑیں کاٹ پھینکیں۔

رفیعہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں۔ ڈاکٹر لیڈی ڈاکٹر کا تو کدھر گذر ہوتا محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر کو اناڑی نکلی۔ کچھ سمجھ پڑا کچھ نہ پڑا۔ اس نے آڑے ٹیڑھے ہاتھوں سے کچّی زچہ کو ایسے جھنجوڑے دیئے کہ الٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی تجربہ کار بوڑھیاں بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ ممانی بی کو بھی کچھ نہ سوجھا۔ مینا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکریوں کا ایسے موقعوں پر کام بھی کیا؟ مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ بٹیا کافی لکھ پڑھ گئی ہیں۔ جھنو خالہ کا بٹیا حوض میں گر پڑا تھا تو انہوں نے اندھا لٹا کے سارا پانی نکلوایا تھا۔ جھنو ماں کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی پتیاں بار بار چبواتی رہیں۔ ممکن ہے رفیعہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے۔ اسے مان لیا کہ ڈاکٹرنی نہیں تھیں پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دینی تو آتی ہی تھی؟

دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا۔

"چھوٹی بی بی سے کہیو۔ بیوی کی طبیعت اچھی نہیں۔" ساری ...... بات پوری ہونے سے پہلے ہی نصیبن بوا چیخ اٹھی۔ "اے میاں تمہاری عقل سلامت ہے۔ بالی چھوکری سے......."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی مینا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی۔ "میری اپنی ذاتی رائے تو یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیجیے۔" اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آئے۔ آواز دی اور کہا:

"میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ فیس کیا لے گی؟ ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی کہ پھر بولے۔ "اور فیس کا کیا ہے۔ جان سے بڑھ کر تو پیسہ ہوتا نہیں۔ اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں۔ پھر میں کیا کروں گا؟"

اور ان کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے مگر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچّا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بی بی ان کا کہنا ذرا کم ہی مانتیں۔ اور بات پیچھے منہ کو منہ دیئے چلی جاتیں۔ کہنے والے کہتے ہی ہیں کہ یہی منہ چار سے اٹھاتا ہے اور یہی منہ چار میں بٹھاتا ہے۔ مگر اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے کہ "جاؤ بی بی میں نے تین بار تمہیں طلاق دی۔" میاں بی بی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہدیا کھیل ختم پیسہ ہضم۔" ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ بغیر دھوئیں کے لکڑی جلے؟

مینا کو بھی خیال آ گیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے۔ پھر کیا ہو گا؟ لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی:

"چلیئے دونوں مل کر اسے بلا لائیں۔" اور ذرا سی جھجک کے بعد وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی؟

شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی ہو گئی۔ چلہ بھی نہا لیا۔ بات پرانی پڑ گئی مگر خاندان والوں نے کیا کیا بہتان نہیں باندھے؟ لیکن مینا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ ممانی بی نے البتہ دو چار دن بٹیا سے بول چال ضرور بند رکھی مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک؟ اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا اور مینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ تو اٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا پنجہ چاند ایسے ماتھے سے چھو جاتا۔ ممانی بی ہنس کر پیار سے ڈانٹتی بھی۔ "پڑھ لکھ کر بالکل ہی چلن بدل دیا۔ یہی کوئی سلام ہوا"؟؟ مینا ہنس پڑتی؟

رفیعہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا ہوا۔ دوسرا اپنے وقت کا قیصر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کو خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے پھر رفیعہ بیگم امید سے رہیں۔ اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

چہلم پر ممانی بی نے بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے بہت ہڑک رہا تھا مگر کرتی بھی کیا بیچاری۔ جوان بیٹی کا

ساتھ تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہے۔ دنیا دکھاوے کو منہ سے کہا بھی کہ "میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں۔ ہمارے ہاں اٹھ آؤ نا۔" مگر شبیر میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ سر ہلا کر انکار کر دیا۔

مینا کو ان پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ میاں کی گائے تھے اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے۔ دونوں بچے الگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے۔ مینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا دیتی۔ ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھا لیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ممانی بی نے ہیر پھیر سے ذکر چھیڑا۔ "اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک یونہی رہو گے۔ ماشاء اللہ خود بھی جان جوان ہو۔ ننھے ننھے بچے ہیں کوئی تو ہو دیکھ بھال کرنے والا؟"

شبیر میاں بولے "ممانی بی رنج و غم کی بات تو جانے ہی دیجئے۔ میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں کا سا برتاؤ نہیں کر سکے گی۔ اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکوں گا۔" ان کی آواز بھیگ سی گئی۔ پھر ٹھہر کر بولے "کیا گھر کا گھر واہو گیا ممانی بی۔ اب تو دھول اڑتی ہے ہر طرف۔ باہر سے آؤں تو کوئی منہ دھلانے والا بھی نہیں۔ پانی وانی کی ضرورت پڑے تو اٹھ کر خود لوں تو لوں ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں کہ پیاس ہی بجھا دے۔ بچے الگ تباہ حال"!

مینا کا دل اندر سے پگھل اٹھا۔ بولی:

"آیئے ہمارے ہاں آ جایئے نا۔ یہاں اماں بھی ہیں۔ بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آ تو جاؤں۔ مگر" شبیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔

ممانی بی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ مینا پھر بولی۔ "خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟! اپنے کام سے کام رکھئے۔ کتوں کا کام بھونکنا ہے۔ بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی پھر ممانی بی نے بھی زور دیا تو شبیر میاں اسی دن اٹھ آئے۔ مینا کا وقت اب بڑا اچھا کٹ جاتا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی۔ بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرتے۔ کبھی کبھار ایسے ہی مینا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے:

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا۔"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور۔ مگر یوں جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔ نہ چٹ نہ پٹ۔ کبھی اونچی آواز سے بولتے نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انہیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھالے تھے کہ بھول سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں۔ بچپن میں میری بٹیا مینا کی طرح چہکتی تھی بس میں نے یہی نام ڈال دیا۔ اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور اسے دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے۔ "واقعی اچھا نام دیا آپ نے۔ مینا بڑی پیاری ہنسو مکھ ہنستی ہیں۔"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے۔ اتنی سادگی سے جو اتنا بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شبیر میاں کے لہجے میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے کتوں کا رونا بڑا نحس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیئے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بوا نے تازہ تازہ دودھ ابال لینے کے لئے چولہے پر چڑھایا تو وہ آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے تھیں۔ منہ سے تو کچھ نہ بولیں مگر مولی کی دوہائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں ممانی بی

چٹ پٹ ہوگئیں۔ اور مینا، مینا سے الو بن گئی۔ اندھیاروں میں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پر اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی۔ بیسیوں ہی تو پیام اچھے برے آئے ہوں گے مگر ماں کو پسند نہ آئے اور جو ماں کو پسند آیا بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی میں ہی لے گئیں۔
اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی سیدھی، جھوٹی سچی، ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا ہول ہول جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی مگر روپے پیسے ہی سے تو سب کام نہیں چلتے؟۔
بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔ لیکن شبیر میاں اب بھی مینا کے ہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے سیدھے اپنے کمرے میں پہونچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا۔ اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آتے ہی گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی۔ اور پھر نرم نرم سی میٹھی آواز:
"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے"۔
شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہو گئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ بنی نہ انھوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا۔
ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا اور منمنا کر بولا۔ "ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں"۔
"ارے رے۔ مینا نے اسے پیار سے گود میں اٹھا لیا" تو بھی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل؟
مینا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دے کر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد بہ اتنا بڑا کاجل جم گیا۔ مینا نے ڈبیہ میں کاجل پکڑا۔ اور منے کو گود میں بٹھا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیرنی چاہی۔
"آں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں لوہا نہیں پھیرنا چاہیئے"۔ مینا ہنس پڑی۔ "اچھا تو انگلی سے لگا دیں؟"
"ہاں"! ارشد نے سر ہلا دیا۔
مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری۔ تھوڑا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔ اور بھول بھی گئی کہ کاجل لگا تھا۔
شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچ دار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی پھر میٹھے لہجے میں آواز آئی:
"خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے"۔
دسترخوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔
"ابا میاں۔ آپ نے ہماری آنکھوں میں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے"۔
"ہاں ہاں۔ بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا"۔ اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ مینا آ گئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی:
"ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اٹھا لیا"۔ شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر ایکدم رک کر، سادگی سے بولے:
"ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں"۔ اور اخبار لے کر پڑھنے میں یوں منہمک ہو گئے گویا کسی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو، موسم کی تعریف کی ہو۔ "واہ بھئی۔ کیا اچھا موسم ہے"!
مینا بوکھلا کر الٹے پاؤں بھاگی تو اس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم

گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آگئی۔ سادگی سے بولے :
"ذرا سنبھل کے نہیں چلتیں ابھی ہڈی چور ہو گئی ہوتی" اور اٹھاتے میں مینا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہو گیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور لیکن اگر کوئی پوچھتا "سناؤ میاں آج کی خاص خبر کیا ہے؟" تو وہ سٹ پٹا کر رہ جاتے۔
مینا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سنائی نہ دی تھی۔ انہوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرتے تو لگتا کہ نرم گرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آتے۔

"اونہہ زکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"
ایک دفعہ وہ بخار میں بھن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے تو مینا نے انہیں مشورہ دیا تھا :
"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا؟"

اب انہیں خیال آیا یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا؟ پھر انہیں مینا اور رمانی بی کے احسان یاد آگئے۔ انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مینا کے لائق کوئی بر ڈھونڈ نکالیں گے۔ مینا جو اتنی پیاری۔ اتنی خوبصورت اتنی سگھڑ اتنی تعلیم یافتہ ہے اس کے جوڑ کو جوڑ تو ملے۔ مینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ بچوں سے تو اب وہ اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی۔ بچے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے بسورتے نہ تھے اور صورت پر بہار آگئی تھی۔

"لاحول ولا" شبیر میاں نے سوچا "میں بھی کتنا کور اخلاق ہوں وہ تو مجھ سے میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں۔" اخبار مونڈھے پر رکھ کر وہ اٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے مارے سوئیٹر چڑھا لیا تھا۔ اب جو گرمی ہوئی تو اسے اتار پھینکنا چاہا۔ سوئیٹر کھلے گلے کا نہ تھا۔ گردن میں سے اتارنا چڑھانا پڑتا تھا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے، ساڑھی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر، وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے، زور لگا کر سوئیٹر اتار رہی تھی۔
شبیر میاں، روایتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر اندھا دھند عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں۔ مگر یہاں ایکدم جگمگاتی سیج دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پروں میں ان کو اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔
مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئیٹر کھینچ کر پھینکا۔ اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑائے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے؟
تین دن سے تو بخار ہی تھا تین دن مینا نے یوں ہی کمرے میں کاٹ دیئے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے باہر آئی تو سہی مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھاوے کو دولہا سے شرمائے۔ اور موقع ملنے پر وہ رہ رہ کے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آگے بھی انہیں یہ خوشبو اپنے تکئے پہ اور بستر پہ مل چکی تھی جو اپنے منہ سے کہتی تھی۔ "میں مینا کے پاس سے آئی ہوں۔"!
اب مینا اتنی گئی گذری بھی نہ تھی کہ کسی کے بستر پر لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے تو اسے بھی گھسیٹ لیتے۔ "آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیئے۔"
تب تک کہ یہ سوئیں سوئیں۔ یہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی۔ کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر لڑھک جاتی۔ انہی کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

آئیے بہتر رویہ اختیار کریں

چھپے میں!

’’کیوں بھئی یہاں کونسی پکچر لگی ہے؟‘‘

’’یہ تو بعد میں پوچھئے گا پہلے لائن میں آجائیے‘‘

’’یہ لائن کونسی کلاس کی ہے؟‘‘

’’چاہے جس کلاس کی سمجھ لیجئے‘‘

’’ارے آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں؟‘‘

’’بھائی جان ہنسنے کی بات صرف اتنی ہے کہ آپ کو یہ لکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے، پھر بھی آپ پوچھتے ہیں یہ کونسی کلاس ہے۔ ڈیڑھ روپے کا ٹکٹ لینا ہوتو لائن میں آجائیے‘‘۔

’’براہ کرم مجھے بھی اپنے قریب جگہ دے دیجئے۔ ورنہ ممکن ہے اتنے پیچھے میرا نمبر ہی نہ آسکے‘‘۔

’’تو پھر کیا کیاجائے۔ گھر سے ذرا پہلے تشریف لے آتے‘‘

’’دیکھئیے صاحب، دیکھئیے، یہاں گھسنے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ دوسروں کا حق چھین رہے ہیں۔ ہم جو اتنی دیر سے یہاں کھڑے ہیں تو کیا نرے بیوقوف ہیں‘‘۔

’’میں تو صرف آپکی اجازت سے یہاں آنا چاہتا تھا‘‘۔

’’اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر میں اجازت دیدوں گا تو میرے پیچھے اور بہت سے لوگ کھڑے ہیں وہ کب برداشت کرینگے کہ ان کا حق چھینا جائے‘‘۔

’’آپ نہیں کھڑا ہونے دینگے مجھے؟‘‘

’’جی نہیں‘‘

’’پھر سوچ لیجئے‘‘

’’جائیے اپنا کام کیجئے۔ میں نے سوچ لیا‘‘

صاحب صاحب زبردستی لائن میں گھس پڑے ہیں اور پھر لوگوں کی طویل، مستقیم قطار میں ایکدم کھلبلی مچ جاتی ہے۔ ایک طرف ٹکٹ بٹنا شروع ہوتا ہے اور دوسری طرف فساد کا آغاز ہوتا ہے پندرہ منٹ تک یہی کیفیت رہتی ہے۔ پھر ایک پولس والا آکر دو چار آدمیوں کو پکڑ کر لے جاتا ہے۔ چلئیے چھٹی ہوئی۔ ہمارے سینما دیکھنے کے لئے گھر سے نکلے تھے، پہنچے ہسپتال!

’’بابوجی گاڑی آگئی ہے۔ مجھے ٹکٹ دیدو‘‘

’’میاں دیکھتے نہیں۔ کہاں چڑھے چلے آرہے ہو‘‘

’’دیکھ رہا ہوں صاحب دیکھ رہا ہوں۔‘‘

’’مجھے بہت جلدی ہے۔ گاڑی نکل جائیگی‘‘

’’گاڑی ہمارے لئے تو ہے ہی نہیں جیسے‘‘

’’لاحول ولا قوۃ!‘‘

’’ہٹنا بھائیوں ہٹنا ذرا‘‘

’’لو اب لیلو ٹکٹ۔ زبردست کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اب لگائیے نا زور۔ میں بھی

کرنے کی جلدی تھی ۔ نہ معلوم ان میں سے اور کون کون اسی طرح کھڑے کھڑے اس فکر ہی سے فراغت پا چکے ہوں گے !

جیب کٹنے کے حادثات کبھی کبھی بس میں سوار ہوتے وقت بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی اسی کا فتور ہے کہ لوگ قطاربندی کے اصول کو بھول کر بزور بازو بس میں سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی پونجی گنوا بیٹھتے ہیں ۔ جیب کترے ایسی بھیڑ سے اور ایسی بے قاعدگی سے بڑافائدہ اٹھاتے ہیں ۔ آنکو تو خدا ایساموقع دے ۔ مگر افسوس تو یہی ہے کہ پتلے خود ہی موقع دیتے ہیں ۔ اس میں ہماری بھی بڑی خطا ہے ۔ آپ خود ہی غور فرمائیں ۔

ایک صاحب خوب طاقتور ، لحیم شحیم دھکا پیل کرتے ہوئے بس میں سوار ہونے کو تو ہوگئے۔ اندر پہنچے تو ایک بھیک منگا ہاتھ پھیلا ئے گا رہا تھا ۔ یہ آگے ایک طرف ہٹا کر خالی سیٹ کی طرف بڑھ گئے ۔ اسکے بعد لوگوں نے اس بھک منگے کی آواز نہ سنی ۔ اور دیکھا تو یہ دیکھا کہ و

میر صاحب ! سنبھالئے [illegible]

اب آپ بڑھے آستین چڑھا کر لائن کو توڑنے !

دیکھتا ہوں کیسے لیتے ہیں یہ ٹکٹ۔،، ذراسی دیر میں شور ، ہنگا مہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور جن صاحب کو حیدرآباد جانے کی سب سے زیادہ جلدی تھی وہی ٹکٹ نہ لینے پائے اور انکی گاڑی چھوٹ گئی!

ایک صاحب کو لاہور منی آرڈر کرنا تھا ۔ بھاگے بھاگے پوسٹ آفس پہنچے ۔ اور اس بھیڑ میں شامل ہوگئے جو منی آرڈر کی کھڑکی کے سامنے لگی تھی ۔ بڑی دیر کے بعد بہت مشکل سے کھڑکی تک پہنچنے کی نوبت آئی ۔ لکھا ہوا منی آرڈر فارم تو ہاتھ میں تھا ہی ۔ پہلے فارم دیکر جیب میں سے روپے نکالنے لگے۔ جیب کے اندر ہاتھ ڈالتے ہی معلوم ہوا کہ رقم پہلے ہی کہیں اور ''منی آرڈر،، کی جا چکی تو صاحب لگے چیخنے چلانے ''میں لٹ گیا ۔ ہو گیا ، لوگو ! میری جیب کٹ گئی ابھی مجھے تنخواہ ملی تھی ۔،، مگر ، کون سنے فغاں درویش ! کس کو اتنی فرصت رکھی کہ انکی فریاد پر کان دھرے، انکی مدد کرے کس کو بھی الٰہی حضرت کی طرح منی آرڈر

نعیم شمیم صاحب جنہیں اپنی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا کنڈکٹر سے کہہ رہے ہیں ”بھائی کہو تو میں اتر جاتا ہوں ۔ بس میں سوار ہونے سے پہلے میری جیب سلامت تھی اور اب تو ٹکٹ کے دام بھی نہیں،، سب نے دیکھا تو اس جیب کا کہیں وجود نہ تھا خود بس میں بیشک آگئے تھے مگر جیب بس سے باہر ہی کسی نے سنگوالی تھی ۔ اگر وہ قطار میں شامل ہوجاتے اور دھکا پیل کر کے چڑھنے کی کوشش نہ فرماتے تو انہیں یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا ۔

بس اسٹاپ پر شام کے وقت اکثر سوار ہونے والوں کا بڑا اژدھام ہوتا ہے ۔ مختلف مقامات پر جانے والی بسیں آتی رہتی ہیں ۔ اور لوگوں کو جہاں جانا ہوتا ہے وہ ان بسوں میں جگہ حاصل کرنے کی فکر میں عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں ۔ اس بھاگ دوڑ کا کبھی یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو ذرا طاقتور ہوتے ہیں وہ تو بس میں چڑھ جاتے ہیں اور نحیف و کمزور حضرات اپنا ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھتے ہیں اور پھر بھی انہیں بس میں جگہ نہیں ملتی ۔ کنڈکٹروں اور بس ڈرائیوروں کو تو زیادہ سے زیادہ مسافر بھرنے کی جستجو رہتی ہے ۔ وہ آپ کو منع نہیں کرتے ۔ اور کرتے بھی ہیں تو ایسے ملائم انداز میں جیسے مطلب ہو ”میں تو یونہی منع کر رہا تھا، آ بھی جائیے،،!

اکثر جگہوں پر یہی عالم ہوتا ہے ۔

جس وقت چوراہے کا سپاہی ٹریفک روکنے کا اشارہ کرتا ہے تو بسیں بھی وہیں رک جاتی ہیں اور وہاں کھڑے ہوئے مسافر لپک کے ان میں سوار ہوجاتے ہیں اور جب اگلے اسٹاپ پر رکتی ہیں تو وہاں انتظار کرنے والوں کو جگہ نہیں ملتی ۔ بعض بسیں تو اسٹاپ پر آتیں بھی نہیں، گزری چلی جاتی ہیں اور مسافر ان کے پیچھے دور تک بھاگے چلے جاتے ہیں ۔ گرتے پڑتے ۔ چوٹیں کھاتے ۔ مگر باز نہیں آتے ۔ جہاں کہیں بھی اس طرح ہوتا ہے تو یہ بے قاعدگی نہیں

بہت دیر کی مہرباں، آتے آتے!

ہوتی ۔ کیا اچھا ہو کہ اپنے اخلاق کے نگہبان ہم خود ہوں ۔

ہسپتال کا ایک منظر: کھانستے ہوئے بوڑھے، روتے ہوئے بچے اور تکلیف سے کراہتی ہوئی

نفسی نفسی کا ایک اور منظر

لیتے ہیں کہ انہیں کسی بات سے منع نہ کیا جائے جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں انہیں کرنے دیاجائے یہ بات سماجی انصاف کے خلاف ہے۔ اسلامی اخلاق کے خلاف ہے۔ شہری شائستگی کے خلاف ہے۔ کیونکہ ''حقوق العباد،، میں دوسرے انسانوں کے آرام کا خیال رکھنا بھی شامل ہے۔ مہذب انسانوں میں ایک کا دوسرے پرکوئی نہ کوئی حق ضرور ہوتا ہے۔ باہمی رواداری اور میل محبت سے زندگی خوشگوار بنتی ہے۔ ہڑبونگ، شور و غل اور ہنگاموں سے سوائے تکلیف کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، وقت الگ برباد ہوتا ہے۔ ہرکام کا ایک طریقہ اور اصول ہوتا ہے۔کسی کام کو مناسب طریقے اور خاص سلیقے کے ساتھ انجام دیا جائے تو اس میں وقت بھی کم لگتا ہے اور زحمت بھی نہیں ہوتی۔

غرض قطار بندی کسی بیدار قوم کے اجتماعی شعور کی علامت ہے۔ اس لئے ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنی شہری ذمہ داری کا خیال کرتے ہوئے ہمیشہ اس احساس کے تحت کام کرے *

''بلا سے جان جائیگی تماشا ہم بھی دیکھیں گے'' !

عورتیں ایک بھیڑ کی صورت میں ایک کھڑکی کے سامنے کھڑی ہیں جہاں سے دوا کے لئے پرچی ملتی ہے۔ کھڑکی کھلتی ہے تو ان بیماروں میں، ان کھانستے ہوئے بوڑھوں، روتے ہوئے بچوں اور تکلیف سے کراہتی ہوئی عورتوں میں اضطراب پھیل جاتا ہے۔ سب اپنی تکلیفیں، اپنے اپنے دکھ درد بھول کر اپنی تمام توجہ، اور تمام زور اس کوشش میں صرف کردیتے ہیں کہ کسی طرح کھڑکی تک پہلے پہنچ جائیں۔ اور سب سے پہلے پرچی حاصل کر کے ڈاکٹر کو دکھادیں۔ اس طرح ہڑبونگ میں بھلا بتائیے تشخیص و تجویز کیسے ہو سکتی ہے بلکہ اور کچھ روگ مول لے آنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

ہمارے شہروں کی آبادی روز افزوں ہے۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر لوگوں میں معاشرتی شعور اور ہم آہنگی پیدا ہونی اور ضروری ہے۔ ایسی باتیں آزاد شہریوں کی فطرت میں داخل ہونی چاہئیں۔ ہر لوگ آزادی کا مفہوم یہ کیوں

میدان محشر میں دادخواہوں کا ہجوم [illegible]

فکاہیہ:
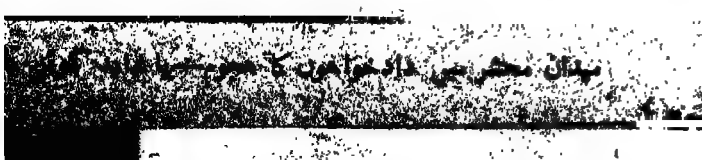
"ادیب العصر"

حسن نور

کل شام "ادیب العصر" کا دم نکل جانے سے انتقال ہوگیا۔ خدا مغفرت کرنا چاہے تو کردے ورنہ اعمال تو ایسے نہ تھے۔ مرحوم کو کوئی بیماری نہ تھی اور ہو بھی تو اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ ہر حکیم، بینا و طبیب، دانا مرحوم کو تاخیرِ مرگ مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا اور اُن کے مرنے کی بشارت کا منتظر رہا مگر افسوس! مرحوم نے اِن حضرات کو بہت انتظار کرایا، حتیٰ کہ یہ مایوس ہو چلے تھے اور انہیں مستثنیات سے قرار دے دیا گیا تھا۔ ہسپتال سے اُن کے وارثین کو اطلاع دے دی گئی تھی، مگر کوئی بروقت نہ پہنچ سکا، لہٰذا بلدیہ نے مرحوم کا جنازہ نہایت تزک و احتشام سے اُٹھوایا اور تمام سرکاری اعزازات کے ساتھ میوہ شاہ میں سپردِ خس و خاشاک کر دیا گیا۔ خارجاً مسموع ہوا ہے کہ بے شمار افراد نے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی، مگر حقیقتاً امام کے علاوہ صرف دو مقتدی تھے جنہیں اُن کی عاقبت سے ڈرا کر کچھ معاوضہ کے لالچ میں شریک کیا گیا تھا۔

جب مرحوم کے مرنے کی خبر ہوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل کی طرح پھیلی تب کلّو نان بائی رو پڑا۔ اسے اپنے چھپّن روپے کا افسوس تھا جو مرحوم کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئے۔ شبراتن زار و قطار رو رہی تھی کہ مرحوم کو اپنا قرض کسی صورت میں نہیں بخش سکتی۔ اور چھپر کا مالک تمام سامان کو (جس میں کوئی چیز اُن کی نہ تھی) بطور یادگار محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ پڑوس کے لوگ مرنے کے بعد کہہ رہے تھے کہ بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ مرحوم کے پاس ذاتی مکان نہ تھا۔ ایک چھپّر تلے گذارا کرتے تھے جس کا نام کچھ مروت اور کچھ لاڈ سے کُٹیا رکھ دیا تھا۔ رات میں کھانستے رہنے سے اُن کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا تھا، پڑوسیوں کو بلا اُجرت چوکیدار مل گیا تھا۔ نہ کھانے کو کھانا تھا نہ پہننے کو کپڑا۔ اللہ پر توکل تھا۔ جب کسی نے دریافت کیا مرحوم نے استقلال سے جواب دیا "سب اللہ کا فضل ہے"۔

سب سے بڑی خوبی اُن کی یہ تھی کہ زندگی میں وفات پائی، اوروں کے لئے ایک قابلِ عمل مثال چھوڑی۔ مرحوم کسی صورت مرنے کے لئے تیار نہ تھے اگر اُن کو موت نہ آتی۔ وہ سب کو مرنے کے لئے تیار رہنے کی نصیحت کرتے تھے، اس لئے کہ وہ اور کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ مرتے دم تک مرحوم آنکھوں سے دیکھتے، کانوں سے سنتے اور مرنے تک زندہ رہے۔ مرحوم نے خود اپنی تاریخ وفات کہی تھی "غم کم جہاں پاک"، اور تاریخ گویوں کی مشکل آسان کر دی۔

مرحوم کے وصیت نامے کو برآمد کر لیا گیا ہے۔ ۵ ہزار روپیہ ایک کتب خانے کے لئے، ۱ ہزار یتیم و نادار ادباء کے لئے اور ۲ ہزار روپیہ متفرقات کے لئے چھوڑا ہے۔ منشی عبد القدیر المتخلص بہ غیر کہتے ہیں کہ مرحوم فرماتے تھے یہ وصیت نامہ اس لئے لکھ رہے ہیں کہ لوگ اُنہیں بخیل نہ خیال کریں۔

ترکہ میں مرحوم نے دو ایم اے کی ڈگریاں، ایک ایل ایل بی کی ڈگری اور ایک سرٹیفکیٹ اِن لائبریرین شپ چھوڑے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے لئے جامعہ نے اُن کا مقالہ منظور کر لیا تھا، لہٰذا یہ ڈگری بھی مرحوم کے ورثاء تک مستقبل قریب میں پہنچ جائے گی۔ علاوہ ازیں بیوی کے لئے تمام عمر کا سوگ، بڑے لڑکے کے لئے کند ذہنی، چھوٹے کے لئے شراب نوشی اور شاعری، لڑکی کے لئے چرب زبانی چھوڑی ہے۔ وارثین میں ترکہ کی بابت کوئی واردات پیش نہیں آئی بلکہ اُن کا خیال مساویانہ طور پر اس ترکہ کو تقسیم کرنا ہے جو اتحاد اور رواداری کی عمدہ مثال ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ رزق تو مقسوم ہے ہی۔ مرحوم کے سامان سے ایک پاس بک برآمد ہوئی ہے جسے وہ اپنی متاعِ عزیز سمجھتے تھے۔ اور روپیہ وہ ضرور پس انداز کرتے اگر اُن کے پاس روپیہ ہوتا۔

مرحوم کو تمام اچھی چیزوں سے رغبت تھی۔ فطرتاً وہ حسن پرست و حسن شناس تھے مگر تقدیر کی ستم ظریفی کوئی اچھی چیز اُن کے پاس نہ دیکھی گئی۔ مرحوم بے انتہا مخلص اور بے تکلف تھے۔ کسی ملاقاتی تک سے قرض مانگنا عار نہ سمجھا اور تمام احباب انہیں قرض دینے کی بجائے اس سے بچنے کی

تراکیب بتاتے رہے۔ مرحوم بغور سنتے تھے۔ اب کہاں ایسے صابر لوگ ؎

مرحوم ایک خود ساختہ انسان تھے۔ پہلے وہ ایک پندرہ روزہ اخبار میں کام کرتے تھے جو سالانامہ نکالا کرتا تھا۔ آخر قضا و قدر نے انہیں ایک روزنامہ کی ادارت سونپ دی۔ اس روزنامہ کا مطالعہ بغور کرنے والوں میں مرحوم کے علاوہ دو کاتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جوشیا بازار کے دو کاندار انہیں خرید لے جاتے تھے۔ غیر مستقل خریداروں کی تعداد ہزاروں سے گذر چکی تھی۔ اس سنہری دور میں مرحوم کو مشاہرہ کے نام سے دو پیالی چائے، ایک ڈبیا سگرٹ، دو پان، رات کو سونے کی اجازت کے علاوہ اسّی روپے سکۂ رائج الوقت بالاقساط ملا کرتے تھے۔ ایک اداریہ کے پیچ ہونے کے شبہ میں مرحوم کو سپرد حوالات کر دیا گیا اور جب، دن تک کوئی ضمانت دینے نہیں پہنچا تو مجبوراً پولیس نے چالان کیا اور مجسٹریٹ نے معاف کر دیا۔ روزنامہ "سکندر" والوں نے اپنے حساب سے تین ماہ کی تنخواہ ضبط کر لی۔ مرحوم کے علاوہ سب کو یقین تھا کہ یہ قطعی غلط تھا مگر اس کا کیا علاج کہ مرحوم جس دور سے گذر رہے تھے اس نے معمولی ضرب تقسیم کے حساب بھی اُن کے لئے عقدۂ لاینحل بنا دیئے تھے ؎

مرحوم اُس دن بہت خوش تھے، اس لئے کہ انہوں نے بچپن میں سُن رکھا تھا کہ اللہ ایک دروازہ بند کرتا ہے تو ستّر دروازے کھول دیتا ہے۔ ان ستّر میں سے ایک "رونق اسلام سیکنڈری اسکول" تھا، بقیہ ۶۹ کا علم اللہ کو ہے۔ خیر وہ مدرس ہو گئے۔ طالب علم اُن سے بہت خوش تھے کہ دیر سے آنے پر مرحوم کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔ نہ کسی طالب علم کو کسی شرارت پر سزا دی۔ نتیجہ یہ کہ قریب امتحان کے ان کے چھپر تلے طالب علم ٹیوشن پڑھنے جمع ہو جاتے تھے اور مرحوم انہیں درس دیا کرتے تھے۔ تمام طلباء اور اُن کے والدین مرحوم کے گرویدہ تھے۔ طلباء انکی تعریف کرتے اور اُن کے سرپرست دعائیں دیکر رخصت ہو جاتے تھے ؎

مدرسہ کی انتظامیہ کمیٹی اُن سے بہت خوش تھی کہ یہ واحد شخص تھے جنہوں نے کبھی مدرسہ چھوڑنے کی دھمکی نہ دی، مگر فلک پیر کو یہ فراغت مرحوم کی ایک آنکھ نہ بھائی۔ تعلقہ انسپکٹر کے معائنہ کے وقت وہ کہہ رہے تھے کہ بھینس بڑی بے عقل ہے۔ انسپکٹر کو یہ توہین نہایت ناگوار گذری کہ ایک ادنیٰ مدرس اُن کو بھینس کہہ دے۔ مرحوم نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا، حضور کو بھینس سے کیا تعلق؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک! وہ ایک مفید جانور ہے، حضور ایک اعلیٰ عہدیدار! انسپکٹر اس معافی نامہ پر خوش ہو کر درگذرا، انسپکٹر خاموش رہا۔ ہیڈ ماسٹر سمجھا کہ عقل خاموش ہے تو پھر وہ خود بھینس ہوا اور انسپکٹر کے چلے جانے کے بعد اُس نے جواب طلب کر لیا کہ "تم نے مجھے بھینس کیوں کہا؟" مرحوم نے جواب دیا۔ "بھینس ایک شریف جانور ہے، بھلا حضور کو میں بھینس کہوں تو کھاؤں کیا؟" خیر اس ازالۂ حیثیت عرفی کے باوجود ہیڈ ماسٹر نے قانونی چارہ جوئی نہ کی اور مرحوم کو مدرسہ بدر کر دیا گیا اور ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ میں ۶ روپے ماہانہ کا اضافہ ؎

مرحوم کو صفائی بیحد پسند تھی مگر افسوس! صفائی کا کوئی معقول انتظام نہ کر پائے۔ جس دن مرحوم باہر نظر نہیں آتے تھے وہی کپڑوں کی صفائی کا دن ہوتا تھا۔ مرحوم کو مرغن غذاؤں کے کئی نام ازبر تھے مگر مرور زمانہ سے بیگن کا بھرتہ، پالک کا ساگ اور ٹماٹر کا حلوہ یاد رہ گیا تھا۔ قناعت اور توکل اس درجہ کا تھا کہ آپ نے جو پایا اسی کو کام میں لائے اور جب کوشش کرنے پر کچھ میسر نہ ہو سکا تو اطمینان سے چھپر تلے سو جاتے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ صابر ایسے کہ بیماری سے کبھی دق نہ ہوئے اور سسک سسک کر سانس لیتے رہے۔ آپ کا بیان تھا کہ عرصہ ہوا میرا غیر رسمی انتقال ہو چکا ہے اب ضابطہ کی تکمیل کے لئے ایک بار اور مرنا پڑا ؎

آپ کی وفات حسرت آیات پر اخبار و رسائل نے خاص نمبر شائع کرنے کا اہتمام کیا اور حکومت سے کاغذ حاصل کیا، مگر کافی مقدار میں حاصل نہ ہونے کی وجہ سے خاص نمبر عام نمبر سے ڈیوڑھے حجم کے نکل سکے۔ احباب نے ہمیشہ مرحوم کے مضامین کی داد دی، انہیں شائع کیا اور معاوضہ کا وعدہ کرتے رہے ؎

ناشرین کا مرحوم پر بہت کرم تھا۔ اکثر چائے پلاتے تھے اور کبھی کبھار کسی ہوٹل میں کھانا بھی کھلا دیتے تھے، ان کی تصاویر اپنے پرچوں میں شائع کرتے تھے۔ کتابیں آپ کی ہمیشہ عمدہ طباعت و کتابت و کاغذ کے ساتھ شائع ہوئیں۔ اب اُن کے انتقال پُر ملال پر تمام ناشرین نے ایصال ثواب کی غرض سے اپنا اپنا پیشگی معاوضہ معاف کر دیا ہے۔ مزید برآں مرحوم کے ورثاء کے لئے ایک فنڈ بھی کھول دیا ہے اور قوم سے چندہ کی اپیل کی ہے ؎

دل

(ترجمہ کافی بابا فریدؒ)

عبدالعزیز فطرت

دل ماحصل ہے کون ومکاں کا　　دل منتہا ہے سارے جہاں کا
دل غیر محدود، دل غیر فانی　　کیوں اہلِ دل، کیوں یہ بدگمانی ؟
ظاہر میں اسرار باطن میں انوار　　دل بزم لاہوت، دل محفلِ یار
شیدائے دل رہ طوفاں میں بہہ　　جو مشکل آئے اس راہ میں، سہہ

دنیا ہے دھوکا - اک عالم خواب
دل بزم انوار - دل گوہر ناب

(۲)

فرقت کا یہ سوزِ دوامی　　ہر سو ہونے لگی ناکامی
عمر تھی عمرِ ناکامی　　اب تک ہوں محرومِ منزل

فرقت میں اک نالۂ پیہم　　قسمتِ دل تھے کلپن اور غم
لیکن دکھ میں ضبطِ پیہم　　اس پہ ہے ناز آپ کا بے دل

بن کچھ سمجھے بوجھے سیانے　　آئے تم کو دوائیں پلانے
کوئی مرے دل کی کیا جانے　　بدارو درمن سے کیا حاصل

دل ہے راہی پریم نگر کا　　اس پہ فریدؔ یہ رنگ سفر کا
علم نہیں کچھ راہ گذر کا　　قدم اٹھانا بھی ہے مشکل

ماہِ نو، کراچی، ستمبر ۱۹۵۷ء

تخلیق

جمیل نقوی

میں آج بھی سوچتا ہوں اکثر، کہ میں نے تسکینِ دل کی خاطر
گریز پا وقت کے دمادم، رواں دواں
کارواں کے ہر لحظہ، ہلکے ہلکے، سنور سنور کر، بگڑتے بنتے، ابھرتے مٹتے
سحاب وار احتمال خوردہ نقوش، کو آئینہ دکھا کر
ہجومِ آلامِ زندگی کو امید کی لوریاں سنا کر
جہانِ تانہ کی ایک موہوم آرزو کا فریب دے کر
بہار کے آخری دقیقہ کو رازدارِ جنوں بنا کر
حیات کی تازگی عطا کی، بطرزِ نو جاوداں بنایا

کبھی تشکک کی کارفرمائیاں تھیں میرے دماغ و دل میں
میں سوچتا تھا کہ پرکشا لمحہ میں وہ رعنائیاں نہیں ہیں
جو اک ہیولائی نور بن کر فضائے انجم میں ضوفشاں ہوں
جو اپنے براق شہپروں میں، طلسمِ صد لالہ زار لائیں
سپہر اندر سپہر رخشاں پیام پہلوئے دلبری میں
میں سوچتا تھا کہ اک جہانِ انفعال ہے سوزِ عاشقی میں
فریب اندر فریب پنہاں گدازِ دل کی حکایتوں میں

مگر وہ اک لمحہ، لمحۂ برق، لمحۂ تیز تیز، جوشاں
مجھے کہیں اور لے گیا دور، دور پہنائے بے کراں میں

وہ لمحہ آتش بپا، وہ لمحہ کہ جو تحیرّت کی انتہا ہے
مجھے کہیں دور لے گیا، اک بسیط پہنائے بے کراں میں

میں اپنے اوہام کی طلسم آفرینیوں کے فسوں سے گزرا
تشکک اک دامِ بوسیدہ و شکستہ کے تار بن کر
جلا کچھ اس طرح، اس سے شعلے بھڑک بھڑک کے بجھے فضا میں
مری نگاہوں نے میرے دل نے، دماغ نے، تارِ تارِ جاں نے
زمیں سے تا آسماں کیا، اک جہاں چراغاں، بھڑکتا پیکر
کہ شعلۂ سربلند تھا، انہیں لے افلاک تک اچھالا

یہ جوہری زرق برق پیکر؟ یہ شعلۂ برق جوش تو تھا؟
کہ زرق برق آتشیں حسینہ تراش لی، التہابِ جاں نے؟

مری پرستش کو ایک تقدیس کا طلسمات مل گیا ہے
اور اب ہوں میں،
اور تری عقیدت،
تری محبت،
تری پرستش!

غزل

سید آل رضا

*

وہاں یہ چھیڑ، ترے آستاں کی باتیں ہیں
یہاں یہ حال، نہ جانے کہاں کی باتیں ہیں

یہ اپنے ذکر میں، کیوں آرہا ہے نام ان کا
یہ کس زمین پہ، کس آسماں کی باتیں ہیں

چلو، اُنہیں سے کریں، انکے مہر و ماہ کا ذکر
وہیں بیان بھی ہوں، یہ جہاں کی باتیں ہیں

بڑی حسین بھی کمبخت ہیں، سنو تو سہی
ہزار زندگیٔ رائیگاں کی باتیں ہیں

مرے چمن کی بلا دور، کیا ہوا مجھ کو
بھری بہار میں دورِ خزاں کی باتیں ہیں

ہمارے ساتھ کوئی وقت کیوں خراب کرے
کہ آشیاں نہ رہا آشیاں کی باتیں ہیں

جو اُن کی بزم میں پہونچے، وہ سُن رہے ہونگے
کہ مجھ کو چھوڑ کے سارے جہاں کی باتیں ہیں

رضاؔ تم اُن کے شعورِ وفا کو کیا سمجھو
ہٹاؤ بھی کہ دلِ بدگماں کی باتیں ہیں

●

روشؔ صدیقی

* *

ابھی خاکِ چمن کو ہے خود اپنا رازداں ہونا
خزاں کا سوزِ دل ہے کر چمن کا پاسباں ہونا

حجاباتِ خزاں سے چہرۂ گلشن نکھرتا ہے
کم آگاہی ہے ممنونِ بہارِ جاوداں ہونا

غروبِ مہر سے ڈوبے ہوئے تارے ابھرتے ہیں
حیاتِ سرمدی کیلئے ہے عیاں ہو کر نہاں ہونا

ٹھہر اے جادہ پیما، رازِ منزل تجھ کو سمجھا دوں
غبارِ کارواں ہونا ہے خضرِ کارواں ہونا

یہ کیوں رقصِ صبا پر لالہ و گل چاک داماں ہیں
ذرا کچھ سوچ کر اہلِ جنوں سے بدگماں ہونا

قفس کی زندگی کا ذکر ہی کیا ننگِ ہستی ہے
مگر اے ہمنشیں! کیا ہے اسیرِ آشیاں ہونا

زمانہ کی نگاہوں میں کھٹک کر جی تو سکتے ہیں
مگر ہے موت، اپنی ہی نگاہوں پر گراں ہونا

یہ دولت وسعتِ فکر و نظر سے ہاتھ آتی ہے
نہیں ہر آبجو کا ظرف، بحرِ بیکراں ہونا

روشؔ! شکوۂ نامہربانی، عصرِ حاضر سے
جہانِ مہرباں کیلئے ہے، خود اپنا مہرباں ہونا

غزل

سراج الدین ظفر

نذرِ سمن بران جگرِ سوختہ ہوا
کن نیکیوں میں صرف یہ اندوختہ ہوا

درپے کسی قبا کے رہے ہم نسیم وار
مشکل سے وا یہ غنچۂ سر دوختہ ہوا

آئینۂ جمال میں کل رات ناگہاں
اپنا ہی شوق چہرۂ برافروختہ ہوا

ہم رہزنانِ قافلۂ گل کی لوٹ میں
تقسیم سب بہار کا اندوختہ ہوا

شب بھر رہے نظر میں خطوطِ قبائے دوست
ازبر ہمیں یہ صفحۂ آموختہ ہوا

کل شب کسی کا غنچۂ لب تھا کہ جوئے لطف
سیراب مزرعِ جگر سوختہ ہوا

آوارگانِ شوق کو راس آسکا نہ زہد
تنگ ان پہ یہ لباسِ غلط دوختہ ہوا

بزمِ قدح میں چشمِ فراست جو وا ہوئی
ہر ذرہ آفتاب برافروختہ ہوا

تعلیمِ شوق دی کسی گیسو نے کیا ہمیں
پھر یاد سے نہ محو یہ آموختہ ہوا

اے آہوانِ شہر کی کافر جوانیو
سب تم پہ ختم کفر کا اندوختہ ہوا

اس کے سوا کچھ اور نہیں رازِ کائنات
اک ذرۂ جمال برافروختہ ہوا

اٹھی ادھر وہ چشم ادھر قدِ زہد پر
پرزے صفا کا جامۂ خوش دوختہ ہوا

اے پردۂ قضا و قدر کے ستم ظریف
انساں بھی ہے بلا جو برافروختہ ہوا

وہ کند ذہنِ مکتبِ اتقا ہیں ہم
جن کو ریا کا یاد نہ آموختہ ہوا

مدحِ بہار و تازگیٔ حسن میں ظفر
کیا کیا نہ تر زبانِ قلم سوختہ ہوا

مشتاق مبارک

عجب انداز سے اس مرتبہ فصلِ بہار آئی
فقط گُل ہی نہیں گیسوئے دوراں تک سنوار آئی

خرد والے تو کیا خود اہلِ دل گم کردہ منزل ہیں
یہ آخر کون سی منزل مرے پروردگار آئی

جو فرزانے فریبِ آگہی دیتے رہے مجھ کو
حدِ ادراک تک ان کو مری وحشت پکار آئی

متاعِ غم حقیقت میں بقدرِ ظرف ملتی ہے
ہمیں تھے جن کو یہ نعمت بخوبی سازگار آئی

مری دیوانگی میں تم کمی محسوس کرتے ہو
مجھے اس بات پر اکثر ہنسی بے اختیار آئی

ہو کوئی محرمِ اسرار تو اس کو یہ سمجھائیں
کہ ہم کو راس کیسے گردشِ لیل و نہار آئی

زہے قسمت گھٹا اٹھی سبو چھلکے چمن لہکا
مبارک اہلِ میخانہ کہ فصلِ سازگار آئی

احسن علوی

یا الٰہ العالمیں توبہ مری
خالقِ جاں آفریں توبہ مری!

یہ جہانِ بغض و کیں توبہ مری!
اتنے پست اس کے مکیں توبہ مری!

جہل ہے مسند نشیں، توبہ مری
علم ہے عزلت گزیں توبہ مری

کیا درندے ہیں یہ ظالم پُر جفا؟
کچھ بھی ہوں، انساں نہیں توبہ مری

ہے دگرگوں حالتِ دنیائے دوں
اک جہنم ہے زمیں، توبہ مری

مژدہ احسن پا گئی شرفِ قبول
بر سرِ عرشِ بریں، توبہ مری

فاختہ ــــــ بقیہ ص ۳۶

بدلی چھائی۔ برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا دھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی واپسی۔ وہی بچوں کی شرارت۔ وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور ول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ کے بعد نرم ملائم گھلی گھلی سی آواز:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے"!

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے: "مینا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا۔ کیڑا نہ لگ جائے"

اس دن تو مینا سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر پر ہی تھے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آ دھمکے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی مینا بیٹھ گئی۔ سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پڑی تھی۔ زیور سے لے کر افشاں تک۔ بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال انہوں نے اپنی ماں سے متعلق نہ کیا۔

مینا خود ہی بول پڑی:

"امی کی یاد آ گئی ہے منے؟" ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے۔ "اونہوں۔ آپ جو اتنی اچھی ہیں"!

"مگر میں امی کی برابری کہاں کر سکتی ہوں"۔ وہ ہنس کر بولی "اوں"۔ ارشد بولا۔ "ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں"! مینا کا منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی: "سچ"؟؟ "ہاں اور کیا" ارشد بولا۔

مینا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی پوت کا لچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے لچھا اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا ــــ دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی۔ زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی۔ مٹھی کھولی۔ اور پھر دوڑتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ "سنئے"۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ شبیر میاں بھی رک گئے۔ اور یکدم چونک گئے۔ دھانی ساڑی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر بولی:

"سنگھار دان میں اور تو سب چیزیں ہیں۔ مگر مسّی نہیں ہے"! اور وہ منہ پلّو میں چھپا کر، شرما کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختئی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈرتے ڈرتے ہی چلے گئے۔

شام کو جب وہ ہاتھ میں مسّی کی دوہری پڑیا سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ اور ہوئی اور نرم ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی:

"اے خانساماں کھانا لگا دے۔ "وہ" آ گئے ہیں"!

سوکھے پتے: ــــــ بقیہ ص ۳۰

بہت طویل ہو گیا۔

ــــ معاف کرنا بڑھاپے کے خیالات بھی بوڑھے ہی ہوتے ہیں۔

ــــ تمہاری والدہ تمہیں اور شائستہ کو دعائیں دیتی ہیں۔ بچوں کو پیار۔

تمہارا باپ ــــ

احمد نے خط ختم کیا۔ اسے دوبارہ سہ بارہ پڑھا۔ پھر جیب سے رومال نکال کر اپنے چشمے کے شیشے صاف کئے اور کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ چپ چاپ اور افسردہ! کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا ــــ!

سیدھی پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے ننھے بچے کو
یہ خالص دودھ دیجئے
OSTERMILK

ہماری ڈاک

سلام مسنون۔ "ماہ نو" کی پچھلی اشاعتوں (اگست تا دسمبر ۱۹۵۶ء) میں شائع ہونے والا ندوی صاحب کا مضمون "سندھی مہریں" کافی دلچسپ تھا۔ اس سے مصنف کے وسیع مطالعے اور تحقیق و تدقیق کے گہرے شوق کا پتہ چلتا ہے۔ موصوف نے اگرچہ اس پہلو میں کافی کوشش کی ہے لیکن تحقیق کے کار طریق کے غلط ہونے کی بنا پر اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ عام طور پر تحقیقات کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تحقیق کی جاتی ہے اور بعد میں نتائج اخذ کئے جاتے ہیں لیکن انہوں نے اس کے برعکس پہلے نتائج تجویز کئے ہیں اور تحقیقات بعد میں شروع کی ہے ÷

شاید موجودہ سلسلۂ مضامین سے پہلے بھی ان کا ایک مضمون ماہ نو کی کسی سابقہ اشاعت میں شائع ہوچکا ہے۔ کیونکہ ایسا ایک مضمون میری نظر سے گذرا تھا۔ یہ یاد نہیں پڑتا کہ کونسے رسالے میں۔ اس کے بعد "ماہ نو" میں ہی کسی ایک دوسرے مضامین میں ان کا حوالہ بھی نظر سے گذرا۔ ان مضامین میں موصوف نے تین باتوں کا دعویٰ کیا ہے :

اول، سندھی مہروں کی تحریر عربی ہے۔

دوم، اس تحریر کی زبان عربی ہے، اور

سوم، موئن جو دڑو کے باشندے عربی الاصل تھے ÷

جہاں تک تحقیقات کا تعلق ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس زمانہ سے سندھی مہریں تعلق رکھتی ہیں اس وقت تک ابھی عربی تحریر کی جنم داتا عبرانی کی جد امجد فونیقی قوم صفحہ تاریخ پر نمودار بھی نہیں ہوئی تھی خود عربی کی پرانی سے پرانی تحریر جو ابھی تک معلوم ہوسکی ہے وہ حلب کے جنوب مشرق میں واقع، قصبہ زابادر کے مقام پر دستیاب ہوئی ہے جو کہ ۵۱۲ یا ۵۱۳ء کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ عربی زبان کا قدیم ترین کتبہ ۳۲۸ء سے تعلق رکھتا ہے اور وہ بھی آرامی رسم الخط میں مرقوم ہے۔ حقیقت میں عربی رسم الخط کی صحیح تکمیل کہیں حجاج بن یوسف والئ عراق ۷۵ھ تا ۹۵ھ کے عہد میں جاکر ہوئی ہے جس نے کہ شامی رسم الخط کی چند علامتیں اس میں شامل کرکے اسے موجودہ صورت دی ÷

اب رہا سوال عرب اور سندھ کے تعلقات کا تو اس کی تاریخ اگرچہ کافی پرانی ہے لیکن وہ بھی ۱۰۰۰ ق م سے آگے نہیں جاسکی۔ "عہد نامہ عتیق" سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے عہد ۱۰۱۵ تا ۹۷۵ ق م میں عرب اور ہند کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔ تقریباً اسی زمانہ میں ہی سامی الاصل فونیقی قوم کے ہندوستان کے جنوبی ساحل اور لنکا سے بحری تعلقات کا پتہ چلتا ہے، لیکن باہمی تعلقات کا صحیح سلسلہ جس کا کہ دستاویزی ثبوت موجود ہے وہ کہیں جاکر پہلی صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے جبکہ مصری نژاد رومن ہم بانہپالس نے ۴۵ء میں مون سون ہواؤں کی مدد سے بحیرہ قلزم سے ساحلِ ہند تک بحری راستہ دریافت کیا ÷

ایسا کوئی دستاویزی یا غیر دستاویزی ثبوت موجود نہیں کہ جس سے اہل موئن جو دڑو کے باشندوں کے عربی الاصل ہونے کا نظریہ قائم کیا جاسکے۔ اگر جزیرہ نمائے عرب میں کہیں سندھی مہروں کی تحریر سے مطابقت یا مماثلت رکھنے والا ایک آدھ کتبہ بھی موجود ہوتا تو ایسا مفروضہ قائم کرنا قرین قیاس تھا لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے ÷

میرا خیال ہے کہ ان سندھی مہروں کی تحریر پڑھنے کے لئے قدیم سنسکرت رسم الخط کی جستجو لازمی ہے۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ آریا لوگ وادئ سندھ میں وارد ہونے کے وقت کسی تحریر سے ناآشنا تھے سنسکرت کی داغ بیل ہند میں آریاؤں کے ورود کے بہت بعد پڑتی ہے۔ اس لئے یہ عین ممکن ہے سنسکرت رسم الخط کی حقیقی اصل یہی سندھی مہروں کی تحریر ہو۔ علاوہ ازیں اس بارے میں شمال ہند کے ہندوؤں میں مروجہ لنڈے رسم الخط بھی پیش کیا جاسکتا ہے، جو کہ کئی لحاظ سے ان مہروں کی تحریر سے ملتا جلتا نظر آتا ہے ÷

(معین الحق فریدکوٹی)

÷

نئی مطبوعات

خونِ حسینؑ

از عزیز ملک

ناشر: مکتبۂ معیار، صدر، راولپنڈی

صفحات ۲۱۵، مجلّد مع گرد پوش، قیمت ۸ روپے

زدم دستے بہ دامانِ شہیدِ کربلا آخر

کہ آں رمز آشنا بر حرفِ باطل خط کشید اینجا

معلوم ہوتا ہے مصنّف نے گرامی مرحوم کے اسی ارشاد پر عمل کرتے ہوئے حادثۂ فاجعۂ کربلا کی مکمل داستان سپردِ قلم کی ہے اور اس اہتمام سے کہ تمام اہم مآخذ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جس قدر تفصیلات بہم پہنچ سکیں اُن کا پورا پورا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں معروف مآخذ کے ساتھ ساتھ ان مآخذ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جن کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اس طرح تصویر کو زیادہ سے زیادہ جامع اور حقیقت افزا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تحقیق و تدقیق کے ساتھ کوائف و شواہد کی برجستہ ترتیب، ان پر مدلّل بحث اور استنباطِ نتائج سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی ہے۔ داستانِ حرم کے اس خونیں حصّہ میں جہاں سرخیِ خونِ حسینؑ یعنی حق و صداقت پہ زور ہے وہاں حرفِ باطل یعنی فریقِ مخالف کی اسلام شکن تخریبی کاروائیو کو بھی الم نشرح کیا گیا ہے۔ مصنّف کے سوز دروں اور جذبۂ دل نے جابجا وہ والہانہ کیفیت پیدا کر دی ہے جس سے خطابت کے کوندے لپکتے ہیں اور تاریخ کے خشک واقعات ایک خوش آئند سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ کتاب یقیناً اپنے موضوع پر ایک بیش بہا تصنیف ہے جو ادبی و تحقیقی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ (ر۔خ)

مسلم خواتین کی تعلیم

مصنّفہ: مولوی محمد امین زبیری

پبلشر: ادارہ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

قیمت نامعلوم صفحات ۲۰۸

اسلام ابتدائی دور سے ہی تعلیمِ نسواں کا مبلغ ہے قدیم زمانے میں بھی مسلمان خواتین زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ تھیں۔ اسی طرح برصغیر پاک و ہند کا ماضی بھی تعلیم یافتہ خواتین سے محروم نہ تھا۔ یہ کتاب ان حقائق کی بہترین ترجمان ہے۔ (ص ا)

اسلامی نظامِ تعلیم

مصنّفہ: پروفیسر سعید احمد رفیق

پبلشر: سید الطاف علی بریلوی جنرل سیکرٹری ادارہ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

صفحات: ۳۰۴ طباعت معمولی

قیمت مجلد: ۳ روپے

اس کتاب میں اسلام کے نقطۂ نظر سے تعلیم کی اہمیت کا ذکر ہے اور اس اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے پرانے نظامِ تعلیم پر محققانہ بحث ہے۔ ماضی میں برصغیر پاک و ہند میں اسلامی دورِ حکومت میں تعلیم کے لئے کیا کیا کوششیں ہوئیں اور کس کس انداز میں ہوئیں، یہ کتاب ان تمام مساعی جمیلہ کی عکاسی ہے اور شعبۂ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے نہایت کارآمد ہوگی۔ (ص۔ا ا)

المعجم الاعظم

(عربی با تصویر لغت)

مؤلف: حسن الاعظمی

ناشر: موتمرِ عالمِ اسلامی، کراچی۔

ملنے کا پتہ: پاکستان، مکتبہ اعظمیہ نزد گاندھی گارڈن گیٹ کراچی۔

قیمت: ۶۰ روپے (مکمل سیٹ)

موتمرِ عالمِ اسلامی کے نام سے ایک بین الاقوامی تحریک عرصے جاری ہے جو "پاکستان عرب کلچرل ایسوسی ایشن"، "رابطہ تالیف و ترجمہ"، "عربی کانفرنس" اور "عربی کالج" کی صورت میں سرگرم کار ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی ادارہ کے مجوزہ کورس اور معتمد عمومی پروفیسر حسن الاعظمی کی ۱۵ سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے اور حکومتِ پاکستان کی مالی امداد سے طبع ہوئی ہے۔ اس ضخیم اور جامع لغت کا مقصد عربی زبان کو کما حقہٗ روشناس کرانا ہے چنانچہ یہ تقریباً دس لاکھ قدیم و جدید الفاظ و مشتقات، ایک لاکھ مادّوں بے شمار نادر تصاویر، امثال، اصطلاحات، احادیث اور مقدمات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس میں عربی زبان کے ساتھ ہی ساتھ اس تہذیب و تمدّن کی جھلک بھی نظر آتی ہے جس کی یہ ترجمان ہے۔ پہلا ایڈیشن لیتھو میں چھپا ہے۔ حسبِ اعلان دوسرا ایڈیشن ٹائپ میں ہوگا۔ مکمل سیٹ کی قیمت ۶۰ روپے ہے۔ (ر۔خ)

ومٹو ایک جھوٹی کہانی

مصنف:۔ خلیل عزیزی
مجلد:۔ ۲۳۴ صفحات (مع کارٹون)
ناشر:۔ اورنٹیل بک ڈپو
کے، بی ۱، ۲۔ ناظم آباد کراچی

یہ وہ کہانی ہے جس میں راحت حسن ومٹو، پاکستان کے سربرآوردہ افسانہ نویس ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو کر سارے اردو ادب کو سوگوار چھوڑ جاتے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر تک صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ اخبارات کے ومٹو نمبر نکل آتے ہیں۔ تعزیتی جلسے، پیغامات، بیانات، غرض سب کچھ ہو چکتا ہے تو ومٹو ہوائی کمپنی کی کوششوں کی بدولت ایک سمندری کشتی میں صحیح سلامت مل جاتا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ عزیزی صاحب سے سنئے۔ مگر دراصل کچھ بھی نہیں ہوتا! عزیزی صاحب نے ادب اور ادیب کی ناقدری پر درحقیقت بڑا دلچسپ طنز کیا ہے۔ ومٹو کے زندہ ہو جانے کے باوجود کہانی کو پڑھنے کے بعد اس خیال سے تسکین ہوتی ہے کہ یہ جھوٹی ہے۔ کسی موثر ٹریجیڈی سے بھی ایسا ہی احساس پیدا ہوتا ہے لیکن افسانے کی ہیئت اور انداز میں کہیں ٹریجیڈی کا شائبہ تک نہیں بلکہ سراسر ومٹو کے جی اٹھنے کا دل خوش کن قصہ ہے۔ مصنف کا یہ اچھوتا طنز قابل داد ہے۔ کتابت۔ طباعت بھی پاکیزہ ہے۔

(ش۔ ح)

چٹانیں اور رومان

مصنف: خاطر غزنوی
پبلشر: خادم کو، پشاور
قیمت: ۲ روپے چار آنے
صفحات: ۱۶۴

اٹک کے اس پار کا علاقہ جسے بادی النظر میں صرف چٹانوں یا چٹانوں جیسے لوگوں کا دیس سمجھا جاتا رہا ہے، جہاں کی زندگی صرف بندوقوں اور گولیوں کی آتش باری سمجھی جاتی رہی ہے، وہاں برگِ گل سے زیادہ نازک دل اور شبنم کے قطروں سے زیادہ روشن آنکھیں بھی ہو سکتی ہیں، وہاں دلوں کا تڑپنا اور آنکھوں کا برسنا بھی ممکن ہے، سنگین چٹانوں سے خون کے چشموں کے بجائے رومانوں کے لطیف اور شیریں چشمے بھی پھوٹ سکتے ہیں، یہ سب کچھ پشتو کی ان الف لیلوی داستانوں سے معلوم ہو سکتا ہے جو چٹانیں اور رومان کے نام سے خاطر غزنوی نے پیش کی ہیں۔ ترجمے نہایت لطیف اور شستہ زبان میں کئے گئے ہیں۔ البتہ کتابت اور طباعت محلِ نظر ہے۔ (ص ا)

نوائے فردا

از: شیخ محمد ایوب
ملنے کا پتہ: فیروز سنز، لاہور، کراچی
صفحات: ۲۰۰، قیمت ۵ روپے

کاریگری کا ایک کمال یہی ہے کہ ایک چیز کا رنگ دوسری چیز سے اس طرح ملا دیا جائے کہ دونوں میں امتیاز مشکل ہو۔ دراصل یہ اپنے محبوب فن کار سے یکجان ہونے کی خواہش کا نتیجہ ہے "بہت ہم تقلید از اسمائے عشق" اور اس عشق میں متبع شاعر نے فنا کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس نے اپنے معتقد اقبالؒ کو اس طرح اپنایا ہے کہ تقریباً "من تو شدم، تو من شدی" کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ نوائے فردا حکیم ملت کی "زبورِ عجم" کی ہر اعتبار سے من و عن نقل معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہی قدرتِ بیان مصنف کی اپنی خودی کو نمایاں کرنے پر صرف ہوتی جیسا کہ اقبالؒ کی تعلیم تھی تو وسیع تر تخلیق کا امکان ہوتا، تقلید کی کوشش میں مقلد نے جہاں کافی کچھ پایا ہے وہاں بہت کچھ کھویا بھی ہے۔

(ر۔ خ)

بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد

از: رئیس احمد جعفری
ناشر: غلام علی اینڈ سنز، لاہور، کراچی
صفحات ۱۲۶۰ قیمت -/۲۰ روپے

آخری تاجدارِ مغلیہ بہادر شاہ ظفر اور اس کا عہد کتنی ہی دلچسپیوں کا حامل ہے۔ اس ضخیم کتاب میں جو رئیس احمد جعفری نے اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں تحریر کی ہے ان دلچسپیوں کا ہر پہلو سے جائزہ لیا گیا ہے اور ایسی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں جن سے اس دور کی ایک واضح تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے اور کہیں ہم اپنے عہدِ رفتہ کی شان و شوکت پر خوش ہوتے ہیں اور کہیں دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" شاید اسلئے بیان بھی خاصا طویل ہے۔

(ر۔ خ)

رسیدِ کتب

(ریویو کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

۱:۔ ثقافت و انتشار، میتھیو آرنلڈ کی کتاب کا ترجمہ۔
۲:۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔
(ادارۂ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی)

چین سے دو خط
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ۔ چین
۱۰ اگست ۱۹۴۲ء
...... گزشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ دل روز کی شیشی ملی۔ شکریہ! مجھے دس سال کے پھوڑے پھنسی کی تکلیف تھی ہر قسم کی دیسی و انگریزی ادویات استعمال کیں مگر کچھ بھی افاقہ نہ ہوا۔ دل روز کو صرف چھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت جاتی رہی۔ کاش! مجھے پہلے ایسے زود اثر علاج کا علم ہوتا......
ن۔ ا۔ خ
میجر
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ۔ چین
۲۲ جولائی ۱۹۴۲ء
...... مجھے کچھ عرصے سے گردن پر ایک قسم کی پھنسیاں ہیں جن کی وجہ سے خارش بہت ہوتی ہے۔ انگریزی علاج کے باوجود افاقہ نہیں ہوا۔ اخبار میں آپ کی دوائی دل روز کا اشتہار دیکھ کر خیال ہوا کہ اسے بھی استعمال کر کے دیکھوں۔
ن۔ ا۔ خ میجر
دل روز تمام الامراض علاج جلدی الامراض
ہر قسم کے پھوڑے پھنسی
کے کاٹے اور ڈسے کا بے ضرر اور زود اثر علاج ہے۔
چیر پھاڑ اور مرہم پٹی سے نجات دلاتی ہے
قیمت فی شیشی
دو روپیہ ۔ ایک روپیہ
استعمال میں ہے
ہر مشہور دوا فروش سے طلب کریں
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز ڈلہوزی فیروز پور روڈ لاہور۔ پنجاب

مشرقی پاکستان کی مساجد

(قدیم طرز تعمیر کے چند نمونے)
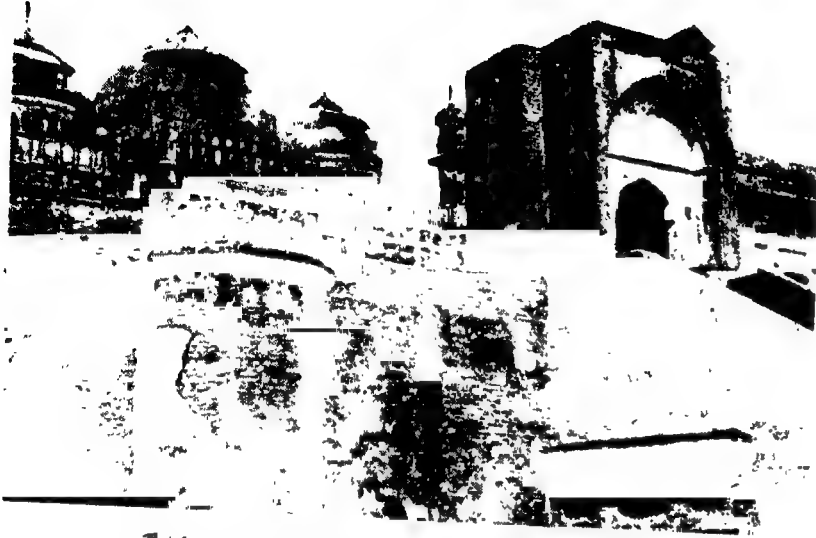
قلعہٴ لال باغ (ڈھاکہ) کی ایک مسجد کا گنبد
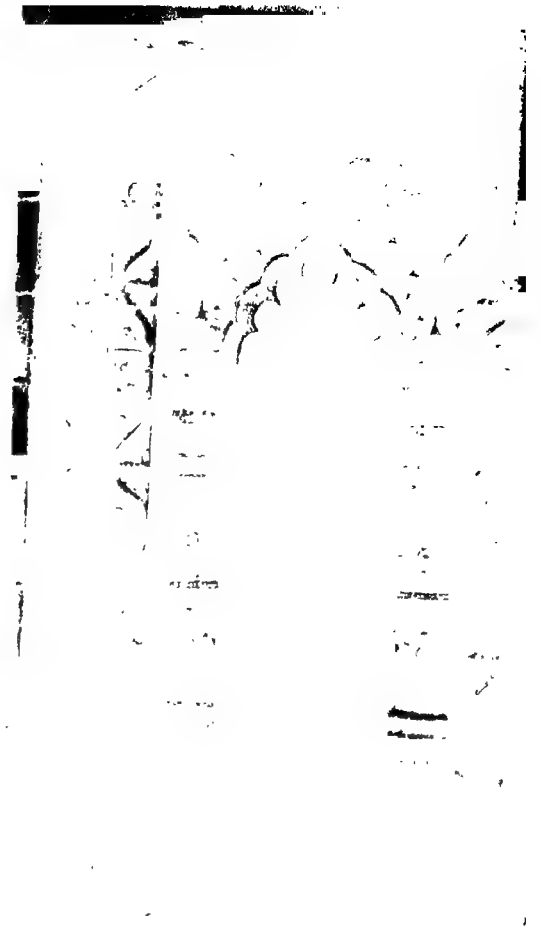
کسم مسجد (راجشاھی) کی مرکزی محراب

مسجد ست گنبد (کھلنا)
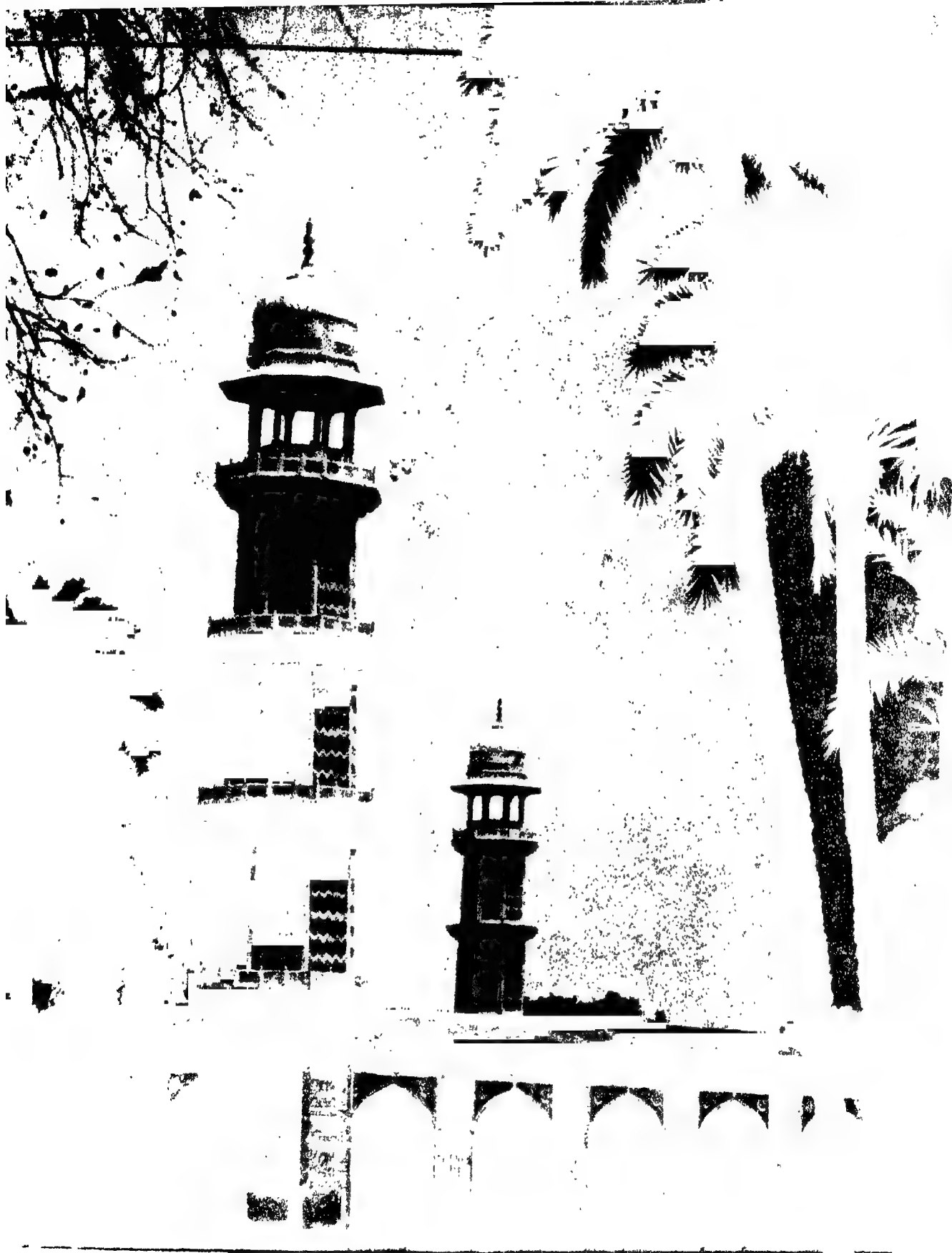
اردو

ڈاکٹر عندلیب شادانی — یوسف ظفر — سیّد آل رضا

رئیس احمد جعفری — جمیل واسطی — سیّد عبدالحمید عدم

غلام الثقلین نقوی — ادیب سہارنپوری — عبدالعزیز خالد

اکتوبر ۱۹۵۷
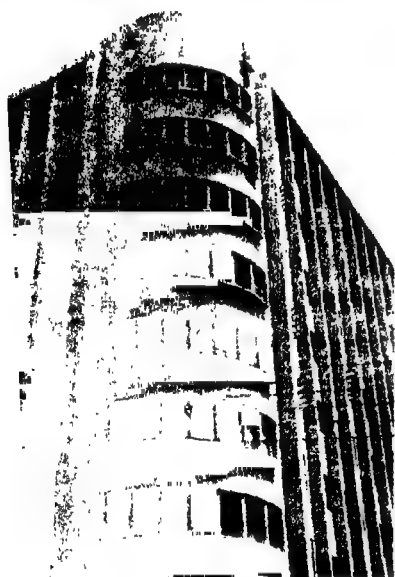
۸ر

میونسپل کارپوریشن

ایمپریس مارکیٹ

ہوائی اڈہ

حمام سمندر (کلفٹن کے ساحل پر)

کراچی

نئی تعمیرات:
محمدی ہاؤس

کیماڑی پر جہازوں کی آمد و رفت
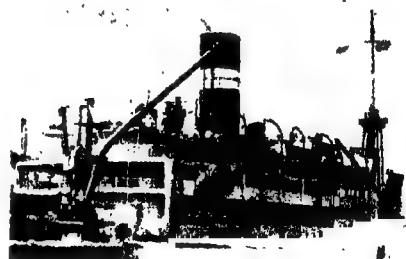
سطح آب پر بادبانی کشتیوں کا خرام

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۷

اکتوبر ۱۹۵۷ء

ادارۂ تحریر

رفیق خاور

ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی — آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اپس کی باتیں

گزشتہ ماہ ملک میں مؤسس پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی نویں برسی کے سلسلہ میں ملک گیر سوگ منایا گیا اور ہم سبنے بابائے قوم کی یاد میں عقیدت و ارادت کا خراج پیش کیا۔ ان کے کارناموں پر نظر ڈال کر اپنے لئے نئی امنگوں اور نئے جوش و عزم کا اظہار کیا۔ ہر فعال بیدار قوم اپنے ابطالِ عظیم کی یاد سے ہمت کو جواں اور عزم کو بیدار و متحرک کرتی ہے کیونکہ ملی شعور کو تازگی و توانائی بخشنے کے لئے اپنے اعمال پر محاسبہ کرنا اور اکابر کی زندگی سے درسِ حیات حاصل کر کے اصلاحِ احوال میں مدد لینا بڑی ضروری چیز ہے ؛

مؤسس پاکستان نے جس عمارت کی داغ بیل ڈالی اور اس قصر کی بنیادیں مستحکم کر کے اٹھائیں، اس پر بام و سقف بنانے سجانے اور دروبست ٹھیک کرنے کا اہم کام ان کے معتمد و جلیسِ خاص 'لیاقت علی خاں' کو تفویض ہوا، ملک کی تاریخ اپنے پہلے وزیر اعظم کی انتظامی صلاحیتوں، ملی خلوص، دبدبہ اور فراستِ مومن کے مظاہرات اور مثالوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ۔ اگر ہر سال ستمبر قائد اعظمؒ کی یاد ہمیں دلاتا ہے تو فوراً ہی بعد ماہ اکتوبر ہمارا ذہن لیاقت علی خاں کی وقیع و عظیم شخصیت کی طرف منعطف کر دیتا ہے۔

ہم اس شمارہ میں رئیس احمد جعفری صاحب کا ایک مقالہ پیش کر رہے ہیں جس میں موصوف نے قائدِ ملتؒ کی تصویرِ زندگی کے بعض اہم گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔

مؤسس و معمارِ پاکستان کی یادوں کے ساتھ ساتھ مفکرِ پاکستان کی طرف بھی ذہن منتقل ہو جاتا ہے جو ایک قدرتی تلازمۂ خیال ہے۔ اقبالؒ کی فکرِ رسا نے اسلامیانِ برِصغیر کے مقدر کو جس طرح اپنی چشمِ بینا سے دیکھا تھا اور اس کے لئے جو نصب العین اور خاکہ تجویز کیا تھا وہ ہمیشہ کے دائمی بقا و استحکام کے باب میں حرفِ آخر ثابت ہوا۔ اور تقدیرِ اُمم کا یہ آشنا بے راز جیتے جی کی بات بتا گیا تھا اس کو پاکستان کی نمود میں آنا مقدر ہو چکا تھا اور ملت کے لئے جو نسخۂ کیمیا اس "حکیم" نے تجویز کر دیا تھا، اس کے نتیجہ پر زرِ خالص ہونے کی مُہر ۱۹۴۷ء میں لگ گئی ؛

مفکرِ ملت کے کاموں کا احاطہ کرنے کی گفتگو کبھی بے مزہ نہیں ہو سکتی اور اگر اس کے فکری ارتقا کی مختلف کڑیوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ بجائے خود ایک اہم ترادبی و ملی خدمت ہے۔ جناب یوسف ظفر کا مقالہ جو اس اشاعت میں پیشِ نظر ہے اس خصوص میں بڑی اہمیت کا حامل ہے ؛

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ہماری طرف ایک عرصہ کے بعد نگہِ التفات کی ہے جو بظاہر نگاہ سے کم ہے، مگر ہم ان کے ممنون ہیں۔ اس دفعہ ان کا طنزِ ملیح ایک فکاہیہ ادب پارے کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور اس اشاعت میں شریک ہے اور امید ہے اربابِ ادب و ذوق کے حلقوں میں مزے لیکر پڑھا جائے گا۔ اور حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے "فرضی نام و مقام" کے پردوں کے پیچھے جھانکنے کی سعی بیہودہ نہ کی جائیگی!

بہرہ منظومات میں منجملہ دیگر پاکیزہ شعری پاروں کے ایک طویل آزاد نظم جناب عبدالعزیز خالد کے قلم سے نذرِ قارئین کی جا رہی ہے جو اپنی بلاغت، آہنگ، موضوعِ فکر اور ترصیع کاری کے باب میں خاصانِ ادب کے لئے بالخصوص شائستہ توجہ ہے ؛

بہ یادِ قائدِ ملت:

لیاقت علی خاں (مرحوم)

رئیس احمد جعفری

لیاقت علی خاں کی سیاسی زندگی کا جب آغاز ہوا تو متحدہ ہندوستان ایک بحران میں مبتلا تھا، آزادی اور حریت کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ برطانوی سامراج اپنی پوری قہرمانیت کے ساتھ، آزادی کے ولولہ اور جذبہ کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کر رہا تھا، کانگرس اور خلافت کے سٹیج سے طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں، ہندوستان کا ہر شخص، نشۂ حریت میں سرمست تھا، اسکول بند ہو رہے تھے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا مقاطعہ کیا جا رہا تھا، عدالتیں سونی پڑی تھیں، جیل کے دروازے کھلے ہوئے تھے، قید و بند، اور دار و رسن کی روایات کہن تازہ کئے جا رہے تھے، وکیل اور بیرسٹر، کسان اور زمیندار، غریب اور دولت مند، ایک ہی صف میں کھڑے تھے، ہنگامہ خیز جلسوں کا بازار گرم تھا، قیامت آفریں جلوسوں کا نظارہ چشم فلک کے لئے بھی حیرت انگیز تھا، وطن اور قوم کے لئے ایثار اور قربانی کے مظاہرے ہو رہے تھے، لمبی مدت کی سزاؤں کا حکم، لوگ مسکراتے ہوئے سنتے تھے، جائداد کی قرقی روزمرہ کا واقعہ تھا، وطن کے جانبازوں اور فداکاروں کا سیل رواں پھانسی کے پھندے کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ہندوؤں میں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، مسلمانوں میں محمد علی، شوکت علی، اجمل خاں، انصاری، ابوالکلام اور شیخ الہند کا طوطی بول رہا تھا، ـــــ لیکن لیاقت علی خاں نہ کسی جلسہ میں نظر آتے ہیں، نہ جلوس میں، نہ پنڈال میں نہ اسٹیج پر، نہ لیڈر کی حیثیت سے، نہ رضاکار کے رنگ میں نہ

کانگرس اور خلافت کی تحریکیں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں، ہندو مسلم اتحاد، افسانۂ پارینہ بن چکا ہے، فساد اور فتنہ کی گرم بازاری شروع ہو چکی ہے، شردھانند اور مالوی نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کر رکھی ہے، حسن نظامی اور کچلو نے تبلیغ و تنظیم کا پرچم بلند کر رکھا ہے، نئی نئی جماعتیں ہیں، جوش و خروش کا دور دورہ ہے، ـــــ لیکن لیاقت علی خاں، اس مرحلہ پر بھی نہیں ابھرتے، انہیں نہ تنظیم سے دلچسپی ہے، نہ تبلیغ سے، وہ اپنے گوشۂ عافیت میں مگن ہیں ÷

تاریخ کا ایک ورق اور الٹتا ہے، منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ہو چکا ہے، صوبوں میں مجالس آئین ساز قائم ہو چکی ہیں، متعدد سیاسی جماعتیں، اپنے نمائندوں اور ممبروں کو لے کر، کونسل میں پہونچ چکی ہیں ÷

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس مجمع میں، لیاقت علی خاں بھی نظر آتے ہیں لیکن، نہ ہاتھ میں کسی سیاسی جماعت کا جھنڈا ہے، نہ سینہ پر کوئی تمغہ، الگ، الگ، خاموش خاموش ـــــ کچھ عرصہ بعد، یوپی کونسل کے ڈپٹی پریسیڈنٹ بن جاتے ہیں، اب زبان کھلتی ہے، نطق کے جوہر کھلتے ہیں، لیکن نہ اتنے کہ کہا جائے،

می تافت ستارۂ بلندی

●

۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تجدید احیا کا فریضہ قائد اعظم انجام دیتے ہیں، مسلم لیگ، ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں سب سے زیادہ "انقلاب پسند" جماعت تھی۔ انقلاب پسند اس اعتبار سے کہ اس کی پالیسی میں نظریات میں، عقائد و خیالات میں، عمل اور آہنگ میں بار بار اور جلد جلد انقلاب ہوتا رہتا تھا، ہر نیا صدر، اس کی باگ جدھر چاہتا تھا موڑ دیتا تھا، ہر نئے اجلاس میں اس کی منزل مقصود بدل جاتی تھی، اس پر بڑی آسانی سے قبضہ ہو جاتا تھا، نہ قبضہ کرنے میں دیر لگتی تھی، نہ قبضہ سے دستبردار ہونے میں، اس کی تاسیس و تشکیل میں اسلامی ہند کے

بہترین دل و دماغ شریک تھے، محسن الملک، وقار الملک، محمد علی، آغا خاں، لیکن بہت جلد وہ موقع پرستوں کی کنیز بن گئی، سر رضا علی قابض ہوئے تو وہ الف لیلہ کے پیر تسمہ پا ثابت ہوئے، مہاراجہ محمود آباد نے دستِ شفقت پھیرا تو وہی سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں آئے، تو انہیں حقوقِ شہنشاہی حاصل ہو گئے، عزیز مرزا نے باگ سنبھالی، تو جب تک ہاتھ شل نہ ہو گئے، باگ نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا، ظہور احمد سکریٹری بنے تو ان کی کوٹھی، مسلم لیگ بن گئی، مظہر الحق مسندِ صدارت پر متمکن ہوئے تو رنگ کچھ اور ہو گیا۔ ڈاکٹر انصاری نے کرسئ صدارت پر قبضہ کیا تو رنگ بالکل بدل گیا، سر علی امام کو یہ رتبۂ بلند ملا، تو حالات نے پلٹا کھایا، سر عبد الرحیم نے صدارت کی تو مسلم لیگ فرقہ پرست بن گئی، سر شفیع صدر ہوئے تو سرکارِ برطانیہ کی یار وفادار ہو گئی، حسرت موہانی کے نام قرعۂ صدارت پڑا تو قومیت متحدہ، اور حریت و آزادی کی علمبردار نظر آنے لگی، سر یعقوب نے عنانِ صدارت ہاتھ میں لی، تو پالیسی بالکل منقلب ہو گئی، غرض ہر سال، اور ہر صدر کے ساتھ مسلم لیگ کے آب و رنگ اور خد و خال میں فرق آتا رہا لیکن قائدِ اعظم کے جلوہ فرما ہوتے ہی حالات یکسر بدل گئے، اور بہت جلد مسلم لیگ، مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔ ـــــ اس موقع پر لیاقت علی خاں، مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے نظر آتے ہیں ـــــ فعال، کارگزار، مخلص، وفادار، لیکن بڑائی اور عظمت؟ ابھی لیاقت علی خاں اس سے بہت دور ہیں۔

حالات پلٹا کھاتے رہے، سیاست ہند کے رنگ میں تبدیلی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں، عارضی وزارت، کانگریس اور مسلم لیگ کے اشتراک سے قائم ہوتی ہے، لیاقت علی خاں، وزارتِ مالیات کی کرسی پر تشریف فرما ہوتے ہیں، پھر وہ اپنا میزانیہ پیش کرتے ہیں، ''انقلابی میزانیہ، غریب آدمی کا بجٹ'' ـــــ اس بجٹ پر، سرمایہ دار، صنعت کار، مالکان مل، خوفناک حملہ کرتے ہیں، ولبھ بھائی پٹیل کی قیادت میں' کانگریس بھی اس کی مخالفت کا فیصلہ کر لیتی ہے، کہ عوامی جماعت ہونے کے باوجود اس کا مزاج بہر حال سرمایہ دارانہ تھا، لیاقت علی خاں سب کی سنتے ہیں، پھر اپنی کہتے ہیں، ان کی جوابی تقریریں دلائل ہیں، حقائق ہیں، جوش ہے، جذبہ ہے، شگفتگی ہے، روانی ہے' ـــــ اور دفعۃً اس تقریر کے بعد لیاقت علی خاں بڑائی اور عظمت کی مسند پر متمکن ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان تقسیم ہوتا ہے، پاکستان بن جاتا ہے، لیاقت علی خاں، اس نئے ملک کے پہلے وزیر اعظم منتخب ہوتے ہیں، حالات بے انتہا ناسازگار ہیں، اس نئے ملک کے پاس نہ سکریٹریٹ ہے' نہ پورا عملہ' نہ فرنیچر، نہ قلم دوات، فوج جو تھوڑی بہت ہے وہ بھی بکھری ہوئی' ہندوستان سے لاکھوں تباہ حال، اور تباہ و برباد مسلمانوں کے قافلے، پاکستان کی سمت رواں دواں ہیں' ان کی ہر چیز چھن چکی ہے، ان کے پاس کچھ نہیں ہے، نہ لباس ہے نہ اناج، نہ مکان نہ روپیہ، لیاقت علی خاں وزیر اعظم کی حیثیت سے اس طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں' اور کامیاب ہوتے ہیں ـــــ لیاقت علی خاں کی عظمت اور نمایاں ہو جاتی ہے، مخالف بھی ان کے تدبر اور سحر طرازی کے قائل ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کو قائم ہوئے ابھی صرف ایک سال ہوا ہے کہ قائد اعظم اس دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، ان کی وفات کے معاً بعد ریاست حیدر آباد پر پولیس ایکشن، انڈین یونین کی طرف سے ہوتا ہے، حالات دگرگوں ہو جاتے ہیں، مسلمانانِ پاکستان اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتے ہیں، ان کا حوصلہ پست ہونے لگتا ہے، ان پر دہشت اور سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، ہر شخص پریشان ہے، اور سوچ رہا ہے اب کیا ہوگا؟ ـــــ لیکن لیاقت علی خاں کی چند تقریریں نقشہ بدل دیتی ہیں، ان تقریروں میں ولولہ تھا، خود اعتمادی تھی، زندگی کی تڑپ تھی، یہ تقریریں نہ تھیں، سحر تھیں، انہوں نے کایا پلٹ دی، حالات بدل دئیے، عامۂ مسلمین میں ایک نیا جذبہ، ایک نیا جوش، ایک نیا احساس پیدا کر دیا۔ وہی مسلمان جو ہراساں اور دلگیر تھے، اب جوش سے معمور، اور نشۂ ملی سے مخمور تھے۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک جام
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی!

لیاقت علی خاں اور بڑے، بہت بڑے ہو گئے!

۱۹۵۰ء میں، ٹرومین کی دعوت پر لیاقت علی خاں نے امریکہ کا دورہ کیا، لیکن اس طرح کہ اپنی خودی کو سر بلند کئے ہوئے۔ نہ ان کے

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

قائد ملت مرحوم

قائد ملت، لیاقت علی خاں، لندن کے کنگزوے ہال میں قائداعظم رح کے ساتھ ایک تقریب میں
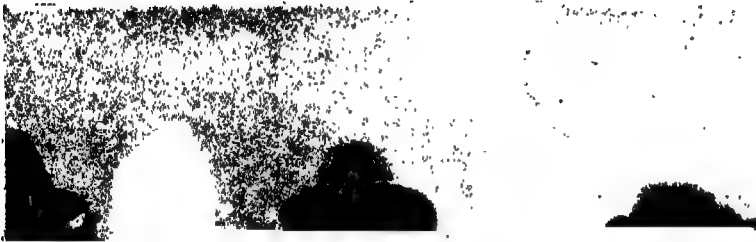
قائد ملت، لیافت علی خاں کی دسمبر ۴۶ء میں سیاسی مذاکرات کے لئے لندن کے ھوائی اڈہ پر آمد

ھزایکسیلنسی مسٹر احمد بالفرح، وزیر خارجہ مراقش، حال ھی میں کراچی تشریف لائے، تصویر میں وہ قائد ملت کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھا رھے ھیں
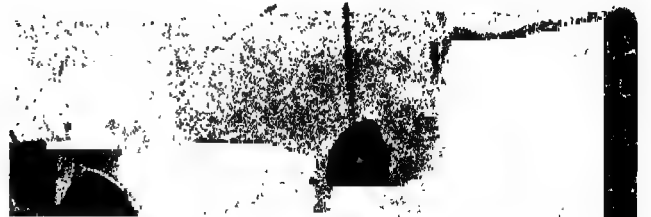
کستانی مصوری کی نمائش

اهتمام آرٹ کونسل پاکستان، کراچی)

صدر جمہوریہ ، جناب اسکندر مرزا نے
نمائش کا افتتاح فرمایا

جناب حسین شہید سہروردی ، وزیراعظم پاکستان،
نے نمائش کی بعض تصاویر میں گہری دلچسپی
کا اظہار کیا

مشرقی پاکستان کے مصور ،
سید جہانگیر کی تصاویر کی نمائش،
(کراچی) جس کا افتتاح مرکزی
وزیر تعلیم، جناب ظہیرالدین نے کیا

اقبال کا تدریجی ارتقاء

یوسف ظفر

اقبال کی شخصیت کے گرد تصوّف اور اس کے فن کے گرد فلسفے کا ایسا چند ھیا دینے والا ھالا تیار کر دیا گیا ہے کہ ہم اس کی فنکارانہ صلاحیت اور اس کے شاعرانہ مقام کو اس نظر غائر سے دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے جس کا وہ مقتضی ہے۔ شخصیت پرستی نے اکثر نقادوں کو اس ضرورت کا احساس نہیں رہنے دیا کہ جب تک ہم اقبال کے کلام کو انسان کا کلام نہیں سمجھیں گے، انسانی کلام کی طرح اس کا تجزیہ نہیں کریں گے۔ اس کے محاسن کو آنے والی نسلوں پر روشن نہیں کریں گے، اس کے فن کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے بعد اردو شاعری نے جو تجربات کئے، روایت سے جس بیزاری کا اظہار کیا، غیر ملکی قدروں کو جس طرح اپنایا، وہ اس ذہنیت کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا جس نے اقبال کو پیغمبری اور اس کے فن کو الہام کے درجے پر پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ اس دور کے فنکاروں کا احساسِ کمتری اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

اقبال فلسفی ہے، اس میں کسی کو کلام نہیں۔ اس نے سانحۂ کربلا سے لے کر آج تک بتدریج مائل بہ انحطاط مسلمان کو اپنے فرض منصبی سے خبردار کرنے کے لئے فن کا سہارا لیا۔ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اس نے انسان کو اس کے مقامِ حقیقی سے روشناس کرانے کے لئے شاعری کو اپنا وسیلہ بنایا۔ یہ بھی حقیقت سہی لیکن کوئی نقاد اس حقیقت سے روگرداں نہیں ہو سکتا کہ ان حقائق کو نظم کرنے کا نام شاعری نہیں۔ کوئی فلسفہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، جب تک جذبے اور احساس کی کٹھالی میں فکر و نظر کی آنچ کھا کر کندن نہیں بن جاتا، شعر کے میزان پر پورا نہیں تُلتا، کسی فلسفی کو شاعر نہیں بنا سکتا۔ شاعری کے حیطۂ نگاہ میں تمام کائنات خام مواد کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ خالقِ کائنات کو بھی اپنے سخن کے دائرے سے باہر نہیں سمجھتا۔ اس کے فکرِ رسا کا ایک شعبہ فلسفہ بھی ہے اور اسے محض فلسفی ٹھیرانا نہ صرف اس کی فنکارانہ عظمت کو محدود کرنے کے مترادف ہے، بلکہ قارئین کو اس سے خوف زدہ کرنے کے مترادف بھی۔ کہ جب ہم نے اقبال کو فلسفی قرار دے دیا تو کون اس کے شعر سے وہ کیف و سرور حاصل کر سکتا ہے جو اس کے شعر کی جان ہے؟ کون اس کے کلام کو اس نظر سے دیکھے گا جس سے غالب، شیکسپیئر اور حافظ کو دیکھا جاتا ہے؟ چنانچہ میرے خیال میں وہ حضرات جو یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اقبال کو فلسفی ٹھیرا کر اقبال اور اس کے فن پر احسان کیا ہے، اس کے اور اردو شاعری کے دشمن ہیں۔ اور آج کی شاعری کی کجروی اور اپنی روایات سے بیزاری کی ذمہ داری انہی کی گردن پر ہے۔

غرض عظیم ترین فلسفہ بھی ایک نااہل تُک بند کو شاعر نہیں بنا سکتا۔ شاعری کے اپنے پیمانے ہیں اور اپنے میزان۔ جب تک کوئی کلام ان پیمانوں کے مطابق نہیں، ان میزانوں پر پورا نہیں اُترتا، وہ قلمروِ سخن میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی عظمت اس میں ہے کہ اس کے ہاتھ میں ہر خیال، ہر تصوّر، ہر فلسفہ، ہر جذبہ ایک ایسا لازوال پیکر بن گیا ہے کہ اس کی جمالیاتی اور ادبی حیثیت صدیوں قائم و باقی رہے گی۔ اس نے اپنے تجربات، احساسات، تخیلات اور فلسفہ کو پری خانوں میں اتارا، انہیں الفاظ کے ایسے نادر محلات میں ٹھیرایا، انہیں ایسا سوز و گداز، اثر و خلوص، شیرینی اور گھلاوٹ، کیف و سرور، نزاکت و ملائمت اور جلال و شکوہ عطا کیا کہ اردو شاعری رہتی دنیا تک اس کی مرہونِ احسان رہے گی۔ وہ ایک ایسا فنکار ہے جس نے اردو نظم کو گہوارے سے نکالا، اسے اپنے خونِ جگر سے پالا، اپنی آنکھوں کے سامنے اسے تعلیم و تربیت سے سنوارا، بلوغت کو پہنچایا جہاں وہ عالمی ادب کے دوش بدوش فخر و مباہات سے کھڑی ہے، اور دنیا کی عظیم ترین شاعری میں اپنا مقام پیدا کئے ہوئے ہے۔ انہیں کے الفاظ میں:-

مری قدر کر اے زمینِ سخن　　تجھے بات میں آسماں کر دیا

یہ قدرت کہ ہر خیال ندرتِ اظہار سے تاثرات و کیفیات کا سرچشمہ بن جائے اچانک پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فنکار کی نظر اپنے تمام تر ادبی سرمائے پر ہو، اس کے فکر کی اساس ماورائیت تک پھیلی ہوئی ہو، اس کے سامنے الفاظ جیتے جاگتے، چلتے پھرتے غلام ہوں۔ زندگی کے تجربات اسے نادر تشبیہات اور انوکھے استعارات کی دولت پیش کریں تو وہ دامن پھیلائے منتظر رہے اور اپنے حُسنِ قبول سے انہیں زندہ کر دے۔ ہر جذبہ کتنا ہی اجنبی کیوں نہ ہو، اس کی کشتِ دل سے اُگے اور بار ور ہو۔ اس کے لئے ہر منظر، ہر کیفیت، ہر واقعہ، دھڑکتا ہوا، سانس لیتا ہوا انسان ہو جو اسے اچھوتے حقائق سے باخبر کرے۔ اقبال ایک ایسا ہی فنکار ہے اس سے کم تو فنکار کے لئے وہ عظمت ممکن ہی نہیں جہاں "بانگِ درا" کی اوّلین نظم سے لے کر "ارمغانِ حجاز" کے آخری مصرعے تک نے اسے پہنچایا ہے۔ اور اس قدرتِ اظہار کا راز اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

چنانچہ ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کے تمام تر کلام کو دیکھیں اور معلوم کریں کہ اس نے خونِ جگر سے اپنے فن کی کس طرح آبیاری کی اور یہ قدرت و کمال کیسے حاصل کیا:

"بانگِ درا" کی پہلی نظم "ہمالہ" کے مطالعے سے ہی ہم اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ فنکار فنی کمال کی وہ بہت سی منزلیں طے کر آیا ہے جن تک پہنچتے ہوئے اکثر شاعر دم توڑ دیتے ہیں۔ اس کی ابتدائی کاوش ہی اس کی انتہائی غمازی ہے۔ "ہمالہ" ۱۹۰۰ عیسوی میں یا اس سے ایک آدھ سال پہلے لکھی گئی۔ اس وقت تک اردو نظم گھٹنوں چل رہی تھی جس نظم کی بنیاد آزاد اور حالی نے رکھی تھی وہ ابھی تک اپنی حدود بھی متعین نہیں کر سکی تھی۔ آزاد کی نظمیں خشک اور مصنوعی ہیں، ان میں وہ کیف و آہنگ نہیں جو کسی اقبال کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ حالی کی فنی چابکدستی اور لطافتِ اظہار البتہ ان چند نظموں میں بھی ملتی ہے جو مسدس اور مرثیۂ غالب کے علاوہ ہیں۔ ان دو فنکاروں کے علاوہ اقبال کے سامنے کسی نظم گو شاعر کا کلام اردو زبان میں نہ تھا جو اس کے لئے مشعلِ راہ بن جاتا۔ نادر کاکوروی کے تراجم یقیناً بڑے زندہ و کامیاب ہیں لیکن ان کا اسلوب بھی اقبال کے لئے رہنما نہیں قرار دیا جا سکتا کہ "ہمالہ" اور اس کے بعد کی نظمیں بندش و اسلوب، ہیئت و رنگ کے اعتبار سے اردو شاعری کے لئے بالکل نئی چیز ہیں۔ اب تک نظم سے مراد یہ لی جاتی تھی کہ ایک موضوع پر اپنے خیالات کو شعر کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یہ نظمیں قصیدے سے قریب تر تھیں۔ کہ قصیدے میں جہاں ممدوح بادشاہ یا کوئی صاحب ثروت شخصیت ہوتی ہے وہاں نظم میں کسی مرغوب یا محبوب شے یا شخصیت کو موضوع قرار دے لیا گیا ہے۔ غلو اور مبالغے کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو "ہمالہ" بھی اپنے پیشروؤں سے مماثل ہے۔ اس کی ابتدا بھی قصیدے کی طرح ہوئی ہے "اے شاہ جہاہ" کی بجائے شاعر نے "اے ہمالہ" "اے فصیل کشورِ ہندوستاں" کہا ہے۔ اس نے اپنے ممدوح یعنی "ہمالہ" کی ثنا خوانی کا حق ادا کیا ہے۔ اس کی چوٹیوں کو ثریا سے سرگرم سخن بتایا ہے، اس کا وطن "پہلوئے فلک" ٹھیرایا ہے، اس کے چشموں کو "آئینۂ سیال" قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہ نظم در و بست، شکوہ اور الفاظ کی بلند آہنگی اور پختگی کے اعتبار سے قصیدوں سے زیادہ قریب ہے لیکن ایک بات اس پہلی نظم ہی سے ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ شاعر کوئی معمولی شاعر نہیں۔ وہ شاعر جس کی شاعری کا سنگِ بنیاد "ہمالہ" ہے، اپنی انتہا کو پہنچ کر ستاروں سے آگے نکل گیا اور اپنی شاعری میں راستے کی تمام منزلوں کے نشان چھوڑ گیا:

"ہمالہ" اور "بانگِ درا" کی دوسری ابتدائی نظمیں اقبال کی متاعِ نظر و فکر کو جاننے کے سلسلے میں ہماری دستگیری کرتی ہیں۔ "ہمالہ" "گلِ رنگیں"، "عہدِ طفلی" اور "ابرِ کوہسار" کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ فنکار اپنے عہد تک کی اردو شاعری، فارسی شاعری، عربی شاعری اور انگریزی ادب سے پوری طرح باخبر ہے، وہ الفاظ کے مزاج کو سمجھتا ہے، اس کی انگلیاں شعر کے آہنگ و اسلوب کی نبض پر ہیں۔ ہر خیال اس کے

طبع رسا کی جوئے تیز رو سے ایک جھلکتی ہوئی موج بن کر اچھالتا ہے۔ اور اہلِ دل کی کشت زارِ کیفیت کو سیراب کرتا جاتا ہے، لیکن جوں جوں ہم "بانگ درا" کے مطالعے میں آگے بڑھتے ہیں، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم بے اختیار اس کی طبعِ رسا کی موجوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس کے سخن کی موجیں تیز تر ہو رہی ہیں۔ اس کے تخیل میں ہیجان بپا ہے۔ اس کی نگاہ بسیط ہوتی جا رہی ہے۔ بچوں کے لئے جو نظمیں دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں انہوں نے اسے دوسرے شعراء کے خیالات کو اپنے قالب میں بہ تمام سلاست و روانی ڈھالنے کی توفیق دی ہے۔ اب اس کے لئے کوئی خیال نظم کرنا مشکل نہیں رہا۔ اب اس کے الفاظ کے انتخاب میں دقت پسندی کم ہوتی جا رہی ہے اور اچانک "تصویرِ درد" میں وہ شاعر ملتا ہے جسے اپنے منصب کا احساس ہے۔ جسے معلوم ہے کہ اس کا مقصدِ حیات کیا ہے، اسے کیا کہنا ہے۔ اس کے دل میں درد و غم کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ کیوں تھی اور کس لئے تھی ؎

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گُل ہوں میں خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری

یہ پہلی نظم ہے جس میں اقبال کنائے اور اشارے سے کام لیتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنے ہر خیال کا بھرپور اظہار کر رہا تھا۔ یہاں وہ ایما اور حقیقت آمیز کرنے کی کوشش میں ہے۔ کبھی کھلم کھلا کہتا ہے ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

اور کبھی انگریز کی غلامی کے زیرِ اثر اپنے پیامِ بیداری کو دامنِ تشبیہہ میں چھپاتا ہے ؎

نشانِ برگِ گُل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

اسی نظم میں اس کا اسلامی ملی شعور بیدار ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں سے خطاب کرتا ہوا کہتا ہے ؎

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

"تصویرِ درد" سے پہلی نظموں میں اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس کے جمالیاتی احساسات اور رومانی جذبات اسے دیدۂ بینا بنائے ہوئے ہیں۔ "تصویرِ درد" اور اس کے بعد وہ دلِ بیدار بن جاتا ہے۔ اسے فکرِ ملت بھی ہے اور فکرِ وطن بھی۔ اس کو مسلمانوں کے انتشار کا شدید احساس بھی ہے اور تعصبات کا غم بھی۔ اسے شجرِ فرقہ آرائی کا بار وری کا دکھ بھی ہے اور اس کے علاج کا علم بھی ؎

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

"تصویرِ درد" اقبال کی پہلی طویل نظم ہے جو ۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم کا شاعر جانتا ہے کہ اسے قدرتِ اظہار کیوں بخشی گئی ہے اور وہ اس عزم کو لے کر اٹھتا ہے اور کہتا ہے ؎

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

یہاں سے اس کے فن میں فکر داخل ہوتا ہے۔ اس کے جذبے میں ملت و وطنیت کے چراغ جلتے ہیں۔ وہ ایک نئی دنیا کا خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس جہانِ نو کے لئے ایک نئے آدم کی تلاش میں چل نکلتا ہے جسے بعد میں اس نے مردِ مومن قرار دیا۔

انگلستان جانے سے پہلے ۱۹۰۵ء تک اقبال کے فکر کی تہوں سے عشقِ رسولؐ کا شعلہ بھڑک بھڑک کر اُبھرتا ہے۔ "بلال" میں یہ عشق پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ حضرتِ بلالؓ کے مقدر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ ساری کی ساری نظم زبانِ حال سے کہتی ہے "کاش میں بلال ہوتا!"

ع تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

اس ایک مصرعے میں کس قدر کسک، تڑپ اور لگن کا سماں ہے۔ شاعر بلالؓ کی نماز کو بھی نظارۂ محبوب کا بہانہ سمجھتا ہے اور یہ شعلہ اقبال کے دل و دماغ کو منور کر دیتا ہے۔ یہ عشق اسے ان منزلوں سے گزارتا ہے جہاں سے نکل کر بالآخر "ارمغانِ حجاز" لئے جاں آفریں سے جا ملتا ہے۔

۱۹۰۵ء تک کی نظموں کو دیکھتے ہوئے ہم اقبال کے رنگِ سخن سے پوری طرح روشناس ہو جاتے ہیں۔ اب اس کے الفاظ، ساخت اور اس کا مزاج ہم پر پوری طرح کھل جاتا ہے۔ اس دور کی غزلوں میں بھی اس کی نظم نگاری کا اثر موجود ہے۔ اور اس کی نظموں میں تو یہ کمال آخری دم تک پیدا ہے کہ اس کا ہر شعر نظم سے الگ پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے کیف و تاثر کو اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اسے غزل کے ایک شعر کی طرح جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اور جہاں ہر شعر میں اپنی وحدت اور اکائی کا عنصر موجود ہے، وہاں وہ ساری نظم کی تعمیر میں ایک جاندار ستون بھی ہے کہ اس کو نکال دینے سے نظم کی وحدت مجروح ہو جاتی ہے۔ اس کے بغیر نظم کی کڑیوں میں ربط باہمی ٹوٹ جاتا ہے اور قاری کے ذہن کو دھچکا لگتا ہے۔ میرے خیال میں اقبال کے فن کا یہی بڑا کمال ہے، اسے اردو شاعری کے دوسرے فنکاروں سے ممیز کرتا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر کہنے والے شعرا کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر جس کی نظم کا ہر شعر اپنی جگہ غزل کے شعر کی طرح کیف آور بھی ہو اور نظم کی مجموعی حیثیت کے لئے ناگزیر بھی۔

۱۹۰۵ء سے پہلے بھی انسان کی تاریخ کا شعور اس کے کلام میں کروٹ لینے لگتا ہے۔ "سرگزشتِ آدم" میں وہ ازلی آدم سے لے کر تاریخی انسان کی حیثیت سے کائنات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہوا مارا مارا پھرتا نظر آتا ہے۔ یہیں اس کے ذہن میں نیشنلزم کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ "ترانۂ ہندی"، "جگنو"، "صبح کا ستارا"، "ہندوستانی بچوں کے قومی گیت"، "ایک پرندہ اور جگنو" اور "نیا شوالہ" میں اس کا پیغامِ محبت ہر مذہب و ملت کے لئے یکساں ہے۔ وہ اخوت و اتحاد چاہتا ہے ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

وہ ہمیں اپنے ملک کی پاکیزگی، عظمت اور عالمگیر حیثیت سے متاثر کر کے ناز کرنا سکھاتا ہے، وہ زندگی کے مختلف شواہد و واقعات، فطرت کے مختلف مظاہر اور پرندوں کے تخیلات سے یگانگت اور اتحاد کا درس دیتا ہے۔ گویا انگلستان جانے سے پہلے اقبال اس راہ پر گامزن ہو چکا ہے جو اس کا موقف تھی۔ اسے اپنے مسلک و مشرب کا یقین ہے اور وہ اپنی تمام تر قوتیں اسی پر صرف کرنے کے درپے ہے۔ ان نظموں میں اگر محض پیام ہی رہتا تو شاید انہیں کوئی بھی پڑھنے کے لئے تیار نہ ہوتا لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ اچھوتی تشبیہات، نادر تراکیب، الفاظ کا بے نظیر انتخاب اور بندشِ مضامین کی دلکشی دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ ان نظموں میں "جگنو" اپنی جگہ منفرد ہے کہ اس میں اقبال قدرتِ اظہار و بیان سے "جگنو" کے لئے ایسی لازوال تشبیہات تراش گیا ہے کہ جگنو ہمارے لئے طلسماتی کردار کا جامہ اوڑھ لیتا ہے۔ اس نظم میں اسے محسوسات کی وحدت کا راز ملتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ

نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے

اور اس لطافت و احساس کے ساتھ وہ ہمیں باہمی اختلافات پر ہنگامہ آرائی سے کنارہ کشی کا درس دیتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۳۲ برس کی عمر تک یعنی ۱۹۰۵ء تک کے کلام میں اقبال ہمیں اپنے مسلکِ سخن سے باخبر، اپنے اظہار بیان پر قادر، اپنی نگاہ کی ژرف نگری سے واقف۔ اپنے احول کی علامتوں کا نباض، ملتِ اسلامیہ کے انتشار پر نوحہ کناں، سیاسی شعور کا مالک، تاریخ ماضی کا راز داں اور فلسفیانہ خیالات کا حامل ملتا ہے۔ البتہ اس کی اس دور کی غزلیں کسی ایک رنگ کی غماز نہیں ملتیں۔ کہیں وہ داغ کا رنگِ سخن اختیار کرتا ہے، کہیں غالب کا انداز جھلکتا ہے۔ کہیں اسے حالی کا رنگ جدید مرغوب ہے۔ کہیں وہ فارسی شعرا سے متاثر نظر آتا ہے۔ ع "نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد" کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر کہتا ہے ؎

نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی — نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے

کہیں فارسی شعراء کے تتبع میں وہ اس دور میں، اپنی غزل کا محبوب خدا کو ٹھیرا لیتا ہے ؎

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو — کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

چنانچہ اس دور کی غزل سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اقبال غزل کے لئے اپنے مخصوص رنگ کی تلاش میں ہے جو ابھی تک اسے نہیں مل سکا۔ وہ کوئی معمولی شاعر نہیں بننا چاہتا۔ اس دور کی ابتدائی نظموں میں اس نے غالب کے آگے سرِ عقیدت جھکایا ہے۔ غالب اس کو کہاں تک محبوب ہے، اس کا اعتراف وہ "جاوید نامہ" میں کرتا ہے جہاں وہ اسے فلکِ چہارم پر بیٹھا ملتا ہے۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ غالب کی غزل نے اقبال پر غزل کے دروازے بند کر دئے تو کچھ بے جا نہ تھا۔ اس نے غزل کو اپنانے کی ضرورت اس وقت سمجھی جب وہ اسے بھی اپنے فکر کے قالب میں ڈھالنے پر قادر ہو گیا۔ اور یہ بات "بالِ جبریل" (۱۹۳۵ء) میں پیدا ہوئی۔ اسی طرح "بانگِ درا" کے خاتمے پر اس نے اکبر کے تتبع میں ظریفانہ کلام جمع کر دیا ہے۔ اس سے وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا طنز بجائے خود تیز ہونے کے باوجود اکبر کے طنز کو نہیں پہنچتا۔ چنانچہ "بانگِ درا" کے بعد اس نے اس نشتر سے تو بارہا کام لیا، لیکن ظرافت کے پیرائے میں نہیں۔ اس نے ظرافت کے معاملے میں اکبر کی فضیلت کے سامنے سر جھکا دیا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اقبال انگلستان میں رہا۔ اس زمانے میں اس کی نظر وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔ اب وہ حقیقت سے اصل حقیقت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس دور کی بیشتر نظموں میں وہ حسن و عشق کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش میں ہے اور ان کے علاوہ بھی ہر دوسری حقیقت سے پردہ اٹھاتا نظر آتا ہے۔ اسی حصے میں اس کا احساسِ جمال بھی پوری طرح ظاہر ہے اس کے موضوعات خصوصیت سے حسن و عشق سے متعلق ہیں لیکن وہ رعنائیت کے تلذذ میں ڈوب نہیں جاتا۔ سرِ ساحل بیٹھ کر اپنی سوچ میں گم ہے اور سر اٹھا کر ہر جذبے ہر احساس پر فیصلے صادر کرتا جاتا ہے۔ اس کے فیصلوں میں کہیں تذبذب نہیں۔ کہیں شک و شبہ کا شائبہ نہیں۔ وہ قطعیت کے ساتھ ہر بنیادی حقیقت پر حکم لگا دیتا ہے۔ پہلے حصے میں اس کے نزدیک شاعر کا پیغام یہ ہے:

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

اس دور میں اس کا موقف بدلا ہوا ہے، وہ کہتا ہے ؎

دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کی رست خیز
کیا خبر تجھ کو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں ...

یعنی اب اسے اپنی نکتہ چینی، جسے میں نے حقیقت سے اصل حقیقت کی طرف مائل ہونا قرار دیا ہے، کا پورا پورا احساس ہے۔ اسی دور میں دو نظمیں حسنِ فطرت سے متعلق ایسی ہیں جو اس کے کمالِ اظہار، ادراکِ جمال اور قدرتِ ابلاغ کی پوری طرح غماز ہیں۔ میری مراد "ایک شام" اور "تنہائی" سے ہے۔

"ایک شام" میں اقبال ایک ساحر ہے کہ الفاظ کی طلسماتی اثر آفرینی سے منظر کی تصویر کشی ہی نہیں بلکہ اس کی کیفیت بھی عطا کر رہا ہے۔ سات اشعار کی اس مختصر سی نظم میں اس نے "ش" اور "س" کے مسلسل حروف کی تکرار سے وہ سکوت، وہ آہنگ، وہ فسوں، وہ سکون اور وہ مدھم سی غنودگی پیدا کر دی ہے جو اس کے پیشِ نظر تھی۔ خلوتِ شام کا یہ اہم راز ایک ایسی بحر کا انتخاب کرتا ہے جو اس نے ساری عمر میں شاذ ہی استعمال کی ہے کہ یہ بحر اس کی کیفیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس بحر کا اختصار، الفاظ کا انتخاب اور صوتی اثرات کی فسوں کاری مل کر اس نظم کو وہ ہالہ بخش دیتے ہیں جو اقبال کے فنی کمال کا خاصہ ہے۔ اس نظم کے ساتھ ہی "تنہائی" ہے جو اس بحر اور اسی نغمۂ آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ "ایک شام" کا تاثر اس نظم میں بھی رچ بس گیا ہے۔ شاعر خود کو آسمان پر پاتا ہے جہاں اس کی تنہائی اسے غم زدہ کر رہی ہے اور وہ پوچھتا ہے ؎

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

یہ شعر کہنے والا شاعر اپنے حزن کی دلیل میں ان آنسوؤں کو پیش بھی کرتا ہے جنہیں وہ "موتی" خوش رنگ پیارے پیارے کہتا ہے: گویا پانچ اشعار میں کیفیات کا سمندر موجزن ہے:

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اقبال یورپ میں رہا۔ اس زمانے میں اس کی جولانیٔ طبع خصوصیت سے احساساتِ جمال، مناظرِ قدرت اور درسِ محبت پر مرکوز رہی۔ لیکن یہ شعور بدستور کارفرما رہا کہ ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

اسی شعر نے اس سے عبدالقادر کے نام یہ پیام دیا۔ ؏

بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اب وہ اپنے موقف کو پوری طرح پا چکا ہے:۔ ؎

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں....

اسی زمانے میں اس نے "صقلیہ" پر وہ معرکہ آرا نظم کہی جو میرے خیال میں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس نظم میں اس نے تاریخ اسلام کا وہ شعور کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے جو "شکوہ" کی جان ہے۔ یہیں سے وہ "صحرا نشیں" اس کا مستقل عنوان بنتے ہیں جنہیں وہ انسانیت کے مثالی کردار جانتا ہے اور جن کے تصور سے وہ اپنا مردِ مومن تراشتا ہے: ؎

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی...
غلغلوں سے جس کی لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

اور اس آخری مصرعے کے استفہام کی نفی کے لئے اس نے اپنے فن کی تمام تر طاقتیں صرف کر دیں۔ اس نے مسلمانوں کو بھی صحرا نشیں بنانے کے لئے اپنا خونِ جگر اشعار کی بھٹی میں جھونکا اور انہیں خلوص و اثر کے صیقل سے کندن بنایا۔ "صقلیہ" پر یہ نظم قیام یورپ کی آخری نظم ہے۔ اسکے بعد وہ اپنے وطن میں لوٹ آتا ہے اور اس کا سینہ اپنی قوم کے ماضی کے غم سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ۱۹۰۸ء کے بعد اس کی نظموں میں اپنے عہدِ رفتہ کی عظمت تمثیل بن کر ابھرتی ہے اور قوم کو پیغامِ عمل دیتی ہے۔ ان نظموں میں اس کا فنکارانہ جوہر ایک طوفان کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ اس کا جذبہ گویا آتش زیرپا ہے۔ وہ پرانی داستانیں دہراتا ہے: ؎

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے....

اقبال یہ نظمیں کہہ کہہ کر ملتِ خفتہ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ ۱۹۰۵ء تک نظموں میں وہ جس نیشنلزم کے اثر سے محبت و اتحاد کا درس دے رہا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ ترانۂ ہندی کی جگہ ترانۂ ملّی نے لے لی۔ "ہندوستاں والو" کے بجائے اب وہ "چین و عرب ہمارا" کا نغمہ سرا بن گیا۔ وطن اس کے لئے ایک ایسا بت بن گیا جس کو مٹی میں ملا دینا اس کا مقصود تھا کہ:

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اب اس نے قوم کے سامنے اپنے شاندار ماضی اور تاریخی روایات کے بھرپور تصورات پیش کئے۔ "بلادِ اسلامیہ"، "گورستانِ شاہی"، "ترانۂ ملی"، "شکوہ"، "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام" وغیرہ میں وہ اسلامی روایات کو حقائق اور جذبے کی آمیزش سے زندہ کر دیتا ہے۔ اب اس کا قلم بے باک ہے کیفیت ہر اندیشے سے آزاد ہے، اس کی نظر کائنات کے ہر گوشے پر پڑ رہی ہے، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہیں، اس کا پیغام شرر بار ہے کہ یورپ میں جنگ لڑی جا رہی ہے اور اس کو اس میں مسلمانوں کی بہتری کی صورت نظر آ رہی ہے۔ امید کی اس منزل میں اقبال کا فکر شعلۂ جوالہ بن گیا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں "شمع و شاعر" کے آخری بندوں میں اسے یقین آ گیا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی بے بسی کوئی دن کی بات ہے۔ اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ وہ منزل دور نہیں، جس کا اسے سودا ہے۔ اس امید نے اس کے فنکارانہ محسوسات کو جلا دے کر "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" میں وہ بنیاد استوار کی جس پر اقبال کا تمام تر فن قائم ہے۔ ان نظموں میں اس نے اپنے استعارات اور کنائے وضع کئے، اس نے خواجگی کی موت کا اعلان کیا، خودی کا پیغام دیا، مومن کے تصور کو واضح تر کیا، کبوتر اور شاہین کی تشبیہات پر اپنی مہرِ ثبت کی، "ذوقِ یقیں" کا صور پھونکا، "عقابی شان" سے جھپٹنا سکھایا۔ "جوئے کوہسار" جس کو اس نے "ہمالہ" میں پہلے پہل دیکھا تھا، اب زندگی کا اشارا بن گئی ہے

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

اسی کے حوالے سے وہ پھر کہتا ہے: ؎

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

۱۹۰۵ء تک اور ۱۹۰۸ء کے بعد کی نظموں میں اس نے فن کی کتنی مسافت طے کی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں یہی جوئے کہسار مدد دیتی ہے۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ "ہمالہ" میں اس نے لکھا تھا: ؎

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

۱۹۰۸ء کے بعد "فلسفۂ غم" میں وہ اسی ندی کو یوں پیش کرتا ہے۔ ؎

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی — آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور — گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے — یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو، مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی — گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

ان اشعار میں اس کے فن کا ارتقا پوری طرح جھلک رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کی عکاسی، منظر کشی، نقاشی، رنگ آمیزی کی کئی منزلیں مار آئی ہے۔

اسی دور میں وہ ماحول کے سیاسی اثرات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ یہی ترجمانی "ضربِ کلیم" میں اپنے کمال کو پہنچتی ہے کہ اس نے ساری کائنات کو اپنے قلب و نظر میں جذب کر لیا ہے۔ اس کا ایک خاص مسلکِ حیات ہے جس کے لئے وہ سیماب وار تڑپ رہا ہے، جس کے اظہار کے لئے ساری دنیا کا ادب و فلسفہ اس کے قدموں میں ہے، جس کا پیمانہ ملتِ اسلامیہ کا عظیم ماضی ہے، اس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے فن کی لطافتوں میں طنز کی تیزی شامل کی کہ وہ اپنے شعر کو محض طربناک و دلآویز بنانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس سے بیداری و عمل کے لئے اذانِ سحرگاہی کا کام لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کہتا ہے کہ ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو شاعری کے علاوہ بھی کچھ سمجھو، یہ دیکھو کہ وہ کون سے محرکات و ہیجانات ہیں جنہوں نے اسے شعر کے زم ونازک آبگینے کو صہبائے عشق و جنون سے پُر کرنے پر مجبور کیا۔ اس احساس نے کہ وہ "محرم راز" ہے، اسے رمز و ایما سے کام لینے پر اُکسایا اور وہ کہہ اٹھا، ؎

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

یہی وہ مقام ہے جہاں شعر، فن کی آخری حدوں کو چھو لیتا ہے۔ اسی رمز و ایما کے افسوں نے بے جان اشیا کو شخصیت اور اسے وہ ملکہ عطا کیا جس سے وہ اپنے شعر کے گرد ایک طلسماتی ماحول بنا لیتا ہے، ایک ایسی فضا قائم کرتا ہے جس میں قاری خود سپردگی کے علاوہ چارہ کار ہی نہیں پاتا۔ یہ سب کچھ اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔ وہ اردو کے ان گنتی کے فنکاروں میں سے ہے جنہوں نے اپنے تخیل کے جسم پر خود اپنے ساختہ و کاشتہ کی قبا چست کی۔ اس نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے فن کے ان تمام وسائل کو استعمال کیا جو آج تک تنقید کی گرفت میں آ چکے ہیں یا ابھی تک انہیں محسوس ہی کیا جا رہا ہے۔ وہ چونکتا ہے، دھمکاتا ہے، ڈرامائی انداز سے سامنے آتا ہے، اکساتا ہے، دلوں کو گداز کرتا ہے۔ نگاہوں میں نئی دُنیا ابھارتا ہے، آنکھوں میں سرمۂ بصیرت لگاتا ہے اور افق پر اس منزل کے دھندلے مگر حسین نقوش دکھاتا ہے جس کا حصول انسان کو "مرد مومن" اور مسلمان کو حقیقی مسلمان بنانے کے لئے ضروری ہی نہیں بلکہ لابدی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ فنی نادرہ کاریوں کو بھی اپنا مقصد ٹھیراتا ہے، کہ جب تک وہ بنیادی طور پر شاعری کے محاسن، اسلوب کی ندرت، الفاظ کی موزونیت اور تناسب، تخیل کی رفعت و وسعت اور بیان و اظہار کی قدرت و کمال سے اپنے فن کو جلا نہیں دیتا، اس کے پیغام کی اہمیت نمایاں نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں "بانگ درا" کی نظموں میں اس نے تمام کمالات کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے بعد فارسی اور اردو دونوں میں اس کی تصانیف انہی پہلوؤں کو اجاگر کرتی چلی گئیں جنہیں وہ اپنے ابتدائی کلام میں اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کر آیا تھا۔ اس کلام میں اس نے جس جذبے کا بیج بویا تھا وہ "پیام مشرق"، "زبور عجم" وغیرہ میں پھوٹ کر شجرِ بار آور بن گیا جس کے سائے میں پاکستان کا تصور ابھرا، پھیلا اور قائم ہوا۔ اور جس کی شاخوں کے سائے میں ملتِ مرحومہ زندہ ہوئی، بیدار ہوئی اور اقوام عالم میں اپنے مقام کا مطالبہ کرنے لگی۔

اقبال ایک عظیم فنکار ہے۔ کہیں وہ مصور ہے کہ جس کے رنگ فطرت کے حسن سے مستعار ہیں، کہیں وہ سنگتراش ہے کہ اس کے الفاظ ٹھوس بت بن کر ہمارے بتکدۂ دل میں سجدۂ عقیدت کے لئے قائم ہو جاتے ہیں، کہیں وہ مغنی ہے کہ اس کے نغمۂ آہنگ سے روح وجد کرنے لگتی ہے، کہیں وہ ڈراماٹسٹ ہے کہ جو آسمانوں کے نامختتم سٹیج پر اپنے لازوال کرداروں کو پیش کرتا چلا جاتا ہے، کہیں وہ پرستارِ جمال ہے کہ اس کے حسن کے مختلف مظاہر میں ایک ایسی دنیا نظر آتی ہے جو اس غم و یاس، درد و رنج، محنت و سرمایہ، آزادی و غلامی کی دنیا سے کہیں دور ہے، کہیں وہ صوفی ہے جسے کائنات میں حسن ذات کا پرتو دکھائی دیتا ہے، لیکن ہر روپ میں اس کے ہاتھ میں یقینِ محکم کی قندیل فروزاں رہتی ہے، اس کا جذبۂ صادق اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ وہ سیاست داں بھی ہے اور مبصر بھی، فلسفی بھی ہے اور انسانِ محض بھی۔ ایک نئے مستقبل کا پیغامبر بھی اور حال کا آئینہ دار بھی۔ مگر وہ ہر حال میں شاعر رہتا ہے۔ اس نے اپنے الفاظ میں اپنے فن کو جس خوبی سے سمویا ہے اس پر کوئی اضافہ ممکن نہیں ؎

نوا مستانہ در محفل زدم من ۔۔۔ شرارِ زندگی بر گل زدم من
دل از نورِ خرد کردم ضیا گیر ۔۔۔ خرد را بر عیارِ دل زدم من

راہ و رسم منزلہا

عبدالعزیز خالد

مرے سامنے رہگزر اپنے دامن میں جلوے سمیٹے
جنونِ تماشا کو آمادۂ امتحاں کر رہی ہے
خیابان و صحرا کے گہواروں، فطرت کی بے قید پہنائیوں میں
یہ محسوس ہوتا ہے گویا حصارِ ہوس سے نکل کر
میں محبوب کی گرم و آسودہ آغوش میں آگیا ہوں
جہاں مجھ کو آفاتِ جاں سے اماں مل گئی ہے
جہاں ذہن، فکرِ پریشاں سے، دل اضطرابِ خفی سے
نظر سلسلہ ہائے پیچاں سے، سرِ ذوقِ آشفتگی سے
سبکبار ہو کر مسرت نشاں بن گئے ہیں
مرے سامنے رہگزر اپنے دامن میں جلوے سمیٹے
مرے ذوقِ صحرا نوردی کو حرکت پہ اکسا رہی ہے
امنگیں شرائین میں گردشِ خون کو تیز تر کر رہی ہیں
پس و پیش گلکاریٔ رنگ و بو دیکھتا سینۂ رہگزر پر
ہوس سے منزہ، خراماں خراماں چلا جا رہا ہوں
میسر ہے مجھ کو تموّل۔ فراغِ نظر کا، شکیبِ جگر کا
نشیبِ زمیں کے سفالیں نظاروں کی رعنائیوں میں
سپہرِ زبرجد کے اجرام نوریں کی حسرت نہیں ہے
وہ اپنی جگہ ہی بھلے ہیں، میں اس بات کو جانتا ہوں
مجھے اپنے فردوس میں ان بناتِ فلک کے لبھانے کی حاجت نہیں ہے!

(۲)

یہ موجِ ہوا جس سے میرے نفس کا تلاطم، مرے نطق کی لب کشائی
یہ اشیا، جو میرے ہیولائے افکار کو بخشتی ہیں خط و خال و احساس و پیکر
یہ بکھرے ہوئے راستے، پیچ کھاتے ہوئے، رینگتے، سرسراتے
ہیں اک غیر مرئی حقیقت کے پرتو سے روشن بھی اور مرتعش بھی
یہ ناسفتہ جلوے مرے دل کی آواز کے ہمنوا ہیں
یہ شہروں کی بھرپور سڑکیں، یہ نقشِ کفِ پا سے گلنار گلیاں
یہ سطحِ سمندر پہ ابھرے ہوئے بام و مینا، یعنی سفینے
یہ حدِ نظر تک مکانوں کے آپس میں الجھے ہوئے سلسلے سے
شفق پوش باموں کی سرگوشیاں بادلوں سے
یہ شفاف آئینے یہ کھڑکیاں رازِ میخانہ کہتی ہوئی سی
یہ پتھر یہ زینے پھسلتے ہوئے یہ خمِ طاق و محراب جن کو کہیں قوسِ مژگاں
یہ نوبادگانِ تمنا کہیں بنت پنجاب و ایراں، کہیں دخترِ کافرستاں
کہیں زلفِ بنگال کی تابداری، کراچی کے جلوے کہیں دامن افشاں
یہ خوبانِ پرکار و سادہ شہیدِ نظر کے لیے ایک طرفہ بلا ہیں!

(۳)

مناظر چپ و راست سے پھسلتے جا رہے ہیں
مرقع — یہ سیّال و زندہ مرقع — شبابِ مکمل، بہارِ مجسم
غنا کی نشیلی مدھر تان دل سے جگر تک اترتی ہوئی سی
کافر جمالوں کی بربط نوازی یہ ناہید و زہرہ یہ ترکی یہ تازی
سرودِ لبِ رہگزر یعنی شارع کا شاداب و سرمست نغمہ
مری رہگزر کیا تو مجھ سے یہ کہتی ہے مجھ کو نہ چھوڑو
مجھے چھوڑ کر تم ہمیشہ بھٹکتے رہو گے
بہت دیر سے تھی میں زحمت کشِ انتظار اب مجھے اپنے قدموں سے پیوستہ رکھو
حسیں رہگزر چھوڑنے میں اگرچہ کوئی خوف مانع نہیں پر مجھے تجھ سے وابستگی ہو گئی ہے
مجھے خود اپنے اظہار پر اتنا قادر نہیں جتنی تو ہے
تری منزلت میرے دل میں مری نظم سے بیشتر ہے
مرا ذہن کہتا ہے سب کارنامے کشادہ فضاؤں کے مرہونِ منت رہے ہیں
سب آزاد نظموں کی تخلیق بھی زندہ ماحول ہی میں ہوئی ہے
میں محسوس کرتا ہوں ایسے میں تعمیرِ ارژنگِ مانی، و تخلیقِ فکرِ فلاطون و
اقبال و غالب بھی مشکل نہیں ہے!

(۴)

اب اس وقت سے کوئی حد، حد نہیں ہے
قیود و سلاسل کے افسوں نگہ و تاز پراب کمندیں نہ ڈالیں گے چھپ کر
جہاں چاہوں جاؤں میں اپنے ارادے میں مطلق ہوں اپنی قلمرو کا مختارِ کل ہوں
میں اوروں کی باتیں اگرچہ سنوں گا مروت سے خندہ لبی سے
گراں مایہ پند و نصائح کے سرمایہ سے بہرہ اندوز ہوتا رہوں گا
پر اس پر میں خُذْ مَا صَفَا اور دَعْ مَا كَدَر کے مطابق عمل پیرا ہوں گا
مری خود نگہداری اب سے مری ذات کی پاسبانی کرے گی
میں بے کار اب ہر کسی سے نہ مرعوب و مغلوب ہوں گا
میں اپنے عمل کی صلابت سے تعمیرِ دنیائے تازہ کروں گا
زمان و مکاں میرے اندر امنڈتے چلے آ رہے ہیں
مشارق، مغارب۔ سب اقصائے عالم مرے حکم کے منتظر میرے
اقبال کے حمد گو ہیں
میں جتنا سمجھتا تھا اپنے کو اس سے بہر حال میں ارفع و خوب تر ہوں

نہیں جانتا تھا کہ کتنے محاسن ہیں پوشیدہ مجھ میں
ہر اک شے حسین و شگفتہ نظر آ رہی ہے
زن و مرد میں میں یہ اعلان کر دوں گا تم نے مرے ساتھ جو کچھ تلطف کیا ہے
میں اس کے لئے اتنا ممنون ہوں اپنا سرمایۂ زندگی وقفِ انسانیت کر رہا ہوں
میں اب سے تمہارے غموں کو بٹانے کی امکانی کوشش کروں گا
ہجومِ زن و مرد میں اپنی ہستی کو اک ساغرِ کیف کی شکل میں پیش کرتا رہوں گا
محبت کے دیپک، خوشی کے کنول، اور امنگوں کے فانوس بے نور کوچوں کو صد رشکِ انجم کریں گے

کسی کینہ ور سے مجھے کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہے
جو مارے گا مجھ کو وہ خود بھی توانا رہے گا مجھے بھی توانا کرے گا!
اگر اب تنومند و خود دار مرد اور مرجان و مرمر کو آئینہ دکھلاتی
شعلہ بدن عورتیں جوق در جوق آئیں انہیں دیکھ کر میں
اب انگشتِ حیرت بدنداں نہ ہوں گا
جمال و نجابت کی سربستہ حکمت کو میں پا چکا ہوں
یہ حکمت ہے فطرت کے آزاد گہواروں میں سانس لینا
غباریں گذرگاہوں میں کھیلنا کودنا اور ان سے ہم آغوش ہونا
یہی دانش و علم کا معرضِ امتحاں ہے
یہ مکتب ذکاوت کی کوئی کسوٹی نہیں ہیں
متاعِ ذکاوت کو اک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل کرنے کی سعی دیوانگی ہے
میں اب تجزیہ کرتا ہوں ان اسالیبِ فکر و نظر کا
جو دانش کدوں میں دقیق و گراں لگتے ہیں ـــ ان
بہار و خزاں کے شہابی نظاروں، خنک موج جلووں، رواں بادلوں اور
بیتاب لہروں کے گرداب پیدہ دبستاں کے خود ساختہ قاعدے کتنے
بے اثر ہیں ـــــــــ ہاں حقیقت یہاں منکشف ہے
جہاں ابنِ آدم کو عرفاں ملتا ہے میں کیا ہوں میرے شعورِ خفی و جلی کی
سرحد کہاں سے کہاں تک ہے
فقط جو ہر ذات کو حق پہنچتا ہے نشو و نما کا
کوئی ہے ہمارے لئے جو نگارِ حقیقت کے چہرے سے پردہ
اٹھائے؟

کوئی ہے جو اسرارِ سربستہ کھولے؟
جو بھٹکے ہوئے کارواں کو دیارِ سلیمیٰ دکھائے؟

(۶)

یہاں روح کا جزر و مد ہے
یہ موجیں جو سینے کے اعماق سے اٹھتی ہیں، کاہش افزا،

تجسس کی زائیدہ موجیں
یہ ظلمت کے افعی، خیالوں کے عفریت، وہموں کے آسیب کیا ہیں
کچھ ایسے زن و مرد ہیں جن کی قربت سے لگ جاتی ہے آگ سی جسم و جاں میں
اجڑ جاتی ہیں جن کے احساسِ فرقت ہی سے میرے شعروں کی سیمیں فضائیں
سرِ شام جنگل میں جاؤں تو ہوتا ہے مجھ پر نزولِ سرودِ خاریں
یہ کیوں ہے یہ کیا ہے جو طاری ہے سب پر جو ساری ہے سب میں
مرے دل میں سرچشمۂ سوز کیوں پھوٹتا ہے؟
یہ کافر جمالوں کے دیدار سے زیرِ مژگاں چمک اٹھتے ہیں کیوں لرزتے
ہوئے شوخ تارے!
دلِ مرد و زن میں محبت کے شعلے کہاں سے بھڑک اٹھتے ہیں والہانہ؟

(۷)

مرے ساتھ آؤ
اک ایسی رفاقت کو پالو سدا جو رہی ہے نبرد آزما زندگی سے
زمیں اوّل اوّل درشت و خموش و پُراسرار لگتی ہے، فطرت
بھی پہلے پہل گو عجیب و پُراسرار معلوم ہو گی
مگر اس سے ہمت نہ ہارو، سمندِ طلب کو عناں تاب کر دو
ہیں کتنے ہی اسرار کھل جاتے ہیں جو سربستہ ہے گا ہے
وہ اسرار اظہار سے جن کے الفاظ قاصر ہیں یکسر
یہ شاداب رمنے، یہ عیش و ہوس کی پناہیں
یہ خیمے یہ دلکش خیاباں، یہ آرام گاہیں
شہاب اور رمیدہ سے گوندھی ہوئی دختران نگاریں
وہ عالم کو تسخیر کرتی نگاہیں خماریں، ادائیں بہاریں
یہ نظارے غارت گرِ امن، دامن کشِ دل ہیں لیکن
جو تو چاہے رک جائیں اپنے قدم غیر ممکن
بڑھاؤ قدم سست پائی کو چھوڑ دو!

(۸)

ابھی اور ترغیبِ سیمیں کی یلغار ہو گی
ابھی اور تحریصِ رنگیں کے شبخون ہوں گے
ہمیں پار کرنا ہے مواج و ہائل سمندر میں ظلمات کی خاکنائیں
رفیقِ سفر! جذبۂ آہنیں، خود شناسی، مسرت، تحیّر
شجاعت سے اور عزتِ نفس سے ہم
ہمالہ کی چوٹی کو نیچا دکھا کر رہیں گے
رفیقِ سفر! میں تمہیں باخبر کر رہا ہوں
مرے ہم سفر کو جفا کوشی و جاں سپاری و پامردی و عزم میں قائدِ جیش بننا پڑے گا

جیسے بہرسبب صحت و حوصلے سے وہی آگے آئے
اگر آفتابِ حیات رواں ڈھل چکا ہے تو آنے کی زحمت نہ کیجیے
مجھے سربلند و جواں پیکروں، خوبصورت سہی قامتوں کی ضرورت ہے ہمدم
کسی کرم خوردہ اپاہج کو تکلیف کرنے کی حاجت نہیں ہے!
میں تم کو سفر کی صعوبت سے آگاہ کردوں
میرے پاس خلعت نہیں جن سے داد و دہش کی نمائش کروں میں
سکھاتا ہوں میں اس غمِ زندگی سے نبرد آزمائی
تمہیں بھی کبھی جس سے دوچار ہونا پڑے گا
تمہارے مقدر میں قاروں کا گنجِ شقاوت نہیں ہے
جو خونِ جگر سے کماؤگے دستِ سخاوت سے اک دن لٹا دوگے آخر
تمہاری رہوں میں بھی ہزل و تمسخر کے کانٹے بچھیں گے
محبت کے نایاب و دزدیدہ پیغاموں کا واپسیں بوسۂ شعلہ آشنا ہی
خیر مقدم کرے گا
تمہاری طرف دست و بازو بڑھیں گے ولیکن گلے میں حمائل نہ ہوں گے!

(۱۰)

کئی نادمیدہ نظارے حجابات میں ہیں
کئی شاہراہیں غبارِ پسِ کارواں کی ترستی ہیں اب تک
مقاماتِ آہ و فغاں جوئے خونناب کے منتظر ہیں
انیسِ غمِ دل! تو کس سوچ میں ہے
کوئی چیز ایسی بھی ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں ہے فقط عزم درکار ہوگا
نسیمِ سحر کی لطافت گل و یاسمن کی طراوت
ستاروں کے خوشے، بہاروں کے توشے
جواہر کی کانیں خوشی کی دکانیں
یہ سرمایہ اپنا ہے اپنا
چلیں تو زمانہ ہمارے جلو میں چلے دست بستہ
بڑھیں تو ہمارے پس و پیش صد کارواں ہوں روانہ
چلیں تو دلوں سے محبت کا رس لیں، دماغوں سے ذہنی عقیدت کا تحفہ
زن و مرد و پیر و جواں، بسترِ استراحت کو چھوڑ دو
اِن اپنے گھروندوں کو سعیِ مقاصد میں حائل نہ ہونے دو ہرگز
مقاصد کا انجاح، ایثار و فرقت کا طالب ہے، اے غم نصیبو!
حجاباتِ منفی ہیں منفی تشائم کو چھوڑ دو
نگاہِ بصیرت سے دیکھو
خرابات کی مجلسوں رامش و رنگ کی محفلوں میں
نگارینہ ملبوس کی نازنیں لرزشوں، طرۂ گیسوئے عنبریں میں

گلو سوز ترشے ہوئے خال و خد میں، خمار آفریں خندۂ شرمگیں میں
جھلکتی ہے خود ناشناسی، عزائم سے محرومی و زندگی کے حقائق پہ بے اعتمادی
کوئی دل بھی تطہیرِ اخلاص و شفقت کا حامل نہیں ہے
یہ انسان انساں نہیں ہیں مشینیں ہیں اپنے
یہ آواز و ہیئت سے عاری تشخص سے محروم انسان
جو زر کار کاروں، سمن پوش محفلوں، پرسناں سے ہوٹلوں میں
کسی دیومالا کے موہوم کرداروں کی طرح اپنے شب و روز کو
غرقِ تلخابۂ عشرت رائگاں کر رہے ہیں
بناتِ نباتِ وشکر اپنے مغرور سینوں پہ مخروط سرکش ابھارے
کہ جن کی جنوں پاش نظارگی سے ہوس نیم جاں ہو نظر تشنہ، سیرِ ہفتہ
سرِ رہگزر اپنے حسنِ گریزاں سے اعصابِ آدم پہ مشقِ ستم کر رہی ہیں
یہ سب ایک ویرانیٔ دل کے بہلانے کے مشغلے ہیں
حیات آج سرِ جادۂ منزلِ سرمدی کھو چکی ہے
کہ انساں فقط ایک بہروپ ہے شوخ، کمزور، بودا!

(۱۱)

مرے لب پہ بانگِ رجز کانپتی ہے
نقیبِ بغاوت ہوں میں جو مرے ساتھ آئے مسلح ہو تیغ و سناں سے
مری ہمرکابی عبادت ہے افلاس و خستہ نصیبی سے پیہم تگاپو سے
کرب و بلا سے

طویل و حسیں رہگذر سامنے ہے
بڑھاؤ قدم کس لئے رک رہے ہو
تپائی پہ رہنے دو قرطاس کو سلکِ افکار سے نامزّین
کتابوں کو سربند شلفوں کی زینت بنا دو
مدارس میں دانش وروں کو جنون و خرد بیچنے دو
سرِ منبرِ عام واعظ کے وجد آور الحان کو چھوڑ دو
وکیلوں کو چھوڑو، کرف لون کے مل کے بخیئے ادھیڑیں
عدالت کو تدبیرِ و چاک و رفو میں جگر خون کرنے دو، آؤ
انیسِ غمِ دل! مرا ہاتھ پھیلا ہوا ہے تمہاری طرف پیش کش میں
میں دیتا ہوں تم کو متاعِ محبت۔ جو ہے گوہر و تاج سے بھی گراں تر
مگر تم بھی اپنی متاعِ دل و جاں کو میرے حوالے کروگے؟
غمِ آگہی کی کٹھن رہگذر میں مرا ساتھ دوگے؟
دمِ واپسیں تک نشیب و فرازِ رہِ زندگی میں رفاقت کروگے؟

●

نظم:

دردِ مشترک

شاہد عشقی

دل تپایا ہے چاند کی لو پر
مشترک سبھی ہے امانتِ غم
جاگ کر ساری رات کاٹی ہے
دولتِ درد سب میں بانٹی ہے
اور پھر یوں بھی سوچتا ہوں میں
ترے ہی پیار کی امانت ہیں
کر یہ حساس دل، یہ دیدۂ نم
تیرے غم نے دیا جہان کا غم

رات کے جاگداز لمحوں میں
جاں مری ساتھ ساتھ پگھلی ہے
جب بھی کوئی چراغ بھڑکا ہے
دل مرا ساتھ ساتھ دھڑکا ہے
جز مرے کون کر سکا محسوس
چاندنی رات کا مہکتا درد
تو شگفتہ کلی کا سوزِ دروں
آخرِ شب کا کرب ناک سکوں

یوں بھی اکثر ہوا کوئی تارا
میں نے محسوس یہ کیا جیسے
گوشۂ آسماں سے ٹوٹا ہے
میرا کوئی عزیز چھوٹا ہے
کوئی تارا بھی تو نہیں ٹوٹا
کون سی شب کا تذکرہ چھیڑوں
کر جو دامن میں جذب ہو نہ سکا
میں کسی رات بھی تو سو نہ سکا

کلیاں گلشن میں سینہ چاک ہوئیں
پھول مرجھا گیا کوئی سرِ شاخ
زخمِ دل کے نکھر نکھر آئے
میری آنکھوں میں اشک بھر آئے
جانتا ہوں کہ اہلِ دل کے لئے
لیکن اک دامنِ وفا کا خیال
زہرِ قاتل ہے شدتِ احساس
لیکن اک سادہ رخ کے حسن کا پاس

سوچتا ہوں کہ اس زمانے میں
غمِ جہاں کا سمیٹنے کے لئے
زندہ رہنا بھی جب کہ مشکل ہے
کیا فقط ایک میرا ہی دل ہے
جس میں خونِ جگر بھی شامل ہے
آج ہم رقصِ وحشتِ دل ہے

لیاقت علی خاں مرحوم ـــــ بقیہ صفحہ ۵۴

دل میں احساسِ کمتری تھا نہ مایوسی، وہ ایک آزاد قوم کے خوددار، خود شناس، اور خودنگر نمائندے کی حیثیت سے، وہاں پہونچے، انہوں نے پریس کانفرنسوں میں چبھتے ہوئے سوالات کا جواب دیا، انہوں نے امریکہ کے ایوان ہند وبین میں تقریر کی، انہوں نے وہاں کے سرمایہ داروں صنعت کاروں اور سیاست دانوں کو مخاطب کیا، وہ پاکستانی مسلمان ہونے پر نازاں تھے، انہیں اپنے اسلام پر بھی فخر تھا، انہوں نے جرأت اور صداقت کے ساتھ امریکی عوام کے سامنے، پاکستان کا "کیس" بھی پیش کیا اور اسلام کی ترجمانی بھی کی، اسلامی جمہوریت کا اقدار بھی روشناس کرائے، انہوں نے امریکہ کے ناواقف لوگوں کو بتایا کہ اسلام کیا ہے؟ اسلامی جمہوریت کیا ہے؟ اسلامی سوسائٹی اور معاشرہ کیا ہے؟ کسی ایشیائی ملک کے وزیر اعظم، یا سربراہ مملکت نے امریکہ سے وہ خراج تحسین نہیں حاصل کیا جو لیاقت علی خاں کے حضور میں وہاں کے عوام و خواص نے پیش کیا ـــ کیا یہ واقعہ لیاقت علی خاں کی عظمت کی دلیل نہیں ہے ـــ؟

اس دنیا میں جو آیا ہے، وہ جائے گا، لیاقت علی خاں بھی اس دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن امتیاز اور اعزاز کے ساتھ، شہادت کے منصب پر فائز ہو کر، مرتے وقت نہ انہیں فرزند و زن کا خیال تھا، نہ عزیزوں اور رشتہ داروں کا، ان کی زبان پر خدا کا کلمہ تھا، اور پاکستان کا نام!

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

افسانہ:

بی بی

غلام الثقلین نقوی

بی بی نے بھینس کو پچکارا اور دوہنا گھٹنوں میں دبا کر اس کے نیچے اکڑوں بیٹھ گئی۔ اُس نے ڈولچے سے پانی کا ایک چلو لے کر تھن دھوئے۔ پھر تھنوں کو باری باری ہاتھ میں لے کر ہلکے ہلکے دبایا۔ تھنوں میں آہستہ آہستہ دودھ اُترنے لگا۔ اُس نے ایک تھن کو زور سے کھینچا۔ دودھ کی ایک سفید دھار شرر کی آواز سے دوہنے میں گری لیکن بھینس اُچک کر دو قدم دور چلی گئی۔ بی بی کا دوہنا ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ بی بی کے بھائی نے دور ہی سے پکار کر کہا:

"بی بی! ابھی اس ندیدی کا پیٹ نہیں بھرا ہے۔ رلے تھوڑا سا سبز چارا اسے اور ڈال دے" بی بی دوہنا زمین پر ٹکا کر سبز چارہ لینے گئی۔ اُس کے بھائی نے کہا: "جب سے اس کا "بال" مر گیا ہے۔ بڑے کڑوے مزاج کی ہو گئی ہے کم بخت۔ آج شام سے پہلے پہلے دودھ نہیں دے گی۔ خدا کرے تیری بھابی آ گئی ہو۔"

"وہ بھابی کہاں آتے گی۔ جب سے گئی ہے کوئی سندیسہ بھی تو نہیں بھیجا اُس نے۔"

"تو کام کاج سے گھبرا گئی ہے نا بی بی"

"نہیں تو بھیا۔ پر بھابی کے لئے جی بڑا اداس ہے۔"

بی بی نے تھوڑا سا چارا ٹوکرے میں ڈال کر بھینس کے آگے لا رکھا۔ بھینس نے بے تاب ہو کر ٹوکرے میں منہ ڈال دیا اور بی بی مغرب کی طرف دیکھنے لگی جہاں بادلوں کو آگ لگ گئی تھی اور سورج آہستہ آہستہ ان لال پردوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ بی بی دیر تک بادلوں کو دیکھتی رہی اور بھینس چارا کھاتی رہی۔ بی بی نے ٹوکرے کی طرف دیکھا۔ چارہ ختم ہونے والا تھا۔ اس نے بھینس کے پٹھوں پر ہاتھ پھیرا اور پچکارا۔ بھینس نے منہ موڑ کر بی بی کی طرف دیکھا۔ بی بی نے دوہنا گھٹنوں میں دبا لیا۔ اب تھنوں کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ دودھ سے بھر گئے۔ بی بی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ شرر شرر دودھ کی دھاریں دوہنے میں گرنے لگیں۔ سفید سفید جھاگ کی سطح بلند ہونے لگی۔ آخر تھن دودھ سے خالی ہو گئے۔ بی بی نے اٹھ کر دوہنا سر پر رکھا اور کہا "بھیا! اب میں جاتی ہوں۔ آج دال تو نہیں پک سکے گی۔"

"میں دودھ سے دو لقمے کھا لوں گا۔ تو فکر نہ کر بی بی۔"

پگڈنڈی کے دونوں طرف گندم کے کھیت تھے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ آسمان پر تارے نکل آتے تھے۔ پودوں پر اوس کی نمی تھی۔ بی بی کی شلوار سے لگ کر پودے سرسراتے اور اس کے قطرے شلوار پر گر کر ٹوٹ جاتے۔ گاؤں پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا چکا تھا۔ تنگ گلی میں سے گزرتے ہوئے بی بی کو بہت احتیاط سے چلنا پڑا۔ دونوں طرف مکانوں کے اندر مٹی کے دیئے روشن تھے لیکن اس کے باوجود گلی میں اندھیرا تھا۔ چودھری کی بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور دروازے کے سامنے گلی کے حصے میں لالٹین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بی بی اُس جگہ پہنچ کر تھوڑا سا ٹھٹکی۔ اس نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ اندر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور کچھ نوجوان لڑکے تاش کھیل رہے تھے۔ بی بی کا رکا ہوا قدم اٹھا ہی تھا کہ چودھری کے بیٹے کی نگاہ پڑ گئی۔

"یہ کون ہے؟" چودھری کے بیٹے نے کہا۔

"یہ بی بی ہے۔ شیرے کی چھوٹی بہن" ایک نوجوان نے کہا۔

"بی بی" چودھری کے بیٹے نے آہ بھرتے ہوتے ذرا اونچی آواز میں کہا اور اٹھ کر دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ اس نے پھر ایک آہ بھری اور کہا "بی بی!"

بی بی نے یہ لفظ سن لیا۔ اُس کے تن بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا کر گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ بی بی! بی بی! بی بی کوئی بڑی میٹھی آواز میں اسے پکارتا اور اس کے کانوں میں رس گھولتا رہا۔ گھر پہنچنے تک چودھری کے بیٹے کا کہا ہوا یہ لفظ کئی بار اُس کے کانوں میں گونجا اور اس میں ہر بار نئے معنی پیدا ہوتے چلے گئے۔ اس ایک لفظ میں کتنی مٹھاس تھی، کتنا پیار تھا! بی بی کو آج سے پہلے کسی نے بھی اس انداز میں نہیں پکارا تھا۔

نجانے کب اُس کا گھر آیا۔ کب اس نے دروازے کے ساتھ والے طاق میں کنجی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ طاق میں کنجی موجود نہیں تھی۔ اُس نے حیران ہو کر دروازے کو ٹٹولا۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ اُس نے دروازے پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھل گیا۔ اندر دیے کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور کڑوے تیل کی بُو رچی ہوئی تھی۔ بی بی کچھ دیر تک حیران ہو کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دوپٹا ایک کونے میں رکھا اور اُس کے ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھے "بھابی آگئی! بھابی آگئی" اُس نے زیرِ لب خوش ہو کر کہا۔ اس نے دودھ چاٹی میں انڈیلا اور بھابی کے لئے ایک پیالہ لبالب بھر کر طاقچے میں رکھ دیا۔ پھر اُس نے چارپائی بچھائی اور اُس پر بیٹھ کر بھابی کا انتظار کرنے لگی۔ بھابی کے انتظار میں بہت لُطف تھا۔ بھابی آج پورے آٹھ دن بعد اپنے ماموں کے ہاں سے لوٹ رہی تھی۔ بھابی اس کی چچا زاد بہن تھی۔ اُن کے گھر کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ بھابی اُس سے عمر میں کئی سال بڑی تھی لیکن اس کے باوجود اس میں بڑا گہرا سہیلاپا تھا۔

اس کے بھائی شیرے کا بیاہ پچھلے چیت میں ہوا تھا۔ باجے بجے تھے۔ آتش بازی چھٹی تھی۔ ڈھولک پر بڑے پیارے پیارے گیت گائے گئے تھے۔ کاش اُس دن اس کی ماں زندہ ہوتی! چاچی نے ہر رسم میں کنجوسی کی تھی۔ ڈھولک پر گانے والی سہیلیوں کا جی بھر کر منہ بھی تو میٹھا نہ کرا سکی تھی۔ بھابی کے آنے پر اُس کے بھائی شیرے نے علیحدہ گھر بسا لیا تھا اور بھابی اُس سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ اُسے اپنی سگی چھوٹی بہن سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بھابی سے جدائی کے یہ آٹھ دن آٹھ سال بن گئے تھے۔ اب وہ بھابی کو کبھی ماموں کے ہاں نہ جانے دے گی۔ ہاں! اُس کے ننھیال میں تو آئے دن کوئی نہ کوئی مرتا رہتا ہے۔ پھر یکایک بی بی کے خیالات کی رَو بدلی یہ چودھری کا بیٹا! اس نے میرا نام اس طرح لے کر پکارا جیسے مجھے مدتوں سے جانتا ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑے چودھری کے لاڈ پیار نے اُسے بہت بگاڑ دیا ہے۔ وہ راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑتا ہے لیکن لوگ بڑے چودھری کے ڈر سے اُسے کچھ نہیں کہتے۔ لیکن اگر میرے بھائی شیرے نے یہ سن لیا کہ چودھری کے بیٹے نے میرا نام لے کر پکارا ہے تو وہ اس کا سر کچل دے گا اور کہے گا "دیکھ چودھری تو نے پھر کبھی میری بہن بی بی کا نام لیا تو جان سے مار دوں گا" اور یہاں پہنچ کر بی بی کو بہت خوف محسوس ہوا۔ وہ ڈر کے مارے کانپ گئی۔ وہ چارپائی سے اٹھی۔ دروازے کی طرف بڑھی۔ چوں چراں چوں کی آواز سے دروازہ کھلا۔

کھلے دروازے میں اس کی بھابی کھڑی تھی۔ اس کے سر پر روٹیوں کی چنگیر تھی۔ بی بی اور وہ کچھ دیر ٹھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر بھابی نے چنگیر سر سے اتار کر چارپائی پر رکھی اور بی بی اس سے لپٹ گئی۔ بی بی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا:

"تو تو ہمیں بھول ہی گئی تھی بھابی۔ تو نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"دیر..... دو چار دن ہی تو رہ کے آئی ہوں۔ کون سے سال لگ گئے ہیں؟" بھابی نے کہا۔

"مجھے تو ایک دن ایک سال لگتا تھا"

"سچ؟"

"ہاں بھابی اگر تو آج نہ آتی تو میں کل بھائی کو ضرور بھیجتی"

"میں نے بھی تو بہت جلدی کی۔ مامی تو اب بھی نہ آنے دیتی تھیں۔ کہتی تھیں، ابھی تیرے بیاہ کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں اور تجھے سسرال سے اتنی محبت ہو گئی ہے"

"پھر تو نے کیا کہا بھابی؟" بی بی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا کہ بی بی سے مجھے بہت پیار ہو گیا ہے اور بی بی کو میرے بغیر ایک ایک دن پہاڑ لگتا ہوگا"

"ہاں بھابی! دن تو جوں توں کر کے گزر جاتا تھا، پر رات کاٹے نہ کٹتی تھی۔ اتنا بڑا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا!"

"لو اب تو میں آگئی ہوں نا" بھابی نے کہا اور بی بی نے مسکرا کر بڑی پیار بھری نگاہوں سے بھابی کو دیکھا "تیرے بھیا اتنی دیر سے کیوں لوٹتے ہیں؟"

بی بی نے کچھ جواب نہ دیا لیکن اس کی آنکھیں شوخی سے مسکرا اٹھیں۔ بھابی نے اپنی بات پر جھینپ کر نگاہیں جھکا لیں:

بی بی نے کہا "ایک بات کہوں بھابی۔ اگر تو بُرا نہ مانے تو؟"

"کہو پگلی"

"تیرے بنا بھائی کا جی نہ لگتا تھا۔ وہ گھر آ کر گم سم بیٹھے رہتے تھے۔ کہتے تھے بی بی تیری بھابی کے نہ ہونے سے گھر کتنا سونا لگتا ہے"

"چل جھوٹی کہیں کی" بھابی نے شرماتے ہوئے کہا لیکن دوسرے لمحے شرماتے ہوئے چہرے پر زردی سا رنگ پھر گیا لیکن دیے کی مدھم روشنی میں بی بی اس تبدیلی کو محسوس نہ کر سکی۔ اس لئے کہا "نہیں بھابی میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بھائی تو مجھ سے بھی زیادہ اداس تھے۔ آج بھی کہہ رہے تھے کہ خدا کرے بی بی تیری بھابی آ جائے"

"چل کیسے جھوٹ گھڑ لیتے آتے ہیں اسے" بھابی نے مری ہوئی آواز میں کہا اور نظریں جھکا کر زمین پر دیکھنے لگی اور خاموش ہو گئی۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ بی بی محوِ انتظار ہو کر بھابی کی طرف دیکھنے لگی تھوڑی دیر بعد بھابی کی جھکی ہوئی نظریں اٹھیں اور اس نے لجا لجا کر کہا:

"لیکن بی بی۔ تیرے بھیا روز دیر سے آتے رہے کیا؟"

"کیوں بھابی۔ اگر بھیا سے اتنا ہی پیار تھا تو پورے آٹھ دن ماموں کے ہاں کیوں رہ کر آئی تو؟"

بھابی نے یکایک سنجیدہ ہو کر کہا "تیرے بھیا کو میرے پیچھے تو جلد گھر آ جانا چاہیئے تھا"

"کیوں بھابی؟" بی بی نے بڑی معصومیت سے سوال کیا

"اکیلے گھر میں جوان بیٹی یا بہن کو اکیلا نہیں رہنا چاہیئے" بھابی نے بڑی متانت سے کہا اور بی بی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بھابی نے غصے سے کہا "بی بی! پگلوں کی طرح کیوں ہنس رہی ہے تو"

"یونہی! بھیا بہت دیر سے آتے رہے لیکن مجھے ذرہ بھر ڈر نہ لگا۔ نہ کوئی جن دیکھا نہ بھوت کہ مجھے کھا جاتا۔ پر ایک بات ضرور تھی ....."

"کیا؟" بھابی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک رات باہر صحن میں نجانے کون گھومتا رہا۔ میں نے دروازہ کھولا تو صحن خالی تھا۔ دوسری رات پھر یہی ہوا۔ کسی نے کہا بی بی، دبے پاؤں باہر جو نکلی تو سیڑھیوں پر ایک کتا چڑھ رہا تھا لیکن بھابی! مجھے ہنسی اس بات پر آئی کہ کہیں کتے بھی کسی کا نام لے کر پکارتے ہیں؟"

"کتے؟" بھابی نے حیران ہو کر پوچھا "میں نہیں سمجھی بی بی....."

"میں بھی آج تک نہیں سمجھ سکی تھی" بی بی نے معصومیت سے کہا "پر آج"

"پگلی! تیرے کان بجے ہوں گے" بھابی نے مسکرا کر کہا۔

"پر آج جب میں گلی سے گزری تو کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو اب کے میرا نام پکارنے والا کتا نہیں تھا۔ چودھری کا بیٹا تھا جو اپنی بیٹھک کے دروازے میں کھڑا تھا"

"چودھری کا بیٹا!" بھابی نے چیختے ہوئے کہا "ذلیل۔ کتا۔ آوارہ۔ بے وفا"

اور بھابی کے چہرے پر غصے کی چتلی پتلی گھٹائیں چھا گئیں۔ بی بی ششدر رہ گئی۔ بی بی نے گھٹاؤں کو گہرا ہوتے دیکھا اور بھابی کے باریک ہونٹوں کو کانپتے دیکھا۔ دھیرے دھیرے اُن ہونٹوں پر اس سرخی کا نام و نشان بھی نہ رہا جو بی بی کو بہت پسند تھی اور بھابی کا سب سے بڑا حسن تھی۔ بھابی نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گئی:

بی بی نے کہا "بھابی تمہیں کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں" بھابی نے یکایک بیدار ہوتے ہوئے کہا "تمہارے بھیا ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

"وہ تو ہمیشہ دیر سے آتے ہیں"

"پر انھیں میرے پیچھے تو جلدی گھر آ جانا چاہیئے تھا"

"بھابی یہ تو بار بار ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟" بی بی نے بڑی معصومیت سے پوچھا لیکن بھابی نے پھر اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور بھابی پھر اپنے خیالات میں کھو گئیں۔ خاموشی طول پکڑ گئی تو بی بی نے گھبرا کر کہا "بھابی! کوئی بات کر۔ میرا جی تیری میٹھی میٹھی باتیں سننے کے لئے ترس کر رہ گیا تھا"

"سچ" بھابی نے ذرا جھک کر کہا "میری باتیں تجھے بہت میٹھی لگتی ہیں بی بی؟"

"شہد سے بھی زیادہ میٹھی بھابی" بی بی کے لہجے میں شوخی تھی۔ دیے کی مدھم روشنی میں اس کی آنکھیں سرِ شام چمکنے والے دو ستاروں کی مانند درخشں

بی بی! بی بی! " اس کے تصور نے پکار کر کہا۔ بی بی! بی بی! کوئی اُسے قریب سے
ہوگئیں اور آہستہ آہستہ وہ چک دھند میں کھوتی چلی گئی " بہت میٹھی . . . . . بی بی! بی بی!
پکارتا رہا اور اس کا انگ انگ اس پکار کا خاموش جواب دیتا رہا اور اس کی آنکھیں پھر ستاروں کی مانند روشن ہوگئیں۔ اس کی دوشیزگی نکھر نکھر کر سنورتی رہی اور
اس کے ہونٹ کسی نہ سنے جانے والی تال پر رقص کرتے رہے۔ یہ 'بی بی' کا ایک لفظ بھابی کی سو باتوں سے بھی زیادہ میٹھا تھا۔

"بی بی! " اس کی بھابی نے پکار کر کہا " تیرے بھیا ابھی تک کیوں نہیں آئے "؟

"بھیا! " بی بی نے بوکھلا کر کہا اور اس کا رنگین خواب چکنا چور ہوگیا۔

" آجائیں گے . . . . بس آنے والے ہی ہوں گے۔ " اُس نے بی بی کی طرف دیکھا اور اب اس کی آنکھوں میں غصّے کی ایک جھلک تھی۔

" میں نے امی سے کہا 'اب مجھے جانے دے۔ ورنہ میری بی بی روٹھ جائے گی'، اور امی نے کہا، 'جا رشیاں جا۔ تجھے اپنے گھر سے کتنا پیار ہوگیا ہے۔
سچ کہتے ہیں لوگ، بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں'! میں نے کہا 'میرے بغیر بی بی تڑپ رہی ہوگی'! امی کی مرضی تھی کہ میں کچھ دیر اور ٹھہر جاؤں پر مجھے تیرے خیال
نے . . . . . . "

" بھابی! بھابی . . . . ہیر . . . . ہیر گا رہی ہے "۔ بی بی نے اچانک تیز تیز کہا۔

" ہیر؟ " بھابی نے حیران ہوکر کہا۔

" ہیر قاضی سے سوال جواب کر رہی ہے۔ ہیر کہہ رہی ہے 'قاضیا جھوٹ بولیں' "
بھابی نے خاموش ہوکر باہر کی طرف کان لگا دیئے۔ ہیر گانے والی کی مدھم آواز آہستہ آہستہ بلند ہوئی اور پھر دھیرے دھیرے ڈوبتی چلی گئی اور تھوڑی دیر
بعد رات کی خاموشیوں میں جذب ہوگئی۔ بی بی آواز کے اتار چڑھاؤ میں ابھر ابھر کر ڈوبتی رہی۔ آواز ڈوب گئی اور بہت دیر بعد بی بی کو ہوش آیا۔ اس نے چونک کر
اپنے اردگرد دیکھا۔ بھابی آدھ کھلے دروازے سے باہر جھانک رہی تھی۔

"بھابی! " بی بی نے دھیمے سے کہا " یہ ہیر کون تھی؟ "

" ہیر . . . . پگلی! ہیر کا قصہ تو بہت پرانا ہے، یہ تو ہیر کا رکاٹ بج رہا تھا۔ "

" رکاٹ؟ . . . . رکاٹ کیا ہوتا ہے بھابی؟ "

" میں کیا جانوں بی بی۔ یہ ایک کالا سا توا ہوتا ہے۔ وہ گھومتا ہے تو اس میں سے ہیر کی آواز نکلتی ہے۔ "

" ہیر کی آواز . . . . کالا سا توا . . . . تو تو کہتی تھی کہ ہیر کا قصہ بہت پرانا ہے۔ "

" ہاں! ہیر تو کب کی مر گئی ہے۔ اب رکاٹ میں ہیر تو نہیں بولتی "۔

" تو کون بولتا ہے؟ "

" میں کیا جانوں؟ مجھے کیا پتہ۔ ہیر آج سے کئی سو سال پہلے، نہ جانے کب کی مر چکی ہے۔ ہیر جھنگ سیال کی رہنے والی تھی، اس کا باپ چوچک وہاں کا سردار تھا
رانجھا تخت ہزارے کا رہنے والا تھا۔ وہ بانسری بجایا کرتا تھا۔ ایک دن بھابیوں نے اُسے طعنہ دیا کہ دیکھیں تو بھلا ہیر کو بیاہ لاتا ہے۔ آنا بانکا بنا پھرتا ہے۔ اور
وہ بانسری ہاتھ میں لے کر ہیر کے دیس کی طرف چل پڑا۔ گھومتے گھامتے ہیر کے باغ میں آنکلا۔ ہیر چناب کے کنارے اپنے بابل کے باغ میں پھولوں کی سیج پر
سو رہی تھی . . . . " بھابی رک گئی۔

" پھر . . . . پھر کیا ہوا؟ " بی بی نے بے تاب ہوکر کہا۔

" پگلی میں کیا جانوں؟ لوگ کہتے ہیں کہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں کو ایسا لگا جیسے وہ مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں، جیسے
وہ بچھڑ کر ایک دوسرے سے مل گئے ہوں۔ رانجھا چوچک کے ہاں بھینس چرانے پر نوکر ہوگیا، وہ بیلے میں جا کر بھینس چراتا اور ہیر اس کے لئے ہر روز چُوری کا
کٹورہ لے کر جاتی . . . . " بھابی پھر رک کر خلاؤں میں گھورنے لگی۔ بی بی کی آنکھیں ایک اَن جانے کیف سے شرابی ہو رہی تھیں۔ بی بی نے اُس
شرابی کی طرح جس کا نشہ ٹوٹ رہا ہو، بیتاب ہوکر کہا " بھابی رک کیوں گئی ہو؟ پھر کیا ہوا؟ "!

"پھر کیا ہونا تھا۔ ہیر اور رانجھے کا عشق چھپ نہ سکا۔ لوگوں نے چوچک کو طعنے دیئے۔ کیدو نے جو ہیر کا چچا تھا، چھپ چھپ کر ہیر کو رانجھے کے پاس جاتے دیکھا اور ایک دن وہ فقیر بن کر رانجھے سے چوری بھی مانگ لایا۔ چوچک کو یقین آگیا اور اس نے رانجھے کو نکال دیا۔ اور رنگ پور کے کھیڑوں سے کہا کہ آکر ہیر کو بیاہ لے جائیں۔" بھابی نے رک کر بی بی کی طرف دیکھا۔ بی بی نے آنکھیں موند لی تھیں۔ دیے کی ہلکی دھیمی روشنی میں بی بی کا چہرہ کانوں کی لووں تک سرخ نظر آرہا تھا۔ اس کے سینے کے زیر و بم میں ایک عجیب کیف تھا۔ نہ تندی، نہ تیزی، نہ طوفان، نہ حرکت جیسے یہ سینہ آہستہ آہستہ ان الہامات کا دفینہ بن رہا تھا جو دنیا کی ہر کنواری پر اس وقت نازل ہوتے ہیں جب اس کے کان محبت کا پہلا بول سنتے ہیں۔

یکایک بی بی نے بیدار ہوتے ہوئے کہا "پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا بھابی؟" "نادان! اس کے بعد وہی ہوا جو آج تک ہوتا آیا ہے۔ رنگپور کے کھیڑے برات لے کر آئے اور ہیر نے قاضی کو شرع کا واسطہ دیا۔ بابل کے سامنے ہاتھ جوڑے، ماں کا دامن پکڑ لیا، لیکن کسی نے بھی اس کی دستگیری نہ کی، رنگ پور کے کھیڑے اسے ڈولی میں بٹھا کر لے گئے اور ہیر ڈولی میں بیٹھ کر چیخیں مارنے لگی۔"

"ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں۔۔۔"

"بھابی!۔۔۔۔۔ بھابی۔۔۔۔۔ ہیر ڈولی پر چڑھ کر چیخیں مار رہی ہے"

"یہ ہیر نہیں، یہ ہیر کا سکاٹ بج رہا ہے۔"

ہیر گانے والی کی آواز میں درد تھا، سوز تھا، گداز تھا۔ بی بی نغمے کے زیر و بم پر اڑنے لگی۔ اسے اپنا ماحول بھول گیا۔ ایک لمحے کی پہنائی اس کے لئے صدیوں کی وسعت بے کراں بن گئی۔ آہستہ آہستہ نغمہ فضاؤں میں ڈوب گیا اور آہستہ آہستہ بی بی زمین پر اتر آئی۔ صدیاں بیت گئیں اور بی بی کو بہت دیر کے بعد ہوش آیا۔ بی بی کی آنکھ میں ایک لرزتا ہوا قطرہ آیا۔ اور ٹوٹ گیا۔ اس نے بھابی کی طرف دیکھا اور درد میں ڈوبی ہوئی لرزتی، کانپتی آواز میں کہا "پھر کیا ہوا بھابی؟"

"چھوڑ اس قصے کو بی بی۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ تیرے بھیا کیوں نہیں آئے؟"

بی بی نے کچھ جواب نہ دیا۔ کمرے کی خاموش فضا میں ابھی تک نغمے کا کیف رچا ہوا تھا۔ یکایک بھابی نے چونک کر کہا "تیرے بھیا آرہے ہیں، یہ کس کے قدموں کی چاپ ہے؟"

"میں کیا جانوں بھابی!" بی بی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ بھابی نے کچھ لمحے انتظار کیا۔ پھر حیران ہو کر کہا "بی بی! میرے کان بجے تھے شاید!"

بی بی تیزی سے اٹھی۔ زور سے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ بھابی اور بھی حیران ہوگئی۔ پٹ دھیرے دھیرے چر رر چوں چوں کی آواز کے ساتھ واپس گھومے اور کھٹ سے مل گئے۔ بھابی کھوئے کھوئے انداز میں بند کواڑوں کی طرف دیکھتی رہی اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں وہ روشنی جاگنے لگی جو بیداری و ذہانت کا دوسرا نام ہے۔ پھر ان آنکھوں میں غصے کی ایک چمک پیدا ہوئی اور پھیلنے لگی۔ اس کے ہونٹ لرزے، حساس نتھنے کانپے اور پھر ہونٹ کھل گئے۔ اس کے دانت ننگے ہوگئے اور اس نے دانت پیستے ہوئے کہا "کم بخت ہیر بن رہی ہے۔ چودھری کا بیٹا۔ بے وفا، ہرجائی۔ میں آٹھ دن باہر رہی اور اس نے بی بی کے ساتھ ہیر رانجھے کا کھیل شروع کر دیا۔" وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور بی بی اندر داخل ہوئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

"یہ کون تھا بی بی؟"

"چودھری کا بیٹا!" بی بی نے کہا۔

"یہ کیا لینے آیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں تو، میں جب باہر نکلی تو وہ سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے کہا، بی بی! تیرے بھیا ابھی کنویں سے نہیں آئے، میں نے کہا "نہیں!"

"بس؟"

"ہاں بھابی، وہ یہ سن کر واپس چلا گیا۔"

"وہ تیرے بھیا سے نہیں ملنے آیا تھا۔ وہ تجھ سے ملنے کے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا۔"

"ایسا نہ کہو بھابی۔" بی بی کی آواز میں شرم کے علاوہ خوشی کے سر تھے۔

"ایسا کیوں نہ کہوں؟ آج تو نے ہیر رانجھے کا قصہ چھیڑ دیا اور میں سمجھ گئی، یہ کھیل بہت خطرناک ہے، کاش میں یہاں سے نہ جاتی!"

"کیوں بھابی؟"

"مجھے ہیر بننے کا خیال تو نہ آنا بی بی"

"ہیر۔ کیا کہا بھابی؟۔ میں ہیر ہوں؟!" بی بی نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"ہیر؟" بھابی نے دانت پیستے ہوئے کہا "کلموہی نہ تو ہیر ہے اور چودھری کا بیٹا رانجھا، وہ ہرجائی اور بے وفا ہے۔ کمینہ، ذلیل اچھے موقع ملے تو اس کے سر پر سو جوتے لگاؤں۔ میں آٹھ دن باہر رہی اور اُس نے تیرے ساتھ ... محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ میرا بس چلے تو میں اس کا گلا .... گھ.... گھو .... گھونٹ دوں!" بھابی کا اپنا گلا جیسے کسی نے گھونٹ دیا۔ شدتِ جذبات سے اس کی زبان بند ہو گئی۔ اور آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ خشک آنکھیں، سوکھے ہونٹ! بھابی کا چہرہ انتہائی خوفناک بن کر رہ گیا۔

"بھابی تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے .... کچھ بھی نہیں .... ڈائن!" بھابی کی وحشت زدہ آنکھیں اور پھیل گئیں اور بی بی سہم کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔

"مجھے کچھ بھی نہیں ہوا چڑیل!" بھابی نے کہا اور بی بی کچھ بھی نہ سمجھ سکی، لیکن بھابی کے اس غیر معمولی رویے سے بی بی کے دل پر چوٹ لگی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ہزار ضبط کے باوجود وہ آنسوؤں کو روک نہ سکی۔ آنسو چھم چھم برسنے لگے اور دروازہ پھٹ سے کھلا۔ اس کے بھائی نے اندر آتے ہی کہا "تو آگئی رشیاں! بی بی بہت اداس تھی۔ ہیں تم رو رہی ہو بی بی۔ کیوں رشیاں تو نے آتے ہی نند بھاوج کا جھگڑا شروع کر دیا؟ کیوں بی بی؟" بی بی کچھ نہ بولی، اس کے بھائی نے غصے سے کانپ کر کہا "دیکھ رشیاں! مجھے بی بی سے بڑھ کر کوئی پیارا نہیں۔ اگر تو نے اس کا دل دکھایا تو میں چوٹی سے پکڑ کر تجھے گھر سے نکال دوں گا۔"

"نہیں بھیا، ایسا نہ کہو، مجھے بھابی نے کچھ نہیں کہا۔ یہ تو خوشی کے آنسو تھے۔ آج بھابی آٹھ دن کے بعد لوٹی ہے نا۔ میں رو کب رہی تھی؟" اور بی بی نے مسکرا کر اپنے آنسوؤں کو پی لیا۔

"سچ؟" اس کے بھائی نے خوش ہو کر کہا "میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ رشیاں روٹی لا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ تو آگئی۔ آج نہ جانے گاؤں کا بچہ کہاں غائب ہو گیا، آج میں کوئیں پر جا کر سوؤں گا، ڈھور ڈنگروں کی رکھوالی کون کرے؟"

بی بی طاقچے سے دودھ کا کٹورا نکال لائی اور رشیاں نے اُس کے سامنے چنگیر سرکا دی۔ بی بی کے بھائی نے روٹی کھائی۔ رشیاں سے اس کے ننھیال کے بارے میں ایک دو باتیں کیں اور چادر کندھے پر ڈال کر چلا گیا۔ بی بی اور رشیاں اکیلی رہ گئیں۔ چند لمحے فضا میں گھٹن رہی۔ بی بی خلاؤں میں گھورتی رہی اور رشیاں زمین پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی۔ یکایک بی بی بازو پھیلا کر بڑھی اور رشیاں کے گلے میں ڈال کر کہنے لگی "بھابی تو ناراض ہو گئی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا، تو نجانے مجھ سے کیوں روٹھ گئی؟"

"نہیں تو بی بی میں تجھ سے کب روٹھی۔ مجھے تو چودھری کے بیٹے پر غصہ آیا تھا۔ وہ بڑا ہرجائی اور بے وفا ہے" بھابی کا گلا پھر سے رندھ گیا۔

"چھوڑ اس قصے کو بھابی۔ مجھے ہیر رانجھے کا قصہ سنا۔"

"بس چلی! میں بہت تھکی ہوئی ہوں، کل سہی۔" بھابی نے ذرا درشتی سے کہا، "نہیں بھابی آج۔" بی بی نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا "کل سجا آئے یا نہ آئے۔"

"تو بہت ضد کر رہی ہے۔ چل بستر بچھا۔" بی بی نے اٹھ کر بستر بچھایا۔ بھابی نے دو چار لقمے کھائے۔ بی بی کی بھوک نجانے کیوں اُڑ کر رہ گئی تھی۔ بھابی نے جلدی جلدی چنگیر ٹھکانے لگائی اور پھر دونوں بستر میں گھس گئیں۔ بی بی نے بھابی سے کہا:

"ہیر کو رنگ پور کے کھیڑے لے گئے۔ پھر رانجھا کہاں گیا؟"

"رانجھے نے جوگ لے لیا اور وہ کانوں میں مندرے ڈال کر دیس دیس کی سیر کرنے لگا اور ایک دن وہ رنگ پور آگیا۔ اس نے ہیر کے گھر آکر صدا دی۔ ہیر نے رانجھے کی کشکول میں مٹھی بھر آٹا ڈالا اور دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ ہیر نے روتے ہوئے کہا "رانجھا میں ہمیشہ تیری تھی اور تیری رہوں گی" رانجھے نے رنگ پور کے باہر ڈیرہ لگا لیا۔ ہیر گھر والوں سے چھپ چھپ کر اندھیری راتوں میں رانجھے سے ملنے لگی۔

"اور ہیر کے سسرال والوں کو اس کا پتہ نہ لگا؟"

"پتہ لگ گیا۔ پتہ کیسے نہ لگتا۔" بھاآبی کے ہونٹ کانپے۔ "انھوں نے جھوٹی عزت کے نام پر ہیر کو زہر دے دیا" بھابی کا سارا جسم تھرا گیا اور وہ یکایک خاموش ہوگئی۔

"رانجھے کا کیا بنا؟" بی آبی نے سوال کیا۔

"جب رانجھے نے یہ سُنا تو وہ اتنا بڑا غم سہہ نہ سکا۔ اس نے بھی جان دے دی۔ دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا۔ وہ جو زندگی میں اکٹھے نہ ہوسکے تھے، موت کے بعد مل گئے۔"

بھاآبی نے قصہ سنا کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بی آبی نے آنکھیں بند کرلیں۔ دیئے کا تیل ختم ہوگیا۔ آخری شعلہ لپکا اور دیا دھوئیں کا آخری مرغولہ چھوڑ کر بجھ گیا۔ کچے کمرے کی تنگ فضا میں اندھیرا چھا گیا۔ گھپ اندھیرے میں کڑوے تیل کی جلی ہوئی بُو دیر تک رچی رہی، لیکن دیر تک بی آبی کو نیند نہ آسکی۔ اس نے کروٹ پر کروٹ بدلی۔ اس کی روح میں دھیرے دھیرے ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ وہ طوفان جو رانجھے کو دیکھ کر ہیر کے دل میں اٹھا تھا۔ یہ طوفان جس میں تندی نہ تھی، ایک دھیما سا نغمہ تھا۔ صبح کی ہوا کے ہلکے ہلکے ہلکوروں پر اُڑتی ہوئی معصوم کلیوں کی ایک آوارہ بو کا تھا تھا رکا رکا طوفان۔ ایک ایسی آگ جس میں شعلے نہ تھے، ہلکی ہلکی تمازت تھی۔ آہستہ آہستہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی، اس کی آنکھیں مند گئیں اور اُس نے وہی ننھے سپنے جو آج رات اس کے کنوارے ارمان بن گئے تھے۔ اس کے جسم نے اس کی روح کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اس کی روح ان سبک پرواز نغموں پر اڑنے لگی، وہ کبھی جھنگ سیالے کی طرف پرواز کر گئی۔ کبھی رنگ پور کو۔ ہیر اور رانجھے کا معصوم عشق اس کی نئی نئی دنیاؤں میں رہنمائی کرتا رہا۔ یہ نئی شاہراہیں، یہ نئے راستے، یہ اجنبی موڑ، یہ ان دیکھی وادیاں ۔ ۔ ۔ اس کی روح ہیر کی روح میں جذب ہوگئی!

اور اس کی روح نے دھیمے سے کہا تیرا رانجھا کون ہے؟ تو کس رانجھے کی تلاش میں ہے؟" اور کسی نے پکار کر کہا۔ "وہ رانجھا جو تخت ہزارے سے آتا ہے اور ہر کنواری مٹیارے کے من میں بس جایا کرتا ہے بی آبی!" ــــ بی آبی! بی آبی! بی آبی! ــــ یہ کتنی میٹھی آواز تھی۔ یہ کس رانجھے کی پکار تھی۔ اس میں وہی کیف تھا، وہی سرمدی نغمے، اور نیند کی دھند چھٹ گئی۔ اُس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ چار کھونٹ اندھیرا تھا۔ نجانے وہ کس اندھیری وادی میں کھوگئی تھی کہ جہاں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں تھی وہ اُٹھی، اس نے دیواروں کو ٹٹولا، ابھی تک خواب کا نشہ اترا نہیں تھا۔ وہ ابھی تک نغموں کے پروں پر سوار تھی ــ 'بی بی!' کسی نے پھر پکارا۔ اُس نے لپک کر دروازہ کھولا، اس کے قدم اُس اندھیری گلی کی طرف اُٹھ گئے۔ جس کے نکڑ پر اُس نے بی آبی کا پیارا نغمہ پہلی بار سنا تھا۔ وہ چند لمحے ٹھٹکی، پھر اس نے وہ دروازہ دیکھ لیا جس سے پرے رانجھوں کی دنیا تھی۔ تخت ہزارے، جھنگ اور رنگ پور تھے ۔ ۔ ۔ ۔ چناب کی مست اور عشق پرور لہروں کا رقص تھا ۔ ۔ ۔ ۔

"لیکن بی آبی! ہمیشہ رانجھے ہیر کے پاس آیا کرتے ہیں۔ ہیریں کبھی پہل کر کے رانجھوں کے پاس جایا نہیں کرتیں۔ ہمیشہ ہر رانجھے نے اپنی ہیر کو ڈھونڈا۔ یہ عشق کی پرانی ریت ہے"

یہ سوچ کر اس کے قدم اندھیری گلی میں اندھیرے کے ساتھ چپک کر رہ گئے تھے۔ نہیں۔ میں پہلے نہیں بڑھوں گی۔ میرے عشق کے جھنگ سیالے میں رانجھے کو پہلے آنا چاہیئے" اور اس نے لوٹنے کیلئے پہلا قدم اُٹھایا اور کوئی اس کے کانوں کے قریب آکر پکارا "بی بی!" اس کا اٹھا ہوا قدم رک گیا۔ "میں نے آج تجھے گلی میں گزرتے ہوئے کتنے میٹھے انداز میں پکارا تھا۔ میں نے کہا تھا 'بی بی!' اور تیری روح نے میری پکار کا خاموش جواب دیا۔ میں ہی رانجھا تھا۔ میں نے ہی عشق کے جھنگ سیالے میں تجھے پکار کر پہلا قدم رکھا تھا۔ اب تیری باری ہے کہ تو بیلے میں مجھ سے ملنے کے لئے آئے" اور بی آبی نے اپنے رانجھے کے پاس بیلے میں جانے کے لئے آخری فیصلہ کرلیا اس کے ہاتھ دروازے تک پہنچ گئے۔ اور دوسرے لمحے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو سکتہ ہوگیا!

"چودھری میں اب جاتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں لشیاں، میں تیری راہ تکتا رہا ہوں۔"

"سچ! تو مجھ سے ملنے کے لئے آیا تھا؟ تو جھوٹ تو نہیں بول رہا۔ تو بی آبی سے ملنے کے لئے آیا تھا؟"

"نہیں، تو میری بات سچ جان۔ میں تجھ سے بیوفائی کیسے کرسکتا تھا؟ میں ایک ہیر کو چھوڑ کر دوسری ہیر کیسے اپنا لیتا؟ تو بہت شک کرتی ہے"

اور بی آبی کا شل ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے گر گیا۔ لیکن اس لمحے اس کا سارا جسم شل ہوگیا۔ اور زمین چکر کھا کر آسمان سے مل گئی۔ چاند ستاروں کے ساتھ
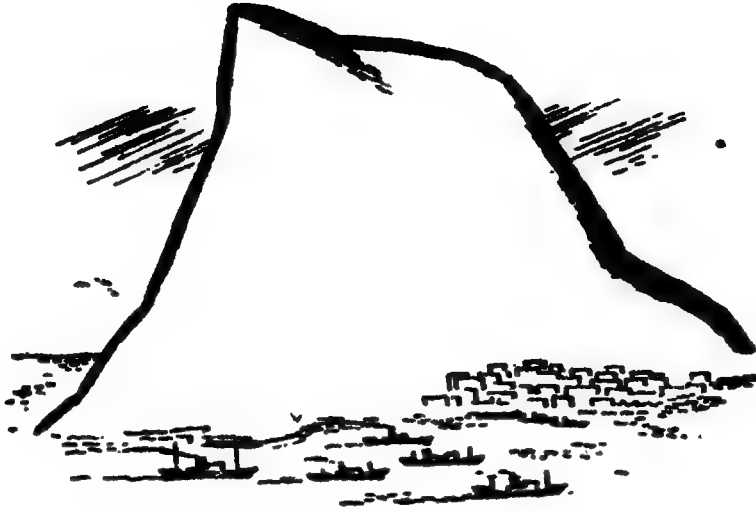
(باقی صفحہ ۵۶ پر)

ماہ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۷ء

افسانہ

دھان

علاء الدین الآزاد

مترجمہ: ابو سعید نورالدین

گو اب بالوں میں مہک نہیں رہی ہے۔ مگر کسی وقت ان میں چمک ضرور تھی۔ خوشبودار تیل کا چلن اگرچہ اب نہیں ہوتا تھا، مگر بالوں کی نرالی ریشمی بناوٹ اور سیاہ بھونر کی طرح گھنی سجاوٹ اس کا ثبوت ضرور ہے۔ دونوں میلے کچیلے تکیے پر سر رکھ کر سو گئے تھے۔ دونوں کے چہرے نزدیک نزدیک تھے، لیٹتے وقت اس نے چوٹی کھول دی تھی۔ اِدھر اُدھر کروٹ لینے سے سرہانے اور منھ کے آس پاس کافی بال بکھر گئے تھے۔ اس نے اس کے گرم سانسوں کو محسوس کیا اور بہت دیر تک اس سہلنے لمحہ میں کھویا رہا۔

مجیب نے سونا چاہا، لیکن جانے کیا چیز اس کے دماغ میں پیشانی کی رگوں کو حرکت دے کر چکر کھانے لگی۔ آنکھیں بہت دیر تک بند رکھنے کی وجہ سے جل رہی تھیں۔ جھٹ سے اُس نے اپنا مضبوط ہاتھ مومنہ کے ماتھے پر رکھ دیا۔ مگر میلی ساڑی کے پھٹے ہوئے حاشیے میں اُنگلی اُلجھ جانے سے وہ رک گیا۔ اور لوہے کی طرح سرد اور جامد ہو گیا۔

”تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟“

پچھلے ہفتے ہاٹ لگنے کے دن مٹی کے تیل کی بوتل اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مومنہ نے کہا تھا —— اگر دیکھا جائے تو پہننے کے لائق صرف ایک ہی کپڑا تھا، جو شادی کے وقت اُسے دیا گیا تھا اور جسے وہ برابر پہنتی چلی آ رہی تھی۔ ایک اور بھی تھا مگر وہ صرف نہانے کے لئے۔ اب وہ پھٹ کر بالکل ختم ہو گیا تھا۔ جو پہننے میں آ رہا تھا وہ اتنے دن میں اس قدر پتلا ہو گیا تھا کہ ذرا سا بھی دباؤ پڑنے سے پھٹ جاتا تھا، یعنی ہوا کا ایک تند جھونکا بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ذرا بھی بے خیال ہو جانے سے جسم کے کسی نہ کسی حصے پر کسی کے بھی نظر پڑنے کا ڈر تھا اور باہر نکلے بغیر بھی چارہ نہ تھا۔ اس طرح آدمی کی آبرو بھی تو جاتی رہتی ہے۔

”بیوی کو جو مرد روٹی کپڑا نہیں دے سکتا، اُسے پھر شادی کرنے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟ شرم نہیں آتی؟“

مجیب سر نیچا کر کے بیٹھ گیا۔

”تم مجھے کیوں اپنے گھر لائے تھے؟ میرا کیا دکھ تھا؟ کیا اب تم چاہتے ہو کہ میں گلے میں رسی ڈال کر ختم ہو جاؤں؟“

وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اس کے دل میں درد سا ہونے لگا۔ وہ مجرم کی طرح بیٹھا رہا۔ اس لئے نہیں کہ چھ مہینے تک ایک ساتھ اس نے زندگی بسر کی تھی، بلکہ اس لیئے کہ بچپن سے بھی ایک دوسرے کے قریب رہنے کی وجہ سے اس کے مزاج سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ معمولی دکھ پر وہ شکایت نہیں کرتی تھی۔ شادی سے پہلے دل میں نہ جانے کتنی امنگیں تھیں۔ مومنہ سے وہ پہلے ہی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اُمید تھی، اُس سے شادی کر کے گھر میں دولت کی نہریں بہنے لگیں گی، خوشی اور شادمانی سے دل پُر ہو جائے گا۔ دل ابھی تک جاں گسل محنت سے مرا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کیسی دبلی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ چمکتا ہوا شگفتہ چہرا کیسا پیلا ہونے لگا تھا، ہونٹ زرد ہونے لگے تھے۔ نگین سُرخی کی بجائے اب انتہائی تھکن اور افسردگی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

پھر بھی وہ کوشش میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ دن بھر بازار میں اور جہازوں کی گودی پر انتھک مزدوری کرتا تھا۔ قلی کا کام کرتا تھا۔ جسم سے پسینہ بہہ نکلتا تھا۔ ہانپتا تھا۔ کڑی دھوپ ہوتی تھی، لیکن اس کا کوئی خیال نہیں کرتا تھا۔ ایک عجیب شیریں خیال میں اس کا سارا وجود ڈوبا ہوا رہتا تھا۔ محنت اور تھکن کو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کا احساس بھی اب پُرانا ہو گیا تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولا:

"اور چند دن ذرا صبر کرو۔ کھیت کا دھان پکنے ہی والا ہے۔ اس وقت ہمارے سارے دکھ دور ہو جائیں گے"

"کھیت کا دھان ———— !" مومنہ غصہ بھرے لہجے میں بولی

"دو بیگھے ہی تو کھیت ہے۔ اس کا ——— پھر آدھا دھان چلا جائے گا زمین کے مالک کو! دکھ نہیں رہے گا! کیا خوب کہا!"

ایک لمحے میں مجید کے چہرے پر تنگ مزاجی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ دھوپ سے جلے ہوئے چہرے کی کھال پر شکن پڑ گئی اور آنکھوں کے جھروکوں میں کوئی شرارت دکھائی دی۔ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ پھر یہ بات سچ بھی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک درانتی کی بو موجود تھی۔ پاؤں میں چکنی مٹی کا اَن مٹ داغ تھا۔ دھان کا ہر پودا اس کے بالوں والے سینے کے پیار سے بڑھا اٹھا تھا۔ وہاں مالک کا کوئی گزر نہیں تھا۔ کوئی دخل نہیں تھا۔

"روپیہ دیا، پھر دھان بھی!"

مٹی کے تیل کی بوتل ہاتھ میں لے کر وہ بازار جانے کے لئے گھر سے نکل پڑا۔ گھر لوٹتے وقت میدان کے بیچ میں جو پہاڑی تھی۔ اس پر جا کر خاموش کھڑا رہا۔ شام ہونے لگی تھی۔ افق سے ملے ہوئے درختوں کی شاخوں اور پتیوں پر سے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی رنگین شعاعوں کا عکس دھیرے دھیرے مٹنے لگا تھا۔ چاروں طرف کی فضا ہلکی ہلکی تاریکی سے پُراسرار ہو گئی تھی۔ کپڑے کے سرے میں بندھے ہوئے چاول کو پاؤں کے قریب زمین پر رکھ کر وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ دھان کے پودے ٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ سب کھیتوں میں شادابی اور نمو کا سیلاب سا آگیا تھا۔ سرسراتی ہوئی ہوا اُبھلی ہوئی پتیوں سے کھیلنے لگی تھی۔ اَن گنت تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ کر اس کا دل اُمید مسرت سے لبریز ہو گیا۔ لنگی کی گانٹھ کھول کر بیڑی سلگائی۔ اس کے بعد پہاڑی پر سے اُتر کر اپنے کھیت کے پاس سے چلنے لگا۔ ایک مرتبہ ذرا اندھا ہو کر کچھ دھان کے پودوں کو ایک ساتھ پکڑ کر اپنے سینے سے بھینچا۔

"اوہ! کتنے دن، اور کتنے دن؟" اس کے منہ سے نکلا۔

میدان چھوڑ کر کافی دور آ کر بھی وہ بار بار پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اور کچھ گنگنانے لگا:

"اے سکھی! تمہارے پیارے سبز دھان کے پتے کب سنہری روشنی سے جگمگائیں گے۔"

گھر آ کر نہایت خاموشی سے برآمدے پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ مومنہ قریب جا کر مدھم لہجے میں بولی: "میری باتوں سے تم ناراض ہو گئے؟"

اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ کھینچ کر بولا:

"نہیں موتی! تم یقین مانو، میں تمہارے لئے ......" زبان پر بات آ کر رک گئی۔ آدھے کھولے ہوئے بالوں پر انگلی پھیر کر بالوں کو کھول دیا۔ بال پشت پر بکھر گئے۔ وہ اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ مومنہ نے نظریں نیچی کر لیں اور ان سے گرم گرم آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک پڑے۔

شام ہوتے ہی دونوں نے کھانا کھایا۔ چونکہ مٹی کا تیل آجکل مہنگا ہو گیا تھا، اس لئے زیادہ رات تک روشنی نہیں کی جا سکتی تھی۔ مومنہ پتلے کمبل کو کمر تک ڈال کر لیٹ گئی۔ اندھیرے میں خاموشی سے آنکھیں کھول کر سوچتی رہی، مگر مجید نہیں لیٹا۔ بلکہ وہ ننگے بدن پر تولیہ ڈال کر اس کے سرہانے ہی بیٹھا رہا۔ بانس کی باڑھ جس جگہ پر ٹوٹ گئی تھی، اس نے کاٹ کاٹ کر اسی جگہ ایک چھوٹی سی کھڑکی بنائی تھی۔ اس میں جال نہیں تھا۔ بانس کی لکڑیاں آڑی ترچھی کر کے چار کونے والے چھید بنائے گئے تھے۔ جتنی دور نظر جا سکتی تھی، وہ آسمان کے تاروں کی طرف دیکھتا رہا۔ بانس کے جھاڑیوں سے سرسر آواز سنائی دینے لگی۔ ہلکی سرد ہوا کے جھونکے اس کے کان کے باریک بالوں کو مس کرنے لگے۔ لیکن وہ جادو کے پتلے کی طرح بیٹھا رہا۔ رات بڑھنے لگی تھی، لیکن اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے دماغ میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ تاروں کی باریک رگیں ایک ایک مرتبہ حرکت میں آنے لگی تھیں۔ چک کی طرف سے اُسے گویا کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

زندگی کی راہ میں کھڑکی اس کے لئے بہت اہم چیز بن گئی تھی۔ آج بھی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ آنکھ کے دونوں پپوٹے جھٹ سے کھل گئے۔ اب بھی جانے اُسے کس چیز کی آواز سنائی دے رہی تھی! گردن موڑ کر اس نے کھڑکی راہ سے باہر کی طرف دیکھا۔ پچھلی رات کی طرح ہی پُرسکون اور روشن آسمان نظر آیا۔

"موتی! او موتی! ——— کیا؟" نرم لہجے میں مومنہ بولی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ سو جاؤ نا! سورج نکلنے سے پہلے پھر کام پر جانا ہے"

لیکن وہ اُٹھ بیٹھا، اور کہنے لگا۔

"مجھے نیند نہیں آتی۔ تم اٹھو، ذرا دیا جلاؤ، جلدی!"

مومنہ کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ اس کے بعد جب اس کے کان میں خاوند کا پریشان کن لہجہ سنائی دیا، تو اس وقت وہ بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور جلدی سے ہانڈی میں رکھی ہوئی آگ میں پٹ سن کی خشک لکڑی دبا دی۔ دھواں اُٹھتے ہی لکڑی اُٹھا کر پھونکی۔ آگ جل گئی۔ دیا کھٹولی پر رکھتے رکھتے اُس نے اپنے کپڑے سنبھالے۔ چہرے پر پریشانی تھی۔ بولی: "تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

کھڑکی کی طرف منہ کر کے مجید نے پریشانی کے لہجے میں کہا، "کچھ سمجھ میں نہیں آتا! ادھر تو ذرا آؤ!" وہ اس کے پاس پہنچی۔

"ادھر کان لگا کر سنو، کوئی گانا سا سنائی دے رہا ہے، ذرا غور سے سنو!"

سر ذرا اونچا کر کے چوکنا ہو کر دونوں بہت دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ شمالی ہوا سے مومنہ کے کھلے بال اڑنے لگے۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ باہر بانس کے پتوں کی مسلسل سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ جنگل کے کیڑے جھن جھن آوازیں کرنے لگے۔ اس محلے کے لوگوں کی باتیں بھی کچھ کچھ سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن مومنہ اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکی۔ اس لئے بہت دیر تک چوکنا رہ کر انتظار کرنے کے بعد پُراسرار نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"کہاں؟ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"وہ سنو، ایک آواز ہے! اکتارے کی آواز جیسی۔"

"سنو، اچھا میں ذرا دیکھ آؤں!"

"کہاں؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی ——— چک کی طرف وہ بولا

اس نے سر پر تولیہ کس کے باندھا۔ اس کے اعضا میں ایک بجلی سی تڑپ رہی تھی جسے وہ خود بھی نہ جان سکا کہ کیا ہے۔ اس نے ہانڈی کے قریب رکھی ہوئی لاٹھی ہاتھ میں اُٹھالی اور کچھ بولے بغیر تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ مومنہ نے سوچا، وہ پاگل ہو گیا ہے کیا؟ چک زیادہ دور نہیں تھا۔

کئی ایک باڑی چھوڑ کر ہی کٹھل کا باغ تھا۔ جھیل کے پاس ایک بے برگ تاڑ کا درخت سر اُٹھائے کھڑا تھا۔ پتلی پتلی شاخیں، لمبی لمبی انگلیوں کی طرح گویا آسمان کی طرف اشارہ کر کے کچھ دکھا رہی تھیں۔ ایک الو بول کر اُڑ گیا۔ میاں باڑی کے تاڑ کے درختوں پر چمگادڑیں چیں چیں کر رہی تھیں۔ جھلملاتے تاروں بھرے آسمان کی ہلکی روشنی کے عکس سے خشک سا راستہ مانگ کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک ہی اُدھر دھان کا کھیت تھا۔

لاٹھی کو ہاتھ کی مٹھی میں دبا کر مجید آگے بڑھا۔ اس وقت رات کے تقریباً بارہ بجے تھے۔ کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اندھیرے تلے دھان کے پودے شبنم سے پُرنم ہوا کے لمس سے ہل رہے تھے۔

ایک کھیت کے پاس آکر لاٹھی پر ٹیک لگا کر وہ جھک گیا۔ کچھ دھان کے پودوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس نے اپنے لبوں سے لگایا۔ پھر انھیں آنکھوں کے اور قریب لے گیا۔ پیشانی میں بل ڈال کر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ ہاں، سفید سا کچھ نظر آ رہا تھا۔ انگلی سے پتے ہٹا کر آہستہ سے انھیں چھوا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے جسم میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اب وہ سوچنے لگا کہ ہنسے یا روئے؟ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

اس نے جو سوچا تھا، حقیقت میں وہی ہوا۔ کھیت میں دھان نکل آئے تھے!

چھوٹی بڑی پگڈنڈیوں پر سے وہ بہت دیر تک پریشان گھومتا رہا۔ جانے وہ کتنی مرتبہ ان پگڈنڈیوں کے نشیب و فراز میں گرتے گرتے لاٹھی کے سہارے بچا۔ اُسے خیال نہ رہا کہ نمناک ہوا سے اس کا سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوا، گویا دونوں کانوں میں برف پگھلا کر ڈال دی گئی ہے۔ دل کی حرکت تیز تر ہو گئی۔ دونوں ایڑیوں میں کب سے درد ہو رہا تھا، اُسے پتہ ہی نہ چلا۔ آخر جب وہ بہت زیادہ ہانپنے لگا۔ اور لڑکھڑا کر چلنے کی نوبت آگئی تو اس وقت اس نے گھر کا رُخ کیا۔ اُسے خود ہی پتہ نہ چلا کہ اُسے کیا ہو گیا تھا۔ اور یہ بات اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ اس پر گویا آسیب کا اثر ہوا تھا کان پر تند ہوا کا اثر ہو رہا تھا۔ اس کے کان میں ایک زہر آلود بات کھٹکی۔

"صرف دو بیگھے کھیت! اس میں سے نصف چلا جائے گا مالک کے گھر! باقی کیا بچا؟ کہتے ہیں دکھ مٹ جائے گا!"

"نہیں، نہیں!"

اس کا احتجاج کرنے کو جی چاہا۔ مگر اس کی باچھوں سے جھاگ نکلنے لگے۔ منہ سے کوئی بات ہی نہیں نکلی۔

کون بتا سکتا ہے، دو بیگھے زمین لینے میں اُسے کتنی زحمت اُٹھانی پڑی تھی اور کتنی قربانیاں کرنی پڑی تھیں۔ چھ مہینے تک فاقہ کر کے اور خون پسینہ ایک کر کے اس نے جو کچھ کمایا تھا، سب کے سب اپنی ہی انگلی سے گن گن کر زمیندار کے ہاتھ اُٹھا دیا تھا۔ اُس کے علاوہ صرف روپے کی بات ہوتی تو کوئی غم نہ تھا۔ لیکن ماں کی آخری یادگار، بیوی کے معمولی زیورات۔ وہ بھی وہ نہیں رکھ سکا۔ گلے کا ایک ہار۔ کان کے دو طلائی جھمکے۔ اور ایک جوڑی چاندی کی جھانجھ، مرتے وقت ماں نے زمین کے نیچے دفن کر دیئے تھے اور ایک اکڑی کے بکس سے نکال کر یہ زیورات دے دئے تھے۔

"یہ تیرے باپ کے دئے ہوئے زیورات ہیں۔ کال کے وقت بھی انھیں نہیں بیچا۔ یہ بہو کو دینا۔ بہت آرزو تھی، مگر افسوس یہ ارمان دل کا دل میں لئے جا رہی ہوں۔!"

مومنہ کا چہرہ زیورات سے اور زیادہ نکھر گیا تھا۔ اس روز اتوار کا دن تھا۔ درانتی کو بغل میں دبا کر وہ گرہست باڑیوں میں گھومتا رہا۔ لیکن مزدوری دینے کو کوئی راضی نہ ہوا۔ چک میں چلچلاتی دھوپ تھی۔ بارش بند تھی۔ آسمان پر ذرا سا بھی ابر نہ تھا۔ ابھی صرف اگلے موسم کے لئے زمینیں تیار ہو رہی تھیں۔ کھیتوں کی مٹی چکنے پتھر کی جمی ہوئی تھی۔ ہل بڑی مشکل سے چل سکتا تھا۔ دوپہر کے وقت چلنے سے پاؤں جل اُٹھتے تھے۔ اس کے باوجود ہل چلانے اور فصل کے بیج بونے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ مجید گھومتا رہا۔ دوسرے گاؤں کے چک میں بھی گیا تھا۔ لیکن پیسہ دے کر مزدوری کرانے والا ایک آدمی بھی نہ ملا۔ دل افسردہ ہو گیا تھا۔ میاں باڑی کی بیٹھک میں آ کر اس نے ایک بات سنی تھی۔ سُن کر اس نے وہاں ایک لحہ بھی دیر نہیں کی۔ تقریباً بھاگ کر گھر آیا۔

مومنہ اس وقت کھچڑی پکا رہی تھی۔ قریب جا کر چپکے چپکے بولا: "میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، بُرا نہ ماننا۔"

——— "کیا، بتاؤ نا!" مجید بولا، "تم ناراض نہ ہونا۔ اس طرح ہماری زندگی کس طرح گزرے گی۔ آسمان جیسا بے ابر ہے، کام کاج ملنا مشکل ہے۔ آئندہ سال بھی اگر صرف مزدوری کر کے پیٹ پالنا پڑا، تو اور کتنے دن جئیں گے؟"

مومنہ نے درد آمیز غصے سے خاوند کی طرف دیکھا اور چپ رہی۔

"سنا ہے کہ میاں باڑی کی ساری زمینیں اجارے پر دی جائیں گی۔ کچھ زمین ہم بھی لے لیں ٹھیکے پر؛ اور اس سے کم از کم چار پانچ مہینے کی خوراک بھی گھر میں آئے گی، اور محنت بھی ذرا ہلکی ہو گی۔"

اس نے چولھے میں ایک مٹھی بھوس ڈالا اور گال پھلا کر پھونک ماری۔ آگ سلگ گئی تو بولی:۔

"نہ رکھ سکو، تو پھر کوئی بات ہی نہیں ہے!"

"لیکن روپیہ! روپیہ نہ ہو تو سب آرزوئیں ناکام ہو کر رہ جائیں گی۔"

بستر پر لیٹ کر کافی رات تک باتیں کر کے دونوں نے ایک فیصلہ کیا۔ مجید کی آنکھوں میں بار بار اس کی ماں کا چہرہ اُبھرنے لگا۔ وہ لرزتا ہوا لہجہ، آخری تمناؤں کی ناکام فریاد! سینے کے اندر ایک ہوک سی اُٹھی۔ جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا، وہ اسی کام کو کرنے والا تھا۔ اس نے اس کے دائیں ہاتھ کو کھینچ کر اپنی مضبوط مٹھی کے اندر لے لیا۔ اور لمس سے سارا دکھ درد دور کر دیا۔ مومنہ پہلے بات نہ کر سکی مگر بعد میں نمناک لہجہ میں بولی۔ "اس لئے نہیں کہ میں خود پہنوں گی بلکہ مرحومہ ساس کی یادگار ہے، اس لئے منع کیا تھا۔"

"تم نہیں جانتیں مومی، ان زیوروں کو بیچنے کا مجھے کس قدر افسوس ہے! لیکن کیا کروں تقدیر بُری ہے، تم میرے متعلق غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ تم مجھ پر یقین رکھو، فصل گھر میں آتے ہی پھر بنوا دوں گا۔"

یہ کہتے کہتے آنکھوں سے گر کر آنسو سینے پر بہنے لگے ——— رات کی تاریکی میں چک سے تنہا لوٹتے لوٹتے اُسے یہ سب باتیں یاد آئیں۔ اس کے ساتھ اور جن لوگوں نے زمین لی تھی ان کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ کسی نے چھت کی ٹین کی چادریں بیچی تھیں۔ کسی نے آم یا کٹھل کے درخت اور کسی نے بھاری سود پر قرض لیا تھا۔ سلامی دیئے بغیر زمین لینے کی اور کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اس پر پھر موسم کے آخر میں فصل کا آدھا حصہ میاں باڑی کے گودام میں لے جا کر جمع کرنا پڑے گا

۲ ۱

۳
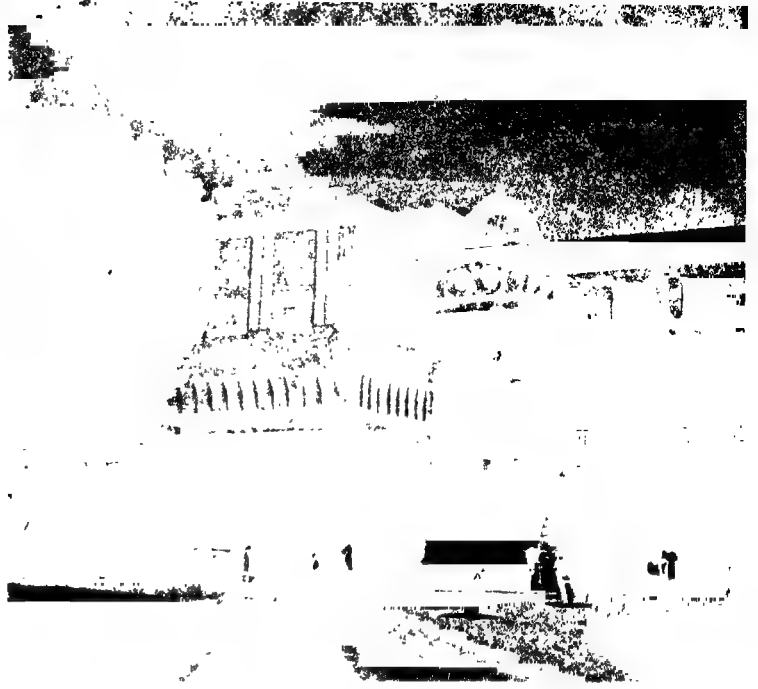
مشرقی پاکستان

۱ ھائی کورٹ ۔ چاٹگام

۲ قلعہ لال باغ (ڈھاکہ) میں ایک قدیم مسجد

۳ کاغذ سازی کے لئے دریا کے کنارے بانسوں کے انبار لگائے جا رہے ھیں

۴ کنا دریا (ایک دلکش نظارہ)

۴

مغربی پاکستان

پشاور میں ریشم کے کیڑے پالنے کے مرکز میں شہتوت کے درخت لگائے گئے ہیں

ریشم کے کیڑوں کی بہتر خوراک و پرداخت کے لئے غیر ملکوں سے بھی شہتوت کے درخت لا کر لگائے گئے ہیں ۔ تصویر میں دائیں طرف پاکستانی اور بائیں طرف ایک غیر ملکی شہتوت کے پتے دکھائی دے رہے ہیں

گلگت کا ایک پرسکون گاؤں

ذرا بھی چوں چرا نہیں کی جائے گی۔ دانے دانے کا حساب دینا ہوگا۔

حالانکہ ایک زمانے میں اس چک کی زمینیں اُن ہی لوگوں کی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے بلیک مارکیٹ کے پیسے اور جنگ کے زمانے کی ٹھیکیداری کے نوٹوں سے خرید لی تھیں۔ کال کے طوفان بے تمیزی میں ان بدنصیب کسانوں کے ہر فرد بشر کو زمیندار نے مگرمچھ کی طرح نگل لیا ہے۔ نادانستہ طور پر مجید نے لاٹھی کے دستے کو ہاتھ کی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کٹھل کے باغ کے قریب ایک پھوس کے گھر کے سامنے آکر وہ رُک گیا اور دروازے پر دستک دے کر آواز دی۔ "منصور بھائی! گھر میں ہو؟"

آٹھ نو مرتبہ اس نے زور زور سے آواز لگائی۔ اس کے بعد اندر سے یکایک بیٹھے ہوئے گلے کی آواز سنائی دی۔ "اتنی رات گئے کون آیا ہے؟"

مجید اپنا نام بتا کر بولا:-

"اب رات کہاں ہے! پورب کے آسمان پر اُجالا ہو چلا ہے۔ جلدی اُٹھو، ضروری بات ہے!"

مگر واقعہ یہ ہے کہ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی صرف آدھی رات گزری تھی۔ نیند ابھی گہری ہونی شروع ہوئی تھی۔ منصور علی نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

مجید نے واقعہ کھول کر بیان کیا، تو نیند کا سہانا جال پھاڑ کر اس کا جسم بالکل لکڑی سا بن گیا۔ ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ گلے کو صاف کر کے دبی آواز میں بولا:-

"تو بیٹھ، میں تمباکو اور چلم لیے آتا ہوں!"

ہلکی اوس کی آڑ میں ستارے سہم سہم کر چمک رہے تھے۔ دونوں بیٹھے بیٹھے حقہ پیتے رہے اور دبی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ باتوں کی صدائے بازگشت کھلم کھلا داد کی شکل میں انھیں کے کانوں میں آکر گونجی۔ آئندہ ذرا بھر اِدھر اُدھر ہونا ممکن نہیں۔ منصور علی فطرتاً کم گو تھا، لیکن جو کہتا تھا، بالکل ناپ تول کر کہتا تھا۔

"آخر اپنی بات پر قائم رہے گا تو؟" اس نے پوچھا۔ مجید اُمنگ بھرے لہجے میں بولا۔ "تم مجھ پر یقین نہیں کرتے؟ پیشانی چھو کر وعدہ کرتا ہوں، بات اگر ادھر اُدھر ہوئی تو اُسی وقت میری موت ہو جائے گی۔ پنچایت کی خاطر جان کی بازی لگا دوں گا۔"

"تو بدھ کے دن سب کو بلایا جائے!"

"اچھا!"

جب وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے، اُس وقت بانس کے جھاڑ میں کئی پرندوں نے پر جھاڑنے شروع کئے تھے۔ اور طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے تھے۔ سڑک پر نکل کر مجید خیالات کے سمندر میں غوطہ کھانے لگا۔ ایک نئے راستے پر وہ لوگ گامزن ہونے والے تھے۔ اس میں عزت کا ڈر تھا، جان کا خطرہ تو تھا ہی۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ یہ صحیح راہ تھی۔ اس کے دل میں روشن یقین کے دیئے کی لو گویا یکایک روشن ہو گئی۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا جاتا تھا۔ اسی لئے ان کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ ورنہ اتنا روپیہ دینے کے بعد بھی دھان کا نصف حصہ دعویٰ کرنے کے سلسلہ میں کوئی دلیل نہیں تھی۔ سال میں سب مرتبہ بھی زمین پر پاؤں نہیں رکھتے تھے۔ جوتے پہن کر ٹھاٹ سے چلتے تھے۔ حالانکہ دھوپ میں جل کر، بارش میں بھیگ کر اور خون پسینہ ایک کر کے جو فصل کاٹی جاتی تھی اُسے بھی اپنے گھر لانے کی اجازت نہیں تھی۔

کان کے پاس کے کانٹے کی مانند بالوں پر وہ انگلی پھیرنے لگا۔ اور صحن کے قریب آکر وہ یکدم رک گیا۔ "کون، موتی؟ تم سوئی نہیں؟"

"نہیں، تم کہاں گئے تھے؟ کیا دیکھا؟" وہ قریب جاکر گردن پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"سورج نکل رہا ہے؟" ـــــ "کہاں ابھی تو بہت رات باقی ہے!"

اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف جاتے ہوئے مجید ایک عجیب لہجے میں بولا، "تم کچھ نہیں سمجھتیں، کسانوں کی زندگی میں تو سورج ایک ہی مرتبہ نکلتا ہے۔ ـــــ فصل اُگتے وقت!"

اور واقعی سورج نکلا۔

ستار میں ترچھی ترچھی انگلی چلائے جانے سے جس طرح عجیب قسم کا شور اور جھنکار ہوتا ہے۔ اسی طرح گاؤں کے تمام لوگوں کی زندگیاں بج اٹھیں، گھروں کی باڑیں ٹوٹ گئی تھیں، دن رات چڑیوں کی طرح مستقل طور پر محنت کر کے ان کی مرمت کی۔ بانس کاٹ کر نئے کھم لگائے۔ صحن گھاس پھوس سے بھر گیا تھا۔ کدال سے صاف کیا۔ بہو بیٹیوں کے ہاتھوں کے جتن سے گھر اور صحن آئینہ کی مانند ہو گئے۔ زنگ لگی ہوئی درانتیوں پر سان چڑھائی گئی۔ لمبی لمبی ٹانگوں والے اور موٹے موٹے پیٹ والے لڑکے سورج کی روشنی میں باہر نکلے۔ اور چیختے چلاتے اور شور مچاتے ہوئے دوپہر کے وقت سب ایک ساتھ ندی میں کودے اور خوشی کے مارے مسلسل تیرتے اور غوطے لگاتے رہے۔ پھر شام کے وقت وہ سب مل کر پیڑوں کے پتوں کی آڑ میں ٹنٹیوں کے گھونسلے تلاش کرنے لگے۔ بہو بیٹیوں نے پان کھا کھا کر ہونٹ لال کئے۔ اور بڑی بوڑھیاں سوئی تاگا لے کر کمبل سینے بیٹھ گئیں۔ آج ان کے الجھے ہوئے بالوں میں بھی کنگھی چلنے لگی تھی!

بڑے بوڑھے آم کے درخت کے نیچے "جنگ نامہ" پوتھی کھول کر بیٹھ گئے تھے۔ اور لہک لہک کر پڑھ رہے تھے:—

"علی، علی! بیٹھے بہادر گھوڑے پر سوار ہو کر!"

"زیگون بیوی نے کیا کیا؟"

پڑھنے کی تیزی اور باتوں کی گرمی سے محفل بڑی بارونق ہو گئی تھی۔ لیکن چک میں جو خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اس کی مثال ملنی مشکل تھی۔ گاؤں کو چھوڑ کر اس جگہ کا رقبہ چار میل سے کم نہ ہوگا۔ دھان کے علاوہ اور کوئی فصل وہاں نہیں تھی۔ ذرا تکلیف سہہ کر جو لوگ "سلامی" دے سکے تھے صرف ان ہی لوگوں کو زمین ملی تھی، پھر بھی تین بیگھے سے زیادہ کوئی نہیں رکھ سکا۔ اسی لئے کسی دوسری فصل کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پٹ سن کا بیج البتہ بویا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا مستقبل اچھا نہیں نظر آتا تھا۔ بازار کا بھاؤ جس قدر گرا ہوا تھا اس سے دو بیگھے زمین کے پٹ سن سے ایک خاندان کا گزارہ ہونا مشکل تھا۔ اس کی بجائے دھان بونے سے کافی فراغت کے ساتھ تقریباً چار مہینے چل سکتے تھے۔ خاص طور پر اس سال موسم کے حالات موافق تھے۔ بارش کافی ہو رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں بھی گویا جوانی کا رنگ لہرا رہا تھا۔ فطرت کی غیر معمولی موافقت، اس کی آب و ہوا، اس کی خوش رنگ روشنی سے پندرہ دن کے اندر ہی دھان پکنا شروع ہو گیا تھا۔ پتے اب ہرے رنگ کی بجائے پیلا رنگ اختیار کر رہے تھے۔ پودے ہوا سے ہلتے جلتے تھے۔ آنکھ نہیں ہٹائی جاتی تھی۔

ان کی نگاہیں بھی مستقل طور پر اس طرف جمی ہوئی تھیں۔

چک کے چار کونے میں چار ڈیرے ڈالے گئے تھے۔ ان ڈیروں کے اردگرد مضبوط بانس کے کھم لگے ہوئے تھے۔ زمین سے ذرا اوپر سپاری کے تناؤ کو چیر کر مچان بنایا گیا تھا۔ اس سے بھی اوپر تاڑ کے پتوں اور چٹائی سے چھت بنائی گئی تھی۔ زیادہ باہمت نوجوان لڑکے ہر دم مچانوں پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتے اور سیٹی بجاتے تھے۔

بندرگاہ پر دن بھر کام کرنے کے باوجود نوجوان لڑکے گھر پر آرام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جھٹ پٹ کھانا پینا ختم کر کے باہر نکل پڑتے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک لمبی لاٹھی ہوتی تھی۔

رات کے وقت پٹ سن کی لکڑیوں سے جلائی ہوئی آگ روشن ہو جاتی تھی۔ لال روشنی میں ہر ایک جتھے کے پریشان چہرے صبح تک جاگتے رہے۔ کیا باتیں کرتے تھے، کس قسم کے مشورے کرتے تھے، ان کے سوا اور کسی کو علم نہ ہوتا تھا۔

اس دن رات کے وقت رونین پیادے سے کر میاں باڑی کا آدمی آیا تھا۔ وہ آدمی بالکل باز کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ چوڑی پیشانی، مضبوط ہونٹ اور ناموزوں اونچی ناک۔ کہتے ہیں کہ اسی کی چال بازی سے اس باڑی کی اس قدر روز افزوں ترقی ہو رہی تھی۔ اس کے چمکتے ہوئے گنجے سر کے اندر منصور پور کا سارا علاقہ سمایا ہوا تھا۔ پاجامہ اور کرتا پہن کر اور لاٹھی پر ٹیک دے کر وہ دوسرے نمبر کے مچان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ پیادے اس کے پیچھے کھڑے تھے منصور علی نے شرافت کے تقاضے کے مطابق بیٹھنے کے لئے ایک کھٹولا بڑھا دیا۔

۱

"نہیں، اب نہیں بیٹھوں گا!" ——— "بیٹھئے تو حقہ پیجئے!"

نوجوان لڑکے مشعل ہاتھ میں لے کر چک کے چاروں طرف گھوم رہے تھے، کوئی گا رہا تھا اور کوئی بلاضرورت صرف چیخ ہی رہا تھا۔ ان ہی کے بیچ میں ہموار چک نے نئی دلہن کی طرح ہلکا سا گھونگٹ ڈال رکھا تھا۔ میاں باڑی کا آدمی آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا رہا۔ بہت سی باتیں اس کے کان میں پڑیں۔ ایک مرتبہ اس نے ناک بھوں چڑھائی۔ آنکھوں کی پتلیاں چمک اٹھیں۔ روشنی کی طرف سے چہرہ ہٹا کر بولا۔

"اب کی بار بہت جوش و خروش معلوم ہوتا ہے، بات کیا ہے!"

"بات کیا ہوتی چچا!"

منصور علی نے بات کا جواب دیا۔

"کہا تو نہیں جا سکتا، کب چور آ کر کھیت کاٹ کر لے جائے! سب ہی خدا کی رحمت ہے، ورنہ ایسا دھان پانچ سال کے اندر نہیں دیکھا۔"

"ہاں، بہت دھان ہوا ہے۔"

اس آدمی نے اپنے دل میں اندازہ کر لیا۔ "دھان کے آدھے حصے سے کم سے کم پندرہ ہزار روپیہ کی آمد ہوگی، بلکہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔"

حقہ رکھ کر وہ چل پڑا۔ سب کی طرف دیکھ کر بولا،

"کل ہی کٹائی شروع ہوگی کیا؟"

"ہاں!"

مجید کو یہ بات برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اصل بات کو صاف صاف جتا دیا جاتا۔ تو شاید اس آدمی کو اچھا سبق مل جاتا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ اس نے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کی۔ دوسرے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا، وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ آجکل جہاں کہیں وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نہیں پھرا کرتا تھا۔ جب بات کرتا تھا تو سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں ہمیشہ چنچل دکھائی دیتی تھیں۔

اس کے سانولے چہرے پر ایک متانت اور سنجیدگی اتر آئی تھی۔

صبح کے وقت کوے کے بولنے کے ساتھ ہی وہ کام کرنے کے لئے بندرگاہ کی طرف چلا جاتا تھا۔ شام ہونے سے ذرا پہلے لوٹتا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا۔ لبوں پر تھکن کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اپنے فرائض سے غافل نہیں رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ذرا آرام کر کے لاٹھی ہاتھ میں لے کر چک کی طرف چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی گھر کا پھیرا لگا جاتا۔ پھر چلا جاتا۔

میاں باڑی کے آدمی کے چلے جانے کے بعد اچانک ایک خیال آنے پر وہ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مستقبل کی روشن زندگی تھی۔

وہ ٹھیک نہیں سمجھ سکتا تھا، مگر اس کے تن من میں گویا ایک سنسنی سی چھا رہی تھی۔ وہاں کسی چیز نے کانٹا نہیں تھا۔ اس میں کسی قسم کی جلن بھی نہیں تھی۔ صرف ایک اعتماد اور گہرا سکون اور اطمینان تھا۔ اس کی گہرائی میں وہ کھو جانا چاہتا تھا، اپنی خود فراموشی میں مست ہو جانا چاہتا تھا۔ "موتنہ شاید مٹی والی ہانڈیوں کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر سالن کا نمک چکھ رہی ہوگی۔ اس کا منہ جھکا ہوا ہوگا۔ کان کے دونوں طرف کچھ پریشان بال اڑ رہے ہوں گے ——— وہ گویا دروازے کے پاس کھڑے ہو کر دیکھنے لگتا تھا۔ تمبا کو کی ٹکیا سلگانے کے بہانے سے قریب جا کر بیٹھتا تھا۔ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ صرف ایک گہری خوشی سے دل اچھل پڑتا تھا۔ وہ کیا اس کے دل کی بات بھانپ سکتی تھی؟ اور دل کی تمناؤں کو سمجھ سکتی تھی؟

آم کے درخت کے نیچے آ کر وہ رک گیا۔ لاٹھی کو اس درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر رکھ دی اور خود کھڑا ہو گیا۔ اس کا گھر یہیں سے نظر آتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد موتنہ حقہ تازہ کر کے ہاتھ میں لے کر آئی۔ ہاتھ بڑھا کر حقہ لیا۔ لیکن ایک کش بھی نہیں پیا۔ درخت کی جڑ کے ساتھ رکھ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اور گردن پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولا،

"کیا ہے بات کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"کیا بات کروں؟"

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

ماہ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۷ء

فکاہیہ۔

شہلا کی شاعری

عندلیب شادانی

حسن، جوانی، آزادی اور دولت ایک جگہ جمع ہو جائیں تو شیطان کو اپنی عملی سرگرمیوں کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آ جاتا ہے لیکن سیما اور شہلا اب تک اس کی دست برد سے محفوظ تھیں۔ ماں تو ان کی پہلے ہی مر چکی تھیں۔ باپ کے انتقال کے بعد لوگوں کا خیال تھا کہ شاید یہ لڑکیاں صراطِ مستقیم سے بھٹک جائیں اور بعض ناہنجار لوگوں نے اس امر کی کوشش بھی کی کہ انہیں اپنی راہ پر لگا لیں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ خاندانی شرافت کا احساس اور بزرگوں کی عزت و حرمت کا پاس ہمیشہ ان کے آڑے آیا اور انہیں اخلاق و شرافت کی بلندیوں سے کبھی گرنے نہیں دیا۔

سیما کی عمر ۲۵ سال تھی۔ شہلا اس سے چار پانچ سال چھوٹی تھی۔ یہ دونوں بہنیں سوسائٹی کی جان تھیں۔ دعوتیں، پارٹیاں، سیر و تفریح یہی ان کے روزانہ کے مشاغل تھے۔ تعلیم ان کی ادھوری رہ گئی تھی میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پھر بھی انہیں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ سیما کبھی کبھی افسانہ لکھتی تھی اور شہلا کو شاعری سے دلچسپی تھی بلکہ افسانہ نویسی اور شعر گوئی کا شوق رفتہ رفتہ ان دونوں بہنوں کی ایک کمزوری بن چکا تھا۔

نام و نمود اور شہرت کی تمنا ان کی دوسری کمزوری تھی۔ بعض شاطروں نے اس صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا اور وہ ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور اٹھاتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا وہ سیما کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ آپ پیدائشی فن کار ہیں۔ اس کے نہایت ہی معمولی اور پھسپھسے افسانوں کی حد سے زیادہ تعریف کرتے اور ان کی فنی اور ادبی خوبیاں گناتے۔ اسی طرح شہلا کے اشعار سن کر جھوم جھوم جاتے اور نہایت شد و مد کے ساتھ داد دیتے۔ یہ بیچاری لڑکیاں آخر انسان ہی تو تھیں۔ اپنی تعریف کسے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ آخر وہ بھی اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو گئیں اور غضب یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ دونوں خود بھی ایک دوسرے کو بڑا فن کار سمجھنے لگیں۔

ادھر یہ خود فریبی، ادھر اہلِ غرض انہیں بڑھاوے دے دے کر اور بھی دیوانہ بنائے دے رہے تھے۔ سوسائٹی میں ان کا رسوخ بہت تھا۔ اس بنا پر جو لوگ ان تک پہنچ سکتے تھے وہ ان کے اس رسوخ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہر قسم کے معاملات میں ان کی سعی سفارش کارگر ہوتی تھی۔ سوال صرف ان تک پہنچنے کا تھا اور اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ ان کی کمزوریوں کو واسطہ بنایا جائے۔

سیما کے یہاں جو لوگ زیادہ آتے جاتے تھے ان میں ایک ڈاکٹر توقیر تھے جو کسی مقامی کالج میں پروفیسر تھے اور دوسرے مسٹر کوکب، شاعر، افسانہ نگار، جو کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ تیسری مس کہکشاں، سیما اور شہلا کی دوست اور رسالہ "خواتین" کی اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ سیما جب کوئی نیا افسانہ لکھتی یا شہلا کوئی تازہ نظم یا غزل کہتی تو یہ لوگ رات کو کھانے پر بلائے جاتے اور کھانے کے بعد جلسہ جمتا۔ افسانہ اور نظم پڑھی جاتی اور اس پر تبصرہ ہوتا۔ چنانچہ آج بھی اسی سلسلے میں سیما کے ہاں ڈنر تھا اور اس مرتبہ کہکشاں کی تحریک پر "خواتین" کے ایڈیٹر مرزا شہریار کو بھی بلایا گیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد سب لوگ صحن میں چبوترے پر آ بیٹھے اور سیما نے بڑے اعتماد اور وقار کے ساتھ اپنا افسانہ سنایا۔ جب تک وہ پڑھتی رہی سب لوگ پوری توجہ کے ساتھ سنتے رہے البتہ مرزا شہریار آہستہ سے کبھی واہ اور کبھی واہ وا کہہ دیتے تھے۔ افسانہ ختم ہوا تو کوئی ایک منٹ تک کامل سکوت رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر توقیر نے کہا:

"فرمایئے مرزا صاحب، کیا رائے ہے آپ کی اس افسانے کے متعلق؟"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کی موجودگی میں زبان کھولنا گستاخی ہے لیکن آپ کا حکم ہے تو عرض کرتا ہوں"۔

مرزا شہریار نے جواب دیا۔ "میرے نزدیک یہ افسانہ فنی اعتبار سے مکمل، ادبی لحاظ سے قابلِ قدر اور تاثر سے بھرپور ہے"۔

کردار نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ انسانی نفس کی کمزوریوں کو اس خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے کہ سبحان اللہ!"

"مجھے آپ کی رائے سے ۱۰۰ فیصدی اتفاق ہے۔" ڈاکٹر توقیر نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔ مرزا شہریار کے ایک ایک لفظ سے سیما کے دل میں اپنی عظمت و بزرگی کا احساس بیدار ہو گیا تھا۔ چہرے سے ایک تمکنت کی شان نمایاں تھی اور آنکھوں سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی بہن کے اس فخر و مسرت میں شہلا بھی شریک تھی۔

"کوکب صاحب، آپ بھی تو کچھ فرمائیے" شہلا نے کہا

شہلا کے اس خطاب پر کوکب صاحب جو اب تک بالکل چپ چاپ اور کھوئے ہوئے سے بیٹھے تھے چونک اٹھے۔ سنبھل کر بیٹھے اور بولے:

"جی میں ...... میں کیا عرض کروں شہلا صاحبہ، سیما صاحبہ افسانہ پڑھ رہی تھیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ پہلے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پھر آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھنے شروع ہوئے۔ تاریکی چھٹنے لگی اور رفتہ رفتہ ایک دھندلکے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پھر سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ افق سے آفتاب نے جھانکا۔ کرنیں بکھریں، نور پھیلا اور ساری فضا جگمگا اٹھی۔ ہر طرف نور ہی نور، روشنی ہی روشنی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

دونوں بہنیں فرطِ مسرت سے بے خود ہوئی جا رہی تھیں۔ سیما بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کے لئے رسمی انکسار کا اظہار بھی ناممکن ہو گیا تھا۔

"کیوں سیما! میں نہ کہتی تھی کہ تمہارے افسانوں میں بڑی جان ہے۔ بہت "اوریجنیلٹی" ہے۔ بڑی فن کاری ہے۔ تم سمجھتی تھیں کہ میں صرف تمہارا دل خوش کرنے کے لئے ایسی باتیں کہتی ہوں۔ اب تو یقین آیا۔ ڈاکٹر توقیر، مرزا شہریار اور مسٹر کوکب کی متفقہ رائے گویا ادبی دنیا کا متفقہ فیصلہ ہے۔" کہکشاں نے بڑے فخریہ انداز سے کہا۔

"کہکشاں! تمہارے خلوص میں تو مجھے کبھی بھی شک نہیں ہوا مگر مجھے آج بھی اپنی کمتری کا احساس ہے" سیما نے جواب دیا۔

"یہ احساس خود آپ کی عظمت اور بزرگی کی دلیل ہے" مرزا شہریار نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا شہلا صاحبہ، از راہِ کرم اب آپ اپنے تازہ کلام سے محظوظ فرمائیے" کوکب نے کہا۔ شہلا نے اپنی بیاض نکالی اور بولی "آپ حضرات کے سامنے پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ڈر لگتا ہے۔ بہر حال تعمیلِ ارشاد کرتی ہوں۔"

"ارشاد" کوکب اور شہریار دونوں نے بیک وقت کہا۔

"مطلع عرض کیا ہے" شہلا نے کہا

کیا شے ہے کہ ملتی نہیں مانگے سے خدا سے — لیکن نہ ملی ہم کو اجل دستِ دعا سے

"سبحان اللہ! نہایت پاکیزہ مطلع ہے۔" کوکب نے داد دی۔

"شعر نہیں تصویر ہے۔ کیا لفظ رکھ دیا ہے "دستِ دعا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی ایک پرستار بندی اپنے خالق کے حضور میں سراپا التجا بنی، عجز و نیاز کے ساتھ ہاتھ پھیلائے مصروفِ دعا ہے۔" مرزا شہریار نے تشریح کی۔

"مس شہلا! خدا کے لئے آپ ایسے اشعار نہ کہا کیجئے۔ بیشک یہ پامال انسانیت کی ایک چیخ ہے۔ ایک فریاد ہے۔ اور آپ کو ایک فن کار کی حیثیت سے اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ آپ عالمگیر انسانی جذبات کی ترجمانی کریں لیکن آپ کے لئے ایسے شعر کہنا مناسب نہیں۔ میں اسے بدشگونی سمجھتا ہوں۔" ڈاکٹر توقیر نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا اور شہلا ایک حجاب آگیں انداز سے مسکرا دی اور دوسرا شعر پڑھا۔

کیا جانے کہ کیا ان سے کہا آنکھوں نے میری — کانوں کی لویں سرخ ہوئیں شرم و حیا سے

سبحان اللہ! کیا نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے" کوکب نے کہا۔

"واقعہ یہ ہے کہ مطالعے اور مشاہدے کے بغیر شعر میں جان نہیں آتی اور کوکب صاحب! آنکھوں اور کانوں کی رعایت اور باہمی مناسبت بھی قابلِ لحاظ ہے۔" مرزا شہریار نے ایک استادِ فن کی حیثیت سے اظہارِ خیال کیا۔ کہکشاں اور سیما نے صرف "واہ واہ" کہا اور ڈاکٹر توقیر خاموش رہے شہلا نے تیسرا شعر پڑھا:

اتنا بھی نہ ہو حسن پہ اپنے کوئی نازاں　　مرجائے کوئی یا کہ جئے ان کی بلا سے

"نہایت بے ساختہ شعر ہے۔ روانی قابلِ داد ہے" ڈاکٹر توقیر نے کہا۔ مرزا شہریار اور دوسروں نے صرف "سبحان اللہ" پر اکتفا کی۔ شہلا آگے بڑھی:

اُف میں نے اِدھر کی کہ اُدھر چڑھ گئی تیوری　　اے صاحبِ من آپ تو لڑتے ہیں ہوا سے

"خوب کہا" کوکب صاحب بولے۔

"محاورہ بڑی خوبی سے باندھا۔ "آپ تو لڑتے ہیں ہوا سے"۔ دعویٰ اور ثبوت دونوں موجود ہیں۔ "اُف" کو ہوا سے تعبیر کر کے آپ نے اس لفظ سے بہت فائدہ اٹھایا۔" شہریار نے تنقید کی۔ شہلا نے اگلا شعر پڑھا:

انسان بھی مجبور ہے، اللہ بھی مجبور　　سنبھلے ترے بیمار، دوا سے نہ دعا سے

یہ شعر سن کر پورا مجمع پھڑک اٹھا۔ سب کی زبان پر سبحان اللہ اور واہ واہ کا شور تھا۔

کوکب نے کہا "شہلا صاحبہ، یہ ایک شعر ہی آپ کو دورِ حاضر کی شاعرات میں ممتاز کر دینے کے لئے کافی ہے۔"

"کوکب صاحب! معاف کیجئے، آپ بخل سے کام لے رہے ہیں۔" مرزا شہریار نے کہا "لاجواب شعر کہا ہے۔ الفاظ کا دروبست دیکھئے۔ بندشوں کی چستی دیکھیے۔ مصرعوں کی ہم چسپیدگی دیکھئے۔ اور پھر سب پر طرۂ خیال کی ندرت۔ "انسان بھی مجبور ہے، اللہ بھی مجبور۔" سبحان اللہ سبحان اللہ، کیا بات کہہ دی ہے۔ میں نے آج تک یہ خیال کہیں دیکھا نہیں۔"

"واقعی بالکل نیا خیال ہے۔" ڈاکٹر توقیر نے مرزا شہریار کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"سیما، میں کہتی نہیں ہوں کہ یہ لڑکی پیدائشی شاعر ہے۔" کہکشاں نے فخریہ انداز میں کہا۔

"یہ شعر اگر مس شہلا کا نہ ہوتا تو کسی استاد کا ہوتا" کوکب نے ریمارک کیا۔

فرطِ مسرت سے شہلا کی آنکھیں چمک اٹھیں اور چہرے پر رنگ آگیا۔ پھر اس نے اگلا شعر پڑھا:

یہ نیشِ ستم ہی ہے فقط نوشِ محبت　　کہلاتے ہیں ہم اہلِ وفا اس کی جفا سے

اس مرتبہ سب سے پہلے ڈاکٹر توقیر بولے "مرزا شہریار صاحب۔ ذرا اس شعر کے مضمون پر خیال کیجئے کتنی گہری حقیقت ہے۔ راحت کی قدر اذیت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی اور وفا کا امتیاز جفا کے تقابل ہی سے ممکن ہے۔"

"لفظوں کا انتخاب بھی قابلِ داد ہے۔ نوش و نیش کس خوبصورتی سے استعمال کئے گئے ہیں۔" مرزا شہریار نے کوکب اور ڈاکٹر توقیر کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

شہلا نے مقطع پڑھا:

ہر شعر مرا نشترِ الماس ہے شہلا　　ہے سامنا ہر وقت حریفوں کو قضا سے

"ہر شعر مرا نشترِ الماس ہے شہلا" سبحان اللہ، کیا ڈھلا ہوا مصرع ہے۔ جیسے ترشے ہوئے نگینوں کی لڑی۔" مرزا شہریار نے کہا۔

"ماشاء اللہ، پوری غزل مرصع ہے" کوکب نے داد دی۔

"مگر اس شعر کا جواب نہیں: "انسان بھی مجبور ہے، اللہ بھی مجبور، سنبھلے ترے بیمار دوا سے نہ دعا سے۔"

ڈاکٹر توقیر نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔

"مجھے سخت حیرت ہے کہ ایسے بصیرت افروز افسانے اور اتنی بلند پایہ نظمیں اور غزلیں آج تک چھپا چھپا کر کیوں رکھی گئیں۔ اور انہیں منظرِ عام پر کیوں نہیں لایا گیا؟" مرزا شہریار نے کہا۔

"سیما صاحبہ، میرا خیال یہ ہے کہ آپ نے اپنے افسانوں کی اشاعت نہ کر کے نہ صرف اپنے ساتھ ناانصافی کی ہے بلکہ ادبی دنیا پر بڑا ظلم کیا ہے۔ ازراہِ کرم یہ افسانہ اور یہ غزل تو ضرور ہی مجھے عنایت فرمائیے۔ "خواتین" کی خوش قسمتی سمجھوں گا کہ اس میں آپ کے افسانے اور شہلا صاحبہ کی نظمیں اور غزلیں شائع ہوں۔"

سیما نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد افسانے اور غزل کی نقل بھیج دینے کا وعدہ کر لیا۔ سب لوگ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے مرزا شہریار نے کہا۔ "سیما صاحبہ۔ اگر آپ توجہ فرمائیں تو "خواتین" کو کچھ نئے خریدار آسانی سے مل سکتے ہیں۔"

سیما نے کہا "میں اس کے لئے کوشش کروں گی۔ آٹھ دس خریدار تو میں آپ کو ابھی دے سکتی ہوں۔ ان کے پتے لکھ لیجئے۔"

مرزا شہریار اپنی نوٹ بک نکال کر جلدی جلدی لکھنے لگے اور اس کے بعد سیما سے خواہش کی کہ "ازراہِ ادب نوازی "خواتین" کی سرپرستی قبول فرمائیے۔" سیما بخوشی ان کے لئے راضی ہو گئی۔

اس واقعے کے دوسرے دن کسی پارٹی میں سیما اور شہلا کا تعارف "دائرۂ اصحابِ ذوق" کے سکریٹری مسٹر وزیر صدیقی سے ہوا۔ تعارف کرانے والے صاحب نے دونوں بہنوں کے ادبی ذوق کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اگر آپ مس سیما کے افسانے اور مس شہلا کے اشعار سنیں تو آپ کو یقین آ جائے کہ ہماری خواتین بھی اِن اصنافِ ادب میں مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

وزیر صدیقی نے کہا کہ ہمیں آج تک اس بات کا علم نہ تھا ورنہ دائرہ میں آپ لوگوں سے ضرور کچھ پڑھواتے۔ دائرہ میں اگر آپ شرکت فرمائیں یقیناً آپ بہت محظوظ ہوں گی۔ وہاں صحیح معنوں میں پڑھے لکھے اور صاحبِ ذوق لوگ جمع ہوتے ہیں۔ بے لاگ تنقید کی جاتی ہے۔ ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اگرچہ دائرہ کا پروگرام دو مہینے پہلے مرتب کر لیا جاتا ہے لیکن اتفاق سے ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ اگلے جمعے کو اگر آپ چاہیں تو آپ کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے۔"

سیما نے پہلے تو پس و پیش کیا لیکن بالآخر دائرہ کے آئندہ جلسے میں اپنا تازہ افسانہ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ شہلا اپنا کلام سنانے کا وعدہ کرتے ہوئے کچھ ڈر سی رہی تھی لیکن سیما کے کہنے سننے سے وہ بھی راضی ہو گئی اور غزل پڑھنے کا وعدہ کر لیا۔

●

جمعے کے دن، صبح کے وقت کوکب نے مرزا شہریار کو ٹیلیفون کیا۔ آواز سے وہ سخت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

مرزا نے پوچھا "خیر تو ہے آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

کوکب نے کہا "مرزا صاحب، غضب ہو گیا۔ رات "دائرہ اصحابِ ذوق" کے سکریٹری وزیر صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ سیما دائرہ میں آج اپنا افسانہ پڑھیں گی اور شہلا غزل سنائیں گی۔"

"ارے۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ مرزا نے گھبرا کر جواب دیا۔" اگر وہ دائرہ میں چلی گئیں تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور ہم لوگ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ کیا انہیں دائرہ کے جلسے میں جانے سے روکا نہیں جا سکتا؟"

"اسی لئے تو میں نے آپ کو ٹیلیفون کیا ہے۔" کوکب نے جلدی سے جواب دیا۔ "کوئی تدبیر کیجئے۔ کوئی صورت نکالئے اور ان لوگوں کو دائرہ میں جانے سے روکئے۔ میں نے تو ڈاکٹر توقیر کو بھی ٹیلیفون کیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔"

"میری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی۔" مرزا شہریار نے کہا۔ "اب ہم لوگ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ دائرہ کے جلسے میں شریک ہوں اور سیما اور شہلا کی حمایت کریں اور معترضین کو جواب دیں۔"

"اس سے کیا ہو گا" کوکب نے پھر گھبرا کر کہا۔ "مرزا صاحب حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ وہ لوگ تو دودھ کا دودھ اور پانی کا

پانی بالکل الگ کر کے دکھا دیں گے۔ بہرحال آپ جو کہتے ہیں وہی کیا جائے۔ جلسے میں ضرور آئیے۔ میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ مگر دیکھئے تاخیر نہ ہو۔"
یہ کہہ کر کوکب نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

●

ٹھیک ساڑھے چار بجے دائرہ کا جلسہ شروع ہوا۔ مسٹر قمر فاروق نے صدارت کی۔ پہلے شہلا کی غزل کی نقلیں حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ اس کے بعد شہلا نے غزل پڑھی شہلا غزل پڑھ چکی تو چند منٹ خاموشی رہی۔ ہر شخص غزل کے مطالعے میں مصروف تھا۔ سب سے پہلے مرزا شہریار نے جناب صدر کی اجازت سے اظہار خیال شروع کیا اور کہا کہ بحیثیت مجموعی غزل کامیاب ہے خیالات اور زبان دونوں حیثیتوں سے قابل تعریف ہے۔ اس شعر میں ؎

کیا جانے کہ کیا ان سے کہا آنکھوں نے میری   کانوں کی لویں سرخ ہوئیں شرم و حیا سے

نفسیات کا اچھا مطالعہ ہے۔ چوتھا شعر ہے:

اُف میں نے اِدھر کی کہ اُدھر چڑھ گئی تیوری   اتنے صاحبِ من آپ تو لڑتے ہیں ہوا سے

ہوا سے لڑنے کا محاورہ بڑی خوبصورتی سے نظم ہوا ہے۔ اور یہ شعر کہ:

انسان بھی مجبور رہے، اللہ بھی مجبور   سنبھلے ترے بیمار دوا سے نہ دعا سے

نہایت حسین اور مکمل شعر ہے"۔ اتنا کہہ کر مرزا شہریار خاموش ہو گئے۔
شہلا حیران ہو کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے اپنی بہن سے کہنے لگی:
"بجیا! یہ مرزا صاحب کو آج کیا ہو گیا ہے۔ گھر پر تو ایک ایک مصرعے کی تعریف میں ایک اچھی خاصی تقریر فرمادیا کرتے تھے۔ اور یہاں ان کے منہ سے بات ہی نہیں نکلتی۔ ڈرے جاتے ہیں۔ سہمے جاتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے کہا بھلا یہ کوئی تبصرہ ہوا؟"
سیما نے کہا "شاید ان لوگوں سے مرعوب ہو گئے ہیں"
اب کوکب صاحب بولے،
"جنابِ صدر! مجھے صرف دو شعروں کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک تو یہی جس کے متعلق مرزا شہریار صاحب نے اظہارِ خیال فرمایا یعنی ؎

انسان بھی مجبور رہے، اللہ بھی مجبور   سنبھلے ترے بیمار دوا سے نہ دعا سے

جہاں تک میری نظر ہے یہ خیال بالکل اچھوتا ہے۔ اسی طرح اس کے بعد والا شعر یعنی:

یہ نیشِ ستم ہی ہے فقط نوشِ محبت   کہلاتے ہیں ہم اہلِ وفا اس کی جفا سے

زندگی کا ایک نیا رخ پیش کرتا ہے۔ اور اس میں نوش و نیش اور جفا و وفا کا تقابل بھی خوب ہے بس مجھے اتنا ہی عرض کرنا تھا"
"لیجئے اِن کی آتش بازی بھی چھٹ چکی۔ خدا جانے آج اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟" سیما نے جھنجھلا کر زیر لب شہلا سے کہا۔
شہلا خود حیران تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔ مگر وہ بالکل خاموش تھی؛
اب مسٹر حنیف شوق نے صدر سے اجازت چاہی اور بولے "بہت ادنیٰ درجے کی غزل ہے کوئی ندرت یا تازگی اس میں نہیں خیالات نہایت سطحی اور پیش پا افتادہ ہیں ایک شعر بھی لفظی اور معنوی اسقام سے پاک نہیں۔ مطلع نہایت کمزور ہے۔ پہلا مصرعہ ہے

ع "کیا شے ہے کہ ملتی نہیں مانگے سے خدا سے"

اس مصرعے میں "سے" کی تکرار نہایت ناگوار ہے۔ پھر "کونسی شے" کے بجائے "کیا شے" کہا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ دوسرا مصرعہ ہے

ع "لیکن نہ ملی ہم کو اجل دستِ دعا سے"

تو اس میں "دستِ دعا" کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ صرف "دعا" کہنا کافی تھا۔ دوسرا شعر ہے:

کیا جانئے کہ کیا ان سے کہا آنکھوں نے میری
کانوں کی لویں سرخ ہوئیں شرم و حیا سے

پٹا ہوا مضمون ہے اور "کہ کیا" میں تنافر ہے جو زبان اور کانوں کو بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے میں یہ پتا نہیں چلتا کہ کس کے کانوں کی لویں سرخ ہوئیں۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں کوئی خاص بات نہیں۔ پانچواں شعر:

انسان بھی مجبور ہے، اللہ بھی مجبور
سنبھلے ترے بیمار دوا سے نہ دعا سے

واقعی اچھا شعر ہے اور میرے نزدیک یہی غزل کا بہترین شعر ہے"

سیما اور شہلا مُنیف شوق کی تنقید سے سخت پریشان ہو رہی تھیں۔ مگر آخری شعر کی تعریف سن کر انہیں کسی قدر تسلی ہوئی ــ

مُنیف شوق کی تنقید سے سخت پریشان ہو رہی تھیں۔ مگر آخری شعر کی تعریف سن کر انہیں کسی قدر تسلی ہوئی مُنیف شوق صاحب کے بعد ظریف الحسن نے تقریر شروع کی۔ انہوں نے کہا:

"اُف میں نے اُدھر کی کہ اُدھر چڑھ گئی تیوری
اے صاحبِ من آپ تو لڑتے ہیں ہوا سے

مرزا شہریار صاحب نے اس شعر کی تعریف فرمائی ہے مگر وہ بھول گئے کہ اس شعر میں اچھا خاصہ ریختی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے مصرع میں "اُف" اور دوسرے مصرع میں "صاحبِ من" کسی اور ہی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ شعر غارت ہو گیا۔ اس شعر کو سن کر انشاؔ کا یہ مصرع بے اختیار یاد آجاتا ہے:

"کونسی ہے وہ ادا جو تری اُف اُف میں نہیں"

ظریف الحسن صاحب کے ریمارک سن کر دونوں بہنوں کو ایک دھچکا سا لگا۔ اب کلام سہسرامی کی باری تھی انہوں نے کہا غزل کا یہ شعر:

اتنا بھی نہ ہو حسن پہ اپنے کوئی نازاں
مرجائے کوئی یا کہ جئے ان کی بلا سے

اب تک زیرِ بحث نہیں آیا۔ میرے نزدیک خیال میں کوئی ندرت نہیں۔ اور دوسرے مصرع میں "یا کہ" کا استعمال غلط ہے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر "کہ" بھی "یا" ہی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً مومنؔ کا یہ مصرع:

"وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

"کوئی مرے یا جئے" اور "کوئی مرے کہ جئے" دونوں طرح کہنا ٹھیک ہے لیکن "کوئی مرے یا کہ جئے" کہنا درست نہیں۔"

کلامؔ سہسرامی نے اپنا آخری جملہ بمشکل تمام کیا تھا کہ ممنون عظیم بول اٹھے:

"کلام صاحب کا اعتراض بجائے خود درست ہے مگر میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس شعر کی داد شہلا صاحبہ کو دی جائے یا میر تقی میر علیہ الرحمۃ کو۔ میر صاحب فرماتے ہیں:

"وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
مرو یا جیو کوئی اس کی بلا سے"

شہلا گھبرا کر بول اٹھی: "خدا گواہ ہے میں نے تو آج سے پہلے یہ شعر کبھی سنا بھی نہیں"

"بیشک آپ نے نہیں سنا ہوگا" ممنون عظیم نے جواب دیا۔ "مگر بہر حال میر صاحب نے یہ شعر کہا ہے اور ان کے چھپے ہوئے

کلیات میں موجود ہے۔ اور۔۔۔۔۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شہلا صاحبہ کا شعر میر صاحب کے شعر سے ماخوذ ہے۔" اوصاف جوہر نے ممنونِ عظیم کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "کوئی مرے یا جیئے اس کی بلا سے" اردو کا روزمرہ ہے۔ جو شخص بھی کہے گا اسی طرح کہے گا۔ اس میں میر صاحب کی تخصیص نہیں، اور پہلے مصرعے کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مضمون لڑ گیا ہے اور یہ توارد کی ایک اچھی مثال ہے"

شہلا نے بڑی شکر گزاری کے انداز سے اوصاف جوہر کی طرف دیکھا۔

متاع الرحمٰن جلیل نے کہا: "مطلع کا مصرعۂ ثانی ہے "لیکن نہ ملی ہم کو اجل دستِ دعا سے" اس میں مقام کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ "اجل" کے بعد لفظ "بھی" لایا جائے۔ مثلاً اس طرح کہہ سکتے ہیں ع

"ہم کو تو اجل بھی نہ ملی دست دعا سے" لیکن "دستِ دعا" کا جھول پھر بھی باقی رہا"

"اگر سب حضرات مل کر کھینچا تانی کریں تو شاید یہ جھول بھی نکل جائے"۔ کوکب نے طنزاً کہا۔ انہوں نے اپنے خیال میں بڑی معرکتہ الآرا بات کہہ دی تھی۔ وہ فخر سے مسکرائے اور داد طلب نظروں سے سیما اور شہلا کی طرف دیکھا۔

اس کے بعد شیخ حسن پوری نے کہا: یہ مصرع "کیا جانے کہ کیا ان سے کہا آنکھوں نے میری" بہت ناہموار ہے۔ "آنکھوں نے" بری طرح دبتا ہے۔ اور "کہ کیا" میں جو تنافر ہے اس کی طرف حنیف شوق صاحب پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔ مصرع کو اگر اس طرح پڑھا جائے:

"کیا جانے کیا ان سے کہا میری نظر نے"

ــ تو دونوں عیب دور ہو جائیں۔ مصرعۂ ثانی "کانوں کی لویں سرخ ہوئیں شرم وحیا سے" یوں تو چست ہے لیکن اس میں "شرم وحیا" دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں حالانکہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس لئے ایک لفظ بیکار ہے۔ "شرم وحیا" کے بجائے اگر "فرطِ حیا" کہیں تو یہ عیب بھی دور ہو سکتا ہے"

شہلا کا غصہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے جھلا کر کہا: "کوئی اور عیب باقی رہ گیا ہو تو وہ بھی فرما دیجئے" سیما کے چہرے سے برہمی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے آہستہ سے شہلا سے کہا:

"یہ کوکب صاحب اور شہریار صاحب کیوں گونگے بنے بیٹھے ہیں۔ بڑے شاعر اور نقاد بنتے ہیں۔ کسی ایک اعتراض کا بھی جواب ا بن نہیں پڑتا۔ کل انہیں اشعار کی تعریف کرتے کرتے ان کے منہ خشک ہوئے جاتے تھے۔ آج انہیں سانپ سونگھ گیا"

اب پروفیسر وزیر صدیقی کی باری تھی۔ انہوں نے کہا: "جناب صدر، یہ شعر:

یہ نیشِ ستم ہی ہے فقط نوشِ محبت
کہلاتے ہیں ہم اہلِ وفا اس کی جفا سے

ــ مضمون کے اعتبار سے قابلِ توجہ ضرور ہے لیکن اندازِ بیان اچھا نہیں۔ پہلے مصرع میں "ہی ہے" اور دوسرے مصرع میں "ہم" کانوں کو بہت برا معلوم ہوتا ہے اور پہلے مصرع میں لفظ "فقط" بھی غالباً برائے بیت ہی لایا گیا ہے۔ اگر اس شعر کو اس طرح پڑھا جائے

ہے نیشِ ستم ہی میں نہاں نوشِ محبت
ہیں اہلِ وفا اہلِ وفا اس کی جفا سے

تو سب عیوب دور ہو سکتے ہیں"

"جناب صدر!" کلام سہسرامی جلدی سے بولے۔ "وزیر صدیقی صاحب کی اصلاح بظاہر مناسب معلوم ہوتی ہے لیکن اس اصلاح بعد شعر میں ایک نیا اور بڑا عیب پیدا ہو گیا۔ لفظ "ہے" سے کسی شعر کو یا مصرع کو شروع کرنا اساتذہ کے نزدیک سخت معیوب ہے۔ چنانچہ علا نیاز فتح پوری اس کے متعلق تفصیل سے لکھ چکے ہیں"

وزیر صدیقی نے جواب دیا کہ "نیاز صاحب کے علامہ ہونے پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے کہ اساتذہ کے نزدیک کسی مصرع کو "ہے" سے شروع کرنا معیوب ہے غالب کا یہ شعر تو آپ نے سنا ہی ہوگا:

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

— ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ غالب کے مختصر سے دیوان میں دو چار نہیں بلکہ درجنوں مصرعے "ہے" سے شروع ہوتے ہیں اور دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں"۔

وزیر صدیقی کی تقریر کے بعد صاحب صدر نے اِدھر اُدھر دیکھا جس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی اور صاحب کچھ کہنا چاہیں تو کہیں پھر فروغ جالندھری سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ فروغ صاحب آپ نے کچھ نہیں فرمایا فروغ جالندھری نے جواب دیا کہ صاحب صدر میں کیا عرض کروں۔ کہنے والے بھی کچھ کہہ رہے ہیں ÷

اب تاج چاندپوری نے بولنے کی اجازت چاہی اور کہا کہ "جناب صدر! غزل پر اب تک جو تنقید ہوئی ہے وہ زیادہ تر اس کی ہیئت پر ہوئی ہے یعنی یہ کہ بندش سست ہے یا فلاں لفظ زائد ہے یا کم ہے یا غلط استعمال ہوا ہے یا تنافر ہے یا مصرع ناہموار ہے یا محاورہ خوب بندھا ہے، لیکن خیالات و مضامین سے بہت کم بحث کی گئی ہے۔ شوق صاحب کی اس رائے سے مجھے شدید اختلاف ہے کہ "خیالات نہایت سطحی اور رسمی پامال ہیں"، اسی شعر کو لیجئے:

کیا جانئے کیا ان سے کہا میری نظر نے
کانوں کی لویں سرخ ہوئیں فرطِ حیا سے

تجربے کی حیثیت سے یہ خیال بیشک نیا نہیں اور ایک عام مشاہدہ ہے لیکن کوئی صاحب بتائیں کہ آیا اس مضمون کا کوئی شعر ان کی نظر سے گزرا ہے؟ اس میں یقیناً ندرت ہے اور فن کارانہ حسن بھی۔ یا پھر یہ شعر:

انسان بھی مجبور ہے اللہ بھی مجبور
سنبھلے ترے بیمار دوا سے نہ دعا سے

یقیناً چونکا دینے والا ہے۔ انسان کی طرح خدا کو مجبور کہنا اور ثابت کر دینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دلیل منطقی نہیں، شاعرانہ ہے۔ مگر شاعر کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ شہلا صاحبہ نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے ÷

"جناب صدر! اس شعر کی تو میں نے خود بھی تعریف کی ہے"۔ منیف شوق نے تاج چاندپوری کا قطعِ کلام کرتے ہوئے کہا۔ تاج چاندپوری آگے بڑھے اور کہا کہ اس شعر کو لیجئے:

ہے نیشِ ستم ہی میں نہاں نوشِ محبت
کہلاتے ہیں ہم اہلِ وفا اس کی جفا سے

— بظاہر اس کا اندازِ بیان رسمی ہے لیکن جو بات کہی گئی ہے وہ رسمی یا روایتی نہیں۔ ایک حکیمانہ نکتہ ہے جو نہایت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے"۔

تاج چاندپوری کی تقریر سن کر صبا اور شہلا دونوں کی یہ کیفیت تھی جیسے ڈوبتے کو کوئی سہارا بلکہ کنارہ مل جائے۔ وہ دونوں انتہائی ممنونیت کے ساتھ تاج چاندپوری کی طرف دیکھ رہی تھیں اور زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ "تاج صاحب خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ ان بے درد نا انصاف لوگوں میں صرف ایک آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس نے خدا لگتی بات کہی ہے۔ لیکن خدارا ابھی کچھ اور بھی کہئے۔ ابھی سے چپ نہ ہو جائیے"۔ مگر تاج چاندپوری کی تقریر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صمدانی نے بحث شروع کی اور کہا کہ "جناب صدر! غزل کے جملہ اشعار پر تفصیل سے بحث ہو چکی۔ صرف مقطع باقی ہے"۔

"اس کے آپ پرنے اڑائیے۔" سیما نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"مقطع یہ ہے:

ہر شعر مرا نشترِ الماس ہے شہلا
ہے سامنا ہر وقت حریفوں کو قضا سے

پہلا مصرع نہایت چست، رواں، شگفتہ اور حسین ہے مگر دوسرا مصرع برابر کا نہیں اور شعر کی ردیف غلط ہے ہم اس طرح بولتے ہیں: "ہر وقت قضا کا سامنا ہے"۔ "قضا سے سامنا ہے" کہنا درست نہیں۔ "مگر سے" تو ردیف ہے ڈاکٹر صاحب! "کا" یہاں کس طرح آسکتا ہے؟" شہلا نے ہمت کرکے گھٹی گھٹی آواز سے کہا۔

"آپ کا خیال صحیح ہے۔" ڈاکٹر صمدانی نے جواب دیا۔ "میرا مطلب بھی یہی ہے کہ "سے" ردیف ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ مگر "سے" کا یہ محل نہیں۔ اس کے بجائے یہاں "کا" ہونا چاہیئے ورنہ محاورہ غلط ہو جائے گا۔"

اس جواب سے شہلا روہانسی ہوگئی۔ سیما سخت پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر صمدانی کی تقریر کے بعد چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر فلاح الدین نے کہا:

"جنابِ صدر! اس میں شک نہیں کہ تاج صاحب نے شاعر کی وکالت کا حق ادا کر دیا۔"

ایک آواز: "شاعر نہیں شاعرہ۔"

"مگر بات جہاں تھی وہیں کی وہیں رہی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تاج صاحب نے اشعار کو اصلاح شدہ شکل میں پیش کیا ہے گویا جن اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے انہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

انسان بھی مجبور رہے، اللہ بھی مجبور
سنبھلے ترے بیمار دوا سے نہ دعا سے

اس شعر کے متعلق کہا گیا ہے کہ مضمون اچھوتا ہے۔ لیکن وہ مضمون آخر ہے کیا؟ چونکہ شاعر کی دعا قبول نہیں ہوئی اس لئے اس نے یہ فرض کر لیا کہ خدا بھی مجبور ہے۔ اس کا جی چاہے تو وہ یہ بھی فرض کر سکتا ہے کہ خدا کا وجود ہی نہیں۔ مگر یہ مفروضے حقیقت تو نہیں بن سکتے۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد بھی اگر کسی صاحب کو اس پر اصرار ہو کہ یہ مضمون اچھوتا ہے۔ تو بسم اللہ، وہ اسے اچھوتا ہی سمجھیں۔ میرے نزدیک تو یہ مضمون محض خود فریبی اور مغالطہ انگیزی ہے۔ شہریار صاحب اور کوکب صاحب نے غزل کے بعض دوسرے اشعار کی بھی تعریف فرمائی ہے لیکن ان کا حسن و قبح اور لوگ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں اور ان پر مزید تنقید کی ضرورت نہیں لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ ایک پرانے دقیانوسی رنگ کی تھرڈ ریٹ غزل ہے جس میں ذرا جان نہیں اور اغلاط سے پُر ہے۔"

اِدھر فلاح الدین نے تقریر ختم کی اُدھر شہلا کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ اس نے اپنی بانہہ آنکھوں پر رکھ کر روتے ہوئے سیما سے کہا:
"آج آپ نے مجھے خوب ذلیل کرایا۔ میں تو پہلے ہی آنے کے لئے تیار نہ تھی آپ مجھے زبردستی لے آئیں۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی حاضرین میں ایک اضطراب سا پھیل گیا۔ سیما کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم کھڑی ہوگئی اور تڑخ کر بولی:

"جنابِ صدر! ہم لوگ آپ کے بہت ممنون ہیں ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کے یہاں مہمانوں کی اس طرح عزت افزائی کی جاتی ہے معاف کیجئے گھر بلا کر کوئی دشمن کو بھی اس طرح ذلیل نہیں کرتا۔ خدا جانے آپ لوگوں نے ہم سے کب کا بیر نکالا ہے۔ آپ اسے دائرہ اصحابِ ذوق کہتے ہیں؟ یہ اصحاب ذوق ہیں جن کی زبان سے مذمت اور ملامت کے سوا ایک کلمہ تحسین کا نہ نکلا؟ یہ آپ کا ادبی مرکز ہے یا چڑیا گھر؟ خدا ہر شریف انسان کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔"

قبل اس کے کہ صدرِ جلسہ قمر فاروق صاحب کوئی جواب دیں، دونوں بہنیں کمرے سے نکل گئیں اور مرزا شہریار اور کوکب بھی چپ چاپ ان کے پیچھے ہو لئے۔

نئے شگوفوں کی دیکھ بھال

خدا خدا کرکے گرمیوں کی جھلسادینے والی تپش کم ہوئی۔ ذرا سانس میں سانس آیا۔ موسم گیلا گیلا ہونا شروع ہوا اب تو صبح شام ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بھی چلنے لگیں۔ اب سارے پاکستان میں بچاری ماؤں کو بھی ذرا چین نصیب ہوگا۔

یوں تو بچوں کا جھنجٹ ہر وقت ہی رہتا ہے مگر گرمیوں میں تو اور بھی یہ بوکھلا دیتے ہیں۔ خیر اب ان بچوں کی بھی ذرا جان میں جان آئی اور ماؤں نے بھی بچوں کو زیادہ چاؤ سے بنا سنوار کر سکول بھیجنا شروع کیا۔ اب ماؤں کو یوں بھی سکون ملا کہ آدھے دن

"پھسلنے میں بھی کیا مزا ہے"!

کتنے جوہر ہیں غربت میں ویراں ابھی
کتنے ٹکڑے ہیں دل کے پریشاں ابھی
درد کتنے ہیں محتاجِ درماں ابھی
دور کتنا ہے انساں سے انساں ابھی

کتنے لب قطرۂ علم سے دور ہیں
کتنے دیدے ہیں یارب کہ بے نور ہیں
تجھ کو اس کور دنیا میں رہنا نہیں
کر دکھانا ہے کچھ صرف کہنا نہیں

(حقی)

تک تو سکول ماسٹروں، استانیوں، کی نگرانی میں رہینگے ۔ گھر کی اودھم ذرا کم ہوگی اور مائیں گرھستی کے دوسرے کاموں کی دیکھ بھال کر سکینگی ۔

آف! یہ بچے! ۔انہیں اگر ڈئینامیٹ مسالے کا بھک سے اڑجانے والا بنڈل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا! ۔ یہ چھوٹے بچے ''انسانی بم'' ہیں ۔ان کی توڑ پھوڑ سے اللہ بچائے. ان کی شرارتیں شراروں سے کم نہیں ۔۔۔مگر ان پیارے بچوں ہی سے گھر کی رونق بھی ہے ۔ قوم کی امیدیں بھی تو یہی نونہال ہیں ۔

سکول جانےوالا بچہ صرف ایک ننھا سا انسان ہی نہیں ہوتا بلکہ کئی ہزار وولٹ کی طاقت والا ' برقپارہ. بھی ہوتا ہے جس کے رگ پٹھوں میں قدرت نے وہ تڑپ، اور چلبلاپن بھردیا ہے کہ اس سے یہ توقع ہی نہیں ہوسکتی کہ کبھی سست ہوگا ۔(بندر اور بچہ اگر کبھی سست ہو تو سمجھ لو کہ بیمار ہے !) ۔

پھرتی کا یہ عالم ہے کہ تیندوے سے زیادہ تیزی کے ساتھ درخت پر چڑھ جائیگا ۔ بطخ پانی میں کیا پھرکی کی طرح گھومتی ہے جو یہ بچہ دن بھر پھدکتا، اچھلتا کودتا پھرتا ہے ۔ بس بندر ہی شرارتوں میں اس سے کچھ زیادہ ہے

تعلیم کی شروعات

تندرستی کے لئے اسکول میں کھلی فضا اور کھیل کود

ورنہ یہ آدمی کا بچہ بندر کی طرح مار دھاڑ، توڑ پھوڑ، افراتفری، گڑبڑ، جیسی حرکتیں کرتا ہی رہتا ہے ۔

''تا! تا! تا!''

یہ سکول کا بچہ، (لڑکا ہو یا لڑکی)، قوت و توانائی کا مظہر ہے ۔ آنکھیں روشن، روشن، شرارتوں کے شراروں سے دمکتی ہوئی ۔ بال چکنے چکنے، کالے کالے ۔ دانت سفید جیسے موتیوں کی لڑی ۔ ذرا مسکرایا اور ماں کے دل میں محبت کی ھمک پیدا ہوئی ۔ ساری کلفتیں دور ہوگئیں ۔ دنیا کی ہر راحت اس مسکراہٹ پر قربان! دنیا کی کوئی بھی چیز بچے کے قہقہے کی برابر قیمتی نہیں ۔

یہ میاں ''اسلم،، ھیں!۔یہ بی ''شگفتہ،، ھیں!
لو صبح ھو گئی ۔ بچے گلے میں بستہ لٹکا ، سلیٹ تختی ھاتھ میں پکڑے گھر سے نکل پڑے ۔ گاؤں میں ھیں تو کھیتوں میں سے گزرتے، شہر ہے تو گلی کوچوں میں سے اچھلتے کودتے سکول کو چل پڑے --- ان بچوں کو دیکھکر دل کیسا مسرور ہوتا ہے ۔ کیوں نہ ہو یہی تو ھمارا مستقبل ھیں یہ آنے والی کل کی دنیا ہے جو آج بن رہی ہے ۔

اب ھم والدین جوھیں، ان پر بڑی ذمہ داری ہے ۔ پاکستان میں ھمارا ایک بڑا کام یہ ہے کہ ان بچوں کو سمجھیں ۔ ان کے مسائل کو سمجھیں ۔ کیونکہ پاکستان کی قوت و توانائی اور اس کا بناؤ بگاڑ سب اس پر منحصر ہے کہ ھم اپنے بچے کیسے اٹھاتے ھیں ۔ جب ھم اپنے بچوں کو کلاس میں بیٹھنے کے لئے بھیجنے لگیں تو اچھی طرح یہ بھی دیکھیں کہ یہ ننھے ننھے پاکستانی، جسم و جان کے اعتبار سے کتنے مضبوط، مستعد اور متحرک ھیں ۔

مثلاً سکول میں جب بچہ کو بھیجنے لگیں تو پہلے تو یہی دیکھئے کہ اس کے چیچک کا ٹیکہ لگا ھوا ہے یا نہیں ۔ ان کی جان سے دور، یہ چیچک کمبخت اڑ کر لگتی ہے ۔ اپنے اور دوسرے کے بچوں کا خیال کرتے ہوئے پہلے ان کے یہ ٹیکہ لگوائیے ۔

اب یہ کلاس میں پہنچ گئے ۔ ذرا دیکھئیے کہ اسکول کی عمارت کیسی ہے؟ صاف، روشن، ھوادار کمرے اور روشندان ھیں یا نہیں ۔ اگر کمرہ میں اندھیرا ہے تو گھور گھور کر لکھنے پڑھنے میں بچہ اپنی آنکھوں کو نقصان پہنچائیگا ۔ روشندان چوڑے، کھلے اور روشن نہیں تو صحت پر برا اثر پڑیگا ۔ والدین کی حیثیت سے آپ کا یہ فرض ہے کہ مدرسے کی عمارت میں ان باتوں کو ضرور جاکر دیکھیں اگر کہیں یہ آسانیاں مہیا نہیں ھیں تو جگہ جگہ اپنے پیارے بچوں کی پرداخت و تعلیم کے سلسلے میں ''انجمن والدین،، بنائیں اور حکام مدرسہ سے ملکر ان دقتوں کو دور کر کے، لکھنے پڑھنے کی فضا کو بہتر بنانے کی کوشش کریں ۔

سکول میں پاخانے اور ھاتھ منہ دھونے کے نل، پینے کے پانی کا انتظام وغیرہ باتیں خاص طور پر صفائی طلب ھیں ۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ کھانے پینے کی کوئی جگہ سکول میں ان کے لئے علیحدہ کر دی گئی ہے یا نہیں ۔

اگر سکول میں کافی جگہ ہے تو ایک ننھا سا کھیت بھی بنا لیا جائے ۔ اس میں ان بچوں کو کھلانے کے لئے سبزی ترکاریاں ان ھی بچوں سے

ذھنی ترقی کے ساتھ جسمانی تربیت بھی ضروری ہے

لگوائی جائیں ۔ خاص کر ایسی سبزیاں جو توانائی بخش ھیں، جیسے پالک ۔ ٹماٹر ۔ ہا پتے دار سبزی ساگ وغیرہ ۔ پھر اگر یہ سہولتیں میسر نہیں آ سکتیں تو انھیں اپنی بساط کے مطابق ھم کسطرح مہیا کرسکتے ھیں، ایسے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے ۔

بچے ترت پھرت میں جسم کا ایندھن بڑی تیزی سے خرچ کرتے ھیں۔ دریا میں بہتی اگن بوٹ کوئیلے کی مقدار جتنے جلدی خرچ کر دیتی ہے،

یہ میاں اسلم جو ہیں، یہ اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ بدن کا ایندھن خرچ کر دیتے ہیں اس لئے انہیں خوب کھلانے پلانے کی ضرورت ہے۔ گیہوں کی روٹی ہو یا چاول ہو، شکر، گھی، پھل، اور سب سبزیاں انہیں دیتے رہیں۔ یہ بھی خیال رکھیں کہ اگر یہ میاں اسلم مٹھاس کے بہت شوقین ہیں تو دانت بھی خوب صاف کرتے ہیں یا نہیں ؟ -

دودھ، گوشت، مچھلی انڈا، ہر طرح کی ترکاریاں -- یہ سب ایسی غذائیں ہیں کہ ان میں پروٹین کا جوہر زیادہ ہوتا ہے اور جسم میں پٹھے بنانے، خون پیدا کرنے، اور مضبوط ہڈیاں پیدا کرنے کے لئے قطعی ضروری ہیں -

آپ کے بچے کے لئے صرف طاقت‌ور غذاؤں کی ہی ضرورت نہیں ہے بلکہ '' بیماری روک '' غذائیں بھی اسے چاہئیں - جیسے سینے کی مشین ہوتی ہے نا، اور اسے تیل نہ دو تو چلنی بند ہو جاتی ہے بس یہی حال بچوں کا ہے - '' بیماری روک '' غذاؤں کو '' حیاتین '' کہتے ہیں - یہ ہری ترکاریوں میں، پھلوں میں، (خاص کر نیبو، نارنگی وغیرہ) یا پھر گاجر، مغزیات، کشمش، مچھلی کے تیل وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں -

غذا ہی نہیں پانی بھی بچے کے لئے بہت ضروری ہے۔ تازہ صاف پانی وہ دن میں خوب (مگر زیادہ نہیں) پیتا ہے یا نہیں، اسکا ضرور خیال رکھیں - دھوپ بھی جسم کے لئے بڑی ضروری چیز ہے - غرض آپ کا بچہ ایک خزانہ ہے جس کی حفاظت خود آپ کو کرنی ہے اسکی جسمانی صحت اور دماغی صحت کا خیال اگر صحیح طور پر رکھا جائے تو قوی امید ہے کہ وہ بڑا ہو کر ذہن، روح اور جسم کے معاملے میں ایک ممتاز انسان ہوگا - یہ بڑے انسان ایک دم بڑے نہیں پیدا ہوئے تھے - یہ بھی کوشش سے بنتے ہیں - کون کہہ سکتا ہے کہ وہ جو بچہ بلی یا بطخ کے پیچھے کھیت یا گلی میں بھاگا چلا جا رہا ہے کسی روز کچھ بن جائیگا ! - ہوسکتا ہے وہ پاکستان کا کوئی بڑا لیڈر، یا بڑا ممتاز و کارآمد شہری بن جائے - اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ بھی ہزاروں انسانوں میں ایک ایسا شخص ہو جو کچھ بھی اہمیت نہ رکھتا ہو — مگر اس سے غرض نہیں، بڑا یا معمولی آدمی ہونا تو ایک الگ ہی بات ہے۔ لیکن اگر لاڈ پیار کرنے والے والدین نے اپنی مقدور بھر اس بچے کو اچھی تربیت، (جسمانی و ذہنی)، بہم پہنچائی ہے تو سمجھ لیجئے کہ ایک دن یہ بچہ ایک معقول، توانا، خود پر بھروسہ کرنے والا، اوسط درجہ کا پاکستانی تو ضرور ہی بن جائیگا -

آپ کو یہ بھی چاہئے کہ اپنے بچے کی عام صحت اور بڑھوتری کے مسائل پر اپنے علاقے کے حکام صحت سے مشورہ کرتے رہیں *

(م ع)

اسکول میں بچوں کو طاقت بخش دودھ پلایا جا رہا ہے

غزل

سید آلِ رضا

باغ تمنا پیارا پیارا
پھول ہمارے، رنگ تمہارا

ڈوب رہا ہوں، ارمانوں میں
پاس ہے سب کچھ دور کنارا

پہلی نظر تو سب سے الگ ہے
کیوں نظر پڑتی ہے دوبارا

یوں نہ کرو، توہینِ محبّت
جیسے کوئی احسان اتارا

آپ تو جیتے اپنی باری
میری بھی سنئے، کوئی نہ ہارا

باقی میری ساری حکایت
کافی اُنکا ایک اشارا

دل سے ہر ارمان کی رخصت
جیسے کوئی مہمان سدھارا

میرے اندھیرے کی محتاجی
دیکھ نہ پائی دور کا تارا

دل کی صدا ہی سچی نکلی
جو بھی تمہیں کہہ کے پکارا

یوسف ظفر

★

نفیرِ پاکستان

(بحضورِ اقبالؒ)

★

تری خودی کے تصوّر میں کائنات وجود
تری طلب کا تخیل حیات کا غماز

ترے نفس کے بگولوں سے گرد تنہا نے
تری حدی سے رواں کاروانِ رہ و مجاز

بہ میرانہ نظر کی حدود میں آئے
فسانہ ہائے حقائق، ترانہ ہائے مجاز

ترے جنوں سے خرد کو ملا بہانۂ زیست
تری نگاہ سے ٹوٹا طلسم خانۂ راز

ترے بلند عزائم خمیرِ پاکستان
ترے کلام کی لَے ہے نفیرِ پاکستان
(ز نشید حریت)

غزل

سید عبدالحمید عدم

ایک دروازہ بھی جب تک باز ہے
بختِ آشفتہ دو عالم ساز ہے

میرے نغمے میں کہاں اتنی کشش
اس میں شاید آپ کی آواز ہے

دیکھ کر اہلِ گلستاں کا سلوک
موسمِ گل مائلِ پرواز ہے

خواب میں بہتا ہے دریا جس طرح
آرزو کتنی شُبک آواز ہے

اُف یہ شرحِ راز کی پیچیدگی
راز کی تشریح بھی اک راز ہے

میری آنکھوں کی نہیں کوئی خطا
میری صورت آپ ہی غماز ہے

گفتگو کرتے ہیں وہ کیسے عدم
ہائے کیا چبھتا ہُوا انداز ہے

جمیل واسطی

ہم تجھے غیر کہیں گے۔ ہمیں معلوم نہ تھا
جاں سے بیزار رہیں گے۔ ہمیں معلوم نہ تھا

تیری غیرت کے لئے ہم نے زمانہ چھوڑا
ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہمیں معلوم نہ تھا

عمر کٹ جائے گی رو رو کے یہ کہتے کہتے
"اپنے دن اب تو پھریں گے"۔ ہمیں معلوم نہ تھا

مر کے مل جاتی ہے بسمل کو تڑپنے سے نجات
زندگی بھر نہ مریں گے۔ ہمیں معلوم نہ تھا

یوں پہاڑ اُٹھیں گے اور سینے سے ٹکرائیں گے
آسماں سر پہ پھٹیں گے۔ ہمیں معلوم نہ تھا

کوئی انساں کسی انساں سے محبت نہ کرے
ہم یہ ہر اک سے کہیں گے۔ ہمیں معلوم نہ تھا

واسطی اپنی محبت کا فسانا کہتے
اپنے آنسو نہ رُکیں گے۔ ہمیں معلوم نہ تھا

غزل

ادیب سہارنپوری

چلی پھر نکہتِ بادِ بہاری
خلش بننے لگی، پرہیزگاری
بہت مشکل ہے غم کی پردہ داری
کہ بن جاتی ہے آنسو بیقراری
طبیعت کیا غمِ ہستی سے ہاری
گوارا ہو گئی۔ ہر ناگواری
بہاری اور گلوں کی زندگی کیا
کسی پر دن۔ کسی پر رات بھاری
دو عالم میں تماشہ بن گئے ہم
اٹھا کر تہمتِ آئینہ داری
ہمیں شیرازہ بندی کی لگن ہے
نہ ہوگی کم پریشانی ہماری
بچھی ہیں راستوں پر کب سے آنکھیں
کہاں ہے موسمِ گل کی سواری
خدا معلوم کیا کر کے رہے گی
بتوں کی حسرتِ پروردگاری
انہیں خوش فہمیوں پر جی رہے ہیں
انہیں بھی یاد آئے گی ہماری
بچھڑ کر اُن سے یوں دن کٹ رہے ہیں
مسافر پر ہو جیسے راہ بھاری
وفاؤں کی بڑھا دیتی ہے عمریں
وفاؤں پر تری بے اعتباری
خوشی کی آرزو۔ خود ایک غم ہے
نہیں آسان غم سے رستگاری
ادیب انسان کی گمراہیوں پر
پشیماں ہے خردمندی بچاری

شیدا گجراتی

ہم کو فن کا دعویٰ کب ہے
صرف یہ اُن کا حسنِ طلب ہے
فرصتِ یک لمحہ اس دل کو
جب تھی میسر اور نہ اب ہے
غم کی دولت نعمتِ عظمےٰ
غم بھی بقدرِ ظرفِ طلب ہے
گل کا تبسم دیکھنے والے
گل بھی تو محرومِ طرب ہے
عشق کی راہیں سادہ و رنگیں
عشق کی منزل صبر طلب ہے
صبر کی تلقین کرنے والو
دل کو صبر کا یارا کب ہے
صبح ہوئی اور ذہن و نظر پر
اب بھی مسلط ظلمتِ شب ہے
حسن ہے مائل عشق گریزاں
یہ کیا رنگِ ذوقِ طلب ہے
آٹھوں پہر کی بے تابی کا
اے دلِ ناداں کچھ تو سبب ہے
دل کا عالم کچھ بھی ہو لیکن
تیرا شیدا نغمہ بہ لب ہے

دھان : ——— بقیہ ص ۳۵

وہ پھیکی ہنسی ہنسی۔
مجید شکایت کے لہجے میں بولا۔ "تم گویا کچھ خوش نہیں ہو۔ اور ہو گی بھی کیسے؟ گھر میں آکر تو صرف تکلیف ہی ہوئی ہے۔ ایک اچھا کپڑا بھی نہیں دے سکا، زیور بھی بیچ ڈالے۔"

"اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟" ——— "ہاں قصور میرا ہی ہے۔"

وہ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ "لیکن تم یقین کرنا۔ دھان گھر میں آتے ہی میں تمہارے زیور بنوا دوں گا۔ تمہارا جسم چھو کر کہتا ہوں، مجھ پر بھروسہ کرو۔"

موتنہ خاموش رہی۔ اس کے بعد اس کے بالوں والے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ڈال کر بولی: "تم میری ایک بات سنو گے؟"

"کیا؟" ——— "زیور کے بغیر کیا مجھے یہ گھر اچھا نہیں لگتا؟"

کچھ دیر تک خاموش رہ کر اس کے سینے کے سہارے وہ ٹیک دیکر بولی:۔

"تم سمجھتے ہو، زیور بنوا کر ہی میں خوش ہوں گی! وہ اب میرے گلے میں کانٹے کی طرح معلوم ہوگا۔ اس کے باوجود اگر تمہارا دل نہ مانے، تو میری ایک بات مانو، کیا کہتے ہو، مانو گے؟"

وہ عجیب انداز سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

مجید نے اطمینان سے جواب دیا،

"کیا ہے، بتاؤ!"

"جس روپیہ سے زیور بنواؤ گے، وہ ہماری پنچایت کے لئے خرچ کرو۔ میں نے سب پنچایت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اسی سے میں خوش ہوں گی، اور بہت خوش ہوں گی!"

"موتی، میری موتی!"

مجید نے اُسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ اس کے سارے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ذرا سا سر جھکا کر وہ اس سے سرگوشیاں کرتا رہا۔

آم کے پتوں پر ہوا کی ہلکی سرسراہٹ تھی۔ چوک کے چاروں طرف مشعلیں گویا اور زیادہ روشن ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھی شعلے اُٹھ رہے تھے، اور پھر لمحہ بھر کے اندر ہی مٹ جاتے تھے۔ اس کے سرے سے کسی نے زور سے آواز لگائی۔

"پہرہ دارو ہوشیار———!"

"دیکھو، آواز آرہی ہے۔"

درخت کی جڑ سے لاٹھی ہاتھ میں اُٹھا کر وہ واپس چلا گیا۔ موتنہ اسی جگہ پر کھڑی رہی۔ دور سے شور سنائی دے رہا تھا۔ گانے کی آواز ہوا کے ساتھ آرہی تھی۔ اس نے سر کے بالوں کو درست کر لیا۔ گردن سے گرتے ہوئے آنچل کو کمر میں لپیٹ لیا۔ سارا جسم خوشی سے کانپ رہا تھا۔ دونوں ہونٹ اب بھی گویا بے حس تھے۔

"اوہ! کس قدر عجیب طاقت ہے، ان آدمیوں میں!" ہلکی تاریکی میں اس کے چہرے پر ایک بے ساختہ ہنسی کی لہر اُبھر آئی۔

آخری مرتبہ اس نے دیکھا، ایک آدمی تیز قدم آگے بڑھ رہا تھا، اور مشعل کی روشنی میں ایک لاٹھی فضا میں چمک رہی تھی۔

●

میری قمیص
پٹخنا
بند کرو...
چٹاخ! پٹاخ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر پھٹی آستینیں!
میں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتا۔
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
جی ہاں! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت۔ سن لائٹ کے جلد تر گرنے والے جھاگ سے کونے کونے سے بغیر پیٹے میل کچیل صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے بھگو دیجئے، سن لائٹ صابن ملئے اور دھو ڈالئے بس آپ کا کام ختم ہو گیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے!
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
سن لائٹ صابن
SUNLIGHT
بغیر پیٹے کپڑوں کو
سفید اور اجلا
دھوتا ہے

(بی بی بقیہ صفحہ)
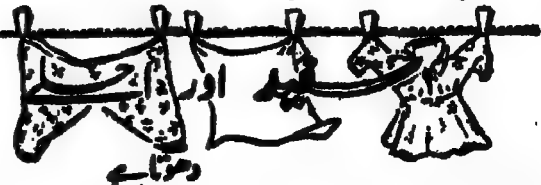
بی بی جھک کے ان دو پاؤں میں پس کر رہ گئی۔ راکھ بن گئی اور وہ راکھ فضاؤں میں بکھر گئی۔ یہ لمحہ گزر گیا اور زمین آسمان جُدا ہو گئے۔ بی بی کی بکھری ہوئی راکھ پھر سمٹی اور اکٹھی ہو گئی۔ زمین نے اس کے قدموں کو چھوڑ دیا اور بی بی گھر کی طرف لوٹنے لگی۔ اب اس کے دل و دماغ، روح اور حافظے میں حسین تصورات کی کوئی چنگاری زندہ نہ رہتی تھی۔ ماضی کا ایک ایک گزرا ہوا لمحہ سہانے کن فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گیا تھا۔ اُسے نہ غصہ تھا نہ مایوسی، نہ غم نہ افسوس۔ اس نے گھر کا دروازہ کھولا، چارپائی کو ٹٹولا اور بستر پر لیٹ کر سوچا:

"کیا یہی دُنیا ہے۔ لعنت!"

Regd. No. S. 1086

جگر مرادآبادی　　ابوالفضل صدیقی　　ابوسعید قریشی

ضمیر جعفری　　محبوب خزاں　　شائستہ بیزار

نومبر ۱۹۵۷ء

مغل سلاطین کی گرفتاری (۱۸۵۷ء: ایک معاصر مصور کے قلم سے)

محاصرۂ دہلی (۱۸۵۷ء)

ماہِ نو

★

جلد ۱۰ — شمارہ ۸

نومبر — ۱۹۵۷ء

مدیر:
رفیق خاور

نائب مدیر:
ظفر قریشی

★

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی — آٹھ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

★

★

اپس کی باتیں

آزادی کی لگن اُس دور میں بھی ہمارے ساتھ رہی جو ہماری تاریخ کا تاریک ترین دور تھا۔ اس کی آگ ہمارے دلوں میں برابر شعلہ زن رہی۔ اس کا ثبوت دیگر امور کے علاوہ ان دلولہ انگیز جہادی نظموں سے بھی ملتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے آشوبِ عظیم سے پہلے لکھی گئیں۔ یہ وہ شعلہ آفریں نظمیں ہیں جنہوں نے تمام برصغیر میں آگ لگادی اور حریت کے شیدائیوں کے سینہ میں یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ حصولِ آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے میں بھی تامل نہ کریں گے۔ اگر آج ہم ایک آزاد قوم کہلانے پر فخر کناں ہیں تو یہ انہی آتش پاروں کا نتیجہ ہے جو جراتِ سوز دروں سے پیدا ہوئے۔ انہوں نے کارواں کے دل میں احساسِ زیاں کے ساتھ ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی زبردست لگن بھی پیدا کر دی اور اُس راستہ پر ڈال دیا جو اُس تک رسائی کا واحد ذریعہ تھا۔ اسی لئے ہم ان ادبی پاروں کی تہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ جہاں کہیں یہ گہرہائے گرانمایہ ہاتھ آئیں ان کو فراہم کرنا اور سینت سینت کر رکھنا ہمارا قومی فرض ہے۔ اس شمارہ میں "اردو کی دو جہادی نظمیں" کے زیرِ عنوان چند ایسے ہی قلمی نوادر پیش کئے جا رہے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ محض اشرافی قوتوں کی دوبارہ حصولِ اقتدار کی کوشش ہی نہ تھا بلکہ اس میں عوام کے بے لوث جذبۂ آزادی اور شوقِ جہاد کو بھی دخل تھا جو روایت پرستی کی بنا پر ہی سہی اپنے ملک و قوم کو غلبۂ فرنگ سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ مزید تلاش سے ایسے اور بھی نقوش دستیاب ہوں اور اُس تصویر کو زیادہ جامع بنانے میں مدد دیں جو ہم نے ۵۷ء کے یادگار نمبر (مئی ۱۹۵۷ء) میں پیش کی تھی ÷

پچھلے دنوں پاکستان بھر میں عید میلاد جس اہتمام سے منائی گئی وہ پیغمبرِ اسلام سے بے پایاں عقیدت کا ولولہ انگیز مظاہرہ ہے۔ یہ درحقیقت اس سرچشمۂ فیض سے ہمکنار ہونے کے جذبۂ و شوق کا نتیجہ ہے جس نے ہمیں اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے مشرف کیا۔ اس شمارہ میں خانۂ کعبہ کی جو تصویر پیش کی جا رہی ہے وہ اسی جذبہ کی آئینہ دار ہے ؎

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

وادیٔ مہران (مغربی پاکستان) کا شاعرِ اعظم، شاہ بھٹائیؒ پاکستان بھر میں روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور ایسا ہونا لازم ہے کیونکہ بھٹائیؒ کی شاعری کے سوتے اس سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں جو تمام نوعِ انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ وجدانی احساسات اور بنیادی کیفیات شاہ صاحب نے جو حقائق و بصائر پیش کئے ہیں وہ ہماری زندگی کی ان افتادوں اور تقاضوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں جن سے ہم آئے دن دوچار ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم قارئین کو وقتاً فوقتاً ان کا کلام تبرکاً پیش کرتے رہے ہیں۔ اس شمارہ میں بھی، جس کا سرورق ان کے حالیہ عرس کی مناسبت سے روضۂ شریف کے رنگین عکس سے مزین ہے، ان کے ایک طویل شاہکار "سر سسئی" کی چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ بھٹائیؒ کو بالعموم ایک صوفی خیال کیا جاتا ہے لیکن انہیں اقبالؒ کی اصطلاح میں بندۂ مومن کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ان کی روحانیت ایک منفی قسم کی روحانیت نہیں، جس کا مرد کار تمام تر رموزِ غیب یا کشف و کرامات سے ہو۔ وہ رومیؒ کی طرح فعال روحانیت کے قائل ہیں جس کا دوسرا نام ایمان ہے جو خالص توحید کا لازمی نتیجہ ہے اور جس سے ہماری زندگی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار زندگی کی حقیقی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں ایک اعلیٰ سیرت کا انسان ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس طرح شاہ بھٹائیؒ کا روحانی سلسلہ براہِ راست پیغمبرِ اسلامؐ تک پہنچتا ہے، اور ان کی تعلیم بھی انہی کی ایمان افروز تعلیم کا پرتو ہے ÷

بیادِ لطیفؒ:

سُر سسئی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجم: رفیق خاور

کافیوں اور وائیوں کے علاوہ بھٹائیؒ کے "رسالو" کا ایک اہم حصہ وہ نظمیں ہیں جن کو وہ "سُر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مثلاً سُر سسئی، سُر مارُوی، سُر سوہنی، سُر یمن، سُر حسینی وغیرہ۔ ان کا صحیح اندازہ ان کے مطالعہ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ سُر در حقیقت راگ کی نہیں اور نہ ان کا راگ سے کوئی نمایاں تعلق ہے شاید بعض سُر مثلاً سُر یمن، سُر سورٹھ، سُر کلیان وغیرہ کا تعلق اس نام کے معروف راگوں سے ہو اور ان عنوانوں سے لکھی ہوئی نظمیں ان راگوں میں گائی جاتی ہوں، کیونکہ ایسی دور کی یادگار ہیں جب شاعری اور گائکی آپس میں بالکل گھلی ملی ہوئی تھیں۔ لیکن سُر سسئی یا سُر مارُوی میں کوئی ایسا واضح رشتہ نظر نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ سُر سے مراد لَے یا نظم ہے ؛

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے ان کی کیفیت بھی انوکھی ہے۔ وہ نہ تو پوری طرح غنائیہ ہیں نہ "ڈرامائی"۔ شاعر ان میں براہِ راست اپنے احساسات یا افکار پیش نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ کہتا ہے اپنے کرداروں کی زبانی کہتا ہے، ماسوا ان مقامات کے جہاں ڈرامانگار خود کردار بن کر "لطیف چئی" یا "سید چئی" کے تحت اس کا پارٹ ادا کرتا ہے اور حالات پر تبصرہ کرتا ہے۔ یا پھر وہ ان کی بپتا یا کتھا کے بعض پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ گویا نظم کی غنائیہ لَے دو طرح کی ہے۔ ایک شاعر کی اپنی کیفیات کی بلاواسطہ ترجمانی اور دوسری کرداروں کے احساسات کی ترجمانی انہی کی زبانی۔ براؤننگ کی طرح اس کی شاعری بھی "افتادوں" کی شاعری ہے۔ بنیادی حیثیت سے وہ ایک درویش رانشیے۔ ایک عارف جس کو صرف اپنے دھنی (واحد، مالک، قدیم) ہی سے سروکار ہے۔ اور وہ اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ قوی بنانے کے لئے حق سے قریب اور غیرِ حق کی کدورتوں سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطمحِ نظر "روح" کی توانائی ہے۔ اس کے لئے انسان کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ اپنی روح کو بے داغ رکھنا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ توانائی پیدا کر سکے۔ اس کی بہترین علامت ماروی ہے جو کسی قیمت پر بھی اپنی آن یعنی روحانی وجاہت بلکہ وسیع ترین معنوں میں اپنی "خودی" کو ان عناصر کے حوالے نہیں کرنا چاہتی جو اس کے منافی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں بے اختیار ایک مغربی مصنف کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ "اگر ہم سب کچھ پا لیں لیکن اپنی روح کو کھو بیٹھیں تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟" درحقیقت بھٹائیؒ کی "روح" خودی یا ذات ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کو ان تمام تخریبی عناصر سے محفوظ رکھنا جو اس کی نفی کرتے ہیں، اس کا محبوب ترین نصب العین ہے۔ وہ سوہنی کی اس لئے تعریف کرتا ہے کہ اس نے دنیا کی پروا نہ کی، ذاتی آفات و مصائب کی پروا نہ کی، طوفانِ حوادث کی پروا نہ کی، بلکہ اپنے محبوب (جس کو ہم عام معنوں میں نصب العین بھی قرار دے سکتے ہیں) کے عشق میں سرشار ہو کر اپنی قوتِ ارادی کا علم بلند کرتے ہوئے تمام انسانی اور قدرتی طوفانوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئی۔ سسئی کو صرف اتنا افسوس ہے کہ اس نے ذرہ بھر غفلت کی اور اس کا محبوب اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد۔ تاہم وہ برابر اپنے محبوب کی لگن میں محو ہے، اس کی تلاش میں خندہ پیشانی سے ہر قسم کی مصیبتیں سہتی ہے، اس کی نظر ایک بلند مقام پر ہے، وہ نومید نہیں ہوتی اور اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ اسی طرح مومل کو بھی افسوس ہے کہ اس نے معمولی ہار کے لئے اپنی روح کی عظمت گنوا دی۔ غرض بھٹائیؒ کا مدعا یہ ہے کہ وہ کبھی اپنی زبان، کبھی خارجاً شاعر کی حیثیت سے اور کبھی کرداروں کی زبانی کسی افتاد کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرے اور ہر رخ، ہر حیثیت سے ایک ہی بنیادی حقیقت ــــ روح کا عروج یا زوال ــــ واضح کرے۔ وہ روح کی دھوپ چھاؤں، اجالوں اندھیروں کا شاعر ہے۔ اسی لئے اس کی تکنیک براؤننگ سے ملتی جلتی ہے جس کا عقیدہ یہ تھا کہ "ہم انسانوں کے لئے بہترین موضوع انسان ہی ہے"۔ اس کے بعض پارے "ڈرامائی خود کلامی" معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ ان میں پلاٹ یا کرداری تجزیہ کا وہ اہتمام نہیں جو براؤننگ میں ہے اور جو اسی کا حصہ ہے ؛

سُر سسئی میں زیادہ تر کلام سسئی ہی کی زبانی ہے یا "لطیف چیتی" کے زیرِ تحت بھٹائی کی زبانی۔ کہیں کہیں پوری طرح یہ واضح نہیں ہوتا کہ متکلم کون ہے، شاعر یا سسئی۔ پھر بھی ہم ایسے پاروں کو سسئی ہی سے منسوب کر سکتے ہیں۔ شاہ لطیف کے کلام میں کردار اور شاعر کا یوں خلط ملط ہونا بہت عام ہے، اسلئے کہ وہ اپنے کرداروں کے پردہ میں خود ہی بولتے ہیں۔ ان کا سایہ کبھی ان سے پرے نہیں ہوتا، جیسا کہ ابتدائی قسم کی تمثیلوں میں عموماً ہوتا ہے۔ ڈراما نگار خود اسٹیج پر آ دھمکتا ہے اور اداکاری کا لباس پرے پھینک کر خود اداکار بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا اور کردار کا معاملہ واحد سمجھتا ہے۔ اس کے لئے ڈرامہ غنائیہ سے دور نہیں۔ پردہ تو محض نام کا ہے لہٰذا بھٹائی کی نظمیں، ڈراما، غنائیہ اور واقعہ نگاری کا ملغوبہ ہیں۔

"افتادوں" کا شاعر ہونے کے معنی یہی ہیں کہ بھٹائی کوئی داستان گو نہیں۔ وہ افسانہ برائے افسانہ کا قائل نہیں۔ اس کی داستانیں ہم پہلے ہی جانتے ہیں صرف وہ کیفیتیں جو کسی افتاد سے التزاماً یا امکاناً پیدا ہو سکتی ہیں، اس کی شاعری کا موضوع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب بنیادی حیثیت سے نہ ڈراما نگار تھے نہ داستان گو، وہ پیغامبر تھے۔ وہ مردِ حق پرست جس کا تمام تر زور روح کی سطوت پر تھا اور جو جسم کی عبودیت پر بھی اسی لئے زور دیتے تھے کہ انسان کی روح اپنے مرتبۂ عالی کو پہنچ جائے۔ یہ پیغامبر، یہ مردِ خودی پرست ہر وقت اپنے کلام کے پاس رہتا ہے۔ وہ اس میں پوری طرح رچا ہوا ہے۔ بھٹائی کا مسلک صوفیانہ خلوت پسندی اور تجرد نہیں۔ اگر وہ روح کی توانائی پر زور دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ہم زندگی میں اس کا مصرف پیدا کریں۔ ان کی بہترین ہیروئن ما زندگی ہی کی ایک افتاد کا سامنا کرتی ہے۔

سُر سسئی چھیالیس چھوٹے بڑے بندوں پر مشتمل ہے۔

سسئی

(۱)

کیا جتنوں میں، کیسا چلاؤں
لوگ کہیں گے دیوانی ہے
اچھا یونہی سہی، کہنے دو
مستانی ہے، مستانی ہے

چیخیں مری دلدوز ہیں پھر کیا
لوگ انہیں سن سن کر آئیں
برا بھلا کہتے ہیں کہہ لیں
ان باتوں پہ شرم دلائیں

اس میں لاج کی بات ہی کیا ہے
بڑھتے چلے جاؤں گی برابر
خواہ بدن ہو پارہ پارہ
اپنے پیا پیارے کی رہ پر

(۲)

ضبط کروں کتنا ہی میں
کیسے رہوں بن ماہی میں
غم ہی غم ہے ٹوٹ پڑا
دل پہ مرے دندا رہتا

جا اے آنے والے کل
تیرے سب وعدے چھل بل
ان پہ بھروسہ کیسے کروں
جیون کو ترساتی رہوں
کل تک صبر کروں مشکل

ہائے یہ میرا بیاکل دل
جانی آ، کل تک مل جا
یا مجھے موت کی راہ دکھا
درشن دے یا موت مجھے
ڈھونڈتی ہوں ہر اور تجھے
مان لے مان لے بات مری
مجھ کو دکھا صورت اپنی

سید :

اے دکھیا، اے غم کی ماری
بھول بھی جا یہ غم کی باتیں
چھوڑ دے اپنی سیج سجیلی
دیکھ یہ جلتی بھنتی چٹانیں

ان پر چل کر ڈھونڈھ نشانی
تینوں راجن کے پاؤں کی

جناب ابراہیم اسماعیل چندریگر، پاکستان کے نئے وزیراعظم

ولیکا ٹیکسٹائل ملز کراچی کے سالانہ
جلسہ میں صدر جمہوریہ پاکستان،
اسکندر مرزا ، حاضرین سے خطاب
کر رہے ہیں

پاکستان و جاپان کے مابین
تجارتی معاہدہ پر دستخط

تعلقات دولت مشترکہ کے برطا
انڈر سیکریٹری نے پاکستان صنـ
ترقیاتی کارپوریشن کے ڈاکیارڈ کرا
کا معائنہ کیا

دیکھو سراپ سے اس دکھیا کے
چیخ اٹھی ہے گھائی گھائی

مرجائے تو جنگل جنگل
سارے ہرن رہ رہ کے پکاریں
ہائے اس دکھیا نے مرکر
دکھیا کیں ہرنوں کی ڈاریں

مرگئے ہم اس کے مرنے سے
اس کی موت نے ہم کو مارا
اس کا دکھ ہم سب کا دکھ ہے
سائیں سائیں کرے بن سارا

اے دکھیاری تیرے کارن
بنجر ہے یہ سب ویرانہ
برکھا برسے دھائیں دھائیں
پھر بھی اُگے کب ایک بھی دانہ

پھل پھلواری دین ہیں اس کی
جو ہے کل جگ کا اَن داتا
ہاتھ اسی کے سامنے پھیلا
مانگیں تو اس سے رزق سدا

(۳)

سسی: خدا کرے کہ کہیں پھر وہ روزگار آئے
کہ یار بچھڑے ہوئے یار کے کنار آئے
چلو چلو، اسی رہ پر چلو کہ دل نہ کہیں
امید باختہ فصلِ خوشگوار آئے
امید آج اُبھرتی ہے دل میں رہ رہ کر
بچھاؤں راہ میں آنکھیں جو وہ نگار آئے
بچھایا میں نے ہے آنکھوں کو راہِ جاناں میں
خوشا جو اس کا قدم سوئے رہگزار آئے

نہ جانے ان کو گئے آج کتنے جگ بیتے
کبھی تو بھول کے یارب وہ شہسوار آئے
گیا جہاں سے مرا دوست پھر وہیں آئے
پیالہ گھوم کے پھر سوئے بادہ خوار آئے
مری امید بھی اتنی ہے جتنا نام ترا
کمالِ صبر سے ہی روح کو قرار آئے
تسلیٔ دلِ مایوس ہے ترے دم سے
ترا ہی نام ہے جو لب پہ بار بار آئے
ہے نقش دل پہ جو میرے رضائے مولیٰ کا
مری امید بھی ایسی ہی سازگار آئے
نہ تیرے در سا کوئی در نہ آسرا تجھ سا
ترے حضور ہر اک پیکر نزار آئے
بہت ہی دیکھے ہیں دروازے اور درگاہیں
کہاں سے تجھ سا الٰہی کرم شعار آئے
نہ چھوڑ اپنے کرم سے تو اس کے دامن کو
جو پاس تیرے بہ ایں حال اشکبار آئے
ہر ایک بے کس و تنہا کی تو ہے پشت و پناہ
نہ پاس کیوں ترے جاں بہر زینہار آئے

(۴)

کر آہ و فغاں، کر آہ و فغاں، مت روک زباں، مت روک زباں
اونٹوں کی قطاروں میں کھوئی، بھولیں نہ کہیں تجھ کو سیاں
بیکار یونہی بیٹھی ہے کیوں؟
بیٹھی ہے ہات پہ ہات دھرے، کیا طور یہی ہیں پریمی کے؟
جس دل میں لگن ہو پیارے کی، بیٹھا رہے اتنی غفلت سے
ہاں سارے بندھن توڑ بھی دے
ہیں دور وہ تجھ سے پنّوں سے، وابستہ جو بھنبھور سے ہیں
کیا ان سے تیرا لینا ہے، جو دور ترے چت چور سے ہیں
ہے پی کے ہاتھ ترا درماں
ہمسایوں کو معلوم نہیں، دن بن گئی تیری رات حزیں
تو اپنے من میں جانتی ہے، پریتم سے ہے روشن تیری جبیں
تری آن ہے پریتم کے دم سے

اردو کی دو جہادی نظمیں

سعیدہ بانو

دنیا میں ملکیت کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں یہ لڑائیاں افراد کے درمیان رہیں۔ بعد میں، انہوں نے ترقی کرتے کرتے بین الاقوامی شکلیں اختیار کر لیں۔ شاعری چونکہ راست جذبات کو اکساتی اور بھڑکاتی ہے اس لئے میدانِ جنگ میں شاعروں کی موجودگی بھی ضروری تصوّر کی جانے لگی۔ یہ لوگ رجزیہ اشعار لکھتے اور لڑنے والوں کو بزرگوں کے کارنامے سنا کر جوش دلاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بزدل سے بزدل شخص بھی مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا۔

علامہ شبلی کا بیان ہے کہ "عربی شاعری کی ابتدا رجز سے ہوئی ہے یعنی میدانِ جنگ میں دو حریف جب مقابلہ کے لئے بڑھتے تھے تو جوش میں فخریہ بلند فقرے زبان سے نکلتے تھے۔ یہ دو چار شعر سے زیادہ نہیں ہوتے تھے لیکن طبل جنگ کا کام دیتے تھے"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ متذکرہ بالا خصوصیت عرب ہی تک محدود نہیں تھی۔ یونان اور ہندوستان میں بھی شاعر اور بھاٹ میدانِ جنگ میں پر جوش اشعار پڑھ کر اپنی فوج والوں کو ہمت دلاتے اور بعض موقعوں پر شکست کے آثار دیکھ کر اس جوش و خروش سے ہمت دلاتے کہ جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا اور شکست فتح میں بدل جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی قبیلہ میں کوئی شاعر پیدا ہوتا تو بڑی خوشیاں منائی جاتیں اور شاعر کی عزت دیوتاؤں کے مانند کی جاتی تھی۔

بدقسمتی سے اردو شاعری نے فارسی شاعری کے آغوش میں پرورش پائی جس کی نشو و نما تمام تر درباروں میں ہوئی اس لئے یہ دونوں اس جوش و خروش سے محروم رہیں جو ریگستانی عربی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان میں میدانی دریاؤں کی سی نرم روی اور آہستہ خرامی ہے، پہاڑی چشموں کی سی گھن گرج اور طوفانی جوش نہیں۔

شاہ نامہ فردوسی کے مانند اردو میں کوئی جنگ نامے اور جنگوں کے حالات مثنویوں کی شکل میں لکھے گئے لیکن ان میں بھی وہ قوت نہیں جو فردوسی کے رزمیہ اشعار میں ہے۔ اس کا سبب تدالی اور تعیشی سپاہیانہ زندگی سے بُعد ہے کیونکہ ہمارے شاعر گھر میں بیٹھ کر فکرِ سخن کرتے تھے اور عملی طور سے جنگ میں حصہ لینا تو کجا انہوں نے دور سے بھی جنگ کے مناظر نہیں دیکھے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری شاعری میں رزمیئے، رجزیئے اور جہادیئے نہ ہونے کے برابر ہیں البتہ شکووں اور شکایتوں کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔

ہندی مسلمانوں کی تاریخ میں ٹیپو سلطان اور انگریزوں کی جنگیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس دور میں کئی رزمیہ نظمیں لکھی گئی تھیں جو انگلستان اور ہندوستان میں ہونے کے باعث ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ اور ان کے متبعین کا دور آیا اور وہ جنگیں ہوئیں جنہیں "وہابی" جنگوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک سے متعلق کثیر مقدار میں ادب موجود ہے لیکن تقریباً سب کا سب پٹنہ، علی گڑھ، رامپور اور حیدرآباد دکن کے سرکاری اور نجی کتب خانوں میں جس کے بارے میں ہم سوچ تو سکتے ہیں لیکن اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت سے کشمکش کی یہ داستان بڑی المناک اور سبق آموز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز حکمرانوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی سب سے پہلی عوامی کوششوں کا سہرا انہی سرفروش مجاہدوں کے سر ہے۔

ان جنگوں سے متعلق کئی شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں جن میں نصاریٰ سے جہاد کرنے، ان کی حکومت کو ختم کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ بیدین نصاریٰ سے نجات حاصل کرنا تمہارا مذہبی فریضہ ہے۔ ان جہادی نظمیں لکھنے والے شعرا میں سب سے ممتاز

شخصیت حکیم مومن خاں مومنؔ مرحوم کی ہے جن کا جہادیہ ملاحظہ ہو ؎

پلا ساقی مجھکو شرابِ طہور
کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا
کہ آجائے بس نشّہ اسلام کا

برنگ مے ایماں کو آجائے ہوش
نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش

یہی اب تو کچھ آ گیا ہے خیال
کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

بہت کوشش و جاں نثاری کروں
کہ شرعِ پیمبر کو جاری کروں

دکھا دوں بس انجام الحاد کا
نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

نہ کیونکر ہوں اس کام میں بے شکیب
ظہورِ امامِ زماں ہے قریب

وہ خضرِ طریقت رسولِ خدا
کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا

وہ نورِ مجسم وہ ظلّ اللہ
کہ سائے سے جن کے خجل مہر و ماہ

زہے سید احمد قبولِ خدا
میرا امتحانِ رسولِ خدا

نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف
علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف

ہے حشر تک زندہ و نیک ذات
ہے کفار کی موت اس کی حیات

خدا نے مجاہد بنایا اسے
سرِ قتلِ کفار لایا اسے

دم اس دست و بازو پہ دیوے اجل
لبِ تیغ کے بوسے لیوے اجل

جلو میں ہمیشہ رواں ہو ظفر
رکاب اسکی پکڑے رواں ہو ظفر

کہوں کیا لوائے امارت کا اوج
کہ ہیں غوث و ابدال سب اہلِ فوج

خبردار ہو جاؤ اے اہلِ دل
کہ رحمت برستی ہے اب متصل

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا
اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک
کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہے
خداوند اس سے رضامند ہے

امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لئے جاں نثاری کرو

کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر
کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر

تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے
تنِ خستہ سے جاں کو جانے نہ دے

قیامت کو اٹھو تو تم بامراد
لب الحو سے اور دل شاد شاد

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
حیاتِ ابد ہے جو اس دم مرو

جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم
سزاوار گردن فرازی ہو تم

یہ ملک جہاں ہے تمہارے لئے
نعیم جناں ہے تمہارے لئے

شراکت یہاں کی ہے طالع کا اوج
کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج

سعادت ہے جو جانفشانی کرے
یہاں اور وہاں کامرانی کرے

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار — پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے — عروجِ شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے — ملا دے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں — اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اس قسم کی نظموں اور وہابی تحریک کے مبلغوں نے سوئے ہوئے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف بیدار کر دیا اور بدیسی حکمرانوں کو نکال باہر کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ جن راجاؤں اور نوابوں کو ان کی حکومتوں سے محروم کر کے انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا وہ تو بیزار تھے ہی عوام بھی عیسائی پادریوں کی چیرہ دستیوں اور "کمپنی بہادر" کی بیجا حمایت نیز معاشی استحصال اور عام بیروزگاری کے باعث بے چین تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح بھی بدیسی حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک برصغیر میں متعدد مقامی شورشیں ہوئیں جنہیں بڑی سختی سے کچلا گیا۔ لیکن چونکہ وہابی تحریک مقامی تحریک نہیں تھی اس لئے اس کے مبلغوں نے شمال ہی نہیں دکن میں بھی جا کر ایک ایک گاؤں میں نصاریٰ کے خلاف جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب نصاریٰ اور نصاریٰ کی حکومت کے خلاف جنگ شروع ہوئی تو یہ نہ صرف نوابوں اور راجاؤں کی جنگ تھی بلکہ ایک عوامی جنگ بھی تھی جس میں سپاہیوں نے بھی حصہ لیا تھا اور کسانوں نے بھی، علماء اور پنڈتوں نے بھی حصہ لیا تھا اور عام شہریوں نے بھی۔

افسوس اس زمانہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے جو کتابیں لکھی تھیں ان میں سے انگریزی حکومت کے خلاف کتابیں تقریباً تمام کی تمام تلف ہو چکی ہیں البتہ انگریزوں کی حمایت میں جو کچھ لکھا اور لکھوایا گیا بکثرت موجود ہے جس کے باعث تصویر کا صرف ایک ہی رخ نظروں کے سامنے آتا ہے۔ میرا اندازہ ہے اور بڑے بوڑھوں سے سنا بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے جنگی اشعار لکھے گئے تھے جو انگریزوں کی فتح کے بعد بمشکل کسی کی زبان سے سنے گئے۔ اگر کوئی سناتا بھی تو بہت احتیاط سے، ادھر ادھر دیکھ کر۔ چند "اشعار" یا نعرے ملاحظہ ہوں۔ یہ میں نے بچپن میں سنے تھے:

ایک دو تین
گھوڑے پہ زین
بھاگ جاؤ وارن ہیسٹین (وارن ہیسٹنگز)
لبالب پیالہ بھرا خون سے
فرنگی کو مارا بڑی دھوم سے

ان اشعار میں آپ فنی خوبیاں نہ تلاش کیجئے بلکہ کہنے والوں کے جذبہ کو دیکھئے کیونکہ ان کے کہنے والے پرجوش سپاہی تھے شاعر نہ تھے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور جہادیہ نظم پیش کی جاتی ہے۔ یہ مولوی لیاقت اللہ الٰہ آبادی کی ہے جو الٰہ آباد میں مدرس اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے پرجوش مبلغ تھے۔ "تاریخِ محاربۂ عظیم" کا مؤلف کنہیا لال لکھتا ہے کہ موصوف الٰہ آباد میں جگہ جگہ وعظ کرتے پھرتے تھے اور انہوں نے وہاں کے باشندوں میں نصاریٰ کی حکومت کے خلاف انتہائی جوش پیدا کر دیا تھا۔ یہ نظم صرف سنائی ہی نہیں جاتی تھی بلکہ جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں بھی کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو کر اسے پڑھتے اور "دین - دین" کے نعرے لگاتے ہوئے آزادی کی راہ میں لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اس جہادیہ میں قرآن و حدیث کے ذریعہ جہاد کی تلقین کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "اب وقت آ گیا ہے کہ ہماری بات سنو اور تلوار کو بڑھ کر مارو"۔

بہرحال یہ جہادیہ ملاحظہ ہو:۔

بعد تحمیدِ خدا نعت رسولِ اکرم
یہ رسالہ ہے جہاد یہ کہ لکھتا ہے قلم

واسطے دین کے لڑنا ہے مٹے طبعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیٔ جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد

فرض ہے تم پہ مسلمانو جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

جس کے پیروں پہ پڑی گردِ صفِ جنگِ جہاد
وہ جہنم سے بچا نار سے وہ ہے آزاد

جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر

اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سن لے
باغِ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے

دل سے اس راہ میں پیسا کوئی دیویگا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روزِ محشر

زر بھی گر خرچ کیا اور لگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اس کے عوض سات ہزار

جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنا دے اسباب
اس کو بھی مثلِ مجاہد کے خدا دیگا ثواب

جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا بیشتر از مرگ وبال

جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں

مدت العمر کے مٹتے ہیں گناہِ شہدا
کیوں نہ ہو جنگ میں کٹواتے ہیں سر بہرِ خدا

فتنۂ قبر و غمِ صور و قیامِ محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں کچھ ڈر

حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیٔ جہاد
چلو اب رن کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد

مال و اولاد کی اور گھر کی محبت چھوڑو
راہِ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو

گر پھرے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے تو جنت کو چلے جاؤ گے

دینِ اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے

زورِ شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام
سستی اگلے جو کبھی کرتے تو ہوتا گمنام

کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹکاؤ گے
اپنی سستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے

اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو
لو چل چل کے امام اپنے سے کافر مارو

بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے

یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تو لے ہیں اور کیا پھر سردار

بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو تم یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ کر مارو

مومن کا اندازِ فکر و بیان

سید محمود رضوی

ہبوطِ آدم سے لے کر اس وقت تک انسانی ذہانتیں حقیقتوں کی مضبوط اساس کو متزلزل نہیں کر سکیں۔ ارسطو کا فلسفہ ہو یا امام غزالی کا علم الکلام ابن سینا کی حکمت آمیز کاوشیں امراء القیس کی جذباتی شاعری ہو یا رودکی کا شباب انگیز کلام۔ زندگی کے ہر ہر گام پر انداز بیاں بدلتے رہے ہیں لیکن حقیقتیں اپنے مقام پر جوں کی توں قائم و دائم ہیں۔ شاعری زندگی کے کسی دور میں بھی حقیقت تسلیم نہیں کی جاتی رہی بلکہ علماء فصاحت و بلاغت اسے اظہارِ حقیقت کا ایک ہی ذریعہ سمجھتے رہے ہیں۔ الفاظ کے ذریعے افکار اور تخیلات کی شیرازہ بندی کا نام شاعری ہے یا ژرف بیں نظروں سے انسان کے قلب و ضمیر میں جھانک کر احساسات، جذبات اور خواہشات عواطف و امیال کی کیفیات کو خطوط و حروف کا پابند بنا دینا ہی مقصود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اصول جو حقیقتوں کے اظہار کے لئے علمائے عصر مقرر کرتے رہے ہیں ان میں ضروریاتِ ادب و شعر کے لحاظ سے اختلافات ہوتے رہے ہیں مگر یہ نہیں ہو سکا کہ حقائق کی نوعیتیں مختلف ہو گئی ہوں۔ یا پسند و عدم پسند کے پندار بہ جبر کسی کے دل و دماغ میں ٹھونسے جا سکے ہوں۔ انہی محسوسات کو اصولِ تنقید کے لئے مختلف اصطلاحات کا نام دے کر علم تنقید عالم وجود میں آیا۔ یہ امکانات اظہارِ حقیقت کے لئے کیونکر تخلیق ہوئے اور ان میں تحریف اور ترمیم کیوں ہوتی رہی تو ایک صاحبِ بصیرت انسان اس کا یہی جواب دے سکتا ہے کہ مشاہدات اور کیفیات ایک مخصوص ماحول کی منت پذیر ہوتی ہیں انسانی ذہانتیں جو ماحول کی گرم و سرد آغوش میں تربیت پاتی ہیں اس پر خارجی اثرات نہیں ہوا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کو جزوِ پیغمبری سمجھا گیا ہے اور شاعر کی دماغی صلاحیتوں کو مادی تربیتوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ثابت ہوا شاعر اکتساب و تحصیل کی ضروریات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ تمام صلاحیتیں عالم لاہوت سے لے کر اس کائناتِ ارضی پر آتا ہے۔

اس مختصر مقالے میں مجھے مومن کی شاعری پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن ایک معزز خاندانِ اطباء کا فرد تھا۔ اس خاندان کی طبی قابلیتیں سلطنتِ مغلیہ کے درباروں کی زینت تھیں۔ یہ خاندان جہاں دنیا بھر کی فضیلتوں کا مجموعہ تھا وہاں فکرِ معاش سے بھی بے نیاز تھا اور دنیا بھر کی فراغتیں اور آسائشیں بھی اس کو میسر تھیں۔ مومن نے ایسے ہی صحت مند اور علمی خاندان میں آنکھ کھولی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک فاضل علوم عربی و فارسی ہونے کے علاوہ حاذق طبیب بھی تھا۔ نیز وہ طبعاً خوددار، غیور اور بلند فطرت انسان بھی تھا۔ گو سلطنتِ مغلیہ کی بجھتی ہوئی شمع اس کے لئے پریشان کن ضرور تھی مگر بلند ہمتی ایک فطری جذبہ ہوتا ہے اور مومن بھی اس سے عاری نہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر نام کو بادشاہ تھا۔ قلعہ کی چہار دیواری تک حکومت باقی رہ گئی تھی۔ دلی کے بڑے بڑے ساہوکاروں کا مقروض ہو چکا تھا۔ ایسے حالات میں مومن کی رفیع نظریں بھلا اپنے ذوق کا سامان کہاں پا سکتی تھیں۔

چونکہ مومن ایک صاحبِ ثروت و متمول خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور وہ تمام تعیش انگیز اسبابِ عیش و تنعم مہیا تھے جو اس وقت کے کھاتے پیتے خوش ذوق امراء کی زندگی میں دخیل ہو چکے تھے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ گام گام پر اس نے مادی عشق کی لذتیں بھی چکھیں اور حسن کے عشوۂ تر کانہ سے دل کو ہمیشہ مجروح پایا۔ اس کے حسن و عشق کے چرچے دلی کے گلی کوچوں میں موضوعِ سخن بن چکے تھے۔ اور یہی انفعالی تاثرات اس کی شاعری میں بھی روحِ کرباخت کی جان بن گئے۔ یہ صحیح ہے کہ مومن کا بیشتر کلام گہری فکر اور وقتِ خیال سے لبریز نہیں، لیکن اس کے باوجود اس کا مقام ہم عصر شعراء میں سب سے بلند نظر آتا ہے مومن کا گوہر بار قلم شاعری کے تمام اصناف پر حاوی رہا جن میں قصیدے تھے مثنویاں تھیں مثمن تھے تاریخیں تھیں رباعیات تھیں مگر ان سب پر رنگِ تغزل کی گلکاریاں نمایاں نظر آتی ہیں وہ طبعاً ایک غزل گو شاعر تھا۔ اس نے جہاں حسن و عشق کی وارداتیں غزل کی زبان میں کہیں اس میں کسی قسم کے ثقیل ترکیب، ابہام اور مغلق جذبات و اظہار کا دخل نہیں اور نہ اس نے اپنے محبوب کے لئے حقیقت کا لباس تجویز کرنے کا فراری راستہ اختیار کیا۔ اس نے اس کائناتِ ارضی میں شاہدانِ مجاز کو لباسِ مجازی ہی میں دیکھا اور جو عناصرِ ترکیبی ایک انسان کے لئے ہو سکتے ہیں ان کو بھی وہی کچھ سمجھا۔ یہی وجہ ہے اس کے اشعار نے اس کی قلبی وارداتوں کو روایتی تصوف کا سہارا لے کر حسن و عشق کے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا۔

اس کے کلام کے معجزانہ ایجاز بیان اور استعارے ہر صاحبِ ذوق و نظر کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں جن سے مومن کی انفرادیت الگ جھلکتی نظر آتی ہے۔ مومن کا کلام دیکھئے کہ اس نے کہاں تک دنیا بھر کی عظمتیں سمیٹ کر شعر کے لباس میں رکھ دیں۔ چند متفرق شعر پیش ہیں:۔

اہل بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے — عشرتِ عمرِ ابد قیمت غم دیتے ہیں
دیتے تکلیف شب ہجر میں آہ اپنے پاس — نقدِ جاں پیش کشِ مرگ کے قابل نہ ہوا
شعلۂ دل کو ناز تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا
یہ علاجِ امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
اربابِ ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے — کم طالعیٔ عاشقِ جانباز تو دیکھو
سرشکِ اعتراضِ عجز نے الماس ریزی کی — جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

آپ نے غور کیا ہوگا کہ ان اشعار میں بیدل و عرفی کے تتبع میں فارسی تراکیب کو کس بے تکلفانہ انداز سے استعمال کیا گیا ہے اور ہر شعر کا حسن بڑھ گیا ہے۔ بلکہ ان کی وجدانی اثر انگیزی اور ندرت پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑا ایک معزز و مادر نوجوان دل میں ارتقائے عشق اور سوز و ساز ہجر اور نیاز محبت کی کیفیتیں کس مجنونانہ انداز میں انگڑائیاں لیتی ہیں اس کو ایک وہبی شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ والہانہ خود فراموشی اور شوق و جذب کی لامحدود وسعتیں بیان کرنا صرف اور صرف مومن ہی کا حصہ ہے۔ اور پھر کتنے سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:۔

وہ حال زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی — تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا
دیدۂ حیراں نے تماشہ کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
سحر تک شام سے کچھ بن ہی حالت رکھی دل نے — نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا
سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی — لو جان کا عذاب ہوا دل کو تھامنا
کیا مخل ہوں اب علاج بے قراری کیا کروں — دھر دیا ہاتھ اس نے جب دل پر تو دل دھڑکا کیا
جلانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا — وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں
کہاں ہے تاب نازِ برق اے کاش — جلا دے آتشِ گل آشیاں کو
شب ہے تجھ بن ذلیں بے چین بے آرام ہم — صبح تک رو دیا کئے لے لے کے تیرا نام ہم
نارسائی سے دم رکے تو رکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

اب تک میں نے مومن کا جو کلام پیش کیا ہے، وہ غزلیات کے اشعار ہیں۔ لیکن جہاں اس نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن میں بھی غزل کا رنگ ہی نمایاں ہے۔ قصیدے کے چند اشعار ہیں:

تم اور حسرتِ ناز آہ کیا علاج کروں — میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا — غضب ہے شوقِ رسائی و دوریٔ منزل
خدا سے ڈر بت بیدرد ہے یہ کیا انصاف — کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل
وہ تند خو کہ اگر جور سے پشیماں ہو — تو بہرِ عذر کرے نازِ طاقتِ تابِ گسل

بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ — رازِ دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۷ء

افسانہ:

عتّاب

ابوسعید قریشی

اس کا نام لونگینہ تھا۔ تھا تو نہیں لیکن اس کے بدن سے، اس کے سانس سے، جہاں سے وہ گذری ہو وہاں کی ہوا سے، اس مٹی سے جو اس کے پاؤں سے چھوتی ہو لونگوں کی سی خوشبو آیا کرتی تھی۔ اسی لئے وہ لونگینہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ خود اس کو بھی اپنا یہی نام یاد رہ گیا تھا۔ اور لونگینہ کی ہر بات نرالی تھی۔ اس کے قبیلے کے لوگ، مرد عورتیں سبھی، پانی کے بجائے بھی شراب پیتے تھے۔ لیکن لونگینہ شراب کے نام پر بھی ناک بند کر لیتی تھی۔ وہ کہا کرتی کہ اگر آدمی کو انگور کا عرق ہی پینا ہے تو اسے مشکوں اور مشکیزوں میں بند کر کے اس میں تعفن پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قبیلے کے بڈھے اس سوال کا یہی جواب دے سکتے تھے کہ یوں نہ کیا جائے تو نشہ کیسے ہو! لیکن لونگینہ کی آنکھوں میں، بن پئے شراب کی سی مستی، اور چال میں رقص کی سی کیفیت کہاں سے آگئی تھی، یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اُس کی بہت سی باتیں ان کی سمجھ سے باہر تھیں۔ مثلاً وہ ہر روز نہاتی کیوں تھی؟ اُن کے جسم تو ان گنت ندیوں اور چشموں کے باوجود برسوں پانی کے لمس سے ناآشنا رہتے تھے مگر لونگینہ ــ جب آس پاس کی پہاڑیاں برف سے ڈھنپ جاتیں اُن دنوں بھی، اور ندیوں کی سطح پر جب برف کی ہوائیاں تیرنے لگتیں اس زمانے میں بھی، کئی بار سنگِ مرمر کی چٹانوں کے پاس غوطہ لگاتے دیکھی گئی تھی۔ قبیلے کے ایک شاعر نے اسے ندی میں نہاتے دیکھ کر کہا تھا کہ سنگِ مرمر کی چٹان موجوں کی حدت سے پگھل کر لہروں کی باہنوں میں بہہ کر عورت کے قالب میں ڈھل گئی ہے۔

یہ بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اپنی قوم کے سب سے متمول سردار کی چہیتی بیٹی ہونے کے باوجود لونگینہ کوڑیوں کی ٹوپی کیوں نہیں پہنتی تھی۔ حالانکہ کوڑیوں کی تعداد تو ان کے ہاں عزت اور آبرو کی علامت تھی۔ اس کو اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس سادگی سے شادی کی منڈی میں میری قیمت گر جائے گی۔ کوڑیوں کی ٹوپی پہننے کے بجائے وہ اپنے بالوں میں پھول گوندھے پھرتی۔ آج گلاب ہے تو کل بنفشہ اور پرسوں جوڑے میں کنول کی جوت جگمگا رہی ہے۔

"عجیب لڑکی ہے!" لوگ کہا کرتے۔

وہ ہر اعتبار سے عجیب تھی۔ مرغِ زریں کی طرح وہ چاندنی راتوں میں باہر نکل کر گھومتی۔ اسے جنگلی جانوروں کا بھی ڈر نہیں تھا، ریچھ اور چیتے بستی کے بڈھے گوالے کا کہنا تھا کہ لونگینہ کی آنکھوں سے چیتا بھی آنکھ نہیں ملا سکتا، میں نے کالے چیتے کو اس کے قدموں میں پالتو بلی کی طرح لوٹتے دیکھا ہے۔ لڑکی نہیں ساحرہ ہے! وہ سچ مچ عجیب تھی۔ ہرنوں کی طرح، جن کی ناف میں مشک ہوتا ہے، ہوا کے الہڑ جھونکوں، آوارہ بادلوں اور ندی کی چنچل موجوں کی مانند اس کو قرار نہیں تھا۔

سرما کی یخ بستہ راتوں اور براق دنوں میں لونگینہ برف پوش ڈھلوانوں پر چلتی چلی جاتی۔ دیکھنے والے کے سامنے شعلہ سا لپکتا، تارا سا ٹوٹتا، بجلی سی چمکتی اور وہ اس فراز سے اس نشیب اور اس وادی سے اس چوٹی پر پہونچ جاتی اور کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ بھی کسی بلند پہاڑ کی چوٹی تھی جس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

اس کی ہر بات ناقابلِ فہم تھی۔ اس کی ہمسن قبیلے کی دوسری نوجوان لڑکیاں جب آپس میں کپکپی پیدا کرنے والی کہانیاں کہتیں۔ کبھی اس گبھرو کو دیکھ کر مدہوش ہو جاتیں اور تاکستانوں کے سایوں سے سرشار ہو کر نکلتیں۔ تو لونگینہ کے جوڑے سے پھولوں کی فقط چند پتیاں، زرِ گل کے چند ذرے گرتے اور جیسے ان سرگوشیوں اور دزدیدہ مسکراہٹوں کا انجام دکھانے کے لئے وہ انگلی سے اُن

بچوں کی طرف اشارہ کرتی جو کیچڑ کے کیڑوں کی طرح اِدھر اُدھر رینگ رہے ہوتے جن میں بعض اوقات ان کی مائیں بھی تمیز نہ کر سکتیں، ان کے چہرے لکڑی کے مجسموں کے چہروں کی طرح بالکل ایک سے نظر آتے، جن سے قوم کے قبرستان اٹے پڑے تھے۔ یہ بچے دراصل پورے قبیلے کی اولاد ہوتے جس کے رسم و رواج کے مطابق ان لوگوں کو بھی ہجر و فراق کی اذیتوں اور عنفوان شباب کی ظلم کا احساس نہیں ہوتا تھا جن کے پاس بیویاں خریدنے کے لئے کوڑیاں، مویشی یا زمین نہیں ہوتی تھی۔ اس بارے میں ان کے یہاں ایک ضرب المثل تھی کہ بھوک اور پیاس میں آدمی چوری بھی تو کرتا ہے۔

لونگینہ، بادلوں میں چمکنے والی بجلی، زمین کو ہلا دینے والے بھونچالوں اور چاند اور سورج کے گہنا جانے کی طرح پراسرار تھی۔ اس کا نام سن کر، اس کو دیکھ کر نوجوانوں کا رواں رواں ہانپنے لگتا۔ اس کی خاطر آس پاس کی وادیوں کے بڈھے بڈھے سردار بھی کیا کچھ دینے کو تیار نہیں تھے۔ سنہری سیبوں کے پیڑ، مشکیزے، دودھ دینے والی گائیں، بادلوں سے نرم اور برف کے گالوں سے سفید اون والی بھیڑیں، دنبے جن کی چکتیاں چھوٹی چھوٹی گاڑیوں پر رکھنا پڑتیں، اور کوڑیوں کے ہار........ لیکن لونگینہ نے ہر گاہک کو یہ کہہ کر ہانک دیا تھا کہ میں بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ مجھے خریدا جا سکے۔ اس پر کسی نے کہا تھا کہ اس کو بیاہنے تو کوئی دیوتا ہی آئے گا۔ یہ تو گش استری ہے!

اُس دن لونگینہ کو یہ الفاظ اچانک یاد آ گئے۔

متواتر تین دن سے شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی، بکروں کے چکنے گوشت کی سوندھی سوندھی خوشبو بنفشہ اور گلاب کی خوشبو میں ملی ہوئی تھی تاکستانوں کے سایوں میں حشر بپا تھا۔ روایات کے مطابق جشنِ بہار کی خوشی میں رہی سہی پابندیاں بھی اُٹھ چکی تھیں۔

ناچتے گاتے اور پیتے ان کو تین دن بیت چکے تھے۔ ریوڑوں کو چراگاہوں کی جانب بھیجنے کی تقریب میں آدمی بھی ریوڑ بن گئے تھے۔

رقص کی تیسری رات کے بعد صبح ہوتے ہی گڈریوں کو اپنی منزل کی طرف کوچ کرنا ہوتا۔ سفر کی صعوبتوں اور خطروں کے باوجود یہ سفر ہر سال اختیار کیا جاتا۔ تاکہ اپنے یہاں کا چارا سردیوں کے لئے محفوظ رہے، ریوڑ پیٹ بھر کے کھائیں، چکتیاں بھاری ہوں گوشت چکنا اور اون نرم۔ اور برفوں کے زمانے میں چربی، گوشت، مشکیزوں، پوستین اور جوتوں کی قلت نہ ہو۔ چنانچہ آس پاس کی وادیوں سے تندرست اور نوجوان گڈریے اپنے ریوڑوں کو لے کر لونگینہ کے قبیلے کی وادی میں جمع ہو جاتے۔ یہ وادی علاقے کی تمام وادیوں کا سنگم تھی۔ یہیں سے آگے چراگاہوں کو راستے جاتے تھے۔ گڈریوں کی تعداد جانوروں کی گنتی پر منحصر ہوتی اور قرعہ اندازی کے ذریعے ان کا ایک سردار مقرر کر دیا جاتا ــــــ رقص کی آخری شب جشن اپنے عروج پر ہوتا۔ رگوں میں شراب کی گردش تیز تر ہو جاتی، خون میں ایاغ روشن ہوتے اور اپنے پرائے کی تمیز سرے سے مٹ جاتی۔ اسی بدمستی کے عالم میں گش کے مندر سے ناقوس کی آواز آتی اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ریوڑ کے رکھوالوں کی ٹولی گش کے سامنے اپنی مہم کی کامیابی کے لئے دعا مانگنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی۔

لیکن لونگینہ اس ہاؤ ہو میں کبھی شریک نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہر بات نرالی تھی۔ وہ گش کے مندر سے ذرا ہٹ کر کھڑی حقارت سے اس ہجوم کو دیکھا کرتی جو جشن میں تو بالکل ہی دیوانہ ہو جاتا تھا۔ اور سوچتی کہ ان نوجوانوں میں، جن سے ریوڑ کی بدبو آتی ہے، آخر کیا بات ہے کہ لڑکیاں خود کو ان کے سپرد کرنا اپنی خوش قسمتی تصور کرتی ہیں! ایسے ہی موقع پر کسی نے کہا تھا کہ لونگینہ کا تو دماغ خراب ہے کہ آدمیوں کو ریوڑ بتاتی تھی۔ اس کو بیاہنے تو کوئی دیوتا ہی آئے گا۔

اُس روز جب جشن کی تیسری رات ختم ہو چکی تھی۔ اور گلہ بان، گش کے معبد سے دعائیں مانگ کر نکل رہے تھے، لونگینہ کو اپنے بارے میں ان کی یہ پھبتی یکایک یاد آ گئی۔ لونگینہ کی نگاہیں اس سے یوں چمٹ گئیں جیسے بھیڑوں کے تھنوں سے ان کے بچے چمٹ جاتے تھے۔ نوجوان کے بال اُن پہاڑی بکروں کی طرح نہیں تھے جن سے باقی گڈریوں کی شکل ملتی تھی اور جن کو دیکھ کر لونگینہ کے کانوں کی لویں سرخ ہو جایا کرتی تھیں۔ عجب بدتمیز جانور تھے یہ پہاڑی بکرے۔ بدبودار جٹے ہوئے، چکنے بال۔ داڑھیاں جیسے...... لیکن اُس نوجوان کے بال صاف ستھرے چمکیلے اور کٹے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں اور ان کے نیچے وہ حلقے نہیں تھے، گیلی مٹی پر کنچوؤں کے

نشان بھی تھے جو کافروں کی وادی میں ہر کسی کی آنکھوں کے نیچے نظر آتے تھے۔ اس کے کپڑوں پر شراب اور قے کے داغ بھی نہیں تھے، جن سے گذشتہ تین راتوں میں کوئی دامن نہیں بچا تھا۔ اس کے چہرے کی جلد اوروں کی طرح زرد اور پیلی نہیں تھی بلکہ دف پر منڈھی ہوئی کھال کی طرح کھنچی ہوئی تھی۔ اس کی گردن کسی تندرست بیل کی طرح تھی اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ کمر میں خنجر تھا، ہاتھ میں بھالا — اس کو دیکھ کر لونگینہ کو خیال آیا جیسے واقعی کوئی دیوتا زمین پر اتر آیا تھا۔ اور اس کو پھر وہ الفاظ یاد آ گئے۔ وہ پھبتی پھر اس کے کانوں میں گونج آئی کہ اسے بیاہنے تو کوئی دیوتا ہی آئے گا۔ یہ تو کنش استری ہے!

لونگینہ کی انگلیاں، نرگس کی پتیوں کو، جو کچھ دنوں سے اس کا محبوب پھول تھا، نوچتی نظر آئیں۔ اور اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئیں — تماشائیوں نے دم سادھ لیا۔

خود کو نظروں میں گھرا ہوا دیکھ کر نوجوان چونکا اور نیزے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کی نگاہیں ہجوم سے ہوتی ہوئی لونگینہ پر پڑیں۔ ان میں تیر کی تیزی تھی، آبشار کا دباؤ تھا، تلوار کی کاٹ تھی — لونگینہ لرزہ براندام ہو گئی۔ ہونٹ کھلے اور کپکپائے۔ اس نے ایک اچٹتا ہوا سانس لیا۔ اور اس کی آنکھیں جنہوں نے کبھی کسی کو جی بھر کے اپنی طرف دیکھنے بھی نہیں دیا تھا۔ اور تمسخر، استہزا یا ہنسا ملکے سوا جن میں اور کوئی جذبہ نظر نہیں آیا تھا۔ اور جنہیں رونا نہیں آتا تھا شبنم آلود ہو گئیں۔ اس کی انگلیاں عشق پیچاں کی طرح آپس میں لپٹی نظر آئیں اور اس کا سراپا سپردگی کی صدا بن گیا — مگر نوجوان نے منہ پھیر لیا!

وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ اس کے قدموں کی چاپ یہ کہہ رہی تھی کہ ہمیں رکنے کی فرصت نہیں ہے۔ اس کے نیزے کی انی نیلے آسمان میں کوہِ نارسا کی چوٹی کی طرح چمک رہی تھی اور اس سے چھوٹتی ہوئی شعاعیں گلے کو آپ سے آپ سیدھے راستے پر لئے جا رہی تھیں — اور گڈریوں کی ٹولی اور ریوڑ کے پیچھے پیچھے لونگینہ تھی۔ اپنی دھن میں مست، لوگوں کی نگاہوں سے لاپروا جواب شہد کی مکھیوں کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

دفعتاً لونگینہ کے ہونٹوں سے ایک دردبھرا نغمہ سنائی دیا۔ وہ جس کی آواز میں نخوت، رعونت، انانیت ......سبھی کچھ تھا لیکن ایک درد ہی نہیں تھا، وہ جسے کو سنگدل، سفاک اور بے مہر کے طعنے دیئے جاتے تھے، نہ جانے اُس کی آواز میں یہ سوز کہاں سے آ گیا تھا، جس کی گرمی سے پہاڑوں کی برف بھی پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس آواز میں جانے کیا جنوں تھا، کیسی وحشت تھی کہ کافروں نے، جن کے جسم سے کپڑے کسی وقت بھی علیحدہ نہیں ہوتے تھے، اپنے گریبان چاک کر ڈالے۔ مگر لونگینہ پکارے چلی گئی؛

اے میرے عناب کے پھول آ
آ کہ میں اپنی خوشبوئیں تجھے بخش دوں

اور کافروں نے پہلی بار عناب کا نام سنا جس کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ وہ نوجوان گڈریئے کی سرد مہری سے کانپ اٹھے۔ ان کے دماغ میں لونگینہ کے بدن کی خوشبوئیں بیدار ہو گئیں۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ نوجوان کس قدر کور ذوق اور بےقدر ناشناس ہے کہ ان وادیوں کا بہترین پھول آپ سے آپ اس کے قدموں میں جا پڑا ہے لیکن یہ اسے دیکھنے تک کا روادار نہیں۔ اس کی ناک بند ہے شاید اور یہ رنگوں کا اندھا ہے — مگر رکھوالے نے ایک نہ سنی۔ اور لونگینہ اپنا نغمہ الاپتی گئی،

اے میرے عناب کے پھول آ

لیکن اس دعوت، اس ترغیب، اس فریاد کا گلہ بان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نغمے کے زیر و بم کے لئے اس کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ وہ صرف اس ریوڑ کی آواز سن رہا تھا جس کی حفاظت کا کام اس کے سپرد ہوا تھا۔

لونگینہ کی رفتار تیز ہو گئی۔ برفانی غزالوں کی طرح جو اپنے نافے کی خوشبو سے مست ہوتے ہیں، وہ چوکڑیاں بھرنے لگی۔ اس نے دیکھتے دیکھتے گڈریئے کو جا لیا۔ اور خشک جھاڑیوں میں اس کے قدموں میں گر پڑی۔ اس کے بازو تھام لئے، ان پر اپنی آنکھیں ملنے لگی، انہیں

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

افسانہ:

سردار!

ابوالفضل صدیقی

سو برس سے اوپر عمر ہوگئی تھی پھر بھی پہاڑ کے پہاڑ بنے ہوئے تھے۔ اور پہاڑ بھی کائی سے ڈھکا ہوا۔ کالا چمڑا جو کسی زمانہ میں سنگِ موسیٰ کی چٹان کی طرح دمکا کرتا ہوگا، اب تو جھورا جھورا سیاہی مائل مٹیالا سا ہوگیا تھا اور دور سے ایسا معلوم ہوتا جیسے اوپر سے نیچے تک میلی جھولی پڑی ہوئی ہے جس کی شکنوں میں دھڑیلوں دھول بھری ہوئی ہے۔ ننھی ننھی گول گول آنکھیں اور بھی اندر جا پڑی تھیں اور دونوں جانب کنپٹیوں کے گڑھے بہت نمایاں اور زیادہ گہرے ہوگئے تھے۔ کسی زمانہ میں جو دانت چیرنے پھاڑنے اکھاڑنے میں غضب ڈھایا کرتے تھے، ان میں سے ایک تو جڑ سے ٹوٹا ہوا تھا اور دوسرا کھٹل شہد کی طرح میلا میلا زردی مائل ترچھا ہوا آگے کو سینگ کی طرح نکلا ہوا تھا، اور یہ بھی بیکار کا بوجھ تھا، خود ہی جب کسی قابل نہ رہے تھے اور اپنے اوپر آپ ہی بوجھ تھے تو یہ کیا کرتا۔ اور اب تو ان حالوں کو پہنچ گئے تھے کہ مونہہ کے اندر داڑھیں بھی کھلی پڑ گئی تھیں اور چبانے تک سے معذور تھے۔

ساری عمر ہمالیہ اور شوالک کے دامن میں بڑی بہادری کے ساتھ سرداری کی تھی اور اپنے زمانہ میں بڑے بڑوں کا، اپنے سے سوائے ڈیوڑھوں تک کا سکہ نہ جمنے دیا تھا، اور اب تو پیری اور صد عیب، ہاتھ پاؤں جواب دے گئے، گوشت تو رہا نہیں ہاتھوں نے بدبودار کھال کا بوجھ لے کر چلنے سے انکار کر دیا، کولہوں اور ٹانگوں کا جوڑ چلنے میں چخ چخ کر فریادی کرتے، اور نگاہ تو خیر پیدائش ہی سے کوتاہ ہوا کرتی ہے، سونگھنے کی قوت بھی گر گئی اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ پیٹ کا دوزخ تو بھڑک بھڑک کر ایندھن مانگتا اور مونہہ کے دانت دشمن ہوگئے، کھاتے میں داڑھیں دکھتیں اور چبانے میں اندر کی کھال دب جاتی، جبڑوں کی حرکت بھی ڈانواڈول سی ہوگئی تھی، نرم غذا تو آسانی کے ساتھ ہاتھ نہ آتی اور سخت کاٹے نہ کٹتی۔ پھر بھی چودھراہٹ بنائے آگے آگے چلتے، ساتھ سنگت میں آدھا پڑتا پیٹ بھر ہی جاتا اور اب تو کل کے لونڈے تیز نگاہوں سے دیکھتے پھر ننھی ننھی آنکھیں اندر ہی اندر کلملا کر دل کھا کے مٹ مار جاتے۔ ایک روز ایک نیا چھورا ساتھ والی سے ٹھٹھولیں کرتا چل رہا تھا اور کچھ وہ بات تو مدتوں سے نہ تھی، پھر بھی بڑ مٹھس تھی، یا شاید یوں ہی جیسے حسب عادت بڑے بوڑھے لڑکوں کو گھرکتے چلتے ہیں۔ ذرا شوں کر کے ڈانٹ سا دیا، اور وہ نالائق تو سیدھا ہوگیا، اور اس کے سیدھے ہوتے ہی چودھراہٹ کی بھو نکل گئی۔ گنیش مہاراج نے بڑے زور سے پھٹی ہوئی گرج میں ڈانٹ بتائی، مگر ڈانٹ کے ساتھ وہ ناخلف تو الٹا بپھر گیا، اور اس کے بپھرتے ہی سب نوجوان اور ادھیڑ تک بپھر گئے، اور نئی نویلیاں تو خوش خوش کھڑی تماشہ دیکھتی رہیں اور ان کے تو جلے دل کے پھپھولے آج پھوٹ رہے تھے، بنے بوڑھے کھوسٹ نے عمر بھر ساتھ والی کے ساتھ ایک ساعت سہانی نہ گذارنے دی تھی اور جب بہار پر ہوتیں تو غول سے بھٹک کر دور کہیں گھنے جنگل میں جہاں بڈھے کی لمبی ناک کام نہ کر سکے دو چار دن کے لئے ساتھ بھاگ جایا کرتیں اور وہاں بھی ہر وقت دغدغہ لگا رہتا کہیں خرانٹ سونگھ نہ لے۔ مگر اس وقت چار چھ ٹھنڈی بڑی بوڑھیاں جن سے اپنے زمانے میں واسطہ رہا تھا آڑے آگئیں، ورنہ بڈھے کو مار ہی گرایا تھا، پھر بھی سوکھی ہڈیاں اچھی خاصی کٹ گئیں اور وہ تو خیریت گذری کہ پہلی جھڈ بڈھا روک گیا اور اگر کہیں دوسری جھڈ ہو جاتی اور نیچے آجاتا تو پھر اٹھائے اٹھتا بھی نہ۔ سلتا اور یہیں پڑے پڑے گدھ نوچ لیتے۔

چودھراہٹ کا طلسم ٹوٹتے ہی غول کی قیادت چھوٹ گئی اور چند روز تو روٹھے روٹھے سے دائیں بائیں لگے رہے مگر مہاراج میں کچھ باقی تو تھا ہی نہیں جو ساتھ والیاں مناکر لاتیں، مفت میں گھیر گھار کرنے پڑے تھے۔ اور نئے چھوروں کے تیور بدستور بیڈھب تھے۔ دوسرے ہی تیسرے روز مہاراج کو اندازہ ہوگیا کہ قیادت ہاتھ سے نکل گئی۔ جب ان میں سے ایک نے رہنمائی کرنی شروع کر دی اور پھر قیادت سنبھال لی تو صبر آگیا۔ مگر غول چھوڑتے بھی بن نہ پڑی۔ اتنا شحنہ مردک نام۔ پون صدی سے غول کے آگے آگے چلنے والا غیور سردار اب دو تین سو گز پیچھے پیچھے چلنے لگا! خیر یہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ آٹھ دس من دانہ کا بھاڑا پیٹ ساتھ لگا ہوا تھا اور اس دوزخ کے اندر جو دو چار چھ من خس و خاشاک پڑ سکتا تھا وہ غول ہی کے سہارے لگے رہنے سے ممکن تھا۔ مگر چند ہی روز میں یہ

بات بھی ناقابل برداشت ہوگئی، خیر کچلا ہوا، ایسی خوردہ اور روندی ہوئی جھوٹن کھا کر صبر کرلیا، اور سب سے آگے چلنے والے اور بہترین نرم و شیریں تازہ غذا پر سب سے پہلے منہ ڈالنے والے سردار نے اس پر گزر کرلی مگر اس کے ساتھ سب سے کریہہ چیز وہ بول و براز کے غلیظ ڈھیر ہوتے جو غول کے ساتھ ساتھ پیچھے چھوٹتے جاتے، چند ہی روز میں لمبی ناک والے مہاراج جی چھوڑ گئے، اور پھر مجبور ہو کر ان کا پیچھا بھی ۔۔۔ اور چھوڑنے کو تو غول چھوڑ گئے مگر چھوڑتے ہی آنکھیں کھل گئیں، مدتوں سے دوسروں کی ناک کان اور آنکھ نے کام کیا تھا اور مہاراج نے مفت میں رہنمائی کی تھی اور بہترین مال مارا تھا، اعلیٰ سے اعلیٰ چارہ کھایا تھا اور نئی سے نئی ٹہنیوں میں ٹٹولی تھیں۔ غول کا پیچھا چھوڑ کر پتہ چلا کہ ہم کیا ہیں، نہ تو سو دو سو قدم کا اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور نہ میل دو میل کا سن سکتے ہیں اور خیر چار چھ میل کی سونگھ بھی لیں کہ نرم نرم نکیلی نکیلی پیڑ کا قطعہ کدھر ہے میٹھی میٹھی ایکھ کے رس بھرے گنّوں والے ہرے بھرے کھیت کون سی سمت ہیں تو پھر بھوک اور بڑھاپے میں دس پانچ کوس کا دھاوا مار کے وہاں پہنچنا کار دارد، اور پھر گنے کے کھیتوں پر اکیلے دوکیلے کے بس کا کام بھی نہ ہوتا، کسان بڑی بھرپور چوکسائی کرتے، وہاں تو غول کے ساتھ ہی چھاپہ پڑ سکتا تھا اور وہ بھی ترکیب سے کٹیلی باڑھیں اُلانگ کے اکھیڑ کر ڈگ ڈگ زمین سونگھتے چلنا اور پھونک پھونک کر قدم ڈالنا کہ کہیں گھاس پھونس سے ڈھکی کھائیوں اور گڑھوں میں نہ جا پڑیں جو کسان کاشت قطعوں کے قرب و جوار میں جنگلی جانوروں کی گذرگاہوں پر کھود دیتے ہیں۔ اب رہیں برگد گولر پیپل کی شاخیں، ان کا توڑنا مروڑنا اور پھر چھیل کر اندر سے گری نکالنا یہ تو ان کے لئے مدتوں سے غول والے کیا کرتے تھے۔ دو ایک دن اس پر بھی کوشش کی، خیر، مگر پہلے تو محنت بہت زیادہ پھر یہ سخت غذا ان کے دانتوں کے بس کا روگ نہ تھی، سمجھ گئے کہ زندگی کے دن بہت تھوڑے باقی ہیں اور کسی دن گھل گھلا کر جہاں تہاں پسرے رہ جائیں گے۔ مگر تقدیر کے لکھے کو کون مٹائے، مثل مشہور ہے ہاتھی جئے تو لاکھ کا مرے تو سوا لاکھ کا، ساری عمر ہاتھیوں کی سرداری کی تھی، اخیر عمر میں دیوتا بننا اور دودھ ملائی کھانا قسمت میں لکھا کر لائے تھے، کئی دن کے بھوکے ایک سمت آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے اور چلتے چلتے شہر کے مضافات میں جا پہنچے۔ اور ڈیرہ دون کے تو چاروں طرف گھنا جنگل لگا ہوا ہے۔ ایک دیہاتی راستہ کے کنارے شام کے وقت تھکے تھکائے گھنے درختوں کے جھنڈ تلے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اور بیٹھ کر اچھی طرح سستا بھی نہ پائے تھے کہ شامہ نے تازہ دودھ کی خوشبو لے لی، پنکھا سے کان جلدی جلدی ہلے اور سونڈ کی نوک ہوا میں لہرا لہرا کر خوشبو کی سمت کا تعین کرنے لگی، جب تک کچھ نسائی آوازیں کان میں پڑیں، میٹھی میٹھی اطمینان سے بڑھتی ہوئی آوازیں، اور یکدم پانچ چھ دیہاتنیں دودھ کی مٹکیاں سروں پر دھرے شہر کو جاتی سامنے آگئیں، بالکل ہی ملحق، اتنی قریب کہ اک ذرا کمر سے اچک کر اور سیدھی ٹانگیں آدھی کھڑی کر کے جو سونڈ بڑھائی تو ایک مٹکی سر پر سے سونڈ کی نوک میں پھنس گئی۔ سب نے حیرت اور خوف سے ایک چیخ لگائی اور "گنیش مہاراج!!" گھگھیا پڑیں۔ بعض اپنی مٹکیاں آہستہ سے اتار کر اور کچھ پٹخ کر الٹے پاؤں بھاگ گئیں۔ گنیش مہاراج نے اطمینان کے ساتھ پہلے سونڈ والی مٹکی سونت کر خالی کی پھر دوسری مٹکیاں، اور پھر زمین پر چھلکا ہوا جتنا دودھ چوس سکا سونڈ سے جمع کر کے چوس گئے اور نہ معلوم کے دن کے بھوکے پیاسے گنیش مہاراج کا برت دودھ سے کھلا، اور من بھر دودھ پی کر آنکھیں کھلیں، کان بھی تیز ہوئے اور ناک بھی سٹر سٹرائی ۔۔۔ صبح تک تمام دیہات میں افواہ پھیل گئی کہ گنیش جی نے درشن دئے ہیں، اور گنیش جی نے یہاں سے ہٹ کر صبح کو دوسری پگڈنڈی پر درشن دئے اور پھر شام کو تیسری سمت اور تیسرے روز لوٹ کر پھر پہلی جگہ پر آگئے۔ تین چار روز تو کچھ چھاپوں جیسی صورت رہی مگر ہفتہ بھر بعد تو یہ چیز عقائد میں گھر کرنے لگی اور روز بروز عقیدہ راسخ تر ہوتا گیا، پہاڑ کے دامن کے بسوئیاً بھولے دیہاتی گنیش درشن کے لئے چڑھاوے لے کر تلاش کرنے لگے، اور گنیش مہاراج کو دودھ پلانا سعادت ہوگئی۔ پھر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چڑھاوے کے بعد گایوں بھینسوں کا دودھ دوچند بلکہ سہ چند تک بڑھ جانے کی زریں افواہیں اور ساتھ ہی ساتھ کوتاہی کرنے میں اچھی بھلی دودھار گایوں اور بھینسوں کے خشک ہوجانے کی باتیں پھیلنے لگیں۔ بھلا اس جنگل میں ہاتھی کب نہیں رہتے تھے، مگر پہلے تو شہر سے دور دور رہا کرتے تھے اور پھر گھاس پات کھایا کرتے تھے۔ کہیں کہیں جب موقع مل جاتا سال میں دو چار مرتبہ دھان، گنے، گیہوں، جوار کی فصل پر دھاوا مار دیتے، یہ سر سے دودھ اتار کر پینے والی بات تو بڑے پرانے بوڑھوں کے تجربوں میں بھی نہ کبھی دیکھی نہ سنی تھی، لہٰذا بات راسخ تر ہوتی گئی اور شہر میں دودھ والوں کی دکان تک پہنچی اور پھر سارے شہر میں گشت کر گئی۔ مقامی اخباروں تک نے گنیش درشن کے عنوان سے خبریں چھاپیں۔ اور گنیش مہاراج کے ایسے دن پھرے کہ کبھی ان کے باپ دادا کو نصیب نہ ہوئے تھے۔ جوں جوں دن بیتے چڑھاوے میں افزونی اور آسانی ہوتی گئی، اور کبھی کبھی تو پیٹ سے اوپر آجاتا اور بچ رہتا۔ پھر تو گاؤں گاؤں باڑے والوں نے اپنی اپنی باری اور اپنا اپنا دن مقرر کرلیا، تھن کے نیچے کا خالص دودھ اپنی باری پر چڑھاوے میں جاتا، گنیش مہاراج چاروں سمت دھاوا مارتے، کبھی پورب میں کبھی پچھم میں، کبھی شمال

کی پہاڑیوں میں جا دبکتے اور کبھی جنوب کی گھاٹیوں میں لگ جاتے۔ دودھ ان کے پیچھے پیچھے پھرتا اور وہ دور سے سونگھ کر دودھ کی جانب بڑھتے، کبھی پگڈنڈیوں پر کبھی بڑی سڑک کے کنارے اور کبھی فاریسٹ کی سروس روڈ پر اپنا بریک فاسٹ لنچ ڈنر لگا ہوا پاتے اور کھا پی کر آرام کرتے۔

ایک روز شام کے وقت آرام کے ساتھ ایک دیہاتی پگڈنڈی پر لگے ہوئے تھے۔ دو عورتیں آگے پیچھے گھاٹی میں سے سر پہ دودھ کی مٹکیاں لئے حسب معمول شہر کو جاتی ہوئی اوپر کو بڑھیں، نہ تو عورتوں کو ہی گمان تھا کہ اس وقت یہاں پر مہاراج درشن دیں گے اور نہ مہاراج ان ہی کو چڑھاوے کی کوئی امید تھی مگر جب یکدم سامنے آگئیں تو مہاراج نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے سونڈ بڑھا کر مٹکی پکڑنا چاہی، یا تو عورت کی اونچائی کا اور اپنی سطح کا صحیح اندازہ نہ ہوا یا نہ معلوم کیا بات ہوئی، مٹکی کا موڑھا پھنسنے کے بجائے عورت کی گردن سونڈ میں پھنسی اور جب مہاراج نے مٹکی اٹھائی تو عورت مع مٹکی کے اوپر اٹھتی چلی آئی، بس بمشکل بیچاری کے مونہہ سے پھنسی پھنسی کھنچی کھنچی آواز میں "جے گنیش!" نکلا اور جب تک ہاتھی کی سونڈ کی سخت گرفت ڈھیلی ہو، آنکھیں ابل آئیں اور زبان باہر نکل آئی اور جب گنیش مہاراج نے اسے زمین پر رکھا تو جان نکل چکی تھی، دوسری اپنی مٹکی پھینک کر بھاگ گئی۔
گنیش مہاراج عورت کے یوں بے حس وحرکت پڑا رہنے پہ ذرا متعجب تو ہوئے، پھر اطمینان کے ساتھ دودھ پی پلا کر چلتے ہوئے۔

دوسرے ہی روز دور دور خبر پھیل گئی کہ گنیش مہاراج نے بھینٹ لے لی اور خیر چڑھاوا تو اور بات تھی مگر بھینٹ کے خوف سے دیہاتیوں کے پتّے پانی ہونے لگے۔ نت نئی افواہوں نے عام ہراس پھیلا دی، خوف کے ساتھ ساتھ چڑھاوے کی مقدار تو بڑھ گئی مگر احتیاط بہت بڑھ گئی، دور سے رکھ کر چلے آتے۔ شہر کو دودھ پہنچنا کم ہو گیا اور افواہیں زیادہ۔ پہلے تو خیر شہر سے مضافات اور دیہات میں اور دیہات سے شہر اور مضافات میں پہنچا کرتیں اور اب تو شہر کے شہر ایک محلے سے دوسرے محلے میں پہنچتیں۔ رات گنیش مہاراج نے بھرے بازار میں درشن دئیے، دودھ کی دکانوں کے ٹھٹھر اکھیڑ پھینکے، حلوائیوں کی بھینٹ لی اور کڑھائیوں کی کڑھائیاں ابلتے دودھ کی سونت کر زمین میں دھنس گئے . . . .
اور خیر شہر میں ہراس تو نہ پھیلنے پائی مگر دودھ کا قحط ہو گیا کیونکہ ڈر کے مارے سو گوالوں میں سے بمشکل پچیس دو دھ لے کر شہر آنے کی ہمت کرتے، وہ بھی سر ہتھیلی پر رکھ کر اور شہر میں یہ افواہیں پھیلتیں کہ دودھ کہاں سے آئے، وہ تو سارے کا سارا گنیش مہاراج کے چڑھاوے میں چلا جاتا ہے، ساتھ ساتھ روزانہ ایک سو ایک بھینٹ کی خبر بھی گشت کر جاتی ؛

بہرحال بھینٹ والی بات تو صحیح تھی، ایک سو ایک نہ سہی تو ایک بھینٹ تو لی ہی تھی۔ حکام ضلع شہر کے اندر سے دودھ کی کمی پر ہی پیچ وتاب کھا رہے تھے، عورت کے مارے جانے سے باقاعدہ قانونی شکل پیدا ہو گئی۔

ادھر محکمہ جنگلات والوں نے خونی ہاتھی کا اپنا علیحدہ فائل چلایا اور سرکاری عہدہ داروں کو تو ہر چیز کا سد باب کرنا تھا، خونی ہاتھی کا استیصال قدم قدم پہ بدل جانے والی افواہوں اور ہراس کا خاتمہ، اور پھر شہر سے دودھ کی کمی کا دور کرنا——— محکمۂ جنگلات اور عالی عہدہ داروں نے ٹھنگ گی۔ بات عقائد کی حد تک اس وقت تک نبھتی ہے جب تک قانون کی زد میں نہ آجائے۔ جنگلات کے قواعد کی رو سے ہاتھی کا شکار مدتوں سے ممنوع تھا۔ مگر جب ہاتھی خونی ہو جائے تو پھر وہ ہاتھی کب رہتا ہے۔ اگرچہ جنگلات کے ماہر حیوانات اس مخصوص ہاتھی کی جبلت کو عام ہاتھیوں سے بالکل علیحدہ اور منفرد بتاتے تھے، بھلا کسی کتاب یا تجربہ میں یہ آیا تھا کہ ہاتھی دودھ پر پاٹ مارے! خیر آدمی کے مار دینے کی تو ایک دو مثال پائی بھی جاتی تھی اگرچہ یہ بھی ہاتھی کی جبلت کے منافی تھا، بہرحال عالی عہدہ داروں کو تو اپنا نظم ونسق برقرار رکھنا ہی تھا، دونوں نے مل کر ہاتھی کو مار دینے کا فتویٰ دے دیا۔ اور یہ ڈیوٹی محکمہ جنگلات والوں کی تھی کہ خطرناک جانوروں کا استیصال کریں اگرچہ مقتول عورت کے ورثاء خون کا دعویٰ نہ کرنا چاہتے تھے ؛

جب محکمہ جنگلات والوں نے معذوری ظاہر کی اور بتایا کہ گنیش مہاراج کے مقابلہ پر انہیں دیہاتیوں حتیٰ کہ خانہ بدوشوں سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی تو پھر عالی عہدہ داروں نے ادھر توجہ کی۔ پہلے تو خود آپس میں نظر دوڑائی تو کشنری بھر میں کوئی حاکم ایسا نظر نہ آیا جو ڈھنگ کے ساتھ ایک گولی ہاتھی تو ہاتھی جنگلی بکرے پر بھی چلا دے۔ پھر چھاؤنی کی جانب رخ کیا، بڑے بڑے بال باندھی گولی مارنے والے کرنل جنرل میجر کپتان بھی تھے۔ اور یہ نہیں کہ نرے چاند ماری ہی مارنے والے ہوں، تھوڑا بہت شکار بھی کھیل لیا کرتے تھے مگر ہاتھی کا شکار تو اپنے

فن میں منفرد ہوا کرتا ہے اور ہاتھی بھی خونی! ــــ اور اب تو یہ مفقود تھا۔ اگلے زمانے میں بھی چار چھ ضلعوں میں ایک آدھ ہوا کرتا تھا یا وقت وقت پر پرانے انگریز فوجیوں میں کوئی افریقہ برہما کے جنگلوں کا کھیلا شوقین شکاری نکل آتا تھا۔ شہر تو شہر کمشنری بھر میں کوئی نہ نکلا اور چھاؤنی سے بھی جواب آگیا۔ اور قانونی ایکشن تو کوئی بھی صبر کرکے بیٹھ جانے کے لئے نہیں لیا جاتا اور پھر یہ تو مسلسل خطرہ تھا، اور مستقل نقصان اور بیم ہراس۔ لہٰذا حاکم ضلع کے سامنے پوری گتھی بن گیا، بہت نگاہیں ڈالیں، پولیس کے عہدہ داروں سے مشورہ کیا اور ایک صورت نکل ہی آئی، شہر میں ایک کنبہ ایک معزول شدہ شاہی خاندان کے دس بارہ افراد کا اب بھی بستا تھا، مگر بوڑھا تو بوڑھا اس خاندان کے جوان تک گوشہ نشین ہو چکے تھے اور ان میں کا ہر ایک قادر انداز اور بڑا دلیر شکاری تھا، بڑے بڑے فوجی انگریزوں پر ان کی نشانہ بازی اور بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن اب تو برسوں سے ان کی بندوقوں کی گریس بھی نہ چھوٹی تھی اور شاید مہینے گذر جاتے اپنی کوٹھی کے کمپاؤنڈ سے بھی باہر آنے کی نوبت نہ آتی اور خاندانی پنشن پر جو حکومت کی معرفت پہنچا کرتی، گذر تھی۔

جب اپنے ساتوں آٹھوں ضلعوں میں کوئی آدمی نظر نہ آیا، محکمہ جنگلات والوں نے بھی جواب دے دیا۔ دیہاتی اور خانہ بدوش کام پہلو تہی کر گئے اور چھاؤنی سے بھی صدائے برنخاست سن لی تو حاکم ضلع نے مجبور ہو کر بوڑھے خان سے تحریک کی کہ اس موذی کے ظلم سے مخلوق خدا کو نجات دلائے۔

موذی کے ظلم سے مخلوق خدا کو نجات دلانے سے زیادہ بوڑھے خاں کے اندر پرانا دبا ہوا شکاری والا جذبہ بھڑک اٹھا۔ ویسے مدتوں سے بندوق نہ پکڑی تھی اور ہاتھی کے شکار کے لئے بڑی اچھی پریکٹس کر کے جانے کی ضرورت تھی مگر وقت کم تھا، جلدی جلدی پروگرام بنایا، ساتھی تو کوئی باقی نہ تھا، بوڑھے خاں کے بیٹے پوتے، بھائی بھتیجے، ایک سے ایک بڑھ کر گل چلے تھے۔ سب ملا کر درجن بھر شکاریوں کی پارٹی بن ہی گئی۔ سب نے اپنے بڑے رائفلوں کی گریس صاف کرائی، نئے کارتوس حاصل کئے اور پرانے شکاری کپڑے نکالے، جنگل میں کچھ زیادہ اندر جانے کا تو پروگرام نہ تھا پھر بھی رہنمائی کے لئے آدمی تلاش کئے اور باوجود حاکم ضلع کی مدد کے دیہات سے ایک بھی متنفس اس کے لئے طیار نہ ہوا، مجبور ہو کر کچھ کوتوالی کے کانسٹبل اور دس پانچ مضافاتی تھانوں کے چوکیدار اور محکمہ جنگلات کے کچھ پٹرول اور دو ایک رینجر جمع کئے جن کے ذریعہ ہاتھی کی نقل وحرکت اور جبلت کے متعلق معلومات فراہم کیں، اور گنیش مہاراج جنگل میں اندر زیادہ دور نہ جاتے، یہی شہر سے دس پانچ میل ادھر ادھر کہیں لگے رہتے۔ کبھی کبھی ذرا ترچھ کر دوپہر میں کسی پھیلے ہوئے چشمہ کے کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ کائی میں جا پڑتے اور کہیں گہرا پانی مل جاتا تو کسی جھیل میں دو چار غوطے لگا لیتے اور سونڈ بھر بھر کر پیٹھ پر پھواریں چھوڑ لیتے اور نہا دھو کر اپنے وقت پر خوشبوئے گردس پانچ میل کے اندر کہیں نہ کہیں اپنا چڑھاوا پا لیتے اور اب تو معتقدین بھانپتے رہتے اور راستہ پر ٹکیاں چن آتے۔

تاہم ہاتھی کا شکار ہاتھی کا شکار ہے، کوئی ہرن چیتل پاڑھے نیلے کا کھیل نہیں ہے۔ بھاری میگنم اور اکسپریس کارواٹ رائفلوں کے علاوہ ہاتھی کے شکار کے اور بہت سے لوازمات اور آداب ہیں جب صبح کو جانے کا پروگرام تھا اس سے پیشتر رات میں خان اور اس کے ساتھی بیٹوں، پوتوں، بھائی بھتیجوں میں مفصل مشورہ ہوا۔ ہر ایک [illegible] پیش کیں مگر اس ہاتھی کے شکار میں نہ ان تمام لوازمات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ وقت اور موقع تھا، نقل وحرکت اور ہانٹ دو دن سے معلوم ہو رہی تھی اور جنگل دور اور نزدیک سب گھوما ہوا اور اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ خان اور اس کے چھوٹے بھائی کئی مرتبہ ہاتھیوں کا شکار کر چکے تھے۔ اپنے ہتھیاروں کی ضرب اور گولی لگانے کے پوائنٹ اچھی طرح جانتے تھے، اور صرف گولی ہی لگانا تھی۔ پھر سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ کوئی غول نہ تھا، ہاتھی اکیلا ہی تو تھا۔ بس ایک کبلی دیوار پر ٹھکانے سے دو گولیاں جڑنی تھیں۔ اپنی عمر میں ایسی دس پانچ دیواریں خان ڈھائے ہوئے تھا، مانا کہ بوڑھا تھا مگر کسی اعتبار سے انیس نہ ہوا تھا، اپنے سب جوانوں سے زیادہ کڑیل بنا ہوا تھا اور پچھتر کی عمر میں پچیس سالہ جذبہ رکھتا تھا۔ مستقل مزاجی سے جو اس عمر کا تقاضا تھی مالا مال تھا، اور بہادری کے ساتھ شکار کے داؤں پیچ، ساری عمر کے عملی تجربہ نے خان کی ضرب کو موت کا طمانچہ بنا دیا تھا، ویسے یہ بات نہیں ہے کہ کبھی مار لئے ہوں اب بھی دس پانچ پرانے ہاتھی جنگل میں ایسے زندہ ہوں گے جن کے کولہوں اور کھوں میں خان کی گولیاں پندرہ پندرہ بیس بیس برس

پُرانی گونجتیں بنی دھری ہوں گی۔

علی الصبح کچھ زیادہ دور جانا بھی نہ پڑا، یہی دس میل شوالک کی ترائی میں اور خان نے تیقن کے ساتھ گنیش مہاراج کی نشست گاہ معلوم کرلی، اب پھر پارٹی میں مشورہ ہوا اور ایک لڑکے نے تجویز پیش کی کہ باقاعدہ شکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے پہلے خان ایک دو گولی مار کر دور سے ہاتھی کی ایک یا دو ٹانگیں توڑ دیں، پھر جب وہ مجبور جہاں کا تہاں پڑ جائے تو سب بڑھ کر قریب سے والی مار دیں، قصہ ختم ہو۔"

"مگر یہ تو بہت ہی اَن اسپورٹنگ اور ہاتھی کے شکار کا سخت مذموم طریقہ ہے۔" من چلے بوڑھے خان نے کہا۔

"لیکن دیکھیے، ہمیں تو استیصال کرنا ہے۔" نوجوان بیٹا بولا۔

"تم کچے شکاری ہو، اور مجھ کو تو شکار کا جذبہ لئے جا رہا ہے، یہ شکاری کا کام نہیں قصائی کا کام ہے جو تم بتا رہے ہو۔" اور خان کے چھوٹے بھائی نے لقمہ دیا۔

"اور یہ چیز شکار جیسے ارفع جذبہ کے سخت منافی ہے۔"

"نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ مخلوق خدا کو اس کی ایذا رسانی سے نجات ہو جائے اور قصہ ختم ہو۔"

"کیا کہنے میاں! سمجھنے کی بات ہے کہ انہوں نے اسپورٹس مین سمجھ کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا، تو پھر ہمیں اسپورٹ کے تمام و کمال آداب برتنا چاہئیں اور پھر میں یہ کیوں کروں، ویسے میرے لئے کون سی مشکل ہے۔ بس تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر میری ہدایت کے مطابق لگے رہنا، ویسے موقع محل تم سب خود سمجھتے بھی ہو، لیکن جب تک میں اشارہ نہ دوں میرے شکار پر کوئی صاحب فیر نہ کریں خواہ میرے لئے خطرہ ہی کیوں نہ ہو، اور پہلے تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" "ہوں ہمارا مطلب یہ ہے کہ بات بھی بن جائے اور خطرہ . . ." بھتیجہ بولا" اور خان نے بات کاٹ کر کہا "میری زندگی کا شاید یہ اخیر شکار ہو اور میں ایسا ریکارڈ کیوں چھوڑوں جو ساری عمر کے کرے دھرے پر پانی پھر جائے۔" اور اپنے بوڑھے ملازم شہباز کی جانب داد طلب نظروں سے دیکھا جو چالیس سال خان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے بندوقوں کا پٹہ لئے ہاتھیوں، شیروں اور بھینسوں کے شکار میں سایہ کی طرح ساتھ لگا رہا تھا، اور جس پر خان کے ساتھ بارہا موت جھپٹی تھی، اور الٹ کر اوندھے مونہہ جا پڑی تھی۔ اور بوڑھے شہباز نے آنکھ اور گردن کے اشارے سے بہادر آقا کی تائید کی، اگرچہ خود کبھی گولی نہ لگائی تھی اور بندوقیں ہی اٹھائی تھیں۔

دوپہر تک خان گنیش مہاراج کی آرام گاہ کے گرد محاصرہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ پر دمیں لگاتے گنیش مہاراج تو میل بھر سے خطرہ کی بو سونگھ رہے تھے، اور اس بو کو تو ہاتھی خوب ہی پہچانتا تھا۔ کتنے ہی بہادر ساتھی اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور خود گنیش مہاراج کے پٹھوں کولہوں اور کوکھوں میں دو چار آدھ آدھ پاؤ کی سوکھی گولیاں گویا دبائے آج تک موجود تھیں، اور اور کچھ تفاصیل تو یاد نہ تھیں، بس خطرہ کا احساس جبلت پر طاری ہو گیا۔ ایک آدھ دھماکا تڑاخا دھکا، پھر کاٹ توڑ جلن اور پھر مہینوں پیپ خون اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور تکلیف اور پالنسو گز سے دوربینوں کی مدد سے بھانپ کر قرارداد کے مطابق خان کی پارٹی تین سمت میں بٹ گئی تھی چوتھی سمت اونچی پہاڑی کا ڈھلان تھا جس کی تلی پر یہ جوہڑ تھا جس میں گنیش مہاراج پڑے لوٹیں لگا رہے تھے اور رشادبا تھدلے رہے تھے۔ اوپر جانے کا امکان نہ تھا۔ پارٹی تمام جھاڑیوں اور درختوں میں چھپی چھپی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور بوڑھا اپنے پرانے تجربہ کار ملازم کو ساتھ لئے خان بوڑھے گنیش مہاراج کے معدد رُو عین اس پامال شدہ راستہ پر چل رہا تھا جو گنیش مہاراج کے دوپہر کو نہانے کے لئے جانے کا اور سہ پہر کو اٹھ کر آنے کا تھا، اور ہاتھی تو اپنے راستہ کا بڑا پابند ہوتا ہے۔ گنیش مہاراج نے کیچڑ پانی کا ٹھنڈا شغلہ چھوڑ کر لمبی سونڈ فضا میں چاروں طرف گھمائی، دائیں بائیں اور سامنے تمام فضا بارود کی بو سے رچی ہوئی تھی اور لحہ بہ لحہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی، پہلے تو کھڑے ہو کر جلدی جلدی کان ہلائے اور ساتھ ساتھ ننھی ننھی آنکھیں حلقوں میں گھومیں۔ سامنے راستہ پر دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ دکھائی دیا، اور نہ سنائی دیا، ایک ٹیڑھی بار بار دائیں سے بائیں اور آگے سے پیچھے بڑے زور سے چلاتی اوپر سے اٹھتی رہی اور یہ بھی آدمی کی موجودگی کا سگنل ہوا کرتا ہے، بو اور تیز اور واضح تر ہو گئی اور ٹیڑی جلدی پلٹ کر آنے لگی۔ بوڑھے گنیش مہاراج نے بھرپور خطرہ محسوس کیا اور قریب ہی اور پھر آگے پیچھے دائیں بائیں سونڈ گھما کر سونگھا اور پیچھے ڈھلان پر سے آتی ہوئی ہوا صاف سنگھائی دی اور اوپر کو بڑھا اور پھر لپکنا شروع کیا۔ جب خان جوہڑ سے تین سو گز کے فاصلہ

پر نمودار ہوا تو ہاتھی کو پہاڑی کے ڈھلان پر ایک جھلک لپکتے دیکھا، ایسے ڈھلانوں پر چڑھنا ہاتھی کی جبلت کے منافی ہے۔ خان سمجھ گیا کہ تینوں جانب سے خطرہ محسوس کرکے یہ رخ اختیار کیا ہے اور ہماری پارٹی کی سیدھ بچا کر اور اوپر پہنچ کر دائیں بائیں کسی جانب کو مڑے گا، غرض جو موہنہ کا نوالہ سمجھ کر چلے تھے وہ بات نہیں ہے، اور جتنا ذکی الحس دودھ کی خوشبو لینے کے معاملہ میں واقع ہوا ہے اس سے زیادہ دشمن کا پسینہ اور اندفل کی بو لیتا ہے۔ بھینٹ لینے کے بعد بھی گنیش مہاراج کو اندازہ نہ ہوا تھا کہ ان سے کتنی بڑی قانونی خطا سرزد ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ بھینٹ کے بعد چڑھاوے زیادہ بھی ہو گئے تھے اور آسان بھی، وہ لوٹ کھسوٹ اور اچکے پن والی بات تو بالکل ہی جاتی رہی تھی، اب تو جدھر کو نکل جائے زندگی دودھ ہی دودھ معلوم پڑتی۔ اس دوران میں کچھ نہ کچھ آدمیوں سے وحشت بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ دوسری بات تھی کہ سہواً ایک کا گلا گھٹ گیا تھا اور آج یہ بارود کی بو بڑے دنوں بعد ناک میں پہنچی تھی اور اس کے ساتھ بڑی مہیب یادیں اور تکلیف دہ واقعات وابستہ تھے۔ خان کی پارٹی جمع ہو گئی اور دو بھیلوں کی مدد سے مفرور شکار کے رخ کا تعین کرنے کی کوشش کرنے لگی، مگر جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں صحیح پتہ نہ چل سکا، مجبور ہو کر کچھ دور اوپر کی سمت کھوجوں پر چلے مگر اوپر پتھریلی زمین میں نشانات قدم تو نہ مل سکے تاہم جھاڑیوں اور سبزے میں سے گزرتے ہوئے اس کا راستہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہونے لگی۔ سورج مغرب کی چمکتی ہوئی پہاڑیوں کے ڈھالوں میں جا پہنچا، جگہ جگہ کھلے حصوں میں درختوں اور جھاڑیوں کے سائے لمبے لمبے ہو کر پڑنے لگے، جنگل میں شام کے وقت مخصوص آوازیں گونجنے لگیں۔ گھاٹیوں اور میدانوں میں سے تمام دن چگ کر ڈھالوں پر پتھروں اور چٹانوں میں بسیرے لئے چکوریں اور مرغیاں کڑکڑا کڑکڑا کر جمع ہونے لگیں اور تھوڑے تھوڑے اڑان کے ساتھ تیز تیز لپکنے لگیں۔ بارہ سنگھے چیتل پاڑے اور جانک جنگل کے اندرونی حصوں سے نکل نکل کر کاشتہ علاقوں سے ملحق جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈوں میں آ گئے بلند پرواز اور تیز پر طوطے تنگ کے تنگ بنا کر بسیرے کے لئے گھنے حصوں کی جانب اڑنے لگے، شوالک رینج کے مشرقی ڈھالوں کی جانب سے بڑی سیاہی ہمالیہ کے سلسلہ کی مشرقی پہاڑیوں سے بڑے پھیلتے ہوئے مہیب دھندلکے سے غٹ پٹ ہو گئی۔ اور خان کی پارٹی تیزی کے ساتھ ہاتھی کے کھوجوں پر چلتی رہی۔ ہاتھی تو جیسا خان کا خیال تھا کچھ دور ڈھال پر چڑھ کر اور خان کے داہنے ہاتھ والے ساتھیوں کے سروں پر سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے سے گزرتا اور پھر اوپر مڑ گیا تھا۔ اب خان کی پارٹی نے رفتار تیز کر دی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور ہزاروں مربع میل میں پھیلی ہوئی ہمالیہ اور شوالک رینج کی وسیع وادی گم ہو جانا چاہتی تھی یہ

مغرب کے قریب کھوج اسے ملنا شروع ہوئے جس سے ہاتھی کی رفتار مدھم ہونے کا سراغ ملتا تھا، تجربہ کار خان سمجھ گیا کہ بس اب زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ تھوڑی دور چل کر خان اور پوری پارٹی کی دوربینوں نے بھانپ لیا۔ تین طرف گھنا جنگل اور ایک جانب ڈھلوان پر ایک چھوٹا سا گانوں اور نیچے درمیان میں ایک زرخیز کاشتہ میدان اور اس میدان کے بیچوں بیچ کھڑے گنیش مہاراج جھوم رہے ہیں۔ شام ہوتے دیکھ کر خان نے اپنی پارٹی کو جلدی جلدی تقسیم کیا، فرق صرف اتنا تھا کہ اب کی ایک جانب یعنی اسی ڈھلوان کی سمت گانوں تھا جس سمت سے پہلے فرار ہوا تھا، پارٹی کو لگتے دیکھ کر اور گنیش مہاراج کو مارنے کے انتظامات دیکھ کر گانوں والوں میں بےچینی پھیلی۔ پہلے سب کے سب گانوں سے باہر جمع ہو گئے اور پھر ڈھلوان سے اتر کر میدان کی جانب بڑھنے لگی۔ بوڑھیوں اور عورتوں نے نوجوانوں کو روکا کہ ارے نہیں بارہ ہزار بندوقیں آ جائیں بھلا گنیش مہاراج کو مار سکتے ہیں؟ اور گنیش مہاراج تو گولی الٹی پھیر دینگے" کوئی بولا کہ گنیش مہاراج کے بدن پر گولی گر کے رہ گئی

اب ہانکا بڑا مکمل ہو گیا، ساتھ ہی ساتھ کچھ ناقص بھی۔ میدان کے دو سمت سے خان کی پارٹی بڑھی اور پرے سے گانوں والوں کی چپقلش اور پھر شور ہوا اور مغربی دہار گنیش مہاراج سامنے کو بڑھیں اور سامنے سے خان اور خان کا پرانا تجربہ کار بندوق بردار ملازم شہباز آگے پیچھے بڑھ رہے تھے۔ جگہ جگہ میدان کھڑی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ لیتے خان اور شہباز آگے پیچھے دونوں بڑھتے رہے، اوپر سے گانوں والوں کا شور فزوں تر ہو رہا تھا، اور گرد سے پارٹی دونوں جانب ایک دوسرے کا آمنا سامنا بچائے سمٹ کر میدان کے کناروں پر آ لگی تھی۔ گنیش مہاراج کے معتقدین پیچھے تھے اور دشمن دائیں بائیں اور سامنے۔ چار چار چھ چھ قدم لپک کر گنیش مہاراج قلعہ کے برج کی طرح ٹھہرتے، توقف کر کے فضا میں لمبی سونڈ لہرا لہرا کر سونگھتے اور اب تو ہر جانب دشمن ہی کی بو بچی معلوم ہوتی۔ پیچھے کے شور سے زیادہ خائف تھے، دائیں بائیں بو زیادہ گہری اور تیز تھی اور آدمی دکھائی دے جاتے اور سیدھا ہی بڑھنے میں عافیت سمجھ میں آئی اور خان ہاتھی جانب کو اور ہاتھی خان کی جانب کو بڑھ رہا تھا، اور بہت جلد ڈھائی سو گز سے سامنا ہو گیا۔ قاعدے کے مطابق خان کو گولی چلانے میں گانوں کی سیدھ

بچانا چاہیے تھی مبادا گولی بھٹک کر دیہاتیوں میں گرے، مگر خان کو اپنے ہاتھ پر بھروسہ تھا اور خالی جانے کا کوئی امکان نہ تھا پھر بھی اس سمت کو فیر کرنا قاعدہ کے خلاف تھا۔ پچاس گز کا فاصلہ ادھر سے گنیش مہاراج نے اُدھر سے خان نے آناً فاناً میں اور طے کر لیا۔ خان سائڈ لے کر کان کے گھگھوئے میں گولی مارنا چاہتا تھا اور ہاتھی ٹینک کی طرح سیدھا بڑھ رہا تھا۔ خان پینترے سے کاٹ کاٹ کر جھاڑیوں کی آڑ لے کر سائڈ لینا چاہتا تھا، اور خان کے دس بیس گز ادھر اُدھر ہوتے ہی ہاتھی اک ذرا ٹھٹک کر پھر سیدھا ہو جاتا تھا اور یہاں تک کہ جب معاملہ دو سو گز کے اندر آ لگا تو خان کو شست لے کر ایک گولی آنکھ پر چپکانی ہی پڑی مگر کچھ تو ہاتھی جھوم رہا تھا، کچھ خان کی پریکٹس چھوٹی ہوئی تھی اور ہاتھ میں بھی وہ بات نہ رہی تھی کہ بال باندھی گولی مارے۔ بجائے آنکھ کے گولی بالشت بھر اوپر مستک پر پڑی۔ بھنا کر ایک پھریری سی لی، بڑے زور سے کان جھٹکے، سونڈ لہرا کر پھر سیدھا ہو گیا اور رفتار کالی آندھی سی! گرج کر بڑے زور سے دانت سیدھا کئے بڑھا اور چارج کیا، اور رخ بدلنے کی ایک اور کوشش میں خان نے تیزی سے پینترا سا بدلا، کچھ جھاڑیوں کی آڑ پکڑنی چاہی اتنی دیر میں ہاتھی نے لپک کر پچاس گز اور لپیٹ لیے، اور سو گز کے اندر موت سے آمنا سامنا ہوا، خان کو سائڈ نہ ملی، پھر آنکھ کی شست لے کر گولی کو دماغ تک پہنچانے کا راستہ تلاش کیا اور اب کی مرتبہ گولی ذرا ہٹ کر ایک جانب کو پڑی اور دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ پیشانی کی چٹان سی ہڈیوں میں چپ ہو کر رہ گئی مگر گنیش مہاراج کی آنکھوں کے سامنے تیلیاں سی ناچ گئیں اور خود بھی ایک مرتبہ کو ناچ گئے۔ مگر عاجز ہونے کے بجائے بارود کا بھڑکا ہوا پہاڑ بن گئے۔ سب کچھ الٹ پھینکنے اور ڈھا دینے کی تندی سے چنگھاڑ کر لپکے اور اب تو دشمن دو ڈگ میں دانت پر تھا، دوسری نال خالی کر کے خان نے شہباز کے ہاتھ سے دوسرا رائفل لیا اور خالی رائفل اس کو دے دیا۔ اتنی دیر میں ہاتھی پچاس گز کے اندر بڑھ رہا تھا، پارٹی سمٹ کے اور بھی قریب آ گئی تھی اور پارٹی میں سے بعض محتاط شکاریوں نے آواز دی "پاؤں پر! پاؤں پر!" یہ تو خان کو خود بھی سوجھ رہی تھی، اور پاؤں تو چاروں ستون سے شروع سے آخر تک سامنے تھے، اور اس سے بہت پیشتر پہلی گولی لگنے سے بھی پہلے خان ہاتھی کو بیکار کر سکتا تھا پہلی ہی جھلک پر ڈھیر ہو جاتا۔ پچاس گز کے اندر بھی خان سائڈ نہ لے سکا اور جب پچیس گز پر معاملہ آ لگا تو خان نے اتنے قریب سے اپنی خارا شگاف گولی کی ضرب کی شدت پر امید کر کے پھر فیر کیا۔ گولی پھر کھوپڑی کی چٹان پر رائیگاں ہی گئی۔ اب خان کے رائفل میں ایک کارتوس باقی تھا، پلٹ کر جو دیکھا تو شہباز اچھل کود اور پینتروں میں دس گز دور ایک جانب علیحدہ ہو گیا تھا اور بھرا رائفل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھی دس گز کے اندر خان پر سونڈ بڑھا بڑھا کر لپٹنے کے لئے لپکتا تھا۔ اور شہباز خان تک پہنچنے کے لئے پینترے کاٹ رہا تھا۔ ادھر پوری پارٹی نے بڑے زور سے چلا کر کہا "پاؤں توڑیئے! پاؤں توڑیے!" مگر خان نہایت اطمینان کے ساتھ پیچ و خم دے کر اور پینترے کاٹ کاٹ کر سونڈ کی لوک سے خود کو بچا رہا تھا اور قلعہ کا قلعہ خان پر دم اٹھا اٹھا کر اخیر جھپٹ کر رہا تھا اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر سونڈ سے خون کا دھواں سا اڑا رہا تھا، خان کو خطرہ میں سمجھ کر شہباز نے ایک دفعہ ہاتھی کو بڑے زور سے للکارا، گویا صریحاً اس کی بلا اپنے سر لیکر اسے موقع فراہم کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھی اک ذرا ادھر متوجہ ہوا، اور گھوم کر اس پر لپکا سائڈ ملتے ہی خان نے کان کے گھگھوئے میں اخیر گولی لگائی، اور گرتے گرتے شہباز ہاتھی کے چنگل میں تھا، گردن سے پکڑ کر سر سے اونچا ہوا میں گھمایا اور زمین پر دھم سے پٹخ دیا۔ اگلا پاؤں بڑھا کر پنڈلی دبائی اور دوسری پنڈلی سونڈ میں پکڑ کر جھر سے چیر دیا، پھر ایک چیتھڑا سونڈ میں دبا ہی ہوا تھا۔ خالی رائفل ہاتھ میں لئے ہنستے خان کی جانب رجوع ہوا اور یکدم دائیں بائیں سے چوبیس گولیوں کی باڑھ نے تڑ تڑ تڑا تڑ سر سے پاؤں تک چھلنی کر دیا اور ارارا دھڑام قلعہ کا قلعہ زمین پر آ رہا۔ اور جب دونوں جانب سے دھوئیں اور گرد کو چیر کر پہنچے تو سونڈ کی لپیٹ میں بوڑھا خان دبا ہوا تھا۔ کولہو کے بیلوں میں لپٹا ہوا گنّے کا پاتا سا۔

۱۸۵۷ء

کوائف و صحائف

۱۸۵۷ء ہماری ملی زندگی کی ایک اہم تاریخ ہے جو گزشتہ سو برس سے برابر ہمارے ذہنوں میں تازہ رہی ہے اور آئندہ بھی ہمارے تہذیبی و معاشرتی تقاضوں کے باب میں رہنمائی کا کام دیتی رہے گی۔ ۱۸۵۷ء نے ہماری سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی پر کیا اثر ڈالا، اس کا جائزہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے ؎

عنواناتِ مطالب:

مذہبی رجحانات	مولانا غلام رسول مہر
تعلیم	ڈاکٹر محمد باقر
سیاسیات	شکور احسن
زبان	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
ادب	سید عابد علی عابد
دلی کے اخبارات	خلیل الرحمن داؤدی
بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ	ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی
بہادر شاہ ظفر کے فرامین	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
غالب کے مکاتیب	مولانا غلام رسول مہر
انگریز افسروں کے خطوط	(ریڈیو پاکستان لاہور)

کتاب نفیس اردو ٹائپ میں نہایت دیدہ زیب چھاپی گئی ہے۔ سرورق رنگین، دیدہ زیب

قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

پشتو بدلہ:

ملغلرےٰ[1]

(رازونیاز)

محمد جی

مترجم: عاصم حسین

مرد: کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے بازار میں
بھونروں کی صورت پرفشاں صد غنچۂ گلنار میں
آشفتہ لب کھولے ہوئے ٹھوڑی کے عشرت زار میں
اور پائی اُن لونگوں کی بُو، اُس نشۂ آور ہار کی
بھونروں کی صورت سیر کی اس زلف کے گلزار کی

عورت: خوشبو سے میرے ہار کی تو مست اور بے خود ہوا
پھر آم کی صورت مرے بستر پہ آکر سوگیا
تجھ سے جبھی تو لاگ ہے زلفوں کے چوکیدار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے بازار کی

مرد: گو لاکھ اس کو لاگ ہو، مجھ کو بچالے گا خدا
زلفوں کی ندیاں بند کر، اک پیار ہو مجھ کو عطا
طاؤس صفت گلگشت کو جانا مجھے کر دے روا
ہاں سیر کرنے دے مجھے اک بار اس انبار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

عورت: الفت کے گلشن میں اگر لے یار جانے دوں تجھے
پھر کیا عجب باغی ہو تو اور مجھ سے آنکھیں پھیر لے
جب رخ دکھا دیتی ہوں میں بجھ جاتے ہیں روشن دیے
پھر مجھ کو حق سے دین ہے گیسوئے عنبر بار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے بازار کی

مرد: ہاں حسن کی دولت تجھے بخشی گئی لا انتہا
بس اک نظر میری طرف، خواہاں ہوں تیرے وصل کا
جب سے تری جانب صنم! میں نے رواں قاصد کیا
میرے دل کو ڈس لیا ناگن زلفِ تار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

عورت: یہ ناگن! اس سے جانِ جاں! میں ہوں کرا سکتی فسوں
تیری محبت میں ہوئی بے چین، محرومِ سکوں
آ پکھلی سے بھاگیں کہیں، غیروں سے میں بیزار ہوں
حاصل مری زلفوں پہ ہے قدرت تجھے یلغار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

شاعر محمد جی یہاں پکھلی میں استادِ زمن
وہ بادشہ ہے اس کو کیا خیلِ گدایاں سے سخن
اشراف دلی، بارہ دیں، وہ فاتحِ اقلیمِ فن
تعریفِ گیسو میں رواں ہے سیل اک اشعار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

---

[1] پشتو = موتی

ڈرامہ:

حق بحقدار رسید

کمال احمد رضوی

کردار:

- پاشا صاحب
- رقیہ خاتون
- ریاض
- یاسمین
- کوکب جہاں
- شاہد جمال اور بڑے میاں
- ایک وکیل

پہلا منظر:

نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی کوٹھی کا وسیع ہال۔

—پردہ اٹھنے پر ہال میں پاشا صاحب ایک صوفے پر نیم دراز ہیں۔ خاص لکھنوی وضع کے آدمی ہیں۔ انگرکھا اور اس کے نیچے چست پاجامہ پہن رکھا ہے۔ سر پر دو پلے کی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے جو ان کی پیشانی پر خم ہو کر ٹکی ہوئی ہے۔ پاؤں میں اعلیٰ درجہ کی سلیم شاہی جوتی ڈال رکھی ہے۔

ان کے برابر والے صوفے پر رقیہ خاتون تشریف فرما ہیں۔ پینتیس کی عمر ہے۔ رنگ روغن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ صرف آنکھوں کے پپوٹے موٹے ہو گئے ہیں اور منکا ڈھلک آیا ہے۔ چہرے پر ایک خاص قسم کی ملائمت اور بردباری کی علامت ہے۔ ان کے ساتھ ہی صوفے پر ان کا لڑکا ریاض بیٹھا ہوا ہے، عمر کوئی ۱۹ سال ہوگی۔ موٹے شیشے کی عینک لگا رکھی ہے۔ چہرا بھدا، باتیں فلاسفرانہ۔

پاشا :- (بیزاری کے سانس بھر کر) بڑی راہ دکھلائی اس کم بخت وکیل نے۔

رقیہ :- اتنے بے صبر کیوں بنے جاتے ہو۔ ابھی دیر ہی کہاں ہوئی اتنی۔

پاشا :- لو، اور دیر کیا ہوگی نواب کو دفنائے پورے تین گھنٹے گزر چکے۔

ریاض :- ادھر منکر نکیر نواب صاحب کا حساب کتاب لے رہے ہوں گے، ادھر ماموں جان اپنا حساب کرنے آ گئے۔

پاشا :- اماں، تم کالج کے لونڈے اتنے زبان دراز کیوں ہوتے ہو (رقیہ سے) یہ صاحبزادے بڑوں کی باتوں میں اپنی ٹانگ اڑانا پیدائشی حق کیوں تصور کرتے ہیں؟

ریاض :- مگر، ماموں جان! آپ اپنا حساب لینے نہیں آئے تو یہاں اور کیا کرنے آئے ہیں؟ میں نے کون سی غلط بات کہہ دی۔

پاشا :- میاں صاحبزادے، اگر میں اپنا حساب چکانے آیا ہوں تو آپ کی والدہ، جدہ مع اپنے دو عدد بچوں کے یہاں فاتحہ خوانی کے لئے آئی ہیں؟

رقیہ :- (ریاض کو ڈانٹ کر) ریاض، تم کیوں الجھتے ہو؟ چپ ہو جاؤ نا لوگ یہ تو تو میں میں سنیں گے تو کیا کہیں گے کہ ادھر جنازہ اٹھا نہیں، ادھر لوگ حساب کتاب لینے آ گئے۔

پاشا :- لیکن اس کم بخت وکیل سے کوئی پوچھے کہ تیری طرح سب لوگ بیکار تو نہیں۔ اب ہم یہاں بدھوؤں کی طرح بیٹھے ان جناب کے نزول اجلال کا انتظار کر رہے ہیں۔

ریاض :- آپ اس وکیل کا کہاں انتظار کر رہے ہیں ماموں جان، آپ تو اس وصیت نامے کا انتظار کر رہے ہیں جو نواب صاحب مرحوم نے اس وکیل کی تحویل میں دے رکھا ہے۔

پاشا :- اب بکواس بند کرے گا یا میں تیرے کھینچوں کان۔ چار حرف انگریزی کے کیا پڑھ لئے بقراط بن گئے۔

(دروازے پر گھنٹی کی آواز)

ریاض ۔ لیجئے ایک اور دعویدار آگئے

(شاہد جمال اندر داخل ہوتے ہیں)

پاشا ۔ اچھا یہ ڈرامہ نگار صاحب بھی آس لگائے ہوئے تھے۔

شاہد ۔ اوہو تو، تو گویا محفل جم چکی ہے!

پاشا ۔ اچھا ہوا کہ آپ بھی رونق بڑھانے تشریف لے ہی آئے۔

شاہد ۔ میں تو صاحب ویسے ہی چلا آیا۔

پاشا ۔ اماں رہنے دو، ویسے ہی تو تم نواب صاحب کی زندگی میں کبھی نہیں آئے۔

شاہد ۔ معاف کیجیے گا، نواب صاحب اپنی زندگی میں گھسنے ہی کب دیتے تھے مجھے یہاں؟

پاشا ۔ تو پھر آپ ان کی موت کے بعد کیا ان کی روح کو خوش کرنے کے لئے آئے ہیں؟

شاہد ۔ خیر مجھے تو وہ کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ میں اس کا اعتراف کرنے میں کوئی خفت محسوس نہیں کرتا مگر آپ کی تو شکل سے وہ بیزار ہوا کرتے تھے۔

پاشا ۔ آدم بیزاری ان کی فطرت جو تھی۔

ریاض ۔ میں نے تو سنا ہے ماموں جان کہ وہ آپ کو سرے سے آدمی تصور نہیں کرتے تھے۔

شاہد ۔ تمام زندگی ان کے آگے یہی تو ہاتھ پھیلائے رہتے تھے۔

پاشا ۔ ارے تو لاولد تھے، اگر میں نے کبھی کبھار کچھ لے لیا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ان پر۔ پھر بھی ان کا اپنا بھانجہ تھا۔

رقیہ ۔ اے بھیا، کبھی کبھار کیوں کہتے ہو، پچھلے پندرہ برس سے ان ہی کے سہارے، تو جی رہے ہو۔

پاشا ۔ اور یہ تمہارے لونڈے اور لونڈیا کا خرچ بھی تو وہی دیتے تھے۔ اور تم جب سے بیوہ ہوئی ہو تمہارا خرچ کس نے چلایا؟

رقیہ ۔ یہ ان کی اپنی مرضی تھی کہ بیوہ بھابی کا خیال کیا۔

پاشا ۔ اور انہوں نے جو میری ذات پر خرچ کیا وہ مرے سے نالائقی تھی گویا۔

رقیہ ۔ مگر تم نے ان کے جیتے جی کبھی اپنے ہاتھ پاؤں بھی ہلائے؟ میں تو خیر بیوہ بے کس تھی، اگر انہوں نے میری دامے درمے کبھی مدد کی تو میں اس کی مستحق تھی۔

پاشا ۔ خیر تو اب دیکھ لیا کہ میں بالکل نکھٹو نہیں ہوں۔ نواب نے جو میرے نام رقم چھوڑی ہوگی اس سے ایسا شاندار بزنس کروں گا کہ انشاء اللہ ان کی روح خوش ہو جائے گی۔

رقیہ ۔ بس رہنے دو، تم نے جو تیر چلائے ہیں مجھے معلوم ہے۔ واہی تباہی میں روپیہ اڑانے کے سوا کچھ نہ کرو گے۔

ریاض ۔ ویسے ماموں جان کونسی بزنس کا ارادہ ہے آپ کا؟

پاشا ۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کا ریسٹورانٹ کھولوں۔ میں تو اس کی آرائش کا نقشہ بھی بنوا چکا ہوں۔

ریاض ۔ پھر تو وہاں آپ کے بے فکرے دوستوں کی خوب محفل جما کرے گی۔

رقیہ ۔ ہاں شطرنج بازی کے سوا ان کا اور کام کیا ہے۔

پاشا ۔ اچھا تم لوگوں کو جو روپیہ ملے گا اس سے تو نواب کا شاندار مزار تعمیر کراؤ گی نا!

رقیہ ۔ اگر مزار تعمیر نہیں کرایا تو ان پیسوں سے مجرا بھی نہیں کراؤں گی۔

پاشا ۔ بس منہ پھلائے بیٹھی رہو۔

ریاض ۔ امی جان دراصل ان پیسوں سے مجھے ولایت بھجوا رہی ہیں وہاں میں "پرسنل میگنٹ ازم" کا کورس کروں گا!

پاشا ۔ پھر تو پورے خدا کی سنوار بن جاؤ گے۔

رقیہ ۔ ارے کون جانے کتنے ملیں گے کتنے نہ ملیں گے۔ مجھے تو انہیں پیسوں میں یاسمین کی شادی کی فکر بھی ہے (ایک وقفہ کے بعد) ابھی تک یاسمین کالج سے آئی نہیں۔ اس کا اس موقع پر موجود ہونا بہت ضروری ہے۔

پاشا ۔ گڑ موجود ہے چیونٹی خود بخود چلی آئے گی تم فکر نہ کرو۔

ریاض ۔ اچھا شاہد آپ کا ان پیسوں سے کیا کچھ کرنے کا پروگرام ہے؟

شاہد ۔ کیسا پروگرام؟

ریاض ۔ یعنی آپ کو جو روپے ملیں گے ان سے کوئی پبلشنگ ہاؤس کھولنے کا ارادہ تو نہیں!

شاہد ۔ بھئی مجھے تو سرے سے یقین ہی نہیں کہ نواب صاحب مرحوم

نے میرے لئے کوئی رقم چھوڑی ہوگی میں نے آپ لوگوں سے پہلے ہی عرض کر دیا کہ میں ان کے بہت ہی معتوب عزیزوں میں سے ہوں۔

ریاض:۔ خیر یہ تو آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔

شاہد:۔ نہیں۔ بخدا یہ واقعہ ہے۔ انہیں میرے لکھنے پڑھنے کا پیشہ قطعی پسند نہ تھا۔ میں جب بھی ان سے ملا انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ میاں یہ کیا الٹی سیدھی کتابیں لکھا کرتے ہو۔ کوئی کام کیا کرو۔

ریاض:۔ مگر میں آج ان کی کتابوں کی الماری دیکھ رہا تھا اس میں آپ کی بھی چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔

شاہد:۔ واقعی؟ تعجب ہے! انہیں تو میرا ادیب بننا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

ریاض:۔ آپ کے ایک دو ڈرامے تو میں نے بھی سرسری طور پر رسالوں میں دیکھے تھے۔ مگر وہ مجھے بڑے خشک۔ کوئی چٹپٹی سی چیز لکھا کیجئے۔

شاہد:۔ مجھے ایسی چیزیں لکھنا نہیں آتیں۔

پاشا:۔ تو پھر لکھنا بند کر دو کسی حکیم نے تو تجویز نہیں کیا ہے۔

شاہد:۔ دراصل میں اپنے شوق کے ماتحت لکھا کرتا ہوں۔

پاشا:۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری کوئی مارکیٹ نہیں ہے۔

(گھنٹی کی آواز)

لو ایک اور آگئیں دعویدار۔

(یاسمین اندر داخل ہوتی ہے)

یاسمین:۔ معاف کیجئے گا۔ آپ لوگوں کو میری وجہ سے زحمت ہوئی، خواہ مخواہ میرا انتظار کرنا پڑا۔ دراصل آج کالج میں الکشن تھا۔ اور میں چونکہ اس میں سلکٹ ہوگئی ہوں ——

پاشا:۔ اور پریس کے فوٹوگرافروں اور رپورٹروں نے آپ کے ارد گرد ایسا ہجوم لگایا کہ آپ کا انٹرویو دیتے دیتے پسینہ نکل آیا۔

رقیہ:۔ (جنہیں پاشا کا یہ مذاق نہیں بھایا) یاسمین! تم ادھر آکر بیٹھو۔

(وہ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

یاسمین:۔ تو سب لوگ آچکے!

پاشا:۔ سوائے اس بدبخت ناہنجار وکیل کے۔

یاسمین:۔ (شاہد کو دیکھ کر) اوہو۔ شاہد بھائی بھی آئے ہوئے ہیں۔ آداب عرض کرتی ہوں۔

شاہد:۔ تسلیم!

پاشا:۔ جنہیں مرحوم نواب ذوالفقار علی سے بڑی عقیدت تھی، اپنے ساتھ عقیدت کے پھول لائے ہیں۔

یاسمین:۔ شاہد بھائی! میں نے کل آپ کے ناول پر ایک رسالہ میں ریویو پڑھا

ریاض:۔ جس میں انہیں مطعون کیا گیا تھا!

یاسمین:۔ بہرحال میں تبصرہ نگار کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتی۔ وہ ناول مجھے خود ذاتی طور پر بہت پسند ہے۔ میری کئی سہیلیوں نے بھی اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ میں نے جب اپنی ایک سہیلی کو بتایا کہ آپ میرے عزیز ہوتے ہیں، تو اسے یقین نہیں آتا تھا۔

شاہد:۔ اچھا؟

یاسمین:۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کا آٹوگراف دلوا دوں گی۔ اس نے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے آٹوگراف جمع کر رکھے ہیں۔

شاہد:۔ مگر میں تو بہت ہی چھوٹا سا ادیب ہوں

یاسمین:۔ پھر تو آپ سے ضرور آٹوگراف لینا چاہیئے، ورنہ بھئی کل کلاں کو اگر آپ بڑے ادیب ہوگئے تو پھر دکھائی کہاں دیں گے آپ!

پاشا:۔ اماں، تم لوگ یہ ادب ودب ڈسکس کرتے رہوگے یا اس وکیل ناہنجار کو بلوانے کا بھی کوئی اپائے کروگے؟

ریاض:۔ صبر سے کام لیجئے ماموں جان، وکیل آپ کا حق غصب نہیں کر جائے گا۔

پاشا:۔ شام ہو رہی ہے دوستوں کی محفل چھوڑ کر یہاں بیٹھا ہوں۔ اچھا چلو بڑے میاں کو تو پکارو تاکہ کوئی چائے شربت وغیرہ ہی ہو جائے۔ اپنا تو انتظار میں گلا ہی خشک ہو گیا۔

ریاض:۔ دوسروں کے تو گلے نہ پڑیں آپ، لیجئے وہ بڑے میاں خود آگئے

(بڑے میاں اندر داخل ہوتے ہیں)

بڑے میاں:۔ حضور وکیل صاحب تشریف لے آئے ہیں یہیں بلا لوں۔

پاشا:۔ (اچھل کر بیٹھ جاتے ہیں) ایں؟ وکیل صاحب آگئے؟ ویری گڈ فوراً بلاؤ نہیں۔ اور ہاں، دیکھو بڑے میاں، کیا نام ہے تمہارا خیر نام کو چھوڑو، نام میں کیا رکھا ہے —

— ہاں تو وکیل صاحب کو بھیج کر تم جلدی سے شربت وغیرہ بنا لاؤ۔

بڑے میاں :- بہت بہتر سرکار۔ (چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے فوراً ہی بعد وکیل صاحب داخل ہوتے ہیں)

وکیل :- معاف کیجیئے گا حضرات، مجھے ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں ذرا دیر ہوگئی۔

پاشا :- کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں ہمیں کون سی ایسی جلدی تھی۔ ہمارے کوئی حلق میں تو دم اٹکا ہوا نہیں میں ذاتی طور پر ہر کام آرام سے کرنے کا عادی ہوں۔ آپ نے سنا ہوگا۔ دیر آید درست آید۔

ریاض :- (کھانستا ہے)

پاشا :- کیوں بے گستاخ، تو کھانستا کیوں ہے؟

ریاض :- ذرا گلا خشک ہوگیا تھا۔

پاشا :- ہاں تو وکیل صاحب، پہلے آپ شربت وغیرہ پی لیں۔ تھوڑی دیر آرام کرلیں۔ اس کے بعد اگر مزاج چاہے تو وصیت نامہ۔

وکیل :- جی ہاں، وہ میں ساتھ لے کر آیا ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔

(وہ فائل کو اٹھا کر کاغذات کو الٹتا پلٹتا ہے)

پاشا :- وکیل صاحب، مناسب ہوگا کہ میں نواب صاحب مرحوم کے عزیزوں کا آپ سے تعارف کرادوں لیجیئے داہنی طرف سے شروع کرتا ہوں۔ یہ میری بہن اور نواب صاحب مرحوم کی بھانجی رقیہ خاتون صاحبہ ہیں۔ ان کے یہ دو بچے ہیں ریاض اور یاسمین اور یہ شاہد جمال صاحب ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کے بھتیجے۔

وکیل :- اور آپ کی تعریف؟

پاشا :- میرا نام احمد علی پاشا ہے۔ اور میں نواب صاحب مرحوم کا بھانجا ہوں۔

وکیل :- خوب! تو گویا نواب صاحب مرحوم کے تمام عزیز اس وقت یہاں موجود ہیں!

پاشا :- جی ہاں ہمارے علاوہ نواب صاحب مرحوم کا اصلی عزیز اور کوئی نہیں۔

(دروازے پر گھنٹی کی آواز)

(بڑے میاں شربت کی ٹرے لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور میز پر ٹرے کو رکھ دیتے ہیں)

بڑے میاں :- سرکار، ایک بٹیا تشریف لائی ہیں۔

رقیہ :- کوئی لڑکی ہے؟ کہہ دو اس وقت ہم لوگ یہاں ایک خاص کام سے جمع ہوئے ہیں ہم اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔

بڑے میاں :- وہ تو میں نے کہا تھا ان سے، مگر وہ کہتی ہیں کہ میں بھی اسی خاص کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔

پاشا :- یعنی کوئی اور رشتہ دار پیدا ہوگیا نواب صاحب کا۔۔۔ خیر جاؤ بلالو۔

(بڑے میاں چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کوکب آتی ہے)

کوکب :- آداب عرض کرتی ہوں۔

پاشا :- جی! فرمایئے کس غرض سے آنا ہوا؟

کوکب :- جس غرض سے آپ موجود ہیں۔

پاشا :- یعنی؟

کوکب :- یعنی میں نواب صاحب مرحوم کا وصیت نامہ سننا چاہتی ہوں۔

پاشا :- مگر آپ ہوتی کون ہیں وصیت نامہ سننے والی؟

کوکب :- میں ان کی لڑکی ہوتی ہوں۔

رقیہ :- کیا بکواس ہے۔ نواب صاحب تو عمر بھر کنوارے رہے۔

کوکب :- پھر اس معاملے میں خود وکیل صاحب وضاحت فرما دیں گے۔ میں ان کے ہی بلاوے پر آئی ہوں۔

وکیل :- جی ہاں حضرات، نواب صاحب مرحوم نے اپنے وصیت نامے میں واقعی کوکب جہاں صاحبہ کو اپنی صاحبزادی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں یہاں پر مزید تفصیل پیش کرنے کے لئے معذرت چاہوں گا۔

کوکب :- آپ غالباً میری پھوپھی زاد بہن یعنی رقیہ خاتون صاحبہ ہیں۔ ابا جان مرحوم نے آپ کی جو شکل مجھے بتائی تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔

رقیہ :- بہر حال میں آپ سے بہن کہلوانا پسند نہیں کرتی۔

کوکب :- اور غالباً یہ ریاض اور یاسمین ہیں۔

یاسمین :- جی ہاں۔ اور یہ شاہد جمال صاحب ہیں۔

کوکب :- جی ہاں ان کا نام میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ان کی ادبی کاوشوں سے بھی متعارف ہوں۔

یاسمین :۔ اور میرے ماموں جان —

کوکب :۔ شطرنج کے شوقین!

پاشا :۔ تو گویا آپ ہم سب سے پوری طرح متعارف ہیں۔

کوکب :۔ جی ہاں بدقسمتی سے ذاتی طور پر شرف نیاز آج ہی حاصل ہو سکا۔

وکیل :۔ خیر اب چونکہ آپ لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے ہیں اس لئے اب میں نواب صاحب مرحوم کا وصیت نامہ اور دیگر کاغذات آپ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رقیہ :۔ ریاض دروازہ بند کر دو۔

پاشا :۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے نواب صاحب مرحوم کا کوئی خفیہ عزیز اب اور نہ ہوگا۔

وکیل :۔ وصیت نامے سے پہلے نواب صاحب مرحوم نے آپ لوگوں کے نام ایک خط تحریر کیا ہے (فائل میں سے ایک لفافہ نکالتا ہے) آپ لوگ یہ سربمہر لفافہ دیکھ رہے ہیں نا۔ یہ خط انہوں نے وصیت نامے سے پہلے آپ لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنانے کی ہدایت کی تھی۔

شاہد :۔ ایک مردہ کا خط

پاشا :۔ لیسے یہ کیا سوجھی تھی نواب صاحب کو؟

شاہد :۔ بہرحال تو سنئیے پہلے میں وہ خط آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ نواب صاحب لکھتے ہیں "بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ مردہ زندوں سے خطاب کرے۔ مگر واقعہ کچھ ایسا ہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری موت کے بعد بھی اپنے عزیزواقارب کے لئے میرے دل میں جو جذبات ہیں وہ تبدیل نہ ہو پائیں گے میرے بیشتر عزیز جو اس وقت اسی ہال میں جمع ہیں، میری موت کا بڑے خلوص کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ انہیں میری ضرورت نہیں، میری دولت کی ضرورت ہے میں اپنے ان عزیزوں کے متعلق اختصار کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہوں"

پاشا :۔ ماشاءاللہ نواب صاحب جیسے بلا کی نثر لکھتے تھے۔

وکیل :۔ آگے سنئے "میرے ایک اللہ کی سنوار بھانجے ہیں احمد علی پاشا۔ اس شخص نے تمام زندگی اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے میں گذشتہ پندرہ سالوں سے اس مردود صفت انسان کی کفالت کا خرچ برداشت کرتا رہا، اس لئے یہ شخص ممنون ہونے کی بجائے ہمیشہ میری پیٹھ پیچھے میرا مذاق اڑاتا رہا۔

پاشا :۔ یہ نواب کی سراسر زیادتی ہے۔

وکیل :۔ دیکھئے حضرات! جب میں آپ کو مرحوم کا خط سنا رہا ہوں خدارا کوئی صاحب اس میں مداخلت نہ فرمائیں، ورنہ میں خط بند کر دوں گا۔

رقیہ :۔ نہیں نہیں، آپ سنائیے، ہم خاموشی سے سنیں گے۔

وکیل :۔ (آگے پڑھتا ہے) اس شخص کو شطرنج اور تاش کا جنون ہے یہ شخص نحوست کا پتلا ہے۔ میں ایسے ناکارہ اور نالائق انسان پر قطعی اپنی دولت ضائع نہیں کروں گا۔

پاشا :۔ (چونک کر) تو کیا نواب نے میرے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔

وکیل :۔ جی نہیں مجھے افسوس ہے۔

پاشا :۔ خدا سمجھے گا تم سے نواب!

وکیل :۔ جی، تو نواب صاحب آگے لکھتے ہیں "ایک میری بھانجی صاحبہ ہیں رقیہ خاتون۔ جن کے متعلق مجھے یہ اعتراف کرنے میں قطعی باک نہیں کہ یہ انتہائی خود غرض قسم کی خاتون واقع ہوئی ہیں۔ ان کے دونوں بچوں کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ گذشتہ پندرہ سال سے میرے ذمے ہے۔ میں ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ انہیں منی آرڈر بھیجتا رہا۔ مگر ان کی طرف سے مجھے منی آرڈر کی رسید کے سوا شکریہ کا ایک لفظ تک نہیں ملا۔ اب چونکہ ان کا ایک لڑکا جوان ہو چکا ہے۔ اس لئے انہیں گھر کی کفالت کے لئے میری مدد کی محتاجی نہیں رہی

رقیہ :۔ تو انہوں نے میرے نام کچھ نہیں چھوڑا۔

وکیل :۔ آگے سنئے، آپ لوگوں میں ضبط کیوں نہیں (پڑھتا ہے) البتہ یاسمین کی شادی کے لئے دس ہزار روپے چھوڑ رہا ہوں۔

رقیہ :۔ صرف دس ہزار؟!

وکیل :۔ جی ہاں، آگے سنئے، نواب صاحب لکھتے ہیں "اب میں ایسے شخص کا ذکر کر رہا ہوں، جو نہ میرا رشتہ دار ہے اور نہ میرا عزیز، مگر اس کا احسان میں کبھی تا دمِ زیست فراموش نہیں کر سکتا۔ میری مراد اپنے بوڑھے ملازم سے ہے۔ اس شخص نے میری زندگی میں ایک باپ، ایک بھائی، ایک بہن، ایک بیٹے، ہر چیز کی
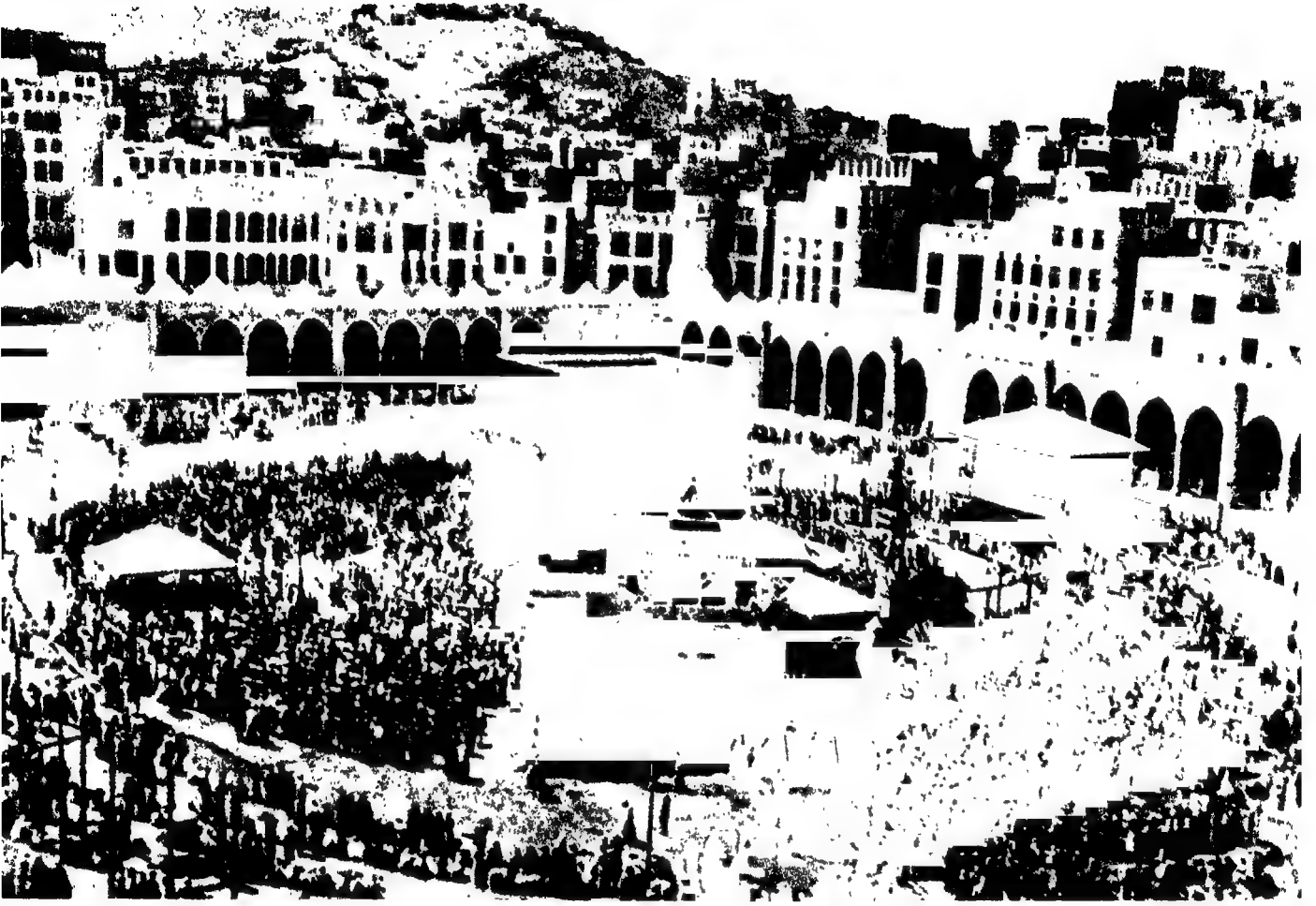
ہم پاسباں ہیں اس کے یہ پاسباں ہمارا

کی پوری کر دی۔ میری موت کے بعد اگر واقعی کوئی شخص شدت
کے ساتھ میری جدائی محسوس کرے گا تو وہ میرا بوڑھا ملازم ہوگا
میں اس کے لئے ہمہ تن منت گزار ہوں۔ میں اس کے نام مبلغ
پندرہ ہزار کی رقم چھوڑتا ہوں۔ اس کے علاوہ اس کی تنخواہ
تا دمِ زیست ملتی رہے گی۔

یاسمین:۔ بڑے میاں کو بلا کر یہ خوش خبری سنا دینی چاہیئے۔

رقیہ:۔ (ڈانٹ کر) او ہو، سن لیگا نا، ایسی جلدی کیا ہے۔

وکیل:۔ ہاں تو آگے سنئے: "اب میں اپنے بھتیجے کے متعلق چند حروف
لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ شاہد جمال صاحب ہیں جس نے
ان کی تصانیف خریدی ضرور ہیں مگر ان کی تحریریں مجھے کچھ ایسی
خشک اور غیر دلچسپ محسوس ہوئیں کہ میں انہیں پڑھ نہ سکا۔ میرے
تمام عزیزوں میں یہ واحد شخص ہے جس نے میرے آگے ہاتھ نہیں
پھیلایا۔ اسی شہر میں اس نے فاقے کئے مگر میرے پاس نہیں آیا۔
اسے دنیا میں اگر کسی پر اعتماد ہے تو اپنے آپ پر مجھے اس شخص پر
اتنا بھروسہ ہے کہ میں اپنی بقیہ رقم جو آٹھ لاکھ بچتی ہے اسی شخص
کے سپرد کرتا ہوں۔

پاشا:۔ (منہ پھاڑ کر) آٹھ لاکھ!

شاہد:۔ (ہنس کر) میں یقین نہیں کرتا۔

وکیل:۔ وصیت نامے میں یہی رقم آپ کے نام چھوڑی گئی ہے۔

کوکب:۔ مبارک ہو شاہد صاحب!

شاہد:۔ میں حیران ہوں نواب صاحب کو آخر یہ کیا سوجھی۔ میں اس کا
بالکل مستحق نہیں ہوں۔

پاشا:۔ تو پھر حضرت آپ اسے ہم میں تقسیم فرما دیجئے۔

رقیہ:۔ اچھا تو انہوں نے اپنی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا؟

وکیل:۔ جی ہاں، ان کا ذکر بھی سن لیجئے: "میری بچی کو دوسروں کے
ہاتھوں میں پلی بڑھی مگر اب تک میں نے اس کے تمام اخراجات
کی کفالت کی ہے۔ اب انشاء اللہ وہ اپنے سن شعور کو پہنچ گئی ہے
یہی وہ وقت ہے جب اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ اگر
ایسے نازک موقع پر اگر میں اپنی دولت یا اس کا کچھ حصہ اس کے
حوالے کر دوں تو اس کی زندگی کی رفتار ماند پڑ جائے گی۔ وہ
پھر اپنے آپ بھروسہ کرنے کی بجائے دوسروں پر بھروسہ
کرے گی۔ اس لئے میں اس کے نام کچھ نہیں چھوڑتا، البتہ اس کی
تعلیم کے اخراجات حسبِ معمول میرا وکیل ادا کرتا رہے گا۔ میں
کوکب کو شاہد جمال کی سرپرستی میں چھوڑتا ہوں۔ وہ اس کی جو
مدد کرنا چاہیں انہیں اختیار ہے۔" (سانس بھر کر) بس نواب صاحب
کا خط یہاں پر ختم ہو جاتا ہے۔

پاشا:۔ ہوں۔ تو گویا اس وقت ہم شاہد صاحب کے مہمان ہیں۔

شاہد:۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے قبلہ۔

رقیہ:۔ ظاہر ہے شاہد کی دیکھ بھال کے لئے خود مجھے بھی یہاں رہنا
پڑے گا۔

پاشا:۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ریاض اور یاسمین کا تمہارے بغیر کبھی جی
نہیں لگے گا۔

کوکب:۔ اچھا تو میں اب اجازت چاہوں گی شاہد صاحب!

شاہد:۔ یہ تو آپ کا گھر ہے کوکب صاحبہ، آپ کا سب سے زیادہ
حق ہے۔ آپ یہیں رہیئے۔

کوکب:۔ جی نہیں۔ میں اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو سکتی ہوں۔ خدا حافظ!

شاہد:۔ خدا حافظ!

(کوکب چلی جاتی ہے)

وکیل:۔ اچھا شاہد صاحب! میں چلتا ہوں۔ کل کسی وقت کاغذات
لیکر آجاؤں گا۔ آپ کے دستخط لینے ہوں گے۔

رقیہ:۔ یاسمین! شاہد صاحب کے لئے اوپر بالکنی والا کمرہ تو درست
کر دو۔

ریاض:۔ ماموں جان آپ کے دوست آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے
آپ تو گھر جائیں گے۔

پاشا:۔ طبیعت کچھ میری بھی مضمحل معلوم ہو رہی ہے یہیں آرام کرنا
پڑے گا۔

(پردہ)

دوسرا منظر

(نواب صاحب مرحوم کی کوٹھی کا ایک کمرہ)

رقیہ:۔ تو پھر انہوں نے پکچر ہاؤس میں تو تم سے باتیں کی ہوں گی۔

یاسمین:۔ نہیں وہاں بھی اسی طرح منہ سجائے بیٹھے رہے۔ انٹرول
ہوا تو میرے لئے ومٹو کا گلاس منگوایا اور خود آرام سے

بیٹھے چائے نوش فرماتے رہے۔

رقیہ :۔ تو تم نے ہی کچھ پہل کی ہوتی۔

یاسمین :۔ موڈ بھی تو ہو انسان کا۔ امی جان مجھے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ وہ میرے ساتھ بالکل بچوں کی طرح سلوک کرتے ہیں

رقیہ :۔ خیر تم سے عمر میں بھی تو بڑے ہیں شاید کچھ نہیں تو دوگنے کا فرق ہوگا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اسے ڈھب پر لاؤں۔

یاسمین :۔ پچھلی دفعہ تم نے ان کے ساتھ پک نک پر بھیجدیا۔ وہاں بھی اسی طرح بور ہوئی میں نے رومانٹک ہونے کی کوشش بھی کی تو وہ بالکل ٹھس بیٹھے رہے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے ایک ناول کا پلاٹ سوچ رہا ہوں؛ دق نہ کرو۔

رقیہ :۔ خیر ابھی بھی کچھ وقت نہیں گذرا۔ اس سے زیادہ دولتمند لڑکا اور کہاں ملے گا۔ نئی روشنی کا آدمی ہے، اس لئے اگر تم سنجیدگی سے کوشش کروگے تو مغلوب ہو جائے گا۔

یاسمین :۔ انہوں نے تو مزاج ہی بالکل جدا گانہ پایا ہے۔ میں دراصل انہیں سمجھ ہی نہیں سکی ہوں۔

رقیہ :۔ خیر بیٹی تم خود سمجھدار ہو۔ کالج کی تعلیم یافتہ ہو۔ اگر اس شخص نے تمہیں قبول کر لیا تو ساری زندگی عیش سے گذر جائے گی۔

یاسمین :۔ (شرما کر آنکھیں نیچے کر لیتی ہے) لیکن یہ مارے باندھے کا بھی تو کام نہیں۔

پاشا :۔ (باہر سے چلا کر) اماں کیا سب زہر کھا کر سو رہے ہو! کوئی سنتا ہی نہیں۔

رقیہ :۔ اس پاشا نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ایک ہفتے کیلئے آئے تھے اور تین مہینے سے پڑے روٹیاں توڑ رہے ہیں۔

یاسمین :۔ اور پھر تنہا نہیں۔ تین تین چار چار مصاحب ہر وقت بغل میں موجود رہتے ہیں۔ موئے شطرنج کی بازیاں ہیں کہ کبھی ختم ہونے ہی میں نہیں آتیں۔ شاید بیچارہ ٹھیرا سیدھا سادا آدمی۔ وہ اپنی زبان سے کاہے کو کچھ کہنے لگا۔

پاشا :۔ (اندر آکر) اماں کب سے پکار رہا ہوں، تم لوگ کان میں روئی ڈالے بیٹھی ہو۔ چار شریف آدمی کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ کسی کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔

رقیہ :۔ اے ہے تو میں نے کب چار آدمیوں کے کھانے کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے۔

پاشا :۔ ہاں تو جب تک میں اس گھر میں ہوں یہ ٹھیکہ تو اٹھانا ہی پڑے گا۔

رقیہ :۔ جی رہنے دیجیے۔ ہم سے یہ مفت کا ٹھیکہ نہیں ہونے کی۔ میں روز روز یہ نازبرداریاں اٹھانے کو تیار نہیں۔

پاشا :۔ ادھو تمہیں میرے دوست زہر کیوں لگتے ہیں؟ وہ کوئی تمہارا دیا کھاتے ہیں جس کا کھاتے ہیں وہ تو پیشانی پر شکن تک نہیں ڈالتا۔

یاسمین :۔ تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ ایسے آدمی کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔

پاشا :۔ ارے تم دونوں ماں بیٹی تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ تم خوب عیش کرو۔ نئے نئے سوٹ بنواؤ۔ ہوٹلوں اور سینماؤں کا لطف لو۔ دو سو چار سو کی شاپنگ کرو۔ اگر میں نے دو شریف آدمیوں کو تفریح کے لئے بلا لیا تو تم دونوں کا دم نکلنے لگا۔

رقیہ :۔ تم تو ایک ہفتے کے لئے آئے تھے۔ تین مہینے سے جمے بیٹھے ہو آخر یہ کوئی شرافت ہے۔

پاشا :۔ اور تم دونوں تینوں؟ تم سے زیادہ خرچ ہے میرا؟

رقیہ :۔ میں تو گھر بار سنبھال رہی ہوں۔

پاشا :۔ اور یہ صاحبزادی صاحبہ؟ یہ خانہ داری کی ٹریننگ لے رہی ہیں یہاں؟

رقیہ :۔ (جل کر) پاشا، تم یوں ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑا کرو

پاشا : تو پھر بھی میرے معاملے میں دخل نہ دیا کرو۔

رقیہ :۔ دخل کیسے نہ دوں، ضرور دخل دوں گی، کوئی حرام کا روپیہ نہیں ہے کہ پانی کی طرح بہا دیا جائے۔

پاشا :۔ پانی کی طرح روپیہ میں نہیں بہا رہا، تم دونوں بہا رہی ہو۔ میری زبان نہ کھلواؤ تو بہتر ہے۔

رقیہ :۔ کیا کیا خورد برد کر دیا ہے ہم دونوں نے؟ دھمکی کیا دیجئے اپنی اوقات دیکھ کر بات کرو۔

پاشا :۔ ارے تم تو چاہتی ہو کہ ساری دولت تمہارے قبضے میں چلی آئے اور ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکو۔

رقیہ: وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔

پاشا: یہ تم روزانہ یاسمین کو اس کے ساتھ کیوں باہر بھیجا کرتی ہو؟ اسی لئے تاکہ تم اسے بہلا پھسلا کر داماد بنانے میں کامیاب ہو جاؤ مگر تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ اس کی نظر کہیں اور ہے۔

رقیہ: کہیں اور؟

پاشا: ہاں ہاں کہیں اور۔

رقیہ: کہاں ہو سکتی ہے اس کی نظر۔

پاشا: کوکب پر۔ تم اتنی عقلمند بنتی ہو۔ تم نے محسوس نہیں کیا وہ اس کے سامنے کیا بھیگی بلی بنا رہتا ہے۔

رقیہ: اس لئے کہ وہ اس کے باپ کا مرہون منت ہے۔

پاشا: پرسوں ہوٹل میں بیٹھے وہ جس طرح باتیں کر رہے تھے اس سے تو کچھ اور ہی اندازہ ہوتا تھا۔

رقیہ: خیر یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم ان کے معاملات میں دخل دیں۔

پاشا: یہی تو میں کہتا ہوں ہمیں ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ میں تمہارے کاموں میں دخل نہیں دیتا اور تمہیں میرے کاموں میں دخل دینا چاہیئے۔ اسطرح ہم زیادہ بہتر اشتراک کے ساتھ زندگی گذار سکتے ہیں اچھا تو میں چلا۔ ابھی بازی چھوڑ کر آیا ہوں۔ کھانا جلدی بھجوا دو۔

(پاشا چلا جاتا ہے)

رقیہ: (جبر سے) اچھی بات ہے۔

(باہر کار رکنے اور دروازہ بند ہونے کی آواز)

یاسمین: امی شاہد صاحب آ گئے

رقیہ: بس ٹھہر جاؤ۔ آج میں ان سے کہہ کر پاشا جی کا تو پتہ کٹواتی ہوں۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔

یاسمین: امی،

رقیہ: کیا بات ہے؟

یاسمین: آج پھر تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے مجھے سو روپے دیجئے۔

رقیہ: خیر لے لینا۔ تم اس وقت تو کھسکو تا یہاں سے۔ اور دیکھو، فضول پیسے نہ خرچ کرو۔ لوگ یوں کیا کم آنکھ لگائے بیٹھے ہیں۔

(یاسمین چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد شاہد اندر داخل ہوتا ہے)

شاہد: آپ لوگ کھانے پر میرا انتظار نہ کیجئے گا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ کھانا کھا لیجئے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

رقیہ: (تشویش سے) کیوں، خیر تو ہے شاہد میاں؟

شاہد: جی ہاں، ویسے میں ٹھیک ہوں، البتہ صبح سے سر کچھ بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا ہے۔

رقیہ: تو کہا ہوتا نا۔ لاؤ سر دبا دوں۔

شاہد: ارے نہیں، میں ٹکیہ کھا لوں گا۔ ٹھیک ہو جائے گا درد

رقیہ: نہیں نہیں تم سوچتے بہت زیادہ ہو نا، اس لئے درد ہو گیا ہے۔ لاؤ دبا دوں، آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے، (پکار کر) یاسمین! اے یاسمین، ذرا تیل کی شیشی لیتی آنا۔

یاسمین: (دور سے) اچھا۔ ابھی لائی۔

رقیہ: آؤ یہاں آرام کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ لو اس اسٹول پر پاؤں پھیلا لو

شاہد: آپ تو خواہ مخواہ زحمت کر رہی ہیں۔

رقیہ: نہیں شاہد میاں، اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ اگر یہی خدانخواستہ یاسمین کے سر میں درد ہو تو ان کا سر دبانا میرے لئے زحمت ہوگی؟ (ہنستی ہے) بڑے شرمیلے ہو تم

شاہد: یہ آپ کی عنایت ہے کہ آپ میرے لئے اتنی زحمتیں اٹھاتی ہیں۔

رقیہ: دیکھو، تم جتاؤ گے تو میں برا مان جاؤں گی۔

شاہد: (مصنوعی ہنسی کے ساتھ) اچھا تو پھر نہیں کہتا۔

(یاسمین اندر آتی ہے)

یاسمین: یہ لیجئے شیشی۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لیجئے گا۔ (چلی جاتی ہے)

رقیہ: اچھی بات ہے۔

(وقفہ)

رقیہ: شاہد میاں!

شاہد: جی

رقیہ: کیا سوچا کرتے ہو تم اتنا؟ جب ہی تو تمہارے سر میں درد ہو جاتا ہے۔

شاہد: میں سوچا کرتا ہوں کہ خدا نے آخر مجھے یہ کس جرم کی سزا

دی ہے۔

رقیہ:۔ سزا!

شاہد:۔ جی ہاں، یہ اتنے سارے روپے، یہ اتنی ساری دولت۔ میں نے کبھی اس کی تمنا نہیں کی تھی۔

رقیہ:۔ تم کیا کہہ رہے ہو!

شاہد:۔ (جیسے خود سے) میں ایک معمولی سا ادیب تھا جب اپنے قلم سے پیسے کمایا کرتا تھا تو فخر سے میری گردن اونچی ہو جاتی تھی۔ جب میرا ڈرامہ نشر ہوتا، میرے ناول کا مسودہ فروخت ہوتا، میری فلمی کہانی بک جاتی تو اس سے جو رقم مجھے ہاتھ آتی، میں اس سے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی چیزیں خریدا کرتا۔ اس وقت میرے پاس فالتو پیسہ نہ ہوتا اور میں خوش ہوتا۔ میں اس خوشی میں میلوں پیدل چلتا، میرے جوتے گھس کر ٹوٹ جاتے میرے پاؤں کبھی نہ دکھتے۔ ایک جگہ سے ناکام ہو کر دوسری جگہ جاتا اور ہر جگہ نئی امید بندھتی۔ میری زندگی کا ہر لمحہ امیدوں کے جال بنتی، نرم، خوبصورت اور رنگین جال!

رقیہ:۔ لیکن اب تمہیں اس بیکار کی بھاگ دوڑ سے نجات مل گئی۔ اب تم اپنی کتابیں خود چھاپ سکتے ہو۔

شاہد:۔ (خشک ہنسی کے ساتھ) اب میں لکھ ہی کہاں سکتا ہوں۔ میرے اندر جو قوت تھی وہ تو جیسے سلب ہو کر رہ گئی۔

رقیہ:۔ نہیں نہیں۔ میرا خیال ہے، اتنی ساری ذمہ داریوں کے احساس نے تمہاری طبیعت کو چاٹ کر دیا ہے۔

شاہد:۔ کاش نواب صاحب نے مجھے ایسی سخت سزا نہ دی ہوتی۔

رقیہ:۔ میرا تو خیال ہے تم شادی کر لو شاہد میاں۔

شاہد:۔ (چونک کر) شادی!

رقیہ:۔ ہاں۔ تمہاری عمر کے انسان کے تمام تفکرات کا یہی ایک علاج ہے۔

شاہد:۔ لیکن میں نے تو اس معاملے میں کبھی سوچا تک نہیں۔

رقیہ:۔ اب تو سوچ سکتے ہو۔ اب تمہارے حالات پہلے کی نسبت بہت بدل چکے ہیں۔ (وقفہ) اگر تم پسند کرو تو لڑکی تو گھر سے کہیں باہر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔

شاہد:۔ گھر میں؟

رقیہ:۔ ہاں، یاسمین کا تمہارے ساتھ رشتہ کرنے میں مجھے قطعی عذر نہیں۔

شاہد:۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میری اور اس کی عمر میں تو دگنے کا فرق ہے۔

رقیہ:۔ کوئی فرق نہیں پڑتا شاہد میاں۔

شاہد:۔ نہیں نہیں۔ معاف کیجئے میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔

رقیہ:۔ تم اتنے برہم کیوں ہو گئے؟ کیا میری بات بری لگی تمہیں؟

شاہد:۔ نہیں۔ یہ بات مجھے جچی نہیں۔

رقیہ:۔ (ہنس کر) یہ تو تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں نے تو یہ بات اس لئے کہی تھی کہ اس سے تمہاری بھلائی مقصود تھی۔

شاہد:۔ میری بھلائی؟

رقیہ:۔ ہاں، تم اپنی عمر کی اس منزل پر ہو شاہد میاں جہاں یہ پہاڑ سا رستہ تنہا نہیں کٹا کرتا۔ اس لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔

شاہد:۔ لیکن اس کمی کا مجھے احساس کیوں نہ ہوا؟

رقیہ:۔ یہی وجہ ہے کہ تم اس طرح رہتے ہو۔

شاہد:۔ تو میں کیا کروں؟

رقیہ:۔ وہی جو میں نے تمہیں کہا۔

شاہد:۔ مگر ـــ

رقیہ:۔ اگر تمہیں اپنی عمر کا اتنا احساس ہے تو اس کی ایک اور صورت ہو سکتی ہے۔

شاہد:۔ کیا؟

رقیہ:۔ تم کسی سن رسیدہ عورت سے، یعنی اپنی جوڑ کی عورت سے، شادی کر لو۔

شاہد:۔ یعنی؟

رقیہ:۔ یعنی جو صحیح معنی میں تمہاری رفیق حیات بن سکے گی جو تمام جذباتی طوفانوں سے گذر چکی ہو، سنجیدہ ہو، دوراندیش ہو ـــ ایسی ہی عورت تمہارے لئے پرسکون گھر بنا سکتی ہے۔

شاہد:۔ پرسکون گھر ـــ یہی خواب تھا جو میں ازل سے دیکھتا آ رہا تھا۔

رقیہ:۔ اگر تم نظر دوڑاؤ گے تو تمہیں ایسا ساتھی ڈھونڈنے

کے لئے دور نہیں جانا پڑے گا۔

رقیہ:۔ مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر۔ مگر۔

شاہد:۔ آپ بلا تکلف کہئے۔

رقیہ:۔ میں تمہارے لئے ایسا گھر بنا سکتی ہوں شاہد!

شاہد:۔ (حواس باختہ ہوکر) آپ!

رقیہ:۔ (اطمینان سے) ہاں، میں!

شاہد:۔ یقیناً میں خواب دیکھ رہا ہوں، یا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگا ہوں۔

رقیہ:۔ کہاں چلے شاہد میاں؟

شاہد:۔ (خود سے) میں کس جال میں آن پھنسا؟

رقیہ:۔ شاہد! تم نے جواب نہیں دیا۔

شاہد:۔ نہیں، میں جواب نہیں دے سکتا۔

رقیہ:۔ شاہد سوچو، ایک لمحہ کے لئے رک کر میری بات سنو۔

شاہد:۔ اوہ ــــ

رقیہ:۔ شاہد رک کر سوچو: کیا میں بری ہوں، کیا میری شکل: کیا میری ــــ

شاہد:۔ (چیخ کر) خدا کے لئے مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں پاگل ہو جاؤں گا!

(پردہ)

تیسرا منظر

(وہی کمرہ جو پچھلے منظر میں ہے)

شاہد:۔ نہیں، اب میں اس زندگی کو اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔

رقیہ:۔ پھر بھی میں ہرگز یہ رائے نہ دوں گی کہ تم روپے کا بٹوارہ کرو۔

شاہد:۔ تو پھر میں اتنی ساری دولت کا کیا کروں گا؟

رقیہ:۔ تمہارا جو جی چاہے کرو مگر اس کو بانٹ کر تباہ نہ کرو۔ اگر یہ روپیہ بانٹنا ہی ہوتا تو نواب صاحب خود ہی میں بانٹ کر جاتے۔ لیکن۔ لیکن انہیں معلوم تھا ان کا روپیہ تمہارے ہی ہاتھوں میں محفوظ رہ سکتا ہے۔ وہ کچی گولیاں

کھیلے ہوئے تھوڑی تھے۔

شاہد:۔ میرے دل کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ میں کچھ سوچ نہیں سکتا، کر نہیں سکتا۔ جب سے یہ روپے ملے ہیں میرا دماغ ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ میں تو اپنی پچھلی معمولی سی زندگی میں ہی خوش تھا۔

رقیہ: خیر تمہارا جو جی چاہے کرو مگر ایسی حماقت کبھی نہ کرنا اور پاشا سے تو اس معاملہ میں رائے لینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ یہاں ایک ہفتے کے لئے آئے تھے اور مستقل چار مہینے سے ٹکے بیٹھے ہیں اور پھر ہر وقت چار پانچ مصاحب بھی ساتھ موجود رہ

شاہد: وہ بے چارے ہمارا کیا بگاڑتے ہیں؟ جب تک روپے میں انہیں بھی آرام اٹھا لینے دیجئے۔

رقیہ: نہیں شاہد میاں، تم سیدھے سادے آدمی ہو، لوگ تمہاری سادگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں نے تو ان کو رخصت کرنے کے انتظامات بھی مکمل کر لئے ہیں۔

شاہد: آپ کیا کہہ رہی ہیں، وہ اس کا بہت برا مانیں گے۔

رقیہ: تم فکر نہ کرو، میں ایسے طریقے سے انتظام کروں گی کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

شاہد: کیا مطلب؟

رقیہ: مطلب یہ کہ میں آج خود بھی اپنے گھر واپس جا رہی ہوں، میں نے اپنا تمام سامان درست کر لیا ہے۔ اور پھر اب تمہیں میری خاص ضرورت بھی نہیں رہی۔

شاہد: نہیں نہیں، آپ کے رہنے سے مجھے واقعی خوشی ہوگی۔

رقیہ: تم نہیں سمجھتے۔ جب تک میں یہاں ہوں گی پاشا ٹلنے کا نام نہیں لیں گے۔

شاہد: لیکن ان کے رہنے سے ہرج ہی کیا ہوتا ہے۔

رقیہ: ہرج یقیناً ہے۔ نواب صاحب نے اپنی تمام زندگی پاشا کو اس مکان میں گھسنے نہیں دیا۔ انہیں زندگی بھر جن جن چیزوں سے نفرت رہی پاشا وہی چیزیں یہاں کر رہے ہیں۔ کیا مرحوم کی روح ان حرکتوں سے خوش ہوگی؟

شاہد: یہ تو آپ درست فرماتی ہیں، ہر وقت کم بخت شطرنج کی منحوس بساط بچھی رہتی ہے۔ مجھے تو ان کے دوستوں میں کوئی بھی

شخص سلیقے کا نظر نہیں آیا۔ پتہ نہیں کہاں سے وہ ایسے واہیات
لوگوں کو اٹھا لاتے ہیں۔

پاشا: (باہر سے چیخ کر) اماں بڑے میاں، چلم تو بھر لاؤ ذرا، مر گئے کیا؟

رقیہ: دن بھر ان کے لئے ایک آدمی محض چلمیں بھرنے کو چاہئے۔

شاہد: افسوس کہ اس شخص نے تمام زندگی واہی تباہی میں گذار دی۔

رقیہ: یہ سب تمہاری حد سے زیادہ سادگی کا قصور رہے۔ میں ہوتی تو
انہیں لمحہ بھر کو جھکنے نہ دیتی۔ (پاشا آتے ہیں)

پاشا: پچاس آوازیں دے چکا ہوں مگر کسی کو جنبش ہی نہیں ہوتی۔

رقیہ: بھیا، یوں شور نہ مچایا کرو۔ یہاں تمہارا کوئی نوکر نہیں لگا ہوا ہے۔

پاشا: سن رہے ہو شاہد میاں؟ یوں لگتا ہے جیسے ان ہی کا دیا تو
کھاتا ہوں میں۔ خدانخواستہ اگر مجھے ان کی روٹیوں پر پلنا پڑتا
تو یہ تو شاید میرے گلے میں کتے کی زنجیر ڈلوا دیتیں۔

رقیہ: شرم اور حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

پاشا: اوہو، تمہارے پیٹ میں کیوں درد ہو رہا ہے؟ شاہد میاں
کہدیں، میں ابھی چلا جاؤں یہاں سے۔

رقیہ: شاہد صاحب کہہ چکے ہیں۔

پاشا: (چونک کر) کہہ چکے ہیں۔

رقیہ: ہاں، میں بھی آج یہاں سے جا رہی ہوں اور تمہارا بھی سامان
بندھوا دیا ہے۔

پاشا: تم شوق سے جاؤ مگر میرا سامان کیوں بندھوا دیا؟

رقیہ: شاہد میاں کے حکم سے۔

پاشا: خوب، تو گویا اب ہم شاہد میاں کے لئے بار بن گئے ہیں۔

رقیہ: جو مہمان ایک ہفتہ کے لئے آئے اور چار مہینے کر جما رہے وہ
بار نہیں تو اور کیا ہوگا؟

پاشا: کیوں شاہد میاں؟

شاہد: میں نے سوچا ہے کہ جاتے وقت آپ کی جو خدمت کر سکتا ہوں
وہ ضرور کروں گا۔

پاشا: یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔ لیکن وہ خدمت کیا ہوگی؟

شاہد: میں آپ کو دو ہزار روپے پیش کروں گا۔

پاشا: دو ہزار؟ خوب، اور رقیہ کو؟

شاہد: ان کے دونوں بچوں کو ملا کر چھ ہزار کا تخمینہ ہے۔

رقیہ: (پاشا سے) اب تو خوش ہو؟

پاشا: ہاں چلو چند روز اور آرام سے کٹ جائیں گے۔

شاہد: آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آج تمام روپوں کا فیصلہ کر رہا ہوں۔

پاشا: میاں، میں نے تو تم سے بہت پہلے کہا تھا کہ اسے مستحق لوگوں میں
تقسیم کر دو۔

شاہد: میں نے یہ بات سوچی تھی مگر بانٹنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔

پاشا: تو پھر خیرات کر دو۔

شاہد: وہ بھی بانٹنے ہی کی ایک شکل ہے۔

پاشا: اماں، یہ باتیں چھوڑو۔ آؤ ہم تم مل کر ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل
کھولیں۔ مغربی موسیقی اور کیبرے کا انتظام ہوگا۔ میری ایک واقف
لڑکی ہے۔ اوّل نمبر کا ڈانس کرتی ہے۔ پبلک پاگل ہو جائے گی
خدا کی قسم! بولو کیا کہتے ہو؟

شاہد: جی نہیں، شکریہ۔ میں اس مزاج کا آدمی نہیں۔

پاشا: تو پھر اسی طرح جنجال میں پھنسے رہو گے؟

شاہد: اب میں نے اس جنجال سے نکلنے کی صورت نکال لی ہے۔

پاشا: وہ بھلا کیسے؟

شاہد: یہ آپ کو ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔

(گھنٹی بجتی ہے)

پاشا: کیا وکیل کو بلوایا ہے؟

شاہد: نہیں۔

(کوکب اندر آتی ہے)

کوکب: شاہد صاحب آپ نے مجھے بلوایا ہے؟

شاہد: جی ہاں، میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آئیے تشریف رکھئے۔

کوکب: (بیٹھتی ہوئی) اچھا تو فرمائیے کیسے یاد کیا؟

شاہد: آپ کو شاید یاد ہو کہ آپ کے والد مرحوم نے اپنے خط میں مجھے
ایک طرح سے آپ کا سرپرست ٹھہرایا تھا۔

کوکب: جی ہاں۔

شاہد: میں نے ان کی خواہشات کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ آج وہ وقت
آگیا ہے کہ میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکوں۔

کوکب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

شاہد: میں نے آپ کے والد سے ملی ہوئی ساری رقم آج آپ کے نام منتقل

کرادی ہے۔ آج سے میں پھر آزاد ہوں۔ آج میں چھوٹی سی دنیا میں واپس جا رہا ہوں۔ جہاں میں نے اپنی قوت بازو سے اپنی جگہ بنائی تھی۔

پاشا: تمہیں یقین ہے شاہد میاں، کہ اس فرض منصبی کو ادا کرنے کے بعد تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوگا؟

شاہد: آج میرے سر سے بہت بڑا بوجھ ٹل گیا ہے۔ مجھے اس کا کبھی افسوس نہ ہوگا۔

رقیہ: دولت جن لوگوں کے آگے پیچھے بھاگتی رہی ہے وہ اسی طرح دولت سے کتراتے رہے ہیں۔

شاہد: جن لوگوں نے اپنا آفرینش ان سے زیادہ بلند اور مستحکم قدروں پر تعمیر کیا ہوتا ہے، وہ ان ہتھیاروں سے مات نہیں کھاتے۔

پاشا: تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تم پھر اپنی اوقات پر آگئے۔

شاہد: ہاں، میں تو اسی اوقات سے مطمئن تھا۔ اچھا کوکب صاحبہ، اب میں اجازت چاہوں گا۔

کوکب: مگر ٹھہریئے آپ بھول رہے ہیں کہ آپ میرے سرپرست ٹھہرائے گئے ہیں اور میں آپ کی سرپرستی سے محروم ہونا نہیں چاہتی۔

شاہد: میں اب اس زندگی سے اکتا چکا ہوں کوکب۔

کوکب: اب ہم دونوں مل کر زندگی کا مقابلہ کریں گے۔ اب میں بھی زندگی کے بار میں آپ کے ساتھ حصہ بٹاؤں گی۔

بڑے میاں: (اندر آکر) پاشا صاحب اور رقیہ بی کا سامان تیار ہے۔

رقیہ: اچھا تو شاہد میاں، ہم اجازت چاہتے ہیں۔

کوکب: پھر بھی جانے سے پہلے یہ قول دیجئے کہ آپ آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ اور اگر ہماری کبھی ضرورت ہو تو فراموش نہیں کریں گی۔

رقیہ: میں قول دیتی ہوں۔

شاہد: اور پاشا صاحب آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔

پاشا: مجھے تم دونوں اس معاملے میں انتہائی فراخ دل پاؤ گے۔

رقیہ اور پاشا: اچھا تو خدا حافظ! (دونوں چلے جاتے ہیں)

کوکب اور شاہد: خدا حافظ!

کوکب: (آواز دے کر) بڑے میاں، میرا سامان اٹھا کر بالکنی والے کمرے میں لگا دو۔

(پردہ)

علوم کی ترقی اور کاغذ

کاغذ نے تہذیب و تمدن کی ترقی میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ طباعت کی ایجاد کے بعد تو کاغذ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ محدود علوم کو چار دانگ عالم میں پھیلا کر کاغذ نے انسانی زندگی کو پہلے سے زیادہ روشن اور خوش آیند بنانا شروع کیا۔ جب تک کتاب انسان کا مایۂ ناز سرمایہ اور اس کی مسرتوں کا منبع بنی رہے گی، انسانی زندگی میں کاغذ کی اہمیت بھی برقرار رہے گی۔

پاکستان کی آیندہ ترقی بھی بڑی حد تک کرنافلی پیپر ملز کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ یہ کارخانہ ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے تمام اقسام کا کاغذ مہیا کرتا ہے۔
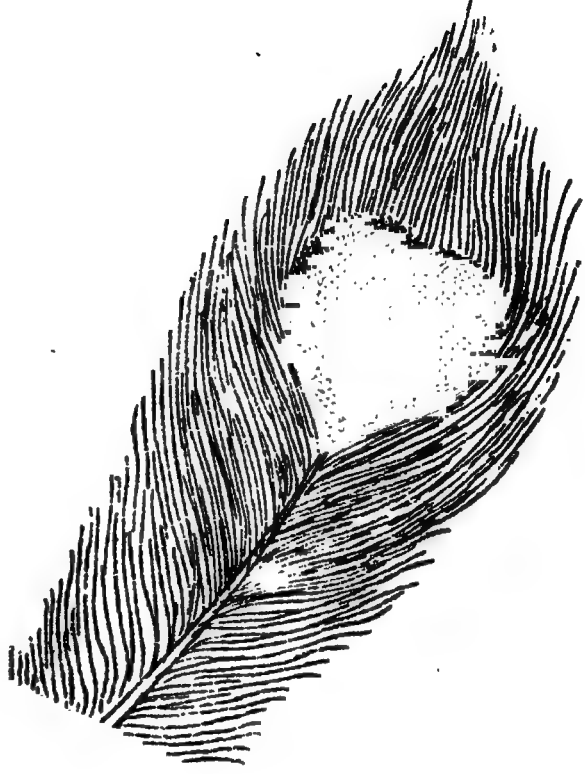
کرنافلی پیپر ملز لمیٹڈ، چندر گونا۔ مشرقی پاکستان

KP-8

UNITED

رپورتاژ:

جہلم کے اُس پار

عارف حجازی

جرنیلی سڑک ایک سیاہ اژدھے کی مانند ناہموار زمین اور ٹیلوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور کبھی سیدھی سپاٹ دکھائی دینے لگتی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے تھے، جن کی گہری چھاؤں میں ابدی سکون اور فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ صدیوں پُرانی سڑک بوڑھی اور تجربہ کار ماں کی مانند ہی تو تھی جس نے اپنے سینے پر نجانے کتنے سپوتوں کو کھیلتے کودتے دیکھا تھا۔ اسے لشکروں کے پُرعظمت مناظر بھی یاد تھے۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک سینکڑوں پُرکیف و پُرخطر مقامات سے گزرتی چلی گئی ہے اور اس کی عظمت و تاریخی شان و شوکت سے لوگ صدیوں سے واقف ہیں۔ گویا وہ دیس کی شہ رگ ہے، جس کی اہمیت اور تاریخی پس منظر میں شیر شاہی دور کی کئی سچی روایات وابستہ ہیں۔

چلتے چلتے میں اور میرا اتفاقی کنک خاں جرنیلی سڑک چھوڑ کے بائیں ہاتھ پر ایک پگڈنڈی پر نکل آئے۔ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کنک خاں ایک فوجی پنشن یافتہ معمر آدمی تھا جنگ عظیم اور جنگ عالمگیر دونوں لڑائیوں میں اس نے سمندر پار جا کر بہت سے تمغے حاصل کئے تھے۔ جہاں دیدہ اور خوش مزاج ہونے کے سبب سے پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں بے تکلف ہو گئے، چنانچہ مارگلہ[1] کے چشمے سے لوٹ کر ہم بریگیڈیر جنرل جان نکلسن فاتح دہلی کے یادگار مینار کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اس مقام کے شمال مغرب کی طرف کھیت اور ہری بھری جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلے تا حدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ فضا بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ کبھی کبھی گیہوں کی پکی فصل کاٹتے وقت کوئی سرو قامت دوشیزہ درانتی ہاتھ میں لئے ہماری طرف دیکھنے لگتی۔ اسے دور سے یوں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی یونانی مجسمہ گیہوں کی سنہری بالیوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہے۔ ہم دونوں اس وقت دنیا بھر کے قصے لئے بیٹھے تھے اور پُراسرار مرغزاروں کے بدلتے ہوئے مناظر ہماری نگاہوں میں کھبے جا رہے تھے۔ اب میں نے کھڑے ہو کر مینار کے محراب کو دیکھا جس پر جنرل مذکور کے کارنامے کندہ تھے۔ لکھا تھا:

"۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۵ء میں سکھوں سے جنگ کی۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں شہرت دوام حاصل کی اور دہلی فتح ہونے کے بعد مارا گیا۔"

نکلسن کے یادگار مینار کو دیکھ کر جیسے آپ ہی آپ میرے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں ۱۸۵۷ء کی آزادی کا تاریخی المیہ (جسے غیر مورخ "غدر ہند" کے نام سے موسوم کرتے ہیں) میری نگاہوں کے سامنے ایک پُرانی تصویر کی مانند گزر گیا۔ اتنے میں کنک خاں بولا:

"شاہ جی انگریزی میں یہ کیا لکھا ہے؟"

"ایک انگریز جرنیل کے کارنامے لکھے ہیں۔ جس نے سن ستاون کی جنگ آزادی کے خلاف لڑ کے ہزاروں وطن پرستوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔"

یہ سُن کر کنک خاں کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا "ہمیں ان یادگاروں سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔"

"ٹھیک کہتے ہو کنک خاں۔ ظلم و تشدد کی ایسی یادگاریں قوم کو غفلت سے چونکانے کے ایک تازیانہ ہیں ــــ"

پھر میں نے موضوع گفتگو بدل کے دریافت کیا۔ "تم اس علاقہ کے چپے چپے سے واقف ہو گے؟"

"جی ہاں۔ آپ جہاں چلنا چاہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں"

ہم دونوں اپنی جگہ سے اُٹھے اور پھر سڑک پر نکل آئے، تھوڑی دیر میں شمال کی جانب سے بادل کا ایک بہت بڑا ٹکڑا فضاؤں میں لہراتا ہوا

---

[1] راول پنڈی سے تھوڑی دور پر ایک پُرفضا مقام ہے۔

اٹھا اور ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ دو چار منٹ میں سورج بادل کی اوٹ میں چھپ گیا۔ مست خرام ہوا سے درخت، جھاڑیاں جھوم رہی تھیں اور کہیں دور سے کوئل کی آواز آ رہی تھی۔ اتنے میں ہمارے اوپر سے ایک چیل کنٹھ شور مچاتا ہوا گزر گیا اور میرے کانوں میں ساتھی دیس کی دوشیزہ کے گیت کے بول لہرانے لگے ——

"کروں کون جتن اے ری، اے ری سکھی موسے نینوں سے برسے بادریا۔ آئی کالی گھٹا بادل گرجے چلے ٹھنڈی پون موا جیا ترسے۔"

اس وقت کا منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے یہ گیت بہت بھلا معلوم ہوا۔ جب ہم ایک ٹیلے کے قریب سے گزرے تو ایک نوجوان دیہاتی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھا بڑے مزے میں گا رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز اور لمبی تانیں جیسے میرے دل کی انتہائی گہرائی میں اترتی چلی گئیں۔ میں نے کنک خاں سے کہا۔

"گیت تو بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے۔"

"اسے ماہیا کہتے ہیں" کنک خاں بولا۔

"ماہیا"

جی ہاں۔ پنجابی گیتوں میں ماہیا بہت مشہور گیت ہے۔ مرد، عورتیں، لڑکیاں۔ غرضیکہ بچے بچے کو یہ گیت بہت مرغوب ہوتا ہے۔ اس کے ڈیڑھ مصرع میں دل کے جذبات کی کائنات سمائی ہوتی ہے، یوں سمجھ لیجئے جیسے کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہو ——"

"خوب۔ خوب" میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ اور پھر باتیں چھیڑ دیں۔

"دیہاتی گیت خواہ کسی علاقے کے کیوں نہ ہوں اور کتنے ہی ناقابلِ فہم اور پیچیدہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن مطلب اور معنی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ کھلی آزاد فضاؤں میں بسنے والے غریب کسانوں اور لوگوں پر جو کچھ گزرتی ہے وہ گیت بن کر اُن کی نوکِ زبان پر آ جاتی ہے۔ یہی قدرتی شاعری ہے جس میں مناظرِ قدرت سے لے کر دکھ، سکھ اور پیار اور محبت کی منہ بولتی اور زندہ جاوید تصویریں ملتی ہیں۔ جہاں کہیں ان گیتوں کے شیریں بول کانوں میں پڑتے ہیں، سننے والے کا دل مطلب سمجھے بغیر ہی پھڑک اٹھتا ہے۔

کنک خاں میری لمبی چوڑی تمہید سن کر کچھ سوچنے لگا، پھر اپنی لمبی چھنگلیا میں سگریٹ دبا کر گہرا کش لگا کے بولا: "شاہ جی ہمارے علاقے میں آپ جہاں کہیں جائیں گے بڑے چھوٹے سب ہی کو مسکراتا ہوا پائیں گے۔ دن بھر محنت مزدوری، کھیتی باڑی اور بوجھ ڈھوتے ڈھوتے جہاں ذرا سی مہلت ملی، کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر گیتوں سے دل بہلا کے اپنی ساری تھکن بھول جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اَن پڑھ سہی مگر بڑے مہمان نواز اور دلیر ہوتے ہیں۔ مزاج میں ظرافت بھی خوب ہوتی ہے۔ ہنسی مذاق کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مذاق، ظرافت کبھی کبھار انھیں دست و گریباں تک پہنچا دیتی ہے۔ غرضیکہ انتہائی محبت اور دشمنی کے جذبات انھیں غیر انسانی فعل کرنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ جن کی مثالیں گیتوں میں بھی کہیں کہیں خوب ملتی ہیں۔"

میں اپنے ملاقاتی کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ بڑی دیر تک گیتوں پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور اس سفر کی طویل مسافت کا ذرہ بھر احساس نہ ہوا اور سورج چھپتے چھپتے ہم پنجہ صاحب پہنچے۔ اس مقام کے بارے میں میرا یہ خیال تھا کہ اس کا نام پانچ دریاؤں کی مناسبت سے رکھا گیا ہو گا۔ لیکن کنک خاں نے اس مقام کے نام کی وجہ جسے یہاں کے سکھ بیان کیا کرتے تھے سنائی کہ ایک مرتبہ سکھوں کے پیشوا گرونانک ادھر آ نکلے اس دوران میں انھیں سخت پیاس معلوم ہوئی پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر آدمی دوڑائے گئے مگر پانی نایاب تھا۔ سب لوگ حیران تھے کہ گرو جی کے لئے پانی کہاں تلاش کیا جائے۔ گرو جی جہاں مقیم تھے وہاں سے تھوڑی دور پر انھیں ایک پہاڑی نظر آئی جس کی چوٹی پر ایک مکان دیکھا۔ خیال آیا کہ اس مکان میں ضرور کوئی رہتا ہو گا اور اس کے پاس پانی بھی ہو گا۔ چنانچہ ایک شخص اس پہاڑی پر پہنچا۔ جب مکان میں داخل ہوا تو ایک مسلمان درویش بابا قندھاری رہتے تھے۔ اس شخص نے درویش سے پانی مانگا۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر تمہارے گرو جی کو کمال آتا ہے تو پھر بیٹھے بیٹھے پانی کیوں نہ منگوا لیا۔ اس نے واپس آ کر اپنے گرو جی سے بابا قندھاری کا ٹکا سا جواب سنا دیا کہتے ہیں پھر گرونانک نے اپنی کرامت دکھائی اور وہ چشمہ جو پہاڑی پر تھا اُسے بیٹھے بیٹھے زمین پر کھینچ لیا۔ اس پر بابا قندھاری بہت بگڑے اور طیش میں آ کر انھوں نے اس پہاڑی کو جس پر چشمہ تھا لڑھکا دیا۔ گرو جی نے جب پہاڑ کو نیچے آتے دیکھا تو ہاتھ بڑھا کر اُسے روک لیا۔ اس طرح پہاڑ کو روک لینے سے ان کے ہاتھ کے پنجے کا نشان بن گیا اور اسی نشان کی مناسبت سے اس مقام کا نام پنجہ صاحب مشہور ہو گیا!!

ماہِ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۷ء

اس کہانی کو سن کر مجھے حسن ابدال کے مشہور "واہ باغ" اور "واہ" گاؤں کی روایت یاد آگئی۔ یوں تو کئی تاریخی باغات نظر سے گزرے مگر "واہ باغ" کا پورا ماحول بڑا دلکش اور رومان پرور ہے۔ ایک نہایت پُرفضا مقام پر یہ باغ واقع ہے اس کے سامنے چوڑے پاٹ کی ندی بہتی ہے۔ باغ کے بیچ میں ایک بہت صاف ستھرے پانی کا چشمہ ہے جسے آب رسانی کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس باغ کو جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان نے بنوایا تھا۔ جب وہ کشمیر جاتا تو اسی باغ میں کچھ روز قیام کرتا۔ باغ میں مغلیہ فن تعمیر کی دو یادگار عمارتیں بھی ہیں۔ ایک تو گردشِ روزگار سے کھنڈر میں تبدیل ہوگئی ہے اور دوسری کچھ بہتر حالت میں ہے۔ کہتے ہیں جب واہ باغ بن کر تیار ہوا تو شہنشاہ دیکھنے کے لئے آیا اور اس کی دلکشی کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا:

"واہ چہ باغ است!"

چنانچہ اسی وقت سے یہ "واہ باغ" ہر خاص و عام میں مشہور ہوگیا۔ اور آبادی کا نام بھی "واہ" پڑ گیا۔

رات کنک خاں کے ایک ملاقاتی بگّو خاں کی حویلی میں بسر کی۔ بڑی دیر تک الکتارے پر پنجابی اور مقامی گیت سنے، ہیر وارث شاہ کے شعر سُنے۔ اور خوب گہما گہمی رہی۔ بگّو خاں نے ہماری خاطر مدارات میں بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب آدھی رات کو بستر پر لیٹنے کا موقع ملا، تو لمحہ بھر ہی میں ایسی نیند آئی کہ دوسرے دن سورج چڑھتے آنکھ کھلی۔ کنک خاں اور بگّو خاں میرے بیدار ہونے کے جیسے منتظر تھے۔ جیسے ہی میں اُٹھا نہانے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ نہا دھو کر فارغ ہوا تو ناشتہ کیا۔ لسی، مکھن سے چپڑی ہوئی اور مہکتی ہوئی روٹیاں، ساگ اور اُبلے ہوئے انڈے کھا پی کر جیسے میرے ہاتھ پیروں میں بلا کی چستی آگئی تھی۔ اب ہم پنجہ صاحب کا گوردوارہ دیکھنے کے لئے روانہ ہوگئے۔

ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں سکھوں کی مقدس عبادت گاہ دوسری تاریخی یادگاروں کی طرح ویران اور خاموش تھی۔ اس کے پاس ہی ایک چشمہ دیکھنے میں آیا۔ جس کی صاف و شفاف سطحِ آب پر سنہری دھوپ نے چاندی کا پانی پھیر دیا تھا۔ تہہ کی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ نیچے کے پتھر الماس کی مانند جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ ہاتھ ہاتھ بھر سیاہ رنگ کی مچھلیاں اپنے گلپھڑے، پنکھ ہلاتی ہوئی سطحِ آب پر آ کر رک جاتیں اور منہ کھولے ہوئے ہمیں بڑے غور سے دیکھنے لگتیں۔ جیسے وہ ماضی کے درد بھرے افسانے سنانا چاہتی ہیں۔ ان کی موتی جیسی آبدار آنکھوں سے مایوسی اور دکھ کا اظہار ہو رہا تھا، لمبی مونچھیں اور دونوں بازو ہلا ہلا کر شاید اپنی ناکام جدوجہد کے بارے میں کچھ بیان کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ غریب مچھلیاں ہمارے پاس اپنی رہائی اور آزادی کی درخواست لے کر آئی ہیں۔ شائد صدیوں کے پُرانے اور روایتی چشمے کی قید و بند سے اُکتا گئی تھیں اور یہ چاہتی تھیں کہ ہماری طرح وہ بھی آزاد ہو جائیں اور کھلے آزاد پانیوں میں اچھلیں، کودیں اور رقص کریں۔ یہ سوچ کر مجھے ان غریب مچھلیوں پر بڑا رحم آیا۔ اتنے میں کنک خاں نے تھوڑے سے مُرمرے اور بھنے ہوئے چنے ان کے سامنے پانی میں ڈال دیتے اور وہ سب بھوک کے مارے دوڑتی ہوئی نیچے تہہ کی طرف چلی گئیں۔

آخر ٹہلتے ہوئے ہم دونوں گوردوارہ کے اندر جانے کے خیال سے بڑے دروازے کی طرف نکل آئے۔ لیکن وہاں سنگینوں کا پہرہ تھا، اس لئے واپس آگئے۔

دوسرے دن صبح ہم پنجہ صاحب سے ٹیکسلا روانہ ہوگئے۔ دوپہر سے پہلے ہی وہاں قیام کیا۔ اور کھانے کے بعد اصل مقام سے کوئی چار میل اور مسافت طے کر کے عجائب خانہ پہونچے۔ کئی چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ چوڑیاں، کنگھیاں، موسل، موتی کی مالائیں، چکیاں، صراحیاں، سونے چاندی کے برتن جنگی ہتھیار اور بہت سی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں تھیں، جن سے قدیم ہندو تہذیب و معاشرت کا پتہ چلتا تھا۔ کنک خاں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ کر مجھ سے دریافت کیا:-

"شاہ جی یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ اصل شہر ابھی تک زمین میں دفن ہے۔ مگر یہ تباہ کیسے ہوا تھا؟"

"اس کے متعلق مجھے بھی نہیں معلوم" میں نے جواب دیا۔

پھر عجائب خانہ سے باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں نے کنک خاں کے کندھے کا سہارا لے کر کہا:-

"اس شہر کی تاریخی کہانی بڑی طویل ہے۔ جب سکندر نے مغربی پاکستان کے اس علاقے پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، جن میں دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقے پر راجہ امبی حکمراں تھا اور ٹیکسلا اس کی راجدھانی تھی، جب سکندر واپس چلا گیا تو پھر یہاں کئی حکومتیں

(باقی صفحہ ۱۲۸ پر)
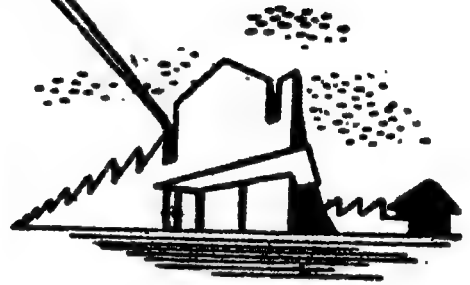
سائنس
آپ کی
خدمت میں
ہر ترقی پذیر تیل کی کمپنی کے لئے جدید ترین
آلات سے لیس تجربہ گاہیں بے حد ضروری ہیں
تاکہ سیال ایندھن اور مزلقات کے نمونوں
کا تجزیہ کر کے اس بات کا یقین کیا جا سکے
کہ گاہکوں کو موزوں ترین تیل فراہم کئے جا رہے ہیں۔
برماشیل کی تجربہ گاہیں، جو قیام پاکستان کے
ساتھ ساتھ وجود میں آئی تھیں، جدید ترین ساز و سامان
سے لیس ہیں اور ان میں کام کرنے والے بھی
اعلیٰ تربیت یافتہ کیمیا داں ہیں۔
یہ تجربہ گاہیں بلا معاوضہ گاہکوں کی خدمت کرتی ہیں
اور ان میں کئے جانے والے اہم تجربات نہ صرف
ہر قسم کی مشینوں کی کارکردگی میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ پیداوار
کی قیمت میں کمی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔
برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے

اکیلی بستیاں

محبوب خزاں

بکیں چمپلی، پھوے اکیلی، آہیں بھرے دل جلی
بھوری پہاڑی، خاکی فصیلیں، دھانی کبھی سانولی

جنگل میں رستے، رستوں میں پتھر، پتھر پہ نیلم پری
لہریلی سڑکیں، چلتے مناظر، بکھری ہوئی زندگی

بادل چٹائیں، مخمل کے پردے، پردوں پہ لہریں پڑی
کاکل پہ کاکل، خیموں پہ خیمے، سلوٹ پہ سلوٹ ہری

بستی میں گندی گلیوں کے زینے، لڑکے دھاچوکڑی
برسے تو چھاگل، ٹھہرے تو ہلچل، راہوں میں اک کھلبلی

گرتے گھروندے، اٹھتی امنگیں، ہاتھوں میں گاگر بھری
کانوں میں بالے، چاندی کے ہلے، پلکیں گھنی کھردری

ٹھڑی پہ چہرے، چہروں میں آنکھیں، آئی جوانی چلی
ٹیلوں پہ جوبن، ریوڑ کے ریوڑ، کھیتوں پہ جھالر چڑھی

وادی میں بھیگے روڑوں کی ہیٹی، چشموں کی چمپا کلی
سانچے نئے اور باتیں پرانی، مٹی کی جادوگری

غزل

سید ضمیر جعفری

درد میں لذت بہت، اشکوں میں رعنائی بہت
اے غمِ ہستی تری دنیا پسند آئی بہت

ہو نہ ہو دشت و چمن میں کچھ تعلق ہے ضرور
بادِ صحرائی بھی خوشبوئیں اٹھا لائی بہت

مصلحت کا جبر ایسا تھا کہ چپ رہنا پڑا
ورنہ اندازِ زمانہ پر ہنسی آئی بہت

بے سہاروں کی محبت، بے نواؤں کا خلوص
ہائے یہ دولت کہ انسانوں نے ٹھکرائی بہت

بے خیالی میں بھی کتنے فاصلے طے ہو گئے
بے ارادہ بھی یہ دنیا دور لے آئی بہت

مطمئن ہو دل تو ویرانوں کے سناٹے بھی گیت
دل اُجڑ جائے تو شہروں میں بھی تنہائی بہت

اپنی خلقت میں بھی روشن ہوں گے لیکن اے ضمیر
میری راتوں سے بھی تاروں نے چمک پائی بہت

غزل

عبداللہ خاور

ترے خیال نے شب کو فراق اثر نہ کیا
مگر ترے خیال نے آسودۂ نظر نہ کیا

ترا کرم ہے تری پردہ داریوں سے عیاں
نگاہِ شوق کو رسوائے رہگذر نہ کیا

ترے اسیر ہوئے خوگرِ درازِ شبی
گذار تو نے مگر جلوۂ سحر نہ کیا

نسیمِ صبح ترے منتظر ہیں غنچہ و گل
کہ ہم نے سوزِ تمنا کو منتشر نہ کیا

جو رہگذر تری وادی کی سمت جاتی ہے
اسے بھی حیلہ گرِ دل نے ہمسفر نہ کیا

وہ ناشنیدہ ترانے ہیں منتظر تیرے
جنہیں خیال نے آلودۂ ہنر نہ کیا

ہوس ہے دل کو اُسی رنگِ التفات کی آج
کہ جس نے کاوشِ حرماں کو بے اثر نہ کیا

شبِ فراق نے بڑھ کر مٹا دئے سائے
غمِ جہاں کو بہر حال معتبر نہ کیا

نگاہِ شوخ کی کچھ جنبشیں جو پنہاں ہیں
شعاعِ ماہ نے دل کی طرف گذر نہ کیا

ترے دیار کی بے مہریاں ہیں غور طلب
ترے جنوں نے بھی آمادۂ سفر نہ کیا

حریمِ ناز کے پردے بڑے سکوت میں ہیں
کہ آج آہ نے رخ سوئے بام و در نہ کیا

ہمارے غم لبِ اظہار پا سکے نہ کبھی
فسانۂ رخ و گیسو کو مختصر نہ کیا

حدودِ ذہن میں لمحہ کوئی نہیں خاورؔ
سکوتِ یاس نے جس کو گداز تر نہ کیا

شائستہ بیزار

گزر رہا ہے عجب طرح زندگی کا سفر
نہ رہبروں کی تمنا نہ منزلوں کی خبر

ہمیں خبر تھی نہ تم آؤ گے مگر پھر بھی
ہزار بار نگاہیں اٹھی ہیں جانبِ در

وہ راہرو ہیں کہ جب منزلیں قریب آئیں
خود اپنی گردِ سفر میں ہی رہ گئے کھو کر

غرورِ ترکِ تمنا کی خیر ہو یارب
وہ اجنبی سی نظر پھر ہے مہرباں ہم پر

یہ کس طرح سے سحر آج مسکرائی ہے
دل و نگاہ میں ٹوٹے ہزارہا نشتر

غمِ حیات کی منزل سے آؤ لوٹ چلیں
بہت اداس ہے سنتے ہیں ان کی راہگزر

غمِ جہاں کی کٹھن راہ کس طرح کٹتی
ترا خیال نہ ہوتا اگر شریکِ سفر

یہ کس مقام پہ لائی ہے بے حسی دل کی
نہ ظلمتوں کی شکایت نہ آرزوئے سحر

چلو کہ درد کے روشن کریں دئے بیزارؔ
بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں کب سے قلب و نظر

غزل

احسنؔ علوی

یادِ جفائے دوست نہ کیوں بھول جائیں ہم
آخر یہ رنج کس لئے ناحق اٹھائیں ہم

آخر قریب آ ہی گئی منزلِ مراد
کیوں شوق و آگہی کے نہ قربان جائیں ہم

ہمت سے کام لیں تو ہو بیدار اک جہاں
پھر کیوں نہ اپنے خفتہ مقدر جگائیں ہم

فرسودہ ہو چکے ہیں فلک تیرے شعبدے
آبادگاہِ دل میں تماشا دکھائیں ہم

رازِ ونیازِ عشق میں برپا ہو انقلاب
رنجور و شکوہ سنج ہوں وہ مسکرائیں ہم

کیوں احترامِ شیوۂ آہ و فغاں کریں
کیوں وقفِ آہ و نالہ ہوں کیوں گڑگڑائیں ہم

کتنی طویل ہے شبِ ہجراں، دلِ غریب
مضطر ہے بے قرار ہے کیسے لبھائیں ہم

احسنؔ کلامِ عہدِ جوانی تلف ہوا
اب کیسے سوزِ غم کی حکایت سنائیں ہم

●

مومن کا اندازِ فکر و بیان ــــــــ بقیہ صفحہ ۱۵

دھوم ہے تابشِ خورشیدِ قیامت کی مگر
مجھ سے اللہ نہ پوچھے گا عذابِ شبِ تار

غیر کو بام پہ آ جلوہ دکھایا تم نے
یہ نہ دیکھا کہ پڑا ہے کوئی زیرِ دیوار

شاد شاد آئے عیادت کو دمِ آخر تم
ایسے بیدرد پہ کرتا ہے کوئی جان نثار

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار
چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار

وہ جلے محفلِ دشمن میں جو ہو شمع لقا
مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار

آپ دیکھا نہ سنا اور سے پر جھوٹ نہیں
تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

یہ رفعتِ اور شوکت الفاظ فطرت نے ہر ذہن کو ودیعت نہیں کی۔ رفعت تخیل کا جائزہ لینے کے بعد ادب میں مومن کے صحیح مقام کا پتہ چل جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ مومن کے کلام پر بہت کم توجہ دی گئی ہے حالانکہ اردو کے اس شاعر پر ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے ؎

جہلم کے اس پار ــــــ بقیہ صفحہ ۴۳

قائم ہوئیں ۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ ٹیکسلا قدیم علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ ہر مکتبۂ فکر کے طالبِ علم دور دراز سے آکر یہاں فیضیاب ہوتے تھے۔ اس شہر کی رونق اور خوب صورتی کے بارے میں قدیم تاریخ میں بہت سے حوالے ملتے ہیں۔ لیکن اب شہر کی جگہ اس چٹیل میدان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تمام تاریخی کہانیاں فرضی داستانیں ہیں۔" میں نے سپاٹ میدان کی جانب اشارہ کرکے کہا۔ اور باتیں کرتا ہوا کنگ خان کو لے کر اس پہاڑی پر پہنچ گیا، جہاں شہر کے کچھ آثار نکالے گئے تھے ۔ جامعہ (یونیورسٹی) کی دو دو گز اونچی دیواروں کو دیکھ کر اس کے محل وقوع کا اندازہ لگانا بہت آسان تھا۔ اس کے علاوہ عبادت گاہیں، دیوتاؤں کے مجسمے، محرابی دروازے اور کچھ قبریں دیکھنے میں آئیں۔ اس زمانہ کا رواج تھا کہ مُردوں کو جلا کر ان کی خاک دفن کردی جاتی تھی۔"

"کافی دلچسپ شہر معلوم ہوتا ہے ۔ نہ معلوم ابھی اور کتنی ایسی عمارتیں ہوں گی جو زیرِ زمین مٹ چکی ہوں گی۔ مگر اس کی دریافت کا کام کس نے کیا؟"

"انگریزوں کے زمانے میں اس شہر کے آثار نکالے گئے تھے اور یہ کام ایک مشہور انگریز سر جان مارشل کی نگرانی میں انجام پایا۔"

کنگ خاں بڑی دلچسپی سے مصروفِ گفتگو تھا اور ہم دونوں پہاڑ کے دامن سے ہوتے ہوئے اسٹیشن کی سرائے کی طرف نکل آئے۔ شام کے دھندلکوں میں ہر چیز چھپ گئی تھی ۔ سورج ڈوبتے ہی تاریکی چھا گئی۔ پُرانے آثار اور یادگاروں پر جیسے اُلو بولنے لگا۔ سرائے کے چاروں طرف عجب ہُو کا عالم اور سناٹا تھا۔ چند مقامی لوگ آپس میں سرائے کے باہر دکان پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے لب و لہجے اور گفتگو کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے پنجابی بولی پشتو بولی سے گلے مل رہی ہے ۔

آیئے بہتر زندگی اختیار کریں

چاندی بوئیے، سونا کاٹیے!

کوئی دوسو برس پہلے کسی سیانے نے بڑی پتے کی بات کہی تھی - "بھائیوں مل جل کر کام کرو - ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاؤ - سب کاروبار اس طرح ہی تو چلتے ہیں" - لیکن شاید ان بڑے میاں کی نظر میں اس ساجھے کی حیثیت صرف اتنی ہی تھی کہ کسی کنبے یا قبیلے کے لوگ مل کر جنگل سے شکار مار لائیں یا عورتیں گھر میں بیٹھ کر ہانڈی روٹی پکائیں -

یہ تو بالکل پرانے زمانے کی بات ہے - اس میں اور آج کل کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے - اس میں ہاتھ بٹانا صرف چکی پیسنے میں ہی ہاتھ بٹانا نہیں بلکہ سو سو کاموں میں سو سو طرح ہاتھ بٹانا ہے - ذرا غور کیجئے - تجارت، زراعت، صنعت، سب کے سب کس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں - اکیلا آدمی تو سمجھ لیجئے بالکل نہتا یا اپاھج ہے - اب تو دو ہاتوں سے بھی ٹھیک تالی نہیں بجتی - جوکام ہوگا سنگت سے ہی ہوگا - چنانچہ اب تک سب ملک امداد باھمی کے اصول پر کام کر رہے ہین اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں -

پاکستان میں آپ جانیں نجی سرمایہ کچھ کم ہی ہے اور جو لوگ کسی کاروباری مہم کا بیڑا اٹھائیں انہیں حکومت کو تھوڑا بہت سہارا اور مالی امداد دینا پڑیگی - اس طرح جن کاموں کو برسوں لگتے ہیں وہ دنوں میں انجام پاجاتے ہیں - اب اپنے ملک کی طرف دیکھئیے، اس کا گذارہ ہی کھیتی باڑی پر ہے - ۸۰ فیصدی آبادی اس پر پلتی ہے - کسان جی لگا کر محنت کر تے ہین، لیکن اس سے کیا بنتا ہے؟ کھیتی باڑی کے طریقے تھوڑے بدل گئے ہیں یہ تو وہی صدیوں کے پرانے طریقے ہیں - بچارہ کسان دن بھر ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہائے لیکن ہاتھ کیا آئیگا؟ باقی دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی

مغربی پاکستان کا مطمئن و مسرور کسان

اور نئے نئے آلات سے پیداوار، سو بلکہ تین سو، گنا بڑھ گئیں، ہماری بہت بڑی ضرورت یہی تھی کہ جیسے بھی ہو کھیتی باڑی کی کایا پلٹ ہوجائے اور ہماری پیداوار ایک دم دوسرے ملکوں کے برابر ہو جائے -

ملک میں جابجا کھیتی باڑی کے لائق زمین کے لمبے چوڑے ٹکڑے خالی پڑے تھے، یہ سیم، کلر، پانی کی وجہ سے بیکار تھے - اس طرح دولت کا بہت بڑا ذریعہ محض بے توجہی سے ضائع جارہا تھا -

کھیتی باڑی کو بہتر بنانا، بنجر زمین کو زیر کاشت لانا، پانی کا بندوبست، یہ ایک بہت بڑی مہم تھی - سوال یہ تھا کہ بیل منڈھے کیسے چڑھے - زمیندار اپنے بل بوتے پر مشین خریدنے سے تو رہے۔

اس کا حل ایک ہی تھا - یہ کہ کاشتکاری کو پرانے ڈھرے سے نکال کر نئے واستے پر ڈالا جائے اور اس کو دوسرے ملکوں کی طرح کے سازو سامان سے لیس کیا جائے - اس مقصد کے لئے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا گیا جس کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں - نام بھی سن لیجئے : مالی کارپوریشن برائے ترقی زراعت۔

اس مقصد کے لئے ایک مالدار مرکزی ادارے کی ضرورت تھی جس کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہوں - چنانچہ سنہ ۱۹۵۲ع میں ایسا ہی ایک ادارہ قائم کیا گیا - یہ ادارہ ایک

ٹریکٹر سے پیداوار میں اضافہ

قسم کا بنک ہے جو کسانوں اور زمینداروں کو کھیتی باڑی کی ترقی کے سلسلے میں قرضہ دیتا ہے -

شروع میں خیال تھا کہ کارپوریشن کا سرمایہ اس کے حصے فروخت کر کے جمع کیا جائے جن میں سے ۵۱ فیصد حکومت خریدے اور باقی صوبائی حکومتوں اور عام لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جائے، لیکن اس طرح بات بنتی نہ تھی - سال ہی بھر کے اندر طے کرلیا گیا کہ کل سرمایہ حکومت ہی فراہم کرے گی - چنانچہ اب تک تین کروڑ روپیہ دیا جاچکا ہے -

کارپوریشن کے فائدے کا اس سے اندازہ کرلیجئے کہ اب تک چھوٹے چھوٹے کسانوں اور کاشتکاروں کو تقریباً سوا کروڑ کے قرضے دئے جاچکے ہیں - لوگوں نے سب سے زیادہ قرضہ ٹریکٹروں اور کل پرزوں کے لئے لیا ہے - ٹیوب ویل لگانے، ڈیری فارم کھولنے، بیل خریدنے، بند باندھنے، کھال کھودنے کے علاوہ لوگ نلکے لگانے، گودام بنانے، بیج اور کھاد خریدنے اور مچھلیاں اور مرغیاں پالنے کے لئے بھی قرضہ لیتے رہے ہیں - شروع میں سود کی شرح سوا چھے فی صد تھی - اب پانچ

فی صد ہے۔ یہ شرح بہت مناسب ہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ، جہاں حکومت کارپوریشن کو اخراجات کی گرانٹ بھی دیتی ہے یہ شرح کم ہے۔ امداد باہمی کی انجمنوں کے لئے تو شرح سود اور بھی کم ہے۔ ان سے صرف چار فیصد وصول کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ آگے قرضے دے سکیں۔

قرضہ لینے کی شرطیں بہت آسان ہیں۔ طریقہ بھی سیدھا سادا ہے۔ ہر زراعت پیشہ شخص قرضہ لینے کا حقدار ہے۔ یا ایساہر شخص جو قرضہ لے کر کھیتی یا کھیتی کی پیداوار کو ترقی دینا چاہے ، پھر لمیٹیڈ کمپنیاں اور امداد باھمی کی سوسائیٹیاں بھی وہ قرضہ لے سکتی ھیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ مالی کارپوریشن کے قرضے ایسے نہیں کہ ان کے بعد تقاوی اور امدادی قرضے نہ مل سکیں۔ یہ اپنی جگہ ھیں اور وہ اپنی جگہ۔ اگر سائل اپنا حق ثابت کرسکے تو وہ یہ قرضے ان کے علاوہ لے سکتا ہے۔

پانچ سو روپے تک قرضہ لینے کے لئے ایک ضمانت اور ایک معاھدہ کافی ہے۔ زیادہ رقم کیلئے جائداد اور زمین گروی رکھنی پڑتی ہے۔ فرد کے لئے زیادہ سے زیادہ قرضے کی حد ایک لاکھ روپیہ اور کمپنی یا سوسائٹی کیلئے پانچ لاکھ ہے ، لیکن اس میں بھی کام نہ چلے اور کام ایساھی مفید اور ضروری ھو تو فرد کو دو لاکھ اور کمپنی یا سوسائٹی کو بیس لاکھ تک دیا جا سکتا ہے۔ قرضے کی وصولی میں بھی آسانیاں دی جاتی ھیں۔ تاکہ مقروض چھوٹی چھوٹی قسطیں ادا کرتا چلا جائے اور تکلیف نہ اٹھائے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو بیس بیس سال کی مہلت دی جا سکتی ہے۔ ضمانت میں جائداد کی مالیت قرضہ کی رقم سے دگنی ہونی چاھئے۔ سرکاری ضمانتوں کی صورت میں بازار کے بھاؤ کا پچھتر فیصد تک مل سکتا ہے۔ زندگی کا بیمہ ھو تو ادا شدہ رقم کا ۹۰ فیصد دیا جا سکتا ہے۔ اور اب تو متروکہ جائدادوں کی ضمانت بھی قبول کر لی جاتی ہے۔

کارپوریشن کا کام ایسا آسان نہیں جیسا سائل کا۔ یہاں بڑی پیچیدگیاں ھیں۔ زرعی ترقی کا کام صنعتی ترقی سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ مثلاً صنعت کے مرکز بڑے بڑے شہروں میں ھیں جہاں نفع نقصان کا حساب بیٹھے بٹھائے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن زرعی آبادی ملک کے دور دراز اور ناقابل سفر کونوں میں ہے جہاں سائلوں کی عرضیوں کی چھان بین ھی کے لئے کہیں زیادہ عملے کی ضرورت ہے جو ضروری تحقیقات کے لئے گھر گھر دوڑے اور کھیت کھیت جائے۔ ظاھر ہے کہ یہ بڑی محنت کا کام ہے۔ اور آپ مانیں گے کہ رقم کے ڈوب جانے اور مقدمے بازی سے بچنے کے لئے جتنی بھی بھاگ دوڑ کی جائے کم ہے۔ کارپوریشن کے راستہ میں اور بھی کئی مشکلات ھیں۔ مثلاً مشرقی پاکستان میں لوگ قسطیں ٹھیک سے ادا نہیں کرتے۔ ویسے مغربی پاکستان میں بھی کہیں کہیں یہی حال ہے۔ سابق سندھ میں تو کام ٹھیک سے چل ھی نہیں سکتا۔ یہاں ایک قانون تھا جس کی رو سے تین سوایکڑ سے کم زمین رھن نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ قانون اب بھی نافذ ہے۔ اس کی وجہ سے چھوٹے کسان زمین رھن نہیں رکھ سکتے اور نہ قرضہ

لے سکتے ھیں - پھر بعض علاقوں میں جمع بندی کے گوشوارے نا مکمل ھیں - مشرقی پاکستان میں تو بڑی گڑبڑ ھے - یہاں بندو بست اراضی کے انتقال چڑھائے ھی نہیں گئے اور زمین کی ملکیت کا کچھ پتہ نہیں چلتا - قلات میں جمع بندی کا وجود ھی نہیں چنانچہ ڈویژن کے کمشنر سے زمین کی ملکیت کے بارہ میں تصدیق نامہ لینا پڑتا ھے - مغربی پاکستان کے باقی حصوں میں تصدیق نامہ پٹواری دیتا ھے - لیکن جب کارپوریشن کا عملہ اسے اصل سے ملاکر دیکھنا چاھتا ھے تو اور بھی دیر لگتی ھے - ان مشکلات کے باوجود کارپوریشن نے حوصلہ نہیں چھوڑا اور برابر کام میں لگی ھے - افسوس کہ کارپوریشن کا کام ایسا نہیں کہ ھر شخص آنکھوں سے دیکھے - لیکن ایسا بھی نہیں کہ کچھ نظر ھی نہ آئے - کارپوریشن کے رجسٹر نہ دیکھئیے ، گاؤں میں جائیے اور لوگوں سے

نئی نہروں کے ذریعے آبپاشی کے بہتر ذرائع

بات چیت کیجئیے جنھوں نے قرضے لے کے سوکام نکالے ھیں ، زمینیں ٹھیکہ کی ھیں ، پیداوار بڑھائی ھے ، اپنی اور اپنے گاؤں کی حالت سدھاری ھے ، تب آپ کو معلوم ھو گا کہ کارپوریشن کے ھونے سے کیا فرق پڑا ھے - اس قلیل عرصہ میں کارپوریشن کو جتنی کامیابی ھوئی

ھے اور لوگوں کو جو فائدہ پہنچا ھے اس کے پیش نظر فیصلہ کیا گیا ھے کہ کارپوریشن کی بہت سی شاخیں قائم کی جائیں تاکہ لوگوں کو قرضہ لینے میں اور بھی آسانی ھو - چنانچہ کراچی، لاھور اور ڈھاکہ کے علاوہ نئے کھلنے والے دفتروں کی تعداد نو ھے اور یہ تو ابھی ابتدا ھے، جب کام ذرا اور چل نکلیگا اور لوگوں کو کارپوریشن کے فائدے اچھی طرح معلوم ھوجائینگے تو نتیجے اور بھی اچھے نکلینگے *

ماہِ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۷ء

عوامی گیت:

سسّی

نور آخگر تونسوی

دریائے سندھ کے اس پار، دریائے سنگھڑ کے کنارے آباد سرزمین تونسہ نے نہ جانے کتنے انقلابات زمانہ دیکھے ہیں اور کتنے ہی انقلابات سے آج بھی دوچار ہے۔ یہاں عہد ماضی میں نہ جانے کتنے حوادث و واقعات نے جنم لیا اور کتنے ہی ابھی کتمِ عدم میں پڑے ہیں اس ریتلی زمین کا ہر ایک ذرہ اپنی پرانی تاریخ کا آئینہ دار ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر ان پرانے واقعات کو عوام کے سامنے کھول کھول کر بیان کر رہا ہے جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ عہد ماضی کے کتنے ہی لوگوں نے ان واقعات کو سنا سمجھا اور لوحِ دل پر کندہ کر لیا۔ یہی واقعات سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہوتے اس دور تک بھی پہنچ گئے ہیں آجکل بھی کہیں کہیں ان کو کسی کی زبان سے سنا جا سکتا ہے۔ یہ واقعات ہماری پرانی تہذیب اور ثقافت سے متعلق ہیں۔

اگر ان عوامی روایات کو ہم نے اب جمع نہ کیا تو استدادِ زمانہ کے ہاتھوں وہ فنا ہو جائیں گے۔ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر مغربی پاکستان کی قدیم تاریخی سرزمین تونسہ کی ایک ثقافتی جھلک یہاں پیش کی جاتی ہے۔

جب تونسہ کی ریتلی زمین سورج کی کرنوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے بعد دوزخ کے گرم ترین طبقے کی طرح گرم ہو جاتی ہے، جب یہاں کی گرم لو کے جھکڑ چلتے ہیں اور یوم الحساب کی العطش کو یاد دلاتے ہیں۔ جب یہاں کے غریب و نادار کسانوں اور کاشتکاروں کی آرزوؤں کی کھیتیاں مرجھانے اور کملانے لگتی ہیں تو ہر آنکھ بے بسی کے عالم میں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہے اس وقت ہر انسان کا سر ایک حقیقی کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے کہ وہی بندوں پر اپنی رحمت ارزانی کرے گا اور یہ تونس، (پیاس اور شدت گرما) دفع ہوگی۔ باران رحمت کی ایک جھال گرے گی اور روحیں تازہ ہو جائیں گی

سورج اس ریتلی زمین کو آگ کے گولے کی طرح گرم کر کے خود پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے تو لو کے جھکڑ اپنی خفیف سی سردی کے ساتھ ریت کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے زمین ٹھنڈی ہونے لگتی ہے۔ اب چاند اپنی پوری کرنوں اور روشنی کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر ہو جاتا ہے اور تونسہ کی وہ زمین جو تھوڑی دیر پہلے سورج کی گرم کرنوں کی زد میں تھی اب چاند کی ٹھنڈی اور صحت بخش کرنوں سے ڈھک جاتی ہے۔ وہ زمین جو سورج کی گرمی سے بالکل مردہ ہو چکی تھی اب زندہ ہونے لگتی ہے —— اس وقت تونسہ کی نواحی بستیوں میں نوجوان لڑکیاں مختلف گروہوں میں اکٹھی ہو کر بڑی بوڑھیوں کی زیرِ ہدایت ایک دیہاتی لوک گیت گاتی ہیں۔ جسے "سسّی" کہا جاتا ہے۔ اس دیہاتی علاقہ میں یہ اعتقاد پایا جاتا ہے کہ "سسّی" کہنے سے رحمت خداوندی جوش میں آ جاتی ہے اور اتنی بارش ہوتی ہے کہ اس علاقہ کی ریتلی اور پیاسی زمین جل تھل ہو جاتی ہے۔ پہاڑی نالے جوش میں آ جاتے ہیں۔ اور اس زمین پر جہاں پانی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ پانی کی ایک موٹی تہہ بچھ جاتی ہے۔ نادار اور غریب کاشتکاروں اور کسانوں کی کھیتیاں سرسبز ہونے لگتی ہیں اور تمام زمین پر زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

"سسّی" ایک لوک گیت ہی نہیں بلکہ ایک برساتی نغمہ بھی ہے۔ فی الحقیقت وہ ایک گیت نہیں بلکہ پورا واقعہ ہے جو تونسہ کی سرزمین پر ہوا۔ ہزاروں دوسرے انسانی واقعات کے ساتھ یہ گیت ایک دکھیا ماں کی فریاد ہے جو اس نے اپنی لڑکی کی یاد میں خون کے آنسو رو کر اپنے خونِ دل سے لکھا۔ پھر یہ واقعہ مشہور ہوتے ہوتے ایک گیت کی صورت میں بکھر گیا اور تونسہ کے نواحی علاقہ میں آجکل بھی اتنا ہی مشہور ہے جتنا کہ کسی اگلے سمے میں تھا۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ کے تونسہ میں تشریف لانے سے پہلے (یعنی ۱۷۸۵ء سے پہلے) تونسہ ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ اس جگہ پر جہاں آجکل تونسہ کا وسیع اور عریض قصبہ پھیلا ہوا ہے ریت کے ان گنت ٹیلوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ آجکل بھی یہ ٹیلے تونسہ کے نواحی علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں، اس وقت یہاں دو تین بلوچ قبیلے آباد تھے۔ ان کی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے دو تین گھرانے قصباتی کاریگروں یعنی موچیوں، کمہاروں اور بڑھئیوں کے بھی موجود تھے۔ انہی گھرانوں میں سے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک اندھی عورت رہتی تھی جو بیوہ بھی تھی۔ اس کی زندگی کا سہارا صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام سسّی تھا۔ وہ

بے چاری عورت امیر گھرانوں میں نوکری کر کر کے اپنا اور اپنی لڑکی کا پیٹ پالتی تھی وہ خود تکلیف اٹھاتی تھی لیکن "سمی" کو تکلیف نہیں پہنچنے دیتی تھی اس طرح اچھے یا برے زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لڑکی بھی جوان ہوگئی۔ اب اس بیوہ کو داماد ڈھونڈنے کا اہم اور نازک مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اپنی منشا کے مطابق نیک اور اچھا رشتہ "سمی" کے لئے نہ مل سکا۔ جس طرح آجکل اچھے برے سب طرح کے سب ہی لوگ ہوتے ہیں اس وقت بھی ایسے ہی تھے۔ ان دنوں وہاں ایک بداخلاق آدمی تھا۔ اس نے ایک دن موقع پاکر اس بیوہ کو دھوکہ دے کر اس کی لڑکی کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور اسے لے جاکر ایسا روپوش ہوا کہ پھر اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ایک تو بے چاری غریب اور پھر ماں متا کی ماری تھی اس لئے وہ سوائے رونے دھونے کے اس وقت اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس غم نے اس کے دل پر اتنا اثر کیا کہ اس کے منہ سے جو آہ نکلتی شعر بن جاتی۔ چنانچہ ان اشعار کو جو دراصل فراق کے گیت ہیں اس لڑکی کے نام پر "سمی" کہا جانے لگا۔

جب ۵۸۱۸ء میں حضرت خواجہ سلیمانؒ سرزمین تونسہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تو اس وقت "سمی" کے یہ گیت کافی مشہور ہو چکے تھے جب بھی لوگ بارش نہ ہونے کی شکایت کرتے تھے تو حضرت خواجہ سلیمانؒ انہیں "سمی" گانے کی ہدایت کیا کرتے تھے کیونکہ یہ ایک دکھی دل کی فریاد تھی۔ "سمی" اتنا دردناک گیت ہے کہ اس کے کہنے سے رحمت الٰہی بھی جوش میں آجاتی تھی اور سرزمین تونسہ بارش کی رحمت سے جل تھل ہو جایا کرتی تھی۔

یوں تو سمیاں بہت ہیں مگر ذیل میں سمی قسم کا ایک گیت جو چند بندوں کی حالت میں ہے پیش کرتا ہوں؟

اچا ککڑ ست موڑیاں نی مچا ڑیاں شمڑیاں وانگ

کسی تاں دیلارات دامیڈا آیا شیرن محل

شیرن دی منگیں ڑی جڑ بیٹھی گو ڈے نال

سمی اللہ وسائی گھر آ

(ترجمہ) اے مرغ زور سے "سمی" کو آواز دے جو ایک موچی کی لڑکی ہے۔ اسے بتا کہ شیرن (سمی کا ہونے والا خاوند) بھی کل رات کو گھر آگیا ہے۔ شیرن کی ہونے والی بیوی بھی اس کے پاس آکر بیٹھ جائے۔ اے سمی تجھے اللہ اپنے گھر لے آئے!

سمی جڑی کجاوڑے مچاندی سخڑی وانگ

پچھو روندی ما گھول گھتاں کجاوے کوں

میڈی صاحب موبی ما۔

(ترجمہ) سمی کو کجاوہ پہ لاد کر لئے جا رہے ہیں اور اس کی ماں اس کے پیچھے رو رہی ہے۔ خدا کرے وہ کجاوہ لوٹ جائے جس کے پیچھے میری ماں اپنی جان ہلکان کر رہی ہے۔

کندھی تے بروٹڑا مچاندی سخڑیں اے وانگ

جھل وے بروٹڑا جھل ساتھی تیڈے کڈ گئے

ڈونیڈاں ڈیکھ نہ بھل

(ترجمہ) دریائے سنگھڑ کے کنارے ایک پوٹا کھڑا ہوا سے ہل رہا ہے۔ اے بوٹے تیرے ساتھ کھیلنے والی سمی تو چلی گئی ہے تو نہ جانے کیوں بے پروا کھڑا ہے:

آجکل بھی جب بارش نہیں ہوتی تو عورتیں "سمی" گاتی ہیں۔ اس وقت ایک دردانگیز سماں بندھ جاتا ہے۔ بارش ہو یا نہ ہو لیکن ہر آنکھ ساون بھادوں کے بادل کی طرح ضرور برسنے لگتی ہے۔ اب اگرچہ "سمی" کی اہمیت ایک برساتی گیت کی نہیں رہی لیکن ایک لوک گیت کی سی اہمیت اسے اب بھی حاصل ہے۔ اسے سن کر ہر اس شخص کی جو اس کے پس منظر کو جانتا ہو راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے اور بہت دنوں تک اس گیت کی دردناک تانیں دل میں ہلچل پیدا کئے رہتی ہیں۔ وقت بڑی تیزی کے ساتھ گزرتا جا رہا ہے۔ نہ جانے ہمارے لوک گیت جو ضائع ہو گئے ان ہی کی طرح یہ گیت بھی ختم نہ ہو جائے اور صرف اس کی یاد دلوں میں باقی رہ جائے کیونکہ لوگ اب اور ہی طرح کی موسیقی اور گیت پسند کرنے لگے ہیں۔

عناب ——— بقیہ صفحہ ۱۸

بقیہ صفحہ ۱۸

چومنے لگی، لیکن نوجوان پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے احتیاط سے اپنے پاؤں چھڑائے اور پھر منزل کی طرف چل پڑا۔ لونگینہ کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اور وہ بدستور جھاڑیوں پر اپنی آنکھیں ملتی رہی۔ ان کو چومتی رہی کہ یہ اسی کے پاؤں ہیں — لوگوں نے کہا کہ اٹھ دیوانی وہ تو جا چکا۔ لیکن لونگینہ نے ایک نہ سنی۔ وہ پھولوں کو چوم رہی تھی اور پکار رہی تھی:

اے میرے عناب کے پھول آ
آ کہ میں اپنی خوشبوئیں تجھے بخش دوں

صبح سے شام ہوگئی۔ سورج پہاڑیوں کی جھولی میں چھپ گیا۔ شام سے رات ہوئی پھر دن اور پھر رات .... بہار گرمی میں تبدیل ہوگئی اور پھر برفانی چوٹیوں سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آنے لگے۔ اور ایک روز وادی، چراگاہوں سے لوٹنے والے ریوڑ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

نوجوان گڈریے کے پاؤں آپ سے آپ اس مقام پر رک گئے جہاں لونگینہ نے اس کا راستہ روکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جھاڑیوں کی خشک شاخوں میں لال لال عناب چمک رہے ہیں جو وادی کے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب لونگینہ کے خون جگر کی تاثیر ہے۔ لونگینہ جس نے ان جھاڑیوں کو چومتے چومتے اپنی جان دے دی۔ اسی کے ہونٹوں کی حدت، شوق کی فراوانی اور جذبے کا خلوص عناب بنا کر چمک رہا ہے۔ ان میں اسی کے ہونٹوں کی رنگت اسی کے جوان لہو کی لالی ہے۔

گڈریا خاموش کھڑا سنتا رہا۔ لوگ جب سب کچھ کہہ چکے تو نوجوان نے جھک کر ایک عناب توڑا۔ اور اسے اپنے ہونٹوں پر پھیرا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے۔ اس نے ایک دبی دبی ہلکی سی آہ کھینچی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اس مٹی میں جذب ہوگئے!

کافرستان کے لوگوں کو اب صرف لونگینہ کا نغمہ یاد رہ گیا ہے۔ کہانی کو وہ بھول چکے ہیں معلوم نہیں یہ ان کہی کہانی میرے ذہن میں کیسے آگئی؟

جو مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو ضرورت بھر یا بالکل ہی چھاتی کا دودھ نہ پلا سکتی ہوں وہ آسٹر ملک پر پورا بھروسہ کر سکتی ہیں۔ یہ بالکل خالص، قوت بخش اور نہایت عمدہ دودھ ہے جسکو اس طرح سے بنایا جاتا ہے کہ بچوں کے ہاضمہ کے موافق ہو۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ آپ اپنے بچے کی نشو و نما سیدھی پیٹھ اور بازوؤں کی مضبوطی کے لئے آسٹر ملک پر پورا اعتماد کر سکتی ہیں۔ یہ خاص کر پاکستان میں شیر خوار بچوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔

ہر ماں کے لئے مفید مشورہ

بچے کی دودھ پینے والی بوتل کو صاف اور جراثیم سے پاک رکھنے کے لئے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لیجئے اسمیں خالی بوتل ڈال کر اتنا گرم کیجئے کہ اُبلنے لگے۔ پھر بوتل نکال لیجئے لیکن اُس کے اندرونی حصہ کو صاف کرتے وقت خشک نہ کیجئے۔

آسٹر ملک

ماں کے دودھ سے قریب تر

گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ

کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

R. 60

”جنت نگاہ“

ڈیر سے چترال تک مغربی پاکستان کا سراپا بہار پہاڑی علاقه
جس میں تاحد نظر پھول ھی پھول نظر آتے ھیں

ہماری ادبی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم جزو ہے ۔ ملت کے ذہن و کردار کی پرداخت پچھلے دو سو سال میں کس کس طرح ہوتی رہی اور کن کن اعمال دمال کی جلوہ گری ہمارے قومی شعور کی تہذیب و تربیت میں شامل رہی اس ۔ صحیح اندازہ کرنے کے لئے اردو کی حریت پسند شاعری کے پچھلے دو سو برس کے سرمائے پر نظر ڈالنا ضروری ہے ۔

ادارہ نے اس ضخیم مجموعے میں دو سو برس کی ملی شاعری کا انتخاب پیش کیا ہے جس میں اردو کے بیشتر بلند پایہ شعرا کا کلام یکجا ہو گیا ہے ۔ اس طرح یہ نہ صرف حوادث ملی کی ایک منظوم داستان ہے ، بلکہ ایک نادر ادبی انتخاب بھی ۔ جس کی قدر و قیمت محتاج بیان نہیں ۔

ترتیب و مقدمہ : **شان الحق حقی**

اس دو سو سال کی شاعری کو چند ابواب میں سمویا گیا ہے ۔ مثلاً :

۱۸۵۷ء سے پہلے — **انقلاب ۱۸۵۷ء کا دور**

پیغام بیداری — **جدید عہد** — **صبحِ نو**

جلد ، سرورق خوبصورت ، رنگین اور دیدہ زیب

پوری کتاب نہایت نفیس اردو ٹائپ میں طبع کی گئی ہے

صفحات ۳۰۰ -- قیمت چار روپے آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ماہِ نو

دسمبر ۱۹۵۷

نذر سجاد حیدر — میراجی — صفیہ شمیم

روشن صدیقی — الطاف گوہر — سراج الدین ظفر

ڈاکٹر تصدق حسین خالد — سید عبدالحمید عدم — شیر افضل جعفری

سید جعفر طاہر — عبدالعزیز خالد — حمید کاشمیری

۲

۱

۳
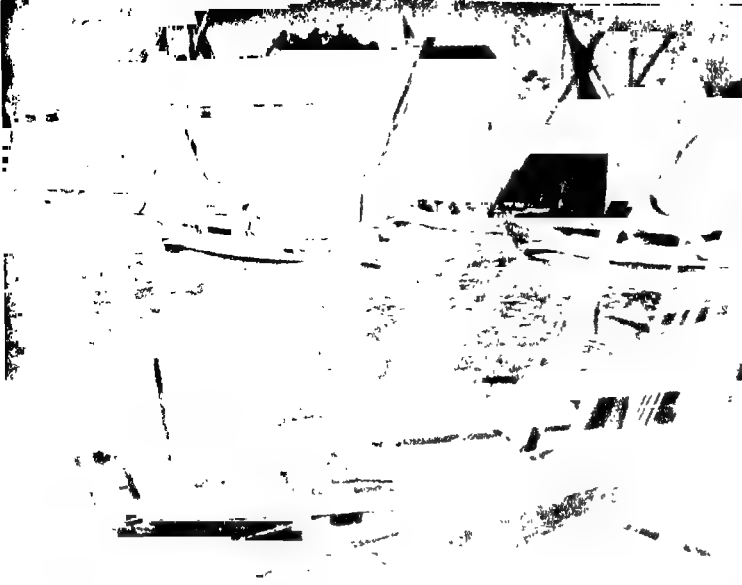
کراچی

(چند جھلکیاں)

(ملاحظہ ہو مضمون ''قدیم کراچی'' صفحہ ۹۴)

۱- کیماڑی کا پل : ''سونے منزل''
۲- نیٹو جیٹی : صدھا سال سے ماہی گیر کشتیوں کا
۳ فریر ہال : مشہور تاریخی عمارت جو اب ہمارا عجائب گھر ہے
۴- ساحل کراچی : ''اختلاط موجہ و ساحل''
۵- منوڑہ : روشنی کا مینار
''یری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو ر

۵

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۹

دسمبر — ۱۹۵۷ء

مدیر

رفیق خاور

نائب مدیر

ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی — آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

آج قائدِ اعظمؒ کو ہم سے جدا ہوئے پورے نو سال گذر چکے ہیں۔ لیکن اُن کی یاد ہمارے دل میں برابر تازہ ہے۔ کیونکہ جو رشتہ ہمیں ان سے ان کے ساتھ وابستہ کرتا ہے وہ محبت کا لازوال رشتہ ہے اور ان کی جدائی نے اس کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے۔

قائدِ اعظمؒ کے سلسلہ میں ان کے مولد کراچی کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کا سنہرا ماضی ایک گہری دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے ایک مضمون نگار نے اس عروس البلاد کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر ایسی جھلکیاں دکھائی ہیں جو ہماری دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا سید ہاشمی فرید آبادی نے بھی لفظ "کراچی" کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اس کا نام قریش کی یادگار ہے، جن کی یہاں ابتدا میں اچھی خاصی آبادی تھی۔ کچھ عجب نہیں کہ ایسے موضوع پر قیاس اور تحقیق کے سرے آپس میں مل جائیں اور ایسی صورت حال پیدا ہو کہ حقیقت افسانہ اور افسانہ حقیقت بن جائے، تاہم اس بارہ میں جو معلومات بھی دستیاب ہوں، قابلِ قدر ہیں۔

یادرفتگاں کے سلسلہ میں ہماری نظر جواں مرگ شاعر میرا جی کی طرف بھی جاتی ہے، جس کو سمجھنے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ "حلقۂ اربابِ ذوق" ایک طرح انہی کی یادگار ہے۔ اس سال حسب معمول حلقہ کی شاخ کراچی نے ان کی برسی منائی۔ اس موقع پر جو چیزیں پڑھی گئیں، ان میں سے دو اس شمارے میں پیش کی جارہی ہیں۔ شاید الطاف گوہر کا مضمون میرا جی کے اعماق روح تک پہنچنے اور شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے۔

کچھ عرصہ ہوا نذر سجاد حیدر صاحبہ نے اپنے سوانح لکھنے شروع کئے تھے، یہ سوانح ابھی تک مکمل نہیں ہوئے۔ لیکن ان کا ایک حصّہ جو ہمیں جلیل قدوائی صاحب کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے، اس شمارہ میں پیش کیا جارہا ہے۔

پاکستان میں فنونِ لطیفہ کی روزافزوں مقبولیت نے آخرکار "پاکستان آرٹ کونسل" جیسے سرگرم ادارے کی شکل اختیار کی ہے، جو فنونِ لطیفہ کی ہمہ گیر نشوونما کا کفیل ہے۔ نقاشی کی پہلی کل پاکستان قومی نمائش اسی کی جدوجہد کی آئینہ دار ہے۔ یہ نمائش جس کی مختصر کیفیت اس شمارہ میں پیش کی گئی ہے، اس کی سرگرمیوں کا عکسِ اولین ہے۔

ادب کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور جلا دینے کی خواہش ہمارے اندر نئی نئی کوششوں اور تجربوں کی تحریص و تحریک پیدا کرتی ہے۔ اس مقصد کو بوجہ احسن حاصل کرنے کے لئے امعانِ نظر سے حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہم ایک نیا لائحۂ فکر و عمل تلاش کر سکیں۔ ایک مضمون بعنوان "تجربہ اور تخلیق" میں ایسی ہی کوشش نمایاں ہے۔ امید ہے کہ جس موضوع پر مضمون نگار نے قلم اٹھایا ہے وہ دوسروں کو بھی غور و فکر اور اظہارِ خیالات کی ترغیب دلائے گا۔

★

"مردِ راہ داں"

عبدالرؤف عروج

قبائے شب پہ ستاروں کی ملگجی سی لکیر
سکوت چیخ رہا تھا خلائے وحشی کا
نہ آرزو نہ تمنا نہ آگہی نہ طلب

سرشکِ دیدۂ دل کی بہار کاری تھی
سکوں نژاد فضاؤں میں بیقراری تھی
دلوں پہ ایک گماں زاد موت طاری تھی

عمیق سوچ کی دانش گداز راتوں میں
فتادہ گام — بہر گام صاحبانِ سفر

کوئی چراغ نہ تھا اہلِ کارواں کے لئے
ترس رہے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قلندرانہ عزایم کی مشعلیں لے کر
رکھی تھیں نبضِ زمانہ پہ انگلیاں اس کی
نشاطِ کارِ ہوس کے طلسم ٹوٹ گئے

بہ التہابِ جنوں، ایک رہنما اٹھا
مزاجِ عصر کو پہچانتا ہوا اٹھا
حجابِ مرحلۂ فکر و ارتقا اٹھا

دمِ مسیح وہی تھا وہی یدِ بیضا
حریفِ ورطۂ غم، کوکبِ جلال ہوئے

کفِ غبار کو تنویرِ آفتاب ملی
ضمیرِ وقت کو تقدیرِ انقلاب ملی

جمودِ کہنہ و افسردہ کی گرانی میں
عزمِ حقائق سنگیں کے زیر دستوں کو

دلوں کو دولتِ انوار سونپ دی اس نے
متاعِ عظمتِ کردار سونپ دی اس نے

اسی کا سازِ درا — یعنی اتحاد و عمل
قدم قدم پہ نئی منزلیں ابھرتی ہیں
اسی کی روح کا پرتو، اسی کے عزم کا عکس

بہ اہتمامِ یقیں حوصلہ بڑھاتا ہے
اسی کا سحرِ نظر راستہ دکھاتا ہے
دل و دماغ کے پردوں پہ نور تھراتا ہے

نشیدِ حریتِ فکر، آرزو اس کی
بہ بیکرانہ وستانہ زندگی کا خرام

اسے زمانہ بڑی حیرتوں سے تکتا ہے
یہ ارتقا کے قدم کون روک سکتا ہے

سلام اس کے خجستہ نظر جوانوں پر
گذر رہے ہیں ہر اک رہ سے سر اٹھائے ہوئے
جنوں نے محو کئے نسل و رنگ کے طاغوت
خیال فکر و نظر کی صفیں جمائے ہوئے

خضرِ راہ

مطلوب الحسن سیّد

پچھلی لڑائی سے چند مہینے قبل ہم چند دوستوں نے مشترکہ طور پر ایک چھوٹا سا مکان بمبئی میں کرائے پر لے رکھا تھا۔ ہم میں سے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی اور ہمارے مکان کا انداز ایک کالج کے بورڈنگ ہاؤس کا سا تھا۔ شام کو جب ہم سب اپنے اپنے کام سے واپس آتے تو طالب علموں کے انداز میں دن بھر کی کارگزاریوں پر تبصرہ ہوا کرتا۔

ہمارے اس گروہ میں ایک صاحب سب سے سن رسیدہ تھے۔ زیادہ نہیں صرف دو تین سال پہلے بھی ہم سب لوگ ان کو بھائی کہا کرتے تھے۔

بھائی کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس لئے کہ جہاں ہم سب قائدِ اعظم کے بے حد مداح اور جاں نثار معتقدین میں سے تھے، بھائی بے انتہا مخالف اور شدید معترض تھے۔ مگر بھائی کو ہم سب پر فوقیت تھی۔ وہ اسلامی تاریخ سے بخوبی واقف تھے۔ اور بین الاقوامی معاملات میں کافی دخل رکھتے تھے۔ سیاست سے ان کو بہت شغف تھا، چنانچہ عموماً شام کو روزانہ، سیاسیات پر ہی بحث ہوا کرتی اور بھائی ہم سب پر چھا جایا کرتے۔

مگر بھائی میں ایک بڑی خوبی اور تھی اور وہ یہ کہ وہ ہر چیز کو عملی پہلو سے جانچا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ سخت اختلافات کے باوجود بھی ہم سب کے دلوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ہم سب کو یقین تھا کہ ان کی دانست میں اب تک قائدِ اعظم نے کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس سے وہ اپنی رائے تبدیل کر دیں۔

بہر حال بھائی کو دو باتوں کا یقین تھا: اسلامی تاریخ کے مطالعہ نے ان کو اس نظریہ پر مستحکم کر دیا تھا کہ انگریز مسلمانوں کے مفاد میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ دوسری طرف کمپنی کے ایک ہندو ادارہ کی ملازمت نے ان کو یقین دلا دیا تھا کہ مسلمان خواہ وہ کتنا بھی قابل اور بے نفس ہو تعصب کی آنچ سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کا یہ نظریہ صحیح تھا یا غلط، مگر ان کو دونوں باتوں کا یقین کامل تھا۔ انہیں نظریات کے تحت ان کو قائدِ اعظم کی سیاست میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ انگریز یا ہندو سے کسی وقت بھی جنگ کرنے کو تیار ہوں گے۔ بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ کی ساری سیاست قائدِ اعظمؒ کے اپنے مفاد کے لئے ہے اور وہ اپنی قیادت کو اس حد تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ ان کو انگریز اور ہندو سے سودا کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ ہمیشہ ایک طرف قائدِ اعظم کی ولایتی تعلیم، مغربی طرزِ بود و باش اور دوسری طرف ہندو اداروں کی طرف ان کے رویہ کا ذکر کرتے اور کہتے تھے کہ اس قسم کا انسان مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں ہو سکتا۔

لیکن ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کے اخبار نے ان حضرت کے ذہن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس اخبار میں لاہور کی مشہور قرارداد کو موٹی موٹی سرخیوں میں پیش کیا گیا تھا۔ ہمارے ان بزرگ دوست نے وہ اخبار اور وہ قرارداد کئی مرتبہ پڑھی اور جب شام کو ہم سب جمع ہوئے تو کہا "مسلمانوں کو اگر کوئی قائد نصیب ہوا ہے تو وہ محمد علی جناح ہی ہیں"۔

ہم لوگ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اپنے کانوں پر یقین کریں یا نہ کریں۔ بھائی نے پھر کہا۔ "آج سے میں تم سب سے زیادہ قائدِ اعظم کا معتقد ہوں"۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے کبھی کسی کی زبان سے قائداعظم کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کیا۔

دو ہفتہ بعد جب مجھے قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تو میں نے ان کو یہ واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا "یہ شخص واقعی مسلمانوں کے میلانِ طبع کا صحیح نمائندہ ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس قرارداد کو ہماری قوم اتنی اچھی طرح سمجھے گی کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں گے"

اس کے بعد کے واقعات ہماری تاریخ میں اس قدر تازہ ہیں کہ ان کی تفصیل محتاجِ بیان نہیں۔

میں نے یہ واقعہ اس لئے بیان کیا ہے کہ اس سے قائداعظم کی عظیم شخصیت پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کوئی فیصلہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس کے متعلق انہیں یقین نہ ہو کہ وہ قوم کے احساسات کی پوری ترجمانی نہیں کرے گا۔

ایک مرتبہ میں نے قائداعظم سے پوچھا کہ ان کو اپنے فیصلوں پر اتنا کامل یقین کیونکر ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ہر فیصلہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم کے مفاد میں ہو اور فیصلہ کرنے والے کا ضمیر اس بات کی گواہی دے کہ وہ ایمانداری سے کیا گیا ہے، بس اتنا ہی کافی ہے۔ انہوں نے کہا، کچھ بھی ہو سچائی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔

قائداعظم اپنے فیصلوں میں کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے خطبوں میں ہزاروں بار کہا ہے "فیصلہ کرنے سے قبل خوب غور کر لو۔ سو بار بلکہ ہزار بار اور جب ایک نتیجہ پر پہنچ جاؤ تو پھر اس پر اڑے رہو" یہی وجہ ہے کہ قائداعظم نے اصولوں پر کبھی مصلحت کو ترجیح نہیں دی اور کبھی اصولوں پر سودا بازی نہیں کی۔ مثلاً حسب ذیل واقعہ سے بھی اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے:

مسٹر پریا بمبئی کے ایک مشہور وکیل تھے۔ انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ جس زمانہ میں قائداعظم وکالت کیا کرتے تھے، ان کے پاس ایک مقدمہ پیروی کے لئے آیا۔ مقدمہ جائداد کے متعلق تھا جس فریق کی طرف سے قائداعظم بحث کر رہے تھے، اس کے خیال میں جائداد کا حقدار وہی تھا، لیکن جو کاغذات عدالت میں پیش کئے گئے تھے ان کی رو سے جائداد مخالفوں کی ملکیت معلوم ہوتی تھی۔ جب یہ کاغذات قائداعظم نے ملاحظہ فرمائے تو انہوں نے اپنے موکل سے کہا کہ ان کی رائے میں جائداد پر اس کا کوئی حق نہیں اور یہ رائے دی کہ مخالفوں کی طرف سے سمجھوتہ کی تجویز قبول کر لے۔ موکل نے کہا "میں اس بات پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتا، کیونکہ مجھے معلوم ہے یہ کاغذات سب جعلی ہیں"۔

جب قائداعظم نے دیکھا کہ موکل اپنی بات پر اڑا ہوا ہے تو انہوں نے عدالت سے درخواست کی کہ اصل کاغذات کی تصدیق شدہ نقلیں منگائی جائیں۔ چنانچہ کچھ دن بعد وہ نقلیں پیش ہوئیں وہ بھی موکل کے خلاف تھیں۔ قائداعظم نے پھر زور دیا کہ سمجھوتہ کر لیا جائے مگر موکل نے کہا نہیں یہ نقلیں بھی جعلی ہیں۔ اس پر قائداعظم کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے اس کو سمجھایا کہ عدالت کی تصدیق شدہ نقلیں غلط نہیں ہوا کرتیں۔ موکل نے کہا "میں سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ آپ اصلی کاغذات منگا لیں"۔

کئی دن تک قائداعظم اپنے موکل کو سمجھاتے رہے کہ اس مقدمہ کی مزید پیروی کرنا خواہ مخواہ روپیہ ضائع کرنا ہے۔ اور بجز نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ موکل نے کہا کچھ بھی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ کاغذات جعلی ہیں۔ آپ اصلی منگائیں۔ بہرحال قائداعظم نے مجبوراً اصلی کاغذات منگانے کی درخواست دے دی۔

جب اصلیں عدالت میں پیش ہوئیں تو واقعی وہ قائداعظم کے موکل کے بالکل موافق تھیں۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ مخالفین نے رشوتیں دے دے کر تمام کاغذات جعلی بنوا لئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد قائداعظم نے کبھی اپنے موکل کو سمجھوتہ کی رائے نہیں دی اور نہ کبھی نقلوں پر اعتماد کیا۔

میراجی کی شخصیت

الطاف گوہر

میراجی کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے اب مجھے جھجک سی محسوس ہوتی ہے، شروع شروع میں یہ سوچ کر کہ میراجی کا دائرہ احباب بہت مختصر تھا اس لیے جس کسی کو بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو ضرور لکھ ڈالے میں نے بھی ذاتی مشاہدات قلمبند کر دیئے تھے، مگر اس کے بعد پتہ چلا کہ وہ دائرۂ احباب مختصر سہی مگر اس دائرہ کا ہر رکن اپنی جگہ معلومات کا سرچشمہ ہے، اور ایسی ایسی باتیں سننے میں آئیں کہ جو میرے گمان میں بھی نہ تھیں، بمبئی میں وہ بلانوشی کا عالم تھا کہ خم و ساغر سے معاملہ کچھ گھڑوں کے وسطی مدارج طے کرتا ہوا بالٹیاں لنڈھانے تک پہنچا، ان بالٹیوں میں کیا بھرا ہوتا تھا اس کے بارے میں روایت میں اختلاف ہے، ولایتی شراب، دیسی ٹھرا، پٹرول، کیروسین کا تیل، گدلا پانی، یا ان سب اجزاء کا مرکب، ایک اور صاحب نے فرمایا کہ لین دین کے معاملہ میں میراجی اپنی مثال آپ تھے، شروع میں ادھار لیتے تھے، اور بعد میں جیب کاٹنے لگے، جس دوست کے ہاں جاتے اس کے تکیے کے نیچے سے اشرفیوں کی تھیلی صبح سویرے منہ اندھیرے نکال کر اپنی راہ لیتے، سود خور پٹھانوں کو اگر کوئی چرکا لگانے میں کامیاب ہوا تو وہ میراجی تھے، پشاور سے رنگون تک یہ پٹھان لٹھ لئے میراجی کی تلاش میں سرگرداں رہے مگر وہ اطمینان سے بمبئی کے ایک ہسپتال میں سائنس کی ایرا پھیری میں لگے رہے، معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں بمبئی میں جو کوئی ادیب بھی تھا وہ دن بھر محنت مشقت کرتا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر میراجی کی حسب توفیق امداد بھی کرتا تھا، مرحوم و مغفور سعادت حسن منٹو کو یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ میراجی کو نہ صرف مفلسی بلکہ شراب خوری کی عادت بھی ہے، انہوں نے بارہا تلقین فرمائی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کی مگر میراجی نے ان کی ایک نہ سنی، اس کے باوجود منٹو مرحوم دامے درمے میراجی کی مدد کرتے رہے اور ایک دفعہ تو اپنے ساتھ انہیں ایک فلم اسٹوڈیو کے دروازے تک بھی لے گئے، پاکیزگی اور طہارت کا میراجی کو قطعی کوئی احساس نہ تھا، بڑھے ہوئے الجھے الجھے بال، پھٹی ہوئی میلی شیروانی، گھسے ہوئے تلے کا جوتا جس میں تسمے تک ندارد، اور صاحب کیا عرض کیا جائے۔ اور ملازمتیں تو نہ جانے کتنے لوگوں نے ان کو دلوائیں، مگر ان کی متلون مزاجی نے انہیں کہیں دم بھر کے لئے ٹھہرنے نہ دیا۔ یہ تو ہوئی ان کی ذاتی زندگی، اب شعر و ادب کی سنئے، جاہل مطلق، ادھر ادھر سے انگریزی اور فرانسیسی شاعری پڑھ کر مبہم مبہم باتیں کہتے تھے، ان کی ساری شاعری جنسی غلاظتوں سے بھری ہے مشاعروں میں جاتے تھے بالکل وحشت، پونا میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا بڑے عظیم الشان پیمانے پر جوش، جگر، فراق سبھی تھے، میراجی آئے اور حاضرین کی طرف پیٹھ کر کے پڑھنے لگے "نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا" غصہ کے مارے ساری محفل پر سکتہ طاری ہو گیا اور جب تک میراجی پڑھتے رہے محفل کا غصہ بدستور قائم رہا۔

ایک صاحب ہیں جنہوں نے بڑی عبادتی شان سے اردو تنقید پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور جس میں ہر ایسے سوال کا جواب موجود ہے جو مڈل کے طالب علموں کو امتحان میں پوچھا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی چیز ان کی فہم سے بالا نہیں ہو سکتی، میراجی کی دیدہ دہنی دیکھئے کہ ان کے سامنے اپنی ایک نظم "جنازے رکھے ہوئے ہیں ان کو اٹھاؤ، جاؤ" پڑھنے لگے، نظم سنتے ہی آپ نے کہا صاحب میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں، میراجی نے پہلے بند کی وضاحت کی ڈرتے ڈرتے، پھر دوسرے بند کی، مگر محض دو بندوں کی وضاحت سے نظم کا تیسرا بند کیسے واضح ہو جاتا، انہوں نے بڑا اصرار کیا کہ تیسرے بند کی وضاحت بھی کیجیے، میراجی کو یہ ماننا پڑا کہ صاحب تیسرے بند کے

معنی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں، صاحبِ تنقید نے فیصلہ دیا کہ میراجی کو اپنی نظموں کے معنی خود بھی معلوم نہیں ہوتے تھے، پڑھنے والے کوئی شاعر کے زر خرید غلام تو نہیں کہ دو بند سمجھ لینے کے بعد تیسرا بند بھی ضرور سمجھ لیں، اور جنہیں تنقید پر کتابیں لکھنا ہوں ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ خود ہی نظمیں پڑھیں اور خود ہی انہیں سمجھیں بھی۔

میں یہ باتیں سنتا ہوں تو سوچتا ہوں ممکن ہے میراجی وقت کے ساتھ ساتھ بدل گئے ہوں، جس میراجی کو میں جانتا تھا وہ ایک سیدھا سادا سا سچ مچ کا شاعر تھا، ایسا ہی جیسے کوئی گاؤں کا گویا جسے فطرت نے آواز بخش دی ہو اور جو دن بھر برگد کے نیچے بیٹھا گاتا ہے، یا کوئی جنگل کا جوگی جو پرندوں کی آوازوں میں کھویا ہوا فضا میں تکتا رہے، سیدھے سادے سچ مچ کے شاعر اس زمانے میں بہت کم ہوتے ہیں، شعری تخلیق کا فعل کچھ اس قدر الجھ گیا ہے کہ اب اس میں جذبات، فکر، استدلال، عقل سبھی کارفرما نظر آتے ہیں، جذبہ کی تمامیت اور راستی نہ صرف منتشر ہوتی ہے بلکہ اس میں ایسے اجزا بھی شامل ہو گئے ہیں جو بظاہر بے تعلق اور غیر مربوط معلوم ہوتے ہیں، پہلے جب عشق کی بات ہوتی تھی تو عشق ہی کی بات ہوتی تھی، بہت ہوا تو ایک آدھ اشارہ غمِ دوراں کی طرف ہو گیا مگر اب عشق کے تذکرے میں مہنگی کے بیوپار، روحانیت کے اسرار، شخصی اور سماجی نامرادی، سبھی کا ذکر آ جاتا ہے، آجکل کا شاعر فلسفی بھی ہے، منطقی بھی، مصور بھی ہے سنگتراش بھی، صوفی بھی ہے، گیانی بھی، میراجی یہ سب کچھ نہیں مگر اسے یہ سب کچھ بننا پڑا، وہ دور کسی گاؤں میں ہوتا تو اپنی کٹیا کے ایک سیدھے سادے دوارے سے دیکھتا:

"جنگل کی ہر اک ٹہنی نے سبزی چھوڑی، شرما کے چھپی تاریکی میں
اور رنگ برنگے پھولوں کے شعلے کالے کاجل بن کر روپوش ہوئے
اور بادل کے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی تکتے تکتے چنچل چندا کا روپ بڑھا
یہ چندا کرشن۔ ستارے ہیں جھرمٹ برندا کی سکھیوں کا!
اور زہرہ نیلے منڈل کی رادھا بنکر کیوں آئی ہے؟
کیا رادھا کی سندرتا چاند بہاری کے من بھائے گی؟
جنگل کی گھنی گپھاؤں میں جگنو جگمگ جگمگ کرتے، جلتے بجھتے چنگارے ہیں
اور جھینگر تال کنارے سے گیتوں کے تیر چلاتے ہیں،
نغموں میں بہتے جاتے ہیں! (سنجوگ)

اور اسی سے اس کی شعری تسکین ہو جاتی میراجی کی شخصیت کا اصل شعری جوہر فطرت سے قرب اور ردِ عمل کا خلوص اور سالمیت ہے، اس ردِ عمل میں بارہا بچے کے ذہن کی پاکیزگی اور سادگی کا احساس ہوتا ہے:

دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا
نہ ٹھہرے گا یہ سر پہ رات کی رانی کے اک پل کو
یہ روشن اور اُجلا چاند یعنی رات کا ہیرا
یہ اس کو جگمگاتے، چلتے تاروں سے
سجا کر لایا ہے گھر سے، (آمدِ صبح)

یا "ایک تصویر" میں سے:

کانوں میں ندو بندے جیسے ننھے ننھے جھولے ہیں
چنچل اچپل سندرتا کے سکھ دیں سب کچھ بھولے ہیں

جوڑا بیل بنا لیتا ہے باہیں گو یا ڈالی ہیں
بیل اور ڈالی کی روحیں یوں مست ہیں مدمتوالی ہیں

ان مصرعوں میں بالکل وہی کیفیت ہے جو دیہات کے نغموں اور بولیوں میں ہوتی ہے، ان میں نہ کوئی ابہام ہے نہ جذبے کا انتشار۔ ردعمل مشاہدہ کی طرح بلا واسطہ اور مکمل ہے، یہ کیفیت میراجی کی شاعری کے کسی مخصوص دور سے متعلق نہیں بلکہ شروع سے آخر تک موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۴۰ء سے پہلے کی نظموں اور گیتوں میں اس کی مثالیں نسبتاً زیادہ ہیں اور آخری چند سالوں کی نظموں میں یہ کیفیت بہت حد تک مدھم پڑ گئی ہے، ان کی نظم "دھوبی کا گھاٹ"، بہت بدنام ہوئی ہے، مگر اس میں بھی ایسے مصرعے موجود ہیں جن میں بچپن کی سی سادگی کا احساس ملتا ہے:

" کیوں صبح شبِ عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیت
سہلاتا ہے مجھ کو "

آخری دور کی ایک نظم ہے "ایک بچی عورت" یہ نظم اس وقت کی ہے جب میراجی پر قریب قریب سب کچھ گذر چکا تھا، اس میں ایک بے حد الجھے ہوئے تجربہ کا اظہار ہے، اس نظم سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں اسی پہلی سادگی اور پاکیزگی کی طرف لوٹ جانے کی کتنی بے پناہ خواہش ہے:

" یہ جی چاہتا ہے کہ تم ایک ننھی سی لڑکی ہو اور ہم تمہیں گود میں لے کے اپنی بٹھا لیں
یونہی چیخو، چلاؤ، ہنس دو، یونہی ہاتھ اٹھاؤ، ہوا میں ہلاؤ، ہلا کر گرا دو
کبھی ایسے جیسے کوئی بات کہنے لگی ہو
کبھی ایسے جیسے نہ بولیں گے تم سے
کبھی مسکراتے ہوئے، شور کرتے ہوئے، پھر گلے سے لپٹ کر کرو ایسی باتیں
ہمیں سرسراتی ہوا یاد آئے
جو گنجان پیڑوں کی شاخوں سے ٹکرائے دل کو انوکھی پہیلی بجھائے مگر وہ پہیلی سمجھ میں نہ آئے "

میراجی کی شعری شخصیت کی سادگی اور بچپن کی سی پاکیزگی کے عنصر پر آپ کی توجہ مرکوز کرانے کے لئے میں نے یہ سب مثالیں ایک خاص ترتیب سے منتخب کی ہیں، شروع میں جو باتیں میں نے میراجی کی ذات کے بارے میں ان کے جاننے والوں کی طرف سے بیان کی تھیں انہیں سن کر یہ خیال نہیں گزرتا کہ ایک ایسی الجھی ہوئی اور متنازعہ شخصیت کا کوئی پہلو اتنا سادہ اور صاف ستھرا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہے:

" کھلا کھیت گندم کا پھیلا ہوا ہے
بہت دور آکاش کا شامیانہ انوکھی مسہری بنائے رسیلے اشاروں سے ہیکار رہا ہے
تھپیڑوں سے پانی کی آواز بھی کے گیتوں میں گھل کر پھسلتے ہوئے اب نگاہوں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے "
(رس کی انوکھی لہریں)

مجھے میراجی کی شخصیت کے اس عنصر کی اہمیت کا اشارہ اس بات سے ملا کہ جس دور سے اس کا تعلق ہے اس دور کی شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ فیض، راشد، دونوں شخصیت کے اعتبار سے میراجی کی بہ نسبت کہیں زیادہ مربوط ہیں مگر ان کے مشاہدات اور تجربات میں ایک گہری سوفسطائیت پائی جاتی ہے، وہ فطری سادگی، اور ردعمل کی وہ اولیت جو لوک گیتوں میں ہوتی ہے وہ میراجی کے

علاوہ اس دور کے اور کسی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتی، اس چیز کا احساس مجھے میراجی سے ذاتی واقفیت کے بنا پر نہیں ہوا، ان کے جاننے والے شاید اس بات پر متفق ہوں کہ ہزار الجھنوں کے باوجود ان کی شخصیت میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو ایک مخصوص کشش رکھتی تھی، اور اب جو میں ان کے اور اپنے تعلقات کی بعض غیر اہم اور سرسری تفصیلات پر غور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے اس کشش میں فطری سادگی اور بچوں کی سی ایمان داری بھی تھی، میں ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں دلی گیا، ریڈیو اسٹیشن پر میراجی سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا یہ جو سوٹ آپ نے پہن رکھا ہے چونکہ مانگا ہوا معلوم ہوتا ہے لہذا پچاس نمبر تو اسی کے کٹ جائیں گے، انٹرویو کے کمرے کے باہر ہم لوگ بیٹھے تھے اور میراجی دن بھر ہمارے ساتھ رہے اور ہر ایک کو کامیابی کے گُر سمجھاتے رہے، اسی موقع پر انہوں نے ضیا جالندھری صاحب سے کہا تھا کہ ضیا صاحب انٹرویو کے دوران میں آپ عقل استعمال نہ کیجئے بس سیدھے سیدھے جواب دیتے جائیے۔

اس فطری سادگی کے باوجود میراجی کی زندگی اور شاعری دونوں بری طرح سے الجھی ہوئی سی رہی، بعض شعرا کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے، میراجی شاید اپنے وقت کے بہت بعد پیدا ہوئے، اور اپنے آپ کو وقت سے ہم آہنگ بنانے میں انہیں بڑی اذیت اٹھانی پڑی، جو وقت انہیں نصیب ہوا اس میں کوئی شے مستحکم نہ تھی، نہ سیاسی حالات پُرامن تھے، نہ کوئی سماجی اقدار قابلِ اعتماد تھیں۔ کوئی اخلاقی قدر ایسی نہ تھی جسے وہ اپنا رشتہ جوڑ کر اپنے تخلیقی جوہر کے اظہار کی کوئی راہ نکال سکتے، جمالیاتی نظریہ جو انہیں ورثہ میں ملا وہ یہ تھا کہ کوئی اخلاقی قدر قطعی نہیں اگر کوئی چیز قطعی ہے تو وہ حسن کی قدر ہے، ایک زمانہ کی اخلاقی قدریں دوسرے زمانے کی اخلاقی قدروں سے قطعی مختلف ہوتی ہیں حسن کی قدر البتہ ہر دور اور ہر زمانے کے لئے مشترک ہے، لہذا کردار اور عمل سے بے نیاز ہو کر میراجی نے حسن کی جستجو کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا، جی کے چیسٹرٹن نے وسلر کی مزاح نگاری پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ اسی موضوع کی طرف اشارہ کیا:
"جدید دور کے جمالیات پرست بڑے زوروں سے اخلاقی قدروں کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں..... وہ ہم پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ کردار سے زیادہ حسن کے قائل ہیں، میلارمے کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور گھٹیا شراب خانوں میں بیٹھ کر پیتے ہیں۔"

میراجی کے ظاہرہ کردار پر اس آخری جملہ کا پورا پورا اطلاق ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بہت سے جدید شاعر یہ سب کچھ دکھاوے کے لئے کرتے تھے اور میراجی مجبور ہو کر، وہ دور کسی گاؤں میں برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سیدھے سادے بول گاتے رہتے، تو انہیں نہ شراب کی ضرورت پیش آتی اور نہ میلارمے کی، چاند کا ڈھلا ہوا چہرا، ندی کا صاف پانی، جگمگ جگمگ کرتے تارے، گہری خاموشی اور رات کے سائے یہی ان کے لئے بہت ہوتے مگر چاند کے چہرے پر، ندی کی شفاف سطح اور چمکتے تاروں کی روشنی میں نجانے کیسے کیسے سیاہ دھبے پھیل چکے تھے، وہ اپنی سادگی کے باوجود ان الجھی ہوئی تاریک اور گھناؤنی لہروں کو دیکھنے پر مجبور رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہر پل اور ہر لمحہ کو حسن کا ہر مظہر سمجھ لیا، اور انہیں حواس کی لذت سے وابستگی ہو گئی۔

غزل

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس آیا نہ دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بری جیسے بھی گذری ان کے سہارے گذری ہے
حضرت دل جب ہاتھ بڑھائیں ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانہ آگے آگے پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں

دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے برباد ہر ایوان کریں

میر ملے تھے میراجی سے، باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

میراجی

ہر منظر، ہر انسان کی دنیا، اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے، پل بیتا، سب مٹ جائے گا
اس ایک جھلک کو چھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو،
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو،
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی ؟
ہے چاند فلک پہ اک لمحہ
اور اک لمحہ یہ تارے ہیں
اور عمر کا عرصہ بھی سوچو اک لمحہ ہے (چل چلاؤ)

یہ وابستگی رفتہ رفتہ جنسی لذت کی شکل اختیار کرنے لگی :

سفید بازو
گداز اتنے
زباں تصور میں حظ اٹھائے
اور انگلیاں بڑھ کے چھونا چاہیں مگر انہیں برق ایسی لہریں
سنسنی سی کی شکل دے دیں

اس وابستگی کی سب سے افسوسناک مثال "لب جوئبارے" ہے، شعری طور پر یہ نظم شاید اتنی گھناؤنی نہیں مگر جہاں تک شاعر کی شخصیت کا تعلق ہے وہ ضرور ایسی سطح پر پہنچ گیا جہاں سے ابھرنا اس کے لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے، اور اس سے خلش کی شدت کا پتہ بھی چلتا ہے،

"کیوں لمس کے حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی ؟" (دھوبی کا گھاٹ)

حواس کی لمحاتی لذت میراجی کی شخصیت پر اس طرح حاوی ہو گئی کہ ان کے لئے جنسی فعل کا ہر پہلو، ہر اشارہ حسن کا ایک مظہر بن گیا، اس موضوع پر ان کی جو نظمیں ہیں ان میں بعض سماجی مسائل کا بھی ذکر ہے، عورت کی بے حرمتی، مفلسی اور مجبوری کا، مگر نہایت سطحی اور سرسری طور پر میراجی کی شاعری کا یہ دور ایک عبوری حیثیت رکھتا ہے، اسی زمانہ میں ان کے دل میں لمحہ کے حسن اور حواس کی وقتی لذت کے بارے میں شکوک پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، کچھ اشارے تو ان نظموں میں بھی موجود ہیں جن کا خطاب مخصوص عورتوں سے ہے، اس شک کی سب سے واضح مثال ان کی نظم "اخلاق کے نام" ہے، اس نظم کا ایک مصرعہ جو مختلف صورتوں میں خیال کی حرکت کے ساتھ چلتا ہے بڑا اہم ہے "اور یہ جھوٹ بھی اک لمحہ جواں رہتا ہے" پہلی بار یہ بات میراجی پر بڑی شدت سے واضح ہوئی کہ لمحہ کا حسن اک جھوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور "دن کا ہر بھید ہے للچاتی ہوئی رات کا جادو، اس کو
کئی پھسلانے کے، بہکانے کے ڈھب آتے ہیں"

اس کے بعد میراجی کی شاعری کا وہ گہرا عارفانہ دور آتا ہے جسے تنقید نگار حضرات نے عموماً نظر انداز کیا ہے، اس دور کی نظموں کا رنگ "سمندر کا بلاوا" سے متعین ہوتا ہے، اس دور کی نظموں میں وہی پرانی شگفتگی، وہی فطرت سے قرب موجود ہے، اور ان میں ماضی کی طرف لوٹ جانے کی ایک پُر درد خواہش ہے "اے پیارے لوگو، تم دور کیوں"

میراجی کی شخصیت مجھے وقت کی ایک لہر معلوم ہوتی ہے جو بڑی سادگی اور حسن سے اتراتی ہوئی اٹھی، سنگریزوں پہ پھسلتی ہوئی نکلی، گھناؤنی چٹانوں سے الجھتی ہوئی بڑھی اور ایک سیاہ ساحل سے ٹکرا کر دم توڑ کر رہ گئی، مگر اس لہر کی ہر حرکت رنگین، اور جاندار تھی ۔

تجربہ اور تخلیق

اصغر بٹ

تجربہ سے مراد بظاہر تاثر اور ردعمل کا امتزاج ہے۔ تجربہ کرنا مراد نہیں ہے۔ تجربہ کا لفظ مشاہدے کے مقابلے میں اس لئے زیادہ موزوں نظر آتا ہے کہ فنی تخلیق کے لئے مشاہدے کی ضرورت بے شک سہی لیکن مشاہدہ جب تک محض شخصیت سے باہر کی دنیا کی تصویر بنتا ہے اور شخصیت کے اندر گہرے محرکات کا باعث نہیں بنتا فنی تخلیق کا موجد نہیں ہو سکتا۔ بیرونی دنیا کا ایک فن کار کی شخصیت پر اثر انداز ہونا مشاہدے کی حدود میں آتا ہے لیکن کبھی کسی فنی تخلیق کے لئے محض ایک تجریدی خیال ہی کافی ہوتا ہے اور اس تجریدی خیال کو کسی ایک بیرونی تاثر سے واسطہ نہیں ہوتا پس مشاہدے کو اس محدود تعریف کے ساتھ ہر فنی تخلیق کا محرک قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ ہر مشاہدے کو فن کار کے لئے ایک تجربہ ہونا پڑتا ہے، اور کبھی کبھی بہت سے مشاہدات شخصیت میں اس حد تک جذب ہو جاتے ہیں کہ جس ذہنی تجربے کو وہ جنم دیتے ہیں وہ ہر مشاہدے سے الگ اور ماورائی ہوتا ہے۔ پس تجربے کا مشاہدے کے مقابلے میں تخلیق سے کہیں زیادہ گہرا رابطہ ہے۔ اور کوئی معیاری فنی تخلیق اس کے بغیر ممکن نہیں۔

تجربے اور مشاہدے میں فرق واضح کرنے کے بعد خود تجربے کی نوعیت کی جانچ اس لئے ضروری ہے کہ ہر تجربے کے بعد تخلیق کا وجود میں آنا ضروری نہیں۔ تجربے میں کم از کم اتنی وسعت ہونی چاہیئے کہ ادب پارے کی وسعت اس سے زیادہ نہ ہو۔ مثلاً اگر تجربے کی وسعت کی بنا پر محض ایک افسانہ لکھا جا سکتا ہے اور کوشش یہ کی جائے کہ اس سے ناول بن جائے تو نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوگا۔ ناول کے تجربے کے لئے عمر کے ایک اچھے خاصے بڑے حصے کے واقعات کا ناول نگار کو متاثر کرنا ضروری ہے۔ اور اگر بات اتنی سی ہو کہ اس سے محض ایک لطیفہ مرتب ہو سکے اور اس پر پورا افسانہ لکھ دیا جائے تو وہی ناکامی ہوگی۔ نظم کے میدان میں طویل نظم کا تجربہ اور غزل کے ایک شعر کا تجربہ (اگر کسی کو غزل کے لئے کوئی تجربہ ہوتا ہے تو) مختلف فنی روپ اختیار کریں گے۔ وسعت کے بعد گہرائی آتی ہے۔ بلکہ شاید پہلے آتی ہے کہ اس کے بغیر کسی قسم کی فنی تخلیق ممکن نہیں۔ اور اس گہرائی کو قبول کرنے کے لئے نہایت حساس شخصیت کی ضرورت ہے۔ ایک ہی واقعہ شاید فنکار اور غیر فنکار دونوں کو متاثر کرے لیکن فنکار کے ذہن پر اس کا تاثر زیادہ گہرا ہوگا اور شاید زیادہ دیرپا بھی ہوگا۔ مثلاً سڑک پر موٹر کا حادثہ دیکھ کر ہر راہ گیر رک جائے گا۔ ہر اک کے دل میں تاسف کے جذبات ابھریں گے لیکن فن کار کی گوناگوں شخصیت میں بیک وقت سینکڑوں سوال پیدا ہوں گے۔ اور ان کے سینکڑوں ہی جواب آئیں گے۔ موٹر والے لوگ کون تھے۔ کیا سوچ کر گھر سے چلے تھے۔ گھر والے ان کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ حادثے کے وقت ان کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ اس سے کتنے گھروں کی زندگی اجڑے گی اور کہاں تک اجڑے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ درست ہے کہ دو فنکار اس ایک واقعے سے غالباً مختلف تاثر لیں گے۔ ممکن ہے دوسرا فنکار اسے خودکشی سمجھ کر اپنے ذہن میں الگ قسم کے واقعات سوچنے لگے۔ لیکن دونوں فنکاروں کا ذہنی تجربہ ایک عام راہگیر کے مقابلے میں زیادہ وسیع بھی ہوگا اور گہرا بھی۔

اب جس کڑی سے یہ تجربہ تخلیق میں بدل جاتا ہے۔ وہ ہے اظہار کی خواہش اور اظہار پر قدرت ـــ خواہش پہلے آئے گی تو اگلا قدم یعنی خود اظہار ممکن ہوگا۔ لیکن اگر حادثہ دیکھ کر اور اس سے پورا پورا تاثر اخذ کر کے بھی اس کے بارے میں قلم اٹھانے کو جی نہیں چاہا تو تجربہ فن کے لبادے میں نہیں آ سکے گا۔ اور اگر تجربہ مکمل ہے اور اس کے بیان کرنے کی خواہش بھی موجود ہے لیکن الفاظ پر قدرت نہیں ہے تو اظہار نامکمل ہوگا اور تخلیق ناقص ہوگی۔ پس وسیع اور گہرے تجربے سے لے کر خواہش اور اظہار تک کی منازل فنی تخلیق کے لئے ضروری قرار پاتی ہیں۔ لیکن اس میں گنجائش شخصیت کی اپج کی رہ گئی، فنکار کے منفرد نقطۂ نظر اور اس کے خلوص کی رہ گئی۔ ان کو شامل کر لیجیئے تو فن پارے میں جاذبیت کی کمی یا بیشی کا جواز مل جاتا ہے۔

اس ساری بات کے کہنے میں کوئی نئی تحقیق شامل نہیں۔ فن کے بارے میں ان حقائق سے لوگ پہلے سے آشنا ہیں۔ اب ان کو دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ کیا آج کی تخلیقات پر بھی ان حقائق کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور آج کی تخلیقات زیرِ بحث اس لئے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد سے ادبی تخلیقات کا کوئی مقام تعین نہیں ہو پایا۔ بعض نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اردو ادب میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا ہی نہیں۔ کچھ یہ کہتے ہیں پاکستان بننے کے فوراً بعد تو تقسیم اور فسادات کے موضوع اچھی خاصی ادبی تخلیقات کے محرک بنے لیکن پچھلے تقریباً پانچ چھ برس سے پاکستانی ادب پر مردنی چھا رہی ہے۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ادبی تخلیقات اور تحریکات کا مفصل تجزیہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک اقلیت اس سے غیر متفق بھی ہے یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ اردو ادب میں اب بھی کمال کی چیزیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن اس اقلیت کی آواز ذرا کمزور ہے اور انہیں اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں کافی دِقّت پیش آتی ہے۔ مقالہ نگار اپنا موقف ان دعووں کے بین بین سمجھتا ہے یعنی یہ کہ پاکستان بننے سے پیشتر اچھے لکھنے والوں کی کھیپ کی کھیپ نے جتنا معیاری۔ دلچسپ۔ متنوع اور زیادہ ادب اردو کو دیا۔ اتنا اس کے بعد کے لکھنے والوں نے نہیں دیا۔ مقدار کی بھی کمی رہی اور معیار کی بھی۔ لیکن جہاں جاندار تحریکات کا قریب قریب فقدان رہا وہاں فرداً فرداً بعض فنکار اپنی جبلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں یعنی پاکستان بننے سے پیشتر میراجی۔ کرشن چندر۔ عصمت۔ راجندر سنگھ بیدی۔ منٹو۔ راشد اور فیض وغیرہ کا نوجوان طبقہ تھا۔ پرانی اقدار سے بغاوت بھی تھی اور نئے میدانوں کی تلاش بھی۔ ایک ولولہ سا تھا جس میں باوجود فنی اور ذہنی اختلافات کے تکنیک میں تجربے کرنے کی خواہش اور اظہار کی بھرپوریت تھی۔ مارکیٹ میں نئی نئی کتابیں اور رسائل آ رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد معیاری ادیبوں میں سے قرۃ العین حیدر اور دو ایک اور لوگ رہ جاتے ہیں جو اسی ترنگ میں لکھتے رہے جس میں پاکستان بننے سے پیشتر لکھ رہے تھے لیکن ان کا فن ماحول سے اور بیرونی واقعات سے ماورا محض انفرادی ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس ادبی خلا کی ناقدوں نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ادیبوں کو مالی پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ جب حکومت نے ترقی پسند تحریک کو کچل دیا تو ادب کا ارتقا رک گیا۔ اسی خیال کے کچھ اور رہنما فرماتے ہیں کہ فی الحال طبقاتی جنگ اس منزل پر نہیں پہنچی جس پر پہنچ کر ادبی تحریکات کو جلا ملتی ہے اور ادیبوں کو لکھنے کے لئے اکساہٹ ہوتی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ پہلے ادبی تخلیق کا مقصد آزادی کا حصول تھا۔ جب آزادی مل گئی تو اب وہ محرکات نہیں رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ادب کس کے لئے لکھیں۔ ادب پڑھنے اور ادب خریدنے والے لوگ ہی چلے گئے۔ اب ادبی رسالوں اور کتابوں کو کون خریدتا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ پچھلی کھیپ لکھتے لکھتے تھک چکی ہے۔ اُن کے پاس اب کہنے کو کوئی بات نہیں رہی اور نئی کھیپ ابھی تیار نہیں ہوئی۔

میرے نزدیک ان میں بعض باتیں ادبی بانجھ پن کی تہہ میں ضرور ہیں لیکن ساری نہیں۔ اور کوئی ایک وجہ تو قطعی طور پر تخلیق کے مانع نہیں ہو سکتی۔ اس کا ثبوت ہمیں ہر ادب کی تاریخ سے مل سکتا ہے۔ مالی پریشانی کو لیجئے۔ گولڈ سمتھ مالی پریشانیوں میں نہیں رہا یا منٹو نہیں رہا۔ پھر وہ جو یہ کہتے ہیں کہ ادب کا ارتقا ترقی پسند تحریک کے ساتھ منسلک تھا کہنا شاید یہ چاہتے ہیں کہ اس تحریک کے حامیوں کے علاوہ ادب کے میدان میں اور کوئی قابلِ ذکر شخصیتیں تھیں ہی نہیں اور ہمعصر ادب کا کون طالب علم ہوگا جو اس کو ماننے کے لئے تیار ہو۔ اسی طرح آزادی کی جدوجہد زندگی کے اور شعبوں کی طرح دلچسپ مواد مہیا کرتی ہے لیکن ادبی موضوعات کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور رہے گا۔ جن کو پڑھنے والے طبقے سے سرد مہری کی شکایت ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ بعض قسم کی کتابیں اور رسائل اب بھی لاکھوں کی تعداد میں بک رہے ہیں اور کافی قیمت پہ بک رہے ہیں، یہی پیسے یا ان کا کچھ حصہ معیاری ادب کی خریداری پر بھی صرف ہو سکتا ہے لیکن معیاری ادب مارکیٹ میں آئے تو سہی۔ سنجیدہ ادبی کتابیں اب بھی بک رہی ہیں اور ناشروں کو ان میں کچھ فائدہ نظر آتا ہے جبھی وہ انہیں چھاپتے ہیں۔ رہ گئی آخری وجہ کہ پرانے ادیب اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں اور نئے ادیب ابھی میدان میں نہیں اترے تو یہ کافی حد تک قابلِ اعتنا ہے۔ لیکن یہ جاننا زیادہ ضروری ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔

ایک تو اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ پرانے ادیبوں میں سے بیشتر ادبی بغاوت کی منفی خوبیوں کو لے کر اٹھے تھے۔ یہ بغاوت تھی جنسی ذکر کی ممانعت کے خلاف۔ رُؤسا اور امراکی کہانیوں کے خلاف۔ اخلاقی سبق آموزی کے خلاف۔ دوسری طرف اکثر لکھنے والوں میں غور و فکر کی کمی تھی۔ کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ اور شعوری رَد کا طرزِ تحریر مثبت پہلو تھے لیکن تجرباتی دور سے آگے نہ نکل سکے۔ پس ان ادیبوں نے خود اپنے موضوعات کا دائرہ محدود رکھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے تجربات ہی اتنے مختصر تھے کہ بسیار نویسی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ بسیار نویسی بذاتِ خود کوئی خوبی نہیں ہے لیکن ایک وسیع اور زندہ شخصیت کے اظہار کے لئے اکثر ضروری ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقطۂ نظر منفی ہو یا مثبت تجربہ ہی وہ بنیادی مواد ہے جس سے تخلیق مرتب ہوتی ہے۔ تجربے کی کوتاہیاں تخلیق کی کوتاہیاں بن جاتی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مغربی ادب کے تتبع میں جو بات چل نکلی تھی وہ بڑھ نہ سکی کیونکہ مقامی زمین میں اس کی جڑیں نہ تھیں۔ جب اسے زمین میں گاڑ دیا گیا تو اسے مضبوط ہونے کے لئے کچھ عرصہ درکار ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پچھلے پانچ یا چھ برس میں ادیبوں کے گرد و پیش یا ان کے اذہان میں ایسی فضا رہی ہے جس سے اخذ کرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ عقلِ سلیم اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ تجربے کے لئے راستے میں پڑے ہوئے پھول سے لے کر راستے میں پڑی ہوئی لاش تک ہر واقعہ محرک ہو سکتا ہے اور ایسے واقعات ملکوں اور قوموں کے انقلابات کے بغیر بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ پھر اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کیا ادیبوں اور فنکاروں کے اذہان اتنے حساس نہیں رہے۔ یہ بات بھی قبول کرنے میں ہمیں تامل ہوگا۔ پھر جبکہ تجربے کے مواقع موجود ہیں۔ حساس شخصیتیں موجود ہیں، اظہار کی راہیں موجود ہیں تو مانع کیا چیز ہے؟

اس سوال کا جواب ہمیں دنیا کے دوسرے ادبوں میں تلاش کرنا چاہئے۔ آخر انگریزی ادب میں سترہویں صدی کیوں اتنی زرخیز گنی جاتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے مقابلے میں اور پھر انیسویں صدی یکایک پھر کیوں زرخیز ہو جاتی ہے جبکہ تجربے اور تخلیق کے مواقع ایک سے ہیں۔ انگریزی ادب کا تجزیہ کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ یوں تو سب صدیاں قریب قریب برابر کی زرخیز تھیں لیکن ہر صدی میں ادبی مذاق بدلتا رہتا تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں ایک قوم بین الاقوامی طور پر اپنے لئے ایک مقام پیدا کر رہی تھی۔ مہم بازی میں مصروف تھی چنانچہ ادب میں بھی وہی مہم نوازی رہی ہے۔ وسعتوں کی تلاش ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جو مل چکا تھا اسے ہضم کر کے ایک ہموار اور آراستہ نظام کی ترویج ہو رہی تھی۔ چنانچہ ادب میں وہی باتیں ہیں۔ انیسویں صدی میں اس آراستگی کے خلاف بغاوت کی لہر اٹھی تو ادب میں بھی وہی بغاوت آ گئی۔ یہ توجیہہ اپنی سادگی اور صفائی کی وجہ سے کافی گمراہ کن ہے اور اردو ادب پر ابھی اتنی صدیاں نہیں گذریں کہ ہمارے بدلتے ہوئے مذاق کی کوئی ایسی ہی آسان سی ترتیب سامنے آ جائے۔ لیکن ہاں ایک اشارہ البتہ ملتا ہے اور وہ یہ کہ ہر صدی میں اونچی قسم کے ادب کا ایک دور سا آتا ہے اور اس سے پہلے اور بعد کی تخلیقات بہت کم معیاری ہوتی رہی ہیں۔ ادیبوں میں نئے خیالات کی ایک رَو سی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ تجربے کرتے ہیں۔ اچھوتے مضامین ڈھونڈتے ہیں اور آنے والی پود کے لئے زمین ہموار کر دیتے ہیں۔ اگلی پود میں حساس اور ذہین فنکار اس تیار زمین میں مقابلتاً آسانی سے اپنی کارگذاری دکھا سکتے ہیں۔ یہ معیاری ادب کا دور مانا جاتا ہے۔ اس زمین میں جب کہنے کی سب باتیں کہی جا چکتی ہیں تو بعد کے کچھ لوگ محض نقالی ہی کر پاتے ہیں۔ یہ اس ادبی دور کا زوال ہے۔ جب اردو ادب کے موجودہ دَور کو دیکھتے ہیں تو گمان ایسا ہوتا ہے کہ نئے خیالات کو پیش کرنے والی پہلی پود گذر چکی ہے۔ زمین ہموار ہے ان کی کہی ہوئی باتیں ذہنوں میں رچ رہی ہیں اُن کے بتائے ہوئے راستے دعوتِ سفر دے رہے ہیں اور ایک نئی پود جو ان خیالات اور تجربات کو آگے بڑھائے گی آنے والی ہے۔ موجودہ دور کی خاموشی آنے والے ہنگامے کی پیش خیمہ ہے، اور چنانچہ ہمارے ادب کا مستقبل اتنا تاریک نہیں جتنا کہ کبھی کبھی نظر آنے لگتا ہے —— لیکن ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ تجربے اور معیاری ادب دونوں کی تخلیق کا دور گذر چکا اب محض نقالی کا دور رہے اور اس خدشے کو تقویت اس امر سے ملتی ہے کہ کرشن چندر اور فیض کی کھیپ سے پہلے لکھنے والوں کا ایک گروہ ایسا بھی نظر آتا ہے جو نئے ماحول کے لئے سازگار فضا پیدا کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لاہور میں وہ گروہ ہے سالک، حسرت، پطرس، عابد، اور تاثیر کا اور ہندوستان میں جوش۔ جگر، عظیم بیگ چغتائی اور بعض دوسرے ادیبوں کا۔ ان کا اپنا ادبی مقام کچھ بھی ہو

لیکن یہ ہمیں معلوم ہے کہ کرشن چندر اور فیض کے گروہ کے اکثر لوگ ان سے متاثر تھے، اور ان میں سے بعض ان لوگوں کے شاگرد بھی تھے۔ پس اگر ادبی تحریکیں کمال اور زوال کے اس جانے بوجھے نقشے پر چلتی ہیں جس کا ذکر کیا جاچکا ہے تو ہو سکتا ہے کہ پہلی منزل پر حسرت اور پطرس کا گروہ آئے۔ دوسری منزل پر کرشن چندر اور فیض کا اور آخری منزل پر بعض موجودہ لکھنے والے شمار ہو سکیں۔ چنانچہ ایک چکر پورا ہو چکا ہو اور آنے والے دور کی دھندلی سی کوئی تصویر بھی ہمیں معلوم نہ ہو اور جانے کتنی دیر اور ہمیں منتظر فردا رہنا پڑے۔

ہمعصر ادب کے بارے میں کسی قسم کی قطعی رائے قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ کیا جانے موجودہ تعطل کے دور کی بعض تخلیقات آنے والی صدیوں میں کلاسیک ہوں اور جن تخلیقات کو ہم حاصل دورِ ادب کہہ رہے ہیں انہیں وقتی یا سطحی کہہ کر رد کر دیا جائے۔ لیکن مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنے میں تو کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اور میری رائے میں کرشن چندر اور فیض کا دور عروج کا دور نہیں ہے بلکہ ابتدا کا دور ہے۔ اور عروج کے دور کی طرف اگر کوئی قابلِ شناخت رجحان نظر نہیں آرہا تو اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پچھلے چند برس میں تجربے کی منزل سے تو غالباً کئی بہتر قسم کے حساس ذہن گذر چکے ہیں لیکن اظہار کی خواہش نہیں رکھتے۔ اس اظہار کی خواہش نہ رکھنے کی بھی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ فنی تخلیق کے لئے کلچر کی رائج اقدار ادیب کو جو فنی پس منظر مہیا کر سکتی ہے وہ کچھ عرصے سے ناپید ہے۔ دھندلکے کی اس فضا میں افراد اور سماج کی ٹھوس قسم کی نقاشی کہاں سے وارد۔ دوسرے بعض اداروں ناشروں اور ادیبوں میں متحدہ طور پر جس ہم پروری کا جذبہ ابھرتا ہے وہ فی الحال نظر نہیں آتا۔ کسی زمانے میں دلی سے ساقی اور لاہور سے ادبِ لطیف اور ادبی دنیا نے یکایک اس وقت کے لکھنے والوں سے مل کر جو فضا قائم کر دی تھی اب ایسا لگتا ہے کہ بعض نامساعد حالات کی وجہ سے "آں قدح بہ شکست و آں ساقی نہ ماند"، کبھی کاغذ مل جاتا ہے کبھی نہیں ملتا۔ کبھی اشتہارات مل جاتے ہیں کبھی نہیں ملتے۔ نشر و اشاعت میں کئی قسم کی بلیک مارکیٹ نے جو بحرانی کیفیت پیدا کر رکھی ہے وہ ایک حساس ادیب کے لئے کافی حوصلہ شکن ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے کہ کس کے لئے لکھوں؟ کیوں لکھوں؟ یہ تعطل اس وقت ختم ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے جب تجربے اور تخلیق کی درمیانی کڑی یعنی اظہار کی خواہش تمام رکاوٹوں اور حوصلہ شکنیوں کو نظر انداز کر کے بروئے کار آئے۔ وفورِ تجربات اور جذبات سے ایک گھٹن سی ہونے لگتی ہے اور ادیب اور فنکار تخلیق کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت ہم گھٹن کے دور میں سے گذر رہے ہیں۔ اور خدا کرے کہ آہ کو جو عمر اثر ہونے کے لئے چاہئے وہ مختصر سے مختصر ہو جائے۔

★

یلدرم

نذر سجاد حیدر

آئینۂ دل میں شکل تیری
ہے طرفہ جوابِ لاجوابی!
(حسرت موہانی)

غالباً جنوری ۱۹۰۰ء کا زمانہ تھا۔ میرا بچپن ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا۔ ویسے سمجھدار، سیانی تھی۔ اردو اخبارات اور رسالے تو آٹھ سال کی عمر سے پڑھنے لگی تھی۔ خصوصاً رسالہ مخزن سے دلی انس تھا۔ میرا پہلا مضمون بھی اسی میں چھپا تھا۔ اخبارات میں سب سے زیادہ علی گڑھ گزٹ اور وکیل امرتسر کی قدرداں تھی۔ وکیل نہایت ہمدردِ قوم اور اصلاحی اخبار تھا۔ معاشرتی اصلاح میں پہلا قدم اسی کے ذریعہ اٹھایا گیا تھا۔ میں نے بھی اپنی کہنہ فضول رسوماتِ شادی و غم کے خلاف وکیل ہی میں لکھنا شروع کیا تھا، اس کے بعد تہذیبِ نسواں میں۔ مگر وہ زمانہ ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء کا تھا جب میرا شمار کمسن لڑکیوں میں تھا۔

ہاں تو جنوری ۱۹۰۰ء کی ابتدا تھی۔ مخزن کے لئے ڈاک کا انتظار رہتا تھا۔ جنوری کا مخزن جو ملا تو اس میں ایک بہت ہی اچھا دلچسپ مضمون دیکھا۔ ہیڈنگ تو یاد نہیں مگر وہ لکھا ہوا یلدرم کا تھا۔ میں نے پڑھا اور تعریف کے ساتھ اپنے باپا اور اماں جان کو دکھایا۔ اس دن سے تو اور بھی رسالہ کا شدت و بے صبری سے انتظار رہنے لگا۔ ان دنوں یلدرم بغداد میں تھے اور وہاں سے بہت ہی دلچسپ کچھ معاشرتی اور جذباتی، مضامین لکھا کرتے تھے۔ نوجوان تھے، اردو میں قابلیت رکھتے تھے، ترکی بھی جانتے تھے۔ ان وجوہ سے ان کے افسانے نہایت دلچسپ و دلکش ہوتے تھے۔ زیادہ تر ترکی سے ترجمے ہوا کرتے تھے۔

اس وقت تک ان کے صرف تین ترکی ناولوں کے ترجمے، جو زمانۂ طالب علمی علی گڑھ کالج میں کئے تھے، شائع ہوئے تھے بعد کو عراق گئے۔ تینوں چھوٹے چھوٹے قصوں کے نام تھے زہرا، ثالث بالخیر اور مطلوبِ حسیناں۔ پھر چار سالہ قیام بغداد میں تو یلدرم نے ایسے ایسے افسانے لکھے کہ ان کا شمار اردو کے ادیبوں میں ہو گیا۔ غالباً ۱۹۱۱ء میں وہ مجموعہ جس کا نام خیالستان ہے شائع ہو گیا تھا۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ نوعمری، بے فکری، عراق کا قیام، بار بار ترکی و ایران کی سیاحت، جذباتی ادبیت کا ایک چشمہ تھا کہ ابل رہا تھا۔ میں کیا سبھی پڑھنے والے بیتابی سے بغدادی نوعمر افسانہ نویس کی تحریر کے منتظر رہتے تھے۔ یلدرم نے اس وقت اردو میں ایک بالکل نئی طرز کی انشا کی بنیاد رکھی جس کی لوگوں نے برسوں نقل کی۔

آخر وہ وقت ختم ہوا اور یلدرم بادلِ ناخواستہ ہندوستان واپس آئے۔ ان کو ترکی سے عشق تھا اور بغداد پر اس وقت ترکی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ گو تعلیم نسواں کا عراق میں ابھی زیادہ چرچا نہ تھا مگر قسطنطنیہ میں قابل خواتین موجود تھیں اور لڑکیاں پڑھائی جا رہی تھیں۔ یلدرم کو تعلیم اور آزادیٔ نسواں کا سودا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ترکی کے نام پر مرتے تھے۔

غرض کہ وہ اُن دنوں خوب جوشیلے اور دل آویز افسانے بغداد سے مخزن میں بھیج رہے تھے جسے ہمارا گھر بھر نہایت شوق سے پڑھتا تھا اور دوسرے لوگ مخزن چھین چھین کر لے جاتے تھے۔ اتفاق کہ ان ہی دنوں میں نے بھی نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ مسلمان لڑکیاں اس زمانے میں بہت ہی کم لکھا کرتی تھیں۔ اس وجہ سے میرے مضامین پر بہت سی نظریں پڑا کرتی تھیں۔ دو تین سال

گزر گئے اور یلدرم عراق سے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ہوکر ہندوستان واپس آگئے اور ڈیرہ دون میں معزول امیر کابل کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے وطن واپس آجانے پر عزیزوں اور دوستوں نے انہیں جلد شادی کرنے کی رائے دی۔ پہلے تو وہ یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ "میں بغداد میں ایک ترک لڑکی سے شادی کر آیا ہوں اور میری ایک لڑکی بھی ہے۔" مگر اس بات کا کسی کو یقین نہیں آیا۔ اور سب نے شادی کر لینے پر مجبور کیا۔

اب یہ فکر ہوئی کہ شادی کہاں کی جائے۔ وہ اپنے بھائیوں بلکہ اپنے خاندان بھر میں نہایت روشن دماغ، آزاد خیال اور حامیٔ تعلیم و حریت نسواں تھے۔ بیوی بھی اپنے ہم خیال چاہتے تھے۔ چند دوستوں نے اس زمانے کی ایک آزاد خیال اور حامیٔ تعلیم نسواں لڑکی بنت نذر الباقر کا نام بتایا۔ اس لڑکی کے مضامین کی وجہ سے وہ خود بھی اس سے کچھ واقف تھے۔ اسی وقت ان کے مضامین کا مجموعہ خیالستان چھپ کر شائع ہوا تھا اور بنت نذر الباقر کے دو معاشرتی ناول، اختر النساء اور آہ مظلوماں چھپے تھے۔ دوستوں کے کہنے سے انہوں نے یہ مشورہ پسند کر لیا اور ہمدرد نسواں شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب کے توسط سے میرے والدین کے پاس رشتہ کا پیام آیا۔

کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے خاندان اور میرے خاندان دونوں نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح سے روڑے اٹکائے۔ اس کو بھی کچھ عرصہ گذر گیا۔ اس زمانے میں ایک بڑا لطیفہ ہوا جس پر بعد میں دوستوں نے ہمیں بہت چھیڑا اور ہم سے مذاق کیا۔ یلدرم کا ایک مضمون "آہ یہ نظریں!" مخزن میں شائع ہوا تھا، جو کسی حسینہ کی پُرکشش آنکھوں سے متاثر ہوکر لکھا گیا تھا۔ واللہ کہ اسکی مجھ کو بالکل خبر نہ تھی۔ میری والدہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان کی آخری، حسرت آمیز اور محبت بھری نگاہیں یاد آآ کر مجھے بے چین کرتی تھیں۔ میں نے بھی "آہ وہ نظریں" کے ہیڈنگ سے محبت بھری نظروں پر مخزن ہی میں مضمون لکھا تھا۔ جن لوگوں نے ان کا مضمون پڑھا تھا انہوں نے میرا بھی پڑھا۔ بہرحال کچھ عرصہ تک ان مخالفتوں کا بھی اثر رہا اور شادی نہ ہونے پائی۔ مگر یہ رشتہ بھی غالباً تقدیر کے زیر اثر ہوتا ہے۔ باوجود ان سب رکاوٹوں کے ہوکر رہا۔ جون ۱۹۱۲ء میں یلدرم معہ مولوی ممتاز علی صاحب اور اپنے بہنوئی وغیرہ کے ہمارے جائے قیام پر یعنی سرحدی مقام کوہاٹ تشریف لائے۔ یلدرم اور بنت نذر الباقر کے درمیان عمر بھر کی رفاقت کا عہد و پیمان ہوگیا۔

اہلِ کوہاٹ ان کو دیکھنے کے بے چینی سے مشتاق تھے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو شادی کے کھانے پر مدعو کئے گئے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی بن بلائے آگئے جنکو یلدرم کے دیدار کا مدت سے اشتیاق تھا۔ جس وقت وہ لوگ پہنچے یہاں کھانا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ خاموش باغیچہ میں ٹہلتے رہے۔ میرے پاپا مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھے۔ اس لئے ان کی نظر اس مجمع کی طرف نہ گئیں۔ جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آکر بیٹھے جہاں نشست کا انتظام تھا تو پاپا دیکھ کر حیران ہوگئے۔ وہاں تو ساٹھ ستر صاحبان موجود تھے جن میں سے پاپا کسی کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے آگے بڑھ کر جو یلدرم کے زمانے کے پڑھے ہوئے علیگ اور بیرسٹر تھے، یلدرم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہنس کر کہا "زہے نصیب ہمارے کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے۔ جس طرح آپ کو زیارتِ قاہرہ کی کشش مصر لے گئی تھی۔ ہم کو زیارت یلدرم کی کشش بنوں ہنگو وغیرہ سے کوہاٹ لے آئی۔"

پھر ان کے ساتھیوں کی قطار آگے بڑھ آئی اور یلدرم کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ اس وقت ذرا اندھیرا ہوگیا تھا۔ اور ان لوگوں کو یلدرم کی شکل اچھی طرح دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے قریب ہی سے ایک گیس کی لالٹین اٹھا کر ان کے چہرہ کے برابر کردی اور باآواز کہا "اے مشتاقانِ دیدار یلدرم! دیکھئے ؎ دلِ انگشش ورخِ ترکانہ داری!" یہ سنتے ہی وہ سب ایک ایک کرکے سید سجاد حیدر صاحب کے سامنے آتے اور زیارت کرتے گئے بیرسٹر صاحب بھاری لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ بے سہرے کے دولہا کا ایک تماشہ بن رہا تھا۔ دولہا اس وقت بادامی چائنا سلک کے سوٹ میں تھے۔ باغ میں ہوا سے ان کی پیشانی پر گھونگھریالے بال بکھر رہے تھے۔ پرکشش بڑی بڑی آنکھوں پر سنہری عینک چمک رہی تھی۔ میرے پاپا بھی اپنے داماد کی ایسی شاندار قدر دانی سے خوش ہو

قریب ہی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بھائی ممتاز علی صاحب وہیں کھڑے یہ نقشہ دیکھ رہے تھے۔ جب اس طریقہ سے دولہا کی نمائش ہو چکی تو پایانے ان سب بعد کے آنے والوں کو کھانا کھلوایا۔ اور یہ حالات ایک بجے شب کو، جب گھر کے اندر آئے، میری خالہ جان اور چھوٹی بہن ثروت آرا کو سنائے۔ میں قریب ہی پلنگ پر لیٹی ہوئی سب سن رہی تھی مگر سوتی بن گئی تھی۔

میں نے اب تک سوائے "مخزن" میں شائع شدہ تصویر کے ان کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو ہماری پہلی ملاقات مقرر ہوئی اور اسی روز شام کو مسوری روانگی تھی۔ شاید گیارہ بجے ہوں گے، ثروت آرا میرے کمرہ میں آئی اور گھبراہٹ کے ساتھ کہا "باجی جان، بھائی جان کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ آپ سے ملاقات کے لئے۔" میں نے کہا "ابھی سے ملاقات کی کیا جلدی ہے، شام کو تو ان کے ساتھ جانا ہی ہے۔" وہ بولیں "نہیں باجی یہ ضروری ہے۔ ماموں جان کی رائے ہے کہ سفر سے پہلے دونوں میں روشناسی ہو جانی چاہئے۔" میں نے کہا "آخر تم نے ایسا بھاری جوڑا کیوں پہنا ہے؟" اس نے ہنس کر جواب دیا "لیجئے آج ہی اچھا جوڑا نہ پہنتی تو کب پہنتی۔ آج ہی تو اپنے دولہا بھائی سید سجاد حیدر یلدرم سے پہلی بار ملنا ہے، جن ملاقات کے شوق میں سنہ ۱۹۰۵ء سے بےچین تھی۔ خالہ جان پھوپی جان بھی تو آ رہی ہیں، اکٹھے ہی ملیں گے۔ آپ ذرا اچھے طریقہ سے بیٹھ جائیے۔ چھوٹے[1] میاں انہیں بلانے باہر گئے ہیں۔"

اب میں حیران، ایک پردہ دار مسلمان لڑکی پہلی بار ایک غیر شخص سے کس طرح ملے جو بالکل اجنبی ہے مگر اسی کے ساتھ سب سے زیادہ اپنا بھی!.... اتنے میں خالہ اور پھوپی جان کمرہ میں آ گئیں۔ پھوپی نے مجھے صوفہ پر بٹھا دیا۔ جارجٹ کے دوپٹہ سے سر کو اچھی طرح ڈھک دیا۔ گھونگھٹ نہیں نکالا گیا۔ میرے قریب ہی ثروت آرا کو بٹھایا گیا۔ خالہ نے ہنس کر کہا "دونوں ایک ہی سی ہیں، سجاد کیسے پہچانیں گے کہ بیوی کون ہے اور سالی کونسی۔" کیونکہ میرے سر پر جھومر اور ٹیکا تو تھا نہیں اور نہ ناک میں نتھ۔ سفید پھولدار ریشمی جوڑا اور ہلکا گلابی دوپٹہ۔ میرے جوڑے سے زیادہ شوخ اور بھاری تو ثروت کا جوڑا تھا۔

سوچا جا رہا تھا کہ مجھ میں کیا خصوصیت پیدا کی جائے کہ دلہن معلوم ہونے لگوں۔ پھولوں یا سہرے کا تو کیا ذکر میرے ہاتھوں میں مہندی بھی نہیں لگی تھی۔

پھوپی جان نے، جو میری دوست بھی تھیں، جلدی سے میرے لباس اور رومال پر سینٹ چھڑکا، میرا سر جھکا دیا، نگاہیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ میرے جسم میں ایک کپکپی سی تھی۔ سوچ رہی تھی کیا کرنا چاہیئے۔ باتیں کی جائیں یا عام دلہنوں کی طرح گپ چپ رہا جائے۔ وہ کیا خیال کریں گے۔ میں نیچے کی طرف قالین کے پھولوں اور اپنی ہائی ہیل کی رو پہلی چمکیلی جوتی کو دیکھ رہی تھی۔ اور وہ تینوں چشم براہ تھیں کہ پردہ ہٹا.... پہلے میرا بھائی افضل علی عرف چھوٹے میاں، جو ایف اے کا طالب علم تھا، داخل ہوا اور بشاشت سے کہا "بھائی جان آ جائیں؟" "ہاں ہاں" فوراً پھوپی نے جواب دیا۔

وہ نیچے منتظر تھے، اندر آئے۔ سب کو سلام کیا۔ خالہ جان کے کہنے سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے جو نہایت خوبصورت گشنوں سے سجی تھی اور اس کے تکیہ اور ہتھوں پر پھولوں کے ہار مہک رہے تھے۔

انہوں نے ہم دونوں پہ ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ یہ مجھ کو بعد میں افضل علی نے بتایا تھا، اور خالہ اور پھوپی جان سے مخاطب ہو گئے، کیونکہ ان سے ایک بار ماہ مئی میں بھی مل چکے تھے جس وقت صرف عقد کے لئے آئے تھے۔ ثروت آرا اس وقت نہ مل سکی تھی کہ بیمار تھی۔ ۱۷ جون، کو آٹ کے تپتے ہوئے پہاڑوں کی گرمی، ۱۲ بجے دن کا وقت، گو پنکھا چل رہا تھا مگر شدت کی گرمی تھی۔ وہ بار بار پانی مانگ کر پی رہے تھے۔ ثروت کوئی پندرہ منٹ خاموش ان کو تکتی رہی۔ بہت بیباک سے، وہ بھی سنا کہ بار بار کنکھیوں سے ثروت کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ آخر اس سکوت کو توڑنے اور ثروت سے ہمکلام ہونے کی پہل انہیں نے کی۔ اس کے بار بار دیکھنے اور میری

---

[1] میرا ماموں زاد بھائی اور ثروت کا منگیتر افضل علی۔

نیچی نظریں بلکہ سر اور گردن بھی جھکی دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ یہ بھڑکیلے لباس والی ہی سالی ہے ۔
سلسلۂ گفتگو مسکرا کر شروع کیا" اب تو آپ کی صحت درست ہے ۔ مئی میں جب میں حاضر ہوا تھا اس وقت طبیعت ناساز تھی۔"
وہ تو منتظر تھی ہی کہ بہنوئی یلدرم کسی طرح بات کریں ۔ فوراً جواب دیا" جی ہاں، بہت بیمار تھی ، تبھی تو اس وقت آپ سے نہ مل سکی تھی ۔
اب تو بہتر ہوں ۔ مگر آج گرمی غیر معمولی پڑ رہی ہے ۔ یہاں کے ریتیلے میدان جب تپتے ہیں تو غضب ڈھاتے ہیں ۔ آپ پہاڑ سے
تشریف لا رہے ہیں، بہت ہی گرمی اور پیاس محسوس کر رہے ہوں گے ۔ دیکھئے ذرا سی دیر میں پانی کا جگ خالی کر دیا ۔"
یہ نوک جھونک سنکر ہنسنے لگے اور کہا" بیشک میں بہت پانی پی رہا ہوں ۔ باہر بھی لُو کا گیا ہوں ۔ شدت کی پیاس ہے ۔"
جب سالی بہنوئی باتیں کرنے لگے تو خالہ اور پھوپی جان یہ کہتی ہوئی اٹھ گئیں" اب کھانا بھجوایا جاتا ہے ۔ پانی ہی پیتے رہے تو
کھانا مشکل ہو جائے گا ۔"
ثروت آرا نے وہ برف کا جگ میز سے اٹھایا اور کھانے کی جگہ وہیں بنائی ، دو چھوٹی میزیں جوڑ کر ۔ نوکرنی کھانا لے آئی تو
وہ بولے" آپ بھی یہیں کھائیں گی نا ؟" ثروت یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں" نہیں بھائی جان ، میری چند دوست مہمان آئی ہوئی ہیں ۔"
یہ کہا اور وہاں سے چل دی ۔
اب یلدرم میری طرف متوجہ ہوئے ۔ اپنی کرسی صوفے کے قریب کر کے فرمایا" السلام علیکم ۔ ۔ ۔ ۔ شدت کی گرمی ہے
۔ ۔ ۔ ۔ ذرا چہرے سے رومال ہٹا کر رخ میری طرف کیجئے ۔"
بہت ہی ہمت سے کام لے کر میں نے ذرا چہرہ اونچا کیا مگر نظریں فرش پر گڑی رہیں ۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے رومال
چھین لیا اور مسکرا کر فرمایا ؎

"اب نہ کر پردہ کہ اے پردہ نشیں دیکھ لیا !"

پھر کھانے کی میز آگے کو بڑھا کر کہا" شروع کیجئے" اور خود مچھلی کا کباب اٹھا لیا ۔
میں اس گھڑی سخت مشکل میں پھنسی تھی ۔ اگر ان کی آزاد خیالی پر اعتماد کر کے بے تکلفی سے کھانا شروع کرتی ہوں تو دل میں
کہیں گے کس قدر بے تکلف دلہن ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کی پرورش کا اثر ہے ۔ اور اگر شرم کا اظہار کروں تو دیہاتی ، پرانی ، پابند رسوم خیال
کریں گے ۔ بدقت تھوڑا سا کھایا ۔ وہ باتیں کرتے رہے ، میں آہستہ آہستہ جواب دیتی رہی ۔
یہ تھی ہماری اولیں ملاقات ۔ اگر شادی سے پہلے ملاقات کا موقع ملتا ، بہ حیثیت ایک اجنبی ادیب اور افسانہ نگار کے ، تو خدا
جانے کتنی باتیں ہوتیں ۔ یلدرم کو دیکھنے ، یلدرم سے ملنے کا مدت سے اشتیاق تھا ۔ مگر ملنا نہ ہوا اور آج وہ زریں موقع ملا تو
کس اور ہی عالم میں جس وقت کہ آزاد سے آزاد اور بے باک سے بے باک لڑکی بھی قدرتاً شرما جاتی ہے ۔
ابھی کھانا ہو ہی رہا تھا کہ باہر سے بلاوا آ گیا ۔ ان کے مشتاقانِ دیدار جون کی گرم دوپہر میں آ گئے ۔ پاپا نے بلوا بھیجا تھا کیونکہ
آج شب کو کوہاٹ سے روانگی تھی ۔ پھر شام کی چائے باہر سب کے ساتھ جا کر پی ۔ چھ بجے کے قریب اندر بلائے گئے ۔ اس وقت
مجھ کو خاص طور پر دلہن بنایا گیا تھا ۔ مگر عزیزوں سے جدائی کا وقت قریب تھا ۔ میں بیحد افسردہ تھی ۔ ثروت اور پھوپی صاحبہ نے ایک
خوبصورت صندلی رنگ کا جوڑا پہنایا جس پر ہلکا ہلکا زری کا کام تھا ۔ زیور بھی لا دیے گئے اور سات بجے کے قریب سب سے رخصت
ہو کر اپنے پاپا کا فوایجاد برقعہ پہنکر اسٹیشن روانہ ہوئی بے شمار لوگ اسٹیشن پر آئے تھے اور سب ہی غمگین تھے ۔
گاڑی ہلی ، میرا دل ہل گیا ، کوہاٹ چھوٹ گیا ۔ ۔ ۔ وہ اندر آ کر میرے پاس بیٹھ گئے ۔ مگر میری حالت خراب تھی ۔ ان کا چہرہ بھی کدر
وافسردہ تھا ، آنکھیں نمناک ، پسینہ پسینہ تھے ۔ مجھ کو بہلانے کی یہ ترکیب نکالی ۔ بولے" میرے سر میں سخت درد ہے ۔ گرمی کی
شدت سے سر پھٹا جا رہا ہے" یہ سنکر میں آنکھیں خشک کر کے اٹھ بیٹھی اور کہا" تھوڑا شربت پئیں یا آئس کریم کھائیں ۔ گرمی سے
(باقی صفحہ ۴۴ پر)

فن،

مصوّری کی پہلی کل پاکستان نمائش

مریم شاہ

اس سال جب ہم اپنا دسواں یومِ آزادی منا رہے تھے پاکستان آرٹ کونسل نے ایک نہایت اہم اقدام کیا جو ہماری قوم کی تاریخ، بالخصوص فنونِ لطیفہ کی نشو و نما کے سلسلے میں، یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تھی پاکستانی مصوری کی پہلی کل پاکستان نمائش جو وفاقی پایۂ تخت کراچی میں منعقد ہوئی۔ یہ پہلی نمائش تھی جس کا اس قدر وسیع پیمانے پر اہتمام کیا گیا اور اس میں مشرقی و مغربی پاکستان دونوں کے بڑے بڑے فنکار اس کثرت سے شریک ہوئے۔ ادھر دلدادگانِ فن کی کثرت نے اس کی رونق دوبالا کردی۔ غرضیکہ یہ واقعہ ہر اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے ÷

اس نمائش میں دو سو ستر تصاویر پیش کی گئیں لیکن ساتھ ہی سنگتراشی کے نمونے بھی تھے اور ایک نبت کاری کا نمونہ بھی۔ بہتّر فن کاروں نے فنکاری کے جو نمونے پیش کئے ان میں توقع سے کہیں زیادہ نقاشی کی قسموں، قلموں، پیرایوں (آب رنگی، روغنی وغیرہ)، موضوعوں اور طرحوں کا تنوع تھا۔ یہ دیکھ کر واقعی بڑی مسرت ہوتی ہے کہ پاکستان میں نقاشی کی اس قدر بوقلموں طرحوں اور پیرایوں کا بیک وقت فروغ ممکن ہے اور فنکار کسی ایک روایت کی پیروی نہیں کر رہے جو لوگ یہ امید کرتے تھے کہ وہ پاکستانی مصوری میں کوئی معین رجحان پائیں گے نہیں یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس میں ایک نہیں کتنے ہی رنگ ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ فنکاروں نے جانے کتنے ذرائع سے اثر قبول کیا ہے۔ چنانچہ بعض کی تو یہ کیفیت ہے کہ ہم ان میں صاف صاف مغربی مصوروں کے اسالیب کا سراغ لگا سکتے ہیں ÷

ان تصاویر میں جہاں ایک طرف چغتائی کی لگی بندھی روایتی وضع دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف مشرقی پاکستان کی آبی رنگوں اور کوئلے سے بنی ہوئی نئی نئی تصاویر میں بڑے جرأت آمیز تجربے کئے گئے ہیں۔ اگر ایک طرف اللہ بخش کی بڑی پھیلی ہوئی قسم کی تشریحی رومانویت ہے جو لیا سمجھئے تقریباً ماقبل رافیل (PRE-RAPHAELITE) مشرب ہی کا دوسرا روپ ہے، تو دوسری طرف قمر الحسن کی بڑی توانا قسم کی تجرّدی آب رنگی تصاویر ہیں۔ مصور بڑی حد تک اپنی اپنی پسند کے مطابق اپنے اپنے انداز میں نقاشی کرتے ہیں۔ گویا کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں نالے اپنے اپنے جدا جدا راستوں پر بہتے چلے جارہے ہیں لیکن آپس میں مل کر کسی تُند دھارے یا گمبھیر دریا کا روپ نہیں دھارتے۔ اس نمائش سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ ترقی کوش فنکار آجکل کے مغربی مصوروں سے جوت جگانے اور اثرات قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ وہ تجریدی آرٹ کے نمونے پیش کرنے میں جتنی بے باکی چاہیں برت سکتے ہیں، ان پر لازم نہیں کہ وہ مشرق کی خطی قلمکاری کی روایت کی پیروی کریں، یا روغنی اور آب رنگی تصاویر کھینچیں جو زیادہ مقبول ہیں۔ پاکستانی مصوروں کی یہ تجریدی نقاشی محض ایک تجربہ ہے کیونکہ مغرب کی طرح اس نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار نہیں کی ÷

جب ہم تصاویر کو دیکھتے ہیں تو کئی ایک باتوں کی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً تکنیک، فیضان، تعبیر و تشریح اور انتخاب۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ایسا پاکستانی مصور جس میں یہ تمام عناصر موجود ہوں، اس کے ابھرنے کا آنے کا وقت آچکا ہے۔ پاکستان میں نئی پود کے مصور ابھی تک تجربات ہی کر رہے ہیں۔ وہ نئے نئے اسالیب اختیار کرتے اور رنگ پر رنگ بدلتے ہیں۔ چونکہ اس موقع پر کراچی میں پاکستان کے دونوں حصوں کے متعدد فنکار جمع ہوئے تھے اس لئے انہیں آپس میں ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا بھی موقع ملا۔ فنکاروں میں یہ لین دین اور تخلیقی عمل کی چھان بین بڑی اہمیت رکھتی ہے ÷

جدید مصوری کے گوشے میں سب سے زیادہ تنوع تھا۔ نئے ابھرنے والے فنکار مثلاً امین الاسلام، کبریا، حنیف رامے، زندی اور صادقین ناقیت سے روگردانی کر چکے ہیں اور کچھ اپنی شوخیٔ فکر اور کچھ ماحول سے کام لیتے ہیں۔ امین الاسلام ایک بڑے ہی نفیس احساس کا مالک ہے۔

اور بہت کم رنگ استعمال کرتا ہے۔ وہ بھی درمیانہ درجے کے نیلے، خاکی اور سبز۔ چونکہ اس نے اطالیہ میں تربیت حاصل کی ہے اس لئے اس کے اسلوب اور موضوعات میں مغرب کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اس کی شبیہیں بہت سیدھی سادی قسم کی ہیں اور ان میں کسی نہ کسی مخصوص کیفیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی خصوصیت ان تصاویر کی ہے جن میں پورے سراپا کی مصوری کی گئی ہے۔ کبریا جس کو اپنی تصویر "لڑکی اور کلی" کے لئے پہلا انعام ملا، رنگوں پر ایسی ہی قدرت رکھتا ہے، منظر نگاری میں وہ تجریدی طرف مائل ہے۔ اس کی تصویر "شفق" جس میں اشجار اور پرندے باہم مل کر ایک مربوط اقلیدسی طرح اختیار کر لیتے ہیں، خاص طور پر دلآویز ہے۔ صادقین کے دو بڑے بڑے تختے اس کی آرائشی نقاشی میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا پیرایہ مرکب یا منفرد رنگوں سے دھلائی ہے جس کو مزید قوت اور گہرائی عطا کرنے کے لئے قلم اور سیاہی سے کام لیا جاتا ہے۔

صفدر علی ایک "پرکشش" مصور ہے۔ جو اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے موضوعات اور "خاموش" چیزوں کی عکاسی کرتا ہے اور ان کو نئے نئے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ اس کے رنگ بولتے ہوئے ہیں۔ سیاہ رنگ کسی پہلو کو ابھارنے یا اثر بڑھانے کے لئے برتا جاتا ہے۔ اس کی تصاویر میں رنگوں کی تہ ابھری ابھری نظر آتی ہے۔ پچھلے پانچ برس میں اس کی مصوری نے کتنے ہی مرحلے طے کئے ہیں۔ اس کی تازہ تصویریں پہلے کی بہ نسبت کہیں دھیمی دھیمی اور منجھی ہوئی ہیں ۔

شاکر علی بھی اسی گروہ میں شامل ہے۔ لیکن وہ زیادہ پختہ کار مصور ہے جس کا کام کتنے ہی دوروں سے گزر چکا ہے۔ اس نمائش میں اس کی آٹھ تصویریں تھیں۔ جن میں سے ایک بڑا تختہ تھا "بھینسیں"۔ دوسری تصویریں پورے قد کی انسانی تصاویر تھیں۔ شاکر علی کی سب تصویریں بڑی احتیاط اور دقتِ نظر سے کھینچی گئی ہیں۔ وہ ماورائی اور خیال انگیز یعنی ایمائی ہیں کیونکہ ان کا موضوع محض مصور کے لئے پروازِ تخیل کا بہانہ ہے۔ رنگ آپس میں مبہم طور پر گھلے ملے ہیں اور تضاد زیادہ کھلواں نہیں ہے "سازندے" اس نمائش کی ان تصاویر میں سے تھی جس کو خاص طور پر سراہا گیا ۔

روایاتی تصاویر کے حصے میں روغنی شبیہیں اور منظر نگاری کے مرقعے تھے۔ ان میں سے بعض تصویریں واقعیت نگاری اور بعض نیم واقعیت نگاری کے اصول پر بنائی گئی تھیں۔ لاہور اور کراچی کے بہت سے مصوروں کی تصویریں جو اس طرز کی نقاشی کے نمائندہ ہیں، نمائش میں موجود تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے اپنے فن کے بہترین نمونے پیش نہیں کئے تھے۔ غالباً یہ نمائش کا سب سے کم دلچسپ حصہ تھا۔ کیونکہ تصاویر کا معیار زیادہ بلند نہ تھا۔ ایسی واقعیت نگاری جس میں کوئی معنویت نہ ہو، کوئی اثر پیدا نہیں کرتی۔ آرٹ میں فطرت کی نقالی ہی کافی نہیں بلکہ توضیح و تعبیر اور کیفیت بھی ضروری ہے ۔

اے۔ بی۔ نذیر نے عکاسی جیسی واقعیت نگاری کے ساتھ انسانی سراپا کھینچے ہیں۔ اور سعید ناگی کے روغنی رنگوں میں بنائے ہوئے سراپا اور شبیہیں واقعیت نگاری کی آئینہ دار ہیں۔ مبارک حسین کے روغنی رنگوں میں بڑے بڑے مناظر زیادہ نظر فریب تھے۔ بہت سی خواتین نے بھی مصوری کی اس صنف کو اپنایا ہے۔ ان میں مسز احمد، انور افضل، نسیم ایچ۔ قاضی، اور ذکیہ ملک کی بنائی ہوئی شبیہیں اور مناظر نمائش کی زینت تھے۔ تسنیم مظہر اور سعیدہ کریم نے خطۂ پنجاب کے رنگین مناظر پیش کئے تھے۔ مشہور مصوروں کے ساتھ کچھ نئے مصوروں کی تصاویر بھی پیش کی گئی تھیں ۔

ان دو حصوں کے بعد نمائش کے اس حصے میں داخل ہونے پر جہاں آب رنگی تصویریں تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم گرم ممالک کے گھنے جنگلوں سے نکل کر کھلے میدان میں پہنچ گئے ہوں۔ مشرقی پاکستان کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں بڑی ہلکی پھلکی، تازہ اور رنگین تھیں۔ انہیں اپنی دھرتی کے لہلہاتے سبزہ زاروں اور بہتے دریاؤں کی تصویریں کھینچنے سے بہت رغبت ہے۔ ان کے لئے وہ آب رنگی شوب جس میں کالی کالی خط کشی کی گئی ہو، کا طریقہ بہت پسند کرتے ہیں۔ سید جہانگیر، دیب داس چکرورتی، اور قاضی عبد الرؤف نے اپنے مناظر اور سراپاؤں میں یہی تکنیک برتی ہے ۔

قمر الحسن کے آب رنگی، رنگ کار پنسلوں اور خشک رنگوں سے بنائے ہوئے سراپاؤں میں رنگوں کی بہار اور مطلوبہ کیفیت کی توانائی

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

١

قومی ثقافتی کی پہلی نمائش
(کراچی)
زیر نگرانی پاکستان آرٹ کونسل

١- منبت کاری عمل : امین الاسلام

٢- ''کرسٹینا'' (ایک شبیہ)
عمل : امین الاسلام

٣- ''سنگھار'' عمل : قمرالاسلام

٤- ایک منظر (مشرقی پاکستان)
عمل : قاضی عبدالرؤف

٥- اسٹل لائف عمل : محمد کبریا

٥

کراچی کے لیل و نہار

وزیراعظم پاکستان ، مسٹر آئی، آئی، چندریگر،
کی صدر پارلیمان، بلجیم، سے ملاقات

بین الاقوامی یوم اطفال کے سلسلے میں بچوں کی مصوری کی نمائش
بیگم ناہید اسکندر مرزا صاحبہ یہ تصویریں ملاحظہ فرما رہی ہیں

ناب فضل الرحمان صاحب ، وزیر تجارت حکومت پاکستان،
طرف سے کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کے سپاسنامہ کا جواب

میاں جعفر شاہ ،
علاقائی مرکز تربیت ڈاک کی
تیسری سالگرہ کی تقریب میں

افسانہ:

اکھاڑہ

عنایت اللہ

استاد کامو کے اکھاڑہ کی کھدی ہوئی نرم و ملائم مٹی میں جانے کتنی کہانیاں، کتنی وارداتیں، کتنے ہی حادثے اور کتنے طرّے دفن تھے۔ اکھاڑے کے پروردہ جہاں بھی گئے جیت کے آئے اور یہاں جو بھی آیا ہار کے گیا۔ کہتے ہیں استاد کامو کے باپ نے ایک بار نشہ سے ٹوٹتے ہوئے ایک فقیر کو چرس کا کش لگوایا تھا۔ اس کے عوض فقیر اسے ایک تعویذ دے گیا تھا جو اس اکھاڑہ میں دبا دیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب استاد کامو کی رگ رگ میں بھرپور جوانی نے فولاد بھرا ہوا تھا اس کی شاگردی میں کوئی کوئی پٹھا ٹھہرتا تھا۔ جو ٹھہر گیا وہ بن گیا۔ اس اکھاڑے میں جامی اور سراج دین؛ نور دین لوہار کی لڑکی کی شرط بد کر لڑے تھے اور جامی کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ چند دنوں بعد سراج دین کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو گئی تھی اور جامی کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ چند دنوں بعد سراج دین کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو گئی تھی اور جامی شاہدرہ کے قریب مال گاڑی کے نیچے آکر کٹ گیا تھا۔

اس اکھاڑے کی فضا میں جو تیل، پسینہ اور باداموں کی بو سے بوجھل رہتی تھی "یا علی مدد!" اور "یا پیر استاد!" کے نعرے گونجا کرتے تھے ...... آخر وہ وقت بھی آیا جب سرسوں کے زرد پیلے پھولوں کی بو اجڑ گئی۔ کنوئیں کی رُوں رُوں نے نوحہ خوانی کی، لہلہاتے کھیت اجڑے، سہاگ اجڑے اور استاد کامو کا اکھاڑہ بھی اجڑ گیا تھا لیکن استاد کامو کا دل زندہ رہا۔ پاکستان پہنچنے کے دو اڑھائی ماہ بعد اس نے اکھاڑہ پھر سے آباد کر لیا۔ وہ خود تو اب کشتی کے قابل نہ رہا، پیٹ ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا تھا، جسم بھی بے ڈھب اور بے قابو ہو چلا تھا اور گھٹنوں میں بھی کبھی کبھی درد کی ٹیس اٹھنے لگی تھی لیکن دل ابھی اسی طرح مچلتا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کر دس بارہ شاگرد جمع کر لئے اور کسرت شروع ہو گئی۔ جمی اکڑی ہوئی مٹی ایک ایک بار پھر کھد کر نرم و ملائم ہو گئی اور تیل پسینہ اس مٹی کو جلا دینے لگے۔ استاد کامو کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ وہ جب بھی لڑاتا تھا، خود یا اس کا کوئی شاگرد، تو سینکڑوں روپوں کی شرط لگا کر لڑاتا تھا۔ علاوہ ازیں کشتی کے دلدادہ اسے باقاعدہ وظیفہ دیتے تھے۔ اس کے ہاں کمی تھی تو اولاد کی۔ اس کے باوجود اسے بیوی کے ساتھ پہلے روز جیسا پیار تھا۔ فسادات نے جہاں ہزاروں امنگوں کا خون کیا تھا وہاں استاد کامو کے گھر میں رونق آگئی تھی۔ ایک پندرہ سالہ لڑکی نے استاد کامو کے گھر آکر پناہ لی تھی، جسے کامو کی بیوی نے سینے سے لگا لیا تھا۔ اور میاں بیوی نے اس کا نام بدل کر زینت کا نام دے دیا تھا اور منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا۔ لڑکی کے لئے استاد کامو اور اس کی بیوی اجنبی نہیں تھے کیونکہ لڑکی کو بچپن سے ہی پہلوانوں اور کشتی سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ ابھی سات آٹھ برس کی تھی کہ استاد کامو کی گود میں بیٹھنے لگ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ لڑکی استاد کامو کے اکھاڑے کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ بعض اوقات وہ کتنی کتنی دیر کسی ایک پہلوان کے جسم پر نظریں جمائے دیکھتی رہتی تھی۔ یہی وابستگی تھی کہ وہ بے بسی کے عالم میں بے خوف و خطر استاد کامو کے گھر آئی تھی اور آتے ہی سسکیوں اور ہچکیوں کی زبان میں کچھ کہا تھا...... اور استاد کامو کی بیوی نے لڑکی کو سینے کے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی کے مشفقانہ پیار و محبت میں جذب ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر اکھاڑے کی زینت بن گئی اور کمہلائی ہوئی زندگی کھل اٹھی۔

استاد کامو کو بعض دوسرے شاگردوں کے چلے جانے کا رنج تو بہت تھا لیکن اس نے چھ ماہ کی محنت سے چار اندر لڑکے تیار کر لئے اور بھاٹی دروازے والے استاد شیرے کو چیلنج کر دیا۔ استاد کامو کو "بھاٹی دروازے" کے ساتھ تو جیسے خدا واسطے کا بیر تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ استاد شیرے نے اسے ایک بار گرا دیا تھا۔ استاد کامو کو معلوم نہ تھا کہ یہ اس کی آخری کشتی ہے۔ اس کے دروازے پر بڑھاپا دستک دینے لگ گیا تھا اور استاد شیرا آئندہ کشتی کسی نہ کسی بہانے ٹالتا جا رہا تھا۔ آخر استاد کامو استاد شیرے کو گرانے کی خواہش دل میں لئے بوڑھا ہو گیا۔ اور اب وہ شاگردوں کو "بھاٹی دروازے" والوں کے خلاف تیار کر رہا تھا۔ اس کے دو شاگرد اڑھائی ہزار کی بازی پر دو کشتیاں جیت چکے تھے لیکن استاد شیرے کا

شاگرد وسیم ابھی کسی سے نہیں گرا تھا اور استاد کامو کے تین شاگرد ڈیڑھ ہزار کی بازی ہار چکے تھے۔ تیسری بار اس کے چار شاگرد وسیم نے گرائے تھے۔ اب تو استاد کامو کی یہ حالت تھی دن بھر شاگردوں کو کسرت کراتا رہتا۔ اس نے باداموں کی دو بوریاں لا کر گھر میں رکھ دیں اور پانچ سو کی ایک بھینس خرید لایا جس کا دودھ شاگرد خود دوہتے اور خود ہی پیتے تھے۔

استاد کامو کے خاص حلقہ میں دو آدمی تھے جو اس کے ہمراز اور ہم نوالہ تھے۔ ایک کرماد‌س نمبریا اور دوسرا بابو قسم کا ایک لکھا پڑھا آدمی نیاز۔ کرمادس نمبریا روپے پیسے والا غنڈہ تھا اور کئی غنڈے اس کے اشارہ پر ناچتے تھے۔ وہ استاد کامو کے اکھاڑے کا وزیر دفاع تھا۔ جہاں ڈانگ سوٹے کی ضرورت پڑتی وہ دو چار بالکے لے کر پہنچ جاتا۔ ایک بار استاد کامو دنگا فساد کے جرم میں گرفتار ہو گیا تھا تو کرمے نے دس جھوٹے گواہ پیش کر کے استاد کو بری کرایا تھا۔ اور کرمے کا سب سے بڑا احسان جو استاد کامو کے سر پر تھا وہ یہ تھا کہ اس نے ایک لڑکی کو اغوا کر کے استاد کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ یہ اس کی موجودہ بیوی تھی۔ نیاز نیو سٹار سینما کی مشین چلاتا تھا۔ فرصت کے وقت وہ استاد کامو کے خط پتر لکھتا۔ روپے پیسے کا حساب کتاب رکھتا اور کشتیوں کے جوڑوں کا انتظام کرتا تھا۔ وہ اکھاڑے کا اچھا خاصا منیجر تھا یا پہلوانی زبان میں "کھڑ پینچ" تھا۔ نیاز جوان سال آدمی تھا، خوش وضع اور خوش پوش۔ زینت اب سولہ برس سے اوپر ہو چلی تھی اور اسے نیاز اچھا لگنے لگ گیا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسے نیاز کے بغیر اکھاڑہ سونا سونا لگنے لگا۔ پھر یہ خواہش بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی کہ وہ نیاز کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرے اور کرتی ہی رہے ساتھ ہی یہ جھجک کہ نیاز اسے کہیں تنہائی میں مل ہی نہ جائے۔ وہ کیونکر اس کا سامنا کرے گی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نیاز کی تھی۔ دونوں سینوں میں ایک ہی چنگاری سلگتے سلگتے جل اٹھی اور راتوں کی تیرگی نے نیاز اور زینت کو ایک رات اکھاڑے سے ذرا پرے پیپل کے اندھیرے سائے میں کھڑے دیکھا۔ زینت کو اکھاڑے اور پہلوانوں کے ساتھ دلچسپی تو تھی ہی، اب یہ دلچسپی شوق کی صورت اختیار کر گئی۔

پیپل کی اندھیری چھاؤں میں ہر دوسری تیسری رات دو سائے ایک دوسرے میں گھل مل جاتے اور پیپل کے ڈال پات رات کا بھید یوں اپنے اندر جذب کر لیتے جس طرح وہ ہوا اور زمین سے نمی چوس لیتے ہیں۔ ایک رات زینت وقت سے پہلے پیپل کے نیچے پہنچ گئی اور بے چینی سے ادھر ادھر گھومنے لگی۔ نیاز آیا تو اس نے تقریباً بھاگ کر اس کا استقبال کیا اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہا "نیاز! خدا را کچھ کرو ورنہ میں مجھلی جاؤں گی..." وہ بغیر سانس لئے کہہ رہی تھی: "... میں کہہ نہیں رہی تھی کہ اندر ہی اندر کچھ کھچڑی پک رہی ہے۔ آج تو ساری بات صاف ہو گئی ہے۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"کرمے دس نمبریے نے استاد چچا کو کہہ دیا ہے کہ زینت کو میرے ساتھ بیاہ دو۔ لڑکی جوان ہو گئی ہے اور دیر نہیں ہونی چاہئے۔"

"تو استاد نے کیا جواب دیا؟"

"یہ کہ جلدی کیا ہے، زینت تمہاری ہے۔ چار چھ مہینے انتظار کرلو۔ زبان تو تمہیں دے چکا ہوں۔ میں ذرا بھاٹی دروازے والوں سے نبٹ لوں۔ دیکھو نیاز! اب انتظار نہ کرو چلو کہیں..."

"کیا تم انکار نہیں کر سکتیں؟" نیاز نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کرمے کی رقابت میں کیا کیا خطرات پنہاں ہیں۔ دس نمبریے کے مقابلہ میں آنا زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اگر کرمے کو نیاز اور زینت کی ملاقاتوں کا علم ہو جاتا تو نیاز کی ہلکی سی بُو بھی اس دنیا میں نہ رہتی۔

"نیاز! ایک کام کرو۔" زینت بولی "استاد چچا تمہاری بات مان جاتا ہے۔ اسے کہو زینت کو دس نمبریے کے ساتھ نہ باندھو ورنہ وہ تباہ ہو جائے گی۔ مانا وہ روپے پیسے والا طرحدار بدمعاش ہے اور دیکھنے میں اچھا خاصا معزز آدمی دکھائی دیتا ہے لیکن خدا کی قسم نیاز! مجھے اس کی بڑی بڑی مونچھوں اور سرخ آنکھوں سے خوف آتا ہے۔"

نیاز کو یوں لگا جیسے وہ ایک پری سے محبت کر رہا ہے اور دونوں پر ایک دیو کا سایہ پڑ رہا ہے۔ بدلتے موسم کی خنک رات کو

نیاز نے قمیص کے اندر پسینے کے قطرے محسوس کئے اور خشک حلق میں تھوک نگل کر چپ ہو گیا۔ اس نے زینت کا ہاتھ دبایا اور صرف اتنا کہا۔
"جو خدا کرے گا، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ یہ شادی نہیں ہو سکے گی!"

نیاز زبان کا تیز تھا، اس نے استاد کامو کے دل میں گھسنے کی ان تھک کوشش شروع کر دی۔ نیاز اور زینت کی ملاقاتیں بدستور ہوتی رہیں۔ دونوں کا عشق ثابت تھا لیکن نیاز کی زبان لڑکھڑانے لگ گئی تھی۔ دیو کا سایہ اس کی ہستی پر منڈلاتا ہی رہا۔ اس نے بارہا سر کو جھٹکا بھی دیا لیکن کرمے کو خیالوں سے نہ دھکیل سکا اور نہ استاد کامو ہی کسی بات پر آتا تھا۔

چند روز بعد، ایک شام، جبکہ اکھاڑہ میں ہر شام والی رونق تھی۔ استاد کامو ایک شاگرد کو داؤ پیچ کا آخری سبق دے رہا تھا۔ دوسرے شاگرد آپس میں مشق کر رہے تھے۔ دو بوڑھے چارپائی پر بیٹھے حقے کی گڑگڑ اور دھوئیں کی دھندلاہٹ کے سہارے شاگردوں کے ننگے جسموں میں گم گشتہ ماضی کو تلاش کر رہے تھے۔ کچھ آدمی یوں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے جیسے غیر ارادی طور پر یہاں آ نکلے ہوں اور کشتی کے "ٹھرکی" (شوقین) شاگردوں کو یوں داد دے رہے تھے جیسے سارا زور انہی کا صرف ہو رہا تھا۔ دو شاگرد بادام رگڑ رہے تھے۔
زینت جو چند روز پہلے تک اس پُر ہنگامہ رونق کا جز بنی ہوتی تھی، اس شام نیم کے درخت کے نیچے کھڑی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

استاد کامو، شاگرد سے فارغ ہو کر مٹی میں لت پت اٹھا اور تمام شاگردوں کو اکھاڑے سے باہر نکال کر کہا: "چلو بھئی جمال اور اچھا!" دوسرے لمحہ دو تیار شدہ شاگرد، جو اب ماہر پہلوان بن چکے تھے، اکھاڑے میں اُتر آئے اور کشتی شروع ہو گئی۔ دونوں اسی اکھاڑہ کے پرمدہ تھے اور استاد کامو کے شاگرد، پون گھنٹہ تک اوپر نیچے ہوتے رہے لیکن فیصلہ نہ ہو سکا اور دونوں ہانپتے ہوئے الگ ہو گئے۔ استاد کامو نے دونوں کی پیٹھ تھپکائی۔ دو چار گالیاں دیں اور ابھی وہ پہلوانی زبان میں ان پر تنقید کر ہی رہا تھا کہ ایک اجنبی جو بہت دیر سے اکھاڑے کے کونے میں خاموشی سے کھڑا تھا، کپڑے اتار کر اکھاڑے میں آ گیا اور باوقار سنجیدگی سے استاد کو للکارا "استاد! کوئی پٹھا اتار دو۔" استاد کامو نے نووارد کو دیکھا اور چند ثانئے دیکھتا ہی رہا۔ نووارد کا جسم ایسا تھا جیسے کسی بت تراش نے سالہا سال کی محنت سے بت تراش کر اکھاڑے میں رکھ دیا ہے۔ اس کا پیٹ پہلوانوں کی طرح بڑھا ہوا نہیں تھا بلکہ پیٹھ کے ساتھ لگا ہوا سارے جسم کو خوبصورت بنائے ہوئے تھا۔ کندھوں کے پٹھے گٹھے ہوئے اور جسم کے تمام اعضا کا تناسب دلکش تھا۔ سر گول اور استرے سے مُنڈا ہوا، آنکھیں چھوٹی، اندر کو دھنسی ہوئی۔ بھرا ہوا سانولا چہرہ جیسے اس میں ہڈی ہے ہی نہیں۔ کھردرے ملیشیا کا پاجامہ اور اسی کپڑے کی قمیص پہنے اور منڈے سر کے گرد ڈیڑھ دو گز کا ململ کا میلا کچیلا صافہ لپیٹے، وہ جانے کب سے اکھاڑے کے کنارے کھڑا تھا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ یہ شخص پہلوان بھی ہو سکتا ہے۔

"چلو جمال!" استاد کامو نے نووارد کے خلاف جمال کو اتارا۔ جمال نے ذرا سا دم لیا اور اکھاڑے میں اتر آیا۔ دیکھنے میں جمال کا جسم نووارد سے کم نہ تھا لیکن جونہی جمال نے حریف سے ہاتھ ملایا اور دونوں نے جھک کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو دوسرے لمحہ جمال چاروں شانے چت اور نووارد دو قدم پرے ہٹ کر استاد کامو کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جن میں سنجیدگی تھی، یہ نگاہیں داد طلب نہ تھیں۔ استاد کامو بے اختیار اچھل کر اکھاڑے میں آ گیا اور نووارد کو گلے سے لگا لیا۔ اسے جمال پر ناز تھا۔ اسے اس نے شبانہ روز کی محنت سے "بھائی دروجے" والوں کے خلاف تیار کیا تھا۔ اس نے اچھے کو نووارد کے خلاف اتارا، لیکن اس کا حشر بھی جمال جیسا ہوا۔ استاد نے نووارد سے پوچھا۔ اس نے کونسا داؤ کھیلا ہے تو اس نے جواب دیا: "طاقت اور دماغ"۔ استاد کامو نے اسے چارپائی پر بٹھایا۔ بڑے سائز کے پیالہ میں بادام پلائے اور کہا: "اگر تم اس اکھاڑے میں آیا کرو تو تمہیں پوری اُجرت دوں گا۔ روٹی کپڑا اور نصف سیر بادام ہر روز۔ دودھ جتنا پی سکو۔ اگر کچھ اور چاہو تو وہ بھی ملیگا!"
"مجھے کچھ نہیں چاہئے!" نووارد نے اداس سی خاموشی سے کہا۔ اس اداسی میں بھی ایک گونہ متانت تھی۔ "روٹی کپڑا کافی ہے اور رہنے کی جگہ!"

نووارد کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ وہ کسی کے ساتھ بات تک نہ کرتا تھا۔ اکھاڑے والوں

نے اسے سہراب کا نام دے دیا جو چند روز بعد شہراب، پھر شہرابا اور آخر میں شرابا بن گیا۔ وہ مکمل طور پر خاموش طبع انسان تھا۔ اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہونے لگ گئیں۔ کوئی کہتا یہ کانگڑہ کا ڈوگرا ہے۔ بعض کہتے مشرقی پنجاب کا گجر ہے اور اس نے اپنے آپکو پاکستان میں سمگل کیا ہے۔ ایک روایت یہ بھی تھی کہ وہ جاسوس ہے۔ لیکن شرابا جاڑے کے چاند کی طرح خاموشی سے بے آواز یا زندگی کا سفر طے کرتا جا رہا تھا۔ کشتی جیت گیا تو خوشی نہیں، ہار گیا تو غم نہیں۔ نصف سیر دودھ آیا تو پی گیا، نہ ملا تو نہ سہی۔ استاد کامو تو استاد تھا لیکن وہ دل ہی دل میں شرابے کو استاد مان چکا تھا اور اس کا سینہ چوڑا ہوتا جا رہا تھا کہ اب "بجائی درو تے" والوں کے ڈھول خاموش ہو جائیں گے۔

پھر وہ دن بھی آیا کہ بھاٹی دروازے والے ڈھول بجاتے ہوئے آئے اور سر جھکا کر لوٹ گئے۔ اکیلے شرابے نے استاد شیرے کے تین شاگردوں اور وکیم کو پچھاڑ دیا۔ اس رات استاد کامو نے جوشِ مسرت سے مغلوب ہو کر سینما دیکھا۔ پچپن سالہ زندگی میں یہ تیسری بار تھی کہ اس نے سینما دیکھا۔ "بجائی درو تے" والوں کے دانت کھٹے ہو چکے تھے لیکن استاد شیرا کیونکر چین سے بیٹھتا۔ اس نے بھاری قیمت دے کر مقبوضہ کشمیر سے ایک ہاتو سمگل کر لیا جو شرابے کا ہم پایہ تھا۔ استاد شیرے نے اسے اپنے رنگ میں تیار کرنا شروع کر دیا، اور استاد کامو کو میٹھی عید پر دو جوڑ کشتی کا چیلنج بھیج دیا۔ عید کو اڑھائی مہینے باقی تھے۔

استاد کامو نے بہتیرا چاہا کہ شرابا اس کے ساتھ کھل کر باتیں کرے لیکن وہ بالکل ہی خاموش رہتا، گریاں نہ خنداں۔ اگر وہ کسی سے ذرا سا بے تکلف ہوا تو نیاز سے ہوا جس کی وجہ کوئی بھی نہ جان سکا سوائے اس کے کہ نیاز اسے کبھی کبھی سینما لے جایا کرتا تھا۔ نیاز کہتا تھا شرابا ذہن اور اعصاب پر کوئی بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ استاد کامو نے کہا "کوئی شر شرارہ ہو گا۔ مجھے تو پہلے روز ہی شک ہوا تھا کہ شرابے پر سید حسن عاشق ہے" شرابا بعض اوقات خلاؤں میں کھو جایا کرتا تھا، گم سم۔ جانے وہ لاشعور میں کیا کچھ اٹھائے پھرتا تھا۔ اس کا شعور دو ہی موقعوں پر بیدار ہوتا تھا۔ ایک اکھاڑے میں اور دوسرا مرا پر آستر اپھیرتے وقت۔

عید کو ابھی اڑھائی ماہ باقی تھے لیکن استاد کامو یوں گھبرایا ہوا اور مصروف تھا جیسے عید پرسوں ہے اور اس کا کوئی پٹھا تیار نہیں۔ اس نے بادام کی ایک اور بوری منگوالی اور ایک اور بھینس خرید لی جس کا نصف دودھ صرف شرابے کے لئے مختص تھا۔ لیکن شرابا کسی اندرونی خلش سے بے چین رہنے لگ گیا تھا۔ بعض اوقات اکھاڑہ میں بھی دیر سے جاتا اور ایک شام بالکل گیا ہی نہیں۔ استاد کامو نے ہزار منتیں کیں لیکن وہ خاموشی سے لیٹا رہا، جواب تک نہ دیا۔ استاد کامو نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کرمے دس نمبریے کو بتایا کہ شرابے نے اکھاڑے میں آنے سے انکار کر دیا ہے۔ "اور نہ میرا حکم ہی مانتا ہے۔" کرما اٹھا اک لمبا چاقو لے کر استاد کے ساتھ چل پڑا اور کہا "سالے کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔ کمین ہماری روٹیاں کھاتا ہے اور یہ جرأت ہے؟"

استاد کامو شرابے کے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا اور کرما کھلا ہوا چاقو لئے لیٹے ہوئے شرابے کو دھمکیاں دے رہا تھا "اگر تم دو منٹ کے اندر نہ اٹھے تو یہ چاقو تمہارے سینے میں ہو گا۔" اور دو منٹ بعد کرما دس نمبریا برآمدے میں اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کا کھلا ہوا چاقو شرابے کے ہاتھ میں تھا۔ یہ تو کرمے کی خوش نصیبی تھی کہ استاد کامو درمیان میں آگیا ورنہ اس کی خیر نہ تھی۔ وہ کرمے کو لے کر چلا گیا اور شرابا پھر لیٹ گیا۔ نیاز کو پتہ چلا تو وہ رات تیسرے شو کے بعد شرابے کے گھر آیا۔ اس کی بتی جل رہی تھی اور وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ نیاز اس کی ایک آدھ دکھتی رگ جانتا تھا اس نے آتے ہی اس رگ پر ہاتھ رکھا تو شرابے کے آنسو پھوٹ آئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شرابا رویا بھی۔ اس نے آنسو صاف کئے لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ نیاز نے بہت کوشش کی کہ شرابا کوئی بات کرے تاکہ اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو جائے لیکن اس نے کوئی بات نہ کی اور نیاز جھلا گیا۔

نیاز وہاں سے واپس آرہا تھا تو اسے پیپل کے نیچے ایک مانوس سایہ متحرک نظر آیا اور نیاز بھی پیپل کے نیچے گم ہو گیا۔ "خدا کے لئے شرابے کا خیال رکھا کرو ورنہ وہ کسی کا خون کر کے پھانسی چڑھ جائیگا......" زینت نے نیاز کو کہا۔ "اگر وہ کرمے کو مار دیتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی، لیکن شرابا......" اس رات کی ملاقات میں زینت نے شرابے کے سوا اور کسی موضوع پر بات ہی نہ کی۔

دوسری صبح نیاز، شرابے کو چڑیا گھر کی سیر کو لے گیا۔ جانور اور پرندے دیکھ کر شرابے کی طبیعت میں کچھ شگفتگی آگئی۔ اس کے چہرے پر مسرت کا

میری قمیص
پٹخنا بند کرو...
چٹاخ! پٹاخ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر، پھٹی آستینیں!
میں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتا۔
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
جی ہاں۔! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح
کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت سن لائٹ کے جلد اثر کرنیوالے
جھاگ سے کوٹے پیٹے بغیر میل خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے
بھگو دیجئے، سن لائٹ صابن ملئے اور دھو ڈالئے بس آپ کا کام
ختم ہو گیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے۔!
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
SUNLIGHT
SOAP
سن لائٹ صابن
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے
S. 14—193 UD
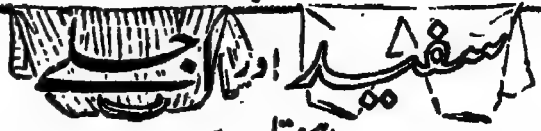
نزلہ؟
کھانسی؟
Lonfruta
اس کا فوری علاج
لیکوفروٹا
جڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی کھانسی کی دوا
آج ہی
ایک شیشی
خریدیئے
یہ بچوں کیلئے بھی نہایت مفید ہے
تجارتی تفصیلات کے لئے: ایس۔ جے اینڈ جی فضل الٰہی لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۹۰ کراچی

یہ تاثر بھی اجنبی سا تاثر تھا۔ سب سے آخر اس نے ہرن دیکھے۔ ایک ہرنی بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا ایک ماہ کا بچہ اس کے جسم پر لیٹا ہوا بڑی پیاری پیاری حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی ماں کا منہ چاٹتا، کبھی اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا۔ پیار محبت کے اس ننھے سے خوبصورت مجسمہ کو دیکھ کر قدرت بھی مسکرا اٹھی ہوگی۔

"دیکھا شرابے!" نیاز نے کہا۔ "بچہ کس طرح ماں سے پیار کر رہا ہے۔" لیکن شرابے نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسم تھا اور وہ محبت کے اس حسین کھیل میں کھویا ہوا تھا۔

اس شام شرابا اکھاڑے میں نہ گیا۔ گھر جا کر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ وہ رات بھر غائب رہا اور استاد کامو کا یہ حال کہ اس نے کھانا ہی نہ کھایا۔ سارا دن ایک ہی فقرہ دہراتا رہا۔ "میں تھانے جا کر بھاٹی دروازے والوں کے خلاف رپورٹ کروں گا کہ انہوں نے میرا شیر اغوا کر لیا ہے۔" استاد اور سارے شاگرد رات دن شرابے کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ بھاٹی دروازے بھی جاسوس بھیجے گئے۔ حد یہ کہ دو شاگرد داتا گنج تک ہو آئے۔ اسی شام نیو سٹار سینما میں دوسرے شو کے درمیان جب نیاز مشین چلا رہا تھا منیجر نے اس کے ہاتھ میں ایک سلائڈ دی کہ وقفہ کے وقت دوسری سلائڈوں کے ساتھ دکھا دے۔ نیاز نے سلائڈ دیکھی۔ اس پر بھدے سے خط میں لکھا ہوا تھا: "چڑیا گھر سے ایک ہرنی کا بچہ گم ہو گیا ہے، جس کی عمر تقریباً ایک ماہ ہے۔ ہرنی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور ایک دن رات میں بے حد کمزور ہو گئی ہے۔ جس کسی کو یہ بچہ ملے یا جو کوئی اس کا سراغ لگا سکے اسے تیس روپے انعام دیا جائیگا ورنہ جس کسی کے پاس بچہ پکڑا گیا اسے حوالۂ پولیس کیا جائیگا۔" نیاز نے سلائڈ پڑھی تو اس کے دماغ میں ایک خیال آیا اور وہ سلائڈ اور اپنے درمیان ایک خلا میں کھو گیا جس طرح دو روز پیشتر شرابا ہرنی اور بچے کے کھیل میں کھویا ہوا تھا۔ نیاز تیسرا شو دکھا کر پیپل تلے پہنچا جہاں زینت اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"شرابے کا کچھ پتہ چلا؟" زینت نے یاس انگیز لہجہ میں پوچھا۔

"نہ ملے۔" نیاز نے بے پروائی سے کہا۔ "ہم اس حسین رات کے یہ پیار بھرے لمحات کیوں ضائع کریں؟ کوئی اور بات کرو۔ کرتے نے پھر تو شادی کا قصہ نہیں چھیڑا؟"

"گولی مارو کرتے کو نیاز!" زینت نے کہا۔ "شرابے کو واپس آجانا چاہئے۔"

"کیوں؟"

"آجائے تو اچھا ہے......" زینت جھینپ سی گئی۔ "آجائے تو اچھا ہے۔ استاد چچا بہت پریشان ہو رہے ہیں۔"

اس رات کی ملاقات بھی شرابے کے متعلق باتوں میں ختم ہو گئی۔ زینت تیز قدم اپنے گھر کے پچھواڑے میں گم ہو گئی اور نیاز خراماں خراماں مایوسی کے عالم میں شرابے کے دروازے کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ رات کا پونا ایک بج رہا تھا۔ اس نے دیکھا شرابے کے کمرے میں بتی جل رہی ہے۔ اس نے سوچا شاید کوئی شاگرد ہوگا۔ شرابا کہاں۔ دروازہ کو ذرا دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ سامنے دیکھا تو کمرے کا بھی دروازہ کھلا ہوا پایا اور چارپائی پر اسے لالٹین کی مدھم روشنی میں شرابا لیٹا ہوا نظر آیا۔ نیاز بھاگ کر کمرے میں پہنچا۔ اس نے دیکھا شرابا گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے پہلو میں ہرنی کا بچہ سویا ہوا تھا۔ نیاز نے چاہا کہ وہ لپک کر ہرنی کے بچے کو اٹھا لے اور چڑیا گھر میں پھینک آئے لیکن وہ لالٹین کی طرف بڑھا، آہستہ سے لالٹین کا شیشہ اٹھایا، بتی کو پھونک مار کر بجھایا اور دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ دوسری صبح نیاز ادھر آ رہا تھا تو استاد کامو اسے رستے میں مل گیا۔ اس کی باچھیں کانوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ نیاز سے لپٹ گیا۔ "سنا تم نے پٹھے؟ میرا شیر لوٹ آیا ہے۔ میں ابھی ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔ ہرنی کے بچے سے کھیل رہا ہے اور خوب ہنس رہا ہے۔" نیاز شرابے کے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا شرابا ہرنی کے بچے کو سینے پر بٹھائے اس کا منہ چوم رہا تھا اور بچہ اس کے گول مٹول گال چاٹ رہا تھا۔

"یہ بچہ کہاں سے لائے ہو شرابے؟" نیاز نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چڑیا گھر سے چرایا ہے۔" شرابا غیر معمولی طور پر مسرور تھا۔ "مال روڈ کی طرف سے میں نے جنگلہ پھاندا اور ــــ"

"کیوں لائے ہو اسے؟"

"پیار کے لئے۔ محبت کی خاطر!" شرابے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "دیکھو تو کیسے میرا منہ چاٹتا ہے۔" نیاز کے لئے شرابے کی ہنسی قدرے حیران کن تھی۔ یہ ہنسی اس کی پہلی ہنسی تھی اور اس کے ہونٹوں پر یوں لگ رہی تھی جیسے وہ یہ ہنسی بھی کہیں سے چرا لایا ہے۔

"یہ بچہ واپس کر دو ورنہ اس کی ماں مر جائے گی۔" نیاز نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں پولیس گرفتار کر لے۔" نیاز نے اسے لمبا چوڑا لکچر دیا کہ بچہ واپس کرنا کیوں ضروری ہے۔ شرابے نے یہ باتیں ایسے انہماک سے سُنیں جیسے وہ ایک ایک لفظ سمجھ رہا ہے اور قائل ہو گیا ہے۔ نیاز نے اطمینان کا سانس لیا کہ شرابے کے مغز میں بات آگئی ہے۔ اس نے کہا۔ "تو اب یوں کرو کہ یہ بچہ خاموشی سے وہیں پھینک آؤ جہاں سے اٹھا لائے ہو۔"

"کیوں؟" شرابا یوں بولا جیسے اس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔

"میں ابھی تمہیں بتا رہا تھا کہ۔" نیاز نے اپنا لکچر پھر الف سے شروع کیا اور ہر فقرے اور خیال کی وضاحت کرتا گیا جسکے جواب میں شرابے نے کئی بار کہا۔ "ہاں بھئی! یہ تو تم درست کہتے ہو۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ یہ بھی ٹھیک ہے، اچھا بہتر ہے۔"

"تو اب اسے چڑیا گھر چھوڑ آؤ۔" نیاز نے کہا۔

"کیوں؟" شرابے نے پھر کیوں کہہ کر نیاز کو شپٹا دیا۔ "پھر میرے ساتھ پیار کون کرے گا؟ پھر میں کھیلوں گا کس کے ساتھ؟" شرابے نے بچے کو سینے کے ساتھ لگا لیا اور کہا۔ "شام کو استاد نے دودھ اور بادام بھیجے تھے، وہ میں نے اُسے پلا دئے ہیں۔"

"سنو شرابے!" نیاز نے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ پولیس کو سراغ مل گیا تو شرابا گرفتار ہو جائے گا۔

"یہ بچہ سرکار کی ملکیت ہے اور اسے لوگوں کی تفریح ـــ"

"کونسی سرکار؟" شرابے نے پوچھا۔

"پاکستان!" نیاز نے جواب دیا۔ "یہ بچہ اور چڑیا گھر کے سارے جانور پاکستان کی ملکیت ہیں۔"

"اچھا؟" شرابے کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔

دوسری صبح معلوم ہوا کہ رات کو پُر اسرار طریقے سے ہرنی کا بچہ چڑیا گھر میں واپس آ گیا۔ شرابا پھر خیالوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اس کی خاموشی اُداسی کا رنگ اختیار کر گئی اور وہ زیادہ سے زیادہ وہ کمرے میں ہی بند رہنے لگا۔ استاد کامو نے ایک دن اس کے گھٹنے چھو لئے اور کہا۔ "بھائی درو تیرے والے جیت گئے تو ـــ"

"دیکھو استاد!" شرابے نے اداس سے لہجے میں کہا۔ "اللہ نگہبان ہے۔ اس اکھاڑے میں سے کوئی جیت کے نہیں جائیگا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے مقابلہ میں ہاتو آ رہا ہے، تم فکر نہ کرو۔ پٹھوں کو تیار کرو۔ اگر کوئی پٹھا تیاری میں ڈھیلا نکلے تو مجھے بتانا۔ مجھے یہیں رہنے دو۔"

شرابا جسمانی لحاظ سے آسودہ و مطمئن تھا۔ اچھی خوراک اور ریاضت سے وہ دن بدن گول مٹول ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے کا سانولا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ لیکن دل ٹمٹماتی ہوئی موم بتی کی طرح بجھتا جا رہا تھا۔ اس نے ہرنی کا بچہ پاکستان کے نام پر واپس تو کر دیا تھا لیکن اس کی محبت اسکے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی لیٹے لیٹے اس کے ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ آ جاتی جیسے سوئے ہوئے بچے کے لبوں پر ہلکا سا تبسم ہوتا ہے لیکن اس کے بھرے ہوئے چہرے کے درمیان تاثرات کے درمیان یہ مسکراہٹ یوں لگتی جیسے قبرستان میں سے برات گذر رہی ہے۔ اور ایک دن شرابے کے گھر کے اوپر سینکڑوں کوّوں نے کائیں کائیں کا قیامت خیز شور برپا کیا ہوا تھا جیسے صحن میں یا کوٹھے پر کوئی مرا ہوا کوا پڑا ہو۔ نیاز اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ وہ شرابے کے گھر میں داخل ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ شرابا کوّوں کے دو ننھے ننھے بچے ہاتھ میں لئے منہ میں دام چبا چبا کر کھلا رہا تھا۔ نیاز کو دیکھ کر شرابا کچھ مسکرایا، شگفتہ سی مسکراہٹ۔ ٹمٹماتی ہوئی موم بتی کی لو پھر چمک اٹھی تھی لیکن دوسری صبح دونوں بچے مر گئے اور شرابے کا تو جیسے دل ہی مر گیا!

شرابے کے گھر کی فضا میں اداسیاں نوحہ گر تھیں۔ گرد و پیش کی دنیا میں گہماگہمی اور ہماہمی اسی طرح تھی جس طرح شرابے کے آنے سے پہلے تھی۔ لیکن شرابا اس ہنگامہ سے بے نیاز چار دیواری کے اندر بند رہا۔ نیاز اور زینت کی اندھیری راتوں میں ملاقاتیں اور دن کو ان کی خاموش نگاہوں کے

رہا ان میں دو تصادم بڑھتے گئے۔ کرما دس نمبریا ہوئے اور غنڈہ گردی میں مصروف رہا۔ استاد کامو دن رات شاگردوں کی جان کھاتا رہا اور راتیں دنوں کو ہڑپ کر کر کے میٹھی عید کو قریب تر لاتی گئیں ؛

ایک دن پچھلے پہر شرابا خلاف معمول ٹہلتا ٹہلتا شہر کے شور و شر سے باہر نکل گیا۔ ادھر کھلے میدان میں ڈھول بج رہے تھے اور بے شمار لوگ گول دائرہ کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ شرابا بھی غیر ارادی طور پر وہاں جا رکا۔ دیکھا کہ وہاں کتوں کی لڑائی شروع ہونے والی ہے۔ شرابا بھی اس تماشہ میں مگن ہو گیا۔ اس نے دونوں کتوں کا جائزہ لیا۔ اس کی نظر ایک کتے پر جم گئی۔ یہ ایک پنشن یافتہ صوبیدار کا کتا تھا۔ رنگ تو سفید تھا لیکن شکل اور جسامت ببر شیر کی سی تھی۔ دو آدمیوں نے اسے زنجیروں سے باندھ کر پکڑا ہوا تھا۔ کتے کے چہرے پر اس قدر گوشت تھا کہ آنکھیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ بوڑھا صوبیدار کتے کے پاس بیٹھا تھا اور کتا اس کے ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ شرابا کتے کے پیار کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگ گیا۔ اتنے میں مجمع کی دوسری طرف سے کسی نے زور سے کہا "آجاؤ صوبیدار صاحب!" دوسرے کتے کا مالک للکار رہا تھا کیا رگی دونوں طرف ڈھول بج اٹھے۔ مجمع نے ایک شور بلند کیا اور صوبیدار نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بید کی چھڑی سے اپنے کتے کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ کتا بلبلا اٹھا۔ وہ زنجیریں توڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن دونوں آدمی کتے کو پوری طاقت سے پکڑے ہوئے تھے اور کتا ڈھول کی آواز سے بھی اونچا چیخ رہا تھا۔ دوسرا کتا میدان میں آ چکا تھا ؛

"یہ کتے کو مار کیوں رہا ہے؟" شرابے نے ایک آدمی سے پوچھا ؛

"اس طرح کتا طیش میں آجاتا ہے اور خوب لڑتا ہے۔" آدمی نے جواب دیا۔ "وہ پھر اپنے حریف پر پورے غصے کے ساتھ حملہ کرتا ہے۔"

"لیکن کتا تو اس سے پیار کر رہا تھا۔" شرابے نے کہا "جو پیار کرے اسے مارنا تو نہیں چاہئے؟"

"سارے مالک یوں نہیں کرتے۔ یہ صرف اسی صوبیدار کا طریقہ ہے۔"

شرابا خاموش ہو گیا ؛

اس شام شرابا گھر واپس نہ آیا۔ استاد کامو ایک بار پھر تڑپ اٹھا۔ اکھاڑے کے گرد و نواح میں پھر وہی افراتفری مچ گئی۔ کرمے دس نمبریے نے اپنے بالکے ہر طرف دوڑا دئے۔ آخر ایک رات شرابا لوٹ آیا۔ استاد کامو کو پتہ چلا تو بھاگا ہوا اس کے گھر پہنچا۔ وہ جونہی صحن میں داخل ہوا ایک خونخوار قسم کا کتا ہیبت ناک طریقہ سے بھونکا اور غرا کر استاد پر جھپٹا۔ جب کتے نے اگلی دونوں ٹانگیں اٹھائیں تو اس کی اونچائی استاد کے برابر ہو گئی۔ استاد کامو الٹے قدموں کو دوا اور دروازے میں جا کر گرا۔ شرابے نے لپک کر کتے کو کمر سے دبوچ لیا اور "خبردار ٹائیگر" کہا۔ کتا شرابے کے قدموں میں لیٹ گیا۔

اس رات نیاز آخری شو دکھا کر لوٹا تو شرابے کے گھر میں داخل ہوا۔ کمرے میں شرابا سفید کتے کو اپنے ساتھ لٹائے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ نیاز کو دیکھ کر کتا غرایا لیکن شرابے نے کتے کو ڈانٹ دیا اور کتا لیٹ گیا ؛

"یہ کتا مالک کے ساتھ پیار کرتا تھا اور مالک اسے مارتا تھا۔" شرابے نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اب یہ میرے ساتھ پیار کرتا ہے اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ٹائیگر!" اور اپنا منہ کتے کے منہ کے قریب کر دیا۔ کتے نے منہ شرابے کے گالوں سے رگڑنا شروع کر دیا اور شرابے کا چہرہ جس پر نیند کا اثر غالب تھا، چمک اٹھا ؛

دوسری طرف صوبیدار کی راتوں کی نیند ختم ہو گئی تھی۔ یہ کتا اس نے جانے کتنے سو روپے خرچ کر کے چترال سے منگوایا تھا۔ اس وقت یہ ننھا سا پلا تھا۔ اس کتے پر اس نے دن رات محنت کی تھی اور اس نے کئی میدان مارے تھے۔ اب جبکہ اس کی شہرت نصف صوبہ میں پھیل گئی تھی، کتا چوری ہو گیا۔ اس نے اخباروں میں اشتہار دئے اور ایک سو روپے انعام کا بھی اعلان کیا لیکن کتے کا سراغ نہ مل سکا۔ یہ اعلان استاد کامو کے اکھاڑہ میں بھی سنائی دیا۔ استاد، نیاز اور چند ایک شاگردوں نے شرابے کو کہا کہ کتا واپس کر دے لیکن شرابے کی زبان پر ایک ہی جواب تھا "جس کسی نے کتا لینے کی ہمت کی اسے جان سے مار دوں گا۔" سب جانتے تھے کہ یہ خالی دھمکی نہیں۔ ایسے موقعوں پر شرابا انسان نہیں درندہ

بن جایا کرتا تھا۔ اکھاڑے والوں نے سوچا کہ شرابا کتا دینے سے تو رہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرابا ہی ہاتھ سے جاتا رہے۔ سب نے کہا کتے کو باہر نکالے اور استاد کاموں نے سب کو ہدایت کی کہ یہ خبر اکھاڑے سے باہر نہ جانے پائے جب کسی کو ایک سو روپے انعام کی ضرورت ہے وہ مجھ سے لے شاگرد استاد کو پیر کی طرح مانتے تھے، بات اکھاڑے میں ہی رہی۔

شرابے کی زندگی میں ایک بار پھر رونق آگئی۔ وہ اکھاڑے میں باقاعدہ جانے لگ گیا۔ اکھاڑے میں پھر ہما ہمی پیدا ہو گئی۔ استاد کاموں کو ایک طرف بٹھا کر شرابا شاگردوں کو تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ آدھ سیر دودھ اور بادام کتے کو پلا دیا کرتا تھا اور رات کو اپنے ساتھ سُلاتا۔ اس کے برعکس صوبیدار اس کتے کو دن میں دو بار پیٹا کرتا۔ زینت جو شرابے کی غیر حاضری میں چپ چاپ سی ہو گئی تھی، پھر کھل اٹھی۔

"زینت!" نیاز نے ایک رات ہنستے ہنستے زینت سے پوچھا "شرابا کہیں چلا جاتا ہے تو تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟"

"ہوتا تو کچھ نہیں" زینت نے ایسے لہجہ میں کہا جیسے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ نہیں سکتی۔ خود اعتمادی سے خالی لہجہ میں اس نے کہا "شرابا اکھاڑے کی رونق ہے اور تم جانتے ہو مجھے اس رونق سے کس قدر پیار ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ وہ بے چارہ تن تنہا اکیلا سا انسان ہے۔ نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں اگر وہ پہلوان نہ ہوتا تو اسے کون پوچھتا؟ سب کو اس کے فن اور جسم سے محبت ہے۔ اس کی ذات میں تو کسی کو دلچسپی نہیں" زینت باتیں کرتے کرتے نسوانی جذبات کی زد میں بہنے لگی "جانے میرا دل کیوں چاہتا ہے کہ شرابے کے پاس بیٹھ کر اس کے ساتھ باتیں کیا اور سنا کروں"۔

"معاملہ کہیں اُلٹا تو نہیں ہو رہا" نیاز نے سنجیدہ سی ہنسی ہنس کر پوچھا۔

"ارے یہ نہیں ناجے!" زینت نے نیاز کے منہ پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا "تم سے بڑھ کر کون ہے؟"

دو اور دن ہنستے کھیلتے گذر گئے۔ تیسری صبح نیاز اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ اسے زینت نے آ جگایا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے نیاز کو بتایا "رات کو ظلم ہو گیا۔ کرما رات کو آیا اور آتے ہی جلدی شادی کرنے کا قصہ چھیڑ دیا۔ استاد چچا اور چچی ٹالتی رہیں لیکن کرما تیز ہو گیا۔ وہ دونوں اس کے احسان مند ہیں۔ خلاف مرضی اس کے سامنے جھکنے لگے۔ مجھ سے رہا نہ گیا، میرا خون کھول رہا تھا۔ میں برس پڑی اور صاف کہہ دیا میں شادی نہیں کروں گی۔ خواہ گلا کاٹ دو میں کرمے کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔ میری بات سے تینوں پر خاموشی چھا گئی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کرمے کا رنگ غصہ سے لال ہو گیا۔ اس نے غصہ میں کہا "تو کس نا سے شادی کرے گی؟ ذرا نام تو لے اس کا" میں نے سوچا صاف کہہ دوں کہ میں نیاز کے ساتھ شادی کروں گی لیکن میں سنبھل گئی۔ خیال آیا وہ دس نمبریا بدمعاش ہے، کہیں تمہارے پیچھے نہ پڑ جائے۔ میں نے کہہ دیا میں شرابے کے سوا کسی دوسرے سے منہ نہ لگاؤں گی۔ میں جانتی تھی کہ کرما شرابے سے بدکتا ہے اور وہ میری جان چھوڑ کر ایک طرف ہو جائیگا۔ کرمے نے چاقو نکال لیا اور کہا "پہلے میں اس شرابے بھینسے سے نبٹ لوں، پھر دیکھتا ہوں تم راہ پر آتی ہو یا نہیں" اس کا یہ کہنا تھا کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور شرابا نمودار ہوا۔ وہ بجلی کی طرح نظر آیا اور دوسرے سانس میں اس نے کرمے کو اوپر اٹھا کر اس زور سے دیوار کے ساتھ پٹخا کہ اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور کرما وہیں بیہوش ہو گیا۔ جتنی دیر میں استاد چچا اور چچی اٹھتے، شرابے نے کرمے کو پاؤں سے پکڑ کر فرش پر گھسیٹا اور دروازے سے باہر پھینک دیا، پھر شرابے نے بڑے اطمینان سے کہا "استاد ابھی کتے کے لئے دودھ نہیں بچا۔ کچھ دودھ ہو تو دے دو" چچی نے اسے دودھ دیا اور وہ چلا گیا۔

اب کرما گھر میں پڑا ہے۔ رات ہی کو استاد نے ڈاکٹر کو بلایا تھا اور مرہم پٹی ہو گئی تھی۔ صبح صبح اسے ہوش آئی ہے اور استاد چچا نے اسے ایک سو روپیہ دیا ہے کہ وہ تھانے میں رپورٹ نہ کرے۔ اور سنو نیاز ے! ایک مزے کی بات، کرمے کو ہوش آیا تو استاد کو کہنے لگا "اب میں زینت کے ساتھ شادی نہیں کروں گا، سالی کنجری ہے" اور کہتا بھی کیا؟ در اصل شرابا دودھ لینے آیا تھا اور دروازے سے باہر کھڑا ساری باتیں سنتا رہا ہوگا۔

نیاز کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کا سینہ اور باچھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس واقعہ کے دو روز بعد صبح سویرے شرابا خلاف معمول

نیاز کے گھر گیا اور اسے بے تکلفی اور مسرت سے بستر سے گھسیٹ کر بٹھا دیا ÷

"نیاز! سُن بے نیاز!" شرابے نے اس کے سر کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "میں رات کو کتا اسی گھر میں پھینک آیا ہوں جہاں سے لایا تھا۔ جانتے ہو کیسے؟ کل آدھی رات کو میں کتے کو ساتھ لے گیا اور اسے اٹھا کر اس کے مالک کے مکان کے صحن میں باہر سے پھینک آیا۔" نیاز اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کتا خود ہی پھینک آیا ہے اور اس قدر خوش بھی ہے؟

"کیا کہہ رہے ہو شرابے؟" نیاز نے آنکھیں مل کر کہا۔ "کیا تم کتے کے بغیر زندہ رہ سکو گے؟ اب تمہارے ساتھ محبت کون کرے گا؟" نیاز نے اس کے خیال کے مطابق بات کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ "اب تمہارے ساتھ کھیلے گا کون؟"

"زینت!" شرابے نے بھرپور مسکراہٹ سے کہا۔ "اس رات اس نے ماں باپ کو صاف کہہ دیا ہے کہ میں شرابے کے سوا کسی کو نزدیک نہیں پھٹکنے دوں گی۔ اسی لئے تو میں نے کرمے کا سر کھول دیا ہے کیونکہ وہ زینت کے نزدیک پھٹکا تھا۔" زینت کی محبت کے جوش میں جو منہ میں آیا، شرابا کہے جا رہا تھا اور نیاز کا خون کھولتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا ایک سے خلاصی ہوئی تو دوسرا دیو آ دھمکا۔ لیکن نیاز کو تسلی تھی کہ شرابا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اس نے رات زینت کی یہ بات سُن لی ہوگی کہ وہ شرابے کو چاہتی ہے اور وہ اسے سچ سمجھ بیٹھا ہے۔ کہاں زینت جیسی گڑیا سی لڑکی اور کہاں شرابا دیو۔

"سنو شرابے!" نیاز نے اسے کہا۔ "تمہیں غلطی ہوئی ہے۔" نیاز نے اسے ساری بات سمجھائی کہ زینت نے کیوں کہا تھا کہ "میں شرابے کے سوا کسی سے منہ نہ لگاؤں گی۔" نیاز نے اسے بتایا۔ "یہ تو تم جانتے ہو کہ کرما دس نمبریا ہے اور میں اس کے مقابلہ میں ٹک نہیں سکتا۔ زینت نے تمہارا نام لے کر کرمے کو دھمکایا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم اتفاق سے وہاں پہنچ گئے اور کرمے کو راستے سے ہٹا دیا!" اس کے بعد نیاز نے اسے اپنی اور زینت کی محبت کی تمام روداد سنائی اور تفصیلاً بتایا کہ پیپل کے لرزتے پتوں میں اس کا ایک ایک لفظ لکھا ہوا ہے۔ آخر میں نیاز نے شرابے سے التجا کی کہ وہ دوست ہوتے ہوئے دوست کی راہ میں نہ آئے "کیونکہ زینت میری ہے۔ اور شرابے ...." نیاز نے شرابے کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے ÷

شرابے کا ردِ عمل عجیب سا تھا۔ اس نے نیاز کی بات سمجھ لی اور مان گیا۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ "اوہو، یہ بات تھی!" اور اس کے ہونٹوں کے کونے میں صبح کاذب کی طرح مسکراہٹ کا دھوکہ ہوا اور تبسم کا یہ واہمہ وہیں کہیں گم ہو گیا۔ شرابا آہستہ سے اٹھا، دو قدم چلا، رکا اور پھر چل پڑا۔ وہ اس طرح جھک کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے اعصاب پر جانے کتنا عظیم بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اگر وہ چاہتا تو نیاز کا بھی وہی حشر کر سکتا تھا جو اس نے کرمے کا کیا تھا، لیکن نیاز اس کا دوست تھا۔ نیاز نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ شرابے نے اس پر کس قدر مہربانی کی ہے کہ یوں خاموشی سے اس کی راہ سے ہٹ گیا ہے جس طرح خشک گھاس کا تنکا ہوا سے اڑ جاتا ہے۔ نیاز کو اچھی طرح علم تھا کہ شرابا گھاس کا تنکا نہیں۔ نیاز سے رہا نہ گیا۔ وہ اٹھا اور صحن میں شرابے کو روک کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے قوی ہیکل جسم سے لپٹ گیا۔ پھر اس کا گول مٹول گہرا سانولا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔ "شرابے! ناراض ہو گئے ہو؟ زینت اگر میری بیٹی یا بہن ہوتی تو میں اسے تمہارے قدموں میں ڈال دیتا۔" اس کے جواب میں شرابے کے ہونٹ ذرا سا لرزے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دو آنسو امڈ آئے جنہیں پلکوں نے وہیں دبوچ لیا۔ شرابا، نیاز کا گال تھپکا کر کچھ کہے بغیر چلا گیا ÷

نیاز نے شرابے کو دروازے سے نکلتے دیکھا۔ دروازہ بند ہوا اور اس کی ہستی کا دروازہ کھل گیا جس میں زینت اور شرابا داخل ہو گئے۔ نیاز کے منہ سے سرگوشی نکلی۔ "بے چارہ!" اور وہ آہ بھر کر کمرے میں آ گیا ÷

شرابا پھر گم ہو گیا۔ عید کو چند روز رہ گئے تھے۔ استاد کاموں نے اب اس کے پیچھے آدمی نہ دوڑائے بلکہ سید علی داتا دربار گیا اور ایک دُنبے کا نذرانہ مانا۔ وہاں سے "کوڑیوں والے" سائیں کے ہاں گیا اور شرابے کی واپسی کی دعا کرائی۔ سائیں جی نے اسے دو تعویذ بھی لکھ دیئے جن میں سے ایک استاد کاموں نے اکھاڑہ میں دبا دیا اور دوسرا شرابے والے مکان کے باہر والے دروازے کے اوپر اینٹوں میں۔ سائیں جی نے کہا تھا کہ شرابے کے صحن میں سوا پندرہ سیر چاول پکا کر غریبوں میں تقسیم کئے جائیں۔ دوسرے دن استاد کاموں نے یہ خیرات بھی دی۔ سائیں

جی نے وثوق سے کہا تھا: "تمہارا آدمی تیسرے روز جب سورج اندر باہر ہوگا گھر لوٹ آئے گا۔"

نیاز اور زینت ملے تو نیاز نے اسے بتایا کہ شرابا کس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کس قدر خوش تھا۔ "شاید تمہاری محبت کا ہی فریب تھا کہ وہ کتا واپس کر آیا۔"

"وہ بہت خوش تھا؟" زینت نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بے حد۔"

"اوہ!" زینت کے منہ سے جیسے تعجب آمیز آہ نکل گئی ہو۔ "اوہ شرابے!" اس نے زیر لب کہا اور نیاز سے مزید بات کئے بغیر سر جھکائے ہوئے گھر چلی گئی۔

تیسرے دن پچھلے پہر ایک اجنبی آدمی استاد کامو کے پاس آیا اور اس سے پوچھا شرابے نام کا کوئی پہلوان اس اکھاڑے میں ہوتا تھا؟

استاد نے اچھل کر جواب دیا۔ "ہاں! وہ کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ دوست! تمہارا منہ میٹھا کراؤں گا۔"

"وہ کوتوالی کی حوالات میں بند ہے۔"

"کہاں؟ حوالات میں؟" استاد کو چکر آ گیا۔

"قتل کے جرم میں۔ میں کوتوالی سے آیا ہوں۔ راوی روڈ پر ایک بہت بڑا حویلی نما سفید مکان ہے نا؟ لکڑی کوئلے کے ٹال کے قریب۔ وہ جالندھر والے صوبیدار افضل خاں کا مکان ہے۔ ان کا کتا گم ہوگیا تھا اور بہت دن ہوئے وہ کتا خود ہی دیوار پھلانگ کر گھر آگیا تھا۔ پرسوں آدھی رات کے وقت ایک ہٹا کٹا آدمی دیوار پھلانگ کر صحن میں آیا اور کتے کا پٹہ کھولا۔ کتا اس کو دیکھ کر بھونکا تو نہیں لیکن زنجیر کی آواز اور کتے کے ہلکے ہلکے غرانے کی آواز سے صوبیدار کی آنکھ کھل گئی۔ صوبیدار کی بیوی کا بیان ہے کہ وہ اور صوبیدار صحن میں آئے تو دیکھا کتا اس آدمی کے ساتھ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا اس طرح بغلگیر تھا جس طرح دو مرد آپس میں ملتے ہیں۔ اس نے بھی کتے کو بازوؤں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ صوبیدار برآمدہ میں پڑی ہوئی ایک لوہے کی سلاخ اٹھا کر اس آدمی پر حملہ کرنے لگا تو کتے نے صوبیدار پر حملہ کر دیا اور ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچ کر لہولہان کر دیا۔ صوبیدار نے بڑی مشکل سے کتے کو الگ کیا اور سلاخ لے کر اس آدمی کی طرف بڑھا، لیکن کتا پیچھے سے صوبیدار پر جھپٹا اور اس کی پیٹھ میں پنجے گاڑ کر پہلو میں ایسا منہ ڈالا کہ صوبیدار کی چیخیں نکل گئیں۔ اس نے پوری طاقت لگا کر کتے سے جان چھڑائی۔ وہ آدمی خاموشی سے ایک طرف کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور صوبیدار کی بیوی اسے گالیاں دیتی رہی۔ صوبیدار کے سارے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ کتا پھر اس کی طرف آیا تو اس نے سلاخ کا بھرپور وار کتے کے سر پر کیا اور کتا زمین پر تڑپنے لگا۔ پھر دوسرا وار کیا اور کتا مر گیا۔ اس آدمی نے جب کتے کو مرتے دیکھا تو اس نے لپک کر زخمی صوبیدار کو دبوچ لیا اور سر سے اوپر اٹھا کر اس زور سے دیوار کے ساتھ پٹخا کہ صوبیدار نے ایک ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ پھر وہ آدمی مرے ہوئے کتے کے ساتھ لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ صوبیدار کی بیوی نے شور مچایا تو محلے کے لوگ آ گئے۔ وہ آدمی ابھی تک کتے کے ساتھ لپٹا ہوا رو رہا تھا۔ لوگوں نے اسے گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس نے ذرہ بھر مزاحمت نہ کی۔ کوتوالی میں آتے ہی بیان دیا کہ مقتول کو میں نے قتل کیا ہے۔ کیونکہ اس نے میرا کتا مار دیا ہے۔ دوسرے دن پولیس نے چالان پیش کر دیا۔ اس نے اپنا نام شرابا بتایا ہے اور مجھے کہا تھا کہ مزنگ والے اکھاڑے میں جا کر استاد کامو، نیاز اور زینت کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ مجھے بخش دو۔"

استاد کامو نے اس آدمی کو دو روپے دے کر رخصت کیا اور اسی شام نیاز اور دو شاگردوں کو ساتھ لے کر کوتوالی گیا۔ منت سماجت سے اسے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ سب نے شرابے کو کہا کہ عدالت میں کہہ دے کہ میں نے قتل نہیں کیا اور گواہ پیش کر دئیے جائیں گے کہ واردات کی رات شرابا اپنے گھر پر موجود تھا۔ لیکن شرابا اس کے سوا کچھ کہتا ہی نہ تھا کہ "میں نے اسے مارا کیونکہ اس نے میرا کتا مار دیا تھا۔ وہ کتا میرے ساتھ محبت کرتا تھا۔ اس نے میری محبت کو مارا۔ میں کتے کو گھر لانے وہاں گیا تھا۔" استاد کامو نے ایک وکیل کیا جس نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور دیگر کاغذات حاصل کر لئے اور کیس کی اونچ نیچ دیکھی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ صاف تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ مقتول کی موت کتے کے حملے سے ہوئی ہے

چہرے اور پیٹھ کی خراشیں مہلک تھیں۔ کتے کے دانت پیٹھ کی طرف سے کھال میں اتر کر پھیپھڑوں تک پہنچ گئے تھے جس سے موت یقینی تھی۔

موقع کے صرف تین گواہ تھے۔ ایک مقتول کی بیوی جس نے سارا حادثہ بیان کیا اور دو محلہ دار جنہوں نے شرابے کو موقع پر پکڑا تھا۔ وکیل نے بھی شرابے کو کہا "استغاثہ کی کہانی بہت کمزور ہے، تم جرم سے انکار کر دینا" لیکن عدالت میں جا کر شرابے نے مختصر سے دو تین فقرے کہے "میں نے مقتول کو قتل کیا ہے۔ میں اپنا کتا واپس لینے گیا تھا۔ اس نے میرا کتا مار ڈالا۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ پٹخ کر مار دیا" ملزم کی صفائی استاد کاموں نے آٹھ گواہ پیش کئے جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ واردات کی رات شرابا اپنے گھر پر موجود تھا اور کتا مقتول کا تھا، ملزم کا نہیں تھا اور نہ ملزم کا اس کتے کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔ دو گواہوں نے یہاں تک کہا کہ یہ بھاٹی دروازے والوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ ملزم کو دراصل مزنگ اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اور گرفتار کرنے والوں نے کہا تھا کہ شرابا، کرمے دس نمبریے کا دوست ہے اس لئے وہ اسے شک میں گرفتار کر رہے ہیں۔ ملزم کے وکیل کی جرح بھی پُر مغز تھی لیکن شرابا ایسی خود اعتمادی اور دلیری سے اقبال جرم کر رہا تھا کہ استغاثہ کی کہانی قابلِ یقین ثابت ہوئی۔ مقدمہ طویل نہ تھا۔ سیشن کورٹ نے دسویں روز فیصلہ سنا دیا کہ "ملزم کو سزائے موت اور اپیل کے لئے ایک ہفتہ کی مہلت دی جاتی ہے"

شرابے کے چہرے پر سکون و اطمینان تھا جیسے اس نے فیصلہ سنا ہی نہیں۔ استاد کاموں اور نیاز نے اسے کہا کہ اپیل کی جائے گی اور اگر ہائی کورٹ نے اسے دوبارہ بیان دینے کو کہا تو وہ کہہ دے کہ پولیس نے مار پیٹ کر کہلوایا ہے کہ تم نے قتل کیا ہے لیکن شرابے نے پھر بھی یہی کہا "نہیں۔ قتل میں نے ہی کیا ہے۔ اپیل پر روپیہ ضائع نہ کرو۔ اگر تم لوگوں نے اپیل کی تو میں منظور نہیں ہونے دونگا"

فیصلہ سن کر استاد کاموں اور دوسرے لوگ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ کرمے دس نمبریے کا سر کا زخم خراب ہو گیا تھا اور پیپ پڑ گئی تھی۔ پیپ غالباً دماغ تک پہنچ گئی تھی۔ زخم اس قدر خطرناک ثابت ہوا کہ عین اس وقت جبکہ شرابے کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا کرما مر گیا۔ استاد کاموں نے بیوی اور زینت کو بتایا کہ اپیل بیکار ہے کیونکہ شرابا خود بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ کسی کی بات مانتا ہی نہیں۔ زینت نے جب یہ قصہ سنا تو اسے غش آنے لگا۔ وہ سیدھی نیاز کے گھر گئی اور اسے کہا "خدا کے لئے استاد چچا کو کہو کہ اپیل ضرور کرے اور شرابے کو بچائے"

"لیکن شرابا تو مانتا ہی نہیں" نیاز نے کہا "اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ میں اپیل منظور ہی نہیں ہونے دوں گا"

"نیاز!" زینت نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا "مجھے استاد چچا سے اجازت لے دو کہ میں شرابے سے ملاقات کرنے جاؤں"

"اری پگلی! تجھے اس قصہ سے کیا واسطہ!" نیاز نے زینت کو کہا "کرما اس طرح ختم ہو گیا ہے اور شرابا اس طرح جا رہا ہے۔ جانے دو۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ چلو بھول جاؤ۔ میں استاد کو شادی کے لئے کہتا ہوں اور اپنی زندگی بناتے ہیں، تمہیں کیا پڑی ہے"

"نیاز!" زینت نے سر جھکا کر کہا "بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ مجھے شرابے سے محبت ہے" اور رُکے ہوئے جذبات کا سیل نوجوان لڑکی کے سینے کے بند توڑ کر باہر آ گیا "اب جبکہ شرابا یہاں نہیں ہے، میں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اس کے بغیر جی نہ سکوں گی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت فریب دئے ہیں۔ شرابے کو دھکیل دھکیل کر اپنے دل سے نکالا ہے لیکن وہ ایک سایہ کی طرح میرے سینے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ گھومتا رہا اور میں اس سائے کو سینے سے دھو نہ سکی۔ سائے گم ہو جاتے ہیں نیاز! ڈھلتے ہیں۔ لیکن یہ سایہ اندھیری راتوں میں آسیب کی طرح میرے ساتھ لگا رہا، گم نہ ہوا۔ شاید اسے میں نے ہی گم نہ ہونے دیا۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں، اپنے آپ سے مجبور ہو جاتا ہے۔ تجھے ان راتوں کی قسم نیاز! جن کی گھڑیاں تو نے میری محبت میں گذاری ہیں۔ مجھے پیپل کے لرزتے پتوں کی قسم، مجھے جیل لے چلو۔ میں شرابے سے لوں گی۔ خدا کے لئے نیاز!"

نیاز کو یوں لگا جیسے وہ سمندر کی مہیب لہروں پر بے بس ہو کر بہا چلا جا رہا ہے۔ لہریں اوپر اٹھتی ہیں نیچے گرتی ہیں، گر کر اٹھتی کہ پھر گریں۔ اور نیاز کو معلوم نہ تھا کہ وہ گرے یا اٹھے کیونکہ وہ ان لہروں کے سامنے بے بس تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے شرابے کو دوستی کا واسطہ دے کر اپنی اور زینت کی راہ سے ہٹایا تھا تو وہ خاموشی سے ہٹ گیا تھا۔ نیاز نے ارادہ کر لیا کہ وہ شرابے کی دوستی کا جواب دے گا۔ اس نے استاد کاموں سے بات کی تو وہ مزاحم نہ ہوا اور کہا "اگر زینت اسے منا سکتی ہے تو تم اسے ساتھ لے جاؤ"

دوسرے دن نیاز اور زینت جیل گئے۔ جب انہیں شرابے کی ملاقات کے لئے بلایا گیا تو نیاز نے زینت کو کہا "تم اکیلی جاؤ، میں یہیں ٹھہروں گا"

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

افسانہ:

ایک اور کرن!

حمید کاشمیری

میں بھی اس بدنصیب گاڑی پر سوار تھا جس کے جانکاہ حادثے سے زندہ بچنے کی خوشی میں میاں حق نواز نے صدقہ دیا ہزاروں خانماں برباد بے کسوں، لاوارثوں، یتیموں اور مسکینوں کو کھانے کھلائے۔ مفت کپڑے تقسیم کئے اور دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاؤں سے مالامال ہوگئے۔ اور دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی سنوار لی۔ میں ان دعاؤں سے قطعی محروم رہا۔ اس لئے کہ میں نے کسی یتیم، مسکین، بے کس اور خانماں برباد کو کھانا نہیں کھلایا۔ اور مفت کپڑے تقسیم نہیں کئے۔ البتہ سفر میں نے بھی میاں حق نواز کے ساتھ فرسٹ کلاس میں ہی کیا تھا اور یہ اعزاز مجھے ان دستاویزوں کی وجہ سے ملا جو میں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اور جن کی بدولت ایک تو میں تھرڈ کلاس کی بھیڑ بھاڑ سے بچ گیا اور دوسرے مجھے اپنی گرہ سے ریلوے کا کرایہ نہیں دینا پڑا ÷

جب دن بھر تیز دھوپ کا سینہ چیرتی ہوئی گاڑی رات کی تاریکی کے پہلے دھندلکے میں داخل ہوئی تو مجھ کو کچھ تکان سی ہو رہی تھی اور اور نیند نے میرے گرد ہالے سے بننے شروع کر دئے تھے۔ میرے اعضا کچھ ڈھیلے پڑتے گئے اور غنودگی کی وجہ سے میں نرم نرم گدے میں نیچے ہی نیچے دھنستا چلا گیا۔ اس وقت مجھے قطعی طور پر یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میں ریل کا سفر کر رہا ہوں بلکہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے کوئی خواب آور شے سنگھا کر نیم بے ہوشی کے عالم میں مخملیں بستر پر ڈال دیا۔ اور پھر کسی غیبی طاقت نے میرے پلنگ کو لے کر کوہ قاف کی وادی کی طرف اڑنا شروع کر دیا ہو۔ میں ریل کے صرف تھرڈ کے ڈبوں کی جان لیوا بھیڑ، گھٹن، حبس اور گھبراہٹ ہی سے واقف تھا جہاں آدمی کے لئے سونا تو درکنار جاگنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن میں فرسٹ کلاس کے آرام دہ، فرحت بخش اور مسرت آگیں نرم و گداز گدوں سے آشنا نہیں تھا، جہاں نیند اپنے ساتھ ایک مسحور کن کیفیت لے کر آتی ہے اور آدمی ایک سرور کے سے عالم میں زمین سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اور مخملیں بستر پر ایک شانِ بے اعتنائی کے ساتھ لیٹا لیٹا اور پریوں اور ستاروں کے درمیان کسی جنت کی تلاش میں گردش کرتا رہتا ہے۔ میں کچھ اسی جنت کی تلاش میں خواب دیکھ رہا تھا اور میرا یہ خواب اس وقت ٹوٹا جب اچانک مجھے نجانے کیسے خیال آ گیا کہ میں ریل کا سفر کر رہا ہوں، اور ریل سے سفر کا خیال آتے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت گاڑی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ رات کے گھپ اندھیرے کو چیر رہی تھی، باہر کی طرف گاڑی کا وہی تھرڈ کلاس والا بے ہنگم شور بلند ہو رہا تھا جو فرسٹ کلاس میں خلاف معمول بہت اچھا معلوم ہوتا تھا جیسے بل ہیلی اپنا آرکسٹرا لئے راک اینڈ رول پر گا رہا ہو۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ہمارے ڈبے میں میرے اور میاں حق نواز کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میاں حق نواز میرے سامنے والے برتھ پر ٹیک لگائے جاگ رہے تھے۔ مجھے جاگتا دیکھ کر وہ ایکدم چونکے اور ایک ہلکی سی مشتبہ نظر میرے چہرے پر ڈالی۔ سیٹ پر رکھا ہوا ہیٹ اٹھا کے اپنے گنجے سر پر رکھ دیا۔ بجھے ہوئے پائپ کو کوئی پانچویں یا چھٹی تیلی سے سلگانے کی ناکام کوشش کی اور پھر تھوڑا سا پہلو بدل کے بجھا ہوا پائپ منہ میں لٹکائے کھڑکی سے باہر کی طرف اندھیرے میں دیکھنے لگے ÷

دن بھر میاں حق نواز اپنے تین چار ہمسفروں کے ساتھ سیاست، تجارت، منڈیوں کے اتار چڑھاؤ، اسٹاک ایکسچینج، حکومت کی کارگزاریوں، یتیم خانوں اور کچھ قومی انجمنوں کے متعلق گفتگو میں مصروف رہے تھے۔ اور میں نے یہ تمام وقت کتابیں پڑھتے گزار دیا تھا۔ اس دوران میں مجھے میاں حق نواز سے آشنائی پیدا کرنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ اور نہ ہی میں نے ان کی مصروفیت کے پیش نظر

اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
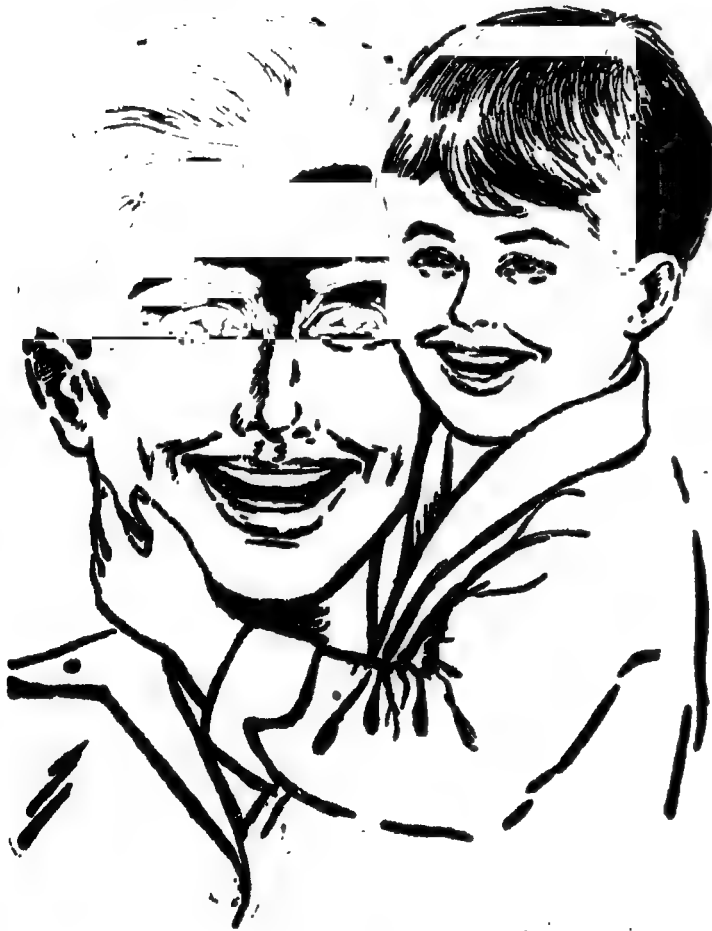
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کہ اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے! آپ کے بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے

ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف

ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔

ڈالڈا برانڈ وناسپتی

کھانوں کو بہتر بناتا ہے

دن بدن
حسین جلد
جی ہاں کیڈل آمیز رکسونا کے استعمال سے
آپ کی جلد میں ایک نئی ملائمت پیدا ہو گی - روزانہ
اس کی جھاگ کو اپنی جلد پر ملئے - آپ کی جلد
دن بدن حسین ہوتی جائے گی -
بلاشبہ
رکسونا
صابن سے
REXONA
دلکش اور
فرحت بخش خوشبو
جلد کو ملائم کرنے اور مقوی
جلد تیلوں کے ایک خاص
مرکب کا ملکیتی نام ہے -

ایسی کوئی کوشش ہی کی تھی لیکن میں نے ان کے تیوروں سے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور میری یہ خواہش تھی کہ ان کی غلط فہمی کو کسی طرح دور کر دوں۔ اور اس طرح جان پہچان کا ایک سلسلہ بھی جاری ہو جائے گا۔ جب میری آنکھ نہیں لگی تھی تو ان کے پاس ایک آدمی موجود تھا اور جب میں نے آنکھ کھولی تو ڈبے میں صرف میں اور میاں حق نواز تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بیچ میں کوئی اسٹیشن آیا ہوگا جس پر تیسرا آدمی اتر گیا ہوگا۔ میں نے برتھ کے نیچے رکھے ہوئے اپنے سوٹ کیس پر ایک نظر ڈالی جو بالکل صحیح سلامت تھا۔ پھر میں نے مطمئن ہو کر پیچھے کو ٹیک لگا لی۔

میاں حق نواز باہر کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن ان کا دھیان میری طرف معلوم ہوتا تھا۔ میری نیند کچھ اکھڑ سی گئی تھی اور مجھے تنہائی کا احساس سا ہونے لگا تھا۔ میں نے اس تنہائی کو ختم کرنے کے لئے میاں حق نواز سے بات چیت کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کی۔

"وقت کیا ہوگا؟" میں نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

"میری گھڑی خراب ہے" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر بے رخی سے جواب دیا۔ اور بدستور باہر کی طرف دیکھتے رہے۔ میں چپ ہو گیا اور کان باہر گاڑی کے پہیوں کی دھکا دھک کی طرف لگا دئے۔ اس کی آواز میں مجھے ایک موسیقی سی ملنے لگی۔ میں جس قسم کا راگ دل میں سوچتا اسی قسم کے سُر باہر سے نکلتے۔ میں نے ہلکے ہلکے سروں میں گاڑی کی چھکا چک کے ساتھ کچھ گانا شروع کیا اور خود ہی محظوظ ہونے لگا۔ پھر اسی دھن میں نرم نرم گدے پر ہولے ہولے اچھلتے ہوئے کتنے ہی میلوں کی مسافت طے کر لی۔ میاں حق نواز ابھی تک مجھ سے بے نیاز ہو کر باہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ان کے منہ میں لٹکا ہوا پائپ ابھی تک بجھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے پھر ماچس نکالی اور ایک تیلی سلگا کے بچھے ہوئے پائپ کی طرف بڑھا دی مگر ہوا کے تیز جھونکوں نے پائپ تک پہنچنے سے پہلے ہی تیلی کو بجھا دیا۔ میں اخلاقاً سگریٹ لائٹر ہاتھ میں لئے ان کی جانب بڑھا۔ جب میں نے لائٹر والا ہاتھ ان کے چہرے کی طرف بڑھایا تو وہ بدک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چوکنے ہو کر پیچھے کو ہٹ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور کچھ کہے سنے بغیر جھٹ سے لائٹر جلا ان کے پائپ پر رکھ دیا۔ انہوں نے کچھ سہمے سہمے انداز سے دو چار کش لگا کے تمباکو جلا دیا اور مجھے کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔ میں چپکے سے واپس اپنی جگہ پر آ گیا اور غور سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بہت سہمے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی سانس اندر سے قدرے پھولی ہوئی تھی جیسے وہ باہر سے قابو میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اور جب میری ان کی نظریں چار ہوئیں تو وہ کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے انہوں نے کش لگا کے دھواں بکھیرنا شروع کر دیا۔ اور میرے اور ان کے درمیان دھوئیں کی ایک دھند سی چھا گئی اور جب یہ دھند چھٹی تو وہ پھر کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرے میں دیکھ رہے تھے۔ اب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مشتبہ طریقہ پر دیکھتے ہی نہیں تھے بلکہ مجھ سے بے حد خائف معلوم ہوتے تھے۔ مجھے ان کا یہ رویہ بہت ناگوار گذرا۔ اندر ہی اندر میں نے ایک گھٹن سی محسوس کی اور ایکدم اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اٹھتے ہی وہ پھر کچھ مستعد سے ہو گئے، چپکے سے ایک ہاتھ اپنی باہر والی جیب میں ڈال دیا۔ اور اس کے اندر ہاتھ کو آہستہ آہستہ جنبش دینے لگے۔ اب وہ میری طرف یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے ہی میں نے ذرا بھی حرکت کی، وہ جیب سے کوئی خطرناک قسم کا ہتھیار نکال کر مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ میں غصے میں آ کر حاجتی میں چلا گیا اور اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر کافی دیر تک حاجتی کے اندر آئینے میں اپنا چہرا دیکھتا رہا جس سے میاں حق نواز غیر معمولی طور پر خوفزدہ تھے۔ مجھے اپنے چہرے میں ایسی ڈرا دینے والی کوئی عجیب و غریب چیز نظر نہیں آئی یا اپنا چہرہ ہونے کی وجہ سے میں خوفزدہ نہیں ہوا۔

اچانک گاڑی کی رفتار سست پڑتی معلوم ہوئی تو اس خیال سے کہ اسٹیشن آ گیا ہوگا میں فوراً دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ ڈبے میں آ کر معلوم ہوا کہ گاڑی کی رفتار ذرا بھی سست نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس وقت میاں حق نواز کی سیٹ خالی تھی۔ شاید وہ چلتی گاڑی سے کود گئے تھے۔ لیکن نہیں، میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو وہ دوسری طرف کھلی کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے اور کش پہ کش لگاتے ہوئے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ مجھ پر ایک انجانی سی نظر ڈالی اور بظاہر

دوسری طرف متوجہ ہو گئے ۔ میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا ۔ ابھی پوری طرح بیٹھنے نہیں پایا تھا کہ معلوم نہیں کیا ہو گیا ایک قیامت خیز قسم کا زلزلہ ہوا ۔ زمین کے ستون ہلا دینے والے جھٹکے محسوس ہوئے اور آسمان کو پھاڑ دینے والے دھماکے بلند ہونے لگے ۔ میں بار بار آمنے سامنے والے برتھوں سے ٹکرایا ۔ اوپر والے برتھ سے کوئی چیز بڑے زور سے میرے اوپر آن گری اور اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کیا ہوا میں اپنے حواس کھو بیٹھا ۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی قیامت خیز زلزلے سے زمین کا سینہ شق ہو گیا ہے ۔ اور میں حواس باختہ ہو کر نیچے ہی نیچے دھنسا جا رہا ہوں ۔ پھر مجھے اسی بے ہوشی کے سے عالم میں عورتوں، مردوں اور بچوں کی دلدوز چیخیں سنائی دیں اور میں ان چیخوں کے قریب اور قریب ہوتا چلا گیا ۔ پھر میں نے بھی چیخنا شروع کر دیا اور پھر میری چیخیں بھی اور لوگوں کی چیخوں کے ساتھ شامل ہو گئیں ۔ میں گلا پھاڑ پھاڑ کے چلانے لگا لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہونے والا ہے ۔ پھر ایک دم میرے کانوں کے پردے جیسے کھل گئے اور میں نے اپنے آپ کو اس آہ و بکا کے درمیان گھرا ہوا محسوس کیا لیکن مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا ۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے کی کوشش کی لیکن مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا ۔ نجانے اچانک میری آنکھوں میں کیسے حرکت پیدا ہو گئی ۔ ایک دم تاریکی چھا گئی اور دھندلاہٹ سی نظر آئی اور پھر چاروں طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے ۔ میں نے اچھی طرح آنکھیں کھول لیں اور اپنے آپ کو ملبے کے ڈھیر میں پھنسا ہوا محسوس کیا ۔ میں بے بس ہو کر ہانپنے لگا ۔ چاروں طرف قیامت مچی ہوئی تھی ۔ گاڑی کا دھچر نکل آیا تھا اور لوگ آسمان کی طرف منہ کر کر کے چیخ رہے تھے ۔ جابجا ملبے میں دہشتناک آگ لگی ہوئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ خوفناک دھواں دھوں کی آوازیں چلی آ رہی تھیں ۔ کچھ لوگ گاڑی کے سالم ڈبوں سے نکل نکل کر بھاگ رہے تھے ۔ کبھی کوئی اپنے بچوں کو بچانے کے لئے آگ میں پھلانگ رہا تھا ۔ کوئی جلتے ہوئے کپڑوں سمیت ادھر ادھر بھاگ رہا تھا کہیں بچہ ماں کے بغیر چیخ رہا تھا کہیں ماں بچے کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگ رہی تھی ۔ اس وقت کوئی کسی کا شوہر، بھائی اور بیٹا نہیں تھا ۔ سب ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے ۔ افراتفری کے عالم میں تمام رشتے ختم ہو چکے تھے ۔ صرف ایک آہ و بکا تھی جو سب کے درمیان مشترک رہ گئی تھی ۔ میرے بدن کا قیمہ سا ہو گیا تھا ۔ پھر بھی بڑی کوشش کی لیکن جسم میں ذرا بھی حرکت پیدا نہ ہو سکی ۔ اور میں اپنے اوپر سے ایک فٹ بھر کی تختی بھی نہ ہٹا سکا ۔

اس دوران میں میرے قریب سے کتنے ہی زخمی، شدید زخمی، جلے کٹے ہوئے اور تندرست لوگ چیختے پکارتے گذر گئے میں ایک ایک کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر آہ و بکا کرتا رہا لیکن میری کسی نے ایک نہ سنی ۔ پھر میں نے دیکھا کہ آگ بالکل میرے قریب آ گئی اور جس ملبے میں دبا ہوا تھا اس کے ایک حصے میں بھی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ۔ اب میں نے گھبراہٹ میں خود ہی ہمت کر کے زور لگانا شروع کیا اور میری ایک ٹانگ بمشکل تھوڑی سی باہر نکلی ۔ میں نے محسوس کیا کہ میری دوسری ٹانگ ٹوٹ چکی تھی، میں بالکل بے بس ہو گیا اتنے میں سامنے کی طرف آگ کے چیختے پکارتے شعلے سے دوڑنے لگے ۔ میں نے غور سے دیکھا، وہ کوئی نوجوان عورت جل رہی تھی میں نے ایک دہشتناک چیخ بلند کی اور پھر وہ عورت میرے بالکل ہی قریب آ کر گر گئی ۔ جس ملبے میں میں دبا ہوا تھا اس کے دوسرے حصے میں بھی آگ لگ گئی اور شعلے آسمان کی طرف بلند ہونے لگے ۔ اب میں نے چیخ چیخ کے مدد کے لئے پکارنا شروع کیا اور چیختے چیختے میری آواز بیٹھ سی گئی ۔ کوئی شخص میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا ۔ کوئی میری مدد کو نہیں دوڑا ۔ میں زندگی سے بالکل ناامید ہو گیا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا لیکن مجھے پھر امید کی کرن نظر آئی ۔ میں نے دیکھا میاں حق نواز جلدی جلدی ملبے کو ہٹاتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے ۔ میری جان میں جان آئی اور آگ کے پہنچنے سے پہلے میاں حق نواز میرے پاس پہنچ گئے تھے میں نے احساس ممنونیت کے ساتھ ان کے پاؤں کو چھو لیا ۔ اور بڑی عاجزی کے ساتھ ان کی طرف دیکھنے لگا ۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لئے مجھے غور سے دیکھا اور پھر میری طرف جھکے، مجھے دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر ایک طرف پلٹ دیا اور میرے نیچے سے ایک اٹیچی کیس نکال کر تیز تیز قدموں سے گرتے پڑتے ملبے سے باہر نکل گئے ــــ آگ میرے چاروں طرف پھیل گئی تھی اور ممکن ہے میں آگ کی لپیٹ میں آنے سے پہلے سر پھوڑ کر مر جاتا مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے ۔ مجھے فوراً ہی امید کی ایک اور کرن نظر آ گئی ۔

جٹیاں[1]

شیر افضل جعفری

ہونٹوں پر رنگیں خاموشی آنکھوں میں شرمیلی باتیں
چہروں پر مے خوار سویرے زلفوں میں مدماتی راتیں
قامت پر، عارض پر، قرباں سرو و سمن کی اونچی ذاتیں
ان کا مالا مال تبسم چیت کو بخشے لال زکواتیں
باتوں میں مصری کی ڈلیاں اُن کی جھاتیں بھی کھنڈراتیں[2]
چاندی سے کانوں میں لٹکیں سونے کی پیلی سوغاتیں
چٹوں پر کومل تاگے کے پھولوں کی رنگیں برساتیں
باہیں ان کی نور کے تڑکے چرخوں پر یہ کرنیں[3] کاتیں
موسم کی جھولی میں ڈالیں گیتوں کی میٹھی خیراتیں
شرمیلی نظروں سے کھلائے نرگس کی مستی بھی ماتیں
تاروں پر منتر برسائیں ان کی جادوگرنی گھاتیں

جوبن کی رکھوالی ہمیشہ
شرم و حیا کی پاک قناتیں

پیغامِ بے صدا

صفیہ شمیم

بحرِ ہستی کی موجِ بے پایاں
بارشِ نور، جلوۂ یزداں
عارضِ گل پہ صبحِ نو کی کرن
نوعروسِ بہار کا دامن
بادۂ آگہی، بہشتِ خیال
روح کا حُسن، زندگی کا جمال
قدسیوں کا تبسمِ رنگیں
موجِ کوثر کا نغمۂ شیریں
رُخ پہ حوروں کے دلربا شوخی
تابِ قوسِ قزح کی رنگینی
قلبِ فطرت کا نغمۂ ابدی
زندگانی کا شعلۂ ازلی
جلوۂ سادہ، جذبۂ معصوم
دل میں رقصاں، نگاہ سے معدوم
گلشنِ دل پہ بارشِ الہام
سازِ خاموش، بے صدا پیغام
روحِ پیغمبریؑ، دلِ جبریلؑ
شوق کی صبح، حسن کی قندیل

★

[1] جاٹنیاں [2] ان کے جلوے منہ میں کھانڈ ڈال دیتے ہیں [3] کرنوں

ماں!

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

★

کھیت سوتے ہیں
فضا میں کرگسوں کا ایک جھنڈ
تیرتا آتا ہے، منڈلاتا ہوا
سوئے زمیں
آنکھ میں تنہائیوں کی وسعتیں

جھونپڑی میں ایک ماں
اک جواں افسردگی
سینۂ عریاں سے لپٹائے ہوئے
ایک جانِ ناتواں

آنکھ پُرنم، ہونٹ لرزاں
"پی، مری جاں پی،
جواں ہو،
منتظر ہے تیری قرباں گاہِ امن"

★

انفس و آفاق

عبدالعزیز خالد

تہیں کاغان و ہمالہ کے مناظر بھی شیل — گو رگِ سنگ بھی ہے بہرہ ورِ سوزِ دروں
دلِ نندہ کے مچلتے ہوئے ارمانوں کے — سازوبرگ اس کا ہے اعجازِ مسیحائے بہار
اک طرف صنعتِ ترصیعِ خداوندِ جلیل — ہے مرا دل بھی تو زخموں سے گلستاں بکنار
اک طرف معجزے اہلِ ہنر انسانوں کے — اس کا سرمایہ۔ مذاقِ خرد و ذوقِ جنوں

ری آنکھیں بھی ہیں سرچشمۂ خونناب رواں — اُن کی فطرت سے ہے نیرنگیٔ قدرت کا ظہور
ن کا آغوش بھی گہوارۂ کُنہار و چناب — نشہ میرا نہیں ممنونِ خرابات و سبو
سماں پوش مری آہِ شبانہ کا دھواں — کوہ الوند کہ ہوں قاف کے برج و بارو
ن کا دامن بھی ہے جولانگہِ رہوارِ سحاب — عظمت و حُسن کے باوصف جمادِ مجبور

رگِ نے، رخصتِ صبا، شعلۂ طور، آتشِ گُل
تذکرہ زہد و ورع کا، ہوسِ مطرب و مُل
پاسِ پیمانِ وفا، صحبتِ یارِ سرِ پُل
ایک مجموعۂ اضداد ہے یہ نادرہ کار
دل کہاں اور کہاں سلسلہ ہائے کہسار
سنگِ یخ بستہ پہ ہے جن کی فضیلت کا مدار!

غزل

رَوش صدیقی

سحر کا ذکر، رسمِ عام بھی ہے
مجھے فکرِ چراغِ شام بھی ہے

غنیمت ہے کہ اب مانوس ہم سے
مزاجِ گردشِ ایام بھی ہے

کوئی سمجھے تو حُسنِ کامرانی
خلوصِ کوششِ ناکام بھی ہے

فقیہِ شہر سے کہہ دو کہ برحق
کتابِ چہرۂ اصنام بھی ہے

سنبھل اے بادہ خوارِ چشمِ ساقی
یہی وقتِ شکستِ جام بھی ہے

سمجھتا ہوں کہ زنجیرِ مشیت
مری آزادیوں کا نام بھی ہے

بس اے صورت گرِ حسنِ معانی
یہاں رعنائیِ ابہام بھی ہے

یہ دنیا اک صنم خانہ ہے لیکن
حریمِ شاہدِ بے نام بھی ہے

فروغِ حسنِ منزل کا بہانہ
غبارِ وادیِ اوہام بھی ہے

سُن اے نامحرمِ حسنِ تغافل
سکوتِ ناز اک پیغام بھی ہے

بہ صد بیتابی و دردآفرینی
محبت گوشۂ آرام بھی ہے

کوئی خاصانِ میخانہ سے کہہ دے
یہ ہنگامِ صلائے عام بھی ہے

تکلف برطرف، یہ کفرِ افکار
نکھر جائے تو پھر اسلام بھی ہے

رَوش کی پارسائی ہے فسانہ
نگاہِ ناز پر الزام بھی ہے

سراج الدین ظفر

میں نے کہا کہ تجزیۂ جسم و جاں کرو
اس نے کہا یہ امر سپردِ بتاں کرو

میں نے کہا بہار کی شب کا کوئی سراغ
اس نے کہا تعاقبِ لالہ رخاں کرو

میں نے کہا کہ یوسفِ دل ناخریدہ ہے
اس نے کہا کہ نذرِ زلیخا وشاں کرو

میں نے کہا کہ فاصلۂ شوق ہے عظیم
اس نے کہا نشاط سے طئی مکاں کرو

میں نے کہا کشائشِ مشکل ہو کس طرح
اس نے کہا وظیفۂ اسمِ بتاں کرو

میں نے کہ صرفِ دل رائگاں ہے کیا
اس نے کہا کہ آرزوئے رائگاں کرو

میں نے کہا کہ عشق میں بھی اب مزا نہیں
اس نے کہا کہ از سرِ نو امتحاں کرو

میں نے کہا کہ بابِ مشیت میں کوئی حکم
اس نے کہا نہ اس میں چنین و چناں کرو

میں نے کہا کہ خیر بھی ہے رسم، شر بھی رسم
اس نے کہا کہ ترکِ رسومِ جہاں کرو

میں نے کہا کہ ہم سے زمانہ ہے سرگراں
اس نے کہا کہ اور اسے سرگراں کرو

میں نے کہا کہ رخ سے اٹھاؤ نقابِ راز
اس نے کہا کہ ہم سے نہ دل بدگماں کرو

میں نے کہا کہ زہد سراسر فریب ہے
اس نے کہا یہ راز بیاں کم بیاں کرو

میں نے کہا غزل نے بچھایا ہے خوانِ لطف
اس نے کہا کہ دعوتِ روحانیاں کرو

میں نے کہا کہ حدِ ادب میں نہیں ظفر
اس نے کہا نہ بند کسی کی زباں کرو

عبدالحمید عدم

شفا میں ایک جراحت بھی پائی جاتی ہے
دعا میں شوخیٔ قسمت بھی پائی جاتی ہے

نظر اگرچہ تری اک ورق ہے سادہ سا
تری نظر میں حکایت بھی پائی جاتی ہے

ستم وہ کرتے ہیں گو صبح و شام، اسی میں مگر
درونِ پردہ عنایت بھی پائی جاتی ہے

وہ چیز کہتے ہیں جس کو سکونِ دل ہمدم!
کہیں وہ حسبِ ضرورت بھی پائی جاتی ہے

سنا ہے آپ کے رجحانِ طبع کے اندر
ہماری طرزِ طبیعت بھی پائی جاتی ہے

تمہاری مانگ تو سرکار ہے دو عالم میں
کہیں ہماری ضرورت بھی پائی جاتی ہے

کہے تو حالِ طبیعت کا کیا کہے کوئی
کہیں حضورِ طبیعت بھی پائی جاتی ہے

تمام بات ہی مبہم نہیں مشیت کی
ذرا ذرا سی صراحت بھی پائی جاتی ہے

ہوس کے آئینہ خانے کو غور سے دیکھو
کہ اس میں شکلِ محبت بھی پائی جاتی ہے

تمہارا حسنِ تصور تو ہے ہر اک شے میں
کہیں تمہاری حقیقت بھی پائی جاتی ہے

یہ دل جو شکلِ جہنم ہے بے کلی میں عدم!
اسی میں صورتِ جنت بھی پائی جاتی ہے

سید جعفر طاہر

ہم سے ہوتے نہ زمانے میں جو دیوانے چند
ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے کہیں ویرانے چند

ظلمتِ ہجر کی آغوش میں ہے شہرِ وصال
راہ میں یوں تو فروزاں بھی ہیں کاشانے چند

بن گئی شعلۂ صد رنگ طربگاہِ بہار
ہائے وہ دستِ حنا بستہ وہ پیمانے چند

کون یوں ذکرِ نگارانِ حرم کرتا تھا
کاش دیتے جو دکھائی کہیں بتخانے چند

تتلیاں بن کے اڑے، لالہ و گل بن کے ملے
توڑ کر پھینک دیئے ہم نے جو پیمانے چند

شرم سے آنکھ اٹھاتی ہی نہیں شمعِ جمال
جان پر کھیل کے پہنچے تو ہیں پروانے چند

موجِ نشہ تری ہر لغزشِ مستانہ ہے
لیکن اس راز کو سمجھے بھی تو مستانے چند

سببِ ولولۂ موجِ صبا ہم سے سنو
رخ ہوا کا تو بتا دیتے ہیں فرزانے چند

آرزو ہے کہ ترا بندِ قبا ہاتھ آئے
ہیں غمِ دہر کے عقدے ابھی سلجھانے چند

شاعرو، نغمہ گرو، دیدہ ورو کچھ تو کرو
غم ہزاروں ہیں مگر نام کے میخانے چند

اتنا رسوا تو نہ تھا شہر میں جعفر طاہر
اب جہاں پہنچا وہیں چھڑ گئے افسانے چند

شان الحق حقی

سب جلوے ہو چکے وہ ہماری نظر کے خواب
یہ دیکھتی ہے چشمِ تمنا کدھر کے خواب
گرویدہ ہو گئے مرے ذوقِ نظر کے خواب
چھوڑیں گے چشمِ شوق کو دیوانہ کر کے خواب
سو رنگ سے نگاہ میں آئے سحر کے خواب
بکھرے ہیں دل کے خون سے کیا کیا نظر کے خواب
آنکھ اب بھی دیکھتی ہے تری رہگزر کے خواب
جلووں سے جن کے گرد مرے عمر بھر کے خواب
ایسا بھی تھا کبھی کہ شبِ ماہتاب میں
میری نظر میں بھی تھے کسی کی نظر کے خواب
دیکھے کوئی شباب کی آسودہ خوابیاں
اللہ رے اس ایک شبِ مختصر کے خواب!
ساقی یہ شرط ہے کہ زمانے کی ضد پہ ہم
رکھ دیں ہر ایک تلخ حقیقت کو کر کے خواب
ہو جیسے آئینے سے تجلی حسن بے حجاب
یوں بھاگتے ہیں میری نگاہوں سے ڈر کے خواب
آئینہ ہو گئیں تری نظروں کی شوخیاں
افسانہ بن گئے، مری حیراں نظر کے خواب
کیا کہیے اس جراحتِ پنہاں کی لذتیں
دل کے فسردہ زخم ہوئے ہیں نکھر کے خواب
اس طرح دل میں تیری تمنا ہے آج بھی
جیسے نگاہِ گل میں طلوعِ سحر کے خواب
یاد آ رہی ہے صحبتِ یارانِ ہم سخن
چونکا رہے ہیں دشت میں دیوار و در کے خواب
ہے مجھ کو آج بھی ترے وعدوں پہ اعتبار
کچھ رہ گئے ہیں خواب کی حد سے گزر کے خواب
گم ہو گئے ہیں آہ وہ جلوے کہ جن کا اب
نظارہ جیسے جی ہو میسر نہ مر کے خواب

ادیب سہارنپوری

توجہ کے تری قابل کہاں ہم
یونہی ہوتے رہیں گے رائیگاں ہم
پریشاں کیوں ہیں اے دیدہ وراں ہم
نہیں مہر و نجوم و کہکشاں ہم
محبت فاصلے کم کر رہی ہے
وگرنہ تم کہاں تھے اور کہاں ہم
تماشا ہیں، تماشائی نہیں ہیں
زمین و آسماں کے درمیاں ہم
خفا اس جرم پر ہم سے ہیں گلچیں
سمجھتے کیوں ہیں پھولوں کی زباں ہم
بہت ہم سے نہ یہ بے اعتنائی
متاعِ باغ ہیں، اے باغباں ہم
سبک کیا تیری نظروں میں ہوئے ہیں
کہ جیسے ہوں دو عالم پر گراں ہم
خدارا یوں نہ اٹھلاتی ہوئی چل
بہت اے موجِ گل ہیں سرگراں ہم
نگاہیں تک نہ اٹھیں ان کے آگے
بہت مشہور تھے جادو بیاں ہم
ادب اُن سے جو مل جاتی ہیں نظریں
تو پھر رہتے ہیں آپے میں کہاں ہم

آئیے بہتر زندگی اختیار کریں

ٹھیک کھائیں ٹھیک جئیں

ہمارے شاعر تو زخم دل کھاتے اور خون جگر پیتے ہیں لیکن دوسرے تو ایسا کرنے سے رہے۔ انہیں تو کھانا بھی ہے اور پینا بھی۔ اگر کھائیں پئیں نہیں تو جئیں کیسے؟ مگر سچ پوچھئے تو کھانے کا ڈھب انہیں بھی نہیں آتا۔ جو نظر آیا اور جب جی چاہا، کھالیا۔ بس اسی میں خوش ہیں کہ پیٹ تو بھر لیا۔ چٹپٹی چیزیں کھا کر مزا تو آگیا۔ زبان پر پھپھولے ہی کیوں نہ پڑ جائیں اور آنتیں چیختی چلاتی ہی کیوں نہ رہیں۔ یونہی الابلا کھا لینے سے کیا بنتا ہے۔ کھانا بھی ضائع اور فائدہ بھی کچھ نہیں۔ اس سے صحت بنتی کم اور بگڑتی زیادہ ہے۔ آخر یہ ستم ظریفی کیوں؟ آئیے ہم اپنی ضرورتوں کو سمجھیں اور جو کچھ کھائیں سوچ سمجھ کر کھائیں۔

پہلے ایک گر سن لیجئے جو سو گروں کا ایک گر ہے: **ٹھیک خوراک، ٹھیک وقت، ٹھیک مقدار، ٹھیک طریقہ۔**

ٹھیک خوراک: اچھی خوراک وہی ہے جو ہلکی پھلکی، سیدھی سادھی ہو، جلد ہضم ہوجائے، معدہ پر بوجھ نہ ڈالے، طاقت بڑھائے، چست و چاق اور کام کاج کے لائق بنائے، بیماری نہ پیدا کرے۔ اس کے ساتھ ہی جسمانی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت بھی کرتی رہے، اور زہریلے فاسد مادوں کا اثر زائل کرے۔ ایسی خوراک وہی ہوسکتی ہے جس میں غذائی قوت ہو۔

آئیے ہم مختلف قسم کی غذاؤں پر ایک نظر ڈالیں۔

پروٹین: ان سب میں نائیٹروجن پائی جاتی ہے۔ مثلاً گوشت، انڈے، دودھ، پنیر، مچھلی۔ یہ چیز دالوں، مٹر، سیم، اور اناج میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے دوسرے جزو ہیں: کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، گندھک اور کبھی کبھی فاسفورس بھی۔

کام: یہ چربی اورنشاستوں کی طرح قوت پیدا کرتی ہیں، لیکن ان کا خاص کام، جو صرف یہی انجام دے سکتی ہیں، گوشت بنانا، عضلات وغیرہ کو بڑھانا اور جسم کی ٹوٹ پھوٹ کو دور کرنا ہے۔

غلیظ ماحول میں غلیظ کھانا

کاربوہائیڈریٹ : کاربن ، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مرکب مثلاً نشاستہ اور شکر ۔ نشاستہ ہضم ہوکر شکر بن جاتا ہے ۔ یہ مرکب چیزیں بہت جلد ہضم ہو جاتی ہیں اور جسم میں قوت و حرارت پیدا کرتی ہیں ۔ مثالیں : اناج، دالیں ، چاول ، میٹھے پھل اور میوے ۔

چربی : یعنی چکنی چیزیں ۔ ترکیب کاربوہائیڈریٹ جیسی ، لیکن آکسیجن کی مقدار نسبتاً کم چنانچہ یہ ان کی جگہ برتی جاسکتی ہیں ۔ مثالیں : دودھ ، مکھن ، گھی ، تیل ، وغیرہ ۔

نمک یا دھاتیں : مثلاً سوڈیم ، پوٹاشیم ، کیلسیم ، میگنیشیم ، فولاد وغیرہ ۔ یہ تندرستی کے لئے ضروری ہیں اور تھوڑی بہت ہر غذا میں پائی جاتی ہیں ۔ مثلاً سبزی ، ترکاری ، پھل اور ساگ وغیرہ ۔ لوہا خون کے سرخ ذروں کو بڑھاتا ہے اور کیلسیم سے ہڈیاں اور دانت بنتے ہیں ۔

پانی : یہ زندگی کے لئے اشد ضروری ہے ۔ خوراک کے ہضم ہونے میں مدد دیتا اور خون کو مائع حالت میں رکھتا ہے تا کہ وہ جسم میں آسانی سے دورہ کر سکے ۔ انسان میں ۶۰ فی صد وزن پانی ہی کا ہوتا ہے ۔

حیاتین یا وٹامن : یہ وہ جوہر ہیں جو غذا تو نہیں لیکن ہاضمہ کے لئے لازمی ہیں ۔ ان سے جسم تندرست رہتا ہے اور بیماریاں دور ہوتی ہیں ۔ عام طور پر یہ تازہ پھلوں ، دودھ ، مکھن ، کلیجی ، ساگ ، ٹماٹر وغیرہ میں پائے جاتے ہیں ۔ ان کی بہت سی قسمیں ہیں، جن کو اے ۔ بی ۔ سی ۔ ڈی کے نام سے موسوم کیا جا تا ہے

پیسے بھی دیں اور بیماری بھی مول لیں !

بعض حیاتین کے نہ ہونے سے ''کمی کی بیماریاں،، مثلاً بیری بیری (فیل پا) ، کھجلی وغیرہ ہو جاتی ہیں ۔ زیادہ تیز آنچ سے ان کا اثر زائل ہو جا تا ہے ۔

ہم لوگ اپنے کھانے میں روٹی ہی سے بسم اللہ کرتے ہیں ۔ کیوں نہ ہو ، دانئہ گندم ہی تو انسان کی پہلی کمزوری تھی، اور ہے ۔ اس کی حیثیت ایندھن کی سی ہے ، جس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور جو جسم کو گرم اور زندہ رکھنے کے کام آتی ہے ۔

نشاستہ کی چیزوں کو چاہے جس شکل میں بھی کھایا جائے بات ایک ہی ہے ۔ وہ ہیں تو ایندھن ہی مگر ان کا کھانا بڑا ضروری ہے ۔ مگر ایک بات ہے ۔ ان کو ایسی شکل میں کھایا جائے کہ جلد ہضم ہو جائیں ۔ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہم آٹا کھاتے تو ہیں لیکن جو چیز

اس میں کارآمد ہے اس کو پھینک دیتے ہیں یعنی بھوسی - اس میں نہ صرف چھلکے کے اعلیٰ غذائی جوہر ہوتے ہیں بلکہ یہ غذا کے لطیف جزو اخذ کرنے اور فضلے کو انتڑیوں سے گزر نے اور ان کو صاف رکھنے میں مدد دیتی ہے - اس لئے بن چھنے آٹے ہی کی روٹی کھانی چاہئے اور ہر حال میں موٹا آٹا ہی اچھا رہیگا - باریک آٹا، جس کو میدہ کہتے ہیں ، معدہ اور ہاضمہ کی نالی کی نازک جھلی میں کھپ بھی جاتا ہے اور اس پر جم بھی جاتا ہے جس سے ان کا عمل ہی بگڑ جاتا ہے - گندم ، جو ، وغیرہ کو دلیے کی صورت میں کھایا جائے تو وہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے - آٹے یا سوجی کو خمیر کر کے پکایا جائے یا ڈبل روٹی بناکر کھایا جائے تو وہ بھی بہت زودھضم رہتا ہے -

میٹھا انسانی نشو و نما کے لئے ضروری ہے ، لیکن اس کو مٹھائیوں کی شکل میں کھانا بہت مضر ہے - چینی کو انسانی نسل کا سب سے بڑا دشمن کہا گیا ہے کیونکہ اس میں عمدہ جوہر نہیں ہوتے اور اس کو جذب کرنے کے لئے جسم کو حد سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے - یہی وجہ ہے کہ مٹھائیاں ہاضمہ پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں - خصوصاً اس قسم کی گردآلود اور مکھیوں کی پوٹ مٹھائیاں جو ہمارے بازاروں میں عام فروخت ہوتی ہیں - وہ در اصل مٹھائیوں کی شکل میں زہر ہیں - میٹھے کی ایک نہایت مفید شکل شہد ہے جس میں اعلیٰ طبی خاصیتیں بھی پائی جاتی ہیں -

سبزیاں ہاضمہ کے لئے بہت مفید ہیں - ان سے پیٹ صاف رہتا ہے ، معدی نالی پر زور نہیں پڑتا - یہ فضلے کو خارج کرنے میں بھی مدد دیتی ہیں - پتوں والی سبزیاں مثلاً ساگ اور میتھی، بند گوبھی وغیرہ بھی بہت مفید ہیں - ان میں لوہا پایا جاتا ہے جو بڑی طاقت کی چیز ہے - زمین کے نیچے اگنے والی چیزیں، مثلاً شلغم ، مولی ، گاجر وغیرہ بھی بڑی مفید ہیں -

دودھ ایک بڑی مکمل غذا ہے - کیونکہ اس میں سب قسم کی چیزیں یکجا پائی جاتی ہیں - یہ چھوٹی عمر کے بچوں کو موافق آتا ہے - لیکن دیکھا گیا ہے کہ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے یہ اکثر مفید ثابت نہیں ہوتا - اسی لئے بعض لوگ اس کو کیمیاوی طور پر ترش کر کے پینے پر زور دیتے ہیں - دودھ غٹاغٹ پینے کے بجائے گھونٹ گھونٹ پینا چاہئے تاکہ معدہ میں پہنچنے سے پہلے منہ کی ہاضم رطوبتیں اس میں اچھی طرح مل جائیں -

چکنائی کھانے کو ثقیل بنادیتی ہے - اور ہاضم رطوبتوں کو اس پر عمل کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے - پراٹھے اور میدہ کے بنے ہوئے شیرمال ، پوریاں ، قتلمے بہت بوجھل اور دیرھضم ہوتے ہیں - مرغن کھانے بھی اسی وجہ سے موزوں نہیں -

دودھ — ایک مکمل غذا

تو پھر ٹھیک خوراک کونسی ہے؟ —— یہی جس میں تمام ضروری غذائی جزو موجود ہوں اور انہیں اس طرح کھایا جائے کہ غذائیت کو نقصان نہ پہنچے، جیسا کہ غلط طریقے پر پکانے اور ضرورت سے زیادہ بھوننے یا تلنے سے ہوتا ہے۔ غذا عمر اور ضرورت کے مطابق ہونی چاہئے۔ مختلف قسم کے کام کرنے والوں کی غذا بھی مختلف ہونی چاہئے۔

ٹھیک مقدار: کھانا اعتدال سے کھانا چاہئے بعض لوگ کھاتے ہیں تو ات گت۔ اس میں احتیاط لازم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے ایک ظریف شاعر نے ہاتھ کی روانی پر جو نظم لکھی ہے وہ انہیں پر صادق آجائے!

ٹھیک طریقہ: کھانا وقفے وقفے سے کھائیں۔ اور اس وقت جب طبیعت اس کا پورا

کیا کتنا؟ — ٹھیک غذا کے جزو

کھانے کو لذیذ بنانے کے لئے مسالے بھی برتے جاتے ہیں۔ اگر یہ زیادہ تیز ہوں تو نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ جو لوگ مرچیں، چٹنیاں، اچار، سرکہ زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ اپنے ہاتھوں زندگی کی جڑیں کھودتے ہیں۔

ٹھیک وقت: بعض لوگ وقت ناوقت کھاتے ہی رہتے ہیں۔ جب دیکھو منہ چل رہا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بار بار کھانے سے ہاضمے کے فعل پر اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ معدے اور معدی نالی کو آرام کا موقع نہیں ملتا۔

تقاضہ کرے۔ کسی نہ کسی وقت ورزش اور کھیل کود بھی لازم ہے۔ کھانا خوب چبا چبا کر کھانا چاہئے تاکہ دانتوں کا کام آنتوں کو نہ کرنا پڑے۔ کھانا بڑی خوشی اور رغبت سے کھانا چاہئے اور بڑے شگفتہ اور ستھرے ماحول میں۔ غم، غصہ، پریشانی اور جھنجھلاہٹ سے ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔ پانی صاف ستھرا پینا چاہئے اور اگر یہ گدلا اور بھاری ہو تو ابال کر پینا چاہئے۔ زیادہ گرم یا سرد چیزیں نہ کھائیں اور نہ ایک وقت سرد و گرم چیزیں ملاکر کھائیں *

قدیم کراچی

ہمایوں مرزا

کراچی پاکستان کا دارالحکومت ہونے کے علاوہ اس کی اہم ترین بندرگاہ بھی ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ کسی وقت میں یہ فوجوں کی چھاؤنی تھا جہاں ذخائر جنگ کے گوداموں میں ریل کی پٹریوں کے لئے ہزار ہا ٹن فولاد اور لوہا اکٹھا کیا جاتا تھا علاوہ بریں یہ لندن اسٹاک ایکسچینج کے لئے کھجور اور کافی کی منڈی تھا۔ پھر بھی یہ کچھ ایسا بارونق مقام نہ تھا۔ آج سے اسّی سال پہلے اس کی آبادی کم از کم آٹھ ہزار سے چودہ ہزار تک تھی۔ پندرہ سال بعد یہ ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی اور پھر آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔

مختلف اور عجیب تلفظ

کبھی تو اس کا تلفظ "کراچی" کیا گیا کبھی "کرنچی" اور کبھی "کوراشی"۔ آخر کار اس کا نام "کراچی" سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا۔ "تاریخ کراچی" مولفہ مسٹر بیلی (۱۸۹۰ء) تک اس کا کوئی مقررہ تلفظ نہ تھا۔ اس سے پہلے گھریلو، تجارتی اور دفتری کاروبار میں اس کو "کراچی" ہی کے نام سے یاد کرتے رہے۔ اور اس کے کئی اور تلفظ بھی جاری رہے۔ انگریزی عہد میں "چیمبر آف کامرس" کے اہالی موالی "کراچی" لکھتے رہے اور سندھ، پنجاب اور دہلی کے ریلوے سپرنٹنڈنٹوں نے مراسلت میں اس کو "کراچی" ہی لکھا۔ حکومت ہند اور پنجاب کی تجارتی رپورٹوں میں تو اس کا موجودہ تلفظ "کراچی" قائم رہا۔ تیز ریلوے گائیڈ، جہازوں کی فہرستوں، محکمہ جات تار برقی میں ناظم تار برقی ہند نے حکم جاری کیا کہ اس کا تلفظ "کراچی" لکھا جاتا رہا ہے۔ اس طرح ہماری بندرگاہ کے متعلق جو برصغیر کی تیسری مشہور بندرگاہ ہے، ایک عام صحیح تلفظ کی ضرورت پیش آئی۔

محل وقوع

راس موازی یا مونزے کراچی کا سب سے پہلا نقطہ یا مقام ہے۔ جو بحر احمر کی طرف سے جہاز میں آنیوالوں کو دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس راس کا بڑا حصہ سمندر میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا عرض البلد شمالی ۲۴، ۵۱ اور شرقی ۶۶، ۳۷ ہے۔ یہ دریائے حب یعنی وہ دریا جو علاقہ سندھ اور قلات میں حد فاصل قائم کرتا ہے، کا دہانہ اور سابقہ سلطنت ہندوستان اور موجودہ پاکستان کی مغربی سرحد ہے۔ اس کا باب الداخلہ ایک مقام مونزے سے منوڑا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے بندرگاہ کراچی بیس میل دور ہے۔ منوڑا پائینٹ (روشنی کے مینار) سے میری دیدرا یا ٹیر تک جزیرہ "کیامیری" یا کیماڑی پر واقع ہے۔ جو بائیس کیبل سے زیادہ دور نہیں گویا کراچی تک تین میل کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ "کسٹم ہاؤس" دو میل آگے ہے۔ روشنی کا مینار بیس میل دور سے نظر آتا ہے۔

انگلستان کی بندرگاہ

ساؤتھمپٹن سے کراچی ۵۹۱۰ دریائی میل اور بمبئی (۶۱۱۹) میل ہے گویا کراچی بمقابلہ بمبئی کے ساؤتھمپٹن سے ۲۰۱ میل قریب تر ہے۔

بحر ہند میں کراچی ہی وہ بندرگاہ ہے جس میں یورپی نیوی نے جہاز چلائے اور یہ برصغیر کا پہلا شہر ہے جہاں سے پہلا تار برقی پیغام انگلستان بھیجا گیا تھا۔

انگریزوں کے زمانہ میں بندرگاہ کراچی کی اہمیت اور افادیت پر نظر گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں بیرونی تجارت نے یہاں کے تاجروں میں ذوق و شوق پیدا کیا اور بمبئی کے انگریز تاجروں نے بہت جلد بندرگاہ کی ترقی، ساحلی علاقہ پر بارکوں اور سڑکوں کی تعمیر اور مختلف اداروں کے قیام میں حصہ لیا۔ چنانچہ یہ بہت جلد ایک معمولی گڑھی سے ایک بڑا شہر بن گیا، جس میں فوجی چھاؤنیاں

بھی شامل تھیں ۔

سر چارلس نیپیئر، فاتح سندھ، یہاں کا پہلا گورنر تھا جس کی توجہ سے کراچی نے بہت ترقی کی۔ اس نے نہ صرف شہر کا رقبہ بڑھایا بلکہ بندرگاہ میں بھی توسیع کی اور محکمۂ حفظانِ صحت کا انتظام بھی کیا جو اس کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

کھاڑی کے ساحل کی تعمیر اور اس سے مضافاتِ کراچی کا الحاق یعنی اس رقبہ میں کیماڑی کی شمولیت شہر کی توسیع کا پہلا اقدام تھا ۔

نیپیئر روڈ کی تعمیر نے، جس کا تعلق براہِ راست بندرگاہ سے تھا، کاروبار تجارت میں بڑی سہولت پیدا کر دی تھی جو پہلے مفقود تھیں۔ کراچی بہت عرصہ سے پہلے کمشنر سندھ کا مستقر قرار دیا گیا جو پورے صوبے کا ناظم تھا۔ اس طرح تمام دفاتر یعنی محکمہ جات مال، عدالت تعمیرات وغیرہ یہاں منتقل ہو گئے اور حیدرآباد (سندھ) کی اہمیت کم ہو گئی۔

۱۸۳۸ء میں انگریزوں کا کراچی پر قبضہ ہوا۔ لارڈ آک لینڈ کے زمانہ میں امیر دوست محمد خاں والئی کابل سے جنگ چھڑ گئی۔ تالپوری حکمراں طاقتور نہ تھے۔ سر جان کین صدر کمشنر صوبۂ بمبئی، کو حکم دیا گیا کہ سندھ پر فوراً حلہ بول دیا جائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس بندرگاہ کا قدیم باب الداخلہ ۱۷۹۹ء کے زلزلہ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس لئے یہ تمام فوج "منوڑا" پار لنگر انداز ہوئی اور یکم فروری ۱۸۳۹ء کو اسی مقام کے ایک چھوٹے سے قلعہ پر بغیر کسی پر گولی چلائے قبضہ ہو گیا مگر پھر صلح ہو گئی، جس کی رُو سے منوڑا پر جو گویا کراچی کا دل ہے، برطانوی فوج عارضی طور پر قابض رہی۔ چند سال بعد سرکاری طور پر انگریزوں کا پوری کراچی پر قبضہ ہو گیا ۔

۱۸۴۲ء میں سر چارلس نیپیئر اور دریائے سندھ کے نشیبی علاقہ کی حکومتوں کے درمیان دوستانہ صلح ہو گئی جس کے مطابق کراچی اور چار دوسرے شہر جو دریائے سندھ کے کنارے پر واقع تھے، ہمیشہ کے لئے برطانیہ کے حوالے کر دئے گئے ۔

ان فتوحات کی یادگار میں سر چارلس نیپیئر نے ۱۸۴۹ء میں ایک مینار بنایا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کراچی کے ایک حصہ میں ایک "کھڑکی" گرجاگھر میں جنرل نیپیئر اور جنگ میانی کے فاتحین کی یاد میں بنائی گئیں ۔

بندرگاہ

"کروکالا" بحر ہند کا وہ پہلا بحری مقام ہے جہاں یورپی بیڑہ آیا تھا۔ اس کا طول البلد ۶۶٫۱۸۰۰ مشرق (گرینویچ)، اور عرض البلد شمالی ۵۰ ، ۴۳ ہے ۔

کراچی کی کسی صحیح تاریخ کا پتہ نہیں چلتا، لیکن ڈاکٹر ولیم ونسنٹ (ڈین ویسٹ منسٹر) نے اپنی تالیف "بحر ہند میں قدما کے تجارتی راستے اور بحری سفر" میں لکھا ہے کہ "میں اس خلیج کا ایک خاکہ پیش کرتا ہوں جس سے اطمینان بخش طریقہ پر واضح ہو جائیگا کہ بحر ہند کی وہ سب سے پہلی بندرگاہ کونسی تھی جہاں بیڑہ لنگر انداز ہوا" اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا یورپی بیڑہ ۳۲۶ق م میں یہاں آیا تھا اور دریائے فرات کے دہانہ کی طرف سے دریائے سندھ کے دہانہ کی طرف پہنچا تھا۔ یہ ۲ اکتوبر ۳۲۶ ق م کو "کروکالا" کے مقام یعنی مضافات کراچی میں پہنچ گیا تھا۔ اور دوسرے ہی دن واپس ہو گیا تھا۔ کروکالا اور کراچی نیز کیماڑی کے متعلق بعض مسائل مابہ النزاع ہیں بعض مصنفین نے اسکو بندرگاہ سکندر سمجھا ہے بعض کا بیان ہے کہ قدیم زمانہ میں سندھ کا ایک ضلع "کروکالا" کے نام سے موسوم تھا۔ بہرحال یہ امر مسلّمہ ہے کہ کراچی دریائے سندھ کے کسی معاون کے کنارے کبھی واقع نہیں تھا اور دریائے سندھ کے دہانے کی تبدیلیوں کی وجہ سے کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی راس موواری ایک قدرتی طور پر سنگلاخ زمین ہے۔ اور راس منوڑا کی شکل بالکل جداگانہ ہے ۔

بعد کے ماہرین مساحت نے لکھا ہے کہ یہ تنگ کنارہ صاف اور چکنی چٹان کی ایک روک ہے، جو خصوصاً ریتیلی ہے لیکن اس میں ریتیلی چٹانوں کے ٹکڑے، گول پتھر، سنگریزے اور کیچڑ موجود ہے۔ لفٹنٹ کمانڈر کارلس نے کراچی بندرگاہ کے متعلق ۱۸۳۸ء میں جو سروے رپورٹ پیش کی تھی اس میں بیان کیا ہے کہ تقریباً ۲۰ سال سے یہ بندرگاہ موجودہ مقام کے بجائے مغربی جانب، پانچ چھ میل کے

فاصلہ پر اسی جگہ واقع تھیں جہاں اب ایک بڑی کم گہری جھیل سندھ سے علیحدہ ہوکر وجود میں آگئی ہے اور وہاں اب ایک ریت کا ٹیلہ بن گیا ہے۔ اس زمانہ میں یہ ٹیلہ عام طور پر اَوَرنگا بندر کے نام سے موسوم تھا۔ آج کل اس مقام کو "اورنگی" کہتے ہیں۔ ہندو باشندے اس کو "رام باغ" کہا کرتے تھے۔ ان کی قدیم ترین کتابوں اور کاغذات میں اس کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور اب تک اسی طرح مشہور ہے اور بول چال میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شہر بہت بڑا تھا، آبادی کثیر تھی اور اس کا نام "کرک" تھا یعنی یہ موجودہ نام "کراچی" اسی سے مشتق ہے۔ اس بیان کے مطابق بندرگاہ کا باب الداخلہ "منوڑا" کے ریتیلے ٹیلے کے شمال مغربی جانب تھا اور اس کی تجارت کا مرکز نوآنار یا نوآنال ہوگا جہاں مذکورہ بالا مقام کرک واقع ہوگا۔

اسی مورخ نے بیان کیا ہے کہ سخت بارشوں کے باعث بہت سے سیلاب آئے جو ریتیلے تودوں کو بہالے گئے جو ریت رفتہ رفتہ اس مقام کے سامنے کے حصہ میں جمع ہوگئے۔ بالآخر یہ حصہ اسقدر وسیع ہوگیا کہ پانی کے بہاؤ کا رخ پرانی بندرگاہ کے بجائے نشیبی پہاڑیوں کے سلسلہ کے کسی کشادہ حصہ کی طرف ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم بندرگاہ کا باب الداخلہ جلد بند ہوگیا۔ اس طرح "کرک" کا قصبہ ویران ہوگیا اور اس کے بجائے موجودہ "کراچی" کی سرزمین ظہور میں آئی۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ گذشتہ صدی کے وسط میں کسی زلزلہ کی وجہ سے یہ باب الداخلہ مسدود ہوگیا اور "منوڑا" اور گھوگھوں کی چٹانوں کے درمیان موجودہ باب الداخلہ کھل گیا۔

یہ روایت کسی بزرگ درویش کی طرف بھی منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی شریرالنفس انسان کو جو نوآنال کا مکھیا تھا بددعا دی تھی۔ اور ایک زبردست زلزلہ آیا تھا، جس میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے تھے اس طرح یہ بندرگاہ بند ہوگئی۔ اگر ممبئی میں جو یہاں سے صرف آٹھ سو میل دور ہے، اس کے متعلق مسلسل مراسلت ہوئی، تو کیا پچاس ہزار باشندوں کی ہلاکت کی اطلاع آس پاس کے شہروں میں نہیں پہنچی۔ اور اس کے اثرات وہاں محسوس نہیں ہوئے؟ قیاس ہے کہ اس کی اطلاع بمبئی کے گورنر کو ۱۷۵۰ء میں پہنچ گئی تھی۔

مگر نسبتاً قریب تر زمانہ یعنی ۱۸۶۴ء میں اس زلزلہ کے متعلق معتمد محکمۂ تعمیرات عامہ کو چیف انجینیر، سندھ سے دریافت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ اور یہ بھی استفسار کیا گیا تھا کہ تقریباً ایک سو بارہ سال قبل بھی کسی زلزلہ کے آنے کی روایت صحیح ہے یا غلط۔

کمانڈر کارلس نے اس کو ۱۸۳۸ء سے تقریباً ۸۰ سال قبل اور معتمد تعمیرات عامہ نے ۱۸۶۴ء میں اس کو ۱۱۲ سال قبل کا زلزلہ شمار کیا ہے۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جبکہ سمندر کے تلاطم نے بندرگاہ کا نیا دہانہ بنایا تھا اور زلزلہ آیا تھا۔ ان دونوں میں ایسی مطابقت ہے کہ یہ زلزلہ ایک ہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

کرنل ٹرمین ہیرے نے اس کے متعلق ثبوت فراہم کیا ہے، لیکن قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کبھی یہاں یا بندرگاہ کے باب الداخلہ کی طرف زلزلہ آیا تھا۔ لیکن اس زمانہ کے گورنر، سر بارٹل فریئر نے ان دلائل کی تردید کی ہے۔ اور اس قیاسی روایت کو کوئی وقعت نہیں دی۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مجھے پرانے شہر کے کھنڈرات کی دریافت میں کوئی دقت نہیں ہوئی چنانچہ قدیم قبرستان تو بہت دور سے نظر آتا تھا۔

کلفٹن: پتھروں اور چٹانی سلسلوں سے ملا ہوا ساحل ہے۔ جو پہلے سطح سمندر سے تقریباً ۸ فٹ نشیب میں تھا۔ ظاہر ہے کہ پانی کے اتار کے وقت کوئی بڑا جہاز اسقدر کم گہرائی میں نہیں گذر سکتا تھا۔

یہ مسلّم ہے کہ یہاں تقریباً سو فٹ چوڑی نہر "نوآنال" موجود تھی اور جو کشتیاں مسقط (عرب) سے یہاں آیا کرتی تھیں ان کو ملاح رسیوں سے دونوں طرف باندھ کر چلایا کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ مغربی نہر کے بند ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد دریائے

ماہ نو، کراچی دسمبر ۱۹۵۵ء

لیاری کا خشک ساحل شدید بارش کی وجہ سے سیلاب زدہ ہوگیا ہو اور سیلاب نے پانی کے زور سے کوئی راستہ نکال لیا ہو یا سطح منوڑا کے مشرق میں بندرگاہ کا دہانہ زیادہ وسیع اور راستہ بھی صاف ہوگیا۔

"المحیط" اور "بندرگاہ لاہوری"

ایک اور روایت ہے کہ سندھ کے کسی بادشاہ نے قاصد بھیج کر پرتگیزوں سے مدد مانگی تھی چنانچہ جزائر زیرباد کے پرتگیزی گورنر کے حکم سے اس کی امداد کے لئے اٹھائیس جہازوں کا ایک بیڑہ جس میں سات سو اشخاص تھے امیر البحر پیرو بارٹیو روکیم کی سرکردگی میں بھیجا تھا۔ غالباً یہ ترخانی خاندان کا کوئی حکمران تھا جو شاہ ارغون کے بعد مسند نشین ہوا اور صرف ۲۷ سال حکومت کی پرتگیزی بیڑے نے دریائے سندھ میں بمقام نگر ٹھٹ، جو ٹھٹھہ میں ہے، لنگر کیا تھا۔ اگرچہ "کروکالا" یا کراچی، کا اس مہم کے تذکروں میں کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ان سے ملتے جلتے کسی مقام کا نام ہے، لیکن ترکی زبان کی ایک تالیف "المحیط" میں جو بحر الہند کی جہازرانی سے متعلق ہے اس کا تذکرہ ہے۔ اس تالیف کا پتہ ہیرن جوزف فان ہیمر نے چلایا تھا اور ترجمہ بھی کیا تھا جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترکی کتاب "دیار بکر" میں لکھی گئی تھی جو ۱۵۵۴ء میں ایشیائے کوچک کے ایک فرماں روا کا صدر مقام تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ عربی زبان میں بھی موجود ہے۔ "محیط" کے معنی تو دائرہ کے ہیں مگر اس سے مراد سمندر ہی کا محیط ہے۔ یہ کتاب جہازی راستوں کی سمتوں کی بڑی اچھی رہنما ہے۔ اس کا ماخذ دس عربی کتب جغرافیہ ہیں جن کا مولف کپتان شیدی علی ہے۔ جنوبی کاٹھیاواڑ کے پرتگیزی جزیرہ دیو، ہرمز (واقع خلیج فارس) اور مسقط کے بحری سفر سے متعلق ہدایات میں اس نے لکھا ہے کہ "بحر ہند کے گردابوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے ممکن ہے افسانہ ہی ہو البتہ جو گرداب خلیج "جاکید" اور "بربری نہر" میں ہوتے ہیں ان میں جہاز ایسے پھنس جاتے ہیں کہ تباہی سے نہیں بچ سکتے۔ اگر تم "جاکید" کی طرف جا رہے ہو تو تم کو احتیاطی تدابیر اختیار کر لینی چاہئیں اور کوشش کرنی چاہئیے کہ مکران کے ساحل کی طرف سے جاؤ، خواہ وہ بندرگاہ "کمات" ہو یا "گوادر" یا "کیچی مکران"۔ گوادر، کاڈندر، ساحل گجرات کی تین بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ناریل پیدا ہوتے ہیں ورنہ تم کو "کوراشی" کی طرف پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئیے یا "دیول سند" یعنی بندر لاہوری میں داخل ہو جانا چاہئیے۔" [1]

بندرگاہ کراچی کی تاریخ پر لفٹنٹ جان پورٹر نے بھی کئی ہزار سال قبل تک نظر دوڑائی ہے جو سکندر اعظم کے ایک امیر البحر نیرکس کے بعد کم از کم اس کے سفر کے حالات قلمبند کرنے والوں کے زمانہ سے متعلق ہے، جنہوں نے بندرگاہ "کیامری" یا کیماڑی متعلقہ بحر ہند کی بابت کچھ شہادت پیش کی ہے۔ لیکن کمانڈر کارلس نے، جو اس کا ایک ملازم تھا، اس کا ذکر کیا ہے اور نہ "کراچی ملٹری کار سپانڈنس" (مطبوعہ بمبئی) یا "سندھ گزیٹیر" مرتبہ مسٹر ہیوفس میں اس کا کہیں ذکر ہے۔

ایک اور سیاح کیپٹن پورٹر نے بیان کیا ہے کہ قصبہ کروچی، جہاں وہ ۱۷۷۴ء میں گیا تھا، جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے مقام سے پانچ چھ میل دور واقع ہے۔ اور ایک خلیج کے کنارے، جہاں پانی کافی نہیں ہے، چھوٹی چھوٹی کشتیاں چل سکتی ہیں اس مقام کو ایک مٹی کی دیوار سے مستحکم کر دیا گیا ہے، جس پر گول برج بنے ہوئے ہیں۔ ان برجوں پر صرف دو توپیں نصب ہیں۔ اور وہ بھی اس قدر پرانی اور ان کی گاڑیوں کے پہیئے اسقدر گھسے ہوئے ہیں کہ ان توپوں کا داغنا خطرہ سے خالی نہیں۔ یہ ایک شخص کی عینی شہادت ہے، لیکن پورٹر کے بیان سے اس شہر کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے ۞

---

[1] ترجمہ سفرنامہ امیر البحر، شیدی علی، مطبوعہ لاہور۔ شیدی علی، ہمایوں کے زمانے میں سندھ بھی آیا تھا۔ امیر عیسیٰ ترخان سندھی نے گورنری دینی چاہی مگر اس نے انکار کر دیا۔ "لاہوری بندرگاہ" سے غالباً بندرگاہ کراچی مراد ہے کیونکہ یہاں سے لاہور کو راستے جاتے تھے۔ (م۔م)

یکدرم —— بقیہ صفحہ ۲۲

درد ہے۔" مسکرا کر بولے" آئس کریم ابھی چائے کے بعد کھائی ہے۔ پانی پی کر تو تھک گیا ہوں۔" میں نے آنکھیں جھکا کر کہا "لیٹ جائیے میں سر دبا دوں۔"

یہ سنتے ہی فوراً اپنی سیٹ پر لیٹ گئے اور میرے دوپٹہ کا آنچل اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا ترنم سے فرمانے لگے: "یہ صندلی دوپٹہ مرے سر سے باندھ دو!"

مصوری کی پہلی کل پاکستان نمائش —— بقیہ صفحہ ۲۴

اظہار کے سبب کافی امتیاز جھلکتا تھا۔ اس کی کوئلے سے بنائی ہوئی تصویر "سنگھار" کو تیسرا انعام ملا۔

مشرقی پاکستان کے اکثر مصوروں پر ڈھاکہ آرٹ اسکول کے پرنسپل "زین العابدین" کا گہرا اثر ہے۔ وہ بصیرت اور پختگی میں دوسروں پر نمایاں فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن نمائش میں ان کی ابتدائی زمانے کی صرف دو تصویریں ہی موجود تھیں۔ ان میں سے روغنی تختے "دسنتھال" جس میں سنتھالی عورتیں شگوفہ ریز شاخوں کے سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہیں، اُن شاہکاروں میں شامل تھا جس کو بے حد سراہا گیا۔

چغتائی اور اللہ بخش جیسے استاد بجائے خود ایک دبستان ہیں۔ چنانچہ ان کے کتنے ہی شاہکار ان کی کماحقہٗ نمائندگی کر رہے تھے۔ اللہ بخش کی روغنی تصاویر پنجاب کے دیہاتوں کی زندگی کا بڑا صحیح اور واقعاتی نقشہ پیش کرتی ہیں۔ اُدھر چغتائی اپنی خیالی دنیا میں کھویا ہوا خواب نما انسانوں اور مناظر کا تصور کرتا ہے اور نرم نرم آبی رنگوں اور سیاہ و سفید کندہ کاری میں ان کی پُر لطف کیفیت پیش کرتا ہے۔

اکھاڑہ —— بقیہ صفحہ ۳۵

زینت اکیلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لوٹی تو اس کی آنکھوں میں دو آنسو اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا "اپیل کر دو، شرابا مان گیا ہے اگر اس کے بیان کی ضرورت ہوئی تو وہ ہماری مرضی کے مطابق بیان دے گا۔"

لیکن بیان کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اپیل ہوئی تو ہائی کورٹ نے ڈاکٹری رپورٹ کافی سمجھی۔ استغاثہ کے تین گواہوں کے مقابلہ میں صفائی کے آٹھ گواہ تھے۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ دے دیا "مقتول کو کتے نے مارا ہے۔ ملزم کو بری کیا جاتا ہے۔"

دو روز بعد استاد کامو کے اکھاڑہ کی فضا ایک بار پھر ڈھولوں کی گونج سے مرتعش ہوئی۔ یہ میٹھی عید کی شام تھی۔ اکھاڑے کے اردگرد، زمین پر، درختوں اور منڈیروں پر، ٹرکوں اور بسوں کی چھتوں پر آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ "بھائی دروجے" کا ہاتو اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔ شرابے نے زندگی میں پہلی بار کھل کر اور بلند آواز سے کہا "یا علی" اور کود کر اکھاڑے میں آگیا۔ اس کے پیچھے استاد کامو آیا اور اس کی پیٹھ تھپکائی۔ شرابے کو جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا اور اکھاڑے سے نکل کر تماشائیوں کی طرف چل پڑا جہاں نیاز بیٹھا ہوا تھا۔ نیاز کے پاس پہنچ کر شرابے نے اس کے گھٹنے چھوئے، ہاتھ ملایا اور اکھاڑہ میں آکر بائیں طرف ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے ایک نرم و گداز مرمریں بازو ہل رہا تھا۔ شرابا مسکرایا اور بڑھ کر حریف سے ہاتھ ملایا۔

بھاٹی دروازے والے جو ڈھول بجاتے ہوئے آئے تھے، ڈھول پیٹھ پیچھے لٹکا کر لوٹ گئے۔ اور مزنگ والے اکھاڑے کے ڈھول رات بھر بجتے رہے۔ پھر یہ ڈھول خاموش نہ ہوئے۔ دوسرا دن، تیسرا دن اور چوتھے روز ڈھولوں کی آواز اور باجوں کے شور و غوغا میں شرابا اور زینت ایک ہو گئے۔

اور استاد کامو کے اکھاڑے کی نرم و ملائم مٹی نے ایک اور واردات کو جنم دے کر اپنے اندر جذب کر لیا۔

"نشاطِ فن"

نشیدِ حریت

۲۰۰ سال کی حریت پسند اردو شاعری کا انتخاب

۱۷۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک

ہماری ادبی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم جزو ہے۔ ملت کے ذہن وکردار کی پرداخت پچھلے دو سو سال میں کس کس طرح ہوتی رہی اور کن کن اہل کمال کی جگرکاوی ہمارے قومی شعور کی تہذیب و تربیت میں شامل رہی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اردو کی حریت پسند شاعری کے پچھلے دو سو برس کے سرمائے پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ادارہ نے اس ضخیم مجموعے میں دو سو برس کی ملی شاعری کا انتخاب پیش کیا ہے جس میں اردو کے بیشتر بلند پایہ شعرا کا کلام یکجا ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف حوادث ملی کی ایک منظوم داستان ہے، بلکہ ایک نادر ادبی انتخاب بھی ، جس کی قدر و قیمت محتاج بیان نہیں -

ترتیب و مقدمہ : **شان‌الحق حقی**

اس دو سو سال کی شاعری کو چند ابواب میں سمویا گیا ہے۔ مثلاً :

۱۸۵۷ء سے پہلے — **انقلاب ۱۸۵۷ء کا دور**

پیغام بیداری — **جدید عہد** — **صبحِ نو**

مجلد ، سرورق خوبصورت ، رنگین اور دیدہ زیب

پوری کتاب نہایت نفیس اردو ٹائپ میں طبع کی گئی ہے

صفحات ۳۰۰ — قیمت چار روپے آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان ، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

جنوری ۱۹۵۸ء

جوش ملیح آبادی — فضل احمد کریم فضلی — شان الحق حقی

اشرف صبوحی — آغا بابر — مقبول احمد سید

ڈاکٹر محمد صادق — جلیل قدوائی — اقبال عظیم

پاکستانی خواتین کی سرگرمیاں

تعلیم بالغاں کے مرکز پاکستان میں جابجا کھولے جارہے ہیں
(ایک زیر تعلیم خاتون)

کراچی میں امور خانگی کی تربیت کا کالج

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۱۰

جنوری — ۱۹۵۸ء

مدیر
رفیق خاور

نائب مدیر
ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

۱۹۵۷ء اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کے آخری ایام اپنی ہما ہمی کے لئے یادگار رہیں گے کیونکہ ان میں انسان کی حکمت عملی سے پہلی دفعہ زمین سے کہیں دور، نادیدہ فضاؤں میں دو مصنوعی سیارے گردش کرنے لگے اور بنی آدم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ خبر نہیں یہ دور آگے چل کر اپنے ساتھ کیا کیا انکشافات لائے اور کیا کیا انقلابات رونما ہوں۔ یہ تجربہ جو اپنے اندر ایک طلسمی کشش لئے ہوئے ہے، تخیل کو کچھ اس طرح برانگیختہ کرتا ہے کہ ہم لامکاں کی بے حد و کراں پہنائیوں میں کھو جاتے ہیں اور کسی عہد میں، جو ممکن ہے زیادہ دور نہ ہو، سیارہ بہ سیارہ آمد و رفت کا تصور کرتے ہیں۔ آج ہم میں سے اکثر یہی سوچنے لگ گئے ہیں کہ دیکھئے زمان و مکاں کی تسخیر کا جو خواب ہم نہ جانے کب سے دیکھتے چلے آئے ہیں، وہ جوہری توانائی اور اس قسم کی دوسری سائنسی دریافتوں سے کس کس طرح شرمندۂ تعبیر ہوتا جا رہا ہے۔ بہرحال اب ہمارے لئے اس نئی کائناتی فضا کے ضمن میں غور و فکر ناگزیر ہو گیا ہے ÷

★

اس سے کچھ کم پیمانے پر، خود ہماری موجودہ دنیا میں، فاصلے اس قدر مٹ چکے ہیں کہ وہ ملک بھی جو ہزارہا میل دور ہیں، ایک دوسرے سے قریب آ گئے ہیں اور قوموں میں وسیع پیمانہ پر ربط و ضبط شروع ہو گیا ہے۔ پاکستان بھی اس عالمگیر رجحان میں شریک ہے، چنانچہ یہاں متعدد بین الاقوامی اجتماعات اور ثقافتی، سماجی اور صنعتی نمائشیں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ حال ہی میں بین الاقوامی جشنِ ثقافت، جس کی تفصیلی کیفیت آپ اس شمارہ میں دیکھیں گے، اس روز افزوں میل جول کا تازہ ترین مظہر ہے۔ اس پندرہ روزہ جشن میں مشرق و مغرب کے کتنے ہی ممالک شریک ہوئے جنہوں نے اپنے فنی کمالات کا عمدہ مظاہرہ کیا۔ ہمارے جرمن اور امریکی مہمانوں کے فنی مظاہرے اپنی مخصوص مغربی وضع کے ساتھ ایسی ندرت کے حامل تھے جس سے خود بخود نئے نئے خیالات سوجھتے اور نئی نئی راہیں اختیار کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ چینی طائفہ کے مظاہروں کو خاص طور پر پسند کیا گیا۔ ان میں نفاست، شائستگی اور شوخیٔ تصور کے ساتھ ساتھ مشرقی حجاب کو بھی کافی دخل تھا۔ چینی فن کاروں نے جس طرح مقامی سنگیت اور مغربی پاکستان کے لڈی ناچ کو ایک دو دن ہی میں اپنایا اور پیش کیا، وہ ان کی طبعی صلاحیت اور غیر معمولی قدرتِ فن کی علامت ہے۔ اس موقع پر پاکستانی فن کاروں کا اظہارِ کمال بھی کچھ کم جاذبِ توجہ نہیں رہا۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی اور رقص کے معیاری نمونوں کے علاوہ ایسے تجربے بھی پیش کئے جن سے نئی نئی راہیں اختیار کرنے کا شوق اور سلیقہ ظاہر ہوتا ہے ÷

★

اس مہینے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی برسی ہے۔ اس کی مناسبت سے ہم اردو کے اس مایۂ ناز انشا پرداز پر ایک مضمون شائع کر رہے ہیں جس میں ان کے دو بار سفرِ ایران پر نئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر اب تک زیادہ تر قیاس آرائی ہی سے کام لیا گیا ہے۔ جو شواہد اس مضمون میں پیش کئے گئے ہیں (بالخصوص وہ دستاویز جس کی نقل اس میں درج ہے) ان سے بات فیصلہ کن صورت اختیار کر لیتی ہے ÷

★

اس شمارہ میں ہم ایسے نئے لکھنے والوں کے "اوّلیں افسانہ" کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں جن کا ابھی تک کوئی افسانہ کہیں شائع نہیں ہوا، تا کہ نئے نئے جوہروں کو اُبھرنے کا موقع ملے۔ جو اصحاب اس مقابلے میں شریک ہوں وہ افسانہ ارسال کرتے وقت یہ وضاحت کر دیں کہ یہ کہیں سے ماخوذ یا ترجمہ نہیں، اور یہ بھی کہ قبل ازیں ان کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا۔ اپنا نام اور پتہ خوشخط تحریر کریں اور آسانی سے ممکن ہو تو اپنے اور اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں تھوڑی سی معلومات بھی ہم پہنچائیں ÷

★

یادِ رفتگاں

جوش ملیح آبادی

میری یہ بڑی خوش قسمتی ہے اور بدبختی بھی کہ میں نے اس وقت ہوش سنبھالا جبکہ ہماری پرانی تہذیب دم توڑ رہی تھی، اور نئی تہذیب کی ولادت کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی تو اس لحاظ سے تھی کہ ہر چند میرے بزرگوں والا لکھنؤ اس وقت باقی نہیں رہا تھا، لیکن ابھی اس کی رنگ اڑی ہوئی زرین محرا میں کچھ ایسی شمعیں روشن تھیں جنہیں دیکھ کر مرحوم لکھنؤ کی تہذیب کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور بدبختی اس لحاظ سے تھی کہ ان اکابر کی صحبتوں میں شریک ہونے اور ان کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اب میں اپنے دور کے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، جن میں اپنے بزرگوں کا کوئی جوہر باقی نہیں رہا ؎

ان آنکھوں کا یہی ہے لیکھ
وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ

میرے خاندان میں سب سے پہلے معلوم شاعر میرے پردادا احسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں بہادر گویا تھے۔ اور ان کے بعد سے یہ سلسلہ میرے دادا اور میرے باپ سے ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے۔

میری پیدائش اس عبوری دور میں ہوئی جب حالی، امیر اور داغ کے چراغ موت کی ہوا سے جھلملا رہے تھے اور میرے ہوش سنبھالتے ہی ان بجھے ہوئے چراغوں کا دھواں ہوا میں لہرا کر فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ بچپن میں لکھنؤ کے جس ممتاز غزل گو شاعر کو سب سے پہلے میں نے دیکھا میر ضامن علی صاحب جلال تھے۔ جن سے امیر و داغ کے بعد میرے والد اصلاح لیا کرتے تھے۔ حضرت جلال کی عمر اس وقت ستر بہتر سے متجاوز ہوگی۔ وہ دبلے پتلے آدمی اور دمے کے مریض تھے۔ ان کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ اور ایسا کہ ان کی پیری میں بھی ایک بانکپن کی آن نکلتی تھی۔

حضرتِ جلال کی یہ ایک خاص شان تھی کہ وہ کسی شاعر کو خطرے میں نہیں لاتے تھے، چنانچہ ایک روز جب کہ وہ میرے والد کے ساتھ حسین آباد کی طرف گاڑی میں گذر رہے تھے تو گاڑی جس وقت شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد کے سامنے سے گذرنے لگی، جلال نے میرے والد سے مسجد کی جانب اشارہ کر کے پوچھا "خان صاحب یہ کیا ہے"؟ والد نے مسکرا کر فرمایا "جناب والا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"۔ جلال نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "آپ اس کا نام تو لے لیجئے"! والد نے ہنس کر فرمایا "مسجد"۔

یہ سنتے ہی جلال صاحب کے چہرے سے ایک خاص قسم کا جلال ٹپکنے لگا، اور مسجد کی جانب دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے ایک عجیب ولولے کے ساتھ بولنے لگے کہ خان صاحب اس خانۂ خدا کی حرمت کو گواہ کر کے دعویٰ کرتا ہوں کہ جلال کا سا شاعر نہ کبھی تھا نہ آج ہے، نہ کل پیدا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالباً تعشق کے بعد جلال ہی وہ پہلے غزل گو تھے جنہوں نے لکھنؤ کی لفظی رعایت والی مصنوعی غزل گوئی سے روگردانی کر کے غزل کو جذباتی سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے زبان کو بھی بہت کچھ مانجھا تھا، لیکن متروکات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا تھا کہ اگر وہ دراز ہو جاتا تو اردو کے گیسو مختصر ہو کر پٹوں میں تبدیل ہو جاتے۔

میرے باپ کی یہ سنتِ جاریہ تھی کہ وہ اپنے ہندوستان کے تمام دوستوں کے پاس ہر سال آموں کے ٹوکرے بطور تحفہ روانہ فرمایا کرتے تھے، لیکن شہر بستے لکھنؤ کی خدمت میں آموں اور دوسرے پھلوں کے ساتھ قلاقند اور گھی بھی روانہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حسب دستور ایک روز والد نے اپنے ایک سپاہی محمد شیر خاں کی معرفت حضرتِ جلال کی خدمت میں جب گھی بھیجا تو وہ شام کے قریب تمتماتے چہرے کے ساتھ آئے، والد کو سلام کیا، اور واپس شدہ گھی کے ظرف کو اسٹول پر رکھ کر خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ محمد شیر خاں ہمارے تمام سپاہیوں میں سب سے زیادہ

کثیلے کڑوے اور تیکھے تھے اور ان کے متعلق والد فرمایا کرتے تھے کہ محمد شیر خاں اُن آدمیوں میں سے ہیں کہ اگر ان کی ایک ایک بوٹی بھی کاٹ ڈالی جائے پھر بھی وہ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کریں گے یعنی وہ قائل ہو جانے اور اپنی غلطی کے مان لینے کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا چکے تھے۔

جب محمد شیر خاں گھی کا ظرف سامنے رکھ کر چپ سادھ گئے تو میرے والد سمجھ گئے کہ وہ کوئی نہ کوئی گل کھلا کر آئے ہیں۔ چنانچہ والد نے ارشاد فرمایا: خاموش کیوں کھڑے ہو؟ کچھ تو سر سے کھیلو منہ سے بولو کہ آخر ہوا کیا؟ یہ سنتے ہی محمد شیر خاں نے غصّے میں اپنی داڑھی کو منہ میں دبایا اور کہا کہ "فدوی حضور کے حقِ نمک سے ادا ہو چکا ہے۔ یہ صرف حضور کا خیال تھا کہ میں کچھ نہیں بولا، نہیں تو جلال کو مزا چکھا دیتا۔"

والد نے بگڑ کر فرمایا: "بات بتاتے نہیں اور جامے سے باہر ہوئے چلے جا رہے ہو؟" محمد شیر خاں نے والد کے تیور بگڑے ہوئے دیکھے تو ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "حضور جیسے ہی میں نے دروازے پر جا کر ہاتک دی، جلال غصّے میں بھرے باہر آئے اور کہنے لگے "جاؤ، جاؤ، تم کون ہو؟" میں نے تپا مار کر کہا: "خاں صاحب بہادر نے ملیح آباد (ملیح آباد) سے آپ کو گھی بھیجا ہے۔" لال پیلے ہو کر انہوں نے کہا "لے جاؤ، لے جاؤ اس گھی کو، گھی بھیجا ہے اور ہمارے ہاں، جاؤ، جاؤ، میں گھی نہیں لیتا، بڑے آئے گھی دینے والے۔ حضور یہ آپ کا ڈر تھا جو میں نے یہ سنا اور منہ سے کچھ نہیں بولا۔ آپ کا ملنے والا نہ ہوتا تو قرآن مجید کی قسم! مزا چکھا دیتا۔" اس کے دوسرے ہی روز والد مجھے ہمراہ لے کر حضرتِ جلال سے ملنے کی خاطر تشریف لے گئے۔ محمد شیر خاں بھی ساتھ تھے۔ انہیں دیکھتے ہی جلال نے والد سے کہا: "خاں صاحب خطا معاف! ان داڑھی والے کو میرے سامنے سے ہٹا دیجئے۔" والد نے محمد شیر خاں کو اشارہ کیا۔ اور وہ فرطِ غضب سے اپنی انگلی کو اپنے دانتوں سے چباتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اُن کے اوجھل ہوتے ہی جلال نے والد سے کہا: "خاں صاحب۔ اس داڑھی والے جناور نے میری ناک کٹا ڈالی۔ محلے بھر میں میری ناک کٹا ڈالی۔"

والد نے انتہائی سنجیدہ ہو کر فرمایا: "ناک کٹا ڈالی! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں بھلا اس کی یہ مجال!"

جلال نے بات کاٹ کر کہا "خاں صاحب کیا عرض کروں۔" اور خاموش ہو گئے۔ والد نے بڑے ادب کے ساتھ کہا "برائے خدا جلد بتایئے اس نے کیا کیا۔ میں اسے کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گا۔" جلال صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر فرمایا: "حضرت یہ جناور میرے دروازے پر آیا، لاٹھی سے میرا دروازہ ٹھونکا۔ آپ خود ملاحظہ فرمایئے، لاٹھی سے میرا دروازہ ٹھونکا، اور پھر چیخ چیخ کر کہنے لگا "جلال خاں ہوت، جلال خاں ہوت، جلال خاں ہوت!"

آپ نے سُنا خاں صاحب، "جلال خاں ہوت" میں کہتا ہوں مجھے اس وقت موت کیوں نہ آ گئی۔ میری دونوں بیگموں نے سُنا، میرے محلے بھر نے سُنا کہ میر ضامن علی جلال کو، جلال خاں ہوت، جلال خاں ہوت کے نعروں سے پکارا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر حضرت جلال نے اپنا سر پکڑ لیا اور گردن ہلا ہلا کر بار بار زیرِ لب کہتے رہے "جلال خاں ہوت! اللہ اکبر، جلال خاں ہوت! اللہ اکبر!" دیکھے "آپ نے جلال کے تیور؟ یہ تھا، [illegible] ہمارا لکھنؤ!۔

اب ایک دوسرے بزرگ کا قصّہ سنئے۔ یہ تھے دُبلے پتلے، گورے چٹے، میانہ قامت، میر یارق لکھنوی، جن کا سن اس وقت ستر کے لگ بھگ ہوگا۔ لکھنؤ کے بہت سے گوشہ نشین، لیکن خوش فکر شعرا کی طرح میر آرزو کی شہرت [illegible] لکھنؤ کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلی۔ میر صاحب انتہا درجہ کے مفلس آدمی تھے۔ ان کی ایک قلیل المعاش بہن ان کے محلے سے کہیں بہت دور رہتی تھیں اور وہ بے چاری کھانا پکا کر انہیں بھیجا کرتی تھیں۔ اور کھانا چونکہ روز نہیں آسکتا تھا، میر صاحب ان کی سوکھی چپاتیوں کو پانی میں [illegible] کے دو دو وقت کیا یا کرتے تھے لیکن خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ تقریباً روز میرے والد کے پاس آتے تھے لیکن ہمارے دسترخوان پر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے اور یہ بات صرف ہمیں تک محدود نہیں تھی۔ وہ اپنے کسی قرابت دار یا کسی دوست کے ہاں کھانا کھانے کو حرام سمجھتے تھے۔ اور جب ان سے کھانے کے لئے اصرار کیا جاتا تھا تو وہ بڑی صاف بیانی کے ساتھ کہتے تھے۔ میاں اگر ہم کسی کے گھر دس بار کھانا کھائیں تو اسے ایک بار تو کھانا کھلا دیں۔ اور جب ہماری

یہ حالت ہے کہ ہم کسی کو کچھ نہیں کھلا سکتے، تو پھر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم دوسروں کے گھر کھانا کھائیں اور دسترخوان کی کھنّی کا خطاب پائیں۔ ایک روز کھانا محرّم کی ساتویں تاریخ تھی کہ وہ ہمارے گھر آئے۔ اس وقت مجلس کی شیرینی تقسیم ہو رہی تھی۔ چنانچہ مٹھائی کی تھالی میر بارق کے سامنے بھی آئی، اور انہوں نے حسبِ دستور قدیم اس کے چکھنے سے انکار فرما دیا۔ میرے والد نے فرمایا "میر صاحب یہ تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی نیاز کی مٹھائی ہے۔ آپ اس تبرک سے بھی اجتناب فرمائیں گے؟"

یہ سن کر میر صاحب نے قائل ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔ اور چاہتے تھے کہ برفی کی ایک ڈلی اٹھائیں کہ یکایک حامد علی خاں بیرسٹر برآمدے میں نمودار ہو گئے اور وہیں سے چلا چلا کر کہنے لگے "بارق صاحب دیکھ لیا۔ بارق صاحب دیکھ لیا! بارق صاحب دیکھ لیا!" بارق صاحب نے یہ سنتے ہی برفی کی ڈلی تھالی میں رکھ دی اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ یہ دیکھتے ہی حامد علی خاں بیرسٹر کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ وہ لپکے ہوئے میر صاحب کے پاس آئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی کی خواستگاری کرتے ہوئے کہنے لگے "میر صاحب اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ پر ایک ذرا سی مذاق کی بات کا اس قدر اثر ہو گا تو واللہ کہ میں ایسی جسارت کبھی نہ کرتا؟"

بارق صاحب نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا "لیکن آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ آس پاس کے لوگ اور سڑک والے جب میر صاحب دیکھ لیا، میر صاحب دیکھ لیا، کا نوحہ سنیں گے تو ان کو یقین ہو جائیگا کہ میر بارق کوئی ایسی بیہودہ حرکت ضرور کر رہا ہو گا کہ بیرسٹر صاحب کو ٹوکنا پڑا۔ آپ نے مجھے اس قابل بھی نہیں رکھا کہ اب یہاں سے باہر نکل کر خلقِ خدا کو منہ دکھا سکوں!"

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یہ تھا ہمارے بزرگوں کا احساسِ خودداری اور پاسِ وضعداری۔ ایک شام کا ذکر ہے۔ اتفاق سے والد کے پاس اس وقت میر بارق کے علاوہ اور کوئی نہ تھا کہ میرے والد نے مجھے پکارا اور میرے کان میں کہا کہ اپنی ماں سے پانچ اشرفیاں لے آؤ۔ اور رومال میں لپیٹ کر لانا۔ چنانچہ میں رومال میں لپیٹ کر اشرفیاں لے آیا اور والد کے حوالے کر دیں۔ اور والد نے مجھ سے فرمایا "اچھا جاؤ کھیلو۔" میں باہر چلا گیا۔ لیکن ذوقِ تجسس کے باعث، پاکھے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے دیکھا کہ والد کھڑے ہو گئے۔ اور درباریوں کی طرح جھک کر وہ اشرفیاں بارق صاحب کی خدمت میں پیش فرمائیں۔ بارق صاحب یہ دیکھتے ہی کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور بھرائی آواز میں کہنے لگے "خاں صاحب بہادر، حضرت عباس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یہ اشرفیاں نہیں لوں گا۔ ہرگز نہیں لوں گا۔ اور اگر آپ دوبارہ چالیس قسم کا کرم مجھ پر کرنا چاہیں گے تو جناب امیر کی قسم میں آپ کو تمام عمر صورت نہیں دکھاؤں گا!" یہ تھی مردانِ خدا کی شان۔ اور یہ تھی لکھنؤ کے بے زروں کی آن!

بہت خوردیم نشتر لاؤ نعم ہا

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے، ہمیں بہت کچھ دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافت کا وہ سرمایہ عزّ و افتخار ہم سے چھین لیا ہے جس کے بغیر لفظ "ایشیا" بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔

ایک روز میر بارق ایک محفل میں ملے۔ پوچھنے لگے میاں اب کس محلے میں قیام ہے، میں نے کہا "لاٹوش روڈ" پر رہتا ہے ہے!" میر صاحب نے چھاتی پیٹ کر کہا "ارے تم اتنے خوش گو شاعر ہو کر ایک ایسی خبیث سڑک پر رہتے ہو جس میں (ٹ) اور (ڈ) کے سے حروفِ ثقیلہ پائے جاتے ہیں! میرے منہ سے تو اس نامراد سڑک کا نام تک نہیں نکل سکتا۔ اگر خاں صاحب زندہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ان حروفِ ثقیلہ میں کبھی قیام نہ فرماتے۔ میاں جب تک اس محلے میں رہو گے، ہم کبھی ملنے نہیں آئیں گے؟"

دیکھا آپ نے، یہ تھا ان لوگوں میں موسیقیت کا رچاؤ اور صوتی زیر و بم کا رکھ رکھاؤ!

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

★

آزاد کا سفرِ ایران

ڈاکٹر محمد صادق

مولانا محمد حسین آزاد دو دفعہ ایران گئے۔ پہلی بار غالباً ۱۸۶۵ء اور دوسری دفعہ ۱۸۸۵ء میں۔ دوسرے سفر کے حالات اور مشاہدات انہوں نے اپنی مختصر سی تصنیف "سیرِ ایران" میں قلمبند کئے ہیں لیکن پہلے سفر کے کوائف اور محرکات کا آجکل تو کیا ان دنوں بھی کسی کو علم نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد بے حد محتاط تھے۔ دوسرے انہیں تاکید کی گئی تھی کہ اس سفر کے اغراض و مقاصد کسی پر ظاہر نہ کریں، اس لئے انہوں نے آخر تک انہیں صیغۂ راز میں رکھا۔ اس پر قیاس آرائیاں شروع ہوئیں، چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "مرحوم دہلی کالج" میں لکھا ہے کہ "غدر" کے بعد آزاد ایران بھاگ گئے اور جب گورنمنٹ کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا تو واپس آ گئے۔ لیکن آزاد کی اپنی تصنیف "آبِ حیات" سے اس کی تردید ہوتی ہے کیونکہ اس کے صفحہ ۱۵۲ پر لکھا ہے کہ ۱۸۵۸ء میں وہ لکھنؤ میں اردو شعراء کے متعلق مواد جمع کر رہے تھے۔

آزاد نے سفرِ ایران کیوں اختیار کیا؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامۂ ۵۷ء کے دوران میں اور اس کے بعد اُن کی زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ کچھ عرصہ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ آزاد کے والد مولوی محمد باقر اُن بے شمار بے گناہ لوگوں میں سے تھے جنہیں برطانوی جبر و تشدد اور بہیمانہ جوشِ انتقام کے بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے (ملاحظہ ہو مضمون "اردو کا پہلا صحافی" مطبوعہ "ماہِ نو" بابت جون ۵۶ء) یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ سانحۂ ۵۷ء کے دوران میں مولوی محمد باقر اور خود آزاد نے انقلاب پسندوں کا ساتھ دیا تھا۔ اسی کی پاداش میں مولوی صاحب کو سزائے موت ملی۔ رہا آزاد کا معاملہ تو یہ ان کی خوش قسمتی تھی اور ہماری بھی کہ وہ اپنی گرفتاری کے احکام جاری ہونے سے پہلے ہی روپوش ہو کر دہلی سے نکل پڑے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد آزاد دربدر ٹھوکریں کھاتے، مصیبتیں جھیلتے، نہایت کس مپرسی کے عالم میں لاہور وارد ہوئے اور نہایت صبر آزما حالات کے بعد انہیں محکمۂ تعلیم کے دفتر میں ایک ادنیٰ سی ملازمت مل گئی۔ ان دنوں پنجاب میں ایک نئی ادبی اور علمی زندگی جنم لے رہی تھی اور آزاد باوجود اپنی زبوں حالی کے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس ضمن میں ان کی ملاقات ڈاکٹر لائٹنر سے ہوئی اور یہ رابطہ اتنا بڑھا کہ وہ ان کے زمرۂ احباب میں شمار ہونے لگے۔ بعد میں جب آزاد "انجمن پنجاب" لاہور کے سکرٹری مقرر ہوئے تو یہ ڈاکٹر لائٹنر ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر لائٹنر اپنے عہد کی ممتاز ہستیوں میں سے تھے۔ وہ بیک وقت گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ وہ ہنگری کے یہودی النسل باشندے تھے۔ معلوم نہیں پہلے پہل کب پنجاب آئے لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ پنجاب کے پہلے انگریزی اخبار "انڈین پبلک اوپنین" کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔ اس کام میں سرلیپل گرفن ان کے شریک کار تھے۔ یہ وہی اخبار ہے جسے بعد میں "سول ملٹری گزٹ" کا نام دیا گیا۔

ہندوستان آنے سے پہلے ڈاکٹر لائٹنر لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کے مددگار استاد تھے اور جنگ کریمیا کے دوران اوّل درجہ کے ترجمان کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ ان کا شمار اعلیٰ درجہ کے زبان دانوں اور ماہرینِ لسانیات میں ہوتا تھا۔ اور انہیں عربی اور ترکی میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ لائٹنر کی تمام ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں آزاد اُن کے دستِ راست تھے۔ آزاد کی غیر معمولی صلاحیتوں سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن لائٹنر کی سرپرستی سے اُن کا رسوخ بڑھ گیا اور انہیں اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔

۱۸۵۷ء کے چند سال بعد آزاد کو نہ صرف فارغ البالی حاصل ہو چکی تھی بلکہ ادبی حلقوں میں اُن کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ نیز انجمن پنجاب کے سکریٹری کی حیثیت سے ان کے انگریزی حکام سے بھی مراسم پختہ ہو رہے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ۵۷ء کے عواقب کا خوف ایک آسیب کی طرح ان کے ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ انہیں خوف تھا کہ اگر اس واقعہ میں شمولیت کا راز فاش ہو گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا اور یہ خدشہ موہوم نہ تھا جب تک

آزاد کو عام سے کسی شخص نے اُن سے تعرض نہ کیا لیکن جب وہ محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ ملازمت پر فائز ہو گئے تو ان کے بعض اقارب کا جذبۂ رقابت بھڑک اٹھا۔ ان کے ایک عزیز نے جو لاہور میں ملازم تھے، ان کے خلاف رپورٹ جڑ دی کہ آزاد جو گورنمنٹ کا خیر خواہ بنا پھرتا ہے، اس نے اپنے باپ کی طرح "غدر" میں انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد کے خلاف خفیہ طور پر تفتیش شروع ہو گئی اور کچھ دیر بعد اُن کی شملہ میں طلبی ہوئی تاکہ وہ ان الزامات کا جواب دیں۔ اس سے آزاد کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ مواخذہ سے بچ نہ سکیں گے۔ اس پریشانی کے عالم میں انہیں صرف ایک شارعِ امید نظر آئی - ڈاکٹر لائیٹنر۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سارا حال انہیں کہہ سنایا اور اُن کی اعانت طلب کی۔ ڈاکٹر لائیٹنر اپنے دوستوں کی مدد اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان کی مدد کا بیڑا اٹھایا اور جو کہا تھا کر دکھایا۔ آزاد کو جواب دہی کے لئے شملہ تو جانا پڑا لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس کے بعد بھی آزاد ملک کی اُن ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں جن کی تحریک حکومت کی طرف سے ہوتی تھی نہایت انہماک سے حصہ لیتے رہے تاکہ ان کی وفاداری کا خیال حکام کے دلوں پر پختگی سے مرتسم ہو جائے۔ جلد ہی انہیں ایک ایسی خدمت سرانجام دینے کا موقع مل گیا جس نے انہیں سرکاری شبہات سے ہمیشہ کے لئے نجات دلوا دی۔ ان دنوں روس کا بڑھتا ہوا رسوخ ہندوستانی سیاست کے لئے ایک مستقل کابوس تھا یعنی وہ وسط ایشیا کے مسلمان ممالک کو اپنے حیطۂ اقتدار یا اختیار میں لا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ اس کے سدباب کے لئے برطانوی حکومت نے ایران اور افغانستان سے معاہدے کئے۔ روس نے پہلے پہل خیوا کے حکمران پر یہ الزام لگایا کہ وہ روسی باشندوں کو غلام بنا کر فروخت کرتا ہے۔ اور اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن یہ حملہ ناکام رہا۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسطِ ایشیا میں قدم بڑھائے اور ۱۸۶۴ء میں روس بڑھتے بڑھتے خیوا، خجند اور بخارا کی حدود تک پہنچ گیا۔

ان ممالک نے انگلستان اور ہندوستان سے مدد طلب کی۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں بمقام لاہور لارڈ لارنس اور سفیرِ خجند کی ملاقات ہوئی۔ تین سال بعد بخارا کا سفیر بھی ہندوستان آیا۔ لیکن یہ سفارت بھی ناکام رہی اور روس نے بخارا اور خجند پر قبضہ کر لیا۔

برطانوی گورنمنٹ ان مخمصوں میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی تاہم وہ خواہاں تھی کہ روس کے جارحانہ اقدامات سے جو واقعات ان ممالک میں رونما ہو رہے تھے ان کے متعلق قابلِ وثوق معلومات حاصل کرے۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ ایک خفیہ مشن ان ممالک میں بھیجا جائے جو ان کا دورہ کرے اور ان کے سیاسی حالات پر رپورٹ پیش کرے۔ حکام کی نظر میں اس کام کے لئے ڈاکٹر لائیٹنر سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔ وہ نہ صرف عربی اور ترکی کے عالم تھے بلکہ ان دونوں زبانوں کو بے تکان بول سکتے تھے۔ علاوہ بریں انہیں اسلامیات پر بھی پورا پورا عبور تھا۔ چنانچہ انہیں اس وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس کے صرف دو اور رکن تھے۔ آزاد[1] اور پنڈت من پھول[2]، جن کا انتخاب ڈاکٹر لائیٹنر کے ایما سے ہوا۔

آزاد کے لئے یہ منصوبہ دو وجہ سے اہم تھا۔ ایک یہ کہ انہیں ایران اور اسلامی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اور دوسرے یہ خدمت سرانجام دے کر وہ گورنمنٹ کے مقربینِ خاص میں داخل ہو جائیں گے۔ اور انہیں "غدر" کے عواقب سے نجات حاصل ہوگی۔

اس خفیہ مشن کی تفصیلات کا آج کسی کو علم نہیں کیونکہ تینوں اراکین پر ان معاملات کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی کڑی شرط لگا دی گئی تھی۔ جہاں تک آزاد کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں اتنے محتاط تھے کہ بالفاظ مولوی خلیل الرحمٰن مؤلف "خمارِ اندلس"، انہوں نے ان کا ذکر اپنی اہلیہ تک سے نہ کیا ہوگا!

معتبر ذرائع سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ اس سفر میں ڈاکٹر لائیٹنر نے اپنے تئیں ایک مسلمان عالم ظاہر کیا۔ مولانا آزاد نے ایک آزاد منش فقیر کا روپ دھارا۔ ایک دو جگہ نانبائی کا کام کیا اور کچھ عرصہ مرغینان میں طلبا کو تعلیم دیتے رہے۔ لائیٹنر اور آزاد نے اس ضمن میں کیا کام کیا، اسکا کسی کو علم نہیں۔ ہاں اس کام کی نوعیت پر ایک "سوال نامہ" سے روشنی پڑتی ہے جو آزاد اور دوسرے ممبروں کو دیا گیا تھا۔ ذیل میں اس نایاب مسودہ کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ اس میں ممالک اور شہروں کے نام نہیں دئے گئے بلکہ ان کے پہلے حروف پر اکتفا کیا ہے۔ (اس مسودہ کی عبارت بہ روشِ املا حسب ذیل ہے):-

---

[1] سنا گیا ہے کہ اس معاملہ میں مولوی سید رجب علی خاں ارسطو جاہ نے آزاد کی مدد کی تھی۔ آپ دہلی کے باشندے تھے اور سر سید کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ "غدر" کے بعد بہت ترقی کی۔ آپ نے ایک اخبار بھی نکالا تھا جس کا نام مجمع البحرین تھا۔

[2] پنڈت من پھول دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ "دہلی کالج" میں انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور ان دنوں لاٹ صاحب کے میر سیکرٹری تھے۔ آزاد سے مربیانہ سلوک تھا۔ آزاد کی تصنیف "نصیحت کا کرن پھول" میں ان کے نام کی رعایت ہے۔

"(ک) میں ان کی اصل حیثیت کیا ہے۔ کتنی فوج ان کی اس ملک میں ہے بہ تفصیل سوار و پیادہ و توپ خانہ۔ فوج ان کی بیشتر اصلی ہے یعنی آدمی سپاہ کی سکنائے گرد و نواح سنٹ پیٹرس برگ سے ہیں یا مسلمان سپاہی ہیں جو اضلاع توابع (س) حدود متصلہ (ک) میں بھرتی کئے گئے۔ افسر اور سپاہی ایک ہی قوم کی ہیں یا افسر عیسائی ہیں اور سپاہی ماتحت مسلمان۔ (س) نے کیا قلعہ بنائے ہیں اور وہاں پر توپیں چڑھائی ہیں بڑی بڑی پلٹ کے یا وہ فقط مضبوط سرائے ہیں جو واسطے حفاظت سوداگراں و مسافراں از غارت گراں بنائی گئی۔ کیا یہ تعمیرات بہت بنائی ہیں۔ عموماً کتنے آدمی ہر جگہ میں مامور ہیں۔ کیا (س) نے (ک) والوں کو بالکل شکست دی ہے یا وہ دونوں اب تک لڑ رہی ہیں اگر لڑ رہی ہیں تو (کث) والے اس وقت میں کہاں تک خواہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ (س) کا کریں یا ضرور شکست کھا دیں گی۔ لڑائی کا سبب کیا ہوا۔ آیا یہ بات ہے کہ (س) چاہتے ہیں کہ (کث) کو فتح کر کے متصرف ہو جاویں یا قصد (س) کا یہ مطلب ہے کہ (ک) والوں کو حملہ اور دست درازی اپنی سرحد سے روکیں۔ کیا (کث) والی پہلی (س) کی ملک میں غارت گری نہیں کرتی تھی اور لوگوں کو پکڑ کر لے جاتی تھی جیسے ترکمان خراسان کی حدود پر کرتے ہیں۔ کیا (س) نے کسی قدر ملک (کث) پر تسلط کر لیا ہے اور جو کر لیا ہے تو کیا اس کا یہ وصول کرتے ہیں اور اس میں کچھ مقرر کر رکھا ہے اور بند و بست اس کا اپنے طور کر رکھا ہے۔ (س) نے (کث) میں اپنی طرف سے کوئی گورنر مقرر کر رکھا ہے اور جو کیا ہے تو اس کا نام کیا ہے وہ عیسائی ہے یا مسلمان۔ (کث) بسبب لڑائی سلسلہ تجارت کس طرح پر ہو رہا ہے آیا (س) سست ہے یا بدستور۔ سوداگروں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان سے حسن سلوک پیش آتی ہیں یا برعکس ہوتا ہی (س) رعایائی ملک متفرقہ جدیدہ کی تالیف قلوب کرتے ہیں یا ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ یارقند کی لوگوں کی عموماً لڑائی کی بابت کیا رائے ہی جو مابین (س) اور (کث) کی ہے۔ کیا ان کو اندیشہ پیدا ہو گیا ہی اور وہ یہ امید کرتے ہیں کہ (س) ہمارے ملک یارقند پر بھی حملہ کرے گی (کث) میں کوئی باترتیب گورنمنٹ ملکیہ لوگوں میں ہی یا نہ اور اگر ہی تو اس خان یا سردار کی عمر اور سیرت کیا ہی۔ وہ لیسی آدمی مستعد اور دلیر ہیں پر لوگوں کو بہرہ ساہی یا نہ۔ (کث) میں سپاہی ملکیہ لوگ ہیں یا اپنے فوج ہو جہاں تک ہو سکے تعداد ہر ایک کے دریافت کرو۔ کیا بیشتر سپاہ سواراں ہمراہیاں سرداران ملک سے ہیں۔ خان (کث) کے پاس کوئی توپ ہے۔ اگر ہے تو کس تپلی اور کس حجم کی اور عموماً ان کی کتنے مار ہی اور کیونکر کھینچی جاتی ہی اگر گھوڑوں سے کھینچی جاتی ہی تو فی توپ کی گھوڑے لگائی جاتی ہے۔ کوئی میگزین بارود اور گولہ کا بھی رکھتی ہیں اگر نہیں رکھتے تو گزارہ کیونکر کرتے ہیں۔ سوار پیادہ کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں۔ کھلی ہوئی میدان میں (س) سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور لڑ سکتے ہیں یا فقط ان کو ناگہانی چھاپہ مار کر حملوں سے حیران کر سکتے ہیں۔ چونکہ حال ہی خبر پہونچی ہی کہ خان (کث) یا تو مسند سے معزول کیا گیا اور نظربند کیا گیا یا مارا گیا اور قبچاقیوں نے اسکو ہٹا کر ملک حوالہ شاہ (ب) کر دیا اسکا حال مفصل حتی الامکان دریافت ہونا چاہئے اور یہ بھی تحقیق ہونا چاہئے کہ اوسکا اثر غالباً بنسبت رابطہ (س) اور (ب) ان دونوں ملکوں میں کیا ہوگا۔ علاوہ اسکی لیپ میں یقین ہو رہا ہی کہ (س) نی اپنے قدیمی قلعہ والی حد بڑھا دی ہی (کث) کا کچھ ملک لے کر۔ اس نئی حد کی لین حتی الامکان معلوم ہونی چاہئے جو قلعہ اس حد کی اوپر بنائی گئی کہاں کہاں اور کے قلعہ ہیں اور کس قدر ملک اس طرح سے (کث) سے نکل کر (س) میں شامل ہو گیا اور چونکہ معلوم ہوتا ہے کاشغر یارقند ختن میں جو اب تک چین کی ماتحت تھے مسلمانوں نے سرکشی خطائیوں سے کی اور اپنے سرداروں کے گورنمنٹ مقرر کر دی ہے اسکے صحیح حالات تحقیقات ہونی چاہئے اور جو مابین ان ملکوں کی آپس میں واسطہ ہے اور درمیان (س) اور درمیان (کث) اور (ب) اور (س) کے جو کچھ ؟ اور واسطہ ہو سب تحقیقات کرنا چاہئے اور ان کی مرضی اور خواہش اور امکانی رابطہ تجارت کیسے ہے اور نیز یہ کہ چین والی پھر سلطنت اپنے قائم کرنے والی ہیں یا نہ۔ اور کابل اور (کث) کی درمیان میں ملک بدخشان جس میں کان بہت ہیں اور ایک اچھی حال میں بہ نمونہ جات پاس پاس (کث) پشاور کی آیا اسکی ملک کے حالات بھی شامل تحقیقات ہونے چاہئے اور اسکی آمدنی اور پیداوار اور اسکا برتاؤ ریاستہائے متصلہ کے ساتھ کیا ہے تحقیقات ہونا چاہئے"

اس مسودہ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ مولانا کے سفر ایران کا محرک شوقِ تحقیق و تجسس نہ تھا، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ ایک سیاسی کاوش تھا۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس سفر سے آزاد کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا، تو اس کا جواب ان کی تصنیف "سخندان پارس" کے مطالعہ سے مل سکتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایران کی پرانی تہذیب اور اس کے آثار قدیمہ کی جو جیتی جاگتی تصاویر آزاد نے اس کتاب میں پیش کی ہیں، نیز ایران کی بوقلموں زندگی، اسکے باشندوں کے عادات خصائل، خوراک لباس، طرز معاشرت، موسموں کی بوقلمونی اور رنگینی کے جو شاداب مرقعے آزاد نے الفاظ کے ذریعہ کھینچے ہیں، وہ سب ان ذاتی مشاہدات کا نتیجہ ہیں جو اس سفر کی وجہ سے انہیں حاصل ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آزاد نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں کے باشندوں کے فارسی زبان، اس کے خدوخال اور اس کے محاوروں کی ساخت پر ایران کے طبعی حالات، رسوم و عقائد، ان کے لباس، خوراک اور طرز حیات کا کیا اثر ہوا۔ یہ سب نہایت دقیق معلومات ہیں اور یہ اکثر اسی سیاسی کاوش کا فیضان ہ

فضل احمد کریم فضلی

غزل

(غمِ دوراں)

★

وہ سنگ سخت حوادث، وہ شیشۂ احساس — یہ سخت تر ہے کہ قائم ہیں اس پہ ہوش و حواس
بہار کے لئے دل خون کر دیا، لیکن — ہوا بہار کی آئی نہ عندلیب کو راس
کھلا یہ مجھ پہ بڑی تلخ کامیوں کے بعد — کہ تلخیوں میں بھی ہوتی ہے اک طرح کی مٹھاس
گذر رہی ہے کرم سے ترے خوش و ناخوش — عجیب دل کا ہے عالم نہ کوئی آس نہ پاس
کریں وہ مجھ پہ کرم یا ستم، خوشی ان کی — مری زباں پہ نہیں کچھ سوائے شکر و سپاس
اٹھا رہا ہوں قدم منزلِ یقیں کی طرف — گذر رہے ہیں مگر دل میں سیکڑوں وسواس
نہ ڈھونڈھو طرفہ مضامیں میرے شعروں میں — پہن لیا ہے حقیقت نے شاعرانہ لباس
اگر ہو دل سے تراوش تو شاعری الہام — جو صرف زورِ بیاں ہو تو شاعری بکواس
نہ زندگی میں سہی، میرے بعد ہی وہ سہی — کبھی تو ہوگا زمانہ مرا بھی قدر شناس

سبھوں کو اپنی ہی اپنی پڑے نہ کیوں فضلی
فضول تم ہو مری جان، اس قدر حساس

غزل

(غمِ جاناں)

★

گئے ہیں جب سے وہ رہنے لگا ہے یہ احساس — ہوا یہ جیسے کہ قائم ہے زندگی کی اساس
وہ راہِ عشق میں پہلے پہل مرا چلنا — قدم قدم پہ کشاکش، نظر نظر میں ہراس
وہ دم بخود شبِ مہتاب اور میں تنہا — وہ ایک عالمِ ہو، اور کوئی آس نہ پاس
ہوا ہے رام کہیں جا کے تب وہ شوخ غزال — ہزار ادوارِ طلب میں جب آئے ہیں بن باس
نفس نفس میں کھلی جا رہی ہے دل کی کلی — کہ عشق مثلِ نسیمِ سحر ہے خوش انفاس
بہت دنوں میں کہیں جا کے کوئی بنتا ہے — ادب شناس، ادا آشنا، نگاہ شناس
ہوا ہے مجکو اکیلے میں بارہا محسوس — کہ جیسے بیٹھ گئے ہیں وہ آکے میرے پاس
امید ہے کہ سُنے جا رہی ہے کیا کیا کچھ — مگر یہ شان تو دیکھو کہ سوت ہے نہ کپاس

تمہی کو مشقِ ستم کے لئے چنا فضلی
اب اُن سے بڑھ کے بھلا کون ہوگا قدر شناس

غزل

جلیل قدوائی

کرتے ہیں وہ پرسشِ الم کیا
رہتی نہیں میری چشم نم کیا؟
صورت سے عیاں نہیں ہے کیا کچھ!
آنکھوں کے گئے ہیں اشک تھم کیا
قسمت میں تھا دل کی ٹوٹ جانا
اب ٹوٹ گیا تو اس کا غم کیا
لو، اپنی جفا پہ ہیں وہ نادم
کرتے ہیں ستم پہ وہ ستم کیا!
کہتے ہیں وہ مجھ سے "ہم ہیں سب کچھ"
سب کچھ ہیں وہی اگر تو ہم کیا
گر حسن خود اپنی ذات سے ہے
پھر عشق کا رہ گیا بھرم کیا
اللہ کرے نہ اس کو واقف
اس سے ہرگز کہ ہے الم کیا
تم کو تو جلیل اک نہیں ہے
کرتے ہیں وہ التفات کم کیا!

غزل

اقبال عظیم

شراب شیشوں میں ڈھل رہی ہے، لبوں پہ ہے پھر بھی تشنگی سی
چراغ روشن ہیں انجمن میں، فضا ہے لیکن بجھی بجھی سی
شریک محفل ہیں یوں تو ہم بھی، مگر باندازِ خود فریبی
مزاج محفل بھی اجنبی سا، نگاہ ساقی بھی اجنبی سی
عجیب منزل پہ آ کے ٹھہرے ہیں، راہِ امروز کے مسافر
نگاہِ ماضی میں بے رخی سی، جبینِ فردا پہ تیرگی سی
فریبِ منزل کا راز افشا ہوا ہے آ کر قریبِ منزل
نظر تو آئی تھی دور سے کچھ سوادِ منزل پہ روشنی سی
شکست کھائی ہے زندگی نے خود اپنے عزمِ غلط کے ہاتھوں
قدم بظاہر تو بڑھ رہے ہیں، مگر بباطن ہے بیدلی سی
نقاب پوشوں کی انجمن میں حقیقتیں یوں چھپی ہوئی ہیں
دلوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں، مگر بظاہر ہے دوستی سی
کسی کو اقبال کیا خبر ہو کہ دل پہ کیا کچھ گذر رہا ہے
نہیں سمجھتی ہے اس کو دنیا لبوں پہ ہے کچھ جو کپکپی سی

ڈرامہ :

دِل بہشت

اغا بابر

افراد

منو۔ بیمار لڑکا
بیگم کرامت۔ مُنّو کی ماں
ڈاکٹر۔
مسخرا۔ دل بہشت

ایک کمرہ

(سامنے کھڑکی، دائیں طرف اندر آنے کے لئے دروازہ۔ دوسرا دروازہ بائیں طرف۔ ایک چارپائی پر مُنّو کمبل لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ چارپائی کے سرہانے ایک میز جس پر ٹیبل لمپ جل رہا ہے۔ ذرا دور تپائی پر ٹیلی فون۔ کمرے میں اداسی۔ پردہ اٹھتا ہے تو ڈاکٹر ٹیبل لمپ کی روشنی میں تھرمامیٹر دیکھ رہا ہے۔ منو کی ماں گھبرائی ہوئی اس پاس کھڑی ہے۔)

بیگم :۔ کیوں ڈاکٹر صاحب۔ کتنا ٹمپریچر ہے؟

ڈاکٹر :۔ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو خدا کے گھر سے پوری امید ہے۔

بیگم :۔ ہائے میرے اللہ!

ڈاکٹر :۔ معاف کیجئے میں نے یہ کہدیا یہ میرا فرض تھا۔

مُنّو :۔ (بیہوشی میں) دل بہشت! تم کہاں ہو؟ آتے کیوں نہیں؟

بیگم :۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے؟ کچھ تو کریں۔

ڈاکٹر :۔ میں اپنی پوری کوشش کر چکا بیگم صاحب!

مُنّو :۔ مجھے دل بہشت چاہیئے، دل بہشت کو بلاؤ۔ میری بات تو سن دل بہشت۔

ڈاکٹر :۔ یہ بیہوشی میں کسے بلا رہا ہے؟

بیگم :۔ مسخرے کو، مُنّو میری جان، میرے لال۔ ہائے پنڈا کس طرح تپ رہا ہے!

ڈاکٹر :۔ کس مسخرے کو؟

بیگم :۔ سرکس کا وہ مسخرا، کیا نام؟ دل بہشت۔ کل سے اسی کو پکارے جا رہا ہے

ڈاکٹر :۔ اچھا، وہ مسخرا! سرکس کے بھی چار پانچ آدمی بیمار پڑے ہیں۔ میں ہی ان کا علاج کر رہا ہوں۔

بیگم :۔ اگر اسے بلا بھیجیں تو۔ بیوقوفی تو ہے لیکن شاید مُنّو اچھا ہو جائے۔

ڈاکٹر :۔ دل بہشت تو اب شاید ہی لوگوں کو خوش کر سکے۔

بیگم :۔ کیوں؟

ڈاکٹر :۔ وہ خود سخت بیمار ہے۔ شاید ہی بچے۔

بیگم :۔ کون؟ دل بہشت؟

ڈاکٹر :۔ ایسا باہمت مخولیا مریض میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ چند دنوں کا مہمان ہے مگر موت پر ہنس رہا ہے۔ اچھا بیگم صاحبہ میں چلتا ہوں۔ دل بہشت کو جا کر دیکھنا ہے۔ واپسی پر پھر آؤں گا۔

مُنّو :۔ امی! دل بہشت کیوں نہیں آتا؟

بیگم :۔ وہ تو بہشت میں جا رہا ہے۔

مُنّو :۔ میں بھی اسی کے ساتھ جاؤں گا۔

بیگم :۔ ایسی بات نہ کہو مُنّو۔ سو جا میرے لال!

مُنّو :۔ کیسے سو جاؤں! نیند نہیں آتی۔ امی مجھے گانا سناؤ۔ وہی جو دل بہشت گاتا ہے۔

بیگم :۔ اچھا تو سونے کی کوشش کر۔ میں بجلی بجھا دیتی ہوں۔

(بجلی بجھ جاتی ہے۔ صرف ٹیبل لیمپ روشن ہے)

مُنّو :۔ اب سناؤ نا گانا

(بیگم پاس بیٹھ کر گاتی ہے)

بیگم آؤ مٹھو منہ سے بولو کرو کچھ ہنسی ٹھٹھول
سب ناچیں، بچہ بوڑھا جیسے کپا گول
میرے یار گلفام شہزادے بچے گول ٹول
سکھ ہے اپنے پاس ہمارے، اٹھ مورکھ ٹٹول
نگر دوں کا یاں گزر نہیں ہے آدمڑے اس کا چام
طاقت میری باندی شہرت مری غلام
میں ہوں مسخرا دل بہشت یہی ہے میرا نام نام نام

(اپنے آپ سے) لو سو گیا۔ (اس پر کمبل اڑھا کر آہستہ سے چلی جاتی ہے)

منو :۔ (کمبل منہ پر سے اتار کر چاروں طرف دیکھتا ہے)
"سب ناچیں بچہ بوڑھا جیسے کپا گول"
شکر خدا کا، کمرہ خالی ہوا۔ (کمبل اتار کر اٹھتا ہے اور ٹیلی فون کے پاس جا کر ریسیور اٹھاتا ہے) مجھے بہشت سے ملا دیجئے۔ جی کیا کہا؟ جی نہیں مجھے کسی نمبر کی ضرورت نہیں۔ میں نے سنا ہے وہ بہشت میں جا رہا ہے۔ میں مسخرے دل بہشت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ جی؟ کیا؟ کیا یہ دل بہشت بول رہا ہے! تو پھر آپ کون ہیں؟ آپ دل بہشت نہیں۔ معاف کریں، جب مسخرا دل بہشت آئے تو اس سے کہئے مجھے فون کرے۔ آپ بھولیں گے تو نہیں؟ مجھے بستر پر لیٹے لیٹے بس اسی کے فون کا انتظار رہے گا۔
(اتنی دیر میں کھڑکی آہستہ آہستہ کھلتی ہے اور اس میں سے ایک آدمی کالے کپڑے پہنے اندر کی طرف کودتا ہے) تم کون؟ یہاں کیوں آئے ہو؟ مجھے لینے کہیں تو موت تو نہیں؟

اجنبی :۔ اونہوں، میں موت ہوں، میں زندگی ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں، میں سب کچھ ہوں۔

منو :۔ تم کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہو! کیا مطلب؟

اجنبی :۔ ابھی دیکھنا۔ یہ لے۔ (کالا چغہ اتار کے پرے پھینکتا ہے نیچے مسخروں جیسے ڈھیلے ڈھالے رنگدار کپڑے پہنے نظر آتا ہے)

منو :۔ (تالی بجا کر) ارے دل بہشت! میں نے تو ابھی ابھی تمہیں ٹیلی فون کیا تھا۔

مسخرا :۔ مجھے پتہ ہے۔

منو :۔ وہ کیسے؟

مسخرا :۔ میں بجلی کے کھمبے پر بیٹھا تھا۔

منو :۔ بجلی کے کھمبے پر؟

مسخرا :۔ ہاں ہاں۔ میں اوپر جا رہا تھا۔ سگرٹ سلگانے کھمبے پر جا بیٹھا تو کیا سنتا ہوں کہ تیرا پیغام جا رہا ہے۔ اسی وقت برف کے ایک تودے پر چھلانگ مار دی۔

منو :۔ برف کے تودے پر!

مسخرا :۔ ہاں، وہ تو نیچے کو لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔ اور مجھے بھی نیچے ہی جانا تھا

منو :۔ میں نے سنا تھا تم مر گئے ہو، بہشت میں چلے گئے ہو۔ یاد نہیں کس نے کہا تھا۔

مسخرا :۔ میرا جسم مر سکتا ہے مگر میری روح بچوں کے دل میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

منو :۔ کیا تم سرکس چھوڑ بیٹھے؟

مسخرا :۔ ہاں چھوڑ دیا۔ اب لوگ دل بہشت کا ٹھٹھا مذاق کبھی نہیں سن سکیں گے۔ میں نے اپنی ہنسی ٹھٹھول سے بوڑھوں کو جوان بنایا، لوگوں کے دلوں کا میل صاف کیا۔ مگر وہ جوان نہ رہ سکا۔

منو :۔ کیا تم نے سرکس بالکل چھوڑ دیا؟ استعفےٰ دے بیٹھے؟

مسخرا :۔ استعفےٰ دیا تو نہیں، لے لیا گیا ہے۔ آج میں فرشتوں کو ہنسانے جا رہا ہوں۔

منو :۔ (خوش ہو کر) ہا ہا ہا! پھر تو تم انہیں ہنسا ہنسا کر دوہرا کر دو گے مگر سنو، بہشت میں ہر کسی کو تو نہیں جانے دیتے۔ تم کیسے چلے گئے؟

مسخرا :۔ مجھے کیسے نہیں جانے دیں گے میں نے خلق خدا کی تاریک زندگیوں میں خوشی کے دیئے جلائے، مردہ دلوں کو گدگداہٹوں سے بھر دیا۔ بہشت والوں کو اور کیا چاہیئے؟ اب تو میرے کام مول پڑے گا۔ میں تو بہشت سے سارے آرام مانگوں گا۔

منو :۔ مگر تم اتنی دور پہنچو گے کیسے؟

مسخرا :۔ (دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ڈھیلے ڈھالے مسخروں جیسے لباس میں ناچ ناچ کے چلتا ہے اور کہتا ہے) قوس قزح کے راستے۔ تم نے کیا سمجھا تھا کیسے پہنچوں گا؟

منو :۔ مگر قوس قزح ہے کہاں؟ اس وقت تجھے نظر نہیں آئے گی۔

مسخرا :۔ کھڑکی سے باہر

منو :۔ مگر میں تو ضرور دیکھوں گا۔

مسخرا :۔ آدمی بن، لیٹا رہ آرام سے۔ میں بتاتا ہوں۔ وہ یہاں سے

وہاں اور وہاں سے وہاں۔ اور وہاں سے وہاں آگے جاتی ہے۔ یہ تمام راستہ پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ رنگ رنگ کے پھول نکلے ہیں۔ میں چاند پر پہنچ کر رات بدلوں گا۔ چاند جگمگ ہوتا پھر میں وہاں سے کشتی پر بیٹھ کر کہکشاں کی پگڈنڈی پکڑ دوں گا۔

مُنّو: یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ راستے تو آپ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

مُنّو: مگر اس وقت قوسِ قزح کہاں ہے؟

مسخرا: ہے تو سہی مگر تو نہیں دیکھ سکتا۔ سورج کے نزدیک استے پھول اُگے ہیں کہ تو کبھی مانے گا نہیں۔ جب پانی برستا ہے تو وہ اپنا سر اوپر اٹھاتے ہیں اور تم لڑکے بالے شور مچانے لگتے ہو "پینگ پینگ پینگ"۔

مُنّو: ہم یہ بھی تو کہتے ہیں کہ آسمان کو آگ لگ گئی۔

مسخرا: ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا کام بحث کرنا نہیں۔ تم بیماری میں بہت کڑوی باتیں کرنے لگے ہو۔ مگر خیر، میں یہاں بحث تھوڑی کرنے آیا تھا۔ میں تو تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ کیا ہوا تمہیں؟

مُنّو: بخار۔

مسخرا: کون کہتا ہے؟ ٹھہر میں تھرما میٹر سے دیکھتا ہوں۔

منو: میں تھرما میٹر سے تنگ آ گیا ہوں۔ اگر لگایا تو توڑ دوں گا، پھر نہ کہنا۔

مسخرا: (ہنس کر) میں تھرما میٹر..... یہ دیکھو

منو: (تالی بجا کر) آہا ہا ہا، میٹھا سگرٹ خوشبودار!

مسخرا: ہے نا، جتنا چوسو اتنا ہی بخار کم ہوتا جائے گا (پاگلوں کی طرح ہنستا ہے) منہ کھول شاباش! (عینک لگاتا ہے)

منو: عینک کیوں لگا رہے ہو۔ یہ تمہیں عجیب سی لگتی ہے۔ مگر کوئی مسخرا عینک کیوں لگائے؟

مسخرا: تاکہ لوگ مجھے سیانا سمجھیں۔ ہوں تو بیوقوف مگر عقل مند۔

مُنّو: ہمارا ڈاکٹر بھی عینک لگاتا ہے۔

مسخرا: تمہارے ڈاکٹر کی عینک میری عینک سے مختلف ہے۔ اس کی عینک بیماری کو بڑھا چڑھا کر دکھاتی ہے۔ میری عینک گھٹا کر دکھاتی ہے۔ جب میں اس عینک سے تم پر نگاہ ڈالتا ہوں تو تم مجھے بالکل ٹھیک نظر آتے ہو۔ مگر ڈاکٹر کی عینک، خیر چھوڑو۔ تھرما میٹر نکالو منہ سے۔ دیکھوں کتنا بخار ہے۔ (تھرما میٹر دیکھ کر)

اوہ! معاملہ خطرناک ہے۔

منو: کیوں؟ کتنا بخار ہے؟

مسخرا: افسوس! تم سو سال سے زیادہ نہیں جیو گے۔

منو: مگر یہ تو خاصی لمبی عمر ہے۔

مسخرا: کون کہتا ہے۔ یہ تو کائنات کی زندگی میں ایک پل کے برابر ہے۔

منو: خیر ہم خوش ہیں کہ ہم اتنی جلدی نہیں مریں گے۔

مسخرا: ہم۔ تم جمع کا صیغہ کیوں استعمال کرتے ہو۔ اگر تجھے مرنا ہی ہے تو صبح کر کے مر۔ ذرا زبان دکھاؤ۔ اوہوں۔ ہوں۔ ہوں۔ بہت گندی ہے۔

منو: اچھا۔

مسخرا: تیرا پیٹ خراب ہے۔ بوجھ محسوس ہوتا ہے؟

منو: ہوں۔

مسخرا: تم نے کاغذ کھائے ہیں؟

مُنّو: کیا کہہ رہے ہو؟ کاغذ؟

مسخرا: اگر تمہارے پیٹ سے نکل آئیں تو؟ یہ لے نکل آئے (منہ کے منہ میں سے رنگ برنگے کاغذ کی زنجیر نکالتا ہے۔ زنجیر میں اور گچھے بنے ہوئے (کہتا نہ تھا اور کھایا کر دکاغذ۔ کیوں؟ کچھ پیٹ ہلکا ہوا؟

منو: (تالی بجا کر) مجھے پتہ ہے مجھے پتہ ہے۔ تو ہاتھ کی صفائی دکھا رہا ہے۔ میں تمہاری سب چالاکیاں جانتا ہوں۔

مسخرا: میری کونسی چالاکیاں۔ میں تو مسخرا ہوں۔ سیدھا سادا مسخرا دل بہشت۔ گلفام شہزادوں کا یا بچوں کا ماموں!

مُنّو: مگر تم ہمارے ڈاکٹر اچھے ہو۔ میں تمہارے علاج سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔

مسخرا: مگر تمہارا رنگ تو ابھی تک پیلا ہے۔ ٹھہر۔ میں اس کا بھی انتظام کر دوں۔ تیرے گال سرخ کرتا ہوں۔ (گال مروڑتا ہے)

منو: مجھے گدگدی ہوتی ہے۔

مسخرا: تو ہوتی رہے۔ یہ دیکھ۔ رنگ اب نکھرا۔ دل بہشت کوئی معمولی ڈاکٹر نہیں۔

منو: اچھا۔ کوئی اور صفائی دکھا۔

مسخرا: منہ کھول۔ تمہارا گلا دیکھوں۔ اوں ہوں۔ ہوں ہوں۔ تو نے ساری دنیا کے نقشے کھائے ہوئے ہیں۔

منو :۔ نقشے ؟

مسخرا :۔ ہاں ہاں۔ کھولے رکھو منہ۔ مجھے اندر جھانکنے دے ۔۔ ارے ۔۔۔ رے رے رے۔ اٹلس کے سارے نقشے اندر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اکڑ بکڑ بمبے بو۔ اسّی نوّے پورے سو۔ اسی کو لگی رسّی۔ گن لو پورے اسّی۔ کیا نک سک کھایا ہوا ہے تم نے۔ دنیا کے سارے جھنڈے اندر گڑے ہوئے ہیں۔ ایسی جنگ کا نقشہ۔ او یارو میری توبہ۔ مجھے نکلنے دو۔ ہٹ جاؤ پرے۔ لے پکڑتا تھا۔ اک دو۔ تین۔ چار۔ پانچ چھ۔ سات، آٹھ، نو، دس۔ اسی کو لگی رسی۔ گن لو پورے اسی۔ (مختلف ملکوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے نکال کے رکھتا جاتا ہے)

منو :۔ پاکستان کا جھنڈا کہاں ہے ؟

مسخرا :۔ بڑے سمجھدار ہو ؟ پاکستان کا ایک جھنڈا تو جناب کو دامن آ گیا۔ یہ جھنڈا تو تمہارے خون میں رچا ہوا ہے۔ یہ تمہارے دل میں ہے، دماغ میں ہے۔ یہ منہ سے نہیں نکلے گا۔ اپنا کان ادھر لاؤ۔ کان دماغ کے پاس ہوتا ہے۔ یہ لو جھنڈا۔ (پاکستان کا چھوٹا سا جھنڈا منو کے ہاتھ میں دیتا ہے)

منو :۔ (ہنستا ہے) دل بہشت بڑے مزے کے آدمی ہو تم۔

مسخرا :۔ بولو اور کیا تکلیف ہے ؟ ذرا کروٹ تو بدلو شاباش (منو کروٹ بدلتا ہے کمر کے نیچے سے اٹھنیاں چونیاں، آنے، روپے گرنے لگتے ہیں) ہا ہا ہا ہا یار تو نے تو پیٹ میں خزانہ بھر رکھا ہے۔ یہ سیونگ بنک تمہیں کیسے آرام کرنے دے گا۔

منو :۔ سیدھا ہو کر چارپائی کے نیچے دیکھتے ہوئے) ہیں، اتنے روپے پیسے ! میں آئس کریم کھاؤں گا۔ چناں جور گرم لوں گا۔ گجک کھاؤں گا، ریوڑیاں چباؤں گا۔

مسخرا :۔ (منسکر) تمہیں اس دولت کا پتہ ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر تو بس کڑوی کسیلی دوا دینے کی بات کرتے ہیں اللہ اللہ خیر سلا۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر بچوں پر اپنی بڑائی جتاتا ہے ۔

منو :۔ کیا تم بڑی عمر کے نہیں ؟

مسخرا :۔ میں ! مسخرا دل بہشت بڑی عمر کا ؟ حد ہو گئی کتنی غلط بات کی ہے تم نے۔ ارے میرے یار، میں تو کل پیدا ہوا ہوں ! کل پھر پیدا ہوں گا۔ ہر ہر پل ایک بیوقوف پیدا ہوتا ہے۔ میں تو سدا بہار احمق ہوں۔ میں تو سورج کی صبح سویرے کی کرن کی طرح جوان ہوں۔ دیکھو مرے ڈھیلے ڈھالے کپڑے کس طرح ڈھلک رہے ہیں۔ (ذرا ناچ کر) اب کیسے مزاج ہیں سرکار کے ؟

منو :۔ پہلے سے بہت اچھے دل بہشت کیا وہ گانا نہیں سناؤ گے ؟

مسخرا :۔ کیوں نہیں۔ گانا سنانے ہی کو تو آیا ہوں۔ کونسا گانا سنوگے؟

منو :۔ وہی مسخرے والا ؟ تمہارا اپنا۔

مسخرا :۔ میں تو ہمیشہ اپنا ہی گانا گاتا ہوں۔ دوسرے کا گانا مجھے پسند نہیں (گاتا ہے، ساتھ ساتھ کدکتا اور ناچتا ہے)۔

میرے قہقہے بے لگام مری ہنسی ہے سب کا جام
پیتا ہوں میں جام جم پلاتا ہوں میں صبح و شام
فکروں کا یاں گزر نہیں ہے، ادھر ہے ان کا چام
ہنسی ہے میرا کام، ۔۔۔ کام کام کام

آؤ بیٹھو منہ سے بولو، کرو کچھ ہنسی ٹھٹھول
سب ناچیں بچے بوڑھے ماشاءاللہ جیسے کپا گول
میرے یار گلفام شہزادے بچے گول مٹول
سکھ ہے اپنے پاس ہمارے اٹھ مور کھ ٹٹول

فکروں کا یاں گزر نہیں ہے ادھر ہے اس کا چام
حماقت میری باندی شہرت میری غلام
میں ہوں مسخرا دل بہشت یہی ہے میرا نام نام

منو :۔ کتنا اچھا گاتے ہو کہاں کڑوی کسیلی دوا اور کہاں تم۔

مسخرا :۔ او ہو، مجھے دوا کا خیال ہی نہیں آیا۔ دوا تو میں نے دی ہی نہیں۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔ مسخرے پن کی بھی حد ہونی چاہیئے۔ (بھّدے ٹھکانہ انداز سے تالی بجاتا ہے، جلدی سے بڑھ کر ٹیبل لیمپ تک جاتا ہے اور ایک رکابی اٹھا لاتا ہے) یہ لو پکڑو۔ دوا کھاؤ۔

منو :۔ کہاں سے لی یہ دوا ؟

مسخرا :۔ تمہارے ٹیبل لیمپ پر پڑی تھی۔ جلدی جلدی کھا لو گل نہ جائے

منو :۔ آہا ہا۔ آئس کریم ! یہ تو بڑی ٹھنڈی ہے۔ تم کہتے ہو ٹیبل لیمپ پر پڑی تھی۔ وہاں تو پگھل جاتی یہ۔

مسخرا :۔ کیوں مزیدار ہے نا؟ میں نے دراصل اسے سورج پر سے اٹھایا تھا۔ سورج پر اتنی گرمی ہوتی ہے کہ تیل لیمپ کی گرمی اس کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں۔ تمہیں پتہ ہے یہ آئس کریم میں نے بنائی ہے۔ برف میں کہکشاں کا کچھ دودھ ڈالا، چینی اور شکر نہیں ڈالی۔ اس کے بدلے میں نے ایک مسکراہٹ نچوڑ دی۔ میٹھی بھی ہے کہ نہیں؟

منو :۔ بہت میٹھی ہے۔ دل بہشت اگر چاکلیٹ آئس کریم بنائی ہو تو پھر؟

مسخرا :۔ چاکلیٹ آئس کریم بس کسی سلونی شام کا رنگ ملا دو۔ بس بن گئی چاکلیٹ آئس کریم۔

منو :۔ (ہنس کر اپنا پیٹ دباتے ہوئے) اوہ میرے اللہ! تم کتنے ہنسوڑ ہو۔

مسخرا :۔ (مسخروں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے) میں ہوں مسخرا دل بہشت (ٹوپی اتار کر) میری ٹوپی تم نے نہیں دیکھی۔ مسخرے کی ٹوپی۔ ذرا سونگھو تو۔ ہے نا داناؤں کے سر کی بو (ٹوپی منو کو سنگھا کے آپ سونگھتا ہے اور برا منہ بنا کر کہتا ہے) اونہوں ہوں! داناؤں کے تیل کی بو! پھینکو باہر (اٹھ کے باہر پھینکنے لگتا ہے پھر ہاتھ روک لیتا ہے) میں منہ تو بیوقوفوں کا سا بنائے رکھتا ہوں مگر اپنے مسخرے پن سے بڑے بڑے بیوقوفوں کو پیچھے پھینکتا ہوں۔ میرا حلیہ مسخروں کا سا ہے مگر میری ہنسی سونا آنسے کھری ہے۔ دیکھنے کو میں بدشکل ہوں مگر میرا داغ سچا موتی ہے۔ میں کالا بھونرا مکڑا ہوں مگر میرا جالا خالص سونے کا ہے۔ دیکھو مجھے میں کس طرح ناچتا ہوں۔ میرے ناچ کی سب کو ضرورت ہے (تھوڑا ناچتا ہے پھر کہتا ہے) "سب ناچو جیسے لوٹا جیسے کپا گول۔"

منو :۔ آہا ہا ہا ہی ہی ہی (تالیاں پیٹتا ہے) تم کمال کے مسخرے ہو۔ اب بس کرو خدا کے لئے پیٹ میں درد ہونے لگا۔

مسخرا :۔ دوا دوں؟

منو :۔ نہیں نہیں!

مسخرا :۔ میرا بیگ کہاں ہے؟ تجھے ایک اور دوا کھلاؤں ــ

منو :۔ ہاں ہاں۔ جب تم آئے تھے تمہارے ہاتھ میں ڈاکٹروں کی طرح کا ایک بیگ تھا۔

مسخرا :۔ سب ڈاکٹروں کے پاس بیگ ہوتا ہے۔ اس سے گول مٹول بچے پیدا ہوتے ہیں، جو بعد میں "گمنام شہزادے" کہلاتے ہیں، میرے دوست بن جاتے ہیں اور میں یاروں کا یار کہلاتا ہوں۔

منو :۔ کیا تمہارے بیگ میں بھی گول مٹول بچے ہیں؟

مسخرا :۔ کوئی ایک؟ یہ دیکھو (بیگ میں ہاتھ ڈال کر خرگوش کا بچہ نکالتا ہے) یہ لو پکڑو خرگوش کا بچہ۔ یہ لو بطخ کا، یہ لو کبوتر۔ چلو میرے بچو! اباؤٹ ٹرن۔ گھس جاؤ تھیلے میں۔ منو سنگترے کھاؤ گے؟ (بیگ میں سے تین سنگترے نکال کے مداری کی طرح ہاتھ میں اچھالتا ہے) ایک دو تین!

منو :۔ توبہ توبہ! کیا کیا چیزیں بیگ میں ڈال رکھی ہیں۔ کتنے خوبصورت سنگترے ہیں!

مسخرا :۔ واہ منو! یہ سنگترے تو نہیں، یہ تو ستارے ہیں، ایک چاند کا بچہ ہے۔ ستارے اور چاند میرے ہاتھ میں اچھل رہے ہیں۔ ایک دو تین۔ جنتر منتر منتر۔ (سنگترے بیگ میں ڈال لیتا ہے)

منو :۔ کیا تم نجومی بھی ہو؟ ستاروں کو کیسے قابو میں کر لیتے ہو! کمال کر دیا تم نے تمہارا تماشہ کوئی خواہ ساری رات دیکھتا رہے۔

مسخرا :۔ رات! اوہو مجھے خیال دلا دیا تم نے، مجھے اب جانا چاہیئے، دیر ہو گئی۔ چاند سے کشتی پکڑنی مشکل ہو جائے گی۔ اور پھر مجھے بہشت کو تار دینا پڑے گا کہ میں دوسری کشتی سے آؤں گا۔ (تھیلے میں ہاتھ ڈالتا ہے) نکل بیٹا، پیغام لے جا۔ (بیگ میں سے ایک کبوتر نکالتا ہے)۔

منو :۔ ارے کبوتر! اس کے پروں پر کیا لکھنے لگے ہو؟

مسخرا :۔ پیغام۔ یہ میرا پیغام لے کر بہشت جائے گا۔ وہاں پتہ چل جائے گا کہ میں دیر سے پہنچوں گا۔

منو :۔ کیا یہ کبوتر بہشت تک اڑ سکتا ہے؟ تھکتا نہیں؟

مسخرا :۔ کیسے تھک سکتا ہے اصیل کبوتر نہ ہوا تھی کا ما دھو ہوا!

منو :۔ لگتا تو اصیل ہے۔

مسخرا :۔ اصیل کہاں ہے یہ تو اصیل کبوتر کی روح ہے۔ دیکھتے نہیں کتنا سفید ہے۔ کبھی اتنا سفید کبوتر نکلا ہوا ہے۔

منو :۔ ہاں ہاں رنگ کچھ زرد سا ہے۔

مسخرا:۔ یہ پچھلی جنگ میں مارا گیا تھا

منو:۔ ہیں!

مسخرا:۔ جنگ کے محاذ سے پیغام لے جا رہا تھا کہ...

منو:۔ چ چ چ چ

مسخرا:۔ رحم کھانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں پتہ نہیں یہ بڑا خوش ہے بہشت کی طرف ہمیشہ گاتا ہوا جاتا ہے۔

منو:۔ کبوتر بھی گاتے ہیں؟

مسخرا:۔ کیوں نہیں گاتے۔ مرنے کے بعد گاتے ہیں۔ اگر انسان مر کے گا بھی نہ سکے تو پھر مرنے کا فائدہ؟ ٹھہر ٹھہر۔ یہ آواز کہاں سے آتی ہے؟

منو:۔ کچھ بھی نہیں تمہارے کان بج رہے ہیں۔

مسخرا:۔ واہ جی واہ! میرے کان بج رہے ہیں! (غور سے سنکر) یار کائنات گا رہی ہے منو! کیا تو سنتا نہیں آواز۔ ستارے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو ہو کر گا رہے ہیں۔ میرا بھی گانے کو جی چاہتا ہے۔

منو:۔ کیسی ستارے بھی گاتے ہیں؟

مسخرا:۔ کیوں نہیں۔ ستارے رات کو جنگل کے پنچھیوں کو گیت سکھاتے ہیں۔ مگر یہ گیت پنچھی سوتے سوتے سنتے ہیں۔ صبح سویرے جب پنچھیوں کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ستاروں کا گیت گانے کی کوشش کرتے ہیں۔

منو:۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ پنچھی بھی گاتے ہیں۔

مسخرا:۔ گاتے کہاں ہیں، گانے کی نقل کرتے ہیں۔ اگر وہ ستاروں کے گیت گا گا سکیں تو دنیا جنت نہ بن جائے

منو:۔ یہ گیت ہوتے ہیں؟ (جمائی لے کر) مجھے نیند آ رہی ہے۔

مسخرا:۔ آ رہی ہے نا۔ میں تجھے بستر پر ٹالکے آپ رفو چکر ہو جاؤں گا۔ اٹھ بستر پر لیٹ جا۔ (منو بستر پر لیٹتا ہے۔ مسخرا اس پر کمبل ڈال دیتا ہے) میں روشنی کم کر دیتا ہوں (کم کر دیتا ہے لیمپ جل رہا ہے) تو اب سو رہ۔

منو:۔ پہلے کہانی سنا پھر سوؤں گا۔

مسخرا:۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بہت بڑا احمق ہوتا تھا۔ بالکل بیوقوف۔ اس کا دل بہت بڑا تھا۔ احمقوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ اس احمق کا دل ایک گھماؤں جیسا آتا تھا۔ سمجھے ایک حویلی کے برابر اس کا دل تھا ایک تمہارے جیسا لڑکا اس کے دل کا راستہ ڈھونڈ کر اندر گھس گیا۔ وہاں کئی کمرے تھے۔ اتنے کہ ساری دنیا کے لڑکے چاہے وہاں آنکھ مچولی کھیلیں وہاں بڑوں کے لئے بھی جگہ تھی۔ احمق کے دل کو کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ لڑکے بالے احمق کے دل کو خاصا گرما گرم رکھتے۔ تمہارے جیسا ایک لڑکا وہاں جا کر سو گیا۔ اس نے خواب دیکھا کہ احمق مر گیا! سن رہے ہو نا؟ او یار میرے تو تو سو گیا (مسخرا اس پر کمبل ڈال دیتا ہے اور کھڑکی پھاندتا ہے اور جس کھڑکی سے آیا تھا اسی سے باہر غائب ہو جاتا ہے۔ کھڑکی کھلی چھوڑ جاتا ہے) (دائیں دروازے سے منو کی ماں دبے پاؤں داخل ہوتی ہے۔ ڈر ڈر کر)

منو:۔ (بیہوشی میں) دل بہشت!

بیگم:۔ میں واری (قریب آکر) کیوں منو!

منو:۔ امی اس کمرے میں مسخرا دل بہشت آیا تھا؟

بیگم:۔ میں کمرے میں آئی تھی تو تم سوئے ہوئے تھے۔ اب کیا حال ہے؟

منو:۔ پہلے سے اچھا ہے۔ (بائیں دروازے سے ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر:۔ کیسی ہے طبیعت اب؟ (نبض دیکھتا ہے) نبض پہلے سے اچھی ہے۔

بیگم:۔ کیا؟ منو اچھا ہو جائے گا!

ڈاکٹر:۔ کیوں نہیں۔

بیگم:۔ خدایا تیرا شکر!

منو:۔ امی، مسخرا ابھی یہاں تھا۔

بیگم:۔ بیٹا تم نے خواب دیکھا ہوگا

منو:۔ امی، وہ یہاں تھا۔ میں کہتا ہوں وہ یہاں تھا اس کھڑکی میں سے کود گیا۔

بیگم:۔ میرے اللہ! کھڑکی کیوں کھلی ہے۔ میں تو خود اسے بند کر کے گئی تھی۔

منو:۔ میں نے کہا امی وہ اسی راستے سے گیا ہے۔

ڈاکٹر:۔ کھڑکی ہوا سے کھل گئی ہوگی۔

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

بچوں کی پرورش کا پہلا سبق

بچے نازک، ناتواں اور بڑی دیکھ بھال کے محتاج ہوتے ہیں۔ تاہم اُن کے اندر نشو و نما کی زبردست صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مناسب نگہداشت، اچھی غذا اور عمدہ ٹانک کے استعمال سے اُن کے پنپتے ہوئے اور زندگی سے بھرپور جسم کو پُوری پُوری افزائش کا موقع مل سکتا ہے۔

نونہال کے باقاعدہ استعمال سے آپ کے بچے کو وہ تمام اجزا مناسب مقدار میں مہیا ہوتے رہیں گے جو اُس کی نشو و نما اور [illegible]ماریوں سے بچانے کے لئے ضروری ہیں۔

بنگالی افسانہ:

احساس

سید مقصود علی

تلخیص و ترجمہ: ابو سعید نورالدین

نواب شائستہ خاں کے پرانے قلعے کے کھنڈر کسی ڈھانچے کی پسلیوں کی طرح کھڑے تھے۔ دیوار کے شگافوں میں مختلف قسم کی گھاس پھونس اور برگد کے پودے اگ رہے تھے۔ جا بجا چمگادڑوں اور گرگٹوں کے سوراخ یوں لگتے تھے جیسے کوئی جاں بلب بڈھا اپنی بجھی بجھی بے نور آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہو۔ نہ فضا میں فوج اور سنتریوں کی ہماہمی تھی نہ اسلحہ کی جھنکار!

اس پرانے قلعے کے اردگرد ایک چھوٹی غلیظ سی بستی آباد ہوگئی تھی۔ ہوا میں ہمیشہ سڑاند بسی رہتی تھی۔

آبادی کے تقریباً سب لوگ رکشا چلاتے، ریس کھیلتے، اور تاڑی پیتے تھے۔ کہتے ہیں ان میں سے قریب قریب سب ہی قلعہ کے محافظوں کی اولاد میں سے تھے یا کسی فوجی خاندان کی یادگار۔ انقلاب زمانہ سے وہ غریب اور نادار ہوگئے تھے۔ اس کے باوجود وہ باپ دادا کا مسکن چھوڑ کر کہیں اور جانا نہیں چاہتے تھے۔ قدیم شکستہ قلعہ ان کے لئے باعث فخر تھا۔

اس بستی کے اکثر باشندوں کی طرح حشمت بھی رکشا چلاتا، تاڑی پیتا اور ریس کھیلتا تھا۔ اس کی زندگی میں بیوی بچوں اور پکانے کھانے کا کوئی بکھیڑا نہ تھا۔ رکشا سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی سے وہ اپنا گذارہ کرلیتا اور یہ آمدنی کافی ہوتی تھی۔ مگر وہ تاڑی اور ریس کے پیچھے سب کچھ اڑا دیتا تھا۔ ہفتہ کے روز کا وہ بہت بے چینی سے انتظار کرتا تھا۔ ریس شروع ہونے تک اندھا دھند رکشا چلاتا۔ جب بھر جاتی تو فوراً ریس کے میدان کی طرف بھاگ اٹھتا۔ اور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے میدان میں کود جاتا۔ وہ اکثر یہیں آکر اپنی قسمت آزماتا۔

ریس شروع ہوگئی تھی۔ شدید بے چینی سے لوگ اپنے اپنے گھوڑوں کے جیتنے کے لئے غل مچا رہے تھے۔ شور اٹھا "بہادر! بہادر! بہادر!"

حشمت نے نئے نئے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ پھر ٹکٹ خریدا اور لوگوں کے ساتھ ساتھ ویسے ہی بے تاب ہوکر چیخنے لگا۔ گھوڑ دوڑ ختم ہوجانے کے بعد حشمت نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ بڑبڑانے لگا "سارا قصور جوگی کا ہے۔ کمبخت نے میرے "کالا پہاڑ" کو دبا رکھا تھا۔"

شام کے اندھیرے میں حشمت بیڑی منہ میں دبائے کوٹھری میں داخل ہوا۔ قلعہ کے ایک کونے میں دو چمگادڑیں اس کے سامنے سے پھڑپھڑا کر اڑ گئیں مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ کوئی چیز لینے کے لئے وہ پھر باہر نکل گیا۔ اصطبل کے پاس چائے کی ایک گندی سی دوکان تھی، وہاں بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔ کھانا کھا کر ایک بیڑی سلگائی۔ رات کے وقت رکشا چلانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اندھیرے کمرے میں موم بتی جلا کر میلے کچیلے کمبل پر لیٹ گیا۔

فلو سردار کے گھر شادی کا ہنگامہ برپا تھا۔ بوڑھے نے دو ہی دن ہوئے شادی رچائی تھی۔ آج چوتھی کی تقریب تھی۔ گراموفون ریکارڈ زور شور سے بج رہے تھے۔ محلے کے بچے بوڑھے سب ہی اس کے گھر جمع ہوگئے تھے۔ حشمت جان بوجھ کر شریک نہ ہوا۔ کیونکہ وہ فلو سردار کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازے پر آہستہ سی دستک سن کر چونک پڑا۔

"کون؟" اس نے پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ جلد ہی سمجھ گیا یہ لیلیٰ تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہوگئی اور حشمت نے موم بتی جلا کر دروازہ بند کردیا۔ "ارے! اس وقت رات گئے تم؟"

فلو سردار لیلیٰ کا باپ تھا۔ لیلیٰ کی آنکھیں یکایک آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگیں۔ وہ کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز حشمت کے ہاتھ میں تھما کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ وہ دونوں بچپن میں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ تب بھی لیلیٰ کو حشمت کی بیوی بننے کا کتنا شوق تھا! مگر حشمت کے ساتھ اس کا

گھل مل جانا کسی کو پسند نہ تھا۔ محلہ کا چودھری ظلو سردار تھا۔ جوانی میں خوب کھل کھیلا۔ اب عقبیٰ کا خیال آنے لگا تھا۔ بیویوں اور بیٹی پر پردے کی سخت پابندی تھی۔ مگر لیلیٰ سب کی آنکھ بچا کر کبھی کبھی حشمت کی خیر و عافیت پوچھ جاتی تھی۔

پھر بھی حشمت کو اس کے آگے شادی کا سوال اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ ظلو سردار عمر خاں کے خاندان سے تھا جس پر وہ بڑا گھمنڈ کرتا تھا۔ کیونکہ عمر خاں نواب شائستہ خاں کے قلعہ میں برق انداز تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی ظلمت خان کے بیٹے شکم علی سے کرنا چاہتا تھا جس کا سلسلۂ نسب نواب شائستہ خاں کے ایک دوسرے نوکر، علی شیخ گولنداز تک پہنچتا تھا۔

حشمت سوچتا تھا، وہ بھی تو عمر خاں کی ہی اولاد میں سے ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے رکشا چلاتا اور تاڑی پیتا تھا۔ ظلو سردار سے شادی کی بات منہ پھوڑ کر کہی بھی جائے تو وہ اس کو ہنسی میں اڑا دے گا۔ حشمت نے گٹھڑی کھولی، اندر سے کچھ کھانا اور مٹھائیاں نکل آئیں۔ یہ ظلو سردار کی شادی کا کھانا تھا جسے لیلیٰ آج موقع پا کر چپکے سے دے گئی تھی! اس کا خلوص دیکھ کر حشمت سوچ میں پڑ گیا اور سوچتے سوچتے سو گیا۔ صبح کافی دیر میں بستر سے اٹھا۔ غنی کی دکان پر پہنچ کر چائے پینے لگا۔ وہاں ظلو سردار کے متعلق عام بات چیت ہو رہی تھی "بوڑھے نے خوب شادی کی ہے۔ بڑی خوبصورت بیوی ہے۔" افضل نے کہا۔

"بڑھاپے میں شادی کرنے کا بڑا شوق ہے۔ ابھی ایک دو اور بھی کرے گا۔" ایک بیوپاری کی اس بات پر سب ہنس پڑے۔ طرح طرح کی بیہودہ باتیں ہوتی رہیں۔ لیلیٰ کا ذکر بھی چل نکلا۔ "بیٹی بھی اچھے ٹھکانے لگ گئی۔ خوب مزے میں ہے شکم علی۔" افضل نے کہا۔

"تو مٹھائی کھلاؤ بیٹا۔" غنی نے کہا۔ "اور حشمت، تم کیوں نہیں بولتے؟" "حضرت کو لیلیٰ سے شادی کرنے کی تمنا تھی، وہ پوری نہیں ہوئی۔" بیچ میں افضل بول اٹھا۔ شکم علی نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔" حشمت غصہ میں آ کر بولا۔ اور پھر بیڑی سلگا کر روزگار کی تلاش میں نکل گیا۔

لیلیٰ کی شادی ہو گئی۔ اس سے پہلے حشمت نے لیلیٰ سے صرف ایک بار اس کے پاس آنے کی تمنا کی تھی۔ شاید بیچاری کو موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ شادی میں شریک نہ ہوا۔ ظلو سخت برہم ہوا۔ حشمت ساری رات اپنی تاریک کوٹھری میں ڈگڈگا کر تاڑی پیتا رہا۔ دل میں کہا "لیلیٰ کتنی جھوٹی ہے، شادی سے پہلے کیسے میری محبت کا دم بھرتی تھی۔"

صبح حشمت رکشا لے کر نکل گیا، دن بھر رکشا چلائی۔ شام کو ایک گلی کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ کہ اچانک کسی نے دبی ہوئی آواز میں پکارا "رکشا والے! آؤ" وہ رک گیا۔ ایک آدمی گرتا پڑتا رکشے پر آ بیٹھا۔ یہ شکم علی تھا! منہ سے دیسی شراب کے بھبکے آ رہے تھے۔ پیچھے سے کچھ لونڈوں نے آوازے کسے۔ حشمت کو سخت طیش آیا۔ "ابھی اس کی شادی کو ایک دن بھی، تو نہیں گذرا!"۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ اور اسے دھکا دے کر نیچے اتار دیا۔

ہوتے ہوتے کئی دن گذر گئے۔ ایک دن وہ کافی رات گئے اتفاقاً شکم علی کے گھر کی طرف جا نکلا۔ اس کے گھر سے کسی عورت کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی "ہائے خدا مجھے اس جلاد کے ہاتھ سے بچاؤ!" یہ لیلیٰ ہی کی آواز تھی۔ "بھاگ نکل نہ! جا اپنے پیارے حشمت کے پاس" شکم نے درشت لہجے میں کہا۔ لیلیٰ نے جھلا کر کہا "دیکھو حشمت کو برا مت کہو۔ خدا یہ برداشت نہیں کرے گا۔"

"کیوں نہیں، وہ تو فرشتہ ٹھہرا، اسے تجھ سے محبت تھی کتنی ہی مرتبہ تو اس کے ہاں گئی ہے۔ خدا نے یہ تو برداشت کر لیا؟!"

حشمت غضب ناک ہو کر شکم کے گھر میں گھس گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے شکم کے سر پہ ایک ضرب لگائی جس سے کان ایک طرف سے کٹ گیا۔ شکم لوہے کی ایک سلاخ اٹھا کر مارنے لگا۔ لیلیٰ نے تیزی سے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شکم نے ایسا دھکا دیا کہ وہ مٹی کی دیوار سے جا ٹکرائی اور سر پر سخت چوٹ لگی۔ حشمت اور شکم گتھم گتھا ہو گئے۔ شکم زخمی ہو کر ڈھیلا پڑ گیا۔ چاروں طرف سے لوگ اس کے گھر کی طرف دوڑ آئے۔ ظلو سردار، ظلمت، غنی، افضل سب اکٹھے ہو گئے۔ حشمت ابھی تک شکم کے سینے پر بیٹھا اس کا گلا دبا رہا تھا۔ لوگوں نے حشمت کو گھسیٹ کر باہر نکالا، وہ سب کی نظریں بچا کر بھاگ نکلا۔ ظلو سردار اور ظلمت غصے کے مارے دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ اسی وقت حشمت کا تکا بوٹی اڑا دینا چاہتے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ظلّو سردار کے صحن میں پنچایت ہوئی۔ سرپنچ خود ظلّو سردار تھا۔ بستی کے تقریباً سب لوگ جمع تھے۔ عورتیں پردے میں تھیں۔ سردار کا فیصلہ ہمیشہ بے چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ حشمت ایک کونے میں مجرم بنا بیٹھا تھا۔ ظلّو کے اشارے پر شکم نے اپنی شکایت پیش کی۔ فیصلہ کی باگ ڈور اس کے خسر کے ہاتھ ہی میں تھی، سب واقعات کو خوب توڑ مروڑ کر پیش کیا اور کہا اس کی عدم موجودگی میں حشمت نے اس کی عزت پر حملہ کرنا چاہا۔ وہ عین وقت پر گھر پہنچ گیا اور یہ ہنگامہ برپا ہوا۔ حشمت نے لوہے کی سلاخ لے کر اسے اور لیلیٰ کو لہو لہان کر دیا۔ ظلّو نے گھر کی طرف رخ کر کے لیلیٰ سے کہا۔ "بیٹی تو بھی اپنا زخم دکھا دے۔" بھلا لیلیٰ مردوں کے سامنے کیسے آتی! شکم کی ماں اس کو کھینچ کر قنات کے پاس لے آئی اور پردہ کھول کر سب کو زخم دکھا دیا۔ ظلّو پھر بولا "بیٹی، تجھے کچھ اور کہنا ہے؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیچاری شرم کے مارے خاموش رہی۔ اب ظلّو نے حشمت سے پوچھا "تجھے کچھ کہنا ہے؟" حشمت دیوانہ وار چیخ اٹھا "یہ سب جھوٹ ہے جھوٹ!" وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ مجمع نے شور مچا دیا "ہم اس کی بات نہیں سنیں گے۔ لفنگا، بدمعاش!" سب بے چینی سے فیصلہ کا انتظار کرنے لگے۔ ظلّو نے بلند آواز سے کہا "اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو بیس جوتے لگائے جائیں۔ شکم علی اٹھ تو ہی اس کی پیٹھ پر جوتے لگا۔" ظلّو نے اپنا موٹے تلے کا جوتا پیر سے کھول کر آگے بڑھا دیا۔ شکم اپنے شکار پر خونخوار بھیڑیے کی طرح جھپٹا۔ چار پانچ آدمیوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اس کی پیٹھ پر تڑا تڑ جوتے پڑنے لگے۔ عورتوں نے ڈر کے مارے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس دوران میں لیلیٰ وہاں سے نکل گئی۔

اس بات کو کئی دن گذر گئے۔ بستی کی زندگی پھر معمول پر آ گئی۔ حشمت موقع کی تاک میں تھا۔ اس کی رگ رگ میں انتقام کی آگ شعلہ زن تھی۔ اس رات وہ اپنی کوٹھری میں ذرا جلدی لیٹ گیا۔ باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ظلّو شیخ کے گھر پھر شادی کا ہنگامہ شروع ہوا۔ آج اس کے چھوٹے بھائی کی شادی تھی۔ حشمت کے سوا سب شریک ہوئے۔ لیلیٰ وہیں رہتی تھی۔ اس کا نام آتے ہی حشمت کے دل میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے اصلی روپ میں اس کے سامنے آ چکی تھی۔ اس دن ذرا سی سچی بات بھی نہ کہہ سکی۔ دفعتاً دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی "کون؟" کوئی جواب نہ ملا۔ حشمت سمجھ گیا۔ اس نے دانت کچکچائے، شکار پاس ہی مل گیا۔ وہ شکاری کتے کی طرح لپک کر اٹھا اور جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ لیلیٰ اندھیرے میں بے حس و حرکت کھڑی تھی! حشمت کا جی چاہا اسے ٹھوکر مار کر بھگا دے۔ پھر سوچا عورت پر کیا ہاتھ اٹھائے۔ وہ عرفاں کی اولاد میں سے تھا۔ حشمت کچھ بولے بغیر پھر چارپائی پر جا لیٹا۔ لیلیٰ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی اور بولی "حشمت بھیا!" اس کا لہجہ بڑا درد آمیز تھا۔ حشمت کچھ نہ بولا۔ اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹول کر لیلیٰ نے حشمت کے سر پر ہاتھ رکھا اور ذرا ہلا کر آواز دی "حشمت بھیا!" — "بھاگو یہاں سے مجھے پیار کی کوئی ضرورت نہیں!" لیلیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹکا دے کر چھڑا لیا۔

لیلیٰ نے اچانک حشمت کے چوڑے چکلے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر درد آمیز لہجے میں بولی "بھیا مجھے معاف کر دو!" حشمت نے اندھیرے میں محسوس کیا، اس کے سینے پر گرم گرم آنسوؤں کے کئی قطرے گرے۔ اس کی طاقتور باہوں نے غیر شعوری طور پر لیلیٰ کو سینے کے ساتھ دبانا چاہا لیکن وہ تیزی سے سایہ کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ حشمت نے بے قرار ہو کر آواز دی "پیاری لیلیٰ!" — مگر لیلیٰ کو وہ آواز سنائی نہ دی۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے حشمت سینہ پر گرے ہوئے گرم آنسوؤں کو محسوس کرنے لگا۔ بے عزتی کے احساس نے اس کے دل پر جو بوجھ ڈال رکھا تھا وہ ہلکا ہو گیا۔ ان معصوم آنکھوں سے ٹپکے ہوئے چند آنسو اس کی دکھی بھیگی زندگی میں، جس پر بدنامی کا گہرا سایہ تھا، واحد سامان تسلی تھے!۔

●

پروائوں کے ہات   کرنوں کے چلّو
بوندا بوندی فضا   خوشوں کے چلّو
رت کو آگ لگائے   کوئل کی کُو کُو
ٹھنڈی میٹھی رات   دھیمی دھیمی "ہُو"

(شیر افضل جعفری)

●

یادیں

مزمّل اللہ خاں

(نئے لکھنے والوں میں جوہرِ قابل ڈھونڈ نکالنے اور اپنے پڑھنے والوں سے روشناس کرانے کے لئے "اوّلین افسانہ" کا یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے کوئی اور افسانہ شائع نہ ہوا ہو)

وہ ایک حسین رات تھی۔ ہر طرف سکوت! چاند اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سے ساری دنیا کو منور کر رہا تھا۔ ہوا کے سرد سرد جھونکے کسی کے آنے کا پیغام دے رہے تھے اور میں تنہا ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں، جو برسوں سے خالی پڑا تھا، بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ جگہ جگہ کڑی کے جالے تھے اور کھڑکیوں، دروازوں کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ لوگ کہتے تھے اس پر جنّات کا قبضہ ہے۔ مگر میں یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی ڈر ہی نہیں۔ مجھے تو صرف کسی کا انتظار تھا۔ وہ رات جو میری زندگی میں اب کبھی نہیں آسکتی، اس کا تصور ہی سحر آفریں ہے۔ اس کے نقوش میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ مجھے عذرا کا انتظار تھا۔ میرے خوابوں کی ملکہ جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی اور ملاپ کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لے گی۔

مجھے اس کا وہ خط حرف بحرف یاد ہے جو اس نے مجھے پہلی بار لکھا تھا۔ خبر نہیں میں نے اس کو پڑھنے میں کتنا وقت صرف کیا، کیونکہ اس کی لکھائی بالکل ٹوٹی پھوٹی تھی۔ وہ بہت ہی کم پڑھی لکھی تھی۔ غریب ماں باپ کی بیٹی۔

لکھا تھا "آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ مدت سے آس لگائے بیٹھی تھی۔ آج امید بر آئی۔ آپ کو میں کس نام سے یاد کروں! کیا آپ میرے خط کا جواب دیں گے؟ ———— آپ کی۔ عذرا"

ایسے ہی کئی دن خط و کتابت جاری رہی ــــ محبت بڑھتی گئی اور اس کا لازمی نتیجہ ــــ دنیا ہماری دشمن بن گئی!

میرے والدین نے وعدہ کیا تھا کہ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ مجھے مزید تعلیم کے لئے ولایت بھیج دیں گے۔ مجھے ان کا بہت پاس تھا اور میں ان کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرتا رہا۔ سب لوگ میری تعریف کرتے تھے، لیکن ایک وقت ایسا آیا جب ان تعریفوں کا سلسلہ رک گیا۔ اور اپنے بھی بیگانے ہو گئے ؎

یار اغیار ہو گئے واللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

اور اس رات تو میرے جذبات کس قدر پاکیزہ تھے۔ اس نے جو کچھ کہا تھا مجھے خوب یاد ہے۔ وہ اس رات بہت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بڑے بڑے کالے بال اور نرگسی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ وہ میرے اور صرف میرے ہی لئے ہے۔ اس کی شیریں آواز کانوں کو کس قدر خوشگوار معلوم ہوتی تھی! اس معصوم لڑکی نے میرے ساتھ زندگی بھر نباہنے کی قسم کھائی تھی۔ اس نے کہا تھا وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ــــ

"میں دیوانوں کی طرح تمہارا نام دیواروں پر لکھتی پھرتی ہوں جس سے میرے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ میں تمہارے خیال میں ایسی محو ہو جاتی ہوں کہ کسی اور بات کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ دنیا کے ظلم سہتے سہتے میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے۔ تم مرد ہو اور میں ایک بے کس و مجبور عورت! تم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور میں غریب ہوں۔ تمہارے ماں باپ کسی بڑے گھرانے میں شادی کرانے کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔ بھلا وہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ایک اَن پڑھ لڑکی اُن کے گھر کی چار دیواری میں قدم رکھے۔ آخر تم چپ کیوں ہو؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

ماہِ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۸ء

اُس لڑکی کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی اور میری عمر کوئی انیس سال۔ وہ مجھے ایک معصوم بچی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچنے لگا کہیں وہ مجھ سے دل لگی یا دھوکہ تو نہیں کر رہی۔ مگر یہ بات دل کو نہ لگی۔ شام ہو گئی تھی، چراغ جل گئے لیکن ہم دونوں اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ آخر جب کافی اندھیرا ہو گیا تو ہمیں مجبوراً اٹھنا ہی پڑا۔ ایسے ہی لوگوں کی نظروں سے بچ بچ کر کبھی کبھار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اس وقت میرا بی۔اے کا آخری سال تھا، جیسے وہ میری زندگی کا آخری سال ہو!

وہ بار بار کہتی میں شادی کا پیغام بھجواؤں مگر میں یہ کیسے کرتا! میرے ماں باپ، میرا خاندان اس کو اپنی بے عزتی خیال کرتا تھا۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں عذرا ہی سے شادی کروں گا۔ مگر جواب ملا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، چاہے زہر کھا لو یا کچھ اور کر دو۔

اُدھر عذرا کے ماں باپ اس شادی کے خلاف تھے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میرے والدین اور عزیزان غریبوں پر طرح طرح کے ظلم توڑ رہے تھے، انہیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی لڑکی کی کہیں جلد از جلد شادی کر دیں۔

عذرا نے بھی شرم و حیا کی چادر پھینک کر ماں باپ سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی، اسی لئے اس پر بڑی سختی کی جاتی تھی۔

ایک دن میں نے اسے اتفاقاً سرِ راہ دیکھا۔ وہ بہت ہی اداس دکھائی دے رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کسی طرح سے معلوم کروں کہ وہ اتنی اداس کیوں ہے۔ لیکن افسوس اب مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ میں رنج و غم میں کھویا ہوا گھر واپس آ گیا اور باہر میدان میں پلنگ پر پڑ کر لیٹ گیا۔ ہر چند سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ اس کا اداس چہرہ بار بار نظروں کے سامنے اُبھر آتا۔

دفعتاً ایک پتھر میرے پاس آ کر گرا۔ اُٹھ کر دیکھا تو عذرا کھڑکی میں کھڑی تھی، وہ چاندنی رات میں صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ بار بار آنچل ہلا رہی تھی تاکہ میں یہ سمجھ جاؤں کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں اٹھ کر اس کی طرف چل دیا۔ میں نے کہا کہ عذرا کیا بات ہے۔ تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ وہ بولی کچھ نہیں، تم خدا کے لئے تھوڑی دیر اوپر آ جاؤ، میں آج اپنے دل کی دھڑکنیں تمہیں سنانا چاہتی ہوں۔ میں نے ہر چند سمجھایا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ یکایک ایک آواز آئی۔ عذرا کی ماں نے ہم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ غصہ میں بھری ہوئی تھی اور اس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے گئی اور میں دیکھتا ہی رہ گیا!

میں نے سنا عذرا کو بخار آ رہا ہے۔ مگر میں اس کی خیر و عافیت بھی نہ پوچھ سکا۔ وقت گذرتا گیا۔ میں بی۔اے پاس نہ کر سکا۔ ماں باپ مجھ سے مایوس ہو گئے۔ انہوں نے خرچ بند کر دیا اور میں آواروں میں شمار ہونے لگا۔

آخر ہم دونوں بڑی مشکل سے ملے اور طے کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم ایک دن مل کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیں۔

افسوس! وہ حسین رات پھر کبھی میری زندگی میں نہیں آ سکتی۔ عذرا اصرار کر رہی تھی کہ میں اسے کوئی قطعی جواب دوں۔ اس کی شادی طے ہو گئی تھی، وہ کسی ایسے شخص کے سپرد کی جا رہی تھی جو اس کے باپ کا ہم عمر تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ رہا تھا، جب میں اسے بچی سمجھتا تھا۔ اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر ٹھہر جاتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں۔ آج وہ ایک معمر آدمی کی شریکِ حیات بننے والی تھی! میری زبان گنگ تھی۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں تو ہر سبق کر چکا تھا۔

عذرا کو نامراد لوٹنا پڑا۔ وہ رات بے بسی کے ساتھ تنہا رہی تھی۔ اپنے والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر، سماج کو بیوقوف بنا کر۔ اگر کسی کو پتہ چل جاتا تو قیامت ہی آ جاتی۔ چلتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ یہ اس کا آخری سلام تھا۔ کیا اس سلام کا کوئی جواب دیا جا سکتا ہے؟!

★

نئی آوازیں،

"غزلیں، دوہے، گیت"

(عالی)

شان الحق حقی

دورِ جدید کے مزاج میں ہنگامہ پسندی کو بڑا دخل ہے، جس کے لئے ایک بڑا دلچسپ لفظ "سنسنی خیزی" ہماری زبان میں رائج ہو چکا ہے۔ اس مذاق نے ادب پر بھی ضرور اثر کیا، کمتر متضاد اور اکثر موافق۔ ایک طرف وہ تیور چمکائے گئے جو شاعروں میں مقبول ہوتے ہیں۔ دوسری طرف نئے شاعروں کو جستجو رہی کہ کوئی بہت ہی غضب کی جدت کر گزریں اور ہو سکے تو ادبی دھارے کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیں۔ ان دو رجحانات کے بین بین بعض نوجوان شعرا بڑی گومگو میں رہے اور کسی حد تک بے اعتمادی کا شکار بھی ہوئے۔ عالی بھی اس سے مبرا نہ تھے۔ تاہم وہ ہمارے ان نئے شاعروں میں ہیں جن کی شعری افتاد بڑی محکم تھی۔ وہ بڑی سلامتی سے اپنی روش پر رہے۔ اور اب انہوں نے اپنی شاعری کا ایک دلپذیر مجموعہ پیش کیا ہے، "غزلیں دوہے گیت"۔

عالی کے مجموعۂ کلام سے کوئی تہلکہ تو ادبی دنیا میں نہیں مچا، لیکن اس کی حیثیت پائدار معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک طرف شعر کی روایات سے پختہ ربط رکھتا ہے تو دوسری طرف شعر کے مستقبل کے بارے میں بھی اچھی آس بندھاتا ہے۔

بڑی شاعری کی ایک شناخت یہ ہے کہ وہ یا تو شاعری میں کسی نئے باب کا اضافہ کرے یا کسی باب کو اپنے ساتھ ختم کر دے، اس کی پرکھ مستقبل ہی کے ہاتھ ہوتی ہے۔ فی الحال دوہوں کا باب، جسے اردو میں عالی نے شروع کیا، تقلید کے قابل معلوم ہوتا ہے۔ مگر شاید قابلِ تقلید ثابت نہ ہو۔ عالی جتنے بھی دوہے اردو کے لئے لکھ جائیں غنیمت ہوگا۔ انہوں نے موضوع کی اتنی راہیں اس ایک انوکھی صنف میں نکال لی ہیں کہ ان کے دم تک تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی:

دوہے کبت کہہ کہہ کے عالی من کی پیاس بجھائے
من کی پیاس بجھے نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

ہمیں ان کی اس پیاس سے اور بھی توقعات ہیں۔ اس صنف کو جس طرح عالی نے برتا ہے اس میں ایک ترقی کی کیفیت اور بڑی گنجائش نظر آتی ہے۔ ہم نے اس کو ناقابلِ تقلید کہا تو اس لئے کہ برج بھاشا تو بہت سے لوگ لکھ سکتے ہیں اور شاید عالی سے زیادہ خالص برج بھاشا لکھیں۔ مگر دلی کی گلیاں، لوہارو کے دیہات، دیس دیس کی سیر، غالب کا پرتو، درد کی میراث اور ان کے ساتھ مرزا جمیل الدین کا سارا چھیل پن جب تک جمع نہ ہوں دوہوں کا لہجہ، روپ، رس اور تاثر کوئی چیز بھی نہ بن سکے گی۔ یہ دوہے بڑے جادو اثر ہیں اور عالی نے ٹھیٹھ اپنی ہی زبان میں لکھے ہیں۔ برج بھاشا کے دوہوں میں اب معنی آفرینی تو ممکن ہے لیکن واردات کی یہ کیفیت اور آمد کی شان نہیں پیدا ہو سکتی جو عالی کی اپنی زبان سے ان کے تجربات میں اور تجربات سے زبان میں پیدا ہوئی ہے۔ دراصل کوئی ادبی جدت، روایت سے بالکل علیحدہ رہ کر تو نہیں پنپ سکتی۔ عالی کے ہاں بھی دوہے کی فارم کے علاوہ، ہندی کے آسان بولوں کی آمیزش میں روایتی آہنگ موجود ہے۔ بلکہ جہاں کہیں صرف مضمون آفرینی کی گئی ہے، کلام میں کلاسکی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح کے دوہوں کو کبیر کا نہیں مگر رحمن کا سمجھ سکتے ہیں:

کہو چندرماں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری ناری کو دیکھ آئے

مگر عالی کا یہ کلام اس تقلید پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جہاں جہاں آمد کا زور ہے لہجے کی متانت بڑھ گئی ہے۔ زبان روایتی وضع (MANNERISM)

سے پاک ہو کر خالص اردو ہو گئی ہے۔ اور تاثیر میں یہ دوہے کہیں غزل سے جا ملے ہیں تو کہیں جدید نظم کا عمدہ نمونہ بن گئے ہیں:

آ لہا او دل گانے والے پیادے سے کترائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

اے بھئین وہ دیکھ سمے نے اپنی تان لگائی
اے بھئین وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی

موضوع کے لحاظ سے یہ دوہے بڑے متنوع ہیں۔ ان میں وحدت شاعر کے لہجے اور شخصیت سے پیدا ہوتی ہے۔ "عالی جی" کا اپنا کردار شروع سے آخر تک نمایاں رہتا ہے:

عالی جی اک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام
جیون بھر نردوش رہیں اور جیون بھر بدنام

مزاج ان کا عموماً تغزل آمیز ہے، لیکن شخصی واردات و تجربات کے اظہار اور ایک مخصوص رومانوی کردار کے باوجود ان میں کافی آفاقیت موجود ہے۔ اسی طرح بعض موقت کوائف اور مخصوص کنایات کے باوجود ان کا لطف اور تاثیر محدود نہیں ہونے پاتی۔ یہ اس کلام کا وہ غیر مرئی، غیر محسوس عنصر ہے جسے کمال سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل میں عالی کی ریاضت استاد سائل مرحوم کی صحبت میں یا اس کے باوجود اس رنگ کی تقلید سے شروع ہوئی ہے جس پر غالب کا پرتو تھا، پھر رفتہ رفتہ اپنے نکھار پر آئی۔ اول اول کلام کی اساس جذباتی ہے اور لہجہ فلسفیانہ معنویت کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ایک رنگ ابھرا ہے جسے نئی غزل کا عمدہ نمونہ کہہ سکتے ہیں ؂

بھٹکے ہوئے عالی سے پوچھو گھر واپس کب آئے گا
کب یہ در و دیوار سجیں گے کب یہ چمن لہرائے گا

ایک آدھ نئی غزل میں عالی نے اپنی روش سے ہٹ کر بھی چلنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تجربے اہلِ کمال کو راس نہیں آتے۔ بعض کلام اس رنگ سے مختلف اور اس کیفیت سے خالی ہو گیا ہے جو ان کے عام کلام میں ملتا ہے۔ یہاں ہم عسکری صاحب کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ عالی کو اپنی شعری صلاحیتوں کے باوجود اپنے کلام کے بارے میں کسی قدر بے اعتمادی لاحق رہی ہے۔

عسکری صاحب نے اپنے مقدمے میں عالی کی شاعری کے بارے میں بعض بڑی خیال آفریں باتیں کہی ہیں۔ ان کے نزدیک عالی کی شاعری اور شخصیت میں بڑا توافق ہے جو کمیاب ہوتا ہے۔ مگر یہ کہنا دراصل بڑا مشکل ہے کہ خارجی شخصیت کی حدود کہاں قائم ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عالی اپنی شاعری میں اکثر صاف پہچانے جاتے ہیں اور ان کی شخصیت اپنی جگہ بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے لیکن ایک وقیع تر داخلی شخصیت بھی ضرور موجود ہے۔

غزل

جمیل الدین عالی

کوئی نہیں کہ ہو کہ اس دشت میں مرادساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز

کبھی طلسمِ غرور اور کبھی فسونِ نیاز
ادائے سادگیٔ دوست تیری عمر دراز

کھلا یہ دوست نوازیٔ اہلِ ذوق سے راز
کہ قدر کے لئے کافی نہیں لبِ اعجاز

خزاں میں منظرِ گل دردناک ہے لیکن
یہیں سے ہے مری رودادِ شوق کا آغاز

یہ لب جو تشنہ ہے اک آہِ مختصر کے لئے
اسی میں تھے کبھی لاکھوں فسانہائے دراز

رہا نہ دل میں غمِ تنگیٔ گلستاں سے
وہ ولولہ جسے کہتے ہیں طاقتِ پرواز

کس انجمن میں دلِ سادہ کو سکون ملے
کہیں ہے قیدِ حقیقت کہیں ہے قیدِ مجاز

بایں فسردہ دلی کیا غضب ہے اے عالی
مجھے دئے چلی جاتی ہے زندگی آواز

جشنِ ثقافت

نومبر کا مہینہ قاعدے سے تو اچھی خاصی دنداں شکن سردیوں کا مہینہ ہوتا ہے لیکن ہمارے شہر کراچی کی اور کون کہے سیدھی ہے جو یہ ہوتی۔ مہینے کے گزشتہ تیسویں تک سردی چھوڑ گلابی جاڑے کا بھی دور تک پتہ نہ تھا اور کراچی والے لحافوں میں بیٹھ کر چلغوزے پھوڑنے اور ریڈیو پر سلامت علی، نزاکت علی کی نازک خیالیاں سننے کی بجائے ہر شب شہر سے میل بھر باہر ایک باغ کے سبزہ زار پہ آسمان کی نیلی چھت کے نیچے جشنِ ثقافت کے شو دیکھنے جمع ہوتے تھے۔ ادھر ساڑھے نو بجے اور ارباب ذوق نے جوب لگائی سے اٹھا ڈھول اور تاشے اور چلو فریئر گارڈن!

★

کراچی کی مصروف اور سرپٹ زندگی میں آرٹ کی حیثیت ایک شوقِ فضول ہی کی سہی لیکن آرٹ کے متوالے ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت' کے مصداق نچلے نہیں بیٹھتے۔ پاکستان آرٹ کونسل دو تین تقریبیں تو کامیابی سے منعقد کر چکی تھی لیکن محدود پیمانے پہ۔ ایک مدت سے اس کا ارادہ ایک معرکے کا جشن ثقافت کرنے کا تھا جس میں اپنے ملک کے آرٹسٹوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے فنکار بھی شریک ہوں۔ یہ خواب اب اگر شرمندۂ تکمیل ہوا۔ ہر چند کہ آرٹ کونسل کے حوصلوں اور ارادوں کے مطابق نہیں تاہم عوام نے اس کی جس ذوق و شوق سے پذیرائی کی اس سے اسے غیر معمولی طور پر کامیاب سمجھنا چاہئے۔ سترہ نومبر کو اس جشن کا آغاز ہوا اور تیس کو تمت۔ ٹکٹ خاصا مہنگا تھا لیکن مشتاقوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے اور پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔

★

اس جشن میں نمائندگی تو چار ملکوں کی ہوئی یعنی پاکستان، امریکہ، جرمنی اور چین کی لیکن چینی آرٹسٹوں کی کارگزاریوں کو اس جشن کا حاصل سمجھنا چاہئے۔ طائفہ بھی انہی کا سب سے بڑا تھا۔ اور ان چودہ دنوں میں بیشتر انہی کے پروگرام رہے۔ پاکستان اور امریکہ کے حصے میں ایک ایک دن آیا اور جرمن آرکسٹرا نے دو دن اپنا کمال دکھایا۔ اختلاف مذاق کی وجہ سے ہمارے ہاں مغربی موسیقی کی کم ہی قدر ہوتی ہے لیکن جرمنی کے برلنر کیمرا آرکسٹرا کو جو دنیا کے ممتاز ترین سازندوں میں سے سمجھا جاتا ہے اور ہینس فان بینڈا کی سرکردگی میں یہاں آیا تھا، لوگوں نے کمال توجہ سے سنا اور بے اختیار داد دی۔ یہ کنسرٹ کھلی فضا کی بجائے چھت میں زیادہ لطف دیتا ہے لیکن اچھا میوزک کہیں بھی ہو، کسی فضا میں بھی ہو، اثر دکھائے بنا نہیں رہتا۔ امریکہ کی شہرۂ آفاق موسیقار مس اینڈرسن کو سن کر یہ شعر یاد آتا رہا ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو

حقیقت یہ ہے کہ صوت و آہنگ کی زبان کسی ملک اور کسی فضا کے لئے اجنبی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کسی ترجمانی کی ضرورت نہیں۔ چینی آرٹسٹوں کے گیت اور رقص پر یہ بات کچھ اور صادق آتی ہے۔ مرکزی وزیر مسٹر یوسف ہارون نے ان آرٹسٹوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے سچ ہی تو کہا تھا کہ " یہ اکھتر رہ نوردانِ شوق ایک پیغام لائے ہیں جو کسی پارچے پر مرقوم نہیں بلکہ ساز و آواز اور رقص کی صورت میں ہے۔ اور ایسے عالم میں کہ دنیا بیم و شک کے ابتلا میں گرفتار ہے۔ دلوں کو فرحت و ابتسام کا درس دیتا ہے۔" کراچی سے فارغ ہو کر یہ لوگ لاہور پہنچے تو مغربی پاکستان کے گورنر جناب اختر حسین نے ان کے پہلے شو کا افتتاح کرتے ہوئے کہا۔ کہ یہ شیریں آواز، نازک اندام اور پراں قدم فنکار ناچتے ناچتے اسٹیج سے سیدھے لوگوں کے دلوں میں جا اترتے ہیں۔ "ہمارے ہاں سے مس آزوری [illegible] اسی زبان میں پیغام لے کر مشرقی افریقہ اور چین گئیں تو وہاں کے لوگوں نے بھی اسی احساس سے ان کا خیر مقدم کیا۔ محبت تو خیر سہی۔ آرٹ بھی کچھ کم فاتحِ عالم نہیں۔

★

بین‌الاقوامی جشن ثقافت

(زیر اہتمام پاکستان آرٹ کونسل کراچی)

چینی فن‌کاروں کے فنی مظاہرے
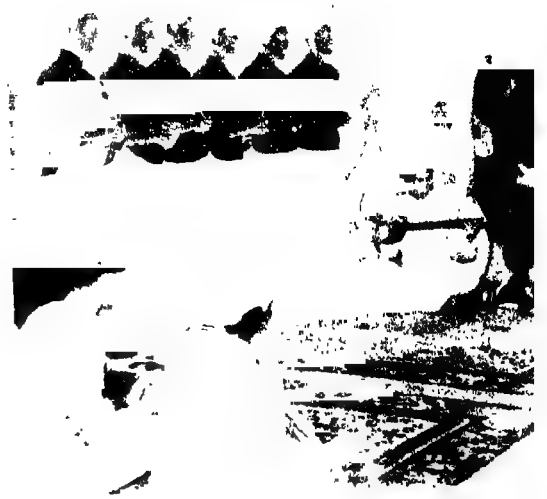
ملاح اور لڑکی

ستانی موسیقی اور رقص جو چینی فنکاروں نے
پاکستان آتے ہی سیکھ کر پیش کئے

) ''آئی بہار''—پاکستانی موسیقی
) ''لڈی ناچ''—پاکستان کا مقبول رقص

مور ناچ

ایک تمثیل کا منظر: (اژدھوں کی سرزمین میں بندروں کا راجہ)

بین‌الاقوامی جشن ثقافت

(۲)

نامور امریکی رقاصہ، میرین اینڈ رسن، کو پاکستان آرٹ کونسل کی طرف سے ان کے مظاہرۂ فن کے اعزاز میں بیگم نون نے ایک تحفہ پیش کیا

پاکستانی فن‌کار جمیلہ رزاق کا مظاہرۂ فن

جرمن سازینہ

...یہاں اندازہ ہو سکتا ہے پروگرام تھا ایک دو منٹ سے ... لیکن چینی آرٹسٹوں کے کمالات، رقاصوں کی سحر طرازی، رنگینیوں کی زنگارنگی، ملبوسات کی تابانی اور دلکشی، ... سب نے آسمان کے نیچے بیٹھے تماشائیوں پر جو جادو کر دیا ہے اس کی کیفیت بیان کرنے کے لئے مولوی محمد حسین آزاد کا قلم چاہئے کیونکہ یہ جشن مہتابی اکبر کے "جشن مہتابی" سے کچھ کم کیف آور اور سرور ناک نہ تھا۔ شروع میں آرٹ کونسل نے دس فٹ اونچا اسٹیج کا شیل بنایا تھا اور رقص و موسیقی کے عام مظاہروں کے لئے اسی قدر کافی ہوتا ہے لیکن چینیوں نے کہا کہ ہمارا تو اژدہا ہی پچیس تیس فٹ کی زقند لگاتا ہے اور بندر راجہ کی قلابازیاں بھی اٹھارہ بیس فٹ کی اونچائی چاہتی ہیں لہٰذا تین دن رات کی محنت سے اور بہت بڑے صرفے سے چینی کاریگروں کی زیر ہدایت ایک تیس فٹ اونچا شیل کھڑا کیا گیا جو بجائے خود ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ پروگرام کا آغاز "رقصِ طاؤس" سے ہوتا ہے۔ دلنواز اور لطیف چینی دھنوں کے ساتھ اسٹیج کا سرخ پردہ اٹھتا ہے اور گیارہ لڑکیاں رنگ برنگے ملبوسات سے مورنی کی طرح نظر آتی ہیں۔ یکایک جھانجن کی جھنکار کے ساتھ یہ گلدستہ بکھر جاتا ہے اور ایک کے گیارہ مور بن جاتے ہیں اور رانی مورنی کے گرد پر پھیلا کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس ناچ کے تین حصے ہیں۔ ایک میں مور کو تالاب سے پانی پیتا دکھاتے ہیں، دوسرے میں نہاتے ہوئے... تیسرے میں ناچتے اور پرواز کرتے ہوئے۔ جنگل میں مور ناچا کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، فیریئر باغ میں سب نے دیکھا۔

★

کنول ناچ مور ناچ سے بھی زیادہ دلنواز چیز ہے۔ نو لڑکیاں گلابی رنگ کا باریک ریشمی لباس پہنے، جس پر کنول کے بڑے بڑے پھول بنے ہیں، اس نرمی اور لطافت سے اسٹیج پر ناچتی ہیں کہ خود وہ اور کنول کے پھول صاف پانی میں تیرتے اور ہلکورے کھاتے معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ تماشائی اٹھ اٹھ کر اسٹیج کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہاں فرش ہے یا واقعی پانی ہے!

اسی قسم کا دھوکا ایک کلاسیکی اوپرا "خزاں کا دریا" دیکھتے وقت ہوتا ہے جس کا قصہ ہمارے ہیر رانجھا کے لڈن ملاح والے حصے کی یاد دلاتا ہے۔ منگ خاندان کی ایک خوبصورت لڑکی جس کی شادی اس کے مرضی کے خلاف ہونے والی ہے، گھر سے بھاگ کر اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ دریا پر اسے بوڑھا ملاح ملتا ہے تو پہلے تو اس سے چہلیں کرتا ہے۔ اور پھر دریا کے پار پہنچا دیتا ہے۔ یہ دو فنکار محض حرکات سے ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اب کشتی کھے رہے ہیں۔ اب اسے کھونٹے سے باندھ رہے ہیں۔ اب کشتی ہچکولے کھا رہی ہے، ہمارے فنکار اس اوپرا سے جو مشہور عالم پیکنگ اوپرا کی پیشکش ہے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اب ایک اور کلاسیکی اوپرا جسے دیکھ کر تماشائی ششدر رہ جاتے ہیں "اژدہا راجا کے محل میں ہنگامہ" کے نام سے موسوم ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک بندر جس نے ایک ہزار برس تک ریاض کر کے فنونِ جنگ میں کمال پیدا کیا ہے اور بندروں کا راجا بھی بن گیا ہے، ایک جادو کے ڈنڈے کی خبر پاتا ہے جو اژدہا راجہ کے محل میں ہے اور وزن اس کا کوئی ساڑھے پانچ سو من ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے اسے ایک ہفت خواں طے کرنی پڑتی ہے۔ راستے میں کیکڑوں اور دوسرے عجیب الخلقت جانوروں کے سردار ملتے ہیں لیکن وہ اپنی طاقت سے زیادہ چستی و چالاکی سے سب کو زیر کرتا ہوا بالکل راجا کے محل میں جا پہنچتا ہے۔ وہاں معرکے کی لڑائی ہوتی ہے اور بندر راجا اس آہنی ڈنڈے کو جسے کوئی ہلا بھی نہیں پاتا، انگلیوں میں یوں گھماتا ہے جیسے کوئی معمولی چھڑی ہو اور بالآخر اژدہا راجہ کے تخت پر قابض ہو جاتا ہے۔ یہ بندر راجہ جس قسم کی قلابازیاں کھاتا ہے وہ معمولی بندر کے بس کی بھی بات نہیں۔

★

ہر پروگرام کے بعد پردہ گر جاتا ہے اور ایک چینی خاتون نئے پروگرام کا چینی میں اعلان کرتی ہیں۔ ایک چینی صاحب ہی اس کا قلعہ معلیٰ کی زبان میں اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اعلان ہوتا ہے "اب دیکھئے رقص۔ چائے کے باغ میں بہار کی آمد"۔ یہ عجیب رقص ہے اور دیکھنے والوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ کیونکہ اس میں شادکامی بھی ہے اور حسرت بھی۔ ابتدا میں ایک سرخ پوش البیلی لڑکی شاداں و فرحاں ٹوکری لٹکائے چائے کی پتیاں چنتی دکھائی دیتی ہے پھر اس کی چار سہیلیاں آ جاتی ہیں۔ اتنے میں چار نوجوان لڑکوں کی ایک ٹولی (یہ بھی پتیاں چننے والے ہیں) آ نکلتی ہے اور یہ لڑکی ازراہِ شرارت اپنی سہیلیوں کے ہمراہ چھپ جاتی ہے۔ کافی دیر کی آنکھ مچولی کے بعد سب مل جل کر ناچتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ چاروں لڑکے چاروں لڑکیوں کے ساتھ جوڑے بنا لیتے ہیں اور یہ بچاری تنہا رہ جاتی ہے۔ کبھی یہ اس نوجوان کو، کبھی

اُس کو ساتھ لانے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے جھٹک دیتے ہیں اور وہ جھنجھلا کر رہ جاتی ہے۔ وہ سب اسے چڑاتے ہیں اور غصّے میں تنہا اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ خیر تھوڑی دیر بعد وہ سہیلیاں اور نوجوان دوبارہ آجاتے ہیں اور اس لڑکی کو جھرمٹ میں لے کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ساتھ مل جاتی ہے اور دل کا غبار دھل جاتا ہے۔

لوک ناچوں میں ان فنکاروں نے منگولیا کا "رکابی ناچ" پیش کیا جس میں مہمان اور میزبان ضیافت کے موقع پر خالی طشت اور طشتریاں لے کر ناچتے ہیں۔ ان کے ملبوسات اور موسیقی میں وسطِ ایشیائی رنگ ہے۔ چینی فنکاروں نے گانے اور سازینے بھی پیش کئے۔ ایک مغنی نے دو تارے پر چڑیوں کی آواز اس طرح نکالی کہ لوگ مبہوت رہ گئے کیونکہ تار دار سازوں پر ایسی آواز نکلنا محال ہے۔ پروگرام کے آخر میں اژدہا ناچ پیش کیا جاتا ہے جو طلسم کا ایک کارخانہ ہے اور عقل کو انگشت بدنداں چھوڑ جاتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور اوپر نیلا آسمان نظر آتا ہے۔ ایک بڑا اژدہا ایک بڑے گول یاقوت کو نگلنے کے لئے سمندر سے جست لگاتا ہے۔ اب وہ یاقوت آگے آگے ہے اور اژدہا پیچھے پیچھے۔ اژدہا بل کھاتا ہے، دوڑتا ہے، تیس فٹ اونچی زقند لگاتا ہے، نیچے آتا ہے لیکن یاقوت گرفت میں نہیں آتا۔ لوگ دم سادھے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو اسے محض فلم سمجھے کیونکہ انسانی ہاتھوں سے ایسا نیرنگ پیدا ہونا مشکل ہے لیکن روشنی ہوتی ہے تو پلاسٹک یا کپڑے کا بنا ہوا اژدہا نظر آجاتا ہے۔ دو نوں پُراسرار ستون بھی جو اس کھیل کے بیچ میں ابھرتے ہیں اور وہ فنکار بھی جو کالے کپڑے پہنے ہاتھوں سے اژدہے کو جھلاتے ہیں!

★

چینی آرٹسٹوں کے پروگرام میں تفریح کا ایک نادر پہلو اور ہے۔ چینی آرٹسٹ ایک پاکستانی گانا گاتے ہیں۔ "آئی ہے بہار۔ کر کے سولہ سنگار" یہ گیت انہوں نے جناب شاہد احمد دہلوی سے دو دن میں سیکھا لیکن لہجے اور تلفظ سے اجنبیت قطعاً ظاہر نہیں ہوتی۔ اس سے بڑا کمال پنجاب کا "لڈی" ناچ ہے۔ یہ ان فنکاروں نے گھنشیام سے چند دن میں سیکھا لیکن اسٹیج پر جب ہم چینی نوجوانوں کو کُرتا و تہمد زیب تن کئے اور چینی لڑکیوں کو چولیاں اور چوڑیاں اور لہنگے پہنے پنجابی مٹیاریں بنے دیکھتے ہیں اور پھر جب رقص کا شباب ہوتا ہے اور نوجوان موڑیں یا ڈھنگ دار "آیا" کا نعرہ لگاتے ہیں تو مجمع تالیوں پر اکتفا نہ کر کے خوشی سے چیخ چیخ اٹھتا ہے اور مکرر مکرر کی آوازوں کے جواب میں انہیں دوبارہ ناچ پیش کرنا پڑتا ہے۔ افقار کا مصرع ہے:

"تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا"

لیکن اسے ہونا یوں چاہیئے کہ:

"اہلِ چین نے پنجابیوں کو لوٹ لیا"

یاد رہے کہ پنجابیوں سے مطلب ایک خاص علاقے کے لوگ نہیں۔ سارے پاکستانی اس ناچ سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔

چینی وفد کے لیڈر ایک چینی مسلمان یوسف ما یو تہوا ہے ہیں جن کا یہ کمال پاکستانیوں کے دلوں پر دائمی نقش چھوڑ جائے گا۔ اے کاش ہمارے پاکستان کے دیہاتی اور عوامی فنکاروں کو دوسرے ملکوں میں جانے کا اسی طرح موقع ملے۔ ہمیں یقین ہے وہ بھی لوگوں کے دلوں کو اسی طرح جیت کر آئیں گے۔ اب بھی ہمارے پاکستانی فنکاروں نے جو چند سازینے اور گانے پیش کئے ہیں چینی فنکار ان سے بہت متاثر ہوئے۔

دودِ چراغِ محفل

جمیل نقوی

یہ نیا چاند یہ ہنستے ہوئے تارے یہ شفق
آسمانوں کی گھنی وسعتیں گمبھیر فضا
مجھے ماضی کی طرف کھینچ کے لے جاتے ہیں
چند بہکے ہوئے لمحات کی تجسیم جمیل
کچھ جواں چہرے تصور میں ابھر آتے ہیں
چاند کے خواب کی تعبیر منور چہرے
برق ساییدہ کی تحریر لئے آنکھوں میں
نوکِ مژگاں پہ لرزتی ہوئی اک شے جیسے
چاند کی پینڈ پہ کرنوں کا لرزتا ہوا عکس
صندلی بانہوں میں پیوست حریری ملبوس
صبحِ کاذب کی ملاحت کا دل آویز فروغ
مرمریں جسموں کے مربوط نظر تاب خطوط
دامنِ صبح پہ فطرت کی نبت کاری
کسمساتے ہوئے جذبات کی بڑھتی ہوئی لے
چاندنی رات میں ذروں کے دلوں کی دھڑکن
شیشۂ ناب سے رِستی ہوئی رنگیں کرنیں
ادھ کھلے پھولوں کی شرمیلی معطر خوشبو
رقص کے لوچ میں گھلتی ہوئی گھنگرو کی چھنک
سرِ مخمل پہ چٹکتی ہوئی کچی کلیاں
نغمۂ روح بکھرتا ہوا ہر سانس کے ساتھ
ساتگینوں کے کھنکنے کی البیلی جھنکار
مضمحل حسن کے چہرہ پہ پسینے کی دمک
رنگ میں ڈوبے ہوئے پیکر کا گھنیرا سایہ
میرے تخیل کے تاریک شبستاں کے پردوں پہ
کچھ ہیولے سے ابھرتے ہیں پگھل جاتے ہیں

مونس

مقبول احمد سعید

پھر وہی سوچ کا صحرا، وہی آشفتہ سری
وہی ماضی کے تصور، وہی یادوں کے غزال

- یہ نہ ہو، حال سلگتا ہوا لمحہ بن جائے
ایک آنسو سرِ مژگاں پہ جو آ بھی نہ سکے
جو رگِ جاں پہ چلے نشترِ غم بن کے کبھی،
اور کبھی صرصرِ غم بن کے اٹھے، لہرائے!

تم سے آباد ہے آوارہ غزالو! مری سوچ
تم کہ دستِ گلِ تر بن کے بسے ہو دل میں!
مری رگ رگ میں رچی ہے تری خوشبو، تری باس
تم کہ ہو برگِ سمن - سادہ و شفاف و لطیف
جگمگاتی ہے مری سوچ کی شبنم جس پر
تم نہ ہو حال سلگتا ہوا لمحہ بن جائے!

یہ چاندنی یہ سفر

انور علی انور

یہ چاندنی، یہ سفر، یہ تری رفاقتِ ناز
یہ کوہسار، یہ وادی، یہ رہگذارِ جمیل
تری نگاہ میں دوشیزہ مستیوں کی امنگ
ہر ایک سمت عیاں تیرے حسن کا عالم
ہر ایک چیز پہ تیرا جمال عکس انداز
یہ ایک منظرِ سیماب گوں نرالا سا
جبینِ وقت پہ ہلکی سی مسکراہٹ ہے
میں انبساط سراپا تو التفات تمام
یہ تیرے حسنِ تبسم کی ہے مسیحائی

یہ سحر فام اجالا، یہ حسنِ سیم طراز
یہ اک ہجوم تمنا، یہ شوق کی تکمیل
تری نگاہ مری آرزو سے ہم آہنگ
ہر ایک سمت عروسِ نشاط کا موسم
ہر ایک چیز ترے سامنے غریقِ نیاز
یہ ہنستا بولتا گاتا ہوا اجالا سا
ترے خرامِ حسیں کی فضا میں آہٹ ہے
یہ دیکھ دیکھ کے رقصاں ہے کائنات تمام
ہر ایک چیز ترنم بلب نظر آئی

(۲)

مگر یہ کیا مرے دل میں ابھی خیال آیا
یہ سچ ہے آج ترا قرب ہے نصیب مجھے
میں سوچتا ہوں بلندی مجھے نصیب تو ہے
یہ لمحہ بھی مگر اے دوست جاوداں تو نہیں
رہِ سفر کی ملاقات پائدار نہیں
رہِ سفر میں مسافر بچھڑ ہی جاتے ہیں
یہ سوچ راہ سفر میں مجھے ڈراتی ہے

فضائے زیست پہ ظلمت نے جال پھیلایا
غمِ مآلِ سفر ہے مرے حبیب مجھے
تو آج چاندنی بنکر مرے قریب تو ہے
مری حیات بجز گردشِ رواں تو نہیں
رواں دواں ہیں یہ لمحات پائدار نہیں
یہ ہنستے بولتے رستے اجڑ بھی جاتے ہیں
ابھر ابھر کے مری سانس ڈوب جاتی ہے

★

آدم

وزیر آغا

کیا ہوئی تیری وہ تسخیرِ دو عالم کی لگن؟
کیا ہوئی ذوقِ تجسس کی وہ عالم گیری؟

تو نے تاریک سے اک کنجِ خیاباں میں کہیں
اپنے نغمے کو کیا ساز کے تاروں میں اسیر
اپنے ہاتھوں سے کیا اپنے قفس کو تعمیر
خود کو پہنائی بصد شوق طلائی زنجیر

یہ محبت کی المناک کہانی سازی
زرد گالوں پہ یہ جلتے ہوئے اشکوں کے دیے
تیری بیماریٔ دل، تیری یہ آشفتہ سری
تو نے خود آپ کیا اپنی لگن کو پابند
تو نے خود آپ یہ جیتی ہوئی بازی ہاری!

بازار—زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز

قلعہ لال باغ—عہد کہن کی ایک پرشکوہ یادگار

بڑے کٹڑے کا دروازہ جسے شہزادہ شجاع نے
بارھویں صدی عیسوی میں بنوایا

احسن منزل—دریا کے کنارے نوابین ڈھاکہ کے قدیمی محل کا نظارہ

''جوئے نغمہ خواں''
سابق صوبہ سرحد

(قلعہ بالا حصار: پشاور)

رپورتاژ:

سرحد کا مغنّی دریا

عارف حجازی
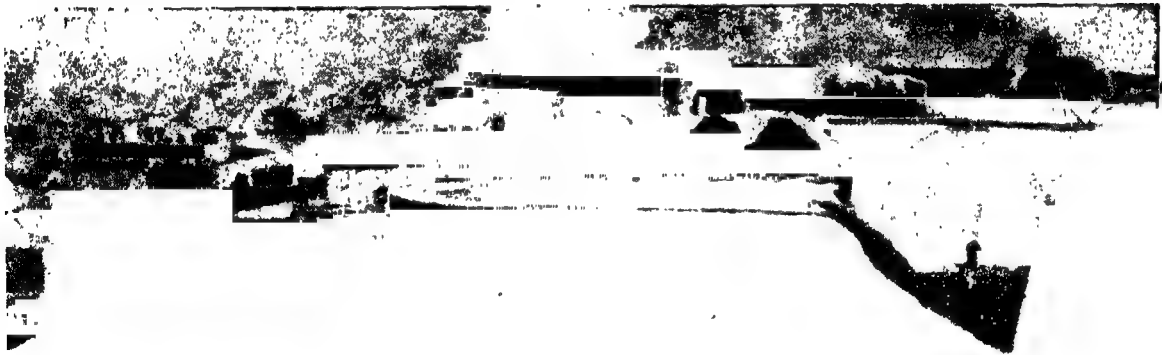
اصفہان دنیا کے قصے تو بہت سنے تھے مگر جب دریائے کابل کی پرشور لہروں کو سنا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جادو نوا مغنّی زندگی کے نہایت موثر گیت گا رہا ہے۔

بیٹھے بیٹھے میں نے خان زماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ دیکھا تو بخار تیز ہو گیا تھا اور نسوار کی دو تین چٹکیاں چڑھانے کے باوجود اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہ آئی۔ آنکھیں شرابی کی طرح چڑھی ہوئی تھیں اور وہ بار بار اونگھنے لگتا۔ چنانچہ میں نے اسے ڈیرے پہ پہنچا دیا اور پھر دریا کے کنارے آ بیٹھا۔

دریائے کابل بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا اور اس کی متلاطم لہریں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ پرندے خوشی کے مارے بچوں کی طرح شور مچا رہے تھے اور جنگلی گلاب کی جھاڑیوں پر بلبلوں نے اپنے سریلے نغمے چھیڑ دئے تھے۔ اس خاموش اور رومانی سہ پہر کے لمحات نے جیسے میرے دل پر ایک جادو سا کر دیا تھا میں سوچنے لگا "یہ دریا نہیں زندگی کا سیل رواں ہے۔ لوگوں نے یہاں کی بہادری کے قصے تو سنے ہوں گے مگر یہاں کے شیریں نغمے اور رومانی گیت شاید ہی سنے ہوں گے"۔

یہ سنکر لہریں بڑے والہانہ انداز سے کسی پٹھان محبوبہ کی طرح مسکرانے لگیں۔ اور میری نگاہوں میں اس فرضی محبوبہ کے نازک خدوخال اجاگر ہو گئے۔ اتنے میں قریب کی پگڈنڈی سے ایک نوجوان کی سریلی آواز آئی:

"آجکل پھر تیرے حسین چہرے سے سرخی جھلکنے لگی ہے۔ جیسے برف میں خون کے قطرے مل گئے ہوں"۔

یہ سنکر مجھے نجانے کیوں اس محبوبہ پر غصہ آ گیا جسے ایک بڑی رقم کے عوض اس کے باپ نے ایک معمر ملک کے گلے باندھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور وہ جس میں اتنی بھی جرأت نہ تھی کہ وہ اس بے جوڑ شادی کے خلاف آواز بلند کرے۔ وہ عالم تنہائی میں افسردہ آواز سے گنگناتی رہی:

"میرے محبوب غیرت کر۔ میرا ظالم باپ مجھے اژدھے کے سپرد کر رہا ہے"۔

مگر وہ غریب محبوب خود حیران ہے کہ کیا کرے۔ وہ اپنے نصیب سے جنگ کیا کرتا جب کہ اس کے پاس نہ کھیت تھے نہ کھلیان۔ جب سے اس نے آنکھ کھولی [illegible] کی بھیڑیں چرانا نصیب ہوا تھا۔ فصلوں کی کٹائی کا زمانہ آتا تو کھیتوں میں صبح سے شام ہو جاتی۔ گرمیوں کی تپتی دھوپ [illegible] جلا دینے والی گرم گرم لُو اس کے جسم کو جلا دیتی مگر وہ اُف تک نہ کرتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو جھوٹی تسلی بھی دے سکتا نہیں [illegible] اس غریب کے پاس ایک ہی جواب رہ گیا تھا:

"اے دلدار کی لڑائی میں تو لڑتا، نصیب کی لڑائی ہے، حیران کھڑا دیکھ رہا ہوں"۔

لہریں مسکراتی ہوئی قریب سے گزر گئیں۔ مجھے ان شریر لہروں پر رشک آنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ وہ زندگی کے غم اور مسرت میں ہمیشہ یکساں انداز سے مسکراتی رہتی ہیں۔ چاہے قحط کا زمانہ ہو یا لڑائی کا۔ بہار کا موسم ہو یا خزاں کا۔ انہیں چٹانوں کا مقابلہ بھی کرنا آتا ہے۔ ان کی زندگی سراب نہیں حقیقت ہے۔

میں نے شمال مغرب کی جانب نظر اٹھا کے دیکھا تو ہندوکش کے لق و دق فلک بوس حصار تا حد نگاہ پھیلے ہوئے تھے اور دور سے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ پہاڑ نہیں بلکہ مجبور دوشیزاؤں کے پاکیزہ جذبات کے اہرام کھڑے ہیں جن میں ان کے پیار سے

پیارے محبوبوں کی یادیں دلوں میں۔ میرے ذہن کے گنبد میں بیشا گیت گونجنے لگے:

"اگر میرے بازو چڑیا کے ہوتے، تو تیرے حجرے کا طواف کرتی"

"تیرے حجرے کی دہلیز تیری ہو جائے، تو نے میرے دل کا کعبہ ٹیڑھا کر دیا"

ہیریں بولیں "یہ حجرہ پٹھانوں کی مجلسی زندگی کا عکس ہے سارے اہم کام اسی میں انجام پاتے ہیں۔ شادی، غمی، رقص و سرود، رومان بڑے بڑے جھگڑوں کے فیصلے، یہ حجرے کی زینت قالین اور حریری پردے نہیں بلکہ چلم ہے دیکھنے میں بڑی معمولی لیکن اس کے بغیر زندگی کی ترنگ باقی نہیں رہتی۔ اس کا سرور محفل پر جادو کر دیتا ہے ۔۔۔ وہ ایک ازادیا قربان ۔۔۔ کی لمبی تانیں اور رہی رنگ جما دیتی ہیں، ایک طرف اہلِ محفل کی مرحبا کا شور اور دوسری طرف سرنا گھڑے پر گھنگرو بندھے ہاتھوں کی تھاپ اور ان کے صوتی اثرات اہلِ محفل کے دل کو بے قابو کر دیتے ہیں۔ پھر چھم چھم کرتی ہوئی مہ جبیں اپنا درد بھرا گیت چھیڑ دیتی ہے:

"اے چلم خدا کی قسم میں تجھے توڑ دوں گی، محبوب میرا ہے اور دل تجھ سے بہلاتا ہے۔ اے چلم تو مجھ سے بہتر ہے ۔۔۔ میرا محبوب دونوں ہاتھوں اور لبوں سے تجھے چومتا ہے"

"چھم چھم چھم" کرتی ہوئی مہ جبیں جیسے ابھی تک میرے ذہن کے حجرے میں ناچ رہی تھی۔ ہیریں بڑے رازدارانہ انداز سے کہنے لگیں:

"دیکھا آپ نے محبوبہ کا دیوانہ پن؟" ۔۔۔ "وہ کیا؟"

وہ قہقہہ لگا کے بولیں "جیسے آپ نے کچھ سنا ہی نہیں۔ چلم توڑنے پر تلی ہے اس نیک بخت سے کوئی پوچھے اس بے زبان نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ یہی تو حجرے کی بہار ہے۔"

کاش محبوبہ بھی اپنے گلابی ہونٹوں سے اس چلم کا بوسہ لیا کرے! تب تو وہ محبوب کے لبوں کی شیرینی اور لطیف جذبات کی سادگی کیکپی اپنے دل میں محسوس کر سکتی ہے اور وہ لذت حاصل کر سکتی ہے جس کے انتظار میں چلم کی حاسد بن گئی ہے!

ہیریں زور زور سے تالیاں بجا کے رقص کرنے لگیں ان کے شور و غل میں مجھے یوں سنائی دیا جیسے وہ محبوبہ مجھے بہت برا بھلا کہہ رہی ہے لیکن میں اس کی پوری بات نہ سن سکا صرف اتنا سنائی دیا کہ "میں چناب کے پانیوں پر کچے گھڑے کے سہارے تیرنے والی بیوقوف سوہنی نہیں۔ بزدلی سے بہتر ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ جھیل لئے جائیں"

ہیروں پر ایک سناٹا چھا گیا اور جیسے جیسے سورج مغرب کی بھول بھلیوں کی جانب بڑھ رہا تھا ان کی خاموشی زیادہ سنگین ہوتی چلی جا رہی تھی۔ پھر جب تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا تو شام کا غبار پھیل گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ نیم وا پلکوں سے مشرق کی جانب دیکھا تو چاند کی منور کرنیں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھیں۔ جیسے سیاہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے نور کا دریا پھوٹ رہا ہے۔ میں کتار[illegible] کی ایک اونچی چٹان پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں چودھویں کا چاند سیاہ پہاڑوں کی اوٹ [illegible] جیسے "چلالہ ۔ ۔"[1] پر پانی بھرنے والی محبوبہ اپنے چہرے سے آنچل ہٹا دیتی ہے اور اس کا ہنس مکھ حسین چہرہ دلکشیوں کا پر[illegible] ہے +

جالانکے چشمے کا خیال آتے ہی جیسے کہ وہ میری نگاہوں کے سامنے کوئی محبوبہ کھڑی [illegible] اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ دشوار گزار چڑھائی چڑھتے چڑھتے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سنگ ریزوں اور نکیلے پتھروں نے اس کے نازک و مرمریں پاؤں زخمی کر دیئے تھے۔ اس کے باوجود وہ درد و کرب کی شدت کو جیسے بھول گئی تھی۔ ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور شریر ہوا نے اس کے آنچل کو بھی ہٹا دیا تھا۔ رخسار پر تھے سے مصنوعی سبز خال[2] نے اس کے حسن کو اور زیادہ جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ اور قریب ہی اس کا محبوب ننھے ننھے پانی

---

[1] گوہد پشتو میں پنگھٹ کو کہتے ہیں۔ جلالہ کا پنگھٹ، وہاں سے تقریباً دو ڈھائی میل شمال میں واقع ہے اور سارے سرحدی علاقہ میں مشہور ہے۔ [2] پٹھان لڑکیاں اور عورتیں مصنوعی سبز خال بہت پسند کرتی ہیں۔

میں کھڑا تصویرِ حیرت بنا اس کے حسن کی دل آویزیوں میں ایسا کھو گیا تھا جیسے کوئی ستارہ شناس سائنسداں چاند کی رومانی اور تخیلی دنیا کے حسین خواب دیکھنے میں مصروف ہے۔ ہوا کی تیز لہر کے ساتھ جیسے دریا کے منجدھار سے ایک دردناک نغمہ بلند ہوا:

"جالا کا پنگھٹ ویران ہو جائے، اسے مجنوں کو دمہ کا عارضہ ہو گیا ہے!"

اس پر لہروں نے گنگناتے ہوئے کہا: "لیجئے اور سنئے! میاں سڑی کیا فرماتے ہیں۔ اگر جالا کا پنگھٹ ویران ہو گیا تو پھر ایسے دردبھرے نغمے کہاں جنم لیں گے اور صدیوں پرانے جالا کے پنگھٹ کی تاریخی عظمت کیسے باقی رہے گی۔ مگر میاں مجنوں بھی اس چلم توڑنے والی نادان محبوبہ سے کم نہیں۔ جذبات کی رو میں ایسے بہہ نکلے کہ گئے افلاطونی محبت جتانے اور جناب کو یہ یاد نہ رہا کہ پنگھٹ کی ہر جڑی بوٹی شفا کا حکم رکھتی ہے۔ کیونکہ اس نے محبوبوں کے آنچلوں کو چھوا ہے!"

لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی خاموش ہو گئیں لیکن میں نے انہیں بڑے اعتماد سے جواب دیا: "تمہارا خیال اپنی جگہ درست ہو سکتا ہے مگر یہ افلاطونی محبت نہیں بلکہ دل پر جو واردات گذرتی ہے وہ گیت بن کر سارے عوام پر چھا جاتی ہے سچ پوچھو تو یہی سچی شاعری ہے۔"

اس پر لہروں نے کچھ نہ کہا۔ اور میں نے اپنا چہرہ دریا کے پہاڑ کی جانب پھیر لیا۔ چاندنی رات میں دریائے کابل کا تیز رفتار دھارا پگھلے ہوئے سونے کی مانند بہہ رہا تھا۔ اس صدیوں پرانے تجربہ کار منچلے دریا کی زندہ دلی کا ثبوت تو پُرجوش لہریں تھیں جو ہر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شور مچاتی ہوئی رقص کرنے لگتیں اور کبھی کوئی جادو بھرا نغمہ چھیڑ دیتیں۔ میں چند منٹ ساکت بیٹھا چاند کو اس طرح گھورتا رہا جیسے کوئی شیر خوار بچہ ماں کی گود میں بیٹھا اس عجیب و غریب قدرت کی لالٹین کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ پھر میں نے آسمان سے نگاہیں پھیر لیں اور وادی کے چھوٹے سے گاؤں کے گھروں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی جانب دیکھا چراغ کی روشنی چنگاری کی مانند دکھائی دی میرا دھیان کسی عورت کی نہایت پُرکشش آواز کی طرف بٹ گیا۔ آواز برابر میرے کانوں کے دریچوں سے ٹکرا رہی تھی:

"سو جا میرے پیارے سو جا۔ تو خالد کا پوتا ہے۔ تو غزنوی کی نسل سے ہے پھر تیرا جی کیوں جلتا ہے۔ سو جا میرے پیارے سو جا۔
تو شہسوار ہے۔ دشمن سے منہ نہ موڑ۔ دشمن کو ملک سے نکال دے۔"

میں نے بڑے خلوص و احترام سے کہا:

آزاد قوم کے آزاد دریا تجھ پر میرا دل قربان ہو تو پاکستانی سرحدوں سے بہت دور درۂ اناٹی (افغانستان) سے اپنے ہی بل بوتے پر چل پڑتا ہے پھر تیرے ساتھ اور بہت سی ندیاں نالے آملتے ہیں، تو تیرے حوصلے اور بڑھ جاتے ہیں اور تو بڑی تیزی سے پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں اپنی راہیں تلاش کرتا ہوا تیز چال سے یوں آگے بڑھتا ہے جیسے تو زمین کو تمام آلودگیوں سے پاک کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ تجھے یہاں کے لاکھوں آدمیوں ہی کا نہیں سارے پاکستان کے لوگوں کا خلوص حاصل ہے تو اس علاقے کی بنجر زمینوں، سنگلاخ چٹانوں اور میدانوں کو سیراب کرتا ہے۔ تجھے یہاں کی قدیم تاریخ بھی خوب یاد ہے تو نے دریائے خیبر سے گزرتے وقت نجانے کتنے قافلوں کی پیاس بجھائی ہے۔ میں تیری بندگی [illegible] عظمت کی تعظیم کرتا ہوں جیسے یہاں کے لاکھوں پٹھان۔ میرے منچلے دریا! میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گا۔ تو سدا اسی طرح بہتا رہے اور دیس کے لوگوں کی خوشحالی کے نغمے سناتا رہے!"

نشید حریت

۲۰۰ سال کی حریت پسند اردو شاعری کا انتخاب

۱۷۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک

ہماری ادبی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم جز ہے ملک کے ذہن و کردار کی پرداخت پچھلے دو سال میں کس کس طرح ہوتی رہی اور کن کن اہل کمال کی جگر کاوی ہمارے قومی شعور کی تہذیب و تربیت میں شامل رہی، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اردو کی حریت پسند شاعری کے پچھلے دو سو برس کے سرمائے پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ادارہ نے اس ضخیم مجموعے میں دو سو برس کی ملی شاعری کا انتخاب پیش کیا ہے جس میں اردو کے بیشتر بلند پایہ شعرا کا کلام یکجا ہو گیا ہے۔
اس طرح یہ نہ صرف حوادث ملی کی ایک منظوم داستان ہے۔ بلکہ ایک نادر ادبی انتخاب بھی جس کی قدر و قیمت محتاج بیان نہیں۔

ترتیب و مقدمہ۔ شان الحق حقی

اس دو سال کی شاعری کو چند ابواب میں سمویا گیا ہے مثلاً!

• ۱۸۵۷ء سے پہلے • انقلاب ۱۸۵۷ء کا دور • پیغام بیداری • جدید عہد • صبح نو •

مجلد۔ سرورق خوبصورت رنگین اور دیدہ زیب پوری کتاب نہایت نفیس اردو ٹائپ میں طبع کی گئی ہے۔

۵۰۳ صفحات۔ قیمت چار روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

مسلم بنگالی ادب

(بنگلا سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیا، اہل قلم، شعرا اور ادبا نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔
سرورق دیدہ زیب اور رنگین۔ ضخامت ۔۔ ۴۰۰ صفحات
قیمت علاوہ محصول ڈاک چار روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی
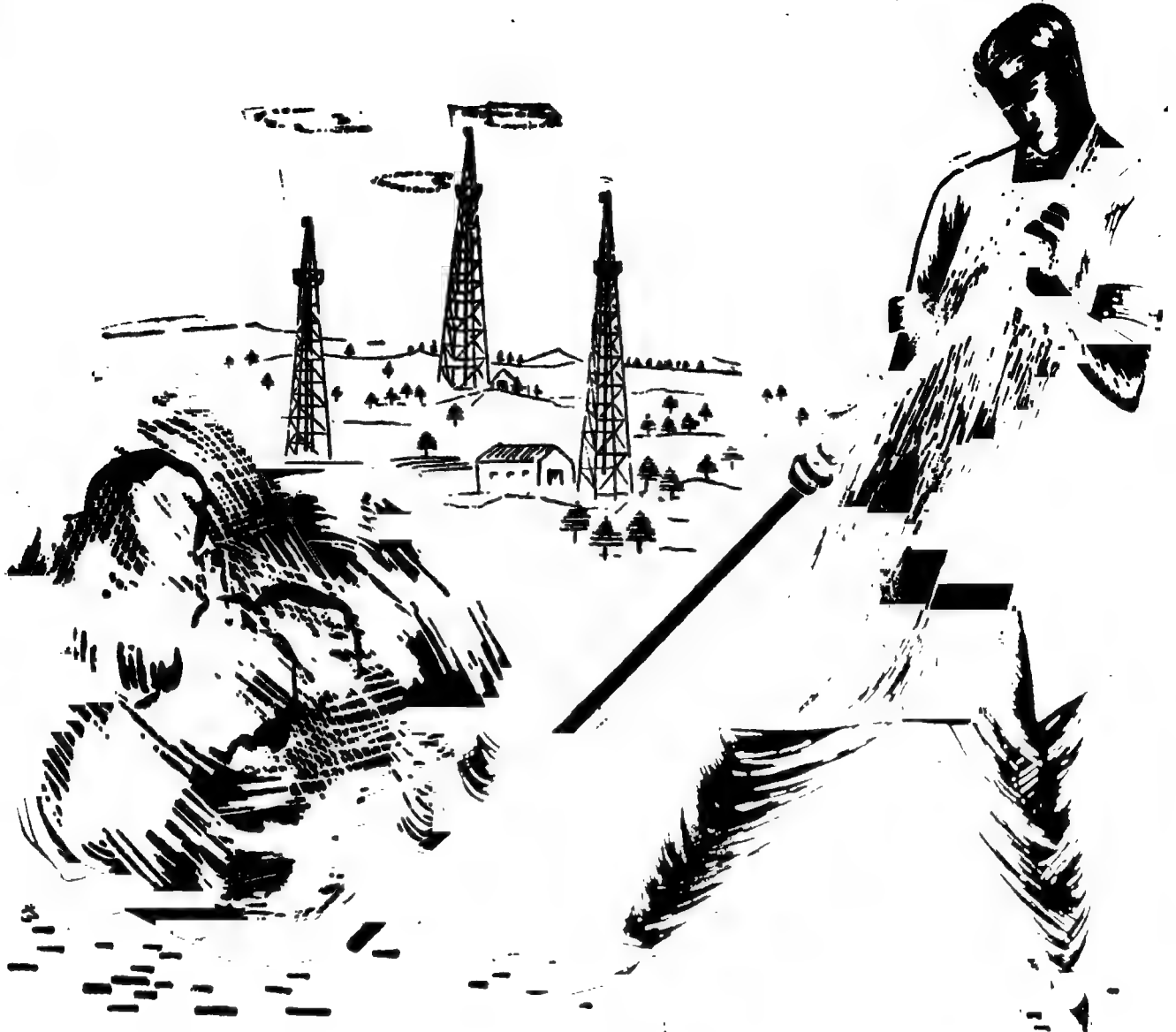
پاکستان شاھراہ ترقی پر

ھمارے نئے با تصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اھم صنعتوں پر ''ادارۂ مطبوعات پاکستان،، نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ھی میں شروع کیا ھے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ھوا ھے ۔ یہ کتابیں ھر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماھروں سے مرتب کرائی گئی ھیں اور ان کی خصوصیت یہ ھے کہ ان میں ملک کی ان اھم صنعتوں پر مختصر مگر مکمل معلومات، اعدادو شمار اور اھم حقائق ، عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش نئے گئے ھیں۔

ھر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ھوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے ۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ھر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذھن نشیں ھو جاتی ھے ۔

ھر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعدادو شمار پیش کئے گئے ھیں جن سے ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ھر شخص کی نظر کے سامنے آجاتا ھے ۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ھر کتابچہ کی قیمت صرف ۴ آنہ رکھی گئی ھے۔ یہ کتابچے ابتک شائع ھو چکے ھیں :

- پٹ سن کی صنعت
- سیمنٹ کی صنعت
- چائے کی کاشت اور صنعت
- کپڑے کی صنعت
- بن بجلی کی صنعت
- ماھی گیری
- اشیائے صرف
- ذرائع آبپاشی کی توسیع
- کاغذ کی صنعت
- غذائی مصنوعات

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

فکاہیہ،

افسانہ نگار

اشرف صبوحی

(شادی سے پہلے)

خلیل :- بیگم! مسعود کہاں ہے۔ ابھی تک اوپر سونے نہیں آیا؟
بیگم :- نیچے کمرے میں بیٹھا ہے۔
خلیل :- ایسی گرمی میں؟
بیگم :- نجانے یہ شاعری کہاں سے اس کے پیچھے پڑی ہے۔ سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔
خلیل :- لاحول ولاقوۃ! یہ خبط اچھا نہیں۔ کہیں دیوانہ نہ ہو جائے۔
بیگم :- سلمیٰ، اپنے بھائی جان سے کہنا ابا میاں خفا ہو رہے ہیں۔ صبح کو لکھ لینا۔
سلمیٰ :- (نیچے پہنچ کر ڈرتے ڈرتے) بھائی جان، اے بھائی جان! بہرے ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ میری طرف دیکھے جاتے ہو۔ بولتے نہیں۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا۔
مسعود :- (چیخ کر) کیا ہے مردار؟ بھتنی بن کر چمٹ گئی۔
سلمیٰ :- (پیچھے ہٹتے ہوئے) واہ! کیسی چیخ ماری ہے۔ نگوڑا کلیجہ بھی دھک دھک کرنے لگا۔
مسعود :- گئی نہیں؟
سلمیٰ :- ابا میاں بلا رہے ہیں۔
مسعود :- نہیں آتا کہہ دے۔
سلمیٰ :- کہہ دوں؟
مسعود :- جاتی ہے یا اٹھوں؟ کمبخت نے میرا سارا مضمون ملیامیٹ کر دیا۔
بیگم :- (بیٹی کو آتا دیکھ کر ہنستے ہوئے) کوئی چانٹا وانٹا تو رسید نہیں کیا؟
خلیل :- تم ہنستی ہو مجھے غصہ آ رہا ہے۔
بیگم :- وہ کیوں؟
خلیل :- تم ہی نے تو شہ دے دے کر بگاڑا ہے۔

بیگم :- تو اب سنوار لو۔ ابھی کچی لکڑی ہے۔
خلیل :- غضب خدا کا، جوان بیٹا پاگل ہو رہا ہے اور مجھ سے کہا بھی نہیں جاتا۔
بیگم :- اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اور یہ کیا کہا دو رہا پیں کے دشمن پاگل ہو رہے آیا۔
خلیل :- پاگلوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ شاعروں اور دیوانوں میں فرق ہی کیا ہے۔
بیگم :- (بیٹے کے پاس جا کر آہستہ سے) میاں! بارہ بجتے ہیں! اٹھو چل کر سو رہو۔
مسعود :- آپ لوگوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ مجھے ابھی نیند نہیں آئی۔
بیگم :- واہی باتیں نہ کرو، صبح کو لکھ لینا۔ گرمی نہیں لگتی۔
مسعود :- آپ کیوں سر ہو گئیں؟ جائیے، آ جاؤں گا۔ تھوڑا سا اور لکھ لوں۔
بیگم :- باوا کی خفگی کا بھی خیال نہیں؟
مسعود :- آپ جاتی ہیں یا میں اپنا سر پھوڑ لوں۔
بیگم :- سچ مچ کہیں دل کا ورق تو نہیں الٹ گیا . . . . سارے سارے دن اور آدھی آدھی رات تک کیلے سر جھکائے بیٹھے رہنے سے یہی ہوتا ہے۔ آج اپنا سر پھوڑو گے تو کل دوسروں کا۔
مسعود :- آپ کی بلا سے۔
بیگم :- ذرا جب تمہارے ہاں اولاد ہو گی تو ایسے جیالوں کا مزہ آئے گا۔
مسعود :- یہ عذاب شادی کرنے والوں کو مبارک ہو۔
بیگم :- اور تم تو بنیوا کا سونٹا ہی بنے رہو گے؟ اگر ان پر بھوت سوار ہو گیا تو آفت آ جائے گی۔
خلیل :- (اوپر سے) کیوں، تم بھی بیٹے کے ساتھ شاعری میں شریک

ہوگئیں!

بیگم :- آرہا ہے۔ دو سطریں پوری کرلے۔

خلیل :- ادھر کیوں نہیں آتا؟ اچھا میں آتا ہوں۔ نیند حرام کردی۔
کیوں؟ دنیا سو رہی ہے اور تو اُلّو کی طرح بیٹھا ہے۔ یہ شاعری ہی تیرا ستیاناس کردے گی۔

مسعود :- میں شاعری تو نہیں کرتا۔

خلیل :- پھر یہ بیٹھے بیٹھے آنکھیں مٹکانی، ہاتھ چلانے، پاگلوں کی طرح آپ ہی آپ بڑبڑانا کیسا؟

مسعود :- نہیں ابا میاں۔ افسانے لکھنے کا شوق ہوگیا ہے۔ یہ کوئی بُرا مشغلہ نہیں۔

خلیل :- مگر نہیں کہلاتے سہی۔ ابھی سے دروغ بافی! اپنے ساتھ ہمیں بھی جہنم میں لے جائے گا؟

مسعود :- ابا میاں! آج کل افسانے لکھنے والے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

خلیل :- قدر اور جھوٹوں کی! وہ بات کر جس سے گھر میں کمائی آئے۔

مسعود :- رسالے والوں سے بات چیت ہو رہی ہے۔ خدا نے چاہا تو دو چار افسانوں کے بعد......

بیگم :- یہ کیا کہا؟ کیا فوج میں جائے گا؟

خلیل :- دو چار افسانوں کے بعد آپ کو تھیلیاں ملنے لگیں گی! اس سے پہلے آپ جو پاگل خانے پہنچ گئے؟

مسعود :- آخر افسانہ نویسی میں نقصان کیا ہے؟

خلیل :- نقصان؟ ایک شریف کا بچہ اخباروں میں نام نکلائے جھوٹ موٹ کے قصے گھڑے اور ان کی اجرت بھی لے؟

مسعود :- آپ تو خواہ مخواہ اُلجھتے ہیں۔ اس زمانے میں ان ہی چیزوں کی قدر ہے۔

بیگم :- ارے، باپ سے دو بدو! بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ صبح کو ایک ایک پرزہ چولھے میں نہ رکھ دیا ہو۔

خلیل :- تم کیا آگ لگاؤ گی۔ میں ابھی دیا سلائی دکھاتا ہوں۔ لو برخوردار، تمہارے افسانے رسالوں میں چھپ رہے ہیں۔ کہو کتنے روپے ملے؟ اگلے سال تمہاری شادی ہونے والی ہے، چڑھاوے کا زیور تو ضرور بن جائے گا۔

(شادی کے بعد)

دلہن :- (پلنگ پر پڑے پڑے) اے کیا کر رہے ہو؟ ادھر تو آؤ... سنتے نہیں۔

مسعود :- کام کر رہا ہوں۔ اس وقت نہ بولو۔

دلہن :- چاہے کسی کا دم نکل جائے تمہاری بلا سے..... ہائے میں مری۔

مسعود :- (گھبرا کر) اوہ! یہ نیا دق کا آزار لگا۔

دلہن :- تم تو اپنے کسی افسانے کی معشوقہ کے چکر میں پڑے ہو۔ میرا ہاتھ سُن ہوگیا ہے۔

مسعود :- پھر میں کیا کروں؟ ہلاؤ جلاؤ ٹھیک ہو جائے گا۔

دلہن :- خدا ایسے کٹر سے پالا نہ ڈالے۔

مسعود :- مجھے کام بھی کرنے دو گی؟ صبح ہی صبح اچھی چھیڑ خانی نکالی۔

دلہن :- تم کو لکھنے پڑھنے سے فرصت نہ تھی تو شادی کیوں کی؟

مسعود :- خطا کی، اب کھائی سو کھائی، آگے کھاؤں تو رام دہائی۔

دلہن : ایسے بیزار ہو تو نہ ہر کیوں انہیں بیاہ دے دیتے ہو؟ تم نے تو مجھے اپنے افسانے کی کوئی بچی ہوئی ہیروئن بنا لیا ہے۔ خیر تھوڑی دیر اپنا کام کرلو، آج میں اکیلی ناشتہ نہیں کروں گی۔

(مشکل سے ایک پیراگراف لکھا ہوگا کہ نیچے سے ماما آتی ہے)

ماما :- بیگم صاحب پوچھتی ہیں دودھ پیو گے یا ٹکیاں تلی جائیں گی؟

(خاموشی)

ماما :- (زور سے) دلہن بیگم کہاں ہیں؟ میاں تو بولتے ہی نہیں — دلہن بیوی! دلہن بیوی!!..... اوئی یہاں تو سب نے گھنٹی سادھ لی۔ دن چڑھتا چلا آتا ہے۔ گھر کے ستر سے بہتر کام کرنے ہیں۔ بڑے میاں کی دوا لانی ہے......

مسعود :- (جھلا کر) میرے سر پر کیوں چلائے جاتی ہے۔

ماما :- میاں کوئی لونڈی نہیں جو اس طرح دھتکارتے ہو۔ میں نے ہاتھ بیچے ہیں ذات نہیں بیچی۔

مسعود :- ہاتھ ذات کی خالہ۔ جاتی ہے یا کچھ اور سُنے گی؟ کہہ دیا مجھے خبر نہیں۔

ماما :- واہ واہ واہ!

دلہن :- — بڑی بی! انہوں نے تو آج خواب میں بلی لانگی ہے۔

ماما :- اچھا بتاؤ، بیگم صاحب نے ناشتے کو پوچھا ہے؟

دلہن :- اے ہیں بتانے والی کون؟ وہ مختار ہیں جس چیز سے آپ ناشتہ کریں ہمیں بھی بھیج دیں۔

ماما :- آپ ہی بتا دیجئے وہ تو نہیں بتلاتے۔ آپ کہیں تو کچھ پیاں تل لوں۔

بیگم :- سلمیٰ بیٹی، دیکھنا گھی بھی ہے؟ ــــ بڑی بی تم بھی سٹری بہتری ہو گئی ہو۔ خاصی طرح سے بنئے کے نام گھی کی پرچی لکھوا تی لاتیں۔
سلمیٰ! جا کر بھائی سے سیر بھر گھی کی پرچی تو لکھوا لاؤ۔

سلمیٰ :- بھائی جان! گھی نہیں ہے بنئے کو پرچی لکھ دو۔

مسعود :- مجھے فرصت نہیں۔

سلمیٰ :- (پاس آ کر) کیا کہانی لکھ رہے ہو، ہمیں بھی تو سناؤ؟

مسعود :- اب تو جاؤ رات کو سنائیں گے۔

سلمیٰ :- کوئی مزے کی کہانی ہے؟

مسعود :- (ہاتھ سے دھکا دے کر) اب کے بولی تو مار بیٹھوں گا۔

سلمیٰ :- میں بھی بھابی دلہن سے کہہ دوں گی۔

ماما :- (نیچے سے چیخ کر) ننھی بی آؤ نا۔ تم تو جا کر بیٹھ ہی رہیں۔

سلمیٰ :- (چلا کر) آتی ہوں بی آتی ہوں۔ پرچی ہی لکھوا لوں۔

مسعود :- کیسی حلق پھاڑ کر چیخی ہے۔ کانوں میں آواز گھس گئی۔

دلہن :- پھر پرچی کیوں نہیں لکھ دیتے۔ ایک پرزے پر دو حرف لکھ دینا بھی ایسا دشوار ہے۔

مسعود :- (جھٹک پٹک کر) تم لوگوں کو نہ جانے میرے ستانے میں کیا مزہ آتا ہے۔ کہاں چلا جاؤں؟ چار سطریں لکھنی قیامت ہو گئیں۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ لوں۔ (کاغذ کا پرزہ پھاڑ کر) آپ لوگوں نے اپنا منہ کالا کر۔ میرے لئے یہ گھر بھوت خانہ ہو گیا۔

بیگم :- (دالان سے) بوا بی جلدی سے تم گھی تو لاؤ۔ قصائی سے گوشت کو کہتی آنا۔

ماما :- لگے ہاتھوں بڑے صاحب کا نسخہ بھی دے دو۔

بیگم :- خدا تمہارا بھلا کرے، خوب یاد دلایا۔ جانا سلمیٰ بھائی جان کو بلا لانا۔ حکیم صاحب مطب میں آ گئے ہوں گے۔ ان سے جا کر حال کہیں۔

سلمیٰ :- (نیچے سے) بھائی جان! بھائی جان! دیکھئے اماں جان کیا کہتی ہیں۔

مسعود :- (دانت پیس کر) اب کیا آفت آئی۔ آٹا ہو چکا ہوگا۔ (بیوی سے) ذرا آ کر کہہ دو وہ ضروری کام کر رہے ہیں۔ اچھا کوئی جواب تو دے دو، نہیں تو وہ بھنبھیری جیسے جائے گی۔

دلہن :- تم خود کھڑے کھڑے جا کر کیوں پوچھ نہیں آتے؟ نجانے ابا میاں رات کو کیسے رہے۔

مسعود :- جی بھر کر دق کر لو۔ دیکھو کوئی کسر نہ رہے۔

بیگم :- (اوپر آ کر) مسعود! ایسا لہو سفید ہو گیا۔ باپ کا یہ حال اور بیٹا کانوں میں تیل ڈالے بیٹھا ہے۔

مسعود :- بات کیا ہے؟ میں گھر سے نکل جاؤں؟

بیگم :- اسی دن کے لئے تم کو پالا تھا۔ آپ گیلے میں سوئی تمہیں سوکھے میں سلایا۔

مسعود :- میں برا معلوم ہوتا ہوں تو گھر سے نکال دو۔ آخر اس کوسنے پیٹنے کا مقصد کیا ہے۔

بیگم :- ننھے بچے ہو، کچھ جانتے ہی نہیں۔ صبح سے اتنا وقت آیا۔ باپ کو آ کر پوچھا، ان کی دوا ٹھنڈائی کا فکر کیا۔

مسعود :- میں بھی تو خالی نہیں بیٹھا۔ گھر چلانے ہی کی خاطر تو آنکھیں پھوڑ رہا ہوں۔

بیگم :- ہم نے تو ابھی تک اس آنکھیں پھوڑنے کا نتیجہ دیکھا نہیں۔

مسعود :- اماں جان! خدا کے واسطے یہ باتیں چھوڑئے۔ لائیے نسخہ دیجئے۔

بیگم :- حکیم کے پاس جاؤ۔ آج کبوتر کا شوربا دینے کو کہا تھا، اگر وہ بتا دیں تو لیتے آنا۔

مسعود :- (اٹھتے ہوئے) حیرت شملوی نے یہ شعر میرے ہی لئے کہا ہوگا ؎

ایک شب کا نہیں ہے قصۂ غم
اور غم ایک دن کی بات نہیں!

★

صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

یوں تو پاکستان کی ہر جہتی ترقی کا ہر پہلو جاذب نظر ہے لیکن جو ترقی اس نے صنعت کے میدان میں کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک طرف حکومت اور دوسری طرف پبلک نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، صنعتی ترقی کے منصوبے تمام تر ایک ہی مہتم بالشان ادارہ سے بروئے کار آئے ہیں - جس کا نام پی-آئی-ڈی-سی یعنی "صنعتی ترقیاتی کارپوریشن" ہے۔ اس کے قیام کی منظوری ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء کو عمل میں آئی تھی لیکن اس کا پہلا بورڈ ۱۲ جنوری سنہ ۵۲ء میں قائم ہوا۔ اس طرح ادارہ کو قائم ہوئے درحقیقت تقریباً ۵ سال ہی گذرے ہیں -

کارپوریشن کا سرمایہ جس سے وہ کام چلاتی ہے دو طرح سے حاصل ہوتا ہے۔ اول مرکزی حکومت اسے ہر سال ایک رقم مہیا کرتی ہے جس میں واجبی حد تک بیرونی زر مبادلہ بھی شامل ہوتا ہے۔ دوسرے وہ روپیہ جو نجی سرمایہ‌دار اسکے کاموں میں لگاتے ہیں -

کارپوریشن نے پاکستان کی صنعتی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے گذشتہ پانچ سال میں لگ بھگ ۵۴ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کی لاگت سے ۳۲ منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ ان کے علاوہ سترہ اور منصوبوں پر کام جاری ہے جن پر اندازاً ۶۱ کروڑ روپے صرف ہونگے - مسودہ پانچ سالہ منصوبہ کے تحت کارپوریشن کا ایسے صنعتی منصوبے اختیار کرنا قرار پایا ہے جن پر ایک ارب روپے سے زیادہ لاگت کا اندازہ ہے۔ لیکن ان منصوبوں میں موجودہ ۱۷ منصوبے بھی شامل ہیں جن پر کام جاری ہے۔ اس وقت تک جو منصوبے مکمل ہو چکے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے :—

پٹ سن کے کارخانے	(۱۲)
شکر کے کارخانے	(۲)

زیل پاک سیمنٹ فیکٹری حیدرآباد
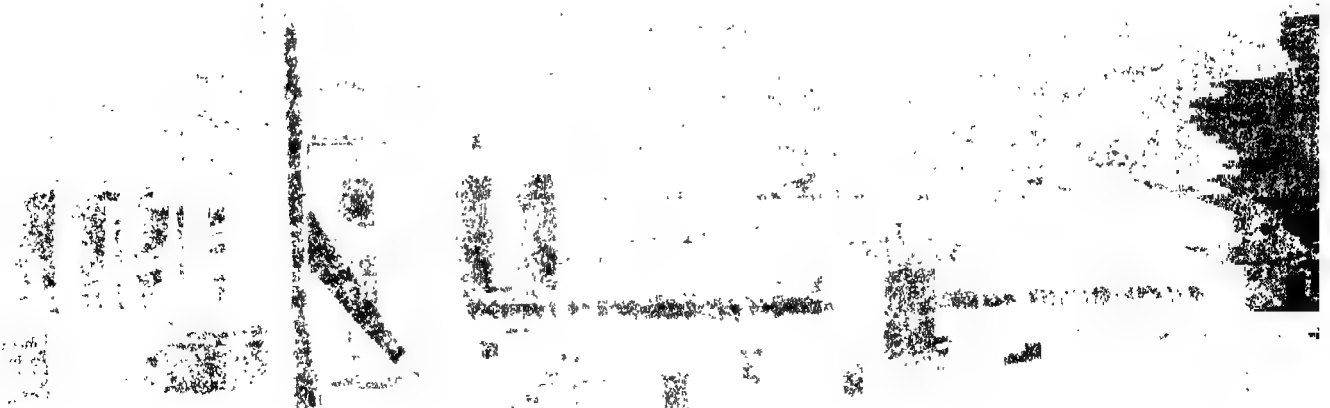
کیمیاوی کھاد کی
فیکٹری داؤد خیل

سوتی کپڑے کا کارخانہ (۱)
ڈی ڈی ٹی کا کارخانہ (۱)
سنٹونن فیکٹری (۱)
کاغذ اور گتے کے کارخانے (۳)
اونی مال کے کارخانے (۳)
روئی اوٹنے کے کارخانے (۵)
گندھک کے تیزاب کا کارخانہ (۱)
سوئی کراچی گیس پائپ لائن۔
زیر تکمیل منصوبے یہ ھیں :

(۱) کراچی اور کھلنا میں جہازوں کی دو بڑی بڑی گودیاں اور نرائن گنج میں ایک خشک گودی ۔ (۲) کھاد کے کارخانے۔ (۳) سوئی ۔ ملتان گیس پائپ لائین ۔ (۴) ملتان میں ایک بڑا گرمایی اسٹیشن جو سوئی گیس سے کام کرے گا۔ (۵) گیس تقسیم کرنے والی کمپنیاں ۔ (۶) ایک پینیسلین کا کارخانہ ۔ (۷) ایک رنگوں اور کیمیاوی اشیاء کا کارخانہ ۔ (۸) تین پٹ سن کے کارخانے ۔ (۹)۔ تین شکر کے کارخانے۔ (۱۰) کھلنا میں اخباری کاغذ کا ایک کارخانہ ۔ (۱۱)۔ کوئلے کی کانوں کے دو کاروباری ادارے۔

کارپوریشن کی سر گرمیوں کا ایک اہم پہلو یہ ھے کہ یہ نجی سرمایہ کو اپنے منصوبوں کی طرف متوجہ کر نے میں کس حد تک کامیاب رہی ھے۔ ابتک کارپوریشن کے مکمل منصوبوں پر اندازاً ۲۷ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ھے جو کارپوریشن کے بعض اور منصوبوں کو لمیٹڈ کمپنیاں بنا نے کی حالت میں اور بھی بڑھ جائے گا۔

یہ کارپوریشن بنیادی طور پر ایک کاروباری نظام ھے اور مفاد عامہ کے پیش نظر حکومت خود اس کی رھنمائی کرتی ھے مگر اس طرح کہ اسکے معاملات دفتری گھس گھس میں نہ پھنسے رھیں ۔ کارپوریشن نے ۴۱ صنعتوں کو جس طرح محکم بنیادوں پر قائم کیا ھے اس کا حال اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ھے:

۱ : پٹ سن: ۱۲ کارخانے چالو ہوئے ہیں جن میں (۶۷۵۰) کرگھے لگے ہوئے ہیں - لاگت ۱۹٫۶ کروڑ روپیہ ہے جن میں ۶ کروڑ کارپوریشن کے ہیں اور باقی نجی صنعت کاروں کے - ایک ہزار کرگھے دوسرے کارخانوں میں ۵۷ء کے آخرتک نصب ہو جائیں گے - باقی (۳۲۵۰) کرگھے جن کی تجویز پہلے پانچ سالہ منصوبے میں پیش کی گئی ہے حکومت کی منظوری اور سرمایہ مہیا کئے جانے پر نصب ہوں گے - موجودہ ذرائع سے پاکستان جو پٹ سن تیار کر رہا ہے اس سے نہ صرف تمام ملکی ضروریات پوری ہو رہی ہیں بلکہ بڑی مقدار میں برآمد بھی ہو رہی ہے - چنانچہ ۱۹۵۵-۵۴ء میں اندازاً ۹ کروڑ روپے کا مال برآمد کیا گیا - سال رواں میں اس کا اندازہ ۱۴ کروڑ روپے کیا جاتا ہے -

۲ : کاغذ سازی : کارپوریشن نے کاغذ اور گتے کے ۳ کارخانے قائم کئے ہیں - ان میں سب سے اہم کارخانہ کرنافلی کا ہے جو سالانہ ۳۰ ہزار ٹن مال تیار کرتا ہے - ایک اور کارخانہ جو (۲۳۰۰۰) ٹن اخباری کاغذ اور (۱۳۰۰۰) ٹن کتابی چھپائی کا کاغذ تیار کرے گا، کھلنا میں زیر تعمیر ہے -

۳ : انجنیرنگ کا بھاری سامان : ملتان میں لوہے اور فولاد کا کارخانہ قائم کرنے کی تجویز مرکزی حکومت کے زیر غور ہے - یہ کارخانہ شروع شروع میں (۷۰) ہزار ٹن فولاد تیار کرے گا - فی الحال کالا باغ کی لوہے کی کانوں میں کانکنی کو ترقی دی جارہی ہے اور چترال میں لوہے کی کانوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے -

۴ : جہاز سازی : کراچی میں جہاز سازی کی گودی کا پہلا مرحلہ مارچ ۵۶ء میں طے ہو گیا تھا، سوائے جہازی مرمت گاہ اور کارخانہ ڈھلائی کے جو امید ہے ۵۷ء کے آخرتک مکمل ہو جائیں گے - توقع ہے کہ کھلنا اور نرائن گنج میں جہاز سازی کی گودیاں ۵۷ء کے دوران میں مکمل ہو جائیں گی -

۵ - بھاری کیمیاوی اشیاء : نوشہرہ میں کیمیاوی اشیاء اور ڈی-ڈی-ٹی کا ایک ایک کارخانہ اور لائل پور میں گندھک کے تیزاب کا کارخانہ کھولا گیا ہے - تیزاب کے کارخانہ میں عنقریب سوپر فاسفیٹ کھاد کا ایک کارخانہ بھی قائم ہوجائیگا - کارپوریشن کے زیر انصرام ''قرم کیمیکل کمپنی'' راولپنڈی میں سنٹونن تیار کر رہی ہے - یہ کمپنی دنیا بھر میں سب سے زیادہ سنٹونن تیار کرتی ہے - ہری پور میں گندہ بروزہ اور تارپین

گندھک کے تیزاب کا کارخانہ، لائل پور

کا کارخانہ بھی بن رہا ہے۔

۶: کھادیں: کیمیاوی کھادیں تیار کرنے کے لئے داؤدخیل میں پاک امریکن فرٹلائزر فیکٹری نے مئی ۱۹۵۷ء سے کام شروع کردیا۔ اس پر ۸ کروڑ روپے لاگت کا اندازہ ہے اور یہ سالانہ ۵۰ ہزار ٹن امونیم سلفیٹ تیار کریگی۔ مشرقی و مغربی پاکستان میں کیمیاوی کھاد کے دوبڑے کارخانے قائم کرنے کے لئے ابتدائی کام ختم ہوچکا ہے۔ یہ کارخانے قدرتی گیس سے کام کریں گے اور دو دو لاکھ ٹن کھاد تیار کریں گے۔

۷: کیمیاوی اشیاء' رنگ اور ادویہ:

کارپوریشن مشہور جرمن کمپنی "بائیرز" کی شرکت میں رنگ اور کیمیاوی اشیاء بنانے کی کلیں داؤد خیل میں لگا رہی ہے جو ۱۹۵۸ء کے اوائل میں مال تیار کرنا شروع کر دیں گی۔

۸: سیمنٹ: کارپوریشن نے داؤد خیل میں ۱ لاکھ ٹن اور حیدرآباد میں ۲ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن پیداوار کا کارخانہ قائم کرکے پاکستان کو بڑی زبردست اقتصادی مدد دی ہے۔ ان کارخانوں کو اور بھی وسیع کرنے کی تجاویز حکومت کے سامنے پیش کی جاچکی ہیں۔ ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ اب پاکستان کچھ سیمنٹ ہندوستان' افغانستان اور خلیج فارس کو بھی برآمد کر رہا ہے۔

۹: شکر: کارپوریشن کے زیر اہتمام جوھرآباد اور چارسدہ (مغربی پاکستان) میں دو، اور ماھی گنج، ٹھاکرگاؤں اور دیوان گنج (مشرقی پاکستان) میں تین کارخانے کام کر رہے ہیں۔ مغربی پاکستان کے کارخانوں نے مال پیدا کرنا شروع بھی کردیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے کارخانے گنے کی اگلی فصل میں کام کرنا شروع کردینگے۔

۱۰: پارچہ بافی: کارپوریشن نے سوتی کپڑے کا کام نجی اداروں پر چھوڑدیا ہے لیکن ۵۰ ہزار تکلوں کا ایک کارخانہ کالی گنج میں خود بھی قائم کردیا ہے۔ یہ کارخانہ مشرقی پاکستان کی پارچہ بافی کی ضروریات کو کافی حد تک پورا کر رہا ہے۔

کارپوریشن نے نجی صنعت کاروں کو روئی اونٹنے کے پانچ کارخانے قائم کرنے میں بھی مدد دی ہے۔ اور اسکی بدولت بنوں' ھرنائی اور قائدآباد میں اندازاً ۱۰۴ کروڑ روپے کی لاگت سے اون کے تین کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں۔

۱۱: قدرتی گیس: کارپوریشن نے پاکستان کے قدرتی گیس کے ذخیروں کو کام میں لانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ برما آئل کمپنی اور کامن ویلتھ ڈویلپمینٹ فنانس کارپوریشن کی شراکت سے کارپوریشن نے سوئی (بلوچستان) سے کراچی تک کم از کم وقت میں ۸۴۳ کروڑ روپے کی لاگت سے ۳۵۰ میل لمبی پائپ لائن بچھائی ہے اور کراچی اور حیدرآباد کے متعدد صنعت کاروں کو فراہم بھی کردی ہے۔ فی الحال روزانہ کھپت تقریباً ۲۶۷ کروڑ مکعب فٹ ہے' لیکن جلد ھی اسکی مقدار بڑھ جانے کی توقع ہے۔ سوئی سے ملتان تک ۲۱۷ میل لمبی لائن بچھانے کا کام شروع ہوگیا ہے۔ ادھر مشرقی پاکستان میں سلھٹ سے ڈھاکہ تک لائن بچھانے کے سلسلہ میں ابتدائی مراحل طے کئے جا چکے ہیں۔

۱۲: طاقت بذریعہ قدرتی گیس:

مرکزی اور مغربی پاکستان کی حکومت کے کہنے پر کارپوریشن نے ملتان میں ۱۰۶۷ کروڑ روپے کی لاگت سے (۱۳۲۰۰۰) کلوواٹ طاقت کا گرمابی اسٹیشن قائم کرنے کا منصوبہ اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ اسٹیشن قدرتی گیس سے چلایا جائیگا۔ اس سلسلہ میں کارپوریشن ملتان سے لائلپور تک لائن بھی بچھائے گی تاکہ اس نئے اسٹیشن سے سابق سرحد و مغربی پنجاب کے علاقوں تک اس طاقت کے کنکشن پہنچا سکے۔

غرض اگر کارپوریشن کی کارگذاریوں پر مجموعی حیثیت سے نظرڈالی جائے تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس نے پاکستان کی صنعتی ترقی اور اقتصادی خوشحالی کے سلسلے میں بہت ھی شاندار خدمات انجام دی ہیں! *

پاکستانی خواتین کی ترقّی

ہماری تحریک آزادی کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس میں خواتین نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔ وہ اس قومی جنگ کے ہر محاذ پر پیش پیش رہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا پوری لگن سے کیا اور کڑی سے کڑی آزمائشوں کا بڑی جرأت و ہمت سے سامنا کرتی رہیں۔ صنف نازک کی یہ جدوجہد ہماری تاریخ کا ایک سنہری باب ہے جس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

خواتین کی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ حصولِ آزادی تو ان کی کوششوں کی بالکل ابتدائی منزل تھی۔ ان کا مدعا تو اس سے کہیں زیادہ وقیع تھا یعنی قومی زندگی کو بام عروج تک پہنچانا۔ اور وہ اس کے لئے برابر کوشاں ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے ذمہ کیا کیا فرائض ہیں یعنی نئی نسل کو صحیح نہج پر پروان چڑھانا، خواتین کو نئی زندگی کے نئے نئے تقاضوں کا اہل بنانا اور مردوں کے ساتھ قومی تعمیر کے کاموں میں شریک ہونا تاکہ ہمارے ملکی اور بین الاقوامی مقاصد بوجہ احسن حاصل ہو سکیں۔ جیسا کہ لازم تھا، حصول آزادی کے بعد ان کا مطمح نظر یہ قرار پایا کہ وہ کس طرح اپنی سرگرمیوں کو نئے سانچوں میں ڈھالیں۔ جس خوش اسلوبی سے انہوں نے یہ کام انجام دیا ہے وہ ان کی فطری صلاحیت اور بیدار مغزی کی بین دلیل ہے۔

صنف نازک کو سماجی فلاح و بہبود کے ساتھ فطری مناسبت ہے۔ گھریلو زندگی ہو یا سماجی، وہ ایسے کاموں کو بڑے سلیقے سے سرانجام دے سکتی ہیں۔ انہوں نے شروع ہی سے نئے تقاضوں کو بھانپ لیا اور اپنی کوششیں ان کے لئے وقف کر دیں۔

پاکستانی خواتین کا مشہور ادارہ "اپوا" اسی کے لئے قائم ہوا اور اس نے گوناگوں معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی اور ثقافتی مقاصد کو اپنایا۔ قدرتی طور پر شروع شروع میں خواتین کی سرگرمیاں مغویہ عورتوں کی بازیابی اور اپنی مصیبت کی ماری، بے سہارا، بے گھر بہنوں کی بحالی کے لئے وقف رہیں۔ یہ در اصل انسانیت کی خدمت تھی اور ہمیں فخر ہے کہ ہماری کتنی ہی خواتین نے گھروں کی چار دیواری اور آسودہ زندگی چھوڑ کر اس شاندار کام کا بیڑا اٹھایا۔

یہ خواتین کی سرگرمیوں کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے صحت اور تعلیم کو فروغ دینے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ چنانچہ اس وقت "اپوا" کے زیر نگرانی کتنے ہی اچھے اچھے ادارے کام کر رہے ہیں جن میں عورتوں کو دستکاری سکھانے، تعلیم دینے اور صحت و صفائی کے کاموں میں تربیت بہم پہنچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

صحت کے سلسلہ میں ایک بڑا اقدام یہ تھا کہ خواتین نے ہسپتالوں اور زچگی و بہبودیٔ اطفال کے مرکزوں میں جا جا کر وہاں کے عملہ کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ قیام پاکستان کے دو تین سال ہی میں اپوا کی کوششوں سے باقاعدہ شفاخانے، ہسپتال، زچگی و بہبودی اطفال کے مرکز بھی قائم ہو گئے۔

پاکستان کی ایک بڑی ضرورت تربیت یافتہ نرسیں تھیں۔ قومی اور اس سے بڑھ کر انسانی خدمت کے جذبہ نے جلد ہی نوعمر مسلمان خواتین کو نرسنگ کی طرف مائل کر دیا اور وہ جوق در جوق اس کی طرف رجوع ہونے لگیں۔ اس سے ابتدائی بحران کی صورت جلد ہی دور ہو گئی اور اب یہ سروس اعلیٰ پیمانہ پر منظم و آراستہ ہے۔ لہٰذا اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ پہلے سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ حفظان صحت اور بڑی بڑی بستیوں اور طبقوں میں "اپنی مدد آپ کرو" اور صحت کے مرکز قائم کرنے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا ہے۔

سینا پرونا، بننا، کھانا پکانا اور مختلف قسم کی گھریلو دستکاریاں عورتوں کے من بھاتے کام ہیں۔ ان کے لئے کتنے ہی صنعتی ہوم اور ٹریننگ سینٹر قائم کئے گئے ہیں جنہوں نے بڑا معرکے کا کام کیا ہے اور ان سے ہمارے ملک کی اقتصادی حالت اور عورتوں کی خوشحالی میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔

کام کے ساتھ ساتھ تفریح بھی ضروری ہے چنانچہ خواتین ملک میں مصوری موسیقی اور دوسرے فنون کا ذوق عام کرنے میں بھی نمایاں حصہ لے رہی ہیں۔

ہماری خواتین بین الاقوامی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہی ہیں جس سے دوسری قوموں اور اداروں کے ساتھ میل ملاپ بڑھانے اور خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ ہمارے یہاں کتنی ہی بین الاقوامی شہرت کی مالک خواتین تشریف لائی ہیں۔

اسی طرح یہاں سے بھی متعدد خواتین اداروں کے وفود دوسرے ممالک کو جاتے رہے ہیں اور ایک جلیل القدر خاتون بیگم لیاقت علی خاں تو عرصہ سے ہالینڈ میں پاکستانی سفیر کے طور پر متعین ہیں۔

ایک اعلیٰ حکومت کی علامت یہ ہے کہ وہ عوام کی خوشحالی کے لئے کیا کیا کوششیں عمل میں لاتی ہے۔ حکومتِ پاکستان نے اجتماعی ترقی کا ایک بہت بڑا منصوبہ تیار کیا ہے جس کو شہری آبادیوں اور دیہات میں تیزی سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ مگر جو بات خود دل چل کر اپنے ہی بل بوتے پر کی جائے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اجتماعی اور دیہاتی ترقی کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ دو بڑے اہم منصوبے ہیں جن کا تعلق بڑی بڑی جماعتوں اور آبادیوں میں رفاہِ عامہ کی سرگرمیوں سے ہے۔ یہ سرگرمیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق اجتماعی ترقی، بچوں اور خاندانوں کی بہبودی، خواتین کے لئے مرکز قائم کرنے اور مہاجر عورتوں کی خوشحالی و آبادکاری سے ہے۔ اس سلسلہ میں "ماؤں کے کلب" بھی بہت مقبول ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض میں تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

ان کاموں کا ایک بڑا اچھا پہلو یہ ہے کہ جو ضرورت بھی پیش آئے عورتیں اسے خود ہی باہمی تعاون اور رضاکارانہ خدمات سے پورا کر لیتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے عورتوں کو تربیت بھی دی جاتی ہے۔ آئے دن سیلاب کی تباہ کاریاں، قحط اور دوسرے حادثے بھی ہنگامی حالات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ان کے سلسلہ میں بھی خواتین برابر امدادی کام کرتی رہی ہیں۔ ادھر عارضی امداد کے لئے دودھ، مکھن، تیل اور کپڑے تقسیم کرنے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ جو عورتیں اس قسم کے سماجی کام کرنا چاہیں، ان کے لئے تھوڑی تھوڑی مدت کے تربیتی کورسوں میں شریک ہونے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

شہری ضرورتیں اپنی جگہ پر ہیں۔ یہ خاصی اہم بھی ہیں اور متنوع بھی۔ ان کے مقابلہ میں دیہی ضرورتیں بھی کچھ کم نہیں۔ ہماری خواتین نے ان کی طرف بھی اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔

چنانچہ علاقہ ملیر کے ایک گاؤں میں دیہاتی تعمیر و ترقی کا ایک منصوبہ جاری کر کے اس کام کی شروعات کی گئی ہے۔ یہاں ایک مرکز قائم کیا گیا ہے جس میں تربیت کے ساتھ ساتھ عملی کام بھی کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اس تربیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ خواتین کو لکچروں اور مظاہروں کے ذریعے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ کس طرح دیہات کی عورتوں میں امورِ خانہ داری، بچوں کی دیکھ بھال، صحت و صفائی، کھیل کود، ورزش، رہن سہن، باہمی تعاون، غذا، گھریلو دستکاریوں اور تعلیمِ بالغان کا پرچار کریں۔

شہروں میں اجتماعی ترقی کا پروگرام مسودہ پنج سالہ منصوبہ کے تحت ہے۔ اس کو رفاہی بہبود کے تمام کاموں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس منصوبے کے مطابق سردست ملیر، علاقہ لیاری، اور کھڈہ نو آباد کراچی میں بڑی سرگرمی سے کام شروع کیا گیا ہے اور ان میں خواتین کی سرگرمیاں خاصی وسیع اور متنوع ہیں۔ لیاری کے پچیدہ علاقوں میں مردوں کی طرح عورتیں بھی "اپنی مدد آپ کرو" کے اصول پر کام کر رہی ہیں۔ وہ اپنی رفاہ کے کام آپ سوچتی اور آپ کرتی ہیں مثلاً۔ تعلیم (مع تعلیم بالغان)، امورِ خانہ داری، ٹریننگ، تفریح، صحت و صفائی، خوبصورت گھروں اور صاف باورچی خانوں کا مقابلہ، طبی امداد، بچوں کی دیکھ بھال، زچہ بچہ اور صحت کے مرکزوں کا قیام، غذا، دوائیں اور دوسرا سامان مہیا کرنا، وباؤں کا انسداد، ٹیکوں کی مہم، گھریلو مسئلے، اخراجات اور دستکاریاں میلے نمائش وغیرہ وغیرہ۔

ایسی ہی سرگرمیاں کھڈہ نو آباد اور ملیر میں بھی جاری ہیں اور ان کی رفتار روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر لاہور اور ڈھاکہ میں بھی اجتماعی ترقی کا ایسا ہی وسیع پیمانہ پر بندوبست کیا جا رہا ہے۔ اس سے ان تمام مقامات میں خواتین کی گوناگوں سرگرمیوں اور ان کے دور رس عمدہ نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ صرف ابتدائی جھلکیاں ہیں۔ امید ہے کہ پاکستانی خواتین کی رفتارِ ترقی اور بڑھے گی اور وہ ملک کی فلاح و تعمیر کے کاموں میں عوام کی بالعموم اور اپنے طبقۂ خواتین کی بالخصوص بیش از پیش خدمت کرتی رہیں گی۔

*

افق تا افق:

نیا نظامِ تعلیم

(اورینٹل کالج لاہور کے ۸۸ ویں یوم تاسیس پر خطبہ استقبالیہ)

ڈاکٹر سید عبد اللہ

مشرقی علوم کے سوال کو عام تعلیم کے مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ بالآخر مشرقی علوم کی ساری بحث بھی اُنہی اُصولوں تک جا پہنچتی ہے جن کا تعلق تعلیم کے عام فلسفہ و حکمت سے ہے۔ اور پھر اس لئے بھی کہ مشرقی علوم کے سوال کو عام تعلیم سے الگ رکھ کر سوچنے کی پالیسی ہی دراصل اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اس وقت ہماری تعلیم (مشرقی اور مغربی) دو الگ الگ خانوں اور طبقوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ جن میں سے عملاً ایک کو اعلیٰ اور دوسری کو ادنیٰ یا ایک کو مفید اور دوسری کو غیر مفید یا بے ضرورت خیال کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ تقسیم ایک غیر ملکی حکومت کی غرض مندانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ اور اب اس تقسیم کو جاری رکھنے کا مطلب ماسوا اس کے کچھ نہیں کہ ہم ایک غلط بات کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے موجودہ عقائد کے پیش نظر ہم اس تعلیمی نظام کو قومی تعلیم کا درجہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس تعلیم کا بنیادی محرک جذبہ غرض مندانہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اصول بیشتر صورتوں میں غیر قدرتی اور غیر عقلی تھے۔ اس میں ہمارے ملک کی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی ضرورتوں کو مد نظر نہیں رکھا گیا تھا اور اس کے اکثر نمونے یا خاکے (PATTERNS) مستعار اور اجنبی تھے۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری یہ تعلیم ہمارے حق میں اتنی مفید ثابت نہیں ہوئی، جتنا کسی اچھی تعلیم کو ہونا چاہیئے۔ ایک بہت بڑا نقصان اس نظام تعلیم سے یہ ہوا کہ ہماری تعلیمی روایت کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کیونکہ یہ تو مسلّم ہے کہ اس ملک میں بھی ایک تہذیب، ایک ثقافت تھی۔ اس ملک کے لوگوں کا بھی کوئی ادب تھا، ان کی بھی کوئی روایات تھیں، ان کا بھی کوئی نظام تعلیم و تربیت تھا۔ میکالے کی نظر میں ان کی اہمیت کچھ بھی ہو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ تاج محل کی بنا ڈالنے والی قوم، دل اور نظر کی کچی نہیں ہو سکتی، پاک بین نگاہ اور گداز دل کی یہ تہذیب کسی گھنیر تعلیمی روایت کے بغیر ممکن نہیں، مگر غیر ملکی حکومت نے یہ تعلیمی روایت یکسر فنا کر دی۔ اس میں اس کے بُرے ارادے کا دخل نہ بھی ہو، تب بھی اس سے ہمارے فکر و نظر کی قدرتی ترقی بالکل رک گئی۔ اس سے ہماری تعلیم دو متحارب کیمپوں میں تقسیم ہو گئی اور ملک ان عمدہ نتائج علمی سے محروم ہو گیا جو ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے اجتماع و ترکیب سے لازمی طور سے برآمد ہوتے۔ آج کئی سوچنے والے اور محسوس کرنے والے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اب ہم میں غزالی، ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ نہیں پیدا ہوتے تو دراصل اس کی ذمہ داری ہماری ڈیڑھ ہزار سالہ تعلیمی روایت کے انقطاع پر ہے جس سے بڑھتی ہوئی روایت تو ختم ہو گئی مگر علم و تعلیم تصنیف و تحقیق اور آزادانہ غور و فکر کی کوئی نئی روایت پیدا نہ ہو سکی ——!

بہر صورت اب پاکستان کے نظامِ تعلیم کی اساس اور غایت کو بدل دینا ہوگا۔ سب سے پہلے پاکستانی تعلیم کی غایت متعین کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اسی پر اس ملک کی ساری تعلیم کی عمارت بلند ہو سکے گی اور اسی سے اس کی تفصیلات و جزئیات کے نقوش تیار ہو سکیں گے۔ میں نے تعلیمی غایت کے سلسلے میں مخصوص عقائد کا سوال اٹھایا ہے کہ تعلیم کے عام اور مثالی نصب العین کچھ بھی ہوں، عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے نظام تعلیم پر اس کے مخصوص سیاسی اور تہذیبی احوال کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اور عمل شکل میں، اقوام عالم میں سے ہر قوم اپنے خاص احوال کو مد نظر رکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ نظری اعتبار سے تو تعلیم کا ہر نصب العین اور ہر مقصد نیک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً شخصیت کی تکمیل، خیر، صداقت اور حسن کی قدروں کی تربیت، عملی قابلیتوں کی تکمیل وغیرہ وغیرہ۔ افلاطون سے لے کر آج تک کئی اہل فکر نے تعلیم کے لئے نہایت اونچے اور مثالی مقاصد تجویز کئے ہیں۔ مگر اس کو تعلیم کی بدقسمتی کہیئے یا ناگزیر خصوصیت کہ تہذیب انسانی کے ہر دور میں وہ سامنے کے مخصوص عمرانی یا سیاسی نصب العینوں سے متاثر ہوتی رہی ہے جن میں سے بعض نے حقیقی تعلیم کو آگے بڑھایا اور بعض نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ مگر مخصوص ملکی اور سماجی احوال کا اثر ہر دور میں ہوتا رہا اور اس کو قبول کرنے پر ہر قوم مجبور رہی۔

بظاہر یہ تصور تنگ نظری پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور میں پاکستان کو اس تنگ نظرانہ اور محدود نقطہ نظر کی دعوت کبھی نہ دیتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ خوش قسمتی

سے پاکستان کی بنیادی تعلیمی غایت قومی ہو جانے پر بھی وسیع اور آفاق گیر ہی رہے گی۔ یورپ اور امریکہ کے ماہرین تعلیم صدیوں کے تجربوں، کاوشوں اور بحثوں کے بعد جس بین الاقوامیت کی طرف اب رجوع کر رہے ہیں، وہ بین الاقوامیت مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ اسلامی ذہن اصولاً بین الاقوامیت، آفاقیت، اور انسانیت سے مانوس ہے۔ یورپ اور امریکہ بڑی بڑی فکری بغاوتوں کے بعد آج اس تصور کے قریب آئے ہیں جو نسل اور جغرافیہ کی حدوں سے بلند تر نظر کا مدعی ہے۔ اسلام کا یہ عقیدہ اس کے اولین عقاید میں سے ہے۔

یورپ میں دوسرے شعبہ ہائے فکر و نظر کی طرح تعلیمی نظریات میں بھی بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ کلاسیکی روایت کے خلاف انسانیاتی تحریک (HUMANISM) کی بغاوت، اس کے خلاف عمرانیاتی پھر عام سائنسی تحریک۔ بیچ میں شوپن ہار کی "خود رو رضائیت" (VOLUNTARISM) اور پھر عملی تجرباتی تحریک (PRAGMATISM) غرض، اسی طرح تعلیم کبھی قومی، کبھی نسلی، کبھی علاقائی عصبیتوں سے متاثر ہوتی رہی، جس کا ایک نمایاں نقطہ وہ تھا جو اس وقت، ایک طرف روس کی منظم تدریس میں ملتا ہے اور دوسری طرف امریکہ کی "قومی بین الاقوامیت" کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

ان سب نظریات میں اصولی اختلافی مسئلے کم و بیش دو ہی ہیں اول یہ کہ تعلیم کا مقصود کس قسم کے انسان اور کس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا ہے اور دوسرا یہ کہ خدا اور انسان اور فرد و اجتماع کے باہمی روابط کیا ہیں اور تعلیم ان کی تنظیم میں کیا مدد دے سکتی ہے؟

دنیا کے موجودہ تعلیمی افکار کے تجزیئے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ذہن انسانی، انسان کی ان قسموں کے جھگڑے سے سخت تنگ آگیا ہے اور اب وہ ایک ایسے انسان کی تلاش میں ہے جو عالم ہو یا نہ ہو، نیک ضرور ہو، اور اسے اب ایک ایسے معاشرہ کی تلاش ہے جس کی حدیں جغرافیہ نے نہیں، انسانیت نے قائم کی ہوں۔ اسی طرح انسان اب مادے کی کارفرمائیوں سے خوف زدہ ہو کر خود اپنے مستقبل کے بارے میں مشوش ہے۔ ان حالات میں اب دنیا روحانیات اور مادیات میں مناسب پیوند اور خوشگوار توازن کی آرزو مند ہے۔ وہ خاص کی بجائے عام، قومیت کی بجائے بین الاقوامیت اور عصبیت کی بجائے انسانیت کی طرف مائل ہے، اور تعلیم کو سائنس بنانے کی بجائے پھر اخلاق، دین اور فلسفہ بنانے کے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔

اسی طرح صدر امریکہ کے تعلیمی کمیشن کی اکثر سفارشات کا رخ بھی ادھر ہی ہے۔ یہاں تک کہ خود روس میں بھی جس پر جبریت کا الزام ہے (RETURN TO CULTURE) کی صدا سننے میں آ رہی ہے۔ جو دراصل مادی افادیت کے ڈھیلا ہونے کی واضح علامت ہے۔

اس گفتگو سے یہ تو ظاہر ہوا کہ اس وقت تعلیم کا عام رجحان یہ ہے کہ اس میں مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ روحانی و اخلاقی تکمیل بھی مدنظر رہنی چاہئے۔ یہ تصور وہ ہے جو دنیا کو بڑی روحانی آزمائش اور سخت ذہنی تکلیف کے بعد اب ہاتھ آیا ہے۔ مگر یہ تصور تو وہی ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی روایت کا ہمیشہ سے ایک اہم اصول رہا ہے۔

پرانے نصاب و نظام پر لاکھ دوسرے اعتراضات ہوں مگر یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ یہ نصاب عملی اور سماجی علوم کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ پرانے تمام مشہور نصابوں کی اصل روح یہی رہی ہے، کہ ان سے دینی و دنیاوی اور علمی و عملی کا لفظی امتیاز مٹ کر ایک ایسا متوازن رویہ نمودار ہو جو زندگی کو وحدت بسیط کی حیثیت سے دیکھ سکے۔ غرض دین و دنیا کے درمیان توازن پیدا کرنا اور قائم رکھنا اس کا سب سے بڑا نصب العین رہا ہے!

یہ صحیح ہے کہ آج ہم پرانی تعلیم کو یک رخا اور دنیا سے ذرا ہٹا ہوا دیکھتے ہیں۔ مگر اس کی ذمہ داری اس تعلیم پر نہیں قوم پر ہے یا اس دور غلامی پر ہے جس نے ہماری تعلیم کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا تھا یعنی جدید اور قدیم یا مشرقی اور مغربی یا دینی اور دنیوی۔ یہ چیز دراصل انگریز کا دیا ہوا تحفہ ہے جسے ہم آج تک سینے سے لگائے پھرتے ہیں اگر ہماری تعلیم قدرتی ارتقا کی فضا میں آگے بڑھتی تو یہ دین اور دنیا کے دو کیمپ کبھی قائم نہ ہوتے۔ کیونکہ ہمارے تصورات کی رو سے دنیا دین کے اندر ہے۔ اس سے باہر نہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے یہاں CHRISTIAN SECULARISED کی سی اصطلاحیں نہیں ملتیں۔

بہر حال یہ دوعملی غیروں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ شبلی نے ندوۃ العلماء کی تحریک میں اس دوعملی کے خلاف آواز بلند کی تھی اور نظریہ وحدت تعلیم پر اصرار کیا تھا تاکہ عام تعلیم کے لئے دینی مدرسے اور دنیوی مدرسے الگ الگ قائم ہو کر قوم کو فکری انتشار میں مبتلا نہ کریں۔ مگر اس دور کے نقار خانے میں شبلی کی آواز طوطی کی آواز سے بھی خفیف تر ثابت ہوئی۔ یہی سمجھنا ہوا، کہ غلامی کے خاتمے کے بعد ہماری پاکستانی تعلیم، نظریہ وحدت تعلیم کے

اصول پر نافذ ہونی چاہیئے جس میں دین و دنیا کی یہ تقسیم باقی نہ رہے۔ اس طرح علوم دین بھی محفوظ رہیں گے اور دنیوی علوم بھی دین کے دائرے میں آجائیں گے۔۔۔

وحدت تعلیم کا تصور ہی ہماری تعلیمی اور تہذیبی مشکلات کا حل ہے۔ اس دوعملی اور دو کیمپوں کی لڑائی سے تو باہمی نفرت اور بغض و عناد اور اس سے بھی زیادہ دو طرفہ بے علمی اور جہالت کی توسیع کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے تلخ تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور غیروں کی نافذ کردہ اس دوعملی کو ختم کر دیں۔ وحدت تعلیم کا منصوبہ صحیح بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ مگر ہاں، اس کے لئے تعصب اور جمود دونوں کو خیرباد کہہ دینا پڑے گا۔!

مروجہ تعلیم اس معنی میں نہایت غیر قدرتی ہے کہ اس کا ذریعہ تعلیم تقریباً ایک سو سال سے ایک غیر ملکی زبان ہے جس کی مشکلات علوم کی اشاعت کے لئے سنگِ راہ بنی ہوئی ہیں۔۔۔۔ بعض لوگ آج بھی اس قدرتی طریق کار کے حق میں ہیں مگر بیشتر عقلی اور عملی دلائل اس کے خلاف ہیں۔ دوعملی نے قدیم و جدید کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی ہے کہ اب مفاہمت کے دروازے تقریباً بند ہو چکے ہیں گویا ایک ہی ملک میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں جن کی زبانیں الگ الگ ہیں اور مزاج بھی الگ الگ۔

غیر قدرتی نظام تعلیم نے ملک کی اعلیٰ اختراعی تخلیقی صلاحیتوں کو بالکل فنا کر دیا ہے۔ ہم میں آزادانہ سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی ہماری سوچ کی دنیا تنگ ہو گئی ہے۔ ہم غلامانہ تفکر کے دائرے میں قید ہو کر اس تنگی کو بھی وسعت ہی خیال کرنے لگے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ جاپان، روس، چین، بھی تو انگریزی کے بغیر جی رہے ہیں اور نظری اور تجرباتی علوم میں روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور روس کا غیر انگریزی داں سائنس داں تو اب آسمانوں اور افلاک پہنچنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ یہ سب ترقی ان ملکوں نے اس لئے کی کہ انہوں نے اپنی تعلیم و تربیت کی اساس قدرتی اصولوں پر رکھی۔۔۔۔ ہمارا تعلیمی دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے اور انسانی مسائل و معلومات کی پر پیچ وسعتوں کے ساتھ تعلیم کی تنظیم بھی اتنی پر پیچ سی شے ہو گئی ہے کہ اب اس کو کامل طور پر قدیم نظام تعلیم کے نمونے پر لانا مشکل بھی ہے اور ناقابل عمل بھی۔ مگر قدیم نظام تعلیم کا ایک اصول اور تجربہ ایسا ہے جو آج بھی قابل غور اور قابل قدر ہے۔ وہ ہے مدت تعلیم کا تجربہ۔ عام احساس یہی ہے کہ اس وقت طلباء کی عمر کا کارآمد اور پر جوش زمانہ غیر ضروری طور پر تعلیم میں صرف ہو جاتا ہے چنانچہ تکمیل کے لئے ۲۰ سے لے کر ۲۵ سال تک کی عمر درکار ہوتی ہے۔ اس طرح تکمیل کے بعد تخلیق و تحقیق اور تعلیم کے عملی استعمال کے لئے جوشِ عمل کا زمانہ کچھ زیادہ نہیں رہتا۔ بقول اکبر:

مغربی کورس میں ہوتی ہے جوانی رخصت
اب تو پیری رہی رندانہ مشاغل کے لئے

شاید یہی سبب ہے کہ ہمارے ملک میں اعلیٰ ذہنی فکری اور عملی کارکردگی کی شخصی روداد اکثر تشنہ و مختصر ہی رہتی ہے۔ اور مقابلتاً جب اسلاف کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کی زندگیاں کتنی نتیجہ خیز اور بار آور ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں کثیر التصانیف مصنفوں کی بڑی کثرت دکھائی دیتی ہے، ان میں سے اکثر تصانیف معمولی رسائل تک محدود نہ تھیں بلکہ نہایت جامع، خیال انگیز اور عہد آفریں ہوتی تھیں۔

میں علی وجہ البصیرت یہ رائے رکھتا ہوں کہ موجودہ مدرسوں کے نظام کے مقابلے میں مسجدوں اور خانقاہوں کا نظام تعلیم زیادہ قابل عمل اور خامیوں کے لحاظ سے زیادہ پر منفعت نظام تھا۔ جو کم خرچ تھا مگر زیادہ نفع کی طرف لے جاتا تھا۔۔۔ اب ہزارہا روپے کے خرچ کے بعد بھی نفع معدوم ہے۔ اس وقت تعلیم آزاد تھی۔ اب تعلیم مقید ہے۔ اس کی وجہ سے اب حکومتوں کو بھی طرح طرح کی پریشانیاں ہیں تعلیم کے سلسلے گراں ہو گئے ہیں اور اتنے وسیع نظام کے اخراجات حکومتوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ لہٰذا جو نظام بھی نافذ ہوتے ہیں ان کے لئے نہ روپیہ ہوتا ہے۔ نہ وسائل۔ پھر کوئی ان سے پوچھے کہ صاحب! جو نظام چل نہیں سکتا اس کو محض اس وجہ سے چلائے جانا کہ امریکہ یا انگلستان میں ایسا ہی ہوتا ہے کہاں کی دانش مندی ہے۔ میرا تو خانقاہی سا مشورہ یہ ہے کہ اس نقالی کو چھوڑیئے! تعلیم کو آزاد کیجئے۔ مدارس بھی! نہیں، بزرگوں کی مکاتب یا لشینی جن کے

بغیر تعلیم اس وقت عام شہری کے لئے عذاب ہی عذاب ہے۔ یعنی بود کے لڈو کہ جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے! ان حالات میں تعلیم کو ارزاں کرنا ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

اب آپ قدرتی طور پر پوچھیں گے کہ تعلیم میں لوریا نشینی کی یہ سپرٹ عملی طور پر پیدا کرنے کی آخر کوئی تدبیر بھی تو ہو! میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی صورت ہے تبدیلیٔ ذہن اور آزادیٔ فکر ایسی آزادیٔ فکر ہم میں اس شاہین کی سی جرأت پیدا کرے گی جس نے اقبال کی روایت کے مطابق پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کر لیا تھا۔ یہ جرأت سب سے پہلے قوم کو عرفانِ نفس سے بہرہ ور کرے گی۔ پھر آہستہ سے ہمارے کان میں یہ بات ڈال دے گی کہ اپنے ملک کے مسائل اپنے ملک کے وسائل کے مطابق اور ان کی روشنی میں ہی حل ہونے چاہئیں ایسی سو نصیحتوں کی ایک نصیحت ہے!

ہمارے ملک کے وسائل ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم تعلیم کا سارا بوجھ حکومت پر نہ ڈالیں اور ان ذمہ داریوں میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ میرا خیال ہے کہ تعلیم قومی زندگی کا ایک آزاد ادارہ ہے۔ اس کا بار پبلک کو برداشت کرنا چاہئیے۔ میرا یہ خیال جنرل ایجوکیشن کے بارے میں ہے۔ البتہ پیشہ ورانہ اور کارخانجات کی تعلیم یعنی ٹکنیکل تعلیم کی ذمہ داری تمام تر حکومت پر ڈالی جانی چاہئیے۔ تاکہ ملک کی ٹکنیکل ضرورتوں کی سر انجامی زیادہ منظم انداز میں ہو۔

دل بہشت —— بقیہ صفحہ

منو :۔ ہوا سے ؟ امی ذرا باہر جھانکنا۔ شاید وہ باہر کھڑا ہو۔

بیگم :۔ (کھڑکی سے باہر جھانکتی ہے) باہر تو کچھ بھی نہیں۔

منو :۔ کچھ بھی نہیں! پھر دیکھو امی۔

بیگم :۔ ایک تارہ ٹوٹا ہے، بس۔

منو :۔ (خوشی سے) امی وہی مسخرا دل بہشت ہے۔ آسمان پر قلابازیاں کھا رہا ہے۔ وہ مسخرے پن سے باز نہیں آتا۔

بیگم :۔ (گھبرا کر) ڈاکٹر صاحب! کہیں بچے کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟

ڈاکٹر :۔ (منو کے ماتھے پر ہاتھ لگا کر) ابھی تپ تو ہے، مگر اب خطرہ نہیں۔

بیگم :۔ تو پھر یہ آپ کی دوا کی کرامت ہے۔

منو :۔ امی، ابا نے تو اپنا کام یونہی کرامت رکھ چھوڑا ہے، یہ ساری کرامت تو مسخرے دل بہشت کی ہے۔ (پس منظر سے مسخرے کے گانے کی آواز آہستہ آہستہ ابھرتی ہے) سنو امی، مسخرا ستاروں کو اپنا گانا سنا رہا ہے، ہے نا وہی دل بہشت کا گانا!

(موسیقی بند ہو جاتی ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیگم :۔ ہیلو، میں بیگم کرامت بول رہی ہوں۔ جی نہیں ہمیں کسی نمبر کی ضرورت نہیں۔ جی نہیں۔ یہ غلط نمبر ہے۔

منو :۔ یہ غلط نمبر نہیں۔ امی بند نہ کرنا ٹیلی فون۔ یہ مسخرا دل بہشت ہوگا۔ میں نے ہی ان لوگوں کو کہا تھا کہ دل بہشت جونہی وہاں پہنچے مجھے ٹیلی فون کرے۔ یہ اسی کا فون ہے۔

بیگم :۔ (گھبراہٹ سے) ڈاکٹر صاحب، یہ کیا؟

ڈاکٹر :۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ زندوں کے متعلق تو ڈاکٹروں کو علم ہوتا ہے مگر مردوں کے متعلق ہم بالکل لاعلم ہیں۔ منو آج رات موت کے منہ میں تھا۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے شاید مسخرا آیا ہی ہو۔

منو :۔ ڈاکٹر صاحب، آپ دل بہشت کو بتا دیں۔ میں اب اچھا ہوں۔

ڈاکٹر :۔ (ٹیلیفون پر) کہ منو اب اچھا ہے۔ دل بہشت ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولیں گے۔ بہشت والوں کو ہمارا سلام کہنا تم جہاں رہو خوش رہو۔ اچھا خدا حافظ!

(پردہ)

”ماہ نو“

میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱۔ ”ماہ نو“ میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان ”ماہ نو“ کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لیے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

نقد و نظر

روزن

از قتیل شفائی

ناشر: ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

صفحات ۱۲۰، قیمت تین روپے

قتیل شفائی کا کلام سادگی و پرکاری کے دوگونہ کیف کا حامل ہے۔ اس کے یہاں ہلکے پھلکے مدھر الفاظ میں احساس کی دھیمی دھیمی آنچ ایک سہانی سی لو پیدا کرتی ہے جو اپنی جھلملاہٹ میں ایک سیمیائی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ اس کی لے ہلکی ہلکی، منجھی ہوئی لے ہے جس میں صرف ایک اندیشہ ہے کہیں یہ زیادہ ہلکی نہ ہو جائے۔ اس کے لئے صرف شاعر کا وہبی شعور ہی ضمانت ہو سکتا ہے۔

قتیل کا میلان تصور سے حقیقت کی طرف ہے۔ وہ اپنے آئینۂ فکر میں "جلوۂ بیدار" یعنی زندگی کی اصلیتوں کا عکس دیکھنا چاہتا ہے مثلاً ناداری، ناانصافی، صنفِ نازک پر سماج کا ظلم، نارواجس سے شاعر فلمی دنیا یا شاید زندگی سے قریب ہونے کے سبب زیادہ متاثر ہے۔ "رگِ سنبل ہو یا زرم آہو" ان میں رومان اور حقیقت دونوں کی لہریں آمیز ہیں کیونکہ شاعر کے اپنے ضمیر میں ان کا وجدانی طور پر سنگم ہے۔ وہ اپنے احساس کو ایک پھیلے ہوئے انکشاف کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے جس کا نتیجہ ایمائیت کے مقابلہ میں شرح و بیان ہے۔ میانہ روی سے کچھ آگے بڑھ کر اقدام فکر و احساس کے ساتھ ساتھ شعری سانچوں میں بھی نمایاں ہے جن میں شاعر ذرا ذرا سی لوچ لچک بڑھا کر نئی نئی طرحیں پیدا کرتا ہے۔

"خمِ کاکل"

از: سیف الدین سیف

ناشر: مکتبۂ کارواں۔ لاہور

صفحات ۲۰۸، قیمت ۴ روپے

یہ مجموعہ سیف کی شعری کوششوں کا اوّلین سرمایہ ہے۔ جن میں ایک نازک کیف کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اترنے والا سوز و گداز بھی ہے۔ اسی سے ان کے سازِ سخن کے تاروں سے ایسی ہلکی ہلکی نوائیں اٹھتی ہیں جو سیج مج اشک کے قافلہ کے لئے بانگِ درا ہیں۔ ان میں شاعر کا رچا ہوا احساس خود بخود بڑی بے تکلفی کے ساتھ رومان کے سانچوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اور "خمِ کاکل" میں اندیشہائے دور و دراز" مثلاً آشوبِ دہر، گردشِ روزگار وغیرہ کو کو دیتا ہے یا دہ آتشہ تو ہے مگر ہلکا ہلکا، دھیما دھیما۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے ان کی روح تغزل ہی ہے اور "اندیشہ ہائے دور و دراز" پر "خمِ کاکل" یعنی غزل کی روایتی زبان کا سایہ اس قدر گہرا ہے کہ مجموعی طور پر یہی نمایاں رہتا ہے۔ گویا غزلیں تمام تر غزلیں ہی ہیں، ان میں زندگی کی اصلیتوں کی جھلکیاں ہیں بھی تو بے حد دبی دبی۔ غزلیں ہوں یا دیگر اصناف، اس مجموعے میں ان سب کا رنگ یکساں ہے۔ ان پر ایک ہلکے ہلکے، منجھے ہوئے بیان کی جھلملاہٹ چھائی ہوئی ہے جس کو سلاست کہتے ہیں۔ اس میں ایک بڑا اندیشہ یہ ہے کہ کہیں اس کا "ملمع" دوسری خوبیوں کو گہنا نہ دے۔ سیف کی شاعری میں یہ اندیشہ ہر کہیں دامنگیر ہے۔

انتخابات

انتخاب سودا، ثاقب کانپوری

ناشر، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی

انتخاب ناسخ، آتش، ذوق، سید مرتضیٰ حسین فاضل

ناشر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور

شعرا کا انتخاب کلام ان کے "دل و دماغ" اور امتیازی خصوصیات کو واضح کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ہمارے قدیم شعرا کے ضخیم کلیات کمیاب نہ ہوں تو بھی ان کا مطالعہ کارے دارد کا مصداق ہے۔ اور آشوبِ نظر کے علاوہ دردِ سر سے بھی خالی نہیں۔ لہٰذا ان کا انتخاب اور بھی ضروری ہے۔ اگر انتخاب موزوں ہو اور پیشکش بھی مناسب تو انتخاب کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہمارے بعض ناشروں نے حال ہی میں اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے نتیجے میں چند نامور شعرا مثلاً سودا، ناسخ، آتش، ذوق وغیرہ کے انتخابات شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان سے وہ مقاصد ایک حد تک حاصل ہو جاتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، لیکن انتخاب اور پیشکش کے حقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں جہاں یہ ضروری ہے کہ انتخاب رطب و یابس سے پاک ہو، وہاں یہ بھی لازم ہے کہ اشعار واقعی چیدہ، قابلِ لحاظ اور کسی اہم خصوصیت کے عکاس ہوں۔ مقدمہ میں ایسی ہی نادر خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہو جو مبصر نے بالواسطہ یا بلاواسطہ مشاہدہ کی ہوں۔ ذاتی مشاہدات کی نشاندہی خصوصاً زیادہ ضروری ہے تاکہ روایتی آرا کو دہرانے کی بجائے تازہ نگاہی کا احساس پیدا ہو۔

ان انتخابات میں زیادہ تر سہل پسندی برتی گئی ہے۔ البتہ "انتخاب جدید" میں بعض نئے اشارات جھلکتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اس سلسلہ کو اور بھی آگے بڑھایا جائے۔ انتخاب برجستہ بھی ہو اور نمائندہ بھی۔ فنی و معنوی قدروں کا زیادہ سکمی تجزیہ کیا جائے۔ عمومی فیصلوں سے پرہیز کیا جائے اور نتائج کے استنباط میں زیادہ احتیاط برتی جائے۔ موجودہ انتخابات میں کئی اشعار کی اہمیت محل نظر ہے۔ اس طرح انتخاب کی خوشگواری میں فرق آجاتا ہے اور بڑی حد تک انتخاب کا مدعا ہی فوت ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ ہم شاعر کے کلام کا زیادہ ذوق و شوق سے مطالعہ کریں اور اس کے خد و خال کو زیادہ آسانی اور وضاحت سے بھانپ سکیں ✦

اردو رسم خط اور طباعت

از پروفیسر ہارون خان شروانی
ناشر: مہتمم مطبوعات، سعود منزل حمایت نگر، حیدر آباد (دکن)
صفحات ۸۲، قیمت دو روپے

اردو کا مروجہ رسم خط اور طباعت بلاشبہ جدید ضروریات کے لئے موزوں نہیں، کیونکہ یہ اتنا لچکدار نہیں کہ دور حاضر کے گوناگوں تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ یہ احساس اقوام مغرب کے آتے ہی پیدا ہو گیا تھا جبکہ جدید سائنسی دریافتوں اور مشینی ایجادات نے پرانے نظام کے بہت سے جامد لوازمات کو بے کار کر دیا تھا۔ چنانچہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اکثر ممالک نے اپنے رسم خط اور طباعت دونوں کو یک قلم تبدیل کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں ان کا مسئلہ ابھی تک محل نظر ہے۔ اور کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے ایسے مقالات کی اشد ضرورت ہے جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔ اس کتاب میں یہ ضرورت کافی حد تک پوری ہو گئی ہے اور مختلف کوائف اور حقائق کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ لیتھو اور نستعلیق کو فوراً خیرباد کہہ کر نسخ ٹائپ کو رواج دیا جائے جو مراکو سے ملایا تک پھیلا ہوا ہے اور ہر اعتبار سے نہایت موزوں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلیٰ علمی و ادبی کتابیں اصلاح شدہ رومن خط میں شائع کی جائیں۔ یہ نتائج نہ صرف قابل توجہ بلکہ نسخ کی حد تک بالعموم قابل قبول بھی ہیں۔ کتاب میں توضیح و تشریح کے سلسلہ میں بہت سی نادر معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہیں جو اس کی افادیت میں اور بھی اضافہ کرتی ہیں ✦

بلو کا بستہ اور دوسری نظمیں

از: ابن انشا
ناشر: لاہور اکیڈمی، سرکلر روڈ لاہور
صفحات ۶۰، قیمت ایک روپیہ
سرورق رنگین اور دلچسپ خاکوں سے مزین

یہ ہماری زبان میں اپنی قسم کی پہلی اور بڑی دلچسپ چیز ہے یعنی انگریزی کے نمونہ پر بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں جو ان ننھے ننھے شوقینوں کی نظر میں پیاری ہوتے ہوئے ان کے دلوں کو بھی پیاری ہیں۔ ہر صفحہ بڑے مزیدار خاکوں سے آراستہ ہے اور بچوں کی جیتی دنیا کا بڑا کرارا منظر پیش کرتا ہے۔ بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لئے ایسی نظمیں بڑی مفید ہیں ✦

رسید کتب

انقلابی مصر	محمد حسن الاعظمی	مکتبۂ اعظمیہ بالمقابل گاندھی گارڈن۔ کراچی۔
آئینۂ دلدار	محمد ابرار علی صدیقی	افسر بکڈپو، سنٹرل جیکب لائن کراچی
سفر چین	عبد القدوس ہاشمی	مکتبۂ مہر نیمروز، کراچی
بنگلہ تعلیم	رفیع احمد فدائی	رائٹرس پبلی کیشنز، ڈھاکہ
اردو کی فریاد	ممد سعیدی	انجمن ترقی اردو ورشاخ، ٹنڈو آدم
اسلامی نظام تعلیم	سعید احمد رفیق	ادارۂ تصنیف و تالیف، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
جرم و سزا	کمال احمد رضوی	غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور
انتخاب غالب	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی۔ سندھ کراچی
امید	مترجمہ نظیر صدیقی	مکتبہ کارواں۔ لاہور
چاند گہن	انتظار حسین	
فکر و نظر	رفیع اللہ عنایتی	سائنٹفک سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
سالنامہ "نئی قدریں"		پوسٹ بکس ۱۶۸۔ حیدر آباد
کانسٹی ٹیوشنل لا اِن اسلام	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	فصیح برادرز۔ "الریاض" حیدر گوڑہ حیدر آباد انڈیا

✦

اچھی عادتیں بڑی دولت ہیں

کیا آپ وقت کے پابند ہیں ؟

کیا آپ صفائی کا خیال رکھتے ہیں ؟

کیا آپ ہمیشہ تپاک برتتے ہیں ؟

کیا آپ اصولِ صحت کے پابند ہیں ؟

کیا آپ روپیہ بھی بچاتے ہیں ؟

ہمیں اپنی زندگی کو صرف گذارنا نہیں بلکہ سُدھارنا اور سنوارنا لازم ہے۔ عمدہ اخلاقی عادات ایسا فریضہ ہیں جو آپ اپنا انعام ہے۔ اچھی عادتوں سے کردار بنتا ہے جو خود بڑی دولت ہے، اور بچت کی عادت سے قسمت بھی بن جاتی ہے۔

بچت کی عادت ڈالئے

پس اندازی اُن عمدہ عادات میں سے ہے جن سے دلی اطمینان بھی حاصل رہتا ہے اور آئندہ خوش حالی کی ضمانت بھی۔ خصوصاً جب کہ آپ اپنی بچت سیونگز سرٹیفکیٹ میں لگائیں۔ آپ جو رقم اِن تمسکات میں لگاتے ہیں اُس کی ضامن حکومت ہے اور اِس سے مُلکی بہبود کے کاموں میں مدد ملتی ہے۔ اِس کے علاوہ آپ کو اِس پر اتنا معقول منافع ملتا ہے کہ کسی اور مد سے نہیں ملتا۔ یعنی دس برس میں دس روپے کے چودہ روپے ۳ آنے بن جاتے ہیں۔

کفایت میں برکت ہے

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگایئے

۳½ فی صدی منافع۔ ڈاک خانوں، سیونگ بیورو اور مقررہ ایجنٹوں سے مل سکتے ہیں

UNITED

ہماری ڈاک

مدیر محترم ـــ کل ایک جوابی مضمون بھیجنے کے بعد ایک خبر کا تراشہ کاغذوں میں مل گیا۔ براہ مہربانی اسے بھی موقع دیکھ کر اسی مضمون میں کہیں شامل کر دیجئے یا اسے الگ ہی شائع کر دیجئے۔ (ابوالجلال ندوی)

(سرِدست ہم اس تراشے کو شائع کر رہے ہیں۔ مدیر)

"مدراس سے ۰۰ میل کے فاصلہ پر لوتھل میں جو آثار کا دی ہوئی ہے اور پڑوس ہی کے علاقے رنگپور میں جو اکتشافات ہوئے ہیں انہوں نے غیر مشتبہ طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ہڑپا کی ثقافت جنوب مشرق میں وادیٔ مہران کے حدود سے بہت دور ہمبئی کے شمالی مبلغ تک پھیلی ہوئی تھی ـــ" اس سے ایک ہندی محقق نے یہ نتائج اخذ کئے ہیں کہ سوراشٹر کا ساحلی مقام لوتھل ایک اہم اور نہایت سرگرم بندرگاہ تھا اور موہن جو دڑو اور ہڑپا کے ساتھ وسیع تجارتی رابطہ رکھتا تھا۔ یہاں کی مہریں رگ ویدی تصورات کو منعکس کرتی ہیں۔ دونوں مقاموں کی مہروں میں کامل مماثلت ہے۔ لوتھل میں سو سے زیادہ سندھی جیسی مہریں اور ٹھپے ملے ہیں جن پہ جانوروں کی صورتیں اور سندھی رسمِ خط کے نوشتے ہیں۔ (۲۰۰۰) ـــ (۱۵۰۰) ق۔م۔ کے دوران یہاں کی آبادی سراسر ہڑپا والوں جیسی تھی۔ رنگپور کے اکتشافات نے (۲۰۰۰) ق۔م سے (۸۰۰) ق۔م تک کی تاریخ ہند پر نئی روشنی ڈالی ہے۔ اس زمانہ میں کلچر کا تسلسل برابر قائم رہا۔ یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ اس کے نابود ہو جانے کا سبب ایک تباہ کن سیلاب تھا۔ گجرات، سوراشٹرا اور کچھ میں چالیس ہڑپائی نو آبادیوں کا نشان ملا ہے"۔

اب ہماری سنئے۔ ہو سکتا ہے کہ لوتھل والے اور رنگپور والے مہاجرینِ سندھ ہوں جو آریوں کے ورود کے بعد بے وطن ہو کر یہاں آ رہے۔ تجارت تو اس وقت مانی جا سکتی ہے جب لوتھل میں صرف ہڑپا اور ہڑپا میں لوتھل کی ساخت کی چیزیں ملیں۔ تیا سائیہ لوگ آریوں کے ستائے ہوئے لوگ تھے جو یہاں آ بسے تھے۔ پھر ان کو یہاں سے بھی ماتو اور جنوب، مشرق یا مغرب میں پناہ کے لئے بھاگنا پڑا۔ اگر ہڑپا اور لوتھل کی مہروں میں کامل مماثلت ہے تو یہ ویدک تصورات کو منعکس نہیں کرتیں۔ اگر یہ مذکورہ بالا زمانہ کی ہیں تو ان کا اندازِ تحریر اس قسم کا ہونا چاہیے:

اگر ان پر تحتانی قسم کے نوشتے ہیں تو ان کا زمانہ (۲۰۰۰) ق۔م سے پہلے ہونا چاہیے۔ یہ نوشتہ سندھی نوشتوں کے حروف اور چند الفاظ کو لے کر بنایا گیا ہے۔ مقصد یہ دکھانا ہے کہ ۸۰۰ ق۔م کے نوشتے ایسے ہوں گے۔ ممکن ہے لوتھل میں ایسے نوشتے مل جائیں جو میرے اس خیال کو ثابت کر دیں کہ (۷۰۰) اور (۵۰۰) ق۔م یا (سنہ ۱۲) اور (سنہ ۱۱) ق۔م کے درمیان جب افغانستان، ایران اور جنوبی عراق سے آریوں کے ریلے آگے آگے، پیچھے خاکستر لئے داخل پنجاب و سندھ ہوئے تو کچھ لوگ مشرق کی طرف پانی پت تک بھاگے۔ پانی پت کے نام سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کیونکہ موہن جو دڑو کی ایک قوم کا نام پنی یا پانی تھا جسے یہاں سے جلا وطن کیا گیا تھا۔ کچھ لوگ جنوب کی طرف بھاگے جن کا محل معلوم نہ تھا۔ یہ اس خبر سے معلوم ہو گیا۔

ان وجوہ سے جناب معین الحق فریدکوٹی صاحب (جن کا مراسلہ "ماہِ نو" بابت ستمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا) کو تقین کر لینا چاہیے کہ لوتھل اور رنگپور کا جو زمانہ مقرر کیا گیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو اب سنسکرت رسمِ خط تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ (۸۰۰) ق۔م تک سندھی رسمِ خط مستعمل تھا۔ اس لئے اس کی بجائے ان مہروں کے عکس حاصل کئے جائیں تو بہتر ہوگا۔

افسوس! میں نے یہ مہریں نہیں دیکھیں اور نہ ان کو حاصل کرنے کی توفیق ہی رکھتا ہوں۔ ورنہ بہت ممکن ہے یہاں کچھ تاریخی نوعیت کی مہریں مل جائیں۔ پاکستان میں جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں چاہیے کہ کم از کم ان کے عکس حاصل کر لیں۔ پھر شاید کوئی ان کو پڑھ سکے۔

سندھی رسم الخط کے ارتقا کے وجود سے اگرچہ قطعی انکار کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ بالکل برعکس ہے۔ (ابوالجلال ندوی)

۱ ۔ ہزایکسیلنسی مسٹر محمد ہاشم خان میوندوال سفیر افغانستان، صدر پاکستان کے سامنے اسناد سفارت پیش کر رہے ہیں

۲ ۔ وزیراعظم پاکستان کا پشاور میں اجتماع عام سے خطاب

۳ ۔ دولت مشترکہ کی پارلیمنٹری ایسوسی ایشن کے اراکین غلام محمد بیراج ملاحظہ فرما رہے ہیں

۴ ۔ پاکستان میں رہن سہن کا معیار بلند کرنے کی تحریک (لانڈھی میں مہاجرین کی بہبود کا مرکز)

جمہوریت نمبر مارچ ۱۹۵۸ء

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی دوسری سالگرہ پر

ایک یادگار پیشکش

''جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش،،

''ماہ نو'' گزشتہ دس سال سے برابر ہماری حیات ملیہ کی عکاسی اور

ہرجہتی ترقیات کا سیرحاصل جائزہ پیش کرتا رہا ہے۔

یہ علوم و معارف کا بہترین مخزن اور ثقافتی سرگرمیوں کا شاندار مرقع ہے

یہ ادب و فن کے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو مظاہر کو بروئے کار لاکر

دل و دماغ کو نئی نئی جولانگاہیں مہیا کرتا ہے۔

یہ بیک وقت ناظر بھی ہے اور مبصر بھی —— اس کے دامن میں ماضی و حال کے

نظرفریب جلوے بھی ہیں اور مستقبل کی سحرآفریں جھلکیاں بھی۔

جمہوریہ نمبر ـ اس کا سالانہ شمارۂ خاص ہے

جو پاک و ہند کے بہترین ارباب قلم کے جواہرپاروں سے مالامال اور متعدد دیدہ زیب

رنگین و سادہ تصاویر سے آراستہ ہوکر اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ

پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوگا

سرورق:۔ فنی محاسن اور تخلیقی ندرت‌کاریوں کا شاہکار

ایجنٹ و مشتہرین حضرات: سالنامہ کی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں اور

اشتہارات کی بکنگ کے لئے فی‌الفور متوجہ ہوں *

ادارۂ مطبوعات پاکستان ـ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

پاکستان م

لاہور میں اولیں بین
اسلامی مذاکرہ کا
صدر پاکستان ، جناب
کا خطبہ افتتا

مجلس مذاکرہ میں بیرونی
ممالک کے مندوبین

ملک فیروز خان نون ،
وزیراعظم پاکستان کا
ذہا ذہ کے اجتماع سے
خطاب

ماہِ نو

جلد ۱۰ شمارہ ۱۱

فروری ۱۹۵۸ء

مدیر

رفیق خاور

نائب مدیر

ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

بلادِ علم وفن، لاہور میں پہلی بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ اپنے پورے عروج پر تھی کہ نئے سال کا آغاز ہوا۔ بعض اوقات کوئی غیر معمولی بات امیدوں کے خاکے میں نیا رنگ بھر دیتی ہے اور مستقبل کے خواب روشن تر ہو جاتے ہیں۔ مجلس مذاکرہ کا شمار بھی اسی قسم کے واقعات میں ہے۔ یہ محض اتفاق ہی نہیں بلکہ براہِ راست اس نصب العین کا نتیجہ ہے جس کے لئے ہم نے پاکستان کی آزاد مملکت قائم کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ خالص اسلامی تصورِ حیات کے مطابق زندگی کو نشو ونما دینے، اسلامی تہذیب و تمدن کو دوبارہ بروئے کار لانے اور اقوامِ مسلم کو رشتۂ یگانگت میں منسلک کرنے کی جو تمنائیں ہم اپنے ساتھ لے کر نکلے تھے یہ مجلس مذاکرہ اس کی ایک عملی شکل ہے۔ پاکستان کو فخر ہے کہ اس قسم کا پہلا اسلامی اور دوسرا عالمی مذاکرہ یہاں منعقد ہوا ہے۔ اس شمارہ میں مذاکرہ کے علمی وفنی پہلوؤں پر دو مقالے پیش کئے جا رہے ہیں ؛

پچھلے دنوں ٹوکیو میں بین الاقوامی انجمن مصنفین، "پی۔ای۔این" کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مشرقی و مغربی ادبیات کے باہمی اثر پر ایک دلچسپ مذاکرہ ہوا جس میں ڈاکٹر عمر حیات ملک، سفیرِ پاکستان متعینہ جاپان، بھی شریک ہوئے۔ "ادبِ مشرق پر ادبیاتِ مغرب کا اثر" کے عنوان سے ان کی تقریر کا ترجمہ اس شمارہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ اس شمارہ کے ایک اور مضمون میں پیش کیا جا رہا ہے جس میں مغربی ادبیات پر مشرق کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے ؛

ہم اس شمارہ میں فضل احمد کریم صاحب فضلی کے زیرِ طبع ناول "خونِ جگر ہونے تک" کا ایک باب پیش کر رہے ہیں جس کا پس منظر مشرقی پاکستان ہے۔ بالخصوص ۱۹۴۳ء کا قحطِ بنگال اور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کا عرصہ۔ اس سلسلے کے دو اور ناول بھی ہیں۔ "سحر ہونے تک" اور "صبح کے بعد" جو تحریکِ پاکستان کے ساتھ ساتھ علی الترتیب ۴۷-۱۹۴۵ء اور ۵۰-۱۹۴۷ء سے متعلق ہیں۔ اس ناول میں مصنف نے اپنی محبوب صنف "غزل" کی تکنیک برتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختصار، اشاریت، جامعیت اور نرم روی کی ایک چھا جانے والی فضا ہے جس میں کردار اور واقعات اپنی بے پناہ ڈرامائی اور گہری المیہ کیفیت کے باوجود غیر محسوس طور پر سموئے ہوئے ہیں۔ اس ناول کو لندن کے مشہور ناشر "کاسلز اینڈ کمپنی" عکسی طباعت کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اور بعد ازاں اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی شائع کریں گے۔ اردو کا یہ پہلا ناول ہے جو اس اہتمام سے شائع ہو رہا ہے اور اس اعتبار سے بین الاقوامی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ ناول کی تکنیک ہی کچھ ایسی ہے کہ صرف ایک باب علیحدہ پیش کرنا نہ صرف ناظرین بلکہ خود ناول کے کرداروں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ اس لئے کہ ابتدائی باب میں بعض کرداروں کا ایک ہی رخ سامنے آتا ہے اور اس گہری اور وسیع ہمدردی کا پورا اندازہ نہیں ہو پاتا جو اس ناول کی روح ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ کسی آئندہ شمارے میں اس ناول کے کچھ اور حصے بھی پیش کریں ؛

ہندوستان میں اردو کی دو روشن شمعیں بجھ گئیں۔ ایک رام بابو سکسینہ، جنہوں نے انگریزی میں اردو ادب کی پہلی تاریخ لکھی تھی۔ دوسری پنڈت ہری چند اختر، اردو نظم ونثر کے ذہنی جوہر تو اپنی بذلہ سنجی سے ادبی محفلوں کو گرماتے رہے۔

پاکستان میں سید علی اختر حیدر آبادی کی وفات ایک اور سانحہ ہے جس نے شعر وسخن کو ایک نامور غزل گو سے محروم کر دیا ہے۔ ہمیں ان کی وفات پر دلی افسوس ہے ؛

سرورق : قلعۂ لاہور میں روغنی خشت سازی کا ایک دلآویز نمونہ ؛

غزل

بیفائدہ الم نہیں بیکار غم نہیں
توفیق دے خدا، تو یہ نعمت بھی کم نہیں

میری زباں پہ شکوۂ اہلِ ستم نہیں
مجھ کو جگا دیا یہی احسان کم نہیں

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں

یارب ہجومِ درد کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

شکوہ تو ایک چھیڑ ہے، لیکن حقیقتہً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

اب عشق اس مقام پہ ہے جستجو نورد
سایہ نہیں جہاں کوئی نقشِ قدم نہیں

زاہد کچھ اور ہو نہ ہو، میخانے میں مگر
کیا کم ہے یہ کہ فتنۂ دیر و حرم نہیں

مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز
اک سانحہ سہی مگر اتنا اہم نہیں

(۴)

یہ ہے اک خیال اور وہ بھی بخواب
ہے بزمِ شہادت سراپا غیاب
ہیں اپنے نشاں ہائے رازِ خیال
ہم اپنی نوا ہائے سازِ خیال
مبارک ہو غالب یہ تحریکِ ساز
بہ ایں طور ہوتا نوا سنجِ راز
جہاں میں نہ کیا اور باتیں رہیں
ذرا ہوش یا تجھ میں باقی نہیں
کہ جب کم ہو سینے میں آہنگِ خوں
تو نشتر سے کھولے رگِ ارغنوں
ہے کیا فائدہ بات ایسی کریں
اگر کوئی پوچھے تو چپ سادھ لیں
نہ برہم کر اندیشہ گفتار سے
نہ کہہ لب سے کچھ دل کی دل میں رہے
نہیں بات کرنا مناسب یہاں
اس آہنگ میں ہے زیاں ہی زیاں
جو پتھر سے شیشہ کو توڑیں گے ہم
کہاں اس میں طنبور کا زیر و بم
تصوف سے مطلب سخن پیشہ کو
سخن پیشہ مردِ کج اندیشہ کو
اگر تجھ میں یہ روشنائی نہیں
جو تو مستِ طرزِ سنائی نہیں
غزل پر غزل جام پر جام آئے
تجھے کیا سحر آئے یا شام آئے
نہیں ہے غزل تو چلے اور کچھ
ترا دم سلامت ہے اور کچھ
اگر پاس تو بانِ یاراں نہیں
سبھائیں رچانے کا ساماں نہیں
نمک آگ میں ڈالنا ناسزا
عبث ہو نمکسارات دانِ خون کا

غزل سے گھٹن ہو تو افسانہ کہہ
کہن داستاں ہائے مستانہ کہہ
میں خواہاں ہوں اے لاابالی خرام
تو ہر چند اٹھاتا ہے مستانہ گام

(۵)

تری چال کچھ اور مستانہ ہو
خرام سبک اور جانانہ ہو
ہیں شاہوں کی باتیں پرونا گہر
نوا حق کی ہے خون کرنا جگر
جگر خوں ہوا پھر یہ غلجان کیا
یہ دیکھو سخن کی ہوئی شان کیا
ہے یہ نظم کیا ایک طومارِ راز
رموزِ حقیقت کا رنگیں طراز
عیاں اس کے جلووں سے تکمیلِ حق
ہے ظاہر بھی باطن بھی تزئینِ حق
بہ انگیزِ معنی یہ پردازِ حرف
یہ ہنگامہ پرورِ طلسمِ شگرف
یہ یاروں کی باتیں، یہ یوں اور دوں
نہیں لاگ سے پھر جو الجھوں تو کیوں؟
کسی نے ریاضت کی تعریف کی
نہ عشرت ہی کی دھاک باندھی کبھی
کہاں رزکی باتیں کہ تھا ہی نہیں
سخن، اس پہ ہنستے ہی کیا نکتہ چیں؟
ہوا کیا جو لب ہائے خنداں نہ تھے
جوانی میں کیا دانت منہ میں نہ تھے
کہ جب رنج ہوتا مجھے بے کراں
تو لوگوں کی نظروں سے ہو کر نہاں
بہت کچکچا کر دلِ خستہ میں
بہ صد کرب میں گاڑ دیتا انہیں
ہے لب ہائے خنداں کا رونا ہی کیا
اب اس رنج میں جی کا کھونا ہی کیا

اسی رنج میں اب تو گھلتی ہے جاں
کہ افسوس! اب دانت منہ میں کہاں
ہوں بے برگ ہی اب تو میں گلفشاں
دمِ سرد کے ساتھ آتش زباں
ترقیٔ معکوس میری فسوس!
پریشانیوں سے ہے سرہائے بوس
ہے چرخِ کہن اور مری دشمنی
یہی چاہتا ہے رہوں خوار ہی
مجھے پالتا ہے سکھاتا بھی ہے
بڑھاتا ہے لیکن گھٹاتا بھی ہے
ہوئی دور سر سے ہوائے خودی
ہوا بید کی طرح سر دہی
قدِ خم شدہ لبسکہ چوگان ہے
ہے سر گیندِ اندیشہ میدان ہے
نہیں غم فلک سے جو سبکی ہوئی
کوئی بازی میں نے اگر ہار دی
ہے بازی سخن کی مرے ہاتھ ہی
اسے جیت سکتا ہوں میں ہر گھڑی

(۶)

کبھی ایسے کہ خود سے بھی بڑھ جاؤں میں
ہوں غالب پہ غالب وہ جا پاؤں میں
بڑھاپے کی کینہ ہے جواں دل مرا
ہے اب بھی مری طبع زور آزما
ہوں میں اک نوا سنجِ معنی طراز
طرحداری وضع پر مجھ کو ناز
ہو جب بھی خلش کاریٔ غم فزوں
تو اٹھتا جگر سے ہے طوفانِ خوں
یہی خون آنکھوں سے داماں پہ آئے
نہ ہو چشم میں پھر کبھی مژگاں پہ آئے
تھا نہ بر قلب و نقوشِ ضمیر
ہے ان میں ابھی تک وہی بوئے شیر

لطائف کہاں پھول منہ سے جھڑیں
رسے اور بسے سر بسر شہد میں
یہ وہ نغز باتیں ہیں مانند قند
خضر "دَتّا مَن قالَ" کہہ دے بلند
قلم نغمہ باری میں منقار ہے
کرے خونِ بلبل یہ وہ خار ہے
جو چاہوں تو مجھ میں ہے وہ دستگاہ
جہانِ ہنر میں ہے اس درجہ راہ
کہ فیاضِ مطلق کی تائید سے
سخن سے کروں محو سب مصر کے
سلف کے مثالوں سب شاہکار
عطا ہو نیا شاعری کو وقار
بناؤں وہ اورنگِ ہفت نشاں
کہ ہر پایہ ہو بالشِ قدسیاں
اگاؤں اک ایسا شجر شاندار
مہ و زہرہ جس پر کریں جاں نثار
کروں ایسی راہِ جلیل اختیار
خضر بھی ہو تقلید کو بے قرار
لب ایسی دعا تک رسائی کرے
اثر دوڑ کر پیشوائی کرے
کروں نقش ایسے رقم وجد میں
پیمبر بھی لا ریب فیہ کہیں
کروں فی المثل تازہ اپنی زباں
بہ اعجازِ بخت ہمایوں نشاں
ادھر میں ہوں اور میرا تیرہ بخت
ادھر ذکرِ سلطان بے تاج و تخت
میں وہ جس کو ہے بہرِ حسنِ کلام
شہنشہ، پیمبر، سپہبد، امام
گیا وقت جب شاعرانِ زمن
سناتے تھے افسانہائے کہن
کچھ اس طرح سے نکتہ انگیز ہوں
کہ مرغِ سحر خواں سے بھی تیز ہوں

ہے فردوسیِ میری نواؤں سے مات
طیورِ سحرخواں صلاؤں سے مات
جو گل ہو گئی شمع ساسانیاں
نمایاں ہوئی صبح ایمانیاں
رقم سنج منشورِ یزداں ہوں میں
کہ منجملۂ اہلِ ایماں ہوں میں
جو پروانۂ شمع بیگانہ ہے
نگاہِ خرد میں وہ دیوانہ ہے
بہ اقبالِ ایماں، بہ نیروئے دیں
کروں مدحتِ سیّد المرسلیںؐ
یہ وہ رہ ہے جس میں سفر ہیں بہت
رہ راست ہے پر خطر ہیں بہت
ہر اک گام پر ٹھوکریں، لغزشیں
اگر ہو بھی تو مختصر کیا کہیں
ہے لازم خرد سے خبردار رہوں
نہ مستی سے سرگرمِ گفتار رہوں
جو بات آئے لب پر سلیقے سے ہو
کہوں جو سخن وہ طریقے سے ہو
کسی کو میسر شبستاں بھی ہے
اور اس پر غضب ساز و ساماں بھی ہے
کہ مانندِ شاہاں ہر شب ہائے دے
رکھے سامنے آگ اور مرغ و مے
کسی کا بہ عشرت گہِ شہریار
بہاراں میں مے سے نفس مشکبار
ادھر میں کہ جاڑوں کے جاڑوں میں بھی
ہے دانوں پہ تسبیح کے زندگی
وہ محفل کہ جس میں ہو یوں احتساب
زر و دود و سرود و شراب و کباب
وہاں شاعری رنگ لائے تو کیا
سخنور سخن آزمائے تو کیا
سخن جس پہ وہ ناز فرما سکے
کہے بات ایسی کہ اترا سکے

کہاں وہ شہنشاہِ دیہیم جو
کہاں یہ شہنشاہِ درویش خو
ہے رندوں کو اس بزم میں بار کیا
مے و ساغر و زخمہ و تار کیا
فقط میں ہی کیا بہر رامش گری
جو زہرہ بھی آئے تو ہو مشتری
جو ہوتا یہاں خوشنوائی کو کام
رہ و رسم جادو نوائی کو کام
تو کرتا زباں وقفِ گفتار میں
دمِ جنبشِ زخمہ پُر کار میں
مرا زخمہ اوروں سے تیز اور بھی
مرا سازِ دل نغمہ خیز اور بھی
خوشا یہ طبیعت کی آزادگی
ہے پردہ میں جس کے نہاں خسروی
اسی سے تہی دست و خوش حال ہوں
بشارت دہِ اوجِ اقبال ہوں
نہ ہوتا اگر پائے دیں درمیاں
تو اک ہفت خواں کیا ہے ہفتاد خواں
بچھاتا کہ ہوں یادگارِ جہاں
خجالت دہِ نامۂ خسرواں
سوا تجھ سے اُڑتا بہ بالِ گزاف
تو سیمرغ لاتا تو میں کوہ قاف
تو سوسن کو لاتا پئے نغمگی
مجھے جنبشِ کلک رقصِ پری
تجھے بادہ ہائے گوارا سے کام
مے آشامیِ آشکارا سے کام
نصیبوں میں میرے مگر مے کہاں
نہنگوں کو ہاتھ آئے یہ شے کہاں
لہو سے پیالہ بھرے جاؤں میں
یونہی پیاس سے دل کو کلپاؤں میں
نہیں جبکہ یہ طور پیارے ترا
بھلا تجھ سے ہو پھر مری بات کیا

زیادہ دیکھو توان کو ہے ناز کیا
ترا جانشیں اور مورث مرا
اگر اس کو حاصل مئے ناب ہے
تو تلچھٹ سے رخ پر مرے آب ہے
کسی کو مئے عیش پرور ملی
کسی کے نصیبے میں تلچھٹ رہی
پئیں جو سدا بادۂ ارغواں
وہ کیا جانیں تلچھٹ کی سرمستیاں
وہ تلچھٹ کے رسیوں کا جوش و خروش
حریفانہ ہنگامۂ نوش نوش
بڑی لذتیں ہیں مئے ناب کی
مگر ہائے وہ دُرد کی سرخوشی
یہ پھر لوٹ پھر کر وہی داستاں
کہاں ہے ترا عہد و پیماں کہاں

ہیں غالب بہت عہد بوڑھے ترے
وہ پیمان ہوش اور فرہنگ کے
یہ ذکرِ مے و شیشہ و جام کیا
یہ طرز و روش اس کا انجام کیا
کہا تھا کہ مے سے ہوں بیزار میں
نہیں اب سے رند قدح خوار میں
چھٹی ہے شراب اور چھٹی بزم مے
ہوں میں اور ترکِ خرابات ہے
بتا پھر یہ دیوانگی کب تلک
مے و جام سے دل لگی کب تلک
کہاں تک رہیں گی تری غفلتیں
ترا گھر گذرگاہِ سیلاب میں
کہاں تک بتا کج خرامی تری
کہاں تک یہ آشفتہ کامی تری

کہاں تک اڑائے گا گرد و غبار
کہاں تک یہ آشوبِ لیل و نہار
نہ چل شورہ پشتی سے اس راہ میں
یہ کیا ہاؤ ہو ہے یہ کیا شور شیں
ادب اور آئیں ہو تیرا شعار
سخن کا ترے دیں پہ دار و مدار
چلے ایسی رہ پر کہ تیری جبیں
چمک اٹھے مانندِ مہرِ مبیں
ترا کام وہ کارِ باساز ہے
کہ روح الامیں تیرا ہمراز ہے
چلیں جیسے کشتی میں دریا نورد
نہ اٹھے تری راہ سے کوئی گرد
نصیبہ ترا کام میں سازگار
ہو پیوند دیں سے مدام استوار

★

کہیں ایسا نہ ہو جائے!

محمد نذیر

موج گرتی ہے گر کے اٹھتی ہے
بجھ گئی تلملا کے شمعِ شفق
اور اک سرمئی نحیف صدا
چپکے چپکے فضا میں پھیل گئی!

•

روحِ دریا کسے بلاتی ہے؟
کتنی وارفتگی ہے لہروں میں
جیسے نوبا کے ناچیں آدم خور
چیونٹیوں کی تھکی تھکی آواز
کس کی بیچارگی کا ماتم ہے!

•

ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو
جیسے آسیب مسکراتے ہیں
جھونپڑی کی جھکی جھکی چھت پر
سیٹیاں سی کوئی بجاتا ہے
ادھ کھلے ہونٹ، اٹھتے اٹھتے ہاتھ
پیٹ کی بھوک کو بھلائے ہوئے
جانے والے کی خیر مانگتے ہیں!

•

ایک بیتاب شور برپا ہے
سطحِ دریا پہ، ریگِ ساحل پر
آسمان اور آسمان والا
کتنے مجبور، کتنے بیکس ہیں!
موج گرتی ہے گر کے اٹھتی ہے!

غالب اور ٹونک

سید قدرت نقوی

میخانہ کا دروازہ کہاں اور واعظ کہاں۔ اسی طرح غالب کہاں اور فن کے ذریعہ کسب معاش کہاں۔ پھر بھی جب ۱۸۴۴ء میں پنشن اور جاگیر کی امید یاد رہوا ثابت ہوئی، طویل علالت سے اعضا مضمحل ہو گئے اور مسلسل ناکامیوں نے دل کو پژمردہ کر دیا تو وہ شاعری کو کچکول بنانے پر مجبور ہو گئے اور عام مدح سرائی شروع کر دی۔ اس لیے "میخانۂ آرزو" منقولہ ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں لمبے قصیدے اور ترکیب بند نسبتاً کم اور غزلیات زیادہ ہیں۔

غالب نے نواب وزیر محمد خاں والی ٹونک کی مدح میں دو قصیدے (نمبر ۵۶/۵ کلیات) لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک "کرم را۔ اہم را" ۱۸۳۸ء کے بعد اور ۱۸۴۶ء سے قبل لکھا گیا کیونکہ یہ "میخانۂ آرزو" میں نہیں اور کلیات مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں درج ہے۔ ایک مکتوب بنام سرور مارہروی مرقومہ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۸ء میں اس کا ذکر ہے۔ لہٰذا مولانا مہر کا یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ قصیدہ ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا۔ اس خط کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا پہلا حصہ چودھری عبد الغفور سرور کے نام ہے "اردوئے معلیٰ" میں جوں کا توں شاہزادہ بشیر الدین کے نام ہے۔ دونوں میں تاریخ درج نہیں۔ یہ "مکاتیب غالب" سے نقل کی گئی ہے۔ یہ بھی اس خط کی نہیں جیسا کہ عرشی کا خیال ہے، بلکہ خط نمبر ۳ کی تاریخ ہے۔ لہٰذا تاریخ کا تعین دشوار ہے۔ تاہم بموجب ترتیب ظاہر ہے کہ یہ خط ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے کا ہے۔ مولانا مہر کی رائے مطالعۂ تاریخ ٹونک اور قصیدہ میں ذکر پیری وضعیفی پر مبنی ہے۔ قصیدہ کے متعلق "سبد چین" کے قطعہ "ہمیں را۔ بریں را" نے غلط فہمی پیدا کی ہے جو وزیر الدولہ کے پہلے قصیدہ کے نہیں بلکہ دوسرے قصیدہ کے صلہ کی طلب میں بھیجا گیا تھا۔ اگر اس قصیدہ کے سلسلہ میں کوئی قطعہ بھیجا گیا تھا تو وہ مضمون اور طرز ادا میں مشابہت اور قطعہ میں قصیدہ کے ساتھ غزل کے تذکرہ کی بنا پر قطعہ نمبر ۲ ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں بھی "سبد چین" والے قطعے کی طرح کسی کا نام نہیں ہے۔ صرف "صلۂ مدح و قبول غزلم" کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ قصیدہ میں غزل بھی ہے۔ اور قطعہ کا مضمون (اپنی تعریف اور بے قدری کا شکوہ) اس سے ایک گونہ مناسبت رکھتا ہے۔ تاریخ ٹونک کے سلسلہ میں مولانا مہر اور "نگارؔ" کے مضمون نگار عظیم ٹونکی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ "سبد چین" والے قطعے میں "ایک قصیدہ" کہا گیا ہے مگر جیسا کہ حالی اور دوسرے محققوں نے بیان کیا ہے، اس کی نشان دہی نہیں کی۔ یہ قطعہ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۶۳ء دونوں سالوں کے مطبوعہ دیوان فارسی میں نہیں جس سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۶۱ء کے بعد لکھا گیا کیونکہ "کلیات غالب" ۱۸۶۱ء میں مرتب ہو کر منشی نولکشور کے پاس پہنچ چکا تھا اور ۱۸۶۳ء[1] میں چھپا۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح کیا جائے گا۔ یہ مفروضہ اور قیاس بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ ۱۸۶۱ء کے بعد لکھا گیا۔

مولانا مہر کی یہ توجیہ کہ اس میں بڑھاپے کا ذکر ہے اور غالب کی عمر ۶۵-۶۴ برس تھی محل نظر ہے۔ کیونکہ اول تو کلیات مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں شامل ہونے سے ظاہر ہے کہ اس وقت غالب کی عمر ۴۹ برس تھی۔ جو انحطاط کا زمانہ ہے اور غالب کو کثرت آلام اور علالت نے کمزور و ضعیف کر دیا تھا۔ یوں بھی ۱۸۴۵ء کے بعد غالب نے ضعیفی و ناتوانی کا مستقلاً شکوہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ قصیدہ نمبر ۱۶ سے ظاہر ہے۔ جن حالات سے غالب اس وقت دوچار تھے، ان میں ایسے حزنیہ خیالات کا اظہار عین ممکن تھا۔

نواب وزیر الدولہ کی مدح میں دوسرا قصیدہ نمبر ۵ ہے "عید اضحیٰ بسر آغاز زمستان آمد" مطلع اور بعد کے اشعار سے ظاہر ہے کہ یہ اس وقت لکھا

---

[1] خاتمۂ کلیات میں غالب نے اپنی عمر ۶۶ برس بتائی ہے۔ جس سے ۱۲۷۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ مہر و سرور نے بھی یہی تاریخ نکالی ہے۔ دوسری تاریخیں ۱۲۷۹ھ کی ہیں۔ لیکن کلیات ۱۸۶۳ء میں تیار ہوا جس کا غالب نے متعدد خطوط میں ذکر کیا ہے۔

گیا جب عید اضحیٰ جاڑے کے شروع میں آئی۔ ع۔م ٹونکی نے اس کا سال تالیف ۷۱، ۱۲۸۰ھ لکھا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں۔ سال کرہ کی علامت کو سہو کاتب مان لیا جائے اور ۲۷۱ء تسلیم کرلیں تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ غالب ۱۸۶۹ء میں فوت ہوچکے تھے۔ وزیرالدولہ اس سے بھی پہلے ۱۸۶۴ء میں فوت ہوچکے تھے۔ اگر اس کو ۱۲۷۲ھ قرار دیں تو بھی صحیح نہیں کیونکہ اس سال ذی الحجہ کی یکم ۱۴ راگست ۵۵ء کو تھی جو آغاز سرما کا زمانہ نہیں۔ مولانا عرشی نے کبرید اور جاڑوں کی یکجائی کی بنا پر سن ۶۵، ۶۶ یا ۶۷ قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان برسوں میں ستمبر ۲۷ راور اکتوبر ۱۸، ۸ کو ذی الحجہ کی پہلی ہوئی جب موسم سرما شروع ہوتا ہے۔ مگر غور کیا جائے تو ایک سال اور بھی ممکن ہے کیونکہ قصیدہ میں موسم کا پورا پورا بیان اور گردش آفتاب کے ساتھ فارسی مہینہ تک کا ذکر موجود ہے ؂

گرمی از آب بروں رفت حرارت زہوا   محمل مہر جہانتاب بہ میزاں آمد
روزی کاہد شب راست[1] ہمی افزائش روئے   موسم دیر غنودن بہ شبستاں آمد

سورج برج میزان میں ۲۱ ستمبر کے بعد داخل ہوتا ہے اور سن شاکھا کا مہینہ میزان ۲۳ یا ۲۴ ستمبر کو شروع ہوتا ہے۔ اور آبان (اینک مہ آبان آمد) کا مہینہ نصف کے قریب گزرچکا ہوتا ہے۔ ہندی مہینہ اسوج بھی انہی تاریخوں میں شروع ہوتا ہے جو جاڑے کا مہینہ خیال کیا جاتا ہے۔ اشعار سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عید کا زمانہ یہی تھا جو $\frac{۱۲۶۷ھ}{۱۸۵۱ء}$ ہوسکتا ہے کیونکہ یکم ذی الحجہ ۲۷ ستمبر کو واقع ہوئی تھی اور عید ۶ اکتوبر کو۔ پہلے کا زمانہ تسلیم کریں جو ۱۲۶۶ھ میں ۸ اکتوبر کو یکم ذی الحجہ اور ۱۷ اکتوبر کو عید واقع ہوگی۔ آبان ختم ہوکر آذر شروع ہوجاتا ہے: ۱۲۶۵ھ میں ۱۸ اکتوبر کو یکم ذی الحجہ اور ۲۷ اکتوبر کو عید ہوئی۔ سورج برج میزان کو چھوڑ کر عقرب میں داخل ہوچکا ہوتا ہے۔ اور آبان ختم ہوکر آذر بھی آدھا گزر چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا ۱۲۶۷ھ کو فوقیت ہے +

غالب جس شدت سے منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے قائل تھے، اس کے پیش نظر لازم تھا کہ وہ یہ قصیدہ ان کو بھی بھیجتے۔ افسوس ہے کہ "نادراتِ غالب" میں خط نمبر ۱۵ مرقومہ ۶ ستمبر ۱۸۵۱ء (۱۰ ذی قعد، ۱۲۶۷ھ) کے بعد مارچ ۵۲ء تک کی مراسلت میں سے صرف خط نمبر ۱۶ شائع ہوا ہے۔ باقی نہیں۔ اس عرصہ میں کئی خطوط ہوں گے جن میں اس معرکہ آرا قصیدہ کا ذکر ہوگا کیونکہ اس کی تمام ناقدین نے تعریف کی ہے۔ قطعہ کا سن تصنیف دیوان کی طباعت کو اساس قرار دے کر متعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بعید از قیاس ہے کہ غالب نے آٹھ نو سال صلہ کا انتظار کیا ہوگا۔ یہ قطعہ تھوڑی ہی دیر بعد لکھا ہوگا۔ جب صلہ ایک ہزار روپیہ مل گیا تو اس کو دیوان میں شامل کرنا خلافِ مصلحت تھا۔ "سبدِ چین" وزیرالدولہ کی وفات کے بعد غالب کی حیات میں چھپی۔ اس لئے یہ قطعہ اس میں شائع کر دیا گیا۔ مولانا مہر اور عرشی کے برعکس میری رائے میں یہ دوسرے قصیدے کا قطعۂ تقاضائی ہے۔ مالک رام نے بھی اسی قطعہ (نمبر ۲۲۔ سبدِ چین) کو اس قصیدے سے متعلق کیا ہے۔ قصیدہ کے دعائیہ اشعار اور قطعہ کے حسنِ طلب دونوں کے اچھوتے انداز کی یگانگت سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے جس طرح ممدوح کے لئے نئی اشیاء بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح اپنے لئے بھی چند چیزیں بطور ارمغاں نواب کی طرف سے ملنے کا اظہار ہے۔ جن کے لئے نواب نے حکم دے دیا ہے اور وہ جلدی اور آسانی سے جمع نہیں ہوسکتیں۔ نواب کو ان کے جمع ہوجانے کا انتظار ہے تاکہ وہ خط کے ساتھ روانہ کرے۔ دعائیہ اشعار میں قریب قریب قصیدہ کے دعائیہ مضمون کی تکرار ہے۔ قطعہ میں قصیدہ کی بعض چیزیں کم کردی ہیں بعض بڑھا دی ہیں۔ قطعہ کا مطلع یہ ہے ؂ گفتم بخردِ بخلوتِ اُنس   کاے شمع و چراغ ہمصفیاں

اس قطعہ کے بعد غالب کے ٹونک سے تعلقات کے سلسلہ میں ع۔م ٹونکی نے لکھا ہے کہ وزیرالدولہ کی وفات کے بعد مرزا نے ایک خط والیٔ رامپور کو یکشنبہ (۱۰ رجون ۱۸۶۶ء) کو لکھا تھا جو کسی طرح نواب محمد علی خاں والیٔ ٹونک کو مل گیا۔ اور وہی ان کی ناراضی کا باعث ہوا۔ اس کی تائید میں خط نمبر ۹۹ "مکاتیب غالب" سے استشہاد کیا ہے کہ نواب محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں نے گورنمنٹ کو "یمین الدولہ" اور دو جزو "ملک و جنگ" لکھ کر دئے اور وہاں سے ان کو وہ عطا ہوئے۔ حضور کے اجداد نے سلاطین بابریہ کا خطاب قبول نہ کیا مگر حضرت کے جد امجد کو احمد شاہ درانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" کیا۔ اگر مناسب جانیں تو اس خطاب کو مع دو جزو "شمس الملک و بہرام جنگ" ملکہ معظمہ سے بذریعہ گورنمنٹ حاصل کریں۔ پھر کہا ہے کہ نواب موصوف نے اس کو اپنے شایانِ شان نہ خیال کرتے ہوئے مرزا سے ترک تعلق کرلیا۔ اس کے لئے کسی کتاب یا روایت کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ غالب نے محمد علی خاں کی مسند نشینی پر ایک تاریخی مثنوی بھی پیش کی تھی جس پر غالباً نواب نے توجہ نہ دی۔ غالب نے بھی کوئی سلسلہ جنبانی نہ کی کیونکہ انہیں کسی انعام کی توقع نہ تھی۔ وزیرالدولہ کے دو پہ کے مطابق محمد علی خاں نے مثنوی کا صلہ نہیں دیا۔ اگر ملتا تو غالب قصیدہ بھیجتے۔ غالب نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے خود یہ سلسلہ

---

[1] کلیات میں 'راست' ہی چھپا ہے۔ میرے خیال میں 'داشت' ہونا چاہیے (ق۔ن)۔ (یہاں راست ہی صحیح ہے یعنی شب ما در افزائش روئے ہست۔ یوں بھی 'می کاہد' کے ساتھ 'ہمی' اعمال ہی مناسب ہے۔ 'راست' بمعنی 'عین' فصیح تر ہوگا۔ یعنی عین در افزائش روئے۔ (مدیر)

بند کر دیا۔ خط کی بنا پر ترکِ تعلق قابلِ یقین نہیں کیونکہ نواب رامپور کے نام نجی خط کا مضمون عام ہو کر نواب محمد علی خاں تک پہنچنا بعید از قیاس ہے۔ میر منشی کے سوا اور کسی کو علم ممکن نہ تھا۔ اور بعض خطوط تو میر منشی تک بھی نہ پہنچتے تھے بعض خطوط خود نواب صاحب چاک کر دیتے تھے (ملاحظہ ہو مکاتیب غالب خط نمبر ۳۰)۔

غالب نواب رامپور کے استاد تھے اور ایک شاگرد سے بعید ہے وہ استاد کی تشہیر کا باعث ہو۔ اس زمانہ کے نوابین کی وضعداری کے پیش نظر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ خود نواب یا ریاست کے کسی رکن نے اس خط کا مضمون ظاہر کیا ہو۔ خصوصاً جبکہ نواب صاحب اس امر کو شایانِ شان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ خود جواباً تحریر کرتے ہیں: "استعمال الفاظ خطاب دستور این ریاست نبودہ" درحقیقت غالب معاشی بدحالی کے سبب نواب رامپور کو خوش کرنے کیلئے نئے نئے اسلوب اختیار کرتے تھے۔ انہوں نے خیر خواہی جتائی۔ نواب کو پسند نہ آئی۔ غالب کو غلطی کا احساس ہوا۔ اور منظوم معذرت نامہ بھیجا جس کا آخری شعر یہ ہے:

چو رائے من نپذیری ز جرم من بگزر   بحق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

شیخ محمد اکرام صاحب نے اس معاملہ پر قیاساً کہا ہے کہ یہ مشورہ ایک قسم کا تملق تھا۔ نواب کو برافروختہ کرنے والی کوئی بات نہ تھی لیکن شاہانہ متلون مزاجی کے باعث ان کو یہ مشورہ پسند نہ آیا۔ معلوم ہوتا ہے رامپور میں اس مشورہ پر سخت نکتہ چینی ہوئی جس کی اطلاع میرزا کے خیر خواہوں (داغ یا امیر؟) نے پہنچا دی ہوگی۔ اسلئے انہوں نے بڑی لجاجت سے ایک فارسی قطعہ لکھ کر اپنے "جرم" جسارت کے لئے عذر خواہی کی۔

غالب نے اس خط کے بعد نواب رامپور کی خدمت میں ۱۰ر جولائی ۱۸۶۵ء کو تنخواہ وصول پانے کے بعد ایک خط لکھا۔ نواب صاحب کا خط ۵ار جولائی ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔ یہ ۱۸ر جون کے خط کا جواب تھا۔ غالب نے ۲۳ر جولائی کو پھر خط لکھا اور اسی کے ساتھ قطعۂ معذرت بھیجا۔ لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ قطعہ انہوں نے آخری چہار شنبہ کو لکھا جو ۲۴ر صفر ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۹ر جولائی ۱۸۶۵ء کو واقع ہوا تھا۔ اس قطعہ سے نواب صاحب کی کدورت جاتی رہی۔ اب وہ ناراض نہ تھے کیونکہ غالب نے ۱۱ر اگست کو تنخواہ کی رسید اور کمی بارش کے گلہ کا خط لکھا اور اسی کے ساتھ ایک دعائیہ قطعہ بھی لکھ بھیجا۔ نواب صاحب نے ۱۶ر اگست کے خط میں قطعہ پر اظہار خوشنودی کیا اور بتقریب صحت دو سو روپے عنایت کئے۔ ظاہر ہے کہ نواب نے اس واقعہ کو اہمیت نہیں دی اور قطعہ سے ان کا دل بالکل صاف ہو گیا۔ غالب نے ۲۱ر اگست کو ایک خط مع قصیدہ "مشتمل اس الزام پر کہ تشبیب کی ابیات اور مدح کے اشعار میں حمزہ و اولادِ حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ یا ان کے معاملات و حالات کا ذکر درمیان آوے" روانہ کیا۔ اسی دن دو سو روپے کی ہنڈوی آگئی۔ ۲۲ر اگست کو دوسرا خط لکھا جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ مجھے آپ کی خوشنودی چاہیئے۔

جب ایڈیٹر "دبدبۂ سکندری" نے بعض رؤسائے ہند کے متعلق مضامین شائع کئے اور نواب رامپور کا بہت کم ذکر کیا تو غالب نے ناراض ہو کر اس کی خریداری بند کر دی اور ایڈیٹر کی روش پر سخت نکتہ چینی کی۔ دراصل غالب نہ کسی رئیس ہند کے خلاف تھے اور نہ نواب محمد علی سے ناراض بلکہ وہ ہر طرح نواب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ غالب کا ایڈیٹر "دبدبۂ سکندری" کو یہ کہنا کہ "تم اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر اخبار حضور کی طرف سے ہے گویا گیجے سنگھ کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہوگی ...." صاف ظاہر کرتا ہے کہ غالب مذکورہ رئیس یا کسی اور سے ناراض نہ تھے۔ یہ تو محض نواب کو خوش کرنے کی حکمتِ عملی تھی اور بس۔

* * * * * * *

زائچہ طالع ولادت سعادت مطالع جناب ... خلد اللہ العالی کہ بوقت شب چہار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۸۱ ہجری مطابق آغاز ۱۸۶۵ء روی دادہ

زہرہ — سہم امراض — سہم اولاد — مشتری — مریخ — سہم السعادت — زحل

شاعر

★

فضا ابن فیضی

شاعر ایک سوال
تیکھی چتون، کڑوے تیور، بکھرے بکھرے بال
شاعر ایک جلال
فکر کے سوزِ رنگیں سے لو دیتے خدّ و خال
شاعر ایک شراب
سوئی سوئی بیداری اور جاگا جاگا خواب
شاعر اک تفسیر
صحنِ چمن میں برگِ گل پر شبنم کی تحریر
شاعر اک احساس
سوزِ فروزاں کی چنگاری قلب و نظر کے پاس
شاعر اک ادراک
چیر گئی ہے عرش کا سینہ جس کی نگاہِ پاک
شاعر اک تعمیر
جس کے قلم کی نوک سے زندہ قوموں کی تقدیر
شاعر اک مفہوم
جس کی نظر کی اک اک جنبش صد روحِ منظوم
شاعر اک امروز
وہ امروز کہ فردا جس سے اندیشہ آموز
شاعر اک انجیل
نطق کلیم و سوزِ خلیل و افسونِ جبریل

شاعر اک ہیجان
ساحل ساحل جوشِ دروں کے بکھرے ہیں طوفان

★

شاعر ایک سرور
باطن فطرت سے پھوٹا ہے بن کر سیلِ نور
شاعر ایک شعور
جس کی جبیں کو چھو کر روشن ہو گئے کتنے طور
شاعر اک ضمیر
جس نے سنایا روحِ سخن کو پیغامِ برخیز
شاعر اک رجحان
پھول کی حس، نرگس کی بصیرت، کلیوں کا وجدان
شاعر اک اعجاز
میر کا نشتر، فانی کا غم، اصغر کا انداز
شاعر ایک خیال
غالب کی دشوار پسندی، فلسفۂ اقبال
شاعر اک عکاس
مومن کی باریک نگاہی، حسرت کا احساس
شاعر ایک رسول
جس کی رسالت کے شاہد ہیں چاند، ستارے، پھول

★

خطوط

ذاکر محمد قاسم

★

یہ خطوط فضائے بسیط میں لرزاں
نشہ سی آنکھوں کی پلکوں پہ ناچتی ہوئی نیند
میں کوہسار میں اک جھیل کے کنارے پر
یہ جھیل کالا دوپٹہ چنا ہوا جیسے
خطوط ابھرتے ہیں، مٹتے ہیں پھر ابھرتے ہیں
سمٹ سمٹ کے کوئی رو رہا ہے لہروں میں
خوشی کی تھاپ پہ رقصاں ہیں نیز دل کی [illegible]
بجھے بجھے سے ستارے اداس اداس سی جھیل
سپیرا وقت بجاتا ہے جھوم جھوم کے بین
تڑپ رہا ہے ستاروں کی سیج پر کوئی
نسیم صبح کے ہونٹوں پہ پھیر دیں کس نے
پلک جھپکتے ہی دنیا نے پھیر لیں آنکھیں

سیاہ بالوں سے منہ ڈھانپے سوچتی ہوئی رات
خموشی ایسی کہ کرتا ہو کوئی دل سے بات
اندھیری رات میں خاموش روشنی کی کرن
شکن شکن میں لپیٹے ہے دھڑکنوں کا چمن
کسی نے چوڑیاں پنگھٹ پہ آج توڑی ہیں
کسی کی ہچکیاں لہروں نے آج گن لی ہیں
ہیں رقص و نغمہ میں سرشار امید کی پریاں
کسی نے حسن و وفا کی بکھیر دیں لڑیاں
چٹیلی ناگنیں ہیں سطحِ آب پر بیکل
اندھیری رات کی آنکھوں سے اڑ گیا کاجل
ہوا کی سانسوں میں جھرنوں کا ہی تار چڑھاؤ
ستے زمانہ کہ اب تم سیلے پن سے بچاؤ

مذاکرہ:

ادبِ مشرق پر ادبیاتِ مغرب کا اثر

ڈاکٹر عمر حیات ملک

آج کے مذاکرہ میں ہم اس موضوع پر اظہار خیال کر رہے ہیں کہ مشرقی و مغربی ادبیات نے ایک دوسرے پر کیا اثر ڈالا ہے۔ ہمارا مطلب وہ اثرات ہیں جو موجودہ یا آنے والے دور کے مصنفین سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ کے بعض ادوار میں بلاشبہ مشرق نے مغربی ادبیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مثلاً وہ دور جب کہ اہلِ عرب پورے سات سو سال تک ہسپانیہ پر حکمران رہے۔ اس وقت اکثر مغربی ممالک میں عرب کی تقلید فیشن میں داخل تھی۔ مگر یہ تو ہوئی محض تاریخ کی بات۔ یہاں تو سوال موضوع کے الفاظ کا ہے جن میں حال و مستقبل کی تخصیص کر دی گئی ہے، اس لئے ہمیں بحث کے دوران لامحالہ انہی دو زمانوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

سب سے پہلے تو یہی بیان کر دینا ضروری ہے کہ مشرقی و مغربی ادبیات میں باہمی اثر کا پلہ مساوی نہیں رہا ہے ــــ ان تمام شواہد کے باوجود جو میرے دوست پروفیسر وان گلےسن آپ، معلم ہندیات، ٹیوبنگن یونیورسٹی نے پیش کئے ہیں، یا ان مزید کوائف کے جو اس سلسلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں، مشرقی ادب کا اثر مغرب پر بہت کم رہا ہے اور ہم اس کو کچھ ایسا وقیع نہیں قرار دے سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ میں بعض ایسے فاضل لوگ گزرے ہیں، بالخصوص جرمنی، انگلستان اور فرانس کے حلقہ ہائے علم و دانش میں جنہوں نے مشرقی ادب کو مغرب سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً برسبیل تذکرہ کیمبرج کے پروفیسر براؤن، جرمنی کے پروفیسر میکس ملر وغیرہ جن کی کوششیں ایران اور ہند کے سرمایۂ ادب کو مغرب سے متعارف کرنے کے لئے وقف رہیں۔ یہ اثر چند خاص خاص لوگوں ہی تک محدود رہا۔ اس کے برعکس مشرق کا اثر معاصر مغربی مصنفوں پر، میرے خیال میں، بہت محدود ہی رہا ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ بعض مشرقی تصانیف جنہوں نے مغرب میں وسیع دلچسپی پیدا کی ہے لازماً اپنے ملک کی ادبی تخلیقات کے بہترین نمونے تصور نہیں کئے جاتے تھے۔ اس کی ایک عمدہ مثال، اور وہ بڑی مشہور مثال بھی ہے، عمر خیام کی رباعیات ہیں جنہوں نے اہلِ مغرب کے تخیل پر ایک طلسماتی اثر کیا ہے۔ مگر جس سرزمین میں یہ بروئے کار آئیں وہاں ان کو کچھ ایسی قدر و منزلت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ میرا خیال نہیں کہ ایران کے اربابِ ذوق عمر خیام کو آج بھی ایک بڑا شاعر یا اس کی رباعیات کو شاعری کا ایک مایۂ ناز شاہکار تصور کرتے ہوں۔ عمر خیام اپنے وطن ایران میں اور اس کے باہر زیادہ تر ایک ریاضی دان اور واقعی اچھے ریاضی دان کی حیثیت سے مشہور ہے نہ کہ ایک شاعر کی حیثیت سے۔

ایک اور مثال لیجئے جو اور بھی نمایاں ہے۔ فارسی ادب کی بعض عظیم الشان تخلیقات مثلاً مثنوی معنوی مولانا جلال الدین رومی کو جو فارسی کی ایک عظیم نظم ہے، یورپ میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے جرمن زبان میں اس کا ترجمہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو صرف اس کے ایک مختصر حصے کا ترجمہ ہی دستیاب ہو سکا، جس پر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ امید نہیں کہ کسی اور مغربی زبان میں ساری کتاب کا ترجمہ موجود ہو۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ مشرقی ممالک، اور خود میرے وطن پاکستان میں، بعض معاصر مصنفوں کی ایسی تصانیف ہوں گی جو مغربی مصنفوں اور اربابِ فکر و نظر کے لئے مطالعہ کے لائق ہوں۔ لیکن نہ ان کا ترجمہ کیا گیا ہے اور نہ ان سے کوئی دلچسپی محسوس کی گئی ہے۔

دلچسپی کے اس فقدان کی وجہ کیا ہے؟ ہم مشرق کے لوگ اُن تمام امور سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں جو ہمیں دیارِ مغرب سے پہنچتا رہتا ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں سے بعض چیزیں کچھ ایسی اعلیٰ قسم کی نہیں پھر بھی ہم لوگ ان سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اور

آپ نے خود جاپان میں بھی دیکھا ہے، ادبیات مغرب کا بہت سا حصہ جاپان اور دیگر مشرقی ممالک میں ترجمہ و اخذ کے ذریعے سے داخل کیا جا چکا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ یورپ یعنی مغرب کو مشرقی ادب سے کوئی دلچسپی نہیں؟ جیسا کہ مجھ سے پہلے ایک مقرر نے بیان کیا ہے، اگر ان مشرقی کتابوں کا مغربی زبانوں میں ترجمہ بھی کر دیا جائے تو بھی ان کا کم ہی مطالعہ کیا جائے گا۔ اس عدم دلچسپی کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا حقیقی سبب مغرب کا مشرق پر سیاسی غلبہ ہے۔ سیاسی اسباب کا ایسے معاملات پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ جو قومیں دوسروں سے مغلوب ہوں۔ اپنوں یا دوسروں سے۔ بات ایک ہی ہے۔ ان کی روح پرواز اور عروج کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ انسانی فطرت غلامی میں نشو و نما نہیں پا سکتی، خواہ یہ غلامی بیرونی ہو یا اندرونی یہی حال مشرق کا پچھلی چند صدیوں سے ہے۔ مشرق، قریب قریب سارے کا سارا مغرب کے سیاسی جوئے تلے دبا رہا ہے۔ اور یہاں کے لوگوں میں وہ خود اعتمادی، وہ انگیخت نہیں پیدا ہوئی کہ وہ اپنے طور پر سوچ سکیں اور بہت اعلیٰ پیمانہ کا ادب پیدا کر سکیں غالباً یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ مشرقی ادب مغرب کی توجہ اپنی طرف منعطف نہیں کر سکا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشرق، مغرب سے اس قدر مختلف ہے گویا اس کی دنیا ہی اور ہے۔ ایک مقرر نے کہا ہے کہ جاپان اس کے لئے ایک بالکل نئی دنیا ہے۔ اس لئے اس بنیادی فرق کی وجہ سے مغرب کے لئے مشرق سے دلچسپی رکھنا بہت مشکل ہے۔ اگر یہ بات ہے تو میری رائے میں اس فرق کو اور بھی دلچسپی پیدا کرنی چاہئے تھی۔ فرق ہمیشہ برگشتگی ہی نہیں پیدا کرتا۔ میرے خیال میں یہ تو دلچسپی پیدا کرتا ہے، اس کو ابھارتا ہے۔ بنابریں میری رائے میں تو مشرق کو اس فرق کے باعث مغربی مصنفوں اور مشتاقانِ ادب کی خصوصی دلچسپی کا موجب ہونا چاہیئے۔ اور پھر اگر ہم غور کریں تو کیا مشرق و مغرب میں اختلاف اتنا ہی زیادہ ہے کہ مشرق کو ایک بالکل نئی، ایک بالکل مختلف دنیا تصور کیا جائے؟ اگر کوئی گلی کوچوں میں پھرتا آدمی ایسی بات کہے تو ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ جو فن کے بڑے بڑے شاہکار پیدا کر رہے ہیں، ادب کے شاندار نمونے پیش کر رہے ہیں اور اس لئے نوع انسان کو محض دیکھتے ہی نہیں بلکہ اس کی گہری اور بھرپور واقفیت بھی رکھتے ہیں، ان کا یہ کہنا ہرگز قابل فہم نہیں ہو سکتا کہ مشرق کی دنیا مغرب سے بالکل الگ اور مختلف ہے۔ مشرق کی دنیا بعینہٖ مغرب کی دنیا ہے۔ اور مشرق کے لوگ بھی بالکل مغرب ہی کے لوگوں جیسے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ جاپانی لوگ تو بس معمہ ہیں۔ ان کی فطرت کو سمجھنا مشکل ہے۔ میں نے اس ملک میں ڈھائی سال زندگی بسر کی ہے۔ اور مجھے جاپانیوں سے ملنے کے کتنے ہی موقعے ملے ہیں۔ مجھے تو وہ بالکل ویسے ہی لوگ لگتے ہیں جیسے میرے اپنے ملک کے لوگ، یورپ کے لوگ، امریکہ کے لوگ۔ ان کے بھی وہی احساسات ہیں، وہی جذبات، وہی تمنائیں، وہی مقاصد، وہی کمزوریاں، وہی مصیبتیں، وہی آزمائشیں جیسی دنیا کے اور لوگوں کی ہیں۔ اور یہ بات، میں بہ ادب گزارش کروں گا، ان تمام لوگوں کو یاد رکھنی چاہیئے جو ادب کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور مشرقی و مغربی ادبیات میں تبادلۂ باہمی کو بیش از بیش ترقی دینے کے خواہاں ہیں۔

اب مغربی ادب کے مشرقی ادب پر اثر کی طرف آیئے جو ہمارا حقیقی موضوع ہے، کیونکہ اثرات کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف رہا ہے اور مشرق کے اثرات مغرب پر بڑے معمولی ہیں۔ ہاں تو مغربی ادب کے اثرات بہت عمیق اور بہت ہی دوررس ثابت ہوئے ہیں۔ یہ اثرات مشرقی ادبیات کی ہیئت پر بھی طاری ہوئے ہیں اور مواد پر بھی۔ اور ان کے مواد پر پڑ تو فگن ہو کر انہوں نے مشرقی قوموں کے افکار کو بھی رنگ دیا ہے اور ان کے رہن سہن، طور طریق کو بھی۔ یہ دنیا کی تاریخ میں ایک بہت ہی اہم واقعہ ہے کہ مغرب کو مشرق پر صرف سیاسی غلبہ ہی نہیں بلکہ ذہنی غلبہ بھی حاصل رہا ہے، جس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چنانچہ اس کے اثرات بہت دوررس رہے ہیں، اچھے بھی اور برے بھی۔

سب سے پہلے ایشیائی ممالک کی شاعری کو لیجئے۔ خاص طور پر میرے اپنے دیس پاکستان کی شاعری۔ مغربی شاعری نے اس پر اثر بھی ڈالا ہے اور اس کو کئی طرح مالا مال بھی کیا ہے۔ نئے نئے اوزان اور نئی نئی ہیئتیں بروئے کار آئی ہیں۔ خصوصاً نظم آزاد اور نثر، کم از کم پاکستان میں تو مغرب ہی کی پیداوار۔ ہماری دونوں زبانوں اردو اور بنگالی میں نثر کافی ترقی یافتہ ہے۔ مگر یہ سب کچھ حکامِ فرنگ کے اس صنف کو دانستہ ترقی دینے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں یہی بات کم و بیش دوسرے ملکوں پر صادق آتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں کہ ہم اپنے ادب کی ان اصناف کو ترقی دینے کے معاملہ میں مغرب کے بہت ہی ممنونِ احسان ہیں۔ یہاں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مشرقی شاعری، مشرق کے انحطاط کے باوجود ایک بڑا ترقی یافتہ فن ہے۔ کئی مشرقی ممالک میں شاعری نے بہت بلند پیمانہ پر ترقی کی ہے۔ اس لئے

مغرب کو اس پر زیادہ توجہ دینی چاہئیے۔ اگر میں یہ کہنے کی جسارت کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ عجب نہیں اس سے مغرب میں فنِ شاعری کو ترقی کرنے میں مدد ملے۔

اب مواد کی طرف آئیے۔ جس پر مغربی اثرات نے بڑے وسیع نتائج پیدا کئے ہیں۔ مغربی ادب کی بدولت ہمارے یہاں نئے تصورات آئے خصوصاً سیاسی آزادی، جمہوریت، مساوات اور مرد و زن کی برابری، بیشک ایسے تصورات مشرقی ادبیات اور نظام ہائے فکر میں نایاب نہیں۔ مثلاً جمہوریت میرے مذہب اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جو ہمارے نظامِ معاشرت میں خوب رس بس گئی ہے۔ شاید دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ۔ لیکن انسانی آزادی و حقوق اور سیاسی جمہوریت کے تصورات اور ان کا اس قدر وسیع پیمانہ پر اطلاق، میرے خیال میں، بیرونی ہی ہیں اور کم از کم علمی حیثیت سے مشرقی قوموں کے لئے اجنبی ہیں۔ ہم اہلِ مغرب اور ان کے ادب کے ممنون ہیں کہ وہ ان تصورات کے مغرب سے مشرق میں پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ نیز ان کی بدولت یہ تصورات عام اور ہر دلعزیز بن کر مختلف مشرقی ممالک میں عملی طور پر رائج ہوگئے ہیں۔ شومئی قسمت سے اس دنیا میں کوئی بھی ایسی اچھی چیز نہیں ہے۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ جو اپنے پیچھے کوئی برا نتیجہ نہیں چھوڑتی۔ خالص نیکی (خیر محض) اور خالص برائی شاید موجود ہی نہیں ہیں۔ اس لئے جمہوریت، انسانیت اور ایسی دوسری چیزیں ہیں تو بہت اچھی، بہت کارآمد، لیکن ان کے باعث قومیت پرستی وجود میں آئی ہے۔ ہم مشرقی لوگ بعض اعتبار سے اہلِ مغرب سے بھی زیادہ قومیت پرست ہیں۔ شاگرد اور پھر ایسے شاگرد! مجھ سے پوچھئے تو میں قومیت پرستی، خصوصاً انتہا پسندانہ قومیت پرستی کو دنیا کے لئے ایک خطرۂ عظیم تصور کرتا ہوں۔ اس لئے جہاں میں مغرب اور ادبِ مغرب کے دئے ہوئے آزادی و جمہوریت کے تصورات کو خوش آمدید کہتا ہوں وہاں میں افسوس بھی کرتا ہوں۔ مجھے شکایت ہے تو مشرق سے نہ کہ مغرب سے۔ کہ ہم نے بھی قومیت پرستی کو مغرب سے اس کی انتہائی شکل میں قبول کر لیا ہے۔

جمہوریت و مساوات، اور انسانوں کے اپنی خوشحالی و بہبودی کو خود ترقی دینے کے حق کے ساتھ ایک اور بات۔ ایک اور ناگوار بلکہ کچھ اچھا اور کچھ ناگوار نتیجہ، یہ ہے کہ مشرق کی پرانی روایات اور عقیدے پارہ پارہ ہوگئے ہیں۔ کم از کم مغربی ادب کے مشرق پر اثر کے باعث وہ متزلزل ضرور ہوگئے ہیں! یہ عمل کچھ اس طرح غیر محسوس طور پر، آہستہ آہستہ، جاری رہا ہے۔ کہ جن لوگوں کے عقیدے پارہ پارہ ہو گئے ہیں وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ سب ہوا کیسے۔ وہ اب بھی خیال کرتے ہیں کہ ان کے خیالات وہی پرانے خیالات ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ میرے وطن پاکستان میں، جس کی اکثریت مسلمانوں ہی کی ہے۔ اور ہم اسلام ہی کے کلمہ گو ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ وہ آزاد خیال لوگ جنہوں نے مغربی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، یہ کہنے کی مجال نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام کے قائل نہیں ہیں۔ کسی سیاسی گیر و دار کے خوف سے نہیں۔ ہم اتنے روادار اور وسیع المشرب واقع ہوئے ہیں کہ لوگوں پر ملحدانہ عقائد کی بناء پر تشدد نہیں کرتے۔ لوگ اسلام کے قائل نہ ہونے کا کھلم کھلا اظہار اس لئے نہیں کرتے کہ اسلام میں اعتقاد تو محض علاماتی ہے، کم از کم انتہا پسند روشن خیال لوگوں کی حد تک۔ یہی صورتِ حال تمام دنیائے مشرق میں ہے۔ جاپان ہی کو دیکھئے۔ یہاں بعض حلقوں میں پرانے عقیدے مٹ چکے ہیں، بعض میں بہت دھیمے پڑ چکے ہیں اور ایک قسم کا روحانی خلا پیدا ہو چکا ہے، خصوصاً نئی پود میں۔ اسی طرح تمام دنیائے مشرق میں افکارِ مغرب کے اثر سے ایک روحانی خلا پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ یہ اثر مغربی ادب ہی کی بدولت پیدا ہوا ہے یعنی اس کے معتبر ذرائع میں سے ایک یہی ہے۔ اور سب سے بڑی بد قسمتی یہی ہے کہ ابھی تک پرانے عقیدوں کی جگہ کوئی نئے عقیدے نہیں پیدا ہو سکے۔ پرانے مشرب مٹ چکے ہیں اور ان کی جگہ کوئی نیا مشرب موجود نہیں۔ یہ صورتِ حال بڑی خطرناک ہے۔ فارسی کی ایک مشہور مثل ہے کہ "خانہ کہ خالی باشد دیو گیرد"۔ اس لئے ہمیں اس شیطان کی طرف سے خبردار رہنا چاہیئے۔ میرے خیال میں یہ بات اشد ضروری ہے کہ کوئی نیا مشرب پرانے مشربوں کی جگہ لے لے، خواہ کسی پرانے مذہب کے احیا سے یا کوئی اور مذہب پیدا کر کے۔ کیونکہ مغرب اور مغربی ادب کے پرانے مشرب تو اب ٹوٹ پھوٹ کر ڈھیر ہو چکے ہیں یا ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔

بدقسمتی سے مجھے پھر پوچھنا پڑتا ہے کہ کیا مغرب ہمیں کوئی نیا مذہب دے سکتا ہے یا معاصر مغربی ادب اس کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ اشتراکیت بھی ایک مذہب ہے۔ ہے تو سہی لیکن میرے خیال میں ہم اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے، کیونکہ اس میں صرف انسان کی مادّی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، روحانی ضروریات کو نہیں۔ اور ہم انسان کبھی محض مادّیت سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ کیا جمہوریت ایسا مذہب ہے؟ ایک حد تک شاید۔ لیکن یہ روح کو گرما نہیں سکتا، اور جو روح کو نہ گرمائے وہ کبھی تسلی بخش نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مجھے یقین نہیں کہ انسان کبھی اس شرف و امتیاز کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے یا اپنے تمام ممکنات کو بروئے کار لا سکتا ہے، تاوقتیکہ وہ پھر کسی مشرب میں ایسا ایقان نہ پیدا کر سکے جس کا وہ پوری گرمجوشی اور خلوص سے گرویدہ ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا کہ کوئی بڑا ادب اس وقت تک جنم نہیں لے سکتا جب تک اس میں ایمان کی حرارت کارفرما نہ ہو۔ میری رائے اگر صحیح نہ ہو تو آپ اس کی تصحیح کر سکتے ہیں۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو وہی دور زیادہ بار آور ثابت ہوئے ہیں، اور انہیں میں ادب بھی زیادہ بار آور رہا ہے، جن میں ایمان کی حرارت کارفرما تھی اس وقت لوگوں نے صرف اس لئے لکھا کہ ان کے دلوں میں ایک شدید خواہش پیدا ہوئی تھی۔ ایسی خواہش جو ان کے جذبۂ ایمان کا نتیجہ تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں نہ کہ انہیں ذریعۂ معاش بنائیں۔ غالباً گوئٹے نے ہی کہا تھا کہ تاریخ کے وہی دور فنی و ادبی حیثیت سے بار آور ثابت ہوئے ہیں جن میں ایقان نے الہامی احساس پیدا کیا تھا۔ ایقان سے میرا مطلب کوئی بھی عقیدہ ہے۔ کوئی خاص مشرب یا مذہب نہیں۔ اور وہ دور جن میں اس اعتقاد کی تحریک نہیں رہی وہ ہمیشہ بے برگ و بار اور بنجر ثابت ہوئے ہیں۔

جہاں تک میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، ضعفِ یقین کا دور تہذیب و تمدن کے انتشار کا دور ہوتا ہے۔ جب یقین ماند پڑنے لگ جاتا ہے، تو تمدن بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہی نظریہ آسوالڈ سپنگلر نے بھی اختیار کیا ہے جس کے متعلق بہت کچھ بحث و تمحیص کی گئی ہے۔ تو پھر وہ کونسا اعتقاد ہے جس سے ہم نوعِ انسان کو اب بھی گرما سکتے ہیں، ادب میں ایسا ہی احساس پیدا کر سکتے ہیں، اور فن میں فیضان کی ولولہ آفرینی؟ کم از کم ایک اعتقاد ہمارے سامنے بالکل بنا بنایا تیار ہے۔ اور وہ ہے نوعِ انسان کی یگانگت۔ اگر ہم کسی روایتی مذہب سے وابستہ ہونا پسند نہیں کرتے تو کم از کم نوعِ انسان کی وحدت کا اعتقاد تو پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ کہ نسلِ آدم تمام اختلافات کے باوجود، جو محض سطحی ہیں، ایک ہی ہے۔ اگر ہم نوعِ انسان کی وحدت پر یقین رکھیں اور اس طرح تمام بنی آدم سے حقیقی دلچسپی محسوس کریں تو اب بھی بڑا ادب اور بڑا آرٹ پیدا ہو سکتا ہے، لہٰذا مغربی ادیبوں پر ذمہ داری کا ایک بہت بڑا بوجھ ہے، جن میں سے بعض نامور ہستیاں آج یہاں بھی موجود ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ صرف اپنے ممالک بلکہ مشرقی ممالک کے خیالات کو بھی تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے شانوں پر واقعی ایک بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کٹھن مہم میں پورے اتر سکتے ہیں اور ان میں وہ اوصاف موجود ہیں جو دنیا پر اثر ڈالنے کے لئے ضروری ہیں یعنی ذہنی و اخلاقی بلندی اور خیالات کا آزادانہ اظہار۔ بدقسمتی سے دنیا میں آزادی پر بڑی پابندیاں ہیں کچھ حکومتوں کی طرف سے جو بعض مملکتوں میں نسبتاً کہیں زیادہ ہیں۔ اور بعض اُس نہایت قوی ادارہ کی طرف سے جو نشر و اشاعت کا کفیل ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ آج کل کے ادیب ان پابندیوں پر غالب آ جائیں گے اور ساکنانِ عالم پر اثر ڈالیں گے۔ مغرب میں بھی اور مشرق میں بھی جس سے انسان کا وقار بڑھ جائے گا اور اسے یہ تحریک دلائے گا کہ وہ اشرف المخلوقات کی حقیقی عظمت و شان تک رسائی پیدا کرے۔

(مترجمہ: ع۔ ن)

مشرق و مغرب کا ادبی افق - ۱

آنریبل جسٹس سر امیر علی (مرحوم)
ر اسلامی مورخ جنھوں نے اپنی انگریزی تصانیف سے
مغرب کو اسلامی تاریخ و تمدن سے روشناس کرایا

رڈیارڈ کپلنگ
مشہور اینگلو انڈین صحافی ، شاعر اور ناول نویس
جس نے برصغیر کی مقامی زندگی اور کرداروں کے
نہایت دلکش مرقعے پیش کئے

شاہد سہروردی
مشرقی پاکستان کے فصیح و بلیغ شاعر اور ادیب
جنھوں نے انگریزی زبان کو کئی شاہکار
عطا کئے ھیں

مشرق و مغرب کا ادبی افق - ۲

بشپ ہیبر
پادری جو مدتوں کلکتہ میں رہا اور اس نے ایسی نظمیں
لکھیں جن میں بنگال کی جھلک نمایاں ہے

سر ولیم جونز
مشہور مستشرق جس نے مشرقی علوم و فنون کے
مطالعہ اور تحقیق کی بنیاد رکھی

ای - ایم - فارسٹر
جنھوں نے بر صغیر کے متعلق دلچسپ ناول
اور کتابیں لکھ کر مشرق کو مغرب سے
روشناس کرانے اور دونوں کو قریب تر
لانے میں سعی بلیغ کی ہے ۔

مشرق و مغرب، ادب کے آئینے میں

مایا جمیل

آغا حشر نے جو شکر یورپ ادا کیا تھا کچھ ایسا بیجا نہ تھا۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب اہل یورپ پہلے پہل سولہویں صدی میں ہمارے یہاں آئے ــــ تاجر، سپاہی، منچلے مہم پیما، نئی دنیا کے متلاشی۔ انہیں کچھ بھی کہہ لیجئے مگر حق یہ ہے کہ وہ "سفید قوموں کا بوجھ" اپنی پیٹھ پر لئے ہوئے ضرور آئے۔ ان کی اجنبی وضع، طور طریق، بول چال، زندگی اور خیالات ہم میں پوری طرح رچ گئے۔ ہمارے سماج، تعلیمی نظام، سیاسی تصورات، نظم ونسق اور زبان و ادب کے رگ و ریشے میں انہی کا اثر سمایا ہوا ہے۔ بعض الفاظ تو اکبر اور جہانگیر کے زمانے ہی میں زبان زد عام ہو چکے تھے۔ جوں جوں سیاسی غلبہ بڑھتا گیا بیرونی اثرات میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ اردو ادب کی کتنی ہی چیزیں مثلاً اصناف نثر ــــ جواب مضمون، سوانح نگاری، افسانے، ناول، ناولٹ، ڈرامہ، اوپیرا، رپورتاژ اور تنقید ــــ اور اصناف نظم مثلاً جدید وضع کی منظومات، شعری سانچے۔ بلینک ورس، فری ورس، کینٹو، سانیٹ، بیلیڈ اور گیت وغیرہ انگریزی ہی کا فیضان ہے۔ سینکڑوں انگریزی الفاظ اردو زبان میں عام طور پر رائج ہو گئے مثلاً ٹکٹ، اسٹیشن، بس، ریڈیو، مارکیٹ وغیرہ۔

لیکن یہ لین دین یکطرفہ نہیں۔ مشرق و مغرب میں میل جول کا سلسلہ قدیم الایام سے جاری ہے۔ جزائر شرق الہند کی چیزیں سب سے پہلے انگریزی میں رائج ہوئیں مثلاً SUGAR ــ GINGER ــ INDIGO۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ انیسویں صدی کے ناولوں کی ہیروئنیں بے تکلف CALICO ــ CASHMERE ــ CHINTZ اور TUSSORE جیسے الفاظ برتتی ہیں۔ جب انگریزوں کا دیسیوں سے خلا ملا شروع ہوا تو بعض عام بول چال کے الفاظ ان کی زبان پر جاری ہو گئے مثلاً BAZAAR ــ GODOWN ــ RUPEES ــ SEER۔ کمپنی کے ملازموں کو ان لفظوں پر بڑا گھمنڈ تھا اور وہ اپنے خطوط میں ان کی بھرمار کرتے تھے یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ کو انہیں حکماً بند کرنا پڑا۔

انگریزوں کے باعث برصغیر میں اینگلو انڈین نام سے جو قوم پیدا ہوئی اس کے بنگلوں میں خدم و حشم کا ایک جم غفیر ہوا کرتا تھا ان کے نام بھی خالص اینگلو انڈین تھے یعنی بیرا۔ آیا۔ چوکیدار۔ دھوبی وغیرہ۔ شکار کا شوق اپنے ساتھ شکار، مچان، بندوق اور جنگل جیسے الفاظ لایا۔ اسی طرح SNAKE اور ELEPHANT اور TIGER جیسے الفاظ بھی ان کی زبان میں رائج ہو گئے۔ چٹنی۔ کری۔ پردہ۔ برقع۔ چند اور دلچسپ الفاظ ہیں۔ انہی میں مختلف جگہوں کے نام بھی شامل ہیں۔

مثلاً دیکھئے ملٹن ان ناموں سے اپنے کلام میں کیا گھن گرج پیدا کرتا ہے:۔

کشورِ ہند کو اور کندنی چہرہ ستون تک
ان سے بھی دور کہیں، دور کہیں ہند سے پار
آبرو بین کی حد تک وہ بلا کی یلغار
ریشمی جبہ و دستار کو لہراتا ہوا
جوق در جوق بڑھے جاتا تھا پُرشور ہجوم

اسی طرح اسکاٹ کے ناول SURGEON'S DAUGHTER میں ولین کس شوق سے پکار اٹھتا ہے۔ "ہائے سہندا! ہائے دہلی! ہائے گولکنڈہ!" کپلنگ تو نسبتاً حال کا مصنف ہے۔ اس کی تصنیف KIM سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن الفاظ کا پہلے ترجمہ کیا جاتا تھا اب عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ کپلنگ کی کامیابی میں ان کے برجستہ استعمال کو بہت دخل ہے۔

انیسویں صدی میں مشرقی زبانوں اور علوم کا گہرا مطالعہ شروع ہوا تو برہمن، پنڈت، فقیر، جوگی اور موذن جیسے الفاظ رائج ہوئے پہلی جنگِ عظیم کے اوٹ پٹانگ اینگلو انڈین الفاظ کی کھیپ پیدا کردی مثلاً BOXWALA اسی طرح دیغیرہ HEKKO—LOOT—EK-DUM اور BUDDHISM جیسے مرکب الفاظ بھی برتے جانے لگے۔

ابتدائی سیاحوں کی نظر میں یہ سرزمین ضرب المثل خزانوں سے بھرپور تھی۔ یہ وہ حیرت انگیز سرزمین تھی جس کا دامن سونے اور قیمتی پتھروں سے مالامال تھا جس میں عجیب وغریب قسم کے جانور پائے جاتے تھے مثلاً ایک سینگ والا ہندوستانی گدھا اور ہاتھی جو بلا کا خطرناک جانور ہے۔

فادر تھامس اسٹیفنس نے سب سے پہلے اس برصغیر سے احباب وطن کے نام خط لکھے۔ پھر ایک سوداگر رالف فچ نے اپنی سیر و سیاحت کے حالات قلمبند کئے۔ اس کے بعد سر طامس رو مغلیہ دربار میں سفیر بن کر آیا۔ اس کی طرح اس کے پادری ایڈورڈ ٹیری نے بھی ایک ڈائری تحریر کی۔ ۱۶۲۲ء میں ولیم میتھولڈ نے ایک کتاب THE RELATION OF THE KINGDOM OF GOLCHONDA تحریر کی۔ ۱۷ویں صدی میں ولیم ہوکنز اور جان فرائیر نے یہاں کے حالات لکھے۔ ۱۸ویں صدی میں رابرٹ آرمے نے اپنی مشہور تاریخ تحریر کی۔ اس کے بعد کئی سیاحوں نے برصغیر کے حالات یا نجی خطوط، ڈائریاں، ملفوظات اور یادداشتیں لکھیں جو دوسرے مصنفوں کے لئے معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ثابت ہوئیں۔ نامور انگریز شاعر چاسر نے نادانستہ ایک بودھی کہانی استعمال کی۔ "مرچنٹ آف وینس" میں تین ڈبیوں کی کہانی ایک قدیم بودھی حکایت ہی سے ماخوذ ہے۔ ڈرائیڈن نے اورنگ زیب کو اپنا ہیرو بنایا ہے۔ اسی طرح اور مصنفوں نے بھی تاریخ اور دیومالا سے خوب استفادہ کیا ہے۔ طامس مور نے اورنگ زیب کی بیٹی، لالہ رخ کو اپنی ایک دلچسپ رومانوی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ ایک کتاب "ھارٹلے ہاؤس" میں اینگلو انڈین زندگی کا خاکہ طنزاً پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک خاتون کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ ایک اور خاتون مسز ایلیزا نے "ہندوستان سے اصلی خطوط" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اسی طرح مسز ایڈن کے خطوط اور ایک اور انگریز خاتون مسز میر حسن کی تصنیف بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ایک انگریزی نظم CURSE OF KENAMA میں ہندو مذہب اور دیومالا کو سمویا گیا ہے۔

جے۔ ایم۔ مائیرز اور فلورا۔ اینی۔ اسٹیل نے راجپوت اور مغل عہد کے متعلق دلچسپ کتابیں تحریر کی ہیں۔ کپنی کے "نوابوں" کا بہترین نقشہ تھیکرے کے یہاں نظر آتا ہے جس نے اپنی معلومات اپنے رشتے داروں کے میل ملاپ سے ہی حاصل کی تھیں۔

اس سلسلے میں مستشرقین کی سرگرمیاں بھی قابل ذکر ہیں۔ شکنتلا کے مترجم سر ولیم جونز نے ۱۷۸۴ء میں "بنگال ایشیاٹک سوسائٹی" قائم کی جو "رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن" کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ سر ولیم نے فارسی اور سنسکرت کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ اور اس کے زمانے میں مشرقی علوم سے متعلق تحقیقات تین جلدوں میں شائع ہوئیں۔ ۱۷۸۹ء میں "سیر المتاخرین" کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ ولکن نے "بھگوت گیتا" اور پاکاک نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا، ادکلے اور ڈاکٹر لانگ نے علی الترتیب "عربی ادب کے مطالعے" اور "حیات محمدؐ" تحریر کی۔ بشپ ہیبر کے مزامیر اور نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ملفوظات میں یہاں کے حالات بھی قلمبند کئے۔ مثلاً ایک نظم ہے "رفیقۂ حیات کے نام" اس میں وہ کیا خوب کہتا ہے:-

گر تو ساتھ ہو دل کی رانی
چھائے یکدم سا بجھ سہانی
سنتے سنتے میٹھی میٹھی
کامنی کوئلیا کی بانی
تاڑ کے پیڑوں کے "رکھ" میں
کھوئی ہوئی یہ مدھ ماتی
ہرے بھرے کنج نبگلا میں
بہے جہاں ہر موڑ پہ پانی

[illegible] ANNALS AND ANTIQUITIES OF RAJASTHAN ۱۸۳۲ء میں شائع ہوئی۔
دیگر نامور مورخین کے نام یہ ہیں: [illegible] الفنسٹن اور جان بگس۔ آخر الذکر نے فرشتہ کی تاریخ ہند کا ترجمہ کیا تھا۔ سر جان کئی نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی ایک مبسوط تاریخ مرتب کی۔ قصص و حکایات کے سلسلے میں ہاکلے اور کرنل میڈوز ٹیلر، مصنف CONFESSIONS OF A THUG کے نام قابل ذکر ہیں۔ "ٹیپو سلطان" بھی انہی کی تصنیف ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے متعلق افسانوں اور دیگر تصانیف کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی خصوصاً معرکہ ۱۸۵۷ء سے متعلق [illegible] فکشن میں داخل ہو گئے۔

۲۰ ویں صدی سے واقعیت کا دور شروع ہوا۔ جس کا نمائندہ کپلنگ ہے اس کے کردار کچھ کچھ رومانوی ہیں اور کچھ واقعاتی۔ وہ برصغیر کا شمالی علاقہ جس کا بیشتر حصہ اب پاکستان میں ہے، کے لوگوں اور ان کی زندگی کی بڑی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ تھامس۔ آر ولی اور ای۔ ایم فارسٹر نے بھی یہاں کے حقیقی حالات پر بسیط روشنی ڈالی ہے۔ ۱۹ ویں صدی میں لارڈ مکالے کی تعلیمی پالیسی کے باعث انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار پائی۔ اس سے انگریزی ادب و صحافت کو فروغ حاصل ہوا اور تورو لاٹا دت، مائیکل مادھو سودن دت۔ ٹیگور اور سروجنی نائیڈو جیسے صف اول کے انشا پرداز پیدا ہوئے۔
سید امیر علی کی مشہور تصنیف HISTORY OF SARACENS ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔ ان کی تصنیف SPIRIT OF ISLAM اپنے موضوع کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ صلاح الدین خدا بخش نے اسلامی تمدن کی ایک تاریخ ترتیب دی۔ علامہ اقبال کے "چھ لیکچر" فلسفیانہ تصانیف میں ایک اہم اضافہ ہے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی کا ترجمۂ قرآن ایک اور قابل قدر تالیف ہے۔ ڈاکٹر سید حسین بلگرامی اور نواب نظامت جنگ نے انگریزی میں نظمیں لکھی ہیں۔ رام بابو سکسینہ کی HISTORY OF URDU LITERATURE بھی ایک اہم تصنیف ہے۔ محمود شستری میسوری نے بھی ایک کتاب HISTORY OF ISLAMIC CULTURE تحریر کی ہے۔ صحافت نے بھی خاصی ترقی کی ہے اور پاکستان میں بھی کتنے ہی انگریزی اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم، قائداعظم محمد علی جناح، سر شاہ سلیمان مرحوم انگریزی کے بڑے بڑے مقرر ہوئے ہیں۔ نامور مقررین میں ہمارے سابق وزیراعظم شہید سہروردی بھی شامل ہیں۔
ہمارے یہاں اچھے ڈرامے کم لکھے گئے ہیں۔ تاہم اے۔ کے خان کی "ضمیر" احمد علی کی LAND OF TWILIGHT اور فیضی رحمین کا ڈرامہ DAUGHTER OF IND انگلستان میں کامیابی سے اسٹیج کئے گئے ہیں۔ ہمارے موجودہ وزیراعظم سر فیروز خاں نون نے اپنے ناول SCENTED DUST میں پنجاب کی دیہاتی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ احمد علی کی TWILIGHT IN DELHI کی تعریف فارسٹر جیسے ماہرین فن نے کی ہے۔ عطیہ حبیب اللہ کے افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ شاہد سہروردی نے جدید انداز میں نظمیں تحریر کی ہیں۔ انہی کی تصنیف INDIAN TRAGEDY میں ایلیٹ کا آہنگ اختیار کیا ہے۔

اس برصغیر کے مناظر، دریاؤں، پہاڑوں، صحراؤں وغیرہ نے سیاحوں، شاعروں اور ناول نویسوں کو ایک بڑا ہی وسیع میدان مہیا کیا ہے چنانچہ آزادی سے قبل کیتھرائن میو۔ بیورلے نکلس اور ولیم آرنلڈ نے یہ [illegible] اپنے نقطۂ نظر سے پیش کئے ہیں۔ یہاں کے فلسفے اور تصوف نے سر ایڈون آرنلڈ۔ ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس۔ ایلیٹ۔ آلڈس ہکسلے اور ایشروڈ جیسے نامور لوگوں کو اپنی طرف راغب کیا ہے۔ یہ سب لوگ اس سرزمین سے جو قدیم بھی ہے اور جدید بھی کسی نہ کسی طرح مسحور ہوئے ہیں۔ سمرسٹ مام، رومر گاڈن، لوئی برام فیلڈ، جان ماسٹرز اور پرل بک جیسے نامور ناول نویس اپنے ناولوں میں اس سرزمین کی عکاسی کرتے رہے ہیں اور امید ہے کہ آئندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔
(تلخیص و ترجمہ)

★

اسلامی مذاکرہ

(ایک طائرانہ نظر)

(حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی)

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک۔ پچھلے دنوں اس کا عینی مشاہدہ لاہور میں ہوا جہاں پہلا بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ منعقد ہوا۔ اس مذاکرہ میں دنیا کے گوشے گوشے سے نامور علماء شریک ہوئے اور یہ کیفیت ہوئی کہ خیل خیل پرواز قطار اندر قطار آمد۔ بلاشبہ پاکستان کی گیارہ سالہ تاریخ میں یہ اجتماع اپنی مثال آپ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دفعتاً ایک شہابِ ثاقب پہنائے آسمان پر نمودار ہوا اور اپنے پیچھے ایک روشن لکیر چھوڑتے ہوئے روپوش ہو گیا۔ مذاکرہ کی چند روزہ سرگرمیاں، اس کے خیال انگیز مقالے اور مباحثے، اس کی تجاویز اور منصوبے، جو صرف اسلامی دانشوروں ہی نہیں بلکہ نامور مستشرقین اور دانایانِ فرنگ کی حکمت و دانش کا لب لباب تھے، سائنس کی حکمت اہرمن نژاد کے باعث روز بروز تاریک سے تاریک تر ہوتے ہوئے ماحول میں ایسی ایسی شمعیں روشن کر گئے جو مدتوں ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی۔ ان کا تصور کیا جائے تو تا حدِ نظر کوندے ہی کوندے لپکتے دکھائی دیں گے۔

علمائے مشرق و مغرب کے اس شاندار اجتماع میں نامور امریکی مورخ پروفیسر فلپ حِتّی بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اہلِ عرب، ان کی تاریخ اور اسلامی ریاست پر بڑی عالمانہ کتابیں لکھی ہیں۔ آپ نے مذاکرہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا:

"آج تاریخ میں دوسری دفعہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے فضلاء بڑے خوشگوار حالات میں اسلامی تمدن، تاریخ اور ادب پر نہایت بلند علمی سطح سے بحث و نظر کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ موقع واقعی نہایت اہم ہے۔ اس قسم کا پہلا مذاکرہ چار سال ہوئے پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) میں ہوا تھا۔ مستشرقین ہر سال ایک کانفرنس منعقد کرتے ہیں جس میں اقوام مشرق (مع اہل ہند) مشرق بعید اور قدیم سامی دنیا کی زبانوں، مذہبوں، ادبیات اور تمدنوں سے متعلق عام مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی آخری کانفرنس پچھلے سال بہار کے موسم میں میونخ (جرمنی) میں منعقد ہوئی تھی لیکن جیسا اجتماع پرنسٹن اور پنجاب میں ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔"

"پرنسٹن میں جو کارروائی ہوئی تھی اس کو غالباً دو جلدوں، ایک انگریزی اور دوسری عربی میں، قلمبند کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کا وسیع پیمانہ پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ موجودہ اجتماع کے مقالات و مذاکرات کو بھی اسی طرح باقاعدہ مجموعہ کی شکل میں ترتیب دیا جائے گا تاکہ اس سے مستقلاً استفادہ کیا جا سکے۔ پرنسٹن میں یہ خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ وقتاً فوقتاً اس قسم کے مذاکرے ہوتے رہا کریں۔ کیا میں امید کروں کہ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جائے گی تاکہ آئندہ مذاکروں کے لئے مناسب مقام اور اوقات متعین کئے جائیں؟"

"غالباً ایسے اجتماعات کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان سے مختلف اداروں کے مختلف النوع علماء میں ذاتی روابط پیدا ہوتے ہیں، پرانے مراسم کی تجدید ہوتی ہے اور نئے تعلقات صورت پذیر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمان مندوبین اس بات پر فخر کریں گے کہ ان میں یورپ اور امریکہ کے کتنے ہی علماء موجود ہیں جو اسلام کی بے حد قدر و منزلت کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگیاں اس کے فنون، تاریخ، ادب، السنہ اور اس کی تہذیب کے دیگر بہت گرانمایہ اور مایۂ ناز مظاہر کے مطالعہ کے لئے وقف کر دی ہیں۔ امید ہے ایک وقت ایسا آئے گا جب مسیحی و مسلمان علماء و فضلاء مل کر اپنا الفاظ اور اپنی مساعی نصرانی تہذیب کے کسی پہلو کے مطالعہ کے لئے

وقف کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے اضافے منفرد نوعیت کے حامل ہوں گے اور وہ اس سلسلہ میں بڑی گراں بہا خدمات انجام دیں گے۔"

مذاکرہ کی اصل غرض و غایت ان مسائل پر بحث تھی جن سے مسلمان اور دوسری قومیں عہد حاضر میں دوچار ہیں اور جن کا حل تلاش کرنا لازم ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پر صدر اسکندر مرزا نے اپنی افتتاحی تقریر اور میاں افضل حسین، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، نے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے بسیط روشنی ڈالی تھی، خصوصاً وہ صورتِ حال جو سائنس کی گریز پا ترقی اور تباہ کن ایجادات کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ اور نوع انسان کی حفظ و بقا ہی "ایٹم برائے امن" کو لائحہ عمل بنانے پر موقوف ہے۔ اسی طرح مادیت و روحانیت، اشتراکیت، سچی جمہوریت، آزادی وغیرہ کے گوناگوں مسائل ہیں جن پر بہت کچھ غور و خوض کی ضرورت ہے۔ حقیقی جمہوریت کیا ہے؟ یہ سوال جامعۂ ازہر کے پروفیسر ڈاکٹر حب اللہ نے چھیڑا اور اس کا یہ جواب دیا:-

"اسلام کے پیرو کبھی بھی ایسے افکار کی مخالفت نہیں کر سکتے جو انسان کو ترقی کی طرف لے جائیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام افکار جدید اور جمہوری رجحانات کا مخالف ہے، فاش غلطی ہے۔ جمہوریت کے معنی کوئی خاص نظامِ حکومت نہیں بلکہ یہ ایک معاشرتی تصور ہے جس میں حریتِ فکر پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کی اساس دو چیزیں ہیں، مذہبی اور اقتصادی آزادی۔ یہ جمہوریت کے مغربی تصور سے دست و گریباں ہے۔ مغربی جمہوریت میں تمیز حاکم و محکوم مٹ نہیں سکتی۔ لیکن اسلامی تصور سے برابری اور اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کی خود غرضی اور ذاتی خواہشات کو دبانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی جمہوریت کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ ہمارا مطمع نظر سیاسی و اقتصادی قسم کی وحدت نہیں بلکہ ایسا نظام ہے جو مساوات، اخوت اور محبت پر مبنی ہو۔ حقیقی جمہوریت اور آزادی، مادیت و روحانیت اور سیاست و مذہب کی ہم آہنگی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ رہے جدید خیالات اور قدریں تو ہر مسلمان ان کا حکیمانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لیتا ہے اور اگر وہ قابل قبول ہوں تو ان کو بڑی خندہ پیشانی سے اپنے نظام فکر میں سمو لیتا ہے۔"

یہی نے ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر رچرڈ این فرائی کے ہاتھ آئی اور یوں لگا جیسے یونان کی مشہور "میراتھون ریس" میں ایک تیز رو نے دوسرے کے ہاتھ سے بھڑکتی ہوئی مشعل لے لی ہو۔ انہوں نے جدید خیالات کے بارہ میں اسلامی موقف پر یوں روشنی ڈالی:-

"آج کل اس رسہ کشی کا چرچا اکثر سنائی دیتا ہے جو مغرب اور سوویٹ روس کی اشتراکیت میں جاری ہے تاکہ وہ اپنے نظریات سے لوگوں کے دلوں پر قبضہ جمالیں۔ جہاں تک مشرق وسطیٰ یا مشرق کے کسی حصہ کا تعلق ہے، اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا یہ یا وہ۔ جو لوگ یہ رائے ظاہر کرتے ہیں وہ عموماً یہ بھول جاتے ہیں کہ مشرقی قومیں خلا میں زندگی بسر نہیں کر رہیں اور ایسے تمدنوں کی حامل ہیں جو مغربی و روسی کشمکش کے فیصلہ سے گہرا تعلق رکھنے کے علاوہ اس پر اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں مشرق وسطیٰ کی اسلامی تہذیب کا بھی اسی شدت سے ذکر کرنا چاہیئے جس طرح ان دونوں کا، کیونکہ الگ الگ ہونے کے باوجود یہ باہمدگر وابستہ بھی ہیں۔ اگر ہم اشتراکیت کو ۱۹ویں صدی کی روشن خیالی اور انسان کو مرکز کائنات کا منطقی نتیجہ قرار دیں تو بھی سوویٹ روس کو ایک علیحدہ تمدن کا حامل قرار دینا چاہیئے۔ اسی طرح اسلام کو بھی گو یہ مغربی خیالات سے بہت متاثر ہوا ہے، ایک علیحدہ تمدن تصور کرنا چاہیئے۔ اسلام صرف مذہب ہی نہیں۔ یہ اجتماعی و انفرادی دونوں صورتوں میں ایک تمدن، ایک طریق زندگی ہے۔ اس لئے ہم اس کے ریاست سے متعلق نظریوں، قانون اور فنون لطیفہ وغیرہ کا تصور اسلامی مذہب یا دینیات کے بغیر نہیں کر سکتے۔"

اسلامی آرٹ اور اس کی علامات کی نسبتاً زیادہ دلچسپ بحث مچی گان یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر رچرڈ ایٹین گاسن کے ہاتھ آئی۔ ان کی بات ان ہی کی زبانی سنئے:-

"اسلامی فنون کا مابہ الامتیاز تلاش کرنے کے لئے اس کے اکثر و بیشتر مظاہر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی اس کی مخصوص علامات کے محرکات کی نشان دہی بھی لازم ہے۔ اسلامی آرٹ کی علامات کے سلسلہ میں یہ مظاہر ہمارے سامنے آتے ہیں:

چراغ: غالباً سورۂ نور کے باعث۔

مسجد: گو اس کی حیثیت زیادہ تر عبادت گاہ کی ہے۔ اس سے دین کا دوام اور اس کی خدمت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وسیع تر نقطۂ نظر سے یہ اسلامی تہذیب کی وحدت میں تنوع کی آئینہ دار ہے۔

ذوالفقار: ذوالفقار کی دلالت محدود ہے۔

ستارہ وہلال: ستارہ وہلال کی اہمیت نسبتاً جدید اور دنیاوی ہے۔ یہ دینی، جامع اور عالمگیر نہیں۔

عربی خط: یہ صریحاً خط ہے، شکل نہیں۔ یہ نہ صرف مسلم اقوام میں ایک بڑا مضبوط رشتۂ اتحاد رہا ہے بلکہ خطاطی جیسے خالص اسلامی فن کا باعث ہوا۔

مدرسہ: درسگاہیں کہیں دیر سے جاکر رونما ہوئیں اور کچھ ایسی نمائندہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

باغ: پھول پتیوں اور اقلیدسی شکلوں کا شوق جس میں اشکالی مصوری کو کم دخل ہوتا ہے اور سنگ تراشی کو اور بھی کم۔

آرائش: ہر سطح اور شکل کو ایسی ہی چیزوں سے آراستہ کرنا، خواہ یہ اشکال کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ اور پیچیدہ لاتعداد طرحوں کی طرف رجحان۔

مواد: نسبتاً معمولی قسم کی چیزوں سے فن کاری کا آغاز جس سے بالعموم غنا کی بجائے فقر کا میلان ظاہر ہو۔

پروفیسر میسی ناں اور ان کے تتبع میں اکثر اہل الرائے نے ان آخری چار چیزوں کو مسلمانوں کے مذہبی میلان کی خاصیت قرار دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ اسلامی آرٹ کی کسی جامع علامت کا ظہور تمام تر اس امر پر موقوف ہے کہ مسلمانوں میں ملتِ واحدہ کا احساس غالب رہتا ہے یا قومیت پرستی کا۔"

آرٹ کے بعد ایک ہی چیز رہ جاتی ہے جس کے متعلق ہم کچھ سننا چاہتے ہیں۔ شاعری۔ اس کے متعلق ہم اپنی اور اپنے لوگوں کی رائیں تو جانتے ہی ہیں لیکن ایک بالغ نظر مغربی دانشور اس کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اس کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ اس کا حق نامور اطالوی مستشرق پروفیسر الیساندرو بوزانی نے ادا کیا:۔

"کیا اسلام نے کوئی ایسی شاعری پیدا کی ہے جس کو بالتخصیص اسلامی شاعری کہا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایران کے صوفی اور عارف شاعروں نے جو رنگ اختیار کیا اور اس کے لئے جو صنف، جو محاکات، تلمیحات، تمثیلات اور پیرائے اختیار کئے ان سے ایک ممتیز اسلامی شاعری کی وضع مرتب ہوتی ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جس میں اعتنا بیاتی عنصر کو زیادہ سے زیادہ ترک کرنے کی طرف میلان رہا ہے۔"

یہ اس روشن لکیر کی چند جھلکیاں ہیں جو اسلامی مذاکرہ کا شہابِ ثاقب اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

رپورتاژ:
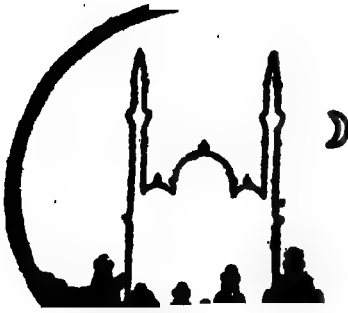
اسلامی نوادر کی نمائش

(آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے!)

عارف حجازی

قلعۂ لاہور کے صدر دروازے پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اس جھنڈے کو دیکھکر ایسا معلوم ہوا جیسے تاریخ اسلامی کی ساری کہانیاں نگاہوں کے سامنے چل پھر رہی ہیں۔ وہی کہانیاں بزم و رزم کے قصوں سے بھری پڑی ہیں، جو شہنشاہوں کے جنگی کارناموں کو دہراتی ہیں اور فتح و نصرت کے شادیانے بجاتی ہیں، تو قلعہ کی دیواریں نعرۂ تکبیر کی فلک شگاف صداؤں سے گونج اٹھتی ہیں۔ کبھی اس قلعہ میں "شہسوار چغتائی" جہانگیر نے دربار کیا تھا، جشن منائے تھے کبھی فوجوں نے قیام کیا تھا اس قلعہ کے اردگرد توپوں کی گونج سے دل لرز جاتے تھے، تلواروں کی جھنکار سے حریفوں کے سینے تھر تھرا اٹھتے تھے۔ یہ ساری کہانیاں اور جشن دمستر کے افسانے نواب گلدستۂ طاق نسیاں بن چکے ہیں۔ کیونکہ ان کی دلچسپیاں، ان کی رد نقیں تاریخ ہی کے نہاں خانوں میں پوشیدہ ہیں لیکن ۳۰ دسمبر ۵۷ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک ایسی بہار گل بداماں ایسی خنت نگاہ اور فردوسِ گوش گہما گہمی لے کر آیا جو بجائے خود ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے اور ہم اسکے خطوط سے مدت تک لذت گیر ہوتے رہینگے۔ یہ تھی اسلامی نوادر کی بین الاقوامی نمائش جس میں رزم کی بجائے بزم، شان جلالی کی بجائے ملت اسلامیہ کی شانِ جمالی کارفرما تھی۔

یہ نمائش اس مذاکرۂ اسلامیہ کا ایک دلفریب پہلو تھی جس کے علمی ہنگامے قلعہ لاہور، شاہی مسجد، اور مزار اقبالؒ سے کافی دور جامعۂ پنجاب کے وسیع اور کشادہ ہال میں پورے دو ہفتے بپا رہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ ع

ہوئے جہرد مہ تماشائی

اس تاریخی تقریب کے لئے 'دلفریب' ہی کا لفظ موزوں ہے کیونکہ اس کا تعلق تمام تر فنون لطیفہ سے ہے یعنی مسلمان اقوام کے فنی نوادر سے جو دنیا کے ہر ہر گوشہ سے فراہم کر کے پہلی دفعہ یکجا پیش کئے گئے اور ایسے ماحول میں جس کے ذرہ ذرہ میں اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے دور عروج ہی کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اس نمائش کے لئے شہنشاہ جہانگیر کے تعمیر کردہ چوگوشہ احاطہ کو منتخب کیا گیا جو قلعہ لاہور کی خوبصورت عمارتوں میں ایک پاکیزہ بیلے حسن ہے۔ حسن و کیف، تاریخ و تہذیب کی اس مثالی فضا میں اسلامی نوادر کی نمائش کا افتتاح اس اہتمام سے ہوا جو اس عدیم النظیر تقریب کے شایان شان تھا۔ یہ نمائش اسلامی فن اور کاریگری کی پہلی نمائش ہے جس میں دنیا کے تقریباً تمام مشہور ملکوں نے حصہ لیا۔ اسلامی ملکوں میں ایران، ترکی، انڈونیشیا اور پاکستان اور غیر اسلامی ملکوں میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، امریکہ، اٹلی اور روس شامل تھے۔ اس طرح یہ نمائش تین براعظموں سے آئے ہوئے نوادر پر مشتمل تھی۔ برطانیہ کے سر ایلیڈرڈ ہیکا کسنے اسلامی ظروف سازی کے نادر نمونوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا جو اس نمائش میں پیش کیا گیا۔ پاکستان کی طرف سے مشہور شہروں، ڈھاکہ، پشاور، لاہور، بہاولپور اور دیگر مقامات سے کئی چیزیں نمائش میں لائی گئیں۔ ان کے علاوہ بخارا، العمارہ اور قم جیسے اہم مقامات کے نوادر بھی اسلامی فن کاری کی بوجہ احسن عکاسی کر رہے تھے۔

اسلامی عہد کی فنکاری کے نمونے دنیا کے جس حصے میں بھی ملتے ہیں انہیں دیکھکر فوراً نگاہوں کے سامنے اسلامی تمدن و تہذیب اور معاشرت کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ کوئی ایسی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی جو فنی نقطہ نظر سے اختلاف خیال کی بنیاد بن جائے گویا اسلامی تمدن کی داغ بیل اتنی پختہ اور ہم رنگ کہ اسے ملک اور فاصلے کے اعتبار سے کسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی فن پاروں میں ایک ہی روح ایک ہی تصور جھلکتا ہے۔ اس نمائش میں اُن قالینوں

لو دیکھئے جو بیسیوں اقسام اور بناوٹ کے تھے۔ کسی میں شالامار باغ کا نقشہ کھنچا تھا تو کسی میں شکار کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ چاروں طرف فطرت کی گوناگوں خوبصورتیاں اجاگر کی گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شکار سچ مچ ہماری نگاہوں کے سامنے کھیلا جا رہا ہے۔ ایک قالین میں پھولوں کی چادر بچھی ہوئی تھی اور پھول پتیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ ایرانی قالین پر ایک چیتے کے خوفناک حملے کا نقشہ کھنچا تھا۔ ایک اور قالین میں چنار کے درخت پر خوش الحان چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ترکی کے قدیم شاہی دربار کی ایک جانماز بھی نمائش کی زینت تھی۔ اس کے پھولوں کو دیکھکر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے باد بہاری نے ان کے رخساروں کا بوسہ لیکر خوب رنگ آمیزی کر دی ہے۔ لاہور کے ساختہ قالین کے نمونے میں جھاڑی کی ابھرتی ہوئی شاخوں اور پتیوں میں ایک خاص کشش تھی۔ ان شاخوں اور پتیوں کی بناوٹ ایسی تھی جیسے سچ مچ ہری بھری جھاڑی ہماری نگاہوں کے سامنے اُگی ہوئی ہے۔ قالینوں کی کاری گری اور فنی دلآویزیوں میں یکساں رنگ جھلک رہا تھا۔ فرق صرف تصویر کی رنگ آمیزی اور ماحول کی شوخیوں ہی کا تھا۔ ہر قالین خیال اور فن کے اعتبار سے ایک علیحدہ دلفریب ٹکڑا تھا۔ یہ فنکارانہ خوبیاں اور پھر اسلامی تخیلات کی یکساں جھلک اس بات کی دلیل ہے کہ ان دور دراز اسلامی ملکوں کے درمیان اتحاد اور ملی رشتے ہمیشہ بڑے مضبوط رہے ہیں اور ان کی چلتی پھرتی تصویریں ہم آرٹ کے آئینے میں بھی بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ فنی حیثیت سے ان کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ ان کے انداز پیشکش میں کوئی فرق نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں سپاٹ یکسانیت اور ہم وضعی ہے بلکہ موضوعات، مقامی رنگ، تصور اور طرح سب میں غیر معمولی تنوع ہے۔

قالینوں کے علاوہ اور کئی چیزیں بھی تھیں جو فنکاروں کے گہرے جذبات اور لطیف احساسات کا مرقع تھیں۔ ان میں کا َناقی حسن تھا، خوبصورتی اور دلکشی تھی اور انہیں دیکھکر دل چاہتا تھا کہ ان فنکاروں کے ہاتھ چوم لئے جائیں۔ یہ فنی معجزے ایسے ہیں کہ دیکھتے ہی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں بالخصوص وہ جن کے ساتھ خاص خاص قومی یادیں بھی والبستہ ہیں۔ ان اشیاء اور نوادر کی خوبصورتیوں کا مشاہدہ ان کے تذکرے سے کہیں بہتر ہے لیکن جن لوگوں نے اس تاریخی نمائش کو نہیں دیکھا ان کے لئے یہ کیا کم ہے کہ ان فنکارانہ تخلیقات کا تذکرہ کر کے انہیں تھوڑی دیر سوچنے کا موقع دیا جائے کہ اسلامی آرٹ نے دنیا میں ایک خاص انفرادی جگہ پیدا کی ہے۔ ان آنکھوں دیکھی چیزوں کا حال سپرد قلم کرتے ہوئے خلیفہ ہارون رشید کے عہد کے ایک درخت کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہتے ہیں کسی نے ہارون رشید کے محل کے باغ میں ایک سونے کا درخت بنایا تھا۔ اس کی شاخوں پہ خوبصورت پرندے بنے ہوئے تھے جن کی آنکھیں لعل و یاقوت کی تھیں، چونچیں زمرد کی بنائی گئی تھیں اور پَر ہیرے کے تھے۔ کاش یہ فنکارانہ حسن و تخلیق کی یہ قدیم یادگار ہمارے سامنے ہوتی لیکن اب تو صرف تاریخ ہی میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی ندرت اور طرفہ کاری کا تصور ہی ایک جنت خیال ہے جو اپنے اندر ایک طلسماتی کیف لئے ہوئے ہے۔ حقیقی مشاہدہ کے کیف و اثر سے کہیں ارفع و اعلیٰ اور لطیف تر! کیا وہ تمام نوادرات جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں باہم ملکر ایک ایسے ہی زریں و مرصع شجر کی کیفیت پیش نہیں کرتے؟

اسلامی فنون کی اس بین الاقوامی نمائش میں دو چیزیں خاص توجہ کا باعث تھیں: ایک وہ یاقوت رمانی جو سلطان شہید ٹیپوؒ کے خنجر کے دستہ میں جڑا ہوا تھا۔ یہ خنجر امیر بہاولپور نے پیش کیا تھا۔ یہ اس مرد مجاہد کی کس قدر اثر آفریں اور ساتھ ہی رقت آفریں یادگار تھی!

شہر قم (ایران) سے امام رضاؒ کی ہمشیرہ کے مزار کا قالین آیا تھا جو قالینوں کی بناوٹ اور کاریگری کا بے مثل نمونہ تھا۔ یہ قالین اس وقت دنیا کے خوبصورت ترین قالینوں میں شمار ہوتا ہے۔ ویسے بھی قم دنیا بھر میں قالینوں کا بہترین مرکز تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بھی تھیں جو فن کاروں کے لئے خاص دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں اور ان کے ذہن میں پھر سے قدیم روایات کی جوت جگا کر ایک نئی لگن پیدا کرتی ہیں اور تخلیق کے فکر و نظر کی نئی نئی راہیں سجھاتی ہیں۔ بعض چیزیں مثلاً سکے، قلمی نسخے، خطوط، نسخ و نستعلیق خطاطی کے نمونے، طغرے، عالموں اور فنکاروں کے لئے یکساں دلچسپی کا باعث تھے۔ سکوں میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کا سکہ جس کا وزن اڑھائی سیر ہے، امیر بہاولپور نے پیش کیا تھا۔ اس کو دیکھکر یکلخت اس مرد مجاہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو حقیقتاً "کش مارا خدنگ آخریں" کا مصداق تھا۔

یہ نمائش چند ہی دن قائم رہی مگر اس طرح۔ جیسے ویرانے میں یکلخت بہار آجائے — پُر اشتیاق تماشائی ہر روز جوق در جوق آتے اور اس کی گوناگوں دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ لطف محض دامان نظر ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر کر ایک پائیدار اثر چھوڑ گیا جو ہمیشہ اہل فن کے وجدان میں محفوظ رہ کر نئے نئے احساسات، تصورات اور فنی کوششوں کو جنم دے گا اور یہی اسلامی نوادر کی اس یادگار کا بہترین حاصل ہے۔

ناول کا ایک باب:

"خونِ جگر ہونے تک"

فضل احمد کریم فضلی

شروع جولائی ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے، صبح کا سہانا وقت تھا اور وہ بھی مشرقی بنگال کی صبح کا۔ دنیا سبز رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھان کے کھیتوں کا دھانی سمندر موجیں مار رہا تھا۔ کنارے پر چھالیہ کے بلند و بالا درخت سب درختوں سے اوپر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کہیں ناریل اور کھجور کے درختوں کی بدولت فضا میں سینکڑوں ہزاروں پنکھیں نکلی ہوئی تھیں، آڑی ترچھی، سیدھی، کہیں بانس کے گھنے جھنڈوں میں ایک مبہم سی پُراسرار کیفیت تھی۔ جمعدار ذلیل الدی اپنے مکان کے ٹیلے سے حسب معمول اتر رہے تھے۔ مولوی صاحب نے تو ان کا نام جلیل الدین رکھا تھا لیکن گاؤں والوں نے اسے زبردستی ذلیل الدی بنا دیا تھا۔ وہ لاکھ صحیح تلفظ بتانے کی کوشش کرتے مگر کون سنتا تھا۔ گاؤں والے جب کہیں تو "ذلیل الدی" "ذلیل میاں" "ذلیل چاچا" "ذلیل بھیا" لیکن جب سے انہوں نے جمعدار صاحب کا لقب اختیار کیا تھا انہیں اس ذلت سے ایک حد تک نجات مل گئی تھی اور اب وہ "زمانہ دار شاہ" ہو گئے تھے۔ یہ ٹیلہ پاس کی مٹی کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک پنتھ دو کاج، مکان بنانے کے لئے اونچی زمین کا بھی انتظام ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک اچھا خاصا تالاب بھی مل گیا۔ تالاب کا پانی کھانے پینے، نہانے اور تیرنے کے کام آتا۔ مچھلیاں الگ مل جاتیں۔ ہر سال ہزار دو ہزار مچھلیوں کے بچے خرید کر ڈال دئے جاتے، گھر کے بھی کام آتے اور بیچنے کے بھی۔ تالاب کے کنارے کیلے، پپیتے، ناریل، چھالیہ کے درخت لگائے جاتے۔ کچھ فصل کی ترکاریاں بھی ہو جاتیں۔ جمعدار صاحب کے ٹیلے پر ان کے مکان کے علاوہ کچھ اور چھوٹے چھوٹے مکان بھی تھے۔ بھائی بندوں کے، غریب مزدوروں کے۔ "گھوڑا مارا" گاؤں اس طرح کے متعدد ٹیلوں پر آباد تھا، جو ایک دوسرے سے سو سو دو دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ شاید یہاں کسی نے کسی زمانے میں کوئی گھوڑا مارا تھا یا کسی گھوڑے نے غیر فانی انداز میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی تھی، وجہ تو کسی کو معلوم نہ تھی لیکن گاؤں والے فخر سے اپنے گاؤں کو گھوڑا مارا ہی کہتے تھے۔

برسات میں ہر ٹیلہ جزیرہ بن جاتا۔ ایک ٹیلے سے دوسرے ٹیلے تک کشتی میں آنا جانا ہوتا، کھیتوں میں دھان کے پودوں پر سے کشتی چلتی۔ ابھی برسات کو شروع ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے، کچھ کھیت جو اونچی جگہ پر واقع تھے اب تک پانی کی سطح سے اوپر تھے۔ دھان کی بالوں میں شبنم کے موتی پروئے ہوئے تھے۔ تلنگیاں ان آبی موتیوں کو اپنی ننھی ننھی چونچوں سے چن رہی تھیں، چنتی تھیں چہکتی تھیں، اور پھر سے اڑ کر دوسری بال کے موتی چننے لگتی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا دامن ان بالوں سے رگڑ کھاتا ہوا اٹھ رہا تھا۔ کھیتوں میں ایک لطیف سرسراہٹ تھی۔ سازِ فطرت مدھم سروں میں بج رہا تھا۔ کائنات غزل سرا معلوم ہوتی تھی، جمعدار صاحب بھی غزل سرا ہو گئے۔ وہی چیز جو ایسے موقعوں پر وہ ہزاروں دفعہ پہلے بھی گا چکے تھے پھر ہونٹوں پر آ گئی "بلبل کا چیں چیں میں آواز مرحبا ہے" یہ خود انہیں کی تصنیف تھی۔ اردو پڑھنے لکھنے کا کچھ تو انہیں واقعی شوق بھی تھا اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ اس سے گاؤں والوں پر رعب پڑتا تھا، جمعدار صاحب ان باقیات الصالحات میں سے تھے جو عربی فارسی اردو سے شغف ظاہر کرنا باعث فضیلت و افتخار سمجھتے تھے، وہ وقت بے وقت غزلیں اور قصیدے بھی تصنیف فرما لیا کرتے تھے۔ یہ "بلبل کا چیں چیں" والا غزل نما قصیدہ انہیں خاص طور سے پسند تھا اور اسے گاتے گاتے وہ اپنا منہ سرخ کر لیتے تھے۔

جمعدار صاحب رفع حاجت کے لئے حسب معمول پودوں کی آڑ میں ایک مناسب جگہ پر بیٹھ گئے اور آس پاس کی گھاس کے شبنمی موتیوں کو اپنی بھدی انگلیوں سے چور چور کرنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی گنگناہٹ اب تک جاری تھی۔ قریب ہی ایک چوہیا اپنے بل سے جھانک رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے برآمد ہوئی۔ جمعدار صاحب کے منہ کی طرف برابر دیکھتی جاتی تھی۔ ان کی شان بے نیازی دیکھ کے اس کی کچھ ہمت

بندھی اور وہ چپکے سے دھان کے ایک پودے پر چڑھ کر اس کی بالوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں سے جلدی جلدی کترنے لگی، دھان کچر اکچر اکر منہ بھر لیا اور جھٹ سے اتر کر بل میں جا چھپی۔ پھر تو بل سے دھان کی بالوں تک آنے جانے کا تانتا بندھ گیا۔ جمعدار صاحب فراغت کے بعد جب اٹھنے لگے تو ان کی نظر چوہیا پر پڑی، اس وقت وہ پودے پر چڑھی دھان چرا رہی تھی۔ جمعدار صاحب نے نشانہ لگا کر لوٹا اس کے سر پر دے مارا۔ "کچ" سے ایک آواز آئی جس میں چوہیا کی چیک دب گئی۔ پودے کی کچھ ڈالیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ اس کا جمعدار صاحب کو بہت افسوس ہوا، لیکن جب انہوں نے لوٹا اٹھاتے وقت دیکھا کہ چوہیا اس کے نیچے دبی پڑی ہے، اس کی ننھی سی زبان نکلی ہوئی ہے، منہ میں جو دھان بھرے تھے وہ باہر نکل آئے ہیں اور اس کا چھوٹا سا بھیجا چھٹکا پڑا ہے تو انہیں اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا نشانہ کتنا ٹھیک بیٹھا تھا۔ چوہیا کا خون لوٹے میں لگ گیا تھا، انہوں نے کہا "لاحول ولا قوۃ! حرام زادی نے لوٹا بھی نجس کر دیا" نشانے کی کامیابی نے ان کے دل کے سرور کو اور بڑھا دیا اور وہ اب پھر بلبل کا "چیں چیں" الاپنے لگے، پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بدستور چلتی رہی، چھلنگیاں بھی بدستور شبنم کے موتی چننے میں مگن رہیں۔ اور چوہیا اسی طرح پڑی رہی، مری ہوئی، زبان نکلی ہوئی، بھیجا چھٹکا ہوا۔

(۲)

جمعدار صاحب کی الاپ اس وقت ایک حرکتِ اضطراری تھی، وہ درحقیقت اس گزرے ہوئے زمانے میں جا پہنچے تھے جب ۱۹۱۴ء کی جنگ میں بھرتی ہو کر وہ لڑائی پر گئے تھے اور چاندماری کی مشق میں مشکل سے ان کی گولی نشانے پر لگتی تھی۔ انہیں خیال آ رہا تھا کہ اگر نشانے پر بجائے ایک بے جان سیاہ داغ کے جاندار چوہیا ہوتی تو شاید ان کا نشانہ خطا نہ ہوا کرتا۔ انہیں اس زمانے کی بہت سی باتیں پھر یاد آ رہی تھیں۔ وہ ان باتوں کو اکثر فخریہ سنا سنا کر گاؤں والوں پر اپنا رعب جمایا کرتے تھے۔ اس وقت ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پھر قصہ کہیں اور لوگ بیٹھے سنیں۔ دل کی پتیلی میں قصے کی بھاپ جوش مار رہی تھی اور ہونٹ کے ڈھکنے اٹھ اٹھ کر گر گر پڑتے تھے۔ گھر میں جا کر جلدی جلدی وضو کرنے لگے۔ فجر کی نماز عموماً قضا ہو جاتی تھی مگر وہ پڑھتے ضرور تھے، سوچ رہے تھے کہ نماز سے جلد فارغ ہو جاؤں تو قصہ خوانی کے لئے باہر نکلوں، ہونٹ بدستور ہل رہے تھے جیسے کچھ بدبدائے جا رہے ہوں۔ "بی بی جان" نے دیکھا تو سمجھیں کچھ ورد کر رہے ہیں، یکایک جمعدار صاحب کے منہ سے آواز نکلی "دائیں"۔ بی بی جان چونک پڑیں، جمعدار صاحب بھی کچھ جھینپ سے گئے۔ "لاحول ولا قوۃ" کہہ کے بات ٹال دی، نماز میں بھی میدان جنگ میں ڈٹے رہے، ان کے رکوع و سجود میں حملہ کرنے کی شان تھی۔ یہ تماشا دیکھ دیکھ کے بی بی جان کے دل میں ایک گھٹا ٹوپ کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ ادھر انہوں نے سلام پھیرا اور ادھر یہ برس پڑیں "تمہیں آج ہوا کیا ہے، پھر کسی فرنگن کے خیال میں پڑے ہو کیا؟" جمعدار صاحب اب تک میدان جنگ میں معرکہ آرا تھے۔ بی بی جان کے سوال نے انہیں دنیائے حسن و عشق میں پہنچا دیا اور ان کی باچھیں کھل گئیں۔ بی بی جان کو اور طیش آیا۔ فرمایا "تمہیں آنے ہی کی کونسی ایسی ضرورت تھی۔ انہیں میموں میں پڑے اپنا منہ کالا کیا کرتے۔" فرمایا "ارے عزیزہ اہلیہ تم تو زبردستی بگڑتی ہو۔ اس وقت وہ میمیں کہاں ہیں" "تمہارے دل میں" یہ کہہ کے "عزیزہ اہلیہ" روہنسی ہو گئیں۔ جمعدار صاحب نے فرمایا "اب تمہیں کون سمجھائے" اور باہر چلے گئے۔ دل میں کہتے جاتے تھے "کیا عورت ہے، خیالی لطف اٹھانا بھی مشکل کر دیا ہے"۔

(۳)

جمعدار صاحب کے انتظار میں ان کی گائے موتی کھڑی بیں بیں کر رہی تھی۔ وہ خود روز سویرے اسے کھلایا کرتے تھے۔ انہوں نے اسے جا کے تھپتھپایا۔ پاس تھوڑی سی پوال پڑی تھی، اٹھا کے دی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد گرجے "او قمیص او قمیص، قمیص کمبخت کے بچے حرام زادہ کو توپ دم کر دے۔" قمیص محمد بارہ تیرہ برس کا لڑکا تھا جسے جمعدار صاحب نے صرف کھانے اور سالانہ دو جوڑے پرانے کپڑے پر نوکر رکھا تھا۔ وہ ڈرا سہا دوڑ کے آیا اور کچھ پوال اپنے سر پر ڈھو کے لایا، تھوڑی دیر تک جمعدار صاحب موتی کا دلار کرتے رہے، وہ ان کے گھر کی بچھیا تھی، وقت بے وقت ہل چلانے کے کام بھی آتی اور اڑوس پڑوس کی دودھاری گایوں میں بھی اس کا شمار تھا۔ یعنی سیر دو سیر دودھ بھی دے دیتی تھی۔ اس دودھ کا زیادہ حصہ ان کا نور نظر پیتا اور بقیہ وہ خود۔ "عزیزہ اہلیہ" کو دودھ پسند نہ تھا۔ کم سے کم وہ کہتی یہی تھیں اور

باوجود جمعدار صاحب کے اصرار کے کہ "گھر کی بچھیا کا دودھ ہے، پی لو فائدہ کرے گا" وہ نہ پیتیں۔

یہ لڑکا ان کے بڑھاپے کی اولاد تھی اور انہیں بہت محبوب۔ بڑے بڑے مولوی مولاناؤں سے پوچھ پوچھ کے اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر کے انہوں نے اس کا نام رکھا تھا "ابوالبرکات تاج الاسلام محمد ذوالقرنین شان خدا"۔ وہ خود تو عموماً بہت شین قاف درست کر کے اس کا نام لینے کی کوشش کرتے اور بڑے مزے میں ابوالبرکات کہہ کے شروع کرتے۔ دلار میں بھی "میرا شان میرا جان" مگر لوگوں نے شانو بھی نہیں بلکہ چھانو بنا دیا تھا۔ "عزیزہ اہلیہ" بھی چھانو ہی کہتیں۔ جمعدار صاحب کی زبان سے خود بعض وقت بے خیالی میں چھانو نکل جاتا جس کا انہیں افسوس ہوتا۔ چھانو چار پانچ برس کا تھا مگر پھر بھی ان کے کندھے پر چڑھا رہتا اور بعض وقت شوخی میں ان کے سر پر طبلہ بجاتا۔ ابھی قمیص دودھ دودھ ہی رہا تھا کہ چھانو زنان خانے سے آنکھیں ملتا ہوا برآمد ہوا اور جمعدار صاحب کے پاؤں سے لپٹ گیا، انہوں نے گود میں اٹھا لیا۔ وہ سر سے اتر پڑا اور موتی سے کھیلنے لگا۔ موتی اسے چاٹنے لگی، اپنے بچے کی طرح، جمعدار صاحب ایک ہاتھ چھانو کے سر پر پھیرتے رہے، دوسرا موتی کی پشت پر اور پھر فرطِ جذبات سے "مرحبا مرحبا" گنگنانے لگے۔

(۴)

تھوڑی دیر بعد گیدو کی ماں ایک چھوٹی ٹوکری میں چیوڑا اور گڑ بھیجنے لائی۔ وہ بیوہ تھی اور پڑوس میں رہتی تھی، عمر ساٹھ برس کے قریب ہو گی۔ گیدو کو مرے ایک مدت ہو گئی تھی اور وہ چھانو کو اس کی جگہ سمجھتی تھی۔ چھانو بھی اسے بہت چاہتا تھا، آج بھی اسے دیکھ کے دوڑا اور اس نے حسب معمول کچھ گڑ اور چیوڑا دیا۔ جمعدار صاحب سے وہ ڈرتی تھی مگر ان کی "عزیزہ اہلیہ" سے اس کی قدرے بے تکلفی تھی، وہ انہیں بی بی شاب (بی بی صاحب) کہتی اور بی بی شاب اس سے گھر کی باتیں کرتیں، آج جب گیدو کی ماں آئی تو دیکھا کہ بی بی شاب غصے میں بھری بیٹھی ہیں، گیدو کی ماں کے سوئے نظر کے نشتر سے بی بی شاب کے دل کا پکا پھوڑا پھوٹ بہا، کہنے لگیں "اے گیدو کی ماں اب میں کیا کہوں میری قسمت ہی ایسی ہے۔ میاں شاب کے دل میں اب بھی وہی چڑیل بسی ہوئی ہیں، انہیں کے خیال میں مگن رہتے ہیں"۔ گیدو کی ماں نے پہلے تو وہی معمولی تسلی کی باتیں کیں۔ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں، گیدو کا باپ بھی ویسا ہی تھا، رات کو جب دیکھو بچھونے سے غائب، پیشاب کا بہانہ، جب رونے دھونے لڑائی جھگڑے سے کچھ نہ ہوا اور پیشاب کا مرض بڑھتا ہی گیا تو وہ صبر کر کے چپ ہو رہی۔ پھر تو کچھ دن کے بعد ایسا رنگ بدلا کہ جب پیشاب لگتا تو اسے جگاتا اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے باہر لے جاتی اور پھر واپس لاتی۔ "بی بی شاب" نے بگڑ کے کہا "یہ بڑھاپے کی بات ہو گی" گیدو کی ماں سٹپٹا سی گئی، لیکن جہاں دیدہ عورت تھی، جھٹ بولی "میاں شاب تو بڑھا گئے ہیں"۔ بی بی شاب نے فرمایا "نہیں ان کا دل تو جوان ہے"۔

گیدو کی ماں نے بی بی شاب کا رنگ دیکھ کے بات کا رخ پلٹ دیا۔ عورتوں کی مظلومی اور مردوں کے مظالم کا رونا رویا جانے لگا اور دونوں تھوڑی دیر خوب روئیں، اس کے بعد بی بی شاب نے ایک ٹوکری میں کچھ چاول لا کے دے دیئے جیسے اس کی ہمدردی اور آنسوؤں کے دام دے رہی ہوں۔ گیدو کی ماں نے حسب معمول بغیر کچھ کہے سنے اسے قبول کر لیا اور آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئیں۔

(۵)

جمعدار صاحب بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے کہ کیسے دن چڑھے لوگ آئیں اور ان کی قصہ خوانی شروع ہو۔ ان کے دل میں بچوں کی سی بے چینی تھی، ان کا جی چاہ رہا تھا کہ سورج آسمان کے زینے پر بچوں کی طرح جلد جلد چڑھ جائے، مگر وہ آج ایک سفید ریش بڈھے کی طرح ہر زینے پر رک رک کر دم لیتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گاؤں میں ابھی تک آمد و رفت شروع نہ ہوئی تھی۔ کوئی اور نہیں تو پھول محمد ہی آ جاتا۔ وہ لونڈا ہے تو شریر اور جمعدار صاحب کی کہانیوں پر الٹے سیدھے بے تکے سوالات بھی کیا کرتا ہے لیکن خیر وہی سہی، وہ شیطان بھی آج ابھی تک نہ آیا تھا۔

آخر جمعدار صاحب نے ٹھانی کہ وہ خود ہی گاؤں کا چکر لگا آئیں۔ انہوں نے اپنی ڈونگی درخت سے کھولی، وہی ڈونگی جسے خود انہوں نے اپنی نگرانی میں تاڑ کے درخت میں خول کر کے تیار کرایا تھا۔ ویسے تو جمعدار صاحب کے پاس ایک اور بھی معمولی قسم کی کشتی تھی، مگر وہ جب اپنے دل میں کوئی خاص توانائی محسوس کرتے تو اس وقت وہ ڈونگی ہی کو بانس سے کھیتے ہوئے نکلتے گویا تاڑ کے درخت کے تنے میں کھڑے کھڑے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جمعدار صاحب

اکثر کوئی چیز گنگناتے بھی چلتے، آج بھی گنگنا رہے تھے۔ جمعدار صاحب بستی کے ٹیلوں کے پاس سے گزرے۔ کچھ لوگ نظر بھی آئے۔ علیک سلیک بھی ہوئی، مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ کی کہ جمعدار صاحب سے باتیں کرتا، سب اپنے اپنے کام میں مصروف نظر آرہے تھے اور یہ بات انہیں ناگوار گزر رہی تھی۔ آخر جمعدار صاحب نے گاؤں کے سب سے بڑے ٹیلے کا رخ کیا۔ یہ ان کے مکان سے کچھ دور تھا اور یہاں ہر صبح چھوٹا سا بازار لگتا۔ پھل دودھ دہی ترکاریاں تھوڑی تھوڑی مقدار میں بکنے آتیں۔ دو ایک مستقل دکانیں بھی تھیں۔ جمعدار صاحب ٹیلے کے کنارے ڈونگی سے ابھی اترے ہی تھے کہ جلو دھر جیٹھی سے ملاقات ہو گئی۔ جلو دھر پچیس تیس برس کا نوجوان تھا، پہلے کالج میں پڑھتا تھا، پھر پڑھائی چھوڑ کر کسی سرکاری دفتر میں نوکر ہو گیا تھا اور اب حال ہی میں گاؤں میں آکے رہنے لگا تھا۔ کوئی کہتا نکالا گیا ہے کوئی کہتا قومی کام کے لئے خود نوکری پر لات ماردی۔ جمعدار صاحب نے کئی برس پہلے اسے دیکھا تھا، انہیں اس کی وضع قطع میں بڑا فرق نظر آیا، موٹا سا چشمہ لگا تھا بغل میں دو تین کتابیں دبی تھیں۔ سر کے بال جتنے بڑھے تھے اس سے زیادہ الجھے، چہرہ کے درو دیوار پر سبزہ بڑی بے تکلفی سے اُگ رہا تھا، جمعدار صاحب کچھ جھجکے پھر بڑے تپاک سے بولے: "او جلو دھر بابو! بہت دن بعد آئے کہو کیسے ہو؟" جلو دھر نے بتایا کہ اب وہ گھر ہی پر رہے گا اور گاؤں والوں کی خدمت میں زندگی صرف کرے گا۔ جمعدار صاحب گرگ باراں دیدہ تھے۔ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ دونوں بازار کی طرف بڑھے۔ راستے میں جلو دھر نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ وہ کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ اور کمیونزم کیا ہے مگر جمعدار صاحب نے جو اپنے خیالات میں مگن تھے مطلق دھیان نہ دیا۔ بازار آگیا۔ ابھی لوگ زیادہ نہ آئے تھے مگر پھر بھی کچھ اللہ کے بندے نظر آہی گئے۔ سب گاؤں کے بھائی بھتیجے بھیا سب خیریت تو ہے"۔ "چاچا آج اتنے سویرے کیسے آنا ہوا؟" وغیرہ وغیرہ کے سوالات نے ان کا خیر مقدم کیا، وہ مسکرائے جس کے معنی تھے ابھی بتاتا ہوں۔ "بھیا دنیا کی کچھ خبر سناؤ؟" جمعدار صاحب نے اپنے سینے میں کشادگی محسوس کی۔ جلو دھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جمعدار صاحب بول اٹھے: "جرمن پھر شرارت پر کمر باندھ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پھر منہ توڑ آؤں"۔

"چاچا آپ تو لام سے آ کے کہہ رہے تھے جرمن کو ایسی مار ماری ہے کہ اب سر نہ اٹھا سکے گا"۔

"مگر چاچا" پھول محمد کی آواز آئی۔ چاچا نے پلٹ کے دیکھا تو پھول محمد کھڑا تھا، اس کے آنے کی انہیں خبر نہ ہوئی تھی، وہ اسی طرح بے سان و گمان آجایا کرتا تھا، مسکراتی ہوئی نگاہیں ملیں اور پلک مارنے سے پہلے ہی ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ گئیں، شکوہ، شکایت عذر معذرت صفائی۔ "مگر چاچا" پھول محمد نے نگاہوں کی گفتگو کے ساتھ ساتھ زبانی گفتگو بھی شروع کر دی، "جرمن سے چاچا کب لڑے تھے۔ چاچا تو ترکوں سے لڑے تھے۔" چاچا بگڑے: "چاچا سب سے لڑے تھے، یہ زخم (ہاتھ کا نشان دکھاتے ہوئے) جرمن ہی سے لڑنے میں لگا تھا۔" پھول محمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آرہی تھی مگر اس نے اپنے ہونٹ چبا کر کہا "یہ قصہ تو آپ نے کبھی نہیں سنایا۔" جمعدار صاحب: "اچھا نہیں سنایا؟ خیال آیا ہو گا" یہ کہہ کے چپ ہو گئے۔ اب کوئی اصرار کرے تو کہیں۔

پھول محمد: چاچا سنائیے نا پھر۔

"اب کیا سنائیں" یہ کہتے ہوئے چاچا ایک سوکھے ہوئے کھجور کے تنے پر جو پاس ہی پڑا تھا اکڑوں بیٹھ گئے۔ قریب ہی سرت ساہا اپنی دکان کھول رہا تھا۔ دکان کی دیواریں اور چھت ٹین کی تھیں جو خوش حالی کی دلیل تھی۔ گاؤں میں یہ سب سے بڑی دکان تھی اور یہاں گاؤں کی ضرورت کی قریب قریب سب ہی چیزیں مل جاتی تھیں۔ دال چاول، سرسوں تیل، بلون گھی، مٹی کا تیل (لال ٹین کی بتی)، موم بتی، پیپرمنٹ، سگریٹ، بیڑی، دیا سلائی وغیرہ وغیرہ۔ سرت نے جمعدار صاحب کو کھجور کے تنے پر بیٹھتے دیکھ کے کہا "کاکا وہاں کیا بیٹھے ہو یہاں آکے بیٹھو نا تمہاری دکان ہے۔" جمعدار صاحب "خیر سنو" کہہ کے قصہ شروع کر چکے تھے۔ اب وہ کہاں اٹھ کے جاتے، انہوں نے کسی اٹلانے کے انداز میں جواب دیا "ٹھیک ہے" اور قصہ سنانے میں لگ گئے "یہ جرمن سپاہی ارے باپ رے باپ آدمی نہیں جنات"۔

"گوروں سے بڑھ کے؟" پھول محمد نے پوچھا۔

ارے گورے کیا کھا کے لڑیں گے۔ گورے ہی لڑ پاتے تو ہم لوگ کاہے کو جاتے"۔

قصہ کی رو میں جمعدار صاحب بہنے لگے، ان کے دستہ نے ایک چوکی پر حملہ کیا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ان کے کئی بہادر کام آئے، آخر چوکی سے گولہ باری بند ہو گئی، ہمیں دشمنوں کے سب سپاہی مارے گئے۔ چوکی میں گھسے تو کوئی زندہ نہ بندہ، صرف ایک سپاہی زمین پر لہولہان پڑا تھا۔ اس ایک نے اتنی آفت ڈھائی تھی۔

جمعدار صاحب اس کے پاس سے گزرے تو ایک دم سے زخمی شیر کی طرح جھپٹ پڑا۔ یہ پہلے تو لڑکھڑا گئے، مگر پھر فوراً قدم جما کے گتھ گئے۔ ایک گھنٹے تک گتھم گتھا رہی۔ انہوں نے اس کے گلے میں اپنی لوہے جیسی انگلیاں دھسانی شروع کیں۔ اس کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں مگر مردود نے مرتے مرتے بھی (ہاتھ میں ایک نشان دکھاتے ہوئے) ان کے ہاتھ میں اس زور سے دانت کاٹا ان کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

پھول محمد سے نہ رہا گیا، وہ ہنس پڑا اور بولا "مگر چاچا یہ نشان تو پھوڑے کا ہے۔"

"پھوڑا کب نکلا تھا، جھوٹا کہیں کا۔"

پھول محمد نے تفصیل بتائی۔ جمعدار صاحب نے مزید انکار مناسب نہ سمجھا کیونکہ انہیں یاد آگیا کہ پھول محمد ہی تو اس وقت ہسپتال سے دوا لایا کرتا تھا۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے بولے "او، وہ پھوڑا، میں بھول ہی گیا تھا، ہاں ان دانتوں کا زہر اب تک باقی رہ گیا ہے، تھوڑے تھوڑے دن پر یہاں پھوڑا نکل آتا ہے۔"

جمعدار صاحب صاف بات بنا گئے اور پھول محمد منہ تکتا رہ گیا۔

"تو بھیا جرمن ترکن سے بھی بڑھ گئے۔" ایک نے سوال کیا۔

جمعدار صاحب کو دوسرے دھارے میں بہہ نکلنے کا اچھا موقع ملا۔ اب ترکوں کا ذکر شروع ہو گیا، وہ ان کا چوڑا چکلا سینہ، بلند و بالا قد، فولاد جیسی کلائیاں، ایک گھونسہ ماردیں تو بھیجا چٹک جائے۔ ایک ترک دس دس انگریزوں پر بھاری، صورت دیکھتے ہی دل دہل جائے، ایک گورے کا اتفاق سے ایک ترکی سپاہی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ بیچارے کو اسی وقت کھڑے کھڑے ہیضہ ہو گیا۔ اب بازار میں سودا سلف لینے والوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ جمعدار صاحب کے محلے کی مسجد کے امام صاحب مولوی نور الانوار بھی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں جمعدار صاحب نے دو پیسے دئیے اور کہا کہ اس کا پان لے کے ان کے گھر پہنچا دیں اور یہ کہہ دیں کہ جمعدار صاحب ذرا ضروری کام میں لگے ہیں اور ان کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ امام صاحب اس قسم کے حکم اکثر فوراً بجا لاتے تھے۔ درحقیقت مسجد میں اذان دینے اور نماز پڑھانے کے علاوہ ان کا بڑا کام سودا سلف لانا تھا، مگر اس وقت ترکوں کا ذکر ہو رہا تھا، اس لئے ان کا دل چاہتا تھا کہ اس کو ذرا سن لیں تو جائیں۔ جمعدار صاحب ترکوں کی عظمت کا ذکر کر کے حسب معمول ذرا رک سے گئے، پھول محمد نے مطلب بھانپ لیا اور کہا "چاچا اپنا وہ قصہ تو سنائیے ترکوں سے چوکی چھیننے والا۔" جمعدار صاحب یہ قصہ تھوڑے تھوڑے اختلافات کے ساتھ کئی دفعہ پہلے بھی سنا چکے تھے۔ اب پھر سلسلہ شروع ہو گیا۔ جمعدار صاحب کے دستے نے بغداد کے قریب ترکوں کی چوکی پر حملہ کیا، دستہ کے کچھ سپاہی مارے گئے، باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ جمعدار صاحب تن تنہا بڑھتے گئے۔ بڑھتے گئے، گولیاں ان کے سر پر سے زن زن نکل رہی تھیں، گولے ان کے پاؤں کے پاس دن دن پھٹ رہے تھے، وہ دھما دھم جست کرتے جا رہے تھے، بالآخر چوکی میں گھس ہی گئے، ترک ان پر سنگینیں لے کر ٹوٹ پڑے، انہوں نے وہی سنگینیں چھین چھین کر ترکوں کے سینوں کے پار کر دیں اور اس طرح ایک دو نہیں سات ترکوں کا خاتمہ کر دیا۔ مولوی نور الانوار کو عموماً جمعدار صاحب کی بہادری کے قصوں سے خوشی ہوا کرتی تھی، مگر آج انہوں نے ترکوں کی شکست کا حال سنا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ سنگینیں ترکوں کے نہیں بلکہ ان کے سینے کے پار ہو رہی ہیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ کاش یہ بات غلط ہوتی، اب ان سے وہاں زیادہ دیر تک ٹھہرتے نہ بنا اور وہ سر جھکائے ہوئے وہاں سے چلے گئے، اپنے سے بیزار، ساری دنیا سے بیزار، ان کے جانے پر کسی نے توجہ نہ کی، قصہ جاری رہا، اس معرکہ میں جمعدار صاحب کو پورے اکیس زخم لگے، مگر انہوں نے جب تک چوکی پر وہ جھنڈا نصب نہ کر لیا جسے وہ اپنے دانتوں میں دبائے ہوئے تھے۔ اس وقت تک انہوں نے دم نہ لیا، جنرل صاحب نے آ کے دیکھا تو بڑی شاباشی دی اور کہا "ول منشی صاحب ایسا بہادری کا کام تو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔" اسی وقت اس نے جمعدار بنا دیا۔ پھول محمد نے پھر ٹانگ اڑائی اور یاد دلایا کہ پہلے تو انہوں نے بتایا تھا ایک ڈوبتی ہوئی میم کی جان بچانے کے صلے میں جمعدار بنے تھے۔ جمعدار صاحب ذرا جھجکے پھر فوراً ہی تسلیم کر لیا کہ وہ وجہ بھی تھی، درحقیقت جمعداری آسانی سے نہیں ملا کرتی، لیکن بابو وہاں کے زمیندار کے کارندے بھی سننے والوں کے مجمع میں شریک ہو گئے تھے، لوگ کچھ تو کہانی سننے اور کچھ کاہلی میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ ان کے آنے کا کسی کو پتہ نہ چلا۔ ان کا ایک ہاتھ سر کے چٹیل میدان میں خرخریج کر رہا تھا، دوسرا ہاتھ پھولے ہوئے پیٹ کے احساس امیری سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور وہ اس تحمل سے جمعدار صاحب کی داستان سرائی سے محظوظ ہو رہے تھے، کئی دفعہ انہوں نے بولنا چاہا تھا مگر بول نہ سکے تھے، اب انہیں موقع ملا۔

جوش میں آکے اردو میں بولے "ایسا ٹھاٹھا بات پر تو ہم کٹو دیا کر اس ملنادر کار تھا" ان کی آواز سنتے ہی جو شخص ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اٹنشن ہو گیا جمعدار صاحب نے پہلو بدل کر دونوں ہاتھوں سے نمسکار کیا اور فرمایا" ملا تھا بابو صاحب، وہ تو ہم نے ریٹائر دیتے وقت واپس کر دیا" پھر انہوں نے تفصیل بتائی کہ کس طرح جب وہ اپنے سب تمغے لگاتے تو سینے پر جگہ باقی نہ رہ جاتی وغیرہ وغیرہ۔ جلودھر کو یہ سب باتیں بکواس معلوم ہو رہی تھیں، وہ کھسیانا ہو رہا تھا مگر مجبوراً سن رہا تھا۔ اب اس سے نہ رہا گیا۔ غصہ کی بات تھی اس لئے اردو میں کی گئی، بول اٹھا" ریٹائر دیا تھا یا نکالا گیا"

جمعدار صاحب گرجے "چوپ" مگر اس "چوپ" کا جلودھر پر کوئی اثر نہ ہوا جیسے بطخ کے پروں پر سے پانی پھسل جائے۔

اس نے کہا" آپ بتاؤ آپ کا بٹیلین کا نام کیا تھا"

جمعدار صاحب نے غصہ اور حقارت کے ساتھ منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

"آپ نہیں بولے گا تو کیا، سب جانتا ہے کہ آپ کا بٹیلین ڈرپوک کے کارن توڑ دیا گیا تھا، آپ سارا بات جھوٹ بولتا ہے"

جمعدار صاحب کے غصے کا بم پھٹا" تم جھوٹا تمہارا باپ جھوٹا، تم خود نوکری سے نکالا گیا اور اب یہاں گاؤں میں آکے بدمعاشی کرتا ہے" فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے لگے۔

سرت سابا نے کہا" کاکا جانے دو جانے دو۔ ارے کچھ گھر کے لئے تو لئے جاؤ"

جمعدار صاحب: "نہیں جھوٹا کہیں کا۔ نہیں، اس وقت پیسہ نہیں ہے"

سرت نے کہا" کاکا پیسے کا کیا ہے، پھر دے دینا۔ ساری دکان تمہاری ہے، لیو نیا نیا لیمن چوس آیا ہے، تھوڑا لئے جاؤ پھانو میاں کے لئے"

لیمن چوس اور پھانو کے ذکر پر جمعدار صاحب پسیج گئے۔ جب وہ لیمن چوس لے کر جائیں گے تو وہ کسی طرح دوڑ کر ان کے پیروں سے لپٹ جائیگا۔ وہ اس کو گود میں اٹھا کے لیمن چوس دیں گے اور وہ بجائے چوسنے کے اسے کُر کُر کھا جائے گا۔ اس خیال سے ان کا غصہ ہوا ہو گیا اور وہ کچھ لیمن چوس اور "عزیزہ اہلیہ" کے لئے ناریل کا تیل لے کر چل پڑے۔ جاتے وقت انہوں نے جلودھر کو اس طرح دیکھا جیسے نظروں ہی سے کچا کھا جائیں گے۔

جلودھر نے جو لوگ باقی رہ گئے تھے ان سے مخاطب ہو کر کہا" ہم سب خبر لیا ہے۔ یہ جمعدار کبھی نہیں بنا، تھوڑا دن سپاہی رہا پھر پلٹن ٹوٹ گیا"

گھن بابو بولے "ہاں جھوٹ تو جرور بولتا ہے، اس دن بولتا تھا ہم ریٹائر دو مقرم کے کارن دیا، ترکوں پر گولی چلانے کو بولا گیا، یہ بولا ترک ہمارا دھرم کا بھائی ہے، ہم ان پر گولی نہیں چلا سکتا، آج بولتا ہے سات ترک مارا"

پھول محمد کو جمعدار صاحب پر اعتراض کرنے میں خود تو مزا ضرور آتا تھا مگر کسی اور کا اعتراض کرنا اور وہ بھی ان کے پیٹھ پیچھے اسے نہ بھایا اور وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا، قدم بڑھا کر جمعدار صاحب کے پاس جا پہنچا، اور ان سے کہا" لاؤ چاچا میں پہنچا دوں" جمعدار صاحب نے "نہیں رہنے دو" کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تیل کی بوتل دے دی مگر "لیمن چوس" کی پڑیا اپنی مٹھی میں دبائے رکھی۔

افسانہ:
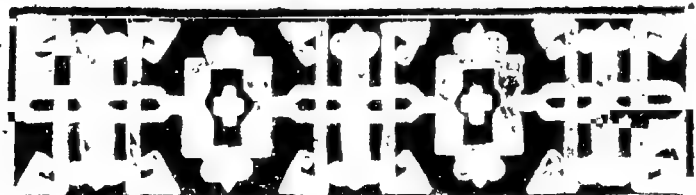
جن پہ تکیہ تھا

خورشید انور جیلانی

دونوں میاں بیوی کو طوطے سے بہت محبت تھی۔ وہ اس پر جان دیتے تھے۔ شادی کے تین سال بعد مولوی نبی بخش ایک بڑے خوبصورت پنجرہ میں میاں مٹھو کو لے کر گھر میں داخل ہوئے تو مریم دیکھ کر کھل گئی۔ اس نے فرطِ مسرت سے دوڑ کر پنجرہ ہاتھ میں تھام لیا۔ تب سے یہ طوطا دونوں میاں بیوی کا مرکزِ توجہ بن گیا۔ اور طوطے کا مرکزِ توجہ مریم تھی اور اس کے بعد مولوی صاحب۔ چنانچہ جب مریم کام کرتے کرتے کہتی "میاں مٹھو، چوری کھاؤ گے؟" تو وہ پنجرے کی درمیانی سلاخ پر ذرا پہلو بدل کر یہی لفظ دوہرا دیتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ لوہے کے باریک تاروں کا یہ مخروطی پنجرہ نہیں بلکہ کسی پرانی عمارت کا گنبد ہے جس سے جیسا کہو گے ویسا ہی سنو گے۔ گنبد اور پنجرے میں صرف یہ فرق تھا کہ پنجرے میں تو لال چونچ، سبز ریشمی پروں والا خوش لباس سیاہی مائل سرخ کنٹھا پہنے زندہ طوطا ہوتا ہے۔ مگر گنبد میں کوئی نہیں ہوتا۔ میاں مٹھو کی تعلیم ہزاروں سال پرانے فقرہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ بیسیوں بار مولوی جی کی نقل اتارتے ہوئے مریم کو پکار بھی لیتا تھا۔

اور کبھی کبھار وہ بڑی باریک آواز میں مریم کی نقل اتارتے ہوئے "مولوی جی" بھی پکار اٹھتا تھا۔ پہلے پہل جب میاں مٹھو اس گھر میں آیا تو وہ چند روز تک پنجرے میں احتجاجاً پھڑپھڑاتا رہا مگر رفتہ رفتہ اپنی اسیری پر مطمئن ہو کر پنجرے سے مانوس ہو گیا۔ یہاں تک کہ کئی بار غلطی سے مریم نے پنجرہ صاف کر کے اس کا پٹ کھلا چھوڑ دیا تو بھی نہ اڑا۔ وہ اپنے پنجرے، چوری اور مریم سے بہرحال مطمئن تھا۔ اور میاں مٹھو کی طرح مریم بھی اپنی تنہائی اور گھر کے پنجرے سے مطمئن تھی۔ جب مولوی جی وعظ فرمانے یا نماز پڑھانے کے لئے چلے جاتے تو اس کے پاس میاں مٹھو کے سوا اور کون مونسِ تنہائی ہو سکتا تھا؟

میاں مٹھو کا خیال مولوی جی کو اس وقت پیدا ہوا جب ہزاروں وظیفوں، دعاؤں، ٹونے، ٹوٹکوں کے بعد بھی قدرت نے ان دونوں کو اولاد سے نہ نوازا حالانکہ مولوی جی کے تعویذوں اور محض دعاؤں ہی سے بیسیوں اندھیرے گھروں میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ اب طوطا تین سال سے مریم کا سو فیصد اور مولوی جی کا چند فیصد مرکزِ توجہ بن کر پرورش پا رہا تھا۔

مولوی صاحب گنے کی مل سے کوئی دو میل دور گنے کے کھیتوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی بستی میں رہتے تھے جو محض کہنے کو بستی تھی۔ کیونکہ اس میں دو گھر اور تھے اور وہ بھی بے چراغ۔ سب نے اپنے اپنے گنے کے کھیتوں میں جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اور سال کا زیادہ حصہ وہیں گزارتے تھے۔

مولوی جی کا گھر چاروں طرف سے گنے کے دور دور پھیلے ہوئے کھیتوں سے گھرا تھا۔ یہاں تین قسم کے گنے بوئے جاتے تھے۔ کاٹھا، پونڈا اور فارمی۔ کاٹھا اس لئے کہ اس سے بونے والا گڑ شکر بنا کر سال بھر کے لئے چینی کی بھیک مانگنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ پونڈا چوسنے یا بازار میں بیچنے کے لئے۔ اور فارمی اس لئے کہ مل کو اس کی مانگ تھی۔ اور کسانوں کو نقد روپیہ مل جاتا تھا۔ مگر اس میں خرابی یہ تھی، یا ایسے ہی مشہور ہو گیا تھا کہ فارمی گنا چوسنے سے قوت میں فرق آ جاتا ہے۔

بہرحال مریم اور میاں مٹھو کے ارد گرد دور دور، میلوں تک، گنے کے کھیت سال کے بیشتر حصہ میں لہلہاتے رہتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گنے کے اس لمبے چوڑے جنگل میں مریم ایک پنجرے میں قید ہے۔ اور مریم کے قید خانے میں ایک چھوٹا سا قید خانہ ہے جس میں مٹھو قید ہے۔ میاں مٹھو کے آنے کے بعد بھی دونوں میاں بیوی نے نذر نیاز کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کا پکا عقیدہ تھا کہ خدا کے گھر میں کوئی کمی نہیں۔ مولوی جی صرف اپنے ہی تعویذوں سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ جہاں کسی بزرگ، ولی اللہ یا مجذوب کی خبر پاتے بڑی عقیدت سے وہاں حاضر ہوتے مگر

قدرت کو دونوں کو نوازنا منظور نہ تھا۔ محرومی کے باوجود دونوں کی ایک دوسرے سے دلچسپی میں کوئی فرق نہ آیا۔ مریم بڑی حسین تھی۔ اتنا عرصہ گذرنے کے باوجود وہ ایک نازک اندام لڑکی ہی نظر آتی تھی۔ گورے رنگ پر جب وہ اس علاقے کے دستور کے مطابق سیاہ کرتا پہنتی اور سیاہ دوپٹہ اوڑھ لیتی تو سیاہ بادلوں میں گھرا ہوا چاند معلوم ہوتی۔ مگر عورت کا سب سے بڑا حسن تو اولاد ہے جو اس کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ مریم کو بھی اس کا احساس تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے باریک باریک سے حلقے پڑ گئے تھے۔ ممکن ہے وہ تنہائی میں زبان سے میاں مٹھو پکارتی رہی ہو۔ مگر دل ہمیشہ بچے کو ہی پکارتا تھا۔ پنجرے کے گنبد سے تو صدا آتی مگر دل کے پنجرے سے کوئی جواب نہ آتا۔ مولوی صاحب صوم و صلوٰۃ کے پابند تو تھے ہی، وعظ و نصیحت میں بھی میلوں تک ان کا ثانی نہ تھا۔ کوئی پینتیس چالیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ کہیں کہیں شرعی مونچھوں میں سفید بال نظر آنے لگے تھے۔ پاکدامنی کا شہرہ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ ویرانے کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھ لیں تو وہ لہلہا اٹھے۔ جنات ان کے قابو میں تھے۔ جہاں سے گزرتے لوگ عقیدت سے جھک جاتے۔ بستی سے کوئی دو میل دور ایک بزرگ کا مزار تھا۔ جن کے دم قدم کی برکت سے ہزاروں مشرف بہ اسلام ہوتے۔ رات کو ان کی جھونپڑی سے روشنی کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی رہتی تھیں۔ اس لئے وہ "نور ولی اللہ" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ ان کا مزار مرجع خلائق تھا۔ جو مزار پر گیا دل کی مراد پائی۔

مزار کے گرداگرد دو ایکڑ زمین، اونچے اونچے نہایت خاردار درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ مگر خود مزار کو پچاس پچاس قدم تک خودرو ڈھاک کے گھنے اور پُراسرار درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔ اس تاریک اور خوفناک منظر کو ایک بہت پرانے برگد کے بھاری بھرکم درخت نے پھیل کر اور بھی تاریک اور خوفناک بنا دیا تھا۔ یہ گھنا جنگل بھیڑیوں اور گیدڑوں کا مسکن تھا۔ جو دن دہاڑے حملہ کر کے کئی لوگوں کو زخمی کر چکے تھے۔ اس لئے اکا دکا آدمی اس طرف جاتے ہوئے کانپ جاتا تھا۔ مزار کے قریب کسی نے تین پختہ کمرے بنا کر چار دیواری بنا دی تھی تاکہ مسافر رات خیر و عافیت سے گزار سکیں۔ اس ہیبت ناک ماحول میں جو کوئی بھی آنا چاہتا شام سے پہلے ہی لوٹ جاتا۔ البتہ مریم اور مولوی جی نے اس مزار پہ پورے چالیس دن کا چلہ کاٹا تھا۔ جس سے ان کی مراد تو نہ بر آئی مگر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ مولوی جی کے قابو میں ضرور کوئی جن ہے۔ جو چلے کے دنوں میں بھی میاں بیوی کی حفاظت کرتا رہا ہے۔

ایک دن ظہر کی نماز پڑھا کر مولوی صاحب گھر آئے تو ان کی بغل میں ایک موٹا تازہ سفید مرغ اور دوسری بغل میں ایک بھاری گٹھری تھی۔ مریم، "میاں مٹھو" سے کہہ رہی تھی "چوری کھاؤ گے؟" مگر وہ پنجرے کی درمیانی سلاخ پر ادھر ادھر پھرے جا رہا تھا اور کبھی کبھی پنجرے کی چھت میں چونچ پھنسا کر الٹا لٹک جاتا تھا۔ گویا وہ اس کی بات پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔

مولوی جی ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ مریم سیاہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے چارپائی سے بسم اللہ کہتی ہوئی اٹھی، مرغ کو تھاما اور دوسرے ہاتھ سے گٹھری لے لی۔ مولوی صاحب خوش خوش مسکرا رہے تھے۔ مریم نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بولے "جان اللہ! آج تک ایسا بزرگ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ نورانی چہرہ کہ فرشتے بھی سجدے کریں۔"

"کہاں؟" مریم کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے تو یقین ہو گیا کہ بزرگ کی دعا سے اس کی مراد بر آئے گی۔

طوطا یوں اٹھا "مریم۔ مریم۔ میاں مٹھو، چوری کھاؤ گے؟"

اور پھر پنجرے کی درمیانی سلاخ پر الٹا لٹک کر جھولنے لگا۔ شاید وہ بھی اس خبر پر خوش تھا۔ مریم نے اپنا سوال پھر دہرایا "مولوی جی، کہاں؟" طوطے نے کہا "مولوی جی، چوری کھاؤ گے؟"

مریم نے طوطے کو جھڑکا "چپ رہ کمبخت! بیچ میں اپنی ہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔" "وہیں حضرت نور ولی اللہ کے مزار پہ" مولوی جی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ طوطا پھر "مریم مریم" چلایا اور چونچ سے پنجرے کی ایک آہنی تیلی کو پکڑ کر پھڑپھڑانے لگا۔ مگر اس نے دھیان نہ کیا۔ مریم کے سامنے تو اپنے دل کی آرزو تھی اور حضرت نور ولی اللہ کا مزار، اسی ہیبت ناک پُراسرار ماحول میں، ایک بزرگ کا آفتاب کی طرح روشن چہرہ اس کی نظروں میں پھر گیا۔ اور وہ خیال ہی خیال میں اس کے قدموں پر گر گئی۔ اور مراد مانگنے لگی۔ طوطا پھر رٹ لگانے لگا۔ "مریم! مریم!" پھر یک کر

"مولوی جی" اپنے انداز سے کہا جیسے ان سے کچھ پوچھتا ہو۔ مریم نے کہا "سبحان اللہ؟ ایسے بزرگ کے مزار پر ایسے ہی بزرگ آتے ہیں۔"

"جی ہاں ہر وقت برقع پہنے رہتے ہیں۔ میں ان کا کھانا کہہ آیا ہوں، سینکڑوں مرد عورتیں زیارت کو جمع تھیں، انہوں نے برقع نہیں اٹھایا۔ مجھے پاس بلا کر نہایت شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا "عورتوں کو کہدو چلی جائیں۔ میں نے آج تک کسی عورت سے بات نہیں کی۔" جب عورتیں چلی گئیں تو دوسرے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں بہت لمبے سفر سے آیا ہوں۔ تین دن بعد مل سکوں گا۔" مگر مجھ سے کہا "ربی بخش، تم بیٹھو۔" میں دو زانو ہو کر ان کے روبرو بیٹھ گیا۔ انہوں نے نقاب الٹ دیا۔ سبحان اللہ! جیسے سورج طلوع ہو گیا ہو۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں، میں فوراً سجدے میں گر گیا۔ فرمانے لگے "ربی بخش، ہم نے آج تک صرف سات مردوں کے سامنے نقاب اٹھایا ہے ان میں سے ایک تم بھی ہو۔"

مریم نے کہا "سبحان اللہ! نیک بندے کے ساتھ اللہ کے نیک بندے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔" اور مولوی صاحب پر ایسی بھرپور نظر ڈالی جس سے فخر ٹپک رہا تھا۔ مولوی جی نے پھر کہا "وہ بزرگ بولے ربی بخش، میں صرف تمہارے ہاں سے دو وقت کا کھانا کھاؤں گا۔ اور کوئی اس قابل نہیں اور کوئی عورت مریم کے سوا ایسی نیک نہیں جس کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا میرے لئے حلال ہو۔"

"سبحان اللہ!" مریم کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ خیال ہی خیال میں اپنے میاں کے دوش بدوش اس بزرگ کے سامنے سجدے میں گر پڑی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا "میرا نام ان کو کس نے بتایا؟"

"واہ! ایسے صاحب کشف بزرگ کو بھلا کچھ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے!"

مریم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگی "میں اس قابل کہاں، یہ تو ان کی عنایت ہے۔ اللہ نے میری سن لی!"

"ہاں سجدے کا مقام ہے مریم۔ لو اٹھو جلدی سے کھانا تیار کرو۔ کوٹھری میں گھی، چینی، سوجی، پرانی باسمتی سب کچھ ہے۔ میں مرغ ذبح کرتا ہوں۔ پکانے سے پہلے وضو کر لینا۔ دونوں وقت کھانا میں خود دے جایا کروں گا۔"

مریم وضو کر چکی تو پوچھنے لگی "کبھی وہ مجھے بھی زیارت کی اجازت دیں گے؟"

"دیکھو، بزرگوں کی موج ہے!" مولوی صاحب نے سرسری سا جواب دیا۔

کھانا پکا۔ مولوی صاحب باوضو ہو کر، کھانا لے کے، سر شام چلے گئے۔ طوطا پنجرے میں سو چکا تھا۔ اس کو کسی کا انتظار نہیں تھا۔ مگر مریم کو انتظار تھا۔ وہ جاگتی رہی کہ مولوی جی آئیں تو اس بزرگ کی اور باتیں سنے۔ آخر رات دیر گزرے مولوی صاحب "سبحان اللہ سبحان اللہ" کہتے ہوئے آئے۔ مریم اٹھ کھڑی ہوئی۔ بسم اللہ کہہ کر برتن ان کے ہاتھ سے لے لئے۔ اور پوچھا "کیوں، حضرت کو کھانا پسند آیا؟"

"بہت دعائیں دیتے تھے تم کو۔ بڑی خوش نصیب ہو۔ فرماتے تھے "تم پہلی عورت ہو جس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا میں نے کھایا ہے۔"

ہوتے ہوتے تین مہینے گزر گئے۔ صبح شام مریم بڑی عقیدت سے کھانا پکا کر مولوی جی کے ہاتھ بھیجتی اور پھر ایک دن اسے محسوس ہوا کہ وہ امید سے تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ اس بزرگ سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گئی جس کی بدولت اس کی برسوں کی مراد پوری ہوئی۔ وہ تصور ہی تصور میں ان کے قدموں میں گر گئی۔ طوطا پھڑپھڑایا اور پکارا "مریم۔ مریم!" مگر مریم اپنے تصور میں محو تھی۔ اس نے طوطے کو چمکارا بھی نہیں۔ اس کو طوطے کا دھیان نہیں رہا تھا۔ وہ خود بخود بول اٹھی۔ "الحمد للہ!" مگر خوشی کے ساتھ غم کا بھی پہلو نکل آیا۔ ایک صبح مولوی جی اٹھے تو بخار میں بھن رہے تھے۔ مریم نے اسی عقیدت سے کھانا پکایا۔ اور مولوی صاحب سے پوچھ ہی رہی تھی کہ کھانا کس طرح پہنچایا جائے کہ باہر سے آواز آئی "مولوی جی!" یہ اللہ دین تھا۔ جو کھانا لینے آیا تھا۔ مولوی جی مشکل سے اٹھے اور اس کو کھانا دے کر چلے آئے۔

مریم نے مسکرا کر کہا۔ "واہ واہ! بزرگ ہو تو ایسا۔ اپنا انتظام خود ہی کر لیا۔" دو ہفتے گزر گئے۔ مولوی جی کا بخار بیجا دی نکلا۔ آج عصر ہی سے مولوی صاحب کی حالت خراب تھی۔ مریم گھبرا رہی تھی اور دل ہی دل میں اس بزرگ سے کہہ رہی تھی "حضور رحم کیجئے میرا اور کون ہے؟" پھر اس کو اپنا ہونے والا بچہ یاد آیا۔ جو اس بیکسی کے عالم میں یکدم جوان بن کر پاس آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "امی کیوں پریشان ہو۔ میں جو ہوں!" مریم کا دل دھڑکنے لگا۔

مولوی جی کی بیماری میں اس کی بھوک مر چکی تھی۔ مگر حضرت کا بھی تو کھانا بھیجنا تھا۔ کھانا پکا کر فارغ ہوئی۔ تو مولوی صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ وہ تلملا اٹھی۔ اس بزرگ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ طوطے نے پکارا "مریم۔ مریم" مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ باہر سے اللہ دین نے آواز دی۔ مریم نے روتی آواز میں کہا "بھائی مولوی جی تو بے ہوش پڑے ہیں، کھانا تیار ہے۔" اور اسے خیال آیا کیوں نہ وہ خود اس کے ہمراہ چلی جائے۔ اور خود اس بزرگ کے قدموں میں گر کر اپنے شوہر کی تندرستی کی التجا کرے۔ مگر معاً طوطے کا خیال آیا کہیں اسے بلی نہ کھا جائے اور خود ہی دل ہی دل میں کہا "کھا جائے میری بلا سے۔" وہ برقعے کے کر باہر نکلی اور کنڈی چڑھا دی۔ اللہ دین نے پوچھا "بی بی آپ کیوں باہر آئیں؟"

"آج میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"مولوی جی سے پوچھ لیا ہے؟"

"ہاں پوچھ لیا ہے۔" اس نے جذبات کی شدت میں غلط جواب دے دیا۔ فقرہ ختم ہوتے ہی وہ نقاب کے اندر رو پڑی۔ خود بخود آنسو بہنے لگے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہیں اس بزرگ کو اس کے آنے پر اعتراض نہ ہو۔ وہ عورتوں کو پاس نہیں آنے دیتے اور حضرت نور ولی اللہ کے مزار کا خوفناک ماحول اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ کانپ اٹھی۔ ادھر شام بھی ہو رہی تھی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ چلوں تو سہی، وہ خود اس خوفناک ماحول میں میری حفاظت کریں گے۔

مریم کے پاؤں بھاری تھے۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ کئی دفعہ گرتے گرتے بچی۔ اس کا نقاب آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ اللہ دین اس کے آگے آگے جا رہا تھا۔ مریم نے پوچھا "بھائی اللہ دین! اور کتنی دور ہے یہاں سے؟" "نزدیک ہی ہے، بس پہنچ گئے سمجھو" اللہ دین نے چلتے چلتے جواب دیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دور سے مغرب کی اذان کی آواز آ رہی تھی کہ وہ دونوں گنے کے کھیتوں کو پار کر کے ایک اور مختصر سی بستی میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی چند ہی گھر تھے۔ اللہ دین ایک گھر کے سامنے رکا، سامنے پردہ پڑا ہوا تھا۔ اللہ دین پردہ اٹھا کر اندر داخل ہونے لگا تو مریم نے پوچھا "یہاں رہتے ہیں وہ؟"

"جی" اللہ دین نے کہا۔ اور مریم سوچنے لگی۔ مولوی جی نے تو بتایا تھا کہ وہ سائیں نور ولی اللہ کے مزار پر رہتے ہیں۔ مگر اس خیال کو دور کرتے ہوئے اس نے کہا "میں اندر چلی جاؤں؟"

اللہ دین نے کہا، "پہلے ان سے اجازت لے لو۔" مریم نے کہا "نہیں ان سے اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ مولوی جی نے جو اجازت دے دی ہے۔"

مریم اندر داخل ہوئی۔ صحن میں ایک اور عورت کھڑی تھی۔ اللہ دین نے اس کو سلام کیا اور مریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بی بی جی، یہ ہیں مولوی جی کی دوسری بیوی۔"

"بسم اللہ" دوسری بیوی نے کہا۔ "آؤ بہن، بیٹھو۔ تمہارے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ چھ مہینے سے تمہارے ہاتھ کا پکا کھانا کھا رہی ہوں۔ کیسا عمدہ کھانا پکاتی ہو! نکاح کے روز سے مولوی جی کو کہے جا رہی تھی مجھے میری بہن سے ملاؤ مگر وہ مانتے ہی نہیں تھے!"

اولیں افسانہ:

تم ہی اگر نہ سن سکے

طلعت اشارت

دیکھو سورج بھی ڈوب گیا۔ یہاں کے سورج کی یہ میرے لئے آخری کرن تھی! سورج جاتے جاتے اِن سرمئی بادلوں کو کتنے تابدار حسن سے نواز تا گیا۔ تمہارا غم بھی اتنا ہی تابناک ہے جس نے میرے وجود میں روشنیوں کی جگہ دھندلکوں کو جنم دیا تھا۔ ایک بے چین سی خلش جو تمہاری مسکراہٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ ایک نامعلوم سے احساس کو جو تم نے عطا کیا تھا۔ ان دنوں میرے تصور میں تم ہی تم تھیں۔ تمہارے خواب تمہاری باتیں! میری آنکھیں اکثر اس رہگذر کا طواف کرتیں جس سے تم گذرا کرتی تھیں، اپنے مخصوص انداز میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ۔ پھر میں تمہیں اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک تم میری نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتیں۔

آخر کار میں پاس ہو گیا اور تم بھی۔ تم میڈیکل کالج میں داخل ہوئیں اور میں بی ایس سی میں۔ پھر غمِ حیات میں ایسا پھنسا کہ کہیں کی خبر نہ رہی۔ تمہارا خیال اکثر آتا مگر اب وہ شدت، وہ بے چینی نہ تھی۔ شاید اس لئے کہ تم دور ہو گئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ بہت دلفریب تھی۔ سلیم اور میں دونوں اکثر تمہاری باتیں کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ سورج ڈھل جاتا۔ بالکل اسی طرح جیسے آج۔ پتھریلی چٹانوں کے پیچھے سرمئی بادل اسی طرح ہی چمکتے تھے۔ اور میں تمہیں دوسرے دن دیکھنے کی امید میں گھر چلا جاتا۔ تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس بے نیازی سے گذر جاتیں کہ مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہونے لگتا۔ ان ہی دنوں الیکشن ہوئے۔ میں بھی امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوا۔ سلیم، سیما کا دوست تھا۔ اس نے سیما سے میرے متعلق کہا اور تمہاری پارٹی نے مجھے قابلِ توجہ سمجھا۔ سیما، سلیم کو اپنا بھائی کہتی تھی اور تم نے اس کے بھائی کے دوست کی جیت کے لئے بہت کوشش کی لیکن میں ہار گیا۔ پھر بھی یہ ہار میرے لئے بہت اچھی رہی کیونکہ تم میرا نام تو جان گئی تھیں۔

وقت گذرتا گیا۔ شہر کے اس گھٹے ہوئے ماحول میں وقت گذرنے کا تذکرہ کیسے کروں۔ بہار و خزاں ہمارے کالج کے لان میں کہاں آسکتی تھیں۔ مگر تمہارے ساتھ تو میں بہار کا ہی تذکرہ کروں گا۔ بہار گذر گئی۔ امتحان کے بعد طویل رخصتیں آئیں۔ میری بدترین رخصتیں! میں تمہیں دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ ایک دن بہت اداس تھا کہ سلیم آگیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کہنے لگا "چلو میں سیما کے گھر جا رہا ہوں۔ شاید وہاں تمہاری روبی بھی ہو۔" میں مسکرا دیا۔ سلیم نے کہا "شکر ہے، مسکراہٹ تو نظر آئی تمہارے چہرے پر۔" مجھے بے اختیار تمہاری مسکراہٹ یاد آگئی۔ سلیم بھی مسکرانے لگا اور میرے تیور دیکھ کر ہنس دیا۔ اس نے اپنا مخصوص ذومعنی فقرہ دہرایا۔ "ساحر یاد آرہا ہے؟" تمہیں دیکھ کر مجھے عموماً ساحر کے اشعار یاد آتے تھے اور سلیم مجھے ساحر کہتا تھا۔ "وہ کیا شعر ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "کیوں مٹی پلید کرتے ہو شعر کی، شعر نہیں دو اشعار ہیں یعنی چار مصرعے، کیا سمجھے؟" "اب بولو بھی" اس نے کہا۔ مگر میں تمہیں دیکھنے کے شوق میں لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو سلیم برابر ان شعروں کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔ میں ہنس دیا۔ "پاجی کہیں کا۔ یہ ہیں وہ اشعار:

"پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں!
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنہیں
ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں؟

سلیم مجھے 'بزدل' کے خطاب سے نوازتا ہوا میرے ساتھ چل پڑا۔ اس نے بتایا کہ اسے بڑی مشکل سے پتہ چلا تھا کہ آج تم

سیما کے گھر آ رہی ہو۔ وہاں پہنچے تو تم موجود نہ تھیں۔ سلیم بڑے مزے سے سیما اور اس کے بھائی سے گفتگو کرتا رہا اور میں بور ہوتا رہا۔ جب ہم جانے لگے تو سیما نے کہا "سلیم صاحب، آپ روبی کے گھر کے سامنے سے گزریں گے۔ اسے میرا ایک پرچہ دے دیجئے گا۔"

جب تمہارے گھر پہنچے تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ تم مجھے دیکھ کر دروازے کی آڑ میں ہو گئیں اور پوچھا "کیا بات ہے؟" تم پہلی بار مجھ سے بولی تھیں۔ سلیم نے آگے بڑھ کر تمہیں سیما کا پرچہ دیا اور تم مسکرا دیں۔ سیاہی مائل بھورے بال تمہارے چہرے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور رخساروں پر شفق چھائی ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں کالج میں اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ اس انداز میں، کیونکہ وہاں تو تم نے خود کو احتیاطوں سے جکڑ رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ حسین سے حسین چہرہ بھی قریب سے اتنا حسین نہیں لگتا جتنا دور سے۔ لیکن تمہارا چہرہ مجھے قریب سے اور بھی خوبصورت معلوم ہوا۔ سلیم میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تم نے پرچہ ختم کر کے پہلے سلیم کو دیکھا اور اسے میری طرف متوجہ پا کر تم بھی میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شفق اور زیادہ پھول گئی۔ شرمندگی سے میری نظریں جھک گئیں تم نے سلیم سے کچھ کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ شاید تم جواب دے چکی تھیں۔ سلیم نے مجھے ڈانٹ بتائی "تم کیوں بیوقوفوں کی طرح اسے دیکھ رہے تھے؟"

"کیا اس نے کچھ کہا تم سے؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "نہیں، بہر حال اس نے محسوس ضرور کر لیا" سلیم نے جواب دیا اور میں مطمئن ہو گیا۔

اس کے بعد نتیجہ نکلا۔ میں کالج گیا۔ تم سب آئی ہوئی تھیں اور کامن روم کے برآمدے میں تمہاری مجلس جمی ہوئی تھی۔ سیما نظر آ رہی تھی۔ تم شاید آڑ میں تھیں۔ اس لئے نظر نہ آ سکیں۔ چند ہفتے بعد میں نے تمہیں آفس میں دیکھا۔ پھر تو ہفتوں بلکہ مہینوں گزر گئے اور تمہیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ جب بے چینی حد کو پہنچ جاتی تو کالج کا چکر لگا لیتا۔ اور وہاں تم مجھ سے اتنی ہی دور رہتیں جتنی شفق۔ نامعلوم رنگوں کا حسین امتزاج! میں دور ہی سے اس شفق میں اپنے دل کے رنگوں کو شامل کر دیتا اور واپس چلا آتا۔ یہ عمل پہلے دنوں بعد ہوتا تھا۔ پھر ہفتوں اور مہینوں کے بعد ہونے لگا۔ اور پھر تو غم حیات میں ایسا الجھا کہ کہیں کی خبر نہ رہی۔ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ چلا گیا۔ ایک دن میز پر رکھی ہوئی تمہاری تصویر ہوا کے جھونکے سے گری اور ٹوٹ گئی۔ میں نے دوڑ کر اس کو اٹھا لیا اور رومال سے صاف کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ ہم تم کبھی نہیں مل سکیں گے۔ تم کسی اور کی ہو جاؤ گی اور میں عمر بھر روتا رہوں گا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ تمہیں اپنی داستان غم سنانے کی جرأت کرنا میرے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ پھر بھی میں تمہاری تصویر سے سرگوشیاں کرتا اور یہ کہتا کہ ؎

کبھی ایسا بھی ہوگا آ ملیں ہم ایک منزل پر
ہمارا اور ان کا فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے

لیکن تمہاری تصویر خاموش رہی۔ اچانک مجھے سردی محسوس ہوئی۔ میری انگلیوں کے سرے جمنے لگے۔ میں سوچنے لگا تصویر کو بھی تو سردی لگ رہی ہوگی اور میں آتشدان کے قریب بیٹھا ہوں۔ تم اسے مجنونانہ حرکت کہہ لو یا کچھ اور، میں نے آگ بجھا دی اور تمہاری تصویر کو بستر میں رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنا جسم برف کا ڈھیر محسوس ہونے لگا۔ دل کی آگ جسم کو سرد ہونے سے نہ بچا سکی۔ جب میری آنکھ کھلی تو تمہاری تصویر کہیں نہ تھی اور میں بستر پر دو لحافوں کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ مالکہ مکان اپنی بیٹی اور ایک ڈاکٹر کے ساتھ پاس کھڑی تھی۔ اور میری خیریت پوچھنے لگی۔ میں نے الٹا تصویر کے متعلق پوچھا۔ ڈاکٹر ہنس دیا "تم لوگ بھی عجیب ہو۔ تصویر بستر میں اور خود اس سردی میں کرسی پر!" بوڑھی مالکہ نے مسکرا کر کہا "اسے ڈیڑھ سال یہاں رہتے ہو گئے لیکن اس تصویر کے سوا کسی اور چیز سے متاثر ہی نہیں۔ اکثر شفق ہی کو دیکھا کرتا ہے۔ ....." میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنوں سے کتنی دور، اس سرزمین سے میلوں پرے جہاں میں نے رنگین سپنوں کے جال بنے تھے اور جہاں میرا دل جلتا رہا تھا، جہاں میں نے تمہارے قدموں کے لئے پھول اور اپنے لئے کانٹے چنے تھے۔ میں کیسے نہ روتا! میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ جن کانٹوں نے میرے پاؤں زخمی کر دیئے تھے، وہ میں نے تمہارے ہی پھولوں سے تو الگ کئے تھے۔ پھر ان زخموں کی جلن میں دوسروں کے سامنے کیسے ظاہر کر دیتا؟ میں نے ٹیسیں برداشت کیں مگر اپنے دل کے شعلوں پر اجنبی دلاسوں کی

ہواؤں کا اثر نہ ہونے دیا۔ خبر نہیں کیسے؟ یہ تو دل کا گھاؤ تھا لیکن اب معلوم ہوا دل کے زخم بھی مندمل ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم دونوں باتیں کر لیتے، اگر تم بھی مجھے چاہتیں تو کیا ہوتا؟ میرے ساتھ ہی ساتھ شاید تم بھی اِن ہی زخموں سے مجھے چاہتیں تو کیا ہوتا؟ میرے ساتھ ہی ساتھ شاید تم بھی اِن ہی زخموں سے چور ہو کر کراہتیں، تم بھی شاید سردی میں کسی تصویر کو......

میں نے تو ہمیشہ تمہیں اپنانے کی تمنا ہی کی ہے، کوشش کبھی نہیں کی۔ کل میں اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔ کل میں اُن فضاؤں میں پرواز کروں گا جہاں میں نے اپنی جوانی کے قیمتی سال گزارے ہیں، جہاں میں سرد سانسوں اور جلتی نگاہوں کے ساتھ جوانی کو خیرباد کہہ دوں گا۔ کل میں اُس باغ کی طرف جاؤں گا جہاں میری تمناؤں پر بہار آئی تھی اور خزاں بن کر چلی گئی، جہاں میری زندگی نے خود اپنے لئے کانٹوں کا انتخاب کیا تھا، جہاں میں نے پھولوں کے ہار گوندھے تھے اور انہیں تمہارے گلے میں ڈال دیا تھا۔ کل میں اس سرزمین کی طرف کوچ کروں گا جہاں میں نے شفق کو پھولتے دیکھا تھا، جہاں میں نے تمہاری مسکراہٹ پر اپنی تمناؤں کی بازی ہاری تھی اور جہاں میں تم سے کچھ کہنے کی آرزو میں تڑپتا رہا تھا۔ سنا ہے تم ڈاکٹر بن چکی ہو۔ سوچتا ہوں آٹھ سال بعد تم سے بات بھی کر سکوں گا یا نہیں۔ سلیم بہت رنجیدہ ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا لیکن آج تک تم سے بات نہ کر سکا۔ میں جانتا ہوں کہ اب بھی تم سے بات کرنا میرے لئے دشوار ہے مگر سوچتا ہوں تمہیں کسی نہ کسی طرح بتا ہی دوں۔ جانے پھر موقع ملے نہ ملے۔ خبر نہیں تم میری نوائے شوق کو سننا گوارا بھی کرو گی یا نہیں!

★

پرتو

حمایت علی شاعر

جب بھی دیکھا ہے اسے، دل نے یہ محسوس کیا
جیسے میرے سحر و شام کا محور ہے یہی
میری تخیئل کے آذر نے تراشا ہے جسے
میرے خوابوں کا وہ بے نام سا پیکر ہے یہی
کوئی خلوت ہو کہ جلوت ـ وہ کسی بزم میں ہو
مجھ کو ہر رنگ میں دلدار نظر آتی ہے
کوئی عالم ہو، کوئی حال ہو میرا لیکن
وہ مجھے میری طلبگار نظر آتی ہے

اُس کی آنکھوں کی وہ معصوم سی دزدیدہ چمک
کتنے ناگفتہ فسانوں کی ہے تمہید نہ پوچھ
اُس کے گل رنگ لبوں کا وہ تبسم، وہ حجاب
کس تمنا کی ہے بے ساختہ تائید نہ پوچھ
اس کے اندازِ تکلم کی وہ محتاط روش
کس نوازش کی ہے غماز، کوئی کیا جانے
پاس رہ کر بھی وہ کچھ دور ہی رہنے کی ادا
کس رفاقت کا ہے آغاز، کوئی کیا جانے

اتنا مانوس ہے اس کا ہر اک انداز کہ دل
اس کی ہر بات کا افسانہ بنا لیتا ہے
اس کے ترشے ہوئے پیکر سے چرا کر کچھ رنگ
اپنے خوابوں کا صنم خانہ سجا لیتا ہے
جانے اس حسنِ تصور کی حقیقت کیا ہے
جانے ان خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں
جانے وہ کون ہے؟ میں نے اسے کیا سمجھا ہے
جانے اس کو بھی مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ حسنِ دلدار
میری تخیئل کے پرتو کے سوا کچھ بھی نہ ہو
اضطراب اور سکوں کی یہ کشاکش، یہ ستیز
خود فریبی کی تگ و دو کے سوا کچھ بھی نہ ہو

غزل

نظر حیدرآبادی

یہ بزم شعر ہے یہ ہے دیارِ سوز و گداز
نگاہ رُوبرو، اے مطربانِ خوش آواز
نہ گردنوں میں وہ خم ہے نہ وہ سلامِ نیاز
بدل گئے ہیں نگارانِ شہر کے انداز
اُڑا چکے ہیں بہت ہم بھی اے بتِ طنّاز
سلونے سانولے مکھڑوں کا رنگِ نوآغاز
چراغِ بزم اخبر ہے ہمارے پہلو میں
رہے ہیں جلوہ فگن کتنے مہرِ ذرّہ نواز
بریدہ زلف میں خم ہی کہاں کہ دل کو ہیں
شبانہ روز وہ اندیشہ ہائے دور و دراز
خیالِ دوست سلامت، سفر تمام ہوا
ہماری راہگذر میں نہ تھے نشیب و فراز
نظر جمالِ اجنتا پہ ختم ہے شاید
ادائے چشمِ محبت، فسونِ زلفِ دراز

غزل

شیدا گجراتی

دل و نگاہ کا شیرازہ منتشر ہی رہا
یہ دورِ منتظرِ سعیِ چارہ گر ہی رہا

مہ و نجوم کو اندیشۂ سحر ہی رہا
ترا جمال بہر رنگ جلوہ گر ہی رہا

ٹھہر سکا نہ کہیں کاروانِ شوق و جنوں
دل و نگاہ کو درپیش اک سفر ہی رہا

کوئی تو بات ہے آخر ترے فسانے میں
ہزار بار سنا پھر بھی تازہ تر ہی رہا

یہ دور، دورِ ہوس ہی سہی مگر پھر بھی
دلوں کا فیصلہ محتاجِ یک نظر ہی رہا

اُدھر کا حال زمانے پہ آشکارا ہے
خدنگِ گردشِ ایام کچھ اِدھر ہی رہا

رہِ طلب میں قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
ترے نثار ترا شوق راہبر ہی رہا

دبی دبی سی رہی شمعِ آرزو کی لَو
دلوں کو وسوسۂ خیر و شر ہی رہا

خرد نے لاکھ دلائل دیے مگر پھر بھی
حضورِ دوست جنوں حرفِ معتبر ہی رہا

غزل

مشفق خواجہ

خراب حال رہے، پیرہن دریدہ رہے
بہر مقام یہ دیوانے برگزیدہ رہے

یہ کیا طلسم ہے تیری نظر کے ہوتے ہوئے
فسانۂ غمِ ایام ناشنیدہ رہے !!

نہ جانے ہو مری تنہائیوں کا عالم کیا
ترا خیال بھی مجھ سے اگر کشیدہ رہے

لطافتِ غمِ دل نے یہ سوچنے نہ دیا
امیدوارِ کرم کیوں ستم رسیدہ رہے

شکایتِ غمِ دوراں بجا سہی لیکن
ہم اپنے آپ سے خود بھی تو سرکشیدہ رہے

ہم اُن سے مل بھی چکے، بات دل کی کہہ بھی چکے
کئی فسانے مگر پھر بھی ناشنیدہ رہے

ضرور بات کوئی یاد آ گئی ہو گی
تمام رات یہ مشفق جو آبدیدہ رہے

بلتستان

مختار حسین موسوی بلتستانی

"گلپوش سبزہ گاہوں اور سبز وادیوں کی سرزمین" اگر بلتستان کو اس نام سے یاد کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ برفانی ندی نالوں کا ملک جہاں قدم قدم پر صاف و شفاف چشمے پھوٹتے ہیں، کوہ قراقرم کی بے شمار سربہ فلک چوٹیوں کا خطہ پاکستان کا سب سے اونچا پہاڑی علاقہ ہے۔ قدرت نے اس کو کشمیر جنت نظیر کے پہلو میں جگہ دی ہے اور یہ مدتوں اس میں شامل بھی رہا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ اب اس کی قسمت میں شریک نہیں کیونکہ یہ آزاد پاکستان میں شامل ہے۔ قدیم تاریخوں میں اس کو "تبت خورد" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ چونکہ اس کی حدود تبت سے ملی ہوئی ہیں اس لئے لوگ لداخ اور بلتستان کو اس ہی کا حصہ خیال کرنے لگ جاتے تھے۔ آج یہ آزاد کشمیر کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کی سیاسی اہمیت اس ہی پر ہے کہ اس کے ایک طرف یارقند (روس) اور دوسری طرف کشمیر ہے۔ ادھر مشرق میں لداخ واقع ہے اور مغرب میں گلگت۔ گویا یہ چاروں طرف اہم سیاسی مقامات سے گھرا ہوا ہے۔

آب و ہوا کی خوشگواری، میوہ جات کی کثرت، میٹھے چشموں کی فراوانی، حیرت انگیز اونچے اونچے پہاڑوں، گل بداماں سبزہ گاہوں اور قدرتی خوبیوں کے لحاظ سے یہ علاقہ پاکستان کے کسی بھی صحت افزا مقام سے کم نہیں ہے۔

گرمیوں کا موسم تو یہاں خاص طور پر روح پرور اور جاں فزاں ہوتا ہے۔ اس کے جن علاقوں میں سرسنگ کا پھلدار درخت ہوتا ہے،

وہاں کے موسم کا کیا کہنا! اس کے پھول کھلے اور میلوں تک خوشبو پھیل گئی۔ اگر ایک طرف شفاف آبشار اور ٹھنڈی نہریں دعوت نظارہ دیتی ہیں تو دوسری طرف ہری بھری چراگاہیں اور گلپوش سبزہ گاہیں دیدہ و دل کو مسحور کرتی ہیں۔ دریاؤں اور نالوں کا چڑھاؤ طغیانی پر ہوتا ہے۔ کہیں کہیں یہ دریا میلوں کی چوڑائی میں پھیل جاتے ہیں۔ لوگ بڑے خوش و خرم نظر آتے ہیں اور آمد بہار کی خوشی میں اہل ذوق اونچے اونچے پہاڑوں اور میدانوں
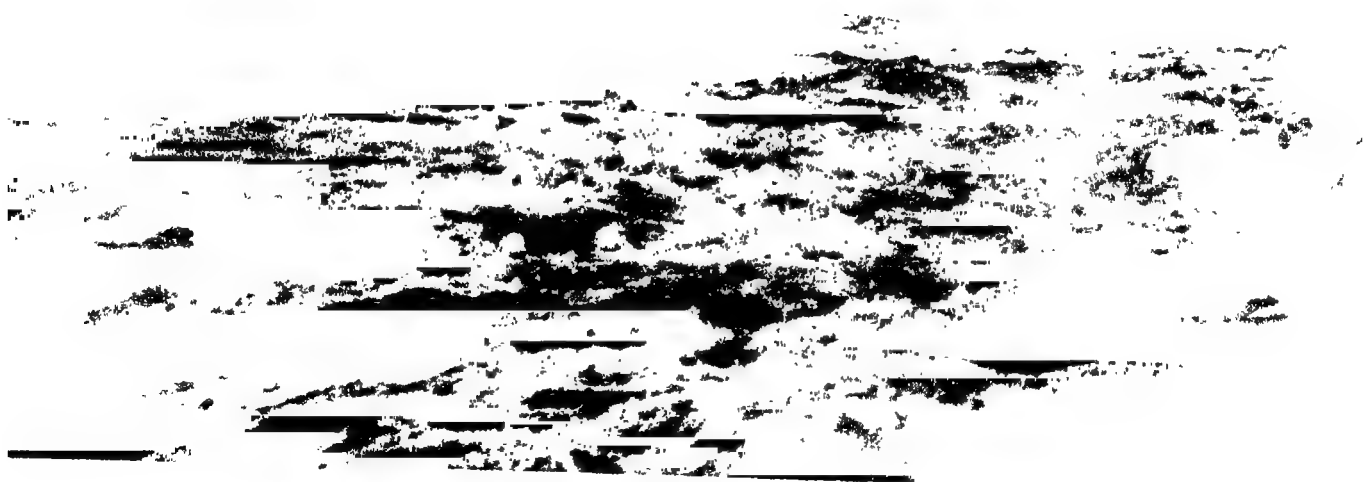
''سوناؤمرگ''—کشمیر کا ایک دلفریب منظر
وہ کشمیر جو حصول آزادی کے لئے دس سال سے برابر بیباکانہ جد و جہد کر رہا ہے

بچوں کا ذوق مصوری

یہ دل‌آویز نقوش سابق صوبۂ سرحد (مغربی پاکستان) کے ہونہار اور نو عمر مصوروں کی ابتدائی کوششیں ہیں جن سے گردوپیش کی زندگی سے ان کی دلچسپی اور فن سے غیر معمولی لگاؤ ظاہر ہوتا ہے

کی سیر کرتے ہیں۔ ان دنوں بلتستان واقعی کشمیر جنت نظیر کا مقابلہ کرتا ہے۔

سردیوں میں کڑاکے کی سردی ہوتی ہے۔ برف پڑتے ہی جم جاتی ہے۔ اور مہینوں جمی رہتی ہے۔ اور لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے میں دقت ہوتی ہے۔ اکثر چوٹیاں بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔

بلتستان پھلوں کی کثرت کے لئے مشہور ہے۔ یہاں خوبانی، سیب شہتوت، ناشپاتی، انگور، آڑو، سرسنگ کیا نہیں ہوتا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں کی خشک خوبانی، ختہ اور خشک انگور سری نگر اور کشمیر کے دوسرے شہروں میں آکر عام بکتے تھے بلکہ پنجاب اور دوسرے ممالک بھی بھیجے جاتے تھے۔ آج بھی ہوائی جہاز کے ذریعہ بعض مشہور میوے اور ختہ مغربی پاکستان آتے ہیں۔

یاک اور زومو بلتستان کے دو مشہور جانور ہیں۔ یاک اور گائے کے ملنے سے زومو یا زو پیدا ہوتا ہے۔ نر یاک بڑا طاقتور جانور ہے۔ یہ اتنا دلیر ہوتا ہے کہ چیتے جیسا خونخوار جانور بھی اس پر حملہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اسی طرح زومو بھی بیل سے زیادہ جفاکش ہوتا ہے۔ ایسے برفانی علاقوں میں جہاں انسان کے لئے گزرنا دشوار ہو یہ برف کے تودوں میں راستہ بنا لیتا ہے اور آدمی ان کی قطار کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

بلتستان میں کئی قسم کے نرم پتھر بہ افراط پائے جاتے ہیں جن سے طرح طرح کے ظروف تیار ہوتے ہیں۔ نرم پتھر کی ظروف سازی میں پھورت کا علاقہ بہت مشہور ہے۔ شگر کے علاقہ میں بھی ایک خاص پتھر کے پیالے وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔

یہاں کے بعض سلسلے اس قدر اونچے ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں بعض چوٹیوں سے پچاس پچاس میل بلکہ اس سے زیادہ دور کے مقامات بھی نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض ابھی تک سر نہیں کی جا سکیں۔ سب سے مشہور چوٹی ماؤنٹ گوڈون آسٹن (کے ٹو) ہے جو ۲۸ ہزار فٹ سے زیادہ بلند خیال کی جاتی ہے۔ یہ پاکستان میں اول نمبر اور دنیا بھر میں دوسرے نمبر کی چوٹی ہے۔ اس کو سر کرنے کی مختلف قوموں نے متعدد کوششیں کی ہیں۔ ۱۹۵۳ء کی گرمیوں میں ایک بہادر امریکن پارٹی نے اس کو فتح کرنا چاہا مگر اس نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس کو سر کرنے کا سہرا ایک اطالوی کوہ پیما جماعت کے سر رہا۔ کہتے ہیں کہ یہ چوٹی "ایورسٹ" سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اس کے اوپر چڑھنے میں بڑے بڑے خوفناک مرحلے پیش آتے ہیں۔ کئی اور چوٹیوں کو جو کم و بیش ۲۶ ہزار فٹ بلند ہیں، سر کرنے کے لئے کوہ پیما پارٹیاں مصروفِ جہاد ہیں۔ پچھلے دنوں ۹ جون ۱۹۵۷ء کو ایک آسٹروی پارٹی نے "براڈ پیک" کو فتح کیا تھا فتح کے نشے میں سرشار کوہ پیماؤں نے اس کے بعد ایک اور نامعلوم چوٹی بھی دریافت کی اور اس کو فتح کیا۔ اس کا نام چیک لیا پیک رکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ کئی چوٹیاں اب بھی غیر مفتوحہ ہیں جن کی وجہ سے بلتستان بیرونی ممالک میں بڑی شہرت حاصل کر رہا ہے۔

پاکستان کا سب سے لمبا دریا "سندھ" جھیل مانسرور سے نکل کر تبت کی حدود سے گزرتا ہوا لداخ (شمولہ مقبوضہ کشمیر) کی مسافت کو طے کرنے کے بعد بلتستان میں داخل ہوتا ہے۔ پھر گلگت اور مغربی پاکستان کو ناپتے ہوئے بحیرۂ عرب میں جا گرتا ہے۔ شیوک اور شگر اس کے دو بڑے معاون ہیں۔ گرمیوں میں بے شمار ندی نالے ان دریاؤں کے معاون بن جاتے ہیں۔ چونکہ دریاؤں کی گزرگاہیں ڈھلوان ہیں اس لئے چند مقامات کے علاوہ ان میں کشتیاں نہیں چل سکتیں۔ ان کو پار کرنے کے لئے لوگ زخ چلاتے ہیں۔ یہ چیز گائے بیل یا بکری کی کھالوں کی پھولی ہوئی مشکوں اور مضبوط ڈنڈوں کو آپس میں باندھ کر بنائی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ میل میل بھر چوڑے دریاؤں کو پار کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ طریقہ صرف بلتستان میں رائج ہے۔

گرم چشمے جن کے پانی میں دوائی تاثیر ہے بلتستان کے لئے ایک بڑی نعمت ہیں۔ یہ زیادہ تر علاقہ چھلو اور شگر میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں فور کونڈو کا چشمہ بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں یہ کسی زمانہ میں اس قدر گرم تھا کہ اس میں گوشت ابالا جا سکتا تھا۔ اب یہ اتنا گرم نہیں رہا۔

اہل بلتستان کا اسلامی جوش جنگ آزادی میں ظاہر ہوا۔ جب کہ انہوں نے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے انتہائی مصائب برداشت کرتے ہوئے بیش بہا قربانیاں پیش کیں۔ اس جنگ میں بعض بلتستانی جوان علاقہ زنسکار میں گھر گئے تھے مگر آزاد فوج کی امداد بالکل منقطع ہو جانے کے باوجود یہ دشمن کا جواں مردی سے مقابلہ کرتے رہے۔ اور مدت تک قصبۂ پادم اور اس کے ارد گرد کے علاقہ پر قابض رہے جب مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کے

سپرد ہوا تو آزاد فوج کے بعض سرداروں نے ان کو وہاں سے بلایا اور اسکردو میں اس خوشی کی تقریب میں جشن منایا۔ ناردرن سکاؤٹس میں بلتستان کے ان جوانوں کو "پادم پارٹی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ؛

اسلام سے پہلے راجاؤں کے آثار اور اسلامی دور کے مذہبی و تاریخی آثار بلتستان میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً قلعۂ کھرفوچو اور جامع مسجد گمبہ (اسکردو) اور مسجد کھری ڈونگ وغیرہ عہد راجگاں میں راجاؤں کے ما بین اکثر جنگ ہوتی رہتی تھی اور انہوں نے اپنے اپنے علاقوں کی حفاظت کے لئے بعض قلعے اور اہم مقامات پر مورچے بنائے ہوئے تھے۔ قلعہ کھرفوچو اسی لئے بنایا گیا تھا۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی کے پہلو میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اور اس کو ایک ہی طرف سے راستہ جاتا ہے۔ جب سکردو پر حملہ ہوتا اور لوگ اس کے اندر نہ رہ سکتے تو وہ قلعہ میں محصور ہو جاتے۔ جس کو سر کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ یہی دشواری آزاد فوج کو بھی پیش آئی۔ کیونکہ ڈوگروں اور سکھوں نے اس کو اپنا مورچہ بنا کر اس میں بڑی مدت سے جنگ کی ضروریات جمع کر رکھی تھیں۔ یہ قلعہ پہاڑی کے عین سر پر ایک سنتری کی طرح کھڑا تھا۔ اس لئے سکردو کے فتح ہونے میں کئی ماہ کا عرصہ لگا۔ آخر مجاہدین کی طاقت کے سامنے یہ قلعہ بھی ہیچ ثابت ہوا اور چند ماہ کے محاصرہ کے بعد آزاد فوج کے جوانوں اور بلتستانی مجاہدین نے اس کو فتح کر ہی لیا اور تمام سکردو دشمنوں کے مظالم سے آزاد ہوا ؛

خپلو میں قلعہ تھورسی بھی اسی قسم کا قلعہ ہے، جو نواب صاحب خپلو کے محل کے عین اوپر پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ قلعہ کھرفوچو کے مقابلے میں بنوایا گیا تھا جب کوئی راجہ خپلو پر حملہ کرتا تو باقی تمام اطراف کے فتح ہونے کے بعد صرف اس کو فتح کرنے سے عاجز رہتا۔ ایک دفعہ جب ایک راجہ اس کو سر کرنے سے قاصر رہا تو اس نے اپنی معذوری دکھلانے کے لئے نیزے پر سیب چڑھا کر دکھایا اور کہا کہ قلعہ تھورسی کی وضع قطع یوں ہے۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ اس صورت میں تم واقعی بے قصور ہو۔ خپلو کی مسجد کو اشاعت اسلام کی یادگار کے طور پر بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ دیگر تاریخی آثار میں پرکوتا کا ایک غار قابل دید اور رازہائے سربستہ کا حامل بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر جاتے ہوئے لوگ دہشت محسوس کرتے ہیں۔ خبر نہیں اس کے اندر کیا کیا عجائبات ہیں۔ اس میں بدھ مت کے کتبے اور تعمیری نشانات بھی پائے جاتے ہیں۔

سکردو، خپلو اور شگر قابل ذکر مقامات ہیں۔ سکردو صدر مقام ہے اور سطح سمندر سے کوئی سات ہزار فٹ بلند ہے۔ آزادی کے بعد اس کی

"زخ"

اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ خوبصورتی میں خپلو سارے بلتستان میں مشہور ہے۔ شگر دس بارہ میل شمال کی طرف دریائے سندھ کے اس پار واقع ہے۔ اس کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ بعض چوٹیوں، ماونٹ گوڈون آسٹن وغیرہ کو یہیں سے راستہ جاتا ہے اس لئے کوہ پیما پارٹیاں اس سے

خوب واقف ہیں۔ بلتستان کا تصور عموماً اسی قصبہ اور اس کے گرد و نواح سے قائم کیا جاتا ہے ÷

بلتستان اس برصغیر کا واحد علاقہ ہے جہاں اشاعت اسلام کے آغاز سے لے کر اب تک سو فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے ÷

ایک بڑی نرالی بات جو یہاں کے عجائبات میں داخل ہے، گلیشیر بنانا ہے۔ جس کو یہاں کی بولی میں "گنگ خسوا" یعنی گلیشیر پالنا کہتے ہیں۔ ان پالتو گلیشیروں سے اطراف کے چھوٹے چھوٹے چشموں سے پانی زیادہ نکلنے لگتا ہے اور برفانی نالے بھی کافی بہتے ہیں اور بنجر علاقے آباد ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کے ابتدائی مراحل میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض دیہات ایسے ہیں جہاں ۱۲ بجے دوپہر تک دھوپ نہیں پڑتی۔ اور بعض میں گرمیوں میں بھی دھوپ زمین پر اتنی دیر سے پڑتی ہے کہ ظہر کی اذان ہو جاتی ہے۔ کئی جگہ سورج غروب ہونے کے بعد پہاڑ کی دوسری طرف سے دوبارہ نکل آتا ہے۔ موضع برآہ جو خپلو سے چار میل دور ہے، کے ایک حصہ میں سورج سردیوں میں دن کے کسی وقت بھی نظر نہیں آتا یعنی پہاڑوں کے پیچھے ہی چھپا رہتا ہے اور زمین پر دھوپ بالکل نہیں پڑتی ÷

یہاں بعض لوگ تیراکی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ کئی من کا بوجھ سر پر لاد کر میلوں تیرتے اور دریاؤں کو پار کرتے ہیں۔ ڈوبتوں اور دریا میں بہتی کشتیوں کو تیر کر بچانا انہی کا کام ہے ÷

تعلیم و ترقی میں بلتستان اور علاقوں سے بہت پیچھے رہا ہے جس کا سبب ڈوگرہ حکومت کی بے توجہی ہے۔ کیونکہ یہاں کی آبادی خالص اسلامی تھی۔ اب جب سے یہاں کے لوگوں نے غلامی کی زنجیر ولد کیا تار پھینکا ہے حکومت پاکستان اس طرف پوری توجہ دے رہی ہے۔ اور اقتصادی و تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کر رہی ہے۔ ان اصلاحات سے لوگ مستقبل قریب ہی میں اپنی کمیوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اپنے علاقے کی ترقی و خوشحالی کے ساتھ ملک و قوم کی بیش بہا خدمات انجام دینے کے قابل بنیں گے ÷

•

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کیلئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے ÷

ادارۂ مطبوعات پاکستان، معرفت پاکستان ہائی کمیشن شیرشاہ میس روڈ نئی دہلی۔ منجانب: ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

★

جنوری ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں جناب فضل احمد کریم فضلی صاحب اور جلیل قدوائی صاحب کی غزلوں میں مصرعے سہواً اس طرح چھپ گئے ہیں:-

"عجیب دل کا ہے عالم نہ کوئی آس نہ پاس۔ صفحہ ۱۳ (فضلی)

"تم کو تو جلیل اک ہوس ہے" صفحہ ۱۳ مصرعے یوں تھا:

(فضلی): عجیب دل کا ہے عالم نہ کوئی آس نہ یاس۔

(جلیل): تم کو تو جلیل اک ہوس ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔

"ماہ نو"
میں
مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی ÷

ان کی تندرستی اہم ہے

اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
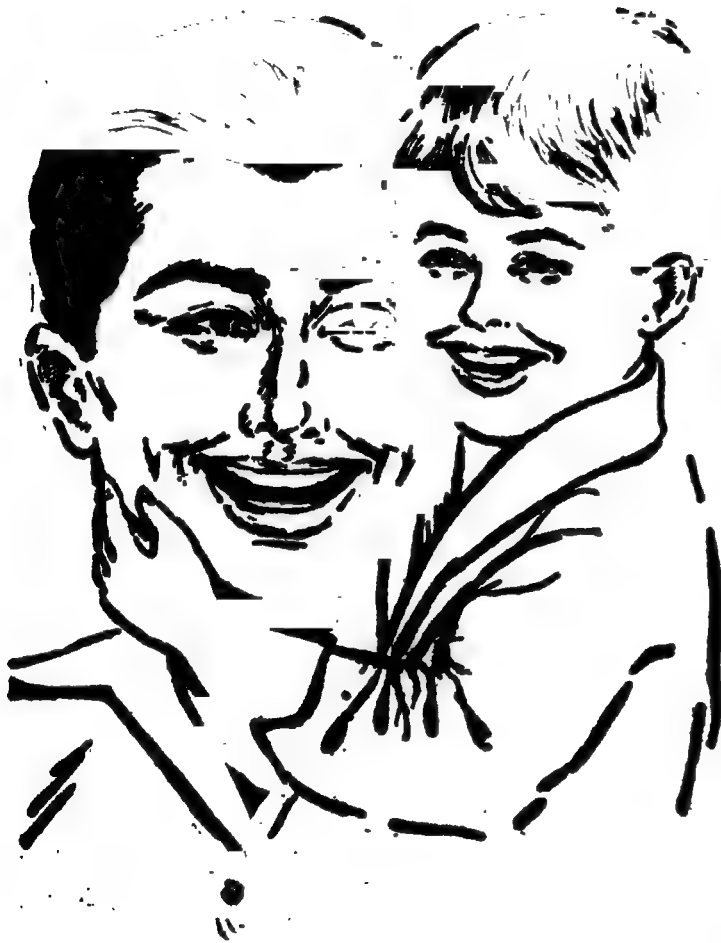
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ
غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی
اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کہ مکھن اور خالص گھی میں
ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے۔ آپ کے
بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان
دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے

ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف

ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار
کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور
ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور
صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار
کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔

ڈالڈا برانڈ وناسپتی

کھانوں کو بہتر بناتا ہے

پاکستان میں جہاز سازی کی صنعت

مغرب کی ترقی میں جہازسازی کی صنعت اور جہازرانی نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان ممالک نے بہتر سے بہتر جہاز بنائے اور ان کی مدد سے سات سمندر پار اپنی حکومتیں اور نو آبادیاں قائم کرلیں - جن سے گزشتہ کئی صدی سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

اچھے جہازوں کی بدولت ھی انگریزوں نے تمام بڑی بڑی جنگیں جیت لیں - بحری بیڑوں کی اھمیت ایٹمی زمانہ میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اور جو قوم دنیا میں سربلند ہونا چاھتی ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ اپنے لئے مضبوط جنگی اور تجارتی بیڑے تیار کرے۔

اکثر مشرقی ممالک کے پاس نہ جہاز ھیں نہ جہاز سازی کے کارخانے - سب کی تجارت کا مدار بیرونی ممالک کے جہازوں پر ہے یا پھر مغربی ممالک کی کمپنیوں سے ناکارہ جہاز خرید کر کام چلایا جاتا ہے اور ہر سال ان کی مرمت پر زرکثیر صرف ہوتا رہتا ہے۔ ساحل ترکی سے لے کر ساحل جاپان تک کے درمیانی علاقے میں اب تک جہاز سازی کا صرف ایک کارخانہ تھا - پاکستان نے جہاز سازی کا ایک بڑا کارخانہ کراچی میں اور دو چھوٹے کارخانے مشرقی پاکستان میں بنا کر نہ صرف اپنی ترقی کی طرف ایک قدم اٹھایا ہے بلکہ پورے ایشیا کی خدمت انجام دی ہے۔

کراچی شپ یارڈ اینڈ انجینیئرنگ ورکس کو پی - آئی - ڈی - سی کے بہت بڑے منصوبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کارخانہ کراچی ویسٹ وھارف کے مغرب میں تین لاکھ ٦٧ ہزار مربع گز زمین میں پھیلا ہوا ہے۔ کارخانے کی تعمیر کو ۲ تدریجی مرحلوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے کا سارا کام مقررہ میعاد کے اندر ھی مکمل ہو گیا، اور شپ یارڈ اب پانچ تا سات ہزار ٹن وزن کے جہاز بنانے کے آرڈر لے سکتا ہے۔ اس وقت کارخانے میں کئی چھوٹی بڑی کشتیاں بن رھی ھیں جن میں بڑی آٹھ سو ٹن تک کی ھیں - اس کے علاوہ لوہے اور فولاد کا بھاری کام بھی جاری ہے۔ پیٹرول اور تیل کے بڑے بڑے ٹینک، بجرے، مردان شوگر فیکٹری کے لئے ایک چار منزلہ فولادی عمارت اور بہت سی دوسری چیزیں بنائی جاچکی ھیں۔ آجکل شپ یارڈ میں ریل گاڑی کے ڈبے فٹ کئے جا رہے ھیں۔

بندرگاہ کیماڑی میں
ایک لنگرانداز جہاز

شپ یارڈ اور انجینئرنگ ورکشاپ (کراچی)

اس کارخانے میں فولادی پل ، ٹرانسمٹر ٹاور اور دوسرا بھاری سامان بھی تیار ہو سکتا ہے۔ زیر آب حصوں کی مرمت کا بڑا کام خشک گودی کی تکمیل پر شروع کیا جاسکے گا۔

پاکستان کے لئے شپ یارڈ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت پاکستان کے پاس جہاز رانی کی کل استعداد صرف ایک لاکھ ۵۶ ہزار ٹن ہے اور پاکستان کے دونوں علاقوں کے مابین اور غیر ممالک سے تجارت کے سلسلہ میں صرف جہازوں کے کرایہ پر تقریباً ساڑھے چار کروڑ روپے سالانہ زرمبادلہ صرف ہو رہا ہے۔ اگر پاکستانی تجارتی بیڑہ اپنے ذمہ لے لے تو زر مبادلہ کی اس بڑی رقم سے بہت سے دوسرے مفید کام انجام پا سکتے ہیں۔ تجارتی بیڑے میں اضافہ باہر سے جہاز خرید کر نہیں کیا جا سکتا۔ جہازوں کی خریداری کے لئے تو اور بھی کثیر رقم درکار ہوگی۔ یہ مقصد صرف مقامی کارخانے ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔

جہازوں کی مرمت پر بھی سالانہ پچاس لاکھ روپے کے قریب خرچ ہو رہا ہے۔ جہازوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ اس خرچ میں معتدبہ اضافہ ہوجائیگا۔ پاکستان میں جہازسازی اور مرمت کے کارخانے کی بدولت یہ کروڑوں روپیہ بچ سکتا ہے اور اپنے اور دوسرے ضرورت مند ملکوں کے لئے نئے جہاز

پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے کراچی شپ یارڈ ہمبرگ (جرمنی) کی صد سالہ تجربہ کار جہاز ساز کمپنی ”سٹلکن سویاں“ کے تعاون سے جدید ترین طرز پر تیار کیا ہے۔ اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر میں ان تمام جدتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو دنیا میں اب تک فن جہازسازی کے سلسلے میں برتی جا چکی ہیں۔ ”سٹلکن سویاں“ کے ساتھ یہ معاہدہ ہوا ہے کہ کارخانے کی تکمیل کے بعد بھی دس سال تک وہ ہمارے فنی مشیروں کی حیثیت سے کام کرتے رہیں گے۔

کارخانہ بنانے کے لئے ویسٹ وھارف کا مقام بھی ”سٹلکن سویاں“ کے مشیروں کی رائے سے منتخب کیا گیا تھا۔ اس کمپنی کے تعاون سے پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی مشرقی پاکستان میں کھلنا کے مقام پر بڑی کشتیاں بنانے کا ایک کارخانہ بنا رہی ہے اور نرائن گنج کے ڈاک یارڈ کو وسعت دے کر جدید ساز و سامان سے لیس کر رہی ہے۔ یہ دونوں کارخانے بھی ”کراچی شپ یارڈ“ کے تعاون سے کام کریں گے۔

تعمیر کے دونوں مرحلے مکمل ہونے پر ”کراچی شپ یارڈ“ میں ۱۲ ہزار ٹن وزنی جہاز بن سکیں گے۔ اور سال بھر میں پچاس ہزار ٹن وزن کے جہاز تیار ہو سکیں گے۔ ان میں سامان بردار، تیل بردار اور مسافر جہاز، بجرے، کشتیاں، دخانی کشتیاں، ٹگ اور حسب ضرورت جنگی جہاز بھی

شامل ہوں گے -

مرمت کا انتظام اور بھاری انجینیئرنگ کا کام کارخانے کو مزید منفعت بخش بنانے کے لئے کیا گیا ہے - شپ یارڈ کی مشین شاپ جدید مشینوں سے لیس ہے - ایک ڈھلائی کا کارخانہ بن رہا ہے جس میں لوہے کے دس ٹن اور دوسری دھاتوں کے چار سو پونڈ وزنی پرزے ڈھالے جا سکیں گے - جہازوں کے دیگر سامان کے علاوہ مشین شاپ اور ڈھلائی گھر میں میسرز "رسٹن اینڈ ھارن بی (لنکن، انگلینڈ)" کے پانچسو گھوڑوں کی طاقت کے "دریٹیکل" اور "آنزیلری" ڈیزل انجن تیار کیئے جائینگے -

پہلے پورے شپ یارڈ کی تعمیر پر چھ کروڑ بیس لاکھ روپے کی لاگت کا اندازہ لگایا گیا تھا لیکن بیرونی مال کی قیمتوں میں اضافے اور پاکستانی روپے کی قیمت میں تبدیلی کی بدولت اس تخمینہ میں اضافہ کر کے پورا سات کروڑ روپیہ کردیا گیا - پہلے شپ یارڈ کی تعمیر کے پہلے مرحلے میں خشک گودی شامل نہ تھی، چنانچہ حکومت کی اجازت ملنے پر اس مرحلے پر اپریل سنہ ۱۹۵۳ء میں کام شروع کردیا گیا - خشک گودی کو بھی کچھ عرصے بعد اس مرحلے میں شریک کردیا گیا - اس لئے اس پر سنہ ۱۹۵۵ء کے وسط میں کام شروع ہوا - اب اس کی تکمیل دسمبر سنہ ۱۹۵۷ء تک ہو سکے گی - شپ یارڈ کے پہلے مرحلے پر کل تین کروڑ نوے لاکھ روپے صرف ہوئے -

کراچی شپ یارڈ جس زمین پر قائم ہے اس میں صرف ۷۶ ہزار مربع گز کراچی پورٹ ٹرسٹ سے حاصل کی گئی ہے - باقی تین لاکھ مربع گز زمین نئی مغربی کھاڑی کھود کر سمندر سے حاصل کی ہے - اس میں سے ۲ لاکھ ۸۳ ہزار گز پر شپ یارڈ اور خشک گودی بنائی گئی ہے اور باقی ۹۶ ہزار گز زمین دوسرے مرحلے کی نئی عمارتوں کی توسیع کے لئے چھوڑ دی گئی ہے - شپ یارڈ تک ریل اور سڑک پر چلنے والی تمام گاڑیاں اور پانی کے جہاز سب ھی پہنچ سکتے ھیں - نئی کھاڑی ابھی کافی گہری اور چوڑی نہیں ہے لیکن جلد ھی اسے بڑھا کر ہرقسم کے جہازوں کے لئے موزوں بنا دیا جائے گا -

شپ یارڈ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے - پہلے میں جہاز سازی کی گودیاں، کرینوں کا کھلا ھال اور تعمیر کا بڑا ھال ہے - دوسرے میں مشین شاپ اور کارپینٹر شاپ و غیرہ ھیں اور تیسرے میں خشک گودی ہے -

جہازسازی کے حصے میں یہ بڑی خاص بات ہے کہ اتنے بڑے شپ یارڈ میں جہاز کے مختلف حصوں کو جوڑنے اور پانی میں اتارنے کے لئے نہایت ھی

کراچی شپ یارڈ میں کرینوں کا کھلا ھال

مختصر جگہ رکھی گئی ہے۔ اس کے برخلاف جن مقامات پر چھوٹے حصے آپس میں جوڑے جاتے ھیں وہ زیادہ وسیع اور کشادہ ھیں - پرانے طرز کے شپ یارڈوں میں اتنے کام کے لئے کم ازکم چھ گودیاں ضروری ھوتیں لیکن یہ شپ یارڈ نئے طریقے پر کام کریگا - جسکے مطابق جہاز کے چھوٹے حصوں کو شپ بلڈنگ ھال اور کرینوں کے کھلے ھال ھی میں جوڑ کر بنالیا جائیگا - اور تیس تیس ٹن کے بڑے حصے کھلے ھال میں چلنے والی کرینوں کے ذریعے گودی کے قریب پہنچادئے جائیں گے - جہاں سے بڑی گھومنے والی کرین انہیں اٹھا کر گودی میں جمع کردیگی - اس طرح چھ گودیوں کا کام صرف تین گودیوں میں پورا ھوجائیگا -

اس طریقے پہ عمل کرنے سے دو فائدے ھیں - ایک تو جہاز بنانے میں وقت بچ جاتا ہے - دوسرے کارخانے کی تعمیر پر خرچ بھی کم آتا ہے - چوالیس ہزار مربع فٹ کی ایک گودی بھی 'اوپن کرین‌وے' سے بہت مہنگی پڑتی ہے - گودی کو سمندر کی طرف فولادی تختہ بندی سے اور زمین کی طرف سیمنٹ یا تلنگ سے تیار کیا جاتا ہے اور 'اوپن کرین وے' کے لئے صرف کنکریٹ کا مضبوط فرش کافی ہے -

کھاڑی کے کنارے کنارے بڑی گودی ہے - اس کے دونوں سروں پر بڑی گھومنے والی کرینیں سامان اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ھیں - جب شپ یارڈ کا دوسرا مرحلہ بھی پورا ھو جائیگا تو تیس تیس ٹن کی دو اور کرینیں گودی نمبر (۱) اور نمبر (۲) پر چلنے لگیں گی - اسی قسم کی دس ٹن کی ایک اور کرین خشک گودی پر بھی کام کریگی -

سمندری پشتے کے قریب ھی ضروری ورکشاپ ھیں اور 'کرین وے' کو ورکشاپ سے اتنا باھر نکال دیا گیا ہے کہ پشتے پر چلنے والی کرین آسانی سے ورکشاپ سے آیا ھوا سامان پانی میں پڑے ھوئے زیر تعمیر جہاز کے ڈھانچے تک لے جا سکے گی -

کام جلدی شروع کرنے کے خیال سے "کراچی شپ یارڈ" کی تعمیر میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ جن کارخانوں اور گودیوں کی پہلے ضرورت ہے انھیں پہلے مکمل کرلیا جائے - اب شپ یارڈ پانچ تا سات ہزار ٹن وزنی جہاز بنانے کے لئے بالکل تیار ہے -

شپ یارڈ میں لو ہے کا بھاری سامان بڑے پیمانے پر تیار کیا جا رہا ہے - جہازوں کے بالائے آب حصوں کی ھرقسم کی مرمت کی جاتی ہے - زیرآب حصوں کی مرمت کا کام خشک گودی کی تکمیل کے بعد دسمبر سنہ ۱۹۵۷ء میں شروع ھو جائے گا - سنہ ۱۹۵۸ء کے آخر تک پانچسو گھوڑوں کی طاقت کے ڈیزل انجن بھی بننے لگیں گے - امید ہے کہ یہ شپ یارڈ جلد ھی اپنی قیمت ادا کر دے گا *

* * *

شپ یارڈ میں جہازسازی کی گودی

فکاہیہ:

بحث برائے بحث

منظور الہی

★

(ایک اوسط درجے کی کوٹھی کا ڈرینگ روم)

"اس مسلسل گنگناہٹ سے میں تنگ آگئی ہوں"۔

"جب سے آپ نے ستار سیکھنی شروع کی ہے میری جان عذاب میں ہے"

"ستار سیکھنا کسی اصول کے تحت ہے، لیکن آپ کی گنگناہٹ ایک ہنگم۔"

اصول تو ایسے معلوم ہوں گے جیسے کوئی شدھ بدھ ہو"

"آپ کی جانے بلا، راگ سے ذرا بھی تو مس نہیں"

"سات سُر ہوتے ہیں سارے گا ما پا دھا نی"

"آپ میرے علم میں کافی اضافہ فرما رہے ہیں"۔

"بندہ نوازی ہے، ہاں تو میری گنگناہٹ پہ کوئی خاص اعتراض؟"

"مجھے شادی کے فوراً بعد کا زمانہ یاد آجاتا ہے جب ....."

"یادش بخیر! تو کیا آپ کے لئے وہ یاد خوشگوار نہیں؟"

"میں کہہ رہی تھی آپ میرے ساتھ تو بہت سنجیدگی سے پیش آتے تھے لیکن غسلخانے میں پانی کا نل کھولتے ہی اپنی پیٹینٹ لے میں گر تھوا قدم نظر اللہ بنا شروع کر دیتے تھے"۔

"پیٹینٹ لے میں؟"

"مسجد قرطبہ کا کوئی بند ہو یا "رو رو ن پتھر پہاڑاں دے" ایسا پنجابی گیت، لے ایک ہی ہوتی ہے"

"حالانکہ غالب نے کہا ہے ؏ - فریاد کی کوئی لے نہیں ہے"

"فریاد کا کیا مقام تھا؟"

"TYRANNY OF HOME LIFE کے خلاف"۔

"جی"۔

"گر تھوا قدم نظر کی بات ہو رہی تھی، قرۃ العین کی اس نظم سے مجھے بے پناہ عقیدت ہے، یا ممکن ہے ان دنوں اپنی INHIBITIONS پر غلبہ پانے کی کوشش ہو گو میں سمجھتا ہوں مجھ میں بہت کم "انہی" ہیں"

"ہر بڑے آدمی کی طرح۔ بڑا آدمی ہونے کی غلط فہمی بھی تو رہی آپ کو جب کہتے تھے ہر بڑا آدمی بالآخر بور ہو جاتا ہے"

"مجھے غلط فہمی نہیں، نہ میں ILLUSION OF GREATNESS کا شکار ہوں، کسر نفسی ہو گی اگر میں کہوں، میں اپنے آپ کو بڑا آدمی نہیں سمجھتا"

"آپ تکبر کا کلمہ بولتے ہیں تو مجھے ڈر آنے لگتا ہے"

"اس میں تکبر کی کون سی بات ہے؟ بڑے آدمیوں کے سر پہ سینگ تو نہیں ہوتے، مجھے بہت سی چیزوں کی خواہش نہیں جس پہ دنیا والے مرتے ہیں"۔

"لیکن ملتان میں کسی تقریب پر کوئی طلائی ہار پہنا دیتا تو آن کر خوشی خوشی دکھلاتے تھے"

"ہار ملنے پر خودکشی تو نہیں کی، نہ کبھی یہ خیال ہی کیا کہ اب طلائی ہار ملنے بند ہو گئے ہیں، یہ تو زندگی کے مختلف دور ہیں جو گزر جاتے ہیں۔ بلکہ کبھی سوچتا ہوں اگر اصول کی خاطر ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں تب بھی میں اتنا ہی خوش رہوں گا"

"استعفا دیتے ہیں آپ کفرانِ نعمت کرتے ہیں، یہ سروس چھوڑنے کا چاؤ کب سے ہوا؟"

"میرا خیال ہے بزنس میں زیادہ آزادی ہو گی، پھر انسان کوئی اصولِ زندگی اپنانا چاہے تو ......"

"دور کے ڈھول سہانے، ورنہ آجکل بزنس اور اصول دو متضاد چیزیں ہیں، بہرحال آپ بزنس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے"۔

"آپ تو یکطرفہ ڈگری دیئے جاتی ہیں، محنت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"شیو کا سامان اور کپڑے تک تو اپنی جگہ پہ رکھتے نہیں، بزنس ضرور کریں گے"۔

"دفتر کا کام تو جوں توں کر کے نکال ڈالتا ہوں"

"سوئی گیس کے ٹرانسفر شیئرز چار سال ٹھکانے نہ لگ سکے اور بزنس میں کامیابی نہ ہوئی تو؟"

"تو SAMS میں بیٹھ کے کریم کوفی پئیں گے، مکان کے سامنے کھٹیا ڈال کے حقہ نوشی کا شغل ہو گا اور ریٹائرڈ افسروں کی طرح کبھی کبھی گورنمنٹ کی پالیسی پر نکتہ چینی کر لیا کریں گے"۔

"گالی گلوچ کی حد تک"۔

"جی"۔

"نیک ارادہ ہے۔ اللہ مبارک کرے"

"بزنس میں آزادی زیادہ ہوگی ورنہ اپنے دوستوں کی طرح میں کسی طرح PAY SCALE کا شاکی تو نہیں"

"ممکن ہے آپ کو PAY SCALE کا خیال نہ ہو، لوگوں کی مجبوریاں ہوتی ہیں، شاید ہمیں ان کا احساس نہ ہو"

"سات آٹھ سو تو میرے جاننے والے بھی پا رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں پانسو سے زیادہ پانے والے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ تنخواہ کی کمی کا رونا روئے"

"اگر آپ کے دو چار بچے زیر تعلیم ہوتے تو ہوش آ جاتا"

"میں نے تو کئی بار کہا ہے ہم نے غلط معیار قائم کرکے اپنی جان مصیبت میں ڈال رکھی ہے، خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جو بڑے کرتے ہیں وہی ماتحت کرنا چاہتے ہیں، تنخواہیں نپی تلی ہیں، نتیجہ ظاہر ہے"

"آپ نے تو ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا کہ کمرے میں کتابیں بکھری ہوں، ایک طرف کھٹیا پڑی ہو اور دیواروں کے درمیان رسی کھینچ دی جائے تاکہ کپڑے پھینکنے اور اتار لینے میں آسانی ہو۔ یہ IDEAL SITUATION ہوگی"

"شاید ایسا ماحول میرے لئے زیادہ پُرسکون ہو، اب تو کتابیں اس قرینے سے چنی رہتی ہیں کہ ایک اچھی کتاب مہینوں نظر سے اوجھل رہتی ہے۔ دفتر سے لوٹ کے اتنی ہمت ہوتی نہیں کہ اسے ڈھونڈھ نکالا جائے اور پڑھ کے اسی جگہ رکھ دیا جائے"

"آپ کاہلی کو انٹیلکچول قسم کا رنگ بخش رہے ہیں"

"یا اس تصنع کا رونا رہا ہوں جس نے ہماری زندگی اجیرن بنا رکھی ہے مثلاً NESCAFE کو لیجئے"

"NESCAFE ?"

"جی ہاں۔ یہاں آن کر بیٹھے نہیں ہوتے کہ بیرا اور ابلا ہوا پانی ایک ٹرالی پہ دھرے آ جاتے ہیں جیسے ہر کام میکانکی طور پہ ہو رہا ہو اور ہوسٹس مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لوڈ اردو سے پوچھتی ہے: آپ کے لئے چینی؟"

"کتابوں کے ساتھ NESCAFE کا کیا تعلق؟"

"یوں ہی بات میں سے بات نکلتی ہے"

"اب ریڈیو پروگرام اور ارینجمنٹ کی بھی شامت آئے گی"

"یہ جھنجھٹ ابھی ختم نہیں ہوتا، بڑھیا قالین خریدنا کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھیں اور دوست ہمارے ٹیسٹ کی داد دیں۔ اس میں کیا بگڑ رہا ہے؟"

"آپ کی جان تو کھٹیا میں اٹکی ہے"

"اس میں آخر قباحت ہی کیا ہے؟"

"اپنی حیثیت کے مطابق ہر ایک کو معیاری زندگی بسر کرنے کا حق ہے"

"چاہے وہ معیار دوسروں کے لئے بلائے جان ہو کے رہ جائے"

"دوسرے ہمارے معیار سے متاثر کیوں ہوتے ہیں؟"

"جیسے ہم کسی بڑے افسر یا مل اونر کی کوئی چیز دیکھ کے کہتے ہیں: بھئی مزا آ گیا، اور پھر سوچتے ہیں اس ٹھاٹھ کا بنگلہ نہیں، موٹر نہیں، بیگم نہیں"

"اب آپ بیویوں کا مقابلہ کرنے پہ اتر آئے"

"اچھا ایک بات بتائیے"

"جی"

"فاطمی کو فون کرتے ہوئے آپ ایں ایں کیا کیا کرتی ہیں؟"

"فاطمی؟"

"میرا مطلب ہے فاطمہ"

"اور اپنا بھول گئے، جب فون کرو بڑے BUSINESS LIKE انداز سے: "منظور الٰہی""

"کیا معلوم کون فون کر رہا ہے؟ پھر شادی کے بعد ہر ایک کو "ہیلو ڈارلنگ" بھی تو نہیں کہہ سکتا"

"تو بتلائیے کسے ڈارلنگ کہنے کو جی چاہتا ہے؟"

"خیر نام بتا دینا اچھا ہی ہوتا ہے، ایک دفعہ میں نے رفعت کا نمبر ڈائل کیا تو بولے ابونصر اور رکتے ہیں "ڈائریکٹر" میں نے چڑ کے کہا "اور کاہے کا ڈائریکٹر؟" ابونصر چک کے بولے آپ کون صاحب ہیں؟"

"پھر؟"

"پھر میں نے ٹیلیفون بند کر دیا"

"اب احتیاط برتتے، میرا علاج کر رہے ہیں"

"پہلے تو میں انہیں نیم حکیم ہی سمجھتا تھا"

"آپ کسی کو کچھ سمجھتے بھی ہیں؟"

"آپ کو تو بہت کچھ سمجھتا ہوں"

"جی"

"وہ CHARMING CONVERSATIONALIST ہونے کی خوش فہمی بھی تو تھی آپ کو"

"خیر وہ تو مذاق تھا لیکن ENGAGING CONVERSATIONALIST کہہ لیجئے"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مختلف قسم کے لوگوں سے باتیں کئے جاؤں تو وہ بور نہیں ہوں گے"

"جی"

"خصوصاً جب ان کا تعلق صنفِ نازک سے ہو"

"اوہو۔ بڑے آئے ڈان جان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایبٹ آباد کا ریسٹ ہاؤس یاد ہے نا"

"جی"

"کسی کو بات کرنے نہیں دے رہے تھے، لوگوں کی بات ٹوکنے کے لئے دونوں ہاتھ یوں اٹھاتے تھے جیسے ہوا میں اڑ جانا چاہتے ہوں"

"دیکھئے ایڈ پہ بحث ہو رہی تھی اور میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہتا تھا"

"لیکن ایک ENGAGING CONVERSATIONALIST کو دونوں ہاتھ اٹھانے کی ضرورت تو نہیں ہوتی"

★

(تین سال کا شوخ و شنگ بچہ لکڑی کا ٹرک گھسیٹتے ہوئے داخل ہوتا ہے)

"چمک دیکھی ہے اس کی آنکھوں میں۔ میرا بچہ بلا کا ذہین ہوگا"

"ہر بچے کی ماں یونہی سوچا کرتی ہے"

"رہنے دیجئے، آپ سے تو زیادہ خوش شکل ہے"

"تو میں نے کب یوسفِ ثانی ہونے کا دعویٰ کیا؟"

(ایک اوسط درجے کا پہاڑی گدھا دروازے سے نظر آتا ہے، پشت پہ چھوٹی سی جنگلہ دار کاٹھی، بچہ گدھے کی طرف بھاگتا ہے)

"دیکھو عظیم، پونی پہ ٹھیک طرح بٹھلانا"

"پونی پہ؟"

"تو اور کیا ہے"

"گدھا ہے گدھا"

"مجھے گدھا کہنا ذرا اچھا نہیں لگتا"

"اس سے کیا ہوتا ہے، ہے تو گدھا"

"میرا بیٹا بڑا آدمی بنے گا تو کیا وہ گدھے پہ سوار ہو۔ ہونہہ!"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں، گدھا اردو اور فارسی ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے، خردماغ، خرگوش، بلکہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید، خرِ عیسیٰ گر بمکہ رود"

"مکے بجا دیں جا دے کھوتا"

"وہ سنا آپ نے ایک صاحب عربی لباس پہن کر، شتر سوار ہو کر عید کی نماز ادا کرنے گئے، لوگ اس حجازی ماحول سے کافی متاثر ہوئے۔ پھر انہیں کیا سوجھی، گدھے پر سوار ہو کر کچہری تشریف لے گئے"

"گدھے پر سوار ہو کر کچہری؟"

"جی ہاں ان کا کہنا تھا اب میں سنتِ عیسیٰ ادا کر رہا ہوں، ایک صاحب نے سنا تو بولے اب صرف سُولی پہ چڑھنے کی سنت باقی رہ گئی ہے"

"معین الدین بہت UNSPARING ہیں"

"OH SORRY تو آپ کو یہ قصہ معلوم تھا"

"جی ہاں جیسا کہ بیشتر قصے معلوم ہوتے ہیں جو آپ چہک چہک کر مہمانوں کو سناتے ہیں"

"حسن محمد صاحب کا جواب یاد ہے نا؟"

"کیا؟"

"اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ میری بیوی ہیں اور آپ نے یہ باتیں پہلے سے سُن رکھی ہیں"

"وہ بھی آپ کی طرح لطیفے دُہراتے ہوں گے"

"بیچارے خاوند!"

"بیچارے! بقول آپ کے TYRANNY OF HOME LIFE کے شکار!"

اُفق تا اُفق

اُردو ایک یورپین کی نظر میں

الیساندرو بوزانی

دانتے کی سرزمین نے پھر ایک شعلۂ جوالہ پیدا کیا ہے جس کو اسلامیات کے ساتھ والہانہ شغف ہے۔ مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر الیساندرو بوزانی، جن کا مشرقی و مغربی زبانوں، فارسی، ترکی، اردو، انگریزی وغیرہ اور علوم پر یکساں عبور ہے۔ اپنے وسیع ذہنی پس منظر کے ساتھ انہوں نے ان موضوعات پر متعدد فاضلانہ کتابیں لکھی ہیں۔ بیدل، غالب، اور اقبال کو ترجمہ و تنقید کے ذریعے روشناس کرنا ان کا کارنامۂ عظیم ہے۔ اقبال کی متعدد نظموں کے علاوہ انہوں نے "جاوید نامہ" اور قرآن مجید کا بھی اطالوی میں ترجمہ کیا ہے۔ "ماہِ نو" وقتاً فوقتاً ان کے فاضلانہ مقالات کو ہدیۂ ناظرین کرتا رہا ہے۔ اب کی بار ہم ان کا ایک مقالہ بجنسہٖ پیش کر رہے ہیں جو انہوں نے کچھ عرصہ ہوا اردو کالج (کراچی) کی بزمِ اردو کا افتتاح کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ اس سے ان کی اردو زبان سے دلچسپی ظاہر ہے اور اس پر غیر معمولی قدرت بھی۔ (مدیر)

ہاں میں یورپین ہوں۔ مگر اطالوی بھی ہوں اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ مغربی ثقافت کے جغرافیائی اور روحانی نقشے میں اطالیہ شرق و غرب کے درمیان واقع ہوا ہے اور اطالیہ کی تاریخ میں آسیائی، افریقائی اور یورپی مختلف اثرات باہم ملے ہوتے ہیں اس وجہ سے میں بھی اطالوی ہو کر نصف مشرقی اور نصف مغربی اپنے آپ کو سمجھتا ہوں اور بے شبہ آپ مجھکو معاف کریں گے اگر اردو کے مسئلہ میں مداخلت کروں۔ میری اردو اتنی ناقص ہے کہ میں مجبور ہوں کہ اپنی فکر کو بہت مختصر اور کوتاہ جملوں سے ظاہر کروں۔ اس لئے شاید میرے جملوں کا مدعا اور میرے اظہارات باریک اور نازک شاخوں سے محروم دکھائی دیں گے۔ میں اس بات کے لئے بھی آپ حضرات سے معذرت مانگتا ہوں۔

میرے خیال میں اردو زبان کی اہمیت تین گنی ہے۔ اس کا ایک لسانی۔ ایک ادبی اور ایک سماجی پہلو بھی ہے۔ آئیے ہم لسانی پہلو سے شروع کریں۔ سب جانتے ہیں کہ اردو زبان ایک مخلوط زبان ہے۔ یورپین مستشرقوں کے خیال میں اردو زبان کا اصل و منبع یہ ہوا ہے کہ فارسی داں یا عربی داں جو مسلمان فوجیں برصغیر ہند و پاکستان آئیں ان کے سپاہیوں نے مقامی لوگوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے واسطے بامرورِ زمان ایک مخصوص آمیختہ زبان کو ایجاد کیا۔ جانتا ہوں کہ ہند و پاکستان کے نقادوں نے اس OVER SIMPLIFYING نظریے کا انکار و رد کیا ہے لیکن بہرحال یہ ثابت چیز ہے کہ شروع ہی سے اردو زبان ایک بین الاقوامی زبان ہوئی ہے اور اس کا کسی نہ کسی نسل و نژاد سے خاص تعلق نہیں۔ اس معنی میں اردو زبان بھی ایک مسلمانی (بولی) کہلا سکتی ہے کہ وہ قدرتی صورت پر اسلامی تعالیم و اصول کو مجسم کرتی ہے جس کی بنیاد سب لوگوں کا مساوات اور ذاتی اور قومی اور نژادی تعصبات کی تخریب ہے ہمارے تاریخی دور میں نژاد پرستی اور قومیت کا حس بہت زور پا کر اب تقریباً سب زبانوں میں وہ مضحک اور نامعقول مظہر دکھائی دیا ہے جس کا نام انگریزی زبان میں PURISM (یا صفائی پرستی) کہتے ہیں مثلاً جرمنی زبان میں TELEFON کے بجائے FERNSPRECHER یا دور سے بولنے والا کہنے لگے اور ایرانی زبان میں طیارہ کی جگہ میں ہواپیما، ویا THERMOMETRE کی لفظ چھوڑ کر وہ اب دگرماسنج) کہنا چاہتے ہیں یا نئی ترکی زبان میں قانونِ اساسی کے بجائے (آنا یاسا) ایک پرانی قبل اسلامی ترکی لفظ استعمال کی جاتی ہے اور اخیراً کسی نے مجھ سے کہا کہ نئی ٹھیٹھ ہندی میں اسٹیشن کی جگہ میں BHAGBHAGHADDI کہنے لگے اور حتیٰ سادہ مقامی لفظوں کو چھوڑ کر مثلاً (اور) لفظ پر پرانی سانسکرت لفظ TATHA ترجیح

دیتے ہیں۔ معلوم ہے کہ زبان اس کو بولنے والوں کے عادات و رسوم و تصورات اور آئیڈیلوں کی زندہ رمز ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ جو لوگ AUTOMOBIL کی جگہ میں KRAFURAYAN بولنے لگے یا کتاب کی جگہ میں پُستک وہ رفتہ رفتہ عملی میدان ہی میں بھی ایک خطرناک افراطی NATIONALISM کے خوگر ہو جائیں گے اس معنی میں اردو زبان بین الاقوامی امن و صلح کا ایک SYMBOL اور ایک ضمانت بھی ہو سکتی۔ شاید آپ کی نظر میں تھوڑی سی مضحک چیز پڑے گی۔ مگر میرے خیال میں ایک ہندو جس کی زبان میں (کتاب) (ثقافت) (علم) (تمدن) وغیرہ عربی الفاظ نیچرل آتی ہیں اور اس کی روزمرّہ زندگی کے بنیادی حصے بن گئیں۔ وہ آدمی مشکل ہے کہ مسلمانوں کے برخلاف لڑائی کرے اور دوسری طرف سے ایک مسلمان جس کی بولی میں سماج۔ نرالا۔ دکھ اور اس قبیل کی ہندوستانی الفاظ رائج ہیں ہندو اور ہندی ثقافتی میراث کی بھی تحقیر نہ کر سکے گا۔

خوش نجتانہ اردو زبان میں PURISM ایک ناممکن بات ہے کیونکہ اگر نہ خود (اردو) کا مفہوم اور اردو ہی زبان اور حتیٰ اس کا نام (جو ترکی زبان سے مقتبس ہوا ہے) بالکل غائب اور ناپدید ہو جائیں گے۔ مختصر یہ کہ اردو زبان عالمگیری غیر قومی اور مِند نژادی تصورات کی ایک زندہ علامت اور نشان ہے۔

جو ملاحظات اردو کے لسانی پہلو کے متعلق میں نے ابھی کئے ہیں اردو کی اہمیت کے دوسرے پہلو کی طرف اچھی طرح سے راہنمائی کریں گے یعنی اردو کی ادبی اہمیت اردو کی ادبی اہمیت اس کی لسانی خاصیات سے مربوط ہے۔ میں فکر کرتا ہوں کہ اردو ادب کے تین عنصر ہیں جو باہم مل کر اردو ادب کی مخصوص حیثیت کو تشکیل کرتے ہیں یعنی (الف) سبک ہندی یا ہندستانی ادبی اسلوب جو فی الاصل صفوی دور کی فارسی شاعری میں پیدا ہوا ہے (ب) مقامی رنگ (ج) حرکیاتی حالات کو بخوبی ظاہر کرنے والے فعل۔

تیسرے عنصر سے شروع کر کے اردو زبان میں جیسے فعل ہیں مثلاً ڈھلنا۔ لڑکھڑانا، گھُٹنا، لہلہانا، چمکنا۔ چھکنا وغیرہ ویسے فعل فارسی زبان میں بالکل نہیں ملتے۔ مثلاً "وصف برشگال لاہور" میں جو نظم مشہور فارسی زبان کے شاعر مسعود سعد سلمان نے لکھا اس میں باوجود اس کے وہ وصفی اور بیانی نظم ہے صرف دادن، داشتن، زدن، گفتن، کردن، کندن، گذشتن، بردن، شدن وغیرہ عمومی فعل استعمال کئے گئے ہیں۔ برعکس نظیر اکبر آبادی کے ایک بیانی نظم کے اس بند کو دیکھئے اس میں وہ زبردست اردو شاعر ہندو عوامی مسئلے کے ایک پہلو کو وصف کرتا ہے:

ناؤ میں وہ جو گلرو ناچوں میں جھک رہے ہیں
جوڑے بدن میں رنگیں گہنے چمک رہے ہیں

تائیں ہوا میں اڑتی طبلے کھڑک رہے ہیں
عیش و طرب کی دھوم میں پانی چھپک رہے ہیں

سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار تیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار تیرتے ہیں

میں پروفیسر ابو اللیث صدیقی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے نظیر کے متعلق اپنی قیمتی کتاب مجھے دیکر اس قابلِ ملاحظہ اردو شاعر کو جاننے کا امکان میرے لئے پیدا کیا۔

یہ پرانی دکھنی اردو سے موروث حرکیاتی فعلوں کا استعمال فارسی تاثیر و رواج پانے کے بعد بھی باقی رہا اور جدید شاعری میں نئے روپ میں ظاہر ہوا۔ اردو زبان میں بہت مستقل فعل موجود ہونا۔ فارسی زبان میں ان کے ندرت کے مقابلے میں اردو زبان کو ایک بڑی اہم خاصیت دیتا جس کے بدولت اس زبان میں مقامی رنگ اچھی طرح سے ابراز کیا جا سکتا ہے۔

مگر ایک ہی وقت میں اس موضوع پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اردو ادب اس کے اوجِ کمال کے دور میں بہت پیچیدہ اور غیر طبیعی فارسی اسلوب کے تحت تاثیر ہو پڑا جس کا نام (سبک ہندی) ہے۔ پر سبک ہندی (یا ہندوستانی فارسی اسلوب) کو باوجود اس کی پیچیدگی اور عدم طبیعت کے میرے خیال میں کسی معنی میں نئے اسلوب ہی کا مبشر اور پیشرو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ سبک ہندی کی مرکزی حیثیت یہ ہے کہ اس میں فارسی کلاسیکی اسلوب شاعری کا موزوں لیکن یکرنگ اور یکساں صوری کا اعتدال نہایتی طور پر توڑ گیا اور شاعروں کے لئے ایک نئی تخلیقی آزادی کا امکان کھل گیا۔ مثلاً جب بیدل کہتا:

من آں شوقم کہ خود را در غبارِ خویش مے جویم
پریشاں مے نولیسد کلکِ موج احوالِ دریا را

ویہلے مصرع میں ایک صرف ذہنی اور ABSTRACT نام یعنی (شوق) مجسم ہوکر اپنے کو انسانی تن کی گردِ و غبار میں ڈھونڈتا ہے اور دوسرے مصرع میں (کلک) موج سے مشتبہ کیا جاتا ہے باوجود ان دونوں کی صوری اور ظاہری ناسازگاری کے اردو شاعری میں میرے خیال میں غالب نے بیدل کی آزادانہ معنی آفرینی کو اوجِ کمال تک پہنچایا ہے، مثلاً:

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا   فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دلپسند آیا

اس بیت میں جو صورتاً ناموزوں و غیر کلاسیکی استعارے ملتے ہیں وہ جدید شاعری کے پیشرو ہیں اور حتیٰ کہ ایک معاصر یورپین شاعر (فضائے خندۂ گل تنگ) اور (فراغت گاہ آغوشِ وداع) کو اپنے ذوق کے قریب سمجھیں گے اور ضرور قبول اور پسند کریں گے۔

یا دیکھئے کس طرح غالب سبک ہندی سے استفادہ کرکے جدید اور آتشیں حسیات کو ظاہر کرسکتا ہے:-

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

یا:- مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر   کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اگر ہم غالب کے یہ نہایت ظریف اور نازک بیت کو:-

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں   جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

نظیر اکبرآبادی کے صرف بیانی لیکن کبھی کبھی عامیانہ شعروں سے مقابلہ کرتے تو اردو ادب کی وسعت اور اس کی بے نظیر اسلوبی دولتمندی ہماری آنکھوں میں بخوبی نمایاں ہوجائے گی۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یعنی اس کے پختہ اور باذوق شاعروں کے نظموں میں سبک ہندی کا ظرافت اور معنی آفرینی، مقامی رنگ اور بیانی حرکت و جنبش کی قوت سے عجیب آمیزش پاتے ہیں۔

ابھی یہ لسانیاتی نقطہ نظر سے نہایت دولت مند اور نفسیاتی احوال اور باریک باریک شاعرانہ حسیات ظاہر کرنے کے لئے بڑی مناسب زبان، بدبختانہ آج تک پاکستان کی یونیورسٹیوں کا وسیلۂ تعلیم نہیں بن گئی۔ اجازہ فرمایئے کہ میں اس بارہ میں آپ کے ساتھ بہت بیباکانہ اور بے تکلفانہ باتیں کروں اور اپنی ناقص اردو میں اردو زبان کی اہمیت کے تیسرے پہلو پر کوئی بات کہوں۔

یہ سماجی اہمیت ہے۔ آسیا کی اس نئے دور میں پیدا ہوئی ریاستوں کا سب سے بڑا نقص و عیب یہ ہے کہ انھوں میں اونچے اور نیچے اجتماعی طبقوں کے درمیان ایک بڑا فرق ہے۔ اس افراطی فرق کو برطرف کرنے کے لئے پختہ اور باعقل سیاسیوں کا ایک نہایت ہی اہم فرض ہے۔ اگر اس کام میں وہ موافق ہوجاتے تو انقلابی اور مبالغہ آمیز رجحانات خود بخود اپنی خطرناک قوت کو کھو کر ایک حقیقتاً اور عادلانہ سماجی انتظام برپا کرسکیں گے۔ دوسرے ملکوں میں بھی طبقیتوں کا فرق موجود ہے۔ مگر ہند و پاکستان میں اس فرق کا ایک لسانی پہلو بھی ہے جو مخصوصاً مہلک ہے۔ پاکستان میں اپنے سفر میں میں نے دیکھا کہ نام نہاد نیچے طبقوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو اردو زبان بحسن و خوبی بولتے اور لکھتے بھی ہیں اور فنی شاعرانہ اور لسانیاتی ذوق کے بھی صاحب ہیں یہ لوگ ابھی اپنے وطن میں نسبتاً پردیسی ہیں۔ جو انگریزی نہیں جانتے تو اپنے ملک کی اداری اور دفتری زبان کو نہیں سمجھتے اور شاید پاکستان کی پوری شہریت کے حقوق سے عمداً استفادہ نہیں کرسکتے ہیں۔

غالباً بعض لوگوں کی نظر میں اردو غریبوں کی بولی بن گئی ہے۔ غالب اور میر کی لسان۔ شاندار مغل بادشاہوں کی زبان، صرف بیروں اور نوکروں سے گفتگو کے لئے مناسب وسیلۂ گفتگو ہوگئی۔ اس چیز کا دوسرا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اردو زبان اور ادب میں خارجی لوگوں کی دلچسپی گھٹ گئی۔ میں نے شخصاً ایک یورپین صاحب کو سنا جس نے مجھے کہا "اردو زبان نرالی ہی زبان ہے۔ وہ بہت ناقص اور حقیر مقامی بولی ہے۔ اردو میں میرے خیال میں سو دو سو الفاظ سے زیادہ موجود نہیں ہوں گی۔" جب میں نے اس سے کہا کہ اردو زبان لااقل تین زبانوں کی ایک موزوں آمیزش ہوکر شاید بعض یورپین زبانوں سے بھی دولت مند ہے اور اس کا ایک وسیع اور درخشاں ادب ہے، وہ نہایت متعجب ہوکر اپنی خاموش مسکراہٹ سے مجھ سے کہنے لگا کہ وہ میری باتوں کو باور نہیں کرسکتا تھا۔ یورپ میں اردو زبان و ادبیات میں دلچسپی رکھنے والے مستشرقوں کی ندرت کا سبب یہی ہے لیکن کسی قدر تو آپ کا بھی قصور ہے، ان تنقیدوں کو معذور رکھئے۔ ان کا باعث اردو زبان کے لئے اور اردو بولنے والوں ہی کے لئے بھی میری محبت ہے کیونکہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا بالکل ہم فکر

ہوں جب وہ لکھتا۔ اردو زبان میں جو وسعت، جو حسن جو تنوع اور جو دل آویزی ہے اس پر رنگوں کی تخلیق کرنے والا۔ بادلوں کو پانی عطا کرنے والا اور سبزے کو ہریالی بخشنے والا خدا بھی رشک کر سکتا ہے۔ جو اردو کا دشمن ہے وہ ہماری تہذیب کا دشمن ہے، ایسے لوگ ایک حسین چیز کو مٹا تو سکتے ہیں لیکن خود ویسی ہی یا اس سے کمتر درجہ کی بھی کوئی دوسری چیز نہیں بنا سکتے۔"

پہلے ہم نے دیکھا کہ اردو زبان اتنی لسانی خصوصیتوں پر مشتمل ہے جو اس کو ایک وسیع الاستعمال کُل آسیائی بین الاقوامی زبان بننے کی قابلیت دیتی ہیں۔ بعد میں میں نے مختصراً دکھانے کی کوشش کی کہ اردو ادب ہند و پاکستان کے برصغیر میں سب سے ... اور ... اور تیسری جگہ پر یہ بھی واضح و روشن ہو گیا کہ اردو کا بحیثیت سرکاری اور اداری زبان کے پورا قبول پاکستانی جماعت کے عمدہ مسائل کے حل میں ... ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب میں پھر پاکستان کو واپس آؤں گا تو ایک دوسرا لیکچر دے سکوں۔ اولاً اب سے ابھی اردو میں اور ثانیاً ایک نئی پاکستانی یونیورسٹی میں جس کی تعلیمی زبان اردو ہو۔

اردو کے جن پہلوؤں پر ہم نے غور کیا، شاید ان پہلوؤں کا خلاصہ کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو لسانی میدان میں اسلام کا ایک symbol ہے مرتجع فقیہوں کے اسلام کا نہیں، بلکہ اکبر اور تاج محل کے اسلام کا۔ اردو ایک اسلامی روح کی لسانی نمائندہ ہے جس میں عربی اور فارسی اور ترکی اور ہندی تعصبات قومیہ مٹ گئے ہیں۔ اس معنی میں ایک ہندو بھی اردو بولنے سے اور اردو میں شعر کہنے سے ناخواستہ بھی مسلمان ہو جائیگا اس اسلام کا بنیادی اساس ہنرمندانہ موزونیت فکر بھی ہے اور وہ خرافات اور بے عاقلانہ قومی اور لسانی اور اجتماعی بندشوں کے برباد کرنے کا نتیجہ ہے۔

جو شعر علامہ اقبال نے "مسجد قرطبہ" میں عالمگیر اسلامی خوبصورتی پر لکھے وہ شاہد ہیں اب اس مختصر لیکچر کو شائستہ طور پر ختم کرنے کے لئے اردو زبان اور اردو ادب کی نسبت کہہ سکتا ہوں،

تجھ سے ہوا آشکارا بندۂ مومن کا راز   اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم   اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

(ڈھاکہ ... کراچی)

LIFEBUOY
... اور
بعد
لائف بوائے صابن
سے غسل کیجئے

قدیم ڈھاکہ
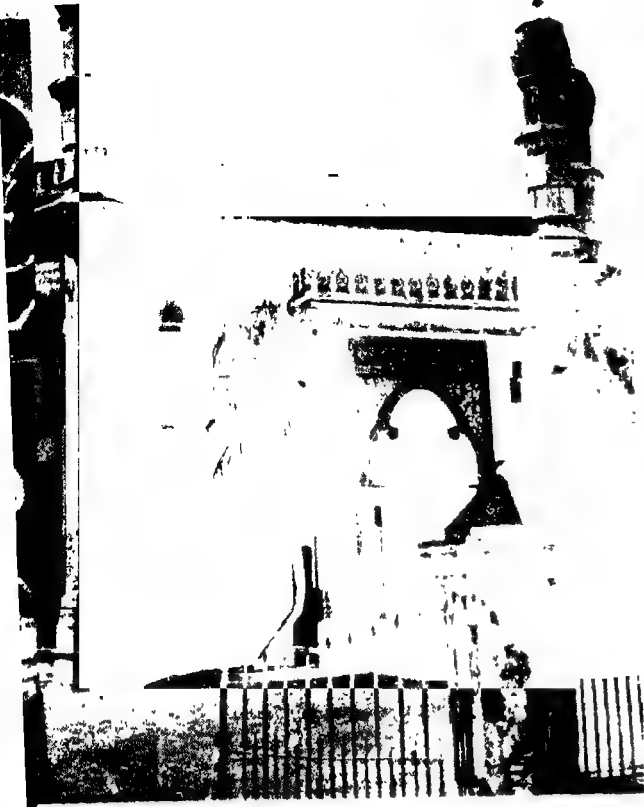
لال کرتی

حویلی روپ لال

پرانا دروازہ

بوڑھی گنگا کے کنارے یہ قدیم شہر دیس دیس سے آنے والوں کے لئے کشش کا باعث رہا ہے اور اپنی ملی جلی، نئی پرانی وضع کے باوجود اپنے بے شمار خوبصورت گنبدوں اور میناروں سے مغل سپہ سالار، اسلام خاں، کی یاد دلاتا ہے جس نے ''جہانگیر نگر'' کے نام سے اس کی بنیاد ڈالی تھی

آج یہ مشرقی پاکستان کا صدر مقام اور سیاسی، تجارتی، معاشرتی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ پھر بھی بنگال کی سہانی فضا میں قدیم ڈھاکہ کی جھلکیاں ایک عجیب رومانوی کیف پیدا کرتی ہیں۔

REGD. No. S. 1086
MAH-I-NAU, FEB. 1958

ماہ نو

جمہوریت نمبر مارچ ۱۹۵۸ء

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی دوسری سالگرہ پر

ایک یادگار پیشکش

"جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش"

"ماہ نو" گزشتہ دس سال سے برابر ہماری حیات ملیہ کی عکاسی اور

ہرجہتی ترقیات کا سیرحاصل جائزہ پیش کرتا رہا ہے۔

یہ علوم و معارف کا بہترین مخزن اور ثقافتی سرگرمیوں کا شاندار مرقع ہے

یہ ادب و فن کے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو مظاہر کو بروئے کار لا کر

دل و دماغ کو نئی نئی جولان گاہیں مہیا کرتا ہے۔

یہ بیک وقت ناظر بھی ہے اور مبصر بھی — اس کے دامن میں ماضی و حال کے

نظرفریب جلوے بھی ہیں اور مستقبل کی سحرآفریں جھلکیاں بھی۔

جمہوریہ نمبر ــ اس کا سالانہ شمارۂ خاص ہے

جو پاک و ہند کے بہترین ارباب قلم کے جواہرپاروں سے مالامال اور متعدد دیدہ زیب

رنگین و سادہ تصاویر سے آراستہ ہوکر اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ

پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوگا

سرورق: ــ فنی محاسن اور تخلیقی ندرت‌کاریوں کا شاہکار

ایجنٹ و مشتہرین حضرات: سالنامہ کی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں اور

اشتہارات کی بکنگ کے لئے فی‌الفور متوجہ ہوں *

ادارۂ مطبوعات پاکستان ــ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

نئے سفیر اطالیہ متعینہ پاکستان ، صدر جمہوریہ پاکستان
کو اسناد سفارت پیش کر رہے ہیں

شاہ افغانستان ، اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ
کا پاکستان میں ورود مسعود

پاکستان میں

اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ کا کراچی میں پر جوش ا

وزیراعظم برطانیہ ، جناب ہیرلڈ میکملن
کی کراچی میں آمد

ماہِ نو

جمہوریت نمبر

مارچ ۱۹۵۸ء
جلد ۱۰ شمارہ ۱۲

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ:
ساڑھے پانچ روپے
جمہوریت نمبر: ــــــ عہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کی دوسری سالگرہ جس کے ساتھ ہم نے تقریباً گیارہ سالہ آزاد زندگی کی تکمیل کرلی ہے ہم سب کے لئے پیغامِ مسرّت ہے اور ہم اس موقع پر اہلِ وطن کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ موقع ہے جس پر ہماری دیرینہ تمناؤں اور اس نصب العین نے جس کے خواب ہم سالہاسال سے دیکھتے چلے آرہے تھے آخر کار عملی شکل اختیار کی تھی، ہماری آنکھوں میں پھر سے ہمارے ایامِ عروج کی تصویر پھر گئی تھی اور ستارہ و ہلال کی گہنائی ہوئی عظمت ایک بار پھر چمک اٹھی تھی۔ خواہ اس میں تصوّر کی وہ اعجاز نمار عنائی اور چکاچوند پیدا کرنے والی آب و تاب نہ پیدا ہوئی ہو پھر بھی اس میں ع رہ یک گام ہے ہمّت کے لئے بامِ بلند ـــــ کی نوید تو موجود ہے اور ہم اسی سے مطمئن اور شادکام ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم آج نہیں تو کل اس مقامِ بلند پر ضرور فائز ہو جائیں گے جو شروع ہی سے ہمارا منتہائے مقصود رہا ہے۔

برخود نظر کشا زتہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

✱

"ماہِ نو" کی ایک خوشگوار روایت بن چکی ہے کہ یہ ہر سال اربابِ نظر کے ذوقِ دل و نگاہ کے لئے ایک شمارۂ خاص پیش کرے چنانچہ پہلے جشنِ استقلال کے موقع پر شمارۂ خصوصی پیش کیا جاتا رہا اور پچھلے سال جمہوریہ کی پہلی سالگرہ پر "جمہوریت نمبر" پیش کیا گیا کیونکہ جمہوریہ کے قیام سے ہماری آزادی کی آئینی توثیق عمل میں آئی۔ یہ "جمہوریت نمبر" اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جو نہ صرف گزشتہ دو برسوں بلکہ ہمارے کُل دورِ آزادی کا مرقع ہے۔ اس جامعیت اور ہمہ گیری کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ہمارا حال درحقیقت ماضی ہی کا منّت پذیر اور اسی کا پرتو ہے۔ بہ الفاظ دیگر ماضی اور حال الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی ہیں، ہمارا ماضی، اس کی روایات، اس کے مشاہیر، اس کی تحریکیں، اس کی سرگرمیاں ہماری میراث ہیں۔ ایک زندۂ جاوید میراث۔ سالگرہ جمہوریہ کی قومی تقریب پر اس کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ اسی لئے ہم نے دورِ رواں کے ساتھ ساتھ دورِ کہن کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس طرح کہ ہم دوش کے آئینے میں فردا کا مشاہدہ کرسکیں۔

ہماری کوشش رہی ہے کہ "ماہِ نو" کا ہر شمارۂ خاص ایک منفرد نوعیت کا حامل ہو۔ اس سے قبل جو شمارے پیش کئے گئے اُن کی امتیازی خصوصیات حالات کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ اب کی "جمہوریت نمبر" میں ہر اعتبار سے زیادہ سے زیادہ تنوع کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ ہماری گیارہ سالہ زندگی کے اکثر مظاہر کی کماحقۂ عکاسی کی جاسکے۔ "نقشِ اوّل" ـــــ "ترقیاتی جائزہ" سے لے کر "نقشِ آخر" ـــــ "تجدیدِ موسیقی" تک یہی بوقلموں کیفیت نمایاں ہے۔ افسوس ہے کہ بعض عمدہ چیزیں دیر سے موصول ہوئیں اس لئے وہ اس شمارہ میں شامل نہ ہوسکیں۔ اگر یہ نقوش بھی اس مرقع میں شامل ہوتے تو اس کا دامن اور بھی گلہائے رنگ رنگ سے معمور ہوتا۔ بہرحال ہم قارئین کی خدمت میں جمہوریۂ پاکستان کی دوسری سالگرہ کے موقع پر یہ شمارۂ خاص پیش کررہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہماری یہ پیشکش حلقہ ہائے علم و فن میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

سرورق: رنگین خشت سازی کا نمونہ (عہدِ تیموریہ، سمرقند)

آج کے دن

اسد ملتانی

آج کے دن ابتدائے طرزِ جمہوری ہوئی
آج کے دن مدتوں کی آرزو پوری ہوئی

ملک کے سر سے ملوکیّت کا سایہ اٹھ گیا
آج مختاری ملی اور ختم مجبوری ہوئی

پھر زمانہ آگیا سلطانیٔ جمہور کا
محو دارائی و خاقانی و فغفوری ہوئی

فضلِ باری ہے غلاموں کو جو آقائی ملی
امرِ ربّی ہے امارت پر جو ماموری ہوئی

حرّیت کو جو کبھی آنے نہ دیتا تھا قریب
آج دار و گیر کے اس دَور سے دُوری ہوئی

تھے سب اربابِ نظر مدت سے جس کے منتظر
آج اُس آئینِ آزادی کی منظوری ہوئی

چل رہا تھا یوں تو پہلے بھی حکومت کا نظام
اس کی حیثیت اب آئینی و دستوری ہوئی

مملکِ پاکستان جمہوریۂ اسلام ہے
آج دنیا بھر کے شہروں میں یہ مشہوری ہوئی

دامنِ اسلام ہی کے اعتدالِ عام میں
ایک شے سرمایہ داری اور مزدوری ہوئی

کس مناسب طور پر اعلانِ آزادی ہوا!
کیا مبارک صورتِ فرمانِ منشوری ہوئی!

ہر طرف لہرا گیا پرچم جو پاکستان کا
اس کے پرتو سے ہوا بھی سبز و انگوری ہوئی

خود بخود دھونے لگیں کافور ساری ظلمتیں
جونہی روشن ماہِ نو کی شمعِ کافوری ہوئی

رابطہ وحی و رسالت سے کیا جب استوار
آدمِ خاکی کو حاصل نسبتِ نوری ہوئی

سب ہوئے قائل کہ قوت قوم کی قرآں سے ہے
ضعف آجائے گا جب بھی اس سے مہجوری ہوئی

مخلصانہ خدمتِ ملت عبادت ہے اسدؔ
کوئی بھی اس کا صلہ چاہا تو مزدوری ہوئی

منزلِ صُبح

عبدالرؤف عروج

رات کے خستہ وزار راہی
منزلِ صبحِ تازہ تک آئے

عیشِ جمہور، آئین نو ہے
وقت کی منجمد تیرگی میں
برق پاروں کی گلنار ضو ہے
زندگی کس قدر تیز رَو تھی
زندگی کس قدر تیز رَو ہے
اُٹھ رہے ہیں بساطِ جہاں سے
اہرمن زاد رُدحوں کے سائے

رات کے خستہ وزار راہی
منزلِ صبحِ تازہ تک آئے

شہر در شہر، قریہ بہ قریہ
جبر کی جانگسل شب گراں تھی
دیدۂ و دل کی آشفتہ حالی
کشتگانِ جنوں کا دھواں تھی
اشتراکِ خیال و نظر میں
ایک دیوار سی درمیاں تھی
اور آزادیوں کی حقیقت
آتش رواہِ حسنِ بیاں تھی
اک نئی مملکت کا تخیل
اک نئی سلطنت کے تقاضے
اک نئی آگہی کی تمنا
صورتِ مشعلِ نور لے کر
عہدِ آئین و دستور لے کر

رات کے خستہ وزار راہی
منزلِ صبحِ تازہ تک آئے

خوابِ دوشیں کے آذرکدے میں
ذوقِ تعمیرِ جاں جاگ اُٹھا
آس کی مشعلوں کے سہارے
جذبۂ ضوفشاں جاگ اُٹھا
زندگی کے نئے ہمہموں سے
مرگ آسا جہاں جاگ اُٹھا
آگہی کا جیالا تصوّر
کارواں کارواں جاگ اٹھا

جانگسل شب کے خونیں افق پر
اَن گنت بجلیاں سرسرائیں
حرّیت سوز تاریکیوں میں
سینکڑوں مشعلیں جگمگائیں
چاولوں کا وطن مسکرایا
دھان کی بالیاں لہلہائیں
جھانجھوں نے مدھر گیت چھیڑے
ہیر کی بستیاں رسمسائیں
رودِ مہراَن کے آنگنوں میں
مدبھری کافیاں گنگنائیں
ماہیا کی جگر تاب ضو سے
جگمگائی چناؤں کی دھرتی
راویوں کے اُفق تمتمائے
منفعل، فکرِ کاذب کی سانسیں
دم بخود، اہلِ نخوت کی رائے

رات کے خستہ وزار راہی
منزلِ صبحِ تازہ تک آئے

بیکراں وقت کی ظلمتوں کو
شعلۂ نور افگن دیا تھا

آندھیوں کی ہوس کار زد میں
اک دیا ہم نے روشن کیا تھا
تیز تر آج بھی اس کی لَو ہے
اس کی لَو اپنے دل میں چھپالے

رات کے خستہ و زار راہی
منزلِ صبحِ تازہ تک آئے

رات کے خستہ و زار راہی
متحد اور بہم بڑھ رہے ہیں
پھر نئی منزلوں نے پکارا
پھر نئے راستوں نے صدا دی
پھر شکستہ قدم بڑھ رہے ہیں
پھر نگارِ وطن تجھ کو مژدہ!

نوزیدہ صبا کی نوازش
فصلِ گل ایستادہ کرے گی
اپنے شہپر کشادہ کرے گی
تیرے زرکار رنگیں اُفق پر
چاند تاروں کے جھومر سجیں گے
ماہپاروں کی افشاں جمے گی
نرم شاداب منظر سجیں گے
عیشِ جمہور، آئینِ نو ہے
وقت کی منجمد تیرگی میں
برق پاروں کی گلنار ضو ہے
زندگی کس قدر تیز رَو تھی
زندگی کس قدر تیز رَو ہے

★

دیارِ نغمہ و گل

جلیل حشمی

★

پیکرِ نغمہ و گل، اے مرے محبوب وطن!
تیری مٹی سے بہاروں کی ردا رنگیں ہے
کہکشاں بھی تری راہوں کی ستارہ چیں ہے
تیرے آفاق سے قائم ہے مہ و خور کا وقار
اخذ کرتے ہیں تری دھول سے تارے انوار
تیرے ہر ذرّے پہ قربان کئی تاج محل
صورتِ قریۂ کنعاں ترے بازار حسیں
تیری گلیاں ہیں حریفِ روشِ خلدِ بریں
رونقِ قافِ نظر تیرے پری زادوں سے
روشنی حجلۂ دل میں ہے تری یادوں سے
تیرا ہر خار ہے گل پوش زمینوں کا بدل!

پرچمِ صبح تری رات کے دم سے نوریں
تیرے کہسار کا ہر سنگ ہے قصرِ شیریں
تیرا ہر ذرّہ مجھے مُہرِ سلیماں کا نگیں
تیرا ہر گوشہ ہے صد عشرتِ جنّت کا امیں
تیرے ہر در سے اُمڈتے ہوئے انوارِ جبیں
تیرا ہر بام ہے اک قوسِ قزح سے رنگیں
تیرے چقماق سے روشن ہیں ستاروں کے کنول!
تیرے دامن کی خراشوں پہ فدا نقشِ بہار
تیرے دھندلے سے نشیبوں پہ کئی طور نثار
ماند سو چاند ترے ایک خزف پارے سے
تیرے صحراؤں کے اک ہلکے سے نظّارے سے
نقشِ بہزاد خجل، پھیکے ہیں مانیؔ کے عمل
پیکرِ نغمہ و گل، اے مرے محبوب وطن!

حسنِ امروز

جعفر طاہر

یہ دن کہ روزِ رحمتِ داور کہیں جسے
یہ دن کہ روزِ لطفِ پیمبر کہیں جسے

پیکِ نشاطِ نصرت و اقبال و آبرو
از بارگاہِ خالقِ اکبر کہیں جسے

یہ دن کہ التفاتِ محمدؐ کا ہے امیں
آئینۂ عنایتِ حیدرؓ کہیں جسے

روزِ ظہورِ سطوتِ فاروقؓ و مرتضیٰؓ
روزِ نمو و فقرِ ابوذرؓ کہیں جسے

یہ دن وقارِ ملک و وطن، عزّ و شانِ قوم
یہ دن براتِ رزق و مقدر کہیں جسے

پروانۂ سرور و نویدِ طرب فزا
فرمانِ عیش و بختِ منور کہیں جسے

لائی گلوں کی سمت نسیمِ خجستہ گام
ایسی خبر بہار کا زیور کہیں جسے

ہر سمت جھنگ رنگ بہاروں کا یہ سماں
اہلِ نظر بہشت کا منظر کہیں جسے

یہ نغمۂ وفا یہ نشیدِ حیات زا
جادو نوا ترانۂ زاور کہیں جسے

یہ رقصِ دلنوازِ غزالانِ دشت و دِہ
رقصِ پری وشاں سے بھی بڑھکر کہیں جسے

یہ حسنِ ہمکلامیٔ شیریں لبانِ شہر
ہم گفتگوئے لعل بہ گوہر کہیں جسے

برپا وہ آج جشنِ طرب ہے کہ دیکھکر
جشنِ کبیرِ طغرل و سنجر کہیں جسے

جمہوریہ بنا تھا مرا ملکِ پاک آج
یہ میرا ملک نور کی کشور کہیں جسے

دستورِ سرزمینِ وطن بھی بنا تھا آج
دستور وہ کہ عدل کا دفتر کہیں جسے

مومن کہیں عطائے خداوندِ ذوالجلال
ترسا و ہم مسیحِ منظفّر کہیں جسے

ہے فردِ فرد کے لئے پروانۂ اماں
قہرِ خدا کہیں تو ستمگر کہیں جسے

آئینہ دارِ خلقِ محمدؐ ہے بے گماں
طغرائے سربلندیٔ شوور کہیں جسے

ناموسِ مملکت کا نگہدار و پاسباں
ہم آبروئے رایت و لشکر کہیں جسے

پھر کیوں نہ ہم منائیں کہو جشنِ یادگار
یہ دن کہ اپنے اوج کا مظہر کہیں جسے

اے شیخ بحث چھوڑ اٹھا جامِ زرنگار
یہ چیز وہ ہے زمزم و کوثر کہیں جسے

نغمہ سرائے دولتِ امروز پھر ہوا
یہ ہے نوا کہ طاہر و جعفر کہیں جسے

جنت میں آج قائدِ اعظمؒ ہیں شاد و شاد
اے سرزمینِ پاک جواں سال زندہ باد!

سازینہ : رفیق خاور

★

اُٹھ بادِ بہار اِٹھلا

توم تنانانا توم تنانا[1]
توم تنانانا توم تنانا:
"شاہدِ نو بہار خوش بیا!
خوش بیا! خوش بیا! خوش بیا!"
برق وش، لالہ گوں، خندہ ریز
ناظمِ دہر کا معجزہ!
اُٹھ بادِ بہار اِٹھلا[2]

دھم دھم دھم دھم دھما دھم دھم
دف، دہل، دائرے، دمدمے
گونج اُٹھے، گونج اُٹھے چارسو،

چھم چھم چھم چھم چھما چھم چھم
جھنجھنا اُٹھے پائیلیا
تھائی تھت، تھائی تھت، تھائی تھا
اُٹھ بادِ بہار اِٹھلا
عشق پیچاں کی زلفیں ہری بھری
اُن پہ شبنم کی افشاں چنی ہوئی
عارضوں کے گلاب اور یاسمن
اُن پہ بھونروں کی آنکھیں جمی ہوئی
چشمکیں نرگسِ نیم باز کی
پنکھڑیاں سرخ ہونٹوں کی عنبریں
جھومتی ساڑی پر پھول کام دار
تا بہ امکاں کشیدہ بہ صد ادا

---

[1]، [2] کسی پُرشکوہ ہستی کی آمد پر شہنائیوں کا طنطنہ۔

قوس = یہ بول تیزی سے ایک دم ادا کئے جائیں۔

| : عمودی خط = علامتِ ترتیل (ACCENT)۔

''منبت کاری''

عمل : امین الاسلام (مشرقی پاکستان)

اپنے آنچل میں گل ہائے رنگ رنگ
تختہ ہائے چمن سے سمیٹ کر
خلد زارِ نگاہ بن کے آ
اٹھ بادِ بہار اِٹھلا

چودھویں رات کا چاند ہالہ دار
تیرا روئے مبیں، گوہرِ طلسم
سنگِ مرمر کی وادی تمام نور
اس میں قدرت کے پہلو سے پھوٹتے
نکھرے پانی کے چشمے بھرے بھرے
چہرے کا یہ سمن زار مرمریں
یہ چھلکتے ہوئے چشمے مدبھرے
جھومتی انکھڑیاں مست شعبدے!
ان کو لے کر طلسماتِ نو [1]
(نو ــــــ دکھا
اٹھ بادِ بہار اِٹھلا

تیرے سینے کا وہ فرازِ سیمیں
غنچے ہونٹوں کے کوزہ ہائے شکریں
پنکھڑیاں کلیوں کی دانت گوہریں
لوچدار انگلیاں ــــ نرم پٹڑیاں
باغ میں جائیں کس بانکپن کے ساتھ!
ان کی نوکوں پہ وہ سرخ سرخ پھول
ناخنوں پر کیوٹیکس کا طلسم
بیر بہوٹیوں کی سوئی سوئی سی قطار

نرم و نازک ہتھیلیوں پہ پھولوں کی
اوس کے موتیوں سے جڑی ہوئی
اُجلی رنگیں رکابیاں لئے ہوئے
گیت گاتی ہوئی ناچتی ہوئی
اپنی آن بان، رنگ رُوپ، دھج دکھا
اور مُدردوں کا طَور نت نیا،
اٹھ بادِ بہار اِٹھلا

ناچ ناچ اور اندھا دھند بیل کو ــــ
ڈھیروں پھینکے ہوئے مست دل پہ دل
دلربایانہ جھک کر، سمیٹ کر
تتلیوں کی طرح اڑا اڑا کے دور
اپنے شیتل سے آنچل کی اوٹ سے
چال باریک چلمن کہیں جیسے
دیکھنے والے بے خود ہجوم کو
اپنے مسکاتے چہرے کی شوخیاں
جادوگری کی صورت دکھا
اٹھ بادِ بہار اِٹھلا

ہاں دُرت چال میں تیز اور تیز
مست جوبن کی جھلکیاں بکھیر دے
گھوم گھوم
اور اور
تیز تیز
گھوم

[1] پول ناش

جھوم جھوم

اور اور

مست مست

جھوم

ہر نفس اک نیا رنگ ڈھنگ ہو
چلتی پھرتی قیامت ہر انگ ہو
عشوہ و غمزہ رنگ رنگ ہو
تیری مستی کی اور ہی ترنگ ہو
شوخ آنکھوں کی محشر طرازیاں
پیکرِ ناز کی دلگدازیاں،
شوکتوں کو نمود کا پیام دے
خفتہ فتنوں کو اذنِ خرام دے
لہریا جسم کا بانکپن دکھا

اٹھ۔ اٹھ۔ بادِ بہار اٹھلا

★

وہ اُمڈتا ہوا جسم شیر فام!
سینکڑوں سانچوں میں انگ انگ ڈھال
ڈھلکی ڈھلکی ہوئی مستیوں کا جال
پھیلے اس موم وش نرم جسم پر
رولتا، جھومتا، تیرتا ہوا
جھالر ایسا سجیلا نرم پیرہن
بے محابا پہن، بے تکان ناچ
ایک گلشن کا گلشن ہو رقص میں
گلستاں گلستاں ہولیاں رچیں

زیر و بالا بسنت ہی بسنت ہو
دیکھ کر مغبچے جھومنے لگیں
گھنگروؤں کے ہم آواز طنطنے
ہر دھمک، تھاپ کے ساتھ دمبدم
پورے آہنگ سے جھنجھنا اٹھیں
شور ہو ہر طرف واہ واہ کا

اٹھ بادِ بہار اٹھلا

★

تیرے پیکر میں اک دھوم دھام ہے
تیرے سینے میں زور احتشام ہے
گزرے دن رات کی سحر کاریاں
خفتہ لمحات کی خوشگواریاں
تجھ میں انگڑائیاں لیں، مچل اٹھیں
ایک دم زور سے پھول پھل پڑیں
تجھ میں ہستی کے سوتے اُبل پڑیں
پھلجھڑی کی طرح دیپ جل اٹھیں،
تجھ میں لیتی ہے پھر سانس تازگی،
چیر کر پردہ ہائے ممات کو
تجھ میں لیتی ہے تازہ جنم حیات
ٹوٹ کر آتی ہے موجِ زندگی

تجھ سے ہوتے ہیں پھر تازہ ولولے
آنکھ وا کرتے ہیں پھر سے یک بیک
کتنی صدیوں کے خوابیدہ سلسلے
گرم ہوتی ہیں بے رُوح خنکیاں
رقص کرتی ہیں شوخ و شنگ شورشیں
حشرِ خاک چمن تو، —— نہیں نہیں

حشرِ آب و گِل آدمی ہے تو،
اس کے ارمانوں کے نقش رنگ رنگ
شورش آئیں تمناؤں کی ترنگ
جاگ اور زندگانی کو پھر جگا

اٹھ باد — اٹھ باد — بہار اٹھلا

★

میں ستم دیدہ گردشِ جہاں
کشتۂ زار نیرنگِ روزگار
تختۂ مشقِ قدر و قضا ہوں میں
ہاویہ ہاویہ سوختہ ہوں میں
میرے سینے میں دل دل نہیں رہا
میرا دل سر بسر داغ ہو گیا
میرا پہلو تمام ریش ریش ہے
نوش کی جا مرے دل میں نیش ہے
میرے پہلو پہ یورشِ بلا ہوئی
رات دن بارشِ صد عنا ہوئی
پیش و پس ہر طرف سے رواں رواں
زیر و بالا یہ جلاد پُر فشاں،
دل میں اَنیاں ہی اَنیاں گڑی ہوئیں
پپڑیاں خوں ہی خوں کی جمی ہوئیں
ایک میں کیا کہ انسان خیل خیل
موج بر موج آدمی سیل سیل

قاف تا قاف ہر نقشِ زندگی
شرق تا غرب وقفِ ستم کشی
اک ہیولائے وحشت رواں رواں
اک تشبیہہ بہاراں ہمہ خزاں
زندگی ہی میں تمثیلِ مرگ ہے
سورگ کہنے کو در اصل نرگ ہے
اب ہمیں شادکامی سے کیا غرض
اب ہمیں زندگانی سے واسطہ
ہاں مگر تیرے طوفانِ رنگ سے
موج در موج امڈتی ترنگ سے
عہدِ رفتہ کے اوقاتِ نوش خند
پھر پلٹ آتے ہیں ہاؤ ہو کناں
تجھ میں ہوتے ہیں وہ سحر آشکار
جن سے ہوتا ہے احساس شادکام
تجھ میں جشنِ تمنّا کی رونقیں
تجھ میں ذوقِ تماشا کی جنّتیں
تجھ سے پیرِ جہاں پھر سے زندہ رود
تجھ میں تخلیق کی شعلہ کاریاں
برق کی روح کی بے قراریاں
ہاں اسی شان سے پھر ذرا
رقص و نغمہ کا طوفاں اٹھا
اُٹھ بادِ بہار اِٹھلا!!!

راہ و مقام

۱- ترقیاتی جائزہ

۲- رفتارِ ادب

۱- ترقیاتی جائزہ :

اگر ۱۸۵۷ء سے شمار کیا جائے جبکہ ایک نیا دور طلوع ہوا اور ہم نے نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق ایک نئی زندگی کی طرح ڈال کر اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو حاصل کرنے کے لئے از سرِ نو جد و جہد شروع کی، تو آج پورے سو سال ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کتنے ہی نشیب و فراز آئے کتنی ہی تحریکیں جاری ہوئیں اور ہمیں کتنی ہی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ہمیں اپنی قومی توانائی پر فخر ہونا چاہئیے کہ ہم نے ع "طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے" کے مصداق ہنستے کھیلتے غلامی کا جُوا اپنے شانوں سے اتار پھینکا اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لیا۔ آج ہم اپنی آزاد زندگی کی دس گیارہ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ ان میں جمہوریت کے دو سال باعتبارِ مدت قلیل سہی لیکن یہ ہماری قومی زندگی کا نقطۂ عروج ہیں، اور آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر پیش کرتے ہیں جس میں ترقی کے روشن ترین خواب روشناسِ تکمیل ہوں گے۔ ہمیں اس موقع پر اپنی سابقہ زندگی پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہئیے کہ پہلے ہماری روش کیا رہی ہے اور آئندہ رجحان کیا ہونا چاہیئے۔

غور سے دیکھا جائے تو گزشتہ سو سال میں پہلے نوّے سال کا دور ایک تیاری کا دور تھا۔ ہمیں اپنی صفیں نئے سرے سے آراستہ کرنی تھیں تاکہ ایک طرف تو ہم معصر یارانِ وطن کا سامنا کریں جو محکومی سے نکل کر دفعتاً ایک حریف کی حیثیت سے مقابل میں آ گئے تھے اور دوسری طرف بیگانوں سے بھی ٹکر لینی تھی جن کی تہذیب و تمدن اور ہماری تہذیب و تمدن میں بُعد المشرقین تھا اور وہ اپنے سیاسی اقتدار کی بنا پر اسے ہم پر مسلط کر رہے تھے۔ پرانی قدریں یا نئی قدریں، پرانی روایات یا نئی روایات، پرانا نظام یا نیا نظام، پرانی روشنی یا نئی روشنی ـــــ ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے بڑا سوال یہی تھا۔ رجعت یا احیائے ثانیہ، یا قلبِ ماہیت یعنی قدیم و جدید، مشرق و مغرب کی آمیزش اور ہم آہنگی سے ایک نئے جادۂ حیات کی تشکیل۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جو اسی کشمکش کے نتیجہ میں بروئے کار آیا تھا اور اہلِ فرنگ کے بڑھتے ہوئے سیاسی و تمدنی غلبے کے خلاف ردِّ عمل تھا، اسی سوال کا ابتدائی جواب تھا اور اب حالات کا جھکاؤ لازماً اس دوسرے پہلو ہی کی طرف تھا کہ نئے اثرات کو قبول کیا جائے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ماضی کے پیشِ نظر قدیم روایات سے روگردانی بھی ناممکن تھی۔ نتیجۃً مسلمان ہوں یا ہندو انہیں دونوں انتہاؤں کے مابین ایک درمیانی راستہ ہی اختیار کرنا پڑا: ایک طرف رجعت، دوسری طرف اقدام۔ چنانچہ ہماری جدید تاریخ انہی دو متضاد رجحانات کے مابین مسلسل کشمکش کا مظاہرہ ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ماضی کی بازیافت پر زور دیا اور ساتھ ہی نئی تحریکیں بھی جاری کیں۔ یہ دونوں روشیں آغاز سے اب تک ایک ساتھ جاری ہیں۔ ایک طرف خالص مذہبی بنیاد پر اصلاحی تحریکیں اور دوسری طرف جدید نظریات پر مبنی تحریکیں اور جماعتیں ہنوز برسرِ کار ہیں۔

ادھر ہندوؤں میں بھی یہی رجعت (سنگٹھن شدھی) اور اقدام (کانگرس) کا عمل جاری تھا۔ غرض برِّ صغیر کی دونوں بڑی قوموں کا رجحان دو قسم کی باہم گردست و گریباں انتہاؤں کی طرف ہی تھا۔ لہٰذا دو قومی نظریہ کوئی اتفاقی چیز نہ تھی جسے اہلِ غرض نے خود بخود بنا لیا بلکہ یہ تو برِّ صغیر کے حالات ہی میں مضمر تھا، اور اس کی تقسیم اس کا لازمی نتیجہ تھی۔

اس سے بھی زیادہ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ تقسیم سے صورتِ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب بھی دونوں حصوں میں وہی رجعت ہے اور وہی اقدام، وہی راشٹریہ سیوک سنگھ ہے اور وہی کانگرس، اور وہی احیائے ثانیہ کی تمنا، بین الاسلامی اتحاد کا جذبہ اور ساتھ ہی بین الاقوامی ماحول سے اثر پذیری جو مخلوط رجحانات کو جنم دیتی ہے۔

پاکستان کی گزشتہ دس گیارہ سالہ زندگی انہی رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ جس بنا پر مسلم اکثریت کے علاقے میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ہم اپنے مذہبی تصورات اور نظریات کی بنا پر زندگی بسر کریں جس میں دوسروں کے مقامی یا بیرونی اثرات کو کوئی دخل نہ ہو۔ ہم اپنے ہی نہج پر نشو و نما کریں اور اپنی تہذیب و تمدن کو فروغ دیں۔ ہم بین الاسلامی اتحاد کو عملی صورت عطا کریں جو تمام مسلمان قوموں کا مشترکہ خواب ہے۔ اور پھر ان پرانی قدروں کو جِلا دیں اور نئی قدروں کو اپنائیں جو صحیح معنوں میں حیات افروز ہوں۔ یہ راستہ ہر قسم کے قدیم و جدید اثرات کو اپنانے کا راستہ ہے اور بین الاقوامی روابط کی نشان دہی کرتا ہے۔

اسلامی قدروں اور روایات کو از سرِ نو زندہ کرنے اور زیادہ سے زیادہ توانا اور فعّال بنانے کی لگن ہی ہماری گیارہ سالہ زندگی میں کارفرما رہی ہے اور ترقی کرتے کرتے
آخرکار آج سے دو برس پہلے جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی ۔ اس آئینی نہج کے مقرر ہونے پر ہم برابر اسی کی روح کے مطابق سرگرمِ کار رہے ہیں۔ آزاد عدلیہ
کا قیام براہِ راست اسی مقصد کو عملی جامہ پہنانے کا نتیجہ ہے اور آئندہ عمومی انتخابات بھی اسی مقصد کو زیادہ سے زیادہ واضح طور پر بروئے کار لانے کی علامت ہے۔ اسی
طرح ہماری ہر کوشش اسی بنیادی خواہش پر مبنی ہے کہ ہم اپنی حیاتِ ملّیہ کو خالص اسلامی جمہوری تصوّر کے سانچے میں ڈھالیں۔

یہ سلسلہ ابھی شروع ہوا ہے۔ اس کی مکمّل نشو ونما آہستہ آہستہ ہی وقوع پذیر ہوگی اور ہم اس کی کوئی انتہا مقرر نہیں کرسکتے۔ ہم ایک طرف اندرونی طور پر اسلامی
طرزِ تصوّر اور نظامِ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور دوسری طرف ہم نے مسلسل جدوجہد سے وہ مضبوط اسلامی روابط بھی پیدا کرلئے ہیں جو آگے چل کر بین الاسلامی
اتحاد کو ایک عملی حقیقت بنادیں گے۔ چنانچہ پاکستان میں بار بار ایسے اجتماع ہوئے ہیں جن سے یہ تحریک بتدریج تقویت حاصل کرتی چلی گئی۔ پہلے مؤتمر عالمِ اسلامی، اور احتفالِ علمائ
اور اب ان سے کہیں وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ اس تحریک کی کامیابی کی بیّن دلیل ہے۔ اس مذاکرہ کی اہمیت صرف یہی نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی اجتماع تھا
جس میں متعدد اسلامی ممالک کے نمائندے شریک ہوئے بلکہ اس طرح مسلم اقوام کا ایک مشترکہ مقصد قوی سے قوی تر ہوتا جارہا ہے۔ ہم موجودہ حالات میں اپنے مسائل کا مطالعہ
تجزیہ کررہے ہیں، ان کو حل کرنے کے لئے مناسب قدم اٹھا رہے ہیں اور موجودہ عالمی صورتِ حال میں اپنا موقف واضح اور متعین کررہے ہیں۔ دیگر اقوام کی شرکت نے ہمیں
ان کے زاویۂ نگاہ اور نظریات کو سمجھنے اور اُن سے قریب تر آنے میں مدد دی ہے۔ اس طرح ہمارا دائرہ فکر و نظر وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور کڑی علامہ اقبالؒ کے افکار کو تمام اقوامِ عالم سے روشناس کرانا ہے جو درحقیقت دورِ حاضرہ کو اسلام کا
حقیقی پیغام پہنچانے کی کوشش ہے۔ اور جس طرح اقوامِ شرق و غرب نے اس پیغام پر لبیک کہی ہے وہ ہماری کامیابی اور جمہوریۂ
اسلامیہ کی فعالیت کی ایک اور بیّن دلیل ہے۔

ہماری نظر جہاں اپنی قوم، اپنے ملک، اپنی ترقیات پر ہے وہاں عالمِ اسلام پر بھی ہے اور اس کے بعد تمام آفاق پر۔ ہماری
مرکزی حیثیت ہمیں چاروں کھونٹ کے اثرات کا مرکز و محور اور تہذیبوں کے اختلاط کا گہوارہ بناتی ہے ہماری وسیع المشربی یہ ترغیب
دلاتی ہے کہ ہم تمام قوموں سے ثقافتی روابط پیدا کریں۔ اسی لئے جہاں ہمارے وفود امریکہ، انگلستان، چین، جاپان، روس، وغیرہ
جاتے رہے ہیں وہاں ہم دیگر اقوام کے وفود کا بھی تہہ دل سے خیر مقدم کرتے رہے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے تعاون سے عالمی امن کا قیام ہمارا مستقل مسلک رہا ہے اسی لئے ہم نے جہاں کہیں اتحاد و یگانگت کا امکان پایا ہے
اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ معاہدۂ بغداد اسی غرض و غایت کی عملی صورت ہے۔

ہم جہاں اپنی آزادی کے خواہاں ہیں وہاں دوسروں کی آزادی کے بھی متمنّی ہیں۔ اہلِ کشمیر کا حق خود ارادیت ان کا پیدائشی حق ہے۔ ہم نے
شروع ہی سے اس کی تائید کی ہے اور آج دس گیارہ سال کے بعد بھی جبکہ مظلوم بدستور مظلوم اور اجنبی کا دستِ غارت گر برابر غارت گر ہے
ہم اہلِ کشمیر کو ان کا جائز حق دلوانے کے لئے کوشاں ہیں۔

ہم نے ایک نئی قوم کے گوناگوں تقاضوں میں اقلیتوں کے حقوق کو فراموش نہیں کیا اور ان کے تحفظ کو ایک مقدس امانت سمجھتے ہوئے برابر
یہ کوشش کررہے ہیں کہ جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان ان کے لئے دیارِ رحمت ثابت ہو۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے ہم نے اُس ثقافتی میراث کو بھی
سینے سے لگایا ہے جو قدرت نے ہمیں عطا کی ہے۔ چنانچہ موئن جودڑو، بلوچستان، سابق مغربی پنجاب اور مشرقی پاکستان میں اقوامِ کہن کے
آثار کو دریافت کرنے اور موجودہ آثار کو برقرار رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی گئی ہے۔

اندرونی معاملات کے سلسلے میں چند باتیں جمہوریہ کے لئے باعثِ شرف رہیں گی۔ رفاہِ عامہ کے لئے سعیٔ بلیغ، اجتماعی خوشحالی کے منصوبے
مہاجرین کی آبادکاری و بحالی اور ان کے دعاوی کا انفصال، شروع ہی سے محلِّ توجہ ہیں۔ یہ کام اب تیزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ
صنفِ نازک کی تعلیم اور ان کے حقوق پر بھی پوری توجہ صرف کی جارہی ہے۔ ادھر ملک کی اقتصادی خوشحالی کے لئے صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے جو ہمہ گیر
اور برق رفتار ترقی کی ہے وہ بڑے سے بڑے ترقی یافتہ ملک کے لئے بھی باعثِ فخر قرار دی جاسکتی ہے۔ حال ہی میں انسدادِ ناجائز درآمد و برآمد کے

سلسلہ میں جو قدم اٹھایا گیا ہے وہ ملک کی اقتصادی حیثیت کو بنانے کے لئے نہایت اہم ہے۔ اسی طرح یہ کوشش کہ پاکستان نہ صرف غذائی حیثیت سے خود کفیل ہو بلکہ غلہ برآمد بھی کر سکے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مادی ترقیات اپنی جگہ پر کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں ثقافتی سرگرمیاں قوم کے حقیقی نشو و نما کی علامت بھی ہیں اور اس کو خراج تحسین بھی۔ ان سے معاشرہ کی جسمانی و ذہنی تندرستی و توانائی بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ فارغ البالی بھی جس کے بغیر نہ دل و دماغ آسودہ ہو سکتے ہیں اور نہ ثقافتی جولانیوں کا امکان ہو سکتا ہے۔ تمام پاکستان میں متعدد فنی ادارے ہماری روز بروز وسعت پذیر ثقافتی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں ان میں سے پاکستان آرٹ کونسل" جس کا قیام تاسیس جمہوریہ کے بعد عمل میں آیا اپنی بوقلموں سرگرمیوں کے باعث اسقدر شہرت پیدا کر چکی ہے کہ اس کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ علمی و ادبی سرگرمیاں بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ یہ موضوع اسقدر مختص و ممیز حیثیت رکھتا ہے کہ اس کا ذکر ایک علیحدہ عنوان ہی مناسب ہے اور آپ اس کی تفصیلی کیفیت اگلی سطور میں پائیں گے۔

اس تجزیہ سے اندرونی و بیرونی معاملات میں وہ نہج خود بخود واضح ہو جاتی ہے جس پر ہم آئندہ بھی خاطر خواہ ترقی کر سکتے ہیں۔ آج جب ہماری نوزائیدہ مملکت اپنی بارہویں منزل میں قدم رکھ رہی ہے اور جمہوریہ کا تیسرا سال شروع ہو رہا ہے ہم ایک نظر اس کے عالم آغاز پر ڈالتے ہیں تو کتنا فرق نظر آتا ہے۔ کوتاہ بینوں کے نزدیک پہلے اس کی حالت ایک مصنوعی سیارہ کی طرح تھی جسے نادیدہ فضاؤں میں چھوڑ دیا گیا ہو اور کچھ خبر نہ تھی کہ اس کا حشر کیا ہوگا۔ بدگمان لوگوں کا گمان غالب یہی تھا کہ تاریکی کی قہرمانی قوتیں اس کو انتہائی سفاکی سے نگل لیں گی۔ لیکن نہیں، ہمارے جبلی قومی توانائی نے ہماری لاج رکھ لی اور آج یہ سیارہ پوری آب و تاب اور استقلال کے ساتھ سیاسی افق پر فروزاں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم اپنی قوت پنہاں سے اس کو دوران مہ و سال میں اور بھی استقلال اور آب و تاب سے جلوہ گر کر کے چھوڑیں گے۔

★

۲۔ رفتارِ ادب :

کسی قوم کی سرگرمیوں کا ایک اہم مظہر ادب ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی زندگی، اس کے تصورات، اس کے نصب العین کا واضح عکس دکھائی دیتا ہے۔ ادب اور قومی روح کا یہ رشتہ ایک بنیادی رشتہ ہے جس کی بنا پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہر قوم کا ادب ایک مخصوص وضع کا حامل ہوگا اور اس میں اس کے تیور پوری طرح نمایاں ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان قائم ہوا تو زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب میں بھی ایک مخصوص وضع کی توقع خود بخود پیدا ہو گئی اور یہ تقاضا کیا جانے لگا کہ جس طرح ہماری ملت نئی ہے اسی طرح اس کا ادب بھی نیا ہو اور اس کی امتیازی خصوصیتوں، اس کی صلاحیتوں اور دل و دماغ کی مخصوص کیفیتوں کا آئینہ دار۔ یہ ایک ایسا ادب ہو جس کو ہم اپنا ادب قرار دے سکیں۔ بے شک پاکستان کوئی نئی سرزمین نہ تھی اور اس میں دور ما قبل آزادی کا وسیع ادبی سرمایہ موجود تھا مگر اس پر نئی ملت کے شعور کی کوئی چھاپ نہ تھی۔ اس لئے ایک ایسے ادب کی تلاش ہوئی جس میں نئے ماحول کے ساتھ ساتھ نئے احساسات اور کیفیات کا عکس دکھائی دے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ایسا کوئی ادب موجود نہ تھا اور نہ چند سال کے عرصے میں بروئے کار آ سکتا تھا۔ اس کے لئے ایک مدت درکار تھی۔ تخلیقی سرگرمیوں کا سلسلہ ضرور جاری تھا مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ آگے چل کر کیا صورت اختیار کریں گی۔

آج صورت حالات بہت مختلف ہے۔ اب وہ پہلی سی کیفیت نہیں رہی جس میں کوئی چیز واضح نہ تھی اور نہ گرد و پیش کوئی ایسی ابھری ہوئی ادبی کوششیں دکھائی دیتی تھیں جنھیں پاکستان سے مخصوص قرار دیا جا سکے۔ اب ہمارا شعور کافی بیدار ہو چکا ہے۔ اور اس نے آہستہ آہستہ اپنی نشو و نما کی راہیں تلاش کر لی ہیں۔ ہم ان راہوں پر کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور ہر طرف تخلیقی سرگرمیوں کے ایسے آثار پاتے ہیں جن میں انفرادیت ہی نہیں، امتیاز بھی ہے۔ اور نئے دیس، نئی زندگی، نئے ماحول، نئے تقاضوں کی گوناگوں جھلکیاں بھی، جو ابھرتی ہوتے ہوئے دلفریب بھی ہیں۔ انہی سے پاکستانی یعنی ملی ادب کا وہ تصور بھی ایک سلجھی ہوئی شکل میں سامنے آگیا ہے جس پر ابتدا ہی میں زور دیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت ہماری نوزائیدہ ملت کا شعور اس کا ٹھیک طرح ادراک کرنے سے قاصر تھا۔ اگر ملی ادب کی معتبر صورت وہی ہے جس کا ظرف

محدود نہ ہو۔ خواہ اس میں قوم و وطن کے بظاہر مقامی و جماعتی احساسات و مشاہدات کی ترجمانی ہی کی گئی ہو، تو جس قومی ادب کی ہم نے تشکیل کی ہے، وہ یقیناً منفرد بھی ہے اور قابل لحاظ بھی۔

وہ حالات جو ہمارے فکر و خیال کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیں اور اس طرح ادب کو بھی ایک نئی درح عطا کر دیں، شروع ہی سے موجود تھے۔ ان میں سب سے بڑھ کر وہ لگن تھی جس نے ہمیں حصول پاکستان کی تحریک میں متحد کیا تھا اور آخرکار ایک ہی ملت کے رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ جب پاکستان ظہور میں آگیا تو یہ لگن اور بھی بڑھ گئی۔ ایک دوسرے سے قریب تر آنے اور جاننے کی لگن۔ کیونکہ اب ملت کو صحیح معنوں میں ملت بننا تھا اس کے تمام عناصر خواہ وہ بنگالی ہوں یا سرحدی، پنجابی ہوں یا سندھی، یا وہ بے شمار مہاجر جو مختلف بولیوں، لہجوں اور طور طریقوں کے ساتھ برصغیر کے گوشے گوشے سے اٹھ کر اپنے نئے وطن میں چلے آئے تھے، کو آپس میں شیر و شکر ہونا تھا۔ سیاسی انقلاب نے دور دراز علاقوں کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں اور ان لوگوں کو جو ایک مدت سے الگ تھلگ پڑے تھے، ایک دوسرے کے قریب لا کھڑا کیا۔ اس طرح باہمی شناسائی کی ضرورت شدید تر ہو گئی۔ ہر قسم کے عناصر۔ لوگ، زبانیں، طور طریق، رسم و رواج آپس میں خلط ملط ہونے لگے۔ ایسے حالات ہمیشہ زبانوں میں تبدیلی کا باعث ہوئے ہیں۔ چنانچہ اردو ایک بار پھر ایسے ہی کایا پلٹ دینے والے اثرات سے دوچار ہوئی۔ نہ یہ خود اپنی اصلی حالت پر قائم رہ سکتی تھی اور نہ اس کی کلاسیکی ادبی روایات۔ اس میں سندھی، پنجابی وغیرہ کے الفاظ کثرت سے در آنے لگے۔ چنانچہ مجید لاہوری مرحوم نے نظم و نثر میں جو روش اختیار کی وہ انہی ملے جلے اثرات کا نتیجہ تھی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ یہ سلسلہ اور آگے بڑھے۔ کیونکہ زبان و ادب میں تبدیلی عوام ہی کرتے ہیں۔ اور قیام پاکستان سے لے کر اب تک ان کا اثر خاصہ نمایاں رہا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب اردو پھر عوام ہی کی اردو بن رہی ہے اور یہ اس کو زیادہ توانا بننے میں مدد دے گی۔ یہ رجحان اب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اس نے عام بول چال سے گزر کر سنجیدہ ادب میں بھی جگہ پیدا کر لی ہے اور ممتاز مفتی، اے حمید اور کئی دوسرے ادیب بے تکلف پنجابی اور دوسری قومی بولیوں کے الفاظ برتتے ہیں۔ اس کی انتہائی مثال سید افضل جعفری کی مخلوط زبان ہے۔

اس وسیع پیمانہ پر خلا ملا نے رفتہ رفتہ اچھی خاصی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اخبارات و رسائل نے علاقائی حالات، روایات، قصص و حکایات، مشاغل، شاعری، گیتوں کو ملا جلا کر رکھ دیا۔ ہم شاہ بھٹائی، وارث شاہ، بلھے شاہ، رحمان بابا، جسیم الدین اور بے شمار دیگر مشاہیر اور ان کے کارناموں سے پہلی بار پوری طرح روشناس ہوئے۔ اس سے اردو ادب، بالخصوص شاعری میں ایک اور روایت کا دھارا آ شامل ہوا جس کے اثرات بہت دور رس ہیں۔ ان ہی کے باعث علاقائی داستانوں، گیتوں اور شاعروں کے نظم و نثر میں تراجم کا سلسلہ شروع ہوا جس نے نہ صرف اردو ادب کا دامن بے حد وسیع کر دیا ہے بلکہ اسے ایک ایسی نئی روایت بخشی ہے جو ممکن ہے اس کا رخ بدل ڈالے۔ شاہ بھٹائی کے "رسالو" اور وارث شاہ کی "ہیر رانجھا" کے مکمل تراجم کے علاوہ متعدد علاقائی شاہکاروں کے معیاری تراجم نے ہمیں نئے نئے تصورات اور نئی نئی اصناف (کافی، وائی، چوبیتہ وغیرہ) بخشی ہیں جن سے اردو شاعری کا دامن روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ "خیابان پاک"، "نشید حریت"، "صور اسرافیل"، "رحمان بابا کے افکار" وغیرہ ایسے مجموعے ہیں جو اردو ادب میں ایک نئے دور کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پاکستان میں ادبی نشو و نما کا سب سے اہم پہلو یہی ہے۔ یہ علاقائی روایت پاکستان کا سب سے بڑا فیضان ہے۔ اور ہمارے ملی ادب کا نہایت گراں قدر حصہ جو آہستہ آہستہ ایک خالص پاکستانی شعور پیدا کر رہا ہے۔

ہمارے دور آزادی کی پیداوار ہر قسم کی کوششوں پر مشتمل ہے۔ اس میں افسانہ، ڈرامہ، تنقید، شاعری سبھی شامل ہیں لیکن زیادہ تر رجحان شاعری ہی کی طرف رہا ہے۔ جو پرانی اصناف میں بھی اتنا ہی نمایاں رہا ہے جتنا نئے تجربات میں۔ ہمارے اکثر نوجوان شعراء کے مجموعے قیام پاکستان کے بعد ہی شائع ہوئے ہیں۔ یہ مقدار میں بھی اہم ہیں اور نوعیت میں بھی اور اگر ان کا انتخاب کیا جائے تو انہیں کسی دوسری قوم کی بہترین تخلیقات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

پہلا موضوع جو ہمارے شعراء کے ہاتھ آیا وہ فسادات تھے یا کشمیر۔ یہ دونوں ہنگامی موضوع تھے پھر بھی کشمیر سے متعلق شاعری نے کافی وقیع نتائج پیدا کئے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے کشمیر کا معاملہ اور اس کی یاد ہمارے دلوں میں گرم رکھی۔ اس کے علاوہ کشمیر پر چند واقعی پائدار چیزیں بھی پیدا ہو گئیں۔ مثلاً "شہنشاہ اکبر کی کشمیر میں آمد"۔ "پری محل" اور "بہار یہ" (جعفر طاہر) اور "سرود باقی" کا آخری بند۔

ایک اور بات جس نے شروع ہی سے شعراء کی ذہنی جولانیوں کو تحریک دلائی اپنے وطن پاکستان کی محبت تھی۔ یہ بھی قدرتے ہنگامی موضوع تھا۔ پھر بھی اس نے بعض بڑی جیتی جاگتی چیزیں پیدا کیں بلکہ بعض مستقل تصانیف اور مجموعوں کی شکل بھی اختیار کی۔ مثلاً "نوائے پاک" "پاکستان کے گیت" "لہو ترنگ" اور "نشید حریت" جن میں فنی حیثیت سے بعض نہایت اچھوتے تجربے بھی ہیں۔

شعری تخلیق کا ایک نہایت وقیع اور خوشگوار پہلو نئی اصناف سخن کی ترویج ہے۔ جعفر طاہر کے پُرشکوہ کینٹو اردو کو ایک نیا وقار عطا کرتے ہیں۔ "آئی رُت پھولن کی" (مطبوعہ شاہکار، ۱۹۴۷ء) "کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد" (مطبوعہ ماہ نو، نشان الحق حقی) اور سیف الدین سیف کے "نغمۂ ساربان" سے لے کر "جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا" "سرو دِ باقی" "اٹھ بادِ بہار اٹھلا" تک تکنیک اور محاکات میں کتنی ہی جستیں، کتنی ہی جولانیاں ہیں۔

اعلیٰ درجہ کی طویل نظمیں پاکستانی شعراء کا ایک اور امتیازِ خصوصی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم کی "یدِ بیضا" (مطبوعہ ماہ نو) فکر و بیاں میں ایک اجتہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضیاء جالندھری کی "زمستاں کی ایک رات" اور "ساحل" غنائیہ اور فکری شاعری میں ایک نئی جوت جگاتی ہیں۔ اول الذکر میں گیتوں کی بے ساختگی اور موسیقیت ہماری شاعری میں ایک نئی چیز ہے۔

پھر، اوپیرا، منظوم ڈرامے (طویل و مختصر) چند اور اچھوتی اصناف ہیں، جو دیکھتے ہی دیکھتے کتنی منزلیں طے کر گئی ہیں۔ یوسف ظفر، قیوم نظر، جعفر طاہر، عبدالعزیز خالد (جس نے اردو میں منظوم تمثیلات کا اولیں مجموعہ "زر داغِ دل" پیش کیا ہے اور جس میں فکر و فن کی کتنی ہی عظمتیں جھلکتی ہیں) صہبا اختر اور رفیق خاور نے ان کے متعدد نادر نمونے پیش کئے ہیں بلکہ بعض اہم عروضی تجربے بھی کئے ہیں۔ صہبا اختر کے دو ڈرامے "تابِ دوام" اور "روادیٔ خیال" کافی ندرت آمیز ہیں۔ خصوصاً بیان اور شوخیٔ تخیل میں۔ احمد فراز کی تمثیل "شمر و زغزالہ" عوامی رنگ اور گیتوں کے باعث ایک خاص کیفیت رکھتی ہے۔ ضیاء جالندھری نے حال ہی میں ایک مکمل پنج بابی منظوم ڈراما بھی ترتیب دیا ہے جو فنی اعتبار سے ایک بڑی جسارت آمیز کوشش ہے۔

منظوم ڈراموں میں بلینک ورس، فری ورس اور سپیکنگ ورس کو بھی آزمایا گیا ہے۔ چنانچہ رضی ترمذی کی بعض تمثیلات، جو دیگر فنی حیثیتوں سے بھی وقیع ہیں، کافی خیال انگیز ہیں۔

بعض شاعروں نے منظوم داستانوں پر بھی توجہ دی ہے۔ اُن کی ایک مثال "بہار و خزاں" آپ کو اسی شمارہ میں دکھائی دے گی۔

دوہے ایک پُرانی صنف ہے جس کے قیامِ پاکستان سے پہلے اردو میں خال خال نمونے نظر آتے ہیں۔ جمیل الدین عالی نے اس میں اس طرح روح پھونکی ہے کہ یہ نئے سرے سے، نئے روپ کے ساتھ جاگ اٹھی ہے۔ خالص ہندی دوہوں کے مقابلے میں یہ زیادہ مانوس اور چٹیلے ہیں۔ اور ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ۔

بیلڈ ایک اور دلچسپ صنف ہے۔ عاصمہ حسین نے اس صنف کو اپنایا ہے اور اس کے بعض دلکش نمونے پیش کئے ہیں۔ مثلاً "بیت چکی رت" اور "گلعذار شہر عاج"۔ "ملاحوں کا مان" (مطبوعہ ماہ نو) اس صنف کی ایک اور اچھوتی مثال ہے۔

گیتوں میں جہاں ہندی رس جاری رہا ہے وہاں سیف الدین سیف، قتیل شفائی، جمیل الدین عالی اور ضمیر اظہر نے اس کے بغیر بھی بہت پُرکیف گیت لکھے ہیں۔ جب تک اردو دوآبہ میں گھری رہی اس پر ہندی کی پرچھائیں رہی، اب اس کی جگہ پنجابی غنائیت نے لے لی ہے۔

غزل کی تجدید بھی ہمارے عہد کے اجتہادات میں شامل ہے۔ اس میں ناصر کاظمی نے داخلیت کی روح دوڑا کر ایک نیا لوچ اور سوز پیدا کیا ہے۔ اور ایک ہی موڈ یا خیال سے بظاہر نظم کی طرح اکائی بنا دیا ہے۔

ہمارے شعرا شاعری کے کینوس کو پرشکوہ بنانے کے خواہاں ہیں۔ جعفر طاہر، عبدالعزیز خالد، ضیاء جالندھری اور صہبا اختر کی طویل پُرسطوت منظومات اور شعری داستانوں سے رغبت اسی میلان کی آئینہ دار ہے۔

ممتاز شاعروں میں سے ڈاکٹر خالد، سید عابد علی عابد، سیف الدین سیف، سید عبدالحمید عدم، قتیل شفائی اور ضمیر جعفری وغیرہ کے مجموعے قیامِ پاکستان کے بعد ہی شائع ہوئے ہیں۔ مختار صدیقی، ابن انشا، ظہیر کاشمیری اور متعدد دیگر جواں سال شعرا کے مجموعے بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔

ہماری شاعرات نے بھی شاعری کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان میں صفیہ شمیم، بیگم ادا جعفری، بیگم تصدق حسین، مسعودہ بانو، شائستہ بیزارا اور طاہرہ کاظمی (جس کی شعری کوششیں پاکستان ہی میں بار آور ہوئی ہیں)" حسن فروغ شمع سخن" میں برابر پیش پیش رہی ہیں۔

نثر میں بھی بعض نئی اصناف پیدا ہوئی ہیں یا انہوں نے اس قدر ترقی کی ہے کہ وہ نئی معلوم ہونے لگیں۔ مثلاً رپورتاژ، ناولٹ، طویل مختصر "نفسیاتی" (نفسیاتی افسانے)" مذاکرہ" اور یہ تازہ وارد ہونے کے باوجود قدیم اصناف کی سی بالیدگی پیدا کر چکی ہیں۔

شاعری کی طرح افسانوں کا اوّلیں موضوع بھی فسادات ہی ٹھیرے کیونکہ قیام پاکستان کے وقت تازہ ترین موضوع اور حادثہ یہی تھے، اور اپنے ہم وطنوں کی طرح لکھنے والے بھی اسی سے متاثر تھے۔ یہ مقامی حالات کی طرف پہلی بار اعتنا تھا۔ اگرچہ اس کی نوعیت ہنگامی تھی، پھر بھی اس نے ہیں بعض عمدہ چیزیں مہیا کیں۔ ان میں سے "جب قافلہ چلا" اور "کشمیر اداس ہے" رپورتاژ ہیں۔ یہ ایک نئی صنف ہے جس نے پاکستان ہی میں بال و پر پیدا کئے ہیں۔ شاہد احمد، ممتاز مفتی، ابو سعید قریشی اور رضا ور جبکانی نے بھی متعدد رپورتاژ لکھے ہیں۔

ناولٹ کے اعلیٰ نمونوں میں ایک "یا خدا" ہے جس میں ایک خاص بحرانی موقع پر ملکی حالات اور سوسائٹی کی ابتری کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

بعض طبائع "طویل مختصر" سے زیادہ مانوس ہیں۔ یزدانی ملک، ابو الفضل صدیقی اور انور کے بعض افسانے اپنے وسیع کینوس کے باعث اس صنف کے نمونے تصور کئے جا سکتے ہیں۔

ایک خاص حلقہ میں زیادہ تر توجہ افسانوں یا ہر دلعزیز تاریخی رومانوی داستانوں پر مرکوز رہی ہے، جن کی بڑی مانگ ہے یہ پاکستان ہی کی پیداوار ہے۔ افسانوں کی تعداد وافر رہی ہے اور بعض تکنیکی حیثیت سے بھی کافی وقیع ہیں۔ ہمارے چوٹی کے افسانہ نگار غلام عباس، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، ابن سعید، ابو سعید قریشی، شوکت صدیقی، آغا بابر، ناصر شمسی، حجاب امتیاز علی، ممتاز شیریں برابر افسانے لکھتے رہے ہیں، اور انہوں نے اپنا معیار برقرار رکھا ہے۔ نو واردوں میں رحمان مذنب، صادق حسین، غلام علی چودھری، حمید کاشمیری اور ضمیر الدین احمد روز بروز ابھر رہے ہیں۔

ناول نویسی کے مظاہر بھی خاصے گوناگوں رہے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر احسن فاروقی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، ابن سعید، اور فضل احمد کریم کے ناموں سے ظاہر ہے۔

محمد حسن عسکری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ممتاز حسین، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز شیریں، ڈاکٹر محمد صادق اور سلیم احمد ہماری تنقیدی قدروں اور سرمایہ میں مسلسل اضافہ کرتے رہے ہیں۔

اس سرسری جائزہ میں جو محض جستہ جستہ اشارات اور مثالوں ہی پر مشتمل ہے، رفتار ادب کے نمایاں پہلوؤں ہی کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے ادبی شخصیتوں اور مظہروں میں جامعیت کا التزام نہیں رکھا گیا۔ حق یہ ہے کہ جن افراد نے ملی ادب کو کسی نہ کسی طرح فروغ دینے کی کوشش کی ہے وہ سب قابل تحسین ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنا خونِ جگر قوم کی تعمیر و ترقی ہی پر صرف کیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ہمارے ادبی معماروں کے متعلق بڑے تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تعداد بھی کثیر ہے اور کارنامے بھی ان کے شایانِ شان ہیں۔ ان کی تخلیقات میں غیر معمولی تنوع بھی ہے اور عظمت بھی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ ان میں ایک زیادہ تابناک مستقبل کی علامات بھی ہیں ✦

"حالیؔ جادو بیاں"

عالی

مغرب سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہمارے ادب پر بھی انگریزی تعلیم کا اثر نمایاں ہے۔ منجملہ ان امور کے جو ہم نے انگریزی سے سیکھے ہیں ادبی تنقید بھی ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں تنقید کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ اردو شعرا کے تذکروں اور مشاعروں کے حالات مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ادبی تنقید صرف ظاہر تک تھی، باطن کی طرف شاذ و نادر ہی نظر پڑتی تھی۔ لیعنی شعر میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ متروک الفاظ نہ ہوں، بندش چست ہو قافیہ ٹھیک بیٹھا ہو، مکروہ اور ثقیل الفاظ نہ آنے پائیں، تعقید، ضعف تالیف، عروضی سقم اور شتر گربگی وغیرہ سے پاک ہو۔ بس ایسی ہی چند باتوں پر ہمارا فنِ تنقید ختم ہو جاتا تھا۔ یہ تنقید بے روح تھی۔ حالیؔ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو زبان میں صحیح تنقید کی بنا رکھی۔ ان کا "مقدمۂ شعر و شاعری" ایک عہد آفریں مقالہ ہے جس نے تنقید کا رنگ یکسر بدل دیا۔ اس میں انہوں نے ادب کے بنیادی مسائل پر نظر ڈالی ہے اور ضروری جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ حالیؔ نے پہلی بار اپنے "مقدمے" کی ابتدا میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "شاعری سوسائٹی کے تابع ہے"۔ اور "جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی ماہیت بدلتی ہے۔ یہ تبدیلی بالکل نامعلوم ہوتی ہے"۔

شعر کی عظمت میں فرماتے ہیں کہ "مشاغل دنیوی میں انہماک کے سبب جو قوتیں سو جاتی ہیں شعر ان کو جگاتا ہے . . . اور ان خالص اور پاک جذبات کو جو لوث غرض کے داغ سے منزہ اور مبرا ہیں پھر تازہ کرتا ہے"۔ "قومی افتخار، قومی عزت، عہد و پیمان کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے، استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا اور ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنا جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہو سکیں اور اسی قسم کی وہ تمام خصلتیں جن کے ہونے سے ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک اٹھتی ہے اور جن کے نہ ہونے سے بڑی سی بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے، اگر کسی قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہو جاتیں تو بلا شبہ ان کی بنیاد تو اس میں شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے"۔

وہ شاعری کے لئے تین شرطیں ضروری قرار دیتے ہیں۔ ایک تخیل۔ دوسری کائنات کا مطالعہ، تیسری تفحص الفاظ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے متعلق مناسب بحث کی ہے۔ اسی طرح لفظ و معنی کے تعلق پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ بحث ہر زبان کے ادب میں قدیم سے چلی آرہی ہے کہ آیا انشا کا ہنر الفاظ میں ہے یا معانی میں۔ اس بارے میں حالیؔ نے اسی خیال کی تائید کی ہے جو عام طور پر ہمارے اکثر ادیبوں کا ہے۔ لیعنی "شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں"۔ الفاظ کی قوت سے انکار نہیں۔ لیکن جب کوئی خیال پوری گہرائی کے ساتھ دل و دماغ پر چھا جاتا ہے تو لفظ و معنی ایسے لپٹے ہوئے تراوش ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلا درجے کے اشعار کا جن میں لفظ و معنی یک جان ہوتے ہیں کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوتا ہے تو وہ لطف باقی نہیں رہتا جو اصل میں ہے۔

مولانا نے شعر کی خوبی کا مدار تین چیزوں پر رکھا ہے۔ سادگی، جوش اور اصلیت۔ یہ ملٹن کا قول ہے اور اسی پر انہوں نے اپنی رائے کی بنیاد

رکھی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ملٹن کے لفظ SENSUOUS کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا۔ یہ اعتراض درست ہے۔ لیکن حالی کی رائے میں شعر کی مقبولیت کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ یہی تین ہیں۔ اس کے بعد وہ ان تینوں کی صراحت کرتے ہیں کہ سادگی، جوش اور اصلیت سے کیا مراد ہے۔

اس بحث کے دوران میں وہ بعض ادبی نکات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً آمد و آورد اور محاورہ اور روزمرہ کا فرق۔ یا یہ کہ شعر کے لئے وزن ضروری ہے یا نہیں۔ یا قافیہ شعر کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔ ان کی رائے میں نفسِ شعر وزن کا محتاج نہیں۔ البتہ وزن سے شعر کی خوبی اور اس کی تاثیر دو بالا ہو جاتی ہے اس طرح قافیہ بھی نظم ہی کے لئے ضروری ہے نہ کہ شعر کے لئے۔ الفاظ کے متروک قرار دینے کے متعلق لکھتے ہیں "جب کہ وہ الفاظ خاص و عام کی زبان پر جاری ہیں تو اردو نظم و نثر میں کیوں نہ استعمال کئے جائیں۔" اسی کے ساتھ ان کا یہ خیال بھی صحت پر مبنی ہے کہ "ایسے لفظوں کو جو عربی فارسی یا انگریزی سے اردو میں لئے گئے ہیں یہ سمجھنا غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں۔ نہیں بلکہ ان کو اردو سمجھنا چاہئے۔"

نیچرل شاعری کی تعریف اور اس کی حقیقت کو مثالیں دے کر بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نیچرل شاعری کے لئے جیسا کہ ظاہر ہے ہماری موجودہ زبان کافی نہیں ہے، اس لئے ضرور ہے کہ اس میں وسعت پیدا کی جائے۔ اور بلا وجہ الفاظ کو واجب الترک قرار دے کر زبان کے دائرے کو تنگ نہ کیا جائے۔"

بنیادی اصولوں کی بحث کے بعد وہ اصنافِ سخن پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کی اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس میں غزل کی اصلاح کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ لکھتے ہیں "غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے محض ایک بے سود اور دور از کار صنعت معلوم ہوتی ہے۔" اس میں انہوں نے بڑے کام کی باتیں کہی ہیں اور کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے، خصوصاً اس کی وسعت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "غزل کو باعتبار مضامین و خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔ اور اسے ہر قسم کے جذبات کا آرگن بنانا چاہئے۔" اسی ضمن میں صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً بچنے کی ہدایت کی ہے۔ مولانا نے صرف مشورہ ہی نہیں دیا خود اس پر عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ جدید غزل کا جو اس وقت رنگ ہے وہ مولانا ہی کا طفیل ہے۔ قصیدے اور مرثیے کی اصلاح کے متعلق بھی بعض نہایت مناسب خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً مرثیہ کے متعلق دو خیال خاص طور پر بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے صرف واقعۂ کربلا تک مخصوص کرنا مناسب نہیں۔ دوسرے ان مرثیوں میں رزم بزم، فخر و خودستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا، لمبی لمبی تمہیدیں اور طولے باندھنا، گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانا مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہے۔" مرثیہ موت پر رنج و اندوہ کا اظہار ہے اور قصیدہ زندہ شخص کی مدح و ثنا ہے۔ دونوں کے بیان میں تصنع و صنعت اور اغراق کا اظہار نہیں ہونا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو راستی سے انحراف نہ کیا جائے اس کا سب سے بہتر نمونہ مولانا کا مرثیۂ غالب ہے جو اردو ادب کا شہ کار ہے۔ مولانا حالی کا کمال یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

مولانا نے سیرۃ النعمان کے تبصرے کے ضمن میں اپنی تنقید کا اصول بھی بتا دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ کسی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ مصنف کی رائے جزئیاتِ مسائل میں فی نفسہٖ کیسی ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کتاب کا عنوانِ بیان کیسا ہے۔ ترتیب کیسی ہے۔ طریقِ استدلال مذاقِ وقت کے موافق ہے یا نہیں اور کتاب لکھنے کی غایت جو مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہئے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے وہ اس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟" یہ بہت صحیح اصول ہے۔ سارے آجکل کے نقاد تنقید یا تبصرہ کرتے وقت دل آزار جملے لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً حقیقت سے بے خبر، ناواقف، سمجھنے سے معذور، حیرت انگیز سطحیت، خیالات مضحکہ خیز رکیک ردی، نظر کی تنگی، پست مذاقی وغیرہ۔ مولانا کبھی ایسا جملہ نہیں لکھتے۔ وہ اپنے تبصروں میں ہلکا سا اشارہ نرم الفاظ میں مصنف کی فروگزاشت کی طرف کر دیتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ بعض اوقات اس قسم کی فروگزاشت کا ذکر کرنے کے بعد مصنف کی طرف سے خود ہی عذر پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے جو مقصد ہے وہ بھی پورا ہو جاتا ہے اور دل آزاری بھی نہیں ہوتی۔ مثلاً سیرۃ النعمان پر تبصرہ کے دوران میں لکھتے ہیں "اس باب میں ایسا بڑا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کافی ثبوت دینا آسان کام نہیں۔ بایں ہمہ جہاں تک ایک سرسری نظر سے رائے قائم ہو سکتی ہے اس کے لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے جتنی خصوصیتیں فقہ حنفی کی جتائی ہیں ان کے ثبوت میں قابلِ اطمینان مثالیں پیش کی ہیں . . . ان مثالوں کے بہم پہنچانے سے نہ صرف سعی و کوشش کا حق ادا کیا ہے بلکہ اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں۔" ان سب تعریفی کلمات کے بعد صرف

ایک جگہ میں مصنف کے لئے ایک ہلکا سا اشارہ کر دیا ہے۔ وہ یہ ہے "ہاں جہاں جس طرح سلسلے ... کا اصل ... ایک ہی سفر میں ... نہیں ہوا اسی طرح ممکن ہے کہ اس باب کی تکمیل کے لئے مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے۔"

یا مثلاً آب حیات کے تبصرے میں لکھتے ہیں "اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا، جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومن یا میر نظام الدین خاں ممنون" اس کے بعد ہی اس خیال سے کہ مصنف کی دل آزاری نہ ہو اس کی طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں "لیکن اس کا یعنی (مصنف کا) عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فروگذاشت نہیں کیا جائے گا بلکہ اس نے ہر دور میں سے چند شاعر بطور نمونہ انتخاب کر لئے ہیں۔" غرض جو بات انہیں کہنی تھی کہہ گئے اور سمجھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے۔ اسی تبصرے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "مصنف نے اپنی کتاب میں کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اردو شاعری نے ہماری معاشرت، ہمارے اخلاق ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا۔" آب حیات پر یہ بڑا سچا اور چبھتا ہوا اعتراض ہے۔ مگر ساتھ ہی اس اعتراض کو نرم کرنے کے لئے لکھتے ہیں "لیکن اس نے یعنی (مصنف نے شعرا کا حال ایسا واشگاف لکھا ہے کہ ہر صاحب رائے اس کو دیکھ کر اس باب میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔" مولانا کی باریک بین نظر نے تصنیف کی اصل خامی کی گرفت کی ہے لیکن اس کا اظہار اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ مصنف کو ناگوار نہ ہو۔

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے لیکن انگریزی ادب یا تنقید کے منشا کو جتنا کچھ وہ سمجھے اور جسے انہوں نے اپنی بے مثل متین اور شگفتہ نثر میں ادا کیا ہمارے انگریزی داں اصحاب سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تنقید پر کوئی ایسی کتاب یا مقالہ نہ لکھ سکے جو "مقدمہ" کے پائے کا ہو۔

ایک خاص اصول جس پر وہ ہمیشہ عامل رہے یہ ہے کہ "شعر میں جہاں تک ممکن ہو حقیقت اور راستی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ دینا چاہئے"۔ یہ مقولہ حالی کے ادب اور شاعری کی جان ہے۔ وہ اس پر اس سختی سے پابند ہیں کہ بعض اوقات صداقت کی خاطر فن کو قربان کر دیتے ہیں۔

باوجود بعض اسقام کے مقدمہ کی تاریخی اہمیت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ اس کے کڑی سی کڑی تنقید کرنے والے بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ "حالی صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں اس وقت اردو کے بہترین نقاد ہیں"۔ ایک دوسرے نقاد لکھتے ہیں "ان کی ہستی اور فطرت نقاد کی ہستی اور فطرت ہے۔" "اس نے اردو کے مذاق کو بدل دیا اور ایسی شاہراہ قائم کی جس پر سب ہی اردو نقاد چلے اور چلتے رہیں گے۔"

حالی کا درجہ اردو ادب میں بہت بلند ہے۔ انہوں نے صحیح ذوق پیدا کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ حالی ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جو کبھی کبھی افق عالم پر نمودار ہوتی ہیں اور اپنی ذہانت اور زورِ قلم سے ادب کا رخ بدل دیتی ہیں ◆ (بہ شکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

●

● کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں	مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
● یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا	ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
● دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام	کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
● ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں	اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
● دنیا کے خرخشوں سے چھٹے تھے ہم اولیں	آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
● جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تو	کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

ہاتھیوں کی لڑائی
(مغل نقاشی کا نمونہ)

شیخ عبدالقادر۔ ایک ادارہ

ڈاکٹر محمد باقر

گفتگو میں دلآویزی پیدا کرنا ایک فن ہے۔ جو سیکھا تو جا سکتا ہے لیکن اسے اعلیٰ درجہ تک پہنچانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بعض لوگ صرف اس لئے باتیں کرتے ہیں کہ انہیں اپنی آواز بھلی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پروا نہیں کرتے کہ سننے والوں پر کیا گزر رہی ہے۔ بعض فقرے بازی سے ہی سروکار رکھتے ہیں۔ اور دوسروں کو طنز و استہزار کا تختۂ مشق بنا کر سامانِ تفریح بہم پہنچاتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر کی گفتگو میں ان معائب کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ایسے خوش طبع اور خوش گفتار انسان تھے کہ آپ گھنٹوں ان کی گفتگو سنتے رہتے پھر بھی طبیعت نہ اکتاتی بلکہ ایک خوشگوار حظ محسوس کرتی۔ انہوں نے گفتگو کو فن کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ اور پھر ایک بامذاق، جہاندیدہ انسان ہونے کی بنا پر، جس نے زندگی کی کتنی ہی بہاریں۔ اور خزائیں دیکھی تھیں، کتنے ہی میدانوں میں گھوم پھر کر بڑا وسیع اور گوناگوں تجربہ حاصل کیا تھا، ان کے موضوعات کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ اس طرح ان کی شخصیت ایک ایسا ہمہ صفت موصوف ادارہ بن گئی تھی۔ جس کی مثال دستیاب ہونا مشکل ہے۔

میری، ان سے راہ و رسم ان کی عمر کے آخری حصے میں ہوئی۔ اس وقت ان کی گفتگو کا فن معراج کمال پر تھا۔ گرم و سردِ زمانہ نے ان کے مزاج اور نظریات میں ایک بہت ہی شگفتہ اعتدال پیدا کر دیا تھا۔ اس وقت تک وہ زندگی کے اسرار و حقائق کو اپنے تجارب کی بناء پر سمجھنے اور پرکھنے میں مشاق ہو چکے تھے۔ ان کا چہرہ بڑے سے بڑے غم کو اپنی متانت کے لطیف پردے میں چھپا لیتا تھا۔ اسی طرح بڑی سے بڑی مسرت کا اظہار وہ صرف ایک لطیف قہقہے سے کرتے جس کی آواز لب و دنداں سے آگے نہ بڑھتی۔ یہ سب کچھ اتفاقی نہیں تھا۔ انہوں نے گفتگو کو فن بنانے میں کافی مطالعہ، مشاہدہ اور ریاضت سے کام لیا تھا۔ اور اب اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ ان کی گفتگو کی جوانی کانٹے میں تل رہی تھی۔ وہ دھیمی دھیمی آواز اور سحر انگیز انداز سے گفتگو کرتے جاتے اور سننے والا مسحور ہوتا جاتا تھا۔ ان کے لب و لہجہ میں بلند آہنگی، تمکنت اور وقار فطری طور پر شامل تھا۔ اس لئے جب وہ دھیمی آواز میں بھی گفتگو کرتے تو اس میں ایک دلکش گونج سنائی دیتی۔ اردو کو انہوں نے اس طرح اپنایا تھا کہ اُن کی آواز کا اُتار چڑھاؤ اور تلفظ اہل زبان کی مانند ہی نہیں بالکل خاص اہل زبان کا تھا۔ اردو سے ان کے شغف کا یہ عالم تھا کہ ان کے بعض بچے شروع شروع میں پنجابی بول ہی نہیں سکتے تھے۔ مجھے یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ میں نے انہیں نہایت عمدہ پنجابی میں بھی گفتگو کرتے سنا۔ غالباً یہ رعایت صرف میرے یا میرے جیسے چند احباب کے لئے تھی جو ان کے سامنے پنجابی میں باتیں کرنے کی جسارت کیا کرتے تھے۔ ورنہ گھر کے اندر اور گھر سے باہر وہ بالعموم اردو ہی بولتے تھے۔

شیخ صاحب کی گفتگو کے موضوع اکثر معاشرتی ہوتے تھے۔ ان کا اسلوبِ بیان ادبی تھا لیکن خالص علمی یا ادبی موضوعات پر وہ بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ ان کی یادداشت بہت قوی تھی۔ میں نے جب بھی ان سے کسی دوست کا تعارف کرایا اور وہ کافی عرصہ بعد ان سے ملے تو انہوں نے نہ صرف انہیں پہچان لیا بلکہ ان کا نام لے کر خوش آمدید کہا ایسا وہی کر سکتا ہے جسے دوسرے انسانوں سے ہمدردی اور دلچسپی ہو۔ اور شیخ صاحب میں یہ اوصاف بدرجۂ اتم تھے۔ لندن میں میرے ایک پروفیسر اس بات پر بہت خفا تھے کہ میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں یہ کیوں لکھ دیا کہ انگریزوں نے ہمارے خزائنِ مخطوطات کو لوٹ کر اپنے کتاب خانے آباد کئے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اصرار کیا کہ اس موضوع اور اس سے متعلق حصے کو مقالے سے خارج کر دیا جائے۔ اس پر میں نے سلطان شہیدؒ کے وہ مخطوطات پیش کئے جن کی فہرست تو انگریزوں نے شائع کر دی تھی مگر وہ برصغیر پاک و ہند میں کہیں بھی دستیاب نہ ہوتے تھے۔ اس کے برعکس ان میں سے بیشتر مخطوطات سلطان شہیدؒ کی مہروں کے ساتھ انڈیا آفس کے کتاب خانے میں موجود تھے۔ اس پر پروفیسر صاحب اور چڑ گئے۔ میں نے سر عبدالقادر سے جا کر شکایت کی۔ آپ اس وقت انڈیا آفس میں وزیر ہند کے مشیر تھے۔

فرمانے لگے، "باقر صاحب، آپ کو آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے! مقالے سے یہ حصے حذف کر دیجیے، تاکہ آپ کو ڈگری مل جائے۔ اگر یہ نہ ملی تو وطن پہنچ کر آپ کس کس کو بتاتے پھریں گے کہ آپ کا رسالہ اس وجہ سے رد کر دیا گیا ہے؟" یہ مخلصانہ نصیحت میرے بہت کام آئی۔

طنز یا مزاح کا جواب دل آزاری کے بغیر دینے میں سر عبدالقادر کو کمال حاصل تھا۔ سن ۱۹۳۸ء میں سر فیروز خان نون نے ایک دن وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ کے ایما پر لندن میں اپنے مکان پر پنڈت جواہر لعل نہرو کو کھانے پر بلایا۔ سر فیروز اس وقت انڈین ہائی کمشنر تھے اور پنڈت جی سیر کرنے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ کھانے پر سر محمد ظفر اللہ خان، سر عبدالقادر اور میاں نسیم حسین بھی مدعو تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ لارڈ زٹلینڈ نے ہندوستانی معاشرت پر چھینٹا پھینکنے کے لئے شیخ صاحب سے پوچھا! "سر عبدل ہندوستانی کھانا کس طرح کھاتے ہیں؟" شیخ صاحب فوراً بھانپ گئے کہ وزیر ہند اس بات پر آوازہ کسنا چاہتے ہیں کہ ہم کھانا کانٹے چھری کے بغیر ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ شیخ صاحب نے جھٹ جواب دیا: "لارڈ زٹلینڈ! بالکل اسی طرح جیسے حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کھاتے تھے۔" اس پر ایک طویل قہقہہ پڑا۔ وزیر ہند اپنے حملے میں ناکام رہنے کے باوجود خفیف نہ ہوئے اور خوب ہنسے۔

سر عبدالقادر بے پناہ مجلسی دلکشی کے حامل تھے۔ ہمارے قیام لندن کے زمانے یعنی ۱۹۳۹ء میں ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی لندن تشریف لائے۔ یہاں ہماری ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز و محور سر عبدالقادر تھے۔ حفیظ صاحب نے ایک مجلس میں شکایت کی: "شیخ صاحب میں لندن کے شور و غل سے بیزار ہوں۔ صبح شام ہر طرف بسوں، ٹریموں اور گاڑیوں کا اس قدر شور ہے کہ میں رات کو سو بھی نہیں سکتا۔" شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "ممکن ہے اس کی وجہ تنہائی ہو۔" اس پر شیخ صاحب کے قہقہے میں حاضرین بھی شامل ہو گئے۔

ایک شام لندن سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر فہمدی کے ہاں ایک دعوت تھی جس میں کلکتہ کے میئر عبدالرحمٰن صدیقی (مرحوم) چودھری خلیق الزماں دیوان اتم آنند شرما اور مسٹر کرشنا مینن شامل تھے، اور علی گڑھ کا ایک طالبعلم بھی تھا۔ کھانے میں ذرا دیر لگی تو طالب علم نے بیقراری کا اظہار شروع کیا۔ اور کہنے لگے: "میری لینڈ لیڈی خفا ہو گی کہ آج اتنی دیر کر دی۔" یہ فقرہ انہوں نے کچھ اس طرح دہرایا کہ ہم سب اصل معاملہ بھانپ گئے۔ یہی کہ بے چینی کا سبب لینڈ لیڈی نہ تھی بلکہ یہ پردہ زنگاری کسی اور پر ڈالا جا رہا تھا۔ تاہم مقامی رسم و رواج کے مطابق ہم اس پر کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اسے گنوار پن سمجھا جاتا ہے۔ جب طالبعلم رخصت ہونے پر آمادہ ہو گئے تو سر عبدالقادر نے فرمایا، حضرت کل ملاقات ہو گی تو معذرت پیش کر دیں۔ آخر دقعہ تو ایک دن ہی کا ہے۔" یہ بات ایسے رازدارانہ انداز میں، اس قدر برملا کہی گئی کہ سب ہنسنے لگے اور طالبعلم اس رات پھر اپنا تقاضہ نہ دہرا سکا۔

لندن میں دو اصحاب مسٹر کرشنا مینن اور بیرسٹر دارا خاص شخصیتیں تھیں۔ مسٹر مینن کانگریس کا ایک اخبار چہ سائکلو اسٹائل کیا کرتے تھے اور بیرسٹر دارا گلاب جامن بنا کر بیچا کرتے تھے۔ ان دونوں اصحاب کے ذرائع آمدنی نہ ہونے کے برابر تھے، پھر بھی یہ وطن واپس آنے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ اس لئے یہ جسم و جان کا رابطہ قائم رکھنے کے لئے اکثر اپنی مصنوعات ہم وطن طلبا کے پاس بیچنے کے لئے لایا کرتے تھے۔ وہ دونوں چیزیں طلبا کے لئے نہایت گراں تھیں لیکن شرم حضوری کی وجہ سے اکثر نوجوان کبھی کبھار اخبار اور گلاب جامن خرید لیا کرتے تھے۔ میں نے سر عبدالقادر سے ایک دن از راہ مذاق کہا شیخ صاحب ہمیں ان کے آزار سے بچنے کی کوئی ترکیب بتائیے۔" فرمایا "باقر صاحب، ان سے آپ کیسے بچ سکتے ہیں؟ یہ نیشنلسٹ ہندو ہیں۔ اگر آپ گلاب جامن کے شہد سے قابو میں نہیں آئیں گے تو یہ اخبار کے زہر سے آپ کو ماریں گے۔ بہر صورت انہیں طوعاً و کرہاً برداشت کرنا ہی پڑے گا!

تعطیل کے روز دریائے ٹیمز میں تفریح کرنے والوں کے لئے چھوٹے چھوٹے کشتی نما جہاز چلتے ہیں جو انہیں ایک تفریح گاہ سے دوسری تفریح گاہ تک پہنچاتے ہیں۔ سفر کا سارا وقت عرشے پر ہی گذرتا ہے۔ اکثر لوگ کٹہرے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خوش گپیوں اور دلکش مناظر سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک سفر میں سر عبدالقادر اور میں ایک ہی جہاز پر سوار ہوئے۔ وہ عرشے پر پڑی ہوئی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ مسافروں میں ایک ہندی رئیس کی صاحبزادی بھی تھی جو ایک متمول ڈاکٹر کی بیوی تھی۔ اسے لوگوں سے ملاقات کا بے حد شوق تھا لیکن طالبعلم اس کی معیت سے گھبراتے تھے۔ وہ عرشے پر ہر طرف گھوم رہی تھی میں نے اس کا ذکر سر عبدالقادر سے کیا۔ کہنے لگے، "باقر صاحب، ہمارے ہاں ایک پرانا مقولہ ہے۔ "نون تے اَن ہنڈنا نہیں چاہی دا" یعنی خوراک اور عورت کی تنقیص نہیں کرنا چاہئے! یہ اتنا پرمعنی اور دلکش تبصرہ تھا کہ ان کے ارد گرد کھڑے ہوئے سب آدمی ہنسنے لگے۔

ماہ نو، کراچی، جمہوریت نمبر ۱۹۵۸ء

وقار الملک مرحوم

(ہستی پُرجوش سرسید کی موج پُرخروش)

مولوی محمد امین زبیری

ایک ایسی تنظیم کا بانی جس نے ہماری تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور ایم۔ اے۔ او کالج علیگڑھ کا سیکرٹری۔ جس شخص کو یہ دونوں شرف حاصل ہوں، اس کو اور کسی اعزاز کی ضرورت نہیں ــــ ہماری قومی تاریخ میں اس کی حیثیت مسلّم ہے۔ اور ہمارے دلوں میں اس کی قدر و منزلت ہمیشہ باقی رہے گی۔ بیشک وہ دَور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا جس کی سرگرمیوں میں انہوں نے حصہ لیا اور شاید اسی وجہ سے ہم ان کی عظمت کا کماحقہٗ اندازہ نہ کر سکیں، پھر بھی جن حالات اور مسائل سے وہ دوچار ہوئے اور جس طرح انہوں نے ایک نازک دور میں افرادِ ملت کی رہنمائی کی، اس سے ان کی قدر اور شخصیت کے خد و خال اور عظمت کے وجوہ بخوبی نمایاں ہو جاتے ہیں ــــ "وقار الدولہ۔ وقار الملک۔ انتصار جنگ" یہ القابات تھے جو انہیں سرکارِ نظام کی طرف سے حاصل ہوئے۔ تمام تر حُسنِ خدمت اور ذاتی قابلیت کی بنا پر، اور یہ ان کے لئے حقیقتاً مایۂ ناز ہیں۔

وقار الملک محض اپنی قدرتی صلاحیتوں کی بدولت ابھرے اور اپنے عہد کی نامور شخصیتوں میں شمار ہوئے۔ یہ ان کی خداداد قابلیت ہی تھی جس نے مولوی مشتاق حسین جیسے غیر معروف شخص کو وقار الملک بنا دیا۔ ان کا تعلق ایک عربی النسل خاندان سے تھا جو سندھ، ملتان، پنجاب، دہلی اور اس کے گرد و پیش کے علاقوں میں آباد ہو کر "کنبوہ" کے لقب سے مشہور ہوا۔ ابھی زندگی کی ایک بہار بھی نہ دیکھی تھی کہ وہ باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ تاہم ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

طبعِ سلیم نے شروع ہی سے حصولِ علم کی ترغیب دلائی اور وہ تیزی سے تعلیمی ترقی کے مدارج طے کرنے لگے۔ ابھی اٹھارہ سال ہی کی عمر تھی کہ ۱۸۶۰ء میں اپنے قصبے کے ورنیکلر اسکول میں ماسٹر ہو گئے ــــ صرف دس روپے ماہوار پر۔ پھر ترقی کرتے کرتے صدر الصدور، سب آرڈی نیٹ جج کی منصفی تک جا پہنچے۔

اتفاق سے ان دنوں سرسید رح جیسا جوہر شناس موجود تھا۔ جس کی نگاہیں ہر وقت کسی جوہر قابل کی تلاش میں رہتیں۔ حسن اتفاق یہ کہ انکے مولوی صاحب کے خاندان سے دیرینہ روابط تھے۔ انہوں نے اس ہونہار نوجوان کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس کی لیاقت کو بھانپ لیا۔ خوبیٔ قسمت سے منصفی کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے تو علیگڈھ میں جہاں سرسید صدر الصدور تھے اور ان کی پیشی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ سرسید ان کی مستعدی اور حسنِ خدمت سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ جب تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے جلد ہی ترقی کرتے کرتے تحصیلدار بن گئے اور ۱۸۷۲ء میں اضلاع بستی و گورکھپور کے قحط کے سلسلہ میں امدادی کام سرسید کی زیر نگرانی جاری ہوئے تو انہوں نے بطور خاص انہی کی خدمات حاصل کیں۔ اس طرح ان کی سرگرمیوں کا دھارا سرسید کی سرگرمیوں کے دھارے سے مل گیا اور اس کے ساتھ قسمت کا دھارا بھی۔

اس سے چند سال قبل سرسید کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ مولوی مشتاق حسین بھی اس میں شریک رہے۔ "سائنٹیفک سوسائٹی" پریس کا انتظام اور تہذیب الاخلاق کی اشاعت کا اہتمام ان کے ذمہ تھا اور وہ ۱۸۶۶ء میں خود بھی سوسائٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ ہوتے ہوتے کئی اور ذہین افراد کی طرح وہ بھی سرسید کا دست راست بن گئے۔ وہ نہ صرف ان کے ہم خیال تھے بلکہ ممد و معاون بھی تھے۔ اس ہم نوائی کا نتیجہ تھا کہ وہ سرسید کی طرح زندقہ و الحاد کے الزاموں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انہوں نے سرسید کی رہنمائی میں زندگی کا آغاز ہی قومی خدمت سے کیا تھا اور اس کے لئے ہمیشہ خندہ پیشانی سے سینہ سپر رہے۔ انھیں ہر اس اقدام سے اتفاق تھا جس کا مقصد قومی ترقی اور رفاہ و بہبود ہو۔

بایں ہمہ وہ ابھی تک محض ایک عام فرد ہی تھے۔ مگر وہ وقت تیزی سے آرہا تھا جو انہیں "وقار الملک" بنا گیا۔ جب ریاست حیدرآباد دکن کو جدید طور پر منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو سرسید کے مشورہ سے شمالی ہند کے چند مردان کار بان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہی آزمودہ کار افراد میں مولوی مشتاق حسین بھی تھے۔ جو تھوڑے ہی عرصہ میں ترقی کر کے صدر المہام عدالت (جوڈیشل منسٹر) کے معتمد مقرر ہو گئے اور پھر وزیر مختار نے انہیں معتمد عدالت و پولیس منتخب کیا۔ اب ان کے جوہر کھلے۔ ریاست کے نظام حکومت کی اصلاح میں ان کا بڑا کارنامہ عدالتی کارروائیوں میں اصلاح اور عدالت العالیہ کا قیام ہے جس نے عدالت کو حکام انتظامی کے اقتدار سے نجات دلا کر آزاد حیثیت عطا کر دی۔ اس کامیابی میں ان کے خلوص اور جذبۂ خدمت کو بیحد دخل تھا اور یہی بات تھی جس نے نہ صرف وزیر مختار بلکہ دوسروں پر بھی گہرا اثر ڈالا۔۔۔ انہوں نے صیغۂ مالگذاری میں بھی ایسی ہی اہم اصلاحات کیں اور پھر صوبہ مشرقی کی صوبہ داری کے دوران ان کا سلسلہ جاری رکھا جس کی بنا پر رعایا نے ان کی یادگاریں قائم کیں۔ یہ انہی خدمات کا نتیجہ تھا کہ ان کو "نواب انتصار جنگ" کا خطاب عطا ہوا۔ اس کے باوجود ان کا جذبۂ خدمت نئے نئے مظاہر پیدا کرتا رہا اور انہوں نے حکومتِ ہند اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ریاست کی خیر خواہی اور فلاح و بہبود میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اسی کی بنا پر وہ "وقار الملک" اور "وقار الدولہ" کے مزید خطابات سے مشرف ہوئے۔ چنانچہ وہ آج تک "وقار الملک" ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ بہرحال حیدرآباد میں ان کے کارہائے نمایاں یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔

ریاست کی ملازمت سے سبکدوشی ان کے لئے حقیقی معنوں میں وقیع تر اور جلیل تر قومی خدمات کا پیغام تھی۔ اور پہلے سے زیادہ نمایاں حیثیت سے اب وہ گویا قومی سرگرمیوں اور خدمات کے پُرزور دھارے میں بہنے لگے۔ اور ان کا ہر اقدام ملکی اہمیت لئے ہوئے تھا۔ ان کی سب سے اہم خدمت یہ تھی کہ انھوں نے جابجا خاموش دورہ کر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو سیاست کی طرف مائل کیا اور ایک سیاسی ادارہ کے قیام پر توجہ دلائی۔ یہ اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ وہ تنظیم بروئے کار آئی جس نے اسلامیانِ برصغیر کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور ان کی کوششیں ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے وقف ہو گئیں۔ وقار الملک اس تنظیم کے معتمد منتخب ہوئے۔ دوسرا اہم ترین ملی ادارہ علیگڈھ کالج تھا جو درحقیقت قوم کی ذہنی نشوونما اور ہمہ گیر ترقی کا منبع و مخرج تھا۔ قوم کے پُرزور اصرار پر انہوں نے اس کی معتمدی بھی قبول کر لی۔ اس طرح قوم کی پوری سیاسی معاشرتی اور علمی و ذہنی زندگی کا بھرپور دھارا انہی کے اختیار میں تھا۔ وہ قوم کے ہر نوع کے معاملات میں پورا پورا حصہ لیتے رہے۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی کا قیام، حادثۂ کانپور، تقسیم بنگال، ترکان احرار کی امداد وغیرہ وغیرہ۔ خواہ اس سلسلہ میں انگریزی حکام سے تصادم ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل اپنے یارانِ طریق سرسید اور محسن الملک کی طرح ان کی حیثیت بھی نقیبِ ملت کی ہو چکی تھی اور ان کا ہر اقدام قومی اہمیت لئے ہوئے تھا۔ یونیورسٹی یا سیاسیات کے سلسلہ میں اہل فرنگ سے جو چپقلشیں ہوئیں۔ اور سب سے پہلے انہی نے مسلمانوں کو اظہار وفا سے گریز کا سبق سکھلایا تھا۔ تو انہوں نے قدرتی طور پر وقار الملک کو بے حد ہر دلعزیز بنا دیا۔ یہ انہی کے دلیرانہ اقدام کا نتیجہ تھا کہ انگریزی اسٹاف سے علیگڈھ کالج کی آزادی کو تسلیم کروایا۔ رفتہ رفتہ انہی کی کوششوں کی بدولت کالج طبقۂ علماء میں بھی مقبول ہوا۔ جامعۂ ملیہ کے قیام کی تجویز جس نے بعد میں فی الحقیقت "جامعۂ ملیہ" کی صورت اختیار کی انہی کے ذہنِ رسا کا نتیجہ تھی۔ وہ ان صاحبِ نظر لوگوں میں سے تھے جنھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کا کوئی متحدہ پلیٹ فارم قائم کرنا مسلمانوں کے لئے مضر ثابت ہوگا۔ اسی لئے وہ مشترکہ انتخاب کے خلاف تھے۔ مختصر یہ کہ ان کی شخصیت محبوب ہوتے ہوئے نمائندہ حیثیت رکھتی تھی اور ان کی آواز قومی آواز ہی تصور کی جاتی تھی۔ اس لئے جب وہ ۷۶ سال کی عمر میں جاں بحق تسلیم ہوئے تو اس کو ایک قومی سانحہ قرار دیا گیا۔

ہر بڑی شخصیت اپنے عہد کے لئے دیدۂ بینا کی حیثیت رکھتی ہے۔ وقار الملک بھی اپنے عہد کے دیدۂ بینا تھے۔ انہوں نے اپنے دور کے ہنگاموں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور قومی زندگی کو ایک خاص نہج پر ڈالا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک زندہ انسان تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کی دشواریوں کا مقابلہ کیا اور ان مسئلوں کو حل کیا جن سے آنے والی نسلوں کی آزادی کا راستہ ہموار ہوا۔ وہ ایک مجاہد تھے۔ پُرخلوص، بے باک اور اس منزل کا نشانِ راہ جہاں تک ہم آج رسا ہوئے ہیں۔

گل شدہ شمعیں

ان متعدد زندۂ جاوید ہستیوں کی مثیل
جنہوں نے ہمیں آزادئی ملت و جمہور
کا راستہ دکھایا ۔

نواب وقارالملک مرحوم

شیخ سر عبدالقادر مرحوم

تحریک آزادی کے
مجاہد اعظم،
سلطان ٹیپو شہید،
کا نوحہ

ایک قلمی بیاض
کے صفحہ کا عکس۔
(شاعر کا نام تحقیق
نہیں ہو سکا)

بنگالہ کے زندۂ جاوید مجاہد

شریف المجاہد

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی

اس برصغیر میں مسلمانوں کی طرف سے حصولِ آزادی کی آخری کشمکش تو بیشک ہمارے ہی عہد میں ہوئی جو اپنے جلو میں پاکستان کی عظیم الشان اسلامی مملکت لائی، لیکن جذبۂ آزادی نے اس سے پہلے بھی بار بار اپنا سر بلند کیا اور ایسی کوششیں عمل میں آتی رہیں جنھوں نے اس نہ مٹنے والے جذبہ کو تازیانہ لگایا اور اسے کامیابی کی منزل کی طرف بڑھنے میں مدد دی۔ لہٰذا اس عظیم الشان کامیابی میں جو ہمارا مقصود و منتہیٰ تھی، ان تمام کوششوں کا حصہ مسلّم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸ ویں صدی عیسوی میں برصغیر کے مسلمان راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔ پھر بھی ان کے سینوں میں عشق کی آگ برابر شعلہ زن تھی۔ اور صرف اتنی ضرورت تھی کہ اس کو ہوا دے دی جائے۔ یہ فرض سید احمد شہید بریلویؒ (۱۷۸۶ - ۱۸۳۱ء) جیسے مجاہد کبیر نے انجام دیا۔ ان کی تحریک کو بالعموم وہابی تحریک قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ یہ مغالطہ صرف اس لئے پیدا ہوا کہ لوگوں نے اس اصلاحی تحریک کا دامن مصلحِ حجاز عبدالوہاب کی تحریک سے وابستہ کر دیا — بعد میں انگریز ان دونوں کا فرق جاننے کے باوجود مقامی تحریک کو وہابی تحریک ہی قرار دیتے رہے تاکہ لوگ اس سے بدظن ہو جائیں۔ اور وہ عوام کو اپنے ساتھ ملا کر "مجاہدین" کا قلع قمع کر دیں۔ یہ تحریکِ جہاد تمام تر اسلام کے احیاء اور اصلاح کی تحریک تھی اور اس میں بالالتزام یہ عقیدہ شامل تھا کہ جب تک فضا کفر و بدعت سے معمور ہو، ان دوگونہ مقاصد کا حصول ناممکن ہے۔ اس طرح اس تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ چونکہ سارا ملک سکھوں اور انگریزوں کے غلبہ سے دارالحرب بن چکا تھا، اس لئے سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ ملک کی فضا کو بے دینی اور ضلالت سے پاک کیا جائے۔ سید احمدؒ نے جہاد اور بغاوت میں یہ نازک فرق بتایا کہ جہاد صرف آزاد علاقہ ہی سے جاری کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے سرحد کو منتخب کیا جو اس وقت تک غیروں کے تسلط سے آزاد تھا۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ پہلے پنجاب کو سکھوں کے ہاتھ سے نجات دلوائی جائے اور اس کے باشندوں کو اپنی تحریک میں شامل کر کے بعد میں انگریزوں کے خلاف جہاد برپا کیا جائے۔ وہ انگریزی حکومت کو عظیم تر خطرہ تصور کرتے تھے۔ اسی لئے انگریزوں کی مخالفت ان کی تحریک جہاد کا شروع ہی سے مقصدِ اولیٰ قرار پایا۔

یہ تحریک ۱۸۲۰ء میں جاری ہوئی تھی لیکن بنگال جس نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بقول ہنٹر بعد میں ذہنی اور برطانیہ کے خلاف جارحانہ رنگ عطا کیا، اس سے اس وقت روشناس ہوا جب کہ سید احمدؒ ۱۸۲۰ء میں حج بیت اللہ سے پہلے یہاں تشریف لائے تھے۔ اُن کی آتشیں تقریروں نے تمام بنگال میں آگ لگا دی۔ اور لوگ جان و دل سے ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ حج کے بعد جب سید صاحبؒ پھر ۱۸۲۴ء میں کلکتہ تشریف لائے تو انہوں نے سکھوں کے خلاف سرحد میں معرکہ آرائی کے لئے بے شمار مجاہد بھرتی کئے۔ آخر کار ۱۸۲۶ء میں علم جہاد بلند کیا گیا اور سکھوں کے ساتھ کتنی ہی لڑائیاں لڑی گئیں۔ اسی دوران میں اسلامی جمہوریہ کے قیام کا اعلان ہوا جس کے خلیفہ سید احمدؒ قرار پائے لیکن افسوس! یہ پہلی جمہوریہ اور اس کا خلیفہ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کی فیصلہ کن لڑائی کی نذر ہو گئے!!

اسی سال تحریک کا دوسرا مرحلہ بھی شروع ہوا جب کہ مجاہدین نے انگریزی راج کو ملیامیٹ کرنے کا تہیّہ کیا تھا۔ اس جہاد کا آغاز انگریزی مملکت میں ہی تیتو میر عرف نثار خاں چاند پوری کے ہاتھوں ہوا جن کی ملاقات سید صاحبؒ سے مکۂ معظمہ میں ہوئی تھی اور وہ وہیں ان کے مرید خاص بن کر بنگال میں اُن کا دستِ راست اور تحریک جہاد کی روحِ رواں بن گیا تھا۔ اس نے اس جبر و تشدد سے بہت فائدہ اُٹھایا جس کا تختۂ مشق نئے ہندو زمینداروں نے ان کے

بیرونوں کو بنایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۱-۱۸۳۰ء میں کسانوں نے ایک زبردست بغاوت برپا کردی۔ تیتومیر انگریزوں کی فوجی طاقت کا برابر مقابلہ کرتا رہا اور کلکتہ کے شمال اور مشرق میں واقع اضلاع اس کے حلقۂ اثر میں شامل ہوگئے۔ جن کے ساتھ ۲۴ پرگنے، اور ندیا اور فرید پور کے اضلاع بھی شریک تھے۔ تیتومیر نے انگریزی راج کے خاتمہ اور اسلامی حکومت کے قیام کا اعلان کردیا۔ وہ اور اس کے ہمراہی آخری دم تک بڑی بہادری سے لڑتے رہے اور داد شجاعت دیتے ہوئے میدانِ جنگ میں کام آئے۔ اس طرح تحریکِ جہاد نے نہ صرف بنگال کے ستم رسیدہ کسانوں میں آزادی کا ولولہ پیدا کیا بلکہ تحریکِ حریت کے وہ اولیں انقلابی اور جانباز بھی پیدا کئے جنہیں سیاسی وجوہ کی بنا پر "کالے پانی" کی سزا دی گئی۔

اسی زمانہ میں یہاں ایک اور انقلابی تحریک یعنی "فرائضی تحریک" بھی جاری تھی جس کی بنیاد حاجی شریعت اللہ نے ۱۸۰۴ء میں رکھی تھی۔ گو اس کا مقصد اصلاح اور احیائے دین تھا، لیکن اس کا نتیجہ بالواسطہ یا بلاواسطہ یہی تھا کہ لوگ یا تو جہاد برپا کریں یا ہجرت کر جائیں۔ شریعت اللہ پہلا شخص تھا جس نے برطانوی علاقہ کو دارالحرب قرار دیا۔ ۱۸۳۵ء میں اس کے بیٹے محمد محسن عرف دادو میاں نے کسانوں کو ظلم و ستم ڈھانے والے ہندو زمینداروں اور نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں کے خلاف برانگیختہ کیا۔ اس نے مختلف اضلاع میں تحریک کے لئے چندہ وغیرہ جمع کرنے کے لئے خلفاء مقرر کئے، اپنی عدالتیں بنائیں اور لوگوں کو برطانوی عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے کی ترغیب دلائی۔ ۱۸۴۰ء تک کلکتہ کے مشرق میں واقع اضلاع کے ہزاروں لوگ فرائضی تحریک میں شامل ہوگئے۔ اور ۱۸۴۳ء تک یہ فرقہ اتنا خطرناک ہوچکا تھا کہ حکومت اس کے متعلق خصوصی تحقیقات کرنے پر مجبور ہوگئی۔ یہ تحریک روز بروز زیادہ سیاسی رنگ اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ اس کا دھارا تحریکِ مجاہدین سے مل گیا۔ اور دونوں کے حامی ہر کہیں اکٹھے ہی سینہ سپر رہے۔ اس تحریک کو سید احمدؒ کی وفات سے سخت زک پہنچی اور گوناگوں دشواریوں کے باعث باقی ماندہ مجاہدین نے یا تو سندھ کے اُس پار پہاڑی علاقہ میں ستانہ کے مقام پر مستقر بنایا تاکہ وہ پھر قوت پیدا کرکے پنجاب اور جموں پر ہلّے بولتے رہیں یا "بازگشت و مراجعت" کے اصول پر کاربند ہوگئے۔ اس دوسری جماعت نے ملک میں ایک وسیع نظام کا جال پھیلایا تاکہ یہ سرحدی مستقر کے لئے بے اندازہ سامان اور سپاہ مہیا کرے جس سے اولاً سکھوں اور ثانیاً انگریزوں کے خلاف بے پناہ جنگ جاری رکھی جاسکے۔ اس جماعت نے اپنا مرکز پٹنہ میں قائم کیا، سارے ملک میں اپنے سفیر بھیجے اور ایسے احیائے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کی نظیر میں کوئی مثال دکھائی نہیں دیتی۔ آزادیٔ وطن اس مذہبی اصلاح و تجدید کا لازمی جزو تھی۔

اس حصول کے سلسلہ میں بنگال پر خاص توجہ دی گئی۔ کیونکہ ایک تو بندوبستِ دوامی (۱۷۹۳ء) کے باعث مسلمان کسان ہندو زمینداروں کے جوئے تلے کراہ رہے تھے۔ اور جو اشراف باقی رہ گئے تھے وہ بھی بدحالی کے باعث تلملا رہے تھے۔ تحریک کے ایک داعی، مولوی عنایت علی پورے چار سال بنگال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دورہ کرکر کے سامان اور سپاہی جمع کرتے رہے۔ اسی طرح اور بھی کئی پُرجوش داعی یہی فرض انجام دیتے رہے مجسٹریٹ کے الفاظ میں "یہ لوگ ہمارے سب سے گنجان آباد اضلاع کے ہر ہر گاؤں میں کھلم کھلا بغاوت کی ترغیب دلاتے تھے اور مسلمانوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے اور سب کچھ عین ہماری آنکھوں کے سامنے!"

اپنی مہم کو بعید سے بعید گاؤں تک پہنچانے کے لئے حامیانِ تحریک نے بے شمار رسالے وغیرہ بھی تیار کئے، جن میں سب سے زیادہ زور جہاد پر تھا۔ ان کے گیتوں میں ایک ہی روح کارفرما تھی اور یہ لوگ آئے دن انگریزی علاقہ میں چلتے چلتے راستہ بھر گیت گاتے سرحد تک پہنچ جاتے تھے۔ جب کابل کی جنگ چھڑی تو انہوں نے جھٹ افغانوں کی مدد کے لئے ایک زبردست فوج بھیجی جس کے ایک ہزار سپاہی مرتے دم تک فریضۂ جہاد کی ادائگی پر کمربستہ رہے۔ انہوں نے چوتھی نیٹو انفنٹری راولپنڈی میں بھی بغاوت پھیلانے کی کوشش کی۔ جو قبل از وقت راز فاش ہوجانے سے ناکام رہی۔ ایسی ہی اور ناکامیوں کے باوجود مجاہدین نے سرحدی قبائل کو برابر انگریزوں کے خلاف بھڑکائے رکھا جس کی وجہ سے حکومت کو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک ۳۶ علیحدہ مہموں پر کتنی ہی فوجیں بھیجنی پڑیں۔ جب سر سڈنی کاٹن نے ان کو ۱۸۵۸ء میں ستانہ سے نکال دیا تو انہوں نے ذرا بھی حوصلہ نہ ہارا اور منگل تھانہ میں نیا کیمپ بنالیا۔ اسی سلسلہ مہابن کے شمالی ڈھلوانوں پر ملکہ میں ایک نئی آبادی قائم کرلی۔ ۱۸۶۰ء میں وہ پھر ستانہ لوٹ آئے اور ایک مضبوط قلعہ بنالیا۔ اس دوران میں انگریزوں نے ناکہ بندی کے علاوہ ہر ممکن تدبیر کی کہ قبائل مجاہدین کو اپنے علاقہ سے نکال دیں لیکن بے سود۔ مجاہدین نے پھر پرانی چوٹ سے سنبھل کر اور بھی زور شور سے جنگ شروع کردی۔ ۶۳-۱۸۶۲ء میں انہوں نے پھر توپی کی برطانوی چوکی پر زناٹے سے حملہ کیا اور انگریزی فوجیں بُری طرح بدحواس ہوکر بھاگیں

یہ وہ قرار ہے جس کو انگریز مورخوں نے "شرمناک" قرار دیا ہے۔ اس کے بعد مجاہدین نے سندھ کے کنارے مورچہ قائم کرلیا اور فوجی ران کی چوٹی کے لئے مسلسل پریشانی کا باعث بن گئے۔ وہ سنگلائی وادی پر بھی حملہ کرتے رہے جہاں انگریزوں کے حلیف نواب امب کی حکومت تھی۔ انہی کارروائیوں کی وجہ سے سر نیول چیمبرلین کو ۱۸۶۳ء میں امبیلا کی مشہور مہم اختیار کرنی پڑی تھی۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ اس "مستقل" فساد کی جڑ یعنی بقول ہنٹر "ہندوستانی شوریدہ پشتوں" کا قلع قمع کر دیا جائے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ میدان ان کے ہاتھ رہے گا۔ لیکن مقابلہ بے پناہ سخت ثابت ہوا۔ تقریباً دو ماہ مجاہدین کا قبائلی اقدام انگریزوں کی کیل کانٹے سے لیس زبردست فوج کی مورچال، جنگی تدبیروں اور بے پناہ حملوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ انگریزوں کو اس خونیں کش مکش میں خفت ہی اٹھانی پڑی۔ جب فوجی کارروائی سے مقصد حاصل نہ ہوا تو "ڈاکٹر محمود حسین کے الفاظ میں" انگریزوں نے حسب معمول حکمتِ عملی، سیاسی ریشہ دوانی اور بے دریغ روپیہ لٹا کر حاصل کرلیا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدین اور ان کی بستی کا آلکا کو بالکل تاراج کر دیا گیا۔ تاہم انگریزوں کو بھی یہ مہم بہت مہنگی پڑی۔ اور ان کے جان و مال کا بے اندازہ نقصان ہوا۔

اس کے باوجود انگریز مجاہدین کا پوری طرح خاتمہ نہ کرسکے۔ بچے کھچے مجاہد پھر چار برس کے اندر اندر جمع ہو کر میدان میں اتر آئے۔ اور انگریزوں کو پھر جنرل وائیلڈ کی کمان میں ایک مہم اختیار کرنی پڑی۔ یہ بھی "ہندوستانی شوریدہ پشتوں" کا قلع قمع کرنے اور ان کو ہتھیار ڈال کر اپنے وطن ہندوستان واپس آنے پر مجبور کئے بغیر ہی ختم ہو گئی۔ ۱۸۷۱ء میں مجاہدین پر مجموعی رائے ظاہر کرتے ہوئے ہنٹر نے لکھا ہے: "یہ لوگ سرحد میں مذہبی تعصب کی بنا پر قبائل کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے تین بار قبائل کی بڑے بڑے وسیع پیمانہ پر جتھہ بندی کی ہے اور انگریزوں کو بڑی بھاری اور قیمتی جنگوں میں مبتلا کیا ہے۔ ہماری ہر حکومت نے انہیں ہمارے اقتدار کے لئے مستقل خطرہ قرار دیا ہے۔ پھر بھی ہم ان کا کھوج نہیں لگا سکے۔ وہ ایک ایسا مرکز نقل ہیں جس کی طرف سرحد کے اس پار ہماری سرکش رعایا اور دشمنوں کی نگاہیں برابر اٹھتی رہتی ہیں۔ ہمیں غداروں سے اتنا خطرہ نہیں بلکہ اندرون ملک ہی میں بغاوت کوش لوگوں اور باہر سرحد میں توہم پرست قبائل کا خطرہ ہے جن سے "شوریدہ پشتوں" نے گٹھ جوڑ کرکے ہمارے خلاف ایک مذہبی جنگ جاری کر رکھی ہے۔ ہم سرحد کے توہم پرست قبائل کو ناکہ بندی، حکمت عملی، جوڑ توڑ وغیرہ سے قابو میں لاسکتے ہیں مگر اپنی ہی مملکت میں بغاوت پسند لوگوں کا کیسے سدِباب کریں؟"

غرض مجاہدین پر محاصروں، سیاسی سازشوں، حکمت و تدبیر اور روپیہ پانی کی طرح بہا دینے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر انگریزوں کی دانش و حکمت نے اس کا علاج بھی تلاش کر ہی لیا۔ ریاستی مقدمات۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک کے زمانہ میں ایسے پانچ مقدمے انبالہ، پٹنہ، کلکتہ، مالدہ اور دیگر مقامات میں دائر ہوئے۔ جو "وہابی مقدمات" کے نام سے موسوم ہیں۔ اور دس سال جاری رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال، بہار، یوپی اور دیگر علاقوں میں تحریکِ جہاد کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔

اسلامیانِ بنگال نے اس تحریک میں جو حصہ لیا وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ جیسا کہ ہنٹر نے کہا ہے کہ سرحدی لشکر کے لئے مجاہد برابر بنگال ہی سے حاصل کئے گئے۔ ان کا حوصلہ و ہمت قابلِ داد ہے۔ کیونکہ یہ بنگال سے سرحد تک کا فاصلہ پا پیادہ طے کرتے تھے۔ اور ایسی دلیری و بے جگری کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے تھے جس طرح افغان، بلکہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر کیونکہ ان میں جہاد فی سبیل اللہ اور خدمتِ اسلام کا جذبہ کہیں زیادہ شدید تھا۔ یہ سر بکف اور اولوالعزم مجاہد سرحد کے محاربات میں ہزاروں کی تعداد میں جاں بحق تسلیم ہوئے اور ہزاروں ستانہ کے مستقر تک طول طویل سفر کے دوران ہلاک ہو گئے۔

جہاں شوقِ شہادت ہو وہاں نظم و نسق اور ظاہری سر و سامان کی گتھیاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء۔ ۷۱ء میں جو مقدمات چلائے گئے، اُن کی کارروائیوں اور فرنٹیئر کیمپ اور جوعمی نیشو انفرڈی کی باہمی خط و کتابت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجاہدین اور اسلحہ کے بنگال سے مستقرِ انقلاب تک پہنچانے کا باقاعدہ بندوبست موجود تھا۔

تحریکِ جہاد ختم ہو گئی لیکن اس سے دلچسپی مدتوں تک باقی رہی۔ ہنٹر کا بیان ہے کہ ۱۸۶۸ء تک کلکتہ محمڈن کالج میں ان کی جہاد سے متعلق تصنیف کے ابواب بڑے شوق سے پڑھے جاتے رہے، اور امتحانات میں "نظریۂ جہاد" پر سوالات پوچھے جاتے تھے۔ اسی کالج ہی میں ایک نامور عالم کا ضبط شدہ کتب خانہ بھی محفوظ کر دیا گیا تھا جسے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں شرکت کی بنا پر "کالے پانی" کی سزا دی گئی تھی۔ اسی کالج کے احاطے میں ایک "فرائضی" مسجد بھی تھی جو ۱۸۶۰ء تک "فتنہ و فساد" کا مرکز بنی رہی۔ علاوہ بریں جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ بنگال کا شمار ان علاقوں میں ہے جہاں سب سے پہلے "دارالحرب" کا فتویٰ جاری کیا گیا تھا اور جہاں مجاہدین نے سرحد کے علاوہ انگریزوں کے خلاف بھی عَلَمِ جہاد بلند کیا تھا۔ ہنٹر نے ٹھیک کہا ہے: "اس میں کوئی تعجب نہیں کہ بنگال کے تیز ذہن نے بالآخر اس تحریک کو اپنا موجودہ ولولہ و آہنگ عطا کیا۔"

غزل

فراقؔ گورکھپوری

نگاہوں میں وہ حل کئی مسائل حیات کے
وہ گیسوؤں میں پیچ و خم کئی معاملات کے

یہ شارحینِ دیں، شکار ہیں توہمات کے
چھڑے ہوئے ہیں مرحلے ممات کے، حیات کے

ہماری انگلیوں میں دھڑکنیں ہیں سازِ دہر کی
ہم اہلِ راز پارکھی ہیں نبضِ کائنات کے

یہ قشقہ سُرخ سُرخ رو کشِ چراغِ طُور ہے
جبینِ کفر سے عیاں ہیں جلوے دینیات کے

نہ ہے وہ محفلِ طرب کہ رات بھی تھی بات بھی
سحر ہوئی تو تذکرے نہ رات کے نہ بات کے

معلّموں کے بس میں ہیں جو نہ تھے مجھے سکھا دیئے
سکوتِ سرمدی نے وہ نکات شعریات کے

کہو یہ شیخ عصر سے کہ دورِ کُفر آ گیا
گھروندے ٹوٹتے چلے ترے تصوّرات کے

یہ کفر ہے وہ دین ہے، یہ دوزخی وہ جنّتی
اُصول ہیں اُصول ہیں اُصول سامیات کے

بُھلا نہ دے بُھلا نہ دے نتیجے میری فکر کے
تلف نہ کر تلف نہ کر یہ نسخے ہیں حیات کے

نظر جو صاف آ رہے ہیں خانہ ہائے بے خطر
وہی بساطِ گنجفہ میں ہیں مقام مات کے

ہزاروں شاہکار پائیں گے، تلاش شرط ہے
قدیم فکریات میں، جدید فکریات کے

نجات کے لئے نہ انتظارِ مرگ و حشر کر
کہ قید و بندِ زندگی میں راز ہیں نجات کے

یہ صف بہ صف مناظرِ زمانہ دیکھ غور سے
لگے ہوئے ہیں صاف آئینے تحیّرات کے

کہاں سے ہاتھ لائیے انھیں اُٹھانے کے لئے
حجاب در حجاب پردے ہیں تعینات کے

یہ درسیات مل سکیں گے کب کسی کتاب میں
ان انکھڑیوں سے سیکھ لے رموز کفریات کے

انہی میں اپنے خط و خال دیکھتی ہے زندگی
یہ میری فکریات ہیں کہ آئینے حیات کے

تمام عمر عشق کا جواز ڈھونڈتے رہے
یہ اہلِ رسم ہو رہے انہی تکلفات کے

نگاہِ شوق کی یہ محویت، یہ عالمِ سماع
خطوطِ جسم دیتے ہیں سبق جمالیات کے

قلم کی چند جنبشوں سے میں نے اور کیا کیا
یہی کہ کھل گئے ہیں کچھ نکات نفسیات کے

نمازِ شاعری کو سیکھ امامِ فن فراقؔ سے
رکوع اور سجود زیر و بم ہیں صوتیات کے

فراقؔ گوش و چشم محوِ خواب ہوتے جاتے ہیں
سُنا رہی ہے زندگی فسانے کتنی رات کے

غزلیں

عابد علی عابد

ہائے اس جانِ تمنا سے ملاقات کا دن
سحر و افسانہ و افسونِ و طلسمات کا دن
چشمِ جادو کی جنوں خیز اشارات کی شام
لبِ لعلیں کی فسوں ریز حکایات کا دن
وہ لگاوٹ کے سلام اور محبت کے پیام
وہ کرامات کا وقت اور عنایات کا دن
وہ تبسم کی نزاکت وہ تکلم کا فسوں
وہ اشارات کا عالم وہ کنایات کا دن
ہوسِ لمس سے مخمور وہ آنکھیں سرمست
ساتگین و قدح و ساغر و کاسات کا دن
حسن کی جلوہ گری، عشق کی آشفتہ سری
عشق اور حسن کے احوال و مقامات کا دن
وہ تماشائے طلسمات نقابِ ہفتم
وہ سلومی کی طرح رفعِ حجابات کا دن
وہ طلوعِ سحرِ وصل کے اسرار و رموز
وہ نویدِ شبِ امید کی غایات کا دن
وہ مری گود میں پھیلی ہوئی چاندی لرزاں
وہ تب و تابِ تمنا کی رعایات کا دن
وہ شبِ زلفِ سیہ تاب وہ صبحِ رخسار
وہ مرے ذوقِ تماشا کی مدارات کا دن
اس کی تابانیٔ تن جیسے ہو کندن روشن
یاد ہے شعلۂ دیدار کی اس رات کا دن
سرِ محبوب مرے دوش پہ با دیدۂ نم
بھولتا ہی نہیں بھیگی ہوئی برسات کا دن

کوئی سمجھائے مجھے حسن کی چالیں عابدؔ
جیت کی رات ہوئی میرے لئے مات کا دن

روش صدیقی

روشؔ یہ شکوۂ حسنِ رمیدہ خو کیا ہے
رمیدگی کے سوا رازِ رنگ و بو کیا ہے

یہاں تو غازۂ روئے حیات ہے درکار
یہ آنسوؤں میں لرزتا ہوا لہو کیا ہے

اگر نہیں ہے غمِ تشنگی کی رسوائی
تو پھر یہ گردشِ پیمانہ و سبو کیا ہے

فریبِ منزلِ ترک و طلب سمجھتا ہوں
یہ کیا کہوں کہ تقاضائے جستجو کیا ہے

چلی ہے مصلحتِ وقت کے قدم چھو کر
ہوائے دامنِ ساحل کی آبرو کیا ہے

سکوتِ تمکنت نازِ کچھ تو ہو ارشاد
دلِ روشؔ میں یہ طوفانِ آرزو کیا ہے

★

غزل

ماہر القادری

دل امیدوں سے پھر شادماں ہے
اے غمِ بیکسی! تو کہاں ہے؟

ہجر میں کوئی کیوں سرگراں ہے
یہ تو اک منزلِ درمیاں ہے

اُس جبیں پر پسینہ کے قطرے
جیسے بھیگی ہوئی کہکشاں ہے

ہر قدم ایک تازہ قیامت
ہر زمیں پر نیا آسماں ہے

آتشِ گل کو اب کے ہُوا کیا؟
گلستاں میں دھواں ہی دھواں ہے

تم جفاؤں پہ نادم نہ ہونا
یہ حسابِ دلِ دوستاں ہے

چوٹ کھائے ہوئے دل کی لَے میں
نغمہ کم ہے، زیادہ فغاں ہے

قربِ منزل کا دھوکا نہ کھانا
زندگی منزلِ بے نشاں ہے

عاشقی اک مصیبت ہے ماہرؔ
دل نگاہوں سے بھی بدگماں ہے

جلیل قدوائی

نہ حاصل ہے غم سے نہ کچھ برہمی سے
جو ملنا تھا بس مل چکا زندگی سے

کبھی غم میں بھی اک طرح کی خوشی تھی
دہلتا ہے جی اب تو لیکن خوشی سے

جو ہو تجھ کو جینا تو ہونٹ اپنے سینا
یہ کہتا تھا اک پھول کل اک کلی سے

یہی سوزِ دل ہے مرا سازِ دل بھی
کہ ملتی ہے کل کچھ اسی بے کلی سے

طراوت تو ہوتی ہے گل میں بھی لیکن
اسے کیا ہے نسبت تری تازگی سے

چمک اُن کی آنکھوں کی ملتی ہے کتنی
سرِ شام تاروں کی تابندگی سے

یہ ہے جذبِ الفت تو میں باز آیا
وہ آزردہ ہیں میری آزردگی سے

مری جان کو ہے یہ کس نے ستایا
وہ کہتے ہیں مجھ سے یہ کس سادگی سے

جلیلؔ اپنے جینے کا انداز یہ ہے
نہ خوش ہیں کسی سے نہ برہم کسی سے!

غزل

شانُ الحق حقی

یوں کہاں ہوتی ہے اک موجِ نفس میں یہ کھٹک — اے خوشا حرف کہ پہنچے لبِ اعجاز تلک

بن گئی یونہی سخن میں تو ذرا نوک پلک — میرے لہجے میں کہاں ہے مرے سینے کی کھٹک

دل کی بخشش سے ہیں کیا کیا گلِ خوش رنگ نصیب — میرے دامن پہ بھی ہے کچھ ترے آنچل کی جھلک

سامنے رہتی ہے یوں اک تری نازک سی شبیہ — لوٹ جاتی ہے اگر آنکھ بھی جاتی ہے جھپک

نام نے بھی ترے دکھلائے کرشمے کیا کیا — منہ سے نکلے تو مہک، ہاتھ سے لکھئے تو دمک

فائدہ بات بنانے سے کہ آخر دل پر — تیری حجت نہ چلے گی ترا دعویٰ بیشک

یوں دعا مانگ کے شرمندہ ہوں دل میں جیسے — تیری خاطر سے درِ غیر پہ دی ہے دستک

اپنی یادوں پہ بھی اب اس نے لگا دی بندش — نام لینے سے خفا، ذکر سے ہوتی ہے ہتک

بے مزا کر کے رہی دل کو وہ پھیکی سی ہنسی — لب کو چھو بھی نہ گیا چہرۂ زیبا کا نمک

دیکھے محفل میں تری جنبشِ لب کے انداز — وہ بھی کیا خوب سخن تھے جو نہ پہنچے ہم تک

وہ ترے دل کی جلن ہو کہ مرے دل کی چبھن — سب مٹا دیتی ہے اک آن میں ساغر کی کھنک

غارتِ عشق میں تخلیق کے پہلو نکلے — خوب کاغذ پہ گئی نقش بنا کر دیمک

ذکرِ خوباں ہی سے ہوتا ہے سرِ حرف آغاز — آ پہنچتا ہے جو غفلت میں بیانِ دل تک

خود ہی دامن پہ چمک اٹھتا ہے گوہر کوئی
نگہِ عشق کو آتی ہے کہاں چھان پھٹک

★

غزل

رضا ہمدانی

ہے خاک بسر کوئی، کوئی آبلہ پا ہے
جو کچھ بھی کرو عشق و محبت میں بجا ہے

ہونٹوں پہ ہنسی سینوں میں کہرام بپا ہے
دیوانوں نے جینے کا چلن سیکھ لیا ہے

یہ کِس نے ڈبویا گل و لالہ کا سفینہ
طوفانِ خزاں ہے کہ کوئی دستِ صبا ہے

اب دستِ جنوں بھی جو سمٹ جائے عجب کیا
دیوانہ کوئی لے کے ترا نام اٹھا ہے

میخانے میں ملتا ہے سراغ امن و سکوں کا
ورنہ حرم و دیر میں ہنگامہ بپا ہے

اک بار جو ٹوٹے تو کبھی جڑ نہیں سکتا
آئینہ نہیں دل مگر آئینہ نما ہے!

اپنوں کو کبھی موت جدا کر نہیں سکتی
جو لوٹ گیا ہاتھ وہ سینے پہ دھرا ہے

انداز کچھ ایسا ہے نیا اپنی غزل کا
سنتا ہے جو بے ساختہ کہتا ہے، رضا ہے

عبداللہ خاور

ابھرے نغمہ، ڈوبے نغمہ، چاند جھکولے کھائے
دور کہیں اک ہجر کا مارا، درد کی لے پر گائے!

سب کہتے ہیں رات ہے، لیکن رات ہے اک ویرانہ
جس کی پہنائی میں تیری حسرت بھی سو جائے!

پہلو پہلو نشترِ حرماں، کروٹ کروٹ کانٹے
لمس مگر آغوشِ صبا کا، تیری یاد دلائے!

تیری دستک دل کے دریچوں پر ابھرے اور ڈوبے
دیپ جلے جاتا ہے لیکن دیپ کی لو تھرّائے!

غم نے کاجل پاڑ کے دل کی لو پہنائی راتیں
لیکن تیری شوخ نگاہی، دور کہیں مسکائے!

چاند کی حد تک کیا پہنچے گی، ہائے چکور کی حسرت
منزل دور ہے، لیکن پاگل راہی بڑھتا جائے

کاہکشاں نے دام بچھایا، ذوقِ نظر الجھایا
دل کے نہاں خانوں سے تیری یاد کے ابھرے سائے!

آج افق پر ذہن کے گاہے برق ہے گہہ اندھیارا
بھول چکا تھا جو افسانے، بادل بن کر چھائے!

ہر تارا ہے اشک بہ مژگاں، اُڑے قمر محزوں سا
ایک ورق اور زیست نے الٹا، ڈوبے شب کے سائے

جلوۂ پنہاں، تیرے رم سے، تیرا خاور ہارا
کب تک تنہائی کی لے پر تارِ نفس تھرّائے!

غزل

طاہرہ کاظمی

فضا کی اداسی میں چشم تمنا شب غم سے مانوس تر ہو گئی ہے
کہیں مضمحل ہیں امیدوں کے سائے کہیں دشت میں آرزو سو گئی ہے

بہت تیز ہیں قافلے زندگی کے، کوئی مڑ کے دیکھے کسی کو تو کیوں کر
ابھرتا نہیں کوئی بھی نقشِ روشن، صدائے جرس رات میں کھو گئی ہے

ہیں نوخیز غنچوں کے دامن میں آنسو، فریب تمنا نے کیا گل کھلایا
یہ شبنم تھی جو پردۂ شب میں چھپ چھپ خزاں کے اشاروں پہ خوں رو گئی ہے

فریبِ گلستاں میں آجانے والو، نشیبِ گلستاں سے آگاہ رہنا
جفا کیش صیاد کی چیرہ دستی گلستاں میں کچھ خار بھی بو گئی ہے

سکھایا مجھے زندگی کا قرینہ، امیدوں کا مسکن یقیں کا خزینہ
تری یاد اتری ہے زینہ بہ زینہ تو ظلمات میں روشنی ہو گئی ہے

وہ اس سمت اک سحرِ آگیں خموشی، دلِ منتظر کو وہی ارمغاں ہے
نہ گونجا ادھر کوئی نغمہ تو کیا غم، وہاں تک ہماری صدا تو گئی ہے

★

قمر جمیل

ابر آئے ہیں یوں بہار فشاں
حسرتیں ناچتی ہیں شعلہ بجاں
ورقِ گل ہے سادہ و رنگیں
پھر بھی اندازِ دستِ ناز کہاں
دور تک تیری یاد کے سائے
یہ چمن یہ خنک ہوا یہ سماں
کچھ طبیعت ہے یوں بھی مائلِ غم
اور تنہائی کہہ رہی ہے کہاں
تجھ میں ہے بند تیری ویرانی
کوئی زنجیر ہے کہ سایۂ جاں
دُردِ صہبا ہے اے غم دنیا
کتنی کم، کتنی تیز، کتنی گراں
کس تعلق سے تجھ کو دیکھتے ہیں
ہم کہ ہیں پائمالِ عمرِ رواں
ہم نے دیکھا جمیل کیا کیا کچھ
شوق کی کیفیت میں رقص کناں

بقلم خود

ابوالاثر حفیظ

میں ہوں خالص پنجابی اور پنجابی ہونے سے شرمندہ بھی نہیں۔ امّاں، ابّا اور خاندان کے کسی رشتے سے بھی مجھے اہلِ زبان ہونے کا فخر حاصل نہیں ہے۔ ولادت کا شرف بھی اس زمانے میں پایا جب اُردو میرے ہاں ابھی میری طرح طفلی کی حالت میں تھی۔ آج کون ہے جو پچاس پچپن برس پیشتر کے پنجاب اور پنجاب کے ایک دیہاتی قصبہ جالندھر کے معاشرے کا اندازہ کر سکے جہاں پنجابیوں کے لئے اس زبان میں کسی شاعرانہ فضا، زباندانوں یا اہلِ زبان سے اصلاح لئے بغیر شعر کہنا ہنوز دلّی دُور کا معاملہ تھا۔ اگرچہ فارسی کی جگہ اُونچے درجوں کے لئے انگریزی اور نچلے درجوں کے لئے اردو کو دفتری زبان قرار دیا جا چکا تھا۔ اگرچہ سرکاری مدارس میں زباندانی کی نصابی کتابیں رائج کی جا چکی تھی۔ اگرچہ لاہور میں اُردو کا چرچا ترقی پر تھا لیکن میری بستی میں اس نئے سُورج کی کرنیں صرف کسی خاص اُونچی ممٹی پر ہی چمکی ہوں گی۔ عام مسلمان۔ ہندو۔ سکھ عیسائی، چوہڑے، چمار، بھنگی جو مذہبی طور پر ایک دوسرے سے الگ لیکن معاشرتی بُنت میں ایک دوسرے میں بنے اور گتھے ہوئے رہتے سہتے تھے، سب پنجابی ہی بولتے اور پنجابی ہی گیت گاتے تھے۔

یہ دور تھا جب مجھ پر اُردو کا پہلا دورہ پڑا۔ میرا مبلغ زباندانی اردو نصاب کی پہلی دوسری کتاب کی نثر" ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ حقہ پی رہا ہے" اور " مولوی صاحب کا گھوڑا" "پنڈت جی کی بہلی" تک اور نظم ؎ "یہ کہتی اُڑی پیڑ سے فاختہ ٭ اری چیونٹی مرحبا مرحبا" یا ع " شیر آیا شیر آیا دوڑنا" تک محدود تھی۔

میں سات برس کا تھا۔ اُردو شعر کی رنگا رنگی میرے کانوں تک ابھی صرف اس قدر آ سکی تھی کہ مدرسہ آتے جاتے ایک بازار سے لازماً گزرتے ہوئے مہین مردوں میں ایسے بول سننے پڑتے تھے: " آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی ــــ نکلیں ہمارے دل کے بھی ارماں کبھی کبھی" اور ع "یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی" اور ع " نہ جا غیر کے گھر زمانہ بُرا ہے"

ہمارے شہر میں آریہ سماج والے نگر کیرتن کیا کرتے تھے۔ ویاکھیان دیتی ہوئی دوسرے مذاہب کا کھنڈن کرتی ہوئی ہندی پنجابی بھجنوں اور گیتوں کے ساتھ ساتھ بزبان اردو بھی کچھ ملاحیان سناتی گاتی بجاتی ٹولیاں بازاروں میں سے گزرتیں۔ مجھے اب تک ایک بول خدا جانے کیوں یاد ہے جسے میں نے ایک دن منڈے ہوئے سر کے پیچھے اوپر سے نیچے کو لٹکی ہوئی چٹیا اور گھٹی ہوئی ٹھوڑی پر جھکی ہوئی " پاجامہ نما" " مونچھوں" والے بھجنگ سے سنا تھا ؎

گردکل سے جب برہم چاری آئیں گے مکّے میں جا کے آریہ مندر بنائیں گے

مسلمان میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ بزرگ حصولِ ثواب اور بچے شیرینی وصول کرنے، اودھم مچانے اور گھرکے جانے کے لئے موجود رہا کرتے۔ عربی۔ فارسی۔ پنجابی کے ساتھ اُردو نعت خوانی بھی شروع ہو گئی تھی۔ ان نعتوں کے چند مصرعے مجھے یاد ہیں۔ " یہ امت تمہیں بخشوانی پڑے گی" اور ع " احد سے ہو گیا احمد جو باندھا میم کا پٹکا" اور ع " محمد سرِ وحدت ہے کوئی رمز اس کا کیا جانے" اور ع " نوح کا بیڑا پار لگایا کھیون ہار محمد نے" یا مشہور مناجات " تیری شان ہے اکبری سروری ! مری بار کیوں دیر اتنی کری"

باتیں میری سمجھ سے بلند تھیں۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے نصاب کی نظمیں یا دوسرے موزوں بول جو سمجھ میں آئے بغیر کانوں کو بھلے لگتے ہیں اُن کو مجھ ایسے انسان ہی "گھڑتے" ہیں۔ یہ بھید مجھ پر اچانک کھلا۔ اس طرح کہ ایک دن میں چند ہمجولی لڑکوں کے ساتھ گیند بلّا کھیل کر گھر پلٹ رہا تھا۔ سرِ راہ ایک حویلی کے صحن میں بہت سے لوگ جمع پائے۔ شور سُن کر ہم بھی جا گھسے۔ محفل کے درمیان ایک مردِ معقول " کریما بہ بخشا" طرز کی بولی میں (جو مجھے مسجد میں رٹائی جا چکی تھی) ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سنا رہا تھا۔ سننے والے واہ بھئی واہ۔ سبحان اللہ۔ خوش گفتی۔ دُرسفتی کہتے تھے۔ سر ہلاتے زانوؤں پر ہاتھ مارتے اور لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ بے اختیار ہنسی چھوٹی۔ میں اور میرے ساتھی بیچ میدان کود کر وہی حرکتیں کرنے لگے جو دوسرے بڑے بوڑھے کر رہے تھے۔ لیکن فوراً "چپتیائے" اور "دھکیائے"

گئے۔ تھپڑ سے میری بکھیر پھوٹ گئی۔ مگر اس پٹائی کے باوجود ہم اپنے گھروں تک "کرسچنی"۔ "ملسیتی" کی مہارانی سے باز نہ آئے۔ گھر پر والد نے سوجا ہوا منہ دیکھ کر چہرہ غصہ کیا ہوتا لیکن دادا آڑے آ گئے اور دادا ہی کی تقریر سے پتہ چلا کہ وہ "کریما بہ بخشا" کی بولی بولنے والا فارسی کا ایک بڑا شاعر ہے۔ جالندھر ہی کا رہنے والا ہے۔ ہمارے دوست شیخ سکندر بخش کا لڑکا ہے۔ بچپن میں سب اسے مست کہتے تھے۔ تکیں جوڑا کرتا تھا۔ اب دیوان حافظ کی ٹکر کا ہے۔ ماں باپ نے غلام قادر نام رکھا تھا۔ گرامی خود بن گیا ہے۔ تمہارے باپ کا ہم مسجد تھا۔ اب دکن کے بادشاہ کے دربار میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی جالندھر آتا ہے۔ بے فکرے وکیل وکلا اور فارسی کے عالم علما محفل جماتے ہیں۔ اس کی فارسی سُن کر واہ واہ کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی تکیں جوڑنے لگے ہیں۔ مگر تو بہ جی۔ "کہاں راجہ بھوج اور کہاں کنگلا تیلی"۔ (دادا نے لمبی گفتگو خالص پنجابی میں فرمائی تھی جس کا بھونڈا خلاصہ میں نے اُردو میں دے دیا ہے)۔

تسندر ہے کہ یہ عرفان یا (گیان) جو مجھے سنہ ۱۹۰۷ء میں اپنی عمر کے ساتویں برس کسی پیڑ کے تلے آنکھیں بند کر کے سمادھی لگانے سے نہیں محض ایک محفل مشاعرہ میں پہلی مرتبہ بغیر اذن جا گھسنے۔ سمجھ میں نہ آنے والے بولی پر داد دینے والوں کی "نقل آتارنے" اور تھپڑ کھا کر پھوٹی ہوئی بکھیر لئے ہوئے نکالے جانے پر ہوا۔ اس عرفان کے دوسرے تیسرے دن گھر کے ایک گوشے میں بیٹھے بیٹھے کاٹھ کی تختی مشق اور خوش خطی کی کاپی پر میری پہلی نظم منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوئی۔ جسے میں دوسرے دن مدرسے لے گیا۔ ہم جماعتوں کو بڑے فخر سے سناتا ہوا پکڑا گیا۔ "مولوی فتح دین" سے چانٹے کھاتے۔ اپنی شاعری کی پہلی داد یوں پائی: "اوئے کھوتیا کتھوں نقل کر لیایا ایں۔ تیرے پیو نے وی کدی شیری کیتی سی"۔ (او گدھے کہاں سے نقل کر لایا ہے، کیا تیرے باپ نے بھی کبھی شاعری کی تھی!)۔

یہ نظم اردو نصاب کی اکثر نظموں کی طرز پر اچھی خاصی لمبی تھی اور اس میں وہ تمام خیالات و جذبات تھے جو میری طفلی نے اب تک اخذ کئے تھے۔ نظم چند ہی دن میں گم ہو گئی۔ مزید لکھنے کا شوق بھی پٹائی کے خوف سے دم سادھ گیا۔ صرف دو بیت یاد ہیں۔ الفاظ غلط سلط ہیں تو کیا ہوا۔ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے میری منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

محمدؐ کی کشتی میں ہونگا سوار — تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار
محمد "حفیظ" نے بنائی غزل — خدا کا ہے اس وقت اس پر فضل

سات برس کی عمر میں یہ خیالات اور ان کے اظہار کے لئے اردو کیوں آموجود ہوئی۔ ان امور پر اس بھولے بسرے معاشرے میں پنجاب کے مسلمانوں کی نفسیات سے باخبر نقاد کے سوا کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ میں تو واقعہ کے بیان پر اکتفا کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں —— چار پانچ سال تک شعر گوئی نے بخوفِ سرزنش سر نہ اٹھایا۔ البتہ نظم ہو یا نثر اُردو میں جو کچھ ہاتھ آیا، سمجھ میں آئے نہ آئے میں اسے پی جانے لگا۔ میلوں ٹھیلوں اور شادی بیاہ کی تقریبوں پر دوسرے قصبات میں بھی جانا ہوتا تھا۔ میں نے چھپی ہوئی اردو کہاں کہاں سے کس کس طرح حاصل کی۔ یہ کہانی طولانی ہے، مختصر یہ کہ پڑیاں باندھنے والے کاغذ تک کو بغیر پڑھے نہ چھوڑا —— کہیں سے ایک پھٹی ہوئی جلد طلسم ہوشربا کی مل گئی۔ چھپا کر ہتھیا لایا۔ مدرسے کا "پڑھنا وڑھنا خیال سے کھسکا"۔ بستے میں باندھ کر گھر سے سکول کے لئے نکلتا اور ایک تالاب کے کنارے امیر حمزہ کے کارنامے اور عمر عیار کی عیاریاں پڑھا کرتا۔ اس دفتر بے پایاں کی اور جلدیں بھی گھر سے پیسے چُرا کر منگا لیں۔ مسدس حالی مل گئی تھی۔ پڑھتا اور خواہ مخواہ روتا۔ اسکول میں اردو کے علاوہ سب مضامین میں صفر ہوتے چلے جانے کے سبب پٹتا، غیر حاضری کا پتہ چلنے پر ابّا اماں کے ہاتھوں مرمت ہوتی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں چھٹی جماعت میں تھا کہ عشق کا پہلا اور شعر گوئی کا دوسرا بھرپور وار مجھ پر ہوا —— اب سنبھل نہ سکا۔ بُتِ ہرجائی پر بس نہ چلا۔ اپنی جان پر اور غزل پر مشق ستم جاری ہوئی۔ اصلاح کے لئے جالندھر میں اپنے سے بہتر نہ پایا۔ دیوان داغ اور دیوان امیر مینائی حاصل کئے گئے —— گھر کی جمع جتھا اڑا کر لاہور امرتسر ہی نہیں دہلی، میرٹھ، مراد آباد بلکہ بمبئی تک بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اکثر دست بدستے پلٹتا۔ مچلتا ہوا مدرسے کی سمت چلتا ہوا نظر آتا۔ آخر بھاگ جانا غالب آگیا۔ ساتویں کا امتحان دے کر نتیجہ سننے نہیں گیا۔ سنا ہے پاس ہو گیا تھا۔

"بے اُستادا" کہلانے کے خوف سے استاد پکڑنا ضروری تھا۔ حضرت گرامی کا پتہ دریافت کر کے دو غزلیں طفلانہ درخواست کے ساتھ دکن ارسال کیں۔ واپس آیا۔ "گرامی فارسی کا شاعر ہے۔ اُردو سے بہرہ ور نہیں۔ حفیظ گرامی کے وطن کا جوہر قابل معلوم ہوتا ہے۔ حفیظ کو چاہیئے کہ اپنا کلام اپنی ہی "ناقدانہ نظر" سے بار بار دیکھے۔ اُستادی شاگردی کے پھیر میں نہ پڑے"۔

میں نے اس ارشاد پر عمل کیا (اب تک کر رہا ہوں)۔ "آبِ حیات" کا ایک نسخہ لاہور سے خرید منگوایا۔ بار بار پڑھا۔ کچھ اور شاعر بھی پڑھ ڈالے۔ چند دوستوں سے

مل کر جالندھر میں اُردو مشاعرے کی بزم قائم کی۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ جناب کبیر خاں رسا اور غازی آباد میں مدرس رہ چکنے والے سید محمد علی آذر بھی شامل ہوا کرتے۔ میاں محمد جان کی حویلی میں مشاعرے ہوتے۔ لدھیانے سے فیاض ہریانوی، کپور تھلے سے مسرور صاحب اپنے والد رنجور تلمیذ داغ کا کلام بھی سناتے۔ میں کسی کا شاگرد ہونے کی بجائے اب جالندھر میں بہتوں کا بھلا کرنے کے لئے استاد بن گیا تھا۔ اسکول کے چند طالب علم اصلاح لیا کرتے۔ مولوی اصغر علی احسن ایم اے (مرحوم) اور مولوی فخر الدین ناطق (مرحوم) مجھے کلام دکھائے بغیر مشاعرے میں نہ سناتے۔

پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ لاہور سے اُردو اخبار آنے لگے تھے۔ میرے والد ایک اخبار "وطن" منگانے لگے۔ اردگرد لوگ بیٹھ کر پڑھتے اور سنتے اور انگریزوں کے خلاف گپ ہانکتے۔ پاداش میں گندھک اور قلمی شورے کے فروخت کے لائسنس اور ہزارہا کا مال بھی ضبط ہوگیا۔ پولیس اور فوج میں وردیوں کے ٹھیکے بھی منسوخ ہوگئے۔ ہیضہ، پلیگ سے میرے بھائیوں بہنوئیوں کی جواں مرگیاں۔ گھر میں بیوہ، بہنوں اور بھاوجوں کی بیچارگیاں۔ اب یہ ضرب کاری ——! والد شکستہ، گھرانا برباد۔ لیکن میں قافیہ ردیف کی دنیا میں آباد۔

یہ نہیں کہ مجھے کھانے کے ساتھ کمانے کا احساس نہ تھا لیکن ساتویں جماعت تک تعلیم، کم سِنی اور ردیف قافیے ملازمت کی سفارش نہ بنے۔ تجارت کی سوجھی۔ ایک مرحومہ دادی امّاں کا (جس نے مجھے متبنّیٰ بنا رکھا تھا) آخری زیور فروخت کیا۔ عطر اور خوشبوئیات کی دکان کھول لی جو عشق و محبت کی دکان ثابت ہوئی۔ اصلاح لینے والوں کا ہجوم اور شاعروں کا جمگھٹ رہنے لگا۔ رنگ رنگ کے حسین صورت لوگ عطر اور لونڈر کی قیمتی شیشیاں مسکرا مسکرا کر اُٹھالے جانے لگے۔ گرمیٔ بازار ایسی بڑھی کہ دکان بڑھانی پڑی۔ میری دوکان کے آخری دنوں کی "یافت" پنڈت ہری چند "شرما" اختر ہیں جن کی جنم پتری میں پرمہنوں نے مجھ سے اصلاح سخن لینے کے بہانے میرا دست اور میری سپر بننا لکھ دیا تھا۔

دوکان اُجڑ گئی۔ اپنے پرائے سب مجھ سے مایوس ہوگئے لیکن میری ماں کو نہ جانے کیوں میرا علاج سوجھ گیا۔ اس نے مجھے میری خالہ کی لڑکی سے بیاہ دیا اور شادی کے تیسرے دن میرے والد نے نئی دلہن سمیت مجھے گھر سے نکال دیا —— میں والدہ، دو سگی بہنوں اور اپنی دلہن کو ساتھ لیکر کرایہ کے مکان میں اُٹھ گیا۔ اُس دن سے شاعری کے ساتھ روٹی کمانے کی دھن بھی لگ گئی۔ میری ماں نے مجھے احساسِ ذمہ داری کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے کہ برابر معیشت کی چکی پیس رہا ہوں۔

میں جسمانی محنت مزدوری میں لگا ہوا تھا کہ شہر میں ایک دنگل ہوا۔ کمشنری جالندھر کے پانچ ضلعوں سے شاعر کشتی لڑنے آئے۔ آریہ اینگلو ورنیکلر اسکول کے ماسٹر گوپال داس کی انگیخت پر طرحی غزل اور متعین مضمون پر ایک نظم راتوں رات میں نے لکھی —— ماسٹر جی مجھے میرے گھر سے اپنے ساتھ دنگل میں لے گئے۔ بھاری بھرکم شاعروں کے مقابلے میں اکھاڑے کے اندر اُترتے وقت میری عمر اور وضع پر سب ہنسے۔ لیکن میں فسانۂ آزاد کا "صف شکن" بٹیر ثابت ہوا۔ اوّل انعام سونے کا تمغہ دوسرا انعام سو روپے دونوں مجھی کو مل گئے۔ گوپال داس جی کی قیادت میں پنڈت ہری چند کے ساتھی طلبہ مجھے کندھوں پر اٹھا کر شہر کے بازاروں میں دہائی دیتے پھرے۔ اب میں تمغہ یافتہ شاعر ہوگیا۔ مگر شاعر برادری "بے اُستادا" کہتی تھی۔ خوش نصیبی سے حضرت گرامی دربارِ دکن سے وظیفہ لے کر وطن میں آگئے۔ اور میں غازی رحمت اللہ علیہ (حمید جالندھری مالک مکتبہ کارواں کے مرحوم ماموں جان) کی معیت میں مٹھائی اور پیازی رنگ کی ایک پگڑی پر پانچ روپے رکھ کر ملک الشعرا فارسی کے حضور دو زانو ہوا۔ اب "بے اُستادا" نہ رہا۔ مرحوم اصلاح کی بجائے شعر کو سہل ممتنع بنانے اور بار بار خود غور کرنے پر زور دیتے تھے —— فرماتے "میاں تقلید نہ کرو اپنی ذات کو باہر لاؤ ——"

جنگ ختم ہوگئی۔ خلافت اور کانگرس کا زور ہوا۔ میں نے ایک نظم ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کی فرمائش پر جالندھر کے ایک بہت بڑے جلسے میں پڑھ ڈالی۔ تیسرے دن امرتسر میں جلیاں والے باغ کا سانحہ پیش آیا۔ یہاں بھی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ پولیس نے مجھے تین دن حوالات میں رکھ کر کم سِنی اور شاعری کے الزام میں چھوڑ دیا ؎

میری فردِ عمل کو سمجھ مجموعہ افسانوں کا — محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا

تنگدستی کے سبب سنگر مشین بیچنے کی نوکری کرلی۔ اوکاڑے چلا گیا۔ منٹگمری قریب تھا، وہاں مشاعرے ہوتے تھے۔ میں بھی سو کام چھوڑ کر پہنچتا۔ یہیں پہلی ملاقات جناب نشتر جالندھری سے ہوئی۔ وہ منٹگمری میں گوروں کو ہندوستانی پڑھاتے تھے۔ مشاعرے میں ٹکسالی غزلوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اقبال اور آغا شاعر دہلوی کے کلام پر لکھی ہوئی تنقیدوں سے ہم نو مشقوں کو مرعوب کیا کرتے تھے۔ لاہور سسرال ہونے کی وجہ سے آنا جانا رہتا۔ ایک "مشترک دوست" کی

قیام گاہ "پلیزنٹ ہاؤس" پر جناب سالک بٹالوی سے نیاز کا شرف ملا۔ وہ پھول اور تہذیبِ نسواں سے منسلک تھے۔ اس وقت ایک شمع کے دو پروانوں کی مٹ بھیڑ تھی۔ مقابلہ میں ڈٹ رہنے کے لئے میں نے دو تین غزلیں سنائیں۔ اس طرح دیرپا مراسم کی داغ بیل پڑ گئی۔ بقول داغ ؎ تم سے تو کوئی واسطہ نہ رہا اب طبیعت قریب کی آئی!

سید امتیاز علی تاج کی ادارت میں بہ تعاون سالک صاحب ایک ادبی رسالہ کہکشاں نکلتا تھا۔ میں نے اسے اوکاڑے میں اپنے نام جاری کرا لیا۔ یہ بہترین صحیفہ تھا مگر افسوس جلد بند ہو گیا۔ سالک صاحب کو حضرت مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے لئے چن لیا تھا۔ شعر کے شوق نے مشین سے بہت جلد بے دل کر دیا۔ نوکری چھوڑ دی۔ جالندھر سے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی دھن سمائی۔ مرحومہ دادی اماں سے وراثت میں ملے ہوئے مکانوں میں سے ایک چپکے چپکے گروی کر دیا۔

گرامی صاحب سے حکیم اجمل خاں (مرحوم)، مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم و مغفور کے نام تعارفی چٹھیاں لے کر دہلی۔ لکھنؤ اور شعر و ادب کے دوسرے مراکز میں مشاہیر سے تعاون حاصل کرنے نکلا۔ مضامین اور وعدوں کے بوجھ سے لدا ہوا پلٹا۔ لاہور علامہ اقبال کی خدمت میں حضرت گرامی کی سفارش لیکر گیا۔ مصورِ مشرق جناب چغتائی سے بھی شناسائی ہوئی۔ میرے لنگوٹیے دوست چودھری سلطان علی (کھوسٹ) جو ان دنوں میو سکول آف آرٹس میں مصوری سیکھتے تھے۔ وسیلہ بنے۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں رسالہ "اعجاز" جالندھر سے جاری ہو گیا۔ لیکن ایک مہمان شاعر پنڈت سرہالوی جو میری امداد کو آئے تھے۔ میرے صندوقچے کو روپے کی کثافت سے پاک صاف کر کے غائب ہو گئے۔ اس لئے "اعجاز" نے تین مہینے کے بعد دم توڑ دیا۔ تاہم میرے حق میں یہ "اعجاز" ہی تھا کیونکہ اس کے طفیل مجھے بہت سے مشاہیر اردو حضرات شررؔ۔ صفیؔ۔ عزیزؔ۔ یگانہؔ۔ شوقؔ قدوائی۔ ہوشؔ بلگرامی۔ اثرؔ۔ جگرؔ۔ جوشؔ۔ بیخودؔ۔ ناصر نذیر فراقؔ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مکان کا گروی رکھنا کب تک مخفی رہتا۔ والد نے میری بیوی اور شیر خوار بچی کے سامنے میرے سر کو جوتوں سے نوازا۔ اور میری والدہ کو شوہریت کے دعوے سے واپس گھر لے گئے۔ اب کے بہت شرم آئی۔ میں اپنی بیوی کو اس کے میکے میں لاہور چھوڑ کر پیدل کشمیر چلا گیا۔ وہاں حکیم فیروز طغرائی مل گئے۔ چند روز غزلخوانیاں رہیں۔ جیب خالی مگر نگاہ حسنِ فطرت سے لبریز واپس لاہور لایا۔

فاخر ہریانوی جو میری شاگردی کا دم بھرتے تھے اور جالندھر سے آ کر یہاں کالج کے طالب علم تھے۔ ایک مشاعرے میں لے گئے۔ لاہور میں شعر سنانے کے خیال سے مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ پروفیسر اور ایڈیٹر شاعروں کا مجھ پر بڑا رعب تھا۔ مجھے عین پیچھے بنچ پر جگہ ملی۔ سامنے زیادہ تر کالجوں کے طلبہ تھے۔ اردو کے پنجابی نوشتوں میں میرا نام بھی پکارا گیا۔ جی کڑا کر کے ایک غزل تحت اللفظ سنائی اور بنچ پر دبک گیا۔ ایک اور، ایک اور کا شور رہا۔ میں نے ان بڑے شاعر صاحب کو یہ فقرہ وقار کے کان میں کہتے اپنے کانوں سنا "...... چھا گیا ہے" یہ ایک نامور شاعر کی طرزِ سخن تھی۔ مجھ پر چھایا ہوا سارا رعب اتر گیا۔ دل نے کہا۔ حفیظ، یہ لوگ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ گالی کے ساتھ "چھا جانے کی داد" مجھے وہیں ختم کر دیتی۔ اگر سر شیخ عبدالقادر صاحب، حکیم احمد شجاعؔ اور جناب چغتائی ایسے مربی شروع ہی میں نہ مل جاتے۔ سید امتیاز علی تاجؔ۔ حضرات سالکؔ و مہرؔ، نشتر و میکش، مجھے بزم خاصانِ ادب کا "رکن" نہ بنا لیتے۔ سید احمد شاہ بخاری پطرس اور ان کے برادر خورد ذوالفقار علی بخاری میرے یارانِ دلنواز نہ بنتے۔ ان سب کا مذاقِ سخن، حوصلہ افزائی اور نقادانہ نگاہ میری ترقی کا باعث ہے۔

ان مراسم کے بعد میں نے اپنے دل سے پوچھا۔ کیا مشاعرہ پر محض پرانی طرز کی غزل سے چھا جانا کافی ہے ـــــ دل نے کہا۔ ہرگز نہیں۔ اب تو سخن فہموں میں باریاب ہو گیا ہے۔ اب "کچھ اور چاہیئے وسعت "ترے" بیاں کے لئے" گرامی کی تلقین یاد آئی۔ تقلید نہ کر اپنی ذات کو باہر نکال۔

سوگوار منمناتی اور بسورتی ہوئی فرسودگی کے بجائے میں نے شگفتگی کو اپنا فن بنانے کی ٹھانی۔ لاہور میں جم گیا۔ شباب اردو۔ ہزار داستان۔ نونہال۔ تہذیبِ نسواں اور پھول کے علاوہ بہت سے اور اداروں میں قلم کی چکی پیستا ہوا میں اربابِ علم کے مشاعروں اور لاہور کے سخن سنج و سخن فہم حلقوں میں در آیا۔ لیجیو۔ پکڑیو جانے نہ دیجیو کا شور اٹھا۔ اس لئے کہ ان دنوں زندہ دلی کی اس سرزمین پر "آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے" کا تسلط تھا اور جب تک "ناتواں دیکھا کئے" والوں کی غلامی کا حلقہ کان میں نہ ڈالے۔ پنجاب کا کوئی اردو شاعر یا ادیب ملک کے شہرِ سخن کا معزز شہری کہلانے کا حقدار نہ تھا۔

★

غزل کا مزاج

ڈاکٹر وزیر آغا

ماحول اور زبان کا رشتہ اس قدر ناقابلِ شکست ہے کہ کسی صنفِ ادب کی نمود کو محض "ایک حادثہ" قرار دینا ممکن نہیں۔ ہر صنفِ ادب کی چند مبادیات، اس کے پیکر کے چند انوکھے خطوط اور اس کے مزاج کے بعض نوکیلے پہلو ہوتے ہیں جو اپنی ترتیب، آہنگ اور صورت کے لئے ماحول ہی سے اثرات قبول کرتے ہیں۔ ماحول سے مراد محض وہ سماج نہیں جو اپنے رسم و رواج، رہن سہن، روحانی تصورات، نسلی امتیازات اور زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کے باعث علیحدہ دکھائی دیتا ہے بلکہ اس سے مراد زمین کی خاصیت، آسمان کی وسعت یا عدم وسعت، پہاڑوں، جنگلوں اور صحراؤں کا وجود یا عدم وجود اور موسم کی برکتیں یا لعنتیں بھی ہیں کہ ان تمام باتوں سے وہ مخصوص سماج تشکیل پذیر ہوتا ہے جس میں کسی ایک زبان، مختلف تاثرات کے مجموعی تاثر کے باعث کسی ایسی نئی صنف کو بھی جنم دے دیتی ہے جو دوسری زبانوں میں موجود نہیں ہوتی۔ غزل کی نمود ماحول کی کسی ایسی ہی کروٹ کا نتیجہ ہے اور اس کا مزاج بڑی حد تک اس مخصوص فضا کا منت کش ہے جس میں اس نے جنم لیا ہے:

غزل مشرق کی چیز ہے۔ مغرب کی ادبیات میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ وہاں ترسیلِ مطالب کے لئے زیادہ تر نظم کو فروغ ملا ہے۔ تاہم یہ فروغ کسی شعوری اقدام کے تابع نہیں بلکہ یہ نتیجہ ہے اس مخصوص مادی نقطۂ نظر کا جس کے پس پشت سماجی اور ذہنی محرکات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ دراصل مغرب میں زبان و ادب کے آغاز اور نشو و نما کا دور، جہد للبقا کا دور تھا اور اس کے باعث ایک ایسے سماج کی تشکیل ہوئی جس میں خاندان کے ساتھ فرد کا رشتہ مضبوط نہیں تھا۔ ضروریاتِ زندگی عدم فراوانی نے مغرب کے انسان کو زندگی کی مادی صورت سے شدید طور پر وابستہ کیا اور اسے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے حقائق سے متصادم ہونا پڑا۔ یہ ایک ایسی زندگی تھی جس میں فرد کی اپنی بقا کا سوال اجتماعی مفاد کے سوال سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ اور چونکہ روحانی ترقی بڑی حد تک کشاکشِ حیات سے فراغت کے لمحات ہی میں ممکن ہے اس لئے مغرب کے اس انسان نے کشاکشِ حیات میں بری طرح مبتلا ہو کر نظر کی کشادگی تو پیدا نہ کی البتہ اپنے گرد ایک مادی خول ضرور تعمیر کر لیا۔ چنانچہ مغرب میں فکر و نظر کا طریق زیادہ تر تحلیلی (INDUCTIVE) تھا اور وہاں اجزا کے تحلیلی مطالعے اور تجزیئے سے "حقیقت" کی طرف پیش قدمی کا طریق رائج ہو گیا۔ مغربی فکر و نظر کی یہ بنیاد آج تک قائم ہے اور مغرب میں سائنس، طب، حیاتیات اور دوسرے علوم کی حیرت انگیز ترقی اسی تحلیلی طریق کار کی رہین منت ہے۔

مغرب کی شاعری میں نظم کی طرف ایک شدید رجحان بھی اسی تحلیلی طریق کار کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ وہی چیز جو مغرب کی عام زندگی میں خود غرضی، زندگی کے لوازمات سے شدید وابستگی اور ایک مادی اور تحلیلی نقطۂ نظر کی صورت میں موجود تھی، ارتفاع پا کر نظم کے ڈھانچے کی صورت میں نمودار ہوئی اور شاعر نے نظم کو اپنے مخصوص تجربے کے اظہار اور واقعات، احساسات اور جذبات کے تجزیاتی مطالعہ کے لئے وقف کر لیا۔ چنانچہ نظم میں جو بالعموم ایک خاص فرد کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے اور تجربات کی عمومیت اور ہمہ گیری کی بجائے ایک انفرادی ردِ عمل کے شواہد ملتے ہیں، یہ سب کچھ زندگی کے بارے میں اس نقطۂ نظر کے اثرات ہیں جو مغرب پر ازمنۂ قدیم سے مسلط رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نظم، بحیثیت مجموعی، شخصی تاثرات کی نقاب کشائی کرتی ہے اور اسی لئے اس کے پیکر اور فکر میں ایسی انفرادیت دکھائی دیتی ہے جو غزل میں موجود نہیں۔ غزل کے دائرۂ عمل میں داخل ہوتے ہی شخصی تصورات، عمومی تصورات کا لباس پہن لیتے ہیں اور فرد کے مخصوص تجربات میں ایک ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کسی خاص احساس یا تجربے کا تجزیاتی مطالعہ، عالم گیر احساسات کے محاکے میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہی غزل کا ممتاز ترین پہلو ہے۔

لیکن غزل کی اس امتیازی خصوصیت کی نمود یا یوں کہیئے کہ خود غزل کی نمود محض ایک حادثہ نہیں ہے بلکہ یہ اس ماحول کی صدائے

بازگشت ہے جس میں سر بفلک پہاڑ، حدِ نظر تک پھیلے ہوئے صحرا، آسمان کی لامحدود وسعت اور اشیا کی افراط اور فراوانی تھی۔ ایسے ماحول میں فرد کو نہ صرف وہ فراغت نصیب تھی جو روحانی پرواز کے لئے از بس ضروری ہے بلکہ اس کی اپنی شخصیت، سماج کی وسیع تر "شخصیت" کا ایک جزو تھی، اور اس کے اقدامات میں اپنی ذات کی بہبود سے کہیں زیادہ سماج کی بہبود کا جذبہ پنہاں تھا۔ دوسرے لفظوں میں ایک طرف اسے ماحول کی وسعت اور کشادگی نصیب تھی جو اس کے مطمحِ نظر کو وسعت اور کشادگی سے ہمکنار کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ اپنی ذات کے خول میں مقید ہونے کی بجائے ایک وسیع تر سماج سے ذہنی اور جذباتی طور پر منسلک ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ اس مخصوص طریقِ فکر و استدلال کی صورت میں ظاہر ہوا جسے (DEDUCTIVE REASONING) کا نام دینا چاہیئے اور جس کے زیرِ اثر اس نے پہلے "حقیقت" کا ادراک کیا اور پھر زندگی کے مظاہر کو اس حقیقت کے ثبوت میں پیش کرنے کی سعی کی یہی وجہ ہے کہ مشرق میں مذاہب کا آغاز ہوا اور خدا کی وحدت کا ایک ایسا تصور پیدا ہوا جو کسی تجزیاتی مطالعہ یا سائنسی طریقِ کار کا رہینِ منت نہیں تھا۔ تصوّف اور ویدانت کے عظیم نظریات بھی اسی طریقِ کار کے غماز ہیں۔ بالخصوص ہمہ اوست کا تصوّر ایسے ماحول کا لازمی نتیجہ تھا جس میں وسعت، کشادگی اور سماجی اور ذہنی ارتباط کے نمایاں عناصر موجود تھے۔ ان تمام باتوں نے (جو اس ماحول کی پیداوار تھیں) اس کی تخلیقی سرگرمیوں پر بھی اثر کیا اور غزل ایسی صنفِ ادب کو معرضِ وجود میں آنے کی ترغیب دی جس میں نظر کی کشادگی، تاثر کی ہمہ گیری، ربطِ باہم کی فراوانی اور اظہار کی کفایت موجود تھی۔ غزل میں عصرِ حاضر کی مخفی تحریکوں اور معاشرے کی اجتماعی کروٹوں کی ترجمانی کا باعث بھی یہی ہے؂

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا نظم بنیادی طور پر تاثرات کے تجزیاتی مطالعہ کا ایک وسیلہ ہے اور اس خاص میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں۔ احساسات، جذبات اور تجربات کے تجزیاتی اور تحلیلی مطالعہ کو جس خوبی اور نفاست سے نظم نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے، غزل کے لئے نہ ممکن ہے نہ مناسب۔ اسی طرح غزل کی امتیازی خصوصیت تحلیلی مطالعہ نہیں بلکہ اجتماعی محاکمہ ہے اور اس ضمن میں غزل نے جس انداز سے شعر کے مختصر سے پیمانے میں بڑے بڑے مطالب کو سمیٹا ہے، شاعری کی کسی اور صنف کے بس کا روگ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں نظم کا مابہ الامتیاز اس کی "گیرائی" ہے اور غزل کی امتیازی خصوصیت اس کی "وسعت"۔ اس فرق سے قطع نظر دونوں کے پس پشت تخلیقی عمل کی نوعیت ایک سی ہے۔ کیونکہ تخلیقی عمل، خیالات و احساسات کی ایک لطیف تر سطح کی طرف جست بھرنے کا نام ہے۔ یہ فنکارانہ جست غزل، نظم بلکہ ہر تخلیقی ادب پارے کی محرک ہے۔ البتہ نظم کی اس جست کو اس غواصی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو سمندر کی سطح اور اس کی گہرائیوں کے مابین آمد و رفت کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کرتی ہے اور غزل کی جست کو اس پرواز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو زمین سے اوپر اٹھ کر بے کنار وسعتوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ میں نے یہ مثال محض بات کو واضح کرنے کے لئے دی ہے ورنہ کہنے کا مدعا فقط یہ ہے کہ غزل، سماجی روابط، اجتماعی کیفیات اور روحانی وسعتوں کی نقیب و داعی ہے لیکن نظم جذبات کی تہہ در تہہ کیفیات کو دائرۂ نور میں لاتی ہے۔ مبادا کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ غزل اور نظم کا یہ فرق محض اصولی حیثیت رکھتا ہے ورنہ نظم نے غزل اور غزل نے نظم پر جو اثرات مرتسم کئے ہیں ان سے اکثر اوقات یہ حدِ فاصل الجھ کر رہ گئی ہے۔ چونکہ اس جائزہ کا مقصد غزل کے مزاج کی پرکھ ہے اس لئے اس حدِ فاصل کو نمایاں کرنا ضروری تھا۔

غزل کے دائرۂ عمل میں وسعت اور کشادگی کے عناصر کا وجود اور غزل کا وہ میلان کہ زندگی کو بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی بجائے ثابت حقیقتوں کی صورت میں پیش کیا جائے، غزل کے مخصوص مزاج کی تشکیل میں ممد ثابت ہوا ہے۔ اس طور سے کہ غزل میں ذاتی ردِ عمل کے مظاہر بھی اپنی نوکیلی کیفیات کھو بیٹھے ہیں جس طرح نوکیلے اور ناتراشیدہ پتھروں کے ٹکڑے اگر بکھرے رہیں تو اپنی نوکیلی صورت کو قائم رکھتے ہیں لیکن اگر انہیں ایک ایسی جگہ ڈھیر کر دیا جائے جہاں انہیں دوسرے سے الجھنے اور متصادم ہونے کے مواقع ملیں تو بہت جلد رگڑ اور تصادم کے باعث ان کے نوکیلے کنارے بیضوی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں بعینہٖ جب ناتراشیدہ احساسات و جذبات جو فرد کی میراث ہیں، سماجی روابط کے دائرہ میں آکر اپنے نوکیلے کناروں کو ملائم اور ہموار کر لیتے ہیں یا بہ الفاظِ دیگر تہذیب اور شائستگی سے مملو ہو جاتے ہیں تو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور ان میں ایک آفاقیت اور اجتماعی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے غزل کے

اہم ترین موضوعات درویشی، آوارگی کا رجحان اور محبت شخصی ردِعمل کی اسی انقلابی تبدیلی کے غماز ہیں۔

ان میں سے پہلے درویشی اور آوارگی کے رجحان کو لیجئے۔ ہر فرد جو سوسائٹی کے حصار میں رہتا ہے اور سماجی قواعد و ضوابط کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا اپنا اولیں فرض سمجھتا ہے، بنیادی طور پر وہی آزاد منش آدم ہے جس نے پابندیوں اور حد بندیوں کو زنجیریں اور سلاسل سمجھا اور انہیں توڑ پھوڑ دینے کی سعی کی۔ اور اگرچہ ہزارہا برس کی سماجی زندگی نے اب اس کی بغاوت اور انحراف کو بڑی حد تک کند اور ہموار کر دیا ہے تاہم اب بھی اس کے دل کے نہاں خانے میں سانچ قانون اور پابندی کے حصار کو توڑ کر باہر نکل آنے کی کوئی نہ کوئی آرزو ضرور سر اٹھاتی رہتی ہے۔ ضوابط سے برہمی، قوانین سے انحراف اور سماجی قیود سے فرار اس کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس کا اظہار ان کاوشوں کے ذریعہ بھی ہوتا ہے جن سے وہ اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے اور سماجی روابط سے ہٹ کر اپنی محدود شخصیت کے خول میں مقید ہو جاتا یا سماج سے فرار حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن انحراف، بغاوت، سرکشی اور فرار کے اس رجحان نے غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر اپنے بہت سے نوکیلے کنارے کو ہموار کر لیا ہے۔ مثلاً غزل میں مُلّا اور زاہد کو ہدفِ طنز بنانے کی ایک ایسی نمایاں روش ملتی ہے جو غزل کی روایت کا ایک جزو بن چکی ہے۔ دراصل مُلّا یا زاہد سماج کے میکانکی عمل کا نمائندہ ہے اور سوسائٹی کے قواعد و ضوابط اور رسوم و قیود کا سب سے بڑا علمبردار۔ غزل کا شاعر اگر سنجیدگی سے قواعد و ضوابط کے خلاف زبان ہلاتا تو ایک شدید تر ردِعمل کے سوا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا لیکن جب اس نے قواعد و ضوابط پر نشتر زنی کیلئے طنز و مزاح کے نازک آلات منتخب کرلئے تو اس کی بات میں توازن، شائستگی اور کھلی کھلی کیفیت پیدا ہوگئی اور اس کے مقصد کی سنجیدگی اظہار کی خندہ آور صورت سے ہم کنار ہو کر گوارہ اور قابلِ برداشت ہوگئی۔ تاہم بنیادی طور پر یہ ایک بغاوت تھی جو کسی اور صنفِ ادب کا سہارا لیتی تو شاید شخصی سطح تک اتر کر شاعر کے ذاتی غم و غصہ کے اظہار کا وسیلہ بنتی لیکن جو غزل کے مخصوص مزاج سے ہم آہنگ ہو کر قواعد و ضوابط کی اجتماعی صورت کے خلاف ایک خندۂ استہزا بن کر نمودار ہوئی اور اس کے سامنے کسی خاص فرد کی بجائے مُلّا اور زاہد جیسی شخصیتیں آئیں جن کی حیثیت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اور مثالی تھی۔

اسی سے وابستہ غزل کی وہ اہم ترین روش بھی ہے جسے "درویشی" کا رجحان کہنا چاہیئے۔ درویشی کے اس رجحان کو محض کسی درد، کسی اصغر، یا کسی فانی سے وابستہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ رجحان ساری کی ساری غزل میں ڈوبتا ابھرتا نظر آتا ہے۔ عام زندگی پر اس درجہ سنجیدگی مسلط ہے اور انسان اس بری طرح مایا کے جال میں الجھا ہوا ہے نیز ہلدی کی گانٹھ کی طرح اس کی جڑیں خاندان، قبیلے اور قوم میں اس قدر پھیلی ہوئی ہیں کہ اسے وہ لمحہ نصیب ہی نہیں ہوتا جس میں وہ ایک تماشائی کا منصب حاصل کر کے زندگی کے بازیچۂ اطفال پر ایک نظر ڈال سکے۔ لیکن وہ ماحول جس میں غزل کو فروغ ملا، ایک ایسا ماحول تھا جس میں بعض محرکات کے زیرِ اثر ایک نیا نقطۂ نظر پیدا ہو گیا تھا۔ یہ نقطۂ نظر زندگی سے وابستگی کے ساتھ ساتھ زندگی کے لوازمات سے بے نیازی پر بھی زور دیتا تھا اور اشکال و مظاہر کی حقیقت پر شک کر کے "حقیقتِ اعلیٰ" کی تلاش پر انسان کو اکساتا تھا۔ تصوف اور ویدانت کے نظریات ایسے ماحول کا لازمی نتیجہ تھے اور چونکہ غزل بنیادی طور پر اجتماعی تحریکات اور نظریات کو خود میں سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے اس لئے تصوف اور غزل کا چولی دامن کا ساتھ بھی آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ غزل میں درویشی کا رجحان نظریاتی لحاظ سے تو تصوف کا منت کش ہے لیکن یہ اس سماج کی پیداوار بھی ہے جو زندگی کے عام مظاہر کو حقیقی اور سچا نہیں سمجھتا تھا اور جس میں لوازماتِ زندگی کی قدم قدم پر نفی کی جاتی تھی۔ چنانچہ درویشی اور سنیاسی کی بازگشت غزل میں صاف طور سے سنائی دیتی ہے۔ درویشی کا ایک پہلو آوارہ گردی کا رجحان ہے اور دوسرا خود اذیتی کا۔ درویش یا سادھو کا کوئی مستقل گھر نہیں ہوتا۔ وہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اٹھتا ہے، دن بھر شہر بہ شہر، کو بہ کو اور در بدر بھٹکتا ہے اور شام کو ایک آوارہ پنچھی کی طرح جہاں سر چھپانے کو جگہ ملتی ہے بسیرا کر لیتا ہے۔ پھر درویش کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی روح اور حقیقتِ علیٰ کے مابین اپنے جسم کو ایک دیوار سمجھتا ہے اور خود اذیتی میں مبتلا ہو کر اسی دیوار کو گرا دینا چاہتا ہے۔ غزل کے شاعر نے عام زندگی سے اپنی وابستگی تو قائم رکھی لیکن ذہنی طور پر درویش یا سادھو کا اس درجہ تتبع کیا کہ غزل کے مزاج میں آوارہ خرامی اور خود اذیتی سے

عناصر متعارف ہوگئے۔ ان تمام باتوں سے وہ نقطۂ نظر ابھرا جو غزل سے مخصوص ہے اور جس کے تحت شاعر نے زندگی کی آلائشوں اور رعنائیوں سے اوپر اٹھ کر بے نیازی کو اپنا مسلک بنایا ہے۔ چنانچہ ان اشعار سے قطع نظر جن میں تصوف کے رموز و نکات کا بیان ہے، غزل کے عام لہجے میں بھی عقل و خرد کے مقابلے میں دیوانگی زندگی کے ساتھ شدید وابستگی کے مقابلے میں بے نیازی اور قناعت اور رسوم و قیود کے خول کے مقابلے میں درویشانہ آوارگی کو ترجیح ملی ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ غزل میں یہ انحراف، بغاوت یا فرار کسی شخصی ردعمل کی پیداوار نہیں بلکہ یہ سماج کے روحانی طور پر زیادہ بالغ نظر طبقے کا وہ اجتماعی ردعمل ہے جو زندگی کے ساتھ شدید وابستگی کے خلاف معرض وجود میں آیا اور جسے غزل نے اپنی مخصوص صلاحیتوں کے باعث اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اردو غزل سے یہ چند اشعار دیکھئے جو اس ردعمل کی غمازی کرتے ہیں:

مسافر اٹھ تجھے چلنا ہے منزل — بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا (حاتم)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے (میر)

کیا پوچھو ہو وجود و عدم اہل شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے (غالب)

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا (فانی)

ولی سے لے کر باقی تک غزل کے مزاج کا اہم ترین عنصر یہی ردعمل ہے جس کے تحت شاعر نے ایک قلندرانہ بے نیازی اور احساس برتری کا اظہار کیا ہے اور زندگی کی آلائشوں اور رعنائیوں پر ایک روحانی بلندی پر سے نظر ڈالی ہے۔ بلاشبہ یہ ردعمل اس ماحول کی پیداوار بھی ہے جس کی روحانی عمارت کشادگی اور فراوانی کی اساس پر قائم تھی۔

غزل کا دوسرا اہم موضوع "محبت" ہے۔ یوں دیکھئے تو ہر شخص کی محبت اس کا ایک ایسا انفرادی تجربہ ہوتا ہے جو اس کے مخصوص مزاج اور اسے پیش آنے والے واقعات کے اتار چڑھاؤ سے ایک اپنا رنگ وضع کرتا ہے۔ سینکڑوں باتیں اس کی تشکیل میں حصہ لیتی ہیں۔ جذبات و احساسات کی لاتعداد کروٹیں اسے ایک خاص صورت عطا کرتی ہیں اور آخر آخر میں یہ ایک ایسا تجربہ قرار پاتا ہے جس کی مثال نہ پہلے موجود تھی اور نہ جس کا بعد ازاں معرض وجود میں آنا قرین قیاس ہے۔ نظم، محبت کے اس تجربے کی سینکڑوں مثالیں پیش کرچکی ہے اور یہ نظم گو شاعر کی محبت اس کے معاصرین کی محبت سے قطعاً علیحدہ دکھائی دیتی ہے لیکن غزل میں بعض دوسرے رجحانات کی طرح محبت کی انفرادیت بھی اجتماعی اور عمومی کیفیات میں ضم ہوجاتی ہے۔ یہی غزل کی امتیازی خصوصیت ہے کہ جو چیز یا کیفیت اس سے مس ہوتی ہے اپنے ابتدائی اوصاف کو ترک کرکے غزل کے مخصوص رنگ کو اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ غزل میں اجتماعی محرکات کے زیر اثر محبوب کی شخصیت کے بہت سے نوکیلے کنارے اس طور ہموار ہوگئے ہیں کہ محبوب ایک خاص عورت کے روپ میں ظاہر ہونے کی بجائے کسی عہد کی نمائندہ "عورت" کے لباس میں نمودار ہوا ہے اور اس کے لباس، چال ڈھال طور اطوار اور وضع قطع میں نہ صرف ایک عمومیت پیدا ہوئی ہے بلکہ شعرا کے ردعمل میں بھی بیشتر اوقات یکسانیت اور مماثلت نظر آنے لگی ہے۔ گویا غزل کا محبوب اپنے زمانے کے غزل گو شعرا کی مشترکہ میراث ہے اور اس میں زمانے کی مقبول عام عورت کے خصائص مرتکز ہوگئے ہیں۔ اردو غزل کے ابتدائی دور میں محبوب کے اوصاف میں حاکم وقت کے اوصاف کی جھلک اسی حقیقت کی غمازی کرتی ہے۔ اسی طرح درمیانی دور میں جب طوائف معاشرے کا مرکز بن چکی تھی، غزل کے محبوب میں بھی طوائف کے تمام تر خصائص جمع نظر آتے ہیں۔ جدید دور میں نظم کے قوی اثرات کے تحت نیز معاشرے میں ایک انقلابی تبدیلی کے باعث غزل کے محبوب نے اپنی عمومی صفات کو ایک حد تک گنوایا ہے لیکن بحیثیت مجموعی آج بھی غزل میں عورت ایک ثابت حقیقت" کے روپ میں نظر آتی ہے۔ دراصل غزل کا مزاج اس کا متقاضی رہا ہے کہ محبت کی انفرادی کیفیات عشق کی وسیع تر کیفیات میں بدل جائیں اور محبت کا انفرادی غم یا مسرت زندگی کے بنیادی غم یا مسرت سے ہم آہنگ ہوجائے۔ غزل میں عشق کا تصور اسی مخصوص ردعمل سے عبارت ہے اور اس میں ایک ایسی آفاقیت، ایک ایسی کشادگی در آئی ہے جو محبت کی عام کیفیات سے اسے ممتاز اور ماورائی کردیتی ہے۔ پس غزل میں محبوب کے سراپا کا تذکرہ اور محبت کے کیف و کم کا بیان غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہوکر عشق کے عمومی تصور کی صورت میں نظر آتا ہے۔

کسی صنفِ ادب کا مزاج اس کی ہیئت سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نظم چونکہ تجزیاتی مطالعہ کی طالب ہے اس لئے نظم نے مختلف تاثرات کے اظہار کے لئے ہیئت کے بہت سے مختلف تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ تاہم نظم کی اکائی ایک مصرعہ یا ایک شعر نہیں بلکہ خود نظم ہے۔ دراصل نظم کسی تاثر کا ایک ایسا بھرپور اظہار ہوتی ہے کہ اسے جب تک از اول تا آخر پڑھا یا سنا نہ جائے، اس کے مطالب ذہن کی گرفت میں نہیں آسکتے۔ لیکن اس کے برخلاف غزل کی ایک مخصوص ہیئت ہے جس میں نئے تجربات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے غزل کی اکائی "شعر" ہے اور یہ شعر غزل سے کاٹ کر علیحدہ کرلیں تو بھی اپنی انفرادیت، تاثر و ہمہ گیری کے لحاظ سے مکمل و اکمل میں نظر آئے گا:

جہاں تک غزل کی ہیئت کا سوال ہے ولی سے لے کر جدید ترین غزل گو شعرا تک غزل کی وہی ایک صورت نظر آتی ہے یعنی یہ مکمل غزل میں ایک مطلع ہوگا، ایک مقطع ہوگا اور باقی اشعار ایک ہی ردیف یا قافیہ میں ہوں گے۔ اشعار کی تعداد کم و بیش ہوسکتی ہے۔ تخلص بالعموم مقطع میں آئے گا لیکن بعض شعرا نے مطلع میں ہی تخلص کو شامل کیا ہے اور بعض نے ایک ہی غزل میں دو بار تخلص کا استعمال کیا ہے اور بس! اس کے علاوہ غزل کی ہیئت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نظر نہیں آتی۔ بعض نقاد جنہوں نے غزل میں ہیئت کے تجربات کا ذکر کیا ہے دراصل ہیئت اور لہجے میں ایک حدِ فاصل قائم نہیں کرسکے اور الجھ کر رہ گئے ہیں۔ لہجہ، ہر شاعر کا اپنا ہوتا ہے۔ میر جب غزل کہتے ہیں تو ان کا اپنا رنگ ہے جو ان کی شخصیت، علمیت اور زندگی کے بارے میں ان کے مخصوص ردعمل سے اثرات قبول کرتا ہے۔ اسی طرح غالب کے لہجے میں ان کی طبیعت، ماحول اور شخصیت کی واضح طور پر عکاسی ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ شاعر کے ہاں رہا ہے وہ نظم کا شاعر ہو یا غزل کا، ایک مختلف لہجہ، ایک نیا انداز ملے گا اور اسی تازگی یا "نیا پن" میں اس کی بقا کا راز بھی مضمر ہوگا لیکن لہجے کی تازگی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ شاعر نے غزل کی ایک نئی ہیئت کو جنم دیا ہے، قطعاً خلافِ حقیقت اور اسی لئے ناقابلِ قبول ہے:

غزل کی ہیئت کے تذکرے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ غزل کی اکائی غزل نہیں بلکہ "شعر" ہے۔ جب کسی غزل گو شاعر کا کلام زیر بحث آتا ہے تو لامحالہ مکمل غزلوں کی بجائے صرف اُن اشعار کا ذکر کرنا پڑتا ہے جو شاعر کا حاصلِ کلام تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بالعموم کسی شاعر کی ساری کی ساری غزل اعلیٰ پائے کے اشعار پر مشتمل نہیں ہوتی۔ دوسرے غزل میں ایک خارجی ربط کے باوصف، اس کا یہ شعر اپنی جگہ پر ایک ایسی مکمل شعری تخلیق ہوتا ہے جس میں کوئی نہ کوئی مجرد خیال، تجربہ یا تاثر سمٹا ہوتا ہے۔ اس کفایت کے باوجود غزل کے ایک اچھے شعر کی یہ خصوصیت حیرت انگیز ہے کہ وہ اپنے تاثر میں ہمہ گیر اور اپنے اظہار میں یکتا ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے یا سننے سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پس غزل کے مزاج سے پوری طرح واقف ہونے کے لئے غزل کے "شعر" کی اس خصوصیت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

میری دانست میں غزل کے ایک شعر اور ایک لطیفے میں شدید مماثلت موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کامیاب لطیفہ کا اثر ہنسی یا تبسم کے عضویاتی مظاہرے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ایک کامیاب شعر کا نتیجہ ایک ایسی جمالیاتی تسکین کی صورت اختیار کرلیتا ہے جسے ابھی تک ذہنی گرفت میں لیا نہیں جاسکا تاہم اپنے طریقِ کار کے لحاظ سے (اور موجودہ بحث کے لئے طریقِ کار کا جائزہ ہی اہم ہے) ایک شعر اور لطیفہ میں یقیناً مماثلت موجود ہے اور غزل کے شعر کے تاثر کو سمجھنے کے لئے اس مماثلت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ایک لطیفے کی کامیابی تین باتوں کی رہینِ منت ہوتی ہے پہلی تو یہ کہ لطیفے میں حیرت کا عنصر موجود ہو۔ دوسری یہ کہ لطیفے کی پیشکش میں کفایت کو ملحوظ رکھا گیا ہو اور تیسری یہ کہ لطیفے نے ناظر کے تخیل کو اس انداز سے اکسایا کہ وہ ایک سعیٔ تخلیقِ نو کے لئے مجبور ہو گیا ہو۔ جہاں تک حیرت کے عنصر کا تعلق ہے لطیفہ کا کام یہ ہے کہ وہ ناظر کے ذہن میں ایک خاص قسم کے تخیلی عمل کو جاری کر دیتا ہے لیکن جب ناظر اس رو میں بہہ نکلتا ہے اور خود کو ایک مخصوص منطقی نتیجہ کے لئے تیار کر لیتا ہے تو لطیفہ یکلخت ایک نئی پگڈنڈی اختیار کرکے ناظر کے سامنے ایک ایسا نتیجہ پیش کر دیتا ہے کہ اس کی تمام تر توقعات مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہیں۔ حیرت کا یہی عنصر لطیفے کی جان ہے کیونکہ اگر اسی عنصر کا فقدان ہو اور ناظر کو لطیفے کے اس موڑ کا پہلے سے احساس ہو چکا ہو تو پھر لطیفہ قطعاً بے اثر ہو جائے گا۔ مثلاً یہی ایک لطیفہ لیجئے کہ ایک بہت بڑے افسر نے پاگل خانہ کا ملاحظہ کرتے

ہوئے ایک پاگل کو دیکھا جو ڈورے کا نٹا لگائے ایک ٹب میں سے مچھلیاں پکڑنے کے فرضی عمل میں منہمک نظر آتا تھا۔ یہ بڑے افسر اس کے پاس چلے گئے اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "سناؤ بھئی! مچھلیاں پکڑ رہے ہو؟"۔ پاگل نے گردن موڑ کر انتہائی غصے اور نفرت سے ان صاحب کی طرف دیکھا اور کہا "بیوقوف! کیا کبھی ٹب میں سے بھی کسی نے مچھلی پکڑی ہے؟" اس کہانی میں بظاہر ناظر اس بات کا متوقع ہوتا ہے کہ افسر کے سوال کا پاگل۔ ہاں، نہ یا خاموشی سے جواب دے گا لیکن جب وہ انتہائی فراست کا مظاہرہ کرتا ہے تو ناظر کی توقعات مضحکہ خیز طریق سے فسخ ہو جاتی ہیں اور اس کے جذبات کی رو فالتو صورت اختیار کر کے ہنسی میں بہہ نکلتی ہے۔ لطیفہ کی یہ غیر متوقع روش اس کا پہلا وصف ہے۔ لطیفہ کی دوسری خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ کم سے کم الفاظ کا سہارا لیتا ہے اور تفصیل یا تجزیئے سے دامن بچائے رکھتا ہے تاکہ ناظر کی توجہ ایک ہی نقطہ پر مرکوز رہے۔ اس بات کو کفایت کا نام دینا چاہیئے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ لطیفہ اشارے کنائے میں بات کو پیش کرتا ہے اور کہانی کی تکمیل کو ناظر کے تخیل پر چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ ناظر کو اپنے ذہن کی مدد سے کہانی کی باقی ماندہ کڑیوں کو خود تخلیق یا مربوط کرنا پڑتا ہے۔ اس بات سے ناظر کو ایک خوشگوار سے تخلیقی عمل کا احساس ہوتا ہے۔

غزل کا شعر اپنے ہمہ گیر تاثر کے لئے ان تینوں ہی باتوں سے مدد لیتا ہے۔ اول یہ کہ اس میں حیرت و استعجاب کا قیمتی عنصر موجود ہوتا ہے۔ شعر کے پہلے مصرعے میں بالعموم ایک ایسی بات کہہ دی جاتی ہے جو ناظر کے تخیل کو ایک خاص روش پر گامزن کر کے اس کے دل میں ایک خاص قسم کی توقع پیدا کر دیتی ہے لیکن دوسرے مصرعے میں شاعر ایک ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کی ناظر کو قطعاً توقع نہیں تھی اور جو ناظر کو خیالات و احساسات کی ایک سطح سے اوپر اٹھا کر خیالات و احساسات کی ایک لطیف تر سطح پر پہنچا دیتی ہے۔ نفسیات میں اس عمل کو عمل مرابطہ (BISOCIATION) کا نام دیا گیا ہے اور اس کا محرک اس فنکارانہ جست کو قرار دیا گیا ہے جس کے طریق کار کے بارے میں ابھی کچھ زیادہ انکشافات نہیں ہو سکے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر لیجیئے۔

کیا پوچھو ہو وجود و عدم اہل شوق کا　　　آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

پہلے مصرعے کے مطالعہ سے ناظر سوچتا ہے کہ شاعر اہل شوق کی کم مائگی اور بے بضاعتی کا رونا روئے گا اور بتائے گا کہ یہ لوگ کس طرح استبداد زمانہ کے ہاتھوں پس گئے لیکن جب وہ دوسرے ہی مصرعے میں ان کے خس و خاشاک کی طرح جل مرنے کی یہ توجیہہ پیش کرتا ہے کہ اس کا باعث وہ آگ ہے جو ان کے اپنے سینوں میں جل رہی ہے تو ناظر حیرت و استعجاب کے ساتھ اس لطیف حقیقت کا ادراک کرتا ہے اور اسے ایک ایسا جمالیاتی حظ حاصل ہوتا ہے جو عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔

غزل کے شعر کے ہمہ گیر تاثر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ شاعر تفصیل اور تجزیئے کی بجائے کفایت اور اختصار کی مدد سے مرکزی نکتے کو ابھارتا ہے اور ناظر کی نگاہیں اس نکتے پر مرتکز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اشارے کنائے کو جس خوبی اور نفاست سے غزل نے استعمال کیا ہے کسی اور صنف سخن میں اس کی مثال موجود نہیں۔ اسی سے وابستہ غزل کے شعر کی یہ خوبی بھی قابل غور ہے کہ یہ بات کو ادھورے انداز سے پیش کرتا ہے اور بات کی تکمیل کو ناظر کے تخلیقی عمل کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ غالب ہی کا یہ شعر لیجیئے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بظاہر اس شعر کے ہر مصرعے میں ایک مختلف بات کہی گئی ہے اور دونوں میں کوئی خارجی ربط موجود نہیں۔ تاہم ان دونوں مصرعوں میں ایک ایسا داخلی ربط ہے جو شاعر کی فنکارانہ جست کے باعث معرض وجود میں آیا تھا۔ لیکن شاعر نے اس حقیقت کو ناظر تک منتقل کرنے کیلئے تفصیل و تجزیئے کی بجائے اشارے کنائے سے کام لیا ہے اور اس دخلی ربط کا ادراک کرنے کے لئے ناظر کو سعی تخلیق پر اکسایا ہے۔ چنانچہ شعر کے مطالعہ کے بعد جب ناظر کو اچانک اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی اس شمع کی طرح ہے جسے صبح ہونے تک جلتے رہنا ہے تو خود ناظر کو ایک تخلیقی عمل کا احساس ہوتا ہے۔ گویا اس نے خود کوئی "نئی بات" دریافت کر لی ہے۔ فی الاصل "دریافت" کا یہی عمل ایک جمالیاتی حظ کا باعث بھی ہے۔

(باقی صفحہ ۸۴ پر)

مغربی پاکستان کے عوامی رقص

یہ آزاد سرزمین جس کی وسیع پہنائیوں پر بے شمار ندیاں تلے اپنے روپہلی اکتارے بجاتے ہیں، ہوائیں طرح طرح کی خوشبوؤں سے سرشار پہاڑوں وادیوں، سبزہ زاروں، کھیتوں پر اٹھ اٹھ کر مستانہ وار ناچتی گاتی ہیں اور کہیں یہ دونوں نت نئے حلقے بنا بنا کر ایک گھن گرج، ایک جھنکار پیدا کرتی ہیں۔ اگر یہ گیتوں اور ناچوں کی سرزمین نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ پھر ایسے لوگ جن کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں آزادی ہی کی روح رچی بسی ہے، جن کے سینوں میں زندگی ہی زندگی ہے۔ اگر یہاں نغمہ و رقص کی چہل پہل نہیں ہوگی تو اور کہاں ہوگی، اور یہ حقیقت بھی ہے۔ پاکستان جہاں طرح طرح کی زندہ دل قومیں آباد ہیں، عوامی گیتوں، رقصوں، اور رومانوں کا گہوارہ ہے۔ گیت ہیں تو ان گنت، رقص ہیں تو بے شمار۔ اور جہاں زندگی گیت اور رقص ہوں وہاں رومانوں کا ہونا لازمی ہے۔ صرف مغربی پاکستان ہی کو لیجئے۔ اس میں رقص و موسیقی کی ایک دنیا نظر آئے گی۔ سچ پوچھئے تو کلاسیکی فنون سے اکتائے ہوئے انسانوں کو ان عوامی گیتوں اور رقصوں میں سیدھے سادے فنون کا ایک بہت بڑا خزانہ ہاتھ آگیا ہے۔

ذرا کان لگا کر سنئے۔ یہ میٹھی میٹھی دھنیں، یہ گنگناتی ہوئی سریلی صدائیں! یہ انہی عوامی گیتوں کی گونجار، انہی بے ساختہ رقصوں کی جھنکار ہے۔ آئیے انہیں قریب سے سنیں اور دیکھیں۔ ان سے زندگی کیسے چھلکی پڑتی ہے۔ بھرپور خوشی کی ایک مچلتی ہوئی لہر۔ جبھی تو ان کا آہنگ اتنا زوردار ہے۔ اور اس میں کوئی کاوش بھی نہیں۔ بالکل بے ساختہ جیسے زندگی خود بخود گیت یا رقص کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔ کیوں نہ ہو۔ جب مغربی پاکستان کی نکھری نکھری آزاد فضاء میں چودھویں کا چاند طلوع ہو اور ہر طرف جھلمل جھلمل کرتی ہوئی روشنی کا جھرنا جھرنے لگے، تو ایک پنجابی فلمی گیت کے الفاظ میں "جٹ ہیلی دے وچ گجدا اے" (جاٹ کھیت میں پڑا گرجتا ہے)۔ کوٹھیاں (کھلیان) بھری پڑی ہوں، شادیاں رچی ہوں، ہر طرف گہما گہمی ہو، تو دل کی رہ رہ کر مچلتی ہوئی امنگیں آپ ہی آپ ہونٹوں پر آجاتی ہیں یا ہاتھ پاؤں کی مستانہ وار جنبشوں میں ڈھل ڈھل کر ایک قدرتی رقص کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ یہ گیت، یہ ناچ تو بس رُت کی چیز ہیں۔ اور پھر ان کے پیچھے جنم جنم کا طلسمی اثر بھی تو ہے۔ مغربی پاکستان کی تاریخ کے نت نئے موڑوں پر نظر ڈالئے۔ نسلوں اور واقعات کا ایک بے پایاں سلسلہ ہے جس کی نہ حد ہے نہ انتہا۔ جیسے ایک رنگا رنگ فانوس گردش میں ہو۔ دراوڑوں، آریاؤں، سیکتھیوں، یونانیوں، عربوں، افغانوں، منگولوں کی گوناگوں تصاویر نظروں پر ایک طلسمی کیفیت پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے احساسات اور امنگیں بھی تو ایسی ہی بوقلموں ہوں گی۔ ان سب پر رومان کی ایک روپہلی سنہری چادر چھائی ہوئی ہے۔ انہی نیرنگیوں کی چھوٹ مغربی پاکستان کے عوامی گیتوں اور رقصوں پر بھی پڑتی ہے۔ گیت اور ناچ تو گویا ان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ اس وسیع و بوقلموں کینوس کے ایک ایک گوشے پر نظر ڈالئے۔

سرحد کے جری جنگجو جن کی بہادری اور نشانہ بازی کی سب دنیا پر دھاک ہے۔ کافرستان کی نیلوفر جیسی آنکھوں والی، برفانی خطوں کی مہ جبین حسینائیں وادی مہران کی کپاس چننے والی عورتیں۔ بلوچی شتر سوار سسی کے ڈاچیوں والے، جو جنگ کے فسانہ خواں شیر افضل جعفری کے الفاظ میں ڈھولے گاتے ہوئے اونٹوں پہ سوار آتے ہیں۔ راوی و چناب کی رانجھوں، مہینوالوں، مرزاؤں کی جادو کرنے والی ہیریں، سوہنیاں اور صاحبائیں۔ مٹیار جٹیاں۔ یہ سب زندگی کی روح اور ماحول کی مست کن فضا سے سرشار ہمیشہ گیت گاتے اور ناچتے رہے ہیں۔ اور جھونپڑوں کے جھرمٹ کے گاؤں کی گلی کوچے، در و دیوار ان کی وجد آفریں نواؤں سے ہمیشہ گونجتے رہیں گے۔

مغربی پاکستان پر نظر اٹھاتے ہی ہمیں سابق سرحد کے بلند بالا جیالے، کڑیل بہادر دکھائی دیتے ہیں۔ رزم اور بزم دونوں کے دھنی! ان کی امر

خٹک ناچ (سرحد)

جھومر (مغربی پنجاب)

ککلی: چھوٹی عمر کی لڑکیوں کا ناچ
(مغربی پنجاب)

مغربی پاکستان کے عوامی رقص

شہرت کو دیکھتے ہوئے کہ "حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر" کون یقین کرے گا کہ ان کے گلوں میں یہ جادو ہوگا۔ ان کے ٹپے سنتے ہی دل میں کٹار بن کر اتر جاتے ہیں گے۔ اور یہ خٹک ناچ !۔ ذرا پاس سے دیکھئے۔ رزم و بزم کا یہ گٹھ بندھا اس میں کتنا لطف ہے۔ گیت اور ناچ تلوار کی دھار اور خون کی موجوں پر پروان چڑھتے ہوئے۔ جبھی تو دنیا میں دور دور رہنے والوں کی نظر اس ناچ کی طرف کھنچ آتی ہے۔ یہ تو پہاڑوں اور کھلی فضاؤں کا ناچ ہے۔ ذرا کسی قبیلہ میں جیت یا خوشی سے ترنگ پیدا ہوئی اور اس کی روح اپنے پورے جلال اور آن بان کے ساتھ اس ناچ میں ابھر آئی۔ رومانوں کا دور دورہ ہو یا میدانِ کارزار سے پہلے شجاعت کا، سرحد کے جری فرزند اسی میں اپنی آتشیں طبیعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غور کیجئے اس ناچ میں کہیں کوئی نرمی یا سستی ہے۔ ذرا بھی نہیں۔ یہ تو چاق و چوبند، تیز گرم روح کا شعلۂ جوالہ ہے۔ جفاکشی اور مزاحمت کی جنگی خاصیت اس کی تند و تیز حرکات میں نمود پاتی ہے۔ اور پھر یہ حیرت انگیز سکت !۔ سر کے عین درمیان مانگ نکالے، کامدار واسکٹیں پہنے، بھولے بھالے بڑے بڑے گھیردار پائجامے اور کلائیوں پر ریشمی رومال باندھے یہ کڑیل کشیدہ قامت جوان گھنٹوں ناچتے جائیں، پھر بھی مجال کیا جو ذرا بھی تکان ہو۔ خودی کی نمود اتنی کہ ہر قبیلہ کا اپنا اپنا خٹک ناچ۔ رقاصوں کے دو الگ الگ قوس نما دائرے، ڈھول بجانے والوں اور ہائی لینڈروں کا سریلا ولولہ انگیز بیگ پائپ بجانے والوں کے گرد اگرد گھومتے ہوئے۔ کبھی الگ کبھی جوڑا جوڑا۔ مگر یہ کیا ؟۔ تیزی سے گھومتے گھومتے، ناچتے ناچتے دفعتہً تلواریں کیوں کھنچ آئیں ؟ جیسے اُمڈتے گرجتے بادلوں میں چکا چوند پیدا کرتی بجلیاں۔ اور ان کی یہ بے تحاشا چکا چاک جیسے صاعقوں کی کڑک۔ اس تلوار زنی میں کتنا قرینہ ہے اور یہ تال سُر پہ کیسی پوری اُترتی ہے۔ یہ تو فوجی کرتب نہیں فن ہے فن۔ اور یہ بلا کے تیز چکر !۔ ان کو دیکھنے والا بھی تو ناچنے والوں کے ساتھ ہی گھومنے لگ جاتا ہے۔ اور پھر لگاتار کئی کئی گھنٹے پنجوں کے بل گھومنا کہ یورپ کے ماہر رقاص بھی مات کھا جائیں۔ جیسے فضا میں کوئی اُجلا اُجلا قاز بل کھا رہا ہو۔ گت اب تیزی کے ساتھ دُرت بننے لگی۔ تیز اور تیز، جیسے بگولا گھوم رہا ہو۔ رقاصوں کا بدن گھومتا ہوا سفید ستون بن گیا۔ اور سارے کا سارا ہجوم کس تندی سے ناچنے گھومنے لگا۔ حلقہ اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ تماشائی بھی بے تاب ہو ہو کر حلقے میں شامل ہونے لگے۔ لے لو، ڈھول بجانے والے بھی میدان میں کود پڑے اور بے تحاشا چکر کاٹنے لگے۔ یہ تو سچ مچ انجمن کی انجمن یعنی قبیلہ کا قبیلہ رقص میں ہے ؛

لٹی ناچ بھی کچھ کم نہیں۔ یہ نوجوان پٹھانوں کا ناچ ہے جو کبھی اکیلے ہی اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر یہ کیا ؟ خٹک ناچ سے آپ کا سر گھوم رہا ہے ؟ نہیں آپ سوچ رہے ہیں۔ یہ تو مردوں کے رقص ہوئے، عورتوں کا رقص ؟ وہ اپنے دل کی ترنگ اور من کی اُمنگ کیسے پوری کرتی ہیں ؟ ان کا بھی ایک رقص ہے۔ آپ اس کو بھی دیکھ سکتے ہیں مگر اس صورت میں کہ آپ بھی کسی قبیلے میں گھل مل جائیں اور اسی کے بن کر رہ جائیں۔ ابھی آپ صرف تصور کی آنکھ ہی سے اس کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ قریب قریب وہی سماں ہے جو چناب اور راوی کی وادی میں "جھومر" کا ؛

آئیے اب ذرا ہزارہ کی سیر کریں۔ برسات کی ننھی ننھی بوندیوں کی رم جھم کی طرح سریلی جھنجھناہٹ، جل کے بِنا جل ترنگ ! پیتل کی یہ ننھی ننھی گھنٹیاں یعنی گھنگرو اپنی چھن چھن کے لئے دُور دُور تک مشہور ہیں۔ یہ ہزاروں گھنگرو جب اکٹھے جھنجھنا اُٹھتے ہیں تو ہزارہ کے پہاڑی ماحول پر جس میں کبھی یونانیوں نے صدہا سال پہلے ناچ اور راگ رنگ کی محفلیں برپا کی ہوں گی، ایک عجب سماں طاری ہو جاتا ہے۔ یہاں کے ناچ کے کیا کہنے۔ بڑا ہی البیلا

گھنگروؤں کی چھن چھن اور لے کا تال میل کانوں سے گزر کر دل میں اُتر جاتا ہے۔ گانے کی کوئی پیاری پیاری ہر دلعزیز دھن سونے پر سہاگہ بن جاتی ہے۔ رقاصوں کے ایک طائفہ نے گیت کا ایک بند ختم کر دیا اور دوسرے نے اس کے ٹیپ کے بول دُہرا کر تان اُٹھائی، سلسلہ آگے بڑھا۔ گیت بھی جاری ہے اور رقص بھی۔ اور سننے دیکھنے والوں کے دلوں میں تو یہ برسوں بعد بھی جاری ہی رہیں گے +

ایک قدم ادھر۔ اور ہم ٹھیک رومانوں کے گہوارے میں آپہنچے "ساریاں دیساں وچ دیس پنجاب تی سیئو (سکھیو، سارے دیسوں میں پنجاب ہی تو ایک دیس ہے) شہروں کی بات نہ کیجئے۔ اصلی دیس پنجاب تو سیدھے سادے کسانوں کا دیس ہے۔ وہی راوی، چناب، جہلم کے ارد گرد پھیلا ہوا بیلوں کا پنجاب جہاں سے رہ رہ کر رومانوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اور حسن عشق، رنگ رنگ کے گیت، طرح طرح کے ناچ مل کر ایک رومانوی پنج ند جاری کرتے ہیں۔ وہی خواب کا عالم! شاید "جتی چلی مربیاں دی سیل نوں" کی دُھن یاد آگئی، اور اس کے ساتھ وہ دیہات کی چلتی پھرتی چونچال زندگی بھی۔ وہ مست کن رنگا رنگ ناچ۔ دھرتی کے دل سے اُبھرتے ہوئے اور اس کی ان گنت سگندھیں لئے ہوئے۔

یہ رہا بھنگڑا۔ کیا ناچ ہے! بھولئے نہیں۔ یہ وزیر آباد، گجرات، جہلم کا باغ و بہار علاقہ ہے۔ سوہنی کا دیس۔ اختر شیرانی کی سلمیٰ کی رنگ بھوم، جہاں چناب کی سطح پر بقول حفیظ "پھوٹتے ہیں رات دن کچے گھڑے"! یہ خوشی بھرا ناچ۔ واقعی گڑیل جاٹوں کا "کنکاں دیاں فصلاں پکیاں بنے" کے موقع پر دھرتی کے سینے پر دھمکتا ہوا ناچ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ یہ چھیلے لوگ جن کی سپہ گری کی دنیا بھر پر دھاک بیٹھی ہوئی ہے لیجئے ایک تنومند شخص بھاری بھرکم ڈھول لئے گھمر گھمر ڈھنڈورہ پیٹ رہا ہے "آؤ گاؤں کی ہری بھری شالاٹ میں آجاؤ تھوڑی دیر جاٹ لوگ موج میلہ کرلیں"! یہ سنتے ہی غول کے غول رواں ہو گئے اور پل جھپکتے میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ ایکا ایکی ناچ شروع ہوا۔ ساتھ "ڈھولا" یعنی پیا پیارے کا گیت فضاؤں میں گونجنے لگا۔ یہ ذوق و شوق یہ مستی یہ ترنگ۔ مغربی "راک این رول" اس کا کیا مقابلہ کرے گا۔

لیجئے تالیاں ہی تالیاں! نازک نازک نرم نرم ہاتھوں کی سنگت اسی کو کہتے ہیں۔ تالی اپنے ہاتھ پر نہیں، سنگ سہیلی کے ہاتھ پر پیٹی جائے۔ "گِدا" کے معنی ہی تالی کے ہیں۔

یہ رہا وہ ناچ جسے چینی رقاصاؤں کے طائفہ نے حال ہی میں ناچ کر دُنیا بھر میں مشہور کر دیا ہے — لُڈی۔ اس کے نام ہی میں ایک مستی ہے۔ جیسے کوئی خوشی کی ترنگ میں بے اختیار ناچنے لگے "پیکے والی" کا وہ سین یاد کیجئے جس میں مٹیاریں گھاس کے بڑے گٹھوں کے پیچھے قدآدم فصلوں کے اوجھل مست ہو ہو کر ناچتی اور آنکھ مچولی کرتی ہیں۔ کچھ لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی اور تال کا تار بندھ گیا۔ دوسریوں نے سُرتال اپنے انگ انگ میں سمو کر ناچ ہی ناچ بنا دیا گیا۔ کیا گیت ہے — "ریشم والا چانک وے۔ نلے مکھاں تے سجرا سک وے" ذکر کیا ہے، ریشمی دھاری دار دھوتی ہے۔ اور ہونٹوں پر دنداسے کا تازہ تازہ رنگ) پچھلے پہر یہ ناچ عجب بہار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ جب نگر نگر کی یادیں اور میٹھے رسیلے گیت مل جاتے ہیں۔ دھرتی اور جیون کے سچے سچے کھرے کھرے بول۔ تو حقیقت اور رومان کے دھارے گھل مل کر عجب کیف پیدا کرتے ہیں۔ یہاں بھی سہیلیوں کا جھرمٹ دائرہ ہی بناتا ہے جو پاک و ہند کے سب ناچوں کی سانجھی خصوصیت ہے۔ (باقی صفحہ ۶۰ پر)

افسانہ اور تصویر

(ایک گفتگو)

آغا بابر
مبارک حسین

بابر:۔ مبارک صاحب میں سمجھتا ہوں افسانہ نگاری اور مصوری کا تخلیقی طریق کار ایک ہی سا ہے۔ یہ اپنے اپنے تاثر کے فنی اعجاز کے دو روپ ہیں۔ جیسے مصور رنگوں اور خطوط کے امتزاج سے پیش کرتا ہے اور افسانہ نگار اظہار و بیان کی خوبیوں سے۔ میرے خیال میں دونوں کا روگ ایک ہی ہے۔ دونوں زندگی کے نقاد اور خلاق ہیں۔

مبارک:۔ آپ نے یہ بجا فرمایا کہ افسانہ اور مصوری اپنے اپنے تاثر کے فنی اعجاز کے دو روپ ہیں۔ غالب کا شعر ہے ؎

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

گویا میری رنگیں بیانی چمن میں جا کر نکہتِ گل بن گئی ہے۔ جو یہاں میرا نفس ہے، وہاں خوشبو ہو گئی ہے۔ بابر صاحب، افسانہ کی رنگیں بیانی ہو یا مصوری کی رنگ آمیزی، دونوں کے پیچھے جذبہ تو ایک ہی کار فرما ہے۔ یعنی تخیل کا اظہار۔ وہاں الفاظ، یہاں رنگ۔ اب رہا تخلیقی طریق کار۔ تو اس کا ذکر کرنے سے پہلے ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ تخیل پیدا کیوں کر ہوتا ہے؟

بابر:۔ تخیل پیدا ہوتا ہے۔ داخلی کیفیت اور مشاہدے سے۔ جب فنکار کی داخلی کیفیت سے مشاہدہ رگڑ کھاتا ہے تو چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔

مبارک:۔ آپ نے درست فرمایا۔ میں اس بات کی وضاحت یوں کروں گا کہ ایک دردمند شخص اپنی روح پر بڑا بوجھ محسوس کرتا تھا۔ اظہار کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی تھی۔ ایک دن کیا دیکھتا ہے کہ باز چڑیا پر جھپٹا۔ اس شخص نے کہا "آہ"! یہ آہ وہ پہلا شعر تھا جو کہا گیا۔ یہ وہ پہلا تخیل پارہ تھا جس نے اظہار کا مرتبہ پایا۔ اس کے اندر محسوسات کا ایک ذخیرہ تو موجود تھا مگر شعلہ نہیں بھڑکتا تھا۔ جونہی چنگاری پائی ایک دھماکا ہوا، شعلہ بھڑک اٹھا۔ دوسرے الفاظ میں اسے صرف محرک کی تلاش تھی۔ جونہی محرک مل گیا اس کے تخیل نے پختگی پائی اور فوراً اظہار کی منزل تک جا پہنچا۔

بابر:۔ آپ نے بڑی صحیح بات کہی۔ افسانہ نگاری میں بھی خارجی محرک کی یہی حیثیت ہے۔ عام اس سے کہ وہ محرک کیا ہے۔ وہ کوئی کردار بھی ہو سکتا ہے کوئی واقعہ بھی ......

مبارک:۔ اور کوئی مقام یا جگہ بھی۔

بابر:۔ جی ہاں۔ میرا خیال ہے مصوری میں بھی یہی ہوتا ہے۔

مبارک:۔ بالکل یہی۔ خارجی محرک ملتے ہی مصور بھی تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ محرک خواہ کردار کی شکل میں ہو یا کسی مقام یا واقعہ کی صورت میں۔

بابر:۔ جی ہاں۔ اس طرح تخیل کو جب تحریک ہوتی ہے تو فنکار اس تخیل کا اظہار کرنے کے لئے بیتاب ہو ہو جاتا ہے۔ اب رہی بات اس تخیل کو بیان کرنے کی۔ تو یہ تخیل لفظوں میں بیان ہو سکتا ہے۔ رنگوں میں بھی، سُروں میں بھی، نرت میں بھی۔ اپنے تاثر اور تخیل کو افسانہ نگار لفظوں میں بیان کرتا ہے اور مصور رنگوں میں۔ یہ گویا اپنا اپنا ذریعہ ہے اظہار کا۔

مبارک:۔ آپ کے ہاں الفاظ، میرے ہاں رنگ۔

بابر:۔ پھر اس MEDIA یا اس ذریعہ کی اپنی اپنی تکنیک ہے۔

مبارک :۔ تکنیک سے آپ کی مراد کیا ہے ؟

بابر :۔ تکنیک سے میری مراد آپ یہ سمجھ لیں : انداز بیان ، اسلوب یا طرز نگارش ۔ اور آپ کے ہاں رنگوں کے معاملہ میں اسٹائل یعنی آپ آرٹسٹوں کا اندازِ ترتیب ۔ مثال کے طور پر ایک بات کہی جا چکی ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسی بات کو دوبارہ کس انداز سے بیان کیا جاتا ہے ۔ اقبال نے وہی کہا جو قرآنِ مجید میں موجود تھا مگر اقبال کا انداز بیان اپنا تھا ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ افسانہ نگار کا قلم افسانہ لکھتے وقت جن مقامات پر رکتا ہے ، کیا مصوّر کا موقلم بھی انہیں مقامات پر رکاوٹ محسوس کرتا ہے ۔ پہلا مقام جہاں افسانہ نگار کا قلم رکتا ہے وہ الفاظ کی مناسب دروبست ہے اور آپ کے ہاں رنگوں کی مناسب ترتیب ، کیوں مبارک صاحب ؟

مبارک :۔ جی ہاں ۔ ہمارے ہاں کینوس دنوں تک نامکمل پڑی رہتی ہے محض اس لئے کہ رنگوں کی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی ۔

بابر :۔ اس کے علاوہ افسانہ نگار اور مصوّر جس رکاوٹ سے دوچار ہوتا ہے وہ بھی ایک ہی ہے ۔ میری مراد اس داخلی کشمکش سے ہے جو افسانہ نگار اور مصوّر مناسب رمزیت پیش کرنے کے لئے محسوس کرتے ہیں ۔ دونوں کے اندر یہ کشمکش ہوتی ہے کہ وہ جس رمزیت کے ساتھ تخیل کو عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں آیا اس رمزیت کو قارئین یا ناظرین سمجھنے میں دقت تو محسوس نہیں کریں گے ÷

مبارک :۔ جی ہاں تخیل کے اظہار میں ہمیشہ ہی دو باتیں رکاوٹ کا باعث رہی ہیں ۔ اخلاقی قدریں یا سیاسی قدریں ۔ شیکسپیئر اور غالب کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ۔ ان دونوں نے اپنے عہد سے بہت آگے آنے والے عہد کی باتیں کہیں ۔ اس لئے ان کی رمزیت ان کے عہد کے لوگ نہ سمجھ سکے ۔ اتنا عرصہ گزر چکا ، مگر مزے کی بات یہ ہے کہ آج بھی شیکسپیئر بغیر (COMMENTS) کے نہیں پڑھا جاتا اور غالب کا مطالعہ بغیر شرح کے نہیں ہوتا ۔ اور پھر ایک ایک شعر کی مختلف شرحیں موجود ہیں ÷

بابر :۔ اس میں شک نہیں کہ رمزیت کے ضمن میں اخلاقی اور سیاسی قدروں کی یہ کشمکش دونوں کو پیش آتی رہی ۔ آپ غور فرمائیے ہماری نفرتیں اور محبتیں ، ہماری خوشیاں اور غم ، ہماری ضرورتیں اور حاجتیں تو وہ بنیادی مانگیں ہیں جو اولادِ آدم کا مشترک سرمایہ ہے ۔ یہی وہ بنیادی مانگیں تھیں جن کے متعلق افسانہ نگار نے کہانیاں لکھیں اور مصوّر نے تصویروں سے نگار خانے بھر دیئے ÷

مبارک :۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگاری اور مصوّری دونوں ایک ہی جیسے مراحل سے گزرتی رہی ہیں ۔ شروع شروع میں جمالیاتی دور افسانہ نگاری اور مصوّری دونوں پر اثر انداز رہا ہے ÷

بابر :۔ جمالیاتی دور سے آپ کی کیا مراد ہے ؟

مبارک :۔ جمالیاتی دور سے میری مراد وہ دور ہے جس کی نقاشی میں انسانی کردار مستعلیق خطوط میں دکھائی دیتے ہیں اور ہلکے ہلکے خوشی پیدا کرنے والے رنگ ۔ جیسے کہ مسلمانوں کے دور کی مصوّری میں نظر آتے ہیں ۔ جہاں مصوّروں نے منی چیوئر (MINATURE) پینٹنگ میں انسانی سراپا اور منظر دونوں کو خوبصورت سے خوبصورت انداز میں پیش کیا ۔ جہاں کوئی ایسا تیز رنگ نہ تھا جو نظر کے لئے بار ہو ۔ کوئی بھدّے خطوط نہ تھے جن سے طبیعت بوجھ محسوس کرے ۔ جو کچھ تھا صرف حسن ہی حسن تھا ۔

بابر :۔ یعنی جیسے چغتائی کی نقاشی ؟

مبارک :۔ جی ہاں ۔ مگر چغتائی کی اسنر کاری اور مسلمانوں کے عہد کی منی چیوئر پینٹنگ میں صرف فرق اتنا ہے کہ اسی منی چیوئر کو یہاں بڑے سائز میں دکھایا گیا ہے ۔ نقش وہی ہے ۔ وہاں سمٹا ہوا تھا ۔ یہاں وسعت کے ساتھ ۔ دونوں میں جمالیاتی اقدار بدرجۂ اتم موجود ۔

بابر :۔ اب آپ کی بات واضح ہو گئی ۔ ہمارے ہاں افسانے کے جمالیاتی دور میں بھی جتنے افسانے لکھے جاتے رہے ان میں انسانی کردار خاص طور پر لڑکا اور لڑکی ، بڑے خوبصورت ہوتے تھے ۔ ہیرو بڑا بانکا سجیلا اور ہیروئین چندے ماہتاب چندے آفتاب بیان کی جاتی شفق پر سرخی ضرور ابھرتی اور باد بہاری ضرور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی ۔ اس دور میں زندگی کے تلخ حقائق موجود تو تھے مگر اس قدر نہیں جیسے کہ اب مسخ شدہ صورت میں ۔ لہذا مصوّر کا موقلم حسن کے ارد گرد کام کرتا رہا اور افسانہ نگار

ماں اور بچہ
۱۹۵۴ء

قحط بنگالہ ۱۹۴۳ء

ایک کوچہ
طولیدو (ہسپانیہ)
۱۹۵۲ء

پاکستان کے نامور فنکار

زین العابدین

کے چند نقوش

"زندگی" (۱۹۵۴ء)

زین العابدین کے نقوش

(۲)

"گون تانا" (کشتیاں کھینچنے والے) ۱۹۵۴ء

بنگالی خاتون (ایک تجریدی تاثر) ۱۹۵۳ء

کندہ کاری کا ایک نمونہ
(سفر جاپان کے دوران ، ۱۹۵۶ء)

کی شفق اور رباد ہماری اپنا اور دوسروں کا دل بہلاتی رہی۔ پھر زندگی کے مصائب براہ راست ہم سے متعلق ہو گئے۔ جہاں حقائق کی یہ تلخی مصور کے سامنے نئی دنیا لے آئی، وہاں افسانہ نگار بھی غیر محسوس طور پر اس سے متاثر ہوا۔ غالب کا شعر ہے ؎
"آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا۔ ہر کوئی واماندگی میں نالے سے ناچار ہے"۔ یہی صورت اس دور میں پیش آئی۔ افسانہ نگار اور مصور دونوں واماندگی کا شکار تھے۔ دونوں کی سوچ کا انداز بدل گیا۔ افسانہ نگار کے لب و لہجہ میں تلخی آگئی اور مصور کے ہاں غیر محسوس طور پر کرخت خطوط ابھرنے لگے۔ یہ افسانہ نگاری کا وہ دور تھا جس میں پریم چند کے افسانے بڑے مقبول ہو رہے تھے یعنی افسانہ نگار کو نئے اسلوب اور نئے انداز سے بات کہنی پڑی، مصوروں کو زیادہ واضح اور گہرے خطوط سے کام لینا پڑا اور مختلف رنگوں کا استعمال بھی عمل میں آنے لگا ÷

مبارک۔ مگر باہر صاحب زندگی کی تلخی نے یہیں بات ختم نہیں کی بلکہ اس کے ترکش میں اور بھی تیر تھے۔

باہر۔ آپ کا مطلب ہے کہ زندگی کے حقائق زیادہ تلخ ہونے لگے اور عام زندگی کا ڈھانچہ زیادہ پیچیدہ ہو گیا؟

مبارک:۔ جی ہاں میرا مطلب ہے کہ بعینہٖ زندگی کے ساتھ ہمارا موضوع بھی پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ زندگی کی اس پیچیدگی اور موضوع کے اس الجھاؤ کی وضاحت کے لئے مصور کو بھی لامحالہ اپنی کینوس وسیع کرنی پڑی۔ بالکل اسی طرح جس طرح افسانہ نگار نے اپنی جزئیات نگاری کے لئے افسانہ کی کینوس کو کشادہ کر لیا۔ اب دونوں نالے سے ناچار ہیں اور واماندگی کے اس الجھے ہوئے شدید دور میں دونوں کے دونوں اشاریت اور رمزیت کے قائل نظر آتے ہیں کیونکہ اخلاقی اور سیاسی قدریں دونوں کا راستہ روکے کھڑی ہیں ÷

باہر۔ جی ہاں۔ زندگی کے الجھاؤ کے لئے آپ کے ہاں جو رنگوں اور خطوں کی علامت وضاحت کر رہی ہیں۔ وہی وضاحت ہمارے ہاں افسانوں میں کنایہ، تشبیہ، استعارہ اور رمزیت سے کی جا رہی ہے۔

مبارک۔ واقعی افسانہ نگار اور مصور دونوں کا روگ ایک ہے۔ دیکھئے نا اب ہماری استرکاری میں ہلکے پھلکے خوشی پیدا کرنے والے رنگ غائب ہیں۔ ان میں زیادہ کرختگی آگئی ہے۔ حسن جیسے جلال میں ہو۔ کسی زمانہ میں ہماری تصویر کی آنکھ میں سرمہ ہوتا تھا مگر اب وہ آنکھ گھور رہی ہے یا ٹپر ٹپر دیکھ رہی ہے۔

باہر:۔ جی ہاں حسن کی یہ مسخ شدہ صورت ہر طرف جھلک رہی ہے۔ مصوری میں بھی افسانے میں بھی۔ یہ بحرانی اور اضطراری کیفیت زندگی کے پیچ در پیچ الجھاؤ کی پیدا وار ہے۔ اب افسانہ نگار بھی مصور کی طرح اپنے اندر زیادہ جھانکتا ہے۔ فطرت کی خارجی رنگینیوں میں اس کی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ اس کے قلب کے اندر خود کئی چور دروازے ہیں جن کا اسے علم اب ہوا ہے۔ اس پر یہ حقیقت اب ظاہر ہوئی ہے کہ افسانے کی ہیروئین کے لئے ضروری نہیں کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہو۔ کسی کالی کلوٹی سے بھی محبت ہو سکتی ہے۔ گویا اب حسن ایک نئے سانچے میں ڈھل کر سامنے آرہا ہے ÷

مبارک:۔ مگر باہر صاحب اب تو یہ چاند کا ٹکڑا بھی ایک حقیقت بن کر آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ اب تو افسانے کی ہیروئین شاید چاند پر سے کسی اور ہی صورت کی اترے ÷

باہر:۔ تصویروں میں بھی تو چاند ایک علامت ہے۔ اس سپٹنک کے دور میں مصوری کو آپ کیسے روئی میں لپیٹ کر الگ رکھ لیں گے؟ اس کا اثر پذیر ہونا بھی اتنا ہی یقینی ہے جتنا افسانے کا۔

مبارک:۔ وہ تو ٹھیک ہے۔

باہر:۔ تو پھر آپ سوچ کیا رہے ہیں؟

مبارک:۔ میں مصور کی ایک ایسی مشکل سوچ رہا ہوں جس سے افسانہ نگار کو دوچار نہیں ہونا پڑا۔

(باقی صفحہ ۸۴ پر)

زین العابدین

جلال الدین احمد

آج سے کوئی پندرہ برس پہلے ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ بنگال میں سخت قحط پڑا۔ کئی لاکھ مرد، عورتیں اور بچے بھوک اور فاقہ زدگی کا شکار ہو کر موت سے ہم کنار ہوئے۔ دیہات سے لیکر چھوٹے چھوٹے شہروں تک' اور ان چھوٹے شہروں سے کلکتہ تک فاقہ زدوں کا ایک رینگتا، گھسٹتا کارواں تھا جن میں کتنے ہی راستے میں مر کھپ گئے اور جو کلکتہ پہنچ بھی گئے وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے ارد گرد پڑے روٹی کے گلے سڑے ٹکڑوں پر جھپٹتے، غراتے ہوئے کوّوں اور کتّوں سے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے زندگی سے ہاتھ دھو گئے۔

مصوری کا ایک جواں سال استاد' جو لڑکپن میں گھر سے اس لئے بھاگ نکلا تھا کہ وہ بڑا ہو کر بڑے بڑے رنگین مناظر کی تصویریں کھینچنے میں کمال پیدا کرے گا، اور جس نے آرٹ اسکول کی طویل رخصتیں سنتھال پرگنہ کی دلفریب اور زندگی سے بھرپور عورتوں کی تصویریں کھینچنے میں بسر کی تھیں، ایک دن اسکول جا رہا تھا کہ اسے راستے میں ایک ماں اور بچہ دکھائی دئے ——— اُن ماں بچوں سے بالکل مختلف جن کی تصویریں وہ مصوری کے بڑے بڑے کلاسیکی شاہکاروں اور زندہ ماڈلوں سے تخلیق یا نقل کیا کرتا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی اسے اپنی مصوری کی کلاسیں بھول گئیں اور وہ ایک کرب اور خود رفتگی کے عالم میں اپنے چھوٹے سے کوٹھری نما کمرے پر لوٹ آیا۔ اُس رات اس نے "میڈونا ۱۹۴۳ء" نامی تصویر بنائی۔ حسرت، شیفتگی اور گہرے کرب کا یہ نقش، کم سے کم خطوط پر مشتمل ایک پُر زور خاکہ ہے، جس میں ایک بچہ بھوک سے بیتاب' ایک عورت ——— جو کچھ دیر پہلے اس کی جیتی جاگتی ماں تھی! ——— کے بھیانک پنجر کی فاقوں سے نڈھال چھاتیوں میں دودھ کی تلاش کر رہا ہے!! بچہ کی یہ معصوم' سوالیہ تلاش ——— اس المناک صورتِ حال پر بڑا ہی پُر معنی تبصرہ تھا اور انسانی ضمیر کے لئے ایک دلدوز چیلنج!

یہ ان متعدد خاکوں میں سے ایک تھا جو مصوّر نے سینکڑوں کی تعداد میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ تخلیق کئے تھے۔ یہ خاکے بغیر کسی اہتمام کے دیسی سیاہی اور مو قلم سے معمولی خاکی کاغذ کے پرزوں اور گتّے پر بنائے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک نیا اور بالکل غیر معروف نام "زین العابدین" مصوری کی دنیا پر بجلی کی طرح چمک گیا۔ فنّی حلقوں میں خط کشی پر اس جواں سال مصوّر کی اُستادانہ قدرت اور اس کی بھرپور، اختصار پسند اور گہری داخلیت کا چرچا ہونے لگا۔ یہ بنگال کا پہلا مسلمان مصوّر تھا جسے اتنی عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اِدھر یہ سب تھا، اور اُدھر خود زین العابدین اکیلا، چُپ چاپ اسی تیزی اور تاثر کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا اور خاکوں پر خاکے بنتے گئے۔ اُن دنوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مغربی نقاد اسٹوارٹ گرفن نے گزشتہ سال اپنے ایک مضمون میں زین العابدین اور اسپین کے عوامی مصوّر گویا کا موازنہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ: "مصور گویا کی طرح' جو جبر و تشدد، قید و بند اور جنگ و جدل کی صعوبتوں اور تباہ کاریوں پر غصّے سے جھلّا اٹھا تھا' زین العابدین بھی کھول اٹھا اور ہسپانوی مصور کی طرح گہرے تاثر اور طیش کے عالم میں یہ ہولناک مناظر مصوّر کرتا رہا ——— کئی کئی دن صبح سے شام تک اس مہیب لامتناہی سلسلے پر نظریں جمائے وہ خاکوں پر خاکے بنائے جاتا اور جب آخر کار اس کا دل ہلکا ہو گیا اور اس نے کام روکا تو دو ہزار کے قریب نقش تیار ہو چکے تھے! جن میں برصغیر کے اس دلدوز حادثے کا نقشہ یوں پیش کیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے آئے، ان خاکوں کو دیکھے اور پوری طرح اندازہ کرلے کہ یہ حادثہ کیسا جانکاہ اور کتنا سنگین تھا۔ اس طرح ایک نوجوان مصوّر، جس کا نام شاید ہی کوئی جانتا ہو، تھوڑے ہی عرصے میں ایک عظیم فن کار تسلیم کر لیا گیا!!"

آج زین العابدین اپنی عمر کے چالیسویں سال میں ہیں، لیکن اب بھی پہلے ہی کی طرح شرمیلے، حسّاس، اور دھن کے پکّے۔ پاکستان میں آرٹ کی ایک زبردست تحریک کے روحِ رواں۔ وہ مشرقی پاکستان میں فن کاروں کے اُس حلقے کے بانی اور اس کے سب سے ممتاز فن کار ہیں جسے عام طور پر "ڈھاکہ آرٹ گروپ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ گورنمنٹ آرٹ انسٹی ٹیوٹ ڈھاکہ کے پرنسپل بھی ہیں۔ یونیسکو اور مختلف بین الاقوامی اداروں کے زیرِ اہتمام ان کی تصاویر کی متعدد نمائشیں ہو چکی ہیں نیز برطانیہ، فرانس، ترکی، جاپان، میکسیکو اور امریکہ کے کئی کئی شہروں میں الگ الگ ان کا کام خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔

اگلے پچھلے دنوں ٹوکیوں میں ان کی نمائش کے موقع پر ایک جاپانی نقاد ولیس گرگی نے کہا تھا کہ "جہاں تک طرح، موضوع تک رسائی اور تکنیک کا تعلق ہے یہ مصور ایک عظیم و قدیم ملک کی فنی میراث سے کما حقہ واقف ہے اور ساتھ ہی ان نئے نئے تصورات پر بھی حاوی ہے جو عالمگیر ہوتے جا رہے ہیں۔ اسے فضا اور پس منظر کی ان تمام پیچیدگیوں، ہیئت کے جدا جدا پاروں اور قدرت کی اقلیدسی تشکیل کا فطری احساس ہے جس کی ملکیت" CUBISM کے علمبردار حمایت کرتا ہے۔ لیکن معلومات کے اس نئے خزینے سے اس نے صرف اتنا ہی کچھ لیا ہے جتنا وہ خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فن کی قومی اور مقامی روایتوں سے آمیز کر سکتا ہے"۔

اس سے پہلے ۱۹۵۲ء میں جب پہلی دفعہ بامکلے گیلریز لندن میں زین العابدین کی تصاویر کی نمائش ہوئی تو انگلستان کے مشہور نقاد ایرک نیوٹن نے بھی زین العابدین کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ "ان تصویروں میں مشرق و مغرب کا ایسا امتزاج نظر آتا ہے جسے تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت دیکھ بھی رہا ہے اور سوچ بھی رہا ہے۔ اور اس کے موقلم کی رفتار، جو نہ کبھی جھجکتی ہے اور نہ کبھی جھٹکے کھاتی ہے، اس کے مقصد کے لئے عین موزوں ہے اس کا ہاتھ ایک خالص مشرقی فن کار کی طرح مخصوص روایتی انداز میں موقلم تھامے ہوئے جاذب کاغذ پر پانی اور رواں کالی روشنائی کے سوا کچھ نہ برتتے ہوئے کام کرتا نظر آتا ہے لیکن پورے وقت یہ احساس بھی ہوتا رہتا ہے کہ ایک یورپی آنکھ اس کی رہنمائی کر رہی ہے"۔

زین العابدین کی اس ابتدائی شہرت نے جو قحط بنگال کے خاکوں کی بنا پر ۲۶ سال کی عمر میں حاصل ہو گئی تھی، انہیں بھی اس شدید خطرے سے دوچار کر دیا جس کے شکار ہو کر کتنے ہی ہونہار کار فن آئندہ ترقی کی راہیں گنوا بیٹھتے ہیں، یعنی غلط احساسِ طمانیت۔ اس کے برعکس زین العابدین ایک فعال مصور کی حیثیت سے برابر تن دہی کے ساتھ اپنے طبعی جوہروں کو مسلسل مشق و ریاضت سے بروئے کار لاتے اور فن کے میدان میں آگے بڑھتے رہے۔ نئے نئے اسلوب سیکھنے اور انہیں سمجھنے اور برتنے میں وہ آج بھی سب سے آگے ہیں۔

زین العابدین پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۱۷ء میں، ضلع میمن سنگھ (جو اب مشرقی پاکستان میں شامل ہے) کے قصبہ کشور گنج میں پیدا ہوئے۔ یہ ضلع خالص زراعتی ہے یہاں دھان خوب ہوتا ہے اور عابدین کی ابتدائی یادیں اسی علاقے کی سیدھی سادی زندگی اور اس کے دلفریب قدرتی مناظر سے وابستہ رہیں۔ رواں دواں برہم پتر دریا جو ہرے بھرے دیہاتوں کے گرد بل کھاتا ہوا ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ بہا رہتا ہے، ان یادوں میں ایک نئی جوت جگاتا ہے افلاس، سادگی اور حسن کے اس ماحول میں ایک طرح کی اداسی رچی ہوئی ہے، اور دل میں ڈوب کر سوچنے والی کیفیت بھی جسے عابدین نے بعد میں بڑی چابکدستی سے دھیمے دھیمے آبی رنگوں اور تیکھے تیکھے، بھرے بھرے، زوردار خطوط میں اسیر کر کے زندہ جاوید کیا۔

عابدین کے باپ پولیس افسر تھے اور ان کی خواہش تھی کہ یہ بچہ بھی بڑا ہو کر پولیس افسر بنے لیکن نوعمر عابدین کو شروع ہی سے مصوری میں فطری دلچسپی تھی۔ اپنے اسکول کی کاپیوں پر حساب کے سوال کرنے کے بجائے وہ عجیب و غریب نقش و نگار بنایا کرتے۔ چنانچہ خاندانی روایات کے خلاف وہ بڑے ہی استقلال اور ثابت قدمی سے جدّوجہد کرتے کرتے کلکتہ سکول آف آرٹ جا پہنچے۔ یہاں انہوں نے فنونِ لطیفہ کا چھ سالہ کورس بڑے امتیاز سے مکمل کیا اور فوراً اس اسکول میں استاد بھی مقرر ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آئی تو عابدین نے ڈھاکہ میں ایک آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا منصوبہ بنایا جو اب پاکستان میں نقاشی و مصوری کی تعلیم کا بہترین ادارہ بن گیا ہے۔ یہاں فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ کمرشل آرٹ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ مکمل نصاب پانچ سال کا ہے اور تمام معلم پاکستانی ہیں، جن میں سے اکثر پہلے بھی زین العابدین کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ عابدین خود اس کے پرنسپل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انتظامی ذمہ داریوں نے ان کے تخلیقی کام کے لئے زیادہ وقت نہیں چھوڑا ہے پھر بھی مصوری سے انہیں جو شغف ہے اس کی بنا پر وہ کبھی ہسپانوی مصور ال گریکو کے ایوان کو ایک مصور کا خراجِ عقیدت پیش کرنے میڈرڈ پہنچ جاتے ہیں۔ اور کبھی میکسیکو میں راہ چلتے منظر کشی کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں کبھی جاپانی پرنٹ اور کندہ کاری کا فن سیکھنے کے لئے ٹوکیو اور نارا کے مصوروں میں جا بیٹھتے ہیں اور کبھی چٹاگانگ کے قبائلی علاقے میں ہفتوں قیام کرنے کے بعد

یکایک ڈھاکہ میں نمودار ہو جاتے ہیں رنگا رنگ علاقائی اور عوامی آرٹ کے نادر نمونوں کو جمع کئے ہوئے، اور اپنی خاکہ کشی کی کاپیوں کو بیسیوں اسکیچوں اور خاکوں سے بھرے ہوئے! اس تمام عرصے میں زین العابدین نے اس کثرت سے تصاویر بنائی ہیں، اور اتنے مختلف اور گوناگوں پیرایوں میں، کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ پھر بھی انہیں تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 'امپرشنسٹ' انداز کی ابتدائی منظر کشی سے شروع ہو کر قحط کی تصاویر پہ ختم ہوتا ہے، یعنی ۱۹۳۸ سے ۱۹۴۷ تک۔ اس دور کے اکثر نقوش، خاص طور سے ابتدائی حصے میں، خالص معروضی اور تقریباً عکاسانہ نوعیت کے ہیں۔ خود قحط کی تصاویر میں مبالغہ آمیزی اور ایک طرح کی اشاریت کے باوجود بنیادی معروضیت ملتی ہے ÷

دوسرا دور ان نت نئے تجریدی اور نیم تجریدی تجربوں کا ہے۔ جو ۴۸-۱۹۴۷ء میں کمرشل آرٹ میں زین العابدین کی دلچسپی سے شروع ہو کر ۱۹۵۴ء تک کی تصاویر پر مشتمل ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایچنگ اور لیتھوگراف میں بھی کافی کام کیا۔ اس دور کے کام کی نوعیت زیادہ تر تجرباتی ہے۔ لیکن بعض تصاویر، مثلاً "مزار قائد اعظم کے راستے میں" اور "سنگار" فنی پختگی کی آئینہ دار ہیں۔

تیسرا دور ۱۹۵۴ء سے شروع ہوتا ہے جب تجریدی تجربوں میں ان کی دلچسپی بڑی حد تک ختم ہو گئی اور وہ دوبارہ اپنے معروضی اسلوب کی طرف رجوع ہوئے۔ تجریدی تجربوں نے اشکال اور اوضاع، ان کے تناسب اور ترتیب کا جو نیا شعور انہیں دیا، وہ ان بعد کی تصاویر میں بھی نمایاں ہے لیکن ان مرقعوں کی دلآویزی بنیادی طور پر اپنے خطوط کی پائداری اور اپنے رنگوں کے معتدل استعمال پر مبنی ہے ÷

مابعدِ قحط کی تصاویر سے صراحتہً پتہ چلتا ہے کہ عابدین اپنے فن میں وہ ضبط و اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ان کے پختہ تر کاموں میں نمایاں ہے۔ مثلاً وہ بڑی زوردار تصویر جس کا عنوان ہے "زندگی" یا خطوط کا وہ حیرت انگیز مرقع "کشتی کھینچنے والے"۔

یہ صحیح ہے کہ زین العابدین کی آبرنگی تصاویر میں جو چابکدستی اور روانی ملتی ہے وہ عام طور پر اُن کی روغنی یا مخلوط الاسلوب (گواش) تصاویر میں مفقود ہے۔ لیکن یہ فرق پیرائے سے زیادہ موضوع کا فرق ہے۔ جہاں مصور اپنے موضوع پر حاوی ہے وہاں پیرایہ اور اسلوب پوری طرح مصور کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایرک نیوٹن نے عابدین کی انہیں تصاویر کے ضبط و اعتدال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابتدائی دور بالخصوص قحط کی تصویروں کے برخلاف "ان حالیہ مرقعوں میں موضوع کے سامنے آتے ہی فوراً تصویر بنا ڈالنے کی بےچینی مفقود ہے اور اس کی جگہ ایک منضبط ٹھہراؤ نے لے لی ہے۔ اب مصور کو جلد جلد برش چلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی 'سبزی منڈی' بجائے خود ایک رنگا رنگ، ہنستا بولتا ہوا نظارہ ہے جس میں مزے مزے سے ہلکورے لیتی ہوئی کشتیاں خود ہی جزئیات مہیا کر دیتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فن کار کا ہنر اپنی جولانی دکھاتا ہے۔ اور اس میں مشرق و مغرب ایک دوسرے سے گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تصاویر میں پیش منظر خالصاً مشرقی ہے۔ لیکن پس منظر کی تفصیلات میں مغربی رچاؤ ہے۔ بار بار تصویر کے خدوخال یاد دلاتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایشیائی ہے۔ لیکن جزئیات کی ترتیب اور تقسیم پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انگریز آب رنگی فن کار کے موقلم سے نکلی ہیں" مشرق و مغرب کو آمیز کرنے اور دونوں کے امکانات سے تخلیقی فنکاری کا حق ادا کرنے کی یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بناء پر آرٹ سے لگاؤ رکھنے والے عابدین کے فنی مستقبل کو بڑی پُرامید نظروں سے دیکھ رہے ہیں ÷

سنتھال عورتیں

عمل : زین العابدین

ریڈیو ڈرامہ میں مکالمہ نگاری

آغا ناصر

ریڈیو ڈرامہ یوں تو عام ڈراموں ہی کی طرح ہوتا ہے اور اس میں وہی ساری باتیں پائی جاتی ہیں جو ایک اسٹیج کے ڈرامہ یا اس ڈرامہ میں ہوتی ہیں جو پڑھنے کے لئے لکھا گیا ہو۔ کہانی، پلاٹ، کردار، کسی قسم کی کش مکش اور پھر اس کا عروج۔ لیکن ان مشترکہ باتوں کے باوجود اگر فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ریڈیائی ڈرامہ اور اسٹیج ڈرامہ دو قطعی مختلف اصنافِ ادب ہیں۔

ریڈیو پر ہم صرف آوازیں سنتے ہیں۔ اس لئے ریڈیو ڈرامہ میں صرف یہی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ یہ سننے کے لئے لکھا جا رہا ہے۔ ریڈیو کے لئے لکھنے والا اپنی تحریر کو اس نظر سے پرکھتا ہے کہ وہ سننے میں کیسی ہے۔ اس کے برخلاف عام لکھنے والے اپنی تخلیقات کو اس نظریہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ پڑھنے میں جاذبِ توجہ، خوبصورت اور معیاری ہیں یا نہیں۔ یہی ابتدائی فرق ریڈیو کے لکھنے والے اور عام لکھنے والوں کو ایک دوسرے سے دُور لے جاتا ہے اور یہیں سے ریڈیو کے لکھنے والے کی مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ ہم سب کچھ پڑھ کر یا دیکھ کر سمجھنے کے عادی ہیں، اس لئے کوئی بات صرف سنا کر سمجھانا مصنّف کے لئے ایک دشوار مرحلہ ہے۔

یوں بھی آنکھیں ایک وقت میں زیادہ چیزیں دیکھ اور سمجھ سکتی ہیں، کان اس کے عادی نہیں ہوتے۔ مزید یہ کہ کوئی مضمون، افسانہ یا ڈرامہ پڑھنے میں اگر ہم اُلجھ جائیں اور کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس حصّہ کو دوبارہ پڑھ کر سمجھا جاسکتا ہے، لیکن سننے والے کے لئے ہر فقرہ، ہر جملہ اور ہر لفظ صرف ایک بار ہی سننے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی تو اس اُلجھن سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس اُصول کو تسلیم کر لینے کے بعد 'بات کا واضح کرنا' ریڈیو کے لکھنے والوں کی تحریر کا سنگِ بنیاد بن جاتا ہے۔ ریڈیائی پروگراموں میں مکالمے مختصر، واضح اور صاف ہونے ضروری ہیں۔

ذکر اچانک مکالموں کا آگیا۔ اس لئے نہیں کہ مضمون مکالمہ نگاری سے متعلق ہے بلکہ اس لئے کہ ریڈیو ڈرامہ میں سننے والوں تک اپنے خیالات پہنچانے کے صرف دو ہی ذریعے ہیں۔ یا تو بذریعہ راوی یعنی ایک آواز کے ذریعہ جو ساری بات خود ہی بتاتی چلی جائے، یا مکالمہ کے ذریعہ یعنی مختلف کرداروں کی زبانی ——— اور اب تو زیادہ تر مکالمے ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ڈراموں میں راوی کو پسند اور استعمال کرنے کا زمانہ اب شاید ختم ہی ہو گیا۔ زیادہ تر لکھنے والے صرف مکالموں ہی سے کام لیکر ساری کہانی بناتے ہیں۔ اور کھیل کا تمام تر دار و مدار صرف مکالموں ہی پر ہوتا ہے۔

کہانی کو آگے بڑھانے، کرداروں کو روشناس کرانے، منظر اور مقام (SCENE AND LOCALE) کو ظاہر کرنے اور اوقات اور مدت کے تعیّن کے لئے ریڈیائی ڈرامے میں صرف مکالمے ہی کام آتے ہیں۔ اسی لئے ریڈیائی ڈرامہ میں مکالمہ نگاری اور اس کے فن کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ آپ نے یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جو مکمّل فقرے بولتے ہوں۔ یا ایک ہی موضوع پر بہت دیر تک بولتے چلے جاتے ہوں۔ عام طور پر ہم ایک بات شروع کرتے ہیں اور پھر اسے درمیان ہی میں چھوڑ کر کوئی دوسری بات شروع کرنے لگتے ہیں۔ ایک جملہ شروع کرتے ہیں اور اُسے پورا کئے بغیر کوئی دوسرا فقرہ بولنے لگتے ہیں۔ ریڈیو ڈرامہ نگار اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کے لئے ادھورے مکالمے اور نامکمل فقرے استعمال کرتا ہے۔ یہی ادھورے مکالمے اگر ناول، افسانے یا اسٹیج کے ڈراموں میں شامل کر دیئے جائیں تو یہ مصنف کی ناتجربہ کاری کی دلیل ہوں گے۔ ناول اور اسٹیج ڈرامہ میں قارئین اور ناظرین ہوتے ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ قاری یا ناظر ہیں لیکن ریڈیو ڈرامے کے سامعین جانتے بوجھتے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ صرف سننے والے ہیں۔ انہیں اپنے تخیّل سے کام لینا ہوتا ہے۔ ریڈیو ڈرامہ سمجھنے کے لئے انہیں اپنے تصوّر کی مدد درکار ہوتی ہے اور تصوّر کی اس دنیا میں وہ اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ وہ سامعین کی بجائے خود کو ڈرامہ کا ایک فرد سمجھ بیٹھتے ہیں اور ڈرامہ میں بذاتِ خود شامل ہو جانے کے بعد پھر وہ یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ دوسرے کردار ایسی گفتگو کریں اور ایسے مکالمے استعمال کریں جو وہ خود نہیں کرتے۔ ناظرین یا قارئین کی طرح سامعین التباس (ILLUSION) کا پردہ اپنے درمیان پسند نہیں کرتے۔ وہ تو ہر بات کو ایسے ہی دیکھنا چاہتے ہیں جیسے اپنی نجی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ کرداروں کو اسی انداز میں بولتے ہوئے سننا چاہتے ہیں جس انداز میں وہ خود باتیں کرتے ہیں۔ اور یوں ریڈیو ڈرامے میں مکالمہ نگاری کا سارا دار و مدار لکھنے والے

کے مشابہ سے پر ہوتا ہے جس حد تک مصنف مکالموں کو حقیقت سے قریب لانے میں کامیاب ہے اسی قدر اس کا ڈرامہ پسندیدگی کے ساتھ سنا جائے گا۔

روزمرہ زندگی میں ہم مختصر فقرے بولتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ چار آدمی ایک جگہ جمع ہیں تو ان میں سے صرف ایک باتیں کئے جاتے اور باقی تین بالکل خاموش بیٹھ جائیں (جلسوں اور لیکچروں کے علاوہ یا اگر کوئی کسی خاص واقعہ کا حال یا کوئی کہانی سنا رہا ہے)۔ اسی لئے طویل مکالمے ریڈیو ڈرامے میں کوفت کا باعث بن جاتے ہیں۔ اگر ایک کردار ایک منٹ تک مسلسل بولتا رہے تو سننے والے کہتے ہیں: "پانچ منٹ سے بس یہی آدمی بولے جا رہا ہے"۔ ویسے بھی کسی کردار کا زیادہ دیر تک بولتے رہنا ڈرامہ کی وحدت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ سننے والوں کے پاس صرف یادداشت ہوتی ہے۔ ڈرامے شروع ہونے سے لیکر ختم ہونے تک وہ صرف یادداشت ہی سے کام لیتے ہیں اور پلاٹ کو سمجھتے ہیں۔ اب اگر درمیان میں کوئی بھی ایسی بات ہو جائے جو اس تسلسل اور انہماک کو توڑ ڈالے، خواہ وہ طویل مکالمہ ہو یا غیر ضروری صوتی اثرات، تو سننے والے اسے کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کرتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ ڈرامے کے کردار اسی طرح باتیں کریں جیسے وہ خود کرتے۔ اسی اصول کے تحت اور بھی کئی باتیں لازمی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً تمام آدمی ایک ہی طرح نہیں بولتے۔ آوازوں کے علاوہ ان کے تلفظ، ان کے انداز، ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اور یہی وہ ڈرامے میں بھی چاہتے ہیں۔ ریل کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے ایک وکیل صاحب، ریلوے ٹکٹ چیکر اور وہ قلی جو وکیل صاحب کا سامان لایا ہے، تینوں اگر ایک ہی زبان میں گفتگو کریں تو یقیناً غیر فطری ہوگا۔ مکالمے لکھتے وقت کرداروں کی عادات، علمی قابلیت، صورت شکل، رہن سہن، پیشہ اور عادات وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مکالمے ہی کرداروں میں جان ڈالتے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ بلا مکالموں کے کردار مٹی کے بت ہیں جو نہ بول سکتے ہیں اور نہ کوئی ان کے متعلق جان سکتا ہے۔

کرداروں کے متعلق ضروری باتیں بتانا اور ضروری باتیں جاننا ریڈیو ڈرامہ لکھنے والے اور سننے والے دونوں کے لئے اہم ہے۔ پہلی چیز جو سننے والا کردار کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہے، اس کا نام ہے۔ اس لئے نہیں کہ بذات خود نام بڑی اہمیت رکھتا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ نام ہی سے وہ کرداروں کو پہچان سکتا ہے۔ کسی بھی کردار کے منظر میں آتے وقت پہلی بات یہی کرنی چاہئے کہ سننے والوں کو اس کا نام بتا دیا جائے۔ ورنہ وہ الجھ جائیں گے۔ اسٹیج کے ڈراموں یا فلموں میں صورت دیکھ کر کرداروں کو پہچانا جا سکتا ہے لیکن ریڈیو ڈرامے میں صرف آواز ہوتی ہے اور آوازوں میں تمیز کرنا چہروں میں تمیز کرنے سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ پھر چونکہ پلاٹ کو آگے بڑھانے کے لئے مکالمے استعمال کئے جاتے ہیں، اس لئے یہ معلوم ہونا کہ یہ مکالمہ کونسا کردار ادا کر رہا ہے، ان کرداروں کے نام سننے والوں کو معلوم ہونا انتہائی ضروری ہے۔ مناسب تو یہ ہے کہ جب بھی دو کردار آپس میں باتیں کریں ہر دوسرے یا تیسرے فقرے پر ایک دوسرے کا نام لیکر مخاطب کریں۔ کسی بھی کردار کا خاموش رہنا ریڈیو ڈرامے میں نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایک منظر میں تین کردار ہیں تو سننے والوں کو یہ علم ہونا ضروری ہے کہ یہاں تین کردار ہیں۔ اور یہ بتانے کے لئے آسان طریقہ یہی ہے کہ ہر منظر کے ابتدائی حصہ میں وہ سارے کردار جو اس منظر میں ہیں ایک ایک فقرہ بول دیں۔ اگر کسی ایک کردار کا خاموش رکھنا کہانی کے نقطۂ نظر سے ضروری ہو تو کم از کم دوسرے کرداروں کی زبانی یہ ضرور بتا دیا جائے کہ وہ کردار بھی منظر میں موجود ہے۔ فرض کیجئے ارشد اور زبیدہ گفتگو کر رہے ہیں اور ان کی ماں قریب ہی پلنگ پر سو رہی ہے اور چند لمحوں بعد جاگنے والی ہے تو سننے والوں کو اس کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دینا چاہئے — ارشد، زبیدہ سے کہے: "اتنے زور سے نہ ہنسو۔ امی جاگ جائیں گی"۔ اس کے بعد جب امی بولیں گی تو سننے والے فوراً سمجھ جائیں گے کہ امی جواب تک سو رہی تھیں، جاگ اٹھی ہیں۔

ایک منظر میں کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کردار ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ سننے والوں کو یہ معلوم ہو کہ منظر میں کون کون ہے۔ نئے کرداروں کا منظر میں داخل ہونا یا کسی کردار کا منظر سے باہر جانا ظاہر کرنے کے لئے صوتی اثرات استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن مکالموں سے ان کا واضح کرنا ناگزیر ہے۔ صرف دروازہ کھولنے یا بند کرنے کی آواز سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کردار کمرے سے باہر نکل گیا ہے۔ جب تک مکالمے میں اس کا ذکر نہ ہو۔ غرض قدم قدم پر ریڈیو ڈرامے میں مکالموں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

کردار نگاری ریڈیو ڈرامے میں بھی اسی قدر ضروری ہے جتنی دیگر اصناف میں، لیکن ریڈیائی ڈراموں میں کردار نگاری ناول یا فلموں کی طرح نہیں ہے۔ ناول میں مصنف ہر کردار کے متعلق جتنی دیر چاہے بات کرے، اس کی ایک ایک عادت، اس کا لباس، اس کی صورت غرض ہر چیز کا ذکر تفصیل سے کر سکتا ہے۔ اسٹیج کے ڈراموں یا فلموں میں دیکھ کر بہت کچھ آپ ہی آپ معلوم ہو جاتا ہے لیکن ریڈیو ڈراموں میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، مکالمے ہی کرداروں میں جان ڈالتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف مکالمے ہوتے ہیں جن کے ذریعہ کرداروں کو روشناس کرایا جاتا ہے لیکن وقت کی کمی اور غیر ضروری طوالت کی وجہ سے کرداروں کو ESTABLISH کرنے کے لئے مصنف وہ تمام باتیں نہیں لکھ سکتا جو ایک ناولسٹ یا اسٹیج پلے رائٹر لکھ دیتا ہے۔ مصنف اپنے مکالموں میں صرف مختصر سا حوالہ دیتا ہے۔ دھندلا سا خاکہ پیش کر دیتا ہے

اس خاکہ سے مکمل تصویر بنانا ، اس میں رنگ بھرنا ، اسے تیسری بُعد عطا کرنا سننے والے کا کام ہے۔ سننے والے اپنے تصور سے ہر کردار کو خود بخود مکمل کر لیتے ہیں۔ ہر وہ کردار جو ڈرامے میں شامل ہے ، سننے والے کے ذہن میں بالکل واضح ہوتا ہے ــــ فرض کیجئے ، کسی منظر میں ہم نے یہ مکالمہ سُنا :۔

آواز ــــ "ذرا حکیم جی سے کہیئے مرزا دلدار آئے ہیں "

اب یہ مکالمہ صرف یہی ثابت نہیں کرتا کہ مرزا دلدار ایک صاحب سے جو حکیم ہیں ، ملنے آئے ہیں بلکہ اس مکالمے کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں مرزا صاحب کا پورا نقشہ بھی آجاتا ہے۔ مرزا صاحب کی عمر کیا ہے (عمر کا اندازہ اُس صداکار کی آواز سے لگایا جاتا ہے جو مرزا صاحب کا پارٹ ادا کر رہا ہے) ، وہ کس وضع قطع کے انسان ہیں ، تنگ پاجامہ ، ڈھیلی ڈھالی شیروانی ، سر پر ترکی ٹوپی ، ہاتھ میں بیت ، چشمہ لگائے ، منہ میں پان دبائے ، خضاب آلود مونچھیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہی قسم کی ایک ہزار ایک باتیں اس پہلے مکالمے کو سنتے ہی ہمارے ذہن میں آجاتی ہیں اور صرف اسی کردار کے متعلق نہیں بلکہ اس کے متعلق بھی جس کا تذکرہ کیا گیا ہو ، جیسے اس مثال میں حکیم صاحب۔ مرزا صاحب کے ساتھ ہی حکیم صاحب کی تصویر بھی سننے والوں کے ذہن میں آجاتی ہے۔ اب یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ آپ کی تصویر دوسرے سننے والے کی تصویر سے مختلف ہو۔ ممکن ہے اس نے یہ مکالمہ سن کر اپنے ذہن میں جن مرزا صاحب کا تصور قائم کیا ہے وہ ترکی ٹوپی کی بجائے دوپلیا اوڑھے ہوئے ہوں اور ان کے داڑھی بھی ہو۔ لیکن اس سے ڈرامے یا اس کے کردار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں اگر کوئی بات ان کی شخصیت میں ایسی ہے جس کا کہانی سے براہ راست تعلق ہے اور مصنّف کو اس سے مدد لینی ہے تو اس کا اظہار ضروری ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے اسی کہانی میں مرزا صاحب جو حکیم صاحب سے ملنے آئے ہیں ، لنگڑے ہیں۔ تو مصنّف کو یہ ESTABLISH کرنا ہوگا کہ وہ لنگڑے ہیں۔ مثلاً مرزا صاحب ، حکیم صاحب کو پکارنے کے بعد آہستہ سے کہیں گے۔

" کمال ہے صاحب ، میں لنگڑا آدمی دس منٹ سے کھڑا انتظار کر رہا ہوں اور وہ تشریف ہی نہیں لاتے "

لیکن ایسی باتوں کا اظہار جس قدر جلدی کر دیا جائے ، اچھا ہے۔ کیونکہ جب سننے والا اپنے خیالات کے مطابق کسی کردار کا خاکہ بنا لیتا ہے تو پھر اس میں ترمیم اس کے لئے کوفت کا باعث ہوتی ہے۔

کردار نگاری کے ساتھ ہی مکالمے ، مقامات اور اوقات کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اس کے لئے بھی بالکل وہی اصول اختیار کرنا بہتر ہوتا ہے۔ یعنی ابتدا ہی میں وقت اور مقام کو ESTABLISH کر دیا جائے۔ ورنہ اگر سننے والوں نے ایک دفعہ یہ فرض کر لیا کہ یہ رات کا منظر ہے اور یہ کردار کسی کمرے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں تو پھر بعد میں وہ یہ یقین کرنے پر بڑی مشکل سے تیار ہوتے ہیں کہ دراصل یہ گرمیوں کی ایک دوپہر ہے اور کردار کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہیں۔

جیسا کہ اب تک بیان کیا گیا ، اگرچہ مکالمے کرداروں کو روشناس کرتے ہیں ، منظر اور مقام کا تعین کرتے ہیں ، کرداروں کے عمل اور ردّ عمل کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد پلاٹ کو آگے بڑھانا ہے۔ ہر مکالمے کے ساتھ کہانی کا ارتقا ضروری ہے۔ اگر مکالمے سے یہ کام نہیں لیا گیا تو وہ مکالمے بالکل بے جان ــ اور بے مقصد ہیں۔ بہت سے لکھنے والے باتونی کردار بناتے ہیں۔ ان کے کردار باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن ڈرامے کی کہانی منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسے کردار ڈرامے کے TEMPO اور PACE کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور پلاٹ کو اُلجھا دیتے ہیں۔

ایک نہایت اہم اور آخری بات اور بھی ہے ــــ اور وہ یہ ہے کہ مکالمے ڈرامے میں اُن تمام ضروریات کو پورا کرتے ہیں جو اُوپر بیان کی گئیں لیکن معیاری مکالمے وہی ہیں جنھیں سُن کر آپ کو یہ احساس نہ ہو پائے کہ یہ کسی ضرورت کے تحت لکھے گئے۔ وقت کے متعلق ، مقام کے متعلق ، کسی کردار کے متعلق ، غرضیکہ کسی بھی قسم کی کوئی اطلاع اگر آپ مکالموں کے ذریعے سننے والے تک پہنچانا چاہتے ہیں تو وہ اس انداز سے پہنچائی جائے کہ اسے یہ مطلق احساس نہ ہو کہ کوئی بات عمداً اُسے بتائی گئی ہے۔ یہ ساری ضروریات جو مکالمے ریڈیو ڈرامہ میں پُوری کرتے ہیں ، اُن سے صرف مصنّف واقف ہوتا ہے۔ سننے والا تو مکالموں کا ایک ہی مقصد جانتا ہے اور وہ یہ کہ مکالمے اُن فقروں کو کہتے ہیں جو کردار ایک دوسرے سے کہیں۔ یعنی مکالمے کرداروں کی گفتگو کا نام ہیں اور کردار گفتگو صرف اسی لئے کرتے ہیں کہ کہانی کو آگے بڑھاتے رہیں ، یہاں تک کہ وہ "عروج" پر پہنچ جائے۔

★

مغربی پاکستان کے عوامی رقص :—— بقیہ صفحہ

ناچ کا تھیٹ رومانوی لوچ، لہراؤ اور سبھاؤ —— اس کی شان تو بس "جھومر" میں اُبھرتی ہے جس کا نام ہی بتاتا ہے کہ جھومر اور گھمر ایک ہی چیز ہیں۔ ملتان، مظفر آباد اور بہاولپور کی سب سے بڑی سوغات بھی سمجھیئے۔ سارے کا سارا رومانوں کے جادو سے بھرپور۔ لُڈی میں تو دھوم دھڑکا ہے، جوش ہے، توانائی ہے، اس میں سکون ہے سکون، افسوں ہی افسوں۔ کیونکہ اس میں انگ دھیرے دھیرے، ہولے ہولے لہرائے جاتے ہیں اور عورتوں کے ڈھیلے ڈھالے رنگ برنگے چولوں کے لہرانے سے گلزار کا پھولوں بھرا تختہ کا تختہ گھومتا نظر آتا ہے۔

جھومر کا ایک مردانہ روپ بھی ہے۔ یہ اندھیری راتوں میں مشالیں (مشعلیں) جلا جلا کر ناچا جاتا ہے۔ اُجالے اندھیرے کا یہ ملاپ، یہ سنجوگ! اس سے ناچ سچ مچ ایک طلسم بن جاتا ہے۔ جہلم کے شیشم کی طرح مضبوط جاٹوں اور گوجروں کا خاص الخاص ناچ یہی ہے۔ جس میں ہاتھ پاؤں کے جھٹکے صحیح معنوں میں جھٹکے ہوتے ہیں۔

رقص و موسیقی کے اس سدا بہار میلے میں ہم جھنگ کو کیسے بھول جائیں؛ وہ جسے ہیر رانجھا کی محبت نے امر بنا دیا ہے۔ ذرا دیکھئے "سمی" کی بہار یہیں تو ہے۔ بڑا ہی رنگین رومانوی ناچ ہے یہ۔ یہاں کے لوگ اپنی خوبروئی اور رومان پسندی کے لئے مشہور ہیں۔ "سمی"۔ شاید یہ سماج کا بدلا ہوا روپ ہے یا کچھ اور —— یہ چاندنی راتوں کا ناچ ہے۔ اور جھنگ کے "سہانے" آس پاس "سے پوری طرح میل کھاتا ہوا۔ اس کا ایک بڑا دلچسپ افسانہ بھی تراشا گیا ہے۔ کہتے ہیں ایک بہت ہی خوبصورت شہزادی جس کا نام سمی تھا۔ شہزادہ ڈھولا پر عاشق ہو گئی۔ (ڈھول کے معنی ہیں محبوب) جو اس کے چوبارے کے نیچے گلی میں سفید براق گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ وہ بھی دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اور اسے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ مگر افسوس! پھر کبھی واپس نہ آیا۔ اور بیچاری شہزادی دن رات اس کے ہجر میں درد بھرے گیت گاتی رہی۔ اس لئے سمی سے ایک رومانوی اداسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے سہاگنیں یا منگیتریں اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو آہیں بھر بھر کر یاد کر رہی ہوں۔ دیکھو دائرے کی شکل یہاں بھی موجود ہے۔

دیکھنا —— یہ ننھی منی تتلیاں —— دس بارہ برس کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں چاندنی رات میں کس تیزی سے گھومتی جا رہی ہیں۔ یہ "کِکلی" ہے۔ کم عمر بچیوں کا ناچ۔ لیجئے، ہم اب لاڑ میں ہیں۔ مہران کی نچلی وادی۔ یہاں بھی طرح طرح کے ناچ ہیں۔ اور اتنے ہی مقبول۔

آپ شاید تھک گئے۔ کُل مغربی پاکستان کا دورہ ہے نا! مگر یقین جانئے اس کے ہشاش بشاس لوگ کبھی نہیں تھکتے اور ہمیشہ یہ ناچ ناچتے رہیں گے۔ جب تک وہ زندہ ہیں اور ان کا محبوب وطن پاکستان زندہ ہے۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱۔ "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

منظوم داستان

بہار و خزاں

صہبا اختر

یونان اور کشمیر ایک دوسرے سے بہت دور ہیں لیکن یونانی دیومالا کا جو خیالی افسانہ اس نظم میں پیش کیا گیا ہے وہ کشمیر پر بھی صادق آتا ہے۔ اگرچہ اب اس پر خزاؤں کا تسلط ہے۔ مگر تابکے؟ اس سلسلے میں شاعر نے جو اشارہ نظم کے آخر میں کیا ہے وہ بہت پُرمعنی ہے ——— (مدیر)

کردار:

سیرس: زمین کی دیوی ٭ پراس پائن: بہار کی دیوی، سیرس کی بیٹی ٭ وینس: خوبصورتی کی دیوی ٭ کیوپڈ: محبت کا دیوتا
زیئس: دیوتاؤں کا خدا ٭ ہیڈس: پاتال کا دیوتا اور زیئس کا بھائی ٭ دیوی! زیئس کی ماں اور سورج ٭

یہ کائناتِ طلسم و افسوں جسے اولمپس کا حسن ترسے
شفق شفق بادلوں سے جس پر گلاب بکھرے شراب برسے
سحر سحر سرخوشی کے نغمے نشاط کی شب بہ شب براتیں
بہار اندر بہار صبحیں، چراغ اندر چراغ راتیں
ہزار کوثر نژاد ساقی سحر کی ہر محفلِ طرب میں
یہاں کئی مطربان و صد رہزنانِ تمکین و ہوش شب میں
چھنک چھنک گھنگھروؤں کی چھن چھن جھنک جھنک جھانجھنوں کی جھن جھن
بجیں کبھی چوڑیاں سحر کی کبھی عروسانِ شب کے کنگن
رباب و طاؤس و بربط و چنگ، جلترنگ اور دف و نفیری
ہزار آہنگ و صوت و نغماتِ نو کی موسیقیت پذیری
زمیں کی دیوی حسین سیرس، وہ خالقِ لالہ زارِ ہستی
کہ جس کے قدموں سے کہکشاں کہکشاں ہر اک رہگذار بستی
قدم قدم جس کی خاکِ پا سے سمن سمن جاگ اٹھیں بہاریں
نظر اٹھائے تو آسماں سے گریں ستاروں کی پھواریں
حسین سیرس وہ مہربان و کریم سیرس جو مسکرائی
تو خاکدانِ چمن چمن نے اک اور تازہ بہار پائی
حسین سیرس کے بحرِ لطف و کرم میں طوفانِ تازہ اٹھا
پراس پائن کے روپ میں اس زمیں کو اک نورِ حسن بخشا
پراس پائن کہ چشمِ نرگس تھی منتظر جس کی ہر چمن میں
وہ ایک ننھی کلی کی صورت کھلی بہاروں کی انجمن میں
جواں ہوئی تو گل و سمن نے کہا بہاروں کی شاہزادی
تھی کتنی ویراں بغیر تیرے بہار کی رنگ رنگ وادی

چمن نژاد و شفق عذار و شباب کار و بہار پیکر
پراس پائن، زمیں کی دیوی کی رشکِ صد مہر و ماہ دختر
زمیں سے آسماں تک گو ردائے انجم تنی ہوئی ہے
یہ چاندنی وہ شراب ہے جو ترے لبوں سے چھنی ہوئی ہے
تری نگاہوں کا نور پی کر صبا شرابی سی ہو گئی ہے
ترے شفق جیسے گال چھو کر فضا گلابی سی ہو گئی ہے
زمردیں وادیوں میں اترے وہ نیلے چشمے سنہرے جھرنے
ترے اجالوں کو بوسہ دینے تری جوانی کو سجدہ کرنے

سیرس۔ مری بہاروں کی روپ رانی بہار ہے تو بہار تجھ سے
زمیں تجلی بدوش تجھ سے فلک قمر در کنار تجھ سے
فضا میں بارانِ رنگ و نور و شراب و کیف و خمار تجھ سے
روش روش دم بہ دم چراغاں کنول کنول میں ایاغ کتنے
ترے بس اک شعلۂ تبسم سے جل رہے ہیں چراغ کتنے
نظر اٹھی تو بہار جاگی نظر رکی تو بہار ٹھہری
تری نظر کے تمام جادو تری نظر سحر کار ٹھہری
خمارِ آبِ حیات جیسے سنہرے پیروں سے چھن رہا ہے
ہر ایک نقشِ قدم زمیں پر بجائے خود پھول بن رہا ہے
ہر ایک جھونکا ترے بدن سے جو مس ہوا ہے مہک رہا ہے
جو ذرہ پیروں کو چھو گیا ہے وہ لعل بن کر دمک رہا ہے
روپہلی مٹی سنہرے پیروں سے ایسے چھنتی چلی گئی ہے
زمیں پہ لعل و گہر کی اک کہکشاں سی بنتی چلی گئی ہے

★

دھرتی۔
جبیں پہ سیمابِ مشتری کا غدارآئینۂ شہابی
یہ حلقۂ نیلگوں میں رقصاں شعاعوں کے جسم ماہتابی
سکوت آنکھوں کا جیسے طوفان جھوم اٹھنے کو راگنی کے
شعاعیں مسکراہٹوں سے کھلیں کرن پھول چاندنی کے
بھنویں کہ جیسے بخطِ سیمیں کسی نے قوسین کھینچ دی ہوں
سنہری لانبی حسین پلکیں کہ جیسے کرنیں سی آملی ہوں
بنفشئی انکھڑیوں میں نیلم سی پتلیوں کے چراغ روشن
اور ان چراغوں میں لاجوردی شعاعوں کا رقص نور افگن
گلاب کی پنکھڑی سے ترشی ہوئی کماں لعل گوں لبوں کی
اور اس کماں سے ملی ہوئی اک قطار زر کار موتیوں کی
حسین ہونٹوں پہ گل کھلاتی سفید گالوں میں رنگ بھرتی
یہ لاجونتی کے پھول جیسی صبا نگاہوں میں رقص کرتی
صراحی جیسی حسین گردن میں عکس رقصاں گلابیوں کا
حسین سینہ کہ جیسا دروازہ کھل رہا ہو تجلیوں کا
یہ گوشوارے چمک سے جن کی فضا میں جگنو سے جھلملائیں
یہ ہار جس کے گہر گہر سے ابھر ابھر آئیں کہکشائیں
یہ انگلیاں پور پور میں جن کی لعل و یاقوت کی ضیائیں
بہ شاخِ مرجاں تراش دی ہیں کسی نے آئینہ کاریاں ہیں
یہ مرمریں جسم کے نشیب و فراز سے ٹوٹتے ستارے
یہ انگ سے انگ تک اجالے یہ رنگ سی رنگت کہ شرارے
کبھی چمک میں ستارہ پیکر کبھی مہک سی بہار پرور
بدن سنہرے بدن پہ سورج مکھی کے پھولوں کی ایک چادر
خدایگانِ جمال و خوبی کہیں جنہیں حسن کا مقدر
انہیں شگفتہ گلوں کا رکھا ہوا نزاکت سے تاج سر پہ
بصد خروشِ شباب رنگیں، بصد ادائے جمالِ حوریں
یہ دوش سے تا بہ ساقِ سیمیں بس ایک سر ریزوانِ نوریں

★

سیرس۔
ہزار ناسفتگان و دوشیزگان و حورانِ دست بستہ
کھڑی ہیں بہاروں کی روشنی کو بنامِ حسن و شباب سجدہ

(۲)
(آسمان کے کسی گوشے میں)

وینس۔
حسین کیوپڈ سنہرے کیوپڈ کہاں چھپے ہو ادھر تو آؤ
رو پہلے تیروں کا روپ دیکھوں کہاں ہے نورین کمان لاؤ
کہاں ہے ترکش محبتوں کا ذرا وہ جادو تو پھر جگاؤ
ہزار ناوک فگن سہی تم ہمیں بھی اپنا ہنر دکھاؤ
سنا ہے تم نے زمین پر نت نئے شگوفے چٹک رہے ہیں
کہ ان دنوں خاک سار ذرے ستارے بن کر چمک رہے ہیں
پلاس پاتن پہ چھا گیا ہے کچھ اس قدر نشۂ جوانی
زمین پر بن گئی ہے میری جگہ بہاروں کی روپ رانی
اور اس کی ماں وہ زمیں کی دیوی تو دیکھئے پھولے نہیں سماتی
وہ کوئی منحوس صبح ہوگی کہ جب قصیدے نہیں سناتی
مرے پجاری سبھی ہیں کیوپڈ زمین والے ازل سے اب تک
مرے ہی ہونٹوں کا رنگ گرتا ہے خاک کے ہر کنول سے اب تک
مگر یہ آتش فشاں سا کیا نظر نظر میں پگھل رہا ہے
وہ میرا ہر روپ بجھ رہا ہے وہ میرا ہر رنگ جل رہا ہے
مقامِ حیرت ہے مجھ سے ہٹ کر اب اس کو قدموں پہ سر نگوں ہیں
عجیب دیوانگی ہے طاری کہ سب کے سب بستۂ جنوں ہیں
مرے پرستار آہ مجھ کو بھلا رہے ہیں بھلا چکے ہیں
پر اس پاتن وہ ساحرہ ہے کہ جس کے جادو میں آ چکے ہیں
سنو اگر یہ زمین والے مجھے بھلانے پہ تل گئے ہیں
جو اُن کی پیشانیوں سے سجدوں کے داغ یکبار دھل گئے ہیں
یہ لوگ میری محبتوں کو اگر فراموش کر چکے ہیں
مرے لئے جو دھڑک رہے تھے اگر وہ دل اب ٹھہر چکے ہیں
تو ان کے ٹھہرے ہوئے دلوں میں سزا کے شعلے بھروں گی میں بھی
زئیس کی سوگند! ان پہ اپنا عتاب نازل کروں گی میں بھی
زمین جو اپنے روپ پر ان دنوں بہت مسکرا رہی ہے
بجائے میرے پر اس پاتن کے حسن کے گیت گا رہی ہے
اسے خبر کیا کہ یہ مرے انتقام کی آگ میں جلے گی
میں دیکھتی ہوں مرے بھیانک عذاب سے کس طرح بچے گی
ہر ایک سجدہ مرے لئے ہے کہ میں بہاروں کی مورتی ہوں
میں روشنی ہوں میں زندگی ہوں میں حسن ہوں کامسوتی ہوں
(لمحہ بھر توقف)

زمیں کی سرکشی کو دیکھے سکوتِ حیرت سے آسماں کیوں
چھڑے نہ غارت گری و بربادی و تباہی کی داستاں کیوں
سنو کہ اس داستاں کا عنواں میری آنکھوں کے سامنے ہے
نہاں یہ عنوانِ خونفشاں بھی تمہاری ننھی کماں میں ہے
وہ ہیڈس زیرِ زمیں اندھیروں پہ جسکا جبروت حکمراں ہے
وہ جس کا پرچم ازل سے تحت الثریٰ کی ظلمت کا سایباں ہے
وہ جسکے قدموں کی گردِ بن کر سحاب اٹھتے ہیں تیرگی کے
وہ جسکو پاتال کے اندھیرے سلام کرتے ہیں عاجزی سے
قدم قدم دود و گرد و خاک و غبار کی برہمی قدم لے
ہزار اسود نگاہ راتوں کی تیرگی دم بہ دم جنم لے
ہزار تیرہ ستون و حلقہ بگوش شیطان سر جھکائیں
زمین کے تہہ بہ تہہ اندھیرے و فورِ ہیبت سے کپکپائیں
وہ غیر فانی و جاودانی اندھیری راتوں کی راجدھانی
جہاں اجل کا سکوتِ پیہم ازل سے مصروفِ نوحہ خوانی
نگاہ محرومِ روشنی سے، نفس رمِ زندگی سے عاری
وہ گوش تا گوش چپ کے پہرے، وہ چشم تا چشم خواب طاری
وہ تیرہ تار و تنگ و تاریک وادیوں کا خدائے عالی
اداس روحوں، چڑیلوں، بھوتوں، بلاؤں کی مسکنوں کا والی
بہ چشم و دل جاکے سجدہ کرتا ہے خود اولمپس کی روشنی کو
وہ سال کے سال بارگاہِ زئیس میں جاتا ہے حاضری کو
زمیں کے سینے کو چاک کر کے زمیں کی وسعت سے پار ہوگا
وہ برق رفتار سات گھوڑوں کے کالے رتھ پر سوار ہوگا
زغال پیکر فضائیں ہوں گی غبارِ صد تیرگی سے چھن کر
وہ دیکھو، یہ وہ مقام ہے وہ جہاں سے گزرے گا خاک بن کر

(پھر لمحہ بھر توقف)

میں اک سنہرے ہرن کو تخلیق حسنِ اعجاز سے کروں گی
اور اس کی آنکھوں میں اپنے سحرِ تمام کی دلکشی بھروں گی
پھر اس سنہرے ہرن کو میں اس حسین وادی میں چھوڑ دوں گی
زمیں کی دیوی کے ہر حصارِ فسوں کو پل بھر میں توڑ دوں گی
پراس پائن بس اک نظر دیکھ کر اسے بیقرار ہوگی
روش روش اس کے پیچھے محوِ خرام دیوانہ وار ہوگی
پراس پائن کو کھینچ لائے گا وہ سنہرا ہرن یہاں تک
نشان اس کا نہ پا سکے گی زمیں کی دیوی پھر آسماں تک
سنو وہ ساعت قریب ہے جب مراد بر آئے گی ہماری
کہ کل سحر دم گذرنے والی ہے ہیڈس کی خاک سے سواری
ستارے پوچھیں کہ چاند پوچھے کسی سے یہ راز تم نہ کہنا
بس اس کمیں گاہِ رنگ و بو میں کماں بکف وقفِ دید رہنا
سحر ستاروں کے بجھتے بجھتے دیئے جلاتی رہیں یہ آنکھیں
پراس پائین، ہیڈس جیسے ہی اس مقامِ فسوں پہ پہنچیں
تمہارا ناوک کچھ اتنی تیزی و ہوشیاری کے ساتھ چھوٹے
پراس پائن کے دل میں اترے تو ہیڈس کو دل میں جا کے توڑے!
تمہارے ترکش کا صرف اک تیر توڑ سکتا ہے سارے جادو
کھنچی تمہاری کماں تو کب تنے رہیں گے زمیں کے ابرو
غرور جس کا حسن پر ہے اتنا اسی کو آنکھوں سے دور کر دوں
میں چاہتی ہوں زمیں کی نخوت کو سامنے آئینے چور کر دوں

✦

(۳)

سیریس ۔ یہ چیخ کتنی جگر شکن تھی یہ چیخ کتنی الم فزا تھی
کہ جس نے پل میں چراغ ہائے خوشی کی اک اک کرن بجھا دی
ارے شبستانِ رنگ و بو پر یہ تیرگی کیسے چھا رہی ہے
یہ چاند کیوں نیم رخ ہوا، چاندنی سمٹتی سی جا رہی ہے
پراس پائن! پراس پائن! قریب آ، تو کہاں چھپی ہو؟
سنو سنو، دل کی دھڑکنوں کو! جواب دو، کیوں ستا رہی ہو؟
دو تم نے میری صدا سنی اور نہ مجھ کو اپنی ندا سنائی
میں برگ و سبزہ میں ڈھونڈ آئی، میں لالہ و گل میں دیکھ آئی

(کچھ وقت گذر جانے کے بعد عالمِ مایوسی میں)

نہ میرا غنچہ نہ میرا لالہ نہ میرا پتہ نہ میرا بوٹا
ہر ایک سے میرا ساتھ چھوٹا ہر ایک سے میرا ربط ٹوٹا!
یہ زعفراں زار راکھ ہو جائیں مرغزاروں کو آگ کھا لے
سیاہ ناگوں کا روپ دھاریں کرن کرن ناچتے اجالے

مری طرح یاس کے اندھیروں میں سب کے سب محوِ یاس ہو جائیں
یہ چندے خورشید و چندے مہتاب راستے شب لباس ہو جائیں
گریں مرے آنسوؤں کی صورت زمیں پہ ہنستے ہوئے ستارے
مری طرح موت موت سارے جہان کی زندگی پکارے
جو زلفِ سنبل کو آگ پکڑے تو آنکھ نرگس کی پھوٹ جائے
یہ سلسلہ رنگ و روشنی کا خروشِ ظلمت سے ٹوٹ جائے
جلی بجھی پتیوں کی زردی ابد تلک رنگِ گل کو ترسے
بجائے پھولوں کے خشک شاخوں سے صرف شعلوں کی راکھ برسے
سنہرے چشمے رُپہلے دریا سراب بن جائیں ظلمت ...
زمردیں وادیوں میں آ جائے زلزلہ تیز آندھیوں کا
بجھیں بجھیں یاوس اوس ہوتی، نہ ہو کہیں کوس کوس جوتی
نگر نگر خاک اڑائیں کرنیں، سحر سحر آئے خون روتی
جلیں جلیں پتیوں کی حوریں، اُڑیں اُڑیں کونپلوں کی پریاں
گریں گریں رنگ رنگ غنچے، جلیں جلیں شاخ شاخ کلیاں

★

(آسمانی فضا میں وینس سے محوِ کلام)

کیوپڈ۔
عظیم و عالی مقام دیوی، غلام کی مادرِ گرامی
تجھے مبارک ہوں تازہ فتح و ظفر کے نغماتِ شادکامی
کہ میں نے اس سنگ زادۂ تیرگی کے سینے کو چیر پھینکا
جو قلبِ گیتی میں آگ بن کر اتر گیا ہے، وہ تیر پھینکا
مرے فسوں لانے سکوں سے۔ بدلے جتنوں کے پردے گرا دیئے ہیں
چراغ ہائے غرور و نخوت بس اک نفس سے بجھا دیئے ہیں
زمین پر چاندنی کی صورت جو آج تک مسکرا چکی ہے
وہ روشنی دور جا رہی ہے، وہ روشنی دور جا چکی ہے
لطیف کرنوں کو ڈس چکی ہے، حسیں اجالوں کو ڈس رہی ہے
گھٹا' اندھیری گھٹا اداسی بھری فضا سے برس رہی ہے
زمین کے تہہ بہ تہہ اندھیروں کی قید میں روشنی رہے گی
پر اس پاپن غرور کے جرمِ ناروا کی سزا سہے گی!
کہاں کہاں کوئی خاک ویران رہگذاروں کی چھانکتا ہے
میں دیکھتا ہوں کہ بزمِ سیرس میں کون اب جا کر جھانکتا ہے
ہر ایک خوشبو ردائے گل سے بنامِ وینس اٹھا کرے گی
بہار کے معبدوں میں دیوی تری پرستش ہوا کرے گی

★

وینس:
(عالمِ مسرت میں)
بناتِ پروین و زہرہ و مشتری و ناہید گیت گاؤ
مری لگا ہوں کے نور کو کہکشاں کی کرنوں کا رس پلاؤ
کہاں ہیں انجم نژاد و خورشید زادگانِ جہانِ نوریں
بچھائیں اپنی سنہری زلفوں کے پیچ و خم سے بساطِ تمکیں
خلاؤں کی شعلہ کار پریاں فضا کو آئینہ گوں بنائیں
ہتھیلیوں پہ چراغ لے کر بڑھیں ستاروں کی اپسرائیں
کہاں گئے نیلے بادلوں میں چھپے ہوئے سیمگوں فرشتے
لکھیں مرے دلفریب کیوپڈ کی شان کے دلنشیں نوشتے
کہ میرے کیوپڈ نے ظلمت انگیز نخوتوں کو شکست دی ہے
زمیں کی پست اور گستاخ وحشتوں کو شکست دی ہے
عزیز کیوپڈ قریب آؤ کہ میں تمہاری جبیں کو چوموں
زمیں کے اس تازیانۂ برق کار کی طرح آج جھوموں
کہ جس کی ہر ضربِ صاعقہ گوں سے آندھیوں نے جنم لیا ہے
کہ جس کے شعلہ فروش پہلو سے بجلیوں نے جنم لیا ہے
نہیں نہیں، اس خوشی کی ساعت میں ایسے شعلے نہیں چنوں گی
میں آج موسیقیت کی حوروں سے نغمۂ آرزو سنوں گی
میں آج خوش ہوں کہ میری عظمت کا چاند پھر جگمگا رہا ہے
زمیں کی پستی پہ سربلندی کا آئینہ مسکرا رہا ہے

★

(۴)

سورج۔
عظیم دیوی، کریم سیرس یہ ماتمِ درد و کرب کب تک
یہ آنکھ نم نم یہ ہونٹ چپ چپ، یہ چہرہ زرد زرد کب تک
بجھی بجھی گلکدوں کی شمعیں' جلے جلے پیرہن تو دیکھو
نظر اٹھاؤ روش روش نرم کونپلوں کے کفن تو دیکھو
یہ خاک اڑاتے ہوئے بگولے' یہ گرد کے پُرشکن ہیولے
کہ جیسے غارت گری کا بازو فضا کی تاریکیوں میں جھولے
نہ اب وہ سرسبز وادیاں ہیں، نہ اب وہ زرکار ندیاں ہیں
ہر ایک ذرے کے دل میں پیوست موت کی سرد انگلیاں ہیں

ہر ایک گوشے میں خیمہ زن ظلمتوں کا اک لشکر تباہی
میں کیسے دیکھوں زمین پر جگمگاتی دنیا کی روسیاہی
کہ میں اسی کے لئے تو دیوی! خلا میں قرنوں سے جل رہا ہوں
کرن کرن گل کھلا رہا ہوں قدم قدم ساتھ چل رہا ہوں
مرے اجالوں کا میری کرنوں کا رقص مدت سے تھم چکا ہے
کہ میرے رستے میں ظلمتوں کا بسیط طوفان جم چکا ہے
اٹھو چراغِ حیات کا نور چہرۂ تیرگی پہ مل دو
یہ تیرگی کی ردا الٹ دو یہ ماتمی پیرہن بدل دو
اسے اندھیروں کی موت کب تک! اسے مسرت کی دھوپ دے دو
زمیں کو بددعا کے بدلے دعا کے پھولوں کا روپ دے دو
کبھی جو اچھا نہ ہو سکے گا، لئے رہو گی وہ روگ کب تک
پراس پائن تو جا چکی ہے، پراس پائن کا سوگ کب تک

سیرس۔ پراس پائن! پراس پائن وہ میری بیٹی کہاں چھپی ہے
مجھے بتاؤ! تمہیں خبر ہے، وہ کن اندھیروں میں جا بسی ہے؟

سورج۔ تمہاری آنکھوں کی روشنی ظلمتوں کا مقسوم ہو چکی ہے
وہ ہیڈس کی ظلمتِ شبستاں میں کب سے معدوم ہو چکی ہے
وہ خواب کی بیکراں فضاؤں میں موت کی نیند سو چکی ہے
وہ ہیڈس کی قید میں رہے گی، وہ پا بہ زنجیر ہو چکی ہے
اک ایسے زنداں میں جسکی دیوار قاف کے طول سے بڑی ہے
اک ایسی زنجیر میں کہ جسکی کڑی کڑی موت سے کڑی ہے
پراس پائن کو ہیڈس کی آتشیں ہوس نے جکڑ رکھا ہے
وہ زندگی راکھ ہو چلی ہے جسے اجل نے پکڑ رکھا ہے
ہزار ماران واژدرانِ سیاہ رستے میں ہانپتے ہیں
وہ ایسی دنیا ہے دیوتا جس کا ذکر سن سن کے کانپتے ہیں
طلسم وافسونِ تیرگی سے کسی کو کوئی مفر نہیں ہے
وہاں فلک زاد طاقتوں کے سوا کسی کا گزر نہیں ہے
وہ ایسی بستی ہے جس کے سنگیں حجاب ہرگز نہیں اٹھیں گے
وہ ایسا زنداں ہے جس کے دروازے تا قیامت نہیں کھلیں گے
یہ خون آنکھوں کا خشک کر لو پراس پائن کو بھول جاؤ
تمہارے سینے میں ماں کا دل ہے، زمین والوں پہ رحم کھاؤ
میں بادلوں کی طناب کھینچوں، سمندروں سے گہر اٹھاؤں
جو تم کہو تو زمین والوں کو پھر پیامِ طرب سناؤں

سیرس! جو ابر و بارانِ ہفت افلاک بھی مجھے بخش دیں خزانہ
میں بانجھ بن کر زمیں سے ہرگز نہ اگنے دوں گی کوئی بھی دانہ
یہ خاک دریا، یہ راکھ چشمے، یہ کھیت ویران یونہی رہیں گے
اداس اندھیری اجاڑ راتوں کے شہر بے جاں یونہی رہیں گے
فضا کے شانوں پہ یہ ردائے شکن شکن تا ابد رہے گی
زمین محرومِ جلوۂ لالہ و سمن تا ابد رہے گی
پراس پائن کے بن میر خاک رقص گلہائے تر نہ ہوگا
یہ وہ اندھیرا ہے جو کبھی روشناسِ حسنِ سحر نہ ہوگا

★

(اولمپس کی فضا میں اپنی ماں سے)

زیئس۔ زمیں پہ پہلے پہل مسلط ہوئی ہے جو تیرگی خزاں کی
کہیں یہ سازش نہ ہو کسی ساکنِ بلندیٔ آسماں کی؟
غریب بیکس اداس سیرس کا گریۂ بیقرار کب تک
یہ راہ در راہ ظلمتوں کا ہجوم سیلاب کار کب تک
ہر ایک آنسو جو چشم سیرس سے سینۂ خاک پر گرے گا
وہ سنگ در سنگ، خار در خار موت کا نقشِ پا بنے گا
سراب کا زہر بددعاؤں کا سم زمانہ پیئے گا کب تک
زمین پتھر بنی رہی تو زمیں پہ کوئی جیئے گا کب تک
پراس پائن کے بن اندھیرا ہے لالہ و گل کی انجمن میں
لپیٹ کر زندگی کو رکھا ہوا ہے جس نے سیہ کفن میں
میں چاہتا ہوں کہ آپ پاتال کے اندھیروں میں آج جائیں
مری طرف سے اسی ستمگار ہیڈس کو یہ خبر سنائیں
کہ تیرگی اپنی حد سے گزری ستم ستم انتہا کو پہونچا
ہر ایک نالہ زمیں کی دیوی کا آسمانی خدا کو پہونچا
میں چاہتا ہوں کہ سنگدل ہیڈس حالِ سیرس پہ رحم کھائے
پراس پائن اسی طرح پھر چمن چمن میں چمن کھلائے
دلوں کی سیماب آشنا بیقراریوں کو قرار مل جائے
میں چاہتا ہوں کہ ساکنانِ زمیں کو واپس بہار مل جائے

★

(عظیم دیوی زئیس کا پیغام لے کر ہیڈس کے پاس پاتال میں پہنچتی ہے)

ہیڈس۔ (عظیم دیوی سے)
خدائے عالی بزرگ و برتر زئیس کا فرمان سن چکا ہوں
مرا ہی فرض ہے کہ تعمیلِ حکم میں اپنا سر جھکا لوں!
مجھے یہ تاب و مجال کب ہے کہ حکمِ حاکم کو ٹال جاؤں
مگر مری دیویوں کی دیوی! برا نہ مانے تو میں سناؤں
وہ داستاں جس کے ایک اک حرف میں مرا دل دھڑک رہا ہے
وہ جس کے شعلوں سے میری راتوں کا گوشہ گوشہ چمک رہا ہے

دیوی۔ تم ایک زندانیٔ ہوس کی طرح رہینِ ہوس نہ ہو گے!
تمہارا مقصد سمجھ رہی ہوں، میں جانتی ہوں جو تم کہو گے!

ہیڈس۔ نہیں مری دیویوں کی دیوی! یہ داستانِ ہوس نہیں ہے
کہ میرے اس داغ داغ سینے کی اصل صورت بڑی حسیں ہے
کہ اس گھٹا ٹوپ تیرگی میں دیئے محبت کے جل رہے ہیں!
دیئے کہ جن کی حسیں لوؤں سے ہزار شعلے نکل رہے ہیں
یہ میرا چہرہ کہ جس کا غازہ ہیں خاک اڑاتے ہوئے اندھیرے
اسی کے نیچے چھپے ہوئے ہیں کہیں محبت بھرے سویرے
پراس پائن نے میرے دل کی چٹان کو خاک کر دیا ہے
مرے رگ و پے کو اپنی آنکھوں کی نرم شبنم سے بھر دیا ہے
بندھے ہوئے ہیں سیاہ راتوں کے پیر چاندی کے گھنگھروؤں سے
کھنک رہا ہے یہ خانۂ تیرگی مسرت کی پائلوں سے
کبھی اجالوں کا گیت ہے تو کبھی ستاروں کی راگنی ہے
پراس پائن مری محبت مرے شبستاں کی چاندنی ہے
ہزار نغمے ابل پڑے ہیں جس کے نرم قدموں کی جنبشوں سے
یہ چاند جس کی کرن کرن سے کنول کھلے مسکراہٹوں کے
جو چھپ گیا تو مری نگاہوں کو ناگ ڈس لیں گے تیرگی کے
مری سماعت کو راکھ کر دیں گے کتنے زہراب خامشی کے!
زئیس سے کہہ دو! پراس پائن کو ہیڈس کی زندگی سمجھ کر
زمین کو بخش دے بہاروں کا اور کوئی حسین پیکر

دیوی۔ تمہاری باتوں میں پیار کا شہد اور زہرابِ درد بھی ہے
اگر محبت اک آئینہ ہے تو اس کی قسمت میں گرد بھی ہے
وہ گرد جس کو جدائی کی تیز آندھیاں بکھیرتی ہیں
جو ہر کرن، ہر شعلۂ رنگیں پہ موت کا رنگ پھیرتی ہیں
پراس پائن تمہاری راتوں کا تلخ زہراب پی سکے گی
نفس نفس جس کا بوئے گل ہو وہ سنگ و آہن میں جی سکے گی
نزاکتِ برگ و گل کی تخلیق جبرِ ظلماتِ شب سہے گی!
یہ لاش، یہ زندہ لاش کب تک تمہاری آغوش میں رہے گی
نہ اس کے ہونٹوں پہ وہ کنول ہیں نہ اس کی آنکھوں میں پیار کے دیئے
یہ تم جسے زندگی سمجھتے ہو صرف تصویر موت کی ہے
(پراس پائن کے بستر خواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

ہیڈس۔ ابھی ابھی نیند کے نشے کا حسین ساغر پلا دیا ہے
پراس پائن یہ خواب کی ساحرہ کا آنچل پڑا ہوا ہے

دیوی! گلاب کی طرح بند آنکھوں سے روشنی کی کرن نہ پھوٹے
یہ خواب شاید کبھی نہ بدلے یہ نیند شاید کبھی نہ ٹوٹے

ہیڈس۔ نہیں نہیں دیویوں کی دیوی! یہ نیند یہ خواب وہم ہی ہیں
پراس پائن کی آنکھیں بے خوابیوں سے بس یونہی تھک گئی ہیں

دیوی۔ اگر یہ سچ ہے تو خواب کی ساحرہ آنچل سمیٹ ڈالو
یہ خواب سچا ہے یا کہ جھوٹا ابھی مری بات آزما لو

ہیڈس۔ (پراس پائن کی طرف متوجہ ہو کر)
حسین پلکوں میں بند کلیوں کو پھول ہنستا ہوا بناؤ!
یہ آنکھ کھولو، یہ بند توڑو، طویل خوابوں سے لوٹ آؤ

دیوی۔ یہ سعیٔ بے سود و کوششِ رائیگاں تجھے کچھ نہ دے سکے گی
پراس پائن کی نیند تا حشر کوئی کروٹ نہ لے سکے گی
بجائے شبنم کے سم رچا ہے ترے در و بام کی ہوا میں
پراس پائن کا خواب ٹوٹا ہے اور نہ ٹوٹے گا اس فضا میں
زمیں کی رونق، زمیں کی زینت، زمین پر مسکرا سکے گی
اسے فقط زندگی کی گاتی ہوئی فضا ہی جگا سکے گی
محبتوں کی لطیف دنیا کو نذرِ جوشِ جنون مت کر
پراس پائن سے پیار ہے تو پراس پائن کا خون مت کر

ہیڈس۔ عظیم دیوی! پراس پائن مرے لئے میری زندگی ہے
مری محبت مری مسرت مری خوشی میری روشنی ہے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

"کوئی ہے!"

ممتاز مفتی

احاطہ حمتی پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ گلی میں کھاٹ پر راجہ جوہر اور چودھری جاناں خاموش بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ چودھری نے اپنے گرد ایک موٹا کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی مہندی رنگی داڑھی پر سفید دھبے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے کی جھریوں میں حرکت یا زندگی مفقود تھی۔ اور وہ خالی نگاہوں سے احاطے کے مغربی کونے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ راجہ جوہر نوجی سویٹر پہنے ہاتھ میں حقے کی نے تھامے چودھری کی طرف جھکا ہوا تھا اور حقے کے نیچے پر لپٹی ہوئی سیاہ ڈوری کو غور سے دیکھ رہا تھا جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے جگہ جگہ پر اُکھڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں یہ بھولے ہوئے تھے کہ وہ حقہ پینے کے لئے وہاں بیٹھے ہیں۔

راجہ جوہر دیر تک حقہ کی نے کی اُکھڑی ہوئی ڈوری کو دیکھتا رہا اور پھر کش لگائے بغیر اُس نے بھی آہ بھر کر نے چودھری کی طرف موڑ دی۔ "تو وہ چلی گئی" اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ "اس نے اچھا نہیں کیا"۔

چودھری جاناں اپنی داڑھی کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "پر ایسی اچھی جگہ اسے ملے گی کہاں؟ یہاں تو سمجھو گھر میں رہتی تھی"۔

"پر چودھری" راجہ جوہر بولا۔ "آج کل گھر میں رہنا چاہتا کون ہے۔ لوگ سڑکوں پر گھومتے ہیں، ہوٹلوں میں بیٹھتے ہیں، اور گھر جانے کی بات کرو تو جان نکلتی ہے ان کی"۔

"ہاں" چودھری نے کہا۔ "زمانہ ہی ایسا آیا ہے۔ پر راجہ ابھی اس احاطے پر اللہ کا فضل ہے"۔

"پھر وہ چلی کیوں گئی؟" راجہ نے پوچھا۔

"بے وقوفی اور کیا؟" چودھری ہنسا۔ "یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے"۔

"نہ جانے کہاں کہاں در در کی خاک چھاننی پڑے گی۔ پاگل لڑکی" راجہ جوہر نے حقے کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

اور وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ اور حقے کی نے کو گھورنے لگے۔

حمتی احاطے کے بیرونی دروازے کے قریب کھوکھے سے بنے ہوئے جمت ہوٹل میں، فضلا چپ چاپ کھڑا چائے دانی کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ پاس ہی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی میں سے بھاپ کا فوارہ سا نکل رہا تھا۔

کھوکھے کے باہر بنچ پر کریم چائے کا پیالہ رکھے بیٹھا آسمان کو گھور رہا تھا۔ اس کے قریب جمال دین دونوں ہاتھوں میں سر تھامے خاموش بیٹھا تھا۔ کریم دفعتاً چونکتا اور بات کرنے کے لئے ہونٹ سنوارتا لیکن پھر جمال دین کی طرف دیکھ کر گھبرا جاتا۔ اِدھر فضلا کھوکھے میں اضطراب بھرے انداز سے گھومتا اور پھر چائے دانی اٹھا کر اسے کپڑے سے پونچھنے لگتا۔

جمال دین نے سر اٹھایا اور فضلے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "فضلے، آج تمہاری چائے نہیں چل رہی"۔

"بس دیکھ لو باؤجی!" فضلا بولا۔ "دو دن سے یہی حال ہو رہا ہے"۔

"یہاں تو کافی بھیڑ رہتی تھی۔ رہتی تھی نا؟" جمال دین نے پوچھا۔

"ہاں باؤجی اللہ کا فضل تھا۔ بات کے ساتھ چائے بھی چلتی تھی۔ اصل میں باؤجی یہ چائے اکیلی نہیں چلتی۔ بات ہو تو چلتی ہے"۔

"اور بات تو فضلے" کریم نے سر اٹھا کر کہا۔ "بات تو ——" پھر وہ فضل دین کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اور اس نے دونوں ہاتھ چلا کر بات کو ہاتھوں کی جنبش سے پورا کر دیا۔

"ٹھیک ہے" فضل دین گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "بات ہو تو چائے چلتی ہے۔ ٹھیک ہے"۔

"اور بابوجی" فضلے کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ "بات ہو تو چار چلتی ہے اور چاہ ہو تو بات چلتی ہے"

"بات ہوئی نا" کریم اچھل پڑا۔

"ہاں ہاں ٹھیک کہتے ہو" جمال دین مسکرا کر بولا۔ "لیکن" اس نے فضلے سے پوچھا۔ "وہ چلی کیوں گئی؟"

رحمت ہوٹل کے قریب میدان میں، حتمی احاطہ کے بچے کھیل رہے تھے۔ نور اور گوگا کٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھے تھے۔ موٹا ہاتھ میں بیٹ پکڑے اسے ہوا میں چلا رہا تھا۔ اس کے قریب منی کھڑی غور سے موٹے کی طرف دیکھ رہی تھی اور نسیم اڑتا ہوا پر پکڑنے میں مصروف تھا۔

"چلو بھئی گیند بلا کھیلیں" موٹے نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا اور بیٹ شانے پر رکھ لیا۔

"ہوں، گیند بلا" نور نے منہ بنایا۔ "پھر گیند آپی کے گھر چلا گیا تو ـــــ پھر پٹیں گے"

"ہٹ جا بے" گوگا اسے گھورنے لگا۔ "ہمارے گھوڑے پر بوجھ پڑتا ہے" اس نے غصے سے نور کی طرف دیکھا۔

"میں نے کہا یہ دیکھو۔ اس سبز پر میں سنہرا رنگ لگا ہے۔ یہ دیکھو" نسیم منی سے مخاطب ہوا۔

"اچھا سنہرا رنگ ہے" منی چلائی۔

"ہوں سنہرا" موٹا بولا۔ "ہماری امی کے پاس ایسا پاؤڈر ہے، جہاں لگاؤ سنہرا ہو جائے، جس چیز پر لگاؤ سنہری ہو جائے۔ چلو میں دکھاؤں"

"نہ ہم نہیں چلتے" گوگا بولا۔ "تمہاری امی تو کاٹنے کو دوڑتی ہے"

"پہلے تو خود بلایا کرتی تھی ہمیں" نور نے کہا۔

"اور مجھ سے پوچھا کرتی تھیں" منی چلانے لگی۔ "پوچھا کرتی تھیں۔ وہ کیا کر رہی ہے؟ اور مجھ سے کہا کرتی تھی۔ جاؤ جا کر دیکھ تو باہر جانے کی تیاری تو نہیں کر رہی وہ"

نسیم نے پر کو اڑاتے ہوئے کہا۔ "وہ تو اب چلی گئی"

"پر وہ چلی کیوں گئی؟" منی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے آہ بھری۔

"اب ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں" نور نے آہ بھری۔

"ہاں وہ چلی گئی" گوگا پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ اور وہ سب خاموش ہو گئے۔

احاطے میں آپی عائشہ کے صحن میں وہ اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں ـــــ آپی ننھے کا سویٹر بُن رہی تھی۔ ماں برکتے کوئی دوائی کوٹنے میں مصروف تھی اور بیگم تلکے کو تلی پر لپیٹ رہی تھی۔

"چلی گئی تو اچھا ہوا" آپی نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "خس کم جہاں پاک"

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی" ماں برکتے بولی۔ "کچھ دیر اور رہتی یہاں تو نہ جانے کیا کیا گل کھلاتی۔ شکر ہے ہمیں اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔

کیوں آپی؟ روز نئی بات، روز نئی بات۔ نئی سے نئی خبر۔ جیسے اللہ مارا خبروں والا ریڈیو لگا ہو"

"ہاں بہن" بیگم نے کہا۔ "تانتا بندھا رہتا تھا خبروں کا، اب کیا ہے، اب ہونٹوں پر اللہ ماری سرخی لگائی جا رہی ہے۔ اب کیا ہے، اب بال بنائے جا رہے ہیں۔ اور اب، بی بی بن ٹھن کر کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے"

"وہ کتاب پڑھنا تو محض بہانہ تھا۔ دراصل ـــــ" آپی نے ہاتھ چلایا۔ "مجھے کیا معلوم نہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ نیچی نگاہیں اور یہ بات بات پر شرمانا محض شرارت ہے، سو وہی ہوا۔ کوئی ہنگامہ ہوا ہے! توبہ ہے۔ بچے ہیں تو وہ خبریں لا رہے ہیں۔ بوڑھے ہیں تو اسی بات کو دہی کی طرح بلو رہے ہیں"

بیگم نے کہا۔ "یہ تو سب ٹھیک ہے آپی، پر وہ چلی کیوں گئی؟"

"چلی گئی ہے تو چلی جائے۔ ہم کیا اسے منا کر لائیں" ماں برکتے نے کہا۔ "نہ بیگم، ہم تو منانے نہ جائیں کبھی"

آپی نے ماں برکتے کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا۔ "تو یہ بتا ماں، ہم نے کیا کہا تھا اس سے کہ یہاں سے چلی جا؟"

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں" بیگم چلائی۔ "کہ آخر وہ چلی کیوں گئی؟"

"اور جاتے ہوتے بتایا بھی تو نہیں کسی کو۔ ہاں؟" آپی نے کہا۔

حتمی احاطہ شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ اور ایک ریٹائرڈ ٹھیکیدار حاتم علی کی ملکیت تھا جو عرصۂ دراز سے ٹھیکیداری چھوڑ کر حج کا فریضہ ادا کرنے کے بعد ٹھیکیداری کا کام چھوڑ چکا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ تائب ہو جانے کے بعد حرام کی کمائی کرنا جائز نہیں۔ اس لئے تائب ہونے سے پہلے کی کمائی پر بسر اوقات کر رہا تھا۔ احاطے کا اصلی نام احاطہ حاتم تھا جو بگڑ کر احاطہ حتمی مشہور ہو چکا تھا۔

احاطہ میں دس ایک منزلہ کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ پانچ ایک طرف اور پانچ دوسری طرف۔ جن کے درمیان میں ایک فراخ گلی تھی جو آگے سے بند تھی۔ ہر کوارٹر میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، ایک مختصر سا برآمدہ اور چھوٹا سا صحن جس کی ایک جانب ایک تنگ باورچی خانہ تھا اور دوسری جانب غسلخانہ۔ چونکہ درمیانی دیواریں ایک اینٹ کی بنی ہوئی تھیں، لہٰذا ایک کوارٹر کی بات دوسرے کوارٹر تک پہنچتی تھی اور دوسرے کی تیسرے تک۔

بیگم کے ہاں کوئی عزیز آجاتا اور وہ اسے کہتی۔ "اے ہے تو آیا ہے، رشید کب آیا تو؟" تو ملحقہ کوارٹر سے آپی چلا کر پوچھتی۔ "اے بیگم کون آیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟" مقابل کے کوارٹر سے ماں برکتے کی آواز آتی۔ "میں کہہ رہی ہوں بیگم ذرا سے چاول بھجوا رہی ہوں گوگے کے ہاتھ۔ مہمان جو آئے ہیں تیرے ہاں؟" اُدھر سے بی بی شور مچا دیتی۔ "کون آیا ہے؟ کس کے ہاں آیا ہے؟ اے مجھے بھی تو بتا ماں برکتے؟"

گلی میں بچے کھیلتے یا بڑے بوڑھے چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتے اور حقہ پیتے ہوئے کوئی نہ کوئی بات چل نکلتی۔ ان کی بات سن کر کوئی نہ کوئی گھر والی ـــ باورچی خانے میں آٹا گوندھتے ہوئے یا کمرے میں جھاڑو دیتے ہوئے وہیں سے چلا کر بات میں شامل ہو جاتی اور لقمہ دیئے جاتی۔

احاطے کے جوان باہر رحمت ہوٹل پر جا بیٹھتے۔ "کیوں رحمت ہے کوئی خبر؟"

اور رحمت کو روز دن میں دو بار نئی سے نئی بات سوچنی پڑتی۔ کیونکہ اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اس خبر کی نوعیت پر اس کی چائے کی بکری کا انحصار ہے، وہ جھٹ سے کہتا۔ "کیا بتاؤں بابو جی، یہ جو سامنے والی بلڈنگ ہے نا، اس کے سات نمبر میں جو رہتے تھی۔ دو بچے چھوڑ کر بھاگ گئی۔"

"بھاگ گئی؟" احاطے والے شوق سے چلاتے۔ "ذرا دیجیو ایک چائے کی پیالی۔ کس کے ساتھ بھاگ گئی؟"

رحمت کو معلوم تھا کہ چا بات کے بغیر نہیں چلتی اور بات چاہ کے بغیر نہیں چلتی۔ اپنی چائے بیچنے کے لئے اسے باتوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اور بات بھی وہ جو چونکا دے، صرف چونکائے ہی نہیں بلکہ دیر تک چونکائے رکھے۔ تاکہ صرف ایک پیالی پر وہ عالم ختم نہ ہو جائے۔

لیکن حتمی احاطہ کے اندر کوارٹروں میں بات چائے کے بغیر ہی چلتی تھی اور اسے چلنے کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ اس میں چاہ کا عنصر ہو۔ حتمی احاطہ دس کوارٹروں پر مشتمل ہونے کے باوجود ایک ہی مکان تھا اور اس کے مکین کو اس بات کی خبر رہتی تھی کہ کس کے ہاں کیا پکا ہے، اور کس کا خاوند اپنے سرتلے دو سرہانے رکھے بغیر سو نہیں سکتا، اور کس نے کنجڑے کے کتنے روپے دینے ہیں۔

حتمی احاطہ میں جگہ حاصل کرنا آسان بات نہ تھی، کیونکہ وہ واحد بلڈنگ تھی جہاں نئے کرایہ دار کو پگڑی یا چھ ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کرنا نہیں پڑتا تھا کیونکہ تائب ہونے کے بعد حاتم علی صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ دفعتاً انہوں نے محسوس کیا ہو کہ انہیں اپنے نام کی لاج پالنا چاہیئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حتمی احاطہ کے کوارٹروں کا کرایہ بہت کم تھا اور حاتم علی کسی صورت میں بھی اسے بڑھانے کے لئے تیار نہ تھے۔

حتمی قوانین کی سب سے بڑی شرط یہ تھی کہ خالی ہونے پر کوٹھڑی کا قبضہ مالک مکان کو دیا جائے اور چپکے سے کسی رشتہ دار یا دوست کو مکان دینے کی اجازت نہ ہوگی۔ اوّل تو حتمی احاطہ میں مکان خالی ہی نہ ہوتا تھا اور ہوتا بھی تو ایک مکان کے لئے کئی امیدوار آپہنچتے اور اپنی نسبی شرافت اور تنگدستی کے ثبوت پیش کرتے۔ بڑے غور و خوض کے بعد حاتم علی فیصلہ کرتے۔ اور جونہی نیا کرایہ دار کوارٹر میں آپہنچتا، احاطہ والوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔

"اے کیسی آوا... ہے یہ آپی؟" ایک زیر لب پوچھتی۔

"میں جانوں ——— ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوڑیوں کی جھنکار ہو۔"

"ہائے اللہ، تو کیا گھر میں جُوا کھیلتے ہیں یہ؟"

"نہیں کچھ اور ہوگا بہن۔"

"اے ذرا لڑکے کو بھیج بہلانے بہلانے دیکھے تو"

پھر دو گھنٹے کے بعد ایک دوسری کو بُلاتی۔

"میں نے کہا ذرا سُن تو ——— آ ادھر گھڑی بھر کے لئے۔ میں نے کہا پردے کی بات ہے۔"

"کچھ معلوم ہوا ——— میں کہتی ہوں یہ نئی پڑوسن تو بڑی زبردست دکھے ہے۔ یہ تو خاوند کو گھورتی ہے۔ اس پر رعب جماتی ہے۔ میں کہتی ہوں۔ میں نے ان کانوں سے سنا ہے۔ اُسے ڈانٹ رہی تھی اور وہ بدھو جواب میں یوں جی جی کر رہا تھا جیسے اسکول کا لڑکا ہو۔"

کوارٹروں کی یہ زیرِلبی باتیں رحمت ہوٹل تک جا پہنچتیں اور ہر نئے کرایہ دار کی آمد پر چار ایک دن رحمت کی چائے چلتی۔ اور بات گویا چاہ کے عنصر سے بے نیاز ہو جاتی لیکن دقت یہ تھی کہ ہر نئے پڑوسی کو پُرانا ہونے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ اور پھر احاطہ حمتی میں تو پڑوسی کا نیاپن بس دو دن ہی چلتا تھا۔ دو دن کے بعد وہ سب نئے کرایہ دار کے گھر میں جا گھستیں اور وہاں اپنی باتوں کا چکر چلا دیتیں۔ اور پھر انہیں باہر نکال لاتیں، اور سارا طلسم ٹوٹ جاتا۔ پھر رحمت کو از سرِ نو باہر کی خبروں کا سہارا لینا پڑتا، اور باہر کی خبر آخر باہر کی خبر ہے۔ خبر ڈھول نہیں ہوتی کہ دُور کی سہانی ہو۔ وہ تو صرف اپنی ذات سے ہٹ کر ہو، اور اس کے بعد جتنی قریب کی ہو اتنی ہی گرم ہوتی ہے۔ دُور کے محلّے سے کسی کے نکل جانے کی بات تو یوں بے معنی معلوم ہوتی ہے جیسے گرین لینڈ میں قحط پڑنے کی خبر ہو۔

چار ایک دن کے بعد حمتی احاطہ میں ہر نیا کرایہ دار پُرانا ہو جاتا تھا۔ اس کے شجرۂ نسب سے لے کر ہونے والی شادیوں کی تفصیلات احاطے والیوں کو ازبر ہو جاتی تھیں، اور نووارد ان سب کا جزو بن کر رہ جاتا۔

یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حمتی احاطے میں کوئی مکین ایسا آیا ہی نہ تھا جو احاطے والوں سے دُور رہتا، یا جس کی طرزِ رہائش، یا خیالات احاطے والوں سے مختلف ہوتے اور وہ ان میں جذب نہ ہو سکتا۔

احاطے میں دفتر کے چار بابو رہتے تھے۔ تین ملوں کے نوکر تھے، اور تین چھوٹے موٹے دُکاندار تھے۔

پھر مل کے ایک ملازم کو کسی اور شہر میں بہتر جگہ مل گئی اور احاطے کا ایک کوارٹر خالی ہو گیا اور پھر چند دنوں کے بعد وہ اس کوارٹر میں منتقل ہو گئی۔ مس کی آمد پر حسبِ معمول احاطے والے "با ملاحظہ ہوشیار" تھے۔ جب بچوں نے اپنے اپنے گھروں میں آ کر یہ خبر سنائی کہ نئے کرایہ دار کا سامان اُتر رہا ہے تو مرد دوڑ کر رحمت ہوٹل پر اکٹھے ہو گئے۔ احاطے کے بوڑھے گلی میں کھاٹ ڈال کر بیٹھ گئے اور عورتیں دروازوں میں کھڑی ہو کر درزوں سے جھانکنے لگیں۔

"ئے میں کہتی ہوں ماں، یہ کیا سامان ہے؟"

"ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے احاطے میں نہیں بلکہ ہوٹل میں رہنے کے لئے آیا ہو کوئی۔ نہ کوئی چارپائی نہ صندوق نہ لُٹر نہ پُٹر۔"

پھر جب وہ خود گلی میں داخل ہوئی تو انہوں نے منہ میں انگلیاں ڈال لیں۔ ماں برکتے نے تو دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ "ہائے میرے اللہ!" بی بی بولی۔ "لو بہن دیکھ لو، نہ چادر نہ برقع!"

"اور پھر چال سے چلتی ہے۔ کیوں بی بی؟ جیسے گلی نہ ہوئی، اللہ مارا ناچ گھر ہوا۔"

"اور میموں کی طرح بولتی ہے۔ سُن رہی ہو۔"

اس کے آنے کے بعد وہ دیر تک دروازوں میں کھڑی رہیں۔ پھر ایک بولی۔ "اے باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔"

"کوئی ہوتا تو آتا نہ"

"اے تو کیا اکیلی رہے گی؟"

"وایسیاں اکیلی ہی رہا کرتی ہیں۔ اور کیا!"

"ہائے اللہ!" وہ سب منہ میں انگلیاں ڈال کر بیٹھ گئیں۔

اُدھر رحمت نے صورتِ حالات دیکھ کر جھٹ پانی کی ایک اور کیتلی دوسرے چولہے پر رکھ دی اور فلمی گیت گنگنانے لگا۔

زہرہ کی عمر بیس اکیس سال کی ہوگی۔ خدوخال کے لحاظ سے اسے خوبصورت نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ دیکھنے میں اچھی لگتی تھی، اور جب وہ کھُل کر بات کرتی تو گویا اندھیرے میں ایک کرن نہ جانے کہاں سے آکر کھیلنے لگتی۔ اور آپ محسوس کرتے جیسے دفعتاً کوئی پردہ ہٹا لیا گیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا جمود طاری رہتا تھا جیسے اُستانیوں کے چہروں پر عام طور سے ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے جیسے بادام پر سخت چھلکا سا چڑھا ہوتا ہے۔ جب وہ ہنس کر بات کرتی تو وہ چھلکا اُتر جاتا۔ گویا مٹیالے بادلوں سے دھنک کے رنگ جھانکتے۔ ویسے دیکھنے میں اُس کی سیاہ آنکھوں پر حسرت و یاس کا پردہ سا چڑھا رہتا تھا اور باریک ہونٹ یوں دبے رہتے گویا اس ڈر کے مارے کہ وہ بات کہہ نہ دے، انہیں مقفل کر رکھا ہو۔ اس کا رنگ سانولا تھا، قد لمبا اور شانے جھکے رہتے تھے۔

حمتی احاطہ میں زہرہ کی آمد کے فوراً بعد ہی احاطے والیاں آپی کے صحن میں اکٹھی ہوگئیں اور زہرہ کے متعلق اپنی اپنی معلومات کا اظہار کرنے لگیں۔ کسی نے کہا۔ اے ہے رنگ تو کالا ہے۔ کوئی بولی۔ کمر یوں جھکی جھکی ہے جیسے بڑھیا ہو۔ کسی نے کہا کنکھیوں سے دیکھتی ہے۔ اور آخر میں سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اس عمر میں جو اکیلی رہتی ہے تو کوئی بات ہے۔ اور سارے احاطے میں زہرہ کے متعلق "کوئی بات ہے" کا فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ اور احاطے والیاں اُس بات کا کھوج لگانے میں مصروف ہوگئیں۔

احاطے کے مردوں کی رائے مختلف تھی۔ بوڑھے اس بات پر خوش تھے کہ وہ شانے جھکا کر چلتی تھی، سینہ تان کر نہیں۔ جوان اس کی نیچی نظروں اور بند ہونٹوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن مردوں کی رائے کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ اُلٹا ان کی رائے نے تو جلتی پر تیل کا کام کیا۔ زہرہ کی آمد کے بعد پہلی رات مردوں نے دبی دبی آواز سے کچھ کہنا چاہا لیکن عورتوں کی آوازیں بلند تر ہوتی گئیں اور "کوئی بات ہے" کا فیصلہ پختہ تر ہوگیا اور بیچارے مرد خاموش ہو کر رہ گئے۔ اب عورتوں پر اور بھی لازم ہوگیا کہ جلد از جلد بات کا کھوج لگا کر "میں نے کہا نہ تھا" کے ساتھ اُسے مردوں کے روبرو پیش کر دیا جائے۔

اگر زہرہ کی شخصیت پر حسرت و یاس اور تنہائی و علیحدگی کی خصوصیات اس حد تک حاوی نہ ہوتیں، اگر وہ احاطے میں آکر چلّا چلّا کر احاطے والیوں سے باتیں شروع کر دیتی۔ "اے ماں برکتے میں کیا کروں، مجھ سے تو آگ نہیں جلتی، یہ لکڑیاں اتنی گیلی ہیں۔" یا آپی سے کہتی۔ "تو آپی اب سوئیٹر بُننا مجھے کب سکھاؤ گی؟" تو وہ سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اس کے ہاں آجمع ہوتیں۔ ماں برکتے دو سوکھی لکڑیاں اٹھا لاتی۔ آپی سلائیاں لے آتی، اور بی بی اُسے یہ سمجھانے بیٹھ جاتی کہ گوندھنے کے لئے آٹے میں پانی ڈالا جاتا ہے یا پانی میں آٹا۔

لیکن زہرہ نے ایسا نہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ "کوئی بات ہے" کی بات پکّی ہوگئی اور بات کا راز پانے کے لئے ان کے کان کھڑے ہو گئے، اور احاطے میں سرگوشیوں کا گویا ایک خاموش طوفان امڈ آیا۔

"میں نے کہا سنا تم نے؟ دن میں چار مرتبہ اللہ ماری چائے پیتی ہے اور معلوم ہے روز نہاتی ہے، روز بلاناغہ! لڑکا آج کہہ رہا تھا کہ کرسی پر بیٹھ کر بال بناتی ہے، میموں کی طرح! ہائے کتنی چالاک ہے، زمین پر سوتی ہے۔ چارپائی تک نہیں ہے گھر میں۔ بس اللہ ماری دو کرسیاں ہیں!"

زہرہ کے کواڑ کی ہر جھری سے چھوٹی آواز کو وہ غور سے سنتیں اور پھر کان سے منہ لگا لگا کر باتیں کرتیں۔

بچوں نے یہ صورتِ حال دیکھی۔ تو انہوں نے اسے کام میں لانا شروع کر دیا۔ جیسے بچوں کی عادت ہوتی ہے۔ سرزنش سے بچنے کے لئے یا گھر والوں کی گذشتہ ناراضگی کو دُور کرنے کے لئے۔ وہ بھاگے بھاگے گھر میں داخل ہوتے اور پُراسرار انداز میں کہتے۔ "آپی، وہ بیٹھی لکھ رہی ہے!"

پھر آپی بھاگ کر ماں برکتے کو بلاتی۔ "تو سن لیا، وہ بیٹھی لکھ رہی ہے۔ ابھی ابھی لڑکے نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے!"

"ضرور اُسے خط لکھ رہی ہوگی!"

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ 'کوئی بات ہے' کہتی نہ تھی میں؟"

اس طرح جلد ہی زہرہ کے متعلق احاطے والیوں کا یہ فیصلہ کہ "کوئی بات ہے" "کوئی ہے" میں تبدیل ہوگیا اور وہ "کون ہے" کی جستجو میں مصروف ہوگئیں۔

زہرہ کی آمد کے بعد حتمی احاطے میں گویا زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ احاطے والیاں بات بات پر آپی کے گھر جمع ہوتیں۔ زہرہ کے متعلق تازہ ترین معلومات پر تبصرے ہوتے، ہاتھ چلتے، آنکھیں مٹکائی جاتیں، نئی تجاویز پیش کی جاتیں۔

باہر رحمت ہوٹل میں چائے کے دور چلتے۔ جوان بہانے بہانے وہاں بیٹھے رہتے تاکہ جب زہرہ سکول جائے یا واپس آئے تو ایک نظر اسے دیکھ سکیں۔ اور پھر اُسے دیکھنے کے بعد اس کی کسی نہ کسی حرکت پر دبی دبی باتیں ہوتیں۔

کبھی رحمت ایک چنگاری چھوڑ دیتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سبھی کچھ نہ کچھ کہتے:

"بھئی شاباش ہے۔ نگاہ اٹھاتے نہیں دیکھا اسے۔"

"ہاں اسے کہتے ہیں نگاہ کا پردہ۔ اصل چیز یہ ہے رحمت۔ برقع تو اب سجاوٹ بن کر رہ گیا ہے۔"

"اور یہ بھی تو دیکھو کہ پیدل جاتی ہے۔ حالانکہ سکول دو میل دور ہوگا۔"

میدان میں لڑکے اسے دیکھتے ہی تالیاں پیٹنا شروع کر دیتے۔

"وہ آگئی اُستانی۔" ایک چلاتا۔

"چلو آنکھ مچولی کھیلیں اس کے گھر جاکر۔"

"ہاں اور پھر آپی کو بتائیں گے جاکر اس کی کوئی بات۔"

اور پھر کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر میں جا گھستے یا چوری چوری دروازے کی درزوں سے جھانکتے اور پھر احاطے والیوں کی محفل میں جاکر کوئی ایسی بات کرتے کہ جسے سن کر وہ سب حیرانی سے ان کی طرف دیکھتیں اور بسا اوقات اپنی اہمیت کا احساس حاصل کرنے کے لئے جھوٹ موٹ کی بات بنا کر احاطے والیوں کو جا سناتے۔

ایک روز جب آپی نے ان سب کو اس بات پر ڈانٹا تھا کہ وہ نالی میں بھیگے ہوئے گند کو ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے اور انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے آپی کو خوش کریں کہ گلی میں انہیں ایک کاغذ ملا۔ گوگے نے وہ کاغذ منّی کے ہاتھ سے چھین لیا اور چلانے لگا۔ "آؤ بھئی اس کاغذ کی ناؤ بنا کر اسے تیرائیں۔"

"اونہوں" موٹا چلانے لگا۔ "اس کا ہم پٹاخہ بنائیں گے؟"

"اس پر تو کچھ لکھا ہوا ہے۔" منّی نے کہا۔

"دکھانا تو۔" گوگا چلایا۔ "یہ تو واقعی لکھا ہوا ہے، ارے۔" اس نے دفعتاً ڈرامائی انداز اختیار کر لیا۔ "چلو آپی سے کہیں یہ کاغذ اُستانی کے گھر سے ملا ہے۔" اُس نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

"ہاں ہاں۔" وہ سب تالیاں پیٹنے لگے۔ "چلو، چلو۔"

"اور جو کسی نے بتایا تو۔" گوگے نے اپنا بازو گھما کر جملہ مکمل کر دیا۔

آپی دیر تک اس کاغذ کا مطالعہ کرتی رہی اور پھر چیک کر بولی۔ "لو میں نے کہا نہ تھا کہ کوئی ہے۔"

"لیکن یہ پرچہ کیا ہے۔" ماں برکتے نے بے تابی سے پوچھا۔

"محبت نامہ ہے اور کیا۔" آپی فاتحانہ انداز سے بولی۔

"ہائے اللہ!" بی بی نے سینہ تھام لیا

"تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ خط آتے جاتے ہیں۔" بیگم بولی۔

"معاملہ تو اس سے بھی آگے بڑھ چکا ہے۔" آپی نے کہا۔ "صاف تو لکھا ہے اور وہ اُسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے کیا لکھا ہے۔ "غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے" اور اور "بات بنائے نہ بنے" تو اس سے زیادہ بھلا کیا بات بنے گی۔ سمجھو تو تم کہ غمِ دل بھی سنایا جا چکا ہے۔ یعنی ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں۔"

"ہائے اللہ" بی بی نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔

"پھر وہ ہے کون؟"

صاف تو لکھا ہے۔"

"لیکن کیا لکھا ہے؟"

"یہ دیکھو نیچے لکھا ہے۔ ظہور۔"

"ہائے اللہ کون اپنا ظہور؟" بی بی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

اور وہ سب حیرت سے آپی کی طرف دیکھنے لگیں۔

ظہور دو سال سے احاطے میں رہتا تھا۔ وہ شہر کی کسی مل میں نوکر تھا اور صبح سویرے سورج نکلنے سے پیشتر ہی اپنے کام پر چلا جاتا تھا اور پھر مغرب کے بعد واپس آتا تھا۔ اس لئے احاطے والوں سے اس کے تعلقات محض علیکم سلیکم تک محدود تھے۔

اوّل تو وہ طبعاً خاموش اور تنہائی پسند تھا، دوسرے ماں باپ کے ہوتے ہوئے اُسے احاطے والوں سے میل ملاپ پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اس کی ماں تو اب سارا دن احاطے میں گھومتی رہتی تھی اور باپ غلام دین ہر وقت گلی میں بیٹھ کر حقہ پینے کا عادی تھا۔ ماں باپ کی وجہ سے سارے احاطے والے ظہور کی علیحدگی کے باوجود اسے اپنا ہی سمجھتے تھے۔

ظہور کی خاموشی اور تنہائی پسندی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کی پہلی بیوی بڑی بدمزاج اور پھوہڑ تھی جس کی وجہ سے اس کے ذہن میں گھریلو زندگی کی یاد تلخی اور دکھ سے بھری تھی۔ اسی وجہ سے اس نے بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ چار سال سے اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن ان دنوں اس کے والدین اپنے کسی عزیز سے ملنے کے لئے کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے، اس لئے وہ کوارٹر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔

ظہور کی تعلیم میٹرک تک تھی لیکن اس کا رکھ رکھاؤ کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ بہت تعلیم یافتہ ہو۔ کلرک ہونے کے باوجود وہ مل میں مزدوروں سے الگ تھلگ رہتا تھا اور اپنے ساتھی کلرکوں سے یوں بات کرتا تھا جیسے وہ ان سے ہر لحاظ سے مختلف ہو۔ شہر میں وہ اکثر کتابوں کی دکانوں پر کھڑا ہو کر کتابوں کے نام دیکھتا رہتا۔ اگرچہ اس نے کبھی کوئی کتاب نہ پڑھی تھی۔ اسے کتابیں پڑھنے کا شوق نہ تھا۔ صرف یہ خواہش تھی کہ لوگ یہ سمجھیں کہ اُسے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ البتہ اسے انگریزی فلم دیکھنے کا بےحد شوق تھا اور جس فلم پر اکیڈمی ایوارڈ لکھا ہوتا اسے تو وہ ضرور ہی دیکھتا تھا یا جس فلم کے متعلق لوگ تذکرے کرتے وہ اسے ضرور دیکھتا اور پھر اس کے بارے میں سنے سنائے فقرے دہرانے کے مواقع تلاش کرتا رہتا۔

احاطے والوں سے اُسے نفرت تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ اسکی عظمت کے یکسر منکر تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس کے ذاتی معاملات میں دخل دیا کرتے تھے۔ دو سال سے وہ مسلسل طور پر کہے جا رہے تھے۔ "اے ہے یہ لڑکا شادی کیوں نہیں کرتا۔" شاید اسی وجہ سے وہ اکیلے میں چڑ کر کہا کرتا تھا۔ "بس نہیں کرتا میری مرضی۔ کسی کو کیا؟" اس کی طبیعت میں ضد کا عنصر خاصہ شدید تھا۔

ظہور کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے کوارٹر کے مقابل کے کوارٹر میں کوئی اُستانی آ رہی ہے۔ یا وہ اکیلی ہے۔ معلوم بھی کیسے ہوتا۔ وہ تو صبح سویرے ہی کام پر نکل جاتا تھا اور پھر رات گئے گھر آتا۔ صرف چھٹی کے روز دوپہر تک وہ گھر رہتا تھا اور اس روز بھی وہ دروازے بند کر کے اندر بیٹھا رہتا اور پھر دوپہر کے وقت کپڑے پہن کر شہر چلا جاتا۔

دفعتاً ظہور نے محسوس کیا کہ احاطے کے لوگ اس میں از سرِ نو دلچسپی لینے لگے ہیں۔ جب وہ رحمت ہوٹل کے پاس بیٹھتا تو ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کی طرف اشارہ کرتے اور باتیں کرنا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے۔ گلی سے گزرتا تو عورتیں دروازوں سے دیکھتیں۔ اُسے سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کے باوجود ظہور کو اس بات کا احساس نہ ہوا کہ اس کی ہر حرکت پر کڑی نگرانی رکھی جا رہی ہے اور اس کے کوارٹر میں احاطے کے بچے جو بار بار آتے ہیں ان کا مقصد کھیلنا نہیں بلکہ احاطے والوں تک خبریں پہنچانا ہے۔

ظہور کا خط پڑھنے کے بعد اتوار کے دن دوپہر تک تو احاطے والیاں بےحد مصروف رہنے لگیں۔

نیک کہتی۔ "میں نے کہا آپی اوپر دھوپ میں بیٹھا ہے۔ مطلب ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" آپی ہنستی۔ "سب جانتی ہوں۔ اور وہ نیک بی بی کہاں ہے؟"

"ہوگی کسی دروازے کی درز سے لگی ہوئی۔"

"نہیں ماں ڈر کتے، وہ میم صاحبہ تو اندر میز لگا کر بیٹھی ہے۔"

"ضرور خط لکھ رہی ہوگی۔ ہاں تم مانو نہ مانو۔ میں کہے دیتی ہوں۔"

"خط نہیں تو سنگار کر رہی ہوگی۔ سامنے آنے سے پہلے بننا سنورنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔"

"میں کیا جانوں کیا ہوتا ہے۔ میری جانے بلا۔ ہاں۔"

پھر ایک روز منی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ جب ظہور نے اسے مٹھائی دی تو وہ بولی۔ "تم ادھر کیوں دیکھا کرتے ہو ماموں؟"

"اِدھر کدھر" اس نے بات سمجھے بغیر پوچھا۔

"ہاں ——— مجھے معلوم ہے" وہ بولی۔ "تم استانی کو تاکتے ہو نا۔"

"استانی ——— کون استانی؟" ظہور نے منی کو گھورا۔

"یہ جو سامنے کوارٹر میں آئی ہوئی ہے وہ استانی۔"

"اچھا" اُس نے حیرانی سے کہا۔ "تو اس کوارٹر میں اُستانی آگئی ہے۔"

"سبھی کہتی ہیں تم اسے دیکھتے ہو اور اسے خط بھی لکھتے ہو۔"

"خط بھی لکھتا ہوں ———" ظہور نے قہقہہ لگایا۔ "اچھا" وہ بولا۔ "تو کیسی ہے وہ۔"

"کون؟" منی چلانے لگی۔

"آہستہ بولو، آہستہ بولو۔" ظہور نے کہا۔

"کون؟" منی نے آہستہ سے پوچھا

"وہی استانی جو سامنے کے کوارٹر میں آئی ہے۔"

"وہ ——— ہے بڑی اچھی ہیں وہ۔ اتنی اچھی ہے اتنی اچھی ہے۔ ہمیں ملنے کھلایا کرتی ہیں جب بھی ہم وہاں جاتے ہیں۔"

"تو اسی واسطے اچھی ہے۔" ظہور نے کہا۔

"نہیں اس واسطے تو نہیں نا۔" منی چیخنے لگی۔ "ویسے ہی اچھی ہے۔ اتنی پیاری ہے ہے بڑی پیاری ہے۔"

منی کی بات سُن کر ظہور نے معاملے کی نزاکت کو نہ سمجھا۔ اس لئے بات ہنس کر ٹال دی، لیکن نہ جانے کیوں اس روز وہ خلاف معمول باہر نہ گیا اور وہیں گھر بیٹھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگا۔ نہ جانے وہ کون ہے۔ نہ جانے کیسی ہے۔ دیکھوں تو۔ وہ اُٹھ کر دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا اور درزوں سے جھانکنے لگا۔ سامنے کوارٹر کا دروازہ کھلا تھا مگر صحن خالی پڑا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ چل کر دیکھوں تو سہی بات کیا ہے۔ اس لئے وہ سلیپر پہن کر احاطے سے باہر نکل کر رحمت ہوٹل میں جا بیٹھا۔

گلی میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ عورتیں بھی اس خیال سے بے پروا ہو چکی تھیں کہ ظہور حسب معمول باہر چلا گیا ہوگا۔

ہوٹل میں اس وقت صرف دو ایک آدمی بیٹھے تھے۔ ظہور کو ادھر آتے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔

"دینا ایک پیالہ" ظہور نے رحمت سے کہا۔

"خیریت تو ہے بابو جی" رحمت بولا۔ "آج سیر نہیں گئے کیا؟"

"بس ویسے ہی" ظہور نے کہا۔ "میں نے کہا آج رحمت کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پئیں گے۔ شہر تو روز ہی پیتے ہیں چائے۔"

"بڑی مہربانی ہے" رحمت نے جواب دیا۔ "آپ خیال نہ رکھیں تو کون رکھے۔"

ظہور کے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی وہاں خاموشی چھا گئی اور وہ معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد رحمت نے بات چھیڑی۔ "آج تو اتوار ہے — ہے نا، میں بھی کیسا احمق ہوں، میں سمجھا آج بھی استانی کو چائے بھیجنی ہے۔"

"استانی کون؟" ظہور نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم کیا بابو جی؟ جو نئی کرایہ دار آئی ہے احاطے میں، آپ کے کوارٹر کے مقابل والے کوارٹر میں۔"

"اچھا" ظہور نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بڑی اچھی لڑکی ہے" رحمت نے کہا۔ "لیکن ہے بڑی دکھیا۔"

"کیوں؟" کریم نے معنی خیز انداز سے کہہ کر رحمت کو اکسایا۔

"وہ بات یہ ہے بابو جی۔ مطلب ہے۔ یعنی —" اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بات کرے۔ پھر دفعتاً اسے سوجھی۔ "اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ بابو جی بیچاری دکھیا ہے، اس لئے کہ جہاں بھی جاتی ہے، محلے کے لڑکے اسے اسقیہ چٹھیاں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"ہاں بیچاری۔" کریم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "شرم نہیں آتی ان لڑکوں کو۔ آخر سبھی کے گھر میں ماں بہنیں ہوتی ہیں۔"

اس وقت دفعتاً ظہور کو احساس ہوا کہ منی ٹھیک کہتی تھی۔ اور وہ سب اشارۃً اس پر الزام دھر رہے تھے۔ اسے غصہ آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ کانوں کی لویں گرم ہوگئیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چائے کا پیالہ اٹھا کر کریم کے سر پر دے مارے۔ لیکن اس نے بصد مشکل اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔

"پہلے اُس محلے میں رہا کرتی تھی نا۔ کیا نام ہے اس محلے کا۔ وہ جہاں۔ وہ مسجد ہے۔" رحمت نے بات پھر سے شروع کی۔

"ہاں ہاں، وہ نیا محلہ ہے، مسجد والا۔" کریم بولا۔

"وہاں رہتی تھی پہلے بابو جی اور پھر اسی لئے اسے وہاں سے آنا پڑا۔ اب لوگ جو جبردستی محبت بھری چٹھیاں لکھیں تو بدنامی تو ہوگی۔" رحمت نے کہا۔

"بالکل میرے بھائی بدنامی تو ہے۔" کریم نے جواب دیا۔

"اب یہاں اللہ خیر کرے۔" رحمت نے کہا۔ "احاطے کی عزت کا معاملہ ہے، کیوں بابو جی؟"

ظہور طیش میں آگیا۔ "بھئی لکھنے والے تو لکھیں گے، جسے محبت ہوگی وہ اسے کسی نہ کسی طرح جتاکر رہے گا۔"

کریم نے حیرت سے ظہور کی طرف دیکھا۔ "پر یہ کیسے معلوم ہو کہ محبت ہے۔ وہ تو ہوس کے مارے لکھتے ہیں۔"

"بھئی تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ہوس کے مارے لکھتا ہے کوئی؟"

"پر بابو جی" رحمت بولا۔ "ہمیں کیسے یقین آئے کہ محبت کے لئے لکھتا ہے کوئی؟"

"یہ کیسے یقین آجاتا ہے تمہیں کہ کوئی ہوس کے لئے لکھتا ہے؟" ظہور نے بصد مشکل اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

"محبت یوں نہیں ہوتی بابو جی۔" کریم چلّایا۔

"تم کیا جانو کس طرح ہوتی ہے؟" ظہور نے غصے میں کہا اور کھوکھے کی میز پر پیسے پھینک کر احاطے کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر وہ زخمی شیر کی طرح بے تحاشہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کمینے! شریف لڑکیوں پر الزام دھرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جو منہ میں آیا بک دیا۔ نہ جانے کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔ لاحول ولاقوۃ! اور مجھے یہاں معلوم ہی نہیں کہ کیا گل کھلانے جا رہے ہیں۔ لیکن وہ ہے کون! بیچاری کو میں نے دیکھا تک نہیں اور یہ محبت نامے بھی بھجوا چکے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ!! وہ پھر دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا اور درزوں میں سے جھانکنے لگا۔ باہر صحن میں ایک آرام کرسی لگی ہوئی تھی۔ کرسی کا منہ پرلی طرف تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بیٹھا ہو۔

دفعتاً جنبش سی ہوئی اور ایک دبلا پتلا بازو کرسی سے اوپر ابھرا۔ زرد زرد سی کلائی پر کالی چوڑیاں حرکت میں آئیں۔ باریک انگلیاں لہرائیں۔ سیاہ آنچل اڑا۔

"ارے" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ تو واقعی کوئی ہے۔"

ابھی وہ گھر پہنچا ہی تھا کہ احاطے میں شور مچ گیا۔ رحمت ہوٹل سے نکل کر بات احاطے میں جا پہنچی۔

"میں نے کہا ماں سنا کچھ؟ لڑکے نے صاف اقبال کر لیا۔" آپی بولی۔

"[illegible] ... میں تو لکھوں گا کرے جو کسی کا جی چاہے"

"سبحان اللہ۔ اس قدر ڈھٹا ہوا ہے اس پر!" ماں بڑی کٹھن سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"میں نے کہا نہ تھا۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا" آپی نے ہاتھ چلایا۔

"تو اب کیا ہوگا؟" ماں سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"تو یہ کتنے منہ پھٹ ہو گئے ہیں یہ آجکل کے لڑکے! نہ کسی کی عزت کا خیال، نہ کسی کے کہنے کی پروا۔ نہ ماں، ہم احاطے میں تو یہ نہ ہونے دیں گے۔" آپی جوش میں چلانے لگی ــــ اور ــــ پھر وہ سب ایک جگہ اکٹھی ہو گئیں اور بات ازسرِ نو شروع ہو گئی۔

ظہور نے ان کی سرگوشیاں سنیں تو وہ باہر گلی میں نکل آیا اور آپی کے دروازے پر کھڑا ہو کر سننے لگا۔

"ہونہہ احاطے میں یہ نہ ہونے دیں گے" وہ زیرِ لب بولا اور کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ زہرہ کے دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹا کر اسے بلائے اور اسے صاف صاف کہہ دے "آپ احاطے والوں کی باتوں کی پروا نہ کریں، کچھ پروا نہ کریں۔ میں سمجھ لوں گا انہیں۔"

پھر وہ اپنے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ "بے چاری!" وہ سوچ رہا تھا۔ "خواہ مخواہ بدنام کر رہے ہیں اسے۔" اس نے لکھنے کا پیڈ اٹھا لیا اور قلم کھول کر بیٹھ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسے ہمدردی بھرا خط لکھے۔ جس میں اسے دلاسہ دے، حوصلہ دے۔ اس نے دو ایک لکیریں لکھیں: "محترمہ! آپ مجھے نہیں جانتیں، نہ مجھے ہی آپ سے ملنے کا فخر حاصل ہے ــ" "اونہوں!" اس نے اپنے آپ سے کہا اور وہ خط پھاڑ دیا۔ اس نے کئی بار کچھ لکھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اسے وہ مضمون مضحکہ خیز معلوم ہوتا اور وہ ورق پھاڑ دیتا۔

دفعتاً قریب کے کوارٹر سے کسی کی آواز آئی: "وہ تو خود مان گیا ہے اپنے منہ سے۔ "مجھے محبت ہے" ہاں کہہ جو رہی ہوں میں، اپنے منہ سے مان گیا ہے۔"

"آلیں اس کے ماں باپ۔ کر لیں گے ان سے بات" بوڑھا بولا۔

"لیکن اس محبت کا بھی تو کوئی انتظام ہونا چاہئے۔ ہونہہ! کہتا ہے مجھے محبت ہے۔"

"ہاں ہے!" وہ غصے میں غرایا۔ "ہے۔ پھر کیا ہوا۔ کر لو جو میرا کرنا ہے۔" اس نے پیڈ کا ایک کاغذ اٹھا لیا اور نہایت احتیاط سے اس پر لکھا: "مجھے تم سے محبت ہے۔" دو ایک بار اسے پڑھا۔ پھر اس کے نیچے اپنا نام لکھا۔ "ظہور"۔ اور پھر ایک پتھر پر وہ کاغذ لپیٹ کر باہر دروازے میں جا کھڑا ہوا اور سامنے کوارٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ زہرہ کے کمرے میں کوئی دھندلی شکل کرسی پر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اس گولے کی طرف دیکھا اور پھر اسے زہرہ کے کوارٹر میں پھینک دیا۔ وہ گولا زہرہ کے پاؤں کے قریب جا گرا، وہ گھبرا کر اٹھی۔

"ہاں ہے" ظہور نے دانت بھینچ کر کہا "مجھے تم سے محبت ہے" اور پھر دروازہ بند کر کے درز میں سے دیکھنے لگا۔

روشنیوں کا شہر

(زیرِ طبع ناول کا ایک باب)

ابنِ سعید

لندن کی بسوں کی دوسری منزل میں پہونچ کر انسانی نقطۂ نظر کچھ معلق ہو کے رہ جاتا ہے۔ اور بس کے اردگرد زندگی اس نقطۂ نظر سے ہم آہنگ بھی نظر آتی ہے اور بعید بھی! ایک حرکت اور جمود کا ملا جلا احساس!

غنی نے جو کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا بس سے نیچے موٹروں اور انسانوں کے سمندر میں ایک نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھو وہ "ایکسپریس" کی وین (VAN) ہے جو ٹریفک کے اصولوں کے خلاف اور گاڑیوں سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ درصل اخبار کے دفتروں کی گاڑیوں کو باقی ٹریفک پر ایک قسم کی فوقیت حاصل ہے"!

"ایکسپریس"! "آبزرور"! "ڈیلی مرر"! "ٹیلیگراف"! "ایوننگ نیوز"! یہ نام ماتھل کے تحتِ شعور میں نہ جانے کب سے موجود تھے۔ اور اس وقت یہی نام اس سڑک کے دونوں طرف کی عمارتوں پر کندہ تھے اور ماتھل اور غنی کی بس کے ساتھ قدم ملا کے دوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

فلیٹ اسٹریٹ!

یہ سڑک کوئی بہت زیادہ چوڑی یا شاندار نہ تھی۔ پھر بھی اس کی ایک اپنی عظمت تھی۔ ایک جداگانہ حیثیت تھی۔ یہ سڑک جو دنیا میں غالباً فورتھ اسٹیٹ (FOURTH ESTATE) کا سب سے بڑا مسکن ہے۔

غنی نے پھر بس سے نیچے ایک موہوم سے نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بس یہ آگے ہمارا اسٹاپ ہے، یہاں ہم اتر جائیں گے!"

وہ دونوں اپنی سیٹوں پر سے کھڑے ہو گئے اور بس دو ایک موٹروں کے بیچ میں سے اپنے لئے راستہ بناتی ہوئی عین اسٹاپ کے سامنے آن کے رُک گئی اور کنڈکٹر ایک قسم کی بے تعلقی کے ساتھ بس میں چڑھنے اور اترنے والوں کے چہروں کو دیکھنے لگا۔ لندن کے بس کنڈکٹروں کی بھی اپنی جگہ خاص حیثیت ہوتی ہے۔ ان کے پھرتیلے پن میں بس کی ایک منزل سے دوسری منزل تک کی بھاگ دوڑ میں، بس کی سیٹوں کے خالی ہو جانے اور پُر ہو جانے کے بلند آواز اعلانات میں ایک طرح کی انفرادیت ہوتی ہے۔ لندن کے پولیس والوں کی طرح لندن کے بس کنڈکٹر بھی ایک خاص شخصیت کے مالک ہیں۔ اور ماتھل اور غنی بس سے اُتر گئے اور ماتھل کو ایک لمحے کے لئے اس بات کا ہلکا ہلکا افسوس ہوا کہ وہ ملا جلا متحرک اور جامد نقطۂ نگاہ جو بس کی دوسری منزل نے اسے عطا کیا تھا اب اس سے چھن گیا۔

غنی نے ماتھل کے بازو کو پکڑ لیا جیسے اس کو خدشہ ہو کہ کہیں وہ اس تمام سمندر میں غائب ہو کے نہ رہ جائے اور وہ دونوں پیومنٹ پر تیز تیز قدموں سے چلنے والے مردوں اور عورتوں اور نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک مسلسل ہجوم کے درمیان اپنے لئے راستہ بناتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلنے لگے اور غنی نے قدرے فلسفیانہ انداز میں کہا: "اگر لندن دیکھنا ہے تو پیدل دیکھنا چاہیئے۔ ویسے کاروباری مقصد سے پھرنے کے لئے ٹیوب سب سے اچھی چیز ہے۔ بسوں کی دوسری منزل سے سیر بہت اچھی ہوتی ہے۔ لیکن بسوں میں پھرنے سے آدمی ان گلی کوچوں کو نظر انداز کر جاتا ہے جو لندن کے تمدن کا ایک جزو ہیں!"

وہ لوگ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے فلیٹ اسٹریٹ کی پیومنٹ کو چھوڑ کے ایک تنگ سی گلی میں مڑ گئے۔ یہ چیشائر چیز (CHESHIRE CHEESE) ہے۔ لندن کا کئی سو سال پرانا شراب خانہ جہاں ڈاکٹر جانسن نے انگریزی شاعروں کی زندگیوں پر تبصرے کئے تھے اور مزاح کا وہ رنگ ایجاد کیا تھا جو [illegible] سے آج تک مشہور ہے۔

"چیشائیر چیز" کے دروازوں میں دھندلے دھندلے شیشے لگے ہوئے تھے۔ جن پر اُبھرے ہوئے نقوش کے کئی پھول پتے بنے ہوئے تھے اور "پبلک بار" اور "سیلون" لکھا ہوا تھا۔ ان دھندلے شیشوں کے پار "پب" کی مخصوص فضا تھی۔ سگریٹوں اور بیئر اور سٹاوٹ کی بُو سے معمور دیواروں پر مختلف قسم کی شرابوں کے قدِ آدم اشتہار، عورتوں کی ننگی ننگی تصویریں، ایک کونے میں جیوک باکس (JUKE BOX) جو چھ پنس ڈالنے پر آپ ہی آپ ایک گانا سنا دیتا ہے اور ایک کونے میں مخصوص بار کاؤنٹر جس پر شراب کے پیپے رکھے ہوئے تھے۔ کھانے کے لئے سارڈین اور سوسیج کی رکابیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دانت کریدنے کی سلائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ راکھ جھاڑنے کے لئے پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آج سے کئی سو سال پہلے اس کاؤنٹر پر ڈاکٹر جانسن نے شراب خریدی ہوگی اور بوسویل نے اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کرلیا ہوگا۔ پھر ڈاکٹر جانسن نے اپنے مخصوص طنزیہ مزاح کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ اور پھر بوسویل نے اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کرلیا ہوگا۔ ماحل نے سوچا۔ "نہ جانے ڈاکٹر جانسن کو بھی بوسویل کی شخصیت میں وہ بوریت نظر آئی کہ نہیں جو ہم کو اس کی نگارشات میں نظر آتی ہے"!

غنی کو بوسویل کی بوریت یا ڈاکٹر جانسن کے مزاح میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس نے اپنے پانچ سالہ قیام میں لندن کو اپنے لئے ایک نئے سرے سے دریافت کیا تھا اور اب آج کی ملاقات میں وہ اپنی اس دریافت کو اپنے بچپن کے دوست اور ساتھی ماحل کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔

تم تو ایک (INTELLECTUAL) ہو اور میں محض ایک ٹیلیفون مکینک ہوں۔ لیکن جب سے میں لندن آیا ہوں مجھے خواہ مخواہ اس جگہ سے ایک رومانوی انداز کا عشق ہوگیا ہے۔ اس کی ایک ایک گلی میں، ایک ایک کوچہ میں، ایک ایک محلے میں ایک رومانوی کیفیت نظر آتی ہے۔ اور نہ جانے کیوں، جب سے میں لندن آیا ہوں۔ میرے دل میں ایک خواہش یہ دبی رہی ہے کہ تم بھی لندن آؤ اور اس کی اس رومانوی کیفیت کو میری طرح اپنے آپ محسوس کرو۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور لندن آؤ گے اور پھر یہاں کی گلیوں کوچوں میں ہم اکٹھے پھریں گے! اگلے وقتوں کی یادیں!

اگلے وقتوں میں ایک شہر تھا جس کا نام تھا دلّی۔ یہ شہر دراصل بڑی چھوٹی گلیوں، کوچوں، محلوں، چھتوں، کھڑکیوں اور دو چھتیوں کا ایک لامتناہی گنجلک سلسلہ تھا اور اکثر وہ لوگ جو اس شہر کی فضا میں سانس لیتے تھے، اس سلسلہ کا ایک جزو بن کے رہ جاتے تھے۔ ماحل اور غنی اور ان کے ہم عمر ساتھی، اس لامتناہی اور گنجلک سلسلے کو ہر رنگ میں، ہر موسم میں دیکھ چکے تھے۔ جاڑوں کی صبح میں، جب تمام شہر پر ایک مردہ مردہ پیلی پیلی دھوپ اور کہر کی ملی جلی چادر تن جاتی، اور گلیوں، کوچوں اور تنگ تنگ محلوں میں رہنے والے بچے اپنے اپنے علاقے چھوڑ کر دلّی دروازے کے باہر میدانوں میں جمع ہو کر کھیلتے رہتے، گرمیوں کی دوپہروں میں سورج کی تمازت کی بنا پر اور لو کے مسلسل تھپیڑوں کی بنا پر، ہر گلی، ہر کوچہ ایک بھٹی بن کر رہ جاتا۔ اور سڑکوں کا کولتار پگھلنے لگتا، اور پرانی گلیوں کے اینٹوں کے فرش بالکل ہی تپ اُٹھتے اور یہ تپش ماحل کو اپنے پیروں پر، ربڑ اور کینوس کے جوتوں کے اندر بری طرح محسوس ہوتی اور وہ اور غنی اور ان کے ساتھی سب سے تنگ اور سب سے تاریک محلوں میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے، کیونکہ ان تاریک اور تنگ محلوں میں دھوپ کی تمازت ذرا مشکل سے پہنچ پاتی۔ ماحل اور غنی اور ان کے ہم عمر بچوں کے قدم ان تمام محلوں، گلیوں، کوچوں سے اس طرح آشنا تھے جس طرح مکڑی اپنے جال کے تانے بانے کو پہچانتی ہے۔!

چیشائر کے اندر پہنچ کے ماحل کو ذرا مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں اس کو ڈاکٹر جانسن اور بوسویل اور ان کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں اور ایکٹروں کے بجائے ادھیڑ عمر اور فربہ جسموں، اور میلے کپڑوں والے لوگوں کا ایک مختصر سا ہجوم نظر آیا، یہ وہ لوگ تھے جو آس پاس کی دکانوں پر اور چھاپے خانوں میں اور اخبار کے دفتروں میں کام کرتے تھے، اور ایک دو گلاس بیئر پینے اور سینڈوچ کھانے یہاں "چیشائر چیز" میں چلے آتے۔

ماحل نے کہا۔ "ان لوگوں کو شاید ڈاکٹر جانسن کی شخصیت کا علم ہی نہ ہوگا۔ وہ شاید یہ بھی نہ جانتے ہوں گے اس شراب خانے کے ہمسائے میں اٹھارویں صدی میں ایک زبردست ڈرامہ ہوا تھا۔ وہ ڈرامہ جس کے کردار ڈاکٹر جانسن اور ایک ادھیڑ عمر والی بدصورت عورت تھی۔ اور چونکہ ڈاکٹر جانسن کی آنکھیں بہت کمزور تھیں، اس لئے ان کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ عورت کس قدر بدصورت ہے، اور وہ عورت ان کو ایک بے عقل لڑکے کی مانند سمجھتی، اور ان کے ساتھ سخت گیری کا سلوک کرتی!"

غنی نے رُکھائی کے ساتھ کہا۔ "یہ سب تو مجھے معلوم نہیں! لیکن میرا خیال ہے "چیشائر چیز" اب بھی ایسے لوگوں کی آماجگاہ ہے جن کی بیوطار

بدصورت ہونے کے باوجود ان کے ساتھ سخت گیری کا سلوک کرتی ہیں۔!

"چیشائر چیز" سے آگے سڑک اور بھی تنگ تھی۔ چوڑی چوڑی اینٹوں کی کھُردری سطح پر ماتھل اور غنی کے قدموں کی چاپ کچھ غیر معمولی طور پر بلند اور کرخت معلوم ہوتی۔ ایک مکان پر کتبہ لگا ہوا تھا۔ "آلورگولڈسمتھ یہاں رہتا تھا۔" جب ماتھل اور غنی اس مکان کے قریب پہنچے تو اس کے دروازے میں ایک نوجوان لڑکی نکلی، جس نے کمر کے گرد ایپرن باندھ رکھا تھا اور جس کے ہاتھ میں کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنے کا برتن تھا۔ اس لڑکی کے بال آگ کے شعلوں کی طرح سرخ تھے اور اس کے کپڑوں کے رنگ میں بھی ایک قسم کی شوخی تھی۔ اس نے غنی اور ماتھل کی طرف آنکھیں جھپکا کے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "تم دونوں اجنبی معلوم ہوتے ہو!"

ماتھل اور غنی اس لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

لڑکی نے کہا۔ "کیا تم لوگوں کو کسی کی تلاش ہے؟"

ماتھل نے مسکرا کر کہا: "ہاں! آلورگولڈسمتھ کی!"

وہ لڑکی سوچ میں پڑ گئی، جیسے اپنے دماغ پر زور دے کر یاد کر رہی ہو۔ اس نے کہا۔ "نام تو ضرور آشنا معلوم ہوتا ہے، مگر افسوس ہے کہ میں اس محلے میں کام کرتی ہوں مگر ——" اور پھر اس کی نظر ماتھل کی نظروں کا تعاقب کرتے کرتے اس کتبے پر پڑ گئی جس پر آلورگولڈسمتھ کا نام لکھا ہوا تھا۔ اور اس نے کتبہ پڑھنے کے بعد خفگی اور ہنسی کے ملے جلے جذبے کے ساتھ ماتھل کی طرف دیکھا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی:

"تم بہت شریر ہو! شاید تم سب مشرقی لوگ بہت شریر ہوتے ہو!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں شریر نہ ہوتے تو تمہارے بھائی بندوں کو جہازوں پر بٹھا کر واپس ان کے وطن کیوں بھیج دیتے!" ماتھل نے جواب دیا۔ اور وہ لڑکی پھر سوچ میں پڑ گئی، جیسے ماتھل کی بات کا اصل مفہوم نہ سمجھ پائی ہو۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "خیر اب صحیح صحیح بتاؤ تم کو کس کی تلاش ہے۔ میں کب تک یہاں کھڑی تم سے باتیں کرتی رہوں گی!" یہ کہہ کے وہ سڑک کے کنارے رکھے ہوئے کوڑے دان کی طرف بڑھ گئی۔ آلورگولڈسمتھ کے ہمسائے کے ایک مکان سے کسی کی زور زور سے بڑبڑانے کی آواز آنے لگی: "یہ ڈیزی پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ہر وقت اپنے دوستوں کے پاس رہتی ہے!" اور ماتھل نے دیکھا کہ یہ بڑبڑانے کی آواز ایک بڑھیا عورت کی تھی جو ایک مکان کی نچلی منزل کی ایک کھڑکی میں سے باہر جھانک رہی تھی۔ اس عورت کے جھریوں والے داغ دار چہرے پر غصّہ کے آثار تھے۔ اور اس کی آواز سنتے ہی وہ سرخ بالوں والی نوجوان لڑکی لپک کے مکان کے اندر چلی گئی۔ چلتے چلتے ماتھل نے دیکھا کہ گولڈسمتھ کے ہمسائے والے مکان کے شیشوں میں سے ایک جھریوں دار غصیلے چہرے کے بجائے آگ کے شعلوں کی سی سرخی جھلک رہی ہے۔ مگر ماتھل کے اس طرف دیکھتے ہی وہ سرخ جھلک غائب ہو گئی اور کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے ہوا سے لہرانے لگے۔

چیشائر چیز والی سڑک سے باہر نکل کر غنی اور ماتھل ایک بار پھر فلیٹ سٹریٹ پر آ گئے اور سڑک کے دونوں طرف کئی منزلی عمارتوں پر چسپاں، بلند قامت اشتہار ایک بار پھر اُن کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنے لگے۔ کبھی کبھی کسی تھیٹر کی عمارت کے باہر چسپاں لمبے چوڑے رنگ برنگے پوسٹر ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔

دراصل اشتہاروں کی ایک پوری دنیا اس سڑک کے دونوں جانب بکھری ہوئی تھی۔ نت نئے رنگ برنگے اشتہار، عریاں عورتوں کے جسموں سے مزیّن اشتہار، ایلوس پریسلے اور مارلن برانڈو کی سی شکلوں والے مردوں سے مزیّن اشتہار، روم اور پیرس اور فلورنس اور ہیلسنکی کی سیرگاہوں سے مزیّن اشتہار، چاکلیٹ اور آئس کریم کی تصویروں سے مزیّن اشتہار، ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی مختلف زاویوں سے تصویروں سے مزیّن اشتہار، جگہ جگہ اشتہاروں کے [illegible] یہ اخباروں کی سرخیاں مقید تھیں۔ "کھانے کی اشیا کی بڑھتی ہوئی گرانی!" "سوئز کے مسئلے میں مزید پیچیدگی!" "مارلن منرو کے یہاں بچہ کب ہوگا؟" "ایسٹ اینڈ میں اپاہج ضعیف عورتوں کے قتل۔" کالے کالے موٹے حروف میں یہ سب سرخیاں دیکھنے والے کی نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن غنی تو جیسے اشتہاروں اور اخباروں کی سرخیوں سب سے بے بہرہ تھا، وہ ماتھل کا بازو پکڑے پکڑے بس اور ٹیوب کے ایک لامتناہی سفر میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بسوں اور زیر زمین ریلوں کے اس عظیم الشان جال سے ایسے واقف تھا جیسے مکڑی اپنے جالے سے واقف ہوتی ہے۔

ایک جگہ جب ماحل نے خود کو اس جال کے تانے بانے سے آزاد کرایا تو غنی نے چوڑی چوڑی ہموار سیڑھیوں کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سینٹ پال کا گرجا ہے! یہاں پر کبوتروں کی سب سے زیادہ گنجان آبادی ہے اور یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر GREAT FIRE کی یادگار ہے۔"

کبوتر گرجا کے گنبد پر، چار دیواری پر، مٹیوں پر، منڈیروں پر، کنگروں پر، سیڑھیوں پر، ستونوں پر، گرجا کے سامنے میدان میں، گرجا کے چاروں طرف ایستادہ لیمپوں کے ستونوں پر، ہر جگہ آباد تھے۔ سفید اور بھورے اور خاکستری اور سیاہ رنگ کے کبوتر جن کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کے مانند نظر آتیں، جن کی گردنیں مستقل طور پر جھولتی رہتیں، جیسے وہ ربڑ کی بنی ہوئی ہوں، اور جو بے تکان غٹرغوں غٹرغوں کا ایک شور مچاتے جاتے!۔

غنی نے کہا، "کبوتروں کے بعد یہاں پر سب سے زیادہ آبادی TOURISTS کی ہوتی ہے!۔" اور واقعہ بھی یہی تھا۔ گرجا کی چوڑی چوڑی ہموار سیڑھیوں پر ٹورسٹوں کی ایک مسلسل یورش تھی۔ کندھوں پر کیمرے لٹکائے، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس، آنکھوں پر گہرے رنگوں کی عینکیں لگائے ہوئے، وہ سب ٹورسٹس ایک مستقل سیلاب کی صورت میں سیڑھیوں پر چڑھے آ رہے تھے، کبھی کبھی ٹورسٹس کا ایک ریلا گرجا کے اندر سے بھی نکل آتا اور پھر باہر کے ہجوم میں مدغم ہو کے رہ جاتا۔ یہ سب ٹورسٹ چہروں سے متمول اور تندرست نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی اپنی زبانوں میں باتیں کرتے، ہنستے، قہقہے لگاتے، سیٹیاں بجاتے، گرجا کو دیکھنے میں محو تھے۔ ان کے ہجوم میں معمر اور ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی شامل تھیں اور نوعمر نوجوان، لڑکیاں بھی، اور کم سن کھلنڈرے بچے بھی۔ ان سب کا اس وقت محض ایک مقصد تھا۔ سینٹ پال کے گرجا کی زیارت۔ اور سینٹ پال اپنی پوری تقدیس آمیز عظمت کے ساتھ اپنے کائی آلود گنبد اور سیاہی آلود دیواروں سمیت، اور ہزاروں کبوتروں سمیت، ایک شان کے ساتھ ان کے استقبال کو کھڑا تھا!۔

ایک ٹورسٹ نے کہا: "یہ گرجا لندن کے لئے سب سے زیادہ ڈالر کماتا ہے!۔"

ایک اور نے کہا! "بس اب گرجاؤں کی یہی اوقات رہ گئی ہے کہ وہ اپنے ملکوں کے لئے ڈالر کمائیں!۔")

کچھ ٹورسٹ گرجا کے اندر تھے۔ سر کرسٹوفرین کے اس عمارتی شاہکار کے ایک ایک جزو کو جستجو یانہ طریقے پر دیکھنے میں مصروف تھے، وہ گردنیں اونچی کر کے گرجا کے گنبد کی اونچائی پر عش عش کرتے۔ WHISPERING GALLERY کے کارنامے پر تعجب اور رائے زنی کرتے، گرجا کی وسیع کھڑکیوں میں جڑے ہوئے رنگ برنگے شیشوں کے نقوش کا جائزہ لیتے، گرجا کے عین وسط میں لگے ہوئے ایک طویل قامت ارغنوں کی موسیقی کو سراہتے اور پھر باہر نکل کے چوڑی چوڑی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ ماحل بھی ایک سیڑھی پر بیٹھ کے آنے جانے والے ٹورسٹس کو بے گانہ طریقے پر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"تم کو یہ چوڑی چوڑی سیڑھیاں دیکھ کر اپنا وطن یاد نہیں آتا؟" ایک اجنبی امریکی آواز نے ماحل کو مخاطب کیا۔ اور ماحل چونک پڑا۔ وہ آواز ایک ادھیڑ عمر کی امریکن عورت کی تھی جو اپنی وضع قطع سے ٹورسٹ معلوم ہوتی تھی۔ اس عورت کے چہرے پر ایک طرح کی دلکش متانت تھی، جیسے اس کے نزدیک ایک ٹورسٹ ہونا دنیا کا سب سے اہم پیشہ ہو!

اس عورت نے مسکرا کر ماحل سے اپنا رسمی تعارف کرایا: "دراصل میں ایک پیشہ ور ٹورسٹ ہوں، پچھلے سال میں سردیوں کے موسم میں تمہارے وطن گئی تھی۔ وہاں میں نے جامع مسجد کی سیڑھیاں دیکھی تھیں۔ ان میں بھی اسی قسم کی عظمت اور جاذبیت ہے جیسی کہ ان سیڑھیوں میں ہے!۔ ہے نا؟"

چوڑی بے حد چوڑی سرخ پتھر کی ہموار متناسب سیڑھیاں، جن کا سلسلہ مسجد کے تین طرف پھیلا ہوا تھا، تپتی ہوئی دھوپ ان سیڑھیوں پر بے دردی کے ساتھ پھیل جاتی اور پتھروں کی تپش پاؤں کو جھلس ڈالتی۔ ماحل تیز تیز قدموں سے ان سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا مسجد کے صدر دروازے پر پہونچ گیا۔ سکول میں ماسٹر صاحب نے "مولا بخش" کو اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے کہا تھا "جمعہ کی نماز کا پورا ثواب جب ملتا ہے جب اپنے محلے کی مسجد سے دور جا کر پڑھی جائے! جامع مسجد جاتے ہو جمعہ کو؟" اور گو کہ دھوپ کی تیزی اس کے پاؤں کو جھلسائے دے رہی تھی اور لو کے تھپیڑے اس کے چہرے پر پھنکے جا رہے تھے، وہ پھر بھی ہموار، خوبصورت سیڑھیوں کے اس سلسلے کو پھلانگتا ہوا مسجد کے اندر پہونچ گیا۔

مسجد کے دالان کا فرش بھی تپ رہا تھا۔ لیکن حوض کے قریب ذرا سکون تھا اور حوض پر وضو کرنے کے بعد ماحل کو اپنے پاؤں گیلے کر کے گرم گرم فرش پر چلنے میں بہت لطف آیا اور پھر وہ نمازیوں کے جھگٹوں کے درمیان اپنے لئے راستہ بناتا ہوا اندر کے دالان تک پہونچ گیا۔ دالان کی چھت بے تحاشہ اونچی تھی اور اس کی وجہ سے تمام اندر کے حصے میں ایک خنکی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ماحل نے اپنے ساتھی کا بازو دبوچتے ہوئے کہا۔ "دیکھو تم مجھ سے دور کھڑے ہونا کیونکہ تم

مجھ کو پھنسا دو گے!۔" یہ کمبخت سکول کے لڑکے ہمیشہ نماز کے دوران میں ہنس پڑتے اور اپنے برابر کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتے!۔ جب جماعت سجدے میں گئی تو دریوں کی ایک سیلی سیلی بو ماتھل کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔ اس کی قوت شامہ اس بو سے خوب واقف تھی، نماز کی دریوں میں، چٹائیوں میں، نہ جانے کیوں ہمیشہ یہ بو رہتی اور اس کی بنا پر ماتھل کے نتھنوں میں ایک گدگدی سی ہونے لگتی!۔

ماتھل نے کہا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ سیڑھیاں کچھ اسی وضع کی ہیں۔ لیکن اتنے بہت سے کبوتر تو میں نے جامع مسجد میں بھی نہیں دیکھے!۔"

امریکی عورت مسکرانے لگی۔

ماتھل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر خوانچے والوں کے ہجوم تو دیکھے ہوں گے۔ لیکن تم تو شاید ان نعمتوں سے محروم رہی ہو گی!۔"

"نہیں۔ بالکل محروم تو نہیں! میں نے ایک مرتبہ ہمت کر کے وہ چیز چکھی تھی جس کو تم لوگ شاید کباب کہتے ہو۔ وہ سوسیج کی شکل کی چیز ہوتی ہے۔ شاید تم لوگ اس میں بارود بھر دیتے ہو! سنا ہے کہ ہندوستان کے نواب اور مہاراجے اس بارود بھری ہوئی سوسیج کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

"یہ تو شاید تم کو لوئی برام فیلڈ نے بتایا ہو گا؟۔" ماتھل نے ہلکے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

امریکن عورت سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے کہا۔ "لوئی۔ کون؟"

"لوئی —— برام —— فیلڈ!۔" ماتھل نے زور دے کر کہا۔

اس عورت نے مایوسی کے ساتھ اپنی گردن ہلا کر کہا۔ "افسوس ہے میں ان حضرت سے واقف نہیں۔ یہ کوئی امریکن ہیں؟۔"

ماتھل نے کہا۔ "چھوڑو اس قصے کو! مگر میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ جامع مسجد کے سلسلے میں تمہاری معلومات ذرا پرانی ہیں!

"پرانی! کیوں!۔" وہ عورت پھر سوچ میں پڑ گئی بلکہ اب کی بار تو اس کی آنکھوں میں ایک اداسی جھلک آئی۔

ماتھل نے خطیبانہ انداز میں کہا۔ "میری پیاری امریکن ٹورسٹ لیڈی!۔ شاید تم کو یہ معلوم نہیں کہ چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو اس ملک میں جس کو تم ہندوستان کہتی ہو ایک نئی سرحد مویدا ہو گئی تھی، ایک نئی سمت وجود میں آگئی۔ ایک ایسی سمت جو سائنس والوں کی دریافت کی ہوئی چوتھی سمت سے بھی علاوہ ایک سمت تھی اور اس نئی سرحد نے، نئی سمت نے اس ملک کو جسے تم ہندوستان کہتی ہو، دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اس تقسیم کے نتیجے کے طور پر وہ مغل عمارت جس کو جامع مسجد کہا جاتا ہے، میرے ملک کی ملکیت نہ رہی۔ اب یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جس پر خواہ مخواہ جذباتیت کا اظہار شروع کر دیا جاتے لیکن چونکہ ہمارے برعظیم کے بارے میں چونکہ تمہاری معلومات ذرا پرانی ہے، اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تم کو اصل حالات سے آگاہ کر دوں۔!"

امریکن ٹورسٹ عورت بالکل بھونچکا رہ گئی، جیسے کسی نے اس کو بہت ہی انہونی بات بتا دی ہو اور زیر لب بڑبڑا بڑبڑا کر کہنے لگی "عجیب بہت عجیب!۔"

ماتھل نے کہا۔ "اس میں کونسی بات عجیب ہے!۔ آخر جنگ آزادی (WAR OF INDEPENDENCE) کے بعد امریکہ میں بھی تو بہت سی نئی سرحدیں، نئی سمتیں ہویدا ہو گئی تھیں۔ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نقشہ بدل گیا تھا۔ پھر دونوں جنگوں نے شدید طور پر یورپ کا نقشہ بدل ڈالا تھا۔ اور پرانی چھپی ہوئی بہت سی اٹلسیں بیکار ہو گئی تھیں۔ اسی طرح یہ بھی ہوا کہ ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو وہ ملک جس کو تم ہندوستان کہتی ہو ایک نئی جغرافیائی شکل اختیار کر گیا۔ یہ تو بالکل ایک قدرتی امر تھا۔ اس پر تعجب کرنے یا نہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی معلومات کو ذرا [illegible] کرے اور لوئی برام فیلڈ کی باتوں کو حرفِ آخر نہ سمجھے!۔"

"یہ لوئی جو کوئی بھی ہے، انتہائی دقیانوسی قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اگر مجھ کو موقعہ ملا تو میں ضرور ایک نہ ایک دن اس کو اس کی جہالت سے آگاہ کر دوں گی۔ اس طریقے پر غلط قسم کی معلومات کی اشاعت کرنا۔ یہ تو خاصی غیر امریکی سی بات معلوم ہوتی ہے! تم مجھ کو ضرور اس لوئی کا پتہ بتاؤ!۔"

ماتھل مسکرا اٹھا۔ اس نے کہا! "اس کا پتہ تو بہت آسان ہے۔ کسی بھی بک اسٹال پر چلی جاؤ۔ پینگوئن سیریز PENGUIN SERIES میں لوئی برام فیلڈ

تمہارے ہاتھ لگ جانے کا۔"

ماحل کو اپنی باتوں میں اس کا اندازہ بھی نہ رہا کہ وقت بہت گذر چکا ہے۔ اور وہ پیلی پیلی دھوپ جو پہلے گرجا کی سیڑھیوں اور اردگرد کی عمارتوں پر پھیلی ہوئی تھی ایک دم سے غائب ہو گئی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا سورج نے یکبارگی جھرجھری لے کر اپنی آنکھیں موندلیں اور کبوتروں کے غول تھوڑی دیر کے واسطے اپنی خوراک کی تلاش کے لامتناہی سلسلے کو فراموش کر کے بے تابانہ طریقے پر کونوں کھدروں میں پناہ ڈھونڈنے لگے اور پھر بارش کا ایک موٹا سا قطرہ عین ماحل کی ناک کی پھننگ پر آکر گرا ——— اور ماحل چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے کہا "سینٹ پال ہماری گم گشتہ روحوں کو پناہ دے یا نہ دے، بارش سے ضرور نجات دلا سکتا ہے!۔"

"گرجا بنا ہی ہے نجات دلانے کے لئے۔" ٹورسٹ امریکن عورت نے مسکرا کر ذومعنی انداز میں کہا۔ "نجات دلانے کے لئے!"

"یسوع مسیح دنیا میں گناہ گاروں کو نجات دلانے کے لئے آیا۔ اور تمہارے لئے بھی۔"

"——— تمہارے لئے بھی!

——— یہ آواز شاید اس امریکن عورت کی تھی جس کے چہرے اور لباس اور لب و لہجہ، اور چھتری اور بٹوہ سنبھالنے کے انداز سے، تمول اور استطاعت کا مظاہرہ ہوتا تھا، یا شاید یہ اس امریکی عورت کی آواز نہ تھی، یہ تو جلی نستعلیق حروف میں ایک اعلان تھا جو ایک عرصے سے ماحل کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یسوع مسیح دنیا میں گناہ گاروں کو نجات دلانے کے لئے آیا! اور تمہارے لئے بھی!" یہ نستعلیق، جلی حروف ایک بے ہنگم، دو منزلہ کائی آلود دیواروں والی عمارت کی پیشانی پر کندہ تھے اور خاصی دور دور تک راستہ چلنے والے کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کراتے۔

اس عمارت میں ایک عیسائی مشن واقع تھا اور ماحل نے تو شاید جب سے ہوش سنبھالا تھا اس عمارت کو اسی حالت میں دیکھا تھا۔ روزانہ دن میں دو مرتبہ جب اپنے گھر سے اسکول آتا جاتا تو وہ اس عمارت کے سامنے سے گزرتا۔ اور یہ عمارت اس کے روزمرہ کے پروگرام کا ایک جزو تھی۔ عمارت کی نچلی منزل میں لڑکیوں کے لئے مشن اسکول تھا۔ اوپر کی منزل میں ایک مختصر سا آنکھوں کا ہسپتال۔ اور اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا چیپل CHAPEL تھا جس کی دیواروں پر مقدس کتاب کے اقوال کندہ تھے۔ ہفتہ میں دو مرتبہ اس چیپل میں ایک زندگی پیدا ہو جاتی، ایک تقدیس آمیز انداز میں گائی ہوئی حمدوں کا کورس اس چار دیواری سے بلند ہوتا اور ایک لطیف سی گونج بن کر عمارت کے قریب سے راستہ چلنے والوں کے کانوں تک پہونچتا۔ ان حمدوں میں مشرقیت اور مغربیت کا انوکھا امتزاج تھا۔ دھنیں مغربی تھیں اور الفاظ اور ترکیبیں مشرقی!

"یسوع نے کہا،

یسوع نے کہا ——— سچا گڈریا ——— سچا گڈریا!

میں ہی ہوں!

یسوع نے کہا۔

یسوع نے کہا ——— رستہ اور پھاٹک۔ رستہ اور پھاٹک میں ہی ہوں ———!"

ماحل اسکول آتے جاتے نوعمر لڑکیوں کے جھنڈوں کو مشن اسکول کی عمارت میں داخل ہوتے اور ہویدا ہوتے دیکھتا۔ ان لڑکیوں کی شکلیں، لباس، ہنسی مذاق کرنے کا طریقہ، آوازیں، سب اس کے لئے ایک جانی پہچانی سی چیز بن کے رہ گئی تھیں، جب وہ لڑکیوں کو ایک ریوڑ کی مانند، سکول کے دروازے سے نکلتے دیکھتا تو سوچتا کہ شاید یہی وہ ریوڑ ہے جس میں یسوع مسیح کی حیثیت ایک گڈریے کی سی ہے!۔ لیکن نہ جانے یہ یسوع کون ہے! ماحل کا پرائمری سکول کی تعلیم میں جکڑا ہوا دماغ اس معمے کو سلجھانے سے معذور تھا!۔

جب بین الاقوامی جنگ نے زور پکڑا تو مشن کی اس عمارت نے بھی ایک نئی حیثیت اختیار کر لی، چیپل سے ہفتے میں دو مرتبہ حمدوں کا کورس اب بھی سنائی دیتا لیکن شام کو سورج غروب ہوتے ہی مشن کی عمارت میں ایک انوکھی قسم کی زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ تانگوں میں سوار انگریز ٹامیوں کی ٹولیاں

یا جیپیں دوڑاتے امریکی فوجیوں کی ٹولیاں اب اکثر اس عمارت کے قریب پہونچ کر ٹھٹک جاتیں۔ ان لوگوں کی آوازیں شراب کی شدت سے مکروہ اور مسخ ہوتیں۔ مگر وہ لوگ اکثر اپنی آواز کی کرختگی اور بے سُرے پن کو محسوس کئے بغیر بیہودہ قسم کے گانے کورس کے انداز میں گاتے، یا پھر آوازیں غیر معمولی طور پر بلند کر کے فقرے بازی شروع کر دیتے۔ پھر جب انگریز ٹامیوں اور امریکن فوجیوں کی یہ ٹولیاں مشن کی عمارت کے سامنے میں چند ایک لمحے ٹھٹک کے آگے بڑھتیں تو ان کے ساتھ شوخ رنگوں کی ساڑھیوں یا اُٹنگی فراکوں میں ملبوس، سانولی لڑکیاں ہوتیں، اور وہ ٹامی یا امریکی فوجی ان لڑکیوں کو بے تکلفی کے ساتھ اپنے بے رحم چنگلوں میں دبوچ لیتے۔ اور تانگے اور جیپیں آگے بڑھ جاتیں اور رکیک قسم کے گانوں اور بیہودہ فقرے بازی کا ایک شور دیر تک عمارت کے اردگرد کی فضا میں گونجتا رہتا!۔

—— اور ماتھل اکثر سوچتا کہ نہ جانے دو منزلہ عمارت کی پیشانی پر کندہ یہ اعلان کہ "یسوع مسیح دنیا میں گناہ گاروں کو نجات دلانے کے لئے آیا!

—— اور تمہارے لئے بھی!۔" دراصل کس سے مخاطب تھا —— نہ جانے انیس سو سال گذر جانے کے بعد بھی یہ اعلان اُکتایا کیوں نہ تھا؟ —— نہ جانے اس ہولناک بین الاقوامی جنگ کا اس اعلان سے کیا تعلق تھا! ——

—— غنی نے جھلا کر کہا: "اگر تمہاری لندن کی سیر کرنے کی رفتار یہی رہی تو تم دس سال میں بھی لندن نہیں دیکھ پاؤ گے!"

—— اور وہ امریکن ٹورسٹ عورت ان دونوں سے ہمدردی جتانے لگی! "دراصل یہ انگریزی موسم ہے ہی واہیات!۔"

سینٹ پال کے صدر دروازے میں ٹورسٹ مردوں اور عورتوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم سا جمع ہو گیا۔ برساتیاں اوڑھے ٹوپیاں پہنے، ناکیں سکوڑے وہ سب انتظار میں تھے کہ کب بارش ذرا ہلکی ہو اور وہ باہر نکلیں! اور بارش کی موٹی موٹی بوندیں ایک یکسانیت کے ساتھ، گرجا کے گنبد پر دیواروں پر، اردگرد کی عمارتوں پر اپنے سروں کو پٹکتی رہیں اور ایک مسحور کن شور پیدا کرتی رہیں۔

تھوڑی دیر بعد بارش کی شدت میں کچھ کمی ہو گئی۔

غنی کو شام کی شفٹ پر کام کرنا تھا، اس لئے ماتھل سے خدا حافظ کہہ کے رخصت ہو گیا، وہ امریکن ٹورسٹ عورت بھی باقی ہجوم میں غائب ہو گئی۔

گرجا کی بڑی بڑی، رنگ برنگے شیشوں سے مزین کھڑکیوں میں سے سورج کی مدھم مدھم کرنیں چھن چھن کر اندر آنے لگیں، اور ان کے اَن گنت رنگوں نے گرجا کے اندر کی فضا میں ایک لطیف غیر مرئی سا جال بن ڈالا —— اور اس فضا میں اتنے بہت سے انسانوں کے اردگرد جمع ہونے کے باوجود ماتھل کو ایک تنہائی کے احساس نے گھیر لیا —— اس نے سوچا کہ اس تمام جم غفیر میں وہ بالکل تنہا رہ گیا ہے۔ گرجا کی یہ قوس قزح کے رنگوں سے مزین فضا، اس کے لئے قطعی اجنبی ہے۔ وہ بڑی بڑی رنگ برنگی کھڑکیاں جن کے شیشوں میں اَن گنت نقوش ہیں، اس کے لئے اجنبی ہیں —— یہ اَن گنت ٹورسٹ مرد اور عورتیں اس کے لئے اجنبی ہیں —— نہ جانے وہ کبھی اس اکیلے پن کے احساس کو اپنے سے جدا کر بھی سکے گا یا نہیں!۔ اور اس کی طبیعت پر ایک ہلکی ہلکی اُداسی غالب ہونی شروع ہو گئی۔ یہ گرجا کی رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکیاں ہمیشہ اس کی طبیعت میں ایک اداسی پیدا کر دیتی تھیں! یہ کھڑکیاں دراصل اس حزنیہ کیفیت کی ایک جیتی جاگتی علامت تھیں جو ہمیشہ سے عیسائیت کا ایک داخلی عنصر بنی رہی ہے۔ صلیب کے نشان کے ساتھ جو ابدی ٹریجڈی وابستہ تھی اس کی یہ رنگ برنگی کھڑکیاں بے تحاشہ یاد دلا دیتیں۔ شاید اس لئے سینٹ پال کی یہ غیر مرئی، رنگ برنگی فضا، ماتھل کو اس کی زندگی کے غیر عیسائی پس منظر کے باوجود خاصہ اُداس بنائے دے رہی تھی!

غزل کا مزاج :۔ بقیہ صفحہ ۴۶

بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل کے پیکر کی تراش اور مزاج کی تشکیل میں ایک خاص تہذیب، ایک مخصوص ماحول اور فکر و استدلال نے ایک منفرد انداز سے حصہ لیا ہے اور جب تک یہ تہذیب قائم رہی ہے اور طریق فکر میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوئی، اُس وقت تک غزل کے خطوط اور نقوش بھی غزل کی روایت سے ہم آہنگ رہے ہیں۔ تاہم بیسویں صدی میں جب مشرق و مغرب ایک فکری تصادم کے دور میں داخل ہوئے اور مغربی علوم اور مغربی طریق فکر و استدلال نے مشرق کی روایات پر نمایاں اثرات مرتسم کرنے شروع کئے تو مشرق کی شاعری بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی نظم نے غزل کی جگہ سنبھالنا شروع کر دی۔ علامہ اقبال نے زیادہ تر نظم ہی کے ذریعے اپنے خیالات کا پرچار کیا اور جوش ملیح آبادی کے ہاں بھی نظم ہی ابلاغِ مطالب کے لئے آلۂ کار بنی۔ ان کے علاوہ چکبست، عظمت اللہ، ظفر علی خان، حفیظ جالندھری اور بعض دوسرے شعراء نے زیادہ تر نظم ہی میں نام پیدا کیا۔ پھر خالد، راشد اور میراجی کی سعی سے نظم کا ایک ایسا دور آیا جس میں مغربی اثرات بڑی تیزی سے نظم میں سرایت کرنے لگے اور مشرق کا طریق فکر مغرب کے طریقِ فکر میں اس طور مدغم ہو گیا کہ دونوں کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا مشکل ہو گیا۔ اس ساری تبدیلی کے پس پشت مغربی علوم، معاشرت، سائنس، تہذیب اور کلچر برابر ہمارے اذہان کو تراشتے اور اپنے مخصوص سانچوں میں ڈھالتے رہے اور یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔ اس سب کے نتیجہ کے طور پر بیسویں صدی میں غزل ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آتی ہے۔ جب وہ ماحول ہی باقی نہ رہا جس سے غزل نے قوت، آہنگ اور فکر کی تحصیل کرنا تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ غزل کا فروغِ بے مثال اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ قائم رہتا۔ چنانچہ تقسیم کے بعد غزل کا احیاء بھی زیادہ تر نظم ہی کا فیض ہے اور نئی غزل میں موڈ کا تسلسل، واقعاتی عناصر کی فراوانی اور خارجی مظاہر کا بیان، یہ سب نظم ہی کے اثرات ہیں البتہ یہ کہنا کہ آگے چل کر ان نئے عناصر کی بدولت غزل کسی نئی بلندی کو چھو لیگی یا اس خطرے کا اظہار کرنا کہ نظم کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر غزل اپنے منفرد انداز، مزاج اور پیکر سے بہت دور ہٹ جائے گی، تا حال قبل از وقت ہے۔ دراصل یہ دور ایک فکری تصادم کا دور ہے اور اس تصادم میں جو طریق فکر و استدلال غالب رہے گا قدرتی طور پر اپنی مخصوص صنفِ سخن کی بقا اور فروغ کا باعث بھی ثابت ہوگا:

افسانہ اور تصویر :۔ بقیہ صفحہ ۵۳

بابر :۔ وہ کیا؟

مبارک :۔ زندگی کی پیچیدگیاں جب ہمارے فن پاروں میں اس طرح در آئی ہیں کہ کوئی فن ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا...

بابر :۔ جی ہاں!

مبارک :۔ افسانے کی کوئی کڑی کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ یا افسانہ بالکل ہی سمجھ میں نہ آئے۔ تو قاری سیخ پا نہیں ہوتا۔ کوئی نظم کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ بے چین نہیں ہوتا۔ رقص یا موسیقی سمجھ سے بالاتر ہو تو بھی وہ بے چینی محسوس نہیں کرتا۔ اگر تصویر کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ کیوں بے چین ہو جاتا ہے جیسے تصویر کو سمجھنا اس کا پیدائشی حق ہو جسے مصور نے اس سے چھین لیا ہے۔

بابر :۔ آپ کی یہ بات کسی حد تک تو صحیح ہے اور خیال انگیز بھی۔ مگر اسے کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھئے۔ مجھے اب افسانہ لکھنا ہے۔

مبارک :۔ اور مجھے تصویر بنانا ہے۔

بابر :۔ تو چلیں پھر اپنے اپنے کام میں لگ جائیں۔ اپنے اپنے زخموں کو کھرچیں:

بین‌الاقوامی اسلامی مذاکرہ

جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کے دوسرے سال مطالعہ و تحقیق اسلامیات کا دوسرا عالمی مذاکرہ لاہور میں منعقد ہوا جس میں مشرق و مغرب کے متعدد نامور علماء نے شرکت کی۔ اس تاریخی اجتماع کے بعض مندوبین کی تصاویر ان صفحات میں پیش کی جاتی ہیں۔

پروفیسر کامل یا تکین (ترکی)

ڈاکٹر مسز لمبٹن (انگلستان)

ڈاکٹر فلپ ، کے ، هٹی (امریکہ)

ڈاکٹر گنر سیلبو (ناروے)

اسماعیل آخوند (روس) (بائیں سے دوسرے)

ڈاکٹر رچرڈ ایٹنگاسن (امریکہ)

علمائے مصر کا وفد

چین ، لنکا ، کنیڈا اور افغانستان کے علماء کا وفد

محبوب بن میلاد
(تیونس)

ڈاکٹر عمر بہاءالامیری (شام)

هز ایکسیلنسی
الشرف ابو شریف
(اردن)

مولانا البنوری
(پاکستان)

تنکو محمد حسبی الصدیقی
(انڈونیشیا)

حاجی نوان سواسن (تھائی لینڈ)

ڈاکٹر
بدیع الزماں
فروزاں فر
(ایران)

ڈاکٹر
عبدالحکیم ضیائی
(افغانستان)

بنگالی ڈرامہ:

بنسری

جسیم الدین
مترجمہ: عاصم حسین

پہلا عمل، پہلا سین

(بورو گھٹنوں کے بل جھکی، چولہے میں ایندھن ڈالتی ہوئی، گیت گنگنا رہی ہے۔ وہ سولہ سترہ برس کی خوبصورت نازنین خوش وضع لڑکی ہے)

آ آ پیارے آ
جب دن ڈھلنے لگے
اور باندھ دے اپنا گھوڑا
سنگ پھول کیا کے
سنگ پھول کدم کے
آ آ پیارے آ
تیرے انگ سنہرے
جیوں سونا ڈھلکے
یوں دھوپ جلے!
آنچل مرا لہرا کے
ان کو رہ رہ کے جھلے
مری زلفیں جھوم کے آئیں
ترے پاؤں کو سہلائیں

(بصیر داخل ہوتا ہے۔ وہ اٹھارہ انیس برس کا تندرست خوبصورت نوجوان ہے جسم پہ ادھر ادھر کیچڑ لگا ہوا۔ بصیر کو دیکھ کر لڑکی بڑے پیارے انداز سے مسکراتی ہے، پھر اپنی ساڑی کا پلو تھوڑا سا اپنے سر پر سرکاتی ہے مگر اس طرح کہ چہرہ کھلا رہتا ہے)۔

بصیر: بورو کیا کر رہی ہو؟

بورو: بھیا بصیر تم ہو۔ آؤ بیٹھو، کہو کیسے آنا ہوا؟

بصیر: یونہی اِدھر سے گزر رہا تھا، چلم میں آگ بجھ گئی تھی۔ میں نے کہا یہاں سے آگ لے لوں۔ کچھ کوئلے ہوں گے؟

بورو: اچھا یہ تو کہو بھیا بصیر، ہر روز تم ہمارے گھر کے پاس سے گزرتے ہو تو تمہاری چلم کی آگ کیوں بجھ جاتی ہے؟

بصیر: تمہیں اس کا یقین نہیں آتا۔ لاؤ اپنا ہاتھ، میں قسم کھا دوں!

بورو: (ہنستی ہوئی) نہیں نہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے ویسے ہی یقین ہے۔

بصیر: اچھا تمہیں یقین ہے۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، پھر تمہیں یقین کیوں نہ ہو؟ مگر سنو، ذرا ادھر تو آؤ۔

بورو: بھیا بصیر، جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہہ دو۔ میں سن رہی ہوں۔

بصیر: تمہارے لئے جنگل سے پھل لایا ہوں کھٹا طوطی اور پکا ہوا ڈکر بھی۔

بورو: اچھا دکر بھی لائے ہو بھیا بصیر، لاؤ ان کو میری ساری کے پلو میں ڈال دو۔ میں آج ان کا ہار بنا کر گلے میں ڈال لوں گی۔

بصیر: ہاں ہاں، اسی لئے تو لایا تھا انہیں۔ اور یاد رکھو، تم نے اس دن کہا تھا کہ تم اپنے ہاتھ تیلا کوچا سے رنگو گی۔ دیکھو میں کچھ پکا ہوا تیلا کوچا بھی لایا ہوں۔ تمہارے ہونٹوں کی طرح کیسے چمکدار اور لال لال ہیں یہ۔ ایک بات سنو گی بورو؟

بورو: نہیں اب مجھے جانا چاہئے۔ اماں جان آ رہی ہیں۔

بصیر: اچھا تو پھر میں بھی چلتا ہوں۔

بورو: تم اپنی چلم کے لئے آگ لینے آئے تھے بھیا بصیر۔

بصیر: مگر اب تو تمہاری اماں جان آ رہی ہیں۔ وہ مجھے یہاں دیکھ کر کیا کہیں گی؟

بورو: تو پھر تمہاری چلم کی آگ واقعی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تو تم میرا ہاتھ میں لے کر قسم کھانے کو تیار تھے۔ (ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے) واللہ! کیسا بہانہ کیا! اماں تو آج بہت دور بھاڑن ونگا بازار میری بہن شونا کو دیکھنے گئی ہوئی ہیں۔ وہ تو

کل تک واپس نہیں آئیں گی۔

بصیرہ: تو پھر میری جان بچ گئی۔ سنو بورو! آج جھٹپٹے کے وقت پنگھٹ
پہ پانی لینے جانا۔

بورو: آج تو پانی لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اماں نے پہلے ہی سارے
گھڑے بھر رکھے ہیں۔

بصیرہ: ایک بھی گھڑا خالی نہیں؟

بورو: ہاں ایک بھی نہیں۔

بصیرہ: ارے میں باتیں کرنے میں ایسا کھو گیا کہ یاد ہی نہ رہا مجھے کتنی
پیاس لگ رہی ہے۔ ذرا جا کر گھڑا تو لاؤ۔

بورو: گھڑے کی اب کیا ضرورت آن پڑی بھیا بصیر؟ یہاں
بیٹھ جاؤ، میں گلاس میں پانی لے آتی ہوں۔

بصیرہ: نہیں یہ گلاس رہنے دو۔ میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔
تم پانی انڈیلتی جانا اور میں اوک سے پیتا جاؤں گا۔

(بورو ہچکچاتی ہے۔ بصیر گھڑا اٹھا کر سارا پانی پی جاتا ہے)

سنو بورو! اب تو گھڑا خالی ہو گیا۔ آج سورج ڈھلنے سے پہلے پنگھٹ
پر پانی لینے جانا۔

بورو: اب جب تم نے گھڑا خالی کر دیا، مجھے اسے بھرنے کے لئے
جانا ہی پڑے گا۔

بصیرہ: سچ مچ جاؤ گی؟

بورو: ہاں کیوں نہیں؟

بصیرہ: اللہ کی قسم کھاؤ۔

بورو: اللہ کی قسم!

بصیرہ: قرآن کی قسم کھاؤ۔

بورو: قرآن کی قسم!

بصیرہ: سنو، دریا کے پاس ایک بڑا سا پیپل کا درخت ہے۔ تم اس کے
پاس جانا اور اس کی جڑیں کچھ ڈھونڈنا۔

بورو: کیا ملے گا وہاں؟ سانپ؟

بصیرہ: نہیں تو کچھ اور۔ دیکھو گی؟

بورو: بہت اچھا۔

بصیرہ: میں اب جا رہا ہوں۔

بورو: اور بھیا بصیر! تم چلے بھی گئے! تم اپنا آم کی گٹھلی کا پہیا تو
بھول ہی گئے۔

دوسرا منظر

(کھیت کی پگڈنڈی)

بصیرہ: (پگڈنڈی پر چلتے ہوئے) تارارارارم۔ تارارارارم۔

(ایک اور پگڈنڈی پر سودن چلتا آتا ہے۔ بصیر کا ہم سن)

سودن: کہو بصیر! آج اتنے خوش خوش کیوں ہو؟

بصیرہ: جاؤ جاؤ۔

سودن: تمہیں ہر روز اس گھر چلم کے لئے آگ لینے جاتے دیکھتا
ہوں۔ کہاں تک بات پہنچی؛ کچھ بنا کہ نہیں؟

بصیرہ: چھوڑو بھی، خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو۔

سودن: اچھا نہیں بتلاتے نہ بتاؤ۔

بصیرہ: بھیا ناراض مت ہو۔ آؤ بیٹھو، بتاتا ہوں۔

سودن: روز اسے کہنے کے لئے کتنی باتیں سوچتا ہوں جب اس کے
پاس پہنچتا ہوں تو ایسی سٹی گم ہوتی ہے کہ کیا کہوں۔ یار!
تمہاری تو شادی ہو چکی۔ تم روز اپنی بیوی سے بات چیت
کرتے ہو۔ ذرا بتاؤ میں اپنی محبوبہ سے کیسے بات کروں؟

سودن: یہی تو میں تمہیں روز بتاتا ہوں۔ تم اس کے پاس جاتے ہی سب
کچھ بھول جاتے ہو۔

بصیرہ: سنو بھیا! آج اس نے مجھے پنگھٹ پر ملنے کا وعدہ کیا ہے۔

سودن: اچھا سچ مچ؟

بصیرہ: ہاں ہاں۔ بتاؤ میں اسے کیسے بتاؤں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔
کبھی تو میں خیال کرتا ہوں کہ مجھے پسند کرتی ہے۔ اور کبھی یہ گمان
ہوتا ہے کہ وہ میری ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔ لیکن اگر وہ میری
نہ بن سکی تو بھیا! میں مر جاؤں گا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح سرخ
ہے۔ اور جب میں اسے دیکھتا ہوں تو میری رگ رگ میں خون
مچلنے لگتا ہے۔ بھیا! اسے اپنا بنانے کی کوئی تدبیر بتاؤ۔

سودن: تو پھر سنو۔ آج دن ڈھلے جب وہ پنگھٹ پر آئے تو اس سے
پوچھنا۔ کیا تم میرا جیون ساتھی بنو گی؟

بصیرہ: جانے بھی دو، میں تو یہ کہہ چکا!

سودن: چلو بھی، بڑے بیل مت بنو۔ کہہ کیوں نہیں سکتے؟ بس اتنا
کہہ دو، اگر تم میری ہو جاؤ گی تو تمہیں کبوتر کی طرح اپنے من میں

سے جوڑ دوں گا، میلے سے نئی ساری، بنجاروں سے رنگ برنگی
چوڑیاں لا کر دوں گا۔

بصیرہ: جانے بھی دو، شرم کے مارے میرے منہ سے تو ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔

سودن: اتنا بھی نہیں کہہ سکتے؟ سچ مچ بدھو بیل ہو۔ اچھا تو آؤ میں تمہیں ایک گیت سکھاتا ہوں، جب اس کے پاس جاؤ تو اسے یہ گیت سنانا۔ گا تو سکتے ہو نا؟

بصیرہ: ہاں ہاں۔

سودن: اور سنو۔ جب تم گیت سناؤ تو دیکھنا وہ کیا کہتی ہے۔

بصیرہ: آؤ آؤ۔ مجھے یہ گیت سکھا دو۔

سودن: آؤ۔

تیسرا منظر
(بورو کا گھر)

بورو: گیت

بجائے جا بجائے جا، رسیلی بنسری پیا
مرے پیا یونہی یونہی
دھیرے دھیرے دھیمے دھیمے ہولے تان اڑا
بجائے جا بجائے جا، سریلی بنسری پیا
میں کھوئی تیرے دھیان میں ہوں دھیرے دھیرے جا رہی
جہاں پہ ہے جمن ندی۔ وہ تیری مست بانسری
ہر ایک تان مدبھری
ہیں جس میں رس ہی رس گھلے   میں سنتی ہوں لیے لیے

*

جو چلتے چلتے سامنے کی   کہیں ترے جھلک پڑی
تو پاؤں لڑکھڑا گئے   کچھ ایسی سدھ گنوا گئے
میں دیکھتی ہی رہ گئی!
مرا گھڑا بھرا ہوا   چھلکتا جا رہا ہے کیا
مرے پیا، مرے پیا
یہ میری بجتی چوڑیاں   ہیں چوڑیاں کہ لوریاں
وہ بنسری کی راگنی   اُسے بھی نیند آ گئی!
مگر یہ دل کی دھڑکنیں   یہ دیپ ہیں سدا جلیں
انہیں سلاؤں کس طرح   انہیں بجھاؤں کس طرح؟
اور آنسوؤں کی یہ جھڑی   میں بس میں لاؤں کس طرح؟

(بصیرہ گیت گاتا آ رہا ہے۔ بورو گھڑا کولھے پر لٹکائے پھر پگڈنڈی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہے۔ سکینہ، سولہ سترہ برس کی نوجوان لڑکی، داخل ہوتی ہے)۔

سکینہ: اری بورو! آج تو تم بڑی خوش نظر آتی ہو۔ اتنی خوش کیوں؟

بورو: جب دل مچل رہا ہو تو کیا کروں؟

سکینہ: مگر یہ بتاؤ، آج اتنی جلدی دریا کنارے کیوں جا رہی ہو؟

بورو: جلدی کہاں؟ سورج تو اتر رہا جیسے ڈوب ہی گیا۔ سنو، کوئلیں پیڑوں میں کیسے کوکو کر رہی ہیں۔

سکینہ: اور کوئی دریا کنارے کھڑا بنسی بجا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سب شگون بڑے اچھے ہیں۔

بورو: چپ چپ سکینہ!

سکینہ: مگر کیوں، میں سب کچھ جانتی ہوں۔ ہونہہ! دھوکہ اور مجھ سے؟ پانی پینا ہے تو پانی میں غوطہ لگانا کیسا؟

بورو: اری نگوڑ ماری چڑیل! مجھے ستاتی کیوں ہے؟

سکینہ: تم نے کسی کا دل جو چھین لیا ہے۔

بورو: اوہ!

سکینہ: تو پھر بتا دو نا، میں سن رہی ہوں۔

بورو: آؤ آج میرے ساتھ گھاٹ پر۔

سکینہ: ابھی بتا دو۔ ساتھ لے جا کر کیا کرو گی؟ تم اس راہ پر اکیلی ہی جاؤ۔ اس میں ساتھ سنگ کیسا؟ جو محبت کرے اکیلا ہی بیٹھے اور روئے، اور کون اس کے ساتھ روئے دھوئے؟

بورو: آؤ میرے ساتھ مجھے ڈر لگتا ہے۔

سکینہ: آؤ ہم چلیں۔

گیت

سکھی آؤ چلیں، سکھی آؤ چلیں
دونوں کولھوں پہ اپنے لٹکائے گھڑے
جہاں جمنا ندی بہے شان سے
اٹھے مکھ سے گھڑوں کے بار بار
پوربی ہوا کی پکار

اور شاخوں سے کوئل کی کوک
اُٹھ کے ہوتی ہے سینے کے پار!
مری پائل بجے جھن جھنک
ہائے یہ چھم چھنک چھم چھنک
یہ شگن پر شگن اے خدا!
لائے اپنے لئے جانے کیا!!

سکینہ: لو ہم گھاٹ پر پہنچ گئیں۔

بورو: اری سکینہ! دیکھ اس بھاری بھرکم پیپل کی شاخوں تلے ایک پیلا پیلا پرندہ ہے۔ تم ٹھیرو۔ دیکھو جو وہ ہاتھ آجائے۔

سکینہ: ذرا دھیان سے، کہیں پیلا پیلا پرندہ پکڑتے پکڑتے اپنا کندن جیسا محبوب نہ کھو بیٹھنا۔

بورو: کیا کہتی ہو۔

سکینہ: ایسا کہنے سے کیا بنتا ہے۔ جب تم اپنے ہلدی کی رنگت والے محبوب کو پکڑلوگی تو مجھ سے بات بھی نہ کروگی۔

بورو: اوہ!

سکینہ: کیا ہے؟

بورو: یہ بانس کی کونپل کی نتھ پیپل کے نیچے کون رکھ گیا؟ آؤ اسے میری ناک میں ڈال دو۔

سکینہ: ادھر تو آؤ۔

بورو: ارے یہ اور کیا کیا کچھ! دھانوں کا ہار، سنہری بیل کا گلوبند، دودھیا دودھیا آتی بیل کی پائل!

سکینہ: آؤ میں تمہیں یہ سب ہار سنگھار پہنا کر سجادوں۔

(سکینہ بیٹھ کر بورو کا ہار سنگھار کرتی ہے)

چوتھا منظر

(دریا کے کنارے)

(بصیر اور سودن گھاس کا گٹھا اٹھائے پاس سے گزرتے ہیں)

بصیر: دیکھا بھیا سودن! یہ گٹھا تو بہت بھاری ہے۔ آؤ اسے زمین پر رکھ کر تھوڑی دیر آرام کرلیں۔

سودن: ہاں ہاں۔ گٹھے کو یہیں تو بھاری ہونا تھا۔ جب آج کوئی گھاٹ کے پاس چلا آرہا ہے۔

بصیر: مذاق مت کرو۔ میری گردن تو اس بھاری بوجھ سے دب کر رہ گئی ہے۔

سودن: اچھا رکھ دو۔ شاید اُٹھوانے کے لئے کوئی من بھاتا آدمی مل جائے

بصیر: اسے کبھی یہ مذاق چھوڑو بھی۔

سودن: اللہ آج تمہاری قسمت نیک کرے!

(گٹھا زمین پر رکھ کر سودن چلا جاتا ہے۔ بصیر درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے گمچھا کپڑے سے پنکھا جھلتا ہے۔ سکینہ اور بورو داخل ہوتے ہیں)

بورو: ارے یہ گھڑا کتنا بھاری ہوگیا۔ آؤ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر سستالیں۔

سکینہ: بورو تم نے حد کردی۔ آتے آتے اتنی دیر کردی اور اب جب ہم واپس جارہی ہیں راستے میں گھنٹہ بھر ٹک گئیں۔

بورو: کیا کروں میرا گھڑا ہی اتنا بھاری ہے۔ ایک قدم بھی تو آگے نہیں چلا جاتا۔ بس ایک منٹ اور دم لے لوں۔

سکینہ: میں تھوڑی دیر اور ٹھہری تو اماں جان اتنا کوسیں گی کہ خدا کی پناہ!

بورو: اچھا تو پھر تم چلی جاؤ۔ میں تھوڑی دیر سانس لے کر آؤں گی۔

(بورو، سکینہ کو کچھ دور جاتے دیکھتی ہے۔ اور پھر بصیر سے بات کرتی ہے جو درخت کے نیچے بیٹھا ہے)

بورو: بھیا بصیر! تمہاری گردن کا چکا کم ہوگیا؟

بصیر: (ادھر ادھر دیکھ کر اس کی طرف آتے ہوئے) ہاں ہاں اب کچھ کم ہوگیا ہے۔

بورو: کتنا کم؟

بصیر: اب تو بالکل دور ہوگئی۔ مگر بورو یہ کیا؟ تمہاری ناک میں یہ نتھ، گلے میں ہار اور پاؤں میں پائل۔ تم کتنی اچھی.....

بورو: کتنی اچھی..... ذرا ٹھہرو۔ تمہاری تعریف کروں۔ تم اتنی اچھی لگتی ہو کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ پھر بھی تمہیں یہاں دیکھ کر میرا دل کچھ کہنا چاہتا ہے۔

بورو: کیا؟

بصیر: تم سننا چاہتی ہو؟ اگر میرا کوئی جیون ساتھی ہوتا۔ تمہارے جیسا تو میں اس کا بالکل ایسا ہی ہار سنگھار کرتا۔ اور جب وہ آنگن میں چلتی پھرتی تو بنسری بجا بجا کر گیت سناتا۔

بورو: اور کیا کرتے؟

بصیر: خبر نہیں، لیکن اگر تم سنو تو گیت کی زبان میں سب کچھ سنا دوں۔ سنو گی؟

بورو: ہاں۔

گیت

ندی کنارے اے البیلی — کومل کامنی نار سجیلی
ملوں تجھے کندن مکھ والی — سندرتا سب من میں بسالی
کومل پھولوں سے ناک سجاؤں — گلے میں ہیکل ہار پہناؤں
پھر ہنسی کے بول سناؤں — ایسے نشیلے مست بناؤں
اے گاؤں کی چھیل کنواری — میں لاؤں پٹ سن کی ساڑی
تیرے لئے بازار سے جاکر — ہاٹ ہاٹ نظر دوڑا کر
تجھ سے یہی ہے بنتی میری — بس جا میرے دوارے پیاری

★

بورو: میرے ہونٹ پہ مہر ہے پیارے
بس میں نہیں تقدیر ہمارے
تو نے دیا کیوں جان! مجھے دل؟
ایسی بنتی سے کیا حاصل؟

پانچواں منظر

(بورو کا گھر)

بصیر: کیا کر رہی ہو چچی؟ سبزی ترکاری صاف کر رہی ہو؟ اور تم بورو ہلدی پیس رہی ہو؟

بورو: آؤ بھیا بصیر؟ یہ مونڈھا کھینچ کر بیٹھ جاؤ۔

بصیر: نہیں ابھی نہیں۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ چچی ذرا کوٹھڑی سے ایک گلاس پانی تو لا دینا۔ اُدھر پڑے پانی ہے نا؟

چچی: اچھا بیٹا، بیٹھ جاؤ۔

بصیر: کہو بورو! تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا نہیں؟

بورو: چپ!

بصیر: میرا سونا، میری چاندی، میری سب کچھ بورو نا۔ بس ایک بات تم میری بن جاؤ گی؟

بورو: دیکھو تو یہ کیا کر رہا ہے۔

چچی: (اندر سے) کیا بات ہے بورو؟

بورو: بتا ہے جو میری ساڑی کو نہیں چھوڑتا ـــ! ہشت!

(چچی آتی ہے)

چچی: بیٹا پانی ہی کیوں، ساتھ ناریل کی یہ دو مٹھائیاں بھی کھا لو نا۔ کچھ سنا ہے؟ کل میری بورو کی شادی ہے۔ کل تم سب آکر میرا ہاتھ بٹاؤ گے نا؟

بصیر: چچی وہ دیکھو میرا ہل جوتنے والا بیل بھاگ اٹھا۔ میں جا رہا ہوں

(بصیر بھاگ جاتا ہے)

بورو: بھیا بصیر! پانی بھی نہیں پیو گے کیا؟

چچی: دیوانہ ہے دیوانہ! اتنی جلدی کہاں بھاگ کھڑا ہوا۔ جاؤ بورو کوئی اچھی سی ساڑی پہنو۔ اڑوس پڑوس کی لڑکیاں شادی بیاہ کے گیت گانے آ رہی ہیں (لڑکیوں سے) آؤ آؤ اُدھر سے آؤ۔ یہ پان کا بیڑا لو اور گیت گانا شروع کرو۔

(دو لڑکیاں آتی ہیں)

گیت

گر میں جانا موہن پیاری — تو نہ بنے گی جیون ساتھی
بندھے گا اور ہی کے سر سہرا — اور میں دیکھتا رہ جاؤں گا
گھسنا صندل کا پتھر پر — چھوڑ کے، میرے جیسی دلبرا
تجھ کو گلے لگا لیتا میں — باہوں سے لپٹا لیتا میں
سندر مکھ کی لیتا بلائیں — چندر بدن کی مست شعاعیں
کھیلتی ہیں میرے شانوں پر — جیسے بجلیاں کھلیانوں پر
پڑ گئے ڈھیلے رشتے ناطے — ایک ہی چھپر کے سائے کے
باپ کی آنکھیں نیر بہائیں — رات اور دن برکھا برسائیں
ماں چپ چپ ہونٹوں کو بھینچے — آنچل آنچل آنسو سینچے
بات جھڑے سب کھیں شائیں — باؤ گرتی سائیں سائیں

چھٹا منظر

(رات کو پیپل کے نیچے)

بورو: بھیا بصیر!

تیرے لئے لاؤں بلم آنسوؤں کے ہار میں
دل سے یہ نکلی ہوئی خون کی سرخ دھار میں
تحفے میں تیرے لئے لاؤں فقط پیار میں
ال کی ہے بات کیا، جان کو دوں وار میں

روپ کی تیرے جھلک دیکھی تھی جب پہلی بار
ہوک سی دل سے اٹھی، تیر ہوا دل کے پار
ہاں مجھے اب عمر بھر سہنے دے دکھ بے کنار
ایک اکیلا ہوں میں، غم کے کچو کے ہزار

لایا تھا تیرے لئے پھول ہی پھول اے بلم
میرے لئے رہ گیا کانٹوں کا تاج اے ستم
تیرے لئے ایک گھر میں نے بنایا صنم
ٹوٹا گھروندا مرا، تیری خوشی میرا غم

میری جلن سے ترے گھر میں بھی شعلے اٹھیں
یہ تو ہے ممکن مگر تاب کہاں پریم میں
جی ترا دکھ سہہ سکے، لاکھ یہ تن من جلیں
اور کوئی کیا مجال آگ کی لو پا سکیں

آنچ سے شعلوں کی گر انگ ترے ہی جلیں
پھول ترے جل بجھیں راکھ سی بن کر اڑیں
میرے نصیبے میں لاکھ گھور اندھیرے رہیں
خوش ہوں اسی میں ترے دیپ خوشی کے جگیں

بصیر: کون، بورو؟ رات اتنی دیر گئے تم یہاں کیوں آئیں؟
بورو: گھر رہ کر مجھے نیند نہیں آتی۔
بصیر: کیوں کیا بات ہے؟
بورو: خدا کے لئے یوں سختی سے نہ بولو۔ ایک وعدہ کرتے ہو؟
بصیر: وہ کیا؟
بورو: تم مجھے اپنی بنسری دے دو گے؟ جب تم آدھی رات کو اس دردناک لے میں بنسری بجاتے ہو تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔
بصیر: اگر میں تمہیں یہ بنسری دے دوں تو تم کیا کرو گی؟ جب میں آدھی رات کو اکیلا ہوتا ہوں، میرے دل میں غم کی ٹیس اٹھتی ہے۔ اور میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا تو میں بنسری بجا بجا کر ہی اپنا دل ہلکا کر لیتا ہوں۔ اگر تم یہ بنسری مجھ سے لے جاؤ گی تو میں کس سے اپنے دل کی بات کہہ سکوں گا؟ کس کو سناؤں گا کہ میرے دل کو کیا کیا غم دکھ دے رہے ہیں۔
بورو: نہیں بھیا بصیر، تم میرے لئے یوں فریاد نہ کرو۔ شادی کر لو کوئی اچھی سی دلہن بیاہ لاؤ اور اپنا گھر بساؤ۔
بصیر: میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم یوں میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آئی ہو؟ میں نے تمہیں اپنا دل دے دیا ہے۔ کسی اور کو کیسے دوں؟
بورو: بھیا بصیر، نادان مت بنو۔ جاؤ مجھے بھول جاؤ۔
بصیر: میں تمہیں بھول جاؤں؟ پھر بتاؤ میں جیوں کیسے؟ جب میں دھان کے کھیت میں کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے تمہاری یاد ستاتی ہے۔ جب مجھے کوئی خوبصورت پھول نظر آتا ہے تو میں اسے تمہارے لئے توڑ لیتا ہوں۔ میں نے کیا کیا جتن نہیں کئے اور تمہارے گھر کے ارد گرد اس لئے نہیں گھومتا رہا کہ صرف تمہارے چاند جیسے چہرے کی ایک جھلک پا لوں؟
بورو: بھیا بصیر!
بصیر: سنو بورو! جب تم آج کھیتوں میں کام کرنے جاؤ گی اور اپنے ٹخنوں کے گرد دودھیا بیل باندھو گی تو جو بیل میں نے بٹی ہے کس کے ٹخنوں پر باندھوں گا؟ جب میں جنگل سے پھول توڑ توڑ کر لاؤں گا تو کس کے ہاتھ میں دوں گا؟ جب میں آدھی رات کو اٹھ کر بنسری بجاؤں گا تو اسے کون سنے گا؟ تم گھاٹ پر پانی بھرنے آیا کرتی تھیں۔ اب تم کبھی وہاں نہ آؤ گی۔ بتاؤ میں یہ ساری باتیں کیسے بھول جاؤں؟
بورو: بھیا بصیر! تم صرف اپنے ہی غم جانتے ہو، صرف اپنے۔ میں بے چاری ـــــ مگر تمہیں اپنے متعلق اب کہوں ہی کیا؟ صرف ایک بات کہوں گی۔ میں عورت ہوں اور میرا مقدر میرے ہاتھ میں نہیں۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے لیکن میرے ہونٹوں سے کوئی آواز نہ نکلے گی۔ تمہیں خوش کرنا میرے بس میں نہیں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو!
بصیر: بورو! آج ہم آخری بار مل رہے ہیں۔ کل تم کسی اور کی ہو جاؤ گی۔ پھر تم مجھے کبھی نہ مل سکو گی۔ اس لئے کوئی ایسی بات کہہ دو جو مجھے عمر بھر یاد رہے۔

بورو: بھیا بصیر! نادان مت بنو۔ تم مرد ہو۔ تم خبر نہیں کہاں کہاں جاؤ۔ کتنے ہی لوگوں سے بات چیت کرو۔ تم مجھے بھول جاؤگے۔ تمہارے پاس بنسری ہے۔ تمہارے غم بنسری کی لے میں ڈھل جائیں گے، لیکن کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ میری زندگی کیسے گزرے گی؟ میں نے تمہیں دل دیا ہے لیکن میرا جیون کسی اور کے ساتھ بسر ہوگا۔ میں اپنی سسکیاں دل میں چھپائے رکھوں گی۔ مگر ظاہراً ہنستی کھیلتی رہوں گی۔ بھیا بصیر! میں اپنی زندگی کیسے گزاروں گی؟

بصیر: بورو! اگر تمہارے دل میں میرے لئے اتنی لگن تھی تو پھر تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟

بورو: اگر بتا بھی دیتی تو پھر کیا ہوتا؟ کچھ بھی فرق نہ ہوتا۔ آج ہمارے یہاں آن کر دیکھنا۔ وہاں کتنی ہی رونق، چہل پہل اور ہنسی خوشی ہوگی۔ مگر وہ جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، کیا کسی نے اس کے دل میں بھی جھانک کر اس کا غم اور رونا دیکھا ہے؟ اپنے متعلق میں اور کچھ نہیں کہوں گی بھیا! دیکھنے میں ہمارا کوئی رشتہ ناطہ نہ تھا۔ مگر ہمارے دلوں کا رشتہ کون توڑ سکتا ہے؟ بس تمہیں پھر حشر کے دن ملوں گی۔ لیکن جانے سے پہلے تم سے یہی التجا کروں گی ـــــ مجھے اپنی بنسری دے دو!

گیت

مجھ کو اپنی بنسی دے دے ـــــ پیارے!
اس سے مل جائے گا چین ـــــ دلارے!
جب اس کو میں دل سے لگاؤں ـــــ بارے
بول محبت کے رس والے ـــــ نیارے
اپنے بھید مجھے کہہ دیں گے ـــــ سارے
مجھ کو اپنی بنسی دے دے ـــــ پیارے
گیت رسیلے وہ پنگھٹ کے ـــــ کنارے
میرے گھڑے کو ڈگنے پھیروں ـــــ ہلارے
پانی ترا چھلکے گا اس کے ـــــ دوارے
پریم گگریا چھلک پڑی ـــــ متوارے!
سُدھ بُدھ کھوئی، بھول گئی ـــــ رستارے!

(پردہ)

★

افسانہ :

سردی

ابوسعید قریشی

چھ ماہ بعد وہ پھر ریلوے سٹیشن پر کھڑا تھا۔ پلیٹ فارم کی نیلی روشنیوں اور دسمبر کی غیر معمولی دھند میں ہر چیز خواب کی طرح پر اسرار اور دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے انجنوں کے دہانوں سے دھوئیں کے ذرّے اور اُڑتے ہوئے انگارے اکٹھے ہو کر کچھ شکلیں کچھ واقعات بن گئے تھے

چھ ماہ ہوئے ، اسی سٹیشن کے اسی پلیٹ فارم پر وہ اور ملیحہ ، لڈّی کو لینے آئے تھے۔ اور گھر پہ بچے شور ہی مچاتے رہ گئے تھے کہ ہم بھی جائیں گے خالہ کو لینے۔ مگر مجید نے " بارات بناکر" جانے سے انکار کر دیا تھا ، اور ملیحہ سے کہا تھا کہ اگر تم اس "جلوس" پہ زیادہ اصرار کرو گی تو تمہیں بھی چھوڑ جاؤں گا۔ چنانچہ گھر چڑیوں کے گھونسلے کی طرح گونج اٹھا تھا۔ بڑے چھوٹے سات بچے اپنے اپنے سُروں میں احتجاج کر رہے تھے۔ ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے ملیحہ نے چھوٹے بچوں کو نہ جانے کس کس چیز کا لالچ دیا تھا۔ اور بڑی بچیوں کو اُس نے یہ کہہ کر کام سے لگا دیا تھا کہ تمہیں تو خالہ کے لئے ناشتہ تیار کرنا ہے ...... چھتیس گھنٹے کا سفر ہے۔ جانے غریب نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں راستے میں۔ کھانے کی چیز ہی کونسی ملتی ہے راستے میں۔ مٹی پھانکو اور ریت کھاؤ۔ چاۓ تک میں تو خشک دودھ چلتا ہے ......

اور اسی طرح چہکتی ہوئی وہ ریلوے سٹیشن پہونچ گئی۔ وہ بے انتہا خوش تھی کہ بہن آرہی ہے۔ اور بار بار اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی کہ آخر ہی تے ہیں نا مجھ سے ملنے کے لئے۔ یہاں تو کبھی اتنی توفیق ہی نہیں ہوئی کہ جھوٹے منہ ہی کہہ دیں کہ جاؤ تم بھی ہو آؤ۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز گاڑی کی وسل میں ڈوب گئی تھی۔ اس پر مجید نے ملیحہ کی آواز پر پھبتی کہی تھی کہ تمہیں بھی آج تک کوئی حریف نہیں ملا تھا ......

لیکن لڈّی کو دیکھ کر ان کے قہقہے سوکھ گئے تھے۔ دہکتے گالوں والی ہنستی کھیلتی ، ناچتی لڈّی کی جگہ کوئی چالیس برس کی بوڑھیا گاڑی سے اُتر رہی تھی ..... گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں ، چہرے کی جلد جھلسے ہوئے چمڑے کی طرح ، گردن کی رگیں کا ٹھنی کی رسّیاں ! سانس لینے سے اس کا کنٹھ ابھرتا اور ہنسلی کے اوپر ٹھوڑی کی سیدھ میں کوئی انچ بھر گہرا گڑھا پیدا ہو جاتا ....

" ہائے میں مرگئی ! تجھے کیا ہوگیا لڈّی ؟ "

لیکن ہچکیوں ملی کھوکھلی کھانسی کے سوا ملیحہ کو اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ مگر مجید کو یہ جواب لڈّی کے چہرے ہی پر نظر آگیا تھا۔ " دق" ! لیکن وہ خاموش رہا۔

لڈّی کو اس حالت میں دیکھ کر مجید کو سخت صدمہ ہوا تھا لیکن دق کے تصور سے اس کی ہمدردی لحہ بھر کے لئے انتہائی غصّے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ دوسرے درجے کے مریض کو ، بغیر اجازت ، بغیر اطلاع ، بچوں بھرے گھر میں بھیج دینا ویسا ہی تھا جیسے کوئی بن بیاہی ماں اپنے بچے کو کسی دوسرے کی گود میں ڈال دے کر لے بھاگے یا کوئی قاتل ، مقتول کی لاش کو کسی دوسرے کے گھر پھینک دے کہ آپ بھگتتا رہے گا ——— مگر یہ کیفیت جلد ہی گزر گئی تھی۔ مجید سوچنے لگا تھا کہ یہ کیوں کر ہوا اور کیسے ہوا ؟ مدّت ہوئی بیماری کے ایک دو خط تو آئے تھے کہ آپریشن ہوا ہے پیٹ کا۔ مگر اس کے بعد خیریت کی بھی تو خبر آگئی تھی ...... اور وہ سٹیشن سے گھر تک قیاس آرائیاں ہی کرتا آرہا تھا۔ لیکن گھر پہونچ کر ، اُسے ملیحہ کی زبانی ، لڈّی کی سرگزشت کا علم ہوا تھا تو اسے اپنی جھنجھلاہٹ پر سخت ندامت ہوئی تھی۔

دوسرا مہینہ تھا شاید۔ بخار ہوا۔ ڈاکٹر نے بن پوچھے PALUDRINE دے دی۔ جس سے خون جم گیا۔ آپریشن ہوا۔ ہسپتال میں خون نہیں تھا کھلی دکانوں میں دوائیاں نہیں تھیں۔ چنانچہ بازوبند کے بجائے سوئیوں کے نشان رہ گئے۔ سوکھی باہوں سے سونے کی چوڑیاں پھسل کر قرض خواہوں کے ہاتھوں میں پہونچ گئیں۔ ست لڑا ہار ، ڈاکٹر کی سٹیتھسکوپ میں ڈھل گیا اور اُس کے بجائے سکڑتے ہوئے پھیپھڑے ان جراثیم کو سہلانے لگے جو گندھک کے تیزاب سے بھی نہیں مرتے۔ لڈّی کا میاں ان دنوں بحرین میں تھا۔ تیل کا انجنیئر۔ کچھ عرصے بعد چھٹی پر گھر آیا۔ لیکن چھٹی تیل کی آگ کی طرح پھیلتی ہی گئی۔ ختم ہوئی ، تب جاکر بتایا کہ کنٹریکٹ ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس دوران میں وہ لڈّی کو ایرانی دوشیزاؤں سے اپنے رومان سناتا رہا اور اُس کی کھانسی کی آواز نہ سنی !

اُس روز ، لڈّی کی آمد کے چھ ماہ بعد ، پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے انجن کی چھک چھک میں مجید کو کھانسی بلند سے بلند تر ہوتی معلوم ہوئی۔

انجن اسکے سامنے سے گزرا۔ اسکے ایک کونے میں اُونگھتا ہوا فائرمین مجید کو بالکل اپنے ہم زلف کی طرح دکھائی دیا جسکے کان انجن کی کھانسی کیلئے بہرے ہو چکے تھے۔۔

اپنے ہم زلف کے خلاف مجید کی دیرینہ نفرت پھر تازہ ہو گئی ——— سلامت اللہ کو جو اپنا نام ایس۔ اے لکھتا تھا۔ مجید نے کبھی لڈّی کے لائق نہیں سمجھا تھا۔ مگر اُن واقعات کی طرح جو اُس وقت سٹیشن پر کھڑے، مجید کے ذہن میں اُبھر رہے تھے۔ ایس اے اور لڈّی کا بیاہ بھی ریل گاڑی کی زنجیر کی طرح ان گنت واقعات کی ایک کڑی تھا، جس پر شاید کسی کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

جب مجید اور ملیحہ کی شادی ہوئی تھی تو نعیمہ کوئی بارہ برس کی تھی۔ شوخ و شنگ، نچلا بیٹھنا اسے آتا ہی نہ تھا۔ یوں نظر آتا جیسے لڈّی ناچ رہی ہو۔ چنانچہ مجید نے اُس کا نام ہی لڈّی رکھ دیا تھا۔ وہ کہیں ہلکے گلابی کپڑے پہن لیتی تو یہی دکھائی دیتا کہ اس کا سراپا سب چہرے کا عکس ہے جس کا رنگ بہہ کر اس کے جسم کے نازک نشیب و فراز اور آبی خطوط میں ڈھل گیا ہے۔ وہ کنول کی ایک بند کلی نظر آتی جو کھلا چاہتی ہو۔ مجید اکثر سوچا کرتا کہ جانے یہ کنول کس کی خوابگاہ کو منور کریگا۔۔۔۔۔۔

لڈّی ملیحہ کی اکلوتی بہن تھی۔ ملیحہ کی ساس تھی نہ نند۔ دُور پار کی درانیاں، جیٹھانیاں البتہ بہت تھیں لیکن جدّی جائداد کے جھگڑوں کی بنا پر مجید اور اُس کا چھوٹا بھائی وحید سب سے الگ تھلگ ہی رہا کرتے تھے۔ اس لئے جب دونوں بھائی باہر ہوتے تو ملیحہ گھر پہ اکیلی رہ جاتی۔ ایسے میں وہ اکثر لڈّی کو اپنے یہاں بُلا لیا کرتی۔ لڈّی کو بھی اپنی بہن سے ایسا اُنس تھا کہ ہفتوں رہتی۔ اپنے بہنوئی سے بھی اُسے بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ اپنی بہن کی گردن میں بانہیں ڈال کر وہ اکثر کہا کرتی: "آپا، آپا کتنے اچھے ہیں میرے بھائی جان۔ جی چاہتا ہے دیکھتی ہی رہوں ان کو"۔ اس پر ملیحہ کہتی "چل کہیں نظر نہ لگا دیجو"۔ لیکن اپنے شوہر کی تعریف سُن کر ملیحہ کے دل میں کلیاں چٹکنے لگتیں۔ ادھر مجید بھی جسے بقول اپنے دوست کے، عشق کرنے کا یارا تھا نہ گناہ کی توفیق، ایک نوخیز لڑکی کے ہونٹوں سے اپنی تعریف سُن کر کبوتر کی طرح گٹکنے لگتا۔ جب وہ اپنے گھر جاتی تو مجید کو محسوس ہوتا جیسے اُن کے صحن میں مولسری کا پیڑ، چنبیلی کی بیل یا سہ درے کی محراب غائب ہو گئی ہے یا دیوان خانے کا ایک فانوس بجھ گیا ہے۔

لڈّی نے اپنی خوش مزاجی سے پڑوسنوں تک کے دل موہ لئے تھے۔ اگر اُسے اپنی ماں کے گھر کبھی زیادہ دن نکل جاتے تو ملیحہ سے پوچھنے لگ جاتیں کہ بہو لڈّی کہاں ہے؟ اچھی تو ہے، بلاؤ نا اُسے؟ رونق نہیں لگتی گھر میں۔۔۔۔۔۔۔ چنانچہ لڈّی مہینے کے بیس دن اپنی بہن ہی کے گھر ہوا کرتی ——— ہنستی کھیلتی، گاتی، گنگناتی، اٹھلاتی، اٹھلاتی جیسے اپنے حسن کا، اپنے جسم کا بھی احساس نہ ہوا تھا۔

لیکن اپنی تمام خوش مزاجی کے باوجود، کبھی کبھی لڈّی پر غصے کے دورے بھی پڑا کرتے تھے۔ سخت چڑچڑاپن۔ وہ بلاوجہ بگڑ جاتی اور بھوک ہڑتال کر دیتی۔ مجید اسے اوائل شباب کی اُلجھنیں کہہ کر ٹال جاتا تھا۔ لیکن ملیحہ جو اس سے کوئی آٹھ برس بڑی تھی، لڈّی کو پیٹ بھی ڈالتی اور لڈّی قسم کھا لیتی کہ آپا اب نہ آؤں گی تمہارے گھر۔ مر جاؤں گی لیکن تمہارے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی!

لیکن چھ ماہ قبل لڈّی کو گاڑی سے اُتارتے وقت مجید کو یہی احساس ہوا تھا کہ وہ مرنے کے لئے ہی وہاں آئی تھی۔ اور ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اس کو اپنے بھائی کی دلہن بنا کر لانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مگر ترا بردوں کی بیویاں یہ دیکھ کر جل گئیں کہ ہائیں دو بہنیں ایک ہی گھر میں! ۔ اور لڈّی کے بارے میں ایک خوفناک خبر اُڑتے اُڑتے علیگڑھ پہونچی جہاں مجید یونیورسٹی میں لیکچرر تھا اور وحید ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔

اُس روز ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر نیلی روشنیوں اور دسمبر کی دھند میں، مجید کو یہ سب باتیں یوں نظر آرہی تھیں جیسے کوئی غیر مرئی انجن واقعات کے ڈبوں کو اس کے سامنے پلیٹ فارم پر لگا لگا کر گاڑی تیار کر رہا تھا۔ دفعتاً کہیں چھناکا ہوا۔۔۔۔۔۔۔

لڈّی اور وحید کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ جیسے ناچتے ناچتے کسی نے روند مچا دیا تھا اور اپنے "ہانی" کے ہمراہ جانے کے بجائے، جسے مجید نے اس کے لئے چنا تھا۔ لڈّی ایس۔ اے کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اِس شخص سے مجید بس دو ایک بار ہی کہیں ملا تھا۔ اُس بارے میں مجید کو صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ آج یہاں ہے تو کل وہاں۔ عمر میں وہ مجید سے پانچ چھ برس بڑا تھا۔ رشتے میں وہ ملیحہ کا چچازاد بھائی تھا۔ اُس نے کبھی ملیحہ کے لئے پیغام بھی بھیجا تھا لیکن لڈّی نے جس کی زبان کترنی کی طرح چلتی تھی، اپنی ماں سے کہا تھا کہ باجی کے لئے یہی لکّہ کبوتر رہ گیا ہے۔۔۔

شنٹ کرتے ہوئے انجن نے جیسے قہقہہ لگایا۔ مجید کو اپنے ہم زلف کا سراپا یاد آگیا ——— لکّہ کبوتر!۔۔۔۔۔

بلکہ زاغ ——— مجید نے کہا ——— جو اپنی چونچ میں انگور لئے پھر رہا تھا۔

ریلوے لائن پر، کہیں دھند کے پردوں کے پیچھے، پھر چھناکا ہوا۔ گاڑیاں بن رہی تھیں۔ ٹوٹ رہی تھیں۔ پھر جڑ رہی تھیں۔ انجن پل بھر کو بھی تو نہیں ٹھہرتا تھا۔ اس کے دہانے سے دھوئیں اور روشنی کے ذرّے مل مل کر نہ جانے کیا تصویریں بنا رہے تھے بھٹی کھلتی، فائرمین اپنے بیلچے سے کوئلہ جھونکتا اور بھٹی کا دروازہ بند کرکے پھر اپنی سیٹ پر بیٹھا اونگھنے لگتا کسی کی کھانسی کا بھی ہوش نہ تھا۔

الیس آلہ بالکل!

اگر ملیحہ بیمار نہ ہوتی ہوتی تو مجید نے اس کی اور لڈّی دونوں کی شکل نہ دیکھی ہوتی۔ اس لئے کہ سسرال والوں سے مجید کے تعلقات بالکل منقطع ہو چکے تھے۔ ملیحہ تک کا میل جول برسوں سے بند تھا۔ لیکن بیمار ملیحہ جسے اچانک دل کا عارضہ ہو گیا تھا، سوتے میں اپنی بہن کو پکارنے لگی تھی۔ اِس پر صرف مجید ہی نہیں، وحید کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ وہ نفسیات کا اُستاد تھا اور اُس نے کہا تھا کہ انہیں بلا لیجئے بھائی جان۔ میں تنے کہیں اور چلا جاؤں گا۔ ملّی کا آدھا دُکھ تو اپنی بہن کو دیکھ کر ہی جاتا رہے گا۔

"مجھ سے ملنے کے لئے باجی کو بیمار ہونا پڑا بھائی جان!" لڈّی نے آتے ہی ایک ایسا نفسیاتی وار کیا تھا کہ اس کا بہنوئی تو کھلا گیا تھا۔

"اچھی تو ہو نعیمہ؟" مجید نے رسماً پوچھا۔

"جی ہاں۔ شکریہ۔ نعیمہ اچھی ہے۔ لڈّی البتہ مرگئی بے چاری۔ آپ کو تو خبر ہی ہوگی۔" اور لڈّی منہ موڑ کے سسکیاں لینے لگی تھی۔

"اُس کو ——— اللہ کو" مجید نے رکتے رکتے کہا۔ "خدا کو یہی منظور تھا شاید۔"

"یا اُس کے حاسد بندوں کو؟ اور اُن کی آوازوں پر کان دھرنے والوں کو میں کیا کہوں۔"

"اپنی مصلحتیں کچھ وہی جانتا ہے۔"

"یا ہماری بے چارگیاں؟" اور لڈّی ایک سسکی لے کر خاموش ہو گئی تھی اور مجید کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے لڈّی کے ناچ میں یکایک ڈھولک کا پڑا پھٹ گیا تھا ——— لڈّی کی مٹھاس نہ جانے کہاں چلی گئی تھی؟ صرف تلخی باقی رہ گئی تھی۔ جیسے وہ کنول کی کلی نہیں تھی بلکہ نیم کی چھال تھی۔ لال مرچ تھی مجید کی آنکھوں میں کڑواہٹ پیدا ہو گئی تھی اور اُس نے اپنے جذبات کو چھپانے کے لئے کہا تھا۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب ملّی کی خبر لو۔ وہ سوتے میں بھی 'لڈّی لڈّی' پکارتی ہے۔"

"لڈّی؟ لڈّی اب کہاں بھائی جان ——— نعیمہ البتہ آگئی ہے۔"

"اپنی بہن کی خاطر!"

"مردے جِلانا تو صرف پیغمبروں کا کام ہے۔ ہاں لڈّی کی رُوح کو بلانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

اور وہ کچھ اس طرح گھر کے کام کاج میں مصروف ہوئی تھی جیسے ہمیشہ سے وہیں تھی ——— اُس نے اپنے بھانجے بھانجیوں کو سنبھال لیا۔ لڑکیوں کے سروں میں کنگھی کی۔ لڑکوں کے ہاتھ پاؤں جھانوے سے دھوئے، میلے کپڑوں کا ڈھیر نکال کے دھوبی کو دیا، کرسیاں جھاڑیں، میز پونچھے، چارپائیاں کسیں، بستروں کی چادریں بدلیں، برتن قلعی کروائے .... سارا گھر دیکھتے دیکھتے شیشے کی طرح چمکنے لگا۔ وہ اپنی بہن کے کمرے میں پھر پہلے کی طرح قہقہے لگاتی ہوئی داخل ہوتی اور مجید کے کانوں میں پھر ہنسی کی بازگشت آنے لگتی۔ لیکن بہن کے کمرے سے نکلتے ہی لڈّی کے قہقہے خاموش ہو جاتے جیسے کوئی لڑکی گیند کھیلتے کھیلتے کبھی کبھی اُدھر آنکلتی تھی اور پھر چلی جاتی تھی۔ ہر بار جب وہ آتی مجید کو وحید یاد آ جاتا۔ شنٹ کرتے ہوئے انجن نے ایسا ریلا دیا تھا کہ وہ جو بلا وجہ بھی وہاں موجود ہوا کرتا تھا جہاں لڈّی ہوتی تھی۔ اب از خود کہیں چلا گیا تھا۔ مجید کو ایسے محسوس ہوتا کہ لڈّی کی آہستی ہوتی نگاہیں کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ مگر خود فراموشی کی یہ ساعت بس ایسے ہی آتی اور نکل جاتی۔ جیسے وہ اپنے خیال کا پیچھا نہیں کرنا چاہتی۔

انجن نے کہیں سٹیم چھوڑی، پلیٹ فارم پر گھنٹی بجی، کہیں قلیوں کا شور ہوا، کوئی گاڑی کہیں سے آئی اور کہیں کو چل دی ——— مجید تھا اور پھر وہی سٹیشن، جہاں وہ چھ ماہ ہوئے لڈّی کو لینے آیا تھا۔ گلاسٹر اسپیچ پڑا پاؤں پاؤں چل کے کہاں پہنچ گیا تھا۔

اور مجید کے غصّے کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اپنے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ مجھے دنیا کی کوئی بیماری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سفید پوشی سے اُوپر اور کوئی مرض اللہ

کی زمین پر انسانی جو شیم نے پیدا نہیں کیا [illegible] ہو جائے اُسے گویا بیماریوں کی علامت مل جاتی ہے ...... مگر لڈّی کے [illegible] کے بارے میں فکر مند ہو گیا تھا۔ اور اس نے ہم زلف کو دل ہی دل میں ایسی ایسی فصیح و بلیغ صلواتیں سنائی تھیں کہ وہ اپنی لغات پر خود حیران رہ گیا تھا —— مگر لڈّی نے ملیحہ کی جو خدمت کی تھی اور جس طرح وہ اس کو موت کے منہ سے بچا لائی تھی، اس کی یاد سے مجید کے دل میں پھر انسانی ہمدردی بیدار ہو گئی تھی اور اُس نے اس موقع کو لڈّی کے احسان کا بدلہ چکانے کا موقع سمجھا تھا۔

لڈّی اپنے ساتھ ایکس رے رپورٹ اور ڈاکٹر کا نسخہ بھی لائی تھی۔ لیکن علاج ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ جان کر مجید کو یوں محسوس ہوا تھا کہ لڈّی کا میاں سرکاری سانڈ تھا جسے کھانے، جگالی کرنے اور سونے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔

'میری حالت تو ایسی نہیں تھی باجی کہ میں اتنا لمبا سفر کر سکتی۔ یہ سوچا کہ یہاں جو ایڑیاں رگڑ رہی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہے نا کہ راستے ہی میں ختم ہو جاؤں گی۔ چلو چھٹی ہو گی۔ اور جو پہونچ گئی آپا کے پاس تو شاید۔ شاید۔ انہی کو ترس آ جائے .... ڈاکٹر تو بس یہی کہتا ہے کہ خون کی کمی ہے۔ آپریشن ہوا تھا نا۔ اور یہ دمہ، سمندر کی ہوا۔ مگر یہ ایکس رے۔ یہ کھانسی۔ یہ دھونکنی اور میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ۔ اور یہ۔ مری شکل صاف ٹی بی کی علامتیں ہیں مجھے دھوکے میں رکھا گیا ہے ...... میں رات رات بھر کھانستی تھی لیکن وہ پاس پڑے خراٹے لیتے تھے۔ آپ جب بیمار ہوئی تھیں باجی تو بھائی جان رات رات بھر جاگتے تھے دبے پاؤں اُٹھ اُٹھ کر، کبھی نبض دیکھ رہے ہیں، کبھی سانس سُن رہے ہیں —— ' اور پھر لڈّی چیخ پڑی تھی۔ 'مجھے بچاؤ آپا، بھائی جان مجھے بچاؤ!!'

اس پکار سے مجید کی روح کانپ اٹھی تھی اور وہ صرف اتنا کہہ سکا تھا کہ تو ٹھیک ہو جائے گی لڈّی۔ ڈاکٹروں کو اب ٹی بی کا علاج معلوم ہے۔ مگر جب مجید نے لڈّی کا ایکس رے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کو دکھایا تھا تو وہ چونک پڑا تھا۔ 'اندھا بھی کہہ دے گا کہ یہ خاصا ADVANCED کیس ہے۔' اور مشورہ دیا تھا کہ مریضہ اور اُس کے اقربا دونوں کی بھلائی اسی میں تھی کہ اُس کو ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ اس پر ملیحہ بولی تھی 'چلو اچھا ہے اُدھر میاں نے نکال دیا گھر سے، اِدھر بہن نکال دے۔ بہنوئی تو خیر ہوا ہی غیر —— کل کی مرتی آج مر جائے گی لاوارث۔ پنڈ چھوٹے گا۔ پہلے کونسی پھولوں کی سیج پہ سو رہی ہے جب سے شادی ہوئی ہے، کل ملا کر دو برس ہی رہی ہو گی میاں کے پاس۔ اس سندباد کے بچے کو کبھی چین نہیں پڑا گھر پہ۔ ہزاروں میل سے اِدھر تو کوئی نوکری ہی نہیں رہ گئی اُس کے لئے —— لعنت ہے ایسی زندگی پر! ٹھیک ہے کہ تنگ نہیں رکھتا۔ اچھے سے اچھا پہنتی ہے، اچھے سے اچھا کھاتی ہے، لیکن کھانا پینا ہی دنیا میں سب کچھ ہوتا تو حلوائیوں، باورچیوں اور بزازوں کی بیویاں سب سے خوش قسمت عورتیں ہوتیں! —— خیر ہٹائیے۔ گلہ تھوڑا ہے کسی سے۔ پہلے آپ کے بھائی نے دھکا دیا تھا۔ پھر ....'

دسمبر کی پر اسرار دھند میں، ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر، مجید کو ایک بار وہی احساس ہوا، جیسے واقعات کے ڈبے کسی شنٹ کرتے ہوئے انجن کے اشارے پر کہیں سے لڑھکتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ اور ایک لمبی گاڑی بنتی چلی جا رہی تھی جس کا نام زندگی تھا۔ کانٹے بدل رہے تھے۔ جھنڈیاں ہل رہی تھیں۔ سبز اور سرخ روشنیاں آنکھیں جھپک رہی تھیں .... ابھی ریل کی پٹڑی خالی دکھائی دیتی۔ لیکن یکایک کہیں چھناکا ہوتا۔ کوئی ڈبہ بھاگتا، رینگتا، ٹہلتا کہیں سے نکل آتا۔ اور جا کر کسی گاڑی سے جڑ جاتا۔ کسی پگڈنڈی کی طرف جا نکلتا۔ کسی مال گاڑی کے پیچھے آنکھ اوجھل ہو جاتا۔ یا کبھی اس مسافر اور کبھی اُس مسافر کے سامنے پہونچ کر رک جاتا ..... مختلف قسم کے پلیٹ فارم پھیلے ہوئے تھے۔ کسی پہ سرخ بانات بچھی تھی، کسی پہ کاٹھ کباڑ اور مال اسباب بکھرا پڑا تھا۔ کسی پہ انسان تھے کسی پہ مویشی۔ اور اس منظر کے عقب میں دھند، دھوئیں اور کہر کے پیچھے سٹیم کی مسلسل سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ انجن کی دھک دھک۔ ایک اور چھناکا ہوا۔ ایک اور ڈبہ!!!

"مار و لات اور نکالو گھر سے! ہوتی کون ہے وہ بن بلائے آنے والی۔ لڈّی تو مر چکی بہن کی لاڈلی، بہنوئی کی چہیتی۔" اور ملیحہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ "جذباتی مت ہو ملّی!" مجید نے کہا تھا۔ "جیسے تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔ بس اتنی کوشش کرنا کہ بچے ذرا الگ رہیں۔ نازک پودے ....."

جب ملیحہ بیمار ہوئی تھی تو مجید شہر سے باہر ایک نئی بستی میں رہتا تھا۔ جہاں ڈاکٹر کو ایک بار بلانے پر کم از کم پانچ روپے اُٹھ جاتے تھے۔ اور ملیحہ کو روز میں چار انجکشن لگتے تھے۔ چنانچہ مجید کو تھوڑی بہت "حکیم گیری" سیکھتے ہی بنی تھی اور وہ انٹروینس انجکشن کا ماہر ہو گیا۔ لڈّی کو بھی انٹروینس انجکشن ہی لگنے تھے۔

درد تو نہیں ہوا؟" اس نے لڈّی کے بازو سے سوئی نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"اے۔ لگ بھی گیا!" لڈّی کو اعتبار نہیں آیا تھا کہ انجکشن لگ گیا۔ "اتنا ہلکا ہاتھ! موئے ہسپتال والے تو چھریاں چبھوتے تھے۔ ابھی تک گومڑ نہیں گئے۔ یہ کولھے کا ٹیکہ تو بس بجر ہی گیا تھا...... کوئی مسام خالی نہیں رہا۔"

اس نے سچ کہا تھا۔ بانہہ اور کولھے چھدے پڑے تھے۔ مجید کو ہر وقت ڈر رہتا کہ کسی گومڑ میں لگ گیا تو سیپٹک ہو جائے گا۔ چنانچہ انتہائی احتیاط کرنا پڑتی۔ سرنج بھرنے کے بعد وہ جگہ جگہ دبا کر پوچھتا کہ درد کہاں نہیں ہوتا۔ مسام ڈھونڈھنے پڑتے تھے کہ تکلیف نہ ہو۔ سٹرپٹومائیسین کے لئے سوئی ویسے بھی گہری جانی چاہیے تھی۔ یہ اور مصیبت تھی۔ گوشت تھوڑی تھا۔ ہڈیوں پہ سوکھا چمڑا لپٹا ہوا تھا۔ سوئی چبھوتے وقت بالکل ویسی ہی آواز آتی جیسے موچی آر سے کوئی پرانی جوتی سینے کی کوشش کر رہا ہو۔ جس کا چمڑا ہاتھ سے ملنے پر بھُربھُری مٹی کی طرح بکھر جائے گا........ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

مجید کے صبح و شام کسی نرس کے صبح و شام بن گئے ——— ٹمپریچر، انجکشن، دوائیاں، ٹانک، ہر ماہ تھوک اور خون کا معائنہ تو ہر پندرھواڑے رہی۔ اور سب سے بڑھ کے مزاج۔ اچھا خاصا طویل چارٹ تھا۔ جس میں ملیحہ کا کام صرف اتنا تھا کہ خوراک کا دھیان رکھے کنگھی کر دے یا کپڑے بدلوا دے۔ اُسے بچوں کی دیکھ بھال ہی سے فرصت نہ تھی کہ اور توجہ کر سکتی۔ ایسے میں مریضہ کی اصل دیکھ بھال مجید ہی کو کرنا پڑتی۔ مگر تھکان کے بجائے اُسے کچھ عجیب آسودگی کا احساس ہونے لگتا۔ اُس کی کراہت آمیز سنجیدگی آہستہ آہستہ قریب قریب پیشہ ورانہ مسکراہٹ میں تبدیل ہوتی گئی ——— مریضہ تن درست ہو رہی تھی۔ "ڈاکٹر" کا تبسم اور واضح ہوتا گیا۔

"رو بصحت ہی نہیں۔ تن درست ہے۔" سپیشلسٹ نے ماہانہ معائنہ کے بعد کہا۔ "لیکن انجکشن ابھی جاری رہیں گے۔"

ٹیکوں کا وقفہ بڑھا دیا گیا۔ ہوا خوری کی اجازت مل گئی۔ اور اگر کسی نے اُس وقت لڈّی کو دیکھا ہوتا تو یقین نہ کر سکتا کہ اس کو ٹی۔ بی تھی ——— ہنسلی کی ہڈی چھپ چکی تھی۔ سینے کا تلاطم نظر آنے لگا تھا۔ بازوؤں میں مچھلیاں مچل رہی تھیں۔ جہاں کبھی ازار بند باندھنے سے جلد اکٹھی ہو جاتی تھی۔ اب بھرے بھرے کولھے اُبھر آئے تھے۔ اور سوئی سوکھے چمڑے کے بجائے زندہ گوشت کی تہوں میں اُترتی چلی جاتی تھی۔ مجید سرنج بھر کے پوچھتا۔ "کہاں لڈّی؟" جواب ملتا: "کہیں بھی۔" اور تندرستی کے ساتھ جیسے نئے پرانے گومڑ بھی گھل کر چربی میں تبدیل ہو گئے تھے۔ سوئی کہیں بھی غوطہ لگاتی اور لوٹ آتی۔

"اب تو تجھے ٹیکہ لگانے میں مزہ آنے لگا ہے لڈّی۔" ایک روز مجید نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لو جی!" ملیحہ بولی۔ "وہ بے چاری چھلنی ہو گئی اور یہاں مزہ آ رہا ہے۔ واہ!"

کہیں ریل کوکی۔ دندناہٹ کی مسلسل آواز سے دھند کے پردے میں لہریں سی محسوس ہوئیں ننھے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہوا سیٹیاں بجانے لگی۔ کہیں لپٹی ہوئی گاڑی کی تیز سرد سیسے کی گولی کی طرح آہیں بھرتی ہوئی سنائی دی۔ لالٹین آنکھیں پھاڑتے گھورنے لگیں۔ ریل کی پٹڑیاں چیخیں.....

"سردی بڑھ رہی ہے۔" ملیحہ لڈّی کے کمرے میں چٹختی ہوئی لکڑیوں سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ "سوچتی ہوں لڈّی برداشت کر گئی یہ موسم۔ خبروں میں تھا کہ شمال کی جانب سے سرد ہوائیں چلنے کا امکان ہے۔ کہیں پارسال والی بات نہ ہو مجھے تو ڈر ہے کہ اب کے نلوں کا پانی جمے گا۔ نا بابا لڈّی کے بس کا نہیں یہ موسم...."

اور اُس کا ہر سانس سردی کا معلن بنتا گیا ——— وہ بار بار لڈّی کے کمرے میں آتی ——— "میں نے کہا دیکھ آؤں آگ تو جل رہی ہے۔ سردی تو نہیں لگ رہی لڈّی۔ کمبل ڈال دوں؟ اور کانوں پہ مفلر لپیٹ کہیں پھر نہ ہوتا ہو کان میں درد ——— یاد ہے نا اتنی سی تھیں۔ تین راتیں آنکھ نہیں جھپکی تھی گھر میں کسی کی۔ ..... سوچتی ہوں یہ سردی برداشت نہیں ہو سکے گی تجھ سے۔ اور ابھی تو پورے جوبن پہ نہیں آئی۔ سانس نہیں لیا جاتا۔ اس موسم میں تو کراچی اچھی۔ سلک دوپٹے سے بھی گذارہ ہو جاتا ہے....؟"

اُس روز لڈّی کی آمد کے چھ ماہ بعد مجید جب کالج سے واپسی پر حسبِ معمول لڈّی کے کمرے میں گیا تو ملیحہ اور اُن کا بڑا لڑکا جو میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، لڈّی کے ہولڈال کا سٹریپ کس رہے تھے۔ مجید نے جس وقت کمرے میں قدم رکھا تو بستر بالکل تیار ہو چکا تھا۔

"لے بابا۔ خیر سے گھر جا اپنے اور کہا سنا معاف کیجو!" ملیحہ نے بستر کو دروازے کی طرف لڑھکاتے ہوئے، اپنی بہن سے کہا۔
"مگر یہ بات کیا ہوئی آخر" مجید بوکھلا گیا۔ "کچھ مجھ کو بھی تو پتہ چلے؟"
"خالہ کراچی جا رہی ہیں ابا جان!" مجید کے لڑکے نے کہا۔
"مگر صاحب خانہ؟"
"اُس کو موسم کی کوئی خبر نہیں؟"
"یہ سردی مجھ سے واقعی برداشت نہیں ہوگی" شال کی تہوں سے لڑکی کی آواز آئی۔
"ہاں بابا، خدا خدا کرکے اتنا آرام آیا ہے اور کہیں ہو الگ جائے؟"
"تو لڑکی پھر لوٹھی پنواڑن نظر آنے لگے" لڑکی کے ہونٹوں پر کسی یخ بستہ پہاڑ کی چمک نمودار ہوئی۔ مجید کو محسوس ہوا جیسے کسی کڑوی دوا کو خوش ذائقہ بنانے کے لئے سنترے کا شربت یا گلوکوز کا چچہ ملا دیا جائے۔

کہیں قریب ہی زور کا چھناکا ہوا۔ زمین لرز گئی جیسے دو گاڑیاں ٹکرا گئی ہوں۔ مجید کانپ اٹھا بسٹیم کی بھر بُور سنسناہٹ اور ہزار ہا تن رینگتے ہوئے وزن کی لہروں سے اُس کی رگیں جھنجھنا گئیں ——— پیچھے ہٹ جاؤ مسٹر، گاڑی آ رہی ہے۔
——— کہر میں چاند سا ابھرا ——— ہالہ سا پھیلا ——— چنگاریاں اُڑیں۔ اور روشنیوں کا ایک پردہ، زری کا دوپٹہ مجید کی آنکھوں کے سامنے تن گیا۔ ملیحہ نے اسے بازو سے پکڑ کر جلدی سے پیچھے کھینچ لیا ——— ہٹ جائیے! ———
گھنٹی بجی، انجن کوکا، گاڑی کی لالٹین لہرائی، بریکیں کھُل گئیں۔ ایک کھڑکی میں شیشے کے پیچھے لڑکی کا سا چہرہ نظر آیا۔ وہ کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے سردی سے ڈر رہی ہو۔ گاڑی چلی ملیحہ نے کچھ کہا۔ لڑکی کا ہاتھ ذرا خدا حافظ کہنے کے لئے اٹھا۔ اُس کے ہونٹ سرد شیشے سے چھوئے۔ اس کا سانس جالی کا نقاب بن گیا۔ اور پھر سب کچھ کہر کے پیچھے چھُپ گیا۔
"آئیے۔ چلیں" ملیحہ نے مجید کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
دھند میں گاڑی کی بتی شہاب ثاقب کی طرح تحلیل ہوگئی۔

اسٹیشن سے واپسی پر مجید کو اپنے دانت بجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ ملیحہ کے اور قریب ہوگیا۔
"میں جھوٹ نہیں کہہ رہی تھی" ملی نے کہا "سردی واقعی بڑھ گئی ہے۔ لڑکی کا جانا ہی مناسب تھا۔ کئے دھرے پہ پانی تھوڑا ہی پھیرنا تھا ہمیں..... ہم سے جتنا ہو سکا، ہم نے کیا۔ اب وہ جانے اور اُس کا میاں۔ اُس کا بھی تو آخر کچھ فرض ہے"

روشن دانوں اور دروازوں کی درازوں میں ہوا سیٹیاں بجانے لگیں۔
"میرا خیال ہے آج ہم کو بھی آگ جلانا ہی پڑے گی" ملیحہ نے اپنا بستر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔
"میں بھی یہی کہنے کو تھا" مجید نے اپنی بیوی کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے سامنے سات بچوں کی ماں ملیحہ نہیں بلکہ کوئی اور ہی عورت کھڑی تھی۔

اُس رات اُن کے کمرے میں پہلی مرتبہ اُس موسم کی آگ جلی +

★

ڈائری:

کیمپ کے شب و روز

سید ضمیر جعفری

۱۰ جون:

کیمپ میں پہلا دن —!

دوپہر کو دفتر سے خیمے میں آیا تو اندر دو گلہریاں ناچ رہی تھیں۔ ایک تو ٹب پر، جو کیمپ کاٹ کے ساتھ ہی لگا رکھا ہے، پھدک رہی تھی، دوسری میز پر شیو کے آئینے میں منہ دیکھ رہی تھی۔ میری آہٹ پر چیں چیں کرتی تھیں پردے کے نیچے سے جو پیچھے غسل خانے کی چھولداری میں کھلتا ہے بلکہ بند ہوتا ہی نہیں، باہر دوڑ گئیں۔ اتنے میں کیمپ کا پرانا خدمتگار کاکا چاچا پانی کی بالٹی اٹھائے آگیا۔ میں نے کچھ شکایت و سرزنش کے لہجے میں کہا:

"کاکا۔ خیمے میں گلہریاں ناچ رہی تھیں"

معلوم ہوا کہ یہ تو ہماری اپنی گلہریاں ہیں یعنی خیمے کے پیچھے جال کے درخت کی کھوہ میں رہتی ہیں اور جب سے کیمپ کھلا ہے روزانہ ٹھیک اس وقت خیمے میں آکر پانی پیتی ہیں۔ مجھ سے پہلے جو پرانا افسر اس خیمے میں رہتا تھا وہ تو ان گلہریوں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ گلہریاں جب تک خیمے کے اندر ہوتیں، وہ خود باہر دھوپ میں کھڑا رہتا۔ وہ تو ان کے لئے امریکہ سے کوئی یخ دان منگوانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اتنے میں خود ہی امریکہ چلا گیا!

ٹب کے بارے میں کاکا سے پوچھا کہ یہ غسل خانے کی چیز یہاں کمرے میں کیوں پڑی ہے تو اطلاع ملی کہ چونکہ یہاں سخت گرمی پڑتی ہے لہٰذا صاحب لوگ دوپہر کے وقت زیادہ تر ٹب ہی میں بیٹھتے ہیں۔ بعض اصحاب تو کھانا تک ٹب میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ مجھے یہ بات سن کر بے ساختہ ہنسی آگئی!

یہ کیمپ ایک انجینئرنگ فرم کا کیمپ ہے جو ایک قریبی پہاڑی کا جگر کاٹ کر اس کا باطن ٹٹول رہی ہے۔ اکثریت غیر ملکی ماہرین کی ہے۔ ہم تین چار مقامی آدمی صرف رابطے، ترجمانی وغیرہ کا فرض ادا کرتے ہیں۔

۱۲ جون:

کاکا چاچا واقعی ٹھیک کہتا تھا۔ یہاں قیامت کی گرمی پڑتی ہے۔ لوگ باگ دوپہر کے بعد سگریٹ سگار سلگا کر ٹب میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آج میں بھی ٹب میں بیٹھا ٹامس ہارڈی کا ایک ناول پڑھتا رہا۔

خیمے کے بالکل سامنے خربوزوں کا ایک کھیت ہے۔ عصر کے وقت کچھ دیر کھیت میں ٹہلتا رہا۔ کھیت خربوزوں سے اٹا پڑا ہے۔ بعض خربوزے تو اتنے بڑے ہیں کہ خربوزوں کے لیڈر معلوم ہوتے ہیں۔ ٹہلنے سے اکتایا تو انہیں میں سے ایک لیڈر کی پشت پر بیٹھ کر دوسرے خربوزوں کو دیکھتا رہا۔ دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ کس طرح رنگ پکڑتا ہے۔ مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ہاں خربوزے کو دیکھ کر خربوزے موٹے ضرور ہو رہے ہیں!

۱۶ جون:

پچھلے دو تین دن ڈائری نہ لکھ سکا۔ دراصل پرسوں شام کو آندھی آئی تو میرے گیس کی چمنی ٹوٹ گئی اور کیمپ میں شیشوں کا مسیحا کوئی

[illegible]— کا کا یا جا کہیں سے ایک مری ہوئی لالٹین اٹھا لایا تھا مگر اس کی روشنی میں خود لالٹین ہی مشکل سے دکھائی دیتی تھی۔ اسے کر [illegible] دوسری چمنی آ گئی۔

یہ کیمپ جتنا پھیلا ہوا ہے اتنا بڑا نہیں ہے۔ ایک طرف افسروں کے خیمے ہیں۔ کچھ دور ماتحتوں کی بارکیں۔ پھر کچھ اور دور مزدوروں کے جھونپڑے۔ بارکیں بنی ہوئی نہیں، زمین سے اگی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

لنچ پر آج خربوزے کے سرخ سرخ قتلے بھی تھے۔ میں بھاگا بھاگا کھیت میں پہنچا کہ کہیں میرا اپنا خربوزہ تو شہید نہیں ہو گیا۔ الحمدللہ کہ میلڈا سلامت تھا!

۱۷ جون:

آج سارجنٹ کے ساتھ بڑی لمبی چوڑی مٹرگشت رہی اور آج پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ یہ کیمپ دراصل ایک کوتاہ قامت سلسلۂ کوہ کے دامن میں واقع ہے لیکن جغرافیہ کچھ اس نوع کا ہے کہ بعض اوقات خود سلسلۂ کوہ کیمپ کے دامن میں واقع نظر آتا ہے۔

ایک بازو پر جھاڑ جھنکاڑ کا ایک وسیع بیابان ہے جس کے بعد ایک شاداب وادی کھلتی ہے یہ اس قدر تنگ ہے کہ گویا کھلتے ہی بند ہو جاتی ہے کیونکہ فوراً ہی پہاڑیوں کا ایک دوسرا سلسلہ طلوع ہو جاتا ہے جو نہ معلوم کہاں جا کر غروب ہوتا ہے۔

سامنے والے بازو پر ایک نامی گرامی دریا بہتا ہے، جس کو ہم سن تو سکتے ہیں، دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ کیونکہ اس تک پہنچنے کے لئے پہلے جس اونچی پہاڑی پر چڑھنا پڑتا ہے وہ آدمی کو کسی قیمت پر دوسری طرف اترنے نہیں دیتی۔ اور چوٹی پر سے دریا اس طرح نظر آتا ہے۔ جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا۔ غالب نے غالباً کہیں ایسے ہی دریا کے بارے میں کہا ہو گا:

"بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا"

سنتے ہیں کہ اس دریا سے بجلی نکالی جائے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر نکالی جائے گی!

دریا اور کیمپ کے درمیان ایک ننھی سی ترائی ہے جس کو اکائی کہنا زیادہ درست ہو گا۔ وسط میں بدھوں کا ایک چھوٹا سا 'اسٹوپا' جو خدا معلوم اس جگہ کب اور کیوں بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد جھاڑیوں کا ایک سلسلہ اور پھر خربوزوں کا وہی کھیت جس کا حاشیہ کیمپ کے حاشئے سے آن ملا ہے۔ اگلے روز جو آندھی چلی تھی اس میں بہت سے خربوزے ٹوٹ کر میرے خیمے میں آ گئے تھے۔ کسی روز ہوا نے رخ بدلا تو انشاءاللہ یقیناً میرا خیمہ خربوزوں کے کھیت میں ہو گا۔ اللہ اکبر، فطرت سے یہ قرب بھی کس قدر سنسنی انگیز ہے کہ آدمی فطرت کو روٹی کی طرح توڑ توڑ کر کھانے لگے!

۱۸ جون:

ہمارا میس خاصہ پُر فضا مقام ہے۔ چھوٹی سی لائبریری، چھوٹا سا سالان، چھوٹا سا بار، سبھی چیزیں موجود ہیں۔ مگر مجھے وہاں جاتے یک گونہ وحشت ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ لوگ پچھلے دو سال سے یہیں بیٹھے وہی باتیں دوہرا رہے ہیں۔ فلسفے کا خمیر شاید تجرد، تنہائی اور ویرانی ہی سے اٹھتا ہے!

۱۹ جون:

اس خطے میں جال کے سخت جان اور تناور درخت پائے جاتے ہیں یہ بوڑھے درخت اتنے قدیم ہیں گویا یہ خطہ جال کے درختوں میں پایا گیا ہے۔ یہ وہی مشہور و معروف درخت ہے جو کسی قسم کی آب و ہوا کے بغیر خود بخود اگنے اور فی سبیل اللہ پھولنے پھلنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ چنانچہ وسطی ایشیا سے اگتا ہوا یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ شیر شاہ سوری نے اپنی شاہراہ اعظم کے گرد اگرد اسی کے پیڑ لگوائے تھے۔ بلکہ شاید پیڑ پہلے موجود ہوں اور سڑک بعد میں داخل کر دی گئی ہو۔

خال خال اکا دکا کوئی جانا پہچانا درخت بھی دکھائی دے جاتا ہے مگر اس ماحول میں بیچارہ کچھ اجڑا سا معلوم ہوتا ہے

جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو کہ — میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں یہ شیشم کا ایک ایسا ہی تنہا پیڑ خربوزوں کے کھیت کے دوسرے کنارے کھڑا ہے۔ ڈنر سے آیا تو چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ میں دیر تک بڑے بڑے خربوزوں پر بیٹھا شیشم کے اس پیڑ کو تکتا رہا۔ ایک عجیب ناقابلِ فہم سا درد تھا جو فضا میں مرتعش تھا۔ یہ میرا درد تھا، چاندنی کا درد یا شیشم کے پیڑ کا درد — کون کہہ سکتا ہے ؟

۲۴ جون:

۲۱ جون کو آندھی کا زبردست طوفان آیا۔ اور — جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی۔ تین چار خیمے زن سے صاف اڑ کر خربوزوں کے کھیت میں جا رہے۔ جو اپنی جگہ پر قائم رہے ان کا سامان نکل بھاگا۔ لوگ باگ اب تک اپنے موزے، رومال، قمیص، ٹائیاں، تولئے وغیرہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ میرا دیوانِ حافظ آج تک نہیں ملا۔ شاید بہت اونچا اڑ گیا، شاید دریا میں جا گرا — میری پھندنے والی سرخ رومی ٹوپی جو مڈل کے امتحان کے لئے والد مرحوم نے خرید کر دی تھی اور اب ایک مدت سے صرف نماز پڑھنے کے کام آتی تھی، سامنے والے جال کے درخت کی سب سے اونچی پھننگ میں جا کر اٹک گئی ہے۔ ٹہنیاں ہلتی ہیں تو پھندنا اس شان سے لہراتا ہے گویا گنگنا رہا ہو "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا"!

سوچتا ہوں ٹوپی کو اتار لوں یا وہیں رہنے دوں۔ ایک خیال آتا ہے کہ وہیں رہنے دوں۔ آخر بدھ بھی تو اس ویرانے میں اپنا اسٹوپا، چھوڑ گئے ہیں۔ درویش کا تحفہ ٹوپی۔ پھر سوچتا ہوں کہ نہیں، اتار ہی لوں۔ ہوسکتا ہے اس وقت ہمارے اس پورے برِ اعظم کی یہ آخری پھندنے والی رومی ٹوپی ہو ؟ — خیر اگلے اتوار تک تو اس طرح چلنے دو !

۲۶ جون؛

آج ملک میں مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کی برسی منائی جا رہی ہوگی۔ یہاں چراغ حسن حسرت تو در کنار مولانا حسرت موہانی کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں۔ جو تین چار ہم خود ہیں، وہ بھی ہم خود نہیں ہیں۔ ہمارے نام تک ہمارے اپنے نہیں۔ صبور صاحب تمارئی ہیں، جاوید — لوئی — اور ذکی۔ اس نے اپنے لئے کوئی پیچیدہ سا فرانسیسی نام تجویز کر رکھا ہے۔ شیلے، بائرن سب کو یاد ہیں، مومن کا نام تک نہیں سنا۔ کس سے کہتا کہ کون مرگیا۔ ناچار اپنے کنجِ تنہائی میں بیٹھا خود ہی در و دیوار کو آوازیں دیتا رہا کہ ؎

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں !

بعض اوقات غم میں بھی اچانک دلچسپی کا کوئی پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً آج جس وقت میں گھرے درد و کرب کے ساتھ باآوازِ بلند حسرت مرحوم کا یہ مصرع بار بار گنگنا رہا تھا کہ — "آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں"، تو دیکھتا کیا ہوں کہ بوڑھا کاکا چاچا ہاتھ میں پالش کا برش پکڑے ایک کونے میں کھڑا ہے اور ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کیوں کاکا کیا بات ہے تو بڑی صادقانہ آواز میں بولا — "صاب مجھے اپنی صنوبر جان یاد آرہی ہے"!

۲۷ جون؛

آج دن بھر کوئی عجب قسم کی دیوانی فاختہ جال کے جھنڈ میں کوکتی رہی۔ فاختائیں تو یہاں اکثر کوکتی رہتی ہیں مگر اس ظالم کے گلے میں تو جیسے کسی نے ہارمونیم فٹ کر دیا تھا۔

پرسوں سے ایک نئے انجینئر ایک مختصر سے معلوماتی و مطالعاتی دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ آپ انجینئر کم اور تاریخ دان زیادہ ہیں (جیسے جزدان، نمکدان وغیرہ) مطالعہ کی غایت تو یہ تھی کہ اس دریا سے بجلی کیونکر پیدا کی جائے مگر آپ تحقیقات فرما رہے ہیں اس امر کی کہ اگر ہندوستان کے قدیم شمال مغربی حملہ آوروں کو اس دریا کے پورے طاس کا علم ہو جاتا تو تاریخ کا رخ کیسا ہوتا!

حیران ہوں کہ پیسے کمپنی والوں سے وصول کر رہے ہیں اور کام سکندرِ اعظم کا کر رہے ہیں!

میری رومی ٹوپی ہنوز درخت پر آویزاں ہے!

۲۸ جون:
دونوں گلہریاں بدستور اپنے وقت پر آ رہی ہیں۔ اب میری آہٹ سے بھاگتی ہیں، بوٹوں میں چھپ جاتی ہیں۔ خانہ بدوش قبائلیوں کے ڈیرے سے ایک بھورا کتا بھی سہ پہر کی چائے پر اکثر آ نکلتا ہے اور ایک آدھ ٹوسٹ لے جاتا ہے۔ مسخرا کچھ اس متوقع صورت سے بیٹھتا ہے اور کمبخت کی آنکھوں میں چاپلوسی کی کچھ ایسی چمک تیرتی ہے کہ اس کو دیکھ کر میں بعض اوقات اپنے اندر جھانکنے لگ جاتا ہوں اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں اپنے باس کے سامنے کھڑا دُم ہلا رہا ہوں۔
کھیت سے بڑا تربوز آج غائب ہے۔ افسوس! —— زمین کھا گئی نوجواں کیسے کیسے!

۲۹ جون:
آج ایک مشہور شاعر کا خط ملا ہے
"اشعار کی بھرمار ہے احوال ندارد"
بمشکل تمام اشعار کی تفسیر و تعبیر سے سمجھ میں آیا کہ آجکل بیمار رہتے ہیں اور جتنے بیمار ہیں اتنی ہی زیادہ شراب پیتے ہیں۔ اشاروں کنایوں میں یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اب مجھے ان کے خطوط کا فائل کھول دینا چاہیئے!

یکم جولائی:
میری عادت ہے کہ بہانے بہانے سے کام نہ کرنے کی تقریبات پیدا کرتا رہتا ہوں۔ جینے کا پہلا دن میری ایسی ہی تقریبات میں سے ہے جن کے احترام میں، میں تمام دن کوئی کام نہیں کرتا۔ چنانچہ آج کی گرمی بھی غیر معمولی تھی، عصر تک ٹب میں بیٹھا رہا۔ پھر نہا دھو کر اٹھنے کے ارادے سے باہر نکلا تو ناگاہ وہ تیر سینے میں لگا کہ ہائے ہائے! میری ٹوپی درخت سے غائب تھی۔ بہت تلاش کی مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ قیاس ہے کہ کوئی عقاب اوپر ہی اوپر لے اڑا یا زمین پر سے کوئی گیدڑ لے بھاگا۔ مایوس و ملول خیمے میں آکر پڑ رہا۔ ٹوپی بار بار خیالات میں گھومتی رہی ...... اس ٹوپی پر والد مرحوم دست شفقت پھیرا کرتے تھے ..... اس ٹوپی میں ڈال کر میں بھنے ہوئے چنے کھایا کرتا تھا ... گاؤں کے مڈل سکول سے لیکر پنجاب یونیورسٹی کے ایوان عالیشان تک یہ ٹوپی میرے سر پر رہی .... میں نے اپنی زندگی کا پہلا (اور آخری) عشق اسی ٹوپی سے آغاز کیا .... یہ ٹوپی ...... میں نہ معلوم کب تک ان خوابوں میں کھویا رہتا کہ کاکا نے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا کہ "صاب آج تو میس میں ہال نائٹ ہے" اور میں جلدی سے ڈنر کے لئے تیار ہو کر میز سے ایک مغربی ٹوپی اٹھا کر سیٹی بجاتا میس کو چلدیا لیکن دل میں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں نہیں کوئی اور غیر اجنبی شخص میری جگہ چلا جا رہا ہے۔ میں تو اپنی ٹوپی کے ساتھ اڑ کر کہیں دور جا چکا تھا!
اس وقت شب کے دو بجے کا عمل ہے، میں خیمے میں بیٹھا ڈائری لکھ رہا ہوں۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں مگر اس خوف سے سو نہیں رہا کہ میں سو گیا تو ٹوپی جاگ پڑے گی۔

۲ جولائی:
انکل گریگوری ہماری میس کی دلچسپ ترین شخصیت ہیں دونوں عالمی جنگوں میں داد شجاعت دے چکے ہیں۔ ہر جنگ میں بجعۂ سادی تین تین مرتبہ زخمی اور دو دو مرتبہ قید ہوئے جسم پر اتنے زخم ہیں کہ گویا اپنے زمانے کے "رانا سانگا"۔ نہایت واہیات قسم کی مونچھیں پال رکھی ہیں جن کو ناک کے بالوں سے مسلسل کمک پہنچاتے رہتے ہیں۔ عمر بہت خاصی ہو چکی ہے لیکن زندگی کے محاذ سے ریٹائر ہونے پر ہنوز آمادہ نہیں۔ ایک عرصہ سے انجینئر فرموں کی ملازمت میں، اپنے سفید طوطے کے ساتھ جس کو آپ فیلڈ مارشل رومیل کے نام سے پکارتے ہیں، ملک ملک گھوم رہے ہیں۔ ساری عمر کیمپوں میں گزر گئی ہے۔ یہ ان کی زندگی کا پچیسواں کیمپ جا رہا ہے جس کی سلور جوبلی کا پروگرام آجکل ہم لوگ بنا رہے ہیں۔
انکل جس کیمپ میں بھی رہے عموماً اور خصوصاً بھی، میس کے انچارج رہے۔ حد یہ ہے کہ جرمنوں کی قید میں بھی لنگر کا

انصرام انہیں کے ہاتھ میں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کام کا سلیقہ بھی انہیں پر ختم ہے۔ ضرورت ہو تو یہ کے ٹو، کی چوٹی پر کلب کھول دیں اور ایسا کلب کہ انسان دیکھ کر آئینہ حیرت، یا حیرتِ آئینہ (جو بھی درست، مناسب یا شایانِ شان ہو) بن کر رہ جائے۔ کلب کھانے سے نہیں، سامان سے چمکتا ہے اور زیبائش و آرائش کا بہت سا سامان ان کا ذاتی ہے جس کو انکل گشتی تھیٹر کے سین سینری کی طرح ہر جگہ ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ میں تو سوچتا ہوں کہ انکل کمپنی والوں سے تنخواہ نہیں، اپنے سامان کا کرایہ ہی لے رہے ہیں!

پرانے کینوس کی کچھ تصویریں ہیں جن میں وضع وضع کے گھوڑے اور خود و مغفر میں ڈوبے بکتر بند شہسوار تیر کمان، ڈھال تلوار سے لڑ رہے ہیں۔ انکل کے دعوے کے مطابق ان میں سے کسی تصویر کی عمر چار سو برس سے کم نہیں۔ یہی ان کا انکسار ہے ورنہ بعض تصویروں میں تو اب سرے سے کوئی نقش نظر ہی نہیں آتا کچھ مبہم خطوط رہ گئے ہیں جن کو آپ اپنی پسند و کوشش کے مطابق کچھ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً میں ایک تصویر کو ہاتھی سمجھ رہا تھا، انکل نے بتایا کہ یہ تو مصر کا سب سے بڑا اہرام ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا اہرام اور بس اتنا سا۔ بولے کہ مصور نے جب یہ شاہکار بنایا تھا، اہرام ابھی اتنا ہی تعمیر ہوا تھا!

کھال میں بھرے ہوئے تین چار شیر دھرے ہیں، سو وہ بھی اتنے قدیم کہ صدیوں سے شاید ان شیروں کی نسل ہی منقطع ہو چکی ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے میں میس میں بیٹھا لائف میگزین میں شیر کے شکار پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا معاً جو ایک اپنے شیر کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کی آنکھ (اس شیر کی ایک ہی آنکھ ہے) میں غیر معمولی روشنی نظر آئی۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہی میری گلہری شیر کے جبڑے میں بیٹھی تھی جس کی آنکھ شیر کی آنکھ میں سے چمک رہی تھی!

چاندی کے بھاری بھاری کپ، خنجر، چھری، کانٹے اور گلاس ہیں، جن میں سے گلاس ہم استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہ سامان دراصل سولہویں صدی کی کسی برٹش کیولری رجمنٹ کا اثاثہ ہے جو نہ معلوم کب، کیوں، کس طرح انکل کے تصرف میں آ گیا۔ ہر گلاس پر کوئی نہ کوئی نام کندہ ہے۔ میں جب پانی پیتا ہوں تو میرے لئے یہ احساس بڑا سنسنی انگیز ہوتا ہے کہ لو اب میں کرنل فرگوسن کے گلاس میں پانی پی رہا ہوں جو ۱۷۱۲ء میں ٹانگانیکا میں پیدا ہوئے، اور اب بریگیڈیئر جنرل گڈ کرافٹ کے گلاس میں جو اس سال گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوئے۔ انکل نے ماحول میں برطانیہ کی تاریخ و روایت کو اس شدت سے بھر دیا ہے کہ بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ ہم تاریخ کے اوپر چل رہے ہیں، تاریخ سونگھ رہے ہیں — تاریخ کھا رہے ہیں۔ میں تو کبھی کوئی پردہ سرکاتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں کہ کہیں پیچھے سے جیمز اول ہی نہ نکل آئیں!

تحائف میں سے اکثر تحائف مرنے والوں کی یادگاریں ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرنے والوں کی اکثریت گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوئی۔ موجودہ گلاسوں میں سے دس گلاس مرنے والوں کی نشانیاں ہیں۔ ان میں صرف ایک طبعی موت مرا، ایک مچھلی کا شکار کھیلتے سمندر میں ڈوب گیا، باقی آٹھوں گھوڑے سے گر کر مرے۔ انگریزوں کی تاریخ پر گھوڑے کا کتنا گہرا اثر ہے؟ خود انکل کہتے ہیں کہ گھوڑا نہ ہوتا تو انگریزوں کی سلطنت بھی نہ ہوتی۔ اور یہ بات بھی کہ اگر گھوڑا نہ ہوتا تو بہت سے انگریز جو مر چکے ہیں شاید آج بھی زندہ ہوتے!

بات سے بات کی طرح گھوڑے سے بھی گھوڑا نکلتا ہے۔ انگریزوں کے گھوڑے سے میرا ذہن قدرتی طور پر مسلمانوں کے گھوڑے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مسلمانوں کی تاریخ بھی گھوڑے ہی کی تاریخ ہے۔ جب تک گھوڑا ان کی ران کے تلے تھا، فاتح و کشور کشا رہے۔ گھوڑے کی باگ چھوٹی تو سلطنت کی باگ بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ سلطنت کچھ دیر سلامت بھی رہی تو یہ عالم تھا کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہیں رکاب میں"۔ اور ہاں یاد آیا کہ اقبال نے بھی تو کہا ہے:

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

صفیہ شبنم

بارش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ پانی بس میں بھی جگہ جگہ سے ٹپک رہا تھا۔ کہیں کہیں بوندوں نے مل کر آبشار کی شکل بنالی تھی۔ وہیں نجمہ بیٹھی تھی۔ اس نے برساتی اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لی تھی اور اپنی اس طرح حفاظت کر رہی تھی جیسے کوئی بڑی قیمتی شے ہو۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تھی جہاں اس کا بھائی بیٹھا تھا کہ کہیں بھیگ تو نہیں رہا۔ وہ بے پروائی سے باہر دیکھ رہا تھا اور سگریٹ کے دھوئیں سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں دائرے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ سفر اس نے پہلے بھی کئی بار کیا تھا لیکن اس دفعہ اس کا دل معمول سے مختلف طریقے پر دھڑک رہا تھا۔ اس ہیجانی کیفیت میں عجیب مسرت اور نغمگی تھی۔ شاید شاہی سے ملنے کی امید اس کا سبب ہو۔ پانچ سال کی مدت میں وہ اسے ایک دن کے لئے بھی تو نہیں بھولی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے خد و خال ذہن میں اس قدر روشن اور تازہ تھے۔ یہاں تک کہ پیشانی پر وہ ننھا سا ابھرا ہوا تل بھی جہاں وہ بالوں کو دو حصوں میں کر کے ایک مبہم سی لکیر بنا لیتا تھا۔ ماضی کے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات ایک ایک کر کے یوں ابھر رہے تھے جیسے وہ کل کی باتیں ہوں۔ ایک دفعہ شاہی کی تصویر دیکھ کر اس کی سہیلی نے چونکا دیا تھا "توبہ! ایسی مسکراہٹ میں نے کبھی نہیں دیکھی کمبخت آنکھیں تک تو مسکرا رہی ہیں"۔ اس نے تصویر میں ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا "دیکھو نجمہ ٹھیک ہے نا"

اور پھر جب وہ محلے کی بیری پر چڑھ گئی تھی، کانٹوں سے ہاتھ بچا بچا کر اس نے بڑے بڑے بیر توڑے تھے۔ بہت سے منہ میں بھرے ہوئے اور دوپٹے کے پلو میں بندھے ہوئے تھے۔ نیچے کھڑی شبانہ اسے لالچی خود غرض اور نہ جانے کیا کیا بنا رہی تھی۔ اسی کی آواز سن کر کہیں سے شاہی آ گئے تھے۔ اترنے میں اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ گر ہی پڑی ہوتی اگر وہ نہ سنبھالتے۔ کس گستاخی سے انہوں نے کہا تھا "بیروں کے لالچ میں اگر ٹانگ ٹوٹ جاتی تو پھر کیا ہوتا"۔ اس زمانے میں یہ خبر بھی تو ادھر ادھر اڑ رہی تھی کہ ان کی منگنی ہونے والی ہے۔ اُف وہ اتفاقات! کالج کا تو بہانہ تھا۔ انہیں یادوں کے سہارے یہ طویل عرصہ اتنی آسانی سے گزر گیا تھا۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی، بارش ہلکی ہو چکی تھی، اس کے بھائی نے کھڑکی کے قریب آکر کہا "ذرا اترو تھوڑی کافی پی جائے"۔ وہاں ایک چھوٹا سا "کٹ گھر" سا تھا پورا دھوئیں سے سیاہ، چھوٹی چھوٹی تپائیاں اور کرسیاں پڑی تھیں جن کی سطح ٹھیک طرح رندہ نہ ہونے کے باعث کھردری کھردری تھی۔ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا جو چائے اور کافی کی پیالیاں لئے ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ یہاں کے پکے ہوئے سیبوں کی طرح سرخ و ملائم "کافی اچھی ہے نا؟" اس کے بھائی نے پوچھا۔

"ہاں بہت عمدہ ہے"۔

"تم تھکی ہوئی کیوں معلوم ہو رہی ہو میں تو بہت ہی چونچال محسوس کر رہا ہوں۔ پہاڑوں کی ہوا کتنی صحت بخش ہے"؟ اس نے لمبا سانس لیا۔

"اور یہ اکتا دینے والی بارش" نجمہ نے باتوں سے اکتا کر کہا۔

"واہ! یہ تو منظر کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی ہے، جس طرح جھلملیوں میں سے چاند ایک نیا ہی منظر پیش کرتا ہے"۔

"تم تو ہر چیز کی تعریف کرنے کے عادی ہو"! نجمہ نے ذرا چڑ کر کہا "اور تم یہ چپکے چپکے انگلیوں پر کیا گن رہی تھیں؟ اچھا ہم! دیکھو اگر ایک بھی کم ہوا تو" وہ زور سے ہنس پڑا۔

نجمہ سوچنے لگی کیسا بے فکرا ہے یہ بھی جتنی لڑکیوں سے ملتا ہے جب تک وہ بیٹھی رہتی ہیں ان کی تعریف کرتا رہتا ہے۔ کسی کی آنکھیں کسی کی

گردن، کسی کی ٹھوڑی، حد سے کہ بدصورت لڑکیوں میں بھی تعریف کی کوئی نہ کوئی بات ڈھونڈ لیتا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے رخسانہ سے کہہ رہا تھا "آپ کی مخروطی انگلیاں کسی شاعر اور مصور کے تخیلات سے بھی زیادہ حسین ہیں" وہ بچاری جانتی ہے کہ یہ تو معمولی ہیں۔ خود بھی ہنستا رہتا ہے اور انہیں بھی ہنساتا ہے۔ اور جب وہ چلی جاتی ہیں تو اسے یہ بھی تو یاد نہیں رہتا کہ جس کی آنکھوں کی تعریف کی تھی وہ شکیلہ نہیں تاج تھی اور جس کے "چاندنی ادا" کو سراہا تھا۔ نسرین نہیں ادیبہ تھی، کمال ہے نہ کبھی خود سنجیدہ ہوا اور نہ انہیں سنجیدہ ہونے دے۔ جب ہی تو ایک لڑکی نے لندن سے اسے لکھا تھا "تم نے اپنے دورانِ قیام میں مجھے اور میری دوست کو بالکل ایک ہی سی باتیں کہی ہیں۔ آئندہ مجھے خط نہ لکھنا۔ میں سطحی باتوں کو ناپسند کرتی ہوں"۔ یقین ہے بڑی خندہ پیشانی سے اس نے یہ فیصلہ قبول کر لیا ہوگا۔ اور شاید وہ پہلی اور آخری لڑکی ہوگی جو غلط فہمی میں ذرا سی دیر کو مبتلا ہو گئی تھی۔

ایک دھماکے کے ساتھ بس رک گئی۔ شام اپنی آخری منزلیں طے کر کے شب سے گلے مل کر جدا ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں بتیاں یوں روشن دکھائی دیتی تھیں جیسے جنگل میں دور، دور جگنو چمک رہے ہوں اور بار بار درختوں کی اوٹ میں ہو جائیں۔

یہ آخری اسٹاپ تھا۔

ہوٹل پہنچ کر اس کے بھائی نے سگریٹ کا نیا ٹین کھولا۔ وہ آرام کرسی پر دراز ہو کر سونے کی فکر میں تھا کہ نجمہ نے اس کا ارادہ بھانپ لیا ٹین کو اپنے بکس میں مقفل کر کے اس سے کہا تیار ہو کر سیر کو چلنا ہوگا۔ اور رچی جان سے بھی ملتے آئیں گے"

مال روڈ سے گزرتے ہوئے دکانوں کی چمک دمک، وہاں کی چہل پہل، ہوٹلوں سے بلند ہوتی ہوئی موسیقی اور لوگوں کے آرکسٹرا سے ملتے جلتے قہقہے، سب نے مل کر کچھ ایسا سماں پیدا کر دیا تھا جیسے کوئی بارات آئی ہوئی ہو۔

نجمہ نے لباس بہت ہی احتیاط سے منتخب کیا۔ آئینے کے سامنے اتنی دیر کھڑے رہنے کا بھی اس کا پہلا ہی اتفاق تھا۔ اس کے سنورے ہوئے بالوں میں لہریں سی پڑی ہوئی تھیں۔ جب وہ باہر نکلی جنگلی باڑھ میں گلابی پھولوں کا گچھا جو رنگ میں بعینہٖ لباس سے مشابہ تھا جھولتا ہوا دکھائی دیا۔ جسے اس نے چپکے سے توڑ کر اپنے بالوں میں اڑس لیا۔ اس کا حسن اس آرائش سے اور بھی نکھر گیا۔ تھوڑی ہی دور بڑھے ہوں گے کہ اس نے دیکھا اس کا بھائی ایک نوجوان کو جھنجھوڑتے ہوئے "ہیلو ہیلو" کہہ رہا ہے۔

"اف میرے خدا! یہ تو شامی ہے کس قدر بدل چکا ہے!"

"آپ کی تعریف؟" نجمہ نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو مغربی لباس میں تھی اور اپنے ترشے ہوئے پریشان بالوں کو بائیں ہاتھ سے درست کر رہی تھی۔ اس کا داہنا ہاتھ شامی کے بازو کی گرفت میں تھا۔

"او ہو ہاں"۔ شامی نے چند مختصر تعارفی جملے کہے۔ لڑکی نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کچھ ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے نجو کیسی ہو تم؟ بالکل بدل چکی ہو! میں تو تمہیں اب بھی وہی تیرہ چودہ سال کی بچی سمجھ رہا تھا"۔

موسیقی بڑے زور سے جھنجھنا کر ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی۔ شامی نے اس کے سراپا پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کوئی سرچ لائٹ ڈال رہا ہو۔ نجمہ نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر بچنے کی کوشش کی۔ شامی کا چہرہ کچھ اور بھی چمک رہا تھا۔ نگاہوں میں تجسس اور شوخی بھی بڑھی ہوئی تھی لیکن وہ ننھا سا تل جس کو چھونے کی خواہش برسوں نجمہ کے نازک دل میں پرورش پاتی رہی تھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ یا تو وہ مدھم پڑ چکا تھا یا نجمہ کی قوتِ مشاہدہ!

★

گلستانِ اُندلس میں

(قرطبہ سے اشبیلیہ جاتے ہوئے)

قیوم نظر

دور ہے مجھ سے بہت دور مگر دور نہیں
آنکھ مجبور سہی دل کا یہ دستور نہیں
دل کہ صدیوں کے گراں بار تلے چور نہیں

★

سر بسر حدِ نظر تک ہیں بھرے جسم سمیت
جھومتی بیلیں۔ دہکتے ہوئے انگور کے کھیت
ایسی شادابیوں میں کیسی یہ اڑتی ہوئی ریت

★

عربی نسل کے گھوڑوں پہ ہیں کچھ شاہ سوار
اتنی تیزی سے بڑھا جاتا ہے جو ابرِ غبار
یا ہے مردانِ جواں عزم کی پیہم یلغار

★

کارواں عظمتوں کے، عبرتوں کے گذرے ہیں
دشتِ تخئیل میں وحشی بھی کئی اترے ہیں
کوئی جچتا ہی نہیں نقش بہت ابھرے ہیں

★

کیسا شعلہ سا لپک اٹھا تھا اس جھاڑی میں
ہنہنانے کی صدا پھولوں بھری باڑی میں
کان بجتے ہیں مرے، ورنہ کہاں گاڑی میں

★

پالیا آنکھ نے اُمڈا ہی تھا جو دل سے آنسو
نعرہ زن پھر بھی رگ و پے میں ہوا میرا لہو
اپنے ہمراہ لئے چل مجھے اے کون ہے تو

۲

کس بہار ساماں تھے
عشق کے میٹھے نغمے
رقص کے دیئے تحفے
ان جواں زمینوں کو
اَن گنت حسیں بیلیں
اُن کی پھیلتی شاخیں
ڈھونڈتی ہیں مستی میں
اپنے خوشہ چینوں کو
تتلیوں سی رنگینی
ایشیائی لاطینی
چشم و عارض و بینی
مل گئے حسینوں کو
سلسلہ کھجوروں کا
آسماں تا نیچے سا
دیکھتا ہے دل تنہا
جانے کن خزینوں کو

★

دفعتاً چھپا سورج
راستے ہوئے کج مج
ڈھونڈ لائی شب کی دھج
صندلیں جبینوں کو
رنگ و بو کا ہنگامہ
جسم آرزو نامہ
جس پہ چست ہر جامہ
کوتہ آستینوں کو
چنگ و بربط و نے ہے
جام ہے، خُمِ مے ہے
زندگی یہی شے ہے
آج تہ نشینوں کو

اپنا اپنا چاند

ابن انشا

اک چاند پرانا صدیوں کا، جس چاند کے پیٹ میں تارا ہے
اک چاند زمیں کے لوگوں نے افلاک پہ آج ابھارا ہے

اُس چاند کا چہرہ کندن ہے، اُس چاند کا رتبہ عالی ہے
اِس چاند میں بھی گن لاکھوں ہیں، اِس چاند کی ریپ نرالی ہے

اُس چاند کے لوبھی دیوانے، اُس چاند کے آلھے گاتے ہیں
اِس چاند چراغ کے پروانے، اِس چاند کی عید مناتے ہیں

تم چاند نگر کے انشا جی، کس چاند کے عاشق ہوتے ہو؟
کس چاند پہ جی کو کھوتے ہو، کس چاند پہ شب کو روتے ہو

★

جب من کے گگن کے آنگن میں اِک چاروں کُوٹ اندھیارا تھا
ہم پیت نگر کے لوگوں نے اک اپنا چاند ابھارا تھ

وہ چاند نہ کنکر پتھر ہے، وہ چاند نہ لوہا پیتل ہے
وہ چاند نہ سونا شیتل ہے جس چاند پہ یہ جی بے کل

اک گوری تھی البیلی سی، مدماتی چھیل چھبیلی سی
تھی جس کی چال نشیلی سی، تھی جس کی بات رسیلی

وہ پیت لگا کر توڑ گئی، ہاں کہنے کو منہ موڑ گئی
تن من کے تار جھنجوڑ گئی، سو یادیں جی میں چھوڑ گئ

اس من کی اندھیری راتوں میں، اِن یادوں کا اُجیالا ہے
یہ چاند کہ آوداکالا ہے، ہر شام نکلنے والا

یہ چاند لگائے سینے سے، یہ چاند سمیٹے دامن میں
ہم جوت جگاتے پھرتے ہیں، پربت ساگر بستی بن

ہر شعر پہ شور سا اُٹھتا ہے، ہر گیت پہ دیپ سا جلتا ہے
جب رات کو من کی محفل میں اُس چاند کا چرچا چلتا

وہ چاند کہ ڈوبیں گہنائیں، وہ چاند کہ آپی جل جائیں
جس چاند سے ہم کو نسبت ہے، اُس چاند کے آگے کیا

پر لوگو مُورکھو دیوانو! یہ بات کسی سے کیوں پوچھو
جس چاند کی جس کو وحشت ہو! جس چاند کا جس کو سودا

بس بات ہے پیت نبھانے میں، اِک چاند پہ جان سے جانے میں
جب ایک نہیں، جب دو بھی نہیں، جب تیرہ ہوں چاند زمانے

★

جھنگ سیال

شیر افضل جعفری

گرجتی گھٹائیں پسینہ پسینہ
چناب اور جہلم سفینہ سفینہ

سحر در سحر بھاؤ[1] نے چیت پھاگن
دھواں دھار ساون شبینہ شبینہ

خیاباں خیاباں ارم زار ساندل
ببول اور شیشم قرینہ قرینہ

جواں سال شاخوں پہ ڈیلوں[2] کے بندے
کریروں کا عالم نگینہ نگینہ

کھجوروں کی اُٹھتی جوانی پہ اکثر
پرندوں کے ڈیرے مہینہ مہینہ

گداز و حسیں نرم و سرشار بالو
فسوں کار ٹیلے مرینہ مرینہ

نباتات پر حسن ورُوماں نچھاور
بڑوٹی[3] بروٹی حسینہ حسینہ

سدا رنگ سرسوں پہ سونے کی افشاں
زمینِ سیالاں خزینہ خزینہ

ازل مست و درویش و مومن فضائیں
لبِ زندگی پر مدینہ مدینہ

★

[1] بھاؤ: چلنے والے
[2] کریروں کا گول گول لال لال پھل
[3] خار دار چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں

سرِ شام

شائستہ بیزار

شام پھر سوگوار آئی ہے
یوں اداسی میں غرق ہیں لمحات
ڈوبتے جائیں جس طرح نغمات
ظلمتوں میں کرن کرن ڈوبی
چھائے ہر شے پہ مضمحل سائے
جیسے اشکوں سے آنکھ دھندلائے
شام کی ہر تھکی تھکی ساعت
زندگانی کے بوجھ سے ہے نڈھال
ہوگئی اور سست وقت کی چال
یہ خلا کی مہیب پہنائی
جس میں ویرانیاں ہیں نوحہ کناں
سرد آہیں ہیں چار سو رقصاں
گنگ پیڑوں پہ سر دھرے کب سے
خامشی سسکیاں سی بھرتی ہے
ہر گھڑی نوحہ خواں گزرتی ہے
یوں اداسی فضا کی ساکت ہے
جیسے پلکوں پہ اشک رک جائیں
دھڑکنیں جیسے درد میں کھو جائیں
دورِ ماضی کی رہگزاروں سے
کس کے قدموں کی چاپ آتی ہے
خامشی چونک چونک جاتی ہے

چوبیتہ:

بہار

سائیں مرحوم
مترجم: عبدالعزیز فطرت

آگئی صبح بہار

آگئی صبح بہار

ظلمتِ رنگِ خزاں ہو گئی خوار و ذلیل

آگئی بادِ بہار بن کے خوشی کی دلیل

جانے رہی ہے کہاں بن کے مسافر غریب

چھپتی پھری ہے کہیں ایک برس کے قریب

آگئی صبح بہار

آگئی صبح بہار

کٹ گئے دن گرم سرد باغوں پہ آیا نکھار

جیسے حسینہ کوئی آئے سوئے بزمِ یار

کہتے ہیں سب یار دوست ایسے یہ موسم کے ٹھے

خوب رہیں محفلیں خوب رہیں جمگھٹے

آگئی صبح بہار

آگئی صبح بہار

(ہندکو)

"مہتاب جواں"

(وطن کی مٹیاروں کے نام)

سائیں فضل
پرویز پروازی

مرے وطن کی حسین و جمیل مٹیارو
چہک چہک کے فضاؤں کو دلنواز کرو
مہک مہک کے بہاروں کا رُوپ نکھراؤ
کہ میری ارضِ وطن سے خزاں نکل جائے
غموں کے گھور اندھیروں کی رات ڈھل جائے

★

تمہارے دل میں سلگتی ہیں کچھ تمنائیں
متاعِ دردِ محبت سے آشنا ہو تم
کسی جوان کے بازو کا آسرا لے کر
ہر ایک حال میں آمادۂ وفا ہو تم
مگر زمانہ کسی سے وفا نہیں کرتا!
مجھے یہ ڈر ہے تمہاری حیا کے پردے میں
تمہارے دل میں سلگتی ہوئی تمنائیں
بھڑک کر آگ کے شعلے کہیں نہ بن جائیں
یہ حُسن آگ میں پڑ کر ہی اور نکھرے گا
تمہارے ماتھوں کے سُورج سے روشنی لے کر
مرے وطن میں بہاروں کا چاند نکلے گا

★

مرے وطن کی جواں اور شوخ مٹیارو
مرے وطن کی فضاؤں کو روشنی دے دو
تمہاری مانگ کا سیندور جگمگاتا رہے
مرے وطن کی فضاؤں میں نُور رچ جائے

★

(پوٹھوہاری)

پاکستان میں خواتین کی تعلیمی ترقی

تعلیم کا شوق شروع ہی سے مسلمانوں کا طرہ امتیاز رہا ہے کیونکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق ''حکمت اشیا'' بھی مذہب کا ایک اہم جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان تعلیم کے سلسلے میں مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور تاریخی کتابوں میں عورتوں کے مکتبوں میں تعلیم پانے کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ اور اس برصغیر میں تو کئی نامور خواتین نظر آئیں گی جن کے علمی کارناموں سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ مثلاً گلبدن بیگم، ملکہ نورجہاں، سلطانہ چاند بی بی اور زیب النسا۔ بیشک دور انحطاط میں تعلیم نسواں کے خلاف کچھ تعصب پیدا ہوگیا تھا۔ جس نے دور جدید میں انگریزی تعلیم کی ترویج پر زیادہ شدت اختیار کرلی تھی۔ پھر بھی حصول علم کا شوق بدستور موجود تھا۔ اور ابتدائی رد عمل کے بعد جو درحقیقت مغرب کے سیاسی و تمدنی غلبے کے خلاف رد عمل تھا، ذکور و اناث زور شور سے تحصیل علم کی طرف مائل ہوئے۔ ہمارا یہ قدیم احساس پھر سے ابھرا کہ تعلیم یافتہ خواتین معاشرہ کے لئے خطرہ کا باعث نہیں بلکہ اس کے لئے نہایت فائدہ مند ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین کے لئے جابجا تعلیمی درسگاہیں قائم ہونے لگیں اور ساتھ ہی ایسے مواقع بھی مہیا کئے جانے لگے جن میں خواتین کی علمی لیاقت کام آسکے اور ان کی تعلیم میں توسیع و ترقی کا جواز پیدا ہو۔

ایشیائی حکومتوں اور تعلیمی حلقوں نے نظری حدتک تو یہ صحیح تسلیم کرلیا ہے کہ عورتوں کو تعلیم دینا ضروری ہے، اتنی ہی تعداد میں جتنا مردوں کو، اور پھر اس کی نوعیت بھی ویسی ہی ہونی چاہئے۔ مگر بد قسمتی سے یہ عملی طور پر ممکن نہیں۔ سب سے پہلے تو قوم میں تعلیم نسواں

تعلیم کا بڑھتا ہوا شوق

کا پرزور مطالبہ ہونا چاہئیے جس کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ مدارس تو بعد میں قائم ہوں گے، پہلے والدین کو تیار ہونا چاہئے کہ وہ اپنی بچیوں کو تعلیم دلوائیں۔ ان میں یہ احساس پیدا ہونا لازم ہے کہ خواتین کی تعلیم کسقدر اہم ہے۔

پاکستان میں تعلیم نسواں کے حامی شکایت کرتے ہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم کو لڑکوں کی تعلیم پر قربان کیا جارہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پڑھی لکھی عورتوں، یہاں تک کہ اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں رکھنے والی خواتین کو بھی اپنے جوہر یا لیاقت دکھانے یا ان کو کام میں لانے کا کوئی موقع بہم نہیں پہنچایا جاتا۔ اور نہ انہیں اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کا موقع ہی دیا جاتا ہے۔ یہ شکایت بڑی حدتک صحیح ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ اس میں حالات کو پیش نظر رکھے بغیر جھٹ پٹ کوئی تیر بہ ہدف علاج کر ڈالنے کی توقع کی جاتی ہے، جو صریحاً ناممکن ہے۔ پھر یہ سوال تو شہروں ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ دیہات کی بات اور ہے۔ وہاں تو زندگی کا دھارا اور ہی رخ سے بہتا ہے اور عورتیں صرف گھر کی دیکھ بھال کرتی اور مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ نہ انہیں تعلیم کی چنداں ضرورت ہے اور نہ اس کی زیادہ مانگ ہی ہے۔ پھر بھی یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ پاکستان نے پچھلے ۱۱ سال میں تعلیم نسواں کے میدان میں نمایاں ترقی کی ہے۔

تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت تو ابتدائی درجوں میں ہوتی ہے۔ ان میں بالعموم بچے بچیاں اکٹھے ہی پڑھتے لکھتے ہیں۔ پاکستان قائم ہوتے ہی ابتدائی مدرسوں کی تعداد بڑھنا شروع ہوگئی تھی اور اب تو وہ کہیں کے کہیں پہنچ چکے ہیں۔ جس سے شوق تعلیم میں دن دونی رات چوگنی ترقی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان سے تھوڑی ہی دیر پہلے پنجاب کی آبادی دو کروڑ ساڑھے آٹھ لاکھ تھی اوراس کا تعلیمی میزانیہ دو کروڑ چھیالیس لاکھ
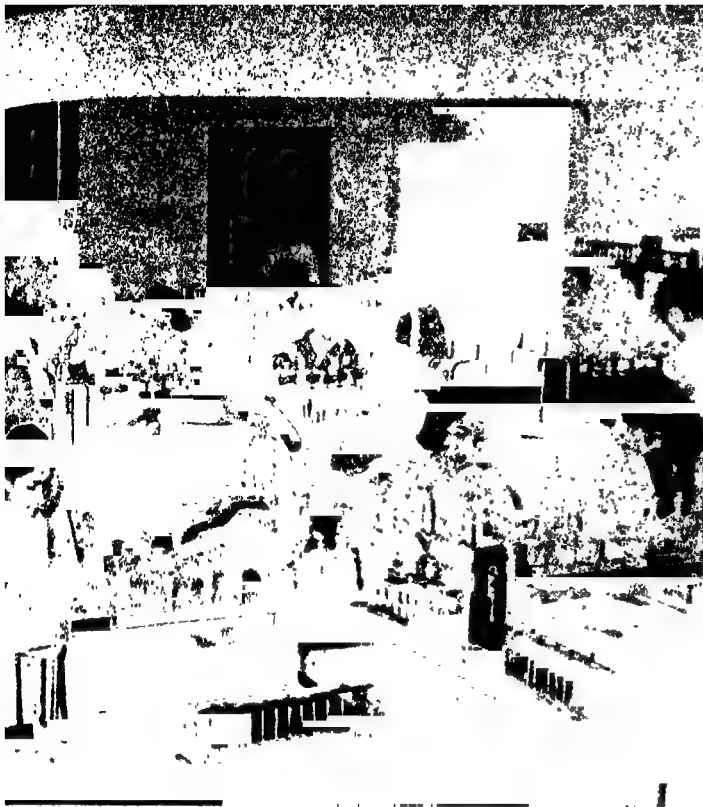
سائنس سے شغف

روپے تھا۔ اب مغربی پنجاب کی آبادی ایک کروڑ نوے لاکھ ہے اور تعلیمی میزانیہ پہلے سے دوگنا ہو گیا ہے۔ اس کی اچھی خاصی مقدار تعلیم نسواں کے لئے وقف ہے۔ چنانچہ جہاں ۱۹۴۹ء میں پرائمری اسکولوں میں لڑکیوں کی تعداد ۶۱۳۵۰ تھی وہاں یہ ۱۹۵۳ء میں ۱۰۰۲۳۶۹ تک پہنچ گئی تھی اور اب تو تقریباً دوگنی ہو چکی ہے۔ پرائمری کے بعد تعلیم نسواں کا زور کافی گھٹتا دکھائی دیتا ہے اور جو ہے وہ بھی شہروں ہی کی حد تک محدود ہے۔ ۱۹۵۳ء میں لڑکیوں کے پرائمری اسکولوں کی تعداد مغربی پنجاب میں ۱۸۳۵ تھی۔ اس کے برعکس ثانوی مدارس میں طالبات کی تعداد، امور خانہ‌داری کو لازمی مضمون بنا دینے کے باوجود، کل ۱۴۹ تھی۔ اس وقت گو دونوں قسم کے مدارس کی تعداد کافی بڑھ چکی ہے پھر بھی ان دونوں کا باھمی تناسب تقریباً ویسا کا ویسا ہی ہے۔

اس سے قدرتی طور پر کالجوں میں بی۔ اے

کے درجے تک تعلیم پانے والی طالبات کی تعداد بھی متعین ہو جاتی ہے۔ گو ملک میں بہت سے مخلوط کالج ہیں پھر بھی پاکستانی طالبات زیادہ تر زنانہ کالجوں ہی میں تعلیم پانا پسند کرتی ہیں۔ البتہ بی - اے کے بعد یونیورسٹیوں میں تعلیم مخلوط ہی ہے۔ مگر جو لڑکیاں پردے کی پابند ہوں ان کے لئے بعض درسگاھوں میں پردہ کا خاص بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض ہونہار طالبات جو بی - اے کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھنا چاھتی ہوں صرف اس لئے اپنا شوق پورا نہیں کر سکتیں کہ ان کے خاندان مخلوط تعلیم کے خلاف ہیں - اس کے باوجود ھماری یونیورسٹیوں سے پوسٹ گریجوایٹ طالبات ہر سال بیش از پیش تعداد میں کامیاب ہو کر نکل رہی ہیں اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ اکثر تعلیمی اعزاز بھی ہر سال طالبات ہی حاصل کرتی ہیں - ان میں سے کئی لڑکیاں تعلیم پانے کے بعد، کم از کم جبتک ان کی شادی نہ ہو جائے، کوئی کاروباری پیشہ یا ملازمت اختیار کر لیتی ہیں -

تعلیم یافتہ خواتین کے باھمی میل جول کے

فرصت کے اوقات میں اسٹیج سے دلچسپی

لئے "پاکستان فیڈریشن آف یونیورسٹی ویمن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ ان خواتین کے لئے خواہ وہ کسی کام پر لگی ہوں یا گھو گرھستی میں گھری ہوئی ہوں، آپس میں مل بیٹھنے، بات چیت کرنے اور تبادلۂ خیالات کے لئے ایک بہت عمدہ مرکز مہیا کرتا ہے۔ ہوسکے تو وہ کوئی سماجی بھلائی کا کام بھی کرتی رہتی ہیں۔ عام طور پر طالبات وہی مضامین لیتی ہیں جو انہیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد عملی مواقع بہم پہنچائیں - یہی وجہ ہے کہ آرٹ ، سائینس اور میڈیکل کے شعبے اُن طالبات سے بھر پور نظر آتے ہیں جو بعد میں استانیاں، ڈاکٹر، کیمسٹ، بیالوجسٹ اور فنکار بننا چاھتی ہیں - لاء کالجوں میں انکی تعداد کم ہے۔ اور انجینئرنگ اور کاروباری تعلیم کے کالجوں میں اس سے بھی کم -

ایک اور بات جس کا کسی شعبۂ تعلیم میں طالبات کی تعداد پر اثر پڑتا ہے ، اس شعبے میں مردوں کی موجودگی ہے - عام طور پر طالبات ایسے شعبوں کو پسند کرتی ہیں جن میں مردوں کے ساتھ میل جول کے مواقع کم ہوں - صرف ایک شعبہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے - میڈیکل کالجوں میں داخلے کی رفتار اسی طرح تیز ہے - اگرچہ پاکستان میں دو زنانہ میڈیکل کالج بھی موجود ہیں - شعبۂ تعلیم میں عورتوں کی بھرمار تو نہیں ، پھر بھی اس شعبے میں ان کی تعداد حسب معمول اور سب شعبوں سے زیادہ ہے - اس کی وجہ ظاھر ہے - مدتوں سے شریف خواتین کے لئے ، جو اپنی روزی آپ کمانا چاھیں، حصول معاش کا یہی ایک معزز ذریعہ ہے - حکومت نے تربیت یافتہ استانیوں کی مانگ پوری کرنے کے لئے جو شہروں میں ثانوی اسکولوں ، اور دیہات میں پرائمری اسکولوں کی حد تک ، بہت شدید ہے ، بہت سے ٹریننگ کالج قائم کئے ہیں - معلمات کو شہر میں سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں میں بہ آسانی ملازمت مل جاتی ہے - اور ان کو وہی آسائشیں اور مشاھرے بھی میسر

فطرت کی کھلی فضا میں

ہیں جو مردوں کو ہیں ۔ خواتین کو تعلیمی نظم و نسق کے سلسلے میں بھی بطور انسپکٹریس آف اسکولز یا محکمہ تعلیمات میں عمال کے طور پر تعینات کیا جاتا ہے ۔

یہ پڑھی لکھی خواتین کے مشاغل کا صرف ایک پہلو ہے۔ ان کو زندگی کے اور شعبوں سے بھی کافی دلچسپی ہے ۔ جب پاکستان قائم ہوا تو اسوقت نرسوں کی تین چوتھائی تعداد سے محروم ہو چکا تھا ۔ خوش قسمتی سے اب صورت حالات بہت بہتر ہو چکی ہے ۔ پھر بھی نرسوں ، اور اس پیشے کی دیگر سہولتوں کی اشد ضرورت ہے۔ آج ہمارے سب شہروں میں نرسوں کی تربیت کے لئے اسکول موجود ہیں۔ اور حکومت نے ان میں داخلے کی لیاقتوں کے معیار بھی سخت کردئیے ہیں ۔ کراچی میں نرسنگ کے دو سالہ پوسٹ گریجوایٹ کورس کے لئے ایک کالج کھولا گیا ہے ۔

جو خواتین سائنس سے لگاؤ رکھتی ہیں ان کے لئے ڈاکٹری سب سے موزوں ہے کیونکہ اس کو ویسے بھی پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے اور آمدنی بھی معقول ہوتی ہے۔ چونکہ میڈیکل کالجوں میں جگہیں کم اور طالبات زیادہ ہوتی ہیں اس لئے داخلے کے لئے سخت مقابلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں لیڈی ڈاکٹروں کا معیار لیاقت اور سب شعبوں سے بلند ہے ۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ خواتین دوسرے سائنسی شعبوں میں داخلہ نہیں لیتیں بلکہ ان میں سے اکثر بیالوجسٹ ، کیمیکل ماہر، کیمیاداں (جو صنعتوں میں ملازم ہیں) ماہر طبیعات، انٹومالوجسٹ، اور پارچہ بافی کی ماہر بھی ہیں ۔ بلکہ بعض کو تو دوسرے ممالک میں سالہا سال کی تربیت کا شرف بھی حاصل ہے ۔

کچھ عرصے سے امور خانہ‌داری اور گھریلو معاشیات کو بھی زنانہ اسکولوں کے نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے ۔ اس سے لڑکیوں میں یہ خوشگوار احساس پیدا ہوا ہے کہ اسکول کی تعلیم گھر گرہستی کے مسئلوں میں ممد ومعاون ثابت ہوگی ۔ جن سے وہ آگے چل کر دوچار ہوں گی۔ حال ہی میں شادی کی عمر بھی کافی بڑھا دی گئی ہے جس سے لڑکیوں کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم سے دلچسپی بڑھ گئی ہے *

فلاح و بہبود کا توازن
"غلہ زیادہ پیدا کیجئے اور غیر ملکی زرمبادلہ بچائیے"
ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے غلہ فراہم کرنے کی غرض سے حکومت پاکستان ہر سال ڈیڑھ کروڑ ٹن غلہ درآمد کرتی ہے جس پر ساٹھ کروڑ روپیہ سے بھی زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ صرف ہوتا ہے۔
اس خطیر رقم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے چنانچہ ملک کے زرعی وسائل کے ذریعہ غلہ کی پیداوار بڑھانے کیلئے حکومت پاکستان نے بعض عملی قدم اٹھائے ہیں مثلاً مزید زمین کو قابل کاشت بنانا، کسانوں کو بہتر بیج اور کھاد فراہم کرنا، تحفظ نباتات کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا اور مزارعین کو جدید آلات زراعت نیز موزوں ترین طریقہ کاشت سے روشناس کرنا۔
پاکستان کی ترقی کے ساتھ ساتھ برماشیل کی کامیابی، محنت اور مہم جوئی کی تاریخ میں بھی ملک اور اہل ملک کی خدمت کے ابواب کا برابر اضافہ ہو رہا ہے۔
برماشیل ترقیٔ پاکستان کا حصہ ہے
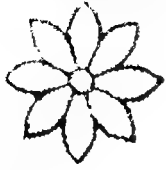
جوہری توانائی

ڈاکٹر نذیر احمد
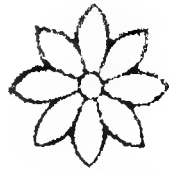
علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر جاں زنی یارے بود
(رومی)

جوہری توانائی کا صحیح، پُرامن مصرف ہمارے عہد کا ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ جس کو نوعِ انسان کی زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت پاکستان نے بارہ سائنسدانوں پر مشتمل ایک اٹامک انرجی کمیٹی مقرر کی ہے جس کا کام یہ ہوگا کہ وہ ہمارے ملک میں جوہری توانائی کے صحیح پُرامن استعمال کو فروغ دینے کے لئے تجاویز پیش کرے۔ اس کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ حکومت جلد از جلد جوہری توانائی سے متعلق ایک کمیشن مقرر کرے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۵۶ء میں غیر معمولی اختیارات کی ایک کونسل مقرر کی گئی جس کے دو حصے ہیں: ایک مجلس قائمہ اور دوسرا خود کمیشن جو چھ سائنسدانوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ تین ارکان کی ایک مشاورتی کمیٹی کی تجویز بھی کی گئی ہے۔ جس میں سائنسداں، ڈاکٹر، صنعت کار، کاشتکار، ماہرانِ تعلیم وغیرہ شامل ہوں گے۔ یہ کمیٹی بہت جلد قائم ہو جائے گی۔

کونسل کا کام یہ ہے کہ جوہری توانائی کو پُرامن مقاصد کے لئے کام میں لانے اور ترقی دینے کی تجویزیں پیش کرے۔ خصوصاً حسب ذیل اُمور کے لئے:- ۱۔ تاب کار مساووں کی تلاش، حصول اور صرف۔ ۲۔ اٹامک انرجی اور نیوکلیئر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام۔ ۳۔ ریسرچ اور پاور ری ایکٹر کا نصب کرنا۔ ۴۔ دیگر اقوام کے اٹامک انرجی سے متعلق اداروں کے ساتھ مراسلت۔ ۵۔ عملہ کا انتخاب اور تربیت۔ ۶۔ زراعت، صحت اور صنعت وغیرہ کے لئے تاب کار جواہر "آئی سوٹوپس" کا استعمال۔

اب تک ۲۰ افراد جوہری توانائی کی مختلف شاخوں میں تربیت پا چکے ہیں۔ ان میں سے ۱۰ نے ریڈیو جواہر کی تکمیل سیکھی ہے اور ۱۰ نے ری ایکٹر ٹکنالوجی میں ٹریننگ حاصل کی ہے۔ یہ سب تربیت یافتہ افراد مرکزی ادارہ، نیز جامعات اور مختلف تحقیقی اداروں کی لیبارٹریوں اور کالجوں میں کام کر رہے ہیں۔

ایسے ادارہ کے لئے خاص طور پر تربیت یافتہ عملہ درکار ہے۔ مثلاً انجینئر، سائنسدان، ریاضی اور معدنیات کے ماہرین وغیرہ جو ایک طرف تحقیق اور ٹکنالوجی میں پوری پوری دسترس رکھتے ہوں۔ اور اس کے تحقیقی نصب العین کو عملی جامہ پہنا سکیں اور دوسری طرف مشینوں کو چلانے اور اُن کی دیکھ بھال کرنے کے فرائض انجام دے سکیں۔ ایسے عملے کی تربیت کا وسیع پیمانہ پر اہتمام کیا گیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ تربیت کا مرحلہ جلد از جلد طے ہو جائے۔ چنانچہ پچھلے سال کوئی بیس افراد دوسرے ممالک میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ جوہری توانائی کے مختلف شعبوں میں تربیت حاصل کریں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ شروع ہی سے اس ضرورت کا شدت سے احساس رہا ہے کہ بنیادی اور استعمالی تحقیق کے لئے ایک ریسرچ مشین (ری ایکٹر) نصب کی جائے جس سے عملہ کی تربیت کا کام بھی لیا جا سکے اور ایسے تاب کار جواہر بھی پیدا کئے جائیں جو زراعت، صحت، صنعت اور ادویہ وغیرہ میں کام آ سکیں۔ چنانچہ کمیشن نے اب تک مختلف قسم کی ریسرچ مشینوں کے لئے کافی ٹیکنیکل معلومات مہیا کر لی ہیں۔ رہی یہ بات کہ مشین کیسی ہو اور ایک مشین ہو یا زیادہ اس کا ابھی تک قطعی طور پر فیصلہ نہیں ہوا۔ لیکن اندازہ ہے کہ کم از کم ایک مشین اعلیٰ طاقت کی ہو اور اس میں غیر برق بردار ذرّوں کے بہاؤ اور تجرباتی سہولتوں کا سامان ہو تاکہ ہم نہ صرف اپنے عملہ کو تربیت دے سکیں اور تاب کار جواہر پیدا کر سکیں بلکہ اپنے طور پر نئی تحقیقات بھی کریں اور آئندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

جوہری مادّوں کے ذریعہ سے طاقت کا حصول پاکستان کے لئے خاص دلچسپی اور اہمیت کا باعث ہے۔ کیونکہ یہاں تیل اور کوئلہ کا ذخیرہ بہت کم ہے اور ہمیں طاقت کے سلسلہ میں اپنی روز افزوں ضروریات کے لئے بیش از بیش زرِ مبادلہ کی ضرورت بھی لاحق ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بڑے بڑے فاصلوں

پر کوئلے یا تیل جیسی بھاری بھاری چیزیں سے جانا کتنا گراں اور دشوار ہے۔ اگر ہم کافی مقدار میں جوہری توانائی حاصل کر سکیں تو اس سے نہ صرف ہمارے عام ذرائع میں اضافہ ہوگا بلکہ کوئلہ، پٹرول وغیرہ پر جو زیادہ زر مبادلہ صرف ہوتا ہے اس میں بھی کفایت ہو جائے گی۔ یہی نہیں بلکہ یہ ان علاقوں کے لئے بے حد موزوں ثابت ہوگا جہاں بھاری قسم کا ایندھن پہنچانے اور گیس کی پائپ لائن بچھانے میں شدید دقتیں پیش آتی ہیں یا اخراجات حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ ان اُمور کے پیش نظر یہ تجویز کی گئی ہے کہ مناسب مقام پر مشینیں نصب کرنے سے پہلے ابتدائی مساحت کی جائے۔ جب تک یہ مساحت پوری ہو کمیشن درمیانے سائز کی مشینوں، توانائی پیدا کرنے کے اقتصادی پہلو اور دیگر امور کے متعلق ضروری ٹکنیکل معلومات اور کوائف حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ارادہ ہے کہ چار ایسے مرکز قائم کئے جائیں جہاں تاب کار جواہر کو نباتات کی نشو و نما کے مطالعہ، خوراک کو زیادہ خوش اسلوبی سے محفوظ رکھنے، کیڑوں مکوڑوں اور بیماریوں کو کم کرنے اور خورد و نوش اور نقدی کی فصلوں کو بہتر اور زیادہ بنانے کے لئے جد و جہد کی جا سکے۔ ان باتوں کا ہماری غذائی اور نقدی کی فصلوں کی پیداوار اور خاصیت پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ ان میں سے دو مرکز مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں قائم ہوں گے۔ ہر مرکز میں تین ایسے تربیت یافتہ سائنسدان کام کریں گے جو تاب کار جواہر کو زرعی مسائل کے لئے برتنے میں ماہر ہوں۔ چنانچہ مغربی و مشرقی پاکستان کے لئے تین تین سائنسدان عنقریب تربیت کے لئے روانہ کر دیئے جائیں گے۔

یہ بھی تجویز ہے کہ آٹھ ایسے مرکز قائم کئے جائیں جہاں تاب کار جواہر کے ذریعہ بیماریوں کی تشخیص اور علاج کیا جائے اور اس طرح بیماریوں کو دور کر کے قومی صحت کو بہتر بنایا جائے۔ مجوزہ چار مرکز کراچی، ملتان، لاہور اور ڈھاکہ میں قائم کئے جائیں گے جہاں اس وقت ماہر حضرات موجود ہیں۔ باقی چار مرکز جلد ہی مزید تربیت یافتہ افراد اور تاب کار جواہر کو طبی ضروریات کے لئے استعمال کرنے والا عملہ میسر آنے پر قائم کئے جائیں گے۔

ممالک متحدہ امریکہ کے اٹامک انرجی کمیشن اور محکمہ موسمیات پاکستان کے تعاون سے کوئٹہ، پشاور، کراچی اور ڈھاکہ میں آٹھوں پہر تاب کار جواہر کا جائزہ لینے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ فی الحال یہ کام صرف امریکہ ہی میں کیا جاتا ہے۔ لیکن اپنے یہاں اس تجزیہ کے لئے ضروری سامان مہیا کرنے کے لئے بھی قدم اٹھایا جا چکا ہے۔

پاکستان میں تاب کار معدنیات کی تلاش کے لئے وسیع پیمانہ پر زمینی اور فضائی دونوں طرح کی مساحت کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ علاوہ بریں جو کمپنیاں پاکستان میں تیل کی تلاش کے لئے کھدائی کر رہی ہیں ان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ تاب کار ماخذوں کا زیر زمین جائزہ لیں۔ ساتھ ہی مغربی پاکستان کے محکمہ ہائے بازیابی زمین، نہری آبپاشی، اور نہری آب رسانی سے بھی جو اس وقت زیر زمین مساحت میں مشغول ہیں، التماس کی گئی ہے کہ وہ تاب کار معدنیات کی دریافت کے امکانات پر بھی غور کریں۔ اس سلسلہ میں جو ادارہ بھی تعاون کرے کمیشن اس کو حتی الامکان ضروری سامان مہیا کرتا ہے اور جو نمونے دستیاب ہوں اُن کے معائنہ کے لئے کمیشن نے لیبارٹری قائم کی ہے۔ پاکستانی یونیورسٹیوں سے بھی درخواست کی گئی ہے کہ وہ طلباء کو تعطیلات کے زمانے میں علم طبقات الارض، جغرافیہ اور طبعیات کے اساتذہ کے زیر نگرانی منتخب علاقوں میں تاب کار معدنیات کی تلاش کے لئے بھیجیں۔ چنانچہ کراچی یونیورسٹی ایسی ایک جماعت کو روانہ کر بھی چکی ہے۔ اس مقصد کے لئے ماہرین طبقات الارض کو زمین کی اوپری اور زیریں مساحت کے لئے ٹریننگ دینے کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہوابازوں کو ضروری سامان کے ساتھ ہوائی جائزہ لینے کی تربیت دی جائے گی۔

چونکہ کمیشن کو بہت سی تاب کار معدنیات کے نمونے ملنے کی توقع ہے جن کے درجوں کا تعین ضروری ہوگا، اس لئے تجویز ہے کہ جو لیبارٹریاں اس مقصد کے لئے قائم کی گئی ہیں، اُن کی توسیع کی جائے۔ اور ان میں مختلف طریقوں سے حاصل شدہ معدنیات کا معائنہ کیا جائے۔ ایسی لیبارٹریوں کے قائم کرنے کے لئے ضروری سامان حاصل کیا جا رہا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کمیشن نے پاکستانی یونیورسٹیوں، کالجوں اور تحقیقی اداروں سے التماس کی تھی کہ وہ جوہری توانائی کی تحقیق اور استعمال کے متعلق مختلف تجاویز پیش کریں۔ چنانچہ اب تک ایسی با مطلب تجویزیں موصول ہوئی ہیں جن کا معائنہ کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے جو تجویزیں منظور ہوں گی ان کو روبہ عمل لانے کے لئے کمیشن ضروری ٹکنیکل اور مالی امداد بہم پہنچانے پر توجہ دے گا۔

ایٹمی سائنس نے جس تیزی سے ترقی کی ہے اس کے پیش نظر یہ لازم ہو گیا ہے کہ ہماری جامعات کے سائنسی نصابات کی از سر نو تشکیل کی جائے تاکہ طلبا کو جوہری طبیعات کی تعلیم دی جا سکے۔ اس بارہ میں ماہرین تعلیم اور سائنسدانوں سے بات چیت کی گئی ہے۔ اس تعلیم کا آغاز کرنے کے لئے تین سائنسدانوں کو ٹریننگ کے لئے بھیجے جانے کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ وہ یونیورسٹیوں میں تعلیم و تدریس کا انجام دے سکیں۔ جب تک پاکستانی جامعات کے سائنسی نصابات کی از سر نو تشکیل عمل میں آئے۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جو اساتذہ کالجوں میں فی الحال علوم طبعی کی تعلیم دے رہے ہیں اُن کے لئے ایٹمی سائنس میں ریفریشر کورس اور تاب کار جواہر کے استعمال پر لیکچروں کا بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ متعلقہ یونیورسٹیوں کو اپنی اپنی اسکیمیں بھیجنے کی درخواست کی گئی۔ ازاں جملہ پنجاب یونیورسٹی نے ایک کورس کا اہتمام کیا جو بیالیس دن جاری رہا اور جس میں چوبیس اساتذہ شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ علمی مجالس اور عملی مظاہروں کا بندوبست بھی کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ ایٹمی ریسرچ اور متعلقہ ٹکنالوجی کے لئے ایک جامع ادارہ قائم کرنے میں کافی عرصہ لگے گا۔ اس لئے فی الحال ایک ہنگامی لیباریٹری قائم کرنے کی صلاح ہے جس میں جوہری طبیعات کی ایسی شاخوں پر تحقیق کی جائے گی جن کے لئے زیادہ قیمتی سامان یا پیچیدہ مشینوں کی ضرورت نہیں۔ سردست صرف ایسے تجربات ہی کئے جائیں گے جو ہمارے لئے فوری دلچسپی کا باعث ہیں اور جن سے ہم اس کام میں کچھ اضافہ کر سکیں گے جو دوسرے ممالک میں ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایسی لیباریٹری کے لئے ضروری سامان، آلات اور دوسری سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

ہماری حکومت نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ جوہری توانائی کے پُر امن استعمال کے سلسلہ میں تعاون کا معاہدہ کیا ہے۔ حکومت امریکہ نے کمیشن کو ۷ ہزار پمفلٹوں، رپورٹوں، رسالوں اور مائیکر کارڈوں وغیرہ پر مشتمل ایک ٹکنیکل لائبریری مہیا کی ہے۔ اس کے علاوہ اور ذرائع سے بھی مطلوبہ لٹریچر حاصل کیا جا رہا ہے۔

معاہدۂ بغداد میں شریک ہونے پر پاکستان بغداد نیوکلیئر سنٹر کے قیام میں تعاون کر رہا ہے۔ چنانچہ دو پاکستانی اساتذہ کو ہارورڈ یونیورسٹی میں اس غرض سے تربیت دی گئی ہے کہ وہ تربیت پانے کے بعد مذکورہ سنٹر میں کام کریں۔ ان کے علاوہ پانچ پاکستانی طلبا کو مارچ ۵۶ء میں تاب کار جواہر کی ٹکنیک میں تربیت حاصل کرنے کے لئے باہر بھیجا گیا۔

جب سے ہماری اٹامک انرجی کونسل قائم ہوئی ہے۔ بیرونی ماہرین کے دو وفد پاکستان میں آئے ہیں۔ پہلا وفد امریکی کمیشن کے دو اراکین پر مشتمل تھا جنہوں نے پاکستانی کمیشن کی ترقیاتی تجاویز پر بحث کی۔ دوسرا وفد مجوزہ ایشیائی نیوکلیئر مرکز کے متعلق بات چیت کے لئے آیا اور اس نے نظم و نسق اور لائحہ عمل کے بارہ میں تفصیلی تجاویز کو بروئے کار لانے کے مسائل پر بحث کی۔ الیکٹرانک سیکشن کو مشورہ دینے کے لئے بغداد سنٹر سے ایک استاد بھی پاکستان آیا۔

پاکستان اُن بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی شریک ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً جوہری توانائی کے پُر امن استعمال کے سلسلہ میں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ اس کے نمائندوں نے "انٹرنیشنل ایٹمس فار پیس کانفرنس" (جنیوا) منعقدہ اگست ۵۵ء اور انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کانفرنس میں شرکت کی۔ پاکستان اس عالمی ایجنسی کے ابتدائی کمیشن کا ممبر منتخب ہوا۔ اس کے علاوہ پاکستانی نمائندے بغداد نیوکلیئر سنٹر کی سائنٹفک کونسل، کامن ویلتھ کانفرنس برائے ریڈی ایشن پیتھولوجی اور انسٹی ٹیوٹ آف فزکس (لندن) کی ری ایکٹر کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔

کیمپ کے شب و روز: ———— بقیہ صفحہ ۱۰۴

۳ جولائی:

ڈنر کے بعد بہت دیر تک لان میں بیٹھا جنوب مشرقی پہاڑیوں میں چاند کو ڈوبتے اُبھرتے دیکھتا رہا۔ عجیب رومان انگیز منظر تھا۔ جی میں آیا ابھی اپنے رومان نگار دوست ابوالفضل صدیقی کو کراچی سے تار دے کر بلوا بھیجوں مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ میں یہاں کنول کے پھول، انگور کی بیلیں، اناس کے شگوفے اور زعفران کے کھیت کہاں سے لاؤں گا اور لمبے سنہرے سوز والی اور زرد نارنجی آنکھوں والی بلی کہاں سے پیدا کروں گا جن کے بغیر ان کی کہانی آگے ہی نہیں چلتی؟

جوہری توانائی
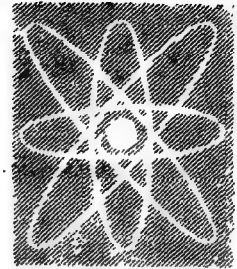
کمیشن جوہری توانائی (پاکستان) کا معمل جس میں تابکار مادوں کی درجہ‌بندی کی جاتی ہے

جدید آلات کی مدد سے اہم تجربات کے نتائج ریکارڈ کئے جارہے ہیں

مینامتی
(مشرقی پاکستان)

مٹی کی ھنڈیا مع ڈھکن
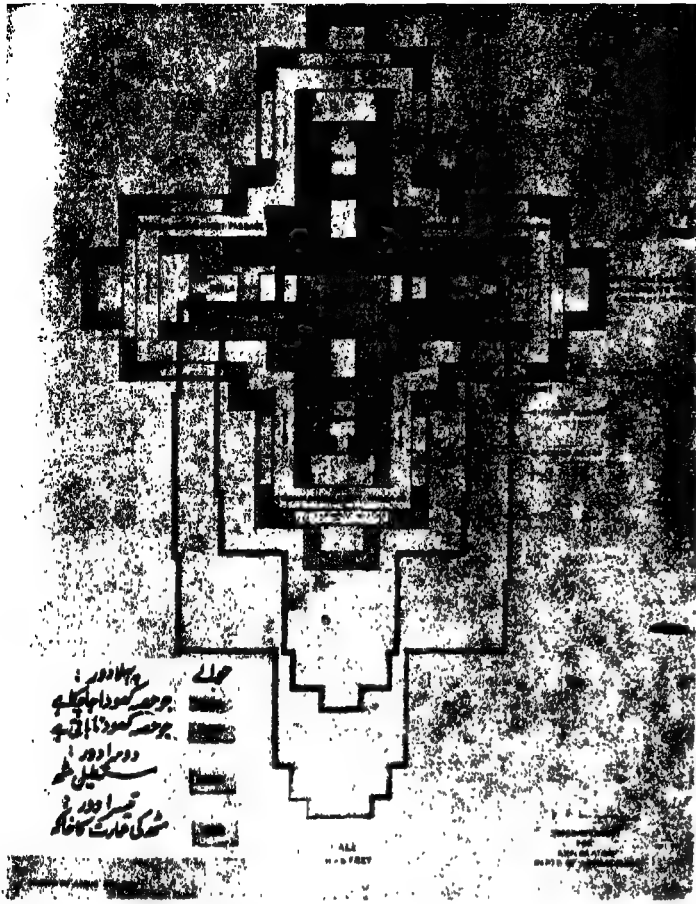
مینامتی کے آثار کی جگہ اور کھدائیوں کا نقشہ

پنڈول کی مہر

طلائی بالیاں اور سونے چاندی کے سکے

خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ
کے عہد کے دینار

مینامتی

جب سے پاکستان قائم ہوا ہے، اس کے ماضی کو اُجالنے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ کوششیں کافی کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے سندھ، بلوچستان اور سرحد کے کئی مقامات پر ماضی کا کھوج لگایا ہے جس سے کتنی ہی نئی باتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان میں دریائے میگھنا کے اُس پار، ڈھاکہ اور تپرا کے ضلعوں میں، کومیلا کے پاس مینامتی کا پہاڑی سلسلہ اپنے نام ہی سے دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اب جو صدیوں کی گہرکا پردہ اُٹھ جانے سے اس پر روشنی پڑی ہے تو اس کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے۔

اس علاقہ کا پرانا نام سماتٹ تھا۔ اس کا پتہ کانسی کی لوحوں سے چلا ہے جو اشرف پور سے دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں خدگا خاندان کے تین راجوں کا ذکر ہے جو بدھ مت کے پیرو تھے اور ۷ ویں صدی عیسوی کے وسط سے لیکر ۸ ویں صدی کے اوائل تک حکمراں رہے۔ ان کی راجدھانی میں جیاکرمانت وساک تھی جس کے ارد گرد کا علاقہ بودھیوں کا ایک زبردست مرکز تھا۔ کیونکہ اس کے مختلف مقامات سے مہاتما بدھ اور بودھی دیویوں کے بے شمار بت دستیاب ہوئے ہیں۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے اسی علاقہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ "سمندر کے کنارے ایک نشیبی مرطوب علاقہ ہے"۔ معلوم ہوتا ہے خدگا خاندان کے بعد راج پاٹ دیو خاندان کے ہاتھ آگیا۔

مینامتی میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے پنڈت دیا کے کئی مجسمے ہاتھ آئے ہیں۔ یہ بہت دلچسپ ہیں۔ ان سے نہ صرف اس زمانے کے رہن سہن پر روشنی پڑتی ہے بلکہ تاریخ اور مذہب کا حال بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کاریگروں نے معمولی مٹی ہی سے ایسا کمال دکھایا ہے کہ ہم اس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور پھر جن باتوں کو موضوعِ فن بنایا ہے ان میں کتنا تنوع ہے۔ ان میں قریب قریب وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن سے کسی دیہاتی کی ذہنی دنیا آباد ہوتی ہے۔ گرہستی، رقاص اور سپاہی اپنے اپنے رنگ ڈھنگ، دم خم اور آن بان کے ساتھ جوں کے توں موجود ہیں۔ چرند پرند اور درندے بڑی اُستادی سے بنائے گئے ہیں۔ کنول کا پھول کاریگروں کو بہت ہی پسند ہے۔ ان سب باتوں کو دیکھکر احساس ہوتا ہے کہ یہ آج کل کے بنگال سے کس قدر مشابہ ہیں۔ آب و ہوا، مناظر، چرند پرند، پھل پھول۔ کسی بات میں بھی کوئی فرق نہیں۔ یہاں تک کہ تہذیب و تمدن بھی قریب قریب وہی ہے۔ خاص طور پر عوامی فنون اور دستکاریاں۔ تعجب یہ ہے کہ ظروف سازی کا انداز اور آرائش بھی بالکل ویسی ہی ہے۔ مذہب میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جنوب مشرقی بنگال قدیم زمانہ میں بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس لئے ہم اس کی ابتدائی تاریخ اور آثار کے متعلق بہت کم جانتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس کے متعلق کچھ بھی علم نہ تھا۔ اس کے حالات دوسرے علاقوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ یہ تحقیق و تفتیش کی ذرا بھی اجازت نہیں دیتے مثلاً بڑے بڑے گھنے جنگل اور دریاؤں کے رُخ میں بار بار تبدیلی جو بالعموم زمین کا حلیہ ہی بدل دیتی ہے۔ اس وجہ سے موجودہ کھدائی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس سے مشرقی پاکستان کی ابتدائی تاریخ کا کھوج لگانے میں بڑی مدد ملے گی۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو کھدائی جنوری ۵۵ء میں سالبان وِہار کے مقام پر ہوئی تھی، وہ اپنی قسم کی پہلی کھدائی تھی۔ اس کے بعد ۵۶ء اور ۵۷ء میں مزید کھدائیاں ہوئیں جن سے سلسلہ اور آگے بڑھا۔ سالبان وِہار کے مرکزی شہر سے تاریخ کے چار دوروں کا پتہ چلا ہے۔ پہلے دور کا تو ایک بہت بھاری عمارت ہے جسے دیو خاندان کے ایک راجہ نے بنایا تھا۔ یہ ایک بودھی خاندان تھا جس کے اثر سے ارد گرد کے علاقے میں بدھ مت کو فروغ ہوا۔ مرکزی شہر صلیبی شکل کا ہے اور شکستہ ہونے کے باوجود فن تعمیر کا نہایت عمدہ نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بودھی عمارت نے یہ انوکھی شکل کیسے اختیار کی؟ چونکہ گرد و پیش کے علاقے میں ایسی کئی عمارتیں ہیں اس لئے یہ وضع معماروں کی اپنی ہی اپج کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ جو ملے جلے ہندو اور بودھی طرزوں کی نشو و نما کا نتیجہ ہے۔ یہ برِصغیر کے روایتی نمونوں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ البتہ اس سے ملتی جلتی عمارتیں وسطی جاوا اور برما میں پائی جاتی ہیں جو بعد کی تعمیرات ہیں۔ اس سے

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طرز تعمیر بدھ مت کے ساتھ بنگال سے نکل کر برما اور جنوب مشرقی ایشیا میں پھیل گیا ہوگا۔

دوسرے دور میں صلیبی شکل مستطیل وضع میں بدل گئی اور تیسرے میں عمارت کی جسامت کم کردی گئی۔ چوتھے یعنی آخری دور میں اس قدر کم آثار رہ گئے ہیں کہ ان سے کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے۔

سالبان وہار کا بے نظیر مٹھ جنوب مشرقی بنگال کی مذہبی تعمیرات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

کوتلی مورا اسی سلسلہ کی ایک نمایاں پہاڑی ہے۔ جو سالبان مٹھ سے تین میل دور ہے۔ یہاں کے تین بڑے مٹھ جو چٹان میں کاٹ کاٹ کر بنائے گئے ہیں، بدھ مت کے "تین رتنوں" ــــ بدھ، دھرم اور سنگھ کے آئینہ دار ہیں۔ یہ اس برصغیر میں غیر معمولی عمارات کا ایک بے نظیر مجموعہ ہیں۔ ان کی داغ بیل دوسرے مٹھ سے مختلف ہے۔ کوتل مورا سے ڈیڑھ میل دور چارپتر مورا واقع ہے۔ یہاں کی کھدائی سے بھی ایک مٹھ کے آثار دستیاب ہوئے ہیں۔

مینامتی سے متعدد نوادر بھی ہاتھ آئے ہیں۔ جن میں پیتل کی لوحیں، سونے چاندی کے سکے، زیورات، ڈبیاں، مورتیاں، ٹوپ، منقش اینٹیں، ظروف اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں شامل ہیں۔ سالبان وہار سے پیتل کی جو دو لوحیں ملی ہیں۔ ان سے بڑی اہم تاریخی معلومات دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک لوح پر دیو خاندان کا شجرۂ نسب درج ہے جس کی تاریخ ابھی تک معلوم نہ تھی۔ اس کے سب راجاؤں کے نام کے ساتھ شاہانہ القاب مہاراج اور ادھیراج بھی تحریر ہے۔ چارپتر مورا میں بھی جو چار لوحیں ملی ہیں۔ ان میں بنگال کے چاندر خاندان (۹۰۰ء – ۱۱۰۰) کا ذکر ہے۔ سالبان وہار کی ابتدائی تہوں سے سکوں کے تین ذخیرے ملے ہیں۔ ان میں سے کچھ سکوں کی پشت پر "تین رتنوں" سورج اور چاند کی علامات ہیں۔ یہ قدیم بنگال کے سب سے پہلے سکے ہیں جو تاحال دستیاب ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی اہمیت خاص ہے۔ ان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کو بنگال کے خود مختار، غالباً دیو خاندان کے راجاؤں نے رائج کیا تھا اور یہ اراکان سے داخل نہیں کئے گئے تھے جیسا کہ اب تک عام طور پر خیال کیا جاتا تھا۔

دو دلچسپ سکے، ایک سونے کا اور ایک چاندی کا، اور ہیں جن پر کوفی عبارت تحریر ہے۔ یہ عباسی عہد کے سکے ہیں۔ جس سے قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک بنگال اور دنیائے اسلام میں تجارتی تعلقات قائم تھے۔

بدھ، بجستو اور دو دیویں۔ تارا اور سروانی کی کوئی بارہ کانسی کی بنی ہوئی چھوٹی مورتیں غیر معمولی نوعیت کی ہیں۔ ان میں بڑی نفیس اور چھی تلی کاریگری سے کام لیا گیا ہے۔ ان کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا ہے گویا یہ پتھر کے کام کی نقل ہیں۔ نیز ان سے ۸۰۰ ویں صدی میں بدھ مت کے مہایان سے تانترک شکل میں بدل جانے کا پتہ چلتا ہے۔ مہاتما بدھ کی مورتوں سے بڑا اجلا پن اور چہرے سے دیو مالائی کی وضع جھلکتی ہے۔ بجستو پدم پتی کی جواہر سے مرصع مورتی بہت ہی نفیس ہے۔ اس میں بجستو کنول کے سنگھاسن پر براجمان ہے۔ تارا اور سروانی کی دو کانسی کی مورتیاں ایسی ہی اعلیٰ کاریگری کی آئینہ دار ہیں۔

کوتل مورا سے بھورے رنگ کے نرم پتھر سے تراشی ہوئی مورتوں کے ٹکڑے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ان تمام چیزوں سے زیادہ دلچسپ اور اہم ہیں جو اب تک بنگال میں بہم پہنچی ہیں۔ کیونکہ ان کا انداز برصغیر کے اور تمام طرزوں سے مختلف ہے۔

سالبان وہار سے پنڈول کی ایک بڑی اہم مہر ملی ہے۔ ان تمام مقامات سے ظروف سازی کے بھی بے شمار نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان تمام ذرائع سے جو شہادت بہم پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ دیو خاندان شمالی بنگال کے پال خاندان کا ہمعصر تھا اور یہ دونوں گپتا سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے بعد برسر اقتدار آئے تھے۔

چین سے دو خط
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ چین
۲۵ اگست ۱۹۴۲ء
دل روز کی شیشی کا شکریہ
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ چین
۲۲ جولائی ۱۹۴۲ء
ل۔ ا۔ ر۔ غ
مینجر
ل۔ ا۔ ر۔ غ مینجر
دل روز تمام الاعلاج جلدی امراض
ہر قسم کے پھوڑے پھنسی لاہوری پھنسے
کے کاٹے اور ڈسے کا بیضرر اور تیر بہدف علاج ہے۔
چیر پھاڑ اور مرہم پٹی سے نجات دلاتی ہے
قیمت فی شیشی
دو روپیہ ــ ایک روپیہ
سنہ ۱۹۰۱ء سے استعمال ہو رہی ہے
ہر شہر و دوا فروش سے طلب کریں
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دواخانہ فیروز پور روڈ لاہور پنجاب

افسانۂ دوش

لطف اللہ بدوی

یہ کس کی ہیں عظمت کے آثار ویراں، کھلیں جس سے تہذیب کی شاہراہیں
مکینوں سے خالی یہ اینٹوں کے گھر ہیں، ہوئیں جن سے عالم کی روشن نگاہیں
مقامِ ادب ہے یہ مُردوں کی وادی، دیئے علم و فن کے یہیں جگمگائے
یہی او لیں خاک ہے پاک جس نے، تمدن کے نکتے جہاں کو بتائے
یہ آثارِ رفتہ یہ کھنڈروں کی بستی، کبھی عقل و دانش کا روشن گگن تھی
ستیزِ جہاں میں یہ افتادہ ہستی، تمدن کی دنیا میں سالارِ فن تھی
زمانے نے دیکھے تھے اس دیس کے کارواں مصر و بابل کے ہمدوش چلتے
ترقی کے منظر دکھاتے جہاں کو، ستاروں سے گذرے یہ خاموش چلتے
معین جو دڑو کے کھنڈر کیا ہیں اے دل، ہیں تاریخِ عالم کے اوراق زریں
سناتے ہیں انسان کی سعیٔ پیہم، مسلسل ارادوں کے افسانے رنگیں

★

حوادث کے طوفاں نے تجھکو مٹایا، بھلا دی زمانے نے تیری کہانی
بنا کر مٹانا، مٹا کر بنانا، یہ ہے رِیت عالم کی صدیوں پرانی
زمانے نے تجھ کو مٹایا ہے ایسا کہ تیرے ابھرنے کا امکاں نہیں ہے
نصیبوں میں تیرے مکینوں کے بسنے کا اب کوئی بھی ساز و ساماں نہیں ہے
ہزاروں برس سے تری اجڑی دنیا پڑی دیکھتی ہے ہزاروں مناظر
خدارا بتا دے یہ خاموش بستی، مہذب ہے کتنی یہ تہذیب حاضر

★

صدا آئی کھنڈروں سے یہ اے مسافر! یہ تہذیب حاضر ہے محبوب مہوش
ہلاکت سے لبریز ہے اس کا باطن، بہ ظاہر نہایت حسین اور دلکش
یہ رازِ نہاں کیا بتا کر تجھے میں پریشاں کروں؟ یہ تمنا نہیں ہے
صداقت سے خالی ہے تہذیب تیری، تو جوہر کے گُن سے شناسا نہیں ہے

پیکرانِ بے سخن

ابوالجلال ندوی

از مہر ہا پیکرانِ بے سخن آوردہ اید پیکران بے سخن را نغمہ زن می آوردم
در بت لے قیس آرزو آدم لیلائے دگر در حریم عہد نو عہد کہن می آوردم

وادی سندھ اور اس کی تہذیب اپنی قدامت کی وجہ سے ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہے گی۔ جو ملک مصر اور سومیریا کے لگ بھگ ماقبل تاریخ کے دھندلکوں سے ابھرے اور پھر ایسی جگہ واقع ہو کہ اس کے گرد و پیش کے ممالک۔ عرب، ایران۔ مصر و روم وغیرہ سے خود بخود پیدا ہو جائیں، اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ دوسرے موئن جو ڈرو اور ہڑپا میں جو ایک پراچین تہذیب کے آثار دستیاب ہوتے ہیں انہ نے اس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ یہ مٹی ہوئی تہذیب کیا تھی، کن لوگوں میں پروان چڑھی، اس کی نسل، زبان، رسم الخط کیا تھا اور وہ عجیب غریب مہریں کیسی ہیں جو صرف یہیں نہیں، آس پاس کے ملکوں میں بھی دستیاب ہوئی ہیں؟ ان سے تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ یہ سب باتیں ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ اور پاکستانیوں کو تو مفصل دعوت تحقیق ہیں کیونکہ یہ اُن کی تاریخی میراث کا نہایت بیش بہا جزو ہیں خصوصاً وہ مہریں جن پر کچھ نقوش اور کچھ عبارت مرتسم ہے۔ ممکن ہے جو سوالات اوپر پیش کئے گئے ہیں، ان کی کلیدان مہروں میں ہی مضمر ہو۔ بنابریں ان کے رازِ نہاں کی تحقیق کتنی ہی خشک سہی پھر بھی کسی نہ کسی طرح ان "پیکرانِ بے سخن" کو "نغمہ زن" کرنا ہی پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ قدیم سندھی مہروں کی عبارت یا آریائی (ویدک، سنسکرت) ہو سکتی ہے یا غیر آریائی (سامی، ڈراویڈی) یا کوئی اور۔ بعض لوگ اس کا راز ویدک، سنسکرت، منڈا یا کسی اور آریائی خط میں تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ماہ نو کے ایک مراسلہ نگار عین الحق صاحب نے دسمبر ۵۹ء ہی پر زور دیا ہے۔ ہندو علماء نے اپنے مفید مطلب وجوہ کی بنا پر اس کو سنسکرت یا ڈراویڈی قرار دیا ہے۔ اس کے خلاف سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ موئن جو ڈرو کے باشندے بظاہر غیر آریائی تھے۔ دوسرے اگر ابجدی نوشتے اور تحریر کو تصویر سے ہم رشتہ باور کیا جاتے تو یہ خط نہ سنسکرت ہو سکتا ہے نہ ڈراویڈی۔ اس سیدھے سادے نتیجہ سے گریز کے سبب انہوں نے یہ قطعی فیصلہ صادر کر دیا کہ (۱) نوشتے قطعی غیر ابجدی ہیں کیونکہ حروف و نقوش کی تعداد ۴۰۰ ہے۔ (۲) ممکن نہیں کہ مہروں پر جن چیزوں کی تصویریں ہیں تحریریں بھی انہی کی بابت ہوں۔

یہ فیصلہ ان لوگوں کا ہے جو ایک مہر کو بھی ان زبانوں میں پڑھ نہیں سکے۔ اور پھر وہ کسی اور قرأت پر غور کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے! اس لئے کہ سامی ذرائع سے یہ عقدہ فوراً حل ہو جاتا ہے۔ "ویدک ایج" کے مولفوں نے مارشل نمبر ۲۰ کو لیا ہے جس پر [illegible] [illegible] [illegible] مکتوب اسی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان مہروں کو معمہ کیوں بنا دیا گیا ہے۔

(۱) [illegible] اور [illegible] متبادل نقوش ہیں، [illegible] رومن واؤ ہے۔

(۲) [illegible] اور اس کے مماثل نقوش کو سامی ح بتا کر مارشل نے گھ پڑھنے کی رائے دی ہے۔

(۳) [illegible] کی بابت ایک ہندوستانی کا پہلا خیال یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ط کی ایک شکل ہے۔

(۴) [illegible] مچھلی کی شکل ہے۔ عربی نام نون ہے، ن کو ص کا نصف ہونے کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔

(۵) [illegible] اور حرف واؤ کی سینائی شکل ہے جو عربی میں ضمہ کا کام دیتی ہے۔ ایک ہندوستانی عالم کا جو حروف و نقوش اور کسی عربی سے بھی واقف ہو پہلا مفروضہ یہ ہو سکتا ہے کہ تصویر پر نطحو بمعنی ناطح (سینگ والا) مکتوب ہے۔ اس ممکن مفروضہ کا [illegible]

کے لئے یہ نظریہ وضع کیا گیا کہ (۱) نوشتہ ابجدی نہیں ہو سکتا۔ (۲) تحریر کا تصویر سے رابطہ نہیں ہو سکتا۔ مارشل نمبر ۱۲۸ پر ? اور ? مکتوب ہے۔

(۶) ? کو ہم ? ? کی صورت میں جدا جدا کر سکتے ہیں۔ ? کو آپ جانتے ہیں سبائی ح ہے۔

(۷) ? ہو بہو سبائی د ہے۔

سندھی مہروں کا یہ حال ہے کہ ایک مہر پر ایک لفظ ملتا ہے، دوسری پر اور، اور تیسری پر ایک اور۔ بات جا کر تیسری مہر میں پوری ہوتی ہے۔ مارشل نمبر ۱۲۸ اور نمبر ۴ کو ملا کر پڑھئے: وَحَدّ نطحو۔ ایک سینگ والا۔ تینیکے نمبر ۶۵۶ پر ? ? ? مکتوب ہے۔

(۸) ? اور ? متبادل نقوش ہیں، ? فنیقی ھ ہے جس سے رومن E ماخوذ ہے۔ عبرانی وغیرہ میں ھائے ھوز انگریزی the اور عربی میں اَل کے مترادف ہے۔

(۹) ? اور ? متبادل نقوش ہیں ? سبائی ق ہے۔

میکے ۶۵۶ کو ھفد پڑھا جا سکتا ہے فداد عربی میں کسان اور ھل جوتنے والے بیلوں کی جوڑی کو کہتے ہیں۔ اب میکے ۶۵۶ اور مارشل ۱۲۸ و نمبر ۴ کو ملا لیجئے ھفد وحد نطحو کے معنی ہوئے ایک سینگ والا بیل۔

ظاہر ہے کہ جو محقق سندھی مہروں کو اس طرح پڑھنے کی کوشش کرے، اسے سنسکرت رسم خط کو تلاش کرنے کا مشورہ کہاں تک بجا ہے۔ بالعموم یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ سنسکرت کا اپنا کوئی خصوصی رسم خط بھی ہے۔ ہندوستان میں کوئی پستک، کوئی نوشتہ، کوئی رسم خط اب تک ایسا نہیں ملا جو اشوک کی رسم خط سے زیادہ قدیم ہو۔ ویدوں کا کوئی ایسا نسخہ معلوم نہیں جس کا زمانہ تحریر اسلام سے آگے بتایا گیا ہو۔ علما سنسکرت نے تسلیم کیا ہے کہ وید کسی ایک رسم خط میں نہیں ملے ہیں۔ مختلف خطوں میں ملے ہیں اور ہر خط براہمی سے ماخوذ ہے۔ اس لئے براہمی کے ہوتے ہوئے اس سے مستخرج نقوش کی مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ اگر وید یا کسی سنسکرت کی پستک کا سراغ دیا جا سکے جس کا سال کتابت ۵۱۲ء سے زیادہ قدیم ہو تو مذکورہ بالا مشورہ کچھ معنی رکھتا ہے۔ ورنہ مناسب یہی ہے کہ ویدک (جو سنسکرت کی قدیم ترین صورت ہے) اور سنسکرت کی بجائے دوسرے خطوط کی طرف رجوع کیا جائے۔

بعض کا خیال ہے کہ براہمی، سندھی سے ماخوذ ہے۔ میں اس کا قائل نہیں لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ محض خیال باز نہیں۔ سندھی مہروں پر براہمی جیسے نقوش ہیں۔ دیکھئے ایک سندھی نوشتہ جس کے سارے نقوش براہمی ہیں: ENX۔ اسے یوں ENX لکھ لیجئے براہمی نوشتہ ہو جاتا ہے۔ دائیں سے پڑھئے مذح، بائیں سے پڑھئے جذم۔ عربی میں پڑھئے لا لذیا اللذ عربی میں لینہ انسانی خورش ہے۔ براہمی خط سندھی مہروں کو حل کرنے میں مدد دے سکتا تو اب تک کتنی مہریں پڑھی گئی ہوتیں۔ غرض سندھی اور براہمی کا ناتا اب مسلمات میں داخل ہے۔

لیکن ان پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے۔ براہمی نوشتہ کی قدامت تیسری صدی قبل مسیح تک ثابت ہے۔ براہمی سے قدیم سبائی ہے۔ اس کے نقوش بھی سندھی مہروں پر ہیں۔ ۳۲۰ ق م تک عربی ثانی اور رحانانی نام کے لوگ جدروشیا (بلوچستان) میں موجود تھے۔ اس کی خبر معاصر یونانیوں نے دی ہے۔ ۲۵ ق۔م میں یمن پر ایک السیروس (الشرح) حکومت کرتا تھا اور رحانانی قبیلہ کا تھا۔ اس کی خبر ایسے رومیوں نے دی ہے جو یمن پر ۲۵۔ ق م میں حملہ آور۔ ایلیس گالوس کی فوج میں شریک تھے اس لئے سندھی مہروں کو براہمی کی بجائے رحانانی خط میں کیوں نہ پڑھا جائے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ (ا) ممکن نہیں کہ نوشتے ابجدی ہوں (ب) ممکن نہیں کہ تحریر کا تعلق تصویر سے ہو نیز سندھ کلچر رگ ویدی کلچر کا منطقی نتیجہ اور صلبی نسل ہے۔ زنہار اس کے نقوش کو عربوں کا نام لے کر زیاں نہ پہنچاؤ۔ پڑھو تو ڈراویڈی یا سنسکرت میں، ورنہ پڑھو ہی نہیں!

بعض کی رائے ہے کہ براہمی ایک ویدک خط سے مستخرج ہے جو سندھی سے مستخرج ہے۔ یہ درمیانی خط جب تک مل نہیں جاتا، اس وقت تک یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

رہا منڈا رسم خط جس کی بعض نے سفارش کی ہے، تو میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ رسم خط جو بھی ہو پہلے زبان کا انداز لیا جاتا ہے، پھر نقوش کی اس زبان کے مطابق آواز تجویز کی جاتی ہے۔ ح اور Z اور S مشابہ حروف ہیں۔ اس سے سا ماخوذ ہے جو براہمی سین ہے۔ پرنسپ، جس نے براہمی کو حل کیا ہے، کا بیان ہے کہ چند سکوں کو دیکھ کر اسے یہ خیال آیا کہ یہ لفظ سو کا مرادف ہے جس کے لئے سنسکرت SYa اور پالی a کی ہے۔ پھر چند نوشتوں کو دیکھا کہ ط پر ختم ہوتے ہیں۔ خیال پیدا ہوا کہ یہ لفظ دانم ہے۔ ط کو دا پڑھنے کی وجہ اس کے ناگری حرف بیل سے ظاہر ہے اور یہ سبائی ط کی بدلی صورت ہے۔ حرف ط کو انہوں نے قیاس سے پڑھا۔ دو برس پہلے وہ مغربی ایشیاء (فلسطین، شام، سینا، مدین، دیار ثمود اور یمن) کی ابجدوں سے واقف ہو چکے تھے جن کی مدد سے پالی زبان کی ایک حرفی ابجد بنائی۔ اسے لیکر دہلی پہنچے اور اشوک کی نوشتہ جو دہلی کے ستون پر ہے اور جسے فیروز تغلق نے پڑھوانا چاہا تھا اور کوئی نہ پڑھ سکا، اس حرفی ابجد سے پڑھ لیا۔ اور دوسروں نے ان کی قرأت کو دوسرے نوشتوں پر آزمایا اور مفروضہ، واقعہ ثابت ہوا۔ میں بھی منڈا خط سے اسی طرح مدد لے سکتا ہوں مگر یہاں تو پرنسپ کے طریق کار کو ابتدا ہی سے شرفِ قبول حاصل نہیں!

اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ سامی ذرائع سے سندھی مہریں پڑھنے میں کوئی مدد ملتی ہے یا نہیں اور کس حد تک؟ سندھی مہروں پر حسبِ ذیل قسم کے نوشتے بھی ملتے ہیں۔ ان کو عربی یا عربی جیسی زبان کے علاوہ کسی زبان میں بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔

[illegible]

یہ متعدد مہروں کے الفاظ ہیں جن کو ہم نے ایک عبارت کی شکل میں ترتیب دے کر لکھا ہے۔ کیونکہ اگر یہ الفاظ ہم کو جنوبی عرب کی تحریر میں مل سکتے ہیں تو جدا جدا مہروں کی بجائے ایک مربوط عبارت کی شکل میں ملیں گے۔ ان میں ہر لفظ ایک بیل کی تصویر پر مکتوب ہے جس کے سامنے ایک ظرف ہے۔ عرب میں یہ تحریر ملے گی تو بے تصویر ملے گی۔ پھر بھی عربی اور اس کے قدیم خط کا ماہر جاننے والا اس تحریر کو دیکھتے ہی بے تامل پڑھ کر اس کا ترجمہ کرے گا: "ایک سینگ والے بیل نے چاٹنی کھالی۔ ناند کے اندر چارہ کا ریزہ تک نہیں ہے۔" اس نوشتے کو خواہ اس کے الفاظ الگ الگ مہروں پر یا یکجا لکھے ملیں، اسی زبان میں پڑھا جا سکتا ہے جو مہر نویسوں کی تھی۔ اس بارہ میں قبل ازیں ایک طویل سلسلۂ مضامین مطبوعہ "ماہِ نو" (اگست تا دسمبر ۱۹۵۶ء) میں تفصیلاً بحث کی جا چکی ہے۔ اتفاق سے اس شہادت کا دامن اہلِ عرب، ان کی تاریخی قدامت، زبان کے تدریجی ارتقاء اور عربی زبان کی مختلف حالتوں سے وابستہ ہے۔ جن کا مجموعی تصور فی زمانہ بہت ہی محدود ہے۔ لہٰذا ہمیں اہلِ عرب ہی نہیں بلکہ عبرانیوں اور فنیقیوں کی تاریخ اور حسب و نسب پر نظر ڈالنی ہو گی جو ان کے آبا و اجداد تھے۔ اسی سے عربی رسم تحریر اور اس کی قدامت پر بھی روشنی پڑے گی۔ اگر اس طرح ایسی شہادت بہم پہنچ جائے جو سندھ اور عرب قدیم میں نسلی، لسانی اور دیگر روابط پیدا کر دے، تو ہمارے لئے سندھی خط اور مہروں کی تشریح بہت آسان ہو جائے گی۔ یہ ایک الگ بحث ہے جس پر میں پھر کبھی اظہار خیال کروں گا۔

تجدیدِ موسیقی

شاہد احمد دہلوی

پاکستان نے دس سال میں بہت بڑے بڑے کام کئے ہیں، مگر فنونِ لطیفہ کی طرف سے پوری طرح توجہ کرنے کا ہمیں اب تک موقع نہیں ملا لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اپنے فنون کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتی۔

برِعظیم کی موسیقی کے دو مختلف انداز آج تک نشوونما پا رہے ہیں، ایک جنوبی اور ایک شمالی۔ عرب تاجروں کا تعلق جنوبی برِعظیم سے ہزاروں سال رہا۔ یہ تاجر اس علاقہ میں رس بس بھی گئے۔ ان کے ساتھ جو عربی موسیقی آئی اس کے زیرِ اثر یہاں ایک نئی موسیقی نے جنم لیا۔ اس موسیقی کا لب و لہجہ آج بھی عربی موسیقی کی نشان دہی کرتا ہے۔ شمال کی طرف سے جو مسلمان فاتح آئے، وہ اپنے ساتھ ایک ترقی یافتہ تہذیب بھی لائے۔ اور جب انہوں نے شمالی علاقہ میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں، تو یہاں بھی دو تہذیبوں کے اتصال سے ایک نئی تہذیب پیدا ہو گئی۔ علوم و فنون میں تبدیلیاں اور ترقیاں ہوتی رہیں۔ مسلمان حکمرانوں کے درباروں میں جگہ جگہ کے اہلِ کمال کھنچے چلے آتے تھے.....

عربی، ایرانی، تورانی، ترکی اور افغانستانی موسیقی جب مقامی موسیقی پر اثر انداز ہوئی، تو ایک نئی موسیقی رونما ہوئی۔ جو اپنی دلکشی کی وجہ سے عوام میں مقبول ہونے لگی۔ اور سرکاروں درباروں میں پہنچ کر تکمیل کے مدارج طے کرنے لگی۔ یہی موسیقی جو مسلمان فنکاروں کی کوششوں سے اور مسلمان فرمانرواؤں کی سرپرستی میں پروان چڑھی، ہماری موسیقی کی اساس ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس برِعظیم کی موسیقی جھند، پربندھ گیت، دوہا، اشلوک، دھوروا اور پد سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ یہ تمام طریقے پرستش کے تھے۔ انہوں نے کوئی فنی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ روایت یہ ہے کہ دھوروا اور پد کو ملا کر دھرپد وضع کیا گیا تھا جس نے جلسوں میں جگہ پائی تھی۔ اس دھرپد کی اصل شکل کا سراغ بھی آج تک نہ چل سکا۔ چار پانچ سو سال سے پرانا دھرپد نایاب ہے۔ حالانکہ ساڑھے چھ سو سال پرانی امیر خسرو کی اختراعات۔ قول، قلبانہ، نقش، گل، ہوا، بسیط، سوہلہ، ترانہ، تروٹ، منڈھا۔ اب بھی گانے والوں کو یاد ہیں۔ دھرپد کو فروغ بھی میاں تان سین، لعل خاں، درنگ خاں، بلاس خاں اور بیسیوں مسلمان فنکاروں ہی نے دیا۔ اور آج بھی سینی گھرانا دھرپد کا راز داں اور امانت دار ہے۔!

پانچ سو سال ہوئے سلطان حسین شرقی، والئی جونپور نے دھرپد کے مقابلے میں خیال وضع کیا۔ خیال کی رعنائی کے آگے دھرپد اپنا وقار قائم نہ رکھ سکا۔ اور محمد شاہ بادشاہِ دہلی کے درباری گائکوں شاہ سدا رنگ اور شاہ ادا رنگ نے اپنی نئی نئی ترکیبوں سے خیال کو چار چاند لگا دیئے۔ شاہانِ اودھ کے درباروں میں ٹھمری، اور دادرے نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی۔ ٹپے نے بھی میاں شوری کی بدولت دربار اودھ ہی میں کلاسیکی مرتبہ حاصل کیا۔ غزل سرائی کا انداز تو خالصتاً مسلمانوں ہی کا ایجاد کردہ ہے۔ اسی کا ایک پہلو قوالی ہے جسے ہمارے اکثر صوفیائے کرام نے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کا ذریعہ بنایا۔ گیت یوں تو زمانۂ قدیم ہی سے گائے جا رہے ہیں اور ہر موقع و محل کے گیت گائے جاتے ہیں لیکن انہیں فنی شکل دینے میں بھی مسلمان فنکار ہی پیش پیش رہے۔ اسٹیج، فلم اور گذشتہ ربع صدی میں ریڈیو نے گیت کو سب سے محبوب صنفِ موسیقی بنا دیا۔

گانے کے یہ سب طریقے ہماری موسیقی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اور آج ہم انہی کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ ہم نے گذشتہ چند سال میں ان میں کس کس طرح تبدیلیاں کیں اور انہیں آگے بڑھانے کے لئے ہم نے کیا کیا۔

کلاسیکی طریقوں میں ہم کچھ زیادہ تبدیلی نہیں کر سکے۔ دراصل کلاسیکی چیزوں میں تبدیلی ہو بھی نہیں سکتی۔ ہمارا جذبۂ قدامت پرستی اول تو

...کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے اگر کلاسیکی چیزوں میں ردوبدل کیا جائے تو وہ کلاسیکی رہیں گی بھی کہاں؟ ہماری کلاسیکی موسیقی میں ظاہر ہے کہ راگ ...ترمیم ممکن نہیں۔ دھرپد، خیال، ٹھمری گانے کا جو ڈھنگ ہے اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ان کی بندش، پیش کش اور بولوں میں ...تغیر کیا جا سکتا ہے۔ انہی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے ہم نے خیال کی گائیکی میں چند تجربات کئے ہیں۔ مثلاً قطعہ یا رباعی کو خیال کے روپ میں ...نا۔ اس تبدیلی کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوتی ہے، کہ صدیوں پرانے بول اکثر غلط، مسخ اور بے معنی ہو چکے ہیں۔ مثلاً بلاول کے ایک ...ل کے بول ہیں "بنا مورے گھر بنڑی کی خاطر بیاہنے آیا" یا درباری کے خیال کے بول ہیں "مبارک بادیاں شادیاں" کسی استاد نے شادی ...ہ کے موقع پر یہ بول بنائے ہوں گے۔ اب ان کا موقع بے موقع گانا مضحکہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قطعہ، رباعی ...ے مضمون کو راگ کے تاثر سے ہم آہنگ کر کے گایا جائے۔ مناسب بولوں سے راگ کا اثر دوگونہ کیا جا سکتا ہے۔ راگ کے روپ میں رباعی یا قطعے ...انے کا ڈھنگ ایک کامیاب تجربہ ثابت ہو چکا ہے۔

دوسری صورت خیال کے بولوں میں ترمیم کرنے کی یہ ہے کہ نئے بول اچھے شاعروں سے لکھوائے جائیں۔ اس باب میں اسلاف پرستی سے انحراف مستحسن ہوگا۔ اسی طرح ٹھمری کے بولوں کی طرف بھی اگر توجہ کی جائے تو یہ نرم و نازک صنف بھی زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی۔ ہلکے پھلکے گانوں میں غزل ہماری محبوب صنف رہی ہے۔ مگر غزل سرائی کا پرانا انداز یعنی ٹھاٹوں کا ڈھنگ فرسودہ ہو چکا ہے۔ کیونکہ وہ مجرے کے زمانہ کی یادگار ہے۔ اب راگوں کی آمیزش اور آرکسٹرا کی امداد سے اس کی صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ غزل کے ساتھ گیت نے بھی اب بہت سے چولے بدل لئے ہیں۔ عربی اور ایرانی دھنوں میں غزلیں بھی گائی جانے لگی ہیں، اور گیت بھی۔ ہمارا ملک عوامی دھنوں کی دولت مالا مال ہے۔ سندھ کی کوہیاری، رالو، سورٹھ۔ پنجاب کی ہیر، مرزا صاحباں، ماہیا۔ سرحد کا ٹپہ، لوبھا، ساقی۔ ادھر مشرقی پاکستان کی دھنیں بھٹیالی، معرفتی، مرشدی وغیرہ اس قدر دلکش دھنیں ہیں کہ انہیں مجلسی گانوں میں رائج کیا جا سکتا ہے۔ ان سب میں غزلیں گانے کا تجربہ بھی کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔

موسیقی میں نئی نئی راہیں تلاش کرنے میں ریڈیو پاکستان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ریڈیو کے بعد فلموں کی جدت طرازیاں قابل داد ہیں۔ حکومت پاکستان کی قائم کردہ آرٹ کاؤنسل نے غیر ملکی فنکاروں اور وفود کی پذیرائی کر کے دوسرے ملکوں کی موسیقی سے استفادہ کے مواقع بہم پہنچائے۔ اس سال کے مہمانوں میں امریکی سمفنی آرکسٹرا، برلن آرکسٹرا، اور چین کا ثقافتی وفد بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ہمارے موسیقار اور موسیقی کے شائقین ان غیر ملکی وفود سے بہت کچھ سیکھ کر اپنے فن کو فروغ دے سکتے ہیں۔ رمبا، سمبا، راک اینڈ رول اور میکسیکن میوزک چلتی ہوئی دھنیں ہمارے ہاں خاصی قبول ہو چکی ہیں۔ بالخصوص فلموں میں۔ مگر انہیں قبول و اختیار کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا ہلکا پن ہماری موسیقی کی عظمت، شان و شکوہ اور رکھ رکھاؤ کو مجروح کر دے۔ خود ہماری موسیقی کے کتنے ہی گوشے ابھی تلاش و تجسس کے محتاج ہیں۔ اور منتظر ہیں کہ۔

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ہماری موسیقی کی ایک معمولی صنف گیت کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ ابھی جو چینی وفد آیا ہوا تھا اس کے گلوکاروں نے اپنے چند روزہ قیام ہی میں ہمارے کئی گیت سیکھ لئے۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ بہترین تحفہ ہے جسے ہم اپنے ملک والوں کے لئے پاکستان سے لے جائیں گے۔"

بہار و خزاں:

بقیہ صفحہ ٦٦

میں کیسے شعلے نگل سکوں گا، میں کیسے زہراب پی سکوں گا
میں اس کے بن کیسے جی سکوں گا میں اس کے بن کیسے جی سکوں گا
عظیم دیوی، زمیں کی سوگند آپ کو مجھ پہ رحم کھائیں
طلسمِ اعجازِ آسماں کی قسم مجھے موت سے بچائیں

دیوی۔ اگرچہ یہ جبر بیکراں ہے، یہ ظلم ظلمِ اجل فشاں ہے
شفیق ماں کے لئے محبت بھی اک کڑا تقدرِ امتحاں ہے
شفیق ماں کی طرح محبت سے دامنِ آرزو بھر دوں گی
سنو تمہارے لئے میں جاکر زمیں سے یہ فیصلہ کروں گی
پراس پائن تمہارے زنداں سے چند دن کو نجات پائے
بہار بن کر گل و سمن میں مسرتوں کے دیئے جلائے
زمیں پہ وحشت اثر بگولوں کا، آندھیوں کا جنون ٹھہرے
اُداس تیرس کی خون روتی ہوئی نگاہوں کا خون ٹھہرے
زمیں پہ زینت نئے شگوفے نشاط کی مشعلیں جلائیں
پراس پائن پراس پائن پراس پائن کے گیت گائیں
صبا کی نرم انگلیاں قباہائے لالہ و گل کے بند کھولیں!
جو آج پتھر بنی ہوئی ہیں وہ شوخ تصویریں منہ سے بولیں

یہ جشن جب ختم ہو رہا ہو قریب تر ہوں خزاں کے سائے
پراس پائن تمہارے زنداں میں بزمِ گلشن سے لوٹ آئے
مسرتوں کی حسین جھولی غموں کے شعلوں سے بھرنی ہوگی
کبھی زمیں کو کبھی تمہیں یہ جدائی برداشت کرنی ہوگی

ہیڈس۔ یہ فیصلہ جاں گسل ہے لیکن یہ فیصلہ بھی قبول مجھ کو
عزیز تر ہیں پراس پائن کی مسکراہٹ کے پھول مجھ کو

ایک آواز۔ پراس پائن کو ہیڈس نے جب سے پابہ زنجیر کر دیا ہے
عظیم دیوی کے فیصلے کو زمیں نے تقدیر کر دیا ہے
چراغ جلتے ہیں تاکہ گل ہوں دھوئیں کے سیلاب بیکراں میں
بہار آتی ہے پھول کھلتے ہیں ڈوب جاتے ہیں پھر خزاں میں
تو سال کے سال روشنی کا ہو منتظر اندھیرے کب تک!
مری زمیں پر خزاں کے تاریک قافلوں کے یہ پھیرے کب تک
ہے کوئی زندانِ ہیڈس کی جو بلند دیوار کو گرا دے
پراس پائن کو طوق و زنجیر تیرگی سے رہا کرا دے
کوئی پیامِ حیات لادے بہار کو عمرِ جاوداں سے
مری زمیں کو نجات مل جائے سالہا سال کی خزاں سے!

سیدھی پیٹھ
اور
مضبوط اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچے کو یہ خالص دودھ
دیجئے
ERMIL
اگر آپ کا بچہ بوتل سے دودھ پا رہا ہے تو اُس کے لئے آسٹر ملک بہترین ہے۔ یہ ایک خالص قوّت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جس کے استعمال سے بچوں کی پیٹھ سیدھی اور اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں اس لئے آسٹر ملک فوراً خرید لیجئے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
تین مہینے کی عمر تک بچے کو ۲۴ گھنٹوں میں ۲۰ گھنٹے سونا چاہئے اس عمر کے بعد نیند کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ نو مہینے کی عمر میں بچے کو دن کے وقت صرف ۳ گھنٹے اور ۲۴ گھنٹوں میں کل ۱۴ گھنٹے سونا چاہئے۔
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

شالامار باغ — لاہور